

جنات اور کائنات کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

جہنم زاد



سنجیدہ خاتون

سنجیدہ خاتون کا تعارف

بچیس برس سے زیادہ ہو گئے کہ سنجیدہ خاتون کی تحریریں مختلف جرائد و روزناموں نیز ہفتہ وار پرچوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ اُن کا نام پڑھنے والوں کے لئے جانا پہچانا ہے۔ وہ دہلی کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کی والدہ مرحومہ کے سگے ماموں مولانا عثمان فارقلیط تھے جن کے نام سے ایک دنیا آشنا ہے۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے ”الجمعیت“ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا مرحوم پہلے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور انہوں نے عیسائی پادریوں سے مناظرے بھی کئے۔ برصغیر کو جب آزادی ملی تو کانگریس کے منافقانہ رویے کے خلاف مولانا نے آواز اٹھائی۔ حکومت ہند نے انہیں صحافت کے شعبے میں خدمات انجام دینے پر ”پدم شری“ کا ایوارڈ دیا مگر مولانا بہ دستور اپنے موقف پر قائم رہے۔

سنجیدہ خاتون ہی کے عزیزوں میں مولانا سلیمان صابر تھے جو دہلی سے شائع ہونے والے ایک کثیرالاشاعت اخبار ”قومی آواز“ کے ایڈیٹر رہے۔ مولانا سلیمان صابر رشتے میں سنجیدہ خاتون کے نانا تھے۔ سنجیدہ خاتون نے طبع زاد تحریریں بھی لکھی ہیں اور دوسری زبانوں سے ترجمے کر کے بھی اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ ایک گھریلو خاتون ہونے کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے کے لئے بھی وقت نکال لیتی ہیں۔ اُن کا کچھ علمی و تحقیقی کام بھی سامنے آچکا ہے۔

آخر میں ہم ”چپکے سے“ اپنے قارئین کو ایک بات بتا دیں کہ سنجیدہ خاتون ہمیں دل و جان سے زیادہ عزیز ہیں اس لئے کہ وہ ہمارے بچوں کی ماں ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے انہیں یہ اختیار بھی دے رکھا ہے کہ بہ وقتِ ضرورت ہم سے ”بیگار“ بھی لیتی رہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ ادھر ہمیں خالی

جن زاد

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

اچانک مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا اور میں نے گھبرا کر اس نرگی آنکھوں والی کی طرف دیکھا جس نے میرے ہوش و حواس اڑا رکھے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے اس کے ہونٹ حرکت میں تھے۔ یقیناً وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ معلوم نہیں اسے کیسے اپنے قریب میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ راہ فرار اختیار کرنے کے سوا اب میرے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ حویلی کی چھت پر تھی اور میں اب اس کے قریب سے ہٹ کر دیوار سے جا لگا تھا۔ میں اس سے جتنا دور ہوتا جا رہا تھا میری حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ وہ جو کچھ بھی پڑھ رہی تھی مجھ سے محفوظ رہنے کے لئے ہی تھا۔ پھر اس نے جیسے ہی پڑھ کر چاروں طرف دم کیا مجھے یوں لگا کہ بھڑکتے ہوئے شعلے میری طرف لپک رہے ہیں۔ میں ان شعلوں کی تپش واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اب وہاں ایک لمحہ بھی مزید رکتا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی سبب وہاں سے فرار ہونے میں دیر نہیں کی۔ میرا قیام شر سے باہر جہانگیر کے مقبرے میں تھا۔ اب میں اسی طرف جا رہا تھا۔ مجھے وہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔

انسان اور شیطان دونوں ہی سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہماری دنیا میں شیطان سے بھی زیادہ خطرناک انسان کو سمجھا جاتا ہے۔ بچپن ہی سے ہمیں انسانوں سے دور رہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود میری ہی طرح اکثر جنات اس تاکید کی پرواہ نہیں کرتے۔ آدم زادوں کے شہنشاہ کی کشش ہمیں اکثر دیرانوں سے آبادیوں کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا حالانکہ میں نے بہت سے ایسے عبرتناک واقعات سن رکھے تھے کہ متعدد جنات انسانوں کے ہاتھوں مارے گئے یا انہیں غلام بنا لیا گیا۔

میں ایک شام اپنے ہم عمر یوسف کے ساتھ شہر کی طرف نکل گیا تھا۔ انسانوں کے ساتھ چھوٹی موٹی شرارتیں کر کے ہمیں بڑا مزہ آتا تھا۔ ہمیں اس خیال سے عجیب سی خوشی محسوس ہوتی تھی کہ انسان

بیٹھے دیکھا، اُدھر کوئی کام تھا دیا، لکھنے پڑھنے کا کام کہ اس کے سوا ہمیں کوئی اور ”ہنر“ نہیں آتا۔ یہ ناول ”جن زاد“ سنجیدہ خاتون ہی کی محنت و کاوش کا ثمر ہے اور انہی کے نام سے کراچی کے ایک ماہنامے میں چھپ چکا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہے اور کسی کو پتا نہ چلے کہ ہم سنجیدہ خاتون کی دھونس میں رہتے ہیں مگر اس کتاب کے پبلشر برادر محمد عبدالغفار کا اصرار تھا کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں بھی اس معاملے میں ”ملوث“ کر لیں۔ سو یوں اس تعارف کی ضرورت پڑ گئی۔

بہر حال سنجیدہ خاتون کا یہ ناول اپنے موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہی کہا جائے گا۔ ہم تو یہی کہیں گے، آپ مانیں کہ نہ مانیں! کتابی صورت میں سنجیدہ خاتون کا کام ابھی کم چھپا ہے، مگر اب اس کی ابتدا ہو گئی ہے۔ توقع ہے کہ یہ سلسلہ وار پراسرار ناول جو حقائق پر مبنی ہے، پڑھنے والوں کو یقیناً پسند آئے گا۔ اگر زندگی کی تلیوں میں کچھ دیر کو یہ ناول پڑھ کر کسی قدر کمی محسوس ہو تو نہ صرف سنجیدہ خاتون بلکہ ہمارے حق میں بھی دعائے خیر کیجئے گا۔

آپ کی محبتوں کا امیر، فقیر
شمیم نوید

ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ شاہی قلعے کے قریب ایک انگریز سر پر ہیٹ لگائے اور ہونٹوں میں موٹا سا سگار دبائے گردن نیڑھی کئے چلا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آگے ساری دنیا کو حقیر و فقیر سمجھ رہا ہو۔ اسے یوں کسی ہتھار کی طرح اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھ کر مجھے شرارت سوچھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار نکال لیا۔ اس نے دھواں جھوٹا بند کر دیا اور اچھل پڑا۔ اسی وقت یاسف نے پیچھے سے بڑھ کر اس کا ہیٹ اتار لیا۔ چند قدم کے فاصلے سے ایک ”دھوٹی بند“ چلا آ رہا تھا۔ یاسف نے وہ ہیٹ اس کے سر پر رکھ دیا۔ کسی فٹ بال کی طرح گول منول وہ دھوٹی بند ہندو اچھلا اور اسی لمحے انگریز نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اپنا ہیٹ اس ہندو کے سر پر دیکھ کر انگریز کا چندر چہرہ مزید چندر نظر آنے لگا۔ میں نے اس دوران میں ایک اور کارروائی کی کہ بوکھلائے ہوئے ہندو کے ہاتھ میں سگار بھی تھما دیا۔

انگریز اس ہندو پر برس پڑا۔ ”نم کالا آڈمی امارے ساٹ بوڈامی کورٹا۔“

”ہے رام..... ہے رام“ کہتے ہوئے ہندو نے اپنے سر سے ہیٹ اتار لیا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے سگار گر گیا اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر انگریز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

معلوم نہیں اس ہندو کی جان انگریز سے کیسے چھوٹی، ہم تو ایک باریش بوڑھے آدمی کو ادھر آتے دیکھ کر بھاگ لئے تھے۔ اس بوڑھے کی پیشانی پر سجدوں کا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔ ہمیں علم تھا کہ عام آدمیوں کے مقابلے میں اس وضع قطع کے آدمی ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے بھاگنے کی وجہ یہی تھی ورنہ ہم مزید کچھ دیر اسی جگہ رک کر لطف اندوز ہوتے۔ وہاں سے ہم ادھر ادھر گھومتے ہوئے بھائی دروازے کی طرف نکل گئے۔

یہ واقعہ اسی روز کا ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ اس غارت گر ہوش کو دیکھا۔ اس کی طرف مجھے یاسف نے متوجہ کیا تھا۔

”وہ دیکھ..... ادھر علیا لیش!“ یاسف نے کہا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ میڑھیاں اترتی ہوئی نیچے بڑے سے صحن کی طرف آ رہی تھی۔ سرو قد، زرگی آنکھیں، گوری رنگت، متناسب جسم، سر کے بال گھٹاؤں کی طرح شانوں پر بکھرے ہوئے، ہلکے نیلے رنگ کا شرار اسوٹ اس کے جسم پر تھا اور دوپٹہ گلے میں پڑا ہوا تھا۔

صحن میں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پلنگ پر کوئی بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی جو پاندا بند کر رہی تھی۔

”زرگس بیٹی! میں نے تم سے کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو چھت پر نہ جایا کرو۔“ بوڑھی عورت نے اس ”قیامت“ کو مخاطب کیا۔ ”مولوی صاحب نے دیکھ لیا کسی دن تو تیرے ساتھ مجھے بھی دس باتیں سنائیں گے۔ ارے جب دونوں وقت ملتے ہیں تو جانے کیا کیا الائنس بلائیں آسمان سے اترتی ہیں، بہترے دیا تک تو اس وقت رک جاتے ہیں، مگر تو میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہے۔“

”ای! میں تو نما کر بس بال سکھانے اوپر چھت پر گئی تھی۔“ وہ میڑھیوں سے اتر کر صحن میں آ گئی۔

اسی وقت مغرب کی اذان ہو گئی۔ بڑی بی نے کہا۔ ”اچھا چل، وضو کر کے نماز پڑھ لے۔“

”وضو ہے میرا۔“ اس نے جواب دیا اور صحن سے دالان کی طرف بڑھ گئی۔

”اے علیا لیش! تجھے کیا ہوا؟“ یاسف نے مجھے ٹوکا۔

”کچھ..... کچھ نہیں۔“ میں چونک کر بولا۔

”تو پھر چل نا، یہیں کیوں رک گیا؟“ یاسف نے کہا۔ ”کہیں تجھ پر اس آدم زاد کی جادو تو نہیں چل گیا؟“

جادو تو خیر مجھ پر چل گیا تھا مگر میں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ یاسف کو کوئی شک نہ ہو میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل دیا۔ اس وقت تک زرگس نماز پڑھنے کے لئے کھڑی ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے میں نے اس پر نگاہ ڈالی اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ میں نے واپس میں اس حویلی کے محل وقوع کو یاد رکھا تھا۔ رات کے وقت پھر میرا ارادہ وہاں آنے کا تھا۔ اس آدم زاد کی نے اپنی پہلی ہی جھلک میں مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔

نصف شب کے قریب میں جہانگیر کے مقبرے سے بھائی دروازے کے لئے روانہ ہوا اور جلدی ہی وہاں پہنچ گیا۔ میری آنکھوں میں زرگس کا حسین چہرہ گھوم رہا تھا۔

مطلوبہ حویلی میں داخل ہو کر میں آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم ٹھک کر رک گیا۔ میرے رکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے وہاں اپنے سوا کسی اور غیر انسانی وجود کی موجودگی کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے، میری سماعت سے ایک غیر انسانی آواز نکلتی۔ ”چلا جاییاں سے اور آئندہ کبھی ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”کون ہے تو؟ سامنے آ۔“ میں نے اسے للکارا۔ ”بزدلوں کی طرح چھپا ہوا کیوں ہے؟“

”میں اس لئے چھپا ہوا ہوں کہ تو مجھے دیکھنے کی تاب نہ لاسکے گا۔ میرا نام صخرہ ہے اور میں عفاریت میں سے ہوں۔“ غیر انسانی آواز پھر اندھیرے سے ابھری۔

جنت کی دس قسمیں ہیں، انہی میں سے ایک قسم عفاریت کی ہے جو عفریت کی جمع ہے۔ عفریت کو دیو بھی کہتے ہیں۔ یہ بڑے سرکش، لڑاکا اور زور آور ہوتے ہیں۔

یہ جاننے کے باوجود کہ وہ عفریت ہے میں اس سے نہیں ڈرا اور کڑک کر بولا۔ ”تو مجھے روکنے والا کون ہوتا ہے، تجھے یہ حق کس نے دیا؟“

”اس حویلی کے مالک مولوی کفایت اللہ نے۔“ میرے سوال کا جواب ملا۔ ”میں اس حویلی کا محافظ ہوں۔ مجھے اس کام پر حویلی کے مالک ہی نے متعین کیا ہے۔“

”مگر تو قوم جنت میں سے ہو کر ایک آدم زاد کی خدمت بجالانے پر کیوں مجبور ہو گیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس لئے کہ میں‘ مولوی کے کسی بھی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے اس نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔“

”سن‘ نہ تو عفواریت میں سے ہے اور نہ تیرا نام مضمر ہے۔ آواز بدل کر بولنا چھوڑ دے اے یاسف! میں نے تجھے تیری خوشبو سے پہچان لیا ہے۔“ میں نے کہا۔

جس طرح انسانوں کے چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے جسموں کی بو بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی جنات کے ساتھ بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام انسان مختلف جسموں کی بو کو الگ الگ شناخت نہیں کر سکتے لیکن جنات ایک دوسرے کے وجود کی بو یا آسانی پہچان سکتے ہیں۔ میں نے اسی سبب یاسف کو پہچان لیا تھا۔ ہاں اس میں کچھ دیر ضرور لگی تھی کیونکہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ تھا۔

میری بات سن کر اور راز افشا ہو جانے پر اس نے اندھیرے کی چادر اپنے اوپر سے ہٹا دی اور ظاہر ہو گیا۔ وہ یاسف ہی تھا۔

”مجھے یقین تھا اے علیالیش کہ تو آج رات یہاں ضرور آئے گا۔“ یاسف نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”تاکہ مجھے یہاں سے ڈرا کر بھگا دے اور پھر اس آدم زاد کو یہاں سے اٹھا کر لے جائے یا میں اسی حویلی میں اس سے قرب کی آرزو پوری کر لے۔“ میں نے طنز کیا۔

”تو مجھے غلط نہ سمجھ اے علیالیش! مت بھول کہ میں بھی تیری طرح ایک جن زاد ہوں اور تیرا دوست بھی ہوں۔ اسی دوستی کے رشتے نے مجھے یہاں رکنے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ میں تجھے مشکل میں گرفتار ہونے کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہوتا۔ پھر جو مجھ پر گزر چکی ہے‘ تجھ پر بھی گزرتی۔“

”کیسی مشکل اور تجھ پر کیا گزری؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”میں تو تجھے یونہی چھیڑنے کے لئے مضمر بن گیا تھا ورنہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ تو میرے جسم کی مخصوص خوشبو پہچان لے گا۔ میرا اصل مقصد تو محض یہ تھا کہ تو خطرے کی حدود میں داخل نہ ہو اور مزید آگے بڑھنے سے رک جائے۔“ یاسف بتانے لگا۔ ”بات یہ ہے کہ.....“

”مگر کیوں؟“ یاسف کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”تو کس لئے درمیان میں آکودا؟“

”تجھے مجھ پر جو شک ہو رہا ہے‘ غلط نہیں۔“ یاسف نے جواب دیا۔ ”میں تیرا دوست ہوں اس لئے تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرا ارادہ اس آدم زاد کو اٹھا کر لے جانے ہی کا تھا۔ تیرا قیاس درست تھا۔ وہ مجھے آج ہی شام کو پسند آگئی تھی۔“ یاسف نے اعتراف کر لیا۔

”مگر تو نے تو شام کو مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔“ میں نے شکوہ کیا۔ ”اس پر تجھے دوستی کا دعویٰ ہے۔“

”اور اے علیالیش! تو نے بھی مجھے کب کچھ بتایا تھا کہ تیرا کیا ارادہ ہے۔ اس کے باوجود میں نے

خود ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ تجھ پر اس آدم زادی کا جادو چل گیا ہے۔ میں نے اسی سبب تیرے یہاں پہنچنے سے پہلے اسے اڑا لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یاد کر کہ تو نے بھی تو ایک مرتبہ ایسا ہی کیا تھا۔ میں آج اسی کا بدلہ چکانے والا تھا۔ جس طرح بعد میں تو نے مجھے تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتا دیا تھا‘ میں بھی تجھ سے کوئی بات راز نہ رکھتا۔“

یاسف غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ گزشتہ سال ہی کا واقعہ تھا۔ وہ ایک سکھ لڑکی کلونت کور تھی‘ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں والی کلونت کور۔ ہونا سے قد والی کلونت پے در پے میری اور یاسف کی وحشوں کا شکار ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دن میں اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا کیونکہ وہ ہم دونوں میں کسی ایک کو بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔ وہ ہمیں صرف محسوس کر سکتی تھی۔ ایک کنویں میں چھلانگ لگا کر اس نے جان دے دی تھی۔ یہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا تو پھر میں نے یاسف سے گلہ نہیں کیا۔ زنگس کے معاملے میں جو اندازہ یاسف نے لگایا تھا‘ وہی قیاس کلونت کور کے بارے میں میرا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یاسف اس آدم زادی پر مر رہا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ یاسف کو میرے ارادے کا علم ہو جاتا‘ میں کلونت کور کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

”خیر پچھلے قصوں کو چھوڑ اے یاسف!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہ بتا کہ تو کس خطرے کا ذکر کر رہا تھا؟“

”اس آدم زادی زنگس کا باپ مولوی کفایت اللہ بڑا کائیاں نکلا۔“ یاسف بتانے لگا۔ ”اس خبیث نے زنگس کی چارپائی کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے جس کے اندر داخل ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ وہ حصار کیونکہ نادیہ تھا اس لئے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر جیسے ہی میں حصار کی حدود میں داخل ہوا میرے وجود کو جھٹکا لگا۔ میں پیچھے جا کر۔“ یاسف تفصیل کے ساتھ مجھے خطرے کی نوعیت سے آگاہ کر رہا تھا۔ ”جھٹکا لگنے کے بعد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہاں نادیہ حصار کھینچا گیا ہے۔ شک تو مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا جب میں تجھے جہانگیر کے مقبرے میں چھوڑ کر یہاں واپس آیا تھا۔ زنگس کا باپ اس وقت نماز پڑھ کر واپس آ چکا تھا۔ حویلی میں کئی مرد اور عورتیں‘ مولوی کا انتظار کر رہی تھیں۔ کسی کو وہ پانی دم کر کے دے رہا تھا‘ کسی کو تعویذ۔ پھر میں نے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں تو ذرا ڈرا۔ پتا لگا کہ جن عورتوں یا مردوں پر جنات کا‘ یعنی ہمارا اثر ہو جاتا ہے‘ مولوی ان کا علاج کرتا ہے۔ کسی سے بھی وہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا بلکہ فی سبیل اللہ علاج کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے میرا کہ وہ کوئی پیشہ ور مولوی نہیں۔ بطور تحفہ بھی کوئی اسے کچھ دینا چاہتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ اتار کلی بازار میں اس کی دکان ہے‘ کپڑے کی بڑی دکان۔ بہر حال میں یہاں اس لئے رکا رہا اے علیالیش! کہ کہیں زنگس تک پہنچنے کے لئے تو بھی میری ہی طرح نادانستی میں اس نادیہ حصار سے نہ ٹکرا جائے۔ اس زبردست جھٹکے کا اثر اب تک مجھ پر ہے۔“ یاسف یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

یاسف نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق زنگس کا باپ مولوی کفایت اللہ واقعی خطرناک آدمی تھا۔ ہمیں زنگس اور مولوی دونوں ہی سے دور رہنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں کچھ

”تو اس سے ڈر رہا ہے تو چلا جا“ میں تجھے نہیں روکوں گا۔ مولوی کے لئے میں اکیلا کافی ہوں۔“
مجھے اور بھی غصہ آگیا۔
”لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ تو چاہتا کیا ہے؟“ یاسف کہنے لگا۔
”چاہتا کیا ہے؟ چل کر اسے ختم کئے دیتے ہیں۔ جب وہ خمیٹ ہی زندہ نہیں رہے گا تو پھر اس کا کھنچا ہوا نادیہ حصار بھی ختم ہو جائے گا۔“ میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔
”ہاں یہ ممکن تو ہے۔“ یاسف بڑبڑایا۔ ”لیکن شاید..... شاید اسے ختم کرنا آسان نہ ہو۔“
”کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”خود وہ بھی تو کسی حفاظتی حصار میں ہو سکتا ہے۔“ یاسف نے خدشے کا اظہار کیا۔
”اب جو بھی ہو۔“ میں اپنی بات پر اڑ گیا۔ ”زرگس کو حاصل کرنے کے لئے اس مولوی سے فکر تو لینا ہی پڑے گی۔“

مجبوراً یاسف کو میرا ساتھ دینا پڑا۔ اس کے لئے میں نے یاسف کو یہ لالچ بھی دیا تھا کہ جس طرح سکھ لڑکی کلونت کو ر کو بعد میں یاسف کے حوالے کر دیا تھا، زرگس کو بھی اس کے لئے چھوڑ دوں گا۔ معاملہ کیونکہ ایک خطرناک آدمی سے نمٹنے کا تھا اس لئے میں نے یاسف کو بھی اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

مولوی کفایت اللہ ہمیں اسی حویلی کے ایک کمرے میں بے خبر سوتا ہوا مل گیا۔ معلوم نہیں اس وقت غصے کے زیر اثر مجھے کیا سوچھی کہ تیزی سے آگے بڑھ کر وہ چارپائی الٹ دی جس پر مولوی سویا ہوا تھا۔ یقیناً اس چارپائی کے گرد کوئی نادیہ حصار قائم نہیں تھا ورنہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔
فرش پر گرے ہی مولوی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں مولوی پر حملہ کر پاتا، خلاف توقع وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں ”یا اللہ“ کہا اور کچھ بڑھ کر تیزی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کو ایک بڑے دائرے کی صورت میں حرکت دی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی تین انگلیاں بند تھیں اور شہادت کی انگلی سیدھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ ابھی تک حرکت میں تھے۔

مجھے خطرہ محسوس ہوا تو مولوی کی طرف جھپٹنے جھپٹنے رک گیا۔ یاسف کو بھی یقیناً کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے ہٹنے سے میں نے یہ اندازہ لگایا۔ پھر میں اور یاسف ایک ساتھ مڑ کر دروازے کی طرف بھاگے تھے، مگر ہمیں دیر ہو چکی تھی۔

معاً مجھے یوں لگا جیسے کسی نفوس شے سے ٹکرا گیا ہوں۔ اسی کے ساتھ مجھے انتہائی سردی محسوس ہوئی، اتنی کہ میں کانپنے لگا۔ بالکل یہی حال یاسف کا بھی تھا۔ ہم دونوں ہی ایک سرخ حصار میں قید ہو چکے تھے۔ حصار کے اندر بلا کی ٹھنڈک تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود ہم کر رہ جائے گا۔

”کون ہو تم؟“ ایک سخت آواز کمرے میں گونجی۔ ”جواب دو کہ تم کس ارادے سے میری حویلی میں داخل ہوئے تھے؟“

اور بھی سوچ رہا تھا۔ کہیں یاسف نے مجھے زرگس سے دور رکھنے کے لئے تو یہ ساری کمائی نہیں سنائی؟ یہ بات بہر حال خارج از امکان نہیں تھی۔ پہلے اس نے صخرہ بن کر مجھے وہاں سے بھگانا چاہا، پھر راز کھل گیا تو نادیہ حصار کا قصہ سنا دیا۔

”میں خود یہ دیکھتا ہوں اے یاسف کہ اس مولوی نے اپنی بیٹی کی چارپائی کے گرد کیسا نادیہ حصار کھینچ رکھا ہے؟“ میں کچھ دیر بعد بولا۔
”تجھے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا اے علیالیش! تو خود کو خطرے میں نہ ڈال۔“

یاسف کے سمجھانے اور یقین دلانے کے باوجود میں نہیں مانا۔
”اگر تو بھند ہے تو پھر ٹھیک ہے، خود چل کر دیکھ لے۔“ یاسف نے کہا۔
”چل میرے ساتھ۔“ میں آگے بڑھا۔

یاسف میرے ساتھ ہو لیا۔ یاسف کی رہنمائی میں میں اس کمرے کے اندر داخل ہو گیا جہاں زرگس محو خواب تھی۔ کمرے میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اس کی ماں دوسری چارپائی پر سو رہی تھی۔ میں اسے شام کو دیکھ چکا تھا۔ کمرے میں لائٹیں کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
میں ’زرگس کی چارپائی کی طرف بڑھنے لگا تو یاسف نے مجھے احتیاط برتنے اور زیادہ آگے نہ بڑھنے کو کہا۔

”تو فکر نہ کر، میں احتیاط ہی سے کام لوں گا۔“ میں نے جواب میں کہا اور رک نہیں۔
زرگس کی چارپائی سے کچھ فاصلے پر میں رک گیا۔ وہ اسی طرف کروٹ لئے سو رہی تھی جدھر میں کھڑا تھا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر لٹک رہی تھی اور ایک ہاتھ رخسار کے نیچے تھا۔ آدھے جسم پر اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سانس لینے کی وجہ سے اس کے جسم میں جو خفیف سی حرکت ہو رہی تھی میرے لئے بڑی قیامت خیز تھی۔ سوتے ہوئے تو وہ اور بھی حسین نظر آ رہی تھی۔ میں ایک عالم وارفتگی میں اس کی طرف بڑھتا چلا گیا جیسے کوئی قوت مجھے کھینچنے لگے جارہی ہو۔ اس وقت نہ تو مجھے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کوئی احتیاط مد نظر تھی۔ پھر اگر یاسف بروقت مجھے مزید آگے بڑھنے سے نہ روک دیتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ اس نادیہ حصار سے ٹکرا کر مجھے معمولی سا جھٹکا ہی لگا تھا لیکن اس سے حقیقت کا علم ضرور ہو گیا تھا۔ یاسف نے واقعی سچ بولا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے زرگس کے باپ مولوی کفایت اللہ پر شدید غصہ آیا جس نے گویا خشن کے خزانے پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ یہ غصہ اپنی ناکامی پر جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔

”آ اے یاسف! اس مولوی کی خبر لیتے ہیں۔“ میں نے غصے میں کہا۔ ”ظاہر ہے وہ بھی بیس کہیں کسی کمرے میں سو رہا ہو گا۔“ یاسف کے ساتھ میں ’زرگس کے کمرے سے نکل آیا۔

”میرا مشورہ تو یہ ہے اے علیالیش کہ یہاں سے چلا ہی چل، مولوی کو چھیننا مناسب نہیں ہے۔ وہ خطرناک آدمی لگتا ہے۔“ یاسف نے مجھے سمجھایا۔

میں کانپتے ہوئے پڑا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مولوی کفایت اللہ کھڑا تھا۔ شعلے برساتی ہوئی اس سرخ آنکھیں مٹی پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے وجود اس کے لئے ناپید نہ رہے ہوں دی۔ اس کے سوا کہ وہ خود بھی اس معاملے میں بے قصور نہیں تھا، یاسف نے سب کچھ سچ سچ بیان وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔ مجھے یاسف کا مشورہ یاد آ رہا تھا کہ مولوی کو چھیڑنا مناسب نہیں ہے لیکن اب کیسے دیا، یہ بھی کہ میرا ارادہ اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے جانے کا تھا۔ اس نے سارا الزام مجھ پر ڈال دیا تھا۔ سکتا تھا، تیر تو مکان سے نکل چکا تھا۔

”بولو۔“ مولوی نے ہمیں پھر مخاطب کیا۔ ”اگر تم نے میرے سوالوں کے جواب نہیں دیئے، مولوی کے سامنے بھولا اور نیک بن گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس موقع پر یاسف کا بھانڈا بھی پھوڑ دوں لیکن تمہیں اسی حصار میں برف کی طرح جما دوں گا۔“ پھر جب چند لمحے خاموش رہ کر دوبارہ بولا تو اس کی آنکھیں پانی سے تر ہو گئیں۔ ”اگر تم نے سچ بولا اور آئندہ کے لئے کوئی شرارت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا، میں تو پھر بھی بے گناہ ثابت نہ ہوتا۔“

میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔“

میں سردی کی اذیت برداشت کرنے کے باوجود سچ بولنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا، اگر مولوی کفایت اللہ کے لمبے میں اظہار تاسف ہو رہا تھا۔ یاسف سے اس نے جو کچھ سنا تھا، ظاہر ہے اسے کوہنچا چلا گیا کہ ہم اس کی بیٹی کے چکر میں وہاں آئے تھے تو وہ ہمیں کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے، اس نے کھلا کر رہ گیا ہو گا۔ ”تو نے میری معصوم اور بھول سی بچی پر نیت خراب کی۔ کیا تجھے نہیں معلوم میں نے اسی وجہ سے جھوٹ کا سہارا لیا۔“

”مولانا! دراصل ہمارے پیچھے ایک خطرناک عفریت لگ گیا تھا۔ اسی سے چھپنے کے لئے ہم۔“

”مولانا! میں سخت شرمندہ ہوں، خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔“ میں نے مصلحت کے تحت حویلی میں آگئے کہ وہ ٹل جائے تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں۔“ میں نے لجاجت کے ساتھ کہا۔

”اور تم نے اسی لئے حویلی میں گھس کر میری چارپائی الٹ دی۔“ مولوی کے لمبے میں زہر بھرا ہوا لہجہ تھا۔ یہ سوچ کر میں نے یاسف کو بھی نہیں بخشا اور بولا۔ ”مولانا! میرا ساتھی بھی اتنا ہی فہروردار ہے جتنا میں ہوں۔ خود کو آپ کی نظر میں نیک ظاہر کرنے کے لئے یہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ میں جب یہاں آیا تو یہ پہلے موجود تھا۔ اس سے آپ قسم لے کر پوچھ لیجئے۔“

”نہیں مولانا! اچانک یاسف جھج اٹھا۔ ”میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے خاطر کہنے لگا۔ ”یقین کریں کہ میں تو صرف علیا لیش کے ساتھ تھا۔ میں نے تو اس سے منع بھی کیا تھا، تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ مولوی نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔ ”جاؤ بدبختو! میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں آزاد کرتا ہوں کہ وعدہ خلافی اللہ کو پسند نہیں۔“ یہ کہتے ہی مولوی نے کچھ پڑھ کر اپنے اٹھ بھانڈے کو الٹی گردش دی۔ اسی کے ساتھ وہ سرخ حصار غائب ہو گیا جس میں اس نے مجھے اور یاسف کو دھکے کھائے تھے۔

”یاسف۔“ اس نے مردہ سی آواز میں بتایا۔

”تم دونوں ہی مجھے اہل ایمان میں سے لگتے ہو۔“ مولوی کا انداز تصدیق طلب تھا۔

”جی ہاں، ہم مسلمان ہیں۔“ یاسف ہی نے جواب دیا۔

”مگر شاید تم جنات کے اس گروہ سے ہو جو اب منافق و فاسق ہو چکا ہے۔ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟“

”قبیلہ وہوش سے۔“

”تو اے قبیلہ وہوش کے گمراہ جنو! بتاؤ کہ کس نیت سے اس حویلی میں داخل ہوئے تھے؟“

چاہے بظاہر ہی مسلمان سہی مگر یقین رکھو کہ اس محترم رشتے کے سبب میں تمہارے ساتھ رعایت نہ کریں گے۔ مولوی نے فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

مولوی کی فراخ دلی کا مجھ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا لیکن یاسف نے اپنی جان بچانے کی غرض سے اپنے بچے تھے پھر بھی ہم نے اس کی یاد کو سراہیہ جاں بنا رکھا تھا۔ اس معاملے میں یاسف میرا رقیب تھا۔

لیکن یہ رقابت رفتہ رفتہ پگھلت میں بدل گئی تھی۔ اس کا اور میرا دکھ بھی تو ایک ہی تھا۔ مولوی کفایت اللہ سے انتقام لینے کا خیال بھی بار بار آتا تھا اس لئے کہ پہلے کبھی کسی آدم زاد کے ہاتھوں میری اذیتیں نہیں ہوئی تھیں۔ ایک روز اپنے اسی خیال کا اظہار میں نے یاسف سے بھی کر دیا۔

”اے علیالیش! کیا تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں جو ایسی بات سوچتا ہے؟“ یاسف خوفزدہ آواز بولا۔

”کیا تو بھول گیا کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے؟“

”ہاں معلوم ہے مجھے۔“ میں نے ٹھنڈے جھانس بھرا۔

”اگر معلوم ہے تو پھر انتقام کو بھول جا۔“

”یہ ممکن ہوتا تو میں تجھ سے اس کا ذکر ہی کیوں چھیڑتا اور کچھ نہیں تو ہم اسے مالی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”وہ کیسے؟“ یاسف نے پوچھا۔

”اس کی دکان میں آگ لگا کر۔“ میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔ ”اے کیا بتا چلے! آگ کس نے لگائی۔“

”اور اگر اسے کسی طرح معلوم ہو گیا تو؟“ یاسف اب بھی ڈرا ہوا تھا۔

”اول تو اسے کچھ خبر ہی نہ ہوگی! فرض کرو اسے خبر ہو بھی گئی تو ہم کچھ عرصے کے لئے یہ ڈھونڈ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ پھر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ہم اس کے ساتھ ہی نہیں آئیں اور نہ ادھر جائیں گے۔“ میں نے یاسف کو ہموار کرنے کی خاطر کہنے لگا۔ ”پھر موقع دیکھ کر ہم زرگس کا بھی کر سکتے ہیں، مولوی تو دکان کے چکر میں پھنسا ہو گا۔“

”میں تو ہرگز اب مولوی کی حویلی میں نہیں جاؤں گا۔“ یاسف نے صاف انکار کر دیا۔ ”پھر یہ اس کی دکان جلائے سے ہمیں کیا فائدہ؟“

”فائدہ تو ہے۔ اس کی دکان کو آگ لگا کر ہمارے جذبہ انتقام کو سکون مل جائے گا۔“ میں نے اور بہت دن سے اس ظالم کو بھی نہیں دیکھا۔ کیا کہتا ہے چلیں آج ہی؟“

”قطعاً نہیں۔ تو شاید بھول گیا کہ مولوی نے کیا کہا تھا؟“

”سب یاد ہے۔ میں نے اس کی ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ ہم ایسے وقت چلیں گے جب مولوی میں نہ ہو۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ ”سن، وہ حفاظتی نادیدہ حصار تو مولوی رات کے کھینچتا ہو گا جب زرگس سوجاتی ہوگی۔ سونے سے پہلے تو زرگس کے گرد حصار کھینچا نہیں رہتا ہو گا۔“

”تو پھر آخر تو کیا کرنا چاہتا ہے؟“ یاسف نے معلوم کیا۔

”دیکھ اے یاسف! ہم اگر ذرا سی بہت سے کام لیں تو زرگس کو اٹھا کر لا سکتے ہیں۔“ میں نے بوجوش آواز میں کہا۔

”گلتا ہے اے علیالیش! کہ زرگس کے عشق اور اس کے قرب کی آرزو نے تجھے پاگل کر دیا۔“ میرے دوست! مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں داخل ہونے کا مطلب یقینی موت ہے اور میں ابھی

نہیں چاہتا، نہ تجھے مرنے کے لئے وہاں جانے دوں گا۔“ یاسف میری بات سن کر بولا۔

”تو میری بات سمجھ ہی نہیں رہا اے یاسف! خطرہ تو اس وقت ہو گا جب مولوی کفایت اللہ حویلی میں موجود ہو۔“ میں نے بحث کی اور اسے سمجھانے لگا۔ ”ہر وقت تو وہ حویلی میں نہیں رہتا، دکان پر بھی تو جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر ایک وقت تو مجھے ایسا معلوم ہے کہ جب وہ یقینی طور پر حویلی سے باہر ہوتا ہے۔ مغرب کی نماز وہ بادشاہی مسجد میں پڑھتا ہے۔ بھائی دروازے سے بادشاہی مسجد جانے، نماز پڑھنے اور پھر واپس آنے میں ظاہر ہے اسے خاصا وقت لگتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس دوران میں کام دکھایا جاسکتا ہے۔“ یاسف کا لہجہ اب امید افزا تھا۔

”ہاں اور کیا، بالکل۔“ میں جلدی سے بول اٹھا۔

یاسف کی سمجھ میں آخر میری بات آئی گئی۔ وہ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا، مگر اس کے باوجود کہنے لگا۔ ”میں تیرے ساتھ حویلی کے اندر نہیں جاؤں گا۔ میں باہر ہی رہوں گا۔ حویلی میں تو اکیلا ہی جائے گا۔ میں اسی شرط پر تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ پھر یہ کہ باہر رہ کر میں تجھے کسی ممکنہ خطرے سے بھی آگاہ کر سکتا ہوں۔“

”اچھا، تو چل تو سہی۔“ میں خوش ہو گیا۔

مغرب کا وقت ہونے ہی والا تھا جب میں اور یاسف، بھائی دروازے پہنچ گئے۔ دور ہی سے میں نے مولوی کفایت اللہ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ حویلی سے باہر نکل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت اپنے معمول کے مطابق بادشاہی مسجد ہی جاسکتا تھا۔ میدان صاف ہوتے ہی ہم دونوں تیزی سے حویلی کی طرف بڑھے۔ پھر یاسف تو باہر ہی رک گیا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

زرگس آج بھی حویلی کی چھت پر تھی۔ پڑوس کے مکان کی چھت، حویلی کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ اس طرف جو دیوار تھی، وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ زرگس اسی دیوار کے قریب کھڑی ہوئی اپنی ہی عمر کی ایک لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ وہ لڑکی بس واجبی شکل و صورت کی تھی۔

”اقبال بھائی نے کہلویا ہے کہ انہیں جلد نوکری ملے والی ہے۔“ لڑکی، زرگس سے کہہ رہی تھی۔

”انہوں نے میرے ذریعے تم سے معلوم کرایا ہے کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو وہ اہی کو رشتہ لے کر تمہارے گھر بھیج دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے تمہارا جواب منگوایا ہے۔“

لڑکی کی بات سن کر زرگس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس لمحے مجھ پر ایک قیامت گزر گئی۔ میں نے سوچا، تو میری محبت کسی اور کی ہونے والی ہے؟ میں تو اب تک زرگس کے معاملے میں یاسف ہی کو اپنا رقیب سمجھتا آیا تھا، یہ معلوم نہیں تھا کہ اصل رقیب کوئی اور تھا، ایک آدم زاد۔ اس ذکر پر زرگس کے شرم جانے کا مطلب بھی میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ وہ بھی یقیناً اقبال کو چاہتی ہوگی۔ میرے لئے یہ بات اور بھی رنج میں مبتلا کر دینے والی تھی کہ میری محبوبہ کا منظور نظر کوئی اور تھا۔

زرگس کو خاموش دیکھ کر وہ لڑکی پھر بولی۔ ”تو پھر میں تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں؟“

کچھ کئے بغیر زرگس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”سنو“ اقبال بھائی نے یہ بھی کھلوا یا ہے کہ آج رات کو جب سب سو جائیں تو تم چھت پر آ جانا۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“ لڑکی نے مزید کہا۔

”مہم..... مگر کسی..... کسی نے دیکھ..... دیکھ لیا تو..... تو غضب ہو جائے گا۔“ زنگس اس بات پر کچھ گھبرا سی گئی۔ ”ان..... ان سے کہنا کہ..... کہ ایک دن اور..... ممبر کر لیں۔ کل امی اور ابو ایک عزیز کی شادی میں جائیں گے۔ میں..... میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے رک جاؤں گی۔“

”لیکن وہ..... وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں؟“ لڑکی حیرت سے بولی۔

”کبھی جب ایسا ہوتا ہے تو وہ وحیدن بوا کو میرے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔“ زنگس نے بتایا۔ ”وہی وحیدن بوا جو پیوہ ہو گئی ہیں۔ دو گھر چھوڑ کر ہی تو وہ رہتی ہیں۔ تم نے انہیں دیکھا ہو گا۔ نیند کی بڑی کچی ہیں وہ۔ ادھر انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی ادھر جھونکے لینا شروع کر دیئے۔ کبھی کبھی تو اللہ کی بندی نماز پڑھتے ہوئے سجدے ہی میں سو جاتی ہیں۔“

”ہاں میں جانتی ہوں، وحیدن بوا کو۔ میری امی بھی ان کی مدد کرتی رہتی ہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں اقبال بھائی سے کل کے لئے کہہ دوں گی۔“ وہ لڑکی جانے کے لئے مڑ گئی۔

اس لڑکی کے جاتے ہی میں تیزی سے زنگس کی طرف بڑھا۔ زنگس نے تیز تیز اور جلدی جلدی سانس لے کر ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ سو گھنے اور دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر وہ زیر لب کچھ پڑھنے لگی۔ ابھی میں اس کے قریب نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے جھکا سا لگا اور میرا دم گھٹنے لگا۔ زنگس کے ابھرے ابھرے خوبصورت ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ زنگس کو کسی طرح وہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔ مجبوراً مجھے ناکام لوٹنا پڑا۔

واپسی میں یاسف نے مجھ سے ناکام لوٹنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔ ”اس کبخت مولوی نے یقیناً اپنی بیٹی کو کچھ ایسی نشانیاں بتا رکھی ہیں کہ اسے اپنے قریب جنات کی موجودگی کا علم ہو جائے، اسی کے ساتھ کوئی ایسا وظیفہ بھی لازماً بتایا ہے جس کے پڑھنے سے جنات قریب نہ آسکیں۔“ اس کے بعد یاسف کو میں نے آگاہ کر دیا کہ زنگس نے جو وظیفہ پڑھا تھا، اس سے میری کیا حالت ہو گئی تھی۔ اپنی بات پوری کر کے میں مزید بولا۔ ”یہ مولوی تو جان کا عذاب ہو گیا ہے، ظالم ہمارا کوئی وار کارگری نہیں ہونے دیتا۔ اب اسے سبق دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ میری آواز میں مولوی کفایت اللہ کے لئے غصہ بھی تھا اور شدید نفرت بھی۔ میرے اور زنگس کے درمیان وہ ایک ایسی دیوار بن گیا تھا جسے گرانما مشکل ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی آدم زاد کی حصول میں مجھے اتنی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں اسی رات کو یاسف کے ساتھ اناٹا کی بازار پہنچا۔ بازار بند ہو چکا تھا۔ یاسف نے مجھے بہت سمجھایا، بڑی کوشش کی کہ میں، مولوی کفایت اللہ جیسے خطرناک آدمی کے خلاف انتقامی کارروائی سے گریز کروں، مگر میں بے انتہا جلا ہوا تھا۔ میں نے اسی لئے یاسف کی بات نہیں مانی اور مولوی کفایت اللہ کی دکان میں آگ لگا دی۔ آگ اتنی زبردست لگی کہ آس پاس موجود دکانوں کے جلنے کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔

یاسف نے مجھے اس خطرے سے آگاہ کیا۔ ظاہر ہے دوسرے دکان داروں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اس لئے میں نے آگ کو پھیلنے سے روک دیا۔ مولوی کفایت اللہ کی دکان میں جتنا بھی کپڑا تھا، جل کر خاک ہو گیا۔ اس سے میرے جذبہ انتقام کو بڑی تسکین ملی۔ کسی بھی طرح سہی میں، مولوی کفایت اللہ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مالی نقصان بھی بہر حال آدمی کو صدے ہی سے دوچار کرتا ہے۔

دوسرے دن صبح ان تماشائیوں میں خود میں بھی شامل تھا جو مولوی کفایت اللہ کی جلی ہوئی دکان کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ توقع کے مطابق مولوی کے چہرے سے انتہائی رنج و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ دکان کے ملازمین اندر گھس کر اس بلے میں بغیر جلا کپڑے کا کوئی تھان تلاش کر رہے تھے، مگر انہیں ناکامی ہوئی۔

ہر زبان پر بس ایک ہی سوال تھا کہ دکان میں آگ کیسے لگی؟ پھر کسی کو یہ خیال بھی آگیا کہ اتنی زبردست آگ لگنے کے باوجود کہ ساری دکان جل کر راکھ ہو گئی، آس پاس کی دکانیں کس طرح محفوظ رہ گئیں؟ یہ خیال مولوی کفایت اللہ کے کسی ہمدرد کے ذہن میں آیا تھا اور اس نے اپنے خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ حیرت مجھے اس پر تھی کہ مولوی کا وہ حمایتی ایک ہندو تھا۔ اس کے لباس سے یہ بات عیاں تھی۔ اس کی دکان بھی وہیں قریب ہی تھی۔

”اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے پنڈت جی!“ سوال کرنے والے ہندو سے ایک پستہ قد شخص مخاطب ہوا۔

”مطلب صاف ہے۔ مولوی صاحب ہی کی دکان کیوں جلی، تمہاری دکان جلنے سے کیسے بچ گئی؟ گیان چند!“

”تو کیا آپ مولوی صاحب کی دکان جلنے کا الزام مجھ پر لگا رہے ہیں؟ مولوی صاحب کی دکان کے برابر دوسری طرف رحمان بھائی کی دکان بھی تو ہے، وہ بھی تو نہیں جلی۔“

”دیکھو بھئی! تم لوگ مجھے اس جھگڑے میں نہ گھسینا!“ گھٹے ہوئے جسم کا ایک اور باریش آدمی بول اٹھا۔ اسی کا نام رحمان تھا۔ ”مولانا سے میرے برسوں پرانے مراسم ہیں۔“

”کیا ہم سے دشمنی ہے مولوی صاحب کی؟“ پستہ قد گیان چند کہنے لگا۔

لوگوں کے درمیان ”تیز تازی“ ہوتی رہی۔ لوگ بہر حال رحمان اور گیان چند ہی پر شک کر رہے تھے۔ مولوی کفایت اللہ کچھ نہ بولا۔ اس کی حالت قابل دید تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ لوگوں کو کیا خبر تھی کہ اس مولوی نے ایک جن سے دشمنی مول لی تھی اور یہ دشمنی اسے منگی پڑی تھی۔ پھر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکھا اور چلا آیا۔ میں نے یہ بات یاسف کو نہیں بتائی تھی کہ کسی نوجوان آدم زادے سے زنگس کا رشتہ طے ہونے والا ہے۔ گزشتہ رات ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ زنگس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اب مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا، مگر زنگس تک پہنچنے کا اب اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میں ہر قیمت پر زنگس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جنات کی مختلف صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ حسب فضا فرشتوں کی طرح ہر

جسے کہیں قید کر دیا گیا ہوں۔ حالانکہ یہ قید خود اختیاری تھی پھر بھی میں گھبرا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ اقبال کے جسم سے باہر نکل آؤں لیکن زنگس کے تصور نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ وہی جسم تو زنگس کے حصول کا ذریعہ بننے والا تھا۔ تقریباً گھنٹے بھر مجھے یہ اذیت برداشت کرنا پڑی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس تنگ جگہ میں رہتا میرے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ اگر زنگس کا خیال نہ ہوتا تو میں اس دوران اقبال کے جسم سے باہر آ جاتا۔ پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مجھے اس جسم میں قرار آنے لگا اور میری بے چینی ختم ہوتی گئی۔ میں نے اس سلسلے میں انتہائی رازداری سے کام لیا تھا اور کسی کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ میرا قریبی دوست یاسف بھی اس معاملے میں بے خبر تھا۔

اقبال تو زنگس کو اپنانے کے خواب دیکھ رہا تھا مگر اس کا باپ افضل کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ یہ بات مجھے اسی روز معلوم ہوئی۔ بعد مغرب کے ایک بوڑھا شخص گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ اس بوڑھے کی ہر چیز ہی چھوٹی تھی۔ چھوٹی آنکھیں، چھوٹا ہاتھ، چھوٹی ناک، چھوٹا قد اور چھوٹا سا جسم۔ اس پر نام بھی چھوٹے خان تھا۔ وہ شخص، اقبال کی ذات برادری ہی کا تھا۔ کسی دور کے رشتے کے افضل کا ماموں زاد یا پھر خالہ زاد ہوتا تھا۔ اقبال اسے چھوٹے چچا کہتا تھا۔ اس رشتے سے وہ مختصر سا وجود گویا میرا بھی چچا بن گیا تھا۔ اب اقبال کا جسم اپنانے کے بعد اقبال کے سارے رشتے دار میرے ہی رشتے دار تھے۔

چھوٹے خان ایک سرکاری دفتر میں انگریز افسر کا چڑا سی تھا۔ اسی کی سفارش پر اقبال کو نوکری ملنے والی تھی۔ اس کے عوض چھوٹے خان اپنی بیٹی پروین کی شادی اقبال سے کرنے کا آرزو مند تھا یعنی اس ہاتھ لے، اس ہاتھ دے۔ اقبال کے باپ افضل نے اس شرط پر یہ بات مان لی تھی کہ جب دونوں بڑے بیٹوں کی شادیاں ہو جائیں گی تو یہ تیل منڈھے چڑھے گی۔ چھوٹے خان نے شرط قبول کر لی اور یوں اس کی بیٹی کے لئے ”ایڈوانس بنگل“ ہو گئی۔ کنبے اور قریبی خاندانوں کی لڑکیاں دیکھی بھالی ہوتی ہیں۔ چھوٹے خان کی بیٹی پروین کو بھی اقبال کے والدین نے دیکھا تھا۔ اس لئے لڑکی دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یوں بھی لڑکی لڑکے کو دیکھنے سے زیادہ خاندان دیکھے جاتے تھے۔

چھوٹے خان لوہاری دروازے میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ یہ بتانے آیا تھا کہ اپنے انگریز افسر سے بات کر لی ہے، کل صبح اقبال کو اس کے ساتھ جانا تھا۔

یوں بھی افضل کے لئے یہ رشتہ چڑی اور دو دو والی بات تھی، رشتہ بھی مل رہا تھا اور نوکری بھی۔ پھر وہ کیسے انکار کر دیتا۔ گویا اس کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ رہا میرا معاملہ تو اقبال کی ہرالا بلا اب مجھی کو بگھلتا تھی۔

انسانوں کے درمیان ایک انسانی جسم میں رہنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا جو ابتدا ہی میں بڑا سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا۔ مجھ سے پہلے شاید ہی جنات میں سے کوئی سرکاری جگہ میں رہا ہو۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب لگنے کے ساتھ ساتھ بہت دلچسپ اور اچھا لگ رہا تھا، ایک جن اور سرکاری نوکر۔ اس رات جب گھر میں ہر طرف ”چم چم“ ہو گئی تو میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چھت پر پہنچ

صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی انسان یا حیوان کے قالب میں داخل ہونا بھی جنات کے لئے مشکل نہیں، یعنی جنات کسی بھی انسان یا حیوان کا روپ دھار سکتے ہیں۔ ایک جن زاد ہونے کے باوجود کبھی خود میں نے اس کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنے بزرگوں سے جو باتیں اس سلسلے میں سنی تھیں، ان کی روشنی میں ایسا کرنا کبھی کبھی انتہائی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ناپید ہونے پر بھی اگر جن کسی قالب (جسم) میں ہو تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ قالب انسانی ہو یا حیوانی۔ بزرگ جنات اسی لئے یہ تاکید کرتے رہتے ہیں کہ جنات کو کسی انسان یا حیوان کے جسم میں داخل ہونے سے گریز کرنا چاہئے۔ اس میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ کسی جسم میں داخل ہونے کے بعد جنات پر اس جسم کی صفات غالب آ جاتی ہیں۔ پھر جب تک جن اس جسم کے اندر رہتا ہے، اس کی اپنی صفات اور قوتیں تقریباً سلب ہو جاتی ہیں۔ جناتی صفات اسے اس وقت واپس ملتی ہیں جب وہ انسانی یا حیوانی جسم سے باہر آ جاتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ اگر میں زنگس کے محبوب اقبال کے جسم میں داخل ہو جاؤں تو اس کا قرب حاصل کرنا میرے لئے مشکل نہیں رہے گا۔ زنگس کے حصول کی خاطر میں یہ خطرہ مول لینے پر تیار ہو گیا تھا۔ زنگس آج ہی رات اقبال سے ملنے والی تھی۔ اقبال سے ملنے ہوئے یہ بات اس کے دہم و گمان میں بھی نہ آتی کہ وہ اپنے محبوب سے نہیں، کسی غیر انسانی وجود سے مل رہی ہے۔ زنگس کے رویے سے میں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ وہ اقبال سے محبت کرتی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بحیثیت اقبال زنگس سے پہلی ہی ملاقات میں اس کا قرب حاصل کر لوں گا۔

اقبال کا جسم اپنانے سے پہلے میں نے اسی روز اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر لیں۔

اقبال خوبصورت، وجیرہ اور پُرکشش نوجوان تھا۔ صنف نازک کے لئے اس میں ہلا کی کشش تھی۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ حال ہی میں اس نے ایف اے کیا تھا۔ اس کا باپ اسے مزید پڑھانے کی بجائے کہیں نوکر کرانا چاہتا تھا۔ تمام تر خوبیوں کے باوجود اقبال میں میرے حساب سے ایک بڑی خرابی اس کا مضبوط کردار تھا۔ اس کے دامن پر اب تک کوئی داغ نہیں تھا۔ مواقع ملنے کے باوجود اقبال حدود سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ جسے وہ اپنی شرافت نفس سمجھتا تھا، میری نظر میں کمزوری تھی۔ یہ بات مجھے کچھ ناگوار سی محسوس ہوئی۔ اس کی پارسائی میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی لیکن زنگس کی آرزو نے مجھے اقبال کی یہ ”حققت“ قبول کرنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ میں نے سوچا، اس کا جسم تو میرے قابو میں ہو گا، اسے اپنے حکم پر چلاؤں گا۔ جس لڑکی کو میں نے زنگس سے بات کرتے دیکھا تھا، وہ اقبال کی چھوٹی بہن شہناز تھی۔ وہ بس معمولی سی شکل و صورت کی لڑکی تھی، ایسی ہرگز نہیں کہ اس کے حصول کی خواہش پیدا ہو۔ شہناز کو قبول صورت بھی کمنا مشکل تھا۔ اقبال سے بڑے دو بھائی اور تھے، شہناز اس سے چھوٹی تھی۔

اس روز اقبال کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد میں اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ یہ تجربہ میرے لئے نیا ہونے کے باوجود بے حد سنسنی خیز تھا۔ ابتدا میں کچھ دیر مجھے گھٹن کا سا احساس ہوا

کیا۔ اوپر پہنچتے ہی میں نے برابر والی چھت کا بجک کر جائزہ لیا تو وہ ابھی خالی تھی۔ نرگس ابھی چھت پر نہیں آئی تھی۔ میں بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ طویل عرصے مبر کرنے کے بعد آج رات میرے ارمان پورے ہونے والے تھے۔ آنے والے حسین لمحات کے تصور ہی سے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ قرب کے زاویے ابھی سے میرے تصور میں رنگ بھر رہے تھے۔

خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد برابر والی چھت پر میں نے قدموں کی چاپ سنی تو چونک اٹھا۔ وہ سراپا ناز وادا چھت پر آگئی تھی۔

”تمہیں جو کچھ کہتا ہے، جلدی سے کہہ دو۔“ وہ تیزی سے دیوار کے قریب آکر بولی۔

”آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”مجھے فوراً واپس جانا ہے۔“ اس نے پہلے ہی کی طرح جلدی سے بتایا۔ معلوم نہیں کیوں وہ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”لیکن جلدی کیوں جانا ہے؟“ میں نے معلوم کیا۔ ”آج تو اتنے دن بعد تم سے ملنے کا موقع ملا ہے۔“

”وحیدن بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں بار بار کھانسی اٹھ رہی ہے۔ اگر ان کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے میری چارپائی خالی دیکھی تو غضب ہو جائے گا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“ نرگس نے جلدی واپس جانے کی وجہ بتائی۔

مجھے اس بیوہ بڑھیا پر بہت غصہ آیا۔ میرے اور نرگس کے درمیان آج کوئی رکاوٹ نہیں تھی تو وہ بڑھیا دیوار بن گئی تھی۔ خدا غارت کرے اس ملعون بڑھیا کو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر غصہ پی کر نرگس کو مخاطب کیا۔ ”تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو، کوئی غضب نہیں ہو گا۔ آج نہیں تو کل تمہیں ہمیشہ کے لئے میرا ہی ہونا ہے۔ پھر کیا ڈرنا؟“

”مرد ذات کا کچھ نہیں جانتا لیکن عورت ایک دفعہ بدنام ہو جائے تو پھر کہیں کی نہیں رہتی۔“ نرگس اداس لہجے میں کہنے لگی۔

میں نے سوچا کہ یہ قیمتی وقت باتوں میں ضائع کرنے کے لئے نہیں ہے۔ میرے اور نرگس کے درمیان بھڑکی جو دیوار حائل تھی، میں اسے گرا کر آج ہی دیوار وصل میں پہلا قدم رکھ دینا چاہتا تھا۔ پھر تو آئندہ کے لئے بھی راستہ کھل جاتا۔ نرگس تو ایک ایسی گھٹا تھی کہ میرے وجود کے صحرا پر ہزار بار برستی رہتی پھر بھی تشنگی شاید کم نہ ہوتی۔ اس لئے مجھے پہلی مرتبہ ایک عجیب سا تجربہ ہوا۔ مجھ پر اقبال کی فطری پارسائی غالب آنے لگی۔ میرے ذہن میں نہ جانے کہاں سے یہ خیال آ گیا کہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے اور اس گناہ کی بڑی سزا ہے۔ پھر یہ کہ میں اس حالت میں پکڑا گیا تو بڑی رسوائی ہو گی۔ طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں نے مجھے گھیر لیا۔ بمشکل میں نے اپنے ذہن سے ان خیالات کو جھٹکا۔ خود پر قابو پاتے ہی میں دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

”ارے ارے۔“ نرگس بوکھلا گئی۔ اسے یقیناً مجھ سے ایسی ”غیر اخلاقی“ حرکت کی توقع نہیں رہی

ہو گی۔ ”شریف شرفا“ قسم کے نوجوان کسی ماہ رو کی خاطر یوں دیواریں نہیں پھاندتے اور نہ دوسروں کے گھروں میں کودتے ہیں۔ اقبال نے شاید کبھی ایسا نہیں کیا ہو گا۔ نرگس خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ”تم..... تم یہ کیا کر رہے ہو؟“

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر میں نے نرگس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ کسمانے لگی اور پھر چلتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑ دو مجھے..... چھوڑ دو.....“

”نن..... نہیں اقبال! یہ..... شادی سے پہلے..... نہیں..... یہ گناہ ہے۔“ نرگس رک رک کر بولی۔

عین اسی وقت نیچے صحن سے ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔ ”نرگس بیٹی! ارے نرگس بیٹی! ارے کہاں ہو تم؟“

”یہ..... یہ وحیدن بوا کی آواز ہے۔ وہ جاگ گئیں۔“ یہ کہتے ہی نرگس تڑپ کر میری آغوش سے نکل گئی۔ معلوم نہیں اس وقت نرگس کے جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی۔ شاید ممکنہ ذلت و رسوائی کے خیال نے اس کے جسم میں اتنی طاقت بھر دی تھی۔ پھر وہ بلند آواز میں بولی۔ ”آئی وحیدن بوا!“

پھر میں نے دیکھا، نرگس اپنا بے ترتیب لباس درست کرتی ہوئی نیچے جانے والے زینے کی طرف بھاگی۔ خواہش کے باوجود میں اسے روک نہیں سکا۔

اس بڑھیا وحیدن کو میں کونے لگا جس نے عین وقت پر بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، ابھی نیچے جا کر اس کبخت کی گردن دبا دوں۔

کچھ ہی دیر کے بعد نیچے سے بڑھیا کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”ارے بیٹی! اس وقت چھت پر.....“

”وہ بوا! میرا ایک بندہ گر گیا تھا، اسے دیکھنے گئی تھی چھت پر، بندہ مل گیا۔“ نرگس نے بات بتائی۔ بڑھیا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

”اندھیرے میں بندہ مل گیا..... حیرت ہے۔“ بڑھیا بڑبڑائی، پھر کہنے لگی۔ ”مگر تم تو سو گئی تھیں بیٹی!“

”سوئی نہیں تھی، بس یونہی آنکھیں بند کر کے پڑی تھی بوا! بار بار مجھے بندے کا خیال آ رہا تھا کہ اسی نے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گی۔ پھر خیال آیا کہ شام کو میں چھت پر گئی تھی، وہیں بندہ گر گیا ہو گا۔“ نرگس کی آواز دور ہوتی گئی۔ پھر معلوم نہیں اس نے بڑھیا کو کیسے مطمئن کیا۔

چھت پر میرا کھڑا رہنا اب فضول ہی تھا اس لئے دوبارہ دیوار پھلانگ کر برابر والی چھت پر آ گیا اور پھر نیچے گھر میں پہنچ گیا۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی کیونکہ میرے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ میری حالت کسی

چاہتا، ابھی خراج محبت وصول کر لوں، مگر اس مرتبہ میں بہت محتاط تھا۔ زمرس کے معاملے میں جلد بازی کا نتیجہ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ وہ مجھ سے کھینچ گئی تھی۔ میں اسی لئے دھیرے دھیرے رہنا کو گھاٹ پر لا رہا تھا۔ رہنا کے علاوہ ایک انگریز میم کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی۔ وہ ایک بڑے انگریز افسر کی بیوی تھی۔ یہ وہی بڑا انگریز افسر تھا جس کے چڑاسی چھوٹے خاں تھے۔ وہ اکثر اپنے شوہر ولسن کے پاس دفتر آتی جاتی رہتی تھی۔ میری میز راستے میں پڑتی تھی۔ پہلی بار جب اسے میں نے دیکھا تو دل ہی دل میں اللہ سے توبہ کرنے لگا۔ اپنی دانست میں شاید وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی لیکن مجھے یہی لگا کسی اور طرف اس کی نگاہ ہو۔ وہ بھیجتی تھی۔ جسم لمبی سی کچی کی طرح تھا جس پر کپڑے ٹانگ دیئے گئے ہوں۔ ایک روز جب میں دفتر سے لوٹ رہا تھا تو وہ ”کمبل“ ہو گئی تھی، اس ہانے کہ مجھے ڈراپ کر دے گی۔ وہ کار میں تھی۔ ہر چند کہ وہ آدم زاد کی کے نام پر ایک سفید دھبا تھی مگر بڑے انگریز افسر کی بیوی ہونے کے سبب میں اس کی پیشکش ٹھکرا نہیں سکا۔ اپنے شوہر نامہ دار کی طرح اس نے بھی مجھے اقبال سے ”ایک بال“ بنا دیا اور میں جی موس کے رہ گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی غرض سے کئی نسوانی حربے آزمائے لیکن میں کسی نہ کسی طرح رسی تڑا کر بھاگ ہی لیا۔ وہ کیا چاہتی ہے، میں خوب سمجھ گیا تھا اسی لئے اپنے گھر سے پہلے ہی کار کو رکوا لیا تھا۔

مجھے دفتر جاتے ہوئے دوسرا ہفتہ شروع ہوا تھا کہ واپسی میں اچانک ایک کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں بھاٹی دروازے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ”چیل“ اپنے پہلے چھپنے میں ناکام ہو کر اب بھی میری ناک میں ہو گی اور میرے ارد گرد ہی منڈلا رہی ہو گی۔ میم صاحبہ کو چیل کہہ کر خدا نخواستہ میرا مقصد ان کی توہین کرنا نہیں۔ میں تو دراصل اس ایک لفظ کے ذریعے ان کی کیفیت بیان کر رہا ہوں۔ میں نے ہارن سنا اور پلٹ کر دیکھا تو وہی تھیں۔ انہوں نے اپنی ترچھی نظروں سے مجھ پر وار کیا۔ اپنی کار کو وہ پہلے ہی میرے قریب روک چکی تھیں۔ انہوں نے مجھے پکارا۔ ”ایک بال! مانی سویٹ ہارٹ۔“ پھر کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ ”کم آن ان وی کار۔“

میں سمجھتا ہوا سا کار میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے ہی انہوں نے کار اسٹارٹ کر دی تو میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ ”میری اکلوتی امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی میم صاحبہ! آپ مجھے یہ کہاں لے جا رہی ہیں؟ میں تو اپنے گھر جا رہا تھا۔“

”چلے جانا، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم سے مجھے ایک بہت ضروری بات کہنا تھی۔“

”تو کہہ دیں جلدی سے۔“ میں ڈرا کہ کہیں پہلی ملاقات کی طرح میم صاحبہ اس مرتبہ بھی بے تکلفی پر نہ اتر آئیں۔

”تم تو مجھ سے اس طرح خوفزدہ لگ رہے ہو جیسے کوئی چوہا، ملی سے۔“ یہ کہتے ہی میم صاحبہ ہنس پڑیں۔ اس طرح ان کے چوہا جیسے چھوٹے چھوٹے دانت واضح طور پر نظر آنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ”کیا تم واقعی اتنے بھولے اور معصوم ہو؟ ایک بال کہ اب تک کچھ نہیں سمجھ سکے۔“

”آپ ہی بتا دیں کہ میں کیا نہیں سمجھ رہا۔“ میں سب کچھ سمجھ کر نا سمجھ بن گیا۔

ایسے شخص کی سی تھی جو انتہائی پیاسا ہو اور ٹھنڈا میٹھا پانی اس کے سامنے لا کر بٹالیا گیا ہو۔ میں نے خود کو دلاسا دیا کہ آج رات نہیں تو پھر کسی رات مجھے اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کا موقع مل ہی جائے گا۔ زمرس مجھ سے دور ہی نکلتی تھی۔ میں نے اس تک پہنچنے کی راہ ہموار کر لی تھی، اس کے علاوہ پیش قدمی کر کے آئندہ مزید آگے بڑھنے کے امکانات پیدا کر لئے تھے۔ جہاں تک میں نے پیش قدمی کی تھی، وہاں سے میری منزل بس ایک ہی قدم تو آگے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ زمرس سے اگلی ملاقات میں یہ فاصلہ عبور کرتے ہوئے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ مجھے یہ سوچ کر بھی عجیب سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا کہ زمرس اصل صورت حال سے قطعی لاعلم تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لینے والا اقبال نہیں کوئی اور تھا، ایک غیر انسانی وجود، آدم زاد نہیں جن زاد۔

☆=====☆=====☆

دوسرے دن صبح چھوٹے خاں آدھمکے۔ میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ آدمی تو خیر وہ چھوٹے ہی تھے مگر ایک بڑے انگریز افسر کے چڑاسی تھے۔ اسی کے نتیجے میں مجھے سرکاری نوکر بنا لیا گیا۔ صاحب بہادر ہی نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران اس انگریز نے مجھے بار بار اقبال کے بجائے۔ ”ایک بال“ کہا جسے میں بہ مجبوری برداشت کر گیا۔ ابھی مجھے وصال یار تک ہر ستم برداشت کرنا تھا ”ایک بال“ بن جانا تو معمولی سی بات تھی۔

اس روز اقبال کی بہن شہناز کے ذریعے میں نے زمرس کو پھر ملنے کا پیغام بھجوایا۔ شہناز نے آکر بتایا کہ زمرس آج نہیں مل سکتی، کسی اور روز موقع نکال کر ملے گی۔ مجھے یہ سن کر غصہ تو آیا لیکن ضبط کر گیا۔ زمرس کے لئے میں جتنا ترپ رہا تھا، وہ اسی قدر سرد مہری دکھا رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید گزشتہ رات کی پیش قدمی اور میری جلد بازی سے وہ ڈر گئی ہو۔ مجھے اتنی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا، رفتہ رفتہ اسے راہ پر لانا تھا۔ وہ بہنو اتنی نا سمجھ نہیں تھی کہ میرا مقصد نہ جان پاتی۔

ایل ڈی اے، یعنی لاہور ڈیولپ منٹ اتھارٹی کا محکمہ خاصا بڑا تھا۔ اس میں آدم زادیاں بھی ملازم تھیں۔ دوسرے ہی دن سے میں نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ انہی پری دشوں کی وجہ سے مجھے دفتر اچھا لگا۔ اقبال واقعی صنف مخالف کے لئے بڑی کشش رکھتا تھا۔ مجھے اسی لئے ان آدم زادیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ”کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے“ والا معاملہ تھا۔ لڑکیاں خود ہی میری طرف کھینچنے لگیں۔ وہ سبھی دیسی عیسائی تھیں، بس اکا دکا ہی غیر ملکی، یعنی انگریز تھیں، مگر انہوں نے بڑے عمدے سنبھال رکھے تھے۔ وہ اسی لئے مجھ سے جلد بے تکلف نہیں ہوئیں۔ ایک ہی ہفتے میں ایک عیسائی لڑکی رہنا کو میں نے شیشے میں اتار لیا اور وہ میری محبت کا دم بھرے لگی۔ وہ میرے ہی کشش میں تھی۔ سانولی سلونی رہنا آنکھوں کے راستے سیدھی میرے دل میں اتر گئی تھی۔ اس میں بڑا نمک تھا۔ جسم متناسب اور چہرہ کتابی ہونے کے علاوہ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، خواب ناک سی آنکھیں۔ ان آنکھوں پر بڑی بڑی پلکوں کی چلن تھی۔ یہ چلن اٹھا کر جب وہ مجھے دیکھتی تو جی

”ایک بال! میں میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“ میم صاحبہ ایسی بے خودی سے میری طرف دیکھنے لگیں کہ سامنے سے ان کی نظر ہٹ گئی۔

”میم صاحبہ!“ میں چیخ اٹھا۔ سامنے سے مجھے ایک تانگہ آتا دکھائی دے گیا تھا۔ کار اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

میم صاحبہ جہان عشق سے فوراً واپس آ گئیں۔ کار لہرا کر بائیں جانب ہو گئی۔ غریب تانگے والے نے حادثے سے بچنے کے لئے اتنی زور سے گھوڑے کی لگام کھینچی کہ تانگہ اٹلتے اٹلتے بچا۔ میم صاحبہ وہاں رکے بغیر ریس لگا گئیں۔ وہ اگر وہاں رک بھی جاتیں تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا۔

”یہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ ابھی ٹکر ہو جاتی تانگے سے؟“ میں بولا۔

”بغیر بریک والی یہ گاڑیاں بند کر دینا چاہئیں۔“

”بریک ہوتا ہے ان میں میم صاحبہ! اسے لگام کہتے ہیں۔“

”کہتے ہوں گے، لعنت پڑھو۔ یہ دیکھو کہ میں نے آج تمہیں ڈھونڈا کیسے؟ حالانکہ تم نے مجھے اپنا گھر نہیں دکھایا لیکن میں جانتی ہوں، بھائی دروازے میں تم کہاں رہتے ہو۔“ میم صاحبہ اس طرح اردو کی ٹانگ توڑ رہی تھیں کہ اگر بیان کروں تو سمجھنا مشکل ہو جائے۔ میں بہر حال پوری توجہ دے کر ان کی بات سمجھ رہا تھا۔

میم صاحبہ نے میرے یعنی اقبال کے گھر کا سراغ لگا لیا تھا، میرے نزدیک یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ انہیں میرے دفتر کا علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ کس سیکشن میں ہوں۔ وہ کسی بھی روز میرا تعاقب کر کے پتا لگا سکتی تھیں کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ میں اسی لئے کچھ نہ بولا۔ میم صاحبہ نے خود ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھے یہ بھی باور کرایا تھا کہ وہ میرے عشق میں کتنی کچی ہیں۔

”مگر اس وقت آپ مجھے کہاں لے جا رہی ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”اپنے بچکے پر۔“ انہوں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

”اور اور صاحبہ وہ کہاں ہیں؟ بچکے پر وہ بھی تو ہوں گے۔“ میں نے پوچھا۔ اس کچی انگریز آدم زادی کا ارادہ بھانپنے مجھے دشواری نہیں ہوئی اسی لئے قدرے گہرا سا گیا۔ میں تو زنگس جیسی آدم زادیوں کا متوالا تھا، اس تاڑ کے پیڑ کا نہیں۔

”صاحبہ آؤٹ آف اسٹیشن ہیں، تم فکر نہ کرو۔“ میم صاحبہ نے مسکرا کر بتایا۔ ”کوئی خطرہ نہیں۔“

میم صاحبہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی خطرہ پیش نہیں آیا اور میم صاحبہ نے مجھے باآسانی ”فتح“ کر لیا۔ میرا سابقہ اب تک جتنی آدم زادیوں سے پڑا تھا، میم صاحبہ ان میں سب سے مختلف اور ”باہنر“ ثابت ہوئی تھیں۔ انہیں میں نے نہیں بلکہ انہوں نے مجھے تغیر کیا تھا۔ عاشق کے بجائے کسی کا محبوب بننے میں ایک اور ہی لذت ہے۔ اس کا اندازہ مجھے پہلی مرتبہ ہوا۔

پھر پورے دس روز تک میم صاحبہ نے مجھے اپنے حصار سے نہیں نکلنے دیا۔ اس کے بعد صاحبہ باہر واپس آ گئے اور میم صاحبہ نے اپنی باطنی نشاط لپیٹ دی۔

اسی دن زنگس کے بارے میں شہناز سے ایک خبر سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔

لاہور سے قصور زیادہ دور نہیں تھا۔ وہیں زنگس کی خالہ رہتی تھیں۔ خالہ ان دنوں بیمار تھیں۔ کوئی ان کی نگہداشت کرنے والا نہیں تھا۔ ان کے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ایک بیٹا تھا جو ملازمت کے سلسلے میں قصور سے باہر رہتا تھا۔ اسے جالندھر میں نوکری ملی تھی۔ خالہ ضعیف تھے۔ زنگس مجھ سے ملے بغیر ہی اپنے خالہ زاد کے ہمراہ قصور چلی گئی تھی۔ اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع پر اس کا خالہ زاد چھٹی لے کر قصور آیا تھا۔ اس کی ماں نے ہی اسے بہن کے پاس لاہور بھیجا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ قصور سے زنگس کی واپسی کب تک ممکن تھی۔ جال میں پھنسے ہوئے شکار کے یوں اڑ جانے پر مجھے بہت ملال ہوا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور سوچا کہ کبھی تو زنگس لاہور لوٹ کر آئے گی۔ اس کے علاوہ مجھے رینا کی صورت میں ایک اور حسین سہارا مل گیا تھا۔ میم صاحبہ، یعنی ماریا کی وجہ سے میں اب تک اس کی طرف پوری طرح توجہ نہیں دے سکا تھا۔ زنگس کی جدائی کے باوجود جلد ہی میں نے اپنے سلگتے ہوئے جذبات پر قابو پا لیا۔ اب میں رینا کو زیر دام لانے کے لئے اس پر کند پھینکنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

انسانوں کے درمیان اب میرا جی لگ گیا تھا۔ پہلے جیسا خوف نہیں رہا تھا۔ شروع شروع میں آتے جاتے اگر کبھی مولوی کفایت اللہ سے مدد بھیڑ ہو جاتی تو میں خوفزدہ ہو جاتا تھا، مگر اب رفتہ رفتہ میں نے آدم زادوں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

زنگس چلی گئی تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے میں نے آخر کار رینا کو ایک روز فتح کر لی۔ رینا نے مجھے وقت گزرنے کا احساس نہ ہونے دیا۔ تین مہینے جیسے پلک جھپکنے بیت گئے۔ مجھے اس عرصے میں زنگس بارہ یاد آئی۔ وہ تو ایسی قصور جا کر بیٹھی تھی کہ لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اقبال کی بہن شہناز کا زنگس کے گھر میں آنا جانا تھا۔ اسی کے ذریعے مجھے حالات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز وہ مجھے بہت خوش خوش نظر آئی تو میں نے وجہ پوچھی۔

”میں تو آپ کی وجہ سے خوش ہوں لیکن اس وقت تک خوشخبری نہیں سناؤں گی جب تک اکئی نہیں لے لوں گی۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”ادھنے سے کام چل جائے تو دے سکتا ہوں ورنہ نہ بتاؤ۔“

”ٹھیک ہے، میں نہیں بتاتی کہ کون کہاں سے واپس آ گیا ہے اور اس نے کیا پیغام بھیجا ہے۔“

”لے آئی۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فوراً اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ ”تو میری بڑی اچھی بہن ہے، جلدی سے بتا دے کہ زنگس نے کیا پیغام بھجوایا ہے اور وہ قصور سے کب واپس آئی ہے؟“ میں سمجھ گیا کہ یقیناً زنگس لاہور آ چکی ہے۔ پھر میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔

شہناز نے مجھے خوشخبری سنائی کہ زنگس اسی روز دہپہر کو قصور سے واپس آئی تھی اور مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس تین ماہ کے عرصے میں زنگس دو مرتبہ اور بھی لاہور آئی تھی لیکن صرف ایک ایک دن

مطلب براری کی خاطر میں نے زرگس کو تسلی دی۔ ”تم بالکل پرواہ نہ کرو۔ گھبراؤ مت“ میں کل ہی اپنی امی سے بات کروں گا لیکن ہم اتنے طویل عرصے کے بعد ملے ہیں تو اس ملاقات کو یادگار.....“ اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ کے میں دوسرے ہی لمحے دیوار پھاند کر زرگس کے پاس پہنچ گیا۔ زرگس شاید پہلے ہی سے چونکا تھی اس لئے میرے آگے بڑھتے ہی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ ”ارے قریب آؤ نا۔“ میں مزید آگے بڑھا۔

”چھوڑ دو مجھے، تم تم نے ایک بار پہلے بھی مجھے گناہ کے راستے پر ڈالنا چاہا تھا۔“ وہ پچھلے

”مان جاؤ نرگس!“ میں نے اسے نہیں چھوڑا بلکہ اس کے جسم پر گرفت اور سخت کر دی۔

”نہیں..... میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔“

کے لئے۔ مجھے اس سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا آنا نہ آتا میرے لئے برابر ہی رہا تھا۔ میں اس کے بھی خوش تھا کہ خود زرگس نے وقت ملاقات رات کا رکھا تھا، جب اس کے اور میرے گھر والے سو جائیں۔ سرشام ہی شبنام سے یہ اطلاع پا کر میں خوشی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سنہری موقع کو ہرگز رائیگاں نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں پہلے سے کہیں زیادہ بے خوف ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ ماریا اور ریٹا تھیں۔ ریٹا پر فتح پانے کے بعد اب میں نے دفتری دوسری لڑکیوں کی طرف بھی پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود زرگس کی چاہت، اس کی طلب اپنی جگہ تھی۔ میں اس کے حصول کی آرزو سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ وہ تھی بھی تو ایسی کہ بھلائے نہ بھلائی جاسکے۔

اس روز رات شاید بہت دیر میں ہوئی۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ نصف شب کے قریب خاموشی سے اٹھ کر میں چھت پر پہنچ گیا۔ زرگس مجھے اپنی چھت پر منتظر ملی۔

”اقبال! خدا کے لئے کچھ کرو ورنہ غضب ہو جائے گا۔“ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے بولی، مگر آواز دھیمی ہی تھی۔

جواب میں زرگس نے بتایا کہ اس کی خالہ سخت بیمار ہیں۔ ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ اسی لئے اپنی زندگی میں اکلوتے بیٹے شریف احمد کی شادی اس کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔ اسی غرض سے انہوں نے زرگس کی ماں کو گزشتہ ماہ قصور بلوایا تھا۔ زرگس کی ماں نے اپنی بیمار بڑی بہن کی بات مان لی تھی۔ زرگس کو اسی لئے قصور سے لاہور بلوایا گیا تھا۔ ظاہر ہے اب شادی سے پہلے زرگس کا قصور میں رہنا مناسب نہیں تھا۔ مولوی کفایت اللہ بھی اس رشتے پر نیم راضی تھا۔ زرگس کو مجھ سے یہ گلہ تھا کہ میں نے وعدے کے مطابق اپنے والدین کو اس کے گھر پہلے سے رشتہ لے کر کیوں نہیں بھیج دیا؟ دراصل زرگس کو یہ گلہ مجھ سے نہیں اپنے اس بے وفاء عشق سے تھا جس کے جسم پر اب میرا قبضہ تھا۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو شاید حالات کچھ اور ہوتے۔ اپنی محبت زرگس کو حاصل کرنے کے لئے اقبال کچھ تو ہاتھ پاؤں مارتا لیکن میرا مسئلہ تو صرف زرگس کے قرب کا حصول تھا جس کے لئے اس سے شادی کرنا غیر ضروری تھا۔ زرگس کا اصرار یہ تھا کہ میں اب بھی اپنے والدین کو رشتہ لے کر بھیج دوں کیونکہ مولوی کفایت اللہ، شریف احمد سے زرگس کے رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ شریف احمد کی تنخواہ کم تھی۔ جذباتی باتوں سے قطع نظر مولوی ٹھوس حقائق کا قائل تھا۔ اسے علم تھا کہ زرگس، شریف احمد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔

مجھے اس بات سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی کہ زنگس کا رشتہ کہاں اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا مستقبل کیا ہو گا؟ لکھل آمدنی میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش بھی رہ سکے یا نہیں؟ میرا مقصد تو اس کے قرب کا حصول تھا، زندگی بھر کے لئے اسے اپنے گلے کا ہار بنانا نہیں۔ پھر یہ کہ آدم زادوں کی اس دنیا میں اور بھی بہت سے آدم زاد تھے جن کے جسموں پر قبضہ کر کے میں مزید عیش کر سکتا تھا۔ یہی شرکیا

تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی۔“ وہ سب اٹھی اور پھر تیزی سے زینے کی طرف لپک گئی۔

اگر مجھے اس کے باپ مولوی کفایت اللہ کا خوف نہ ہوتا تو ہرگز اسے یوں نہ جانے دیتا۔ مجبوراً مجھے اس رات بھی ناکام و نامراد لوٹنا پڑا۔ اپنے بستر پر واپس آکر دیر تک میں اس مسئلے پر غور کرتا رہا کہ تکمیل تنہا کی کیا صورت ہو؟ آخر میرے ذہن نے اس کا ایک حل تلاش کر ہی لیا۔

چند ہی روز بعد نرگس کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ میں نے نرگس کے حصول کی خاطر جو کچھ سوچا تھا، اس میں ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ نرگس کے ہونے والے شوہر شریف احمد کے متعلق میں نے ضروری معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو ایک مرحلہ ایسا آیا کہ مجھے شدید حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔

شریف احمد نے محض اپنی لب گور ماں کی خاطر شادی پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ نرگس ہی کی کسی بھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ اخلاقی جرأت سے کام نہ لے کر شریف احمد ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ کینگی پر اتر آیا تھا۔ اگر نرگس سے اس کی شادی ہو جاتی تو یہ بڑا ظلم ہوتا۔ مجھے کوئی ایسی راہ نکالنا تھی کہ کم سے کم شریف احمد کے ساتھ نرگس کی شادی نہ ہو سکے۔ پھر خاصی سوچ بچار کے بعد مجھے ایک راہ مل ہی گئی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ قصور سے رات آچکی تھی۔ شادی میں پڑوسی ہونے کے ناتے اقبال کے سب گھر والے بھی مدعو تھے۔ اقبال کی بہن شہناز بہت اداس تھی۔ وجہ یہ کہ وہ اپنے بھائی کی رازدار تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال، نرگس سے محبت کرتا ہے اور نرگس بھی اسے چاہتی ہے۔

دوسرے پہلے ہی نکاح ہونا تھا۔ جب قاضی آگیا تو میں آگے بڑھ کر شریف احمد کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں مولوی کفایت اللہ، نرگس کا بوڑھا خالو اور خاندان کے دوسرے بزرگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہی میں اقبال کا باپ افضل اور چھوٹے خاں بھی موجود تھے۔

ادھر قاضی نے نکاح پڑھانے کا آغاز کیا، ادھر میں اقبال کے جسم کو چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اقبال کے جسم پر طویل عرصے تک میرا قبضہ رہا تھا۔ میں اس کی رگ رگ میں سایا ہوا تھا اس لئے باہر آئے ہوئے مجھے انتہائی اذیت محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا کہ میرا وجود کانٹوں سے الجھتا ہوا باہر نکلا ہو۔ اس سے اقبال کے جسم کو بھی زبردست جھٹکا لگا اور وہ چکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے یہ تجربہ ہوا کہ زیادہ مدت تک کسی آدم زاد کے جسم پر تصرف جن زاد اور آدم زاد دونوں ہی کے لئے الگ ہونے کی صورت میں بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ جن جب طویل عرصے کسی انسانی جسم میں رہ کر باہر نکلتا ہے تو کیا صورت پیش آتی ہے۔

اقبال چکرا کر ایک طرف گرا تو کئی حیرت زدہ آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ ”ارے ارے“ اے کیا ہوا؟“

قاضی نکاح پڑھاتے پڑھاتے ایک دم رک گیا۔ وہاں ایک خطرناک آدم زاد، یعنی خبیث مولوی کفایت اللہ بھی موجود تھا۔ اسے اگر وہاں میری موجودگی کا شبہ ہو جاتا تو پھر میری خیر نہیں تھی۔ میں اگر

کسی آدم زاد کے جسم میں چھپ جاتا تو بات دوسری تھی۔ اقبال کے جسم میں وہ کر میں کئی بار مولوی کے قریب سے گزرا تھا۔ مگر مولوی کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ اگر کسی آدم زاد کے جسم کو ایک جن زاد نے اپنا لیا ہو تو خصوصی توجہ دینے ہی سے حقیقت کا پتہ چلتا ہے، وہ بھی ایسی صورت میں کہ توجہ دینے والا کوئی صاحب علم ہو۔ مجھے پہلے ہی سے ان تمام باتوں کی خبر تھی، سو اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ چکا تھا۔ میں نے اسی لئے شدید اذیت کے باوجود پہلے سے طے شدہ تدبیر کے مطابق خود کو ایک آدم زاد کے جسم میں چھپا لیا اور یہ آدم زاد نرگس کا ہونے والا شوہر شریف احمد تھا کیونکہ ابھی نرگس سے اس کا نکاح نہیں پڑھایا جاسکا تھا۔ میں نے اس سے قبل ہی کام دکھا دیا تھا۔

اقبال کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو جلد ہی اسے ہوش آگیا۔

”مم..... میں کہاں ہوں؟ اور..... اور یہ کیا..... کیا ہو رہا ہے؟“ اقبال بڑبڑایا۔

”ہوش میں آؤ بیٹے!“ افضل نے اقبال کو سہارا دے کر بٹھایا۔ ”ہم نرگس بیٹی کی شادی میں شریک ہونے آئے ہیں۔“

”نرگس کی شادی۔“ اقبال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ظاہر ہے اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

”نھرو افضل! میں پانی دم کر کے دیتا ہوں۔ یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ مولوی کفایت اللہ بولا۔ قریب ہی بیٹھا تھا۔ پھر اس نے کسی سے پانی لانے کو کہا اور اقبال کے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے کو مخاطب کیا۔ ”ذرا ادھر دیکھو بیٹے!“

اقبال نے نظرس انٹائیں۔ میں مولوی کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اقبال کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ مولوی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

مولوی کفایت اللہ کے چہرے پر معاً حیرت نظر آنے لگی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں اقبال کے باپ افضل کی طرف جھک کر کہا۔ ”اقبال پر کسی جن کا اثر رہ چکا ہے۔ علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اس جن کا سراغ لگا لوں گا جو اسے چھوڑ کر کسی نامعلوم وجہ سے فرار ہو چکا ہے۔“

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب!“ افضل گھبرا گیا۔

”جو کچھ کہا ہے میں نے غلط نہیں۔ اس کا علاج میں کروں گا تاکہ وہ جن دوبارہ اسے یرغمال نہ بنا سکے۔“ مولوی کفایت اللہ پریقین آواز میں بولا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے اور ذہن ”خطرہ“ کی گردان کرنے لگا۔ مولوی بڑا ہی کانیاں اور خطرناک تھا۔

اتنے میں ایک شخص پانی لے آیا۔ ”لیجئے مولوی صاحب!“ اس شخص نے پانی سے بھرا کنورا مولوی طرف بڑھادیا۔

مولوی نے کنورا لے لیا اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔ جو بات اس نے دھیمی آواز میں صرف اقبال

اب افضل سے کسی تھی، ایک سے دوسرے اور دوسرے نے تیسرے شخص سے کہہ دی۔ ذرا سی دیر میں سارے براتیوں اور ”گھراتیوں“ کو پورا قصہ معلوم ہو گیا۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی چہ بیگوئیاں کرنے لگے۔ مولوی کفایت اللہ کیونکہ کوئی پیشہ ور مولوی نہیں تھا اس لئے سبھی اس کے ”علم“ کی مداحی میں لگے ہوئے تھے اور میں اس پر کھول رہا تھا۔ غصے کے ساتھ ساتھ مجھے اب کچھ کچھ خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

پڑھنے کے بعد مولوی کفایت اللہ نے پانی پر دم کیا اور پھر خود اپنے ہاتھ سے اقبال کو پانی پلایا۔ اقبال کے چہرے سے بلا کے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ پانی پی کر اقبال سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ قاضی نے مولوی کفایت اللہ کے کہنے پر دوبارہ نکاح پڑھانا شروع کر دیا۔

پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ قاضی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”مسماں زگس جہاں بنت کفایت اللہ کا نکاح بہ عوض مہر.....“

”مجھے قبول نہیں۔“ یہ تین الفاظ شادی کی اس تقریب میں دھماکہ بن کر گونج اٹھے۔ یہ الفاظ میں نے بلند آواز میں ادا کئے تھے۔ آواز بے شک شریف احمد کی تھی مگر الفاظ میرے تھے۔ جنات جس آدمی پر بھی قبضہ کر لیتے ہیں، اس کی آواز بھی اپنا لیتے ہیں۔ پہلے میں، اقبال کی آواز میں بولتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا جنات کو آدمی کے جسم میں پہچانا آسان ہو جائے۔

میرے انکار پر چند لمحوں کو سناٹا چھا گیا۔ پھر شریف احمد کے باپ کی تیز آواز ابھری۔ ”شریف احمد یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟“

”یہ بکواس نہیں ابا! حقیقت ہے۔“ میں پُر زور آواز میں بولا۔ ”مجھے ایسی لڑکی قبول نہیں جو کہ اور سے محبت کرتی ہو۔ زگس اور اقبال کے ہاتھوں پر قرآن رکھ کر پوچھ لیں، کیا وہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے؟ کیا وہ چھپ چھپ کر نہیں ملتے رہے؟ گواہی کے لئے اقبال کی بہن شہناز کافی ہے۔ تم دے کے اس سے معلوم کر لیں۔“

سب لوگ اقبال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”ابے کیوں بے آوارہ؟ میں یہ کیا سن رہا ہوں؟“ اقبال کا باپ افضل اسے مارنے دوڑا۔

لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ ”یہ کیا کرتے ہو، جوان اولاد پر اس طرح ہاتھ نہیں اٹھاتے۔“

اس ہنگامے کا نتیجہ میرے لئے متوقع تھا۔ مولوی کفایت اللہ کی طرف سے مجھے جو خطرہ تھا، گیا۔ دوسروں کی طرح اس کا دھیان بھی اب میری طرف نہیں رہا۔ اسے میں نے لپک کر حویلی میں جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً زگس کی خبر لینے گیا تھا۔

اسی وقت شریف احمد کا بوڑھا باپ مجھے اپنا بیٹا سمجھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”چل اٹھ، برات دیا جائے گی۔“

”مگر قبلہ! تھوڑی دیر تو رک جائیں، مولوی صاحب کو تو واپس آ جانے دیں۔“ کسی نے کہا۔

”اب کسی کے آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ بڑھا غصے میں بولا۔ ”چلو بھی اٹھو۔“ اس نے براتیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ جس لاری میں قصور سے برات آئی تھی، گلی کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ براتی اس میں سوار ہونے لگے۔ میں نے اپنا کام دکھا دیا تھا اس لئے شریف احمد کے جسم کو چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اس مرتبہ مجھے زیادہ تکلیف نہیں سہا پڑی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شریف احمد کے جسم میں مجھے مختصر عرصے ہی رہنا پڑا تھا۔ اس کے جسم نے بیٹھے بیٹھے جھکا کھایا اور پھر حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

جلد ہی میں، اقبال کے پاس پہنچ گیا۔ قاضی اپنا بستہ لپیٹ رہا تھا۔ اقبال کے جسم میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ مولوی کفایت اللہ پر پڑی۔ ہر چند کہ میرے اور اس کے درمیان خلافاً فاصلہ تھا، اس کے باوجود میں چونکا ہوا گیا۔ میں خطرے کی صورت حال میں اقبال کا جسم چھوڑ کر فرار ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھا، مگر غیبش مولوی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ سیدھا اقبال کے باپ افضل کے قریب پہنچا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر افضل کے پیچ پڑے۔

”بھائی افضل! اس گناہ گار نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔ اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ مولوی کفایت اللہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اس خطرناک بوڑھے آدم زاد کو بھری محفل میں یوں ذلیل و رسوا ہوتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ میری ہی چال تھی کہ مولوی جس میں پھنس گیا تھا۔ گویا ایک جن زاد نے آدم زاد کو بچھاڑ لیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھانا اسی کو کہتے ہیں۔

مولوی کی بات سن کر افضل کہنے لگا۔ ”مگر..... مگر مولوی صاب! یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں..... میں کسی اور کو زبان دے چکا ہوں۔“

پھر خاندان کے کچھ اور لوگ بھی درمیان میں پڑ گئے۔ وہ اقبال کے باپ کو سمجھانے لگے کہ وہ مولوی کفایت اللہ کی درخواست قبول کر لے۔ چھوٹے خاں کی حالت قابل دید تھی۔ اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ یقیناً یہ انکشاف اس کے لئے بھی صدمے کا سبب ہوا تھا کہ جس نوجوان کو وہ شریف اور خاندانی سمجھ کر اپنا داماد بنانے والا تھا، وہ اچھے کردار کا ثابت نہیں ہوا۔ افضل کو آخر کار بزرگوں کی بات ماننا ہی پڑی اور میرے دل میں خوشی کے لہو پھوٹنے لگے لیکن یہ خوشی زیادہ دیر پا نہیں ہوئی۔ اقبال کے باپ نے نکاح پر تو آمادگی ظاہر کر دی تھی لیکن رخصتی کے لئے فوراً راضی نہیں ہوا تھا۔

لعنت ہو تجھ پر۔ میں نے دل ہی دل میں افضل کو برا بھلا کہا۔ وہاں مولوی کفایت اللہ جیسا گھاگ آدم زاد بھی موجود تھا ورنہ افضل تو کیا اس کے باپ کو بھی فوری رخصتی پر آمادہ ہوتا پڑتا۔ مولوی کی وہاں موجودگی میں بار بار میں ایک جسم چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

طے پایا کہ نکاح اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان ہو گا۔ رخصتی کے لئے افضل نے یہ شرط رکھی تھی کہ جب اس کے دونوں بڑے بیٹوں کی ہوسیں بیاہ کر گھر میں آ جائیں گی تو وہ زگس کو رخصت

میں انکار نہ کر سکا۔ ”جی ہاں۔“ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی اعتراف جرم کر رہا ہوں۔

”ماریا تم کو بنگلے پر بھی لے گیا تھا؟“ اس نے نرم آواز ہی میں دوسرا سوال کیا۔

اس سوال کا جواب دیتا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنے عرصے بعد یہ گڑا مردہ کہاں سے اکھڑ آیا؟

مجھے خاموش دیکھ کر دلن پھر بول اٹھا۔ ”ایک بال تم جھوٹ نہیں بولے گا، سمجھا۔“ اب اس کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ ”بنگلے کا نوکر لوگ ہم کو بتا چکا ہے کہ تم بھی ان دنوں بنگلے پر آتا رہا ہے جب ہم آؤٹ آف اسٹیشن تھا۔“ دلن کی اردو دوسرے انگریزوں کی نسبت قدرے بہتر تھی۔ دلن کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میری منہ کی گم ہو گئی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گمشدہ سٹی کو تلاش کر سکتا۔ جواب دیئے بغیر وہاں سے میرا نو دو گیارہ ہونا بھی ناممکن تھا۔

”سنو ایک بال!“ مجھے بولنے کا موقع دینے کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”ماریا سے بھی ہم پوچھ سمجھ کر چکا ہے کہ وہ تم کو کس لئے پورا دس دن بنگلے پر بلاتا رہا۔ کوئی جواب دینے سے پہلے تم اس کا خیال رکھنا ایک بال! چ بولے گا تو ہو سکتا ہے ہم تم کو معاف کر دے ورنہ ہم جو سلوک ماریا سے کیا تمہارے ساتھ بھی کر سکتا ہے، یعنی تم کو نوکری سے نکال دے۔ بولو تم کیا کہتا ہے؟“

معلوم نہیں ماریا نے اپنے شوہر کو کیا کیا بتا دیا تھا اور اس کی نوبت کیوں آئی تھی؟ کہیں وہ کسی اور کے ساتھ تو رینگے ہاتھوں نہیں پھڑی گئی؟ ورنہ اتنے دن بعد اس قصے کا کیا مطلب تھا؟ میں نے سوچا، مگر اس بد بخت انگریز سے میں کسی طرح اپنے خیال کی تصدیق کرتا۔

”ہم جانتا ہے، تم خود سے ہمارے بنگلے پر نہیں گیا ہو گا۔ تم کو ماریا ہی ادھر لے گیا ہو گا۔“ یہ کہہ کر گویا اس نے میری ہمت بڑھائی۔

میں سوچنے لگا کہ دلن کو یقیناً کسی طرح اپنی بیوی کی بدکرداری کا علم ہو گیا ہے۔ سو میں نے اعتراف جرم کے لئے تمہید باندھی۔ ”مجھے معاف کر دیں سر کہ..... کہ جو کچھ بھی ہوا، اس میں میرا کوئی..... کوئی قصور نہیں تھا۔“

”وہی تو ہم معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ہوا کیا؟ جو بھی تم بولنا مانگتا، صاف صاف بولو۔“

میں نے ڈرتے جھجکتے اشاروں کنایوں میں بتا ہی دیا جو وہ معلوم کر رہا تھا۔

”دیری گڈ ایک بال!“ میری توقع کے برعکس وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ہم خوش ہوا کہ تم ماریا کی طرح جھوٹ نہیں بولا۔ ہم جانتا ہے کہ وہ عورت اچھا نہیں۔ ہم اسی لئے اس کو جھوڑ دیا..... ڈاؤن ورس دے دیا اس کو۔ یہ کل کا بات ہے کہ ایک ہندوستانی چھوکر کو وہ بنگلے پر لایا۔ کل ہم دفتر سے جلدی بنگلے پہنچ گیا۔ بس پھر ہم کو سب کچھ بتا چل گیا۔ نوکر لوگ نے بتایا کہ ماریا بہت روز سے ایسا کرتا رہا ہے۔ پہلے تو ماریا بھی ہم کو جھوٹ بولا، پھر اس کو بھی زبان کھولنا پڑا۔ ایسا عورت کو ہم کس طرح اپنے پاس رکھتا جو انڈیا

کر کے لے جائے گا۔ بات میں وزن تھا اس لئے درمیان میں جو لوگ پڑے تھے، کچھ نہ بولے۔ مجبوراً مولوی کفایت اللہ کو افضل کی شرط ماننا پڑی۔ چھوٹے خاں اپنا چھوٹا سامنہ لئے دیکھتا رہ گیا اور اس کا متوقع داماد پرایا ہو گیا۔ بات طے ہوتے دیکھ کر وہ رفو پکڑ ہو گیا۔ بے چارے نے اپنی بیٹی کے لئے ایک عدد شوہر فراہم کرنے کی خاطر اتنے پاپ بیلے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہونے والے داماد کو سرکاری نوکری تک دلوا دی، اس سے زیادہ وہ غریب کیا کرتا۔ مجھے چھوٹے خاں پر ترس آنے کے ساتھ ساتھ اقبال کے باپ پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس کیسے بڑھے سے مجھے صرف نکاح پر رٹھا دیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر بمشکل اپنے دل کو تسلی دی کہ ایک نہ ایک روز تو اب میری تمنا پوری ہو ہی جائے گی۔ زنگس تو اب گھر کی مرضی تھی جسے حلال ہونا ہی تھا۔ اس عرصے میں دوسرے معرکے سر کئے جاسکتے تھے۔ میں نے اس کے لئے ایک ہندو لڑکی بھلا کو بھی تاک رکھا تھا۔ وہ ایک کام سے میرے دفتر آئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنے تیر نظر سے شکار کر لیا تھا۔ یہ بات گزشتہ دو روز پہلے ہی کی تھی۔ ابھی مجھے بھلا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد مجھے گھرا کر جب دولہا بنایا جا رہا تھا تو میں اس امکان پر بھی غور کرنے لگا کہ نکاح ہونے کے بعد رخصتی سے پہلے بھی چوری چھپے زنگس پر ہاتھ صاف کیا جاسکتا ہے۔ میری منکود ہونے کے بعد یقیناً اس کے پاس مزاحمت کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ پھر وہ میرے قرب کو گناہ نہ کہہ پاتی۔ خود مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ حالات ایسا رخ اختیار کر جائیں گے۔ تمام تر تیک و دو سے میرا مقصد تو محض اتنا تھا کہ زنگس کی شادی فی الحال کسی طرح ٹل جائے اور وہ شخص جو کسی قابل نہیں اس کا شوہر نہ بنے۔ خلاف توقع مولوی کفایت اللہ نے اپنی عزت کی خاطر اقبال کو داماد بنانا قبول کر لیا۔ صورت حال اس کے علاوہ کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی تھی لیکن مولوی نے بہتر فیصلہ ہی کیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس سے زنگس بدنام تو ہوئی تھی مگر حصول مقصد کے لئے میرے نزدیک یہ ضروری تھا۔

عصر کے بعد زنگس سے میرا نکاح پڑھا ہی دیا گیا۔ اس وقت بھی میں بہت محتاط اور چوکنا تھا۔

دوسرے دن صبح جب میں دفتر پہنچا تو ایک اور واقعہ پیش آیا۔ وہ انگریز افسر دلن جس نے چھوٹے خاں کی سفارش پر مجھے سرکاری نوکری دی تھی، اس کی طرف سے میری طلبی ہو گئی۔ میں اس پر چکر ایسا کہ صاحب بہادر نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ وہ مجھے کا سربراہ تھا۔ چھوٹے خاں نے ہی طلبی کا پیغام دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں چھوٹے خاں ہی نے تو کوئی ”مہارواوی“ نہیں ڈال دی۔ اس نے مجھے نوکر رکھوایا تھا تو نکلوانا بھی مشکل نہ ہوتا۔ اس نوکری سے اگر مجھے کچھ دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ وہاں کچھ آدم زادیاں بھی ملازم تھیں۔ ورنہ نوکری رہتی کہ چلی جاتی، مجھ پر کیا فرق پڑتا۔

چھوٹے خاں کے چہرے پر اس وقت بھی اداسی کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اس لئے میں نے اسے نہیں چھیڑا اور انگریز صاحب بہادر کے پاس پہنچ گیا۔

دلن نے مجھے دھیمے لہجے میں مخاطب کیا تو میرا حوصلہ کچھ بڑھا۔ اس نے کہا۔ ”ایک بال! تم ہمارا واکف ماریا کو تو جانتا ہے نا؟“

کے لوگ کو بھی نہیں چھوڑتا۔ ایک بال! اگر تم جھوٹ بولنا تو ہم تم کو بھی ادھر نوکری سے نکال دیتا۔ اب یہ بولو ایک بال! کہ تمہارا ایسا کوئی فریڈ ہے مگر فریڈ کہ بوائے فریڈ جس سے تم کوئی بات نہیں چھپاتا ہر راز کا بات کر سکتا ہے؟“ آخر میں صاحب بادر نے بظاہر غیر متعلق سا سوال کیا۔

”جی نہیں سر!“ میں نے جواب دیا جو قطعی درست تھا۔

”آگے بھی اس ڈیپارٹمنٹ میں یا باہر تمہارا کوئی فریڈ بن گیا تو تم اپنا زبان بند ہی رکھے گا۔“ دلن کا لہجہ تاکید کی تھا۔ ”اگر تم اس کے خلاف کیا اور کبھی کسی کو کچھ بولا اور ہم کو خبر ہو گیا تو تمہارا نوکری فٹش۔ ہم سمجھتا ہے کہ تم اپنا نوکری بچانے کو زبان نہیں کھولے گا۔ ٹھیک بولا نا ہم؟“

”بالکل سر!“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”ایسا ہی ہو گا سر! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ میں سمجھ چکا تھا کہ اس نے مجھے زبان بندی کی خاطر ہی بلایا تھا۔

”تم جا سکتا ہے۔“ دلن نے مجھے مخاطب کیا۔

میں اس کے کمرے سے نکلا تو جی پر کچھ بوجھ ساتھ بہر حال میرا کچھ اچھا وقت گزرا تھا۔ اس نے مجھے قرب کے بت سے نئے آداب سکھائے تھے۔

اس دن میں دفتر سے لوٹ کر آ رہا تھا تو راستے میں مولوی کفایت اللہ سے ملے بھڑ ہو گئی۔ اب میں اس کا صرف پڑوسی نہیں باقاعدہ داماد بن چکا تھا اس لئے نظر بچا کر گزر جانا خلاف مصلحت بھی تھا اور ناممکن بھی۔ اقبال کا ناہنجار باپ مجھے ”بالے“ کہتا تھا، سو مولوی نے بھی مجھے اپنی دامادی میں قبول کرنے کے بعد اظہار شفقت کے لئے یہی ضروری سمجھا۔ قریب آتے ہی وہ کہنے لگا۔ ”بالے میاں! آج مغرب کے بعد گھر آ جانا۔“

مولوی سے نگاہ ملاتے ہوئے میری ہوا خراب ہو رہی تھی۔ میں رک گیا تھا مگر دانستہ نظریں نیچے کئے کھڑا تھا۔ مولوی نے غالباً اسے میرا اظہار پیشانی جانا۔

”ارے میاں! جو ہوا خاک ڈالو اس پر تمہیں اس قدر پیشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اب اس بد ذات مولوی کو میں یہ کیے بتا دیتا کہ ہرگز کوئی ایسی بات نہیں۔ مجھے تو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا، کہیں وہ اقبال کی آنکھیں دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگا لے کہ اس کے جسم پر میرا قبضہ ہے۔ جب وہ قبضہ چھوڑ دینے کے باوجود حقیقت تک پہنچ گیا تھا تو اس وقت کیسے چوک جاتا۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ”دیکھو میاں! اللہ کو جو منظور ہے، وہی ہوتا ہے۔“ پھر مولوی نے خود ہی اپنے گھر بلانے کی وجہ بتا دی۔ ”کل تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور میں نے تمہیں دم کر کے پانی پلایا تھا۔ میرے معمولات کا تو تمہیں علم ہو گا ہی۔ میں روزانہ بعد مغرب ضرورت مندوں کا روحانی علاج کرتا ہوں۔ جن لوگوں پر جنتا.....“

مولوی اپنی بکواس کرتا رہا اور میں بدستور نظریں جھکائے سنتا رہا۔ اس دوران میں میرا ذہن تیزی سے کوئی تدبیر سوچنے میں مصروف تھا۔ میں بھلا خود اپنی موت کا سامان کیسے کر لیتا۔ آخر مجھے ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں، شہناز کو بھیج دوں گا، آپ پانی دم کر کے دے دیجئے

گا۔“

”ٹھیک ہے.....“ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ ”صرف سات دن کا علاج ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی کوئی جن تمہارے قریب نہیں پھٹے گا۔“

”بہتر ہے۔“ یہ کہتے ہی میں اسے سلام کر کے یوں آگے بڑھا جیسے موت کے منہ میں جاتے جاتے بال بال بچا ہوں۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر میں اس مولوی کو غصہ نہ دیتا تو خدا جانے وہ میرا کیا حشر کرتا۔ گھر میں داخل ہونے تک میں یہ سوچ چکا تھا کہ اب زیادہ ٹھنڈا کر کے کھانا قطعی مناسب نہیں۔ جتنی جلد ممکن ہو اپنا ٹیڑھا آلو سیدھا کرو اور یہاں سے چپت ہو جاؤ ورنہ کسی دن مولوی کفایت اللہ جیسا خطرناک آدم زاد پچھاڑ کر سینے پر چڑھ جائے گا۔

اسی روز میں نے اقبال کی بہن شہناز کے ذریعے زرگس کو پیغام بھجووانے کا فیصلہ کر لیا۔ مغرب کے بعد شہناز کو دم کیا ہوا پانی لینے مولوی کی حویلی جانا ہی تھا۔

زرگس کے حصول کی خاطر میں عرصہ دراز سے خوار ہو رہا تھا۔ میں ایک جن ہونے کے باوجود اپنی محبوبہ کا قرب حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس ناکامی کا اصل سبب مولوی کفایت اللہ ہی تھا۔ وہ کبھت خزانہ خن پر کسی سانپ کی طرح پھیرا رہتا بیٹھا تھا۔ خود زرگس کو بھی اس نے جنت سے بچاؤ کے جانے کتنے دغبنے سکھا رکھے تھے۔ وہ ظالم اتنی چٹ تھی کہ اپنے قریب کسی جن کی موجودگی کو محسوس کر لیتی تھی۔ اقبال اس سے عشق لڑا رہا تھا اور وہ اقبال سے کہ میں درمیان میں کود پڑا۔ ظالم ایسی پاک دامن نکلی کہ میں اس کے حصول کی خاطر علیالیش سے اقبال بن گیا تو بھی مجھے شادی سے قبل ایک حد میں رکھا۔ نتیجتاً میں ٹپتا رہ گیا۔ نکاح کے بعد اب وہ اقبال کی بیوی بن چکی تھی۔ اب زرگس کے پاس یہ کہنے کا جواز نہیں رہا تھا کہ شادی کے بعد ہی وہ مجھے حد سے گزرنے کا موقع دے سکتی ہے۔

ممبر کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ میں نے زرگس کے لئے اب تک بت ممبر کیا تھا، ممبر بھی قیامت کا۔ اب پناہ نہ چھلکنے والا تھا۔

یہ تو حقیقت ہے کہ میں نے زرگس کا قرب حاصل کرنے ہی کی خاطر ایک آدم زاد کے جسم پر قبضہ کیا تھا مگر اب مجھے جن کی بجائے آدمی بن کر رہنے میں زیادہ مزہ آنے لگا تھا۔ جن ہونے کی حیثیت سے مجھے ایسی قوتیں حاصل تھیں کہ جو آدم زادوں کو میسر نہیں لیکن آدم زاد کی مجبوریوں میں بھی بڑا لطف تھا۔ ہزار خطرات کے باوجود بھی میں آدم زاد ہی بنا رہنا چاہتا تھا۔ زرگس کو تو یوں بھی میں، اقبال کے جسم کا سہارا لئے بغیر حاصل نہ کر پاتا۔

پھر میں نے شہناز سے پیغام بھجوایا ہی دیا۔ وقت ملاقات وہی تھا، یعنی عشاء کے بعد جب دونوں گھروں میں ”چم چم“ ہو جائے۔

اس رات جب سبھی سو گئے تو میں چپکے سے چھت پر پہنچ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زرگس مجھ سے پہلے اپنی چھت پر موجود تھی۔

”تم ادھر آؤ گی کہ میں ادھر آ جاؤں؟“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ میرے اور اس کے درمیان جو

جھوٹی سی دیوار حائل تھی اسے باآسانی عبور کیا جاسکتا تھا۔

”کل ہی تو ہمارا نکاح ہوا ہے اور آج ہی تم نے مجھے بلوایا۔“

”گزشتہ رات بھی بڑی مشکل سے کاٹی ہے۔ یقین کرو کہ.....“

”ان فضول باتوں کو چھوڑو۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”کیا بات ہے، جلدی سے کہہ دو۔ ماں کی طبیعت

ٹھیک نہیں ہے، کہیں ان کی آنکھ نہ کھل جائے۔“

”اور میری طبیعت جو اتنے دن سے خراب ہے، اس کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔“ میں نے اس کا

نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

”ہاں سنا تو تھا میں نے بھی کہ جب شریف بھائی سے میرا.....“ وہ کچھ کتے کتے رک گئی، پھر

خود ہی بولی۔ ”نکاح ہونے والا تھا تو اچانک تمہاری طبیعت بگڑ گئی تھی۔ کوئی مجھے شاید یہ بھی بتا رہا تھا کہ ابا

جی نے تمہیں دم کر کے پانی پلایا تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ صدے سے تمہاری طبیعت خراب.....“

”وجہ یہی تھی۔“ میں جلدی سے بول اٹھا۔ ”پتا نہیں لوگ کیا کیا باتیں بناتے لگے۔“ میں سمجھ گیا

کہ اقبال کے جسم پر کسی جن کے قابض ہونے کی بات نرگس نے بھی سن لی ہوگی۔

”خیر یہ بتاؤ، اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ شہناز جو پانی تمہارے لئے دم کرا کے لئے گئی تھی، یقیناً

پی لیا ہو گا تم نے۔ تاہم نہ کرنا، دیسے تو اباجی خود بھی خیال رکھیں گے۔“

مجھے اس ذکر سے چڑ ہو رہی تھی۔ شہناز پانی تو دے گئی تھی مجھے مگر ظاہر ہے، میں اسے کیوں پیتا۔

میں نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ ”میرا علاج تو تم ہو، مگر تمہیں اپنے بیمار کی خبری نہیں۔“ یہ کہہ

کر میں نے اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

چاندنی رات میں نرگس کا خُسن ایسا جادو چگا رہا تھا کہ مجھے خود پر قابو پانا محال ہو گیا۔ میں نے ایک

ہی جست میں درمیانی دیوار عبور کر لی اور پھر نرگس کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ نکاح ہونے کے بعد اب

وہ مجھ پر اور میں اس پر حلال ہو چکا تھا۔

انہی لمحات میں اچانک عقب سے مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ یہی

حالت نرگس کی ہوئی تھی۔ وہ زینے کی طرف لپکی۔ ایک دوسرے کے لئے حلال یا جائز ہونے اور بے

حیالی میں جو فرق ہے، نرگس کو یقیناً اس کا علم تھا۔

قدموں کی چاپ عقب سے آئی تھی۔ اس طرف اقبال کے گھر کی چھت تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا

تو حیران رہ گیا۔ وہ شہناز تھی جو اب درمیانی دیوار تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے دیوار پھاند کر اس تک پہنچنے

میں دیر نہیں کی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا وہ بول اٹھی۔ ”معلوم نہیں کیسے بڑے بھیا کی آنکھ

کھل گئی اور انہوں نے آپ کا بستر خالی دیکھ کر اودھم مچا دیا۔ میں پہلے ہی سے جاگ رہی تھی۔ مجھے معلوم

تھا کہ آپ چھت پر ہیں۔ جلدی سے نیچے چلیں، ابھی تو امی جاگی ہیں، کہیں ابا بھی نہ جاگ اٹھیں۔“ شہناز

نے جلدی جلدی مجھے صورت حال سے آگاہ کیا اور اُلٹے قدموں لوٹ گئی۔

خدا تمہیں غارت کرے اقبال کے بڑے بھیا! افضال کو میں نے دل ہی دل میں کو سا اور شہناز کے

بیچے لپکا۔ اقبال کے سب سے بڑے بھائی کا نام افضال تھا۔ اس سے چھوٹے کو نمال کہتے تھے۔ اقبال کا نمبر

تیسرا تھا۔ نمال تو خیر میرے لئے پھر بھی قابل برداشت تھا، مگر افضال بڑا ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس

کے لپکھن بھی اچھے نہیں تھے۔ نمال تو سیدھے سجاو رہتا مگر افضال جب میں چاقو ڈالے پھرتا۔ اس کی

محبت اچھی نہیں تھی۔ اس کا مشغلہ محض آوارہ گردی تھا۔ مجھ سے تو جانے کیوں وہ خار کھاتا۔ اسی لمحوں

نے اس وقت رنگ میں بھنگ ملا دیا تھا۔ میں بیچ و تاب کھاتا ہوا زینے سے اترتا۔ زینے سے ملا ہوا ہی بیت

الخلا تھا۔

میں نے نیچے آتے ہی خاموشی سے بیت الخلا میں سرک لیا۔ فوری طور پر مجھے اپنے بستر سے غائب

ہونے کا یہی بھانہ سوجھا۔ آنگن میں نیم تاریکی تھی اس لئے شاید کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی کمروں کے

اندر کی کچھ روشنی باہر آنگن میں بھی آ رہی تھی جو ناکافی تھی۔

”اری تو کہاں چلی گئی تھی کبنت؟“ میں نے اقبال کی امی رحیمین کی آواز سنی۔

”بالے..... بالے بھائی کو ڈھونڈ رہی تھی۔“ شہناز کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی۔

”مگر گئی کہاں تھی اسے ڈھونڈنے؟“ رحیمین، شہناز ہی کو کھبا سمجھ کر نوپنے لگی۔

”چھت پر..... وہیں دیکھنے لگی تھی۔“ شہناز کے منہ سے جچی بات نکل گئی۔

”اس وقت تو اسے چھت پر ڈھونڈنے لگی تھی۔“ افضال کی بلند اور منحوس آواز سنائی دی۔ ”تیسرا

دماغ تو درست ہے۔“

”آہستہ بول کبنت! کہیں تیرے ابا نہ جاگ جائیں۔“ رحیمین نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا۔

”جاگ چکا ہوں میں..... سب کچھ سن بھی لیا ہے میں نے۔“ اقبال کے باپ افضال کی گرج

ابھری۔ ”جائے گا کہاں وہ، پیشاب و شہاب کرنے گیا ہو گیا۔“

”پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا ابا! مگر وہ وہاں بھی نہیں ہے۔“ افضال بول اٹھا۔

”لاؤ مجھے لائین دو، میں دیکھتا ہوں۔“ ذرا ہی دیر بعد افضال کی آواز قدرے قریب سے آئی۔ وہ

غالباً اپنے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

پھر میں نے قدموں کی چاپ قریب آتے سنی تو پاس ہی رکھے پیٹیل کے لوٹے کی طرف ہاتھ

بڑھایا۔ لوٹے میں پانی موجود تھا۔ میں نے بیت الخلا میں اپنی موجودگی ظاہر ہونے کی غرض سے زوردار آواز

میں پانی نیچے گرایا۔

”سن لو کم بخنو! وہ بیس ہے۔“ افضال تقریباً چیخ اٹھا۔ ”اس بدذات افضال کو تو میں ابھی مزہ چکھاتا

ہوں۔“ قدموں کی چاپ اور آواز دور دور ہونے لگی۔ ”سارے گھر کو جگا دیا کبنت نے۔ اس پر جھوٹ بول

رہا تھا کہ میاں بھی دیکھ لیا، وہاں بھی دیکھ لیا۔“

اقبال کے بڑے بھائی کو اس کا باپ برا بھلا کہہ رہا تھا، اس سے مجھے خوشی ہی ہوئی۔ لوٹنے سے پانی

بہا کر میں بیت الخلا سے باہر آ گیا اور پھر ہاتھ دھونے کے بعد منہ می معصوم جان بنا ہوا اندر کمرے میں پہنچ

گیا۔ وہاں میں نے افضال کی ”مزائی“ ہوتے دیکھی۔ پھر رحیمین نے درمیان میں آ کر بیٹے کو شوہر کے

”بچہ ستم“ سے آزاد کرایا۔ میری طرف نظر اٹھاتے ہوئے افضل کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ میں نے عین وقت پر بیت الخلاء سے اپنی ”برآمدگی“ ظاہر کر کے اسے جھوٹا ثابت کرا دیا تھا۔

جب رحیمین، افضل، نمال اور شبنام سبھی کمرے سے چلے گئے تو افضل نے مجھے مخاطب کیا۔ ”بالے! میں تجھے دیکھ لوں گا ذلیل! تو اُدھے گھٹنے سے غائب تھا اور میں نے سارے گھر میں تجھے ڈھونڈ لیا تھا۔ بتا کہاں مر گیا تھا؟“ میں اور افضل ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔

میں ایسا بن گیا جیسے میری آنکھ لگ گئی ہو۔ افضل کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں واقعی خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوں، مصنوعی خراٹے بھی نشر کرنے لگا۔

”کیونکی مت دکھا“ مجھے معلوم ہے تو جاگ رہا ہے۔“ افضل بولا بلکہ غرایا۔ وہ شاید اس لئے بھی مجھ سے جلتا تھا کہ میں کماد پوت تھا اور وہ نکلا۔

پلکوں کے درمیان ذرا سی جھری بنا کر میں نے دیکھا تو پتا چلا کہ افضل اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔

”بب..... بڑے بھیا!“ میں گھبرا کر بول ہی اٹھا کہ کہیں وہ ظالم اپنے چھوٹے بھائی کے چکر میں مجھے ہی نہ مار ڈالے۔ وہ اب میری چارپائی تک پہنچ گیا تھا۔

”چینا چلایا تو گردن پر چاقو پھیر دوں گا۔“ اس نے مجھے دہلانا چاہا۔ ”اس لئے جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتا دے۔ بول کہاں گیا تھا تو؟“

بھلا کوئی کھلے ہوئے چاقو کے سامنے بھی جھوٹ بولنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ سو میں نے بتا دیا۔ ”چھت..... چھت پر گیا تھا۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مجھے چھت پر جانے کا بہانہ بھی سوچ گیا۔ میں بہر حال کسی صورت یہ راز فاش نہیں کر سکتا تھا کہ چھت پر زنگ سے ملے گیا تھا۔

”چھت پر۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”وہاں کیا کرنے گیا تھا؟“

”کل شام چھت پر میری انٹنی گر گئی تھی، اسے ڈھونڈنے گیا تھا۔“ میں نے سوچا ہوا بہانہ بنا دیا۔ ”تو مل گئی تیری انٹنی؟“ افضل کے لہجے میں جیسے زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔

”جی..... جی نہیں بڑے بھیا!“ میں گزبوا گیا۔ مجھے ایک اور بات بھی یاد آگئی تھی جسے پہلے بہانہ بناتے ہوئے بھول گیا تھا۔

”تُو صفا صفا جھوٹ بول رہا ہے۔“ وہ پُر یقین آواز میں کہنے لگا۔ ”تُو چھت پر نہیں گیا تھا، تجھے شبنام چھت پر بھی ڈھونڈنے لگی تھی، تُو وہاں نہیں تھا..... ہاں ایک بات تو بتا، کل شام کو تو تجھے دولہا بتایا جا رہا تھا، پھر تُو چھت پر کب چلا گیا؟“ اس نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جو بہانہ کرتے ہوئے میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

اب میں اسے کس طرح بتاتا کہ شبنام مجھے چھت پر ڈھونڈنے نہیں، خطرے سے آگاہ کرنے لگی تھی۔

”مجھے سونے دیں بڑے بھیا! صبح دفتر جانے کے لئے بھی جلدی اٹھنا ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر جان

جھڑنا چاہی کیونکہ میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ ”اچھا، ٹھیک ہے سو جا آج..... نہ بتا اصل بات۔ کبھی تو آئے گا میرے بائیں پر۔“ یہ کہتے ہی

اس نے چاقو بند کیا اور اپنی چارپائی کی طرف چلا گیا۔ مجھے اس غم میں نیند نہیں آ رہی تھی کہ میرے دل کی کلی کھلتے کھلتے رہ گئی تھی۔ آج رات اگر

میں وقت پر اقبال کا بڑا بھائی ”بھڑنگ“ نہ پھیلا دیتا تو مجھے زنگس کا قرب حاصل ہو ہی جاتا۔ زنگس کا خیال آیا تو ایک بار پھر میرے جذبات پھل اٹھے۔ اک جھوم مہ دشاں میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ ایک ایک کر کے مجھے وہ سبھی آدم زادیاں یاد آنے لگیں جو میری زینت آغوش بن چکی تھیں۔ پھر نہ جانے کیسے بھلا کا حسین چہرہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ زنگس کے بعد اگر کوئی آدم زادی میرے دل میں کبھی تھی تو یہی بھلا تھی۔ بھلا وہی تھی جو اپنے ایک کام سے دو روز قبل دفتر آئی تھی۔ اس کا پتا تو مجھے معلوم تھا، باقی کچھ نہیں۔

میں نے سوچا کہ فی الحال اقبال کے جسم میں رہتے ہوئے تو کسی آدم زادی کا حصول ممکن نہیں تو کیوں نہ علیا لیش بن جاؤں۔ اقبال یہاں سوتا رہے گا اور میں کام دکھا کر پھر اس کے جسم میں آنکھوں گا۔ مجھے بھی ضد سی ہو گئی تھی کہ اقبال کے جسم کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک زنگس کو حاصل نہ کر لوں۔ اگر آج رات بات نہیں بنی تو پھر کسی۔ میں آخر کب تک لب دریا پیاسا رہوں گا۔ کبھی تو بجھے گی پیاس۔

اس رات علیا لیش بن جانے کے خیال کو میں نے عملی شکل دینے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ بھلا کا زیادہ آگاہی معلوم کرنے کی یوں بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ اس کی ضرورت تو اس وقت پڑتی جب میں آدم زاد کے جسم میں اسے زیر کرتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ ایک ہندو لڑکی تھی، کسی مولوی کفایت اللہ کا مجھے خوف نہیں تھا۔

اقبال کے جسم سے نکلے ہوئے مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن میں اب پہلے ہی سے اس کے لئے آمادہ تھا۔ اقبال کے جسم کو جھکا لگا تھا اور میں باہر آ گیا تھا۔ میری توقع کے مطابق اقبال کے جسم کو جھکا لگنے سے اس پر غفلت طاری ہو گئی۔

اب میں، اقبال نہیں علیا لیش تھا، ایک جن زاد۔ وہ علیا لیش جو حیرت انگیز قوتوں کا مالک تھا۔ ایک جن کی حیثیت سے میں، زنگس کے پاس تو نہیں جا سکتا تھا مگر اب کسی اور آدم زادی کا قرب حاصل کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔

میں، اقبال کے گھر سے روانہ ہونے والا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوچیں۔ یہ شرارت ایک طرح سے انتقامی کارروائی بھی تھی۔ افضل نے مجھے بت سنا رکھا تھا۔ سو میں نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ چھوٹا بھائی بن کر اکثر میں سوچتا کہ اللہ میاں، آدمی کو کتنا بلی بنا دے۔ مگر چھوٹا بھائی نہ بنائے۔ آدم زاد کی حیثیت میں افضل خبیث میرا بڑا بھائی بن بیٹھا تھا اور اسی ناتے میری ناک میں کیل ڈال دی تھی۔ آج ہی رات اس لعنتی نے مجھے دھونسنے کے لئے چاقو نکال لیا تھا۔ اب میں جن زاد بن چکا تھا اس لئے

کوئی بھی قالب اختیار کر لیتا میرے بس میں تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں ایک سانپ بن گیا۔ افضال کے بستر میں گھستے ہوئے مجھے دیر نہیں لگی۔

افضال شاید ابھی پوری طرح سویا نہیں تھا، سرسراہٹ ہوئی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، چہرہ فٹن ہو گیا۔ میں سانپ کے قالب میں پھن کاڑھے اس کے بستر پر بیٹھا تھا۔ افضال کی نظریں مجھی پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ کمرے میں لائین کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی وقت میں نے افضال کے منہ پر اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ اس کا چہرہ ادھر سے ادھر ہو گیا۔

”بول اب ڈرائے گا، اپنے معصوم بھائی بالے کو؟“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اب میری آواز غیر انسانی تھی۔

”کک..... کون..... کون ہو تم؟“ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔

”میں ایک جن زاد ہوں جسے تو نے ابھی سانپ کے قالب میں دیکھا تھا۔ میرے سوال کا جواب دے، ستائے گا یا اب چاقو دکھا کر ڈرائے گا بالے کو؟“

”نن..... نہیں، اب..... اب کبھی اسے نہیں ستاؤں گا۔“ اس نے گھبرا کر کہہ دیا۔

”اور سن، اگر تو نے کسی سے میرا ذکر کیا تو گلا دبا دوں گا تیرا..... اس طرح۔“ میں نے اس کی گردن دبا لی، پھر چھوڑ دی۔ ”بول، کسی کو میرے بارے میں کچھ بتائے گا؟“

غالباً خوف کے سبب اس کی آواز نہیں نکلی اور اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور جسم پر لرزہ طاری ہونے لگا تھا۔ اقبال کے ”بڑے بھیا“ کے لئے اتنی سزا کافی تھی۔ پھر میں وہاں نہیں رکا اور بھلا کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

شہر سے باہر ایک باغ کے قریب وہ ایک شاندار کوٹھی تھی جہاں میں پہنچا۔ قصہ اسی باغ کے کچھ حصے کا تھا۔ اس باغ کا خاصا حصہ بھلا کے باپ راؤ بہادر ہماری لال نے اپنی کوٹھی کی حدود میں لے لیا تھا۔ زمین سرکاری تھی جس پر ظاہر ہے کہ ایل ڈی اے، یعنی ادارہ ترقیات لاہور کو اعتراض تھا۔ خطاب یافتہ ہندو اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سرکاری زمین ہڑپ کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کے لئے جہاں دیدہ ہماری لال نے اوپری سطح پر اپنے اثر و رسوخ کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے سیدھا سیدھا طریقہ کار استعمال کیا تھا۔ عموماً جو کام اوپری سطح پر ذرا مشکل ہوتے ہیں انہیں ٹپلی سطح پر بڑی آسانی سے نمٹا دیا جاتا ہے۔ بھلا سے پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ راؤ بہادر نے اسے میرے پاس کیوں بھیجا ہے۔ وہ اس کام کے لئے اپنے کسی ملازم کو بھی بھیج سکتا تھا۔ اس کی لونڈیا نے بلا سبب تو نین بان نہیں چلائے ہوں گے۔ ”صنف کرخت“ کی بجائے اگر صنف نازک مسکرا کر کسی کام کو کئے تو بھلا کس دل سے آدمی انکار کر دے۔ وہ بھی بھلا جیسی نیلے کی کلی۔ راؤ بہادر کے خلاف کارروائی رکوانا تو خیر میرے دائرہ اختیار میں نہیں تھا، ہاں اس فائل کو ادھر ادھر کر دینا ضرور بس میں تھا جس کے اندر یہ ثبوت و شواہد مع نقشوں کے موجود

تھے کہ راؤ بہادر نے سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ ابھی میں نے فائل غائب تو نہیں کی تھی مگر ہم رضامندی کا اظہار ضرور کر دیا تھا تاکہ وہ سند نہ چکر لگاتی رہے۔ اسے میں نے تین چار دن بعد آنے کو کہا تھا۔ اس وقت میرا ارادہ یہ تھا کہ کام کی ”اجرت“ وصول کر کے ہی یہ ”فرض“ انجام دوں گا۔ مجھے اس کے لئے کوئی راستہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ بھلا کے انداز و اطوار بتا رہے تھے وہ خود راستہ دینے پر آمادہ ہے۔ یہ آدم زاد بھی کتنے گھٹیا ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا۔ ایک ”ہندو پنچ“ زمین کے ایک معمولی ٹکڑے کی خاطر اپنی بیٹی کا ”جلوہ“ دکھانے اور اسے بطور چارہ استعمال کرنے کے لئے راضی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ راؤ بہادر کے پاس زمین اور جائیداد کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ وہ آخر انگریز حکومت کا خطاب یافتہ تھا اور انگریز حکومت کبھی ایسے ویسوں کو گھاس ڈالنے کی روادار نہیں تھی۔ میں جس کوٹھی کی حدود میں اس وقت داخل ہو رہا تھا، وہ بھی اسی کا ثبوت تھی۔ اگر آج رات نرگس نے مجھے تشنہ کام نہ چھوڑ دیا ہوتا تو میں یقیناً ابھی بھلا کو قہقہہ نہ کرتا۔ میں اس سے ایک آدم زاد کے روپ ہی میں ملتا۔ باتوں باتوں میں بھلا سے میں نے یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ ابھی وہ کنواری کنیا ہی ہے۔ یہ جاننے کے بعد اس کی طلب مزید بڑھ گئی تھی۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں جلد ہی میں نے بھلا کی خواب گاہ تلاش کر لی۔ میں خواب گاہ کے دروازے ہی پر تھا کہ اندر سے خلاف توقع سرگوشیاں سنائی دیں۔ میں چونک اٹھا کہ اس وقت بھلا کے پاس کون ہو سکتا ہے۔ خواب گاہ کا دروازہ بند تھا، مگر مجھے بھلا اندر داخل ہونے سے کون روکتا۔

اندر پہنچتے ہی میں نے جو منظر دیکھا، وہ میرے لئے حیران کن ہی تھا۔ بھلا کی خواب گاہ میں ہلکا نیلا بلب جل رہا تھا۔ بھلا وہاں اکیلی نہیں تھی۔ ایک نوجوان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نوجوان نے بھلا کو اپنی آغوش میں سیٹھ رکھا تھا۔

”بھلا! تم آخر کب راؤ بہادر جی سے بات کرو گی؟“ اس نوجوان نے سرگوشی کی۔

”کیوں، اس طرح ملنے میں کیا برائی ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اچانک بھلا نے نوجوان کے رخسار پر زور سے چٹکی بھری۔

نوجوان کے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ پھر وہ بولا۔ ”بڑی ظالم ہو تم۔“ اس کے بعد وہ نوجوان، بھلا کے چہرے پر جھک گیا۔

یعنی اسی وقت میں نے لپک کر اس نوجوان کی ٹانگ پکڑ لی اور پھر اسے مسری سے نیچے گھسیٹ لیا۔ وہ کولے کے بل زمین پر گرا اور منہ سے چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا راجندر!“ بھلا اٹھ کر بیٹھ گئی اور حیرت سے اپنے نوجوان عاشق کو دیکھنے لگی جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”جھگڑا جانے کیا ہوا۔“ نوجوان راجندر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو یوں جان پڑا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑ کر.....“ پھر اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔

وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا اور دوبارہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ میں نے اسے پیچھے سے دھکا دے کر گرا

دیا تھا۔

”بھاگ جا..... بھاگ جا یہاں سے۔“ میں نے راجندر سے سرگوشی کی۔ ”بھلا تیری نہیں میری محبوبہ ہے۔“

”پپ..... پر ت..... تم کون ہو؟“ راجندر کراچے ہوئے ہکھلایا۔

”میں پچھلے جنم میں اس کا پتی (شوہر) تھا۔“ میں نے راجندر کو بتایا۔ مجھے ہندوؤں کی توہم پرستی اور آواگون کے متعلق سب کچھ معلوم تھا اسی لئے راجندر کو آلو بنا رہا تھا۔ ”بھلا کے بنا میری آتما (روح) ویاکل تھی، سو ملن کو آگیا۔“

راجندر کے چہرے سے دہشت کا اظہار ہونے لگا۔ اس وقت تک بھلا مسہری سے اتر آئی تھی۔ وہ اٹھ کر سیدھی کھڑی ہوئی تو مجھ پر ایک اور قیامت گزر گئی۔ اس کا سرخ و سفید جسم جیسے لودے رہا تھا۔ بھلا نے راجندر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

بھلا کی بات پوری ہوئی تھی کہ میں نے بڑی زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھری۔ اس کے منہ سے سکھاری اہل پڑی۔

”اسے بھگا دے بھلا کہ اب میں آگیا ہوں۔ کیا تو نے اپنے پتی کو بھلا دیا؟ اپنے سوہن کو بھول گئی؟“ میری آواز بہت دھیمی تھی، اتنی کہ بھلا ہی میرے الفاظ سن سکے۔

”پتی..... سوہن؟“ وہ حیرت زدہ ہو کر بڑبڑائی۔

”ہمارا ساتھ تو جنم جنم کا ہے نگلی!“ میں بولا۔ ”پچھلے جنم میں بھی ہم ساتھ تھے۔“ ہندوؤں کے عقائد سے میں فائدہ اٹھا رہا تھا۔

بھلا کے چہرے سے خوف کا اظہار ہونے لگا۔ اسے اپنی خواب گاہ میں یقیناً کسی غیر انسانی وجود کا احساس ہو چکا تھا۔

”اس جنم میں تیرے ملن ہی کے کارن تو میں پرلوک سے آیا ہوں۔“ میں نے مزید کہا۔ ”اب تجھے میرے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ تو میری چٹنی (بیوی) ہے۔“

اتنے عرصے میں راجندر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈری ڈری سی آواز میں بھلا کو مخاطب کیا۔ ”میں..... میں اب چلوں گا۔ ت..... تم مجھے پچھلے گیٹ سے باہر نکال دو۔“

”ٹھکی..... ٹھیک ہے۔“ چچ..... چلو..... میں..... تمہیں چھوڑ آؤں۔“ بھلا نے جواب دیا۔

پھر میں خاموشی کے ساتھ ان دونوں کے ساتھ چلنے لگا کہ دیکھوں وہ ایک دوسرے سے کیا بات کرتے ہیں۔

مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے وہ دونوں کو ٹھکی کی عقبی سمت نکل آئے۔ اسی طرف باغ تھا جس کی زمین کو ٹھکی کی حدود میں شامل کر لی گئی تھی۔ عقبی پھاٹک تک پہنچتے ہوئے تو وہ دونوں خاموش ہی رہے، مگر وہاں رک کر بات کرنے لگے۔ گفتگو میں پبل راجندر نے کی۔ اب وہ خاصی حد تک شاید خود پر قابو پا چکا تھا۔

”اب..... اب میں تم سے نہیں ملوں گا بھلا!..... وہ تمہارے پچھلے جنم کے پتی کی آتما (روح) اب یہاں آنے لگی ہے۔ یہ..... یہ ٹھیک بھی ہے۔ بھلا ایک پتی کی آتما اپنی پتی کو کسی اور کی دل میں کس طرح دیکھ سکتی ہے۔“ راجندر بولا۔

”اس نے مجھ تک پہنچنے کے لئے کوئی روپ کیوں نہیں دھارا؟ اس جنم میں مجھ سے ملن کے لئے وہ..... اس نے اسے کوئی شریر (جسم) کیوں نہیں دیا؟“ بھلا کے لہجے میں الجھن تھی۔

”یہ سوال تو تم اس کی آتما سے کرنا۔“

”تم سے اس نے کیا کہا تھا؟“ بھلا نے پوچھا۔

میں نے اپنے بارے میں راجندر کو جو کچھ بتایا تھا اس نے کہہ دیا۔

”کل میں، پنڈت ہر دیال جی کے پاس جاؤں گی۔ بھگوان کرے وہ میری سہایتا (مدد) کرنے پر راضی جائیں۔ میں نے سنا ہے وہ بڑے گیانی ہیں۔ اس نے مجھے اپنا نام سوہن بتایا ہے پر مجھے تو کچھ بھی یاد

نہیں آتا راجندر!..... اس طرح تو وہ..... وہ مجھے کسی.....“ بھلا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں جان گیا کہ بھلا کیا کہنا چاہتی ہو گی۔ اس آدم زادی کا اصل روپ مجھے نظر آگیا تھا۔ راجندر

بہ علاوہ بھی اس رئیس زادی نے یقیناً دوسرے عاشق بھی پال رکھے ہوں گے۔ ہر چند کہ وہ ایک بدکردار

والہی تھی، پھر بھی اس کا خن انتہائی پُرکشش تھا۔ شاید اس نے خود کو بہت سنبھال سنبھال کر ”خرچ“

بقاوند نہ اب تک ڈھل گئی ہوتی۔ اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اتنی سی عمر

بنا اب اس نے زندگی کو خاصا بہت لیا تھا۔ اس پر مجھے کچھ ملال تو ہوا لیکن ملال سے حاصل بھی کیا تھا۔

ب کچھ سمجھ لینے کے باوجود میں اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ اس لئے فکرمند تھی کہ

وہی وجہ سے اسے اپنے دوسرے عاشقوں کو بھی چھوڑنا پڑتا۔ ہندو پنڈتوں کے متعلق بھی میں نے عالم

ات میں بہت سی باتیں سنی تھیں کہ آدم زادوں کا یہ قبیلہ بھی بہت عیار اور کرتبی ہوتا ہے۔ کافر جنات

اور طرح ان کافر پنڈتوں کے پاس بھی کچھ قوتیں ہوتی ہیں لیکن مسلمان عاملوں سے بہت کم۔ پنڈت اتنے

لڑاک نہیں ہوتے جتنے مسلمان عامل ہوتے ہیں۔ اس پر بھی میں نے سوچا کہ تدارک ضروری ہے۔

میں مولوی کفایت اللہ کی طرح پنڈت ہر دیال بھی آئندہ میرے لئے مسئلہ نہ بن جائے۔ بھلا جیسی نازک

دام و حسین آدم زادی کو تو مستقل طور پر اپنے تصرف میں رکھا جا سکتا تھا۔

بھلا کی ادھوری بات سن کر راجندر کہنے لگا۔ ”تم بھی کمال کرتی ہو بھلا! بھلا پچھلے جنم کی باتیں بھی

کی کو یاد رہتی ہیں۔ میں تو تم سے یہی کہوں گا کہ اس بیچ پنڈت ہر دیال جی کو نہ لاؤ، کہیں معاملہ بگڑ نہ

اے۔ اگر وہ تمہارے پتی کی آتما نہ ہوتی تو تمہارے ہی پاس کیوں آتی؟“

”کیا خبر وہ کوئی بھوت پریت ہو؟“ بھلا نے ایک اور شوشہ چھوڑا۔ جنات کو عموماً ہندو بھوت پریت

ناکھتے ہیں۔ بھلا نے قطعی درست اندازہ لگایا تھا۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ظالم ذہین بھی تھی۔

بہ کہہ رہی تھی۔ ”اگر وہ کوئی بھوت ہوا تو پنڈت جی اسے بھگا دیں گے۔ پھر وہ میرے پاس نہیں

آئے گا۔“

”وہ اگر بھوت ہوتا تو اسے تمہارے پتی ہونے کا سوانگ رکھانے کی کیا ضرورت تھی؟“ راہ میرے حق میں بولا۔ وہ نرا گھاسڑ تھا۔

”تاکہ میں اسے اپنا پتی مان لوں اور پھر وہ آگے بھی میرے شریر (جسم) سے کھیلتا رہے۔ پتہ کے ادھیکار (حق) کا اور کیا مطلب ہوا؟“ اس کا یہ قیاس بھی بالکل صحیح تھا۔

”تم جانو لیکن اب میں اس سے تک تم سے نہیں ملوں گا جب تک وہ تمہارے پاس آتا جاتا۔“

گا۔ ”راجندر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”شاید تم ڈر گئے ہو اس سے۔“

”ہاں! مار سے کون نہیں ڈرتا۔ اگر وہ کوئی بھوت بھی ہے تو..... تو میرے اندر اس سے مقابلہ کی ہمت نہیں۔ اب تم جلدی سے گیٹ کھول کر مجھے نکال دو۔ کہیں وہ بیڑ روم میں تمہارا انتظار کرتے ہیں نہ آجائے۔“ راجندر نے اپنی بزدلی کا اعتراف کر لیا۔

”بس نام کے مرد ہو تم۔“ ہلانے اسے طعنہ دیا اور گیٹ کھولنے لگی۔

”اب تم جو چاہو سمجھ لو۔“ راجندر یہ کہتا ہوا گیٹ سے نکل گیا۔

وہاں سے مجھے ہلا کی خواب گاہ میں پہنچنے کے لئے چند ہی لمبے لگے۔ وہ ذرا دیر بعد خواب گاہ پہنچی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ قدرے مضبوط اعصاب کی مالک تھی ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ پاتی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں اسے اٹھائے مسری طرف بڑھا۔

”ہلا! میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تو مجھے کوئی بھوت سمجھ رہی ہے نا؟“

”نہیں..... نہیں تو۔“ وہ ہکلائی۔

”بھوت بول رہی ہے تو؟“ میں نے اسے مسری پر لٹا دیا۔ ”کیا ابھی راجندر سے تو یہی نہیں رہی تھی، بھلا کسی آتما سے بھی کچھ چھپ سکتا ہے؟“

تو..... تو تم..... تم وہاں ساتھ..... میرے ساتھ ساتھ تھے۔“

”نہیں! میں یہیں تھا مگر وہ ساری باتیں سن رہا تھا جو تو راجندر سے کر رہی تھی۔ بے وفا! ایک جنم میں اپنے سوہن کو بھول گئی۔“ میری غیر انسانی آواز میں دکھ شامل ہو گیا۔ ایسا میں نے دانستہ متاثر کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ ”تو نے تو مجھ سے جنم جنم ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا..... اب اگر مجھ سے ملن نہیں چاہتی تو..... تو میں چلا جاتا ہوں لیکن یاد رکھ کہ پھر کسی سے بھی میرا ملن نہیں سکے گا۔ میں تجھ پر اپنا ادھیکار نہیں چھوڑوں گا۔ بول کیا کہتی ہے، ”میں جاؤں؟“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہلا کچھ نہ بولی، پھر کہنے لگی۔ ”سوہن! اگر تو میرا پتی ہے تو پھر یہ بتا کہ بھگوان نے اس جنم میں جسم کے بغیر کیسے بھیج دیا؟“ یہ وہی سوال تھا جو اس نے اپنے عاشق راجندر بھی کیا تھا۔

میں نے پہلے ہی سے اس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا، سو فوراً بول اٹھا۔ ”کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ نے گھریلو حالات سے تنگ آ کے آتم ہتھیا (خودکشی) کر لی تھی۔“ وہ ہندو لڑکی تھی، میں اسی لئے اسے رات بندی الفاظ بول رہا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”جو لوگ آتم ہتھیا کرتے ہیں، ان کی آتما کو ترنت (جلد) چھن نہیں آتا۔ ان کی آتما میں (روحیں) بھٹکی رہتی ہیں۔ سو بھگوان نے مجھے یہ سزا دی کہ مجھ سے میرا شریر چھین لیا۔“

اس عرصے میں مجھے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ جیسے ہلا کو میری کہانی پر یقین آ رہا ہو۔

”تجھے تو پیا ملن کی آس نہ ہو گی، کیوں ہے نا؟“ میں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ ”مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ سن ہلا! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب کوئی اور میری جگہ نہ لے۔ مجھ سے یہ بات نہیں ہو سکے گا۔ آج رات کے بعد اگر کسی کو میں نے تیرا پہلو آباد کرتے دیکھا تو اسے زندہ نہیں دوں گا۔ یہ بھی جان لے کہ تو کسی سے میرا ذکر نہیں کرے گی، چاہے وہ پنڈت ہر دیال ہی کیوں نہ ہو۔“ جنات عموماً آدم زادوں کو یہی تاکید کرتے ہیں۔ اس کی وجہ خطرناک قسم کے آدم زادوں سے بچنا ہے، ایسے خطرناک آدم زاد جو جنات کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ ”بول کسی سے کچھ کہے گی تو نہیں؟“

لیکن وہ رات غالباً میری ناکامیوں کی رات تھی۔ میں آنے والے روح فرساحات سے بے خبر دیا رہا، میں پہلا قدم رکھنے ہی والا تھا کہ میرے وجود کو شدید جھٹکا لگا۔ یوں جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ جیسے میرا وجود شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہ تمام علامات ایک ہی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ میں پہلے کبھی کسی ایسی حالت سے گزرا تو نہیں تھا، مگر اس کے متعلق بزرگ جنات سے بہت کچھ سنا رکھا تھا۔

میں خطرے میں گھر گیا تھا اور اس خطرے کی نوعیت سے بھی آگاہ تھا۔

میرے لئے اب وہاں ایک لمحے بھی رکنا ممکن نہیں تھا، پھر بھی میں نے ہلا سے بمشکل کہا۔ ”میں نہیں۔“ اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی۔ ”سو..... سوہن! مجھے..... مجھے لڑنا پڑنا چھوڑ کر نہ جاؤ..... سوہن!“

ہلا مجھے آوازیں دیتی رہ گئی مگر میں نہیں رکا۔ عین وقت پر ایک آدم زاد نے مجھ سے لقمہ تر چھین لیا، میری بساط نشاط الٹ دی تھی۔

میں اس سے بے خبر تھا کہ جس عذاب میں گرفتار کر دیا گیا ہوں اس کا تدارک کیسے ہو۔ اس موقع پر مجھے اپنا دوست یاسف یاد آیا۔ وہ ایک ایسے عالم جن سے واقف تھا جو اس سلسلے میں میری رہنمائی اور ذکر رکھتا تھا۔

رات کا وہ آخری پہر تھا جب میں جاناگیر کے مقبرے پہنچا۔ یہ میری بد قسمتی تھی کہ یاسف مجھے انہیں ملے۔ ہاں یاسف کی بہن طرہ مجھے ضرور مل گئی۔ میں پہلے ہی اس جہیہ سے بچا بچا پھرتا تھا۔ وہ بالکل پسند نہیں تھی۔ میں نے اس سے معلوم کیا کہ یاسف کہاں ہے؟

”وہ تو میں نہیں جانتی لیکن اے علیا! تو اتنے دن سے کہاں غائب تھا؟“ طربہ قریب کہنے لگی۔ ”کیا تو نے کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے؟“

”یہ ان باتوں کا وقت نہیں اے طربہ! میں شدید اذیت میں مبتلا ہوں۔“ میں جلدی سے بولا ”تجھے کیا ہوا؟“ طربہ نے ہمدردی کی۔

”کسی آدم زاد نے مجھے قابو میں کرنے کی خاطر شاید عمل شروع کر دیا ہے۔“ میں نے بتا دیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا اے علیا! کب کی بات ہے یہ؟“ طربہ فکرمندی سے بولی۔

”ابھی کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہے کہ اچانک میرے وجود کو شدید جھکا.....“ میں نے اسے کیفیت سے آگاہ کر دیا۔

طربہ نے بھی تصدیق کر دی کہ میرا اندازہ بالکل درست ہے۔ پھر اس نے مجھے ہاموس سے مشورہ دیا۔ طربہ اس سے واقف تھی۔ ہاموس ایک ویران حویلی میں اپنے خاندان والوں کے ساتھ تھا۔ یہ حویلی مغلوں کے وقت کی بنی ہوئی تھی اور اس کا بڑا حصہ مندم ہو چکا تھا۔ طربہ مجھے ہاموس پاس لے گئی تو وہ اس وقت تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا۔ ہاموس راست باز بندہ (جن کی جمع عموماً لوگ دیتے ہیں جو قطعی غلط ہے۔ اجنبی ہندی لفظ ہے جس کا مطلب وہ پچھ ہے جو ابھی نہ جتا گیا ہو۔) میں سے تھا۔ ہمیں انتظار کرنا پڑا کہ وہ نماز پڑھ لے۔ میری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ نے مجھے سنبھال رکھا تھا۔ اس بہانے وہ مجھ پر اپنی محبت بھی نچھاور کرتی جا رہی تھی۔ ”ہمت سے کا اے علیا! تیش کہ خدا بہتر کرے گا۔“ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں جل رہا ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ کوئی آن دیکھی طاقت مجھے جانب کھینچ رہی ہے۔

خدا خدا کر کے ہاموس نے سلام پھیرا اور پھر دعا مانگنے لگا۔ جب وہ دعا مانگ چکا تو طربہ نے مخاطب کیا۔ ”اے ہاموس! اے اللہ کے نیک اور فرمانبردار! یہ علیا! ہے میرے بھائی یاسف کا۔“ تو اس کی حالت دیکھ، کسی آدم زاد نے شاید اسے عذاب میں گرفتار کر دیا ہے۔“

ہاموس میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ ”کیس تو آدم زادوں کی بستی میں تو نہیں رہنے لگا؟“ ”ہاں میں وہیں کچھ دن سے ہوں۔“ میں نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے اقرار کیا۔

”تو پھر جیسا کیا ہے بھگت! کیا تجھے خبر نہیں یا کسی نے نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم اشرف المخلوقات بنایا ہے؟ تیرے انہوں میں سے کسی نے تجھے یہ تاکید نہیں کی کہ آدم زادوں سے رہنا چاہئے؟“ ہاموس بولا۔

”اے ہاموس! مجھ سے غلطی ہو گئی لیکن وہ کہ جسے تو اشرف المخلوقات کہہ رہا ہے، کیا اسے یہ ہے اللہ کی دوسری مخلوقات کو ضرر پہنچائے؟“ مجھے غصہ آنے لگا۔

”بلا سبب کچھ نہیں ہوتا۔ یقیناً تو نے کسی آدم زاد کو اپنا نام بتایا ہو گا۔ جب تک کسی آدم زاد کا نام معلوم نہ ہو، وہ آدم زاد تسخیر جن کا وظیفہ نہیں کر سکتا۔ تیری جو حالت ہے مجھ سے

نہیں۔ کسی آدم زاد نے تجھے اپنا مطیع بنانے کی غرض سے وظیفہ شروع کر دیا ہے۔ ایسے وظائف رات کے مختلف اوقات میں کئے جاتے ہیں۔ تو مجھے یہ بتا کہ کب سے تیرا یہ حال ہے؟“ ہاموس نے آخر میں سوال کیا۔

جو حقیقت تھی میں نے بیان کر دی، مگر یہ نہیں بتایا کہ جب میری یہ کیفیت ہوئی تو میں کہاں تھا۔ ”تو پھر یہ وظیفہ مختصر وقت کے لئے ہے۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی تیری حالت سنبھل جائے گی۔“

”لیکن میں اس وقت تک یہ اذیت کس طرح برداشت کروں اے ہاموس!“ میں نے کہا۔ ”جلا جا رہا ہوں میں۔“

”میں تیری تکلیف ختم تو نہیں کر سکتا، ہاں کم کرنے کی تدبیر بتاتا ہوں۔ پاک صاف ہو کر تو نماز پڑھنے کھڑا ہو جا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے دعا کر۔ اللہ کی پناہ میں پہنچ جائے گا تو کوئی آدم زاد تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے اے ہاموس! لیکن اس آدم زاد کا سراغ کیسے لگایا جائے کہ جو علیا! تیش کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے؟ پھر اسے روکا کیسے جائے؟“ طربہ بول اٹھی۔

”تیرے ان سوالوں کے جواب اس وقت ممکن نہیں۔ اس کے لئے مجھے علیا! تیش سے تفصیلی گفتگو کرنا پڑے گی تبھی کچھ کہہ سکوں گا۔ فی الحال یہ اس قابل نہیں، اسے صبح فجر کے بعد میرے پاس بھیج دینا۔ خدا حافظ!“ ہاموس بولا۔ ”اب جاؤ، میں آرام کر رہا ہوں۔“

خفت اذیت کی حالت میں مجھے طربہ کے ساتھ واپس آنا پڑا۔

نماز میں نے صرف اپنے بچپن میں پڑھی تھی لیکن اس وقت واقعی خدا یاد آ رہا تھا۔ ہاموس کے مشورے پر عمل کرنا گویا میری مجبوری تھی۔ طربہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی کہ میں یاد الہی میں مصروف ہو سکوں۔ پھر جیسے ہی میں نے نماز کے لئے نیت باندھی اور اپنا دھیان خالق حقیقی کی طرف لگایا، تکلیف کم ہونے لگی۔ نماز پڑھتے ہوئے مجھے سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔

صبح ہونے تک میں نماز پڑھ پڑھ کر دعا مانگتا رہا۔ فجر کے وقت مجھے یوں لگا جیسے بڑھکتے شعلے ایک دم سرد پڑ گئے ہوں۔ مجھ پر نیم غشی سی طاری ہو گئی۔

مجھے بیدار کرنے والی طربہ ہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“ ”بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تو ہاموس سے ملے نہیں جائے گا؟“ طربہ بولی۔

”میں تو خیر ہاموس کے پاس چلا جاتا ہوں اے طربہ! لیکن تو میرے ساتھ نہ چل، وہ پھر وعظ کرنے لگے گا۔“

”لوٹ کر تو آئے گا تو اس کے پاس سے؟“ ”ہاں کیوں نہیں۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا“ میں بھی تجھے چاہتا ہوں۔“ میں نے جھوٹ بول دیا۔
 ”تو پھر کیوں بھاگتا ہے مجھ سے؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں“ وہ کل رات سے کہاں چلا گیا ہے۔ میں تو اسے دور دور ڈھونڈ آئی، نہیں ملا۔“ پھر وہ کہنے لگی کہ مقبرے سے متصل باغ میں میری واپسی کا انتظار کرے گی، میں ہاموس سے مل کر سیدھا وہیں پہنچوں۔

طرطبہ کے جاتے ہی میں ہاموس کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے وجہ بتا دی۔

”تو پھر تو نے فجر کی نماز نہیں پڑھی۔“

”پڑھتا کہاں سے اے ہاموس! تجھے میں نے بتایا نا کہ مجھ پر نیم غشی سی طاری ہو گئی تھی۔“

”خیر اب تھا پڑھنا۔“ اس کی آواز میں تاکید تھی۔ ”بس طرح اہل ایمان آدم زادوں پر پانچوں وقت کی نماز فرض ہے، جنت بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔“ پھر اس سے پہلے کہ میں ہاموس کی نصیحتوں سے بیزار ہو جاتا وہ خود ہی اصل موضوع کی طرف آگیا۔ ”تجھے میں ایک وظیفہ تعلیم کرتا ہوں۔ یہ وظیفہ تجھے تین راتوں تک بعد نماز عشاء زوال کے وقت سے پہلے پہلے تک پڑھنا ہے۔ تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ تجھے کون آدم زاد اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے۔“

”تو کیا اس سے پہلے مسلسل تین راتوں تک مجھے گزشتہ رات ہی کی طرح اذیت سے گزرا نہ پڑے گا؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں، اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔ اذیت کے وقت تجھے وہی تدبیر کرنا پڑے گی جس پر پچھلی رات عمل کر چکا ہے۔“

کہاں تو میں نماز سے بھاگتا تھا اور کہاں اب ہاموس ساری ساری رات نماز پڑھنے کو کہہ رہا تھا، میں بڑی طرح پھنس گیا تھا۔

”اور سن اے علیا! تین دن اور رات کو تو کسی جنیہ سے نہیں ملے گا اور نہ آدم زادوں کی کسی آبادی کا رخ کرے گا۔ اس کے علاوہ فضول گوئی سے بھی تجھے اجتناب کرنا پڑے گا۔ تیرے لئے بہتر یہی ہے کہ تو اس عرصے میں صرف یاد خدا کرے۔ اگر تو نے ان شرائط کا خیال نہ رکھا تو وظیفہ بے اثر ہو جائے گا۔“

وہ ایک ہی آدمی تھا کہ جسے مجبوراً مجھے اپنا نام بتانا پڑا تھا، یعنی مولوی کفایت اللہ۔ مجھے یاد تو آ گیا مگر ہاموس کے روزِ بروز میں نے اس کا اقرار نہیں کیا۔ میں اگر مولوی کا نام بتا دیتا تو پھر سارا ہی راز کھل جاتا۔ ہاموس مجھ سے سب کچھ پوچھ لیتا۔ اگر وہ یہ سوال کرتا کہ میں کس لئے مولوی کی حویلی میں گیا تھا تو کیا جواب دیتا۔ ہاموس سے زیادہ جھوٹ بولنا بہر حال مناسب نہیں تھا۔ اسے شک ہو جاتا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو پھر شاید وہ میری مدد نہ کرتا۔

”تو یاد کرتا رہ، ممکن ہے تجھے اس آدم زاد کا نام یاد آ ہی جائے۔“ ہاموس نے میرا انکار سن کر کہا۔
 ”یقیناً کبھی نہ کبھی تو نے کسی آدم زاد کو اپنا نام ضرور بتایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تیرا نام جانے بغیر تیرے لئے وہ عمل نہ کر جاتا۔“

”اے ہاموس! میں کوشش کروں گا کہ ایسے کسی آدم زاد کا نام یاد آجائے۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک اور تدبیر بھی آ رہی تھی۔

”دیکھ! اگر اس کا نام معلوم ہو گیا تو پھر اسے وظیفہ کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔“ ہاموس کہنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں میں یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا کہ ہاموس جس طرف اشارہ کر رہا ہے، وہی درست بات ہے۔ مولوی کلنات اللہ بھلا کیوں مجھے قابو میں کرنے کو وظیفہ پڑھتا۔ وہ اس طرح کا آدمی نہیں تھا۔ اس سے بظاہر رنجش کو تو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ مولوی تو اس قدر عہد کا پابند تھا کہ سب کچھ جان لینے کے باوجود بھی وہ اپنی زبان سے نہیں پھرا تھا۔ مجھے اور یاسف کو اس نے قابو میں کرنے کے باوجود ہار کر دیا تھا۔ اسے اگر کوئی انتہائی کارروائی بھی کرنا ہوتی تو اب تک کر چکا ہوتا۔

”تو چپ کیوں ہو گیا؟“ ہاموس نے مجھے ٹوکا۔ ”کیسے تجھے ملیتا کی بیٹی طرہ کا خیال تو نہیں آ گیا؟“

مجھے یاد آیا کہ طرطبہ مجھ سے ملنے کا وعدہ لے چکی ہے۔ سو میں نے کہا۔ ”ہاں ابے ہاموس“ خیال کسی کا آیا تھا۔ اس وقت بھی وہ مقبرے سے متصل باغ میں میری واپسی کی کھنکھاہٹ سن رہی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ظیفہ پورا ہونے تک میں بھی اسی حویلی کے کسی حصے میں پڑ رہا ہوں؟“

”آں ہاں، کیوں نہیں۔ یہ بہت بڑی حویلی ہے، تو یہاں عارضی طور پر رہ سکتا ہے، میں حد قائم کروں گا کہ تجھے کس مقام سے آگے نہیں بڑھنا۔ وجہ یہ کہ یہاں میری بیٹیاں بھی ہیں۔“ ہاموس مجھے اس

حویلی میں رکھنے پر آمادہ ہو گیا، پھر کہنے لگا۔ ”مطلبہ کو میں خود ادھر آنے سے منع کر دوں گا۔“
پھر ہاموس مجھے اپنے ساتھ اٹھا کر لے گیا۔ حویلی کا وہ ایک ٹوٹا ہوا کمرہ تھا جس کی صرف ایک دیوار
اور تھوڑا سا حصہ گرنے سے بچ گیا تھا۔

”تو یہاں یاد الہی میں مصروف ہو جا۔“ ہاموس کہنے لگا۔ ”آج رات عشاء کے بعد تجھے جو وظیفہ
زوال کے وقت سے پہلے تک پڑھنا ہے، وہ یہ ہے، یاد کر لے۔“
ہاموس مجھے عربی کی وہ آیات یاد کرانے لگا جو مجھے پڑھتے رہنا تھیں۔ پھر جب مجھے وظیفہ یاد ہو گیا تو
اس نے ان حدود کا تعین بھی کر دیا جہاں سے آگے پڑھنا میرے لئے ممنوع تھا۔

جب ہاموس مجھے اس جگہ چھوڑ کر چلا گیا تو میں سوچنے لگا، جنات کو عموماً وہی لوگ قابو میں کرنے کی
خاطر وظیفے پڑھتے ہیں جنہیں یا تو دوسروں پر اپنی علیت کا رعب جمانا ہوتا ہے کہ طالع جنات کے ذریعے
اپنی ”کرتب بازی“ دکھا سکیں یا پھر ایسے آدم زاد ہوتے ہیں جنہیں مال و متاع کی طلب ہو۔ اس کے علاوہ
ایسے عالم بھی کہ جنہیں کوئی جن ستائے تو انتقاماً اسے اپنا مطیع بنالیں۔ مولوی کفایت اللہ کو نہ تو کرتب
دکھانے کا شوق تھا، نہ مال و متاع کی خواہش۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رزق حلال کے حصول کی خاطر کپڑے کی
دکان کھول کر نہ بیٹھتا۔ وہ تو روزانہ فی سبیل اللہ خلق خدا کی خدمت کرتا تھا، وہ کوئی پیشہ ور قسم کا مولوی
ہوتا تو میں اس سے اتنا نہ ڈرتا ایسے مولوی ہم جنات کے لئے خطرناک نہیں ہوتے۔ ہاموس سے بات
کرتے ہوئے مجھے یہ تدبیر سوجھی تھی کہ اگر واقعی کسی سبب مولوی کفایت اللہ ہی میرے لئے وظیفہ پڑھ
رہا ہے تو یہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں۔ میں تکلیف و اذیت کے باوجود مولوی کی حویلی میں گھسنے کا خطرہ
مول لے سکتا تھا۔ مولوی کو وظیفہ کرتے دیکھ کر میں لوٹ آتا۔ اس سے کم از کم میرے خیال کی تردید یا
تائید ہو تو جاتی۔ پھر یہ کہ ایک نظر اس غارت گر ہوش پر بھی ڈال آتا جس کے عشق نے میرا یہ حال کر
دیا تھا۔

جیسے تیسے وہ دن گزرا۔ مجھے شدت سے رات ہونے کا انتظار تھا۔ رات آئی تو عشاء کے بعد سے
میں نے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا اور نصف شب سے پہلے تک پڑھتا رہا۔ ہاموس نے وظیفے کے لئے جو
شرائط عائد کی تھیں، ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ میں آدم زادوں کی کسی آبادی کا رخ نہیں کروں
گا۔ میں نے سوچا، وظیفہ تو اسی لئے کر رہا ہوں کہ خود کو مطیع بنانے والے تک پہنچ سکوں۔ اگر اس کے
لئے کوئی اور راستہ مل گیا ہے تو مجھے کوشش ضرور کرنا چاہئے۔ اس طرح ایک ہی رات تو رائیگاں جائے
گی، وظیفہ آئندہ رات سے از سر نو شروع کیا جا سکتا ہے۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ میں یہ سوچ کر شری
آبادی کبھی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی میں شربچہ کر بھائی دروازے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ گزشتہ شب کی طرح میرے
وجود کو زبردست جھٹکا لگا اور پھر جیسے میں شعلوں میں گھر گیا۔

جلنے جھلنے کے باوجود میں رکنا نہیں اور حوصلہ کر کے مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں داخل ہو گیا۔
جس آدم زاد نے مجھے اپنا غلام بنانے کے لئے گزشتہ رات سے وظیفہ شروع کیا تھا، وہ آج رات بھی وظیفہ

کرنے بیٹھ چکا تھا۔

مولوی کفایت اللہ کا کمرہ پہلے پڑا اور اسے بے خبر سوتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ میرا مجرم نہیں
تھا۔ میرا قیاس قطعی درست ثابت ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے مولوی کفایت اللہ کے سوا کسی
آدم زاد کو اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ پھر وہ کون ملعون آدم زاد ہے جو میری جان کا درپے ہو گیا ہے؟ میں نے
انتہائی اذیت برداشت کرتے ہوئے سوچا اور چکرے کر رہ گیا۔

اب اس اذیت کو برداشت کرنے کی صرف اور صرف ایک ہی صورت تھی کہ گزشتہ رات کی
طرح ہاموس کے مشورے پر عمل کرتا اور نماز پڑھنے لگتا، مگر آدم زادوں کی بستی میں میرے لئے ہر
طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ مجھے اپنے ٹھکانے ہی پر پہنچ کر نماز پڑھنا تھی۔

عشق اور کسی آدم زادی کا عشق بڑی بڑی بلا ہے۔ اسی حویلی میں زمرس بھی تھی، میری محبوبہ
زمرس۔ شدید تکلیف اور اذیت سے گزرتے ہوئے بھی میں ایک نظر اسے دیکھنے کی آرزو پر قابو نہ پاسکا۔
دیار تک آ کر یوں لوٹ جانا بھلا کیسے ممکن تھا۔ پھر اسی آرزو نے جیسے میرے جلتے ہوئے وجوہ کو اور جلا ڈالا۔
زمرس کا بستر خالی تھا۔

میں اسی لمحے کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا اور میرے وجود میں انگارے ہی انگارے بھر
گئے۔

اس آواز میں بڑا ہی غرور و تکبر تھا اور وہ میرے لئے اجنبی آواز نہیں تھی۔ میں اسی لئے تو کھول
اٹھا تھا۔ مجھے میرا نام لے کر پکارنے والا ایک جن زاد ہی تھا، میرا دوست اور میرا رقیب یاسف۔ وہ مجھ سے
مخاطب تھا۔ ”تو کسے ڈھونڈ رہا ہے یہاں؟“

میں تیزی سے ہلکا۔ سامنے ہی یاسف موجود تھا۔ ”یہاں تو کیسے؟“ اپنے غصے اور اذیت پر قابو پاتے
ہوئے میں نے یاسف سے پوچھا۔

”یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔“ اس کی غیر انسانی آواز میں تمسخر تھا۔ ”کیا یہاں میرے آنے پر
پابندی ہے؟ تو اگر ایک مدت تک اقبال کے جسم پر قبضہ کر کے عیش اڑا سکتا ہے تو میں ایسا کیوں نہیں کر
سکتا۔ میں نے بھی کل رات موقع ملنے ہی اقبال کے جسم کو اپنا لیا۔ مجھے تو ایک مدت سے انتظار تھا کہ تو
کب اس آدم زاد کے جسم سے نکل کر کہیں جائے اور کب میں اس کے قالب میں اتر جاؤں۔ زمرس کو
میں نے آج رات کے لئے اقبال کی بہن سے پیغام بھجوا دیا تھا۔ وہ باب تیری نہیں، میری بیوی ہے اور
آدم زاد بیویاں اپنے شوہر کی بڑی فرماں بردار ہوتی ہیں۔ زمرس ابھی ذرا دیر پہلے مجھ سے ملنے پھمت پر گئی
ہے۔ اس کے باوجود مجھے تیری طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں تو نہ آ جائے۔ میں نے اسی لئے اقبال
کے جسم سے باہر آنے کی تکلیف اٹھائی اور یہاں آ گیا کہ اگر تو واقعی آئی جائے تو حقیقت سے آگاہ کر
دوں۔ اب میں چلا اور تو بھی جا۔ میرے اور زمرس کے درمیان دیوار نہ بن۔“ یاسف مڑا۔

”فھر جا اے یاسف!“ میں بول اٹھا۔ ”مت بھول کہ زمرس سے باقاعدہ میرا نکاح پڑھایا جا چکا
ہے۔“

”تیرا نکاح۔“ وہ ہنس پڑا۔

”کیوں، کیا کسی جن زاد سے ایک آدم زادی کا نکاح نہیں ہو سکتا؟“ میں نے بحث کی۔

”مجھے بھی یہ معلوم ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ عالم ہاموس نے مجھے ایک دفعہ ایک جینیہ اور ایک

آدم زاد کے نکاح کا قصہ سنایا تھا اور شرعاً اسے جائز قرار دیا تھا، ایسی صورت میں کہ دونوں اہل ایمان ہوں لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ زمرس قطعی لاعلم تھی کہ اقبال کے جسم میں ٹو ہے۔ اس نے تجھ سے نہیں اپنے آدم زاد محبوب اقبال سے نکاح کی ہاں بھری تھی۔ سو پھر وہ کس طرح تیری بیوی ہو گئی؟ مجھے مسئلے مسائل سمجھانے کی کوشش نہ کر اے علیالیش! اب تو زمرس کو بھول جا اور اپنی جان کی خیر منہ میں جانتا ہوں کہ تو گزشتہ رات سے کس عذاب میں گرفتار ہے، پہلے کسی آدم زاد کے قبضے میں جانے سے بچنے کی سبیل کر۔ اس وقت تک مجھے عیش کرنے دے۔ اگر تو کسی آدم زادی کی گرفت میں آنے سے بچ گیا تو پھر دیکھا جائے گا۔ میرے لئے تین راتیں بہت ہیں۔ تیری طرح میں دیوانہ نہیں ہوں کہ کسی ایک ہی آدم زادی پر اکتفا کر لوں۔ تو میرا دوست ہے اسی لئے وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی زمرس کو چھوڑ دوں گا۔ پھر تو چاہے تو دوبارہ اقبال کو تختہ مشق بنالینا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”لعلت بھیجتا ہوں میں تجھ پر اور تیری دوستی پر۔“ میں چیخ اٹھا۔ میرے چیخنے سے حویلی کے در و بام گونج اٹھے۔

اسی وقت مولوی کفایت اللہ کے کمرے کی طرف سے تیز آواز میں کلمہ پڑھنے کی آواز آئی۔ یقیناً وہ جاگ اٹھا تھا۔

اب میرا وہاں رکنا اپنی موت کو دعوت دیتا تھا۔ مولوی کی صورت میں ایک فتنہ بیدار ہو چکا تھا۔ میں بھاگ اٹھا اور بھاگتے بھاگتے زمرس کو دیکھا جو تیزی کے ساتھ مہن عبور کر کے اپنے کمرے کی جانب لپک رہی تھی۔ یاسف مجھ سے پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ کر غائب ہو گیا تھا۔

میں تو شدید غصے کے عالم میں خود پر قابو نہ پا کر چیخ اٹھا تھا۔ مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ میرے چیخنے کا رد عمل یہ ہو گا۔ جو کچھ ہوا میرے حق میں تھا۔ اس طرح کم از کم زمرس ایک رات کے لئے تو یاسف سے محفوظ ہو گئی تھی۔ گزشتہ شب اسے پیغام بھیج کر میں نے بلایا تھا اور آج رات یاسف نے ایسا کیا تھا۔ زمرس بے خبری میں گویا اپنے محبوب کے بلاوے پر آ رہی تھی، وہ محبوب جو اب اس کا شوہر بھی تھا۔ اگر یہ رشتہ درمیان میں نہ ہوتا تو یقیناً دوسری ہی رات وہ چھت پر نہ پہنچ جاتی۔ میرے چیخ اٹھنے سے مولوی کفایت اللہ کی طرح وہ بھی گھبرا گئی تھی اور غالباً اسی لئے اپنے شوہر سے ملے بغیر لوٹ آئی تھی۔ اقبال اس کا شوہر سہی لیکن وہ بہرحال ایک باعزت گھرانے کی بیٹی تھی۔ کوئی باغیرت آدم زادی نکاح ہونے کے باوجود اپنی رسوائی برداشت نہیں کرتی۔ آدم زاد خلوت اور جلوت کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جنات کی اکثریت کی طرح ابھی وہ بے حیا نہیں ہوئے۔ میں جوان ہوتے ہی آدم زادوں کی آبادیوں میں آنے جانے لگا تھا مجھے اسی لئے ان تمام باتوں کا علم تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک آدم زاد کے جسم میں رہنے کا بھی تجربہ ہو چکا تھا۔ سو آدم زادوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ معلومات کسے ہوتیں۔ اس رات

جب میں شمر سے باہر ویران حویلی میں پہنچا تو میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ شدید تکلیف و اذیت کی وجہ سے بمشکل میں نماز کی نیت باندھ سکا۔ رفتہ رفتہ اذیت کم ہونے لگی۔ پھر بھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے صبح نہیں ہو گی۔

فجر کی اذان کہیں دور سے سنائی دی۔ اسی کے ساتھ میں ڈھس گیا میرا وجود اب لپکتے ہوئے شعلوں کے درمیان سے نکل آیا تھا۔

خاصی دیر کے بعد نیم غنوغوی کے عالم میں مجھے ہاموس کی آواز سنائی دی۔ ”اے علیالیش! اٹھ۔“ ہاموس کی آواز سے خفگی جھلک رہی تھی۔

”کیا ہوا اے ہاموس تو مجھ سے کچھ ناراض لگتا ہے؟“ میں جواباً بولا۔

”ہاں، میں تجھ سے خفا ہوں۔ تو یہاں سے چلا جا۔“

”مگر میرا قصور بھی تو بتا۔“

”تو عہد شکن ہے اور عہد توڑنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔“ ہاموس کہنے لگا۔ ”تجھے شاید یہ غلط فہمی ہے کہ میں تیری طرف سے غافل ہوں۔ رات کو جب میں تجھ کی نماز پڑھنے کے لئے اٹھا تو تیرا خیال آیا۔ دیکھا تو یہاں تو نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تو آدم زادوں کی طرف ہی گیا ہو گا۔ تجھے تو اس وقت اللہ کے حضور میں ہونا چاہئے تھا۔“

ہاموس کی ناراضگی کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہی غنیمت معلوم ہوا کہ اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ عارضی طور پر سہی، اس نے بہرحال مجھے رہنے کو جگہ دی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اس آدم زاد کا سراغ لگانے میں میری مدد کر رہا تھا جس نے میری زندگی اجیرن بنا دی تھی۔

صاحب علم جنات ہوں کہ آدم زاد، معافی و درگزر ان کا وظیفہ ہوتا ہے۔ ہاموس بھی ایسے ہی جنات میں سے تھا۔ اس نے مجھے معاف کر دیا اور اس حویلی سے نہیں نکالا۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”تیری مشکل، کا ایک اور حل میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ تو کیوں کہ خود اس آدم زاد کا ہدف ہے اس لئے تجھے دیر لگے کی دیے بھی وظیفے کی شرط پوری نہ ہونے کے سبب تجھے ازسرنو وظیفہ شروع کرنا پڑتا۔ شراناک کے مطابق تجھے وظیفہ پورا ہونے تک آدم زادوں سے دور ہی رہنا تھا لیکن تجھ سے یہ نہ ہوا۔ یہ بتا کہ تیری خاطر کوئی خود کو خطرے میں ڈال سکتا ہے؟ میری مراد جنات سے ہے، آدم زادوں سے نہیں۔“

مجھے طربہ یاد آئی، وہ میری دیوانی تھی۔ یوں بھی میں اس کے بھائی یاسف سے لڑ چکا تھا۔ اگر وہ میری جان بچاتے ہوئے کسی خطرے میں گھر جاتی تو مجھے کوئی رنج نہ ہوتا۔ اسی کے بھائی نے تو میری جگہ لے لی تھی۔ موجودہ صورت حال میں یاسف کا پلہ بھاری تھا۔ ایک آدم زاد کے جسم پر کوئی ایک ہی جن زاد قابض رہ سکتا ہے۔ ایک ہی وقت میں دو جن زاد کسی ایک جسم میں نہیں رہ سکتے۔ یاسف کو اسی لئے تو اقبال کے جسم سے میرے نکل جانے کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں ان سے یہی ظاہر تھا کہ وہ میری ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ پھر میں نے خطرے کی نوعیت جانے بغیر ہاموس سے کہہ دیا۔ ”ہاں اے ہاموس! ایک ہستی ایسی ہے۔“

”کہیں وہ ملیتا کی بیٹی طربہ تو نہیں؟“ ہاموس نے پوچھا۔ ”وہی جو تجھے میرے پاس لے کر آئی تھی۔“

”تو ٹھیک سمجھا۔“ میں نے اقرار کر لیا۔

”دیکھ اے علیالیش! یہ بڑے خطرے کا کام ہے۔ کیا خبر وہ اس پر راضی نہ ہو۔“ ہاموس نے اندیشہ کا اظہار کیا۔

میں نے اس سے خطرے کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

”خطرہ یہ ہے کہ ناکامی کی صورت میں وہ اسی قالب میں ہمیشہ کے لئے قید ہو کر رہ جائے گی جسے اختیار کرے گی۔ اسے آدم زادوں کی اس آبادی میں جانا ہو گا جہاں تو جا چکا ہے۔ کسی قالب کے بغیر اسے کوئی عالم آدم زاد قید بھی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تیرے حصول کی خاطر جس آدم زاد نے وظیفہ شروع کیا ہے وہ بھی خارج ہونے پر طربہ کو نقصان پہنچا دے، یہ بھی بعید از قیاس نہیں۔ ان خطرات کے باوجود اگر طربہ راضی ہو جائے تو اسے میرے پاس لے آ، میں اسے وہ عمل بتا دوں گا کہ جس کے ذریعے نامعلوم آدم زاد کا سراغ لگانا ممکن ہے۔“ ہاموس نے مجھے آگاہ کر دیا۔

میں اسی وقت طربہ کی تلاش میں چل دیا۔ وہ مجھے اداس و ملول مقبرے کی ایک سہ دری میں مل گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران سی نظر آنے لگی اور بولی۔ ”مجھ سے تو ہاموس نے کہا تھا کہ تو کوئی عمل کر رہا ہے اور تین راتوں تک مجھ سے نہیں مل سکے گا۔“

”ہاں ایسا ہی تھا اے طربہ! میرے ساتھ باغ میں چل کہ میں تجھے بتا سکوں، کسی مشکل میں گرفتار ہوں۔“

باغ میں چلنے کا سن کر وہ خوش ہو گئی اور ساتھ چل دی۔ ہم دونوں باغ کے ایک ویران گوشے میں پہنچ گئے۔ غلوت میرے آتے ہی طربہ میری توقع کے مطابق عملاً اظہار عشق کرنے لگی۔ طربہ ایسی بڑی بھی نہیں تھی کہ میں اپنے قریب اسے برداشت نہ کر سکتا۔ ایک وہی کیا مجھے تو کوئی جینیہ پسند نہیں تھی۔ مصلحت کے تحت میں اس کی وجہتوں کا ساتھ دیتا رہا لیکن جب وہ ہمکناری کی منزلوں تک پہنچنے لگی تو مجبوراً اسے روکنا پڑا۔ میں نے دانستہ اسے ان منزلوں تک آنے دیا تھا۔

”کچھ دن صبر کر لے اے طربہ! مجھے اس ملعون آدم زاد کا سراغ لگا لینے دے جو تیرے علیالیش کو ہمیشہ کے لئے تجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”میں اسے قتل کر دوں گی۔“ طربہ جوش جذبات میں بولی۔ ”تجھے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“

”اگر تو چاہے تو یہ ممکن ہے۔“ میں فوراً مطلب کی بات پر آگیا۔

”میں۔“ وہ حیرت سے کہنے لگی۔ ”میں بھلا ایسا کیوں نہ چاہوں گی اے علیالیش! تیری خاطر تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔“

میں جو کچھ سننا چاہتا تھا سن لیا اور پھر اسے بتا دیا کہ ہاموس کی تجویز کیا ہے۔

”چل! ابھی ہاموس کے پاس چل۔ تو جان لے گا اے علیالیش کہ میں تیرے عشق میں سچی تھی۔ یہی تو ہو گا کہ میں ماری جاؤں لیکن تو..... تو اے علیالیش اس عذاب سے نجات پا جائے تو شاید میری زندگی رائیگاں نہ ہو۔“ وہ جذبات کے دھارے میں بہہ رہی تھی۔

میرا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ مجھے طربہ کے مرنے یا جینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سو میں اسے فوراً ہاموس کے پاس لے گیا۔

”اے ملیتا کی بیٹی! کیا تجھے علیالیش نے خطرات سے آگاہ کر دیا؟“ ہاموس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں اے ہاموس! میں باخبر کی جا چکی ہوں۔ علیالیش کی خاطر مجھے ہر خطرہ قبول ہے۔“ طربہ نے بے عزم آواز میں جواب دیا۔

”یہ بھی یاد رکھو اے طربہ کہ علیالیش ممکن ہے تجھ سے وفا نہ کرے اور بعد میں تو پچھتائے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ آدم زادوں کا گرویدہ ہے اور جو ایک بار اس راہ پر لگ جائے پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ تاکید کے باوجود گزشتہ رات آدم زادوں کی بستی میں نہ جاتا۔“ ہاموس نے طربہ سے کہا۔

ہاموس شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں پچھلی رات کسی آدم زادی سے ملنے گیا تھا، سو میں بول اٹھا۔

”اے ہاموس! بات وہ نہ تھی جو تو نے سمجھ لی۔ ہوا یہ کہ مجھے ایک آدم زاد پر شک تھا کہ شاید وہ مجھے اپنا مطیع بنانا چاہتا ہو۔ میں اسی کو دیکھنے گیا تھا کہ کہیں وہی تو وظیفہ نہیں پڑھ رہا لیکن ایسا نہیں تھا۔“

”تجھے اس آدم زاد پر شک کیوں ہوا؟ کوئی تو اس کی وجہ ہو گی۔“ ہاموس جرح کرنے لگا۔

”میں اور طربہ کا بھائی یاسف ایک رات غلطی سے آدم زادوں کی بستی میں جا پھنسے اور پھر ہمارے پیچھے ایک عفریت لگ گیا۔ اسی سے بچنے کی خاطر ہم.....“ میں نے وہی کہانی ہاموس کو سنا دی جس پر مولوی کفایت اللہ نے بوجہ یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے آخر میں نرگس کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ ”اس خطرناک مولوی نے مجھے اور یاسف کو قید کر لیا کہ ہم اس کی حویلی میں کیوں داخل ہوئے۔ اسی دوران اس نے ہمارے نام بھی پوچھ لئے۔ پھر جب اسے ہم نے حقیقت سے آگاہ کیا تو اس نے ہمیں آزاد کر دیا۔“

”یہ تو بڑی عجیب سی بات کسی نے اے علیالیش! آدم زادوں میں خال خال ہی ایسے نیک عالم ہوتے ہیں کہ جنات کو قابو میں کرنے کے بعد رہائی دے دیں۔ پھر تو تجھے اس عالم اور نیک آدمی پر شک ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ ہاموس بولا۔

”شک صرف اس لئے ہوا کہ کسی آدم زاد کو میں نے کبھی اپنا نام نہیں بتایا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اگر یوں ہے تو پھر ایک اور بات بتا، عالم جنات میں تو کوئی تیرا دشمن نہیں؟“ ہاموس نے دریافت کیا، پھر کہنے لگا۔ ”کبھی کبھی دشمنی کے سبب جنات بھی اپنے دشمن کو راستے سے ہٹانے کے لئے کسی آدم زاد کو پیچھے لگا دیتے ہیں یا پھر کسی خاص مقصد کے حصول کی غرض سے ایسا کر گزرتے ہیں۔“

مولوی کفایت اللہ نے ستار کو میرا ہی نام اس لئے بتایا تھا کہ میں نے اس کی بیٹی پر بڑی نظر ڈالی تھی۔ اسے یہ علم تھا۔ اس کے علاوہ مولوی کو مجھ پر یہ شبہ بھی تھا کہ اتار کلی بازار میں اس کی دکان کو نذر آتش میں نے ہی کیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ستار کوئی پرانا گھاگ نہیں تھا کہ آسانی سے قابو میں نہ آتا۔ وہ پہلی مرتبہ کوئی وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا اور اس کے پتے کا بھی مجھے علم ہو گیا۔ طرہ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کے صلے میں طرہ کو کم سے کم ایک بار ضرور شاد کام کر دوں گا۔ پھر چاہے وہ زندگی بھر میرا انتظار کرتی رہے، اس کی طرف نہیں پلٹوں گا۔ مجھے طرہ کی واپسی تک یہ خبر نہیں تھی کہ اس پر کیا گزری۔

مغرب ہونے سے کچھ ہی پہلے وہ لوٹی تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں جب تک ہاموس کو بلا کر لایا، طرہ جاں بہ لب ہو چکی تھی۔

ہوا وہی جس کا ہاموس کو ڈر تھا۔ ستار نے پرندے کے قالب میں طرہ کو شدید زخمی کر دیا لیکن وہ درد پورا کرنے سے پہلے ستار کے گھر سے نہ ٹلی۔ وہ منڈلائی ہی رہی۔ ایک وفادار جنبہ نے اپنے عاشق کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔ وہ انتہائی زخمی حالت میں درد پورا کر کے بمشکل ویران حویلی تک پہنچی تھی۔ میری آغوش میں دم توڑنے سے کچھ دیر پہلے طرہ نے سب کچھ بتا دیا۔ ہاموس بھی اسے موت کے منہ میں جانے سے نہ بچا سکا۔

ہر چند کہ مجھے طرہ سے محبت نہیں تھی مگر اس کی موت کا سبب وہ آدم زاد تھا جس نے دولت کی ہوس میں مجھے اپنا غلام بنانا چاہا تھا۔ مجھے اسی لئے اس پر شدید غصہ آ گیا۔

”ستار! میں تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے غصے میں کہا۔

”نہیں اے علیالیش! تجھے یہ حق نہیں۔ طرہ کے قتل کا قصاص لینا اس کے باپ ملیقا پر منحصر ہے۔ تو اس معاملے میں نہ پڑ۔“ ہاموس مجھے سمجھانے لگا۔ ”تیرا کام صرف اتنا ہے کہ تو اس آدم زاد کو وظیفہ پڑھنے سے روک دے اور بس۔“

وقتی طور پر میں نے ہاموس کے روبرو یہ اقرار کر لیا کہ ستار کو گزند نہیں پہنچاؤں گا۔ ہاموس بہر حال میرا محسن تھا، میں اس کی کسی بات کو ماننے سے کس طرح انکار کر دیتا، لیکن میرا ارادہ کچھ اور ہی تھا۔ مولوی کفایت اللہ پر بھی مجھے غصہ آ رہا تھا کہ وہی مردود اس فساد کی جڑ تھا نہ وہ ستار کو میرا نام بتاتا نہ یہ نوبت آتی اس کے علاوہ مجھے طرہ کے باپ ملیقا کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرا دشمن نہ بن جائے۔ طرہ میری ہی خاطر تو اپنی جان سے گزر گئی تھی۔ ہاموس اس پر گواہ تھا کہ طرہ نے خود ہی اپنی مرضی سے زندگی داؤ پر لگائی تھی لیکن جنات تو یوں بھی مزاجاً مشتعل ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے سامنے کے بعد ملیقا کا مشتعل ہو جانا قرین قیاس تھا۔ عالم اشتعال میں وہ مجھے نقصان نہ پہنچا دے، سو میں یہ سوچ کر فکرمند ہو گیا۔

ہاموس، ملیقا کو طرہ کے قتل ہونے کی خبر دینے گیا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور

میرے دھیان میں فوری طور پر یاسف ہی آیا۔ نرمس کے قرب کی خاطر یاسف یہ چال چل سکتا تھا لیکن وہاں یاسف کی بہن طرہ بھی موجود تھی۔ یوں بھی یاسف کو وہ میرا دوست ہی سمجھتی تھی۔ طرہ کے سامنے یاسف کا نام لینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

”تجھے خبر ہو کہ نہ ہو اے علیالیش! تیرا کوئی نہ کوئی دشمن ضرور ہے۔“ ہاموس نے کہا۔ پھر وہ طرہ سے مخاطب ہوا۔ ”تو ایک پرندے کا قالب اختیار کرے گی۔ میں جس پرندے کو فضا میں چھوڑوں تو اس کا پیچھا کرے گی۔ میرا چھوڑا ہوا پرندہ شہر پر منزلانے گا اور پھر ادھر کا رخ کرے گا جہاں مطلوبہ آدم زاد رہتا ہے۔ وہ پرندہ اسی آدم زاد کے گھر کی چھت پر بیٹھے گا اور ذرا دیر بعد اڑ جائے گا لیکن تجھے وہیں بیٹھے رہنا ہے۔ تجھے میں چند الفاظ ورد کرنے کو بتاتا ہوں۔ تو ان الفاظ کا ورد کرتی رہے گی تو وہ نامعلوم آدم زاد کہیں بھی ہوا اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ وہ چھت پر آ کر تجھے بھگائے گا تو نہ بھاگنا اور وہیں منزلاتی رہنا۔ جب تک کہ بتایا ہوا ورد مکمل نہ ہو، مقررہ تعداد یا گنتی تو پوری نہ کر لے وہاں سے ٹلنا نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ آدم زاد تجھ پر کسی غلیل سے حملہ کرے یا تجھے پتھر مار کے زخمی کر دے، سو حملوں سے بچنا اور ورد پورا کرنا تیرا کام ہے۔ اگر تو زخمی ہو کر کہیں گر گئی یا ورد نہ کر سکی تو پھر اسی قالب میں قید رہے گی، ہمیشہ کے لئے، اب بھی وقت ہے، سوچ لے اے طرہ تجھے جان کی بازی لگا کر ورد پورا کرنا ہے۔ تو اگر کامیاب رہی تو علیالیش کو اس نامعلوم آدم زاد کے بارے میں خود بخود تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ علیالیش بھی یہاں اس عرصے میں انہی الفاظ کا ورد کرتا رہے گا۔ پول کیا کہتی ہے؟“

”میں راضی ہوں اے ہاموس!“ طرہ سب کچھ سن کر بھی کہنے لگی۔

میں اگر طرہ کی جگہ ہوتا تو ہرگز خود کو خطرے میں نہ ڈالتا لیکن وہ تو ایک دیوانی تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا۔ ہاموس نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کیا۔ ایک کے بعد ایک، دو پرندے اس ویران حویلی سے اڑے اور دور افق میں گم ہو گئے۔

ہاموس نے مجھے بھی ورد کے الفاظ تعلیم کر دیئے تھے، سو میں ورد کرنے لگا۔ ہاموس میرے پاس سے چلا گیا۔

وہ غالباً عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا کہ جب مجھے ایک آدم زاد کا چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے سے اس کی عمر زیادہ نہیں لگتی تھی۔ میرے لئے وہ قطعی اجنبی تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اس شخص کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھا، کس سے اسے میرے نام کا پتہ چلا۔

اس کا نام ستار تھا اور وہ مولوی کفایت اللہ کے معتقدین میں سے ایک تھا۔ مولوی سے اس کی رشتے داری بھی تھی۔ وہ بہت دن سے مولوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ اسے کسی جن کو مطیع کرنے کا وظیفہ بتا دے۔ اس طرح وہ اپنی غربت دور کرنے کا آرزو مند تھا۔ مولوی نے اسے سمجھایا کہ یہ بہت خطرناک کام ہے، اس میں جان بھی جا سکتی ہے۔ دولت کی ہوس نے ستار کو ہر خطرہ مول لینے پر اکسایا۔ وہ کسی بھی جن کو قابو میں کر کے اس سے جو چاہتا کام لیتا۔ ستار اسی لئے اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار ایک روز مولوی کو رام ہونا ہی پڑا۔ اس نے ستار کو وظیفہ بتا دیا اور میرا نام بھی۔

وہاں سے فرار ہو گیا۔

جنت عموماً آدم زادوں کی بستیوں میں جانے سے گریز کرتے ہیں اس لئے میری جائے پناہ یکی بستیاں ممکن تھیں۔ آج ہی رات مجھے لمحوں ستار سے بھی انتقام لینا تھا اس لئے کہیں اور جانے کی بجائے لاہور ہی کا رخ کیا۔ وظیفہ پڑھنے کے دوران میں ستار غافل ہوتا میں نے اسی لئے نصف شب کے بعد عین اس وقت ستار پر حملے کا فیصلہ کیا جب وہ وظیفہ کرنے بیٹھ جائے۔ اب میرے سامنے صرف یہ مسئلہ تھا کہ میں نصف شب گزرنے تک کہاں رہوں۔

اس موقع پر مجھے بملا یاد آگئی وہ بہر حال ایک امیر باپ کی بیٹی تھی میں نے سوچا کہ اس کے یہاں ملازمین تو ہوں گے، کسی بھی ملازم کے جسم میں داخل ہو کر عارضی طور پر پناہ لے لوں گا۔ اس طرح ایک طرف تو میں، طرفہ کے باپ ملیقات کی ممکنہ دشمنی اور اشتعال سے بچ جاتا، دوسری جانب موقع ملنے پر بملا کے قرب میں حسین لہلت گزرتے۔ یہی سوچ کر میں، بملا کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ خلاف توقع وہاں مجھے گہما گہمی نظر آئی۔ کوٹھی کے سبزہ زار پر خاصے لوگ جمع تھے ان میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی۔

اس وقت تک زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ مجھے کسی تقریب کا سا سماں نظر آیا۔ اس ہجوم میں انگریز عورتیں اور مرد بھی تھے۔ بملا مجھے ایک انگریز ہی کے پہلو میں دکھائی دی۔ بڑی سی لمبی میز کی دونوں جانب کرسیاں بچھی تھیں۔ میز پر دلائی شراب کی بوتلیں، گلاس، سوڈا، کباب اور کھانے پینے کا دوسرا سامان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ بملا کا باپ راؤ بہادر ہماری لال، بے پوری کوٹ پہنے، سر پر گڈڑی باندھے اور گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے وہاں موجود افراد میں نمایاں لگ رہا تھا۔ اسے میں نے بملا کے چہرے کی بناوٹ اور رنگ سے پہچانا۔ راؤ بہادر بھی سرخ و سفید تھا، اس کے علاوہ بملا اسی پر گئی تھی۔

خدا جانے وہ تقریب کس سلسلے میں منعقد کی جا رہی تھی۔ کئی ملازمین کو میں نے مستعدی سے ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا۔ ایک نوجوان ملازم خاص طور پر بملا اور اس انگریز کی خدمات پر مامور تھا۔ وہ ایک بار انگریز کے گلاس میں شراب انڈیلنے جھکا تو بملا نے بڑی صفائی سے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ غالباً اذیت رسانی بملا کی عادت میں شامل تھا۔ اسی سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ بملا، نوجوان ملازم سے بے تکلف ہے ورنہ بھری محفل میں ایسی حرکت نہ کرتی۔ نوجوان ملازم کا نام بھی پکارے جانے پر مجھے معلوم ہو گیا۔ پھولے ہوئے رخساروں والے اس ملازم کا نام رام بھروسے تھا۔ یہی ٹھیک رہے گا، میں نے سوچا اور پھر رام بھروسے کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اس طرح میں، بملا کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اب میں اس انگریز اور بملا کے درمیان دھیمی آوازیں ہونے والی گفتگو بھی سن رہا تھا۔

ان دونوں کی گفتگو سے مجھ پر ساری حقیقت کھل گئی۔ وہ انگریز رچرڈ، انگریز حکومت کا ایک بڑا افسر تھا۔ ایل ڈی اے کے ڈائریکٹر ولسن سے بھی اس کی دوستی تھی۔ قصہ اسی سرکاری زمین پر ناجائز قبضے کا تھا جو راؤ بہادر نے ہڑپ کر لی تھی۔ رچرڈ کو بملا اس پر آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ولسن سے راؤ بہادر کی سفارش کر کے معاملے کو رکوا دے۔ راؤ بہادر گویا اس طرح دہری چال چل رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ بملا

کے ذریعے غلی سطح پر کام دکھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، دوسری جانب اوپر سے بھی دباؤ ڈالنے کا بندوبست جاری تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح کامیابی ہو ہی جائے۔ یہ تقریب اسی سلسلے میں ایک کڑی تھی۔ رچرڈ مجھے رنگین مزاج آدمی لگا۔ وہ بملا کو بڑی میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بملا اس پر جیسے زبان ہوئی جا رہی تھی۔ بملا کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں سے نوشی کے سبب لال لال ڈورے پڑ جاتے تھے۔ رچرڈ بھی لہریں دکھائی دیتا تھا۔

بملا نے اس پچاس سالہ بوڑھے انگریز کو شیشے میں اتارنے کے لئے خود اپنے ہاتھ سے ایک بار پلائی۔ پھر خود اس گلاس سے ایک گھونٹ بھر لیا۔ رچرڈ کی چندیا کا بڑا حصہ سپاٹ تھا۔ میرا جی چاہا کہ ایک پیٹ لگا دوں لیکن اسی وقت بملا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے رام بھروسے! ذرا وہ کباب کی پلیٹ اٹھا کر

”جی بی بی جی!“ میں ادب سے بولا اور کباب کی پلیٹ اٹھانے جھکا۔

بملا نے پلیٹ لینے سے پہلے تیزی کے ساتھ میری کلائی میں اتنی زور سے چٹکی بھری کہ میں بلبلایا گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے سسکاری روکی۔

میں بالکل پیچھے ہی کھڑا تھا۔ انتہائی کارروائی کے طور پر میں نے چپکے سے ہاتھ بڑھایا۔ میں واقعی تو رام بھروسے تھا نہیں کہ بملا سے ڈر جاتا۔ میں تو خیر برداشت کر گیا تھا لیکن بملا اپنی سسکاری نہ روک سکی، میں یوں اس کی کرسی کے پیچھے معصوم بنا کھڑا تھا جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔

”کیا ہوا؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

”کسی چیونٹے کجھنٹ نے پیر میں کاٹ لیا ہے۔“ بملا نے بمانہ بتا دیا۔

”چیونٹا نہیں کوئی چیونٹ ہو گی، مجھے بھی کئی بار کاٹ چکی ہے بی بی جی!“ بملا کو مزید بتانے کے لئے میں بول اٹھا۔

بملا نے مڑ کر مجھے غضبناک نظروں سے دیکھا اور ڈانٹ دیا۔ ”اپنی چونچ بند رکھ۔“

میں گویا سم گیا۔ پھر بملا ”بے تکلف“ نہ ہوئی۔ پارٹی گھٹنے بھر بعد ختم ہو گئی۔ مہمان چلے گئے تو راؤ بہادر اپنی بیٹی کے قریب آکر پوچھنے لگا۔ ”کچھ بات بنی؟“

”ہاں اس نے وعدہ تو کر لیا ہے۔“ بملا اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”نٹے میں کئے ہوئے وعدے عموماً لوگوں کو یاد نہیں رہتے کل تم اس کے دفتر ضرور جانا تاکہ یاد دہانی کرا سکو۔“

بملا نے اقرار میں سر ہلا دیا تو راؤ بہادر وہاں سے عمارت کی طرف چل دیا۔ ملازمین سامان وغیرہ اٹھانے میں لگے ہوئے تھے اور میں ادھر سے ادھر یوں ہی مڑ گشتی میں مصروف تھا۔ ایک ادیبز عمر ملازم نے اس بات کو محسوس کر لیا تو ہانک لگائی۔ ”ابے اور رام بھروسے! تو راجا اندر بنا کہ ہر گھوم رہا ہے، کام کر۔“

اسی وقت بملا بول اٹھی۔ ”اس سے مجھے اپنے کمرے کی صفائی کرانا ہے۔“

”اچھا بی بی جی!“ ادھیڑ عمر ملازم جلدی سے کہنے لگا۔

”چل رام بھروسے!“ بھلانے آگے بڑھتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

میں اس سرو قامت قیامت کے ساتھ ہو لیا۔ خواب گاہ وہی تھی جہاں میں پہلے بھی ایک بار آچا تھا، اندر چنچتے ہی بھلانے میرے پھولے ہوئے رخساروں میں سے ایک کو نشانہ بنایا۔ اس کے تیز ناخن میرے رخسار میں اتر گئے۔ میں چلائی۔ ”ہائے بی بی جی! مر گیا۔“

”ابھی تو دوسرا گال باقی ہے۔ ادھر منہ کر۔ تیرے پھولے پھولے گال دیکھ کر میرے ہاتھوں میں کھلبلی ہونے لگتی ہے۔“

وہ نوحا کھسوٹی پر اتر آئی تو مجبوراً مجھے اس کے دونوں ہاتھ پکڑنا پڑے۔

”چھوڑ میرے ہاتھ! یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ بل کھا کر سخت غصے میں بولی۔

”بہتر ہے بی بی جی!“ میں اس کے ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے پلٹا اور خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

”ارے ارے! یہ تو کیا کر رہا ہے؟“ بھلا کی آواز آئی۔ ”آج رات یہ سب نہیں چلے گا۔ میں تھک گئی ہوں۔“

”میں بھی تو تھک گیا ہوں بی بی جی!“ میں نے لپک کر اسے جکڑ لیا۔ بھلانے جو کچھ کہا تھا، اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ رام بھروسے بھی اس کی خلوتیں آباد کرتا رہا ہے۔

بھلا زور آزمائی کرنے لگی مگر میں اسے کب چھوڑنے والا تھا۔ شاید اسے اپنے ایک ملازم سے اتنی حسرتی کی توقع نہیں تھی۔ اس کے غصے سے یہی ظاہر ہو رہا تھا وہ تیز آواز میں کہنے لگی۔ ”میں اپنی مرضی کی مالک ہوں زبردستی پر اترتا تو تیری کھال ادھیڑ دوں گی، نوکری سے نکال دوں گی تجھے۔“

میں اگر رام بھروسے ہوتا تو شاید اس کی دھمکی میں آجاتا۔ اس کے احتجاج کو خاطر میں نہ لا کر میں اسے جکڑے ہوئے مسری تک لے آیا اور پھر دھکا دے کر گرا دیا۔

”رام بھروسے..... نمک حرام..... گندی موری کے کیڑے۔“ وہ چیخنے لگی۔

”بی بی جی! چیخنے چلانے سے آپ ہی کی بدنامی ہوگی اس لئے ایسا نہ کریں۔“ میں نے پرسکون آواز میں کہا اور مسری پر بیٹھنے لگا۔

بھلانے لینے لینے میری کمر پر ایسی زوردار لات ماری کہ میں اوندھے منہ مسری کے قریب زمین پر گرا۔ وہ سراپا ناز و حوصلہ دھپے سے بھی باز نہ آئی تو مجبوراً مجھے اس کی خبر لینا پڑی۔ گرنے کی وجہ سے میرے دونوں کندیاں زخمی ہو گئی تھیں جن میں نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انداز ایسا تھا جیسے مجھے چیر پھاڑ ڈالے گی۔

میرے اٹنے کے ساتھ ہی زور سے اس کے منہ پر پڑا کہ کمرہ گونج اٹھا تھپڑ کھا کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ آنسو بھری آنکھوں سے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ رہا ہو کہ سامنے اس کا فرمایاں بردار ملازم رام بھروسے کھڑا ہے یا کوئی اور شخص ہے۔ اس کا سارا نشہ ہل

ہو گیا تھا۔

”بھلا! اگر اب تو نے شور مچایا تو بہت ماروں گا۔“ میں دوبارہ مسری پر بیٹھ گیا۔

عورت کتنی ہی شیرینی کیوں نہ بن جائے اس کے اندر شاید یہ خواہش نہیں مرنے کی کوئی مرد اسے فتح کرے، اس سے اپنی برتری تسلیم کر لے۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر مجھے تو یہی تجربہ ہوا۔ پت کر بھلا بھی سیدھی ہو گئی۔ شاید وقتی طور پر اس کے ذہن میں رام بھروسے کی حیثیت کا خیال نکل گیا۔ اب وہ صرف ایک عورت تھی اور میں مرد۔

مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ وقت کتنا گزر چکا ہے۔ میں چونکا اس وقت کہ جب میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ میں الگ جا پڑا۔ ستار نے مجھے تسخیر کرنے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

”تجھے کیا ہوا رام بھروسے!“ بھلا کتنی کے بل اٹھتے ہوئے بولی۔

اسی لمحے رام بھروسے کے جسم کو دوسرا جھٹکا لگا۔ میں اس کے جسم سے باہر آچکا تھا۔

مجھے قطعی پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر کوئی جن زاد کسی آدم زاد کے جسم میں ہو اور اس کی تسخیر کے لئے عمل شروع کر دیا جائے تو مقبوضہ جسم پر کیا گزرتی ہے۔ ایک جن زاد تو یہ جملہ برداشت کر سکتا ہے مگر کوئی آدم زاد نہیں۔ رام بھروسے کا جسم شدید جھٹکا کھا کر اچھلا اور پھر دوسرے جھٹکے پر اس کی گردن ٹھک گئی۔ وہ سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا، آنکھیں پٹی رہ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

بھلا کے لئے یقیناً یہ ایک غیر متوقع بات تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے رام بھروسے کو دیکھنے لگی۔ وہ بہر حال میرے تصرف میں آچکی تھی۔ پھر میں اسے کسی مشکل میں گرفتار چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔ اس کی خواب گاہ سے رام بھروسے کی لاش برآمد ہوتی تو مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ میرا وجود شعلوں کی لپیٹ میں تھا، اس پر ہی میں نے حوصلہ نہ ہارا۔

”بھلا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے میری آواز سے پہچانو۔“

”سو..... سوہن!“ بھلا کے پنکھڑیوں جیسے لب ہلے۔ وہ میری غیر انسانی آواز پہچان گئی تھی۔

”ہاں میں تیرا پتی سوہن ہوں۔ تجھے گلہ تھا نا کہ اس جنم میں مجھے بنگوان نے کوئی شریر (جسم) کیوں نہیں دیا۔ سو میں نے تیری خاطر کچھ دیر کو رام بھروسے کا شریر اپنا لیا۔ میری آتما (روح) کو چین کہاں۔ رام بھروسے کی آتما میری آتما کا بوجھ سہن (برداشت) نہ کر سکی اور مجھے اس کا شریر چھوڑنا پڑا۔ اسی کارن (اسب) یہ مر گیا۔ تجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں اس کی لاش اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ کوئی تجھ سے اس کے بارے میں پوچھے تو کہہ دیجیو کہ اپنے کمرے کی صفائی کرا کے تُو نے اسے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر یہ کہاں چلا گیا، تجھے نہیں معلوم۔ سمجھی کہ نہیں؟“

”سمجھ..... سمجھ گئی۔“ بھلا جلدی سے بولی۔ ”پر اب..... اب تُو آئے تو میرے ملن کے لئے کسی شریر کو نہ.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ اس کی نظریں رام بھروسے کی لاش پر ٹھک جیسے میں اٹھا چکا تھا۔ اس نے تو صرف یہ دیکھا ہو گا کہ لاش خود بخود فضا میں بلند ہو رہی ہے۔ اسی

وجہ سے وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکی تھی۔ اس کا حسین گلابی چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب میں نے دروازہ کھولا اور اسے مڑ کر دیکھا۔ اس نے بستر پر پڑی چادر گھسینے لگی تھی۔

رام بھروسے کی لاش کو میں نے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا اور پھر تیزی سے ستار کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے اس کا چہرہ یاد تھا۔

خلاف توقع ستار مجھے اپنے گھر میں نہیں ملا تو میں چکرا گیا۔ میں نے سوچا کیا وہ آج رات کہیں اور جا کر وظیفہ پڑھ رہا ہے؟

کہاں جا سکتا ہے وہ؟ میرے ذہن پر یہ سوال ہتھوڑے سے برسائے لگا۔ میں نے تو سنا تھا کہ کونسا عمل کرنے کے لئے وقت اور جگہ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا پھر ایسا کس طرح ہو گیا؟ کہیں اس نے کسی نئی جگہ ازسرنو تو وظیفہ پڑھنا شروع نہیں کر دیا؟ متعدد سوالات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ اذیت مارے میرا برا حال تھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ چوکنا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ طرہ کی مداخلت ہی ممکن تھی۔ حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ہی شخص کے پاس جا سکتا تھا، وہی کہ جس خبیث مولوی نے اسے میرے پیچھے لگا تھا۔ ستار سے انتقام لینے کی آگ اور بھڑک انھیں میں سوچنے لگا، اگر وہ گھر میں نہیں تو اس کے گھر والے تو ہیں، پھر میں گھر میں اتر گیا۔ ستار کے گھر میں والدین کے علاوہ اس کی بیوی اور دو جوان بیٹیں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ چار بچے تھے۔

میں نے سانپ کا قالب اختیار کر لیا۔ اس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی میں اس کے سینے پر چڑھ بیٹھ گیا۔ وہ میری پھنکار سن کر جاگ اٹھی اور پھر دہشت زدہ ہو کر چیختے لگی۔ ذرا سی دیر میں سارا گھر جاگ اٹھا۔

”بلنا مت بھو!“ ستار کے باپ نے خوفزدہ آواز میں تاکید کی۔ ”بلوگی تو یہ تمہیں ڈس لے گا۔“ اس کا جسم ساکت ہو گیا، آنکھیں بھی پر جبی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ آدم زاد بہت چالاک ہوتا ہے۔ ستار کا باپ، سانپ کے قالب میں مجھے مار بھی سکتا تھا سو میں نے دیر نہیں لگائی میں نے ستار کی بیوی کو ڈس لیا اس کے لئے میں نے گردن پر پھن مارا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سانپ کا قالب ترک کر دیا اور ستار کے گھر سے چلا آیا۔ میں نے نہ سے انتقام لینے کی پہلی قسط ادا کر دی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ ستار، مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں ہو گا لیکن میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی وہاں جا سکتا پھر اقبال کے جسم میں یاسف بھی وہیں تھا۔ وہ میرے راستے کی دیوار بن جاتا۔ وہ رات نے نواح شہر کے ایک ویران باغ میں گزاری۔ فجر ہونے تک میرا برا حال ہو چکا تھا۔

دن نکلا تو مجھے ایک بار پھر خطرے کا احساس ہوا۔ مجھے روپوشی کے لئے کسی نہ کسی آدم زاد جسم میں پناہ لینا تھی۔ جنات عموماً آدم زادوں سے الگ تھلگ ویران مقامات ہی کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔

میلتا مگر مجھے تلاش کرتا تو ایسے ہی مقامات کا رخ کرتا۔ طرہ کے باپ کی طرف سے میں مطمئن نہیں تھا۔

گزشتہ رات میرے ہاتھوں دو آدم زاد قتل ہو چکے تھے، ایک تو بملا کا نو جوان ملازم رام بھروسے، دوسری ستار کی بیوی۔

جنات، آدم زادوں کے جسم میں بھی داخل ہو جاتے ہیں لیکن مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا، یہ تجربہ بھی سبھی عارضی طور پر ہیں، بملا کے جسم میں کیوں نہ چھپ جاؤں۔ یوں میں ہر وقت اس کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ جب چاہوں گا اس کے جسم سے نکل کر اسے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ بنا لوں گا۔

صبح کا وقت تھا کہ میں، بملا کی کوغی میں پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک محو خواب تھی۔ میں اس کے جسم میں داخل ہو گیا تو مجھے عجیب سا لگا۔ کسی عورت کا جسم میرے لئے نیا نیا سا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی اویسر عمر ملازم کھڑا تھا جسے میں رات کو دیکھ چکا تھا۔

”بی بی جی! راؤ صاحب کہہ رہے ہیں، پنڈت ہر دیال جی آگئے ہیں، تیار ہو کر بیٹھک میں آ جائیں۔“ ملازم نے کہا۔

اس پنڈت کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ بملا نے راجندر سے اسی کا ذکر کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بملا نے میری تاکید پر عمل نہیں کیا۔ وہ مجھے جن یا بھوت ہی سمجھ رہی تھی۔ پچھلے جنم میں، میں اس کا شوہر تھا، اس کمائی اور میری تاکید پر بملا نے دھیان نہیں دیا تھا۔ یقیناً گزشتہ روز وہ پنڈت سے ملی ہوگی اور رات کو پیش آنے والا واقعہ اس حد تک بیان کر دیا ہو گا کہ کردار پر حرف نہ آئے۔ ملازم مجھے اطلاع دے کر چلا گیا تو میں نے فوراً بملا کا جسم چھوڑ دیا اور وہ جھٹکا کھا کر گر پڑی۔

جب وہ فرش سے حیران پریشان سی اٹھ رہی تھی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے بازو میں چٹکی بھر لی، پھر اسے غیر انسانی آواز میں مخاطب کیا۔ ”تو مجھے اب تک کوئی بھوت ہی سمجھ رہی ہے؟..... جواب دے بملا!“ میری آواز میں سختی آگئی۔

”نن..... نہیں تو۔“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”اب وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔“

”پھر تو نے پنڈت ہر دیال کو کیوں بلایا ہے؟“

”مم..... میں نے تو انہیں..... انہیں نہیں بلایا۔ ہاں پتا جی.....“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے سر کے بالوں کو گرفت میں لے کر جھٹکا دیا اور کہا۔ ”سچ بتا دے، کیا بات ہے؟“ وہ کراہتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بتاتی ہوں مگر میرے بال تو چھوڑ دو۔“

میں نے بال چھوڑ دیئے تو اس نے بتایا کہ اپنے باپ راؤ بھادر سے یہ بات کی تھی۔ راؤ بھادر ہی نے پنڈت ہر دیال کو بلوایا تھا۔ نرگس کے ساتھ اس کا باپ مولوی کفایت اللہ لگا ہوا تھا اور یہاں یہ بد ذات

پنڈت آدمکا تھا۔ یہ آدم زاد کہیں بھی مجھے چین نہیں لینے دے رہے تھے۔

”جا اور اس پنڈت کو ٹال کر آکر وہ آئندہ نہ آئے۔ کہہ دیجو کہ تجھے پنا (خواب) نظر آیا تھا ٹھیک ہے؟“ میں نے پنڈت کو ٹالنے کا ٹر بتایا۔

”ہاں..... ہاں یہی..... یہ کہہ دوں گی۔“ وہ اپنی جان چھڑانے کو بولی۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی، مگر اس پر عمل کرنے سے پہلے میں نے بملا سے کہہ ”خیال رکھیو کہ ابھی میں بیس ہوں۔“ ٹوٹنے کوئی اور چکر چلایا تو بست پڑ گئی۔“

پھر میں ’بملا کی خواب گاہ سے نکل کر نشست گاہ میں آ گیا۔ پتلے دبلے لبوترے چہرے والے پنڈت ہر دیال کو میں نے دیکھا۔ بظاہر وہ مجھے خطرناک معلوم نہیں ہوا۔ راؤ بہادر بھی اس کے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھا تھا۔ پنڈت کی عمر پچاس سے اوپر لگتی تھی۔ وہ راؤ بہادر سے کہہ رہا تھا۔ ”کوئی بھی آتما شریر کے بنا جھپٹے جسم سے اس جسم میں نہیں آ سکتی۔“

”تم بکواس کر رہے ہو پنڈت جی!“ یہ الفاظ میرے تھے، مگر زبان راؤ بہادر بہاری لال کی تھی۔ میں نے راؤ بہادر کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شریمان جی! آپ تو میرا ایمان (توہین) کر رہے ہیں۔“ پنڈت ہر دیال کی پیشانی پر ہل پڑ گئے۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھ گیا اور بولا۔ ”تجھے اپنے ایمان کا اتنا ہی خیال تھا تو یہاں آیا ہی کیوں؟“

”راؤ بہادر جی! ہوش میں آئیں۔ شاید آپ کو دولت کی گری چڑھ گئی ہے۔“ پنڈت ہستے سے اکڑ گیا۔

”ابے جا، بڑا آیا مجھے ہوش میں لانے والا۔ ہم جیسے امیر کبیر لوگ تجھ سے پنڈتوں کو دان دکھانا دیں تو.....“

”بس بست ہو گیا راؤ بہادر!“ پنڈت غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب میں ایک پل یہاں نہیں رک سکوں۔“

”تو تیری خوشامد کون کر رہا ہے، دفع ہو جا۔ تو اگر خود نہ جاتا تو میں تیری چنیا پکڑ کر گھسیٹا ہوا دیکھ کے پھانک تک لے جاتا یا نوکروں سے دھکے دے کر نکلتا دیتا۔“

پنڈت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نشست گاہ سے نکل گیا۔ وہ یقیناً کوئی خطرناک آدمی نہیں تھا ورنہ حقیقت جان لیتا کہ راؤ بہادر کے اندر کوئی اور بول رہا ہے یا پھر اسے اس انداز میں سوچنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ بہر حال جو بھی رہا ہو، اس سے مجھے نجات مل گئی تھی۔ پنڈت چلا گیا تو میں ’راؤ بہادر کے جسم سے نکل آیا۔

جھکا کھا کر راؤ بہادر کا جسم سنبھلا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ اس کی نظریں پنڈت کی خالی کرسی پر تھیں۔

”ارے او راہو!“ راؤ بہادر نے غالباً اپنے کسی ملازم کو پکارا۔

چند ہی لمحوں بعد ادرہ عمر ملازم نشست گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کا نام راہو تھا۔ ”پنڈت جی کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہاں بیٹھے تھے۔“

”وہ تو پھانک کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے گئے ہیں۔“ راہو نے بتایا۔

”جلدی سے بھاگ کر جا اور بلا کے لے آ۔ معلوم نہیں کب اور کیوں اٹھ کر چلے گئے۔“

راہو پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور وہ گر گیا۔

”کیا ہو گیا تجھے؟“ راؤ بہادر چیخا۔ ”جتنی جلدی کو کہہ رہا ہوں، دیر لگا رہا ہے۔“

”دھوٹی میں پیرا لٹھ گیا تھا۔“ معلوم نہیں راہو نے بہانہ کیا تھا یا یہی سمجھا تھا۔

میں نے اسے نشست گاہ سے نکل جانے دیا، مگر پچھانہ چھوڑا۔ باہر آتے ہی وہ واقعی بھاگنے لگا تھا۔ برآمدے کی میزوں سے اترتے ہی وہ ایک بار پھر لڑھک گیا۔ میں نے پھانک کی طرف دیکھا تو پنڈت ہر دیال پھانک تک پہنچ چکا تھا راہو پھر اٹھا اور دوبارہ گر پڑا۔

”ہے بھگوان! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ وہ روہنسا ہو گیا۔

پنڈت اس وقت تک پھانک سے نکل چکا تھا۔ میں نے راہو کو مزید کچھ دیر پھانک کی طرف نہ جانے دیا کہ کہیں وہ دوڑ کر پنڈت کو روک ہی نہ لے۔ یہ تو محض ایک احتیاط تھی ورنہ راہو اس پنڈت سے اب یہ جا کر بھی کہہ دیتا کہ راؤ بہادر بلا رہا ہے تو وہ لوٹ کر نہ آتا۔

میں واپس کوٹھی میں پہنچا تو بملا کو نشست گاہ کی طرف بڑھتے دیکھا بملا کے چہرے سے خوف اور فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اس سے پہلے نشست گاہ میں پہنچ گیا کہ دیکھوں وہ اپنے باپ سے کیا کہتی ہے۔ بملا کے کچھ کہنے سے قبل راؤ بہادر بول اٹھا۔ ”پنڈت جی آئے تھے پر جانے کیوں ایک دم اٹھ کر چل دیئے۔ راہو نے انہیں پھانک کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ پنڈت جی کو بلانے گیا ہے راہو، آتا ہوگا، تم بیٹھو۔ سنو، پنڈت جی آجائیں تو ایک بات انہیں بتا دینا۔ کوئی بات ایسی ہو کہ میرے سامنے نہ کہنے کی ہو تو اشارہ کر دینا، میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔“

”پتا جی! اب..... اب تو مجھے یوں جان پڑتا ہے کہ..... کہ.....“ بملا نے خوفزدہ نظروں سے ادرہ ادرہ دیکھا۔ پھر اپنی داستان میں شاید بڑی صفائی سے ایک پرچہ راؤ بہادر کو تھا دیا۔

راؤ بہادر نے حیرت سے بملا کی جانب دیکھا اور پرچہ پڑھنے لگا۔ میں نے بھی پرچے پر نظر ڈالی اور چیخ و تاب کھا کے رہ گیا ہندی میں پرچے پر بملا نے صرف ایک جملہ لکھا تھا۔ ”پتا جی! وہ بھوت اس وقت بھی ہماری کوٹھی میں موجود ہے، پنڈت جی کو بھی پرچہ پڑھا دیں۔“

بملا کنبخت اب تک یہ مان کے نہیں دے رہی تھی کہ میں بھوت نہیں ہوں۔ وہ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ میں صرف وہی بات جان سکتا ہوں جو زبان سے کہی جائے۔

پرچہ پڑھ کر راؤ بہادر کے چہرے پر ہوا پیاں اڑنے لگیں۔ اسی وقت ایک ملازم اندر آیا اور اس نے رام بھروسے کے غائب ہو جانے کی اطلاع دی۔

”تو میں کیا کروں، گیا ہو گا نرگ (دورخ) میں۔“ راؤ بہادر پھٹ پڑا۔ ”تو اس حرام خور راہو کو جا

کے دیکھ پنڈت جی کو بلائے گیا تھا اور وہیں مر گیا۔
ملازم ابھی دروازے سے نکلا نہیں تھا کہ ”حرام خور“ خود آگیا اور کہنے لگا۔ ”سرکار!.....
پنڈت جی تو چلے گئے۔ دور دور ان کا پتہ نہیں۔“

راؤ بہادر نے راجو کو قہرناک نظروں سے دیکھا، پھر چیخا۔ ”چلے جاؤ یہاں سے“ ذرا سا کام نہیں ہوتا
تم لوگوں سے۔ ”راجو جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ راؤ بہادر پھر بول اٹھا۔ ”پنڈت جی کو ان کے گھر جا کر بلا
لا۔ موتی سے کہہ دے“ وہ تجھے موٹو میں بٹھا کر لے جائے گا پنڈت جی کو ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔“
مجھے پورا یقین تھا کہ پنڈت ہر دیال اب راؤ بہادر کے بلائے پر نہیں آئے گا۔ دوبارہ وہ بھلا کیوں
بے عزت ہونے آ جاتا، راجو بہر حال چلا گیا۔

”پنڈت جی کو بھی شاید اسی..... اسی بھوت نے.....“
”ہاں جی!“ بملا درمیان میں بول اٹھی، پھر اس نے جھک کر سرگوشی کی۔ ”کیا خبر وہ ہمیں موجود
ہو۔“

”ہاں بملا! میں ہمیں ہوں اور وہ پرچہ جو ٹوٹنے اپنے باپ کو دیا ہے اس پر لکھے الفاظ بھی پڑھ چکا
ہوں۔“ میں اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔
بملا تو خیر پہلے بھی میری غیر انسانی آواز سنتی رہی تھی مگر راؤ بہادر کے لئے یہ نئی بات تھی۔ وہ شاید
بہت ڈر پوک آدی تھا۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔ ”بب..... بھوت..... بھو.....“
”تم بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہو راؤ بہادر!“ میں نرم آواز میں بولا۔ ”میں بھوت نہیں، تمہاری بیٹی
کا پتی (شوہر) ہوں۔“

راؤ بہادر پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا، دہشت سے وہ ہوش کھو بیٹھا۔
بملا اسے سنبھالنے اٹھی تو میں نے اس کی کٹائی پکڑ لی اور بولا۔ ”اسے خود ہوش آ جائے گا، تو
میرے ساتھ چل۔“

”کک..... کہاں؟“ وہ ہلکائی۔
”اپنے کمرے میں۔“ میں نے جواب دیا۔
بملا کو اس کے کمرے میں لا کر میں نے دروازہ اندر سے بند کیا، پھر اسے مسہری تک لے آیا۔
”ہاں تباہ تیرا کیا حشر کروں؟“ میں سخت آواز میں بولا۔ ”تو مجھے اپنا پتی نہیں مانے گی؟“
”مانتی ہوں..... بالکل مانتی ہوں۔“ وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ ”غلطی ہو گئی، معاف کر دو۔“
”اب اگر تو نے کسی سے میرے بارے میں کچھ کہا تو تیرے باپ کو مار ڈالوں گا۔“ میں نے دھمکی
دی۔ ”رام بھروسے کی لاش دیکھی تھی نا تو نے۔“

بملا رونے اور گڑ گڑانے لگی تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔
”اچھا اب نہ رو، تجھے معاف کر دیا میں نے۔“ میں نے کہا اور وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے
لگی۔

کچھ دیر کو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میرا دھیان ستار کی طرف چلا گیا اسے اب تک یقیناً اپنی
بیوی کی موت کا پتا چل گیا ہو گا۔ میں نے سوچا کہ اسے اس وقت اپنے گھر پر ہی ہونا چاہئے۔ اسی کے
ساتھ میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا کہ میں پھر بملا کے پاس نہیں رکا۔ بملا کو میں نے یہ بتانا ضروری
نہیں سمجھا تھا کہ وہاں سے جا رہا ہوں۔ مصلحتاً یہی مناسب تھا کہ بملا اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے، میں اسی
کی کوششی میں موجود ہوں۔ ایسی صورت میں وہ مجھ سے ڈرتی رہتی اور کسی سے میرا ذکر نہ کرتی۔

میں، ستار کے گھر پہنچا تو دروازے کے سامنے گلی میں چارپائیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ انہی لوگوں
میں مجھے مولوی کفایت اللہ بھی نظر آ گیا وہ الگ ایک چھوٹی سی چارپائی پر ستار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں آگے
بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ ستار کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر بلا کا حزن و ملال تھا۔ آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا
کہ وہ بہت رویا ہو گا۔ ہمت سے کام لے کر میں کچھ اور آگے بڑھا تو لوگوں کی گفتگو سے پتا چلا کہ ستار کی
بیوی کو دفنایا جا چکا ہے وہ لوگ قبرستان سے لوٹ کر آئے تھے۔ میں ایسی جگہ تک پہنچ گیا تھا کہ مولوی
کفایت اللہ کی دھیمی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ ستار سے مخاطب تھا۔ ”میں نے تسخیر جن کا وظیفہ
پڑھنے سے تمہیں منع کیا تھا لیکن تم نہیں مانے اور ایسا نقصان اٹھا بیٹھے کہ جس کی تلافی ممکن نہیں۔ کل
بھی جب تم نے مجھ سے اپنی حالت بیان کی تھی اور پراسرار پرندے کا ذکر کیا تھا تو اس وقت بھی تمہیں
خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر بھی تم بضد رہے تو میں نے تمہیں اپنی حویلی کی پھت پر از سر نو وظیفہ پڑھنے
کی اجازت دے دی۔ تم ادھر وظیفہ پڑھتے رہے اور یہاں اس جن نے سانپ کے قالب میں آکر تمہاری
بیوی کو ڈس لیا۔ شواہد سے یہی ظاہر ہے کہ تمہاری بیوی کو قتل کرنے والا وہی جن ہے جسے تم قابو میں کرنا
چاہتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اچانک نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ میرا تو مشورہ یہ ہے کہ اب
تم.....“

”اگر..... اگر آپ کو یقین ہے، میری بیوی کا قاتل وہی جن ہے تو..... تو پھر میں اسے ضرور
قابو میں کروں گا تاکہ اس سے انتقام لے سکوں۔“ ستار پرجوش آواز میں بول اٹھا۔
”اس نے اگر تمہیں پھر کوئی نقصان پہنچا دیا تو؟..... ابھی تو جگہ بدل جانے کی وجہ سے ایک ہی
دن شمار ہو گا چالیس روز تک تم کس طرح جانی اور مالی نقصان برداشت کرو گے؟ بات کو سمجھنے کی کوشش
کرو ستار! تم ابھی نا تجربہ کار ہو۔“ مولوی اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔

”آپ..... آپ شاید اس لئے ایسا کہہ رہے ہیں کہ میری وجہ سے چالیس دن تک آپ کو بھی
پریشانی اٹھانا پڑے گی۔“
”قطعاً نہیں۔“ مولوی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں تو تمہاری بھلائی کو یہ بات کہہ رہا تھا۔ تم اگر
اب بھی بضد ہو اور وظیفہ جاری رکھنا چاہتے ہو تو کل کی طرح بعد نماز عشاء حویلی پہنچ جانا مجھے کوئی
اعتراض نہیں ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، خدا حافظ!“ مولوی اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے وہاں سے اس خبیث مولوی کے جانے ہی کا انتظار تھا۔ مولوی کی وہاں موجودگی کے سبب ہی تو
اب تک میں نے اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا تھا۔ مولوی کے جاتے ہی میں ملعون ستار کی طرف لپکا۔

”لیکن تُو نے تو مجھ پر اور میری دوستی پر لعنت بھیج دی تھی، پھر کیوں آیا ہے میرے پاس؟“ یاسف بہت دھیمی آواز میں بولا جیسے آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہو۔
”مجھے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ تُو نے کسی آدم زاد کو میرا نام بتا دیا ہے اب میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ اب اٹھ نا۔“

وہ اٹھا ہی تھا کہ ریٹا ادھر آگئی۔ یہ وہی دیکھی سیائی لڑکی تھی جسے میں شکار کر چکا تھا۔
”اقبال! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ ریٹا جھک کر دھیمی آواز میں بولی۔ ”کل سے بات ہی نہیں کر رہے۔ میری میز کی طرف تم ایک دفعہ بھی نہیں آئے، مجھے ہی مجبوراً آنا پڑا۔“
یاسف یقیناً لاعلم تھا کہ ریٹا میرے تصرف میں ہے۔ وہ اسی لئے اسے ٹالنے کی خاطر کہنے لگا۔
”آؤں گا، اس وقت ذرا ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“

ریٹا کا منہ بن گیا۔ اس نے قدرے فحشگی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے جاؤ، میں بھی اب تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ مجھے بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔“ وہ یہ کہتے ہی مڑ گئی۔

دفتر کی عمارت سے باہر آکر خلوت ملتے ہی یاسف نے پہلا سوال ریٹا کے متعلق ہی کیا۔ ”یہ لڑکی کون تھی، تجھ سے شاید قریب بلکہ بہت قریب رہ چکی ہے؟“

”اے جنم میں جھوٹک اور ایک روح فرسا خبر سننے کے لئے تیار ہو جا۔“ میں بولا۔

”روح فرسا خبر۔“ وہ چونک اٹھا۔ ”تو ایسی کیا خبر لے کر آیا ہے؟“

میں نے اسے طرہ کی موت کے بارے میں بتا دیا۔

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ”یہ..... یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ..... طرہ تو بالکل ٹھیک تھی۔“

”حقیقت یہی ہے اے یاسف! جو میں نے بیان کی۔ طرہ ماری گئی اور اسے مارنے والے آدم زاد کو میں نے مار دیا۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا اے علیالیش کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

پھر میں نے یاسف کو سب کچھ بتا دیا، اس کے سوا کہ طرہ نے میرے عشق میں جان دی۔ میں آخر میں بولا۔ ”میری بات پر ہاموس گواہ ہے۔“

”اب کسی گواہی کی ضرورت نہیں رہی اے علیالیش! اس کا انجام ایک روز یہی ہوتا تھا۔ وہ..... وہ ایک بے وفا کو چاہتی تھی۔ اسے میں نے کئی بار سمجھایا بھی تھا کہ اے طرہ! تو بچھتاے گی۔ تُو

ہی بتا اے علیالیش کہ مجھ سے زیادہ تجھے اور کون جانتا ہے۔“

یاسف کو جو بات میں نے نہیں بتائی تھی، وہ پہلے سے جانتا تھا۔

”اور سن کہ تُو نے اس آدم زاد کو طرہ کا انتقام لینے کی خاطر نہیں، غلام بننے سے بچنے کے لئے قتل کیا ہے۔ تجھے طرہ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔“

اپنی بیوی کی موت سے بھی اس نے سبق حاصل نہیں کیا تھا بلکہ مجھے قابو میں کر کے انتقام لینے کی فکر میں تھا۔

اگر ستار واقعی مولوی کفایت اللہ کی طرح کوئی خطرناک، قسم کا آدم زاد ہوتا تو میں اس کے جسم میں داخل نہ ہو پاتا۔

میں، ستار کا تین منزلہ مکان رات ہی کو دیکھ چکا تھا چھت خاصی بلندی پر تھی چارپائی سے اٹھ کر میں اندر گھر میں جانے لگا تو ستار کے باپ نے مجھے آواز دی۔ ”ستار بیٹے! گھر میں باپردہ خواتین بھی ہیں، ابھی اندر نہ جاؤ۔“

اس وقت تک میں گھر کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ میں ایسا بن گیا جیسے کچھ شای نہ ہو۔ صدر دروازے کے قریب ہی اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا گیا، پہلی منزل، دوسری منزل اور پھر تیسری منزل، پھر چھت پر پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔

مکان کی عقبی سمت بھی ایک پتلی لگی تھی۔ میں چھوٹی سی دیوار پر چڑھ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے سر کے بل چھت سے نیچے گرنے لگا۔ تیزی سے نیچے گرتے ہوئے اچانک میں، ستار کے جسم سے باہر آ گیا۔ اسی کے چند لمحوں بعد میں نے ستار کی بھیانک چیخ سنی۔ جب پختہ زمین سے اس کا سر پوری قوت سے ٹکرایا تو زبردست آواز آئی۔ اس کا کاسہ سر ٹوٹ کر بکھر گیا اور مغز باہر نکل پڑا۔ یہ اس ضدی آدم زاد کا انجام تھا جو مجھے یعنی ایک جن زاد کو حصول دولت کی خاطر اپنا مطیع بنانا چاہتا تھا۔

ذرا سی دیر میں وہاں بھیڑ لگ گئی اور کھرا مچ گیا۔ ہر زبان پر یہی تھا کہ ستار نے خودکشی کر لی۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ وہ خودکشی نہیں، قتل تھا۔ ایک قاتل سے بہتر اس بات کو اور کون جان سکتا ہے۔

☆=====☆=====☆

میں نے ایک قرض چکا دیا تو دوسری فکر ہوئی۔ زرگس تک پہنچنے کی راہ میں یاسف میرے راستے کی دیوار بن گیا تھا مجھے خبر نہیں تھی کہ اسے اپنی بن طرہ کی موت کا علم ہوا ہے یا نہیں۔ قیاس یہی تھا کہ اسے کچھ پتہ نہیں ہو گا۔

یاسف میری معلومات کے مطابق ابھی تک اقبال ہی کے جسم میں تھا۔ مجھے یہ اندازہ بھی تھا کہ یاسف ابھی زرگس کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ابھی دو ہی راتیں تو گزری تھیں۔ پہلی رات کو میرے چیخ اٹھنے کی وجہ سے اس کا کھیل بگڑ گیا تھا گزشتہ رات چھت پر ستار میری تسخیر کے لئے عمل کرنے بیٹھ گیا تھا۔ ایسی صورت میں بھلا یاسف کو کیسے کامیابی ہو جاتی۔ سو اسی وجہ سے مجھے کسی قدر اطمینان تھا لیکن اب ستار زندہ نہیں رہا تھا، یاسف، زرگس کو چھت پر بلا سکتا تھا۔

اقبال کو دن کے وقت دفتر میں ملنا چاہئے، میں نے سوچا اور ایل ڈی اے کے دفتر پہنچ گیا۔

یاسف مجھے اقبال کے جسم ہی میں ملا۔ اس نے اپنے قریب میری موجودگی کو محسوس کر لیا تو میں نے سرگوشی کی۔ ”اے یاسف! یہاں سے اٹھ کر باہر چل۔ تجھ سے مجھے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں ہرگز تیرے پاس آنا گوارا نہ کرتا۔“

”ایسا نہیں اے یاسف!“ میں نے مصلحت کے تحت جھوٹ بولا۔ ”مجھے تو پہلی بار تجھ سے حقیقت کا علم ہو رہا ہے۔ تو اس وقت صدمے کے زیر اثر ایسی باتیں کر رہا ہے۔“

”جھوٹا ہے تو۔“ اس نے برملا کہا۔ ”جان کر انجان بن رہا ہے اور تجھے یہ بھی بتا دوں کہ تو مجھے یہ اندوہناک خبر دینے کیوں آیا ہے۔ سن سکے گا۔“ تجھے یہ جسم چاہئے جس پر میرا قبضہ ہے تاکہ تو زنگس تک پہنچ سکے۔ یہ نہ ہوتا تو ہرگز تو میرے پاس نہ آتا۔“

یاسف جو کچھ کہہ رہا تھا قطعی سچ تھا، مگر میں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔

”نہ مان اے علیالیش کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے تو اب اس جسم کو چھوڑ کر جانا ہی ہے کہ میرا باپ ملیقا اکیلا ہی رو رہا ہو گا۔ تو نے خوب دوستی نبھائی اے علیالیش!..... خوب دوستی نبھائی۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی اقبال کے جسم کو جھٹکا لگا اور یاسف چلا گیا۔

میں نے اقبال کے جسم کو گرنے نہیں دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب اس وقت تک یاسف، اقبال کے جسم پر قبضہ نہ کر پاتا جب تک میں ہی اسے یہ موقع نہ دیتا۔ اقبال کا جسم اس لئے اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ زنگس تک اسی کے ذریعے پہنچنا ممکن تھا۔

دفتر میں گھسنے کے بعد خود ہی میں ’رینا کی میز پر چلا گیا۔ حسین آدم زادوں کو خفا کرنا میرا شیوہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے میں نے منالیا۔

اس روز میں دفتر سے گھر پہنچا تو خلاف توقع نشست گاہ میں مولوی کفایت اللہ کو موجود پایا۔ میرا ماتھا ٹھکا اور ذہن میں خطرے کی گردان ہونے لگی۔ میں اسے سلام کرتا ہوا اندر کمرے میں جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔ ”اقبال بیٹے! ذرا میری بات سننا۔“

”مجبوراً مجھے رکنا پڑا۔ مولوی کے پاس اقبال کا باپ افضل بیٹھا تھا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ اللہ خیر کرے، اس خطرناک آدم زاد کے قدم یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔“

نشست گاہ میں داخل ہو کر میں نظرسں جھکائے مولوی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بولا۔ ”جی فرمائیے۔“

”بیٹے! یہاں ادھر مونڈھے پر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ مولوی نے نرم آواز میں کہا۔ ”میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے دم کئے ہوئے پانی کا تم پر کتنا اثر ہو رہا ہے۔“

خطرے کی گھنٹی بہت زور سے بجی۔ مجھے کچھ اور نہ سوچنا تو پیٹ میں سخت مروڑ کا بہانہ کر کے کچھ دیر کو جان بچالی۔

”ٹھیک ہے بیٹے! میں بیٹھا ہوں، تم آ جاؤ۔“ مولوی نے وقتی طور پر مجھے بیت الخلاء جانے کی اجازت دے دی۔ وہ نہ نلنے والی موت کی طرح وہیں موجود رہا۔

کروں تو کیا کروں؟ میں سخت مشکل میں پھنس گیا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اقبال کے جسم سے نکل بھاگتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولوی میری آنکھیں دیکھ کر حقیقت تک پہنچ جائے گا اور پھر میرا پچنا ممکن نہیں میں بیت الخلاء جانے کی بجائے سیدھا اندر والے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کوئی اس

وقت نہیں تھا۔

وہاں بچے ہوئے پنگ پر لیٹے ہی میں اقبال کے جسم سے باہر آ گیا۔ عین اسی لمحے مجھے یاسف کے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔

میں اگر چاہتا تو یاسف کو خطرے سے آگاہ کر دیتا لیکن دانستہ ایسا نہیں کیا۔ میں دور سے یہ تماشا دیکھنا چاہتا تھا کہ مولوی کفایت اللہ اس کا کیا حشر کرتا ہے۔ یاسف یقیناً اسی وقت آیا تھا اس نے میرے اور مولوی کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ دھوکا کھا گیا۔ اقبال کا خالی جسم دیکھتے ہی اس نے اپنا قبضہ ہمالیا۔ میں اس سے دور ہو گیا اسی کے ساتھ نڈھال اقبال اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم جنت کی آدروفت سے نڈھال ہو رہا تھا آج اس کے جسم کو کئی بار جھکوں کی وجہ سے اذیت برداشت کرنا پڑی تھی۔ ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر اقبال کی پکار پڑی۔ اس مرتبہ اسے پکارنے والا افضل تھا۔

”آیا یا!“ یاسف نے اقبال کی آواز میں جواب دیا۔

پھنسا بیٹا! میں نے سوچا اور اسے تیز قدمی سے نشست گاہ کی طرف جاتے دیکھا جہاں ایک خطرناک آدم زاد اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے نشست گاہ کے دروازے ہی پر ٹھک کر رکے دیکھا۔ یاسف کو بھی علم تھا کہ مولوی کتنا خطرناک آدمی ہے۔ مولوی دروازے کے قریب ہی مونڈھے پر بیٹھا تھا۔

”اب میں تجھے نہیں بھاگنے دوں گا۔“ مولوی کی تیز آواز بلند ہوئی۔ غالباً مولوی نے اس کی آنکھیں دیکھ لیں تھیں۔

اقبال چیخا ہوا گھر کے اندر بھاگا۔ مولوی اس کے تعاقب میں تھا۔ اس نے جلد ہی اقبال کو دبوچ لیا اور گھینٹا ہوا نشست گاہ میں لے گیا۔ مولوی کی پھرتی قابل دید تھی۔ اس بڑھاپے میں بھی مولوی کا جسم چست تھا۔

”میں نے تجھے اس جسم کے اندر قید کر دیا ہے، تو فرار نہیں ہو سکتا۔“ میں نے دور سے مولوی کی آواز سنی اور دیکھا کہ وہ اقبال کے سر کھکے بال پکڑے ہوئے ہے۔ مولوی نے لازماً بہت تیزی کے ساتھ کوئی ایسا عمل کیا تھا کہ یاسف، اقبال کے جسم سے نکل نہ سکے۔ اگر مجھے بروقت خطرے کا احساس نہ ہو جاتا اور میں اس کا تدارک نہ کر لیتا تو یاسف کی جگہ میری یہ درگت بن رہی ہوتی۔ عامل حضرات عام طور پر آدم زادوں یا آدم زادوں کے جسم سے جنت کو نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یہاں الٹا ہی چکر چل رہا تھا۔ خبیث اور زبردست مولوی نے زیر دست یاسف کی راہ فرار منہ دود کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اقبال کے جسم کو ذریعہ بنا کر یاسف کو سزا دے رہا تھا۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی جن کسی قالب کو اختیار کر لیتا ہے خواہ وہ قالب حیوان کا ہو یا انسان کا، تو جسم کی تکلیف روح کو ہی محسوس ہوتی ہے۔ حیوان یا انسان کی روح اس کے جسم میں ہونے کے باوجود مغلوب ہو جاتی ہے۔ سو یوں اذیت جنت ہی کو ہوتی ہے۔

”ٹھیک، یعنی نشست گاہ کا اندرونی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جس سے اقبال کی ماں رحیمین بھی یہ منظر

کا نام بھی لگا دیا تھا۔

”اب سچ آیا نا تیری زبان پر لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔“ مولوی کے

ہوں۔

میں اتنی دور تھا کہ یاسف میرے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس نہ کر پاتا۔

”تو تم دونوں ہی نے یہ گھر دیکھ لیا ہے اور اقبال کو اپنا آلہ کار بنا کر

غصہ تھا۔ ”بولو کس لئے؟ تم دونوں کیوں ایسا کر رہے ہو؟“

جانے کیا کرتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

ہیں، ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ آدم زادوں کی اس بستی میں آ گئے۔" ماسف کہنے لگا۔

”تاکہ تم آدم زادوں کے قریب بھی رہ سکو۔“ مولوی کی آواز جیسے زہر میں بجھی ہوئی تھی۔
 ”تمہیں اگر تمہارے قبیلے سے نکال بھی دیا گاتا تو تم کسی ویرانے کا رخ کر سکتے تھے۔ بولو، کسا تمہارے لئے

ایسا ممکن نہیں تھا؟“

”مولانا! آپ ٹھیک کتے ہیں۔ ہمیں یہی کرنا چاہئے تھا۔“ اقبال کے جسم میں موجود ریاضت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”آب کو اللہ کا واسطہ مولانا! میرا قصور معاف کر دو۔“ اس نے آگے بڑھ کر مولوی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

لئے اور رونے لگا مولوی بکے غصے کو وہ آنسوؤں ہی سے ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے مولوی کے قدموں

”ایسا نہ کر۔“ مولوی نے جھک کر اس سے اپنے پیر چھڑا لئے۔ ”سر صرف اللہ کے آگے جھکتے ہیں۔“ مولوی پیچھے ہٹ گیا۔

”مولانا! اگر آپ نے مجھے حقیقتاً کر دیا تو یقین رکھیں پھر کبھی اقبال پر نہیں آؤں گا۔“ یاسف

”معافی مجھ سے نہیں اللہ سے مانگ اے بدکار!“ مولوی بولا۔ ”تو کیا“ آج کے بعد کوئی بھی جن اس

کسی گھر کو کیل دیئے کا مطلب مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا۔ مولوی کی بات سے میں صرف

مولاوی کی بات سن کر یاسف ایک بار پھر اپنی رہائی کی التجا کرنے لگا۔

”میں بھی ایک شرط پر چھوڑوں گا جیسے اس ذیل علیا لیش کے بارے میں سب کچھ بتا دے جو تیرے علم میں ہے۔ اس ظالم و بدکار نے پہلے میرے ایک عزیز کی بیوی کو سانپ بن کر ڈس لیا، پھر اس

عزیز کو بھی مل کر دیا، وہ کمینہ ناقابل معافی اور واجب القتل ہے۔“ مولوی کی آواز سے دکھ اور غم سے کا
انگھار ہونے لگا۔ ”ایک ہی گھر سے آج کیے بعد دیگرے دو جنازے اٹھے۔ اگر وہ حرامزادہ مجھے مل جائے تو

"آپ درست فرماتے ہیں مولانا! علیالیش واقعی بڑا ہی بے رحم ہے۔ اس کی وجہ سے کل میری طبیعت کا حال چل گیا۔" منافق ہولاء پھر شاید اس نے مولوی کو اعتراض لینے کا غرض سے طوط

”میں تو ابھی اپنی بہن کا غم نہیں بھولا مولانا! اسے علیالیش ہی نے بھلا کر ستار کا سر اغ لگانے کو بھیجا تھا۔“

”حیف صد حیف۔“ مولوی اظہار افسوس کرنے لگا۔ ”کاش ستار میری بات مان لیتا اور تسخیر جن کا

ارے! یاسف! تیری بے گناہ بہن طرہ کے مارے جانے کا بھی مجھے ملال ہوا! اسے بھی اللہ جوار رحمت

میرے اندازے کے مطابق یاسف کا تیر صحیح نشانے پر بیٹھ گیا تھا۔ مولوی کفایت اللہ کا دل نرم پڑ

پھر مولوی نے یاسف سے متعدد سوالات کئے جن کا تعلق مجھ سے تھا لیکن یاسف نے کوئی جواب

ت: میں دیا۔ اس روپیہ بار مجھے سیاف کی دوسری پر اعتبار آ گیا۔ اپنی بسن طرہ کی ہلاکت کا ذکر پچھڑ
 ۱۰ مولوی کی نظر میں مظلوم بن گیا تھا اور اب اس مظلومیت سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

”مسل چاہے کسی بن کا ہو یا انسان کا، دونوں کی سزا برابر ہے۔“ مولوی کچھ دیر بعد بولا۔ ”تیری خاطر طبع مرحوم ستار کے ہاتھوں ماری گئی۔ سو اگر تو ایسا تیرا باپ ملیقا، ستار سے قتل کا بدلہ لیتا تو جائز تھا

انٹیلیجنس کو یہ حق نہ تھا۔ سو وہ مجرم ہے۔ پھر اس نے ستار کی بیوی کو تو ناحق مارا اس غریب کا بھلا کیا کرتا تھا۔ ان معصوم بچوں کو کس جرم کی سزا ملی جو یتیم ہو گئے۔ بول یاسف! کیا تیرا دوست ظالم، سفاک،

”یقیناً ہے مولانا! یاسف نے فوراً کہا۔ ”اب آپ اس قاتل و بدکار کو میرا دوست نہ کہیں۔“

”لگتا ہے کہ مجھے بھی علیا لیش ہی کی محبت نے خراب کیا تھا ورنہ تیرے باپ ملیقائے تو مجھے یہ بت نہ دی ہوگی۔“

”ہاں مولانا! میرے باپ نے ہمیشہ مجھے یہ نصیحت کی کہ خلق خدا کو نہ ستاؤں، خواہ وہ جنت ہوں یا نسلان۔ میرے باپ نے تو مجھے یہ تاکد بھی کہ تم کہ آدم زادوں کے آدابوں کا رخ کر کے اور لے کر۔“

”اے ہاسف! مجھ سے عذر کہ کہ اب صحت میں نہیں رہا۔ کچھ دنوں کے تیر کے

ان انسانوں کی بستیوں میں آئے گا۔“

یہ سب باتیں سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔

نکلی مٹی۔ بد بخت کی آنکھوں میں یقیناً ستارے ناچ گئے ہوں گے۔ وہ لڑکھڑایا ضرور مگر گرا نہیں۔
اقبال کا باپ افضل کمرے سے بھاگتا ہوا نکلا اور مولوی کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”کیا ہوا مولوی صاحب؟“

مولوی نے اپنے سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرا۔ گھاس قریب ہی پڑا تھا۔
”ارے..... آپ کے سر سے تو خون نکل رہا ہے۔“ افضل نے مولوی کے ہاتھ پر لگا ہوا خون دیکھ کر گھبراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ وہ حرامزادہ علیا لیش ابھی یہیں ہے۔“ مولوی بولا اسی کے ساتھ اس کے ہونٹ رکت کرنے لگے۔

بیٹا علیا لیش، بھاگ لے یہاں سے اس دقت ورنہ پھر یہ خبیث مولوی تجھے قید کر لے گا۔ یہ سوچتے ہی میں وہاں سے روفو چکر ہو گیا۔ کتنے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے، سو میں نے بھاگ کر مولوی بی کی دہلی میں پناہ لی۔ اس طرح مجھے اپنی محبوبہ زرگس کے دیدار کا موقع بھی مل گیا۔ وہ اپنی حویلی کے صحن میں فنی بکری میں اس سے دور ہی رہا۔ آداب عشق تو بہر حال ملحوظ رکھنا ہی پڑتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ یہ سوچ کر میں خود کو قتل دے رہا تھا ورنہ حقیقت کچھ اور تھی میں اگر اس سراپا ناز کے قریب جاتا تو وہ چوکنہا ہو جاتی۔ پھر اس حویلی میں بھی میرا ٹھہرنا محال ہو جاتا۔ کبکنت نے زرگس کو نہ جانے کیا کیا سکھا پڑھا رکھا تھا کہ اسے اپنے قریب کسی جن کی موجودگی کا پتا چل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ جن کو اپنے پاس سے ہٹا بھی جانتی تھی۔ وہ جھکی ہوئی صحن کی جھاڑو نکال رہی تھی۔

زرگس کا یوں بھگنا، بار بار دوپٹے کا ڈھلک جانا اور پھر دوپٹہ درست کرتے ہوئے اس کے حسین جسم کا مخصوص انداز میں حرکت کرنا، گویا مجھ پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ زرگس نہ ہو، شاخ لہو ہو۔

میں اسے یونہی دیکھے گیا اور جانے کب وہ جھاڑو دیتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ مجھے تو اس وقت شرم آیا جب دم گھٹنا محسوس کیا۔ وہ لب لعلیں حرکت میں تھی۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے حواس میں آنا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی کی حویلی سے بھی مجھے بھاگنا پڑا۔

وہ بڑی ٹیڈھی کھیر تھی اسے سیدھا کرنا آسان نہیں تھا۔ میں جو خود کو آدم زاد یوں پر پڑ ڈالنے میں لگتا تھا، زرگس نے مجھ سے بھی کوڑی بلوا دی تھی۔

اقبال کے گھر میں زرگس کا باپ موجود تھا اور یہاں زرگس۔ میرے لئے اب تیسرا ٹھکانہ بھلا کی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اقبال کے گھر سے مولوی پھوٹ لے گا تو دوبارہ اقبال کے جسم پر قابض ہواں گا۔ بھلا کی کوئی نواخ شرم میں تھی۔ سارے ہی دولت مند آدم زاد ہم جنات کی طرح شرم سے اپنے کو ترجمہ دیتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ عیال۔ خدمت اکا ہم۔ ملے جلتے۔ ہم۔ جاتے۔

مولوی کفایت اللہ نے پھر کچھ پڑھنا شروع کر دیا اس کے موئے موئے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ پڑھنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر اقبال پر دم کیا۔

”جایا سف! میں نے تجھے اللہ کے نام پر آزاد کیا۔“
مولوی کے الفاظ ختم ہوتے ہی اقبال کے جسم نے جھٹکا کھایا اور ایک طرف لڑھک گیا۔
”اسے کیا ہوا مولوی صاحب!“ اقبال کے باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

”اس کے جسم سے ابھی ایک جن باہر نکلا ہے۔ اسی کے اثر سے آزاد ہو کر اس پر غفلت طاری ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ اسے ابھی ہوش آجائے گا۔ اسے یہاں سے اٹھوا کر اندر لے چلو۔“ مولوی نے جواب دیا اور آگے بڑھا۔

پھر افضل اور مولوی نے اقبال کے بے ہوش اور کسی قدر زخمی جسم کو اٹھایا اور اندر کمرے میں لا پٹنگ پر لٹا دیا۔ میں اس دوران راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اتنی دیر وہاں مولوی کی موجودگی کے باوجود رہنے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں اب صحن سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا سبھی اس کمرے میں تھے۔

مولوی کے بیٹھنے کو اقبال کی بہن بیٹھک سے ایک مونڈھا اٹھا لائی۔ افضل پٹنگ کی پابندی پر بیٹھ رہا۔
رحیم سر ہانے کھڑی تھی۔

اقبال کے چہرے اور جسم پر مولوی کی مار پیٹ کے نشانات میں نے دیکھتے تھے۔ ان پر کوئی مرم جانے لگا۔ اقبال کو ذرا دیر کے بعد ہوش آگیا اور وہ جسمانی تکلیف سے کراہنے لگا۔ وہ نقاہت آمیز آواز میں حیرت سے بولا۔ ”مجھے کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں بیٹے!“ مولوی نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر پانی منگوا کر دم کیا پلایا۔

”میرا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔“ اقبال کی آواز مجھے سنائی دی۔

”انشاء اللہ تم جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ مولوی نے اسے دلاسا دیا، پھر اپنی جیب سے نکال کر اس میں وقت دیکھنے کے بعد افضل سے کہنے لگا۔ ”مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہیں تو ہے کہ میں مغرب کی نماز بادشاہی مسجد ہی میں پڑھتا ہوں بعد مغرب حاجت مندوں سے فارغ ہو کر

پھر آؤں گا کہ تمہارے گھر کو کیل دوں۔ یاسف جن تو خیر شریف باپ کا بیٹا تھا مگر اس کا دوست علیا جن بہت خطرناک اور بد معاش ہے اس کا مستقل بندوبست ضروری ہے کہ وہ یہاں داخل نہ ہو سکے۔

جب تک نہ آ جاؤں تم اقبال کو کہیں نہ جانے دینا۔“ مولوی یہ کہتے ہی مونڈھے سے اٹھ گیا۔

مجھے مولوی پر اس سے ڈرنے کے باوجود شدید غصہ آ رہا تھا۔ قریب ہی گھڑوچی پر مجھے گھاس رکھا نظر آگیا۔ مولوی کمرے سے نکلا تو میں پیچھے ہٹ گیا وہ جب صحن عبور کر کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی پشت میری طرف ہو گئی۔ میں نے بھاری گھاس اٹھا کر

بات میں دلچسپی لی اور اظہار دوستی کرنے لگا۔ ”اب آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ تو مجھے اپنے کسی راز میں شریک نہیں کر رہا؟“

”پہلے تو نے ہی کی تھی اے علیا لیش!“ وہ بولا۔ ”ورنہ تو کبھی میں نے تجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔“

”پچھلی باتوں پر خاک ڈال دے کہ اب مجھے تیری دوستی پر یقین آ گیا ہے۔“

یاسف بہر حال مجھ سے زیادہ چالاک نہیں تھا اسی لئے باتوں میں آگیا اور بتانے لگا۔ ”اس کا نام زینت ہے، تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ زینت کے والدین سے ایک حماقت ہو گئی جس کا نتیجہ زینت کو بھگتنا پڑا۔ ہوا یہ کہ لڑکے والے زینت کو دیکھنے آئے تھے اور پسند کر لی اس کی چھوٹی بہن نگہت۔ والدین نے سوچا کہ چلو پہلے چھوٹی ہی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ انہوں نے نگہت کی شادی کر دی۔ بس یہی برا ہوا۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے، جب زینت صرف سولہ سال کی تھی اور نگہت.....“

”اب کیا عمر ہے زینت کی؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”تیس کے قریب ہو گی لیکن تو پہلے پوری بات تو سن لے۔“ یاسف نے کہا۔ ”دراصل دو مہینے پہلے ہی زینت سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ تو اس وقت اقبال کے جسم میں تھا۔ خیر تو میں تجھے یہ بتا رہا تھا کہ چھوٹی بہن کی شادی پہلے ہو جانے کی وجہ سے یہ بات مشہور ہو گئی کہ زینت میں یقیناً کوئی عیب ہے اور اسی وجہ سے والدین نے اس کی شادی نہیں کی۔ سو یوں حسین و خوبصورت ہونے کے باوجود شادی کی عمر نکل گئی۔ زینت کی تباہی میں اس کے بڑے بھائی افتخار کا بھی ہاتھ ہے۔ خود اس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ اس کا سبب خود افتخار ہے۔ وہ غنڈہ ہے، گھٹیا درجے کا غنڈہ۔ زینت کا ایک آدھ رشتہ آیا بھی تو افتخار کی پسینے خانی آڑے آگئی اور بدنامی بھی۔ مجھے یہ ساری باتیں خود زینت ہی نے بتائی ہیں۔“

”زینت نے۔“ میں حیرت سے بولا۔

”ہاں اس نے مجھے اور میں نے اسے قبول کر لیا ہے۔ اسے میں نے اپنے بارے میں بتا دیا ہے کہ جن زاد ہوں۔“

”پھر بھی وہ تجھ سے راضی ہے؟“

”ہاں اور کیا..... پہلی مرتبہ تو میں نے چپکے سے ایک رات کام دکھا دیا تھا۔ وہ نیند میں تھی۔ دوسری بار جاگ رہی تھی تو ڈر گئی۔ دو چار مزید ملاقاتوں میں اس کا خوف کچھ کم ہوا تو پوچھنے لگی، میں کون ہوں؟ بتانے پر وہ خوفزدہ ہوئی تو میں نے اسے سمجھایا۔ پھر جب پورے ایک مہینے وہ میرے تصرف میں رہی تو اس نے حالات سے صلح کر لی۔ اب وہ بھی خوش ہے اور میں بھی۔ نرگس کے معاملے میں پھنس کر میں کئی دن ہو گئے، اس سے نہیں ملا۔ سو آج ادھر آ نکلا۔“ یاسف نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔

یاسف کی زبانی زینت کے خن کا ذکر سن کر میں لپٹا گیا۔ میرے لئے یہ بات بھی باعث کشش تھی کہ زینت اب تک صرف یاسف کے تصرف میں آئی تھی اور اس واقعے کو بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ چونکہ کہ بلا، زینت سے عمر میں کم تھی مگر وہ گویا ملائے عام تھی۔ وہ صرف کسی ایک اہل دل کے لئے مخصوص نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ یاسف کو اگر میں ادھر لگا دوں اور خود زینت کو اپنی آغوش کی زینت

تھا۔ وہ مجھے تنگی کا ناچ نچا رہی تھی اور پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دے رہی تھی۔ اس کے قریب صرف ایک ہی آدم زاد پہنچ سکا تھا جسے وہ چاہتی تھی اسی وجہ سے اس آدم زادے کا بھاؤ بڑھ گیا تھا۔ خدا جانے زادیوں کی یہ کون سی قسم تھی کہ ایک کے سوا کسی دوسرے کو قریب آنے دیتا ان کے نزدیک کفر و کثرت ایسی ہی آدم زادوں کی تھی یہ الگ بات کہ ہم جیسے جنات کسی آدمی کے جسم میں گھس کر باہر دھوکہ دے جائیں یا پھر کہیں تنہا پا کر ڈرانے دھمکانے کے بعد راہ و رسم پیدا کر لیں۔ کبھی کبھی تو سب بڑی خاموشی سے ہو جاتا۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی اور کام بن جاتا۔ ایسا عموماً بڑوں کی آدم زادوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خوف کے سبب ان کی قوت گویائی سلب ہو جاتی اور جب خوف ہوتا تو وہ جیسے کسی اور ہی جہان میں ہوتیں۔ شاید وہ اسے کوئی حسین خواب سمجھنے لگتی ہوں گی۔

ابھی میں شرکی حدود ہی میں تھا کہ خلاف توقع یاسف پر میری نظر پڑ گئی۔ یہاں میں یہ وضاحت دوں کہ ہم جنات بھی آدم زادوں کی طرح جسمانی اعضاء کے مالک ہوتے ہیں، فرق صرف مادے کا ہے۔ آدم زادوں کے اور ہمارے مادے مختلف ہیں۔ آدم زادوں کا خمیر مٹی سے اٹھا ہے اور ہمیں تیز ہوا رگڑے جو آگ پیدا ہوتی ہے، اس سے بنایا گیا ہے۔ ہمیں بھی تکلیف و اذیت محسوس ہوتی ہے ہمارے ناپیدہ وجود یا جسم پر بھی چوٹ لگتی ہے۔ ہمیں بھی آگ سے پیدا ہونے کے باوجود جلایا جا سکتا ہے اس کی مثال بڑی آسانی سے دی جاسکتی ہے۔ آدم زاد مٹی سے بنے ہیں مگر مٹی ہی کا کوئی تختہ انہیں زخمی کر سکتا ہے۔ سو کھلا ہے کہ ہر مٹی یکساں نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر آگ ایک جیسی نہیں۔ یاسف میرے قریب ہی تھامیں نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ”مولوی کفایت اللہ سے تم نے عہد کیا تھا، پورا نہیں کیا؟“

”اگر انہی مولویوں کی باتوں میں آگئے ہم تو جی لئے اے علیا لیش!“ وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا تو موجود تھا، کیا نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تجھے بہت مارا اس خبیث مولوی نے۔ میں تیرا ممنون ہوں دوست کہ تو نے اسے میرے بارے میں صحیح باتیں نہیں بتائیں واقعی تجھ جیسے دوست پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ تو ناحق نرگس کی خاطر مجھ سے لڑ بیٹھا۔ ویسے نرگس کے باپ کو میں نے بھی آج مزہ چکھنا ہی دیا۔ چھاڑ دیا بد بخت کا۔“

”وہ کیسے اے علیا لیش! مولوی تو بہت عیار ہے، وہ تیرے داؤ میں کیسے آگیا؟“ یاسف نے جرات کر معلوم کیا۔

میں نے مولوی کو زخمی کرنے کا واقعہ بیان کر دیا اس پر یاسف بہت خوش ہوا۔ پھر میں نے اس دریافت کیا۔ ”تو ادھر کہاں گھوم رہا ہے؟“

”تجھے بتا دیا تو پھر تو بھی اس آدم زادی کے پیچھے پنچے جھاڑ کر پڑ جائے گا، اس لئے رہنے دے۔“

”اے یاسف! پہلے بھی تو ہم ایک تھے نا۔“ میں نے نئی آدم زادی کے ذکر کی وجہ سے اپنے

یٹالوں تو یہ سودا منگائیں رہے گا اس طرح میں اپنے دوست یاسف کا اعتماد ایک بار پھر حاصل کر لیتا۔
”چھوڑ اے یاسف! زینت کا قصہ۔ میں تجھے ایک ایسی آدم زادی کا دیدار کراتا ہوں جسے تو زنگر کا نعم البدل سمجھے گا اسے ایک نظر دیکھ کر اگر تو بھی اس کے حسن کا قصیدہ نہ پڑھنے لگے تو کتنا بول پڑے میرے ساتھ؟“

”وہ ہے کون؟ کچھ اس کے بارے میں بتا تو سہی۔“

”ارے اسی ظالم کی خاطر تو میں نے اقبال کے جسم کو چھوڑا تھا کہ تو نے اقبال پر اپنا قبضہ جمالیا۔“
یہ کہتے ہوئے مجھے ایک اور بات یاد آگئی جو میرے لئے ابھن کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ستار نے جب مجھے غلام بنانے کی خاطر وظیفہ شروع کیا اور میں دوسری شب مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں پہنچا تو یاسف مل گیا۔ یاسف نے اس وقت مجھ سے کہا تھا میں جانتا ہوں کہ تو گزشتہ رات سے کس عذاب میں گرفتار ہے، پہلے کسی آدم زاد کے قبضے میں جانے سے بچنے کی سبیل کر۔ اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ میں یاسف سے نہیں پوچھ سکا کہ اسے کس طرح یہ بات معلوم ہو گئی؟ وہ سوال اب میری زبان پر آ گیا۔

”میں تو تیری ٹوہ میں لگا ہی رہتا تھا۔“ یاسف نے جواب دیا۔ ”سو زنگس کی حویلی کے ارد گرد منڈلا رہا میرا معمول تھا۔ مولوی نے میری ہی موجودگی میں اس ملعون ستار کو وظیفہ بتایا تھا۔ کاش مجھے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ میری بہن طرہ کو قتل کر دے گا تو میں پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتا۔“
”مگر ایک دوست کی حیثیت سے تو مجھے تو اس سے آگاہ کر دیتا اے یاسف!“ میں نے گلہ کیا۔
”تجھے تو معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔“

”ضرور آگاہ کرتا، مگر اس وقت جب زنگس کو اپنے تصرف میں لے آتا۔ وظیفہ پورا ہونے میں تو ابھی بہت دن تھے۔“

”تجھے شاید ابھی یہ تجربہ نہیں کہ جب کوئی آدم زاد کسی جن زاد کو اپنا مطیع بنانے کے لئے عمل شروع کرتا ہے تو کتنی تکلیف و اذیت ہوتی ہے۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے اے علیا لیش! میں نے اس کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے کہ جنات عمل کے دوران بڑی اذیت سے گزرتے ہیں۔ مجھ سے تو یہ کہہ رہا تھا تو کہ کچھیلی باتوں پر خاک ڈال دوں اور خود گڑے غرے اکھیرنے لگا۔ اس کی بات کر کہ جس کا دیدار کرانے کو کہہ رہا تھا۔ کیا وہ بھی زنگس کی طرح تیرے ہاتھ نہیں آئی؟“

”ہاتھ کیسے نہ آئی۔ ہر آدم زادی تو زنگس کی طرح نہیں۔“

”یہ سنا ہی تو نے خوشخبری۔“ یاسف کہنے لگا۔ ”اب تو اس کے دیدار کا شوق اور بڑھ گیا۔“

”تو پھر تجھے میرا شوق بھی پورا کرنا پڑے گا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”زینت کا دیدار“

”بھی کروں گا۔“

”سیدھی سیدھی بات کر اے علیا لیش! دوستی میں زیادہ چالاک نہیں دکھاتے۔“ یاسف بولا۔

مجھے اس آدم زادی کو دکھا دے جسے زنگس کا نعم البدل بتا رہا ہے۔ میں تجھے زینت کا دیدار کرا دوں گا۔

اگر بات بن گئی تو ہم دونوں دوست پہلے ہی کی طرح پھر ایک ہو جائیں گے، یعنی زینت بھی تیری اور وہ آدم زادی بھی میری۔“

یاسف نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ بملا کو دیکھ کر یاسف بے اختیار ہو جائے گا۔

”تو پھر چل اے یاسف! پہل میری طرف سے سہی۔“ میں نے کہہ دیا۔ ”مجھے تیری شرط منظور ہے۔“

پھر وہی ہوا جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ بملا اداس اداس سی تھی۔ مجھے اس کا سبب معلوم تھا اس نے مجھ سے بہت ڈانٹ کھائی تھی، اس پر کہ وہ مجھے اپنا شوہر تسلیم کیوں نہیں کرتی۔

”پسند آئی..... واقعی بہت پسند آئی“ یہ آدم زادی۔“ یاسف بے خود سا ہو کر بولا۔ ”تو نے ٹھیک ہی کہا تھا اے میرے دوست علیا۔“

یاسف اب میرے ساتھ عمارت سے نکل کر کوٹھی کے لان میں آ گیا تھا۔

”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، وہ اتنی اداس کیوں تھی؟“ یاسف نے سوال کیا۔

جواب میں اسے میں نے تفصیل کے ساتھ وجہ بتا دی، پھر کہا۔ ”تجھے بھی خود کو بملا کے سامنے سونہی ہی ظاہر کرتا ہے۔ یوں بھی ہم دونوں کی آوازیں غیر انسانی ہیں اور ان میں زیادہ فرق نہیں۔ بملا مجھ سے پہلے ہی ڈری ہوئی ہے، تیرے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گی۔ اب اپنے وعدے کے مطابق تو بھی ساتھ چل کر زینت کو دکھا دے۔“

یاسف فوراً راضی ہو گیا۔ وہ مجھے غریبوں کی ایک آبادی میں لے آیا۔ زینت کا گھر بھی زیادہ بڑا نہیں تھا، صرف دو کمرے اور ایک بیٹھک تھی۔ اس کے والدین ایک کمرے میں سوتے تھے اور زینت الگ دوسرے کمرے میں جہاں اس کے بھائی افتخار کی چارپائی بھی بچھی تھی لیکن اکثر یہ چارپائی خالی ہی پڑی رہتی تھی۔ افتخار بیٹھے میں ایک آدھ دن ہی رات کو گھر پر سوتا تھا۔ اس کی راتیں عموماً لاہور کے بازار حسن بہرا منڈی میں گزرتی تھیں۔ وہ زینت سے دس برس بڑا تھا۔ زینت سے بڑی دو بہنیں اور تھیں جو بچپن ہی میں مر چکی تھیں۔ یہ تمام باتیں یاسف نے مجھے راستے ہی میں بتا دی تھیں۔ ظاہر ہے ان باتوں کا علم اسے زینت ہی سے ہوا تھا۔

عمر زیادہ ہونے کے باوجود زینت جیسے بھری بھار تھی۔ قد لمبا، چہرہ کتابی، ٹھوڑی میں نمایاں گڑھا، جسم نہ زیادہ بلکا نہ بہت بھاری، رنگت اجلی سی تھی۔ ایک رخسار پر چھوٹا سا سیاہ مساکہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ زینت بہر حال مجھے اچھی لگی اور اس گھر سے نکلتے ہی میں نے یاسف کو یہ بات بتا بھی دی۔ معاملہ طے ہو گیا۔ وہ رات مجھے زینت کے ساتھ اور یاسف کو بملا کے قرب میں بسر کرنا تھی، ہم دونوں ہی خوشی اس پر راضی ہو گئے تھے۔ آدم زادیوں کو خبر بھی نہیں تھی کہ دو جن زاد ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکے ہیں۔

ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی اس لئے میں نے یاسف سے کہا۔ ”کیا خیال ہے، ایک چکر بھائی

دروازے کا لگا لیس؟

”سوچ لے، مولوی کفایت اللہ مجھ سے پہلے ہی بہت ناراض ہے۔ تو اسے زخمی بھی کر چکا ہے۔ کہیں ہم کسی چکر میں نہ پھنس جائیں۔“ یاسف نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”اے یاسف! کیا تو بھول گیا کہ اس کینے نے کیا دعویٰ کیا تھا؟“

”کس سلسلے میں؟“

”اس نے تجھی سے تو کہا تھا، تو کیا آج کے بعد کوئی بھی جن اس گھر میں نہیں آسکے گا۔ میں اسے

کیل دوں گا۔ یہ کیلنا کیا ہوتا ہے؟ اے یاسف!“

”مجھے نہیں معلوم..... کسی عمل ہی کو کہتے ہوں گے۔“

”میں وہاں چل کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ مولوی کا دعویٰ کس حد تک صحیح تھا، وہ تجھے رعب میں لینے کو بھی تو بڑباک سکتا ہے۔“

”تیرے کہنے پر میں ساتھ تو چلتا ہوں لیکن اقبال کے گھر میں نہیں جاؤں گا۔“

میں ہنسا۔ ”تو اس بد ذات مولوی سے ڈر گیا ہے، بس اور کوئی بات نہیں۔“

”اگر وہ پڑھ پڑھ کر تیرے کنکریاں مارتا تو تجھے پتا چلتا۔ جب بھی کنکری پڑتی ایسا لگتا کہ جیسے بیک

وقت سارے جسم میں ہزاروں سویاں اتر گئی ہوں۔ تو بہ تو بہ زندگی میں کبھی میں نے ایسی اذیت برداشت

نہیں کی۔ انتہائی خطرناک آدم زاد ہے وہ مولوی۔“

”مجھے یاد ہے، تو پہلے بھی ایک بار مولوی کی حویلی میں جانے سے ڈر گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔

تیرے ساتھ ہونے سے کم از کم اتنا سہارا تو ہو گا کہ اگر گھر کے باہر کسی خطرے کی بو محسوس ہو تو بروقت

مجھے آگاہ کر دے۔ مولوی کی حویلی، اقبال کے گھر سے ملی ہوئی ہے اس لئے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔“

جب ہم بھائی دروازے پہنچے تو عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ یاسف باہر ہی منڈلاتا رہا اور میں چونکا سا

اقبال کے گھر میں داخل ہو گیا۔ میں نے سارے ہی گھر کا چکر لگایا اور اقبال کے پاس بھی گیا مگر کچھ نہ ہوا۔

اقبال ابھی تک آرام کر رہا تھا اور اس کی ماں رحیمین اسی کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔

میں نے یہی سوچا کہ مولوی کفایت اللہ نے یاسف کو ڈرانے کے لئے جھوٹ بولا ہو گا۔ مقصد ظاہر

تھا کہ یاسف دوبارہ اس گھر میں نہ آئے۔ ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ یاسف نے گھر میں داخل ہونے کی ہمت

نہیں کی تھی، مگر میں علیالیش تھا۔ اگر آج رات مجھے زینت کے ساتھ نہ گزارنا ہوتی تو یہ موقع بہت

غیبت تھا، میں فوری طور پر اقبال کے جسم میں ٹھس جاتا۔

کچھ دیر اقبال کے گھر میں رہ کر میں باہر آ گیا۔ یاسف میرا منتظر تھا۔

”کیا ہوا اے علیالیش!“ اس نے پراضطراب آواز میں دریافت کیا۔

”ہونا کیا تھا؟“ میں طنزیہ آواز میں ہنسا۔ ”اس خبیث مولوی نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا، غلط دعویٰ

کیا تھا۔ تجھے اس نے آلو بنا دیا۔ میں سارے گھر میں گھوم پھر کے آیا ہوں۔“

”حیرت ہے، میں نے تو سنا تھا کہ مولوی جھوٹ نہیں بولتے۔“

”ان آدم زادوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ انہیں خود اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی عادت ہوتی ہے، پرلے درجے کے جھوٹے ہوتے ہیں یہ۔“

”پھر اب تیرے کیا ارادے ہیں اے علیالیش! کیا تو پھر اقبال کے جسم کو آلہ کار بنائے گا؟“

”کیوں نہیں، وہی تو ایک ٹپل ہے، پار اترنے کے لئے۔ تجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں اے دوست! دنیا بھری پڑی ہے، آدم زادوں سے۔ بس ذرا تلاش کی بات ہے۔ مجھے کوئی

شوق نہیں اپنے جسم میں سویاں چھوانے کا۔“ یاسف نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”زرگس تجھی کو

مبارک۔“

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ سامنے سے مولوی کفایت اللہ آتا دکھائی دیا۔ اس کے سر پر پٹی

بندھی تھی جس پر وہ پھندے والی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

”اس کی ٹوپی اتار کے بھاگ لیتے ہیں۔“ مجھے شرارت سوچی۔

یاسف نے منع بھی کیا مگر میں باز نہ آیا میں نے سہاٹا بھرا اور کسی چیل کی طرح جھپٹا مارتا ہوا فضا

میں بلند ہوتا گیا، مولوی نے منہ اٹھا کر اوپر دیکھا مگر میں چم زدن میں اس کی ٹوپی سمیت وہاں سے تھری

فور ہو گیا۔ یاسف مجھ سے پہلے ہی آگے آگے اڑا جا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بولا۔ ”اے

علیالیش! ان جا میرے دوست، مولوی سے چھیڑ چھاڑ نہ کر۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اسے تیرا نام معلوم

ہے۔ تنگ آکر وہ کہیں تجھے قابو میں کرنے کا عمل شروع.....“

”میں اب اس سے ڈرنے والا نہیں۔“ میں نے یاسف کی بات کاٹ دی۔ ”ان آدم زادوں نے

جتنا ڈرو یہ اتنے ہی شیر ہوتے جاتے ہیں۔ ابھی تو دیکھتا رہ، میں اسے کس طرح تپاتا ہوں۔“

مولوی کی ترکی ٹوپی میرے پاس تھی۔ میں نے ایک جگہ اتر کر اس میں غلاطت بھری اور یاسف کو

وچیں رکنے کے لئے کہہ کر دوبارہ بھائی دروازے کی طرف لپک لیا۔

میں نے اوپر سے دیکھا تو مولوی اپنی حویلی کے صحن سے گزرتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا

تھا۔ اس کے سر پر اب ٹپل کی دوپلو ٹوپی تھی۔ وہ شاید حویلی سے کہیں باہر جا رہا تھا۔ تاک کر میں نے

غلاطت بھری ترکی ٹوپی اس کے اوپر پھینکی۔ اس کے پاک صاف کپڑے غلاطت میں لٹھر گئے۔ یہ دیکھتے ہی

میں وہاں سے ہوا ہو گیا۔

ذرا ہی دیر بعد میں زور سے ہنس ہنس کر یاسف کو یہ واقعہ سنا رہا تھا۔ اپنے ہاتھ میں نے راوی کے

پانی میں پہلے ہی دھولے تھے۔

”اب تیری خیر نہیں اے علیالیش!“ یاسف بھی ہنستے ہوئے بولا۔ ”مولوی اس پر بھنوت ہو جائے

گا۔“

”وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی جن زاد سے پالا پڑا تھا۔ خیر اب لعنت پڑھ اس پر۔ تو بھلا کے پاس

چلا جا اور میں زینت کے ساتھ عیش کرتا ہوں۔“

سترہ سالہ نوجوان، دوسری اس سے ایک سال بڑی بیٹی اکبری۔ ملا اب دوسری شادی کی فکر میں تھا اسی غرض سے ابھی دو روز پہلے اس نے زینت کے لئے پیغام بھیجا تھا۔ زینت کے والدین نے نکاح سا جواب دے دیا تو ملا تپ گیا اور یوں گویا کھبا نونپے لگا۔ مجھے ان باتوں کا علم زینت کے گھر میں جا کر ہوا۔ اس کے والدین اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ زینت کا باپ وحید تو اس پر تھوڑا بہت راضی بھی تھا مگر ماں معصوم النساء ہرگز دس بچوں کے باپ کو اپنی بیٹی دینے پر آمادہ نہیں تھی۔

”اب تجھے چھین آگیا“ سارے محلے میں تھو تھو رہی ہے۔“ وحید اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔
”اپنا دام کھوٹا نہ ہو تو پرکھنے والے کا کیا دوش۔“ بڑھیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اگر افتخار ایسا نہ ہوتا تو.....“

”اسے جھونک جنم میں“ یہ سوچ کہ کل کلاں کو میری آنکھ بند ہو گئی تو کیا کرے گی تو؟ اچار کا سا گھڑا کب تک گھر میں لئے بیٹھی رہے گی؟“ اس کا اشارہ زینت کی طرف تھا۔ ”برسوں بعد تو ایک رشتہ آیا تھا، وہ بھی تو نے ٹھکرا دیا۔“

”سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے۔ اس وقت میری نہیں سنی کہ دیکھو پہلے بڑی کے ہاتھ پہلے ہو جانے دو پھر نکلت کو بیانا، مگر کبھی سنی ہے تم نے میری۔“

بڑھے اور بڑھیا کی نوک جھونک جانے کب تک چلتی، مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا، پتا چل گیا تھا۔ اسی وجہ سے ملا پر مجھے بہت غصہ آنے لگا۔ بھلا بتاؤ، وہ زینت پر دانت جمائے بیٹھا تھا۔ تاکا بھی تو اس نے کس کو۔ دوسرے کمرے سے زینت کی سسکیاں سنائی دیں تو میں اور بھی کھول اٹھا میں نے اندر داخل ہوتے ہی زینت کے حسین چہرے کو آنسوؤں میں بھیگا ہوا دیکھا۔ قریب پہنچ کر جب اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ چونک اٹھی۔ پھر لینے لینے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے شاید کمرے میں کسی غیر انسان کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنی ذلت پر اس کا آنسو بہانا بے جا نہیں تھا۔ قصور وار اس کے والدین تھے اور سزا وہ بھگت رہی تھی۔ کمرے میں لائین جل رہی تھی جس کی لوائی دھیمی نہیں کی گئی تھی۔

”تم آگئے؟“ زینت نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے یاسف سمجھ کر مخاطب کیا۔

”ہاں۔“ میں نے دانستہ دھیمی آواز میں جواب دیا۔

وہ اٹھی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی وہ دوبارہ چارپائی پر آ بیٹھی اور کہنے لگی۔ ”یہ نہیں ہو سکتا کہ..... کہ تم مجھے..... اپنے ساتھ کہیں لے جاؤ؟“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”ملا نے آج یہاں جو فساد برپا کیا ہے، مجھے اس کا پتا چل گیا ہے۔ تم فکر نہ کرو، آج کے بعد اس کی غلیظ زبان پر کبھی تمہارا نام نہیں آئے گا، میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی کہ کہیں اسے یہ شبہ تو نہیں ہو گیا، یاسف کی جگہ کوئی اور ہے۔

زینت یوں بھی کچھ دیر پہلے تک ایک اور ہی ذہنی فضا میں تھی، پھر یہ کہ یاسف ہی کی طرح میری آواز بھی غیر انسانی تھی۔ اسے اپنے عاشق کے بدل جانے کا احساس نہیں ہو سکا۔ اس کے چہرے اور

پھر یاسف اور میں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ میں، زینت کے گھر پہنچا تو گلی میں بھڑنگی تھی۔ گھر کے سامنے ایک شخص چاقو ہاتھ میں لئے ہوئے چچ رہا تھا۔ کئی افراد اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ”چھوڑ دو مجھے، میں اس کا بیٹ فائر دوں گا۔“ چاقو والا پھرا جا رہا تھا۔ وہ نشے میں لگتا تھا۔

”سنو تو افتخار بھائی! تم سے کسی نے غلط کہا ہے۔“ ایک آدمی چاقو والے کو سمجھانے لگا۔

”ہاں گنڈا ہوں میں..... مگر محلے میں کبھی کی میں نے گنڈا کر دی؟ فروہ ملا کون ہوتا ہے یہ کہنے والا کہ ہمیں محلے سے نکال دو۔ اس نے میری بھین کا نام کیسے لیا؟ میں سالے کی جہان کاٹ دوں گا..... نہیں کرتے ہم اپنی بھین کی سادی۔ وہ کون.....؟“

میں سارا قصہ سمجھ گیا۔ محلے ہی کے کسی ملا نے زینت کے بھائی افتخار کو غنڈہ کہہ دیا تھا اور زینت کو گھر میں بٹھالینے پر بھی معترض تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ملا محلے والوں کو اس پر اکسا رہا تھا کہ زینت کے گھر والوں کو محلے سے نکال دیا جائے۔ ملا کی دانستہ میں اس طرح محلے کا ماحول پاک صاف ہو جاتا۔ کہیں سے اڑتی ہوئی یہ خبر افتخار تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ تو تھا ہی چھٹا ہوا، چاقو نکال کر بھاگا ملا کے پیچھے۔ ملا نے قریبی مسجد میں داخل ہو کر اپنی جان بچائی تھی۔ لوگوں کی چہ بیگوئیوں سے مجھے تمام بات معلوم ہوئی۔

”نسا کر کے مسجد میں نہیں جاتے اس وجہ سے میں رک گیا۔ اب تم لوگ ملا کو مسجد سے نکالو باہر۔“ افتخار اصرار کئے جا رہا تھا۔ اس غنڈے کو نشے کی حالت میں بھی خوف خدا تھا ورنہ ملا کو وہ چیر پھاڑ ڈالتا جس نے نہ صرف اسے برا کہا تھا بلکہ اس کی بہن زینت کو بھی نہیں بخشا تھا۔

لوگوں نے بڑی مشکل سے افتخار کو سمجھا بھا کر وہاں سے چلے جانے پر آمادہ کیا۔ وہ جھومتا جھومتا گلی سے نکل گیا تو قریبی مسجد کے بند حجرے سے لوگوں نے ملا جی کو باہر نکالا۔ صورت ہی سے وہ بڑھا شیطان لگتا تھا۔ چہرے پر ہلا کی خباثت تھی۔ چاند گھٹی ہوئی اور تھوٹی باہر کو نکلی ہوئی تھی، جسم بھاری تھا اور عمر ساٹھ سے اوپر معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور توند باہر تھی۔ نٹھوں سے اوپر تھم باندھے ہوئے تھا، سر پر سوراخوں والی ہوادار ٹوپی تھی اسے دیکھ کر کراہت کا احساس ہوتا تھا۔

”ملا جی! اب کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دینا کسی سے۔“ ایک آدمی نے ملا کو سمجھایا۔

”میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔“ ملا چمار کی طرح ایٹھ گیا۔ ”جس محلے میں کوئی کنواری لڑکی بن

بیای بیٹھی رہے اس کے تمام رہنے والوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تم جانو اور افتخار جانے۔ ہم لوگ آئندہ اس معاملے میں نہیں پڑیں گے۔“

”میں اس غنڈے کے خلاف پرچہ درج کرا دوں گا۔ آخر وہ سمجھتا کیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے کہ

وہ ہیرا منڈی میں طوائفوں کی داللی کرتا ہے۔“

میں تو سمجھا تھا کہ اب اس محلے میں لوگ سو ساچکے ہوں گے مگر یہاں تو اور ہی چکر چلا ہوا تھا۔ ملا جی کا گھر بھی اسی گلی کے ٹکڑ پر تھا۔ ایک نوجوان وہاں سے نکلا اور ملا جی کو مخاطب کیا۔ ”چلو اب! گھر چلو۔“

باجی نے رو رو کے برا حال کر لیا ہے۔“

معلوم ہوا کہ ملا دس بچوں کا باپ تھا اور بیوی مرچکی تھی دو بچے بس بڑے تھے، ایک تو وہی سولہ

روپے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔

”میں ابھی اس ملا کی خبر لے کر آتا ہوں، اتنے میں تم منہ دھو لو اور لائین کی ٹوکم کر دو۔“ میں پھر بولا۔

”سارے محلے پر عذاب نازل کر رہا تھا کہینہ! اب ہٹا چلے گا اسے۔“ زینت کا حوصلہ میری آمد سے بڑھ گیا۔ ”جب بھی گھر سے نکل کر کہیں اڑوس پڑوس میں جاتی تھی تو اس طرح ناکتا تھا بوڑھا گدھ کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پورا کا پورا نگل جائے گا۔“

”اب وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا، مطمئن رہو۔ بلکہ وہ تمہیں دیکھ کر اس طرح بھاگے گا جیسے کبے سے کافر بھاگتا ہے، میں آتا ہوں ابھی۔“

میں وہاں سے ملا کے گھر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی ملا سو گیا۔ وہ شاید جلدی سونے اور صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا، اس کے علاوہ ڈھیٹ بھی لگتا تھا۔ ایک لڑکی یا عورت کو محلے بھر میں رسوا کر کے وہ بڑے آرام سے آکے سو گیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ بچے اندر کمروں میں سو رہے تھے اور ملا آنگن میں موجود نیب کے پڑتے چارپائی بچھائے خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے خزانے سارے گھر میں گونج رہے تھے۔ اس کے بچوں کو یقیناً خزانے سننے کی عادت ہو گئی ورنہ اس ”خز خراہٹ“ میں کون سو سکتا ہے۔ زور زور سے سانس لینے کے سبب اس کی توند کبھی اور پھول جاتی کبھی پچک جاتی۔ اس حسین چاندنی رات پر ملا کا وجود گویا ایک سیاہ دھبہ تھا۔

ملا کی چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر میں نے چند لمحے اطراف اور ماحول کا جائزہ لیا پھر قریب ہی پڑا ہوا ایک بڑا سا تنکا اٹھالیا، اسے بہر حال جگانا تو تھا۔

”خوں اوں، خوں اوں۔“ اور ”خر“ ”خر“ کی آوازیں کان میں تنکا داخل ہوتے ہی بند ہو گئیں۔ اسی وقت میں نے تازہ تازہ استرا پھری ہوئی چندیا پر زور دار چپت جڑ دی۔

”کون ہے؟“ کہتا ہوا ملا ایک دم کسی کٹھ پتلی کی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا اور کوتیاں بدل بدل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

گینڈے جیسی گردن ادھر ادھر گھومی تو میں نے اس پر بھی ایک ہاتھ جما دیا۔ گدی صاف ہی تھی اس لئے ہاتھ کرا رہا پڑا۔

ملا حواس باختہ سا ہو کر چارپائی سے اتر آیا۔ میں اس عرصے میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چارپائی کے پائنٹی بندھی ہوئی رسی کھولنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ ملا ”ارے ارے“ ہی کرتا رہ گیا۔ خود بخود گویا رسی کا کھٹنا اس کے لئے حیران کن ہی رہا ہو گا۔

”اب تو شرافت سے چارپائی پر لیٹ جانا کہ میں تیرے دونوں پیر باندھ دوں۔“ میں نے پہلی بار ملا کو مخاطب کیا۔

وہ میری غیر انسانی آواز سن کر اچھل پڑا پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ بھاگنے کی فکر میں ہو اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کرتا میں نے اسے جکڑ لیا۔

”اگر تو چنچا چلایا تو سمجھ لے میں تیرا گلا دبا دوں گا۔“ میں نے اسے دھمکی دی۔

”تت..... تُو..... کہیں تُو کک..... کوئی بدروح تو نہیں؟“ وہ بھلایا۔

”بدروح تو خیر تُو ہے، میں تو ایک نیک روح جن ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے اسے وہیں آنگن میں گرا لیا اور اس کے دونوں پیر باندھنے لگا۔

خلاف توقع ملا نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور کہنے لگا۔ ”اچھا تو جن ہے تُو۔“ لفظ ”جن“ اس نے یوں ادا کیا تھا جیسے جن اس کی نظر میں کم اوقات مخلوق ہو۔ پھر وہ مزید بولا۔ ”تجھے شاید معلوم نہیں کہ میرا نام ملا رحیم الدین ہے۔ کئی جنوں کو تو میں نے بوتل میں بند کر کے دریائے راوی میں بہا دیا ہے۔“ وہ الٹا مجھے دھونس لے لگا۔ ”میرے پاؤں نہ باندھ ورنہ بعد میں بہت پچھتائے گا تُو۔“

میں اس کی بکواس کو سنی آن سنی کرتا رہا اور پاؤں باندھ کر اسے نیب کے پیڑ سے الٹا لٹکا دیا۔

”دیکھ مجھے اب بھی کھول دے ورنہ ایسا عمل پڑھوں گا کہ.....“

”چپ!“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”ابے تُو مجھے رعب میں لینے کی کوشش کر رہا ہے، گینڈے کی اولاد!“ اسی کے ساتھ ملا کی پھولی ہوئی توند کو میں نے گھونسہ مار کے پچکا دیا اور فوراً ہی منہ بھی دبا لیا کہ کہیں چیخ نہ اٹھے۔ اس کی چیخ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ میری دوسری ضرب سے اس کی پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ میرا مقصد اسے ہلاک کرنا نہیں، صرف ڈرا دھمکا کر راہ پر لانا تھا۔ میں اسے مار بھی رہا تھا اور چیخنے بھی نہیں دے رہا تھا لیکن ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔

ذرا سی دیر میں اس کے کس بل نکل گئے۔ یہ اندازہ میں نے اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے لگایا۔ میں نے اسے مارنا بند کر دیا منہ سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پھر میں نے خاموش رہنے کو کہا تو وہ کراہتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مارتے بھی ہو اور چیخنے بھی نہیں دیتے۔“

”تُو شاید مجھے بچوں کی کمائیوں والا کوئی جن سمجھ کر ڈرا رہا تھا۔ اب پڑھ ناعمل، بڑا عامل کی دم بن رہا تھا۔“

”معاف کر دو، غلطی ہو گئی۔“ وہ ٹھکھیانے لگا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”تیری بیوی کو مرے کتنے دن ہوئے ہیں؟“

”پچھلے ہفتے میں نے بڑی دھوم دھام سے اس کا چالیسواں کیا تھا۔“ اس نے الٹا لٹکا ہونے کے باوجود فخریہ لہجے میں بتایا۔ ”ساری برادری کو بلایا تھا۔ پوری پانچ دیکھیں پکوانی تھیں۔“

”اس خوشی میں کہ تیری بیوی مر گئی اور اب تُو دوسری بیوی لانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ابے کہینے! بیوی کے ایصال ثواب کی خاطر اگر تجھے کھانا ہی کھانا تھا تو کسی یتیم خانے بھجوا دیتا۔ عزیز واقارب کو کھلانے سے کیا ملا؟ بول نا۔“

”میں نے بھی تو دوسروں کے چالیسویں کھائے ہیں۔ برادری یہ نہ کہتی کہ خود تو ملا رحیم الدین ہمارے بیان چالیسواں کھا گیا، اپنی بیوی مری تو پوچھا تک نہیں۔ پھر کسی کو پتا کیسے چلتا کہ میں نے

چالیسواں کیا بھی یا نہیں..... پھر بھی تم کہتے ہو تو اب نہیں کروں گا چالیسواں۔
 ”اب تو بیٹا! خود تیرا چالیسواں ہو گا۔“

”ارے نہیں! ایسی باتیں نہ کرو! ابھی میں نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔“
 ”کیوں! کیا زینت کو نہیں دیکھا؟“ میں نے جھپٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم..... تم اسے کیسے..... کیسے جانتے ہو؟“

”ابے وہ میری ہی تو محبوبہ ہے جس پر تو ڈورے ڈالنے کے چکر میں تھا۔“

”نن..... نہیں تو۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”میں تو کارِ خیر سمجھ کر باقاعدہ اسے بیوی بنانا چاہتا تھا۔ بے چاری کی اتنی عمر ہو گئی کوئی رشتہ ہی نہیں جڑا۔“

”ایک تو یہی لم ڈھینگ رہ گیا تھا اس کارِ خیر کے لئے۔“ میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ”بڑا نیک بن رہا ہے میرے سامنے۔ ابھی کچھ دیر پہلے محلے والوں سے کیا کہہ رہا تھا تو..... اسے اپنی بیوی بنانے کی خاطر سارے محلے پر عذاب نازل کرا رہا تھا تو۔ کوئی شادی کرے نہ کرے تو خدا کی فوجدار ہے..... محلے والوں کو تو نے یہ نہیں بتایا کہ اندر ہی اندر کیا گل کھلا رہا تھا۔“

”یقین کرو! چاہے جیسی قسم لے لو مجھ سے! اگر مجھے ذرا بھی یہ خبر ہوتی کہ کوئی جن اس پر عاشق ہے تو قطعی رشتہ نہ بھیجتا۔“

”میں رشتہ بھیجے نہ بھیجے کی بات نہیں کر رہا! تیرے خبث باطنی کا ذکر کر رہا ہوں۔ زیادہ ہوشیاری نہ دکھاؤ! ورنہ پھر تیری دھناتی شروع کر دوں گا۔ زینت کے والدین نے جب رشتے سے انکار کر دیا تو پھر تو نے حرای پن دکھانا شروع کر دیا۔ بول! اتنے دن سے تو کہاں مرا ہوا تھا؟ جب تیری بیوی زندہ تھی تو تجھے کبھی یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ محلے میں ایک کنواری لڑکی اپنے گھر بن بیٹھی ہے کہیں اس کی شادی کرا دی جائے؟ پھر یہ کہ پہلے کیا تجھے زینت کے بھائی افتخار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا؟ جواب دے۔“

”معلوم تھا۔“ وہ ہینکی ملی بن گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”میرے پیر کئے جا رہے ہیں! اللہ کے واسطے مجھے نیچے اتار دو۔“

”اپنے جسم پر تو نے اتنا بد گوشت چڑھایا ہی کیوں تھا! لوگوں کے چالیسویں کھا کھا کر۔ اب تو تیرا چالیسواں ہو کے رہے گا۔“

”رحم کرو مجھ پر! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ وہ رونے لگا۔

”ایک شرط ہے! میں تجھے معاف کر دوں گا۔ اگر اب تو نے زینت یا اس کے گھر والوں کے خلاف زبان کھولی تو گدی سے تیری زبان کھینچ لوں گا۔ اسی کے ساتھ زینت پر بڑی نظر ڈالی تو نے تو یہ دونوں چیاں چیاں سی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ بول شرط منظور ہے؟“

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق ملا رحیم الدین نے اپنا بھٹا سار بھی اقرار میں ہلا دیا اور زبان بھی۔ میں نے اسے پیڑ سے اتار لیا۔

”اور آخری بات یہ سن لے ملا کہ تو نے میرا ذکر کیا کسی سے تو اسی طرح تجھے اتلا لٹکا کر تیری چاند برائے جوتے ماروں گا کہ مغز باہر آ جائے گا۔“ میں نے پلٹے پلٹے دھمکی دی۔

ملا زمین پر بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اپنا منہ بند رکھے گا۔

میں جب زینت کے پاس پہنچا تو وہ بھی سنوری اپنی چارپائی پر نیم دراز تھی۔ نکلیے اس نے سر ہانے کی دیوار سے نکار کھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تو تھا! ہاں ہانوں میں گجرا نہ تھا! مگر مجھے کی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ تو خود ایک کھلا ہوا خوشبودار پھول تھی۔ لالین کی دھیمی روشنی میں بھی اس کی اجلی رنگت سے جیسے تیز روشنی ہو رہی تھی۔

جب میں نے اس سے ملا کی کٹائی کا واقعہ بیان کیا تو اسے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔ میرا انداز بیان ہی ایسا تھا۔

”آؤ اب ہم ایک ہو جائیں۔“ میں زیادہ دیر صبر نہ کر سکا۔

”ہم الگ تھے ہی کب۔“ وہ جیسے گنگنا اٹھی۔

صبح جب میں اس سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ بولی۔ ”پھر کب آؤ گے؟“
 ”جب کوگی۔“

”رزد آیا کرو! پہلے کی طرح۔ اس مرتبہ بھی تم کئی راتوں کے بعد آئے ہو اور ہاں تمہاری آواز آج مجھے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔“

”موسم جو بدل رہا ہے۔“

”تو کیا جنات پر بھی موسم کا اثر ہوتا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں نہیں! ہم بھی تو آخر اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔“

”تم نے مجھے اب تک اپنا نام کیوں نہیں بتایا؟ جب پوچھتی ہوں ٹال جاتے ہو۔“

”کرنا کیا ہے! تمہیں نام پوچھ کر؟“

”نہ بتاؤ! تمہاری مرضی۔“ اس کا منہ بالکل یوں بن گیا جیسے کوئی محبوبہ اپنے عاشق سے اظہارِ خفگی کرتی ہے۔

”سنو زینت! نام نہ بتانے کی ایک وجہ ہے۔ یہ جو آدم زاد ہوتے ہیں تا! ان میں بعض بعض بڑے ہی لعنتی ہوتے ہیں۔ ایسے آدم زادوں کو اگر کسی جن کا نام معلوم ہو جائے تو وہ اسے اپنا غلام بنانے کے لئے عمل شروع کر دیتے ہیں۔ میرا مطلب اس سے ہرگز یہ نہیں کہ تم بھی کسی کو میرے نام سے آگاہ کر دو گی۔ صرف احتیاطاً! ہم کسی آدم زاد کو اپنا نام نہیں بتاتے! خواہ وہ ہمارا دوست ہی کیوں نہ بن جائے۔ تمہارا بتاؤ! بھولے سے نام زبان پر آ سکتا ہے نا؟“ میں نے اس سے حقیقت نہیں چھپائی۔

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو پھر اب میں نہیں پوچھوں گی۔“ وہ کہنے لگی! پھر بولی۔ ”میں تمہیں کسی نام سے پکارنے لگوں تو؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں تم جو چاہو میرا نام رکھ لو۔“ میں نے کہہ دیا۔

چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولی۔ ”محبوب کیسا رہے گا؟..... یعنی محبوب علی..... میں تمہیں صرف محبوب کہا کروں گی۔“

”وہ تو میں یوں بھی تمہارا محبوب ہوں۔ بولو ہوں نا؟“

شرما کر اس نے سر جھکایا ہی تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی، زینت کچھ گھبرا گئی اور جلدی سے اٹھ کر بستر کی شکن شکن چادر درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کھلے ہوئے لمبے بالوں کو لپیٹتی ہوئی زور سے بولی۔ ”کون؟“

”دروازہ کھول زینت! میں ہوں۔“ باہر سے نسوانی آواز آئی۔ میں اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ زینت کی ماں معصوم النساء کی آواز تھی۔

زینت نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو بڑھیا فوراً اندر آ گئی اور تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ پھر اس نے کمرے میں موجود دونوں چارپائیوں کے نیچے بھی جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے سے حیرانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کیا تلاش کر رہی ہو اماں!“ زینت نے پوچھ ہی لیا۔

سوال کا جواب دینے کی بجائے بڑھیا اپنی بیٹی سے پوچھنے لگی۔ ”یہ تو بند کمرے میں کس سے باتیں کرتی رہتی ہے؟“

”میں تو سو رہی تھی اماں! تم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ابھی آنکھ کھلی ہے۔“ زینت نے جھوٹ بول دیا۔ اس کے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا بڑھیا کے بس میں نہیں تھا۔

”رات کو تیرے ابا نے بھی کسی سے تیرے باتیں کرنے کی آواز سنی تھی۔ وہ سونے سے پہلے پانی پینے باہر آئے تھے۔ مجھ سے کہا تو میں بولی، تمہارے کان بج رہے ہوں گے۔ اب میں خود نماز پڑھنے کے لئے وضو کرنے کو نکلی تھی کہ تیرے کمرے سے آوازیں آئیں۔ میں نے دروازے کے قریب آ کے سنا تو کوئی مردانہ سی آواز بھی آئی۔“

”وہم ہو گا اماں تمہارا، خود ہی دیکھ لو یہاں کوئی نہیں۔“

”مجھے تو کوئی اثر لگتا ہے یہاں، پہلے بھی ایک آدھ دفعہ مجھے شبہ ہوا ہے۔ آج ہی تیرے ابا کو بھیج کر حاجی کو بلواتی ہوں۔ وہ پڑھ کر گھر میں دم کر دیں گے تو پھر کوئی بڑی روح یہاں نہیں آئے گی۔ چل اب وضو کر کے تو بھی نماز پڑھ لے۔“ بڑھیا جانے کے لئے پلٹی۔

”بہت زور کی نیند آ رہی ہے، اماں! کل سے پڑھ لوں گی۔“ زینت نے ہمانہ کیا۔

”تیری انہی باتوں سے تو جی جلتا ہے۔“ بڑھیا بکتی جھکتی کمرے سے چلی گئی۔

بڑھیا کے جاتے ہی میں نے زینت سے سرگوشی کی۔ ”یہ حاجی کون ہیں؟“

رشتے میں اماں کے بھائی لگتے ہیں۔ ہر مہینے کی آخری جمعرات کو وہ ہمارے یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ بس وہ ادھر آئے، ادھر ہمارے گھر عورتوں کی قطار لگی۔ ”زینت کے لمبے تھیں بیزاری تھی۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تعوذ گنڈے دیتے ہیں وہ، فی عورت اتنی سے کم نہیں لیتے۔ کسی بچی پر پھل پیری کا اثر پڑتا ہے، کسی عورت پر جنات کا اثر، کسی کے پیٹ میں درد اٹھتا ہو تو کہہ دیتے ہیں، بھوت اندر گھس کر اچھل چلتا ہے۔ مجھے تو ان کی باتوں پر ذرا بھی یقین نہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی کام دھندا بھی کرتے ہیں؟“

”مجھے زیادہ پتا نہیں ویسے اماں کہہ رہی تھیں ایک دفعہ کہ انہیں نذرانہ ہی اتنا مل جاتا ہے کہ کچھ بچے کی ضرورت نہیں۔“

”ویسے جمعرات کل ہی ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”مہینے کی آخری جمعرات۔“

”اماں بھول گئی ہوں گی ورنہ انہیں آج ہی بلوانے کو نہ کہیں۔“

”آتے کس وقت ہیں؟“ میں نے معلوم کیا۔

”صبح ہی صبح آدھ گھنٹے ہیں اور پھر شام کو جیسیں انہیوں سے بھر کے جاتے ہیں۔“ زینت نے بتایا، پھر نے لگی۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”کل میں بھی تمہارا دیکھنے آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ دراصل ”عورتوں کی قطار“ کا ذکر سن کر مجھے ناچ جی سے دلچسپی ہو گئی تھی ورنہ تو میں موصوف کی حقیقت جان ہی گیا تھا۔ بہت سے جمل سازوں نے پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ حافظ جی بھی مجھے ایسے ہی لگتے تھے۔ ان سے ڈرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں اگر وہ زینت کے گھر میں آ کے دم کر جاتے تو میرا کیا بگڑتا۔

زینت کے گھر سے نکل کر میں نے ہملا کی کوٹھی کا قصد کیا ہی تھا کہ یاسف خود ہی ادھر نکل آیا ہم اس محلے سے باہر آ کے ایسی جگہ رک گئے جہاں آدم زادوں کا گزر نہ ہو۔ یاسف مجھے بہت ہی رادکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہملا کی بہت تعریف کی۔ جواباً میں نے بھی ہنسنے سے کام نہیں لیا۔ رات جو ہنگامہ برپا ہوا تھا، اس سے بھی یاسف کو میں نے آگاہ کر دیا اور یہ بھی کہ زینت اب اسے یا مجھے کس سے پکارا کرے گی۔

”تو اے پیارے محبوب! میں تو اب جاؤں گا بھائی دروازے، تیرے ارادے کدھر کے ہیں؟“ میں یاسف سے کہا۔

”میں تو اب بھی تجھ سے یہی کہوں گا اے علیالیش کہ ادھر کا دھیان چھوڑ دے۔“ یاسف مجھے نالائے لگا۔ ”آخر ہملا اور زینت میں کی کیا ہے؟ چل انہیں بھی چھوڑ اور بہت ہیں۔“

”تجھے یہی تو خبر نہیں اے میرے دوست کہ اس ظالم جیسا اور کوئی نہیں؟“

”اچھا تو پھر صبح ہی صبح اس طرف نہ جا۔ مولوی ابھی اپنی دکان پر نہیں گیا ہو گا۔ جب وہ دکان پر جائے تو پھر وہاں جانا خطرناک نہیں۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ مولوی اس وقت تجھ سے پتا ہوا ہے، انوار نے تجھے اس نے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

یاسف جو کچھ کہہ رہا تھا میری بھلائی ہی میں تھا۔ میں نے اسی لئے اس کی بات مان لی۔ اس کے

ساتھ میں ایک ایسے گھر میں چلا آیا جو دیران پڑا تھا۔ مکان کا کچھ حصہ گر بھی گیا تھا۔ مالک مکان شاید منہدم کرا کے دوبارہ تعمیر کرانا چاہتا ہو گا۔ ہم جنت، آدم زادوں کی بستیوں میں ایسے ٹھکانے نظر میں ہیں۔

☆=====☆

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور یاسف کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ سو ہم دونوں نے گئے۔ پھر دوسری کو میری آنکھ کھلی۔ یاسف نہیں جاگا اور میں وہاں سے چل دیا۔

اپنے معمول کے مطابق اس وقت اقبال کو دفتر میں ہونا چاہئے تھا۔ اب مجھے اسی کے جسم میں ہونا تھا۔ سو بھائی دروازے جانے کا ارادہ ترک کر کے میں، اقبال کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مجھے وہاں نہیں خیال آیا، شاید کل کی ”ٹھکانی“ کا اثر ابھی باقی ہے۔ پھر یہ کہ طویل عرصے اس کا جسم میرے اور یاسف کے قبضے میں رہا تھا۔ اس کا اثر بھی ہو گا۔ ممکن ہے کہ مولوی کفایت اللہ نے مزید آرام کا مشورہ دیا ہو اور اس کے جسم سے جنت کے اثرات ختم کرنا چاہتا ہو۔ یہی سوچ کر میں بھائی دروازے آ گیا۔

وہاں پہنچ کر جی چاہا کہ ایک نظر مولوی کی حویلی میں جھانک لوں۔ کیا خبر زمرس کی ایک جھٹک نظر ہی جائے۔ اسی خیال سے میں حویلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ جیسے کسی جال کے اندر پھنس کے رہ گیا۔

کے ساتھ مجھے یوں لگا کہ میری اطراف نادیدہ جال سمیٹنے لگا ہو۔ چند ہی لمحے بعد چاروں طرف سے میرے جسم پر اتنا شدید دباؤ پڑا کہ میری چیخ نکل گئی۔

میں صدر دروازے سے دہری عبور کر کے صحن میں پہنچا ہی تھا کہ اس آفت میں گھر گیا۔

معاً میں نے زمرس کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسی طرف آتے دیکھا۔ اس نے شاید میری چیخ لی تھی۔

”تو آخر آج تو پھنس ہی گیا۔“ زمرس مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئی وہ اس طرح سے مخاطب تھی جیسے مجھے دیکھ رہی ہو۔ ”تو نے ہمیں بہت دن سے ستار کھا تھا کیئے! بول، تیرا نام علیا ہے؟“

”ہاں؟“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور یاسف کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ سو ہم دونوں نے گئے۔ پھر دوسری کو میری آنکھ کھلی۔ یاسف نہیں جاگا اور میں وہاں سے چل دیا۔

اپنے معمول کے مطابق اس وقت اقبال کو دفتر میں ہونا چاہئے تھا۔ اب مجھے اسی کے جسم میں ہونا تھا۔ سو بھائی دروازے جانے کا ارادہ ترک کر کے میں، اقبال کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مجھے وہاں نہیں خیال آیا، شاید کل کی ”ٹھکانی“ کا اثر ابھی باقی ہے۔ پھر یہ کہ طویل عرصے اس کا جسم میرے اور یاسف کے قبضے میں رہا تھا۔ اس کا اثر بھی ہو گا۔ ممکن ہے کہ مولوی کفایت اللہ نے مزید آرام کا مشورہ دیا ہو اور اس کے جسم سے جنت کے اثرات ختم کرنا چاہتا ہو۔ یہی سوچ کر میں بھائی دروازے آ گیا۔

وہاں پہنچ کر جی چاہا کہ ایک نظر مولوی کی حویلی میں جھانک لوں۔ کیا خبر زمرس کی ایک جھٹک نظر ہی جائے۔ اسی خیال سے میں حویلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ جیسے کسی جال کے اندر پھنس کے رہ گیا۔

کے ساتھ مجھے یوں لگا کہ میری اطراف نادیدہ جال سمیٹنے لگا ہو۔ چند ہی لمحے بعد چاروں طرف سے میرے جسم پر اتنا شدید دباؤ پڑا کہ میری چیخ نکل گئی۔

میں صدر دروازے سے دہری عبور کر کے صحن میں پہنچا ہی تھا کہ اس آفت میں گھر گیا۔

معاً میں نے زمرس کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسی طرف آتے دیکھا۔ اس نے شاید میری چیخ لی تھی۔

”تو آخر آج تو پھنس ہی گیا۔“ زمرس مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئی وہ اس طرح سے مخاطب تھی جیسے مجھے دیکھ رہی ہو۔ ”تو نے ہمیں بہت دن سے ستار کھا تھا کیئے! بول، تیرا نام علیا ہے؟“

”ہاں؟“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

”عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے اے زمرس! پھر تیرے ساتھ تو میرا نکاح بھی ہو چکا ہے۔“

”چپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تیری صورت پر تو میں تو کتنا بھی پسند نہ کروں۔“

فرار ہونا پڑا۔ اب میں اس آدم زاد کا سراغ لگانا چاہتا تھا جو میری آزادی چھین کر مجھے غلام بنا کر رہے تھا۔ رقیب تو آخر رقیب ہی ہوتا ہے۔ وہ تاک میں تھا کہ اقبال کے ذریعے تجھ تک پہنچ جائے دوسری رات کو اس نے تجھے چھت پر بلوا بھی لیا مگر میں شدید تکلیف و اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود تیری عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے یہاں پہنچ گیا۔ تو میری ہی چیخ و پکار پر چھت سے اترا آئی تھی۔ اگلی رات کو ستار کمینہ تیری حویلی کی چھت پر عمل کرنے آ گیا۔ یوں تو دوسری شب کو بھی اقبال کے پاس میں موجود یاسف سے نہیں مل سکی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تجھے خبر ہی ہے..... زمرس! میرا قصور کوئی ہے تو صرف یہ کہ میں نے تجھ سے محبت کی، یقین کر کہ میں نے کبھی نہ کسی جانیہ کو آنکھ اندھ دیکھا اور نہ ہی کسی آدم زاد کی کو تیرے سوا چاہا۔ تجھے تو میں نے شریف احمد تک سے بچا لیا ورنہ زندگی تباہ ہو جاتی کیوں کہ وہ عیار صرف اپنی ماں کی خوشنودی کے لئے تجھ سے شادی کر رہا تھا۔ سن کر یقیناً حیرت ہو گی کہ تیرا خالہ زاد کسی بھی عورت کے قابل نہیں تھا۔ ”زمرس کو شیشے میں اتارنا خاطر میں ہر حربہ آزما رہا تھا۔

میں نے زمرس کے چہرے کو متغیر دیکھا۔ یقیناً میری بات اس کے دل کو لگی تھی۔ وہ جیسے آپ آپ بڑبڑانے لگی۔ ”بھئی تو خالہ کی وفات کے بعد شریف نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔“ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ بعد میں شریف احمد پر کیا گزری۔ زمرس کے ان الفاظ سے اندازہ ہوا شریف احمد کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو گئی تھی۔ زمرس بہر حال مجھے نہیں اقبال کو چاہتی تھی۔ اس کے باوجود میں بڑی مہارت سے اور ہوش کے ساتھ اسے اپنی وفا کا یقین دلا رہا تھا۔

”مگر تو نے کیا کیا کہ شریف احمد عین وقت پر میرے ساتھ نکاح سے انکار کرنے لگا؟“ زمرس نے کے بعد زمرس نے سوال کیا۔ ”کیا اسے بھی تو نے اپنے اثر میں لے لیا تھا؟“ ”ہاں زمرس! اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ میں تجھے برباد ہونے سے بچا سکتا۔“ یوں میں نے اس پر احسان جنابا۔

”اس میں تیری خود غرضی بھی تو شامل تھی۔“ ”کوئی جن زاد ہو کہ آدم زاد، عشق اسے خود غرض بنا دیتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ نہ عشق نے مجھے خود غرض بنا دیا تھا۔“ میں بولا۔ ”اگر میں خود غرض نہ بن جاتا تو پھر تیرے ساتھ میرا کیسے ہوتا؟ میں تجھے جائز طریقے سے حاصل کرنے کا آرزو مند تھا اور آخر کار اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔“ ”غلام کہتا ہے تو۔“ زمرس نے تیرا آواز میں کہا۔ ”نکاح سے پہلے کیا تو نے مجھے ورغلانے اور کے راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں کی؟“

”وہ..... وہ میرے عشق کی دیوانگی تھی۔ میں تجھے اپنے قریب دیکھ کر ہوش و حواس نہ تھا۔ سچ بتا، کیا تیرا بھی یہی حال نہیں ہوا تھا؟ اگر اس رات وحیدن جاگ نہ جاتی تو.....“ ”بار بار یہ بات نہ کر۔“ اس کے حسین چہرے کو میں نے رنگ بدلتے دیکھا۔

”تیرا حکم ہے تو اب میں یہ ذکر نہیں کروں گا لیکن مجھ سے نکاح کے بعد اب.....“ ”تو نے میرے ساتھ نکاح کی ہاں بھری ہو گی، مگر میں نے تو تجھے نہیں اقبال کو قبول کیا تھا۔ نکاح ہر دو طرف سے رضامندی، یعنی ایجاب و قبول کو کہتے ہیں۔ پھر تیرے ساتھ میرا نکاح کیسے جائز ہو گیا؟“ زمرس نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جس کا مجھے خدشہ تھا۔ مولوی کفایت اللہ بدبخت نے لازماً اسے دینی تعلیم سے پوری طرح آشنا کیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور آن پڑھ آدم زاد کی ہوتی تو اسے بڑی آسانی سے میں بے وقوف بنا لیتا۔

اس پر بھی میں نے ہار نہیں مانی۔ بلی اگر کھائے نہیں تو اونڈھا ہی دے، یہ سوچ کر میں بولا۔ ”تو نے اقبال کو قبول کیا لیکن اقبال نے تجھے قبول نہیں کیا کیوں کہ اس کی جگہ میں تھا۔ یوں تو پھر اقبال سے بھی تیرا نکاح نہیں ہوا۔ شرعاً تو یہ قید ہوش و حواس قبولیت ضروری ہے۔“ میں نے ایسی دلیل دی تھی کہ زمرس لاجواب ہو گئی۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”تجھے مجھ سے عشق ہے نا؟“

زمرس کا یہ سوال میرے لئے خطرے کی گھنٹی تھا۔ اس کے باوجود مجھے اقرار تو کرنا ہی پڑا۔ ”کیا تجھے اس پر بھی یقین ہے کہ عشق ایثار و قربانی کا نام ہے؟“ وہ مجھے گھبرنے لگی۔ ”اے زمرس! تو صاف بات کر کہ ان باتوں سے تیرا مقصد کیا ہے؟“

”میں تجھ سے قربانی چاہتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیسی قربانی؟“ میں سمجھ کر بھی دانستہ ناممجھ بن گیا۔ ”تو میرے اور اقبال کے درمیان سے ہٹ جا۔“ وہ بات زمرس کی زبان پر آئی گئی جس کا اندیشہ مجھے پہلے سے تھا۔

”میں یہ قربانی دینے پر آمادہ ہوں، مگر تجھ سے صرف ایک التجا ہے۔“ میں نے مصلحت وقت کو مد نظر رکھ کر کہا۔ ”بول، اگر تو نے کوئی ناجائز التجا نہ کی تو میں تیری التجا رد نہیں کروں گی۔“ ”مجھے علم ہے کہ تیرے والد محترم قبلہ مولانا کفایت اللہ نے تجھے ایسا علم بخشا ہے جو مجھے تیرے قریب نہیں آنے دیتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں اے زمرس، اے میری زندگی، اے میری قرار جاں کہ تو مجھے اپنے دیدار سے محروم نہ کرے۔ میں تجھے قریب سے آکر دیکھنا چاہوں تو دیکھ سکوں۔ تو جب مجھے اپنے قریب محسوس کر کے کچھ پڑھنے لگتی ہے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے اور..... اور پھر میں اپنی نظروں کی پیاس بجھائے بغیر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں؟“ میں نے یہ الفاظ انتہائی رقت آمیز آواز میں ادا کئے۔

وہ بھی بہت چٹ تھی، فوری طور پر داؤ میں نہ آئی اور بولی۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تو اپنی مدد میں رہے گا۔“ ”میں تجھے تیری ہی قسم کھا کر یقین دلا سکتا ہوں کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ مجھے کوئی اور عزیز نہیں۔“

اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈال۔ کیا مجھے یہ خبر نہیں کہ تیرے والد محترم حضرت مولانا کتنے صاحب علم آدمی ہیں۔“

”اگر تو میرے اباجی کا اتنا احترام کرتا ہے اور انہیں صاحب علم کہہ رہا ہے تو پھر تو نے کل انہیں زخمی کیوں کیا؟ ان کی ٹوپی اتار کر بھاگنے کی گستاخی کیوں کی؟ پھر اسی ٹوپی میں غلاقت بھر کے یہاں ان کیوں بچھکی؟“

”میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔ تیری قسم زمرس! یہ تو کینے یاسف کی شرارت تھی۔ اس پر یاسف نے میرا جھگڑا بھی ہو گیا۔ دراصل کل حضرت مولانا کے ہاتھوں وہ بہت پنا تھا، سو انتقاماً ذلالت پر اتر آیا۔ تو مولانا صاحب کی دکان میں آگ بھی اسی بد ذات نے لگائی تھی۔ مجھے اس کا علم بعد میں ہوا ورنہ وہ ایسا کر پاتا۔ تو خود سوچ کہ بھلا کوئی عاشق اپنی محبوبہ کے نیک اطوار والد کو دکھ دینے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ میں تو حضرت مولانا کی دل سے عزت کرتا ہوں۔“

”چل میں تیری بات مان لیتی ہوں لیکن تو نے ستار کی بے گناہ بیوی کو سانپ بن کر کیوں ڈسا؟ پھر ستار کو بھی مار ڈالا۔ تو اس قدر سفاک اور ظالم ہو کر مجھ سے عشق کا دعویٰ کرتا ہے۔ عاشق تو بڑے نرم اور گداز دل ہوتے ہیں۔“

”نہ میں نے ستار کی بیوی کو ڈسا اور نہ ہی ستار کو مارا۔“ میں قطعی مکر گیا۔ ”ان دونوں کو قتل کرنے والی یاسف ہی کی بہن طرہ تھی۔“

”لیکن کیوں؟ طرہ سے تو ستار کی کوئی دشمنی نہیں تھی اگر اس کا کوئی دشمن ہو سکتا تھا تو وہ صرف تو ہی تھا کہ وہ تجھے قابو میں کرنے کے لئے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔“

”نہیک کہتی ہے تو۔ ستار سے میری ہی دشمنی تھی مگر طرہ سے میری حالت نہ دیکھی گئی۔ میں شدید تکلیف و اذیت کا شکار تھا۔ وہ بد نصیب جنبہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ سو میرے منع کرنے کے باوجود نہیں مانی۔ یاسف نے حضرت مولانا کے سامنے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کے لئے یہ جھوٹ بولا تھا کہ طرہ پہلے ہی مر گئی تھی یا اسے میں نے بھگایا تھا۔ طرہ تو اس وقت ہلاک ہوئی جب ستار مارا گیا۔ وہ ستار سے میرا انتقام لینے کی خاطر اس کے گھر گئی۔ ستار کو وہاں نہ پا کر اس نے ناگن بن کر ستار کی بیوی کو ڈس لیا، پھر دوسرے دن وہ ستار کے جسم میں داخل ہو کر اسے گھر کی چھت پر لے گئی اور سر کے بل پھینک گئی میں چھلانگ لگا دی۔ جوش انتقام میں وہ ہوش کھو بیٹھی تھی اسی لئے ستار کے جسم سے نہیں نکل سکی۔ وہ بھی ستار ہی کے ساتھ ماری گئی۔ طرہ نے مجھے ایک آدم زاد کا غلام بننے سے تو بچایا مگر اپنی جان دے دی۔ کاش..... کاش اے زمرس! میں تیرے عشق میں گرفتار نہ ہوتا تو یوں طرہ اپنی جان سے نہ جاتی۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح روک لیتا، مگر بخدا مجھے طرہ سے عشق نہیں تھا۔ مجھے تو تو نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اسی دیوانگی نے تو مجھے اس وقت بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا۔ لیکن اس پر مجھے کوئی ملال نہیں۔ میں اگر مارا بھی گیا تو اپنے عشق پر صداقت کی مہر ثبت کر جاؤں گا۔“ میری آواز آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بھرا گئی۔

زمرس مجھے کچھ دیر عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں محسوس کر چکا تھا کہ میری باتوں کا اس کے دل پر ضرور اثر ہوا ہے۔

”میں چاہوں تو تجھے ایک یقینی موت سے بچا سکتی ہوں۔“ آخر کار زمرس کے حسین لب پہلے۔

”لیکن تجھے ایک وعدہ کرنا پڑے گا کہ اب کبھی اقبال کے جسم میں داخل نہیں ہو گا۔“

”مر جانے دے مجھے اے زمرس!“ میں رد دیا۔ ”مجھے رہا نہ کر“ میں..... میری وجہ سے تجھے..... بڑا دکھ ہوا..... تو اپنے محبوب سے بچھڑی رہی۔ میں..... میں تو غیر ہوں تیرے لئے.....

ایک جن زاد..... مجھ پر رحم نہ کر۔ حضرت مولانا کو آ جانے دو..... وہ تو مجھے مجرم ہی سمجھتے ہیں نا..... تو پھر وہ اسی قید کی حالت میں جلا ڈالیں گے۔ اگر..... اگر تیرے عشق میں ایک..... ایک جن زاد اپنی جان سے گزر بھی گیا تو کیا ہوا..... تو..... تجھے تو تیرا محبوب مل جائے گا۔“

”نہیں“ یہ تجھ پر ظلم ہو گا۔“ زمرس بول اٹھی۔ ”تو نے بہرحال مجھ پر ایک احسان ضرور کیا ہے کہ مجھے شریف احمد سے بچالیا، سو میں احسان فراموش نہیں۔ میں تجھے اباجی کے ہاتھوں قتل نہیں ہونے دوں گی لیکن اس سے پہلے تجھے اقبال کے جسم میں داخل نہ ہونے کا عہد ضرور کرنا پڑے گا۔“

”مجھ میں تیرا حکم ٹالنے کی ہمت کہاں..... مگر تو بھی تو عہد کر..... خدا کی قسم کھا کر مجھے یقین دلا کہ اپنے قریب آنے سے نہیں روکے گی۔“ میں نے پلٹا کھایا۔

زمرس لاکھ ایک خطرناک عالم کی بیٹی سہی مگر تھی تو ایک کم عقل آدم زاد کی، سو مات کھائی گئی، کہنے لگی۔ ”میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتی ہوں اے علیالیش کہ تجھے کبھی اپنے قریب آنے سے نہیں روکوں گی۔“

”اور اے زمرس! تیرے سر کی قسم کہ میں اب اقبال کے جسم میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔“ میں نے بھی اسے غپ دینے کے لئے جھوٹا عہد کر لیا۔

ابھی میرے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن میں آنے والے کو نہیں دیکھ سکا۔ مڑ کر دیکھنا یا اپنے جسم کو حرکت دینا میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ میرے سارے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی، اس وقت جب میں نے لعنتی مولوی کفایت اللہ کو دیکھا۔ اب وہ میرے لئے

”حضرت مولانا“ نہیں رہا تھا۔

مولوی بد بخت کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔

”زمرس!“ وہ دھاڑا۔ ”تو یہاں سے چلی جا۔“

”لے..... لیکن اب.....“

”جا“ میں نے کہہ دیا تجھ سے چلی جا۔“ کینہ مولوی آپے سے باہر ہو گیا۔ ”اس حرام زادے علیالیش کو میں نے پہچان لیا، اب میں اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مرنے سے پہلے کلمہ پڑھ لے۔“

اب اس کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہیں تھا کہ میں، خبیث مولوی کفایت اللہ کا حکم مان لیتا۔

یوں بھی کلمہ پڑھنا اچھی بات ہے، ہر مومن اور مومنہ کو پڑھتے رہنا چاہئے۔ میں بھٹکا ہوا ایک جن زار سی مگر تھا تو اہل ایمان کی نسل سے۔ مجھے اگر غصہ آیا تو صرف اس بات پر کہ مولوی مجھ بے بس کو عالم بلا کی سیر کرانے سے پہلے کلمہ پڑھنے کو کہہ رہا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک ذی روح کو قتل بھی کر دیا اور خود اللہ میاں کی نظر میں بھلا بننے کے لئے اس سے کلمہ بھی پڑھاؤ۔ دیکھ لے اے اللہ تعالیٰ، ہم تیرے کتنے نیک اور فرمانبردار بندے ہیں کہ مقتول کا خاتمہ ایمان پر کیا گویا ع

دی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

اس سے قطع نظر میری ہوا تو اتنی سنٹ تھی کہ اگر وہ بد ذات مولوی یہ کتا کہ بیٹا علیا لیش، مرغابن جا اور نکلروں کوں کی آواز نکال تو میں ہرگز انکار نہ کرتا۔ میں فوراً کتا، جی حضرت مولانا ابھی قہیل حکم کرتا ہوں لیکن ہائے افسوس، بھری جوانی میں وقت آخر آ گیا تھا۔ وہاں تو کوئی مجھ پر رونے والا بھی نہ تھا، نہ کوئی جن نہ جینیہ۔ میں ایک دن یوں آدم زادوں کی ایک بستی میں مارا جاؤں گا، یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔ ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ کچھ سوچنے کی فرصت تھی بھی کہاں۔ میری عمر ابھی تھی ہی کتنی۔ مشکل سے ڈیڑھ سو سال ہو گی عمر۔ ہا سو تو ہزار سال سے اوپر ہو گا۔ ہم جنات کی عمریں صدیوں پر محیط ہوتی ہیں۔ پانچ سو برس تک تو جن زار جوان ہی شمار ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی تو اس پر مجھے بڑی حیرت ہوتی کہ یہ آدم زاد اتنی سی عمر میں کیا کیا فتنے اٹھا دیتے ہیں۔ ابھی ساٹھ سال کے نہیں ہوتے کہ کسی بوڑھے گدھ کی طرح کھال لٹکنے لگی۔ دو چار سال اور گھسٹ گھٹا لئے کہ ٹیس ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ غلطی سے محفل وعظ میں شرکت کر لی تھی۔ کئی ہزار سالہ ایک جن کو دور دیں سے وعظ کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس نے اپنے وعظ میں کہا تھا کہ پہلے آدم زاد بھی سینکڑوں سال کے ہوتے تھے اور یہ نہیں ہوتا تھا کہ گویا ادھر پیدا ہوئے، ادھر بچکان کی قطار لگائی اور ٹھنڈے ٹھنڈے نسل لئے۔ وعظ کئے والے عمر رسیدہ جن نے طویل عمری کے باب میں حضرت نوح علیہ السلام کی مثال بھی دی تھی جنہیں اس نے آدم علیہ السلام ثانی بھی کہا تھا۔ واعظ جن نے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر نو سو برس سے زیادہ بتائی تھی اور بطور ثبوت قرآن کی آیات بھی پڑھ کر سنائی تھیں۔ میں، یاسف کو اشارہ کر کے وہاں سے پھوٹ لیا تھا کہ اسی نے مجھے محفل وعظ میں پھنسیا تھا۔ پھوٹ لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے وعظ کئے والے کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ واعظ موصوف کو جوش خطابت میں یہ ہوش نہیں رہتا تھا کہ ثواب دارین حاصل کرنے والے چپکے چپکے خاصی بڑی تعداد میں کھسک چکے ہیں۔ جو بے چارے مجبوراً پھنسے ہوئے ہیں، منتظرین ہیں۔

میں بھی اس وقت بڑی طرح پھنس گیا تھا مگر یہ محفل وعظ نہیں، مقتل تھا جہاں سے کھسک لینا تو دور کی بات ہے، ہلنا بھی مشکل تھا۔ میری محبوبہ کی حویلی کا صحن، صحن مقتل بننے والا تھا، سو میں نے با آواز بلند انتہائی رقت کے ساتھ کلمہ پڑھ ہی دیا۔ رقت کا خیال میں نے بہ ہزار دقت رکھا تھا کیونکہ میری فاختہ اڑی ہوئی تھی۔ رقت کا تاثر میں نے کچھ تو اپنی ممکنہ مرگ ناگمانی کی وجہ سے دیا تھا، کچھ یہ سوچ کر کہ

شاید اس پتھر دل مولوی کو مجھ پر رحم آ ہی جائے۔

مولوی بد بخت تو خیر مومن نہ ہوا، وہ گلبدن کہ جس کی خاطر عاشقی اختیار کی تھی، آڑے آگئی۔

”آپ میری بات تو سن لیں اباجی!“

”تو ابھی تک گئی نہیں یہاں سے۔“

”علیا لیش بے گناہ ہے اباجی!“

”تو پھر گناہگار کون ہے؟ کیا میں گناہگار ہوں؟“ مولوی کسی پاگل ہاتھی کی طرح چنگھاڑا۔

”آپ کو اس کی طرف سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”بالکل نہیں“ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ اسی حویلی میں ایک رات یہ اور اس کا دوست دونوں ہی اقرار جرم کر چکے ہیں۔ تجھے کچھ خبر نہیں۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں میری ”عملتین“ یعنی پیکر خشن و رعنائی زمرس کچھ اور نہ سمجھ بیٹھے، اس کے ”اباجی“ کی وہاں موجودگی کا بھی خیال نہ کیا اور جھٹ بول پڑا۔ ”اے زمرس! تو ہی حضرت قبلہ مولانا کو بتا دے کہ میں نے جرم عشق کا اقرار تجھ سے بھی کر لیا ہے یا نہیں۔ یہی اقرار پہلے حضرت مولانا سے کیا تھا۔“

موت کی دہشت کے سبب یہ بات میرے ذہن سے نکل ہی گئی کہ شریف و نیک اور باجیا ہو بیٹیوں کے ”ابا حضور“ بھی موجود ہوں تو ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہئے۔ مجھ سے یہ غلطی ہو چکی تھی، سو خیاڑہ بھگتا پڑا۔ مولوی نے نہ جانے کیا پڑھا اور مجھ پر پھونکا کہ نادیدہ جال کی گرفت ایک دم سخت ہونے لگی۔ میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

”بے غیرت! حرام زادے..... بے شرم، بے حیا، بے ایمان بے.....“ مولوی نے شاید کسی ایسے ہی موقع کے لئے ”بے“ سے شروع ہونے والے سارے الفاظ یاد کر رکھے تھے، سو بولے چلا گیا۔ میری مجبوری سننا تھی، سنتا رہا اور چنٹا رہا۔

جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ مرنے سے پہلے دل پہنی بھڑاس نکال لوں، مولوی ظالم کو بھی وہ کھری کھری سناؤں، اس کی سات پشتیں یاد رکھیں لیکن مجھے چیخنے سے کب فرصت تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ مجھے کھری یا کھوٹی سنانے کی فرصت نہ ملی ورنہ وہ نازنین، وہ خوش اندام اپنے اباجی کو مزید غضب ناک ہونے سے نہ روکتی۔

”تو کہتی ہے تو میں گرفت ڈھیلی کئے لیتا ہوں مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس حرامی نے کل رات میری ٹوپی اتار لی، بھرے بازار میں، پھر اسی ٹوپی میں غلاط بھر کر مجھ پر پھینک دی اور مجھے ٹپاک کر دیا۔“ مولوی بھنایا۔

”اس نے ایسا نہیں کیا اباجی! آپ کو یہی تو بتا رہی تھی میں۔ وہ اس کا شیطان دوست یاسف تھا۔ اسی نے انتقاماً ایسا کیا تھا کیونکہ اسے کل آپ کے ہاتھوں مار کھانا پڑی تھی۔ علیا لیش سے تو اس پر یاسف کا جھگڑا بھی ہو گیا۔“ زمرس اپنے باپ کو سمجھانے لگی۔

نہیں؟“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے زمر سے کہا۔ ”مجھے بتا کر مئی تھی کہ کوفتے نعت خانے میں رکھے ہیں مگر م کر کے دے دیجیو۔ بس میرا تو کھر سے نکلتا قیامت ہے۔ کھڑی بھر کو کیس جاؤں تو.....“

”تم اندر جاؤ۔“ مولوی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”ابھی کوفتے گرم کرنے کی ضرورت نہیں، جب کون گرم کر دینا اور سنو، اب ادھر نہ آنا۔“

”لو اور سنو، کیوں نہ آؤں ادھر، کیا یہاں انگریز پلٹن کا پہرا لگا ہے؟“ بڑھیا سک مئی ط آثار کہہ رہے تھے عمارت عظیم تھی

جوانی میں اس نے مولوی سے بڑے ناز اٹھوائے ہوں گے، تجھی مولوی کو گھر کی مرغی دال برابر سمجھ رہی تھی۔ آخر تھی بھی تو زمر کی ماں۔ میاں چاہے عالم فاضل ہو کہ کوئی بزرگ ہستی، آدم زاد بیویاں انہیں جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔

”زیادہ فضول باتیں نہ کرو اور جاؤ اندر۔“ میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی ظہر کی نماز بھی نہیں پڑھی ہوگی، جا کے نماز پڑھو۔“ مولوی نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

”اے لو، اچھا یاد دلایا تم نے۔ وضو تو کر لیا تھا میں نے وہیں اور نماز بھی پڑھنے والی تھی کہ تمہارا خیال آگیا کہ کھانا کھانے آگئے ہو گے۔ یہ زمر کہیں بھول نہ جائے کہ کوفتے کہاں رکھے ہیں۔ یہی سوچ کر آگئی کہ گھر جا کے نماز پڑھ لوں گی۔ بوا رحیم روکتی رہ گئیں مگر میں نہیں رکی۔“ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسے نظر نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ مولوی نے بیٹی کو تو علم سکھایا تھا، بڑھیا کو اس معاملے میں کورای رکھا تھا۔

”اب جاؤ گی بھی کہ یہیں کھڑی تقریر جھاڑتی رہو گی۔“ مولوی نے اسے ٹوکا۔

”کھڑے رہو باپ بیٹی دھوپ میں، مجھے کوئی شوق نہیں۔ ذرا کی ذرا میں مجھے تو پینے آگیا۔“ بڑھیا برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں بتاتی ہوں اباجی کہ علیالیش قاتل نہیں ہے۔“ پھر زمر کو میں نے جو کچھ اپنی صفائی میں بتایا، قدرے اختصار سے اس نے بیان کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ مولوی کچھ نرم پڑنے لگا ہے۔ زمر اگر میرے حق میں نہ بولتی تو شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔

”اباجی! سارا کیا دھرا اسی شیطان یاسف کا ہے۔ اپنی جان بچانے کے لئے اس نے غریب علیالیش پر الزامات لگا دیئے۔“

”عقل کام نہیں کرتی کہ ان دونوں خبیثوں میں سے کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ کم بختوں کو اہل ایمان ہونے کا دعویٰ بھی ہے اور کیمینہ پن بھی نہیں چھوڑتے۔“

”حضرت قبلہ مولانا! میں آپ سے مؤدبانہ ایک سوال کرنے کی جرات.....“

”بول، کیا سوال ہے تیرا؟“

”آدم زاد بھی جس طرح اللہ کی مخلوق ہیں، ہم جنات بھی ہیں۔ پھر آدم زادوں کو یہ حق کس نے

مولوی نے تادیبہ جال کا دباؤ تو ہٹایا مگر مجھے آزاد نہ کیا۔ پھر وہ زمر سے کہنے لگا۔ ”کل وہ اس پر الزام دھر رہا تھا، آج یہ اسے برا کہہ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، یہ دونوں کینے اس طرح مل کر مجھے چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”یقین کریں حضرت مولانا! میں تو آپ کی اتنی عزت کرتا ہوں کہ میرا اللہ ہی جانتا ہے۔“ میں روتے ہوئے بولا۔ شدید اذیت سے گزر کر مجھے خود بخود رونہ آ رہا تھا۔ پھر اس سے مولوی کو آلو بنانے کے لئے کیوں فائدہ نہ اٹھاتا۔ ”میں تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو سوچ رہا تھا۔ بھلا آپ جیسے اللہ کے نیک بندے اس جہان میں اب کتنے رہ گئے ہیں؟“

”میں تو بڑا گناہگار بندہ ہوں، کیوں مجھے کانٹوں میں محسوس رہا ہے۔“

ہے تو واقعی تو بڑا گناہ گار ورنہ کہاں میں ہڈی نہ بنتا۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر مجھے سچ بولنے کا بیضہ نہیں تھا، سو بولا۔ ”میں حضرت مولانا! آپ کے دست حق پر بیعت تو میرے لئے باعث سعادت ہو گی۔“ آگے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیں، مگر وہ پھر بیک اٹھتا۔

مولوی کو مزید پرچانے کی غرض سے زمر بھی بول اٹھی۔ ”اباجی! یہ مجھ سے عہد کر چکا ہے کہ اب اقبال کے جسم پر قابض نہیں ہو گا۔ اس نے قسم بھی کھائی ہے۔“ زمر نے خوف فساد کے سبب یہ نہیں بتایا کہ میں نے اسی کے ”سر عزیز“ کی قسم کھائی تھی۔

”قسم تو اس نے آئندہ کے لئے کھائی ہو گی۔ جو ناقابل معافی گناہ یہ پہلے کر چکا ہے ان کی سزا تو صرف اور صرف موت ہے۔“ مولوی بھی ایک ہی بد معاش تھا۔ بد ذات اپنی بیٹی کی سفارش بھی مان کے نہیں دے رہا تھا۔ بولا۔ ”یہ قاتل ہے۔ اس نے ستار اور اس کی بیوی کو قتل کیا ہے۔ شرع کی رو سے قصاص واجب ہے۔“

زمر بھی تھی تو اس کی بیٹی، دبے لفظوں میں کہنے لگی۔ ”مگر اباجی، قصاص لینا ہم پر تو فرض نہیں، یہ تو ستار کے در ثاء کا حق ہے۔“

”تو پھر ہو گیا فیصلہ..... میں بلواتا ہوں، ستار کے والدین کو۔“

”لیکن حضرت مولانا! ان دونوں کو میں نے قتل نہیں کیا۔“ میں بول اٹھا۔ ”زمر کو میں سب کچھ بتا چکا ہوں، وہ دونوں طریقہ کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔“

”کیا بکتا ہے تو۔“ مولوی برہم ہو گیا۔ ”وہ تو پہلے ہی ماری گئی تھی۔ یاسف نے مجھے کل خود یہ بتایا تھا۔“

”میں اسی کے جھوٹ کی سزا تو بھگت رہا ہوں قبلہ و کعبہ۔“ میں نے پھر مکر کیا اور زار و قطار رونے لگا۔

اسی وقت زمر کی ماں آگئی اور آتے ہی کہنے لگی۔ ”یہ تم باپ بیٹی صحن میں کیوں کھڑے ہو؟ مجھے بوا رحیم سے باتوں میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ کل کا واقعہ سنا رہی تھیں کہ کس طرح یاسف جن، ان کے پیروں میں سر رکھ رہا تھا۔“ اس کا اشارہ مولوی کی جانب تھا۔ ”اری باپ کے لئے کھانا بھی لگلا کہ

دیا کہ وہ ہمیں اپنا غلام بنالیں؟ میں اس گستاخانہ سوال کے لئے معذرت طلب ہوں۔“
 ”تو ٹھیک کہتا ہے، اشرف المخلوقات ہونے کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ اللہ کی کسی اور مخلوق کو غلام بنالیا جائے۔ ہاں فتنہ مگر اور کافر جنات کے لئے یہ حکم نہیں۔ جنات میں اکثریت اب فتنہ پروردوں کی ہے۔ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو آدم زادوں کو ستاتے ہیں۔ سوائسوں کو گیل ڈال دی جاتے تو بے جا نہیں۔ میں ذاتی طور پر اس کے حق میں بھی نہیں۔ اللہ جانے اور اس کے بندے، ہم کون کسی کو اس ہمارے غلام بنانے والے۔“

”گستاخی معاف حضرت مولانا! پھر تو ستار کو میرا نام آپ نے.....“
 ”صرف تجھے سزا دینے کی خاطر کہ تو نے میری دکان کو آگ لگا کر مجھے مالی نقصان پہنچایا تھا۔“
 مولوی نے میری بات کاٹ دی۔

”ابا جی! وہ بھی یاسف کی حرکت.....“
 ”یہ تو کیوں بار بار اس کی حمایت میں بولے جا رہی ہے؟ ہر قصور یاسف نے کیا؟ یہ بالکل بھولا ہے۔“ مولوی چڑ گیا۔

”میں..... میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ..... کہیں کسی بے گناہ پر ظلم نہ ہو جائے۔ اس کا عذاب تو ہم پر ہو گا نا۔“ زمرس اپنی صفائی میں کہنے لگی۔

جیتتی رہو چند! میں نے دل ہی دل میں اسے شاباش دی۔ اگر تم جیسی عقل سے پیدل آدم زادیاں اس جہان بے ثبات میں ظہور کرتی رہیں تو ہم جن زادوں کے عیش ہی عیش ہیں۔

زمرس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے مولوی نے مجھے قربانک نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”لگتا ہے کہ تو نے میری بیٹی کو کوئی ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ یہ بھی تیرے گمن گار رہی ہے۔ سچ اور جھوٹ کا ابھی پتا چلا جاتا ہے۔ اگر تیری زبان نہ کھلوئی تو میرا نام بھی مولوی کفایت اللہ نہیں۔“

پھر مولوی نے ”پڑھنت“ شروع کر دی۔ اس مرتبہ زمرس کچھ نہ بولی۔ اس کے بے داغ دامن پر میری وجہ سے داغ لگا جا رہا تھا تو وہ کیوں ”داغدار“ ہوتی۔

مولوی بد بخت کی ”پڑھنت“ کا انجام جلد ہی میری چیخوں کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ میری دہی حالت ہو گئی جو ستار کے عمل کرنے کے دوران میں ہوئی تھی۔ اس پر یہ ستم مزید ہوا کہ نادیہہ جال کا دباؤ بردھتا ہی چلا گیا۔

”سچ بول دے ورنہ مار ڈالوں گا تجھے۔“ مولوی نے مجھے بندر بچکی دی۔

میں نے انتہائی تکلیف کے عالم میں بھی اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے۔ میری زندگی کا انحصار زبان نہ کھولنے پر تھا۔ سچ بول دیتا تو یقینی طور پر مارا جاتا۔ سواذیت ستار ہاں تک کہ میری جگر خراش چیخیں سن کر ”مولوں“ یعنی زمرس کی ماں صحن میں آ گئی۔ میں اسے ”نپائی“ تو نہیں دے رہا تھا مگر ”سنائی“ ضرور دے گیا۔

”ارے یہ کون بے چارہ چیخا جا رہا ہے اتنی زور زور سے؟“ بڑھیا نے دُور ہی سے ہانک لگائی۔ وہ یا

نماز پڑھ چکی تھی یا پھر دو چار رکعت چھوڑ کر آ گئی تھی۔

مولوی تو دباؤ ب ”پڑھائی“ میں لگا ہوا تھا، کیا بولتا، ہاں زمرس نے بڑھیا سے ضرور کچھ ”کھسر پسر“ کی۔ وہ اپنی ماں کے قریب جا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ میری تو جان پر پنی تھی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ آخر کار ”اٹنا غلیل“ ہو گیا، یعنی مجھے ہوش نہ رہا۔

مجھ پر زیادہ عرصے بے ہوشی طاری نہ رہی۔ یہ عرصہ غالباً چند منٹ کا ہو گا۔ اندازہ اس سے ہوا کہ بڑھیا کو میں نے مولوی کی خبر لیتے دیکھا۔

”ارے کیوں ایک مظلوم کی آہ لے رہے ہو؟“ بڑھیا اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔ زمرس نے یقیناً اپنی ماں کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔

”تو بھی اپنی بیٹی کی بولی بولنے لگی۔“ مولوی اس پر غرایا۔ وہ پڑھتا ترک کر چکا تھا اور اب میں اذیت میں نہیں تھا۔

”جنات بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ کا کلام اس لئے تو نہیں کہ تم کسی کو تکلیف پہنچاؤ۔“
 بیٹی کو تو مولوی نے رعب میں لے لیا مگر بیوی دھونس میں نہیں آئی۔ مولوی تنگ آ کر کہنے لگا۔
 ”اب اگر کچھ ہوا تو تمہی دونوں ماں بیٹی اس کی ذمہ دار ہو گی۔ میرا کیا ہے، چھوڑے دیتا ہوں اسے۔ اگر یہ پھر تمہارے داماد اور بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تو مجھ سے نہ کہنا۔“

”کیوں رے بول، کیا نام ہے تیرا..... مجھ سے وعدہ کر کہ اب ادھر کبھی نہیں آئے گا۔“ بڑھیا نے اس طرف دیکھا جدھر سے میری چیخیں سنیں تھیں۔

”اماں! پیاری اماں! بچالو مجھے۔“ میں نے فریاد کی۔ ”ورنہ تو..... قب..... قبلہ مولونا مجھ بے گناہ کی جان لے لیں گے۔“

”ہائے ہائے بے چارہ کس چاؤ سے مجھے اماں کہہ رہا ہے۔“ بڑھیا کا کلیجہ میری فریاد سن کر جیسے منہ کو آ گیا۔ ”میرا بچو بھی اسی طرح مجھے اماں اماں کہتا تھا، برا ہوا اس چچک کا جو میرے سچو کو اچک لے گئی۔ آج کو زندہ ہوتا تو.....“ بڑھیا نے باقاعدہ ”بھوکڑا“ دینا شروع کر دیا۔

”چپ ہو جاؤ خدا کے لئے۔ یہ تمہیں اس وقت ساجد کہاں سے یاد آ گیا۔ تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے میں نے کہ اللہ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی۔ دس برس سے زیادہ ہو گئے۔ مگر تمہاری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی۔“ مرحوم بیٹے کے ذکر پر آخر پھر دل مولوی بھی اندر سے شاید پھٹل ہی گیا اور مجھ سے بولا۔ ”جا اپنے ساجد کے صدمے تجھے آزاد کیا میں نے۔“ پھر اس نے کچھ پڑھ کر چھوٹک ماری۔ نادیہہ جال کی گرفت ختم ہو گئی۔

میں نیم جان ہونے کے باوجود وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے کتے کا کانا پانی سے بھاگتا ہے۔ اس وقت میری حالت غیر ہو رہی تھی جب مطلوبہ ویران مکان تک پہنچا۔ یہ وہی مکان تھا جہاں میں، یاسف کو دوتا چھوڑ گیا تھا۔ وہ ظالم ابھی تک نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میری ”ہائے ہائے“ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”کیا ہوا تجھے اے علیائش!“

”یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا..... ہائے۔“

”تیری حالت تو واقعی بہت خراب لگتی ہے۔“ یاسف فکر مند ہو گیا۔ ”کسی حکیم کو لے کر آؤں؟“

”یہ..... یہ روحانی زخم ہیں اے یاسف! کسی طبیب کے بس کا روگ نہیں۔“ میں نے کراہے ہوئے بتایا۔

”تو پھر تجھے ہاموس کے پاس اٹھا کر لے چلوں؟“

”اور اگر میں راستے ہی میں آخری منزل کی طرف کوچ کر گیا تو؟“

”خدا نہ کرے اے میرے دوست! تو گھبرا مت! میں یسین ہاموس کو بلاؤں.....“

”وہ نہیں آئے گا یہاں کہ یہ آدم زادوں کی بستی ہے۔ پھر..... پھر اگر تیری غیر موجودگی میں میرا کام تمام ہو گیا تو وقت آخر کوئی سورۃ یسین سنانے والا بھی نہ ہو گا۔“

”مجھے میرے باپ ملیتا ہے بچپن میں کچھ قرآنی آیات ایسے مواقع کے لئے یاد کرائی تھیں کہ جب روحانی اذیت پہنچے تو انہیں پڑھ کر مریض پر دم کر دیا جائے انشاء اللہ شفا ہوگی۔ میں وہ آیات پڑھ کر ابھی دم کرتا ہوں لیکن..... اس کے لئے تو پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ میں آیا ابھی راوی میں غوطہ لگا کر۔“ یہ کہتے ہی یاسف غائب ہو گیا۔

یاسف کو واپسی میں چند ہی لمحے لگے۔ پھر اس نے جب قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر دم کیں تو جیسے مجھے قرار آ گیا۔ ایسا سکون ملا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں گہری نیند سو گیا۔ اللہ کے کلام میں واقعی بڑا اثر ہے۔

☆=====☆

آنکھ کھلی تو یوں لگا کہ کوئی تکلیف ہی نہیں تھی۔ یاسف میرے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے میرا حال پوچھا۔ اس وقت اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں اب‘ تو نے تو واقعی کمال کر دیا۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اب تو بھی جا کے راوی میں ایک غوطہ لگا آ۔ پھر تجھ سے بات ہوگی کہ تیری یہ حالت ہوئی کیسے۔“ یاسف نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے یاسف کا مشورہ مان لیا اور راوی کنارے پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں دریا میں غوطہ لگاتا ایک آدم زاد کی گھنٹی گھنٹی سی چیخ مجھے سنائی دی جیسے کسی نے اسے جینے سے روکنے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ کچھ ہی فاصلے پر بھاریاں تھیں۔ چیخ ادھر ہی سے سنائی دی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”خاموشی سے پڑی رہ! اگر جیتی چلائی تو گھگھایا دوں گا۔“ یہ کسی آدم زاد کی آواز تھی جو بھڑیے کی طرح غرایا تھا۔

آدم زادوں میں طرح طرح کے درندے بھی ہوتے ہیں۔ مگر شکلیں آدمیوں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی کوئی درندہ ہی تھا جو کسی بھولی بھالی آدم زاد کو اٹھا لایا تھا۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ

دیکھوں! معاملہ کیا ہے۔

میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک آدم زاد نے کسی کو پچھاڑ رکھا تھا لیکن ابھی ”چھری“ نہیں پھیری تھی۔ آدم زادی دولتیاں بھاڑ رہی تھیں۔

”اے! یہ بہت بڑی بات ہے۔“ میں بول اٹھا۔ ”پہلے پچکارا تو مار لیتا۔“

آدم زاد میری غیر انسانی آواز سن کر اتنی زور سے اچلا کہ پچھڑی ہوئی اھڑنا کر کو موقع مل گیا۔ وہ بچے سے نکل گئی اور ”پچاؤ“ ”پچاؤ“ کہتی ہوئی دریا کی طرف بھاگی۔

میں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا ورنہ بھری جوانی میں دریا برد ہو جاتی۔ بوکھلاہٹ میں اسے سستوں کا دھیان نہیں رہا ہو گا۔ اتنے میں آدم زاد اسے کوئی کبوتری سمجھ کر کسی شکرے کی طرح اس پر جھپٹا۔ میں نے لات ماری تو بلبلہ کر دور جاگرا۔ وہ سمجھا شاید یہ آدم زادی کی کارروائی ہے۔ گالیاں بکتا ہوا وہ اٹھا اور دوسری مرتبہ بھی اسے زمین چاٹنا پڑی۔ آدم زادی کی کلائی میں نے پکڑ رکھی تھی۔ وہ لانچا باندھے تھی اور

لبا کڑھا ہوا کرتے جسم کے اوپری حصے پر تھا۔ نہ سر پر دوپٹہ تھا اور نہ چادر۔ ماشاء اللہ خاصی صحت مند تھی اسی لئے گینڈے جیسے اس آدم زاد کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ دوپٹہ یا چادر وغیرہ زور آزمائی کے نتیجے میں کیس کر گرا گئی ہوگی۔

”گینڈے صاحب“ اس مرتبہ بڑے بڑے تیلے قدم رکھتے ہوئے بڑھے۔

”بس کر بے۔“ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”ایک عورت کے سامنے شیر بن رہا ہے۔ ابھی تجھے بکری بنا دوں گا تو میاں لگے گا۔“

”گینڈا“ ایک دم ٹھک کر رک گیا۔ حالانکہ ابھی شام ہی تھی مگر اس کے چہرے پر بارہا بچنے لگے۔ بعض چہرے اچانک غلط وقت بتانے لگتے ہیں۔ اھڑنا بھی سم گئی۔

”اے کہاں سے اٹھا کر لایا ہے؟“ جواب دے۔

”اپ..... اپنے گھر سے۔“

”ابے تو کیا گھر میں جگہ نہیں تھی جو یہاں گھیر لایا اسے۔“

پھر مزید سوال جواب کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ وہ آدم زادی مسات خدیجہ اس آدم زاد شوکت عرف شوکی کے بڑے چچا زاد کی بیوہ تھی۔ شوکت بہت دن سے اسے دانہ ڈال رہا تھا لیکن وہ دانہ چکنے پر اندر نہیں تھی۔ خدیجہ کا شوہر اسے ایک عدد بیٹے کا تحفہ دے کر بہ عارضہ تپ دق دنیا سے منسلک کیا تھا۔ اس کے شوہر کو مرے ابھی سال بھر ہوا تھا۔ بیٹا دو سال کا تھا۔ کچھ آدم زادیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ایک مرد کا منہ دیکھ کر کسی دوسرے کے منہ پر اپنا تھوک بھی ضائع نہیں کرتیں۔ خدیجہ بھی ایسی ہی لگتی تھی،

مگر بعد میں اسی روز کچھ اور ہی عقدہ کھلا۔

وہ اس حق میں مبتلا تھی کہ اب صرف اپنے بیٹے کے لئے چنے گی۔ دوسری شادی سے انکاری تھی اور اسی چکر میں اپنی بھابیوں کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ اس کی ایک بھابی ہی نے شوکت کو پیچھے لگایا

فد بھابی بد اطوار کا خیال یہ تھا کہ اگر ایک بار بھی ”پھول ٹٹی“ لٹ گئی تو خدیجہ راہ راست پر آ کر شوکت

”پھر سیکھ لینا“ زیادہ مشکل نہیں۔“ میں نے کہا اور پھر میرے کہنے پر اس نے خدیجہ سے دست درازی کرنے پر معافی مانگ لی۔

اس معاملے میں میری دلچسپی کا سبب صرف خدیجہ تھی۔ اس کی عمر ابھی بائیس سال سے زیادہ نہیں گئی تھی۔ اتنی سی عمر میں بے چاری ایک بچے کی ماں بن کر بیوہ بھی ہو گئی تھی۔ اس کی بھری جوانی یوں ہی رانچاں جا رہی تھی۔ مجھے اس پر بڑا افسوس ہوا۔ سو اسی لئے پوچھ لیا کہ کہاں رہتی ہے۔

”خدیجہ! تجھے پیسوں پیسوں کی طرف سے کوئی تنگی ہو تو بتا دیتا۔“ میں نے ہمدردی جتائی۔ ”میں تیری خبر گیری کو تیرے پاس آتا جاتا رہوں گا۔“

”بھگڑا تو سارا اسی کا تھا جی!“ شوکت بول اٹھا۔ ”چھوٹا بھائی سلیم اللہ اس کا سارا خرچ اٹھاتا ہے۔ دو بڑے بھائی اور بھی ہیں پر ان کی اتنی آمدنی نہیں۔ شبو اسی لئے تو اس سے جلتی ہے کہ کمائے تو اس کا ہاں اور کھائے یہ۔ وہ اسی لئے چاہتی تھی کہ خدیجہ اپنے گھر کی ہو جائے تو اس کی جان چھوٹے، مگر یہ ٹھانی پر تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔“

”کوئی عورت اگر شادی نہ کرنا چاہے تو زبردستی اسے اس پر مجبور نہیں کرنا چاہئے“ یہ گناہ ہے۔“ میں نے عالم ہاموس کے لہجے کی نقل اٹاری، پھر مزید بولا۔ ”بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرنا ہم نیک جن زادوں کا کام ہے لیکن ایک بات تم دونوں ہی کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے کسی سے بھی میرا ذکر کیا تو نہارے لئے بہت برا ہو گا۔ کسی کو کچھ دیا جائے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے اٹھ کو نہ ہو۔ اے خدیجہ! تو پرواہ نہ کر تیرے دن پھرنے والے ہیں۔“ میں نے پیار بھری نظر اس خیار پر ڈالی۔

وہ مجھے دعا دینے لگی اور میں سوچنے لگا کہ چلو آج رات کا بندوبست تو ہو ہی گیا۔ خدیجہ کی چادر ہاں بھاڑیوں کے چپچپے پڑی تھی، اوڑھ کر شوکت کے ساتھ چل دی۔

وہ دونوں چلے گئے تو میں نے راوی میں غوطہ لگایا۔ ابھی میں سطح آب پر نہیں ابھرا تھا کہ کسی نے ہراہیر پکڑ کر مجھے نیچے کھینچ لیا اور میں ڈر گیا۔ جنت کی ایک قسم ”غواصوں“ کہلاتی ہے۔ یہ پانی میں رہتے ہیں۔ انہیں بہت سرکش اور قوی کہا جاتا ہے۔ یہ اس قدر کینے ہوتے ہیں کہ جن زادوں کو بھی اذیت پہناتے سے باز نہیں آتے۔ میرے خوف کی وجہ یہی تھی اور پھر میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔

”اے کم ذات! مجھ ہامہ کی سن۔ خدیجہ کا خیال دل سے نکال دے۔“ اس نے مجھے گرفت میں لے کر سطح آب پر لے آیا۔

”بھائی ہامہ! تم کیا کہہ رہے ہو“ میں کچھ سمجھا نہیں۔ ”میں عاجزانہ آواز میں بولا۔

”خدیجہ ایک بار میرے تصرف میں رہ چکی ہے، اب سمجھ میں آیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ نہ بھائی نہیں تھی اور ہامہ بس ایک ہی دفعہ کسی آدم زاد پر ہاتھ ڈالتا ہے، دوبارہ نہیں اور سننے کا کہ آدم زاد کسی آدم زاد کے کام کی نہیں رہتی اور نہ ہی کوئی جن زاد اسے اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔“

کی جو رو بننے پر راضی ہو جائے گی۔ بھائی ہی نے اسے ہسلا پھلا کر شوکت کے ساتھ بھیجا تھا کہ اس کے ساتھ جا کے شوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھ آ۔ خدیجہ غریب نے کبھی قبرستان دیکھا نہیں تھا، تھی بھی ان پڑھ۔ سو شوکت اسے ادھر لے آیا جہاں نہ کوئی بندہ تھا نہ بندے کی ذات۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اللہ کے پکڑ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کھلی آنکھوں بھی ٹپائی نہیں دیتے۔

آدم زادیوں کے ساتھ اگر ہم جیسے جن زاد زبردستی پر اتر آئیں تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن خود بھی آدمی ہو کر اپنی ہی نسل کے ساتھ ایسی حرکات نازیبا قطعی درست نہیں۔ آدمی کو آدمی کا دشمن نہیں بننا چاہئے۔ مجھے تو حیرت اس پر تھی کہ خود ایک آدم زاد دوسری کی عزت و آبرو لوٹانے کو آمادہ ہو گئی تھی۔

خدیجہ کی اس بھالی کا نام شوکت نے شبو بتایا تھا۔

”کتنے بچے ہیں شبو کے؟“ میں نے معلوم کیا۔

”ابھی کہاں..... اس کی شادی کو چھ مہینے ہی ہوئے ہیں۔“

شوکت کا جواب سن کر میں کھٹکا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس آفت کی پرکالہ کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ پھر اس نے شوکت سے کس طرح ایسی بات کر لی؟

”تیرا کیا رشتہ ہے شبو سے؟“

میرے سوال پر شوکت کچھ سٹٹایا، پھر بتایا۔ ”وہ میرے ماموں کی بیٹی ہے۔“

”بہن کہتے ہوئے کیا شرم آ رہی ہے تجھے۔“ میں نے طنز کیا۔

”سگی بہن تو نہیں نا جی!“

پھر شوکت کو یہ بھی قبولنا پڑا کہ شبو کی شادی سے پہلے وہ اور شبو گل کھلا چکے تھے اور اب بھی گل کھلانے سے باز نہیں آئے تھے۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ خدیجہ حیران حیران سی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اپنی اس بھالی کو وہ بڑے چاؤ سے چھوٹے بھائی کے لئے بیاہ کر لائی تھی، بعد میں خدیجہ نے مجھے روتے ہوئے بتایا تھا۔

میں نے ان دونوں کو اپنے بارے میں بتایا تھا کہ ایک نیک جن زاد ہوں اور جہاں گناہ ہوتا دیکھتا ہوں فی الفور وہاں پہنچ جاتا ہوں۔

اس پر خدیجہ بولی تھی۔ ”پھر تو جی آپ اللہ کے بڑے نیک بندے ہوئے۔“

”اور کیا“ تم کیا مجھے کوئی لچا لنگھ جن سمجھ رہی ہو۔“

اس کے بعد شوکت نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ آئندہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

”اور اگر شبو نے درغلا یا تو؟“ میں نے سوال کیا۔

”منع کر دوں گا اے۔ آخر مجھے اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔“

”بچ وقت نماز بھی پڑھا کر۔“ میں کسی چاچ کے نیک جن کی طرح اسے نصیحت کرنے لگا۔

”نماز سیکھی تھی میں نے پر جی بھول گیا اب کہ اس میں کیا پڑھتے ہیں۔“

”لیکن اس کی تو شادی بھی ہوئی اور وہ صاحب اولاد بھی بن گئی۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ کر دیا۔

”تو مجھے زرا گھماڑ لگتا ہے۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔“ پھر ہامہ نے جو کچھ بتایا میرے لئے حیران کن ہی تھا۔ آخر میں وہ کہنے لگا۔ ”مجھے آگاہ کرنا میرا کام تھا‘ آگے تو جان۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی ہامہ! اب مجھے چھوڑ دو۔“

”گھبرا گیا۔“ وہ ہنسا اور میرا بازو مروڑ کر مجھے دور پانی میں اچھال دیا۔

میں وہاں سے چپت ہو گیا کہ کہیں ذلیل ہامہ پھر مجھ سے ”تفریق“ نہ لینے لگے۔ میں اس دیران مکان کی طرف ہو لیا کہ جہاں عارضی ٹھکانہ تھا۔

”نوٹے میں تُو نے بڑی دیر کر دی اے علیا لیش!“ یاسف کہنے لگا۔ ”میں تو تیری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔“

خدیجہ کا ذکر تو میں گول کر گیا البتہ ہامہ کے ہاتھوں پکڑے جانے کا واقعہ ذرا طول دے کر بتا دیا۔ در سے واپسی کا جواز میں نے اسی واقعے کو بتا لیا تھا۔

”ہم پر تو پے در پے عذاب نازل ہو رہے ہیں اے علیا لیش!“ یاسف اظہارِ افسوس کرنے لگا۔ ”ان قوی جنات کو ہمیں ستانے میں جانے کیا مزہ آتا ہے۔“

”ابھی تو تجھ سے میں نے دوپہر کا واقعہ بیان نہیں کیا“ سنے گا تو تیرے حواس جواب دے جائیں گے۔ جنات تو خیر ہیں ہی جنات، کبخت آدم زاد ہم سے بھی دو جوتے آگے ہیں۔ میری جو حالت تُو نے دیکھی، معلوم ہے کیا وجہ تھی اس کی..... اب ہمیں اس کیلئے مولوی کفایت اللہ کا کوئی مستقل بندوبست کرنا ہی پڑے گا ورنہ ہم ایک نہ ایک روز اس کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔“ پھر میں نے یاسف کو تفصیل کے ساتھ بتا دیا کہ مجھ پر اس روز دوپہر کیا گزری۔

یاسف خوفزدہ ہو کر بولا۔ ”میراں سے کہیں اور نہ بھاگ چلیں۔“

”کیوں کیا آج رات بملا کے پاس جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ میں نے دانستہ بملا کا ذکر چھیڑ دیا۔

”ہاں ارادہ تھا تو مگر..... اس شرم میں ہمارے لئے خطرات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ مولوی کہیں کسی کو وظیفہ کرنے کے لئے میرا نام نہ بتا دے۔“

میں نے یاسف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سارا الزام اس کے سر تھوپ آیا ہوں، پھر بھی وہ مولوی سے ڈر رہا تھا۔

”نہیں اے یاسف! اس سلسلے میں بھی مولوی سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ جنات کو غلام بنانے کے حق میں نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”پھر اس نے ستار کو وظیفہ تعلیم کیوں کیا، اس کے لئے؟“

”وہ اور معاملہ تھا۔ ایک تو لعنتی ستار کہل ہو گیا تھا، دوسرے مولوی کو مجھ پر شبہ تھا کہ میں نے اس کی دکان میں آگ لگا کر اسے مالی نقصان پہنچایا ہے۔ تجھے اور مجھے تو وہ یوں بھی معاف کر چکا ہے،

اس بد ذات سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تُو ہی تو ابھی اس کے مستقل بندوبست کی بات کر رہا تھا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ میں تو زنگس کو کسی صورت نہیں بھول سکتا اور یہ طے ہے کہ مولوی ضرور آئے گا۔ میں اسی لئے مستقل بندوبست کو کہہ رہا تھا۔ میں نے جس نا دیدہ جال کا تجھ سے ذکر کیا،

ہمارے عاملوں کے پاس تو اس کا کوئی توڑ ہو گا ہی..... بہت سی باتیں ہمیں نہیں معلوم جو تجربہ کار علماء ہی کو خبر ہوں گی۔ ممکن ہے ہاموس ہماری کوئی مدد یا رہنمائی کر سکے۔“

”مشکل ہی ہے۔ وہ تو بس نماز پڑھنے پر لگا دیتا ہے اور آدم زادوں کی آبادیوں میں داخلے سے بھی روکتا ہے۔ پہلے تو وہ یہی کہے گا کہ ہمیں آدم زادوں کی بستیوں میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کوئی فخر پیش آئے۔ پھر بول کہ تو کیا کہے گا؟“

”کوشش کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ کل کسی وقت چلیں گے۔“

ہامہ سے مجھے خدیجہ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس کے باوجود خدیجہ کی طلب کم نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس رات یاسف کو تو میں نے بملا کے پاس ٹھلا دیا اور خود ایک ہندو سیٹھ کی تجوری صاف کر کے خدیجہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں زیادہ تر چاندی کا روپیہ چلتا تھا۔ روپوں کا خاصا بوجھ تھا مگر میرے لئے نہیں۔ ہاں کوئی آدم زاد بیک وقت اس قدر بوجھ نہ اٹھا پاتا۔ ہم جن زاد تو بھاری سے بھاری بوجھ اٹھا لیتے ہیں کہ جسے اٹھانے کا کوئی آدم زاد تصور بھی نہ کر سکے۔

دوسرے دن اپنی تجوری خالی دیکھ کر ہندو سیٹھ پر کیا گزرتی، مجھے اس سے سروکار نہیں تھا۔ یوں ہی وہ کمائی حرام ہی کی تھی۔ ہندو سیٹھ سود پر روپے کے لین دین کا دھندا کرتا تھا۔

چاندی کے روپے میں ایک چادر میں باندھ کر لایا تھا۔ روپوں کی گٹھری کو عارضی طور پر میں نے گھر کی بھت پر رکھ دیا۔ ابھی تو مجھے وہ گھر اندر سے گھوم پھر کے دیکھنا تھا کہ حسین و جوان بیوہ کہاں ہے۔ کبخت شیو نے اسے گھر کی چھوٹی سی ایک کوٹھری میں ڈال رکھا تھا۔ اس کوٹھری میں خدیجہ کے علاوہ اور لڑکا پھوٹا مسلمان بھی پڑا تھا۔ گویا خدیجہ کی حیثیت اس گھر میں نوٹے پھوٹے مسلمان جیسی ہی تھی۔ خود آدم زادوں کی دوسری آدم زادوں پر جتنے ستم ڈھاتی ہیں، آدم زاد بھی نہیں ڈھاتے۔ خدیجہ کی چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں کم ہی جگہ بچی ہوئی تھی۔ چارپائی بھی بس اتنی سی تھی کہ اس کے دو سالہ بچے کے علاوہ کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔ کوٹھری میں بدبو کے بجھکے الگ تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح وہاں سو باقی تھی۔ عموماً جن آدم زادوں کو اپنے شوہروں کے نکل لینے کے بعد جب میکے میں رہنا پڑتا ہے تو ان کی کمی درگت بنتی ہے۔ پہلے جس گھر کو وہ اپنا کہتی تھی، اس پر بھابیوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ وہ ماحول کم از کم میرے لئے بڑا ہی غیر شاعرانہ تھا۔ وہ اپنے لاڈلے پوت کو سینے سے لگائے سو رہی تھی۔ کوٹھری میں بھولسا لپ لب دم تھا کہ اب بھجا کہ تب۔

کچھ سوچ کر میں نے آہستہ سے آواز دی، مگر وہ نہ جاگی تو شانہ ہلایا۔

”کک..... کون؟“ وہ حواس باختہ سی ہو کر اٹھی۔

”میں ہوں‘ ڈرومت۔“ میں نے نرمی کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ”کما تھا میں نے کہ رات آؤں گا۔“

اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔ ”تت تم ہو‘ میں میں تو ڈری مٹی تھی کہ کہ کہیں کوئی چور نہ کھس آیا ہو۔“

”چھت پر چلو اور کوئی چادر بھی بچھانے کو لے لو۔“

”اس اس وقت چھت پر۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

”ہاں مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے اور کچھ دکھانا بھی ہے۔“

”کیا کیا دکھاؤ گے؟“

”وہ جو تم نے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔“

”مگر یہ یہ اس نے اپنے خوابیدہ بچے کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے یہیں سونے دو۔“

”جاگ گیا تو روئے گا اور پھر شبو مجھے کون سے لگے گی کہ چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔ کوئی اور آگیا تو اور مصیبت ہو جائے گی۔ خالی چارپائی دیکھ کر کوئی جانے کیا سوچے۔“

مجھے اس گنواں کی بحث بازی پر غصہ آگیا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے‘ سڑتی رہو اس کو غمری میں اس طرح‘ میں تو چاہتا تھا تمہارے دن پھر جائیں مگر.....“

”چل چل رہی ہوں۔“ وہ درمیان میں بول اٹھی۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کے دن پھر جائیں۔ پھر اسے میں نے تکتے کے نیچے سے ایک ڈبیا نکالتے دیکھا۔ ڈبیا میں انیون تھی جو اس نے بچے

منہ کھول کر کھلے میں تھوڑی سی دبا دی۔ پھر کہنے لگی۔ ”اب کوئی فکر کی بات نہیں‘ یہ سوتا رہے گا سارے گھر کا کام کاج بھی کو کرنا پڑتا ہے‘ اس وقت اسے انیم کھلا کر سلا دیتی ہوں۔“

جب وہ میرے ساتھ کو غمری سے نکل رہی تھی تو لیمپ خود بخود بجھ گیا۔ شاید اس میں برائے نام ی تیل تھا۔

چھت پر چاندنی رات میں جب خدیجہ نے چاندی کی بھکاری سنی تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اس کی سات پشتوں میں شاید کسی نے اتنی ساری دولت نہ دیکھی ہو گی۔ میں نے اس موقع سے تھوڑا فائدہ اٹھانا چاہا‘ لیکن آدم زادیاں کتنی ہی ”غیس غش“ یعنی بے سدھ کیوں نہ ہوں ایسے مواقع پر ایک چوکس ہو جاتی ہیں۔

”یہ یہ کیا کیا.....“ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا‘ نہ دیکھنے کے باوجود صرنا محسوس کر کے۔

”کچھ نہیں‘ تم تو یوں ہی گھبرا گئیں۔“

”تم تم تو کہہ رہے تھے کہ کہ بہت نیک ہو۔“

”یہ بھی تو نیکی ہے۔ تمہارے شوہر کو مرے ایک سال ہو گیا ہے‘ تم ہی نے تو بتایا تھا۔“

”مجھے ایسی نیکی نہیں چاہئے۔“ وہ یقیناً میرا مدعا سمجھ گئی تھی۔ غالباً اسی لئے صاف انکار کر دیا۔

”دولت بھی نہیں چاہئے؟“

”اس کے بدلے بالکل نہیں۔“

پھر میں نے بہت سے آزمودہ حربے آزمائے مگر ناکام رہا۔ ہامہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہامہ نے بتایا تھا کہ شادی سے قبل وہ شادی کی تقریب میں کسی گاؤں گئی تھی۔ وہیں وہ ایک جھیل میں نہائی اور ہامہ کے

ہتے چڑھ گئی۔ کہاں دیو پیکر ہامہ کہاں وہ خیار۔ تبھی سے خدیجہ کے دل میں دہشت بیٹھ گئی۔ قرب اس کے لئے اذیت بن گیا‘ ناقابل برداشت اذیت۔ شادی کے بعد شوہر سے اس کا جھگڑا ہی رہا ہو گا۔ ماں بھی

یقیناً وہ اپنی مرضی یا خوشی سے نہیں بنی ہو گی۔

اس اعتبار سے خدیجہ خوش نصیب ہی تھی کہ شوہر جلد مر گیا۔ پھر دوسری شادی کر کے بھلا وہ کیوں عذاب مول لیتی۔

ہامہ نے اسی لئے مجھ سے کہا تھا کہ خدیجہ کا خیال دل سے نکال دوں۔ دنیا میں بھی ایک سے ایک جب آدم زادی پڑی ہے۔ بظاہر وہ بالکل صحت مند اور بھرپور تھی مگر اندر سے بیمار تھی۔ ایک ظالم جن

ہامہ نے اس پر یہ ظلم کیا تھا کہ فطری تقاضہ پورا کرنا اس کے لئے اذیت ناک بن گیا تھا۔

میں پہلے ہی سے اس کے لئے تیار تھا وہ ایک دفعہ اٹھ کر بھاگی تو میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہامہ نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔

اس رات مجھے ایک نیا تجربہ ہوا‘ کسی آدم زادی پر ظلم و زبردستی کا تجربہ۔ اس کا اثر مجھ پر کچھ اچھا

عرب نہیں ہوا۔ وہ بعد میں جب رو رہی تھی تو میں نے اس سے خلوص دل کے ساتھ معافی مانگی۔ وہ

سکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تم تم بھی اسی اسی ظالم کی طرح ہو جو مر گیا۔“

”اب ایسا کبھی نہیں ہو گا خدیجہ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ.....“

”چپ رہو‘ بے شرم لے جاؤ اپنی یہ دولت۔“

”دولت کا اس بات سے کیا تعلق؟“

”تم اسی کے بل پر تو مجھے خریدنے آئے تھے۔ تو تو میں بکاؤ مال نہیں ہوں۔ مجھے شوکت سے چھڑا کر تو تم بڑے نیک بن رہے تھے‘ مگر نکلے بد معاش۔“

خدیجہ نے مجھے بہت برا بھلا کہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا کہ قصور وار تھا۔ میرا ضمیر مجھ پر ملامت

کر رہا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے وہ روپے لینے پر راضی ہوئی۔ اس کی کو غمری میں لکڑی کا بڑا سا ایک صندوق تھا جس میں چھٹے پرانے اور کچھ پسینے کے قابل کپڑے تھے۔ میں نے انہی کے نیچے روپے چھپا

بیٹے۔

”اگر کسی نے پوچھ لیا کہ اتنی دولت کہاں سے آئی پھر؟“ اس نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

”ضرورت کیا ہے‘ کسی کو دولت دکھانے کی۔ تھوڑے تھوڑے روپے نکال کر خرچ کئے جاؤ۔ میں

نہیں اس کی ایک ترکیب سمجھاتا ہوں۔ کل ہی سے اس پر عمل شروع کر دو۔ پھر دیکھنا‘ سارے گھر پر

تمہارا ہی راج ہو گا۔ کیا تمہارے بھائی اور کیا بھابھیاں، سب تمہارے ناز اٹھائیں گے۔“ پھر میں اسے ترکیب سمجھانے لگا۔

”تم آتو جاؤ گے نا وقت پر؟“ جب میں چلنے لگا تو اس نے پوچھا۔

”ہاں آ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا اور وہاں سے چلا آیا۔

وہ رات بڑی ہی بے مزہ گزری۔ سونے سے پہلے خدیجہ کا مظلوم چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار کسی آدم زاد کی قرب پر مجھے انتہائی پشیمانی کا احساس ہوا۔ اسی کے ساتھ مجھے ہمارے بھی بہت غصہ آیا جس حرامی نے ایک آدم زاد کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو اس کے گلے کر دیتا، مگر اللہ میاں مجھے کو اسی لئے ناخن نہیں دیتا کہ کھیا کھیا کر نہ مر جائے۔ میں یہ سوچے ہوئے سو گیا کہ جب کل عالم ہاموس سے ملوں گا تو دھکے چپے لفظوں میں یہ ذکر بھی کر دوں گا۔ کیا خبر اس کا کوئی علاج ممکن ہو۔ اس تلخ واقعے کو بھلانے کی خاطر میں نے زمر کے حسین سراپا کا تصور کیا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ میں اسی دیران مکان میں تھا اور یاسف میری آنکھ لگنے سے قبل لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ صبح دم ہی واپس آیا۔ میں اس وقت تک جاگ چکا تھا۔

”اے علیالیش! کیا تو آج رات زینت کے پاس نہیں گیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں تو

سمجھا تھا کہ تو وہیں جائے گا۔“

”اب جانے کا ارادہ ہے۔“

”دن میں؟“

”ہاں ایک جعلی عامل کی خبر لیتا ہے۔“ میں نے اسے ”اکئی پیر“ کے بارے میں بتا دیا۔

”زینت نے کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔“

”خود زینت اسے جعلی سمجھتی ہے تو تجھ سے کیا ذکر کرتی..... خیر چھوڑ اس بات کو آج ہاموس

کے پاس چلتا ہے، یاد ہے نا تجھے؟“

”دوپہر کو چلیں گے۔ اس وقت تو مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”کیسی بھ رہی ہے بھلا کے ساتھ؟“

”بہت عمدہ..... بس ذرا سی کٹ کھتی ہے۔“ یاسف ہنس کر بولا۔

”تجھے اس نے اپنے پیچھے جنم کا پتی مان لیا کہ نہیں؟“

”پچھلا تو پچھلا، وہ تو اب جنم جنم ساتھ رہنے کو کہہ رہی ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے، تو اچھا جا رہا ہے۔“

پھر میں ”عورتوں کی قطار“ کا معائنہ کرنے زینت کے گھر جا پہنچا۔ حافظ جی کا نام مجھے ”اکئی پیر“ ہی لگا۔ واقعی وہاں صبح ہی سے قطار لگی ہوئی تھی۔ عورتیں ابھی سے صحن میں دھرتا مارے بیٹھی تھیں کہ نہر جلدی آ جائے۔ بڑھیوں کی اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اتنی ساریوں میں مجھے ایک ہی جوان جمان آتا۔ زادی کچھ ٹھیک ٹھاک لگی۔ اس کی بھی ایک حرکت میرے ذوق جمال پر گراں گزری۔ بار بار وہ اپنی ایک

انگلی کو منہ میں لیتی اور چوسنے لگتی۔ بچپن میں انگوٹھا چوسے چوسے جانے کب وہ یہ بھول گئی تھی کہ انگوٹھے کی جگہ انگلی منہ میں نہیں لی جاتی، وہ بھی جوان ہو کر۔ ”اکئی پیر“ ابھی نہیں آیا تھا مگر اس کے لئے زینت کے کمرے میں چوکی بچھا دی گئی تھی۔ زینت کے والدین اپنے کمرے میں تھے۔

زینت چارپائیاں اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑی کر رہی تھی کہ میں قریب جا کر بولا۔ ”ملا رحیم الدین نے تو کوئی نیا حرامی پن نہیں کیا؟“

”ارے!“ اس نے چونک کر کہا۔ ”میں رات کو تمہارا انتظار کرتی رہی اور تم اب آئے ہو محبوب!“

”میرے محبوب کو!“ میں نے اس کی ٹھوڑی کے گڑھے میں انگلی رکھ دی۔

”اس وقت تو ممکن نہیں کہ.....“

”میں آج تم سے نہیں اکئی پیر سے ملنے آیا ہوں، جان محبوب!“

”تم حافظ جی کو اکئی پیر کہہ رہے ہو، نا؟“ وہ زور سے ہنس پڑی۔

”ہاں۔“ میں بھی دھیرے سے ہنس دیا۔ ”آج اس کی اکئیاں تمہاری۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے اپنے بڑے بڑے دیدے گھمائے۔

”ہر مینے کی آخری جمعرات کو وہ یہاں سے جو مال کما کر لے جاتا ہے، اس میں تمہارا بھی تو حصہ ہونا

چاہئے۔ تم لوگوں کو اس نے خواہ مخواہ میں دھربنا رکھا ہے۔“

”چھوڑو مجھی ہمارا کیا جاتا ہے، بس دوپہر کو روٹی ہی تو کھانا پڑتی ہے۔“

”اچھا تو وہ یہاں روٹی بھی کھاتا ہے، سرامفت خورہ۔“

اس پر زینت پھر زوردار آواز میں ہنسی۔ باہر صحن میں موجود ایک بڑھیا اس مرتبہ بول ہی اٹھی۔

”ارے بچی! کیسے تجھ پر بھی تو کسی جن کا اثر نہیں ہو گیا۔ بلاوجہ ٹھٹھے لگائے جا رہی ہے۔ ابھی کتنی ہوں

تیری ماں سے کہ اسے بھی حاج جی کو دکھاؤ۔“

عین اسی وقت اکئی پیر کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا۔ سب عورتیں، لڑکیاں اور بچے احتراماً اٹھ کر

کمرے ہو گئے۔ اکئی پیر صورت سے بڑا بھولا دکھائی دیتا تھا۔ سر پر پگڑ بندھا تھا، بھاری جسم پر ڈھیلا کرتہ

اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنے تھا، آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر پان کا لالکھا جما تھا، ہاتھ میں پان کی ڈبیا،

چھالیا اور تمباکو کا بوٹا نیز ہزار سی تیج تھی، کاندھے پر بڑا سا رومال پڑا تھا، داڑھی ترشی ہوئی اور خضاب

آلودہ تھی، دراز مندی لگے بال کاندھوں سے نیچے تک آ رہے تھے۔ یہ تھا اکئی پیر۔ وہ چوکی پر جوتے ایک

طرف اتار کے بیٹھ گیا اور کاندھے پر موجود رومال دائیں جانب بچھالیا۔

”زینت بیٹا! تو باہر جا اور ایک ایک کر کے مریموں کو اندر بھیجتی جا۔“ اکئی پیر نے زینت کو مخاطب

کیا۔ ”ہاں میری پھل اور لمٹس بھی لا دیجو، اپنی ماں سے۔“

یہ ”فرض“ زینت کو شاید ہر مینے انجام دینا پڑتا تھا۔ زینت کمرے سے چلی گئی، مگر میں نہ ملا۔

دھندہ ذرا دیر کے بعد شروع ہو گیا۔ پہلی عورت اندر آئی، عمر بچپن سے اوپر ہی لگتی تھی۔ زیادہ تر

بال سفید تھے۔

”حجور کا نام سن کے میں بڑی دور سے آئی ہوں۔“ عورت چوکی کے نیچے بچھی چادر پر بیٹھتی ہی بولی۔

”اکنی بھی لائی ہے کہ نہیں؟“

عورت نے چادر کے پلو سے اکنی کھول کر آگے بڑھا دی۔ ”روال پر رکھ دے۔ اکنی کھوٹی ہوئی تو تیرا کام نہیں ہو گا، یہ سمجھ لے۔“

”بالکل کھری ہے حجور!“ عورت نے یقین دلایا۔

”ہاں بول، کیا مرض ہے تجھے؟“

”کسی جاہلم نے میری کوکھ باندھ دی ہے۔ آٹھ لڑکیاں ہو چکی ہیں، لڑکا ایک نہیں ہوا۔“

”لڑکا چاہتی ہے تو سات جھڑتوں تک حاضری دیتا ہوگی، اکنی ہر مرتبہ لانی ہے۔“ اس کا سارا زور اکنی پر تھا۔ گویا اس نے سات مہینے کے لئے عورت کو اپنا گاہک بنا لیا تھا، پھر بولا۔ ”تجھے میں اگلی جھڑت کو ایک گنڈا دوں گا، پڑھ کر، اسے ہر وقت کمرے سے کس کر باندھ رکھنا ہے۔ گنڈا ڈھیلا ہوا تو عمل بیکار ہو جائے گا۔“ اکنی پیر نے پہلے ہی سے اپنی بچت کر لی کہ بعد میں گنڈا ڈھیلا ہو جانے کا بمانہ کر سکے۔

”گنڈا آج ہی دے دیں حجور!“ عورت عاجزی سے بولی۔

”یہ گنڈا پڑھنے کا وقت ہے؟ دیکھتی نہیں کہ کتنے حاجت مند باہر بیٹھے ہیں۔ تیری کوکھ میں ایک بد ذات جن بیٹھ گیا ہے، اسے نکالنے کے لئے گنڈا پڑھنا پڑے گا۔ تو کیا اسے کوئی کھیل تماشا سمجھ رہی ہے۔ مجھے سات روز تک بعد نماز عشاء اس کے لئے آدھی رات تک کینڈا کاڑھ کر بیٹھنا پڑے گا۔ مفت میں اکنی نہیں لیتا ہوں۔“

”جھوٹ بول رہا ہے یہ۔“ میں ایک دم بول اٹھا۔ ”بڑی بی! اب تمہاری عمر نہیں رہی ماں بننے کی۔ یہ اکنی پیر جعلی ہے۔ اس کے اجابی نے بھی کبھی کوئی جن نہیں نکالا ہو گا۔“

میری آواز سننے ہی اکنی پیر اچھل پڑا۔ ایسے موقعوں پر عموماً بچھو کے ڈنک مارنے کی مثال دی جاتی ہے مگر میں کوئی بچھو نہیں ایک عدو جن زاد علیائش ہوں اس لئے ہرگز یہ مثال نہیں دوں گا۔ بڑی بی غش کھا گئیں۔ اچھا خاصا بھڑنگ پھیل گیا۔ ہر طرف یہی پکار تھی، جن آگیا، جن آگیا۔

صحن میں جمع عورتیں سر پر پیر رکھنا بھی بھول گئیں اور سر پر پیر رکھے بغیر ہی بھاگ اٹھیں۔ اکنی پیر یوں سمجھا سہت، یعنی محفل کا ”دی اینڈ“ لگتے دیکھ کر خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کبیدہ خاطر اور کچھ اداس بلبل کے مانند چوکی پر ٹھونٹ کا آلو بنا بیٹھا رہ گیا۔

”اے“ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کمرے میں جنت آتے ہیں۔ ”زینت کی ماں معصوم النساء کی آواز باہر سے آئی۔

گھر والوں اور اکنی پیر کے سوا سارے بیچھی اڑ گئے۔ وہ بھی چوکی سے اٹھنے والا تھا کہ میں نے اس کے دراز گیسو پکڑ لئے۔ ”تو کہاں چل دیا مردود!“ میں نے بالوں کو جھٹکا دیا۔

”ہائے مر گیا۔“ اکنی پیر چیخا۔

”تو ابھی سے کیسے مر جائے گا حرام خور۔ تجھے تو ابھی اور بہت سے غریبوں کو لوٹنا ہے۔“ میں نے یہ کہنے ہی اس کی پگڑی اتار لی۔

”اری او زینت! یہ تو کدھر چلی۔ اندر حاجی جی سے جن کا مقابلہ ہو رہا ہے، کہیں وہ جن تجھ پر نہ چڑھ جائے۔“

”میں نہیں ڈرتی اماں! کسی جن دن سے۔ میں تو ان بڑی بی کو اٹھانے جا رہی ہوں جو اندر بے ہوش پڑی ہیں۔“ زینت کی آواز سنائی دی۔

پھر زینت کا باپ وحید بھی اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ مگر وہ نہیں رکی۔ اسے بھلا مجھ سے ڈرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب تک زینت کمرے میں داخل ہوئی میں اس اکنی پیر کو تنگی بنا چکا تھا، یعنی اس کی پگڑی سے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر زمین پر ڈال دیا تھا۔

”ارے ماموں! یہ آپ کو کس نے باندھ دیا؟“ زینت کے حسین ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

”کک..... کھول..... بیٹی مجھے کھول دے..... لگ..... لگتا ہے میرا وظیفہ الٹا ہو گیا ہے۔“ اکنی پیر نے اپنی درگت بننے کا جواز پیش کیا۔

”بالکل نہیں، جب تک تو اس دھندے سے توبہ نہیں کرے گا، تجھے میں باندھ کے رکھوں گا۔ حرام کی کمانی کھا کر تیرے جسم پر کتنا بد گوشت چڑھ گیا ہے۔ ابھی تو میں تجھے الٹا ٹانگوں کا بیٹے! تیرے باپ نے بھی کبھی کوئی وظیفہ پڑھا ہے۔ ان پڑھ عورتوں کو آلو بنا کے ان سے انکیاں لیتا ہے خبیث۔“

اکنی پیر واقعی جعلی نکلا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ قرآنی آیات کے یاد نہیں ہوتیں مگر جو حرام کھاتا ہے، اس کے پڑھنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

زینت نے میری آواز سے اندازہ لگا کر کہ میں کہاں ہوں، قریب آ کے سرگوشی کی۔ ”اتنا بہت ہے، ماموں کو چھوڑ دو۔“

”اسے توبہ کر لینے دو، چھوڑ دوں گا۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

زینت کے ہاتھ میں بانی بھرا کٹورا تھا، اس نے بے ہوش بڑی بی کے منہ پر چھینے مارے۔ بڑی بی کو ہوش آ گیا تو وہ بھی اٹھ کے بھاگ لی۔

”نہیں..... اب کسی کو دھوکا نہیں دوں گا۔“ کو لمے پر لات پڑتے ہی اکنی پیر چیخا۔

”بول تو نرا جاہل ہے کہ عال؟“

”جاہل..... میں بالکل جاہل ہوں۔“ اکنی پیر نے اپنی جہالت کا اعتراف کر لیا۔ ”مجھے کچھ..... کچھ نہیں آتا۔ م..... میں عامل نہیں ہوں۔“

حسب وعدہ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھولتے ہوئے دھکی دی۔ ”اب اگر میں نے کہیں تجھے یہ ہوا نگ بھرتے دیکھ لیا تو سالے زندہ گاڑ دوں گا، کسی قبرستان میں لے جا کر۔“

کھلتے ہی اکنی پیر ریس لگا گیا۔ وہ ننگے پیر اور ننگے سر ہی دوڑ لیا تھا۔ اس پر زینت کی ہنسی چھوٹ

گئی۔

”اے لو! اب وہ جن‘ زینت پر چڑھ گیا..... دیکھ رہے ہو، کس طرح پاگلوں کی طرح اس کے ہنسنے کی آواز آرہی ہے۔“ معصوم النساء شاید اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔

”میں اب چلا..... اور اب یہ ہنسا بند کرو۔ تمہاری اماں دن ديساڑے مجھ پر بڑے نازیبا الزامات لگا رہی ہیں۔“ میں دھیمی آواز میں بولا۔

”رات کو تو آؤ گے نا؟“ زینت نے دھیرے سے پوچھا اور نظریں نیچی کر لیں۔

”دیکھا جائے گا، موقع ملا تو ضرور آؤں گا۔“ میں یہ کہتے ہی وہاں سے چل دیا۔

خلاف توقع اکتی پیر کی محفل جلد اجڑ گئی تھی اس لئے جب میں ویران مکان میں پہنچا تو یاسف کو خواب ہی تھا۔ کچھ دیر کو میں بھی سو گیا۔

دوپہر کے وقت یاسف کو ساتھ لے کر میں شہر سے نکلا اور جلد ہی ہاموس کی ویران حویلی میں پہنچ گیا۔ اس وقت ہاموس ظہر کی نماز پڑھنے کھڑا ہو چکا تھا۔

”سنو! مجھے اکیلے میں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ بہت ہی دھیمی سرگوشی میں نے سنی۔ آواز غیر انسانی ہی تھی اور میرے لئے قطعی اجنبی۔ وہ کوئی جینیہ ہی تھی۔ یاسف مجھ سے ذرا فاصلے پر تھا۔ دھیمی آواز میں مجھے پھر مخاطب کیا گیا۔ ”جس جگہ تم حویلی میں رہتے تھے، وہیں آ جاؤ۔“

”یاسف! اتنے میں ہاموس نماز پڑھے، میں ابھی آیا۔“ میں نے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اسی حویلی میں، کہیں اور نہیں، تم بیٹھو۔“ یہ کہتے ہی میں رکائیں اور دوسرے ہی لمحے حویلی کے شگتہ کمرے میں پہنچ گیا۔

کم ہی کوئی جینیہ اتنی حسین ہوگی جتنی وہ تھی۔ اس کے حسن کی تپش میں نے واضح طور پر محسوس کی۔

”اے علیالیش، اے میری جان! تو نے مجھے ہوش و حواس کھونے پر مجبور کر دیا ہے۔“ پہلی ہی ملاقات میں اس نے اظہار عشق کر دیا۔ جن زادیاں عموماً آدم زادیوں کی طرح بے جا تکلفات میں وقت ضائع نہیں کرتیں۔ وہ ”ڈائریکٹ ایکشن“ کی قائل ہوتی ہیں۔

”مگر تو ہے کون؟ پہلے کبھی تجھے دیکھا نہیں۔“

”میں، ہاموس کی بیٹی وازعہ ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کراتے مجھ سے ”فری“ ہونے کا آغاز کر دیا اور بولی۔ ”میرا باپ مجھے باہر نہیں نکلنے دیتا حالانکہ میری عمر دو سو سال ہو چکی ہے اور میں اب کوئی بچی نہیں ہوں۔“ وازعہ مجھ سے مزید قریب ہو گئی۔

”پھر تو مجھ سے بھی پچاس برس بڑی ہوئی تو! میرا تیرا جوڑ کیسے بیٹھے گا اے وازعہ!“

”سو پچاس سال سے کوئی ایسا خاص فرق نہیں پڑتا۔ تو پہلا جن زاد ہے کہ جسے میں نے اپنے قریب کیا ہے۔“

”وہ تو خیر ٹھیک کتنی ہو تم مگر مجھے ہاموس سے ڈر لگتا ہے۔“

”تو ہم یہاں سے کہیں بھاگ چلیں گے۔“ وہ مجھے کسی آدم زادی کی طرح ترغیب گناہ دینے لگی۔

”تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ جب تو ہماری حویلی میں تھا تو میں تجھے رات کو چھپ چھپ کر دیکھتی تھی۔“ پھر اس نے ایک اور تجویز رکھی کہ مجھے زنجیر کر سکے۔ ”تو میرے باپ سے بات کر کہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔“

”اور اگر اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تجھے کب اور کہاں دیکھا، پھر؟“ میں بولا۔ ”اسے شک ہو جائے گا کہ جب میں یہاں رہا تھا تو تجھے درغلا لیا ہو گا۔ ہر چند کہ معاملہ اسطرح ہے۔“

”اب جو بھی ہو۔“ وہ بہت جلدی میں تھی کہ کسی طرح فی الفور باہر نکل جائے، شاید اسی لئے جہالت کے پردے جلدی جلدی اٹھانے لگی۔

میں بھی جذبات کی لہر میں بننے والا تھا کہ یاسف کی آواز سنائی دی۔ ”ہاموس آخر کا رکعت پڑھ رہا ہے اے علیالیش!“

خطرے کی گھنٹی آخر بج ہی گئی۔ وازعہ سٹپٹا کر میری آغوش سے نکلی اور غائب ہو گئی۔ یاسف کے لئے میری تلاش کوئی مشکل نہیں تھی۔ میرے جسم کی مخصوص خوشبو سے وہ مجھ تک پہنچ گیا تھا، بس اتنی شرافت برتی تھی کہ سامنے نہیں آیا اور دور ہی سے آواز دے لی۔

”اے علیالیش! تو کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے؟“ وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ”میرے دوست! ہاموس سے ٹکرنے لے۔“

”تو کون لے رہا ہے ٹکرنے۔ تجھے تو خبر ہے، جن زادیاں ایک چھوڑ دونوں آنکھوں نہیں بھاتیں۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”یوں بھی ہاموس یاد الہی میں غرق ہو گا، اسے تو ہوا بھی نہیں لگی ہو گی۔“

”مگر ہوا لگتے دیر کتنی لگتی ہے..... اچھا چھوڑ، اس پر بھی بات کریں گے۔“

ہم دونوں پھر اسی جگہ آ بیٹھے کہ جہاں ہاموس تھا۔ اس نے سلام پھیرا ہی تھا کہ ہم پہنچ گئے۔ دعا مانگ کر اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بولا۔ ”اے علیالیش! کہیں پھر تو کسی آدم زاد نے تیرے لئے عمل شروع نہیں کر دیا؟“

”نہیں اے ہاموس! ہم تجھ سے کچھ اور جاننے آئے ہیں کہ تو صاحب علم ہے۔“ میں نے ہی بات شروع کی۔ ”یہ بتا کہ کسی گھر کو کیل دینے کا مطلب کیا ہے؟“

”تجھے یہ جاننے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ کہیں تو بغیر اجازت کسی آدم زاد کے گھر میں تو گھسنا نہیں چاہتا؟“

”در اصل معاملہ اس کا نہیں میرا ہے۔“ یاسف بول اٹھا اور ظاہر ہے کہ جھوٹ ہی بولا۔ ”میں ایک ویران مکان میں مقیم تھا۔ مالک مکان اسے گرا کر دوبارہ بنوانے کی غرض سے وہاں آیا تو اپنا ٹھکانا بچانے کی خاطر میں نے اس کو ڈرا کے بھاگ دیا۔ کل وہ ایک مولوی کو لے آیا جو کہنے لگا کہ میں اس مکان کو کیل لاس گا تو پھر کوئی جن یہاں داخل نہیں ہو گا۔ تجھی سے مجھے فکر لگی ہے کہ جانے کیا ہو۔“

”وہ مکان ہے کہاں؟“

”شر میں۔“ مجبوراً یاسف کو بتانا پڑا۔

”پھر تو فوراً تو اسے خالی کر دے۔ ہر چند کہ کسی ویران یا غیر آباد جگہ جنت کو رہنے کی ممانعت نہیں لیکن مکان کو اگر صاحب مکان آباد کرنا چاہے تو یہ اسے جائز ہے۔ وہ مکان اس آدم زاد کی ملکیت ہے تیری نہیں۔ اول تو تجھے شر میں رہنے سے گریزی ہی کرنا تھا۔ کیا ضرورت ہے بلا سبب خطرے میں رہنے کی۔ ویرانے ہمارے لئے کم تو نہیں۔“

”تیرا مشورہ صائب ہے اے ہاموس!“ یاسف نے بلا جھجک اقرار کر لیا۔ ”اب میں اس مکان کا رخ نہیں کروں گا لیکن یہ تو بتا دے کہ کیلنا ہے کیا؟ آئندہ محتاط رہا جاسکے۔“

”مکان کے چاروں کونوں میں تعویذ لکھ کر گاڑ دیئے جاتے ہیں، کیلنے کا ایک عام طریقہ تو یہ ہے۔“ ہاموس بتانے لگا۔ ”کیلنے کے لئے دوسرے عمل بھی ہیں، ان کا انحصار اس پر ہے کہ عامل کس درجے کا ہے۔ دوسرا طریقہ آہنی کیلیں پڑھ کر چاروں سمت گاڑنے کا ہے، یہ بھی عام ہے اور اسی سے کیل دینا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اور بہت سے طریقے ہیں۔ کیلے گئے مکان میں اگر جنت داخل ہونے کی کوشش کریں تو ضرر پہنچنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ان میں سب سے خطرناک جان کا زیاں ہے، یعنی جیسے ہی کوئی جن اس گھر میں داخل ہو، جل کر مر جائے۔ مکان کو کیلنے وقت ہی عامل ایسا عمل کرتا ہے۔ یہ عمل ہر آدم زاد کے بس کا نہیں۔ ہزاروں لاکھوں میں کوئی ایک آدم زاد یہ عمل کرنے پر قادر ہوتا ہے، کوئی ایسا کہ جس کی تجد بھی قضا نہ ہو۔ کم تر صورت یہ ہے، کیلنے والے گھر میں داخلے کے وقت جنت کو اس قدر شدید جھٹکا لگے کہ وہ زخمی ہو جائیں اور اس جگہ سے دور جا گریں۔ پھر خاصے عرصے کے لئے ان کی جناتی صفات چھن جاتی ہیں۔ بعض عامل، جنت کو گرفتار کرنے کے لئے اس گھر یا مقام کو پسندایتا دیتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی جن اس گھر یا مقام کے اندر پہنچتا ہے، پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ اس کے بعد.....“ پھر ہاموس وہی سب کچھ بیان کرنے لگا جس کا مجھے عملی تجربہ ہو چکا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”کسی مقام کو کیلے جاتے وقت مدت بھی مقرر کرنا ضروری ہے جو ایک دن سے ایک برس تک ہو سکتی ہے۔ مدت ختم ہونے پر اس مکان کو دوبارہ کیلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر عامل کسی سبب اسے لازمی نہ جانے، یعنی مدت ختم ہونے پر دوبارہ مکان کو نہ کیلے تو پھر اثر ختم ہو جاتا ہے۔“

”اس کا کوئی توڑ بھی ہے اے ہاموس!“ میں نے ہاموس کے چپ ہوتے ہی سوال کر دیا۔

”ہر عمل کا توڑ ہوتا ہے لیکن تجھے جاننے کی کیا حاجت ہے؟“ ہاموس نے مجھے گھورا۔

”عالم ہی اگر ہمیں علم سے بے بہرہ رکھیں گے تو پھر ہم کیسے اپنے دشمن آدم زادوں سے بچیں گے۔“

”لیکن تو دشمنی مول ہی کیوں لے؟“

”نیک و بد تو آدم زادوں میں بھی ہیں اے ہاموس!“ اس مرتبہ یاسف بولا۔ ”اگر کوئی آدم زاد

بلاوجہ ہمارا دشمن بن جائے تو ہم کس طرح اس سے اپنا بچاؤ کریں؟“

”بلاشبہ آدم زاد بڑے بھی ہیں، راہ راست سے بھٹکے ہوئے۔ مگر یہ معاملہ اور ہے۔ اس میں تو خود ازم زاد، جنت سے بچنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ کسی مکان کو کیل دینے کا مطلب یہی ہوا کہ وہاں جنت داخل نہ ہو سکیں۔ کیا تو آدم زادوں سے ان کا یہ حق چھین لینا چاہتا ہے؟ گویا تیرا مقصد یہ ہے کہ تو زبردستی کسی آدم زاد کے گھر میں داخل ہو جائے۔“

”نہیں اے ہاموس! ہمارا یہ مقصد نہ تھا۔ ہم بھلا کیوں کسی آدم زاد کے گھر میں بہرہ بردار داخل ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”پھر عمل کا توڑ کیوں پوچھ رہا تھا؟“

”صرف اپنے علم کی خاطر۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تجھے علم حاصل کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو سب سے پہلے علم القرآن حاصل کر کہ اس سے بڑا علم کوئی اور نہیں۔“

”بے شک۔“ میں نے فوراً کہہ دیا کہ ابھی ہاموس سے مجھے کچھ اور بھی پوچھنا تھا، سو بولا۔ ”آدم زادوں کے علاوہ بھی تو جنت کی کچھ قسمیں بڑی سرکش اور قوی ہیں جو ہمیں ستاتی ہیں۔ اچھے ہاموس! کیا تو ہمیں ان سے بچنے کی تدبیر بھی تعلیم نہیں کرے گا؟ مثلاً غواصوں کے جو پانی میں رہتے ہیں۔ کل شام مجھے پانی میں رہنے والے ایک قوی جن زاد نے ہٹکا ستایا۔ اس ظالم نے تو ایک آدم زادی کو بھی زندہ درگور کر دیا ہے۔ کیا خلق خدا کو کسی عذاب سے نجات دلا دینا بھی ممکن نہیں؟“

”میں سمجھ گیا کہ وہ آدم زادی کس اذیت میں گرفتار ہوگی لیکن تجھے اس پر اتنا رحم کیوں آ رہا ہے، تیرا اس سے کیا تعلق ہے اسے علیالیش!“

”وہ ایک غریب اور مجبور بیوہ ہے، تم رسیدہ ہے۔ اگر وہ اذیت سے نجات پا جائے تو اس کا گھر بس جائے، اس کے دو سالہ بیٹے کا مستقبل بھی سنور جائے۔“ میرا لہجہ پڑتا تھا۔

”ہاں یہ نیکی ہوگی۔“ ہاموس آخر میری باتوں میں آ ہی گیا۔ ”لیکن اگر تو اس آدم زادی کے ساتھ یہ نیکی کرنا ہی چاہتا ہے تو اس کے لئے تجھے کچھ ایثار کرنا ہوگا۔“

پھر ہاموس نے مجھے ایک عمل تعلیم کیا۔ مقررہ وقت پر مجھے سات راتوں تک یہ عمل کرنا تھا۔ اس عمل کے دوران خدیجہ کی موجودگی اور رضامندی ضروری تھی ورنہ عمل بیکار تھا۔

میں نے سوچا، چلو ایک کام تو بنا۔ دوسرے کام بنانے کی صورت بھی خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لئے مجھے ہاموس کی بیٹی وازعہ کو شیشے میں اتارنا پڑتا جو آدھی سے زیادہ تو خود ہی شیشے میں اتر گئی تھی۔ اس کے ذریعے مولوی کفایت اللہ جیسے حرام الدہر کے عمل کا توڑ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ ہاموس اپنی بیٹی کو شاید عمل کا توڑ بتا دیتا۔ نماز کے اوقات میں وازعہ سے ملاقاتیں ممکن تھیں۔ اس کے لئے وازعہ کو ”رشتہ“ بھی دینا پڑتی تو میں راضی تھا۔ وہ بہر حال تھی تو خوبصورت، خواہ جن زادی ہی سی۔

”اچھا اے ہاموس! اب ہم چلتے ہیں، پھر کسی دن حاضر خدمت ہوں گے کہ تیری صحبت میں دل کو برا سکون ملتا ہے۔“ میں نے ہاموس کو اُلویانے کی غرض سے کہا۔

”حق ہو..... حق ہو۔“ خدیجہ نے نعرہ لگایا، پھر زور سے بولی۔ ”اے جنات کے سردار! حاضر ہو

”میں آگیا ہوں اے خدیجہ! بول تجھے کیا چاہئے؟“ میں نے زور سے کہا۔ خدیجہ کی تینوں بھائیوں کے چہرے میری غیر انسانی آواز سن کر قرفی پڑ گئے۔

”دولت چاہئے مجھے دولت۔“ خدیجہ چیچی۔ ”میں نے اسی لئے تجھے قابو میں کیا ہے۔ جا اور میرے لئے چاندی کے ٹکھناتے روپے لے کر آ کہ میں کسی پر بوجھ بن کے اس گھر میں نہ رہوں۔ تو میرا حکم سن رہا ہے؟“

”ہاں اے خدیجہ! سن رہا ہوں۔“ میں پھر بولا۔ ”میں تیرے لئے دولت کے ڈھیر لگا دوں گا، مگر اس دولت پر صرف تجھے اختیار ہو گا۔ کسی اور نے اس پر قبضہ کرنا چاہا تو میں اسے مار ڈالوں گا۔ تو خود اپنے ہاتھ سے کسی کو کچھ دے گی تو مجھے اعتراض نہ ہو گا۔ انتظار کر کہ میں ابھی آتا ہوں۔“

پھر میں نے دانستہ اتنی دیر لگا دی کہ خدیجہ کے تینوں بھائی بھی گھر آ گئے۔ پہلے تو خدیجہ کی حالت دیکھ کر انہوں نے یہی تبصرہ کیا کہ ”کھٹک“ گئی ہے، پھر جب ان کی بیویوں نے ایک غیر انسانی آواز سننے اور گویا ”سردار جن“ سے خدیجہ کی گفتگو کا ذکر سنا تو ”چکر گھٹی“ بن گئے۔

میں اندر کوٹھری میں گیا اور لکڑی کا صندوق کھول کر تقریباً نصف روپے نکال لئے۔ انہیں میں نے ایک چادر میں باندھا اور باہر آ گیا۔

”اے خدیجہ! میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی ہے، مگر میری شرط نہ بھولیو۔ ورنہ اس گھر میں برے ہاتھوں کی کاخون ہو جائے گا۔“ میں نے شرط دہرائی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان روپوں کو اس کے بھائی یا بھائیاں نہ ہتھیلیں۔ اس کے بعد میں بولا۔ ”تجھے مزید دولت کی طلب ہو تو میں تیرے حکم پر ہر حاضر ہو جاؤں گا۔“

اس کے بعد میں نے چادر سے چاندی کے روپے خدیجہ کے سامنے گرانا شروع کر دیئے۔

”اور کہ بس؟“ روپے ختم ہونے لگے تو میں نے سوال کیا۔

خدیجہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور بولی۔ ”بس کر اور اب تو جا۔“

چاندی کے روپوں کا ڈھیر خدیجہ کے سامنے لگ گیا۔ چادر بھی میں نے قریب ہی پھینک دی۔ خدیجہ کے بھائی اور بھائیاں ہونق سے بنے روپوں کو دیکھ جا رہے تھے۔

مجھے اب وہاں مزید رکنے کی ضرورت نہیں تھی کہ خدیجہ سے جو کہتا تھا، اس کے لئے رات کا وقت ندری تھا۔ ہاموس نے جو عمل بتایا تھا، وہ خدیجہ کی رضامندی کے بغیر ناممکن تھا۔

☆=====☆=====☆

اسی روز عشاء کی نماز کا وقت ہوتے ہی میں نے ہاموس کی ویران حویلی کا رخ کیا اور ارد گرد ڈھالنے لگا تاکہ مجھ پر واذعہ کی نظر پڑ جائے۔ ہاموس کو میں نے دور سے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتے دیکھا تو کچھ امید بندھی۔ پھر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو ہی گئی۔ کہتے ہیں کہ بھگت کے پیٹ سے ولی

کسی عالم کو آلو بنانا آسان نہیں ہوتا سو ہاموس بھی اس پر راضی نہ ہوا، ظالم کہنے لگا۔ ”نماز پڑھا کر، یاد الہی کے سوا کہیں اور سکون ممکن نہیں۔“

لعت ہو تجھ پر، میں نے سوچا۔ کبھی تو نصیحتوں سے جان بخش دیا کر۔ پھر میں بولا۔ ”تو نے حق بات کسی اے ہاموس! لیکن میں نے ایک وعظ کہنے والے سے سنا تھا کہ کسی عالم کی صحبت نماز سے بہتر ہے۔“ میں نے واقعی عالم جنات کے ایک جن زاد کو یہ کہتے سنا تھا ورنہ میں کہاں اور محفل وعظ کہاں۔

”شرط عالم کی ہے اے علیا لیش! اور میں بھلا کہاں کا عالم ہوں۔ یوں ہی مجھے عالم مشہور کر دیا گیا ہے۔“

”ایک عالم کی یہی تو پہچان ہے کہ وہ کبھی عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔“ میں نے بھی ہار نہ مانی اور پھر یاسف کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

میرا دل بھائی دروازے جانے کے لئے بہت مچل رہا تھا کہ زگس کا دیدار کر لوں مگر یاسف نے مجھے سمجھایا، کچھ دن تو ادھر نہ جاؤں تاکہ مولوی مطمئن ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ پہلے کی طرح کہیں مولوی کے ہتھ نہ چڑھ جاؤں۔ یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ مولوی نے اپنی حویلی کو کتنے دن کے لئے کیلا تھا۔ میں نے بہر حال یاسف کی بات مان لی۔ زگس کے فراق کی کسرو سوری آدم زادیوں کے وصال سے پوری ہو جاتی۔ چاہے وقتی طور ہی پر سہی جی تو بھل ہی جاتا۔ ہاموس نے مجھے عمل تعلیم کیا تھا، اس کے ذریعے خدیجہ بھی راہ پر لگ جاتی۔ پھر زینت بھی تھی۔ چڑی اور دو دو والی بات تھی۔ عصر کے وقت میں نے خدیجہ کے گھر کی راہ لی کہ اس سے یہی وعدہ کیا تھا۔ یاسف شہر کا پھیرا لگنے گیا تھا کہ نئے شکار کو تاک سکے۔

میری بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق خدیجہ گھر کے آگن میں چادر بچھائے گویا عالم وجد و کیف میں جھوسے جا رہی تھی۔ اس کی تینوں بھائیاں یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ شبو، یعنی خدیجہ کی چھوٹی بھائی کو میں نے پہلی بار دیکھا، نہ دیکھتا تو افسوس ہوتا کہ وہ دیکھنے ہی کی چیز تھی۔ بوٹا سا قد، اکرا بدن، چھوٹی سی خوبصورت ستواں ناک، آنکھیں بڑی اور باتیں کرتی، رنگ سانولا تھا مگر چہرے پر خاصا نمک تھا۔ اس غنچہ دہن کو دیکھ کر کوئی یہ نہ کہتا کہ گنتوں سے بھری ہو گی۔ اس بالی عمر میں اس نے ایک عدد عاشق، وہ بھی گینڈے جیسا اور ایک شوہر پال رکھا تھا۔ کچھ بھولی صورتیں بھی دھوکا دیتی ہیں۔ اس کے باوجود خدیجہ کی بات ہی اور تھی۔ ایک بچے کی ماں بن کر بھی اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ جنات عموماً بچے والیوں کو پسند نہیں کرتے۔ پہلے میں بھی ایسا ہی تھا مگر خدیجہ نے جیسے میرے ذوق جمال میں خود بخود اپنے لئے گنجائش پیدا کر لی تھی۔ اس میں بس ایک ہی خرابی تھی جسے دور کرنا اب ممکن ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں شبو جیسی لڑکی کے قریب جانا میں ناپسند کرتا مگر اس نے خدیجہ کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کی سزا تو اسے ملنا ہی چاہئے تھی۔ سو میں نے سوچ لیا کہ اس پھول کی خوشبو کو بھی اسیر ضرور کروں گا۔

”آج اس نے کوئی نیا چکر چلایا ہے۔ اپنے بھائیوں کو ہماری طرف سے بدگمان کرنے کے لئے شاید کوئی عمل کر رہی ہے۔“ شبو نے جھٹائیوں کو ہٹایا۔

”یہ کسی آدم زادی کا پکڑ تو نہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔ بڑی ہی کانیاں تھی کہ کچھ کہے سے بغیر ہی بات کی تہ تک پہنچ گئی۔

مجبوراً مجھے ہائی بھرنا پڑی اور اسی لمحے ذہن میں اسٹوری وارو ہو گئی، سو بولا۔ ”ایک آدم زادی سے مجھے اپنی ذلت و رسوائی کا انتقام لینا ہے لیکن اس کے خاتم باپ نے اپنے گھر کو کیل دیا ہے۔“ میں نے اس لئے بھی ایسی اسٹوری سنانا شروع کی کہ وازعہ کا جذبہ رقابت نہ جاگ اٹھے۔

”ہوا کیا تھا؟“ اس نے تفصیل جاننا چاہی۔

”میں اور میرا دوست یاسف ایک دن بس یونی تقریباً اس حویلی میں گھس گئے۔ یاسف کچھ شریر ہے۔ اس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اسی وقت آدم زادی کا مولوی آیا گیا۔ پھر یاسف تو بھاگ گیا، مجھے مولوی نے چھانسی لیا۔ غصہ مجھے اس بات پر آیا کہ آدم زادی نے سارا الزام مجھ پر لگا دیا۔ جھوٹ اتنی تھی کہ جو نہیں ہوا، وہ تک باپ سے کہہ دیا۔ بڑی مار پڑی مجھ پر۔ آدم زادی مجھے چڑانے کے لئے دور کھڑی مسکراتی رہی۔ تیری ہی طرح وہ بھی ایک عالم آدم زادی کی بیٹی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تو شریف اور وہ لمبی ہے۔ دوسری مرتبہ جب میں اپنے دل کا غبار نکالنے اور اس بد بخت آدم زادی کو الٹا لٹکانے پہنچا تو مجھے ہی الٹا لٹکا دیا گیا۔ مولوی نے حویلی کو کیل رکھا تھا۔ پھر مجھے ذلیل و رسوا ہوتا پڑا اور اس مرتبہ تو جان پر بن گئی۔ مولوی کی بیوی نے بڑی مشکل سے میری زندگی بچائی ورنہ تو مولوی مجھے اپنی بیٹی کی شہ پر مارے ہی ڈال رہا تھا۔“

”تو یہ قصہ ہے۔“ وازعہ بولی۔ ”چھوڑ لعنت پڑھ اس آدم زادی پر۔“

”لعنت پڑھنا اتنا ہی آسان ہوتا تو کب کا پڑھ چکا ہوتا۔“

”تو پھر دوسری ایک اور بھی صورت ہے۔ مجھے بتا، وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے، میں آج ہی رات کسی وقت جا کر اس کی گردن دبا آتی ہوں۔ مجھے ایسا عمل آتا ہے کہ کیل دیئے جانے والے مکان میں داخل ہو سکوں۔ بہتر یہ رہے گا کہ رات کو زوال کے بعد تو خود مجھے وہاں ساتھ لے چل، کام ہی کتنی دیر کا ہے۔“ وازعہ نے اپنی دانست میں میرا مسئلہ حل کر دیا۔

واہ ری جن زادی! تجھے ایک میں ہی ملا ہوں بے وقوف بنانے کو۔ جس شاخ پر آشیانہ بنانے کی آرزو ہے، تیرے ہاتھوں سے کنوا دوں۔ میں نے سوچا اور انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”اس طرح مجھے قرار نہیں آئے گا۔ میں خود اس سے انتقام لوں گا۔“

”اچھا یہ بات پھر کبھی کر لیں گے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ کہیں میرا باپ نماز پڑھ کے کسی کام سے مجھے آواز نہ دے لے۔“ وہ قبل از وقت رشوت طلب کرنے لگی۔

کبھی کبھی کام بننے سے پہلے بھی رشوت کی ایک آدھ قسط ادا کرنا پڑتی ہے۔ دانہ ڈالے بغیر پرندہ جال میں نہیں پھنستا۔ بعض دفعہ تو دانہ چٹکنے کا عادی بنانا پڑتا ہے۔ سو میں بھی اس ”پرندی“ کو دانہ چکگانے، ہاراضی ہو گیا۔ ایسی ”وحشت“ سے پہلی بار میرا سابقہ پڑا تھا۔

میرے دل کی آگ تو خیر کیا ٹھنڈی ہوتی، ہاں اس کے کلیجے میں ٹھنڈ پے گئی، وہ بھی بہ مردوسو

اور ولی کے پیٹ سے بھوت بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وازعہ کا کس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ باپ عالم اور بیٹی یہ لکھن۔ آدم زادوں میں گھیرا گھاری عموماً مردوں کی طرف سے ہوتی ہے مگر جنات میں ہر دو اصناف، پلہ برابر ہے، نہ یہ کم نہ وہ کم۔ چل برابر رکھا برابر۔ کچھ آدم زادیوں کو بھی برابری کا شوق ہوتا ہے اور اس شوق میں نہ گھر کی رہتی ہیں، نہ گھٹ کی۔ گھٹ گھٹ کا پانی پینا عادت بن جاتی ہے اور بمشکل تھان سے بندھنے پر راضی ہوتی ہیں۔ ہاں کافر آدم زادیوں کو اور ہی شوق ہے۔ وہ عاشق بننا پسند کرتی ہیں۔ اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔ میں بھلا اعتراض کرنے والا کون۔ کچھ بولوں گا تو بولیں کہ اے نوح، یہ تو ویسے بھی جن زاد ہے، کوئی اس کی باتوں میں نہ آئے۔ انہیں کیا خبر کہ باتیں بنا بنا کر ہی تو اب تک میں عیش اڑاتا آیا ہوں۔ آدم زادیاں تو خیر کس شمار قطار میں ہیں، میں تو بنات جنہ کو بھی تو بولے بنا کر اڑنے سے پہلے گرفتار کر لیتا تھا۔ وازعہ بھی ایک ایسی ہی جن زادی تھی کہ جسے میں باتوں باتوں میں راہ پر لگانے آیا تھا۔

”تیری ہمت کی داد دینا پڑتی ہے اے علیالیش!“ وازعہ نے آتے ہی مجھے بانس پر چڑھایا کہ میں آئندہ بھی اسی طرح آتا جاتا رہوں۔ ”چل اس حویلی سے کہیں باہر چلتے ہیں۔“

میں تو راضی ہونے آیا ہی تھا سو راضی ہو گیا۔ وہ مجھے دور ایک گھنٹے برگد کے بیڑ پر لے آئی۔ شاخیں گویا ہم دونوں کا بستر تھیں۔

”تجھ سے ایک بہت ضروری کام تھا مجھے اے وازعہ!“ میں پہلے ہی شروع ہو گیا کہ وہ کہیں مونہ لٹے ہی بے تکلفی پر نہ اتر آئے۔

”بول کیا کام ہے؟“ وہ صدقے داری ہونے لگی۔

میں نے کام بتایا تو سٹپٹا گئی۔ کچھ زیادہ ہی اسے باپ کا خوف تھا۔

”مجھے تو یہ گمان تھا کہ اس نے تجھے بھی علم دریاؤ بنا دیا ہو گا۔“ میں اسے چپ دیکھ کر بولا۔ یوں ہی میں نے یہ بات کہہ دی تھی لیکن اندھیرے میں چلا ہوا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔

”لیکن اس دریا میں کسی کو ہاتھ دھونے کی اجازت اس نے نہیں دی۔ مجھے اس نے علم تو سارے

سکھائے ہیں مگر ساتھ ہی عہد بھی لے لیا ہے کہ ان علوم کو صرف اپنی حفاظت کے لئے استعمال کروں۔“

کتا ہے کہ علم ایک ایسی تلوار ہے جس سے اپنا گلا بھی کاٹا جاسکتا ہے اور حفاظت بھی کی جاسکتی ہے۔“

وازعہ کی بات سن کر میں چونکنے کی بجائے اچھل پڑا کیونکہ یہ صرف چونکنے کا عمل نہیں تھا۔ وہ خود

ہی ”علم دریاؤ“ نکل آئے گی، مجھے گمان تک نہ تھا۔ مسئلہ صرف اس عہد کا تھا کہ جو وازعہ نے اپنے باپ

سے کر رکھا تھا۔ گویا منزل قریب آگئی تھی۔

”تجھے آخر کسی کیلے گئے مکان میں گھسنے کی ضرورت ہی کیا پڑ گئی؟“ وازعہ ذرا توقف کے بعد پوچھ

گئی۔

فوری طور پر مجھے اس کر دیا کرادی کا جواب نہ سوجھا۔ کوئی دل گداز قسم کی اسٹوری سنانے بغیر

چلنے والا نہیں تھا جو میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

برس میں پہلی مرتبہ۔

نٹے باز کوشہ کر کے مزید نٹے کی طلب ہوتی ہے اور ابھی اور۔ مگر میں درجہ شہادت پر فائز ہوں۔
کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوا۔ ہاموس کے ذکر پر اس کی ہوا کھک گئی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بھی
کھک لیا۔ ہاں کھکنے سے پہلے آئندہ کے لئے وقت اور جگہ طے کرنا ہرگز نہ بھولا کہ

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

مجھے یقین تھا کہ دھرتی کے سینے میں بیٹھے سوت ہوں گے لیکن ابھی تو میں کنکر پتھر ڈھونڈنے میں
صرف ہوا جا رہا تھا۔ میرے لئے نرگس ایسی ہی دھرتی تھی۔

جب میں لوٹ رہا تھا تو شردھیرے دھیرے سنانے میں ڈوب رہا تھا۔ اس زمانے میں رات جلدی ہو
جاتی۔ مجھے پہلے خدیجہ اور پھر شبو، یعنی خدیجہ کی چھوٹی بھالی کا خیال آیا۔

خدیجہ کے گھر میں داخل ہو کر پہلے میں نے شبو کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ بند تھا مگر اندر سے
دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ ”ففتی“ گویا ابھی جاگ رہی تھی۔

کسی زن شادی شدہ کی خلوت میں یوں دخل ہونا، وہ بھی اس کے شوہر نامدار کی موجودگی میں،
بڑی ہی غیر شرفانہ حرکت ہے لیکن شرافت آدم زادوں ہی کو زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے یہ
سارے اصول و قواعد آدم زادوں کے لئے ہیں، ہم جن زادوں کے لئے نہیں۔ یوں بھی مجھے شریف، یعنی
گھامڑ ہونے کا دعویٰ نہیں تھا، سو پہنچ گیا اندر۔ چھوٹی سی وہ نمکین ”ففتی“ کسی کبوتری کی طرح اپنے شوہر
سلیم اللہ سے ”غزغزوں“ ”غزغزوں“ کئے جا رہی تھی۔ کمرے میں لائین کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
خدیجہ اب اس کے لئے خدیجہ بابی بن چکی تھی۔

”اچھا نہیں لگتا کہ بابی اس کو ٹھری میں پڑی رہیں۔“ شبو شوہر سے منک رہی تھیں یوں جیسے نند
کی محبت میں کلیجہ پٹھا جا رہا ہو۔ ”یہ کمرہ اچھا خاصا بڑا ہے، بیچ میں پردے کے لئے ہم چادر باندھ لیں گے۔
وہ ڈوب کے ساتھ ہمارے ہی کمرے میں سو جایا کریں گی۔“

”چاندی کے کھلتے سکوں کی جھنکار سن کر تمہاری تو عقل ماری گئی ہے۔ یہ بے شری ہے بے
شری۔ کبھی بابی کی آنکھ کھل گئی اور تم میرے پاس ہوئیں تو؟“

”میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ تمہاری بڑی بھادجیں یہی مسکوت کر رہی تھیں۔ اگر بابی ان
دونوں میں سے کسی کے کمرے میں چلی گئیں تو سمجھ لو ہمیں کچھ نہیں ملنے کا۔ بھلا بتاؤ، اب تک بابی اور
ان کے بیٹے کا خرچہ ہم نے اٹھایا اور ہم اب کھانے میں رہیں۔“

”رشتوں میں نفع نقصان نہیں دیکھا جاتا۔“ سلیم اللہ نے کہا۔ ”میں نے بابی کے ساتھ جو کچھ کیا
میرا فرض تھا۔ تم نے ہی تو ان کی چارپائی کو ٹھری میں ڈلوائی تھی۔ پہلے جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو
وہ بھی اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ شادی ہو گئی تو وہ بیٹھک میں جا کے خود ہی پڑ رہیں لیکن تمہیں چین
نہیں آیا، یہ غم کھانے لگا کہ کسی آئے گئے کو کہاں بٹھائیں گے۔“

”مجھی پر سارا الزام لگا دو۔ میں تو ہوں ہی بڑی تمہاری نظرمیں۔“ شبو نے عورتوں کا روایتی ہتھیار

آزایا، اور رونے لگی۔

سلیم اللہ اسے منانے لگا، پھر یہ تجویز باہمی رضامندی سے طے پائی کہ بیٹھک پر خدیجہ کا قبضہ بحال
کر دیا جائے تاکہ وہ ”نیموئل زون“ میں پہنچ جائے، بڑی ”بھابیوں“ کی سازش کامیاب نہ ہو۔ اس تجویز
کی خوشی میں جب چوڑیاں کھکانے کی نوبت آنے لگی تو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے شبو کو گھینا اور
اٹھا کر اس کی چارپائی پر ڈال دیا۔

دونوں میاں بیوی کی سٹیاں ایک ساتھ گم ہو گئیں کہ آخر یہ اچانک ہوا کیا؟ میں جو سوچ کر آیا تھا
اسے عملی جامہ پہنانے میں دیر نہ کی۔

”سس..... سا..... سلی..... سلیم!“ شبو نے خوفزدہ آواز میں اپنے شوہر کا نام ٹکڑوں
میں تقسیم کر دیا۔

”کیا ہوا پیاری شبو؟“ سلیم کی پرسکون آواز کمرے میں گونجی۔ میں اس کے اندر نفوذ کر چکا تھا۔
میں ہی سلیم کی آواز میں بول رہا تھا۔

”مم..... مجھے کسی نے تم..... تمہارے پاس سے اٹھا کر لیا..... پھینک دیا۔“
”چلو تو اچھا ہوا، تم ہو بھی تو اسی قابل۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”تم جیسی عورتوں کو تو منہ ہی
نہیں لگانا چاہئے۔“

”کیا؟“ وہ ایک دم غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شدید غصے کے سبب شاید خوف کا احساس دب گیا تھا۔
”کیا کہا تم نے؟“

”جو سن رہی ہو تم۔ تمہارے سارے کروتوت معلوم ہیں مجھے۔ شادی سے پہلے کے بھی اور بعد کے
بھی۔“

پہلے تو وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر پھیل جانے لگی۔ چوری اور سینہ زوری۔
”بند کر یہ رونا دھونا، ورنہ ابھی ناک اور چوٹی کاٹ کر گھر سے نکال دوں گا۔ شوکت نے مجھے سب
کچھ بتا دیا ہے۔“

پھر وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، کسی ہرنی کی طرح چوڑی بھول گئی۔
”آوارہ عورت! میں تجھے طلاق دے دوں گا۔“ میں نے آخری ضرب لگائی۔ ”تیرا سارا کچا پٹھا بھی
کھول دوں گا تاکہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔“

”نہیں۔“ اس نے کہا اور جلدی سے لپک کر میرے پیر پکڑ لئے اسی کے ساتھ گڑگڑانے لگی۔
”معاف کر دو مجھے۔“

”تیرا ایک گناہ ہو تو معاف بھی کر دوں۔ تو نے میری امانت میں خیانت کی جسے کوئی غیرت مند مرد
برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر تو نے شوکت کے ذریعے میری بہن کو برباد کرنا چاہا لیکن اپنے ناپاک ارادے
میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اب اس کی دولت پر دانت جمائے بیٹھی ہے۔“

رورو کر شبو کا برا حال ہو گیا، ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں نے اس سے خدیجہ کا انتقام لے لیا۔

”چل جا“ منہ دھو کر اور ناک سٹک کر آبد ذات!“ میں نے اسے حکم دیا۔

”تم..... تم مجھے طلاق..... طلاق تو نہیں دو گے سلیم!“ بچیاں لیتے ہوئے اس نے بڑے قابل رحم نظروں سے دیکھا۔

”پہلے وہ کر جو میں نے تجھ سے کہا ہے۔“ میں سختی سے بولا۔

شب چلی گئی اور ذرا دیر میں شبو منہ دھو آئی۔ اس نے اندر آتے ہی آہستہ سے کنڈی بھی لگا دی تھی۔ آتے ہی وہ پھر میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا اور پھر کلائی پکڑ کر تھپتھپایا۔ وہ میرے پہلو سے لگ گئی۔

”جا اے بے وفا“ تجھے معاف کیا۔ صبح باجی سے بھی معافی مانگ لینا۔“

اس نے گویا مجھے مٹانے کی خاطر وہ سارے نسوانی حربے آزمائے جو غالباً کچھ تو اسے شوکت نے سکھائے تھے، کچھ خود ہی اسے آتے ہوں گے۔

اسے کیا مٹانا کہ جو خود ہی من جاتا ہے۔ بہر حال اس بوٹا سے قد والی نے مجھے نمال کر دیا۔

میں، سلیم کے کمرے سے نکل کر آئندہ کا بندوبست کرنے کی غرض سے خدیجہ کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اسے جگا کر پھٹ پر چلنے کو کہا تو وہ بولی۔ ”لیکن تم نے تو مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ اب آئندہ کبھی.....“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں آہستہ سے بولا۔

”پھر کیوں پھٹ پر لے جا رہے ہو؟“

”تم جو کچھ سمجھ رہی ہو، اس کے علاوہ کیا کوئی اور بات کرنے کو نہیں۔“

بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئی، پھر میرے ساتھ پھٹ پر آ گئی۔

”صبح شبو تم سے معافی مانگ لے گی۔“ میں نے بات شروع کی۔

”کس بات کی معافی؟“

”اس ظلم کی معافی جو اب تک کر چکی ہے۔ پہلے تم بیٹھک میں سوتی تھیں، اب پھر وہیں سویا کر

گی۔ پھر تمہیں پھٹ پر لانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ خدیجہ نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”میں جن زاد ہوں، یہ کیوں بھول جاتی ہو؟“

”ہاں واقعی یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔“ اس نے اعتراف کر لیا، پھر بتانے لگی۔ ”تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ گھر والوں کا رویہ میرے ساتھ بدل جائے گا۔ دولت میں بڑی طاقت ہے۔“

”اپنی روحانی قوت سے مجھے تمہارے بارے میں ایک حیرت انگیز بات کا پتا چلا ہے۔“

”کیا بات ہے وہ؟“ اس نے توقع کے مطابق فوراً سوال کیا۔

”تمہیں ایک ایسا مرض لاحق ہے کہ جس کا علاج ہونا چاہئے۔ میں نے بڑی ہی تنگ و دوکے

علاج کا طریقہ معلوم کیا ہے، مگر اس کے لئے تمہاری رضامندی ضروری ہے۔“

”لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر مجھے ہے کیا مرض؟“

میرے لئے جواب دینا مشکل تھا، سو بولا۔ ”بس تم علاج کی اجازت دے دو، کچھ ابھی پوچھو مت۔“

روحانی مرض ہے جس کا اثر تمہارے جسم پر بھی پڑا ہے۔ میں اس مرض کو دور کرنے کے لئے سات راتوں تک ایک وظیفہ پڑھوں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا، صرف میرے سامنے بیٹھے رہنا ہے، وہ بھی صرف نصف گھنٹے تک رات کو نصف رات گزرنے کے بعد۔“

خدیجہ نے مجھے غالباً یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔

”تو پھر کل سے میں وظیفہ شروع کر دیتا ہوں۔“ میں نے کہا، پھر اپنا اعتماد بحال کرنے کی خاطر خواہش کے باوجود اس بدن بہار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور چلا آیا۔

یاسف کو بھلا سے فرصت نہیں تھی۔ میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو وہ غائب ہی تھا۔ وہ رات خاصی بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔ سو میں سو گیا۔ دوازعہ سے میں نے آئندہ رات نصف شب سے پہلے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ نماز عشاء کے کچھ ہی دیر بعد ہاموس گری نیند سو جاتا ہے اور پھر صبح

چار بجے تہجد پڑھنے اٹھتا ہے۔ گویا عشاء کے بعد سے صبح چار بجے سے قبل کا وقت ملاقات کے لئے مناسب زمین تھا۔ نصف شب کے بعد میری دیگر مصروفیات شروع ہو جاتیں اس لئے دوازعہ سے پہلے ہی ملنا غنیمت تھا۔

دوسرے دن صبح جب میں اٹھا تو ایک اور خیال آیا۔ یاسف جانے کب آ کے سو گیا تھا۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لئے میں نے اقبال کے دفتر کا رخ کیا۔ وہاں رہنا بھی تو تھی۔ رہنا کے علاوہ اور دو ایک

”ٹھکانہ“ ایسے تھے کہ جن کی خاطر میں نے جال بچھا دیا تھا۔ جال کی ڈوری کھینچنے سے پہلے ہی مولوی کفایت اللہ نے مجھے راہ فرار پر مجبور کر دیا۔ اقبال کے جسم کو گھر کے باہر تو میں اپنی مطلب براری کے لئے استعمال

کر ہی سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اقبال کے دفتر تک پہنچنے پہنچنے اور بہت کچھ سوچ لیا۔ یوں بھلا میں مولوی کے سامنے کس طرح ہتھیار ڈال دیتا۔ وہاں پہنچا تو اقبال دفتر میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر

پریشانی ظاہر تھی۔ ایک تو شاید دفتری کام اس کے لئے نیا تھا، دوم اسے جب حقیقت پتا چلی ہو گی کہ ایک جن زاد طویل عرصے تک اسے یہ غمال بنائے رہا تو وہ اور بھی جی جھوڑ بیٹھا ہو گا۔ پریشانی کا اور کوئی سبب

میری سمجھ میں نہ آیا۔

اقبال کا جسم میرے لئے ایک گھر کے مانند تھا، سو میں چپکے سے گویا اس میں داخل ہو گیا۔ اس وقت

یکشن انچارج کے سامنے میری طلبی ہو گئی۔ اس نے ایک فائل میرے سامنے میز پر زور سے پھینکی اور

بلا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہ نوٹ لکھا ہے تم نے کہ گھاس کائی ہے..... پھر کوئی بھی کانفڈر تیب سے نہیں لگایا۔ سفارشی ٹو ہو ورنہ کب کا نکال باہر کرتا۔“

وہ اقبال تو تھا نہیں کہ جو یہ سب کچھ سن کر سر جھکا لیتا، سو میں نے یکشن انچارج سے کہا۔ ”سر! تم کوئی گھسیارا نہیں ہوں۔ آپ ہی کی انگریزی کچھ کمزور معلوم ہوتی ہے کہ میرا لکھا ہوا نوٹ آپ کے

اسے گزر گیا۔“ یہ کہتے ہی میں نے وہ فائل اٹھالی۔

نیکشن انچارج کو یقیناً مجھ سے ایسی گستاخی کی توقع نہیں ہو گی، سو غصے میں جھگ ڈال گیا۔ بخیر دھمکیاں بھی دیں کہ دیکھ لوں گا وغیرہ۔

میں اطمینان سے اپنی میز پر آ کے بیٹھ گیا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اقبال نے وہ نوٹ لکھ کر واپس گھاس ہی کاٹی تھی۔ فائل سے میں نے وہ نوٹ نکال کر اس کی جگہ دوسرا نوٹ لکھا اور لگا دیا۔ کانفرنس ترتیب سے لگا دیے۔ پھر میں وہ فائل لے کر سیدھا چھوٹے خاں کے پاس پہنچ گیا۔

”آؤ آؤ بالے میاں!“ چھوٹے خاں خلاف توقع میری پزیرائی کرنے لگا۔ وہ شاید ابھی اقبال کی طرف سے مایوس نہیں تھا۔ ”میں تو خود تم سے ملنے کو سوچ رہا تھا۔“ غالباً اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ حالانکہ میرا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ مگر چھوٹے خاں کبیل ہی ہو گیا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ”پرایا“ ہونے کے باوجود کسی اپنے کی طرح مل جاتا تو میں لحاظ مروت میں سلام کر لیتا۔ جواب میں وہ اس طرح وعلیم السلام کہتا جیسے لٹھے مار رہا ہو۔ آج بات ہی کچھ اور تھی۔

اقبال کے رشتے سے چچا پس ہونے والا خسر لگتا تھا۔ سو میں نے کہا۔ ”چچا! آج بہت خوش نظر رہے ہو، کیا بات ہے؟“

”تم بیٹھو تو سہی“ بتاتا ہوں ابھی۔“ اس نے مجھے اپنے قریب دوسرے اسٹول پر بٹھالیا۔ ”میں نے سوچا ہے بالے بیٹے، کچھلی تفتیوں کو بھلا ہی دیا جائے تو اچھا ہے۔“

”کیسی تنخیاں چچا!“ میں نے پوچھا۔

”ایک بات تو پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم پر جو الزام شریف احمد نے لگایا تھا مجھے اس پر قطعی یقین نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ مولوی کی لونڈیا نے ایک طرفہ چکر چلا رکھا ہو۔ تم ایک شریف خاندان کے ذرا ہو، نیک بچے ہو تمہارے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ کسی پر بڑی نظر ڈالو گے۔ اس مولوی کی لونڈیا ہی نے یقیناً تمہیں بھلا یا بھسلا یا ہو گا۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب ان باتوں سے چھوٹے خاں کا مقصد کیا تھا۔ پھر بھی وہ بکواس کرتا رہا میں نے سن لی۔ مولوی کی لونڈیا سے اس کی مراد نرگس ہی تھی۔

”اب اگر مولوی کفایت اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ بچھلا نکاح فتح ہو گیا، تمہارا نکاح دوبارہ نرگس سے گا تو بھائی افضل کو انکار کر دینا چاہئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا..... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نکاح نہ ہوا، گڈے کا کھیل ہو گیا..... تم سے اس لئے میں بات کرنا چاہتا تھا کہ تمہاری مرضی معلوم ہو جائے بات آگے بڑھاؤں۔ دیکھو بالے میاں! ایسی لڑکیاں جو شادی سے پہلے ہی بولا جائیں، اچھی بیویاں نہیں ہوتیں۔ دیے بھی مولوی ہماری برادری کا نہیں ہے۔ اچھے بھلے خاندان میں ٹانگا لگ جائے گا۔“

پورا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ شرعی نقطہ نظر سے میں نے جو بحث نرگس سے کی تھی، وہ رنگ لے آئی تھی، یعنی اقبال کے جسم میں میری موجودگی کے سبب میں نے نرگس کو قبول کیا تھا، اقبال نہیں۔ بات ایسی نہیں تھی کہ نرگس براہ راست مولوی سے کہتی۔ اس نے یقیناً اپنی ماں سے بات کی۔ اسی کے بعد مولوی تک بات پہنچی ہو گی۔ مولوی کفایت اللہ میری نظر میں لاکھ خبیث اور برا سہی

میں نے فی الحال چھوٹے خاں کو ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔ ”چچا! میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ اس وقت تو میں ایک دفتری کام کے سلسلے میں صاحب بہادر سے ملنے آیا تھا۔ ان سے میری ملاقات کراہی۔ ممکن ہے وہ میرا نام بھول گئے ہوں تو آپ یاد دلا دیجئے گا۔“

اس حکمے کا سربراہ ولسن بھلا مجھے کس طرح بھول سکتا تھا۔ اس کی تو ”انگریزین“ بیوی میرا پہلو آباد کر چکی تھی۔ جسے وہ طلاق دے کر لندن بھجوا چکا تھا۔ میں نے تو بس چچا چھوٹے خاں کو مطمئن کرنے کو آفری جملہ ادا کر دیا تھا۔ اس پر چھوٹے خاں بولا۔ ”بالے بیٹا! تم فکر نہ کرو، ارے میاں، صاحب بہادر نے میری ہی سفارش پر تو تمہیں نوکر رکھا تھا، بھول گئے۔“ موقع غنیمت جان کر چھوٹے خاں نے میری ہانڈ پر احسان کا جو تار مار ہی دیا۔

”یاد ہے چچا! یاد ہے سب۔“ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

چھوٹے خاں چوڑا ہوا اور جھٹ اٹھ کر صاحب بہادر کے کمرے میں گھس گیا۔ لوٹا تو اس نے آکر بتایا۔ ”صاحب بہادر تم سے نونج کر تہین منٹ پر ملیں گے۔“ یہ کہتے ہی چھوٹے خاں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ ”اس وقت ٹھیک نونج کر پچاس منٹ اور تیس سیکنڈ ہو رہے ہیں، جی ڈھائی منٹ بعد تمہیں صاحب بہادر سے ملنا ہے۔“

وقت کے معاملے میں بعض انگریز مینٹل کیس بن جانے کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، ولسن بھی ایسا ہی ایک مینٹل کیس تھا۔ ٹھیک ڈھائی منٹ پر کھنٹی بجی اور پھر چھوٹے خاں نے چھوٹے ہی گویا مجھے اندر داخل دیا۔ ”ہیلو ایک بال! تم بہت روز بعد آیا۔ بولو کیا بولتا؟“ ولسن مجھ سے مخاطب ہوا۔

میرا نیکشن انچارج ایک ہندو شری واسٹو تھا۔ میں آگے بڑھا اور بولا۔ ”سر! میں نے ایک فائل پر نوٹ لکھا تھا۔ میرے نیکشن انچارج مسٹر شری واسٹو کی انگریزی بہت کمزور ہے۔ ان کی سمجھ میں میرا لکھا ہوا نوٹ نہیں آیا تو انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ میں آپ کو سر! وہی نوٹ ملاحظہ کرانے لایا ہوں۔“

”لاؤ دکھاؤ!“ ولسن نے مجھ سے فائل لے لی۔ میرا لکھا ہوا نوٹ سب سے اوپر لگا تھا۔ ولسن اسے پورے دیکھنے لگا۔ ”ویری گڈ! تم تو بہت اچھا انگریزی لکھتا ہے۔ کہیں پر کوما اور فل اسٹاپ تک کا غلطی

نہیں۔ تمہارا انچارج ہم کو ڈفر لگتا ہے۔“
 ”انہوں نے سفارشی ٹوکہ کر سہا! آپ پر بھی طفر کیا ہے۔“ میں نے مزید لگائی بجائی کی۔ پھر میں نے انگریزی میں اسے سفارشی ٹوکہ کا مطلب بھی سمجھایا۔
 صاحب ہمار کا چہرہ پہلے ہی چندر جیسا تھا، میری بات پر مزید چندر ہو گیا۔
 ”ہم ابھی آفس آرڈر نکالتا ہے کہ آج سے تم نیکشن انچارج ہو گا ایک بال! مسٹر واسا تو تم کو اسٹ کرے گا۔“ دسٹن غصے میں بولا اور فائل میری طرف بڑھا دی۔
 باہر آیا تو چھوٹے خاں نے پھر گھیرنا چاہا مگر میں رسی تڑا کر بھاگ لیا۔
 قہوڑی دیر کے بعد ہی نیکشن میں جیسے بھونچال آ گیا۔ میری ترقی اور شری واسٹو کی تہذیب کے اکام آگئے تھے۔ میں نے جھنا جھٹ چارج لے لیا۔ شری واسٹو کے چہرے سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے سر پر جوتے پڑے ہوں یا بھرے بازار میں بالوں سے محروم اس کی چکنی چندیا پر کوئی چپت مار کے بھاگ لیا ہو۔

اب گویا میں اس نیکشن کے سیاہ و سفید کا مالک تھا جس میں سیاہ زیادہ سفید کم تھا۔ ”کھانے پینے کے خاصے مواقع تھے۔ مجھے سب سے پہلے ریٹانے آکر مبارک باد دی۔
 ”میں سوکھی مبارک باد وصول نہیں کرتا۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا۔ مجھے خود بخود ایک مونچ مل گیا تھا۔ ”تم اس مبارک باد کو کسی طرح گیل کر دو۔ کیوں مائی ڈیئر اسٹنٹ مسٹر شری واسٹو! میں نے سابقہ نیکشن انچارج کو سڑانے کے لئے اسے مخاطب کیا۔ اس کی میز میرے برابر ہی تھی۔
 توقع کے مطابق وہ سڑ کر بولا۔ ”یہ تمہارا پرسل معاملہ ہے، تم جانو۔“
 ”مانڈ یور لینگوئج۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”آئی ایم یور آفسر۔ ڈونٹ لی فری۔“ انگریزی جھاڑنے کا مقصد اسے رعب میں لینا تھا۔ پھر میں اردو میں بولا۔ ”کیونکہ تمہاری انگریزی کمزور ہے اس لئے تمہیں اردو میں بتا رہا ہوں کہ آئندہ مجھ سے زبان سنبھال کر بات کرنا۔ میں تمہارا افسر ہوں، مجھے سر کر گئے تم، اسی کے ساتھ آپ بھی۔“

”لیس سر!“ شری واسٹو نے جیسے کڑوا گھونٹ پی کر جواب دیا۔
 ”تم بیٹھو نارینا! کھڑی کیوں ہو؟“
 ”تھینک یو سر!“ کہہ کر وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ”ہاں تو مبارک باد کو گیل کرنے کے بارے میں تم نے غور کیا؟“
 وہ کچھ اور ہی سمجھی جس کے نتیجے میں چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔
 ”کچھ کھلاؤ، پلوؤ تو مبارک باد گیلی ہوگی۔“ میں نے وضاحت کر دی۔ ”سنا ہے اتار کلی بازار میں کئی اچھے ہوٹل ہیں۔ آج دوپہر کا کھانا تمہاری طرف سے، بولو منظور؟“
 ”نہی“ میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

”میں نے کوئی فکر نہ کرنا“ ظاہر ہے میرے انچارج بن جانے پر مسٹر شری واسٹو بھی خوش ہوں گے۔
 ہر چند کہ وہ مجھے مبارک باد دینا بھول گئے ہیں مگر دل میں ضرور خوش ہوں گے اور اس خوشی میں یہ بھی دعوت دینے کو سوچ رہے ہوں گے۔ بوڑھے آدمی ہیں بے چارے۔ اتار کلی بازار تک ہمارے ساتھ کہاں ہائیں گے، ہاں یہ ممکن ہے کہ تم ان کی نمائندگی بھی کر دو۔ اپنے حصے کے پیسے یہ تمہیں دے دیں گے۔ کیا خیال ہے مسٹر شری واسٹو؟“
 ”میرے پاس گھر جانے کے لئے صرف تانگے کا کرایہ ہے سس..... سر!“
 ”تو کوئی بات نہیں، مجھ سے ادھار لے لو، کل واپس کر دینا۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور دے دیا۔
 شری واسٹو نے بڑی غصہ ناک نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر روپیہ ریٹا کو دے دیا۔
 ”لچ تائم سے کچھ پہلے ہی اٹھ جانا تاکہ وقت پر دفتر واپس آ جاؤں۔“ میں نے ریٹا سے کہا اور وہ اترار میں سر ہلا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔
 ریٹا اٹھ کر گئی ہی تھی کہ بملا کے درشن ہو گئے۔ میری سیٹ پر اس نے ایک نئے بندے کو بیٹھے دیکھ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

”مس بملا!“ میں نے اسے آواز دی۔ ”آپ کو یقیناً میری تلاش ہے۔“
 وہ اپنی قیمتی ساڑھی سنبھالتی، مسکراتی اور تیر نظر چلاتی میرے سامنے آ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں ندایاں تھیں۔ یاسف شاید اسے رات رات بھر جگا رہا تھا۔
 ”فرماؤ اے نازک اندام حسین!“ میں نے ذرا سا آگے جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔
 ”جج..... جی!“ وہ میرے طرز خطاب پر حیران رہ گئی۔ ”آپ یہ..... یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“
 ”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی، تم نازک اندام بھی ہو اور حسین بھی۔“ میری آواز اب بھی مرگوشی کی حد تک دھیمی ہی تھی کہ گنجاشری واسٹو نہ سن لے۔
 اس نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور بولی۔ ”میرا کام کیا آپ نے؟“
 میں نے بملا کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس بندے کو بلایا جو اب میری سیٹ پر تھا۔ اس سے میں نے راؤ ہمدرد ہماری لال والے کیس کی فائل منگوائی۔ فائل آگئی تو میں بلند آواز میں بولا۔ ”آپ کے پتا جی اس فائل کو یہاں سے غائب کرانا چاہتے ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے آنکھوں سے شری واسٹو کی طرف دیکھ لیا۔ اس کے دونوں کان اپریل کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے مزید کہا۔ ”وہ جو آپ کے پتا جی نے چند روز پہلے شراب کی پارٹی دی تھی، اس سے کام نہیں لیا کیا؟“
 بملا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو اچھا تھا کہ بلا تو توں کو ساتھ نہیں لائی تھی ورنہ ایسے موقعوں پر ہاتھوں سے تو تے بھی اڑ جاتے ہیں۔ وہ بھلانے لگی۔ ”مم..... میں سمجھی..... سمجھی نہیں آپ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”سرکاری زمین ہرپ کرنا بہت بڑی بات ہے۔“ میں نے ایک بار پھر شری واستو سے تصدیق چاہی۔
”جی..... جی ہاں سر!“ شری واستو بول اٹھا۔

”مائی ڈیئر ماتحت! اس فائل کو تم حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھو۔ اس کیس کو بھی اب تم ہی ڈیل کرو گے۔ راؤ بہادر ہماری لال، یعنی ان کا فرادہ کافر حسینہ کے پتا جی اس فائل کو غائب کرانا چاہتے ہیں لیکن تم اس کیس میں مال پانی بنانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ فائل غائب ہوئی یا اس کیس کو دبا دیا گیا؟ میں تمہیں ڈس مس کرا دوں گا۔ رہیں یہ مس جو میرے سامنے بیٹھی قہوج کے اصلی روح گلاب عطری خوشبو سے سارے دفتر کو مکا رہی ہیں، انہیں میں باہر چھوڑ آتا ہوں۔ اٹھئے مس بھلا!“

بھلا کا چہرہ غصے کے مارے مزید سرخ یعنی مزید حسین نظر آنے لگا۔ وہ بہر حال ایک عدد راؤ بہادری بیٹی تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں راؤ بہادر اور خان بہادر کوئی ایسا ویسا معمولی آدمی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر تو انگریز ہندوستانی قوم کے لئے پیر تمہ پابن گئے تھے۔ سو بھلا جلال میں آگئی۔ وہ ایک جھپٹکے سے اٹھی اور سیدھی ایل ڈی اے کے انگریز ڈائریکٹر ولسن کے کمرے کی طرف تیر کی طرح گئی۔ اس سے پہلے بھلانے مجھ پر اپنی توہین کرنے کا الزام لگایا تھا۔

میں بھلا کہاں چوکنے والا تھا، بھلا کے پیچھے راہداری میں لپکا اور اسے روک لیا۔ راہداری جو ولسن کے کمرے کی طرف جاتی تھی، اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔
”راستہ چھوڑو میرا۔“ وہ کسی غصیلی بیٹی کی طرح غرائی۔

”اے میری جنم جنم کی ساتھی! تیرا راستہ میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”کیا تو اپنے بانی سوہن کو نہیں پہچانی؟ تیرے ہی کارنر تو میں نے اس شریر میں پر لوک (عالم بالا) سے یہاں آنے کا کٹھ بھوگا ہے۔“ میں نے بڑے مددانی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”تنت..... تم ہوا می!“ بھلا حیرت زدہ رہ گئی۔

”ہاں میں..... تم باہر چل کے انتظار کرو، میں ابھی فائل لے کر آیا۔“

”بھور سے تو تم میرے پاس سے گئے تھے، پھر کیا سوئے نہیں؟“

”کبھی کوئی آتما (روح) بھی سوتی ہے نگلی!“

بھلا پلٹ کر چلی گئی۔ مجھے نہ تو اس سے دلچسپی تھی کہ راؤ بہادر نے سرکاری زمین دبا رکھی ہے، نہ سرکار انگلیش سے ہمدردی۔ یہ زمین بہر حال انگریزوں کے ابا حضور یا امی جان کی نہیں تھی۔ یہ سارا کھیل تو میں نے شری واستو کے چہار پن کی وجہ سے کھیلا تھا۔ وہ متعجب قسم کا ہندو تھا۔ جو تھوڑے بہت مسلمان اس کی ماتحتی میں تھے، وہ انہیں کسی نہ کسی بہانے ذلیل کرتا رہتا۔ شری واستو کی کوشش یہ ہوتی کہ انہیں کم از کم اپنے نیکشن سے پھٹا کھلا دے۔ میں لاکھ بگڑا ہوا سسی، مگر تھا تو ایک مسلمان جن زاد، گھٹنے تو پیٹ ہی کی طرف جھکتے ہیں نا۔

واپس نیکشن میں آکر میں نے شری واستو کو مخاطب کیا۔ ”تم ایسا کرو کہ فی الحال اس فائل کو ریکارڈ روم میں رکھوا دو۔ بلکہ خود فائل لے کر چلے جاؤ۔ راؤ بہادر ہماری لال بااثر آدمی ہے، مجھے نہیں تو کم از

کم نہیں تو الٹا لکھوا دے گا۔“

شری واستو نے میرے آخری الفاظ غالباً بڑی مشکل سے ہضم کئے اور پھر میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ ایک کانڈ پر میں نے شری واستو کے نام مختصر سا نوٹ لکھا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اس پر دستخط کر دو تاکہ سندہ رہے اور بوقت ضرورت کام آوے کہ یہ فائل تمہارے سپرد کی گئی ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”پھر تو میں ریکارڈ کیپر سے بھی اس فائل کی رسید لوں گا۔“ اس کانیاں بالک نے دستخط کر کے کانڈ پر طرف بڑھا دیا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے وہ کانڈ اپنی میز کی دراز میں رکھ کر تالا لگا دیا۔
شری واستو نے ریکارڈ کیپر کے دستخط لینے کی غرض سے ایک رجسٹر چڑھائی سے منگوایا جو اسی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اس نے رجسٹر میں فائل کی انٹری کی، پھر مجھ سے بولا۔ ”اگر آپ کا حکم ہو تو چڑھائی سے یہ فائل ریکارڈ کیپر کے پاس بھجوا دوں؟“

واہ بیٹا! چڑھائی کو پھنساوانا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا اور سختی سے کہا۔ ”مسٹر شری واستو! او بے مائی آرڈر۔“

قرآ و جبراً اسی کو وہ رجسٹر اور فائل خود لے کر اپنی سیٹ سے اٹھنا پڑا۔ دفتر میں شاید ہی کبھی اس کی اتنی بے عزتی کی گئی ہو لیکن وہ اسی قابل تھا۔ نچلے عملے کو عموماً شری واستو جیسے لوگوں سے شکایت رہتی ہے۔ سو ان کبھی کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ آدم زادوں کی اس دنیا میں بیشہ کرسی کی عزت ہوتی ہے، آدمی کی نہیں۔ شری واستو تو یوں بھی آدمی کم جانور زیادہ تھا۔ اسے میں نے ایک ہی دن کیا، کچھ ہی دیر میں بھٹکی بنا دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں اقبال کے جسم کو چھوڑا اور چل دیا۔

شری واستو کو ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ کرنے کے لئے ایک ہاتھ ہی کافی ہوا۔ ادھر وہ لہرا کے زین پر گرا ادھر میں فائل لے کر تھری فور ہو گیا۔

بھلا اپنی موٹر میں بیٹھی میری منتظر تھی۔
”لے لے یہ فائل اور نکل لے۔“ میں نے فائل ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر پھینک دی۔
”تم کتنے اچھے ہو میرے سوا! مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ تم سے اپنی چٹا کدہ دوں۔“ وہ بڑے لاڈ سے بولی۔

”پرتو میں تو تیرا دھیان رکھتا ہوں میری بچی!“ میں اس کی طرف جھکا۔
”ارے ارے یہاں تو.....“ اس کا جملہ ادھر ادھر گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ہینڈ پرس کھولا اور بھونسا آئینہ نکال کر لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

”دیر نہ کر اب۔“ میں نے اسے ٹوکا۔
اس نے جلدی سے موٹر اشارت کی اور میں پلٹ آیا۔ اقبال سر پکڑے بیٹھا تھا کہ میں نے اس کے

اندر انٹری دے دی۔

توقع کے مطابق جب شرعی واسطو ہال کمرے میں داخل ہوا تو انتہائی بوکھلایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اس کی ٹانگ کھینچی۔ ”مسٹر شرعی واسطو! ذرا سے کام میں اتنی دیر لگادی تم نے۔“

جواب طلبی پر وہ اور بھی نزوس نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے رو دے گا، بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”سر! مجھ سے وہ فائل جانے کون راہشس (شیطان) چھین لے گیا۔“

ابے تو میرے ہی منہ پر مجھے شیطان کہہ رہا ہے۔ یہ سوچ کر میں اس پر برس پڑا۔ ”مال بتالیا، آخر کتنے دام ملے راؤ بہادر کی بیٹی سے فائل کے؟“

”بھگوان کی سوگند میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ راؤ بہادر جی کی پتہری تو پہلے ہی چلی گئی تھی، پھر میں کس طرح.....“

”کیا خبر پہلے سے تم نے مال توڑنے کے لئے اسے سانٹ رکھا ہو۔ وہ دفتر کے باہر رک کر بھی تمہارا انتظار کر سکتی ہے۔ اب ہو گئی تمہاری نوکری تیل۔“ میں نے اسے دہلایا۔

یقیناً اس کے چوہہ طبق سے زیادہ روشن ہو چکے تھے۔ وہ آکر اپنی کرسی پر ڈھے گیا۔ پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو اپنی پتہاٹانے لگا۔

”یہ اسٹوری تم ڈائریکٹر صاحب کو سنانا، میں آج ہی انہیں تمہاری تحریری رپورٹ لکھ کر مع ثبوت بھیج دوں گا۔“

”مجھ پر دیا (رحم) کریں سر! اپنے پریوار (خاندان) کا میں ایک ہی کمانے والا ہوں۔ چھ پتریاں ہیں اور پترسب سے چھوٹا ہے، چار درش کا۔“

”پتروں میں سے کے جوان ہیں؟“ بے اختیار یہ سوال میری زبان پر آگیا اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بات بنانے کی خاطر اسی لئے فوراً بولا۔ ”کسی پتہری کی شادی بھی کی؟“

”بڑی کی سگائی (مگنی) کر دی ہے، اس سے چھوٹی کے لئے رشتہ ڈھونڈ رہا ہوں، باقی ابھی چھوٹی ہیں۔“ وہ میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اپنا پراہلم بتانے لگا۔ ”سر! ابھی تو میرے ریٹائر ہونے میں دس سال باقی ہیں۔ بھگوان نہ کرے نوکری چلی گئی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔“ وہ آبدیدہ ہو گیا۔

”اچھا اب اپنی چونچ بند رکھو، میں سوچوں گا کہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے افسرانہ شان سے کہا اور پھر بطور احتیاط فائل کے متعلق جو نوٹ لکھا تھا، جس پر شرعی واسطو سے دستخط کرائے تھے، میز کی دراز کھول کر نکال لیا۔ اسے میں نے تہہ کر کے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھا اور کام کرنے لگا۔

لچ ٹائم سے گھنٹے بھر پہلے میں اٹھ کھڑا ہوا اور ریٹائر ہو گیا۔ اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مسٹر شرعی واسطو! دیسے تو میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد لوٹ آؤں، پھر بھی دیر ہو جائے یا میں دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے نہ آسکوں تو تم میری جگہ ڈیوٹی دو گے۔“

”مس ریٹائر! مجھ سے آدھے دن کی چھٹی لے چکی ہیں۔ یہ مجھے لچ کرا کے اپنے گھر چلی جائیں گی۔ ان کے پیٹ میں درد ہے۔“ میں نے ریٹائر کی لائن بھی دانستہ کلیئر کر دی حالانکہ ریٹائر سے کوئی بات نہیں

ہوتی تھی یہ سنتے ہی ریٹائر نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات سمیٹ کر دراز میں ٹھونس دیے۔ وہ یقیناً سمجھ جاتی تھی کہ آج اسے پھر خراج محبت ادا کرنا ہے۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ آج کی شام اس کے نام کر دی جائے۔ باغوں کے شرلابور میں ایسے کئی باغ تھے جہاں پہلے بھی کئی بار اس نے یہ خراج ادا کیا تھا۔

ریٹائر میرے پیچھے پیچھے کسی فرمانبردار بیوی کی طرح چل دی، مگر باہر آتے ہی قریب آگئی اور بولی۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اقبال!“

”پہلی بات تو یہ سن لو کہ تمہاری سمجھ دانی چھوٹی سی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اب زیادہ زہی ہونے کی اس وقت تک ٹرائی نہ کرنا جب تک تم سے اس کے لئے کمانہ جائے۔ میں اب تمہارا افسر ہوں اور افسر کو سر کہتے ہیں۔ کیا سمجھیں؟“

”فضول باتیں نہ کرو۔ تم جو کچھ بھی بن جاؤ میرے لئے ڈارلنگ اقبال ہی رہو گے۔“ ریٹائر نے اس ارادے سے یہ الفاظ ادا کئے کہ اگر نقص امن کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں جانے کیا کر بیٹھتا۔

پہلے سے ملے شدہ پروگرام کے مطابق میں اسے ٹانگے میں بٹھا کر اتار کھلی بازار لے آیا۔ انگریز عموماً اپنی میموں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بھی برسر عام چلنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ انہی کی حرص میں کچھ بڑھے لکھے غلاموں نے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ سو میں نے بھی ریٹائر کی نازک کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ نیم انگریز تو وہ پہلے ہی تھی، اعتراض نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولوی کفایت اللہ کی دکان کدھر ہے، میں دانستہ گویا اس قابل اعتراض حالت میں اس کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ وہ اس وقت اپنے ایک ملازم سے

کپڑے کا تھان لے کر کسی گاہک کے سامنے کھول رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے تھان بھوٹ گیا۔ میں اس طرح گزر گیا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

میں نے سوچا کہ کہیں مولوی اسی وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پیچھے نہ لپک لے اس لئے ریٹائر سے کہا۔ ”ذرا تیز چلو۔“

مولوی مجھے اس بازار میں دیکھ چکا تھا یا میں اسے ایک دل سوز نظارہ کرا چکا تھا، سو وہاں سے کھٹک لیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا کہ اس کا ہونے والا دامادیوں برسر بازار لونڈیوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے پھرتا ہے۔ ایسے آوارہ نوجوان کو وہ بھلا اپنی بیٹی کیسے دے دیتا۔ اب اقبال پر جو گزرتی سو گزرتی، مجھے اس سے

رض نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مولوی کو ہشکا دوں کہ اقبال کا کردار ہرگز شرفانہ نہیں ہے۔ حویلی کی چھت پر چھپ چھپ کر نکاح سے پہلے زنگس کے ساتھ ملاقاتوں کی تو اسے خبر تھی ہی، نیک طرار نوجوان تو شادی سے پہلے اپنی زوجہ کو دیکھتے تک نہیں، عقد ہونے کے بعد ہی پہلی بار گھونگٹ اٹھا کر بکھتے ہیں کہ لاٹری ٹکلی یا نہیں۔

ریٹائر کو اتار کھلی بازار سے لے کر میں چوبی آگیا۔ وہاں گھوم پھر کر ہم نے لذت کام و دہن کا سامان لیا۔ پھر سیر گلشن کو نکل گئے۔ میں نے سوچا، شام کا انتظار کون کرے۔ دوسرے بھی تو کسی کے نام کی جاسکتی ہے۔ بھلا دوسرے کیا بگاڑا ہے۔ بس یہی تو ہو گا کہ کسی باغ کا کوئی ایسا حصہ ڈھونڈنا پڑے گا کہ جہاں دن

نہا بھی کوئی نہ آئے۔ مجھ سے زیادہ کسے شر کے دیران گوشوں کا علم ہوتا۔ سو میں اسے ایک ایسے ہی

نہا بھی کوئی نہ آئے۔ مجھ سے زیادہ کسے شر کے دیران گوشوں کا علم ہوتا۔ سو میں اسے ایک ایسے ہی

نہا بھی کوئی نہ آئے۔ مجھ سے زیادہ کسے شر کے دیران گوشوں کا علم ہوتا۔ سو میں اسے ایک ایسے ہی

نہا بھی کوئی نہ آئے۔ مجھ سے زیادہ کسے شر کے دیران گوشوں کا علم ہوتا۔ سو میں اسے ایک ایسے ہی

ویران اجاڑ باغ میں لے آیا جو نواح شہر میں تھا۔ وہاں میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ تاکہ وہاں سے دور ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس باغ میں داخل ہوتے وقت ریٹا ذرا گھبرائی۔

”یہ تو جن اور بھوتوں کا ٹھکانہ معلوم ہوتا ہے۔ تم یہ آج مجھے کہاں لے آئے؟“ ریٹا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس بھولی لڑکی کو خبر ہی نہیں تھی کہ ایک جن زادی اس کے ساتھ تھا۔

”تو کیا ہوا؟“ میں ہنس کر بولا۔ ”زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ کوئی جن تم پر عاشق ہو جائے گا۔“ ”ذراؤ مت“ آئندہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“

وہ دوسرے صبح گزری۔ باغ سے نکل کر خاصی دور پیدل چلنے کے بعد سواری ملی۔ ریٹا کو اس کے گھرا تارک میں نے اقبال کے جسم کو تاکتے ہی میں چھوڑا اور پھوٹ لیا۔ اب مجھے آدم زادوں کے جہر میں داخل ہونے اور نکلنے کی عادت ہو چکی جا رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ ہوس کا کوئی انت، یعنی آخر نہیں۔ سو میں وہاں سے سیدھا بھلا کی کوٹھی جا پہنچا۔ وہ بھی ایک ہی حرافہ تھی۔ میں اگر بوالہوس تھا تو اس نے بھی ریکارڈ توڑ رکھا تھا۔ رات کو تو یاسف اس کے پاس ہوتا، دن میں راجندر یا کوئی اور۔ جو لڑکی اپنے نوجوان نوکروں تک پر ہاتھ صاف کرنے سے باز آئے، وہ بھلا کسی ایک کی بن کر کیسے رہ سکتی ہے۔ دن میں بھی وہ عیش کرتی ہے، اسی روز مجھے یہ اندازہ ہوا۔ اس کا عاشق راجندر ہی خواب گاہ میں تھا۔ راجندر کو میں نے ہی ایک رات بھلا کی خواب گاہ سے مار پیٹ کر بھگایا تھا لیکن اس روز ایسا نہیں کیا۔ ابھی وہ دونوں مرحلہ عشق کی پہلی منزل میں تھے کہ میں راجندر کے جسم پر قابض ہو گیا۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔“ بھلانے راجندر کے دھوکے میں مجھ سے کہا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہی جو میرے پچھلے جنم کا پتی ہے نا اسی نے بہت بڑا کام کر دیا۔“ پھر وہ کام کی تفصیل بتانے کے بعد بولی۔ ”پتا جی اس پر حیران رہ گئے۔“

”تمہارے پتی کی آتما اگر پھر کبھی میری موجودگی میں یہاں آگئی تو بہت بڑا ہو گا۔“

”ارے وہ تو رات کو آتا ہے اور تمہیں میں دن کے وقت بلاتی ہوں۔ اسے کس طرح پتا چلے گا۔“

”دیے بھلا! تو ہے بڑی سلی شے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”تمہیں اگر میں گھاس ڈال دیتی ہوں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تم اپنی اوقات بھول جاؤ۔ کتے ہو گے تم خود۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں دھکے دے کر اپنی کوٹھی سے نکلوا سکتی ہوں۔“ بھلا کو غصہ آ گیا۔ ”تمہاری اتنی ہمت کیسے ہو گئی کہ مجھے کتی کہو۔“

”کتی تو خیر تو ہے۔“ میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

وہ ایک دم اٹھی اور پھر میرے منہ پر طمانچہ مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ”توڑ دوں“ بول..... آوارہ کبیں کی۔ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے دھوکا دے سکتی ہے۔“

”چھوڑو میری کلائی۔“ وہ زور آزمائی کرنے لگی اور پھر دوسرے ہاتھ سے میرے یعنی راجندر کے چہرے پر نقش و نگار بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ یقیناً وہ ابھی اصل معاملے کو سمجھ نہیں سکی تھی کہ پردہ نگاری میں کوئی اور ہے۔ سو اس نے چیخنے کی دھمکی دی۔

”جینچی تو گلا دبا دوں گا تیرا۔“ میں نے اسے دھکا دے کر بیڑ پر گرا دیا۔ ”تو شاید ابھی پہچانی نہیں مجھے کہ میں کون ہوں۔ تیرے لئے میں‘ رام بھروسے بنا‘ اقبال کے جسم میں گھس کر تیرا کام بنایا تو کیا تیرے اس عاشق راجندر کے جسم پر قبضہ نہیں کر سکتا۔“

”تو..... تو ضرور کوئی..... کوئی بھوت ہے۔“ بھلانے خوفزدہ آواز میں چیخنے ہوئے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ”مجھے دھوکا..... دھوکا دے رہا ہے تو کہ..... کہ میرے پچھلے جنم کے پتی کی آتما ہے۔“ بھلا ایک بار پھر پڑی سے اترنے لگی۔ ”تو کیوں..... کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟“ اس کی آواز میں بے بسی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”کوئی بھوت..... بھوت ہی اس طرح منش کے شریر میں داخل ہو سکتا ہے۔“ بھلا کی دلیل بڑی مضبوط تھی۔

”اگر تو مجھے اپنا پتی سوئیکار نہیں کرتی اور بھوت ہی سمجھتی ہے تو بھی میں تجھے ہرجائی پن نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”تجھے اس کا کوئی ادھکار (حق) نہیں۔“ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔

”پچھلی مار بھول گئی کیا؟“ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھالیا۔

”مار ڈال..... مار ڈال مجھے۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اسے راہ پر لانے کے لئے غلط طریقہ اپنایا۔ میں یہ بھول گیا کہ اس وقت جذبات کے تاروں پر انگلیاں رکھنے سے کچھ نہیں ہو گا، غصہ اس کے ہر احساس پر غالب ہے۔ میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا تو شاید وہ صورت حال پیش نہ آتی۔ جب دروازے پر زور دار دستک دی جانے لگی تو مجھے اپنی غلطی کا خیال آیا۔

”بچاؤ..... بچاؤ.....“ وہ پھر زور سے جینچی مگر دوبارہ پورا لفظ ادا نہ کر سکی۔

میں نے اسے ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ کر دیا اور پھر خود ہی دروازہ کھول دیا۔ ملازمین کے ساتھ ہی راؤ بہادر ہماری لال بھی میرے سامنے کھڑا تھا۔

”کینے تو!“ راؤ بہادر نے راجندر کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ عین اسی وقت میں راجندر کے جسم سے باہر آ گیا۔

راجندر کے جسم کو جھٹکا لگا اور پھر وہ راؤ بہادر کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ میں‘ بھلا کی کوٹھی سے نکل آیا۔ وہ پہلی آدم زادی تھی جو یہ جاننے کے باوجود کہ میں غیر انسان ہوں‘ مجھ سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ نرگس کا معاملہ مختلف تھا، وہ علم والی تھی، لیکن بھلا تو اس سے قطعی مختلف تھی۔ نہ اسے علم سے

کوئی علاقہ تھا نہ کسی طرح مجھے اپنے قریب آنے سے روک سکتی تھی۔ میں بہت بے چین ہوا۔ شام ہو رہی تھی جب میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ یاسف موجود تھا۔
 ”اے علیالیش! تجھ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ تو کہاں رہتا ہے؟“ یاسف مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”بس اے یاسف! نہ پوچھ آج کل کیا کیا بیت رہی ہے۔“ میرے لہجے میں اداسی تھی۔
 ”ہوا کیا؟“ مجھے بھی تو بتا۔ کہیں تو بھالی دروازے کی طرف تو نہیں چلا گیا تھا؟“
 ”نہیں۔“ میں نے جواب دیا، پھر بھلا کا قصہ سنا دیا۔

میں اور یاسف ہی کیا، کوئی بھی جن زاد یہ پسند نہیں کرتا کہ جو آدم زادی اس کے تصرف میں ہو، وہ کسی آدم زاد سے بھی تعلق رکھے۔ سو میری بات سن کر یاسف کو بھی غصہ آ گیا اور کہنے لگا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی ذلیل ہو گی۔ آج رات اس فریبی آدم زادی کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ پھر کبھی کسی آدم زاد کا تصور بھی نہ کر سکے گی۔ مجھے تو اس نے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہوں اور اب اس پر صرف میرا ہی حق ہے۔ بڑی ہی دعا باز نکلی۔“
 ”غصے میں کہیں اس خوبصورت کھلونے کو توڑ نہ دیجو اے یاسف! ابھی اس سے جی نہیں بھرا۔ لاکھ ہرجائی سہی مگر ہے تو حسین۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتا ہے تو۔ جی تو ابھی میرا بھی نہیں بھرا۔“
 رات کا سناٹا پھیلنے لگا تو ہم دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ مجھے دوازے سے ملنا تھا۔

دوازے مجھے اپنے ممکن کے باہر مقررہ جگہ پر مل گئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تیرا باپ ہاموس تو سو گیا نا؟“
 ”وہ نہ سوتا تو میں تجھ سے ملنے کیسے آتی اے علیالیش! چل آج رات بھی اسی برگد کے پتے پر چلے ہیں جہاں.....“

”تو نے پچھلی ملاقات میں جو وعدہ کیا تھا، تجھے یاد ہے نا؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”کون سا وعدہ؟ مجھے تو یاد نہیں۔“

”یہی کہ کیل دیئے جانے والے مکان میں داخل ہونے کا عمل بتا دے گی۔“
 ”یہ تو نہیں کہا تھا میں نے..... ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ اس پر پھر بات کریں گے۔“ وہ میری باتوں میں نہ آئی۔

”میں انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں دوازے اور..... اور تجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ میں نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”اسی پر تجھے عشق کا دعویٰ ہے۔“

”میرے عشق کی سچائی کو آزمائش میں نہ ڈال اے علیالیش! تجھے میں بتا چکی ہوں کہ اپنے باپ سے عہد.....“
 ”اے دوازے! تجھے اپنا عہد عزیز ہے، اپنا عشق عزیز نہیں..... ٹھیک ہے، آئندہ میں تجھ سے

نہیں ملوں گا۔“ میں جانے کے لئے مڑا۔

”نہر جا اے علیالیش! مجھے سوچنے بچھنے کی مہلت دے۔“ دوازے میرے سامنے آ گئی۔

پھر چند ہی لمحوں کے بعد ہم دونوں ایک کھنڈر میں تھے۔ میں اس کے کہنے پر رک گیا تھا۔ اس رات دوازے نے مجھے بے خودی کے لمحوں میں وہ عمل بتا دیا کہ جس کی خاطر میں نے اس کا قرب گوارا کر لیا تھا۔ اسی خیال سے میں رک بھی گیا تھا ورنہ وہ کوئی آدم زادی تو تھی نہیں کہ میں اس کا دیوانہ ہو جاتا۔ اس عمل کی کچھ شرائط بھی تھیں جن کو پورا کرنا کم از کم اس رات میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ یوں بھی مجھے نصف شب کے بعد خدیجہ کے پاس پہنچنا تھا۔ دوازے سے رخصت ہو کر میں نے ایک نہر میں ڈبکی لگائی کہ مجھے خدیجہ کی خاطر اسی رات سے ہاموس کا تعلیم کیا ہوا عمل کرنا تھا۔ عمل کے لئے میرا پاک ہونا بھی ضروری تھا۔

میں نصف شب کے قریب خدیجہ کے گھر پہنچا تو وہ توقع کے مطابق مجھے اپنے گھر کی بیٹھک ہی میں جاگتی مل گئی۔ وہ میرے ہی انتظار میں جاگ رہی تھی۔ تنگ اور بدبودار کوٹھری سے اسے نجات مل گئی تھی۔ اس کے دن واقعی پھر گئے تھے۔ چارپائی کی بجائے اب وہ ایک بڑے پتک پر تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا بچہ دوسری طرف سو رہا تھا۔ بیٹھک میں لیپ کی دھیمی روشنی تھی اور دروازے بند تھے۔ اپنی موجودگی کا اسے میں نے جلد ہی احساس دلادیا۔
 وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی اور غصے میں بولی۔ ”یہ کیا بد تمیزی ہے؟ مجھے یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں۔“

میں دانستہ خاموش رہا کہ دیکھوں وہ ڈرتی ہے کہ نہیں۔
 ”مجھے معلوم ہے تم آچکے ہو، بولو نا، ورنہ میں سو جاؤں گی۔ ایک تو تمہارے انتظار میں اب تک جاگ رہی تھی، اس پر آتے ہی تم نے بد تمیزی شروع کر دی۔“
 خدیجہ کچھ اس طرح بولی کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

”دیکھا، میں ٹھیک سمجھی تھی نا، نکلے تھی۔“

”میں تو سمجھا تھا کہ تم سو رہی ہو تو تمہیں جگانے کی خاطر.....“
 ”اس طرح جگاتے ہیں۔“ اس نے آنکھیں نکالیں۔

”اچھا چلو، اب ادھر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”عمل شروع کرنے کا وقت ہو رہا ہے۔“
 نصف شب گزرتے ہی میں نے عمل پڑھنا شروع کر دیا خدیجہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ میرے ایما پر اس نے بیٹھک کے فرش پر ایک چادر بچھالی تھی۔

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا نہ ہی ہاموس نے یہ بتایا تھا کہ اس عمل کا کیا رد عمل ہو گا۔ میں تو اس وقت بوکھلایا کہ جب اچانک خدیجہ پوری قوت سے چیختی لگی۔ ”نہیں..... نہیں ہامہ! اب نہیں۔“ ہامہ اسی لہجہ میں کہتا تھا کہ جس نے خدیجہ کو اس حالت پر پہنچایا تھا۔ خدیجہ کسی مایہ بے آب کی طرح فرش پر گر کے تڑپ رہی تھی۔ چیخوں سے اس کا بچہ بھی جاگ گیا اور سارے گھر والے بھی اٹھ گئے۔ بیٹھک کے

میری غیر انسانی آواز سن کر وہ بھی گنگ رہ گئے۔ ان کے چروں سے خوف و دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی وقت خدیجہ کے کراہنے کی آواز آئی اور بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ سلیم اللہ نے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہوا تھا بائی!“

”کب؟“ وہ حیران سی ہو کر بولی۔

”تم کسی ہامہ کا نام لے لے کر چیخے جا رہی تھیں۔“ سلیم اللہ نے بتایا۔

”میں..... میں تو کسی ہامہ کو نہیں جانتی۔“ خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر حیرت زدہ سی ہو کر پوچھنے لگی۔ ”تم سب یہاں کس طرح آ گئے؟ دروازہ تو میں بند کر کے لیٹی تھی۔“

”ہیں نہیں معلوم خدیجہ کہ دروازہ کس نے کھولا۔“ خدیجہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ ”تم اس قدر زور زور سے چیخ رہی تھیں کہ ہم ڈر گئے اور دروازہ توڑنے والے تھے کہ خود بخود دروازہ کھل گیا۔ تم فرش پر بے ہوش پڑی ملیں۔“ ان لوگوں نے شاید اب اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا اور خدیجہ کو ہوش میں دیکھ کر وہاں غالباً میری موجودگی کو بھی بھول گئے تھے۔

خدیجہ نے اپنے بیٹے کو گود میں لے لیا، پھر کہنے لگی۔ ”مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوا، میں تو سو رہی تھی اور ابھی آنکھ کھلی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ خدیجہ مصلحتاً اپنے گھر والوں سے میرا ذکر نہیں کر رہی۔ گھر والوں نے بھی اس سے میرے بارے میں کچھ نہ کہا اور بیشک کا اندرونی دروازہ کھلا رکھنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

”خدیجہ!“ میں نے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا، پھر عمل کے دوران اس پر جو کچھ گزری تھی اس کے متعلق دریافت کیا۔

مجھے خدیجہ کے جواب پر حیرت ہوئی، اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ میں پھر وہاں رکا نہیں اور چلا آیا۔ خدیجہ کے گھر سے نکل کر ابھی میں کچھ ہی دور آ سکا تھا کہ ہامہ نے مجھے پکڑ لیا اور پھر ایک تالاب کے کنارے لے آیا۔ مجھے بھڑا کر وہ میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور غرایا۔ ”اس وقت تو عمل کر رہا تھا اس لئے میں قریب نہیں آیا لیکن اب تو تیرا کچھ مر نکال دوں گا..... میرے منع کرنے کے باوجود تو نے خدیجہ کو زیر کیا اور میں اسے تیری پہلی غلطی سمجھ کر طرح دے گیا کہ تو نے اس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ پھر بھی تو کیننگی سے باز نہ آیا اور اسے آئندہ اپنے تصرف میں لانے کی خاطر عمل شروع کر دیا۔ عالم کے بچے! بول! اب میں تیرا کیا حشر کروں؟“ وہ مجھے مارنے لگا۔ میں نے لاکھ یہ کوشش کی کہ اس کی گرفت سے نکل جاؤں، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ”بتا، کل سے عمل کرے گا؟“ وہ میری گردن دبائے لگا۔ ”یہ میری ٹوہن ہے کہ جو آدم زاد میری ہو، اسے کوئی اور برتے۔“

میرا جواب سننے کے لئے ہامہ نے گردن دبانا چھوڑ دی تو میں بڑی عاجزی سے روتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بھائی ہامہ! تم..... تم اب تو اس سے نہیں ملتے، پھر..... پھر مجھے کیوں روکتے ہو؟“

”ابے تو بڑا ہی بے غیرت اور ڈھیٹ ہے۔ اتنا پٹنے کے باوجود نہیں مان رہا۔“ پھر ہامہ مجھے تالاب میں گھسیٹ لے گیا اور بڑی درگت بنائی۔ میرا دم گھٹنے لگا تو وہ مجھے دوبارہ اوپر لے آیا۔ ”اب تیرا دماغ

دروازے پر زور زور سے دی جانے والی دستک اور آوازیں اسی کا ثبوت تھیں۔

میں اتنا تو جانتا ہی تھا کہ کسی عمل یا دھنپنے کو درمیان میں چھوڑ دینا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے عامل اور معمول دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ایک جن زاد، یعنی میں خود سے زیادہ قوی جن کے اثر کو ختم کر رہا تھا۔ خدیجہ بار بار ہامہ کا نام لے کر اس سے التجائیں کر رہی تھی۔ اس سے میں نے یہی قیاس کیا کہ ذلیل و سرکش ہامہ بھی وہاں آ گیا ہے اور عمل رکوانے کی خاطر خدیجہ کو اذیت دے رہا ہے۔ جنت بڑی مشکل ہی سے کسی آدم زادی کا پیچھا چھوڑتے ہیں۔ چیخ پکار اور ہنگامے کے باوجود میں نے عمل ترک نہیں کیا۔ ہاموس نے جو وقت مقرر کیا تھا، وہ میں نے پورا کیا۔ اسی کے ساتھ خدیجہ تڑپتے تڑپتے ایک دم ساکت ہو گئی اور چیخنا بھی بند کر دیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا تو دیکھا وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا بچہ جاگنے کے بعد اب تک روئے جا رہا تھا۔ بیٹھک کے اندرونی دروازے کو غالباً اب توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے اسی لئے دروازہ کھول دیا۔

خدیجہ کے تینوں بھائی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ انہی کے پیچھے خدیجہ کی بھابھیاں بھی تھیں۔ ایک نے روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر کاندھے سے لگا لیا، دوسری نے لیمپ کی لو تیز کر دی۔ بے ہوش خدیجہ کو فرش سے اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس بے ترتیب تھا۔ چھوٹے بھائی سلیم اللہ نے اس کے اوپر چادر ڈال دی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ خدیجہ نے جس جن کو اپنے قبضے میں کیا ہے، وہ باغی ہو گیا ہے اور اب خدیجہ کو ستا رہا ہے۔“ خدیجہ کے بڑے بھائی نے قیاس آرائی کی۔

”میں نے اس کا نام بھی سنا ہے۔ خدیجہ ہامہ کا نام لے رہی تھی۔“ دوسرے بھائی نے بتایا، پھر کہنے لگا۔ ”میں نے ایک مولانا صاحب کا بہت نام سنا ہے۔ وہ روحانی علاج کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ میرا ایک دوست ان سے واقف ہے۔ مولوی کفایت اللہ نام ہے شاید ان کا اور وہ بھائی دروازے میں رہتے ہیں۔ وہ خود کہیں نہیں جاتے، حاجت مند ہی ان کے پاس جاتے ہیں۔ میں آج اپنے دوست سے بات کرتا ہوں۔ پھر کل خدیجہ کو وہاں لے چلیں گے۔“

چھوٹے بھائی سلیم اللہ نے بھی اس تجویز کی تائید کر دی اور بولا۔ ”ہامہ جن، خدیجہ کو خدا نخواستہ ہلاک بھی کر سکتا ہے۔“

مولوی کفایت اللہ کے ذکر پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑا خطرناک آدم زاد تھا۔ اگر خدیجہ کے گھر والے اسے مولوی کے پاس لے جاتے تو جانے کیا صورت ہوتی۔ مجھے تو ابھی مزید چھ دن عمل کرنا تھا۔ یہی سوچ کر میں ایک دم بول اٹھا۔ ”اے آدم زادو! اسے ہرگز اس مولوی کے پاس نہ لے جانا ورنہ یہ زندہ نہیں بچے گی۔ میں، ہامہ نہیں ہوں۔ ہامہ تو اس کا دشمن ہے۔ میں اسے ہامہ کے اثر ہی سے نکالنے کے لئے عمل کر رہا ہوں۔ ہامہ نہیں چاہتا کہ میرا عمل پورا ہو۔ وہ اسی لئے خدیجہ کو ستا رہا ہے۔ ابھی مجھے مزید چھ راتوں کو یہ عمل کرنا ہے۔ اگر عمل کے دوران میں کوئی مداخلت ہوئی یا عمل پورا نہ ہو سکا تو خدیجہ ہی نہیں اس گھر کا کوئی بھی فرد زندہ نہیں رہے گا۔“

درست ہوا؟

خالم ہامہ سے بچنے کی یہی صورت تھی کہ میں اس کی بات مان لیتا لیکن اسی وقت مجھے خیال آیا کہ جو عمل ہاموس نے مجھے تعلیم کیا ہے اس کا درد شروع کر دوں۔ شاید اس طرح میری جان بچ جائے۔ یہ وہی عمل تھا کہ جو میں خدیجہ کے لئے پڑھتا رہا تھا اور اس عرصے میں ہامہ میرے قریب نہیں آسکا تھا۔ خود ہامہ نے بھی یہ اعتراف کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے درد شروع کر دیا۔ ہامہ کے جسم کو زبردست جھکا لگا اور وہ اچھل کر تالاب میں جاگرا۔ اٹکل لگ گئی اور پھر میں وہاں سے ورد کرتا ہوا ریس لگا گیا۔ ہامہ کے ظلم سے بچنے کی تدبیر میرے ہاتھ آگئی تھی۔

شیطان ہامہ سے پٹ کر میری حالت اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس رات کسی اور طرف سے رخ کرتا، سو ٹھکانے پر آگیا۔ ساری رات کراچے گزری اور نیند نہیں آئی۔ ان آدم زادوں کی طلب نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اک پاس کا صحرا تھا کہ میں جس سے آبلہ پاگزرے پر مجبور تھا۔ صبح دم یاسف لوٹ کر آیا تو اس نے میری حالت پر تاسف کیا۔ خدیجہ کے بارے میں اسے میں نے

بتائی دیا۔

”یہی تو تجھ میں خرابی ہے اے علیالیش کہ مجھے دوست کہنے کے باوجود رازداری سے کام لیتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ تجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔“ پھر وہ راوی میں ڈبکی لگانے چلا گیا اور آکر مجھ پر دم کیا، پھر بتانے لگا۔ ”ہملا نے معافی مانگ لی ہے۔ تیرے لئے ایک نئی خبر یہ ہے کہ اس کے یہاں کوئی مسمان آئی ہے۔ اس کا تعلق کسی ریاست سے ہے۔ محض تیری خاطر اسے میں نے نہیں چھیڑا۔ دور سے ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کا نام لٹتا ہے۔ تو اسے دیکھ گا تو زنگس کو بھول جائے گا۔“ پھر وہ دیر تک لٹتا کے خُسن کا قصیدہ پڑھتا رہا۔

یاسف کے دم کرنے سے میری تکلیف ختم ہو گئی اور نیند آنے لگی۔ وہ پورا دن میں نے سوتے ہوئے گزارا۔ یاسف ابھی مکان میں موجود تھا۔ میرا ارادہ آج رات زنگس کی طرف جانے کا تھا کہ وہ عمل آزمادوں جو ہاموس کی بیٹی وازعہ سے معلوم ہوا تھا لیکن لٹتا کے خُسن کا جو نقشہ یاسف نے کھینچا تھا اس نے مجھے روک لیا۔

”اے یاسف! آج تو ہملا کی طرف نہ جا۔“ میں بولا۔

”ٹھیک ہے، میں زینت کے پاس چلا جاتا ہوں۔“ وہ راضی ہو گیا۔ ”تو شاید لٹتا کو دیکھنا چاہتا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے اعتراف کر لیا، پھر آہستہ سے ہنس کر کہا۔ ”میں صرف دیدار سے بہلنے والا نہیں“

اس کا اندازہ شاید تجھے بھی ہو گا۔“

”تجھے میں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا“ لٹتا کے ساتھ مجھے ایک خطرناک آدم زاد بھی خزانے کے سانپ کی طرح نظر آیا تھا۔ اس سے تجھے بچ کے رہنا پڑے گا۔ ہندوؤں میں بھی تو کچھ ایسے آدم زاد ہوتے ہیں جو علم جانتے ہیں۔ ملے سے وہ مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ لٹتا اسے گرد دیو کہہ رہی تھی۔“ یاسف نے بتایا۔

”ایسی تھی اس گرد دیو کی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو کہے تو اے علیالیش! میں آج رات زینت کے پاس نہ جاؤں اور تیرے ساتھ چلوں۔“ یاسف

بولا۔

وہ کس لئے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تو کسی اور دن چلا جائیو“ وعدے سے نہ پھر اور نہ بھول کہ تو مجھ سے کہہ چکا ہے، میری خاطر لٹتا کو نہیں چھیڑا۔“

”بڑا افسوس ہے، اے علیالیش کہ تو مجھے آج تک سمجھ نہیں سکا۔ میں تو اس لئے تیرے ساتھ چلے کو کہہ رہا تھا کہ گرد کہیں کالا علم نہ جانتا ہو۔ اس نے اگر مداخلت کی تو ہم دونوں مل کر اس سے بھگت لیں گے۔ ایک مرتبہ ہاموس ہی نے مجھے بتایا تھا، کافر جنات کی طرح کافر آدم زاد بھی کچھ ایسے علوم سے واقف ہوتے ہیں کہ جنات کو قابو میں کر لیں۔ پھر بھی تو اگر اکیلا ہی جانا چاہتا ہے تو میں تیرے ساتھ چلنے کی ضد نہیں کروں گا۔“ یاسف نے اپنی صفائی پیش کی۔

”ہاں مجھے اکیلا ہی جانے دے اور ڈرانے کی کوشش نہ کر۔“ میں نے کہہ دیا۔

یاسف چلا گیا تو میں بھی ویران مکان سے نکل آیا۔ آدم زادوں کی بستی خاموشی میں ڈوب چکی تھی۔

میں لٹتا کے تصور میں ایسا غرق تھا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی، کب اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

چاندنی رات میں وہ منظر میرے لئے انتہائی حیران کن تھا جو کوٹھی کی حدود میں داخل ہوتے ہی مجھے نظر آیا۔ کوٹھی کے بڑے سے لان میں ایک سرو قد آدم زادی اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کا رخ چاند کی طرف تھا، جسم پر ریٹشی لبادہ تھا۔ یاسف نے لٹتا کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ اس پر پوری اترتی تھی۔

میں ایک بے خودی کے سے عالم میں جیسے اس کی طرف کھینچا چلا گیا۔ اچانک اس کے جسم کو میں نے دھیرے دھیرے فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ پھر وہ میری طرف پلٹی۔

”تو خود ہی آگیا۔ میں تو تیری تلاش میں جا رہی تھی۔“ اس کی خواب ناک سی آواز مجھے سنائی دی۔

مجھے اسی لمحے یوں لگا جیسے میرا جسم ساکت ہو گیا ہے اور میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا مگر ناکام رہا۔

”فضول کوشش نہ کر کہ میں نے تجھے قید کر لیا ہے۔“ اس کے حسین لبوں نے حرکت کی اور پھر دھیرے دھیرے ہی اس کا جسم فضا سے نیچے آنے لگا۔

اس خیال سے کہ ایک کافر آدم زادی مجھے اپنا قیدی بنا چکی ہے، میں نے بڑی ذلت محسوس کی۔ اسی کے ساتھ مجھے ڈر بھی لگا کہ وہ نہ جانے میرا کیا حشر کرے۔ پھر میں نے سوچا، اس اجنبی آدم زادی کو میری تلاش کیوں تھی؟ ابھی یہ سوال تشنہ جواب ہی تھا کہ اس نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف اٹھایا۔ میں نے چنگاریاں سی اپنی طرف لپکتے دیکھیں اور پھر انہی چنگاریوں نے میرے وجود کو اپنے گھیرے میں لے

”میں تجھے زندہ جلا دوں گی۔“ یہ وہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے، پھر میرے ہوش و حواس برقرار نہ رہ سکے۔

☆=====☆=====☆

آدم زاد واقعی اللہ کی بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ جنات اسی لئے تو آدم زادوں سے بچنے رہنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا اور اس رات بھی ہوا جب ایک کافر آدم زادی لٹا نے مجھے زندہ جلا دینے کی دھمکی دی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ معلوم نہیں اس ظالم حسینہ کو مجھ غریب جن زاد سے کیا دشمنی تھی۔ بھلا کسی آدم زادی کی آرزو کرنا بھی کوئی جرم ہے۔ میں نے تو کسی آدم زادیوں کے ایسے واقعات سنے تھے جو باقاعدہ جنات سے نکاح کر کے ان کی بیویاں بن گئی تھیں۔ میں بھی چاہتا تو اس کے لئے کسی آدم زادی کو آمادہ کر لیتا۔ زینت ہی سے اگر کہتا کہ چندا میری بیوی بن جاؤ اور میرے ساتھ نکاح پڑھو لو تو وہ فوراً راضی ہو جاتی لیکن بیوی اور محبوبہ میں فرق ہوتا ہے۔ بیوی تو بس بیوی ہوتی ہے۔ کسی ایک کا بن کے رہتا مجھے پسند ہی نہیں تھا، خواہ وہ کوئی آدم زادی ہو کہ جن زادی۔ ایک ہی چہرہ دیکھتے دیکھتے جی بھی تو ادب جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہو یا کسی کو باندھ لو۔ یکسانیت میرے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی اور یقیناً آدم زادوں کی اکثریت بھی یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ آج ایک پھول کی خوشبو سے روح کو مکھیا تو کل کسی کلی کو پھول بننے پر اکسایا۔ آج ایک خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو کل ایک نیا خواب در دل پر دستک دینے لگا۔ شوق آوارگی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ورنہ میں اس رات لٹا کی طلب میں کیوں قید ہو جاتا۔

مجھے اس بات کا علم بعد میں ہوا کہ میری بے ہوشی خاصی طویل تھی۔ اس کے لئے مجھے دانستہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ رکھا گیا تھا۔

حواس میں آنے کے بعد خود کو میں نے ایک اجنبی جگہ پایا۔ پختہ چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی وہ کوئی گہری سی جگہ تھی جس میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ حواس کھونٹے سے پہلے میں جس عذاب میں گرفتار تھا اب وہ کیفیت نہیں تھی، نہ چنگاریاں مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں بلکہ میں اپنے جسم کو حرکت دینے پر بھی قادر تھا۔ سو پھر میں وہاں کیوں پڑا رہتا۔ میں گمراہی سے اوپر کی طرف چلا لیکن ابھی مشکل سے اوپر پہنچنے کے لئے نصف راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ میرے جسم نے جھٹکا کھایا۔ وہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں پھر گمراہی میں جاگرا۔ پھر کئی بار اسی کوشش کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہاں مجھے قید کر دیا گیا ہے۔ میں مقررہ حد سے اوپر نہیں جا سکتا۔ اس جگہ کی خاموشی اور تنگسگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھلا کی کوٹھی کا کوئی حصہ ہرگز نہیں ہے۔ وہاں سے نکلنے کی جدوجہد میں نڈھال ہو کر میں ایک طرف پڑ گیا۔ وہاں جگہ جگہ چھوٹے پتھر، روڑے اور کنکریاں بکھری ہوئی تھیں۔ زمین بھی ناہموار سی تھی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ لٹا اگر مجھے زندہ ہی جلا دینے والی تھی تو پھر اس نے اب تک ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ تو میرے لئے قطعی اجنبی تھی، اس سے میری کوئی دشمنی بھی نہیں تھی تو

س لئے مجھے قید کر رکھا تھا؟ میری سمجھ میں صرف یہ آیا کہ شاید اس حرافہ بھلانے لٹا سے میرا ذکر کر دیا ہو۔ لٹا کتنی خطرناک تھی، اس کا تجربہ بھی مجھے ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں حسین ترین آدم زادیاں اس قدر خطرناک کیوں ہوتی ہیں کہ ہم جیسا کوئی جن زاد ان کے شے پر ہاتھ ہی نہ رکھ سکے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ زمیں کے بعد یہ دوسری آدم زادی تھی جس نے مجھے قریب نہیں آئے دیا تھا لیکن لٹا قطعی مختلف نکلی۔ اس کا اندازہ مجھے ذرا ہی دیر کے بعد ہو گیا۔

ہوا یہ کہ میں نے بلندی پر زینے کی ابتدائی سیڑھیوں سے اسی کافر حسینہ کو اترتے دیکھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ ایک باریش ”دھوتی بند“ بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس شخص کا جسم گٹھا ہوا، بازو پر گوشت اور سر پر شانوں تک لٹکے ہوئے بال تھے، آنکھیں درمیانی تھیں۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں کے درمیان اس کا دہانہ غائب تھا۔ دھوتی کے اوپر کسی موٹے کپڑے کا کرتہ پہنے ہوئے تھا، گلے میں بڑے موتیوں کی مالا تھی۔ وہ دھیرے دھیرے باتیں کرتا لٹا کے ساتھ گمراہی میں اتر رہا تھا۔ لٹا اس وقت سرخ ریشمی ساڑھی باندھے ہوئے تھی، ساڑھی پر سبز رنگ کے پھول بنے تھے۔ سرخ ساڑھی میں اس کا سرخ و سفید جسم چبے لودے رہا تھا۔ ابھی وہ دونوں مجھ سے خاصے اوپر تھے، پھر بھی میں نے ان کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا۔ مجھے ان دونوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ادھیڑ عمر کا وہ باریش آدمی اپنے گلے سے مجھے لٹا کا گرد ہی معلوم ہوا۔ یاسف نے مجھے اس کا حلیہ بتایا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب اسے ہوش آ جانا چاہئے“ سے ہو گیا ہے۔ ”گرد کو دھو رہا تھا۔“ نہ بھی ہوش آیا تو میں اسلوک پڑھ کے چلا جاؤں گا۔ پھر وہ ہوش میں آ جائے گا۔ تیرے ساتھ اسی لئے میں آیا ہوں۔ جو سمجھایا ہے، اسے دھیان میں رکھنا۔ بھلا کی وجہ سے بھگوان نے کام بنوا دیا ورنہ یہ ہمارے ہاتھ نہ آتا۔“

”کام تو بن گیا کرو جی پرنتو مجھے ڈر لگتا ہے۔“ لٹا جواب میں بولی۔

”تم اتنی بلوان (طاقتور) ہو کر ڈرتی ہو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ تمہیں اسے گندا کرنا ہے، اس کے بغیر وہ قابو میں نہیں رہے گا۔“ گرد کا انداز سمجھانے والا تھا۔ ”تجھی تو میں جاپ کر پاؤں گا۔ تم سے ملاپ کے بعد اسے پانی سے دور ہی رکھنا ہے تاکہ وہ پوتر (پاک) نہ ہو سکے۔ اس کے لئے جاپ پورا ہونے تک ہم اسے ہمیں قید رکھیں گے۔ جاپ (عمل) وظیفہ پورا ہو گیا تو پھر کوئی چٹا (فکر) نہیں رہے گی۔ ہم جو کہیں گے سو وہ کرے گا۔“

”گرد جی! یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہو، پر اس سے پہلے کسی بھوت بلا کو میں نے قریب نہیں آنے دیا۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ اس سے شریر (بدن) میں آگ سی بھر جاتی ہے اور پھر.....“

”غلط سنا ہے تم نے، یہ ان بھوت پریت میں سے نہیں کہ پھر استری (عورت) کسی اور کے قابل نہ رہے۔ یہ جو تین دن بیٹے ہیں اسے یہاں لا کر قید کئے ہوئے تو اس عرصے میں مجھے بت کچھ پتا چلا ہے۔ ہاں اس کا نام معلوم نہیں کر پایا جو تمہیں معلوم کرنا ہے۔ جاپ کے لئے اس کے نام کی جانکاری بھی ضروری ہے۔“

باتیں کرتے ہوئے اب وہ دونوں زینے کی آخری میزھیوں تک اتر آئے تھے۔

”گرو جی! آپ جو کرنے کو کہتے ہو اس کے لئے یہ جگہ بھی تو اچھی نہیں۔“ للتا نے ایک اور اعتراض کیا۔

”یہاں سے اسے نکال کر کہیں اور لے جانا خطرناک ہو گا۔ یہ فرار بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے ہاں کالی چرن جی تو پہلے ہی ان باتوں کے خلاف ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ان کے آدمی ہر حال میں شہساز خاں کو ڈھونڈ کر مار دیں گے۔ پچھلے ہی ہفتے مجھ سے وہ کہہ رہے تھے گرو جی! کسی جاپ واپ کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہیں میرے اور تمہارے میل ملاپ پر بھی شاید شک ہو گیا ہے۔ اگر کسی طرح شہساز خاں کا کاٹنا نکل جائے تو وہ میرے آجھاری (ممنون) ہو جائیں گے۔ پھر ہمارے ملن پر بھی انہیں اعتراض نہ ہو گا۔ سو جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔“

گرو ایک نمبر کا بد معاشرہ نکلا۔ کہاں للتا جیسی کافر ادا حسین ترین آدم زادی اور کہاں گرو۔ اپنی ”بلبل“ کے پہلو میں اس لنگور کو دیکھ کر میں ہمت ہی پتا۔ رقیب ہو کر وہ للتا کو میری زینت آغوش بن جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ہر چند کہ اس سے میرے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے لیکن اسی کے ساتھ قسمت پھوٹنے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔

میں نے جی بی جی میں سوچا، بیٹا علیا لیش! امتحان کی گھڑی سر پر آن پہنچی ہے۔ اس کافر آدم زادی کے قیامت خیز خشن سے بچ کر دکھا تو جانوں۔ اب تک تو خود تجھے یہ آرزو رہتی تھی لیکن آج ایک آدم زادی تیری تسخیر کے در پے ہے۔ پھر جی میں آیا کہ گردن گردن مروڑ دوں اور للتا کو لے بھاگوں۔ یہ احقائد خیال گزشتہ تجربے کی روشنی میں دم توڑ گیا۔ خود للتا جب اتنی خطرناک تھی کہ مجھے تن تنہا چھڑا لیا تو گرو اس سے دو جوئے آگے ہی ہو گا۔

میزھیوں سے اتر کر وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر آکھڑے ہوئے۔ دونوں اس طرح میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے میں انہیں دکھائی دے رہا ہوں۔

چند لمحوں بعد عیار گرو کی آواز ابھری۔ ”للتا! یہ ہوش میں ہے اور یوں ہی دھوکا دینے کو بے حرکت پڑا ہوا ہے۔“

”ہاں گرو جی! مجھے بھی یہی جان پڑتا ہے۔ آپ جاؤ، میں اسے دیکھتی ہوں۔“

گرو اپنی ”چیلی“ کے کہنے پر کسی فرمانبردار بچے کی طرح میزھیوں کی طرف مڑ گیا۔ حسین لڑکیوں کے عاشق چاہے ان کے گرو ہوں کہ چیلے سعادت مند ہی ہوتے ہیں۔ اسی سعادت مندی میں فائدہ بھی ہے۔ زن مریدی کو کوئی لاکھ بڑا کہے مگر جنہیں اس کا چکا پڑ جاتا ہے وہ ایک کان سے بڑا بھلا سنتے ہیں اور دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ دو کانوں کا آخر کچھ تو مصروف ہو۔

بول کھل جانے کے بعد بے ہوش بن کر پڑے رہنا فضول ہی تھا، سو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ للتا کچھ بھی سہی مگر میرے حسابوں تھی عقل سے پیدل ہی۔ اس کا گرو بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ اگر وہ مجھ غریب جن زاد کی عزت و آبرو پر حملہ ہی کرنا چاہتی تھی تو بھل میں ایک آدھ چادر یا چٹائی ہی داب لاتی۔ ممکن ہے

ذہنی طور پر وہ اس کے لئے تیار نہ ہو ورنہ اپنے گرو سے آخر تک ”بٹا بجٹی“ نہ کرتی۔ بہر حال میں سخت الجھن کا شکار تھا۔ اس کافرہ کی خواہشات پر قربان چڑھنے کا مقصد اپنی آزادی کھونا ہوتا۔ کاش اس معاملے میں یہ ایک عدد بیچ نہ آتا۔ اگر یہ بیچ تھا بھی تو مجھے اس کی خبر نہ ہوتی۔ پھر تو راوی عیش ہی عیش لکھتا۔ بعد میں جو گزرتی سو گزر جاتی۔

اس غارت گر ہوش کا گرو تو وہاں سے مثل لیا اور وہ میرے رویرو آکھڑی ہوئی اور بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

میں پہلے ہی اس سوال کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا، سو جھٹ بولا۔ ”عبدالغفور۔ میری اماں پیار سے مجھے غفورا بھی کہتی تھی۔ ہر چند کہ ابھی تم سے میرا کوئی رشتہ استوار نہیں ہوا لیکن تم بھی چاہو تو مجھے غفورا کہہ سکتی ہو۔ میں بڑا نہیں مانوں گا۔“

میرا جواب سن کر وہ چونکی، پھر کہنے لگی۔ ”تو مسلا ہے؟“ مجھے ”مسلا“ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں حقارت سی تھی۔ ”مسلمان“ کا اس نے یہ طیلہ بگاڑا تھا۔

”ہاں ہوں تو سہی۔ اب سوچ لو اچھی طرح، میرے ملن سے تمہارا دھرم (مذہب) خطرے میں پڑ جائے گا۔ مجھے تم ادنیٰ ذات کی لگتی ہو اور میں تمہارا نظریں ایک بیچ ذات مسلا۔“ باتیں بتاتا اور آدم زادوں کو اس طرح آلو بتاتا مجھے خوب آتا تھا۔ ہندوؤں کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کو بھی اچھوت ہی سمجھتے ہیں۔ میں اسی معلومات سے فائدہ اٹھا کر بہ جبر و اکراہ اس حسن تو بہ شکن سے دامن بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تُو نے میری اور گرو جی کی باتیں سن لی ہیں۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”تُو کسی مسئلے کی بھٹکی ہوئی آتما (روح) ہے، یہ بات غلط فہمی پھر؟“ وہ اپنے ہندو عقیدے کے مطابق کہنے لگی۔ عموماً جنات کو ہندو بھٹکی ہوئی روحمیں سمجھتے ہیں۔

مجھے کیا پڑی تھی کہ اسے عالم جنات کے بارے میں کچھ بتاتا۔ میں نے اس کے عقائد درست کرنے کا ٹھیک ہی نہیں لیا تھا۔ خود میں صاحب عقیدہ ہونے کے باوجود کب اپنے عقائد پر عمل پیرا تھا۔ میرے اعمال کون سے درست تھے۔ میں تو بس نام کا مسلمان تھا ورنہ آدم زادوں کے چکر میں چھپنے کی بجائے کسی جن زادی سے نکاح پڑھواتا اور ہاموس کی طرح بیچ وقتہ نماز پڑھا کرتا۔ کسی دیر ان حویلی میں ڈیرا ڈال دیتا اور بچوں کی فوج ظفر موج میرے آگے پیچھے اڑتی پھرتی۔

للتا نے مجھ سے جو سوال کیا تھا، میں نے اس کے جواب میں کہا۔ ”تمہارے گرو جی نے گزشتہ تین روز میں میرے متعلق یقیناً یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ میں ایک مسلمان ہی کی بھٹکی ہوئی روح ہوں۔ تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں تو ان سے جا کے پوچھ لو۔“

میں نے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھے۔ پھر ذرا توقف کے بعد وہ بولی۔ ”لیکن تُو نے ہلا سے تو کچھ اور ہی کہا تھا؟“

”ہاں۔“ میں نے فوراً اعتراف کر لیا۔ ”اسے میں نے اپنا نام سوہن ہی بتایا تھا اور یہ بھی کہ میں

چپھلے جنم میں اس کا پتی (شوہر) تھا۔ اگر میں اس سے یہ جھوٹ نہ بولتا تو بھی میرا کام چل ہی جاتا، لیکن راضی بہ رضا ہونے میں اور زبردستی میں بڑا فرق ہے۔ مجھے کسی کے ساتھ زبردستی پسند نہیں، نہ اپنے ساتھ کسی کی زبردستی اچھی لگتی ہے۔" میں نے آخر میں اپنے مطلب کی بات بھی کہہ دی، پھر اس پر مزید پوچھ ڈالنے کی خاطر بولا۔ "تم مجھ سے جو کام بھی لینا چاہو، میں کوئی رشوت لئے بغیر بھی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس طرح تمہارا دھرم بھی بھرٹش ہونے سے بچ جائے گا اور میرے ملن سے جو ذہنی اور جسمانی اذیت تمہیں ہونے کا امکان ہے، وہ بھی نہیں ہوگی۔ تم ایک بار مجھے آزما کر تو دیکھو۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تو اپنے قول سے نہیں پھرے گا؟ جب تو بھلا سے جھوٹ بول سکتا ہے تو....."

"تمہاری اور بھلا کی بات مختلف ہے۔ تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم تو مجھے جلا کے خاک بھی کر سکتی ہو۔" میں نے اسے ہانس پر چڑھایا کہ اس وقت یہی مناسب تھا۔

للتا کے چہرے سے اب قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ شاید وہ تھوڑی بہت ہانس پر چڑھ گئی تھی۔ کسی اور دوسری صورت حال کو غالباً وہ اپنے لئے خطرناک اور اذیت رسا سمجھ رہی تھی۔

اسے چپ دیکھ کر میں پھر بول اٹھا۔ "تم خود ہی سوچو، تمہیں پالینے کی تمنا کون نہیں کرے گا؟ تم جیسی نازک اندام و خوش خرام حسینہ کو دیکھ کر تو پارساؤں کی پارسانی خطرے میں پڑ جائے۔ کوئی بھی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دے۔ تمہاری تو پوجا کی جانی چاہئے۔ تم تو حسن کی دیوی ہو۔ تمہارے جسم کو تو چھونا بھی پاپ (گناہ) ہے۔" پھر جوش جذبات یا پھر احساس رقابت میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو کم از کم اس وقت نہیں نکلنا چاہئے تھی۔ میں کہہ گیا۔ "گرو جی کو بھی یہ پاپ نہیں کرنا چاہئے۔"

"تو نے یہ کیا بکواس شروع کر دی۔ تجھے اس سے کیا مطلب؟ یہ میرا اور گرو جی کا معاملہ ہے۔ میں تو ان کے چرن دھو کر پتی ہوں۔" وہ برہم ہو گئی۔

"یہ بھی کوئی اچھا نہیں کرتیں تم۔ بیروں میں مٹی اور میل بھی لگا ہوتا ہے۔ تمہیں گرو جی کے پیر دھو کر وہ گند پانی پیتے ہوئے گھن نہیں آتی؟" اس کی خفگی کا خیال نہ کر کے میں اپنی ہی ہانکے گیا۔ "گرو جی کو ویسے بھی سوچنا چاہئے کہ تم ان کی چیلی ہو اور پچیوں کے ساتھ قابل اعتراض تعلقات رکھنا بڑی بڑی بات ہے۔ گرو، یعنی ایک استاد کا درجہ تو....."

"خاموش۔" اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اس کا حسین چہرہ سرخ ہو کر مزید حسین ہو گیا۔ "مگر تو نے اب گرو جی کے بارے میں کوئی بکواس کی تو باندھ کر اتنا ماروں گی کہ ہمیشہ کے لئے زبان چلانا بھول جائے گا۔ کمینہ کہیں کا۔ مجھے سبق پڑھانے چلا ہے۔"

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ گرو بدبخت سے رقابت رکھنے کے باوجود اپنے دل کی بات زبان پر نہیں لانا تھی۔ جسم اس کا تھا۔ وہ چاہے اسے کسی بھنگی کو سوپ دیتی، میں بھلا کون اعتراض کرنے والا۔ یہی سوچ کر میں نے اسے دوبارہ گھاٹ پر لانے کے لئے کہا۔ "اے حسن کی دیوی! میرا مقصد خدا نخواستہ گرو جی یا تمہارا ایمان کرنا ہرگز نہ تھا۔ میں تو بس اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ گرو جی کی

جگہ اے کاش اگر میں ہوتا تو تمہاری پوجا ہی کرتا، تمہیں ہاتھ نہ لگاتا کہ ہاتھ لگانے سے دیویاں گندی ہو جاتی ہیں۔"

"تو بس اپنی بات کر۔ گرو جی کا نام اپنی گندی زبان پر نہ لا۔" وہ کچھ نرم پڑنے لگی۔

زبان پر نام لانا تو کیا، میں تو اس کی صورت پر تھوکتا بھی پسند نہیں کروں۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر زبان سے کچھ اور ہی نکلا۔ "میں تمہارے حکم سے باہر نہیں ہوں۔ تمہارے ناتے سے میرے لئے بھی گرو جی قابل احترام ہیں۔ ان کے تو چہرے ہی سے شرافت نکلتی ہے۔" خباثت کی جگہ بڑی مشکل نے میں نے شرافت کہا تھا۔ اس شعلہ رو کو ٹھنڈا تو کرنا ہی تھا ورنہ وہ غصے میں آ جاتی تو مجھے "ٹھنڈا" کر دیتی۔ اس پر میں ابھی راضی نہیں تھا۔

اس وقت تو میں نے "بتولے" بنا کر اسے ٹرخا دیا اور اپنی عزت لٹنے سے بال بال بچالی مگر کچھ ہی دیر بعد پھر اس کے درشن ہو گئے۔ اس مرتبہ درشن دہرے تھے، یعنی بدبخت گرو جی اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ طویل مذاکرات کے نتیجے میں میرے اور اس کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ وہ میرے متعلق گرو سے مشورہ کر کے ہی کوئی فیصلہ کرے گی۔

وہاں سے نکلنے کی جدوجہد میں مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا جسم کہاں تک بلند ہونے کے بعد جھٹکا کھا کر نیچے آگرتا تھا۔ ابھی وہ دونوں بیڑھیاں اترتے ہوئے اس جگہ تک نہیں پہنچے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق میں نے ان گرو اور "چیلی" پر نظر پڑتے ہی سوچ لیا، ادھر یا ادھر۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ کوشش کر کے تو دیکھ لوں، کیا خبر دھپل لگ ہی جائے۔ اگر کامیابی ہو گئی تو ان کبجنت کافر آدم زادوں کی جی حضوری تو نہیں کرنا پڑے گی ورنہ تو ظالموں نے قیدی بنا ہی لیا ہے اور اب اس قید کو غلامی میں بدلنا چاہئے ہیں۔ کسی جن زاد کے لئے یہ بڑی قابل شرم بات ہے کہ کوئی آدم زاد اسے اپنا غلام بنا لے۔ اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔

مصنوعی عارضی بے ہوشی یا ان کافروں کی غفلت سے اتنا فائدہ بہر حال ہوا کہ مجھے ان کے ارادوں کا پتا چل گیا ورنہ مجھ جیسے آوارہ جن زاد پر کوئی لٹتا جیسی کافر حسینہ، چاہے اپنی مطلب براری ہی کے لئے قربان ہونے لگے تو کفرانِ نعمت کا سوال نہیں۔ اس وقت لٹا کو جیت لینے کا مطلب میری ہار پر بیٹج ہوتا، سو میں جان بوجھ کر ہار گیا۔ اب میں اسی ہار کو جیت میں بدلنے کے لئے پر قول رہا تھا۔ ایسے مواقع میری زندگی میں کم ہی آئے تھے کہ میں نے اپنی جان کی پرواہ بھی نہ کی ہو۔

جیسے ہی وہ دونوں میرے اندازے کے مطابق خطرے کی حد عبور کر کے مزید نیچے اترے، میں چشم زدن میں گرو تک پہنچا اور پھر گھبرا گیا۔ اس کافر کے جسم میں ہلا کی ٹھٹھن تھی۔ جی چاہا کہ اس کے جسم سے باہر آ جاؤں مگر دم ساہ لیا۔ اس اچانک حملے کے نتیجے میں گرو کے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ لٹا اگر بروقت اس کا بازو نہ پکڑ لیتی تو وہ بیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے گھرائی میں جا کر رہتا۔ جھٹکا لگنے سے اس کے جسم کا توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کے بدبودار جسم میں داخل ہوتے ہی میری حالت خود قابلِ رحم تھی، سو اسے نہ سنبھال پاتا۔

”کیا ہوا گرو جی! کیا ہو گیا آپ کو؟“ لتا فکر مند سے بولی۔ وہ رک گئی تھی۔

فوری طور پر میں اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا کہ ابھی اس قابل ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ پہلا انسانی جسم تھا کہ جس میں اتر کر مجھے اس قدر محض محسوس ہوئی تھی۔ یقیناً اس بدکار کے باطن میں بڑا اندھیرا تھا۔ میں نے محض دور کرنے کے لئے لمبے لمبے سانس لئے۔

”آپ کچھ بولو تو سہی گرو جی!“ لتا نے مجھے ایک مرتبہ پھر مخاطب کیا۔

”ٹھہرو..... ذرا ٹھہرو..... ابھی بولتا ہوں۔“ میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ذرا دیر اور گزری تو مجھے اس غبیث گرو کے جسم میں قرار آ ہی گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ”وہ بھاگ گیا۔“

”کون گرو جی؟“ لتا نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جسے ہم بھلا کی کوٹھی سے باندھ کر لائے تھے۔“ میں نے بتایا، پھر گہرائی کی طرف اشارہ کیا۔

”تم خود ہی دیکھ لو، وہ کہیں نظر آ رہا ہے؟“

”مگر..... مگر گرو جی! یہ..... یہ کیسے ہو گیا؟“ لتا نے گہرائی میں نگاہ دوڑائی۔ گرو کے جسم

میں چھپ کر میں اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”جب میں تمہارے ساتھ نیچے اتر رہا تھا تو اسے بجلی کی طرح کوند کر اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔“ میں اسے اٹوٹانے لگا۔ ”پھر اس سے پہلے کہ میں اسے باندھ لیتا، اس نے مجھے دھکا دیا اور غائب ہو گیا۔ وہ ایک سُلے کی آتما تھی اور تمہیں تو خبر ہے، سُلوں کے پاس ہم سے بڑا علم ہے۔ کچھ پڑھنت آتی ہوگی اسے کہ ہمارا گھبراؤڑ دیا۔“

”یہ تو بہت بڑا ہوا گرو جی! سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔“ لتا نے انگہار مٹا دیا۔ ”چلیں

اب یہاں کیا رکھا ہے، واپس چلتے ہیں۔ پتا جی آپ سے ملنے کو کہہ رہے تھے۔ اٹھان گرہ (غسل خانہ) سے نکل کر وہ پوجا کے لئے بیٹھ رہے تھے۔ اب تک پوجا کر چکے ہوں گے۔“

گرو کے اطمینان سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کے جسم پر قبضہ تو کر لیا تھا مگر اب میری ہوا خراب ہو رہی تھی۔ جس ناہیدہ حصار سے ٹکرا کر میں کئی بار نیچے گر چکا تھا، وہ ابھی تک برقرار تھا۔ مجھے خبر تھی کہ وہ حصار میرے ہی لئے قائم کیا گیا تھا، ہاں اس کا پتا نہیں تھا کہ کسی انسانی جسم میں چھپ کر کیا صورت پیش آ سکتی ہے۔ میں اسی لئے چوکڑی بھولا ہوا تھا۔ گرو اور لتا کو تو میں اس سے گزر کر آتے جاتے دیکھ چکا تھا۔ حصار کی موجودگی ان پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دیر کو مہلت لینے اور سوچنے کی غرض سے میں نے لتا سے کہا۔ ”آؤ نیچے چل کر دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی سراغ مل جائے کہ آخر اس نے کیا کیا؟ کچھ جاپ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے لئے لکیر کاڑھ کر دائرے میں بیٹھنا پڑتا ہے۔“ یہ کہتے ہی میں رکائیں اور تیزی سے میڑھیاں اترنے لگا۔

”گرو جی! اب چھوڑیں بھی۔“ لتا کی آواز پیچھے سے آئی۔ ”سانپ تو نکل گیا، اب لکیر کو کیا بیٹھا۔

میں اب یہ گھبراؤڑ دیتی ہوں۔ کوئی نوکریا اس کا بچہ بالا ادھر نکل آیا تو بھول میں مارا جائے گا۔ اس گھبرے کا اب کوئی لاہجہ (فائدہ) نہیں۔“

لتا کے الفاظ میرے لئے کسی خوشخبری سے کم نہیں تھے۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ بادیہ حصار گرو اور لتا کو چھوڑ کر دوسروں کے لئے یقیناً خطرناک اور جان لیوا تھا۔ انہیں کیوں کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس کی وجہ وہی کالا علم ہو گا جس کے وہ ماہر تھے۔ اسی کالے علم کا ذکر مجھ سے یاسف نے بھی کیا تھا جسے میں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

میڑھیاں اترتے اترتے میں رکا تو ایسی آواز آئی جیسے قریب ہی بجلی کڑکی ہو۔ مڑ کر اوپر دیکھا تو آتش بازی کا سا منظر تھا۔ چنگاریاں سی اڑ کر فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں بعد وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ لتا کے اٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں کو نیچے آتے دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ میری مشکل خود بخود آسان ہو گئی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔

”تم کہتی ہو تو آجاتا ہوں اوپر۔“ میں پُر سکون آواز میں بولا اور میڑھیاں چڑھنے لگا۔

”ہاں گرو جی! آپ آ جاؤ۔ پتا جی کے پاس چلتے ہیں۔“ لتا نے کہا اور وہیں کھڑی رہی۔

لتا پیاری! اب تو میں تیرے باپ کو بھی دیکھ لوں گا۔ میں نے سوچا اور پھر اس کے پاس پہنچ کر ساتھ ساتھ اوپر چل دیا۔

باہر آ کر معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑی اور شکستہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ خالص فاصلے پر دائیں جانب بڑے رتبے میں محل نما ایک دوسری بڑی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اپنے طرز تعمیر سے وہ عمارت مجھے ایسی ہی لگی جیسے وہاں مسلمان آدم زاد رہتے ہوں۔ اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی مگر اظہار نہ ہونے دیا۔ اس عمارت کے قریب پہنچنے کے بعد میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ جگہ جگہ محرابی دروازے اور در پیچے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے یہی سوچا کہ وہ عمارت مسلمانوں ہی نے بنوائی ہوگی اور اب یہاں ہندو رہتے تھے۔ جس شکستہ عمارت کے عقب میں مجھے قید کیا گیا تھا، اس کا طرز تعمیر بھی ایسا ہی تھا۔

وہاں تک پہنچنے پہنچتے لتا اور میرے درمیان صرف چند جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ لتا نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر پتا جی، شاہنواز خاں کو راستے سے ہٹانے کے لئے کہیں تو آپ نہ ماننا۔ جواباً مجھے اقرار ہی کرنا تھا، سو کر دیا۔ پھر وہ کہنے لگی کہ جب تک شہباز خاں ہاتھ نہ آ جائے جلدی نہیں کرنی۔

شہباز خاں کا نام گرو کی زبان سے آج ہی میں نے سنا تھا۔ لتا کے باپ کالی چرن کے آدمی، شہباز کی تلاش میں تھے کہ اسے مار ڈالیں۔ ابھی وہی قصہ نہیں سنا تھا کہ ایک اور شخص شاہنواز کو راستے سے ہٹانے یا نہ ہٹانے کا چکر چل گیا۔ معلوم نہیں یہ ”مارا ماری“ کیوں لگی ہوئی تھی۔ آدم زادوں نے تو قتل و غارت گری میں ہم جن زادوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ خدا جانے یہ شہباز اور شاہنواز کون تھے کہ کالی چرن ان کی جان لینے پر اتار دیا ہو گیا تھا۔ میں تو بس اتنا سمجھ سکا کہ دونوں میں کوئی تعلق ضرور ہے۔

اس کمرے کی آرائش و زیبائش قابلِ داد تھی جہاں مجھے لتا لے کر آئی۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھا تھا جس میں پاؤں دھنے جا رہے تھے۔ دیواروں پر ریشمی پردے تھے۔ بیٹھنے کے لئے دیوان اور قدیم طرز کی آرام دہ کرسیاں تھیں۔ اونچی پشت والی ایک کرسی پر توتے جیسی لمبی اور آگے کی طرف مڑی ہوئی

ناک والا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے جڑے بھاری، آنکھیں چھوٹی، ہونٹ پتلے، رنگ سانولا، سر کے بال سفید و سیاہ، بھونیں گھنی اور رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر چہرے سے سفاکی جھلکتی تھی۔ جسم توانا اور عمر ساٹھ سال سے اوپر ہی لگتی تھی۔ سفید دھوٹی پر کڑھے ہوئے گلے کا سفید ہی کرہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ مجھے کسی بھی طرف سے لٹکا کا "پتا جی" معلوم نہ ہوا۔

"نسکار" اور "بے رام جی" کا تبادلہ ہو گیا تو اس شخص نے مجھ سے سامنے بچے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے صوفے میں دھنس گیا۔ لٹا اپنے باپ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔ "گرو جی! اس سے میں نے آپ کو ایک اچھی خبر دینے کے لئے بلایا ہے۔ شہباز خان کا پتا چل گیا ہے۔ میرے آدمیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے۔ چند روز میں خبر مل جائے گی کہ اسے مار دیا گیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب اس کے تباہ کو زندہ رکھنا بیکار ہے۔ آپ سے اس لئے صلاح کر رہا ہوں کہ اس بوڑھے شاہنواز خان کو آپ ہی کے مشورے پر زندہ رکھا گیا ہے کہ اس کے بچے پر دباؤ برقرار رہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ بولیں آپ کیا کہتے ہیں؟"

بوڑھے شاہنواز اور شہباز کے درمیان رشتہ اب میری سمجھ میں آ چکا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی کہ شاہنواز ان لوگوں کی قید میں ہو گا۔

"اسی سچ ایک ارجن (مشکل) اور بھی آپ ہی ہے۔" میرے کچھ بولنے سے پہلے کالی چرن دوبارہ بول اٹھا۔ "اس پر بعد میں بات کریں گے۔"

وہاں جو کھیل بھی کھیلا جا رہا تھا اسے سمجھنے کے لئے ابھی وقت کی ضرورت تھی۔ کچھ باتیں تو سامنے آ گئی تھیں، کچھ کا جاننا باقی تھا۔ میں نے اس دوران بہر حال یہ فیصلہ تو کر ہی لیا تھا کہ چند روز یہاں رہ کر سکون اور عیش کے ساتھ گزارے جاسکتے ہیں۔ اس فیصلے کی بڑی وجہ ظاہر ہے وہ کافر حسینہ لٹا ہی تھی۔ گرو کے جسم پر قبضہ کرنے کے بعد اب میرے لئے لٹا کا حصول کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ میں اسی لئے اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا۔ اسی کے ساتھ گرو کا کردار نبھانا بھی میری مجبوری تھی۔ شاہنواز کے سلسلے میں لٹا نے مجھے جو سبق پڑھایا تھا، جواباً میں نے وہی فر فرنا دیا۔

میرا جواب سن کر کالی چرن کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔ اسی حالت میں لٹا بھی کہنے لگی۔ "پتا جی! وہی بہتر ہے جو گرو جی کہتے ہیں۔"

چند لمحے خاموشی کے بعد کالی چرن بولا۔ "گرو جی ہی کے کارن آج ہم راج کر رہے ہیں، سو ان کی بات تو ماننا ہی پڑے گی، پر جتنا بھی تو سر اٹھا رہی ہے۔ اسے اگر کسی طرح پتا چل گیا کہ اس ریاست کا اصل حکمران شاہنواز مرا نہیں زندہ ہے تو ریاست میں بغاوت ہو جائے گی۔ ایک شہباز خان کی وجہ سے جب انہوں نے اتنا اودھم مچا رکھا ہے تو شاہنواز خان کو چھڑانے کے لئے تو وہ سردھڑکی بازی لگا دیں گے۔"

"لیکن یہ راز کھلا تبھی تو ایسا ہو گا۔" لٹا نے کہا۔ "پھر جب وہ شاہنواز خان کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر قبرستان تک لے جا چکے ہیں۔ قبر بھی موجود ہے تو پھر....."

"پھر یہ کہ شہباز خاں کے حمایتی اب کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔" کالی چرن نے لٹا کی بات کاٹ دی۔ "وہ یہ افواہ پھیلا رہے ہیں کہ جس شخص کو شاہنواز خاں ظاہر کر کے قبر میں اتارا گیا ہے، وہ اس کا جڑواں بھائی ایاز خاں تھا۔ دراصل ہم سے بھی جلد بازی میں غلطی ہو گئی۔ شہباز خاں پر دباؤ ڈالنے کے لئے ہمیں یہ پیغام اس تک نہیں بھیجنا چاہئے تھا کہ اگر اس نے خود کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ایاز خاں کو قتل کر دیا جائے گا۔ معلوم نہیں کس طرح اس حرام کے بچے کو پتا چل گیا کہ ایاز خاں مرا ہے، شاہنواز خان نہیں۔ مجھے تو اس معاملے میں اسی مردود کا ہاتھ لگتا ہے جس نے شہباز خاں کو پناہ دے رکھی ہے۔"

اب شاہنواز کا ایک جڑواں بھائی بھی نکل پڑا تھا جسے شاہنواز ظاہر کر کے سفر آخرت پر روانہ کیا جا چکا تھا۔ ایک میں سے ایک نئی گھسی نکل کر میرے دماغ کی چولیس ہلانے کے درپے تھی۔ مجھے کچھ پتا ہوتا تو بچہ بولتا بھی اس لئے چپ سادھے بیٹھا رہا۔ جس گرو کے جسم پر اس وقت میرا قبضہ تھا، مجھے اس کی اہمیت و حیثیت بھی کالی چرن کے الفاظ سے معلوم ہو گئی۔ شاید اسی لئے اس نے اپنی حسین بیٹی لٹا کو گرو کے ہاتھ کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا تھا۔

"افسوس کی بات تو یہ ہے گرو جی کہ ہم نے اس ریاست پر کوئی ناجائز قبضہ نہیں کیا۔ پوری پوری رقم ادا کی ہے شاہنواز خاں کو۔ اس پر بھی یہاں کی مسلمان جتنا ہمارے خلاف ہے۔ اگر انگریز سرکار نے بھی ریاست پر ہمارا حق مان لیا ہے۔ پھر تو یہ کھلا ظلم ہے کہ جتنا شہباز خاں کے برکائے میں آ کر ہی کو بڑا بھلا کہنے لگے۔" کالی چرن مجھے چپ دیکھ کر پھر بولا۔

"گرو جی نے کہا تو تھا کہ ایسے لوگوں کو پکڑ کر سخت سزائیں دی جائیں۔" لٹا نے گویا اپنے باپ کو یاد دلایا۔ "آپ نے اس سلسلے میں حکم جاری کیا؟"

"ہاں، حکم جاری کئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔ تم کیونکہ گرو جی کے ساتھ لاہور چل گئی تھیں اس لئے تمہیں خبر نہیں ہوئی۔ مختلف بستیوں سے کوئی پانچ سو ایسے باقی پکڑے جا چکے ہیں، مگر بات وہیں کی وہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس کس کو پکڑا جائے؟ ریاست میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ ہیں۔"

میں خواہ ایک جن زاد سہی مگر تھا تو نسل مسلمان۔ کہتے ہیں کہ گھٹنے پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے ایک کافر حسینہ کے منہ سے مسلمانوں کی برائی اچھی نہ لگی۔ گرو کے مشورے پر تو مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تھی اور اس کی "چٹیلی" بے گناہوں کو پھانسی پر چڑھانے کی تجویز دے رہی تھی۔ ان کم بختوں کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایک بگڑے دل ڈیڑھ سو سالہ نوجوان جن زاد کے جوش ایمانی کو ہٹا رہے ہیں۔

"لگتا یہی ہے کہ آخر کار سختی کرنا پڑے گی، صرف گرفتاریوں سے کچھ نہیں ہو گا۔" کالی چرن پہلو ہل کر بولا، پھر مجھ سے تصدیق چاہی۔ "کیوں گرو جی! آپ کا کیا دھار ہے؟"

"سوچ کر بتاؤں گا۔" میں نے فی الحال جان چھڑانا چاہی، مگر لٹا "کمبل" ہو گئی اور مجھے کہنا ہی پڑا۔ "اس معاملے میں سختی سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ شاید سختی کرنے سے معاملہ دب جائے گا مگر اب سوچ بچار کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔"

مجھے نوکرانیوں پر رُخائے دے رہا تھا۔ کہاں رانی کہاں نوکرانی۔ لٹاکو میں نے اپنے دل کی رانی ہی تو پایا تھا۔ سو اگر رانی کے ساتھ رانی پور جاتا تو مزہ بھی آتا۔ رانی میں کسی بھی قسم کی ”نوک“ مجھے ہرگز لڑا نہ نہیں تھی۔ میں نے اسی سبب فوری طور پر رانی پور جانے سے انکار میں دیر نہیں لگائی۔
”تو گرو جی کوئی اور رستہ نکالیں۔“ کالی چرن میرا انکار سن کر بولا۔ ”شہباز خاں کی گرفتاری بہت زبردی ہے۔ خود آپ بھی کئی بار یہ کہہ چکے ہیں۔“

خدا ہی جانے بد بخت گرو کیا کیا کہہ چکا تھا جس کی سزا مجھے بھگتنا پڑ رہی تھی۔

”نکل آئے گارستہ۔“ میں نے دلاسا دیا۔ ”چھتا نہ کریں۔“

اسی وقت چھوٹے قد کی ایک گول مٹول سی نوجوان ہندو لڑکی، کالی چرن سے اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مجھ سے بولی۔ ”گرو جی! سجا کا سہ ہو گیا ہے، چیلے آگئے ہیں۔“

وہ لڑکی اطلاع دے کر مڑی ہی تھی کہ میں بولا۔ ”نھر! میں چلتا ہوں۔“ لڑکی کو میں نے اس لئے دیکھ لیا تھا کہ کم از کم وہاں تک تو پہنچ ہی جاؤں جہاں چیلے جمع ہیں۔ میرے لئے تو وہ قطعی اجنبی جگہ تھی۔ کسی آدم زاد کے جسم کو اپنانے میں یہ بڑا عذاب ہے کہ لمبے گھٹنوں میں بدل جاتے ہیں۔ اگر میں دیکھ کے جسم سے باہر ہوتا تو چند لمحوں کے اندر اندر اس محل نما عمارت کے ایک ایک گوشے کو دیکھ چکا ہوتا۔ کسی آدم زاد کے جسم کو اپنانے سے پہلے میں اسی سبب پہلے ہی تمام معلومات حاصل کر لیتا تھا۔ اس رنگینی حالات کے پیش نظر مجھے یہ موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ کسی معمولی آدمی کا جسم بھی نہیں تھا کہ بڑے بھاگ لیتا اور پھر آن دبوچتا۔ اس خبیث کے جسم سے تو نکلنے ہی مجھے فوری طور پر ریس لگا دینا پڑتا۔

پھر لٹا تو وہیں اپنے باپ کے پاس رہ گئی اور میں اس لڑکی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ لڑکی شاید

میرے پیچھے چلنے لگی۔ اس طرح اسے ساتھ رکھنے کا مقصد ہی ختم ہوا جا رہا تھا۔

”آگے جا کر چیلوں کو بتا کہ میں آتا ہوں۔“ مڑ کر میں نے لڑکی سے کہا اور رک گیا۔

لڑکی آگے آ کر ایک طرف چل دی اور پھر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ چلتے چلتے لڑکی نے ایک بار دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہی ہو گی کہ میں کیس اور ہو کر وہاں پہنچا ہوں۔ (مخفی) جننے والی ہے۔ مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ غالباً اسی لئے حیران تھی۔

وہ عمارت شیطان کی آنت تھی۔ مختلف راستوں سے گزر کر میں، لڑکی کا پیچھا کرتا ہوا ایک ایسے محل میں آ گیا جو بقیہ عمارت سے قدرے مختلف تھا۔ ایک ہی نظر ڈال کر پتا چل گیا کہ اس حصے کی تعمیر کو بالعموم نہیں مگر ذرا۔ اس خوبصورت عمارت میں مجھے وہ حصہ کسی بد نما پیوند کی طرح معلوم ہوا۔ وہاں پہنچنے سے ایک مندر کا بیٹا بھی دکھائی دیا۔

اپنے سوا مجھے وہاں تقریباً سبھی گہروے لہادوں میں نظر آئے۔ میں اندر پہنچا تو انہوں نے جھک کر میرے پیچھے چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ پختہ اینٹوں سے بنے ہوئے فرش پر بڑی سی دری لگی تھی۔ میری آمد سے پہلے وہ اسی دری پر بیٹھے تھے۔ ان کی تعداد بیس پچیس سے کم نہیں ہو گی۔ جس

”ٹھیک ہے گرو جی! آپ سوچ لیں۔“ کالی چرن بولا۔ ”آپ جو کہیں گے وہی ہو گا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ جتنا بغاوت نہ کرے۔ ہاں اتنا ضرور کموں گا کہ جو بھی سوچتا ہے، جلد سوچیں۔ پانی اب سر سے اونچا ہونے لگا ہے۔ آج ہی صبح جنگل میں ایک سپاہی کی لاش بھی ملی ہے۔ دیوان جی بے حال سمجھ کا کہتا ہے کہ قریبی جنگل میں مسلمان باغیوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے اور انہی کے ہاتھوں سپاہی کا قتل ہوا ہے۔ میں نے تفتیش کو کہہ دیا ہے، دیکھیں کیا بات سامنے آتی ہے۔“
”ہاں جی! آپ کسی ارچن کی بات بھی تو کر رہے تھے۔“ لٹا بولی۔

اب یہاں سے اٹھنے کی بھی کہ اسی طرح باتیں بتاتی رہے گی؟ میں نے سوچا۔ وہ ظالم خواہ تو اپنے ”ابا حضور“ کے سامنے میری ”پیشی“ کو طول دینے جا رہی تھی اور میں اس پر جل بھن رہا تھا۔ ”استحالی پرچہ“ ختم ہوتا تو اس قرار جاں کو محل کے کسی کونے کھد رے میں لے جاں۔ اس نے ابھی یہ موقع ہی نہیں دیا تھا اور سیدھی اس ”توتا ناک“ کے پاس لے آئی تھی۔ میں ابھی اس ہندو نار کے غیر عاشقانہ رویے پر کف افسوس لے رہا تھا کہ ”ہاں جی“ بول اٹھا۔ اس بد بخت نے مجھی کو مخاطب کیا تھا۔ ”گرو جی! ارچن میرے آدمیوں کو یہ آن پڑی ہے کہ کوئی مسلمان بابا جی، شہباز خاں کی مدد کر رہا ہے۔ خبر یہ ملی ہے کہ جب بھی اسے گھیر لیا جاتا ہے، بابا جی نہ جانے کہاں سے آچکے ہیں۔ پھر شہباز خاں کا کوئی ہاں نہیں چلتا کہ کہاں گیا۔ کئی بار میرے آدمیوں نے شہباز خاں کو اسی بابے کے ساتھ جنگل میں دیکھا ہے۔ اس بابا کے بارے میں عجیب طرح کی باتیں لوگ کرتے ہیں۔ رانی پور اور اس پاس کے علاقوں میں مشہور ہے کہ وہ بابا پراسرار قوتوں کا مالک ہے، اسی وجہ سے جب جہاں چاہتا ہے، پہنچ جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ باتیں سچ ہیں کہ جھوٹ مگر شہباز خاں کو جنگل میں پناہ دینے والا یہی بابا ہے۔ اب آپ یہ بتائیں گرو جی کہ اس مسلمان بابا کا کیا بندوبست ہو؟“

”کچھ سوچتے ہیں، اس ارچن کا کوئی حل نکل ہی آئے گا۔“ میں نے اس طرح کہا جیسے واقعی یہ کوئی اہم مسئلہ ہو۔

”اس میں سوچنا کیا ہے گرو جی!“ لٹا مجھ سے بولی۔ ”آپ خود کیوں نہ چلے جاؤ وہاں، آپ کے آگے وہ بابا کیا کئے گا۔“ پھر اس نے کالی چرن سے پوچھا۔ ”رانی پور ہے کہاں؟“
”یہاں سے بہت دور سندھ میں ہے لیکن وہ بابا وہاں نہیں رہتا۔ بہت سی خاصی دور دریا کے کنارے جو جنگل ہے، بابا کو وہیں دیکھا گیا ہے۔“ کالی چرن نے بتایا، پھر کہنے لگا۔ ”مشورہ تو تم نے اچھا ہے کہ خود گرو جی وہاں چلے جائیں۔ بس یہ ہے کہ گرو جی کو سفر میں تکلیف ہو گی۔“
”ان کی سیوا (خدمت) کے لئے میں بھی ساتھ چلی جاؤں گی۔ یہ قصہ تو کسی طرح ختم ہو۔“
”نہیں لٹا! تمہیں میں اتنے لمبے سفر کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ کالی چرن نے صاف انکار کر دیا۔
”گرو جی کی سیوا کے لئے نوکرانیاں ساتھ چلی جائیں گی۔“

وہ دونوں باپ بیٹی آپس ہی میں باتیں کئے جا رہے تھے، مجھ سے کوئی نہیں پوچھ رہا تھا کہ میں بہت سی چھوڑ کر جنگل میں جانے کو تیار ہوں یا نہیں۔ لٹا ساتھ جاتی تو خیر اس پر غور بھی کیا جاسکتا تھا۔ کا

لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے میں وہاں پہنچا تھا، اس کے علاوہ بھی اور کئی لڑکیاں ادھر سے اُدھر آتی جاتی تھیں۔ ان میں سے کوئی زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ گول مثل لڑکی کی طرح دوسری لڑکیاں بھی سبز ساڑھیاں ہی باندھے ہوئی تھیں۔

یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہاں جمع ہونے والے گرو کے چیلے ہیں۔ مگر وہ کیوں آئے ہیں؟ ان سے مجھے کیا کہنا سنا ہے؟ کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے اس طرح کھڑے تھے جیسے میرے کسی حکم کے منتظر ہوں اور میں ان کے درمیان ہوتی بنا کھڑا تھا۔

”گرو جی! کیا آج سبھا نہیں ہوگی؟“ بے قد والے ایک چیلے نے آخر پوچھ ہی لیا۔

قریب ہی سے ایک لڑکی گزر رہی تھی، وہ اس چیلے کے جواب میں بول اٹھی۔ ”گرو جی اندر چل کر اپنے استھان (جگہ) پر جا کے بیٹھیں گے تبھی تو سبھا آدھ (شروع) ہوگی۔“ لڑکی نے یہ کہتے ہوئے دائیں جانب دیکھا بھی تھا۔ ادھر مجھے کئی کمرے قطار سے بنے ہوئے نظر آئے۔

کچھ کے بغیر میں اس طرف بڑھ گیا۔ ایک کمرے کے باہر دروازے پر دی چھوٹے قد والی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ مجھے آتے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی تو میں اسی کمرے میں گھس گیا۔ مگر اتنا چھوٹا تھا کہ میں چکر گیا۔ یہاں بھلا محفل کیسے جے گی؟ میں نے سوچا۔ کمرے میں سفید چاندنی بچھی تھی اور ایک طرف دیوار سے لگا گاؤ نکلیے رکھا تھا۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کمرے میں زیادہ سے زیادہ آدھ دس آدمی آکے بیٹھ سکتے تھے جب کہ باہر بیٹھے آدمیوں یا چیلوں کی تعداد دگنی سے زیادہ تھی۔ دروازے کے قریب چپل اتار کر میں آگے بڑھا اور گاؤ نکلیے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے۔ اس وقت تک مجھے خبر نہیں تھی کہ میں اپنے استھان یا تھان پر آ کے بندھ چکا ہوں۔

زرا ہی دیر بعد لڑکی نے دروازے سے اندر آ کر مجھ سے پوچھا۔ ”گرو جی کا حکم ہو تو چیلوں کو ادھر بھیٹا شروع کرو؟“

”ہاں ہاں، بھیجو۔“ میں نے گویا حکم دے دیا۔

پھر ایک ایک کر کے چیلوں کو اندر بھیجا جانے لگا۔ وہ کینٹ چیلے ویلے نہیں، گرو کے تجربے ریاست کے مختلف علاقوں سے خبریں لے کر آتے تھے۔ یقیناً یہ ”سبھا“ ہر صبح روز اسی وقت جیتی ہوگی۔ جواب میں گرو اپنے تجربوں کو ہدایات بھی دیتا ہو گا لیکن اس دن کسی چیلے یا تجرب کو کوئی ہدایت نہیں گئی۔ اس کار عبث میں تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تب کہیں میری جان چھوٹی۔ اب وہاں صرف دو لڑکیاں، ”گنیں جو“ چیلوں کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میری خدمت کرنا لگیں، میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں موجود کروں کا جائزہ لینے پر پتا چلا کہ ان میں سے ایک گرو کی خواب تھی۔ دوسرا کمرہ نشست گاہ کے طور پر اور تیسرا پوجا پاٹ کے لئے مخصوص تھا۔ خواب گاہ بھی پڑ آسائش تھی اور نشست گاہ کو بھی خوب سجایا گیا تھا۔ ان چاروں کمروں میں سے صرف دو کمرے خالی تھے۔ ایک تو وہی سبھا والا کمرہ دوسرا پوجا پاٹ کا کمرہ جس میں چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر دو تین مورچے رکھی تھیں۔ باہر پختہ فرش کے میدان کی دوسری جانب چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے وہاں کا پھیرا بھی لگا

پنڈت اپنے روایتی لباس میں وہاں موجود تھے۔ انہوں نے میرے پیروں کو اپنے ناپاک ہاتھ لگائے۔ دونوں ہی حرام کا مال کھا کھا کر دسنبے بنے ہوئے تھے۔ انہی دونوں میں سے ایک پیر پھو کر سیدھا کھڑا ہوا تو مجھے آواز میں بولا۔ ”گرو جی! قیدی بیمار ہو گیا ہے، اگر دوا دروازہ ہوئی تو چل بے گام۔“

پنڈت سے یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اب تک جو حالات میرے علم میں تھے، ان کی روشنی میں قیدی صرف شاہنواز خاں ہی ہو سکتا تھا۔

”چل میرے ساتھ“ میں دیکھتا ہوں۔ ”میں نے پنڈت سے کہا۔ مقصد یہ تھا کہ پنڈت مجھے شاہنواز خاں تک پہنچا دے۔

جواب میں پنڈت نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔ پھر وہ بولا۔ ”گرو جی! تم..... میں..... میں آپ کے ساتھ..... چلوں؟ پپ..... پہلے تو آپ نے کسی پر اتنا دشواری (اعتماد) نہیں کیا کہ..... کہ تمہ خانے میں ساتھ لے گئے ہوں۔“

لاعلی قدم قدم پر مجھ اچھے بھلے جن زاد کو اُلونے پر مجبور کر رہی تھی حالانکہ اب تک میں ہروں کو اُلونا تا آیا تھا۔ پہلے ”سبھا کے سے“ نے چکرایا اور اب یہ موٹا پنڈت مجھے اپنی عقل پر ماتم لانے پر اکسارہا تھا۔ اے بد بخت اگر تو کبھی اس تہ خانے میں نہیں گیا جہاں قیدی موجود ہے تو تجھے کس حد اس کی بیماری کا پتا چل گیا؟ یہی سوال دوسرے الفاظ میں میری زبان پر آئی گیا۔

”آپ ہی نے تو حکم دیا تھا گرو جی کہ میں اس کی دیکھ رکھوں۔“ وہ بھولی سی صورت بنا کر ”ہاں دیا تھا حکم، تو پھر؟“ میں چڑسا گیا۔

”سو دیکھ رکھ کر رہا ہوں۔ وہ کچھ بھی کہتا ہے تو سن کے ان سنی کر جاتا ہوں۔ کھانا پانی وقت پر دیا لٹ آیا۔ کل شام کو میں نے دروازے کے قریب کھانے کی تھالی رکھی تو وہ اپنی جگہ پڑا کراہتا رہا۔ مجھ آپ کیسی ہی سو گند (حتم) لے لیں، آج تک میں نے دروازے کے اندر قدم نہیں رکھا۔“ پنڈت اپنی باتیں کرنے لگا۔ ”گرو جی! آپ کے حکم کا پالنے کا حق حیزا دھرم ہے۔“ وہ شاید یہ سمجھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ میں اس پر کسی طرح کا ٹھک کر رہا ہوں۔ اب وہ بتا رہا تھا۔ ”رات کو جب میں خالی برتن اٹھانے لگا تو ویسے ہی پڑا تھا۔ برتن خالی نہیں تھے۔ میرے من میں آئی کہ آواز دے کر پوچھ لوں کہ کھانا کھائے؟ لیکن چپ ہی رہا کہ آپ نے اس سے کوئی بات کرنے کو منع کر رکھا ہے۔ کراہتے ہوئے خود اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہلے جلنے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بقی (درخواست) کہ میں اس کے لئے کسی دوا دارو کا بندوبست کروں مگر میں تھالی اٹھا کر واپس آ گیا اور.....“

”اور یہ کہ تیری کھوپڑی میں بھس بھرا ہوا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اے دوا دارو کی بات ہے، تو نے اسے کھانا تو کھلا دیا ہوتا۔ اس طرح بغیر کچھ کھائے پیئے بھی مری جائے گا۔“

”اے چل ابھی۔“

پنڈت فوراً دوڑ لیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ پنڈت کے ہٹلانے کا سبب کیا تھا۔ گرو نے اسے تر

”دیکھو بڑے میاں! میں ایک مسلمان ہونے کے ناتے تم پر رحم کھا رہا ہوں اور تم برف خانے کے

میں کہا۔

کسی چدار کی طرح اٹھنے ہی چلے جا رہے ہو۔“ پھر میں نے اسے اپنا نام تو خیر نہیں بتایا ہاں اپنی حقیر ضرور ظاہر کر دی کہ ایک جن زاد ہوں۔

بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ ذرا دیر چپ رہا، شاید اپنے منتشر حواس پر قابو پانے کے لئے، اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”تو..... تو تم نے دشوا ناتھ کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے..... مجھے سخت تعجب ہو رہا ہے کہ تم نے اس عیار پر قابو کیسے پا لیا۔ وہ تو خود بہت سے شیطانی علم جانتا ہے۔“

”شیطان تو شیطان ہی ہوتا ہے اور کہیں نہ کہیں مار کھا ہی جاتا ہے۔ اب اس قصے کو چھوڑ دو اور بتاؤ کہ تم لٹتا کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟“

”اگر..... اگر وہ لڑکی رکنی ہی سے پیدا ہوئی ہے تو..... تو پھر میری ہی ناجائز اولاد ہے۔“ بوڑھے نے انکشاف کیا۔ ”مجھے یاد آ رہا ہے کہ شاید اس سلسلے میں ایک مرتبہ رکنی نے اشارت کوئی بات کی بھی تھی جس پر میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔“

ابھی مجھے بوڑھے شاہنواز خان سے بہت کچھ معلوم کرنا تھا کہ اسی وقت تہہ خانے کی میز میوں کی کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔

”شاہنواز خان! تم اب قطعی نہ گھبراؤ۔ یہ کسی آدم زاد کا نہیں ایک جن زاد کا وعدہ ہے کہ جسم اس قید سے رہائی مل جائے گی۔ میں پھر کسی وقت آؤں گا۔“

آنے والا دہی موٹا پنڈت تھا جو مجھے یہاں تک چھوڑ کر گیا تھا۔ پنڈت کی آمد کا سبب لٹا کا یہ بیٹا تھا کہ وہ میری خواب گاہ میں ہے۔ گرد کی ایک نوکرانی پنڈت کو یہ پیغام دے گئی تھی۔ پھر تو جیسے میر پیروں میں پڑ لگ گئے۔ میں نے گرد و دشوا ناتھ کی خواب گاہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔

☆=====☆

لٹا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے میں موجود آرام دہ مسری پر نیم دراز تھی۔ ساڑھی آٹھ ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اتنا سارا خن زگس کے بعد کسی ایک جگہ دیکھنے کا یہ دوسرا اتفاق تھا، مجھے آتے دیکھ کر اٹھنے لگی تو میں خدار آلود سی آواز میں بولا۔ ”اسی طرح لیٹی رہو، اچھی لگ رہی ہو۔“

”رہنے بھی دس گرو جی! آپ تو بس مجھے اسی طرح بناتے رہتے ہیں۔“ اس کی زبان سے ایسا قاعد کی رو سے یہ ”شر کرنا“ بھلی لگتی تھی۔ ”آپ“ اور ”تم“ دونوں کا مزہ ایک ساتھ آ جاتا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر حیا کا رنگ دیکھ کر میرا جی چاہا کہ ایک دفعہ کی بجائے کئی بار قریان ہو جاؤں مجھے اس وقت یہ علم نہیں تھا کہ وہ خود ہی مجھے قریانی کا بکرا بنانے آئی ہے۔

کسی جن زاد کو اگر لٹتا جیسی آدم زاد کی کے لئے بکرا بھی بننا پڑ جائے تو تامل نہیں کرنا چاہئے۔ میری کیا مجال تھی کہ انکار کر دیتا۔ اب تو یہ خوف بھی نہیں تھا کہ اس کا گرد مجھے ہمیشہ کے لئے غلام لے گا۔ گرد کے جسم پر تو خود میں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جس نے بھی یہ کہا ہو، غلط نہیں کہا کہ مزہ آدمی موت کو بھول جاتا ہے اور میں بھی اس وقت ایک آدمی ہی کے جسم میں تھا۔ شاید اسی لئے میں

موت کو بھول گیا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ وہ کافر آدم زاد کی کتنی خطرناک تھی۔ لمحات قرب میں اس خالم نے جانے کب اور کیسے اندازہ کر لیا کہ میں اصلی نہیں نقلی ”گرو جی“ ہوں۔

مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب میں گویا بستر دیبا و حریر سے اچھل کر دور جاگرا۔ لٹتا مجھے اس لئے کوئی بھری ہوئی شیرینی محسوس ہوئی۔

”میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا۔“ وہ غرائی، پھر سر کے بال پکڑ لئے۔ ”بول کون ہے تو؟“

”تمہارا گرد..... گرد جی ہوں اور..... اور کون ہوتا۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے جھوٹ بولا۔ اسی لئے میری نگاہ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر پڑی جو تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔ بھاگ لے علیالیش ورنہ مارا جائے گا۔ یہ سوچتے ہی میں نے گرد کے جسم سے نکلنے کے لئے زور لگایا۔

اپنی کوشش میں کامیاب ہوتے ہی انتہائی اذیت کے باوجود میں وہاں سے سرپٹ دوڑ لیا۔ گرد کے جسم کو میں نے ریت کی کسی دیوار کی طرح زمین پر گرتے دیکھا تھا۔ وہاں سے فرار ہو کر میں نے قریبی جنگل ہی کا رخ کیا اور زیادہ دور جانے کی ہمت فی الحال نہیں تھی۔

اس منحوس گرد و دشوا ناتھ کے جسم میں داخل ہونے اور پھر نکلنے میں مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ خدا کی دشن جن زاد کو بھی ایسے پاپی جسم میں داخل ہونے سے بچائے۔

کچھ ہی دیر میں اذیت خود بخود ختم ہو گئی تو مجھے مظلوم بوڑھے شاہنواز خان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ اسی کے ساتھ بچا کچھا ”جوش ایمانی“ بھی زور مارنے لگا۔ جن لوگوں پر وہ کافر ظلم ڈھا رہے تھے، میرے ہی ہم عقیدہ تھے۔ فرق صرف جن زاد اور آدم زاد کا تھا۔ میں نے سوچا، آج تک گناہ ہی گناہ کئے ہیں اور آدم زادوں کو ستایا ہے، تھوڑا بہت ثواب بھی کمائی لوں، کیا خبر کسی آڑے وقت کام آ ہی جائے۔ کالی چرن سے گفتگو کرتے ہوئے غالباً اسی جنگل کا ذکر آیا تھا کہ یہاں باغی مسلمانوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ یہیں سے ایک سپاہی کی لاش بھی ملی تھی۔

اب میں کسی آدم زاد کے جسم میں قید نہیں تھا کہ اس جنگل کو چھان مارنے میں دیر لگتی۔ میں نے باغیوں کا ٹھکانہ ڈھونڈ ہی لیا۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے چالیس ہوں گے۔ وہ مجھے بڑی خراب حالت میں نظر آئے۔ پتا چلا کہ وہ بے چارے باغی داغی نہیں تھے بلکہ گرفتاری کے خوف سے اس جنگل میں آچھپے تھے۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ سبھی نوجوان تھے۔ ان کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ریاست کے سپاہی خاص طور پر اسی عمر کے نوجوانوں کو گرفتار کر رہے تھے۔ جس سپاہی کی لاش اس جنگل میں ملی تھی، انہی نوجوانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس سپاہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ سپاہی اگر بخوشی انہیں اپنی بندوق دے دیتا اور مزامت نہ کرتا تو نہ مارا جاتا۔ بندوق بھری ہوئی تھی، گولی چل گئی۔ سپاہی مر گیا تو وہ نوجوان اس کی لاش اپنے ٹھکانے سے بہت دور پھینک آئے تھے۔ چالیس نوجوانوں کے پاس صرف تین بندوقیں تھیں۔ بقیہ دو بندوقیں بھی انہوں نے شاید سپاہیوں ہی سے چھینی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ ان نوجوانوں کی پہلی ضرورت اسلحہ نہیں، خوراک ہے۔ وہ جنگلی پھلوں سے

گزارہ کر رہے تھے۔

بستی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، بطور خاص میرے لئے۔ میں بستی میں پہنچا اور ایک طوائی کی دکان پر ہاتھ دکھایا۔ پوریوں سے بھرا ایک تھاں، ترکاری، مٹھائیاں، غرض کہ جو کچھ بھی دکان میں تھا، میں لے کر چپیت ہو گیا۔ طوائی پوریوں سے بھرا تھاں ”اڑتے“ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسی سبب میرا کام اور آسان ہو گیا۔

سارا سامان لا کر میں نے ان بھوکے نوجوانوں کے قریب رکھ دیا۔ باتوں میں وہ اتنے منہمک تھے کہ کوئی اس طرف متوجہ ہی نہ ہوا کہ میرے کارنامے کی داد دیتا نہ دیتا پیٹ پوجا تو کر لیتا۔ جس سرسبز میدان میں وہ نوجوان بیٹھے تھے، درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ میں ان کے عقب میں تھا۔ خود کو ان پر ظاہر کئے بغیر تھاں سے میں نے ایک پوری اٹھائی اور قریب ہی بیٹھے نوجوان کے منہ پر مار دی۔ وہ نوجوان اچھل پڑا۔ اس اچھلنے میں گرم پوری کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور تھا۔

ان بھوکے نوجوانوں کو پوریوں اور مٹھائیوں کے تھاںوں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اتنی ہی کافی تھا۔ پھر تو وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس طرح پوریوں پر ٹوٹ پڑے جیسے دیر لگائی تو پوریاں کہیں بھاگ جائیں گی۔ ان میں سے کسی نے اس پر اظہار حیرت بھی نہیں کیا کہ جنگل میں گرم پوریاں کہاں سے آ گئیں۔

نوجوانوں کو پوریوں اور مٹھائیوں سے ”نبرد آزما“ کرتے ہوئے وہیں چھوڑ کر میں نے دوبارہ بستی کا رخ کیا۔ محل نما عمارت سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے وہ جیل خانہ مل گیا جہاں بے قصور و بے گناہ نوجوانوں کو قید کیا گیا تھا۔ انہیں مختلف بستیوں سے ریاستی پولیس نے ”باغی“ بنا کر پکڑا تھا۔ حکمرانوں کو اپنی کارکردگی تو دکھانا ہی تھی۔ لبتا نے بطور عبرت انہی میں سے دو چار کو پھانسی پر چڑھا دینے کا ”نیک مشورہ“ دیا تھا۔ جیل خانے کے محافظوں کو بے ہوش کرنے، بیرون اور جیل کے سارے دروازے کھولنے اور وہاں سے قیدیوں کو ریس لگوانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ بے ہوش محافظوں کا سارا اسلحہ میں نے جنگل میں موجود ”باغی“ نوجوانوں کو ”پھلائی“ کر دیا۔ جیل سے بھاگنے والے اکثر نوجوانوں نے بھی اسی جنگل میں پناہ لی تھی کہ قریب ترین محفوظ جگہ یہی تھی۔ انہیں خطرہ ہو گا کہ کہیں دوبارہ نہ دھر لے جائیں۔ آدم زادوں کے درمیان رہتے ہوئے یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی کسی ”حرکت“ پر عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔

میں بستی کے آس پاس ہی منزلہا رہا تھا کہ اپنے دشمنوں کا تماشہ دیکھوں۔ لبتا کے ادھورے قرب کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی کھولا ہوا تھا۔ لب بام بس دو چار ہی ہاتھ رہ گیا ہو گا کہ ظالم نے کند توڑ دی۔ اگر تھوڑی دیر اس بدن بہار کو یہ پتا نہ چلا کہ میں اصلی نہیں نقلی کرو ہوں تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔ چلو اگر اسے حقیقت کا علم ہو بھی گیا تھا تو کیا یہ ضروری تھا کہ فوراً ہی چمادرن پن پر اتر آئی۔ میں اسی لئے خوشی ہو گیا تھا۔ اس کی ماں چاہے ہندو سہی، باپ تو مسلمان تھا۔ جائز نہ سہی ایک مسلمان کی ناجائز اولاد تو تھی ہی۔ اب میری سمجھ میں یہ قصہ آیا تھا کہ ”توتا ناک“ مجھے اس کا ”پتا جی“ کیوں نہیں لگا تھا۔ شاہنواز خان

نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ شاید اسی ”بھانڈے“ کو پھوڑنے کے لئے قدرت نے اسے زندہ رکھا تھا۔ بعض ”بھانڈے“ اسی طرح کے ہوتے ہیں کہ نہ پھوٹیں تو برسوں نہ پھوٹیں اور جب پھوٹنے پر آئیں تو پھوٹنے ہی چلے جائیں۔ لبتا کا بھانڈا بھی اسی قبیل کے بھانڈوں میں سے تھا۔ بستی کا پھیرا لگاتے ہوئے ایک مرتبہ ہمت کر کے میں محل نما عمارت کی طرف بھی نکل گیا۔

دور سے میں نے دیکھا کہ وہاں بڑی افرا تفری مچی ہوئی تھی۔ سبھی جیسے ناچے ناچے پھر رہے تھے۔ بات بھی کوئی معمولی نہیں تھی۔ پانچ سو ”باغی“ نوجوانوں کا جیل سے فرار ہو جانا، اسی کے ساتھ محافظوں کا اسلحہ غائب ہونا بظاہر کسی عظیم الشان قسم کی بغاوت کا پتا دے رہا تھا۔ پھر بھلا محل والے کس طرح چین کی بانسی بجاتے رہتے۔ ایک آ رہا تھا تو ایک جا رہا تھا۔ محل نما عمارت کے سامنے بڑے سے میدان میں مجھے مسلح سپاہیوں کا اڑہام نظر آیا۔ کسی ممکنہ بغاوت کا گویا سرکھٹنے کی تیاریاں بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ ادھر غریب بستی والوں کا دم خشک ہوا جا رہا تھا کہ دیکھیں پردہ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔

”ابوان اقتدار“ کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں نے کچھ اور ہمت پکڑی کہ فضا میں ہمت کے سوا پکڑنے کو کچھ اور تھا بھی نہیں۔ میں نے سوچا، کچھ سن گن تولوں کہ ایک فرضی بغاوت کو دبانے کے لئے وہاں کیا ”پجریاں“ پک رہی ہیں۔ وہاں صرف ایک بندہ اور ایک عدد بندی ایسی تھی کہ جن سے مجھے ہٹ بچ کر رہنا تھا، ایک تو وہی گرو وشوا ناتھ دوسری اس کی چیلی لبتا۔ سو پہلے میں نے انہی کو تلاش کیا کہ کہاں مڑ بھنا رہے ہیں۔

وہ دونوں بذات مجھے ایک ہی جگہ مل گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے میں نے ریس لگائی تھی۔ اس نو تعمیر حصے میں بھی خاصی ”بھاگ بھاگ“ مچی ہوئی تھی۔

گرو وشوا ناتھ اپنی خواب گاہ کی مسمری پر بے سدھ پڑا تھا۔ اسی کے سرہانے لبتا قلمند سی بیٹھی تھی اور گرد کے بالوں پر کبھی ہاتھ پھیر رہی تھی اور کبھی سر دبا رہی تھی۔ میں خواب گاہ کے ایک در پہنچے سے چپکا ہوا یہ ناگوار اور ناقابل دید منظر دیکھ رہا تھا۔ گرو بد بخت نے ایک بار ذرا سی آنکھیں کھولیں تو لبتا جھٹ سے بول اٹھی۔ ”اب آپ کیسے ہیں گرو جی..... اب چکر تو نہیں آ رہے؟“ یہ کہتے ہوئے جیسے اس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔

”پہلے سے اب کچھ کم ہیں چکر۔“ گرو نے جواب دیا۔ ”پر تو بدن کی نس نس میں بڑی دکن ہے۔ ابھی میں اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔“

”تو آپ لینے رہو، آرام کرو، میں بیٹھی ہوں۔“ لبتا نے تسلی دی، پھر پوچھنے لگی۔ ”سیب کا رس اور پلاؤ؟“

”نہیں۔“ گرو نے انکار کرتے ہوئے لبتا کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”تم پاس بیٹھی رہو میرے لئے یہی بہت ہے۔“

”مجھے تو حیرت اس پر ہے گرو جی کہ اس ٹپلے کی آتما نے اتنی ہمت کیسے کر لی۔ میرے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ آپ کے بدن میں گھس جائے گا۔“

”سے سے کی بات ہے لنتا! اچھے اچھے گیانی دھیانی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اگر میں اس کی طرف سے چوکنہ ہوتا تو وہ ہرگز مجھ پر حملہ نہ کر پاتا۔ نام تو خیر تم نے معلوم کر ہی لیا تھا، میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس کی آتما جنم جنم اسی طرح بھگتی رہے گی اور اسے کوئی بدن نہیں مل پائے گا۔ وہ دوسرا جنم نہیں لے سکے گی۔“

چل بے لاپڑیے! تیرا ابا حضور بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور وہاں سے کھسک لیا۔ شیطان اور شیطان کی منظور نظر دونوں اس وقت میری طرف سے یقیناً اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ میں اب اس عمارت میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ ان کی اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر میں نے ایک اور ایسا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا کہ وہ بلبلہ کے رہ جائیں۔ وہاں سے میں سیدھا اس چھوٹے سے مندر میں پہنچا جہاں پہلے بھی آچکا تھا۔

شام کا وقت ہو چکا تھا اور مندر کے پلے ہوئے دونوں دہنے، یعنی موٹے موٹے دو عدد پنڈت پوجا پاٹ کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے ان دونوں ہی کو ایک ایک ہاتھ مارا اور لہلہا دیا۔ ایک پنڈت کی انٹی میں تہہ خانے کے قفل کی چابی اڑی ہوئی تھی جو میں نے نکال لی۔ جب چابی موجود تھی تو کالا توڑ کر شور مچانے کی کیا ضرورت تھی۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تہہ خانے کی سیڑھیوں پر مسلح محافظوں کو متعین کر دیا گیا ہو گا۔ صبح میں نے وہاں کسی محافظ کو نہیں دیکھا تھا۔ ممکنہ بغاوت کے پیش نظر شاید اس اہم قیدی کی حفاظت کے لئے یہ نیا بندوبست کیا گیا تھا کہ کہیں ”باغی“ اس عمارت پر حملہ کر کے اپنے ساتھی مسلمان حکمران کو چھڑا نہ لے جائیں۔

محافظوں کی تعداد پانچ تھی۔ دو سیڑھیوں کے اوپر کھڑے تھے، ایک درمیان میں اور دو آہٹی سلاخوں والے دروازے پر موجود تھے۔ ان پانچوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ”باغیوں“ نے حملہ اب کیا اور تب کیا۔ بندوقیں اوپر کی طرف تانے وہ بھی چروں سے خاصے ہونق لگ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفرق لینے کی خاطر ایک کے قریب جا کے سرگوشی کی۔ ”ابے بھاگ لے یہاں سے، محل پر باغیوں نے حملہ کر دیا ہے۔“

”نن..... نہیں۔“ وہ اچھل پڑا۔

پھر قریب ہی کھڑے دوسرے محافظ کی ساعت میں بھی میں نے تقریباً یہی الفاظ انڈیل دیے۔ وہ بھی بوکھلا گیا۔

”ارے اولو! سناؤ نے کچھ..... باغیوں نے محل پڑ چھائی کر دی ہے۔“ آخر ایک محافظ نے دوسرے کو خوفزدہ سی آواز میں خطرے سے آگاہ کر ہی دیا۔

”اور اب وہ تمہیں چٹنی بنانے ادھر آ رہے ہیں۔“ میں نے انہیں اور بھی ڈرایا۔ ”جان ہے تو جہان ہے اس لئے پیارے لہو! خاموشی کے ساتھ یہاں سے سرک لو۔“

عقل سے پیدل ان محافظوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ سرگوشتیاں کرنے والا کون ہے۔ وہ بندوقیں

ہمے ہوئے آگے پیچھے دوڑ لے۔ میں اگر چاہتا تو پنڈتوں کی طرح ان سب کو بھی ”لم لیٹ“ ہونے پر مجبور کر دیتا مگر اس کے بغیر ہی بات بن گئی۔

محافظ وہاں سے رفو چکر ہو گئے تو میں نے آہٹی دروازے کا کالا کھول اور اندر داخل ہو گیا۔ شاہنواز خان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت کے ساتھ حیرت بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”شاہنواز خان! میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں رہائی دلانے آ گیا ہوں۔“

”مل..... لیکن..... تم..... تم تو گرد..... یعنی وشوا ناتھ کے جسم میں تھے۔“ وہ ہلکایا۔

”تو کیا اپنی کے غلیظ جسم کے اندر ساری زندگی گزار دیتا۔ برہا پے کی وجہ سے تم شاید سٹھیا گئے ہو۔ میں اگر کسی آدم زاد کے جسم میں داخل ہو جاؤں تو کیا نکل نہیں سکتا۔ تم کیا مجھے کسی جن زاد کے بجائے کوئی گھسارا سمجھ رہے ہو؟“

”مل..... بالکل نہیں۔“ شاہنواز خان جلدی سے بول اٹھا۔ ”تم تو مجھے اللہ کے کوئی نیک بندے لگتے ہو۔“

”نیک ویک میں بالکل نہیں ہوں، بس حالات ہی نے مجھے وقتی طور پر نیک اطوار بنا دیا ہے۔ اچھا خیر چھوڑو! اپنی ٹانگ ادھر کرو جس سے زنجیر بندھی ہے۔“

اس نے ٹانگ پھیلا دی۔ پیر پر موٹے چمڑے کا جو خول چڑھا تھا، زنجیر اسی سے منسلک تھی تاکہ لوہے کی زنجیر سے پیر زخمی نہ ہو۔ میں نے چمڑے کے اس موٹے خول کو اس طرح پکڑا کہ شاہنواز خان کے پیر پر چوٹ نہ لگے۔ دوسرے ہی لمحے وہ موٹا خول دو ٹکڑے ہو گیا۔

”اب اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”میں تمہیں اس بہتی کے قریب جنگل میں پہنچا دوں گا۔ وہاں متعدد ایسے مسلح مسلمان نوجوان موجود ہیں جو اپنی جان سے زیادہ تمہاری جان کی حفاظت کریں گے۔ تم انہیں بتا دینا کہ کون ہو۔ تمہاری ہی خاطر وہ بے چارے گھر سے بے گھر ہوئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ تمہارے ہم مذہب ہیں۔“ پھر میں نے اسے مختصر آں نوجوانوں کے متعلق بتا دیا۔

”حرام زادہ کالی چرن میری رعایا پر یہ ظلم ڈھا رہا ہے۔“ بوڑھا جوش میں آ گیا۔

”تم کون سے بھولے شاہ ہو۔ کیا تم نے کالی چرن کی حسین نوجوان بیوی رکنی پر ظلم نہیں ڈھایا؟ اسے داشتہ بنا کر ایک عدد ناجائز بیٹی کی ماں نہیں بنایا بڑے میاں! کبھی کبھار اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے ہیں۔ نشے کی حالت میں جوا کھیلے ہوئے پوری ریاست ہار دی اور پھر اپنی داشتہ کے کہنے پر کاغذات پر دستخط بھی کر دیئے۔ سب کچھ خود ہی مجھے بتا چکے ہو اور اب نصی معصوم جان بن رہے ہو۔ تمہاری اسی حماقت کے نتیجے میں آج بے چارے غریب مسلمان نوجوان ریاستی ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔“

میں نے بوڑھے کو آئینہ دکھایا تو پھر اس کی ساری اکڑ فوں نکل گئی۔

”اچھا“ اب میں تمہیں اٹھا کر یہاں سے فوری طور ہونے والا ہوں“ ڈر گئے تو آنکھیں بند کر لیاں!“ یہ کہتے ہی میں نے بوڑھے کو اپنی پشت پر لا دیا۔

شاہنواز خان کو اس عمارت سے نکال کر جنگل تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اپنی اسپید میں نے ذرا کم ہی رکھی تھی ورنہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔

وہ مجھے دعائیں دینے لگا جنہیں سننے کے لئے میں وہاں نہیں رکا۔ چند ہی لمحوں بعد میں ایک بار پھر محل میں داخل ہو گیا۔ اب مجھے اصل معاملے کی سن گئی تھی۔

کالی چرن مجھے اسی عمارت کے ایک بڑے کمرے میں مل گیا۔ اس کے ساتھ دس گیارہ افراد اور تھے۔ میٹنگ شاید اپنے ”آخر“ پر تھی۔ شاہنواز خان کو وہاں سے فرار کرانے کے چکر میں پوری میٹنگ اٹینڈ کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہوا تھا۔

ایک باوردی شخص نے شاید کوئی تجویز پیش کی تھی جس پر ”توتا ناک“ بڑے خطرناک انداز میں رائے زنی کر رہا تھا۔ ”یقیناً ان مفروضہ باغیوں کو بستیوں کے مسلمانوں ہی نے پناہ دی ہوگی۔ بستی کے سارے محلوں کا محاصرہ کرنا تو ایک ساتھ ممکن نہیں، ہاں باری باری ایسا ہو سکتا ہے۔ بستی سے باہر جانے والے تمام راستے پہلے بند کر دیئے جائیں! اس کے بعد کسی ایک محلے کا محاصرہ کر کے ایک ایک گھر کی تلاشی لو! وہاں جو بھی نوجوان مسلمان نظر آئے اسے گرفتار کر لو!“

”اور جنگل کے بارے میں راجا صاحب کا کیا حکم ہے؟“ کسی نے سوال کیا۔

”اتنی نفری کہاں ہے کہ بستی اور جنگل دونوں کو ایک ساتھ گھیرا جاسکے۔“ ایک اوجیز عمر شخص، کالی چرن سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ریاستی پولیس کا شاید وہی سربراہ تھا۔ ہر دور میں پولیس کے سربراہوں کو نفری کم ہونے کا شکوہ رہا ہے۔ پھر بھلا وہ شخص یہ رٹا کیوں نہ لگاتا!

”لیکن اب تک کی تفتیش سے تو یہی بات سامنے آئی ہے کہ باغیوں کا ٹھکانا قریبی جنگل ہے۔ وہاں سے ایک سپاہی کی لاش بھی مل چکی ہے جسے گولی ماری گئی ہے۔ ایسی صورت میں ہم جنگل کو نظر انداز کرنے کی غلطی کس طرح.....“

”دیوان جی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!“ کالی چرن اس بوڑھے کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا جس کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر داڑھی بھی تھی جسے دونوں جانب سے اوپر کی طرف کس کے باندھا گیا تھا۔ اس کے گلے سے میں سمجھ گیا کہ یہی ریاست کا دیوان ہے پال سنگھ ہے۔ کالی چرن نے صبح اسی کا ذکر کیا تھا۔ کچھ دیوان اپنے چہرے سے گھاگ ہونے کے ساتھ سفاک بھی معلوم ہوتا تھا۔ کالی چرن نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تو وہ جیسے محل اٹھا۔

”راجا صاحب! میری یہ تجویز ہے کہ نفری کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔“ گھاگ دیوان بولا۔ ”نفری کا ایک حصہ جنگل کو گھیر لے، دوسرا حصہ باری باری محلوں کا محاصرہ کرے اور گھر گھر تلاشی لینے کا کام شروع کرے۔ مجھے یقین ہے کہ ریاست کی جیل سے فرار ہونے والے نوجوان باغیوں نے جنگل ہی میں پناہ لی ہوگی۔“

بوڑھے گھاگ دیوان کا اندازہ قطعی درست تھا۔ اس طرح نہ جانے کتنے مظلوم و بے گناہ مارے جاتے! چیونٹی کو بھی کوئی مسئلے تو وہ بھی اپنی جان بچانے کے لئے کاٹ کھاتی ہے۔ وہ تو بہر حال آدم زادے تھے۔ ان کے پاس ریاستی پولیس کے مقابلے میں ہتھیار کم تھے، پھر بھی جان بچانے کی خاطر وہ مقابلہ تو کرتے ہی! بہر حال یہ سب کچھ ان نوجوانوں کے حق میں سودمند نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ محاصرے اور گھروں کی تلاشی کے دوران پولیس اپنی روایت کے مطابق اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتی۔

اس ممکنہ ظلم و تشدد کو کس طرح روکا جائے؟ چند ہی لمحوں میں یہی ایک سوال کئی بار میرے ذہن میں گردش کر گیا۔ اسے اگر کسی جن زاد کی خود ستائی نہ سمجھا جائے تو میں کون گا کہ ہم جنگل، آدم زادوں کے مقابلے میں جلد نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور جلد ہی کسی مسئلے کا حل بھی دریافت کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب شاید ہمارے مزاج کی تیزی اور شعلہ صفت حرکت کرنے کی صلاحیت ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بہت جلد اس اہم مسئلے کا حل بھی میرے ذہن میں آ گیا۔

وہاں ایک ہی شخص ایسا تھا کہ جس کا حکم ٹالنا کسی کے لئے ممکن نہیں تھا۔ آمریت میں کسی آمر کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم اور قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک ’احق‘ ایک آمر ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں جو ریاستیں تھیں، ان کے فرمانروا بھی آمر ہی تھے، خواہ وہ ہندو ہوں کہ مسلمان! کالی چرن بھی انہی میں سے تھا۔ شیطان گرو دشوانا تھہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا اور لٹا اس کی ناز برداری میں لگی ہوئی تھی۔ ایسے میں ان دونوں کے وہاں آنے کا سوال ہی نہیں تھا کہ میں کسی خطرے میں گھر جاتا۔ سو میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس ”توتا ناک“ پلس خطرناک آمر کالی چرن کو دبوچ لیا۔

دیکھنے والوں نے بس اتنا ہی دیکھا ہو گا کہ کالی چرن اپنی اونچی پشت والی آرام دہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا ہے۔ میں اس کے جسم میں اتر چکا تھا۔

”کیا ہوا راجا صاحب؟“ دیوان بے پال سنگھ نے چونک کر پوچھا۔ ”توتا ناک“ کا جسم بھی گندا اور مکروہ تھا مگر خبیث گرو دشوانا تھہ سے کم۔ میں نے اس لئے اس کے رگ دریئے میں جلد ہی سرایت کر لی۔ کچھن تو خیر ہوئی، لیکن ناقابل برداشت حد تک نہیں۔ مجھے خود پر قابو پانے میں چند لمحے ضرور لگے۔

”تم کیا پوچھ رہے تھے دیوان جی؟“ میں نے دیوان بے پال سنگھ کو گھور کر دیکھا۔ سارے فساد کی جڑ وہی کینہ تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے کالی چرن کے غلیظ جسم میں اترنا پڑا تھا۔

”کک..... کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں..... راجا صاحب!“ بوڑھا دیوان میری سخت نظروں کی تاب نہ لا کر ہٹکاتے لگا۔

”ہاں وہ کیا تجویز تھی تمہاری کہ جنگل کو گھیرے میں لے لیا جائے؟ اس کا فائدہ؟“ میرے لہجے میں سختی برقرار رہی۔

”وہ..... وہ راجا صاحب! اس طرح باغی وہاں..... وہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔“

”ایک طرف تمہارا کتنا یہ ہے کہ جنگل میں باغیوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے، دوسری جانب تمہیں ان کے فرار ہو جانے کا غم کھائے جا رہا ہے۔ دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات ہی درست ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری دونوں ہی باتیں بالکل غلط ہیں۔ قیدیوں کو جیل سے فرار ہونے اب تک خاصا وقت گزر چکا ہے۔ اگر انہیں جنگل میں موجود اپنے ٹھکانے تک ہی پہنچنا تھا تو پھر وہاں سے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ بولو، غلط کہہ رہا ہوں میں!“

”آپ..... آپ نے کبھی کوئی غلط بات کی ہی نہیں۔“ دیوان نے فوراً سپردال دی، مگر ابھی میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔

”اب شام ہو رہی ہے اور کچھ ہی دیر میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ ایسی صورت میں کیا سپاہیوں کو جنگل کے اندر بھیج کر تم انہیں گاجر مولیٰ کی طرح باغیوں کے ہاتھوں کوٹنا چاہتے ہو.....؟“ اور پھر مجھے ایک بات کا جواب دو کہ جن نوجوانوں کو پکڑا گیا تھا، کیا ان میں سے کسی نے باغی ہونے کا اقرار کیا؟“

”اس..... اس کا جواب تو یہی..... یہی دے سکتے ہیں۔“ دیوان نے اپنی طرف آنے والے پتھر کا رخ پولیس چیف کی طرف موڑ دیا۔

ادھیڑ عمر باوردی پولیس چیف کو غالباً یہ گمان نہیں ہو گا کہ وہ بھی رگڑائی میں آجائے گا۔ وہ اسی لئے شٹا گیا۔ ”مم..... میں بتاؤں..... میں جواب دوں!“

”ناں“ تجھے کیا ضرورت ہے جواب دینے کی! تیرا باپ مرگٹ سے اٹھ کر آئے گا تو وہ جواب دے گا!“ میری آواز زہر میں سمجھی ہوئی تھی۔

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں راجا صاحب.....! دیوان جی نے مجھ سے کہا تھا کہ ابھی گرفتاریاں کرتے رہو، پوچھ گچھ بعد میں کرتے رہنا۔“ پولیس چیف نے سارا الزام ریاست کے سکھ دیوان (وزیر) پر ڈال دیا۔ ”دیوان جی نے کہا تھا کہ جتنی زیادہ گرفتاریاں ہوں گی، راجا صاحب اتنے ہی زیادہ مطمئن اور خوش ہوں گے۔“

”جن نوجوانوں کو ریاست کی مختلف بستیوں سے گرفتار کیا گیا، ان کے متعلق یہ کیسے پتا چلا کہ وہ باغی ہیں۔ کیا ان کے ہاتھوں پر لکھا تھا کہ ہم باغی ہیں؟ جواب دو!“

”نہیں..... کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ..... کہ کون کیا ہے..... اور دیوان جی کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ سو..... جو نوجوان ابھی ہتھے چڑھ گیا.....“

”اے تم نے باغی قرار دے دیا!“ میں نے ٹھوہرے لہجے میں پولیس چیف کی بات پوری کر دی، پھر زور سے بولا۔ ”کیا تم اور کیا یہ بوڑھے دیوان جی، تم سبھی گھماڑ اور نااہل ہو۔ تم لوگ اس طرح ریاست کے خلاف زبردستی بناوت کرانا چاہتے ہو! جو نوجوان ریاست کے وفادار ہیں تم لوگ اپنے نمبر بڑھانے کے لئے انہیں باغی بنا رہے ہو! محاصروں اور گرفتاریوں سے بھنا (عوام) میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو گی۔ تم لوگوں کی نااہلی پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ قیدی جیل سے فرار ہو رہے ہیں اور تم لوگ میرے سامنے امتحان تجویزیں پیش کر کے اپنی قابلیت گنہار رہے ہو۔ اب کسی محاصرے، کسی

گرفتاری کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے جسموں پر نہیں دلوں پر حکومت کی جاتی ہے اور تم نے لوگوں کے دل ہماری طرف سے پھیر دیئے ہیں۔ ہم اس جرم میں مع دیوان جی کے تم سب کو تمہارے عہدوں سے معطل کرتے ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔ باہر جو سپاہی جمع کئے ہیں، ان سے کہہ دو کہ اپنی اپنی بیرکوں میں چلے جائیں!“ یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت اچانک میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی اور مجھے خطرے کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ دروازے سے داخل ہونے والی لٹا تھی جس کے چہرے سے بدحواسی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”یہ کبخت اس وقت اپنے عاشق کو چھوڑ کر یہاں کیسے آئی؟“ میں نے سوچا۔ اگر میں فوری طور پر کالی چرن کے جسم کو چھوڑ کر بھاگ نکلتا تو سارے کئے دھڑے پر پانی پھر جاتا۔ اس کے علاوہ کالی چرن کے جسم کو شدید جھٹکا لگتا جس سے لٹتا چوکنہ ہو جاتی اور پھر اسے حقیقت تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں، کالی چرن کا جسم چھوڑ کر بھاگتے بھاگتے ذرا دیر کو رک گیا۔ اس کی وجہ لٹتا کے چہرے کی بدحواسی بھی تھی۔ میں اس کا سبب جانتا چاہتا تھا۔

”پتا جی!“ وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ ”قیدی، مندر کے تہ خانے سے فرار ہو گیا۔“

”آج کے دن جو نہ ہو جائے سو کم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کس طرح اس کا پتا چلا؟“

”گرد جی کی دو نوکرانیاں مندر میں شام کی پوجا کرنے گئی تھیں۔ انہوں نے وہاں پندتوں کو بے ہوش پڑے دیکھا تو آکر بتایا۔ گرد جی نے مجھے وہاں بھیجا کہ تہ خانے کی خبر لوں اور دیکھوں کہ وہاں تو کوئی گزبڑ نہیں ہوئی۔ مسلح محافظ موجود ہیں کہ نہیں۔ وہاں نہ کوئی محافظ تھا اور نہ تہ خانے میں کوئی قیدی۔ معلوم نہیں، یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے پتا جی!“

ابے او ہندو نار! مجھے پتا جی تو نہ کہہ۔ ویسے بھی ٹوٹے پتا جی سمجھ رہی ہے، تیرا باپ نہیں۔ تیرا اصل باپ تو وہ تھا جسے میں نے تہ خانے سے فرار کرا دیا۔ کاش اس وقت میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس آفت کی پرکالہ سے کہہ بھی سکتا۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ مجھے ابھی تک کالی چرن ہی سمجھ رہی تھی۔

”انہی تمام کوتاہیوں کی وجہ سے میں نے ان سب کو عہدوں سے ہٹا دیا ہے۔“ میں نے سامنے منہ لگائے کھڑے ہوئے افراد کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا..... کیا دیوان جی کو بھی.....؟ ان کی تو بڑی خدمات ہیں ریاست کے لئے۔“ لٹا حیرت سے بولی۔

”دیوان جی اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کی عقل بھی ماری گئی ہے۔ یہ صرف میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ریاست کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔“

”تو پھر..... پھر ان کی جگہ کسے دیوان بنائیں گے؟“

”یہ بعد میں سوچیں گے۔“ میں نے جواب دیا اور پھر ان سب ”منہ لٹکوں“ کو حاضری برخاست کا اشارہ کیا۔

”میرے خیال میں گرد جی کو نیا دیوان بنا دیں۔“ لٹا نے کہا۔

”تمہیں تو سارے سنار میں گروہی کے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔“ میں منہ بنا کر بولا۔ ”جہاں اندر جاؤ اپنی ماں کے پاس۔“

”اندروں..... ماں جی کے پاس۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ماں کو جی تو مرے بھی دو برس سے زیادہ.....“ پھر لٹتا نے اپنا جملہ ادھر اچھوڑ کر غور سے میری طرف دیکھا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ اس بد بخت کی بدکردار ماں دو سال پہلے ہی جہنم کا کلکت کاٹ چکی تھی۔ میں نے تو محض اس سے جان چھڑانے کے لئے یوں ہی یہ بات کہہ دی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے ”پر“ باندھ دیتی، میں اس کے باپ کا جسم چھوڑ کر اڑان بھر گیا۔ اب وہاں مزید ایک لمحے بھی رکتا اپنی موت کو دعوت دیتا تھا۔

☆=====☆=====☆

وہاں سے بھاگ کر میں نے جنگل کی راہ لی۔ جنگل میں منگل مٹایا جا رہا تھا۔ حالانکہ اس دن منگل نہیں بدھ تھا۔ شاہنواز خاں پورے کردفر کے ساتھ غریب نوجوانوں کے درمیان موجود تھا۔ اس نے یقیناً یہ بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ کسی ریاست کے سربراہ کو ان بے چارے نوجوانوں نے پہلی بار یوں ”گھاس“ نکھیں دیکھا ہو گا۔ شاہنواز خاں اپنے حلقے کے سبب اس وقت کسی جنگی سے بھی بدتر دکھائی دے رہا تھا مگر گردن تنی ہوئی تھی، یوں جیسے ابھی کائنات کے زیر و زبر ہونے کا فیصلہ شانے والا ہے۔ خوئے سلطانی ابھی گنتی نہیں تھی، سر سے کلاہ گر چکی تھی مگر بائکین وہی تھا۔

شاہنواز خان سے مجھے کچھ پوچھ گچھ کرنا تھی اور وہ تھا کہ نوجوانوں کو اس زمانے کے قصے سنارہا تھا جب انہوں نے اس عالم بے ثبات میں آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔

”جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو ہمارے جسم میں بے پناہ طاقت تھی جس کا تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ شاہنواز خان نان سناپ بولے جا رہا تھا۔ ”ایک مرتبہ کیا ہوا کہ شیر کا شکار کھیلتے ہوئے ہمارے ہاتھ سے بندوق گر گئی۔ ہمارے سامنے تین ہیر شیر کھڑے تھے۔ ہماری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہیں دہشت کھا کے مر گیا ہوتا، لیکن ہم ٹھہرے نواب ابن نواب۔ ہم بھلا کس طرح ان شیروں سے ڈر جاتے۔ پھر جو ایک شیر کے ہم نے گھونسا مارا تو اس کا سر ضرب سے پاش پاش ہو گیا۔ دوسرے شیر کو ہم نے بغل میں دبوچ لیا۔ تیسرا شیر یہ صورت حال دیکھ کر دور کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔“

شاہنواز خاں ابھی اسی قدر کہہ پایا تھا کہ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ”سبحان اللہ! تیسرا شیر جو دور کھڑا سوچ رہا تھا، وہ بھی تمہیں جادو سے معلوم ہو گیا۔“

خلاف توقع میری سرگوشی سن کر وہ اس طرح اچھلا جیسے واقع کوئی شیر مقابل آ گیا ہو۔

اس کے ہونٹ کچھ کھنکھنے کو پھڑپھڑائے ہی تھے کہ میں نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر بولا۔ ”ان نوجوانوں کو کوئی گھسا دے کر کسی طرف اکیلے نکل چلو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔ کہہ دو کہ پیٹ میں مروڑ ہو رہا ہے جس کے لئے تمہیں کچھ دیر کو غلوت چاہئے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”پھر کیا ہوا نواب صاحب؟“ ایک نوجوان نے شاہنواز خاں کو خاموش دیکھ کر پُر اشتیاق آواز میں پوچھا۔ ”تیسرے شیر نے کیا کیا؟“

”ہم ابھی آکر بیٹاتے ہیں۔“ پھر شاہنواز خاں نے وہی بھانہ بنا دیا جو میں نے سمجھایا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ تیز قدمی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اسے وہاں سے خاصی دور لے آیا کہ کوئی اسے اکیلے بیٹھ کر باتیں کرتے دیکھ تو پاگل نہ سمجھے۔

شاہنواز خاں کے سامنے گھاس پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”ہاں تو جناب قبلہ نواب شاہنواز خاں صاحب بہادر! باتیں تیسرے شیر کی روداد خوں چکاں۔“

”تم سے بھلا کیا دون کی لیتا میاں! بس بچوں بالوں کا دل بھلا رہا تھا۔ بہادری کے قصے سن کر بچے زرا خوش ہو جاتے ہیں۔“

”ایک ہی فقرے میں تم نے کئی قابل اعتراض باتیں کر دی ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ عمر کیا ہو گی تمہاری؟“

”اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ستر کی لپیٹ میں ہوں گا۔“

”اور میری عمر معلوم ہے تمہیں..... ڈیڑھ سو برس کا ہوں۔ یہ اس لئے تمہیں بتایا ہے کہ آئندہ مجھے میاں کہہ کر بزرگی نہ چھانٹنا، سمجھ گئے ستر سالہ بر خرودار!“

”بالکل سمجھ گیا قبلہ! آپ تو مجھ سے بھی دگنی عمر کے ہیں بلکہ دس برس اور زیادہ ہیں۔ آئندہ غلطی نہیں ہو گی۔“

”دوسری قابل اعتراض بات یہ تھی کہ وہ بچے نہیں نوجوان تھے جنہیں تم بچہ کہہ کر اپنے بچپنے کا ثبوت دے رہے ہو۔ تیسرے یہ کہ تم ان کا نہیں اپنا دل بھلا رہے تھے۔ چوتھی اور آخری بات یہ کہ بہادری اور حماقت میں فرق ہوتا ہے۔ وہ قصے تمہاری بہادری نہیں حماقت ظاہر کر رہے تھے۔ آئندہ گپ باتنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ اگلا بھی تھوڑی بہت تو عقل رکھتا ہی ہو گا، لحاظ مروت میں کچھ نہ کہے تو الگ بات ہے۔ خیر یہ ذکر چھوڑو، مجھے تم سے شہباز خاں کے بارے میں معلوم کرنا تھا، اس کا کیا چکر ہے؟“

”دراصل شہباز خان بھی میرا ہی بیٹا ہے۔“

”جائز یا ناجائز؟“ میں فوراً بول اٹھا۔ ”تم نوابین کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”وہ میرا جائز بیٹا ہے۔ اسے میرے جڑواں بھائی آریاز خاں نے گود لے لیا تھا کہ اس کے اولاد نہیں ملتی تھی۔ آریاز خاں کو رنج نہ ہو، یہ سوچ کر کبھی میں نے شہباز پر اپنا حق نہیں جتایا۔ شہباز کے علاوہ میرے دو بیٹے اور بھی تھے مگر وہ جی نہ سکے۔ وہ شہباز سے چھوٹے تھے۔ میں کیونکہ تین بیٹوں کا باپ تھا

لئے جب بڑے بیٹے کو بھائی نے گود لینے کے لئے کہا تو مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ آریاز خاں نے شہباز کو اپنی اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ میں نے اسی لئے چھوٹے بیٹوں کی موت کے بعد بھی شہباز کو آریاز خاں کے

جانی رہنے دیا۔“

”چلو یہ قصہ تو ایک طرف ہوا۔ یہ بتاؤ کہ کالی چرن تمہاری ریاست میں کہاں سے آگیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کالی چرن قریبی ہندو ریاست کا دیوان تھا اور میرا دیوان دشوا ناتھ تھا جو خود کو گردی کسلواتا ہے۔ دشوا ناتھ اور کالی چرن میں دوستی تھی۔ اسی دوستی کے ناتے کالی چرن آتا جاتا رہتا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا کہ کالی چرن کی بیوی رکنتی پر میرا دل آگیا۔ وہ ہر وقت اداس اداس سی رہتی تھی۔ ایک دفعہ مجھے موقع مل گیا کہ اس اداسی کی وجہ معلوم کر سکوں۔ وجہ وہی تھی جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ رکنتی کو ازدادی سکھ میسر نہ تھا۔ پھر باہمی رضامندی سے میرے اور اس کے درمیان تعلقات استوار ہو گئے۔ رکنتی ہی کی وجہ سے کالی چرن بھی میرے قریب آگیا۔ کالی چرن کو لہبا جوا کھیلنے کی لت بھی تھی۔ سو جوا چل نکلا۔ دشوا ناتھ نے مجھے شراب کا چکا بھی لگا دیا تھا۔ غرض کہ شراب و شباب نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس پر جوا بھی جان کو لگ گیا۔ میں بھی کالی چرن کی طرح بڑے داؤ لگانے لگا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں کالی چرن کا مقروض ہوتا گیا۔ پھر ایک روز نشے کی ترنگ میں اپنی پوسہی ریاست میں نے داؤ پر لگا دی اور اسے بھی ہار گیا۔ رکنتی اس وقت مجھے اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہی تھی۔ یہ اندازہ مجھے بہت بعد میں اور وقت گزرنے کے بعد ہوا کہ اس سازش میں حرام زادی رکنتی بھی برابر کی شریک تھی۔ اسی کے ساتھ دشوا ناتھ بھی۔ رکنتی کو کالی چرن اور دشوا ناتھ نے مجھے پھانسنے کے لئے بطور چارہ استعمال کیا تھا۔ خدا اسے عارت کرے۔“

”تو پھر خوش ہو جاؤ کہ خدا نے اسے عارت کر دیا ہے۔ رکنتی دو سال پہلے مر چکی ہے۔ اب نہ پارے تم کالی چرن اور دشوا ناتھ کے لئے بددعا کرو کہ وہ عارت ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور ہاں تمہیں یہ معلوم ہے کہ تمہارے آبائی قبرستان میں تمہاری قبر بھی موجود ہے؟“

”میری قبر..... مگر میں تو زندہ ہوں۔“

”ہاں مجھے بھی تم زندہ ہی نظر آ رہے ہو، لیکن بہر حال تمہاری قبر بن چکی ہے اور تمہاری جگہ اس میں تمہارے جزواں بھائی ایاز خاں کو دفن کر دیا گیا ہے۔ یعنی قبر میں تمہارا بھائی ہے اور قبر پر کتبہ تمہارے نام کا ہے۔ تمہارے دشمنوں نے پکا کام کیا ہے..... اچھا تو پھر جب جوئے میں تم نے ریاست ہار دی تو کیا گزری؟“

”اسی رات دشوا ناتھ نے مجھے قید کر لیا۔ آخری بیچے کی پیدائش کے کچھ روز بعد ہی میری بیوی م چکی تھی۔ عورتوں کی میرے لئے کبھی نہیں تھی اس لئے دوسری شادی نہیں کی۔ دشوا ناتھ اس معاملے میں مجھے خوش رکھتا تھا۔ کوٹھی میں ایاز خاں شہباز اور ایاز کی بیوی کے سوا صرف میں تھا۔ ایاز خاں کے ہاں میں ابھی تم سے معلوم ہوا کہ اسے میری جگہ دفتا دیا گیا۔ شہباز خاں کے متعلق قید کے دوران دشوا ناتھ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ نکل بھاگا تھا۔ ایاز کی بیوی کو خالوں نے مار دیا ہو گا۔ بہر حال جو کچھ ہو میری قسمت میں لکھا تھا اور اللہ کو یہی منظور تھا۔“ یہ کہہ کر شاہنواز خاں کچھ اداس سا ہو گیا۔

”سنو“ میں کوئی عالم فاضل تو نہیں ہوں لیکن چند باتیں واضح طور پر سمجھتا اور جانتا ہوں جو میں

اپنے بزرگوں سے سنی ہیں۔“ میں بولا۔ ”یہ جو تم آدم زاد ہر بات کو قسمت اور اللہ میاں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہو، یہ قطعی مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم آدم زادوں کو بارادہ اور با اختیار مخلوق بنایا ہے۔ جب میں جھوٹا سا تھا، یعنی یہی کوئی چالیس پچاس برس کا تو میں نے اپنے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ جب اللہ ہر شے پر قادر ہے تو پھر بندے پر کس بات کا الزام ہے؟ بندہ جو کچھ کرتا ہے، اللہ کے حکم ہی سے کرتا ہے، چاہے ثواب کمائے یا گناہ کرے۔ بزرگ نے مجھے ایک معمولی سی مثال دے کر سارا مسئلہ سمجھا دیا۔ اسی کو ہم مسئلہ جبر و اختیار کہتے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں یوں بھی آسانی سے یہ بات آ جائے گی کہ طویل عرصے تک تمہارا ایک پیر بھی بندھا رہا ہے۔ وہ معمولی مثال یہ تھی کہ کسی پرند کا ایک پیر کسی رسی یا زنجیر سے باندھ دیا جائے اور وہ رسی خاصی بڑی ہو، یعنی پرند ایک محدود درجے میں چلنے پھرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ اس دائرے میں ہموار جگہ بھی ہو، گڑھے بھی ہوں۔ پرند کو اس دائرے کی حدود میں رہتے ہوئے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے گڑھے میں گر جائے یا ہموار جگہ پر چلے۔ اسی دائرے کے اندر دانہ بھی پڑا ہو اور غلات بھی موجود ہو۔ پرند دانہ بھی کھا سکتا ہے اور غلات پر بھی منہ مار سکتا ہے۔ سو شاہنواز خاں، زندگی اسی دائرے کی طرح ہے۔ دائرے کے اندر اللہ کی مخلوق کو اختیار ہے کہ وہ چاہے گڑھے میں گرے یا سیدھی راہ چلے، رزق حلال کو اپنے لئے منتخب کرے یا حرام کھائے۔ اللہ نے اسے پورا اختیار دیا ہے۔ جبر پاؤں کا باندھا جاتا ہے، یعنی مخلوق اپنی معینہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ تو میری جان، اے ستر سالہ برخوردار! قسمت مخلوق کے عمل سے بنتی اور بگڑتی ہے۔ یہ کوئی جلد شے نہیں ہے۔ پیر باندھا ہونا، موت کا استعارہ ہے، یعنی مخلوق اپنی موت سے فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ اب آیا تمہاری سمجھ میں کچھ۔ عموماً میں کسی سے ایسی گاڑھی باتیں نہیں کرتا، لیکن جب کوئی تم جیسا پاپی سب کچھ خود کر کے یہ کہنے لگتا ہے کہ اللہ کو یہی منظور تھا تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ بہر حال آئندہ کم از کم میرے سامنے تم مظلوم کو تر بننے کی کوشش نہ کرنا۔“

”تم نے واقعی آج میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب مجھے پتا چلا کہ جنات میں بھی بڑے بڑے بزرگ موجود ہیں۔“

جو باتیں میرے لئے الجھن اور تجسس کا سبب بنی ہوئی تھیں، شاہنواز خاں سے معلوم ہو گئیں۔ تو میں نے پوچھا۔ ”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟ اصولی طور پر تم یہ ریاست جوئے میں ہار چکے ہو۔ تمہیں اس پر دعوے کا حق نہیں رہا، لیکن تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے یا سیدھے سادے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ اُلٹا بنا دیئے گئے ہو۔ کالی چرن نے یہ مشہور کر رکھا ہے اور غالباً جن کافذات پر تم سے دھتخلہ لئے گئے ہیں، ان سے بھی یہی ثابت ہے کہ کالی چرن نے اس ریاست کو تم سے خریدا ہے۔ اگرچہ سرکار نے بھی ریاست پر کالی چرن کے حق کو تسلیم کر لیا ہے۔ مسئلہ اگر صرف تمہارے مفاد کا ہوتا تو میں ہرگز اس میں الجھی نہ لیتا۔ میری بلا سے اس ریاست کے مالک تم ہوتے یا کوئی اور، مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ میرے نزدیک اس ریاست کی اکثریت کا ہے جو مسلمان ہے اور تمہاری حماقت سے ان بے چارے مسلمانوں پر ہندو حاکم مسلط ہو گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس

ریاست کا حکمران بن جائے یا بنا دیا جائے تو میرے خیال میں یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مسلمان آبادی ہندو حکمران کے ظلم سے بچ جائے گی۔ اس سلسلے میں تم مجھ سے جو مدد چاہو، وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔“

”یقیناً اللہ تمہیں اس کارِ خیر کا اجر دے گا کہ تم نے ایک مسلمان جن زاد ہونے کا حق ادا کر دیا۔“

”اجر تو اس وقت ملے گا جب حق ادا ہو جائے“ ابھی تو حق ادا کرنے کی ابتدا بھی نہیں ہوئی

برخواردار!“

”میری کیا کم ہے کہ تم نے پانچ سو بے گناہ نوجوان مسلمانوں کو رہا کر دیا اور پھر مجھے بھی آزادی دلا دی۔“

”تو پھر اور کچھ نہیں چاہئے، میں شل لوں؟“

”میرا یہ مقصد نہیں تھا۔“

”تو پھر مقصد بیان بھی کر چکویا! تم تو کلف خان بن کر خواہ مخواہ ادھر ادھر کی اڑائے جا رہے ہو..... اور ہاں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ ریاستی سپاہی اس جنگل کو گھیرے میں لے کر بزن بھی بول گئے ہیں۔ تمہیں نوجوانوں کو اس کے لئے پہلے سے ذہنی طور پر تیار رکھنا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”یہ جنگل بہت بڑا اور گھنا ہے۔ اگر سپاہیوں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو انہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ نوجوانوں کے پاس میں نے اسلحہ بھی دیکھا ہے۔“

”لیکن اسلحہ کم ہے۔ ہر نوجوان کے پاس نہ تو بندوق ہے، نہ دافر تعداد میں کارتوس ہیں۔ پھر یہ کہ ان میں سے ایسے بھی ہوں گے جنہیں بندوق چلانا بھی نہیں آتی ہوگی۔ مزید اسلحہ اور خوراک کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی بہتر یہ ہے کہ کوئی اور راستہ نکل آئے۔ ریاستی سپاہیوں سے مقابلے کی صورت میں مسلمان نوجوان بھی مارے جا سکتے ہیں۔ میں بھی اس جنگل میں تم لوگوں کی پوری مدد کروں گا۔ ممکن ہے کہ صبح ہوتے ہی اس جنگل پر یلغار کر دی جائے اس لئے میں چلتا ہوں تاکہ تمہارے لئے اسلحہ کا ذرا بندوبست کر رہی دوں۔ تمہیں علم ہے کسی اسلحہ خانے کا؟“ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔

جواب میں شاہنواز خان نے دو بڑے اسلحہ خانوں کی نشاندہی کی، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ممکن ہے اب اسلحہ خانوں کے مقامات تبدیل کر دیئے گئے ہوں۔

”تم فکر نہ کرو، میں ڈھونڈ لوں گا۔“ میں نے اسے دلاسا دیا اور ایک بار پھر جنگل سے آبادی کی طرف چل دیا۔

شاہنواز خاں سے میں نے جس خدشے یا خطرے کا اظہار کیا وہ بعید از قیاس بہر حال نہیں تھا۔ کالی چرن کے جسم پر قبضہ کر کے میں نے جو کامیابی حاصل کی تھی، ذرا سی لاعلمی کے سبب ناکامی میں بدل گئی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ہندو حسینہ لتا کی اماں دو سال پہلے ہی زمین کا بوجھ کم کر چکی ہے تو یہ کھنڈت نہ ہوتی۔ لتا اسی سے چونک گئی تھی اور پھر مجھے وہاں سے ریس لگانا پڑی تھی۔ ایسی صورت میں کالی چرن کی حیثیت سے میں نے جو احکام دیئے تھے انہیں کالعدم قرار دے دیا گیا ہو گا۔ بات گھوم پھر کے دوبارہ وہیں آگئی تھی، یعنی بستی کے محلوں کے محاصرے اور گرفتاریوں کا خطرہ بدستور تھا۔ پھر بھی مجھے اس

لال نہیں تھا۔ میں نے اپنی سی کوشش تو کر لی تھی۔

للتا کو یہ معلوم ہو جانا بھی میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا کہ اسے پتا چل گیا تھا، میں ابھی تلا نہیں ہوں۔ وہ میرے لئے کوئی نہ کوئی جال ضرور پھیلاتی کہ اب اگر محل نما عمارت میں داخل ہونا چاہوں تو گھیر لیا جاؤں۔ میرے لئے پہلے کی نسبت خطرہ بڑھ گیا تھا، پھر بھی میں نے جی نہیں ہارا اور ایک اسلحہ خانے کا سارا اسلحہ غائب کر کے جنگل میں اس کا ڈھیر لگا دیا۔ ریاستی سپاہیوں سے مقابلے کی صورت میں اب کم از کم اسلحہ کی کمی نہ ہوتی۔ اسی کے ساتھ میں نے خوراک بھی دافر مقدار میں پہنچا دی کہ خالی پیٹ لڑنے والے اکثر مار لئے جاتے ہیں۔ لڑنے کے لئے پیٹ میں روٹی ہونا بہت ضروری ہے۔ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ بھی ہانک کر میں نے جنگل میں بھیج دیا تھا۔ اس پر نوجوان بہت خوش اور بڑجوش تھے۔ شاہنواز خان نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک صاحب ایمان جن زاد ان بے گناہ نوجوانوں کی مدد کر رہا ہے۔ اس سے نوجوانوں کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا۔

اسی رات نصف شب سے پہلے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں بستی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ ریاستی سپاہیوں نے بستی میں ظلم و تشدد کا بازار گرم کر دیا تھا۔ میں بستی کی طرف لپک لیا۔ شاہنواز خاں مجھے بتا چکا تھا کہ بستی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں۔

معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے ایک ایسے ہی محلے کا محاصرہ کر رکھا ہے جہاں مسلمان آباد ہیں۔ وہ زبردستی لوگوں کے گھروں میں گھس گھس کر انہیں باہر نکال رہے تھے۔ نوجوانوں کی چھٹائی ہو رہی تھی۔ ان کی مائیں اور بہنیں چیخ چلا رہی تھیں۔ کچھ حرام زادے سپاہی مسلمان لڑکیوں پر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دست درازیاں بھی کر رہے تھے۔

میں نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جو دو سپاہیوں کے چنگل سے نکل کر کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ایک طرف بھاگ رہی تھی۔ سپاہی اس کے پیچھے تھے اور ایک ادھیڑ عمر عورت ان سپاہیوں کے عقب میں چپٹی ہوئی دوڑ لگا رہی تھی۔ ”میری بچی..... ارے کوئی میری بچی کو بچاؤ۔“

بھپٹ کر میں نے دونوں سپاہیوں کی گردنیں دیوچ لیں۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ دونوں بد معاش ایٹم گر کر شیطان کو پیارے ہو گئے۔

سپاہی لوگوں کے گھروں کا مال و اسباب بھی لوٹ رہے تھے، انہیں بے عزت بھی کر رہے تھے اور نوجوانوں کی گرفتاریاں بھی جاری تھیں۔ ادھیڑ عمر پولیس چیف کی وہاں موجودگی سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کالی چرن کے جسم پر قبضہ کر کے میں نے جن اعلیٰ عہدیداروں کو معطل کر دیا تھا، وہ بدستور اپنے عہدوں پر باہمان تھے۔

بربریت اور ظلم و وحشت کے اس تماشے کو بند کرانے کی غرض سے میں نے پولیس چیف کا عہدہ نبھال لیا۔ اس کے لئے مجھے پولیس چیف کے جسم پر قبضہ کرنا پڑا۔ پولیس چیف کے ارد گرد اس کے ماتحت افراد کھڑے تھے جو چیف کے احکام کی تعمیل کر رہے تھے۔

”بس کافی ہے اتنا۔“ میں نے چیخ کر پہلا حکم دیا۔

”مگر حضور! ابھی تو آدھے محلے کے گھریا ہی ہیں ان کی تلاشی.....“

اس پولیس افسر کا جملہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ اس کے منہ پر بڑا زوردار طمانچہ پڑا تھا۔ وہ اپنا رخ سہلانے لگا۔

”تو کون ہے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کرنے والا یا ہمیں یہ بتانے والا کہ ابھی کتنے گھروں کی تلاشی باقی ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

اپنے ایک ساتھی کو سرعام پختے دیکھ کر دوسرے پولیس افسروں کو بھی عبرت ہو گئی اور پھر فوراً طور پر میرے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔

اب تک تقریباً پچاس نوجوانوں کو حراست میں لیا جا چکا تھا۔ انہیں میرے سامنے پیش کیا گیا۔ پٹن کا حکم میں نے ہی دیا تھا۔ ایک ہی سوال تھا جو میں نے ہر نوجوان سے کیا۔ ”کیا تم حکومت کے خلاف ہو؟“ اس سوال کا جواب ظاہر ہی تھا۔ کوئی اگر حکومت کے خلاف بھی ہوتا تو کس طرح اقرار کر لیتا۔ پتچا میں نے ایک ایک کر کے سب کو رہا کر دیا اور اپنے ماتحتوں سے کہا کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں ہے۔ سپاہی بھی میری نظر میں تھے جنہوں نے مسلمانوں کے گھر لوٹے تھے۔ وہ بھی میرے حکم پر حاضر ہو گئے۔ ان کی تعداد خاصی تھی، سو سے اوپر ہوں گے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں کو کس لئے یہاں لایا گیا تھا؟

”گھروں کی تلاشی اور باغیوں کی گرفتاری کے لئے جناب!“ ایک بارلش سپاہی نے جواب دیا جو مجھے مسلمان معلوم ہوا۔

”نام کیا ہے تیرا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”صغیر جناب!“ جواب ملا۔

”تو مسلمان ہے تو! تجھے شرم نہیں آئی مسلمانوں ہی کے گھر لوٹتے ہوئے؟“ میں نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر گریبان پکڑ کر آگے گھسٹ لیا۔ لکڑی کا ایک رول میرے ہاتھ میں تھا، اس سے میں لٹیرے سپاہی کو ”نچانا“ شروع کر دیا۔ پھر دوسروں کی باری آئی۔ انہیں میرے حکم پر دوسرے سپاہیوں مارا تھا۔

سارا محلہ چوک میں جمع ہو کر لٹیرے سپاہیوں کی ”کٹائی“ کا ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً ان طرح کا تماشا انہوں نے پہلے نہیں دیکھا ہو گا۔

”حرامزادو! تم عوام کے جان و مال کے محافظ ہو کر لٹیرے۔“ میں نے پٹنے والوں کو مخاطب کیا۔

”رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر تم سب کو معطل کیا جاتا ہے۔ اتارو اپنی اپنی پٹیاں۔“

پھر میرے حکم کے مطابق ہی عمل کیا گیا۔ جو مسلمان جس گھر سے لوٹا گیا تھا، واپس کر دیا گیا۔ اس تمام کارروائی میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا اور میں نے واپس کا حکم دے دیا۔ پھر میں نے ایک ماتحت افسر سے کہا، تم چلو سپاہیوں کو لے کر میں آتا ہوں۔

پولیس چیف کی گردن پر نہ جانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا، سو میں نے اسے سزا دینا ضروری

سمجھا۔ میرے خیال میں اس ظالم کے لئے سزائے موت بھی کم تھی، مگر مجبوری تھی۔ اسے مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا اور پھر قتل کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ حکمرانوں کے ایوان اقتدار کی عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ کر میں اس کے جسم سے باہر آ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تو میں نے اس کی گردن مروڑ دی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر مر گیا۔

میرا جی چاہا کہ اس محل نما عمارت میں بھی گھس جاؤں اور دو چار کو ٹھنڈا کر دوں لیکن ممکنہ خطرے کے پیش نظر ایسا نہیں کیا اور جنگل کی طرف لوٹ گیا۔

جن مسلح نوجوانوں کو جنگل کے ابتدائی حصے میں پہرے پر مقرر کیا گیا تھا، انہوں نے شاہنواز خاں کو دوسرے دن صبح ہی صبح ایک سنسنی خیز اطلاع دی۔ سپاہیوں نے جنگل کو گھیرے میں لے لیا تھا اور اب مختلف راستوں سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ریاست کا دیوان بے پال سنگھ اپنی ٹکرائی میں یہ کارروائی کر رہا تھا۔

”میں شاہنواز خاں کے قریب ہی تھا اور یہ بات شاہنواز خاں کو بھی معلوم تھی۔ اس نے مجھے طلب کیا۔“ بولو کیا کہتے ہو اب؟ تم سن رہے ہو میری آواز؟“ اسے ابھی ابھی سوتے سے جگایا گیا تھا اس لئے آواز بھاری سی تھی۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ جنگل کے اندر گھسنے کے جو بھی راستے ہیں، ان پر پہلے ہی مسلح نوجوان مقرر ہیں۔ ان سے کھلو دو کہ وہ درختوں پر چڑھ کر سپاہیوں کو بھوننا شروع کر دیں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں اتنے میں اس بوڑھے دیوان کی خبر لیتا ہوں۔ جنگل پر چڑھائی کرنے کی تجویز ای حرامزادے کی تھی۔“

رات کو میں نے جس طرح بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالا تھا اور پھر بعد میں پولیس چیف کو ٹھکانے لگا دیا تھا، شاہنواز خاں کو بتا دیا تھا۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اب تم شاید اس ظالم دیوان کو بھی زندہ نہیں چھوڑو گے۔ میرا اندازہ ٹھیک ہے نا؟“

دیوان بے پال سنگھ مجھے چند بڑے افسران کے ساتھ جنگل سے باہر نظر آیا۔ اس کے ساتھ نظر آنے والے وہی لوگ تھے جنہیں میں نے کالی چرن کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ ایسے ہی ظالم و جابر حکام کسی حکومت کے لئے ریزہ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ انہی کے بل پر حکمرانی کی جاتی ہے اور عوام پر حکومت ارمب قائم کیا جاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ اگر دشمن کی ریزہ کی ہڈی توڑ دی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ سو میں نے دیوان کے نائب کھڑے ہوئے ایک افسر کے جسم پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ہوسلٹر میں مجھے بھرا ہوا ریوالتور نظر آ گیا۔ افسر سے ریوالتور نکال کر میں نے بڑے اطمینان سے دیوان کے سر کا نشانہ لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی پیشانی کے پتھوں بچ سوراخ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے فوری طور پر اس افسر کا جسم چھوڑ دیا۔ یہ میرے حق میں بہتری ہوا۔ ادھر میں نے اس افسر کا جسم چھوڑا، ادھر ایک اور افسر نے اس کے ٹمبلر گولی اتار دی۔

پہلا فاز ہوتے ہی جنگل کی طرف سے دھماکے سنائی دینے لگے تھے۔ مقتول دیوان نے شاید پہلے کو بھی حکم دیا ہو گا کہ پہلے فاز کی آواز سننے ہی فازنگ شروع کر دیں۔

دیوان بے پال سنگھ اور ایک افسر کی موت کے بعد اب وہاں صرف آٹھ افراد باقی رہ گئے تھے۔ نے پھر ایک افسر کو یہ غمال بنا لیا۔ اس وقت قریب کھڑے ہوئے ایک افسر نے مجھے مخاطب کیا۔ ”طور پر راجا صاحب کو دیوان جی کے قتل کی اطلاع بھجوانا چاہئے۔ معلوم نہیں اچانک شیکھر کو کیا ہوا کہ نے دیوان جی کو گولی مار دی۔“

”شیکھر یقیناً باغیوں سے مل گیا ہو گا ورنہ وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں شاید یہ کر حیرت ہو گی کہ ہمارے درمیان اب بھی دواپسے افسران موجود ہیں جو مسلمانوں کے آلہ کار بنے ہیں۔ انہیں اس سے بڑے عہدوں اور دولت کا لالچ دیا گیا ہے۔“

توقع کے مطابق وہ بھی بیک زبان پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کون ہیں۔ ”ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے ریوالور نکال لیا اور پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے دوا کو بھون دیا۔ ”یہ تھے وہ غدار۔“

چند لمحوں کے بعد بھی خاموش رہے، پھر ان میں سے ایک بولا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟ تمہارے پار ثبوت ہے کہ یہ دونوں غدار تھے؟“

”ثبوت چاہئے۔“ میں نے ریوالور سیدھا کیا اور ثبوت طلب کرنے والے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“ ایک افسر چیخ اٹھا۔

پھر اسی لمحے میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک افسر نے اپنے ریوالور کی ٹال میری کمر سے لگا دیا۔ سخت لہجے میں بولا۔ ”ریوالور پھینک دو۔“

ریوالور پھینکتے ہی میں اس افسر کے جسم سے باہر آ گیا۔ اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ زمین گیا۔ میں نے دانستہ اس کے جسم سے نکلنے ہوئے زوردار جھٹکا لگایا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے دل؛ ایسی ضرب لگائی تھی کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

آس پاس ہی چھ لاشیں پڑی تھیں۔ اب وہاں صرف چار افراد زندہ تھے۔ معلوم نہیں ان میں ایک کو کیا سوچا کہ وہ پلٹ کر ہستی کی طرف بھاگنے لگا۔

”ارے ارے“ اسے کیا ہوا؟ ”کوئی حیرت سے بولا۔

”شاید قتل و غارت گری دیکھ کر دہشت کھا گیا ہے۔“ دوسرے نے تبصرہ کیا۔

میں نے لپک کر بھاگنے والے کی ٹانگ پکڑ لی اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر اس کی ٹانگ کر میں نے اسے فضا میں کئی چکر دیئے اور پختہ زمین پر دے مارا۔ زمین سے ٹکرا کر اس کا سر ٹکڑ ٹکڑ ہو گیا اور مغز نکل کر ایک طرف جا پڑا۔

بقیہ تین افسران کے لئے یہ منظر اتنا ہولناک اور خوفزدہ کر دینے والا تھا کہ ان کے چروں پر ہوا اڑنے لگیں۔

”یہ..... یہ کوئی آن دیکھی پڑ..... پراسرار طاقت ہے جو..... جو ہمیں ایک ایک کر کے قتل.....“ اس کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اسے دبوچ لیا تھا۔

اس کے جسم کی ہڈیاں میری گرفت میں آ کر کڑکڑائیں اور پھر وہ بھی سدھا گیا۔ یہ دیکھ کر ایک شخص ہوش دھواں کھو بیٹھا اور دوسرا ”بچاؤ، بچاؤ۔“ چیخنے لگا۔ موت کی گرفت سے بھی کوئی بچا ہے جو وہ بچ جاتا۔ جو بے ہوش تھا اس کی بے ہوشی کو بھی میں نے پیشگی میں بدل دیا۔

جنگل کے اندر سے شدید فازنگ کی آوازیں آرہی تھیں، سو میں ادھر متوجہ ہو گیا۔ سپاہیوں کے ایک دستے کو میں نے ایک پگڈنڈی پر آگے بڑھتے دیکھا تو اپنے منہ سے دہشت ناک آواز نکالی اور پھر قریبی درختوں کو زور زور سے ہلانے لگا۔

”بب..... بھوت۔“ کوئی سپاہی خوفزدہ ہو کر چخا۔

اتنا کافی تھا۔ سپاہیوں کا وہ دست واپسی کے لئے بھاگ اٹھا۔ اسی وقت میں نے ایک خوفناک شیر کا قالب اختیار کر لیا اور جنگل میں زقدیں بھرنے لگا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ جنگل میں شیر کی دھائیں سن کر سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ دو چار کو میں نے چبڑ پھاڑ ڈالا۔

”شیر..... شیر..... بھاگو، بھاگو۔“ کے شور سے جنگل گونج اٹھا۔

درختوں پر مسلح نوجوان موجود تھے۔ انہوں نے بھاگتے سپاہیوں پر جنم کے دہانے کھول دیئے۔ مقتول دیوان بے پال سنگھ نے شاید اس حملے میں سپاہیوں کی پوری نفری جھونک دی تھی۔ ان میں سے شاید آدھے سپاہی جنگل سے جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی پسائی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ انہیں کمان کرنے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ انہیں تو میں نے پہلے ہی ہلے میں صاف کر دیا تھا۔

فازنگ رک گئی اور جنگل میں سناٹا پھیل گیا تو میں نے شیر کا قالب ترک کر دیا اور شاہنواز خاں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ خود بھی بندوق سنہالے ایک پیڑ پر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ ”کب تک اسی طرح بندر بنے شاخ پر لٹکے رہو گے، چلو نیچے اترو۔“

”دشمن اگر پھر پلٹ کر حملہ آور ہو گیا تو؟“

”اب ایسا نہیں ہو گا برخوردار! کیونکہ پلٹ کے حملہ کرنے کا حکم دینے والوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔“ پھر میں نے اسے مختصر مقتول حکام کے بارے میں بتا دیا۔

”یہ تو تم نے کمال کر دیا۔“ وہ مرعوب ہو کر بولا۔

”اصل کمال تو اس شیر کا تھا جس نے دھائیں مار مار کر سپاہیوں کے پتے پانی کر دیئے اور وہ بھاگ اٹھے۔“

”ویسے یہ بات ہمارے لئے بھی بہت خطرناک ہے۔ پہلے تو اس جنگل میں ایک بھی شیر نہیں تھا۔“ شاہنواز خاں نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

”وہ تو خیر اب بھی نہیں ہے۔“ میں نے سکون آواز میں بولا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم! میں نے خود اسے ایک سپاہی پر زقد بھرتے اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا

ہے۔“

”گناہگار آنکھوں سے دیکھنے والوں کو اکثر کچھ کا کچھ نظر آتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں پیارے نواب!“ پھر اسے میں نے حقیقت سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”تو..... تو وہ تم..... تم تھے۔“ شاہنواز خاں ہلکا ہوا۔

”یقین نہیں آ رہا تو لو یہ دیکھو۔“ میں نے یہ کہتے ہی شیر کا قالب اختیار کیا اور پیڑ سے چھلانگ لگا دی۔

”بب..... بس..... بس۔“ شاہنواز خاں کی ڈری ڈری سی آواز آئی اور میں نے شیر کا قالب چھوڑ دیا۔

اس روز پولیس سے مقابلے میں چھ نوجوان مارے گئے اور اٹھارہ زخمی ہوئے۔ دشمنوں کے جانی نقصان کے مقابلے میں یہ تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مرنے والے نوجوانوں کو جنگل ہی میں ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔ سپاہیوں کی لاشیں گئی گئیں تو ان کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اس خیال سے کہ جنگل میں لاشوں کے سڑنے سے بدبو نہ پھیلے، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس طرح ایک تیرے دو شکار ہو جاتے۔

پھر اس بستی والوں نے شاید اپنی زندگی کا سب سے حیران کن منظر دیکھا۔ ”ایوان اقتدار“ پر آسمان سے گویا لاشوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ساری بستی میں سنسنی پھیل گئی۔ میں نے رد عمل کے طور پر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ حکمرانوں پر خدائی قبر ٹوٹ رہا ہے۔ بستی والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لاشیں صرف ظالموں کی تھیں۔ گزشتہ روز سے اب تک اس ریاست کے ستون ہل کر رہ گئے تھے۔ لہذا کو مجھ سے دشمنی بہت مہنگی پڑی تھی۔ مسلمان اب کھل کر باغی نوجوانوں کی حمایت میں بول رہے تھے۔ بے در پے جو واقعات رونما ہوئے تھے، ان سے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ نیچے والوں نے اپنی کارگزاری ظاہر کرنے کے لئے جس ممکنہ فرضی بغاوت کے قصے ”ایوان اقتدار“ میں سنائے تھے، وہ اب حقیقت بنتی جا رہی تھی۔ میں نے لوگوں کے جوش و دلولے کو مزید بڑھانے کی خاطر بستی میں یہ بات پھیلا دی کہ ریاست کا اصل حکمران شاہنواز خان زندہ ہے اور وہی باغی نوجوانوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اس کے لئے مجھے کئی قالب بدلنا پڑے۔ اس دور میں شخصیت پرستی عام تھی، سو عوام شاہنواز خاں کے گمن گانے لگے۔ اس دن شام تک یہ حالت ہو گئی کہ وردی پوشوں کے لئے مسلمان محلوں سے گزرنا دو بھر ہو گیا۔ میں نے شاہنواز خاں کو یہ سب کچھ بتایا تو اس کا سینہ فخر سے اتنا چڑھ گیا کہ مزید چوڑنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے عوام مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔“ فرط جذبات سے اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”غلط فہمی ہے تمہیں برخودار! لوگ تم سے نہیں اقتدار سے محبت کرتے ہیں۔ ریاست میں اکثریت کیونکہ مسلمانوں کی ہے اور اتفاق سے تم بھی میری طرح نام کے مسلمان ہو اس لئے تمہارا برسر اقتدار آنا اکثریت کے حق میں ہے۔“ میں نے صاف بات کہہ دی۔

”کبھی کبھی تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگتے ہو۔“

”کبھی کبھی نہیں بلکہ ہمیشہ میں اتنی ہی تلخ باتیں کرتا ہوں۔ مجھے تم سے نہ کوئی جاگیر اپنے نام لکھوانی ہے، نہ کسی عہدے کی طلب ہے۔ پھر جھوٹ کیوں بولوں۔“

”میرے اندازے کے مطابق حالات اب ایسا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں کہ چند ہی روز میں مشعل عوام کو بھی پر حملہ کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو..... تو پھر وہ..... عوام اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے جسے کالی چرن کی بیٹی سمجھتے ہیں اور..... تمہیں تو یہ..... یہ معلوم ہی ہے کہ وہ..... وہ دراصل میرا خون ہے۔“

”گند خون کو تو زیادہ مناسب ہے۔“ میں بولا۔ ”وہ بھی اپنی ماں کی روش پر چل رہی ہے۔“ ”کیا مطلب؟“ بوڑھے شاہنواز خاں کی تیوریوں پر ہل پڑ گئے۔ بیٹی چاہے ناجائز ہی سہی مگر بوڑھا یہ کڑوا چ برداشت نہ کر سکا۔

”ابھی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کیا؟“ میں نے کہا۔ ”جس طرح اس کی ماں تمہاری داشتہ بنی ہوئی تھی اسی طرح وہ گرد و شوائتہ کی داشتہ ہے۔“

”نہیں۔“ بوڑھا شاہنواز خاں تقریباً چیخ اٹھا۔ ”میرا خون ایسا نہیں ہو سکتا۔“

غیبت تھا کہ کوئی اس وقت ہم دونوں کے آس پاس نہیں تھا اور ہم نوجوانوں سے خاصی دور آ کر بیٹھے تھے ورنہ شاہنواز خان کو چیخنے دیکھ کر کوئی نہ کوئی تفتیش حال کو آگیا ہوتا۔

”تمہارا خون ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا تم آسمان سے اترے ہو؟“ میں نے گلی لپٹی نہ رکھی۔

خاندانی شرافت و نجابت بھی کچھ ہوتی ہے۔ ”بوڑھا شکست خوردہ سے لہجے میں کہنے لگا۔

”اور تمہارا خیال یہ ہے شاید کہ شرافت و نجابت صرف امیروں کے حصے میں آئی ہے۔ دوسرے کی بیوی کو داشتہ بنا کر تم نے کون سی خاندانی شرافت کا ثبوت دیا تھا۔ اب اگر تمہاری ناجائز بیٹی کسی کی داشتہ بنی ہوئی ہے تو ہلکا رہے ہو..... اور سنو شاہنواز خاں! جس کا غم تمہیں کھائے جا رہا ہے، اسے مارنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ اس سے تو میں بھی ڈرتا ہوں۔“

”کیا..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ شاہنواز خاں مجسم حیرت بن گیا۔ کوئی جن زاد بھی کسی سے ڈر سکتا ہے، یہ شاید اس کے لئے نئی بات تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میرے نواب! تمہاری بیٹا رانی لٹا اتنی ہی خطرناک ہے۔ گرد و شوائتہ کی وہ داشتہ بھی ہے اور چیلی بھی۔ گرد نے اسے ایسے ایسے شیطانی عمل سکھار رکھے ہیں کہ کوئی آدم زاد تو کیا جن زاد بھی اس کی مرضی کے خلاف اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ دو مرتبہ تو وہ مجھے ہی دوڑا چلی ہے۔ ایک اور بات سن لو، اس کے بارے میں کہ تمہارا گند خون ہونے کے باوجود مسلمانوں کی وہ بھی بچی دشمن ہے۔ اگر تمہاری کو بھی یا اس محل نما عمارت میں لٹا نہ ہوتی تو اب تک میں تمہیں تخت حکومت پر بٹھا چکا ہوتا۔ گرد کو تو میں نے قابو میں کر ہی لیا تھا۔ یہ ساری باتیں میں نے تمہیں اس لئے بتائی ہیں کہ اس کی محبت میں تمہارا کلیجہ آئندہ نہ پھٹے۔“

ہیں یہ لمحات راحت اس وقت ختم ہو گئے جب اس نے مجھے گرو کے قریب ہی مسہری پر لٹا دیا۔ میرے نام حواس پوری طرح بیدار تھے، صرف اتنا تھا کہ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر ہو چکا تھا۔ لٹتا ہے یقیناً مجھے تلاش کرنے کے بعد سوتے ہی میں کسی شیطانی عمل کے ذریعے باندھ دیا تھا۔ پر جب وہ مجھے اٹھا کر میاں لاری تھی تو میری آنکھ کھل گئی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ میرے دشمن مجھ پر قابو پانے کے باوجود محبت سے پیش آرہے تھے اور ایسا بلا سبب ممکن نہیں تھا۔ گرو نے مجھے اسی رضی نام سے مخاطب کیا تھا جو قید کے دوران میں لٹتا کو میں نے بتایا تھا، یہ بات بہر حال میرے لئے تسلی بخش تھی۔

گرو مسہری سے اٹھ کر قریب ہی پڑی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور لٹتا میرے پاس آگئی۔ ”ہم تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں عبدالغفور!“ گرو نے بات شروع کی۔ ”اب تک ہمارے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی، اسے بھول جاؤ۔ مجھے اس پر کوئی غصہ نہیں کہ تم نے میرے جسم کو اپنا لیا۔ فائدہ میں سچے دل سے تمہارا یہ قصور معاف کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ تم نے جو نقصانات ہمیں پہنچائے ہیں وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔ جب دشمنی دوستی میں بدل رہی ہے تو پھر گلے شکوے بھلے نہیں لگتے۔ لٹتا جس طرح تمہیں ڈھونڈ کر میاں لے آئی ہے، شاہنواز خان بھی میاں پہنچ چکا ہے جسے تم نے تہ خانے سے فرار کرا دیا تھا۔“

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا، مگر میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بات کہہ ہی دی۔ ”گرو جی! ہزارا زمانہ آگیا ہے کہ ایک بیٹی اپنے باپ کی دشمن ہو گئی ہے۔ لٹتا بے چاری کو تو خیر کچھ خبر نہیں، مگر تم آج بھی طرح جانتے ہو کہ شاہنواز خاں، لٹتا کا باپ ہے۔“

میری بات سن کر گرو جی اور لٹتا دونوں ہی چونک اٹھے۔ لٹتا تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور مجھ سے بولی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو عبدالغفور؟“

”دی جوج ہے، تم شاہنواز خاں ہی کی بیٹی ہو۔“ پھر اس سے پہلے کہ گرو وشواتا تھ درمیان میں کہہ لیتا، لٹتا کو میں نے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

لٹتا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان میں حیرت بھی شامل تھی اور غصہ بھی، اظہار افسوس بھی تھا، نفرت بھی۔

”یہ تو بہت بڑا ہوا کہ اپنا ہی خون اپنا دشمن ہو گیا۔“ شاہنواز خاں دکھ بھری آواز میں بولا۔ ”مہل کسی طرح اسے حقیقت کا علم ہو جائے۔“

”خام خیالی ہے تمہاری۔ حقیقت جان لینے کے بعد بھی وہ تمہی کو ظالم سمجھے گی اور اپنی ماں کو مظلوم۔ اسے تم مبرہی کر لو پیارے!“ میں نے اسے سمجھایا۔

دشمن کے خلاف میں نے جو اقدامات کئے تھے، میرے دل میں ان کا رد عمل جاننے کی بڑی جھڑپ تھی۔ پھر بھی میں نے عمل نما عمارت میں داخل ہونے سے گریز کیا۔ اس رات کو میں لٹتا کا تصور کئے سو گیا اور حیرت اس پر ہوئی کہ آنکھ کھلتے ہی مجھے اس کا حسین چہرہ نظر آیا۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے شاید اس کے حسن نے مبہوت کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ لٹتا کو میں نے ریشمی لباس میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی جیسے ریشم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔

اس نے مجھے اپنی بانسوں میں سمیٹ لیا اور پھر فضا میں بلند ہونے لگی۔

”لٹتا! یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”اپنے من مندر میں رہا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تو کیا تم اپنا من مندر کہیں اور بھول آئی ہو جو مجھے وہاں لے جا رہی ہو؟“

وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تم سے دشمنی مول لے کر ہم نے اچھا نہیں کیا۔ گرو جی کو بھی اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے۔ مجھے بھی اب یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ پھر یہ کہ ایک بار تو تم گرو جی کے روپ میں میرے اتنے قریب آ چکے ہو کہ گرو جی کے سوا کوئی میرے اتنا قریب نہیں آ سکا۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ آئندہ کے لئے بھی اب کوئی پردہ نہ رہے۔“

”تمہارے گرو جی اس پر راضی ہو جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”انہی کی مرضی سے تو میں تمہیں تلاش کر کے ان کے پاس لے جا رہی ہوں۔“

”میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آ رہی کہ ایک پیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔“

”سمجھ جاؤ گے۔ گرو جی تو اس پر راضی ہیں، تم ان کے پاس چل ہی رہے ہو، خود بات کر لینا۔ دراصل غلطی ہماری ہی ہے۔ تم نے تو کہہ ہی دیا تھا پہلے کہ ہم جو کچھ کہیں گے تمہیں اس پر عمل کرنے میں اعتراض نہیں ہو گا۔ مجھے تمہاری یہ پیشکش مان لینا چاہئے تھی۔“

پھر وہ مجھے اپنی آغوش میں سینے ہوئے عمل نما عمارت کے اس حصے میں اتر گئی جو گرو وشواتا تھ کے لئے مخصوص تھا۔ گرو کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لٹتا مجھے گود میں اٹھائے اندر پہنچ گئی۔ وہاں مسہری پر گرو نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے سے اب بھی نقاہت جھلک رہی تھی۔ لٹتا پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ عبدالغفور! آخر لٹتا نے تمہیں تلاش کر ہی لیا۔ معلوم نہیں، تم نے ایک ہی احوالے میں اس پر کیا جادو کر دیا ہے کہ اب ہر دم یہ تمہارے ہی گمن گاتی رہتی ہے۔“

لٹتا کی آغوش میں مجھے ایسی راحت محسوس ہو رہی تھی جو ناقابل بیان ہے۔ میں جیسے کھلا جا رہا تھا

”لیکن گرو جی! مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی گئی؟“ لتا کی آواز میں احتجاج تھا۔

”کچھ باتوں کا چھپا لینا ہی اچھا ہوتا ہے لتا!“ گرو نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، صرف دولت و اقتدار ہی تو سب کچھ نہیں گرو جی! آپ ہی بتاؤ رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ گرو اب بھی پُرسکون ہی رہا۔ ”کیا تمہاری ماما جی نے رشتہ نہیں نبھایا؟ تمہارا کاساتھ نہیں دیا؟“

”اب تو آپ اس شخص کو میرا پتا نہ کو گرو جی کہ جس نے دولت و اقتدار کی خاطر میری ماں جان بوجھ کر ایک اور مرد کے حوالے کر دیا۔ میں تو اب اسے اپنا پتا مانتی ہوں کہ جو صرف میری ماں محبت کے خرباب میں آکر اقتدار سے محروم ہو گیا، وہ کہ جس نے جیون بھر کبھی پتا جی نہیں کماوا گرو جی کہ جس نے ایک عمر قید میں بیٹا دی۔“

”لتا! تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمہاری ماں ایک ہندو ناری تھی اور اسی ناسے تم بھی ہندو ہو۔“

”نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں صرف انسان ہوں۔ میرا دین دھرم انسانیت ہے۔“

”انسانیت دھرم سے بڑی نہیں ہوتی بلکہ دھرم ہی کسی منٹ کو انسان بناتا ہے۔“ گرو جھٹک کر

لگا، انداز اب بھی سمجھانے والا تھا۔

”اگر دھرم ہی آدمی کو انسان بناتا ہے تو پھر آپ مجھے یہ بتاؤ گرو جی کہ دنیا کا کون سا دھرم نر

سکھاتا ہے؟ دوسرے دھرم والوں کو مار ڈالنے کے لئے کتا ہے؟ دوسروں سے جینے کا حق چھین لینا کیا؟

ہے؟ اگر دھرم یہی ہے تو پھر میں آدھرم (لاذہب) ہوں۔ ویسے بھی میں دو دھرموں کے ملاپ کا

ہوں۔ میری ماں ہندو تھی اور باپ مسلمان، تو پھر میں کون ہوئی؟ ہندو کہ مسلمان؟“ توقع کے برعکس

بھڑک اٹھی تھی حالانکہ میں نے شاہنواز خاں سے اس کے بارے میں کچھ اور ہی کہا تھا۔

”تم ہندو ہو کہ ہندو گھرانہ ہی تمہاری پہچان ہے۔ پھر یہ تو سوچو لتا کہ سب کچھ تمہارا ہی تو

کالی چرن جی کے بعد تمہی کو تو اس ریاست پر حکمرانی کرنی ہے۔“

”نہیں کرنی مجھے حکمرانی! جہاں رشتے ہی جھوٹے ہوں، کسی پر بھروسہ ہی نہ کیا جاسکے، جہاں

کھلائے جانے والا پتا نہ ہو، وہاں مستقبل کے خواب کیا دیکھنا۔“

”کیا تمہیں جذبات کی رو میں بہہ کر میرا دھیان بھی نہیں رہا؟ مجھ سے بھی تو تمہارا ایک

ہے۔“

”گرو جی! آپ بھی کالی چرن سے کم نہیں ہو۔ آپ بھی تو مجھے اپنا آپ کسی اور کو سوپ دینے

لے کہہ رہے ہو۔ کیا کوئی پری اپنی پریکا (محبوبہ) کو جانتے بوجھتے اور اپنی خوشی سے کسی اور کے

سکتا ہے؟ تو پھر یہ کیسا بندھن ہے، کیسا رشتہ ہے یہ؟ آپ جھوٹ بولتے ہو گرو جی کہ آپ کو مجھ سے

ہے۔ آپ کو اگر کسی سے پریم ہے گرو جی تو وہ اقتدار ہے، دولت ہے۔ آپ مجھے نہیں، اس ریاست

اپنا چاہتے ہو گرو جی!“

آخر کار گرو کی قوت برداشت جواب دے ہی گئی اور وہ بلند آواز میں بولا۔ ”بس کر لتا! بہت ہو گیا۔

اب اگر تو نے زبان کھولی تو تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو مرنے کی دعائیں

کرے گی اور تجھے موت نہیں آئے گی۔ تجھ سے میں نے جو کہا ہے، اس پر عمل کر۔ اس منٹے کی آتما کو

گنداکر دے تاکہ میں چاب شروع کروں اور اسے اپنا غلام بنا لوں۔ خلاف ورزی کی تو پچھتائے گی۔“

اسی لمحے میں نے یوں محسوس کیا کہ لتا نے میرے جسم پر ہاتھ بھیرا ہو۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ

لگی کہ میری بندش ختم ہو چکی ہے۔ اسی کے ساتھ میں لتا کا مقصد بھی سمجھ گیا۔ گرو میری طرف سے

مطمئن تھا کہ میں مسمری پر بندھا ہوا ہوں۔ پہلے بھی میں اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا چکا تھا، سو اس مرتبہ

بھی اسے اچانک دبوچ لیا۔ اس کے بدبودار اندھے جسم پر قبضہ کرنا میری مجبوری تھی ورنہ ہرگز اس کے

لے آتا نہ ہوتا۔

جس اور گھٹن کے ابتدائی چند لمحات مجھ پر بہت گراں گزرے جو مجھے مجبوراً برداشت کرنا پڑے۔

”عبدالغفور!“ لتا نے مجھے میرے فرضی نام سے پکارا۔ ”میں تمہاری آجھاری (احسان مند) ہوں کہ

تمہاری وجہ سے آج مجھے اپنی اصلیت کا پتا چل گیا۔ اسی کے ساتھ ایک شیطان کے چرے سے عقیدت،

محبت اور شرافت کی نقاب بھی اتر گئی۔ جب میں نے تمہاری بندش کھولی تو مجھے یقین تھا کہ تم اسے قابو

میں کر لو گے، پہلے کی طرح اور تم میری توقع پر پورے اترے۔“

”لتا! اس خوشی کے موقع پر کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گی کہ بول اے عبدالغفور کیا مانگتا ہے۔

تیری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔“ میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے حسین چہرے پر حیا کی سرخی پھیلتے دیکھی اور اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں

اتھا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”نہیں عبدالغفور!“ وہ جھل کر میری آغوش سے نکل گئی، پھر کہنے لگی۔ ”مجھے اب اس جسم سے

نفرت ہو گئی ہے۔ پہلے اسے ختم کرنا ہے۔“ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”ہوں۔“ میں سوچنے لگا کہ گرو کو کس طرح قتل کیا جائے؟

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کتا لتا بول اٹھی۔ ”تم جب پہلے اس کا جسم چھوڑ کر بھاگے تھے تو

شدید جھکا گئے سے چند لمحوں کو یہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس بار بھی یقیناً ایسا ہی ہو گا اور شاید یہ چند

لمحے اسے ٹھکانے لگانے کے لئے کافی ہوں گے۔ اگر اسے ہوش آگیا تو پھر اس پر قابو پانا ناممکن ہے۔“

میں نے لتا کی تجویز سے اتفاق کیا اور گرو کے جسم سے نکلے ہوئے اس کے دل کو بھی نشانہ بنایا۔

توقع کے مطابق وہ منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں تیزی سے جھکا اور اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے

درمیان سے چر دیا۔ لتا کو شاید مجھ سے اتنی برق رفتاری کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنے ریشمی لہاڑے

سے جو خنجر نکالا تھا، وہ بے مصرف ہی رہا۔

”عبدالغفور! ابھی ہمیں ایک اور پالی کو قتل کرنا ہے۔“ لتا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اسی کے بعد میں

تمہاری آتما کی شافی کے لئے وہ سوال کروں گی کہ بولو کیا مانگتے ہو۔“

”اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو میں تمہاری خاطر ایک نہیں دس قتل اور کر سکتا ہوں۔“ میں بولا۔
”نہیں! اسے میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر اپنے ریشتی لبائے
میں چھپالیا، پھر کہنے لگی۔ ”تم صرف تماشا دیکھو گے کہ میں اسے کس طرح مارتی ہوں۔“
”وہ شخص یقیناً تمہارا جعلی پتا جی کالی چرن ہے جسے تم موت کی نیند سلاتا چاہتی ہو۔“ میں نے جو
اندازہ لگایا تھا، کہہ دیا۔

”تم ٹھیک ہی سمجھے لیکن اعتراف گناہ کے بعد ہی میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ اس کی گردن پر
اتنے بے گناہ انسانوں کا خون ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“
”ایک وہی کیا، اقتدار کی ہوس میں جلا بہت سے حکمرانوں کی گردنوں پر ہزاروں لاکھوں انسانوں کا
خون ہوتا ہے۔ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے وہ درندے بن جاتے ہیں۔“
اس کے بعد لیتا مجھے محل نما عمارت کے ایک ایسے حصے میں لے آئی جہاں جگہ جگہ چوکناسلحہ محافظ
موجود تھے۔ لیتا لاکھوں نے نہیں روکا اور مجھے روکنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں کسی آدم زاد کے جسم
میں ہوتا تو شاید وہ روکتے بھی۔ جو میرا راستہ روک سکتی، وہ خود میرے ساتھ تھی۔
کالی چرن کی خواب گاہ کے دروازوں پر بھی دو تندرست و توانا مسلح محافظ موجود تھے اور دروازہ اندر
سے بند تھا۔

”تم لوگ جاؤ۔“ لیتا نے ان محافظوں کو حکم دیا۔
”لیکن راجا صاحب کا حکم ہے کہ ہم کسی بھی حالت میں یہاں سے نہ ہٹیں۔“ ایک محافظ نے
اعتراض کیا۔

”لیتا کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔“ میں تمہیں حکم دے رہی ہوں۔“
”ہم اس معاملے میں راجا صاحب کا حکم ماننے کے سوا کسی کا حکم بھی ماننے کے پابند نہیں۔“ دوسرا
محافظ بھی بول اٹھا۔

اس طویل راہداری میں ان دونوں کے سوا کوئی اور محافظ نہیں تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان
دونوں محافظوں کو راستے سے ہٹا دیتا، لیتا نے کچھ پڑھ کر باری باری ان دونوں پر پھونک دیا۔ وہ دونوں ہی
بے جان مجسموں کی طرح اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ پھر لیتا نے خواب گاہ کے دروازے پر کئی مرتبہ دستک
دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔

”نہمرد!“ میں نے کہا۔ ”وہ شاید پی پلا کر خوب گہری نیند سو رہا ہے۔ میں اندر جا کے تمہارے لئے
دردازہ کھول دیتا ہوں۔“

کسی جن زاد کے لئے بند دروازوں یا دیواروں سے گزرتا کوئی مشکل کام نہیں۔ سو میں نے جو کہا
تھا، دوسرے ہی لمحے کر دکھایا۔ خواب گاہ میں دھیمی دھیمی روشنی والا ایک فانوس روشن تھا۔ بڑی سی
مسمری کے سرہانے ایک طرف میز پر ولایتی شراب کی بوتل اور خالی جام رکھا تھا۔ میرا قیاس درست نکلا۔
اس رات وہ شاید زیادہ ہی چڑھا کے سویا تھا۔ اس کی وجہ غالباً موجودہ حالات تھے جن سے کالی چرن سخت

پریشان ہو گا۔

لیتا نے خواب گاہ کا دروازہ پھر اندر سے بند کر لیا اور اس مسمری کی طرف بڑھی جس پر کالی چرن
بے سدھ پڑا تھا۔ کالی چرن خاصی دیر میں بار بار آوازیں دینے اور جھنجھوڑنے کے بعد جاگا۔
”تم یہاں؟“ اپنی آنکھیں ملٹے ہوئے کھلیں کے بل اٹھا۔ ”اس وقت تمہیں میری خواب گاہ میں
محافظوں نے کیسے..... آئے دیا؟ اور دروازہ کس نے کھولا؟“

”کیا تجھے نہیں معلوم کالی چرن کہ میں کون ہوں اور یہ کہ کوئی بھی مجھے کیس پہنچنے سے نہیں روک
سکتا۔“ لیتا سخت لمبے میں بولی۔
”تم..... تم اپنے پتا جی کا نام لے رہی ہو، اچان کر رہی ہو۔“ کالی چرن غصے میں اٹھ کر بیٹھ
گیا۔

”میرا پتا اگر تو ہی ہو، کالی چرن تو میں ہرگز تجھ سے ایسے لمبے میں بات نہ کرتی۔ میں تو شاہنواز
خاں کی بیٹی ہوں اور تجھے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔“
”تمہیں یقیناً کسی نے میری طرف سے ہکا دیا ہے لیتا!“ وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

اسی وقت میں نے کالی چرن کے ایک ہاتھ کو تکیے کے نیچے جاتے دیکھا اور جھٹ کر اس کی کلائی پکڑ
لی۔ پھر میں نے تکیہ ہٹا کر دیکھا تو وہاں ریوالور رکھا تھا۔ کالی چرن اسی ریوالور کو نکالنے والا تھا۔ اس نے
شاید بساط الٹ جانے کا اندازہ کر لیا تھا۔ ریوالور اٹھا کر میں نے کالی چرن کی کلائی چھوڑ دی اور وہاں سے
ہٹ گیا۔

”تو پوچھنا پتا جی اپنی پیاری بیٹی کو گولی مارنے والے تھے۔“ لیتا کی آواز میں کسی تیز نشتر کی سی
کاٹ تھی۔

”تنت..... تم غلط..... غلط سمجھ رہی ہو لیتا بیٹی!“ کالی چرن کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ ہٹکانے
لگا۔ ”ہرگز میرا یہ ارادہ نہیں تھا۔ میرا ہاتھ تو یوں ہی تکیے پر پڑ گیا تھا۔“

”کبواس بند کر کالی چرن!“ لیتا نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اور میں تجھ سے جو پوچھوں اس کا جواب
دے۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ تو نے میری ماں پر بد چلنی کا اصرار لگا کر اسے کیوں قتل کیا؟“
”وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔“ کالی چرن خوفزدہ نظروں سے اپنی طرف اٹھے ہوئے ریوالور کی
ٹال کو دیکھنے لگا جو میرے ہاتھ میں تھا۔

لیتا نے اپنے لبائے سے خنجر نکال لیا اور غرائی۔ ”سچ بک دے کالی چرن ورنہ میں اس خنجر سے
تیری کھال اتار دوں گی۔“

”مم..... میں سچ..... سچ کہہ رہا ہوں کہ..... کہ تیری ماں بد چلن تھی۔“
”تو اسے بد چلنی پر قتل نہیں کر سکتا۔ جھوٹ بول رہا ہے تو۔ بد چلنی پر تو اسے تو نے خود آمادہ کیا تھا
جس کی زندہ مثال تیرے سامنے کھڑی ہے۔ قتل کی وجہ یقیناً کوئی اور تھی۔“

پھر جب لیتا نے آگے بڑھ کر کالی چرن کے جسم پر خنجر سے کئی چرے کے لگائے تو وہ کھل ہی گیا۔ لیتا

کی ماں 'شاہنواز خاں کو رہا کر دینے پر مصر تھی۔ مسلسل بیمار رہنے کے سبب شاید رکنی کو یقین ہو گیا تھا کہ اب زندہ نہیں بچے گی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ شاہنواز خاں اسی سے محبت کی سزا بھگت رہا تھا۔ کالی چرن نے اسی لئے رکنی پر بد چلنی کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیا تھا کہ کہیں وہ کسی کے سامنے زبان نہ کھول دے۔

کالی چرن اپنے تمام تر گناہوں کا اعتراف کرنے کے بعد لٹتا سے زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔
"کچھ..... کچھ نہیں چاہئے۔" وہ گڑ گڑانے لگا۔ "نہ اقتدار، نہ دولت کچھ بھی نہیں۔ تم مجھے بس میراں سے زندہ نکل جانے دو۔"
"تو میری ماں کا قاتل ہے کالی چرن! تجھے میں کیسے زندہ چھوڑ سکتی ہوں۔" لٹتا تیزی سے اُٹے بڑھی اور خنجر سے کالی چرن کی توتے جیسی ناک اڑا دی۔
"بچاؤ..... بچاؤ۔" کالی چرن بڑی طرح چیختے لگا تو لٹتا نے کچھ پڑھا اور اس کی طرف پھوٹا ہ

دی۔

"اب تو تڑپے گا مگر چیخ نہیں سکے گا۔ میں نے تیری زبان پر تالا ڈال دیا ہے۔" لٹتا بولی اور پھر کال چرن کا دایاں ہاتھ پکڑ کر رکنی کے پاس سے کاٹ دیا۔
ممکن ہے کہ کالی چرن تکلیف و اذیت سے ہوش و حواس کھو بیٹھا مگر لٹتا نے ایسا بھی نہ ہونے دیا۔ آخر کار کالی چرن نے تڑپ تڑپ کر آرام دہ بستر پر جان دے دی۔ اس کے جسم کے کٹے ہوئے ٹکڑے مسہری پر بکھرے ہوئے تھے۔ بستر خون میں تر ہو گیا تھا۔ خون آلود خنجر لٹتا نے وہیں پھینک دیا اور پھر مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

اسی راہداری میں لٹتا کی خواب گاہ تھی۔ وہ مجھے وہاں لے آئی۔
کسی جن زاد کے لئے ضروری نہیں کہ کسی آدم زاد کے جسم میں داخل ہو کر ہی وہ آدم زاد نظر آئے۔ کسی آدم زاد کے جسم کو حاصل کئے بغیر بھی کوئی جن زاد 'انسانی قالب میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر لٹتا کو شدید حیرت ہوئی۔ میں نے ایک خوبصورت نوجوان کا قالب اپنا لیا تھا۔
"تم مجھے یوں تعجب سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" میں نے لٹتا کے قریب اس کی مسہری پر نیم دراز کر کہا۔

وہ میری طرف کروٹ لے کر بولی۔ "کسی بھکی ہوئی آتما کو شریر (جسم) ملتے ہوئے میں نے آج بلی بار ہی دیکھا ہے۔"

"میری طرف سے تم غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں کوئی بھکی ہوئی روح ہوں؟"

"پھر کون ہو تم؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"بنادو گا مگر پہلے مجھ سے یہ تو پوچھ لو کہ بول کیا مانگتا ہے؟"

جواباً وہ سراپا قیامت میرے پہلو میں سٹ گئی اور پھر میں نے ایک حسین و رنگین خواب کو شرمنا تعبیر ہوتے دیکھا۔ کاش اس وقت میں سچ سچ کسی آدم زاد کے جسم میں ہوتا تو یہ لمحات امر بن جاتے۔

خود فراموشی کے سارے لمحے گزر گئے تو میں نے لٹتا سے کہا۔ "مجھ سے شادی کرو گی؟"
"کیا..... یہ کس طرح ممکن ہے؟ کسی لڑکی نے کبھی کسی آتما سے بھی شادی کی ہے۔"
"ممکن ہے" اسی لئے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ میں کوئی آتما نہیں ایک جن زاد ہوں اور جن زادوں سے آدم زادوں کی شادی ہو سکتی ہے۔" پھر میں اسے جنات کے بارے میں بتانے لگا۔

لٹتا حیرت سے میری باتیں سنتی رہی۔ وہ جنات کے ذکر کو محض قصے کہانیاں سمجھتی رہتی تھی۔ جب اسے میری باتوں پر یقین آ گیا تو کہنے لگی۔ "اگر تم انسان بن کے رہنے پر آمادہ ہو جاؤ تو میں اپنا سارا جیون تمہیں سونپ دوں۔ گرد کے سوا مجھے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"مجھ سے شادی کرنے اور میری پیوی بننے کے لئے تمہیں مسلمان بننا پڑے گا۔"
"آدھی مسلمان تو میں اپنے باپ کی طرف سے ہوں ہی، بقیہ آدھی تمہاری خاطر بن جاؤں گی۔"
"دوبارہ خود پردگی کی حالت میں آگئی۔"

میں نے اس موقع کو بھی رائیگاں نہیں جانے دیا۔

میں نے جو انسانی قالب اختیار کیا تھا، اس میں صنف مخالف کے لئے بے پناہ کشش تھی۔ وہ جسم ایک دھوکا، ایک سراپا ہی سہی مگر لٹتا کو بہت پسند آیا۔ اس نے میرے پہلو سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
"عبدالغفور! اب تم اسی جسم میں رہنا، اسے چھوڑنا مت۔"

جھونک میں یا پھر جلد بازی کے سبب میں نے لٹتا کو بڑا غیر شاعرانہ سا نام بتا دیا تھا۔ جب وہ مجھے عبدالغفور کہتی تو یوں لگتا جیسے میرے چہرے پر خود بخود داڑھی اُگ آئی ہو۔ یہ نام کسی بزرگ یا عمر رسیدہ شخص کے لئے تو اچھا تھا مجھ جیسے جوان جہان رومینک جن زاد کے لئے نہیں۔ سو میں نے یہی سوچ کر اس سے کہا۔ "لٹتا بیاری! جنسی گرو دشواتھ کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا تاکہ وہ باپ کر کے مجھے اپنے قبضے میں نہ کر لے۔ اس کا ارادہ میں نے بھانپ لیا تھا۔ اب تمہارے اور میرے درمیان جب کوئی پردہ نہیں رہا اور ہم ایک دوسرے کا لباس بن چکے ہیں تو پھر تمہیں اپنا اصل نام بتا دینا ہائے۔ میرا نام عبدالغفور نہیں شرابا ہے۔" اپنا اصل نام مصلحت کے تحت میں اس وقت بھی چھپا گیا۔
"آدم زادوں پر اتنا زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔"

"میرے شرابا!" اس نے صدقے داری ہو کر میرے گلے میں بانیں ڈال دیں۔ "تمہاری ہی لٹتا تمہارا نام بھی بت خوبصورت ہے۔"

"اب تم بھی ہندوئی سے مسلمان بن جاؤ تو بہتر ہے۔" میں بولا۔

"اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟" اس نے دریافت کیا۔

"نما دھو کر پاک صاف ہو جاؤ تو بتا دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کے لئے بہت سیدھا سا رٹہ ہے۔"

خواب گاہ سے متصل غسل خانہ تھا۔ سو ہم دونوں ہی نما دھو کر پاک صاف ہو گئے۔ اب وہ اور زمین نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے کلہ پڑھایا اور مطلب بھی سمجھایا۔

”بس؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں مسلمان ہونے کے لئے زبان سے کلمہ طیبہ پڑھنا اور دل سے اس کا اقرار کرنا کافی ہے۔“

میں نے اسے بتایا۔

”اور نام؟“ اس نے سوال کیا۔

”عندلب رکھ لو کہ تم کسی بلبل ہی کی طرح تو چمکتی ہو۔“ میں نے اس کا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔

سو یوں وہ لتا سے عندلب ہو گئی۔

میں جب اسے مسلمان کرنے کے لئے کلمہ پڑھا رہا تھا تو عجب سا کون مجھے محسوس ہوا۔ میں نے

سوچا، چلو زندگی میں کوئی کام تو ثواب کا کیا، کیا خیرا سی پر میری بخشش ہو جائے۔

”تم نے شاہنواز خاں کو کہاں قید کیا ہے؟“ میں نے معلوم کیا۔

”وہیں مندر کے تہ خانے میں۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”ارے میں تو یہ بھول ہی گئی تھی

کہ پتا جی کو بھی آزاد کرنا ہے۔“

”اب تم انہیں پتا جی نہیں، ابا حضور کہا کرتا اس سے قطع نظر پہلے ان کاغذات کو حاصل

کرنا ہے، جن پر تہداری ماں نے شاہنواز خاں کے دستخط کرائے تھے۔“

”وہ کاغذات کالی چرن نے اپنی تجوری میں رکھے تھے۔ تجوری خواب گاہ میں ہے۔“ عندلب نے

بتایا۔

انسانی قالب ہو کہ کوئی اختیاری حیوانی قالب، جناتی صفات پر قرار رہتی ہیں۔ یہ جناتی صفات ان

صورت میں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی عارضی طور پر کہ جب کوئی جن زاد واقعی کسی آدم زاد کے جسم میں

اتر جائے۔ سو اس وقت میری تمام تر جناتی صفات پوری طرح فعال تھیں۔ میں نے صرف انسانی بینہ

اختیار کی تھی، واقعاً کسی آدم زاد کا جسم نہیں اپنایا تھا۔ بہت سے جنات اسی طرح آدم زادوں میں آ

زاد بن کر رہتے ہیں اور کوئی انہیں نہیں پہچان پاتا۔ کوئی عالم آدم زاد یا جن زاد ہی انہیں اس ہیئت میں

شناخت کر سکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے تجوری کی چابیاں تلاش کرنے میں وقت نہیں گنوا یا اور ایک

ہی جھٹکے میں تجوری کھول دی۔ بڑی سی تجوری میں ہیروں اور جواہر کے علاوہ خاصی دولت کالی چرن نے

جمع کر رکھی تھی۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ایک خانے سے مطلوبہ کاغذات نکال لئے۔

کاغذات پر انگریز حکومت کی طرف سے تصدیق کی خاطر مہر اور دستخط بھی تھے۔ اسی وقت میرے ذہن میں

یہ خیال آیا کہ کالی چرن کی لاش کا کیا کیا جائے؟ یہی معاملہ گرو وشواناتھ کی لاش کا تھا۔

اس پر میں اور عندلب گفتگو کرتے رہے اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔

کالی چرن کے بعد قانونی طور پر اس ریاست پر حکمرانی کا حق عندلب کا تھا۔ طے یہ پایا کہ عندلب

ریاست کی حکمران ہونے کی حیثیت سے اپنے حقوق سابق حکمران شاہنواز خاں کے نام کر دے۔ پھر

کاغذات پر انگریز حکومت سے تصدیقی مہر اور دستخط بھی لے لئے جائیں۔ کالی چرن اور گرو وشواناتھ

قتل کو نامعلوم باغیوں کے سر تھوپا جا سکتا تھا۔ کالی چرن کی خواب گاہ کے دروازے کو اسی طرح کھلا

دیا گیا، صرف کواڑ بھڑ دیئے گئے۔ دروازے کے باہر اب تک مسلح محافظ مجسموں کی طرح کھڑے تھے۔ چلتے

چلتے عندلب نے انہیں سحر سے آزاد کر دیا اور میرے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میری حیثیت اب گویا عندلب

کے ایک مہمان کی تھی جس کا تعلق ہندوستان کی ایک مسلمان ریاست سے تھا۔

جو کاغذات عندلب نے کالی چرن کی تجوری سے حاصل کئے تھے، انہیں بحفاظت اپنی خواب گاہ کی

ایک الماری میں رکھ آئی تھی۔ اب وہ مجھے ساتھ لئے عمارت کے اس حصے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں

مندر تھا۔ اب صبح کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا اور مندر کی طرف سے سکھ بچے کی آوازیں آرہی تھیں۔

صبح کی پوجا کا وقت ہو چکا تھا۔ سکھ ہی کے ساتھ مندر کے گھنٹے بجنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ہم وہاں

پہنچے تو عجب افرا تفری اور بھاگ دوڑ سی نظر آئی۔ ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی اور پھر اس

نے ہانپتے ہوئے جو کچھ بتایا، ہمیں پہلے ہی معلوم تھا۔ گرو وشواناتھ کو قتل کیا جا چکا ہے، سبھی کو یہ بات پتا

چل گئی تھی۔

”گرو جی کے قتل میں بھی باغیوں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔“ سابق لتا اور حال کی عندلب نے پہلے

سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گرو کے قتل پر تبصرہ کیا اور پھر اتر تھی کی تیاری کا حکم دے کر وہاں موجود

نوکروں اور نوکرانیوں کو دکھانے کی خاطر ”گرو جی“ کا آخری دیدار کرنے اس کی خواب گاہ میں چلی گئی۔

میں باہر صحن ہی میں کھڑا رہا۔ عندلب کا یہ تبصرہ کارگر ثابت ہوا تھا کہ گرو کو باغیوں نے قتل کیا

ہے۔ اس پر سبھی نے یقین کر لیا تھا اور خوفزدہ سے نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد عندلب، گرو کی خواب گاہ سے نکل آئی اور میرے ساتھ مندر کی طرف بڑھی۔

مندر کے احاطے میں داخل ہوتے ہی مجھے ہر طرف مسلح محافظ دکھائی دیئے۔ قیدی شاہنواز خاں کی حفاظت

کے لئے شاید رات ہی کو یہ بندوبست کیا گیا تھا۔ محافظوں نے عندلب کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ میں بھی

کیونکہ عندلب کے ساتھ تھا اس لئے مجھے بھی نہیں روکا گیا۔ تہ خانے کی طرف جو پختہ راہداری جاری

تھی، اس پر بھی محافظ موجود تھے۔ عندلب نے اس موئے پنڈت کو ساتھ لے لیا تھا جس کے پاس تہ

خانے کے دروازے پر پڑے ہوئے قفل کی چابی تھی۔

خاص طور پر میں نے یہ بات محسوس کی کہ پنڈت کچھ گھبرا ہوا سا تھا۔

پنڈت نے ساتھ چلتے ہوئے عندلب سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ ”لتا جی! اس ننھے کو ہمیشہ کے

لئے ختم ہی کیوں نہ کر دیں۔“

”کس ننھے کو پنڈت جی؟“ عندلب نے چونک کر پوچھا۔

”اسی قیدی کے ننھے کو؟ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ وہ اس ریاست کا سابق حکمران رہ چکا ہے۔ جب

تک یہ زندہ رہے گا اسی طرح بغاوتیں ہوتی رہیں گی۔ ابھی ذرا دیر پہلے پتا چلا کہ کسی ایسا چاری (ظالم) نے

گرو جی کو بھی قتل کر دیا ہے۔“

”پنڈت جی!“ عندلب سخت لمحے میں بولی۔ ”اپنے کام سے کام رکھا کریں۔ زیادہ قابل بننے اور

مشورے دینے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، کیا نہیں۔ یہ سوچنا آپ کا نہیں ہمارا کام ہے۔ جسے

دیکھو راج نیتی میں اپنی ٹانگ اڑانے لگتا ہے۔
 بڑی طرح جھڑکے جانے پر مونے پنڈت کے پھولے ہوئے گال مزید پھول گئے اور وہ خاموشی سے ساتھ چلنے لگے۔ پھر اچانک ہی وہ کہنے لگا۔ ”میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑی ہو رہی ہے۔ چھما چاہتا ہوں کٹھ دینے پر۔ یہ دروازے کے تالے کی چابی لے لیں۔“ پنڈت نے اپنی دھوتی کی انٹی سے چابی نکال کر عندلیب کو دے دی اور پھر تیزی سے لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ وہ شاید ایک نوجوان لڑکی سے ڈانٹ کھا کر کچھ زیادہ ہی نروس ہو گیا تھا۔ اس کی پیٹ کی گڑبڑ کا راز تو خاصی دیر بعد کھلا۔
 عندلیب کے ساتھ میں اسی تہ خانے کی میڑھیوں تک پہنچ گیا جہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ وہاں بھی محافظ چونکا کھڑے تھے۔

میڑھیوں سے اتر کر عندلیب نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور پھر سامنے نظر پڑتے ہی وہی کیا میں بھی اچھل پڑا۔

تہ خانے کی دیوار کے قریب شاہنواز خاں نپٹ پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک خنجر دسے تک پیوست تھا۔ منہ اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ارد گرد خون پھیلا ہوا تھا۔

”پتا جی!“ عندلیب کی چیخ سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ فوری طور پر پہنچنے والے صدے کے سبب وہ بھول چکی تھی کہ میں نے شاہنواز خاں کو ابا حضور کہنے کے لئے کہا تھا۔

اب شاہنواز خاں کو ابا حضور کہا جاتا یا پتا جی، اس سے کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ وہ کچھ سننے کے قابل نہیں تھا۔

وہ منظر واقعی بڑا دردناک تھا جب ایک بیٹی اپنے باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی بلک رہی تھی۔ بلکتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ ”کچھ دیر تو انتظار کر لیا ہوتا پتا جی..... کچھ دیر تو رک جاتے کہ میں آپ کے جیتے جی آپ کو پتا جی کہہ سکتی۔“

اچانک میڑھیوں سے کوئی تیزی کے ساتھ اترا اور تہ خانے میں آ گیا۔ وہ ایک سپاہی تھا جو غالباً دوڑتا ہوا وہاں تک آیا تھا۔ اس نے روتی بلکتی عندلیب کو ہانپتے ہوئے دو خبریں دیں۔ ایک خبر تو خیر متوقع تھی، یعنی یہ کہ کالی چرن کو قتل کر دیا گیا البتہ دوسری خبر انتہائی تشویش ناک تھی۔ محل نما عمارت پر ”باغیوں“ نے حملہ کر دیا تھا۔

اچانک بدل جانے والی صورت حال سے میں بھی گھبرا گیا تھا۔ اگر شاہنواز خاں زندہ ہوتا تو فکر کی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ حملہ آور ظاہر ہے کہ اسی کے طرفدار تھے اور اسے قتل کیا جا چکا تھا۔ یہ مسئلہ بعد کا تھا کہ شاہنواز خاں کو کس نے اور کیوں قتل کیا، فی الحال تو مشتعل عوام کو خون خرابے سے روکنا تھا۔ جو لوگ کسی بھی سبب انتہائی قدم اٹھا لیتے ہیں، انہیں روکنا یا سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ روتے روتے عندلیب چپ سی ہو گئی اور اس طرح خالی خالی سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

اسی وقت مجھے دھماکوں کی تیز آوازیں سنائی دیں۔ فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔

”اٹھو۔“ میں نے آگے بڑھ کر عندلیب کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر میں تہ خانے سے نکل کر وہاں موجود سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ کسی بھی صورت میں یہاں سے نہیں ہٹو گے، نہ کسی کو بھی تہ خانے میں داخل ہونے دو گے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے تہ خانے کے دروازے میں تالا ڈال دیا اور چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ تہ خانے کی میڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے عندلیب کو مخاطب کیا۔ ”خود کو سنبھالو! ہمیں ایک طوفان کو روکنا ہے۔“

میرے کہنے اور سمجھانے پر عندلیب نے آنسو پونچھ لئے، پھر کہنے لگی۔ ”تم..... تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

”یہ بتاؤ کہ عمارت میں کتنے مسلح محافظ ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً پچاس ساٹھ!“ اس نے جواب دیا۔

”یہ تو نہ ہونے کے برابر ہیں، حملہ آوروں کو بھلا کب تک روک سکیں گے! معلوم نہیں حملہ کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے! اندازہ یہی ہے کہ وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے ورنہ حملہ کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوتی۔ بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے اور عندلیب دونوں ہی کو معلوم تھا، حملہ آور کوئی غیر نہیں، اپنے ہی بن ہیں اور انہوں نے اپنی حق طلبی کے لئے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ میں تو ایک جن زاد تھا ہی، عندلیب بھی کم نہ تھی۔ وہ بھی اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر حملہ آوروں کو شدید نقصان پہنچانے کی اہل تھی، لیکن یہ مناسب نہ ہوتا۔

وہ جو کبھی مظلوم تھے اس وقت ظالم بن گئے تھے۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ اپنے اندر سے ہار جانے والوں پر کسی حملہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مندر کی حدود سے باہر نکلنے ہوئے مجھے اس پنڈت کا خیال آیا جس نے شاہنواز خاں کے قتل کا مشورہ دیا تھا۔ وہ جھڑک دیئے جانے کے بعد پیٹ میں گڑبڑ کا بہانہ کر کے کھٹک لیا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے مندر کے احاطے میں موجود محافظوں کو بھی یہی ہدایت دی کہ وہاں سے نہ کسی کو باہر جانے دیں نہ کسی کو اندر آنے دیں۔ میں کیونکہ عندلیب کے ساتھ تھا اور اب کالی چرن کے بعد وہی گویا حکمراں تھی اس لئے محافظوں نے میرے کچھ کہنے کو حکم ہی کا درجہ دیا۔ انہوں نے غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، عندلیب کا ایما بھی اس میں شامل ہے۔ عندلیب کے چہرے سے اب حزن و ملال کے ساتھ غر مندگی بھی جھلک رہی تھی اور یہ پتا بھی چل رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ ”شہزاد!“ اچانک عندلیب نے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”اب ایک ہی صورت ہے کہ فی الحال حملہ آوروں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر کسی بھی طرح ڈرا کر بھگا دیا جائے۔ بعد میں انہیں خود بھی حقیقت کا علم ہو جائے گا کہ کالی چرن مر چکا ہے۔“

”لیکن تمہیں بھی تو وہ کالی چرن ہی کی بیٹی سمجھتے ہیں۔ جس شخص کے سینے میں یہ راز محفوظ تھا کہ تم کالی چرن کا نہیں، اس کا خون ہو، اسے بھی موت کی گہری نیند سلا دیا گیا ہے۔ پھر حقیقت کی گواہی کون

مئی۔ کسی کو بھی مجھ پر گولی چلانے کا خیال نہیں آیا۔ کچھ دور تک دھاڑتے ہوئے میں نے لوگوں کا تعاقب کیا اس کے بعد پلٹ آیا۔ اب چنگاریاں برسا بند ہو چکی تھیں۔

عمارت کی چھت پر پہنچنے سے پہلے میں نے شیر کا قالب ترک کر دیا اور اوپر پہنچنے ہی دوبارہ انسانی بیت اختیار کر لی۔

”وقتی طور پر خطرہ ٹل گیا ہے۔“ میں نے عندلب کو مخاطب کیا۔ ”لیکن اس کا مستقل سد باب ضروری ہے۔“ پھر جو کچھ اس کے لئے میں نے سوچا تھا، عندلب کو بتا دیا۔

عندلب نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ چھت سے اترتے ہی تجویز پر فوراً عمل درآمد کی تیاری شروع کر دی گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد دس ڈھنڈوچی چند سپاہیوں کے ساتھ محل نما عمارت سے نکلے۔ اس زمانے میں فوری طور پر عوام تک کوئی اہم خبر پہنچانے کا یہی طریقہ رائج تھا۔ ڈھنڈوچی شریا بستی کے مختلف علاقوں میں پھیل جاتے اور ڈھول بجا بجا کر لوگوں کو جمع کرتے۔ لوگ جمع ہو جاتے تو ایک سپاہی بلند آواز میں حکمران وقت کا فرمان پڑھ کر سناٹا اور یوں لوگوں تک وہ اہم خبر پہنچ جاتی۔

ڈھنڈوچیوں کے ذریعے جو اعلان کرایا گیا، وہ مختصر مگر بہت پڑا اثر تھا۔ فوری طور پر لوگوں کو مطمئن و پرسکون کرنے کا اس سے مؤثر کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ اس اعلان کا لب لباب یہ تھا کہ ریاست کے ظالم ہندو حکمران کالی چرن کو قتل کیا جا چکا ہے۔ اس کی جگہ لٹا، ریاست کی نئی حکمران بن گئی ہے۔ لٹا نے اسلام قبول کر کے اپنا نام عندلب رکھ لیا ہے۔ اعلان میں گرو و شواناتھ کے قتل کی اطلاع بھی تھی کہ عوام اس سے بھی تنگ تھے۔

بستی والوں پر اس اعلان کا مثبت رد عمل ہوا۔ اس کی توقع بھی تھی۔

دوپہر تک حالات پوری طرح قابو میں آچکے تھے۔ مصلحت کے تحت شاہنواز خاں کے قتل کو راز رکھا گیا کہ موجود حالات میں اس کی تشہیر مناسب نہیں تھی۔ عارضی طور پر مجھے ریاست کے دیوان (وزیر) کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ میں نے عندلب کے ایما پر ایسا کیا تھا۔ وہ سیاسی ذہن رکھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ریاست کا دیوان اگر کوئی مسلمان مقرر کیا گیا تو اکثریت مزید مطمئن ہو جائے گی۔ دیگر اہم عہدے بھی زیادہ تر مسلمانوں ہی کے حصے میں آئے۔ ہر چند کہ مسلمان اکثریت میں تھے لیکن ریاست میں ہندوؤں کی آبادی بھی تھی۔ ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ عہدے انہیں بھی دیئے گئے تاکہ وہ خود کو دوسرے درجے کا شہری تصور نہ کریں اور کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ ایسا میرے ہی ایما پر کیا گیا تھا۔ ہر مذہب و ملت میں اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ سو ہندوؤں میں بھی ایسا ہی تھا۔ ان میں غیر متعصب لوگ بھی تھے جو صدیوں سے مسلمانوں کے زیر سایہ مل جل کے رہ رہے تھے۔ اسی دوران نو تعمیر مندر کے قریب مرگٹ میں کالی چرن اور گرو و شواناتھ کی چٹاؤں کو جلا یا گیا۔ اسی کے ساتھ انتہائی راز داری سے عمارت کے عقبی باغ میں شاہنواز خاں کی تدفین بھی ہو گئی۔ میرے حکم کے مطابق اب تک کسی بھی فرد کو مندر کے احاطے سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا تھا۔

دے گا؟ عوام تو تمہارے بھی خلاف ہوں گے۔“ میں بولا۔

”میں خود ایک زندہ گواہی ہوں جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا!“ عندلب کے لہجے میں اعتماد تھا۔

ہاتھیں کرتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں محرکہ گرم تھا۔ عمارت کے اندر موجود محافظوں نے ایک ہی عقل مندی کا کام کیا تھا کہ حملہ ہوتے ہی صدر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دروازہ مضبوط تھا جس توڑنے کے لئے باہر سے ضربیں لگائی جاسکتی تھیں۔ عمارت میں جو محافظ موجود تھے، چھت پر چڑھ گئے تھے اور وہاں سے حملہ آوروں پر آگ برسانے میں مصروف تھے۔ جو اب میں حملہ آوروں کی طرف سے بھی فائرنگ جاری تھی۔

”آؤ شہرارا!“ عندلب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر وہ مجھے ساتھ لئے فضا میں بلند ہونے لگی۔

عندلب مجھے عمارت کی چھت پر لے آئی اور اس نے پیچ کر سپاہیوں کو فائرنگ سے روک دیا۔

”تم سب نیچے جاؤ!“ سپاہیوں کو عندلب نے حکم دیا۔

پھر میں نے چھت کے کنارے پہنچ کر عندلب کو دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتے دیکھا۔ وہ کچھ پاد بھی رہی تھی۔ چھت کی چار دیواری اتنی اونچی تھی کہ نیچے سے عندلب کو دیکھا جانا، ممکن نہیں تھا۔ دیوار میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ سپاہی انہی سوراخوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ سوراخ شاید کسی ایسے ہی موقع کے لئے بنائے گئے ہوں گے۔

چند ہی لمحے بعد میں نے عندلب کے ہاتھوں کی انگلیوں سے چنگاریاں ہی نکلنے دیکھیں جو بلند ہو کر نیم دائرے کی صورت میں عمارت سے باہر گرنے لگیں۔

اسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ عندلب، حملہ آوروں کو کوئی نقصان پہنچانے بغیر ڈرا کر بھاگ دینے کا کہہ رہی تھی، میں بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ سو میں نے دوسرے ہی لمحے اپنے منہ سے بڑی تیز اور بھیانک آواز نکالی، پھر انسانی قالب ترک کر کے ایک خوفناک اور ڈراؤنے شیر کا قالب اختیار کر لیا۔

میں نے زقہ بھری اور چار دیواری پر چڑھ گیا۔ نیچے نگاہ ڈالی تو ایک جھوم صدر دروازے سے خالصے فاصلے پر نظر آیا۔

چنگاریاں خالصے بڑے حصے میں گر رہی تھیں اور شاید انہی سے بچنے کی خاطر جھوم پیچھے ہٹا تھا۔ اسی کے سبب فائرنگ وقتی طور پر رک گئی تھی۔ فضا سے برستی چنگاریوں نے انہیں یقیناً خوفزدہ کر دیا تھا۔ بات بھی عقل میں نہ آئے، وہ حیران و خوفزدہ ہی کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ پیچھے تو ہٹ گئے تھے۔ فائرنگ بھی بند کر دی تھی مگر وہاں سے ٹلے نہیں تھے۔ انہیں وہاں سے بھاگنے کے لئے میں پہلے ہی پہے خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

پوری قوت سے میں نے دھاڑ ماری کہ لوگ مجھے دیکھ لیں۔ پھر نیچے چھلانگ لگا دی۔ اگر کوئی ان وقت مجھے گولی مار دیتا تو میں زندہ نہ بچتا، لیکن پہلے ہی سے خوفزدہ لوگوں نے عمارت کی چھت سے خلاف توقع ایک خوفناک شیر کو جست بھر کے نیچے آتے دیکھا تو ان کے اعصاب جواب دے گئے اور پھر بھی

جب تمام مسائل منٹ گئے تو میں، عبدالرب کے ساتھ مندر میں پہنچ گیا۔ مجھے اس پنڈت پر شاہنواز خاں کے قتل کا شبہ تھا جو بہانہ کر کے ہمارے ساتھ تہ خانے میں نہیں گیا تھا۔ وہی شاہنواز خاں کو کھانا بھی پہنچاتا تھا اور تہ خانے کے آہنی دروازے میں لگے ہوئے قفل کی چابی بھی اسی کے پاس رہتی تھی۔ جن سپاہیوں کو وہاں متعین کیا گیا تھا، انہوں نے بھی یہی بتایا کہ صبح ہونے سے کچھ پہلے پنڈت تہ خانے میں کھانے کی ٹھالی لے کر گیا تھا، یہ کھانا پہچانے کا وقت نہیں تھا، اس پر ایک محافظ نے پنڈت کو ٹوکا بھی تھا جو اب میں پنڈت نے کہا تھا کہ قیدی بھوکا ہو گا اور ممکن ہے، رات کو اس نے کھانا نہ کھایا ہو۔ محافظوں کو علم تھا کہ پنڈت کی یہی ذمہ داری ہے۔ سو پھر کسی نے اسے نہیں روکا۔ کسی بھی محافظ نے شاہنواز خاں کی چیخ نہیں سنی تھی اور اس کا سبب ظاہر تھا۔ عبدالرب نے اس پر گہری بے ہوشی طاری کر دی تھی۔ اسی دوران میں پنڈت نے اسے ختم کر دیا۔

پوچھ گچھ سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ پنڈت کو تلاش کیا گیا تو وہ غائب تھا۔ دوسرے پنڈت نے انکشاف کیا کہ مقتول گرو وشناتھ نے اس صبح کی تعمیر کراتے ہوئے مندر سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ بھی بنوایا تھا۔ وہ خفیہ راستہ مفرد پنڈت کے علم میں بھی تھا۔ شاہد سے یہی پتا چلا کہ پنڈت اسی خفیہ راستے سے فرار ہوا ہے۔ پنڈت کے فرار ہونے کی وجہ سے بہر حال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اگر وہی قاتل تھا تو اس نے ایسا کیوں کیا؟

عبدالرب کے ساتھ جب میں مندر سے لوٹا تو ایک خبر میرا خنجر تھا۔ مجھے یہ محکمہ ریاست کے سابق دیوان سے گویا ورٹے میں ملا تھا۔

”ایک شخص نظیر شاہ حکومت کے خلاف اب بھی سرگرم عمل ہے۔“ خبر نے بتایا۔ ”آج صبح باغیوں کی قیادت کرنے والا بھی نظیر شاہ ہی تھا۔ وہ خود کو ریاست کے سابق حکمران خاندان سے ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ذریعے یہ افواہ پھیلا رہا ہے کہ موجودہ حکمران نے شاہنواز خاں کو خاموشی سے قتل کرا دیا ہے اور اس طرح اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ سابق حکمران شاہنواز خاں کو گزشتہ رات بستی کے قریبی جنگل سے گرفتار کر لیا گیا تھا اور وہ مندر کے تہ خانے میں قید تھا۔ کچھ نوجوان یہ گواہی بھی دے رہے ہیں کہ شاہنواز خاں جنگل میں ان کے ساتھ تھا۔

یہ بات نظیر شاہ کو کیسے معلوم ہوئی کہ شاہنواز خاں کو کہاں قید کیا تھا؟ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔ پھر یہ کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے، اس کا علم نظیر شاہ کو کس طرح ہوا؟ میں نے سوچا اور پھر خبر سے نظیر شاہ کا پتا معلوم کر لیا۔

”اگر حضور کا حکم ہو تو اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے۔“ خبر نے اجازت طلب کی۔ میرے کچھ کنے سے پہلے ہی عبدالرب بول اٹھی۔ ”نہیں، اس شخص کی گرفتاری سے عوام میں بے چینی پھیل جائے گی۔ پھر اس کے لگائے ہوئے الزامات کو لوگ سچ جان لیں گے۔ فی الحال اس پر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں، صرف اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھو۔“

پھر خبر اجازت لے کر رخصت ہو گیا تو وہ سوالات میری زبان پر آ گئے جو ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

”مندر میں کوئی تہ خانہ بھی ہے، چند ہی لوگوں کو اس کا علم تھا۔“ عبدالرب بولی۔ ”نظیر شاہ کو یہ اطلاع فراہم کرنے والا کوئی گھری کا بھیدی ہے۔“

”اور گھر کا وہ بھیدی مفرد پنڈت بھی ہو سکتا ہے جس پر ہمیں شاہنواز خاں کو قتل کرنے کا شبہ بھی ہے۔ وہی پنڈت، نظیر شاہ کو شاہنواز خاں کے قتل کی اطلاع بھی فراہم کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ نظیر شاہ کے ایما پر پنڈت نے شاہنواز خاں کو قتل کیا ہو۔“

”لیکن کیوں؟ نظیر شاہ کو اس قتل سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟“ عبدالرب نے دریافت کیا۔ ”کیا تم خبر کے یہ الفاظ بھول گئیں کہ نظیر شاہ کو ریاست کے سابق حکمران خاندان سے ظاہر کرتا ہے۔ پھر یہ کہ آج صبح حملہ آوروں کی قیادت بھی وہی کر رہا تھا۔ ان دونوں باتوں میں کیا تمہیں کوئی تعلق نظر نہیں آتا؟ اس کا سیدھا سیدھا مقصد صرف ایک ہے کہ نظیر شاہ موقع سے فائدہ اٹھا کر عوام کی حمایت سے اقتدار کی کرسی تک پہنچنا چاہتا ہے۔“

”تو پھر تمہارا ارادہ کیا ہے؟ اس سے کس طرح نمٹا جائے؟“

”اس سے میں آج ہی شرف ملاقات حاصل کر لیتا ہوں، تم کیوں فکر کرتی ہو۔“ خبر سے بلاوجہ تو میں نے اس کا پتا معلوم نہیں کیا۔ ”میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب اگر تم نے میرے گلے میں غلائی کا پاڈال ہی دیا ہے تو حق نمک ادا کرنا ہی پڑے گا حالانکہ میں تمہاری مستقل غلائی کا پنا اپنے گلے میں ڈالنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔“

پھر میں مزید رکا نہیں اور عبدالرب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نظیر شاہ کا قصہ جتنی جلدی ”نک“ جاتا نیست تھا۔ وجہ یہ کہ میں واقعی عبدالرب جیسی آدم زادی کو جلد سے جلد اپنی بیوی بنالینے پر اندر تھا کہ کیا خبر کوئی اور ”کھانچا“ فٹ نہ کر لے۔ میاں یعنی میں بھی راضی تھا اور بیوی یعنی عبدالرب بھی اس پر آمادہ تھی، پھر بے چارہ قاضی کیا کرتا۔ اسے تو نکاح ہی پڑھانا تھا۔ رہی نرگس تو اس کے لئے بھی چانس تھا۔ دو چار بیویاں رکھنا کون سی ایسی بڑی بات ہے۔ ہاں جن زادیوں یا آدم زادیوں کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ ایک شوہر کی موجودگی میں وہ دوسرے شوہر بھی پال نکلیں، چوری چھپے عشاق پالنے پر خیر کوئی قدغن نہیں۔

میں جب نظیر شاہ کے گھر پہنچا تو اس کی بیٹھک میں ”غیتوں کی نشست“ جمی ہوئی تھی۔ بیٹھک خاصی بڑی تھی۔ وہاں زمین پر گاڑ نکلیوں سے ٹیک لگائے ایک سے ایک ”نمونہ“ بیٹھا تھا۔ ان میں سب سے بڑا نمونہ خود نظیر شاہ تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی، عمر پچاس کے قریب ہو گی، تنگ پوشانی اور چھوٹی آنکھوں سے عیاری جھلک رہی تھی، کاندھوں تک بال تھے، قد لمبا، چہرہ لبوڑا اور گال بچکے ہوئے سے تھے۔ وہانہ ایسا تھا جیسے کسی نے زوردار گھونسا مار کر پورا ”دال خانہ“ اندر کر دیا ہو۔

”تم لوگ دیکھنا کہ میں اس جلی نو مسلم عبدالرب بیگم کو کیسا بچاتا ہوں۔“ نظیر شاہ اپنے ہمنواؤں سے مخاطب تھا۔ ”وہ ہندو زادی شاید اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ ہمیں مسلمان ہو جانے کا غصہ دے کر ہمارے سروں پر مسلط رہے گی۔“

”شاہ جی! صبح تو بزمگ پھیل گئی۔“ ایک شخص کہنے لگا جس کا ایک ”بازار“ بند تھا، یعنی وہ ایک ہی آنکھ سے دونوں آنکھوں کا کام لینے پر مجبور تھا۔ ”معلوم نہیں، وہ شیر کہاں سے آگیا؟ پہلے تو کبھی نہیں بنا تھا کہ محل والوں نے کوئی شیر بھی پال رکھا ہے۔ پھر وہ چنگاریاں بھی عجیب تھیں جن سے کوئی جلا تو نہیں مگر پھر بھی لوگ گھبرا کر پیچھے ہو گئے۔ یہ کوئی جادو وغیرہ کا پتہ لگتا ہے۔ اس کا کوئی توڑ سوچنا پڑے گا۔“

”تم کہہ رہے ہو سوچنا پڑے گا۔ ارے میں تو سوچ بھی چکا۔“ نظیر شاہ بڑے دانشورانہ انداز میں مسکرایا۔ مسکرانے کی وجہ سے اس کے چوہوں جیسے چھوٹے چھوٹے دانت بھی مجھے نظر آنے لگے جنہوں نے اس کی مکروہ شکل کو مزید مکروہ بنا دیا۔

”ہمیں بھی تو بتائیں شاہ جی کہ آپ نے کیا توڑ سوچا ہے؟“ کوئی پُر اشتیاق لہجے میں پوچھنے لگا۔

”بھائی! میں نے پورا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔ سو فیصد اقتدار پر قبضہ ہو جاتا، اگر عین وقت پر درمیان میں وہ شیر نہ آکودا ہوتا۔ شاہنواز خاں کی لاش بھی مندر کے تہ خانے سے برآمد ہو جاتی تو لوگ اور زیادہ جوش میں آجاتے۔“ نظیر شاہ نے رازدارانہ لہجے میں دھیرے سے کہا۔

”ظاہر ہے کہ تُو نے اس کے لئے مندر کے پنڈت ہی کو سناٹا ہو گا۔“ میں نے نظیر شاہ کے کان میں سرگوشی کی تو وہ اچھل پڑا۔

نظیر شاہ اپنے دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص کو گھور کر دیکھنے لگا۔ غالباً وہ یہی سمجھا تھا کہ اسی شخص نے سرگوشی کی ہے۔

”کیا ہو گیا شاہ جی! آپ مجھے اس طرح کیوں گھورے جا رہے ہیں؟“ وہ شخص بول اٹھا۔

”تم ابھی میرے کان میں کیا کہہ رہے تھے؟“ نظیر شاہ غصے میں بولا۔

”میں..... نہیں تو شاہ جی! میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“ اس شخص نے یقین دلایا۔

”تو پھر میرے ہی کان بج رہے ہوں گے۔“ نظیر شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد وہ دوبارہ جاگتی آنکھوں اپنے ساتھیوں کو اقتدار و حکومت کے خواب دکھانے لگا۔

”نظیر شاہ! تُو مجھے کسی شیخ چلی کی اولاد لگتا ہے۔“ اس مرتبہ میں نے دائیں کان میں لفظ انڈیلے۔

ادھر یک چشم بیٹھا تھا۔ میں نے اسے نظیر شاہ کی طرف اس طرح جھکا دیا جیسے اسی نے سرگوشی کی ہو۔ اس پر نظیر شاہ کا سیاہ چہرہ غصے میں مزید سیاہ نظر آنے لگا۔

”تم لوگ مذاق اڑا رہے ہو میرا۔“ وہ یک چشم پر برس پڑا۔ ”معلوم ہے تمہیں کہ میں اس ریاست کا ہونے والا حکمران ہوں۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا..... اور سن محمد اکبر! تُو نے جو کچھ آہستہ سے میرے کان میں کہا ہے تو تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔ مجھے ذرا تخت حکومت پر بیٹھ جانے دے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ شاہ جی! میں تو آپ کا بے دام غلام ہوں۔“ یک چشم شخص، نظیر شاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے لگا۔

نظیر شاہ سے میں نے خاصی تفریح لے لی تھی اس لئے محفل برخواست کرنے کی غرض سے میں نے سانپ کا قالب اٹھایا اور زور سے پھنکار ماری کہ اہل محفل مجھے دیکھ لیں۔

”س..... سا..... سا..... سانپ۔“ کوئی میری طرف انگلی اٹھا کر ہکھلایا اور پھر اٹھ کر بھاگ لیا۔ بقیہ بھی اس کی تقلید میں دوڑے۔

”نظیر شاہ بھی اٹھ کر بھاگنے کے چکر میں تھا کہ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ میں پھن کاڑھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے سانپ کا قالب چھوڑ کر نظیر شاہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شدید حیرت کے سبب نظیر شاہ اور بھی چند نظر آنے لگا۔

میں نے اس کی چاند پر چپت رسید کی اور بولا۔ ”کیوں بے مستقبل کے حکمران! بنگال سے جادوگر بلوائے گا؟ بول.....“

غالباً انتہائی خوف نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ زندگی میں شاید کبھی کسی جن زاد سے اس کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے اس کے لمبے بال پکڑے اور کھینچنے لگا۔

”بولنا تو پڑے گا تجھے بیٹا! نہیں بولا تو تیری کھال میں بھس بھردوں گا۔ کرے گا جنت سے مقابلہ؟“ میں نے دانستہ آخری الفاظ ادا کئے کہ وہ سپر ڈال دے۔ عام طور پر پیدل قسم کے آدم زاد ہم جنت کا نام سن کر ہی کوڑی بول جاتے ہیں۔ نظیر شاہ بھی مجھے ”پیدل“ ہی معلوم ہوا تھا۔

”جج..... جن..... نات!“ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے تھے اور وہ بیٹھ میں کھنکھنے دیئے کروٹ سے پڑا تھا۔

”ہاں بیٹا رام! جنت!“ میں نے اس کے کولہ پر ٹھوکر ماری۔ ”سیدھا ہو جا..... اٹھ کر بیٹھ اور جو پوچھوں جلدی جلدی بتاتا جا۔“

وہ کانپتا ہوا اٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

”تُو نے ہی مندر کے پنڈت سے شاہنواز خاں کو قتل کرایا تھا؟“ میں نے پہلا سوال کیا۔ ”جھوٹ بولا تو بھت سے الٹا ٹانگ کر اتنی مار لگاؤں گا کہ تجھے اپنی سات پشتیں یاد آجائیں گی۔“

اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر اقرار میں سر ہلا دیا۔

پھر اسے زبان کھولنا ہی پڑی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ شاہنواز خاں کے بہت دور کے عزیزوں میں سے تھا۔ شاہنواز خاں کی بیوی کسی دور کے رشتے سے اس کی نانی لگتی تھی۔ لوگوں کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اس میں حالات کا بہت بڑا دخل تھا۔ پانسا پٹنے دیکھ کر وہ ”باغی“ نوجوانوں کا ”چوہدری“ بن بیٹھا تھا۔ شہباز خاں کے بارے میں اسے علم تھا کہ مغرور ہے۔ شہباز کے سوا حکومت کا کوئی اور دعویدار تھا بھی نہیں۔ گرد و شواہات کے مشورے پر جب کالی چرن نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کیا تو نظیر شاہ بھی اپنے دو نوجوان بیٹوں کے ساتھ جنگل میں جا چھپا۔ اس کو ڈر تھا کہ شاہنواز خاں سے اس کی رشتہ داری گلے کا پھندا نہ بن جائے۔ پھر حالات نے کروٹ لی اور شاہنواز خاں کو میں نے رہائی دلا کر جنگل میں پہنچا دیا۔ نظیر شاہ جنگل سے بھاگ لیا۔ اس کا یہ قیاس درست نکلا کہ ریاست سپاہی اب جنگل کو گھیر لیں گے۔ پھر اپنے ایک بیٹے کے ذریعے اسے خبر ملی کہ شاہنواز خاں جنگل سے غائب ہو چکا ہے۔

موتے پنڈت درگا پرشاد سے اس کی رسم و راہ تھی۔ اپنے ایک ہندو دوست کے ذریعے اس نے پنڈت سے رابطہ قائم کیا اور سونے کے دو توڑے بھی بھجوائے۔ یہ شاہنواز خاں کے قتل کا معاوضہ تھا۔ مزید دو توڑے بعد میں دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ چالاک پنڈت نے بھانپ لیا کہ کالی چرن کے دن پورے ہوئے والے ہیں۔ سو وہ لالچ میں آگیا۔ اسے بھی شاہنواز خاں سے نظیر شاہ کی رشتے داری کا علم تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر بغاوت کامیاب ہو گئی تو نظیر شاہ ہی ریاست کا حکمران بنے گا۔ خود نظیر شاہ نے بھی اس سے یہی کہلوایا تھا کہ اقتدار ملتے ہی پنڈت کو نال کر دے گا۔ کالی چرن کی طرح نظیر شاہ نے بھی یہی منصوبہ بنایا تھا کہ وہ شہباز خاں کو قتل کر دے گا۔ فی الحال صرف شاہنواز خاں اسے اپنے راستے کا کٹنا نظر آیا۔ اس کاٹنے کو ٹکائے کے لئے نظیر شاہ نے پنڈت کو پرچا لیا۔ اندر ہی اندر اس نے سازش کا پورا جال بن لیا تھا اور ”باغی“ نوجوانوں کی قیادت سنبھال لی تھی۔ اس کی سازش کا ایک حصہ تو کامیاب ہو گیا، یعنی شاہنواز خاں کو پنڈت نے قتل کر دیا، مگر وہ عوام کی بھرپور حمایت کے باوجود ”ایوان اقتدار“ پر قبضہ نہ کر سکا۔ اس کے باوجود نظیر شاہ نے ہمت نہ ہاری اور نئی چالیں چلنے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق پنڈت درگا پرشاد مندر سے فرار ہو کر نظیر شاہ کی پناہ ہی میں آیا ہو گا۔ اسی خیال سے میں نے پنڈت کے بارے میں بھی پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ ”میرے ہی گھر میں چھپا ہوا ہے۔“ نظیر شاہ نے جواب دیا۔ ”واہ بیٹا! کسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ ایک پنڈت کسی مسلمان کے گھر میں بھی چھپ سکتا ہے۔“

پھر گھر کے ایک اندرونی کمرے سے میں ’پنڈت کو بھی وہیں بیٹھک میں اٹھا لیا۔ جب پنڈت کو ہٹا چلا کہ میں کون ہوں تو دھوٹی میں اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے میں دیر نہ کی۔ میری نظر میں قتل کرنے اور قتل کرانے والا دونوں ہی مجرم تھے۔ سو میں ان دونوں ہی کو اٹھا کر محل نما عمارت میں لے آیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اس وقت شام ڈھل چکی تھی۔ جب ڈھنڈورچی ایک بار پھر ساری بستی میں ایک اعلان کرتے پھر رہے تھے۔ اعلان یہ تھا کہ بعد نماز مغرب شاہنواز خاں کے قاتلوں کو محل کے سامنے والے میدان میں عبرتناک سزا دی جائے گی۔ نظیر شاہ اور پنڈت درگا پرشاد کو میں نے یہ ”گھسا“ دیا تھا کہ اگر انہوں نے عوام کے سامنے سازش اور قتل کا اعتراف کر لیا تو ان دونوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ اس طرح حکومت سے برگشتہ نوجوان راہ راست پر آ جاتے اور انہیں حقیقت کا علم ہو جاتا کہ جو ان کا رہنما بنا ہوا ہے، دراصل وہی راہزن تھا۔

ظاہر ہے کہ عندلب میری اس کارگزاری پر بہت خوش تھی۔ اس طرح سانپ بھی مر جاتے اور لاشی بھی سلامت رہتی۔ اسی خوشی کے موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس سے ایک وعدہ بھی لے لیا۔ اس طرح کے وعدے کرتے ہوئے دل میں لڈو پھونسنے کے باوجود صنف مخالف کی زبان پر اسی طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ چلو ہنو، تم بڑے ”وہ“ ہو۔ پھر چہرے پر حیا کی سرخی پھیل جاتی ہے۔ یہ منظر مجھے بڑا بھلا لگتا ہے۔ اس وقت بھی میری آنکھوں نے ایسا ہی حسین منظر دیکھا۔ پھر بات بدلنے کے لئے عندلب مجھ

سے بعد مغرب والے ”تماشے“ کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا، اسے بتا دیا۔ اس نے میری ایک تجویز پر اعتراض بھی کیا کہ اس ”ڈرامے“ کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تجویز مجرموں کو عبرتناک سزا دینے کے متعلق تھی۔ عندلب کا خیال تھا کہ سیدھے سبھاؤ دونوں کا ”جھکا“ کر دیا جائے، یعنی گردن مار دی جائے۔ میں اس سے متفق نہیں تھا۔

”دیکھو میری جان!“ میں جواب میں بولا۔ ”عوام کی اکثریت یقیناً بھولی اور معصوم ہوتی ہے۔ اسی لئے حکمران انہیں با آسانی آلو بنا لیتے ہیں لیکن انہی میں نظیر شاہ جیسے حرای بھی ہوتے ہیں جو عوام کی ہمدردیاں حاصل کر کے انہی کا گھلا کاٹ دیتے ہیں۔ سو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام پر حکومت کا توڑا بت تو رعب قائم رہے تاکہ سازشیں کرنے والے اپنے انجام سے ڈرتے رہیں۔ طالع آزمائوں کی یہ ہمت نہ ہو کہ وہ کسی بہانے اقتدار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔“

میں اب انسانی جون میں آ کر شہر بار بن چکا تھا۔ میری خواب گاہ اب کالی چرن کا دہی کمرہ تھا جہاں گزشتہ رات کالی چرن کو ”گھنڈا“ گیا گیا تھا۔ کسی ریاست کے دیوان کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ حکمران کے اتنے قریب رہے۔ اس وقت بھی میں ’عندلب کے ساتھ اسی کمرے میں تھا۔ میں اگر کوئی آدم زاد ہوتا تو یہ عمدہ اور عزت ملنے پر میری گردن اٹھ جاتی، سو ایک جن زاد ہونے کے ناتے میری گردن میں یہ ”تکلیف“ نہیں ہوئی۔ میں تو نظیر شاہ جیسے آدم زادوں کی گردنیں ٹاپنے میں مصروف تھا۔ مجھے یوں بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ اپنی گردن کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ دے لیتا۔

بعد مغرب محل نما عمارت کے سامنے والے میدان میں لوگوں کا جھوم ہو گیا۔ میرے ماتحتوں نے ہدایت کے مطابق سارا انتظام سنبھال لیا۔ دونوں مجرموں کو زنجیریں پہنا کر میدان میں گڑے کھونٹوں سے باندھ دیا گیا اور مجھے اطلاع مل گئی۔

”شہرارا! تمہیں اس ہیئت میں دیکھ کر لوگ بھاگ نہ اٹھیں۔“ عندلب نے مجھ سے کہا۔ ”میرے آدمی اعلان کر چکے ہوں گے جان من کہ اس ریاست کی حکمران اپنے پالتو شیر پر سوار ہو کر زول اجلال فرمائے گی، عوام کو حکمران کی سواری سے ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ میں شیر نہ کی مگر تمہارا پالتو تو کھلاؤں گا ہی۔“ میں ہنس کر بولا۔ ”تم پر سواری کرتے ہوئے مجھے عجیب سا لگے گا۔“ وہ کہنے لگی۔

میں صرف مسکرا کر رہ گیا کہ یہ بولنے کا موقع نہیں تھا۔ پھر میں انسانی ہیئت سے درندہ بن گیا۔ عندلب بہ جلد اکراہ مجھ پر سوار ہو گئی۔ میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر مختلف راستوں سے گزرتا ہوا عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ راستے میں کوئی محافظ، خدنگار یا اس عمارت کا باسی نہیں ملا۔ سب کو یہی ہدایت تھی کہ عمارت کے باہر میدان میں رہیں۔ صدر دروازے سے میں جیسے ہی نکلا، دہشت زدہ ہو کر کئی افراد پیچ اٹھے۔ عندلب مجھ پر سوار رہی۔ میں صدر دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

عندلب نے بلند آواز میں دونوں مجرموں سے اعتراف جرم کے لئے کہا۔ وہ دونوں کچھ ہی فاصلے پر باہر زنجیر کھڑے تھے۔

پہل نظیر شاہ نے کی اور اپنا سارا کچا پٹھا بیان کر دیا۔ پھر پنڈت درگا پرشاد نے بھی شاہنواز خاں کے قتل کا اعتراف کر لیا۔

لوگ بلند آواز میں ان دونوں پر لعنت بھیجنے لگے۔ عندلب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر بولی۔ ”دونوں مجرم اعتراف گناہ کر چکے ہیں۔ میں اس ریاست کی حکمران ہونے کے ناتے انہیں سزا کا حکم سناسکتی ہوں لیکن یہ فیصلہ آپ لوگوں پر چھوڑا جاتا ہے۔ آپ چاہو تو انہیں معاف کر دو“ چاہو تو سزا دو۔ آپ بتاؤ کہ ان دونوں کو معاف کر دیا جائے؟“ آخر میں عندلب نے با آواز بلند ہجوم سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں۔“ لوگ ہر طرف سے چیخ اٹھے۔ ایک آواز بھی مجرموں کے حق میں بلند نہیں ہوئی۔

”انہیں سزائے موت دے دی جائے؟“ عندلب نے پھر مجمع سے سوال کیا۔

ہر طرف سے سزائے موت کے حق میں صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لوگوں کے خاموش ہوتے ہی نظیر شاہ پوری قوت سے چیخا۔ ”ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ اگر لوگوں کے سامنے اعتراف جرم کر لیں گے تو ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔“

جواب میں لوگ نظیر کو ایسے ”القلابات“ سے نوازنے لگے جس کا واقعی وہ اہل تھا۔ ایک نوجوان نے بلند آواز میں یہ بھی کہا۔ ”تجھے سزا ہم نے دی ہے اے غدار قوم!“

جب یہ ہنگامہ آرائی ختم ہوئی تو عندلب نے ایک اور انکشاف کیا۔ یہ انکشاف لوگوں کے لئے یقیناً تھا، میرے لئے بہر حال نہیں۔ عندلب بولی۔ ”کالی چرن میرا باپ نہیں تھا بلکہ میری رگوں میں شاہنواز خاں کا خون دوڑ رہا ہے۔ میں شاہنواز خاں کی بیٹی ہوں۔ قتل ہونے سے پہلے میرے والد نے یہ وار کھول دیا تھا۔ اسی کے بعد میں نے اسلام قبول کر لیا۔ مجھے حکمرانی کی ہوس نہیں۔ کالی چرن کے قتل کے بعد میرے والد ہی حکمران ہوتے، مگر کینے نظیر شاہ نے اس نمک حرام پنڈت درگا پرشاد کے ذریعے انہیں قتل کرا دیا۔ اب مجھے اس دن کا انتظار ہے کہ جب میرا بھائی شہباز خاں لوٹ آئے اور میں اقتدار اس کے حوالے کر دوں کہ میرا بھائی ہی اس کا حقدار ہے۔“

عندلب نے اس انکشاف کے بعد اور اپنے سوتیلے بھائی شہباز خاں کی خاطر اقتدار چھوڑ دینے کا اعلان کر کے لوگوں کے دل جیت لئے۔ وہ عندلب کے حق میں زبردست نعرے لگانے لگے۔

میں کہ ایک جن زاد، آدم زادوں کے اس ہجوم کے اندر شیر کے قاب میں پھنسا ہوا، ایک بھول بدن کو خود پر سوار کئے نعرہ زن ”پنگلوٹوں“ کی خاموشی کا خنجر تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ حکمرانی خواہ عندلب کرے یا شہباز خاں، انہیں کیا مل جائے گا جو گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخے جا رہے تھے۔ سارے ہی حکمران ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ شاہنواز خاں ہی بد معاشی میں کون سا کم تھا۔ اس نے کون سا گناہ کئے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ جو اس نے کھلیا تھا، شراب نوشی اس نے کی تھی، زنا کار وہ تھا لیکن شخصیت پرستی کے جنون میں مبتلا عوام کو نہ کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ وہ کچھ سنتے ہیں بلکہ بعض اوقات و حالات میں تو

میں کے بھی آن سنی کر جاتے ہیں۔ کوئی حکمران انہیں مذہب کی آڑ میں بے وقوف بناتا ہے تو کوئی قبیلے اور قوم کے نام پر۔ عالم جنات میں بھی یہی سب کاروبار چلتا رہتا ہے جس سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے تو اللہ کی ایسی مخلوق پسند ہے جو ملائے کسی کو کسی سے جدا نہ کرے۔ تم فلاں بن فلاں ہو اس لئے فلاں بن فلاں تمہارا دشمن ہے۔ تم فلاں سے الگ ہو وغیرہ وغیرہ۔ الگ الگ شناخت اور پہچان کے نام پر یہ کھیل ازل سے کھیلا جا رہا ہے۔ سو محبتوں کی جگہ نفرتیں بونی جاتی ہیں اور انہیں بونے والا وہی طبقہ ہے جس نے لوگ نجات دہندہ سمجھے ہیں اور ان کے مقبرے بنا کر صدیوں ان کو پوجتے رہتے ہیں۔ پوجنے والوں کو کبھی کچھ نہیں ملتا، ان کی جھولیاں خالی ہی رہتی ہیں اور جنہیں پوجا جاتا ہے، وہ عیش اڑا کر ہی زمین کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اس چکر کو نہ کوئی آدم زاد روک سکتا ہے نہ جن زاد۔ سو مجھے کیا پڑی تھی کہ اس غم میں خواہ مخواہ اپنی جان کو روگ لگاتا۔ ہاں مجھے لوگوں کی حماقتوں پر کبھی تو افسوس ہوتا، کبھی ہنسی آتی۔

احسانہ نعروں کی گونج ختم ہوئی تو وہ سراپا ناز، یعنی عندلب میری پشت سے اتری۔ لوگوں میں سنسنی، دی دوڑ گئی کہ دیکھیں کہ اب پردہ غیب سے کس نئی شے کا ظہور ہوتا ہے۔

پھر پروگرام کے مطابق عندلب نے میری پشت پر تھکی دی اور میں نے احقر آدم زادوں کو دھلانے کے لئے ایک عدد دھاڑ ماری کہ انہیں یقین ہو جائے، میں سچ سچ کا شیر ہوں۔ میں نے جب نظیر شاہ اور پنڈت درگا پرشاد کی طرف زقہ بھری تو وہاں موجود لوگ بغیر بتائے ہی کچھ گئے کہ دونوں مجرموں کو عبرتناک سزا دینے کے لئے کیا نیا طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ پنڈت تو میری داشت ہی سے بچھاڑ کھا کر گر گیا البتہ نظیر شاہ چیخنے لگا۔ میں نے اس کے منہ پر پتھر مارا تو ناخنوں کے ساتھ چہرے کی کھال بھی ساتھ آ گئی۔ جس طرح بلی اپنے شکار سے کھیتی ہے، کچھ دیر میں بھی ان دونوں کے جسموں سے کھیتا رہا اور پھر انہیں چیر پھاڑ ڈالا۔ آدم زادوں کے اندر بھی ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے جسے کسی ایسے منظر سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ برسر عام پھانسی دینے کا رواج آدم زادوں نے شاید اسی درندے کو تسکین دینے کے لئے رواج رکھا تھا۔

اپنا فرض انجام دے کر میں واپس عندلب کے پاس آکھڑا ہوا اور وہ مجھ پر سوار ہو گئی۔ ”تماشا“ ختم ہو چکا تھا۔ عندلب کو میں اپنی خواب گاہ میں لے آیا اور درندے سے انسان بن گیا۔

وہ ”تماشا“ اتنا سنسنی خیز تھا کہ کسی نے شاید میری کمی محسوس نہیں کی۔ حالانکہ میں وہیں موجود تھا مگر گویا وہاں نہیں تھا۔ میری مراد اپنی انسانی ہیئت کے ریاستی عہدے سے ہے۔ کسی کو احساس نہیں ہو سکا کہ دیوان شرار کہاں ہے۔

رات آئی تو حسرتوں کی سچ پر ایک گلاب مٹکنے لگا۔ میں، عندلب کی خواب گاہ میں تھا حالانکہ کانٹوں نے مجھے اپنی خواب گاہ میں داخل ہوتے اور اندر سے دروازہ بند کرتے دیکھا تھا۔

”شہزاد! تم بیک وقت شعلہ بھی ہو اور شبنم بھی۔“ عندلب تصویر کا ”دوسرا رخ“ دیکھ کر جیسے گنگنا اٹھی۔ شہزاد عندلب نے اس وقت دیکھا تھا جب میں درندہ بنا ہوا تھا۔

میں نے پھر اسے کچھ بولنے کی مصلحت نہیں دی اور شاید اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت بھی نہیں

ساری عمر بیتا دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

کہتے ہیں کہ بری گھڑی آتے دیر نہیں لگتی اور دانایہ بھی کہہ مرے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔ سو ایک روز مجھے بھی عندلیب نے ہیرا پھیری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ میں جس کے ساتھ ”ہیرا پھیری“ میں مصروف تھا، وہ عندلیب ہی کی ایک نوعرد و نوخیز ملازمہ تھی۔ اس بے چاری کی جان گئی سو گئی مگر میری جان پر بھی بن آئی۔ میرے لئے حکم ہوا کہ اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔

”آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ میں بات بگڑتے دیکھ کر خوشامد پر اتر آیا۔ ”غلطی ہو گئی معاف کر دو۔“ عندلیب انتہائی غصے میں تھی، میرے معافی مانگنے پر اور بھڑک اٹھی۔ اس نے مجھ پر نہ جانے کیا پڑھ کر پھونک دیا کہ میں زمین پر گر کے ترپنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے جسم کو کسی تیز دھار خنجر سے اندر ہی اندر کاٹنے ڈال رہا ہو۔ میں اس وقت انسانی قالب ہی میں تھا۔ اس اذیت سے بچنے کی خاطر میں نے انسانی قالب ترک کر دینا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر مجھے ترپتے دیکھ کر اس ظالم کو رحم آ گیا۔ ”آج تمہیں چھوڑے دیتی ہوں کہ یہ تمہاری پہلی غلطی ہے، آئندہ اگر پھر ایسی غلطی کی تو اسی طرح ترپا ترپا کر مار دوں گی۔“ یہ کہتے ہی اس نے دوبارہ کچھ پڑھا اور مجھ پر پھونکا۔ میں بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش آیا تو خود کو اپنی خواب گاہ کے آرام دہ بستری پر دیکھا۔ بطور مزید سزا کے عندلیب نے دو تین روز تک مجھے اپنے قریب نہ آنے دیا، پھر خوشامد در آمد سے مان ہی گئی۔

اس واقعے کو ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ حالات نے غیر متوقع طور پر ایک نئی کروٹ لی۔ چل چلا چل شہباز خاں مع بابا جی کے آن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہاں جو کچھ ہوا تھا، بابا نے شہباز کو وہیں بتا دیا تھا۔ بابا نے ”ایوان اقتدار“ میں رہنا قبول نہیں کیا۔ وہ شاید جنگل میں رہنے کا عادی تھا اس لئے بستی کے قریب جنگل میں جھونپڑی ڈال لی۔

میں نے بابا کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے، جسم پر پیوند لگے کپڑے تھے، کمر کمان کی طرح تھی۔ میں اس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں لگا پایا۔ معلوم نہیں وہ کب سے زندہ تھا اور مزید کب تک زندہ رہنے کا ارادہ تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے خطرناک قسم کا آدم زاد معلوم ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس ”جنگلی“ نے رہنے کے لئے جنگل ہی کو پسند کیا۔ شہباز خاں نے بھی خاصی عمر جنگل میں گزاری تھی۔ مگر میں نے اس میں کوئی جنگلی پن نہیں دیکھا۔ میں برس کوئی کم تو نہیں ہوتے۔ وہ اس وقت سولہ سترہ سال کا رہا ہو گا کہ جب جنگل کی راہ لی تھی۔ اس سے شہباز خاں کی عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو اپنی جان بچانے کی پڑی ہو تو دوسرے ششخانی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اسی لئے اب تک کنوارا تھا۔ فطری زندگی گزارنے کی وجہ سے صحت اچھی تھی۔ چوڑا سینہ، آنکھیں بڑی اور روشن، قد مناسب، رنگ سرخ و سفید۔ شاید ورزش بھی کرتا

تھی۔

طلسم ”خواب زلیخا“ ٹوٹا تو رات کے آخری پھر میرے دل کی بات زبان پر آئی گئی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”عندلیب!“

”ہوں۔“ وہ بند آنکھوں سے شاید اب بھی کوئی خواب دیکھے جا رہی تھی۔

”تم ہر حال میں میری ہی رہو گی نا؟“

”کیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”ہاں، اسی لئے تو سوال کیا تھا۔“ میں بولا۔ ”دراصل میں تمہیں کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔“

”کیسا دھوکا؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

”بات یہ ہے کہ مسلمان چاہے کوئی جن زاد ہو یا آدم زاد، ایک ساتھ کئی بیویوں کا شوہر ہو سکتا ہے۔“ میں نے تمہید باندھی۔

”کیا مسلمان ہونے کے لئے یہ ضروری ہے؟“

”ضروری تو خیر نہیں ہے البتہ ضرورت کے تحت اس کی اجازت ہے۔“ میں نے جھوٹ نہیں بولا۔

”لیکن تم مجھ سے یہ باتیں کیوں کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے سے ابھن کا اظہار ہونے لگا۔

”اس لئے کہ میں تمہیں اپنی بیوی بنانے والا ہوں اور تمہارے بعد بھی کسی کو اپنی بیوی بناؤں گا۔“

”بالکل نہیں۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی۔“

”اس میں تمہاری توہین کی کیا بات ہے؟“

”یہ ایک عورت کی توہین ہی تو ہے کہ اس کا مرد کسی اور کی تمنا بھی کرے۔“ وہ بحث کرنے لگی۔

پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہہ ہی دیا۔ ”سنو شہباز! اگر تمہارے دل میں کسی اور کی طلب ہے تو پھر مجھ سے شادی نہ کرو۔ میں تمہیں اس کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔“

میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ اس میں کوئی برائی نہیں اور ایسا ہوتا آیا ہے لیکن وہ نہیں مانی۔ مجبوراً مجھے مصلحت کے پیش نظر ہتھیار ڈالنا ہی پڑے کہ ایسے مواقع پر ایسا ہی کرنا بہتر ہوتا ہے۔ وہ پہلی آدم زادی تھی کہ جس سے میں نے سچ بولنا چاہا اور ناکام رہا۔ سو میں نے جھوٹ اوڑھ لیا کہ کہیں دھوٹی کی ٹاک میں لنگوٹی بھی نہ چلی جائے۔ وہ خوش ہو گئی اور میں اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا۔ عندلیب کسی اور کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی، میں زمرگس کو چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔ اگر میں اس رات عندلیب سے جھوٹ نہ بولتا کہ اس کے سوا کسی اور کو نہیں چاہتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ آئندہ کے لئے وہ اپنی خواب گاہ میں میری انٹری پر پابندی لگا دیتی۔ وہ کوئی ایسی ویسی آدم زادی تو تھی نہیں کہ اس کی مرضی و خواہش کے بغیر کوئی اسے ہاتھ لگا سکتا۔ میں بھی اگر یہ جرات کرتا تو ایک طرف باندھ کے ڈال دیتی۔ پھر میں نہ گھبرا رہتا نہ گھٹا کا۔ گھٹا گھٹا کا پانی پی کر میں ایک ایسے گھٹا آ لگا تھا کہ مجھے ایک ہی لہر کا دامن تھا۔

تھا۔ لوگ اسے ”شرابی“ کہتے تھے۔ شراب کو میں نے کبھی شرابے یا جھجکے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ دو ٹوک بات کرتا۔ اس کی یہی ادا تھی اور عندلب کو پسند آگئی تھی۔ نتیجتاً اسے یہ عمدہ دے دیا گیا تھا۔ ہم دونوں کے علاوہ دائیں جانب والی دونوں کرسیوں میں سے ایک پر تو عندلب بیٹھی تھی لیکن دوسری کرسی ابھی خالی تھی۔ شہباز خاں بھی اپنی کرسی پر آکر بیٹھ چکا تھا اور میدان بھی کچھ کچھ بھرا ہوا تھا، پھر بھی جلسہ شروع نہیں کیا گیا۔ بابا کے بارے میں خبر مل چکی تھی کہ وہ جنگل سے بستی کی طرف چل چکا ہے اور راستے میں ہے۔ خالی کرسی اسی کے لئے تھی۔ بڑھے بابا کے لئے سواری بھی بھیجی گئی مگر اس نے پیدل چلنے کو ترجیح دی اور پھر لاشی لیکتا ہوا پہنچ گیا۔ اس کا استقبال کرنے شہباز خاں اپنی کرسی چھوڑ کے اٹھا تو تخت پر موجود بقیہ افراد کو بھی مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑا۔

بابا، عندلب کے برابر کرسی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا تو جلسہ شروع ہوا۔ پہلے عندلب نے مختصر سی تقریر کر کے ایٹھائے دعدہ، یعنی اقتدار شہباز خاں کے حوالے کر دینے پر عوام سے داد بوری، پھر شہباز خاں نے محصول میں کوٹنی کا اعلان کر کے گویا یہ ثابت کیا کہ وہ بڑا رحم دل حکمران ہے اور عوام کے دکھ درد کو سمجھتا ہے۔ نعرے بازی کے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔ مجھے توقع تھی کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد بابا اپنی لاشی لیکتا ہوا پھر جنگل کی طرف سدھار جائے گا۔ ایسا نہیں ہوا تو میرا ماتھ ٹھنکا۔ بابا کو میں نے شہباز خاں اور عندلب کے ساتھ عمارت کے صدر دروازے سے اندر جاتے دیکھا۔ یہ اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ بابا خطرناک قسم کا آدم زاد ہے۔ سو میں چوکنا ہو گیا۔

ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے، میں نے انسانی ہیئت ترک کر دی اور عمارت کے ساتھ اس کمرے میں جا رہا تھا جسے نشست گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ میں دور ہی رک گیا کہ وہ لوگ اندر جا کے بیٹھ جائیں تو ہٹا لگاؤں، بابا کس لئے وہاں رکا ہے اور دونوں بھائی بہن سے اکیلے میں کیا بات کر رہا ہے۔ چور کی داڑھی میں تنکے کا محاورہ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے بنا ہے۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں میری پول پٹی نہ کھل جائے۔

ذرا ہی دیر بعد میں اندر پہنچا تو بابا کو چونکتے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔

”جی بابا! آپ کہہ رہے تھے کہ یہاں اس عمارت میں کوئی غیر انسان بھی رہتا ہے۔ وہ کون.....“

شہباز خاں کی بات پوری نہ ہو سکی کیونکہ بابا بول اٹھا۔ ”وہ تو اس وقت یہاں بھی آچکا ہے۔“ اس پر عندلب نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ وہ مجھے دیکھنے کی اہل تھی۔

بابا بھی ایک ہی کایاں تھا، کہنے لگا۔ ”رہنے دو بیٹی! اسے باہر نہ نکالو۔ مجھے جو کچھ کہتا ہے، اس کی موجودگی میں بھی کہہ سکتا ہوں۔“ پھر بابا نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور کہا۔ ”ادھر دروازے کے قریب کیوں کھڑے ہو، یہاں ہمارے ساتھ آکر بیٹھ جاؤ۔“ بابا نے عندلب کے برابر والی خالی کرسی کی طرف

ہو گا جس سے جسم کسا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت وجہہ و پرکشش ہی تھی۔ جنگل میں اگر اسے کوئی آدم زادی مل گئی ہوتی تو شاید چہرے پر اتنی تازگی نظر نہ آتی۔ عندلب نے اس سے میرا تعارف ریاست کے دیوان کی حیثیت ہی سے کرایا۔

غلاب توقع شہباز خاں نے بڑی گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا، پھر پوچھنے لگا۔ ”ہماری ہی ریاست کے رہنے والے ہو یا کہیں باہر سے آئے ہو؟“

”شریار کا تعلق لاہور سے ہے جو انگریزوں کی عمل داری میں ہے۔“ میری بجائے عندلب بول اٹھی۔ ”میری ایک سہیلی بللا وہاں رہتی ہے۔ اس کے والد راؤ بہادر بہاری لال، کالی چرن کے رشتے دار تھے۔ ان کی وجہ سے وہاں میرا آنا جانا تھا۔ پچھلے دنوں وہاں میں گئی تو وہیں ملاقات ہوئی۔ وہیں میں نے شریار کی صلاحیتوں کو دیکھا۔ راؤ بہادر جی کی تمام زمینوں، جائیداد اور کاروبار کی دیکھ بھال شریار ہی کے ذمے تھی۔ یہاں ضرورت پڑی تو میں نے بلوایا۔“

عندلب نے میری مشکل آسان کر دی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ شہباز خاں صرف میرے ہی متعلق مجلس نہیں تھا۔ اس نے تمام ہی عمدیداروں کے بارے میں اس طرح پوچھ گچھ کی تھی، کون کہاں کا ہے، کدھر سے آیا ہے؟ وغیرہ۔ اس نے بہر حال دبی دبی زبان میں ایک اعتراض ضرور کیا۔ یہ اعتراض مجھی سے متعلق تھا۔

عمارت کا جو حصہ صرف حکمران خاندان کی رہائش کے لئے مخصوص تھا، وہاں کسی اور کو نہیں رہنا چاہئے۔ میں اس عمارت میں کہیں بھی رہتا، اس سے مجھ پر کوئی فرق نہ پڑتا۔ سو میں نے خود ہی کالی چرن کی خواب گاہ چھوڑ دی۔ پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ کبھی اسی خواب گاہ میں ریاست کا سابق حکمران شاہنواز خاں رہتا تھا۔ یہ کچھ جذباتی معاملہ تھا۔ شہباز خاں اپنے مرحوم باپ کی خواب گاہ میں کسی اجنبی کی موجودگی کیسے گوارہ کر لیتا۔ میں اسی عمارت کے ایک اور حصے میں منتقل ہو گیا۔ عندلب نے بھی میرے اس ایثار کو سراہا۔ شہباز خاں اپنی نوجوانی کے زمانے میں جہاں رہتا تھا، وہیں رہنے پر اصرار کیا۔ وہ کمرہ عندلب کی خواب گاہ کے برابر والا تھا۔

”بھیا جی! آپ ابا حضور والے کمرے میں رہو نا۔“ عندلب نے کہا تھا۔
”نہیں عندلب!“ شہباز خاں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”ابا حضور کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ ان کی خواب گاہ کو خالی ہی رہنے دو۔“

دوسرے ہی روز اقتدار کی منتقلی عمل میں آگئی۔ عندلب نے اپنے دعدے کے مطابق شہباز خاں کو اقتدار سونپ دیا۔ اس خوشی کے موقع پر ریاست میں عام تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ صبح دس بجے کے قریب عمارت کے سامنے والے میدان میں جلسہ ہوا تاکہ ریاست کے عوام نئے حکمران کا دیدار کر لیں۔ بڑے سے تخت پر قالین بچھا کر کرسیاں رکھی گئیں۔ درمیان میں اونچی پشت والی وہی کرسی تھی جس پر میں نے کبھی کالی چرن کو بیٹھ دیکھا تھا۔ دائیں بائیں تھوڑے سے فاصلے سے دو دو کرسیاں اور تھیں۔ بائیں جانب ایک کرسی میرے لئے اور دوسری سپاہیوں کے لئے سربراہ کے لئے تھیں یہ ایک ادھیر عمر بند و شوکار شہ

اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا کہ اپنی روحانی قوت کے سبب بابا نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے۔ بابا کی آواز میں بے نرمی تھی۔ اس کمرے میں صرف شہباز خاں ایک ایسا تھا کہ ہونق لگ رہا تھا۔

مجھے یہی غنیمت معلوم ہوا کہ بھانگے کی بجائے بابا کی بات مان لوں۔ اسی کے ساتھ میں نے انسانِ قالب بھی اختیار کر لیا۔ بھانڈا تو پھوٹ ہی گیا تھا سو اب پھپ کے کیا کرتا۔ اچانک مجھے نمودار ہوتے دیکھ کر شہباز خاں اچھل پڑا۔ میں اس لئے زیادہ خوفزدہ نہیں تھا کہ وہاں میری ایک ”حملتین“ یعنی عندلب موجود تھی۔ میں بہر حال اس کا محبوب تھا۔ خواہ وہ مجھے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتی مگر کسی اور کے ہاتھوں نہ مرنے دیتی۔ آگے بڑھ کر میں ’عندلب کے برابر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”شہباز خاں! یہ معاملہ ذرا سناڑک ہے۔“ بابا نے دوبارہ بات شروع کی۔ ”پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اس معاملے میں سختی سے کام نہیں چلے گا۔“ پھر بابا نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ایک جن زاد ہے اور تمہاری بہن عندلب اسے پسند کرتی ہے۔“

”ایک..... ایک جن کو؟“ شہباز خاں حیرت سے بولا۔ ”عندلب کو شاید اس کی حقیقت کا علم نہیں.....“

”یہ بات نہیں۔“ بابا نے شہباز کی بات کاٹ دی۔ ”عندلب کو خبر ہے کہ یہ ایک جن زاد ہے پھر بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

شہباز خاں نے اس طرح عندلب کی طرف دیکھا جیسے اسے عندلب کی دماغی صحت پر شبہ ہو۔ ”جہاں تک میرے علم میں ہے شہباز خاں! یہ کوئی ناجائز فعل نہیں، خاص طور پر اس لئے بھی کہ یہ جن زاد بھی سنا ایک مسلمان ہی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر تمہاری بہن اس سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو یہ ممکن ہے۔ میرا یا تمہارا فرض صرف اتنا ہے کہ اسے نیک و بد سمجھا دیں۔ مجھے اس معاملے میں مداخلت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ یہ جن زاد صاحب کردار نہیں۔ بہت مشکل ہے کہ یہ تمہاری بہن کے ساتھ وفا کر سکے۔ اچھا ہے کہ یہ بات اسی جن زاد کے سامنے ہو رہی ہے۔ میں اس پر کوئی الزام نہیں لگا رہا بلکہ جو حقیقت ہے بوجہ بیان کر رہا ہوں۔ اس کے حق میں اگر کوئی بات جاتی ہے تو صرف یہ ہے کہ اسی نے تمہاری بہن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ریاست کے مسلمانوں کو شیطان صفت گرد و دشوائتھ اور کالی چرن سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ذریعہ بنایا ہے۔ بہر حال کوئی فیصلہ کرنا میرا منصب نہیں۔ فیصلہ تمہاری بہن ہی کو کرنا ہے۔“

بابا خاموش ہو گیا تو میں نے اپنی صفائی میں زبان کھولی۔ ”بابا جی! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت گناہگار ہوں لیکن اب میں نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم۔“ میری بات کی تردید کرتے ہوئے بھی بابا کا لہجہ نرم ہی رہا۔ ”اب بھی تمہاری کوئی رات گناہ کے بغیر نہیں گزرتی۔ جواب دو کہ نکاح کئے بغیر تمہیں عندلب پر تصرف کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ تمہارے نزدیک کیا یہ گناہ نہیں؟“

بابا میرے اندازے سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بڑی میٹھی چھری تھی۔ ایک بھائی کے سامنے اس کی ناجائز بہن کے کروتوت بابا نے اتنی صفائی سے بیان کر دیئے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری جھگی ہوئی گردن اوپر اٹھتی اور میں کچھ کتا، شہباز خاں کی غیرت جوش میں آ گئی۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ”میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تخل سے کام لو شہباز خاں! ابھی تو بات ہو رہی ہے۔“ بابا بولا۔ ”میں نے ابھی تمہیں سمجھایا تھا کہ اس معاملے میں سختی مناسب نہیں۔“

”لیکن بابا جی! یہ تو سراسر.....“

”تم کچھ دیر خاموش رہو اور مجھے ان دونوں سے بات کرنے دو۔“ بابا نے شہباز خاں کی بات کاٹ دی۔

شہباز خاں مجھے اس طرح گھور کے دیکھنے لگا جیسے کچا چبا جائے گا۔ بابا نے مجھ سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب عندلب نے دیا۔ ”میں نے شراب کو اپنا پتی مان لیا ہے، سو آپ جو کہہ رہے ہو بابا جی! اسے میں پاپ نہیں جانتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لمبے میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ آخر پرانی ”پاپن“ تھی اور مجھ سے پہلے گرد و دشوائتھ کو اپنا شوہر تسلیم کر چکی تھی۔ مسلمان ہوئے اسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن تو ہوئے تھے۔ وہ مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح پردہ بھی نہیں کرتی تھی، میری مراد اس دور کے روایتی پردے سے ہے۔

”کسی کو شوہر مان لینے سے کوئی شوہر نہیں بن جاتا۔“ بابا نے گویا سمجھایا۔ ”خود ہندو دھرم میں آگئی کے گرد پھیرے لگانے پڑتے ہیں، اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ بہت سی باتیں لوگوں نے بس یوں ہی مشہور کر رکھی ہیں جن کا تعلق کسی دھرم یا مذہب سے نہیں۔ تم تو خیر نو مسلم ہو اس لئے زیادہ قصور وار نہیں، مگر یہ جن زاد تو سب کچھ جانتا ہے۔“

بڑھے نے ایک بار پھر مجھے ہدف بنا لیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ کائیاں میری گلی ہوئی دال کو مزید نہیں گلے دے گا۔ ایک چپ سو کو ہراتی ہے، اس خیال سے میں دم سادھے بیٹھا رہا۔

”تمہاری خاموشی سے ظاہر ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، درست ہے۔“ بابا نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا۔ میری خاموشی سے اس نے ہار نہیں مانی۔

نہ ہی میں ’عندلب کو چھوڑنے پر آمادہ تھا نہ وہ مجھے۔ ہم دونوں ہی نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

”پھر تو بس گناہ سے بچنے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔“ بابا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اب آئندہ جو بھی ہو اللہ بہتر جانتا ہے۔“

اس کے بعد بابا نے جو تجویز پیش کی اسی پر عمل درآمد کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے گلے میں ”طوق غلامی“ ڈال دیا گیا۔ اسی شام ایک قاضی نے عندلب سے میرا نکاح پڑھا دیا۔ مختصر سی اس تقریب میں ریاست عظیم پور کے تمام ہی اہم افراد اور عہدیدار موجود تھے جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ چار رکنی بینک میں پہلے ہی یہ طے پا چکا تھا کہ اس بات کو راز رکھا جائے گا کہ عندلب کا نکاح ایک جن زاد سے

رکش ہوتی کہ میں ریاست کے کسی نہ کسی معاملے میں الجھا رہوں۔ وہ شاید بابا جی کے یہ الفاظ بھولا نہیں تھا کہ میں اس کی بہن سے وفائیں کر سکوں گا۔ ان حالات میں میرے لئے یہی ممکن تھا کہ جب عذرا مجھے کہیں اپنے ساتھ لے جائے تو اسے غصہ دے جاؤں۔ ایسی صورت میں وہ میری طرف سے ذرے مطمئن ہوتی۔ فرار کے لئے کیا طریقہ کار زیادہ مناسب و محفوظ رہے گا؟ یہ بھی میں نے سوچ لیا تھا۔ اگر عذرا جی کوئی آدم زادی میری زوجیت میں نہ آتی تو اسے چھوڑ کر بھاگ لینا میرے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ ظالم تو ایسی پراسرار قوتوں کی مالک تھی کہ مجھ جیسے جن زاد کو ناکوں پنے چھوڑ دیئے تھے۔

پر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور امید بھار نہ چھوڑی، شجر سے پیوست رہا۔

احمد یار خاں ایک بڑا جاگیردار تھا۔ عذرا جی کو اس کی بیٹی کے بارے میں خبر ملی کہ بہت خوبصورت ہے تو اس نے سامان سفر باندھنا شروع کر دیا۔ احمد یار خاں کی جاگیر انگریزوں کی عملداری میں تھی۔ علاقہ پنجاب ہی کا تھا اور وہاں سے لاہور بھی زیادہ دور نہیں تھا اس لئے میری طبیعت چل گئی۔ میں تو کافی دن سے کسی ایسے موقع کی تاک میں تھا۔ سو عذرا جی کو میں نے منایا اور مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئی۔ جاگیردار احمد یار خاں کو پہلے ہی خبر بھجوائی جا چکی تھی کہ ریاست عظیم پور کے حکمران کی بہن، اپنے بھائی کے لئے اس کی بیٹی کو دیکھنے آرہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم اچھے خاصے لاؤ لٹکر کے ساتھ خزانوں پر مندریں مارتے وہاں پہنچے تو جاگیردار نے اپنی حویلی سے نکل کر ہمارا استقبال کیا۔

حویلی کا مہمان خانہ خاصا بڑا تھا جس میں ہمیں ٹھہرا دیا گیا۔ ہم شام کے وقت پہنچے تھے اس لئے ابھی اگلے روز ہی ممکن تھی۔

میں اس وقت بہت خوش ہوا جب احمد یار خاں نے بطور اظہار خلوص و محبت عذرا جی سے یہ درخواست کی کہ بہن، آپ اندر حویلی میں چل کر رہیں۔

عذرا جی نے بڑی نرمی سے یہ درخواست رد کر دی تو ظاہر ہے میرا دل بیٹھ گیا۔ ظالم کسی طرح مجھے لپکا چھوڑ کر نکلنے کو تیار نہیں تھی۔

جواب سن کر احمد یار خاں نے اپنی آدمی مونچھ سلائی، پھر اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کی آدمی مونچھ بھی اچھے بھلے دو چار مردوں کے برابر ہو گی۔ بھرے بھرے چرے پر بڑی بڑی بل کھائی ہوئی مونچھیں تھیں۔ مونچھوں کے سرے دونوں جانب سے اس طرح گولائی میں مڑے ہوئے تھے کہ خدا عز و جل نہ بلوائے تو ہر دو طرف ایک ایک نیبو رکھنے کی گنجائش تھی۔ اس زمانے میں مونچھیں رکھنے ہی کو اعزاز و شرف کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

جاگیرداروں کو موقع بے موقع شان امارت دکھانے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ شوق احمد یار خاں کو بھی اندازت کو کھانے پر اس نے بڑی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا جس میں آس پاس کے کئی اور جاگیردار بھی آئے۔ اس کے چھوٹے بھائی احمد یار خاں کی جاگیر، بھائی کی جاگیر سے ملی ہوئی تھی، وہ بھی دعوت میں آئے۔ احمد یار اور احمد یار کی عمروں میں بارہ تیرہ سال سے زیادہ کا فرق تھا۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں کے بھائی تین عدد بہنیں تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ جوان ہونے کے باوجود احمد یار اپنے

ہوا ہے۔ یوں میں اس ریاست کا باقاعدہ داماد بن گیا۔ بے قاعدہ داماد تو خیر پہلے ہی سے تھا۔ آدم زاد قاعدے قانون کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور ہم جنات ان سے بھاگتے ہیں۔ شخص ہی گیا تھا تو کیا کرتا۔ صرف اتنا کیا کہ بوقت نکاح نہ اپنا صحیح نام بتایا نہ اپنے باپ کا۔ مجھے نہیں معلوم کہ نام غلط بتانے سے نکاح ہوا یا نہیں۔

نکاح کے بعد پہلی ہی رات عذرا جی نے دھمکی دے دی کہ میں نے اگر ادھر ادھر منہ مارا تو میرا حلیہ بگاڑ دے گی۔ وہ ابھی تک میری ”ہیرا پھیری“ کو بھولی نہیں تھی۔

”کیوں ڈرا رہی ہو؟ میں تو پہلے ہی تم سے خوفزدہ رہتا ہوں۔“ میں کسی فرمانبردار شوہر کی طرح بولا۔

”یہ سمجھنا لینا کہ میں اب تمہاری بیوی ہوں اور تم پر صرف میرا حق ہے۔“ اسی کے ساتھ اس نے عملاً بھی اپنا حق ثابت کرنے کے لئے میرے گلے میں اپنی بانسوں کا ہار ڈال دیا۔ اس کا رویہ بالکل ایسا تھا کہ نکاح پڑھوا کر جیسے وہ میری شوہر بن گئی ہو۔

اس دن کے بعد سے میں بس اعزازی ”دیوان جی“ رہ گیا۔ میرا اصل عہدہ ”گھر داماد“ تھا۔ اب مجھے دوبارہ حکمران خاندان کے لئے مخصوص حصے میں جگہ مل گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ میرا اور عذرا جی کا بیڑا روم ایک ہی تھا اور نوبت پتا جوڑے کی وجہ سے وہاں دوسرا بیڈ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔

بہن کے لئے ایک عدد شوہر کو گھر میں بسا کر بھائی کو اپنا گھر بسانے کی سوجھی۔ اسے یہ سمجھانے والی عذرا جی ہی تھی۔ رشتہ عکر کا ہونا چاہئے اس چکر میں قریب و دور کی ریاستوں کے پھیرے لگائے جانے لگے۔ عذرا جی مجھے اپنے ساتھ رکھتی اور کبھی عظیم پور ہی میں چھوڑ جاتی۔ میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کے لئے عارضی طور پر آوارہ گردی چھوڑ دی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ اپنے فطری مزاج کے مطابق اب عذرا جی سے میرا جی بھر چکا تھا اور میں اس فکر میں تھا کہ موقع ملتے ہی وہاں سے رسی تڑا کر بھاگ جاؤں۔ نرگس کا خیال بار بار میرے دامن دل کو کھینچتا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ اکثر میں یہ بھی سوچتا کہ کہیں مولوی کفایت اللہ نے اسے اقبال کے کھونٹے سے نہ باندھ دیا ہو۔ جب مجھے عذرا جی لاہور سے اغوا کر کے لائی تھی تو اقبال سے نرگس کے دوبارہ نکاح کی بات چل رہی تھی۔ عالم ہاموس کی بیٹی وازعہ کا دھیان بھی مجھے آتا کہ وہ جن زادی میرے فراق میں تڑپ رہی ہو گی۔ یادوں کے اس جھوم میں لکھوں کے درمیان میں کسی سانچے کی طرح جی رہا تھا۔ میری حالت کسی ایسے پرندے کی سی تھی کہ جس کے پر باندھ دیئے گئے ہوں۔ میں کسی ایک فضا، کسی ایک ہی موسم میں رہنے کا عادی نہیں تھا۔ کبھی تو میں ہجر سے رہائی چاہتا اور کبھی وصل سے۔ عذرا جی اگر اپنی ہونے والی بھائی کو دیکھنے کہیں اکیلی جاتی تو مجھے عمل نما عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی۔ وہ مجھے خود بھی بتا چکی تھی کہ میں نے کبھی ایسی کوشش کی تو مہنگی پڑے گی۔ ان الفاظ کا مطلب جاننا میرے لئے مشکل نہ تھا۔ اس نے یقیناً کوئی ایسا بندہ دست کر رکھا تھا کہ میں راہ فرار اختیار کرنا چاہوں تو کامیاب نہ ہو سکوں۔ شہباز خاں بھی مجھ پر نظر رکھتا۔ اس کی

میں نے کیونکہ پہلے ہی سے صمد یار خان کو تاک لیا تھا اس لئے کھانا کھانے کے دوران ہی میں کچھ زبردستی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا۔ ”میری جاگیر یہاں سے بشکل سات آٹھ میل ہو گی۔ آبادی سے نکل کر بائیں جانب جو سڑک جا رہی ہے، اسی پر چلتے رہیں۔ سڑک پر سفر کرتے ہوئے بائیں جانب ہی جو پہلی آبادی آپ کو نظر آئے گی، وہی امیر آباد ہے۔ ابھر خاں دراصل ہمارے دادا کا نام تھا۔ یہ بہتی انہی کی بسائی ہوئی ہے اسی لئے انہی کے نام سے منسوب ہے۔ بھائی شہرارا! آپ جب چاہیں تشریف لائیں، دیدہ دل فرش راہ پائیں گے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ مجسم انکسار بن گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے چہرے پر موجود تاثرات الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کھولے الفاظ الگ ہی معلوم ہو جاتے ہیں کہ وہ صرف لفظ ہیں، ان کے معنی کچھ بھی نہیں۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا۔ میرا جو مقصد تھا، وہ حل ہو گیا۔

سفر واقعی طویل نہیں تھا اس لئے ہم جلد ہی امیر آباد پہنچ گئے۔ ایسی آبادیوں میں جاگیرداروں کی بڑی بڑی حویلیاں الگ ہی نظر آ جاتی ہیں۔ چاندنی رات ہونے کے علاوہ ہستی میں کہیں کہیں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ سو مجھے ایک جانب بڑی سی حویلی نظر آ گئی۔ میں نے اسی طرف گھوڑا موڑ دیا۔ اسی وقت میرا ایک ہم سفر خادم بول اٹھا۔ ”سرکار! پہلے تو ادھر چلتا ہے۔ عبدال نے یقیناً اب تک آپ کے حکم کی تعمیل کر دی ہو گی۔ میں نے عبدال کے ساتھ اپنے دو خاص آدمی بھی کر دیئے تھے کہ بات ہر صورت میں بن ہی جائے۔ میں نے عبدال سے یہ بھی کہہ دیا تھا سرکار کہ وہ لوٹنیا کا منہ باندھنا نہ بولے۔“

خادم کی بات سنتے ہی میں نے گھوڑے کی بائیں کھینچ لی تھیں۔ اس کی بات سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ کسی آدم زاد کی اغوا کا معاملہ ہے جس پر صمد یار خاں کا دل آگیا ہو گا۔ جس پر کسی کا دل آ جائے، ظاہر ہے کہ وہ ایسی ویسی نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ مجھے صمد یار کی بیوی کا پیار ہو جانا بھی محض بمانہ لگ۔ صمد یار خاں نے آج رات اپنی کسی محبوب نظر کو اغوا کرانے اور عیش اڑانے کا قصد پہلے سے کر رکھا ہو گا۔ اسی اثنا میں بڑے بھائی احمد یار خاں کی طرف سے دعوت کا پیغام مل گیا۔ معاملہ سمجھتی کے رہنے کا تھا، سو اس نے سوچا ہو گا کہ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔ یعنی اس نے دعوت میں شریک ہو کر احمد یار خاں کو بھی خوش کر دیا اور خود بھی راضی رہا۔ ناراض تو بے چاری وہ ہو گی جسے زندگی اٹھوا لیا گیا تھا۔ بہت سرعت کے ساتھ میرے ذہن نے ساری کڑیاں جوڑ لیں۔ اب مسئلہ صرف ”ادھر“ چلنے کا تھا اور یہ ”ادھر“ نہ جانے کدھر تھی۔ اس کا حل صرف ایک ہی تھا۔ سو میں نے اسی پر عمل کیا اور اس سے آگے آگے چلنے کو کہہ دیا۔

اس پر خادم بدبخت بولا۔ ”سرکار! حاکم کی اگڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ڈر ہی لگتا ہے۔“ ”ابے ہم جو تجھے حکم دے رہے ہیں کہ آگے چل تو پھر کیوں بکواس کر رہا ہے۔“ میں نے جاگیردارانہ رعب کا اظہار کیا۔

”سرکار ایسا کہہ رہے ہیں تو اس کی کوئی وجہ ہی ہو گی۔“ دوسرے خادم نے پہلے کو سمجھایا۔

بڑے بھائی کی ڈپٹیٹ تھا، صرف عمروں کا فرق تھا۔ صمد یار نے بھی جاگیر پالنے کے ساتھ ساتھ مویشی پال رکھی تھیں۔ غالباً یہ ان کی خاندانی روایت تھی جسے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اپنے اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے تھے۔ بڑے گھرانوں کے افراد کا اعمال نامہ چاہے سیاہ ہو، چہرے عموماً سرخ و سفید اور جھپٹا طور پر صحت مند تھے البتہ ذہنی صحت کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں نے جھوٹے بھائی کی صمد یار خاں پر بوجہ زیادہ توجہ دی۔

خواتین کے کھانے کا انتظام اندر حویلی میں تھا۔ سو عندلیب اندر چلی گئی۔ میں بھی کیونکہ ربات عظیم پور کا گویا داماد تھا، دونوں بھائی اسی لئے میرے دائیں بائیں تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے صمد یار خاں سے فوری واپسی کی وجہ پوچھی تو پتا چلا، اس کی بیوی باہر تھی۔ شادی کو دو سال سے زیادہ ہو چکے تھے مگر ابھی وہ ”ابا حضور“ نہیں بنا تھا۔ صمد یار میں خصوصی دلچسپی لینے کا سبب اس کی فوری واپسی ہی تھی۔ میں نے سوچا، بیٹا علی لیش یہاں سے تو نکل آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ کوئی جن زاد اگر کسی آدم زاد کے جسم میں چھپ جائے تو اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کسی ”آشلاء راز“ کے ستے ہی چڑھ جائے، یعنی رو بہ رو آجائے تو دوسری بات ہے۔ آدم زادوں کے درمیان وہ کر کم از کم مجھے تو یہی تجربہ ہوا تھا۔ ہر آدم زاد نہ تو مولوی کفایت اللہ ہوتا ہے، ہر آدم زادی عندلیب کہ پہچان لے، آدمی کے اندر کوئی جن تو براجمان نہیں۔ نہ ہر ابرا غیر باجمانی کی طرح یہ جان لینے کا اہل ہے کہ ایک جن زاد نے انسانی ہیئت اختیار کر رکھی ہے۔ اس حویلی میں صرف ایک ہی ”راز درون خانہ“ سے واقف تھی، یعنی عندلیب، وہ حویلی میں تھی۔ میں اسی لئے مطمئن تھا۔

مردوں کو خواتین سے پہلے کھانا کھلایا گیا۔ کھانا کھاتے ہی میں شیلنے کے بھانے حویلی کے باغ میں آیا اور فی الفور انسانی ہیئت ترک کر دی۔ پھر باغ سے باہر آکر میں نے صمد یار خاں کو ڈھونڈنے میں نہیں کی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے رخصت ہو کر تیز قدمی کے ساتھ ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ حویلی کا صدر دروازہ ادھر ہی تھا۔ صدر دروازے پر اس کے دو خادم ایک مشکی گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے تھے جب صمد یار خاں مشکی گھوڑے پر سوار ہو گیا تو خادموں نے بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے میں نہیں کی۔ یہی وہ سنہری موقع تھا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ایک ہی نپائے میں اپنے ”شکار“ تک ل گیا۔ صمد یار خاں کو خبر بھی نہ ہو گی کہ اس کا پلا پلایا جوان جسم پرایا ہونے والا ہے۔ میں جیسے ہی صمد یار کے جسم میں داخل ہوا جھکا کھانے کے سبب گھوڑا بہت زور سے ہنسیا۔ میں اس وقت صمد یار خاں کے جسم میں سرایت کر رہا تھا اس لئے گھوڑے کی فریاد پر کان نہیں دھرا۔ میں تو جلد از جلد وہاں سے فور ہو جانے پر تلا ہوا تھا۔ سو میں نے گھٹن کا احساس کم ہوتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ خطرے کی حد سے میں جتنی جلد نکل جاتا میرے لئے بہتر ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ عندلیب اس وقت پیٹ پوجا میں لگی۔ اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ ”پنچھی“ اڑ چکا ہے۔ مجھ سے پہلے بھلا کون اپنی حسین ترین بیوی کو جھوڑ کر بھاگا ہو گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قورمہ بھی روز کھانے کو لے تو متلی ہونے لگتی ہے۔ یہ فارمولا جن و بشر پر لاگو نہیں ہوتا، بات صرف اپنے اپنے مزاج اور فطرت کی ہے۔

”ہاں اور کیا؟ یہ نامعقول اتنی سی بات نہیں سمجھ سکا۔“ میں بولا۔
”تصور ہو گیا سرکار! معاف کر دیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ سرکار جو حکم دیں گے اس کی قمر میں لے بھر کر دیر نہ ہوگی۔“

”چل معاف کیا، اب آگے بھی بڑھے گا کہ ہمیں کھڑا باتیں ملتا رہے گا۔“ میں نے اسے ہر پلائی۔

خادم نے اپنا تصور معاف ہوتے ہی گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ مختلف رستوں سے گزر کر ہمارا سر رکی قافلہ آگے پیچھے بستی کے ایک سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں چھوٹے سے ایک باغ کے عقب میں صمد یار خاں اور ”عشرت کدہ“ تھا۔ باغ کی آڑ میں ہونے کے سبب وہ دور سے نظر نہیں آیا تھا۔

میری سواری وہاں پہنچی تو کھلبلی سی مچ گئی۔ ”سرکار آگئے، سرکار آگئے۔“ گویا ”سرکار“ نہ آئے ہوں، زلزلہ آگیا ہو۔ وہاں آٹھ دس خادمان خاص پہلے سے موجود تھے۔ میں جب گھوڑے سے اتارا، ایک خادم نے باگ سنبھال لی۔ سامنے ہی اس پختہ عمارت کا صدر دروازہ تھا۔ میں خادم کے جلو میں اس طرف بڑھا۔

”سرکار! بس یوں سمجھ لیں کہ جان پر کھیلتا پڑ گیا۔“ میرے ساتھ چلتے والوں میں سے ایک خادم نے مجھے مخاطب کیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”معلوم نہیں کیسے جاگ ہو گئی۔ بلد یونہی تھکے تو بدوق نکل کے فیر بھی کر دیا تھا۔ عبدال کی ٹانگ میں گولی لگی۔ وہ تو میں نے پیچھے سے لپک کر بدوق چھین لی درنہ تو جانے کیا ہوتا۔ لونڈیا کو بہر حال ہم اٹا لئے۔ فیر ہونے کی وجہ سے گاؤں والے بھی بھالے اور کھلاڑے لے کر ہمارے پیچھے بھاگے مگر ہم ہاتھ نہ آئے۔“ خادم نے اپنی کارکردگی بیان کر دی۔ وہ مجھے صورت ہی سے چمڑا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔ اس کی کارکردگی کے اظہار سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اغوا کی جانے والی کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔

اس عمارت کی خواب گاہ تک پہنچتے پہنچتے میرے جذبات ”نقطہ ابال“ تک پہنچ گئے۔ چشم تصور سے میں نے ایک ایسی البرٹیا کو دیکھا کہ جس پر نظر پڑتے ہی جسم کے سارے تار ایک ساتھ جھن جھن جھن جھن بن گئے۔ میں نے دل ہی دل میں صمد یار خاں کو دعائیں دے ڈالیں۔ عندلب سے آزادی ملنے کی میری پہلی رات ”شب برات“ بن گئی تھی۔ ذہن میں حسین تصورات سجائے میں نے خواب گاہ کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

خواب گاہ میں لپک کی روشنی تھی۔ سامنے ہی بڑی سی مسہری پر میں نے کسی کو رسیوں سے بندھا ہوا دیکھا۔ اس کی جسامت بندھنے کے باوجود ظاہر تھی۔ میرے ذہن کو پہلا جھٹکا لگا۔ پھر میں نے قریب کر دیکھا تو حقیقت کچھ اور واضح ہو گئی۔ وہ ”لونڈیا“ مجھے ایک ”دیو پیکر حسینہ“ دکھائی دی۔ اس کے چوڑے چپکے منہ پر کپڑا بندھا تھا۔ رنگ تو خیر اجلا ہی تھا اور آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں، مگر جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ ہو جو بڑا فظرنہ آ رہا ہو۔

میں ”پکر گھنی“ بن گیا اور سوچا کہ اس ”لونڈیا“ کو صمد یار خاں نے شب باشی کی بجائے لازماً کشتی لانے کے لئے انبویا ہو گا۔ اس کی آنکھیں مجھے گالیاں بکتی ہوئی سی لگیں۔ وہ ہوش میں تھی اور اپنی ناک سے صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔

جب میں نے اس کے منہ پر کپڑا کھول دیا تو آنکھوں کی جگہ زبان نے لے لی۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

”اے او پہاڑ زادی، تجھے اس طرح گالیاں بکتے ہوئے شرم نہیں آرہی۔“ میں جل کر بولا۔
”تجھے نہیں آتی شرم مجھے پانچ بچوں کی ماں کو اغوا کراتے ہوئے۔“ اس نے ترکی بہ ترکی منہ توڑ جواب دیا۔

”پانچ بچے۔“ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بال بال بچا۔ ”تو پانچ بچوں کی اماں ہے؟“
”ہاں، کھول دے مجھے اور میرے گاؤں چمڑا دے درنہ میرا شوہر بلد یو سنگھ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ وہ مجھے دھمکانے لگی۔ ”تو جب ہمارے گاؤں میں شکار کھیلنے آیا تھا اور مجھے اکیلی دیکھ کر چیمڑنے لگا تھا تو اسی وقت میں سمجھ گئی تھی کہ تو برا حرامی ہے۔“

”اپنی چونچ بند رکھ۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”اب اگر تو نے میری شان میں گستاخی کی تو منہ پر ایسا بھانپڑ رید کر دوں گا کہ صورت نہیں پہچانی جائے گی۔“

میرے غصے کا اس پر اتنا اثر بہر حال ہوا کہ ”حرامی“ وغیرہ کے القابات سے نوازنا چھوڑ دیا اور تھوڑی سی سسم بھی گئی۔

”میں کھول رہا ہوں تجھے، تو نے سمجھا کیا ہے اپنے آپ کو..... پہچانتی ہے مجھے کون ہوں میں؟“
”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور جانتا بھی نہیں چاہتی۔“

میں جوش جذبات میں آ کر اسے حقیقت سے آگاہ کرنے والا تھا کہ فوراً خیال آگیا، یہ مناسب نہیں۔ بہر طور اسے میں نے کھول دیا اور کھلنے کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ بندھے ہونے کی وجہ سے اس کا جسم سٹ سٹا گیا تھا۔ وہ مسہری پر اچھل کر بیٹھی تو یوں لگا جیسے مسہری اس کا بوجھ نہیں سہا سکے گی۔

مسہری کے سر ہانے ہی ایک کرسی رکھی تھی۔ جس کے سامنے چھوٹی سی میز پر مجھے ولائی شراب کی ایک بوتل، دو گلاس پانی سے بھرا ایک جگ اور پلیٹ میں بننے ہوئے چنے رکھے دکھائی دیے۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا اور میز ذرا آگے سرکا دی۔ ”دیو پیکر حسینہ“ رسیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ پیروں کے ان حصوں کو بھی سلاتی جا رہی تھی جن پر رسیوں کے نشانات پڑ گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہونہ ہو صمد یار خاں کے خادم ”لونڈیا“ کے دھوکے میں اس ”پہاڑ سنگھ“ کو اٹھالائے ہوں۔ اس کی عمر کسی بھی طرح چالیس برس سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس کے پانچ بچوں میں شاید لڑکی سب سے بڑی ہوگی۔ صمد یار خاں نے یقیناً اس کی جوان لونڈیا کو اٹھالانے کا حکم دیا ہو گا اور کبکنت خادم لونڈیا کی اماں کو اٹھالائے ہوں گے۔ پھر یاد آیا کہ وہ مجھ پر ”چیمڑا چھاڑی“ کا الزام بھی لگا رہی تھی۔ ہو گا یہ کہ اس کے ساتھ لونڈیا بھی ہوگی۔ صمد یار خاں نے

پھر میں وہاں رکا نہیں۔ خادم مستعد و چوکنا ہو گئے۔ میری خدمت میں سواری کے لئے فوراً اسٹبل سے منگلی گھوڑا کھول کر لایا گیا۔ جو خادم یہاں تک میرے ساتھ آئے تھے، وہ بھی ساتھ ہو لئے۔ انہیں ہی میں نے حیران حیران سادیکھا تھا۔

صمد یار خاں کی آبائی حویلی بھی اپنے بڑے بھائی احمد یار خاں کی طرح خاصی بڑی تھی۔ وہاں بھی بڑی آمد سے پہلے سی گئی تھی۔ جو سورہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ گئے، اونگھنے والے سٹنار کہ ”ہوشیار خردار“ کا نمونہ دکھائی دینے لگے۔ پتا چلا کہ وہاں کوئی بھی آج رات میری آمد کا متوقع نہیں تھا۔

حویلی کے اندر داخل ہو کر میں نے جو خاص بات محسوس کی کہ وہ یہ تھی کہ جتنی بھی خادائیں تھیں، خاصی صحت مند تھیں۔ ان میں کسی کی عمر بھی تیس سال سے کم نہ ہو گی۔ ان بد بختوں میں سے کسی ایک کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہ چاہا۔ وہ چلتیں تو لگتا کہ ادھر سے ادھر بڑی بڑی گیندیں اڑھک رہی ہوں۔ میرے لئے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ صمد یار خاں صنف مخالف کے معاملے میں ایک الگ ہی ذوق کا مالک تھا ورنہ حویلی میں وہ ”گیندیں“ لڑھکتی نظر نہ آتیں۔ ان کا انتخاب یقیناً اسی کور ذوق نے کیا ہو گا۔

مجھے کیونکہ حویلی کے اندرونی حصے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اس لئے اندر قدم رکھتے ہی ایسا ہی گیا تھا جیسے خاصی چڑھالی ہو۔ یہ خیال مجھے صمد یار خاں کے ”عشرت کدے“ میں ولایتی شراب کی موجودگی کے سبب آیا تھا۔ میں نے اسی لئے نشے کی آڑ میں ایک موٹی خادمہ سے کہا۔ ”ہمیں ہماری خواب گاہ میں لے چلو۔“

دو خادماؤں نے مجھے سنبھال لیا۔ مجھے ان کے پلپلے وجود وقتی طور پر برداشت کرنا پڑے۔ میں اس وقت دل ہی دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ کہیں اس جاگیر داڑی کی جاگیر دارانی بھی کوئی جتنی نہ ہو۔ مجھے یہ توقع تھی کہ صمد یار خاں کی خواب گاہ میں اس کی ”بیٹا بیوی“ کے دیدار بھی ہو جائیں گے۔ اب تو میں وہاں آئی ہوں پھنسا ہوا ہوتا بھگتنا پڑتا۔ اس وقت صمد یار خاں کے جسم سے لگتا میرے لئے خطرناک ثابت ہوتا۔ مجھے علم تھا کہ اب تک پراسرار قوتوں کی مالک میری زوجہ عندلیب نے دور دور تک میری تلاش میں جال بھلا دیئے ہوں گے۔ ادھر میں اپنی ”پناہ گاہ“ یعنی صمد یار خاں کے جسم سے باہر نکلتا ادھر اسے خبر ہو جاتی اور وہ مجھے ”پھر“ لیتی۔ چند روز تک تو مجھے صمد یار خاں کے جسم کو بہر طور برداشت کرنا ہی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم جیسے جن زاداؤں کو جسم کے ساتھ ”اہل جسم“ کی مہافتیں بھی بھگتنا پڑتی ہیں۔ میں نے تو اپنی عقل کے مطابق صمد یار خاں کے جسم کا انتخاب کر کے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا، مگر یہ خبر نہ تھی کہ ذہانت، نفاقت ثابت ہو گی۔ میرے خیال میں کسی کلن بدھن کی نسبت ایک جاگیر دار بن جانا بہت بہتر تھا۔ راوی میں ہی عیش لکھتا، لیکن راوی شاید دریائے راوی میں ڈوب مرا تھا تو پھر لکھتا کیا خاک۔

کشاں کشاں ان خادماؤں نے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جو سلمان آرائش و زیبائش میں بالمشتمل تھا۔ چونکہ میں اس وقت جب کمرے میں صرف ایک مسمری دکھائی دی۔ میں نے سوچا ”کیا خبر لڑائی نکل ہی آئے اور بیگم صمد یار خوبصورت ہو۔ اسی خیال سے میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگم

چھیڑا لونڈیا کو ہو گا“ غلط فہمی اسے ہو گئی تھی۔ عورت چاہے کسی عمر کی اور کیسی ہی بدبخت کیوں نہ ہو، اسے غلط فہمی کا شکار ہوتے دیر نہیں لگتی۔ میرا دل کسی طرح یہ ماننے پر آمادہ نہیں تھا کہ صمد یار خاں اس ”بدگوشٹ“ پر لکھوت ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی اچھا بھلا مرد ڈر تو سکتا تھا، اس پر مائل ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے دو دو انچ چربی کی تہہ الگ سے اس کے جسم پر چڑھائی گئی تھی۔ انہی نتائج کی روشنی میں اس سے میں نے بچوں کی تفصیل معلوم کی۔

”کیوں بتاؤں میں تجھے؟“ وہ اڑ گئی۔ اب اس نے لمبے لمبے سانس لینا چھوڑ دیا تھا۔ ”پانچ بچوں میں سے کتنی لڑکیاں ہیں کتنے لڑکے، اس سے تجھے کیا؟“

میں نے اس کی گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے مطلب براری کی خاطر نرمی سے کہا۔ ”تجھے اپنے گاؤں جانا ہے نا؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ جھٹ سے بول اٹھی۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا چلوں کہ اس کی منوار بولی کو دانستہ مہذب الفاظ میں بیان کیا ہے ورنہ کچھ پلے نہ پڑتا کہ اس سے میرے کیا مکالمات ہوئے اور پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا۔

اس کا جواب سن کر میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”پانچوں لڑکے ہیں۔“ آخر اس نے بتا ہی دیا۔

میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں یا پھر اسے پینٹا شروع کر دوں جس نے مجھے بد مزہ کر دیا تھا۔

”اب تو میں نے تیرے سوال کا جواب دے دیا“ مجھے میرے گاؤں بھجوا دے۔“ اس نے مجھے چپ دیکھ کر کہا۔ ”تجھے تیرے اللہ میاں کی قسم۔“

مجھے اگر وہ قسم نہ بھی دیتی تو میں اسے اٹھوا کر پھٹکوا ہی دیتا۔ یا تو یہ کوئی اور ہی قصہ تھا یا پھر صمد یار خاں کوئی بد ذوق اور سنگی آدمی تھا۔ میں یہی سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

خواب گاہ کا دروازہ کھول کر میں نے باہر دیکھا۔ راہداری میں کچھ ہی فاصلے پر ایک شمع دان روشن تھا۔ وہیں مجھے وہ دو خادم نظر آئے جنہوں نے اپنی دانست میں اس ”لونڈیا“ کو اغوا کرنے کا ”کارتنامہ“ انجام دیا تھا۔ انہی کا ایک ساتھی عبدال گولی لگنے سے زخمی بھی ہو گیا تھا۔ دروازے سے نکل کر انہیں قریب آنے کا اشارہ کیا تو ان کے چروں پر حیرت نظر آئی۔ انہیں شاید یہ توقع نہیں ہو گی کہ میں اتنی جلدی باہر آ جاؤں گا۔

”جی سرکار! حکم۔“ ایک خادم قریب آتے ہی میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”اس بھینس کو جہاں سے لائے ہو، وہیں چھوڑ آؤ۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”کیا فرمایا سرکار! بھینس۔“ خادم نے اظہار حیرت کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین

نہ آیا ہو۔

”میں بھینس نہیں ہوں، پانچ بچوں کی وہ ماں بھینس ہے۔ نامعقول! مجھے سرکار کہنے کے ساتھ ساتھ بھینس بھی کہہ رہا ہے۔“

صاحبہ کہاں ہیں؟

”وہ تو اس وقت محو خواب ہوں گی حضور!“ ایک خادمہ نے بتایا۔

”لہلہ..... لیکن وہ تو ہمیں محو خواب نظر نہیں آ رہی مسہری تو خالی ہے۔“

”آپ شاید اس وقت یہ بھول رہے ہیں حضور کہ بیگم صاحبہ تو حویلی کے دوسرے حصے میں الگ رہتی ہیں۔“ خادمہ نے ایک ایسا انکشاف کیا جو ناقابل یقین سا تھا۔

”مگر کیوں؟ ہمیں بتایا جائے کہ وہ ہم سے الگ کیوں رہتی ہیں؟“ اس وقت تک مجھے مسہری تک پہنچایا جا چکا تھا۔ میں بیٹھ گیا تو ایک خادمہ میرے جوتے اتارنے لگی۔

”ان..... ان پر کوئی جن عاشق ہے حضور.....! آپ تو نشے میں سب..... سب کچھ بھول گئے ہیں۔ وہ..... وہ جن آپ کو بیگم صاحبہ کے قریب نہیں جانے دیتا۔“

میرے دونوں کان ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ یہ اطلاع ہی ایسی خوفناک تھی۔ وہاں مجھ سے پہلے میرا ایک ہم قوم موجود تھا۔ پھر میں تو سوچ میں گم ہو گیا کہ یا الہی! یہ کہاں آ پھنسا؟ اور وہ دونوں میری ناز برداریوں میں لگ گئیں۔ ایک بڑی سی گہری پرات میں میرے پیر دھلوائے گئے، اس کے بعد ہاتھ اور منہ بھی۔ خود انہوں نے ہی تولیے سے میرے ہاتھ پیر اور منہ پونچھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں اور وہ میری آیاں ہیں۔ خواب گاہ ہی میں موجود ایک آنسوئی الماری سے شب خوابی کا لباس نکالا گیا تو میں بولا۔ ”لباس ہم خود ہی تبدیل کریں گے، تم دونوں باہر ٹھل لو۔“

انہوں نے حیرت سے ایک دوسری کو دیکھا اور خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے لئے میرا تازہ حکم غیر متوقع ہی رہا ہو گا۔

”دروازہ بھیڑ جانا۔“ میں نے ہانک لگائی۔

دروازے سے نکلتے ہوئے انہوں نے میرے اس حکم کی تعمیل بھی کر دی۔ میں نے جلدی سے لباس تبدیل کر لیا۔ جو کپڑے اتارے تھے ایک طرف کرسی پر ڈال دیے۔ ذرا ہی دیر کے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک خادمہ کی آواز آئی۔ ”حضور نے لباس زیب تن کر لیا ہو تو ہم اندر آ جائیں؟“

”کس لئے؟“ میں زور سے بولا۔ ”مجھے کیا تمہارا اچار ڈالنا ہے؟“

”آج حضور کو کیا ہو گیا ہے؟ اگر ہم نے حضور کے پیر نہ دبائے تو نیند کیسے آئے گی؟“

تو صہ یار خاں بد ذات پیر دوا کر سونے کا عادی تھا، وہ بھی عورتوں سے، میں نے سوچا۔ خواہ عورتیں، عورتوں کے نام پر موٹا سا دھبا ہی تھیں مگر تھیں تو عورتیں ہی۔ میں اس وقت حویلی میں ایک جن زاد کی موجودگی کے متعلق سوچنا چاہتا تھا کہ کروں تو کیا کروں اور وہ خدامائیں مجھے کچھ سوچنے کی صلت نہیں دے رہی تھیں۔

”دفع ہو جاؤ۔“ میں چیخ اٹھا۔ ”آج ہم پیر دوائے بغیری سو جائیں گے۔“

”جو حضور کا حکم۔“ باہر سے کہا گیا اور پھر بھاری قدموں کی دور ہوتی آواز سنائی دی۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ ”یہ کم بخت تھیں تو سہی۔“ پھر میں آرام دہ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ ایک تکیہ میں نے مسہری کے سر ہانے لگا لیا تھا۔

خواب گاہ میں اب میرے سوا کوئی اور نہیں تھا اس لئے سوچ کے گھوڑے با آسانی دوڑائے جاسکتے تھے۔ اس خطرے سے قطع نظر کہ حویلی میں کوئی اور جن زاد بھی تھا یا وہاں آتا جاتا ہو گا، میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کوئی بھی جن زاد کسی ایسی ویسی اوسط درجے کی قبول صورت آدم زاد پر عاشق نہیں ہوتا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ بیگم صاحبہ یار یقیناً قابل دید بلکہ نہ جانے کس کس قابل ہو گی۔ میرا ہی کوئی دوسرا ہم قوم اگر یہاں نہ آہرا ہوتا تو عیش ہی عیش تھے۔

اس معاملے پر خاصی دیر غور و خوض کے بعد میں نے سوچا، اب سو جانا چاہئے، صبح اس ماہ ویش کا دیدار کروں گا۔ ایک خطرہ بر حال تھا کہ کہیں میرے اس ہم قوم نے حویلی میں بیگم صاحبہ کے پاس مستقبل ڈیرہ نہ ڈال رکھا ہو۔ ایسی صورت میں وہ مجھے اور میں اسے دیکھ لیتا۔ ایک جن زاد کسی دوسرے جن زاد کو آدم زاد کے جسم میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ اگر وہ مجھ سے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ قوی اور مجھ سے زیادہ طاقتور ہونے پر وہ غالب آ جاتا اور مجھے مغلوب ہونا پڑتا۔ اس کے بعد ایک نیاں میں دو گھوڑوں کا رہنا ممکن نہ ہوتا۔ یا تو پھر وہی حویلی میں رہتا یا پھر میں۔ صنف مخالف خصوصاً آدم زادوں کے معاملے میں جنت ذرا کم ہی مصالحت کرتے ہیں۔ ایسے جیسے سبھی تو نہیں ہوتے کہ مل بانٹ کر کھانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سے تو خیر میری دوستی بھی تھی، یہ جس جن زاد سے میرا چھینٹا متوقع تھا، میرے لئے اجنبی ہی ہوتا۔ پھر یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ جنت کی کون سی قسم میں سے تھا۔ اگر وہ کوئی عفریت تھا تو مار مار کے میرا بھر کس نکال دیتا۔ ایک آدم زادی خدیجہ کے معاملے میں جس طرح ایک دیو زاد ہامہ نے میری کٹائی لگائی تھی، میں بھولا نہیں تھا۔ وہ تو عین موقع پر مجھے عالم ہاموس کا تعلیم کیا ہوا عمل یاد آ گیا ورنہ تو ہامہ اس رات مجھے مار ہی ڈالتا۔ پانی میں رہنے والے اس جن ہامہ کا تصور کر کے مجھے ایسا ڈر لگا کہ بڑی مشکل سے نیند آئی۔

صبح ہی صبح خود ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے شب خوابی ہی کے لباس میں پہلے حویلی کا ایک چکر لگنا ضروری سمجھا کہ قدم قدم پر کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ رہے۔ خدامائیں اور خدام میں سے اس وقت تک کم ہی جاگے تھے۔ میں نے ان کے چروں پر حیرت کے آثار دیکھے۔ پھر ایک موٹی خادمہ شاید بہت کر کے میرے قریب آئی گئی۔

”حضور! غالباً ابھی نیند میں ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”یہ تو بہت راز کی بات تھی اے مسما! تمہیں کیسے معلوم ہو گئی؟“ میں نے اس موٹی کا پھلکا اڑایا۔

”اس طرح حضور! بندی نے یہ جانا کہ آپ شب خوابی کے لباس ہی میں اپنی خواب گاہ سے نکل آئے ہیں۔“ خادمہ نے گویا ”راز“ سے پردہ اٹھا دیا۔

”اے تو یہ کوئی جرم ہے؟ میری مرضی میں چاہے لنگوٹی باندھ کر گھوموں، تم کون مجھے ٹوکنے

والی۔" میں چڑ گیا۔

"بجا ارشاد فرمایا مگر ایسا کرنا حضور کے شایان شان نہیں۔" خادمہ نے میری ڈانٹ کو پس پشت یعنی اپنی کمر کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کی کمر خاصی موٹی تھی جسے کمر کی جگہ کمرہ کتنا زیادہ مناسب ہے۔ میں اسی لئے اس سے جان چھڑانے کے لئے آگے بڑھ لیا اور دوبارہ اسے ڈانٹا مٹ جانا۔ اس کا کیا تھا؟ وہ پھر میری ڈانٹ کو پس پشت ڈال دیتی۔

کہاں کیا ہے؟ یہ دیکھتے بھالتے ہوئے میں ایک طرف بڑھ رہا تھا کہ اس مرتبہ جانے کدھر سے نکل کر ایک خادمہ سامنے آگیا۔

"تجھے کیا تکلیف ہے؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا اور وہیں رک گیا۔

"یہ حضور کدھر چلے جا رہے ہیں؟" خادمہ گھبرا کر بولا۔

"کیوں بتاؤں تجھے؟ تو کیا میرا ایڈی کاٹ لگا ہوا ہے؟"

"حضور! اس راہداری کے بعد ہی تو وہ دروازہ ہے جسے عبور کرتے ہی آپ حویلی کے دوسرے حصے میں پہنچ جائیں گے جہاں بیگم صاحبہ رہتی ہیں۔" خادمہ کے لہجے میں ایسی بے بسی تھی کہ جیسے مجبوراً مجھے یہ سب کچھ بتا رہا ہو۔ "آپ کے حافظے کو کیا ہو گیا ہے حضور! بیگم صاحبہ کی اجازت کے بغیر اگر آپ اس حصے میں چلے گئے تو وہ پتھر آ کر دیں گی۔ ایک بار بھولے سے آپ نے پہلے بھی ایسا ہی کیا تھا تو زخمی ہو گئے تھے۔"

"کیا پاگل ہیں بیگم صاحبہ؟" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"خدا نخواستہ حضور! بیگم صاحبہ پاگل کیوں ہوتیں۔ بس جب جن کا اثر ہو جاتا ہے تو وہ آپے میں نہیں رہتیں اور عموماً ایسا ہی وقت ہوتا ہے جب حضور ان کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ آپ تو خود ہی سب کچھ جانتے ہیں، مجھ غریب کو کیوں کاتنوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ میں نے تو محض اس لئے یاد دہانی ضروری سمجھی کہ کہیں بھولے میں حضور ادھر....."

"بس کر" زیادہ قابلیت جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنا برا بھلا تجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں، رستہ چھوڑ ہمارا۔"

خادمہ سسم کر ایک طرف ہو گیا اور میں سیدھا بڑھتا چلا گیا۔

خود بخود ہی اپنی حماقت مائیوں کے سبب مجھے سب کچھ معلوم ہوتا جا رہا تھا۔ مدد یار خاں کی آمد پر اس کی بیوی کا کسی جن کے زیر اثر آ جانا میرے لئے معنی خیز تھا۔ میں نے سوچا جو ہونا ہے، اس سے ڈرنا کیا۔ اسی وقت کیوں نہ اس معاملے سے نمٹ لیا جائے۔

اس راہداری سے گزر کر میں ایک محرابی دروازے تک پہنچا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ صبح کے جھپٹے میں دروازے کی دوسری جانب میں نے دو خادموں کو خلاف توقع مستعد و چونکا کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں نے مجھے جھک کر تعظیم دی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکے تھے۔ اس کی وجہ شاید صبح ہی صبح مدد یار خاں کی آمد ہوگی۔ وہ اتنی صبح کبھی ادھر نہیں آتا ہو گا۔ میں نے اسی لئے ان کے چونک اٹھنے پر کوئی خاص توجہ

نہیں دی۔ پھر ان میں سے ایک خادمہ مجھے تعظیم دیتے ہی تیزی کے ساتھ ایک طرف لپکا تو میرا ماتھ ٹھٹکا۔ "نہرو۔" میں نے اس خادمہ کو آواز دی۔ "یہ تم مجھے دیکھتے ہی کدھر دوڑے جا رہے ہو؟"

خادمہ رک گیا اور میں قدم آگے بڑھا کر اس تک پہنچا تو کہنے لگا۔ "آپ کی آمد کی خبر بیگم صاحبہ کو دینے جا رہا ہوں حضور!"

"لیکن میں نے تو تمہیں یہ حکم نہیں دیا۔" میں بولا۔

"یہ بیگم صاحبہ کا حکم ہے حضور کہ آپ جب اور جس وقت بھی تشریف لائیں، انہیں فوراً مطلع کیا جائے۔" خادمہ نے جواب دیا۔

"چلو میرے ساتھ۔" میں نے خادمہ سے کہا۔ "میرے سامنے ہی تم انہیں اندر جا کے مطلع کرنا کہ میں باہر کھڑا ہوں۔" یہ داؤ میں نے اس لئے چلایا تھا کہ حویلی کا وہ حصہ بھی خاصا بڑا لگ رہا تھا۔ میں کہاں بیگم مدد یار کی خواب گاہ تلاش کرنے کے لئے ٹکریں مارتا پھرتا۔

میرا حکم سن کر خادمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں "کھٹک" گیا ہوں۔ پھر بھی اسے میرے ساتھ چلنا ہی پڑا۔

بڑے سے ایک صحن سے گزر کر وہ مجھے لئے ایک برآمدے میں آیا، پھر بائیں جانب مڑنے لگا تو میں نے پوچھا۔ "اس وقت تو بیگم صاحبہ محو خواب ہوں گی، کیا تم انہیں جگا کر اطلاع دو گے؟"

"حضور! حکم تو حکم ہوتا ہے اور ہمارا فرض تعمیل کرنا ہے۔" خادمہ نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔ پھر وہ چند قدم چل کر ایک بند دروازے کے سامنے رک گیا اور دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے فوراً پوچھا گیا۔ آواز نسوانی ہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مدد یار خاں کی بیوی جاگ چکی تھی۔

جواب میں خادمہ نے اپنا نام بتایا، پھر بلند آواز میں بولا۔ "حضور والا تشریف لائے ہیں اور دروازہ کھلنے کے منتظر کھڑے ہیں۔"

"کیا؟" گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی۔ "وہ..... کیا وہ دروازے کے باہر ہی موجود ہیں؟ تم نے پہلے..... پہلے سے آکر اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"حضور نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا تھا، بیگم صاحبہ!"

"کہہ دو کہ اس وقت ہم خلوت میں ہیں اور ان سے نہیں مل سکتے۔" لہجے اور الفاظ کی ادائیگی سے وہ ذہنی طور پر درست ہی معلوم ہوتی تھی۔

"جی بہتر ہے بیگم صاحبہ! حضور خود آپ کی آواز سن رہے ہیں، پھر بھی خادمہ....."

"تم جاؤ۔" میں نے خادمہ کی بات پوری نہ ہونے دی۔ مجھے علم ہو چکا تھا کہ جس کی تلاش تھی، وہ کہاں ہے۔

خادمہ لئے قدموں واپس چلا گیا تو میں نے دروازے پر پھر دستک دی۔ وہاں اگر میرا کوئی ہم قوم، یعنی جن زاد ہوتا تو اب تک ظاہر ہو جاتا۔ مجھے ایسے آثار دکھائی نہ دیے۔

سے لگا کہ میں بلبل گیا۔

دھان پان سی اس عورت نے شاید ایسے ہی موقع کے لئے صحن میں پھرج کر رکھے تھے۔ اپنے مرد، یعنی محمد یار خاں پر پھراؤ کرنے میں وہ عورت خاصی ماہر لگتی تھی۔
میں اگر محمد یار خاں ہو تا تو شاید یہ سوچ کر کہ بیگم پر جن سوار ہے، وہاں سے بھاگ لیتا لیکن خود جن زاد ہو کر مورچہ کیسے چھوڑ دیتا۔

خادموں اور خادماؤں کی فوج ظفر موج دور کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ محمد یار کی پتلی دہلی بیوی سر کے بال کھولے اس وقت پیچھے چلاتے اور پھراؤ کرتے ہوئے واقعی ایسی لگ رہی تھی کہ اس پر کوئی جن سوار ہو۔ پھراؤ سے بچتے ہوئے میں نے پہلے تو چیخ کر ”تمناش بیوں“ یعنی خادموں اور خادماؤں کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا پھر پچھتا پچھتا اس ”پتلی کمریا“ والی کی طرف بڑھا جو شاید پہلے بھی ایسے سوانگ رہاقتی رہی ہوگی۔ اس کوشش میں ایک آدھ پھراؤ لگا، مگر میں نے پرواہ نہیں کی۔

اس نے جب دیکھا کہ آج میں کسی طرح رعب میں نہیں آ رہا تو وہ اپنی خواب گاہ کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی۔ غالباً اب اس کا ارادہ یہ تھا کہ اندر جا کے دروازہ بند کر لے۔ یہ بھانپتے ہی میں دروازے کی طرف لپکا۔ ادھر سے وہ ہانپتی کانپتی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ کسی سسمی ہوئی فائنٹ کی طرح مجھے اپنی غزالی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ شاید اب اس میں مزید مزاحمت کا دم نہیں رہا تھا۔ میں اسے اٹھائے ہوئے خواب گاہ میں لے آیا۔ شب خوابی کا لباس اس کے جسم پر بھی تھا۔

خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ سامان آرائش سے مزین وہ خواب گاہ خاصی بڑی تھی۔ ایک جانب بڑی سی مسری بڑی تھی۔ جس پر بچھا ہوا بستر ایک آن دیکھی، آن کی کمائی بیان کر رہا تھا۔ میں نے اسے مسری پر ڈال دیا اور پھر تیزی سے خواب گاہ کا جائزہ لینے لگا۔ دائیں جانب خاصے فاصلے پر مجھے ایک کھڑکی کھلی نظر آئی گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بھی اندر سے لگا دیا۔

بہر جب میں پلٹ کر مسری کی طرف آیا تو محمد یار خاں کی بیوی کو سسکیاں لے کر روتے دیکھا۔ میں نے مسری پر بیٹھ کر پہلی بار اس کے سراپا کو غور سے دیکھا۔ وہ اگر بے انتہا حسین نہیں تو خوبصورت بہر حال تھی۔ ستواں ناک، نازک لب، کمان سے ابرو، سر کے بال بڑے، چوڑی پیشانی، سفید رنگ، کتابی چہرہ، قد موزوں، البتہ جسم پر گوشت برائے نام ہی تھا۔

”اب رونے سے کیا فائدہ اے میری پیاری بیگم!“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”تمہارا جن تو اُم دبا کر بھاگ لیا۔“

سسکیاں بھرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ پھر وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی اور میرا گریبان پکڑ کر چیخ اٹھی۔ ”تو کیا کروں میں“ بولو..... میں تو چھپکلی ہوں، مرکھلی ہوں..... تمہارے قابل نہیں ہوں میں..... تم مجھ سے نفرت کرتے ہو تو..... تو پھر یوں آتے ہو مجھے تالنے اور طعنے دینے کے لئے..... مجھے..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو..... طلاق دے دو

”تم گئے نہیں اب تک۔“ محمد یار کی بیوی کے لہجے میں سختی تھی۔ غالباً وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ دروازے پر دوبارہ دستک دینے والا اسی کا خادم ہے۔

”دروازہ کھولو۔“ پہلی مرتبہ میں نے قدرے دنگ آواز میں کہا۔ ظاہر ہے کہ آواز محمد یار خاں ہی کی تھی۔ یہ جاننے کے بعد کہ وہاں کوئی جن زاد نہیں، میں بے خوف ہو گیا تھا۔
”ہم ہرگز دروازہ نہیں کھولیں گے، آپ چلے جائیں۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی اور موجود ہے، جسے آپ کی آمد گوارہ نہیں۔“

”تمہارے پاس جو بھی موجود ہے، اس کی ایسی تہی۔ ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔“ میں نڈر ہو کر تیز آواز میں بولا۔

”یہ آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا۔“ اسی کے بعد اندر سے کچھ سرگوشیاں سی سنائی دیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ محمد یار کی بیوی کس سے سرگوشیاں کر رہی ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔

میں نے دروازے سے کان لگا دیئے بلکہ کان لگا دیا کتنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ بیک وقت دروازے سے دونوں کان لگانا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ توجہ دینے پر یہ منکشف ہوا کہ ان سرگوشیوں میں سے ایک عدد سرگوشی مردانہ تھی۔ چند لمحوں میں نے خاموشی ہی بہتر جانی۔ میرا ذہن تیزی سے ایک نتیجہ اخذ کر رہا تھا۔ معافیوں لگا جیسے کوئی دروازہ یا درپچہ کھولا گیا ہو۔ پھر دھم سے کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ یہ آواز دائیں جانب سے آئی تھی۔ اس طرف برآمدے کا موڑ تھا اس لئے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے پیروں میں جیسے پر لگ گئے۔ میں آواز کی طرف دوڑا۔ موڑ سے گزرتے ہی مجھے کسی کی پشت دکھائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، سامنے موجود باغ کے اندر دوڑتا ہوا گھس رہا تھا۔ میں بھلا اسے کس طرح چپیت ہو جانے دیتا۔ اس کے پیچھے جھپٹا۔ محمد یار خاں کا بھاری بھر کم جسم مزید تیز دوڑنے میں مانع تھا۔ پھر بھی میں نے حوصلہ نہ چھوڑا۔

حویلی ہی کی حدود میں واقع وہ چھوٹا سا باغ چار دیواری تک چلا گیا تھا۔ باغ میں داخل ہوتے ہی وہ شخص میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں جب تک وہاں پہنچا ”پنچھی“ جانے کدھراڑ چکا تھا۔ پھر میں نے سارا باغ چھان مارا مگر وہ بد ذات نہیں ملا۔ مجبوراً مجھے ناکام و نامراد باغ سے باہر آنا پڑا۔ اب مجھ پر ”جن“ کا عقدہ کھل گیا تھا کہ اسے خود اپنی آنکھوں سے رفو چکر ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہر چند کہ محمد یار خاں بھی اپنی بیوی کا وفادار نہیں تھا لیکن ”بیگم صاحبہ“ کے لپھن دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ کبخت دن دسواڑے مجھے آلو بنانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ میں ہرگز آلو نہیں تھا۔ مزید کھولن مجھے اس پر ہوئی کہ محمد یار خاں کی بیوی اپنے کرتوت چھپانے کے لئے میری قوم، یعنی قوم جنات کو بدنام کر رہی تھی۔

میں یہی سب کچھ سوچتا اور اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتا جب برآمدے میں پہنچا تو مڑتے ہی میری ”خاطر مدارات“ شروع ہو گئی۔ محمد یار کی بیوی صحن میں کھڑی مجھ پر پھراؤ کر رہی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ گلا بھاڑ بھاڑ کر چیخ بھی رہی تھی۔ دو چار پھرتو ادھر ادھر سے گزر گئے، ایک پھر البتہ میری ہنڈی پر اتنی زور

مجھے.....

”تاکہ تم اس جن سے شادی کر لو جو ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری خواب گاہ میں تھا۔“
 ”ہاں..... ہاں.....“ وہ پھر چیخی۔ ”اب..... اب یہ راز کھل ہی گیا ہے تو سن لو کہ میں..... میں اسے چاہتی ہوں اور..... اور تم سے مجھے نفرت ہے۔“
 ”مگر نفرت کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم میری امانت میں خیانت کرنے لگو۔“ میں نے جیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اور تم کیا کرتے ہو..... بولو، کیا کرتے رہے ہو اب تک؟ کیا تم نے خیانت نہیں کی؟ تمہیں کیا یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کیا مجھے یہ خبر نہیں کہ تم نے مولیٰ مولیٰ اور بھڑی خاندانیں کیوں پال رکھی ہیں۔ سنو صمد یار خاں! جس طرح ایک عورت اپنے مرد کی امانت ہوتی ہے، اسی طرح مرد پر بھی عورت کا حق ہے۔ اسے کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ خود تو خیانت کا مرتکب ہو اور اپنی عورت سے امانت داری کا مطالبہ کرے؟“ وہ بڑی روائی اور سچائی کے ساتھ بول رہی تھی۔
 میں نے دل ہی دل میں یہ اعتراف کیا کہ خواہ وہ گناہ گار سہی مگر غلط نہیں کہہ رہی۔ یہ مجھے بد میں معلوم ہوا کہ اس کا گناہ صرف محبت کرنا تھا، بدکاری نہیں۔

”تو پھر ہم دونوں ہی خطا کار ہوئے نا۔“ اس مرتبہ میری آواز میں نرمی تھی۔ ”کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اپنے اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں؟“

اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی تو چہرے سے بے یقینی صاف جھلک رہی تھی۔ ”یہ تم کہہ رہے ہو تم صمد یار خاں!“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں میں، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تم پر ظلم کیا، تمہارے ساتھ نا انصافی کی اور تمہیں تمہارا حق نہیں دیا۔“

وہ موم کی طرح پکھل گئی اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بننے لگے۔ میں نے اس خود سے قریب تر کر لیا اور اپنے دونوں پیر بھی اٹھا کر مسمری پر نیم دراز ہو گیا۔

”یقین کرو کہ اگر تم مجھ سے نفرت اور کسی دوسرے سے محبت کرتی ہو تو میں تمہاری راہ میں دیوار نہیں بنوں گا۔ مجھے بتاؤ، وہ کون ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ دیے۔

”تم..... تم اسے جانتے..... ہو۔“ اس نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ ارسلان بیگ ہے کہ جس سے میری منگنی ہو چکی تھی اور..... اور جب میرے لئے تمہارا رشتہ آیا تو..... تو یہ منگنی توڑ دی گئی۔ ارسلان نے محض میری خاطر اب تک شادی نہیں کی، لیکن..... لیکن اب مجھے..... مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ شاید..... شاید جذبہ انتقام نے مجھے اندھا کر دیا تھا کہ..... کہ میرے پیروں میں لغزش آگئی۔ میں نے یہ..... یہ سوچا تھا کہ شاید تم..... تم مجھے طلاق دے دو گے، مگر..... مگر.....“ اس کا گلا رندھ گیا اور پھر وہ میرے پیروں پر سر رکھ کر مجھ سے معافی مانگنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو میرے پیروں پر گر رہے تھے۔

میں نے اسے پیروں سے اٹھا کر دوبارہ اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ میری نظر میں وہ ایک مظلوم عورت تھی جسے نہ اس کی محبت مل سکی تھی، نہ اسے شوہر ہی نے منہ لگایا تھا۔ میں اگر درمیان میں نہ آ جاتا تو شاید وہ اسی طرح گناہ کے راستے پر چلتی ہوئی اور اپنے ضمیر کی لعنت کا شکار ہو کر ایک دن مرجاتی۔ میں سوچنے لگا، علیائش! تم بھلا کب تک اس جسم میں ٹھہرو گے؟ ایک روز تو تمہیں یہ جسم چھوڑنا ہی پڑے گا۔ پھر وہی صمد یار خاں ہو گا، وہی اس کی بددلتی اور بے راہ روی۔ پھر اس عورت کو دھوکا دینے سے کیا حاصل۔ کچھ دن کو اگر اسے اپنے شوہر کی محبت مل بھی گئی تو دوبارہ یہ تہوارہ جائے گی۔ صمد یار خاں اسے تڑپا تڑپا کر مار دے گا۔ تمہارا کیا ہے علیائش! تمہارے لئے آدم زادوں کی کوئی کمی نہیں۔ یہ نہ سہی، کوئی اور سہی۔ اس عورت کے اعتماد کو دھوکا نہ دو۔ اگر اسے اس کا محبوب مل جائے تو شاید تمہیں بھی تمہاری زرگس مل جائے۔ پیارے! یہ کار خیر کر ہی ڈالو۔

”سنو!“ ایک نتیجے تک پہنچنے کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ اب اس نے سسکا چھوڑ دیا تھا۔
 ”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔

”میرا خیال ہے کہ تم جذبات کی رو میں بہہ گئی ہو۔“ میں نرمی سے بولا۔

”میں تمہاری بات بات سمجھی نہیں۔“

”تم ایمانداری کے ساتھ یہ بتاؤ کہ واقعی تمہیں ارسلان بیگ سے محبت تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”فیروزہ اب تم سے جھوٹ نہیں بولے گی کہ..... کہ تم نے بھی اس سے سچ بولا ہے۔ ہاں میں..... میں نے اس سے محبت کی تھی اور..... اور وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔“

- اس بار مجھے نام بھی معلوم ہو گیا تو میں نے کہا۔ ”فیروزہ! ہم ایک دوسرے کو دھوکا دیتے رہے ہیں، کم از کم اس حد تک کہ ہمارے درمیان ازدواجی تعلقات قائم ہیں۔ یہ سچ ہے نا؟“

”ہاں بالکل سچ ہے۔ آج سے پہلے تم کبھی میرے اتنے قریب نہیں آئے۔ تم..... تم پہلی ہی رات کو مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے تھے۔ میں..... میں تمہیں پسند نہیں آئی تھی۔ مجھے اچھی طرح آج بھی یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ تمہارے بڑے بھائی اور بھانجے نے شیر کے ساتھ بکری باندھ دی ہے۔ اس پر میں ساری رات روتی رہی تھی۔“

یہ بھی میرے لئے ایک انکشاف ہی تھا کہ بدذات و بد مذاق صمد یار خاں نے دو سال گزر جانے کے باوجود ”حق زوج“ بھی ادا نہیں کئے تھے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں فیروزہ نے مجھے ایک ایسی بات بھی بتا دی کہ کار خیر کا جو اہل میرے دل میں اٹھا تھا جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ ارسلان بیگ سے خفیہ ملاقاتوں کے دوران بھی فیروزہ نے حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا، یعنی اپنے دامن پر گناہ کا ایک داغ بھی نہیں لگنے دیا تھا۔ ارسلان بیگ بھی اس حد تک ہی فیروزہ کے قریب آ سکا تھا جتنا اس وقت میں تھا۔ اسے بھی وہ اپنے شوہر کی امانت میں خیانت سمجھ رہی تھی۔ اس کے لہجے سے واضح طور پر پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ جھوٹ ہی بولنا ہوتا تو وہ ارسلان کے ساتھ اپنی محبت کا اقرار ہی کیوں کرتی۔

میرا دل ڈنوا ڈول ہونے لگا تو میں نے آہستگی کے ساتھ اسے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر

دیا۔ جو بات چل نکلی تھی، ادھوری ہی رہ گئی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں تو میں بولا۔ ”فیروزہ! اس موضوع پر پھر کبھی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غیر جذباتی ہو کر بات کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”تم نے مجھے معاف تو کر دیا ہے نا؟“ اس کی آواز اب بھی جیسے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

”ہاں فیروزہ! اور تم بھی مجھے معاف کر دینا۔“ یہ کہنے کے بعد میں وہاں مزید نہیں رکا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے صمد یار خاں کے خادان خاص کو طلب کر لیا۔ ان میں وہ دونوں بھی تھے جو رات کو میرے ساتھ تھے۔

”اس حویلی میں اب مجھے کوئی موٹی اور عمر رسیدہ خادمہ نظر نہیں آتا چاہئے۔“ میں نے پہلا حکم جاری کیا۔ ”ان سب کو کسی اور خدمت پر لگا دیا جائے۔ ہماری جاگیر میں کیا ایسی خوبصورت اور نازک اندام لڑکیوں کا قحط پڑ گیا جنہیں دیکھ کر متلی نہ ہو؟“

”سرکار نے اپنی پسند بدل جانے کے بارے میں کبھی ہم خادموں کو کچھ بتایا ہی نہیں۔“ گھاگ قسم کا ایک ادھیڑ عمر خادم ادب سے بولا۔ ”ورنہ تو حویلی میں خدمت گزاری کے لئے ایک سے ایک حسین لڑکی راضی ہو سکتی ہے۔ ہاں اس میں وقت ضرور لگے گا۔“

”ہم نے وقت دیا۔ کتنا وقت چاہئے تم لوگوں کو تلاش و جستجو کے لئے؟“

میرے سوال پر وہ آپس میں کھسک پھرنے لگے اور پھر کم سے کم ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ اس کے بعد ادھیڑ عمر خادم کہنے لگا۔ ”ایک لڑکی میری نظر میں ہے تو سہی، مگر اس کا باپ راضی ہو جائے تب کی بات ہے۔ میں آج ہی اس کے باپ سے بات کرتا ہوں۔ دراصل رخصتی سے پہلے ہی اسے طلاق ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ کسی غریب کی بیٹی کو طلاق ہو جائے تو پھر کوئی اس سے شادی پر آمادہ نہیں ہوتا۔“

”عمر کیا ہو گی اس کی؟“ میں نے معلوم کیا۔

”بیس بائیس برس سے زیادہ کی نہیں ہو گی سرکار!“ جواب ملا۔

”ٹھیک ہے، بات کر لو، کم از کم ایک تو ایسی خادمہ چاہئے جو فوری طور پر ہماری خدمت کر سکے۔“

میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

خادمان خاص کی خفیہ میٹنگ ختم ہوئی تو اسی حویلی کے ایک بڑے سے کمرے میں ”دربار عام“ لگ گیا۔ جاگیر کے منشی تفضل بیگ سے میں پہلی بار ملا۔ وہ بڑھا مجھے بت ہی پہنچا ہوا لگا۔ ہر معاملے میں اسے میں نے صمد یار خاں کا بے دام غلام اور غریب کسانوں اور ملازمین جاگیر کی حق تلفی کرتے دیکھا۔

ایک دو ”کیس“ تو اسی صورت نمٹ گئے، پھر میں نے مداخلت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غریبوں کے پوبارہ ہو گئے۔ وہ مجھے دعائیں دیتے رخصت ہوئے تو منشی نے میری ٹانگ پکڑ کر گویا تھسین۔ ”سرکار! آج آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح آپ نے فیصلے کئے تو ساری جاگیر ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

میں کچھ تو جھونک میں اور کچھ منشی کو پٹانے کی خاطر کہہ گیا۔ ”تو نکل جانے دو، ہم نے اس جاگیر کو

حاصل کرنے کے لئے کون سے پاپڑ بیٹے ہیں۔“ میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ وہ جاگیر میری یا میرے ابا جی کی نہیں صمد یار خاں جیسے عیاش و ظالم شخص کی تھی۔ میں اپنی دانست میں اس طرح ”صاحب جسم“ سے انتقام لے رہا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”منشی جی! جو لوگ زمین کاشت کرنے کے لئے چچ پاپڑ بیٹے ہیں، زمین دراصل انہی کی ہے۔ ہم نے تو اس پر عاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔“

”بس کریں سرکار! آپ تو ایسی باتیں کر کے مجھے پاگل بنا دیں گے۔“ منشی یہ کہہ کر اپنی پگڑی سنبھالنے لگا۔ شاید اسے اپنی پگڑی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ پھر وہ بڑی لجاجت سے کہنے لگا۔ ”عبدالکیم والے معاملے پر سرکار ذرا نظر ثانی کر لیں ورنہ برخوردار ارسلان بیگ کے ساتھ میری بھی بڑی سبکی ہو گی۔“

ارسلان بیگ، میرے ذہن میں چھٹکا سا ہوا، اسی نام کا شخص تو صمد یار خاں کی بیوی کا عاشق نامراد تھا۔ پھر باقی باتیں جو منشی نے کی تھیں، وہ تو میں نے نظر انداز کر دیں اور بولا۔ ”برخوردار ارسلان بیگ اس وقت کہاں ہو گا؟“

”میں اسے گھر ہی پر چھوڑ کر آیا تھا سرکار!“ منشی تفضل بیگ نے جواب دیا۔

منشی کے جواب سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ارسلان بیگ اسی کا بیٹا ہو گا۔

”ایک بات بتائیں منشی جی کہ ہماری بیگم صاحبہ سے پہلے آپ ہی کے برخوردار ارسلان بیگ کی معنی ہوئی تھی نا؟“ میں نے یہ کہہ کر منشی کے چہرے کا جائزہ لیا۔

منشی کے جھریوں بھرے باریش چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر وہ ہٹلانے لگا۔ ”سر..... سرکار کو یہ..... یہ بات کک..... کس نے بپ..... بتا دی؟“

”کس نے ہمیں یہ بات بتائی یا کیسے ہمیں یہ راز معلوم ہوا، اس ذکر کو چھوڑو منشی جی! ہم نے تم سے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب دو۔“

”جج..... جی..... جی ہاں سرکار!“ منشی نے جیسے اقبال جرم کر لیا۔ ”مم..... مگر یہ..... یہ بات تو گھر سے با..... باہر نہیں نکلی..... نہ نکلے دی گئی تھی کک..... کہ کہیں سرکار کو خبر نہ ہو جائے۔“

”ہمیں خبردار کرنے والی خود ہماری بیگم صاحبہ ہیں۔ ان پر کوئی جن بھوت نہیں آتا البتہ تمہارا برخوردار ضرور حویلی میں آکر اچھل کود مچاتا رہتا ہے۔“

منشی کے پیر کاٹنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑا رہا تو ہچاجاز کھا جائے گا۔ غیبت یہ تھا کہ ”دربار عام“ اس وقت تک برخاست ہو چکا تھا۔ میرے پاس منشی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ منشی کی حالت دیکھ کر میں کرسی سے اٹھا اور اسے اپنے ساتھ اندر نشست گاہ میں لے آیا۔ خادموں کو میں نے تاکید کر دی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ وہ نشست گاہ انگریزی طرز پر سجی ہوئی تھی۔ وہاں شاید انگریز مہمان بھی آتے تھے جن کی خوشنودی کا خیال رکھا جاتا ہو گا۔

میں نے منشی کو ایک صوفے میں دھانس دیا اور خود سامنے دوسرے صوفے میں دھنس گیا۔

”دیکھو فشی جی! میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، اس کی وجہ سے لرزے یا کانپنے کی ضرورت نہیں۔ سچائی پر لاکھ پردے ڈال دو کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کے رہتی ہے۔ اس سے قطع نظر تمہارا برخوردار آدمی ہے کہ بندر؟ اس سوال سے ہماری مراد ہرگز تمہارے حسب نسب پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ ہے۔ آج ہی صبح صبح کا ذکر ہے کہ جب تمہارا برخوردار ہماری بیگم صاحبہ کی خواب گاہ سے نکل کر بھاگا اور ہم اسے پکڑنے دوڑے تو حویلی کے باغ میں گھسے ہی وہ ایسا غائب ہوا کہ مت پوچھو۔ ہم ٹاپتے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی درخت پر چڑھ کر ہی چار دیواری تک پہنچا ہو گا۔ ہمارا جسم بھاری ہے، پھر یہ کہ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنے کی مشق بھی نہیں۔ سو ظاہر ہے، منہ لٹکائے ناکام لوٹ آئے۔“

”اگر..... اگر اس بد ذات نے یہ جسارت کی ہے تو..... تو میں اسے ابھی جا کر گولی سے اڑائے دیتا ہوں۔“ فشی تفصل بیگم نمک حلائی کی رو میں آکر اپنے سخت جگر کو حویلی کی عزت و آبرو پر قربان کر دینے کے لئے فی الفور آمادہ ہو گیا۔ اسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ عشاق تو سر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ یا پھر اسے عشق کا براہ راست کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ غصے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

”دھیرج فشی جی! دھیرج۔“ میں نرمی سے بولا۔ ”تمہیں گھر جا کر اسے گولی مارنے کی ضرورت نہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اسے صفائی کا موقع دیا جائے۔ کیا خبر کہ وہ اپنے عشق میں واقعی سچا ہو۔ اگر ایسا ہو اور اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا تو ہرگز میں تمہیں گولی مارنے سے نہیں روکوں گا۔ ابھی کسی خادم کو بھیج کر اسے پیسے بلوائے لیتے ہیں۔“ پھر میں نے آواز دے کر ایک خادم کو بلایا اور فشی جی کے گھر بھیج دیا کہ ارسلان بیگ کو اپنے ساتھ لے کر آئے۔

مجھے یقین تھا کہ ارسلان بیگ کسی بھی صورت حویلی آکر اپنی موت کو دعوت نہیں دے گا۔ اس کی وجہ آج صبح پیش آنے والا واقعہ تھا۔ میں نے تو خیر اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن اسے تو معلوم تھا کہ تعاقب کرنے والا کون تھا۔ وہ فیروزہ کی خواب گاہ میں تھا۔ اس نے میری آواز بھی سنی ہوگی۔ پہلی بار اس کا تعاقب کیا گیا تھا۔ ان حالات میں وہ حویلی سے میرے بلاوے کی خبر پاتے ہی راہ فرار اختیار کر سکتا تھا۔ کوئی پھاند نے میں تو ماہر تھا ہی، اپنے گھر کی دیوار پھاند کر جدھر منہ اٹھتا بھاگ لیتا۔ دوسروں کی بیویوں سے عشق لڑانے والے عموماً بیویوں کے شوہروں کو دیکھ کر اس طرح بھاگتے ہیں جیسے کتے کا لانا پانی سے بھاگتا ہے۔ پھر صمد یار جیسے باجروت جاگیردار کی بیوی سے عشق لڑانا اور پھر اسی کی عمل داری میں رہنا تو اور بھی دل گردے کا کام ہے۔ سو یوں ارسلان بیگ کا لانا خون خرابے کے بغیر ہی نکل جاتا۔ اگر کہیں کسی طرف سے الجھتا بھی تو فشی تفصل بیگ حق نمک ادا کرنے میں کوتاہی نہ دکھاتا۔ وہ اگر بیٹے کو گولی نہ بھی مارتا تو کہیں نہ کہیں کھسکا ضرور دیتا کہ نکل لے بیٹا! آندھی آ رہی ہے جو تیرے ساتھ ہم سب کو بھی تنکوں کی طرح اڑا لے جائے گی۔ دراصل قصہ یہ تھا میں دو دلا ہو رہا تھا۔ ایک دل کتا، ابے علیا! کلاخیر کا یہ موقع نہ گنوا، دو پھڑے ہوئے دلوں کو مل جانے دے۔ دوسرا دل کتا کہ جھولی میں خود ہی گر آنے والے پھل کو ٹھکرا کر کفرانِ نعمت نہ کر۔ اگر صمد یار خاں کی بیوی فیروزہ مجھے اپنی پاک دامنی کا یقین نہ دلا دیتی تو شاید میرا دل دو ٹکڑوں میں بٹ کر بے ایمانی پر آمادہ نہ ہوتا۔

خادم کے لوٹ کر آنے تک فشی تفصل بیگ جیسے سولی پر لٹکا رہا۔ میں البتہ مطمئن تھا، لیکن اس وقت سارا اطمینان ہوا ہو گیا جب سارے ”سوچے سچائے“ پر پانی پھر گیا۔ دلیر عاشق جان ہتھیلی پر رکھ کر حاضر ہو گیا تھا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ اچھا بھلا خوبصورت جوان تھا۔ کم از کم صمد یار خاں سے تو زیادہ ہی دلچسپ و دلکش تھا۔

”کیوں بھی تم ہماری بیگم صاحبہ سے عشق کرتے ہو؟“ میں نے اس سے یہ سوال یوں کیا جیسے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہو یا یہ پوچھا ہو کہ صبح ناشتہ کر لیا تھا؟

”جی ہاں سرکار!“ اس نے نظرس جھکا کر جواب دیا۔

اسی وقت فشی تفصل بیگ اپنے ایک پیر سے جوتا اتار کر ارسلان بیگ کی طرف لپکا۔ ”ابے حرامزادے! تیری.....“

”خبردار فشی جی! اپنی جگہ شرافت سے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے ڈانٹ پلائی۔ ”مداخلت بے جا کے جرم میں ہم تمہیں کمرے سے باہر بھی پھینکا سکتے ہیں۔“

فشی ڈانٹ پی کر پھر دھم سے صوفے میں جا دھنسا۔ جوتا اس نے پھر پاؤں میں ڈال لیا تھا کہ پھر بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

”ارسلان بیگ! تمہیں اعترافِ جرم کی سزا معلوم ہے؟“ میں نے فشی کو ٹھنڈا کر کے پھر عاشق جاں باز کو مخاطب کیا۔

”اگر عشق کرنا جرم ہے سرکار تو یہ جرم آپ کی بیگم صاحبہ نے بھی کیا ہے سرکار!“ وہ بے دھڑک ہو کر بولا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، ہم انہیں بھی تمہارے ہی ساتھ گولی مار دیتے ہیں۔“ میں نے اس کے عشق کی گمراہی ٹاپنے کی خاطر ذرا سخت لہجے میں کہا کہ دیکھوں اب کیا کتا ہے۔ اس نے لپک کر میرے دونوں پیر پکڑ لئے اور گڑگڑانے لگا۔ ”خدا کے واسطے سرکار! بیگم صاحبہ سے کچھ نہ کہیں۔“

”کننے سننے کی اس میں کوئی بات نہیں، میں تو سیدھے سمجھاؤ گولی مارنے کی بات کر رہا ہوں۔ بیوی میری ہے اور دکھ تمہیں ہو رہا ہے، اسے گولی مارے جانے پر۔ میری بیوی ہے، میں اس کا چاہے اچار ڈالوں کہ گولی مار دوں، تم کون..... اور ابھی تو تم اسے بھی مجرمہ قرار دے رہے تھے۔ پھر اب ہوا کیوں کھسک رہی ہے؟“

”آپ سرکار! مجھے..... مجھے گولی مار دیں مگر..... مگر بیگم صاحبہ کو زندہ چھوڑ دیں۔“ وہ یہ کہہ کر رونے لگا۔

”جب چیزیاں کھیت چک جائیں تو پچھتانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو تم نے پہلے سوچا ہوتا کہ پرانی عورت سے عشق بازی نہیں کرنا چاہئے۔ بھلا یہ کوئی شرافت ہے؟“

پھر میں نے اسے ہر طرح ہلا جلا کر دیکھ لیا۔ وہ فیروزہ کے عشق میں اپنی جان دینے پر بخوش تیار تھا لیکن اس شرط پر کہ فیروزہ زندہ بچ جائے۔

”اچھا میرے پیر تو چھوڑو۔“ میں قدرے نرمی سے بولا۔

”نہیں سرکار! میں اس وقت تک آپ کے پیر نہیں چھوڑوں گا جب تک بیگم صاحبہ کی جان بخشی کا وعدہ نہیں کر لیں گے، چاہے آپ مجھے قتل کر دیں۔“ وہ اڑ گیا۔

”یار! تم تو بڑے ڈھیٹ قسم کے عاشق ہو۔ سنو تو سہی، اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔ ابھی تو بیٹی باپ کے گھر ہے، یعنی ہم نے مسات فیروزہ بیگم کو گولی نہیں ماری نہ اب تک تمہی کو قتل کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مسات اور تم نے حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ اپنے اپنے دامنوں پر گناہ کے دھبے نہیں لگائے۔“

”باللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ورنہ میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔“ اس موقع پر منشی تفضل بیگ چپ نہ رہ سکا۔

”منشی جی! تم اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ ہمیں برخوردار سے بات کرنے دو۔“ میں نے منشی کو خوش نہ ہونے دیا۔ ”تم اگر بلا اجازت بولے تو ہم غصہ و درگزر کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ تمہیں صرف یہ اجازت دی جا سکتی ہے کہ اپنے برخوردار کو ہمارے قدموں سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھالو۔“ منشی نے فوراً میرے حکم کی تعمیل میں اٹھ کر ارسلان بیگ کا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ ”سرکار کا حکم مان لے بد بخت!“

”مگر بابا! ابھی سرکار نے وعدہ تو کیا ہی نہیں۔“ ارسلان بیگ روہانسی آواز میں کہنے لگا۔

پھر ادھر تو میں نے زور لگایا، ادھر منشی نے جان لڑا دی۔ سو یوں میرے پیر ارسلان بیگ کی آہنی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ میں فوراً ہی صوفے سے اٹھا اور دُور جا کھڑا ہوا کہ وہ عاشق نامراد دوبارہ میرے پیر جکڑ کر نہ بیٹھ جائے۔ ظالم کی گرفت بہت ہی سخت تھی۔ دونوں باپ بیٹے بھی کھڑے تھے۔ انہیں رعب میں لینے کے لئے میں ڈپٹ کر بولا۔ ”بیٹھو۔“

”لل..... لیکن سر..... سرکار تو تشریف رکھیں۔“ منشی منمنایا۔

”ہم بیٹھ جاتے ہیں مگر اس شرط پر کہ تمہارا برخوردار اب ہمارے قریب آنے کی گستاخی نہیں کرے گا۔“

”ہرگز نہیں۔ اگر اب اس نے یہ ہمت کی تو جوتے مار مار کر ایک بال چاند پر نہیں چھوڑوں گا۔“ منشی نے مجھے یقین دلایا اور پھر دوبارہ ”تشریف رکھنے“ کو کہا۔

میں صوفے پر براجمان ہو گیا اور وہ دونوں بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”فرض کرو ارسلان بیگ کہ ہم تمہاری محبوبہ اور اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو تم اس سے شادی کر لو گے؟“ میں نے سوال کیا۔

میرے یہ غیر متوقع الفاظ گولی ہی طرح ان دونوں کے دلوں پر لگے ہوں گے ورنہ وہ اچھل نہ پڑتے۔

”یہ..... یہ آپ کیا..... کیا فرما رہے ہیں سرکار!“ ارسلان بیگ کی بجائے منشی بول اٹھا۔

”ہم نے تم سے نہیں، تمہارے بیٹے سے کچھ فرمایا ہے، اسے بولنے دو۔“

وہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو بولتا۔ شاید ہی کوئی عاشق نامرادیوں کبھی بامراد بنا ہو۔ ایسی باتوں پر یوں بھی جھوٹ کا گمان ہوتا ہے۔ ارسلان بیگ کی بولتی شاید اسی لئے بند ہو گئی تھی۔ اسے شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ سنا ہے خواب میں نہیں سنا۔

”بولو ارسلان بیگ! تمہیں مسات فیروزہ بیگم قبول ہے یا نہیں؟“ میں نے اس طرح پوچھا جیسے بوقت نکاح قاضی کسی دولہا سے سوال کرتا ہے۔ میں یہ سوال کرتے ہوئے بھول ہی گیا تھا کہ ابھی تو فیروزہ، صدر بار خاں کے نکاح ہی میں ہے۔ دو پھڑپھڑے ہوئے دلوں کے ملن کی گھڑیاں تو ابھی بہت دور ہیں۔ پہلے طلاق ہوگی، پھر عدت کے دن گزریں گے، اس کے بعد دولہا گھوڑے یا گھوڑی پر سوار ہو کر سہرا بانہ سے شہنائیاں بجواتا، طبلے کھڑکواتا دلہن کے گھر پہنچے گا وغیرہ وغیرہ، تب کہیں جا کے یہ بیل منڈھے پڑھے گی۔

پھر میرے بار بار یقین دلانے پر ارسلان بیگ نے ہابی بھر لی۔ میں دراصل اس عاشق صادق کو دیکھ کر اور پھر فیروزہ کے لئے اس کی تڑپ کو محسوس کر کے ایک بار پھر پلٹو ہو گیا تھا۔ میں نے کسی طرح اپنے بدکار دل کو سمجھا بھالایا کہ کار خیر میں روڑے نہ اٹکائے۔

کہتے ہیں کہ بن مانگے موتی لے اور مانگے لے نہ بھیجے۔ یہی مثل ارسلان بیگ پر صادق آگئی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے گل و گھزار دکھائی دے رہا تھا۔

پھر میں نے ان دونوں، یعنی منشی تفضل بیگ اور اس کے عاشق بیٹے ارسلان بیگ کو ٹھلا دیا کہ اچھے دقت کا انتظار کریں۔ جاتے جاتے وہ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے ابھی ابھی انہیں چھانسی کے پھندے سے اتار لیا گیا ہو۔ جن طریموں یا مجرموں کی سزائے موت معاف کر دی جاتی ہوگی وہ بھی شاید اتنے باغ و بہار نظر نہ آتے ہوں۔ یہاں تو سزا بھی معاف ہوئی تھی اور انعام میں ایک عدد حسین و نوجوان محبوبہ دل نواز بھی مل گئی تھی۔ مجھے ابھی یہ خوشخبری جسے میں نے خود ہی اپنے لئے ”بد خبری“ بنا لیا تھا، فیروزہ بیگم کو بھی سنانا تھی اس لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں حویلی کے اس حصے میں داخل ہوا جو فیروزہ کے لئے مخصوص تھا تو اس مرتبہ کوئی سرگرمی نظر نہ آئی۔ نہ کوئی خادم مجھے دیکھ کر سراسیہ ہوا، نہ کسی نے متوقع خطرے کی نشاندہی فرض سمجھی۔ غالباً سبھی کو علم ہو گیا تھا کہ میں نے اس جن پر قابو پالیا ہے جو ان کی بیگم صاحبہ کو آ آ کے ستایا کرتا تھا۔

صبح ہی صبح میں نے فیروزہ کو شب خوابی کے لباس میں دیکھا تھا۔ اس پر قسم یہ کہ وہ مذہال و بد حال تھی۔ اب جو سجا سورا دیکھا تو وہ مجھے کچھ اور بھی اچھی لگی۔ نہ اس کے چہرے پر تھوڑا سا غمناک غمناک آنکھوں میں میرے لئے نفرت تھی۔ کوئی جیسے میرے اندر سے بولا، فیصلہ ہو چکا اے علیا لیش! اب نہ بچھتا۔ حسرت انصاف کے پھیر میں آکر میں نے خود اپنے ہی خلاف فیصلہ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہونا چاہئے، میں نے اپنے باغی دل کو تسلی دی اور فیروزہ کے سامنے آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ مسہری پر سکتے سے نیک لگا کر بیٹھ چکی تھی۔

”کیا بات ہے تم کچھ فکر مند سے لگ رہے ہو؟“ گفتگو میں پہل اسی نے کی۔
 ”نہیں تو۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”دراصل میں تمہیں ایک خوشخبری دینے آیا تھا۔“
 ”کیسی خوشخبری؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہیں تمہارا پیار مل جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کچھ بھی سہی، اسے کھو دینے کا مجھے ملال تو تھا۔ پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”تو..... تو تم مجھے طلاق دے دو گے؟“ اس کے لہجے میں بے یقینی جھلک رہی تھی۔

”ہاں اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ تم اور ارسلان یک ایک ہو سکو۔“

”لیکن رسوائی..... اس میں تو تمہاری بہت رسوائی ہو گی۔ لوگ مجھے..... مجھے بھی رسوا کریں گے۔“ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

میں نے اسے سمجھایا۔ ”عشق کرنے والے رسوائی سے نہیں ڈرتے۔ پھر یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اس طرح تمہاری اور ارسلان کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔ رہا میری رسوائی کا معاملہ تو میں پہلے ہی کون سا نیک نام ہوں۔ لوگ زبان پر یہ بات لائیں نہ لائیں مگر مجھے ایک آوارہ مزاج جاگیردار ہی سمجھتے ہوں گے۔“

”تم اندر سے اتنے نرم و گداز ہو گے، تمہارے دل میں ایثار و قربانی کا اتنا بڑا حوصلہ ہو گا، یہ تو میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ میں تو دو سال تک بالکل اندھیرے میں رہی، کبھی تمہارے جذبات کو محسوس ہی نہیں کیا اور..... اور نہ تم نے مجھے یہ موقع دیا۔“ وہ پُر تاسف آواز میں بولی۔

”جو ہو گیا اسے بھول جاؤ فیروزہ کہ وقت کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔ اپنے والدین کے گھر جانے کی تیاری کرو کہ عدت کے دن وہیں گزار سکو۔“

”لیکن میں..... میں ان سے کیا..... کیا کہوں گی کہ تم نے مجھے کیوں طلاق دے دی؟“

”کہہ دینا کہ میری بدکرداری کے سبب تم نے خود مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔“ میں نے اسے راہ بھائی۔

”یہ..... یہ تو سراسر ظلم ہو گا تم پر، میں..... میں تم پر الزام نہیں لگا سکتی..... بالکل نہیں۔ یہ تو احسان فراموشی ہے۔ تم مجھ پر احسان کرو اور میں الزام لگا دوں۔“ اس کے الفاظ گواہ تھے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے شوہر سے علیحدگی کے لئے آمادہ ہے۔ مسئلہ صرف اتنا رہ گیا تھا کہ وہ الزام تراشی پر راضی نہیں تھی۔

”دوسری صورت میں مجھے تم پر الزام لگانا پڑے گا جو کسی طرح مناسب نہیں۔ عورت کی نسبت کسی مرد پر بدکرداری کے الزام کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اول تو یہ کہ مجھ پر تم جو الزام لگاؤ گی، وہ الزام نہیں حقیقت ہو گا، دوم یہ کہ اس کے باوجود کسی کو میرے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہو گی۔“ میری دلیل میں وزن تھا۔

تھوڑی دیر مزید سمجھانے بچانے کے بعد آخر وہ میری بات مان ہی گئی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں

پہری نیت بدل نہ جائے، فوری طور پر اسے طلاق دے دی۔

”یہ کیا..... کیا کر دیا تم نے صمد یار خاں!“ خلاف توقع وہ تقریباً جھج اٹھی۔

اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور بولا۔ ”کیوں؟ یہ بات تو طے ہو چکی تھی۔“

”مگر..... مگر اتنی جلدی تھی، میں..... میں نے تو کچھ اور..... اور ہی سوچا تھا۔

تمہارے ایثار و قربانی کا کچھ تو بدل مل جاتا۔ چند روز تو میں تمہاری خدمت کر لیتی..... تمہیں سکھ دے رہی جو..... جو صرف بیوی ہی سے مل سکتا ہے، کسی داشتہ سے نہیں۔“

”ایثار و قربانی کا کوئی بدل نہیں ہوتا فیروزہ! جن کی قسمت میں ازدواجی سکھ اٹھانا لکھا ہوتا ہے، وہی یہ سکھ اٹھاتے ہیں، مجھ جیسے آوارہ مزاج نہیں۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ

گیا کہ کہیں نیکی برباد اور گناہ لازم نہ ہو جائے۔ چلتے چلتے میں نے کہا۔ ”خدا حافظ فیروزہ!“

”خدا حافظ!“ اس کی لرزتی ہوئی آواز جواب میں ابھری۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور پھر تیز قدمی سے خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆=====☆=====☆

اسی شام حویلی کا وہ حصہ خالی ہو گیا جہاں صمد یار خاں کی بیوی فیروزہ رہتی تھی۔ وہ اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ اس پر جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بوجھ میرے سینے سے اتر گیا ہو۔ ایسا کوئی ایثار میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ بااختیار ہو کر اپنے اختیار کو استعمال نہ کرنے والے یا تو بے وقوف ہوتے ہیں یا درویش صفت۔ مجھے درویشی کا دعویٰ تو ہرگز نہیں کہ ایک سیاہ کار جن ہوں البتہ بے وقوف ہونے کے امکانات پر ضرور غور کیا جاسکتا ہے۔ پھر بھی فیروزہ کے معاملے میں اپنی بے وقوفی پر خوشی سی ہوئی۔ یوں لگا جیسے میں نے کسی قیدی پرندے کو آزاد کر دیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے اندر ہی اندر مجھ میں ایک تبدیلی سی رونما ہو رہی تھی۔ اپنی بے وقوفی پر خوش ہونا بھی شاید اسی تبدیلی کا حصہ تھا۔

صمد یار خاں کے خادمان خاص میں سے ایک گھاگ قسم کے ادھیڑ عمر خادم لطیف نے کوئی جوان و حسن خادمہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دن ڈھلے وہ مجھ سے آکر ملا۔ میں نے نشست گاہ میں اس سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا۔ ”سرکار! لڑکی کے باپ کو میں نے راضی کر لیا ہے۔ رہنے سننے، کھانے پینے اور کپڑوں لٹوں کے علاوہ پورم پٹ پچاس روپے مہینہ تنخواہ کم نہیں ہوتی۔ مجھے یقین تھا سرکار کہ وہ لالچ میں آ جائے گا اور یہی ہوا۔ میں نے فوراً اسے بیس روپے پیشگی تنخواہ دیے کہ زبان سے پھر نہ جائے۔“ یہ کہتے ہوئے لطیف کے لہجے میں داد طلبی تھی۔

میں نے یہ ”کارنامہ“ انجام دینے پر اسے خیر داد تو نہیں دی، ہاں یہ ضرور پوچھا۔ ”لڑکی کہاں ہے؟“

”اس کے باپ سے میں نے مزید تیس روپے دینے کا وعدہ کیا ہے کہ پوری ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی ہو جائے۔ سرکار کا حکم ہو تو تیس روپے ادائیگی کر کے لڑکی کو لے آؤں۔“

”دس روز بعد ہی وہ چل بسی اور پھر میرے سوتیلے باپ کا ارادہ بدل گیا۔“

”تمہارا سوتیلا باپ کیا کرتا ہے؟“

”شراب پیتا ہے اور جوا کھیلتا ہے۔“ شیخ نے جواب دیا۔

”اور اس نے تمہیں کیا کی ڈال دیا؟“

میرے اس سوال کا جواب شیخ کا جھکا ہوا سر تھا۔ اس کے بعد میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ پوچھنے کو رہا بھی کیا تھا۔ خواب گاہ میں اسی لڑکی یا عورت کی آمد سے پہلے میرے دل میں جذبات کا جو طوفان نہ رہا تھا، ایک دم جیسے ختم گیا۔ اس کی جگہ غصے نے لے لی۔ غصہ مجھے اس مجبور و بے بس لڑکی پر نہیں، اس کے بے غیرت سوتیلے باپ پر تھا۔

”آج تو پورے پچاس روپے لئے پر تمہارا سوتیلا باپ بے انتہا خوش ہو گا۔“ میں شیخ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔

”پچاس روپے..... میرا سودا تو پچیس روپے مہینہ پر ہوا ہے۔ میں بس اتنا ہی سن سکی تھی، باقی اپنی آپ کے کارندے اور میرے سوتیلے باپ صابر نے دھیمی آواز میں کی تھیں۔“

شیخ کی اس بات سے ایک اور عقدہ کھلا۔ صمد یار خاں کے خادمان خاص بھی پہنچے ہوئے ”فقیر“ تھے۔ میرا غصہ دگنا ہو گیا۔

میں غصے کے عالم میں اٹھا تو شیخ کچھ اور ہی سمجھی۔ اس نے سہم کر کہا۔ ”سرکار! کیا مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں؟“

”نہیں، ہم تم سے خفا نہیں ہیں۔ تم بیٹھو، ہم ابھی آتے ہیں۔“ یہ کہتا ہوا میں خواب گاہ سے نکل آیا۔

ابھی رات کا پہلا ہی پرتھا اور حویلی میں چل پھل تھا۔ میں نے ایک خادم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے لطیف کے بارے میں معلوم کیا۔

”سرکار! ابھی کچھ ہی دیر پہلے انہیں میں نے حویلی کے دوسرے حصے میں جاتے دیکھا تھا جو آج ہی ٹھم خالی ہوا ہے۔“ خادم نے بتایا۔

”وہاں وہ اس وقت کیا کرتے کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم سرکار! حکم ہو تو بلا لاؤں۔“

”ہاں، اس سے جا کر کہو کہ ہم نے اسے فوراً طلب کیا ہے۔ ہم نشست گاہ میں ہیں۔“

اس عرصے میں مجھے دیکھ کر ایک اور خادم بھی وہاں آ پہنچا تھا۔ وہ نشست گاہ کی طرف لپک لیا اور بال روشنی کر دی۔

میں نشست گاہ میں داخل ہو کر بحالت اضطراب ٹھٹھلنے لگا۔ یہ موقع صوفے میں دھنسنے کا نہیں تھا۔ لطیف کے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا چہرہ فق تھا۔ غالباً اس کا سبب فوری طلبی تھی۔ پہلے میں نے اس سے حویلی کے دوسرے حصے میں جانے کی وجہ پوچھی۔ میرا لہجہ سخت ہی تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی کی بجائے کوئی سامان خرید کر لانے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ یہ بات بھی میرے علم میں آچکی تھی کہ لطیف ہی صمد یار خاں کا گویا کل وقتی خزانچی تھا۔ ”کارہائے خاص“ کی درمیان مال خرچ کرنے کے لئے ہر وقت اس کے پاس کچھ رقم رہتی تھی۔ صمد یار خاں کی اجازت کے بعد اسے فنی تفصیل بیگ سے پرچی حاصل کرنا پڑتی اور پھر جاگیر کا قاعدہ خازن رقم ادا کر دیتا۔ آج ہی صبح کی خبر میٹنگ میں لطیف نے مجھ سے کچھ رقم اس میں منظور کرائی تھی تو مجھے ان باتوں کا علم ہو تھا۔

میں نے نیا نیا ایک زخم کھایا تھا، یعنی فیروزہ بیگم سے دست برداری قبول کر لی تھی اس لئے لطیف فوراً اجازت دے دی کہ لڑکی کے باپ کو مزید تیس روپے ادا کر دے۔

لطیف خوش خوش واپس چلا گیا۔

پھر اسی شب وہ لڑکی ”خدمت گزاری“ کے لئے میری خواب گاہ میں بھیج دی گئی۔ وہ میرے سامنے کسی سہمی ہوئی فاختہ کی طرح کھڑی تھی۔ صمد یار خاں کے خادمان خاص نے یقیناً اسے خدمت گزاری کے آداب اچھی طرح سمجھا دیئے تھے۔ میں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ حسین تو نہیں تھی قبول صورت ضرور تھی۔ عمر بھی پچیس سے کم نہ ہوگی۔ جسم پر موجود لباس گواہی دے رہا تھا کہ اس کا تعلق کسی غریب گھرانے سے ہے۔ وہ اگر کسی کھاتے پیتے گھر کی ہوتی تو شاید حسین دکھائی دیتی۔ غربت تو حسن کو بد صورتی میں بھی بدل دیتا ہے۔ وہ تو پھر قبول صورت تھی۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”بن..... بندی کا نام شیخ ہے سرکار!“ وہ لرزیدہ سی آواز میں بولی۔

”تم اس قدر ڈری ڈری سی کیوں ہو؟ آؤ، ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ کانپتے قدموں سے آگے بڑھی اور نیچے فرش پر بچھے قالین پر میرے پیروں کے قریب بیٹھ گئی۔

”ادھر نہیں ادھر۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے جھک کر اس کا بازو تھام لیا۔

وہ میرے قریب مسسری پر بیٹھ گئی تو میں نے اس سے نرمی کے ساتھ خوف کی وجہ پوچھی۔

میری نرم گفتاری نے اثر دکھایا۔ اس کے چہرے سے خاصی حد تک خوف کے سامنے چھٹ گئے۔

پھر وہ کہنے لگی۔ ”میرے سوتیلے باپ نے آج سے پہلے کبھی مجھے اتنے بڑے گھر میں رات گزارنے کے لئے نہیں بھیجا اور..... اور نہ اس سے پہلے میں نے کوئی ایسا کمرہ دیکھا۔“

میں اس کا جواب سن کر چونک اٹھا۔ ایک ہی جملے میں جیسے اس نے اپنی روداد زندگی بیان کر دی تھی۔

”لیکن مجھے تو تمہارے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ کسی سے نکاح کے بعد تمہیں طلاق ہو گئی تھی۔“

”طلاق ہوئی نہیں تھی بلکہ میرے سوتیلے باپ نے لڑکے والوں کو مجبور کر کے رخصتی سے پہلے خود ہی طلاق لی تھی۔“

”اگر اسے یہی کرنا تھا تو اس نے تمہارا نکاح ہی کیوں کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”میری ماں کے مجبور کرنے پر وہ میری شادی کر دینے پر راضی ہوا تھا۔ ماں بیمار تھی۔ میرے نکاح

”صفا..... سرکار! صفائی..... وہاں کی صفائی کرا رہا تھا۔“ اس نے بات بتاتا چاہی مگر نہیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

”سچ بتا، اس وقت کیا کر رہا تھا وہاں؟“ میں اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔

”آپ..... آپ تو جانتے ہیں سرکار کہ..... کہ مجھے چوسر کھیلنے کا شوق ہے۔ سو وہاں منظر جمالی تھی۔“ اس نے چالپوسی کے انداز میں دانت نکال دیئے۔

”اور کون کون سے کھیل کھیلنے کا شوق ہے تجھے؟“ میں نے چپتے ہوئے لمبے میں سوال کیا۔ ”تجھے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا شوق بھی تو ہے۔“

”نہن..... نہیں تو سرکار.....! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مم..... میرے کسی دشمن نے آپ سے لگائی بجھائی کی ہو گی۔“ وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر ہنستا گیا۔ ”میں تو ایک ایک پیچہ کا حساب.....“

”جانتا ہوں میں، تو کتنا ایماندار ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی، پھر سخت آواز میں پوچھا۔ ”لڑکی کے سوتیلے باپ صابر کو تو نے کتنے روپے دیئے تھے؟“

پہلے تو وہ بدستور جھوٹ بولتا رہا، پھر شاید اسے میری سخت گیری سے اندازہ ہو گیا کہ جھوٹ سے کام نہیں چلے گا تو اس نے میرے پیر پکڑ لئے۔

”غلطی ہو گئی سرکار! آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

استفسار پر معلوم ہوا کہ صابر کو اس نے سناٹ لیا تھا۔ صابر، خازن سے ہر مہینے پچاس روپے کا وصول کر کے انگوٹھا لگاتا اور لطیف بعد میں اس سے پچیس روپے لے لیتا۔ بندوبست ایسا تھا کہ لطیف کی چوری نہ پکڑی جاتی۔ ایک آدم زاد کا مال تھا جسے دوسرے آدم زاد مل بانٹ کر کھا رہے تھے۔ میری گرا سے کچھ نہیں جا رہا تھا اس لئے میں نے لطیف کی غلطی معاف کر دی۔ معلوم نہیں وہ ایسی اور کتنی غلطیاں کر چکا تھا، میں نے ان کے بارے میں پوچھنا ضروری نہیں سمجھا، صرف ڈانٹ پھینکا کر چھوڑ دیا۔ ہاں میں نے اسے یہ حکم ضرور دیا کہ کل صبح شمع کے سوتیلے باپ صابر کو میرے سامنے پیش کرے۔ میرے نزدیک نہ صمد یار خاں شریف تھا، نہ اس کے کارندے۔ سبھی ایک ہی تھیلی کے پٹے بٹے تھے۔ رہے، صابر بچے بے ضمیر لوگ تو ان کی گرفت ضروری تھی۔

اس معاملے سے نمٹ کر میں خواب گاہ میں لوٹ کر آیا تو شمع کو متشکر پایا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسسری سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس پر مجھے بہت رحم آیا۔ اتنی سی عمر میں اس نے نہ جانے کتنے مردوں کے غرض مند چہرے دیکھتے تھے۔ کتنوں کے تصرف میں رہی تھی۔ غرض مند میں بھی تھا مگر میرے ضمیر نے اس کی مجبور یوں کا سودا کرنا گوارہ نہیں کیا۔ میں خود کو پتھر نہ بنا سکا۔ میرے اندر تبدیلی غیر محسوس طور پر پیدا ہو رہی تھی، شاید یہ اسی کا رد عمل تھا۔

”شمع! تم جاؤ اور آرام کرو۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”کیا سرکار! مجھ سے کوئی خدمت نہیں لیں گے؟“ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ نظریں نیچی

نہیں، اس میں شاید ابھی پیشہ ورانہ بے باکی نہیں آئی تھی۔

”نہیں، ہمیں کسی خدمت کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔

”کیا میں، سرکار کے معیار پر پوری نہیں اترتی؟ سرکار! مجھے نوکری سے نکال دیں گے؟ اگر..... ایسا ہوا تو وہ..... وہ میرا سوتیلے باپ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”ڈرو مت، تمہیں نوکری سے نہیں نکالا جائے گا۔ تم اسی حویلی میں رہو گی۔ نہ اب تمہارا سوتیلے باپ تم پر ظلم کر سکے گا۔ تمہاری تنخواہ پچاس روپے مہینہ ہی ملے گی گنتی ہے۔ یہ تنخواہ اب خود تمہی وصول کیا کرو گی۔ صابر سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ تمہیں زبردستی یہاں سے نہیں لے جاسکتا۔ ہاں یہ ضرور بتا دو کہ تم اس حویلی میں بخوشی رہنے پر آمادہ بھی ہو یا نہیں؟ اب تک تم پر بہت جبر کیا جا چکا ہے۔ تمہارے حالات کے پیش نظر ہمیں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیں رہو لیکن اپنی مرضی سے، زبردستی نہیں۔“

تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے وہ غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کسی خدمت کی انجام دہی کے بغیر سب کچھ حاصل ہو جانا یقیناً اس کے لئے حیران کن ہی رہا ہو گا۔

”میں..... میں راضی ہوں سرکار!“ آخر اس نے کہہ ہی دیا، پھر پوچھا۔ ”لیکن میں..... میں ہال رہ کر کیا کام کروں گی؟“

”میری خواب گاہ کی دیکھ بھال، صفائی اور دیگر متعلقہ کام تمہارے سپرد ہوں گے۔ تفصیل تمہیں میرے خادم سمجھا دیں گے۔ تم ہماری خادمہ خاص کلاؤ گی۔“ میں نے بتایا۔ جو کام اسے میں نے بتائے تھے، ان کے لئے بہر حال کسی نہ کسی خادمہ کی ضرورت تھی۔ یہ خدمات پہلے جو خادما میں انجام دیتی تھیں، نہیں پہلے ہی میرے حکم پر وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

شمع کے چہرے سے میں نے اندازہ لگایا وہ اب کسی قدر مطمئن ہو چکی ہے۔ ایک عورت جو تحفظ پاتی ہے، اسے مل چکا تھا۔

”اُڑل تو اس حویلی میں موجود کسی بھی شخص کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ تمہاری طرف میلی نظر فائے، پھر بھی اگر تم کبھی ایسا محسوس کرو تو بلا تھجک مجھے بتا دینا۔“

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا، پھر مجھ سے اجازت چاہی۔ ”تو میں جاؤں؟“

اسے میں نے جانے کی اجازت دے دی۔ حویلی کا ایک حصہ خادموں اور خادماؤں کے لئے فرم تھا۔ لطیف نے اسے بھی وہیں ایک کمرہ دے دیا تھا۔ سو وہ چلی گئی۔

دوسرے روز صبح شمع کے سوتیلے باپ صابر کو میرے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ مدقوق سادھو، عمر محض لہجہ سے عیاری کی بجائے مظلومیت جھلکتی تھی۔ اس پر مجھے تعجب ہوا۔ لطیف نے غالباً پہلے ہی سے طبی کے سبب سے آگاہ کر دیا تھا۔ مظلومیت کے علاوہ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں بھی مل۔

خفی کے ساتھ پوچھ گچھ کرنے پر اس سے شمع کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ سچ بولنے پر میرے دل

میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

”تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی کام ہو سرکار! تو کروں بھی۔ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس پر سرکار کے کارندوں نے قبضہ کر لیا تھا توڑی بہت کاشت کر کے پیٹ کا دوزخ بھر لیتا تھا، وہ بھی نہ رہا تو.....“ اس نے اپنا ہاتھ اٹھوڑا چھوڑ کر کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

فشی تفصل بیگ بھی موجود تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”سرکار ہی کے حکم پر ایسا کیا گیا تھا۔“ فشی بول اٹھا۔ ”صابر کی زمین کا وہ ٹکڑا ہماری زمینوں کے درمیان میں تھا۔ اسے زمین کے اس ٹکڑے کی رقم ادا کر دی گئی تھی۔“

مزید چھان بین پر پتا چلا کہ ساری کارروائی محض کاغذی تھی۔ حقیقتاً صابر کو خانہ پری کے لئے تھوڑی سی رقم تصدیق گئی تھی، اتنی رقم کہ وہ دو تین ماہ تک گھریلو اخراجات برداشت کر سکے۔ تمام بات سامنے آنے کے بعد میں نے فیصلہ سنا دیا۔ ”آج ہی صابر کو اس کی زمین واپس کر دی جائے۔“

”لیکن سرکار! اس پر تو تیار فصل کھڑی ہے۔ دو چار دن میں فصل کی کٹائی ہوتا ہے۔“ فشی تفصل بیگ نے اپنی دانست میں مجھے نقصان سے آگاہ کیا۔

”تو کیا ہوا؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم نے جو حکم دیا ہے، اس پر فوراً عمل درآمد ہونا چاہئے۔“ میں نے حتیٰ لچے میں کہا۔

”بہتر ہے سرکار!“ فشی اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

کس طرح کچھ لوگ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں اور مجبوریاں آزادوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں، مجھے اس کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس روز بھی جتنے معاملات جاگیر کے متعلق میرے سامنے پیش کئے گئے، میں نے غریبوں کے حق ہی میں فیصلے دے کر صمد یار خاں کا کوڑا ایک اگلے دو روز بھی سکون سے گزرے۔ میں گویا دونوں ہاتھوں سے صمد یار خاں کی جاگیر لٹا رہا لگا تیسرے دن کی صبح میرے لئے ایک ہولناک خبر لے کر آئی۔ صمد یار خاں کی مطلقہ بیوی فیروزہ بیگم کو گزشتہ رات قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نامعلوم تھا۔ اطلاعات کے مطابق ان کے چہرے پر ڈھانے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے اس اطلاع پر بہت رنج ہوا اور پھر میں تحقیق حال کی غرض سے خود وہاں گیا۔ فیروزہ بیگم کے والدین کی کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی کہ اس قتل کو دشمنوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔ ہاں میں نے وہاں موجود لوگوں کے چروں اور نظروں سے اتنا ضرور محسوس کر لیا کہ فیروزہ بیگم کے قتل میں میرا ہی ہاتھ سمجھا جا رہا تھا۔ نیم پاگل سا ارسلان بیگ بھی مجھے وہیں نظر آیا۔ اس نے بھی زبان سے کچھ نہ کہا لیکن اس کی وحشت زدہ نظریں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میرے لئے وہاں مزید رکنا دشوار ہو گیا اور میں حویلی واپس چلا آیا۔

فیروزہ کے گھر سے لوٹے مجھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ خلاف توقع صمد یار خاں کا بڑا بھائی احمد خاں آن پکا۔ یہ وہی تھا کہ جس کی حویلی سے میں، صمد یار خاں کے جسم میں چھپ کر فرار ہوا تھا۔ اس کی

بہن کو دیکھنے عندلب مجھے ساتھ لے کر گئی تھی۔

اس وقت میں بڑی بے دلی کے ساتھ جاگیر کے ضروری معاملات نٹانے میں مصروف تھا۔ جاگیر کے تمام ہی متعلقہ کارندے میرے ارد گرد موجود تھے۔ احمد یار خاں منہ اٹھائے سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔ وہ صمد یار خاں کا بڑا بھائی تھا اس لئے میں نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

”صمد! ہمیں فوری طور پر خلوت میں تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے۔“ احمد یار خاں نے مجھے طلب کیا۔

میں نے اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے دیکھے تو کچھ کھٹکا کہ آخر بات کیا ہے۔ بہر حال میں اس کے ساتھ نشست گاہ میں آ گیا تھا۔ خادموں کو تاکید کر دی گئی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں۔

”تم نے ہمارے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ ہمیں حیرت ہے کہ تم سے ایک عورت نہ منہ پھائی گئی۔ تمہاری رسوائی کے قصے صرف ہماری جاگیر تک نہیں، دور دور تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے دشمن بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اس عورت کی زبان بند نہ کرا سکتے جو طلاق لے کر تمہیں بدنام کر رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی اسے طلاق دینے کی؟“ احمد یار خاں کی آواز میں غصہ بھی تھا، رنج کا عنصر بھی اور جواب طلبی کا انداز بھی۔ وہ ابھی تک بیٹھا نہیں تھا اس لئے مجبوراً مجھے بھی کھڑا رہنا پڑا۔

”آپ تشریف تو رکھئے، بھائی صاحب!“ یہ کہتے ہوئے میں معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا خاک بیٹھیں کہ تم نے تو ہمارے دل پر آرے چلا رکھے ہیں۔“ نشست گاہ کے طول و عرض کو ناپتے ناپتے وہ ایک صوفے پر بیٹھ ہی گیا اور بولا۔ ”ہمیں تم سے کسی ایسی حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ہم نے تم سے اس عورت کو طلاق دینے کی وجہ پوچھی ہے، وہ بتاؤ۔“

فیروزہ کو طلاق دینے کا جو سبب تھیں میں نے بیان کر دیا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ عورت بد کردار تھی۔ پھر تم نے یہ بات ظاہر کیوں نہیں کی؟“ ظاہر تو جب کرنا کہ واقعی وہ بد کردار ہوتی۔ اس کا دامن بے داغ تھا۔

”تو رسوائی سے بچنے کے لئے تم اسے زہر دے دیتے۔ اس شخص کو قتل کرا دیتے، تم سے شادی کے بعد بھی جسے وہ بھولی نہیں تھی۔“

”یہ سراسر ظلم ہوتا بھائی صاحب!“

”اور ہم پر جو ظلم ہوا ہے، اس کا حساب کون دے گا؟ تمہاری حماقت سے ہمارے خاندان کی جو بدنامی ہوئی ہے، اس کا بدلہ ہم کس سے لیں؟“

”آپ شاید فیروزہ کو قتل کرا کے یہ بدلہ لے چکے ہیں۔“ جو بات میرے دل میں تھی، زبان پر آ گئی۔

”ہاں، ہم نے اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کرائی ہے۔ جو قدم تمہیں اٹھانا چاہئے تھا، مجبوراً ہمیں اٹھانا پڑا لیکن اسے بدلہ لینا ہرگز نہیں کما جا سکتا۔“ احمد یار خاں نے بوئے فخر کے ساتھ فیروزہ

کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نامعلوم تھا۔ اطلاعات کے مطابق ان کے چہرے پر ڈھانے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے اس اطلاع پر بہت رنج ہوا اور پھر میں تحقیق حال کی غرض سے خود وہاں گیا۔ فیروزہ بیگم کے والدین کی کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی کہ اس قتل کو دشمنوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔ ہاں میں نے وہاں موجود لوگوں کے چروں اور نظروں سے اتنا ضرور محسوس کر لیا کہ فیروزہ بیگم کے قتل میں میرا ہی ہاتھ سمجھا جا رہا تھا۔ نیم پاگل سا ارسلان بیگ بھی مجھے وہیں نظر آیا۔ اس نے بھی زبان سے کچھ نہ کہا لیکن اس کی وحشت زدہ نظریں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میرے لئے وہاں مزید رکنا دشوار ہو گیا اور میں حویلی واپس چلا آیا۔

فیروزہ کے گھر سے لوٹے مجھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ خلاف توقع صمد یار خاں کا بڑا بھائی احمد خاں آن پکا۔ یہ وہی تھا کہ جس کی حویلی سے میں، صمد یار خاں کے جسم میں چھپ کر فرار ہوا تھا۔ اس کی

بہن کو دیکھنے عندلب مجھے ساتھ لے کر گئی تھی۔

اس وقت میں بڑی بے دلی کے ساتھ جاگیر کے ضروری معاملات نٹانے میں مصروف تھا۔ جاگیر کے تمام ہی متعلقہ کارندے میرے ارد گرد موجود تھے۔ احمد یار خاں منہ اٹھائے سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔ وہ صمد یار خاں کا بڑا بھائی تھا اس لئے میں نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

”صمد! ہمیں فوری طور پر خلوت میں تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے۔“ احمد یار خاں نے مجھے طلب کیا۔

میں نے اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے دیکھے تو کچھ کھٹکا کہ آخر بات کیا ہے۔ بہر حال میں اس کے ساتھ نشست گاہ میں آ گیا تھا۔ خادموں کو تاکید کر دی گئی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں۔

”تم نے ہمارے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ ہمیں حیرت ہے کہ تم سے ایک عورت نہ منہ پھائی گئی۔ تمہاری رسوائی کے قصے صرف ہماری جاگیر تک نہیں، دور دور تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے دشمن بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تم اس عورت کی زبان بند نہ کرا سکتے جو طلاق لے کر تمہیں بدنام کر رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی اسے طلاق دینے کی؟“ احمد یار خاں کی آواز میں غصہ بھی تھا، رنج کا عنصر بھی اور جواب طلبی کا انداز بھی۔ وہ ابھی تک بیٹھا نہیں تھا اس لئے مجبوراً مجھے بھی کھڑا رہنا پڑا۔

”آپ تشریف تو رکھئے، بھائی صاحب!“ یہ کہتے ہوئے میں معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا خاک بیٹھیں کہ تم نے تو ہمارے دل پر آرے چلا رکھے ہیں۔“ نشست گاہ کے طول و عرض کو ناپتے ناپتے وہ ایک صوفے پر بیٹھ ہی گیا اور بولا۔ ”ہمیں تم سے کسی ایسی حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ہم نے تم سے اس عورت کو طلاق دینے کی وجہ پوچھی ہے، وہ بتاؤ۔“

فیروزہ کو طلاق دینے کا جو سبب تھیں میں نے بیان کر دیا۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ عورت بد کردار تھی۔ پھر تم نے یہ بات ظاہر کیوں نہیں کی؟“ ظاہر تو جب کرنا کہ واقعی وہ بد کردار ہوتی۔ اس کا دامن بے داغ تھا۔

”تو رسوائی سے بچنے کے لئے تم اسے زہر دے دیتے۔ اس شخص کو قتل کرا دیتے، تم سے شادی کے بعد بھی جسے وہ بھولی نہیں تھی۔“

”یہ سراسر ظلم ہوتا بھائی صاحب!“

”اور ہم پر جو ظلم ہوا ہے، اس کا حساب کون دے گا؟ تمہاری حماقت سے ہمارے خاندان کی جو بدنامی ہوئی ہے، اس کا بدلہ ہم کس سے لیں؟“

”آپ شاید فیروزہ کو قتل کرا کے یہ بدلہ لے چکے ہیں۔“ جو بات میرے دل میں تھی، زبان پر آ گئی۔

”ہاں، ہم نے اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کرائی ہے۔ جو قدم تمہیں اٹھانا چاہئے تھا، مجبوراً ہمیں اٹھانا پڑا لیکن اسے بدلہ لینا ہرگز نہیں کما جا سکتا۔“ احمد یار خاں نے بوئے فخر کے ساتھ فیروزہ

کو قتل کرانے کا اقرار کیا، پھر کہنے لگا۔ ”تمہارے متعلق چند روز میں ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں، غلط معلوم نہیں ہوتیں۔ تم یقیناً اب وہ پہلے والے صدمہ نہیں رہے کہ جس پر ہمیں ناز تھا۔ یہ جاگیر جو ہمارے آباد اجداد نے بڑی محنت سے حاصل کی تھی، تم اسے تباہ کر رہے ہو۔ بولو کیا یہ صحیح نہیں؟“

میں اس تصدیق کے بعد کہ احمد یار خاں ہی نے بے گناہ فیروزہ کو قتل کرایا ہے، کھول اٹھا تھا۔ پھر مزید جواب طلبی کے نتیجے میں مجھے اور بھی غصہ آگیا۔

”بھائی صاحب! یہ میری جاگیر ہے، آپ کی نہیں۔ میرے معاملات میں مداخلت کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہہ دیا۔

”وٹو..... تو یقیناً میرا بھائی نہیں ہے۔ کل رات تیرے بارے میں عندلب بیگم نے جو کچھ کہا تھا، سچ ہی لگتا ہے۔“

عندلب..... میرے ذہن میں چھٹکا ماما ہوا۔ میں نے خطرے کی بوسو گھ لی۔

”وہ اپنے شوہر شہرار کی تلاش میں کل دوبارہ آئی تھیں۔“ احمد یار خاں خود ہی بتائے جا رہا تھا۔ ”انہی کے سامنے مجھے اپنے آدمیوں سے تیرے متعلق مختلف اطلاعات ملیں۔ عندلب بیگم نے اس شے کا اظہار کیا تھا کہ میرے بھائی کے جسم پر شاید کسی جن زاد نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب..... اب مجھے یقین.....“

پھر احمد یار خاں نے مزید اور کیا کہا، یہ سننے کے لئے میں دہاں رکا نہیں۔ میں اٹھ کر نشست گاہ کے دروازے کی طرف بھاگا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں، عندلب کے کسی متوقع پراسرار حملے سے بچنے کے لئے فوری طور پر صدمہ یار خاں کا جسم نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”پکڑو..... اسے پکڑو! یہ بہرہو میرا بھائی صدمہ یار خاں نہیں ہے۔“ احمد یار خاں چیختا ہوا میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

حویلی کے صدر دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے اچانک عندلب پر میری نظر پڑی اور جیسے کسی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

اب مزید آگے بڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ عندلب یقیناً اپنے شے کی تصدیق ہی کے لئے احمد یار خاں کے پیچھے پیچھے آئی تھی کہ اگر اس کا شبہ درست ثابت ہو تو وہ مجھے قابو میں کر لے۔ میں دوبارہ اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر رہائی مشکل ہی ہوتی۔ عندلب کو میں نے صدر دروازے سے داخل ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی یا نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان بہر حال ابھی خاصا فاصلہ تھا۔ آزادی اور غلامی کے درمیان بھی صرف چند ہی لمحے تھے۔ میں نے ان چند لمحوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔

حویلی ہی کی حدود میں صدر دروازے کے قریب دائیں جانب اصطبل تھا۔ میں نے اس طرف دوڑا لگا دی۔ پھر اصطبل کا گھراں یہ کتا ہی رہ گیا کہ سرکار! میں ابھی گھوڑے پر زین کس کر لاتا ہوں مگر میں اتنی دیر میں ایک گھوڑا کھول کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس عرصے میں اصطبل کا گھراں صرف لگا

فراہم کر سکا۔ یہ بھی غنیمت ہوا ورنہ گھوڑے پر سفر کرنا میرے لئے محال ہو جاتا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سر جھکائے ہوئے اصطبل کے عقبی دروازے سے باہر آگیا کیونکہ اس طرف کے دروازے کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔

اس حویلی کا تفصیلی جائزہ لینا میرے کام آگیا ورنہ شاید میں دہاں سے نکل نہ پاتا۔ اصطبل کے عقب میں ایک تنگ سا راستہ حویلی کے پیچھے چلا گیا تھا۔ تنگی کے باوجود اس راستے پر گھوڑا دوڑانا محال ثابت نہ ہوا۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ احمد یار خاں سے اگر عندلب کو حقیقت کا علم ہو جاتا تو وہ یقیناً میرا پیچھا کرتی۔ میں اسی لئے جلد از جلد دہاں سے دور نکل جانے کی فکر میں تھا۔ پھر جو ہوتا دیکھا جاتا۔ تھوڑا سا خطرہ مول لے کر میں صدمہ یار خاں کے جسم کو چھوڑ کے فوراً کسی اور آدم زاد کے جسم میں بھی پناہ لے سکتا تھا۔ اس طرح عندلب میری تلاش میں کامیاب نہ ہو پاتی۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ اس ہستی سے نکلے ہی مجھے دو گھڑ سوار مل گئے۔ وہ اپنے لباس سے ہندو معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھ کسی لڑکی کو بھی بٹھا رکھا تھا۔ میں ان دونوں کے قریب سے تیزی کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا ذرا آگے نکل گیا۔

جب تک میں، صدمہ یار خاں کے جسم میں رہتا، میرے لئے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک میری تلاش میں گھڑ سوار چل چکے ہوں گے۔ ان کے لئے صدمہ یار خاں کو پہچان لینا کون سا مشکل ہوتا! گھوڑے کو راستے کی ایک جانب دوڑاتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں گھڑ سوار بڑی سست رفتاری سے چلے آرہے تھے۔ انہیں شاید اپنی منزل تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ انہی کے عقب میں خاصے فاصلے پر مجھے دھول اڑتی دکھائی دی۔

میں نے اس فکر سے بے نیاز ہو کر کہ صدمہ یار خاں کا کیا ہو گا، ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ صدمہ یار خاں کے جسم سے نکل کر میں پیچھے کی طرف جھپٹا اور ان میں سے ایک گھڑ سوار کو دو بوج لیا۔ ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہونے تک مجھے انتہائی اذیت برداشت کرنا پڑی مگر یہ اذیت گرفتار ہو جانے سے بہر حال بہتر تھی۔

”یہ تجھے کیا ہوا آئند، بیٹھے بیٹھے جھکا کیوں کھا گیا؟“ دوسرے گھڑ سوار نے مجھے مخاطب کیا۔ اسی نے اپنے آگے ایک جوان لڑکی کو بٹھا رکھا تھا۔

فوری طور پر میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ جسم آئند نام کے کسی شخص کا ہے۔ میں، آئند کے رنگ و ریشے میں اتار گیا تو کچھ قرار آیا۔ ساتھی گھڑ سوار نے پھر اپنا سوال دہرایا تو پہلی بار میں، آئند کی آواز میں بولا۔ ”بس جھپکی سی آگئی تھی۔“

”رات کو تو پوری نیند سویا تھا، پھر اس وقت کیسے نیند آنے لگی یار!“ اس کے انداز گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آئند کا دوست ہو گا۔

”ٹھیک سے سو نہیں سکا، بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔“ میں نے یوں ہی بات بنا دی۔

اس وقت تک ہمارے گھوڑے سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے ہوئے صدمہ یار خاں تک پہنچ

چکے تھے۔ گھوڑا اسے گرا کر نہ جانے کدھر بھاک لیا تھا۔

”ارے او آئند یہ دیکھ کون پڑا ہوا ہے یہاں.....؟ کوئی مار کے نہ ڈال گیا ہو!“ ساتھی گھڑ سوار نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”اتر کر دیکھتے ہیں۔“

”کیس پاگل تو نہیں ہو گیا تو؟ یہاں رکنے کی ضرورت نہیں، تیز چلا چل! کسی پکڑ میں پھنس گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!“ یہ کہتے ہی میں نے اپنے گھوڑے کی پسیلوں پر دباؤ بڑھا دیا، اسی کے ساتھ مزکر دیکھا۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ ہم سے اب زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ بڑی تیزی سے آرہے تھے۔

میرا گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ ساتھی گھڑ سوار پیچھے رہ گیا، لیکن اب مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ میرے نزدیک وہاں سے جلد از جلد دور ہو جانا زیادہ ضروری تھا۔ وہ گھڑ سوار یقیناً صمد یار خاں کی تلاش میں امیر آباد سے چلے تھے۔ صمد یار خاں کو بے ہوش پڑے دیکھ کر وہ ہم سے بھی پوچھ گچھ کرتے۔ یہ امکان بھی تھا کہ شےبے میں مبتلا ہو کر وہ ہمیں بھی پکڑ لیتے۔ میں اسی سبب ساتھی گھڑ سوار سے آگے نکل آیا تھا۔ رک کر اس کے قریب آجانے کا انتظار حماقت ہوتی اور میں نے یہ حماقت نہیں کی۔

وہ کچا راستہ جس پر میں سفر کر رہا تھا، ایک پختہ سڑک سے آگیا۔ میں نے پختہ سڑک کے کنارے گھوڑا دوڑانا شروع کر دیا۔ گھوڑے کو اب سرپٹ دوڑانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ خطرے کی حدود بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے اسی لئے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔

ابھی میں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک سنگ میل پر نگاہ پڑی۔ اسی کے ساتھ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ شہر لاہور وہاں سے صرف گیارہ میل کے فاصلے پر تھا۔

پھر پیچھے سے مجھے ایک موٹر کار ہارن سنائی دیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال آیا جس پر میں نے فوراً عمل کیا۔ اس موٹر کے قریب آتے ہی میں نے آئند کے جسم کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ڈرائیور کے علاوہ اس موٹر میں دو افراد بچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں انہی میں سے ایک کے جسم میں داخل ہو گیا۔ وہ شخص کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا، عمر چالیس برس کے قریب ہو گی۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا آدمی لباس سے ہندو لگتا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس آدمی نے فوری طور پر مجھے مخاطب نہیں کیا۔ وہ دونوں شاید خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دوسرے آدمی کے چہرے سے ہٹا چل رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ بول ہی اٹھا۔ اس نے مجھے وکیل صاحب کہا تھا۔

”جی۔“ میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

”موقعہ واردات کا معائنہ کر کے آپ نے کیا اندازہ لگایا؟“ اس نے سوال کیا۔

”ابھی تو کوئی خاص اندازہ نہیں لگا سکا۔“ میں نے گول مول جواب دیا جو اس کے سوال ہی سے میرے ذہن میں آیا تھا۔

”میں اسی لئے تو آپ کو گاؤں لے کر آیا تھا۔“ اس نے کہا۔ پھر وہ نہ جانے کیا کیا باتیں لگا۔

”لاہور پہنچ کر اطمینان سے بات ہو گی۔ میں پہلے کسی نتیجے پر خود تو پہنچ جاؤں، تبھی تو آپ کو کچھ بتاؤں گا۔“ میں جان چھڑانے کے لئے بولا۔ ”ابھی مجھے سوچنے دیں۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب!“ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

”بیٹا! لاہور تو آنے دے، پھر دیکھو کہ تجھے اور تیرے اس وکیل کے جسم کو چھوڑ کر میں کس طرح نو دو گیارہ ہوتا ہوں!“ میں نے سوچا۔

لاہور کی اپنی ہی ایک کشش اور خوشبو ہے۔ جیسے جیسے شہر قریب آتا گیا میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگا۔ کتنے چہرے تھے جو میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ ان میں سب سے نمایاں چہرہ نرگس کا تھا۔ نرگس کے ساتھ ہی میری چشم تصور میں اس کے باپ مولوی کفایت اللہ کا منہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے لاجول پڑھی اور کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ہر چند کہ عندلب جو پہلے کبھی لٹا تھی، مجھے اسی شہر لاہور سے اغوا کر کے ریاست عظیم پور لے گئی تھی، لیکن اب میں اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس کی پراسرار قوتوں کے جال سے بچنے کے لئے اب مجھے کسی آدم زاد کے جسم میں چھپنے کی ضرورت نہ تھی۔ لاہور پہنچ کر مجھے گویا آزادی مل جاتی۔

وہ لمحہ بھی خدا خدا کر کے آتی گیا کہ جب موٹر شہر کی حدود میں داخل ہوئی۔ میں نے اس وکیل کے جسم کو چھوڑ دیا۔ ایک آدم زاد کے جسم کی قید سے آزاد ہو کر کچھ دیر تک میں توقع کے مطابق تکلیف کا شکار رہا اور پھر آزادی کے ساتھ کھلی فضا میں پرواز کرنے لگا۔

یہاں فضا میں جال نہیں پھیلے تھے کہ مجھے پر سمیٹ کر کسی آشیانے پر بیٹھنا پڑتا۔ یہ آشیانہ میرے لئے کسی آدم زاد کا جسم ہی تھا۔ خاصی دیر تک میں یونہی بلا مقصد گھومتا پھرتا رہا، پھر ایک طرف چل دیا۔ میرا رخ اس دیران مکان کی طرف تھا کہ جہاں میں اپنے جن زاد دوست یاسف کے ساتھ رہتا تھا۔

ابھی دھیر نہیں ہوئی تھی۔ میرا یہ خیال درست ہی نکلا کہ رات بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد یاسف اب تک سو رہا ہو گا۔ یاسف سے تفرق لینے کی خاطر مجھے شرارت سوچھی۔ میں نے اپنے منہ سے بڑی بھیاں آواز نکالی اور ایک دیوار کی آڑ میں چھپ گیا۔

سوئے سوئے یاسف اچھل پڑا اور پھر حیران پریشان سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک مرتبہ یاسف نے خود کو عفریت بتا کر مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں نے اسی کا بدلہ چکایا اور آواز بدل کر گویا گرجا۔ ”بھاگ جا یہاں سے کہ میں ایک عفریت ہوں۔ اس مکان میں اب میں رہوں گا۔“

مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ میرے جسم کی خوشبو سے یاسف کو وہاں میری موجودگی کا پتا چل جائے گا اور یہی ہوا۔ میری گرجدار آواز کے جواب میں وہ زور سے ہنس پڑا، پھر کہنے لگا۔ ”اے بے وفا علیا لیش! تو مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟ سامنے آ جا کہ میں تجھے پہچان گیا ہوں۔ تیرے جسم کی خوشبو میں کیسے بھول سکتا ہوں!“

میں دیوار کی آڑ سے نکل آیا اور وہ مجھ سے چپٹ گیا۔ گلے شکوے کرنے کے بعد اس نے حقیقت حال جاننے پر اصرار کیا اور بولا۔ ”مجھے اب بھی وہ رات یاد ہے کہ جب تو مجھ سے ٹھکر کر ایک حسین ترین آدم زادی لٹتا سے ملے گیا تھا۔“

”کیا تو یقین کرے گا اے یاسف کہ میں نے اس آدم زادی کو اپنی بیوی بنا لیا تھا!“

”پھر تو اے میرے یار، تو بڑا خوش قسمت ہوا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”ہمیں اس خوشی کے موقع پر تو نے بھلا ہی دیا!“

”وہ خوشی کا نہیں زبردستی کا موقع تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کیا تو اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا؟ کیونکہ جب میں اگلی رات بھلا سے ملا تو لتا ہاں نہیں تھی۔“ میں اپنی مرضی سے نہیں گیا بلکہ وہ مجھے اغوا کر کے لے گئی تھی۔ تجھے یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں آج اسی سے بمشکل جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“

اس کے بعد یاسف کو میں نے ایک ایک بات تفصیل کے ساتھ بتا دی، کچھ نہیں چھپایا۔ میری روداد کا آخری حصہ سن کر اسے زیادہ حیرت ہوئی۔ یہ حصہ صمد یار خاں سے متعلق تھا۔

”اے علیالیش! میں تیرے اندر ایک بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ تو آخر آدم زادوں کا ہمدرد کب سے ہو گیا؟ تو پہلے تو ایسا نہ تھا۔“ یاسف نے اپنی حیرت کا واضح اظہار کر ہی دیا۔

”ہاں خود مجھے بھی اس پر تعجب ہے اے یاسف! میرے اندر یہ تبدیلی کب اور کیسے آئی، میں نہیں جانتا۔ ہاں، مجھے یہ خبر ہے کہ بے غرض کسی کی مدد کر دینے سے ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ جس کا کوئی بدل نہیں۔ گزشتہ دنوں مجھے اس کا تجربہ کئی بار ہوا۔“ میں نے اسے بتایا۔

”یہ کوئی خاص بات نہیں، بس اتنا ہے کہ مجھ سے دور رہ کر تو کچھ خراب ہو گیا ہے۔“ یاسف دھیرے سے ہنسا۔ ”بھائی دروازے کے دو چار پھیرے لگا کر تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہائے ظالم، تو نے یہ کیا ذکر چھیڑ دیا!“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”کچھ خیر خبر سنا ادھر کی، کیا حال احوال ہیں!“

”میں کیا تجھے کوئی پاگل جن زاد نظر آتا ہوں!“ یاسف بولا۔

”کیوں، اس میں پاگل ہونے کی کیا بات ہے؟“

”مجھے اپنے دیدہ و دل عزیز ہیں اور جان بھی، تو پھر اس گلی میں کیوں جاتا! ایک بار مرتے مرتے بچ گیا، یہی بہت ہے۔“

”وہ تو خیر میں بھی کڑی آزمائش سے گزر چکا ہوں۔ اے یاسف! عشق میں ایسے مقامات تو آتے ہی ہیں!“

”عشق تو نے کیا ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے کبھی یہ روگ نہیں لگا۔ ہاں، وہ جو تجھ سے عشق کرتی ہے، ایک مرتبہ شہر سے باہر رات کے وقت تجھے ڈھونڈتی ضرور مل گئی تھی، مگر اس کو بھی بہت دن ہو گئے۔ تو سمجھ گیا، ہمارا کہ میں کس کا ذکر کر رہا ہوں!“

”ہاں، سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”تو عالم ہاموس کی بیٹی جن زادی وازعہ کی بات کر رہا ہے۔ اس کا ذکر چھوڑ اور یہ بتا کہ میرے ساتھ بھائی دروازے چل رہا ہے؟ کم از کم اس مولوی زادی کی ایک جھلک تو دیکھ ہی لیں کہ جس نے جن زادوں کو بھی دیوانہ بنا رکھا ہے!“

”تجھے اس کی جھلک دیکھنے کا شوق ہے تو خود اکیلا ہی چلا جا۔ ابھی میں کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔“

یاسف نے جواب دیا۔ ”دن ڈھلے تک لوٹ آئے گا نا؟“ جواب دے کر وہ پوچھنے لگا۔

”ہاں۔ امید تو ہے کہ زیادہ دیر نہیں ہو گی۔“

”کسی آدم زادی کے ہاتھوں اغوا ہونے کا تو اب خطرہ نہیں؟“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

یاسف کی اس بات پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ میں نے یاسف کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ”سن اب کچھ دن کے لئے بھلا سے کنارہ کشی کر لے۔ میں بھی اس کی طرف نہیں جاؤں گا۔ ممکن ہے، میری تلاش میں عندیاب کسی روز وہاں آجائے۔ ایک جن زاد ہونے کے ناتے وہ تجھے بھی کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

”تو نے اچھا کیا کہ بتا دیا، میں ادھر جانے سے گریز کروں گا اور ہاں، ایک بات مجھے بھی تجھ سے کہنا تھی۔ ممکن ہے خبیث مولوی کفایت اللہ نے ہم دونوں میں سے کسی کو زیر دام لانے کے لئے اب تک کوئی جال پھیلا رکھا ہو۔ تجھے ادھر جاتے ہوئے بہت محتاط رہنا پڑے گا، اے علیالیش!“

”معلوم نہیں تجھے میں نے بتایا تھا یا نہیں کہ وازعہ سے مجھے کیل دیے جانے والے کسی مکان میں داخل ہونے کا عمل معلوم ہو گیا تھا۔ اس عمل کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ کم از کم تین روز تک پاک صاف رہا جائے اور اس عرصے میں کسی بھی وقت کی نماز قضا نہ ہو۔ اسی کے بعد وہ عمل پڑھ کر اپنے آپ پر دم کیا جائے گا۔ جس روز بھی نے میں نے عمل کی یہ کڑی شرط پوری کر لی، کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ پھر میں جب چاہوں، زگرس سے ملنے اس کی حویلی میں داخل ہو سکتا ہوں۔“

”اے علیالیش! میرا دوستانہ مشورہ تیرے لئے یہی ہے کہ پہلے اس قابل ہو جا، یعنی عمل کر لے۔ پھر میں تجھے وہاں جانے سے نہیں روکوں گا۔“

”عمل کی شرط بھی تو بڑی مشکل ہے، یہ تو سوچ!“ میں بولا۔ ”پورے تین دن کم ہوتے ہیں کیا!“

”یہ تو ہے۔“ یاسف نے میری بات کی تائید میں کہا کہ وہ بھی مجھی جیسا تھا۔

☆=====☆=====☆

پھر یاسف تو سونے کے لئے لیٹ گیا اور میں بھائی دروازے کے لئے روانہ ہو گیا۔ میں کچھ ہی دیر میں وہاں جا پہنچا۔ وہ مانوس گلی کو چپے عرصہ دراز کے بعد کر عجیب سی خوشی ہوئی۔ دیر یار پھر دربار ہے! یہ سوچتا ہوا میں زگرس کی حویلی کے اوپر چکر لگانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ زگرس کا باپ مولوی کفایت اللہ دہبر کا کھانا گھر ہی آکر کھاتا ہے۔ کھانے کا وقت گزرے دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت حویلی میں مولوی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ سو میں بہت احتیاط کے ساتھ دھیرے دھیرے نیچے آیا اور درباری سے صحن میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ حویلی میں داخل ہونے کا خطرہ مول لینے سے میں نے بہر حال گریز کیا۔ ہر چند کہ اس واقعے کو کافی دن بیت چکے تھے جب میں مولوی کے کھینچے ہوئے نایدہ حصار میں قید ہو گیا تھا، پھر بھی احتیاط لازمی تھی۔ کیا خبر مولوی کی حویلی کتنے عرصے کے لئے کیل دی گئی ہو!

طلب صادق ہو تو بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں۔ زگرس کا دیدار ہو ہی گیا۔ وہ صحن میں ایک طرف رکھی گھڑوئی کی طرف بڑھتی دکھائی دے گئی۔ گھڑے پر رکھے ڈونگے سے اس نے پانی نکالا اور نقشیں

اجازت نہیں دوں گا!“
”ابے گھماڑا! غلطی کرتے ہوئے کوئی اجازت بھی لیتا ہے جو تو ایسی احمقانہ بات کر رہا ہے۔“ میں نے شری داستو سے سرگوشی کی۔

وہ ایک دم اچھل پڑا۔ مدینا اس وقت تک گئی نہیں تھی۔ وہ پوچھ بیٹھی۔ ”کیا ہوا سر؟“
”کک..... کک..... کک..... تم..... تم اپنی سیٹ پر جا کے بیٹھو۔“ شری داستو ہنسنے لگا۔
”تم اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی تو میں نے ایک بار پھر شری داستو کو مخاطب کیا۔“ غرور و تکبر چھوڑ دے ہندو بنے!“

”کون..... کون ہو تم؟ اور..... اور مجھے نظر کیوں نہیں آرہے؟“ شری داستو کی خوفزدہ آواز اتنی دھیمی تھی جیسے وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہو۔

”ابے او گاؤدی! کبھی کوئی آتما (روح) بھی کسی کو دکھائی دی ہے جو تجھے نہ چاہے گی! مجھ سے پوچھ رہا ہے، کون ہوں! کیا منہ پر طمانچہ کھا کر تو نے کوئی اندازہ نہیں لگایا! تجھے کیا یہ بھی خبر نہیں کہ بزرگ ہی بچوں کی غلطیوں پر انہیں سزا دیتے ہیں۔ تو نے بلا تصور اپنی افسری چھاننے کے لئے اس بے چاری لونڈیا کو ڈانٹ پلا دی حالانکہ پلانے کو اور بہت سی چیزیں بھگوان نے بنائی ہیں۔ مثلاً سوڈا واٹر، شربت اور وغیرہ وغیرہ! تجھے اتنا خیال بھی نہیں آیا کہ اس کی ماما (ماں) بیمار ہے! انسان بن انسان! دنیا میں کوئی بھلائی کا کام بھی کر لے کہ لوگ تجھے اچھے لفظوں میں یاد کریں ورنہ تو‘ رام نام ست ہے‘ کی صدائیں بلند ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے!“ میں جان بوجھ کر اس کی زبان‘ محاوروں اور اصطلاحات میں یہ تقریر اسے پلا رہا تھا۔ جب ہندوؤں کا ”دی اینڈ“ لگ جاتا ہے اور ان کی ارتھی‘ یعنی جنازہ اٹھا کر لے جاتے ہیں تو ”رام نام ست ہے“ زور زور سے کہتے ہیں۔ جواب میں دوسرے لوگ ست یعنی سچ بولنے کو عقل مندی بتاتے ہیں۔ کچھ ایسے الفاظ ہیں ”ست بولو.....“ وغیرہ! مسلمانوں میں ایسے مواقع پر ”مومنو! یہ آواز بلند کلمہ شہادت“ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ کسی ہندو یا مسلمان کے سامنے دہرا دو تو جتنا جھٹ اس کی آنکھوں میں کی ارتھی یا جنازے کے اٹھنے کا منظر گھوم جاتا ہے۔ میں نے بطور عبرت اسی غرض سے شری داستو سے یہ الفاظ کہے تھے کہ اگر وہ کچھ اور نہیں تو چشم تصور سے اپنی ارتھی اٹھتے ہوئے دیکھ کر عبرت پکڑ لے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”میں تیرے ایک پڑکے (جد امجد) کی آتما ہوں اور میرا مقصد تجھے نصیحت کرنا ہے کہ اپنا کمینہ پن چھوڑ دے! رام کے بھگت اور رحیم کے بندے سب ایک ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی دھرم (مذہب) آدمی سے آدمی کو نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ اب بھی اگر تو نہ بدلا تو میں تجھے پچھاڑ کے تیرا گلا دبا دوں گا!“

”نن..... نہیں!“ شری داستو بول اٹھا۔ ”بھگوان کی سوگند (قسم) اب سے کوئی ہندو ہو کہ مسلمان، سکھ ہو کہ عیسائی میں کسی پر اتیار چار (ظلم) نہیں کروں گا۔“

”تو پھر اسی خوشی میں اپنا دوسرا گال ادھر کہ حساب برابر ہو جائے۔ اب تک جو تو اتیار چار کرتا رہا ہے اس کا ڈنڈ بھی تو بھگتنا پڑے گا!“

کٹورے میں پلٹنے لگی۔ اسے دیکھ کر جیسے میرے وجود میں محبت کا ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا۔ میرے جذبات بے قابو ہونے لگے۔ اگر وہ اسی وقت پلٹ کر اندر دالان کی طرف نہ چلی گئی ہوتی تو شاید میں ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کے قریب چلا جاتا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی جس کے دیدار کی آرزو مجھے یہاں بھیج لائی تھی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تو میں وہاں سے لوٹ آیا۔ میں نے واپسی میں اقبال کے متعلق سوچا، وہی جو نرسنگ کا محبوب تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے دسی عیسائی لڑکی ریٹا بھی یاد آئی اور پھر میرا رخ خود بخود ہی ایل ڈی اے، یعنی ادارہ ترقیات لاہور کی طرف ہو گیا۔ دفتر کا وقت ختم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اقبال کو میری ہی وجہ سے نیکشن انچارج بنایا گیا تھا۔ اس کے افسر شری داستو کی تنزیلی ہو گئی تھی۔ متعصب ہندو افسر شری داستو‘ اقبال کا ماتحت تھا۔ آخری بار جب میں یہاں آیا تھا تو یہی صورت حال تھی۔ مجھے اسی لئے شری داستو کو نیکشن انچارج کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اقبال شاید ٹائپل کے سبب اپنا عہدہ برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کہ اقبال کو عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ مجھے تو اس پر افسوس ہوا کہ شری داستو جیسا متعصب ہندو پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ میں نے اقبال پر نظر ڈالی تو وہ سر جھکائے کام میں مصروف تھا۔ ریٹا بھی اپنی کرسی پر بیٹھی دکھائی دی۔ بلا سبب بات بے بات مسکراتے رہنا ریٹا کی عادت میں شامل تھا، لیکن اس وقت وہ خلاف توقع مجھے اداس لگی۔ معلوم نہیں اس کی اداسی کی وجہ کیا تھی!۔

اپنا ک اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے شری داستو نے آواز لگائی۔ ”مس ریٹا! ادھر آؤ!“ شری داستو کے سامنے کچھ کانڈات رکھے تھے۔ اس نے کانڈات سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

ریٹا اپنی سیٹ سے اٹھ کر شری داستو کے سامنے پہنچ گئی اور بولی۔ ”جی سر!“
شری داستو نے تھوڑی دیر پر بل ڈال کر ریٹا کو مخاطب کیا۔ ”آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں یہ بات مار کر رہا ہوں کہ تم بھی اقبال کی طرح دماغ گھر رکھ کر دفتر آتی ہو!“

”میں نے آپ کو بتایا تو تمہارے میری جی کی طبیعت خراب ہے۔“ ریٹا نے جواب دیا۔
”تمہاری جی کی بیماری کا اس دفتر سے کوئی تعلق نہیں! کام کرنا ہے تو دماغ حاضر رکھو ورنہ میں اوپر والوں سے تمہاری شکایت کر دوں گا!“

شری داستو کا لہجہ تو جہن آ میز تھا اس لئے مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ ریٹا بہر حال میری محبوب نظر رہ چکی تھی۔ جواباً میں نے ایک عدد طمانچہ شری داستو کے رخسار پر ”عرض“ کر دیا۔ طمانچہ اتنا زور دار تھا کہ پورا کمر اس کی آواز سے گونج اٹھا۔ اسی کے ساتھ شری داستو اپنا رخسار سہلانے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں کیونکہ طمانچہ مارنے والا اسے نظر نہیں آیا۔ طمانچے کی آواز سن کر بھی شری داستو کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”کام کرو تم لوگ اپنا!“ شری داستو کے خوف پر غصہ غالب آ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ آواز سے لگنا مشکل نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے سارے کانڈات اٹھائے اور ریٹا کو دیئے۔ ”جہاں جہاں میں نے سرخ نشان لگائے ہیں، ان پیرا اگر انفر کو غور سے پڑھ کر دوبارہ لکھو! اس مرتبہ میں تمہیں غلطی کی

اس نے بڑی شرافت کے ساتھ اپنا بایاں رخسار آگے کر دیا اور میں نے بڑی شقاوت کے ساتھ دوسرا طمانچہ جڑ دیا۔

کمرے میں موجود شرعی داستوں کے ماتحت طمانچے کی گونج سے ایک مرتبہ پھر چونک اٹھے مگر اس بار شرعی داستوں نے انہیں نہیں ڈانٹا۔ اس خبیث روح کو راہ راست پر لانے کا مجھے یہی راستہ نظر آیا تھا کہ وہ آئندہ اپنے ایک پرکھے کی آتما سے ڈرتا رہے اور کسی کے ساتھ بدسلوکی نہ کرے۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ہی دن کو کسی 'دہ سیدھا ہو جائے گا۔

میراجی تو چاہ رہا تھا کہ ذرا دیر ایک سانولی سلونی لڑکی سے بھی چھیڑا چھاڑی کر لوں لیکن ریٹا ڈر جاتی اسی لئے ارادہ بدل دیا۔ یوں بھی وہ "اداس بلبل" بنی بیٹھی تھی۔ آدم زادیاں مجھے اس حالت میں ایک آنکھ تو کیا دونوں آنکھوں نہیں بھاتیں۔ جب تک وہ نہ نہیں اور ان کے منہ سے ایک خاص قسم کی آواز "قل قل" نہ نکلے مزا نہیں آتا۔ ایسی کم ہی ہوں گی کہ ان کی اداسی پر بھی سو جان سے قریاں ہو جائے کو جی چاہے۔ ریٹا کی اداسی سے قطع نظر مجھے اس دفتر میں ایک اور کام بھی تھا۔

جنات کو اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز صفات عطا کی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی آدم زاد کے جسم میں داخل ہوئے بغیر اس کی شکل و صورت بھی اپنا سکتے ہیں۔ دینی صورت، وہی جسم اور وہی آواز! جنات کے علاوہ فرشتوں کو بھی یہ صفت عطا کی گئی ہے کہ وہ کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ فرشتوں اور جنات میں فرق ہے۔ وہ جب کسی شکل میں ظہور کرتے ہیں تو انہیں کوئی زحمت یا اذیت نہیں ہوتی۔ ہاں، جنات کو کسی آدم زاد کی ہو ہو تصویر بننے ہوئے ایک خاص عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ عمل ہر حال تکلیف دہ ہے۔ اس کا سبب آگ اور مٹی کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً جنات کسی زندہ یا مردہ آدم زاد کی نقل مطابق اصل بننے سے کتراتے ہیں۔ میں اسی لئے اب تک کسی آدم زاد کی نقل نہیں بنا تھا کہ خدا جانے کس اذیت سے گزرنا پڑے۔ ہاں، فرضی صورتیں کئی دفعہ اختیار کی تھیں۔ اس میں مگدھا، گھوڑا، کتا، بلی، سانپ اور شیر بن جانے کی طرح کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ مگدھے بن جاؤ کہ آدمی، کسی جن زاد پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گزشتہ دنوں ہی میں خاصے دن انسانی ہیئت میں رہا تھا۔ شہریار بن کر عندلب کے ساتھ! مجھے ایک آدم زاد کا فرضی قالب اختیار کرتے ہوئے کوئی اذیت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں، کسی چچ کے آدم زاد کے جسم میں گھسنا اور ٹکنا ضرور تکلیف کا سبب ہوتا ہے۔ یاسف مجھ سے بھی زیادہ کایاں جن زاد ہے۔ اس نے البتہ ایک مرتبہ کسی آدم زاد کی ہو ہو شکل اختیار کی تھی۔ اسے بھی خبر تھی کہ ایسا کرتے ہوئے بڑی تکلیف اٹھانا پڑے گی لیکن اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یاسف نے بطور عبرت مجھے یہ پورا قصہ تفصیل کے ساتھ سنایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ جو کوئی جن زاد کسی آدمی کی نقل بنتا ہے تو قدرت کی طرف سے اسے سزا ملتی ہے۔ سزا یہ ہے کہ خاصی دیر تک اس کے وجود کو جیسے تھے ہوئے لوہے سے داغا جاتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ منہ سے ایک بار بھی آہ نکل گئی تو وہ نقل نہیں بن سکتا، اصل یعنی جن زاد ہی رہتا ہے۔ یہ سن کر واقعی میں نے عبرت پکڑ لی تھی کہ کبھی کسی آدم زاد کی نقل بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اسی کے ساتھ یاسف نے بقیہ جو واقعہ بیان

کیا وہ بہت دلچسپ اور میرے وجود میں سنسنی سی دوڑانے کے لئے کافی تھا۔ عبرت پکڑ لینے کے باوجود میرا بھی دل چاہا تھا، کاش میں بد بخت یاسف کی جگہ ہوتا۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک خوبصورت آدم زادی پر یاسف کا دل آ گیا۔ اس سیم تن کی شادی کو چند ہفتے ہوئے تھے۔ ظالم کسی طرح یاسف کو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہی تھی۔ نرگس ہی کی طرح اسے بھی کچھ ایسے دغاخف کا علم تھا کہ ادھر یاسف گھر میں داخل ہوا، ادھر اس نے ریس لگوا دی۔ اب است، حو کا دینے اور آرزوئے وصال پوری کرنے کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ یاسف اس کے شوہر کی نقل بن جاتا۔ اس طرح وہ یقیناً دھوکا کھا جاتی۔ اسے کوئی شک ہوتا تو وظیفہ وغیرہ پڑھ کر یاسف کو بھگاتی۔ بھلا اپنے شوہر نامدار کو کون کیوں ریس لگواتی ہے۔ اس ماہوش کا شوہر کوئی ایسا کام کرتا تھا کہ جس کے سبب اکثر دوسرے شہروں میں بھی ہفتے دس دن کبھی کبھار رہ جاتا پڑتا۔

یاسف تو تاک میں تھا ہی۔ ادھر شوہر دوسرے شہر سدھارا، ادھر یاسف نے اس کی جگہ لے لی۔ اس ماہ رو سے یہ بہانہ بنا دیا کہ دورہ منسوخ ہو گیا ہے اور کچھ دن تہمدارے ساتھ چین سے گزارنے کے لئے میں نے دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ گھر میں شوہر کے سوا کوئی اور تھا نہیں۔ شوہر کے گھر والوں کی مستقل سکونت بمبئی میں تھی۔ وہیں دونوں کی شادی ہوئی تھی اور پھر ملازمت کی مجبوری کے سبب شادی کے پہلے ہی ہفتے میں شوہر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور آ گیا تھا۔ اس کی بد قسمتی سے خوبصورت بیوی پر یاسف کی نظر پڑ گئی۔ تبھی سے یاسف اس کے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ جب کسی طرح بات نہ بنی تو یہ مجبوری یاسف کو انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔

پورے پانچ دن تک یاسف نے اس گل بدن کا شوہر بن کر عیش کئے۔ شوہر کا دورہ پورے آٹھ دن کا تھا مگر کام جلدی منت گیا اور وہ چھپے روز ہی لاہور آدھمکا۔ یاسف اس وقت بھی شوہر کا "ڈپیکٹ" بنا بیوی کو گلے کا ہار بنائے ہوئے تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔

یہ دستک خلاف توقع تھی کیونکہ اب تو لاہور میں ان کے عزیز و اقارب نہیں تھے کہ گھر میں کسی کی آرجا رہتی، شوہر کے دوست احباب جو تھے وہ شوہر کی غیر موجودگی میں آتے جاتے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ آدم زادی بھی لئے دیئے رہتی۔ محلے پڑوس کی عورتوں سے ابھی اس کی اتنی رسم دراہ نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہو جاتا۔ یاسف اسی لئے چین کی بانسری بجا رہا تھا اور "بانسری" کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نہ کسی کے آنے کا دھڑکانہ کوئی خوف! اب آنیویل قسم کے حالات میں جب اچانک گھر کے دروازے کی کڑی بجی تو یاسف جھری یا بانسری بجانا بھول گیا، یوں جیسے ہرن کسی ٹکاری کو دیکھ کر چوڑی بھرتا بھول جاتے ہیں۔ وہ جلدی سے یہ یہ گھٹا ہوا باہر نکلا کہ میں دیکھتا ہوں، اس وقت کون حرامزادہ کہاب میں ہڈی بننے آ گیا!

پھر یاسف نے دروازے کی جھری سے باہر جھانک کر دیکھا تو "اصلی تے وڈا" شوہر سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو اس نے بیوی کا نام لے کر اسے آواز دی۔

بیوی بے چاری اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ فوراً اندر کمرے سے نکل کر صحن عبور کرتی اور

مجھے دراصل یہ جاننے کی جیتلی تھی کہ میری محبوبہ دل نواز یعنی نرگس سے اقبال کا دوسرا نکاح ہوا یا نہیں؟ ایک طرف تو تجربے سے گزرنے کا شوق، دوسری جانب حقیقت حال جاننے کی فوری جستجو و اسن گیر تھی۔ سو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنے رقیب اقبال کا ڈپلیکیٹ بن گیا۔ اس تجربے سے گزرتے ہوئے بلاشبہ مجھے اذیت ہوئی، لیکن اس قدر نہیں کہ جتنی میرے ہم قوموں یعنی جنات نے مشہور کر رکھی تھی۔ ممکن ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ آدم زادوں کے درمیان رہتے ہوئے مجھ پر اتنی مشکلیں پڑ چکی تھیں کہ اب ہر مشکل آسان معلوم ہوتی تھی۔ ”مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔“ مرزا غالب کی طرح میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔ میں اس سے کہیں بڑی اذیتیں جھیل چکا تھا۔ آئندہ کے لئے بھی میں نے کچھ ایسی منصوبہ بندی کی تھی کہ وقت پڑنے پر ہر رنگ میں ظاہر ہو سکوں۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ پہلے ریسرسل ضروری تھی۔ ایک جن زاد کو جو جو صفات بھی ودیعت کی گئی ہیں، میرا ارادہ ان سبھی سے فائدہ اٹھانے کا تھا۔

جن دنوں میں نے اقبال کے جسم پر قبضہ کیا تھا، اس کے دفتر آمد و رفت رہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کہاں کسی آدم زاد کی نظر مجھ پر نہیں پڑے گی۔ دفتر کا یہ ایسا ہی ایک گوشہ تھا جسے میں نے گوشہ عافیت جانا۔ ایک تکلیف وہ عمل سے گزر کر میں، اقبال کی نقل بن گیا۔ یعنی اب ایک اقبال تو اپنے یکشن میں بیٹھا جھک مار رہا تھا اور دوسرا اقبال اس طرف چل دیا تھا کہ جہاں اس دفتر کا انگریز سربراہ بیٹھتا تھا۔ اسی کے کمرے کے باہر وہ ”پاکٹ سائز“ شخص ایک اسٹول پر مجھے براجمان ملتا کہ جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ عقل کے ساتھ ساتھ اس کی ہر چیز بھی چھوٹی تھی اور نام بھی چھوٹے خاں تھا۔ یہی چھوٹے خاں تھا کہ جو اقبال کو اپنا داماد بنانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

اپنے انخوا سے پہلے میں، چھوٹے خاں سے ملا تھا۔ اسی سے مجھے یہ خبر ملی تھی کہ مولوی کفایت اللہ نرگس کا نکاح دوبارہ اقبال سے کرنے والا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چچا چھوٹے خاں نے اپنی ٹانگ درمیان میں اڑا دی تھی کہ لونڈے یعنی اقبال کو وہ اپنی لونڈیا کے لئے لے اڑے۔ اسی سلسلے میں وہ اقبال کے باپ افضل پر دوبارہ جال پھینکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مجھے نہ تو اقبال سے کوئی دلچسپی تھی نہ چھوٹے خاں سے۔ میرا مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ نرگس کا نکاح ثانی یا نکاح اصلی اقبال سے نہ ہو پائے۔ ایک میں ہی کیا، کوئی بھی عشق پیشہ جن زاد اپنی محبوبہ کو کسی دوسرے کے پہلو میں دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ اب اگر نکاح ہو جاتا تو ایک نہ ایک روز تو نرگس کی رخصتی بھی ہو جاتی۔ پھر میں ٹاپتا رہ جاتا۔ تازہ ترین صورت حال سے باخبر ہونے کی خاطر چھوٹے خاں ہی فی الحال ایک ذریعہ تھا۔ وہ اپنے متوقع داماد کو یقیناً سب کچھ بتا دیتا۔

ایک عرصے پہلے چھوٹے خاں کو میں جس طرح اسٹول پر بیٹھے چھوڑ گیا تھا، اسی طرح بیٹھا ملا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی باجیس کھل اٹھیں۔ اسی کے نتیجے میں اس کی پگی داڑھی بھی ملی۔ حسب عادت وہ لہک کر بولا۔ ”آؤ اقبال بیٹے! تمہارے تو اب درشن ہی نہیں ہوتے۔ یقین جانو میاں کہ آج تمہیں دیکھ کر ہلا خوشی ہوئی۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“

دروازہ کھول دیتی۔ سویوں اسے کمرے سے نکلنے میں دیر ہوئی۔ معلوم نہیں دروازہ اتنی دیر نہ کھلنے پر شوہر کو کس طرح کسی ”گٹز بڑ“ کا خیال آگیا۔ اس خیال کا اظہار شوہر کے گھا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے سے ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر بیوی کو پکارے جا رہا تھا۔

صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یوسف نقل سے اصل پر آگیا۔ اس نے دل ہی دل میں شوہر کو برا بھلا کہتے ہوئے کڈی کھول تو دی مگر وہیں ارد گرد منڈلاتا رہا کہ دیکھے اب کیا ہوتا ہے۔ آئندہ کے لئے ادھر آنے کا چانس باقی بچا ہے یا نہیں!

دروازہ کھلتے ہی ”اصلی شوہر“ دندنا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے یوں چاروں طرف کا جائزہ لیا جیسے اپنی خوبصورت بیوی کے متوقع عاشق بامراد کو تلاش کر رہا ہو۔ اس پریشانی میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ گھر کا دروازہ کس نے کھولا! اسے کیا خبر تھی کہ اس کا کردار ادا کرنے والا دروازہ کھول کر چپت ہو چکا ہے اور اس طرح چپت ہوا ہے کہ وہاں موجود ہو کر بھی گویا ناموجود ہے۔ جن زاد ہونے کا یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے۔

پھر ادھر تو شوہر گھر کا صحن عبور کر کے بکس ہاتھ میں اٹھائے کمرے کے دروازے پر پہنچا، ادھر وہ نازنین کے جو پہلے باہر آنے کی پوزیشن میں نہیں، بال و کھراے کمرے سے نکلی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کر حق بقی رہ گئے۔ بیوی غالباً اس پر حیران تھی کہ شوہر جو ابھی کسی اور حال میں تھا، مسافر کیسے بن گیا؟ شوہر کو شاید اس پر حیرت تھی کہ بیوی کی آنکھوں کا کجرا کس طرح پھیلا ہوا ہے؟ دروازے زلفیں اس طرح کیوں کھلی ہیں جیسے کسی کے شانوں پر پریشاں ہوئی ہیں؟

شوہر نے بتایا کہ وہ کیوں آٹھ دن سے پہلے آگیا! بیوی بولی، تم گئے ہی کب تھے! تم نے چہین کی بانسری بجانے کو دفتر سے چھٹی لے لی تھی! کچھ اسی طرح کے مکالمات کی تبدیلی کے بعد ان دونوں کو حقیقت کا علم ہو گیا کہ کوئی رقیب زد سیاہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ لیا ہے۔

مرد بد بخت ایک چھوڑ دس مرتبہ عورت سے بے وفا کی جائے، اس کی عزت و آبرو کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر بے چاری عورت کے ساتھ کوئی فراڈ ہو جائے تو وہ مرد کو برواشت نہیں ہوتا۔ وہ ماہ جیسں بہت روٹی گائی کہ دھوکے میں کسی نے اس کے ساتھ یہ کام دکھا دیا ہے مگر شوہر نہ پہچانے۔ وہ سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر بیوی کو ہمیں بھیجنے پر آمادہ ہو گیا اور اسی وقت کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔

یوسف ”ڈراپ سین“ ہوتے ہی وہاں سے پھوٹ لیا، پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا کہ وہ تو شرعی چھوڑ گئی تھی کہ جس کی گلی کے پھیرے لگاتے یوسف تھکتا نہیں تھا۔

ماضی کے اس دردناک قصے کے بعد کہ جس کی وجہ سے ایک گھرا جڑ گیا، میں پھر حال کی طرف لوٹا ہوں۔ واقعہ یہ تھا کہ میرے دل میں یہ حسرت تھی کہ میں کبھی کسی آدم زاد کا ڈپلیکیٹ بنوں۔ یہ ذکر میں نے یوں کیا کہ اسی روز اقبال کے دفتر میں اس تلخ تجربے سے پہلی بار گزرا۔

اقبال کو میں نے اسی لئے بخش دیا تھا ورنہ کب کا اسے راستے سے ہٹا دیتا۔ نہ ہوتا بانس نہ بجتی بانسری۔ اس سے ہرگز میرا یہ مقصد نہیں کہ اقبال کو بانس اور زنگس کو بانسری کہتا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے وہاں سے کھٹک لینے کے بارے میں سوچا اور چھوٹے خاں سے اجازت چاہی۔

”اچھا تو میاں، میں اب تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں؟“ چھوٹے خاں نے مجھ سے اقرار کرانا ضروری سمجھا۔

”اور کیا چچا! میں آپ کے حکم سے باہر کب ہوں؟“ میں نے ”گرین سنگل“ دے دیا۔

”اللہ، تمہیں خوش رکھے اقبال بیٹے!“ چھوٹے خاں نے مجھے دعا دی۔

پھر میں اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس پر دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ چھوٹے خاں کو اپنے رقیب کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اپنے ہونے والے داماد کی رضامندی کے بعد وہ بڑھا سردھڑ کی بازی لگا دیتا۔ چلتے چلتے میں نے ایک اور پانسا پیچکا۔ ”چچا! میں آپ کو ایک اور راز کی بات بتا دوں کہ مولوی صاحب نے واقعی کوئی نہ کوئی عمل ضرور کیا ہے۔ کبھی کبھی تو خود مجھے اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا۔ کتنا کچھ چاہتا ہوں، منہ سے کچھ نکل جاتا ہے۔ بعد میں خود مجھے بھی اس پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ یہ بات میں نے آپ کو اس لئے بتائی ہے کہ اگر کبھی میں آپ کے سامنے بھی رشتے سے انکار کر دوں تو ہرگز یقین نہ کریں۔ فوراً یہ سمجھ لیں کہ مجھے مولوی صاحب نے قابو میں کر رکھا ہے۔“

”یہ بتا کر تم نے بہت اچھا کیا۔ مولوی کفایت اللہ اس حد تک سفلے پن پر اتر آئے گا، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مولوی نے تم پر تعویذ کر رکھا ہے۔ فکر نہ کرو، اس کا بھی کوئی توڑ سوچ لیں گے۔ لاہور میں ایک سے ایک بڑا اللہ والا پڑا ہے، بس تلاش کی ضرورت ہے۔ بھلا بتاؤ، اس مولوی کی اب اتنی اہم ہو گئی کہ ہمارے گھر کے بچوں پر عمل کرنے لگے۔ تمہیں اب کوئی پروا کرنے کی ضرورت نہیں بیٹے! اب میں جانوں اور مولوی جانے، تم میرے ساتھ ہو تو مجھے کیا غم!“

اسی وقت انگریز صاحب بہادر ولسن نے چھوٹے خاں کو طلب کرنے کے لئے کھنٹی بجائی۔ چھوٹے خاں تھے تو چراسی مگر اعلیٰ حکام کے چراسی بھی خود کو کسی تیس مار خاں سے کم نہیں سمجھتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز افسران اپنے قریبی اور ذاتی عملے کو ہر طرح خوش رکھتے تھے۔ وقت پڑنے پر لکھا نمک خوار ان کے کام آتے تھے۔ ولسن بھی اسی پالیسی پر گامزن تھا۔ چھوٹے آدمی کی سفارش ہی پر اس نے اقبال کو اپنے محلے میں ملازم رکھ لیا تھا۔

موقع نینیت جان کر میں نے چھوٹے خاں سے کہا۔ ”اچھا چچا! میں چلا۔“

چھوٹے خاں کو صاحب کی کھنٹی پر لپکتا تھا اس لئے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور چنچ اور راندہ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔

اب صرف ایک ہی عقدہ کھلنا باقی رہ گیا تھا کہ اپنی پہلی سیٹ تک اقبال نے واپسی کا سفر کیسے طے کیا؟ اس کی جگہ دوبارہ شری واستو کیسے آبیٹھا؟ یہ عقدہ فی الوقت نہ بھی کھلتا تو میری صحت پر کوئی اثر پڑنے کا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ خطرہ تو ایک اور تھا کہ ایک ہی دفتر میں دو عدد اقبالیوں کی موجودگی کا کسی کو

مجھے خبر تھی کہ اقبال سر سے پیر تک زنگس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں وہ بھلا چھوٹے خاں کو لفٹ کیوں دیتا۔ اقبال کو علم تھا کہ چچا چھوٹے خاں اسے اپنی فرزندگی میں لینے کے ارادہ مند ہیں۔ چھوٹے خاں نے اسی لئے مجھے اقبال جان کر بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اس کے برابری لکڑی کی ایک بیچ اور کبھی کوئی اسٹول پڑا رہتا تھا کہ اپنے طے چلنے والوں کو وہاں بٹھا سکے۔ اس وقت اسٹول ہی تھا جس پر مجھے بٹھا دیا۔

اسٹول پر بیٹھتے ہی میں نے اس بڑھے کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کا آغاز کر دیا اور بولا۔ ”چھوٹے چچا! آپ یقین کریں یا نہ کریں، میں تو دل سے آپ کی اب بھی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔ بس وقت اور حالات نے مجبور کر رکھا ہے کہ زبانیں کھولتا۔“

”تو میاں، وہ خبر کیا غلط تھی کہ تم نے رشتے سے انکار کر دیا ہے؟“ چھوٹے خاں حیرت سے بولا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ کیا قصہ ہے؟ سو کہا۔ ”کس سے چچا؟“

”میری پردین سے اور کس سے!“ چھوٹے خاں کی بیٹی کا نام پردین تھا۔

چھوٹے خاں کے جواب سے میں سمجھ گیا کہ اقبال نے اس کی دال نہیں گلنے دی ہو گی۔ وہ بھلا زنگس کو کس طرح چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا اور چھوٹے خاں کی بیٹی سے نکاح پڑھوا لیتا!

”چچا! میں نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ آپ خود ہی سوچیں کہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں!“

”میرے اور بھائی افضل کے درمیان رشتے کے معاملے میں ایک اور عزیز عبد الحمید صاحب کوشش کر رہے تھے۔ انہی کے ذریعے مجھے تمہارے والد، بھائی افضل کا یہ پیغام ملا کہ لڑکا یعنی تم اس رشتے پر راضی نہیں ہو۔ بس میاں، وہ دن اور آج کا دن، میں نے صبر کر لیا۔ سوچا کہ جہاں اللہ کی مرضی ہو گی، بچی کا رشتہ ہو جائے گا۔ اگر یہ بات مجھے تم سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی کہ تمہاری طرف سے انکار نہیں کیا گیا تو میں خود بھائی افضل کو منا لیتا۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تمام چکر اسی مولوی کفایت اللہ کا چلایا ہوا ہے۔ بلی کھائے نہیں تو اوندھا دے۔ مولوی نے کوئی عمل وغیرہ کیا ہو گا کہ اگر بھائی افضل نے اس کی بیٹی کے ساتھ تمہارا دوبارہ نکاح پڑھوانے سے انکار کر دیا ہے تو کہیں اور بھی رشتہ نہ ہو۔“ چھوٹے خاں کے الفاظ سے پوری صورت حال واضح ہو گئی۔ اقبال سے زنگس کا نکاح کھائی میں پڑ گیا تھا۔ دوسری جانب اس نے چھوٹے خاں کی ”نیک پردین“ کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے، یہ اطلاع میرے لئے باعث مسرت ہی تھی۔ محبوبہ کا کسی دوسرے کے ہتھے نہ چڑھنا ہر عاشق صادق کے لئے خوشی کا پیغام ہے۔ اب میں سمجھا کہ چھوٹے خاں نے مجھے ”صبح کا بھولا“ کیوں کہا تھا۔

چھوٹے خاں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی کہ میرا رقیب اقبال اگر کہیں اور ٹھکانے لگ جائے، پردین ہی سے شادی کر لے تو ہمیشہ کے لئے کاٹنا نکل جائے۔ ویسے موجودہ صورت حال بھی میرے حق میں تھی، اسے برقرار بھی رکھا جاسکتا تھا۔ پھر کوئی چکر چل جاتا یا گزربز ہو جاتی تو اس سے نمٹ لینا مشکل نہ ہوتا۔ ہم جن زادوں کو درمیان سے کاٹنے نکالنے کے اور بہت سے طریقے آتے ہیں۔ ان طریقوں کو میں نے زنگس کے معاملے میں دانستہ نہیں اپنایا۔ لیلیٰ پیاری تو اس کا کتا بھی پیارا!

جن زاد ☆ 254 ☆ پہلا حصہ

علم نہ ہو جائے! سو میں فوراً اپنی اصل پر لوٹ آیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے راہداری میں دور تک نظر دوڑالی تھی۔ کوئی مجھے یوں اچانک غائب ہوتے دیکھ لیتا تو غش کھا جاتا۔
اس روز سے میں نے نئی لائن آف ایکشن مقرر کر لی۔ میرے اغوا سے کئی معاملات التواء میں پڑ گئے تھے، پہلے ان سے نمٹنا ضروری تھا۔

☆=====☆=====☆

پاکستانی دفتروں کا نام

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جنات اور کالے علم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

جہنم زاد



سنبھیدہ خاتون

جن زاد

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

کبھی کبھی وقتی یا فوری مفاد کو دیر یا دور رس فوائد کی خاطر قربان کرنا پڑتا ہے۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ میری اس نئی حکمت عملی پر یاسف بہت ہنسا۔ میں نے اگلے ہی روز سے پانچوں وقت کی نماز پڑھنا شروع کر دی اور قلعہ بند ہو گیا۔ قلعہ میں اسی ویران مکان کو کمرہ رہا ہوں کہ جہاں میری سکونت تھی۔ تین دن میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ گزار دیئے۔ عالم ہاموس نے مجھے جو عمل تعلیم کیا تھا، وہ میں نے پڑھا۔ اس کے باوجود کہ میں اب کسی خوف کے بغیر مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں داخل ہو سکتا تھا، جلد بازی نہیں کی۔ ابھی مجھے ایک اور معاملہ بھگتنا تھا۔ اسے بھگتانے میں پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ یہ عمل میں نے خدیجہ کو ہامہ کے اثر سے نکالنے کے لیے کیا۔ خدیجہ نے اس سلسلے میں مجھ سے پورا تعاون کیا۔ نصف شب کے بعد خدیجہ کو میں اس کے گھر کی چھت پر لے جاتا اور عمل پڑھتا۔ پہلے جب میں نے یہ عمل شروع کیا تھا تو ہامہ نے مداخلت کی تھی لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو گی کہ میں نے اس دوران میں اپنا نامہ اعمال مزید سیاہ نہیں کیا۔ میرے دامن پر گناہ کا ایک بھی داغ نہیں لگا۔ خدیجہ وہی لہڑیہ تھی کہ جسے پانی میں رہنے والے جن زاد ہامہ نے خراب کر دیا تھا۔ وہ اسی سبب فطری ازدواجی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی جن زاد ہو کہ آدمی خدیجہ کو کسی کا قرب گوارا نہیں تھا لیکن اب وہ صحت یاب ہو گئی۔ جو روگ تھا جاتا رہا۔ اس سے بھی میں نے اپنی روح میں طمانیت سی محسوس کی۔ ایک حسین و جوان عورت کی پوری زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ ایک عذاب مسلسل سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ خدیجہ واقعی عمل کے بعد صحت یاب ہو چکی ہے، میں نے یہ جاننے اور اسے برتنے میں بھی جلدی نہیں کی۔ مجھے عالم ہاموس کی بات پر پورا یقین تھا۔ میں نے سوچا تھا، اے علیا لیش! ابھی گناہ کرنے کو بہت زندگی پڑی ہے۔ خدیجہ کون سی کہیں بھاگی جا رہی ہے!

جب یہ دونوں معاملے منٹ گئے تو ایک شام حسب عادت یاسف نے مجھے پھر چھیڑا۔ ”اے علیا لیش“

میں نے تیرے لئے ایک بڑی اچھی بات سوچی ہے۔ ثواب نمازی تو ہو ہی گیا ہے، غازی بھی بن جا! اس کا طریقہ یہ ہے کہ گناہ کے خلاف جہاد شروع کر دے اور عالم ہاموس کی خدمت میں حاضر ہو جا۔ تو بھی ایک نہ ایک روز عالم بن ہی جائے گا۔ پھر عالم جنات میں ہاموس کی طرح تجھے بھی شہرت ملے گی۔ جنات تیری عزت کیا کریں گے۔“

یاسف کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے جوگ لے لیا ہے۔ اس نے کبھی میری طرح کسی سے عشق کیا ہوتا تو خبر ہوتی کہ یہ آگ ایسی ہے جو ایک دفعہ بھڑک اٹھے تو پھر بجھائے نہیں جھپتی۔ عشق تو ایک کارِ مسلسل ہے اور یہ کیا نہیں جاتا خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسی کے بعد عشق و ہوس کا فرق سمجھ میں آتا ہے۔ زنگس سے میرے عشق کے مراحل بھی انہی منزلوں سے گزرے۔ ابتدا بلاشبہ اچھی نہیں تھی۔ میں ہوس کا اسیر رہا اور چاہا کہ کسی بھی طرح زنگس کو حاصل کر لوں مگر اب رفتہ رفتہ مجھ پر عشق کے معنی کھل رہے تھے۔ کسی پڑھے لکھے آدمی کا یہ قول ہے کہ وقت سب سے بڑا استاد ہے! سو مجھے وقت ہی سب کچھ سکھا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یاسف کی چیمیز چھڑا کر اس شام میں ہنس کر ٹال گیا۔

اگلے ہی دن صبح جب یاسف محو خواب تھا تو میں اس دیران مکان سے نکل آیا۔ میں اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عملی طور پر اتنے دن تک ”مجاہدے“ کا کیا نتیجہ نکلا!

اس وقت حویلی میں مولوی کفایت اللہ کے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں اسی لئے اطمینان سے بھائی دروازے پہنچ گیا۔ مولوی صبح ہی صبح دکان کھولنے بازار انار کھلی چلا جاتا تھا۔ فجر کی نماز پڑھی، کچھ اوراد و ظائف پڑھے، قرآن مجید پڑھا، دعا مانگی، پھر ناشتا کیا اور ٹہل لیا، یہ مولوی کے معمولات تھے۔ اس کی حویلی میں داخل ہونے کے لئے مجھے یہی وقت مناسب معلوم ہوا۔ یوں تو حویلی میں زنگس بھی تھی۔ باپ نے اسے بھی عملیات میں طاق کر دیا تھا۔ وہ مجھے آگے پیچھے نہ لگنے دیتی مگر مجھے اس کی طرف سے اب خطرہ نہیں تھا۔ ایک تو میں نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کا عاشق صادق ہوں، دوئم مجھے وہ الفاظ اذیر تھے جو کبھی اس سے ملے تھے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب مولوی نے مجھے پھانسنے کے لئے حویلی میں جال بچھا رکھا تھا اور میں اس جال میں پھنسنے لگا تھا۔ زنگس کو اپنے عشق کا یقین دلانے کے بعد میں نے کہا تھا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں اے زنگس، اے میری زندگی، اے میری قرار جاں کہ تو مجھے اپنے دیدار سے محروم نہ کرے۔ میں تجھے قریب سے آکر دیکھنا چاہوں تو دیکھ سکوں۔“ پھر انہی مذاکرات کے دوران مجھے ”مظلوم کبوتر“ بننے ہوئے دیر نہیں لگی تھی۔ میں بولا کہ خدا کی قسم کھا کر مجھے یقین دلا کہ اپنے قریب آنے سے نہیں روکے گی۔ اس موقع پر زنگس مات کھا گئی اور کہنے لگی، میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کے یہ عہد کرتی ہوں اے علیا! میں نے تجھے کبھی اپنے قریب آنے سے نہیں روکوں گی۔ جواباً میں نے بھی جھوٹی قسم کھالی تھی، اے زنگس! تیرے سر کی قسم اب اقبال کے جسم میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ شاید کسی آدم زاد ہی نے یہ پتے کی بات کہی ہے کہ جنگ اور عشق میں سب جازز ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی پتے کی بات بھی کہہ جاتا ہے۔ میں ایسی پتے کی باتیں ہمیشہ سے اپنی گرہ میں باندھتا آیا تھا۔ سو اسے بھی باندھ لیا۔ اس نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا تھا مگر میں ”چالاک“ نکلا

اور خدا کی جھوٹی قسم نہ کھائی۔

ان حالات میں اگر مولوی کی حویلی کسی خاص مدت تک کے لئے کیل دی گئی تھی تو بھی اب خطرہ نہ تھا۔ ہاں بد ذات مولوی اگر خود حویلی میں ہوتا تو دوسری بات تھی۔ عہد اس کی بیٹی نے کیا تھا، وہ اس عہد سے مبرا تھا۔ اسے بڑے داؤ آتے تھے۔ جن زادوں سے نمٹتا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ خود مجھے کئی بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے اب بھی مولوی سے بچ کر رہنا پڑتا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قبیل کے خطرناک ترین آدم زادوں کو تو دھوکا دے کر ہی چونا لگایا جاسکتا ہے۔ سو میں اس لئے اس وقت آیا تھا۔ اگر میں مولوی کی حویلی میں داخل ہو جاتا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ مولوی پر مجھے برتری حاصل ہو گئی ہے۔ بے خوف ہو کر بھی مجھے یہ خوف تھا کہ مولوی کفایت اللہ کو پچھاڑ لینا آسان نہیں۔ مولوی کی حویلی کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں نے فضا میں غوطہ لگایا اور اللہ کا نام لے کر چھت پر اتر ہی گیا۔ اس وقت بھی عمل کے الفاظ ورد زباں تھے۔

جب میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس چھت پر طویل عرصے کے بعد مجھے اترا نا نصیب ہوا تھا۔

اپنے دل میں ہزاروں آرزوؤں کے چراغ جلائے میں نیچے پہنچا۔ ”مولوں“ یعنی زنگس کی امی جسے زنگس کے رشتے میں نے بھی اپنی اماں بنا لیا تھا، کس شاید اڑوس پڑوس میں گئی تھی۔ بڑھاپے میں ایسی بڑھیوں کا یہی ایک مشغلہ رہ جاتا ہے کہ تیرے میرے گھر جھانکتی پھریں۔ زنگس مجھے باورچی خانے میں اکیلی ملی۔

میں نے جیسے ہی باورچی خانے میں قدم رکھا، وہ تقریباً اچھل پڑی۔ اسے یقیناً اپنے ”علم دریاؤ“ سے میری آمد کا پتا چل گیا۔

”تو علیا! ش ہے نا؟“ اس نے میری طرف مڑ کر پوچھا۔

”ہاں اے جان علیا! میں، تیرا ہی سودا ہی تیرے حضور میں کھڑا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس پر صدقے داری ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک ہی جگہ اتنا سارا حسن خدا جانے کیسے جمع ہو گیا تھا! سادہ سے گھریلو لباس میں بھی وہ غضب ڈھاری تھی کہ لعل تو گدڑیوں میں بھی نہیں چھپتے۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کوئی انسانی قالب اختیار کر لیا جائے! میں نے دوسرے ہی لمحے اس پر عمل کیا۔ اب میں ایک وجیہ اور پرکشش مردانہ انسانی جسم میں ظاہر ہو چکا تھا۔

”ارے ارے، تو نے یہ کیا کیا!“ وہ مجھے انسانی ہیئت میں دیکھ کر چوک اٹھی۔ جنات کے بارے میں غالباً اسے سب کچھ معلوم تھا کہ وہ کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ پھر اس نے کہا۔ ”اگر تیرا یہ خیال ہے اے علیا! میں نے تو مجھے اس طرح رجھالے گا تو غلطی پر ہے۔ مجھ پر تیری اس مردانہ وجاہت کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ نظر کا دھوکا ہے۔ تو اپنی اصل میں ایسا نہیں جیسا دکھائی دے رہا ہے!“

اس پر مجھے ایک عالم جن زاد کا واقعہ یاد آ گیا۔ ایک کافر جن نے خدا کے وجود سے انکار کیا تو عالم

بولا، اگر خدا نہیں ہے تو پھر تو کس کا انکار کر رہا ہے؟ خود تیرے ہی انکار سے یہ ثابت ہو گیا کہ خدا ہے! کافر جن ایسا جواب ہوا کہ پھر عالم سے بحث نہ کی۔ یہ واقعہ میں نے اس موقع پر یوں بیان کیا کہ اگر زگس میری مردانہ وجاہت سے متاثر نہیں ہوئی تھی تو اسے انکار کی کیا ضرورت تھی! یہ قطعی غیر فطری سی بات ہے کہ مرد، عورت کے حسن اور عورت مرد کی وجاہت و خوبصورتی کا کوئی اثر قبول نہ کرے۔ پھر بھی میں بولا۔ ”اے جان! تو غلط سمجھی۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا جو تو نے سمجھا۔ میں نے تو تیری محبت میں انسانی قالب اختیار کیا ہے۔“

معاً جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی۔ پھر اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو حویلی میں کس طرح داخل ہو گیا؟“

”کیوں کیا ایسا میرے لئے ممکن نہیں تھا؟“ میں نے اسے کریدا۔
”ہاں۔“ اس نے اقرار کیا۔ ”ابا جی نے پوری حویلی کیل رکھی ہے اور ابھی اس کی مدت ختم نہیں ہوئی۔“

”سن اے میری محبوب نظر! عشق بڑی بری بلا ہے۔ کوئی آدمی ہو کہ جن زاد، جان پر کھیل جانے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔“

”میں تیری بات مانتی ہوں، مگر یہ بتا کہ ایسا کس طرح ہوا؟ تجھے تو اس حویلی میں قدم رکھتے ہی قید ہو جانا تھا جس طرح پہلے تیرے ساتھ ہوا تھا۔“

”یہ راز میں تجھے نہیں بتاؤں گا۔“ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔
”اور میں نے تیری آمد کے بارے میں ابا جی کو بتا دیا پھر؟“ اس نے دھکی دی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تو اپنے عہد سے پھر گئی ہے۔“ پھر میں نے اسے اس کا عہد یاد دلایا۔
”وہ بھی ایک آفت کی پرکالہ تھی، بولی۔“ عہد میں نے یہ کیا تھا کہ تجھے اپنے قریب آنے سے نہیں روکوں گی۔ کیا میں نے تجھے روک دیا؟ ابا جی کو تیرے تعلق کچھ نہ بتانے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا میں نے! بول اب میرے سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہے کہ نہیں؟“

مجھے زبان کھولنا ہی پڑی، مگر مصلحتاً سچ کے ساتھ تھوڑا سا جھوٹ بھی شامل کر دیا۔ ”تیرے دیدار کی خاطر عرصہ دراز تک میں نے ویرانوں کی خاک چھانی، تب جا کر مجھے ایک عالم جن زاد ملا۔ میں نے اس کی بڑی خدمت کی اور پھر ایک روز اپنا مسئلہ بیان کر ہی دیا۔ عالم بڑا رحم دل نکلا۔ شاید اس نے بھی میری ہی طرح کسی آدم زاد سے عشق کیا ہو گا۔ پھر اسی نے مجھے ایک ایسا عمل تعلیم کیا کہ اگر میں اپنے عشق میں سچا نکلوں تو ہر رکاوٹ کو عبور کرتا ہوا تجھ تک پہنچ جاؤں۔ اس کے بعد پورے چالیس دن تک میں نے عمل کیا۔ اس عرصے میں مجھے پاک صاف رہنا تھا اور تہجد بھی قضا نہیں کرنا تھی۔ غرض کہ اس عمل کی شرائط بہت کڑی تھیں، لیکن محض تیری خاطر میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ میرا عشق صادق تھا، سو عمل کامیاب رہا اور میں تجھ تک پہنچ گیا۔“

میں نے زگس کے چہرے کو متغیر ہوتے دیکھا۔ یقیناً میرے الفاظ کا اثر اس پر ہوا تھا۔

”چل آ اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔“ چند لمحوں بعد وہ بولی۔ ”تجھ سے میں ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”امی کہاں ہیں؟“ میں نے معلوم کیا۔
”وہ گوجرانوالہ گئی ہوئی ہیں۔ ان کے خالہ زاد گزر گئے تھے، پڑے کو گئی ہیں، ایک عزیز کے ساتھ!“

سبحان اللہ بندہ کیا بروقت اس دار فانی سے رخصت ہوا ہے! میں نے خوش ہو کر سوچا۔ عشق اتنا خود غرض بنا دیتا ہے کہ جن و بشر کو کسی کے مرجانے کا بھی غم نہیں ہوتا۔ بڑھیا گوجرانوالہ گئی تھی اور مولوی دکان پر! اب میں سمجھا کہ زگس اس قدر اطمینان کے ساتھ باتیں کیوں کر رہی ہے! اندر کمرے میں لے جا کر اس نے مجھے ایک مونڈھے پر بٹھا دیا اور خود بھی دوسرے مونڈھے پر ٹنگ گئی۔ میرا عالم یہ تھا کہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں اسے دیکھ جاؤں، دیکھے ہی جاؤں۔ وہ تھی بھی تو ایسی کہ جہاں نظر پڑ جائے وہیں ساری عمر بسر کر دینے کو جی چاہے۔

فرصت نگارہ بھی تھی اور وہ صورت بھی دید کے قابل، مگر میری محویت اس کی آواز نے توڑ دی۔
”تو اس طرح مجھے کیوں دیکھے جا رہا ہے؟“

”اس لئے اے جان جاں کہ تو دیکھنے ہی کی چیز ہے۔“ میرے لمبے میں وارفتگی تھی۔
”پانگل پن چھوڑ اور میری بات سن!“ اس کے حسین چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

”اچھا تو سنا!“ میں بولا۔
”تجھے میرے عشق کا دعویٰ ہے نا؟“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”وہ تو ہے اور رہے گا! تو کے تو لکھ کر دے دوں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔“
اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے کوئی کام لینے کو کہا، لیکن یہ نہیں بتایا کام کیا ہے! سو میں نے پوچھا تو بولی۔ ”پہلے وعدہ کر کہ تو انکار نہیں کرے گا۔“

”کام کی نوعیت جانے بغیر ہرگز وعدہ نہیں کروں گا! تیرا کیا بھروسہ، کہہ دے کہ آج کے بعد ادھر نہ آؤ۔“ میں چونکا ہو گیا۔

”یہ کوئی کام ہوا؟ کیس تیری عقل تو نہیں ماری گئی!..... کام ایسا ہے کہ تیرے بس سے باہر نہیں۔“

”تو پھر بتا دے! پہلے ہی میرے پیروں میں وعدہ کی زنجیر کیوں ڈال رہی ہے!“
میری بات سن کر وہ کچھ دیر چپ رہی، پھر کہنے لگی۔ ”وعدہ اسی لئے لے رہی تھی کہ یہ کام بہر حال تیری مرضی کے خلاف ہو گا۔“

میں بھانپ گیا کہ وہ کیا چاہتی ہوگی! چھوٹے خاں سے ملنا فائدہ مند رہا تھا۔ یہی سوچ کر میں بولا۔
”کچھ اے زگس، عاشقی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اپنے ہی گلے پر چھری پھیر لی جائے۔ میں تجھے کسی بھی

صورت کھونا نہیں چاہتا! اگر اس کام کا تعلق اقبال اور تیرے ملن سے ہے تو ہرگز میں آمادہ نہیں۔“
”اس کا مطلب تو یہ ہوا اے علیا! میں نے تجھے شاد آباد نہیں دیکھ سکتا!“

”تو شاد آباد رہے اور میں برباد! یہ تو انصاف نہ ہوا۔“
”میں‘ اقبال کے بغیر نہیں جی سکتی۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔

”اور میں تیرے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا!“ میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ”بات کھل ہی گئی ہے تو صاف صاف کہہ دے جو تیرے دل میں ہے۔“

”اب کیا کہنا باقی رہ گیا ہے اے علیا! اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”تو جب راضی ہی نہیں تو کچھ کہنے سے فائدہ.....! پہلے تو کبھی کبھار یہ موقع بھی مل جاتا تھا کہ ہم چھت پر مل لیا کرتے تھے“ لیکن اب..... اب تو یہ بھی ممکن نہیں رہا۔“ وہ مجھ سے اس طرح یہ سب کچھ کہہ رہی تھی جیسے میں اس کا عاشق نہیں کوئی راز دار و غمگسار سیلی ہوں۔ ”اب تو اقبال کے والد نے دیوار..... اپنی طرف کی دیوار اتنی اونچی کرا دی ہے کہ برابر والی چھت پر کوئی آہی جائے تو نظر نہ آئے۔ میں نے تو اقبال کو بہت دن سے دیکھا تک نہیں۔“ وہ دکھیااری عشق کی ماری اپنی روداد محبت سنا بھی رہی تھی تو مجھے! ظاہر ہے کہ اس سے میرے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ حویلی کی چھت پر اترتے ہوئے میری نظر دیوار پر نہیں تھی۔ میں تو اس وقت اور ہی خیال میں تھا۔ مٹا میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”اقبال کو دیکھے گی؟“
”مگر کیسے؟“

”یہ تو مجھے پر چھوڑ دے اور میں نے تجھ سے جو پوچھا ہے اس کا جواب دے!“
اس نے غالباً کچھ سوچے سمجھے بغیر بے دھیانی میں سر ہلایا۔ وہ عمل یقیناً میرے لئے تکلیف دہ تو ہوتا لیکن شاید اس طرح زنگس میرے قریب آجائی۔ چند ہی لمحوں بعد میں‘ اقبال کی نقل بن گیا۔ بے ساختہ اس کے ہونٹ ہلے اور پھر کانپ کر رہ گئے۔
”سن!“ میری آواز بھی بدل گئی۔ میں اقبال ہی کی آواز میں بول رہا تھا۔ ”کبھی کبھی دانستہ دھوکا کھانا بھی اچھا لگتا ہے۔“

جواب میں وہ کچھ نہ بولی اور مجھے ایک نیک دیکھتی رہی۔ پھر خاصی دیر بعد اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ ”اے علیا! میں تیری ممنون ہوں کہ تو نے میری آنکھوں کی پیاس بجھا دی۔“

کاش اس نے یہ الفاظ اقبال کی شبیہ کو دیکھ کر ادا نہ کئے ہوتے، خصوصاً آنکھوں کی پیاس بجھنے والے الفاظ! اس سے پہلے میں نے جو انسانی ہیئت اختیار کی تھی، وجاہت اور کشش و خوبصورتی میں اقبال سے کہیں بڑھ کر تھی، لیکن دل ہی تو ہے! عشق شاید ظاہر کو نہیں دیکھتا، باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اس خیال کی خود میں نے ہی تردید کر دی۔ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ اگر عشق صرف باطن سے ہوتا ہے، ظاہر کی کوئی حیثیت نہیں تو حسین و نوجوان لڑکیاں ہی عاشقوں کو کیوں پسند آتی ہیں؟ کیا کسی بڑھیا کا باطن حسین نہیں ہو سکتا؟ پھر کوئی نوجوان کسی بوڑھی عورت کے عشق میں کیوں مبتلا نہیں ہوتا؟

کوئی نوجوان حسینہ کسی بوڑھے کے باطن کو نکل کر کیوں نہیں دیکھتی؟ ایک سوال سے بقیہ سوالات پیدا ہوتے گئے۔ پھر مجھ پر منکشف ہوا کہ عشق ظاہر و باطن اور جسم و جاں میں توازن کا نام ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وصال یار کی آرزو ہی نہ ہو۔ روح سے روح کا وصال، جسم سے جسم کا اتصال ہی عشق ہے۔ عشق اعتدال ہے، انتہائے کمال ہے! میرے اندر جیسے کوئی اور بول رہا تھا۔

وہ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی، ایسے ہی لمحے تھے کہ مجھے اپنے رقیب پر بھی پیار آنے لگا۔ زنگس نے جانے کیا سوچ کر میرا مشورہ قبول کر لیا اور دانستہ دھوکا کھانے لگی۔ اس کے انفاس کی خوشبو میں نے اپنے بہت قریب محسوس کی۔ میں نے عالم بے خودی میں بھی خود کو سنبھالے رکھا۔ نہ اس نے حدود سے تجاوز کیا نہ میں نے! مسند رے پیاسے کو قطرہ شبنم بھی مل جائے تو بہت ہے! داماندگی شوق پناہیں تلاش کرنے لگی۔ ہم ایک دوسرے کی پناہ بن گئے۔

معلوم نہیں کب اور کتنی دیر بعد خوابوں کا وہ طلسم ٹوٹا تو زنگس کے چہرے پر حجاب تھا۔
”معاف..... معاف کر دیجیو مجھے علیا! میں نے شاید اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔“
زنگس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
”مجھے بھی کب ہوش تھا!“

”نہیں.....! تو ہوش میں تھا ورنہ.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورہ چھوڑ دیا، پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”آج مجھے یقین ہو گیا کہ..... کہ تجھ پر اب اعتماد کیا جا سکتا ہے، لیکن تو..... تو پہلے تو ایسا نہیں تھا!“ اس نے میرے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

وہ جس طرف اشارہ کر رہی تھی، ان لمحات کی یادیں اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔
”ہاں اے زنگس! اب عشق و ہوس کا فرق کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔“ میں نے اعتراف کر لیا۔ ”تسکین ہوس کے لئے تو سارے بہت ہیں، لیکن عشق کوئی اور ہی بلا ہے۔ تو نے اگر مجھے قابل اعتماد سمجھا ہے تو..... تو تیری مرضی کے بغیر کبھی میں آرزوئے وصال نہیں کروں گا۔ وصال شاید عشق کی آخری منزل ہے اور..... اور شاید پھر..... پھر عشق اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ سو جب تک آخری منزل نہ آئے، جسم و جاں میں شعلے سے لپکتے رہیں، تڑپ ختم نہ ہو چکا ہے۔“ الفاظ کی ادائیگی جیسے میری دسترس میں نہیں تھی۔ میں نے شاید جو کچھ آخر میں کہا، کتنا نہیں چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کون سی قوت تھی جو مجھ سے یہ کہلا رہی تھی!

”تو آجایا کرا اب! بس یہ خیال رکھو کہ اباجی حویلی میں نہ ہوں۔“ زنگس نے مجھے آمد و رفت کی اجازت خود ہی دے دی۔ غالباً اس لئے کہ میں اس کے محبوب کا نعم البدل بن گیا تھا۔

نادانستگی میں جو تیر مجھ سے چل گیا۔ وہ نشانے پر بیٹھا۔ میں سرشار سا ہو کر لوٹا۔ میں نے اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا۔ میری واپسی سے پہلے زنگس نے مجھے بتا دیا تھا کہ دو روز کے بعد اس کی ماں گوجرانوالہ سے لوٹ آئے گی۔ گوجرانوالہ اس کی ماں کا میکہ تھا۔ عورت چاہے بوڑھی ہو جائے اپنا میکہ نہیں بھولتی۔

ہیں۔ افضل بھی جانا پہچانتا تھا، سو جھگڑا ہوتے دیکھ کر لوگ اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ ”کی ہو یا بھافضل؟“ ہر طرف سے یہی صدا گونجنے لگی۔

میری وہاں موجودگی میں یہ سوال احمقانہ ہی تھا مگر آدم زادوں میں اکثریت احمقوں ہی کی ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ شاید وہ اس طرح مجھے یہ باور کرا رہے تھے کہ وہ افضل کو جانتے ہیں یا اس کی حمایت میں آئے ہیں۔ میں بھی اصلی غنڈوں کی طرح بڑکیں مار رہا تھا۔

کہیں وہ لوگ مجھ پر ہل نہ بول دیں، یہ سوچ کر میں نے چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ چاقو کو اس دور میں ”ہتھیار“ سمجھا جاتا تھا۔ کسی ہتھیار بند پر حملہ کرنا خلاف مصلحت گردانتے ہوئے لوگوں نے مجھے جانے کا راستہ دے دیا۔ چلتے چلتے بھی میں نے ایک عدد بڑک اور ماری۔ ”اوئے میں ٹبر کھا جاواں تے ڈکار نہ لاواں!“

وہ گلی میں نے تقریباً ہاتھتے ہوئے عبور کی، پھر باہر نکلتے ہی انسانی ہیئت ترک کر دی۔ شیاطین بھی نسل کے اعتبار سے جنات ہی میں سے ہیں۔ جنات کی دس قسموں میں سے ایک قسم شیاطین کہلاتی ہے۔ آدم زادوں کو کسی بھی صورت آپس میں لڑا دینے کا ہنران سے زیادہ کوئی اور نہیں جانتا۔ اس وقت میں نے یہی کردار ادا کیا تھا۔

لڑانے والے کو تماشا دیکھنے کا بھی شوق ہوتا ہے، سو میں فوراً پلٹا۔ افضل اتنا ”ہکا“ ہوا تھا کہ اسی وقت دو تین یعنی شاہدوں کو ساتھ لے کر بازار انار کلی چل دیا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا کہ کہیں لوگ بچ میں پڑ کے مصالحت کی فضا پیدا نہ کر دیں۔ میں موقع پر موجود ہوتا تو کسی طرح بات نہ بننے دیتا۔ مولوی کفایت اللہ اور افضل میں کھٹک جاتی تو پھر نرگس اور اقبال کی شادی کے امکانات نہ رہتے۔ میری تمام تر تنگ و دو کا اصل مقصد یہی تھا۔ اس کے بعد چاہے اقبال کتنا ہی زور مار لیتا اور نرگس بھی لاکھ چاہتی یہ رشتہ نہ ہوتا۔ مولوی اس سے بے خبر کہ میں اس کے خلاف کیا چال چل چکا ہوں، اطمینان سے دکان داری میں مصروف تھا۔

”بھائی! یہ دیکھ لو“ اس کپڑے میں یہاں سائٹ ہے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سودا کرتے وقت اپنے مال کا عیب نہ چھپاؤ۔ دیکھ لو، پسند ہو تو لے لو ورنہ کوئی اور کپڑے دکھاؤں۔“ مولوی کفایت اللہ اپنے کسی گاہک سے ہمکلام تھا۔

میں نے اپنے اور مولوی کے درمیان اتنا فاصلہ برقرار رکھا تھا کہ وہ کہیں تاڑ نہ لے، کوئی جن زاد قریب موجود ہے۔ یوں بھی اس کی توجہ گاہک پر تھی۔

اس وقت مجھے مولوی کے چہرے پر حیرت نظر آئی جب اس نے افضل اور چند محلے والوں کو ساتھ دیکھا۔ گاہک نے اس عرصے میں کپڑا لے لیا تھا۔ جس جگہ کپڑے میں عیب تھا، مولوی اسے پہلے ہی دکھا چکا تھا اسی لئے پیسے کم کر دیئے تھے۔ سلام کرنے میں پھل مولوی ہی نے کی، پھر اپنی جگہ ایک ملازم کو بٹھا کر افضل سے مخاطب ہوا۔ ”بھائی افضل! ادھر آجائیں، یہاں بیٹھیں! اور آئیں آپ حضرات بھی آجائیے۔“ مولوی نے تھان بنا کر جگہ بنائی۔

بھائی دروازے ہی میں اقبال کے باپ افضل کی دکان تھی۔ وہ درزی تھا۔ میں اب اقبال کی نقل نہیں، اپنی اصل پر آچکا تھا۔ معلوم نہیں میرے جی میں کیا آئی کہ اس گلی کا رخ کر لیا۔ افضل کی دکان پر دو کارگر بھی تھے۔ عموماً وہ انہی سے کام لیتا۔ کبھی کبھار کسی بڑے گاہک کا کپڑا کاٹ دیتا ورنہ تو یہ کام بھی اس کا شکر درشد ہی انجام دیتا۔ بڑا گاہک وہ اس کو سمجھتا تھا جس کے پاس مال زیادہ ہو۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا افضل تو خیر اہل تھا البتہ اس سے چھوٹا نمال، باپ کا ہاتھ بٹاتا رہتا تھا۔ نمال کو زردوزی میں مہارت حاصل تھی۔ سلائی کرنا بھی اس نے باپ سے سیکھ لیا تھا، مگر کام وہ ایک زردوزی ہی کی دکان پر کرتا تھا۔ عید پر کام زیادہ ہوتا تو باپ کی مدد بھی کر دیتا۔ گھر میں کیونکہ اب تین تین کمانے والے تھے اس لئے افضل کو کچھ پیسے کی گری بھی چڑھ گئی تھی۔ بڑے بیٹے افضل کی آوارگی کو اسی لئے وہ برداشت کر گیا تھا۔ مالدار تو خیر مولوی بھی تھا، لیکن افضل سے کچھ کم۔ پھر بھی اقبال انہم نرگس کا رشتہ ہو جاتا تو کوئی یہ نہ کہتا کہ دونوں گھرانے برابر کے نہیں، لیکن میں بھلا ایسا کیوں ہوئے؟ ذیابا افضل کی دکان تک پہنچتے پہنچتے اسے مولوی کی طرف سے مزید جھڑکنے کی ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ موقع ملے ہی میں نے انسانی ہیئت اختیار کر لی۔ ”چلے“ چہرے مہرے اور لباس کی وجہ سے ہر آدمی مجھے کوئی چھٹا ہوا غذا ہی سمجھتا۔ قد کاٹھ سے بھی میں کوئی ”کن ٹا“ ہی لگ رہا تھا۔ یہ اصطلاح عموماً بد معاشوں کے لئے ہی استعمال ہوتی تھی۔

”اوئے افضل!“ میں نے دکان پر پہنچتے ہی افضل کو بڑے گستاخانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ افضل کے چہرے سے صاف معلوم ہو گیا کہ وہ تھوڑا بہت رعب میں آگیا ہے، کہنے لگا۔ ”میں تمہیں پہچانتا نہیں۔“

”اوئے توں پهلوان جیدے نوں نہیں جان دا“ اس؟ میں اس طرح بولا جیسے مجھے نہ جاننا کوئی جرم ہو۔

مجھ کا وقت تھا اس لئے گلی میں بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ میں نے اسی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ”پهلوان جی! آپ کام بتائیں۔“ افضل مزید دھونس گیا اور ”تم“ کی جگہ ”آپ“ پر اتر آیا۔ ”گل سن!“ پھر میں نے اسے بتایا کہ مجھے مولوی کفایت اللہ نے بھیجا ہے۔

”مولوی صاحب نے بھیجا ہے، آپ کو! ارے وہ تو ہمارے بڑے کرم فرما ہیں، چھت سے چھت ملی ہوئی ہے پهلوان جی!“

”چھٹ دے اوئے!“ میں نے اسے پھر ڈانٹ پلائی۔ اس کے بعد میں نے دانستہ اقبال سے نرگس کے رشتے کا ذکر چھیڑ کر اسے بت ذلیل کیا، اتنا کہ اس کی برداشت جواب دے جائے۔

”اب مولوی صاحب میری دکان پر غنڈے بھیج کر مجھے رشتے پر مجبور کریں گے!“ اسے آخر غصہ آئی گیا۔ اسی غصے میں چیتنے ہوئے اس نے قبیحی اٹھالی۔

دکان پر جو دو کارگر تھے، انہوں نے بھی ہمت پکڑ لی۔ ایک نے لوہے کا گز اٹھالیا، دوسرے کے ہتھے پیچ کس چڑھ گیا۔ حالانکہ میرا کوئی اسلحہ نہ تھا جسے کہنے کی ضرورت پیش آتی۔ چیخ پکار کی وجہ سے لوگ جمع ہو گئے۔ افضل اسی لئے چینا ہو گا۔ محلے پڑوس میں عموماً بھی ایک دوسرے کو جانتے

”ویسے مولوی صاحب کی بیٹی کے قصے ہم نے بھی سنے ہیں۔ بھائی افضل! تمہارے لڑکے کو اب بھی اس لڑکی نے پھانس رکھا ہے۔“

”یہ آپ کیا بیسودہ زبان استعمال کر رہے ہیں ہادی صاحب! شرم آنی چاہئے آپ کو!“ مولوی چراغ پا ہو گیا۔ ”آپ کے گھر میں بھی بو بیٹیاں ہیں!“

”بھائی! ہم تو خدا لگتی کہتے ہیں، کسی کو برا لگے کہ بھلا!“ میں ڈھیٹ بن گیا۔ ”ویسے بھی مولوی صاحب، میں آپ سے ہکلام نہیں تھا۔ میں تو بھائی افضل کو سمجھا رہا تھا کہ یہی کہیں آپ کی چلتی چڑی باتوں میں نہ آجائیں۔ یہ سیدھے آدمی ہیں اور آپ ایک گھاگ ہیں۔ کہیں سے ان کے بیٹے کا رشتہ آیا بھی تو یہ اسی پر الزام دھریں گے کہ جیدے پهلوان کو تھمی نے بھیجا ہو گا۔ واہ مولوی صاحب! آپ کے کیا کہنے! ایک تیرے دو دو شکار کر رہے ہیں!“

اسی وقت افضل بولا۔ ”رشتہ تو طے ہو چکا تھا پہلے ہی! بھائی چھوٹے خاں کو میں نے زبان بھی دے دی تھی۔ کل رات وہ پھر رشتے کی بات کرنے آئے تھے۔ واقعی ہادی صاحب، میں تو چھوٹے خاں کے بارے میں یہ سوچنے لگا تھا کہ جیدے پهلوان کو انہوں نے بھیجا ہو۔ آپ نے مولوی صاحب کی چالاکی کو خوب کپڑا۔“

مولوی کفایت اللہ کی طرف سے میں بہت چونکا تھا کہ اس سے میری نظر نہ مل جائے۔ افضل کی بات سن کر مولوی پھر سٹک گیا۔ دونوں میں دوبارہ ٹھن گئی۔ میرا کام بن گیا تو میں وہاں سے کھمک لیا۔ چلتے ہوئے میں نے افضل سے کہا تھا، مجھے تو ایک کام جانا ہے، تم مولوی صاحب کے لئے اکیلے بھی کافی ہو۔

ہادی کی عمر بچپن اور ساتھ کے درمیان ہو گی لیکن صحت اچھی تھی۔ غالباً اسی لئے وہ جھنکا برداشت کر گیا تھا۔ کچھ دور چلتے ہی میں نے اس کے جسم کو چھوڑ دیا تھا پلٹ کر میں پھر مولوی کی دکان پر آیا تو وہ افضل سے کہہ رہا تھا۔ ”آج کے بعد کبھی مجھ سے کلام نہ کرنا! چلے جاؤ یہاں سے!“

”جارہا ہوں مولوی! تجھ جیسے بہت دیکھے ہیں میں نے! میں تجھے کیوں منہ لگانے لگا!“ افضل ابے تے پر اتر آیا کہ مولوی کی طرح پڑھا لکھا نہیں تھا۔

لوگوں نے سمجھا بھاکر افضل کو واپس بھیج دیا ورنہ ہاتھ پائی پر نوبت آگئی ہوتی۔ مولوی کفایت اللہ جیسے عزت دار آدمی کو شاید پہلے کبھی ایسی رسوائی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہر چند کہ میں نے ہی اسے اس حال پر پہنچایا تھا مگر ترس آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شدت غم سے نمی تیرنے لگی تھی۔ پھر اسی وقت جیسے میری آنکھوں کے آگے پڑا ہوا ایک پردہ ہٹ گیا۔ مولوی کی جگہ میں نے خود کو تصور کیا۔ میں اگر ایک بیٹی کا باپ ہوتا اور مجھے یوں رسوا کیا جاتا تو مجھ پر کیا گزرتی؟ کیا بیٹی کا باپ ہونا جرم ہے؟ اگر نہیں تو پھر مولوی کو کس بات کی سزا مل رہی تھی؟

میرا خمیر مجھ پر ملامت کرنے لگا تو میں وہاں مزید نہیں رک سکا۔ نرگس نے مجھ سے جو چاہا تھا، میں نے اپنے مفاد میں اس کے برعکس کیا۔ بات اگر اقبال اور نرگس تک ہی محدود رہتی تو بہتر تھا۔ میں یہی

”ہم یہاں بیٹھے نہیں آئے مولوی صاحب!“ افضل تیوریوں پر بل ڈال کر بولا۔

”پھر بھی بھرے بازار میں کھڑے کھڑے بات کرنا شرفاء کا دستور نہیں! شریف تو.....“

”بس بس مولوی صاحب!“ افضل نے بات کاٹ دی۔ ”ہمیں شرافت کا سبق پڑھانے کی کوشش نہ کریں! آپ کتنے شریف ہیں، آج معلوم ہو گیا۔ مجھی کو نہیں سب کو!“

”کیا مطلب ہے اس سے آپ کا؟“ مولوی کے تیور بھی بدلنے لگے۔

”غذے میری دکان پر بھیج کر مطلب بھی مجھی سے پوچھ رہے ہیں! وہ دن بھول گئے جب اپنی بیٹی کے کروت جان کر میرے پیڑ پکڑ لئے تھے!“

”تم حد سے بڑھ رہے ہو افضل! اب اگر میری بیٹی کے بارے میں تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا!“ بھرے بازار میں رسوائی پر مولوی کو تاؤ آئی گیا کیونکہ اریب قریب کے دکاندار بھی جمع ہونے لگے تھے۔

”مولوی صاحب! زیادہ بڑھ چڑھ کر بولنے کی ضرورت نہیں ورنہ سب کے سامنے تمہاری شرافت کا بھانڈا پھوڑ دوں گا!“ افضل بھی جواباً چیخا۔

اس تو تکار میں اصل بات مولوی نے اب تک پوچھی ہی نہیں تھی۔ پھر جو محلے والے، افضل کے ساتھ آئے تھے، دونوں کو خوشامد درآمد کر کے خاموش کیا اور جو واقعہ پیش آیا تھا، مولوی کو بتایا۔ اس پر مولوی نے قسم کھا کر کہا۔ ”میں کسی جیدے پهلوان کو نہیں جانتا۔“

”مولوی صاحب، قسم کھا رہے ہیں تو پھر ماننا ہی پڑے گا۔“ ایک محلے دار بولا۔

”لیکن کسی اجنبی کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجھے آکر دھمکیاں دے! وہ بد معاش کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے اپنے چھوٹے بیٹے اقبال کی شادی مولوی صاحب کی بیٹی سے نہ کی تو اچھا نہ ہو گا۔ اب آپ ہی لوگ فیصلہ کریں یہ ظلم ہے یا نہیں! اس نے تو آتے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔“ افضل پھر بول اٹھا۔

”کل کو اگر کوئی بھی تمہاری طرف سے کچھ بھی آکر کہہ دے تو میں یقین کر لوں؟“ مولوی بحث کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی مضبوط دلیل دی۔ ”یہ بتاؤ کیا اس طرح دھونس دھمکی سے رشتے ہوتے ہیں؟ یہ تو واضح طور پر ہمارے کسی دشمن کی سازش لگتی ہے۔“ مولوی قدرے نرم پڑ گیا۔ ”کسی نے مجھے اور تمہیں لڑوانے کے لیے یہ چال چلی ہے۔ یہ سوچو کہ ہماری تمہاری لڑائی سے کون فائدہ اٹھا سکتا ہے! یہ کوئی بہت قریب کا آدمی لگتا ہے۔ رہی رشتے کی بات تو وہ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ تم نے انکار کر دیا، میں نے مان لیا۔“

پھر سبھی مولوی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ افضل کے چہرے کا تاثر بھی بدل گیا۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ چھوٹے خاں گزشتہ رات ہی افضل کے گھر آیا تھا۔ مولوی کی پتنگ کٹ جانے سے اسی کو فائدہ ہوتا۔ میرا الزام گویا کسی اور کے سر تھوپ کر مصالحت کی راہ ہموار ہونے لگی تو میں کس طرح اپنے کئے پر پانی پھرتے دیکھ لیتا! میں فوراً ہی ایک محلے دار کے جسم میں گھس گیا اور بولا۔

”بس کر اے علیائش! عالموں کی سی باتیں تجھے زیب نہیں دیتیں۔“
پھر میں نے یاسف سے مزید بحث مناسب نہ جانی اور چپ ہو گیا۔

☆=====☆

دوسرے دن جب میں ’زرس‘ سے ملا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔
”کل اقبال کی بہن شمناز آئی تھی۔ وہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ کہنے لگی کہ آخری بار ملنے آئی ہوں۔ پھر
اس نے ایک ایسا واقعہ بیان کیا کہ میں حیران رہ گئی۔ اسی کے ساتھ یہ سن کر دکھ بھی ہوا کہ اباجی اور چچا
افضل میں کل سر بازار جھگڑا ہو گیا۔“

”تو اس کی وجہ سے تجھے دکھی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں بولا۔
”دکھ کی بات یہ ہے کہ علیائش کہ دونوں گھروں کے درمیان آنا جانا بند ہو گیا ہے۔“

میں نے زرس کی دل دہی کی خاطر اس واقعے پر اظہار افسوس کر دیا۔ تنکا کیونکہ خود میری ہی
داڑھی میں تھا اس لئے بھی یہ ضروری تھا۔ پھر میں نے یہ بھی کہا۔ ”بزرگوں کو تو کم از کم نہیں لڑنا
چاہئے۔ اس کے علاوہ پڑوس کا بھی ناتا ہوتا ہے۔ پھر بھی اے جان‘ تو اداس نہ ہو کر تیرا اترا ہوا چہرہ نہیں
دیکھا جاتا۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ رومانی ہو گیا۔ ابھی تک میں نے کوئی انسانی ہیئت اختیار
نہیں کی تھی۔

زرس کی اداسی کا اصل سبب مجھے معلوم تھا۔ شمناز تو محض ایک بہانہ تھی، غم تو اسے اپنے محبوب
اقبال سے بچھڑنے کا تھا۔ دونوں گھروں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ ان سے کوئی اور متاثر ہوتا نہ
ہوتا‘ زرس اور اقبال ضرور سر پکڑ کے روتے۔ زرس تو خیر مجھ سے اپنا رونا رو ہی رہی تھی‘ اقبال بھی کاٹھ
کا آٹو بنا بیٹھا سوچ میں گم ہو گا۔

یہ ساری کارستانی میری ہی تھی اس لئے خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ
زرس کا دھیان کسی اور طرف لگ جائے۔ بچے جب ضرورت سے زیادہ رونے لگتے ہیں تو ان کے ہاتھ
میں کھلونا تھا دو تو چپ ہو جاتے ہیں۔ بچپن کی یہ عادت عمر بھر نہیں جاتی۔ کھلونوں سے بہل جانا آدمی کی
فطرت ہے‘ عمر چاہے کم ہو کہ زیادہ! میرے خیال میں زرس کو بھی اس وقت کسی کھلونے کی ضرورت
تھی۔ سو میں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر کھلونا بن گیا۔ ایسا میں نے اسے بتائے بغیر اچانک کیا تھا اس لئے وہ
چوٹک اٹھی۔ اب اسے میری جگہ اپنا محبوب اقبال بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کے حسین لب حرکت میں
آگئے۔ ”علیائش! تو یہ..... اقبال.....“

”ہاں مجھے اقبال ہی کہہ۔“ میں بول اٹھا۔ ”بھول جا علیائش کو!“ میری آواز بھی اب بدل چکی
تھی۔

پھر وہ تو علیائش کو بھول گئی، مگر مجھے یاد رہا کہ میں‘ اقبال نہیں ہوں۔ کسی کو کھلونا دے کر بھلانے
والا یا خود کھلونا بن جانے والا چاہے بھی تو اپنی حقیقت نہیں بھولتا۔

”اقبال!“ مجھے جیسے کہیں بہت دور سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ خود فریبی کے دائرے میں داخل

سوچتا ہوا اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔
مجھے میرے مجاہدے کا شرٹل گیا، مگر مولوی کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس زیادتی
کے نتیجے میں زرس اور اقبال کے ملاپ کی لائن کٹ گئی۔ مجھے مقتول فیروزہ بیگم یاد آئی۔ امیر آباد کے
جاگیردار مہدیار خاں کی بیوی! وہ بھی کسی کے عشق میں جلا تھی اور میں نے ہی اسے اس کے بچھڑے
ہوئے محبوب سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ یہاں بھی تقریباً وہی معاملہ تھا البتہ نوعیت مختلف تھی۔ میرے
اندر تضادات کی ایک جنگ جاری رہی جس کے سبب ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر میں نے
ایک اور ہی رخ پر سوچنا شروع کر دیا۔
یاسف دوپہر کو سواٹھا تو کہنے لگا۔ ”کب تک کے لئے تُو نے بن باس لیا ہے اے علیائش! کچھ تو بتا
دے یا!“

”یہ بتا اے یاسف کہ ہم دونوں اگر آدم زادوں کے درمیان آدم زاد ہی بن کر رہیں تو تجھے کوئی
اعتراض ہو گا اس پر؟“ میں نے جو سوچا تھا‘ کہہ دیا۔ اس کی بات کو میں نظر انداز کر گیا۔
”اس طرح رہنے میں کیا برائی ہے؟ پہلے یہ بتا!“ یاسف نے پوچھا۔

”یہ بھی کوئی زندگی ہے اے یاسف! آدم زادوں کو دیکھ‘ کتنے خوش نظر آتے ہیں! گھر‘ بیوی‘ بچے‘
خاندان‘ سبھی کچھ تو انہیں میسر ہے۔ بلاشبہ ان کے حصے میں دکھ بھی ہیں‘ لیکن وہ ایک دوسرے کا دکھ
بانٹ لیتے ہیں۔ ان کے دکھوں پر بھی پیار آتا ہے۔ ایک ہم جنات ہیں‘ سوچ کہ کس قدر بکھرے ہوئے
ہیں! نہ گھر‘ نہ در‘ نہ کوئی مستقل ٹھکانا! آج یہاں تو کل وہاں! بیویاں وفادار نہیں‘ ماں کو اولاد سے محبت
نہیں! نہ بیٹے کو باپ کی فکر‘ نہ باپ کو بیٹے سے تعلق! کوئی رشتہ بھی تو ایسا نہیں کہ جس پر بھروسہ کیا جا
سکے۔“

”تمام جنات کے لئے تو یہ نہیں کہا جا سکتا اے علیائش! بہت سے اب بھی اپنے خاندانوں کے
ساتھ رہتے ہیں۔ کیا ہاموس اپنے خاندان کو سیٹھے نہیں بیٹھا؟“
”میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے جو تجھ سے آدم زاد بن کر رہنے کی بات چھیڑی ہے تو

اس کی وجہ ہے۔ یوں جینے میں ایک الگ ہی مزہ ہے۔“
”ہو گا‘ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ ہزاری سے بولا۔ ”اغوا ہونے کے بعد جب تُو لوٹ کر آیا ہے‘
تیری باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔ تُو بھی پہلے میری ہی طرح اچھا بھلا جن زاد تھا۔ اب تجھے ہر وقت
آدم زادوں کی گفتگو سے فرصت نہیں۔ ارے لعنت پڑھ ان پر‘ ہمارا ان سے کیا تعلق!“
”کیا تُو اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ وہ بھی ہم جنات کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں؟“

”تو میں کیا کروں! ہوا کریں۔ تُو شاید آدم زادوں کے عشق میں یہ بھول گیا کہ اس زمین پر آدم
زادوں سے پہلے صرف ہی رہتے تھے! اب ان کی وجہ سے ہم دوسرے درجے بلکہ تیسرے درجے کی
مخلوق بن گئے۔ تو پھر یہ ہمارے دشمن ہوئے کہ دوست؟“
”ہمیں تو ہمارے اعمال نے مارا۔“

”ہاں، مجھے اس کی ایک کمزوری معلوم ہے۔ حکمت کے ساتھ اسے شاعری کا بھی شوق ہے۔ پہلے اس کے اشعار لی کر ہمیں سر دھتا پڑے گا، پھر عرض مدعا کریں گے تو حقیقتاً انکار نہیں کرے گا۔ شاعری میرے پلے تو پڑتی نہیں، لیکن تجھے تو جن زادوں اور آدم زادوں کے لاتعداد شعریاد ہیں۔ تجھ سے مل کر وہ بہت خوش ہو گا۔“

پھر یاسف کے ساتھ اسی وقت میں، حکیم خاشع سے ملنے شہر سے باہر نکل آیا۔ عالم ہاموس کی ویران حویلی سے کچھ آگے کھنڈرات تھے۔ حکیم خاشع نے وہیں اپنا ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ہاموس کی حویلی کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اس کی بیٹی وازعہ کا خیال آگیا جو مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو چکی تھی۔ اس نے مجھ سے خراج عشق بھی وصول کر لیا تھا، لیکن میں مستحقاً خراج کی ادائیگی پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا، اگر اس جن زادی کو کسی طرح سن گن مل گئی کہ قریب ہی اس کا مطلوب و مفرد موجود ہے تو جینا حرام کر دے گی۔ اس خطرے سے بچنے کی ایک صورت یہی تھی کہ میں، کھنڈرات میں آنے جانے کا راستہ دوسری طرف سے رکھتا۔ اس طرح مجھے ذرا لمبا پتھر تو ضرور کاٹنا پڑتا مگر وازعہ کے دستِ ہوس سے بچا رہتا۔

خاشع کے معنی عاجزی کرنے والا ہیں۔ ابلیس لعین کا پہلا نام بھی یہی تھا کہ اس کا شمار بھی اللہ کی عاجزی کرنے والوں میں تھا۔ وہ بھی ایک جن ہی تھا کہ جسے غرور و تکبر لے ڈوبا۔ جب یاسف نے مجھے حکیم کا نام بتایا تھا تو مجھے نام کی نسبت سے یہی گمان ہوا کہ حکیم منکر الزنا ج قسم کا ہو گا، مگر معاملہ برعکس نکلا۔

ہزار سالہ خزانہ حکیم خاشع بہت رُدا دکھائی دیا۔ وہ ایک مریضہ جن زادی کی کیفیت اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے اسے ڈانٹ رہا ہو۔ بڑھاپے میں عموماً ابھی ایسے رُے ہو جاتے ہیں۔ مریضہ دوا لے کر چلی گئی تو وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

”تم دونوں میں سے تو مجھے کوئی بھی بیمار نہیں لگتا!“ اس نے تیز نظروں سے ہمیں دیکھا۔
”اے حکیم! ہم تجھ سے دوا لینے نہیں آئے۔“ یاسف بول اٹھا۔ ”تیرا ایک شعر ہمیں عالم ہاموس نے سنایا تھا تو اشتیاق پیدا ہوا کہ خود کبھی جا کر شعر سنیں گے۔“
”اچھا..... اچھا! تو عالم ہاموس کو بھی ہمارے شعریاد ہیں، بہت خوب!“ وہ خوش ہو گیا۔ اپنی انا کی باش کسے پسند نہیں ہوتی! اس کے چہرے کا خزانہ پن خاصی حد تک کم ہو گیا اور پھر وہ بلا تاخیر ہماری سامعوں کو لبو لہان کرنے لگا۔

حکیم کے شعرا اس قابل نہیں تھے کہ میں یاد رکھتا، لیکن یاسف کی ہدایت کے مطابق ہر شعر پر ”واہ واہ“ سبحان اللہ سبحان اللہ“ کہتا رہا۔ اس وقت اپنا سر دھنے کی بجائے حکیم کا سر دھنے کو جی چاہ رہا تھا کیونکہ وہ اشعار ”اگلے ہوئے نوالے“ تھے۔ حکیم خاشع انہی کی جگالی کر رہا تھا۔ کسی شعر میں حافظ کی ”پیر دُئی“ تھی تو کسی میں نظیر و بیدل کا عکس تھا۔ آدم زاد شعراء کے شعر ”گھاو“ کہ حکیم کو شاید غلط فہمی تھی کہ عالم جنات میں کسی کو اس کی خبر نہ ہوگی۔ پھر بھی میں باخبر ہو کر بے خبر بنا رہا۔ وہ خاصی دیر تک ”سینہ زداری“

ہو گئی۔ اس نے مجھی کو اقبال کہا تھا۔
روح سفر میں ہی تھا، کل مجھے کسی اور نام سے بھی پکارا جاسکتا تھا۔ سو میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ جو روح سفر ہوتے ہیں، انہیں ناموں سے نہیں پہچانا جاتا، مگر یہ بات میری زبان پر نہ آئی کہ اس طرح وہ خواب بکھر جاتا جو زنگس کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

اے میرے شاہد حیات اور ابھی قریب تر! میں نے سوچا لیکن نہ تو یہ کہا نہ اس پر عمل کیا
دور بیضا غبار میر اس سے
عشق بن۔ یہ ادب نہیں آتا
قرب و دوری دراصل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہے۔ کچھ تو پاس ہو کر بھی دور رہتے ہیں اور کچھ دوری کے باوجود رگِ جاں سے بھی قریب لگتے ہیں۔ عشق ہوئے بغیر یہ آداب نہیں آتے۔
اس خواب کی دھند چھٹ گئی تو میں نے کچھ سوچتے ہوئے زنگس کو مخاطب کیا۔ ”تُو مجھے یاد تو رکھے گی نا؟“

”کیوں..... کیا تُو اب میرے پاس نہیں آئے گا؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔
”ہاں یہ ممکن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے ایک سفر درپیش ہے۔“
”کہاں جا رہا ہے تُو؟ کیا اس شہر سے کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟“
”کہیں اور جا بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی! سفر کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہوگی۔ اس سفر کا تعلق کہیں آنے جانے سے نہیں۔“ گزشتہ شب سونے سے پہلے میں نے جو کچھ سوچا تھا، اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”یہ سفر خارج کا نہیں، داخل کا سفر ہے، اپنے اندر کا سفر!“
”آج تُو بڑی عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا! مجھے ذرا وضاحت سے بتا کہ تیرا مقصد کیا ہے؟ تُو چاہتا کیا ہے؟“
”تُو اگر مجھ سے یہ سوال نہ کرتی، کوئی اور تیری جگہ ہوتا تو شاید میں جواب دینے سے گریز کرتا۔“
پھر میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا، پھر بولا۔ ”اس کے باوجود میں کبھی کبھار تجھ سے آکر ملتا رہوں گا اس لئے اے زنگس کہ تُو میری مجبوری ہے! تجھ سے غافل رہنا میرے بس میں نہیں۔“
”لیکن یہ تو بہت لمبا سفر ہے!“ وہ بولی۔

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“
”میں دعا کروں گی کہ تُو اپنے اس سفر میں کامیاب رہے۔“
پھر میں چلا آیا اور اسی شام یاسف سے تفصیلی بات کی۔ وہ کہنے لگا۔ ”تُو پھر ابھی چلتے ہیں، آج کی شام تیرے نام سہی! حکیم خاشع سے مل لیتے ہیں کہ عالم جنات میں اس سے اچھا حکیم کوئی اور نہیں ہے۔“ جنات میں حکیم بھی ہوتے ہیں۔
”مگر کیا وہ مجھے حکمت سکھانے پر راضی ہو جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

ان گڑھ تو پاگل ہو جائیں گے۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے اور لاعلمی کے سبب ہر وقت پکڑے جانے کا خطرہ الگ ہو گا۔ کہیں کوئی مولوی کفایت اللہ جیسا ٹکرا گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔“

”اس مسئلے پر بھی غور کر چکا ہوں۔ ہم بے سپر نہیں ہوں گے۔ میدان جنگ میں ہتھیاروں کے بغیر اتر جانے والے عموماً مارے جاتے ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ چلیں گے۔ یہ سفر شوق مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔“ میں اسے سمجھانے لگا۔ ”جو علم یا جو ہنر ہمیں نہیں آتا، ہم اس سیکھیں گے۔“

”میں تجھ سے پھر یہ سوال کروں گا کہ آخر ہم ایسا کیوں کریں؟“

”زندگی تغیر کا نام ہے، جہود کا نہیں۔ یکساں جیتے جی مار دیتی ہے۔ ایک سے دن، ایک سی راتیں، ایک سے صبح و شام! وہی آدم زادیوں کی جستجو، وہی آدم زادوں سے معرکہ آرائیاں، وہی فریب دی، وہی آوارہ گردی، دشت نور دی، کیا رکھا ہے اس میں!“

”پانی میں رہ کر مگر مجھ سے بیرکھنے والی بات کی ہے تو نے!“ یاسف بولا۔ ”بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم آدم زادوں میں رہیں اور ان سے نہ ٹھنڈے!“

”وہ تو اب بھی ٹھنڈی ہی رہتی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا!.....! دیکھ اے یاسف، کوئی بھی علم سیکھنے کو میں اپنے اندر کا سفر جانتا ہوں۔ پہلے ہم اندر کا سفر کریں گے، پھر باہر کا! آدم زادوں کو جو علوم آتے ہیں، ہم سیکھ لیں تو کیا برائی ہے!“

”اور تیرے عشق کا کیا ہے گا؟ کیا تو زگر سے بچھڑ کے زندہ رہ سکے گا؟“

”میں اسے بھی اس سفر کے بارے میں بتا چکا ہوں! تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس طرح میں اس سے بچھڑ جاؤں گا؟ کسی کو یاد رکھو تو وہ دل کے قریب رہتا ہے اور بھول جاؤ تو فاصلہ ہی فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ جب دیدار کی طلب قابو میں نہیں رہے گی تو مل لیا کروں گا!“

”تو ابھی تک اے علیالیش، تو دیدار ہی پر گمراہ کر رہا ہے!“ وہ ہنسا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا کہ.....“

”تو جو چاہے سمجھا کر مگر میرے لئے یہ بھی بہت ہے۔“ پھر میں نے اسے بتایا۔ ”فرض کر کہ میں کسی حکیم کے جسم میں اتر جاتا ہوں تو میرے لئے کیا جاننا ضروری ہے.....؟ تیرا جواب یہی ہو گا کہ حکمت! کیا یہ علم سیکھنا ممکن نہیں؟ متعدد جنات حکیم ہیں۔ ان سے یہ علم سیکھا جاسکتا ہے۔“

”پھر تو آدم زادیوں سے وہاں بھی سابقہ ہو گا!“ یاسف نے پلٹ کر بار بار پر اشتیاق لہجے میں کہا۔ ”کسی بھی آدم زاد کے جسم میں اتر کر بھلا آدم زادیوں سے چٹنا کیسے ممکن ہے؟“

”میں نے یہ کب کہا اے یاسف! لیکن یہ تیرا مسئلہ تو ہو سکتا ہے، اب کم از کم میرا یہ مسئلہ نہیں رہا۔“

”تو خارج تو نہیں ہو گا میرے معاملات میں؟“ اس نے یقین دہانی چاہی۔

”مجھے کیا پڑی ہے! تیرا عمل تیرے ساتھ، میرا عمل میرے ساتھ!“

کے بعد چپ ہوا تو یاسف مقطع کے بند پر آگیا۔
”اے اس عہد کے عظیم شاعر اور عظیم حکیم! میرے اس دوست علیالیش کو حکمت سیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ یاسف نے اصل گفتگو شروع کر دی۔

اعتراف عقلمندی پر اس نے ہرگز انکساری سے کام نہ لیا جیسے یہ اس کا حق، کہنے لگا۔ ”شوق تو بہت سوں کو ہوتا ہے لیکن یہ بڑا پتادوں کا کام ہے۔“ پھر اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ ”تو محنت کر سکے گا؟ خرافات سے وقت ہے تیرے پاس؟ پھر یہ بتا کہ تجھے حکمت سیکھنے ہی کی کیوں سوجھی؟“

”خلق خدا کی خدمت میرے نزدیک کارِ ثواب ہے۔“ میں نے پہلے سے طے شدہ جواب دے دیا۔
مجھے اندازہ تھا کہ یہ سوال ضرور کرے گا۔

میرے جواب سے وہ مطمئن نظر آیا اور پھر کام بن گیا۔ یاسف کا ”نسخہ“ کارگر رہا۔
شاعر تو وہ انتہائی لغو تھا لیکن حکیم واقعی بڑا تھا۔ دوسرے ہی روز سے اس کے یہاں میری آمد و رفت شروع ہو گئی۔ میرے اصرار پر یاسف بھی ساتھ جانے لگا۔ حکیم نے اسے نئے باندھنے پر لگا دیا۔ یوں میں تو حکیم بننے کی تیاری کرنے لگا اور یاسف کو عطار بن جانے پر آمادہ ہونا پڑا۔ انواع و اقسام کی جزی بوئیاں کوٹنے اور کھل کرتے ہوئے میں تھک جاتا مگر حکیم خاشع کو مجھ پر ترس نہ آتا۔

آدم زادوں کی نسبت اپنے مزاج کی تیزی کے سبب جنات کسی بھی علم کو زیادہ جلدی سیکھ جاتے ہیں۔ میں اسی لئے ”تیز ترک گامزن“ کی تفسیر بتا ہوا تھا کہ میری منزل اب زیادہ دور نہیں تھی۔ یاسف کی عیاشیوں میں بھی اسی کے سبب خاصی کمی آگئی۔ بظاہر تو وہ میرے اصرار پر عطار بننے کو راضی ہوا تھا، لیکن حقیقت کی مجھے خبر تھی۔ اپنے مستقبل کی خاطر میں نے جو منصوبہ بنایا تھا، بوجہ یاسف کو بھی پسند آیا تھا۔

پہلے تو یاسف نے میری یہ بات ٹال دی تھی کہ آدم زادوں کے درمیان آدم زاد بن کر رہا جائے، لیکن جب اس سے تفصیلی گفتگو ہوئی تو اسے قائل ہونا پڑا۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ ”اے یاسف! اب تک ہم نے دور ہی دور سے آدم زادوں کو دیکھا ہے۔ ہمیں ان کو زیادہ سمجھنے اور ان کے اندر اترنے کے زیادہ مواقع نہیں ملے۔ ممکن ہے کہ جس طرح جنات کی مختلف قسمیں ہیں، آدم زادوں کی اقسام بھی ہوں۔ میں نے سوچا کہ ہم ان کے درمیان مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے ان کے اندر اتر کے دیکھیں۔ جسوں جسوں سفر کریں، پھر کسی فیصلے تک پہنچیں۔“

اس پر یاسف بولا۔ ”اے علیالیش! یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بہت سے جن زاد، آدم زادوں میں انسان بن کر رہتے ہیں۔“

”لیکن ان کا تجربہ ہمارا تجربہ تو نہیں بن سکتا!“

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتا ہے!“ یاسف نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ”سب کا تجربہ الگ الگ ہوتا ہے، لیکن یہ کام ہے مشکل! ہمیں آنا جانا کیا ہے! آدم زاد مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں، کوئی دکیل ہے تو کوئی طبیب، کسی نے لوہے کو موم کرنے کا ہنر سیکھا ہے، کسی کو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنا آتی ہیں۔ اسی طرح متعدد علوم و فنون انہیں آتے ہیں۔ زراعت، صنعت و تجارت وہ کس میں طاق نہیں! ہم جیسے ان پڑھ اور

”پھر تو تیرے ساتھ رہنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔“ یوسف بولا۔ ”اسی کے بعد یوسف نے مجھ سے حکیم خاشع کا ذکر کیا تھا۔

جب حکیم سے معاملہ بن گیا تو میں نے یہ تجویز رکھی کہ یوسف عطار بن جائے تاکہ ہم دونوں دوست ساتھ رہ سکیں۔ پہلے تو اس نے تھوڑا سا خزا دکھایا، پھر مان گیا۔ اتنا فرق اس کے معمولات میں ضرور پڑا کہ اب ہر شب، شب برات نہ رہی۔ وہ ہفتے میں دو ایک مرتبہ حکیم خاشع کو غچہ دے جاتا۔ حکیم مجھ سے کہتا: اے علیالیش! تجھ میں جو میں جستجو دیکھتا ہوں، تیرے دوست یوسف کے اندر نام کو نہیں۔ مجھے تو وہ آوارہ گرد لگتا ہے۔

حکیم سے میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ کبھی جب میں بہت نڈھال ہو جاتا تو خاشع سے تازہ اشعار سنانے کی فرمائش کر دیتا۔ وہ تو جیسے اسی انتظار میں ہوتا، فوراً مجھے سامنے بٹھا کر شعر ”پلانا“ شروع کر دیتا۔ یوں مجھے آرام کا موقع نصیب ہو جاتا، وہ بھی کچھ دیر کے لئے! شعر سناتے ہی خاشع مجھے پھر ”دیراڑی“ سے لگا دیتا۔ خاشع اب اکثر مریضوں کو میرے حوالے کر کے خود شعر موزوں کرنے لگتا تھا۔

اب تک خطرہ مجھ سے دور ہی دور تھا۔ وازعہ میرے بارے میں لاعلم ہی تھی کہ میں کہاں ہوں! لیکن ایک روز میں عین موقع پر پکڑا گیا۔ اس روز بھی میں، حکیم خاشع کی جگہ مریضوں کو دیکھ رہا تھا کہ وازعہ وہاں آگئی۔ صورت ہی سے وہ بیمار دکھائی دے رہی تھی۔

خلاف توقع ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

مریضوں کو ایک ایک کر کے حکیم کے پاس ٹوٹی ہوئی منڈیر کے پیچھے آنا پڑتا تھا۔ وہاں مریض اور حکیم کے سوا عموماً کوئی نہ ہوتا تاکہ مریض کو اپنا مرض بتاتے ہوئے جھجک نہ ہو۔ وازعہ بھی اکیلی ہی آئی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ”اے بے وفا علیالیش! تو یہاں چھپا بیٹھا ہے!“

”یہ ان باتوں کا وقت نہیں اے وازعہ! تو اپنا مرض بتا! میں رات کو تجھ سے آکر ملوں گا۔ پھر تجھے جو کہنا ہو، کہہ لینا!“

”میرا اصل مرض جانتا ہے تو!“ وہ ہلا جھجک بولی۔ ”تیرے پاس علاج بھی ہے اس کا! مگر تو جھوٹا ہے۔ مجھے خبر ہے، رات کو اپنا وعدہ وفا کرنے تو نہیں آئے گا۔“

بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھا جھکا کر کیفیت بتانے پر آمادہ کیا اور وہ نسخہ لکھوا کر یوسف کے پاس چلی گئی۔ غنیمت یہ تھا کہ خاشع آس پاس نہیں تھا۔ شعر موزوں کرتے ہوئے اسے ٹھٹھنے کی عادت تھی۔ وہ ٹھٹھا ہوا ذرا دور نکل گیا تھا۔ وازعہ نے جانے سے پہلے جگہ اور وقت کا تعین کر لیا تھا۔

جنات اور آدم زادوں کے امراض میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ طریقہ علاج اور دوائیں بھی تقریباً یکساں ہیں۔ فرق صرف دونوں کی تخلیق کا ہے، یعنی آگ اور مٹی کا تضاد! اس کے لئے دواؤں میں تھوڑی سی رد و بدل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دوا کسی جن زاد کو فائدہ پہنچائے، آدمی کے لئے زہر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ حکیم خاشع نے مجھے یہ فرق بھی سمجھا دیا تھا۔ خاشع ہی سے مجھے پہلی بار یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات، انسانی طب سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ خود خاشع نے بھی ایسا کیا تھا۔

وازعہ کو جو مرض تھا، وہ بھی آدم زادیوں کو ہوتا ہے۔ عام طور پر عالم جنات میں سو سال کی عمر ہوتے ہی جن زادیوں کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ ڈیڑھ سو سال تک نوجوانی ہی شمار ہوتی ہے البتہ کوئی جہیز دو سو سال کی ہو جائے تو رشتے ملنے میں قناعت ہونے لگتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ فق و غور میں مبتلا ہونے کے سبب جن زادیاں نوجوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی کھل کھیلتی ہیں۔ کم ہی ایسی ہوتی ہیں کہ پاک دامن رہیں۔ وازعہ کی زندگی میں آنے والا میں پہلا جن زاد تھا۔ اس کا بڑا سبب عالم ہاموس تھا۔ وہ اپنی اولاد پر کڑی نظر رکھتا۔ پھر بھی تقاضائے فطرت دبائے نہیں دیتے۔ وازعہ دو سو سال کی ہو چکی تھی۔ باپ کی تربیت اور ماحول کے سبب وہ نہیں بکھی، مگر کب تک! آخر اس کے صبر کا پیمانہ پھٹک ہی پڑا۔ جنات میں دین داروں کی بہت کمی تھی۔ ہاموس کو اسی لئے کوئی مناسب رشتہ نہ مل سکا۔ اسی کے نتیجے میں وازعہ کے قدموں کو لغزش ہوئی۔ میں اس لغزش کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا تھا، کہ شاید یہی وازعہ کا مقدر تھا۔ ایک عمر کو پہنچ کر بھی فطری تقاضے پورے نہ ہوں تو طرح طرح کے عوارض آگھیرتے ہیں۔ وازعہ کو بھی ایک ایسا ہی عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ ان حالات میں طیب عموماً شادی کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن میں، وازعہ کو یہ مشورہ کیسے دیتا! وہ ظالم مجھ سے شادی کی خواہش مند تھی۔ میں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ پھر جب میرا مطلب نکل گیا تو میں نہیں پلٹا۔ وازعہ چاہتی تھی کہ میں اس سلسلے میں اس کے باپ ہاموس سے بات کلاؤں۔ میری خاطر وازعہ نے اپنے باپ سے کیا ہوا عہد تک توڑ دیا تھا۔ اسی نے مجھے وہ عمل بتایا کہ کسی کیل دیئے جانے والے مکان میں داخل ہونے کے لئے کیا کرنا اور پڑھنا ہوتا ہے۔ تبھی میں، نرس کی حویلی میں داخل ہو سکا تھا۔

ادھر تو ہاموس مجبور تھا کہ بیٹی کی شادی کسی گمراہ جن زاد کے ساتھ کس طرح کر دے، ادھر وازعہ صبر کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔ اگر میں درمیان میں نہ آجاتا تو شاید وازعہ کے قدم نہ بھٹکتے۔ طلب کوئی بھی ہو، کسی طرح پوری ہو جائے تو اس میں اضافے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ناآشنائے منزل ایک مرتبہ اگر منزل تک پہنچ جائے تو پھر دوبارہ اسے جیسے وہی رستے صدائیں دیتے ہیں کہ جن سے گزر کر منزل تک پہنچنا ممکن ہو۔ راہ کے پیچ و خم سے آگئی قدم اٹھانے پر اسکا پی رہتی ہے۔ اگر راستہ بند کر دیا جائے یا کسی سبب پیروں میں زنجیر ڈال دی جائے تو ایسے مسافر کی جو حالت ہوتی ہے، وازعہ کی حالت اسی سے مماثل تھی۔ سو مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آیا۔

عالموں کا معیار انتخاب ذرا کڑا ہوتا ہے ورنہ تو یہ معاملہ اتنا طول نہ کھینچتا۔ مجھے اس ضمن میں ہاموس کی انتہا پسندی پر بھی رنج ہوا۔ میرے لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وازعہ کی خواہش پر خود کو قربان کر دیتا، اسے اپنا لیتا، ہاں ایک اور صورت ممکن تھی۔ سو میں نے اسی پر عمل کیا۔

میں اسی روز بعد مغرب ہاموس کی ویران حویلی میں پہنچ گیا۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھا ہی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ ”کیا مجھ سے پھر کوئی عمل پوچھنے آیا ہے؟“

”نہیں اے ہاموس، میں ایک اور غرض سے آیا ہوں۔“

”مجھے خبر ہے کہ تو غرض ہی کا بندہ ہے! نماز چھوڑ دی کہ پڑھ رہا ہے اب بھی؟“ حسب عادت وہ

”ہاں یہ مجبوریاں تو ہیں۔ پھر بھی اے ہاموس، کیا یہ ممکن نہیں کہ تو اپنے معیار انتخاب کو اعتدال لے آئے؟“

”یہ کیا کٹاؤنے؟ اعتدال تو کسے سمجھتا ہے؟“ اس کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔

”عظمتی سے میں نرمی کی جگہ اعتدال استعمال کر گیا۔“ میں نے فوراً پینتر بدل دیا۔

”ہاں انتخاب میں نرمی ممکن ہے۔ مثلاً مجھے خبر ہے کہ تو بھی کوئی پار سانیس۔ تیرے دامن پر بھی مٹا ہوں کے دھبے لگے ہیں، لیکن تیرے اندر نیکی بھی موجود ہے۔ تو راہ راست پر آسکتا ہے۔ تجھ میں متپائش ہے! اگر تجھ جیسا کوئی نوجوان بھی مل جائے تو میں اس وازعہ کا رشتہ کر دوں۔“

اس پر میں ذرا سادہ کا کہ یہ ”نیکی“ میرے ہی گندے ہاتھوں کے لئے سبب تو مثال نہیں دی ہوگی، یہ سوچ کر اپنی گلو خلاصی کی خاطر میں نے کہا۔ ”جہاں تک میرا قیاس ہے، وازعہ مجھ سے عمر میں بہت بڑی ہوگی۔ میں تو ابھی صرف ڈیڑھ سو سال کا ہوں۔“

”ہاں وہ دو سو سال سے اوپر نکل رہی ہے، پھر بھی اتنی گنتی نہیں۔ میں نے تو محض مثال کے طور پر نرمی کی وضاحت کے خیال سے تیرا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ تو ہی وازعہ سے شادی کر لے۔ تیری نظر میں کوئی رشتہ ہو تو بتا! ایک مرتبہ میں نے یاسف کے باپ سے بھی بات کی تھی، لیکن بعد میں پتا چلا کہ یاسف بھی آدم زادوں کے چکر میں رہتا ہے۔ پھر میں نے بات آگے نہیں بڑھنے دی۔ جس نوجوان کے بارے میں میں بھی پتا لگاتا ہوں، وہ آوارہ نکلتا ہے۔ اس کے باوجود میں تیرے مشورے پر جلد از جلد عمل کروں گا، انشاء اللہ! میں تیرا ممنون ہوں اے علیائش کو تو نے بروقت مجھے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔“

”ایک طبیب کی حیثیت سے یہ تو میرا فرض تھا بھئی ہاموس!“ میں نے اس سے کہا اور اٹھ آیا۔ اس مرتبہ وازعہ سے ملاقات کا وعدہ کر کے میں نے راہ فرار اختیار نہیں کی۔ یوں بھی اب ایسا ممکن نہیں تھا۔ وازعہ کو خبر تھی کہ دن کے وقت میں اب اسے کہاں مل سکتا ہوں! دن میں وہ حکیم خاشع کے ٹھکانے پر آدھمکتی۔ اسے یہ گمان تھا کہ مجھ پر اس کا حق ہے۔ اس گمان کا سبب میری ہی مطلب براری تھی۔ وہی کیا ہر جن زادی اس جن زاد پر اپنا حق سمجھتی ہے جسے خود قریب کر لے یا قریب آنے کا موقع فراہم کر دے۔ ایسا ہی آدم زادوں میں بھی ہے لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں!

وقت مقررہ پر میں اسی برگد کے پڑتک پہنچ گیا جو وازعہ کے خیال میں اس سے میری محبت کا نشان تھا۔ اسی درخت پر اس سے میرا پہلا ملن ہوا تھا۔

وازعہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکی اور گلے کا ہار بن گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وازعہ صبر نہ کر سکے گی۔ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ مجھے اس سے جو کچھ کہنا اور جو سمجھانا تھا، اس کے لئے سختی کی نہیں نرمی کی ضرورت تھی۔

”سن اے وازعہ! اوپر پڑ پڑ بیٹھ کے بات کریں گے۔ تجھ سے آج میں بہت اہم اور ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“ میں نرمی سے بولا۔

”شروع“ ہو گیا۔

”پڑھ لیتا ہوں، مگر پابندی سے نہیں۔“ میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ ”مجھے معلوم ہے اے ہاموس کہ نماز فرض ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی تو اور بہت سے اہم فرائض ہیں۔ بندوں کو نماز کے ساتھ ساتھ ان فرائض کو بھی پورا کرنا چاہئے! کیا تجھے میری بات سے اتفاق ہے؟“ میں نے اصل بات کرنے کے لئے تھوڑی سی تمہید باندھی۔

”تو کن فرائض کی بات کر رہا ہے؟“

”ایک نہیں بہت سے فرائض ہیں۔ مثلاً اولاد کی حیثیت سے کچھ فرائض کی ادائیگی ضروری ہے، کچھ کی بحیثیت والدین! بندوں پر بندوں کے جو حقوق ہیں، ان کی ادائیگی بھی فرائض میں شامل ہے۔ اب تو سمجھا اے ہاموس کہ میں کن فرائض کا ذکر کر رہا ہوں! میں تجھ سے عمر میں بہت چھوٹا ہوں اور مجھے یہ زیب نہیں کہ تجھ جیسے عالم کو کچھ بتانے کی جسارت کروں!“

”نہیں اے علیائش، تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو نوجوان ہے اور جب تیری عمر کا کوئی جن زاد ایسی باتیں کرتا ہے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں جان گیا کہ تو حقوق العباد کی بات کر رہا ہے۔ بلاشبہ بندوں پر اللہ کا جو حق ہے، وہ چاہے تو معاف کر سکتا ہے مگر کوئی بندہ اگر دوسرے بندے کا حق ادا نہ کرے تو اس کی معافی نہیں۔“ ہاموس نے نرمی سے کہا۔ ”تجھے جو بھی کہنا ہو، صاف صاف کہہ دے! یقین کر کہ میں برا نہیں مانوں گا۔ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تو مجھ سے کوئی خاص بات ہی کہنے آیا ہے۔“

”تیرا اندازہ درست ہے اے ہاموس!“ میں نے اعتراف کر لیا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے میں تجھے اپنے بارے میں یہ بتا دوں کہ مجھے حکمت سے شغف ہو گیا ہے۔ میں خاصے عرصے سے حکیم خاشع سے یہ علم سیکھ رہا ہوں۔ اب تو خاشع مجھے اپنی جگہ پر بھی بٹھانے لگا ہے۔“

”تو نے نیکی کی راہ اپنائی، مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔“

”میں اس وقت بحیثیت طبیب ہی تجھ سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“ میں اصل موضوع پر آ گیا۔ ”آج صبح تیری علیل بیٹی وازعہ، حکیم خاشع سے دوا لینے آئی تھی۔ خاشع نہیں تھا تو میں ہی مریضوں کو دیکھ رہا تھا۔“ پھر میں نے بطور مصلحت جھوٹ بولا۔ ”وازعہ ہی سے مجھے پتا چلا کہ وہ تیری بیٹی ہے۔ میں نے اسے یوں بھی زیادہ توجہ دی کہ تو میرا محسن ہے۔ تیری ہی وجہ سے میں ایک آدم زاد کی غلامی کا طوق پہننے ہوئے بال بال بچ گیا۔“

”یہ ذکر چھوڑ! مجھے تو وازعہ کے مرض سے آگاہ کر! پتا کہ تیری تشخیص کیا ہے؟“

”تو اب اس کی شادی کر دے کہ مرض کا صحیح اور مستقل علاج یہی ہے۔ دوا تو خیر میں نے دے ہی دی ہے، مگر اصل بات وازعہ سے نہیں مجھے تجھ سے کرنا تھی۔ یہ بات اس سے کرنے کی تھی بھی نہیں۔“

”ٹھیک کہا اور ٹھیک ہی کیا تو نے کہ والدین ہی سے ایسی باتیں کرنا مناسب ہے۔“ پھر ہاموس مجھے اپنی ان مجبوریوں سے آگاہ کرنے لگا جن کا علم مجھے پہلے ہی تھا۔

”مجھے معلوم ہے تو کیا باتیں کرے گا!“ وہ اٹھائی۔ ”میں نے آج مغرب کے بعد تجھے اپنے باپ ہاموس کے پاس بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ تو یقیناً اس سے میرا رشتہ مانگنے آیا ہو گا۔“

اس خوش گمان جن زادی سے سچ بولنا میں نے مناسب نہیں جانا کہ وہ اس کی متحمل نہ ہوتی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھی۔ یہ ذہنی جھٹکا اس سے شاید برداشت نہ ہوتا۔

”تو نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پھر اوپر چلنے پر اصرار کیا کہ ہم راہ گزر پر کھڑے تھے۔ کوئی آوارہ گرد جن زاد ہم دونوں کو دیکھ کر پہچان لیتا تو بڑی رسوائی ہوتی، میری رسوائی کم وازعہ کی زیادہ کہ وہ بہر حال ایک عالم کی بیٹی تھی۔ جنات ایک دوسرے کو دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں، اگر وہ خود پر اندھیرے کی چادر نہ ڈال لیں۔

وازعہ مان گئی۔ ہم اس درخت کی ایک موٹی سی شاخ پر جا بیٹھے۔

”باقی باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے تو یہ بتا کہ اتنے دن سے کہاں تھا؟“ وازعہ نے خالص محبوبانہ انداز میں دریافت کیا۔

”مجھے ایک خطرناک آدم زادی اغوا کر کے لے گئی تھی۔“ میں نے بات بنادی۔ ”طویل عرصے میں اس کی غلامی میں رہا، پھر بڑی مشکل سے فرار ہو سکا۔“

”کس اس نے تجھے اپنے تصرف میں تو نہیں لے لیا؟“ سب سے پہلے اسے میری عزت و آبرو کا خیال آیا۔

”نہیں۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کو جھوٹ بول دیا۔ ”وہ مجھ سے ایک اور کام لیتا چاہتی تھی۔“

اس پر وازعہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ گویا کسی دوسری نے مجھ پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ مجھے اپنا متوقع شوہر سمجھ رہی تھی۔

”لیکن وہاں سے فرار ہو کر تو سیدھا میرے پاس کیوں نہیں آیا؟“ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔ ”تو حکیم خاشع کے ساتھ تو بہت دن سے ہو گا! اس قدر قریب رہ کر بھی نہیں ملا!“

”اول تو یہ کہ میں صرف دن کے وقت یہاں ہوتا تھا۔ پھر یہ کہ مجھ سے حکیم نے یہ عہد لیا تھا اسی صورت میں حکمت سکھائے گا جب میں آوارہ گردی چھوڑ دوں۔“

”تجھے یہ علم سیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ خاک ڈالتا حکیم کی صورت پر!“

ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے دوسرے اور پھر تیسرے جھوٹ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی، میں اسے کس طرح بتا دیتا! وہ اس وقت میرے لئے جہاز کا چیخڑا بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے ایک اور جھوٹ بولا۔ ”یہ بھی میں نے تیری ہی خاطر کیا کہ ہاموس مجھے نیک چلن سمجھ کر رشتے سے انکار نہ کرے۔ تیری ہی وجہ سے آج مجھے حکیم سے کیا ہوا عہد بھی تو نرا پڑا۔ اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ جب تک میں اس سے حکمت کا علم سیکھ رہا ہوں، کسی جن زادی سے نہ ملوں۔ علم طلب کو وہ خزانہ حکیم عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ جب اس محترم پیشے سے وابستہ ہو جاؤں گا، خلق خدا کی خدمت کرنے لگوں گا تو یقیناً ہاموس متاثر ہو گا۔ پھر تجھے حاصل کرنا کوئی مشکل نہ

ہو گا۔ یہی سوچ کر میں نے حکیم سے عہد کر لیا اور آج عہد شکنی بھی ہو گئی۔“

”میں نے بھی تو اسے علیالیش، تیری خاطر اپنے باپ سے کیا ہوا عہد توڑ دیا تھا!“ وازعہ نے بات برابر کردی، پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہوئی میرے باپ سے یہ بتا!“

”مجھے علم تھا کہ وازعہ میں اتنی ہمت نہیں، اپنے باپ سے میری بات کی تصدیق کر سکے۔ میں اسی لئے بہت اطمینان سے بولا۔“ ہاموس فوری طور پر راضی نہیں ہوا۔ اس نے یہ شرط عائد کی ہے کہ پہلے میں پوری طرح حکمت سیکھ لوں، کامل ہو جاؤں اور حکیم خاشع بھی اس کی تصدیق کر دے، تبھی وہ تجھ سے میرا نکاح پڑھوائے گا۔“ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وازعہ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دے۔ اسے یہ آس رہے کہ آج نہیں تو کل میں اس کا ہو جاؤں گا۔

”یہ تو میرے باپ نے بڑی کڑی شرط لگا دی! کیا خبر تو کب تک حکمت میں کامل ہو!“

”میں بہت کچھ سیکھ چکا ہوں اے وازعہ! زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

وہ بہل گئی کہ اسے بھلنا ہی تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس نے بے تکلفی شروع کر دی تو میں برداشت نہ کر سکا۔

”نہیں اے وازعہ!“ میں بول اٹھا۔ ”آج کی اس ملاقات کی حد تک میں نے عہد شکنی کر لی، مگر اب حد سے تجاوز کرنا اچھا نہ ہو گا۔ یوں بھی تو ایک عالم کی بیٹی ہے، تجھے یہ سب کچھ مناسب نہیں۔ تو نے جب اتنے عرصے صبر کر لیا تو کچھ دن اور سہی!“ پھر میں نے اسے ڈرایا۔ ”کیا خبر ہمارے گناہ دامن گیر ہو جائیں اور پھر ہم کبھی ایک دوسرے کے نہ ہو سکیں!“

اس پر بھی وہ ڈری نہیں بلکہ بحث کرنے لگی۔ مجھے پارسائی کا دعویٰ نہیں، پھر بھی دل آمادہ گناہ نہ ہوا۔ اسی سبب میں نے آخری حربہ آزمایا۔

”تو خفا ہو گیا اے علیالیش تو پھر..... پھر.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”میں..... میں تجھے ناراض نہیں دیکھ سکتی۔“

میں یہی سننا چاہتا تھا۔ آخری حربہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے اپنے پھرے ہوئے جذبات پر قابو پا لی لیا۔

”دوا تمہیں بلا ناغہ پابندی سے کھانی ہے۔“ میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ وہ دوا اس کے وجود کی حد تک کم کرنے کے لئے ہی تھی۔

”کتنے دن تک چلے گی دوا؟“ اس نے دریافت کیا۔

”میرے اندازے کے مطابق تقریباً تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔ ہر ہفتے دوا آکے لے جایا سکیجو!“

فی الحال میں نے اسے ہفتے بھر کی دوا دے دی تھی۔

”اور ایک ہفتے سے پہلے اگر تجھے دیکھنے کو جی چاہے؟“

”نہیں۔“ میں نے منع کر دیا۔ ”اس سے حکیم خاشع کو شک ہو جائے گا۔“

جواب میں اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، کچھ بولی نہیں۔ پھر وقت رخصت اسے میں نے مزید سمجھایا۔

یوں اس سے میری جان چھوٹی اور میں شرکی طرف لوٹ گیا۔ یاسف اس وقت تک میرے انتظار میں سوا نہیں تھا، دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ”مجھے تو کھوٹے سے باندھ رکھا ہے اور خود کھلا پھر رہا ہے! مجھے معلوم ہے تو وازعہ سے ملنے گیا تھا! مجھے بتایا بھی نہیں!“

”تو اگر پوچھ لیتا، کہاں جا رہا ہوں تو بتا دیتا! تو نے پوچھا نہیں، میں نے بتایا نہیں۔ ناحق تو نے میرا پیچھا کیا!“ میں بے دھڑک بولا کہ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ اس نے قبول دیا کہ میرا تعاقب کیا تھا۔ یہ جان کر کہ میں کس سے ملا ہوں، وہ لوٹ آیا تھا۔ اسے میری اس بات پر یقین نہ آیا کہ میرا دامن صاف رہا۔ میں نے بھی اصرار نہ کیا کہ وہ یقین کر ہی لے۔ اس سے فرق بھی کیا پڑ جاتا! میں اس کے خیال میں آدم زاد یوں سے متنفر ہو کر اب جن زادیوں پر مائل ہو رہا تھا۔

میں صرف ہنس دیا۔ پھر وہ معلوم کرنے لگا کہ اندر کا سفر کب ختم ہو گا؟
”تقریباً ختم ہونے ہی پر ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”کل باتوں باتوں میں خاشع، ملتان کے ایک مشہور آدم زاد حکیم نیراس الدین کا ذکر کر رہا تھا۔ کیا خیال ہے، ملتان چلیں؟“
”اب تو کیس بھی چل، میں تیرے ساتھ ہوں، لیکن یہاں رہتے رہتے جی بھر گیا۔ بتا تو سہی کہ ابھی کتنے دن اس کھنڈر میں گزارنے ہیں؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ!“ میں نے جواب دیا۔ ”آدم زادوں سے متعلق کچھ نئے اس خزانے نے اب بھی مجھے نہیں بتائے۔ میں نے پوچھے تو ٹال گیا کہ تجھے ان نسخوں کا کیا کرنا ہے! اس کے باوجود میں پیچھے لگا ہوں اور امید ہے کہ اس کو بخش میں ہفتے بھر سے زیادہ نہیں لگے گا۔ خاشع کو شعر سنانے کے ساتھ ساتھ اپنی قابلیت و عظمت جتانے کا بھی بہت شوق ہے۔ کبخت بڑھے کا حافظہ بہت اچھا ہے، دیگر شعراء کے بھی اسے ہزاروں اشعار یاد ہیں۔ کیا عربی، کیا فارسی کہیں بند نہیں۔ مجھے اس کے شعر سن کر ہی متلی ہونے لگتی ہے اس لئے جب بھی وہ عربی اور فارسی سننے کو پر توڑتا ہے، میں کسی ہانے کھٹک لیتا ہوں۔ اب ایک یہی ترکیب اسے شیشے میں اتارنے کی باقی رہ گئی ہے کہ یہ ستم بھی برداشت نہ کر لوں۔ عربی اور فارسی کے اشعار بھی اس سے سن لوں اور اس کی عظمت پر اشک اشک کرنے لگوں۔ کل ہی سے اسے بانس پر چڑھانا شروع کر دوں گا۔ اس سے دہرا فائدہ ہو گا۔ ایک تو نہ صرف اس کے بکواس شعروں سے نجات مل جائے گی، دوم اپنا آٹو بھی سیدھا ہو جائے گا۔ خاشع ایک دفعہ کسی جن شاعر کا ذکر بھی کر رہا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا۔ کل اس کے اشعار سننے کی فرمائش کر دوں گا۔ کیا خبر اتھے شعر ہوں!“ میں نے تفصیل کے ساتھ یاسف کو اپنے آئندہ منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

یاسف بھی میری تائید کرنے لگا۔ اسے تو بس اب یہ گلی ہوئی تھی کہ گھڑی کی چوٹھائی میں ہم کدھر ہی نکل چلیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب حکیم خاشع سے جان چھڑانا ہی تھا۔ حکیم دن بھر اتنی مشقت کراتا کہ رات کی آوارہ گردی کے لئے مہلت ہی نہ ملتی۔ گھر پہنچتے ہی یاسف کمر سیدھی کرتے لیتا کہ ابھی اٹھتا ہوں اور پھر کمر سیدھی کی سیدھی رہ جاتی۔ یہاں گھر سے مراد وہی دیران مکان ہے کہ جہاں ایک عرصہ

دراز سے ہم دونوں رہتے تھے۔ اس ناجائز قبضے پر اب تک کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ کوئی جی دار آدم زاد اگر کبھی اس مکان میں گھسنے اور ہمداری دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم اسے ڈرا کر بھاگ دیتے۔ پھر وہ مکان مزید ”جن زدہ“ مشہور ہو جاتا۔ آدم زادوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ہم جنات کے وجود پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ وہ سرے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ کسی کا ایمان کمزور ہو تو ہم کیا کریں! وہ کہتے ہیں کہ جن دن سب وہم و گمان ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جواباً اگر ہم کسی آدم زاد سے کہہ دیں کہ تم دراصل ہو ہی نہیں تو کتنا بڑا مانے گا! سو ہمیں بھی اس پر غصہ آتا ہے کہ لو یہ بد بخت ہمارے وجود کو مفقود ہستی سے مٹانے کے درپے ہو رہا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ اس دیران مکان میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ ہمیں بھی پیش آیا۔

ہوا یہ کہ جس آدمی کا وہ مکان تھا، اس کا ایک ”لندن پلٹ“ دوست بے پور سے لاہور آیا۔ مالک مکان نے کہیں اس سے ”آسیب زدہ“ مکان کا تذکرہ کر دیا ہو گا۔ بس وہ سنک گیا۔ زبردستی مالک مکان کو گھٹ لایا ساتھ! شام کا وقت تھا اور ہم تھکے ہارے ”کھنکی کھنڈرات“ سے لوٹے تھے۔ ہمیں مکان میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پگلی منزل پر قدموں کی چاپ گونجی اور ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ یاسف ڈرا کہ کہیں کوئی عامل قسم کا آدم زاد مکان میں نہ گھس آیا ہو۔

”اب کیا ہو گا علیالیش؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا بھاگ چلیں؟“
”پاگل ہوا ہے کیا! پہلے دیکھنے تو دے کہ ہے کون! خطرہ ہوا تو نکل چلیں گے۔“ میں نے یاسف کو دلاسا دیا۔ ”میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں، تو پروا نہ کر!“

میرے ہمت بندھانے کا اس پر اچھا رد عمل ہوا۔ بولا۔ ”میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“
دوسرے ہی لمحے ہم مختاط انداز میں نیچے جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کون نوگ ہیں، بعد میں یہ ہمیں انہی کے مکالمات کے تبادلے سے پتا چلا۔ ان میں سے ایک بالکل کسی انگریز کا دیسی ایڈیشن بنا ہوا تھا، کوٹ پتلون، سر پر ہیٹ اور ہونٹوں کی بجائے دانتوں میں پاپ دبا ہوا! دوسرا آدمی دیسی لباس میں تھا۔ وہ صحن میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

ان دونوں میں سے کوئی مجھے خطرناک معلوم نہ ہوا۔ یاسف بھی مطمئن نظر آنے لگا۔
”برادر! یہ لندن نہیں لاہور ہے۔“ دیسی لباس والا بولا۔ ”یہاں جنات ہوتے ہیں۔“
”سب کیواس باتیں ہیں چوہدری نظر محمد!“ انگریز کا دیسی ایڈیشن منہ سے دھواں چھوڑنے لگا۔
”آج تک میں بیسیوں ایسے مکانات میں جا چکا ہوں جنہیں لوگوں نے آسیب زدہ قرار دیا تھا۔ مجھے تو یہ آج تک کوئی جن یا آسیب کہیں نہیں ملا۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کچھ مکانوں کے بارے میں لوگ افواہیں بھی اڑاتے ہیں، لیکن اس مکان میں واقعی جنات رہتے ہیں، وہاں خاں!“
”یہی سن کر تو میں زبردستی تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔“ وہاں خاں نے، آواز کرکما، پھر چوہدری نظر محمد سے اندر کمروں میں چلنے کے لئے ضد کرنے لگا۔

ہائے ادھر ادھر ہو گیا۔ تو مجھے بڑا ہی بد ذوق لگتا ہے۔" وہ نرایا۔
"اگر میں بد ذوق ہوتا تو کبھی تیرے شعروں کی تعریف نہ کرتا۔" میں نے ایک ایسی دلیل دی کہ جسے وہ رد نہ کر سکے۔

"خیر یہ تو حقیقت ہے۔" بوڑھا حکیم اٹھ گیا، پھر بولا۔ "رات کو بھی میں نے کچھ نئے اشعار لکھے ہیں، پہلے وہ سنا ہوں تجھے!"

میں خود ہی اس کے پچگل میں پھنسا تھا، سو سزا بھگتنا پڑی۔ وہ دو غزل معلوم نہیں اس نے کہاں سے گھاڑا تھا جو پورے تیس شعروں پر مشتمل تھا۔ داد دیتے دیتے میرا منہ دکھ گیا، مگر اسے میری حالت پر رحم نہ آیا، دو تین غزلیں اور پیل دیں۔ ہر غزل کے بعد وہ میری اعلیٰ ذوق کی تعریف کرتا نہ بھولتا۔

ایک غزل سنا کہ وہ جیسے ہی سانس لینے کو رکا، میں بول اٹھا۔ "اے حکیم! ایک دفعہ تو دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی شاعر کی بہت تعریف کر رہا تھا، وہ کون تھا؟"

"نام تو مجھے اس کا اب یاد نہیں رہا، ہاں اشعار ضرور یاد ہیں۔ تجھے یہ سن کر حیرت ہو گی اے علیا، یہ کہ وہ ایک کافر جن تھا۔"

میں نے بڑھے کی توقعات پر پورا اترنے کی خاطر اطمینان حیرت ضروری سمجھا۔ "واقعی! تو یہ جو اشعار تو مجھے سنائے والا ہے کسی جن کے ہیں!"

"اور جن بھی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ہے۔" وہ اور چوڑ گیا۔ "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اس کافر جن شاعر نے جبل ابوقیس پر چڑھ کر با آواز بلند یہ اشعار پڑھے تھے۔"

پھر حکیم خاشع نے عربی زبان کے وہ اشعار سنائے جو ایک کافر جن کی تخلیق تھے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

برا کرے اللہ تعالیٰ رائے کعب بن فر کا
یہ لوگ کتنے سبک عقل ہیں
بنی کعب کا دین ان کے آباء کرام کی حمایت
کرنے والوں کا دین ہے

وہ اس دین میں ملامت کئے جاتے ہیں
تمہارا ساتھ جنت دیں گے،

جس وقت تم پر حکم کیا جاوے

اور وہ مرد تمہارا ساتھ دیں گے

جو نخل و آطام کے ہیں

قریب ہے کہ تو سواروں کو دیکھے گا

کہ وہ خرام کریں گے

"تمہارا سوٹ خراب ہو جائے گا۔ طویل عرصے سے یہاں صفائی نہیں ہوئی۔"
"تم چلو تو سہی! ہمارے شہر بے پور میں بھی ایسا ہی ایک آسیب زدہ مکان مشہور تھا۔ میں لندن سے لوٹ کر بے پور پہنچا تو مجھے بھی یہ بات معلوم ہوئی۔ میں نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور جس بند کا وہ گھر تھا، اس سے چابی لے لی۔ میں اکیلا اندر گیا تو دوسروں کو بھی حوصلہ ہوا۔ دوسری مرتبہ کئی لوگ ساتھ ہو گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کوئی اب وہاں جاتے ہوئے نہیں ڈرتا۔ تم میرے سوٹ وغیرہ کا خیال نہ کرو، دھل جائے گا، اگر نہیں ہمت تو کہہ دو، میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔"

میں اور یاسف قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے یاسف کو اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا، میرا کیا ارادہ ہے! مالک مکان چوہدری نظر محمد صحن سے آگے نہ بڑھا تو وہاں خاں بولا۔ "یار! تم بہت ہی ڈرپوک ہو! اگر یہاں بقول تمہارے جنت ہوتے تو اب تک ظاہر ہو جاتے۔ میں نے تمہیں گھر پر بھی یہ بات سمجھائی تھی کہ تو ہم پرست لوگوں نے ایسی باتیں مشہور کر رکھی ہیں! جنت انہی کے ذہنوں کی اختراع ہیں۔ ان کا وجود ہی نہیں!"

"چپ بے!" میں چپ نہ رہ سکا۔ "ہمارے ہی سامنے ہمیں دہم بتا رہا ہے!"
اسی وقت یاسف نے وہاں خاں کے سر سے بیٹ اتار کر دور اچھال دیا۔ میں نے دانتوں سے پکڑے ہوئے پائپ کو کھینچا۔ اس میں جلتا ہوا تمباکو تھا۔ یہ تمباکو میں نے وہاں خاں کے کوٹ کی ایک جیب میں الٹ دیا اور پائپ چوہدری نظر محمد کی طرف بڑھا دیا۔

نظر محمد کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے پائپ کی طرف ایسی خوفزدہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ آلہ قتل ہو۔ پائپ کو میں نے زمین پر دے مارا۔ حیرت کی بات یہ نظر آئی کہ وہاں خاں، مالک مکان سے بھی زیادہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ کوٹ اتار کر اس نے پھینک دیا۔ شاید جلتے ہوئے تمباکو نے کچھ کام دکھا دیا تھا۔

پھر مالک مکان تو بھاگ لیا مگر وہاں خاں کو ہم نے نکلنے نہ دیا بڑی درگت بنائی اس کی! ایک زیر جاے کے سوا کوئی کپڑا اس کے جسم پر نہ تھا جب ہم اسے بے ہوشی کی حالت میں اس مکان کے باہر پھینکنے گئے۔ دور کچھ فاصلے پر لوگ جمع تھے۔ انہی میں مالک مکان بھی تھا۔ وہاں خاں کو انہوں نے شاید مردہ سمجھا اور چیخ پکار مچ گئی۔

ہم نے اطمینان سے اوپری منزل کا رخ کیا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔
اسی طرح کے چند واقعات کی وجہ سے اس مکان پر ہمارا قبضہ بدستور قائم تھا۔ اب تو ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ ہم وہاں سے چلے بھی جاتے تو کوئی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

دوسرے روز اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق جب مریض چھٹ گئے تو میں، حکیم خاشع کی مدد سرائی کرنے لگا۔ "اے حکیم دانا! تو اگر دیگر قدیم شعراء کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ میری بد قسمتی کہ کبھی مجھے یہ اشعار سننے کا موقع نہیں ملا۔ میں تو ان علیت سے بڑا ہی متاثر ہوں۔"

"بس رہنے دے، زیادہ باتیں نہ بنا! جب بھی میں نے تجھے ایسے نایاب و نادر اشعار سنانا چاہے تو کسی

ایسی حالت میں کہ قوم کے بڑے شہروں میں قتل کریں گے
کیا تم لوگوں میں کوئی ایسا کریم ہے
کہ اس کا نفس آزاد ہے

اور اس کے ماں باپ اور چچا شریف ہیں
وہ کریم ایسی ضرب لگانے والا ہو
کہ وہ عذاب خوشی ہو، سختی اور غم سے

کافر جن کے اشعار سننے کے بعد حکیم خاشع بتانے لگا۔ ”یہ اشعار شرمکہ میں اس قدر مقبول
ہوئے کہ ایک ایک مشرک کی زبان پر تھے۔ کفار ان کا مضمون سن کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے
کننے لگے، ”یکھو تمہارا قتل اور شہر بدر ہونے کا حکم غیب سے ہوا ہے۔ شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت
نے ان اشعار کا جواب بھی دیا تھا۔ بعد میں اس کافر جن کو قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا حافظ دیکھ کہ میں نے تجھے
جو اشعار سنائے اپنے دادا سے سنے تھے۔ اس وقت میری عمر صرف پچاس برس ہوگی، میں بچہ ہی تھا۔“

”کیا کہنے ہیں اے حکیم تیرے!“ وہ جو سننا چاہتا تھا، میں کہتا رہا۔
غرض کہ ایک ہفتے سے پہلے ہی کام بن گیا۔ اس کے بدلے میری سماعت کو روز کئی کئی گھنٹے حکیم
نے لہولہاں کیا، مگر میں نے اف نہ کی۔ مجھے اس سے جو نئے چاہئے تھے، مل گئے۔
دوسرے ہی روز میں نے آنکھیں پھیر لیں۔ حسب معمول حکیم نے مجھے شعر سنائے کو گھیرا، لیکن
میں طرح دے گیا۔ اس پر وہ بڑا جربز ہوا۔

”میں یہاں خدمت خلق کا جذبہ لے کر آیا تھا اے حکیم، مگر تو ہے کہ مجھ سے اپنی ہی خدمت لے
جاتا ہے!“ میں دہشتی سے بولا

وہ مجھے دھکتا رہ گیا اور پھر غصے میں کہا۔ ”بول، تجھ سے میں نے کون سی ذاتی خدمت لی ہے؟“
”تیرے فضول اشعار سن کر بھی ان کی داد دیئے جانا، کیا تو اسے خدمت میں شمار نہیں کرتا!“ میں
نے اسے اور تپا دیا۔

نتیجہ میری توقع کے مطابق ہی نکلا۔ حکیم نے مجھے اور یاسف کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔ یاسف
ایک ”قصور“ یہ تھا کہ اس سے میری دوستی تھی، دوسرا ”جرم“ ایک اور سرزد ہو گیا۔ اس نے بھی
میری تائید میں بات کی اور شعر سنائے پر خاشع کو مورد الزام ٹھہرایا۔

دوپہر کے وقت ہم کھنڈرات سے لوٹے تو جان چھوٹ جانے پر بہت خوش تھے۔
اپنے ٹھکانے پر لوٹ آنے کے بعد یاسف نے مجھ سے معلوم کیا۔ ”متمان ہی چلنے کا ارادہ ہے نا؟“
”ہاں وہیں چلتے ہیں۔ حکیم نیراس الدین کے بارے میں پہلے معلومات بھی تو حاصل کرتا ہوں گی۔“

میں بولا۔
”وہ تو خیر متمان پہنچ کر دیکھا جائے گا۔ یہ بتا کہ چلنا کب ہے؟“
”کل صبح نکل چلیں گے۔ آج تو بھی زینت اور ہملانیز دوسری آدم زادوں سے مل لے، مجھے

زگرس سے ملنا ہے۔ کیا خراب لاہور کب آتا ہوا!“ میں نے کہا۔

”دن کے وقت ملنا بھی کوئی ملنا ہوا!“ یاسف نے منہ بتایا۔ ”ایک رات رک جاتے ہیں۔“
”مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی تو کل ہی صبح چلنے کو کہہ رہا ہوں! لیکن رات آواہ
مردی میں گزار کر صبح سے شام تک تو سوتا رہے گا!“
”تو پھر شام کو چل!“

مجھے یاسف کی بات ماننا ہی پڑی۔ اس طرح مجھے خدیجہ سے ملنے کا بھی موقع مل جاتا۔ دن میں
زگرس سے ملاقات کر لیتا کہ رات کو مولوی کفایت اللہ حویلی میں ہوتا۔ زگرس سے دن ہی میں ملنا بہتر تھا۔
رات کو خدیجہ سے ملاقات ہو جاتی۔ آئندہ روز شام کو متمان روائی کا فیصلہ کر کے میں زیادہ رکا نہیں۔
ظہر پڑھ کر مولوی کھانا کھانے آتا، پھر دکان پر چلا جاتا۔ زگرس کی ماں دوپہر کو عموماً سو جاتی تھی۔ یہ
وقت زگرس سے ملاقات کے لئے مناسب ترین تھا۔ سو میں دربار پر پہنچ گیا۔ زگرس اپنے کمرے میں آرام
کر رہی تھی۔ میری موجودگی محسوس کرتے ہی اٹھی۔

”اس مرتبہ تو اے علیالیش، بڑے ہی دن کے بعد آیا تو! کیا ابھی اندر کا سفر ختم نہیں ہوا؟“
”ہو گیا ختم!“ میں نے بتایا۔

”مبارک ہو تجھے! اب کیا ارادہ ہے تیرا؟ حکمت تو آگئی تجھے!“ وہ پوچھنے لگی۔ میں نے اسے یہ بتایا
تھا کہ آئندہ آدم زادوں کے درمیان رہنے کی خاطر مختلف علوم و فنون سیکھ رہا ہوں۔
”اب ایک اور سفر درپیش ہے اے زگرس! تجھ سے اسی لئے ملنے آیا تھا کہ بتا سکوں، میں تیرا شہر
چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

”کمان؟ کب؟ کس لئے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے، چہرے پر حیرت تھی۔
”کل شام کو متمان جا رہا ہوں۔“ پھر میں اصل بات گول کر گیا اور بولا۔ ”دراصل ابھی مجھے حکمت
میں کامل مہارت حاصل نہیں ہوئی۔ متمان کے ایک حکیم کی بڑی شہرت سنی ہے۔ کچھ دن اس سے
اکتاب علم کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے مجھے انسانی ہیئت اختیار کرنا پڑے گی۔ ہر علم ایک سمندر کی
طرح ہے اور ہم چند قطروں کو سمندر کہنے لگتے ہیں۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے اے علیالیش، مگر تجھے اس قدیم شہر کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہے کہ جو مدینہ
الاولیاء کہلاتا ہے؟ وہاں پہلے بھی کبھی گیا ہے تو؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ شہر میرے لئے قطعی اجنبی ہے۔ وہاں پہنچ کر ہی میں اس کے
بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔“

”اگر تو چاہے تو میں اس سلسلے میں تیری مدد کر سکتی ہوں۔ یوں تجھے وہاں جانے کے بعد زیادہ
دشواری نہیں ہوگی۔“

”کیا تو نے دیکھا ہے وہ شہر؟“ میں نے دریافت کیا۔
اس کا جواب بھی انکار ہی میں تھا، کہنے لگی۔ ”دیکھا تو نہیں لیکن اس کے متعلق ایک کتاب اباجی

کتاب پڑھنا بہتر ہے۔ نرگس سے میں نے وعدہ کر لیا کہ کل اسی وقت کتاب واپس کر جاؤں گا۔ اگلے روز بھی مجھے آنا تھا، یعنی نرگس سے میری ملاقات آخری نہیں تھی۔ میں اسی لئے رکا نہیں اور اپنے ٹھکانے پر واپس آگیا، یاسف خدا جانے کس کس آدم زادی سے ٹانٹا، ٹانٹی سائی، کرنے گیا تھا۔ تمنائی سے فائدہ اٹھا کر میں ملتان سے متعلق وہ کتاب پڑھنے لگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کتاب یقیناً تاریخ کے کسی بڑے عالم نے لکھی تھی۔ کتاب ضخیم تھی اس لئے اسے میں نے کچھ تو اسی روز اور پھر کچھ آئندہ روز دوسر تک پڑھا۔ صاحب کتاب نے کسی اہم بات اور کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ کتاب پڑھ کر مجھے یوں لگا کہ میں نے اس شہر کو نہ دیکھ کر بھی جیسے دیکھ لیا ہو۔

ملتان شہر کو سندھ اور پنجاب کے تہذیبی عہد کی حیثیت حاصل تھی۔ کتاب ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر اور اس کے گرد و نواح میں متعدد صوفیائے کرام کے مقابر اور مزارات ہیں۔ بہت سے ماہرین فن نے اس شہر کو اردو زبان کا پہلا گوارہ قرار دیا تھا۔ یہ بات مجھے قرن قیاس نہ لگی۔ لکھنے والا اگر یہ لکھتا کہ اردو زبان کی لسانی تکمیل اسی شہر میں ہوئی تو شاید مجھے اختلاف نہ ہوتا۔ کتاب میں ہندومت کی قدیم مذہبی کتاب ”رگ وید“ کا حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ ”رگ وید“ میں اس شہر کے آس پاس کے علاقوں کا ذکر ہے۔ ”رگ وید“ کے متعلق میں نے پڑھا تھا کہ اس میں بھجن ہیں۔ جنہیں گیت کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھوانی گیت یا لوک گیت ہیں جن میں مخصوص عقائد کا اظہار کیا گیا ہے۔ ”رگ وید“ ہی میں دریائے سندھ کا ذکر بھی ہے۔ کسی جن زاد عالم نے یہ بات لکھی تھی جو میرے حافظے میں تھی۔ یاد رہ جانے کی وجہ شاعری سے میرا لگاؤ ہے۔ جن زاد عالم نے لکھا تھا کہ ”رگ وید“ کا ایک گیت بہت خوبصورت ہے۔ دریائے سندھ کی تعریف اس گیت میں یوں کی گئی ہے۔ ”چپکنے والی، درخشاں، عالی شان، نہ فح ہونے والی ندی ہے۔ سب ندیوں سے زیادہ اس میں پانی ہے، خوبصورت ابلتی گھوڑے کی طرح حسین ہے۔“ دریائے سندھ کو ”رگ وید“ میں سندھ ندی لکھا گیا ہے۔

اس کتاب میں ”رگ وید“ کے متعلق جو بقیہ صفحات تھے، انہیں میں نے سرسری طور پر دیکھا اور آگے بڑھ گیا کہ پہلے ہی مجھے بہت کچھ معلوم تھا۔ اس وقت تو ملتان شہر سے متعلق مجھے مزید معلومات درکار تھیں۔ میں نے ایک جگہ پڑھا کہ تہذیب انسانی کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر ملتان بھی ہے، بیرونی حملہ آوروں کے سبب دہلی کی طرح یہ شہر بھی بار بار بسا اور اجڑا۔ راوی، چناب، اور جہلم کی موج لہروں میں گھرا ہوا زر خیر علاقہ، بعد میں یہ شہر اور اس کا گرد و نواح کھلیا۔

شہر کے قدیم و جدید نام بھی پہلی مرتبہ میرے علم میں آئے، ویل استخان، مہادیل استخان، مولی استخان (یہی ملی استخان بھی کہلاتا ہے) سکندر اعظم کے حملے سے تقریباً ہزار بارہ سو سال قبل شہر کا یہی نام تھا، ملہ، ملتان (یہ عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی ”دو نیروں کے برابر“ ہیں)

مصنف نے شہر کا نام ملتان پڑ جانے کی وجہ ایک تاریخی کتاب ”نوح البلدان“ کے حوالے سے یہ لکھی تھی جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئی۔

کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ تجھے تو آتی ہوگی فارسی؟“ میرے لئے یہ اطلاع ہی تھی کہ مولوی کفایت اللہ کی حویلی میں کوئی کتب خانہ بھی تھا۔ نرگس کا باپ تو چمچ پڑھا لکھا نکل آیا، میں نے سوچا۔ کہاں کپڑے کی دکان اور کہاں کتب خانہ، وہ بھی گھر میں! پھر مجھے یاد آیا کہ حضرت امام ابو حنیفہ بھی اسی پیشے سے وابستہ تھے۔ فارسی ہی کیا مجھے عربی، انگریزی اور دوسری زبانیں بھی آتی تھیں۔ بچپن سے پچاس برس کی عمر تک میرے باپ نے مجھے پڑھنے لکھنے کے سوا کچھ نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کے بعد کبھی میں نے کتاب کھول کر نہیں دیکھی تھی۔ کتابوں سے مجھے چڑی ہو گئی تھی، لیکن اس وقت کتاب میری ضرورت بن گئی۔ یہ بہت اچھا ہوتا کہ میں جب اس اجنبی شہر میں پہنچتا تو وہ میرے لئے اجنبی نہ ہوتا۔

نرگس نے مجھے اسی حویلی کا ایک کمرہ دکھایا جسے میں نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ لکڑی کی بڑی بڑی بغیر دروازوں کی الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی ساری کتابوں کو دیکھ کر ظاہر ہے وحشت ہی ہو سکتی ہے۔ یہ رو عمل بچپن میں زبردستی کتابیں پڑھوانے پر میرے اندر پیدا ہوا تھا۔ نہ میرا باپ مجھے کتابیں پڑھنے پر مجبور کرتا نہ میں پھر ساری عمر کتابوں سے بھاگتا۔ جن زاد علماء نے بھی کتابیں لکھ کر ڈھیر لگا دیئے تھے۔ علماء کو شاید اس دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہوتا۔ بس ایک کے بعد ایک کتاب لکھی اور مر گئے، ہم جیسوں کے لئے زندگی کو جہنم بنا گئے کہ بیٹا پڑھتے رہو ساری عمر! ہم نے اگر دنیا کو نہیں برتا تو تمہیں کیسے عیش اڑانے دیں گے!

ادھر ادھر رکھی ڈھیروں کتابوں میں سے ایک کتاب کے پٹے پر مجھے ایسی عبارت لکھی نظر آئی کہ چونکے کی بجائے اچھل پڑا۔ اس کتاب کا نام تھا ’تخیر جنات‘! میں غیر ارادی طور پر اس کتاب کی طرف لپکا تو نرگس نے مجھے روک دیا، بولی۔ ”یہ کتاب تیرے لئے نہیں، صرف ہمارے لئے ہے۔“

”لیکن..... لیکن ہے تو یہی سے متعلق!“ میں نے کہا۔ ”یقیناً اس میں کسی آدم زاد عالم نے جنات کو غلام بنانے کے عمل تحریر کئے ہوں گے! یعنی یہ کتاب ہمارے خلاف لکھی گئی ہے۔ اسے یہاں..... یہاں نہیں ہونا چاہئے! بلکہ ایسی تمام کتابوں کو نیست و نابود کر دینا چاہئے!“ مجھے واقعی غصہ آ گیا۔

”اس موضوع پر اسی کتب خانے میں کیا“ سینٹروں تہ خانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ تو کہاں کہاں سے ایسی کتابیں نکال کر ضائع کرنا پھرے گا!“

وہ میری محبوبہ تھی، سو میں اس کی بات کیسے ٹال دیتا! اپنے غصے کو میں نے دبایا۔ پھر نرگس نے ایک کتاب نکال کر میرے حوالے کی۔ ”ملتان جانے سے پہلے اسے پڑھ کے واپس کر جانا!“ میں نے کتاب لے لی اور سوچا کہ خدیجہ سے ملنا اتنا ضروری نہیں، نہ بھی مل سکا تو کیا مضائقہ ہے!

فاصلے اہمیت نہیں رکھتے۔ جب میں 'یوسف کو ساتھ لے کر حضوری باغ پہنچا تو اس سے کہا۔ "تو مجھے کتاب پڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت ہنس رہا تھا۔ میں نے وہ کتاب نہ پڑھی ہوتی تو مجھے اس باغ کا علم نہ ہوتا جہاں تجھے لے کر سیدھا آگیا ہوں۔"

"کتاب نہ پڑھتا تو بس ذرا سا ٹیڑھا آتا پڑتا۔ ہم بہر حال کوئی نہ کوئی جگہ تو عارضی ٹھکانے کے لئے ڈھونڈ ہی لیتے!"

خاشع سے حکیم نیراس الدین کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا مطب بازار کلاں میں ایک بڑی مسجد کے قریب ہی کہیں واقع ہے۔ ملتان شہر کی سب سے بڑی مسجد یہی تھی۔ اس رات یوسف کو میں نے باغ سے نہیں نکلنے دیا اور خود بھی وہیں رہا۔ ہمیں پہلے اس حکیم کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنا تھیں کہ جس کے جسم میں مجھے اتنا تھا۔ دوسرے دن ہی صبح ہم باغ سے نکل آئے اور انسانی ہیئت اختیار کر لی۔ سب سے پہلے تو بازار کلاں میں ہمیں حکیم نیراس الدین کا مطب تلاش کرنا تھا۔

کچھ دور چلتے ہی ہمیں ایک تانگہ نظر آگیا جو خالی تھا۔ تانگے والا بازار کلاں چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ صورت سے وہ ہمیں شریف ہی لگا تھا۔

تانگہ چل دیا اور پھر چلتا ہی رہا۔ معلوم نہیں بازار کلاں کتنی دور واقع تھا۔ جب 'میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے بارش تانگے والے کو مخاطب کیا۔ "بڑے صاحب! اتنی دیر چلتے ہو گئی! بازار کلاں نہیں آیا! ابھی اور کتنی دور ہے؟"

"چپ بیٹھ! زیادہ باتیں نہ بنا!" خلاف توقع تانگے والے نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ایک تانگے والے سے مجھے ہرگز ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔ وہ پھیپھر آدی خدا جانے خود کو کیا سمجھ رہا تھا! مجھے اسی لئے غصہ آگیا۔

"کیوں چپ بیٹھو؟" میں چیخ کر بولا۔

"اس لئے کہ یہ میرا حکم ہے!" وہ مزے بغیر سخت لہجے میں کہنے لگا۔

"اے کیا تو! اس شہر کا حاکم لگا ہوا ہے!" مجھ سے پہلے یوسف بول اٹھا۔

"تو ٹھیک سمجھا!" تانگے والے نے بے نیازی سے کہا۔ "مجھے ہی اس شہر کا نیا حاکم مقرر کیا گیا ہے۔"

اس کے بڑھک مارنے پر غصے کی بجائے میری ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر میں بولا۔ "تجھے اگر یہ معلوم ہو گیا کہ ہم دونوں کون ہیں تو ابھی تیرا پیشاب خطا ہو جائے گا۔"

گفتگو کے دوران بھی تانگہ چلتا رہا۔ میری بات کے جواب میں تانگے والے نے کہا۔ "غلط فہمی ہے تیری!" اس کی آواز پڑ سکون تھی۔ "میں تم دونوں ہی کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کون ہو.....! لہذا اور کہنے ہو تم! اگر ایسا نہ ہو تا تو تم ادلیاؤں کے اس شہر میں داخل ہونے کی ہرگز ہمت نہ کرتے!"

خلیفہ ولید بن عبد المالک اس پر راضی نہیں تھا کہ سندھ پر حملہ کیا جائے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پہلی بار جب حضرت عمر کے عہد میں (632ء) عثمان بن ابی عاص ثقفی نے اپنے بھائی کو لوٹ مار اور مال غنیمت کی خاطر سندھ پر سمندری راستے سے حملہ کرایا تو خلیفہ دوم حضرت عمر نے اسے پابند کیا تھا۔ محمد بن قاسم نے حجاج کو سندھ پر حملہ کرنے کے لئے راضی کر لیا۔ خلیفہ ولید نے حجاج کی بات اس شرط پر مان لی تھی کہ محمد بن قاسم مال غنیمت کا پانچواں حصہ حجاج کے ذریعے خلیفہ کو بھیجے گا، مگر سندھ آکر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اسی دوران میں اس نے ملتان پر پیش قدمی کی اور اسے فتح کر لیا۔ سندھ فوج کے اخراجات برداشت کرتے ہوئے نوجوان محمد بن قاسم کو ذاتی طور پر کچھ ہاتھ نہ آیا تھا اور نہ وہ حجاج کو وعدے کے مطابق کچھ بھیج سکا تھا۔ ملتان کے علاقے کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کی خوش فہمی سے ایک برہمن نے ایسے پوشیدہ خزانے کی نشان دہی کی کہ بات بن گئی۔ برہمن نے ایک حوض کی نشان دہی کی تھی کہ اس میں خزانہ ہے۔ اس حوض میں دو سو من سونا اور سونے کی کترن سے بھرے ہوئے چالیس ٹنگے ملے۔ خزانے کی مالیت بارہ کروڑ تھی۔ سو یوں محمد بن قاسم حجاج سے اپنا وعدہ وفا کر سکا۔ یہ حوض دونیزوں کے برابر تھا، اسی قدر چوڑا اور اتنا ہی گہرا تھا۔ اسی سبب اور اسی نسبت سے محمد بن قاسم نے اس پورے علاقے کا نام "ملتان" تجویز کیا جو بعد میں "ملتان" کہلایا۔

مجھے مطالعے میں غرق دیکھ کر یوسف خوب ہنسا۔ میری ہی طرح اب تک وہ بھی کتابوں سے بھاگتا رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک قدر مشترک یہ بھی تھی۔

دوسرے کے بعد ہی وہ سو کر اٹھ گیا تھا اور اسی شام کو ہمیں ملتان پہنچنا تھا۔ ابھی مجھے بھائی دروازے جا کر زنگس کو کتاب بھی واپس کرنا تھی، سو میں روانہ ہو گیا۔

زنگس بڑے پتاک سے ملی اور پوچھنے لگی کہ اب واپسی کب ہو گی؟ "کیا تو میری واپسی کا انتظار کرے گی اے زنگس؟" یہ کہتے ہوئے میری آواز جذبات کی شدت سے مرتعش ہو گئی۔ یہ وہی تو تھی جو قریب نہیں آئے دیتی تھی!

"ہاں! اب تو یاد آئے گا۔" اس نے دھیرے سے کہہ دیا اور پھر دھیرے ہی سے کوئی پکیاں میرے دل میں اتر گیا۔ وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ مجھے اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رہنا چاہئے، کہیں جذبات پر قابو رکھنا مشکل نہ ہو جائے!

"میں..... میں اب چلتا ہوں۔" میں نظریں جھکا کر بولا کہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دے۔ "لیکن تو نے میرے سوال کا جواب تو یاد ہی نہیں کہ لو نے گا کب؟"

"کچھ ملے شدہ نہیں اے زنگس! لیکن..... تیری یاد شاید مجھے جلد یہاں کھینچ لائے۔" میں نے جواب دیا اور پھر "خدا حافظ" کہہ کر چلا آیا۔

☆=====☆

اسی روز شام کو ہم دونوں دوست ملتان روانہ ہوئے اور جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ جنات کے لئے

اس مرتبہ یاسف کو طیش آگیا، زور سے بولا۔ ”روک تاںکہ! ورنہ ابھی تیری چٹنی بنادوں گا!“
جواب میں تاںکہ والا ہنس پڑا۔ اسی کے ساتھ تاںکہ کی رفتار میں بھی مزید اضافہ ہو گیا۔
مجھے کچھ خطرہ سا محسوس ہوا۔ تاںکہ والے کا اس طرح ہنسا، ہمیں برا بھلا کہنا اور پھر تاںکہ کی رفتار مزید تیز ہو جانا بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔
”نہیں روکے گا تاںکہ تو پھر یہ لے!“ یاسف اٹھا اور پھر دھم سے اپنی نفست پر گرا۔ شاید وہ تاںکہ والے پر حملہ کرنے اٹھا تھا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“ تاںکہ والے نے جیسے مذاق اڑایا۔ ”اٹھتے اٹھتے گر کیوں گیا؟“
تاںکہ والے نے اب تک ایک مرتبہ بھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، پھر بھی اسے یاسف کے اٹھنے اور گرنے کا پتا چل گیا تھا۔ میں کھٹک گیا کہ ہم لاعلمی میں یقیناً کسی نہ کسی خطرناک آدم زاد کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔

”سنو اے لعنتی جن زادو! مجھے کل ہی رات اس شر میں تمہارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔“ تاںکہ والے نے پہلی مرتبہ مڑ کر ہمیں مخاطب کیا۔ ”میں اسی لئے یہاں صبح ہی پہنچ گیا کہ تمہیں اس شر میں داخل نہ ہونے دوں اور شر سے باہر چھوڑ آؤں۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے اس کے چہرے پر سختی کے آثار نظر آئے۔ ”میں چاہوں تو تمہیں کوئی ایسی سزا بھی دے سکتا ہوں کہ جسے ساری زندگی یاد رکھو، لیکن اللہ کو معاف کر دینا پسند ہے۔ سو معاف کیا! میں تاںکہ روک رہا ہوں، تم دونوں اتر جاؤ اور پلٹنے کی کوشش نہ کرنا! تمہیں میں نے فی الحال تمہارے انہی قابلوں میں قید کر دیا ہے۔ تمہاری جناتی صفات اسی لئے عارضی طور پر معطل ہو چکی ہیں۔ ورنہ تو تمہیں اتنی دور لانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔“

تاںکہ اسی وقت رک گیا۔ میں نے خوفزدہ ہونے کے باوجود پوچھ ہی لیا۔ ”ہماری جناتی صفات ہمیں کب واپس ملیں گی؟“

”پہلے تاںکہ سے نیچے اتر!“ اس نے ڈانٹ دیا۔
میں اٹھا اور پھر یاسف کو بھی سہارا دے کر تاںکہ سے اتارا۔ یاسف برسوں کا بیمار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم میں جیسے طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر معلوم نہیں مجھے اچانک کیا ہوا کہ اپنے انجام سے بے پروا ہو گیا۔ میں نے جھپٹ کر تاںکہ والے کو نیچے گھٹینا چاہا۔ تاںکہ ابھی واپسی کے لئے مڑا نہیں تھا۔

معاً میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور میں اچھل کر دور جاگرا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکا۔
”معلوم تھا مجھے تو کینٹکی پر اتر آئے گا!“ تاںکہ والا نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا سائنا تھا۔ وہ میری طرف، تدم بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تجھے سزا دینا اب ضروری ہو گیا ہے! ایسی سزا کہ جسے تو کبھی نہ بھولے اور پھر کبھی نافرمانی نہ کرے!“ اس کے الفاظ کسی تیز نشتر کی طرح میری سماعت میں اترے۔

میں اپنی غلطی پر پچھتاتے لگا۔ مجھے اپنے غصے کو قابو میں رکھنا چاہئے تھا، مگر اب وقت گزر چکا تھا۔

تاںکہ والا میرے قریب پہنچ گیا۔ یاسف دور کھڑا کانپ رہا تھا۔ سزا کے خوف سے میں بھی کانپ اٹھا کہ وہ پہلے ہی پتا چکا تھا، سزا معمولی نوعیت کی نہیں ہوگی۔

اس معمولی سے تاںکہ والے نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اسے ملتان شر کا نیا حاکم مقرر کیا گیا ہے۔ گزشتہ رات ہی اسے ملتان میں ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ اسی لئے صبح ہوتے ہی ہمارے پاس آ پہنچا تھا کہ ہمیں شر میں داخل نہ ہونے دے اور شر سے باہر چھوڑ آئے۔ اس کی ان باتوں کو میں نے بڑھک مارنے پر محمول کیا اور نتیجتاً زک اٹھائی۔ نہ میں اس پر حملہ کرتا نہ میرا یہ حال ہوتا۔

خطرناک ترین حالات میں بھی میں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس وقت بھی خوفزدہ اور بے بس ہونے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری مجھے معلوم تھا کہ اللہ والوں کے دل گداز ہوتے ہیں۔ سو میں نے اس کے سامنے گڑ گڑانا شروع کر دیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ خدا ربیدہ آدم زادوں کی اس ”کزدوری“ سے پہلے بھی فائدہ اٹھا چکا تھا۔

”اے بزرگ، اے اللہ کے نیک بندے! ابھی تو نے ہی یہ کہا تھا کہ اللہ کو معاف کر دینا پسند ہے۔“ میں عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”یقین کر کہ ہمیں تیری حیثیت اور مرتبے کا علم نہیں تھا ورنہ تیرے حضور گستاخی کی جسارت ہرگز نہ کرتے۔ ہمیں معاف کر دے کہ ہم بے خبر تھے۔ دراصل ہم نے یہ سنا تھا کہ اس شر کا حاکم ایک انگریز ہے۔ ہمیں اسی سبب تیرے دعوے پر یقین نہیں آیا تھا۔“

کچھ دیر تک وہ مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”تو جن بدیہیوں کا ذکر کر رہا ہے، وہ ظاہر پرستوں کے اعمال کی سزا میں مسلط کئے گئے ہیں۔ ابھی سزا پوری نہیں ہوئی، جب سزا پوری ہو جائے گی تو بدیہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اصل حاکم وہ نہیں ہم ہیں۔ کیا تو نے کبھی کسی قطب یا ابدال کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟“

”ہاں اے بزرگ، سنا ہے اور پڑھا بھی ہے۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا۔ ”ابدال اولیاء اللہ کو کہتے ہیں اور قطب، لقب ہے اس ولی کا جس کے قبضہ قدرت میں انتظام کسی ملک یا خطے کا عالم معنوی میں خدا کی جانب سے سپرد ہو۔ سوائے بزرگ، اب میں سمجھ گیا کہ تو قطب ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے انکار کر دیا۔ ”میں قطب نہیں کہ یہ درجہ بلند ہے۔ سن کہ ہر ملک میں ایک ہی قطب ہوتا ہے۔ ہندوستان کا قطب اس وقت دہلی میں ہے۔ اسی کے نائب سارے ملک میں اور شہروں شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ نظام حکومت اللہ کا ہے۔ اس نظام کو سمجھنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ میں تو اس نظام میں بڑے کمتر درجے پر ہوں۔ چند ہی روز قبل خطہ پنجاب کے ابدال نے گجرات سے میرا تبادلہ یہاں کیا ہے اور میں اسے اپنے لئے باعثِ فخر جانتا ہوں کہ مجھے اولیاءوں کے اس شر کا حاکم بنا کر بھیجا گیا۔“

”یقیناً اے بزرگ، تو مبارک باد کے قابل ہے۔“ میں نے اپنی کوشش کو کارگر دیکھ کر کہا۔ ”کاش ہمیں بھی تیری خدمت کی سعادت حاصل ہو جاتی۔“

”مجھے علم ہے اے جن زاد کہ تو سزا سے بچنے کے لئے میری مدد و ستائش کر رہا ہے۔“ وہ خلاف

توقع مسکرانے لگا۔ ”مجھے شاید خبر نہیں کہ ہم لوگ تسخیر انا کے بعد ہی اللہ کے اس نظام کا حصہ بنتے ہیں۔ سو میں تیرے اس فریب میں نہیں آؤں گا۔“

پھر میں نے اس آدم زاد کے جذبہ رحم کو جگانے کے لئے ایک اور حربہ آزمایا۔ اپنے بارے میں اسے بتا دیا کہ مسلمان ہوں۔

”معلوم ہے مجھے کہ تم دونوں نام کے مسلمان ہو در نہ تمہارے دامن داغدار نہ ہوتے۔ پھر بھی اس ناتے تمہاری معافی کی درخواست پر غور کیا جا سکتا ہے۔ تم دونوں کو ایک مرتبہ میں پہلے ہی معاف کر چکا ہوں، اس گستاخی پر کہ تم نے یہاں آنے کی جسارت کی۔ اب دوسری بار.....“ وہ اپنا جملہ ادھورا جھوڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

میں اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے منت سماجت پر اتر آیا اور یاسف کو بھی اشارہ کیا۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔ یاسف مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا اور اس کے قدموں میں آگرا۔ ”ہمیں معاف کر دے اے بزرگ معاف کر دے!“ یاسف بار بار یہی الفاظ دہرانے لگا۔

”مجھے گناہ گار نہ کر اور اٹھ جا میرے قدموں سے!“ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ”خلق خدا کو ایک دوسرے کے آگے جھکنا زیب نہیں۔“ پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ”ہر چند کہ میں جانتا ہوں تم دونوں جھوٹے ہو اور صدق دل سے معافی کے طالب نہیں لیکن راہ راست پر آنے کے لئے تمہیں ایک موقع دیا جاتا ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ جانے کے لئے مڑا۔

اسی لمحے میرے وجود سے کوئی ناہیدہ گرفت ختم ہو گئی۔ یاسف کو بھی میں نے اٹھتے دیکھا۔

”نھراے بزرگ!“ میں نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔

”اور اب کیا چاہتا ہے؟“ وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔

”ہمیں ہماری جناتی صفات واپس کر دے۔“

”آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ ممکن نہیں۔ ان انسانی قابلوں سے بھی تمہیں اسی کے بعد آزادی ملے گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کم از کم سزا تو بھگتنا ہی پڑے گی!“

ایک ہی دن کی تو بات تھی اس لئے میں نے ضد نہیں کی اور اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ تانگے پر بیٹھا اور چلا گیا۔ یاسف کی حالت بھی اب سدھر چکی تھی مگر خوف چہرے سے ظاہر تھا، کہنے لگا۔ ”اے علیالیش! یہ تو نے مجھے کہاں لا پھنسا یا؟ اس سے تو ہم لاہور ہی میں اچھے تھے۔“

”زندگی اسی کا نام ہے اے یاسف! ایک سے شب و روز میں کیا رکھا ہے! کیا تجھے اس پر خوشی نہیں ہوئی کہ ہمیں لاہور سے نکل کر پہلے ہی مرحلے میں کامیابی ہوئی؟“

”کیا کہہ رہا ہے؟ کیسی کامیابی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جنات کی طرح آدم زادوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں، کیا یہ ثابت نہیں ہو گیا؟ ابھی جس آدم زاد سے ہمارا ساقتہ پڑا، کیا یہ دوسروں سے مختلف نہیں تھا؟“

”ہو گا۔“ وہ بیزار سے بولا۔ ”مجھے تو اتنا پتا ہے کہ اس کعبنت نے خواہ مخواہ ہمیں ایک عذاب

میں گرفتار کر دیا۔“

”اچھا چل، ادھر درختوں کے جھنڈ میں چل کے آرام کرتے ہیں۔ پھر سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے!“ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو کہا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

سڑک کے دائیں جانب کچھ فاصلے پر درختوں کا وہ جھنڈ تھا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ جیسے ہی ہم اس جھنڈ میں داخل ہوئے ہمیں اپنے عقب میں آٹھیس سی محسوس ہوئیں جیسے کچھ لوگ دبے پاؤں ہماری طرف بڑھ رہے ہوں۔ میں چونک اٹھا اور مڑ کر دیکھا۔ یاسف بھی چونکا ہو گیا۔ درختوں سے نکلے ہوئے خشک پتے چر مرائے لگے۔ پھر ایسی ہی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

”شاید کچھ لوگ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں نے یاسف سے سرگوشی کی۔

”نہ مگر کس لئے؟“ یاسف نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔ ”اور وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”کیا خبر؟“ میں نے جواب دیا اور پھر یاسف کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آ“ اس چیز پر چڑھ جاتے ہیں۔“

پھر پہلے میں پیڑ پر چڑھا، بعد میں یاسف نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہماری جناتی صفات عارضی طور پر معطل تھیں اور ہم نے جو انسانی قالب اختیار کئے تھے انہی میں قید تھے۔ ایسی صورت میں ہماری حیثیت کسی عام آدم زاد کی طرح تھی۔ ہمیں اسی لئے اپنے تحفظ اور سلامتی کا خیال تھا۔ ان انسانی قابلوں میں ہمیں کسی بھی نوع کی گزند پہنچانی جا سکتی تھی، یہاں تک کہ ہمیں ہلاک کیا جانا بھی ممکن تھا۔ غروب آفتاب تک تو ہمیں بہر حال آدم زادوں کے شر سے بچنا ہی تھا۔

اس درخت پر چڑھے ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چار پانچ قوی بیکل افراد مختلف سمتوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان کے آدھے چہرے ڈھانوں میں چھپے ہوئے تھے، سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقین نظر آئیں، شانوں سے کارتوسوں کی چرمی بیٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔

”میں نے ان دونوں کو ادھر ہی دیکھا تھا۔“ ان میں سے ایک شخص نے ہماری آواز میں اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

”تو پھر وہ کہاں گئے؟“ دوسرا شخص ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ ”اگر وہ بچ کر نکل گئے تو بہت برا ہو گا۔“

”بچ کر کہاں جائیں گے! ہمیں کہیں چھپ گئے ہوں گے۔“ ایک اور شخص نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یہ شخص یک چشم تھا۔

”لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ وہ دونوں پولیس ہی کے مخبر ہوں!“ اس مرتبہ وہ شخص بولا جو اب تک خاموش رہا تھا۔

”یہاں شہر سے اتنی دور جنگل میں اور کون آئے گا! قریبی ڈھوک بھی یہاں سے دس بارہ میل ہو گا۔ وہ بھولے بھٹکے مسافر نہیں ہو سکتے۔ یقیناً وہ ہمارے پڑاؤ کا کھوج لگانے آئے ہوں گے۔ انہیں تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔“ جس شخص نے یہ بات کہی، خود اسی کو خیال آ گیا کہ ہم کسی درخت پر بھی چڑھ سکتے ہیں۔ اپنے اس خیال کا اظہار اس نے بلند آواز میں کیا۔

ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ وہ ڈاکو ہیں اور پولیس سے چھپ کر انہوں نے اس گھنے جنگ میں پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ یہ بات بہر طور ہمارے حق میں نہیں تھی کہ ہم جن زادوں کو وہ پولیس کا مخبر سمجھ رہے تھے۔

”مارے گئے اے علیالیش!“ یاسف نے میرے کان میں کہا۔ ”وہ بندوقیں سیدھی کر رہے ہیں۔“ انہی میں سے ایک شخص نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آس پاس کے درختوں پر گولیاں چلا کر دیکھ لیا جائے۔ اگر ہم واقعی کسی درخت پر چڑھ گئے ہوں گے تو وہ ہمیں اس طرح گرائیں گے۔ اس شخص کی تجویز مان لی گئی، مگر اس تجویز پر عمل درآمد سے پہلے ہی میں نے درخت سے چھلانگ لگا دی۔ اب اس درخت پر چڑھا رہنا موت کو دعوت دینا ہوتا۔ چھلانگ لگانے سے پہلے یاسف کو بھی میں نے یہی مشورہ دیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ ہی نیچے کودا۔

”کوہ در ہم سیدھے کھڑے ہوئے تھے کہ ہمارے سینوں پر بندوقوں کو نالیں رکھ دی گئیں۔“

”کون ہو تم لوگ؟“ میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے کڑک کر پوچھا۔

”تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو پیارے بھائیو!“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔ ”ہم پولیس کے مخبر نہیں ہیں۔ ہم تو خود پولیس سے بھاگ کر یہاں چھپے آئے ہیں۔“

”پولیس سے بھاگ کر آئے ہو؟“ حیرت سے کہا گیا۔ ”لیکن کیوں؟“

”ہم نے بھل ہٹان والی مسجد کے قریب ایک دکان میں نقب لگائی تھی کہ جاگ ہو گئی اور ہمیں سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔“ میں نے بات بتائی۔ ملتان کی بابت اگر پہلے ہی سے مجھے ضروری معلومات حاصل نہ ہوتیں تو بات بتانا مشکل ہو جاتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ہمیں بھی اپنے ہی طرح جرائم پیشہ سمجھ کر ہماری جان بخشی کر دیں گے۔

”تو تم لوگ نقب زن ہو!“

”جی ہاں جناب!“

”مگر تمہارے پاس نقب زنی کا سامان کیوں نہیں؟“

”وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔“ میں نے فوراً جواب دیا تاکہ انہیں شبہ نہ ہو۔ ”رات کے گشت پر جو پولیس تھی، ہمارے پیچھے لگی گئی تھی۔“

”یہاں سے ملتان شہر کم سے کم بھی آٹھ دس میل ہے۔ تم یہاں تک پہنچے کیسے؟“ پوچھا گیا۔

”بھاگتے ہوئے پیدل آئے ہیں۔ جب ہم شہر سے چلے تھے تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔“

میں یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ میرے بیان سے وہ مطمئن ہوئے یا نہیں! ہاں انہوں نے ہمارے سینوں سے بندوقوں کی نالیں ہٹائیں اور ہمیں جنگل میں ایک طرف لے چلے۔

پندرہ بیس آدمیوں کا وہ ایک گروہ تھا جس نے گھنے جنگل کے درمیان پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ مجھے ایک چھو لداری بھی دکھائی دی۔ ہمیں اسی میں لے جایا گیا۔ وہاں زمین پر فرش بچھا تھا۔ ایک جسم شخص کو میں نے گاؤں تھکنے سے کہنی ٹکائے بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ اس نے اپنا ایک پیر پھیلا

رکھا تھا۔ خوبصورت سی ایک نوجوان لڑکی اس کا پیر دبا رہی تھی۔ مجھے وہاں اس لڑکی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ شاید اس نازک اندام لڑکی کو کہیں سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔

”انہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟“ گھنی مونچھوں والے نے اپنے ان دونوں آدمیوں سے دریافت کیا جو ہمارے پیچھے بندوقیں لے کھڑے تھے۔

جواب میں ہمارے متعلق گھنی مونچھوں والے کو تفصیل بتا دی گئی جو ان ڈاکوؤں کا سردار ہی تھا۔ تفصیل بتانے والے نے اسے سردار ہی کہا تھا۔

تفصیل سن کر سردار نے باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا، پھر ایک دم بول اٹھا۔ ”یہ جھوٹے ہیں۔ اگر انہیں چھپنا ہی ہوتا تو شہری میں کیسے چھپتے، اس جنگل کی راہ نہ لیتے۔ معمولی چور اچکے اور نقب زن کبھی ادھر نہیں آتے۔ کسے خبر نہیں کہ جنگل ہماری کمین گاہ ہے! انہیں لے جاؤ اور ان کی زبان کھلاؤ! یہ مجھے پولیس ہی کے مخبر لگتے ہیں۔“

”اے سردار! ہم پر رحم کرا“ میں عاجزی سے بولا۔ ”یقین کر کہ ہمارا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم دراصل حال ہی میں لاہور سے یہاں آئے ہیں اسی لئے ہمیں اس جنگل کے متعلق کچھ خبر نہیں تھی ورنہ ہرگز یہاں قدم رکھنے کی ہمت نہ کرتے۔“

”چلو!“ میرے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے بندوق کی نال سے ٹوکا دیا۔

”تھکرو.....!“ سردار نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مجھے خود ان سے دو ایک باتیں پوچھنے دو!“

پھر اس نے مجھ سے نقب زنی کے متعلق کئی سوالات کئے میں کسی ایک سوال کا جواب بھی تسلی بخش نہ دے سکا۔ مجھے اگر خبر ہوتی کہ کسی ایسی صورت حال سے سابقہ پڑے گا تو ہرگز خود کو نقب زن نہ بتاتا۔ معلوم نہیں اس خبیث سردار نے کس طرح ہمارے چہروں سے جھوٹ کا اندازہ کر لیا تھا۔

”تو اب تک بالکل چپ کھڑا ہے۔“ سردار، یاسف کی طرف متوجہ ہوا۔ ”بول تجھے کچھ معلوم ہے کہ نقب کیسے لگائی جاتی ہے؟“

یاسف بوکھلا کر بظلیں جھانکنے لگا۔ پھر جب سردار نے دوبارہ سخت آواز میں یہی سوال کیا تو یاسف مردہ سی آواز میں کہنے لگا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم! میں تو صرف اس کا سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ سارا کام یہ خود ہی کرتا ہے۔“

اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

”تم دونوں کچھ بھی سہی، نقب زن بہر حال نہیں ہو!“ سردار کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ”مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم جیسے بے دونوں کو پولیس نے اپنا مخبر کیسے بنالیا!“ سردار جہاں دیدہ آدی لگتا تھا۔

اس پر میں ایک مرتبہ پھر سردار کو یقین دلانے لگا کہ ہم پولیس کے مخبر نہیں۔

”تو پھر آخر بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم ہو کون.....!“ وہ صہلایا گیا۔

”اے سردار! تیرا یہ کہنا قطعی درست ہے کہ ہم نقب زن نہیں۔ میں نے یہ سوچ کر جھوٹ بولا تھا کہ اس طرح تو ہمیں اپنا ہی جانے گا اور مفرد سمجھ کے ہم سے بہرہ بردی کرے گا۔ دراصل ہمارا پیشہ

حکمت ہے اور ہم اس جنگل میں بوٹیاں تلاش کرنے آئے تھے۔ ہمیں لاہور میں معلوم ہوا تھا کہ ملتان کے قریب جو جنگل ہے وہاں کچھ نایاب.....!!

”تم لوگ لاہور سے یہاں کب آئے؟“ سردار نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔
”کل ہی آئے تھے۔“ میں نے جج بول دیا۔

”یہاں تک کس طرح پہنچے؟“
”ایک تانگے والے کو اس پر راضی کر لیا تھا۔“ یہ بات بھی میں نے غلط نہیں کہی۔
”اگر تو حکیم ہے تو پھر پرانے زخم کا علاج بھی تجھے آتا ہو گا!“
”ہاں میں علاج کر سکتا ہوں، اگر مجھے مطلوبہ دوائیں میسر آجائیں۔“

پھر سردار نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اپنی پشت پر دائیں شانے کے قریب ایک زخم کھول کر دکھایا جس پر پٹی بندھی تھی۔ میں نے زخم کا معائنہ کیا۔ زخم واقعی پرانا تھا، مگر لا علاج نہیں۔ میں نے اسے یہ بات بتا دی تو وہ بولا۔ ”اگر تو نے واقعی میرا یہ زخم اچھا کر دیا تو میں تجھے مالالامال کر دوں گا۔“
”اس کے لئے مجھے ایک مہرہ بنانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مہرہ اتنا تیز اثر ہے کہ تجھے دو ایک گھنٹے ہی میں نمایاں فرق محسوس ہو گا۔ اپنے کسی آدمی کو شہر بھیج کر جو دوائیں میں لکھوں، منگوا دے۔ مہرہ کی تیاری میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

سردار راضی ہو گیا۔ میں نے دوائیں لکھ دیں۔ سردار نے اپنے ایک آدمی کو اسی وقت شہر بھیج دیا۔ سواری کے لئے ان لوگوں کے پاس گھوڑے موجود تھے۔ دوپہر تک مطلوبہ دوائیں آگئیں اور میں مہرہ بنانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ یاسف بھی میرا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا سردار نے ہمیں اپنے ساتھ ہی کھلایا تھا۔ مہرہ ایک گھنٹے کے اندر تیار ہو گیا اور میں نے اسے زخم پر لگا کر پٹی باندھ دی۔ شام ہوتے ہوتے خود ہی سردار نے بتایا کہ پہلے سے تکلیف بہت کم ہے۔ اس نے مجھے اور یاسف کو اپنی چھولداری سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ نوجوان لڑکی اب تک چھولداری میں موجود تھی۔ وہ سردار کی خدمت گزاری میں لگی ہوئی تھی۔ یاسف نے کئی بار اسے چور نظروں سے دیکھا اور سردار سے اس کی یہ چوری چھپی نہ رہ سکی۔

”تیرا ساتھی مجھے بڑا نظر باز لگتا ہے۔“ سردار نے مجھ سے کہا، پھر وہ براہ راست یاسف سے مخاطب ہوا۔ ”کیا یہ لڑکی تجھے پسند آگئی ہے؟“

”نہیں..... نہیں تو.....“ یاسف گھبرا گیا۔

”اگر پسند ہو تو بتا دے۔ یہ میرے حکم سے انکار نہیں کرے گی۔“ سردار مسکرا کر بولا۔

یاسف میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دل کی بات زبان پر لے آتا۔ پھر سردار اس لڑکی کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ ایک طوائف زادی تھی۔ ایک زمیندار نے اسے اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔ وہ زمیندار، سردار کے ہاتھوں مارا گیا۔ سردار، زمیندار کی حویلی سے مال و دولت کے ساتھ اس لڑکی کو بھی اٹھا لایا۔ اس واقعے کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ لڑکی، سردار کے ساتھ بہت خوش تھی اس لئے کہ سردار

زمیندار کی طرح لڑکی پر جسمانی تشدد نہیں کرتا تھا۔

اسی اثناء میں سورج غروب ہو گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو مشعلیں روشن کر لی گئیں۔

”اب تم دونوں کو اس وقت تک میرے ہی ساتھ رہنا ہے جب تک میری پشت کا زخم بھر نہیں جاتا۔“ سردار نے رات کو ہمارے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

”اے سردار! میں نے مہرہ بنا دیا ہے۔ تو اسے ایک ہفتے تک پابندی سے زخم پر لگاتا رہ، زخم بھر جائے گا۔ اس کے لئے ہمیں تیرے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں بولا۔

”نہیں!“ سردار نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہ میرا حکم ہے۔ تم دونوں کو یہیں رہنا پڑے گا۔“
”لیکن تو ہماری مرضی کے خلاف ہمیں روے گا کیسے؟“ میں مسکرایا۔

سردار کی تیوریوں پر ہل پڑ گئے، کہنے لگا۔ ”اگر تم لوگوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی اور زہر ہونا چاہا تو تمہیں گولی مار دی جائے گی!“ اس کی آواز میں سختی آگئی۔

”کیا تو اسی طرح احسان کا بدلہ دیتا ہے.....؟ سن اے سردار! تو یا تیرے ساتھی ہمیں جانے سے روک نہیں سکتے۔ سو بہتر یہی ہے کہ خود ہی ہمیں جانے کی اجازت دے دے۔ ہم کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔“ میں اس کی خفگی کو خاطر میں نہ لایا۔ ”تجھے شاید خبر نہیں کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور سورج غروب ہوتے ہی ہم تیرا کوئی حکم ماننے کے پابند نہیں رہے۔“

”سورج کے غروب ہونے سے میرا حکم ماننے نہ ماننے کا کیا تعلق؟ کہیں تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟“
”یہ تعلق تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ میں ہنس دیا۔ یاسف نے بھی میری ہنسی کا ساتھ دیا۔

”ہمیں ہنسنے دیکھ کر سردار کا پاپرا چڑھ گیا۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی سے بولا۔ ”پانی پلاؤ!“ لڑکی نے فوراً تعمیل حکم کی۔ پانی پی کر سردار مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے! جو کہتا ہوں، مان جان ورنہ بہت پچھتائے گا۔“

”آخر معلوم بھی تو ہو اے سردار کہ تو ہمیں اپنے ساتھ رکھنے پر کیوں بضد ہے؟“ میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ میرے نزدیک روکے جانے کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔

پھر وہ کھل ہی گیا اور کہا۔ ”تم دونوں کو اس وقت تک یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ملے گی جب تک میرے ساتھی جنگل میں کہیں اور پڑاؤ ڈالنے کی جگہ تلاش نہ کر لیں۔ پھر یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو اس جگہ کی نشان دہی کر دو گے۔ اب سمجھ گئے کہ میں تمہیں کس لئے روک رہا ہوں!“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تجھے ہم پر بھروسہ نہیں!“

”تم پر تو میں بھروسہ کر سکتا ہوں، لیکن تمہاری حماقت پر نہیں۔ تم دونوں بے وقوف بھی تو ہو!“
اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ پھر میں بولا۔ ”دراصل تو نے ہمیں پہچانا ہی نہیں کہ ہم کون ہیں ورنہ ہمارے خلوص کو بے وقوفی نہ کہتا۔ تجھے شاید یہ گمان ہے کہ تم نے ہمیں زبردستی روک لیا تھا تو ایسا

نہیں۔ ہم جب چاہتے یہاں سے چلے جاتے۔“
اس مرتبہ وہ زور سے ہنسا اور کہا۔ ”تبھی میرے آدمی تمہیں چوہوں کی طرح پکڑ کر لے آئے تھے!“

”ہم تو خود ہی تیرے آدمیوں کے ساتھ چلے آئے تھے، اگر نہ آتا چاہتے تو کسی کی مجال تھی کہ جبر ہمیں یہاں لے آتا!“ اس مرتبہ یاسف بھی خاموش نہ رہ سکا۔
”تجھے بھی بولنا آتا ہے!“ سردار نے یاسف کا مذاق اڑایا۔ ”میں تو اب تک تجھے بے زبان جانور سمجھ رہا تھا یا پھر اس گدھے کی بیخ!“ سردار نے میری طرف اشارہ کیا۔

”دیکھ اے سردار! اب ہمارے ضبط کا مزید امتحان نہ لے!“ میں بول اٹھا۔ ”تیرے ساتھ ہمارا اچھا وقت گزرا، اسے برائی میں نہ بدل!“
”ورنہ تو کیا کر لے گا؟“

”کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ مجھے شرارت سوچھ گئی کہ بہت دن سے میں نے کسی آدم زاد کو نہیں ستایا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسی لئے میں نے کہا۔ ”مثلاً یہ کہ میں تیری پگڑی اتار کر بھاگ جاؤں اور تو پتا نہ رہ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرا ساتھی تیری بڑی بڑی مونچھیں کھینچنے لگے اور تو اٹھے۔“

توقع کے مطابق وہ آپے سے باہر ہو گیا اور گاؤں تکنے کے سہارے نکلی ہوئی بددوق اٹھالی، پھر دھاڑا
”میں تم دونوں کو ابھی پھونک دیتا ہوں!“

دوسرے ہی لمحے میں نے یاسف کو اشارہ کیا اور انسانی ہیئت ترک کر دی۔ یاسف نے بھی نظروں سے اوجھل ہونے میں دیر نہیں کی۔

”ارے پکڑو..... پکڑو! وہ بھاگ گئے!“ سردار چیخ اٹھا۔

سردار کے کئی مسلح ساتھی جو باہر موجود تھے، بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔ سردار نے جب انہمارے فرار ہو جانے کے متعلق بتایا تو ان کے چہروں سے بے یقینی کا اظہار ہونے لگا۔ پھر ان میں سے ایک بولا۔ ”ہم تو باہر ہی موجود تھے۔ ان دونوں کو ہم نے بھاگتے نہیں دیکھا۔“

”سارے جنگل میں پھیل جاؤ اور تلاش کرو انہیں! ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ کبھی دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہو گئے!“

”اے بے وقوف سردار! تو ان بے چاروں کو کیوں دوڑا رہا ہے! ہم تو یہیں موجود ہیں۔“ میں باآواز بلند کہا، پھر اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”جاؤ تم لوگ! تمہارے سردار کا دماغ چل گیا۔ جاؤ.....! شاباس.....!“ یہ کہتے ہوئے میں، سردار کے قریب پہنچا اور اس کی پگڑی اتار لی، پھر پگڑی اس کے ساتھیوں کی طرف اچھال دی۔ ”اس پگڑی کو اب تم لوگوں میں سے کسی کے سر پر چاہئے۔“ پگڑی ایک شخص کے قدموں میں جا کے گری۔

وہ بھی حواس باختہ نظر آنے لگے۔ میں نے سردار کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑتے دیکھے

یاسف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سردار کی گھنٹی مونچھوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔
”ابے چھوڑ.....! چھوڑ میری مونچھیں!“ سردار چیخنے لگا۔

میں نے یاسف کو اشارے سے منع کر دیا۔ اسے جانے کیا سوچھی کہ اس نے لڑکی کو گدگدانا شروع کر دیا۔ لڑکی ”ارے ارے“ کہتی ہوئی زور سے ہنس پڑی۔

”مجھ پر ہنس رہی ہے بد بخت!“ سردار نے لڑکی کو ڈانٹا۔

”نہن..... نک..... کوئی میرے گد..... گدی کئے جا رہا ہے۔“ لڑکی نے ہنسنے ہوئے بتایا۔

سارے دن کی بیزاری کے بعد یہ تفریح بڑی غنیمت معلوم ہوئی۔ وہ لوگ خاصے سراسیمہ ہو گئے تھے۔ میں نے اسی لئے یہ تماشا ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور آگے بڑھ کر سردار کی کھلی ہوئی پگڑی اٹھالی، پھر اسے سردار کے آگے ڈالتے ہوئے بولا۔ ”باندھ لو اسے سر پر اور اپنے ساتھیوں سے کہو کہ باہر جاکے پھرا دیں۔ ہمیں اگر جانا ہی ہوا تو یہ ہمیں نہیں روک سکیں گے۔“

سردار نے پگڑی اٹھا کر سر پر باندھ لی اور پھر اپنے ساتھیوں کو باہر بھیج دیا۔ پھر میں اور یاسف دوبارہ ظاہر ہو گئے۔ سردار کی آنکھیں ہمیں ظاہر ہوتے دیکھ کر حیرت سے پھیل گئیں۔

”اب تجھے یقین آیا اے سردار کہ تو چاہے بھی تو ہمیں جانے سے نہیں روک سکتا!“ میں نے سردار کو مخاطب کیا۔ میری نگاہ لڑکی کی طرف اٹھی تو وہ بھی ہونق بنی دکھائی دی۔

”کون..... تم لوگ کون ہو؟“ سردار نے خوفزدہ سی آواز میں پوچھا۔

”ہم اللہ کے نیک بندے ہیں اور تم جیسے بیٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانا ہمارا کام ہے۔“ میں نے ایک اور چولا بدلا۔

”پہلے تم نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ نقب زن ہو، پھر کہنے لگے، حکیم ہو اور اب خود کو اللہ کے نیک بندے ظاہر کر رہے ہو۔“ سردار ہمت کر کے بولا۔ ”تمہی بتاؤ کہ تمہارا کس بات کا یقین کروں.....؟ اگر ہم یہ..... یہ پیشہ ترک کر دیں تو..... تو پیٹ کیسے بھرے؟“

”تو جو لوگ تمہاری طرح ڈاکو نہیں، وہ اپنے پیٹ نہیں بھرتے.....؟ بہر حال ہمارا کام تمہیں نصیحت کرنا تھا، آگے تم جانو کہ روز قیامت اپنے گناہوں کا حساب تمہیں دینا ہوگا، ہمیں نہیں۔ ہم تو ایک شب کے مہمان ہیں، کل چلے جائیں گے۔“

مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ میری اتنی سی بات کا اس شخص پر اتنا اثر ہوگا! ابھی اس کے وجود میں یقیناً ایمان کی کوئی رقی باقی تھی۔ روز قیامت کے ذکر پر خلاف توقع میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ وہ ظالم مجھ گناہ گار کو واقعی اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ سمجھ بیٹھا اور میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ ”تم نے مجھے روشنی دکھائی ہے تو اب راستہ بھی دکھاؤ!“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اب آنکھوں سے آنسو بھی بننے لگے تھے۔ ”میں خود بھی اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں کہ جس میں ہر وقت موت پیچھا کرتی رہتی ہے۔ حکومت پنجاب نے میرے سر کی قیمت پانچ سو روپے مقرر کی ہے۔ میں اگر

چاہوں بھی تو ہتھیار نہیں پھینک سکتا۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔
”کیا یہ ممکن نہیں کہ تم کسی اور صوبے میں چلے جاؤ؟“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”میں اس جنگل سے نکلا تو گرفتار کر لیا جاؤں گا۔“ اس نے جواب میں بتایا۔
”تمہیں اور تمہارے تمام ساتھیوں کو اگر حفاظت پنجاب سے نکال کر کسی دوسرے صوبے میں پہنچا دیا جائے تو کیا تم شرفانہ زندگی بسر کر سکتے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔ میں واقعی اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ”ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ تم چاہو تو خود کو لوگوں کے جھوم میں گم کر سکتے ہو۔“
”لیکن..... لیکن ہمارا یہاں سے..... اس صوبے سے نکلتا کس طرح ممکن ہے؟“ اس نے

حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہمارے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تم چاہو تو آج رات تمہیں یہاں سے نکال کر کہیں اور پہنچایا جا سکتا ہے۔“ مجھے یہ کہتے ہوئے عجیب سی خوشی ہو رہی تھی۔

”اگر..... ایسا ممکن ہے تو..... تو پھر میں ابھی اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ان سے پوچھ رہا ہوں کہ کون کون میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہے؟“ اس نے بڑبڑاتا ہوا اور پھر باہر پہرے پر موجود اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ ”سب کو جمع کر لو“ مجھے کچھ کہنا ہے۔“ اس نے اندر آنے والوں کو حکم دیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد چھو لداری کے باہر سارے ڈاکو اکٹھا ہو گئے۔ سردار کے ساتھ ہی ہم دونوں بگ باہر نکل آئے لڑکی بھی ہمارے ہم قدم تھی۔ سردار نے بڑی بڑبڑاتی نظر کی۔

ان میں سے صرف دس افراد نے سردار کے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کی، بقیہ چھ سات افراد اپنا حصہ لینے پر اصرار کیا۔ یوں بھی انہیں جرائم کی دنیا میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ نئے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ابھی پولیس کے پاس ان کا ریکارڈ نہیں اور وہ اپنے گھروں کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ ان کا تعلق ارد گرد کے دیہات اور بستیوں سے تھا۔ دولت کے لالچ میں انہوں نے یہ زندگی اپنائی تھی۔ سردار کے پاس جتنا بھی مال و متاع تھا اس نے تمام ساتھیوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا۔ اسلحہ کو ایک اور گروہ کے ہاتھوں فروخت کرنے کی ذمہ داری ایک شخص نے قبول کر لی۔ اسے بھی سردار کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اندازاً اسلحہ کی قیمت مقرر کر دی گئی جو اس شخص کے حصے سے کاٹ لی گئی۔

”اور یہ لڑکی کس کے حصے میں آئے گی؟ یہ فیصلہ تو ابھی ہوا ہی نہیں!“ ایک شخص بولا جو ایک چڑچڑاہٹ والا لہجہ میں خود سری تھی۔ یہ شخص انہی میں سے تھا کہ جنہوں نے مجھے اور یاسف کو پکڑا تھا۔ اس پر میں خاموش نہ رہ سکا اور بول اٹھا۔ ”لگتا ہے کہ تجھے ایک آنکھ سے بھی کچھ زیادہ ہی نظر آ رہا ہے! کیا تجھے یہ لڑکی بھی لوٹ کا مال نظر آ رہی ہے؟“

”ابے نقب زن! اپنی زبان بند رکھ! تو کون ہوتا ہے ہمارے درمیان بولنے والا! مجھے ایک آنکھ طعنہ دے رہا ہے، میں تیری دونوں آنکھوں نکال لوں گا!“ وہ غرایا۔

”چپ ہو جا!“ سردار نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اللہ کے اس نیک بندے سے گستاخی کر کے

آخرت کیوں خراب کر رہا ہے!“
”گروہ لوٹ چکا ہے اور تو اب ہمارا سردار نہیں رہا لہذا اب میں تیرا کوئی حکم نہیں ماننے کا پابند نہیں! لڑکی کو میرے حوالے کر دے! اسے میں اپنے پاس رکھوں گا کہ تو نے بہت دن اس کے ساتھ عیش کر لئے۔ رہا یہ نیک بندہ تو مجھے اس کی کوئی پردہ نہیں۔“ وہ عثمانی پر اتر آیا۔

جو لوگ سردار کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے تھے، انہوں نے ایک چشم کو سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے کچھ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا۔

”لڑکی سے پوچھ لو کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے!“ ایک شخص نے جھگڑا ختم کرانے کے لئے تجویز پیش کی۔

اس پر لڑکی فوراً بول اٹھی۔ ”میں سردار کے ساتھ رہوں گی۔“
”رہے گی تو جب میں تجھے اس کے ساتھ جانے دوں گا!“ ایک چشم نے جھپٹ کر لڑکی کا بازو تھام لیا۔

میری قوت برداشت جوال دے گئی۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں لڑکی کا بازو اس سے چھڑا لیا۔ پھر میں اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اسے گھسیٹا ہوا دور لے گیا۔ ایک درخت کی گھنی اور موٹی شاخوں میں اس کے دونوں پیرالجا کر میں نے اسے سر کے بل لٹکا دیا۔ سب کچھ اتنی تیزی کے ساتھ چند لمحوں میں ہو گیا کہ ایک چشم کو اس طرح تنہا درخت سے الٹا لٹکا دینا یقیناً ان لوگوں کے لئے حیران کن رہا ہو گا۔ میں سردار کے پاس لوٹ آیا۔ کوئی بھی مجھے چشم کی حمایت میں کچھ نہیں بولا۔

”چلیں! اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔“ میں نے سردار سے کہا۔
سردار اور اس کے دس ساتھی بھی چھو لداری میں آ گئے۔ یاسف نے موقع ملتے ہی مجھ سے سرگوشی کی۔ ”تو نے یہ کیا ناکہ شروع کر دیا؟“

”اگر ہماری وجہ سے کچھ لوگ راہ راست پر آجائیں تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا!“ میں نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔

پھر صبح ہونے سے پہلے پہلے ڈاکوؤں کا وہ بڑاؤ اجڑ گیا۔ جو لوگ سردار کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے، وہ راتوں رات جنگل سے نکل گئے۔ اپنے ساتھ وہ ایک چشم کو بھی لے گئے تھے۔ مجھے اور یاسف کو کوئی بار لمبی مسافت طے کرنا پڑی۔ سردار اور اس کے ساتھیوں کو ہم نے ملک کے شمالی صوبے میں پہنچا دیا۔ جنگل کا وہ حصہ بھی کبھی ویران تھا آباد ہو گیا۔ اپنے اس عمل سے مجھے عجیب سی ناقابل بیان روحانی طمانیت محسوس ہوئی۔

”اب یہ بتا اے علیابیش کہ ہم شہر میں کس طرح داخل ہوں گے؟“ یاسف نے دریافت کیا۔
”کیوں اس میں اب کیا تباہت ہے؟ ہماری جناتی صفات ہمیں واپس مل چکی ہیں“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تو اس حاکم شہر کو بھول گیا کہ جو ہمیں شہر بدر کر کے چلا گیا تھا؟ کیا وہ ہمیں دوبارہ شہر کا رخ

کرنے دے گا؟

”گزشتہ تجربات کی روشنی میں اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم کسی آدم زاد کے جسم میں چھپ کر شریک بنیں۔“

”لیکن یہاں جنگل میں تو اب دور دور تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آتا۔ پہلے سے تو نے یہ تدبیر سوچی ہوئی تو یہاں رک جانے والے ڈاکوؤں کے جسموں میں ہی ہم کھس جاتے۔“

”صبح ہونے میں اب دیر نہیں۔ سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی۔ یہاں سے شہر دور ہی کتنا ہے! ہم انسانی قالب میں پیدل شہر کی طرف چل دیں گے۔ راستے میں کوئی نہ کوئی تو آتے جاتے مل ہی جائے گا۔ پھر ہم انسانی قالب ترک کر کے آدم زادوں کے جسموں میں پناہ لے لیں گے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

چارو ناچار یاسف کو میری تجویز ماننا ہی پڑی۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”معلوم نہیں ان دنوں تجھے کیا ہو گیا ہے! میری سمجھ میں تو تیری کوئی بات نہیں آ رہی!“

”کیا بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ بتا تو سہی!“

”اور باتوں کو تو خیر چھوڑ! ایسی خوب صورت آدم زادی کو تو نے جانے دیا۔ اگر تو اسے سردار سے مانگ لیتا تو کیا وہ منع کر دیتا!“ یاسف نے گلہ کیا۔

”تو اس طوائف زادی کی بات کر رہا ہے جو پہلے ایک زمیندار کے تصرف میں تھی اور اب ڈاکوؤں کا ایک سردار اسے اپنی داشتہ بنائے ہوئے تھا۔ تجب ہے تجھ پر! روئے زمین پر کیا نیک سیرت آدم زادیوں کی کمی ہے؟ اے یاسف! تو بھی تو پہلے ایسا نہ تھا کہ ایک طوائف زادی کی آرزو کرے۔“

میری بات سن کر وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا، پھر بولا۔ ”دراصل تیرے ساتھ رہ کر میں آدم زادیوں کا اتنا ترس گیا ہوں کہ اب اس معاملے میں میرا کوئی معیار ہی نہیں رہا۔“

صبح کے آثار نمودار ہونے تک ہم آئندہ کے لئے منصوبے بناتے بگاڑتے رہے اور پھر جنگل سے نکل آئے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور شہر کی طرف چلے ہوں گے کہ سامنے سے اچانک ایک ٹانگہ آتا دکھائی دیا۔ سڑک پر کوئی اور سواری نہیں تھی۔ جیسے ہی ٹانگہ کچھ اور قریب آیا، میرے اعصاب جھمن جھمن اٹھے۔ ٹانگے والا وہی باریش آدم زاد تھا کہ جو گزشتہ روز ہمیں شہر سے باہر چھوڑ گیا تھا۔ ہمارے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”اب کیا ہو گا علیائش؟ وہ تو پھر ہمارا راستہ روکنے آگیا!“ یاسف خوفزدہ آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں ابھی یاسف کی بات کا جواب نہیں دے سکا تھا کہ ٹانگہ ہمارے قریب آکر رک گیا۔ ”مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت دے دوں۔“ ٹانگے والا مجھ سے بولا ”اور تمہارے ہی طفیل اسے بھی اجازت ہے۔“ ٹانگے والے نے یاسف کی طرف اشارہ کیا، پھر کہنے لگا ”بیٹھ جاؤ، ٹانگے میں! تمہیں میں بازار کلاں پہنچا دیتا ہوں۔“

اپنی سماعت پر مجھے یقین سا نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ جس نے ہمیں شہر بدر کیا تھا، خود ہمیں شریک پہنچانے کے لئے آگیا! اسے یہ بھی یاد تھا کہ ہمیں کہاں جانا تھا! ”جلدی بیٹھو، دیر نہ کرو!“ ٹانگے والے نے ٹانگہ واپسی کے لئے موڑ لیا۔

میں نے یاسف کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہ مجھے بے حد خوفزدہ محسوس ہوا۔ وہ یقیناً ٹانگے میں بیٹھنے سے ڈر رہا تھا۔

”آؤ! اللہ مالک ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے ساتھ لرزتے قدموں سے ٹانگے میں آ بیٹھا۔ اسی کے ساتھ ٹانگہ چل پڑا۔

سارے راستے ٹانگے والے نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ٹانگہ جب شہر میں داخل ہوا تو بازار کھلنے لگے تھے۔ اس وقت مجھے شدید حیرت ہوئی کہ جب بازار کلاں پہنچ کر ٹانگہ ایک جگہ رک گیا۔ سامنے ہی حکیم نبراس الدین کے مطب کا بورڈ لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”اترو!“ ٹانگے والے نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تمہاری منزل آگئی۔“

☆=====☆=====☆

ہم جیسے ہی ٹانگے سے اترے، ٹانگہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں ٹانگے والے کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ مطب کھل چکا تھا اور مریضوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں بھی مطب میں داخل ہو گئے۔ عورتیں الگ بیٹھی تھیں اور مرد الگ۔ معلوم ہوا کہ حکیم آٹھ بجے تک آئے گا۔ اسی کے ساتھ مریضوں کی گفتگو سے حکیم کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ اپنے ہی گھر کے بیرونی حصے میں حکیم نے مطب کھول رکھا تھا۔ مطب کے ساتھ ہی گھر کا صدر دروازہ تھا۔ ایک دروازہ گھر کے اندر سے بھی مطب ہی کھلتا تھا۔

”تو یہاں بیٹھ، میں ابھی آیا۔“ میں نے دھیمی آواز میں یاسف سے کہا۔

”کہاں جا رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا تو بھول گیا کہ ہم یہاں کس لئے آئے ہیں!“ میرا اشارہ حکیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی طرف تھا۔

”سمجھ گیا، مگر جلد لوٹ آنا۔“ یاسف دھیرے سے بولا۔ ”کیا خبر یہاں مجھ پر کیا افتاد پڑ جائے!“ ”ادھر آ، میری بات سن!“ میں اسے اٹھا کر ایک طرف لے آیا۔ ”تو بھی بیکار نہ بیٹھ! میں تو حکیم کے پیچھے لگتا ہوں تو عطار کا کھوج لگا۔“ میں نے مطب ہی میں موجود عطار کی طرف اشارہ کیا جو حکیم سے پہلے ہی وہاں آچکا تھا۔ اس باریش عطار کی عمر پچاس برس سے اوپر لگتی تھی۔

”اس کی صورت ہی پر پچھکار برس رہی ہے۔ میں اس کے جسم میں داخل ہو گیا تو کوئی آدم زادی میری طرف آنکھ اٹھ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گی۔“ یاسف کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

”بعد میں جب میں حکیم نبراس الدین کی جگہ لے لوں گا تو کسی نوجوان عطار کو یہاں لے آؤں گا۔ توئی الحال مان جا، مجبوری ہے۔ ابھی تو ہم نے حکیم کو بھی نہیں دیکھا، کیا معلوم وہ بھی کوئی خراث بوڑھا

کی طرف چل دیا۔ عطار عبدالکلام کا گھر کوئلہ تو لے خان ہی میں تھا۔ آج مجھے تو حکیم نبراس الدین کے جسم میں اترتا تھا اور یاسف کو عطار عبدالکلام کے جسم پر قبضہ کرنا تھا۔

حکیم نبراس الدین کی عمر زیادہ نہیں صرف چالیس برس تھی۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی اس سے پانچ سال بڑی اور دوسری بیس سال چھوٹی تھی۔ دوسری شادی کو سال بھر ہوا تھا۔ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ بڑی بیوی نیک اور شریف مگر چھوٹی پوری آفت کی پڑیا تھی۔ حکیم بے اولاد تھا اور بظاہر اس نے اولاد ہی کی خاطر یہ دوسری شادی کی تھی، لیکن اصل واقعہ کچھ اور ہی تھا۔ پہلی شادی حکیم نے حصول دولت کی خاطر کی تھی کوئلہ وہ خود ایک غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ حکیم نے اسی لئے اپنی عمر سے بڑی عمر کی ایک عورت کو قبول کر لیا تھا۔ دوسری شادی اس نے بقیہ زندگی عیش سے گزارنے کے لئے کی تھی۔ اولاد کی تمنا کو اس میں دخل نہ تھا۔ وہ اپنے الگ ہی کینڈے اور مزاج کا آدمی تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ حکیم خود صاحب اولاد نہیں بنا۔ اس کی بڑی بیوی راجہ کو کوئی ایسا خاص مرض لاحق نہیں تھا کہ حکیم اس کا علاج نہ کر سکتا۔ راجہ بانجھ نہیں تھی، ہاں اسے علاج کی ضرورت تھی۔ حکیم نے دانستہ اسے ایسی دوائیں استعمال کرائیں کہ وہ ماں نہ بن سکے۔ اولاد کو وہ روگ سمجھتا تھا۔ اس بد بخت حکیم کا خیال یہ تھا کہ ماں بننے کے بعد عورت کا جسم ڈھل جاتا ہے۔ بنیادی طور پر ایک عیاش آدمی تھا۔ جب پہلی بیوی اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے سبب اس کے معیار سے گرنے لگی تو اولاد کے بہانے اس نے کلثوم سے شادی کر لی۔ کلثوم غریب گھر کی تھی اور حکیم سرمایہ دار تھا۔ کلثوم کے والدین نے اسی لئے حکیم سے اس کا رشتہ کر دیا۔ اپنے نئے سرسالیوں کو بھی حکیم نے یہی کمائی سنائی تھی کہ اولاد کی خاطر مجبوراً دوسری شادی کر رہا ہے۔ ان تمام عیوب کے باوجود حکیم کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی تھی۔ دور دور سے لا علاج مریض اس کے پاس آتے تھے۔

لاچکی حکیم اسی سے فائدہ اٹھا کر انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ عورت کی ہوس کے ساتھ ساتھ وہ ہوس زر کا بھی غلام تھا۔ حکمت کا فن اس نے راجہ کے باپ ہی سے سیکھا تھا۔ راجہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے راجہ کا رشتہ ایک اچھی جگہ کر بھی دیا تھا لیکن شوہر کی زندگی نے دفا نہیں کی۔ اسے خاندانی دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا گیا اور یوں راجہ بیوہ ہو گئی۔ اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے صرف چند ماہ سکون سے گزارے تھے۔ راجہ کے باپ کا شمار بھی ملتان کے اچھے حکیموں میں ہوتا تھا۔ حکیم نبراس اس کے گھر بھی آنے جانے لگا۔ راجہ کا باپ حکیم شجاع اسے اپنے جینیتے شاگردوں میں سمجھتا تھا۔ حکیم نبراس کی نظر راجہ پر پڑ گئی جو اس سے عمر میں بھی بڑی تھی اور بیوہ بھی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے راجہ کو رام کر لیا۔ راجہ خوبصورت بھی تھی اور دولت مند باپ کی بیٹی تھی، پہلے شوہر سے اولاد کوئی تھی نہیں۔ راجہ راضی ہو گئی تو حکیم نبراس الدین نے اس کے لئے رشتہ بھیج دیا۔ راجہ کے باپ نے رشتہ فوراً قبول کر لیا کہ حکیم نبراس الدین نوجوان اور کنوارہ ہونے کے علاوہ خدمت گزار بھی تھا۔ بیوہ بیٹی کے لئے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ملتا! حکیم شجاع نے جینیت میں بیٹی کو آبائی گھر دے دیا جو کسی بڑی حویلی یا کوٹھی سے کم نہیں تھا۔ بیٹی کے سوا اس کا اور کون تھا! یوں حکیم نبراس الدین بہ یک وقت حسن و دولت دونوں

ہو۔ بار بار تو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ ہم یہاں آدم زادوں کے چکر میں نہیں آئے!“ میرے سمجھانے بھانے پر یاسف مان ہی گیا۔ وہ تمام دن ہم نے حکیم اور عطار عبدالکلام کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے میں صرف کیا اور پھر حضوری باغ آ گئے۔ یہ وہی باغ تھا کہ جہاں ملتان آکر پہلے بھی ہم ایک رات گزار چکے تھے۔ یاسف کا منہ بنا ہوا تھا، کہنے لگا۔ ”پتا نہیں تو نے مجھ سے کب کا انتقام لیا ہے!“

”کیا ہوا، کچھ بتائے گا بھی!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”عطار کی بیوی بڑی خبیث ہے۔ ایک تو کبھت کے چربے پر پچک کے اتنے گہرے گہرے داغ ہیں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پاؤ بھر قیہ بھی کم پڑ جائے، اس پر اتنی غزلی ہے کہ خود کو کسی حور پری سے کم نہیں سمجھتی۔ عطار عبدالکلام زن مرید ہے۔ بیوی ڈانٹتی پھٹکارتی رہتی ہے اور وہ بے حیا بنا اس کی خوشامد میں لگا رہتا ہے۔“ یاسف نے بتایا۔

میں نے اسے چھیڑا۔ ”چل یہ اچھا ہوا، تجھے کسی ایسی ہی آدم زادی کی ضرورت بھی تھی کہ تجھے سیدھا کر دے۔“ میں ہنسا۔ ”خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“

”دیوانہ ہو گا تو! میں ہرگز اس آدم زادی سے دب کر نہیں رہوں گا۔ وہ یوں اور شیرینی بنی ہوئی ہے کہ اس کے دونوں بیٹے جوان ہو چکے ہیں جو ماں کی حمایت لیتے ہیں۔ باپ کی طرف سے بڑی بی نے انہیں فرنٹ کر رکھا ہے۔ دونوں ہی کماد پوت ہیں ایک خطا ہے دوسرا قاتلین باف!“

”ان کا ذکر چھوڑ اور بڑی بی کے بارے میں بتا کہ کیا عمر ہے؟“ میں اب تک شرارت پر آمادہ تھا۔

”پچاس سے کم ہوگی کبھت!“ یاسف نے جل کر جواب دیا۔

”پھر تو ابھی لاکھین ہوا! پچاس سال بھی کوئی عمر ہے! تجھ سے تو سو سال کم ہے، عمر میں! اور کیا چاہتے تھے! کیا لوٹے گا کسی کو!“

”دیکھ اسے علیائش، میرے مہر کو نہ آزما! پہلی فرصت میں اس بوڑھے عطار کی جگہ حسب وعدہ تجھے کوئی جوان مرد ملازم رکھنا پڑے گا ورنہ سمجھ لے، بھاگ لوں گا، میں یہاں سے!“

”ابھی چھری کے نیچے دم تو لے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کسی جوان مرد کی تلاش میں وقت تو لگے گا! پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عطار ہو۔“

”کسی دوسرے حکیم کے عطار پر ہاتھ صاف کر دیں گے۔“ یاسف نے ایک راہ نکال ہی لی۔ پھر وہ مجھ سے حکیم نبراس الدین کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔

میں نے اسے مختصراً حکیم کے متعلق بتا دیا۔ بہت سی باتیں میں دانستہ گول کر گیا۔

”چڑی اور دودو! تیرے تو عیش ہی عیش ہوئے پھر! کاش میں نے حکمت سیکھی ہوتی!“

”نیم حکیم تو اب بھی ہے تو! خطرہ جاں اس لئے نہیں کہ رہا کہ تو برا نہ مان جائے۔“

ہم اسی طرح ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے سو گئے کہ صبح ہمیں جلدی اٹھنا تھا۔

صبح ہوئی تو طے شدہ پروگرام کے مطابق یاسف تو کوئلہ تو لے خان روانہ ہو گیا اور میں بازار کلاں

کا مالک بن گیا۔ رابعہ کی شادی کے چند برس بعد اس کے والدین انتقال کر گئے اور حکیم نبراس الدین نے اپنے سر کی جگہ سنبھال لی۔ اس نے اپنے بچے بھائیوں اور عزیز و اقارب سے ملنا چھوڑ دیا کہ وہ غریب تھے۔ گھر داماد تو وہ پہلے ہی بن چکا تھا۔ مگر رشتے داروں سے ترک تعلق نہیں کیا تھا۔ اب سر کی ساری دولت بھی اس کے حصے میں آگئی تو وہ اور بد دماغ ہو گیا۔ اس کی ماں، بہنیں اور بھائی بھی زندہ تھے، لیکن وہ نہ تو کسی سے ملنا پسند کرتا نہ کسی کی مال مدد کرتا۔ وہ بڑا ہی خود غرض اور احسان فراموش تھا۔ کہتا کہ میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے تو پھر کیوں کسی کو اپنے عیش و عشرت میں حصے دار بناؤں۔ رابعہ ہی کے بل بوتے پر اس نے ایک عمر بڑی خوش حال زندگی گزاری تھی اور اب بھی مزے کر رہا تھا، لیکن کلثوم سے شادی کے بعد رابعہ کو اس نے جیسے بھلا ہی دیا تھا۔ سال بھر کے غرصے میں کلثوم کو بھی اس نے اب تک ماں نہیں بننے دیا تھا۔ وہ عجیب اولاد دشمن آدمی تھا۔ حکیم نبراس الدین سے پہلے کبھی کوئی ایسا آدم زاد میں نے نہیں دیکھا۔ وہ آدم زاد جیسا بھی برا بھلا سہی مجھے بہر حال اسی کے جسم میں اترنا تھا، سو میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

صبح ہی صبح کا وقت تھا۔ حکیم کو سو کر اٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں، صحت قابل رشک تھی، درمیانہ قد تھا، چہرے پر داڑھی نہیں صرف مونچھیں تھیں۔ دیکھنے میں وہ بڑا بارعب لگتا اور چہرے سے خست باطنی ظاہر نہ ہوتا۔ صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک، پھر شام چار بجے سے سات بجے تک وہ مطب میں بیٹھا۔ جس مریض کو بھی نسخہ لکھ کر دیتا، صاف کہہ دیتا کہ دوا میرے ہی مطب سے لینا ہے ورنہ صحت یابی کی ضمانت نہیں۔ نسخے پر ہی وہ مطلوبہ رقم ایک طرف عربی ہندسوں میں لکھ دیتا کہ کوئی مریض پڑھ نہ سکے۔ پیسوں کے معاملے میں کسی کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہ کرتا، خواہ مریض غریب ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی مریض اپنی غربت کا دکھڑا روتا تو وہ کہتا کہ میاں، گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا! اگر میری دوا تمہیں مہنگی پڑتی ہے تو کسی اور حکیم یا وید کے پاس چلے جاؤ۔ مریض بے چارہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا۔ اس کے باوجود بھی مریضوں کا جھوم رہتا۔ عالم جنات تک اس کی شہرت بلا سبب تو نہ تھی۔ وہ اپنے فن میں طاق تھا۔ رابعہ کے باپ حکیم شجاع کو جو نسخے اپنے اجداد سے وراثت میں ملے تھے، اب وہ بھی حکیم نبراس الدین کی ملکیت تھے۔ انہیں اس نے لکھ رکھا تھا۔ یہ نسخے اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ ان نسخوں کو ایک اتھنی تجوری میں رکھتا۔ اسی تجوری میں اس نے اپنی ساری دولت جمع کر رکھی تھی۔ عطار عبدالکلام اس کے اعتماد کا آدمی تھا، پھر بھی وہ نسخوں پر درج رقم کے مطابق اس سے ایک ایک پیسے کا حساب لیتا۔ وہ کم کھاتا مگر مقوی غذائیں استعمال کرتا۔ اس وقت بھی رابعہ باورچی خانے میں اس کے لئے بنی کو جوش دے رہی تھی۔ صبح ناشتے میں وہ بنی ضرور پیتا۔ رابعہ کی حیثیت اب اس گھر میں ایک ملازمہ کی سی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی خدمت کے ساتھ ساتھ سوکن کے ناز بھی اٹھاتی۔ گھر میں کوئی ملازم یا ملازمہ رکھنا، حکیم کے نزدیک فضول خرچی تھی۔

میں جب حکیم نبراس الدین کے جسم میں داخل ہوا تو وہ ناشتے کا منتظر تھا۔ اس کی بیوی نہرود، یعنی

کلثوم بھی کولے سے لگی بیٹھی تھی۔ حکیم کے جسم کو جھکا لگا تو وہ چوڑی اور کسنے لگی۔ ”یہ تم بیٹھے بیٹھے مال کیوں کھیلنے لگے؟“

مجھے ابھی حکیم کے جسم میں قرار نہیں آیا تھا اس لئے خاموش رہا۔ کلثوم کو جانے کیا شرارت سوچھی کہ اس نے بازو میں چٹکی بھری۔ وہ شاید حکیم سے زیادہ فری تھی۔ چند لمحوں بعد میں اس قابل ہوا کہ شوخ کلثوم کی شرارت کا جواب دے سکتا۔ میں نے جو چٹکی بھری تو وہ بلبلا اٹھی۔ اسی وقت رابعہ ناشتے کی سینی اٹھائے اس چوکی کی طرف بڑھی جس پر میرے ساتھ کلثوم بھی بیٹھی تھی۔ صحن کے برآمدے میں کلثوم کی خواب گاہ کے باہر وہ چوکی پڑی تھی۔ رابعہ کے چہرے پر میں نے مظلومیت برستے دیکھی۔ اس کے جسم پر ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تھے۔

رابعہ نے سینی سامنے رکھ دی تو میں نے اسے پہلی بار مخاطب کیا۔ ”تم نے بھی ناشتہ کیا؟“ میری طرف رابعہ نے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ”میں تو روز آپ دونوں کو ناشتہ کرانے کے بعد ہی.....“

”نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آج میرے ساتھ تم ناشتا کرو گی۔ کلثوم بعد میں ناشتہ کر لے گی۔“

”کیا؟“ کلثوم چیخ اٹھی۔ ”میں کیوں کرنے لگی، بعد میں ناشتہ؟ کہیں اس بڑھیا نے تم پر کوئی تعویذ تو نہیں کرا دیا؟“

”یہ بڑھیا نہیں، اس گھر کی مالک ہے، میری پہلی بیوی ہے! کچھ آیا تمہاری عقل میں.....! چلو اٹھو یہاں سے اور باورچی خانے میں جا کر ناشتہ بناؤ اپنے لئے!“ میں سختی سے بولا۔

حکیم کی دوسری لاڈلی اور نوجوان بیوی کلثوم نے شاید پہلی بار سختی دیکھی تھی، سو روتی ہوئی اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ میں نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ یہ آنسو یقیناً بے اندازہ اور غیر متوقع خوشی کے سبب اس کی آنکھوں میں آگئے تھے۔ عمر میں وہ لاکھ بڑی سہی مگر چہرے پر اب بھی بہار گریزاں کے آثار باقی تھے۔ سانولی رنگت میں اب بھی کشش تھی، جسم بھی متناسب ہی تھا۔

”آج..... آج یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ رابعہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، تم ناشتہ کرو۔“

”اور وہ..... وہ کلثوم..... اس غریب نے بھی تو ابھی.....“

”اس غریب کے غم میں تمہیں زیادہ گھلنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے اسے بھی ہاتھ پیر دیئے ہیں۔“

وہ آج خود اپنے لئے ناشتہ بنائے گی!“

”اگر آپ اس سے ناراض ہیں تو..... تو میں اس کی طرف سے معافی مانگ لیتی ہوں۔“

”مجھے مطب جانے کو دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے رابعہ کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ”جلدی ناشتہ

کروا

”آپ کا حکم ہے تو پھر کیسے ٹال سکتی ہوں!“ یہ کہہ کر رابعہ ناشتہ کرنے لگی۔

میں نے دانستہ ایسا کیا تھا کہ غیث حکیم نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ جو زیادتی کر رکھی ہے اس کی تلانی شروع ہو جائے۔ ناشتہ کر کے میں اٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حکیم اپنی دوسری بیوی کے کمرے میں ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ مجبوراً مجھے لباس تبدیل کرنے دہاں جانا پڑا۔ کلثوم اور زور زور سے رونے لگی۔

”ابھی تو میں زندہ ہوں، پھر کسے رو رہی ہو؟“ میں نے کلثوم کو مخاطب کیا۔ ”اٹھو بستر سے اور گھر کے کام کاج میں رابعہ کا ہاتھ بٹاؤ! تم کوئی مہارانی نہیں ہو کہ تھان پہ بیٹھی بچو! زیادہ پھیل بچانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ تمہارے ابا کے گھر بھیج دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، بھیج دیں!“ وہ کسی پھری ہوئی شیرینی کی طرح ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میں اس گھر میں ذلیل ہو کر رہنا نہیں چاہتی!“

”سوچ لو تمہارے والدین بہت غریب ہیں، تمہارا بوجھ ان سے برداشت نہیں ہو گا۔“ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مطب سے لوٹ آؤں تو بتا دیتا ابھی جلدی نہیں۔“

پھر اس کی زبان پر تالا پڑ گیا اور وہ مزید کچھ نہیں بولی۔ پہلے دن کے لئے اتنا کافی تھا۔ یوں بھی آٹھ بجنے والے تھے، سو میں لباس تبدیل کر کے مطب میں پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ عطار عبدالکلام کے جسم پر یاسف نے قبضہ کر لیا ہے۔ اور ایک نگاہ ڈال کر میں حکیم کی نشست پر آ بیٹھا۔

میں نے ایک مریض کی نبض دیکھ کر پہلا نسخہ لکھا اور اسے تھما دیا۔ دانستہ میں نے نسخے پر ایک پیسا لکھا جب کہ حکیم ہراس الدن دو آنے سے کم کی دوا کسی مریض کو نہیں دیتا تھا۔ پھر یہی ایک پیسا میں ہر نسخے پر لکھتا چلا گیا۔ اس پر مریضوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ان میں سے کچھ پرانے مریض بھی تھے۔ ایک مریض تو میرے پاس دوڑی چلی آئی۔

”ہاں بی بی، کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”عطار نے صرف ایک پیسہ لیا ہے۔ حکیم صاحب! اس سے پہلے تو کبھی دو آنے سے کم.....“

”ہاں اب ہم نے پیسے کم کر دیئے ہیں۔“ میں بول اٹھا۔ ”ہر مریض کی تو اتنی حیثیت نہیں کہ وہ دو آنے روز کی دوا لے سکے۔“

”اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ مریضہ نے دعا دی۔ ”پورے ملتان بھر میں کوئی حکیم دو پیسے سے کم کی دوا نہیں دیتا۔“

تین گھنٹے کے دوران طرح طرح کے مریضوں سے میرا سابقہ پڑا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کچھ مریض تو دوسرے شہروں سے بھی کرایہ خرچ کر کے آئے تھے۔

اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دوا کی قیمت کم کرنے کا کیا اثر ہو گا! سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس کا نتیجہ مجھے شام کو بھگتنا پڑا کہ جب مطب پر گویا مریضوں نے یلغار کر دی، لیکن اس وقت تو میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔

مطب کا دقت ختم ہو گیا تو یاسف نے جلدی جلدی مریضوں کے نسخے باندھ کر دیئے۔ میں اس وقت تک اٹھ کر اندر نہیں گیا تھا۔ مریضوں کو نمنا کر یاسف نے مطب کا دروازہ اندر سے بند کیا اور لپک کر میرے پاس آ گیا، کہنے لگا۔ ”مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔“

”کیوں، کیا ہو گیا تھے؟“

”پوچھ رہا ہے، کیا ہو گیا! ارے ناک کھانے تک کی مہلت نہیں دی، کبجنت مریضوں نے!“

”تو اب کھالو ناک!“ میں مسکرایا۔ ”اس وقت تو فرصت ہی فرصت ہے۔“

”مجھ سے وہ بد ذات چپک رو لڑ پڑی اور ناشتہ کئے بغیر ہی مطب آنا پڑا۔ صبح سے اب تک عذاب ہی عذاب میں گزری ہے، تیرے تو عیش ہوں گے! تجھے میری کیا پرواہ۔“

”چل میرے ساتھ تھری پیٹ پوجا میں کرائے دیتا ہوں۔ اچھے بچے بات بات پر خفا نہیں ہوتے۔“

پھر میں، یاسف کو گھر کی نشست گاہ میں لے آیا اور کھلا پلا کر ہی رخصت کیا۔ یاسف چلا گیا تو رابعہ نے بتایا کہ اب تک کلثوم نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا۔ وہ ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ میں کمرے میں پہنچا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم..... تم پہلے تو اتنے ظالم نہیں تھے!“ اس نے شکوہ کیا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں یہاں رہنا ہے یا اپنے ماں باپ کے گھر جانا ہے؟“

”میرا گھر..... میرا گھر تو یہی ہے، میں..... میں کہاں جاؤں گی!“ وہ نظریں چراتے ہوئے رک رک کر بولی۔

”اگر تم اس گھر کو اپنا سمجھتی ہو تو تمہیں اس کی ذمہ داریاں بھی ادا کرنا چاہئیں! میں تم سے کہہ کر گیا تھا کہ رابعہ کا ہاتھ بٹانا، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔“ میں اسے راہ راست پر آتے دیکھ کر سمجھانے لگا۔

”تمہارے اور رابعہ کے حقوق برابر ہیں بلکہ وہ تم سے عمر میں بہت بڑی ہے، تمہیں اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں، میرے پاس جو کچھ ہے، اسی کی وجہ سے ہے۔ تمہاری خاطر میں نے اس کی حق تلفی کی یہ میری غلطی تھی۔ مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ میں، رابعہ سے معافی مانگ لوں گا۔ مجھے یقین ہے، اس کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ میرے قصور معاف کر دے گی۔ تم نے بھی میری شہ پر اس کے ساتھ جو زیادتیاں کیں تمہیں بھی ان کی معافی مانگنا پڑے گی۔“

پہلے تو کلثوم اس پر آمادہ نہ ہوئی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ میرے رویے میں کوئی چپک نہیں تو اس کی گردن کا تناؤ ختم ہو گیا۔ میں نے آواز دے کر رابعہ کو وہیں بلا لیا اور پھر اس سے معافی مانگنے لگا۔

کلثوم نے بھی ایسا ہی کیا تو رابعہ تصویر حیرت بن گئی۔ شاید اسے اپنی سماعت و بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو جتے دیکھے۔ دل کا غبار آنسوؤں میں بہہ گیا تو اس نے کلثوم کو گلے سے لگا لیا۔ ”ہم..... ہم دونوں بہنوں کی طرح اس..... اس گھر میں رہیں گے۔“ رابعہ

بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ سے دانستہ یا نادانستہ جو بھی میری حق تلفی ہوئی، وہ میں نے معاف کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ میں نے بھی آپ کے حقوق کی ادائیگی میں جانے کتنی بار کوتاہی کی ہوگی، مجھے بھی آپ معاف کر دیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔

حکیم نبراس الدین نے اس جیسی نیک سرشت عورت کو جانے کتنے دکھ دیئے تھے! بہر حال میں نے ایک ہی دن میں گھر کی فضا بدل دی۔ دوسرے کا کھانا ہم تینوں نے ایک ساتھ کھایا۔ گھر میں حکیم کا اپنا بھی الگ کمرہ تھا۔ کلثوم کے کمرے سے میرا تمام سامان وہاں منتقل ہو گیا۔ حکیم کی تجوری ہی اسی کمرے میں تھی۔

”اب تم دونوں جا کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کرو اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔“ میں نے ان دونوں سے کہا۔

”آپ کے چیر دباؤں میں تاکہ آرام سے سو جائیں!“ رابعہ بولی۔

”نہیں، تم پہلے ہی بہت تھک گئی ہو۔“ میں نے منع کر دیا۔

”اب تو باجی کے ساتھ میں بھی گھر کا کام کاج سنبھالا کروں گی، پھر یہ اتنا نہیں تھکا کریں گی۔“ کلثوم بول اٹھی۔

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا تو وہ دونوں کمرے سے چلی گئیں۔ جب ان کے قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوئے معدوم ہو گئی تو میں اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ بڑی سی آہنی تجوری کمرے کی ایک دیوار میں جگہ بنا کر رکھی گئی تھی جسے میں کھول کر دیکھنا چاہتا تھا۔ کمرے کی یہ عقبی دیوار تھی جہاں چھت سے لے کر فرش تک ایک ریشمی پردہ لٹکا ہوا تھا۔ تاکہ تجوری نظر نہ آئے۔ میں گزشتہ روز ہی اس گھر کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ تجوری کی چابیاں اب میرے پاس ہی تھیں۔

پردہ ہٹا کر میں نے تجوری کا آہنی بھاری دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ چاندی کے روپوں کے علاوہ تجوری کے مختلف خانوں میں سونے کے توڑے اور ہیرے بھی مجھے رکھے دکھائی دیئے۔ حکیم نبراس الدین میری توقع سے کہیں زیادہ امیر و کبیر نکلا۔ میں نے جس شے کی تلاش میں تجوری کھولی تھی، وہ بھی مجھے مل گئی۔ یہ وہ جملہ قلمی نسخہ تھا کہ جس میں حکیم نے مختلف عوارض کے تیر بہ ہدف نسخے درج کر رکھے تھے۔ یہی وہ نسخے تھے کہ جن کے طفیل وہ دولت مند بنا تھا۔ تجوری بند کر کے میں دیر تک ان نسخوں کو ذہن نشین کرتا رہا۔ ان میں سے بہت سے نسخے میرے لئے بالکل نئے تھے۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ علم طب میں آدم زادوں نے جنات سے زیادہ ترقی کر لی ہے۔ اس قلمی نسخے کو میں نے دوبارہ تجوری میں بند کر دیا۔ میرے نزدیک اس تجوری میں سب سے قیمتی شے وہی تھی۔

آرام تو محض ایک بمانہ تھا کہ مجھے تنہائی میسر آجائے اور میں تجوری کھول کر دیکھ سکوں اس لئے جلد ہی اٹھا گیا۔

مجھے بوہڑ دروازے جانا تھا۔ وہاں حکیم نبراس الدین کے والدین رہتے تھے۔ گزشتہ روز انہیں میں

نے بڑے بڑے حالوں دیکھا تھا۔ غربت بڑی بری بلا ہے، آدمیوں کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ حکیم اتنا سخت دل تھا کہ اپنے والدین کی بھی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ مالی مدد کرنا تو درکنار وہ ان سے ملتا بھی نہیں تھا۔ والدین کے علاوہ حکیم کی تین بہنیں اور دو بھائی بھی تھے۔ دو بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں البتہ ایک بہن ابھی غیر شادی شدہ تھی۔ بھائیوں میں ایک، حکیم سے بڑا اور ایک چھوٹا تھا۔ دونوں شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ والدین سے الگ رہنے اور تنگ دستی کے باوجود ان کا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ وہ حتی المقدور والدین کا خیال رکھتے اور ہر ماہ گھریلو اخراجات کے لئے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے، لیکن اس میں بڑی مشکل سے گزر ہوتی۔ دراصل جب سے حکیم کا باپ الیاس بیمار پڑا تھا، گھر کے حالات بگڑ گئے تھے۔ بوڑھے الیاس کو فن تعمیر میں دسترس تھی۔ وہ محنت مزدوری کر کے اتنا کمالاتا کہ بیوی اور بیٹی کا پیٹ بھر سکے۔ ایک تو بڑھاپا، اس پر دسے کی بیماری، آخر کب تک وہ اپنی ہڈیاں پیٹتا! آخر بستر پر لیٹنا ہی پڑا۔ تبھی سے یہ صورت حال تھی۔ الیاس کی غیرت نے عمرت کے باوجود یہ گوارہ نہ کیا کہ حکیم کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ حالات کے جبر سے تنگ آکر اس کی بیوی بتول نے کہا بھی کہ نبراس بیٹے کے پاس چلے جاؤ، کچھ اور نہیں تو وہ دوا دارو کا بندوبست تو کر ہی دے گا، مگر وہ نہیں مانا۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ٹوٹ تو جاتے ہیں لیکن جھکتے نہیں۔ الیاس بھی انہی میں سے تھا۔

یہاں میں یہ بھی بیان کرتا چلوں کہ دیگر صفات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جنات کو ایک اور حیرت انگیز صلاحیت عطا کی ہے۔ رضائے الٰہی سے جنات، آدم زادوں کے ماضی اور مستقبل سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ کوئی عالم آدم زوایا جن اس میں خارج نہ ہو۔ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے، سو اللہ ہی کی مصلحت سے جنات غیب کا حال بتا سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی یہ غیبی آوازیں سنی جا چکی ہیں جو جنات کی تھیں۔ اس ضمن میں متعدد واقعات میں نے کتب تواریخ میں پڑھے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان موقوفی دہی کا جو زمانہ تھا، اس زمانے میں آسمان پر جنات ایسی جگہ جا کر بیٹھ جاتے جہاں وہ فرشتوں کی باتیں سن سکیں۔ یہی باتیں وہ کاہنوں کو بتا دیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے قبل بھی ایک کاہن نے اسی طرح کی پیش گوئی کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے کثرت سے ستارے ٹوٹنے لگے۔ عرب اس حالت کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے ایک بڑے کاہن کے پاس گئے۔ یہ کاہن آنے والے واقعات کی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ کاہن نے کہا، اگر برج ٹوٹ رہے ہیں تو سمجھ لو دنیا کے خاتمے کا وقت آگیا ہے ورنہ دنیا میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آنے والا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس زمانے کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ انہی کاہنوں کے متعلق میں نے ایک حدیث بھی پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا، ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ بعض وقت ایسا باتیں کر جاتے ہیں جو سچی ہوتی ہیں۔ ارشاد ہوا، جنات کوئی کوئی بات فرشتوں سے سن کر کاہنوں کے کان میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی طرف سے بھی ایسی باتیں اس میں شامل کر دیتے ہیں جو بالکل جھوٹی ہوتی

ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے غیب کی باتیں چرانے کا انسداد ٹوٹنے والے ستاروں سے کر دیا ہے۔
بشّت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جنات کی نجی آوازوں سے متعلق دو مستند واقعات آئے ہیں۔
میرے حافظے میں تازہ ہیں۔ ان میں سے ایک واقعے کا تعلق خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور دوسرا واقعہ سواد بن اقاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان لانے سے تعلق رکھتا ہے۔
واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنات نے اللہ کے حکم سے آدم زادوں کی رہنمائی صحیح سمت میں بھی کی۔
دونوں واقعات میں نے کتب احادیث میں پڑھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے ایک خوبصورت مروگزارا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے حال دریافت کیا۔ اس شخص نے بتایا کہ میں زاحلیت میں عرب کا کائن تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جنیہ کی کوئی عجیب و غریب بات سناؤ۔ اس شخص نے کہا کہ وہ جنیہ ایک روز بازار میں ملی تو اس نے یہ اشعار پڑھ کر سنائے۔

الر ترانجن وابلما سما
وبا سما من انکا سما
ولحو تما باقلاص احلا سما

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، اس نے سچ کہا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش ہوا۔ میں ایک روز بت کے پاس سو رہا تھا۔ ایک آدمی 'گائے کا ایک بچہ' بت پر چڑھانے آیا۔ اس شخص نے گائے کے بچے کو بت کے سامنے ذبح کیا۔ اس بچے کے پیٹ میں یکایک شور بلند ہوا۔ "یا علیج امر رجل فصیح یقول لالا لا اللہ۔" (اے علیج! یہ امر نجات دینے والا ہے، مرد فصیح کرنے والا ہے، وہ لا الا اللہ کہتا ہے)

یہی کلمات میں نے دوبارہ بارہ سنے۔ اس واقعے کو کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خبر مشہور ہو گئی۔

دوسرا واقعہ سواد بن اقاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے لانے کے متعلق بیان کیا۔ سواد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، ایک جن میرا دوست تھا۔ وہ مجھے جگا کر اٹھو، سمجھ لو، جان لو، لوئی بن غالب میں سے ایک رسول مبعوث کیا گیا ہے۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے (عربی اشعار کا ترجمہ) جنات میں سے میں تعجب کرتا ہوں اور جنات کے نجس لوگوں سے تعجب ہوں اور اس سے کہ وہ اپنے انٹوں پر کھاوے باندھتے ہیں۔ وہ جنات کے کی طرف میل کرتے ہیں ہدایت کی خواہش کرتے ہیں۔ ان جنات میں جو مومن ہیں، وہ ان کے نجس جنات کی مثل نہیں۔ تو خلاصے کی طرف جا جو ہاشم میں سے ہے اور اپنی آنکھوں کو ذرہ ہاشم کی طرف اٹھا کے دیکھ، یعنی نبی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ نبی ہاشم کی راس ہیں۔

یہ اشعار سنا کر اس جن نے مجھ سے تمدید آمیز انداز میں کہا، اے سواد! اللہ تعالیٰ نے ایک مبعوث کیا ہے، تو اس نبی کے پاس جا ہدایت پائے گا۔

دوسری شب میرے اسی دوست جن نے مجھے بیدار کر کے جو اشعار سنائے ان کا مطلب بھی یہی تھا کہ جنات آمادہ سفر ہیں اور ان کے کی طرف جانے والے ہیں کہ ہدایت پائیں، سوائے سواد، تو بھی ادھر ہی جا! میری رات بھی اس جن نے مجھے اسی مضمون کے اشعار سنائے۔ مسلسل یہ اشعار سن کر میرے دل میں اسلام کی محبت جاگزیں ہو گئی۔ اس کے بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

ان واقعات کے بیان سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ میں قوم جنات کو اس بہانے افضل و برتر ظاہر کر رہا ہوں۔ جنات میں تو مجھ جیسے بھی فاسق و فاجر موجود ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ جناتی صفات کسی طور ظاہر ہو جائیں اور جو آدم زاد ہمیں محض و ہم و قیاس گردانتے ہیں، وہ بھی اعتراف حقیقت کر لیں۔ حکیم نبراس الدین کا ماضی بھی انہی فطری صفات کے سبب مجھ پر پوری طرح عیاں ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی میں نے مختلف آدم زادوں کے ماضی کا سراغ لگایا تھا۔

روانگی سے قبل میں نے ایک تھیلے میں خاصا زر نقد بھر لیا اور پھر لباس تبدیل کر کے اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس وقت دوپہر کے دو بجتے والے تھے۔ مطب کے وقت سے پہلے بوہڑ دروازے ہو کر میری واپس ممکن تھی۔ راجہ کے کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ملا تو میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ سوئی نہیں تھی، مجھے دیکھتے ہی بستر سے اٹھی اور پوچھنے لگی۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "دروازہ بند کر لو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کپڑے کا تھیلہ بغل میں دبا لیا۔

"کیا آج مطب میں بیٹھنے کا ارادہ نہیں؟" راجہ نے قریب آتے ہوئے سوال کیا۔

"مطب کے وقت تک لوٹ آؤں گا۔" میں نے بتایا۔

راجہ میرے ساتھ ساتھ گھر کے دروازے تک آئی۔ جب میں باہر نکل آیا تو اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ نہ راجہ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کہاں جا رہا ہوں، نہ میں نے ہی اسے کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ مسجد کے قریب مجھے ایک خالی تاکہ مل گیا اور میں اس میں بیٹھ کر جلد ہی بوہڑ دروازے پہنچ گیا۔ مطلب یہ کہ میں گزشتہ روز ہی دیکھ چکا تھا۔ میں نے تاکہ وہیں روکایا اور کرایہ ادا کر کے اتر گیا۔ اسی وقت متوسط عمر کا ایک شخص قریب سے گزرتے گزرتے مجھے دیکھ کر رک گیا۔

اس نے مجھے سلام کیا، پھر کہنے لگا۔ "حکیم صاحب! پچانا مجھے، میں آپ کے بچپن کا دوست عبدالرشید ہوں۔ ہم دونوں ہم کتب تھے۔ آج ادھر کہاں بھول پڑے؟"

مجھے اچھا ہوا کہ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا۔ اپنے لباس سے وہ بھی مجھے غریب آدمی ہی معلوم ہوا۔ بچپن کا دوست ہونے کے ناتے اسے میں نے گلے سے لگایا اور بولا۔ "ارے رشیدو! میں تمہیں کیسے نہیں پہچانوں گا؟" اظہار بے تکلفی کی خاطر میں نے اس کا نام بھی بگاڑ دیا۔

"گزشتہ سال تجربے کے سبب مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ یوں گلے سے لگ جاؤ گے۔" عبدالرشید بھی بے تکلف ہو گیا۔ "بھول گئے کہ یاد ہے، اپنے پیار بیٹے کو میں تمہارے مطب لے کر آیا

تھا تو تم نے پیسوں کے بغیر دوا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بس وہ دن اور آج کا دن، پھر میں نے تمہارے مطب کا رخ نہیں کیا۔“

بدبخت حکیم نیراس الدین پیسے کا یار تھا اور مجھے اس کا جسم اپنا کر سارے بچھلے گناہ بخشوانا پڑ رہے تھے۔ میں نے عبدالرشید سے حکیم کے سنگ دلانہ رویے پر معذرت کی اور کہا۔ ”مطب تمہارا ہے، جب چاہو آؤ۔ اب میں دوستوں اور عزیزو اقارب سے دوا کے پیسے نہیں لیتا۔“

”کچھ یقین سانس نہیں آ رہا کہ تم اتنے بدل سکتے ہو۔“ عبدالرشید کہنے لگا۔ ”مجھے تو تمہیں اس مسئلے میں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ اپنے اباجی کی علالت کے بارے میں سن کر آئے ہو گے!“

”ہاں، میں ان سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”اچھا تو پھر میں چلا، تم اپنے گھر ہو آؤ۔“ عبدالرشید بولا۔ ”بڑی بیٹی کی شادی کرنے والا ہوں تمہیں مدعو کرنے آؤں گا۔“ پھر وہ ”خدا حافظ“ کہہ کر چلا گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر حکیم کے آبائی گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھولا کر کسی نے بھری اسے جھانکا۔ میں نے اس کی طرف ایک جھٹک دیکھی۔ وہ حکیم کی نوجوان بہن راشدہ تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ ”بھائی صاحب!“ اس کے لئے یقیناً میری آمد قطعی غیر متوقع تھی۔

گھر میں داخل ہو کر میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔ ”اباجی کی طبیعت اب کیسے ہے؟“

”پہلے سے آدھے رہ گئے ہیں۔“ راشدہ نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔ ”لیو آپ..... آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ.....“

”پگلی! کیا تو سمجھتی ہے کہ غافل ہوں!“ میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں جب سامنے والے کمرے میں داخل ہوا تو حکیم نیراس الدین۔ باپ الیاس کو جھانگتی ایک چارپائی پر بڑے ہوئے دیکھا۔ چارپائی کے قریب ہی موڑھے پر حکیم کی بوڑھاں بٹول بیٹھی تھی۔

”اماں! بھائی صاحب آئے ہیں، اباجی کو دیکھئے۔“ راشدہ نے بلند آواز میں بتایا۔

میں نے سلام کیا تو بٹول اور الیاس دونوں ہی نے جواب تو دے دیا، لیکن بٹول نے میری طرف سے منہ پھیر لیا، الیاس نے دیوار کی طرف کروٹ کر لی۔ وہ دونوں ہی یقیناً اپنے خود غرض بیٹے سے ناراض تھے۔ اس طرح انہوں نے گویا اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے پہلے ہی سے اس کا اندازہ تھا، سو آ بڑھ کر بٹول کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”یہاں کیوں آ بیٹھا تو؟“ بٹول نے مجھے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس لئے اماں کہ میری جنت آپ ہی کے قدموں میں ہے۔“ میں بولا۔

”بڑی جلدی تجھے جنت کا خیال آ گیا جنسی!“ بٹول کی آواز میں برہمی تھی۔

”راشدہ! اس سے کہہ دو کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔ میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا!“ بوڑھا الیاس بھی خاموش نہ رہا۔

پھر میں نے بڑی مشکل سے حکیم کے والدین کو منایا۔ والدین کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے حکیم کے قصور معاف کر دیئے۔ میں نے الیاس کا طبی معائنہ کیا اور رات کو خود ہی دوا لے کر آئے کو کہا۔ چلتے وقت میں نے روپوں سے بھرا تھیلا بٹول کو تھمایا تو وہ پوچھنے لگی۔ ”یہ کیا ہے نیراس بیٹے؟“

”آپ کے لئے کچھ رقم ہے۔ یہ خرچ ہو جائے تو اور دے جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

بٹول نے تھیلا کھول کر دیکھا تو حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں اور کہنے لگی۔ ”یہ..... یہ اتنے سارے روپے.....! سارا تھیلا روپوں سے بھرا ہے۔ ارے کیا سارا جمع جوڑ لے آیا؟“

”نہیں اماں، آپ کی دعاؤں کے طفیل اللہ نے مجھے بہت دے رکھا ہے۔“

”لیکن تیری دو دو بیویاں ہیں، دہرا خرچ کرنا پڑتا ہو گا، تجھے!“ بٹول بولی، پھر الیاس کو مخاطب کیا۔ ”ذرا دیکھو تو سہی، بھر تھیلا روپے دیئے جا رہا ہے! کسی چور، ڈاکو کو خبر ہو گئی تو کیا ہو گا؟“ بٹول اپنی گود میں رکھا ہوا تھیلا اٹھانے لگی۔ تھیلا اتنا بھاری تھا کہ اس سے نہ اٹھا۔ پھر راشدہ نے اس کے کہنے پر تھیلا اٹھایا اور الیاس کے پاس لے گئی۔

بوڑھے الیاس نے بھی مجھے سمجھایا۔ ”اس میں سے آدھے روپے تو لے جا کہ کہیں تجھے تنگی نہ ہو۔“

”اباجی! مجھے بالکل تنگی نہیں ہو گی، آپ میری پرواہ نہ کریں۔“

”اگر یہ ضد کر رہا ہے تو رکھ لے۔“ الیاس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ بٹول سے مخاطب تھا۔ بٹول کے اشارے پر راشدہ نے وہ تھیلا اٹھایا اور اسی کمرے کی ایک الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ ہال ہی اس نے بٹول کو دے دی تھی۔

”اب آئے تو دونوں دنوں کو بھی ساتھ لے کر آنا! میری طرف سے انہیں دعا کہتا۔“ پھر بٹول نے مجھے بھی دعا دی۔ ”اللہ تجھے صاحب اولاد کرے۔“

اس پر راشدہ کہنے لگی۔ ”بھائی صاحب رات کو تو آنے کے لئے کہہ ہی رہے ہیں، اباجی کی دوا لے کر بھائیوں کو بھی ساتھ لیتے آئیں گے اور کھانا بھی یہیں کھالیں گے۔ بتائیں بھائی صاحب، کیا کھائیں گے؟ جو کس وہ پکالوں۔“ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تو جو پکا لے گی، ہم کھالیں گے۔“ میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

جب کچھ دیر کے بعد میں تانگے میں بیٹھ کر بازار کلاں کی طرف لوٹ رہا تھا تو مجھے بے اندازہ خوشی ہو رہی تھی، ایسی خوشی کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

واپس گھر آ کر میں نے رابعہ کو بتایا کہ بوڑھے دروازے گیا تھا تو وہ کہنے لگی۔ ”آپ نے مجھے نہیں بتایا نہ میں بھی ساتھ چلتی۔“ وہ صحن میں چوکی پر بیٹھی دال چن رہی تھی۔

”رات کو چلنا! اماں تمہیں یاد کر رہی تھیں۔“ میں نے بتایا۔
”تو کیا مجھے گھر میں اکیلا چھوڑ جائیں گے؟“ کلثوم باورچی خانے سے نکل کر قریب آتے ہوئے

بولی۔

”تم جی چلو گی۔ ہاں سنو رابعہ! رات کا کھانا ہم سب وہیں کھائیں گے۔“

”لو تو میں خواہ مخواہ دال چنے جا رہی ہوں!“ رابعہ دھڑے سے ہنسی اور تھالی ایک طرف رکھ دی۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا تو یوسف تھا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ”قبلہ
حکیم صاحب! مطب کا دروازہ کھول دیجئے۔ ابھی مطب کا وقت نہیں ہوا۔ مگر مریضوں نے آنا شروع کر دیا
ہے۔“ حکیم نبراس الدین کا عطار عبدالکلام دونوں وقت آدھے کھٹنے پہلے ہی آجاتا تھا۔ یوسف نے بھی ایسا
ہی کیا تھا۔ پھر یوسف اپنی بات جاری رکھتے ہوئے قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ”اے علیالیش! تجھ سے
خدا ہی کہے لگا۔ تُو نے مجھے بڑی غلط جگہ لاکے بھجایا ہے۔“

”یقیناً بھائی عبدالکلام!“ میں مسکرایا۔ ”اللہ ہر بندے کو حسب توفیق، یعنی اس کی صلاحیت کے
مطابق نوازتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے مزید چڑایا۔ ”صبح غالباً آپ صفائی کرنا بھول گئے تھے، اس وقت
مطب میں جھاڑو ضرور دے لیجئے گا کہ صفائی نصف ایمان ہے۔“

”سبحان اللہ قبلہ حکیم صاحب! آپ جب کچھ ارشاد فرماتے ہیں تو دہن مبارک سے موتی جھڑتے
ہیں۔“ اس نے میرا مذاق اڑایا۔

”جن لیا کریں یہ موتی کہ آڑے وقت کام آئیں۔“ یہ کہتے ہی میں واپسی کے لئے مڑ گیا۔
مطب کا دروازہ اندر سے بند کیا جاتا تھا جو میں نے کھول دیا۔ ابھی ساڑھے تین ہی بجے تھے، مگر
دروازہ کھلتے ہی جیسے مریضوں نے یلغار کر دی۔ پھر جب میں وقت مقررہ پر حکیم کی جگہ آگے بیٹھا تو مطب
میں قتل دھرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارا ملتان شہر امنڈ آیا ہو۔ دو آنے سے دو اک
قیمت ایک پیسے کر دینے کا یہ اثر ہو گا، میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ سات بجے تک مجھے سانس لینے کا
مہلت نہ ملی، پھر بھی مریض ختم نہ ہوئے۔ مجھے اگر آج رات رابعہ اور کلثوم کو لے کر بوہڑ دروازے
جانا ہوتا تو ابھی اور بیٹھتا۔ مجبوراً مجھے مریضوں سے معذرت کرنا پڑی کہ وہ آئندہ روز صبح آجائیں۔

مریضوں کے رخصت ہوتے ہی یوسف نے جھپٹ کے دروازہ بند کر دیا۔ میں، حکیم کے باپ الیا
کے لئے نسخہ لکھنے لگا۔ یوسف قریب آگیا تو میں نے نسخہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”بھائی عبدالکلام! ذرا
نسخہ اور باندھ دیں، آپ کو زحمت تو ہو گی۔“

اس وقت مطب میں میرے اور یوسف کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یوسف اسی لئے سامنے مونڈھے
بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ”قبلہ حکیم صاحب! مطب کا وقت ختم ہو چکا ہے، میں معذرت خواہ ہوں
آپ یہ نسخہ یا تو کل ہماری خدمت میں پیش کریں یا پھر خود بنفس نفیس جا کر باندھ لیں۔ اس حقیر فقیر
تقصیر کی ناگوں میں اب اتنا دم نہیں رہا کہ مزید کھڑا رہ سکے۔ ویسے یہ ضرور فرمادیں کہ یہ نسخہ کہیں ا
دایوں میں سے تو کسی کے لئے نہیں؟“ اندر والیوں سے اس کا مطلب حکیم کی بیویاں تھیں۔

”جی نہیں، یہ نسخہ ایک باہر والے کے لئے ہے۔ اندر والیاں آپ کی دعا سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔“
یوسف نے نسخہ لے لیا۔ نسخے پر اوپر ہی مریض کا نام لکھا تھا۔
”یہ محمد الیاس کون ذات شریف ہیں، جن پر قبلہ حکیم صاحب اتنی عنایت فرما رہے ہیں؟“ یوسف
نے نام پڑھ کر دریافت کیا۔

میں نے جواب میں اسے حکیم کے والدین کے متعلق بات دیا۔ حکیم نے اپنے والدین سے کیا
سلوک روا رکھا تھا، یوسف کو میں نے یہ بھی بتایا۔

”اے علیالیش! لگتا ہے کہ آدم زادوں کی صحبت تجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گی! یہ تو کن فضول
کاہنوں میں پڑ گیا ہے؟ تجھے کیا پڑی تھی بوہڑ دروازے جانے کی! ہم نے کیا سارے زمانے کا ٹھیک لے رکھا
ہے! کوئی مرے یا جیئے ہمیں کیا!“ وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔

”اب اتنا ٹھنور بھی نہ بن اے یوسف!“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”سب کچھ آدم زادوں ہی کا تو ہے،
ہمارا کیا ہے! ہماری وجہ سے اگر کسی کے دکھ دور ہو جائیں تو ہمارا کیا چلا جائے گا!“

”کرتا رہ اسی طرح دکھ دور۔ کبھی کسی آدم زاد کو بھی ہم پر رحم آیا؟ جسے دیکھو ہمیں غلام بنالینے
کے پکر میں رہتا ہے۔ ایک دفعہ بھی کسی آدم زاد کے ہتھے چڑھ گیا تو کان پکڑ لے گا، ان کی ہمدردی سے۔
جینے دی تو تجھے اپنی غلامی سے آزاد نہیں کرے گا۔“ یوسف نے مجھے عبرت دلائی۔

”ان کا عمل وہ جائیں، اپنے عمل کے ہم جواب دہ ہیں۔“
”لیکن تُو اپنے ساتھ مجھے کیوں رگید رہا ہے.....؟ ہاں وہ میں تجھ سے ایک بات تو کہنا بھول ہی
گیا۔ میں نے ایک نوجوان عطار کو تاڑ لیا ہے۔ وہ کوئلہ تو لے خان ہی میں رہتا ہے۔“

”اس مسئلے پر کل بات کریں گے، فی الحال دیر ہو رہی ہے۔ اتنے میں تُو اس نوجوان کے بارے میں
حطوات حاصل کر لے۔ تیرے کہنے سے میرے ذہن میں ایک بات اور آئی ہے۔ مریضوں کی تعداد
کیونکہ پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ عبدالکلام کو جواب دے دوں اس لئے دو
فردا نسخے باندھیں تو بہتر ہے۔ تیرے اوپر سے کام کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے تیرا؟ تُو عبدالکلام
کے جسم کو چھوڑ کر اس نوجوان کے جسم کو اپنا لیجیو۔“ میں نے تجویز رکھی۔

”سوچ کر بتاؤں گا۔ ویسے بھی اس وقت تجھے جلدی ہے میں ابھی نسخہ باندھ کر لایا۔“ یوسف اٹھ
فرا ہوا۔

یوسف نسخہ باندھ لایا تو میں نے اسے رخصت کر کے مطب کا دروازہ اندر سے بند کیا اور گھر میں
لیا۔ رابعہ اور کلثوم تیار تھیں۔ میں تانگہ لے آیا اور تانگے پر چادر باندھ دی۔ شریف اور معزز گھرانوں
ناخاتین برقع یا چادر اوڑھنے کے باوجود مزید پردہ داری کی خاطر سواری کے گرد بھی چادر بندھوا کر گھر
سے نکلتی تھیں۔

☆=====☆

ہم بوہڑ دروازے پہنچے تو گھر میں جیسے عید کا سماں تھا۔ حکیم کی ماں بتول نے رابعہ اور کلثوم کو باری

باری گلے سے لگا کر اولاد کی دعائیں دیں۔ دونوں نے لمبے لمبے گھونگٹ نکال کے الیاس کو سلام کیا اور پھر راشدہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے الیاس کو دوائیں دیں اور ایک خوراک اپنے سامنے ہی کھلائی، پھر بوتل کو سمجھایا کہ پابندی سے تین وقت کیا کیا دوائیں دیتا ہیں! بوتل نے دوائیں سارے کر طاق میں رکھ دیں، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”تیرے ابا جی نے ایک مشورہ دیا ہے کہ تُو جو ذمہ سارے روپے آج دے گیا تھا، ان میں سے بس ضرورت کے مطابق کچھ روپے لے کر بقیہ رقم اٹھا کے رکھ دی جائے۔“

”لیکن کس لئے اماں؟“ میں نے پوچھا۔

”راشدہ کے لئے!“ بوتل نے جواب دیا۔ ”آج نہیں تو کل اس کی شادی کرنا ہے۔ پیسے پاؤ ہوئے تو وقت پر کام آئیں گے۔“

”ابا جی بھی بس حد کرتے ہیں!“ میں بولا۔ ”ارے میں جو ہوں، اس کی شادی کرنے کے لئے آپ کوئی اچھا سارشتہ تلاش کر لیں، باقی ساری ذمہ داری میری!“

”اکیلے تجھ پر کیسے سارا بوجھ ڈال دیں بیٹا!“ الیاس کہنے لگا۔ ”راشدہ کی ذمہ داری تیرے بقیہ بھائیوں پر بھی تو ہے۔“

”کیا ان کا حال مجھ سے چھپا ہے! ان کی گزر بسر تو ویسے ہی مشکل سے ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

بات ختم تھی اس لئے الیاس پھر کچھ نہیں بولا۔

”ایک لڑکا نظر میں تو ہے۔“ بوتل نے بتایا۔ ”ایک مرتبہ اس کی ماں نے بات بھی چھیڑی تھی مگر میں طرح دی گئی۔ پاس لپے کچھ ہوتا تو بات بھی آگے بڑھاتی۔ تُو کتا ہے تو کسی کے ذریعے پھر بات چلاؤ ہوں۔ سوچ لے بیٹا اب بھی یہ بڑا بھاری بوجھ ہے، تُو اکیلا اٹھا بھی سکے گا!“

”آپ بات تو چلائیں، اللہ مالک ہے۔“

”اچھا چل اٹھ، کھانا کھالے۔ یہ تو پرہیزی کھانا کھاتے ہیں، کھا چکے ہیں۔“ بوتل نے اپنے شوہر طرف اشارہ کیا اور انھیں لگی۔

بوتل کے ساتھ میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ رابعہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”راشدہ کو تو ساتھ ہی چلتے ہیں۔“

”اے ہو، اس بڑھاپے میں مجھ سے چولہا چکی کراؤ گی؟“ بوتل بول اٹھی۔ ”یہی تو گھر کا سارا کاج کرتی ہے۔“

”لیکن اماں، اسے تو پرانے گھر جانا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ رابعہ کی بات سے میری ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔

میری بات سن کر بوتل فکر مند سی ہو گئی، پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”پھر جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔“

کھانا کھانے کے دوران جو کچھ میں نے سوچا تھا، کہہ ہی دیا۔ براہ راست بوتل سے یہ بات نہیں بلکہ رابعہ کو مخاطب کیا۔ ”اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں اور رابعہ! اب ان کی عمر کام کرنے کی نہیں رہی۔“

ہوؤں کے ہوتے انہیں کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے! تمہیں اور کلثوم کو تو ان کی خدمت کرنا چاہئے۔“

”کیوں نہیں!“ رابعہ نے فوراً میری بات سے اتفاق کیا۔ ”میں نے تو کئی بار پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ.....“

”پہلے کی باتیں چھوڑو!“ میں نے رابعہ کی بات کاٹ دی۔ ”اللہ کا احسان ہے۔ ہمارا گھر خاصا بڑا ہے۔ اگر تم اور کلثوم اماں اور ابا جی کی خدمت کرنے پر تیار ہو تو راشدہ کے ساتھ انہیں بھی اپنے گھر لئے چلے ہیں۔ بولو کیا کہتی ہو؟“

رابعہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بوتل بول اٹھی۔ ”ارے تُو کیوں دہنوں کو امتحان میں ڈال رہا ہے! فضول باتیں نہ کر، ہم یہیں ٹھیک ہیں۔“

”نہیں اماں، اب تو آپ کو چلنا ہی پڑے گا!“ رابعہ ضد کرنے لگی اور کلثوم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

بوتل نیم راضی سی ہو کر بولی۔ ”میں تو خیر ہاں کر دوں مگر وہ..... راشدہ کے ابا آمادہ نہیں ہوں گے۔“

”ابا جی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے تو ان کے علاج میں بھی آسانی رہے گی۔“ میں نے ایک اور دلیل دی۔

”تُو پھر تُو ہی ان سے بات کر لے۔ میں نے کچھ کہا تو بگڑ جائیں گے۔ جب سے بیمار پڑے ہیں، بت چڑھے ہو گئے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر غصہ کرنے لگتے ہیں۔“

”تم دونوں بھی ساتھ چلو!“ میں نے کھانا کھالیا تو رابعہ اور کلثوم کو مخاطب کیا۔ ”میرا نہیں تو ابا جی تم دونوں کا تو کچھ خیال کریں گے ہی!“

ذرا ہی دیر کے بعد ایک بار پھر بھی الیاس کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ بوتل ہی نے بات چھیڑی۔ ”سنئے ہو، یہ تمہارا بیٹا کیا کہہ رہا ہے! کتا ہے، ہم سب کو اپنے ساتھ رکھے گا۔“

”تیرا تو دماغ حل گیا ہے شاید!“ الیاس نے سخت آواز میں کہا۔ ”یہ تو خود اپنی سرسراں میں رہتا ہے۔ اس پر ہم بھی دباؤ پہنچ جائیں! میری غیرت تو ہرگز یہ گوارہ نہیں کرے گی۔“

”ابا جی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!“ میں بولا۔ ”کیسی سرسراں، کس کی سرسراں! وہ گھر اب میرا ہے۔ میرے ساس سر کے انتقال کو بھی برسوں گزر گئے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ گھر تو انہوں نے مجھے جینزی میں دے دیا تھا! پھر وہ تو میری ملکیت ہوئی!“

”معلوم ہے مجھے! مگر دنیا والوں کی زبان کون پڑے گا! پھر اس پر تیرے دونوں بھائیوں کو بھی اعتراض ہو گا۔“

”وہ کیوں اعتراض کریں گے! میں ان سے بات کر لوں گا۔ رہے دنیا والے تو کچھ بھی کہتے رہیں۔“

پھر بمشکل بوڑھے الیاس نے خاصے بحث و مباحثے کے بعد اس شرط پر میری بات مانی کہ میں اس

کے دونوں بیٹوں کو پہلے راضی کر لوں۔

”ٹھیک ہے، میں جلد ہی ان سے مل لیتا ہوں۔“ میں نے کہہ دیا۔

”اور بیٹا، ہم سب اگر تیرے ساتھ چلے گئے تو یہ گھر کیا خالی پڑا رہے گا؟“ بتول نے مجھ سے سوال کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ حکیم کے دونوں بھائی لطیف اور حنیف کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے۔ میں نے اسی لئے جواب دیا۔ ”مگر خالی چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے! ابابی اگر اجازت دے دیں تو میری ایک تجویز ہے۔ اس طرح لطیف بھائی جان اور حنیف دونوں میں کرائے سے بچ جائیں گے۔ اس گھر میں بہر حال اتنی گنجائش ہے کہ وہ دونوں یہاں رہ سکیں۔“

”بیٹا! گنجائش تو دلوں میں ہونا چاہئے۔ دونوں بھائیوں میں تو بن جائے گی مگر شاید ان کی بیویاں ساتھ رہنے پر راضی نہ ہوں۔ تم بات کر کے دیکھ لو، میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔ میں نے تو ان دونوں میں سے کسی کو گھر سے نہیں نکالا، خود ہی الگ ہو گئے۔ تم بھی میرے منع کرنے کے باوجود سرالٰی..... خیر اب اس ذکر کو چھوڑو!“ الیاس کہتے کہتے رک گیا۔

”ہاں گڑے مردے نہ ہی اکھیر تو اچھا ہے۔“ بتول بول اٹھی۔ ”تنے دن بعد تو اللہ نے ہمیں ملایا ہے۔“

”بات سے بات نکل آئی ورنہ میں تو خود اس موقع پر یہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دلہن بے چاری نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی!“ الیاس کا اشارہ رابعہ کی طرف تھا۔

”نہیں ابابی، میں کیوں کچھ سوچنے لگی!“ رابعہ دھیمی آواز میں بول اٹھی۔ ”مجھے تو خود یہ افسوس ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع نہیں مل سکا۔ حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے۔ آپ نے کوئی بات خلاف واقعہ نہیں کی۔ پھر آپ کو تو میں اپنے مرحوم والد کی طرح سمجھتی ہوں، بے خطا بھی کچھ کہہ دیں گے تو میرا سر جھکا ہی رہے گا۔“

”یہ تمہاری سعادت مندی ہے بیٹی، اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ الیاس جواب میں بولا۔
واپسی میں دیر ہو گئی تھی اس لئے مکھے ہی کے ایک تانگے والے کو بلوانا پڑا اور میں، حکیم کی دونوں بیویوں کو ساتھ لے کر بازار کلاں آ گیا۔

اس رات کو میں نے حکیم کی بیویوں سے طبیعت کی تاسازی کا بہانہ کر دیا۔ ان پر میرا نہیں حکیم نہ اس الدین کا حق تھا میری طبیعت انہیں خراب کرنے پر مائل نہ ہو سکی۔ میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے لیٹ تو گیا، لیکن ذہن اسی مسئلے میں الجھا رہا۔ میں آخر کب تک ان سے بچا رہتا۔ یہی خیال مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ وہ بہر حال حکیم کی بیویاں تھیں اور حکیم کہ جس پر میرا قبضہ تھا۔ مجھے تو حقیقت حال کی خبر تھی لیکن وہ بے خبر تھیں۔ رابعہ کی طرف سے تو میں بڑی حد تک مطمئن تھا کہ وہ عمر کی اس منزل میں پہنچ چکی تھی جہاں جذبات کے دریا میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ مگر کلثوم کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ جوان تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد مجھے ایک ہی صورت نظر آئی کہ اس کے فطری تقاضوں پر بند باندھ دیا

جائے۔ ایسی دوائیں بہر حال تھیں کہ جو ان تقاضوں کو وقتی طور پر ہی سہی میٹھی نیند سلا دیتیں۔ معلوم نہیں کیوں کلثوم یا رابعہ سے ازدواجی تعلق مجھے امانت میں خیانت محسوس ہوا۔ یہ تو سرا سر فریب تھا۔ اب سوال صرف یہ تھا کلثوم کو ان دواؤں کے استعمال پر کیسے راضی کیا جائے۔ سو اس کی ایک راہ بھی نکل آئی اور پھر میں اطمینان کے ساتھ سو گیا۔

ہر عورت کو ماں بننے کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ کلثوم کے دل میں بھی یہ تمنا ہو گی اور جب دوسرے دن صبح میں نے کلثوم سے اس موضوع پر بات کی تو میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ میں اسی کے کمرے میں تھا۔ میری بات سن کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولی۔ ”کاش ایسا ہو جائے۔ عرصہ دراز سے میری یہی آرزو ہے۔ تم نے مجھے دوائیں دی تھیں، میں پابندی سے کھا رہی ہوں۔“
مجھے معلوم تھا کہ اسے جو دوائیں حکیم کھلا رہا تھا، وہ ماں بننے سے روکنے کے لئے تھیں۔ میں نے اسے کہا۔ ”وہ دوائیں کھانا بند کر دو۔ میں تمہیں دوسری دوائیں دوں گا۔ ان دواؤں کو تین مہینے تک استعمال کرنا ہے۔ اس عرصے میں تمہیں ذرا صبر اور حوصلے سے کام لینا ہو گا۔“ مجھے ایک اور تدبیر سوجھ گئی۔

”میں سمجھی نہیں، صبر اور حوصلے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اس نے پوچھا۔ حکیم سے وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھی۔

”تمہیں تین مہینے تک مجھ سے دور رہنا ہو گا۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ یہی نئی تدبیر میرے ذہن میں آئی تھی۔ پھر میں نے اپنی بات کو مزید وضاحت سے بیان کیا۔ ”اس عرصے میں کہ جب تک تم یہ دوائیں کھاؤ گی ہمارے درمیان ازدواجی تعلق نہیں رہے گا۔ اس کے بعد جس دن یہ تعلق قائم ہو گا تو پھر باپوسی کے بدل چھٹ جائیں گے۔ اسے تم ایک طرح کی قربانی بھی سمجھ سکتی ہو۔“
”اولاد کی خاطر مجھے سب کچھ گوارہ ہے۔“ کلثوم پرجوش نظر آنے لگی۔

ابھی صبح کے سات ہی بجے تھے۔ میں مطب میں گیا اور مطلوبہ دوائیں لے آیا۔ حکیم نے کلثوم کو جو دوائیں دی تھیں، وہ کسی عورت کو بانٹھ بنانے کے ساتھ ساتھ جذبات کو مشتعل رکھنے کے لئے بھی تھیں۔ وہ دوائیں اس سے میں نے واپس لے لیں۔ اسی روز رابعہ سے بھی میں نے اسی طرح کی گفتگو کی تو وہ کہنے لگی۔ ”میں نے تو اب صبر کر لیا ہے۔ اب تو میری ایک ہی دعا ہے کہ کلثوم سے آپ کے یہاں اولاد ہو جائے۔ انشاء اللہ اسے بھی میں اپنی ہی اولاد کی طرح سمجھوں گی۔“

مصلحت کے پیش نظر اسے بھی میں نے دوا کھانے پر راضی کر لیا۔ رابعہ کو بھی میں نے کلثوم کی طرح تین مہینے ”احتیاط“ والی کمائی سنا دی تھی۔ اس باجیا عورت نے سر جھکا لیا۔
یوں میں نے تین ماہ کے لئے اپنے دامن کو آلودہ گناہ ہونے سے بچا لیا اور میرے ضمیر پر جو بوجھ تھا ہٹ گیا۔ اس سے مجھے ایک روحانی مسرت کا احساس ہوا۔

☆=====☆=====☆

اس دن بھی توقع کے مطابق مطب میں خاصا جھوم رہا۔ مطب کا وقت ختم ہوا تو حسب معمول

یوسف میری جان کو آگیا۔ گزشتہ روز اس نے مجھ سے جس نوجوان عطار مشتاق کا ذکر کیا تھا، اس کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

”اگلے ہی مہینے اس کی شادی ہونے والی ہے اور میں ہاجرہ کو بھی دیکھ آیا ہوں۔“ یوسف نے پُر جوش لہجے میں بتایا۔

”یہ ہاجرہ کون ہے اور اس معاملے میں کہاں سے ٹپک پڑی؟“ میں نے پوچھا۔

”مشتاق کی ہونے والے بیوی کا نام ہاجرہ ہے، مگر میں تجھے اس کا پتا نہیں بتاؤں گا۔“

”میں تجھ سے پوچھ بھی نہیں رہا۔ اپنی طرح سب کو نہ سمجھا کر!“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”بس رہنے دے! تو کتنا بڑا پارسا ہے، معلوم ہے مجھے!“

”تو نے یہ تو بتا دیا کہ وہ تیرے ہی محلے میں رہتا ہے، مگر کس حکیم کے پاس ملازم ہے؟ یہ بھی پتا ہے، یہ بھی پتا چلایا؟“

”ایک دوا خانے میں ملازم ہے، تنخواہ کم ہے اس لئے شلام کو محلے ہی کے ایک حکیم کے یہاں لئے بھی باندھتا ہے۔ آٹھ بھائی بنوں میں وہ ایک ہی بھائی ہے اور سب سے بڑا ہے۔ باپ مرچکا ہے اس لئے اپنے گھر کا واحد کفیل ہے، سات بنوں اور ماں کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ اگر اسے زیادہ تنخواہ دی جائے تو وہ دونوں جگہ کا کام چھوڑ کر یہاں.....“ یوسف کچھ کتے کتے رک گیا، پھر بولا۔ ”لیکن اسے آمادہ کرنے کی کیا ضرورت ہے! میں جب اس کے جسم پر قبضہ کر لوں گا تو پھر کیسی آمادگی اور اس کی رضامندی۔ بس تو ہابی بھر لے اے علیا لیش!“

یوسف کی پوری بات سن کر میرے ذہن میں ایک اور خطرہ پیدا ہوا۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”مشتاق کی سات بنوں میں سے کتنی جوان ہیں؟“

”میں سمجھ گیا کہ تو کیا سوچ رہا ہو گا۔ مجھے ان دونوں مرگھلی لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک تو ان میں سے نکلنا کر چلتی ہے، بچپن میں گر گئی تھی، دوسری کے ناک پر پیسہ پھرا ہوا ہے، اس پر جسم اتنا بھاری ہے کہ دیکھ کر خوف آئے۔ بقیہ پانچ بچیاں ہیں اور ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچیں۔“ یوسف نے بتایا۔

میرے دل کو اطمینان ہو گیا کہ وہ یوسف جیسے عیاش جن زاد کے دست ہوس سے بچی رہیں گی۔ پھر بھی بطور احتیاط یوسف سے میں نے مشتاق کے گھر کا پتا معلوم کر لیا۔ اس امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا کہ وہ مجھے مطمئن کرنے کے لئے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ آئندہ روز مطب کی چھٹی تھی، سو میں نے اگلے روز تک کے لئے یوسف کو ٹال دیا۔

”دیکھ اے علیا لیش، میں تجھے بس کل کی مہلت دے رہا ہوں۔ مجھ سے اب عبدالکلام کی بیوی کے ستم نہیں سے جاتے۔ کبخت مارتی بھی ہے اور رونے بھی نہیں دیتی۔“ یوسف مظلوم بن کر بولا۔

”تو نے پہلے تو یہ نہیں بتایا کہ وہ تجھے مارتی بھی ہے!“ میں نے ہمدردی جنائی۔

”اس سے مطلب کچھ اور ہے۔ بد ذات ایک تو اتنی گندی رہتی ہے کہ قریب آنے سے ابکائی

آجائے۔ اس پر یہ زبردستی الگ کرے ہی کرے میں سوئے گی۔ رات بھر اسٹیم کے ریلوے انجن کی طرح اتنی زور زور سے خزانے لیتی ہے کہ سونا دو بھر ہو جاتا ہے۔ منہ سے بدبو کے ہیکے چھوٹتے ہیں، کھو کہ بی بی، سال دو سال میں ایک آدھ بار دانت بھی مائج لیا کرو تو اللہ دے اور بندہ لے! سات پشتوں کو بکھان کے رکھ دیتی ہے۔ پھر شوربا ہے تو اس میں سے بولی غائب اور دال ہے پانی اتنا کہ ناک پکڑو اور غوطہ لگا جاؤ۔“ یوسف نے ظلم کی تفصیل بیان کی۔

”اے دوست، غم نہ کر، اللہ تیرے دن ضرور پھیرے گا۔“ میں اپنی ہنسی ضبط کر گیا۔

”نہ پھرے تو خود پھیر لوں گا، تو مجھے زیادہ قابل رحم نہ بنا!“ وہ چڑ کر بولا۔ ”اس نے زیادہ چلتر دکھائے تو سوتے میں گردن دبا دوں گا۔ اسے ابھی اندازہ نہیں کہ کس سے سابقہ.....“

”دو ایک دن کی تو بات ہے، اسے مار کے کیوں گناہ مول لیتا ہے!“ میں بول اٹھا۔

”اسی وجہ سے تو اب تک اسے معاف کر رکھا ہے۔“

”تو بہت ہی نیک جن زاد ہے اے یوسف!“

”اب اتنا نیک بھی نہیں ہوں کہ ہر ستم خاموشی سے سہہ جاؤں۔“ پھر یوسف جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

رات کو بھی مطب کے بعد یوسف نے ایک بار یاد دہانی کرائی کہ آئندہ روز فیصلہ کن ہے۔ وہ اب کسی صورت عبدالکلام کے جسم میں رہنے پر راضی نہیں تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ کل تم سے خود آکر ملوں گا، پھر جیسا مناسب ہو کر لیں گے۔ زیادہ تنگ وہ عبدالکلام کی بیوی سے تھا۔ یوسف کی گفتگو کی روشنی میں وہ مجھے کوئی مرد مار قسم کی عورت لگتی تھی۔ عموماً جن زادیاں اس مزاج کی ہوتی ہیں۔ میں اسی لئے تو جن زادیوں سے بھاگتا تھا۔

سونے سے پہلے میں نے یوسف کے اس بیان کی تصدیق کر لی کہ مشتاق کی بہنیں واقعی اس قابل نہیں جو یوسف ان کے لئے خطرہ بن سکے۔ مجھے اس کے لئے حکیم کے جسم کو چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ اس کے سوا مشتاق کے گھر میں گھسنے کی کوئی اور تدبیر نہیں تھی۔ مشتاق کو بھی میں نے دیکھا، اس کی عمر انیس برس سے زیادہ نہیں لگی۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کر کے میں، کڑی افغانان روانہ ہو گیا۔ باغ لانگے خان شہر کی مشہور و مقبول تفریح گاہ تھی، اس سے متصل کڑی افغانان میں حکیم نیراس الدین کے دونوں بھائی رہتے تھے۔ بوہڑ دروازے سے کڑی افغانان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ باغ لانگے خان، بوہڑ دروازے کے باہر واقع تھا۔ پہلے میں نے حکیم کے بڑے بھائی لطیف کے گھر کا رخ کیا۔ وہ خلاف توقع صبح مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”آج برسوں بعد اپنے بھائی جان کی یاد کیسے آگئی؟“ لطیف نے جھپٹی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ”تم تو اس وقت بھی نہیں آئے کہ جب میں نے ہاجرہ کی منگنی کی تھی، اب تو.....“

”ہاجرہ؟“ میں چونک کر بول اٹھا۔ میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ یوسف نے مشتاق کی منگیت کا یہی

نام بتایا تھا۔

”کیا اپنی بیٹی کا نام بھی بھول گئے.....! ہاں بھی تم ٹھہرے بڑے آدمی، تمہیں کیوں یاد رہنے لگے ہم غریبوں کے نام.....!“ لطیف نے ٹھوکیا۔

”یہ بات نہیں ہے بھائی جان!“ میں سنبھل کر بولا، پھر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے جہاں تک علم ہے، آپ نے جس لڑکے سے ہاجرہ کا رشتہ کیا ہے، اس کا نام مشتاق ہے اور وہ عطار ہے..... کوئلہ تو لے خان میں غالباً وہ رہتا ہے!“

لطیف نے میرے خیال کی تصدیق کر دی تو میں نے ہاجرہ کو کمرے میں بلانے کے لئے کہا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یاسف جیسا جن زاد اس پر کیوں مر مٹا ہے! کیا وہ اتنی غی حسین ہے! اسی کے ساتھ میں اب یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یاسف نے ہاجرہ کے گھر کا پتا کیوں نہیں بتایا۔ اسے خدشہ ہو گا کہ حکیم کی بیٹی ہونے کے سبب کہیں میں اس معاملے میں روڑے نہ اٹکا دوں!

میرے کہنے پر لطیف نے اپنی بڑی بیٹی ہاجرہ کو آواز دی۔ کہتے ہیں لعل تو گدڑیوں میں بھی نہیں چھپتے۔ یہی حال ہاجرہ کا تھا۔ اس کی عمر کا چاند سولہویں برس میں ہو گا۔ میں نے بڑی بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔ جانے کیوں مجھے اس پر طال سا ہوا کہ ایک جن زاد، یعنی یاسف اس بھولی بھالی معصوم لڑکی کو خراب کر دے گا۔ مشتاق سے اس کی شادی کا مطلب یہی ہوتا۔ اس خیال کی وجہ شاید وہ رشتہ یا تعلق تھا کہ حکیم نبراس الدین اس نوجوان و حسین دوشیزہ کا چچا تھا۔ ہاجرہ نے سلام کرتے ہوئے مجھے چچا ہی کہا تھا۔

”جی رہو!“ میں نے اس کے سر پر کسی بزرگ ہی کی طرح شفقت سے ہاتھ پھیرا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور اسے دے دیا۔

وہ ایک بار پھر مجھے سلام کر کے چلی گئی۔ لطیف نے چہرے سے شاید میرے دلی جذبات کا اندازہ کر لیا اور بولا۔ ”تم کچھ فکر مند سے لگتے ہو، کیا بات ہے؟“

”میں دراصل اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا تھا بھائی جان کہ..... کہ اپنی ہاجرہ بیٹی اس گھر میں خوش نہیں رہے گی۔“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”بڑی جلدی خیال آگیا تمہیں!“ لطیف نے مجھے ترہیمی نظروں سے دیکھا۔ ”میاں، تم سے اور تو کچھ امید تھی نہیں، اب جیسے تیسے بچی کا رشتہ کیا ہے، اس میں بھی ٹانگ مارنے آگے!“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی جان! میں نے ذاتی طور پر مشتاق کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں انہی کے سبب یہ بات کہی تھی۔“

”کیا معلومات حاصل کیں تم نے، کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے!“ لطیف کے لہجے میں اب بھی چین تھی جیسے وہ لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہو۔

”میری معلومات کے مطابق مشتاق اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ وہ اندرون حرم بھی آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔“

اندرون حرم سے میری مراد ملتان کا بازار حسن تھا۔

”تم میرے ہونے والے داماد پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو!“ لطیف کی قوت برداشت جیسے جواب دے گئی۔ اس کی آواز اسی لئے تیز اور بلند ہو گئی۔

”یہ الزام نہیں، حقیقت ہے اور اس کا اندازہ جلد ہی آپ کو ہو جائے گا۔ مشتاق تو ان دنوں خود میرے مطب کے چکر لگا رہا ہے۔“

”وہ کس خوش میں؟“

”یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل ہے اسی لئے دو دو جگہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس پر تماش بینی کا شوق! ظاہر ہے، گھر کا خرچہ بھی چلانا ہو اور شوق کی تکمیل بھی کرنا ہو تو پیسے زیادہ چاہئیں۔ وہ یہ چاہتا ہے میں اسے اپنے مطب میں ملازم رکھ لوں۔ کسی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ میں اکیلا اسے اتنے پیسے دے سکتا ہوں جو دونوں جگہ کام کر کے نہیں ملتے۔ آج کل یوں بھی مریضوں کا بہت ہجوم رہتا ہے۔ مجھے ایک کے بجائے دو عطاروں کی ضرورت ہے۔ مشتاق کو میں زیادہ پیسے بھی دے سکتا ہوں۔

خیر یہ تو ایک الگ مسئلہ رہا کہ اسے میں ضرورتاً اپنے مطب میں رکھتا ہوں یا نہیں، اصل بات اس کے کردار کی ہے۔“ میں نے جو کچھ بھی کہا، اس کا مقصد ہاجرہ کو ایک جن زاد کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچانا تھا۔ شاید اسی کو دروغ مصلحت آمیز کہا جاتا ہے۔ یاسف سے اگر میں یہ کہتا کہ مشتاق کی جگہ کسی اور عطار کو تلاش کر لے تو وہ ہرگز نہ مانتا۔ وہ بھلا ہاجرہ جیسی نوجوان دوشیزہ سے کس طرح دست بردار ہونا قبول کر لیتا! میرے نزدیک اب اس کی یہی صورت تھی کہ مشتاق سے ہاجرہ کی شادی نہ ہونے دی جاتی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”بھائی جان! میں نے مشتاق کے متعلق جو بتایا ہے، اس میں میری نیک نیتی کو دخل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں آپ بھی پچھتائیں اور مجھے بھی دکھ ہو۔“

”ایک بات بتاؤ میاں نبراس! تم نے جو کچھ کہا ہے، اسے ثابت بھی کر سکتے ہو؟“ لطیف نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں!“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر تم نے یہ ثابت کر دیا کہ مشتاق صاحب کردار نہیں تو میں رشتہ چھوڑ دوں گا، لیکن یہ خیال رکھنا، اگر الزام ثابت نہ ہو سکا تو پھر زندگی بھر میری دہلیز پر قدم نہ رکھنا۔ میں تمہاری صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوں گا۔“ لطیف کی آواز میں جوش کے ساتھ غصہ بھی تھا۔

میں نے ثبوت فراہم کرنے کی ہاں بھری اور بولا۔ ”جس روز بھی مشتاق کے بارے میں مجھے یہ خبر ملی کہ وہ اندرون حرم ہے، آپ کو خبر کرا دوں گا۔ آپ خود اسے وہاں دیکھ لیجئے گا۔“

زرا توقف کے بعد میں نے وہ بات بھی چھیڑ دی کہ جس کے لئے آیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، تم اماں، راشدہ اور ابائی کو کس لئے بوہڑ دروازے سے لے جا رہے ہو؟“

لطیف میری بات سن کر پوچھنے لگا، انداز جواب طلبی کا تھا۔

”ایک تو اس سے والدین کی خدمت مقصود ہے کہ بد قسمتی سے مجھے یہ موقع نہیں مل سکا“

دوسرے مجھے راشدہ کا بھی خیال ہے۔ بھائی ہونے کے ناتے ہم پر یہ فرض ہے کہ.....

”بس بس رہنے دو!“ لطیف نے ہاتھ اٹھ کر میری بات کاٹ دی۔ ”آج تمہیں اپنے سارے فرائض یاد آنے لگے! بن کو تو چھوڑو، کبھی ماں باپ کو بھی جا کر دیکھا کہ کس حال میں ہیں؟ صاحب حیثیت ہونے کے باوجود کبھی تم نے ان کے ہاتھ پر پھوٹی کوڑی نہیں رکھی، کبھی انہیں پلٹ کر نہیں دیکھا.....! چلے ہو مجھے فرض بتانے! میاں، مجھ سے پوچھو، اگر میرا اور حنیف کا خون بھی تمہاری طرح سفید ہو جاتا تو قاتلوں پر نوبت آگئی ہوتی!“

”آپ غلط نہیں کہہ رہے بھائی جان! واقعی آپ نے اولاد ہونے کا حق ادا کر دیا، لیکن اب اگر میں یہ حق ادا کرنا چاہتا ہوں تو.....“

”تو میاں، کس نے روکا ہے تمہیں!“ لطیف میری بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ابا جی ہرگز تمہارے گھر رہنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔“

”انہیں میں نے منالیا ہے بھائی جان!“ میں نے بتایا۔

”کیا تم گئے تھے ان سے ملنے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”میں نے تو انہیں اس پر بھی راضی کر لیا ہے کہ آبائی گھر میں اب آپ اور حنیف رہیں۔ اس طرح آپ دونوں کرائے کے گھنٹے سے بھی چھوٹ جائیں گے۔“ میری یہ بات کیونکہ لطیف کے مفاد میں تھی، سو اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا، کہنے لگا۔ ”اگر یہ بات ہے چلو ابھی چل کر حنیف سے مل لیتے ہیں۔“

دو گلی چھوڑ کر ہی حنیف کا گھر تھا۔ میری توقع کے مطابق وہ بھی آمادہ ہو گیا۔ پھر میں ان دونوں کو ساتھ لئے بوہڑ دروازے پہنچا کہ آئے سامنے بات ہو جائے۔

”آج تم تینوں بھائیوں کو ساتھ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، مت پوچھو!“ بوڑھے الیاس کے چہرے پر رونق آگئی۔

پھر بقیہ معاملات طے ہونے میں دیر نہیں لگی۔ اس گھر میں کوئی ایسا سامان نہیں تھا کہ جسے ساتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی۔ چار چھ بکس تھے کہ جن میں کپڑے وغیرہ تھے، ان کے لئے میں نے کہہ دیا، لے چلیں۔ ان کے علاوہ نوے پچھوٹے برتن بھاڑے اور پھنے پرانے بستر وہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ ہوا۔ حنیف کیونکہ حکیم کا چھوٹا بھائی تھا، میں نے اسی لئے کئی کام اس کے سپرد کر دیئے۔ گھر میں پوری تیاری کے ساتھ چلا تھا۔ میرے پاس خاصی رقم تھی۔ اسے میں نے رقم دے دی کہ بتول، الیاس اور راشدہ کے لئے نئے بستر نیز دیگر ضروری سامان خرید کر میرے گھر پہنچا دے۔ اسی دوران بتول نے یہ خوش خبری سنائی کہ راشدہ کے رشتے کی بات چھیڑ دی ہے۔

”لیکن اماں، آپ کو تو معلوم ہے اگلے مہینے مجھے ہاجرہ کو رخصت کرنا ہے۔“ لطیف کہنے لگا۔ ”میرے پاس تو.....“

”آپ فکر مند نہ ہوں بھائی جان!“ میں بول اٹھا۔ ”راشدہ کی شادی کے تمام اخراجات اکیلا میں

اٹھاؤں گا۔ اس کے علاوہ ہاجرہ بیٹی کا بھی تو مجھ پر کچھ حق ہے۔ ہاجرہ کے لئے زیور میں بناؤں گا۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ کتنے تولے کا زیور ہونا چاہئے؟“

لطیف کا چہرہ کھل اٹھا، بولا۔ ”کم سے کم بھی گیارہ تولے کا زیور تو ہو! کیوں اماں؟“

”دیکھ لو تم لوگ! جتنی چادر ہوا اتنے پاؤں پھیلاؤ۔“ بتول نے جواب دیا۔

”اب یہ تو میاں نبیرا ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔“ لطیف نے مجھے متوقع نظروں سے دیکھا۔ ”میں تو زیور کی طرف سے بہت فکر مند تھا کہ برے وقتوں میں ہاجرہ کی ماں کا زیور بھی بیچنا پڑا۔ ورنہ اس موقع پر ہم آجاکہ بہر حال اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔“

”زیور کے علاوہ اور جو ہو سکا وہ بھی میں ہاجرہ بیٹی کے لئے کروں گا، بھائی جان! آپ کو پریشان ہوئے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے لطیف کی متوقع نظروں کے جواب میں اسے مایوس نہیں کیا۔

اس کے بعد میرے اہم پر حنیف دو تانگے لے آیا۔ پھر پورا قافلہ بوہڑ دروازے سے بازار کلاں روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر حنیف تو بازار چلا گیا، بتول، راشدہ اور الیاس کو میں نے رابعہ کے سپرد کر دیا۔ کلثوم بھی رابعہ کے ساتھ کام میں لگ گئی۔ گھر کا جو سب سے بڑا کمرہ حکیم کے مہمانوں کے لئے مخصوص تھا، میں نے اس کی مزید صفائی کے لئے کہہ دیا۔ اس کمرے میں باآسانی چار پانچ چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ وہاں حکیم کے والدین اور بہن کے رہنے کا بندوبست ممکن تھا، سو یہ تیاری کی جانے لگی عارضی طور پر بیمار الیاس کو رابعہ نے اپنے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ لطیف کو ساتھ لئے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت لطیف کی حالت قابل دید تھی کہ جب میں نے تجوری سے سونے کے توڑے نکال کر اسے دیئے۔

”نی اٹھا! یہ میری طرف سے ہاجرہ بیٹی کے لئے رکھ لیں بھائی جان!“

”مم..... مگر یہ..... یہ تو میں تولے لگتے ہیں!“

”تو کیا ہوا؟ کچھ زیادہ سہی!“

”میں..... میرے تو وہم و گمان میں نہیں تھا نبیرا، کہ تم..... تم اندر سے ہیرا نکلو گے!“

لطیف کی آواز شدت جذبات سے بھرا لے گئی۔ ”تمہیں تو میں..... میں فرعون کہتا تھا، میرے بھائی!“

”بھول جائیں بھائی جان، اب ان باتوں کو۔“ غلطی میری ہی تھی اور..... اور اب میری آنکھوں

کے آگے پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے تجوری سے کچھ روپے بھی نکالے اور پھر

تجوری بند کر دی۔ وہ روپے بھی میں نے لطیف کو دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آج کل آپ کا

ہاتھ تنگ ہے۔ چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے بڑوں کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ اللہ نے مجھے اگر نوازا ہے

تو اس میں آپ کا حصہ بھی ہے۔ میں جو کچھ ہوں، آپ ہی سب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

جب حنیف ضروری سامان لے کر بازار سے لوٹ آیا تو اسے بھی میں نے ایک بڑی رقم تھادی۔

لطیف بھی اب تک میرے ہی کمرے میں موجود تھا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں بھائی صاحب‘ رہنے دیں!“ وہ منع کرنے لگا۔
”تمہارا حق ہے مجھ پر‘ چھوٹے ہو مجھ سے۔ رکھ لو۔ میں تمہارے حالات سے غافل نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ارے ادھر تو دیکھ حنیف!“ لطیف کہنے لگا۔ ”اس نے اپنی ہاجرہ کے لئے کیا کیا ہے!“ لطیف نے سونے کے توڑے نکال کر دکھائے۔

”میں نے کچھ نہیں کیا“ نہ یہ سب کچھ میرا ہے۔ مجھے تو اللہ نے حق داروں تک ان کا حق پہنچانے کے لئے ذریعہ بنایا ہے۔“ میری زبان پر سچ بات آگئی جسے میری اکساری سمجھا گیا۔

اب دوسرے ہونے والی تھی اس لئے رابعہ نے حکیم کے دونوں بھائیوں کو روک لیا کہ کھانا کھا کر جائیں۔ مجھے کوئلہ تولے خان جانے کی جلدی تھی‘ مجبوراً رکنا پڑا۔ رابعہ نے باہر برآمدے میں دری بچھادی اور پھر کھانا لگا دیا۔ اس سے پہلے وہ بوڑھے الیاس کو گرم گرم بخنی دے کر آئی تھی۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بٹول کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ لطیف نے اسے بھی سونے کے توڑے دکھا دیئے تھے۔ ان آدم زادوں کی خوشی میں ایک جن زاد‘ یعنی میں بھی شامل تھا۔

کھانا کھا کے جب حکیم کے دونوں بھائی رخصت ہو گئے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تاکہ کر کے میں جلد ہی کوئلہ تولے خان پہنچ گیا۔ یاسف نے مجھے بیٹھک میں بٹھا دیا اور بولا‘ میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا ہی دیر کے بعد اندر سے چیتنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں نسوانی تھیں۔

”ارے اللہ کی بندی‘ آئے گئے کا تو کچھ خیال کر لے۔ حکیم صاحب آئے ہیں۔“ یاسف کی آواز آئی۔

”آپا کرے کوئی بھی‘ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تم نے اپنے کمرے سے میرا بستر باہر کیوں نکالا؟“
”کتنی دفعہ بتاؤں کہ کمرے کی جھاڑو لگانے کے لئے بستر اٹھایا تھا۔ اب آئندہ یہ قصور نہیں ہو گا۔“

”اگر اٹھایا ہی تھا تو پھر دوبارہ وہیں کیوں نہیں بچھایا؟ اور اب تک تم نے برتن کیوں نہیں دھوئے؟“

”برتن دھونے ہی تو باورچی خانے میں جا رہا تھا کہ حکیم صاحب آگئے۔ حکیم صاحب چلے جائیں تو میں برتن.....“

”تو پھر جا کے دفع کرو‘ انہیں!“

اب مجھے اندازہ ہوا کہ عبدالکلام کی بیوی کتنی ظالم اور زبان دراز تھی! یاسف نے واقعی انتہائی صبر و تحمل کا ثبوت دیا تھا ورنہ تو کوئی آدم زادی کسی جن زاد کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتی۔ یاسف کی جگہ اگر میں بھی ہوتا تو تنگ آجاتا۔ جب وہ مظلوم صورت بنائے دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔

”اے علیالیش!“ وہ میرے قریب آکر بیٹھے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ”اب تو خود سن لیا ہو گا“

”غیث عورت کتنی حرافہ ہے۔ مگر لگتا ہے‘ ابھی تیرے کان پر جوں نہیں رہی۔ تو اسی لئے تو اب مجھ پر! برداشت کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ یہ بد ذات عورت اگر میرے ہاتھوں ماری جائے تو مجھ نے دھرتا۔“

”چل غصہ تھوک دے میرے دوست!“ میں نے اسے ستانے کی خاطر کہا۔ ”بس ایک ہفتہ اور میں گزار لے“ پھر.....“

”ہرگز نہیں!“ وہ اپنی تیز آواز پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اس گھر میں آخری دن ہے۔ صبح سے میں تیرا انتظار کر رہا تھا اور تو اب آیا تو جلا رہا ہے مجھے!“

میں تو پہلے یہ سوچ کر آیا تھا کہ یاسف کو اس عذاب سے نجات دلا دوں گا۔ مشتاق کے جسم میں پناہ کے ہاجرہ کو خراب نہ کر سکے‘ اس کا راستہ میں نے پہلے ہی نکال لیا تھا۔ یاسف کو بس یہ اجازت لی ضرورت تھی کہ وہ عبدالکلام کا جسم چھوڑ سکتا ہے‘ باقی سب کچھ تو خود اسی کو کرنا تھا۔

”اگر تو یہاں واقعی بہت تنگ ہے تو پھر چھوڑ دے یہ جسم!“ میں نے آخر اسے اجازت دے دی۔ ”لیکن یہ سمجھ لے کہ مجھ سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسی کے ساتھ تجھے مجھ وعدہ بھی کرنا پڑے گا کہ کڑی افغانان کے پھیرے نہیں لگائے گا!“ آخری الفاظ میں نے معنی خیز میں ادا کئے۔

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا‘ پھر بولا۔ ”آخر تو نے پتا لگا ہی لیا کہ وہ حسن کی دیوی ملاں رہتی ہے! کہیں تیری نیت تو خراب نہیں ہو گئی اس پر!“

”بکواس نہ کر! وہ میری بھتیجی ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”تو اب تو آدم زادوں سے اپنے رشتے بھی جوڑنے لگا.....! چل ٹھیک ہے‘ ہاجرہ کے رشتے تو سر بن جائے گا۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”مجھے یہ بھی منظور ہے۔“

”فضول باتیں چھوڑ اور مجھ سے وعدہ کر ہاجرہ سے نہ ملنے کا! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تک اسے اس کی شادی نہ ہو جائے تو اس معصوم لڑکی کو نہ ستائے۔“

”لیکن تو نے تو لاہور میں مجھ سے یہاں آتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ میرے معاملات میں مداخلت کرے گا پھر اب مجھ پر کیوں پھرے بٹھا رہا ہے؟“

”ہاجرہ اگر حکیم نیراس الدین کے رشتے سے میری بھتیجی نہ ہوتی تو یقین کر میں کچھ نہ کہتا۔“

یاسف کو وعدہ کرنا ہی پڑا کہ شادی سے قبل ہاجرہ کو نہیں چھیڑے گا۔ میں پہلے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کے ہتھے نہیں چڑھنے دوں گا۔ اس کی یہی صورت تھی کہ مشتاق سے ہاجرہ کی شادی نہ ہوتی۔ نہ تو اقبال اور نرگس کو ایک نہیں ہونے دیا تھا جب کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے یہاں تو میں نہیں تھا۔ میرے لئے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ لطیف کو میں نے اسی لئے ممنون احسان نہ میرے نزدیک اس طرح آدھا کام ہو چکا تھا‘ آدھا باقی تھا۔ صرف اب اتنی ضرورت تھی کہ لطیف مشتاق کی طرف سے برگشتہ کر دیا جاتا۔ یاسف کو میں نے اس سلسلے میں ہوا نہیں لگنے دی کہ میرا کیا

ارادہ ہے۔

”اچھا تو اب تجھ سے مشتاق کے جسم میں ہی ملاقات ہو گی۔“ میں نے کچھ دیر بعد یاسفؔ کیا۔ ”شام کو عبدالکلام کے ساتھ تجھے میرے گھر آنا ہے۔“

”وہ کس لئے؟“ یاسفؔ نے سوال کیا۔ وہ غالباً میری بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

”عبدالکلام سے اپنی سفارش کرانے کے لئے کہ میں تجھے ملازم رکھ لوں، اب سمجھا کچھ۔“ عبدالکلام کو بھی تو فنی صورت حال سے واقف ہونا چاہئے یا نہیں؟

”ہاں، تو یہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ یاسفؔ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”مگر کیا خبر عبدالکلام میری کرنے پر آمادہ ہو کہ نہیں! پھر.....؟“

”پھر تو خود اکیلا میرے پاس آجاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تجھے کو واپسی بھیج کر میں! لوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ تجھے ملازم رکھ لیا ہے۔ ظاہر ہے مطلب میرا ہے، اس کا نام

بجے چاہوں ملازم رکھوں۔ مشتاق کی والدہ کو اس پر تجھے ہی راضی کرنا ہے۔ جب تو اسے یہ بتائے جگہ کی تنخواہ ایک ہی جگہ سے مل سکتی ہے تو وہ انکار نہیں کرے گی۔“

ہم دونوں قریب قریب بیٹھے ہوئے دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ معاً اندر مردانہ آواز آئی۔ ”ابا! تمہیں اماں بلارہی ہیں۔“

”یہ آواز عبدالکلام کے بڑے لڑکے کی ہے۔“ یاسفؔ نے آہستہ سے کہا۔ ”جب تک عورت اپنے شوہر سے برتن نہیں دھووالے گی، اسے چین نہیں پڑے گا۔“ اسی وقت لڑکے نے

لگائی تو یاسفؔ نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ”آیا ابھی!“ اب وہاں رکنا ممکن نہیں تھا اس لئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور یاسفؔ سے کہا۔ ”چلتے چلے

اس نافرمان آدم زادی کو تھوڑا بہت سبق ضرور دے دیجیو۔“

”میں تو خود بھی یہی سوچ چکا تھا۔“ یاسفؔ نے بتایا۔ ”آج اس سے کوڑی نہ بلوائی تو میر

یاسفؔ نہیں۔“

”اور ہاں سن! عبدالکلام کے جسم سے ذرا آرام کے ساتھ ٹکنا، ادھیڑ عمر جسم کہیں ڈھے، جھٹکا زور سے نہ لگے۔“ یہ تاکید کر کے میں بیٹھک سے نکل آیا۔

میراجی تو بہت چاہا کہ عبدالکلام کی بیوی کا حشر دیکھوں، مگر اس کے لئے مجھے حکیم کے جسم

آنا پڑتا، سو اس خواہش کو دبا گیا۔

☆=====☆=====☆

بازار کلاں میں جب میں اپنے گھر کے قریب تانگے سے اتر رہا تھا تو ایک نوجوان کو آس

کاٹے دیکھا۔ صورت شکل سے وہ بگڑا ہوا اور آوارہ لگتا تھا۔ اس کا حلیہ بھی بد معاشوں جیسا تھا۔

تانگے والے کو کرایہ ادا کیا، پھر اس نوجوان کی طرف بڑھا جو مجھے دیکھ کر مسجد کی طرف ہو لیا تھا۔ کے ساتھ میں اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے روک لیا۔

مجھے کیوں روکا ہے حکیم جی؟“ اس نے ترخ کر پوچھا۔

”یہاں تم کیوں چکر کاٹ رہے ہو؟“ میں نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں؟“ خلاف توقع وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں، میں کون ہوں؟“

”تو بتا دو!“ میں اس کے گستاخانہ لہجے کو نظر انداز کر کے بولا۔

”کرم الہی عرف کسانام ہے میرا! بوڑھو دروازے میں بڑا ٹیکا ہے اہنا!“ اس نے گردن ٹیڑھی کر کے مجھے رعب میں لینا چاہتا ہو۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“

اپنی بلبل یہاں آگئی ہے تو ظاہر ہے ہم بھی آئیں گے۔ اب کہیں بلبل کا نام نہ پوچھ لینا حکیم جی، شرا جاؤ گے۔“

”وہ تو میں ضرور پوچھوں گا تم سے!“ مجھے اب غصہ آنے لگا اسی لئے آواز میں سختی آگئی۔

”حکیم جی! تم کیونکہ میرے ہونے والے سالے ہو ورنہ کوئی اور تمہاری جگہ ہوتا تو اس طرح ابھی آنتیں باہر کر دیتا۔“ یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

برے لئے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ غذا، حکیم کی بہن راشدہ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ کرتے ہی میں نے ایک ہاتھ سے تو اس کا چاقو پھینکا اور دوسرے ہاتھ سے گریبان پکڑ لیا۔ ”الو کے

لی یہ مجال کہ یہاں آکر بد معاشی دکھائے!“ میں نے بلند آواز میں کہا اور اس کے گریبان کو جھٹکا

راہی دیر میں لوگ جمع ہو گئے اور وہ غذا چیخ چیخ کر لوگوں کو بتانے لگا۔ ”اس کی بہن مجھ

.....“

ل کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ میرا الٹا ہاتھ اتنی زور سے اس کے منہ پر پڑا کہ نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔

اے اے اے حکیم صاحب! آپ عزت دار آدمی ہو کر کیوں اس غنڈے کے منہ لگ رہے ہیں!“

سمجھانے لگے۔

لوگوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اور کچھ نے اس غنڈے کو۔

اس کی بہن نے میرا بہت مال کھایا ہے۔“ وہ زور سے بولا۔ ”پورا محلہ گواہ ہے، چل کر ابھی پچھو

بوڑھو دروازے کے بچے بچے کو پتا ہے کہ.....“

چپ حرام زادے!“ میں دھاڑا اور پھر لوگوں کی گرفت سے نکل گیا۔

ابے بھاگ بھاگ جا!“ کسی نے اس غنڈے سے کہا۔ ”ورنہ حکیم صاحب تیرا خون کر دیں

ل وقت تک میں لوگوں کے جوم سے گزرتا ہوا کافی آگے بڑھ چکا تھا وہ غذا اب مجھے سے زیادہ

تھا۔

دیکھ لوں گا تجھے..... دیکھ لوں گا!“ وہ یہ کہتا ہوا بھاگ نکلا۔

”کوئی نہ کوئی چکر ہے ضرور!“ میں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں۔ ”ایسا نہ ہوتا تو دروازے سے یہاں کیوں آتا؟“

میں خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس غنڈے نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے سے قطع نظر مجھے بھی لوگوں کی بات میں وزن نظر آیا۔ کما بلا سبب راشدہ کے پیچھے نہیں آ لوگوں کی چہ میگوئیوں کو نظر انداز کرتا ہوا میں اپنے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ مجمع مسجد کے قریب گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے راشدہ کو آواز دی۔ وہ کلثوم کے کمرے میں تھی۔ ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ”بیٹو!“ میں نے موبذھے کی طرف اشارہ کیا اور اس کے سائے پر بیٹھے ہی پوچھا۔ ”راشدہ! تم کرم الہی عرف کرنا کو جانتی ہو؟“ یہ پوچھتے ہوئے میری نظریں چہرے پر تھیں۔

”نک..... کرنا.....!“ وہ بکلائی اور چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”ہاں وی!“ میں زور دے کر بولا۔ ”تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی!“

”وہ..... وہ سامنے..... ہمارے گھر کے سامنے ہی رہتا ہے، ل..... لیکن“

آپ کیوں..... اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ میرے استفسار اور سختی کے نتیجے میں راشدہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں آخر اقرار کر ہی لیا الہی کو چاہتی ہے۔

”تمہیں معلوم ہے، وہ غذا ہے؟“

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”پھر بھی..... پھر بھی تم نے اس سے محبت کرتی ہو؟“

راشدہ نے سر جھکا لیا تو میں نے اسے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے سے آ ”وہ..... وہ ایسا..... ایسا نہیں کر سکتا!“ راشدہ بڑبڑائی، انداز خود کلائی کا تھا۔ اسے یق سے یہ توقع نہیں رہی ہو گی۔ میں نے اس کے چہرے پر غصے کے آثار بھی دیکھے۔

”تمہیں اس نے کبھی کچھ پیسے بھی دیئے تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں..... میں تو نہیں لے رہی تھی، خود اسی نے زبردستی کئی دفعہ.....“

”ٹھیک ہے۔“ میں بول اٹھا۔ پھر مزید پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ تقریباً چھ مہینے سے یہ

تھا۔ سب غربت کے تماشے تھے۔ پھر بھی یہ رقم پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ کرم الہی تو ابھی مجھے علم نہیں تھا کہ وہ صرف ہوس کا بندہ تھا یا کچھ اور، البتہ راشدہ کے بارے میں یہ کہ وہ اپنے عشق میں سچی تھی۔ اس کے باوجود راشدہ نے حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا یا پھر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے راشدہ سے میں نے آخری سوال کیا۔ ”کر جو بے عزتی کی، اسے تم اپنے ذہن سے جھٹک کر یہ بتاؤ، تمہاری شادی اگر ہم اس سے کر دیر ساتھ خوش رہ سکو گی؟“

کئی بار جب میں نے یہی سوال دہرایا تو راشدہ نے آہستہ سے ”ہاں“ کر دی۔ پھر میں نے حکیم کی ماں بول کو بھی اپنے کمرے میں بلا لیا۔ راشدہ اپنی ماں کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تو اسے میں نے جانے دیا۔ بول کو جب ساری بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنا سر پکڑ لیا، پھر روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مجھے کیا خبر تھی کہ..... کہ راشدہ یوں ماں باپ اور بھائیوں کو رسوا کرے گی۔ میں..... میں بد نصیب تو اسے ابھی بچی ہی سمجھ رہی تھی..... اس لیے، لنگے، اٹھائی گیرے کا تو میں خون لی جاؤں گی.....! برا ماں ماں کرتا رہتا تھا! میں سمجھتی تھی کہ وہ محلے داری کا خیال کر کے کبھی کبھار گھر کا سودا سلف لا دیتا ہے، اندر ہی اندر کیا گل کھلا رہا ہے، یہ تو پتا ہی نہیں تھا.....! نہ تیرے ابا جان بیمار پڑتے، نہ آج یہ دن دیکھنا پڑتا!“

”اب آپ رونا دھونا تو چھوڑیں اماں، یہ بتائیں کیا ہو؟“ پھر میں سوال کر کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بول اٹھا۔ ”ہماری عزت راشدہ کے مستقبل سے زیادہ نہیں ابھی بوہڑ دروازے جا کر کرم الہی اور اس کے والدین سے بات کرتا ہوں۔“

”مگر میں نے جو بات رشتے کی چلائی ہے، اس کا کیا ہو گا؟“

”بھول جائیں اب اس رشتے کو۔“ میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

بوہڑ دروازے میں کرم الہی مجھے اپنی گلی میں ہی ایک پرچون فروش کی دکان پر بیٹھا مل گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”کرم الہی! مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔“ میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔

میرا رویہ یقیناً اس کے لئے خلاف توقع رہا ہو گا۔ اسے بہر حال میں محلے سے باہر لے آیا اور باغ لائے خان میں داخل ہوا۔ وہاں جب میں نے گھاس پر اسے ایک طرف بٹھایا اور خود بھی سامنے بیٹھ گیا تو وہ کہنے لگا۔ ”مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو حکیم جی؟ یہ نہ سمجھتا کہ.....“

”آرام سے بات کرو۔“ میرے لہجے میں نرمی برقرار رہی۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، پہلے وہ سن لو!“

”بولو کیا کہتا ہے تمہیں؟“ وہ بدستور اکڑا رہا۔

اس کی زبان کھلوانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اسے بھی راشدہ سے محبت تھی۔ معلوم ہوا کہ آج جو کچھ ہوا اس نے دانستہ کیا تھا۔ راشدہ کو اپنانے کی اسے یہی ایک صورت نظر آئی تھی کہ رسوائی سے ڈر کر راشدہ کے گھر والے اس کی شادی راشدہ سے کر دیں گے۔ بہت دن سے وہ یہی منصوبہ بنا رہا تھا۔ جس کا اسے آج موقع مل گیا۔ اس کا باپ قصائی تھا۔ بوہڑ دروازے کی دکان تھی۔ سب کچھ سن کر میں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کیا کام کرتے ہو؟

”معمولی چوری چکاری کر لیتا ہوں۔“ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

”راشدہ سے اگر تمہاری شادی کر دی جائے تب بھی یہی کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں!“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے قائلین بانی بھی آتی ہے۔ کچھ دن ایک

کارخانے میں کام بھی کیا تھا مگر پھر چوری کا دھندا اپنا لیا۔ اس میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔“
کرم الہی کو راہ راست پر لانا ممکن تھا، سو میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور بولا۔ ”اگر کچھ پیسے لگا کر تمہیں کارخانہ کھلوا دیا جائے تو چلا لو گے؟“
”بالکل حکیم جی!“ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”میں..... میں راشدہ کے لئے چوری دھندا چھوڑ دوں گا۔“

اس سے میں یہی سنتا چاہتا تھا۔ کچھ دیر اسے مزید سمجھا بجا کر میں نے معلوم کیا۔ ”تمہارے والد اس وقت گھر پر ہوں گے؟“
”ہاں وہ کچھ ہی دیر پہلے دکان بند کر کے آئے ہیں حکیم جی! کیا تم ان سے بات کرو گے؟“
”ظاہر ہے، رشتے کی بات تو انہی سے کرنا پڑے گی۔“
”مجھے معاف کر دینا حکیم جی کہ میں نے تمہاری بے عزتی کی، اپنا مطلب نکالنے کے لئے؟“
باغ سے اٹھ کر میں پھر بوہڑ دروازے آگیا۔ کرم الہی نے اندر جا کر اپنے باپ کو بتا دیا کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے اس نے گھر کی چھوٹی سی بیٹھک میں بٹھا دیا تھا۔ حکیم نیراس الدین سارے شرمیل شیطان کی طرح مشہور تھا۔ کرم الہی کا باپ احسان اللہ فوراً آکر ملا۔
”ارے حکیم جی، مجھے بلوایا ہوتا! آپ خود کیوں آ گئے؟“ احسان اللہ لجاجت سے بولا۔ ”کسی شادی پر گوشت وغیرہ چاہئے ہو گا۔“
”نہیں۔“ پھر میں نے اصل بات کرنے میں دیر نہیں کی۔

احسان اللہ کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”آپ محل میں ناز کا بیوند لگانے کی بات کر رہے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کرم الہی آوارہ ہے۔“
”سب کچھ معلوم ہے برادر! یہ بھی کہ وہ چور ہے۔“
”اس..... اس کے باوجود آپ..... آپ اپنی بہن کا رشتہ اس کے لئے لے کر آتے ہیں؟“ وہ حیران سا ہو کر بولا۔
”ہاں شیخ جی.....! کرم الہی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آوارہ گردی چھوڑ دے گا۔“
”ایسے وعدے تو وہ مجھ سے بھی دس مرتبہ کر چکا ہے۔ آپ کو اس کی بات پر یقین ہو تو ہو؟“
”نہیں۔“

”کرم الہی کو سیدھے راستے پر لانے کا طریقہ یہ ہے کہ..... میں نے جو سوچا تھا، احسان اللہ بتا دیا۔ پھر کہا۔ ”جب وہ سدھر جائے گا تبھی اس کی شادی کریں گے۔“
”مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ آپ کے پیسے جوئے میں نہ اڑا دے۔..... وہ جوا بھی کھیلتا ہے پھر آپ مجھ سے گلہ نہ کیجئے گا۔“
”نکوشش کر لینے میں کیا حرج ہے! کیا خبر خدا اس کے دل میں نیکی ڈال ہی دے۔ اگر آپ کو اس بھروسا نہیں شیخ جی تو کارخانے کے لئے رقم میں آپ کو دیئے دیتا ہوں۔“

”نہیں حکیم جی، یہ ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔ میرا پیسا ہوتا تو یہ خطرہ بھی مول لے لیتا۔ میں غریب آدمی ہوں ورنہ خود اسے کارخانہ کھلوا دیتا۔ جگہ تو خیر ہے میرے پاس۔ پچھلے سال جیسے تیسے اور دو کرے ہوا لئے تھے۔ جو خالی پڑے ہیں۔ بچوں کو لے کر میں اوپر چلا جاؤں گا، نیچے کارخانہ کھلوا جا سکتا ہے۔“

”پھر یہی ٹھیک ہے شیخ جی کہ کرم الہی کو میں پیسے دوں۔ اس طرح کرم الہی کا اعتماد بھی بحال ہو گا۔ سوچے گا کہ اس پر بھروسا کیا گیا ہے۔ پھر وہ شاید گڑ بڑ نہ کرے۔ آپ اسے کل دوپہر..... بلکہ گیارہ بجے ہی بھیج دیں۔ اس وقت تک میں مطب بند کر دیتا ہوں۔“
احسان اللہ نے خاطر مدارات کے بغیر مجھے نہ اٹھنے دیا۔ میں گھر سے نکلا تو کرم الہی دوڑ کر میرے لئے تانگہ لے آیا۔ خود اس سے بھی میں نے آئندہ روز گیارہ بجے آنے کو کہہ دیا۔
”ابا مان تو گئے نا؟“ اس ن بڑی بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں، مگر اس شرط پر کہ تم راہ راست پر آ جاؤ اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ کل مطب آ جاؤ تو پھر تفصیلی بات کریں گے۔“ یہ کہتا ہوا میں تانگے میں بیٹھ گیا۔
گھر واپس پہنچا تو میں نے نشست گاہ میں یاسف اور عبد الکلام کو اپنا ہتھکریا یا۔ یاسف نے مشتاق کا جسم اپنا لیا تھا۔ رابعہ نے انہیں نشست گاہ میں بٹھا دیا تھا۔ انہیں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ عبد الکلام چہرے سے پشیمردہ سا لگ رہا تھا۔
”ہاں بھی عبد الکلام کیسے آتا ہوا؟“ میں انجان بن کر بولا۔ یاسف کی طرف میں دانستہ متوجہ نہیں ہوا۔

عبد الکلام نے اپنی دانستہ میں مشتاق سے میرا تعارف کرایا، پھر کہنے لگا۔ ”حکیم صاحب! میں چاہتا ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو اسے بھی اپنے ساتھ کام پر لگا لوں۔ میں تو اسے ساتھ لانے پر راضی نہیں ہو رہا تھا، لیکن اس نے اتنا اصرار کیا کہ آنا پڑا۔ بیسوں کی بات خود آپ اس سے کر لیں۔ ویسے اس سے میں نے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ دو جگہ سے تم جتنا کما لیتے ہو، حکیم صاحب اتنے پیسے نہیں دیں گے۔ آپ تو جانتے ہیں حکیم صاحب کہ اب مجھ سے پہلے جیسا کام نہیں ہوتا، اگر یہ نوجوان بھی.....“
”تم تو اسے ساتھ رکھنے پر راضی ہو؟ بیسوں کی بات بعد میں ہوتی رہے گی۔“ میں نے عبد الکلام کی بات کاٹ دی کہ وہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”راضی نہ ہوتا تو ساتھ کیوں لے کر آتا جناب!“ عبد الکلام نے جواب دیا۔
”ہاں میاں!“ میں نے یاسف کو مخاطب کیا۔ ”دونوں جگہ کام کر کے تمہیں کیا مل جاتا ہے؟ سچ بتانا ورنہ تصدیق کرالوں گا۔“

”دوا خانے سے اٹھارہ روپے ملتے ہیں ہر مہینے اور جن حکیم صاحب کے یہاں شام کو میں نئے ہاتھ ہوں، سات روپے ماہوار دیتے ہیں۔ کل اس طرح پچیس روپے پڑے جاتے ہیں۔“
میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عبد الکلام بول اٹھا۔ ”یہ بہت زیادہ ہیں مشتاق میاں! حکیم صاحب

کے پاس مجھے پندرہ سال ہو گئے۔ بارہ روپے مہینہ لگا تھا اور اب جا کے بیس روپے ملتے ہیں۔ پندرہ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ بعد میں دو تین مہینے گزر جانے پر میں خود تمہارا ایک روپیہ بڑھوا دوں گا۔

”عبد الکلام! جب اسے اٹھارہ روپے تنخواہ دوا خانے سے ملتی ہے تو یہ پندرہ روپے پر کس طرح مان جائے گا؟ یہ بھی تو سوچو!“ میں نے کہا۔

”یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے حکیم صاحب، میں کیا عرض کر سکتا ہوں!“

”میرا خیال یہ ہے عبد الکلام کہ تمہاری تنخواہ بھی بہت کم ہے۔ تمہیں کم سے کم پچیس روپے ملنا چاہئیں۔

”جی حکیم صاحب؟“ عبد الکلام اس طرح بولا جیسے اپنی ساعت پر یقین نہ آیا ہو۔

”ہاں۔ تم کیونکہ پرانے ہو اس لئے مشتاق میاں کی تنخواہ تم سے کم یعنی بیس روپے تک ہو چاہئے۔“ یہ کہہ کر میں نے سوالیہ نظروں سے یاسف کی طرف دیکھا۔

یاسف کو تو ہر حال میں میری بات ماننا ہی تھی، سو آمادہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دانستہ اس نے بارہ روپے زیادہ بتائے تھے۔ خود اسی نے مجھے پہلے یہ بتایا تھا کہ مشتاق کو دوا خانے سے پندرہ روپے اور حکیم سے پانچ روپے ملتے تھے۔ اس وقت شاید غلط بیانی کا مقصد یہ تھا کہ عبد الکلام مطمئن ہو جائے۔ عبد الکلام کی تنخواہ میں پانچ روپے کا اضافہ بھی میں نے اسی غرض سے کیا تھا۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے تو گھر میں جا کر میں نے بٹول کو کرم الہی اور شیخ جی سے ہونے والی گفتگو تفصیل کے ساتھ بتا دی۔ پھر الیاس کو بھی میں نے اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ تھوڑی بحث و تکرار کے بعد بوڑھے کو بھی میری بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ عزت اسی طرح بچائی سکتی ہے۔

”تم کو بیٹے تو بات کہی کرنے کے لئے لڑکے کے ہاتھ پر کچھ رکھ آئیں!“ بٹول بولی۔

”ابھی کچھ عرصہ رک جائیں، پہلے اسے کارخانہ جمالیے دیں۔“ جب میں دیکھوں گا کہ اس نے خوب دل لیا ہے تو پھر رشتہ پکا کر دیجئے گا۔“

”نیراس ٹھیک کہتا ہے، راشدہ کی ماں! جلد بازی کی ضروری نہیں۔ ابھی لطیف اور حنیف سے ہم تو رائے لے لو کہ وہ کیا کہتے ہیں!“ الیاس نے کہا۔

اگلے روز مطب کا وقت ختم ہونے سے کچھ پہلے ہی کرم الہی آگیا۔ آج اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا عبد الکلام کو میں نے جانے دیا اور یاسف کو روک لیا۔ میں نے ایک مخصوص رقم لا کر کرم الہی کے حوالہ کر دی اور بولا۔ ”پیسے اگر کم پڑیں تو آکر اور لے جانا۔“

کرم الہی کچھ دیر مجھ سے گفتگو کر کے مطمئن ہونے کے بعد چلا گیا تو یاسف نے کہا۔ ”علیائش! بے چارے حکیم نیراس الدین کی برسوں کی کمائی تو دونوں ہاتھوں سے کیوں لٹا رہا ہے؟ تو نے کیا کیا نئے چکر چلا دیئے ہیں! آخر تو چاہتا کیا ہے؟ یہ لونڈا تو نے کہاں سے پکڑ لیا، حکیم کی بہن کے لئے؟

مختصر آسے میں نے ساری روداد سنا دی۔

”کھائے جائیگی۔ نیکی! مگر یہ سمجھ لے کہ آدم زادوں سے وفا نہیں ملے گی تھی۔ جب تو ان کے باتیں پر آگیا۔ یہ تجھے بخشش ملے نہیں۔ چل یہ سب قصے چھوڑ، آج رات بلایا زمرس جیسی کسی آدم زادی کو تلاش کرتے ہیں۔ ملتان شہر بھی اہل حسن سے خالی تو نہیں ہو گا۔“ یاسف کی فطری آوارگی رنگ دکھانے لگی۔

مجھے یاسف کو زیر دام لانے کا موقع مل گیا اور بولا۔ ”ٹھیک کہتا ہے تو! یہاں تو پورا بازار حسن موجود ہے۔“

یاسف مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر کہا۔ ”پہلے خود تو ہی بازار حسن کا نام سن کر بدک جاتا تھا، اب کیا ہو گیا تجھے؟ میں تو خیر لاہور میں بھی ہیرا منڈی کے پھیرے لگا لیتا تھا۔ مگر تو کبھی ساتھ نہیں گیا۔ یہاں آ کر اتنی مہلت ہی نہیں ملی۔ سنا ہے کہ یہاں بازار حسن کو اندرون حرم کہا جاتا ہے۔ خیر چلیں آج رات وہاں؟“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے ہای بھری، اسی کے ساتھ بولا۔ ”حکیم نیراس الدین کو پورا ملتان شہر جانتا پہچانتا ہے۔ تیرے ساتھ چلنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے۔ اس طرح رسوائی بھی نہیں ہو گی۔“

یاسف کے استفسار پر اسے میں نے بتا دیا کہ میرے ذہن میں کیا تدبیر آئی ہے۔

”تو پھر میں، مشتاق کی ماں سے کوئی بہانہ کر کے رات کو آٹھ بجے تک مسجد کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔“ یاسف نے خوش ہو کر کہا۔

میں سمجھ گیا کہ یاسف اس طرح مجھے دوبارہ بے راہ روی پر آمادہ کر رہا تھا۔ اسے یہ گمان بھی نہ ہو گا کہ میرا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ چلا گیا تو میں نے مطب کا دروازہ بند کیا اور سوچنے لگا، لطیف کو کس طرح مطلع کیا جائے کہ آج رات اس کا ہونے والا داماد بازار حسن جائے گا؟ پھر خود ہی اس کی ایک راہ نکل آئی۔ حکیم کا چھوٹا بھائی حنیف دوپہر کے کھانے سے کچھ پہلے آگیا۔ اس سے میں نے کہہ دیا کہ بھائی جان جب شام کو کام سے واپس آجائیں تو میرے پاس انہیں ضرور بھیج دیتا۔

”لیکن بھائی صاحب، وہ تو آپ کے مطب کا وقت ہے!“ حنیف بولا۔

”دو منٹ کو آٹھ کے بات کر لوں گا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔

☆=====☆=====☆

اسی روز شام کو جب میں مریضوں میں گھرا ہوا تھا تو مجھے لطیف مطب میں گھستا دکھائی دیا۔ ایک مریض کو دیکھ کر میں اٹھ گیا اور لطیف کو اپنے ساتھ مطب سے باہر لے آیا۔ میری بات سن کر وہ کہنے لگا۔ ”اگر یہ بات ہے تو پھر میں آٹھ بجے سے پہلے ہی مسجد کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔ ایک تانگے والا میرا جاننے والا ہے، اندرون حرم تک تانگے ہی میں پیچھا کروں گا اس کا۔ مگر تمہیں کس طرح یہ خبر لگ گئی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

دھوتی باندھے ہوئے تھا، باہر آیا۔ میں نے اسے ایک لڑکی کی کلائی تھامے دیکھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس خوبصورت لڑکی کے جسم پر رزق برق لباس تھا۔ دھوتی بند شخص اسے گھسیتا ہوا اس طرف لایا جہاں ہم کھڑے تھے۔ لڑکی ”بچاؤ بچاؤ“ چیخ رہی تھی۔

”ارے کوئی میری شمشاد کو بچالو!“ اندر سے ایک بوڑھی عورت بھاتی ہوئی نکلی۔ اسی کے ساتھ تین چار دھوتی بند افراد بھی باہر نکلے اور بوڑھی عورت کو اٹھا کر اندر پھینک آئے۔ چروں سے وہ غنڈے ہی لگتے تھے۔ انہیں شاید قوی ہیکل شخص اپنے ساتھ لایا تھا۔

”ہو بے مُسلو“ سامنے سے! قوی ہیکل دھوتی بند نے ہمیں نفرت و حقارت سے مخاطب کیا۔ اس نے یقیناً ہمارے جسوں پر موجود لباس سے اندازہ کیا ہو گا کہ ہم مسلمان ہیں۔

مکن ہے کہ وہ ”مسلو“ کہہ کے ہماری تحقیر نہ کرتا تو ہم اس جھگڑے میں نہ پڑتے۔ وہ جھگڑا ہم جن زادوں کو مہنگا بھی پڑ سکتا ہے، اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ ہم نے اس دھوتی بند شخص پر حملہ کیا تو اس نے ہمیں کھلونوں کی طرح اٹھا کر دور پھینک دیا۔ لڑکی کو اس کے ساتھی غنڈوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ لڑکی مجھے کوئی طوائف زادی ہی لگی۔

زینے اور کمرے کے دروازے کی درمیانی جگہ معرکہ کار زار بنی ہوئی تھی۔

گرتے ہی میں اچھل کر اٹھا اور انسانی قالب چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح ”دھوتی بند“ کو خاصا مزہ چکھا سکوں گا۔

یاسف کو بھی نے سنبھل کر اٹھتے دیکھا۔ اب تک اس نے راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

”تم اس طرح نہیں مانو گے!“ دھوتی بند شخص کسی درندے کی طرح غرانا ہوا یاسف پر جھپٹا۔

میں اسی لمحے لپک کر میں نے اس کافر کی موٹی گردن کو گرفت میں لے لیا۔ وہ رک گیا اور پھر بڑے اطمینان سے اپنی گردن چھڑانے کے بعد اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اس وقت تک یاسف قریب آچکا تھا۔ وہ بھی سینے پر لات کھا کر ڈھیر ہو گیا۔

دوسری مرتبہ گر کر اٹھنے میں مجھے دیر لگی۔ میں اٹھا ہی تھا کہ وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”کیوں بے“ تو سمجھ رہا ہو گا کہ میری نظروں سے چھپ گیا ہے!“ یہ کہتے ہی اس نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور پھر مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود کسی آہنی شکنجے میں ہو۔ میں نے بہت زور لگایا کہ کسی طرح اس شکنجے سے نکل جاؤں مگر ناکام رہا۔

”بول مُسلے“ تجھے اسی طرح بھیج کر مار دوں؟“ وہ پھر زور سے ہنسا۔

اب میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس کے جسم کی مخصوص بو سے میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے حواس جواب دینے لگے۔

اس سے پہلے کہ میں بالکل ہوش کو بیٹھتا، قوی ہیکل شخص نے جانے کیا سوچ کر خود ہی مجھے چھوڑ دیا۔ اس کے آہنی شکنجے سے نکل کر میں لڑکھڑایا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ میں

”مشتاق اپنے جس دوست کے ساتھ بازار حسن جاتا ہے“ وہ میرا ممنون احسان ہے۔ میں نے اس کی بیمار ماں کا علاج کیا تھا۔“ میں نے بات بتائی۔ ”اسی نے مجھے مشتاق کے سارے کرتوتوں سے آگاہ کیا تھا“ یہ سوچ کر کہ میں ”باہرہ کا بچا ہوں۔“ مشتاق ہی سے اسے رشتے کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ وہی آج صبح مجھے یہ اطلاع دے کر گیا تھا کیونکہ میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”اچھا تو یہ بات تھی!“ لطیف نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ، تمہارے مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔“

میں کام دکھا کر مطب میں لوٹ آیا۔ اس رات جب مطب سے فارغ ہو کر میں گھر میں داخل ہوا، سردرد کا بہانہ کر کے بے ہوشی کی دوا پی لی، پھر اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد دوا کا اثر ہونے لگا تو میں نے حکیم کا جسم چھوڑ دیا۔ ایک تو دوا کا اثر، دوسرے میں ذرا سا جھکاؤ سے کر حکیم کے جسم سے باہر آیا، نتیجتاً وہ فوراً بے ہوش ہو گیا۔ اب تین گھنٹے سے پہلے اسے ہوش آتا، ممکن نہیں تھا۔ دوا کی مقدار میں نے اتنی ہی رکھی تھی۔

آٹھ بجتے میں اس وقت چند منٹ باقی تھے کہ جب میں حکیم کے گھر سے نکلا اور انسانی ہیئت اختیار کر لی۔ یاسف مجھے حسب وعدہ مسجد کے سامنے مل گیا۔ خود میں نے ہی اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا تاکہ وہ مجھے پہچان لے۔ میں نے اسے دن ہی میں اس تدبیر سے آگاہ کر دیا تھا۔ مسجد سے کچھ ہی فاصلے پر میں نے ایک تانگہ بھی کھڑا دیکھ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں لطیف ہی تھا۔ جب میں اور یاسف ایک اور تانگے میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور وہاں کھڑا ہوا تانگہ بھی پیچھے ہو لیا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

ملتان شہر میں بیرون حرم وہ حصہ کہلاتا تھا جہاں آبادی میں طوائفوں کی سکونت ممنوع تھی۔ حرم عربی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں وہ احاطہ جو خانہ کعبہ کے گرد گرد ہے۔ جب یہ لفظ سفر کرتا ہوا فارس یعنی ایران پہنچا تو حرمت کی رعایت سے اس کے معنی بدل گئے۔ فارسی زبان میں ”حرم“ مکان کے اندر رہنے والی اس منکوحہ عورت، کنیز، باندی یا لونڈی کو کہتے ہیں جو اپنے شوہر یا آقا کی خدمت گزار ہو اور اس کے تصرف میں آچکی ہو۔ ایران ہی کے زیر اثر عربوں نے بھی ”حرم“ بنائے۔ یہی لفظ ایران سے ہندوستان پہنچا تو تاریخی تناظر، تغیر وقت اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر اس کے معنی کنیزوں، باندیوں اور لونڈیوں کی رعایت سے مزید بدل گئے۔ ہندوستان میں طوائفوں، داشتادوں وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا، یعنی ان کے رہنے کی جگہ۔ اسی سبب طوائفوں کے علاقے کو ملتان میں ”اندرون حرم“ کہ گیا۔ یاسف کو بھی میں نے اس سے بے خبر نہیں رکھا۔

ہم اندرون حرم پہنچ کر تانگے سے اترے تو وہاں ہر طرف رونق نظر آئی۔ یاسف کو ساتھ لئے میں ایک کونٹے کی میزبیاں چڑھ گیا۔

جیسے ہی ہم اوپر پہنچے خلاف توقع چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ سامنے ہی دروازے پر پردہ پڑا تھا۔ چیخ و پکار اسی پردے کے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ معاً پردہ اٹھا اور ایک قوی ہیکل شخص

یاسف کے قریب جا کے گرا۔ میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ فوراً اٹھ سکتا۔ اس وقت اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ میرے قابو میں آنے والا تھا بھی کب!

کافر جن زادوں کے جسموں سے ایک خاص قسم کی بو آتی ہے۔ وہ بو اس کے جسم سے بھی آ رہی تھی۔ یا تو اس کافر جن زاد نے انسانی قالب اختیار کر رکھا تھا یا پھر وہ کسی آدم زاد کے جسم پر قابض تھا۔ جنت کی جو دس قسمیں ہیں، انہی میں سے ایک قسم مردہ کھلاتی ہے یہ جن زاد بھی عفاریت کی طرح انتہائی قوی ہوتے ہیں۔ یہ اگر کافر ہوں تو اور بھی خود سرد مغرور بن جاتے ہیں۔ پھر یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ بظاہر آدم زاد نظر آنے والا وہ کوئی زبردست و قوی جن زاد ہو گا تو ہرگز اس کا راستہ روکنے کی حماقت نہ کرتا۔ وہ اور اس کے ساتھی، طوائف زادی کو اغوا کر کے لے گئے تو میں نے دوبارہ انسانی ہیئت اختیار کر لی۔ پہلے میں ہی ہمت کر کے اٹھا اور یاسف کو بھی اٹھنے میں مدد دی۔ اس کی حالت بھی زیادہ ٹھیک نہیں تھی۔ میں اس کوٹھے سے یاسف کو نیچے اتار لایا۔ میرے دل میں یہ تجسس ضرور تھا کہ یہ چکر کیا تھا؟ لیکن اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں وہاں رکا نہیں۔ میں نے خود اپنے طور پر ایک اندازہ قائم کر کے دل کو مطمئن کر لیا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ جن زاد جس آدم زادی پر عاشق ہو جائیں اسے کسی اور سے تعلق قائم نہیں کرنے دیتے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ یہاں ہو گا۔ نائیکا اس نوجوان و حسین طوائف زادی کا سودا کسی سے کر رہی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ایک جن زاد کس طرح یہ برداشت کر لیتا، سو اسے زبردستی کوٹھے سے اٹھا لے گیا۔ وہ آدم زادی کی صورت میں اس کوٹھے پر آتا ہو گا۔ اگر اس کے سوا کوئی اور بات تھی تو بھی مجھے کیا لینا دینا تھا۔

یاسف کو میں جس مقصد کے تحت اس بدنام بازار میں لے کر آیا تھا، وہ پورا ہو چکا تھا۔ یوں بھی اب وہاں مزید رکنے کی ضرورت نہیں تھی، اس سے قطع نظر یاسف کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر کچھ زیادہ ہی زور دار لات پڑ گئی تھی۔ تکلیف کا اندازہ اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اس نے خود زبانی بھی مجھے بتایا کہ سینے میں درد ہو رہا ہے۔

”میرے ساتھ مطب چل، تجھے دوا دیے دیتا ہوں۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”سینے پر لگانے کو مرہم بھی دے دوں گا فکر نہ کر، تو صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔“

”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”پہلے کبھی ایسے کسی بازار میں میرے ساتھ کوئی اس طرح کا واقعہ نہیں ہوا۔ آج تو پہلی بار میرے ساتھ آیا اور یہ ہو گیا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنا اسی کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کافر آدم زاد میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ.....“

”وہ کوئی آدم زاد نہیں تھا۔“ میں نے یاسف کی بات کاٹ دی۔ ”اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا اس لئے.....“ پھر میں نے یاسف کو بھی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

”پھر تو یہی بہت بڑی بات ہے کہ اس کافر جن زاد نے ہمیں زندہ چھوڑ دیا۔“ ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا اور اسی وقت میری نظر ایک خالی تانگے پر پڑی اور اسے روک لیا۔ یاسف کو میں اپنے ساتھ بازار کلاں لے آیا اور مطب سے دوا دے کر رخصت کیا اس سے پہلے

میں نے انسانی قالب ترک کر دیا تھا۔ حکیم نیراس الدین اب تک اپنی خواب گاہ میں بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے جسم میں اتر کر مجھ پر بھی غفلت طاری ہو گئی۔

اگلے ہی روز حکیم نیراس الدین کے بڑے بھائی لطیف نے مشتاق سے اپنی بیٹی ہاجرہ کا رشتہ توڑ دیا۔ یاسف کو یہ بات اس وقت پتا چلی جب رات کو مطب سے فارغ ہو کر مشتاق کے گھر پہنچا۔ لطیف نے اپنی بیوی کے ہاتھوں عقلی کا وہ جوڑا واپس کرا دیا تھا جو مشتاق کی ماں نے ہاجرہ کو دیا تھا۔

یاسف اس پر چراغ پا ہو گیا۔ دوسرے دن جب دوسرے کو مطب کا وقت ختم ہوا تو تنہائی ملتے ہی وہ مجھ پر برس پڑا۔ ”مجھے یہ سارا چکر تیرا ہی چلایا ہوا لگتا ہے!“

”کون سا چکر؟“ میں بالکل انجان بن گیا۔

”بھولا نہ بن اے علیا لیش! تجھے سب معلوم ہے۔“ پھر اس نے ہاجرہ سے رشتہ ٹوٹ جانے کے بارے میں بتایا اور بولا۔ ”ہاجرہ کی ماں نے مشتاق پر بد کرداری کا الزام لگایا ہے۔ اس نے مشتاق کی ماں سے یہ بھی کہا ہے کہ مشتاق طوائف باز ہے، گزشتہ رات اس کے شوہر نے خود اپنی آنکھوں سے مشتاق کو ایک کوٹھے کی میز میاں چڑھتے دیکھا ہے۔ اب میں سمجھ گیا کہ تو مجھے.....“

”مشتاق کی ماں نے یہ نہیں پوچھا کہ تیرا ہونے والا سر کس لئے طوائفوں کے بازار میں گیا تھا؟“ میں بول اٹھا۔

”مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کر۔ یہ سب تیری ہی کارستانی لگتی ہے۔ تو نے ہی پہلے لطیف کو خبر دی ہو گی۔ کل اسے میں نے مطب میں آتے دیکھا بھی تھا۔ کوئی بات کرنے اسے مطب سے باہر لے گیا تھا۔ وہ یقیناً یہی بات ہو گی!..... ٹھیک ہے اے علیا لیش، اب میں ہاجرہ کو نہیں چھوڑوں گا اور آج رات.....“

”ہرگز نہیں!“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تو اسے خراب نہیں کرے گا!“

یاسف بڑی مشکل سے میری بات اس شرط پر مانا کہ میں دیگر آدم زادوں کے باب میں اسے کھلی چھٹی دے دوں۔ اگر میں اسے یہ آزادی نہ بھی دیتا وہ بہر حال پابند نہیں تھا۔ صرف دوستی ہی کے ناتے تو میں اس پر دباؤ ڈال کر اپنی کوئی بات منوا سکتا تھا۔ اس نے ہاجرہ کو خراب نہ کرنے کا عہد کر لیا، یہی غنیمت تھا۔

اس دن کے بعد سے یاسف نے اپنی گزشتہ ذکر اپنا لی۔ راتوں کو عیاشی و آوارہ گردی کے سبب صبح سے دوپہر کے وقت مطب آتا اسے گراں گزرنے لگا سو وہ اکثر غائب رہتا، ہاں شام کو پابندی سے آ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ صبح کے وقت وہ سوتا ہو گا۔ میں اسی لئے کچھ نہ بولا، لیکن عبدالکلام چپ نہ رہ سکتا۔

”حکیم صاحب! آپ نے مشتاق کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔“ عبدالکلام نے مجھ سے شکایت کی۔ ”اسے آپ نے میری مدد کے لئے رکھا تھا لیکن وہ تو اب ہفتے بھر میں ایک آدھ ہی روز صبح کے وقت آتا ہے۔ اس سے تو میں اکیلا ہی ٹھیک تھا۔ ناحق آپ کو اسے تنخواہ دینا پڑ رہی ہے۔“

”تنخواہ کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن اسے میں نے نکال دیا تو شام کو بھی تمہیں سانس لینے کی

ملت نہیں ملے گی۔“

”یہ بھی آپ ٹھیک ہی فرماتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی اور عطار کا بندہ بندہ کر لوں۔“

”نہیں عبدالکلام!“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میری نظر میں اس کا ایک حل اور ہے۔ ذرا مشتاق کو بھی بلا لویں!“

مریض رخصت ہو چکے تھے اور مشتاق دواؤں کے مرتبان وغیرہ ان کی جگہوں پر منبصال کے رکھ رہا تھا۔ یوں بھی وہ عبدالکلام کے بعد ہی جاتا تھا۔

عبدالکلام کے بلانے پر یاسف فوراً لپکتا ہوا آگیا اور بولا۔ ”جی حکیم صاحب؟“

”بھئی یہ تم اتنی چٹھیاں کیوں کرنے لگے ہو؟“ میں نے عبدالکلام کو مطمئن کرنے کی خاطر جواب طلب کیا۔

”چھٹی؟..... نہیں حکیم صاحب، میں تو روزانہ مطب آتا ہوں۔“

”لیکن صرف ایک وقت۔ جب کہ مطب دو وقت کھلتا ہے!“

”آپ کو پتا ہے حکیم صاحب کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور جوانی میں نیند کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔“

یاسف ہنسنے لگا۔ ”رات بھر حسین خواب دیکھ کر صبح ہوتے آنکھ لگتی ہے۔“

”تو یہ خواب تم کیا جانتی آنکھوں سے دیکھتے ہو؟“

”جی ہاں جناب! ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ بھی تو کبھی جوان رہے ہوں گے۔“ یاسف دانستہ شرارت پر اتر آیا تھا۔

اس پر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ عبدالکلام کے سامنے اسے مجھ سے بہر حال اس طرح کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں تھیں۔ پھر میں نے اپنی تجویز پیش کر دی جو یاسف کے حق میں تھی۔ اس نے فوراً رضا مندی ظاہر کر دی۔ تجویز یہ تھی کہ عبدالکلام صرف صبح اور یاسف شام کو مطب آئے گا۔ میں نے عبدالکلام سے بھی اس تجویز کے بارے میں رائے لی۔ ”کیوں بھئی عبدالکلام! یہ ٹھیک رہے گا؟ اس طرح تم دونوں ہی کو ایک وقت آرام کا موقع مل جائے گا کسی ایک فرد کے ساتھ نا انصافی بھی نہیں ہوگی۔“

”جیسی حکیم صاحب کی مرضی۔“ عبدالکلام بولا۔ وہ غریب اس کے سوا اور کتا بھی کیا!

یوں بحسن و خوبی یہ معاملہ طے ہو گیا۔ یاسف شام کو اور عبدالکلام صبح مطب آئے لگا۔

چند ہی روز سکون سے گزرنے لگے کہ ایک دن میں نے کلثوم کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ وہ مجھے بڑی عجب اور شورش سی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس پر مجھے حیرت ہوئی اور پھر حقیقت حال جاننے کی خاطر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، وہ خود ہی بول اٹھی ”مجھ سے تو تم تین مہینے مہر کرنے کو کہہ رہے تھے اور خود مہینے مہر بھی مہر نہیں کر سکے۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ میں نے منع بھی کیا مگر.....“ اس نے اپنا جملہ ادھر ادھر چھوڑ دیا اور نگاہیں جھکا لیں، چہرہ پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی۔

ایک وقت میرے چوہ سے زیادہ طبع روشن ہو گئے۔ کلثوم کی بات سمجھتا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ حکیم کی دونوں بیویوں سے ازدواجی تعلق قائم نہ رکھنے اور اپنے دامن کو گناہوں سے بچانے کی خاطر خود میں نے ایک بہانہ بنا دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ تین ماہ تک دوا استعمال کرنے کے دوران مجھے ان سے دور رہنا ہے۔ اس کے بعد جب تعلق استوار ہو گا تو پھر وہ صاحب اولاد بن جائیں گی۔ حکیم کی دونوں ہی بیویاں اس پر آمادہ ہو گئی تھیں، لیکن اب کلثوم کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ میں اس کی بات سن کر چکرا گیا۔

کلثوم نے یقیناً میرے چہرے سے فکر مندی کا اندازہ کر لیا اور اپنی دانست میں مجھے سمجھانے لگی۔

”اب چھوڑ دو بھی جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟“ یہ کہہ کر گویا اس نے مجھے آئندہ کے لئے بھی اجازت دے دی یا اپنے لئے راہ ہموار کر لی۔

”راجہ اکیلی گھر کے کام میں لگی ہوئی ہے، تم جا کر اس کا ہاتھ بٹاؤ، مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو۔“

میں نے کلثوم سے کہا۔

مجھے اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی۔ کلثوم چلی گئی تو میں سوچنے لگا میرے گھر میں نقب لگانے والا کون ہو سکتا ہے؟ میرے ذہن میں اس سوال کا جواب ایک ہی آیا کہ وہ کوئی جن زاد ہی ہو گا، کوئی جن زاد ہی میرا قالب اختیار کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا دھیان یاسف کی طرف بھی گیا، مگر دل نہیں مانا کہ یاسف نے ایسا کیا ہو گا پھر بھی میں نے اسے ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کو جب مطب کا وقت ختم ہو گیا تو اسے میں نے اپنے پاس بلا لیا۔

”ان دنوں کہاں کہاں دھاوے بھر رہا ہے اے یاسف؟“ میں نے تمہید باندھی۔

اپنے اس سوال پر اسے میں نے خلاف توقع چونکتے محسوس کیا۔ پھر وہ ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگا۔

”گتا ہے کہ تجھے پتا چل گیا ہے!“

”کس بات کا؟“ اپنے گمان کو حقیقت میں بدلتے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”اسی بات کا جو میں نے مصلحتاً تجھ سے چھپائی تھی۔“

”صاف بات کر!“ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”بات یہ ہے اے علیالیش کہ گھر گھر جھانکتے ہوئے پچھلے دنوں مجھے حکیم کے گھر کا بھی خیال آگیا۔ پھر کلثوم کو دیکھ کر میرا دل چل گیا۔ پھر بھی میں نے تجھ سے دوستی کے ناتے اپنا دل مار لیا، لیکن جب کئی روز تک تجھے اس کے پاس خلوت میں نہ دیکھا تو تجسس ہوا۔ وہ نوجوان و حسین عورت بہر حال ایسی نہ تھی کہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا۔ پھر جب میں نے حقیقت کا سراغ لگایا تو تجھ پر بڑی حیرت ہوئی۔ اسی کے ساتھ مجھے کلثوم کی قسمت پر بھی ملال ہوا کہ تو اس کی آرزوؤں کو یوں خاک میں ملا رہا ہے۔ تو جانتا ہے اے علیالیش کہ اگر میں چاہتا تو کسی بھی شکل میں ظاہر ہوئے بغیر اپنا کام نکال لیتا، مگر ایسا نہیں کیا۔ میں، حکیم ہی کے قالب میں گزشتہ رات اس سے ملنا تاکہ اسے احساس گناہ نہ ہو۔ پہلے میں نے اسے یہ سوچ کر مجھوڑ دیا تھا کہ وہ تیرے تصرف میں ہوگی۔ جب میرا یہ خیال غلط نکلا تو پھر مجھ پر دوستی کا قرض نہ رہا۔“

یاسف نے سب کچھ واضح الفاظ میں بتا دیا۔

ہر چند کہ کلثوم سے نہ میرا کوئی جذباتی تعلق تھا، نہ کوئی گہری وابستگی، پھر بھی مجھے یاسف کی یہ غیر شائستہ حرکت پسند نہیں آئی۔ میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

”تیری دانست میں اگر میں نے یہ اچھا نہیں کیا تو پھر خود تو ایک جوان عورت کے جذبات کو اپنی پارسائی کی ہیئت چڑھا کر کون سا اچھا کام کر رہا تھا؟“

”تجھے بہت ہمدردی ہے اس عورت سے؟“ میں نے طنز کیا۔

”ہاں کیوں نہیں! میرے نزدیک وہ قابلِ رحم ہے۔“ یاسف ترکی بہ ترکی بولا۔

”اگر میں اسے چھوڑ دوں تو کیا تو اس سے شادی کر لے گا؟“

”یعنی تو اسے طلاق دے دے؟“ یاسف نے وضاحت چاہی۔

”ہاں یہی مطلب ہے میرا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے اے علی لیش! ایسی خوب صورت اور نوجوان آدم زادی سے دستبردار ہو کر تجھے دکھ نہیں ہو گا؟“ یاسف نے اس طرح کہا جیسے مجھے میری حماقت کا احساس دلانا مقصود ہو۔

”میرے دکھ سے تجھے کیا! تیرے خیال میں تو خراب ہو ہی چکا ہوں۔ تجھ سے میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دے!“

”اتنا طویل انتظار مجھ سے نہیں ہو گا۔ پہلے تو اسے طلاق دے گا، پھر وہ عدت پوری کرے گی، اس کے بعد کہیں وہ میری بن سکتی ہے۔ ویسے بھی اب مستقل طور پر کوئی ڈھول اپنے گلے میں ڈالنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ہاجرہ کی بات اور تھی کلثوم کی طرح کسی کے تصرف میں نہیں رہی تھی۔ کلثوم کو اگر تو چھوڑ بھی دے تو میں اسے نہیں اپنا سکتا۔“ یاسف نے صاف جواب دے دیا۔

”تو پھر سن لے کہ کلثوم کو چاہے میں اپنے قریب آنے دوں یا نہ آنے دوں تو اسے دھوکا دے کر خراب نہیں کرے گا۔ اس پر بہر حال میرا حق ہے، تیرا نہیں!“ میں تیز آواز میں بولا۔ ”جس طرح میں تیرے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا تجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے!“

میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر یاسف کو مجھ سے وعدہ کرنا ہی پڑا کہ آئندہ کلثوم سے تعلق نہیں رکھے گا۔ حکیم نیراس الدین کے گھر میں اس کی غیر شادی شدہ بہن راشدہ بھی تھی۔ مجھے اب اس کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو گیا، سو اس کا بھی تدارک کر لیا۔ یاسف نے اعتراف کیا کہ اس کا دوسرا شکار راشدہ ہی تھی۔ میرے ایمان پر وہ راشدہ سے بھی دستبردار ہو گیا۔ یاسف کے عہد پر مجھے اس لئے بھی یقین آ گیا کہ اگر اس کے دل میں کھوٹ ہو تا تو راشدہ کے بارے میں اعتراف ہی نہ کرتا۔

☆=====☆

چند ہی روز بعد ملتان ہی کے دوران قیام میں مجھے ایک ایسا عالم ناک واقعہ پیش آیا کہ جس نے طویل عرصے کے لئے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری ذرا سی لاعلمی اور خود سری کی مجھے اتنی بڑا سزا ملے گی!

ہوا یہ کہ میرے دل میں جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی، ملتان میں جن بزرگانِ دین کے مقام

ہیں، میں ان کی زیارت کروں۔ ملتان آئے مجھے کافی دن ہو گئے تھے مگر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ جس روز صبح کی چھٹی تھی، میں تانگہ کر کے وہاں پہنچ گیا۔

شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مزار مبارک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے وہاں بہت سے زائرین کو دیکھا۔ ان میں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سبھی تھے۔ ابھی میں مقبرے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ میری پشت پر ایک ڈھیلا آکر لگا۔ میں غصے میں تیزی سے مڑا تو کچھ ہی فاصلے پر ایک فقیر کو دیکھا جو چرے سے کوئی مجذوب لگتا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں مجھے ڈھیلا نظر آئے وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور پھر دوسرا ڈھیلا کھینچ مارا یہ ڈھیلا میرے سر پر لگا۔

”بھگ لے یہاں سے چڑیا کے!“ فقیر ہنستے ہنستے ایک دم جیسے خفا ہو کر غرایا۔ ”تجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں۔“

”کیوں، تو کیا شر کو توال لگا ہوا ہے!“ میں اس کی طرف لپکا، اسی کے ساتھ اسے برا بھلا بھی کہا۔ ”کہہ دیا تجھ سے کہ چلا جا یہاں سے ورنہ ایسی سزا دوں گا.....“ فقیر کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔

میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی تھی۔ غصے کے سبب میں بے قابو ہو گیا تھا۔ فقیر کی گردن دباتے ہوئے مجھے اچانک جھٹکا سا لگا اور پھر زندگی میں پہلی بار مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ حکیم نیراس الدین کے جسم میں میرا دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر میں نے فقیر کی گردن چھوڑ دیں۔

”اب اس جسم کو بھی چھوڑ دے گستاخ ورنہ اسی کے اندر گھٹ کے مرجائے گا۔“ فقیر نے مجھے نفرت و حقارت سے مخاطب کیا۔

فقیر اگر مجھ سے ایسا کرنے کو نہ بھی کہتا تو اب حکیم کے جسم میں میرا مزید ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ سو میں حکیم کے جسم سے باہر آ گیا۔ اسی وقت مجھے فقیر کے ہاتھ میں بول کی ایک خاردار شاخ نظر آئی۔ پہلے مجھے اس کے ہاتھ میں وہ شاخ دکھائی نہیں دی تھی۔ میرا وجود اب ناویدہ تھا مگر مجھ یوں لگا جیسے وہ فقیر مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور وہ مجھے کانٹوں بھری شاخ سے مارنے لگا۔ میرے وجود میں خنجر سے اتر گئے۔ میں اس کی مار سے بچنے کے لئے مقبرے کی طرف بھاگا، لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مارنے کی طرف بھاگا، لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سامنے ہی مجھے ایک مرد اور عورت نظر آئے جن کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، اس فقیر کی نظروں سے چھپنے کے لئے مجھے یہی ایک تدبیر نظر آئی کہ کسی آدم زاد کے جسم میں گھس جاؤں۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں، مجھے کچھ اور نہ سوچا تو اسی بچے کے جسم کے اندر اتر گیا۔

ایک مرتبہ پھر فقیر زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ”بس اب تو قید ہو گیا۔ اس قید خانے سے تیرا نکلنا بہت محال ہو گا۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جا مگر تو گستاخی پر اتر آیا اور نہ گیا، سو اب سزا بھگت..... لمبی سزا! تیری صفات میں نے تجھ سے جھین لیں۔“

فقیر کی آواز پیچھے رہ گئی اور میں، ان دونوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گیا۔ بچے میں مجھے قرار آچکا

تھا۔ اس فقیر نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس پر مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ ہی دیر کے بعد بچے کے جسم سے نکل کر فرار ہو جاؤں گا۔ دوبارہ حکیم نیراس الدین کے جسم پر قبضہ کر لینا میرے نزدیک مشکل نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بے ہوش حکیم ہوش میں آنے کے بعد اپنے گھر ہی کا رخ کرتا۔ جب میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ حکیم کا جسم چھوڑا تھا تو اسے بے ہوش ہو کر گرتے دیکھا تھا میرے لئے یہ امر بھی باعث حیرت ہی تھا کہ مرد اور عورت دونوں میں سے کسی نے فقیر کے کسے ہوئے الفاظ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یوں جس طرح انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ مرد عورت اس بچے کے والدین معلوم ہوتے تھے۔ بعد میں میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا۔

ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ میں نے پہلی بار شیخ بناؤ الدین زکریا کے مزار مبارک کی زیارت کی شیخ کا مقبرہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ زرگس نے مجھے ملتان کی تاریخ کے متعلق جو کتاب دی تھی، اسی کا مطالعہ کر کے یہ معلوم ہوا تھا کہ شیخ نے اپنی زندگی ہی میں یہ مقبرہ خود بنوایا تھا بعد میں یہیں ان کی تدفین ہوئی۔ شیخ کا تعلق صوفیاء کے نقش بندی سلسلے سے تھا اور وہ سماع، یعنی قوالی کے قائل نہیں تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ان کا فارسی دیوان موجود ہے۔ شیخ کے صاحبزادے صدر الدین عارف کا مزار اپنے والد محترم کے پہلو میں ہے۔ یہ سماع کے قائل تھے، ان کے متعلق بھی میں نے مذکورہ کتاب میں پڑھا تھا۔ شیخ کے مقبرہ کی زیارت کر کے وہ دونوں میاں بیوی مجھے لئے باہر آئے تو میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہ مجذب فقیر مجھے دور دور تک نظر نہیں آیا۔ جس جگہ پر حکیم نیراس الدین کا بے ہوش جسم پڑا تھا، وہ بھی خالی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ ہوش میں آکر حکیم کتنا حیران ہوگا، پھر گھر پہنچا ہوگا تو بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر اس پر کیا گزرے گی؟

میں جس بچے کے جسم میں تھا، اس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی، جب میں نے اس کے جسم سے باہر نکلنے کا قصد کیا تو گھبرا گیا۔ کوشش کے باوجود مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ کیا واقعی میں اس بچے کے جسم میں قید ہو گیا ہوں؟ میں نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ کیا میری جناتی صفات مجھ سے چھن گئی ہیں؟ کیا فقیر نے سچ کہا تھا؟ میرے ذہن میں سوالات نے جیسے یلغار کر دی۔ مجھے فقیر کے الفاظ یاد آئے۔ ”میں نے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جا مگر تو گستاخی پر اتر آیا اور نہ گیا، سو سزا بھگت لمبی سزا! تیری صفات میں نے تجھ سے چھین لی ہیں۔“

میں اس قدر وحشت زدہ ہوا کہ ایک طرف بھاگا۔ مرد نے لپک کر مجھے پکڑ لیا اور منہ پر زور دیا۔ طمانچہ مارا۔ ”یہ کیا حرکت ہے حسن؟“ مرد نے مجھے ڈانٹا، یوں مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اس بچے کا نام حسن ہے، پھر اس کی ماں کا نام بھی پتا چل گیا۔ مرد نے اپنی خوب صورت بیوی سے کہا تھا۔ ”زرینہ! اس ہاتھ پکڑ کے رکھو!“

ملتان سے مجھے وہ دونوں میاں بیوی ایک قصبہ اسلام نگر لے آئے۔

اسلام نگر آنے کے بعد مجھے حسن علی کے خاندانی پس منظر کا علم ہوا۔ میں پہلے تفصیل کے ساتھ وہی بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ واقعات مجھے رفتہ رفتہ معلوم ہوئے تھے۔ ان واقعات کا تعلق کیوں کہ مجھ

مرد نے والے آئندہ عجیب حیرت انگیز سانچوں سے ہے اس لئے انہی کو پہلے بیان کرنا ضروری ہے۔ حسن علی کے آباء واجداد ہندو تھے۔ اس کے دادا پیارے لال شرما نے ایک پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پیر صاحب نے اس کا نام شریف علی رکھا تھا۔ شریف علی کے والد، یعنی حسن کے پردادا کٹر تم کے ہندو تھے۔ ان کا نام پنڈت گنگا پرشاد تھا۔ قصبہ بھر میں اس خاندان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حسن نے بچپن سے اب تک اپنے پردادا گنگا پرشاد کے بارے میں بہت سی عجیب باتیں سنی تھیں جو اسے اس وقت کبھی بڑی بچکانا اور کبھی بڑی پراسرار محسوس ہوتی تھیں لیکن اب ان باتوں پر اسے پورا یقین آچکا تھا۔

پنڈت گنگا پرشاد شرما نے مرنے سے پہلے ایک پیش گوئی کی تھی، وہ یہ کہ حسن کے دادا شریف علی کا صرف ایک پوتا ہو گا جو مذہب اسلام سے بھر جائے گا اور دوبارہ ہندو دھرم کا پالن کرے گا اور یہ بھی کہ اس کے بعد نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ یہ عجیب و غریب پیش گوئی حسن کے بارے میں تھی کہ میں جس کے جسم میں قید ہو گیا تھا۔ ایک حد تک یہ پیش گوئی حسن کے ہوش سنبھالنے تک پوری ہو چکی تھی، حسن کے والد شباب علی نے بہت تعویذ گنڈے کرائے، بزرگان دین کے مزاروں پر جا کر بڑی دعائیں کیں مگر زینہ پھر کبھی امید سے نہ ہوئی۔

حسن کا دادا شریف علی اپنے والد پنڈت گنگا پرشاد ہی کی زندگی میں پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو چکا تھا۔ پنڈت گنگا پرشاد اسی سبب اس سے بہت ناراض تھا۔ اس نے انگار ناراضگی میں اپنی زمین اور مکان شریف علی کے نام کرنے کی بجائے ایک مندر کے نام کر دیئے اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔

پنڈت گنگا پرشاد نے جو پیش گوئی حسن کے بارے میں کی تھی اس میں یہ بھی شامل تھا کہ جس جاپ کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہیں کر سکا، وہ حسن پورا کرے گا اور کامیاب رہے گا۔ یہ بھوانی کا جاپ کہلاتا تھا۔ یہ جاپ کرنے والے بھوانی کے داس کہلاتے تھے۔ جاپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس جاپ کو پورا کرنے والا جب چاہتا اپنی جون بدل سکتا تھا، اپنا جسم چھوڑ کر کسی بھی جسم پر قبضہ کر سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں حسن کے والد شباب علی نے اپنے باپ شریف علی سے سنی تھیں اور اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حسن کے والد شباب علی نے اس کی تربیت غیث مذہبی انداز میں کی تھی۔

جب مجھے ان باتوں کا علم ہوا تو میرے دل میں امید کی کرن پیدا ہو گئی۔ یہ جاپ پورا کر کے گویا مجھے حسن کے جسم کی قید سے رہائی مل سکتی تھی یوں گویا مجھے کم از کم میری ایک جناتی صفت تو واپس مل ہی جاتی۔ میں جو پہلے مایوسی کا شکار ہو گیا تھا، اب نہ رہی۔

بچپن ہی سے حسن پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اسے پانچوں وقت کی نماز زبردستی پڑھانی گئی تاکہ بڑا ہو کہ نماز اس کی عادت بن جائے۔ وہ ابھی پانچ ہی سال کا ہوا کہ اس کو روزہ رکھوا دیا گیا۔ پھر اس دن کے بعد سے تمام روزے اس پر فرض کر دیئے گئے۔ حسن کو یہ ایک طرح کی رسم سی لگی۔ تمام قصبہ میں مضامی اور افطار کا سامان تقسیم کیا گیا۔ اس کا مقصد حسن کے والد شباب علی کی نظر میں یہ تھا کہ اس کا

ہری بول منظور؟“
مولوی نے کہا۔ ”منظور! یہ بھی تو نے کوئی اور سمجھ رکھا ہے مجھے کہ تیری گیدڑ بھکیوں میں آجاؤں گا“

پاس پڑوس کے لوگوں نے بہت سمجھایا مگر مولوی نے ایک نہ سنی۔
”تم لوگ درمیان میں نہ آؤ!“ مولوی کہنے لگا۔ ”اس شیطان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اسے مزاحیہ ضروری ہے!“

”دیکھ مولوی، زبان سنجال کر بات کر۔ میں نے تجھے کل تک کی مہلت دی ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو میرے منہ آنے لگے۔ کل تک تجھ سے جو کیا جائے کر لے، پھر میری باری ہے۔“
اتنی بات سن کر اور لوگوں کے سمجھانے بھانے پر مولوی فضل داد اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پنڈت گنگا پرشاد نے اپنی گڑھی کی راہ لی۔

مولوی کا گھر نزدیک ہی تھا مگر پنڈت زرا دور رہتا تھا۔ ابھی پنڈت نے اپنے گھر کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے بڑے زور کی جھرجھری آئی اور جاڑا گنگے لگا حالانکہ یہ دن سخت گرمی کے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ بظلوں میں دبا لیے اور دانت پر دانت جما کر تیز قدموں سے راستہ طے کرنے لگا۔

گڑھی کے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے پنڈت کی حالت غیر ہو گئی یوں بھی وہ ساٹھ سال سے اوپر تھا پنڈت کو اتنی زور کا جاڑا چڑھا کہ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور دانت بچنے لگے۔ جیسے تیسے وہ گڑھی میں داخل ہوا۔ اتنی بڑی گڑھی میں وہ تن تھارہتا تھا اس لئے کہ شریف علی کو تو پوی بچوں سمیت پہلے ہی گڑھی سے نکال دیا تھا۔

گرتے پڑتے اس نے پھاٹک بند کیا۔ نیچے سے گزرتا ہوا وہ بس بیٹھک تک ہی آیا ہو گا کہ اس کے لئے مزید اپنے پیروں پر چلنا دو بھر ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ مولوی فضل داد نے اپنا کام کر دیا۔ بیٹھک ہی میں ایک پٹنگ بچھا تھا جس پر بستر بھی پڑا تھا گرمیوں کے موسم کی وجہ سے بستر پر کوئی لحاف یا کپل ہونے کا سوال نہیں تھا، صرف ایک چادر رکھی تھی۔ اس نے وہی چادر اوڑھ لی۔ جب چادر سے بھی سردی نہ گئی تو نیچے سے درزی نکال کر اسے چادر کے ساتھ ملایا اور بدن پر لپیٹ لیا۔

اس وقت پنڈت کی عجیب حالت تھی۔ وہ گڑھی ہو کر پڑا تھا۔ اتار کے جو منتر اسے یاد تھے پڑھتے پڑھتے بچ میں بھول جاتا تھا۔ جھنجھلا کر وہ دوسرے منتر کا جاپ شروع کرتا اور پھر منتر یاد نہ آتا۔ پنڈت اسی طرح ساری رات جاڑے بخار میں پھنکتا رہا۔ صبح ہوئی تو اس کی حالت کچھ سنبھلنے لگی۔

مولوی فضل داد اس وقت مسجد میں فجر کی اذان دے رہا تھا۔ پنڈت بستر سے اٹھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی عمر یک بہ یک ساٹھ سال سے بڑھ کر سو سال ہو گئی ہے۔ اس نے اب جو ایک منتر یاد کیا تو فوراً یاد آگیا۔ منتر کے جاپ سے جسم میں توانائی واپس آنے لگی۔ وہ دیر تک منتر کا جاپ کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل اعتدال پر آگیا۔ پھر بھی تھوڑی ٹھانہ اب تک باقی تھی۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا سا ناشتا پانی کر کے وہ لمبی تان کے سو گیا۔

بیٹا زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات سے قریب رہے اور ہندو تہذیب اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ حسن کو کسی ہندو دوست سے ملنے یا اس کے ساتھ کھیلنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ محلے کے تمام لڑکے جب کھیل رہے ہوتے تھے تو حسن ملائی سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔ گھر سے حسن کے نکلنے پر بھی پابندی تھی تاکہ وہ کہیں کسی ہندو لڑکے یا آدمی سے بات نہ کر سکے۔

حسن پر اتنے پہرے لگائے گئے تھے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہیں سے بھوانی کا جاپ کیسکتا۔ پھر یہ کہ اسے اس کی ضرورت بھی کیا تھی جب وہ جاپ کی اہمیت و خصوصیت ہی سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ شتاب علی نے حسن پر جو سختیاں کیں ان کی بہت سی وجوہ تھیں۔ اس نے اپنے باپ سے پنڈت گنگا پرشاد کے جو واقعات سنے تھے، وہ ایسے ہی تھے۔ گنگا پرشاد نے اپنی زندگی میں جو پیش گوئی کی وہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ پنڈت بڑی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اس کی تمام زندگی منتروں کا جاپ کرتے گزری تھی۔ اس نے کبھی کسی سے ہار نہیں مانی تھی، سوائے اپنی موت سے کچھ دن پہلے کے! پنڈت گنگا پرشاد کا یہ واقعہ میں نے حسن کے باپ شتاب علی کی زبانی سنا تھا۔ یہ واقعہ اس طرح تھا کہ ایک مرتبہ مولوی فضل داد سے پنڈت گنگا پرشاد کا جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے کی وجہ زمین تھی۔ پہلے تو پنڈت گنگا پرشاد نے مولوی فضل داد کو سمجھایا کہ معاملہ سیدھی طرح طے کر لو۔ معاملہ یہ تھا کہ پنڈت گنگا پرشاد مولوی فضل داد کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ زمین پنڈت کی زمین کے قریب ہی تھی۔ اس کے لئے مولوی فضل داد قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ بھلا اپنی زمین پنڈت کو کیسے ہڑپ کر لینے دیتا! اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اور ہوں گے جنہوں نے تمہارے منتروں و منروں کی دھونس میں آکر اپنی زمینیں تمہارے حوالے کر دی ہوں گی، مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ تم سے جو کیا جائے کر لو۔

زیادتی کچھ مولوی کی بھی تھی جو ایک دم گرم ہو گیا۔ آج تک قبضے میں کسی کی اتنی مجال نہیں ہوئی تھی کہ پنڈت گنگا پرشاد کے آگے اونچی آواز سے بھی بول سکتا۔ مولوی اگر نرمی سے بات کرتا تو شاید پنڈت اسے معاف کر دیتا جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ اگر کوئی پنڈت کے آگے رحم کی بھیک مانگتا یا افراد کرتا تو وہ اسے نہیں سنا تھا۔ ایسے کئی واقعات قبضے میں ہو چکے تھے۔ ہر چند کہ اس واقعے میں تمام قصور پنڈت ہی کا تھا کیوں کہ وہ مولوی کی زمین ڈکار جانا چاہتا تھا، مگر یہاں تو وہ مثل تھی، زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ ان حالات میں مناسب یہی تھا کہ مولوی درگزر سے کام لیتا اور پنڈت کے قہر سے بچ جاتا اس کے برخلاف مولوی نے نہ صرف پنڈت کی بے عزتی کی بلکہ اسے چیلنج بھی کر دیا۔

پھر کیا تھا، پنڈت گنگا پرشاد غصے میں لال پیلا ہو گیا اور اسی غصے کی حالت میں کہا۔ ”جا مولوی! آج کی رات تیرے اوپر بھاری ہے۔“

مولوی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”یہ رات مجھ پر نہیں پنڈت، تجھ پر بھاری ہو گی۔ میں بھی ایک صاحب کرامت پیر کا مرید ہوں۔ اگر آج ہی رات تجھے جاڑا چڑھ کر بخار نہ آجائے اور تو میری کی ڈال کی طرح تھر تھر کانپنے نہ لگے تو میرا نام مولوی فضل داد نہیں۔“

یہ سن کر پنڈت گنگا پرشاد نے کچھ لمبے توقف کیا، پھر بولا۔ ”اچھا تو پھر آج کی رات تیری اور کل کی

پنڈت کی آنکھ مغرب کی اذان سے کھلی۔ اب وہ بالکل چاق و چوبند تھا۔ بستر سے اٹھ کر وہ نمایاں اور گڑھی سے نکل آیا۔

کچھ دور پر مسجد تھی جس سے اکا دکا نمازی اب بھی نماز پڑھ کے نکل رہے تھے۔ ایک دم اس کی نظر مولوی فضل داد پر پڑی۔ مولوی پر نظر پڑتے ہی پہلے تو پنڈت کچھ جھجکا، مگر پھر غصے سے سرخ ہو گیا۔ مولوی کی مسکراہٹ اس وقت جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ اس معنی خیز مسکراہٹ سے پنڈت کو اپنی بڑی تشویش محسوس ہوئی۔

”بس مولوی، یہی سیکھا ہے تو نے ہونہ!“ پنڈت برس پڑا۔ ”ایسے جنتر منتر تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔“

مولوی فضل داد بولا۔ ”پھر بچ گیا ہوتا میرے دار سے! کھا اپنے بھگوان کی قسم کہ تجھے رات کو جاڑا بخار نہیں آیا!“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ پنڈت نے کہا۔ ”جاڑا بخار تو آیا تھا، پر آج رات میری ہے۔ تو قول دے چکا ہے مولوی!“

”ہاں۔“ مولوی نے جواب دیا۔ ”قسم ہے مجھے خدا کی جو آج کی رات میں تیرے اوپر کوئی دار کر جاؤں۔ مسلمان کی زبان ایک ہوتی ہے مر جاؤں گا اپنی زبان سے نہیں پھروں گا پنڈت! کیا سمجھتا ہے تو مجھے!..... جو ہو سکے کر لیتا!“

مولوی فضل داد اور پنڈت لنگا پر شاد کی ٹوٹو میں سن کر سب لوگ جمع ہو گئے خدا خدا کر کے انہوں نے دونوں کو الگ کیا۔ مولوی اپنے گھر اور پنڈت اپنی گڑھی واپس چلا گیا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی پتا چلا کہ مولوی فضل داد کی طبیعت بے حد خراب ہے اور وہ منہ کے راستے خون ڈال رہا ہے۔ سارے قصبے کے لوگ، مولوی اور پنڈت کی جنگ سے واقف تھے وہ سب جمع ہو کر پنڈت کی گڑھی میں اس سے ملنے پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا تو پنڈت اپنے باغ کے کچے کنویں کے پاس صرف ایک دھوئی پینے بیٹھا تھا۔ اس کی اطراف ایک حصار سا کھنچا ہوا تھا، کان میں جینیو پڑا تھا اور وہ کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ایک کنکری اٹھاتا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکتا، پھر زور سے ایک بار ”جے بھوانی“ کہہ کر کنکری کو کچے کنویں میں پھینک دیتا۔ کنویں سے زور دار آواز آتی جیسے کسی نے ہماری پھر پانی میں پھینک دیا ہو۔ کنویں میں کنکری کے گرتے ہی بہت تیزی سے دھواں اٹھتا۔ جب دھواں چھٹ جاتا تو پنڈت دوسری کنکری اٹھاتا اور اس پر منتر پڑھ کر پھونکتے لگتا۔

تمام قصبے والوں نے یہ منظر دیکھا۔ ان آنے والوں میں مولوی کی بیوی، اس کا لڑکا اور بیٹی بھی تھے۔ وہ مولوی کی طرف سے معافی مانگتے آئے تھے۔ تمام لوگ حصار کے باہر ہی کھڑے رہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پنڈت ایک اور کنکری زور سے ”جے بھوانی“ کہہ کر کنویں میں پھینک چکا اور کنویں سے دھماکے کے ساتھ دھواں اٹھ چکا تو وہ زور زور سے چلا کر اور پنڈت سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔

”معاف کر دیں پنڈت جی، مولوی فضل داد کو معاف کر دیں!“

پنڈت جو شاید اب تک ان لوگوں کی موجودگی سے ناواقف تھا اور آنکھیں میچے منتر کا جاپ کر رہا تھا ایک دم شور سن کر چونک اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت پنڈت کی آنکھیں دیکھ کر لوگ ڈر گئے۔ قصبے والے ایک بار پھر اس سے مولوی کی جان بخشی کے لئے درخواست کرنے لگے۔

”پنڈت جی! آپ مولوی صاحب کی ساری زمین بھی لے لیں اور ہم میں سے جس کی زمین پر قبضہ چاہیں کر لیں مگر مولوی صاحب کی جان بخش دیں۔ ہم مولوی صاحب کی طرف سے معافی مانگتے ہیں۔ انہیں جینے دیں پنڈت جی!“ لوگ باری باری پنڈت سے التجائیں کرتے رہے۔

مولوی فضل داد کی بوڑھی ماں بھی فریاد کرنے لگی اور پوچھے منہ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی، لیکن پنڈت لٹ سے مس نہ ہوا وہ برابر کچے کنویں میں کنکریاں پھینکتا رہا۔ لوگوں کے دل ہر کنکری کے ساتھ دھپتے رہے۔ ان میں ہندو اور مسلمان سبھی تھے۔

”اب بس کیجئے پنڈت جی!“ لوگ چیختے رہے۔ ”بس کیجئے!..... معاف کر دیجئے! آپ کو بھگوان کا واسطہ!..... بھگوان کے لئے چھما کر دیجئے ہمارا ج!“

جب شور زیادہ ہی بڑھ گیا تو پنڈت آنکھیں کھول کر مجمع پر گر جا۔ ”چلے جاؤ!..... احمق! چلے جاؤ!..... بہت برا سے ہے..... اگر میں اس سے (وقت) منتر کا جاپ چھوڑ دوں گا تو جو حالت اس سے مولوی کی ہوئی ہے، میری ہو جائے گی۔ پھر میں تمہارے سامنے منہ سے خون ڈال ڈال کر مر جاؤں گا چلے جاؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا!“

پنڈت کی کڑک دار آواز لوگوں پر بجلی بن کر گری۔ ڈر کے مارے وہ ایک ایک کر کے کھٹکنے لگے۔ جاتے جاتے ان کے کانوں میں ”جے بھوانی“ کے نعرے گونجتے رہے۔ پے در پے زبردست دھماکے ہوتے رہے جس سے بستی لرزتی رہی۔

قصبے کے لوگ جب واپس مولوی فضل داد کے مکان میں داخل ہوئے تو وہ آخری چکیاں لے رہا تھا، مگر کوئی کیا کر سکتا تھا، سوائے خدا یا بھگوان کو یاد کرنے کے۔ اس واقعے کی وجہ سے ان کے دلوں پر پنڈت کا اتنا رعب بیٹھ گیا تھا کہ وہ دل تک میں پنڈت کو برا سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھے، مبادا اس سے کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

آخر کار مولوی فضل داد ایک دفعہ زور سے ترپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے آخری دھماکا سنا اس کے بعد دھماکے بند ہو گئے۔ شاید پنڈت جان چکا تھا کہ اس کا شکار دم توڑ چکا ہے۔

یہ تھا اس بچے حسن علی کے خاندان کا پس منظر کہ میں جس کے جسم میں قید ہو گیا تھا۔ اپنی جناتی صفات کھونے کے ساتھ ساتھ میرے لئے یہ احساس بے حد عجیب اور سوہان روح تھا کہ مجھے یوں لگتا جیسے میں ہمیشہ سے اسی بچے کے اندر ہوں۔ میں جن زاد علیا لیش نہیں، حسن علی ہوں صرف حسن علی!

کچھ واقعات کا تعلق حسن علی کے باپ شتاب علی سے ہے۔ میں انہیں بھی بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جب شریف علی نے پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو شتاب علی کی عمر دس گیارہ سال تھی۔

اس کا نام شریف علی نے بنساری لال رکھا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد شریف علی نے اسی عمر میں اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی بیعت کرا دی اور وہ دونوں بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں بچہ خاصا ہوش سنبھال لیتا ہے۔ شباب علی کے بہت سے ہندو دوست تھے۔ اس کا تعلق کیوں کہ ایک پنڈت گھرانے سے تھا اس لئے مذہبی امور کی تعلیم اسے شروع ہی سے دی گئی تھی۔ دس سال کی عمر میں وہ گیتا اور رامائن کا پات کر لیتا تھا، وہ بھی بڑی سرلی آواز میں۔ جب بھی قصبے میں کتا وغیرہ ہوتی تو وہ گیتا اور رامائن باقاعدہ طبلے اور ہار مونیئم کے ساتھ سنا کر لوگوں کو مبہوت کر دیتا۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی زرینہ سے ہو گئی۔ مسلمان ہونے کے باوجود شباب علی نے اپنے ہندو دوستوں یاروں سے قطع تعلق نہیں کیا، ہاں پنڈت گنگا پرشاد کے پاس گڑھی میں جانا ضرور چھوڑ دیا تھا جب بھی ہندوؤں کا کوئی تہوار آتا، وہ اس میں بھند ہو کر ضرور شرکت کرتا۔ ہولی ہوتی تو شباب علی خوب پچکاریاں بھر بھر کے تمام قصبے میں اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ہولی کھیلتا پھرتا۔ دیوالی آتی تو وہ اپنے باپ شریف علی کے لاکھ منع کرنے پر بھی تمام گھر کو چھوٹے چھوٹے دیوں سے روشن کر دیتا۔ شریف علی پھونک مار مار کر انہیں بجاتا جاتا اور وہ روشن کرتا جاتا۔ شریف علی جھنجھلا کر اسے مارنے دوڑتا اور سمجھاتا۔ ”دیکھو اب ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ سب کفر نہیں کرنا چاہئے!“ لیکن شباب علی نہ مانتا۔ جب شریف کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تو صغرا اسے الگ لے جا کر سمجھاتی۔ ماں کے سمجھانے پر شباب علی روتا جاتا اور ایک ایک دیا خود اپنی پھونکوں سے بجاتا جاتا۔ اپنی ماں کا کتا وہ کم ہی مانتا تھا۔

رام لیلا ہوتی تو شباب علی سواگ میں حصہ لیتا، کبھی بھجن بناتا، کبھی رام۔ رام لیلا کے میلے میں وہ اپنے تمام ہندو دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ شریک ہوتا۔ صغرا کسی طرح سمجھا بھا کر شریف علی کا غصہ ٹھنڈا کرتی اور کہتی۔ ”کیا ہوا بچہ ہے، سمجھ جائے گا۔ یہ تو دیکھ، تمہارے کتنے پر وہ کتنا چلتا ہے۔ کبھی ایک وقت کی نماز قضا نہیں کرتا، قرآن شریف بھی جی لگا کر پڑھتا ہے۔ اگر سال میں دو ایک دفعہ وہ یہ اودھم مچا لیتا ہے تو کون سی ایسی آفت آگئی!“ شریف علی یہ سن کر چپ ہو جاتا۔

ایسا نہیں کہ شباب علی اسلام سے متنفر تھا، وہ مزاجاً اسی طرح کا واقع ہوا تھا۔ پرجوم میلوں ٹیلیوں، تہواروں اور جہاں بھی سارے قصبے کی اجتماعی زندگی کا معاملہ ہوتا تو وہ اس میں پیش پیش رہتا۔ جس طرح وہ ہندوؤں کے میلوں، تہواروں وغیرہ میں دلچسپی لیتا تھا اسی طرح عید، شب برات اور مسلمانوں کے دوسرے تہواروں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ شباب علی عید پر اپنے تمام ہندو دوستوں کو بھی گھر بلاتا۔ بغیر ہندو مسلمان کی تخصیص کے وہ سب سے گلے ملتا پھرتا۔

شباب علی اس قصبے کی عام زندگی کی علامت تھا دراصل قصبے کی فضا یہی تھی کہ ہندو، مسلمانوں کے تہواروں پر چھٹی کرتے اور مسلمان ہندوؤں کے تہواروں پر ان کے ساتھ خوب رنگ رلیاں مانتے۔ جب سے شریف علی، مولوی فضل داد مرحوم اور قصبے کے بہت ہندو اور مسلمانوں کے پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور بہت سے ہندو دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان

کچھ کشیدگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر بھی کشیدگی کی یہ فضا کچھ گھرانوں تک محدود تھی۔ ان میں خاص طور پر وہ ہندو گھرانے شامل تھے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ انہی میں ایک گھر پنڈت گنگا پرشاد کے نو مسلم بیٹے شریف علی کا تھا اس نے ہندوؤں سے تعلقات منقطع کر لئے تھے اور ان کے تہواروں پر بھی ملنا ملانا شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک مرتبہ جمعے کے دن ہولی پڑی۔ شریف علی قصبے کی بڑی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے جا رہا تھا کہ اس کے ایک ہندو دوست گھنشیام نے صاف شفاف کپڑوں پر ایک رنگ کی پچکاری ماری۔ گھنشیام، شریف علی کے بچپن کا دوست تھا، شریف علی اس بات پر اتنا برہم ہوا کہ ایک بڑا جھگڑا ہوتے ہوئے رہ گیا۔ شریف علی نے گھنشیام سے ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کر لئے۔ گھنشیام کا خیال تھا کہ شریف علی لاکھ مسلمان ہو گیا ہے مگر اس کی دوستی کا خیال ضرور کرے گا، حسب معمول اس کے پیچھے بھاگے گا اور اسے رنگ میں نہلا دے گا، لیکن وہ شریف علی تھا۔ گھنشیام کی دوستی پیارے لال سے تھی جو کبھی کا مرچا تھا شریف علی نے اپنے اندر کے پیارے لال کا کلا گھونٹ دیا تھا اسی سبب اس نام کے ساتھ وابستہ تمام یادیں، محبتیں، تعلق اور رشتے بھی اس کے اندر مر چکے تھے۔ رد عمل ظاہر ہے۔ شریف علی کی اس برہمی پر گھنشیام رو پڑا اور اس نے اسی وقت اپنی پچکاری کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس ہولی پر پھر کسی نے اسے گھر سے نکلنے نہ دیکھا۔

قصبے میں اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے کسی مسلمان نے اس قدر شدید رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس واقعے کو لوگوں نے بھلا دیا پھر بھی اس کا ایک ہلکا سا نقش لوگوں کے دلوں پر ضرور رہ گیا۔ آئندہ ہولی کے تہوار پر انہوں نے تھوڑی احتیاط برتی تاکہ کوئی ایسا نا خوشگوار واقعہ نہ ہونے پائے جس سے لوگوں کے دلوں میں رنجش پیدا ہو۔ شباب علی کشیدگی کی اس فضا سے قطعی الگ تھا۔ ہولی ہو کہ دیوالی حسب معمول وہ برابر ہر تہوار پر ہندوؤں کے ساتھ شرکت کرتا۔ وہ خود کیونکہ ایک پنڈت گھرانے کا فرد تھا۔ اس لئے ہندوؤں کے رسم و رواج اور تہذیب و تربیت سے زیادہ واقف تھا۔

ہندو اور مسلمان دونوں ہی شباب علی سے خوش تھے، اگر کوئی اس سے ناخوش تھا تو صرف شریف علی۔ کچھ تو بیٹے کی محبت اور کچھ بیوی کے سمجھانے بھانے کے سبب وہ اب برلا خنگی کا اظہار نہیں کرتا تھا، دل ہی دل میں ضرور کڑھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع ہی سے شباب علی دہری شخصیت کا عادی ہو گیا۔ اس کی ایک اور دلچسپی تھی۔ وہ یہ کہ مسلمان ہونے کے باوجود سادھو سنتوں اور رشی مہاتما قسم کے لوگوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ اسی پسندیدگی کی وجہ سے ان کی محبت میں بیٹھنے کے مواقع بھی تلاش کرتا رہتا تھا۔ جب بھی قصبے میں اس طرح کا کوئی سادھو جو گیا لباس پہنے دکھائی دیتا، سب سے پہلے اس کی آؤ بھگت کرنے والوں میں شباب علی ہی ہوا کرتا تھا۔ میں نے حسن علی کے والد شباب علی کے بارے میں اس لئے اتنی تفصیل بیان کی کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ مجھے جس ماحول سے واسطہ پڑا، وہ اپنے اندر اور باہر سے کس طرح کا تھا۔

پنڈت گنگا پرشاد نے اپنی موت سے پہلے حسن علی کے متعلق جو پیش گوئی کی تھی، اس سے شباب علی کو اس وقت آگاہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ کسی قسم کے وہم یا خوف کا شکار نہ ہو۔ پنڈت کو مرے ابھی چھ ہی

مینے ہوئے تھے کہ شریف علی پر قانچ کا شدید حملہ ہوا۔ مشکل سے وہ صرف دو دن زندہ رہ سکا۔ مرنے سے پہلے اس نے بمشکل ایک ایک کر شتاب علی کو گزرے ہوئے تمام واقعات بتا دیے۔ اس نے شتاب علی کو بتایا۔ ”سنو بیٹا! تمہارے دادا پنڈت گنگا پرشاد نے اپنے مرنے سے پہلے تمہارے بارے میں ایک پیش گوئی کی تھی۔ میرا آخری وقت ہے اس لئے میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتا ہوں جو تمہارے دادا نے کہا ہے۔ غور سے سنو!..... سن رہے ہو نا؟“

”ہاں ابا! سن رہا ہوں“ کہہ دیں جو کہتا ہو۔“ شتاب علی نے جواب دیا۔

کچھ توقف کے بعد شریف علی نے پھر یوں شروع کر دیا۔ ”جس طرح تم میری واحد اولاد ہو اسی طرح پنڈت جی کی پیش گوئی کے مطابق تمہارا صرف ایک لڑکا ہو گا، لیکن وہ لڑکا پھر ان کے دھرم پر واپس آجائے گا، یعنی تمہارا بیٹا دوبارہ ہندو مذہب قبول کر لے گا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بھوانی دیوی کا باپ بھی پورا کرے گا۔ پنڈت جی اپنی زندگی میں یہ باپ پورا نہیں کر سکے تھے، پھر گویا تمہارا بیٹا، بھوانی دیوی کا داس ہو جائے گا۔ اس باپ کی تکمیل کے بعد وہ جس کے جسم پر چاہے بغض کر لے گا۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اگر خدا نخواستہ ایسا ہی ہو تو تم اپنے بیٹے کی بہت دیکھ بھال کرنا، شروع ہی سے اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنا۔ اس کی تربیت عین اسلامی ہونا چاہئے تاکہ وہ بڑا ہو کر ہمک نہ سکے۔ تم اس بات کا وہم نہ کرنا۔ میں نے صرف احتیاط کے طور پر تم سے بات کہی ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو کہ میرا پوتا ہندو ہو جائے اور بھوانی کا داس کھلائے۔“

شریف علی نے دو روز کے دوران میں تمام ہی گزشتہ واقعات بیان کر دیئے اور پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ شتاب علی کو باپ کی موت کا بے حد رنج ہوا۔ اس سے بھی زیادہ مغزا کو دکھ پہنچا۔ وہ اس دکھ کو تین مہینے سے زیادہ برداشت نہ کر سکی اور اللہ کو پیاری ہو گئی۔ موت سے قبل اس نے بھی شریف علی کی وصیت دہرائی اور تاکید کی کہ اپنے بیٹے کو شروع ہی سے اسلامی تعلیم کا نمونہ بنانا اور ہندو تہذیب کو اس کے پاس بھی نہ پھٹکنے دینا۔

اس خوف کی وجہ پنڈت گنگا پرشاد کی پیش گوئی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے، کیا ہونا تھا! حسن علی کا بچپن بہت سخت گزرا۔ اس پر طرح طرح کے پہرے تھے۔ بچپن ہی سے اسے روزے نماز کا پابند کیا گیا لیکن تقدیر کچھ اور ہی مغل کھلا رہی تھی۔ وہی شخصیت کا مالک شتاب علی اپنے باپ کی موت کے بعد پوری طرح آزاد ہو گیا۔ کوئی تنویر آتا، وہ تمام قصبے کے گھروں کے علاوہ شتاب علی کے گھر بھی آتا۔ اسے اپنی آزاد خیالی کے لئے کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ اسے اگر کوئی خوف تھا تو صرف یہ کہ حسن علی پر اس کا اثر نہ ہو۔

حسن علی کے ہوش میں جو پہلی ہولی پڑی تو اس نے دیکھا، شتاب علی بھوت بنا ہوا گھر میں گھس رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں رنگ پھینکنے کی پکڑی ہے۔ آتے ہی اس نے رنگ کی ایک پکڑی اپنی بیوی زینہ پر ماری جو اس وقت خود بھی رنگ گھولنے میں مصروف تھی۔ حسن علی اپنی ماں کے قریب بیٹھا پارہ کھولے مولوی صاحب کا دیا ہوا سبق یاد کر رہا تھا۔ اپنی ماں کو رنگ میں نہاتے دیکھ کر وہ خوشی سے تالیاں

بجانے لگا۔ زینہ نے بھی جواب میں شتاب علی پر رنگ پھینکا۔ حسن علی نے موقع غنیمت جان کر ماں کے گھولے ہوئے رنگ میں ڈوٹکا ڈبویا اور بھاگ کر جلدی سے شتاب علی کی پیٹھ پر ڈال دیا۔ شتاب علی نے اس کے ایک ہاتھ جڑ دیا اور بہت گھر کا کہ آئندہ کسی پر رنگ نہ ڈالنا۔ حسن علی رونے لگا روتے ہوئے وہ گھر سے باہر جانے والا تھا کہ زینہ نے اسے گھسیٹ لیا۔

”تو آج کے دن باہر نہیں نکل سکتا!“ زینہ بولی۔

باہر ہولی شتاب پر تھی۔ حسن علی نے ذرا ہوش سنبھالا تو اس بات کو سنجیدگی سے محسوس کیا کہ اسے دانستہ ان تقریبات سے دور رکھا جاتا ہے۔

اپنے والدین کے اس رویے سے اسے سخت کڑھن اور پریشانی ہونے لگی، ایک عجیب سی محض کا احساس اس کے اندر پرورش پانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب قید میں ہو۔ رفتہ رفتہ اسے اس قید و بند سے نفرت ہونے لگی۔ جس قدر اسے ان پابندیوں سے نفرت پیدا ہوتی گئی اسی قدر سختی برتی جانے لگی۔ اس سے حسن علی کے مزاج میں ایک خاص قسم کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی۔ پھر یہ کہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ دیوالی ہوتی تو خوب گھر سجایا جاتا، روشنی ہوتی۔ رام لیلا ہوتی تو شتاب علی اس میں حصہ لیتا، مگر حسن علی کو کسی تقریب میں شرکت کی اجازت نہیں تھی، سوائے مسلمانوں کے تنواروں کے۔ وہ بھی صرف گھر ہی گھر میں۔ اس سے یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ حسن علی کی نفرت کا رخ والدین کی طرف مڑ گیا۔ اب وہ مجبوراً ہی ان کا کہنا مانتا تھا۔ حسن علی پر وہ اور بھی سختی کرتے تھے۔ اگر ایک وقت بھی نماز قضا ہو جاتی تو باپ اسے مار مار کے سجا دیتا، ماں الگ لعنت ملامت کرتی اور بوڑھی ثانی اماں بھی سوائے نصیحتوں اور کمر دہانے کے کچھ نہ کرتی۔ ان سب کے علاوہ یہ کہ قصبے میں جب بھی کوئی سادھویا جوگی آتا تو شتاب علی کے گھر ہی ٹھہرتا، لیکن حسن علی کو اس سے ملنے یا قریب جانے کی قطعی اجازت نہ ہوتی۔

مجھے اب حسن علی کے جسم میں قید ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ میں نے اس عرصے میں تنگ آ کر کئی دفعہ فرار ہونے کی کوشش تھی کی، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ شتاب علی اور زینہ مجھ پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ حسن علی اب پندرہ سال کا تھا۔ فرار ہونے کی کوشش پر کئی بار شتاب علی نے مجھے بہت مارا مگر میری خود سری نہ گئی۔ میں بھلا ایک جن زاد ہو کر کس طرح یہ ظلم و ستم برداشت کر لیتا!

ایک دن میں زینہ سے اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں پر احتجاج کر رہا تھا کہ شتاب علی آگیا۔ میری بات اس نے بھی سن لی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے اس خاندان کے ماضی کا پوری طرح علم ہوا۔ شتاب علی نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور سمجھایا کہ اصل بات کیا ہے جس کے سبب مجھ پر اتنی نگرانی ہے۔ یہ وہی تمام واقعات تھے جو اس نے اپنے باپ شریف علی سے سنے تھے۔ آدم زاد کے جسم اور سرشت کا اثر اس جن زاد پر بھی پڑتا ہے کہ جو اس کے جسم میں ہو۔ سو حسن علی کی نفرت میرے اندر منتقل ہو گئی۔

اس روز کے بعد سے میں اور بھی سرکشی پر اتر آیا اور کئی کئی وقت کی نماز قضا کرنے لگا۔ شتاب علی نے اس پر میری خوب مرمت کی اس کا بھی مجھ پر الٹا اثر ہوا۔ پہلے میں اس کے خوف سے نماز قضا نہ کرتا اب نماز نہ پڑھنے کے بجائے ڈھونڈنے لگا، بہر حال اس طرح وقت گزر رہا تھا۔ میں کسی ایسے موقع کی تاک

میں تھا کہ کسی ہندو پنڈت سے مل کر بھوانی دیوی کا جاپ معلوم کروں تاکہ اس جسم کی قید سے رہائی مل سکے، مگر مجھے موقع نہیں ملا۔ پھر تقدیر نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ میں اس گھر سے فرار ہو سکوں خود میری کوششوں کو اس میں زیادہ دخل نہیں تھا۔

اس عرصے میں ایک سادھو اس قصبے میں آگیا۔ حسب معمول شتاب علی اسے اپنے گھر لے آیا۔ جب شتاب علی، سادھو کی بھولی اور کنڈل اٹھا کر اس کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہا تھا، میں گھر سے نکل رہا تھا۔ سادھو نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ اس کی نظر میں عجیب کشش سی تھی۔ اس کا حلیہ بھی عجیب تھا، گہرے کپڑے، ننگے پاؤں، ننگے سر۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال بے انتہا بڑھے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں تھیں اور گودا رنگ تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام سوامی اوم پرکاش تھا۔ لوگ اسے صرف سوامی جی کہتے تھے۔ اس نے مجھے دروازے سے نکلے دیکھا تو روکا اور کہا۔ ”بچہ! کدھر جاتا ہے! میری آشرवाद نہیں لے گا؟“

میں کھنچا ہوا سا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”بھگوان تجھے سکون سے رکھے۔“ اس نے مجھے آشرवाद دی۔ ”بہت جلد تیرے دن پھرنے والے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شتاب علی نے جلدی سے کہا۔ ”چلے مہاراج! اندر چلے! یہ تو بس ایسے ہی پاگل ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”چل جا! اپنا کام کر، عصر کی اذان ہو چکی ہے جلدی سے جا کر نماز پڑھ ورنہ جماعت نہیں ملے گی۔“

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں کہ تم بھی تو یہاں نماز قضا کر رہے ہو لیکن مجھے اس کے ہاتھوں پناہ نہیں تھا، سو خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ راستے میں مجھے سوامی کا خیال آیا۔ جب اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرا سارا ذہنی بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ میں ایک دم ہلکا چلکا سا ہو گیا تھا۔

☆=====☆

اس کے دوسرے دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہوا یوں کہ میں فجر کی نماز پڑھ کر آ رہا تھا اور سوامی شاید مندر سے پوجا کر کے لوٹا تھا۔ میں نے ایک شخص دھرم پال کو دیکھا۔ اس نے سوامی کے پیر چھوئے اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت سوامی ایک درخت کے قریب تھا اور وہیں رک گیا تھا۔

”مہاراج! میرے اوپر کپا (مہربانی) کیجئے۔“ دھرم پال نے کہا۔ ”میری ایک کنیا (بیٹی) ہے جس کا مجھے اسی مہاساکھ میں دواہ (شادی) کرنا ہے، پر پلے کچھ نہیں۔ دان دیچ کہاں سے لاؤں گا؟ مہاراج کپا درشنی (نظر کرم) ہو جائے تو بیڑا پار لگ جائے۔“ یہ کہہ کر دھرم پال رونے لگا اور سوامی کے قدموں پر گر گیا۔

سوامی بولا۔ ”اٹھ دھرم پال! بھگوان تیری سائیتا (مدد) کرے۔ جا اور اس سامنے والے پیر کو خوب زور سے ہلا۔ جو پھول پتے گریں انہیں اپنی گود میں بھر کے ہمارے سامنے لا۔“

دھرم پال نے ایسا ہی کیا۔ وہ درخت کے قریب گیا جو ابھی چھوٹا سا ہی تھا۔ دھرم پال نے اسے پوری قوت سے ہلایا تو بہت سے پھول پتے گرے۔ دھرم پال انہیں اپنی قبض کے دامن میں سمیٹا رہا۔ جب وہ ایک ایک پھول اور پتا سمیٹ چکا تو سوامی کے پاس آیا۔

سوامی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشرवाद دی اور کہا۔ ”جا بھگوان نے تیری سن لی، لیکن سن! دان پن (خیرات و صدقہ) سے کبھی جی نہ چرنا، دیکھ تیری بھولی میں کیا ہے؟“

اب جو دھرم پال نے اپنی گود پھیلا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں بھی ان کے پیچھے دور کھڑا ہوا حیرت سے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ دھرم پال کی گود جو اہرات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پھر سوامی کے قدموں میں گر گیا۔ سوامی نے اسے اپنے قدموں سے اٹھا لیا۔

”جا اپنی کنیا کے ہاتھ پیلے کرا“ سوامی نے دھرم پال سے کہا۔ ”بھگوان تجھ پر اپنی کپا کرے۔“ یہ کہہ کر سوامی میرے گھر کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جن زادوں کی طرح کچھ آدم زاد بھی حیرت انگیز پراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ بہ ذات خود مجھے کئی بار اس کا تجربہ کا چکا تھا۔ میرے لئے اسی سبب پھول پتوں کا جو اہرات میں تبدیل ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی یقیناً سوامی بھی ایسے ہی باکمال آدم زادوں میں سے تھا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ سوامی سے بھوانی دیوی کے جاپ کا پتا کروں یا نہ کروں؟ اسی کے ساتھ میرے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں سوامی کو میری حقیقت کا علم نہ ہو جائے۔ وہ یہ نہ جان لے کہ حسن علی کے جسم میں دراصل ایک جن زاد قید ہے۔ میرا خیال تھا کہ سوامی نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس وقت گلی میں سوامی اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔

”حسن علی!“ اچانک سوامی نے مڑے بغیر مجھے مخاطب کیا۔ ”ہمارے سامنے آ جاؤ۔ ادھر ہمارے پاس آکر آشرवाद لو۔ تم سے ہمیں کچھ کہنا بھی ہے۔“

میں تو سمجھ ہی چکا تھا کہ وہ پنچا ہوا آدم زاد ہے، سو قدم بڑھا کر سامنے آ گیا۔ میں نے دھرم پال ہی کی طرح اس کے پیر چھوئے، مقصد اظہار عقیدت تھا۔ میں اسے اپنی دانست میں آلو بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بھگوان نے ہمیں یہاں تمہارے ہی کارخ (سبب) بھیجا ہے ورنہ ہم تو کن جن کی چوٹی پر بیٹھے رام نام چپ رہے تھے کہ بھوانی دیوی نے ہمیں درشن دیئے اور ہم سے کہا، سنو اوم پرکاش! ہم تمہیں آج اپنا ایک کاریہ (کام) سونپتے ہیں۔ ہمارے ایک داس کی آتما دیا کل (روح بے چین) ہے۔ وہ اس سے اسلام نگر میں ہے۔ تم اسے یہاں لے کر آؤ تاکہ وہ یہاں بیٹھ کر ہم سے دھیان لگائے اور ہمارے منتر کا جاپ کر سکے۔ وہ پنڈت گنگا پرشاد کی اولاد میں سے ہے اور اس کا نام حسن علی ہے۔ ہم تمہیں اتنی شکتی پراپت (طاقت فراہم) کر دیتے ہیں کہ تم آٹھ بیٹے ہی وہاں پہنچ جاؤ گے۔ سو بھوانی دیوی کے حکم پر ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم نے یہاں آکر دیکھا کہ تم جی جی بڑے دیا کل ہو۔ ادھر بھوانی دیوی تمہارے لئے دیا کل پیل۔ اس سے ہمیں موقع مل گیا کہ دو گھڑی تم سے اپنے من کی بات کر لیں۔“

سوائی کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا میں نے سوچا کہ شاید اب مجھے حسن علی کے جسم کی قید سے رہائی مل جائے گی۔ سوائی یہ نہیں جان پایا تھا کہ حسن علی کے جسم میں دراصل میں ہوں۔ یہ احساس میرے لئے باعث تقویت تھا۔

سوائی اب کہہ رہا تھا۔ ”کل پورن ماشی ہے۔ تم کل رات کو بارہ بجے مرگھٹ میں آجاؤ۔ تمہارے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہمارا سارا جیون بیت گیا“ پرتو بھوانی دیوی نے کبھی ہمیں اپنے درشن نہیں دیئے اور نہ ہمیں اپنا داس بنانا سونیکار (قبول) کیا۔ تم بھاگوان ہو کہ بھوانی دیوی نے تمہیں سونیکار یا پرتو مراضی ہو؟“

”سوائی جی! کیا آپ بھی میرے ساتھ ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”اوشیہ پچہ! اوشیہ! (یقیناً) ورنہ تم اکیلے کن جن چنگا کی چوٹی تک کس طرح پہنچ سکتے ہو!“

”میں ضرور آپ کے ساتھ جاؤ گا سوائی جی! ضرور!“

میرا جواب سن کر سوائی خوش ہو گیا اور بولا۔ ”ہم تمہارے اتر (جواب) سے پرسن (خوش) ہوئے۔ دھنیہ ہو، ہم نے ایک کاریہ پورا کیا کل رات بارہ بجے مرگھٹ میں پہنچنا بھولنا نہیں۔“ سوائی نے آخر میں تاکید کی۔

میں نے اسے یقین دلایا۔ ”نہیں مہاراج! یہ کس طرح ہو سکتا ہے!“

یہ سن کر سوائی اوم پرکاش ”اوم اوم“ اور ”بے بزرگ بلی“ کے نعرے مارتا ہوا، میرے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد میں قدم بڑھائے۔ میں ’سوائی کے ساتھ ساتھ دانستہ گھر میں نہیں گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے حسب معمول قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔ میں خوش تھا کہ آئندہ روز مجھے پابندیوں اور مجبوریوں سے نجات ملنے والی تھی۔ ایک سال کم نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں مجھے اپنی محبوبہ نرگس بھی متعدد بار یاد آئی کہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ مجھے اس نے بھی یاد کیا ہو گا کہ نہیں۔ میرے دوست یاسف پر کیا گزری ہوگی۔ ظاہر ہے کہ حکیم نبراس الدین جیسے لالچی شخص نے اسے مطب سے نکال دیا ہو گا۔ میں جس عرصے میں حکیم کے جسم پر قابض رہا اور جو کچھ اقدامات کئے حکیم پر ان کا کیا رد عمل ہو گا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں تو خود اپنے ہی عذابوں میں گرفتار تھا۔ اگر میں اس گھر سے کسی طرح فرار بھی ہو جاتا تو اس کا حاصل کیا ہوتا؟ اس طرح مجھے حسن علی کے جسم کی قید سے تو رہائی نہ ملتی ہاں گھر سے بے گھر ضرور ہو جاتا اور پھر یہ آدم زاد مجھ پر نہ جانے کیا کیا مزید ستم ڈھاتے۔ اول تو مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا اور اگر یہ موقع مل بھی جاتا تو میرے لئے آدم زادوں کی بستیوں میں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ جیسے تیسے میں وہ دن گزرا اور میں بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وقت میری دانست میں بہت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔

میں نے عشاء کی نماز ادا کی اور گھر آ گیا۔ حالانکہ میں جلد سونے کا عادی ہو چکا تھا مگر اس رات نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ میں خود بھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے چنگی کے گھٹنوں کی آواز گنتا رہا۔ ’نوب! دس گیارہ۔ میں نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ حسن علی کے والدین بے خبر سو رہے ہیں‘

لاٹین کی لوبست دھیمی ہے۔ میرے گھر سے مرگھٹ کا راستہ مشکل سے پندرہ منٹ کا تھا، مگر میں گیارہ بجے ہی بستر چھوڑ کر آہستہ اٹھ گیا۔ میں دبے قدموں ننگے پیر ہی اٹھ کر چل دیا تاکہ جوتے پن کے پٹنے سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔

صدر دروازے پر پہنچ کر میں نے دیکھا، کنڈی کھلی ہوئی تھی لمبے بھر کو مجھے خوف سا محسوس ہوا میں نے صدر دروازے کے قریب بنے ہوئے کمرے میں کھڑکی سے جھانکا۔ اس کمرے میں بھی لاٹین جل رہی تھی، مگر سوائی اوم پرکاش غائب تھا۔ یہ دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں نے سوچا، شاید سوائی میرا انتظار کر رہا ہو گا، مجھے بھی چلنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں گھر کے باہر گلی میں نکل آیا۔ میری ہلکی سی آہٹ ہی سے گلی کے کتے جاگ اٹھے۔ وہ مجھ پر بھونکنے لگے تو میں نے انہیں پکڑا اور وہ خاموش ہو گئے۔ مجھ سے وہ کسی قدر مانوس تھے۔ میں اپنی گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوا اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد گلیوں قصبے کے قبرستان تک پہنچ گیا۔ میں نے خاص کر ایسی گلیوں کا انتخاب کیا جن میں کتے نظر نہ آئیں تاکہ ان کے زیادہ بھونکنے سے بستی میں جاگ نہ ہو جائے۔

قبرستان کے قریب پہنچ کر مجھ پر ایک مرتبہ پھر خوف غالب آنے لگا۔ اس خوف کی اصل وجہ وہ جسم تھا کہ میں جس میں قید تھا۔ اس جسم کی عادات مجھ پر اثر انداز تھیں وہ بہر حال ایک پندرہ سالہ لڑکے کا جسم تھا اور لڑکا بھی ایسا کہ بچپن سے جسے دبا کر رکھا گیا تھا۔ اس وقت خوف کی ظاہری وجہ حسن علی کی ٹانگی تھی۔ اس کا انتقال کچھ ہی دن پہلے ہوا تھا اور اسے اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ وہ بے چاری بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی اور اکثر مجھے پٹنے سے بچاتی تھی، لیکن نصیحت کرنا نہیں بھولتی تھی۔ روزے اور نماز کی پابندی کے لئے تاکید کرتی رہتی۔ مجھے اسی لئے ٹانگی کی موت پر خوشی ہوئی تھی کہ چلو ایک نصیحت کرنے والا تو کم ہوا۔

میں نے ایک قبرستان کی طرف دیکھا اور پھر مجھے تھر تھری سی چڑھ گئی۔ یہ بھی حسن علی کے جسم کا اثر تھا ورنہ کسی جن زاد کو کیسا خوف! اسی خوف کے زیر اثر میں نے آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ اتنے میں زور سے ایک گھنٹے کی آواز آئی اور میں سمجھ گیا کہ ساڑھے گیارہ بج گئے۔

مرگھٹ اس قبرستان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے جلدی ہی یہ راستہ بھی طے کر لیا۔ اس وقت مرگھٹ کو دیکھ کر مجھ پر دوبارہ ہیبت سی طاری ہو گئی۔ بہر حال کسی طرح میں مرگھٹ کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت میں نے سوائی کی آواز سنی۔ ”حسن علی! تم آگے!..... ڈرو نہیں ادھر آجاؤ! میں یہاں ہوں۔“

میں نے سوائی کو اپنی دائیں جانب کھڑے ہوئے دیکھا۔ پورن ماشی! یعنی پورے چاند کی رات تھی۔ ہاتھوں طرف چاندنی چٹکی ہوئی تھی اسی لئے مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میں ’سوائی کے پاس کھڑا ہوا تو اس نے کہا۔“تم چلنے کو راضی ہو حسن علی؟“

”جی ہاں سوائی جی!“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”یہ جان کر ہمارے من کو بڑی شافقی ہوئی اور ہمارا ہر دے خوشی سے بھر گیا۔“ سوائی کہنے لگا۔

ایک سرور کی سی حالت مجھ پر جانے کتنی دیر مسلط رہی۔ جب مجھے پوری طرح ہوش آیا تو میں نے کہا کہ سوای کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ”جے بجرنگ“ کا نعرہ سنتے ہی گھبرا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ وقت صبح کے جھپٹنے کا سا تھا۔ میں نے دیکھا جہاں کھڑا ہوں اس کی بلندی سے ہزاروں فٹ نیچے گہرے گہرے کھڈ اور دادیوں کا سلسلہ سا ہے، چاروں طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں۔

سوای نے مجھے مخاطب کیا۔ ”بچہ! اب تم ایک نیا جیون شروع کر رہے ہو۔ تمہیں اس کے لئے لہان دینا تھا، سو تم نے دیا۔ اپنے ماما پتا سب کو تم نے تیاگ دیا اور بھوانی دیوی کا داس ہونا سونپنا کر لیا۔ غصہ ہو! بھگوان تمہیں ہمتی دیں۔ آؤ پہلے کچھ جل پان (ناشتا) ہو جائے۔“

پھر سوای نے میرا ہاتھ پکڑا لیا اور ہم آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی سے اترنے لگے۔

وہ ایک گہسا سی تھی جس میں سوای مجھے لے آیا۔ اندر گھستے ہی وہ مجھ سے بولا۔ ”بچہ! دیکھو یہ ہمارا خانہ ہے۔“

میں نے دیکھا کہ گہسا میں ایک بڑے سے بت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ اتنا بڑا بت اس گہسا میں کس طرح آیا ہو گا؟ گہسا اندر سے بہت اونچی اور چوڑی تھی، کمر اس میں داخل ہونے کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ مشکل سے دو آدمی بیک وقت اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا کہ اس بت کو وہاں کون لایا ہو گا؟ اتنے وزنی بت کو ہاں لانا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ کسی جن زاد کے لئے تو یہ ممکن تھا مگر آدم زاد کے لئے نہیں۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ سوای کی آواز سے چونک اٹھا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تم حیران ہو گے“ بھگوان یہاں کیسے آگئے، سو سوچو! بھگوان کے پاس جاؤ، تمہیں معلوم ہو گا کہ بھگوان نے انہی پتھروں سے جنم لیا ہے۔“

سوای کے کہنے پر میں ذرا ڈرا ڈرا اس بت کے قریب پہنچا جس کا سر اس گہسا کی چھت سے لگا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوا اپنے آپ کو بڑا حقیر سا سمجھ رہا تھا۔ بت کے قریب جا کر مجھے ایک بات کا درحساس ہوا کہ گہسا میں روشنی کہاں سے آرہی تھی؟ اب جو میں نے غور کیا تو دیکھا اس بت کے چہرے کی اطراف روشنی کا ایک ہالہ سا تھا جس سے تمام گہسا روشن تھی۔ اس کا سر بلندی پر تھا ورنہ مجھے وہ بڑے ضرور نظر آگئے ہوتے جو چہرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ بت دیوار سے بالکل جڑا ہوا تھا۔

نہج جا کر دیکھنے سے مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ اس بت کو کہیں سے وہاں لایا نہیں گیا بلکہ اسے گہسا ہی کی دیوار سے تراشا گیا تھا دیوار اور بت کے درمیان کوئی جوڑ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بت دیوار سے اگا ہوا۔

اس بت کو دیکھنے میں مجھ پر اتنی محویت طاری ہو گئی کہ مجھے یہ احساس نہ رہا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ بت اتنا بڑا تھا کہ میرا سر اس کے گھٹنے تک پہنچا تھا۔ حالانکہ اسے اس طرح بتایا گیا تھا کہ جیسے کوئی آگنی پالنی مارے بیٹھا ہو۔ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو بھگوان کہتا، میرے نزدیک پہلے

”جانتے ہو“ بھوانی دیوی کا داس بننے کے بعد تمہارے اندر کتنی ہمتی آجائے گی!..... پھر تم جس شر پر چاہو گے قبضہ کر سکو گے۔ جو شریر بھی تمہارے من کو بھائے گا، تم اس میں داخل ہو کر اسے اپنا سکو گے، چاہے وہ شریر کسی دیکتی (نر) کا ہو، چاہے وہ منٹ (آدی) ہو یا کوئی جانور! پھر تو اس کے لئے تمہیں کچھ کٹ ادیشہ بھونکنا پڑے گا۔“

سوای جو کچھ کہہ رہا تھا اس سے میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ یوں مجھے میری ایک جتنی صفت تو مل ہی جاتی۔ کیسی عجیب صورت حال تھی کہ قدرت نے ایک جن زاد کو جو صفات عطا کی تھیں، انہی کے حصول کی خاطر مجھے پھر سے جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی!

”تمہیں بھوانی دیوی کے منتر کا جاپ کرنا ہو گا۔“ سوای بتا رہا تھا۔ ”اس کے لئے تمہیں اپنے دھرم کو بھی تیاگانا (چھوڑنا) ہو گا۔ تمہیں ہندو دھرم کا پالن کرنا ہو گا۔ اگر تم ہندو دھرم کا پالن کرتے رہے تو تمہاری ہمتی کوئی نہ چھین سکے گا۔ اگر اس دھرم سے پھرنے کا دھار (خیال) بھی تم نے کیا تو بھوانی دیوی تمہاری ہمتی چھین لے گی۔ بولو تم اپنا دھرم تیاگنے پر راضی ہو؟“

نام ہی کو سہی، میں بہر حال اہل ایمان میں سے تھا۔ وقت اور حالات کے جبر نے مجھے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا کہ میں نے خیر دل سے تو نہیں، ہاں زبان سے اقرار کرنے میں کوئی دیر نہیں کی۔ میں، حسن علی کے جسم میں قید ہو کر آدم زادوں کے ظلم کا شکار تھا۔ اس ظلم سے چھٹکارا پانے کے لئے میں ہر شرط ماننے پر آمادہ تھا۔ پھر سوای نے جس صلاحیت کا اظہار کیا تھا کہ میرے اندر پیدا ہو جائے گی، اصل معاملہ اسی کا حصول تھا۔ میں نے حسن علی کے جسم پر نگاہ ڈالی۔ یہ جسم خوب صورت تو تھا مگر طاقت ور ہرگز نہیں تھا۔ اسی وجہ سے حسن علی کا باپ مجھے جس طرح چاہتا مارتا پینتا۔ میں اس کی مار سے بچنے تک کی ہمت نہ کر پاتا۔ حسن علی کے اس طرح نحیف و کمزور رہ جانے میں اس کے باپ شتاب علی کی مار اور خوف کو بھی بڑا دخل تھا۔ میں نے اسی لئے سوای کے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا۔ ”سوای جی! میں ہر شرط ماننے پر تیار ہوں آپ مجھے جلد از جلد بھوانی دیوی کے پاس لے چلے۔“

اتنا سنتے ہی سوای بولا۔ ”دھنیہ ہو بچہ، دھنیہ ہو!“ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ زور سے ”جے بجرنگ ملی“ کا نعرہ مارا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں، سوای اوم پرکاش کے ساتھ ہواؤں میں آسمان کی طرف اڑتا جا رہا ہوں۔ میرے سر پر سوای کا ہاتھ تھا اور آنکھیں دھیرے دھیرے ایک سمور کن خوشی سے بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر طرف تیز سنسنات سنائی دے رہی تھی، لیکن اس سے مجھے کوئی خوف نہیں لگ رہا تھا۔

اس وقت میری کیفیت ہوش اور بے ہوشی کے درمیان تھی۔ میرا دل ان لامحدود فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے ایک عجیب سی مسرت سے ہلکتا تھا۔ ایک ایسی خوشی کہ جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔

مجھ پر خواب کا سا عالم طاری تھا۔ نہ مجھے اس وقت یہ احساس تھا کہ میں ایک زندگی چھوڑ کر دوسری زندگی میں قدم رکھنے والا ہوں اور نہ یہ خیال تھا کہ میرے ساتھ ہی سوای اوم پرکاش بھی آسمان کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کر رہا ہے۔

بھی عجیب سی بات تھی اور اس وقت بھی یہی احساس مجھ پر غالب تھا۔ میں بغور بت کے چرے کی طرز دیکھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ اٹھا ہوا تھا، دوسرا ہاتھ گھٹنے پر رکھا تھا۔

”سوامی جی! یہ کس کا بت ہے؟“ اس بت کا اچھی طرح جائزہ لے کر میں نے سوال کیا۔

مجھے میرے سوال کا کوئی جواب نہ ملا تو میں نے پلٹ کر دیکھا اور دل دھک سے رہ گیا۔ سوامی جی! پرکاش غائب تھا میں ایک دم گھبرا سا گیا اور فوراً گھساکے دہانے کی طرف بڑھا۔ میں نے جیسے ہی گھبرا دہانے سے نکلنے کا ارادہ کیا، بت زور کی پھنکار سنائی دی۔ اب جو غور سے دیکھا تو بیچ راستے میں ایک کار سانپ کو پھن کاڑھے بیٹھا دیکھا۔ میں اگلے قدموں پھر گھبرا ہوا۔ بلاشبہ میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ سوچنے لگا، یہ کیا ماجرا ہے؟ سوامی کہاں گیا اور سانپ کب تک کھانا کھا رہا ہے؟ یہ بت برا ہوا۔ اب کیا ہو گا؟ نہ تو میرے پاس کچھ اوڑھنے بچانے کو ہے اور نہ کھانے پینے کو۔ کھانے خیال آتے ہی بھوک چمک اٹھی۔ مجھے یاد آیا کہ رات کو خوشی کے سبب میں نے کھانا بھی نہیں کھانا تھا دوسرے یہ خوف الگ تھا کہ ایک سانپ گھساکے دہانے میں موجود ہے، نہ معلوم کب وہ گھسا میں آجائے اور حملہ کر دے۔ کسی انسانی قالب میں قید ہو کر جن زاد بھی موت سے ہمتدار ہو جاتے ہیں، مجھے یہ علم اسی سبب سانپ سے مجھے خوف آرہا تھا۔ وہ حسن علی کو ڈس لیتا تو میں بھی مارا جاتا۔

گھسا میں بظاہر کوئی ایسی شے بھی نہیں تھی کہ جس سے میں اپنی مدافعت کر سکتا۔ مجھے خیال آیا، میں نے سوامی کی باتوں میں آکر یقیناً غلطی کی ہے۔ اس طرح میں نے خود اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اہل ایمان ہو کر مجھے کفر کے راستے پر قدم نہیں رکھنا چاہئے تھا۔

میں اسی لمحے میرے پیروں کے نیچے زمین بہت زور سے ہلنے لگی اور پھر قیامت کا شور سنائی دیا۔ میں اس وقت کھڑا ہوا تھا، ڈر کر فوراً بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں کانوں میں، میں نے انگلیاں ٹھونس لیں، مگر کچھ تھا کہ اب بھی میرے کانوں میں گھسا جا رہا تھا جیسے بجلیاں کڑک رہی ہوں۔ مجھے ایک دفعہ ایسا لگا کہ بچہ گھساکے چھت مجھ پر گرنے والی ہو۔ میری نگاہ بت کی طرف اٹھی اور منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ بت میرے اوپر گر رہا تھا۔ میں نے آخری چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

پھر جو میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، سوامی مجھ پر جھکا ہوا ہے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ سوامی نے کہا۔ ”وشرام کرو! وشرام! بھگوان تم پر اپنی دیا کریں۔ تم نے کیا دھار کیا تھا اپنے من میں؟“

اب میں نے اطراف پر نگاہ کی تو نہ وہ گھسا تھی، نہ وہ بت، نہ وہ ماحول! میرے سر پر کھلا آنا تھا۔ دن پوری طرح نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے سوامی کو بتایا کہ اس کے جاتے ہی مجھ پر کیا گزری۔ مگر زلزلے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر میں، سوامی کو اس کی وجہ بتاتا بھی کیا کہ خود لاعلم تھا۔

سوامی بولا۔ ”بھگوان تم سے نہ جانے کیوں ایسا ہوا، میں نے دیکھا کہ تمہیں ایک پل بھی اپنے رکھنا سونیکار نہیں کیا۔ پھر بھی کیوں کہ تم بھوانی دیوی کا جاپ کرنے آئے تھے۔ تمہیں انہوں نے نقد نہیں پہنچایا اور جیتا چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی کارن اوشر ہے۔ تم یاد کرو کہ جس۔

زمین ملی تو تمہارے من میں کیا دھار آیا؟“ سوامی کے کہنے پر مجھے دھیان آگیا کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے باوجود سوامی کو میں نے پوری بات نہیں بتائی اور صرف اپنے بچتاوے سے آگاہ کیا کہ یہاں آکر برا کیا۔ ”اوشیہ اوشیہ یہی کارن ہو گا۔“ سوامی نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ورنہ بھگوان آج تک کسی سے اس طرح نہیں روٹھے۔“

”مگر آپ کہاں چلے گئے تھے سوامی جی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم کہاں جاتے! ہم تمہارے بھوجن کے لئے گئے تھے۔“ سوامی نے جواب دیا۔

کھانے کا ذکر سن کر میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے اور میں نے کہا۔ ”سوامی جی! کہاں ہے کھانا؟ مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اگر کچھ گوشت مل جائے تو کیا اچھا ہو!“

اس پر سوامی ایک دم بول اٹھا۔ ”پاپ!..... مہاپاپ! ایسا دھار بھی اب کبھی من میں نہ لانا اب تمہیں (گوشت) نہیں کھا سکتے، پرنتو ہم نے تمہارے من بھاتے بھوجن کی آگیا بھوانی دیوی سے لے لی ہے۔ لو اٹھو، تمہیں کھجوریں بہت پسند ہیں۔ یہ کھجوریں خاص طور پر تمہارے لئے بھرے سے منگوائی گئی ہیں اٹھو!“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو ایک پتے پر صرف تین کھجوریں رکھی تھیں اور چھوٹی سے ایک پیالی میں دو گھونٹ دودھ تھا۔ یہ دیکھ کر میرا جی بہت کڑھا کہ لو یہ ہے کھانا! اس سے کیا خاک پیٹ بھرے گا۔ مگر میں نے اس کا اظہار سوامی سے نہیں کیا اور ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ پھر دوسری کھجوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انہیں بھی میں اپنی دانست میں اٹھا کر کھا گیا۔ اب پیالی کے دودھ کو میں نے پینا چاہا۔ جیسے ہی میں نے پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا، میری نظر اس پتے پر پڑی جس پر سے کھجوریں اٹھا کر کھائی تھیں۔ میں نے اپنے منہ میں کھجوروں کا ذائقہ محسوس کیا اور حیرت سے پتے پر رکھی ہوئی کھجوروں کو دیکھنے لگا۔

مجھے حیرت زدہ دیکھ کر سوامی کہنے لگا۔ ”اچنہانہ کر پچ! یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے۔ کھا اور پیٹ بھر کے کھا۔ دودھ پی اور پیٹ بھر کے پی۔ جو دیکھتا ہے، اس کے دھوکے میں نہ آ۔ ان آنکھوں پر دھواں (تھین) چھوڑ دے اور آتما (روح) کی آنکھیں کھول۔ سب کچھ تو جان جائے گا۔ ابھی تجھے بہت کچھ پراپت (حاصل) کرنا ہے۔“

میں نے سوامی کے ہمت بندھانے پر دودھ کی پیالی اٹھائی اور منہ سے لگالی۔ دودھ بہت مزیدار اور میٹھا تھا۔ میں گھونٹ پر گھونٹ پیتا گیا یہاں تک کہ خوب سیر ہو گیا اور پیالی پھر زمین پر رکھ دی۔ دیکھا تو پیالی جوں کی توں دودھ سے لالباں بھری ہوئی تھی۔ میں نے کچھ کھجوریں اور کھائیں، اوپر سے پھر دو چار گھونٹ ”دودھ پیا۔“

اب میں بالکل شکم سیر ہو چکا تھا۔ سوامی بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہارے شریر میں خلقی آگئی ہوگی اور تم چلنے کے یوگ (قابل) ہو۔ سو آؤ چلو! میں تمہیں بھوانی دیوی کو سونپ آؤں۔ دیوی نے

میرے سپرد جو کاریہ کیا تھا سو یوں پورا ہو جائے گا۔

”چلئے!“ میں نے کہا، پھر معلوم کیا۔ ”اور وہ سانپ کا کیا معاملہ تھا؟ میں نے لاکھ چاہا کہ گھبرا نکل جاؤں مگر وہ راستے میں اس طرح پین کاڑھ کر بیٹھا تھا کہ میں گھسا سے نہ نکل سکا۔“

اس پر سوای نے بتایا۔ ”وہ تو ناگ دیوتا تھے۔ ہم کو یہ جانکاری تھی کہ تم ہمیں نہ پا کر گھبرا نکلنے کے پائے (طریقے) سوچو گے۔ سو بھی نے انہیں اس کاریہ لگا دیا تھا کہ وہ تمہیں گھسا سے نہ نکل دیں۔ سو ایسا ہی ہوا، پرنو تم نے اپنے من میں غلط دھار کر کے بھگوان کو دکھ پہنچایا۔ بھوانی دیوی کے کار بھگوان نے تمہیں چھما کر دیا ورنہ بھسم کر دیتے۔“ یہ کہہ کر سوای اٹھا اور مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہلا۔ اب ہم پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر سوای رک گیا۔ یہ ایک تنگ سارا راستہ تھا اس کی ایک طرف گہری کھائی تھی، ہزاروں فٹ گہری! سیدھے ہاتھ کی جانب بہت جھوٹی سی ایک پگڑی اندر کو جاری تھی، پہاڑ کے اندر ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی بڑے غار کے دہانے پر کھڑے ہوں۔ بائیں طرف ہزاروں فٹ گہری کھائی کو دیکھ کر میرا دل دھل گیا۔ ہر حال وہ بہت خطرناک جگہ تھی۔

”اچھا بچہ، اس سے آگے جانے کی ہمیں آگیا نہیں ہے۔“ سوای نے مجھ سے کہا۔ ”تم اب ایک ہی آگے جاؤ گے۔ تمہاری سیدھی طرف جو یہ راستہ دکھائی پڑتا ہے، یہی تمہیں بھوانی دیوی تک لے جائے گا۔ ہمیں اگر آگیا (اجازت) ہوتی تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے، پرنو ایسا نہیں۔ تم چٹنا (فکر) نہ کرنا، بھگوان تمہاری سہایتا کریں گے۔“ یہ کہتے ہی سوای نے ”بے بزرگ بلی“ کا نمرو لگایا اور میری آنکھوں نے عجیب و حیرت ناک منظر دیکھا۔

سوای ہزاروں فٹ گہری کھائی کے اوپر سے اڑتا ہوا دوسری پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ میں بڑا دیر تک بھونچکا سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کسی آدم زاد کو میں نے یوں اڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سوای دوسری پہاڑی کے پیچھے جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس وقت میرا دل طرح طرح کے دوسوں اور خدشات کا شکار تھا۔ اب میں وہاں تنہا رہ گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس ماحول کا جائزہ لیا جو میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ دل سے ہر خوف کو جھٹک کر میں نے سوای کے بتائے ہوئے تنگ راستے پر قدم رکھا اور گے بڑھا۔ ابھی میں کچھ ہی دور چلا ہوں گا کہ آگے راستہ روشن سا ہے۔ میں پہاڑ کے اندر ہوں۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا روشنی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ مجھے ہر شے واضح نظر آنے لگی۔

وہ واقعی ایک پہاڑی سرنگ تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ آگے بڑھتے ہوئے مجھے کسی ٹھن کی احساس نہیں تھا۔ روشنی جیسے اس سرنگ کی دیواروں سے پھوٹ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہلکی اور خواب ناک سی دودھ روشنی سرنگ میں دور تک چلی گئی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ پھر مجھے یوں لگا کہ روشنی کی حد ختم ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اب روشنی سٹ کر صرف سرنگ کی زمین تک محدود ہو گئی ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ یہ ٹھنڈک ناقابل برداشت نہیں تھی۔ دودھیا روشنی کی دھار بہت آگے جا کر سرنگ کی سطح میں جیسے اترتی جا رہی تھی۔ میں اس جگہ تک پہنچنے کے لئے جلدی جلدی چلنے لگا۔

لگا۔

اب میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے کی دھیمی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور کوئی عجیب سی ٹانوس خوشبو بھی میرے اندر اتر رہی تھی۔ اس خوشبو کی مثال کسی اور خوشبو سے نہیں دی جا سکتی۔ گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ ایک دھیمی لے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کچھ ہی دیر کے بعد اس جگہ پہنچ گیا جہاں دودھیا روشنی کو کسی دھار کی صورت میں اترتے دیکھا تھا۔ وہاں نیچے اترنے کے لئے مجھے پتھرلی بڑھیاں نظر آئیں۔ گھنٹیوں کی آواز اب گھٹنے بجنے کی آوازیں میں بدل چکی تھی۔ یہ آواز میڑھیوں کے نیچے سے آ رہی تھی۔

میں میڑھیاں اترنے لگا۔ اب خوشبو پہلے سے زیادہ تھی۔ میڑھیاں اتر کر میں ایک بہت بڑے گول سے ہال میں پہنچ گیا۔ بڑے بڑے ستون بہت اونچائی پر جا کر اس گول کمرے کی چھت سے مل گئے تھے یہ پتھرلی ستون بھی گول اور پتھنے تھے۔ انہیں بھی میں نے دائرے کی صورت میں دیکھا۔ ستونوں کے دائرے میں داخل ہو کر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

بڑے سے ایک چبوترے پر گول اور سڈول سی ایک عورت بیٹھی تھی، پالتی مارے ہوئے۔ اس عورت کے آٹھ ہاتھ تھے سر پر کوئی تاج سا رکھا ہوا تھا جو جگمگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی اطراف بھی روشنی کا ہالہ تھا۔ اس ہالے میں عورت کا کالا سیاہ چمک دار چہرہ بہت بھیاںک اور ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی کالے تھے۔ اس کے کسی ہاتھ میں سکھ، کسی ہاتھ میں ترشول، کسی میں تلوار تھی۔ یہ ہاتھ باقاعدہ حرکت بھی کر رہے تھے۔ اس سے مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی۔ میں اسے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ مجھے کسی اور شے کا احساس ہی نہ تھا، نہ خوشبو کا، نہ روشنی کا اور نہ گھٹنے بجنے کا جو چھت سے لٹکے ہوئے تھے اور خود بخود بج رہے تھے۔

میری یہ تمام حیرت اور یہ سب کچھ دیکھنا چند لمحوں کا عمل تھا۔ میرے ذہن کے نماں خانوں میں یہ ایک خیال ضرور تھا کہ یہ کوئی شیطانی چکر ہے اور وہ عورت بدی کی نمائندہ ہے۔ میں نے اس خیال کو فوراً ہی اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ کہیں پھر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

اچانک اس سیاہ عورت کے ہونٹوں میں جنش ہوئی اور میں نے ایک غیر انسانی سی آواز سنی۔ وہ ٹھنی سے مخاطب تھی۔ ”بھوانی نے تمہیں سو بیکار کیا۔ جاؤ ہم سے دھیان لگاؤ اور ہمارا پالن کرو! جب تم ہمارا پورا کر لو گے تو ہم تمہیں ہفتی پراپت کر دیں گے۔ جاپ کے شبد (الفاظ) اور گیان سویم (خود) ہم ہیں۔ بھوانی نام جپو، اس سے تک جپو جب تک تمہاری آتما پوتر (پاک) نہ ہو جائے۔ اس سے کا اور چھوڑ نہیں، پرنو تمہیں کسی اور منشیہ کے سامان اس کی چٹنا نہ ہوگی کہ تمہارا شریر کس حال میں ہے! نہ ہی تمہیں کچھ کھانے پینے کی آؤگھٹنا (ضرورت) ہوگی۔ بھوانی تمہاری آتما اور شریر کی رکشا (حفاظت) کرے گی۔ پر دیکھو جب ہم سے دھیان لگاؤ تو کوئی اور دھار من میں نہ لانا۔ اس سے یہ ہو گا کہ تم کشت بھوگئے سے بچ رہو گے۔ تمہیں دوسرے دیوی دیوتا کوئی کشت نہ دے پائیں گے۔ تم سے بزرگ دیوتا پہلے ہی اٹھ چکا ہے۔ اسے ہم نے شانت کر دیا ہے تم آگے کی طرف دیکھو یہ راستہ تمہیں اس امتحان تک لے

جائے گا جہاں بیٹھ کر تم ہمارا نام چو گے، یہ راستہ جہاں ختم ہو تم وہیں بیٹھ رہنا۔ بھوانی کا داس ہونا تمہیں سہل (کامیاب) بنا دے گا۔ ہماری آخیر داد تمہارے ساتھ سدا رہے گی، اگر تم نے ہندو دھرم اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا اور ہمارا پالن کرتے رہے۔ آؤ، ہمارے چہروں میں آجاؤ۔ آج سے تم وہ نہیں رہے جو تھے۔ تم بھوانی دیوی کے داس ہو اور کچھ بھی نہیں۔ تمہیں داس ہونے کا یہ امتحان اس سے ملے گا کہ جب تم جاپ پورا کر لو گے۔ ہمارا من جب بھی تمہارے جاپ سے شانت ہو گیا، ہم تمہیں تمہاری جگہ کے بدلے عقیقی پراپت کر دیں گے۔ سکھی رہو، سدا سکھی رہو!"

ان الفاظ میں ایک عجیب جادو سا تھا۔ مجھے ان لفظوں کے سوا کچھ بھی یاد نہ رہا۔ میں کون ہوں کیا ہوں، یہاں کیوں آیا ہوں، میرا فشا کیا ہے؟ یہاں تک کہ میں یہ بھی بھول گیا کہ ایک جن زاد ہوں میں بے خودی کے سے عالم میں بھوانی دیوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نہ جانے کس طرح اس تک پہنچا اور اس میں کتنی دیر لگی، مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہاں یہ ضرور خبر ہے جب میں نے بھوانی دیوی کے پیروں کو چھوا تو میرے جسم کو کرنٹ سا لگا۔ میں نے اپنے سر پر کوئی ہاتھ محسوس کیا۔ انہی لمحات میں مجھے ایک بار بار بھوانی دیوی کی غیر انسانی آواز دی۔ "بھوانی کے سوا سب کچھ بھول جاؤ، بھول جاؤ کہ جب تک جاپ پورا نہ کر لو!"

اس آواز کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی میرے ذہن سے کچھ کھینچ رہا ہو ایک ایک کر کے بہت سے منظر میری آنکھوں میں آتے جاتے، مگر ان سب کا تعلق مجھ سے نہیں، حسن علی کی زندگی سے تھا۔ رفتہ رفتہ ہر خیال میرے ذہن سے نکل گیا۔ اب میرے ذہن میں بھوانی دیوی کے سوا کچھ نہیں تھا مجھے بس اتنا یاد رہ گیا کہ میں بھوانی دیوی کا داس ہوں اور مجھے جاپ پورا کرنا ہے۔ میں، بھوانی دیوی کے پیروں کو چھو کر ذرا پیچھے ہٹا اور "ہے بھوانی دیوی" کا نعرہ لگایا۔ گھنٹے خود بہ خود زور زور سے بجنے لگے پھر میرے قدم خود ہی دائیں جانب اٹھ گئے۔ وہیں سے میزبیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میرا دل بھوانی دیوی کے سوا ہر جذبے سے خالی تھا۔ میں نے میزبیاں ملے کیوں اور ایک سرنگ میں داخل ہو گیا۔ یہ سرنگ بھی روشن تھی اور دور تک چلی گئی تھی۔ میں اس میں آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ روشنی دھیمی پڑنے پڑنے لگی، معدوم ہو گئی۔ اب نیم تاریکی سی تھی اور اس کے آگے اندھیرا۔ مجھے اب خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نیم تاریکی کے بعد اس اندھیرے سے بھی میں گزر گیا۔ اب میں ایک تنگ راستے پر چل رہا تھا۔

رفتہ رفتہ پھر مجھے ہلکا سا اجالا محسوس ہوا مگر یہ اس روشنی سے مختلف تھا جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آہستہ آہستہ میں پوری طرح اجالے میں آ گیا سرنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں باہر نکلا۔ آگے راستہ نہیں تھا مگر کھائی تھی۔ میں آگے بڑھا اور نیچے دیکھا ہزاروں فٹ گہری کھائی میرے سامنے تھی۔

یہ ایک ایک زور دار آواز سے میں چونک اٹھا۔ اب جو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نہ وہاں سرنگ تھی نہ کوئی راستہ۔ وہ تو پتھر کی دیوار سی تھی۔ وہاں بمشکل اتنی جگہ ہو گی کہ میں پانی مار کے بیٹھ سکتا ہوں ہو سکتا، دائیں بائیں یا کسی اور طرف بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ سامنے، کھائی تھی۔ میں آلتی پالتی مارا وہیں بیٹھ گیا۔ میرے سامنے پہاڑوں کے سلسلے تھے اور درمیان میں وہ تہری کھائی تھی۔

صورت حال دیکھ کر خوف کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ زندگی کی طرف واپسی کے لیے سارے دروازے میرے لئے بند ہو چکے تھے۔

کچھ دیر تک میں خوف کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے بھوانی دیوی کا جاپ مکمل کر لیا تو حسن علی کے جسم سے آزادی مل جائے گی۔ معاً اسی وقت پھر بھوانی دیوی کے الفاظ گونجنے۔ جیسے کوئی میرے ہی اندر بیٹھا کہہ رہا ہو۔ "ہم سے دھیان لگاؤ اور ہمارا جاپ کرو، بھوانی نام چند..... بھوانی نام چند!"

میں فوراً ہی بھوانی دیوی کے نام کا جاپ (دور) کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے نہ وقت کا احساس رہا نہ کسی اور شے کا۔ میں تو بس آلتی پالتی مارے بھوانی نام چپ رہا تھا۔ دن تمام ہوا، رات آئی میں اسی طرح بھوانی کا نام چپا رہا۔ پھر دن ہوا، پھر رات آئی۔ نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں یونہی آتی جاتی رہیں اور میں جاپ کرتا رہا۔ مجھ پر ایک بے خودی سی طاری ہوتی گئی۔ شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ عجیب بات یہ کہ نہ میرے ذہن میں کوئی اور خیال آیا، نہ ہی مجھے اپنے جسم میں کسی کمزوری کا احساس ہوا، نہ مجھے بھوک پیاس نے ستایا۔ اس کے بجائے مجھ میں ایک عجیب سی قوت آگئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ہلکا پن سا، ایک بے خودی سی، ایک سکون بخش خواب سا، ایک بے نام لذت سی تھی۔ نہ جانے میں کب تک اسی کیفیت میں رہا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ نہ جانے کب ایک آشناس آواز نے مجھے اس کیفیت سے باہر کھینچ لیا۔ یہ آواز مجھے اپنے وجود سے، اپنے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ "جاؤ سہل ہو گیا، بھوانی نے تجھے اپنا بنالیا، تجھے عقیقی پراپت کر دی جا بھوانی نے تجھ پر اپنی دیا کی، تجھے سونکار کیا تیرا جاپ سہل (کامیاب) ہوا۔"

اس کے بعد میرا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا میں نے آنکھیں کھولیں تو وہی وقت تھا جب میں یہاں آسن مار کے بیٹھا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔ دھیرے دھیرے تمام یادیں میرے ذہن میں جیسے جاگ اٹھیں۔ میں نے اپنی اطراف نگاہ ڈالی۔ راستہ کہیں نہیں تھا۔ سامنے اسی طرح وہ کھائی موجود تھی۔ نیچے پہاڑ کی دیوار تھی میں نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا مگر مجھے یہ جان کر عجیب سا احساس ہوا کہ میں ہلنے سے بھی قاصر تھا۔ میں صرف دیکھ اور سوچ سکتا تھا، سننے کی صلاحیت بھی مجھ میں موجود تھی۔

میرے نچلے دھڑ کو دیکھ لگ چکی تھی۔ میں نے ذرا کوشش سے گردن اُدھر اُدھر گھما کر اپنے جسم کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ ہڈیوں کا ایک پنجر سا ہے جو نیچے سے تقریباً گل چکا ہے۔ میرا دھڑ اور دونوں پیروں بالکل بیکار ہو چکے تھے۔ ہاتھ بھی جس طرح رکھے تھے اسی حالت میں اکڑ کر سوکھ گئے تھے۔

چند لمحوں گزرے تھے کہ میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پرندہ اڑ کر گیا اور پھر پرندوں کی ایک ڈار کی ڈار اڑی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میرے اندر جناتی صفات موجود تھیں تو کس طرح فضا میں پرواز کرتا تھا۔ اگر میں جن زاد نہ بھی ہوتا، پرندہ ہی ہوتا تو ان واویلوں اور پہاڑوں پر کیسا منزلاتا پھرتا! میں سوچنے لگا۔ کسی نے مجھے پھر میرے اندر سے مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو یہ ممکن ہے۔ تو نے، ہمارا جاپ پورا کر لیا۔ اب تو جس شریر پر چاہے قبضہ کر سکتا ہے اور جسے چاہے چھوڑ سکتا ہے، جس شریر میں چاہے جا سکتا ہے۔"

اپنی ہلکی پہچان۔ پرتو ایک شریر چھوڑ کر دوبارہ تو اس میں نہیں جاسکتا۔
اب بھی میرے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ ”وہ شریر چاہے کسی منشیہ کا ہو“ چاہے کسی چرند پرند یا درندے کا تو اس کے اندر داخل ہو سکتا ہے۔ تو اب بھوانی دیوی کا داس ہے۔ ہم نے تجھے ہلکی پراپت کر دی ہے۔ اب یہ تیری مرضی ہے کہ تو اسی شریر میں رہے یا کسی اور منشیہ یا کسی چرند پرند کے شریر میں۔“

یہ الفاظ سنتے ہی جیسے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے پھر اپنے سڑے گلے جسم پر لگا کر اور پوری قوت سے ”جے بھوانی دیوی“ کا نعرہ مارا۔ اسی کے ساتھ مجھے لگا کہ میں ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا جسم چھوڑ چکا ہوں۔ سامنے سے ایک پرند اڑ کر جا رہا تھا میں نے اس کا خیال کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ہواؤں میں تیر رہا ہوں۔ میں آخر حسن علی کے جسم کی قید سے آزاد ہو ہی گیا۔ اب میں ایک پرندے کے جسم میں تھا۔

خود بخود میرے پر ہوا کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے بڑھتے بڑھتے میں ایک دفعہ پھر پلٹا۔ مجھے ایک عجیب سی خوشی اور رنج کا ملا جلا سا احساس ہو رہا تھا۔ میں سمٹ کر کتنا سا ہو گیا۔ پلٹ کر میں نے اس پہاڑی کا پکڑ لیا۔ پہاڑی میں مجھے ایک جگہ ڈھانچا سا رکھا دکھائی دیا۔ میں اڑ کر اس انسانی ڈھانچے کے قریب پہنچا اور ڈھانچے کے برابر بیٹھ گیا۔ مٹا مجھے خیال آیا، یہ تو میں نہیں ہوں۔ پھر میں کہاں ہوں؟ پرندے کے جسم میں، مجھے وہ حسن علی کا جسم نہ لگا کہ جس میں ایک عرصے میں قید رہا تھا۔ وہ تو ایک سزا سزا یا ڈھانچا تھا۔ میں نے اس پر بیٹ کر دی اور وہاں سے اڑ گیا۔

حسن علی کا جسم چھوڑنے اور پرندے کے جسم میں داخل ہونے تک مجھ پر ایک اور حقیقت منکشف ہو چکی تھی۔ یہ حقیقت بھی میرے لئے نئی اور ایک طرح سے عجیب اور الم انگیز ہی تھی۔ میں اب کسی جن زاد کی طرح فضا میں پرواز کرنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ مجھے کسی نہ کسی جسم کے سہارے کی ضرورت بہر حال تھی۔ حسن علی کا جسم چھوڑتے ہی میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ پھر میں فوراً ہی پرندے کے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی جسم کے بغیر بھی میں جی سکتا ہوں، جاننے کے لئے مجھے اس پرندے کا جسم چھوڑنا پڑا۔ ”جے بھوانی دیوی“ کا نعرہ لگا کر میں پرندے کے جسم سے باہر آ گیا۔ وہ صرف چند ہی لمبے تھے جو مجھے پر قیامت بن کر گزر گئے۔ پرندہ فضا میں فلاپا بایاں کھاتا ہوا پہاڑی سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بے جان اور مردہ ہو چکا تھا اب میں سمجھا کہ کسی جسم میں دوبارہ داخل کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں جس جسم سے نکل آؤں، وہ زندہ نہیں رہ سکتا جب دم زیادہ گھٹنے لگا اور میرے لئے یہ حالت ناقابل برداشت ہو گئی تو میں ایک اور پرندے کے جسم میں گھس گیا کہ وہاں دور دور تک کوئی اور جاندار نہیں تھا۔

میری منزل کہاں تھی؟ اس سوال کا جواب خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔ ایک خیال سا یہی آیا کہ میں ملتان جاؤں۔ کیا خبر یاسف اب بھی وہیں ہو! پھر مجھے لاہور کا دھیان آیا، اسی کی ساتھ اپنی محبوبہ زرگس یاد آگئی۔ معلوم نہیں کہ میں جہاں تھا، وہاں سے ملتان یا لاہور کتنی دور تھے! میں یوں ہی بے مقصد بہت دیر تک اڑتا رہا۔ دور دور تک پہاڑی سلسلوں کے وہاں کچھ بھی نہ

تھا۔ آدمی تو درکنار کوئی جانور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بلا ارادہ ایک سمت میں اڑنے لگا۔ اپنی پرواز میں نے نیچی کر دی ابھی میں تھوڑی ہی دور اڑاں ہو گا، مجھے نیچے بہت نیچے ایک پہاڑی کے دامن میں کچھ حرکت سی نظر آئی۔ میں نے ایک غوطہ کھایا اور پھر فلاپا بایاں کھاتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ مجھے اب نیچے صاف دکھائی دیتے لگا تھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑا چلا جا رہا ہے۔

میں اس شخص کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا۔ اپنی اڑاں بھی میں نے ذرا نیچی کیں۔ وہ شخص جوان تھا، بہت خوب صورت۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا چکلا سینہ، گورا رنگ، سر پر گڑی بندھی ہوئی اور کاندھے پہ بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ بہترین شہسوار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہر ادا مجھے بہت بھائی۔ میں نے اپنی چونچ کھول کر ”جے بھوانی دیوی“ کا نعرہ مارا جو بہت کچھ ”قتل قیں“ سے ملتا جلتا تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں اس پرندے کا جسم میں نے چھوڑ دیا اور اس نوجوان گھڑ سوار کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اس گھڑ سوار کو ایک جھرجھری سی آئی، مجھے حسب معمول چند لمبے کھٹکن کا احساس ہوا اور پھر اس جسم میں قرار آ گیا۔ میں نے گھوڑے کی لگائیں ذرا کھینچیں اور پھر پیچھے دیکھا پرندے کا جسم مردہ ہو کر نیچے گر رہا تھا۔

پتھریلی زمین میرے گھوڑے کے سموں سے ایک خوش آہنگ آواز پیدا کر رہی تھی۔ میں نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ وہ شخص خدا جانے کون تھا۔ میرا گھوڑا اسی رفتار سے دوڑتا رہا کہ اچانک پہاڑی کا موڑ آیا اور میں نے فائزنگ کی آواز سنی جیسے تیز تیز گولیاں چلنے لگی ہوں۔ میں نے لگائیں کھینچیں مگر گھوڑا نہ رکا۔ میں ابھی اسی سوچ میں ہی تھا کہ کیا کروں، اپنے پیچھے مجھے گھوڑوں کی دوڑنے کی آواز سنائی دی، جیسے کئی گھوڑے بہت تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے میرے قریب آ رہے ہوں۔

اچانک ایک فائر ہوا، شوں اوں! گولی میرے کان کے برابر سے نکل گئی۔ میرا گھوڑا بہت زور سے بدکا۔

دوسرا فائر ہوا اور مجھے ایسا لگا کہ آگ کا ایک خنجر سا میرے بازو میں اتر گیا ہو۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس مرتبہ گھوڑا اور زور سے بدکا۔ گھوڑے نے ایک دم زقندیں بھرتا شروع کر دیں۔ اب گھوڑا میرے قابو سے باہر تھا۔ میں نے فوراً ہی لگائیں چھوڑ دیں اور اس کی گردن سے پلٹ گیا۔ فائزنگ کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں، مگر گھوڑا اب بھی میرے قابو سے باہر تھا۔ میں اسی طرح گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ گھوڑا آندھی طوفان کی طرح کسی نامعلوم سمت میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ہاروں طرف اونچی نیچی چٹانوں کے ناموار سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔ پتھریلی زمین میں گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے تھوڑی دیر میں محسوس کیا کہ گھوڑے کی رفتار کچھ کم ہو رہی ہے۔ اس کی گردن چھوڑ کر میں نے دوبارہ باگیں تھام لیں۔

راتے سے میں نادانف تھا۔ مجھے کہاں جانا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں سے میں گزر رہا ہوں؟ اس کا مجھے علم ہی نہ تھا۔ مجھے تو بس یہ خبر تھی کہ میں کن چٹان کی چوٹی سے چلا تھا۔ اس کے

بعد دو پرندوں کے جسم چھوڑنے کے بعد یہ جسم اپنایا تھا۔ پرندوں نے کتنا سرفٹے کیا اور پھر اس گھوڑے نے اپنی طوفانی رفتار سے اس عرصے میں کتنا سرفٹے کیا، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ گھوڑا اب بھی تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے ایک تنگ سے درے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے بائیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ گھوڑا کدھر جاتا ہے۔ وہ گھوڑا مجھے سدھا ہوا لگتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد گھوڑا واقعی اس تنگ درے میں داخل ہو گیا۔ درے کی دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ کچھ دور دوڑ کر گھوڑا ایک جگہ رک گیا۔ درہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ نہ وہاں آدم تھا نہ آدم زاد۔ میں حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ابھی میں گھوڑے کی پشت سے اترنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خیال آیا، اگر گھوڑا مجھے اس جگہ ایسا چھوڑ کر بھاگ لیا تو میں کیسے کانیں رہوں گا۔ تو پھر یہاں رک کر بھی کیا کیا جائے۔ یہ سوچ کر میں نے گھوڑے کو آگے بڑھانے کے لئے باگوں کو حرکت دی، مگر گھوڑا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا وہ زور زور سے ہنسا کر اپنا اگلا پیر ایک پتھر پر مارنے لگا، گھوڑے نے کئی بار ایسا ہی کیا میں اس کی یہ حرکت بغور دیکھتا رہا۔ میرے خیال میں گھوڑے کی اس حرکت کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور تھے، لیکن کافی دیر انتظار کے بعد بھی مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر گھوڑے کو آگے بڑھانے کی کوشش میں اس کی لگام ہلائی اور پسلیوں پر بھی گھٹنوں کا دباؤ ڈالا مگر اس بار پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ گھوڑے نے ہنسا کر اسی پتھر پر پیر مارا اور آگے نہ بڑھا۔

مجبوراً میں گھوڑے سے اترا اور اس پتھر کو غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس عرصے میں گھوڑے کی لگام نہیں چھوڑی۔ مجھے ایسا لگا کہ اس پتھر کو دانستہ وہاں رکھا گیا ہے۔ زمین کی سطح سے وہ کچھ ابھرا ہوا سا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اسے انسانی ہاتھوں نے کیسے کیسے سے تراشا بھی ہے۔ پتھر بیضی شکل میں تراشا گیا تھا، بظاہر وہ پہاڑی کا حصہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں اس پتھر کا جائزہ لینے میں ایسا سو ہوا کہ گھوڑے کی لگام چھوڑ کر اس پر جھک گیا۔ میں نے دیکھا کہ پتھر کی دائیں طرف لوہے کا چھوٹا سا گول کنڈا لگا ہوا ہے۔ میں نے اس کنڈے میں اپنی دونوں انگلیاں ڈال دیں اور اسے حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جیسے ہی ذرا سا زور لگا کر اسے اوپر اٹھایا، بہت زور کی مرکز گراہٹ سنائی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے پیروں کی زمین نیچے سے کھسک رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر کنڈے سے انگلیاں نکالیں اور اس جگہ سے اچھل کر دور کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر قبل جہاں میں کھڑا تھا، اس کی داہنی جانب ایک بہت بڑے غار کا دہانہ سامنہ دار ہو گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس میں جھانکا، مجھے اپنے کندھے پر گرم گرم سانس محسوس ہوئے۔ گھوڑا خود بخود چل کر میرے پاس آ گیا تھا۔ میں پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چاہا کہ اس چکر میں نہ پھنس کر کسی اور طرف نکل چلوں، معلوم نہیں اس غار میں کیا ہے؟ لیکن جیسے ہی میں گھوڑے پر سوار ہوا وہ بلا جھجک اس نیم تاریک سے غار میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔

پتا نہیں وہ غار تھا یا شیطان کی آنت، ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ گھوڑا دوڑتا رہا اور میں اس کے رحم و کرم پر بائیں ڈھیلی کئے سواری کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے کچھ روشنی کا احساس ہوا۔ ہاں وہ

روشنی ہی تھی۔ غار میں اور روشنی؟ مگر یہ کسی بلب بالائین کی روشنی نہیں تھی، دن کی روشنی تھی۔ میں اب بالکل روشنی میں تھا۔ سامنے مجھے دور تک چھوٹی بڑی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چاروں طرف بڑی بڑی پہاڑیاں تھیں جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بظاہر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پہاڑوں سے گھری ہوئی پہاڑ نما سی یہ وادی بڑی سرسبز و شاداب نظر آ رہی تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی جہاں میری آنکھوں کو بہت بھلی لگی۔ اس کے درمیان چھوٹے بڑے جھونپڑے بھی خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ جنگلی پھولوں پر ناچتی ہوئی سنہری کرنوں کی جالیاں مجھ سے قریب آگئی تھیں۔ میں نے دیکھا، میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے جیسے ان جھونپڑیوں میں زندگی آگئی ہو۔ ہر جھونپڑے سے عورتیں، بچے اور بوڑھے نکل رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزرتا رہا۔ وہ سب چیخ چیخ کر مجھ سے جانے کیا پوچھ رہے تھے۔ ہاں ایک لفظ بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہا تھا، سردار! اس وقت میرا گھوڑا جھونپڑیوں کے درمیان دوڑ رہا تھا بچے، بوڑھے اور عورتیں دو طرفہ کھڑے ہوئے ہاتھ ہاتھ ملا کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

سردار؟ یہ سردار کون ہے؟ میں نے سوچا، تو کیا یہ کوئی قبیلہ ہے؟ کیا اس قبیلے کا سردار یہ جسم ہے جس میں اس وقت میں ہوں؟ میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہے تھے کہ گھوڑا بڑے سے ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا۔ جھونپڑے کے در پر ایک سفید ریش بوڑھا اور ایک بوڑھی عورت کے علاوہ ایک نہایت حسین لڑکی بھی کھڑی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال ہو گی۔ میرے گھوڑے کے رکتے ہی وہ بڑی بڑی نشلی آنکھوں والی لڑکی سب سے پہلے بھاگ کر قریب آگئی اور مجھے گھوڑے سے اترنے میں مدد دینے لگی۔

میں جیسے ہی گھوڑے سے اترا اس نے چیخ کر کہا۔ ”بھیا! میں پہلے ہی منع کر رہی تھی کہ آج نہ جاؤ، مگر تم نہ مانے۔ تائی! یہ دیکھو بھیا کے ہاتھ پر خون جما ہوا ہے۔“ اس لڑکی نے جسے تائی کہہ کر پکارا تھا، وہ بوڑھی عورت گھبرا کر آگے بڑھی اور ”میرا چاند“ کہتی ہوئی مجھ سے پٹ گئی۔

اسی وقت بوڑھے کی کڑک دار آواز گونجی۔ ”رنجیت کی ماں! ہٹو! اسے جلدی سے اندر لے چلو اور مرہم پٹی کرو!..... اے سریتا! پانی گرم کر!“

میں اس عرصے میں اپنے بازو کی تکلیف کو بالکل بھول ہی گیا تھا، مجھے یاد آیا کہ جس وقت میرا گھوڑا بدک کر بھاگا تھا، ایک سنسناتی ہوئی گولی میرے بازو کو چھو کر گزر گئی تھی۔ میں گھوڑے سے اتر کر اندر جھونپڑے میں داخل ہو رہا تھا کہ پیچھے سے ایک شور سنائی دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بہت سے بوڑھے، عورتیں، لڑکیاں اور بچے جھونپڑے کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ سفید ریش بوڑھا جو جھونپڑے میں داخل ہو چکا تھا، باہر آیا اور اپنی گونجیلی آواز میں سب کو مخاطب کیا۔ ”ابھی چلے جاؤ۔ سردار زخمی ہے۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

بوڑھے کی آواز سن کر تمام مجمع چھٹ گیا۔ بوڑھا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اندر لے آیا۔

وہ جمونپڑا اندر سے کافی کشادہ تھا۔ جگہ جگہ جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پیالہ کاہت نرم و گداز بستر بچھا ہوا تھا جس پر مجھے لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بڑی بڑی لیشلی آنکھوں والی لڑکی کرم پانی لے آئی جسے بوڑھے نے سریتا کہہ کر پکارا تھا۔ لڑکی میرے ہاتھ کا زخم دھونے لگی۔ سفید ریش بوڑھا سامنے ایک تخت پر بیٹھا میری بندوق صاف کر رہا تھا۔ بوڑھی عورت جمونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی گئی تھی۔

میری مرہم پٹی ہو گئی۔ سریتا نے خود میرے جوتوں کے بند کھوئے اور انہیں اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اتنے میں بوڑھی عورت گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ لے کر آگئی۔ میں اٹھا اور پیالہ اس کے ہاتھ سے لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ بوڑھا اس عرصے میں بندوق صاف کر کے ایک کھوئی سے لٹکا چکا تھا۔ وہ میرے بستر پر آگے بیٹھ گیا۔ اس نے میرے سر کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیر کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔ ”ہاں بیٹے اب بتاؤ معرکہ کیا رہا؟ باقی لوگ کہاں رہ گئے؟“ میں یہ سن کر لمبے بھر کر چکرا سا گیا۔ کیا معرکہ اور کیسے لوگ؟ کیا میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے؟ ممکن ہے، رہے ہوں، مگر میں اس بات سے ناواقف تھا۔

میں نے غور سے بوڑھے کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسی وقت میرے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا یہی کیفیت بوڑھے کی ہوئی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھا تھا، مجھے محسوس ہوا جیسے میں اس بوڑھے کا ذہن پڑھ سکتا ہوں۔ پھر میں اس کا ذہن پڑھنے لگا۔ میرے لئے یہ بالکل ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ ایک جن زاد کی حیثیت سے کبھی مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ بوڑھا اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کی جھڑپ یقیناً پولیس سے ہو گئی ہے اسی کے نتیجے میں رنجیت زخمی ہو گیا ہے اور اپنی جان بچا کر کسی طرح اپنے ٹھکانے تک پہنچ گیا ہے۔ میں پڑھتا رہا۔ تو میں اس وقت جس شخص کے جسم میں ہوں، اس کا باپ یہ بوڑھا ہے۔ اس جسم کا نام رنجیت سنگھ ہے جو اس سفید ریش بوڑھے کے بعد گردہ کا سردار بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ مجھے ایک بات کا علم ہوتا گیا۔ اس بستی میں تقریباً سو سو گھر تھے۔ ان میں تقریباً دو سو ڈھائی سو مرد تھے، جوان! یہ ڈاکوؤں کا ایک بڑا منظم گروہ تھا۔

میں ڈاکو رنجیت سنگھ ہوں۔ خوب! میں نے سوچا یہ نام بہت مشہور تھا۔ اس کے بارے میں یہ افواہ بھی تھی کہ وہ مرچکا ہے۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخیاں لگی تھیں کہ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔ حقیقت یہ پہنچی کہ رنجیت سنگھ کے بچپانے گرفتار ہونے کے بعد خود کو رنجیت سنگھ ظاہر کیا تھا۔ اسی کو رنجیت سنگھ سمجھ کر پھانسی دے دی گئی تھی۔ سریتا کا باپ وہی تھا۔ اس کی بیوی نے شوہر کے غم میں خود کشی کر لی تھی۔ اس واقعے کو کچھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد سریتا کی عمر اس وقت دس گیارہ سال ہو گئی۔ پھر بوڑھے تایا اور تائی ہی نے اسے پالا تھا۔ میرا دھیان سریتا کی طرف چلا گیا تو بوڑھے کے ذہن سے توجہ ہٹ گئی۔

مجھے اور بوڑھے، دونوں کو ایک جھٹکا سا لگا بوڑھا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اور بولا۔ ”مجھے کیا ہو

میا تارنجیت؟ کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا؟“
”نہیں تو پتا چلی!“

”پتا چلی؟“ بوڑھے نے حیرت سے کہا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے! مجھے تو تو بایا کتا ہے۔“
”ہاں، بابا! بابا!“ میں جلدی سے بولا۔

”میں تجھ سے پوچھ رہا تھا بیٹے کہ معرکہ کیا رہا؟ کیا ہمارے کچھ لوگ مارے گئے؟ اور بچ جانے والے کہاں رہ گئے؟“ بوڑھے نے پھر مجھ پر سوالوں کی یلغار کر دی۔

میں ابھی اسی سوچ میں تھا، کیا جواب دوں کہ جمونپڑے سے باہر مجھے شور سنائی دیا، اسی کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بھی آئیں۔

چند ہی لمحوں بعد چار پانچ نوجوان تقریباً بھاگتے ہوئے جمونپڑے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور مجھے دیکھ کر بولا۔ ”سردار! بھگوان کی دیا سے آپ بچ گئے۔ یہ جان کر میں بہت خوش ہوں۔ ہم سب تو آپ کے نہ ہونے سے ڈر ہی گئے تھے۔ رام سرپ نے آپ کے گھوڑے کو ایک سمت بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہم نے سوچا، یقیناً آپ بچ کر نکل گئے۔“ یہ کہہ کر وہ نوجوان سر جھکائے خاموش کھڑا ہو گیا۔

اتنا سننا تھا کہ سفید ریش بوڑھا غضب ناک ہو کر ایک دم اٹھا اور چیخ کر مجھ سے کہا۔ ”رنجیت! یہ کیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟ جواب دے تو نے میدان کو پیٹھ کیوں دکھائی؟ تو کیوں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اس طرح بھاگ آیا؟ بول! ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میں نے اپنی پوری زندگی سرداری کی، مگر کبھی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اس طرح نہیں بھاگا اور..... اور تو نے بھی تو پہلے کبھی ایسا نہیں کیا!..... پھر اب ایسا کیوں کیا؟ جواب دے، کیا تیرے بدن میں ہمارا خون نہیں؟ بول! خاموش کیوں ہے؟“ بوڑھا گرجتا رہا۔ اس کے چہرے سے شدید غصے اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

بوڑھے کی بات سن کر پیچھے کھڑا ہوا ایک نوجوان آگے آگیا اور بولا۔ ”مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیں۔“ وہ بوڑھے سے مخاطب تھا۔

”ہاں کہہ، تجھے کیا کہنا ہے؟“ بوڑھا بدستور پوچھتا رہا۔

”بڑے ٹھاکرا! وہ نوجوان نرمی سے بولا۔ ”اس میں سردار کا کوئی دوش نہیں۔ پولیس نے اچانک ہم پر حملہ کیا اور ہم سب تہمت ہو گئے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے سردار کو فائرنگ کرتے دیکھا ہے، مگر ایک مرتبہ ان کا گھوڑا بہت زور سے بدک گیا اور قابو میں نہ آیا۔ سردار اس کی گردن سے لپٹ گئے اور وہ انہیں یہاں لے آیا۔ اس میں سردار کا کیا قصور؟“

اس نوجوان کی بات سن کر بوڑھا تھوڑا ٹھنڈا پڑ گیا، مگر قدرے خفگی سے کہنے لگا۔ ”رام سرپ! تو ٹھیک کہتا ہے، مگر کیا تمہارے سردار کو اب مجھے دوبارہ گھوڑے کی سواری سکھانا پڑے گی؟ کیا یہ ایک گھوڑے کو بس میں نہیں کر سکتا تھا؟ ہم نے سینکڑوں منہ زور گھوڑے سیدھے کر دیئے۔ ہمیں تو اس کی گھڑسواری پر ناز تھا۔ پھر اسے کیا ہو گیا؟“

اس پر آگے کھڑا ہوا نوجوان بولا۔ ”وقت وقت کی بات ہے بڑے ٹھاکر! کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“

سفید ریش بوزھا کچھ کہتے کہتے رکا، پھر نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا جیت کر پولیس کو کس طرح اس ڈاکے کے اطلاع مل گئی؟..... یقیناً کسی نے خبری کی ہے! آج کوئی دس برس کے بعد یہ پہلا ڈاکہ ہے جو تم لوگ ناکام لوٹے ہو اور پہلے ہی سے پولیس کو تمہاری خبر لگ گئی۔ ضرور ہیکر گزب ہوئی ہے۔“

میں اس عرصے میں اٹھ کر ٹھٹھنے لگا تھا اور پیچھے کھڑے ہوئے جوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر پسینے کے قطرے سے جھپکنے لگے۔ وہ مجھے کچھ گھبراہٹ گھبراہٹ سا معلوم ہوا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ایک جھپکنے کے ساتھ پھر مجھے ایسا لگا جیسے اس نوجوان کا ذہن میرے لئے کھلی کتاب ہے۔

میں نے اپنے ذہن میں سوال کیا، کون ہے یہ؟

مجھے اس سوال کا جواب فوراً مل گیا، میرا نام کرتا ہے۔

ہوں! تو اب میں ذہنوں سے سوال بھی کر سکتا ہوں، میں نے سوچا اور اس نوجوان کا ذہن نکلنا شروع کر دیا۔

وہ اس وقت سوچ رہا تھا، بھگوان، کسی طرح یہ نہ پتا چل جائے کہ میں نے پولیس سے خبری کی ہے ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے اور پانچ ہزار روپے کا بھاری انعام جو سردار کو زندہ یا مردہ پکڑوانے پر حکومت نے مقرر کیا ہے، اس سے محروم ہو جاؤں گا۔

تو یہ ہے وہ شخص کہ جس نے پولیس سے خبری کی ہے!

مجھے جواب ملا، ہاں۔

میں نے اس کے ذہن سے سوال کیا، تم کب اس مردہ میں شامل ہوئے؟

ایک سال پہلے۔ جواب ملا۔

میں نے پھر اپنے ذہن میں سوال سوچا، تمہیں یہاں کون لایا؟

جواب آیا، خود سردار رنجیت سنگھ۔ میں انہیں پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا ملا تھا۔ میں نے سردار سے کہا تھا کہ میں خونیں ہوں۔ میں نے کئی قتل کیے ہیں اور جیل سے بھاگ کر آیا ہوں۔ میرے جسم پر اس وقت قیدیوں کے کپڑے تھے اور پاؤں میں بیڑیوں کے کتے ہوئے کڑے پڑے تھے۔ سردار مجھے یہاں لے آئے۔ چھ مہینے مجھے یہاں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی اور آخر کار سردار نے مجھے ایک ڈاکے میں اپنے ساتھ لے لیا۔ میں نے سردار کے ساتھ اس کے بعد کئی ڈاکوں میں نہایت بہادری سے لوگوں کو قتل کیا۔ سردار کا اعتبار مجھ پر بڑھ گیا پھر مجھے اکیلے بھی باہر آنے جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ اجازت مجھے ابھی ایک مہینے پہلے ملی تھی۔ اس مرتبہ میں نے موقع پا کر پولیس کو ڈاکے کی اطلاع دے دی، اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ڈاکو رنجیت سنگھ کن کن راستوں سے گزرے گا۔ مجھے خود پولیس نے یہاں بھیجا تھا اور جیل

کے کپڑے بھی فراہم کئے تھے اس لئے میں حراست میں نہیں لیا گیا۔ پولیس نے مجھ سے واپس جانے کو کہا، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ بھگوان نہ کرے رنجیت سنگھ اس مرتبہ بھی بچ کر نکل گیا تو پھر آئندہ تم ہمیں اطلاع دے سکو گے، میں نے ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی ٹھکانے کا پتا نہیں بتایا۔

لیکن آخر کیوں؟ تم نے پولیس کو یہاں کا پتا کیوں نہیں بتایا؟ میں نے پوچھا، اس میں کیا مصلحت تھی؟ اور پھر انہوں نے تم سے پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ دریافت کیوں نہیں کی؟

مجھے جواب ملا، میں نے ان سے جھوٹ بول دیا۔ ان سے کہا کہ ابھی سردار کو میرے اوپر اعتماد نہیں اس لئے ایک خاص جگہ کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تھی اور پھر وہاں سے مجھے ایک اور فص کھوڑے بٹھا کر لے جاتا ہے۔ میں نے یہ جھوٹ اس لئے بولا کہ پولیس کے ارادے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ پولیس حکام نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر رنجیت سنگھ کے ٹھکانے کا سراغ مل جائے تو اس جگہ کو بمباری کر کے اڑا دیں میں بھلا یہ کیسے گوارا کر لیتا!

کیوں؟ تمہیں یہ کیوں گوارا نہ ہوتا؟ تم ایسا کیوں نہیں چاہتے؟ جواب دو! میرے ذہن نے پھر اس کے ذہن کو حکم دیا۔

اس کا جواب تھا کہ اس طرح اگر وہ تمام وادی کو بم سے اڑا دیتے تو..... تو سردار کی چچا زاد سرتیا بھی ماری جاتی جس سے میں عشق کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں اس کی جدائی برداشت نہ کر پاتا، میں نے سوچ لیا تھا کہ سرتیا کو ساتھ لے کر یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا، دور بہت دور، جہاں یہ گھٹاؤنی زندگی نہ ہو، قتل و غارت گری نہ ہو! اس کا اظہار میں، سرتیا سے بھی کر چکا ہوں اور وہ میرے ساتھ چلنے پر تیار ہے۔ وہ اس کے لئے مجھ سے بار بار تقاضا کرتی ہے۔ میں اسے ٹال دیتا ہوں۔

اس موقع پر میں نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔ میں نے اس سے سرتیا کو ٹالنے کی وجہ پوچھی تھی۔

مجھے اس وقت کا انتظار ہے جب میں ڈاکو رنجیت سنگھ کو زندہ یا مردہ پکڑا دوں۔ کرتار کے ذہن نے جواب دیا۔ مجھے اس طرح انعام کی رقم مل جائے گی۔ پھر میں، کہیں اور کسی جگہ جا کر سرتیا کے ساتھ سکھ جمن کی زندگی گزار سکوں گا۔

اچانک میرے کانوں میں بہت زور کی آواز آئی اور میں چونک اٹھا۔ کرتار کے ذہن سے میرے ذہن کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ یہ آواز بوڑھے کی تھی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا ”رنجیت! تو کیا تم صم کھڑا ہے! تمہارے کچھ ساتھیوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے اور ابھی وہ جیل میں نہیں پہنچے بلکہ تھانہ گڑوال ہی میں قید ہیں۔ ان کے لئے کچھ سوچنا ہے، مگر تو تو ایسا شخص ہوا ہے کہ کچھ بولتا ہی نہیں۔ میں ہی ان لوگوں سے ہاتھ تاجھ کر رہا ہوں! یہ آج کیا ہو گیا ہے تجھے؟

میں نے پلٹ کر ایک نظر سب کو دیکھا۔ سرتیا سامنے کھڑی ہوئی بڑی میٹھی نظروں سے کرتار کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک میں نے رام سروپ اور وہاں موجود دوسرے نوجوان کو حکم دیا۔ ”کرتار کو پکڑو! اسے فوراً

باندھ کر ڈال دو!"

یہ سنتے ہی کرتار پر جیسے بجلی گر گئی۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے بندوق پر ہاتھ ڈالنا چاہا، مگر قہر کھڑے ہوئے نوجوان اس پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے کرتار کی بندوق چھین کر اس کی مشکلیں کس دیں۔ یہ دیکھ کر سریتا چیخی۔ "بھیا! یہ تو نے کیا کیا؟"

میں کڑک کر بولا۔ "خاموش رہ اور شرم کر! میری بھول کا انجام میرے سامنے ہے۔ اس نے..... اس کرتار نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور ساتھ ساتھ تیری آنکھوں میں بھی کیا تو اپنے بھیا کے خون سے اپنے سرے کے گلاب کھلانا چاہتی ہے؟ کیا تیرے جھوٹے پیار کی قیمت تیرے بھائی کا سر ہے؟ وہ سر کہ جسے بچانے کی خاطر میرے چاچا نے اپنی جان دے دی! جواب دے، کیا تو اس بزدل کینے پولیس کے مخبر کے ساتھ بھاگنا چاہتی تھی؟ بول!"

"رہنچتے! کیا بک رہا ہے؟" سفید ریش بوڑھا چیخ اٹھا۔ "اپنی زبان کو لگام دے! تو میرے سوردگ باٹل (جنت مکانی) بھائی کی بیٹی اور اپنی بہن پر الزام لگا رہا ہے! تو کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا؟ سریتا مجھے تیری ہی طرح پیاری ہے!"

میں نے غیر جذباتی آواز میں کہا۔ "نہیں بابا! میں پاگل نہیں ہوا۔ خود کرتار سب کچھ قبول دے گا۔"

سریتا سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "بھیا! یہ نہیں ہو سکتا۔ کرتار ایسا نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں۔ بول تاکرتار کہہ دے تاکہ یہ سب جھوٹ ہے کہ تو نے مخبری کی ہے۔ بولتا کیوں نہیں!"

"تو اندر جا سریتا!" بوڑھا بول اٹھا۔ "ہم ابھی سب کچھ معلوم کیے لیتے ہیں۔ رام سروپ! میرا ہنرلا۔ میں اس کی کھال گرا دوں گا۔ مار کر اس کا بدن ادھیڑ دوں گا۔ اسے اپنی زبان سے اقرار کرنا پڑے گا کہ رہنچتے نے جو کچھ کہا ہے، سچ ہے۔"

سریتا روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ رام سروپ نے بوڑھے کو چمڑے کا ہنر تھما دیا۔ بوڑھے نے، جیسے ہی تیل میں بھیگا ہوا ہنر گھمایا، کرتار چیخا۔ "نہیں نہیں، مجھے مت مارو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا! بالکل سچ۔ مگر..... تمہارا پیار جھوٹا نہیں۔ میں..... میں نے سریتا سے سچی محبت کی ہے، بالکل سچی! اور اب مجھے پیسے کا لالچ بھی نہیں۔ میں، سریتا کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، اپنے ماں باپ، اپنی چھٹی زندگی، سب کچھ! مگر مجھے مارو مت!" یہ گویا کرتار کا اعتراف جرم ہی تھا۔

بوڑھے کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آگیا۔ وہ ہانپتا ہوا پیال کے بستر پر گر گیا۔ باقی تمام لوگوں کو جیسے چپ لگ گئی۔ پھر رام سروپ نے اس خاموشی کو توڑا۔ "سردار! مبارک ہو۔ آج آپ نے کمال کر دیا۔ ہمیں تو اس پر دور تک شک نہیں تھا۔ پھر یہ آپ کا چیتا بھی تھا۔ ہم کیا کہتے! آپ تو جانتے ہی ہیں مخبر کی سزا سوائے موت کے کچھ نہیں اب آپ چاہیں تو ہم اسے اسی وقت گولی مار دیں یا....."

"نہیں!" بوڑھے نے رام سروپ کی بات کاٹ دی۔ "اسے کل بڑے میدان میں سب کے سامنے میں گولی ماروں گا۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بہتی والوں کے سامنے اسے گولی ماری جائے گی تو

نہیں بھی عبرت ہوگی کہ مخبر کا انجام کیا ہوتا ہے!" اسی وقت سریتا جھونپڑے کے اندر دھکی گئی۔ نکلے اور بوڑھے کے پیروں سے لپٹ گئی۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "بابا! اب..... اب کرتار ایسا نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں۔ اسے معاف کر دے۔"

بوڑھا کڑک کر بولا۔ "تو..... تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنے گھر میں سانپ پاؤں؟..... نہیں، ہرگز نہیں! اگر تو نے کچھ کہا تو میں تجھے بھی گولی مار دوں گا!..... رنجیتے کی ماں! اسے لے جا میرے ماں سے! میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔"

یہ سن کر بوڑھی عورت نے سریتا کو سینے سے لگا لیا اور اندر لے گئی۔

رام سروپ پھر بولا۔ "تو سردار، کیا حکم ہے؟ ہم نے پولیس کے دس آدمی زندہ پکڑ لئے ہیں اور ہمارے پانچ آدمی ان کی قید میں ہیں۔ کیا آج شب خون مار دیا جائے؟"

"نہیں۔" بوڑھے نے انکار میں سر ہلایا۔ "ان پولیس والوں میں سے پانچ کو گولی مار دو اور ان کی لاشیں آج ہی رات گزوال پہنچا دو، کسی بھی طرح!"

"اس سے کیا ہو گا بابا؟" میں پوچھ بیٹھا۔ "پہلے پوری بات سن لیا کرو!" بوڑھے نے مجھے ڈانٹ دیا، پھر بتانے لگا۔ "ان لاشوں کے ساتھ ایک ڈبا بھی جائے گا۔ پولیس حکام کے نام خط میں لکھا جائے گا کہ اگر ہمارے پانچ آدمی صبح تک نہ چھوڑے گئے تو بقیہ پانچ سپاہیوں کی لاشیں بھی کل رات تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ یہ کام آج ہی رات ہونا چاہئے۔ اور سنو! یہ بھی لکھ دو کہ اگر ہمارے ان آدمیوں کا پیچھا کیا تو بھی ہم باقی پانچ سپاہیوں کو گولی مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ کل صبح سے پہلے تمہانہ گزوال سے یہاں تک اپنے آدمیوں کا جال بچھا دو۔ اگر کسی کو بھی ان پانچوں کے پیچھے آتا ہوا دیکھو تو بے کھٹکے بھون دو۔" پھر بوڑھے نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے رنجیتے؟"

"بالکل صحیح تجویز ہے بابا! ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس مہم کو رام سروپ سر کرے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔" بوڑھا بولا۔ "تم سردار ہو، یہ کام تمہارا ہے۔ تم تمہانہ گزوال کے راستے سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور خفیہ رستوں سے بھی۔ پولیس کا معاملہ ہے، میں رام سروپ کو اکیلا بھیجے....."

"لیکن بابا! اس کے ساتھ....."

بوڑھے نے بھی میری بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اور بھی جوان ہوں گے لیکن تمہارا ہونا بہت ضروری ہے۔" پھر بوڑھا، رام سروپ سے مخاطب ہوا۔ "تم قید خانے سے پانچ سپاہیوں کو لے کر آؤ! بہت دن ہو گئے کسی آدمی پر گولی چلائے ہوئے۔ کیا خراب میرا نشانہ کیسا ہے۔ آج نشانے ڈالنی ہی ہو جائے۔ ویسے بھی آج مجھ پر خون سوار ہے۔ اس طرح کم از کم کچھ دل کی بھڑاس ہی نکل جائے گی۔ جاؤ اور ابھی پانچ سپاہیوں کو لے کر میدان میں آجاؤ۔ بہتی میں خبر کر دو کہ آج بڑے ٹھاکر

طرح غروب ہو چکا تھا۔ تمام بستی پر ہلکا ہلکا اندھیرا اتر آیا تھا۔ اس اندھیرے کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مٹی ہوئی مٹھلیں دور کر رہی تھیں۔ جمونپڑی کے باہر پانچ چھ گھوڑے کھڑے تھے جن پر ہم سب سوار ہوئے۔ بڑے ٹھاکر کا گھوڑا آگے تھا۔ گھوڑوں کے قریب موجود ایک شخص نے ہم سب کے ہاتھوں میں ایک مشعل تھادی۔ پھر یہ قافلہ آگے بڑھا۔ معلوم ہوتا تھا اس وقت بستی کے سارے جمونپڑے خالی پڑے ہیں۔ کہیں دور سے دھیمے دھیمے شور کی سی آوازیں تھیں۔ گھوڑے پتھریلی زمین پر اسی شور کی سمت بڑھنے لگے۔

وہ ایک بہت بڑا گول میدان سا تھا۔ میدان کے پیچھے پہاڑی تھی جس کے سامنے درجنوں ستون نیم دائرے کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ ان ستونوں میں پانچ پر مٹھلیں روشن تھیں۔ ہم اور قریب پہنچ گئے۔ ان ستونوں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر سامنے ایک بڑا مجمع تھا جس میں بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، زبانیں سبھی تھے تقریباً سبھی کے ہاتھوں میں مٹھلیں تھیں۔ میدان ان مشعلوں سے پوری طرح جگمگا رہا تھا۔

مجمع ہمیں قریب دیکھ کر نعرے لگانے لگا۔ ”سردار رنجیت سنگھ کی جے!..... بڑے ٹھاکر کی جے!“

ہم ان نعروں کی گونج میں اس بڑے چوترے تک پہنچے جس پر ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس چوترے کے دونوں جانب مجمع تھا۔ اس مجمع کو دیکھ کر مجھے عجیب سی دھشت محسوس ہوئی میرا جی چاہا کسی طرح وہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس کے ساتھ اپنے حق میں نعرے سن کر مجھے فخر بھی ہو رہا تھا۔ میں چوترے کی میڑھیاں چڑھنے لگا۔

اب ہم سب چوترے پر تھے اور مجمع نعرے لگا رہا تھا۔ ہم سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ستونوں پر روشن مٹھلیں ان کی گویا نشان دہی کر رہی تھیں۔ جن کے اندر موت کے اندھیرے اترنے والے تھے۔ سفید ریش بوڑھا چوترے پر کھڑا ہوا اور تقریر شروع کی۔ ”میرے بیٹو، بیٹیو اور بزرگو! آج کوئی دن برس بعد ایسا واقعہ ہوا ہے کہ ہمارے پانچ بہادر جوان زخمی حالت میں پولیس کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوا کہ ہمارے بچ پولیس کا منبر تھا جسے آج ہی تمہارے سردار نے پہچان لیا ہے اور اسے نذر کر دیا گیا ہے۔ یہ بزدل، کرناک تھا۔“

بوڑھے نے اتنی ہی کہا تھا کہ مجمع سے ایک شور اٹھا۔ ”منبر کو گولی مار دو۔ اسے بھی یہاں لاؤ۔ اسے بھی گولی مار دو!“ ہاتھ اٹھا کر بوڑھے نے لوگوں کو خاموش کیا اور پھر تقریر شروع کر دی۔ ”تم لوگ صحیح کہتے ہو۔ منبر کی سزا ہمارے قانون میں گولی ہے۔ ایسا ہی ہوگا، مگر ابھی اس سے کچھ پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ کل میں خود اسی میدان میں اسے گولی ماروں گا۔ مطمئن رہو۔“ یہ سن کر مجمع پر سکوت طاری ہو گیا اور بوڑھے نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”ہمارے پانچ آدمی ان کی قید میں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ آدمی، پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے ہیں۔ ان کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال اور گزر بسر کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہم یہ ذمہ داری پوری کریں گے۔ ہم نے اپنے آدمیوں کی پولیس سے رہائی کے لئے ایک ترکیب

نشانے بازی کریں گے۔ جاؤ!.....!“ یہ سن کر دو نوجوان نے کرناک کو اٹھایا۔ پھر رام سروپ اور اس کے ساتھی جمونپڑے سے نکلے۔ بوڑھا بدوق لوڈ کرنے لگا اندر سے اب بھی سکپوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں اندر جمونپڑے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ بوڑھی عورت افسردہ سی ایک بیڑھی پر بیٹھ لائیں کی چنی صاف کر رہی تھی۔ سریتا پیال کے ایک بستر پر اندھ سی پڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں، سریتا کے قریب گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ کافی دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سریتا کی نشیلی آنکھیں سرخ ہو کر اور بھی حسین لگ رہی تھیں۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے مجھے بستر پر کھینچ لیا اور رونے لگی۔

”بھیا! مجھے معاف کر دو!“ سریتا کہنے لگی۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ منبر ہے۔..... مگر اب..... اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میں..... میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اب وہ بالکل بدلا جائے گا۔ تم..... تم اسے..... معاف کر دو بھیا!“

بوڑھی عورت یہ سنتے ہی سخت آواز میں بولی۔ ”لڑکی! تو ٹھاکر کی اولاد ہے یا کسی بزدل کی؟ تیرے باپ..... بہادر باپ نے خود اپنے ہاتھوں سے چھانی کا پھندا اپنی گردن میں ڈالا تھا۔ شرم کراؤ! تیرے باپ کی بیٹی ہو کر ایک بزدل کو معاف کر دینے کے لئے کہہ رہی ہے۔ اس بزدل کینے نے تیرے بھائی کے سر کی قیمت وصول کرنا چاہی اور..... تو اس کے لئے رحم کی بھیک مانگ رہی ہے! تجھ پر لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہئے تھا!“ یہ کہہ کر بوڑھی عورت رونے لگی۔

میں اب بڑھیا کے پاس آگیا اور اسے دلاسا دینے لگا۔ ”مت رونا! یہ ابھی بچی ہے، نا سمجھ ہے آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔“

ابھی میں اتنی ہی کہہ سکا تھا کہ جمونپڑے کے دوسرے حصے سے رام سروپ کی آواز سنائی دی۔ کہہ رہا تھا۔ ”بڑے ٹھاکر! ہم کرناک کو قید خانے میں ڈال آئے ہیں اور آپ کے حکم پر ہم نے پانچ سپاہیوں کو بڑے میدان کے ستونوں سے باندھ دیا ہے۔ تمام بستی کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ آپ کا انتظار چلے!“

بوڑھے کے اٹھنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ ”رنجیت! تو نہیں چلے گا ہمارے نشانے بازی دیکھئے؟“

میں یہ سن کر باہر آیا۔ میرے ساتھ بوڑھی عورت بھی تھی۔

بوڑھے نے سخت آواز میں کہا۔ ”سریتا کہاں ہے؟ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی!“ بڑھیا اندر گئی اور پلٹی تو اس کے ساتھ سریتا بھی تھی۔ بوڑھا، سریتا کو دیکھ کر بولا۔ ”اپنی صورت دیکھ! منہ لمبوں کا سا چہرہ ہو رہا ہے۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو اور ہوش میں آجا! ورنہ چھٹے ستون سے بھی بندھوا کر گولی سے اڑا دوں گا!“

سریتا سسم گئی اور پھر جلدی سے منہ دھو کر آگئی۔ ہم سب جمونپڑے سے باہر نکلے۔ سورج بڑا

سوچی ہے۔ ان کے دس سپاہی زندہ ہمارے پاس ہیں جن میں سے پانچ موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ آتمدار سردار اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ رات ہی میں ان کی لاشیں لے کر تھانہ گزوال جانے لگا۔ لاشیں ساتھ ہی یہ تحریر بھی پولیس کے نام چھوڑ آئے گا کہ اگر ہمارے آدمی کل صبح تک رہا نہ کئے گئے تو رات بقیہ پانچ سپاہیوں کی لاشیں بھی پولیس کو پہنچادی جائیں گی۔ اب تم لوگ متاؤ، کیا تمہیں یہ ترکر منظور ہے؟“

مجمع نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہمیں منظور ہے۔ بڑے ٹھاکر کی ہے۔“

نعروں کی گونج میں بڑے ٹھاکر نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے آخر میں کہا۔ ”اگر اس پر بھی پولیس نے ہمارے آدمی نہ چھوڑے تو ہم تھانے پر حملہ کر کے زبردستی انہیں چھڑالیں گے۔“ ایک بار پھر بڑے ٹھاکر کی جے جے کا دہرائی۔ پھر بڑے ٹھاکر نے بندوق لوڈ کر کے کہا۔ ”اب تم دیکھو کہ تمہارے بڑے ٹھاکر کا نشانہ کتنا سچا ہے!“

بڑے ٹھاکر نے پے در پے دو فائر کئے اور سامنے سے دو جگر خراش چیخیں سنائی دیں۔ پھر بڑے ٹھاکر نے بندوق لوڈ کی۔ مجمع خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ یکے بعد دیگرے نعروں کی گونج میں تین فائر ہوئے اور تین چیخیں میدان کے شور میں مزید شامل ہو گئیں۔

وہ ایک ایسا ہی مجمع تھا کہ وحشت و بربریت کے مظاہرے پر خوشی سے تالیاں بجا رہا تھا۔ جب پانچ سپاہیوں کی لاشیں ستونوں سے کھول کر گھینٹے ہوئے مجمع کے سامنے لائی گئیں تو چہرے ہلکائیوں کی طرح کھل اٹھے۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے جیسے ان کا یہ دل بڑے مشغلہ ہو۔ سفید ریش بوڑھا بڑے فخر سے سینہ تان کر ان لاشوں کے پاس آکھڑا ہوا جیسے کہہ رہا ہو، ”میں ہی وہ ہوں جس نے تمہاری لئے خوشی کا یہ موقع فراہم کیا ہے۔“

سریتا کا رد عمل بالکل اس کے برعکس تھا۔ وہ خاموش خاموش تھی اور بھیجی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے انگ انگ سے جیسے رنگ ہی رنگ برس رہے تھے، بڑی بڑی آنکھیں تو جیسے بول رہی تھیں۔ بھوانی دیوی کا جاپ کرنے کے بعد یہ تبدیلی میں نے پہلی مرتبہ پورا شدت سے محسوس کی۔ ایک آدم زاد نے پھر مجھے اپنے حسن کے حصار میں لے لیا تھا۔ میں اس وقت سریتا کے وجود میں ایسا کھو گیا کہ جی چاہا بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لوں۔

میں انہی خیالوں میں گمن رہتا اگر رام سروپ مجھے مخاطب نہ کرتا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سردار! یہاں سے تھانہ گزوال تقریباً نوے میل پر ہے۔ اگر ہم اس وقت بھی چلیں تو صبح تڑکے تک لوٹ پائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ جو کچھ کرنا ہے۔ جلدی کیجئے۔ بڑے ٹھاکر کہتے ہیں کہ ہم ابھی اسی وقت میسوں سے روانہ ہو جائیں۔ اس مہم کے لئے جوانوں کا انتخاب اور ان کی تعداد آپ طے کریں گے۔ آپ حکم دیں کیا؟“

میں نے کہا۔ ”کسی سے چھینا تو کرنا نہیں ہے، صرف تھانے تک لاشیں اور خط پہنچانا ہے میرا

خیال ہے دس آدمی کافی رہیں گے۔ زیادہ بھیڑ کی کیا ضرورت ہے!“

رام سروپ پہلے تو میرے جواب پر تھوڑا خاموش رہا، پھر بولا۔ ”یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں سردار! لیکن اگر پولیس سے پھر ٹکراؤ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ دس آدمی پوری پلٹن کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ آج آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ہمیں کتنا سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم پچاس جوان تو ساتھ ہونا ہی چاہئیں۔ ہم سب تھانے سے ایک میل دور ہی رک جائیں گے۔ تھانے تک صرف دس جوان ہی جائیں گے، وہ بھی پیدل تاکہ پولیس کو کسی طرح ہماری آمد کا شک نہ ہو۔ ویسے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم آج ہی تھانے پہنچ جائیں گے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، پچاس جوان ہی سہی۔“ میں بولا۔ ”تم خود جوانوں کا انتخاب کر لو اور وہ لاشیں.....“

رام سروپ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”کل پانچ لاشیں ہی تو ہیں۔ پانچ جوانوں کے ساتھ ایک ایک لاش گھوڑوں پر باندھ دی جائے گی۔ اچھا اب میں اصطبل چلتا ہوں۔ ویسے تو ہر جوان کے پاس اس کا گھوڑا موجود ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم دس سہارے ہوئے گھوڑے بھی ساتھ ہوں جو وقت بے وقت ہمارے کام آسکیں۔ وہ خود بخود ٹھکانے تک پہنچ سکیں۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر کے میس میدان میں آجائیں۔ یہاں آپ کو جوان تیار ملیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں بولا، پھر سریتا سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ اب چلتے ہیں۔ بڑے ٹھاکر شاید ابھی میس رہیں گے۔ ممکن ہے، وہ خود اپنے سامنے تمام تیاریاں کرنا چاہتے ہوں۔“

سریتا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے جھوپڑے میں آگئے۔ بڑی عورت جو رنجیت سنگھ کی ماں تھی، ابھی میدان سے واپس نہیں آئی تھی۔

میں، سریتا اور خالی جھوپڑا! میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ہم دونوں اندر والے حصے میں چلے آئے۔ سریتا پیال کے نرم بستر پر لیٹ گئی۔ میں بھی جانے کیا سوچ کر دوسرے بستر کی بجائے اسی کے پاس دروازہ ہو گیا۔ جیسے ہی سریتا کے جسم کا لمس محسوس ہوا، مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔ میں نے اس کی ٹوڑی پکڑ کر کہا۔ ”کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟“

میرے اس سوال پر سریتا نے اپنی بڑی بڑی شرابی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

”میں تجھے کیسا لگتا ہوں؟“ میں نے جذبات سے بھرپور کانپتی آواز میں اس سے پوچھا۔ ”بول کیسا لگتا ہوں؟“

”دوسرے ہی لمحے اس نے سسکی سی لی اور مجھ سے چپٹ گئی۔ ”بھیا!..... تو بہت اچھا ہے بھیا! مگر کیا تو کرنا کو معاف نہیں کر سکتا؟“ بتا! وہ مجھ سے اور چپٹ گئی۔

ایک وقت مجھ پر کئی کینیتیں طاری ہو گئیں۔ ایک تو اس کے جسم کی قربت جس سے مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی میٹھی میٹھی آگ کا احساس ہو رہا تھا جو دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا، دوسرے اس کے

بھیا کہنے سے ایک بے نام سی خفت اور جھنجھلاہٹ مجھ پر طاری ہو رہی تھی، تیسرے کمرہ کے ذکر پر غرور و نفرت اور رقابت کا احساس مجھے پھونکنے دے رہا تھا۔ ان متضاد کیفیات نے مجھے چند لمحوں میں جیس کر دیا۔ میں ایک دم گھبرا کے اٹھا اور ٹپٹلے لگا۔

ہندوؤں کے بارے میں مجھے علم تھا کہ کوئی بھی ایسی لڑکی جو کسی قریب یا دور کے رشتے سے بڑی لگتی ہو، وہ اپنے چچا زاد، خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد وغیرہ کے قرب کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ رشتے کے بھائیوں اور بہنوں کے درمیان شادی ممکن نہیں۔ جنوبی ہند کا ایک مخصوص علاقہ ایسا ہے کہ جہاں رشتے کے بہن بھائی شادی کر لیتے ہیں۔ باقی سارے ہندوستان میں ایسی شادیاں ہندو عقائد کے مطابق ممنوع ہیں۔ سریتا بھی رنجیت سنگھ کی چچا زاد تھی۔ یقیناً رنجیت سنگھ نے کبھی ایک بھائی کی نظر کے سوا کچھ اور طرح دیکھنا تو کیا، سوچا بھی نہ ہوگا، لیکن میں تو رنجیت سنگھ نہیں تھا۔ علیالیش تھا، ایک جن زاد! جن نے سریتا کے چچا زاد کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا۔

میرے چہرے پر موجود تاثرات سے سریتا جانے کیا سمجھی اور بولی۔ ”تجھے کیا ہوا بھیا؟“ ”کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا اور سختی سے ہونٹ بھینچ لے۔ پھر ٹپٹلے ٹپٹلے رک کر میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”سریتا! تجھے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا، میں یا کمرہ! بول کسے چاہتی ہے تو؟“ میرا سوا خود میرے لئے بھی گنگناک اور ذومعنی تھا، لیکن سریتا کے لئے قطعی واضح! ”میں دونوں کو چاہتی ہوں بھیا!“ اس نے بھولپن سے کہہ دیا۔ ”مگر ایک نیام میں دو کمواریں نہیں رہ سکتیں سریتا!“

میرے الفاظ پھر ذومعنی تھے۔ یہ سریتا کا چچا زاد نہیں اس کا شیدائی بول رہا تھا، میں جو اس عشق میں جلا ہو چکا تھا اور میرا جسم جو اس کا چچا زاد تھا۔ اس وقت میرا جسم نہیں، میں بول رہا تھا۔ ”لیکن بھیا، میرا اس کا کیا مقابلہ!“ سریتا بولی۔

اس کے بار بار بھیا کہنے سے مجھے شدید نفرت اور غصے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تو اپنی محبوبہ بات کر رہا ہوں، یہ سچ میں بھیا کون کد پڑتا ہے۔ اس غصے کی حالت میں خود پر مجھے قابو نہ رہا اور میں اٹھا۔ ”مجھے بھیامت کہہ!“

میرے اس طرح ناراض ہونے پر وہ سہم گئی اور غم زدہ ہو کر رونے لگی۔ میرے لئے اس فقرہ کے معنی مختلف تھے اور میں یہ فقرہ کہنے میں حق بجانب تھا، لیکن سریتا کے لئے اس کا مطلب کچھ اور تھا جس نے یقیناً اسے بہت تکلیف پہنچائی۔ اس کے رونے سے میں کھپکنے لگا اور عالم خواب سے حقیقت کی دنیا میں آگیا۔ اب میں نے اپنے فتنوں پر غور کیا تو مجھے خود اپنے آپ سے ندامت سی ہونے لگی۔ میں اس کے قریب گیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ اس وقت میرا جی چاہا، کاش وہ پھر پہلے طرح مجھ سے لپٹ جائے مگر اس مرتبہ وہ خاموشی سے لپٹی رہی۔ میں اس کے پاس پیال کے نرم بستری گیا۔

”خیر چھوڑ سب باتیں۔“ میں اس کا دل بھلانے کے لئے بولا۔ ”میرے ساتھ آج کی صبح“

مئی؟ تیرا جی بھی بھل جائے گا؟“

میرے اتار کتے ہی وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”ہاں میں ضرور چلوں گی تیرے ساتھ ضرور! پر پایا جانے دے گا؟“

سریتا اس وقت بالکل معصوم سی بچی لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کسی بچے کو روتے روتے کوئی کھلونا مل گیا ہو اور وہ اپنے رونے کو بھول کر کھلونے سے کھیلنے لگا ہو۔ سریتا کے رخسار آنسوؤں سے بھیکے ہوئے تھے لیکن چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی جیسے تازہ کھلے ہوئے گلاب پر ٹہنم کی نمی۔ آخر ابھی اس کی عمری کیا تھی، لڑکی ہی تو تھی، بس ذرا جذباتی تھی۔

میں نے اس کے یوں کھل اٹھنے پر دل توڑنا اچھا نہ سمجھا اور کہہ۔ ”میں بابا کو راضی کر لوں گا۔“ میری بات سن کر وہ انہنی اور جلدی سے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ اسی وقت باہر کی طرف جھونپڑے میں آہٹ سی ہوئی۔ میں نے درمیانی پردہ ہٹا کر جھانکا تو وہ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی تھی جو میرے لئے قطعی اجنبی تھی، پتلی دلی دراز قد، فاصلے کے سبب میں اتنا ہی دیکھ پایا۔

میں نے اس لڑکی سے مخاطب ہونے کی بجائے سریتا سے کہہ۔ ”دیکھ سریتا کون ہے یہ؟ پتا نہیں کون لڑکی گھس آئی ہے جھونپڑے میں!“ میرے لہجے میں اجنبیت اور روکھا پن تھا سریتا کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ارے ارے، چلیں کہاں؟ بھیا تو مذاق کر رہا ہے۔ تم تو برا مان گئیں بھالی!“ اس کے جواب میں مجھے میٹھی سی ایک آواز سنائی دی۔ ”ہٹ شریر کہیں کی۔ ابھی سے بھالی کتنا شروع کر دیا!“

”ہاں ضرور کہوں گی بھالی!“ سریتا زور سے بولی۔ ”ایک دفعہ نہیں سو دفعہ۔ لاجو بھالی! لاجو بھالی!“ ابھی شادی نہیں ہوئی تو کیا ہوا، بات تو بچپن سے پکی ہے، ایک دن شادی بھی ہو جائے گی۔ ابھی ایسی جلدی کیا ہے!“

سریتا جھونپڑے کے باہر والے حصے میں چھٹی رہی اور میں عجیب الجھن میں گرفتار ٹپٹلے رہا، یہ کیا نئی مصیبت ہے؟ بچپن کی سنگیترا کیسی دلی پتلی مرگھلی سی ہے۔ اور ایک اپنی سریتا ہے جیسے رس بھری۔ میرے خیالوں کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا۔ اس کا سبب سریتا ہی تھی۔

یہ سریتا کی آواز تھی، کہہ رہی تھی۔ ”لو میں جاتی ہوں بھالی! اب جو چاہے باتیں کر لو، مگر سنو! جلدی کرنا ذرا پایا اور تالی آتے ہی ہوں گے پڑوس میں ہوں۔“

مجھے صرف قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سریتا ہی شاید جھونپڑے سے نکل کر گئی تھی۔ میں نے ”سوا“ چلو ذرا ایک نظر اس لاجو کو بھی قریب سے دیکھ لو کیسی ہے۔“

میں اسی خیال سے جھونپڑے کے باہر والے حصے میں آگیا۔ دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔ پھر میرے قدموں کی چاپ اپنے قریب سن کر وہ ٹھہر گئی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں ذرا سا جھجکا۔ وہ پلٹی۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ”پتا نہیں کون لڑکی گھس آئی ہے جھونپڑے میں؟ اب میں تیرے لئے کون ہو گئی؟“

لاجو نے یہ فقرہ کچھ اس طرح ادا کیا کہ فقرے کا سارا درد اور جذبہ مجھ پر اثر کر گیا۔ قریب سے دیکھنے پر وہ مجھے اتنی بری نہ لگی۔ دہلی تہی تو ضرور تھی مگر ایک دم گوری تھی۔ گودا رنگ تو اس کے جسم پر چھتا تھا اب وہ مجھے مرکلی نہیں، نازک نازک سی لگ رہی تھی، بالکل چینی کی پھول کی طرح! سریتا اگر گلاب تھی تو لاجو چینی! میں کچھ دیر اسی میں کھویا رہا۔

”تو نے کہا تھا لوٹنے ہی مجھ سے ملے گا۔“ وہ پھر بولی۔ ”ایک تو جب نہ ملا، پھر میں نے بڑے میدان میں تجھے لاکھ اشارے کئے، تو نے کچھ توجہ نہ کی۔ اب میں موقع دیکھ کر تجھ سے یہاں ملنے آئی تو میری بے عزتی کر رہا ہے! دیکھ سریتا، کون ہے یہ!“ اس نے اپنی دانست میں میرے لمبے کی نقل اتاری۔ میں اس کا بنا ہوا منہ دیکھ کر ہنس پڑا۔

”اچھا تو یہ بات تھی! میں نے تو یوں ہی تجھے چڑانے کو کہا تھا کہ پتا نہیں کون لڑکی گھس آئی ہے جھونپڑے میں! تو خواہ خواہ برا مان گئی پگلی!“ یہ بات میں نے اس لئے بتائی کہ کچھ تو وہ مجھے اچھی لگی تھی اور کچھ میں یہ نہیں چاہتا تھا، وہ یہ سمجھ میرے لئے اجنبی ہے۔

میری بات سن کر وہ ایک دم کھل اٹھی اور بولی۔ ”ج!“ پھر میرے سینے سے آگئی۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ اسی وقت دور سے گھوڑے دوڑنے کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ وہ مجھ سے فوراً الگ ہو کر باہر بھاگ گئی۔ میں خالی خالی سا کھڑا رہ گیا۔ آنے والے بڑے ٹھاکر، بوڑھی عورت اور رام سرور تھے۔ شاید سریتا کو بھی ان کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ بھی انہی کے پیچھے پیچھے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔

بڑے ٹھاکر نے آتے ہی بددق کھونٹی پر ناگی اور مجھ سے کہا۔ ”رہتیے! وہ تمام لوگ جنہیں تمہارے ساتھ اس مہم پر جانا ہے، بڑے میدان میں پہنچ چکے ہیں اور ہر طرح تیار ہیں۔ اب تم جاؤ اور بھگوان کرے خیریت سے واپس آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ سامنے پیچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گیا۔

بوڑھی عورت اندر جھونپڑے میں چلی گئی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تھکی ہوئی لگتی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کتا سریتا نے بڑے ٹھاکر سے کہا۔ ”بابا! بھیا کے ساتھ مہم پر میں بھی جاؤں گی۔ بھیا مجھے بھی ساتھ لے جانے پر راضی ہے۔“

”کیا؟“ بڑے ٹھاکر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”کیا تو پاگل ہو گیا رہتیے؟ یہ تو ابھی بچی ہے، تیری ہی عقل ماری گئی ہے کیا! پولیس سے پھر نکراؤ ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی سیدھا سادہ ڈاکہ تو ہے نہیں کہ دو ہوائی فیرکے اور گاؤں بھر ڈاکو رنجیت سنگھ کا نام سن کر کانپنے لگا۔ پولیس کا معاملہ ہے پولیس کا! میں ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ سریتا تمہارے ساتھ جائے۔ پھر ابھی اس کو ٹھیک سے گھڑ سواری بھی نہیں آتی۔“

”میں بھیا کے گھوڑے پر بیٹھ جاؤں گی۔“ سریتا چل کر بولی۔ ”اس کی فرق پڑتا ہے!“

میں نے سریتا سے جیسے ہی یہ الفاظ سنے میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں چشم تصور سے دیکھنے لگا، سریتا میرے آگے مجھ سے لگی گھوڑے پر بیٹھی ہے اور گھوڑا اونچے نیچے راستوں پر بھاگا جا رہا ہے۔ اسی رد میں میرے منہ سے نکل گیا۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اسے میں اپنے گھوڑے پر بٹھالوں گا۔“

بڑے ٹھاکر نے جب یہ سنا تو وہ مجھ پر برس پڑا۔ ”کیا بکتا ہے؟ کیا ٹھیک ہے؟ تجھے کیا ہو گیا ہے رہتیے؟ کیا تیری عقل بالکل ماری گئی ہے؟..... اری سنتی ہو، رنجیتے کی ماں! یہ تمہارا بیٹا مہم پر سریتا کو بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔“ بڑے ٹھاکر نے زور سے ہانک لگائی۔

بوڑھی عورت نے دہن سے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔ ”تم جانو اور یہ جانے۔ مجھے تم دونوں باپ بیٹوں نے تنگ کر دیا ہے۔ ذرا کمر بھی سیدھی کرنے دو گے کہ نہیں!“

سریتا پھر ضد کرنے لگی، یہاں تک کہ اس نے بڑے ٹھاکر کے گلے میں ہانسیں ڈال کر اپنی بات منوائی لی، بڑے ٹھاکر نے آخر کار کہہ ہی دیا۔ ”اچھا تو تم جانو، مگر دیکھو یہ کسے دیتا ہوں کہ دونوں بہن بھائی ساتھ ساتھ رہنا، بلکہ رنجیتے ایسا کرو کہ تم اسے اپنے ہی گھوڑے پر بٹھالینا۔“

اس عرصے میں رام سرور بے چارہ کھڑا سوکھتا رہا۔

میں اور سریتا ایک گھوڑے پر اور دوسرے پر رام سرور بڑے میدان کی طرف چل دیے۔ وہاں جا کر دیکھا تو کسی فوجی دستے کا سا ساں تھا۔ قطار در قطار گھوڑوں پر جوان تیار کھڑے تھے ان کے کاندھوں سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور کمرے کارتوسوں کی پٹٹیاں بندھی تھیں۔ کمرے کے پیچھے ایک ایک تھیلا بندھا تھا۔ ایسا ہی ایک تھیلا میرے پاس بھی تھا جس میں موم بتی، ماچس، خنجر اور دوسری ضروری چیزیں تھیں۔ وہاں میرے پیچھے ہی تمام جوانوں نے ”سردار رنجیت سنگھ کی جے“ کے نعرے لگائے۔

میں اور رام سرور اس قافلے کی رہنمائی کر رہے تھے۔ میرے برابر رام سرور کا گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے تمام جوان گھوڑوں پر سوار اس خفیہ راستے کی طرف بڑھ رہے تھے جس سے میں آج دن کے وقت دادی میں داخل ہوا تھا۔ میرے ساتھ گھوڑے پر سریتا مجھ سے چپکی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت شاید کردار کے غم کو بھول گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب خوشی سی ٹاچ رہی تھی جیسے کوئی بچہ اپنے کسی بڑے کے ساتھ میلہ دیکھنے جا رہا ہو۔

مجھے سریتا کے جسم کا لمس جانے کنی دنیاؤں کی سیر کر رہا تھا۔ آدم زادوں میں اب مجھے دوبارہ کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ ڈاکو رنجیت سنگھ کے جسم کا اثر تھا یا اس جاپ کا نتیجہ، میرے جسم میں بہر حال بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔

ہم اب سرنگ نمار غار کے دہانے تک پہنچ چکے تھے۔ یہ دہانہ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں بیک وقت دو گھوڑے آگے تھے۔ ہم دونوں سب سے پہلے اس میں داخل ہوئے اور پھر ہمارے پیچھے بقیہ گھوڑے دو دو کر کے اس سرنگ نمار غار کے دہانے میں داخل ہوتے رہے۔ غار مشعلوں سے روشن ہو گیا۔ اندر سے بھی یہ غار زیادہ چوڑا نہ تھا جس آگے کی طرف لمبا لمبا سا تھا اور بہت دور تک اسی طرح چلا گیا تھا۔ ہم سب اسی طرح گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے غار کے آخر تک پہنچے۔

رام سرور گھوڑے سے اترا اور غار کی دیوار میں ایک طرف لگے ہوئے گول سے کڑے کو تھما کر کھینچا۔ یہ بالکل دیباہی کڑا تھا جیسا میں نے آج دن میں غار کے باہر دیکھا تھا۔ بڑے زور کی گڑگڑاہٹ سی ہوئی جیسے کوئی بڑا سا پتھر اپنی جگہ سے لڑھکتا ہوا ٹیپ میں گر رہا ہو۔ چند لمبے بعد ہی سامنے راستہ

نمودار ہو گیا۔ رام سروپ اسی طرح کڑے میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا۔ تمام لوگ دودو کی قطار میں باہر نکلے رہے۔ جب سب باہر آگئے تو آخر میں رام سروپ باہر نکلا۔ رام سروپ کے باہر آتے ہی غار کا دہانہ خود بخود پیلے کی طرح بند ہو گیا۔ اب ہم اس درے میں تھے، میں جس میں آج ہی سفر کر چکا تھا۔ سدھا ہوا گھوڑا مجھے اسی درے میں لے کر آیا تھا۔ یہ درہ کیوں کہ خاصا تنگ تھا اس لئے دودو ہی کی قطار میں ہمارا قافلہ درے سے باہر نکلا۔ اب پھر رام سروپ میرے گھوڑے کے برابر آ گیا تھا۔

مجھے رام سروپ کا اس طرح ساتھ رہنا کھل رہا تھا، مگر میں کرتا بھی کیا۔ وہ بدستور کباب میں ہڈی بنا رہا۔ تھانہ گڑوال کے راستے سے میں نادانف تھا اس لئے رام سروپ کو اپنے ساتھ آگے رکھنا میری مجبوری تھی میں دانستہ رام سروپ کے گھوڑے سے اپنے گھوڑے کو ذرا پیچھے ہی دوڑا رہا تھا۔ وہ کجنت جب بھی محسوس کرتا کہ میں اس کے گھوڑے سے پیچھے ہوں تو اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر کے پیچھے آ جاتا اس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ شاید وہ ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ کہیں اس سے سردار کی توہین نہ ہو۔ سردار کے گھوڑے سے آگے اپنا گھوڑا دوڑانا ان کے یہاں بے ادبی شمار ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سردار کے گھوڑے کے برابر بھی ہر شخص نہیں چل سکتا تھا سوائے اس کے جسے خود سردار یہ اجازت دے دے۔ میں دراصل یہ چاہتا تھا کہ سریتا سے باتیں کرتا ہوا چلوں اور ان باتوں کو کوئی اور نہ سن سکے مگر اس آفت ناگمانی رام سروپ کا میں کیا کرتا جو ان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

رات کا سناٹا ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے مجروح ہوتا رہا۔ پہاڑی سلسلے اور چٹانیں اب خاصی پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے بہت دور مدھم سی روشنی کے کچھ آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ہم کیوں کہ اس وقت ذرا اونچی سطح پر دوڑ رہے تھے اس لئے وہ روشنی ہمیں کافی دور اور شیب میں دکھائی دے رہی تھی۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

رام سروپ میرے برابر ہی دوڑ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”وہ روشنی کیا ہوئی جو ابھی کچھ دیر پہلے نظر آ رہی تھی؟“

میرے سوال پر رام سروپ کچھ حیران سا نظر آیا، پھر جواب دیا۔ ”سردار! کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہم نے راستہ کچھ بدل دیا ہے۔ اب ہم تھانے کے پیچھے سے چلیں گے تاکہ پولیس کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو جائے اور اس کی نظر سے ہماری نقل و حرکت چھپی رہے۔“

میں نے جلدی سے بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا۔ میں اسی لئے تو ہر وقت تمہیں ساتھ رکھتا ہوں۔“ میں نے یہ الفاظ لاعلمی کے سبب ادا کئے تھے۔

میری تعریف پر رام سروپ کا سینہ اور چوڑا ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”سردار! یہ تو آپ کی محبت ہے ورنہ میں کس قابل ہوں!“

”کس میں کیا خوبی ہے رام سروپ؟ یہ مجھ سے چھپا نہیں ہے۔“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ رام سروپ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اور یہ بھی آپ کی محبت ہی ہے کہ پہلے مجھے اپنے ساتھ نہ رکھتے ہوئے بھی آپ یہ محسوس کرتے تھے کہ میں ساتھ ہوں۔ گرنام سنگھ نے سن لیا تو

مجھ سے بہت جلدی گائیوں کہ وہی تو اس سے پہلے آپ کا دایاں بازو تھا۔ آج آپ نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو یہ آپ کا احسان ہے۔“

میں نے رام سروپ سے جب یہ سنا تو جلدی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، گرنام سنگھ کو بھی ہم بہت چاہتے ہیں، مگر ہر آدمی کی حیثیت اپنی جگہ ہے۔ گرنام گرنام ہے اور رام سروپ رام سروپ ہے!“ بار بار مجھے اپنی لاعلمی کا احساس ہو جاتا تھا اور میں بات بنا دیتا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس مردہ میں کوئی کجنت گرنام سنگھ بھی ہے جو میرے ساتھ یا ڈاکو رنجیت سنگھ کے ساتھ اکثر ڈاکوؤں میں شریک ہو چکا ہے اور وہ رنجیت سنگھ کا دایاں بازو ہے۔ میں نے کچھ سوچ کر رام سروپ سروپ سے دریافت کیا۔ ”کیا آج اس مم میں ہمارے ساتھ گرنام سنگھ بھی ہے؟“

”نہیں سردار!“ رام سروپ نے جواب دیا۔ ”جب آپ نے جوانوں کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا تھا تو میں نے سوچا، اسے کیوں تکلیف دوں، خود ہی آپ کی ٹائی کیوں نہ کروں!“ رام سروپ کے لہجے سے چور پن کا سا احساس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے عین چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

میں ساری بات بھانپ گیا۔ میری نادانیت کے سبب رام سروپ یہ سمجھا ہو گا کہ سردار مجھ پر آج مہمان ہیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس نے اسی لئے میرے دست راست گرنام سنگھ کو اس مم میں شریک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کی خبر کیسے ہوئی! مجھے تو خود ڈاکو رنجیت سنگھ کے بارے میں ابھی زیادہ باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں نے جس آدم زاد کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا، اس کے متعلق صرف یہ معلوم تھا کہ وہ زبردست خونی اور دلیر آدمی ہے، کئی دفعہ پولیس کا محاصرہ توڑ کر بھاگ چکا ہے۔ کچھ عرصے تک پولیس اس کے متعلق اس غلط فہمی کا شکار بھی رہ چکی تھی کہ وہ مارا جا چکا ہے اور یہ کہ حکومت نے اس کے سر کی بڑی بھاری قیمت، یعنی پانچ ہزار روپے مقرر کر رکھی ہے۔

اب مجھ پر آہستہ آہستہ تمام حالات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ وہ حالات مختصر یہ تھے کہ میں ایک مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کے جسم میں پناہ گزین تھا۔ اس کے باپ کو لوگ ”بڑے ٹھاکر“ کہتے تھے اور ماں وہ بوڑھی عورت تھی، چچا زاد سریتا تھی اور بچپن کی سنگیتز لالہ!

میرے سامنے ایک اور ہی ابھرن تھی۔ میں پہلی ہی نظر میں سریتا کے بھرے بھرے گداز جسم پر عاشق ہو چکا تھا۔ رنجیت سنگھ کا جسم اپنانے سے پہلے میرے اندر جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، میں آدم زادوں کے قرب سے کھینچ گیا تھا، اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ معلوم نہیں، اب مجھے کیوں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ بغیر عورت کے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا وجود عورت کے بغیر نامکمل ہے۔ اس عجیب اور نئے احساس نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ کیا خبر رنجیت سنگھ کا جسم عورت کا اتنا ہی عادی ہو۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اب رنجیت سنگھ زندہ نہیں ہے۔ ہر چند کہ اس کا جسم زندہ تھا، مگر روح اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس کے جسم میں اس وقت میں تھا، ایک جن زاد علیالیش! مجھے یقین تھا کہ جب بھی میں نے وہ جسم چھوڑا بے روح و بے جان ہو جائے گا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھے جس سے جنون کی حد تک عشق ہو چکا تھا، وہ اس جسم کی چچا زاد تھی اور ہندو عقائد کے مطابق میں اسے اپنا نہیں سکتا تھا۔

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا گھوڑا دوڑا رہا تھا کہ سربتا کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ ”بھیا! ابھی اور کتنی دور ہے تھانہ؟ میں تو بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔“

سربتا کی آواز سن کر میں چونکا اور اس کے بھیا کہنے پر جی بی جی میں گھٹ کے رہ گیا۔ پھر بے رخی سے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ اگر تجھے حشک کا ایسا ہی خیال تھا تو ہمارے ساتھ آئی ہی کیوں؟ تجھے تو معلوم تھا کہ سفر طویل ہے!“

میرے لہجے کی خفگی کے سبب وہ کچھ سسم سی گئی اور پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں کس بات پر چڑ رہا ہوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ رام سروپ اپنے گھوڑے کو روک رہا ہے۔ یہ ایک موڑ تھا۔ موڑ آتے ہی میں نے اپنا گھوڑا ذرا سا اس سے پیچھے کر لیا تھا تاکہ وہ رہنمائی کر سکے۔ تمام قافلہ رک گیا۔ مڑتے ہی سامنے پھر روشنی سی دکھائی دی۔ رام سروپ کے اشارے پر وہ جوان آگے بڑھے جن کے گھوڑوں سے پانچ سپاہیوں کی لاشیں بندھی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں سے لاشیں کھولی گئیں۔ اب میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ مجھے دیکھ کر میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ واقعی آدم زاد سے بڑا کوئی درندہ نہیں۔

رام سروپ نے اپنی جب سے ایک پرچہ نکالا اور اسے خنجر میں پرو دیا۔ پھر وہ خنجر اس نے دستے تک ایک مردہ سپاہی کے سینے میں اندر دیا۔

”میرے ساتھ صرف دس جوان یہاں سے پیدل چلیں گے۔“ رام سروپ نے کہا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سردار! کیا حکم ہے؟ اجازت ہے؟“

”ٹھیک ہے، ہم بیس رک کر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ اس پر ایک اور نوجوان اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر آیا اور بولا۔ ”رام سروپ! اگر تم کسی طرح خطرہ محسوس کرو تو فوراً اشارہ دے دیتا۔ ہم تمہاری مدد کو پہنچ جائیں گے۔“

یہ بھی ایک بھاری بھر کم جوان تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رام سروپ کا بڑا بھائی چرنجی تھا، لال لال خونی آنکھوں والا چرنجی!

☆=====☆

رام سروپ اپنے ساتھ دس جوانوں کو لے کر روانہ ہو گیا، ہم سب وہیں ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ میرے قریب اس وقت چرنجی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کا ذہن پڑھنے لگا۔ وہ اس وقت یہ سوچ رہا تھا، ”آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی خطرناک موقع پر سردار نے پہل نہ کی ہو۔ پتا نہیں سردار کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر پولیس کے مقابلے سے بھاگ کھڑا ہوا اور آج جب رام سروپ نے کہا کہ میں دس جوانوں کو لے کر آگے جاتا ہوں تو بھی سردار نے اسے نہیں روکا۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ چرنجی کے ذہن میں میری طرف سے بغاوت کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے یہ خیالات آئندہ میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتے تھے۔

میں نے آہستہ آواز میں اچانک چرنجی سے کہا۔ ”تم غلط سوچ رہے ہو چرنجی! سردار سے بہتر یہ اور کون جان سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ اگر اس طرح قدم قدم پر تم لوگ میری انگلی پکڑ کر چلتے رہے تو میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ میں چاہتا ہوں، اپنے سامنے ہی تمہارے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا کر دوں کہ تم میرے بعد بھی کسی خطرناک سے خطرناک موقع پر اپنے آپ کو کم نہ پاؤ اور خود بروقت کوئی فیصلہ کر سکو۔“

میری بات سن کر چرنجی ایک دم چونک اٹھا اور جلدی سے گھبرا کر بولا۔ ”نہیں سردار! میں یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ تو خود بہت دلیر اور بہادر ہیں۔ آپ کسی طرح ہم سب سے پیچھے نہیں۔ دلیری، عقل اور خون خرابے میں ہم سے آپ لاکھ گنا آگے ہیں۔ میں ایسا کس طرح سوچ سکتا ہوں!“

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”جھوٹ مت بولو چرنجی! کیا تم بھول گئے کہ آج شام ہی میں نے کرنا کو کس طرح پہچان لیا۔ میں تمہارا سردار ہوں۔ تمہارے دلوں کا حال مجھ پر روشن ہے۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے! اگر تمہیں یقین نہ ہو تو میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ابھی تم یہ سوچ رہے تھے کہ آج دن میں تمہیں میں چھوڑ کر بھاگ گیا اور میں نے پہلے کبھی کسی موقع پر ایسا نہیں کیا۔ اس کے علاوہ.....“

چرنجی میری بات سن کر بوکھلا گیا اور میری بات کاٹ کر جلدی سے کہنے لگا۔ ”سردار! مجھے..... مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے واقعی قصور ہوا۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور میرے پیچھے پکڑ کر گزر گئے۔ ”آپ ہمارے پتا سان ہیں۔ سردار کا درجہ باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ ہم سب آپ کی اولاد کی جگہ ہیں۔ معاف کر دیجئے مجھے، مجھ سے بھاری غلطی ہوئی جو میں نے آپ کے بارے میں ایسا سوچا۔“ پھر وہ بھاری بھر کم نوجوان رونے لگا۔ بقیہ تمام جوان جو ذرا پیچھے گھوڑوں پر مستعد بیٹھے تھے، چرنجی کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

”چرنجی! میں نے تجھے معاف کیا۔“ مجھے اس کے حالت پر ترس آگیا۔ ”تو بھی آخر انسان ہے۔ غلطی بڑے بڑوں سے ہو جاتی ہے۔ جا، اپنے گھوڑے پر آرام سے بیٹھ۔ دل سے اس بات کو نکال دے کہ ہم نے تجھ سے سخت لہجے میں بات کی۔ جا!“

اتنا سن کر چرنجی اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور بقیہ جوانوں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں جوانوں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں جوانوں سے کوئی بیس منٹیں گزر آگے کھڑا تھا۔

”تم اگر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو تو نیچے اتر آؤ۔“ میں نے سربتا کو مخاطب کیا۔ ”چلو نیچے اترتے ہیں۔ یہ جگہ دیے بھی بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ اس پر یہ چاندنی رات تو اور بھی جادو جگا رہی ہے!“ میرے دل میں خواہشوں کے بھنور سے پڑنے لگے۔

سربتا میری بات سن کر گھوڑے سے اتر گئی اور بولی۔ ”ابھی رام سروپ کو گئے چند منٹ ہوئے ہیں۔ اسے واپس آنے میں کم سے کم ایک گھنٹہ تو لگے گا ہی۔ کیوں نہ ہم تھوڑی دیر ساتھ دالے باغ میں

ملیں..... کیا خیال ہے بھیا؟

میں نے لفظ بھیا کا کڑوا گھونٹ پی لیا اور اس کی تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس تجویز پر تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا 'سریتا اور میں' باغ' چاندنی' تنائی' میں بولا۔ "اؤ چلے ہیں۔" پھر میں نے چرنجی کے قریب پہنچ کر کہا۔ "سریتا اور میں اس برابر والے باغ میں گھوم کر ابھی آئے ہیں۔ اگر ایسی دیکھی کوئی بات ہو تو ہم یہیں قریب ہی موجود ہیں۔ میں فوراً آ جاؤں گا۔"

میری بات سن کر جوان مجھے حیرت سے دیکھنے لگے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ وہ شاید کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ چرنجی نے ان کی طرف مڑ کر اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھا اور ان کے سر جھک گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گروہ میں چرنجی کی حیثیت بھی خاصی مضبوط تھی۔

مجھے بھیا کہنے والی ایک حسین و نوجوان لڑکی میرے ساتھ جا رہی تھی۔ اسی سبب کسی کے وہم دگمان میں بھی نہ ہو گا کہ میرے دل میں کیا ہے۔

میں 'سریتا کو ساتھ لئے ٹھٹھا باغ میں داخل ہو گیا۔ ہمارے پیروں کے نیچے سوکھے پتے چرمرکی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ہمیں باغ میں اس طرح ٹھٹھا بہت اچھا لگا رہا تھا۔ میں نے سریتا سے کہا۔ "اؤ اس چیز کے نیچے تھوڑی دیر لیٹ جائیں۔ پتوں کا بستر بڑا مزہ دے گا۔"

سریتا نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم دونوں اوندھے آنے سامنے لیٹ گئے۔ سریتا نے کنبیوں کے بل اٹھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "کتنا اچھا لگا رہا اس وقت!"

میں بھی کنبیوں کے بل ذرا سا اٹھا۔ میرے اور سریتا کے چہرے بالکل آنے سامنے تھے۔ اس کے گرم گرم سانس میرے سانسوں میں گھل رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اور سریتا صدیوں سے اسی حالت میں پڑے ہیں۔ اس کے گرم گرم سانس اور جسم کا اتار چڑھاؤ مجھ میں طوفان سا چمکے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا 'آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں، لیکن پہلے میں نے اس کی بڑی بڑی ٹٹلی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک دم مجھے اور اسے جھٹکا سالگا۔ اب میں اس کے ذہن کو پڑھ سکتا تھا۔

اس وقت وہ کرتار کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کرتار کے بارے میں جان کر میں ایک دم سلگ اٹھا۔ میں نے اپنے ذہن سے سریتا کے ذہن کو حکم دیا 'کرتار کو بھول جا! وہ بے وفا ہے، پولیس کا جبر ہے' تیرے بھائی کا دشمن ہے! وہ تجھے نہیں چاہتا۔

سریتا نے ذہن جواب دیا 'نہیں! میں اسے نہیں بھول سکتی، کسی قیمت پر نہیں۔ میں اسے چاہتی ہوں۔'

میں نے پھر اسے حکم دیا 'تجھے اس کو بھولنا پڑے گا' تجھے اب ہوش آئے گا تو اسے بھول چکی ہوگی۔ اس نے تیری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ تیرا اور تیرے بھائی کا دشمن ہے، بس تجھے اتنا یاد رہ جائے گا۔ تو خود بڑے ٹھاکر سے یہ کہے گی کہ میں 'کرتار کو گولی ماروں گی۔ تو خود کل صبح اپنے ہاتھ سے کرتار کو گولی مارے گی!

ٹھیک ہے! ایسا ہی ہوگا۔ اس کے ذہن نے جواب دیا۔ اب اس کا ذہن پوری طرح میری گرفت

میں آچکا تھا۔

مجھے اپنی ایک اور قوت کا احساس ہوا کہ میں حکم بھی کسی سے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اس سے میں اور بھی خوش ہو گیا۔ میرے ذہن میں بالکل نئی ہی بات آئی۔ میں نے اپنے ذہن سے پھر اسے ایک حکم دیا۔ رنجیت سنگھ تیرا بھائی نہیں، وہ تیرا عاشق ہے اور تو بھی اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ جو بھی تجھ سے کہے گا، تو انکار نہیں کرے گی۔ سب اسے تیرا بھائی کہیں گے مگر تو اسے اپنا عاشق سمجھے گی اور تو بھی اسے پوری شدت سے چاہے گی۔ ہوش میں آنے کے بعد تو یہ سب کچھ بھول جائے گی کہ کسی نے حکم دیا تھا۔ یہ سب کچھ کرایا ہے۔ بس تجھے اتنا یاد رہ جائے گا کہ کرتار تیرا اور تیرے عاشق رنجیت سنگھ کا دشمن ہے۔ تیرے عاشق کو کرتار 'پولیس' کے ہاتھوں پکڑا دینا چاہتا ہے۔

پھر میں نے لمحے بھر کو اس کی آنکھوں سے آنکھیں جدا کیں۔ دوبارہ اسے اور مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے اپنے نزدیک پا کر وہ شرمائی اور نظریں جھٹکیں۔ میرے دل پر جیسے بجلی سی گر گئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنانے لگا۔

پھر میں اسے سہارا دیے اٹھا کر سڑک کی طرف چلے لگا۔ ہم اب سڑک پر نکل آئے تھے۔ ہر چند کہ کسی آدم زاد کی قریب میرے لئے نیا نہیں تھا مگر سریتا کی بات ہی کچھ اور تھی۔

ہمیں ابھی اپنے گھوڑے کے پاس آئے ایک منٹ ہوا تھا کہ دور سے رام سروپ اور اس کے ماتھی آتے دکھائی دیے۔

"سردار مبارک ہو!" رام سروپ قریب آتے ہی بولا۔ "تمام کام ٹھیک طرح اور خاموشی کے ساتھ ہو گیا۔ ہم پانچوں لاشوں کو ایک رسی سے باندھ کر بالکل تھانے کے سامنے پھینک آئے ہیں۔ وہاں پڑا تھا، مگر تھانے کا پھانک اندر سے بند تھا۔ اندر ہی پانچ چھ سپاہی پھرا رہے تھے۔ تھانے کے پھانک نے ہمارے کام میں آسانی کر دی۔ اس میں سلاخیں نہیں ہیں بلکہ نین کی چادر چڑھی ہوئی ہے۔ ہم اکڑوں بیٹھ کر بالکل پھانک کے سامنے وہ پانچوں لاشیں پھینک آئے اور اسی طرح خاموشی سے واپس آ گئے۔"

کلاردوائی کی پوری تفصیل سن کر میں نے رام سروپ کو شاباش دی اور کہا۔ "مجھے تم یہی امید تھی۔"

"سردار اگر چاہیں تو اب واپسی میں سریتا کو میرے گھوڑے پر بٹھا دیں، آپ تھک گئے ہوں گے۔"

رام سروپ کا یہ فقرہ سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے سختی سے کہا۔ "کیا؟" پھر میں نے رام سروپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اسے اور مجھے جھٹکا سالگا۔

رام سروپ سوچ رہا تھا 'ہائے سریتا! تو میرے ساتھ گھوڑے پر بیٹھے تو کتنا مزہ آئے۔ تجھے تو ابھی میرے پیار کی خبر ہی نہیں کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس کا ذہن سریتا سریتا کی حکمرانی میں جلا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ سریتا اب اس کی ہم سفر ہوگی۔

موزے ہی پر بیٹھے بیٹھے ایک مرتبہ کسمائی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی جیسے اسے میرا وہاں رکنا پسند نہ آیا ہو۔

میں جیسے ہی گھوڑے سے اترا لاہو بولی۔ ”بس آرام کر“ میں یہی دیکھنے یہاں کھڑی تھی کہ ٹو ساتھ نیرت کے واپس آجائے۔ سو بھگوان نے میری سن لی۔ ”یہ کہہ کر اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں عجیب سپردگی، عجیب کیف تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”اچھا تو سریتا بھی نیرے ساتھ گئی تھی!“

میں نے سوچا کہ اس موقع پر سریتا ضرور کچھ بولے گی اور اپنی خاموشی ختم کر دے گی، مگر وہ اسی طرح منہ پھلائے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔

سریتا کی سرد مہری کا لاہو نے کوئی اثر نہ لیا اور کہنے لگی۔ ”تو نے ضرور سریتا کو ناراض کر دیا ہے۔ ہاں اسے مناوہرہ میں تھے سے نہیں بولوں گی۔“ وہ اٹھلا کر سریتا کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کہا۔ ”کیوں رہی کیا بات ہے؟ تجھے سانپ سوکھ گیا ہے؟ اگر اس نے تجھ سے کچھ کہا ہے تو مجھے بتا! میں اس کی ساری سرداری ابھی جھاڑ دیتی ہوں۔ اری بولتی کیوں نہیں؟..... اچھا شاید بہت تھک گئی ہے۔ لے میں تجھے اور زیادہ نہیں ستاتی۔ دیسے میں تجھے بتا دوں کہ رات بھر میں بھی نہیں سوئی ہوں۔ ماں نے لاکھ مجھ سے کہا کہ اری سو جا، وہ خیریت کے ساتھ آجائے گا، لیکن میں بیس جھونپڑے کے باہر رات بھر کھڑی رہی۔ تھک ہار کر ماں بھی سو گئی..... اچھا جا، اب تو بھی سو میں بھی چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہو گئی۔ رات بھر جاگ کر شاید وہ بھی تھک گئی تھی۔

میں آگے بڑھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی گھوڑا آگے بڑھا، سریتا مجھے پر برس پڑی۔ ”یہ کبھت لاہو مجھے ایک نظر نہیں بھاتی۔ دیکھ رہی تھی، میں تجھے چاہتی ہوں اور ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور بھی تجھ سے محبت کرے۔ اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو پتا ہے کیا ہو گا؟“

”کیا؟“ بے اختیار یہ سوال میری زبان پر آ گیا۔

”یا تو میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گی یا تجھے، سمجھا کہ نہیں!“ وہ غصے سے میری طرف مڑی۔

میں نے اسے ذرا اور چڑانے کو کہہ دیا۔ ”مگر میری جان، وہ تو میری منگیتر ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بچپن کا رشتہ ختم ہو جائے؟ شادی تو میں اسی سے کروں گا، ہاں محبت تجھ سے کرتا رہوں گا۔ ہاں اس میں برائی بھی کیا ہے، تو بھی خوش رہے گی اور وہ بھی!“

اس نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے میرے الفاظ دہرائے، پھر بولی۔ ”گولی نہ مار دوں گی تجھے!“

میں نے یوں ہی بظاہر ڈرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہے تو بہت خطرناک ہے۔“

ہماری آہٹ سے شاید بڑے ٹھاکر کی آنکھ کھل گئی۔ جیسے ہی ہمارا گھوڑا جھونپڑے کے آگے رکاوٹ بننے لگا، دروازہ کھول دیا۔ بڑے ٹھاکر کو دیکھتے ہی سریتا چونکی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ جھونپڑے میں سے ہونے بولی۔ ”بابا! کرتار کی ٹمک حرامی اور بڑی کا بدلہ میں اس سے لوں گی۔“

میں نے اس کے ذہن کو حکم دیا، سریتا کا خیال دل سے نکال دے، وہ تجھے نہیں چاہتی۔ ۱۱
سروپ! ایک طرف محبت بے معنی ہے۔ پھر یہ بھی تو سوچ کہ وہ تیرے سردار کی بہن ہے۔ اب تو جبر ہوش میں آئے گا تو تیرے دل سے سریتا کا خیال نکل چکا ہو گا۔ تو اسے اب صرف اپنی بہن کہہ گا.....

اس کے ذہن نے مدافعت کی، مگر میں نے اس کی سوچ کاٹ دی، کچھ نہیں! آج سے تو اسے بہن ہی سمجھے گا، کچھ اور نہیں۔

بمتر ہے۔ اس کا ذہن مطلوب ہو گیا۔ اب سے میں، سریتا کو بہن ہی سمجھوں گا۔ وہ میری بہن ہی کے برابر ہے۔

میں نے رام سروپ کی طرف سے نظریں ہٹالیں اور کہا۔ ”ہاں رام سروپ، تم کیا کہہ رہے تھے کہ سریتا کو تمہارے گھوڑے پر بٹھا دیا جائے؟“

”جی نہیں سردار! آپ ہی بہن جی کو اپنے ساتھ بٹھالیں۔“ رام سروپ نے جواب دیا۔

میرے دل سے ایک کانٹا سا نکل گیا۔ اب ہم پھر اپنے ٹھکانے کی طرف واپس جا رہے تھے۔ مگر اس وقت سوچ رہا تھا کہ صبح جب سریتا، بڑے ٹھاکر سے کہے گی کہ میں خود کرتار کو گولی ماروں گی تو بڑے ٹھاکر کا کیا حال ہو گا؟ خود کرتار اس وقت کیا سوچے گا جب وہ ستون سے بندھا ہوا اپنی موت کی گھڑیاں گز رہا ہو گا!

جب ہم گول وادی میں پہنچے تو صبح نوار ہونے والی تھی۔ اس جھپٹے میں سرسبز و شاداب وادی بہت حسین لگ رہی تھی۔ عجیب خواب ناک سا منظر تھا۔ میرے ذہن سے ابھی رات کا شمار نہیں اترتا تھا۔ باغ، سریتا، چاندنی اور میں۔ سریتا اس وقت بھی گھوڑے پر میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی جیسے وہ میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔

وادی میں داخل ہوتے ہی تمام جوان اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں، سریتا کے ساتھ لئے اپنے جھونپڑے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وادی میں جاگ نہیں ہوئی تھی۔ میں جب سب سے الگ ہو گیا اور ایک سنان گلی سے گزرنے لگا تو سریتا نے پیچھے مڑ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میرے طرف دیکھا، یوں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں پہلے سے بھی سو گنا زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

اچانک میری نظر گلی کے ایک جھونپڑے کے در پر پڑی۔ وہاں ایک جانی پہچانی نازک سی دروازہ لڑکی کھڑی تھی۔ گھوڑا جیسے ہی اس کے قریب، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ لاہو تھی، یعنی میرے موجود جسم ڈاکو رنجیت سنگھ کی منگیترا!

لاہو کو اس وقت میں وہاں دیکھ کر عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ تو کیا یہ لڑکی صبح ہی صبح میرے انتظار میں یہاں آ کر کھڑی ہو گئی ہے؟ یا یہ رات بھر سو نہیں سکی؟ آخر چکر کیا ہے؟ پھر بھی مجھے اس سے ایک قسم کی ہمدردی ضرور محسوس ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ سریتا خاموش تھی۔

”کیا؟“ بوڑھا سفید ریش، سریتا کی بات سن کر حیران سا نظر آنے لگا۔

”ہاں بابا! اسے آپ نہیں، میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گی! اس نے پولیس سے مخبری کر ہمارے ساتھ ہی نہیں پوری دادی سے غداری کی ہے۔ وہ میری محبت کا جھوٹا ڈھونگ رکھا کر سزا چاہتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا!“

”سریتا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے بابا!“ میں نے بھی تائید کی۔

بڑے ٹھاکر نے آگے بڑھ کر سریتا کو گلے سے لگایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میری میری سریتا! تو نے میری عزت رکھ لی۔ تیرے اندر ہمارے ہی خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ تو میرا بھائی کی بھادر بیٹی ہے۔ تو ایک ٹھاکر ہی کی اولاد ہے، ٹھاکر کی!“ یہ کہہ کر وہ بلند آواز میں بولا۔ ”رہنچے ماں، اے رنجیت کی ماں، اری سنتی ہو، تمہاری سریتا کیا کہہ رہی ہے، یہ ہے اصل ٹھکرائن!“

جواب میں اندر جھونپڑے سے فیند میں ڈبلی ہوئی ایک آواز آئی۔ ”ارے کیا آفت آگئی، صبح کیوں جھونپڑا سر پر اٹھا رکھا ہے!“ یہ بڑی ٹھکرائن کی آواز تھی۔

”اب تم آتی ہو یا تمہارے اوپر آکر مکالمہ دوں آکر۔ صبح ہو گئی اور تم ابھی تک پڑی ہو!“ بوڑھا کڑک کر بولا۔

بوڑھے کی کڑک دار آواز سن کر بڑی ٹھکرائن جھونپڑے کے اگلے حصے میں داخل ہوئی اور سے بولی۔ ”تو واپس آگیا، گزرتو نہیں ہوئی کچھ؟ میں تو ذرا سی تھی کہ تیرے ساتھ سریتا بھی گئی۔ کہیں کوئی ایسی دلی بات نہ ہو جائے۔“

بوڑھا ٹھاکر فخر سے سینہ تان کر کہنے لگا۔ ”ہونہ! سریتا کو تم کیا سمجھتی ہو! آخر وہ میرے بھادر کا خون ہے، ایک ٹھاکر کا خون! آج تم اس کا نشانہ بھی دیکھ لو گی۔ دیکھنا ہے، میری اب تک کی محنت کا ہوئی یا نہیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا نشانہ؟“ ٹھکرائن نے حیران ہو کر پوچھا۔
”تمہیں سب کچھ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا، دنگ رہ جاؤ گی سریتا کا فیصلہ کرنا۔“

”اب کچھ بتاؤ گے بھی یا بس یوں ہی تنگ کئے جاؤ گے!“
بڑے ٹھاکر کا سینہ جیسے کچھ اور چڑا ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اس کی جھکی ہوئی کمر ایک دم سیدھی ہے۔ ”سریتا اپنا نشانہ کرنا پر آئے گی۔“ ٹھاکر نے بتایا۔

”کیا؟“ ٹھکرائن حیرت زدہ رہ گئی۔
”ہاں، یہ خود سریتا کا فیصلہ ہے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اس کی غیرت جاگ اٹھی۔ یہ کرتار کے جھونے پیار کو سمجھ چکی ہے۔“

ٹھاکر ابھی یہی کہہ پایا تھا کہ ایک آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کی صورت بت بہا تھی۔ آدھا چہرہ بالکل جلا ہوا تھا، قطعی سیاہ تھا۔ ایک آنکھ بھی چہرے پر نہیں تھی۔ پیشانی سے

ایک جگہ جگہ سیاہ گوشت لٹک رہا تھا اور آدھا چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ یہ بڑی سی آنکھ اور گوری ریشہ چہرہ کسی ایک آدمی کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دھچرے آپس میں جوڑ دیئے گئے ہوں۔ اسے سیدھی طرف سے دیکھا جاتا تو وہ نہایت خوب صورت جوان تھا۔ بائیں طرف سے اگر کوئی اسے

دیکھتا تو وہ بے حد بد صورت، کربہ اور بھیانک دکھائی دیتا۔ وہ آتے ہی بولا۔ ”سردار! کرتار ایک بار مرنے پہلے سریتا سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ آخری خواہش ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بے شک مجھے گولی مار دو مگر رات مرنے سے پہلے ایک خواہش پوری کرو، مجھے سریتا سے ملا دو۔ مرنے والے کی آخری خواہش کا نام دنیا کے ہر قانون میں کیا جاتا ہے اور ہمارے قانون میں بھی اس کی گنجائش ہے۔ اگر سردار اجازت مانو اس کی خواہش پوری کر دی جائے۔“ وہ یہ کہہ کر ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، بڑے ٹھاکر کی گردن آواز جھونپڑے میں گونجی۔ ”اس سے کہہ دو اس کی یہ خواہش ضرور پوری کی جائے گی، مگر بڑے میدان میں۔ وہاں سریتا خود اپنے ہاتھ سے اسے مارے گی۔“

اس فیصلے کو دیکھ کر میں زیادہ خوش نہ ہوا اس لئے ذرا ناگواری سے کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو مگر نام و نام نہ بڑے ٹھاکر کا فیصلہ سن لیا۔ یہی ہماری رائے ہے۔“

مگر نام سنگھ نے اپنی ایک بڑی آنکھ سے میری طرف دیکھا۔ میرے لہجے کی سختی سے وہ کچھ سٹپٹا رہا تھا۔

”بھتر ہے سردار!“ وہ میرے آگے سر جھکا کر بڑی عقیدت کے سے انداز میں لوٹا اور جھونپڑے سے نکل گیا۔

بڑے ٹھاکر نے میرے سخت لہجے کو شاید کچھ اور ہی معنی دیے اور کہا۔ ”رنجیت! کیا تو ہمارے فیصلے سے مطمئن نہیں؟ تیرے لہجے میں ناگواری کیوں ہے؟“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ذرا سنبھل کر بولا۔ ”نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل اس نے گرام سنگھ کو دیکھ کر مجھے ذرا ناگواری ہوئی۔“

”کیا مطلب؟“ بڑے ٹھاکر نے اظہار حیرت کیا۔ ”مگر نام تو تیرے اوپر جان چڑھتا ہے۔ کیا تو بھول باکہ ایک مرتبہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تجھے بچایا تھا اور تیرے لئے بھڑکتی ہوئی آگ میں دھڑکتا تھا۔ پھر تجھے بچانے ہی کی خاطر یہ سامنے آگیا تھا۔ پھر اس کے بجائے کہ دشمن کی انھی ہوئی مشعل سے چرے کو بھون دیتی، اس نے اپنا چہرہ آگے کر دیا اور اپنی ایک آنکھ کے ساتھ آدھے چہرے سے دم ہو گیا۔ نشانہ اتنا سچا ہے کہ آواز پر گولی مارتا ہے۔ تجھے کل سے یہ کیا ہو گیا ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کی اہم معرکے میں تو نے اسے ساتھ نہ لیا ہو۔ کل تم سب کے روانہ ہونے کے بعد میں بہت دیر سوچتا رہا کہ اس کی کیا وجہ ہے جو تو نے اسے ساتھ نہ لیا؟“ یہ کہہ کر وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اپنی غلطی اور لاعلمی پر جی ہی جی میں شرمندہ ہوا۔ مجھے واقعی یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنی نقت مٹانے کے لئے میں نے کہا۔ ”بابا! دراصل رات بھر کی تھکن نے میری طبیعت کچھ بجا

دی ہے۔ مجھے واقعی گرتام سے اس طرح سخت لہجے میں بات نہیں کرنا چاہئے تھی۔ آپ صبح کتنے ہیں میرا محسن ہے اور محسنوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔“

جب میں بڑے ٹھاکر سے بات کر رہا تھا تو سریتا اور ٹھکرائن اندر جھوپڑے میں چلی گئی تھیں۔ غالباً ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ناشتہ آگیا۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران سریتا نے ایک غیر حرکت کی۔ پوری کا ایک نوالہ میری طرف بڑھایا اور میرے منہ کے قریب لاکر بولی۔ ”لے کھا“۔ میں نے منہ کھولا تو نوالہ ہٹا لیا۔ اسی طرح اس نے کئی دفعہ کیا۔ میں نے جھنجھلا کر منہ آگے بڑھایا۔ زبردستی پوری کا نوالہ اس سے جبین کر کھا گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ سریتا کی انگلی بھی میرے دانت کے آکر زخمی ہو گئی اور ”سی سی“ کرتی ہوئی چیخ اٹھی۔ پھر مجھے بھی یہی سوچیں۔ میں نے بھی نوالہ اس طرف بڑھایا اور اس نے پہلے ہی ہلے میں اس سے بے نیاز ہو کر کہ میری انگلیوں کا کیا حشر ہوگا، پورا نوالہ جھپٹ لیا اور ساتھ ہی میری انگلیاں بھی چبا ڈالیں، پھر کہنے لگی۔ ”اب پتا چلا!“

ہم دونوں کی ہچکنا حرکت پر ٹھاکر نے بزرگانہ شفقت سے ہمیں ڈانٹا۔

”چپ چاپ دونوں ناشتہ کرو ورنہ دونوں کے کان اکھاڑ دیئے جائیں گے!“ ٹھاکر نے کہا۔

اس پر ٹھکرائن بولی۔ ”ہاں تمہیں تو میرے بچوں کو مارنے کا موقع ملنا چاہئے۔ دیکھتے نہیں، دوڑا بہن بھائیوں میں کتنی محبت ہے۔ دونوں بالکل سکے لگتے ہیں۔ بھگوان کرے دونوں جیون بھرائی طر ایک دوسرے کو پیار کرتے رہیں۔“

بڑی ٹھکرائن کے یہ الفاظ سن کر سریتا چند لمحوں کو کچھ کھوس گئی اور پھر ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گئی۔ اب وہ نہ جانے کیوں خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ مجھے اس وقت بتا چکی تھی کہ میں ’بالکل گڑیا سی! سریتا کیا تھی‘ ایک جادو تھی۔ اس کی ہر ادا میں ایک بھولپن، ایک سادگی، ایک سپردگی، ایک پیار اور نہ جانے کیا کیا تھا جس پر میں دل و جان سے عاشق تھا۔ شاید ہر عاشق کو اپنی محبوبہ کی یہ لگتی ہو.....!!!

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ لوگوں کی نظر میں پچا زاد تھی، لوگ اسے میری بہن سمجھتے تھے اور میرا نظریں وہ میری محبوبہ تھی۔ کبھی کبھی میں اس خیال سے لرز جاتا کہ لوگوں کو اگر کبھی اس سے میرا عشق کا پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟ ہندو عقائد رکھنے والے وہ لوگ کیا اسے قبول کر لیں گے؟ پھر میں یہ سوچا مطمئن ہو جاتا کہ راز افشا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی اسی سوچ میں گم تھا کہ گرتام سنگھ پھر جھوپڑے میں داخل ہوا۔ اس مرتبہ گرتام سنگھ کے ساتھ رام سروپ اور چرنی بھی تھے۔ وہ دونوں گرتام سنگھ سے دلچسپی سے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ چرنی کی خوفناک آنکھیں اس وقت عقیدت میرے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔ کل رات کے واقعے نے اس کی نظر میں میری عقیدت کافی بڑھا دی تھی اور گرتام سنگھ کے بارے میں تو میں جان چکا تھا کہ میرا جان نثار ہے۔

”سردار!“ گرتام سنگھ نے سر جھکا کر مجھے مخاطب کیا۔ ”بہتی کے تمام لوگ بڑے میدان میں جا“

تج ہیں۔ سورج اب نکلنے ہی والا ہے۔ قانون کے مطابق سورج نکلنے ہی مجرم کو گولی مار دینی چاہئے اس لئے ہم سب آپ کے منتظر ہیں۔ پھر مرنے والے کی آخری خواہش کا مسئلہ بھی ہے۔“

وہ سب ایک ساتھ سر جھکا کر جھوپڑے سے نکل گئے۔ بڑے ٹھاکر نے بندوق لوڈ کر کے سریتا کی طرف بڑھا دی۔ سریتا نے بڑے اعتماد سے بندوق لے کر اپنے شانے سے لٹکا لی۔ ہم سب یعنی فائر ٹھکرائن، میں اور سریتا، گھوڑوں پر سوار ہو کر رات والے بڑے میدان کی طرف چل دیے جہاں مزید رات پانچ ساہیوں کو گولی مار دی گئی۔ رات کو مجھے اس درندگی کے مظاہرے سے نفرت سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اس فعل کو بریریت سمجھا تھا، مگر آج جب کہ یہی فعل دہرایا جانے والا تھا اور پانچ آدمیوں کا قاتل ٹھاکر میرے ساتھ ساتھ گھوڑے پر دوڑ رہا تھا تو مجھے کوئی نفرت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے تو جب ہی خوشی تھی۔ میں اپنے رقیب کو راستے سے ہٹا رہا تھا۔ حصول اقتدار کے بعد شاید عورت ہی کی خاطر دنیا میں سب سے زیادہ خون بہایا گیا ہے۔ عورتوں کے لئے آدم زادوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ خود میری محبوبہ، میرے رقیب کو قتل کرنے والی تھی۔ اس وقت سریتا ایک الگ گھوڑے پر سواری کر رہی تھی۔ اس کے کانڈھے سے بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ وہی بندوق میرے رقیب کو اس دنیا سے رخصت کرنے والی تھی۔

اب ہم اس خونی میدان میں تھے۔ وہی منظر جو رات کو تھا، اس وقت بھی تھا، بس اگر کچھ فرق تھا تو شطوں کا۔ اس وقت کیونکہ صبح تھی اس لئے شعلیں نہیں تھیں۔ باقی سب کچھ وہی تھا، وہی نعرے، وہی جھوم۔ ”بڑے ٹھاکر کی بے، رنجیت سنگھ کی بے، سریتا رانی کی بے!“ اپنی اور سریتا کی بے کے نعرے ساتھ ساتھ سن کر میرے دل کو ایک عجیب خوشگوار احساس ہوا۔ ہم بھی انھی نعروں کی گونج میں چوتھے تک پہنچے۔ حسب توقع بڑے ٹھاکر کی تقریر شروع ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تو اس طرح اس شخص نے ہم سب کے ساتھ غداری کی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک جرم اور کیا۔“

جھوم ہم تن گوش تھا کیونکہ دوسرے جرم کا علم صرف چند افراد کو تھا۔ لوگوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ اسی لئے دم سادھے بڑے ٹھاکر کی تقریر سن رہے تھے۔

”دوسرا جرم!“ ذرا توقف سے بڑے ٹھاکر کی آواز پھر بلند ہوئی۔ ”اس کا دوسرا جرم یہ ہے، سزا سے بچنے کے لئے اس نے بہتی کی ایک عزت دار بیٹی سریتا پر یہ الزام لگایا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور سریتا بھی اسے چاہتی ہے۔ یہ سب ایک ڈھونگ، ایک جھوٹ تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ خود اس بہتی کی وہ غیرت مند بیٹی اس بزدل اور جھوٹے کو اپنے ہاتھ سے گولی مارے گی۔ پھر شاید کسی کو بہت نہ ہو کہ اس بہتی کی غیرت مند بیٹیوں پر الزام لگا سکے۔“

ٹھاکر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی مجمع نے پھر خوشی سے پُر جوش نعرے لگائے۔ میں نے دور بندھے ہوئے کرنا کو دیکھا کہ اس کی گردن جھک گئی ہے۔ بڑے ٹھاکر کی کڑک دار آواز شاید اس تک پہنچ گئی تھی۔ ستون سے بندھا ہوا وہ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے موت سے پہلے ہی مر چکا ہو۔ یہ اطلاع غالباً اس کے لئے موت سے بھی بڑی خبر تھی کہ سریتا خود اسے گولی مارے گی۔ یقیناً یہ بات اس کے لئے ناقابل

یقین ہوگی، لیکن حقیقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

بڑے ٹھاکر کی آواز پھر گونجی۔ ”اس بزدل کی آخری خواہش یہ ہے کہ سریتا ایک دفعہ اس سے ملے۔ مرنے سے پہلے اس کی یہ آخری خواہش ہم پوری کرتے ہیں اور سریتا کو حکم دیتے ہیں کہ وہ بزدل کے پاس جائے اور اس کی بات سنے!“

اتنا سن کر مجمع سے ایک شور بلند ہوا۔ سریتا نے سامنے ستون سے بندھے ہوئے کرتار کی طرف دیکھ کر ٹھوک دیا، مگر شاید کرتار نے اسے ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ٹھاکر کے فخرے سن کر بہت زور سے چیخا۔ ”انھوں نے سریتا کو مجبور کر دیا ہے ورنہ سریتا واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں نے سریتا اور سریتا نے مجھ سے محبت کی ہے۔ میں اپنی موت کا یقین ہونے کے باوجود دو چ ضرور بولوں گا۔ موت سے پہلے کوئی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

یہ سنتے ہی سریتا اپنی جگہ سے خود اٹھی اور زور سے چیخ کر بولی۔ ”یہ شخص جھوٹا ہے۔“ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ ”یہ بزدل اور کینہ ہے۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کے اوسلن خطا ہو چکے ہیں۔ پاگل ہو گیا ہے۔ یہ غدار ہے۔ میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی۔“

پھر سریتا نے جو فقرہ کہا، بہت خطرناک تھا، اتنا خطرناک کہ میں بھی ایک دفعہ سریتا ہی کی طرح کانپ اٹھا، لیکن میرے اور اس کے کانپنے میں فرق تھا۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور میں خوف سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کیا ہو گیا!

سریتا نے کہا تھا۔ ”میں نے اس بزدل سے نہیں، رنجیت سے محبت کی ہے، سچی محبت! اور وہ مجھے اسی طرح چاہتا ہے۔“

یہ الفاظ میرے اوپر بجلی بن کر گرے۔ باقی تمام لوگ بھی کچھ دیر کے لئے مبسوت ہو گئے کہ سریتا نے یہ کیا کہہ دیا۔

اسی وقت فائر ہوا اور سب جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گئے۔ سریتا نے اپنا فقرہ ختم کرتے ہی کرتار گولی مار دی تھی۔ لوگ فائر اور مرنے والے کی آخری چیخ سے چونک اٹھے تھے۔ کرتار نے مرنے سے صرف ”سریتا“ کہا تھا اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ گولی شاید عین دل پر لگی تھی۔ اس کی آخری چیخ اور آخری لفظ صداقت کے گواہ تھے، مگر اس کی سچائی کو محسوس کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا ایک شخص اس کے عشق کی گواہی دے سکتا تھا اور وہ میں تھا۔ میں نے ہی اپنی پراسرار قوت کو بروئے کار کر سریتا کے ذہن سے کرتار کی محبت کے تمام نقوش مٹا دیے تھے، اس کے دل میں کرتار کی جگہ اپنی محبت پیدا کر دی تھی، ایسی محبت، اتنی شدید محبت کہ جس نے بھرے مجمع میں اپنا اظہار کر لیا۔

سریتا ہندوں رکھ کر چوتھے پر بیٹھ چکی تھی۔ بڑے ٹھاکر نے اٹھ کر مجمع کے سکوت کو اپنی پاٹ آواز سے توڑ دیا۔ ”آپ لوگ اب جان چکے ہوں گے کہ سریتا کو کرتار سے محبت نہیں تھی۔ کیونکہ کرتار نے تمہارے سردار رنجیت سنگھ کے سر کی قیمت وصول کرنا چاہی تھی اس لئے سریتا سے یہ برداشت نہ سکا۔ ہم میں سے یقیناً کوئی بھی یہ برداشت نہ کر پاتا! وہ تو پھر بھی ایک بہن ہے۔ سریتا کے دل

نہارے سردار اور اپنے بھائی رنجیت سنگھ کے لئے محبت تھی اس لئے آج اس نے اپنے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر خود کرتار کو گولی مارنا پسند کیا۔ کرتار اپنی سزا کو پتلا رنجیت بھی اپنی بہن کو اسی طرح چاہتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔“

بڑے ٹھاکر کی تقریر سے گویا ایک دھند سی چھٹ گئی۔ لوگ مطمئن ہو گئے اور متاثر ہو کر ”سریتا رانی کی ہے“ بولنے لگے۔ میرے دل کو بھی کچھ سکون ہوا، لیکن بڑے ٹھاکر کی وضاحتی تقریر کے بعد کچھ سننے کے لئے سریتا نے اٹھنا چاہا۔ میں اس کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر کچھ کہنا چاہتی ہے تو میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ اٹھ نہ سکے۔ سریتا نے میری طرف دیکھا تو میں بولا۔ ”بس اب کسی تقریر کی ضرورت نہیں۔“

میرے کہنے پر وہ مان گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تمام مجمع منتشر ہونے لگا۔ کرتار کی لاش کے لئے بڑے ٹھاکر کا حکم تھا کہ اسی طرح ستون سے بندھی رہے گی تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو، خبر اور غدار کا انجام کیا ہوتا ہے۔ کسی نے بڑے ٹھاکر کو یا مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ مرنے والے کی آخری خواہش پوری کیوں نہیں کی گئی؟ آخری خواہش پوری کیے بغیر ہی سریتا نے کرتار کو گولی مار دی تھی۔ شاید اسے بھی لوگوں نے سریتا کی غیرت مندی ہی سمجھا تھا۔

☆=====☆

گزری ہوئی رات اور وہ صبح بڑی تھکا دینے والی تھی۔

سریتا اور میں، دونوں ہی رات بھر کے جاگ اور تھکے ہوئے تھے۔ سو جھونپڑے میں بچنے ہی نرم نرم پال کے بستروں پر لیٹتے ہی سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ اندر کا حصہ بالکل خالی تھا اور درمیانی دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا۔ باہر کے حصے میں بھی شاید کوئی نہیں تھا۔ میں نے تصدیق کے لئے پردہ اٹھا کر جھانکا اور دوبارہ پال دار بستر پر آکر لیٹ گیا۔ اسی وقت میری نگاہ سریتا پر پڑی۔ وہ ابھی تک میرے دائیں جانب والے بستر پر بے خبر پڑی سو رہی تھی۔

میں بستر سے اٹھا اور اس کے چہرے جھک گیا اور پھر ایک آہٹ سنتے ہی چونک اٹھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لاجو کھڑی تھی۔

مجھے سے نظر ملنے ہی وہ کہنے لگی۔ ”بہت چاہتے ہو اپنی بہن کو! اس نے بھی تو آج بھرے مجمع میں تمہاری محبت کا اقرار کیا ہے۔ واقعی تمہارے لئے سریتا نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ میں اس کی رازدار ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ کرتار کو بے انتہا چاہتی تھی، اتنا کہ کرتار کے بغیر اس کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ اس نے بھائی بہن کی محبت کو امر بنا دیا ہے۔ ایسی مثال قائم کی ہے کہ پہلے کبھی نہیں سنی۔ تم نے آخراں پر کیا جادو کر دیا کہ اس نے خود اپنے عاشق کو گولی مار دی؟ عجیب لڑکی ہے!“

میں نے لاجو کے الفاظ سنے۔ اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ پیلی ساڑھی میں اس کا رنگ کھل رہا تھا۔

وہ میری نظریں بھانپ گئی اور بولی۔ ”کوئی شرارت نہ کرنا۔ کہیں سریتا جاگ نہ جائے!“

لاجو نے یہ جملہ اس طرح ادا کیا کہ مجھے اور نشہ ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کسمائی اور آہستہ سے کہا۔ ”دیکھ وہ جاگ گئی۔“
یہ سنتے ہی میں نے اسے جلدی سے چھوڑ دیا۔

”نکل جا یہاں سے“ بے غیرت کہیں کی دوسرے کے مال پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی!“ یہ آواز سریتا کی تھی جس سے انتہائی غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔
لaju حیرت زدہ سی رہ گئی اور پھر رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ ”سریتا تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا تو کمر کو اپنے ہاتھ سے گولی مار کر پاگل ہو گئی ہے؟“
سریتا غضب ناک ہو گئی اور کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوئی لaju! تیری عقل پر پتھر بڑھ گئے ہیں۔ اگر میں نے اب تجھے اس طرح رنجیت کے ساتھ دیکھا تو دونوں کو گولی مار دوں گی“ سمجھی کہ نہیں۔“
”سنو تو سریتا!“ میں بول اٹھا۔ ”آخر لaju میری منگیتر ہے۔ تمہیں اس طرح اس کی توہین نہیں کر چاہئے۔“

سریتا چیخ اٹھی۔ ”تم چپ رہو“ میں کچھ نہیں جانتی“ میرے علاوہ تمہیں کسی نے چاہا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“
لaju نے شاید یہ خیال کیا کہ کرنا کے صدمے نے سریتا کے ہوش و حواس معطل کر دیے ہیں۔ اسی لیے بولی۔ ”ابھی تم آرام کرو“ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔“

”تیری بلا سے“ میں مروں یا جیوں، لیکن تو اب یہاں قدم نہیں رکھے گی۔“
سریتا کے الفاظ سن کر لaju کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”اچھا اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی“ کبھی نہیں!“ میرے روکنے کے باوجود وہ جھونپڑے سے چلی گئی۔
لaju کے جاتے ہی میں نے سریتا کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے سریتا! آخر کوئی بات بھی ہو۔ تم نے ناحق لaju کو دکھ دیا۔“

سریتا نے خفگی سے کہا۔ ”رنجیت! میں تجھے چاہتی ہوں۔ ایک نیاں میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“
یہ کتنی عجیب بات تھی کہ کل ہی میں نے اس سے یہ فقرہ کہا تھا اور آج وہ مجھی سے یہ الفاظ کہہ رہی تھی۔ مجھے سریتا کی یہ انتہا پسندی کچھ زیادہ اچھی نہ لگی مگر میں کرتا بھی کیا!

اس عرصے میں ٹھاکر اور ٹھکرائن بھی آگئے۔ ٹھاکر نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ”کیونکہ پولیس نے ہمارے آدمیوں کو نہیں چھوڑا اس لئے میں نے بقیہ پانچ سپاہیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ آج رات ہمارا کی لاشیں تھانہ گزوال پہنچائی جانا چاہئیں۔ پولیس کو آئندہ کے لئے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم صرف دھمکی نہیں دیتے“ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اس طرح آئندہ پولیس محتاط رہے گی اور ہمارے لئے پر توجہ دے گی۔ تم کل رات کے تھکے ہو“ آج یہ کام گرام سنگھ کرے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“
میں نے جواب دیا۔ ”بالکل صحیح ہے“ مگر آج رات کل سے زیادہ خطرہ ہے۔ پولیس ہمارے ارادے

سے واقف ہے کہ ہم آج رات بقیہ سپاہیوں کی لاشیں لائیں گے۔ آپ سوچ لیجئے بڑے ٹھاکر!“ میرے یہ کہنے میں ڈھکی چھپی یہ خواہش پنہاں تھی کہ آج رات بھی مجھے باہر نکلنے کا موقع مل جائے تاکہ کل کی طرح چھوٹی باغ اور سریتا ہو۔

”یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔“ بڑے ٹھاکر نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ”ویسے ہمارے آدمی اب بھی تھانہ گزوال سے لے کر یہاں تک ٹکڑیوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ پولیس ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دے تو پیچھا کرنے والوں کو صاف کیا جاسکے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس نے ہمارے آدمیوں کو کیوں نہیں چھوڑا۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ اپنے پانچ سپاہیوں کی لاشیں دیکھ کر ڈر جائیں گے اور بقیہ پانچ کی زندگی بچانے کے لئے ہمارے آدمیوں کو رہا کر دیں گے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں نہیں ہوا!“

ٹھاکر ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دور سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہم سب چونک اٹھے اور ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اسی وقت گرام سنگھ بھاگتا ہوا جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے اس نے بتایا۔ ”سردار! غضب ہو گیا۔ پولیس ہمارے ٹھکانے تک پہنچ گئی۔ وہ بہت بھاری تعداد میں ہیں اور ان کے پاس.....“

گرام سنگھ اپنی بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ بہت زور کا دھماکا ہوا۔
”آپ نے سنا سردار! ان کے پاس گولے بھی ہیں۔ یہ ایک گولے ہی کی آواز تھی۔“ گرام سنگھ بول اٹھا۔

”یہ..... یہ تو بہت..... بہت برا ہوا!“ بڑے ٹھاکر نے کلمہ اس کے چہرے پر مجھے پہلی مرتبہ بدحواسی نظر آئی۔

”ہاں بڑے ٹھاکر!“ گرام سنگھ مزید بتانے لگا۔ ”انہوں نے گولے مار مار کر ہمارے خفیہ راستے کو اڑا دیا ہے اور اسی کے ذریعے وادی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے آدمی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر رہے ہیں“ بڑے ٹھاکر، بڑی ٹھکرائن اور سریتا پچھلے خفیہ راستے سے فرار ہو جائیں۔ اس عرصے میں ہم کوشش کریں گے کہ وہ وادی میں محاصرہ نہ ہو سکیں۔“

اس کا یہ کہنا تھا کہ ٹھاکر چیخ اٹھا۔ ”کیا بکتا ہے گرام! یہ کہہ کر ہمارے پڑکھوں کی روحوں کو شرماتا ہے۔ ہم میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں، ناممکن، ایسا نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں! ہم اٹھائی گیرے نہیں ہیں، پشتینی ڈاکو ہیں! رنجیت! ماں! میری بندوق دوا!“

گرام سنگھ پھر گزرا یا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ”سردار! بڑے ٹھاکر جذبات میں بہہ رہے ہیں۔ بمکوان کے لئے آپ نکل جائیے۔ ہم سب کی جانیں آپ سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔“

میں عجیب شش و پنج میں تھا۔ اس وقت میرے اوپر سینکڑوں سوال حملہ کر رہے تھے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے مجھے؟ آخر میں ایک فیصلے تک پہنچ ہی گیا۔ ہمارا اس طرح بھاگنا کسی بھی صورت مفید نہیں تھا۔ کیا خبر ہم جس راستے سے فرار کی کوشش کرتے، وہاں پہلے سے پولیس موجود ہوتی۔ میں نے یہی

سوچ کر گرنام سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”نہیں گرنام، ہم اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے! تم صرف اتنا بتا دو کہ پولیس کی کمان کون کر رہا ہے؟“

”خود آئی جی پولیس۔“ گرنام نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں ایک تدبیر آچکی تھی۔ میں نے گرنام سے کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ میں خفیہ راستے سے ہو کر اس کی جیب تک پہنچ سکوں؟ پوزیشن کیا ہے، مجھے سمجھاؤ!“

”اگر آپ پچھلے خفیہ راستے سے جائیں گے تو یہ راستہ آپ کو عین ان کی پشت پر پہنچا دے گا، لیکن آئی جی کی جیب تک پہنچنا بہت جاں جو کھوں کا کام ہے سردار!“ گرنام نے بتایا۔

”مگر تم وہاں تک پہنچ کے کیا کرنا چاہتے ہو؟“ ٹھاکر نے سوال کیا۔

”یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے بابا! میرا وہاں تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ اگر میں وہاں تک پہنچ گیا تو ہم جانیں گے۔“ یہ کہہ کر میں نے گرنام سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”تم مجھے پچھلے خفیہ راستے سے چھوڑ کر یہاں واپس آؤ گے۔ جب تمہیں میرے فائر کی آواز سنائی دے۔“

”اتنی فائرنگ میں آپ کے فائر کی آواز میں الگ سے کس طرح پہچانوں گا؟“ گرنام میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا۔

”تم سنو تو!“ میں نے کہا۔ ”جب تم دیکھو کہ پولیس نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے ہیں اور فائرنگ بند ہو چکی ہے۔ اس کے بعد تم ایک فائر کی آواز سنو تو آدھے جوانوں کو ساتھ لے کر خفیہ راستے سے نکل آؤ۔ آدھے جوان سامنے سے پولیس کو گھیریں۔ اب تم سمجھ گئے؟“

بڑے ٹھاکر نے پھر دھل اندازی کی۔ ”مگر ریجیٹے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پولیس ہتھیار ڈال دے؟ آج تک پولیس کو ہتھیار ڈالنے نہیں سنا!“

اس پر گرنام بھی بولا۔ ”اور پھر وہ ہم سے دگنی تعداد میں ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہم سے زیادہ ہے۔“

میں نے سختی سے کہا۔ ”تم یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو!“ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو!“ ذرا ہی دیر کے بعد میں اور گرنام سنگھ جھونڈے سے نکل گئے۔

فائزوں اور تیز دھماکوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ میں، گرنام سنگھ کو ساتھ لیے پچھلے خفیہ راستے سے گزر رہا تھا۔ یہ راستہ بھی بالکل سامنے والے راستے کی طرح تھا۔ ہم نے راستہ طے کیا۔ میں اپنے ساتھ گرنام سنگھ کو صرف اس لئے لایا تھا کہ مجھے پچھلے خفیہ راستے کا علم نہیں تھا۔ اس کے سوا اسے ساتھ لانے کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔

راستے کے آخر تک پہنچ کر میں نے گرنام سے کہا۔ ”اچھا اب تم واپس جاؤ، میں اپنا کام شروع کر رہا ہوں۔“ بلکہ ایسا کرو، ابھی سے کچھ آدمی اس راستے سے باہر نکالنا شروع کر رہے۔“

”یہ خطرناک ہے سردار!“ گرنام نے میری بات سے اختلاف کیا۔ ”سامنے سے اگر آدمی کم کیے گئے تو پولیس ہم پر حاوی ہو جائے گی۔ ابھی تو کسی نہ کسی طرح مقابلہ برابر چل رہا ہے۔ بھگوان نہ کرے۔ اگر

آدھے آدمی ہم نے سامنے سے ہٹا لیے تو ہمیں شکست ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے گرنام!“ اس کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ ”پھر وہی مناسب ہے جو میں نے پہلے کہا تھا۔ جب تم دیکھو کہ پولیس نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے ہیں تو تم پچھلے راستے سے نکلتے ہی انہیں گھیر لو۔ خاموشی کے ساتھ آدھے آدمیوں کو سامنے سے ہٹا ہے، سمجھ گئے؟“

”ہاں سردار، بالکل!“ گرنام نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”بھگوان آپ کی مدد کرے۔“ یہ کہہ کر وہ واپس کے لئے قدم بڑھانے لگا۔

دیوار میں لگا ہوا کڑا مجھے نظر آگیا۔ میں اس پر زور آزمائی کرنے لگا۔ یہ غنیمت ہوا تھا کہ پولیس کو پچھلے خفیہ راستے کا علم نہیں تھا ورنہ اسے بھی اڑا دیا جاتا۔ یہ راستہ یقیناً طویل عرصے سے استعمال نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا، اگر راستہ نہ کھلا تو کیا ہو گا؟ لیکن یہ خدشہ بے سود ثابت ہوا۔ میں نے مزید زور لگایا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سامنے راستہ نمودار ہو گیا۔ میں جیسے ہی باہر نکلا خود بہ خود راستہ بند ہو گیا۔ اب میں اسی طرح کے ایک تنگ سے درے میں تھا جیسا اس وادی کی دوسری سمت میں تھا۔

اب فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں خاصی تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے جلد ہی درہ عبور کر لیا۔ سامنے ایک اونچی سی چٹان تھی مگر اس پر چڑھنا کوئی ایسا دشوار نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ وہ بہ تدریج بلند ہوئی گئی تھی۔ میں سنبھل سنبھل کر اس چٹان پر چڑھنے لگا۔

جیسے ہی میں چٹان کے اوپر پہنچا مجھے کوئی دس پندرہ ٹرک دکھائی دیے۔ ان کے پیچھے ایک جیب تھی۔ سپاہی ٹرکوں کے اندر اور باہر موجود تھے۔ انہوں نے ٹرکوں کی ایک دیوار سی بنالی تھی۔ فائرنگ برابر جاری تھی۔ کبھی ادھر سے اور کبھی مخالف سمت سے جھڑپوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جیب میں ایک شخص دور بین لئے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی جس سے کبھی کبھی وہ نشانہ لیتا اور فائر کرتا۔ اس وقت دور بین اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ کبھی وہ دور بین آنکھوں سے لگاتا اور قریب ہی رکھے ہوئے ایک مائیک کو اٹھا لیتا۔ پھر وہ سپاہیوں کو ہدایات دیتا۔ ان سب کی پشت میری طرف تھی۔

تو یہ ہے آئی جی، میں نے سوچا۔ وہ جیب میں تھا تھا۔ میں سینے کے بل چٹان پر لیٹ کر نیچے کھٹکنے لگا چٹان سے ٹرکوں کی دیوار اور اس جیب کا فاصلہ مشکل سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز ہو گا۔ میں اس طرف تیزی سے رینگنے لگا مگر جیب کھڑی تھی۔

رفتہ رفتہ میں جیب سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میں جیسے ہی جیب کے قریب پہنچا، آئی جی کو شاید آنکھوں کے سبب میری موجودگی کا علم ہو گیا۔ وہ ایک دم چونک کر مڑا۔ مجھے بھی پتا چل گیا کہ اسے میری موجودگی کی خبر ہو گئی ہے۔ میں اس کی جیب کے نیچے رینگ گیا۔ مجھے نازک صورت حال کا پوری طرح احساس تھا۔ میں ایک آدم زاد کے جسم میں تھا۔ اگر اس کے جسم کو شکار کر لیا جاتا تو پھر میرا پتا بھی ناممکن ہی تھا۔ سوائے اس کے مجھے کوئی اور راہ نظر نہ آئی تھی کہ جیب کے نیچے رینگ جاتا۔ دوسری بات یہ کہ میں نہتا بھی تھا۔ میرے پاس بندوق بھی نہیں تھی۔ میں دانستہ اپنے ساتھ بندوق لے کر نہیں چلا تھا۔

آئی جی جیب سے اترتا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر ایک دم جیب کے نیچے جھانکنے لگا۔ اسی سمت میرا

چہرہ تھا۔ جیسے ہی اس نے میری طرف دیکھا، میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دوسرے لمحے میں آئی جی کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

تم یہ بھول کر کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے، جیب پر دوبارہ چڑھو گے۔ میرے ذہن نے آئی جی کے ذہن کو حکم دیا۔ مائیک پر تم اپنے ساتھیوں کو حکم دو گے کہ وہ ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھائے ٹرکوں کی دوسری طرف چلے جائیں۔ تم یہ بھی کہو گے کہ تمہیں چاروں طرف سے ڈاکو رنجیت سنگھ کے آدمیوں نے گھیر لیا ہے اس لئے مقابلہ بیکار ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد تم یہ بھی بھول جاؤ گے کہ تم سے یہ زبردستی کرایا گیا ہے۔ بولو، تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو؟

لیکن اس طرح تو ہم سب مارے جائیں گے۔ آئی جی کے ذہن نے مزاحمت کی۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔ میں اپنے بڑوں کو کیا جواب دوں گا؟

میں نے پھر زور دے کر اپنی بات کو دہرایا اور اسے سمجھایا۔ تم مارے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں دی کر ہے جس کا حکم دیا جا چکا ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے!

نہیں! تم چاہے مجھے جان سے مار دو، میں اپنے سپاہیوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ آئی جی یقیناً ایک طاقتور ذہن کا مالک تھا۔ میں نے اس کے ذہن کو جھجھوڑ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ میں نے دریافت کیا، اب کو تم راضی ہو؟

اس کے منہ سے لمبی سی کراہ نکلی۔ اب اس کے ذہن نے مزاحمت چھوڑ دی تھی اور پوری طرح میری گرفت میں تھا۔ مجھے اسی لئے اس مرتبہ مثبت جواب ملا۔ میں تیار ہوں۔ آئی جی کے ساتھ اس جنگ سے میرے سر میں بھی شدید درد ہونے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ہٹالیں۔

آئی جی خاموشی کے ساتھ جیب پر چڑھا اور مائیک سے اعلان کرنے لگا۔

اب میرے سر کا درد قدرے کم ہو گیا۔ جس وقت آئی جی کے ذہن کو میں اپنے قابو میں کئے ہوں تھا، مجھے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ مائیک کے ذریعے آئی جی کہہ رہا تھا۔ ”تم سب اپنے ہتھیار فوراً پھینک دو۔ یہ میرا حکم ہے، تمہارے آئی جی کا حکم۔ ہم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہیں۔ بہتری ای نہ ہے کہ تم ہتھیار پھینک کر ٹرکوں کی دیوار کی دوسری طرف چلے جاؤ۔ جلدی کرو!“

آئی جی کے اعلان پر فوراً فائرنگ بند ہو گئی اور وہ سب اپنے ہتھیار پھینکنے لگے، مگر سامنے فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ آئی جی کے حکم پر سپاہی ہتھیار پھینک کر ٹرکوں کی اوٹ سے نکل رہے تھے۔ مجھے اپنے ساتھیوں پر سخت غصہ آ رہا تھا جو پولیس کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود فائرنگ بند نہیں کر رہے تھے۔

میں اب جیب کے نیچے سے ریگ کر باہر آچکا تھا اور جیب پر آئی جی کے پیچھے سے چڑھ رہا تھا۔ آئی جی اپنے حکم کی تعمیل ہوتے دیکھ کر خود بھی ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی رانٹل بھی پھینک دی تھی۔ میں جھکا اور قریب ہی پڑی ہوئی آئی جی کی رانٹل اٹھالی۔ رانٹل لوڈ تھی۔ میرے ساتھیوں کی طرف سے اب بھی فائرنگ جاری تھی۔ اب وہ بے دھڑک سامنے ہاتھ اٹھا

نے والے سپاہیوں کو بھون رہے تھے۔ میں اس وقت عجیب الجھن اور کوفت میں مبتلا تھا۔ میرے ذہن میں ابھانک ایک ترکیب آئی اور میں نے پاس پڑا ہوا مائیک اٹھالیا جس سے کچھ دیر پہلے تک آئی جی سپاہیوں کو ہدایت دے رہا تھا۔

میں اب مائیک تھامے کہہ رہا تھا۔ ”رام سرور!..... چرنجی! فائرنگ بند کر دو۔ پولیس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ فائرنگ فوراً بند کر دو!“

میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی فائرنگ فوراً بند ہو گئی۔ فائرنگ بند ہوتے ہی میں نے رانٹل سے ایک ہوائی فائر کیا۔ یہ اشارہ گرنام سنگھ کے لئے تھا جسے آدھے آدمی لے کر پچھلے خفیہ راستے سے پولیس والوں کو گھیرنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ تیزی کے ساتھ خاموشی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔

میں نے آئی جی کے گلے میں پڑی ہوئی دور بین اتاری اور اس سے اپنے آدمیوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔ جیب اس پوزیشن میں کھڑی تھی کہ اپنے ساتھیوں کو دیکھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے رانٹل دوبارہ لوڈ کی اور آئی جی کی پشت پر اس کی ٹال رکھ دی۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ وہ خوب رو اور وجیہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے اپنے پیچھے سے ایک شور سنائی دیا۔ یہ گرنام سنگھ اور اس کے ساتھی تھے۔ وہ جیب تک آ گئے۔

”آئی جی کو تم سنبھالو!“ میں نے گرنام سنگھ کو حکم دیا۔ ”باقی جتنے سپاہی زندہ ہیں انھیں باندھ لو!“ میرے حکم پر کارروائی شروع ہو گئی۔ میں جیب سے اترا تو دیکھا، سامنے سے بھی لوگ بندوقیں لائے بڑھے آ رہے ہیں۔ پولیس والوں کو دونوں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔

”میں آئی جی کی رانٹل اپنے کندھے پر ڈالے اب ٹرکوں کی دیوار عبور کر چکا تھا۔ اب جو میں نے سامنے کی طرف نظر اٹھائی تو نہ وہ درہ دکھائی دیا اور نہ سامنے چھوٹی پہاڑی جس کے نیچے سے وہ خفیہ عمارت مارنگ جاتی تھی۔ وہ سرنگ لمبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے سامنے لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں جن کے درمیان سپاہی ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں ان لاشوں اور لمبے سے گزرتا ہوا گول واڈی میں داخل ہو گیا۔

میرے ساتھی بھی کچھ کم نہیں مارے گئے تھے، مگر یہاں لاشیں بہر حال میدان سے کم تھیں۔ وجہ یہ کہ میرے ساتھی پھر بھی چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تھے اور پولیس والے کھلے میدان میں۔ پولیس والوں کا اسی لئے زیادہ جانی نقصان ہوا تھا۔

میں جیسے ہی جھوپڑوں کے درمیان آیا، دیکھا کہ سامنے سے ایک گھوڑا دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ یہ ٹھاکر تھا جو غالباً میری تلاش میں چلا تھا۔ اسی کے پیچھے سرتیبا بھی گھوڑے پر بیٹھی تھی، کسی ہرنی کی طرح ہانک وچوند۔ اس کے ہاتھ بڑے ٹھاکر کی بندوق تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھاکر نے گھوڑا روک لیا اور پھر وہ دونوں گھوڑے سے اتر آئے۔

گھوڑے سے اترتے ہی سرتیبا میری طرف لپکی۔ اس نے میری پیشانی اور رخساروں پر بوسوں کی

بارش کر دی۔ میں وہاں بڑے ٹھاکر کی موجودگی سے بہت خائف ہوا، مگر وہ باز نہ آئی یہاں تک کہ خود میر نے اسے الگ کیا۔

”تو زندہ ہے رنجیتے!“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تجھے اگر کچھ ہو جاتا تو میں ایک ایک سپاہی کو بھونک رہتی!“

بڑے ٹھاکر نے جب اسے میرا نام لے کر جذباتی لہجے میں بات کرتے دیکھا تو چونک اٹھا اور بولا۔

”یہ تجھ سے بڑا ہے سرتا! تجھے اس طرح اس کا نام نہیں لینا چاہئے۔“

وہ اکڑ کر بولی۔ ”تو کیا ہوا؟ ہے تو میرا۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ بات بڑھ نہ جائے، جلدی سے کہا۔ ”بابا! آپ جھونپڑے میں چلے، ہم اسے لے کر آتا ہوں۔“

ٹھاکر ذرا سا ہچکچایا، پھر بولا۔ ”مگر مجھے بتا تو سہی رنجیتے، یہ سب کچھ ہوا کس طرح؟ مجھے تو خبر ملی تھی کہ ہم پسا ہو رہے ہیں پھر ایک دم کس طرح پانسا پلٹ گیا؟ تیرے جانے کے بعد میں بہت بچھڑایا کہ تیرے ٹوٹنے موت کے منہ میں چھلانگ لگا دی ہے۔ آخر تو کچھ بتا تو سہی کہ کس طرح آئی جی کو زیر کیا اور اسے کیسے مجبور کیا؟ وہ اپنے سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب اور ناممکن سی بات لگتی ہے۔“

یہ سب کچھ جاننے کے لئے ٹھاکر بہت بے چین تھا، لیکن میں نے اسے فی الحال ٹال دیا۔ ”آپ چلیے تو بابا! میں سب کچھ بتا دوں گا۔“

میں جھوٹ بولنے اور کوئی کمائی گھرنے کے لئے وقت چاہتا تھا۔ مجھے اپنی پراسرار قوتوں اور اپنے اصل وجود پر تو پردہ ڈالنا ہی تھا!

میری بات سن کر وہ گھوڑے بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تیری ماں فکر مند ہے، فوراً پہنچنے کی کوشش کرنا کہ اس کی ڈھارس بندھے۔“ یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

”ہوں! تو میری خاطر تو ایک ایک سپاہی کو بھونک دیتی!“

میں نے سرتا کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔ ”کیوں؟“

وہ جھینپ سی گئی اور شرما کر گردن جھکائی، پھر نظریں نیچی کر کے بولی۔ ”رنجیتے! میں تیرے بتا جی نہیں سکتی۔“

سرتا ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ گلی میں ایک شور سا ہوا۔ لوگ شاید کسی زخمی کو چارپائی پر ڈال کر لارہے تھے۔ وہ چارپائی قریب آئی اور جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو ایک دم کم صم سا رہ گیا۔ وہ لارہی تھی، میری تنگیڑا میں نے چارپائی اٹھانے والوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ گرنام سنگھ تھا۔ گرنام سنگھ اور لاجو کی چارپائی اٹھائے ہوئے؟ گرنام سنگھ اس وقت بہت غم زدہ لگ رہا تھا۔ اس کی واحد آنکھ بھی شاید ڈبڈباری تھی۔

میں چارپائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور گرنام سنگھ سے پوچھا۔ ”اسے کیا ہوا؟“

”یہ میری لاعلمی میں میری ماں سے آنکھ بچا کر بندوق لئے اگلے مورچوں تک پہنچ گئی تھی۔“ گرنام سنگھ نے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”اسے..... اسے معلوم ہو گیا تھا۔“ وہ کچھ ہچکچایا۔

”کیا؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”پوری بات بتاؤ!“

”یہ معلوم ہو گیا تھا اسے کہ..... سردار نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا دی ہے۔“ گرنام سنگھ بتانے لگا۔ ”اسے خبر ہو گئی تھی کہ آپ پچھلے راستے سے دشمنوں کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ پہلے

و پچھلے خفیہ راستے کی طرف گئی، راستہ کیونکہ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو چکا تھا، سو یہ وہاں سے ہٹام لوٹ آئی پھر یہ سامنے والے مورچے کی طرف بھاگی اور مسلسل فائرنگ کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

مجھے اس کی اطلاع اس وقت ملی جب آپ راتقل سے اشارتی فائر کر چکے تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر پچھلے خفیہ راستے کی طرف بھاگا۔ مجھ سے راستے میں کئی جوانوں نے کہا بھی کہ تمہاری بہن لاجو سخت زخمی ہے مگر میرے لئے آپ کا حکم پہلے ضروری تھا۔“ یہ کہتے ہوئے گرنام سنگھ کی آنکھ میں رکا ہوا آنسو

اس کے رخسار پر بننے لگا، میں ایک عجیب سی فضا میں پہنچ گیا۔

میں سوچنے لگا، یہ لڑکی مجھے اس قدر چاہتی ہے! اتنا کہ اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ وہ گلاب اس وقت خون میں لت پت بے خبر چارپائی پر پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا اور آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔

میری یہ حالت دیکھ کر گرنام سنگھ بولا۔ ”سردار! آپ فکر نہ کیجئے۔ بھگوان نے چاہا تو یہ بچ جائے گی۔ آپ پر ایک لاجو کیا، سینکڑوں لاجو قربان کی جاسکتی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے گرنام کی آواز بھرا گئی۔ یہ

گرنام سنگھ کی بہن تھی جو اپنے بھائی کی طرح میری وفادار تھی اور میں؟

مجھے اپنے آپ سے شرم سی محسوس ہوئی۔ میں اس عرصے میں سرتا کو بھول ہی چکا تھا۔ اب جو اس کا خیال آیا اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھی۔

لاجو کا زخمی جسم اب اس کی جھونپڑی تک پہنچ چکا تھا۔ چارپائی رکھی گئی۔ چارپائی رکھتے ہی ایک بڑھیا گھبرا کر آگے بڑھی اور لاجو کی حالت دیکھ کر رونے لگی، پھر مجھ سے بولی۔ ”اسے کیا ہوا سردار؟ کچھ تو

بتائیں، آپ کی لاجو کو کیا ہوا؟“

بڑھیا کے رقت کرنے کا میرے دل پر اثر ہوا اور میں نے سختی سے ہونٹ سمجھنے لیے۔ میں نے غور سے لاجو کے جسم کو دیکھا تو میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ گرنام سنگھ مجھے ہسلا رہا تھا کیونکہ لاجو کا جسم

تو گولیوں سے چھلن تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ میں نے سر جھکا کر گرنام سنگھ کی پیٹھ جھکی اور کہا۔ ”مہر کرو گرنام، مہر کرو!“ یہ کہتے کہتے خود میرے آنسو نکل پڑے۔ اس لڑکی کی قربانی نے میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔

میں سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔ راستے بھر میری آنکھوں میں گلاب چہرہ گھومتا رہا، خون میں ڈوبا مسکراتا ہوا چہرہ!

”کیا ہو گیا ہے تجھے؟“
”مجھے کچھ نہیں ہوا“ تجھے ہو گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”جب سے تُو نے اسے زخمی دیکھا ہے، تو کسی زخمی کی طرح رُپ رہا ہے۔ کیا ہو گیا اگر ایک آدھ گولی لگ گئی۔ کون سی مر جائے گی! وہ اتنی حیدار کب ہے!“

”بکواس مت کرو!“ میں نے غصے سے کہا۔ ”مرنے والوں کو برا نہیں کہتے۔“
وہ چونک اٹھی۔ ”کیا وہ مر گئی؟ لاجو مر گئی؟“ اس کے لیے میں عجیب سی خوشگوار حیرت تھی۔
”ہاں وہ مر گئی۔ تیری طرح نہیں تھی کہ خیالوں ہی میں بندوق چلائی رہتی!“ میں نے اسے چڑانے کے لئے کہا اور وہ جھج چڑ گئی۔

اس وقت جھونپڑے کے باہر والے حصے سے بڑے ٹھاکر کی آواز آئی۔ ”رنجیٹے! باہر آؤ۔ گرنام آیا ہے، کتا ہے لاجو کی ار تھی تیار ہے۔ تُو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“
ٹھاکر کی آواز سن کر میں باہر آیا۔ گرنام سٹکھ سامنے سر جھکانے کھڑا تھا۔ اس وقت گرنام کا آدھا چہرہ بہت غم زدہ اور آدھا نہایت بھیاں لگ رہا تھا۔ وہ میری طرف منہ کیے کھڑا تھا، مجھے دیکھ کر بولا۔ ”تمام مرنے والوں کی ار تھیاں اس وقت شمشان میں پہنچ چکی ہیں جن ایک ار تھی لاجو کی بھی ہے۔ کیا آپ وہاں تک چلنا پسند کریں گے؟“

میں نے اس کی آواز میں دکھ کو محسوس کیا۔ ہم سب اس کے ساتھ گول دادی کے ایک حصے میں پہنچے جاتے تقریباً سو سے اوپر ار تھیاں رکھی تھیں۔ انہی کے برابر ایک طرف سپاہیوں کی لاشوں کا ڈھیر تھا۔ ڈھیر بلاشبہ ار تھیوں سے دگنا چو کنا تھا۔

”بقیہ جو لوگ زندہ پکڑ لیے گئے ہیں ان کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ بڑے قید خانے میں آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ جب کہیں انھیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔“
گرنام نے جواب دیا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ مجھے سوچنے دو۔“ میں بولا۔

پہلے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا گیا۔ ایک عجیب سی بدبو سے تمام دادی بھر گئی۔ لاشوں پر انھوں نے مٹی کا تیل چھڑک دیا تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے پھر بقیہ تمام ار تھیوں کو بھی جلا دیا گیا۔ پوری دادی کے نیچے ’بورے‘ جو ان یہاں موجود تھے۔ عجیب سی فضا تھی جیسے آسمان سے اداسی برس رہی ہو۔ چاروں طرف شعلیں روشن تھیں۔ شعلوں کی زبانیں لاشوں کو چاٹ رہی تھیں۔ اس کے بعد ٹھاکر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مرگٹھ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ وہ غالباً کچھ کہنا چاہتا تھا۔ تمام مجمع سٹ کر اس کے ارد گرد ہو گیا۔

”اے اپنی عزت و غیرت پر جان قربان کرنے والو!“ ٹھاکر نے تقریر شروع کی۔ ”سنو کہ ہم سب ایک دوسرے کے دکھ درد کے برابر کے شریک ہیں۔ جن نوجوانوں نے بہادری سے لڑتے ہوئے اس دادی کے دوسرے رہنے والوں کے لئے خوش حال زندگی اور سکون و اطمینان کی خاطر اپنی جانیں قربان کر

میں غمگین سا اپنے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ راستے بھر میں جس جس گلی سے گزرا وہاں کھرام ہا تھا۔ کسی کا بھائی، کسی کا بیٹا اور کسی کا شوہر موت و زبست کی اس خوفناک لڑائی میں مارا جا چکا تھا۔ میرے کان ماؤں کی چیخوں، بہنوں کے بین اور بوڑھے باپوں کی دردناک آہوں سے بھرے ہوئے تھے۔
ٹھاکر نے مجھے دیکھتے ہی ٹھکرائن سے کہا۔ ”لو یہ آگیا تمہارا جیلا بیٹا! اس نے تن تنہا اتنی بڑی پلٹن کو ٹھکانے لگوا دیا۔ میری زندگی میں آج تک اتنا بڑا معرکہ نہیں ہوا تھا۔ تم ذرا باہر نکل کر دیکھو! لاشوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔“
ٹھکرائن نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بولی۔ ”مگر تُو اتنا اداس کیوں ہے؟ کیا بات ہے؟ یہ تو خوشی کا موقع ہے۔“

میں نے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا۔ ”ماں! اگر تمہارے لئے کسی کا ساگ لٹ جاتا، کسی بہن کا بھائی چھن جاتا، کسی ماں کا لالہ مارا جاتا، کسی بوڑھے کی آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتا، خوشی کا موقع ہے تو ضرور خوشی مناؤ، ضرور“ میری آواز بھرا گئی۔

ٹھکرائن تو پیسے کہیں کھو سی گئی، ہاں ٹھاکر گرجا۔ ”کیا کم ہمتی کی بات کرتا ہے رنجیٹے! لڑائی میں یہ تو ہوتا ہی ہے۔ تُو نے خود اپنے ہاتھ سے کتنی عورتوں کے ساگ اجاڑ دیے، کتنی بہنوں کے بھائی چھین لیے، کتنی ماؤں کی گودیں ویران کر دیں، کتنے باپوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک آگ میں جھونک دی اور تُو نے ہی کیا، تیرے پرکھوں نے کیا کیا؟ یہ تو اس زندگی کی دین ہے رنجیٹے! تو کیا، میں کیا، سب کو ایک دن اسی طرح لڑتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ اسی میں بہادری ہے، اسی میں عزت ہے، یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے، پھانسی کا پھندا یا قتل و غارت گری! اگر ہم یہ سب چھوڑ بھی دیں، یہ زندگی ترک بھی کر دیں تو کیا پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہمیں اسی لئے بہادری کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہئے۔ غریبوں کا خون چوسنے والے بیٹھوں، چھوٹے چھوٹے نوابوں اور راجاؤں کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتار کر ہمیں اپنا حق وصول کرنا چاہئے یہی ہماری زندگی ہے۔“

بڑے ٹھاکر کے پُر جوش الفاظ نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا۔ میں مزید کچھ کے بغیر پردہ اٹھا کر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں داخل ہو گیا اور پھال دار نرم بستر پر ڈھے گیا۔ برابر ہی دوسرے بستر پر سریتا منہ پھلائی لیٹی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں اس وقت اور ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ میرے سامنے خون میں ڈوبا لاجو کا مسکراتا چہرہ جیسے اب بھی تھا، ایک جاں نثار بھائی کی جاں نثار بہن لاجو! ایک بے وفا عاشق کی با وفا محبوبہ لاجو! محبت و قربانی کی ایک روشن مثال لاجو! سوچتے سوچتے میرے منہ سے شاید کئی دفعہ ”لاجو“ نکل گیا۔

میں تب چونکا جب اپنی گردن پر کسی کی گرفت محسوس کی۔ میرے اوپر سریتا سوار تھی جو کہہ رہی تھی۔ ”اب اگر تیرے منہ سے یہ نام نکلا تو میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی، سمجھا! میں تیرا خون پی جاؤں گی!“
اگر میرے علاوہ کسی اور کا نام تیری زبان پر آیا۔

میں نے آہستہ سے اس کی گداز کلائییاں پکڑیں اور اپنی گردن سے الگ کر دیں۔ ”سریتا! ہوش میں

دیں، ہمارے دل ان کی محبتوں، یادوں اور قربانیوں سے بیش ان کے احسان مند رہیں گے۔ وہ بہادر تھے، لڑتے ہوئے مارے گئے، تمہارے لئے، ہم سب کے لئے۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ ان کے بیوی بچوں اور ضعیف والدین کا سارا بنیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اب سے جو کچھ بھی لوٹ مار کر کے حاصل کریں گے، اس میں مرنے والوں کے عزیزوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہوا کرے گا جتنا انہیں ان کی زندگی میں ملا۔ آج سے یہ قانون جاری کیا جاتا ہے کہ جو بھی لڑتے ہوئے مارا گیا، اس کے عزیزوں کو ہمیشہ حصہ ملتا رہے گا۔ ٹھاکر کے یہ کہتے ہی اس کی ”جے“ سے تمام وادی گونج اٹھی۔ وہ پھر بولا۔ ”تمہارے بہادر سردار نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر جس طرح اس بار کو جیت میں بدلا ہے، یہ تو تم سب جان ہی چکے ہو۔“ اس کے بعد سردار رنجیت سنگھ کی جے بولی جانے لگی۔

مجمع کے اصرار پر مجھے بھی کچھ کہنے کے لئے مندر پر چڑھنا پڑا، مگر میری آواز ٹھاکر کی طرح پاٹ دار نہیں تھی۔ میں نے بولنا شروع کیا۔ ”میرے بزرگو اور ساتھیو! میں نے اس لڑائی میں کوئی ایسا خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بس میں نے اتنا کیا کہ کسی طرح پچھلے خفیہ راستے سے آئی جی کی جیب تک پہنچ گیا اور رائفل کی ٹال اس کی کینٹی پر رکھ کر یہ اعلان کرا دیا کہ تمام سپاہی ہتھیار پھینک کے ہاتھ اوپر اٹھا لیں۔“ میں نے یہ جموٹ دانستہ بولا تھا تاکہ وادی کے لوگ مجھے اپنی ہی طرح ایک معمولی آدم زاد سمجھیں، کوئی پراسرار وجود نہیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”بڑے ٹھاکر نے ابھی جو کچھ کہا، میں بھی اس سے ہر طرح متفق ہوں۔ اس وقت سب سے پہلا مسئلہ جو ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ کسی بھی طرح اس راستے کو قطعی بند کر دیں جو پولیس سے جھڑپ کے دوران بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس راستے کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ اس مرتبہ راستے میں اتنی گنجائش رکھی جائے کہ پولیس سے جو ٹرک ہمیں ملے ہیں، وہ بھی ادھر سے آجائیں۔ آئندہ ہم اس طرح ان ٹرکوں سے کام بھی لے سکیں گے۔ گھوڑوں کے مقابلے میں یہ ٹرک زیادہ بہتر ہیں۔“

میری اس بات پر مجمع میں شور سا ہوا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش کرنا چاہا۔ غالباً وہ میری تجویز سے متفق نہیں تھے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی ان ٹرکوں کو چلانا نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس بات کو بھانپ لیا۔

”مجھے معلوم ہے، تم میں سے کوئی بھی ان کا استعمال نہیں جانتا۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ کچھ ایسی مشکل بات نہیں۔ ہم قیدیوں کو اس پر مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمیں ان کو چلانا سکھائیں۔ ہمیں ابھی یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ پولیس یہاں تک کس طرح پہنچ گئی۔ یہ بھی انہی قیدیوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لی الحال کل سے راستے کی تعمیر شروع ہو جانا چاہئے۔ اس کی نگرانی کرنا ہم سب کے کام ہے۔“ یہ کہہ کر میں مرگٹ کی دیوار سے اتر آیا۔

پھر ہم سب اپنے اپنے جمونپڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

گرناٹ سنگھ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم قید خانے سے آئی جی کو نکال کر میرے جمونپڑے پہنچو!“

گرناٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف چلا گیا۔ ٹھاکر، ٹھکرائن اور سرتا کے ساتھ میں گھوڑوں پر اپنے جمونپڑے کی طرف چل دیا۔

☆=====☆

راستے میں مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اپنا گھوڑا، سرتا کے گھوڑے سے قریب کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”سرتا! بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کو جانے دو۔ ہم دونوں بعد میں چلے جائیں گے۔ ذرا قید خانے کی سیر ہو جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

سرتا تو شاید خود سے چاہتی تھی کہ اسے میرے ساتھ تنہائی کا موقع ملے۔ وہ فوراً راضی ہو گئی۔ میں اسے قید خانے تک کبھی نہ لے جاتا، اگر راستے سے واقف ہوتا۔ اب تک حالات اور تقدیر میرے حق میں رہے تھے۔ کچھ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیا تھا جو یہ راز اب تک نہیں کھلا تھا کہ میں، مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ نہیں، ایک جن زاد علیاں ہوں جس نے ڈاکو کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے۔

میں اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آگیا اور بڑے ٹھاکر کے قریب ہو کر بولا۔ ”بابا! میں اور سرتا ابھی قید خانے ہو کر آتے ہیں، آپ چلیں۔“

بڑے ٹھاکر نے سر ہلایا اور ہم دونوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ دیں۔ آج پھر میری وہی حالت تھی جو اس سے پہلے دو مواقع پر تھی۔ ایک تو تھانہ گڑوال کے راستے میں جس سے میں ناواقف تھا اور اپنی ناواقفیت کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دی، دوسرے آج ہی جب گول وادی کے پچھلے خفیہ راستے تک میں، گرناٹ سنگھ کے ساتھ پہنچا تھا۔ اس وقت بھی حالات کیونکہ ہنگامی تھے اس لئے میں نے گرناٹ سنگھ کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ راستہ نہیں جانتا۔ اب میں، سرتا کو محض اس غرض سے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ وہ قید خانے تک میری رہنمائی کر سکے۔ یہ بات میں اس سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا اس لئے جب کسی گلی کا موڑ آتا تو دانستہ اپنا گھوڑا اس سے پیچھے کر لیتا۔ میں نے بس اچانک اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ میں، آئی جی کو اپنے جمونپڑے ہی میں بلا کر اس کے ذہن کو گرفت میں لے لوں گا۔ مجھے اس سے معلوم کرنا تھا کہ وہ یہاں تک کس طرح پہنچا؟ لیکن اس میں ایک خطرہ تھا۔ اگر میں جمونپڑے میں ایسا کرتا تو میری پراسرار قوتوں سے ٹھاکر وغیرہ بھی آگاہ ہو جاتے۔ میرے ذہن میں یہ بات بعد میں آئی جب میں، گرناٹ سنگھ کو قید خانے کے لئے روانہ کر چکا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں تک پہنچ جاؤں۔

ہم دونوں جلد ہی اس جگہ تک پہنچ گئے جسے قید خانے کہا جاتا تھا، مگر وہ تو ایک میدان تھا۔ اس کے سامنے پہاڑی کی سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ قید خانہ نہیں ہو سکتا، مجھے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ اب جو میری نگاہ سامنے پہاڑی کی دیوار پر پڑی تو وہاں بڑا سا خلا نظر آیا۔ اس خلا سے گرناٹ سنگھ گھوڑے پر سوار باہر نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ گرناٹ کے ساتھ ہی مجھے ایک گھوڑا اور دکھائی دیا۔ اس پر کوئی شخص بندھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر گرناٹ سنگھ رک گیا۔ وہ گھوڑے سے اتر اور میری طرف سوائے نظروں سے دیکھنے لگا۔

”گرنام! ہم خود ہمیں آگے۔“ میں بول اٹھا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ تمناؤں میں اس سے کچھ پوچھیں۔ اس کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔“

”میری خود بھی یہی فضا تھی سردار!“ گرنام میری تائید میں بولا۔ ”لیکن میں نے آپ کی بات نہیں کاٹی۔ قید خانے میں اذیت دینے اور زبان کھلانے کے تمام ذرائع موجود ہیں۔ جھونڈے میں ظاہر ہے یہ ممکن نہ ہوتا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر اس طرف بڑھا جہاں کچھ دیر پہلے غلامودار ہوا تھا۔

گرنام سنگھ کے باہر آتے ہی غلام برابر ہو گیا تھا۔ گھوڑے پر سوار گرنام سنگھ کو میں نے سپاٹ دیوار کے ایک پتھر پر زور آزمائی کرتے دیکھا۔ وہ پتھر قدرے ابھرا ہوا تھا۔ پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ہم اس چوڑے سے خلا میں داخل ہو گئے۔

تھوڑی دور چل کر سلاخوں دار ایک پھانک سا تھا جس کے باہر ایک شخص بندوق لئے ٹھل رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا سا جھکا اور دروازے کا بڑا تالا کھول دیا۔ اس پھانک سے گزرتے ہی سیدھے ہاتھ پر ایک بہت بڑا ہال نظر آیا۔ اس میں آٹھ دس جوان، گھوڑوں کی ماش کر رہے تھے۔ یہ اصطبل تھا جس میں بہترین نسل کے بچاس ساٹھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو تین نوجوان آگے بڑھے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے سر جھکا کر تعظیم دی، اس کے بعد ہم سب کے گھوڑوں کی بائیں تمام کر اصطبل میں چلے گئے۔ اب میں، سریتا اور گرنام سنگھ ایک راہداری طے کر رہے تھے۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ بائیں طرف ایک اور بڑا سا ہال دیکھا۔ یہ ہال اس وقت مقفل تھا مگر اس کے سلاخوں دار دروازے سے اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس میں لاتعداد بندوقیں، رائفلیں اور دوسرا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے پہلے کبھی ایسا سارا اسلحہ کسی ایک ہی جگہ اکٹھا نہیں دیکھا تھا۔

گرنام سنگھ نے مجھے اس طرف متوجہ پا کر کہا۔ ”سردار! یہ جو آپ رائفلوں کا نیا ڈھیر دیکھ رہے ہیں، آج ہی یہ سپاہیوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ دوسری طرف جو ڈھیر ہے، گولوں کا ہے۔ کل تک ان رائفلوں کو صاف کر کے اور تیل لگا کر حفاظت سے رکھ دیا جائے گا۔“

میں نے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ وہاں تھکن نہیں تھی۔ میں نے اسی لئے راہداری کی چھت پر نگاہ ڈالی۔ مجھے چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سوراخ دکھائی دیے جو تاریک تھے۔ راہداری میں ذرا ذرا فاصلے سے مشعلیں روشن تھیں اس لئے ہر شے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ دور چل کر راہداری ختم ہو گئی۔ سامنے ایک سپاٹ دیوار تھی۔ گرنام سنگھ پھر آگے بڑھا اور دیوار میں لگی ہوئی مشعل کو نکالا۔ پھر اس جگہ ہاتھ ڈال کر غالباً کوئی کل دبائی۔

”سردار! سنبھل کر کھڑے ہو جائیے!“ کل دباتے ہی گرنام سنگھ بولا۔ ”ہم نیچے قید خانے میں چل رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مشعل دوبارہ سوراخ میں لگا دی۔

اسی لمحے مجھے زمین دھستے ہوئے محسوس ہوئی۔ میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ میں، سریتا اور گرنام سنگھ نیچے دھستے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر ایک خلا سا تھا جیسے ہم کسی گہرے کنویں میں اتر رہے ہوں۔ سریتا کے لئے غالباً یہ سب کچھ متوقع تھا۔ اس کے چہرے سے اسی لمحے حیرت یا خوف ظاہر نہیں ہو

رہا تھا۔ پھر جیسے زمین رک گئی۔ ہماری دائیں طرف ایک دروازہ تھا۔ سلاخوں دار دروازے کے باہر جو شخص پہرا دے رہا تھا، اس نے ہمیں دیکھتے ہی تالا کھول دیا، اسی کے ساتھ جھک کر تعظیم بھی دی۔ دروازے سے جیسے ہی ہم نے چوڑی سی راہداری میں قدم رکھا، بڑی سی ایک سل چھت سے آہستہ آہستہ پھل کر زمین میں پھوٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ شخص دروازے کا تالا لگاتا نہیں بھولا تھا۔ اب وہاں ایک سپاٹ دیوار تھی۔

اب ہم پھر چوڑی سی ایک راہداری میں تھے۔ یہاں بھی دونوں جانب مشعلیں روشن تھیں اور دور تک بڑے بڑے دروازے نظر آرہے تھے۔ دروازوں میں تالے پڑے ہوئے تھے۔ وہی شخص جس نے ہمارے لیے تالا کھولا تھا آگے بڑھا اور بائیں ہاتھ پر بنے ہوئے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ یہ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جس میں ایک طرف چبوترہ بنا ہوا تھا۔ چبوترے پر جنگلی جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور گڑبگڑ لگے تھے۔ دوسری طرف پیال کا ایک نرم بستر بچھا ہوا تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہو گئے۔

”آپ چاہیں سردار تو ہمیں بیٹھیں۔“ گرنام سنگھ نے مجھ سے کہا۔ ”میں آئی جی کو اوپر سے لے کر آتا ہوں۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ ایک گھوڑے کی بیٹھ سے بندھا ہوا تھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ میں اس بھول پر معافی چاہتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھے پاؤں واپس اوپر جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔

میں نے سریتا کو مخاطب کیا۔ ”آؤ اس وقت تک ذرا قیدیوں کو دیکھ لیا جائے۔“

ہم دونوں اس کمرے سے نکلے اور آگے راہداری میں دور تک چلے گئے۔ دونوں طرف سلاخوں دار دروازے تھے۔ یہ دروازے بڑے بڑے ہالوں کے تھے۔ ہر ہال میں مجھے تقریباً سو ڈیڑھ سو سپاہی نظر آئے۔ یہ کل چھ ہال تھے جن میں سے اس وقت چار تقریباً پورے بھرے ہوئے تھے۔ ایک میں صرف بچاس ساٹھ سپاہی تھے اور بقیہ ایک بالکل خالی پڑا تھا۔ یہ دوسرے ہالوں سے مختلف تھا۔ میں وہاں موجود سالن دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس ہال کو اذیت رسانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ یہاں راہداری ختم ہو گئی تھی۔ اس ہال کو دیکھتے ہی میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

مجھے اور سریتا کو دیکھ کر قیدیوں نے طرح طرح کی گالیاں دیں مگر میں گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہوا۔ لا سریتا کو مخاطب کر کے بھی طرح طرح کی نازیبا حرکات کر رہے تھے۔ میں نے سریتا کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر اسے غصے سے باز رکھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دشمنی قیدیوں کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

ہم دونوں ابھی کمرے میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ گرنام اس سبز آنکھوں والے آئی جی کو لے کر آگیا۔ آئی جی کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

اب اس راز کے کھلنے کا وقت قریب آچکا تھا کہ پولیس کو ہمارے ٹھکانے کا پتا کیسا چلا؟ میرے نزدیک یہ سوال بہت اہم تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس قریب پہنچا ہی تھا کہ اچھل پڑا۔ اس کی دلیری اور بہت قابل دید تھی۔ اس نے میرے منہ پر تھوک دیا اور ایک موٹی سی گالی دی۔ گرنام اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ یہ دیکھ

کر وہ برہم ہو گیا۔ گرنام سنگھ نے اپنی رائفل کا کندا بہت زور سے آئی جی کے کندھے پر مارا۔ آئی جی تڑپ کر میرے قدموں پر گر گیا۔ دوسری ٹھوک بھی خاصی جان دار تھی جو آئی جی کے سر پر پڑی تھی۔ یہ بھی گرنام سنگھ ہی کا ”کارنامہ“ تھا۔

اپنے چرے سے تھوک پونچھتے ہوئے میں نے گرنام سنگھ کو روکا۔ ”بس گرنام سنگھ! بس! یہ مر جائے گا اور میں یہ نہیں چاہتا۔“

آئی جی رحمان لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا جو اس کے چرے پر بہت برا لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے سے خون پونچھ دیا۔ اس نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”رنجیت سنگھ! میں نے عمد کیا تھا کہ یا تو تمہیں گرفتار کروں گا یا.....“ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے خود اپنے سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا جانے وہ کون سی پراسرار قوت تھی جس نے مجھے اس پر مجبور کر دیا!“ یہ کہہ کر دانتوں سے وہ اپنا پھلپھونٹ کاٹنے لگا۔

گرنام سنگھ کے چرے پر مجھے حیرت سی نظر آئی۔ سریتا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید آئی جی کے بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے سوا بھلا کون جان سکتا تھا آئی جی کو کس نے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو ہتھیار ڈال کر ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دے۔

میں نے گرنام سنگھ کی طرف مڑ کر کہا۔ ”انہیں آخری ہال میں لے کر چلو اور سنو! ان کے ہاتھ بھی کھول دو!“

گرنام سنگھ ہچکچایا۔ ”مگر سردار.....“

”کچھ نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کریں گے۔“

میرے کہنے پر گرنام سنگھ نے آئی جی کے ہاتھ کھول دیئے۔ اسی کے ساتھ گرنام سنگھ نے تیزی کے ساتھ اپنی رائفل کی نال آئی جی کی پشت پر رکھ دی اور دھکا دیا۔ ”چلو!“

میں نے گرنام کے رویے پر اس سے کچھ نہیں کہا حالانکہ مجھے آئی جی سے اس کا رویہ ناگوار ضرور گزرا تھا۔ وہ شاید یہ نہیں بھولا تھا کہ آئی جی نے میرے منہ پر تھوکا تھا۔

”تم یہیں ٹھہرو!“ میں، سریتا سے مخاطب ہوا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔ گرنام بھی ذرا دیر بعد تمہارے پاس آجائے گا۔“

سریتا غالباً یہ سمجھ رہی تھی کہ میں، آئی جی کو اذیت دے کر اس کی زبان کھلوانا چاہتا ہوں۔ وہ اس لئے وہیں بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

ہم جیسے ہی راہداری میں داخل ہوئے ہمیں دیکھتے ہی قیدی پھر جنگلے پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور پہلے ک طرح گالیاں بکنے لگے۔

گرنام سنگھ ان کی طرف ہلکا۔ ”چپ رہو حرام زادو! ورنہ ایک ایک گولی مار دوں گا!“

گرنام سنگھ کا بھیاںک چہرہ دیکھ کر قیدی سپاہی کچھ سہم سے گئے۔ شاید وہ قید خانے میں میری آمد سے پہلے، کچھ قیدیوں کی ”خاطر مدارات“ کر چکا تھا۔ وہ یقیناً بہت سفاک آدمی تھا۔

اس نے جس طرح میرے سامنے آئی جی کے کندھے پر رائفل کا کندا مارا، تھا، وہ اس کی درندگی کا ایک نمونہ تھا۔ آئی جی اب بھی ایک کندھا ڈالے ہوئے راستے طے کر رہا تھا۔ اس کے کندھے میں شاید سخت تکلیف تھی۔ اوندھے منہ زمین پر مگر کرنے کے سبب گومڑا پڑ گیا تھا۔

مطلوبہ ہال تک پہنچنے کے بعد گرنام سنگھ نے اس کی چابی جیب سے نکال کر مجھے دے دی۔ میں آگے بڑھ کر اس ہال کا قفل کھولا۔

آئی جی رحمان جیسے ہی ہال میں داخل ہوا ٹھٹک گیا۔ ہال میں جگہ جگہ شعلیں روشن تھیں۔ غالباً آئی جی یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے وہاں اذیت دینے کے لئے ہی لایا گیا ہے۔ وہاں اذیت رسانی کے مختلف آلات موجود تھے۔ وہ سما ہوا سا آگے بڑھا۔

”اب تم جاؤ اور سریتا کے پاس ٹھہرو!“ میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ گرنام سنگھ بھی شاید یہی سمجھا تھا کہ میں، آئی جی کو اذیتیں دوں گا۔ وہ اسی لئے بولا۔ ”سردار! میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا“ شاید یہ جلد کچھ نہ قبولے!“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”گرنام! میں تمہارا سردار ہوں۔ کیا مجھے اس کے سوا بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟“

یقیناً گرنام سنگھ میرے خشک لہجے کا مطلب سمجھ گیا اور خاموشی کے ساتھ دروازہ بھینڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

گرنام سنگھ کے جاتے ہی آئی جی رحمان نے مجھے مخاطب کیا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”اگر تمہیں برا نہ لگے تو کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟ میں نے شام سے سگریٹ نہیں پی۔“

میں بولا۔ ”ضرور پیو۔“

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلا کر میری طرف بھی پیکٹ بڑھایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ ”میں سگریٹ نہیں پیتا۔ ہاں تم سکون سے سگریٹ پی لو، ہم اس کے بعد گفتگو شروع کریں گے۔“

”نہیں! تمہیں جو کہنا ہے کہو۔ مجھے اپنے پچھلے رویے پر افسوس ہے کہ میں نے تمہارے منہ پر تھوکا۔“

”خیر ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ”اس وقت میں تمہارا دشمن تھا، مگر اب.....“

آئی جی نے میری بات کاٹ دی۔ ”دشمن تو اب بھی ہوں!“

میں نے بات کو زیادہ نہ بڑھا کر اپنا کام شروع کرنے کی غرض سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

ابھی میں اس کے ذہن کو قابو میں نہ لے سکا تھا کہ وہ بول اٹھا۔ ”سنو رنجیت سنگھ! تم پولیس کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکتے! اگر آج تم نے ایک رحمان کو شکست دے دی ہے تو کل..... کلک.....“ وہ اچانک ہچکاتے لگا۔

میں اس کے ذہن پر قبضہ بنا چکا تھا۔ ہکلاتے ہکلاتے اس کو اور مجھے ایک ساتھ جھٹکا سا لگا۔ میرے ذہن نے اس کے ذہن کو حکم دینا شروع کیا۔ ”تم رحمان! رنجیت سنگھ کے وفادار ہو..... اس کے ساتھی ہو!“

”نہیں!“ رحمان کے ذہن نے جواب دیا۔ ”میں کسی قانون شکن شخص کا ساتھی نہیں ہو سکتا۔“
”ایسا نہیں ہے، تم واقعی مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ ہی کے ساتھی ہو، اقرار کرو۔“ میرے ذہن نے حکم دیا۔

آئی جی کے ذہن نے آخری بار مدافعت کی۔ ”نہیں..... نہیں.....! نہیں وہ.....“
”ہاں کو، ہاں کو، میں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا وفادار ساتھی ہوں!“ میں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ ”تم رنجیت سنگھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو، اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتے ہو.....! تم رنجیت سنگھ کے غلام ہو!“ میرے ذہن نے اس کے ذہن پر گرفت اور بھی سخت کر دی۔

ابھی تک اس کے طاقتور ذہن میں مدافعت کی قوت باقی تھی۔ میرا سر دھکنے لگا، دماغ کی رگیں جھٹکیں، مگر میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے نہیں ہٹائیں۔

”نہیں! میں ایک ڈاکو کا وفادار نہیں، قانون کا وفادار ہوں۔ میں آئی جی پولیس ہوں!“ اس کا ذہن کہہ رہا تھا۔

مجھے غصہ آگیا اور اس کے ذہن کو کئی بار جھٹکے دیئے۔ اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ اب بھی سلگ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر دور پھینک دی۔ اس کی سبز آنکھیں پھٹی ہوئی سی تھیں۔ میرے ذہن نے پھر اس کے ذہن کو حکم دینا شروع کیا۔ اب میرے ذہن کا تناؤ پہلے کی نسبت قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ اب آئی جی کا ذہن پہلے جیسی مدافعت کا اہل نہیں رہا۔

اس کے خوابیدہ ذہن کا جواب اس مرتبہ اقرار میں تھا۔ ”قطعی بھول جاؤں گا۔“
اب وہ پوری طرح میرے قابو میں تھا۔ میں نے اسی لئے حکم دیا کہ ”اپنی پچھلی زندگی بھولنے کے باوجود تمہاری ذہانت و صلاحیت پوری طرح برقرار ہے۔ تم اپنی تعلیم بھی نہیں بھولے، اس کے سوا کچھ بھول چکے ہو۔ تمہیں صرف یہ معلوم ہے کہ تم رنجیت سنگھ کے وفادار ساتھی ہو اور وہ تمہارا سردار ہے۔ اس کے ہر حکم کے آگے تم اپنا سر جھکا دو گے۔ تم اپنے سردار کے لئے جان بھی دے سکتے ہو۔ بولا کیا تمہیں اپنے سردار رنجیت سنگھ سے اتنی ہی محبت ہے؟“

آئی جی رحمان کے ذہن نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اپنے سردار رنجیت سنگھ کے ہر حکم کو مانوں گا۔ میں اس کا غلام ہو۔“

میں نے نغمہ دیا۔ ”اور سردار کے ساتھیوں سے بھی تم بھائیوں جیسی محبت کرو گے!“
”بھائیوں۔“ کے لفظ پر رحمان کے ذہن نے پھر قلابازی سی کھائی۔ ”بھائی..... میرا بھائی کون ہے؟ کہاں ہے؟“ وہ سوچ رہا تھا، مگر اس کا ذہن جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اسی کے نقوش اس کے ذہن سے مٹ چکے تھے۔ غالباً وہ اپنے کسی بھائی سے شدید محبت کرتا تھا جیسی اس لفظ نے اس کے ذہن پر اثر کیا تھا۔

”نہ تمہاری کوئی ماں ہے، نہ بہن، نہ بھائی اور نہ کوئی اور! تم تنہا۔ بس تم اتنا جانتے ہو کہ تمہیں سردار رنجیت سنگھ سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ تم اسی کے وفادار اور غلام ہو۔“

اس کے ذہن کا جواب تھا۔ ”ہاں میں کچھ اور نہیں جانتا۔ میرا بھائی..... بھائی اور سب کچھ سردار رنجیت سنگھ ہے..... میں اسی کا ہوں۔ مجھے کچھ اور نہیں معلوم..... کچھ نہیں!“

میرے ذہن نے اسے آخری حکم دیا۔ ”تم یہاں سے کہیں نہیں بھاگو گے۔ تمہارا سب کچھ تمہارا سردار اور تمہارے ساتھی ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد تم یہ بھی بھول جاؤ گے کہ تمہیں کسی نے اس بات پر، ایسا سمجھنے پر مجبور کیا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے رحمان کی طرف سے نظریں ہٹائیں۔

میری آنکھوں کے ڈھیلے ورد کرنے لگے تھے۔ آئی جی رحمان یقیناً بہت طاقتور ذہن کا مالک تھا۔ پیسے ہی میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اسے جھٹکا سا لگا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں زمین پر پٹ گیا۔ وہ اس وقت کئی راتوں کا جاگا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی گہری سبز آنکھیں ایک دم سرخ ہو گئی تھیں۔

میں نے اسی دوران اس کا ذہن پڑھ کر بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ سردار رنجیت سنگھ کے جو پانچ ساتھی، پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے انہی میں سے ایک تشدد برداشت نہیں کر پایا تھا۔ چار افراد اسی کے سامنے تشدد کا شکار ہو کر دم توڑ چکے تھے۔ پانچویں نے اپنی زندگی کی طرف سے بائوس ہو کر زبان کھول دی تھی۔ پولیس کو اسی کے ذریعے ہمارے ٹھکانے کا علم ہوا تھا۔

کچھ دیر تک میں نے رحمان کو زمین پر بے سدھ پڑا رہنے دیا، پھر جھک کر پوچھا۔ ”کیسے ہو رحمان؟ تمہارا کیا حال ہے؟“

اس نے خفیف آواز میں جواب دیتے ہوئے بطور تعظیم اٹھنا چاہا۔ ”ٹھیک ہوں سردار! ہاں کچھ کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے۔“

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے لٹاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ دیر اور لیٹے رہو، ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

وہ بولا۔ ”مگر مجھے کیا ہو گیا تھا سردار؟ میں کہاں ہوں؟“
”تم ٹھیک ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ تم ہمارے پاس ہو۔ تم لیٹے رہو، میں تمہارے لئے دودھ کا انتظام کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں راہداری میں نکل آیا اور زور سے گڑگڑاہٹ سنگھ کو آواز دی۔ میری آواز راہداری میں گونج گئی۔

میں نے یہی اندازہ لگایا۔

میں نے کمرے میں پہنچتے ہی رحمان سے کہا۔ ”یہ تمہارے سردار کی بہن سریتا ہے۔“ پھر میں نے سریتا کو مخاطب کیا۔ ”سریتا! انہیں نمستے کرو۔“

سریتا میری بات سن کر غصیلے لہجے میں بولی۔ ”میں تو نہیں کرتی اسے نمستے، اور نہ ہی تو میرا بھائی ہے۔“

گرنام سنگھ چونک اٹھا۔ سریتا کے آخری الفاظ اس کے لئے چونکا دینے والے ہی تھے۔

میں بات کو ٹالنے کے لئے فوراً بول اٹھا۔ ”ارے ایک دم اتنی ناراض ہو گئی کہ ہر رشتہ ختم کر لیا!“

وہ پھر بولی۔ ”ہر رشتہ کیوں، تو تو میرا.....“

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں وہ گرنام سنگھ کے سامنے کوئی ایسی دلی بات نہ کہہ دے!

سریتا کے ذہن کو میں نے جب سے قابو میں کیا تھا، وہ میرے لئے مستقل خطرہ بن گئی تھی، وہ اسی سبب کہیں بھی اور کبھی بھی اس بات کا اعتراف کر سکتی تھی کہ میں اس کا بھائی نہیں عاشق ہوں جبکہ تمام دادی والے اسے میری بہن سمجھتے تھے۔

جب میں، آئی جی رحمان کو لے کر اس قید خانے سے نکل رہا تھا گرنام سنگھ نے مجھے الگ لے جا کر کہا۔ ”سردار! کیا واقعی آپ نے اسے آزاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟“

”گرنام! یہ آزاد نہیں، اب ہمیشہ کے لئے ہمارا غلام بن چکا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”وقت آنے پر تم خود دیکھ لو گے۔“

”اور بڑے ٹھاکر؟“ اس نے سول کیا۔ ”کیا وہ بھی آپ کے اس فیصلے کو مان لیں گے؟“

”میں اسے لے کر وہیں تو جا رہا ہوں۔ آج سے یہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔“

دو دھڑلے دھڑلے گول دادی پر رات اتر رہی تھی اور نہ جانے اب تک کتنا سفر طے کر چکی تھی۔ گلیوں میں دور تک دو روئے مشعلوں کی قطاریں ایک عجیب سا ساں پیدا کر رہی تھیں۔ تمام ماحول، ساری فضا یوں لگ رہی تھی جیسے کہیں دور سے کوئی جادوگر آیا ہو اور ساری دادی کو پتھر بنا گیا ہو۔ ایسا سناٹا کسی طوفان سے پہلے ہوتا ہے یا پھر طوفان گزر جانے کے بعد۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے گھوڑوں کے دوڑنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بھی اسی سناٹے کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ آئی جی رحمان گرنام سنگھ اور میرے گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اپنے ہی گھوڑے پر اب میں نے سریتا کو بٹھالیا تھا۔

گرنام سنگھ کا بھونپڑا قریب آگیا تو وہ رک گیا۔ میں، سریتا اور رحمان آگے بڑھ گئے۔

ٹھاکر ابھی سویا نہیں تھا۔ بے چینی سے وہ ہماری آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ہم جمو پڑے میں داخل ہوئے تو اس نے رحمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے رحمان سے کہا۔ ”ان سے ملو رحمان، یہ بڑے ٹھاکر ہیں، تمہارے سردار کے بابا! پھر میں“

آواز سننے ہی گرنام سنگھ گھبرا ہوا دوڑ کر آیا اور قریب آگے پوچھا۔ ”کیا ہوا سردار؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک پیالہ گرم دودھ چاہئے، آئی جی کو پلاتا ہے۔“

وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ”سردار! ساہنوں کو دودھ نہیں پلاتے، یہ بات مجھ سے بہتر آپ جانتے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم!“ میں مسکرایا۔ ”لیکن میں، سانپ کا زہر نکال چکا ہوں۔ اس کا اندازہ جلد ہی خود تمہیں بھی ہو جائے گا۔“

پھر گرنام سنگھ نے مزید کچھ نہیں کہا اور سامنے سپاٹ دیوار پر لگی ہوئی مشعل نکال لی، اس کے بعد سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کوئی کل دہائی۔ دیوار ایک طرف کھسک گئی۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا کہ دیوار کی دوسری جانب بھی کچھ ہے۔ یہ ایک بڑا سا دیوارچی خانہ تھا جس میں بہت سے لوگ کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ میں پھر بال کمرے میں آگیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رحمان اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔

”لینے رہو!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ابھی اور لینے رہو۔ دودھ ابھی آتا ہے۔“ وہ میرے اصرار پر پھر لیٹ گیا۔

کچھ ہی دیر میں گرنام سنگھ دودھ لے کر آگیا۔ میں نے آئی جی رحمان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ کر اپنے ایک ہاتھ سے دودھ کا کنوڑا اس کے منہ سے لگا دیا۔ گرنام سنگھ پاس کھڑا یہ منظر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی آمد سے پہلے غالباً اسے یہ توقع ہو گئی کہ آئی جی زنجیروں سے بندھا ہو گا، اس کے جسم پر کوڑوں کے نشان ہوں گے اور وہ کراہ رہا ہو گا، مگر یہاں ماجرا ہی اور تھا۔ اس کے برخلاف آئی جی آرام سے زمین پر لیٹا تھا اور کپڑے بھی جسم پر تھے۔ وہ کبھی حیرت سے مجھے اور کبھی رحمان کو دیکھ رہا تھا۔

”اب شاید تم اٹھ سکتے ہو رحمان! اور اپنی سگریٹ تو سلگا لو، تم سگریٹ بھی تو پیتے ہو۔“ میں بولا۔

”ہاں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگالی۔ وہ بڑے احترام سے سر جھکائے میرے پاس کھڑا تھا جیسے حکم کا منتظر ہو۔

میں نے کہا۔ ”ان سے ملو رحمان، یہ تمہارے ساتھی گرنام سنگھ ہیں۔“

رحمان نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ گرنام سنگھ نے بھی میرے اشارے پر ایسا ہی کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ رحمان کی گرفت دوستانہ تھی، مگر گرنام سنگھ کا انداز غیر دوستانہ تھا۔

اس بات کو محسوس کرتے ہوئے میں نے گرنام سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”گرنام! آج سے یہ تمہارے ساتھی ہیں، سمجھ گئے! تم ان پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو، اچھا اب چلو!“

گرنام سنگھ نے ایک دفعہ حیرت سے میری طرف دیکھا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رحمان بھی اب سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ گرنام سنگھ اب بھی حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ میں نے اتنی جلدی آئی جی پر کس طرح اعتماد کر لیا۔ ہم لوگ راہداری سے گزر کر اس کمرے میں آگئے جہاں سریتا کو چھوڑ گئے تھے۔ وہ خاصی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے

ٹھاکر کی طرف مڑا۔ ”اور بابا! یہ رحمان ہے، ہمارا نیا ساتھی۔ آج سے یہ بھی میرے ساتھ اسی جھوپڑوں میں رہے گا۔“

ٹھاکر ذرا ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”رنجیتے! اجنبیوں پر اعتبار کرنے کا انجام ایک مرتبہ تم اور ہم سب بھگت چکے ہیں۔ کر تار کی غداری کا واقعہ ابھی کوئی زیادہ پرانا نہیں۔ میں اب تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنے ساتھ باقی تمام وادی والوں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دو۔“

میں اس کے شک کرنے پر دل ہی دل میں ہنسا اور سوچنے لگا، اگر خدا نخواستہ اس وقت اسے یہ بتا دیا جائے کہ رحمان پولیس کا آئی جی ہے جس نے آج ہم پر پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ حملہ کیا تھا تو ہتھے سے اکڑ جائے گا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”بابا! اس مرتبہ ایسا نہیں ہو گا۔ ہم ہر مرتبہ دھوکا نہیں کھا سکتے۔ پھر یہ کہ مجھے رحمان کی وفاداری پر پورا یقین ہے۔“ ٹھاکر نے طنزیہ لہجے میں وفاداری کے لفظ کو دہرایا اور بولا۔ ”اتنی جلدی تمہیں اس کی وفاداری کا یقین بھی آگیا؟“

”قطعی!“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا اپنے آپ پر یا کسی وفادار و جاں نثار ساتھی پر ہو سکتا ہے۔ وقت آنے پر آپ کو بھی اس کا اندازہ ہو جائے گا۔“

غالباً ابھی تک ٹھاکر نے رحمان کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ رحمان اس وقت بھی آئی جی کی وردی میں تھا۔ اس عرصے میں سریتا جھوپڑے کے اندرونی حصے میں جا چکی تھی۔ وہ شاید ہماری باتوں سے اکتانگئی تھی۔ رحمان سر جھکائے کھڑا تھا۔

”بیٹہ جاؤ!“ میں نے رحمان کو مخاطب کیا۔ ”کھڑے کیوں ہو!“

میرا حکم سنتے ہی رحمان نرم بستر پر بیٹھ گیا۔ بستر کے اوپر ہی دیوار میں مشعل پیوست تھی۔ رحمان اب پوری طرح روشنی میں تھا۔

اب جو ٹھاکر کی نظر رحمان پر پڑی تو وہ اچھل پڑا جیسے اس نے کوئی ناقابل یقین منظر دیکھ لیا ہو۔ وہ حلق کے بل چیخا۔ ”رنجیتے! کیا تو مجھے پاگل کر دے گا! ارے یہ تو مجھے اپنی وردی سے پولیس کا کوئی بڑا افسر لگتا ہے!“ یہ کہتے ہی ٹھاکر نے برابر ہی دیوار پر لٹکی ہوئی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

رحمان کے سکون میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اسی طرح مصوویت سے بستر پر بیٹھا چلیں جھپکا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹھاکر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آخر تو کیا چاہتا ہے؟“ ٹھاکر برہم ہو کر پلٹا۔

میں بولا۔ ”صرف اسے یہاں رکھنا۔ آپ اس پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہ ہر طرح میرے اور آپ کے حکم کا غلام ہے۔ اگر آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ یہ اپنا سر خود اپنے ہاتھ سے قلم کر لے تو آپ یقین کیجئے، اسے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں ہوگی!“

ٹھاکر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہو نہ! سر قلم کر لے گا۔ سر قلم کرنا تو خیر بہت بڑی بات ہے، کیا یہ تمہارے حکم سے جلتی ہوئی مشعل پر ہاتھ رکھ سکتا ہے؟“ اس نے مشعل کی طرف اشارہ کیا۔ ”کننے اور

کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے رنجیتے!“

میں اس مطالبے پر چکرا سا گیا۔ یہ سراسر درندگی ہے، میں نے سوچا ایک شخص جو ہر طرح میرے قابو میں ہے، اس کی وفاداری کا امتحان اذیت دے کر لیتا، ظلم تھا۔ پھر بھی یہ بات تو صرف میں جانتا تھا کہ رحمان اب ہر طرح ہمارے بس میں ہے، ٹھاکر کو اس بات کا یقین کس طرح دلایا جاسکتا تھا! یہ تو پورا باول ہی وحشت و بربریت پر زندہ تھا۔ یہاں آئے دن سوائے کشت و خون کے اور کوئی بات ہی نہ ہوتی تھی۔ جب سے میں نے ڈاکو رنجیت سنگھ کے جسم کو اپنی پناہ گاہ بنایا تھا نہ معلوم کتنے آدمیوں کا خون ہونے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا حالانکہ مجھے اس جسم میں چند ہی دن ہوئے تھے۔ ان چند دنوں میں، میں اس قدر عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوا تھا کہ میری عقل دنگ رہ گئی تھی۔

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ٹھاکر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”چپ کیوں ہو گئے؟ جواب دو! کہاں گئے تمہارے دعوے؟“

”مگر بابا! یہ ظلم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں کیا حق ہے کہ ایک شخص کو بیٹھے بٹھائے تکلیف میں جلا کر دیں اور اسے اپنی بے جا خواہش کا شکار بنائیں!“

میری اس بات پر ٹھاکر برس پڑا۔ ”اسے تو ظلم کتنا ہے، بے جا خواہش بتاتا ہے! کیا ہو گیا ہے تجھے؟ آنکھوں دیکھتے کبھی لگتا چاہتا ہے، آستین میں سانپ پانا چاہتا ہے تو! اور مجھے سمجھا رہا ہے! کیا میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے ہیں!..... آگ اور پانی بھی کہیں لے ہیں! دریا کے دو کنارے اگر مل سکتے ہیں تو پولیس ضرور ایک قانون شکن اور مجرم کی وفادار ہو سکتی ہے۔ اس شخص نے یقیناً تجھ پر فریب و مکاری سے کوئی جال پھینکا ہے۔ یہ بھی اس کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اس وقت تک اس کی وفاداری کا یقین نہیں آسکتا جب تک یہ تیرے حکم سے اپنا ہاتھ جلتی ہوئی مشعل پر نہ رکھ دے!“

رحمان بھی یہ سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ اسے شاید میرے حکم کا انتظار تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی اور سر جھکا کر بولا۔ ”سردار! اگر بابا کی یہی مرضی ہے تو میں اس پر تیار ہوں۔“

میں نے رحمان کی بات سنی اور پھر بڑے ٹھاکر کی ضد پر غور کیا۔ مجبوراً مجھے رحمان کو حکم دینا پڑا۔ رحمان اطمینان سے اٹھا اور اپنا باباں ہاتھ مشعل کے بھڑکتے ہوئے شعلے پر رکھ دیا۔ زندہ گوشت جلنے کی بو سے سارا جھوپڑا بھر گیا۔ وہ بڑی قوت برداشت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے تھے۔ ٹھاکر اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار میں چیخ ہی اٹھا۔ ”بس رحمان! بس!“

رحمان نے اپنا جلا بھنا ہاتھ مشعل سے اٹھا لیا۔ باوجود ضبط کے اس کے منہ سے طویل کراہ نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ اب ٹھاکر مطمئن سا ہو گیا ہے۔ وہ اندر جھوپڑے میں گیا اور ایک صندوقچی اٹھا لایا، پھر خود اپنے ہاتھ سے رحمان کے ہاتھ کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔ غالباً اب رحمان پر ٹھاکر کو رحم آچکا تھا۔

دوسری صبح ایک اور ہی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ میں 'سریتا اور رحمان کو ساتھ لے کر غار نما سرنگ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سرنگ گزشتہ روز پولیس کی گولہ باری سے پوری طرح تباہ ہو چکی تھی۔ آج ہی صبح سے اس کی تعمیر نو کا کام شروع ہوا تھا۔ روناگئی سے قتل میں نے آئی جی رحمان کے کپڑے بھی تبدیل کرادیئے تھے۔ اس کی وردی میں نے احتیاط سے رکھوا دی تھی۔ اس کے جسم پر میرے کپڑے بالکل فٹ آئے تھے۔ ہم تینوں شلتے ہوئے کام کرنے والوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ سریتا اس وقت بھی بیزار بیزار سی تھی۔ میں اس سے بیزاری کا سبب دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم نیم شکستہ سرنگ کے ایک ایسے حصے سے گزر رہے تھے جہاں کام نہیں ہو رہا تھا۔ یہ جگہ کچھ الگ الگ کی بھی تھی۔

"تم ذرا گھومو پھر دو!" میں نے رحمان سے کہا۔ "ہم دونوں یہاں بیٹھے ہیں۔"

یہ جگہ ایک بڑے پتھر کے کٹاؤ کی وجہ سے ذرا الگ تھلگ سی ہو گئی تھی۔ زمین ریتی تھی، غالباً اس کا سبب ٹوٹ پھوٹ اور گرد و غبار تھا ورنہ پہلے میں اس جگہ سے گزرا تھا تو یہ تقریباً پتھر لی تھی۔ رحمان پیچھے رہ گیا اور ہم دونوں اس جگہ بیٹھ گئے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے سریتا کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم کچھ بھی بھیجی ہو میری دس بھری!"

پھر میرے ذرا سے اشارے پر سریتا میری آغوش میں سمٹ آئی۔

ہم دونوں عالم بے خودی کی حالت میں یک جان دو قالب بنے ہوئے تھے کہ اچانک شور سن کر میں چونک اٹھا۔ یہ بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازوں کا شور تھا جو ہم دونوں کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں تقریباً سبھی نوجوان تھے۔ وہ سخت برہم اور ناراض نظر آ رہے تھے۔ ان کے چروں پر عجب قسم کی دردناک رقص کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہے تھے، بالکل کل جگ ہے..... کیا کوئی یہ منظر دیکھے بغیر یقین کر سکتا تھا کہ دو بہن بھائی اتنی ذلیل اور بچ حرکت کر سکتے ہیں! ہمیں سردار سے ایسی امید نہیں تھی۔ ہمارا سردار اس قدر گھٹیا اور بچ ہو سکتا ہے! اب تو ہماری ماں بہنوں کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی۔ جب یہ خود اپنی بہن کے ساتھ منہ کالا کر سکتا ہے تو پھر یہ کسی کی بہن کا کیا خیال کرے گا! اسے تو کسی کی عزت لوٹنے میں اب کوئی عار نہیں ہوگی۔

غصے اور نفرت میں ڈوبی ہوئی ان آوازوں نے مجھے مبہوت سا کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ مجھے شرمندگی اور خفت محسوس ہو رہی تھی۔ میری ہی طرح سریتا بھی بے حس و حرکت ہو گئی تھی۔ یوں جیسے بجڑتے ہوئے شعلوں پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔

ان میں سے پھر کسی نے کہا۔ "قانون سب کے لئے برابر ہے۔ قانون اگر اس جرم پر دوسروں کو گولی مارنے کی سزا دے سکتا ہے تو سردار کو بھی یہی سزا ملنا چاہئے۔ سردار قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ ہم اپنا سردار کسی اور کو بنا لیں گے۔ یہ تو ہماری عزت و ناموس پر ایک داغ ہے۔ اسے فوراً رنگے ہاتھوں پکڑ

لینا چاہئے!"

اچانک انہی آوازوں میں سے ایک آواز ابھری۔ "اگر کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی تو گولی بردوں گا۔" یہ آواز آئی جی رحمان کی تھی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ!" دوسری تیز اور بلند آواز سنائی دی۔ "نہ بٹے تو تم پر جہنم کا دہانہ کھول دوں گا!"

نقطہ میں ڈوبی ہوئی یہ آواز گرنام سنگھ کی تھی۔ اسی کے بعد دو آوازیں اور آئیں۔ پہلی آواز رام سروپ کی تھی۔ "تم سردار کو ہاتھ نہیں لگا سکتے!"

"اگر کسی نے ایسی کوشش کی تو اسے ہماری لاشوں سے گزرتا پڑے گا۔" یہ چرنجی تھا، رام سروپ کا بڑا بھائی!

وہ چاروں رحمان، گرنام سنگھ، چرنجی اور رام سروپ مجمع میرے جاں نثار تھے۔ اب انہوں نے مجھے اور سریتا کو مجمع کی نظر سے قطعی چھپا دیا تھا۔ ہمارے اور مجمع کے درمیان وہ ایک آہنی دیوار بن گئے تھے۔

مجھے کچھ ہوش آیا کہ کس حال میں ہوں! سریتا کا سکتہ بھی ان چاروں کی آواز سن کر ٹوٹ گیا۔ وہ اسی لئے چونک کر کسمائی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ لیا۔ میں بھی اٹھ کر خود کو سنبھالنے لگا۔ تمام ہنگامے کی اصل وجہ سریتا تھی۔ بستی کا شاید ہی کوئی نوجوان ایسا ہو جو سریتا کے

حسن سے متاثر نہ ہو۔ وہ تھی بھی تو قیامت! اس تمام رویے میں وہ رقابت بھی چھپی ہوئی تھی جو اس وقت مجھے سریتا کے ساتھ اس حالت میں دیکھ کر ان کے دلوں کو چھید گئی تھی۔ وہ میری جگہ خود کو دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لئے سخت برہم ہو گئے تھے۔ اس واقعے نے انہیں ایک خوبصورت بہانہ فراہم کر دیا تھا۔ وہ غالباً آئی جی رحمان، گرنام سنگھ، رام سروپ اور چرنجی سے اس رویے کے متوقع نہیں تھے۔ پھر آئی جی رحمان تو ان کے لئے انجینی ہی تھا۔ رحمان کو تو صرف میری چند قربی سہاٹی جانتے تھے۔ وادی والوں پر میرے بقیہ تینوں جاں نثاروں کا بڑا اثر تھا اس لئے وہ آگے بڑھنے کی بہت نہ کر سکے۔

وادی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ مجمع اسی لئے لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے جاں نثار مجھے اور سریتا کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ ہم دونوں کو لئے ہوئے مجمع کو چیر کر اس طرح نکل آئے جیسے صابن میں سے تار۔ چاروں نے چاروں سمیتیں سنبھال رکھی تھیں۔ انہوں نے بے حفاظت اور سریتا کو میرے جھوپڑے تک پہنچا دیا اور خود جھوپڑے کے سامنے رانٹیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

جھوپڑا اس وقت خالی پڑا تھا۔ نہ معلوم ٹھاکر اور ٹھکرائن کہاں چلے گئے تھے! کیا خبر انہیں بھی یہ اطلاع مل چکی ہو! میں نے سوچا اور دیکھا کہ ٹھاکر کی ہندو دیوار پر موجود نہیں تھی۔ ہمیں ابھی جھوپڑے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ٹھاکر کی گرج دار آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کہاں ہے رنجی؟ میں اسے گولی مار دوں گا!"

ٹھاکر کے ساتھ بستی کے اور لوگ بھی معلوم ہوتے تھے جن کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی

تھیں۔

جھوپڑا اس وقت خالی پڑا تھا۔ نہ معلوم ٹھاکر اور ٹھکرائن کہاں چلے گئے تھے! کیا خبر انہیں بھی یہ اطلاع مل چکی ہو! میں نے سوچا اور دیکھا کہ ٹھاکر کی ہندو دیوار پر موجود نہیں تھی۔ ہمیں ابھی جھوپڑے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ٹھاکر کی گرج دار آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کہاں ہے رنجی؟ میں اسے گولی مار دوں گا!"

ٹھاکر کے ساتھ بستی کے اور لوگ بھی معلوم ہوتے تھے جن کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی

تھیں۔

تھیں۔

”بابا! آپ جھوپڑے میں داخل نہیں ہو سکتے!“ میں نے رحمان کی آواز سنی۔ ”آپ ہی کیا کرنا بھی میری لاش پر سے گزرے بغیر سردار تک نہیں پہنچ سکتا!“

رحمان کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ اس کے باوجود اس کی ہمت قابل ستائش تھی۔ رات کا واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جب اس نے میرے حکم کی تعمیل میں جلتی ہوئی مشعل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس ذہن میں میری وفاداری کے نقوش اتنے ہی گہرے تھے۔

”وادی کے تمام لوگ سردار کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ سب سردار کے دشمن ہو چکے ہیں۔ رحمان کی آواز پھر آئی۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے تیور بھی خطرناک ہیں اس لئے آپ بھی اب وقت تک جھوپڑے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک آپ اپنی بندوق نہیں دے دیں اور سردار کو آپ کو اندر آنے کی اجازت نہ دے دیں۔“

رحمان کے اس جواب پر ٹھاکر اور برہم ہو گیا۔ ہستی والے اسے سمجھانے لگے۔ پھر میں نے ایک آواز سن کر اندازہ لگایا کہ وہ کسی بوڑھے کی آواز تھی۔ ”بڑے ٹھاکر! اپنا خون پھر اپنا ہوتا ہے۔ نہ مطہر رنجیت سنگھ کس کی اولاد ہے! اب تو مجھے یاد بھی نہیں شاید وہ کوئی بنیا تھا۔ ٹھاکر.....“

لیکن ٹھاکر شاید اس وقت کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں بوڑھے کی بات سن کر عجیب محسوس میں پڑ گیا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ کون بنیا؟ کیا رنجیت سنگھ بڑے ٹھاکر کی اولاد نہیں؟ جس کے جسم پر میں قبضہ کر رکھا ہے۔ دوسرے کچھ اور لوگ بھی بڑے ٹھاکر کو سمجھا رہے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی آوازوں سے بوڑھے ہی لگتے تھے۔

”کون سا ایسا باپ گناہ ہو گیا بڑے ٹھاکر!“ کوئی بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ”آپ کیوں رنجیت سنگھ کو مار دینا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنی بہن کے ساتھ تو کوئی برا کام نہیں کیا۔“

رنجیت سنگھ کو آپ نے گود ہی تو لیا تھا! کون سا وہ آپ کا خون ہے! اگر وہ آپ کی اولاد ہوتا تو اسے ایسی خطا ہی کیوں ہوتی!“

لوگوں کے سمجھانے بھانے پر ٹھاکر شاید کچھ نرم پڑ گیا۔ جھوپڑے کے باہر سے اب کچھ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ نوجوان شاید سرتیا کے امیدواروں میں سے تھے۔ کسی بوڑھے نے نوجوانوں کو مخاطب کیا۔ ”سنو! وہ رنجیت سنگھ سرتیا کا بھائی ہرگز نہیں ہے۔ مجھے آج تک سب کچھ ہے۔ اب سے تیس برس پہلے کی بات ہے جب بڑے ٹھاکر ہمارے سردار تھے۔ ایک گاؤں میں ڈالتے ہوئے بڑے ٹھاکر نے رنجیت سنگھ کو اٹھالیا۔“

نوجوان شور مچانے لگے تو بڑے ٹھاکر نے انہیں ڈانٹ دیا۔ پھر حکم دیا۔ ”اس شخص کی بات چپ کر سنو!“

بڑے ٹھاکر کے ڈانٹنے پر سناٹا چھا گیا تو بوڑھے کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ ”اس وقت رنجیت سنگھ بالکل بچہ تھا، بمشکل کوئی ایک سال کا ہو گا۔ ہمارے بڑے ٹھاکر سردار بمبیر سنگھ کے کوئی اولاد نہ

تھی۔ انہوں نے اس لڑکے کو پال لیا اور اس کا نام رنجیت سنگھ رکھا۔ بعد میں سردار کے یہاں ایک لڑکا ہوا تاہم وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ اگر رنجیت بڑے ٹھاکر ہی کا خون ہوتا تو پھر رونا کس بات کا تھا! یہ تو ایک بچہ کی اولاد ہے، ٹھاکر نہیں۔“

پھر مزید کئی ایسی ہی آوازوں نے تمام معاملہ صاف کر دیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب میں مادی بات سمجھ چکا تھا۔ میں نے اپنے جاں نثاروں کو بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”مع بندوق کے بڑے ٹھاکر کو اندر آنے دو! میں سب کچھ جان چکا ہوں کہ میں بڑے ٹھاکر کی اولاد نہیں لیکن انہوں نے مجھے اولاد ہی کی طرح پالا ہے۔ اگر یہ مجھے گولی مار دینا چاہتے ہیں تو میرا سینہ حاضر ہے۔“

میرے نزدیک یہ ایک ایسا اخلاقی دباؤ تھا کہ ٹھاکر مجھ پر گولی نہ چلا پاتا۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ مجھے حالت پر آمادہ نظر آتا تو میں فوری طور پر رنجیت سنگھ کا جسم چھوڑ کر خود اسی کے جسم پر قبضہ کر لیتا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ ہوتا۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ ظاہر ہے کہ میں بوڑھے ٹھاکر کے جسم میں رہنا پسند نہ کرتا اور کوئی نیا جسم اپنا لیتا۔

میرے کہنے پر صرف بڑے ٹھاکر کو جھوپڑے میں آنے دیا گیا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں تھی جس کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آیا میں اور سرتیا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے سینہ کھول کر کہا۔ بابا! چلائیے گولی۔“

سرتیا یہ دیکھتے ہی میرے سامنے آگئی۔ میں نے اسے ہاتھ سے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ ہٹی اور بولی۔ ”اگر بابا میرا ساگ اجازت ہی چاہتا ہے تو پھر میں بھی کیوں زندہ رہوں! بابا! اسی کے ماتھے مجھے بھی گولی مار دے۔“

میں دونوں کی بات سن کر ٹھاکر کے ہاتھ ذرا سے کانپے اور اٹھی ہوئی بندوق کی نال جھکتی چلی گئی۔ پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں نمی تیرتے دیکھی، پھر آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ ”میرے بچو!“ کہہ کر آگے بڑھا۔ میں اور سرتیا اس کے سینے سے لگ گئے۔ میرا اندازہ قطعی درست ثابت ہوا تھا۔

میں دونوں ٹھاکر کے سینے سے لگے ہوئے تھے کہ ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوئی سی جھوپڑے میں داخل ہوئی۔ یہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔ ٹھاکر نے اسے مخاطب کیا۔ ”رنجیت کی ماں! میں نے ان دونوں کو معاف کر دیا۔“ یہ کہتے ہوئے ٹھاکر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

پھر ٹھاکر جھوپڑے سے باہر چلا گیا جہاں لوگ جمع تھے۔

ذرا ہی دیر بعد میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ بستی والوں سے کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگ جان ہی چکے ہو کہ تمہارا سردار رنجیت سنگھ میری اصل اولاد نہیں اور نہ وہ سرتیا کا بھائی ہے۔ میں اسی لئے آج ہی ان دونوں کا بیاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا

اور شاید بھگوان کی بھی یہی مرضی تھی ورنہ رنجیت سنگھ کی منگیت لاجو اس دنیا سے نہ سدھارتی۔ ار لوگ اپنے اپنے کام کرو۔“

میں نے لوگوں کے دور ہوتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ رحمان اور گرنام سنگھ البتہ وہاں سے گئے۔ ٹھاکر کے ساتھ ساتھ ہی وہ دونوں بھی جھونپڑے میں داخل ہوئے۔ ٹھاکر کا اعلان سربیتا نے بھی لیا تھا۔ وہ شرمکار جھونپڑے کے اندرونی حصے میں بھاگ گئی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد رام سرورپ اور چرنی جھونپڑے میں آگئے۔

مجھے مبارک باد دینے والوں میں سب سے پہلا شخص گرنام سنگھ تھا لاجو کا بھائی! اس نے گڑ سے میرا ہاتھ دبایا۔ مجھے پہلی دفعہ اس کی محبت کا بھرپور احساس ہوا۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بڑے صبر و حوصلے کا آدمی تھا۔ اس کی مرحومہ بہن کا منگیتر کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر رہا تھا اور اس پر یہ بھی ظاہر ہو چکا تھا کہ میں اس کی بہن کا وفادار نہیں تھا بلکہ کسی اور سے محبت کرتا تھا۔ اس کے دل سے میری محبت کم نہیں ہوئی تھی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کی وفاداریاں نہیں ہوتیں۔ گرنام سنگھ ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ رام سرورپ اور چرنی نے بھی باری باری مبارک باد دی۔

اس بھاگ دوڑ میں شاید رحمان کے ہاتھ کا زخم پھر تکلیف دینے لگا تھا اور پنی ڈھیلی ہو گئی تھی دیکھ کر ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ”رحمان! جاؤ اندر سے میری صندوقچی اٹھلا“ تیری پنی بدل دوں۔“ کے لہجے میں محبت تھی۔ اسے غالباً اب رحمان پر پورا بھروسہ ہو چکا تھا۔

رحمان جواب میں بولا۔ ”اچھا بابا!“ پھر وہ جھونپڑے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ”میں ذرا قید خانے تک چلتا ہوں۔“ میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔ ”تم تینوں میرے ساتھ چلو اور ہاں یہ بتاؤ گرنام! کام کی کیا رفتار ہے؟“

”کام کی طرف سے آپ کا فکر مند ہونا بالکل ٹھیک ہے سردار!“ گرنام سنگھ نے جواب دیا۔ اس وقت تک خطرے میں ہیں جب تک یہ راستہ بند نہیں ہو جاتا، مگر کیونکہ ایک تو پہلے راستے کو کرنا ہے، اس میں وقت لگے گا، دوسرے یہ کہ ہمارے پاس آدمی کم ہیں۔“

”تمہیں کتنے آدمی اور مل جائیں تو یہ کام جلد از جلد پورا کر لو گے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ میرے سوال پر حیران سا ہوا، پھر بولا۔ ”آدمی کہاں سے آئیں گے؟ سردار! میں نے داد تمام ہی جوانوں کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ ہاں ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔“

”ہاں بتاؤ!“ میں بول اٹھا۔ ”ممکن ہے یہی ترکیب آپ نے بھی سوچی ہو سردار!“ گرنام سنگھ نے کہا۔ ”قیدی سپاہیوں زبردستی کام لیا جائے، لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔“

میں اس کی بات سن کر ہنس دیا۔ ٹھاکر نے بھی گرنام سنگھ کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ وہ رملہ ہاتھ سے پنی کھولنے میں مصروف تھا۔

ٹھاکر نے جب رحمان کی پنی بدل دی تو میں نے کہا۔ ”آؤ رحمان! تم بھی ہمارے ساتھ چلو!“ میرے چاروں جاں نثار ساتھ ہو گئے۔ ہمیں باہر جاتے دیکھ کر ٹھاکر بولا۔ ”یہ نہ بھول جانا کہ آج مادی شادی ہے، جاؤ رہے ہو مگر جلد لوٹ آنا۔“

”ٹھیک ہے بابا!“ میں اقرار میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ یکے بعد دیگرے میں اتنی تیزی کے ساتھ حالات سے دو چار ہوا تھا کہ تھوڑی دیر کھلی فضا میں ہنس لینا چاہتا تھا جس سے میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ میں اپنے چاروں ساتھیوں کے ہمراہ ٹھوڑے پر بیٹھ کر قید خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے میں نے اپنا گھوڑا گرنام سنگھ کے قریب کر لیا اور بولا۔ ”ہاں تو گرنام! کیسی رہے اگر اس کی جی کی طرف بقیہ پولیس والے بھی تمہارے سردار کا دم بھرنے لگیں؟“

میری بات گرنام سنگھ کے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ چونک اٹھا اور کہا۔ ”سردار! ایسا بچنے کا بھی مت! اگر آپ نے کسی طرح ایک آدمی کو قابو میں کر لیا ہے تو اتنی بڑی پلٹن کی پلٹن کو اپنے ہاں میں کرنا ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خطرہ مول لینا.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”ہماری زندگی ہی خطروں سے کھیلتا ہے۔“ میں بولا۔ ”کل تمہارے ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ حیران حیران سامیری طرف دیکھنے لگا تو میں نے ذرا راز دارانہ لہجے میں سے بتایا۔ ”کیا تم یقین کرو گے کہ رحمان اب اپنی پچھلی زندگی بھول چکا ہے۔ وہ اس کے سوا اب کچھ نہیں جانتا کہ تمہارا ساتھی ہے!“ ظاہر ہے کہ گرنام سنگھ کے لئے یہ بات بھی حیران کن ہی تھی۔ اپنی بات باری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”اسی طرح تمام سپاہی بھی قطعی سب کچھ بھول جائیں گے۔ انہیں سوائے اس کے اور کچھ یاد نہیں رہ جائے گا کہ ان کا سب کچھ میں ہوں اور وہ میرا حکم ماننے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔“

گرنام سنگھ سے اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم سب قید خانے تک پہنچ گئے۔ اندر پہنچ کر میں نے رام سرورپ کو بڑے ہال کے دروازے پر مقرر کیا اور چرنی کو اس نشست نما کمرے کے دروازے پر جس میں گزشتہ رات میں اور سربیتا آکر بیٹھے تھے۔ پھر میں نے گرنام سنگھ کو حکم دیا کہ تم ایک ایک کر کے تمام سپاہیوں کو میرے پاس لاتے رہو۔ رحمان کو میں نے اپنے ساتھ ہی رکھا اور ہدایت کی کہ جو سپاہی بھی آئے نہیں اس صرف اتنا کہتا ہے، خاموشی سے سردار کے سامنے کھڑے رہو! اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑے جائے گی۔ رحمان میرے اس حکم پر پہلے کچھ حیران سا ہوا، پھر سر ہلا کر بولا۔ ”بہتر ہے سردار!“

اس کے بعد ایک ایک کر کے سپاہیوں کو میرے پاس لایا جانے لگا۔ پہلے سپاہی نے آتے ہی آئی جی رحمان کو سیلوٹ کیا۔ رحمان اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میرے کمرے ہوئے بٹلے دہرا دیئے۔ وہ سپاہی خاموش کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سپاہیوں کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے جاتے تو سب کچھ بھول چکے ہوتے۔ سوائے اپنے نام، ذہنی صلاحیت اور

تعلیم کے انہیں کچھ یاد نہ رہ جاتا۔

ان کا ڈی آئی جی ایک انگریز ڈیوڑھا تھا۔ میں اسی کی تلاش میں تھا۔ مجھے اس کا نام وغیرہ ایک پانچ سو سوالات کے دوران معلوم ہو گیا تو میں نے گرنام سنگھ کو حکم دیا۔ ”دیکھو ان سپاہیوں میں کوئی انگریز ہو گا جس کا نام ڈیوڑھا ہے۔ اب سب سے پہلے اسے لاؤ!“

گرنام سنگھ تھوڑی دیر میں گوری چڑی والے ایک شخص کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس شخص کی عمر تقریباً چالیس برس ہو گی، جسم تندرست تھا۔ بھاری جبڑوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں سے عیاری جھلکتی تھی۔ اس نے بھی آتے ہی رحمان کو سیلوٹ کیا۔ رحمان نے انگریزی میں میری ہدایت دہرا دی۔ ڈیوڑھا ”اوکے“ کہہ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کی عیار آنکھیں میری طرف انھیں بھر بیٹھ سکیں۔ اس نے لاکھ چاہا کسی اور طرف دیکھ سکے مگر ناکام رہا۔

رنجیت سنگھ کے جو ساتھی، پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے، ان کا قاتل ڈیوڑھا ہی تھا۔ اسی نے ان پانچوں میں سے ایک کی زبان کھلوائی تھی۔ ڈیوڑھا کا ذہن پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے آئی جی رحمان سے مل کر فوراً وادی پر حملے کی تیاری کر لی تھی۔ اس نے جلدی میں اپنے پیچھے کوئی ریکارڈ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کے کیس کی فائل برسوں پہلے اسی وقت بند کر دی گئی تھی جب سربراہ باپ رنجیت سنگھ ہونے کا دعویٰ کر کے پھانسی پر چڑھ گیا تھا۔

مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ جو لوگ میرے قبضے میں تھے، ان کے سوا کسی کو ہمارے ٹھکانے، علم نہیں تھا۔

پھر تو چند لمحوں بعد ہی ڈیوڑھا بھی میرے ساتھیوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میرا جانی دشمن ڈیوڑھا اب میرے لئے جان بھی دے سکتا تھا۔ پھر میں نے بقیہ سپاہیوں اور انسپکٹروں کو بھی اپنا وفادار ساتھی بنالیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے گرنام سنگھ سے کہا۔ ”ان سب لوگوں کو اب قید خانے سے نکالو اور اس کام پر لگا دو کہ یہ خود اپنے جھونڈے تعمیر کریں۔ بقیہ لوگوں کو بھی انہی کے ساتھ پہلے جھونڈوں کی تعمیر لگا دو۔ اس غار نما سرنگ کا کام اس کے بعد شروع ہو گا اس لئے کہ اب کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ جب یہ جھونڈے تعمیر کر چکیں تو ان کی رانٹیلیں اور بقیہ اسلحہ بھی انہیں بانٹ دو۔“

میرے اس حکم پر گرنام سنگھ نے سر جھکا لیا۔

”تمام وادی والوں سے کہہ دو کہ ان پر پورا اعتماد کریں۔“ میں مزید بولا۔ ”وادی والے ان سے کسی قسم کے سوالات نہ کریں اس لئے کہ اب یہ انہیں کچھ نہیں بتا پائیں گے۔ ان سے کہہ دو کہ یہ میرا حکم ہے۔ اگر حکم کے خلاف ہوا تو نتیجے میں انہیں پریشانی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں سنو! غالباً اب شام ہو چکی ہے۔ تم جاہو تو کل سے کام شروع کرا سکتے ہو۔ آج انہیں یہیں رہنے دو، باہر کماں رہیں گے! بلکہ جب تک جھونڈے تعمیر نہیں ہو جاتے انہیں یہیں رکھو۔ رات یہ یہاں گزارا کریں گے۔“

اس پر گرنام سنگھ بولا۔ ”سر دار! آج آپ کی شادی بھی تو ہے، اگر یہ لوگ بھی اس میں شریک جائیں تو کیا حرج ہے؟“

”کوئی نہیں، بلکہ یہ تو اچھا ہے۔“ میں نے گرنام سنگھ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اب یہ پورے سات آٹھ سو آدمی میرے ہمراہ بستی کی طرف بڑھے۔ انہیں دیکھ کر بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ لوگ سمجھے کہ قیدی سپاہی شاید آزاد ہو کر زبردستی باہر نکل آئے ہیں۔ اسی خیال سے انہوں نے ایک دم فائرنگ شروع کر دی۔ یہ شام کا وقت تھا اور سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ تمام سپاہی اپنی اپنی وردیوں ہی میں تھے۔ یہ دیکھ کر غالباً وادی کے لوگ بمزگم گئے۔ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ سپاہیوں کے ہاتھ خالی ہیں اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ میں گرنام سنگھ، رام سروپ وغیرہ ہیں۔ انہوں نے سامنے مورچے سمجھال لئے۔ وہ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ صورت حال نہایت خطرناک تھی۔

ہم چاروں گھوڑوں سے کود کر زمین پر لیٹ گئے۔ میں نے بقیہ لوگوں کو بھی چیخ کر حکم دیا کہ زمین پر لیٹ جاؤ! وہ میرے حکم سے پہلے ہی ایسا کر چکے تھے اس لئے کہ ان کی ذہانت اور صلاحیت برقرار تھی۔ ہر حال وہ تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہئے! سامنے سے برابر فائرنگ ہو رہی تھی اور ہم سب زمین پر اوندھے پڑے تھے۔ ہمارے سروں کے اوپر سے گولیاں سانس سانس کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

کچھ دیر کو میرے اوسمان خطا ہو گئے۔ سب سے آگے ہم چاروں ہی تھے۔ سینے کے بل رینگ کر میں گرنام سنگھ کے قریب ہو گیا اور اس سے کہا۔ ”تم ایسا کرو گرنام کہ اسی طرح سینے کے بل رینگتے ہوئے ذرا چکر کاٹ کر پیچھے سے وادی والوں تک پہنچو، انہیں صورت حال سے آگاہ کر دو اور کسی طرح فائرنگ بند کرا دو۔“

گرنام سنگھ میرے حکم کی تعمیل میں پیچھے ہٹا گیا۔ مجھے وادی والوں کی حماقت پر غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

ہم اسی طرح دم سادھے پڑے رہے۔ پھر خدا خدا کر کے سامنے سے فائرنگ بند ہوئی۔ شاید گرنام سنگھ وہاں پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ ہم سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر میں جب ہم وادی والوں کے قریب پہنچے تو وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

وادی میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بڑے میدان میں شادی کی تقریب کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس وقت ٹھاکر وہیں تھا۔ میدان میں بڑے بڑے شامیانے نصب تھے جو دور سے نظر آرہے تھے۔ فائرنگ کی آواز بڑے میدان تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ٹھاکر بھی اس لئے کچھ دیر پہلے تک اسی مجمع میں موجود تھا۔ صورت حال کا علم ہونے کے بعد وہ گرنام سنگھ سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ رنجیت کو فوراً میرے پاس بڑے میدان میں بھیجو۔

گرنام سنگھ نے مجھے ٹھاکر کے حکم سے آگاہ کیا۔ میں تمام سپاہیوں کے ہمراہ بڑے میدان میں پہنچا جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ بڑے بڑے شامیانوں، قاتوں اور فرشوں سے پورے میدان کو سجا دیا گیا تھا۔ شعلیں بھی جگہ جگہ پہلے ہی لگا دی گئی تھیں، ہر چند کہ انہیں ابھی روشن نہیں کیا گیا تھا۔

تمام میدان سپاہیوں اور وادی والوں سے بھر گیا۔ چوتھرے پر منڈپ بنایا گیا تھا۔ وہیں میری اور

چرنجی کی صاف گوئی پر میں بہت خوش ہوا۔ اس نے خود اپنی اولاد کے بارے میں بغیر کوئی سفارش سے چٹائی کے ساتھ ساری بات بتا دی تھی۔

”میں ابھی چلتا ہوں چرنجی!“ میں بولا۔ ”تمہاری سچائی اور صاف گوئی نے مجھے بہت خوش کیا۔“ میں اور چرنجی کچھ ہی دیر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر بڑے میدان پہنچ گئے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی بڑا شور ہوا۔ میں اس چوتھے پر چڑھ گیا جہاں شادی کا منڈپ بنا ہوا تھا۔

”میرے بہادر اور جاں نثار ساتھیو!“ میں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم سب آپس میں لڑو۔ اس موقع پر میں‘ وادی والوں کو ایک اور خوش خبری دیتا ہوں۔ وہ خوش خبری یہ ہے کہ اب ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ آج سے وہ دو ڈھائی سو کی بجائے ایک ہزار کے قریب ہو چکے ہیں۔ اس وقت مجھے آپ لوگوں کو ایک نصیحت کرنا ہے کہ ایک دوسرے کی وفاداری پر ٹک نہ کریں اور جو لوگ ہمارے گردہ میں نئے شامل ہوئے ہیں ان سے محبت کا سلوک کریں۔ ان نئے لوگوں نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ وادی والوں کے بیوی بچے تو خیر ان کے ساتھ بیٹھیں ہیں مگر ان نئے لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں۔ پھر بھی انہوں نے بیوی بچوں کی پرداہ نہیں کی اور تمہارے سردار سے وفاداری کا عہد کیا۔ ان کی وفاداری اور محبت کسی شرط کے بغیر ہے۔ اگر کوئی ان کے سامنے مجھے برا بھلا کہے گا یا میرے بارے میں کسی غلط بات کا اظہار کرے گا تو یہ لوگ کسی طرح اسے برداشت نہیں کریں گے۔ تم لوگوں کو یہ جو اس وادی کے قدیم رہنے والے ہو‘ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ان نئے لوگوں کی تعداد تم سے زیادہ ہے۔ تم لوگ اس گھمنڈ میں بھی نہ رہنا کہ یہ لوگ نئے ہیں۔ کل سے ان کی رانٹیں اور بقیہ اسلحہ بھی انہیں دے دیا جائے گا۔ میں تمام جوانوں کو معاف کرتا ہوں جنہوں نے عارضی جذبات میں آکر مجھے برا کہا اور سپاہیوں کے غصے کا شکار ہوئے۔ میں نئے شامل ہونے والوں سے بھی کہتا ہوں کہ وہ غصہ تھوک کر ان لوگوں کو معاف کر دیں۔ آئندہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونا چاہئے! بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔“

اس کے بعد سارا میدان۔ ”سردار رنجیت جگہ کی جے“ سے گونج اٹھا۔ اب ان میں نئی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ٹھاکرے بھی معاملے کو رفع دفع کرنے پر مجھے شاباش دی۔

”تمہارا بیٹا سوہن کہاں ہے چرنجی؟ اسے میرے پاس لاؤ! وہ سنو‘ ذرا رام سروپ کو بھی میرے پاس بھیج دو۔“

اس پر چرنجی غم زدہ لہجے میں بولا۔ ”سردار! رام سروپ اپنے جوان بیٹے کی لاش اٹھا کر جھونپڑے میں لے گیا ہے۔ ہاں میں‘ سوہن کو دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا کچھ دیر بعد چرنجی نے آکر کہا۔ ”جھگوان جانے سوہن کدھر گیا۔.....؟ بڑے ٹھاکرے نے یہ بتایا ہے کہ عام معافی کے بعد وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ لگے ہاتھوں اس کانٹے کو بھی نکال دوں۔ سوہن کے ذہن کو قابو میں کر کے سریتا کی محبت کے نقوش مٹا دینا کون سا مشکل تھا! خیر پھر کبھی سہی! میں نے سوچا۔ اسی

سریتا کی شادی کی رسوم طے ہونا تھیں۔ ٹھاکرے نے مجھے دیکھ کر پہلے تو قیدی سپاہیوں کو آزاد کرنے پر خاموشی کی‘ مگر جب میں نے اسے سپاہیوں کی وفاداری کا یقین دلایا تو وہ چپ ہو گیا۔ ٹھاکرے نے مجھے تیار ہونے کے لئے وہاں سے بڑے جھونپڑے جانے کو کہا۔ اب اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

ابھی میں نہا دھو کر کپڑے ہی تبدیل کر پایا تھا کہ چرنجی گھبرایا ہوا جھونپڑے میں آیا اور بولا۔ ”سردار! غضب ہو گیا۔ وہ تو جھگوان نے کیا (میریانی) کر دی اور بڑے ٹھاکرے میں آگئے ورنہ سپاہیوں اور وادی والوں میں بڑی زبردست جھڑپ ہو جاتی ایک ہمارا آدمی اور دو سپاہی مارے گئے ہیں۔“

میں نے اس کی بات سن کر ذرا سختی سے کہا۔ ”ہمارا آدمی کیا مطلب؟ کیا اب وہ تمام سپاہی بھی تمہارے ساتھی نہیں ہیں؟“

چرنجی کچھ سٹپٹا گیا اور کہنے لگا۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا سردار! بہر حال اب سپاہی بڑے ٹھاکرے قبضے میں بھی نہیں آ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سردار کے ایک دشمن کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سخت برہم ہیں۔“

”تم پوری بات تو بتاؤ چرنجی‘ ہوا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

چرنجی نے بتایا۔ ”ہو یہ سردار کہ پہلے پہل تو وادی کے کچھ نوجوان ان میں سے بہت سے سپاہیوں کا مذاق اڑانے لگے‘ خاص طور پر اس سفید چمڑی والے کا مذاق جو نوٹی پھوٹی ہماری زبان بولتا ہے۔ اس کا نام.....“ چرنجی سونے لگا۔

”ڈیوڑا ہے اس کا نام۔ تم آگے کہو!“ میں بول اٹھا۔

”تو سردار! اپنا مذاق اڑائے جانے پر سپاہی چپ رہے‘ لیکن جب چند نوجوانوں نے آپ کے لئے کچھ گستاخانہ جملے ادا کئے تو وہ ہتھ سے اکھڑ گئے۔ پہلے تو ہاتھ پائی ہوئی‘ پھر ایک نوجوان نے اپنی بندوق لوڈ کر کے ایک سپاہی کو ٹھکانے لگا دیا۔ پھر کیا تھا‘ بہت سے سپاہی اس نوجوان پر پل پڑے اور مار مار کر اسے لب دم کر دیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو آپ کو اور سریتا رانی کو سب سے زیادہ برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا نام موتی تھا۔ یہ میرا بھتیجا اور رام سروپ کا بیٹا تھا۔“ چرنجی جھگڑے کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ ”تھوڑی دیر بعد موتی مر گیا۔ میرے بڑے بیٹے سوہن نے یہ دیکھ کر اپنی بندوق لوڈ کر لی اور مزید ایک سپاہی کو ٹھکانے لگا دیا۔ کئی سپاہیوں کو اس نے زخمی بھی کر دیا۔ سوہن بندوق نہ رکھتا مگر بڑے ٹھاکرے میں آگئے۔ سوہن ان کے احترام میں خاموش ہو گیا۔ اب سپاہی برابر بڑے ٹھاکرے سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ سوہن کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ دراصل میرا بیٹا سوہن‘ اپنے چچا زاد کی موت کو برداشت نہ کر سکا اور غصے میں آگیا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں چھپاؤں گا کہ میرا بیٹا بھی آپ کی برائی کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس پر میں نے اسے ڈانٹا بھی‘ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ آپ کو رقابت کی وجہ سے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ سریتا رانی کو چاہتا ہے۔ دبی دبی زبان میں وہ اپنی ماں سے بھی اس کا اظہار کر چکا تھا‘ لیکن میں نے ہمیشہ اسے ٹال دیا۔ یہ پورا معاملہ ہے سردار!“

وقت ٹھاکر نے مجھے سورج غروب ہونے کا احساس دلایا اور بڑے جھوپڑے میں جانے کو کہا۔ وہیں سے مجھے سرا بانہہ کر برات کے ساتھ بڑے میدان پہنچنا تھا۔ میں اپنے جھوپڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ چرنجی، رحمان وغیرہ بھی تھے۔ جیسے ہی ہم اس گلی میں پہنچے جہاں جھوپڑا تھا تو عورتوں کی چیخ و پکار سنی۔ چرنجی تیزی سے اپنا گھوڑا دوڑاتا روٹی ہوئی ایک عورت کے قریب پہنچا۔ یہ بڑی ٹھکرائن تھی۔ اس کے ساتھ دوسری عورتیں بھی مین کر رہی تھیں۔ معلوم نہیں ٹھکرائن نے چرنجی سے کیا کہا کہ وہ سامنے گلی میں گھوڑا دوڑاتا چلا گیا اور تھوڑا پر جا کر غائب ہو گیا۔ اسی عرصے میں ہم عورتوں تک پہنچ گئے۔ ٹھکرائن مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ میں چلا گیا۔ بڑے ٹھاکر کے استفسار پر جو کچھ معلوم ہوا اسے جان کر میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ چرنجی کا بیٹا سوہن زبردستی سریتا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ میں نے یہ سنتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس سمت دوڑنے لگا۔ جدھر چرنجی گیا تھا۔ یہ راستہ گلی ختم ہوتے ہی غار نما سرنگ کی طرف نکل جاتا تھا۔ میرے پیچھے گرنام سنگھ نے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد رحمان نے بھی اپنے گھوڑے کو دوڑایا۔

اب ہم تینوں آگے پیچھے اپنے گھوڑوں کو سریت دوڑاتے ہوئے غار نما سرنگ کی طرف جارہے تھے۔ ہم بہت جلد وہاں تک پہنچ گئے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ میری نظروں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک ہاتھ سے سوہن اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھی سریتا کو پکڑے ہوئے تھا جیسے عقاب اپنے شکار کو دبوچتا ہے۔ اس کے دانتوں میں گھوڑے کی باگ دبی ہوئی تھی، سیدھے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر چرنجی راستہ روکے کھڑا تھا۔

”مجھے جانے دے بابا!“ سوہن کہہ رہا تھا۔ ”میرا راستہ نہ کھونا کر، کیسے میرے ہاتھ تیرے خون سے نہ رنگ جائیں۔ ہٹ جا میرے سامنے سے!“ یہ کہتے ہی اس نے اپنا بندوق والا ہاتھ فضا میں لہرایا اسی کے ساتھ گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

چرنجی چیخا۔ ”سوہن! رک جا سوہن! ورنہ سوہن!“ اسی وقت فائر کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ چرنجی نے سوہن کو گولی مار دی تھی۔ سوہن تڑپ کر گھوڑے سے گرا۔ میں اپنا گھوڑا دوڑا کر چرنجی کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔ وہ خودکشی کرنے والا تھا۔

”مجھے مر جانے دو سردار!..... مر جانے دو! میرا..... میرا یہی ایک بیٹا جسے میں نے آج..... آج خود اپنے ہاتھ سے گولی مار دی۔ اب میں کس کے لئے جیوں؟“ چرنجی روتے ہوئے کہنے لگا۔

میں نے اسے دلا سا دیا۔ وہ سسکیاں بھرتا ہوا اٹھا اور سوہن کے قریب گیا۔ چرنجی نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہ مر چکا تھا۔

پنڈت نے اشلوک پڑھے۔ ”اوم..... اوم..... اوم اس سواہا!“

پھر سریتا کی ساڑھی کا دامن میرے کرتے سے بانہہ کر منڈپ کے پھیرے کرائے گئے۔ عندلب کے بعد کسی آدم زادی سے میری یہ دوسری شادی تھی۔ شادی کی رسوم پوری ہونے کے بعد مجھے سب سے پہلے مبارک باد دینے والوں میں چرنجی، گرنام سنگھ اور رام سروپ ہی تھے۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں نے ان تینوں کو باری باری گلے سے لگایا۔ اس سے پہلے کہ میں شادی کی خوشی میں ان دکھ کو بھول جاتا اور کھانا کھاتا، چرنجی اور رام سروپ کے ساتھ ان کے گھر تعزیت کرنے گیا جہاں ان دونوں کے جوان بیٹوں کی اڑتھیاں رکھی تھیں۔ ان دونوں کے کرایا کریم (آخری رسوم) کے بعد ہی میں نے اپنے جھوپڑے میں قدم رکھا۔ بڑے میدان میں رات بھر شادی کا جشن منایا جاتا رہا۔ کھانا کھلایا گیا، رقص ہوا، مگر میں اور سریتا سب کو چھوڑ کر اپنے جھوپڑے میں آ گئے۔

☆=====☆=====☆

صبح جب میں نہادھو کر فارغ ہوا تو گرنام سنگھ آ گیا۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ بولا۔ ”سردار! آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے تمام لوگوں کو جھوپڑوں کی تعمیر پر لگا دیا ہے۔ اس کے بعد غار نما سرنگ کی مرمت کا کام شروع کر دیا جائے گا، لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آدمی کم تھے تو ہمارا خرچ بھی کم تھا۔ اب ایک دم اتنے آدمی بڑھنے سے اخراجات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔“

”تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں کیا کوں سردار! آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“

”پھر بھی!“

”میری ناچیز رائے یہ ہے کہ نواب داؤد خاں کے گاؤں پر پھر حملہ کیا جائے۔ پچھلی مرتبہ ہمارا ڈاکہ پولیس کی بروقت آمد سے ناکام ہو گیا۔ مخبری کی وجہ سے ہمیں راستے ہی میں پولیس سے ٹھٹھا پڑ گیا اور ہم وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ کیا خیال ہے، اگر پھر ایک مرتبہ وہیں ڈاکہ ڈالا جائے؟“ گرنام سنگھ نے تجویز پیش

”بہت نیک خیال ہے بیٹے!“ بڑے ٹھاکر نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ”اس ظالم کے پاس بڑی دولت ہے۔ سنا ہے اس نے اپنے کسانوں کا خون چوس چوس کر تجوریاں بھری ہیں اور اپنے پڑکھوں سے بھی اسے خاصی دولت ملی ہے۔ اس کے پڑکھے بھی غریبوں کا خون چوسنے میں اسی کی طرح ماہر تھے۔“ یہ بات آخر طے ہو گئی کہ ڈاکہ مراول ہی پر پڑے گا۔ اس گاؤں کے نواب کا نام داؤد خاں تھا۔ ”میرے خیال میں اس ڈاکے کے لئے کوئی منصوبہ ہمیں ضرور بنالینا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ اس پر گرام سنگھ بول اٹھا۔ ”سردار! اگر کوئی منصوبہ بنانے کا خیال ہے تو رام سروپ، چرنی اور دوسرے اہم لوگوں کو بھی کیوں نہ بلا کر رائے مشورہ کیا جائے!“

”ٹھیک ہے، مگر زیادہ بھیڑ کی ضرورت نہیں۔“ میں بولا۔ ”تم صرف چرنی، رام سروپ اور ڈیسوزا کو بلاؤ۔“

تھوڑی دیر میں سب لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے اپنی تجویز ان سب کے سامنے رکھی جسے سبھی نے پسند کیا۔ یہ تجویز تھی بھی بہت بے ضرر۔ تجویز یہ تھی کہ نواب داؤد خاں کو پہلے ایک خط لکھا جائے۔ خط کا مضمون کچھ ایسا ہو کہ پچھلی مرتبہ ہم سے بچ گئے، مگر اس مرتبہ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ ہم تمہاری جان کے نہیں، دولت کے دشمن ہیں، وہ دولت جو تم نے غریبوں کے پیٹ کاٹ کر حاصل کی ہے۔ اگر تم نے پولیس کو اس کی اطلاع دی تو تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ڈاکہ کامیاب ہو نہ ہو، ہم تمہیں ضرور ٹھکانے لگا دیں گے۔ تمہارے حق میں اس لئے یہی بہتر ہے کہ اپنی جان نہ گنواؤ!“

میری اس تجویز کے بعد رام سروپ نے کہا۔ ”داؤد خاں تک یہ خط ٹھکر لال پہنچائے گا۔ وجہ یہ کہ وہ بہت دور سے خنجر پھینکنے میں ماہر ہے۔ ایسا اس لئے ضروری ہے کہ نواب پہلے ہی سے خوفزدہ ہو جائے۔ خط کو خنجر میں پرو کر اس کی حویلی میں پھینکا جائے۔“

سب نے رام سروپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

اسی کے فوراً بعد میں بول اٹھا۔ ”ہاں تو جب شکر خط پھینک کر تقریباً ایک میل واپس آچکا ہو، وہاں پولیس پہنچ جائے۔“

”کیا مطلب؟“ کئی حیرت زدہ آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

میں نے وضاحت کی۔ ”مطلب یہ کہ مراول گاؤں سے ایک میل ادھر پہلے ہی سے ہمارے آدمی پولیس کی وردیوں میں لمبوس موجود ہوں۔ ان کی سربراہی رحمان کرے گا اور.....“

”رنجیت!“ بڑے ٹھاکر نے میری بات کاٹ دی اور دریافت کیا۔ ”تو کیا اس ڈاکے پر نہیں جائے گا؟“

”میں بھی ضرور جاؤں گا۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”اصل سربراہی میں ہی کروں گا، مگر دکھاوے کے لئے رحمان ہمارا بڑا افسر ہو گا اس لئے کہ.....“

”بقیہ بات میں نے جھک کر بڑے ٹھاکر سے سرگوشی میں کی۔ گرام سنگھ اور چرنی میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی میری سرگوشی سن لی اور سر

ہلانے لگے۔ میں نے سرگوشی میں بڑے ٹھاکر کو بتایا تھا۔

”بابا! یہ اس لئے کہ رحمان پولیس کا آئی جی رہ چکا ہے۔ تمام بڑے بڑے نواب، جاگیردار اور راجا اسے پہچانتے ہیں۔“

”کیا؟“ ٹھاکر چونک اٹھا۔ ”رحمان آئی جی پولیس؟“

”ہاں۔“ میں نے دھیمی آواز میں تصدیق کی۔ سبب یہ کہ وہیں رحمان اور ڈیسوزا بھی موجود تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے سامنے ان کی پچھلی زندگی کا کوئی واقعہ دہراؤں اور یوں وہ کسی الجھن کا شکار ہو جائیں۔

”ہوں تو پھر تم کیا کہہ رہے تھے؟“ بڑے ٹھاکر نے بات آگے بڑھائی۔

”ہاں تو میں اور میرے تقریباً دو سو آدمی پولیس کی وردیوں میں لمبوس مراول سے ایک میل ادھر ٹھہرے رہیں گے۔ جب شکر خنجر پھینک کر ہم تک واپس آجائے گا تو ہم مراول کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ شکر یہاں سے پولیس ہی کی وردی میں روانہ ہو گا تاکہ ہمارے ساتھ پھر مراول چل سکے۔ ہم لوگ نواب داؤد خاں کی حویلی میں داخل ہوں گے مگر پولیس کی حیثیت سے۔ ہم اس سے یہ کہیں گے کہ ہماری اطلاع کے مطابق آج رات یہاں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ ڈاکہ ڈالنے والا ہے اور اس نے تمہیں کوئی خط بھی بھیجا ہے۔ ہم سے کچھ مت چھپاؤ، سب کچھ بتا دو۔ پولیس تمہاری مدد کرے گی، لیکن ہو سکتا ہے مقابلہ سخت ہو۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ تم اپنی ساری دولت، زیورات وغیرہ ہمیں دے دو تاکہ ہم اسے لے کر پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں اور تمام روپیہ مع زیورات کے سرکاری خزانے میں جمع کرا دیں۔ بعد میں یہ رقم اور زیورات تمہیں واپس مل جائیں گے۔ یہ تمام باتیں اس سے رحمان کے گا اور اپنے آپ کو آئی جی پولیس بتائے گا۔ رحمان ہی اس سے کہے گا کہ اس وقت ہم یہ رقم اور زیورات لے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم آکر پورے گاؤں کو خفیہ طور پر گھیر لیں گے تاکہ جب ڈاکو گاؤں میں داخل ہوں تو انہیں زندہ گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد ہم سب چپ چاپ چپ اور ٹرکوں میں بیٹھ کر بغیر کسی خطرے کے یہیں واپس آجائیں گے۔ اس طرح ہمیں ایک گولی تک نہیں چلانا پڑے گی۔“

میں نے پورا منصوبہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

کسی نے بھی اس سے اختلاف نہ کیا۔ سبب یہ بھی تھا کہ ہر طرح سے یہ منصوبہ بے داغ تھا۔ اس طرح نواب کو مار پیٹ کر تجوریوں کا پتا اور چاہیاں حاصل نہ کرنا پڑتیں۔ اس مصیبت سے نجات مل جاتی کیونکہ کچھ لوگ بہت ضدی ہوتے ہیں، جان دے دیتے ہیں زبان نہیں کھولتے۔ نواب بھی ایسے لوگوں میں ہو سکتا تھا۔ دوم یہ کہ اس منصوبے پر عمل کرنے کی صورت میں بظاہر لڑائی بھڑائی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ منصوبے کی ناکامی کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اگر اس منصوبے پر عمل نہ کیا جاتا تو یہ ممکن تھا، نواب جان دے دیتا اور تجوریوں کا پتا نہ بتاتا جنہیں ڈھونڈنا مشکل ہوتا۔ پھر یہ کہ گاؤں والوں سے مقابلے کا بھی امکان تھا۔ میرے منصوبے میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

تمام لوگوں نے مل کر طے یہ کیا کہ یہ کام آج ہی ہونا چاہئے۔ آج شام چار بجے کے قریب رواجی

موجھیں جاگیردار صد یار خاں اور اس کے بھائی کی بھی تھیں۔ صد یار خاں کے جسم میں بھی میں نے کچھ دقت گزارا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں 'عندلب سے جان چھڑانے کی خاطر فرار ہوا تھا۔ ان واقعات کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ بہر حال نواب داؤد خاں کی موجھیں دیکھ کر مجھے صد یار خاں یاد آگیا۔ نواب داؤد خاں ہم سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آ رہا تھا، لیکن اس کے چہرے سے فکر مندی کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ اس فکر مندی کا سبب ظاہر ہے میرے علم میں تھا۔ خط یقیناً اس تک پہنچ چکا تھا، بدنام زمانہ اور سفاک ڈاکو رنجیت سنگھ کا خط! رنجیت سنگھ کا نام سن کر اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے آجاتے تھے، وہ نواب کس گنتی میں شمار تھا! پھر بھی اس نے خط کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہم اس سے ادھر ادھر کی گپ بازی کرتے رہے۔ وہ اپنے شکار کے قصے سنانے لگا تھا۔

آخر کار میرا اشارہ پاکر رحمان نے لب کشائی کی۔ ”نواب صاحب! دراصل ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں، ہمیں باخبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ آج یہاں مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ ڈاکہ ڈالنے والا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس نے آپ کو خط بھی پہنچا دیا ہو گا یا اس کا خط پہنچنے والا ہو گا۔ یہ بتائیے کہ کیا آپ کو اس کا کوئی خط ملا؟“

رحمان کی بات سن کر نواب کچھ ہچکچایا اور بولا۔ ”نہیں آئی جی صاحب، آپ کو شاید غلط اطلاع.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نواب صاحب! ہمیں غلط اطلاع نہیں ملی۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، پولیس آپ کے ساتھ ہے۔ پہلے بھی ایک موقع پر پولیس آپ کو اس ڈاکو سے بچا چکی ہے۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیجئے، اسی میں آپ کی بہتری ہے۔ قانون کے ہاتھ مضبوط کرنا ویسے بھی ہر شہری کا فرض ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ رنجیت سنگھ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ ہمارے جوان میمن ساری رات آپ کی حفاظت پر رہیں گے۔“

میری بات سن کر نواب چلا کی سے بولا۔ ”یہ بہت اچھا ہے کہ رات پھر آپ کے جوان یہاں رہیں۔ اب تک مجھے اس حرام خور کا کوئی خط نہیں ملا، پھر بھی کیا خبر خط آتی جائے یا وہ بغیر خط لکھے خود ادھر کارخ کر لے! ایسی صورت میں پولیس کے مسلح جوانوں کا یہاں رہنا بہت اچھا ہے۔“

نواب کی عیاری کا جواب اس مرتبہ ڈیوڑا نے دیا اس لئے کہ ڈیوڑا کی سرشت ہی میں عیاری تھی۔ اس نے کہا۔ ”ویل نواب! ام چلتا ہے اور پولیس کے جوانوں کو بھی اور سے لے جاتا ہے۔ ام بی کار نہیں جو آپ کا پیرا دے گا۔ جب ٹم کو کھت ملا نہیں تو کائے کو ڈرتا ہے!“ یہ کہہ کر ڈیوڑا اٹھنے لگا۔

”سنئے تو ڈی آئی جی صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے! میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ.....“

ڈیوڑا اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ کر بات کانتے ہوئے بولا۔ ”ویل! پھر ٹم جی بولو۔“

”میں تو جی بولنے کو بول دوں گا مگر.....“

اس مرتبہ رحمان بول اٹھا۔ ”ہمیں معلوم ہے، اس ڈاکو کے بچے نے لکھا ہو گا کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو تمہیں جان سے مار دے گا، لیکن تم اس کی دھمکی میں مت آؤ! وہ خط فوراً ہمیں لا کر دکھاؤ جو

سے اتفاق کیا گیا تاکہ دن ڈھلے تک مرادل پہنچا جاسکے۔ فکر کے لئے بھی یہی فیصلہ ہوا کہ وہ ہمارے ہی ساتھ ساتھ یہاں سے چلے گا۔ اس کو پہلے سے روانہ کرنا بے سود ہی تھا۔

شام ہوتے ہوئے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ہمیں یہاں سے جیپ اور ٹرکوں پر جانا تھا۔ سدھا ہوا ایک گھوڑا بھی ایک ٹرک میں سوار کر لیا گیا تاکہ مرادل سے ایک میل ادھر شکر اس پر چڑھ کر مرادل جا سکے اور خنجر کے ساتھ خط پھینک کر واپس آ سکے۔

آدھے آدمی میں نے بالکل سننے لئے، یعنی پولیس والے اور آدھے وادی کے قدم رہنے والوں میں سے منتخب کئے، جیپ ڈیوڑا چلا رہا تھا۔ اس کے برابر گرام سنگھ بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹوں پر ہم بقیہ افراد تھے۔ رحمان اور ہم سب پولیس کی وردیوں میں تھے۔ آگے آگے جیپ تھی۔ جس کے پیچھے چار ٹرکوں پر بقیہ سارے لوگ تھے جو سب کے سب پولیس میں ملبوس تھے۔ ان ٹرکوں کو بھی پولیس کے تجربے کار ڈرائیور چلا رہے تھے۔ یہ پہلے ہی معلوم کر لیا گیا کہ ان میں ڈرائیونگ کسے آتی ہے!

وادی کے سوا افراد کے کپڑے پولیس والوں کی وردیوں سے تبدیل کر دیے گئے تھے۔ یہ سب بمادر جوان تھے۔ ہم سب کے پاس رائفلیں اور ریوالور تھے جو پولیس ہی سے ہمیں ملے تھے۔ راستہ کیونکہ اونچا نیچا اور دشوار تھا اس لئے ہمیں مرادل سے ایک میل ادھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ اب سورج غروب ہو رہا تھا۔

چار ٹرکوں اور جیپ کو روک دیا گیا۔ ایک ٹرک سے گھوڑے کو اتارا گیا جس پر سوار ہو کر شکر، مرادل کے لئے روانہ ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس بھی آگیا۔ اپنا کام اس نے بہ حسن و خوبی انجام دیا تھا۔ دن اب پوری طرح ڈھل چکا تھا۔

ہم لوگوں کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔

کسی مزاحمت کے بغیر ہم گاؤں میں گھس گئے۔ گاؤں والے اتنے سارے پولیس والوں کو دیکھ کر سسم گئے۔ ان کے چہروں سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ ہم نواب کی حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نواب کو بھی شاید کسی نے دوڑ کر خبر دے دی۔ حویلی کے دروازے پر وہ ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھا۔ جیسے ہی ہماری جیپ حویلی کے دروازے پر رکی وہ دوڑ کر آیا اور بولا۔ ”آئی جی صاحب! ارے ڈیوڑا صاحب بھی موجود ہیں۔ آداب.....! آداب! میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ حضرات خود غریب خانے پر تشریف لائے۔ آئیے آئیے، دیوان خانے میں آجائیے۔“ نواب نے رحمان اور ڈیوڑا کو پہچان لیا تھا

ہم سب لوگ اتر کر حویلی میں داخل ہوئے۔ حویلی پکی بنی ہوئی تھی۔ ہم صرف چھ اشخاص اس کے ساتھ اندر گئے، باقی لوگ ٹرکوں ہی میں بیٹھے رہے۔ نواب نے اندر لے جا کر ہمیں قالینوں پر بٹھایا۔ اب میں نے نواب کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً بیستائیس برس کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں مجھے سب سے عجیب موجھیں اور آنکھیں لگیں۔ اندر دھنسی ہوئی لال لال چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور یہ بڑی بڑی موجھیں جو کئی بل کھا کر اس کے آدھے رخساروں کو گھیرے ہوئے تھیں۔ تقریباً اسی طرح کی

اس نے تمہیں لکھا ہے۔ ہم ہر طرح تمہاری جان اور مال کی حفاظت کریں گے۔ یہ ہمارا فرض ہے۔“
نواب داؤد خاں کو آخر ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اس نے ہمارا بھیجا ہوا خط اور خنجر لا کر ہمیں دکھایا۔
ہم نے اسے تسلی دی۔ پھر رحمان نے اپنی تجویز بیان کر دی، یعنی نواب اپنی تمام دولت اور زیورات پولیس کے حوالے کر دے تاکہ انھیں حفاظت کے ساتھ سرکاری خزانے میں رکھا جاسکے۔ اس تجویز پر نواب نے پھر چکر دینے کی کوشش کی، مگر ہم تو طے ہی کر کے گئے تھے کہ اسے راہ فرار اختیار نہیں کرنے دیں گے۔ آخر کار وہ ہمیں ساتھ لے کر اندر حویلی میں گیا۔ ہم نے اپنے کچھ آدمی باہر سے اور بلوالے تاکہ سامان بہ حفاظت باہر ٹرکوں میں رکھا جاسکے۔

نواب داؤد خاں کی تجوریاں کیا تھیں، عمرو عیار کی زنجیلیں تھیں۔ کوئی چھ تجوریاں تھیں جو نوٹوں، بیروں اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ انھیں بمشکل تمام ہمارے آدمیوں نے خالی کیا۔ جب تمام تجوریاں خالی ہو گئیں تو نواب ہم سے بولا۔ ”مجھے بھی آپ لوگ اپنے ساتھ لیتے چلیں۔“
”ہمیں ابھی شہر پہنچنا ہے اور راستہ خطرناک ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ نواب صاحب قبلہ کی جان خطرے میں پڑے۔“ میں نے کہا۔ ”جب ڈاکو رنجیت سنگھ نے آپ کو خط لکھنے کی ہمت کر لی تو پولیس سے بھی خزانہ لوٹنے کی جرات کر سکتا ہے اس لئے خزانے کے ساتھ تمام سپاہیوں کا واپس جانا ضروری ہے۔ ہم یہاں بھی فی الحال سپاہیوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔“

میں نے پہلے ہی سے پیش بندی کر دی کہ کہیں نواب وہاں کچھ سپاہیوں کو چھوڑنے کے لئے نہ کہ دے۔ اسے مطمئن کرنے کی غرض سے میں نے یہ ضرور کہہ دیا۔ ”خزانہ پہنچانے کے بعد ہم سب فوراً ہی واپس آجائیں گے کیونکہ ہمیں رنجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو بھی تو گرفتار کرنا ہے۔“
میرے سمجھانے بھجانے اور دلاسنے دینے سے نواب داؤد خاں کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے گلے مل کر ہمیں رخصت کیا۔

ہم سب جیب اور ٹرکوں میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاؤں والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ ہم پولیس والے نہیں ڈاکو ہیں۔ ہم انھی کے سامنے سے گزر گئے۔
جب ہم گول وادی تک پہنچے تو خاصی رات ہو چکی تھی۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ ہماری جیب اور ٹرک جس میں نوٹ، اور جواہرات تھے، بڑے جھوپڑے کے سامنے آکے رک گئے۔ نوٹوں کو نواب داؤد خاں نے جلدی جلدی میں بڑے بڑے چھ بوروں میں بھروا دیا تھا۔ ان بوروں کو ٹرک سے اتار لیا گیا۔ اس کے بعد میرے جواہرات اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تینوں صندوق اٹارے گئے۔ اتنا بڑا ڈاکو بڑے ٹھاکر نے شاید اپنی زندگی میں نہیں ڈالا تھا۔ نوٹ اور سونا وغیرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور پھر بہت دیر تک میری تجویز کی واد دیتا رہا۔ اس ڈاکے میں نہ تو کسی کی جان گئی تھی، نہ ایک بھی گولی چلی تھی۔

دوسری صبح یہ تمام دولت، زیورات اور سونا خود بڑے ٹھاکر نے تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ تمام مسلمان تقریباً ایک ہزار آدمیوں میں بٹنے کے باوجود ہر آدمی کے حصے میں اتنا آیا تھا کہ زندگی بھر اتنی دولت

پانچور نہیں کیا ہوگا۔ تمام دولت میں سے ایک حصہ وادی کے لوگوں کے مجموعی فلاح و بہبود کے لئے اور دیگر اخراجات کی خاطر الگ رکھ دیا گیا اور اسی خوشی میں رات کو جشن کا اہتمام کیا گیا۔
جشن کیا تھا، اچھا خاصا طوفان بد تمیزی تھا۔ خوب ڈھیروں ڈھیر شراب پی کر لوگ ناچ رہے تھے اور ہامیدان مشعلوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سینکڑوں خوش فکرے ایک جگہ اکٹھا کر دیے گئے ہوں۔ گزشتہ رات کی طرح میں آج بھی اس گمراہی سے جلد آگیا گیا اور سریتا کو ساتھ لے کر اپنے جھوپڑے میں آگیا۔ کل نہ سونے کی کسر بھی ہم دونوں نے آج پوری کی۔

☆=====☆=====☆

صبح و شام اسی طرح گزرتے رہے۔ میں اب اس ماحول کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے میری جناتی صفات ملنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ سو میں نے بھی فی الحال ممبر کر لیا۔ وادی کے قدیم باشندے بھی اب سپاہیوں سے مکمل مل گئے تھے۔ ان میں بہت سوں نے پڑھنا لکھنا اور ٹرک چلانا سیکھ لیا تھا۔ نئے جھوپڑے تعمیر ہو چکے تھے اور غار نما سرنگ بھی بن چکی تھی۔ اب اسے پہلے سے زیادہ محفوظ اور کشادہ بنا دیا گیا تھا۔

اس عرصے میں ہمیں باہر کی خبریں بھی ملنے لگی تھیں۔ ہمارے پاس اخبار بھی آنے لگے تھے۔ ان اخبارات میں ڈاکو رنجیت سنگھ کے متعلق عجیب عجیب خبریں کبھی کبھی شائع ہوتیں۔ حکومت آئی جی رحمان، ڈی آئی جی ڈیوڑا اور ان کے ساتھ سپاہیوں کی بھی تلاش میں تھی۔ اعلیٰ حکام نے نواب داؤد خاں کے اس بیان پر یقین نہیں کیا تھا کہ خود آئی جی رحمان اس کی تمام دولت اور جواہرات اڑا لے گیا۔ نواب کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ گاؤں والوں نے صرف اتنی گواہی دی تھی کہ پولیس کو انھوں نے گاؤں میں آتے اور واپس جاتے دیکھا تھا۔ آئی جی رحمان وغیرہ کی گمشدگی کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان کی تصویریں بھی کئی بار اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر خود آئی جی رحمان اور ڈیوڑا حیرت میں رہ گئے تھے کہ لو، انھوں نے ہمیں سچ سچ آئی جی اور ڈی آئی جی بنا دیا۔ وہ اس پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ میں بھی بے دلی سے ان کا ساتھ دیتا رہا۔ میں تو واقف تھا کہ وہ واقعی پولیس افسران ہیں۔

دو تین کامیاب ڈاکے ہم نے اور ڈالے۔ ان میں بھی ہم نے ایسی ذہانت کا ثبوت دیا کہ پولیس کو ہماری گردبھی نہ ملی۔ اس پر ہمارے حوصلے بھی اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔ اب ہم باقاعدہ چیلنج دے کر ڈاکے مارتے تھے۔ جہاں بھی ہمارا خنجر اور خط پہنچ جاتا، وہاں سے ہم ناکام واپس نہ آتے۔ ان میں سے کسی جاگیردار یا زمیندار کی یہ جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ پولیس کو ہماری متوقع آمد سے مطلع کر دے۔ اب میرے ساتھ کبھی کبھار تقریباً سریتا بھی ڈاکوؤں میں شامل ہو جاتی تھی۔

ہمارے ٹھکانے سے کوئی ستر میل دور ایک رجاوا تھا۔ اس پر گرنام سنگھ کی نظر تھی۔ اس کے راجہ کانام شمشیر سنگھ تھا۔ وہ بہت ظالم اور جابر مشہور تھا۔ آج تک اس پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ ہماری شہرت یقیناً شمشیر سنگھ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ہم نے حسب معمول اسے دھمکی بھرا خط روانہ کر دیا، لیکن

میں نے کھوئی کھوئی سی آواز میں جواب دیا۔ ”سریتا اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ چلی گئی رمان! مجھے ایسا چھوڑ کر چلی گئی!“ یہ کہتے ہوئے میرا دل ایک دم بھر آیا۔ سریتا وہ پہلی آدم زادی تھی کہ جس کے لئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سریتا کی لاش میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت قطعی فکر نہیں تھی کہ راجہ شمشیر سنگھ کی دولت ہمیں ملے گی یا نہیں۔ اور یہ کہ گرام سنگھ کی بچہ۔ راجہ بھکاری شانتی زندہ بچی ہو گی کہ نہیں!

انہوں نے مجھے سریتا کی لاش کے ساتھ جپ تک پہنچا دیا۔ راجہ شمشیر سنگھ مارا جا چکا تھا۔ اس کی قلعہ نما حویلی فتح ہو چکی تھی۔ راجہ کو اس کی بڑی پگڑی اور اگلیوں میں موجود قیمتی انگوٹھیوں سے پہنچا گیا۔ راجہ بھکاری شانتی بے ہوش حالت میں مل گئی۔ اسے بھی ایک ٹرک پر سوار کر دیا گیا۔

مجھے اس وقت اپنے آدمیوں کی نقل و حرکت بہت گراں گزر رہی تھی جو قلعہ نما حویلی سے سلمان نکل نکال کر ٹرکوں پر لاد رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ڈاکہ پچھلے تمام ڈاکوں سے زیادہ منفعت بخش تھا۔ کوئی دس گیارہ تجوریوں جوں کی توں مختلف ٹرکوں میں رکھی گئیں، اسی کے ساتھ درجنوں بکے اور دوسرا سلمان بھی تھا جس میں بندوقین اور اسلحہ بھی تھا۔ مجھے اس سب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیسے نیسے یہ کلاردانی ختم ہوئی۔ سنتا پور پر موت کا سناٹا طاری تھا جب ہم نے اسے خیرباد کہا۔

یہ پورا قافلہ گول دادی کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ساتھ جپ میں گرام سنگھ، رحمان، ڈیسوزا، چرنی اور رام سروپ تھے۔ گرام سنگھ جپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جپ کے پیچھے دس ٹرک تھے۔ اس معرکے میں ہمارے بھی پچاس سے زیادہ آدمی مارے گئے تھے۔ ان کی لاشیں بھی ہمارے ہی ساتھ گول دادی جا رہی تھیں۔ پولیس کے کتنے جوان مارے گئے، اس کا اندازہ ہمیں نہیں تھا۔ ہمیں تو بس اتنا معلوم تھا کہ جب ہم نے سنتا پور چھوڑا تھا تو اس کے ہر گلی کوچے میں لاشیں ہی لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ پولیس کو ہمارے مقابلے میں زبردست جانی نقصان ہوا تھا۔ ایسا شاید اس وجہ سے ہوا کہ پولیس نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہو گا۔ پولیس والے ہم سے زیادہ ہی تعداد میں تھے، مگر دستی بموں کے سامنے وہ ٹک نہیں سکے تھے۔ میرے آدمی رواجی سے قبل مرہ سپاہیوں کا اسلحہ اکٹھا کر کے ساتھ لانا نہیں بھولے تھے۔

ہمارا قافلہ تیزی کے ساتھ اونچے نیچے ناہموار راستوں پر آگے بڑھتا رہا اور میں اپنے خیالوں میں ایسا کھویا رہا کہ راستے بھر کسی سے کوئی بات نہ کی۔ میں بار بار سریتا کے مرہ جسم کو دیکھتا اور میری آنکھیں بجک جاتیں۔ عندلب جو میری پہلی آدم زاد بیوی تھی اس کی طرح میں، سریتا کے قرب سے اکتایا نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ جسمانی اور روحانی تعلق کا فرق ہو۔ عندلب سے میرا صرف جسمانی رشتہ استوار ہوا تھا مگر سریتا کو میں نے اپنے جسم و جاں کی تمام تر صداقتوں کے ساتھ چاہا تھا۔

میرا دل اس خون آشام اور وحشت و بربریت سے بھری ہوئی زندگی سے یکسر اچھاٹ ہو گیا۔ میرے لئے ساری دنیا اندھیر ہو گئی۔ سریتا کے بعد اب موجودہ جسم میں میرے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ شاید وہ سریتا کا شق ہی تھا جس نے مجھے رنجیت سنگھ کے جسم کو قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا ورنہ تو میں یہاں چند روز

اس مرتبہ ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ ہم جیسے ہی سنتا پور کی حدود میں داخل ہوئے ہم پر جنم کے دہانے کھول دیے گئے۔ ہم اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ میں گھبرا گیا کہ اس ڈاکے میں سریتا بھی میرے ساتھ تھی۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں تھی، ہاں سریتا کی طرف سے ضرور فکر مند ہو گیا۔

گرام سنگھ اس روز کچھ زیادہ ہی جوش میں تھا۔ مقابلہ سخت تھا۔ ہمیں پیش قدمی میں غامی دشواری ہو رہی تھی۔

راجہ نے یقیناً پولیس کو ہمارا خط پہنچا دیا تھا۔ ہم ابھی اس کی قلعہ نما حویلی سے خالص دور تھے۔ پورا قصبہ فائرنگ سے گونج رہا تھا۔ پولیس بھی غالباً خاصی تعداد میں تھی۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ میرے ساتھ ہپا ہونے لگے ہیں۔ یہ صورت حال میرے لئے تشویش ناک تھی۔ قریب ہی ایک ٹرسٹ ہوئے مکان کی آڑ لئے ہوئے ڈیسوزا فائرنگ کر رہا تھا۔ اس نے میری پریشانی کو بھانپ کر کہا۔ ”ڈیل سردار، کاہے کو گھبراتا ہے! ابھی ہمارے پاس بوہت ایمونیشن ہے۔ ام ابی آرڈر کرتا گرینڈ پھینکو گرینڈ!“ ڈیسوزا کی اس رائے سے میں نے اتفاق کیا۔ ہم پوری تیاری سے چلے تھے اور ہمارے پاس خالص تعداد میں دستی بم موجود تھے۔

پھر دستی بم پھینکے جانے لگے۔ پولیس والوں کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ ان کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ہمارے پاس دستی بم ہوں گے۔ دھماکے پر دھماکے ہونے لگے۔ قصبے کے چھوٹے چھوٹے کچے کچے مکان گرنے لگے جن میں سپاہی چھپے ہوئے تھے اور ان کی تعداد کافی تھی۔ پولیس اب بری طرح ہپا ہو رہی تھی۔ اب ہمارا پلہ بھاری ہو گیا۔

آخر کار ہم راجہ کی قلعہ نما حویلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔

قصبے والے شاید خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ پولیس کے جو بچے کچھ جوان رہ گئے تھے وہ بھی جان بچانے کی فکر میں تھے۔

اچانک میری نظر سامنے راجہ کی حویلی پر پڑی۔ ایک جھروکے میں مجھے راجہ کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اس کی بندوق کی ٹال جھروکے میں نظر آئی اور ایک فائر ہوا۔ میرے برابر ہی ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ سریتا کی تھی۔ گولی عین اس کی کٹہٹی پر لگی تھی۔ وہ زمین پر گری اور گرے ہی دم توڑ دیا۔ میں یہ دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ اتنی دیر میں گولیوں کی ایک پوری باڑھ جھروکے پر پڑی۔ اسی کے ساتھ ایک دستی بم بھی پھینکا گیا۔

بڑے زور کا دھماکا ہوا اور اس قلعہ نما حویلی کا اگلا حصہ نیچے آ رہا۔ میں اس سے بے خبر سریتا کے مرہ جسم کو اپنی آنکھوں میں سیٹھ بیٹھا تھا۔ میرے اندر اس سے کہیں زیادہ زوردار دھما ہو رہے تھے۔ فائرنگ اب قطعی بند ہو چکی تھی۔

اچانک کسی نے میرا کاندھا پکڑ کر ہلایا۔ ”سردار! کیا ہوا آپ کو؟ ارے سریتا رانی..... انہیں کب ہو گیا؟“ یہ رحمان تھا۔

سے زیادہ رہنا پسند نہ کرتا، نہ ہی اپنے گروہ کو اتنا مضبوط اور منظم کرتا۔ ہمارا گروہ حد درجہ منظم اور مضبوط تھا۔ اسے اس منزل تک پہنچانے میں رحمان اور ڈیسوزا کو بہت دخل تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر گروہ میں ایک تنظیم اور فوجی اسپرٹ سی پیدا کر دی تھی۔ وادی میں روز نشائے بازن کا قاعدہ مشقیں ہوتیں۔ طرح طرح کی جسمانی اور ذہنی طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا۔ وقت پر اٹھنا اور وقت سونا، یونٹوں کے کمانڈروں کا حکم ماننا، سب کچھ قطعی فوجی انداز میں ہوتا۔ رحمان اور ڈیسوزا نے وادی کو قدیم باشندوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ گول وادی کو انہوں نے کسی کی پناہ گاہ سے ایک نئی کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا۔

قافلہ گول وادی میں داخل ہوا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح تمام مراحل طے ہوئے۔ نہ جانے کب سریتا کی ارٹھی مرگٹ پہنچی اور نہ جانے کب اس پھول بدن کو شعلوں کی زبانیں چاٹ گئیں۔ مجھے سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ میں نہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا اور میری یہ کیفیت سب پر ظاہر تھی۔ اس بات سے واقف تھے کہ مجھے سریتا سے کتنی محبت تھی۔ پھر خواب ہی کے سے عالم میں مرگٹ میری واپسی ہوئی۔

جب میں لوٹ کر جھونپڑے میں پہنچا تو بڑے ٹھاکر نے مجھے سینے سے لگا کر رونا شروع کیا۔ ٹھاکر کی بھی آپس اور سسکیاں میری سماعت سے ٹکرائیں تو جیسے کوئی بند نوٹ گیا۔ میں 'بڑے ٹھاکر کے بیٹے سے لگا زار و قطار رو رہا تھا' بالکل کسی بچے کی طرح جس کا کھلونا نوٹ گیا ہو! میری یہ حالت دیکھ کر گڑے سنگھ جیسے پتھر دل شخص کی بھی سسکیاں نکل گئیں جس نے اپنی جوان بہن لاجو کی موت پر بھی سوائے چہ آنسو بہانے کے ضبط سے کام لیا تھا۔ اس وقت جھونپڑے میں وادی کے سبھی اہم افراد موجود تھے اور سبھی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنے سردار کے دکھ کا پورا اندازا تھا۔ کسی طرح وہ بھیانک اور کالی رات کٹ گئی جس نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرا سب کچھ سریتا ہی تو تھی!

☆=====☆=====☆
دوسری صبح ایک نیا ہی انقلاب لے کر آئی۔ میں اپنے اندر قطعی بدل چکا تھا۔ میں نے اپنے تمام جاں نثاروں کو جمع کر لیا اور ان سے کہا۔ "تم اپنے لئے دوسرا سردار خود منتخب کر لو۔ اب میں اس کے لئے قطعی موزوں نہیں ہوں۔"

وہ سب میری بات سن کر دنگ رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ ناممکن ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ "اگر یہ ناممکن ہے کہ تم میری جگہ کسی دوسرے کو سردار قبول کر لو تو ایک دوسرا راستہ ہے۔" میں بولا۔

"کیا؟" بہ یک وقت کئی آوازیں ابھریں۔
"دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم اس زندگی کو ترک کر دو۔" میں نے جواب دیا۔ میں ایک مرتبہ پہلے ملتان کے قریبی جنگل میں چھپے ہوئے ڈاؤنوں کو راہ راست پر لا چکا تھا، لیکن یہ معاملہ اس سے ذرا مختلف

میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر جھونپڑے میں ٹہلنے لگا۔ میرا جی اس وقت بالکل یہ نہیں چاہ رہا تھا کہ جھونپڑے میں جاؤں جہاں میں نے سریتا کے ساتھ ایک آدم زاد بن کر اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔ وہ یہ جانے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی کہ اس کا عاشق ایک آدم زاد نیت ہو جس بلکہ جن زاد علیا لیش تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی وحشت سی ہوتی کہ اب وہاں سریتا نہیں ہوگی۔

جب میری آنکھ کھلی تو دوسرا ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رحمان اور ڈیسوزا جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے کھانا کھانے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے مجھے بیدار دیکھ کر کھانے کے لئے اصرار کیا۔ مجھے قطعی بھوک پیاس نہیں تھی حالانکہ کل سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ دونوں پھر کھانا کھانے لگے۔

ہم بغیر چون و چرا کے اس کی قبول کریں گے۔ ہمیں بہر حال یہ منظور نہیں ہے، کسی بھی صورت میں نہیں کہ آپ کی جگہ کسی اور کو اپنا سردار بنالیں۔“

گرام سنگھ کے بعد بقیہ افراد بھی اس کی تائید میں تقریباً ایسے ہی الفاظ ادا کئے۔ پھر رحمان بولا۔ ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نے یہ زندگی ترک کر دی تو چھانی کے ہندے سے بچے رہیں گے؟“ میرے لئے یہ بڑی عجیب صورت حال تھی کہ ایک آئی جی پولیس یہ سوال کر رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ”ہم جتنے لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں، ان میں سے یقیناً کسی کو بھی آپ کے علم پر چھانی کا پھندا قبول کرنے سے بھی انکار نہیں لیکن دادی کے باقی لوگوں کی زندگی کو ہم اپنی مرضی پر قربان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یقین ہے، آپ کے ذہن میں کوئی ایسا حل ضرور ہو گا جس سے دادی کے دوسرے لوگوں کی زندگی محفوظ رہے۔“ وہ یہ کہہ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ لوگ بھی مجسم سوال بن گئے۔

اب میں نے کتنا شروع کیا۔ ”میرے جاں نثارو! مجھے تمہارے اوپر فخر ہے۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو ہرگز تم سے وہ باتیں نہ کہتا جو آج صبح کہیں۔ تمہارے فیصلے نے میری نظریں تمہاری عزت اور بڑھادی۔ میرے ذہن میں یقیناً ایک تجویز ہے، اگر وہ کارگر ہو جائے۔ مجھے تم سب پر پورا بھروسہ ہے کہ تم لوگ میری تجویز قبول کر لو گے۔ وہ تجویز بیان کرنے سے پہلے میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم اس پر عمل کرو گے۔ اس وعدہ کا مقصد یہ نہیں کہ مجھے تم پر یقین نہیں۔ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بات میں اس تجویز سے انکار نہ کر دو۔ تو بولو، کیا تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنے کو تیار ہو کہ میں جو تجویز پیش کروں گا، اس سے تم مکمل اتفاق کرو گے؟“

اس پر باری باری تمام لوگ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ میں جو بھی تجویز رکھوں گا، اس سے وہ مرتے دم تک انحراف نہیں کریں گے اور اسے پورا کریں گے۔

پھر میں نے اپنی تجویز بیان کی تو اسے سن کر سب سناٹے میں آ گئے۔ تجویز یہ تھی کہ گورنر صاحب کو ایک خط لکھا جائے گا جسے رحمان بذات خود لے کر جائے گا۔ اس خط کی عبارت اس طرح ہو گی کہ میں بدنام زمانہ ڈاکو رنجیت سنگھ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ حکومت سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ مجھے میرے جرائم کی پاداش میں سزائے موت دے دے تاکہ مجھ جیسے دوسرے قانون شکنوں کو عبرت حاصل ہو۔ میں اپنے تقریباً ایک ہزار ساتھیوں سمیت خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا۔ میری طرف اور صرف ایک شرط ہے کہ میرے تمام ساتھیوں کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع اور اجازت دی جائے اور حکومت انھیں عام معافی دے دے۔ میں اپنے ساتھ کروڑوں روپے کی کرنسی، کروڑوں ہی ”لوہوں“ کے ہیرے جو اہرات اور سونا چاندی، سینکڑوں رانٹیلیں اور ہندو قہیں اور دوسرا اسلحہ بھی ان لوگوں کی معافی کے بدلے حکومت کی تحویل میں جمع کرا دوں گا۔ میری صرف اپنی خواہش ہے میرے ساتھیوں کو حکومت قطعی معاف کر دے۔

میرے ان ساتھیوں میں سات سو کے قریب پولیس کے آدمی بھی شامل ہیں جو مصلحتاً اتنے دن

میں خود کو اس تنہائی کے برداشت کرنے کا اہل نہیں پارہا تھا۔ بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کو شاید میرے پاس موجود ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ مجھے رحمان سے معلوم ہوا کہ جب سے میں سویا ہوں، وہ دونوں مرتبہ چکر لگا کر جا چکے ہیں۔ گزشتہ رات ایک لمحے کو بھی میری پلک نہیں جھپکی تھی۔ میں رات بھر گڑبگڑا بدلتا رہا تھا۔ مجھے جاگے ہوئے ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ پھر وہ دونوں آ گئے۔

”رنجیت!“ بڑے ٹھاکر نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ غمگین تھا۔ ”چل ہمارے ساتھ جھونپڑ میں چل! ہمیں اکیلا پن کھائے جا رہا ہے۔ ہم تیرے بغیر وہاں نہیں رہ سکتے۔“

”اب میں وہاں کس طرح جاؤں۔“ میں بھی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اگر میں وہاں رہا تو ہاں ہو جاؤں گا۔ وہاں مجھے ہر گھڑی سرتیا کی یاد ستائے گی۔“

میری بات سن کر بڑے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ ”تو پھر ہمیں بھی اپنے ہی ساتھ رکھ۔ جہاں تو رہے! وہیں ہم رہیں گے۔ تو کیا سمجھتا ہے، ہمارا کلیجہ منہ کو نہیں آتا۔ ممبر کر میرے بیٹے، ممبر کر سب کو ایک دہرنا ہے۔ سدا کون بیٹا ہے!“

”مگر بابا! کیا اسے ابھی مرنا تھا!“ میں چیخ اٹھا۔ ”کیا یہ دن اس کے مرنے کے تھے، بولو؟“ میں نے بڑے ٹھاکر کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

بڑے ٹھاکر کے رخساروں پر آنسو بہہ بہہ کر سفید داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ آخر کار بولا۔ ”رنجیت! مجھے تیرے دکھ کا اندازہ ہے۔ یہ دن تمہارے لئے ہمارے دن تھے۔ تم دونوں ہی جوان تھے، سرتیا تجھے اور ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ تو اکیلا رہ گیا۔ میرا ایک بیٹا تھا اور اس بھائی سے بس ایک بیٹی تھی۔ اب تو تجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں کہ میں بے اولاد رہا۔ سو یوں سرتیا کے بعد میری نسل ہو گئی۔ میرے دل میں جھانک رنجیت!..... پھر بھی میں نے تیری خاطر ممبر کیا۔ اب اگر تو نے بھی تمنا چھوڑ دیا تو میں ایک دن زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ ہم اس جھونپڑے کو چھوڑ دیں گے، کہیں اور رہ گئے، مگر تو ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔“

”میں آج رات یہیں رہوں گا۔ کل جب سب کچھ بدل جائے گا تو تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن سر جھکائے داہیں چلے گئے۔ میں پھر غڈ حال ہو کر بستر پر گر پڑا اور سنبھلنے لگا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کی موت پر اتنا شدید رنج ہوا تھا، وہ بھی ایک آدم زاد کی۔ پھر رحمان اور ڈیوڑا میرے پاس آ گئے۔ وہ کھانا تھم کر چکے تھے۔ انھوں نے مجھے تسلیاں دیں، طرح سے ہسلانے کی کوشش کی مگر میرا جی نہ ہسلنا تھا نہ ہسلنا۔ اسی طرح شام ہو گئی۔

جھونپڑے میں ایک ایک کر کے گرام سنگھ، رام سروپ اور چرنی داخل ہو گئے۔ رحمان اور میرے پاس پہلے سے موجود تھے ہی۔ میں ان کے فیصلے کا شکر تھا۔ وہ سب آکر سر جھکائے چوڑے آکے بیٹھ گئے۔ میں بھی بستر سے اٹھا اور منہ دھو کر ان کے ساتھ آ بیٹھا۔

سب سے پہلے گرام سنگھ نے بات شروع کی۔ ”سردار! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو بھی آپ

میرے ساتھی بنے رہے۔ میں یہ زندگی آئی جی رحمان اور ڈی آئی ڈیوزا کے کہنے پر ترک کر رہا ہوں۔ ان دونوں نے مجھے اپنے دلائل اور محبت سے قائل کر دیا ہے کہ وحشت و بربریت اور لاقانونیت کی زندگی کی لعنت کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے جب یہ الفاظ ادا کیے تو رحمان اور ڈیوزا کے ساتھ گرام سنگھ کے سوا بقیہ افراد چمڑ اٹھے۔

چند لمبے توقف کے بعد میں پھر بولا۔ ”میں یہ صفائی بھی پیش کر دوں کہ جب آئی جی رحمان، ڈی آئی جی ڈیوزا کے ساتھ میں نے ان بقیہ ساتھیوں کو بھی زیر کر لیا تو آئی جی رحمان اور ڈیوزا نے ذہان سے کام لیتے ہوئے اپنے سپاہیوں اور خود اپنی جانیں بچانے کے لئے عارضی طور پر میری طرف دوجی ہاتھ بڑھایا۔ جو کہ وہ طاقت کے ذریعے نہ کر سکے انھوں نے محبت سے انجام دے دیا۔ اس عرصے میں انھوں نے میری کاپی پلٹ دی اور میرا اعتماد حاصل کرنے کے لئے میرے شانہ بہ شانہ کام بھی کیا، مگر سب کچھ قانون کی افضلیت اور اس کی برتری کی خاطر تھا۔ انجام کار ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور میں رفتہ رفتہ یکسر بدل گیا۔ اب میں خود کو قانون اور انصاف کے سپرد کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرا درخواست کے مطابق میرے ساتھیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔“

وہ لوگ میری تجویز سن کر بے چین سے ہو گئے۔ میں نے رحمان اور ڈیوزا کے ذہنوں پر توجہ دے کر پتہ چلا کہ ان ذہنوں میں متعدد سوالات گردش کر رہے تھے۔

گرام سنگھ نے پھر بولنے میں پھل کی۔ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ ”سردار! یہ تجویز بہت مہنگی ہے ہم آپ کی زندگی قربان کر کے زندہ نہیں رہنا چاہتے، ہرگز نہیں۔“

بقیہ لوگ بھی گرام کی اس بات سے اتفاق کرنے لگے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے تم لوگ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عہد کر چکے ہو کہ مرتے دم تک میری توجہ سے انحراف نہیں کرو گے۔“ میں نے سختی سے کہا۔ ”تمہیں وہی کرنا ہے جو میرا حکم ہے۔ تم لوگ! عہد سے پھر نہیں سکتے۔ تمہیں اپنا عہد پورا کرنا پڑے گا!“

میں نے دیکھا کہ ان کے سر جھک گئے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرا بھی بھر آیا۔ میں نے منہ پھیر لیا کہ وہ میرے آنسو دیکھ کر ہمت نہ چھوڑ بیٹھیں۔ مجھے محسوس ہوا رحمان اور ڈیوزا دونوں ہی کچھ کہنا چاہتے ہیں پھر پھل رحمان نے کی وہ بولا۔ ”لیکن سردار! میں آئی کب ہوں! میں تو صرف آپ کا ساتھی ہوں۔ میں نے تو صرف ایک ڈاکے کے دوران آپ کے حکم پر فرض ادا کیا تھا۔ پھر میں نے اخباروں میں بھی اپنی تصویریں دیکھیں جن کے ساتھ مجھے آئی جی اور ڈیوزا کو ڈی آئی جی لکھا گیا تھا، مگر وہ تو محض ایک کہانی تھی، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نہ مٹا حکومت تک میری اور ڈیوزا کی تصویریں کس طرح پہنچ گئیں۔ یہ معمہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حکومت بھلا ایک کہانی کو حقیقت کس طرح سمجھ سکتی ہے؟ مجھے تو یہ حکومت کی کوئی چال معلوم ہے۔ اس طرح شاید حکومت مجھے اور ڈیوزا کو پھانسا چاہتی ہے۔ ایک ڈاکو، ایک قانون شکن کے سا

حکومت کے ذمے دار افسران کیسے ہو سکتے ہیں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ یہ کیا ماجرا ہے!“

اس پر میں نے کہا۔ ”تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا اور ڈیوزا بھی سب کچھ سمجھ جائے گا۔ اور میری آنکھوں میں دیکھو!“

رحمان نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اسی کے ساتھ ہم دونوں ہی کو جھٹکا سالگا۔ اس کا ذہن میرے ذہن کی گرفت میں آ گیا۔

تم یقین کرو کہ تھی آئی جی رحمان ہو۔ میرے ذہن نے اسے یاد کرنا شروع کیا۔ تمہیں اب سے کچھ عرصے پہلے کی وہ شام یاد آ رہی ہے جب تم نے ڈی آئی جی ڈیوزا اور پولیس کی بھاری تعداد کے ساتھ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کے ٹھکانے گول دادی پر حملہ کیا تھا۔ تم اپنی پچھلی زندگی یاد کر رہے ہو..... تمہیں سب کچھ یاد آتا جا رہا ہے..... اپنے سپاہیوں کو تم ہتھیار پھینکنے کا حکم دے رہے ہو اس لئے کہ تمہیں ڈاکوؤں نے دو طرف سے گھیر لیا ہے۔ اب تمہیں سب کچھ یاد آ چکا ہے۔ تم نے اپنے آدمیوں کی زندگی بچانے کے لئے مصلحتاً سردار رنجیت سنگھ سے عارضی طور پر دوستی کر لی ہے اور تم حقیقت میں اس کے جاں نثار بن چکے ہو، لیکن کیونکہ تمہیں قانون کی بالادستی پر یقین ہے اس لئے رنجیت کو رفتہ رفتہ راہ راست پر لا کر اس زندگی سے نفرت پیدا کر رہے ہو۔ تمہیں سردار رنجیت سنگھ سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے۔ تم دادی کی زندگی قطعی نہیں بھولے۔ تمہیں سب کچھ یاد ہے، لیکن یہ سب کچھ تم نے قانون کی بالادستی کے لیے کیا ہے۔ اب بھی تم سردار کو بے حد چاہتے ہو، مگر اپنے فرض اور قانون کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سردار کو اسی کے کہنے پر قانون کے حوالے کر دو گے۔

میں نے آئی جی رحمان کے ذہن کو قطعی آئینہ کر دیا۔ اب جو میں نے اس کی نظروں سے اپنی نظرس جدا کیں تو وہ ایک اور ہی شخص تھا۔

رحمان کے چہرے پر عجیب سی الجھن تھی۔ وہ اچانک بولا۔ ”سردار! میں آئی جی رحمان آپ سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں۔ ایک طرف آپ کی محبت ہے، دوسری طرف فرض مجھے آواز دے رہا ہے، میں کیا کروں؟ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

ڈیوزا نے رحمان کو حیرت سے دیکھا۔ باقی لوگوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔

”رحمان!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ہمیشہ سے دنیا کا یہ دستور رہا ہے اور ہمیشہ بڑے لوگوں نے قانون اور فرض پر محبت کو قربان کیا ہے۔ تم بھی ایک بڑے آدمی ہو، تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے اور تم یہی کرو گے۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈیوزا کی طرف دیکھا۔ ”اب تم آجاؤ ڈیوزا! میں تمہاری حیرت بھی دور کر دوں۔“

پھر ڈیوزا کا ذہن میرے قابو میں آ گیا۔ یہ ذہن بہت خطرناک تھا اس لئے میں پوری توجہ صرف کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد دل رہا تھا۔ میں نے بہت مشکل سے اس کے ذہن سے انتقامی خیالات ختم کیے۔ میرے ذہن نے اس کے ذہن کو حکم دیا، ڈیوزا! اب تم پوری طرح اپنی پچھلی زندگی میں واپس جا چکے ہو، مگر جس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا، وہ میں نہیں بلکہ میرا دادا تھا جو مر چکا ہے۔ تمہیں

اس لئے ذہن سے انتقام کے خیال کو قطعی طور پر جھٹک دینا چاہئے، یوں بھی کہ تم موجودہ سردار رنجیت سنگھ کو اپنے ماں باپ سے زیادہ چاہتے ہو۔

اس طرح آخر کار وہ شخص بھی راہ راست پر آگیا جس نے اپنے باپ کی موت پر ڈاکو رنجیت سنگھ سے انتقام لینے کا عہد کیا تھا۔ لندن سے اس نے ہندوستان تک کا سفر اسی لئے کیا تھا اور پولیس میں نوکری بھی اسی غرض سے کی تھی۔ اپنے باپ کے مارے جانے کی خبر اسے لندن ہی میں ملی تھی۔

ڈیووزا اب سر جھکائے روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں..... میں اپنے فادر کی روح سے شرمندہ ہوں..... میں ان کا انتقام نہیں لے سکا، مگر یہ اب میرے بس میں کب ہے! وہ شخص تو مر چکا جس نے میرے فادر کو مارا تھا۔ سردار! ہم..... ہم آپ کو چاہتا ہے اور..... اور اب ہم خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو قانون کے حوالے کرے گا۔ ہمارا تو سب کچھ آپ تھا۔ ہمارا باپ مرا، پھر ماں مرا، ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، آپ تھا لیکن آپ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گیا سردار!“ ڈیووزا یہ کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

باقی لوگ حیرت اور رحم کے طے جملے جذبات کے ساتھ اسے سمجھانے لگے۔ میں نے سب کو رحمان اور ڈیووزا کے حالات سے آگاہ کیا اور کہا۔ ”یہ لوگ دانستہ میری محبت میں اپنی بچھلی زندگی ترک کر کے میرے ساتھ آگئے تھے، مگر میں اب انہیں ان کی بچھلی زندگی قبول کرنے کو کہہ رہا ہوں تو یہ رو رہے ہیں، لیکن ایسا ضرور ہو گا، ضرور! میں اپنی موجودہ زندگی سے بیزار آچکا ہوں۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے جاں نثار ساتھی وہ زندگی بسر کریں جو قابل نفرت ہے۔“

وہ سب میری تجویز سے اتفاق کرنے پر مجبور تھے اس لئے کہ عہد کر چکے تھے۔ وہ سر جھکائے غمزہ بیٹھے تھے جیسے انہوں نے ابھی اپنے کسی قریبی عزیز کے انتقال کی خبر سنی ہو۔

پھر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ”ابھی یہ تجویز تم لوگوں تک ہی محدود رہنا چاہیے اس لئے کہ بہت سے کام باقی ہیں۔ مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ دادی کے دوسرے لوگوں کو اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے کس طرح تیار کیا جائے! وجہ یہ کہ ان میں سے بہت سوں نے تو اپنی پوری زندگی ہی اس ماحول میں گزاری ہے۔ وہ کسی قیمت پر اسے ترک کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بہت سے اسی ماحول میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے ہیں۔ میں اس بات سے بھی بہ خوبی واقف ہوں، تم لوگوں کی طرح سبھی مجھے اتنا نہیں چاہتے کہ کسی دباؤ کے بغیر میری بات مان لیں اور اپنی زندگی یکسر بدل دیں۔ اس کے باوجود میں فیصلہ کر چکا ہوں اب ایسا ہی ہو گا۔ پھر بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کا مسئلہ بھی ہے۔ سریتا کو وہ اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں میں سریتا کی موت کا زخم ابھی تازہ ہے۔ یہ زخم ابھی مندمل بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے آنسو تو ابھی خشک بھی نہیں ہوئے کہ انہیں یہ اطلاع دے دی جائے کہ جس رنجیت سنگھ کو تم نے اولاد کی طرح پالا پوسا ہے اور اولاد کی طرح چاہا ہے، وہ خود کو پھانسی کے پھندے کے سپرد کر رہا ہے۔ مجھے ابھی بہت کچھ سوچنا ہے۔ خیر..... یہ سب میں کر لوں گا۔ میرے ذہن میں تمام باتیں ہیں۔“ اس کے بعد میں گرنام سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ”گرنام! تم بتاؤ کہ وہ تمہاری راجکمار شانتی کیا کہتی ہے؟ کیا

نام سے شادی کرنے پر تیار ہے؟“ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

گرنام سنگھ نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر کہنے لگا۔ ”اسے چھوڑیے سردار! مجھے اب اس سے یا دنیا کی کسی اور بات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ خود میرا عہد ہے جس پر اب میں بچھتا رہا ہوں۔ میں نے آپ سے جتنی محبت کی ہے اسے بتانے یا جتانے کی ضرورت نہیں لیکن یہ کہنے ہوئے بھی مجھے فخر ہے کہ میں نے جتنا آپ کو چاہا ہے، اتنا کسی کو نہیں چاہا..... کسی کو بھی نہیں!“ یہ کہتے کہتے وہ رو پڑا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور کہا۔ ”گرنام! سب کچھ بھول جاؤ کہ جو کچھ مزارا ہے، جو ہوتا تھا، ہو گیا۔ اب تم اپنی زندگی کو بہتر اور خوش و حال پُر امن طور پر گزار دو گے تو میری روح کو تسکین ہو گی۔ اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ تمہاری شادی راجکمار شانتی ہی سے کر دی جائے۔“ ”لیکن سردار! وہ تو گرنام سنگھ کا چہرہ دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گئی!“ اس مرتبہ چرنجی نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت نازک مزاج ہے وہ لڑکی!“

پھر رام سرور نے بھی اپنی بھائی کی تائید میں لقمہ دیا۔ ”وہ گرنام سنگھ کے آدھے جملے ہوئے چہرے کا بھیاک پن برداشت نہیں کر سکتی۔ میں خود اس وقت وہاں موجود تھا۔“ پھر رام سرور کچھ غفلت مابہو کر گرنام سنگھ کو دیکھنے لگا شاید اسے بات کہہ کر احساس ہو گیا تھا کہ اس طرح گرنام سنگھ کے جذبات کو نہیں سمجھتی ہو گی۔ وہ اسی لئے معذرت کرنے لگا۔

گرنام سنگھ بولا۔ ”ہاں میرا چہرہ اتنا ہی بھیاک ہے کہ سردار کے سوا مجھ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا، مگر.....“ اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور اپنا فقرہ ادھورا ہی چھوڑ کر سر جھکا لیا۔

مجھے اس کے دکھ کا اندازہ تھا۔ اب تو اس سے محبت کرنے والی واحد ہستی یعنی اس کی ماں بھی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ اسے چاہئے والی بہن لاجو نے تو پہلے ہی مجھ پر اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ اب تو اس کی چھوٹی سی دنیا میں ایک میں ہی اس کا سب کچھ تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ اس کے ایک ایک لفظ میں صداقت تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ میں نے گرنام سنگھ سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ گرنام کہ اس وقت راجکمار کہاں ہے؟“

وہ حیران سامیری طرف دیکھنے لگا، پھر جواب دیا۔ ”وہ میرے ہی جھونپڑے میں ہے، مگر..... مگر میں اس جھونپڑے میں کس طرح جا سکتا ہوں؟ وہ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب میں جھونپڑے میں داخل ہوں بغیر باہر ہی کھڑے ہو کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اندر سے سسکیوں اور رونے کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔“

”گرنام! پچھڑنے سے پہلے میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ وہ تحفہ راجکمار شانتی ہے اور.....“

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”مگر سردار.....“

”یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو!“ میں بول اٹھا۔ ”مجھے وہاں لے چلو“ ابھی اسی وقت آج رات ہی تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔“

چرچائی رام سرورپ وغیرہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے، لیکن گرنام سنگھ کو غالباً میری بات کی صداقت کچھ یقین سا تھا اس لئے کہ وہ اب تک بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ آئی جی رحمان، ڈیوڑھا وغیرہ کی نفرت کو اس نے خود اپنی آنکھوں سے محبت میں بدلتے دیکھا تھا۔ گرنام سنگھ میرے ساتھ چل دیا۔ چرچائی اور رام سرورپ اپنے جھوپڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

گرنام سنگھ اپنے جھوپڑے کا تالا کھول کر باہر ہی رک گیا۔ اب دن مند چکا تھا۔ جھوپڑے میں تاریکی تھی۔ میں نے جیسے ہی جھوپڑے میں قدم رکھا نسوانی چیخ سنائی دی۔

”میں گرنام سنگھ نہیں ہوں۔“ میں نے فوراً بتا دیا۔ ”بلکہ میں تمہیں اس قید سے رہائی دلانے آیا ہوں اس لئے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔“ میری بات سن کر لڑکی دوبارہ نہیں چیخی۔ میں پھر جھوپڑے سے باہر گیا اور گرنام سنگھ کو آہستہ آواز میں مخاطب کیا۔ ”قربانی جھوپڑے سے مشعل مانگ لو۔“

گرنام سنگھ مشعل لے آیا۔ اس سے میں نے گرنام سنگھ کے جھوپڑے کی مشعل روشن کر دی، پھر جو مشعل منگوائی تھی باہر جا کے واپس کر آیا۔ اس مرتبہ اندر آتے ہی میں نے جھوپڑے کا دروازہ بھڑ دیا۔ اب میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ لڑکی واقعی بہت حسین تھی، پتلے پتلے نازک سرخ ہونٹ، بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت ناچتی ہوئی، بڑے بڑے کھلے ہوئے بال، گلے میں قیمتی موتیوں کے ہار اور ہاتھوں میں جھنگ کرتی سونے کی انگوٹھیاں!

پتلی دہلی پھول جیسی راجکاری شائقی اس وقت بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ پیال دار نرم ہنر پر وہ گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھے مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

آخراں کی میٹھی آواز سنائی دی۔ ”کون ہو تم؟“

بظاہر وہ تین لفظ تھے گرنام میں اتار س تھا جس کی مٹھاس میں نے اپنی روح تک میں محسوس کی۔ ”میں تمہارا ایک خیر خواہ ہوں راجکاری!“ میں نے جواب دیا۔ ”دیکھو“ ادھر دیکھو!“

جیسے ہی اس کی نظریں مجھ سے ملیں، وہ پوری طرح میرے قابو میں آگئی۔ اب میرا ذہن اسے غم دے رہا تھا، تم اپنی بچپنی زندگی قطعی بھول جاؤ گی..... تم اپنی بچپنی زندگی بھول رہی ہو..... بھول چکی ہو! تم پہلے کون تھیں، نہیں جانتیں، تمہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ تم گرنام سنگھ کو بے انتہا چاہتی ہو اور وہ بھی تم پر جان دیتا ہے۔ تم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں اس کے چہرے سے بھی پیار ہے۔ تم اس کی صورت دیکھ کر قطعی نہیں ڈرتیں بلکہ تمہیں اس پر پیار آتا ہے۔ تمہارا سب کچھ گرنام سنگھ ہے تم اس کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ تمہیں اس سے عشق ہے۔ تم اس کے لئے اپنی جان تک دے سکتی ہو۔ ہوش میں آنے کے بعد تم یہ بھول جاؤ گی کہ تمہیں اس کے لئے کسی نے مجبور کیا تھا۔ میں تمہارا سردار رنجیت سنگھ ہوں جسے تم اسی طرح چاہتی ہو جس طرح تمہارا گرنام اسے چاہتا ہے۔ تمہارا سردار تمہارے بڑے بھائی کی طرح ہے۔

میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں۔ اس کے ذہن نے خفیف سی مزاحمت کی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”سردار! گرنام سنگھ کہاں گیا ہے؟ صبح سے اس کا پتا نہیں۔“

”وہ باہر ہی ہے، ابھی بھیجتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ گرنام سنگھ مجھ سے پلٹ گیا اور بے اختیار میری پیشانی کا بوسہ لے لیا۔

”جاؤ گرنام“ راجکاری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میری طرف سے یہ تحفہ قبول کرو۔ آج ہی رات تم دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ نیک کام میں دیر کیسی! کیا تم اس پر راضی ہو؟“

وہ کیا کہتا! اس کی خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔ ”بہتر ہے سردار، جو آپ کا حکم۔“ یہ کہہ کر وہ جھوپڑے میں چلا گیا۔

جاتے جاتے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ خوشی کے سبب گرنام سنگھ نے جھوپڑے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ راجکاری کو میں نے گرنام سنگھ کی آغوش میں سینٹے دیکھا۔ گرنام سنگھ اس پر جھکا ہوا تھا۔ میرے سینے سے جیسے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب میں یہ خوش خبری بڑے ٹھاکر کو سنانا چاہتا تھا اس لئے میرے قدم بڑے جھوپڑے کی طرف اٹھنے لگے۔

میں بڑے جھوپڑے میں پہنچا تو دیکھا وہ سنسان پڑا تھا۔ میرا ماتھا ٹھکا۔ مجھے دیکھ کر ایک پڑوسی نوجوان آگے بڑھا اور بولا۔ ”سردار! بڑے ٹھاکر نے جھوپڑا بدل دیا ہے اب وہ اس سے تیسری گلی میں چلے گئے ہیں۔ وہاں ایک جھوپڑے خالی پڑا تھا۔ اس جھوپڑے میں پہلے گنیش رہتا تھا جو اکیلا ہی تھا۔ آخری ڈاکے میں وہ مارا گیا۔ بڑے ٹھاکر اب اسی جھوپڑے میں چلے گئے ہیں۔ سارا سامان بھی وہیں پہنچا دیا گیا ہے۔“

اس نوجوان سے یہ اطلاع پا کر میں آگے بڑھ گیا۔ میں تیسری گلی کی طرف چلنے لگا جو زیادہ دور نہیں تھی۔ نوجوان کی بات سے میرے دل کو دھکا سے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا، تو اب یہ بڑا جھوپڑا ہمیشہ کے لئے ویران ہو گیا جس میں کبھی سریتا کے زندگی سے بھرپور قصے گوئیے تھے! میں یہی سوچتا ہوا اس جھوپڑے میں داخل ہو گیا، لیکن ٹھاکر موجود نہیں تھا۔

ٹھکانے میں مجھے دیکھ کر آگے بڑھی اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ”تو آگیا میرے لال! دیکھ لے، ہم نے تیری خاطر وہ محسوس جھوپڑا چھوڑ دیا۔ بڑے ٹھاکر تجھی کو لینے رحمان کے یہاں گئے ہیں، اب آتے ہی ہوں گے۔ بیٹھ جا، نا!“

میں، ٹھکانے کے کہنے پر چوتھے پے بیٹھ گیا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں ٹھاکر آگیا۔ ”میں تجھے کہاں کہاں دیکھتا پھرا میرا چاند! اور تو یہاں موجود ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تو نے آج گرنام سنگھ اور راجکاری کی شادی کا اعلان کر دیا۔ یہ اچھی بات ہے۔ اس بے چارے کا گھر بس جائے گا۔ جب سے اس کی ماں مری تھی وہ بالکل اکیلا تھا، افسردہ رہنے لگا تھا۔ مجھے اتنی دیر اسی لئے ہوئی کہ میں اس کی شادی کا انتظام کر رہا تھا۔ مجھے گرنام سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

یہ سنتے ہی میں چونک کر اٹھا کر کہیں گرنام سنگھ نے بڑے ٹھاکر کو میرے آئندہ کے ارادے سے تو

آگاہ نہیں کر دیا! لیکن یہ کس طرح ممکن تھا!

”کیا معلوم ہو گیا بابا؟“ میں نے بڑے ٹھاکر سے پوچھ ہی لیا۔

”یہی کہ تیری مرضی ہے، آج ہی ان دنوں کی شادی ہو جائے۔“ بڑے ٹھاکر نے جواب دیا۔ میری جان میں جان آگئی۔

اب سے کچھ عرصے پہلے جہاں دولہا بنا میں منڈپ کے پھیرے لگا رہا تھا اور سریتا کی ساڑھی کا دامن میرے کرتے سے بندھا ہوا تھا، آج وہاں میرا ساتھی اور جاں نثار گرنام سنگھ راجبھاری کے ساتھ اسی طرح پھیرے لگا رہا تھا۔ میں جی بی جی میں اس پر خوش تھا کہ گرنام سنگھ کا مستقبل محفوظ کر دیا۔ اب کوئی راجا شمشیر سنگھ کسی ڈاکے کے دوران کسی سریتا کو گولی نہیں مار سکے گا۔ شادی کی رسمیں خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گئیں۔ لڑکی کی طرف سے میں اور لڑکے کی جانب سے بڑے ٹھاکر نے تمام فرائض ادا کئے۔ جب یہ سارا ہنگامہ ختم ہو گیا تو میں، بڑے ٹھاکر کے ساتھ اپنے نئے جھونپڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس میں رہنا شاید مجھے ایک آدھ دن ہی نصیب ہوتا تھا۔

☆=====☆=====☆

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی میں نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ بڑے ٹھاکر کے ذہن کو قابو میں کر کے قتل و غارت گری کی زندگی کے خلاف نفرت بھردی۔ بہت حد تک میں نے سریتا کا غم بھی اس کے ذہن سے نکال دیا، مگر کاش کوئی میرے ذہن سے یہ بوجھ ہلکا کر سکتا۔ میں نے یہ سب تو کر لیا مگر پوری طرح اپنی محبت کے نقوش اس کے ذہن سے نہ مٹا سکا۔ مجھے اس کے ذہن میں یہ ساری باتیں بٹھانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ انسانیت اور شرافت کے نام پر اس کا ذہن میری تجاویز قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اپنے حواس میں واپس آتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔

”رہتیے! ہمیں یہ زندگی قطعی پسند نہیں۔ کب کس کا بیٹا یا بیٹی گولی کا نشانہ بن جائے کچھ نہیں معلوم! تیرا کیا خیال ہے؟“ ٹوٹے جو تجویز مجھے بتائی تھی، وہ پوری طرح مجھے منظور نہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تجھے پھانسی بھی نہ ہو اور سب معاملہ ٹھیک بھی ہو جائے؟“

ٹھکرائن پھانسی کا ذکر سن کر چونک اٹھی اور بولی۔ ”یہ تم کیا اول فول منہ سے نکال رہے ہو! ہوش میں تو ہو، پھانسی لگے اس کے دشمنوں کو!“

مجھے اندازہ تھا کہ ٹھکرائن کا یہی رد عمل ہو گا۔ میں اسی لئے یہ چاہتا تھا کہ اس کے ذہن کو بھی قابو میں کر کے اس بات کے لئے پہلے سے تیار کیا جائے ورنہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی۔ میں نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ اس عرصے میں ٹھاکر کا منہ ہاتھ دھونے چلا گیا تھا۔ ٹھکرائن کمزور ذہن کی تھی اس لئے پوری طرح قابو میں آگئی، لیکن میرے اور سریتا کے معاملے میں وہ بھی مضبوط ثابت ہوئی۔ جس حد تک میں نے بڑے ٹھاکر کے ذہن کو اس بات پر آمادہ کیا تھا، اس سے کچھ کم ہی ٹھکرائن راضی ہوئی۔ ایک ماں کی گہری اور مضبوط محبت کا اندازہ اس وقت مجھے اچھی طرح ہو گیا۔ بے اولاد ہو کر بھی ٹھکرائن میں بلا

کی متا تھی، میرے اور سریتا کے لئے!

میں اب اپنے جھونپڑے سے نکل کر گرنام سنگھ کے یہاں پہنچا۔ راجبھاری مجھے دیکھ کر کھل اٹھی اور خاطر تواضع کرنے لگی۔ آج وہ مجھے کل سے بھی لاکھ درجے حسین دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پیاسی دھرتی پر کھل کے بادل برسے ہوں اور کھیتی ہری بھری ہو کر لہلہا اٹھی ہو۔

میں نے گرنام سنگھ کو بتایا۔ ”تمہیں یہ جان کر شاید خوشی ہو کہ میں نے بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن کو کسی حد تک اپنی جدائی برداشت کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔“

گرنام سنگھ کے لئے اب یہ بات کوئی زیادہ حیرت کی نہیں تھی۔ اسے کسی حد تک میری پراسرار قوتوں کا اندازہ ہو چکا تھا، لیکن وہ پوری طرح معاملے کو نہیں جانتا تھا۔ بس اسے یہ خبر تھی کہ سردار جو چاہیں ہو سکتا ہے اور جو بات جس سے چاہیں منوا سکتے ہیں۔ کس؟ اس سوال کے جواب سے ظاہر ہے وہ آگاہ نہیں تھا۔

”اب وادی کے تمام لوگوں کو تم ایک ایک کر کے میرے پاس بھیجو۔ ان سے کہو کہ سردار تمنائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے تم کوئی خالی جھونپڑا منتخب کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی یہ معاملہ بھی ختم ہوں۔“ میں نے کہا۔ ہم دونوں باہر نکلے تو میں بولا۔ ”جب تم پورا انتظام کر لو تو مجھے رحمان کے جھونپڑے پر اس کی اطلاع دو۔“ یہ کہہ کر میں اس سے جدا ہوا اور رحمان کے جھونپڑے پہنچ گیا۔

رحمان اور ڈیوسزا شیو کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں ہی نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”کل صبح تم دونوں میرا خط لے کر جیپ کے ذریعے دارالحکومت روانہ ہو جاؤ گے۔ مجھے یقین ہے کہ شام تک تم دونوں واپس آ جاؤ گے۔“ میں نے انھیں مخاطب کیا۔ ”پھر پرسوں صبح ہمارا قافلہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ دارالحکومت میں تمہیں سب سے پہلے گورنر صاحب سے ملنا ہو گا اور تم کم از کم تین سو آدمیوں کے رہنے کی بہترین جگہ کا انتظام بھی کر کے آؤ گے۔ وہ اس صورت میں کہ گورنر صاحب تمام لوگوں کو عام معافی دینے پر راضی ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ میں تم دونوں کو ایک ڈسے داری اور سونپتا ہوں۔ وہ ڈسے داری یہ ہے، تم گورنر صاحب سے یہ اجازت بھی حاصل کرو گے کہ تمام سپاہیوں کو دوبارہ ڈیوٹی پر لیا جائے، ان کی پوری تنخواہیں جو باقی ہیں، ادا کی جائیں تاکہ وہ اپنی پچھلی کسر پوری کر سکیں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش حال زندگی گزاریں۔ مزید یہ کہ میرے ساتھیوں کو جو بہترین نشانے باز اور بمادر ہیں، پولیس اور فوج میں نوکریاں دی جائیں تاکہ وہ بھی باعزت زندگی بسر کر سکیں اور باعزت حلال کی روزی کما کر اپنے بیوی بچہ کا پیٹ بھر سکیں۔“

میری باتوں سے رحمان اور ڈیوسزا دونوں نے پورا اتفاق کیا۔ پھر ڈیوسزا پُر یقین لہجے میں بولا۔ ”سردار! ہم آپ کو یقین دلاتا ہے کہ گورنر صاحب سے اپنی باتیں منوالے گا۔ وہ ہمارا وطن کا ہے، ہمارا بلت نہیں ٹالے گا۔ ہم یہ بھی کوشش کرے گا کہ وہ آپ کو چھوڑ دے۔“

”نہیں ڈیوسزا، اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ دیں۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”میں

قانون اور انصاف کا مذاق اڑانا نہیں چاہتا۔ اگر مجھے ایسا ہی کرنا ہوتا تو یہ زندگی ہی کیوں ترک کرتا؟ تم مجھے یقین دلاؤ کہ گورنر صاحب سے میرے متعلق سفارش نہیں کرو گے۔

”تم ٹھیک کہتا سردار“ پر ہم اس دل کا کیا کرے!“ ڈیوڑھا غمگین لہجے میں بولا۔

رحمان بھی اب دیدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔ ”سردار! کچھ اور چاہے ہو نہ ہو“ میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے تمام ساتھیوں کو گورنر صاحب سے معافی دلا دوں گا اور انھیں مطلوبہ نوکریاں بھی مل جائیں گی۔“ رحمان کے لہجے سے یقین کا اظہار ہو رہا تھا۔

ابھی ہمارے درمیان یہی گفتگو جاری تھی کہ گرام سنگھ آگیا۔ اس نے آتے ہی مجھے بتایا کہ تمام وادی کے لوگوں تک میرا حکم پہنچا دیا ہے۔ لوگ اب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ قریب ہی ایک گلی میں اس غرض سے گرام سنگھ نے ایک جھونپڑا خالی کر لیا تھا۔

گرام سنگھ کے ساتھ میں اس جھونپڑے تک پہنچا۔ دیکھا تو پوری چوڑی گلی وادی والوں سے بھری ہوئی ہے۔ اب میں اپنا کام شروع کرنے والا تھا۔

ایک ایک کر کے لوگ آتے رہے اور میں ان کے ذہنوں کو تبدیل کرتا رہا۔ سامنے کے دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور پچھلے دروازے سے میرے حکم پر اپنے جھونپڑوں کو روانہ ہو جاتے جہاں انھیں اپنا سامان وغیرہ باندھ کر چلنے کی تیاری کرنا تھی۔ آئندہ روز انھیں دوسرے کام کرنا تھے۔ انھیں قید خانہ خالی کرنا تھا، اسلحہ اور تجوریاں باہر نکالنا تھیں جن میں کروڑوں روپیہ، سونا اور میرے جواہرات بھرے پڑے تھے۔

مجھے یہ کام کرتے کرتے شام ہو گئی اور میں بے حد تھک گیا۔ تمام سپاہیوں کو اب اپنی پچھلی زندگی یاد آچکی تھی، لیکن میں نے ان کے ذہن سے وادی کی زندگی کے نقوش نہیں مٹائے تھے۔ انہیں سب کچھ یاد تھا۔ ہاں میں نے اس میں اتنا اضافہ ضرور کیا کہ انہوں نے سب کچھ آئی جی اور ڈی آئی جی کی فٹا کے مطابق کیا۔ انہیں یہ علم تھا کہ وہ میاں عارضی طور پر ہیں۔ میاں سے نکل کر انہیں یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ مجبور تھے۔ ان پر سخت پابندی تھی اور انہیں وادی سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ جب کبھی انہیں وادی سے نکالا گیا تو آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور وادی میں واپسی کے وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ تمام باتیں ان کے ذہن نشین کر دی گئی تھیں تاکہ باہر نکلنے کے بعد خود ان پر یہ الزام نہ لگے، انہوں نے قانون کی مدد کرنے کی بجائے قانون شکنی کی۔ میں نے ان کے ذہنوں میں یہ بات بھی بٹھادی کہ وہ جن دو ایک ڈاکوؤں میں شریک ہوئے ان کی تعداد بہت کم تھی، ڈاکو ان پر بھاری رہتے تھے اور ہر طرح سے انہیں اپنی غمگشت میں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈیوڑھا کا بھی یہ حکم تھا کہ وہ لڑے بھڑے بغیر کچھ گزر رہا ہے، دیکھتے رہیں، اس میں قطعی مداخلت نہ کریں۔ میں نے انہیں یہ بھی یاد کر لیا کہ انہوں نے کئی دفعہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر راستہ تلاش نہ کر سکے۔ وہ اگر ڈاکوؤں سے لڑ بھڑ کر انہیں مار بھی دیتے تو اس قید خانے سے کس طرح نکلے! شاید یہی راز جاننے کے لئے آئی جی رحمان اور ڈی آئی جی ڈیوڑھا نے سردار نجیت سنگھ سے دوستی کی تھی تاکہ راستے کا علم ہو جانے کے بعد

سپاہیوں کو میاں سے نکال لے جائیں۔ سپاہیوں سے انہوں نے کہا بھی تھا کہ اس وقت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے جب تک خفیہ راستے کا علم نہ ہو جائے، کدھر ہے۔ وجہ یہ کہ چاروں طرف اونچی اونچی بات پھاڑیاں تھیں۔ وہ بھاگتے بھی تو بھاگ کر کہاں جاتے!

اس تھکا دینے والے کام سے فارغ ہو کر میں اپنے نئے جھونپڑے پہنچا۔ میری آنکھیں نیند سے جمل ہو رہی تھیں اور سر دکھ رہا تھا۔ جیسے میں برسوں سے نہیں سویا۔ پیالہ دار نرم بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے بے خبر سو گیا۔ پھر صبح اسی وقت میری آنکھ کھلی جب رحمان اور ڈیوڑھا نے آکر جگایا۔ وہ میرے ہی علم پر شہر روانہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنی وردیاں پہن لی تھیں اور بغل میں چھوٹے چھوٹے رول بے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پی کیپ بھلی لگ رہی تھی۔ ہوشیروں میں ان کے ریلو اور بھی موجود تھے۔ بہت دن بعد وہ مجھے اس وردی میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے وہ خط دکھایا جسے مجھے اپنی تحریر میں نقل کرنا تھا۔

میں نے وہ خط اپنے طرز تحریر میں جوں کا توں نقل کر دیا۔ خط گورنر کے نام تھا اور مضمون وہی تھا جو میں نے انہیں بتایا تھا۔

جھونپڑے سے باہر آکر میں اس پولیس جیب کو دیکھنے لگا جس میں وہ روانہ ہونے والے تھے۔ ان کے انکار پر بھی میں جیب میں بیٹھ گیا۔ جیب خفیہ راستے سے گزرتی ہوئی اس گول وادی سے باہر نکل آئی۔ پیچھے راستہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ میں نے ان دونوں کو گلے سے لگایا اور رخصت کیا۔ پھر اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک کہ جیب اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں وحشت و بربریت کی جس زندگی کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس کا تجربہ مجھے رنجیت سنگھ کے جسم سے نکل کر ہوا، لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ تبھی مجھے کچھ ایسی نئی حقیقتوں کا عرفان ہوا کہ جو پہلے میرے شعور کی سطح پر نہیں تھیں۔ روئے زمین پر ابتدائے آفرینش سے اب تک کوئی ایسا معاشرہ نہیں رہا جس میں مجرم نہ پیدا ہوتے رہے ہوں۔ ہر معاشرے اور ہر تہذیب نے بڑے بڑے مجرموں کو جنم دیا ہے اور ہر عہد میں جرم کے سدباب کی خاطر مجرموں کو سزائیں دی جاتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود مجرم پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ آدم زاد اب تک صرف اس جرم کو دیکھتے رہے ہیں جو ہوا۔ وہ اس مجرم کو سزا دیتے ہیں جس نے جرم کیا، مگر شاید انہوں نے ان حالات پر غور نہیں کیا، ان اسباب کو کبھی تلاش نہیں کیا جن سے جرم پروان چڑھتا ہے اور مجرم پیدا ہوتے ہیں۔ اس گول وادی میں بسنے والوں کے آباؤ اجداد بھی یقیناً ڈاکو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ کوئی تو ایسا معاشرتی جبر تھا کہ جس نے انہیں جرم کی راہ پر ڈال دیا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر مجھے آئندہ ایک ایسے ہی تجربے سے گزرنانا پڑا جس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا۔ اپنی جنائی صفات چھن

جانبے کے بعد میرا وجود تو کسی ایسے تنکے کے مانند ہو گیا تھا جو وقت کے سیل رواں میں بے ارادہ بہا بہا جاتا ہے۔

پھر وہ دن بھی تمام ہو ہی گیا اور گول وادی میں دھیرے دھیرے شام اترنے لگی۔ ہم سب رہا اور ڈیوڑا کی واپسی کے منتظر تھے۔ جو گورنر سے ملنے گئے تھے۔ ان کی واپسی ہی پر اس وادی کے لوگوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ قید خانہ خالی کر دیا گیا تھا۔ تمام اسلحہ بڑے میدان میں ڈھیر تھا۔ اس کے علاوہ وادی والوں کے پاس جتنی دولت تھی۔ وہ بھی صندوقوں میں بھری ہوئی تھی۔ میدان میں رکھی تھی۔

ٹھاکر اس تمام سامان کے پاس بنے ہوئے چوترے پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ وادی کے لوگ مزہ بہ صف میدان میں بیٹھے رحمان اور ڈیوڑا کا انتظار کر رہے تھے۔ رحمان کے ساتھی پولیس والے اپنی اپنی وردیوں میں ملبوس تھے۔ انھیں اپنا ماضی پوری طرح یاد آچکا تھا۔ اب وہ اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے ایک جیب آئی دکھائی دی اور پھر وہ چوترے کے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے رحمان اور ڈیوڑا نیچے اترے۔ لوگوں نے انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ گورنر کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین تھے۔ اضطراب ان کے چروں سے عیاں تھا۔ وہ دونوں میرے قریب آئے اور رحمان میرے گلے سے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے ساتھ چوترے پر چڑھ جائے اور بہ آواز بلند لوگوں کو گورنر کے فیصلے سے آگاہ کر دے۔

رحمان نے بتایا کہ گورنر صاحب نے وہ تمام شرائط منظور کر لی ہیں جو تمہارے سردار نے گورنر کے نام اپنے خط میں تحریر کی تھیں۔ گورنر صاحب کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ تمہارا سردار اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر حکومت کے حوالے کر دے اور تمہارا سردار یہ شرط پوری کرنے کے لئے بہ خوشی تیار ہے۔ یہ سن کر لوگوں کے چہرے بگھڑ گئے۔ اس خوشی پر اس پر گئی جو انھیں اپنے معاف کئے جانے ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس بات پر شور مچانا شروع کر دیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو سمجھایا کہ ایک شخص کی زندگی سینکڑوں انسانوں کی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ بات ان سب کے مفاد میں ہے کہ میں خود کو حکومت کے حوالے کر دوں۔ میں نے بہت محبت اور شفقت کے ساتھ ان لوگوں کو تمام باتیں سمجھائیں۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ لوگ جلد ہی میری بات سمجھ گئے۔

دوسری صبح ہم سب نے گول وادی کو الوداع کہا۔ ہمارا قافلہ وادی سے نکل کر اونچے نیچے چڑھنے راستوں پر آگے بڑھنے لگا۔ ایک زندگی ختم ہو رہی تھی اور دوسری ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ پولیس کے ٹرک سب سے آگے تھے جن کے پیچھے گھوڑوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے بعد قافلے میں شان عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔

ہمارا قافلہ جب شہر میں داخل ہوا تو اسے دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ نے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو اپنی مرضی سے قانون سے

حوالے کر دیا ہے۔ آخر کار ہمارا قافلہ ایک بڑے سے میدان میں پہنچ کر رک گیا جس کی دائیں جانب کوارٹروں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ تمام لوگ سوار یوں سے اتر اتر کر ان کوارٹروں میں چلے گئے۔ اسی کے ساتھ ان کا سامان بھی۔ نوٹوں سے بھری ہوئی تجوریاں، زیورات اور جواہرات سے بھرے صندوق سرکاری خزانے میں پہنچا دیئے گئے۔

یہ تمام کارروائی میرے سامنے ہوئی۔ رحمان شاید یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے اپنے وفادار ساتھیوں کو بہتر مکانوں میں منتقل ہوتے دیکھ لوں۔ اب میرے جیل جانے کا وقت آگیا تھا۔ میرے سامنے بڑے ٹھاکر، ٹھکرائن، گرانام سنگھ، رام سرورپ اور چرنجی کھڑے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل بھی رو رہا تھا۔

میں ان سب سے آخری بار گلے ملا، پھر رحمان اور ڈیوڑا کے ساتھ جیب میں بیٹھ کر سینٹرل جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں رحمان نے مجھے بتایا۔ ”قانون کی رو سے حکومت آپ پر مقدمہ چلائے گی۔ اس کے لئے میں نے ایک بہترین وکیل کا انتظام کر لیا ہے جو آپ کی طرف سے صفائی پیش کرے گا اور مقدمہ لڑے گا۔ ایڈووکیٹ فضل الرحمن فوجداری مقدمات لڑنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ کم ہی کیس ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہار جائے۔“

”لیکن یہ سب فضول ہے، بیکار ہے اور رحمان!“ میں نے اختلاف کیا۔ ”میں اپنے متعلق تمام اعتراضات کر چکا ہوں۔ اب اس تماشے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”پھر بھی قانون کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر مقدمہ تو ضرور چلے گا سردار!“ رحمان بولا۔ ”اس سے مفرت نہیں پھر عدالت جو فیصلہ سنائے گی، ہم سب کو اس کا پابند ہونا پڑے گا۔ گورنر صاحب نے اس معاملے کو فوری طور پر نمٹانے کے لئے فوری سماعت کی ایک خصوصی عدالت قائم کرنے کا حکم بھی جاری کیا ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میرا ذہن دراصل مستقبل کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچنے میں مصروف تھا۔ جیل پہنچ کر رحمان نے بطور خاص میرا تعارف جنیلر ولیم برٹ سے کرایا اور اسے ہدایت دی۔ ”سردار رنجیت سنگھ نے چونکہ خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا ہے اس لئے ان پر سختی نہ کی جائے اور خصوصی رعایت برتی جائے۔“

دو روز کے بعد ہی میرے مقدمے کی پہلی پیشی فوری سماعت کی اسی خصوصی عدالت میں ہوئی جو گورنر کے حکم پر قائم کی گئی تھی۔ عدالت میں میری ملاقات ملک کے ذہین اور مشہور وکیل فضل الرحمن سے ہوئی۔ رحمان نے اسی کا ذکر کیا تھا اور ایک روز قبل مجھ سے وکالت نامے پر دستخط کرا کے بھی لے گیا تھا۔

مقدمے کی باضابطہ کارروائی شروع ہوئی۔ وکیل سرکار جو ایک عمر رسیدہ شخص تھا، اپنی نیک درست کرتا ہوا اس کٹہرے کے قریب آیا جہاں میں کھڑا تھا۔

کی آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں۔ روشن آنکھوں کے علاوہ اس کا جسم صحت مند تھا، مگر وہ موٹا نہیں تھا،
ٹھنڈے ہوئے جسم کا مالک تھا۔

میں ابھی انہی خیالوں میں غم تھا کہ عدالت برخاست کر دی گئی۔ میں نے واپسی میں رحمان سے
ایڈووکیٹ فضل الرحمن کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ شادی شدہ ہے یا کنوارا ہے؟ اس کی
دیگر مصروفیات کیا ہیں؟ اس کے کتنے بہن بھائی وغیرہ ہیں؟ میری اس پوچھ گچھ پر رحمان نے اظہار حیرت
کیا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے رحمان کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ ”وہ مجھے اچھا لگا اس لئے
پوچھا تھا۔“

مجھے فضل الرحمن کے بارے میں آئی جی رحمان سے معلوم ہوا کہ فضل الرحمن ایک معزز خاندان
سے تعلق رکھتا ہے اور ایک ریٹائرڈ کرنل کی اولاد ہے۔ عقیقہ یہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اپنے
باپ کے ساتھ سادات نگر میں رہتا ہے۔

میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا رہا اور جانے کب رحمان مجھ سے رخصت ہو کر چلا گیا۔
دوسری پیش دوسرے ہی دن تھی۔ میں گھنٹوں ایڈووکیٹ فضل الرحمن کے تصور میں کھویا رہا۔ میرا
ذہن ایک فیصلے تک پہنچنے والا تھا۔

دوسری صبح جیلر ولیم برٹ نے مجھے مطلع کیا کہ مجھ سے کچھ لوگ ملنے کے خواہش مند ہیں۔ میں
نے ملاقاتیوں کے کمرے میں آکر دیکھا۔ یہ بڑے ٹھاکر، ٹھکرائیں، گرانام سنگھ، رام سروپ اور چرنی تھے۔
عام حالات میں کسی قیدی سے یہ بیک وقت اتنے لوگوں کو ملنے نہیں دیا جاتا لیکن میرے معاملے میں
خصوصی رعایتیں برتی جا رہی تھیں۔ مجھے رام سروپ، چرنی اور گرانام سنگھ بہت اچھے لگے۔ وہ تینوں اس
وقت پولیس کی دردیوں میں لمبوس تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بقیہ لوگ بھی مجھ سے ملاقات کے متمنی
ہیں، اجازت ملنے کے بعد وہ مجھ سے ملاقات کریں گے۔ ابھی میرے لئے فکر مند تھے۔

میں نے گرانام سنگھ سے پوچھا۔ ”کو شہر کیسا لگا؟ تم خوش تو ہو؟“
وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ ”ہماری خوشی آپ کے بغیر ادھوری ہے، لیکن بہر حال ہم یہاں آکر
بہت مطمئن ہیں۔ بھگوان کی دیا ہے ہم آپ کے نام کو داغ نہیں لگنے دیں گے۔ میری ڈیوٹی کشم پر ہے۔
کل ہی میں نے ایک رشوت خور افسر کو پکڑ دیا ہے۔“

میں نے یہ سن کر اس کی بیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ ”مجھے تم لوگوں پر فخر ہے، اسی طرح ملک و قوم کی
خدمت کرتے رہو۔ اسی میں تمہاری اور سب کی بھلائی ہے۔“

پھر میں کچھ دیر تک بڑے ٹھاکر اور دوسرے لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور انہیں تسلیاں دیتا رہا کہ
مجھے جیل میں ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ تم لوگ قطعی میری فکر نہ کرو۔ وہ سب تھوڑی دیر مزید میرے
باس بیٹھے اور پھر چلتے چلتے بڑے ٹھاکر نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ ”رنجیتے! کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں
کہ تجھے بھی رہائی مل جائے؟“

”ڈاکو رنجیت سنگھ ولد ڈاکو بلیر سنگھ!“ اس نے بہ آواز بلند مجھے مخاطب کیا، پھر پوچھا۔ ”کیا
اعتراف کرتے ہو کہ تم نے ہزاروں افراد کو لوٹا اور سینکڑوں افراد کو قتل کیا؟“

وکیل سرکار کی ناگوار اور کرخت آواز سننے کے بعد میں نے بلند آواز میں اقبال جرم کر لیا۔
میرے اقبال جرم کرتے ہی وکیل سرکار کی آواز عدالت میں گونجی۔ ”یور آئر مجرم اقبال جرم کر
ہے اس کیس کو مزید مضبوط کرنے کے لئے میں عدالت سے اجازت چاہوں گا کہ گواہوں کو پیش کر سکوں
تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔“

”گواہوں کو عدالت میں پیش کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔“ جج کی آوازی سنائی دی۔
یہ کتنی عجیب سی بات تھی کہ میرے خلاف گواہی دینے والوں میں سب سے پہلا نام آئی جی رحمان
کا تھا، لیکن یہ گواہ میرے خلاف کب تھے! یہ سب کچھ تو میری مرضی کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ آئی
رحمان نے حلف اٹھایا۔ پھر اس سے متعدد سوالات کئے گئے۔ ان سوالوں کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا
میں نے متعدد قتل کئے ہیں، ڈاکے ڈالے ہیں اور امیروں کے لئے عذاب الہی بنا رہا ہوں۔ رحمان کے
ڈیوڑا اور دوسرے گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ میں نہایت بے دلی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتا رہا
سب سے آخر میں وکیل سرکار نے عدالت کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو میں نے گورنر کے نام تحریر کیا تھا۔
نے اس خط میں اپیل کی تھی کہ میرے گناہوں کی پاداش کے طور پر مجھے پھانسی دے دی جائے۔ اس
بعد وکیل سرکار کہنے لگا۔ ”یور آئر یہ تمام چکر چلانے کا اصل مقصد اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے کہ
نے اتنی آسانی سے اقبال جرم کیوں کر لیا، جبکہ وہ ایک بدنام زمانہ ڈاکو اور قاتل ہے، اس نے گور
صاحب کو ایسا خط کیوں لکھا! یقیناً ان تمام باتوں سے یہ چالاک مجرم، حکومت اور انصاف کی ہمدردی
حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

مجھے اس وکیل سرکار کی یہ بات نہایت ناگوار گزری۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، میرا وکیل
کھڑا ہوا جواب تک خاموش بیٹھا تھا۔ وہ تیز آواز میں بولا۔

”پوائنٹ آف آرڈر، یور آئر! وکیل سرکار کو یہ حق نہیں کہ وہ میرے موکل کی دیانت اور سچائی
حملہ کریں۔ میں اس بات پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ جب کہ میرا موکل خود اقبال جرم کر چکا ہے اور
عدالت سے رحم کا طلبگار بھی نہیں تو اس کی نیت پر اس طرح حملہ کرنا شرافت اور سچائی کے خلاف ہے
میں معزز عدالت کی وساطت سے وکیل سرکار سے کہوں گا اور پُر زور الفاظ میں کہوں گا کہ وہ اپنے
واپس لیں!“

اس سے پہلے کہ جج کچھ کہتا، وکیل سرکار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے الفاظ واپس لے لئے۔
مجھے اس نوجوان وکیل کی یہ ادا بہت بھائی۔ اس کی آواز میں عجیب مضامین تھی۔ میں اس
اور اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ بھولا سا معصوم چہرہ، گورا رنگ، رخساروں پر غالباً روزانہ
کرنے کے سبب ہلکی سی نیلاہٹ، کالے کالے بڑے بال، ریشم کی طرح اس کے ملائم بال بار بار پیشانی
پڑتے اور وہ ایک خفیف سے جھٹکے سے انہیں پیچھے کر دیتا۔ اس کی ہر ادا خوب تھی۔ قد دراز تھا اور

ساتھ ایک عمرگزاری تھی! وہ تو صرف اس کے جسم کے حوالے سے مجھے جانتے پہچانتے تھے کہ اب میں چھوڑنے کا قصد کر چکا تھا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس جسم میں اب ایک جن زاد علیالیش ہے!

ایڈووکیٹ فضل الرحمن آج بھی تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ وکیل سرکار بار بار حسب عادت اپنی ٹینک پر بجا رہا تھا۔ آخر کار فیصلہ سنانے کا وقت آ ہی گیا۔ جج نے ایک مرتبہ اپنی چکنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا رزرا کھٹکا کر اپنا گلا صاف کیا۔

”مجرم رنجیت سنگھ نے جس ہمت اور حوصلے نیز قربانی کا ثبوت دیا ہے، عدالت اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔“ جج نے اپنی بھاری آواز میں فیصلہ سناتا شروع کیا۔ ”اس نے پولیس اور پولیس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ جو سلوک اور رویہ اپنی پناہ گاہ میں روا رکھا، عدالت اس کے لئے بھی مجرم کی شکر گزار ہے۔ مجرم نے حکومت کی نظر میں پولیس کی پوزیشن جس طرح بالکل واضح کر دی، وہ بھی قابل داد عمل ہے۔ مجرم نے جس طرح اپنے ساتھیوں کی ذنیت بدل کر انہیں ایک ذمے دار اور پرامن شہری بنا دیا، یہ بھی اس کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ مجرم نے سرکاری خزانے میں جو اضافہ کیا اور جس دیانت کا ثبوت دیا، حکومت اس کے لئے مجرم کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مجرم نے بغیر کسی دباؤ کے اپنے آپ کو جس طرح قانون کے سپرد کر کے اقبال جرم کیا، وہ ایک مثالی اور یادگار کارنامہ ہے۔ عدالت اس باب میں بھی مجرم کو قابل تقلید اور مثالی سمجھتی ہے، لیکن قانون ہر حال میں قانون ہے! یہ عدالت اسی لئے کافی غور و خوض کے بعد مجرم کے ساتھ خاص رعایت اور اس کے کارناموں کو مد نظر رکھتے ہوئے مجرم کو سزائے موت کی بجائے عمر قید کی سزا دیتی ہے۔“

میں نے گزشتہ رات اپنے مستقبل کے فیصلے کو عدالت سے منسلک کر دیا تھا، یعنی عدالت جو فیصلہ سنائے گی، اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے اگلا قدم اٹھانا چاہئے۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ عدالت میرے ساتھ اتنی رعایت کرے گی۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا ہوگی۔ سزائے موت سنائے جانے کی صورت میں میرے پاس صرف اور صرف ایک راستہ تھا کہ میں وہ جسم چھوڑ دیتا۔ اس کے لئے میں پہلے ہی سے اگلے جسم کا انتخاب کر چکا تھا۔ میرا نیا جسم ایڈووکیٹ فضل الرحمن کا ہوتا۔ میں یہ آواز بلند کرتا کہ مجھے عدالت کا فیصلہ منظور نہیں اور پھر ”جے بھوانی“ کا نعرہ لگا کر رنجیت سنگھ کے جسم کو بھجوز کے وکیل فضل الرحمن کے جسم میں داخل ہو جاتا۔ عدالت سے میں بہ حیثیت رنجیت سنگھ جیل واپس نہ جاتا کیوں کہ اس طرح مجھے مطلوبہ نیا جسم حاصل نہ ہو پاتا۔ گزشتہ رات ہی کو میں اپنی چشم تصور سے سب کچھ دیکھ چکا تھا۔

جب میں عدالت کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیتا تو سب لوگ حیرت زدہ رہ جاتے اور جج ”آرڈر“ آرڈر“ کے بعد کہتا۔ ”عدالت برخاست کی جاتی ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ لوگ اٹھتے عدالت ”جے بھوانی“ کے نعرے سے گونج اٹھتی۔ سامنے کھڑے ہوئے وکیل فضل الرحمن کے جسم کو اسی کے ساتھ جھٹکا سا لگتا اور مجھے بھی۔ عدالت میں بالکل جج جاتی اور اٹھ کر جاتا ہوا جج ٹھہر جاتا۔ لوگوں کے سامنے مشہور ڈاکو رنجیت سنگھ کا مردہ جسم کمرے میں پڑا ہوتا۔ میں

اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا۔ ”ابھی تو مقدمہ چل رہا ہے، کیا خبر بھگوان آپ سب! سن ہی لے!“

اس روز عدالت میں میرے وکیل کے بولنے کی باری تھی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنا شروع کیا۔ ”یور آنرا! مجھے اپنے موکل کی تائید میں زیادہ لمبی چوڑی تقریر نہیں کرنا۔ مجھے محض یہ عرض کرنا ہے، فاضل عدالت میرے موکل کے اقبال جرم کو مد نظر رکھے کہ اس نے بغیر کسی دباؤ یا جبر کے اقبال جرم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنی پچھلی زندگی کسی خوف یا پولیس سے بچنے یا کسی سازش کے تحت ترک نہیں کی بلکہ اس نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر قانون اور انصاف کا ساتھ دیا ہے۔ یہی نہیں اس نے اپنے سینکڑوں ساتھیوں کو بھی قانون کا احترام کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس شخص نے جو بہت بڑا قاتل اور ڈاکو مشہور ہے، ہماری پولیس، اس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ کیسا بے مثال رویہ رکھا، اس کا ثبوت خود آئی جی رحمان، ڈی آئی جی ڈیوڑا اور سینکڑوں پولیس کے جوان ہیں۔ وہ قانون اور انصاف کے مخالف ہونے کے باوجود بھی اس شخص کی دیانت، اخلاق اور صداقت کی قسم کھا سکتے ہیں۔ میں اپنی طرف سے کوئی گواہ پیش نہیں کروں گا اس لئے کہ وکیل سرکار نے جو گواہ عدالت میں پیش کئے، وہی میرے گواہ بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بیانات میں صاف صاف رنجیت سنگھ کی سچائی اور بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ میں آخر میں معزز عدالت سے اپنے موکل رنجیت سنگھ کے لئے رحم کی اپیل کرتا ہوں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ عدالت اسے باعزت بری کر دے تاکہ دوسرے قانون شکن ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کی ہمت بھی بڑھے اور وہ بھی خود کو قانون و انصاف کے حوالے کرنے سے نہ ڈریں۔ اس سے ملک میں ایک اچھی مثال قائم ہوگی۔“

مجھے اس نوجوان وکیل کے الفاظ سن کر عجیب سا احساس ہوا۔ میرے اندر جینے کا حوصلہ جیسے بڑھ گیا۔ میں جو سہیلا کی موت کے بعد بکھر سا گیا تھا جیسے سمٹنے لگا۔ اداسی اور مایوسی کے بادل دھیرے دھیرے چھٹنے لگے۔ آئندہ روز تک کے لئے عدالت پھر برخاست کر دی گئی۔ کل فیصلے کا دن تھا۔

رات بھر مجھے نیند نہ آئی اور میں اٹھ اٹھ کر ٹھٹھا رہا۔ اس عرصے میں جیلر ولیم برٹ کی دفعہ میرے پاس آیا۔ وہ اپنی نوٹی پھونی اردو میں لطیفے سناتا کہ میرا جی بہلا رہا تھا۔ میں ساری رات جاگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ صبح اس وقت ذرا میری آنکھ لگی جب جیل گارڈ نے پانچ بج رہا تھا۔ میں اس وقت بیدار ہوا جب آئی جی رحمان آیا۔ اسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ آپ تیار ملیں گے۔“ رحمان نے کہا۔ ”مگر یہاں آکر مجھے دلیم سے معلوم ہوا کہ آپ رات بھر سو نہیں سکے۔ آخر آپ اتنے فکر مند کیوں ہیں! خدا نے چاہا تو آپ صاف بری ہوں گے۔ ہم سب کی دعاؤں آپ کے ساتھ ہیں۔“

رحمان کو میں کیا بتاتا کہ میری فکر مندی کا اصل سبب کیا ہے! میں بہر حال اس کے ساتھ عدالت پہنچ گیا۔

سامنے بیٹھے ہوئے بڑے ٹھاکر، گرنام سنگھ وغیرہ فکر مند اور طول نظر آ رہے تھے۔ آخر میں نے ان

جاتی۔ اب نہیں تو کچھ عرصے بعد میرے چاہنے والوں کو وہ صدمہ ضرور پہنچتا جس سے میں نے فی الحال انہیں بچا لیا تھا۔ جیل سے میرے فرار کا مطلب یقینی طور پر رنجیت سنگھ کی موت ہوتا۔ فرار ہونے کی غرض سے میں جیسے ہی اس کے جسم سے نکلتا، وہ مردہ ہو جاتا۔

”آپ کسی ایسی خطرناک جیل میں تبادلہ کیوں چاہتے ہیں؟“ رحمان اب مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں غالباً تمہیں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ یہاں رہا تو تم لوگ مجھ سے ملنے آتے رہو گے اور..... اور میں کبھی اپنے ماضی کو بھول نہیں سکوں گا۔“

رحمان سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا۔ ”نہیک ہے اگر..... اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو یہ..... یہ کام جلد ہو جائے گا۔“

”لیکن اسی کے ساتھ تمہیں مجھ سے ایک وعدہ بھی کرنا پڑے گا۔ جیتے جی تم اس بات کو راز رکھو گے کہ میری مرضی پر یہاں کی جیل سے مجھے کہیں اور بھیجا گیا ہے۔“

رحمان نے وعدہ کر لیا۔ پھر اگلے ہی ہفتے ہی آخری بار اپنے جاں نثاروں سے ملا۔ ان میں بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن بھی شامل تھے۔ انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ روز ہی میرا تبادلہ ہونے والا ہے۔ صرف مجھے اور رحمان کو اس کا علم تھا یا پھر جیل کے حکام کو۔ یہ گویا ان لوگوں سے میری آخری ملاقات تھی۔

مجھے رحمان سے ہٹا چل چکا تھا کہ میرا تبادلہ وہاں سے آگرہ جیل میں کیا گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بڑے ٹھاکر، ٹھکرائن، گمرنام سنگھ وغیرہ اپنی محبت سے مجبور ہو کر وہاں تک بھی میرا پیچھا کریں گے اور مجھ سے ملنے آئیں گے۔ میں نے اسی لئے وہاں پہنچنے ہی فوری طور پر فرار ہونے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پھر یہی ہوا۔ مجھے آگرہ جیل آئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن مجھ سے ملنے پہنچ گئے۔

”تُو نے بتایا کیوں نہیں رنجیت کہ تجھے یہاں بھیجا جانے والا ہے؟“ بڑے ٹھاکر کے لہجے میں شکایت تھی۔

”مجھے خود معلوم نہیں تھا بابا!“ میں نے مصلحت کے پیش نظر جھوٹ بول دیا۔ ”دراصل لمبی سزائیں کاٹنے والوں کے لئے کچھ خاص جیلیں ہیں۔ انہی میں سے ایک جیل یہ ہے۔“

”رحمان نے یہ بات مجھے بتادی تھی۔“ بڑے ٹھاکر نے کہا۔ ”بڑی مشکل سے ملاقات کی اجازت ملی ہے۔ رحمان نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہاں کی طرح یہاں روز روز ملاقاتیں نہیں ہو سکتیں اور نہ وہاں کی سی رعایتیں یہاں ہیں۔ سنا ہے یہاں پر قیدیوں کی سخت نگرانی ہوتی ہے۔ تجھے کوئی تکلیف تو نہیں یہاں؟“

”نہیں بابا!“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ کو میری طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سختیاں ان لوگوں پر یہاں کی جاتی ہیں جو شریک ہیں اور دنگ فساد کرتے رہتے ہیں، جیل کے قواعد و ضوابط کا خیال نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے مجھے کسی سے لڑنے بھڑنے یا ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے کہیں کی فائل بھی جیل حکام کو بھیجی گئی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ میں نے خود گرفتاری دی تھی اس لئے

یعنی جن زاد علیا لیش، اس وقت تک وکیل فضل الرحمن کے جسم میں اتر چکا ہوتا۔ اس پر ٹھاکر یقیناً میرا لے کر چل اٹھتا۔ وہ اور گمرنام سنگھ بھی ششدر رہ جاتے کہ ابھی کچھ دیر پہلے تو رنجیت سنگھ ٹھیک تھا، یہ ایک دم کیا ہوا؟ ٹھاکر زار و قطار روتا اور میں جو اس وقت وکیل فضل الرحمن کے جسم میں ہوتا، تسلیاں دے رہا ہوتا۔ رحمان اور ڈیوسو بھی یہ منظر دیکھ کر ضبط نہ کر پاتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ پھر میں خود ہی اپنے جسم کے قریب جا کر اسے دیکھتا اور میری لاش طبی معاینے کے ہسپتال روانہ کر دی جاتی۔ اس کے بعد شاید اسی روز اپنے جسم کو کاٹھا دیتا۔ ایک مصروف وکیل ہو کے باوجود میں اس جنازے میں ضرور شریک ہوتا۔ روتے روتے ٹھاکر، ٹھکرائن اور میرے دیگر جاں نثار ساتھیوں کا برا حال ہو جاتا۔

رات کو میں نے اپنی چشم تصور سے جو مناظر دیکھے تھے، اب عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد ان حقیقت کا روپ دینے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اپنے پیاروں، اپنے محبت کرنے والوں کو اپنا شدید صدمہ پہنچانا اب ضروری نہیں تھا۔ ظاہر ہے مجھے جیل میں تو رہنا نہیں تھا۔ رہا وہاں سے ملنے سوال تو مجھے کون روک سکتا تھا! رنجیت سنگھ کے جسم کو وہیں چھوڑ کر میں کسی بھی اور جسم کو ذریعہ جیل سے نکل آتا۔ اب اس کے لئے جلد بازی کی ضروری نہیں تھی۔ مجھے ابھی نئی صورت حال میں سی باتوں پر غور کرنا تھا۔

عدالت سے مجھے پھر جیل بھیج دیا گیا۔ میری زندگی بسر حال بچ گئی تھی اس پر بھی خوش تھے۔ میرے ساتھیوں اور بھی خواہوں کو کوئی ملال تھا تو صرف یہ کہ میں ان کی طرح اب آزاد فضا میں نہیں لے سکتا۔ پھر چند روز اسی طرح گزر گئے۔ میرے وفادار مجھ سے جیل میں آ کر ملتے رہے۔ دوران ایک روز رحمان مجھ سے ملنے آیا تو میں نے پہلے سے طے شدہ ایک منصوبے کے مطابق اس کو کہا۔ ”کیا اس جیل سے مجھے ملک کی کسی اور دور دراز جیل میں منتقل نہیں کیا جاسکتا؟“

”وہ کیوں؟“ رحمان حیرت زدہ ہو کر پوچھنے لگا۔ ”کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں میرا دل چاہتا ہے کہ میرا تبادلہ یہاں سے کسی ایسی جیل ہو جائے کہ جہاں کوئی میرا شناسا نہ ہو، کوئی جس شر میں مجھ سے ملنے نہ آ سکے میں..... میں اپنے کو بھول جانا چاہتا ہوں رحمان!“

”عجیب خواہش ہے آپ کی۔“ وہ بدستور حیران تھا۔

”تم یہ بتاؤ، ایسا ممکن ہے یا نہیں؟“

”ممکن کیوں نہیں۔ یوں بھی عموماً عمر قید پانے والے خطرناک مجرموں کو اس جیل میں نہیں جاتا۔ لمبی سزائیں کاٹنے والے مجرم مخصوص جیلوں میں رکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے انتظامات بہت ہیں۔ وہاں سے فرار تو ممکن ہی نہیں!“ رحمان نے بتایا۔

رحمان کی اس بات پر میں دل ہی دل میں ہنسا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ جیل سے فرار ہونے کے لئے تو میں یہاں سے تبادلہ چاہتا تھا۔ یہاں رہتا تو فوری طور پر رنجیت سنگھ کے انتقال کی خبر

وہ میرا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ دوسروں کی طرح مجھ پر کڑی نگرانی نہیں رکھتے۔ آپ کو مجھ سے ملنے کے لئے اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں۔ کبھی سال دو سال میں ایک آدھ چکر لگایا کریں تو بھی کافی ہے۔“

”ہمارے لئے تو یہی بہت ہے کہ تو زندہ ہے رنجیت!“ یہ کہتے ہوئے بڑے ٹھاکر کی آواز بھرا گئی۔

”جیتے جی تو تیری صورت دیکھنے آتے ہی رہیں گے۔“

کچھ دیر کے بعد ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تو بڑے ٹھاکر اور ٹھکرائن مجھے دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ اسی ملاقات میں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ گرنام سنگھ کے اصرار پر وہ دونوں اب اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اگلے ہی مہینے گرنام سنگھ بھی مجھ سے ملنے آیا اور میں نے اسے بھی اپنی طرف سے مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔

میں اب قیدیوں سے کھل مل گیا تھا۔ خاص طور پر اب میں ایسے قیدیوں سے مراسم بڑھاتا جنہیں کچھ ہی عرصے کے بعد رہائی ملنے والی ہوتی۔ انہی میں سے ایک بلونت سنگھ تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گئی۔ وہ راجپوت تھا۔ بھاری بھر کم اور چوڑے سینے والے بلونت کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور عادات و اطوار کی وجہ سے بلونت مجھے بہت پسند آیا اور اس سے میری دوستی ہو گئی۔ عموماً وہ لوگوں سے کم ہی بات کرتا، خاموش طبع اور گہرا آدمی تھا۔ مجھ سے بھی وہ جلد نہ کھلا۔ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا چل سکا کہ اسے پندرہ سال کی سزا ہوئی تھی۔ جیل میں نیک چلتی کے سبب مختلف موقع پر اس کی سزا میں تخفیف ہوتی رہی اور یہ سزا صرف گیارہ سال کی رہ گئی۔ کچھ ہی دن بعد اسے رہائی ملنے والی تھی۔ میں نے جیل سے فرار ہونے کے لئے بلونت سنگھ ہی کا انتخاب کیا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں اس کا جسم کچھ دن کے بعد چھوڑ دوں گا یا فوری طور پر کسی اور جسم میں داخل ہو جاؤں گا۔ اس سے صرف یہ ہوتا کہ بلونت سنگھ مارا جاتا۔ کسی نہ کسی آدم زاد کو تو میرے لئے یہ قربانی بہر حال دینا ہی تھی تو پھر وہ بلونت سنگھ سی!

بلونت سنگھ کے بارے میں کچھ باتوں کا علم تو مجھے خود اسی کی زبانی ہوا اور کچھ باتیں میں نے اس کا ذہن پڑھ کر معلوم کیں۔ بلونت سنگھ کا ذہن پڑھتے ہوئے میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مجھ میں دوسروں کا ذہن پڑھنے لینے کی جو پراسرار اور حیرت انگیز قوت پیدا ہو گئی تھی، جلد ہی چھن جائے گی۔ اس کی وجہ کیا ہوئی؟ اس سوال پر بعد میں بہت غور کرنے کے بعد میں ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکا کہ جسم کی تبدیلی کے ساتھ دماغ بھی تبدیل ہوتا ہے اور ہر دماغ یکساں صلاحیت کا مالک نہیں ہوتا۔ میری یہ پراسرار قوت شاید اسی لئے جسم کی تبدیلی کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ آئندہ پھر یہ قوت میرے اندر بیدار ہوتی یا نہیں، مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا۔

میں نے بلونت سنگھ کے اوراق ماضی کا مطالعہ کیا تو مجھ کو ایک ایک بات کا علم ہو گیا کہ اسے اتنی لمبی سزایوں ہوئی تھی!

بلونت سنگھ کے باپ کا نام بھاری سنگھ تھا۔ ایک دوپہر کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے بیٹیں سالہ بیٹے

بلونت کو اعتماد میں لینے کی خاطر کہا۔ ”بیٹا بلونت! راجپوت خاندان کی عزت ایک بے غیرت کے ذریعے ختم نہیں ہونا چاہئے۔ اس بھولے ناتھ نے تلسی رام کا سارا لے رکھا ہے۔ بھولے ناتھ کو تلسی رام عدالت میں جانے کے لئے اکسارہا ہے۔“

بلونت سنگھ نے بغور اپنے باپ کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر بے چینی نظر آ رہی تھی۔ بلونت سے بڑا نواب سنگھ تھا۔ دو کڑیل جوان بیٹوں کے ہوتے باپ کو کیوں پریشانی ہے، بلونت سمجھ نہ سکا۔ اس نے دھبے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔ ”باپ! کیا تلسی رام کا سر جھکا ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ فکر نہ کریں۔ میں اور بڑے بھائی اسے دیکھ لیں گے۔“ یہ کہہ کر بلونت کھڑا ہو گیا۔ بھاری سنگھ نے اسے غیر یقینی سی نظروں سے دیکھا۔

اپنے باپ سے بلونت کو اکثر اختلاف رہتا تھا۔ پانچ بیکھے زمین سے بہ مشکل گھر کا خرچ چلتا تھا، مگر اس کا باپ ہمیشہ بڑے ٹھٹھاٹ باٹ سے رہنے کا عادی تھا۔ وہ اس طرح اپنا رعب رکھتا تھا جیسے گاؤں کا مالک ہو۔ بلونت کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس کا باپ اس قدر فضول خرچیوں کے لئے روپیہ کہاں سے لاتا ہے! اس کے باپ کی عزت اور مرتبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رات کی تاریکی میں بھاری سنگھ سے کچھ پراسرار لوگ ملنے آتے ہیں۔ وہ لوگ آتے تو بہت دیر تک اس کے باپ کے کمرے میں سرگوشیاں ہوتی رہتیں۔ معلوم نہیں سرگوشیوں میں وہ کیا باتیں کرتے تھے۔

ایک دن بلونت نے اپنے باپ سے پوچھ ہی لیا۔ ”یہ ہمارے گھر راتوں کو کون لوگ آتے ہیں باپ؟“

بیٹے کی مشتعل نظروں کو بھاری سنگھ پی گیا اور جواب دیا۔ ”بیٹے! وہ میرے دوست ہیں۔“

باپ کے اس جواب سے بلونت مطمئن تو نہ ہوا مگر مزید پوچھ کچھ نہیں کی۔

اپنے باپ کے یار دوست، بلونت کو اچھے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ خراب صحبت سے بلونت کو پہلے ہی نفرت تھی۔ اس کا بڑا بھائی نواب سنگھ اپنی راجپوتی کا رعب ڈالنے کے لئے کھیزا رانخور گاؤں میں ہنگامے کرتا پھرتا تھا، مگر بلونت ایک نیک، بہادر اور سچے راجپوت کی طرح لوگوں کے کام آتا۔ برہمنوں کو وہ کبھی خود سے کمتر خیال نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے علم پر اسے یقین تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ راجپوت بہادر ہوتے ہیں تو برہمن بھی ذہین ہوتے ہیں۔ ملک کو دونوں کی ضرورت ہے۔

پھر جب بلونت کو اپنے باپ کے دھندے کا علم ہوا تو اس کے دل کو صدمہ سا ہوا کہ میرے باپو اسکھروں کے ساتھی ہیں! وہ چوری کا مال ٹھکانے لگاتے ہیں!

اس مسئلے پر باپ بیٹے کے درمیان دو ایک بار تکرار بھی ہوئی۔

”ابھی تمہارا خون گرم ہے۔ تمہارے اندر سمجھ نہیں۔“ بھاری سنگھ نے ایک روز تکرار کے دوران بلونت سے کہا۔ ”اسکھنگ تو ایک کاروبار ہے۔ تم خود ہی سوچو کہ صرف پانچ بیکھے زمین سے ہم کس طرح ٹھٹھاٹ کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں!“

”ہمیں ایسے ٹھٹھاٹ باٹ کی ضرورت نہیں۔ جتنی چادر ہے ہمیں اتنے ہی پاؤں پھیلانا چاہئیں۔“

بلونت نے صاف صاف کہہ دیا۔
 ”تو کیا راجپوت ہو کر بھیک مانگو گے؟“ ہماری نگہ گرم ہو گیا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ راجپوت ہمیشہ حکومت کرتے رہے ہیں۔ لڑکرو اور چھین کر قبضہ کرنا ہر بہادر راجپوت کا دھرم ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ گاؤں والے میرا کتنا احترام کرتے ہیں۔ جیسے میں ہی ان کا آن داتا ہوں۔“
 باپ کے سامنے بلونت کو چپ ہونا ہی پڑا۔ اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی اس میں بہت بھی نہیں تھی۔ اس موقع پر بلونت کو یہ خیال ضرور آیا کہ اس کے باپ نے اسے پولیس کے محکمے میں بھرتی ہونے سے کیوں منع کیا تھا!

ایک پولیس افسر نے کبھی ہماری نگہ سے کہا تھا۔ ”ٹھاکر! اپنے بلونت نگہ کو ایک بار پولیس کی تربیت حاصل کر لینے دو، پھر دیکھنا ایک دن یہ کتنا بڑا افسر بن جائے گا!“
 پولیس افسر کی یہ بات سن کر ہماری نگہ نے منہ بنا لیا تھا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو“ راجپوت کا بیٹا اور پولیس کی وردی پن کر دوسروں کے سامنے جھکے!“
 اس گنگ کی کماٹی سے ہماری نگہ سود کا کام کرتا تھا۔ وہ لمبے سود پر کسانوں سے ان کے کھیت یا بھجراتاج سے بھرے ہوئے کھلیان چھین لیتا۔ اس کا کچھ رعب ہی ایسا چھایا ہوا تھا کہ اس کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو جاتیں، مگر بھولے ناتھ نے مقابلہ کیا۔ ہماری نگہ اس کا مکان ہتھیانے کے چکر میں تھا۔ بھولے ناتھ نے برہمن تلسی رام کا سہارا لیا۔

”مجھے بچاؤ! ٹھاکر! میرا گھر چھین لینا چاہتا ہے۔“ بھولے ناتھ نے تلسی رام سے فریاد کی۔
 تلسی رام تو پہلے ہی ہماری نگہ سے خار کھاتا تھا اسے موقع مل گیا۔ ”مت گھبرا! تو رقم ادا نہ بھی کر پائے تو تجھ سے تیرا مکان کوئی بھی نہیں چھین سکتا!“ تلسی رام پر زور آواز میں بولا۔ ”وہ راجپوت اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا، میں تیرے ساتھ ہوں۔“
 اور اس دن سے گاؤں کی چودھراہٹ کے لئے تلسی رام اور ہماری نگہ میں سرد جنگ چھڑ گئی۔ ہماری نگہ کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے سوچا، اگر بھولے ناتھ میرے خلاف عدالت میں جائے گا تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے۔ بہت ہو چکا اب اس برہمن کو ٹھیک کرنا ہی پڑے گا جو اندر اندر آگ بھڑا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اس نے بلونت اور نواب نگہ کے سامنے بھی کیا، مگر تلسی رام بھی کسی کم نہ تھا۔ سرمایہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بااثر بھی تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اس کے رشتے والے بھی تھے۔ ادھر ہماری نگہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو تلسی رام سے نبرد آزما ہونے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔
 شام کو بلونت گھر لوٹا تو اپنے باپ کو بتایا۔ ”باپو! میں پولیس تھانے ہو آیا ہوں۔“
 ہماری نگہ چونک اٹھا۔ ”ہاں تو کس لئے گیا تھا؟“

”میں رانفل کے لائنس کے لئے گیا تھا۔“ بلونت نے جواب دیا۔ ”میرے اور بڑے بھائی کے لائنس مل جائیں گے۔ دو رانفلیں خریدنے کی تجویز ہے۔“
 دونوں طرف تیاریاں ہونے لگیں۔ گاؤں پر لڑائی کا خطرہ منڈلانے لگا۔ بلونت کا خیال تھا کہ

رانفل استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس بات کا پتا چلتے ہی برہمن ڈر کر اس کے باپ کی راہ سے ہٹ جائے گا، مگر تلسی رام طاقت کی بجائے داغ کو استعمال کرنے لگا۔ پڑوسی گاؤں مہوا میں ڈاکہ پڑا تو اس نے پولیس کو بھڑکایا۔ ”یقیناً اس ڈاکے میں بلونت نگہ کا ہاتھ ہے۔ وہ اسی لئے رانفل لے کر چکر کاٹا نظر آتا ہے۔“
 بلونت کو پولیس نے بلوایا۔ الزام مچ کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا کہ ڈاکے میں اسے لوٹ کیا جا رہا ہے۔

”کس نے میرا نام لیا؟“ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔
 جواب ملا۔ ”تلسی رام نے۔“
 بلونت کی آنکھوں سے غصے کے سبب چنگاریاں سی ٹپکنے لگیں۔ اس نے سوچا کہ شاید تلسی رام کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اس نے کہا۔ ”میں ڈاکے کی رات تمہارے ایک پولیس والے کے یہاں تھا، پوچھ لو اس سے۔“

بلونت پر ڈاکے کا الزام غلط ثابت ہوا۔ اب بلونت، تلسی رام کا کٹر دشمن ہو گیا۔ اس نے سوچا، اگر میں، تلسی رام کے خاندان کی بنیاد نہ اٹھیز دوں تو میرا نام بھی بلونت نگہ نہیں۔ میں راجپوت کا بچہ ہوں۔ الزام تراشی نے اسے ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ تلسی رام کو یقیناً یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بلونت کو نہیں ایک آتش فشاں کو جھیر رہا ہے۔

نواب نگہ اور بلونت نگہ، دونوں بھائیوں کا ایک ایک بیٹا درشن اور جسونت، ان کے علاوہ دوسرے دس بارہ جوان جمع تھے۔ رانفل استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وجہ یہ کہ پولیس فوری طور پر ہوشیار نہ ہو جائے۔ لاٹھیاں، چھریاں اور تلواریں لے کر سب تیار ہو گئے۔
 تلسی رام کسی ایسی ممکنہ گھڑی کے لئے ہمیشہ چوکنا رہتا تھا۔ وہ اکیلا کس باہر نہ جاتا۔ دو چار رشتے دار اور مسلح ساتھی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے۔ وہ ایک قریبی گاؤں سے زمین کا سودا کر کے لوٹ رہا تھا۔ تلسی رام بیل گاڑی میں تھا اور بیل گاڑی کے آگے دیال نگہ گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ تلسی رام کا وفادار ساتھی تھا۔ اس وقت وہ مسلح تھا۔ مضبوط بازو، چوڑے شانے، بڑی بڑی آنکھیں اور پیشانی پر زخم کا نشان! اس کا نام دیال نگہ ضرور تھا، مگر فطرتاً وہ ظالم تھا۔ وہ کئی قتل بھی کر چکا تھا، مگر تلسی رام کے اثر اور دولت کے سبب اس پر آج تک نہ آئی تھی۔ دیال نگہ کی طاقت اور رعب ہی کی وجہ سے تلسی رام بے خوف رہتا تھا۔ بیل گاڑی میں سات آٹھ آدمی سوار تھے۔

بیل گاڑی کا ایک پیہر اچانک کچھڑ میں پھنس گیا۔ چار پانچ آدمی نیچے اتر آئے۔ تلسی رام اندر ہی بیٹھا رہا۔

پچاس گز دور بڑکے ایک درخت کی آڑ میں بلونت اور نواب نگہ اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ بلونت، نواب نگہ اور درشن گھوڑوں پر تھے، باقی لوگ پیدل تھے۔ تلسی رام کی مخصوص بیل گاڑی کو انہوں نے پھان لیا۔

”بڑے بھائی! تیل گاڑی کا پیسہ بچھڑ میں پھنس گیا ہے شاید۔ کیا ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مر اور ہو جائیں؟“ بلونت بولا۔

”پہلے ان لوگوں کو کچھ دور اور پیدل آنے دو، پھر ہم گھوڑے دوڑائیں گے۔“ نواب سنگھ نے جواب دیا۔

بلونت نے اپنے بڑے بیٹے جسوت کو آگے کیا۔ جسوت ابھی نوخیز و نو عمر ہی تھا، مگر اس کے بازو میں لاشی تھی۔ وہ اس کم عمری اور نوجوانی کے باوجود لاشی چلانا خوب اچھی طرح جانتا تھا اور آج اس کا پہلا عملی امتحان تھا۔ راجپوت اپنے بچوں کو بچپن ہی سے فن حرب و ضرب کی تربیت دیتے تھے۔

سب سے آگے چلتے ہوئے نوجوان بیٹے کو دیکھ کر بلونت کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ جس طرح وہ اپنے باپ کا لاڈلا تھا اسی طرح جسوت اس کا لاڈلا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا؟ بلونت کو لمحے بھر کے لئے خیال آیا تو اس کے لہو کی گردش تیز ہو گئی۔

آٹھ دس افراد کا گروہ دیکھ کر دیال سنگھ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے دوسروں کو بھی ہوشیار کر دیا۔ ”جو لوگ اس طرف آرہے ہیں۔ غالباً وہ راجپوت ہیں اور مسلح ہیں۔“

وہ بھی تیل گاڑی میں موجود ہتھیار لے کر تیار ہو گئے، لیکن تلسی رام اندر ہی بیٹھا رہا۔ ”ہم سنبھال لیں گے، تمہارا بال بھی بیکانہ ہو گا۔“ دیال سنگھ نے تلسی رام کو تسلی دی پھر اس کی گرفت بھالے پر مضبوط ہو گئی جو دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کی نگاہیں بلونت کو تلاش کر رہی تھیں۔

آنے والے قریب ہوتے جارہے تھے۔ آٹھوں افراد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بڑھ رہے تھے۔ تلسی رام کے ساتھی ان پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں پہلے کون کس پر دار کرے!

”جلد بازی نہ کرنا!“ دیال سنگھ نے ہاتھ بلند کر کے کہا۔ ”پہلے میں خود ان میں سے دو تین کو ٹھکانے لگاؤں گا!“

پھر دیال سنگھ نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور دوسرے ہاتھ میں بھالا اٹھایا۔ گھوڑا پیچھے دوڑنے پر الف ہو گیا۔ معاً دیال سنگھ نے لگام کو ڈھیل دی۔ گھوڑا پوری قوت سے ہنسا کر دوڑا۔ بلونت کے ساتھی ہوشیار ہو گئے اور بھیڑتے ہوئے گھوڑے کی راہ سے ہٹ گئے۔ اس پر بھی دیال سنگھ کے اٹھے ہوئے بھالے کی اتنی ایک شخص کے شانے میں گھس گئی۔ دیال سنگھ جوش میں گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس نے دوبارہ حملہ کرنے کے لئے گھوڑے کی لگام پھر کھینچی۔ گھوڑا گھوم گیا۔ دیال سنگھ نے بھالے پر گرفت مضبوط کر کے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ بھالے کی خون آلود انی سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ دیال سنگھ نے بلونت کے نوجوان بیٹے پر نظریں جمائیں جو لاشی سنبھالے آگے بڑھ رہا تھا۔ دیال سنگھ نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے جسوت کی گردن کا نشانہ لیا۔

اسی لمحے پیچھے سے کوئی چیخ اٹھا۔ ”جسوت! خبردار۔“

بلونت کی چیخ نے بیٹے کو ہوشیار کر دیا۔ دیال سنگھ کسی تند و تیز جھکڑ کی طرح اپنے گھوڑے پر جسوت کی طرف لپک رہا تھا۔ جسوت نے جھک کر دیال سنگھ کا دار بیکار کر دیا۔ دیال سنگھ کا بھلا زمین میں گر گیا۔ بھالے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عین اسی وقت پیچھے سے بلونت اپنے ہاتھ میں برہنہ تلوار لہراتا ہوا دیال سنگھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا دار بچانے کے لئے دیال سنگھ قلابازی کھا کر گھوڑے کی پشت پر لٹ گیا، لیکن بلونت کی تلوار اس کی پہلی میں چرک لگاتی ہوئی ایک بار پھر بلند ہوئی پھر اس سے پہلے کہ بلونت اس پر دوسرا وار کرتا، وہ گھوڑے سے کود گیا اور زمین میں گرنا ہوا بھالا اپنے قبضے میں کر لیا۔ اسی کے ساتھ وہ سامنے سے جھپٹتے ہوئے بلونت کے سامنے ڈٹ گیا۔

پہلا وار چونکے کے بعد بلونت جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے جوش میں گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا رکا اور اسی لمحے بلونت پر دیال سنگھ بھالاتا بھلاتا بھلاتا تلوار کا دار بھالے کی لاشی پر لگا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ لاشی دو ٹکڑے ہو گئی۔ لکڑی کا ٹکڑا دیال سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ فرار ہونے لگا، مگر بلونت نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے دوڑا دیا۔ قریب پہنچتے ہی بلونت کی تلوار بجلی بن کر دیال سنگھ کے بازو پر گری۔ دیال سنگھ کا دایاں ہاتھ شانے سے الگ ہو گیا اور خون کا فوارہ اٹھنے لگا، مگر گرم گھاؤ میں جیسے دیال سنگھ کو کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے کمر سے بندا خنجر کھینچ لیا اور بلونت کا نشانہ لے کر پھینکا۔ بلونت اس پر تلوار کا ایک اور وار کرنے والا تھا۔ دیال سنگھ اچھا نشانہ باز تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے شخص پر بھی خنجر پھینکتا تو اس کا دار خالی نہ جاتا تھا، مگر یہ تو بائیں ہاتھ کا دار تھا۔ اس کا پھینکا ہوا خنجر گھوڑے کی گردن میں گھس گیا۔ اسی وقت بلونت کی تلوار اس کی گردن پر پڑی اور اس کا سر، دھڑ سے الگ ہو کر دس قدم دور جاگرا۔ دیال سنگھ کا دھڑ خون کے فوارے اڑاتا چند لمحے زمین پر کھڑا رہا۔ بلونت کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا پھر اس نے لات مار کر دھڑ کو گرا دیا۔

پیسے سے بھیجا جسم اور خون سے سرخ تلوار لئے بلونت نے دوسری جانب دیکھا جہاں لڑائی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی گردن سے خنجر کھینچا تو گھوڑا ہنسنایا اور خون سے بھیگ گیا۔ بلونت کی نظریں اب اپنے بیٹے جسوت کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس خوفناک لڑائی میں اسے تو کچھ نہیں ہو گیا؟ جسوت کا بہر حال پہلا ہی معرکہ تھا۔ کچھ لوگ لڑتے لڑتے زمین پر گر چکے تھے اور کچھ ابھی تک پورے جوش و خروش سے لڑ رہے تھے۔ آخر کار بلونت کو لاشی گھماتا ہوا جسوت نظر آئی گیا۔ پسینے سے بھیگا ہوا کرتہ جسوت کی پشت سے چپک گیا تھا۔ اس کے مقابل ایک نیم شیم شخص تھا جس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا۔ دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر وہ جسوت کی لاشی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلونت ادھر دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار دیکھ کر وہ شخص گھبرایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

”شاباش بیٹا!“ بلونت نے جسوت کو مخاطب کیا، مقصد اس کی حوصلہ افزائی تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”لے یہ تلوار اور اپنی لاشی مجھے دے دے۔ گھوڑا زخمی ہے، اسے لے کر تم اپنے تایا کے ساتھ چلے جانا! میں تلسی رام کو دیکھتا ہوں۔“

جسوت نے خون آلود تلوار کی طرف نگاہ اٹھائی اور بولا۔ ”مگر باپو، تلوار کی ضرورت تو آپ کو

پڑے گی۔“

”میرے پاس خنجر موجود ہے۔“ بلونت نے بیٹے کو تلوار تھا کر لاشی لے لی۔ ”میں اس بزدل کو آسان موت نہیں مرنے دوں گا“ پہلے تھوڑا ترپاؤں گا؟“ یہ کہتے ہی بلونت، تیل گاڑی کی طرف بچھا۔ قریب پہنچ کر اس نے تیل گاڑی کی چھت پر لاشی ماری اور گرجا۔ ”تلسی رام! باہر آجا! موت تیری خنجر ہے!“

لاشی مارنے سے تیل بدک گئے۔ بلونت نے تیل گاڑی میں جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا غصہ بڑھ گیا۔ پھر اس نے گاڑی کے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک شخص اپنے دونوں پیر پیٹ میں دبا کر گھری بنا ہوا کپکپا رہا تھا۔ بلونت نے اس کا پیر پکڑ کر باہر کھینچا۔ وہ زمین پر گھسٹا ہوا باہر آگیا۔ ”مائی باپ! مجھے نہ مارو!“ وہ گزر گیا۔ تلسی رام کی بجائے وہ گاڑی بان تھا۔ بلونت یہ دیکھ کر اور بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ گاڑی بان کی گردن پکڑ کر چیخا۔ ”بول تلسی کہاں گیا؟“

گاڑی بان نے بلونت کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا دیکھا تو لرزے لگا۔ کانپتی ہوئی انگلی سے اس نے ایک اشارہ کیا۔ بلونت نے ادھر دیکھا۔ گھوڑے پر تلسی رام فرار ہو رہا تھا۔ اس نے ہونٹ کاٹ لئے۔ اس عرصے میں گاڑی بان اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ بلونت نے غصے میں اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ وہ تلسی رام کا تعاقب کرنے کے لئے بوج رہا تھا۔ اسی وقت بلونت نے دیکھا کہ اس کا بھتیجا درشن اور بڑا بھائی نواب سنگھ، تلسی رام کی جانب بچھٹ رہے تھے۔ وہ دونوں گھوڑوں پر تھے۔ فاصلے سے جسونت بھی زخمی گھوڑے پر ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ بلونت کی آواز اتنی دور پہنچنا مشکل تھی، پھر بھی اس نے چیخ کر کہا کہ بڑے بھائی! اسے فرار نہ ہونے دیتا۔

تینوں گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو بلونت بچے ہوئے افراد کو ٹھکانے لگانے دوڑا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ تلسی رام کے دو اور بلونت کا ایک ساتھی، اس ہنگامے کی نذر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ چار پانچ افراد بری طرح زخمی ہو کر زمین پر پڑے سک رہے تھے۔ بلونت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”جلدی سے اپنے آدمیوں کو اٹھا کر تیل گاڑی میں ڈالو!“

ایک لاش اور تین زخمیوں کو تیل گاڑی میں ڈال کر وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ بلونت آگے بڑھا تھا۔ اس کی نظریں گاؤں کی پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تلسی رام کو قتل کر کے نواب سنگھ واپس آئے گا۔ اس کام کے منت جانے کے بعد بلونت کا ارادہ یہ تھا کہ گاؤں سے فرار ہو جائے۔

تیل گاڑی جیسے ہی موڑ کاٹ کر آگے بڑھی، پولیس کی جیب کے بریک چرچرائے۔ چار مسلح سپاہیوں نے فوری طور پر تیل گاڑی کو گھیر لیا۔ تیل چار قدم پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے ہی پولیس انسپکٹر کی نظر بلونت پر پڑی اور اس نے خون میں بیگا ہوا لباس دیکھا تو کہا۔ ”بلونت!

بپ میں بیٹھ جا!“

دو پولیس والوں کے سپرد تیل گاڑی کر کے جیب اس جگہ پہنچ گئی جہاں کچھ دیر قبل ہنگامہ ہوا تھا۔ راستے میں بلونت نے پولیس افسر سے پوچھا۔ ”آپ کو کس نے بھگڑے کی اطلاع دی؟“

”تلسی رام نے۔“

پولیس افسر کا جواب سن کر بلونت کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر گیا۔ اس نے دانت پیس لئے۔ ”بزدل بیچ گیا۔“ وہ بڑبڑایا۔

پولیس نے نواب سنگھ، اس کے بیٹے درشن اور بلونت کے بیٹے جسونت کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ دو روز کے بعد خبر ملی کہ وہ تینوں ڈاکو بن چکے ہیں۔

بلونت اور اس کے ساتھیوں پر کیس چلا۔ تلسی رام نے سرمایہ خرچ کیا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ بلونت کو پھانسی ہو جائے، مگر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ بلونت کے باپ بھاری سنگھ نے پورا زور لگایا تاکہ بیٹے کو کم سے کم سزا ہو۔ اس نے سوچا کہ بلونت کی بجائے نواب سنگھ پر قتل کا الزام آجائے تو بلونت بچ سکتا ہے۔ نواب سنگھ تو اب ڈاکو بن ہی چکا تھا اس لئے بھاری سنگھ اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ وہ پولیس کی دسترس سے دور تھا، مگر بھاری سنگھ کا سوچا پورا نہ ہوا۔ بلونت کو پندرہ سال اور اس کے ساتھیوں کو پانچ بائیس سال کی قید ہوئی۔ پھر بلونت کی سزا میں تخفیف ہو گئی۔ رہائی پانے میں بلونت کو صرف چھ ماہ باقی رہ گئے تھے کہ ساری خوشی ایک اندوہ ناک واقعے کے سبب خاک میں مل گئی۔ پورے دس سال تک پولیس کو ناکوں پنے چھوانے والے نواب سنگھ، درشن اور جسونت پولیس کی جھپٹ میں آگئے۔ انتہائی سخت مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بلونت کا بیٹا جسونت اور بھتیجا درشن مارے گئے۔ نواب سنگھ زندہ پکڑا گیا۔ اسے کالے پانی کی سزا دی گئی۔

بلونت کے خاندان پر یہ پہلی کاری ضرب پڑی۔ ایک ہی دفعہ میں گھر کے تین افراد کم ہو گئے۔

یہ تھا اس بلونت سنگھ کا ماضی کہ میں نے جس کے جسم میں اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جیل سے اسے رہائی ملنے میں اب کتنی کے چند روز رہ گئے تھے۔

☆=====☆=====☆

جیل سے فرار ہونے کے لئے میں دانستہ کسی نوجوان آدم زاد کے جسم کو اپنانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ میں اس جسم کو زیادہ عرصے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک بلونت نے ایک دنیا دیکھ لی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، چار بیٹوں کا باپ تھا جن میں سے بڑا بیٹا جسونت مارا گیا تھا۔ کسی نوجوان کی جگہ اگر وہ بائیس سالہ شخص مرجاتا تو شاید اس کے خاندان پر کوئی ایسا خاص اثر نہ پڑتا۔ جب میں نے یہ فیصلہ کیا تو مستقبل کی مجھے کچھ خبر نہ تھی، نہ تو اپنے مستقبل کی، نہ بلونت کے! میں نے سوچا تھا کہ اس مرتبہ جلد بازی میں کوئی نیا جسم مستقل طور پر نہیں اپناؤں گا۔ سکون کے ساتھ پہلے اس نوجوان کے ماضی اور حال کا سراغ لگاؤں گا، پھر اس کے اندر اتروں گا۔ حالات بھی اب اتنے ہنگامی نہیں تھے کہ فوری طور پر بلونت کے جسم کو مجھے چھوڑنا پڑتا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جیل سے رہا ہو کر بھتے بھر بلونت کے گاؤں

جسم کو بھی نذر آتش کیا جائے گا۔

اس کا نام چھاد رام تھا اور وہ بھی بلونت ہی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس سے بس میری واجبی ملاقات تھی۔ اسے میں نے دو ایک مرتبہ بلونت کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ ابھی اپنے سابقہ جسم کو شعلوں کے پردہ کے میں اپنی ہیرک میں آیا ہی تھا کہ ایک سنتری نے آکر مجھے مخاطب کیا۔ ”چھاد رام آخری سانس لے رہا ہے۔ بلونت! اس نے مرنے سے پہلے تم سے ملنے کی خواہش کی ہے۔“

مجبوراً مجھے اٹھنا پڑا حالانکہ بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور جسم بھی دن بھر کی مشقت کے سبب بے حد تھکا ہوا تھا۔ کھانے میں ابھی دیر تھی میں نے سوچا تھا کہ اتنی دیر ذرا اپنے نئے تھکے ہوئے جسم کو آرام دے لوں، مگر یہ ممکن نہ ہوا۔

میں اب تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس ہیرک کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کم سزا پانے والے قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بلونت ہی نے بتائی تھی کہ چھاد رام علم نجوم سے بھی واقف ہے۔ بلونت نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنا ہاتھ چھاد رام کو دکھاؤں۔ مجھے علم نجوم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے بلونت کے مشورے کو ٹال گیا۔

چھاد رام کی عمر تقریباً پچپن سال تھی اور وہ گزشتہ تین سال سے آگرہ جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ برہمن ہونے کے باوجود اس نے بلونت کے راجپوت خاندان سے بڑا اچھا برتاؤ رکھا تھا اسی لئے تلسی رام بھی اس سے خار کھاتا تھا۔ چھاد رام کے متعلق بھی مجھے بلونت کا ذہن پڑھ کر ہی بت سی باتوں کا علم ہوا تھا جنہیں میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس وقت مجھے وہی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ایک دن تلسی رام کو جانے کیا سوچھی کہ اس نے چھاد رام کو اپنی جنم کنڈلی دیکھنے کے لئے بلایا۔ سارے آگرے میں چھاد رام علم نجوم جاننے کے سبب مشہور تھا۔ اس کا کہا ہوا کم ہی غلط لگتا تھا۔ وہ اسی لئے خاص رکھ رکھاؤ سے رہتا اور سب اس کے ناز اٹھاتے۔ اگر وہ یہ دیکھتا کہ عزت و احترام میں ذرا بھی کمزوری جاری ہے تو وہ جنم کنڈلی نہ دیکھتا۔ وہ اس غرض سے جس گھر میں جاتا وہاں کچھ نہ کھاتا پیتا۔ اگر اسے کچھ نذرانہ دینا ہوتا تو اس کے گھر پہنچا پڑتا۔

تلسی رام کی جنم کنڈلی دیکھ کر چھاد رام خاموش ہو گیا۔ اس نے تلسی رام کے بیٹے نیت رام کی جنم کنڈلی بھی دیکھی۔

”میں پھر کبھی بتاؤں گا، ابھی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ چھاد رام نے تلسی رام کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا۔

”چھاد رام! آج!“ تلسی رام نے اس کی بات کا غلط مطلب سمجھا۔ ”راجپوت کے گھر تو کھڑے کھڑے سب کچھ بتا دیتے ہیں! میں تو تمہیں اس کے بدلے پیسے بھی دوں گا۔ پھر آخر اس قدر نخرے کیوں دکھا رہے ہو، کچھ بتانے میں!“

یہ سن کر چھاد رام بگڑ گیا۔ ”پیسوں کی بات کر کے تم میرے علم کی توہین کر رہے ہو!“

”اس بھاری سنگھ راجپوت کی باتوں میں آکر تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ تم برہمن ہو!“ تلسی رام

میں رہوں گا۔ اس کا سبب بھی محض انسانی ہمدردی تھی۔ آدم زادوں کے درمیان اتنے دن گزارنے کے بعد مجھ جن زاد میں بھی انسانی ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک شخص پورے گیارہ سال بعد رہائی پا کر اپنے گھر اپنے گاؤں جانے والا تھا، اگر اتنے طویل عرصے کے بعد بھی وہ اپنے گھر نہ پہنچ پاتا، راستے ہی میں چل بستا تو یہ اس کے خاندان اور گھر والوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا۔ کم از کم وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک ہفتہ تو گزار ہی لیتا۔

پھر وہ چند روز بھی گزر گئے اور مجھے معلوم ہوا کہ اگلے ہی دن صبح بلونت سنگھ کو رہائی ملنے والی ہے۔

آگرہ جیل میں قیدیوں سے سخت مشقت لی جاتی تھی۔ آخری دن بھی بلونت کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ وہ چکی پیس کر لوٹ رہا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے چکی پیسنے کے سبب مجھ سے اپنے بازوؤں میں درد ہونے کی شکایت کی۔

”یہ تمہاری مشقت کا آخری دن تھا بلونت! کل سے تمہیں یہ عذاب برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ہم دونوں کے بالکل قریب کوئی قیدی نہیں تھا۔ دوسرے قیدیوں اور ہمارے درمیان تھوڑا فاصلہ تھا۔ سبھی محنت مشقت کر کے بوجھل قدموں سے اپنی اپنی ہیرکوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”ہاں درست۔“ بلونت نے طویل سانس لیا۔ ”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو!“

بلونت کا جملہ ابھی پورا ہوا تھا کہ میں نے ”جے بھوانی“ کا نعرہ لگایا اور رنجیت سنگھ کے جسم سے باہر آ گیا۔ رنجیت سنگھ کا جسم بے جان ہو کر زمین پر گرنے لگا۔

”رن..... رنجیت! کیا..... ہوا؟“ بلونت کے یہ آخری الفاظ تھے۔

دوسرے ہی لمحے میں اس کے جسم میں اتر چکا تھا۔ آس پاس جو قیدی موجود تھے، سبھی ادھر دوڑ پڑے۔ ”کیا ہوا؟..... کیا ہوا؟“ ہر طرف سے یہی ایک سوال کیا جا رہا تھا۔

میں اس عرصے میں رنجیت سنگھ سے بلونت سنگھ بن چکا تھا۔ مجھے بلونت کے جسم میں قرار آ گیا تو ارد گرد جمع ہو جانے والوں کو بتانے لگا۔ ”رنجیت سنگھ اچھا بھلا مجھ سے باتیں کرتا ہوا ساتھ چل رہا تھا کہ چلے چلتے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ گر پڑا۔“

اسی وقت جیل کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ساری جیل میں رنجیت کی اچانک موت سے ہلچل سی مچ گئی۔ ڈاکٹر نے بھی طبی معائنے کے بعد رنجیت کے انتقال کی تصدیق کر دی۔ اسی شام رنجیت کو جیل کی ہیرکوں کے پیچھے چھوٹے سے میدان میں نذر آتش کر دیا گیا۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ خود میں نے بھی گویا اپنے ہی جنازے کو کاندھا دیا۔ یوں وہ جسم کہ میں نے جس میں ایک عرصہ گزارا تھا، مٹی ہو گیا۔ میری حیرت انگیز زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اسی روز سے دوسرا باب شروع ہو گیا۔ اب میں کھیڑا راٹھو گاؤں کا ایک راجپوت بلونت سنگھ تھا جسے اگلے روز صبح رہا کیا جانے والا تھا۔

ایک میں ہی کیا کسی کو بھی پتا نہیں تھا کہ اسی رات جیل کی حدود میں ایک آدم زاد کے مر

نے اپنے دل کی بھراس نکالی۔ ”مجھے تو دراصل تمہارا امتحان لینا تھا۔ جنم کنڈلی میں کیا ہے؟ یہ تو میں پہلے ہی معلوم کر چکا ہوں۔“

”میری آزمائش..... میرے علم کا مذاق؟“ چھاد رام غصے سے کانپنے لگا۔ ”مگر اب سنو!“ وہ اپنے جینیو پر ہاتھ رکھ کر دباڑا۔ ”تمہارا غرور تمہیں خاک میں ملا دے گا۔ تم بے موت مارے جاؤ گے۔ تمہاری موت بہت اذیت ناک اور عبرت ناک ہوگی۔ تمہارے خاندان میں کوئی سکون سے نہیں جی سکے گا اور اطمینان سے مر بھی نہ سکے گا۔“ یہ کہہ کر چھاد رام چل دیا۔ غصے کی وجہ سے اس کا جسم پسینے میں بھج رہا تھا۔

”جاجا! تیرے کسے سے میرا کچھ نہیں ہوگا۔“ تسلی رام کھڑے ہو کر چیخا۔ ”دیکھتا ہوں کہ گاؤں میں اب اب ٹور رہتا ہے یا میں!“

اس سے پہلے کہ چھاد رام کی پیش گوئی پوری ہوتی تسلی رام نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے اپنے اثر، تعلقات اور دولت کے زور پر بے گناہ چھاد رام کو ایک جرم میں پھنسا دیا۔ اس طرح بے چارے چھاد رام کو اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں گزارنا پڑے۔

کونھریوں کی ایک قطار ختم ہوتے ہی میں کھلے میدان میں داخل ہوا۔ سامنے ہی بڑا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے میں داخل ہوتے ہی کم سزا پانے والے قیدیوں کی بیرکیں تھیں۔ میں نے دیکھا اس وقت قیدیوں کی گنتی ہو رہی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ بیرکوں سے باہر قیدی ایک قطار میں کھڑے تھے۔ جیل اپنے ہاتھ میں رجسٹر لے قیدیوں کے نام پکار رہا تھا۔ میں نے چھاد رام کی بیرک میں قدم رکھا۔ چھاد رام بیرک کے فرش پر دراز تھا۔ ایک قیدی اس کے قریب گھی کا دیا جلا رہا تھا۔ چھاد رام کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ تیز تیز سانسوں کی وجہ سے سینہ بار بار اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے چھاد رام کی روح اس کے جسم سے پرواز کرنے کے لئے بے چین ہو۔ میں اس کے سرانے بیٹھ گیا اور چھاد رام کا سر آہستہ سے اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے جبروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھ کر بے مشکل کہا۔

”آگے ٹھاکر..... بس اب..... اب میں سکون سے مر سکوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ہانپنے لگا۔

میں اس کے سینے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”ابھی تم نہیں مرو گے پنڈت جی!“

”نہیں ٹھاکر! اب میری روح اس شکستہ پنجرے سے پرواز کرنے کے لئے بے قرار ہے، مگر میں مرنے سے پہلے تم سے جو کہنا چاہتا ہوں، وہ سن لو!“ میں چھاد رام کی جمبھی جمبھی سی آنکھوں میں بھانکنے لگا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس کا ذہن پڑھ کر پتا لگاؤں، وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس طرح آخری وقت میں اسے کچھ بولنے کی تکلیف نہ اٹھانا پڑتی، لیکن خلاف توقع میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے اندر وہ پراسرار قوت بیدار نہ ہو سکی۔ جس کے ذریعے میں دوسروں کے ذہن کسی کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیتا تھا، اسی کے ساتھ اپنے احکام بھی منوالیتا تھا۔ اپنے اندر اس پراسرار قوت کو بیدار نہ ہوتے محسوس کر کے مجھے رنج سا ہوا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ ایسا کیوں ہوا! میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ چھاد رام کی آواز

سنائی دی۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو ٹھاکر! میری روح اب ہر بندھن سے آزاد ہو چکی ہے، لیکن صرف روپا میں انکی ہوئی ہے۔“ وہ کچھ دیر کو رکا، پھر لڑکھرائی آواز میں بولا۔ ”روپا کو میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ میرے چاروں بچوں میں وہ سب سے چھوٹا ہے۔ وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کی ماں مر گئی اس لئے میں اسے سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تم بھی ٹھاکر..... تم بھی اسے اپنے بیٹے کی طرح رکھنا!“ یہ کہتے ہی چھاد رام کو بہت زور کی کھانسی اٹھی۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پسینے سے میری پھٹی بھج گئی۔ میں سمجھ گیا، یہ موت کے پسینے ہیں۔

”چھاد رام مہاراج!“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں، روپا آج سے میرا بیٹا ہے۔“ ایک مرتے ہوئے شخص کو ان الفاظ سے سکون مل جاتا تو میرا کیا بگڑتا!

چھاد رام کی بجھتی ہوئی آنکھیں جیسے ایک دم روشن ہو گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”دجن دو ٹھاکر!“ چھاد رام کی آواز ابھری۔

”مہاراج! راجپوت کی زبان ہی دجن ہوتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا دایاں ہاتھ چھاد رام کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”اس کے باوجود میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے بیٹے روپا کا اپنے بیٹے کی طرح خیال رکھوں گا۔“

چھاد رام کی پلکیں بھج گئیں۔ اس کے رخساروں پر خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے میرا ہاتھ دایاں۔ اسی وقت اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے جیسے اچانک وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو یا اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ میری کھلی پھٹی یایوں کہہ لیں کہ بلونت سنگھ کی پھٹی کی لکیروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ میری اور اس کی نظریں ملیں۔ پھر چھاد رام کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ”ٹھاکر! تم نے کئی بار اپنا مستقبل جاننے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے ہر بار تمہیں کچھ نہ کچھ دلاسا دے کر بھلا دیا۔“ چھاد رام چند لمبے اپنا سانس درست کرنے کے لئے رکا پھر بولا۔ ”تمہارے باپو نے بھی مجھے تمہاری جنم کنڈلی دکھائی تھی۔ میں نے جو بات اب تک اپنے سینے میں دبائے رکھی تھی، اب تمہیں بتا دیتا چاہتا ہوں کیونکہ میرا آخری وقت آچکا ہے۔“ ابھی اس نے اپنا جملہ پورا کیا تھا کہ شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ چھاد رام کا سارا جسم ہل کر رہ گیا۔ میں نے سوچا شاید اب چھاد رام کچھ نہ تاسکے، مگر چند لمبے بعد اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”میں..... میں تم سے..... یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صرف اتنی ہی بھلائی کسی کے ساتھ کرنا جتنی ممکن ہو اور وہ شخص اس بھلائی کا مستحق ہو کیونکہ تمہارے ہاتھ میں بے شمار قفل ہیں اور تم.....“ چھاد رام اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کے جسم میں کھچاؤ بڑھ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ زور سے فرش پر گرنا۔

چھاد رام کی ادھوری بات سن کر میں چکر اٹ گیا۔ میرے خیال میں بلونت کو اب ایک ہفتے سے زیادہ نہیں جینا تھا۔ ہفتے بھر بعد میں اس کا جسم چھوڑ دیتا تو ظاہر ہے، وہ زندہ نہ رہتا۔ پھر بھلا وہ بے شمار قفل کیسے کر سکتا تھا! مجھے تو علم نجوم وغیرہ پر پہلے ہی سے یقین نہیں تھا اس لئے چھاد رام کی پیش گوئی کو ذہن

سے جھٹک دیا۔

اس دوران چھاد رام کی دونوں ٹانگیں پھیل گئیں اور آنکھیں بے حرکت ہو گئیں۔ اس کی دھجک جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

میں نے اپنے زانو پر رکھا ہوا اس کا سر آہستہ سے فرش پر رکھ دیا۔ اس وقت تک قیدی ہیرک میں لوٹ چکے تھے۔

چھاد رام کی بیڑیاں کاٹنے جیل کا لوہار آیا۔ قیدیوں کے رجسٹر سے ایک نام پیشہ کے لئے کاٹ دیا گیا۔

دوسرے دن صبح مجھے جیلر نے اپنے کمرے میں بلوایا اور بولا۔ ”بلونت سنگھ! میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ ہماری اس طرح ملاقات نہیں ہوگی۔“ پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔

جیلر کی بات سن کر میں مسکرایا کہ وہ مجھے بلونت سنگھ سمجھ رہا تھا۔ اس غریب کو کیا خبر تھی کہ بلونت کے جسم پر اب ایک جن زاد کا قبضہ ہو چکا تھا!

”نہیں صاحب! اب دوبارہ میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”شباباش!“ جیلر نے میری بیٹہ پر ستائی انداز میں تھکی دی۔ ”تم سے یہی امید ہے۔“

پھر کچھ ہی دیر کے بعد میں آگرہ جیل کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ جیل سے باہر آکر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ میں نے بڑے ٹھاکر اور دوسرے جاں نثاروں کو صدمہ نہ پہنچانے کی خاطر خاصے دن جیل میں گزار دیے تھے۔ اب انھیں رنجیت سنگھ کی موت کا پتا چلا! اس سے ان پر کیا گزرتی! ان باتوں سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ مجھے تو جیل سے نکل کر ہوا میں خوشبو سی بسی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا سایہ بھی عجیب سا نظر آیا۔ صبح کے سورج کی گرمی میرے جسم کو گدگدا رہی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد میں رک گیا۔ میرا دل چاہا کہ مرکز جیل کا پڑھت دروازہ دیکھوں۔ آسمان سے باتیں کرتی جیل کی دیواریں، ہیرکوں کی مضبوط سلاخیں، بڑے بڑے وزنی تالے سب میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے ہونٹ بھیجھنے لگے اور سوچنے لگا، ”نہیں اب یہ بندھن مجھے منظور نہیں۔ اب یہ ہاتھ فوجداری زنجیر نہیں پہنیں گے، پیروں میں وزنی سلاخیں نہیں ہوں گی۔ جیل میں رہنا میرے لئے بہر حال کوئی خوش گوار تجربہ نہیں تھا۔“

یہی سوچتے ہوئے میں آگے بڑھتا گیا اور آگرہ جیل میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب میں اپنے آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ برابر سے سرسراتی ہوئی ایک سائیکل گزر گئی۔ مخالف سمت سے ایک ٹانگا آرہا تھا جس میں ایک مرد اپنی بیوی کا نرم و گداز ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ عورت کی کلاں رنگ برنگی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے سرتیاد آگئی۔ اس کے ساتھ بلونت سنگھ کی بیوی رکنی کا خیال آیا۔ بلونت نے بار بار اپنی حسین و بزرگش بیوی رکنی کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔ بلونت کا ذہن پڑھ کر بھی اپنی بیوی سے اس کی گہری جذباتی وابستگی کا مجھے علم ہو چکا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ رکنی کا شہر

سوں بعد گھر لوٹ رہا ہے تو اس کے لئے کم سے کم چوڑیوں کا تحفہ ہی لے جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بلونت کے تینوں بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ خود صاحب اولاد ہو چکے ہیں۔ بلونت کی بیوی رکنی اور اس کے پوتے پوتیوں کے لئے میں نے چوڑیاں اور کھلونے بازار سے خریدے، پھر اس جگہ پہنچ گیا جہاں گاؤں کے لئے تیل گاڑی مل سکتی تھی۔ بلونت کا ذہن پڑھ کر یہ تمام ضروری معلومات میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

”ارے راتھور! کب رہا ہوئے؟“ ایک تیل گاڑی والا مجھے پہچان گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ بلونت کے گاؤں ہی کا ہوگا۔ اس کی تیل گاڑی میں بیٹھ کر میں نے جواب دیا۔

”تیل گاڑی چل دی۔“

”تم شاید مجھے پہچانے نہیں، ارے میں پٹیل ہوں۔“

گاڑی بان نے اپنا تعارف کرایا۔

میں نے فوراً بات بتا دی۔ ”ہاں واقعی! مگر تم تو بہت جلدی بوڑھے ہو گئے۔“ یہ ایک ایسا جملہ تھا دیکھارہ سال بعد ملنے والے کسی بھی شخص کے لئے کہا جاسکتا تھا۔

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا، پھر کہنے لگا۔ ”لیکن تم ذرا نہیں بدلے! ویسے کے ویسے ہی جوان نظر آتے ہو جیسے دیکھارہ سال پہلے تھے۔ میں اسی لئے تو تمہیں فوراً پہچان گیا۔“ وہ کچھ زیادہ ہی باتوںی لگتا تھا۔

”ہاں۔“ ”تمہیں اپنا بڑا بیٹا جسونت تو یاد آتا ہی ہوگا!“

مجبوراً مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا کہ جوان بیٹے کی موت پر میں بہت غمزدہ ہوں۔

”ٹھاکر! وہ آخر تمہارا خون تھا۔ اس نے آخر تک پولیس کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔“ پٹیل بولے بارہا تھا۔ ”کہتے ہیں کہ اس کا جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد بھی پولیس قریب جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ لاش بڑا گلیاں برساتے ہوئے پولیس والے قریب پہنچے تھے۔“

معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے اپنے لبو میں حرارت سی محسوس ہوئی! جسونت کا ذکر میں، بلونت کی زبانی بھی سن چکا تھا۔ میں اس وقت جس آدم زاد کے جسم میں تھا، جسونت اسی کا بیٹا تھا شاید میرے لبو میں حرارت پیدا ہونے کا سبب یہی رشتہ ہو۔

راستے بھر گاڑی بان پٹیل مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ کھیزا راتھور گاؤں کے متعلق مجھے پٹیل سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اسی نے یہ بھی بتایا کہ بلونت کا دشمن تلسی رام اب بھی زندہ ہے۔ پھر یہ سفر ختم ہوئی گیا۔ تیل گاڑی، گڑھی کے دروازے میں داخل ہو کر رک گئی۔

”بلونت آگیا!“ چارپائی پر باہر لیٹے ہوئے ایک بوڑھے آدمی کو میں نے اٹھ کر جینٹے دیکھا۔

اسے میں نے اس کے ٹانگے سے پہچانا۔ وہ بلونت کا باپ ہماری سنگھ ہی تھا۔ گھر میں سے بلونت کے تینوں بیٹے باہر آگئے۔ بلونت کی بیوی رکنی کو میں نے چوکھٹ کے قریب کھڑے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ”جیسے سرتیاد دوسرا جنم تھی۔“ مجھے بالکل یوں لگا جیسے سرتیاد کی عمر دگنی ہو گئی ہے۔ اس کے سوار رکنی اور رکنی میں کوئی فرق نہیں تھا، وہی بھرا بھرا گداز بدن، وہی چہرہ مرہ، سب کچھ وہی! پھر بلونت کے تینوں

اس کے ہنگاموں جیسے ہونٹ کانپے۔

”پر کیا رکنی؟“ میں نے پوچھا۔ ”رک کیوں گئیں؟“

”میں ماں ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی چٹی (بیوی) بھی تو ہوں۔ آپ کو شریر (جسم) کا کھڑا بھی تو میرا دھرم ہے۔ آپ برسوں بعد لوٹے ہیں اور میرے شریر کو ہاتھ لگایا ہے۔ پھر..... پھر کیسے میری آپ کی ہانپوں کو جھٹک دوں؟..... یہ تو پاپ (گناہ) ہو گا ایک پتی درنا استری (شوہر پرست عورت) ایسا پاپ نہیں کرنا چاہئے مجھے..... نرک (جہنم) میں نہیں جانا۔“

رکنی کے ان الفاظ نے میرے وجود میں جیسے آگ سی لگا دی۔ پھر میری نظروں سے رکنی تو ابھر ہو گئی، صرف اور صرف سرتا رہ گئی، سرتا جو میرے لئے مرکز بھی نہیں مری تھی، سرتا جو میری زندگی تھی، میری محبوبہ تھی جنت جو مجھ سے کھو گئی تھی، مجھے پھر مل گئی۔

دوسرے دن صبح نہادھو کر ناشا کرنے کے بعد میں نے بلونت کے تینوں بیٹوں کو آواز دے کر بلا دیا۔ رکنی بھی باہر آ گئی۔ اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی جیسے سب کچھ سمجھ لیا۔ میں نے بلونت کے بیٹوں سے ہتھیار ساتھ لے کر چلنے کو کہا۔ رکنی کے چہرے سے اس وقت کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ٹھکرانی!“ میں نے رکنی کو مخاطب کیا۔ ”اب میں، جسوت کا بدلہ لے کر ہی گھر آؤں گا۔ اس سے پہلے گھر نہیں لوٹوں گا۔“

رکنی کے خوب صورت ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ”مگر ٹھاکر برہمن ہتھیار کا پاپ.....“

”پاپ اور پُرن (گناہ و ثواب) کو درمیان میں نہ لاؤ ٹھکرانی!“ میں بول اٹھا۔ ”دشمن کی ذات نہیں دیکھی جاتی۔ رام چندر رچی نے بھی تو ایک برہمن راون ہی کو مارا تھا۔ کیا وہ پاپ نہیں تھا؟“

پھر رکنی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اس نے مجھے اور اپنے تینوں جوان بیٹوں کو گھر سے نکلے دیکھا۔

جاتے جاتے میں ایک بار اپنی ”سرتا“ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے پلٹا۔ اس کے رخساروں پر گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے، موتیوں جیسے آنسو۔ میرا جی چاہا کہ ان سچے موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے چن لوں، مگر ضبط کر کے آگے بڑھ گیا۔

☆=====☆

پھاگن کی لو کے گرم تھیزے رات کے اندھیرے کو چھوٹے ہی ٹھنڈی ہواؤں میں بدل چکے تھے۔ چاندنی دور دور تک زمین پر پھیلی ہوئی تھی جو آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ ہوا کے تھیزوں سے تار درخت جھوم رہے تھے۔ اس ماحول میں آنکھیں کھولے میں چارپائی پر لیٹا ہوا چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے آج دن ہی میں تلسی رام کے دونوں بھتیجیوں رتی رام اور سونی پال کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ بلونت کے تینوں جوان بیٹوں کو ساتھ لئے اب میں گڑھی سے نکل کر کھیتوں پر آ گیا تھا۔ دن بھر بیس گاؤں والوں سے میری ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ اسی دوران مجھے چھاد رام کے بھائی مراری کے متعلق بھی پتا چلا تھا۔

تلسی رام کے دونوں بھانجے معلومات کے مطابق بہت عجیب تھے۔ دونوں ہی کے جسم تقریباً ایک جیسے تھے، ناک نقشہ بھی یکساں ہی تھا، لیکن ذہن مختلف تھے۔ اس کے علاوہ ان میں سے ایک گورا تھا اور دوسرا کالا۔ قدرت نے ان جڑواں بھائیوں کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ ایک کو عقل عطا کی تھی تو دوسرے کو رنگ۔ پیدا ہوتے ہی ان کو گورے اور کالے کے نام سے پکارا جاتا رہا تھا۔ ماں ان دونوں کو چھوڑ کر بچپن ہی میں مر چکی تھی۔ اس نے مرتے وقت ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہدایت کی تھی کہ جس طرح دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں، ہمیشہ اسی طرح ساتھ رہیں۔ مرنے سے پہلے اس نے دونوں کے ہاتھ اپنے بھائی تلسی رام کے ہاتھ میں دے دیئے تھے اور کہا تھا کہ وہ ماموں کا حکم ہمیشہ مانیں۔ اس کا عیاش اور نشے باز شوہر گاؤں کی ایک لڑکی کو بھگا کر کسی دور دراز شہر میں جا بسا تھا۔ اس کے بارے میں سنا گیا تھا کہ لڑکی سے وہ پیشہ کرتا ہے۔ دونوں بھائی، باپ کو بھول کر بس ماموں کے ہو رہے تھے۔ رتی رام خوب صورت تھا اور اس کا رنگ بھی گورا تھا، مگر کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ سونی پال رنگ کا کالا ضرور تھا مگر اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ تھوڑا بڑھا کھاکر تلسی رام نے انہیں کام پر لگا دیا تھا۔ سونی پال کے سپرد تلسی رام کے کاروبار کا حساب کتاب تھا اور رتی رام اپنی ممانی گورانی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ گورانی کے ساتھ وہ گھر کے کام کاج میں لگا رہتا تھا۔ ان دونوں کی ماں کو مرے پندرہ سال ہو چکے تھے، مگر دونوں اپنی ماں کی نصیحت پر عمل پیرا تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ صبح ہی صبح جنگل جانا ہو یا رات کے وقت رام لیلیا دیکھنی ہو، وہ دونوں ساتھ رہتے، بالکل دن رات کی طرح۔ اگر کبھی ان میں سے کوئی ایک تہا دکھائی دیتا تو گاؤں والوں کو جیسے فکر لاحق ہو جاتی۔ وہ از راہ مذاق پوچھتے، ارے آج گورا ساتھ نہیں ہے؟ کوئی دوسرا شخص مذاق میں کتا، گورے کالے شادی کرنے کے لئے ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو کر جائیں گے۔ گاؤں والوں کے لئے یہ دونوں بھائی کھلونے تھے۔

ان کھلونوں کو توڑنے سے پہلے میں یہ تصدیق چاہتا تھا کہ واقعی انہوں نے پولیس سے خبری کی بھی ہے یا نہیں۔ ناخن ان کا خون بہانا مجھے منظور نہیں تھا۔ میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ بلونت کے بیٹے صوبیدار نے میرے ہاتھ میں حقے کی لئے تھما دی۔ ”لیجئے باپو!“ اس نے کہا تھا۔

میں کچھ بولے بغیر حقہ گڑگڑانے لگا، پھر کچھ دیر بعد صوبیدار کو مخاطب کیا۔ ”وہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟“

”کھوپڑی پکا کر رہے ہیں کہ تلسی رام اپنے بیٹے نیتا رام کے ساتھ ساتھ ان کی شادی بھی کر دے۔“

صوبیدار نے جواب دیا، پھر پوچھا۔ ”ہم کھانا کھا کر چل دیں گے نا؟“

”کہاں؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

جواب میں صوبیدار کے ہونٹ سختی سے بھنج گئے اور جڑے ابھر آئے۔ مجھے میری بات کا جواب مل گیا تھا۔

”بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کی بہت جلدی ہے کیا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”باپو! ہم آپ کے رہا ہونے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔“ صوبیدار کی آواز میں سختی تھی۔ ”راستے

میں ان دونوں کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ ہم نے بہت برداشت کیا مگر..... مگر ہمارے صبر کا پیمانہ بھر چکا ہے۔

”شاباش بیٹے!“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ بیٹھا۔ ”مگر ان دونوں کو ختم کرنے سے پہلے مجھے ایک بار کا یقین ضرور کرنا ہے۔“

”کس بات کا یقین باپو؟“

”یہ کہ واقعی انہوں نے جسونت کی مخبری کی تھی۔“ میری بات سن کر صوبیدار چونک اٹھا۔ اس میں نے مزید کہا۔ ”بیٹا! انتقام کی آگ بہت بھیاںک ہوتی ہے، یہ آدمی کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے، ازل لے ان دونوں پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے یقین کر لینا بہتر ہے۔“

”لیکن وہ دونوں ہمیں کیوں بتانے لگے کہ انہوں نے مخبری کی ہے۔“ صوبیدار الجھے ہوئے بولے۔

”اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں سوچنے لگا، پھر اچانک میرے ذہن میں ایک تدبیر آگئی اور بولا۔ ”تم ایک کام کرو کہ چھاد رام کے بھائی مراری کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا کہ باپو نے بلایا ہے۔ اگر روپا گھر پر ہو تو اسے بھی ساتھ لیتے آنا۔“

میں نے صوبیدار کے برابر کھڑے ہوئے چھاد رام کے بیٹے روپ نارائن عرف روپا کو پہلی بار دیکھا۔ چاندنی میں روپا کا سرخ و سفید چہرہ، بھوری آنکھیں، بل کھائے ہوئے بال اور معصوم سی مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ ”روپا بیٹے! اب میں آگیا ہوں، کسی بات سے گھبرا نہیں۔ تمہارے باقی تینوں بھائی ٹھیک ہیں؟..... تعلیم کا کیا حال ہے؟..... دیکھو اپنی تعلیم جاری رکھنا۔ تم اپنے باپ کی طرح بہت بڑے جیوتشی بنو گے۔ ہم راجپوت چاہے جاہل ہی رہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر ایک برہمن زادے کو تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہئے ورنہ وہ بھوکا مر جائے گا۔“

روپا خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر میرے لئے محبت و عقیدت کے تاثرات تھے۔ یوں جیسے اسے میری صورت میں اپنے باپ کا چہرہ نظر آ رہا ہو۔

”باپو مجھ سے بڑا جیوتشی بننے کو کہتے تھے۔“ روپا دھیرے سے بولا۔

اسی وقت مراری آگیا۔ سلام کر کے وہ قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”آتے ہی مجھے یاد کیا تھا کہ!“

”ہاں تم سے ذرا گاؤں کی خبر معلوم کرنا تھی۔ گیارہ سال بعد گاؤں لوٹ کر آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے صوبیدار اور روپا کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں دور جا کر کھڑے ہو گئے تو میں مراری سے مخاطب ہوا۔ ”مراری! تمہیں ایک کام کرنا ہے۔“

”بولو ٹھاکر، تمہارے لئے یہ خادم سب کچھ کر گزرے گا۔“ مراری نے جواب دیا۔

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے بھائی، بیٹھے اور بیٹے کی مخبری پولیس سے کس نے کی؟ پولیس کو کس نے یہ اطلاع دی کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ کیا پولیس کو یہ اطلاع تلسی رام کے بھائیوں نے دی تھی؟“ میں یہ کہہ کر مراری کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

”مجھے بھی یہی معلوم ہوا ہے ٹھاکر!“

”لیکن مجھے یقینی اطلاع چاہئے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”میں صرف سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے ان دونوں لڑکوں کی لاشیں گرانہ نہیں چاہتا۔“

مراری میری بات سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔

”کس سوچ میں کھو گئے مراری؟“ میں نے اسے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔ مجھے دوسرے لوگوں سے پتا چل گیا تھا کہ اپنے بڑے بھائی چھاد رام کا حشر دیکھ کر مراری، تلسی رام سے دس قدم دور ہی رہتا تھا کیوں کہ اسے اپنے اور چھاد رام کے کنبے کا گوارہ کرنا تھا۔ وہ اسی لئے تلسی رام کے چکر میں نہیں آتا چاہتا تھا۔ ”میں حل تلاش کر رہا تھا ٹھاکر!“ مراری نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ”ان دونوں گورے کالے میں رتی رام احمق ہے۔ اسے بھلا پھسلا کر زبان کھلوائی جاسکتی ہے۔“

”جس طرح تم مناسب سمجھو کرو۔ ہم طاقت سے کام لیتے ہیں، تم عقل استعمال کرو۔ اس سلسلے میں کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے کہ تم مجھ سے مل چکے ہو۔ کئی بات ہو جائے اور تم اس احمق کو بھانسنے کی کوئی تدبیر کر لو تو مجھے یہیں کھیت پر آ کے بتا جانا۔ جب تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں یہیں کھیتوں پر رہوں گا اور اپنے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔ ٹھکرائی نے ابھی تک جسونت کے سوگ کی سازشیں نہیں اتاری۔ جسونت کی بیوی اپنے والدین کے گھر میں ہے۔ وہاں بھی میں بعد میں تعزیت کرنے جاؤں گا۔“

مراری نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ یقیناً وہ بھی راجپوتوں کی روایات اور ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اچانک اس نے چنگی بجا لی اور خوش ہو کر بولا۔ ”بات بن گئی ٹھاکر!..... پانچ دن بعد ہولی ہے۔ میں اس وقت موقع دیکھ کر سب کچھ معلوم کر لوں گا، صرف اس وقت تک رک جاؤ۔“

”ٹھیک ہے، اپنا منصوبہ مجھے ضرور بتا جانا۔ میں خود اپنے کانوں سے سب کچھ سنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

مراری نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر اپنے بیٹھے روپا کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆=====☆

پونم کی شام ڈوب چکی تھی۔ گاؤں کی چوپال میں ہولی چلنے لگی۔ میری نظریں رتی رام پر جمی ہوئی تھیں۔ مراری مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کر چکا تھا۔ رتی رام آہستہ آہستہ جوانوں کی بھیڑ سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جڑواں بھائی کی نظریں اس پر پڑے کیوں کہ ایسا ضروری تھا۔ اطلاع کے مطابق اگر سونی اس کے ساتھ ہوتا تو وہ مہادیو کے مندر میں جا کر بھنگ نہیں پی سکتا تھا۔ سال میں تین بار وہ اس شوق کی خاطر سونی سے الگ ہو جاتا تھا۔ رتی رام کو بھنگ کے بغیر رکھا کے گیتوں کا لطف نہیں آتا تھا اور گیتوں کے بغیر ہولی کا مزہ کیسا۔

میں اس کا تعاقب کرتا ہوا مندر کے قریب پہنچ گیا۔

”آگیا رتی رام!“ مندر کے بوڑھے پجاری کی آواز مجھے سنائی دی۔ میں نے اندر کوٹھری میں جھانک

کر دیکھا کہ بیماری پتھر پر بھگت پس رہا تھا۔ ”آج اچھی طرح بھگت پیسی ہے۔ تجھے مزہ آ جائے گا، تیری طبیعت سیر ہو جائے گی۔“

کوٹھری کی ادھ کھلی شکستہ کھڑکی سے مجھے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ گاؤں کے اس قریبی مندر کے عقب میں یہ کوٹھری تھی۔ مراری کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہاں اکثر نشے باز جمع ہوتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کے ماموں تھکی رام کو پتا نہ چل جائے، رتی رام کا جب جی چاہتا وہ بیماری سے کہہ کر اپنا شوق پورا کر لیتا اور آج تو خود بیماری نے اسے دعوت دی تھی البتہ اس نے کہہ دیا تھا کہ ایک اور شخص بھی موجود ہو گا، لیکن وہ رتی رام کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔

”ایک اور شخص بھی تو آنے والا تھا۔“ رتی رام نے بھگت پینے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
”ابھی وہ بھی آئے گا۔“ یہ کہہ کر خود بیماری بھی بھگت چڑھانے لگا۔ ”واہ کیا چیز پی ہے۔“ اسی وقت ”بے بھولا ناتھ“ کی آواز گونجی اور مراری وہاں پہنچ گیا۔

”ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے مراری! ابھی تو صرف ذرا ذرا سی چکھی ہے۔“ بیماری نے مراری سے کہا۔

مراری کو دیکھ کر رتی رام چونکا۔ اسے یقیناً علم تھا کہ مراری اس کے ماموں کے دشمن چھاد رام کا چھوٹا بھائی ہے۔ گاؤں میں سبھی ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کے چونک اٹھنے کی وجہ یہی ہو گی۔ مراری بھی شاید اس کے چہرے سے کیفیت بھانپ گیا اور بولا۔ ”رتی رام! تمہارے ماموں اور میرے بھائی کے درمیان دشمنی تھی تو اس سے ہمیں کیا۔ خواہ مخواہ میرے بھائی صاحب، بلونت کی بغل میں جا بیٹھے۔ اسی کے نتیجے میں انہیں جیل کا منہ دیکھنا پڑا اور پھر ان کی موت بھی جیل میں ہوئی۔“

بلونت کے ذکر پر رتی رام اور بھڑک گیا۔ مراری نے اس کی طرف دیکھے بغیر بھگت پینا شروع کر دی۔ رتی رام بھی تیسرا گلاس چڑھا گیا۔

”راجپوتوں کے زمانے گئے۔“ مراری پھر بول اٹھا۔ ”اس دلس میں اب برہمن راج ہی آئے گا۔ بس ذرا انگریز یہاں سے چلے جائیں۔“

میں نے رتی رام کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اب اس کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں تھے۔ غالباً ذہن پر نشہ غالب آئے لگا تھا۔

مراری کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے اپنے کرتے کی جیب سے تانبے کا ایک پرانا پیسا نکالا اور بیماری کو مخاطب کیا۔ ”مہاراج! آج تو ہمیں تانبا ملی بھگت پینا ہے۔“

رتی رام تانبے کے پیسے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی بہت سے لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ تانبا ملی ہوئی بھگت بہت نشہ آور ہوتی ہے۔ میں بھی پیوں گا۔“

”لڑکے! یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔“ مراری نے اسے تاؤ دلایا۔

رتی رام جوش میں آ کر بولا۔ ”ارے اگر بہت چڑھ جائے گی تو اپنے دشمنوں کو دو چار گالیاں بک لیں گے۔ ہولی کا رنگ بڑھ جائے گا۔ دھت ترے بلونت کی ایسی تھی۔“ وہ کچھ زیادہ ہی لہر میں آ گیا۔

اس نے گویا بھی کو برا کہا تھا مگر میں اپنا غصہ پی گیا۔

معاملہ جم گیا۔ مراری کا یہی مقصد تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رتی رام کو اصل معاملے کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”بھئی تیرے ماموں کا بہت رعب ہے۔ بلونت کو جیل سے آئے پانچ دن گزر گئے مگر ابھی تک اس کی اتنی ہمت نہیں پڑی کہ گاؤں والوں کو اپنا چہرہ دکھاسکے۔ وہ تو اپنے کھیتوں پر پڑا رہتا ہے۔“ مراری نے دانستہ میرا ذکر چھیڑ دیا۔

”ارے وہ تو اپنے جوان بیٹے کا سوگ منا رہا ہو گا۔“ بیماری نے درمیان میں مداخلت کی۔

”کس کا سوگ؟ کیا جسونت کے سوگ کی بات کر رہے ہو؟“ مراری یہ کہہ کر رتی رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر رتی رام چپ ہی رہا۔ وہ آدھا گلاس اور پی گیا تو مراری پھر بولا۔ ”مہاراج! بہت سوں کو بھگت ایسی چڑھتی ہے کہ ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ بات ہی نہیں کر پاتے۔“ وہ بیماری سے مخاطب تھا۔ پھر اس نے رتی رام کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کہیں تمہیں تو بھگت نہیں چڑھ گئی؟ تم کچھ نہیں بول رہے۔“

”میرا جی تو گالیاں بکنے کو چاہ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہی رتی رام نے واقعی بلونت اور اس کے سارے خاندان کو بری بری گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ پھر زور سے ہنسنے لگا۔

”ویسے رتی رام، تمہیں ایک بات ماننا پڑے گی کہ آج کل ہماری پولیس بہت صحیح جا رہی ہے۔“ مراری نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”پولیس نے تمہارے تینوں خاندانی دشمنوں کا پتا کس آسانی سے لگا لیا، کمال ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ ہماری پولیس نے دہلی کی خفیہ پولیس سے مدد لی تھی۔“ مراری نے گپ ماری۔ ”اس کے بغیر اتنا بڑا کام نہیں ہو سکتا تھا۔“

اپنے کارنامے کا سہرا دہلی کی خفیہ پولیس کے سر بندھتے دیکھ کر بھلا رتی رام کس طرح خاموش رہتا۔ پہلے تو وہ آہستہ پھر بلند آواز میں قہقہے لگانے لگا۔

”ارے اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے رتی رام؟ تمہیں کہیں نشہ تو نہیں ہو گیا۔“ مراری نے اسے ٹوکا تاکہ وہ کھلے۔

”نشہ تو تمہیں ہو گیا ہے مراری!“ رتی رام نے جواب دیا۔ ”خفیہ پولیس ک.....“ اس نے پولیس کو گالی دی، پھر سینہ پھلا کر بولا۔ ”یہ اطلاع پولیس کو ہم نے دی تھی۔“

”تم بھی خوب اڑاتے ہو یاد!“ مراری نے اسے چڑایا۔ ”تم تو اس طرح بات کر رہے ہو جیسے یہ تمہارا ہی کارنامہ ہو۔“

رتی رام اور گرم ہو گیا۔ ”تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔“ اس نے مراری کو گھورا۔ ”اگر ہم دونوں بھائی امت نہ کرتے تو تمہاری پولیس کھیاں مارتی رہتی۔“

”ارے چھوٹو یار، کیوں گپ مار رہے ہو۔“ مراری نے یقیناً مزید تصدیق کی خاطر کہا۔ ”گاؤں میں تو کسی کو اس بات کا پتا نہیں۔“

”پتا کیسے چل سکتا ہے، جب ہم نے کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں۔ ماما نے ہم سے منع جو کر دیا ہے۔“
رتی رام نے تڑنگ میں اعتراف کر لیا۔

پانچ روز تک میں نے جس بات کا بے چینی سے انتظار کیا تھا، معلوم ہو چکی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے لوٹ آیا۔ گاؤں کے چوک میں لوگ پانی چمڑک کر ہولی ٹھنڈی کر رہے تھے۔ ادھر ایک ہولی ٹھنڈی ہو رہی تھی اور دوسری ہولی کی آگ میرے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ یہ انتقام کی آگ تھی ان سے انتقام لینے کے بعد رکنی سے کیا ہوا عہد پورا ہو جاتا۔ پھر اس کے جسم پر سیاہ ساڑھی نہ ہوتی اور نہ ہی میری راتیں اس کی آغوش سے خالی ہوتیں۔ اس کے باوجود میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ جہاں اتنا وقت لگا تھا، کچھ اور وقت بھی خرچ ہو جاتا، مجھے پروا نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں کے قتل کا الزام مجھی پر عائد کیا جاتا۔ سو اس کا تذکر ضروری تھا۔ میں نے اسی لئے قانون کی گرفت سے بچنے کا پہلے بندوبست کیا تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ لوٹے۔ میری تمام تر تیک و دو رکنی کے قرب کی خاطر تھی۔

پھر وہ رات بھی آئی گئی کہ جب سارا گاؤں نیند سے جاگ اٹھا۔ گورا اور کالا دونوں ایک ساتھ دبا سے سفر کر گئے۔ ان دونوں کی خون میں تر بہ تر لاشیں ایک ٹالے سے ملی تھیں۔ میں چوری جیسے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پولیس جب ان کی لاشوں کو لے جا رہی تھی تو لوگوں کا جھوم انہیں دیکھنے کے لئے ٹھانھیں رہا تھا۔ پلو بہ پلو سوئے ہوئے دونوں بھائیوں کو جو بھی دیکھتا اس کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ دلی دلی آوازوں میں وہ میرا ذکر بھی کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان دونوں بھائیوں کو میں نے ہی قتل کیا ہے، لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بلند آواز سے مجھ پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کر سکتا، لیکن تلسی رام نے یہی کہا۔ ”یہ اسی بلونت سنگھ کا کارنامہ ہے، پکڑو اس سالے کو۔“

اسی کے بعد پولیس کی ایک پوری ٹکڑی میری گڑھی میں کھس گئی۔ میں دور دور رہ کر سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سب کو نیند سے جگایا گیا، گھر کی تلاشی لی گئی مگر میں وہاں ہوتا تو انہیں ملتا۔ میرے فرار سے پولیس کا شک یقین میں بدل گیا۔ پولیس آگاہ تھی کہ جسونت کی مخبری انہی دونوں مرنے والوں نے کی تھی، غالباً اسی لئے میں نے ان سے اپنے بیٹے کا انتقام لیا تھا۔ اس کے باوجود سوال یہ تھا کہ مجھے اس بات کا علم کس طرح ہوا؟ کیا پولیس والوں میں کسی نے میرے لئے مخبری کا فرض انجام دیا تھا؟

میرے بچنے کا دار و مدار اس پر تھا کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور میں صبح ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر آگرہ شہر پہنچ جاؤں۔ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد میں رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گیا۔ گھوڑے کو میں تیزی سے شہر کی طرف دوڑا رہا تھا۔ میرے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

دوپہر کے وقت میں ایک بار پھر گاؤں میں داخل ہوا۔ اس وقت تک دونوں بھائیوں کے جنازے تیار ہو چکے تھے جنہیں دیکھ کر سبھی اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ لوگوں کی زبانوں پر انہی دونوں کا ذکر تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تو مذاق ہی میں کہا کرتے تھے دونوں ایک ہی گھوڑے پر بیٹھ کر شادی کرنے جائیں

ہے۔ یہ بھی قسمت کے کھیل ہیں کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے اور ایک ساتھ ہی مرے۔ میں نے چمپ کر لوگوں کی باتیں سنیں اور پھر وہاں سے ہٹ آیا۔ شام ہونے سے پہلے لوگ شمشان گھاٹ سے لوٹ آئے۔

اب میرا چھاپا رہنا ضروری نہیں تھا۔ اس مرتبہ میں کھلے عام گاؤں میں آیا۔ گاؤں کا ریوڑ لے کر لوٹنے والا چرواہا رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ!“ میں نے چرواہے کی حیرت زدہ آواز سنی۔

راستے سے گزرنے والے ہر شخص کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ میں بڑی بے خوفی سے گھوڑے پر سوار آگے بڑھ رہا تھا۔ تمباکو والے کی دکان پر پہنچ کر میں نے اپنا گھوڑا روک لیا۔

”چاچا! دو پیسے تمباکو دیتا۔“ میں نے دکان دار کو مخاطب کیا، پھر گھوڑے سے اتر گیا۔

بوڑھا دکان دار مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے حقے کے تمباکو کی پڑیا تھماتے ہوئے وہ آخریوں ہی اٹھا۔ ”ٹھاکر! تمہیں شاید کچھ خبر نہیں۔“

”کس بات کی خبر چاچا؟“ میں تمباکو کی پڑیا لے کر انجان سا بن کر بولا۔

”رتی رام اور سونی پال قتل ہو گئے۔ ان دونوں کی لاشیں گاؤں کے قریبی ٹالے سے ملی ہیں۔ کسی نے بڑی بے دردی کے ساتھ ان کی گردنوں پر چھری پھیری ہے، جس طرح مسلمان بکروں کو ذبح کرتے ہیں بالکل اسی طرح گردنیں آدمی کٹی ہوئی تھیں۔“ بوڑھے تمباکو فروش نے بتایا۔ اس کے لہجے میں انچاپاٹ تھی اور وہ بغور میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں آس پاس اور جو دوسرے لوگ موجود تھے، ان کی نظریں بھی میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”ان کے ماموں تلسی رام ہی نے انہیں مروایا ہو گا۔“ میں نے جواب میں سکون کے ساتھ کہا۔ ”کئی بات پر بھانجوں سے وہ بگڑ گیا ہو گا۔ وہ بڑا فراڈ برہمن ہے۔“ پھر میں نے اپنی بات کا رد عمل دیکھتے بغیر گھوڑے پر بیٹھ کے اس کی باگ کھینچی اور گڑھی کے راستے پر ہو لیا۔

ایک پولیس افسر نے توقع کے مطابق مجھے راستے ہی میں روک لیا۔ سارے گاؤں میں میری آمد کی خبر پھیل چکی تھی۔

”ٹھاکر! تھانے چلو۔“ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔

”خواہ مخواہ آپ نے تکلیف کی۔“ میں نے ہنسا۔ ”بارہ سال پہلے اسی طرح مجھ پر قریبی گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے کا الزام لگایا گیا تھا جو بعد میں غلط ثابت ہوا۔“

”مگر تلسی رام سے تمہاری دشمنی کے بارے میں سبھی جانتے ہیں ٹھاکر!“ پولیس افسر بولا۔

”اسی وجہ سے تو کہتا ہوں کہ دشمنی کے سبب ہی تو اس بد معاش نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا ہو گا۔“

پولیس انسپکٹر سے خاصی دیر بحث مباحثے کے بعد آخر کار مجھے تھانے جانے ہی پڑا۔ تپ کا اکامیری جبیب میں تھا جسے ابھی میں نے دانستہ ظاہر نہیں کیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد تلسی رام بھی تھانے پہنچ گیا۔ تعزیت کے لئے آنے والوں میں سے کچھ افراد کو بھی وہ اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ تھانے میں پہنچتے ہی اس نے مجھے دیکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے خیال میں شاید مجھے تھانے کی حوالات میں بند ہونا چاہئے تھا۔ میں اسے دیکھ کر حشرات سے ہنس دیا۔

”فوجدار صاحب! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے اس قاتل کو یوں آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ کیا آپ اس کے رعب میں آگئے؟“ تلسی رام رہنسا ہو کر بولا۔

پولیس انسپکٹر نے خاموشی سے ایک کانڈ تلسی رام کی طرف بڑھا دیا۔ یہی وہ تڑپ کا اکا تھا جس کا توڑ پولیس یا تلسی رام کے پاس نہیں تھا۔

تلسی رام نے وہ کانڈ دیکھا اور دانت پس لئے۔ ”نہیں نہیں یہ فراڈ ہے۔“ وہ چیخ اٹھا۔ ”اس نے میرے بھانجوں کو قتل کیا ہے۔ اسے آپ جانے نہ دیں پکڑ لیں۔“

”سیٹھ تلسی رام! کسی بھی شخص کو محض شک کے سبب گرفتار نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو۔“ پولیس آفیسر نے تلسی رام کو سمجھایا۔ ”جس وقت گاؤں میں یہ جرم سرزد ہوا بلونت سنگھ آگرہ سول اسپتال میں تھا۔ ثبوت ڈسپانچ سرٹیفکیٹ کی صورت میں موجود ہے۔ سر سے ابھی تک پٹی بھی بندھی ہوئی ہے۔ کل شام ایک ٹانگے کی جھپٹ میں آکر بلونت سنگھ زخمی ہو گیا تھا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی اس لئے اسے ایک رات اسپتال میں رکھ کر صبح چھٹی دے دی گئی۔ اس نے احتیاطاً سرٹیفکیٹ بنوایا تھا کہ کہیں گاؤں سے اس کی غیر موجودگی میں کوئی الزام نہ لگا دیا جائے۔“ پولیس انسپکٹر کی بات سن کر تلسی رام کا چہرہ اتر گیا۔ ”تمہیں کسی اور پر شک ہے؟“ پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔ تلسی رام خاموش رہا تو وہ پھر بولا۔ ”ہو سکتا ہے، سود کے لین دین میں تمہارا کسی کسان سے جھگڑا ہو گیا ہو اور اس نے تم سے انتقام لینے کے لئے تمہارے بھانجوں کو قتل کر دیا ہو۔“

”نہیں نہیں، اس ظالم کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا۔“ تلسی رام نے فوراً جواب دیا۔

میں کچھ نہ بولا اور مسکراتے ہوئے خاموشی سے تلسی رام کی بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا۔ مجھے کچھ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پولیس انسپکٹر خود میری طرف سے بول رہا تھا۔

”پھر جب تک ہمیں اصل مجرم نہیں ملتا، تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔“

پولیس انسپکٹر کی بات سن کر تلسی رام رونے لگا۔ اسے یقیناً بھانجوں کی موت سے زیادہ اس بات کا غم تھا کہ میں صاف بچ گیا۔

”تو پھر مجھے اجازت ہے جناب! میں جاؤں؟“ میں کافی دیر کے بعد پولس انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔

”ہاں تم جاسکتے ہو کیوں کہ تم نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی ہے۔“ پولیس انسپکٹر نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور برآمدے سے گزر کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے میں بڑے فطرت انداز میں تلسی رام کی طرف دیکھ کر ہنسا تھا۔

میری وہ رات بہت حسین گزری۔ میں نے رکنی کے بیٹے کا انتقام لے لیا تھا۔ اب اس نے سیاہ ساڑھی اتار دی تھی۔ اس کے جسم پر ہری پھول دار ساڑھی تھی۔

☆=====☆

دن گزرنے لگے اور گاؤں والے دونوں جڑواں بھائیوں کے قتل کو بھول گئے۔ رفتہ رفتہ شاید تلسی رام بھی یہی سمجھنے لگا کہ ہو سکتا ہے اس کے بھانجوں کو میں نے قتل نہ کیا ہو ورنہ اتنے عرصے تک میری طرف سے خاموشی نہ رہتی۔ دشمنی تو تلسی رام سے تھی۔ اگر دشمنی کا قرض ہی چکانا ہوتا تو میں اب تک تلسی رام سے کچھ کیوں نہ کہتا۔ تلسی رام اسی سبب اپنے سودی دھندے میں مصروف ہو گیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ مجھے اس سے انتقام لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کاروباری مصروفیت ہی کی وجہ سے تلسی رام نے اپنے بیٹے نیتا رام کی شادی کو کچھ دن ٹال دیا اور پھر شادی بھی کر ہی دی۔ وقت سے فائدہ اٹھا کر وہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ رہا تھا۔ میری طرف سے خاموشی بھی یقیناً اس کے لئے تعجب خیز ہی رہی ہو گی۔ اگر درمیان میں رکنی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں تلسی رام کے بھانجوں کو بھی قتل نہ کرتا۔

بلونت سنگھ کے باپ ہماری سنگھ نے کئی بار ڈھکے چھپی لفظوں میں مجھے یاد دلایا تھا کہ ابھی تلسی رام زندہ ہے اور اس کا کاروبار پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے، چہرہ دستیاب بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ اس کے باوجود ان تمام باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا میری جگہ اگر واقعی بلونت ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

رتی رام اور سونی پال کے قتل ہونے پر گھر والوں نے سکون کا سانس لیا تھا انہیں اطمینان تھا کہ اب جسونت کی روح کو قرار آ گیا ہو گا۔ مجھے اگر دکھ ہوتا تو صرف جسونت کی بیوہ اور بیٹے کو دیکھ کر۔ میرے دل میں محبت کی نری بھی تھی۔ یہی نری میرے لئے عذاب جان تھی۔ میں سوچتا کہ بلونت کے باپ کا جھگڑا تلسی رام سے تھا۔ اس کے لئے بلونت نے اپنے بیٹے کو موت کی بھینٹ کیوں چڑھا دیا؟ ایسی عزت کس کام کی؟ ایسی ہمدردی اور شان سے کیا فائدہ؟ جس نے ایک جوان لڑکی کی مانگ اجاڑ دی۔ وہ بے چاری تو اب ساری عمر آہیں بھرتی رہے گی اور میں اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر سلگتا رہوں گا۔ ایک بچے کو جینم کر کے کون سی راجپوتی شان بڑھ گئی؟

اسی عرصے میں ایک روز بلونت کی بھالی، یعنی نواب سنگھ کی بیوی نے مجھ سے کہا۔ ”دیور! جیتے جیتے بیٹے کی موت کا انتقام لے کر کیا تم خاموش بیٹھ گئے؟ کیا اس کے لئے صرف تلسی رام کے بھانجوں کو قتل کر دینا کافی تھا؟ کیا انتقام پورا ہو گیا؟ کیا تم اپنے بڑے بھائی کو بھول گئے جنہیں کالے پانی کی سزا دی گئی ہے؟ اور وہ وہاں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ یا پھر اپنی بیوی اور بیٹوں کے پیار میں گم ہو کر تم نے بھائی کو فراموش کر دیا؟“

جس وقت مجھ سے یہ بات کہی گئی، گھر میں عزیز واقارب بھی موجود تھے۔ اس عورت کے طنز سے میرے دل پر چوٹ سی گئی۔

”بھائی! اگر میں اپنی زندگی کے بدلے بھی بڑے بھائی کو کالے پانی کی سزا سے بچا سکتا تو قطعی دریغ

ہارک اور کشادہ غار، ممکن ہے میری روح کو سکون دے سکیں، میں سوچتا اور تلسی رام کو راستے سے ہٹانے کے نئے نئے منصوبے بناتا رہتا۔

پھر جون کا مینٹا شروع ہو گیا۔ اس بار بارش جلدی شروع ہو گئی۔ چنبل جیسے جوان ہو گیا۔ میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔ منصوبہ بناتے ہوئے اس امکان کو بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ تلسی رام کو قتل کرنے کے بعد مجھے راہ فرار اختیار کرنا پڑے۔ ایسی صورت میں چنبل کے غار ہی مجھے پناہ دے سکتے تھے۔ اب میں کسی صورت پولیس کے ہتھے چڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی غرض سے میں نے ہتھیار، کارٹوس اور ساتھی، سب کچھ جمع کر لیا تھا۔ اب صرف دن کا تعین کرنا باقی تھا۔ اسی دوران مجھے اطلاع ملی کہ تلسی رام کے بیٹے نیتا رام کی بیوی ماں بن گئی ہے میں نے سوچا، ایسے میں تلسی رام بہت خوش ہو گا۔ وہ اپنے پوتے کا چہرہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گا۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کہاں گھیرا جائے؟ قدرت نے مجھے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ میں نے اس راستے کا اچھی طرح جائزہ لیا جس سے تلسی رام کو گزرنا تھا اور میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔

اس راستے میں ایک جگہ دلدل تھی۔ اگر کسی طرح تلسی رام کو دلدل کی طرف رگید دیا جاتا تو اس کی موت حادثہ کہلاتی۔ مجھ پر اس کے قتل کا الزام نہ آتا۔

ہر پونم کی رات تلسی رام دیوی کے مندر میں پوجا کرنے جاتا تھا۔ آخر اس کی موت کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ درمیان میں صرف دو دن باقی تھے۔

پونم کی شام کو میں اپنے گھر پہنچا کہ رکنی کو دیکھ سکوں، اس خیال سے کہ اب لوٹ کے آ بھی سکوں یا نہیں۔ جو کچھ سوچا جاتا ہے، سب اسی طرح تو نہیں ہوتا۔ عین وقت پر کوئی بھی غیر متوقع صورت حال پیش آ سکتی تھی۔ رواجی سے قبل میں نے بلونت کے باپ بہاری سنگھ کے پاؤں چھوئے، پوتے پوتوں کے سر پر ہاتھ پھیرے، جسوت کے بیٹے کو خوب پیار کیا، پھر قریب کھڑی رکنی سے مخاطب ہوا۔ ”ٹھکرانی! کون جانے اب زندگی میں ملاپ ہو گا بھی یا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھاری ہو گئی۔ میں نے کھٹاکر گلا صاف کیا، پھر مزید بولا۔ ”میں تمہارے تینوں بیٹوں کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں ٹھاکرا“ رکنی بولی۔ ”میں لگن منڈپ میں آپ کے ساتھ سات پھیرے لگا کر آپ کی بیویں ساتھی بنی ہوں۔ میرا آپ کا ساتھ تو جنم جنم ختم نہیں ہو سکتا۔ آپ خوشی سے جائیں اور میرے جوان بیٹوں کو بھی ساتھ لے لیں کہ یہ آپ کے بازو ہیں۔“

”میں انہیں اس لئے بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں ٹھکرانی کہ میرے پیچھے کہیں پولیس انہیں کسی جگہ میں نہ پھانس دے۔“ میں نے وضاحت کی۔

اس کے بعد میں نے چھاد رام کے بیٹے روپا کو بھی ملاقات کے لئے بلوایا اور اسے تسلی دی کہ بیٹا، دل گھبرائے تو ماں سے ملنے آ جایا کرنا۔ کسی طرح گھبراتا مت۔ میں نے رکنی کی طرف اشارہ کیا۔ روپا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگا۔

پھر اسی رات کا یہ واقعہ ہے کہ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی جانب دیکھتے ہوئے میں ایک درخت کی

نہ کرتا۔ مجھے یہ سودا منظور ہوتا۔ ”میں نے اس عورت کو سمجھا۔

”میں تم سے تمہارے بھائی کی رہائی کے لئے نہیں کہہ رہی۔“ بلونت کی بھابی کہنے لگی۔ ”تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ انہیں یہ سخت سزا کیوں ملی ہے اور اس میں کس کا ہاتھ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار صرف اور صرف تلسی رام ہے۔ اس نے پانی کی طرح روپیا بہا کر جھوٹے گواہ پولیس کو فراہم کئے تاکہ تمہارے بھائی کو لمبی اور سخت سزا ہو۔“

بات کو ٹالنے کے لئے ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ خلاف توقع رکنی بول اٹھی۔ ”ٹھاکرا! بھابی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں ہمارا اصل دشمن تلسی رام ہے جب تک وہ زندہ رہے گا ہمارے دلوں کو سکون نہیں مل سکے گا اسی نے تو تمہیں تباہ و برباد کیا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ بلونت کے باپ اور بھابی نے رکنی کے دل و دماغ میں یہ زہر بھرا ہے۔ انہوں نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ میں رکنی کی بات نہیں ٹال سکتا۔

رات کو میں نے رکنی کو سمجھانا چاہا مگر جو خود ہی کچھ نہ سمجھنا چاہے اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ نتیجاً اس کی محبت نے مجھے ایک بار پھر آزمائش میں ڈال دیا۔

”اچھی بات ہے۔“ میں بولا۔ ”اگر تم یہی چاہتی ہو تو آج سے میں نے سب کچھ چھوڑا۔“

عورت ہی شاید مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ مجھے انتقام کی آگ میں جھونکنے اور خود سے جدا کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کی باتیں جھٹک دوں لیکن اتنی ہمت کہاں سے لاتا۔ وہ صرف بلونت کی بیوی ہوتی تو یقیناً میں ایسا کر گزرتا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ تو میری محبوبہ تھی، سربیتا تھی۔ اور اپنی محبوبہ کی بات کون ٹال سکتا ہے۔

خود فراموشی کے لمحات میں جانے کب میری زبان پر پہلی مرتبہ سربیتا کا نام آ گیا۔ ”میری زندگی، میری سربیتا!“

رکنی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”ٹھاکرا! یہ سربیتا کون ہے۔“

میں چونک اٹھا اور سنبھل کر بولا۔ ”تم ہی ہو..... سب کچھ تم ہی ہو، تمہارے ہزار نام ہیں۔“ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میرے جواب سے یقیناً وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

تلسی رام کو بھی میں اس طرح مارنا چاہتا تھا کہ الزام مجھ پر نہ آئے، لیکن ایک ہی داؤ ہر مرتبہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔ اب میں دوبارہ گھر سے اٹھ کر کھیتوں پر آ گیا تھا۔ کھیتوں کے کنارے چارپائی پر سوتے سوتے میں اکثر چونک اٹھتا۔ میری آنکھ کھل جاتی تو میں، تک چنبل کی جانب سے آتی گرجتی ہوئی ہواؤں کے شور کو سنتا رہتا۔ چنبل کی ہوائیں جیسے مجھ سے کہتیں، آ جاؤ ہماری گود میں آ جاؤ، سب دکھ ختم ہو جائیں گے۔

اپنی محبت سے پچھڑ کر میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ میری روح کو کسی طرح قرار نہیں تھا۔ میں چنبل کے غاروں میں اکیلا بھٹکتا پھرتا۔ تیز آواز سے بہتا ہوا دریائے چنبل، دور تک پھیلے ہوئے جنگ

آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ میری نظرس بے چینی سے اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جو دیوی کے مندر سے وہاں تک آتا تھا۔ میرے دونوں شانوں پر کارتوسوں کی بیلیں پڑی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ میں راکفل تھی۔ بلونت کے تینوں بیٹے اور چاروں ساتھی کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ میں خود تلسی رام کو گھیر کر دلدل میں گرانا چاہتا تھا کیوں کہ اندازے کی ذرا سی بھی غلطی خود گھیرنے والے کو موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ وہ خود دلدل میں جا کر تا۔ مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ تلسی رام اپنے ملازم کو ساتھ لے کر پوجا کے لئے روانہ ہو گیا ہے۔ میں ایسی جگہ چھپا ہوا تھا کہ جیسے ہی تلسی رام وہاں تک پہنچے اسے دلدل کی طرف ہانک دوں۔ جگہ ایسی تھی کہ آنے جانے والوں کی نظر مجھ پر نہ پڑتی۔

کچھ ہی دیر میں دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی میں تلسی رام کا پیلا مجھے دور ہی سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”اس کا ہر قدم موت کی جانب اٹھ رہا ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

تلسی رام اب اپنی حفاظت کے لئے صرف ایک شخص کو ساتھ رکھتا تھا۔ اس کی دانست میں اب عداوت ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ پھر اطلاعات کے مطابق اس کے پاس بھرا ہوا پتول بھی رہتا تھا۔ اس لئے وہ بے فکر تھا۔ تلسی رام کے ساتھ جو شخص تھا، اس کے ایک ہاتھ میں لاشی تھی اور دوسرے میں دیوی کے پرشاد (تبرک) کا تھا۔ تلسی رام کو پتا بھی نہ چلا کہ اس کے ساتھ چلنے والے شخص کے سر پر کب پیچے سے ایک ضرب لگی۔ تلسی رام اس وقت چونکا جب وہ شخص راکفل کے کندے کی زوردار ضرب کھا کر زمین پر گر رہا تھا۔ اس نے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا، تین چار مسلح افراد کو دیکھ کر اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اچانک اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے وہ اپنی کمر سے بندھا ہوا پتول نکالنے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ اسی وقت اسے اپنی مخالف سمت سے موت کا فرشتہ، یعنی میں اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میرے ہاتھ میں راکفل تھی جس کی نال تلسی رام کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کا وہ ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے آ رہا جس سے وہ پتول نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کہاں بھاگ رہا ہے کتے!“ میں دانست پس کر بولا، مجھے اس پر غصہ یوں تھا کہ وہی رکشی اور میرے درمیان دیوار بن گیا تھا۔ ”یہی تو حساب برابر کرنے کا وقت ہے۔“

اسی دوران کھٹ کی آواز کے ساتھ پتول تلسی رام کی کمر سے پھسل کر نیچے گرا۔ جس پٹی سے پتول بندھا ہوا تھا، وہ پتول نکالنے کی کوشش میں غالباً ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میں نے تلسی رام کو یہ سوچ نہیں دیا کہ وہ جھک کر پتول اٹھا سکے۔ زمین پر پتول کے گرتے ہی میں نے ٹھوکر مار کے اسے دور پھینک دیا۔

تلسی رام نے موت کو سامنے دیکھ کر جان بچانے کی ایک اور کوشش کی۔ وہ پھر بھاگ کھڑا ہوا یا ایک سمت ایسی تھی جو میں نے دانست کھلی رکھی تھی۔ اس طرف میں نے اپنے کسی آدمی کو دانست کھڑا نہیں کیا تھا۔ تلسی رام تیزی کے ساتھ اپنی موت سے قریب ہونے لگا۔ میرا مقصد اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ذرا ہی دیر کے بعد تلسی رام کے منہ سے چیخ نکلی جو میرے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ میرا منصوبہ

کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا میں اس کی طرف دوڑا میں نے دیکھا کہ تلسی رام کا جسم اس طرح بل کھا رہا تھا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو، لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی جس سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ تلسی رام کے پاؤں دلدل میں پھنس گئے تھے۔ وہ دلدل سے نکلنے کے لئے جس قدر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اسی قدر دلدل میں دھنسا چلا جا رہا تھا۔

میں پھر زور سے ہنس پڑا اور اس سے کہا۔ ”تلسی! آج تقدیر تجھ سے روٹھ چکی ہے۔ تو خود اپنے گناہوں کی دلدل میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔“

کسی خوفناک عفریت کے جڑوں کی طرح دلدل تلسی رام کے جاندار جسم کو نگل رہی تھی۔ اس کا جسم اب کمر تک دلدل میں دھنسا چکا تھا۔ موت کے خوف سے تلسی رام چیخ اٹھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سینہ دھوکئی کی طرح چل رہا تھا، نتھنے پھول چک رہے تھے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ فضا میں اس طرح ہاتھ چلا رہا تھا جیسے ہواؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ”دھرتی تجھے نگھنا چاہتی ہے تلسی! اب تجھے کوئی نہیں بچا سکتا اس لئے خاموشی سے دھرتی کے اندر اتر جا، ہمیشہ کے لئے۔“

اسی عرصے میں میرے ساتھی بھی وہاں تک پہنچ گئے جہاں تلسی رام دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ لوگوں کو خود سے اتنے قریب دیکھ کر تلسی رام ہار ماننے والے انداز میں ان کی طرف ہاتھ پھیلا کر گزر گئے۔ ”بھگوان کے لئے مجھے بچالو“ میں..... میں اپنی ساری دولت تمہیں دے دوں گا..... ساری زمین جائیداد تمہارے نام کر دوں گی۔“ جب میرا کوئی بھی ساتھی جواب میں کچھ نہ بولا تو اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور گزر گرایا۔ ”ٹھاکرا! مجھے باہر نکال لو..... میں تمہارا غلام بن کے رہوں گا اور گاؤں کی چودھراہٹ تمہارے باپ ہی کے پاس رہنے دوں گا بلکہ میں..... میں یہ گاؤں چھوڑ کر ہی چلا جاؤں گا“ لیکن..... لیکن..... مجھے بچالو ٹھاکرا!..... مجھے بچالو..... مجھے زندہ رہنے دو۔“ تلسی رام کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ اس کا چہرہ پسینے اور آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ موت کے خوف نے اس کے چہرے کو انتہائی خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

”اب وقت گزر چکا ہے تلسی!“ میں نے حقارت کے ساتھ جواب دیا۔ گاؤں میں اب تک رہتے ہوئے مجھے اس کی ایک ایک کمینگی کا علم ہو چکا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”مجھے نیل بھیج کر تو خوش ہو رہا تھا۔ میرا بیٹا اور بھتیجا، پولیس کی گولی سے مارے گئے تو اس خوشی میں تو نے لوگوں کی دعوت کی۔ میرے بھائی کو تو نے کالے پانی کی سزا دلوا دی۔ کیا تو یہ ساری باتیں بھول گیا تلسی!“ اس عیار آدم زاد کی بے بسی میرے لئے باعث مسرت تھی۔

”میرے گناہ معاف کر دے ٹھاکر، معاف کر دے۔ تو چاہے میرا سب کچھ لے لے مگر میرا ہاتھ تمام لے ٹھاکرا!..... میرا ہاتھ تمام لے۔ مجھے اس جہنم میں غرق ہونے سے بچالے۔“ تلسی رام کے رونے، مڑ گزرنے اور عاجزی کرنے سے فضا گونج رہی تھی۔ اب وہ سینے تک دلدل میں دھنسا چکا تھا۔

اسی لمحے جیسے کوئی میرے اندر سے بولا علیالیش: تیری اس آدم زاد سے کیا دشمنی ہے؟ اس کی

طرف چل دیئے تو میں بھی خاموشی سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔ نیتا رام کا سفر پولیس تھانے پر ختم ہوا۔ تھانے کی حدود ہی میں اس کا انچارج فوجدار رہتا تھا۔ نیتا رام اس کا دروازہ پٹینے لگا۔ ”فوجدار صاحب!..... فوجدار صاحب! دروازہ کھولیں!..... جلدی دروازہ کھولیں۔“

”کون کبخت ہے، سونے بھی نہیں دیتا؟“ فوجدار جواب میں زور سے بولا۔

”میں نیتا رام ہوں صاحب! میرے باپو!.....“ آواز بھرا جانے کی وجہ سے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

فوجدار نے دروازہ کھولا۔ نیتا رام کی جگہ اگر اس وقت کوئی اور ہوتا تو شاید فوجدار اسے ڈانٹ کر تھانے میں رپورٹ درج کرانے کو کہہ دیتا، لیکن وہ تو گاؤں کے چودھری کا بیٹا تھا جو ہر تہوار پر فوجدار کے لئے قیمتی تحفے بھیجتا تھا۔ فوجدار نے سوالیہ نظروں سے نیتا رام کی طرف دیکھا۔

”صاحب! باپو، دیوی کے درشن کو گئے تھے لیکن اب تک نہیں لوٹے۔ انہوں نے کبھی اتنی دیر نہیں کی۔“ نیتا رام نے بتایا۔ اس نے غالباً بڑی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔

”اکیلے گئے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“ فوجدار نے پوچھا۔ اس نے تلسی رام کی حفاظت کے لئے اپنا ایک آدمی پیارے دے رکھا تھا۔

”صاحب! ان کے ساتھ آپ کا آدمی پیارے بھی تھا، مگر وہ بھی واپس نہیں آیا۔“ نیتا رام نے جواب دیا۔

”میں ابھی لباس تبدیل کر کے آیا۔“ فوجدار نے کہا۔ ”پھر تو انہیں یقیناً بلونت نے روکا ہو گا۔“

فوجدار نے فوری طور پر میرے ہی اوپر شک کا اظہار کیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا سبب پرانی دشمنی ہی تھی۔ پولیس ہی کیا اس دشمنی سے پورا گاؤں واقف تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد فوجدار نے تھانے سے اپنے ہمراہ تین چار مسلح سپاہی لئے اور تلسی رام کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو کر ان سب کا پیچھا کرنے لگا۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے جن کے پیچھے چھپا ہوا چاند کبھی کبھی درمیان سے بادلوں کی نقاب اٹھا کر زمین کی طرف دیکھتا اور بھرچھپ جاتا اس سے مجھے تعاقب میں اور آسانی ہو رہی تھی۔ آگے آگے ٹارچ جلائے ہوئے چلنے والا سپاہی اچانک رک گیا۔ ٹارچ کا دائرہ گیلی مٹی پر پڑا تھا وہاں سبھی کو گھوڑے کی نعل کے تازہ نشان نظر آ چکے تھے۔ سب کی نگاہیں وہیں جمی ہوئی تھیں۔ انہی نشانات کے درمیان کچھ لوگوں کے قدموں کے نشانات بھی نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر وہاں کوئی شخص زمین پر پڑا تھا۔

سب لوگ دوڑ کر وہاں پہنچے اور پھر نیتا رام تقریباً جچ اٹھا۔ ”ارے یہ تو پیارے ہے۔“

پیارے کے سر کے پچھلے حصے پر خون بھی جما ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش شروع ہو گئی۔

”باپو!..... باپو کہاں گئے پیارے؟ بولو تمہیں کس نے مارا ہے؟“ نیتا رام پاگوں کی طرح بڑبڑاتا رہا۔

دشمنی تو بلونت سے ہے۔ مجھ پر خیر کے جذبات غالب آنے لگے۔ بے اختیار میں چند قدم آگے بڑھا اور پھر ایک پتھر پڑاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو جینے کا موقع مل جائے تو یہ شیطان سے یقیناً انسان بن سکتا ہے۔

یہ دیکھتے ہی تلسی رام نے پھر بہ مشکل میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ٹھاکرا! اے مریمان اور رحم دل ٹھاکرا! مجھے بچالے، میں زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گا۔“

میں نے بائیں ہاتھ میں رانٹل تھامی اور اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

تلسی رام کی آنکھوں میں جیسے زندگی کی چمک لوٹ آئی۔ ”ٹھاکرا!..... ٹھاکرا!“ وہ میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرنے لگا۔

”ٹھاکرا! اس راگھش (شیطان) پر رحم نہ کرنا۔“

اپنے ساتھیوں کی آواز سن کر میں چونک اٹھا، مگر اس وقت تک تلسی رام کی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنس چکی تھیں۔ تلسی رام نے شاید اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر جھٹکا دیا اور میرا پیچھا چمک پھرے پھسل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی گھنٹوں تک دلدل میں دھنس گیا۔

تلسی رام کا چہرہ مجھے اس لمحے شیطان کا چہرہ معلوم ہوا۔ اس نے پاگوں کی طرح قہقہہ لگایا اور بولا۔

”مرتے مرنے بھی میں اپنے دشمن کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور مجھے بھی اپنے ساتھ دلدل میں دھنسانے کے لئے آخری زور لگانے لگا۔

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ میں نے اس شیطان پر رحم کھا کر واقعی شدید غلطی کی تھی۔ میں نے انتہائی غم و غصے کی حالت میں جھٹکا دے کر اپنا بایاں ہاتھ چھڑایا اور رانٹل سیدھی کر لی۔ پھر اس سے پہلے کہ تلسی رام جھٹکا مار کر رانٹل کی ٹال کا رخ اپنی طرف سے پھیر دیتا، ٹریگر دب گیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور رانٹل کی گولی تلسی رام کے جڑے میں گھس گئی۔ اس کا منہ پھٹ گیا اور آنکھیں پھیل گئیں اس کے ہاتھ سے میرا دایاں ہاتھ بھی پھوٹ گیا۔ چند ہی لمحے بعد اس کے جسم کو دلدل نے نگل لیا۔

میرے ساتھیوں نے زور لگا کر مجھے دلدل سے باہر کھینچ لیا۔ میں چند لمحے دلدل کی سطح پر اُترے ہوئے بلبلوں کو دیکھتا رہا، پھر دلدل کی طرف نفرت سے تھوک دیا۔ مجھے اس پر سخت ملال تھا کہ ایک حادثاتی موت قتل میں بدل چکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یہ اطمینان تھا کہ تلسی رام کی لاش دلدل نے نگل لی تھی۔ جب تک تلسی رام کی لاش نہ مل جاتی مجھ پر قتل کا الزام ثابت نہ ہوتا۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ سو اسی خیال سے میں نے اپنے ساتھیوں کو چنبل کے غاروں میں چھپ جانے کی ہدایت کی اور خود گاؤں کی طرف چل دیا۔ میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تلسی رام کی لاش کا سراغ نہ لگالیں۔ میرے مستقبل کا انحصار اسی پر تھا۔ میں چھپتا چھپاتا تلسی رام کی حویلی تک پہنچ گیا۔ وہاں روشنی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جاگ ہو گئی ہے۔ میں مزید چوکنا ہو گیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد مجھے حویلی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ تلسی رام کے بیٹے نیتا رام کو میں نے باہر نکلے دیکھا۔ اس کے ساتھ دو ملازمین بھی تھے۔ انہی میں سے ایک کے پاس لائین تھی وہ ایک

کچھ دیر بعد ہی پیارے کے جسم کو حرکت ہوئی اور اس نے ایک سسکی لی، پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ہوش میں آتے ہی اپنے سر کا پچھلا حصہ سلایا۔

”چھوٹے سینہ! جلدی کرو۔ دشمن بڑے سینہ کا تعاقب کر رہے ہیں۔“ پیارے تیزی سے بولا شاید وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ کافی عرصے بے ہوش رہا ہے۔

”تلسی رام کا تعاقب کرنے والے کون لوگ تھے؟“ فوجدار نے جلدی سے دریافت کیا۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم کیوں کہ میرے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ میں اسی لئے حملہ آوروں کو نہیں دیکھ سکا مگر وہ تعداد میں زیادہ لگتے تھے، مجھے یہ احساس ضرور ہے۔“

”جلدی کریں فوجدار صاحب! وہ میرے باپ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ وہ وہ ان کا برا حال کر دیں گے۔“ نیتا رام کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

پھر قدموں کے نشانات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لوگ دلدل تک بھی پہنچ گئے۔ وہاں جدوجہد کے آثار تو نظر آئے مگر تلسی رام کہاں گیا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ نیتا رام کی بری حالت تھی۔ فوجدار نے اسے تسلی دی۔ ”تم گھر جاؤ، ابھی کسی سے کچھ نہ کہنا۔ میں ‘بلونت’ کی گڑھی جا رہا ہوں۔“

نیتا رام رونے لگا۔ فوجدار سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ میں اب بھی کچھ فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ سیدھا بلونت کی گڑھی پہنچا اور صدر دروازے پر زور سے دستک دی۔ بلونت کا باپ شاید اسی انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اسے یقین ہو گا کہ صبح ہوتے ہوتے پولیس ‘گڑھی’ ضرور پہنچ جائے گی۔ ذرا ہی دیر بعد اس کی آواز آئی اور اس نے پوچھا کون ہے؟ فوجدار کی آواز جواب میں سن کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

”بلونت سنگھ گھر میں ہے؟“ فوجدار نے سوال کیا۔

”کوئی کام ہے اس سے؟“ ہماری سنگھ انجمن بن گیا۔

”تلسی رام غائب ہے۔“ فوجدار نے بتایا۔ ”اس کے محافظ کو بھی کسی نے زخمی کر دیا ہے۔ تلسی رام کے بیٹے نے رپورٹ کی ہے کہ اسے بلونت پر شک ہے۔ بلونت ہے کہاں؟“

”وہ آج کل کھیتوں پر ہوتا ہے۔“ ہماری سنگھ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

اسی دوران مجھے رکنی بھی نظر آگئی۔ اس کے چہرے سے بھی سکون کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس سکون کی وجہ ظاہر ہے یہی ہو گی کہ اس کا شوہر اور بیٹے، پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ فوجدار نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارے بیٹے کہاں ہیں؟“

”وہ بھی ٹھاکر کے ساتھ کھیتوں ہی پر سوتے ہیں۔“ رکنی نے دھیمی اور نرسکون آواز میں جواب دیا۔

”میں سمجھا تھا جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ ویسے یہ ہوا بہت برا۔“ فوجدار نے ہماری سنگھ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”فوجدار صاحب!“ معاً رکنی بول اٹھی۔ ”میری طرف سے تلسی رام کے گھر تعزیت کر دیتا۔“

حالانکہ جب میرے بیٹے جسونت کو پولیس کی گولی لگی تو کوئی تعزیت کرنے نہیں آیا مگر اپنا اپنا طرف ہے ہم ان جیسے نہیں۔“ رکنی کی آواز میں گہرا طنز تھا اور لہجے میں نشتر کی سی کاٹ تھی۔

میں اس کے بعد خاموشی سے لوٹ آیا۔

پھر دوسرے ہی روز وہ خطرہ سامنے آ گیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ تیز دھوپ پڑی اور دلدل کچھ سوکھی تو تلسی رام کے ایک ہاتھ کا پنجہ باہر نظر آنے لگا اور اس طرح لاش کا پتا چل گیا۔ جب تلسی رام کی لاش دلدل سے نکالی جا رہی تھی تو میں بھی قریب ہی ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا سارا تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سارا گاؤں اسے دیکھنے جمع ہو گیا تھا۔ اگڑے سے پولیس چیف بھی آیا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ بلونت نے تلسی رام کو مارنے کے لئے دلدل کا سارا کیوں لیا؟ یا پھر تلسی رام فرار کی کوشش میں خود دلدل کے اندر جا کر مر گیا تھا؟ لاش دلدل سے باہر نکالی گئی جو بری طرح پھول چکی تھی۔ لاش کے چہرے سے کچھ صاف کی گئی تو منہ میں بھی کچھ بھری دیکھ کر سب اس عبرت ناک موت پر انکار افسوس کرنے لگے۔ زخمی جڑے نے یہ راز بھی کھول دیا کہ اسے گولی مار کر قتل کیا گیا تھا۔

یہ سوچ کر میرا دل بیٹھ گیا کہ اب فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ اب گاؤں واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اب رکنی سے بچھڑ گیا تھا، اگر وہ موت حادثاتی ہوتی تو یقیناً مجھے فرار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر رکنی کی یاد میرے پاؤں کی زنجیر نہ بن جاتی، مجھے اگر اس سے ملنے کی آس نہ ہوتی تو میں ‘بلونت’ کے جسم کو چھوڑ کر کہیں بھی چلا جاتا، کسی بھی اور جسم کو اپنی ہاتھ لگا بنا لیتا۔ سو اسی امید پر میں نے اس گاؤں کے قریب قریب ہی روپوش رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے لئے چنیل کے غار نہایت مناسب تھے۔ ان غاروں کی بھول بھلیوں میں پولیس کبھی مجھ پر ہاتھ نہ ڈال پاتی۔ سو میں نے انہی کو اپنا ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا۔

جب میں نے اپنے ساتھیوں کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو ادھیڑ عمر راجپوت موتی بولا۔ ”ٹھاکر! غاروں میں روپوش ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ کھانے پینے کا کچھ بندوبست کر لیا جائے۔“

”کیوں، کیا بہت بھوک لگ رہی ہے موتی؟“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ رنجیت سنگھ کے جسم میں رہ کر میں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا، وہ کام آنے لگا۔ کچھ توقف سے میں نے اسی لئے کہا۔ ”کچھ رانظلیں، کارتوس اور گھوڑے ہمیں کہیں نہ کہیں سے ہر حال میں جلد از جلد حاصل کرنا ہیں۔ برابر والے گاؤں کی سرائے میں تمہارا کوئی جان پہچان والا ہے موتی؟ آدمی اعتماد کا ہونا ضروری ہے۔“

”ہے تو سہی ایک۔“ موتی نے جواب دیا۔ ”اس کا نام بانگے ہے اور وہ اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔ کہیں تو اسے دیکھوں؟“

”فی الحال ہم یہیں پڑاؤ ڈالے لیتے ہیں۔ ہو سکے تو تم اسے اپنے ساتھ لیتے آؤ، مگر دیکھنا زیادہ وقت نہیں لگنا چاہئے۔ ہمیں جلد سے جلد غاروں میں چھپنا ہے۔“

موتی ایک گھنٹے سے پہلے ہی واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ بانگے بھی تھا۔ کچھ دیر تک میں بغور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ بانگے اس بات سے لاعلم تھا کہ سامنے کھڑا ہوا شخص بلونت ہے پھر بھی میں نے اس کے

جرے پر مرعوب ہونے کے اثرات دیکھے۔

”ہمیں رائل اور کارٹوس درکار ہیں۔“ میں نے اسے پہلی بار عجب آواز میں مخاطب کیا۔

”مال تو دے سکتا ہوں مگر اس کی فراہمی میں دو دن لگیں گے۔ پیسے نقد لاؤ اور مال لے جاؤ۔“

بانگے نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

”بستر ہے“ پرسوں اندھیرا پھیلنے ہی یہاں آ جانا۔ مجھے بھی نقد سودا پسند ہے۔“ میں بولا۔ ”بے ایمانی کرنے والے کے لئے میری رائل فوراً شعلے اگلنے لگتی ہے۔ میں ادھار سودا نہیں کرتا۔“ میری آواز میں گرج تھی۔

بانگے رخصت ہو گیا تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ غاروں میں داخل ہو گیا۔

☆=====☆

اسی کے دوسرے دن شام کو کھیزا رانٹور گاؤں سے آٹھ میل دور ایک گاؤں کے زمیندار کو میں نے اپنا پسلا نشانہ بتایا۔ اس کے متعلق ضروری معلومات موتی نے فراہم کی تھیں۔ اگلے روز بانگے سے اسلحہ خریدنا تھا اس لئے مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔

پہلے ڈاکے کا مال سمیٹ کر جاتے ہوئے میں نے پیغام چھوڑا کہ اگر تلسی رام کے بیٹے نیتا رام کو اپنی جان پیاری ہو تو گاؤں چھوڑ کر چلا جائے، پولیس کے چکر میں پڑا تو میں اس کے پورے خاندان کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ میں نے زمیندار کو تاکید کی کہ یہ پیغام کھیزا رانٹور گاؤں میں نیتا رام تک ضرور پہنچا دیا جائے۔

پھر مجھے اطلاع ملی کہ اگر پولیس ہوشیار ہو گئی ہے۔ وہ ابتدا ہی میں مجھے دبا دینا چاہتی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کے مقابل ایک تجربے کار ڈاکو ہے۔ میری جگہ اگر واقعی بلونت ہوتا تو شاید سسم کریٹھ جاتا۔ معلوم ہوا کہ پولیس چیف نے پوری پلٹن کو اسی کام پر لگا دیا ہے۔ اس کا حکم تھا کہ گاؤں گاؤں گھومو اور بلونت سنگھ کو زندہ یا مردہ حاضر کرو۔

میں ہار ماننے والا کب تھا۔ رکنی مجھے بہت یاد آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کئی دن ہو چکے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ غاروں کے قریب ہی رک کر میرا انتظار کریں سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔

”لیکن باپو! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ صوبیدار نے پوچھا۔

”تمہاری ماں سے ملنے۔“ میں نے اس سے اصل بات نہیں چھپائی۔ ”اسے تسلی دینی ہے کہ ہم سب خیریت سے ہیں۔“

”یہ بہت خطرناک ہے۔ سردار!“ موتی بول اٹھا۔

”ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے موتی اس میں تو قدم قدم پر خطرہ ہے، پھر کیا ڈرنا!“ میں بولا۔

موتی خاموش ہو گیا اور میں وہاں سے چل دیا۔ میرے نزدیک ان غاروں میں روپوش رہنے کا فائدہ ہی کیا تھا، اگر میں رکنی سے نہ مل پاتا۔ چھپتا چھپاتا آخر میں گڑھی کی عقبی دیوار پھاند کر اندر پہنچ ہی گیا۔

مجھے اس طرح گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سبھی حیران رہ گئے۔

”ٹھکرانی! اندر کمرے میں چلو“ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع

کئے بغیر رکنی کو مخاطب کیا۔

رکنی فوراً میرے ساتھ اندر کمرے میں آگئی تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے کٹھی لگا دی۔

”ارے ارے“ یہ کیا کر رہے ہو ٹھاکرا! گھر میں جوان ہوئیں.....“ رکنی کا جملہ ادھورا ہی رہ

گیا۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو مزید حرکت کرنے سے روک دیا تھا۔

وہ اپنے بیٹوں کے بارے میں پوچھنے لگی اور میں نے اسے اطمینان دلا دیا۔ پھر میں وہاں زیادہ نہیں

رکا۔

میں واپس اپنے ساتھیوں تک بہ حفاظت پہنچ گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ غاروں میں چھپنے کے

لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا۔ سب لوگ پیدل تھے۔

”ٹھکر!“ اچانک میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

میرے ساتھیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ مجھے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر درختوں کی آڑ

میں کچھ سائے سے حرکت کرتے نظر آئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ وہ پولیس والے ہی ہو سکتے ہیں۔ میں

نے اپنی رائل کی ٹال درختوں کی طرف کر کے فائر کیا۔ دوسری جانب سے فوراً جوابی فائر کیا گیا۔ پولیس

سے یہ میرا پسلا مقابلہ تھا۔

میرے ساتھیوں نے فوراً پتھروں کی آڑ لی اور پھر فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ نصف گھنٹے تک یہ

مقابلہ جاری رہا۔ سورج غروب ہو گیا، لیکن کچھ دیر تک اندھیرے میں بھی فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں۔

میرے ساتھیوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ پولیس اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی رہی اور میں

اپنے ساتھیوں کو لے کر غاروں میں روپوش ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ پولیس نے میری بوسونگھ لی ہے اور اب

میرے پیچھے لگ چکی ہے، میں چونکا ہوا ہوا۔

میں نے پولیس سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے گروہ میں اضافہ شروع کر دیا۔ رائفلوں اور کارتوسوں

کے منہ مانگے دام دے کر میں انہیں خریدنے لگا۔

چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں پورے اگھر ضلع میں میرا سکھ بیٹھ گیا۔ مجھے اطلاعات ملتی رہتی

تھیں کہ پولیس مجھ سے تنگ آ چکی ہے۔ گزرے ہوئے مہینوں میں کئی راتیں میں نے رکنی کے ساتھ

گزارشیں کیں۔ میرے ساتھی مجھ سے منع بھی کرتے کہ میں گاؤں جانے کا خطرہ مول نہ لوں، اس کے

باوجود مہینے میں کم از کم ایک چکر تو لگا ہی لیتا۔ اس کے بغیر میرا گزراہ بھی کب تھا۔ اگر مجھے رکنی سے ہی

بچنے کے رہنا تھا، اسی کے قرب کو ترسنا تھا تو پھر بلونت کے جسم میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔

رکنی ہر مرتبہ مجھ سے کہتی کہ آپ میری خاطر کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہیں؟

میں جواب دیتا، اے جان! یہ جان تمہاری ہی تو ہے۔ اگر یہ چل بھی گئی تو کیا۔

وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور میں اسے سینے سے لگا لیتا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس کے وہم و گمان

میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ میں جان پر کھیل کر رکنی سے ملنے گاؤں آتا ہوں گا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ جس کے سر میں عشق کا سودا سا جائے وہ پھر موت کی پرواہ نہیں کرتا۔

پولیس والوں کو میں کتوں کے نام سے یاد کرتا اور جس گاؤں میں بھی ڈاکہ ڈالتا لوگوں کو تنبیہ کر دیتا کہ خبردار جو کتوں کو خبر دی۔ میں دھمکی دیتا کہ اگر پولیس کو ڈاکے کی اطلاع دی گئی تو سارے گاؤں کو پھونک دوں گا اور مخبری کرنے والے کو کتے کی موت مار دوں گا۔ گاؤں والوں کی زبانوں پر تالے پڑ جاتے۔ مجھ سے دشمنی مول لے کر اپنی بربادی کو کون آواز دیتا۔ پولیس نے گاؤں گاؤں دھنڈورا پیڑا دیا کہ ڈاکو بلونت سنگھ کو پناہ دینے والا حکومت کا باغی سمجھا جائے گا اور اسے بھی سخت سزا دی جائے گی۔ میری گرفتاری پر انعام مقرر کر دیا گیا۔ مجھے زندہ یا مردہ پکڑوانے والے کو ڈھائی ہزار روپے انعام کا لالچ دیا گیا۔

اتنی بڑی رقم کا اعلان سن کر غریب گاؤں والوں کے منہ میں یقیناً پانی آ جاتا ہو گا مگر وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ ”ڈھائی ہزار کے عوض زندگی کا سودا منگا ہے۔“ ان میں اکثر کو یہی کہتے سنا گیا۔ مجھے تمام اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ تاقھو چار گاؤں گاؤں ڈھول پیٹتا پھرتا تھا۔

ایک مرتبہ یہ ہوا کہ تھاکی گاؤں کے چوراہے پر رک کر اس نے ڈھول پیٹا۔ چھوٹے بڑے سب گھروں سے نکل کر اس کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ کچھ دیر ہی میں مجمع لگ گیا۔ میں اس وقت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عام مسافروں کی طرح اونٹوں پر سفر کر رہا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر میں بھی وہاں رک گیا کہ ذرا خود بھی تو اپنی گرفتاری کا اعلان سنوں۔ ڈھول پیٹنا بند ہوا تو چمار کے ساتھ سپاہی نے پہلو میں بندھی ہوئی پیٹل کی ٹلی سے ایک کانڈ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

سپاہی ابھی ڈھائی ہزار روپے کے اعلان تک پہنچا تھا کہ کسی بچے نے گدھے کو چھیڑ دیا۔ گدھے نے پچھلے پیر اچھال کر سپاہی کے پیٹ پر دوپٹی جھاڑ دی۔ سپاہی کے منہ سے ”او“ کی آواز نکلی اور وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دبائے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگ زور سے ہنس پڑے۔ سپاہی کے قریب کھڑے ایک بزمین نے یہ برداشت نہ ہوا۔ اس نے گدھے کو چھیڑنے والے لڑکے کے منہ پر ایک تھپڑ بڑا دیا۔

یہ دیکھ کر ایک راجپوت کو غصہ آ گیا۔ ”ارے میو رام تم تم تلسی رام کے بھتیجے ہو اس لئے بلونت سنگھ کا خاں اس بچے پر اتار رہے ہو۔“

”ارے یہ گدھا بھی بہت سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔“ کسی نے چرمزاج لہجے میں کہا۔ ”ڈھائی ہزار کے انعام پر اس گدھے نے بھی لات مار دی۔“

میو رام کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”خود کو راجپوت سمجھ کر بڑبانک رہا ہے۔“ میو رام نے اس راجپوت کو مخاطب کیا۔ ”دو کوڑی کا بلونت سنگھ گاؤں لوٹ کر چلا جاتا ہے تو تم لوگ بھیگی ملی بن کر بیویوں کی گود میں منہ چھپا لینے ہو۔ اگر ذرا سی بھی شرم باقی ہے تو اپنی مونچھیں منڈا دو۔ تم سے تو ہم بڑبھن لاکھ درجے بہتر اور حوصلے والے ہیں کہ بلونت سنگھ کی دھمکی کے باوجود نیا رام آج تک گاؤں چھوڑ کر نہیں گیا۔“

میری قوت برداشت اب جواب دے گئی اور میں گرج اٹھا۔ ”اے کتے! اپنی بکواس بند کر۔“ سب لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا آدھا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، شانے پر رانقل جھول رہی تھی۔

”میری یہ ہمت کہ تُو نے بلونت سنگھ کو دو کوڑی کا آدمی کہا۔“ میں ایک مرتبہ پھر میو رام سے مخاطب ہوا۔ ”اس سپاہی سے پوچھ کہ حکومت نے بلونت سنگھ کے سر کی قیمت ڈھائی ہزار روپے کیوں مقرر کی ہے۔“ میں نے میو رام کو گھورا۔

میو رام بوکھلا گیا، مگر گاؤں والوں کی بھیڑ دیکھ کر اکڑ گیا۔ اس نے میرا مذاق اڑایا۔ ”اے تم ہمارے گاؤں کی بات میں دخل دینے والے کون ہو؟ آج کل تو جگہ جگہ لوگ بلونت سنگھ کے بچے بنے ہوئے ہیں، لیکن تُو مجھے کٹکیر لگتا ہے۔“ وہ مجھے اجنبی جان کر مجھی کو میرا چچا اور کٹکیر بنا رہا تھا۔

”زبان سنجال کتے!“ یہ کہہ کر میں نے اپنے شانے سے رانقل اتاری تو نصف چہرے پر پڑا ہوا کپڑا بھی ہٹ گیا۔ رانقل کی ٹال میں نے میو رام کی طرف کر دی۔

”ارے یہ تو خود تھا کہ بلونت سنگھ ہیں۔“ اسی لمحے کوئی ہجوم میں سے چیخا۔

میو رام اپنی طرف انھی ہوئی ٹال اور میری آگ برساتی آنکھیں دیکھ کر فرار ہونا چاہتا تھا، مگر ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھ سکا تھا کہ فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ میو رام لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ میں نے میو رام کی گردن پر فائر کیا تھا۔ گولی گردن کو چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔

فائر کے دھماکے سے گدھا بدک گیا اور ڈھول سمیت بھاگ اٹھا، مجمع سہم کر رہ گیا۔ عورتیں دھڑا دھڑاپے اپنے گھروں کے دروازے بند کرنے لگیں۔ تاقھو چمار اور سپاہی کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ میرے غضب سے بچنے کے لئے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھی موتی نے سپاہی کا نشانہ لیا، مگر وہ ابھی ٹریگر نہ دبا پایا تھا کہ میں بول اٹھا۔ ”ٹھہرو، نیتے آدمی کو نہیں مارتے۔“ میں نے موتی کو روک کر حکم دیا کہ سرکاری فرمان سپاہی سے لے آئے۔

موتی نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے سرکاری فرمان کو اپنی رانقل کی ٹال میں ڈالا اور ٹال کو آسمان کی طرف کر کے فائر کیا۔ سرکاری فرمان کے چیتھرے فضا میں بکھر گئے۔

”اپنے پولیس چیف سے جا کر کہہ دینا کہ عورتوں کی طرح ڈھول پڑانے کی بجائے آنے سائے مقابلہ کرے۔ بلونت سنگھ کے سر کی قیمت وصول کرنے کا خواہش مند زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسے کسی بھی شخص کا سر اس کے شانوں پر سلامت رہنا ناممکن ہے۔“ میں سپاہی سے مخاطب تھا۔ میو رام کی لاش ابھی تک زمین پر پڑی تھی، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے قریب جا سکتا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ ”گاؤں کا کھیا کون ہے؟“

لوگ اکیٹے دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ سبھی کے چہروں پر خوف تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس خوف کا سبب لیا تھا۔ اس گاؤں کا کھیا ایک بڑبھن تھا اور لوگوں کو خبر تھی کہ میں بڑبھنوں سے شدید نفرت کرتا ہوں حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ میری نفرت صرف تلسی رام کے خاندان تک محدود تھی۔

میں چونکہ اٹھ۔ مراری کا قتل میرے لئے بہت معنی خیز تھا۔ مراری، روپا کا چچا اور چھاد رام کا بھائی تھا۔ اسی کے ذریعے میں نے تلسی رام کے بھانجے رتی رام کی زبان کھلوائی تھی۔ اس کے قتل میں نیتا رام ہی کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ میرے استفسار پر خواب گاہ میں آکر رکنی نے ساری بات بتائی۔ روپا آج ہی شام اس سے ملتا تھا۔ رکنی سے اسی نے پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اسی روز صبح جب روپا اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مکان میں تین سپاہی داخل ہوئے۔ انہوں نے روپا سے پوچھا کہ مراری رام کہاں ہے؟ روپا نے جواب دیا چچا پوچھا کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی نے اسے رعب کے ساتھ حکم دیا، اسے پوجا سے اٹھالاد۔ اس پر روپا نے پوچھا کہ آپ کو ان سے کام کیا ہے؟ وہ پوجا کے درمیان نہیں اٹھتے۔ آپ کچھ دیر ٹھہر جائیں۔ سپاہی نے طنزیہ اور سخت آواز میں کہا کہ تم کون ہو پوچھنے والے؟ فوجدار صاحب نے ابھی اور اسی وقت اسے طلب کیا ہے۔ اس کی باقی پوجا وہیں ان کے سامنے ہوگی۔

بہر حال پوجا کرتے ہوئے مراری کو پولیس والے اسی حالت میں اٹھا کر لے گئے۔ روپا اور اس کا بڑا بھائی کنہائی بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے، مگر ظاہر ہے وہ کیا کرتے۔

روپا اسکول سے لوٹ کر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے چچا مراری کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش مندر کے راستے میں پڑی ملی تھی۔ روپا تھانے پہنچا تو فوجدار صاف مکر گیا کہ اس نے مراری کو تھانے بلوایا تھا۔ پولیس والوں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔

پورا واقعہ سن کر میرے ذہن نے ساری کڑیاں جوڑ لیں۔ رتی رام کی زبان کھلوانے کے لئے مراری نے مندر کے پجاری کو استعمال کیا تھا۔ اسی کے سامنے رتی رام نے تجبیری کا اعتراف کیا تھا کسی طرح پولیس، پجاری تک پہنچ گئی ہوگی اور پجاری نے سب کچھ اگل دیا ہو گا اسی کے بعد مراری کو تھانے بلوا کر پوچھ گچھ کی گئی ہوگی۔ پولیس اور نیتا رام کے گھ جڑ سے میں پہلے ہی واقف تھا۔ اس اعتراف کے بعد کہ مراری ہی نے رتی رام کی زبان کھلوائی تھی، نیتا رام نے اپنے آدمیوں سے اسے قتل کرا دیا ہو گا۔ مجھے مراری کے قتل پر بہت افسوس ہوا۔

دوسرے روز شام کو روپا اپنے بڑے بھائی کنہائی کے ساتھ چنبل کے غاروں میں میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ میری گود میں سر رکھ کے بہت رویا۔ وہ غاروں میں بھگ رہے تھے کہ میرے آدمی انہیں لے آئے۔

”بس کرا ب روپا!“ میں نے روپا کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ ”مرد بننا ہے تو آنسوؤں کو پینا سیکھ۔ تکلیف کو برداشت کر بیٹے!“

روپا کا بڑا بھائی کنہائی وہاں غاروں میں آنے کے متعلق بتانے لگا۔ مراری کے قتل کی تفصیل وہ پہلے ہی بیان کر چکا تھا۔ میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے گزشتہ رات ہی سب کچھ پتا چل گیا تھا۔ کنہائی کہہ رہا تھا۔ ”چچا کی چٹا ٹھنڈی کرنے کے بعد شمشان گھاٹ سے واپس آکر ہم چاروں بھائی گم صم بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک روپا بولا کہ میں اب اسکول نہیں جاؤں گا۔ ہم تینوں بھائی اسے حیرت سے دیکھنے لگے، پھر میں نے کہا کہ روپا، ہم تم سے بڑے ہیں۔ گھر کے خرچ کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ تم اسکول نہیں

”میرے سوال کا جواب کیوں نہیں ملتا۔“ میں گرجا۔

”ٹھاکر!..... ہمارے گاؤں کے کھیا سانسے والی چوٹ کے قریب بیٹھے ہیں جن کے جسم پر جنیو نظر آ رہا ہے۔“ کسی شخص نے میری بات کا جواب دیا۔

گاؤں کے کھیا شیو شکر نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہاں آؤ۔“ پھر میں اونٹ کو بٹھا کر نیچے اتر آیا۔ دراصل میں اس عام تاثر کو اپنے بارے میں ختم کرنا چاہتا تھا کہ مجھے برہمنوں سے دشمنی ہے یا ان سے شدید نفرت ہے۔

قرآ و جبراً جب کھیا اٹھا تو اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ ایک برہمن کی لاش گرتے دیکھ چکا تھا، پھر خوفزدہ کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس طرح میری طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ جیسے موت کی طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے رک گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور نظریں نیچی تھیں جیسے میرے سامنے نظریں اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ وہ یقیناً میرے ارادے سے بے خبر تھا۔ میں نے اپنے پلو سے بندھی ہوئی تھیلی کھول کر تھیلی پر کھٹکناٹی۔ ”لو کھیا!“ میں نے تھیلی اس کی طرف بڑھائی۔

کھیا شیو شکر کو شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ڈاکو اسے روپوں سے بھری ہوئی تھیلی پیش کر رہا ہے۔ لوگ بھی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

”گھبراؤ مت کھیا! بلونت کی دشمنی صرف تلسی رام کے خاندان سے ہے۔“ میں نے وہ بات کہہ دی جو میرے دل میں تھی۔ کھیا نے لرزتے ہاتھوں سے تھیلی تھام لی تو میں نے مزید کہا۔ ”اس رقم سے گاؤں میں اسکول کھولنا۔ بچوں کو سب سے پہلے حساب کی تعلیم دلانا تاکہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح قرض کے جھوٹے سود کو ادا کرنے میں اپنی ساری زندگی نہ بیتا دیں اور تلسی رام جیسے سود خور برہمن ان کا بیٹا حرام نہ کر دیں۔“

پھر میں وہاں مزید رکے بغیر تیزی سے اپنے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک برہمن کی جان لی تھی اور دوسرے کو دان دیا تھا۔

☆=====☆

نصف شب کے قریب گزر چکی تھی کہ میں نے بلونت کے گھر میں قدم رکھا۔ میرے لئے دروازہ کھولنے والی رکنی ہی تھی۔

”تم اب تک جاگ رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں آج نیند نہیں آ رہی تھی۔“ خلاف توقع اس رات رکنی سنجیدہ اور اداس سی تھی۔

”کیوں“ کیا ہوا؟ نیند کیوں اڑ گئی آنکھوں سے؟“ میں نے اس کے ساتھ ساتھ اندرونی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”بار بار روپا بے چارے کا خیال آ رہا تھا جسے آپ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے۔“ رکنی نے بتایا۔

”اس کا آخری سہارا بھی چھن گیا۔ مراری کو کسی نے قتل کر دیا۔“

چھوڑو گے اس پر روپا کہنے لگا میں گاؤں چھوڑ کر تایا کے پاس چلا جاؤں گا مجھے اپنے چاچا کا انتقام لینا ہے۔ ہم سب بھائیوں نے سمجھایا کہ یہ ہمارا کام نہیں۔ برہمن کا بیٹا قتل نہیں کر سکتا مگر روپا نہیں مانا۔ پھر ہم نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو پولیس ہمیں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ روپا نے مشورہ دیا کہ پھر تم لوگ گاؤں چھوڑ دو۔ میں تایا کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ میاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا خیال ہے کہ چاچا کے قتل میں نیتا رام کا ہاتھ ہے۔ فوجدار سے اس کی بہت دوستی ہے۔

کنہائی نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا۔ میں نے تائید کی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے! فوجدار کے ذریعے نیتا رام نے صحیح بات جان لی ہوگی۔ تمہارے چاچا مراری ہی نے رتی رام کی زبان کھلوائی تھی۔ یقیناً اسے اس کی سزا ملی ہے۔ نیتا رام ہی نے مراری کو مروایا ہے۔ میں بھی نیتا رام کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مگر اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ پولیس سے ٹکرانے کے لئے مجھے پوری تیاری کرنا ہے۔ اس وقت تک تم دونوں یہیں میرے پاس رہو۔“

میری بات سنتے ہی روپا کا سر ایک جھٹکے سے بلند ہوا۔ ”تایا! آپ نے یہ کیا کہا؟ ہم یہاں سے واپس جانے کے لئے نہیں آئے۔“ روپا بولا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو جیسے بھاپ بن کر اڑ چکے تھے۔ ”اب تو آپ ہی ہمارے باپ کی جگہ ہیں۔ ہمیں یہیں جینا مرنا ہے۔“

میں نے روپا کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں مجھے چنگلی محسوس ہوئی۔ میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”نہیں روپا بیٹے! میں تجھے اس راستے پر نہیں چلنے دوں گا۔ تیرے باپ نے تجھے جیوتش میں ماہر بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ مرتے وقت اس نے تیری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی۔ نہیں، میں ایک برہمن زادے کو ڈاکو نہیں بننے دوں گا۔“

”لیکن اب میں برہمن کا بیٹا نہیں رہا۔ میرے سر پر تو آپ نے ہاتھ رکھا ہے۔“ روپا پر اعتماد آواز میں کہنے لگا۔ ”میں اپنے چاچا کا انتقام لینے کی سوغند (قسم) کھا کر یہاں آیا ہوں۔ کیا آپ مجھے واپس کر دیں گے؟ میری قسم کا آپ کیا کوئی خیال نہیں کریں گے؟“

”اگر تم دونوں میرے ساتھ رہے تو تمہارے باقی دونوں بھائیوں کا کیا ہو گا؟“ میں نے سمجھانا چاہا۔ ”اس بات کا فیصلہ ہم خود ہی کر چکے ہیں۔“ روپا نے بتایا۔ ”وہ اب تک کھیزا راٹھور گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہوں گے۔ اب وہ اپنی قسمت کہیں اور آزمائیں گے۔“

آخر کار مجھے روپا کی بات ماننا ہی پڑی اور میں نے کہہ دیا۔ ”ٹھیک ہے، تم دونوں بھائی کل سے راتقل چلنا سیکھو۔ میں صوبیدار اور تحصیلدار سے کہہ دوں گا۔“

روپا اور کنہائی کے ساتھ میں جس غار میں بیٹھا ہوا تھا، وہ کنارے کے کنارے کے اندر بنا ہوا تھا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ موتی غار میں داخل ہوا۔

”ٹھاکر! آج چلنا ہے، اس کی یاد دہانی کرائے آیا تھا۔“ موتی قریب آ کر بولا۔

”موتی! تم ہی منٹ آؤ۔ یہ لڑکے ابھی تو آئے ہیں، میں ذرا ان سے باتیں کر رہا ہوں۔“ میں نے

کچھ دیر سوچ کر موتی کی بات کا جواب دیا۔

”مگر ٹھاکر! آج وہ نئی چیز دکھائے گا۔“ موتی نے روپا اور کنہائی کی موجودگی کے سبب اشاروں میں مجھے آنویٹنگ گمن کے بارے میں بتایا۔ ”آپ کے بغیر اسے کون چیک کرے گا؟ میں اسی لئے چاہتا ہوں کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔“

”ان لڑکوں کو غیر نہ سمجھو۔ آج سے یہ ہمارے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”گو جاری کنویں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، آرام سے چلیں گے۔“

”تایا! گو جاری کنویں پر کیا ہے؟“ روپا نے چونک کر پوچھا۔ اس پر موتی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

”بیٹا! گردہ کو مضبوط کرنے کی غرض سے میں نے حال ہی میں چالیس آدمیوں کا اضافہ کیا ہے۔“ موتی کی ناگواری کو نظر انداز کر کے میں، روپا کو بتانے لگا۔ ”ظاہر ہے ان نئے لوگوں کے لئے راتقلوں اور کارتوسوں کی ضرورت ہے۔ جو شخص پہلے اسلحہ فراہم کرتا تھا اسی کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے آج رات دس بجے گو جاری کنویں پر مال دینے اور بدلے میں رقم لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک آنویٹنگ گمن بھی دکھانے کا وعدہ کیا تھا جسے فوجی استعمال کرتے ہیں۔ بقیہ مال کی ذیوری کے وقت وہ گمن بھی لے کر آئے گا کہ میں دیکھ لوں اور پسند آ جائے تو خرید لوں۔ وہ آدمی اس سے پہلے بھی ہمیں اسلحہ فراہم کرتا رہا ہے۔ ہم اسے مناسب اور نقد رقم دیتے ہیں۔“

”وہ کون شخص ہے تایا؟ آپ نے کس سے گو جاری کنویں پر ملنے کا وعدہ کیا ہے؟“ روپا نے جلدی سے معلوم کیا۔

”آخر تمہیں اس شخص کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ موتی، روپا پر گرم ہو گیا۔ اس پر میں نے موتی کو گھورا۔ ”نہیں موتی، اسے نہ ڈانٹو!“ میں بولا، پھر روپا سے مخاطب ہوا۔ ”اس کا نام بانگے ہے اور وہ خود سامان لے کر آنے والا ہے۔“

”تایا! کیا آپ کو اس آدمی پر بھروسہ ہے کہ وہ آپ سے دغا نہیں کرے گا؟“ روپا نے عجیب سا سوال کیا۔ ”نہیں یہ سب آپ کو پھانسنے کی چال نہ ہو۔“

”لڑکے! زبان سنبلال۔“ موتی چیخ اٹھا۔ ”تو آج ہی ہمارے درمیان آیا ہے اور آج ہی پھوٹ ڈال رہا ہے۔“

روپا اس کا غصہ دیکھ کر سسم گیا۔

”تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو بیٹے؟“ میں نے موتی کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے روپا سے پوچھا۔ ”ہم راجپوت بات بے بات گڑ جاتے ہیں اس لئے ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“

”بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں۔“ روپا دبی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے یہ سب کچھ اس لئے پوچھا تھا تایا کہ شام کو ادھر آتے ہوئے میں نے گو جاری کنویں کے ارد گرد پولیس والوں کو چھپتے دیکھا تھا اس لئے مجھے ذرا کیرید تھی۔“

روپا کے الفاظ سن کر میں چونک اٹھا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے تیز نظروں سے موتی کی طرف دیکھا۔

”تم نے دیکھا موتی! اگر تم اسے بولنے سے منع کر دیتے تو ہم سب بے خبر ہی رہتے۔“ میں نے موتی سے کہا، پھر روپا سے دریافت کیا۔ ”روپا! تم نے اور کیا دیکھا؟“

”دراصل ہم دونوں کنویں کے پاس آرام کرنے بیٹھ گئے تھے کہ ہم نے قریبی بیڑوں کے جھنڈ سے دو سپاہیوں کو نکلنے دیکھا۔ وہ دونوں ہماری طرف آرہے تھے۔ بیڑوں پر نظر پڑی تو ہمیں وہاں اور سپاہی بھی چھپے نظر آئے۔ ان دونوں سپاہیوں نے ہمارے قریب آ کر ہمیں ڈانٹا اور وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ روپا تفصیل بتا رہا تھا۔ ”انہوں نے ہم سے وہاں بیٹھنے کا سبب بھی دریافت کیا۔ ہم نے بتایا کہ تھوڑا آرام لینے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کسی اور جگہ آرام لینے کو کہا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم وہاں سے نہ ہٹے تو وہ ہمیں تھانے لے جائیں گے۔ ہم خود بھی پولیس سے دور رہنا چاہتے تھے اس لئے وہاں سے ہٹ گئے، مگر دور سے چھپ کر تماشا دیکھنے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں کچھ دیر بعد ایک جیپ آئی۔ اس پولیس جیپ سے کوئی بڑا پولیس افسر اتر ا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے ماتحتوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔“

روپا کے ادا کئے ہوئے الفاظ کے ساتھ ساتھ میری پیشانی پر ہل پڑ رہے تھے۔ میں نے روپا کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ ”موتی! مجھے پہلے ہی بانگے گرا آدمی محسوس ہوا تھا۔ اس نے آئوینک گن دکھانے کے بہانے اس بار مجھے بھی بلایا تھا۔ یقیناً وہ کوئی کھیل کھیلتا چاہتا ہو گا۔“

موتی کے چہرے پر بھی جوش اور فکر مندی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس نے اپنے شک کا اظہار کیا۔ ”ٹھاکرا! اب مجھے یاد آرہا ہے کہ اس نے میری روگائی کے وقت خاص طور سے اس بات پر زور دیا تھا، میں آپ کو ضرور ساتھ لاؤں۔ صرف ایک آئوینک گن بیچنے کے لئے وہ اس قدر بے چین نہ ہوتا۔“

”پھر تو وہ یقیناً دعا کرنا چاہتا ہو گا۔“ میں بولا۔ ”اب ہم ضرور گوجاری کنویں جائیں گے، اگر یہ سچ ہو تو پھر غدار بانگے کو آج ہی اس کی غداری کا انعام مل جائے گا۔“ اس کے بعد میں نے موتی سے پانچ دن قبل ہونے والی ملاقات کے بارے میں تفصیل معلوم کی۔ ”جب بانگے سے تمہاری ملاقات ہوئی تو تم نے کیا دیکھا، کیا سنا اور کیا محسوس کیا؟ ایک ایک بات اور ایک ایک لفظ یاد کر کے بتاؤ۔“

موتی چند لمحے خاموش رہا، پھر بتانے لگا۔ ”جب میں نے بانگے سے کہا، مال چاہئے تو اس کی ہاتھیں کھل گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ہی آمد کا منتظر تھا۔ کہنے لگا، موتی! تم تو میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ تم آخر اتنا مال کہاں ہمارے دیتے ہو؟ اس پر میں نے کہا، یہ تو خیر بعد میں بتا دوں گا، لیکن بانگے، پہلے یہ بتاؤ کہ جب میں گھر میں داخل ہوا تھا تو میاں میں نے ایک اجنبی شخص کو دیکھا تھا، کون ہے وہ؟ بانگے نے تہہ بچکپاتے ہوئے جواب دیا، اس کی فکر نہ کرو موتی! وہ میرا مہمان ہے۔ وہ بچے پور سے آئے ہیں، بھگت آدمی ہیں۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا اور اسے گروہ میں نئے آدمیوں کی شمولیت کے متعلق بتایا اور پوچھا، کب آؤں؟ پھر میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اس نے آئوینک گن کے بارے میں بتایا اور“

اس بات پر زور دیا کہ خود ٹھاکر گن دیکھنے آئیں۔ اسی کے بعد بانگے نے آج رات دس بجے گوجاری کنویں پر مال کی ڈلیوری دینے کو کہا اور پھر میں چلا آیا۔“

”اجنبی شخص!“ میں بڑبڑایا۔ ”سادہ لباس میں وہ پولیس کا کوئی آدمی بھی ہو سکتا ہے۔“ موتی خاموش رہا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو۔“

”لیکن کہاں ٹھاکر؟“ موتی نے حیران سا ہو کر سوال کیا۔

”بانگے اور اس اجنبی بھگت سے ملنے۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اپنے ساتھ صرف پانچ مسلح آدمی لے لو۔“

سورج اس وقت تک ڈوبا نہیں تھا کہ میں، موتی اور اپنے پانچ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ قریبی گاؤں پہنچ گیا۔ بانگے اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ میں سیدھا اس کے گھر پہنچ گیا۔ میری خلاف توقع آمد پر پہلے وہ کچھ گھبرایا، پھر اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ وہ اجنبی شخص بھی وہاں موجود تھا جس کا تذکرہ موتی سے میں سن چکا تھا۔ اپنے چہرے اور ملنے سے مجھے وہ ہرگز کوئی بھگت نہیں لگا۔ وہ کوئی عیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔

”بانگے! آئوینک گن کہاں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”میں وہ گن دیکھنے آیا ہوں۔“

”ٹھاکرا! مجھے ابھی گن لینے کے لئے جانا ہے۔“ بانگے نے بہانہ کیا۔ ”ہمیں رات کو کیوں کر گوجاری کنویں پر ملنا تھا اس لئے میں نے سوچا، ابھی وقت ہے۔“

جب بانگے یہ جواب دے رہا تھا تو میں نے اجنبی شخص کو مضطرب سا محسوس کیا۔ مجھے لگا جیسے وہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے پر تول رہا ہو۔ میں نے اپنے دو آدمیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کی ٹائلس اس اجنبی کے دونوں پہلوؤں سے لگا دیں۔

”مجھے گن ابھی چاہئے بانگے!“ میں زور دے کر بولا۔ مجھے یقین تھا کہ بانگے کے پاس کوئی ایسی گن نہیں، نہ اس سلسلے میں کسی سے اس کی بات ہوئی ہے، آئوینک گن کی کمائی تو محض مجھے پھانسنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”جہاں سے وہ گن لائی ہے چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

بانگے حواس باختہ سا نظر آنے لگا۔ اس کے باوجود بھی اس نے اداکاری جاری رکھی۔ ”ٹھاکرا! اس طرح جلد بازی میں کیا ہو سکتا ہے۔ تم مقررہ وقت پر گوجاری کنویں آ جانا، میں مال لے کر وہاں پہنچ جاؤں گا۔ گن بھی میرے ساتھ ہو گی۔“

”گوجاری کنویں آ جاؤں۔“ میں اب مزید برداشت نہ کر سکا۔ ”بانگے! وہاں پولیس میرے انتظار میں ہے۔ مجھے ابھی اور اسی وقت گن چاہئے۔“

”پولیس؟“ بانگے نے انجان بننے کی اداکاری کی۔ ”پولیس کو کیسے پتا چلا؟“

”یہاں! اب بھی انجان بن رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سر پر رائفل کا بٹ مارا اور وہ مارا کر زمین پر گرا۔ ”دونوں کو باندھ کر غاروں میں لے چلو۔“

موتی اور دوسرے ساتھیوں نے ان دونوں کو باندھ لیا اور پھر ہم غاروں میں پہنچ گئے۔ بے ہوش

بانگے اس وقت تک ہوش میں آچکا تھا۔ میری گرفتاری پر ڈھائی ہزار روپے کا جو انعام مقرر تھا، بانگے جیسے شخص کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے دگنا مال وہ مجھ سے کما چکا تھا اور آئندہ بھی اسلحہ فراہم کرنے کی صورت میں اسے منافع کی توقع تھی۔ پھر ایسی کیا بات تھی جو وہ غداری پر آمادہ ہو گیا؟ اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں نے اس کے ماتھے پر رانقل کی نال رکھ دی اور یہی سوال میری زبان پر آگیا۔ میں نے آخر میں کہا۔ ”سب کچھ سچ بچ بک دے ورنہ تیری موت آسان نہیں ہوگی۔“

”یہ رانقل ہٹالیں ٹھاکر! میں میں بتا سب کچھ بتا دوں گا۔“ اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی۔

”پہلے اس اجنبی کے بارے میں بتا، یہ پولیس ہی کا آدمی ہے نا؟“ میں نے اس کے ماتھے سے رانقل کی نال ہٹالی۔

”ہاں ٹھاکر!“ اس نے اقرار کر لیا۔

”اب میرے اس سوال کا جواب دے جو میں نے تجھ سے پہلے کیا تھا۔“ میں نے اسے گھورا۔

”م میں پھنس گیا تھا ٹھاکر! بری طرح پھنس گیا تھا۔“ بانگے بتانے لگا۔ اس نے تشدد کے بغیر ہی زبان کھول دی۔ ”اس سنگٹ کرتے ہوئے میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مجھے پولیس نے خوب زد و کوب کیا۔ اسی دوران مجھے یہ خیال آیا کہ اگر میں تمہیں گرفتار کرا دوں تو بچ سکتا ہوں۔ پولیس سے یہ سودے بازی میرے خیال میں ممکن تھی۔ یہی سوچ کر میں نے فوجدار کو مخاطب کیا، میرے خلاف یہ کاغذات تیار کرنا بند کرو، میں اس کی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔ میری بات سن کر فوجدار بیچ اٹھا، بے وقوف! مجھے رشوت کا لالچ دے رہا ہے؟ اس نے پوری قوت سے میرے سینے پر گھونسا مارا۔ اس کی ناراضگی کا شاید ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے یہ بات اس کے ماتحتوں کی موجودگی میں کہی تھی۔ میں کرا کر بولا، صاحب! میں رشوت کی بات نہیں کر رہا۔ آپ میری بات سن لیں، بعد میں چاہے جتنا مار لیجئے گا، فوجدار غصے میں کہنے لگا، کیا بات کرنا ہے بول۔ میں نے وہاں دوسرے لوگوں کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ تنہائی میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے سپاہیوں کو باہر بھیج دیا، پھر غرایا، اب بول۔ سب کچھ لیتا کہ میرے ساتھ کوئی چال بازی نہیں چلے گی۔ پھر میں نے کہا، صاحب! آپ ٹھاکر بلونت سنگھ کی گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟ آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میری اس پیشکش پر فوجدار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر بھی وہ بظاہر خفگی سے بولا، بانگے! تو پولیس کے ٹکھے کا مذاق اڑا رہا ہے؟ بلونت سنگھ کی گرفتاری میں بھلا تو کیا مدد کر سکتا ہے؟ اس پر میں نے کہا، آپ نے اب تک مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں اسلحہ کس کے ہاتھ فروخت کرتا تھا؟ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا، بولا کہ کیا تو بلونت سنگھ اسلحہ بیچتا تھا؟ ظاہر ہے میں نے اقرار کر لیا۔ میری تدبیر کارگر رہی۔ فوجدار پہنچ گیا میں نے شرط رکھی۔ اگر میرے جرائم معاف کر دیئے جائیں تو میں کسی نہ کسی طرح بلونت سنگھ کو جال تک کھینچ لاؤں گا۔ سوچ بچار کے بعد فوجدار نے میری بات مان لی اور کہا کہ میں اس سلسلے میں پولیس چیف کو اطلاع دے دوں، لیکن اس وقت تک تم ہماری تحویل میں رہو گے اور فرار کی کوشش بھی نہیں کرو گے اس پر

بولا، مجھے آپ اپنی تحویل میں خوشی سے رکھیں مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر پولیس اسٹیشن میں نہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے، بلونت سنگھ کو مجھ پر کسی طرح شک نہ ہو جائے کہ اسے گرفتار کرانے کے لئے میں نے پولیس کی مدد کی ہے۔ آپ کو بہر حال مجھے آزاد کرنا پڑے گا اگر ایسا ہی ہے تو ایک سادہ لباس پولیس والے کو آپ میری نگرانی پر مقرر کر سکتے ہیں۔ فوجدار مان گیا اور اور پھر ”وہ چپ ہو گیا۔“

”اور پھر تو نے اپنی گردن کا پھندا میری گردن میں ڈالنے کا بندوبست کر دیا۔“ میں نے گویا اس کا آخری فقرہ مکمل کر دیا، پھر بولا۔ ”میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تیری موت آسان ہوگی۔ سو میں اپنا یہ وعدہ بہر حال پورا کر سکتا ہوں۔“

”رحم ٹھاکر، رحم!“ بانگے گڑگڑانے لگا۔ ”مجھے جینے دیں۔“

”اگر میں تجھ جیسوں کو جینے دوں تو پھر ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکوں۔ یہ بتا کہ تیرے دل میں گولی اتاروں کہ داغ میں؟ دونوں ہی جگہ گولی مارنے سے تو زیادہ دیر تک نہیں تڑپے گا اور چند لمحوں میں مر جائے گا۔“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

ایسے ہول ناک سوال کا جواب کسی نے دیا ہے جو بانگے دیتا۔ وہ میرے قدموں پر گر گیا اور میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔

”اب گوجاری کنویں چلنے کی تیار کرو۔“ میں اطمینان سے بولا۔

”ٹھاکر! کس کس لئے وہاں جانا ہے؟“ موتی ہکھلایا۔

”کیا پولیس چیف کو یہ تحفہ نہیں پہنچانا؟“ میں نے بانگے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس دوران سب کچھ سوچ چکا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ ”میرے ساتھ صرف تم چلو گے موتی! کسی اور کو چلنے کی ضرورت نہیں۔“

”جو ٹھاکر کا حکم۔“ موتی کو کہنا ہی پڑا۔

سادہ لباس پولیس والے نے بھی کسی تشدد کے بغیر بانگے کے بیان کی تصدیق کر دی اور مجھ سے زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں پہلے ہی اسے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے زندہ رکھنا میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں نے اس پولیس والے کو جاں بخشی کا مژدہ سنا دیا اور موتی کو الگ لے جا کر اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

☆=====☆=====☆

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات تیرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جنات اور کالے اعظم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

حسین زاد



سنبیدہ خاتون

جن زاد

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

جنبل کی گود میں سوئے ہوئے سرہانی گاؤں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دھیمی آواز میں گنگلتا ہوا درہائے جنبل کہیں سبک اور کہیں تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ چاند نے کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں سینے کے بل آگے بڑھ رہا تھا کہ موتی نے سرگوشی کی۔ ”بس ٹھاکرا اب اور آگے جانا خطرناک ہے۔“ ہم دونوں گوجاری کنویں کی عقبی سمت سے بڑھتے ہوئے کنویں کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے موتی کی بات مان لی اور رک کر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نے آگرہ پولیس کے چیف وجے سنگھ کو کچھ ہی فاصلے پر دیکھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ بار بار کنویں کی دیوار بے سرائٹھا کر سامنے نظر آنے والی گینڈیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں مجھے اسی سمت سے آنا تھا۔ سارے انتظامات میں نے اپنے سامنے مکمل ہوتے دیکھے۔ تقریباً ساٹھ پولیس والے مختلف سمتوں میں چھپے ہوئے تھے، لیکن کنویں کی عقبی سمت کوئی نہیں تھا۔ ادھر سرہانی گاؤں تھا اس طرف سے گویا میرے آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں بھلا کیوں گاؤں سے گزرنے کا خطرہ مول لوں گا؟ پولیس چیف نے یہی سوچا ہو گا کہ حالانکہ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں گاؤں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا۔ پولیس چیف نے میرے ہی سامنے دس مسلح سپاہی کنویں میں بھی اتارے تھے۔ یہ سارے انتظامات غالباً اس لئے کئے گئے تھے کہ اگر میرا پورا گردہ بھی مقابلے پر آجائے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ گینڈیوں کی دونوں جانب اونچی اونچی چٹانیں تھیں اس لئے وہاں چھپنے کی اچھی جگہ تھی۔ پولیس چیف نے حکم دیا تھا کہ بلونت سنگھ اور اس کے ساتھی جب تک کنویں کے بالکل قریب نہ پہنچ جائیں انہیں نہ چھیڑا جائے۔ بلونت سنگھ انتہائی چالاک شخص ہے۔ پولیس کی ذرا سی بھی سن گن۔ ملتے ہی وہ سپاہیوں کی زندگی سے کھیلتا ہوا نکل بھاگے گا۔ اس کی نظر میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ جیسے ہی بلونت سنگھ کنویں کے قریب

”دردی میں نے اتاری ہے اور سردی تمہیں لگ رہی ہے۔“ پولیس چیف کی آواز میں طنز تھا۔
”تم میری قیض اور پیٹ میں پتھر بھر لو اور اس کا بنڈل بنا لو۔“ پولیس چیف نے فوجدار کو حکم دیا اس کے
بعد وہ کنویں کی گھر سے سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اسی وقت دور سے ایک اونٹ آتا دکھائی دیا۔ اونٹ کی گردن میں گھٹی بندھی ہوئی تھی۔ گھٹی کے
شور سے سنانا جیسے لرز رہا تھا۔

”جلدی کرو۔“ پولیس چیف نے فوجدار کو مخاطب کیا۔ ”بلونت سگھ آ رہا ہے۔“ پھر دبے سگھ نے
اپنا پستول تان لیا اور بولا۔ ”بلونت سگھ کے ساتھ اونٹ پر کوئی اور شخص بھی بیٹھا ہوا ہے، دو آدمی ہیں۔“
پولیس چیف دبے سگھ یہ کہہ کر گھٹوں کے بل بیٹھ گیا اور تیز نظروں سے ادھر دیکھنے لگا جدھر سے اونٹ
آ رہا تھا۔

میں یہی تماشا دیکھنے وہاں آیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ پولیس کی حماقت پر زور زور سے ہنسون، لیکن
خبط کر گیا۔ میری ہنسی یہ بازی پلٹ سکتی تھی۔

فوجدار نے پتھر بھر کر بنڈل تیار کر لیا اور پولیس چیف نے اس میں اپنا پستول چھپا دیا۔ اونٹ تیزی
سے قریب آ رہا تھا۔ ایک سوار نے ہاتھ میں لائینن تھامی ہوئی تھی جو اونٹ کی کج رفتاری کے باعث فضا
میں جھولتی محسوس ہو رہی تھی۔

”صاحب! وہ قریب آ رہا ہے، اسے پھونک دو۔“ فوجدار تیزی سے بولا۔
”کیا کہتے ہو؟ مجھے بلونت سگھ کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔“ دبے سگھ نے فوجدار کے شانے پر ہاتھ
مارتے ہوئے کہا۔

”مگر ان کے شانوں پر رانٹیلیں کیوں نظر نہیں آ رہی ہیں؟..... شاید انہوں نے پہلو میں
ریوالبور چھپا رکھے ہوں گے۔“ فوجدار نے خود ہی سوال کیا اور جواب بھی دے دیا۔

”کوئی بات نہیں۔“ پولیس چیف کی آواز ابھرنی۔ ”تم یہیں چھپے رہو میں، بانکے کا آدمی بن کر
کنویں پر بیٹھا ہوں۔“ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”بے وقوف بانکے اب تک نہیں آیا۔“

اونٹ اب صرف دس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اونٹ پر سوار دونوں افراد کے چروں پر نشانیں
تھیں۔

دبے سگھ سر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بنڈل اور دوسرے میں ٹارچ تھی۔ اسی
وقت ایسی آواز آئی جیسے اونٹ کے پیچھے کوئی چیز گھٹ رہی ہو۔ پھر اونٹ کی لگام کھینچی گئی۔ دبے سگھ
مزید آگے بڑھا۔ اسی لمحے ایک سوار کے ہاتھ سے لائینن چھوٹ گئی، ساتھ ہی ہاتھ سے لگام بھی نکل گئی۔
آگے بیٹھا ہوا سوار قطعی سناکت تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر پولیس چیف کی آواز سنائی دی۔ ”ٹھاکرا
نیچے اتریں..... مال لے آیا ہوں۔“

دبے سگھ کی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ سواروں میں سے ایک نے پیر کی ایزی مار کر اونٹ کو
بٹھانے کی کوشش کی۔ دبے سگھ نے بنڈل میں اوپر ہی رکھا ہوا پستول گرفت میں لے لیا۔ ٹریگر پر انگلی رکھ

آئے اسے گھیر لیا جائے اور فرار کے تمام راستے مسدود کر دیئے جائیں، اس سے پہلے نہیں۔ اپنے پولیس
چیف دبے سگھ کی اس قدر احتیاط پر اس کے دوا یک ماتحتوں نے اظہار حیرت بھی کیا تھا۔
”یہ شیر کا شکار ہے جس میں زندگی داؤ پر لگانا پڑتی ہے۔“ پولیس چیف نے کہا تھا۔
مجھے خوب علم تھا کہ پولیس چیف نے میرے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ میں کنویں
پولیس کو بل دے کر نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”اس کی نظریں اتنی تیز ہیں کہ وہ پچاس گز دور کھڑے ہوئے آدمی کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے،
دوست ہے یا دشمن۔“ دبے سگھ نے اپنے ماتحتوں کو میرے متعلق بتایا، پھر بولا۔ ”اگر وہ صرف دو
آدمیوں کے ہمراہ آیا تو سارا معاملہ پانچ چھ منٹ میں ختم ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی صورت یہ
گولی چلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔“

کنویں کی گھر کے پیچھے اس کے برابر فوجدار بھی چھپا ہوا تھا۔ میری نظر اس پر بھی پڑی۔
”ابھی تک بانکے نہیں آیا؟ کیا بات ہے؟“ پولیس چیف نے فوجدار سے سوال کیا۔

”صاحب! وہ بس آنے ہی والا ہو گا۔“ فوجدار نے جواب دیا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی یقیناً
مجھ سے بہت خوفزدہ تھا۔

”کیس آخری وقت وہ پیچھے نہ ہٹ جائے۔“ پولیس چیف نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ ”یا بلونز
سگھ کا خوف اس پر غالب آ جائے۔ وہ ایسا آدمی تو نہیں ہے؟“

اس سوال کا جواب دینے کی بجائے فوجدار نے اپنے رخسار پر ہاتھ مارا۔ ”بڑبڑایا۔“ سائلے مجھ
بہت ہیں یہاں۔“

”اسی طرح یہاں ڈاکوؤں کی بھی بہتات ہے۔“ پولیس چیف بولا، پھر پوچھا۔ ”بانکے کو سب کچھ
سمجھا تو دیا ہے؟“

”ہاں ہاں صاحب! اس کے ساتھ سادہ لباس میں ہمارا آدمی بھی ہے۔ دوسرے پہلے میں خود تما
معاملات ٹھیک کر کے آیا ہوں۔ اس نے کار تو سوں کی بیٹی میں پتھر بھر کر تیار رکھے تھے۔ وہ جانتا ہے کہ آ
آخری وقت میں پیچھے ہٹ گیا تو جیل جانا پڑے گا۔ ہمارا آدمی اسے بھاگنے نہیں دے گا۔“ فوجدار۔
پولیس چیف کو اطمینان دلایا۔

”پھر اب تک وہ آیا کیوں نہیں؟“ پولیس چیف آسانی سے فوجدار کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا
”اگر بانکے کی آمد سے پہلے بلونت سگھ آ گیا تو؟“ کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر دوبارہ پولیس چیف ہی
آواز سنائی دی۔ ”پھر ایک ہی صورت ہے کہ خود کو بانکے کا آدمی ظاہر کر کے بلونت سگھ سے بات
جائے۔“ اس نے فوراً عمل سوچ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ آسانی سے ہمت ہار جانے والا آدمی نہیں ہے۔ ہرچہ
کہ وہ میرا دشمن تھا مگر بزدل دوست سے بہادر دشمن اچھا ہوتا ہے۔

دبے سگھ کو میں نے قیض اتارتے دیکھا پھر وہ صرف نیکر اور بنیان میں نظر آنے لگا۔ پیٹ
اس نے اتار دی تھی۔ فوجدار کے جسم کو میں نے نمایاں طور پر کانپتے دیکھا۔

کر اس نے ٹارچ کا بیٹن دبایا۔ اندھیرے کا سینہ جھرتی ہوئی روشنی کی لکیر اونٹ کے سر سے گزرتی ہوئی دونوں سواروں کے چروں سے ٹکرائی۔ آگے بیٹھے ہوئے سوار کی گردن نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ پیچھے بیٹھا ہوا سوار اچانک ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی چونک اٹھا مگر اس نے دونوں ہاتھ بلند کر کے زور زور سے بلانا شروع کر دیے۔ وجہ سنگھ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اونٹ کے پاؤں جیسے ہی نیچے بیٹھنے کے لئے مڑے تو اس کی پشت پر بیٹھے ہوئے دونوں سوار نیچے آ رہے۔

”خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ ورنہ تم دونوں پھونک دیئے جاؤ گے۔“ سنائے میں پولیس چیف کی آواز گونجی۔

چند ہی لمحے بعد پولیس چیف کے اس ہاتھ کو حرکت ہوئی جس میں ٹارچ تھی۔ ارد گرد چھپے ہوئے سپاہیوں کے لئے یہ مخصوص اشارہ تھا۔ جلد ہی مجھے یہ بات معلوم ہو گئی۔

”بلونت سنگھ! تمہیں ہر طرف سے گھرا جا چکا ہے۔ اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ وجہ سنگھ کی آواز میں حکم تھا۔

کنویں میں اور ارد گرد چھپے ہوئے تم سپاہی سامنے آ گئے۔ فوجدار ان سب کے پیچھے تھا۔ اسی وقت اونٹ کے پیچھے کچھ حرکت ہوئی۔ وجہ سنگھ نیچے جھٹکا ہوا اونٹ کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے اونٹ کی گردن کے نیچے روشنی ڈالی اور اچھل پڑا۔ میں اب کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا تاکہ اپنے ڈرامے کا آخری منظر دیکھ سکوں۔

”فوجدار!“ وجہ سنگھ کی گرج اتنی بلند تھی جیسے چنبل کے کٹاؤ دار کنارے قہقہے لگا رہے ہوں۔ فوجدار دوڑ کر قریب پہنچ گیا۔ وجہ کو یقیناً اپنی بصارت پر شبہ ہوا ہو گا۔ اس کے سامنے بانٹے اور رام سنگھ زمین پر پڑے تھے۔ سپاہیوں کی انھی ہوئی رائفلیں ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں۔ رام سنگھ پولیس کے اس سادہ لباس آدمی کا نام تھا جسے میں نے مصطفیٰ زندہ چھوڑ دیا تھا۔ وجہ سنگھ نے فوجدار کو ٹارچ تھمائی اور ان دونوں کے قریب گیا۔ بانٹے کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ رام سنگھ کی آنکھوں میں خوف اور شرمندگی تھی۔ اب وجہ سنگھ نے دیکھا وہ دونوں ایک دوسرے کی پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ بانٹے کا لباس خون سے تر بہ تر تھا۔ رام سنگھ کی نقاب کے نیچے اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے پولیس سے بھیانک مذاق کیا تھا۔

ان دونوں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا گیا۔ اس دوران وجہ سنگھ نے اپنی وردی پہن لی۔ رام سنگھ کے منہ سے کپڑا نکلا گیا تو وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ پولیس چیف ’فوجدار اور سپاہیوں کو وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔ بانٹے کی لاش زبان حال سے وہ سب کچھ بیان کر رہی تھی جو گزر چکا تھا لیکن ظاہر ہے، ابھی تک کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکا ہو گا کہ سب کچھ کس طرح ہوا؟ رام سنگھ کو اپنے حواس میں آنے کے لئے کچھ وقت لگا۔

وجہ سنگھ کو اس پر غصہ آ گیا۔ ”اب منہ سے بک تو سی کہ کیا ہوا؟“ پھر رام سنگھ نے سب کچھ بک دیا۔ ”اتحق! جب تو نے بلونت سنگھ کے سامنے زبان کھول ہی دی

تھی تو پھر اونٹ پر سوار ہو کر یہاں تشریف لائے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم یہاں پورے دو گھنٹے سے پریشان بیٹھے ہیں۔“ وجہ سنگھ نے کہا۔ ”اگر میں فائر کرتا تو تم زندہ نہ بچتے۔“

”صاحب! بلونت سنگھ نے مجھے بانٹے کے ساتھ ہاتھ کر اونٹ پر بٹھا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں گوجاری کنویں کی طرف روانہ ہو جاؤں، اگر گھوم کر دیکھا تو گولی مار دی جائے گی۔ ہم تمہارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔“ رام سنگھ نے جواب دیا۔

”مگر اتحق کے بیٹے! اس بات کا تو یقین کر لینا تھا کہ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آ بھی رہے ہیں یا نہیں۔“ وجہ سنگھ نے غصے سے بے قابو ہو کر رام سنگھ کے ایک ہاتھ جڑی دیا۔

”صاحب!..... وہ میرے پیچھے، بلکہ اونٹ کے برابر تھا کیا آپ نے اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی۔“ رام سنگھ رخسار سہلاتے ہوئے بولا۔

وجہ سنگھ نے اونٹ کی طرف توجہ دی تو اس پر حقیقت کھل گئی اونٹ کی دم سے جوتوں کی ایک جوڑی بندھی ہوئی تھی۔

”صاحب! یہ!..... یہ تو بانٹے کے جوتے ہیں۔“ رام سنگھ نے بتایا۔

”اب بکواس بند کر۔ یہ بتا کہ بلونت سنگھ نے تجھے زندہ کیوں آنے دیا؟“ وجہ نے سوال کیا۔

”صاحب! ایک تو یہ کہ میں نے اس سے جھوٹ نہیں بولا اور سب کچھ بتا دیا اس لئے دوسرے..... وہ بانٹے کی لاش کے ساتھ آپ کو ایک پیغام بھی بھیجنا چاہتا تھا۔“

”کیا!..... کیا پیغام ہے وہ؟“ وجہ نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا۔

”اس نے کہا ہے کہ اپنے چیف سے کہہ دینا اگر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنا ہے تو مرد کی طرح سامنے آئے۔ ڈرپوک شکاری کی طرح چھپ کر جال بچھانا چھوڑ دے۔“ رام سنگھ نے بتایا۔ اس نے لفظ بہ لفظ میرا پیغام پولیس چیف وجہ سنگھ کو پہنچا دیا تھا۔

”بلونت سنگھ کو خود پر اتنا گھمڑ ہے۔“ وجہ کے نکتے پھولنے پھٹنے لگے۔ ”ابھی بات ہے، میں اسے بتا دوں گا کہ میں کیا ہوں۔“

پولیس چیف وجہ سنگھ کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ ناکام لوٹا پڑا۔ بانٹے کی لاش اس کے ساتھ تھی جو اس کی ناکامی کا افسانہ بیان کر رہی تھی۔

نصف شب کے قریب میں چنبل کے غاروں میں پہنچا تو روپا، کنہائی، صوبیدار اور تحصیلدار سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ جاتے ہی میں نے روپا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور اسے گردش دینے لگا ”بٹیا روپا! بھگوان نے آج تجھے میری جان بچانے کے لئے بھیج دیا۔“ میں پورے طور پر بلونت کا کردار ادا کر رہا تھا ورنہ اللہ کی جگہ میری زبان پر بھگوان کا نام نہ آتا۔ ”میری بات سچ ثابت ہوئی۔ بانٹے پولیس سے مل گیا تھا اور پولیس گوجاری کنویں کے پاس گھیرا ڈال کر پڑی تھی۔“ میں زور سے ہنسا۔ غار گونج اٹھا۔

اسی روز سے روپا میرا دایاں ہاتھ بن گیا۔ میں نے اسے خود را کفل چلانا سکھایا۔ روپا کو خود بھی بے حد شوق تھا۔ ڈاکے ڈالتے ہوئے وہ میرے ساتھ آگے آگے رہتا۔ چند ہی روز میں روپا انتہائی سفاک اور

بے لگام ہو گیا۔ میرے سوا وہ کسی اور کی بات نہیں سنتا تھا۔ میں بھی اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ہمت اور ذہانت سے بھرپور رویا علم جیوتش میں بھی ترقی کرنے لگا۔ اپنے باپ جھاد رام کی ساری کتابیں وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ ہتاروں کی گردش کو وہ گھنٹوں بغور دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ اچانک مجھے کسی کام سے روک دیتا۔ ”تایا! آج ڈاکا ڈالنے نہیں جائیں گے۔ یہ اچھی گھڑی نہیں ہے۔“ روپا کہتا۔ ”نہیک ہے“ آج نہیں جاتے۔“ میں اس کی بات مان لیتا حالانکہ مجھے جیوتش وغیرہ پر یقین نہیں تھا۔

روپا کے ساتھ میرا لاڈ موتی کی آنکھوں میں کھلنے لگا۔ بلونت کا رشتے دار اور پرانا ساتھی ہونے کے باوجود وہ کم درجے پر آگیا تھا۔ یہ بات یقیناً اس نے محسوس کر لی تھی کہ میں اس کے مقابلے میں روپا کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ روپا اور موتی کے درمیان اسی وجہ سے کبھی کبھار تلخی بھی ہو جاتی۔ ایسے موقع پر میں درمیان میں آ جاتا۔ ”موتی! تم دونوں میرے دائیں بائیں بازو ہو“ اگر تم دونوں آپس میں لڑو گے تو یہ اچھی بات نہیں۔“ میری مصالحت سے وہ دونوں چپ ہو جاتے۔ گوجاری کنویں کا واقعہ پیش آنے کے بعد اپنے گردہ کو میں نے اور مضبوط کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج نہیں تو کل پولیس، چنبل کے کٹاؤ میں میرا محاصرہ ضرور کرے گی۔

کھیزا راٹھور گاؤں سے اسی عرصے میں یہ خبر آئی کہ نیتا رام اب بھی گاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسے پولیس کا پورا تحفظ حاصل تھا۔ دوسری طرف روپا، نیتا رام کو ختم کرنے کی جلدی کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ”روپا! جلدی نہ کر۔ ابھی بہت تیاری کرنا باقی ہے۔“

جگہ جگہ میں نے اپنے چھپنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔ گاؤں گاؤں میرے مخبر موجود تھے۔ اس طرح پولیس کی نقل و حرکت کے بارے میں بھی مجھے تمام اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اسلحہ فراہم کرنے والے بااعتماد افراد بھی مجھے مل گئے تھے۔ میں رفتہ رفتہ وہی نظام قائم کرنے لگا جو گول وادی میں قائم کیا تھا۔ ڈاکا ڈالنا میرے نزدیک حکومت کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ اس کام میں ذرا سی بھی غفلت موت سے ہمکنار کر دیتی ہے اور نرمی ہو نہیں سکتی۔ لوگ اب مجھے راجا بلونت سنگھ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اب مجھے ڈاکو کہنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ میں بھی اکثر یہی کہتا کہ میں ڈاکو نہیں بائی ہوں۔ میں نے ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کی ہے۔

میں ایسا کہنے میں حق بہ جانب تھا۔ میں ڈاکا ڈالنے کے باوجود عموماً غریبوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ ہر ڈاکے کے بعد میں ایک مخصوص رقم خیرات کرتا، غریبوں کی لڑکیوں کو جیز دیتا۔ رکنی بھی اس کاہر خیر میں میرا ہاتھ بٹاتی۔ میرا اصول تھا کہ میں کبھی کوئی برات نہ لوں، کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتا، اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ میرے لئے ایک رکنی ہی کافی تھی۔ وہ مجھے اتنا سیراب رکھتی کہ کبھی تشنگی محسوس نہ ہوتی۔ رکنی کے سوا اب میری نظر میں کوئی چٹا ہی نہیں تھا۔ عبادت گاہ کسی کی بھی ہو، میں اس کا احترام کرتا۔ مندر، مسجد، گرجا اور گرد و دوارے سب میرے نزدیک قابلِ تکریم تھے۔ گاؤں گاؤں لوگ میرے گن گاتے۔ ان میں زیادہ تعداد غریبوں کی ہوتی کیوں کہ غریبوں سے مجھے خاص طور پر ہمدردی تھی۔

میرے دل میں غریبوں کے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے میں رکنی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک مرتبہ مندر میں آرتی اتارتے وقت میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مندر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ مجھے مندر کے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ ”تایا! روپا نے مجھے مخاطب کیا۔“ چلیں ورشن کر آئیں۔“ وہ بہر حال برہمن زادہ تھا۔ مجھے اتنے عرصے تک ہندوؤں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے رسم و رواج اور عقائد نیز طریقہ عبادت کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔

”مگر روپا! کیا بدوق بھی ساتھ لے چلو گے؟“ میں نے ساتھیوں کو رکنے کے لئے کہہ کر روپا سے پوچھا۔ ”نہیں۔“ روپا نے جواب دیا۔ ”بھگوان کے سامنے سر جھکانے میں دنیا کا دھیان نہیں ہونا چاہئے۔“

میں اس کی بات پر ہنسا اور اپنی بدوق شانے سے اتار کر روپا کے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کے سپرد کر دی۔

مندر میں آرتی اتاری جا رہی تھی۔ ہم دونوں مندر کے اندر داخل ہو گئے۔ مندر گاؤں سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا اس لئے سات آٹھ آدمی ہی مندر میں تھے ادھیر عمر پجاری کچھ دیر بعد آرتی کا تھال آگے کر کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”بھولا تاتھ کا پرشاد لو!“ پجاری نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اس کی طرف نرم نظروں سے دیکھا۔ اس وقت اگر کوئی پجاری سے یہ کہتا کہ اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی مشہور اور خوفناک ڈاکو تھا کہ بلونت سنگھ ہے تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ آرتی کے تھال سے پرشاد (تبرک) لے کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر روپے تھال میں رکھ دیے۔ پجاری کی آنکھیں چاندی کے روپوں کا چھوٹا سا ڈھیر دیکھ کر پھیل گئیں اور اس نے دعا دی۔ ”بھگوان تمہارا بھنڈار (خزانہ) بھرا رکھے۔“

آہستہ آہستہ لوگ مندر سے رخصت ہو گئے۔ میں مندر کا جائزہ لینے لگا۔

”تایا! اب چلیں۔“ روپا بولا۔

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”روپا! مندر بھگوان کے گھر ہوتا ہے۔ انسان اپنا گھر اچھا رکھتا ہے، مگر بھگوان کے گھر کا حال دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برسوں سے قلعی تک نہیں ہوئی۔ بھگوان کا گھر بالکل کھنڈر بنا ہوا ہے۔“

”بھگت! تمہاری بات سچی ہے۔“ مندر کے پجاری نے کہا۔ ”آرتی کے تھال میں تم نے مٹھی بھر کے روپے ڈالے، اسی وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ رقم مندر کے کام میں لگاؤں گا۔“

میں نے غور سے پجاری کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلو سے بندھی ہوئی روپوں کی تھیلی کھول کر پجاری کے ہاتھ میں دے دی۔

”مہاراج! آرتی کے روپے آپ کے لئے تھے۔ مندر کی مرمت اس رقم سے کرانا۔“ میں بولا۔
”بھولا ناتھ نے میری دعا سن لی۔“ یہ کہتے ہوئے پجاری کی آواز بھرا گئی۔ ”میں بھگوان سے دعا کرتا تھا کہ کسی داتا کو اس مندر کی مرمت کے لئے بھیج دے۔“

”میں نے سنا ہے مہاراج کہ یہ مندر گاؤں کے ٹھاکر نے بنوایا ہے اور اس کے وارث مندر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ پھر مندر کی ایسی حالت کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ دن گئے بھگت!“ پجاری نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اب جو گاؤں کے ٹھاکر ہیں، میں ان سے گزشتہ پانچ برسوں سے مندر کی مرمت کے لئے کہہ رہا ہوں، مگر جب بھی وہ میری بات سنتے ہیں ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، شکر بھگوان تو اس کھنڈر میں بھی رہ سکتے ہیں۔ انہیں آخر ظاہری سجاوٹ کی کیا ضرورت ہے؟“

پجاری کی بات سن کر میں چونکا اور دریافت کیا۔ ”پھر گاؤں کے لوگ چندہ جمع کر کے مندر کی حالت کو بہتر کیوں نہیں بناتے؟“

”بھائی، میں نے یہ بھی سوچا، مگر ٹھاکر نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر گاؤں کے لوگ مندر کی مرمت کرائیں گے تو ان کے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ جسے وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔“ پجاری نے بتایا۔

”تمہارے ٹھاکر کبھی مندر نہیں آتے؟“ میں نے معلوم کیا۔ روپا کے چہرے پر بیزاری تھی مگر وہ خاموش تھا۔

”ٹھاکر یہاں سال میں ایک بار آتے ہیں، کاتک پونم کی شام کو مندر کا گھنٹا چڑھانے۔“ پجاری نے جواب دیا۔

”مندر کا گھنٹا چڑھانے آتا ہے مگر مندر کی حالت دیکھ کر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ میں نے اظہار حیرت کیا۔

”اسے گھنٹا چڑھاتے وقت ارد گرد کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت نشے میں مست ہوتا ہے۔“ پجاری نے قدرے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

اس مرتبہ روپا بھی خاموش نہ رہ سکا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا۔ ”کیا بات کرتے ہو پجاری! وہ بھگوان کے دربار میں نشہ کر کے آتا ہے، تم یہ کس طرح برداشت کرتے ہو؟“

پجاری، روپا کا غصہ دیکھ کر کانپنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر روپا کو مخاطب کیا۔ ”کیا کریں بھائی، راجا کو کون روک سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نشے کے بغیر اس کی کوئی شام نہیں گزرتی۔ گئے سال کی بات ہے، اس کا بوڑھا باپ عاجزی کرنے لگا کہ کاتک کی ایک شام تو شراب کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ جواب میں اس نے اپنے باپ کی زبان کٹوا دی۔ مرتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں اپنے بیٹے سے جیسے التجا کر رہی تھی کہ بیٹا، کچھ بھی ہو شکر بھگوان کی پوجا نہ چھوڑنا، باپ دادا کی جو روایت ہے اسے قائم رکھنا۔“

”اس نے بوڑھے باپ کی زبان کٹوا دی پھر بھی گاؤں والے خاموش رہے؟“ بزدل۔“ میں

غصے میں بولا۔
”آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن بائیس گاؤں کے مالک کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ لوگ کس سے فریاد کریں؟“

”پجاری! اب آنے والی کاتک پونم میں بس چند روز رہ گئے ہیں۔ وہ جاگیردار اس مرتبہ گھنٹا نہیں چڑھائے گا۔ میں تمہیں وجہ دیتا ہوں۔“ میں کہا۔

”اگر ٹھاکر بابو گھنٹا نہیں چڑھائیں گے تو پھر کون.....“
”میں چڑھاؤں گا۔“ میں بول اٹھا۔ ”پجاری! تم مجھے نہیں جانتے، ٹھاکر بلونت سنگھ بائیس گاؤں کے مالک سے نہیں ڈرتا۔“

میرا نام سن کر پجاری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، میری نظریں اس کے چہرے ہی پر تھیں۔ ”آپ..... آپ راجا بلونت سنگھ۔“ پجاری گڑ گڑایا۔ ”آپ میرے مندر میں آئے۔“

”اب پونم کی آرتی کے وقت آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھا۔ ”اور سنو! کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہ ہو۔“

”بہتر حضور!“ پجاری نے کہا۔
میں، روپا کو ساتھ لے کر مندر سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

کاتک پونم کی دوپہر ہی سے مندر کے میدان میں انسانی سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس سمندر کا ایک حصہ میں بھی تھا۔ سال بھر ٹوٹی رہنے والی عمارت ایک دن کے لئے لوگوں سے بھر جاتی تھی۔ شکر بھگوان کے درشن کی تمنا، میلے کی موج، پرشاد کالاچ، کسی نہ کسی بھانے آس پاس کے گاؤں والے یہاں جمع ہو جاتے۔ مختلف دیہات کے مہاجن اور کھیا بھی حاضر رہتے تھے کیوں کہ بائیس گاؤں کا مالک اس مندر میں گھنٹا چڑھانے آتا تھا۔ طرح طرح کے بھیل تماشے بھی ہوتے اور کہیں کہیں جوا بھی کھیلا جاتا۔ گزشتہ سال کی نسبت اس مرتبہ مندر کی رونق میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے پرانے جھنڈے کی جگہ اب نیا جھنڈا لگا دیا گیا تھا۔ مختلف اقسام کے درختوں کے پھول پتوں اور جھنڈیوں سے پورا مندر سجایا گیا تھا۔ سیاہ دیواریں اب قلعی ہونے کے بعد چمکنے لگی تھیں۔ مندر کی سجاوٹ دیکھ کر لوگ آپس میں مختلف تبصرے کر رہے تھے۔

”ٹھاکر صاحب نے اس بار خرچ کیا ہے۔ مندر کی سجاوٹ ہی کچھ اور ہے۔“ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

سورج مغرب کی طرف چھکا اور آرتی کی آواز بلند ہوئی۔ نوبت بجنے لگی۔ لوگ دو رویہ قطاروں میں مندر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ٹھاکر صاحب کی کبھی دیکھ کر چھوٹے بڑے سبھی، سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح خاموش ہو گئے۔ کچھ لوگ استقبالیہ نعرے لگوانے وہاں پہلے سے موجود تھے۔

ٹھاکر صاحب خود کبھی سے نہیں اترے بلکہ دوویو قامت آدمیوں نے انہیں کبھی سے اتارا۔ سر پر

سامنے جھکنے کی بجائے سینہ تان کر کھڑا ہے۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، میں نے اسی لئے ہنر سے بچنے کی خاطر ہاتھ کی آڑ کر لی۔ ایک آواز کے ساتھ ہنر میری کلائی سے لپٹ گیا۔ میں نے جھکا دے کر ہنر محافظ سے چھین لیا اور کہا۔ ”بھگوان کے سوا میں کسی کے آگے نہیں جھکا اور گالی کا جواب ٹھوکر سے دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے ایک محافظ کے پیٹ پر بھرپور لات ماری۔ وہ جیج کر الٹ گیا۔ اسی کے ساتھ لوگوں میں شور مچ گیا۔

”ٹھاکرا! گھنٹا چڑھانے کا وقت گزر رہا ہے۔“ پجاری ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔“ ”بھائی! جھگڑا بند کرو۔ بھگوان کے گھر میں جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔“ پجاری کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے سمجھا رہا ہو۔

”بھگوان کا گھر۔“ میں نے زور سے کہا۔ ”پجاری! بھگوان کے گھر میں ایک شرابی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہونا چاہئے۔ اس پانی کے ہاتھوں مندر کا گھنٹا نہیں چڑھے گا۔“

جاگیردار کا نشہ جیسے ہرن ہو گیا تھا۔ اس کے منہ پر تو کیا شاید پیٹھ پیچھے کسی نے ایسی بات کہنے کی ہمت نہیں کی ہو گی۔ پھر بھلا عوام کی موجودگی میں اپنی یہ بے عزتی اس سے کیسے برداشت ہوتی۔ بائیس ٹاؤں کے مالک نے پہلو سے لپکتی ہوئی تلوار نیام سے باہر کھینچنے کے لئے اس کے دستے پر ہاتھ رکھا۔

تلوار ابھی نیام سے آدمی باہر آئی ہو گی کہ میں نے اس کے ہاتھ پر ہنر مارا۔

”جاگیردار! اپنی تلوار نیام ہی میں رہنے دے۔“ میں تیز اور سخت آواز میں بولا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ کے سامنے ہتھیار اٹھانے کے لئے تجھے دوسرا جہنم لینا پڑے گا۔“

لوگوں نے جیسے ہی میرا نام سنا، سناٹا سا چھا گیا۔ جاگیردار کے آدمیوں کے بلند کئے ہوئے ہتھیار اسی طرح رہ گئے۔ جاگیردار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔ پھر بھی کیوں کہ میں نہتا تھا اس لئے بارعب آواز میں اس نے آدمیوں کو لٹکارا۔ ”ارے سب کھڑے کیا ہو، پیٹ ڈالو اسے۔“

یہ کہتے ہی وہ دو آدمیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

”جا جا بڑل! خاموشی سے اپنی حویلی واپس چلا جا۔ شکر بھگوان کے مندر کا خیال ہے ورنہ.....“

میں نے یہ کہہ کر مجمع کی طرف ہاتھ بلند کر کے مخصوص اشارہ کیا۔ ”دیکھ لے“ یہ رانٹیں خاموش نہیں رہیں گی۔“

میرے اشارے کے ساتھ ہی مجمع سے بیک وقت کئی رانٹیں بلند ہوئیں۔ سب کے سامنے سے گزرتا ہوا روپا مجمع سے باہر آیا اور میرے برابر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کن آنکھوں سے جاگیردار کی طرف دیکھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو بائیس گاؤں کے مالک! زندہ واپس جانا ہے یا.....“ روپا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جاگیردار کی طرف رانٹل تان کر بولا۔ ”صرف ایک گولی کی ضرورت ہے۔“

روپا کا بھیا تک روپ دیکھ کر جاگیردار کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اسے کھڑا رہنے کے لئے دو آدمیوں کا سارا لینا پڑا پھر اچانک اسے جانے کیا سوچی کہ اس نے ایک نظر اپنی طرف اٹھی ہوئی رانٹل پر ڈالی اور کسی سارے کے بغیر مٹھیاں کس کر دوڑ لگا دی۔ موت کے خوف سے شاید اس کے اندر اتنی ہمت پیدا ہو

جن زاد ☆ 12 ☆ تیسرا حصہ

سفید صاف، پیروں میں نخل کے جوتے، بند گلے کا جو دھوری کوٹ اور نیچے تقریباً جسم سے چپکا ہوا پاجامہ، کمر سے بندھی ہوئی تلوار اور آنکھوں میں نشے کا خمار۔ یہ تھے بائیس گاؤں کے مالک۔ لڑکھائے قدموں اور پھرتے ہونٹوں سے ٹھاکر صاحب آگے بڑھے۔ ان کی آمد کا اعلان کیا گیا اور لوگ نعرے بلند کرنے لگے۔ نعرے سن کر ٹھاکر صاحب کے چہرے پر جوش نظر آیا۔

”ہماری مونچھوں کے بل چڑھاؤ!“ ٹھاکر صاحب نے اپنے دونوں طرف ساتھ ساتھ چلتے ہوئے قوی نیکل افراد کو حکم دیا۔

ٹھاکر صاحب کی یہ حالت دیکھ کر کچھ لوگ زرب لب مسکرا رہے تھے۔ کچھ کے چروں پر مجھے نفرت نظر آئی۔ اس کے باوجود سبھی جیسے مشینی انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ ایک قوی نیکل شخص کے ہاتھ میں گرچھ کی دم کا ہنر تھا اور دوسرا فضا میں تیلی کی لکڑی لہراتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہی لوگوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ قریب سے گزرنے پر لوگ، ٹھاکر صاحب کو جھک کر سلام کرتے ورنہ لکڑی یا ہنر پڑتا۔

مندر کی میزھیوں کے قریب کھادی کے کپڑوں میں ملبوس پجاری ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، مگر اس کی نگاہیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں ابھی تک اس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس دوران ٹھاکر صاحب، پجاری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پجاری نے نمستہ کہنے کے لئے سر جھکا یا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اسی وقت لوگوں کی بھیڑ سے نکل کر میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بالکل مندر کی میزھیوں کے پاس۔ میں، ٹھاکر صاحب کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

”اے! راستے سے ہٹ جا۔ دیکھتا نہیں ٹھاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔“ ہنر والے شخص نے مجھے سختی سے مخاطب کیا۔

”ابے گدھے! اس طرح کیا کھڑا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو نمستہ کر۔“ دوسرا جی حضور یا بھی بولا۔

میں نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔ دونوں جی حضور یے کچھ ہچکچائے۔

”ہاٹ جا احمق!“ ٹھاکر صاحب نشے میں ڈوبی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے سامنے کھڑے دیکھ کر بڑبڑائے، مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ یہ دیکھ کر ٹھاکر صاحب گرجے اور اپنے دونوں محافظوں کو حکم دیا۔ ”سالے کو ہنر لگاؤ۔“

”زبان سنہال ٹھاکرا!“ میں پیچھے ہٹنے کی بجائے چند قدم آگے بڑھ کر تیز آواز میں بولا۔

”خواہ مخواہ یہ بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔“ لوگ اظہارِ افسوس کرنے لگے۔ ”بھلا بائیس گاؤں کے جاگیردار کا راستہ روکنے والا کس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔“

پجاری کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جاگیردار کے عقب میں مسلح آدمی چونکا ہو گئے۔ میری تیز آواز سن کر ٹھاکر صاحب کی ادھ کھلی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ”سالے کی زبان کھینچ لو۔“ جاگیردار چیخا۔ غصے کے سبب اس کا چہرہ بڑک گیا۔

جاگیردار کے حکم پر ہنر والے کا ہاتھ اٹھا اور دوسرا غصے میں بولا۔ ”بے وقوف، ٹھاکر صاحب کے

”نہر جاؤ جاگیردار! میں گھٹنا چڑھاتا ہوں“ یہ تو دیکھتے جاؤ۔“ میں نے بھاگتے ہوئے جاگیردار کو لٹکارا، پھر جہوم سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ بالکل نہ گھبراتا۔ اطمینان رکھو، میری موجودگی میں کسی کا بال بیکا نہ ہو گا۔“ مجھے اندازہ تھا کہ کچھ ساہوکار اور مہاجنوں کے سوا باقی لوگوں کو مجھ سے کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عام لوگ تو خود مجھے دیکھنے کے آرزو مند رہتے تھے۔ وہ شخص جس کے تذکرے دن رات سنتے اور وہ جو غریبوں کا ہمدرد تھا، وہ جو مظلوموں کا ساتھی تھا، وہ جو کھلے ہاتھوں خیرات کرتا تھا لوگوں کے چہرے اسے اپنے درمیان دیکھ کر مسرت سے چمک رہے تھے۔ میں ان کے چہروں سے دلی جذبات کا اندازہ بہ آسانی لگا سکتا تھا۔

پجاری نے پوجا کا آغاز کیا۔ میں نے چھت کا نیا گھٹنا چڑھایا۔ جاگیردار جو میری لٹکار پر رک گیا تھا، مردہ چہرے لئے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمی بھی دم بخود ہو کر مجھے گھٹنا لٹکاتے دیکھ رہے تھے۔ لوگ جوش میں آکر ”راجا بلونت سنگھ کی ہے“ کے نعرے لگا رہے تھے۔

”نہیں نہیں!“ میں نے ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو نعرے لگانے سے روک دیا۔ ”بھگوان کے گھر میں انسان کی بے نہیں ہوتی۔“ اس پر لوگ ”شکر بھگوان کی ہے“ کے نعرے مارنے لگے۔ پھر میں بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے آدمیوں کو لے کر جہوم سے الگ ہو گیا۔

جاتے جاتے میں نے جاگیردار کو مخاطب کیا۔ ”تم بائیس گاؤں کے مالک ہو تو عوام کو بھی اپنی اولاد سمجھو۔ اب ہر سال یہاں گھٹنا چڑھانے میں آؤں گا۔“

”بہتر ہے جناب!“ جاگیردار فرماں برداری سے بولا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے چلا آیا۔ رفتہ رفتہ میرا حلقہ اثر بڑھتا گیا۔ اگرہ ضلع سے یو پی کے دوسرے شہروں، چنبل کے کنارے راجستھان اور مدھیہ پردیش کے علاقوں میں بھی میں نے پاؤں پھیلا دیئے۔ مجھے اطلاع ملی کہ دوسرے صوبے والوں نے یو پی کے حکام سے فراد کی۔ ”تمہارا بلونت سنگھ اب ہماری حد میں بھی دھاوے بھرنے لگا ہے، اسے روکنے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔“

یو پی پولیس کی عزت گویا دن دہماڑے نیلام ہو گئی۔ مجھے خبریں ملتی رہیں۔ صوبے کے اعلیٰ حکام جمع ہوئے۔ پولیس کی پیشانی پر لگا ہوا داغ دھونے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ ”آپریشن بلونت سنگھ“ ایک منصوبے کا نام رکھا گیا۔ کسی طرح، کتنے ہی خرچ پر مجھے ہلاک کرنے کا حکم ہوا۔ چنبل کے کٹاؤ میں تین طرفہ حملہ کر کے مجھے گھیرنے کا پلان بنا۔ میرا اڈا کہاں ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لئے خفیہ پولیس کے ہوشیار اور مستعد افراد کو مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہر پولیس افسر کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ مجھے کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ میں یہ تمام اطلاعات بڑے سکون و اطمینان سے سنتا رہا۔

اسی دوران ایک رات روپا کو ٹھکانے تک واپسی میں دیر ہو گئی تو میں اس کی طرف سے فکرمند ہو

سنسناٹی ہوئی ہوا چنبل میں گرج رہی تھی۔ گہرے تاریک کناروں کے کٹاؤ میں میرے ساتھی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے میں اور میرے ساتھی لکڑیوں کا ڈھیر جلا کر جسموں کو گرمی پہنچا رہے تھے۔ شعلوں کی سرخ زبانیں اس طرح لپک رہی تھیں جیسے آڈھوں کی زبانیں بار بار ان کے دہانوں سے لپک رہی ہوں۔ مجھے سوچ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر برابر بیٹھے موتی نے پوچھا۔ ”ٹھاکرا! کس گہری سوچ میں گم ہیں؟“

”سوچ رہا ہوں، روپا اب تک کیوں نہیں آیا؟“ میں نے پگڈنڈی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”میں نے اسے کئی بار ٹوکا ہے کہ اکیلے باہر نہ جایا کرو، پولیس کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، کبھی مشکل میں پڑ جاؤ گے، مگر وہ مانتا ہی نہیں۔“

”بڑا ہمت والا ہے۔“ موتی بولا۔ مجھے خبر تھی کہ روپا سے حسد کرتا ہے۔ وہ محض میری دل دہی کی خاطر روپا کی تعریف کر رہا تھا۔

معا میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ روپا ہی ہے۔ چیتے جیسی چال کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“ پھر جب روپا قریب آ گیا تو میں نے اپنی گرم ہتھیلیاں اس کے ٹھنڈے رخساروں پر رکھ دیں اور بولا۔ ”تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔“ میرے لیے میں اس کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

روپا نے سر پر بندھا ہوا کپڑا ایک طرف پھینکا، رائفل ایک جانب رکھی اور میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”مجھے دیر ہو گئی۔ اس بھیانک کٹاؤ میں اکیلے تفریق کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔“

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا خبر لایا؟ پلے ہوئے کتے آج کل کس طرف گھوم رہے ہیں؟“

میری نفرت اب روز بروز پولیس والوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اسی لئے ہمیشہ انہیں حقارت سے یاد کرتا تھا۔ یہ نفرت بلا سبب نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس ہمیشہ سرمایہ داروں کا ساتھ دیتی ہے اور غریبوں کو قانون کی آڑ لے کے تنگ کرتی رہتی ہے۔ پولیس، ظالموں کا ساتھ دیتی تھی اور خود بھی ظالم تھی۔

”ساری پولیس پلٹن قریب ہی پڑی ہے تاؤ!“ روپا نے آگ میں مزید لکڑیاں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں دور سے دیکھ کر چلا آیا۔“ پھر اس نے یقیناً میرے چہرے پر فکرمندی سے، آثار دیکھ لئے اور کہنے لگا۔ ”فکر نہ کرو، وہ اب تک دوسری سمت میں جھک مار رہے ہیں۔ کل صبح ہی صبح وہ شمال کی طرف جائیں گے جب کہ ہم جنوب کی طرف بڑھیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے روپا کے چہرے پر جوش سا نظر آیا۔ پھر وہ مزید بولا۔ ”اپنے مخبروں نے انہیں الٹے راستے پر لگا دیا ہے۔“

روپا کے آخری الفاظ سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ کچھ دیر بعد حقہ گزرگا کر میں نے پوچھا۔ ”اور کوئی خبر؟“

”اس نیا رام کو سیدھا کرنا پڑے گا۔“ روپا نے دانت پیس کر کہا۔ ”وہ ہمارے مخبروں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ایک مخبر تواری کو روپوں کا لالچ بھی دیا ہے کہ وہ اسے ہمارا پتا بتا دے۔ خاصے

سرد ہوا ہے تو جلد یا بدیر اسے سزا ضرور ملے گی۔“ پھر میں نے کہا۔ ”روپا اور موتی! آج رات ہمیں ڈاکا ڈالنے جانا ہے اس لئے تیار رہنا۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس وقت تک تمام لوگ آرام کر لیں، صرف چار آدمی پہرا دیں گے۔“

☆=====☆=====☆

روٹی صاف کرنے والے کارخانے کا بڑا گیٹ بند ہونے والا تھا۔ اسی وقت روٹی سے بھری ہوئی ایک بیل گاڑی اندر گھس آئی۔ روٹی کے ڈھیر پر میرے ساتھ روپا بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ہی اونچے چوڑے پر کارخانے کا مارواڑی سیٹھ ٹانگیں پھیلائے اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سانس لینے کے سبب اس کی موتی اور پھولی ہوئی توند پھول پچک رہی تھی۔ سیٹھ کا منہ روپے گن گن کے کپڑے کی تھیلیوں میں بھر کر لکڑی کی ایک میز پر رکھ رہا تھا۔ بیل گاڑی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر سیٹھ اور منہ دوڑی ہوئی نے سر اٹھائے۔ سیٹھ نے بیل گاڑی والے کو گالیاں بکنا شروع کر دیں کیوں کہ کارخانے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ بیل گاڑی جیسے ہی چوڑے سے قریب ہوئی میں رانٹل تھامے ہوئے کودا اور رانٹل کی نالی سیٹھ کی طرف کر دی۔ سیٹھ کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ روپا گاڑی سے کود کر سیٹھ کی گردی پر بیٹھ گیا۔

”کیوں سیٹھ، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“ روپا نے سیٹھ کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ سیٹھ کی نظرس جھک گئیں تو روپا نے منہ سے کہا۔ ”منہ جی! تمہارا حساب کیا کتنا ہے، تجوری میں کتنی رقم ہے؟“ یہ کہتے ہوئے روپا کی رانٹل کا رخ منہ کی طرف ہوا۔ منہ جی نے سیٹھ کی طرف ہاتھ کیٹے۔ منہ جی کے کان پر رکھا ہوا قلم گر گیا۔ مونے ٹیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں خوف کی شدت سے بند ہونے لگیں۔ چند لمحے تک منہ جی نے باری باری روپا اور میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ سیٹھ کے پیٹ پر دھوتی ڈھیلی ہو گئی۔ سیٹھ اور منہ جی نے ایک دوسرے کو کھنکھیں سے دیکھا۔

”میں ذرا پیشاب کر کے آتا ہوں۔“ منہ جی نے ڈری ڈری آواز میں کہا اور اٹھنے لگا۔

ابھی وہ پوری طرح کھڑا نہیں ہو سکا تھا کہ روپا کی رانٹل کی نال اس کے پیٹ سے ٹکرائی اور وہ دم سے دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”منہ جی! سیٹھ تمہیں حساب کتاب رکھنے کی تنخواہ دیتا ہے پولیس کو اطلاع دینے کی نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔“ روپا نے سختی سے کہا، پھر رانٹل کی نال اس کے پیٹ پر مارنے ہوئے بولا۔ ”بے وقوف! ہمیں دیکھ کر تیرا پیشاب خطا ہونے لگا۔“

اسی وقت میرے آٹھ دس آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں موتی بھی تھا۔ میں گرجا۔ ”سیٹھ! اگر تجھے اپنی زندگی عزیز ہے تو جتنی رقم موجود ہے وہ ہمارے حوالے کر دے ورنہ تجھے جہنم میں پہنچا کر میں تیرے کارخانے کو بھی آگ لگا دوں گا۔“

مارواڑی سیٹھ نے روٹی صورت بنا کر اپنے منہ کو دیکھا۔ منہ جی نے میز کی دراز کھولی اور کانپتے اٹھوں سے روپوں کی تھیلیاں روپا کے سامنے رکھ دیں۔ یہ سات تھیلیاں تھیں۔

دن سے وہ تیواڑی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”لگتا ہے اس کتے کے دن پورے ہو گئے ہیں۔“ مجھے غصہ آگیا۔ ”اپنے بھائی میا رام کی طرح اس کی موت بھی اسے پکار رہی ہے۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔“

”نہیں تایا، وہ تمہارے ہاتھوں ہلاک نہیں ہو گا۔“ روپا نے اپنی رانٹل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ حساب میں صاف کروں گا۔ میں سب انتظام کر کے آیا ہوں۔ میں نے تیواڑی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس کی باتوں میں آجانے کی اداکاری کر کے چار دن کے بعد اسے اکیلا اپنے گھر بلائے۔ پھر میں اسے دیکھ لوں گا۔“

”نہیں روپا، تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ ممکن ہے، تیواڑی اداکاری کرتے کرتے واقعی بدل جائے اور تمہیں پھنسا دے۔“ میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

”تایا! آپ مجھے ہر معاملے میں نہ روکا کریں۔“ روپا نے کہا۔ اس کی آواز میں جوش تھا۔ ”میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا تاکہ آئندہ کسی میں یہ ہمت نہ پیدا ہو کہ بلونت سنگھ کے آدمیوں کو ورغلا سکے۔“ روپا کی آواز میں سختی آگئی۔

میں خاموش ہو گیا اور میری یہ خاموشی گویا اجازت کے مترادف تھی۔

”تایا! ایک بات اور سنی ہے۔“ روپا نے موتی کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا۔ موتی چونک اٹھا۔ میں نے حقے کی لئے رکھتے ہوئے روپا اور موتی کی جانب باری باری دیکھا۔ روپا مزید کچھ کہتے ہوئے تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔ ”اپنے ایک ساتھی کے بارے میں عورتوں کو چھیڑنے کی شکایت آئی ہے۔“

”ہمارے ساتھی، عورتوں کو چھیڑتے ہیں۔“ میں نے سختی سے کہا۔ ”تمہیں یہ کس نے بتایا؟“

”شیو پوری کے کھیا نے بتایا ہے۔“ روپا نے نظرس نیچی کر کے جواب دیا۔ ”ہمارے ایک ساتھی نے ایک غریب کسان کی حسین و نوجوان بیوی کی عصمت دن دیمارے لوٹ لی ہے۔“

”روپا!“ مجھے غصہ آگیا۔ ”بول! ٹھاکر بلونت سنگھ کے نام کو کس نے داغ لگایا؟ جلدی اس کا نام بتا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے قریب رکھی رانٹل اٹھالی۔

میرے تمام ہی ساتھیوں کو معلوم تھا کہ میں ایسا جرم کبھی معاف نہیں کرتا۔ ان کے چہروں سے اسی لئے خوف جھلکنے لگا۔

”تایا! کھیا کو نام کا ہتا نہیں، مگر اس عورت نے یقین سے کہا ہے کہ عزت لوٹنے والا بلونت سنگھ کا ساتھی تھا۔ سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی ہے اس لئے وہ عورت گاؤں چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔“ روپا نے بتایا۔

”شیو پوری کے کھیا نے نام نہیں بتایا، اس میں ضرور اس کی کوئی چال ہے۔“ موتی بولا۔ ”کسی اور نے اس عورت کی عزت لوٹی ہوگی۔ کھیا، بلونت سنگھ کے ساتھی کا نام لے کر یقیناً ہمارے درمیان پھوٹ ڈلوانا چاہتا ہے۔“

”موتی! ہو سکتا ہے، تمہارا کنا ٹھیک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پھر بھی اگر یہ جرم ہمارے کسی آدمی سے

”ان تھیلیوں میں کتنے روپے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔
”چار ہزار چھ سو اٹھ روپے۔“ منشی نے بمشکل جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ نو آنے اور سات پائی۔“

”تجھ سے آنے پائی کا حساب کون پوچھ رہا ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اگر میں یہاں سے دس ہزار روپے سے کم رقم لے کر گیا تو اس سے تمہارے سیٹھ کی بے عزتی ہوگی۔ بتاؤ اور روپے کہاں ہیں؟“ میں نے رانقل کی نال اب سیٹھ کی طرف کردی۔ ”تو بول سیٹھ!“

”جناب! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اتنے ہی ہیں اس سے زیادہ ایک پائی نہیں۔“ مارواڑی سیٹھ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

”معلوم ہوتا ہے، تجھے چڑی سے زیادہ دمڑی پیاری ہے۔“ میں تیز آواز میں بولا، پھر سوال کیا۔ ”یہاں اور کتنے گلے ہیں؟“

”یہاں تو اور کوئی نہیں البتہ دکان میں پچاس ساٹھ سے زیادہ گلے نہیں ہوں گے۔“ سیٹھ نے خوفزدہ آواز میں جواب دیا۔

”اس دکان کے پیچھے ایک تہہ خانے ہے اور اس تہہ خانے میں ایک تجوری ہے اس تجوری میں کتنے روپے ہیں؟“ میں نے چپتے ہوئے لمبے میں دریافت کیا۔ سیٹھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا جو میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ میں نے سیٹھ کے بارے میں تمام اطلاعات معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ سیٹھ کو دھمکانے کی خاطر میں نے موتی کو مخاطب کیا۔ ”جاؤ، یہاں جتنی روٹی ہے سب کو آگ لگا دو۔ سیٹھ کو شاید ہولی دیکھنے کی آرزو ہے۔“

میرا حکم سنتے ہی موتی آگے بڑھا۔ اسی وقت سیٹھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی ڈھالی دھوٹی کو سنبھالا اور گڑگڑایا۔ ”نہیں نہیں حضور اسے روکیں۔ مم..... میں جتنی رقم ہے سب دے رہا ہوں، مگر..... مگر میری پشت در پشت کا دھندا تو خراب نہ کریں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پڑا، پھر دھوٹی کمر پر کس کر باندھتا ہوا چوتھے سے نیچے اتر آیا۔

”میں سیٹھ کے ساتھ جا رہا ہوں۔“ میں نے اپنی رانقل روپا کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر سیٹھ چلاؤ دھمکانے گا تو میں اسے ختم کر دوں گا۔ منشی اگر چالاکی کرے تو تم کارخانے کو آگ لگا دینا۔“ پھر میں روپا کے مزید قریب ہو گیا اور سرگوشی کی۔ ”رقم لے کر میں سیدھا دریا پار کر کے آ رہا ہوں تم لوگ یہاں سے فرما ہو جانا۔“

”نمایا! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ایک کی بجائے دو ہوں تو خطرہ کم رہتا ہے۔“ روپا۔
”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”مارواڑی سیٹھ اب رقم دے دے گا۔ تمہارا ضرورت نہیں۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جاؤ اور جو رقم یہاں سے ہاتھ لگی ہے اسے بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ میری فکر نہ کرنا پتول میرے پاس ہے۔“

دو گھوڑوں کی کبھی میں بیٹھ کر میں، مارواڑی سیٹھ کے ساتھ اس کی دکان پر پہنچا۔ وہ چراغ جلائے کا وقت تھا۔ بازار میں سناٹا تھا۔ سیٹھ نے کانپتے ہاتھوں سے دکان کا تالا کھولا اور میں اس کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

کبھی سے اترتے وقت میں نے کبھی چلانے والے سیٹھ کے ملازم کو دھمکی دی تھی کہ وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلا تو اس کے سیٹھ کو گولی مار دی جائے گی۔ کبھی خود سیٹھ کی تھی۔

دکان میں گھستے ہی میں نے اندر سے کنڈی لگا دی اور پستول نکال کر سیٹھ پر تان لیا، پھر اسے مخاطب کیا۔ ”ہزاری مل! اگر تو نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تیری پھولی ہوئی توند کو گولی مار کر پچکا دوں گا۔“

”بھائی صاحب! پستول دور رکھو۔ جو چاہو لے جاؤ مگر..... مگر میری جان بخش دو۔“ سیٹھ خوفزدہ آواز میں بولا۔

”تو پھر جلدی کرو، وقت ضائع نہ کرو۔“ میں نے اس کی توند پر پستول کی نال رکھ کر دھکا دیا۔ ہزاری مل نے دکان کے دوسرے حصے میں جانے کے لئے قدم بڑھائے تو میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”ادھر کہاں جا رہے ہو، اب بھی تم چالاکی سے باز نہیں آ رہے۔ چلو یہ گدی اٹھاؤ۔ تمہ خانے کا راستہ گدی کے نیچے ہے۔“ مجھے اپنے تجربوں کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان پر پورا یقین تھا۔ سیٹھ نے چہرے پر شرمندگی نظر آنے لگی۔

”پستول دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔“ سیٹھ نے اپنی صفائی پیش کی۔

گدی ہٹانے کے بعد نائل بٹایا گیا۔ تہہ خانے میں اندر تھا۔ دکان کے ایک کونے میں مجھے لالین نظر آگئی۔ سیٹھ کو میں نے لالین جلائے کا حکم دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا۔ لالین جلنے کے بعد میں اسے اٹھائے تہہ خانے کے راتے تک آیا، پھر لالین رکھ کر اندر جھانکا۔ نیچے اترنے کے لئے کنڈی کی ایک میٹھی موجود تھی۔

”ہزاری مل! پہلے تم تہہ خانے میں اترو۔“ میں نے سیٹھ کو حکم دیا۔

سیٹھ اتر گیا تو میں تیزی سے نیچے پہنچ گیا۔ لالین میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی میں، میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں تجوری موجود تھی۔ لالین چھت سے لٹکا کر میں نے سیٹھ سے تجوری کی چابیاں طلب کیں۔ اس نے چابیاں دے دیں۔ تجوری کھولتے ہی مجھے روپوں سے بھری بے شمار تھیلیاں نظر آئیں۔ وہ رقم میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے اور سیٹھ کے درمیان دس بارہ قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ میٹھی کے قریب کھڑا تھا۔ میں تو تجوری سے تھیلیاں نکالنے میں مصروف تھا اور ادھر سیٹھ ہزاری مل میری موت کا سامان کر رہا تھا۔ اس کی خبر مجھے تب لگی کہ جب وقت گزر چکا تھا۔

اچانک اپنے عقب میں مجھے کھٹکا سانسائی دیا تو تیزی کے ساتھ پلٹا اور جیسے میرے حواس گم ہو گئے۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ جانے کب کی کب میں بد معاش سیٹھ میٹھی کے ذریعے اوپر چڑھ

احتیاط کے ساتھ بوریاں وہاں سے اٹھانا شروع کر دیں۔ میں اب ان بوریوں کو تہ خانے کے وسط میں اس جگہ رکھ رہا تھا جہاں پانچ فٹ اوپر تہ خانے سے نکلنے کا راستہ تھا۔ جلد ہی میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے تجوری سے نکالی ہوئی روپوں کی تھیلیاں چادر میں باندھیں اور بوریوں پر چڑھ گیا۔

تہ خانے کے راستے پر رکھا ہوا ٹائل خاصا بھاری تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر آخر کار اسے جگہ سے ہٹا ہی دیا۔ اس کے بعد مجھے تہ خانے سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب مجھے اس دکان سے نکلتا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ تہ خانے کے راستے پر میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ ٹائل رکھ دیا تھا۔

دکان کی چھت پر سینٹ کی چادر پڑی تھی اور چھت تک پہنچنا بھی زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں نے اس کے لئے وہ میڑھی استعمال کی جو مارواڑی سینٹھ نے تہ خانے سے باہر کھینچ لی تھی۔ دکان ہی میں مجھے ایک تھوڑی پڑی نظر آگئی۔ میں وہی تھوڑی لئے میڑھی پر چڑھ گیا۔ سینٹ کی ٹیٹ توڑ کر اتنا غلاتا لینا مشکل نہ ہوا کہ میں جس سے گزر کر دکان کی چھت پر پہنچ سکوں۔

چھت پر چڑھ کر میں دکان کی عقبی ست پتلی سی ایک گلی میں کود گیا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں اس گلی میں دبے قدموں آگے بڑھا اور پھر گلی کے اختتام پر ٹھک کر رک گیا۔ میں نے خطرے کی بوسوگھ لی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے باوردی پولیس والے نظر آ گئے۔ ان بھی کے ہاتھوں میں مجھے رانٹیں نظر آرہی تھیں۔ ان کی تعداد دو درجن سے بھی زیادہ تھی۔ گاؤں میں جتنی پولیس کو نفری تھی، تھانے کا انچارج شاید بھی کو ساتھ لے آیا تھا۔ غالباً اسے یہ خطرہ لاحق رہا ہو گا کہ کہیں میرے ساتھی مجھے چھڑانے نہ آجائیں۔ ان سے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہے پولیس کی زیادہ نفری کی ضرورت تھی۔

تمام سپاہیوں کو میں نے دکان کے دروازے پر جمع ہوتے دیکھا۔ ان کی رانٹوں کا رخ دکان کی طرف تھا۔ میں اب گلی سے نکل کر آڑ لیتا ہوا کچھ آگے آ گیا تھا، لیکن ابھی میرا وہاں سے فرار ہونا خطرناک تھا۔ آڑ سے نکلنے کی صورت میں کسی بھی سپاہی کی نظر مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ نتیجے کے طور پر میں ایک بیل گاڑی کی آڑ میں چھپا رہا۔ بیل گاڑی میں شاید اناج بھرا ہوا تھا، مگر بیل وہاں نہیں تھے۔ میں ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ سینٹھ کی دکان کا دروازہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے اور دکان کے دروازے کے درمیان چند ہی قدم کا فاصلہ ہو گا۔ میں بے حس و حرکت اسی جگہ کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔

”سینٹھ! دکان کا تالا کھولو۔“ پولیس افسر نے سینٹھ ہزاری مل کو مخاطب کیا۔

”جج..... جی صاحب!“ سینٹھ ہکلیا اور کانپتے قدموں سے آگے بڑھا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں سینٹھ! ہم تمہارے ساتھ موجود ہیں۔“ پولیس افسر نے سینٹھ کی ہمت

بندھائی۔

مارواڑی سینٹھ نے آخر تالا کھول ہی دیا دکان کے اندر لالین کی روشنی تھی۔ مارواڑی سینٹھ اتنا سرا سیدہ اور بوکھلایا ہوا تھا کہ اس اجنبی نے غور ہی نہیں کیا کہ جو لالین تہ خانے میں تھی، اوپر دکان میں

گیا تھا اور اب میڑھی بھی اس نے اوپر کھینچ لی تھی۔ اسی کے کھٹکے سے میں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ جست بھر کر میں تہ خانے کے راستے کے نیچے پہنچا مگر مجھے دیر ہو چیک تھی اس وقت تک مارواڑی سینٹھ تہ خانے کے راستے پر بھاری ٹائل رکھ چکا تھا۔ دانت پیس کر میں سینٹھ کو گالیاں بکتے لگا۔ میں اس طرح کبھی بے بس نہیں ہوا تھا۔ سینٹھ نے دکان کا دروازہ کھول کر پھر غالباً باہر سے بند کیا تو یہ آوازیں بھی میں نے سنیں۔

زندگی میں پہلی بار میں گھبرا گیا۔ تہ خانے کی چھت میرے سر سے پانچ فٹ بلند تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر میں نے تہ خانے کی دیواروں پر ٹھوکریں مار کر ان کی مضبوطی کو آزمایا۔ باہر نکلنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مارواڑی سینٹھ نے مجھے کسی چوہے کی طرح چوہے دان میں بند کر دیا تھا۔ یقیناً وہ پولیس کو اطلاع دینے گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں پولیس آ کر دکان کو گھیر لے گی۔ کیا پولیس مجھے اس بے بسی کے عالم میں گرفتار کر لے گی؟ کیا میرے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا؟ ابھی تو نیتا رام بھی زندہ ہے۔ اس سے انتقام لینا باقی ہے۔ اگر روپا اس وقت میری مدد کے لئے آ جائے تو..... میرے دل میں امید کی کرن پیدا ہوئی، مگر میرا خیال خام تھا۔ روپا سے تو میں خود کہہ کر آیا تھا کہ وہ چلا جائے، میں ٹھکانے پر پہنچ جاؤں گا۔

اس تہ خانے میں کوئی ذی روح بھی نہیں تھا کہ میں، بلونت کے جسم سے نکل کر کسی اور جسم میں داخل ہو جاؤں۔ پولیس یقیناً اسی وقت تہ خانے میں اترتی جب اسے میری موت کا یقین ہو جاتا۔ وہ اوپر ہی سے مجھ پر جسم کے دہانے کھول دیتے۔

میرا دل بیٹھنے لگا اور میں نے سوچا، اے علیالیش! اے جن زاد! کیا اسی آدم زاد کے جسم میں تیری موت لکھی تھی؟

☆=====☆=====☆

چند لمبے مجھ پر حزن و ملال کی کیفیت طاری رہی۔ تہ خانے کا جائزہ لیتے ہوئے جیسے ہی میری نگاہ تجوری پر پڑی تھی، میں اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ پھر میں نے وہاں موجود کسی بھی شے کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں وہاں جس غرض سے آیا تھا، وہ پوری ہو چکی تھی تو پھر کسی اور طرف کیوں دیکھتا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ مجھے اب دولت کے حصول سے زیادہ اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔

”مجھے ہر قیمت پر اس تہ خانے سے نکلنا ہے۔“ میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ”میں کوئی آدم زاد نہیں کہ جی ہار بیٹھوں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر۔ اداسی کی دھند جیسے چھٹ گئی۔ میری نگاہ تیزی سے تہ خانے میں گھوم گئی۔ اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس تہ خانے سے فرار کی راہ نظر آ گئی تھی۔ تہ خانے کی ایک دیوار کے ساتھ مجھے تلے اوپر بوریاں رکھی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ بوریاں تہ خانے کی چھت تک جتنی ہوئی تھیں۔ میں لپک کر ان بھری ہوئی بوریوں تک جا پہنچا۔ بوریوں میں گیسوں بھرے ہوئے تھے۔ میں نے

کس طرح پہنچ گئی؟ تمہ خانے سے میں نے ہی لائین باہر نکالی تھی کہ دکان کا جائزہ لے کر وہاں سے فرار ہونے کی کوئی تدبیر سکوں۔

پولیس افسر سمیت تمام سپاہیوں کو میں نے دکان کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ فرار ہونے کے لئے مجھے بہر حال دکان کے سامنے سے گزرننا پڑتا۔ سو میں نے فی الحال یہ خطرہ مول نہیں لیا۔ ہاں تھوڑا سا آگے اور کھسک آیا۔ اب دکان کے اندر ہونے والی سرگرمی بھی میرے احاطہ نظر میں تھی۔

میں نے سیٹھ کو تمہ خانے کے راستے پر رکھے ہوئے ٹائل کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔
”ادھر کیا ہے؟“ پولیس افسر نے سوال کیا۔

”یہ..... یہی تہ..... تمہ خانے کا راستہ ہے۔“ سیٹھ نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔
چار بھری ہوئی رانٹلوں کے ساتھ جن کی ٹائیں تمہ خانے کے راستے پر جھکی ہوئی تھیں، پولیس والوں نے ٹائل کو اس کی جگہ سے ہٹایا۔

”بیچھے ہٹ جاؤ۔“ پولیس افسر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”وہ اندر سے گولی بھی چلا سکتا ہے۔“

”جج..... جی ہاں صاحب.....! وہ..... اس کے پاس ریوالور ہے۔“ مارواڑی سیٹھ نے تصدیق کی۔

سپاہی بیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سبھی کے چروں پر مجھے تناؤ نظر آ رہا تھا۔
معاذ مجھے پولیس افسر کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ اپنی دانست میں گویا مجھ سے ہمکلام تھا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ! تم گھر چکے ہو اس لئے ہتھیار پھینک دو۔“

ظاہر ہے اس کی آواز کا جواب کون دیتا۔ میں تو تمہ خانے میں تھا نہیں۔
”ہم دکان کو آگ لگا رہے ہیں۔“ پولیس افسر کی آواز پھر گونجی۔ ”بلونت سنگھ! تم اس طرح زندہ

جل جاؤ گے ورنہ تمہ خانے سے باہر آ جاؤ۔“

”نن..... نہیں صاحب! ایسا نہ کرنا..... مم..... میری دکان میں آگ نہ لگائیں۔“
مارواڑی سیٹھ جلدی سے بولا۔ ”میری ساری رقم اس طرح بھسم ہو جائے گی۔“

جواب میں پولیس افسر نے سیٹھ کو گھور کر دیکھا، پھر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سیٹھ ہزاری مل غالباً سمجھ گیا کہ پولیس افسر نے محض دھمکی دی تھی۔ اس کا ارادہ واقعی دکان کو آگ لگانے کا نہیں تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ تمہ خانے میں اتر سکے۔ انہیں غالباً یقین تھا کہ ان میں سے جس نے بھی پیل کی اس کی زندگی ختم ہو جائے لازمی ہے۔ میری نظر پولیس افسر کے چہرے پر تھی۔ اس کے چہرے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گرفتار کرنا کوئی آسان کام نہیں اور یہ کہ میں اس کی دھمکی میں آ کر تمہ خانے سے نہیں نکلوں گا۔

پولیس افسر نے آخر کار اس مسئلے کا ایک حل سوچ ہی لیا۔ مجھے اس کی دھیمی آواز سنائی دی۔ اس

نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”تم لوگ بہ یک وقت چاروں رانٹلیں تمہ خانے میں ڈال کر ٹریگر دبا دو۔“ یہ حکم اس نے قریب کھڑے چار مسلح سپاہیوں کو دیا تھا۔

حکم کی تعمیل میں سپاہیوں نے دیر نہیں کی۔ چاروں رانٹلیں ایک ساتھ گرج اٹھیں۔ رانٹلوں کے دھماکوں سے دکان کی دیواریں جیسے ہل گئیں لیکن تمہ خانے کے اندر بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسی وقت کسی سپاہی کی نظر دکان کی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ دھماکوں کی وجہ سے سینٹ کی چادر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر اس کے اوپر گرا تھا۔ پولیس افسر نے بھی سپاہی کی نظروں کا تعاقب کیا اور تقریباً اچھل پڑا۔ چھت میں اسے سوراخ نظر آ گیا تھا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ یقیناً فرار ہو چکا ہے۔ وہ تمہ خانے میں نہیں ہو سکتا۔“ پولیس افسر بولا۔
”مم..... مگر کس..... کس طرح صاحب؟ میں..... میں تو اسے تمہ خانے..... پھر

چھت..... دکان کی چھت کس نے توڑی.....؟ اور..... اور یہ لائین..... یہ بھی تو.....“

”چپ رہو!“ پولیس افسر نے اسے ڈانٹ دیا۔ اسے غالباً میرے فرار کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ اسی لئے بے دھڑک آگے بڑھا اور تمہ خانے کے راستے کے قریب بیٹھ کر اندر مارچ کی روشنی ڈالی۔ ظاہر ہے اسے وہاں بوریاں رکھی نظر آ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”بلونت سنگھ نے انہی بوریوں پر چڑھ کر تمہ خانے کا بھاری ٹائل اٹھایا ہو گا اور پھر پولیس کی توجہ اسی طرف رکھنے کے لئے تمہ خانے سے نکل کر دوبارہ ٹائل پیس رکھ دیا ہو گا۔“

پولیس افسر نے غلط نہیں کہا۔ میں نے پولیس کو الجھانے کے لئے ہی ایسا کیا تھا۔ سارا معاملہ ہو چکا تھا اس لئے پولیس کو وہاں سے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اپنی حفاظت کی خاطر مارواڑی سیٹھ نے پولیس افسر سے درخواست کر کے دو مسلح سپاہیوں کو روک لیا تھا۔ دکان بند کر کے وہ بھی سپاہیوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے بہر حال اس عیار سیٹھ سے انتقام لینا تھا جس نے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ غاروں کا رخ کرنے کے بجائے میں ایک بار پھر اس غرض سے سیٹھ کے کارخانے کی طرف چل دیا۔ روٹی بہت جلدی آگ پکڑتی ہے اس لئے مجھے کارخانے کو آگ لگانے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔

سارا گاؤں برب سیٹھ کا جتنا ہوا کارخانہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا تھا تو میں تیزی کے ساتھ غاروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں جب غاروں میں پہنچا تو اپنے سبھی ساتھیوں کو مضطرب دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی روپا کہنے لگا۔ ”ہم تو ڈر رہے تھے تاہم کہ آپ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“ روپا اس وقت ٹوٹ گئی تھی۔ یہ وہ رقم تھی جو سیٹھ کے کارخانے سے لوٹی گئی تھی۔

”لو یہ بھی گنو!“ میں نے تجوری سے نکالی جانے والی تھیلیاں بھی چادر کھول کر سامنے رکھ دیں۔ انہی کے ساتھ سونے چاندی کے زیورات بھی تھے۔

ڈاکے میں ہاتھ آنے والا مال دیکھ کر سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کسی ڈاکے میں ایسا مال ہاتھ نہیں آیا تھا۔

”تایا! مارواڑی سیٹھ تو ہمارے اندازے سے زیادہ مالدار نکلا۔“ روپا بولا۔

”اتنا بہت سارا مال سمیٹ کر لانے میں دیر تو ہونا ہی تھی روپا! تم خواہ مخواہ فکر کر رہے تھے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کو وہ بزدل مارواڑی بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔“ موتی نے کہا۔

”ایسی بات نہیں موتی!“ میں بول اٹھا۔ ”معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ میں بمشکل جا رہا تھا کہ وہاں سے نکلا ہوں۔ وہ مارواڑی سیٹھ پکا حرامی نکلا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ وہ مجھے دکان کے تر خانے میں بند کر کے پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا تھا؟“

”کیا؟“ کئی حیرت زدہ آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

جو کچھ مجھ پر گزری تھی، میں نے بیان کر دی اور آخر میں بتایا۔ ”وہ تو اچھا ہوا کہ تمہ خانے میں گندم کی بوریاں موجود تھیں۔ انہی بوریوں کی مدد سے میں چھت تک پہنچ سکا ورنہ مال تو مال تم لوگوں میری لاش تک نہ مل پاتی۔“ میرے ان الفاظ کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔

”اگر تایا کو کچھ ہو جاتا تو.....“ روپا کی بیزباہٹ نے اس سانے کو توڑ دیا۔ ”میں اس مارواڑی سیٹھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس کہنے کی یہ ہمت۔“

”اس سے میں نے بھی انتقام لے لیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں اس کے کارخانے کو آگ آیا ہوں۔“ میں نے کہا، پھر روپا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم سچ کہتے تھے روپا! مجھ پر دو بڑی آفتیں ہیں۔ ان میں سے ایک آفت آج آکر گزر گئی۔“

”سب ٹھیک ہے، مگر میں اب آپ کو ایسے کسی کام کے لئے اکیلے نہیں جانے دوں گا۔“ یہ کہہ کر روپا کی آواز بھرا گئی۔

”تم علم جیوتش پر یقین رکھنے کے باوجود ایسی باتیں کرتے ہو۔“ میں ہنس دیا۔ ”جو قسمت میں آ رہا ہے، وہ ضرور ہو گا، چاہے ہم ایک ساتھ ہوں یا الگ۔“ پھر میں بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب بھوانی دیوی کی نظر سیدھی ہونے کی وجہ سے ہوا ہے کہ میری جان بچ گئی۔ ہم صبح درشن کے لئے جا رہے تھے۔“

”اور کل رات تلسی رام کے بھتیجے جیٹھارام کو بھی ٹھکانے لگانا ہے تایا!“ روپا کے لہجے میں شدت تھی۔ ”وہ ہماری اطلاع حاصل کرنے تیواڑی کے گھر آئے گا۔“

اس گفتگو کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں، چنبل کے الجھا دینے والے غاروں کی گہرائی میں گیا۔

☆=====☆

روپا ضد کر کے اکیلا چلا تو گیا تھا، لیکن میں اس کی طرف سے فکر مند تھا۔ مجھے علم تھا کہ کوئی خبر دولت کی خاطر دہرا کھیل بھی سکتا ہے۔ تیواڑی ہمارا خبر تھا۔ جیٹھارام نے اسے دولت کا لالچ دیا تو

یہ بھی اطلاع مل گئی تھی کہ جیٹھارام نے انگریز کیپٹن شرمن سے کیا بات کی ہے۔ اب پولیس کے ٹکے میں بھی میرے خبر موجود تھے۔

جیٹھارام نے کیپٹن شرمن سے کہا تھا، آپ نے ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے چنبل کے غاروں میں تین پٹنیں اتاری ہیں، مگر میں ایسی اطلاع لاؤں گا کہ آپ اپنے ہمراہ صرف سو پچاس پولیس والے لے کر ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کر لیں گے، پھر دیکھیں گا، ٹھاکر بلونت سنگھ کے ساتھ ہی اس کا پورا گروہ ختم ہوتا ہے یا نہیں۔ صاحب، جو کام آپ کی دھمکی سے نہیں ہو سکتے، وہ میرے روپے کی طاقت سے ہو جاتے ہیں۔

”آپریشن ٹھاکر بلونت سنگھ“ کا انچارج انگریز کیپٹن شرمن ہی تھا۔ اطلاع کے مطابق آج رات جیٹھارام، تیواڑی سے ملنے کے لئے آنے والا تھا۔ روپا کو گئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا سردار، کہاں جا رہے ہیں؟“ موتی پوچھ بیٹھا۔

میں کسی پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ روپا کی طرف سے فکر و تشویش میں مبتلا ہوں اسی لئے موتی کو جواب دیا۔ ”میں ذرا پولیس کی خیر خبر لینے جا رہا ہوں کہ اس نے ہم سے کتنی دور پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ میں جلد ہی روپا کی واپسی سے پہلے لوٹ آؤں گا۔“

”اگر سردار کا حکم ہو تو میں اس کام کے لئے چلا جاؤں؟ ہمارے ہوتے آپ کو.....“

”نہیں!“ میں نے موتی کی بات کاٹ دی۔ ”میں خود جاؤں گا۔“

میرا لہجہ فیصلہ کن تھا اس لئے موتی پھر کچھ نہیں بولا۔

اس کے بعد میں، چنبل کے کنارے دار خوفناک غاروں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اندھیرے میں وہ غار اور بھی خوفناک نظر آنے لگتے تھے، اتنے بھیانک اور ہیبت ناک کہ کمزور دل کا کوئی آدمی اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ غاروں کے ارد گرد رہنے والے بھی اندھیرا ہونے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ مجھے ان غاروں کے بھیانک پن کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں کوئی آدم زاد تو تھا نہیں کہ ڈر جاتا۔ میرے ساتھی بھی اب یہاں رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ غار اس قدر تنگ در تنگ تھے کہ ان میں دن کے وقت بھی پولیس پٹنیں راستہ بھول جاتی تھیں۔ ہم لوگ اندھیرے کے باوجود ان میں اپنا راستہ ڈھونڈ لیتے تھے۔

تیواڑی کی سکونت انہی غاروں کے قریب ایک بستی میں تھی۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تیواڑی کے گھر کے قریب ہی ایک جگہ چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں مجھے روپا چھپا ہوا نظر آ گیا۔ میری آنکھیں بڑی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ روپا کی وہاں موجودگی کی ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی جیٹھارام نہیں آیا۔ بڑے سے ایک پتھر کی آڑ لے کر میں بھی تیواڑی کے گھر کے قریب جا بیٹھا۔ روپا کی نسبت میں، تیواڑی کے گھر سے زیادہ قریب تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر ضرورت ہوگی تو مداخلت کروں گا ورنہ نہیں۔ اس طرح میری غیر ضروری مداخلت سے روپا کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تیواڑی اکیلا ہی رہتا ہے۔ میں

جاتے دیکھا۔

توقع کے مطابق تین مرتبہ ہلکی دستک سنائی دی، پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

”اب تو اچھی طرح دیکھ بھال کر آئے ہو تیواڑی!“ جیٹھا رام کی آواز دور سے آئی۔

”جیٹھا رام! میں‘ تیواڑی نہیں تیری موت ہوں۔“ میں نے روپا کی غراہٹ سنی۔

تیواڑی کو میں نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے گھر کے دروازے کی طرف آتے دیکھا تو سٹ کر بیٹھ گیا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کندھی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے دروازہ کھلا ہی

رہنے دیا تھا۔ مجھے اسی لئے گھر کے اندر بیرونی کمرے کا منظر واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ جیٹھا رام کے

منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ روپا نے اس کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا تھا۔

”اس کے ہاتھ سے روپوں کی تھیلی لے لو تیواڑی!“ روپا نے تیواڑی کو مخاطب کیا۔

تیواڑی نے تھیلی حکم میں دیر نہیں کی۔ پھر روپا نے ایک ہاتھ سے جیٹھا رام کا گریبان پکڑا اور

دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن میں پڑی ہوئی سونے کی بھاری زنجیر کھینچ لی۔

”لے تیواڑی! یہ بھی رکھ لے۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے، وہ بھی اتار لے۔“

روپا کے اس حکم پر بھی عمل کرنے میں تیواڑی نے جلد بازی سے کام لیا۔ جیٹھا رام کے چہرے سے

خوف و دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ چکا تھا کہ داؤ الٹا ہو گیا ہے۔

”چلو! تمہیں ٹھاکر بلونت سنگھ کا پتا چاہئے، میں بتاتا ہوں۔“ روپا نے کہہ کر جیٹھا رام کو دروازے کی

طرف گھینے لگا۔ جیٹھا رام دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا معافی مانگنے لگا، مگر روپا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس

نے تیواڑی کو مخاطب کیا۔ ”تیواڑی! تمہاری وفاداری کا انعام تمہیں مل گیا ہے، اب میں اسے لے جا رہا

ہوں۔“

جیٹھا رام کو روپا گھینتا ہوا مکان سے باہر نکال لایا۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس اندھیرے میں

روپا کا رخ چنبل کے کٹاؤ دار غاروں کی طرف تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ ان دونوں کا تعاقب کرتا رہا۔

روپا اب جیٹھا رام کو ساتھ لے چنبل کے کٹاؤ میں داخل ہو چکا تھا۔ جیٹھا رام خوف کے سبب شاید بار بار

رک جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یقیناً موت ناچ رہی ہو گی۔ روپا اسے راکفل کی ٹال سے دھکا دے کر

آگے بڑھنے پر مجبور کرتا تھا اسی کے ساتھ روپا، تسلی رام کی سات پشتوں کو بھی گالیاں بکتا جاتا تھا۔

ایک بار چلتے چلتے اچانک جیٹھا رام کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ روپا کے قدموں پر گر گیا۔ اس نے روپا

کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا، مگر روپا نہیں پگھلا۔ اس کے برعکس میں نے اس کا وحشیانہ قہقہہ سنا جس سے

غار گونج اٹھے۔

”سن جیٹھا رام! تیری موت کی گھڑیاں ہمارے غاروں میں قہقہے لگا رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر روپا نے

پہلے جیٹھا رام کے منہ پر براہ کپڑا کھولا، پھر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بھی نکال کر پھینک دیا۔ ظاہر ہے کہ اب

اسے جیٹھا رام کے چیختے چلانے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

گھر کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ معاً میں نے ایک سائے کو اس طرف بڑھنے دیکھا، مگر یہ روپا ہرگز نہیں تھا۔

”وہ سایہ! ادھر ادھر چوکنا انداز میں دیکھتا ہوا گھر کے دروازے پر آکر رک گیا۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے زنجیر ہلائی۔

”کھول رہا ہوں۔“ گھر کے اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ میں پہچان گیا۔ یہ آواز میرے بچر تیواڑی ہی کی تھی۔

پھر چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا تیواڑی ہی تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔ مجھے تیواڑی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ جیٹھا رام گھر میں داخل ہو گیا۔ تیواڑی نے

گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

”باہر تو بڑی سردی ہے۔“ یہ آواز تیواڑی کی نہیں، آنے والے کی تھی جو یقیناً جیٹھا رام تھا۔

”پورے سوا سو روپے ہیں اس تھیلی میں، مگن لو۔“ میں نے روپوں کی جھنکار سنی۔

”جیٹھا رام! تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ تیواڑی نے پوچھا۔

”ارے نہیں، اسی لئے تو میں نے کبل اوڑھ لیا تھا۔ بھلا میں کوئی ایسا کام کس طرح کر سکتا ہوں کہ تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔“ جیٹھا رام نے جواب دیا، پھر جلدی سے بولا۔ ”اب جلدی سے کام کی بات کرو۔ دیکھو یہ نقد روپے..... تمہیں بھی ایسی ہی کھری اطلاع دینی ہے جیسے کھرے یہ روپے ہیں۔

کام پورا ہونے کے بعد نیتا رام سے کہہ کر تمہیں اور بخشش دلوادوں گا..... ارے تم بار بار دروازے کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟“

”جیٹھا رام! مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کسی نے تمہیں آتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو۔ میرے سوا اس گاؤں میں ٹھاکر بلونت سنگھ کے دوسرے بچر بھی ہو سکتے ہیں۔ میں باہر چکر لگا کر دیکھ کر آتا ہوں کہ کہیں

کوئی آس پاس چھپا ہوا ہماری گفتگو تو نہیں سن رہا۔“ پھر قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ تیواڑی یقیناً دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ تیواڑی گھر سے نکل کر کدھر جائے گا۔ منصوبے کے مطابق

اسے روپا کو اطلاع دینا تھی کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ چند لمحوں بعد تیواڑی کی آواز پھر آئی۔ وہ یقیناً جیٹھا رام سے مخاطب تھا۔ ”دیکھنا، میں باہر سے دروازہ بند کر کے جاؤں گا اور واپسی میں عقبی دروازے

سے آؤں گا..... اور ہاں سنو۔ میں تین مرتبہ عقبی دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دوں گا۔ یہ دستک سن کر ہی تم دروازہ کھولنا دہ نہ نہیں۔“

”اچھا اچھا جلدی کر۔“ جیٹھا رام کی آواز سے بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”خواہ مخواہ سردی میں خوار ہونے باہر جا رہا ہے۔“

تیواڑی گھر سے باہر آ گیا اور اس نے زنجیر لگا دی۔ میں نے اسے گھر کے قریب ہی اس چھوٹے سے ٹیلے کی طرف جاتے دیکھا جس کی آڑ میں روپا چھپا ہوا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر کے بعد مجھے روپا ٹیلے کی آڑ

سے نکل کر تیواڑی کے گھر کی طرف دبے قدموں جاتا دکھائی دیا۔ اسے میں نے گھر کی عقبی سمت میں

”روپ نرائن!.....! مم..... مجھے معاف کر دے۔ میں اور تو دونوں برہمن ہیں۔“ جیٹھارام گڑگڑانے لگا۔

اس کی بات کے جواب میں روپا نے اس کے کھلے ہوئے منہ میں راکفل کی نال ڈال دی۔
”بے وقوف! تجھے اب یاد آیا ہے کہ میں برہمن ہوں۔ میرے بے گناہ بچا کے قتل کے وقت تو یہ بات بھول گیا تھا۔“ روپا گرجا۔

راکفل کی نال سے بچنے کے لئے جیٹھارام زمین پر چت لیٹ گیا۔ وہ بے بسی سے زمین پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور بری طرح رو رہا تھا۔

روپا نے اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر اسے انتہائی غضب ناک آواز میں مخاطب کیا۔ ”بزدل! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تجھے مارنے کے لئے راکفل استعمال نہیں کروں گا۔ تجھ پر میں اپنا ایک قیمتی کارتوس ضائع نہیں کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے روپا نے اپنے پہلو سے خنجر کھینچ لیا۔ راکفل کو اس نے شانے پر ڈال لیا تھا۔ جیٹھارام کے سینے پر اس کا پیر تھا اور ہاتھ میں خنجر۔ جیٹھارام ساکت ہو گیا۔ موت کے سامنے آدمی کتنا رحم طلب اور لاچار بن جاتا ہے۔ روپا ایک بار پھر جیٹھارام سے مخاطب ہوا۔ ”تو جتنا چیخے گا اتنا ہی عذاب برداشت کرنا پڑے گا۔“ جملہ ختم ہوتے ہی روپا نے ایک دم جھک کر جیٹھارام پر خنجر کا وار کیا۔

روپا کے جسم میں جیسے اس وقت کسی درندے کی روح حلول کر گئی تھی۔ اس نے خنجر کی نوک سے جیٹھارام کی دونوں آنکھیں نکال لیں، پھر زبان کاٹ دی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت روپا کی آنکھوں میں لازماً اپنے بچا مراد کی لاش گھوم رہی ہو گی۔ غالباً اسی جنون میں وہ جیٹھارام کی کرب ناک چیخیں سن کر بھی جیسے برا ہو گیا تھا۔

جب جیٹھارام کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا تو روپا بالکل پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ میں نے اب وہاں مزید رکنا مناسب نہیں سمجھا اور غاروں کی بھول بھلیوں میں اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ گیا۔ روپا سے پہلے میں وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی اس کوشش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ میرے بچنے کے کچھ ہی دیر بعد روپا، جیٹھارام کی لاش اٹھائے ہوئے آگیا۔ اس کی حالت قابل دید تھی۔ بھیا نک چرے اور خون میں لتھڑے ہوئے لباس میں روپا انتہائی خوفناک نظر آ رہا تھا۔

”بیچے تپا، تپسی رام کے کہنے کا ایک آدمی کم ہو گیا۔“ روپا نے جیٹھارام کی لاش میرے سامنے ڈال دی۔ ”اس کی بگڑی ہوئی لاش دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کریں گے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ سے دشمنی رکھنے والوں کا انجام ایسا ہوتا ہے۔“

جیٹھارام کے قتل پر میں خوش تھا، لیکن یہ بھی سوچ رہا تھا کہ روپا کو اس قتل کے سلسلے میں اس قدر وحشت و بربریت کا ثبوت نہیں دینا چاہئے تھا۔

”اچھا ہوا۔“ میں نے روپا کی پشت پر تھکی دی۔ ”چلو اب ہمیں یہاں سے فرار ہونا ہے۔ پولیس ہمیں ہر طرف سے گھیر رہی ہے۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے، یعنی کھیزا راٹھور کا راستہ۔“

”تپا! اطلاع کس نے دی؟“ روپا نے سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

روپا اس سے قبل بھی کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہمیں خبروں پر مکمل اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی مخبر پولیس سے مل جائے یا اسے پولیس گرفتار کر لے اور اس طرح ہمارا ہی مخبر ہمیں ہنسوا دے۔ اسی خیال سے غالباً اس نے مجھ سے اطلاع فراہم کرنے والے بارے میں پوچھا تھا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ گیا روپا! میں نے جواب دیا۔“ ہم نے چار جگہ سے اس خبر کی تصدیق کر لی ہے۔ ہمیں تین طرف سے گھیرا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ یہ گھیراؤ تنگ ہو رہا ہے۔ ہم اس وقت اس جگہ سے صرف دس پندرہ میل دور ہیں جہاں پولیس نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔“

”لیکن تپا! آپ اس بات پر بھی غور کریں کہ پولیس نے صرف کھیزا راٹھور کی طرف ہمارا راستہ کیوں خالی چھوڑ دیا ہے؟“ روپا نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

موتی کو روپا کا یہ سوال اہم معلوم ہوا، وہ بھی کہنے لگا۔ ”ہاں ٹھاکر! یہ بات سوچنے والی ہے۔“
”مجھے بھی پہلے اس بات پر شک ہوا تھا۔“ میں بولا۔ ”پھر مجھے خیال آیا، کیپٹن شرمن نے یہ سوچا ہو گا کہ ہم کھیزا راٹھور جانے کی ہمت ہی نہیں کریں گے۔ اس نے اسی لئے تین طرف سے ہم پر پڑاؤ ڈالنا کافی سمجھا ہو گا۔“ یہ کہہ کر میں سوالیہ نظروں سے روپا کی طرف دیکھنے لگا۔

”ممکن ہے تپا کہ جو آپ نے سوچا ہے، ٹھیک ہو۔“ روپا کی آواز سے اب بھی شک کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”پھر بھی ہمیں انتہائی ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔ کیپٹن شرمن برا فریبی انگریز ہے۔“

اس گفتگو کے بعد بقیہ تمام رات میں اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھتا رہا۔ پولیس کے پڑاؤ سے میں حتی الامکان دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ہم نے کہیں بھی زیادہ دیر ٹھہر کر آرام نہ کیا۔ کیونکہ یہ آرام کا وقت نہیں تھا۔ جب تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا، میں اس سے پورا فائدہ اٹھا کر ممکن حد تک راستے طے کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنے گروہ کو چار حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اپنے تعاقب میں آنے والی پولیس پارٹی سے دور رہنے کے لئے میں بیچ در بیچ راستوں کا انتخاب کر رہا تھا۔

صبح کی گرم دھوپ جب زمین کے سینے سے لپٹنے لگی تو میں، روپا، موتی اور دوسرے چار ساتھی ایک گاؤں میں کنویں کے قریب رکے۔ پنہاریوں نے ہماری طرف دیکھا، لیکن خوفزدہ نہ ہوئیں۔ شاید وہ ہمیں مسلح دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ ہمارا تعلق کس گروہ سے ہو سکتا ہے۔ خواتین کو مجھ سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے جب سے یہ راہ اختیار کی تھی، یعنی ڈاکو بنا تھا، خواتین کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی تھی۔ عورتوں کی طرف میں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

پنہاریاں کنویں کے پاس سے ایک طرف ہٹ گئیں۔ میرے ساتھیوں نے کنویں سے پانی کھینچا۔ سب نے منہ ہاتھ دھوئے، پانی پیا اور آگے بڑھ گئے۔ ہمارا رویہ مسافروں جیسا بے ضرر تھا۔ ابھی ہم تقریباً چالیس پچاس قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ مجھے موتی کا خیال آیا۔ میں نے روپا کو مخاطب کیا۔ ”روپا! موتی کہاں ہے؟“

میرے اس سوال پر سب رک گئے۔ روپا نے گھوم کر دیکھا اور کنویں کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید

آہا ہو گا کہ راستے میں پولیس نے اسے دیکھ لیا ہو گا۔ پولیس کے مجھے میں وہ ایک معمولی چیز سی تھا، لیکن ایسے معمولی لوگ میرے لئے بہت اہم تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہی رگھویر کی آنکھوں کے پونٹوں میں حرکت ہوئی اور میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں اور نظر میرے چہرے پر پڑی تو ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے ہونٹ کھولے۔ ”بلونت سنگھ باپو! ہم..... میں آخر تم..... تم لوگوں تک پہنچ ہی گیا اور.....“ اس کا جملہ ادھورہ رہ گیا اور وہ کراہنے لگا۔ پھر اس نے ہمت کر کے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ”کھیزا راٹھور میں کیپٹن شرمین تمہارے لئے جال بچھائے بیٹھا ہے۔ وہ آج رات تم لوگوں پر حملہ کرنے والا ہے۔“

”لیکن تمہیں گولی کس نے ماری؟“ میں بول اٹھا۔ مجھے اس شخص کی وفاداری نے بہت متاثر کیا تھا۔

”باپو! میں چھپ کر تمہیں خبر دینے آ رہا تھا کہ کیپٹن شرمین کے ایک سپاہی نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے رکنے کے لئے لاکارا۔ میں اس لئے نہیں رکا کہ جواب طلبی پر کیا کرتا۔ مجھے تو اس وقت ڈیوٹی پر ہونا چاہئے تھا۔ یہی سوچ کر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ پر فائر جھونک مارا۔ گولی میری پنڈلی میں گھس گئی، پھر بھی میں بھاگتا رہا کیونکہ رکنے کا مطلب یقینی موت تھا۔ پھر میں کب بے ہوش ہو کر گر پڑا، مجھے یاد نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید اذیت میں مبتلا ہے۔ ”رگھویر!“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”تم نے میری جان بچائی ہے۔ میری زندگی کی خاطر تم نے اپنے بال بچوں کا خیال بھی نہیں کیا۔“

کچھ کہنے کے لئے رگھویر کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکل سکی۔ اس کے چہرے پر مجھے کرب کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ہوش کے لئے آنکھیں موند لیں۔

رگھویر کی وفاداری کا احسان اتارنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس نے جان دے کر مجھے کیپٹن شرمین کے جال میں پھنسنے سے بچالیا تھا۔

میرے ساتھیوں نے کچھ ہی دیر میں رگھویر کی ارتھی تیار کر دی۔ پھر اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی۔ میں جلتی ہوئی چتا کے سامنے اداس بیٹھا تھا۔

”تایا! چلے میاں سے واپس چلیں۔“ روپا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”رگھویر کی قربانی کام آگئی اور ہم عیار کیپٹن شرمین کے جال میں نہیں پھنسے۔“

”نہیں روپا! اب واپس نہیں چلتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے کیپٹن شرمین کا غرور خاک میں ملانا ہے۔ وہ ہمیں پھانسا چاہتا تھا تو ہم بھی اسے سبق دینے بغیر نہیں رہیں گے۔ جب تک میں رگھویر کے بدلے اس کے سات آٹھ آدمی ٹھنڈے نہیں کروں گا میری روح کو سکون نہیں ملے گا۔“

روپا نے سر جھکا لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں آگے بڑھ کر خطرے کو لاکارنا چاہتا ہوں۔

اس کی پیاس ابھی بجھی نہیں۔ اسی لئے ابھی تک وہ کنویں پر موجود ہے۔ ”روپا کے لمبے میں طنز کی چہرہ تھی۔ روپا کے کہنے پر میں نے مڑ کر دیکھا۔

میری نگاہیں جیسے ہی موتی پر پڑیں، خون کھول اٹھا۔ موتی ایک نوجوان پنہاری پر دست درازی کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنہاری کا دہن تھا، دوسرے ہاتھ سے پنہاری کا بازو تھام رکھا تھا اور اسے ایک طرف کھینچ رہا تھا۔ پنہاری کا پورا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔

میں نے کچھ کہے بغیر اپنے شانے سے رائفل اتاری اور اس کا رخ موتی کی طرف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے خوفناک دھماکہ ہوا اور موتی چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ پنہاری کے سر سے مٹکا گر گیا۔ رائفل کو دوبارہ اپنے شانے پر ڈال کر میں اس طرح آگے بڑھا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ میرے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر موتی کی لاش دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ میں نے نشانہ لے کر فائر کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ موتی کے دل میں گولی اتر جانے کے بعد اس کا زندہ بچنا ممکن نہیں تھا۔

”کھیا ٹھیک کتا تھا۔ موتی جب بھی باہر جاتا تھا، اس کی ہوس بے قابو ہو جاتی تھی۔“ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد میں بولا۔ ”مجھے تو موتی پر پہلے ہی شک تھا، مگر آج یقین ہو گیا۔ وہ یقیناً ہم میں سے نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے اسے گردہ سے الگ کر دیا۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

دوسرے وقت سارا گردہ کھیزا راٹھور گاؤں سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر رک گیا۔ ”اب کچھ دیر آرام کر لو۔“ میں نے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”وہ آدمی آگے جا کر دیکھ کر آئیں کہ کوئی خطرہ تو نہیں، پھر شام کو آگے بڑھیں گے۔“

گشت پر گئے ہوئے لوگ تقریباً ایک گھنٹے میں واپس آئے۔ ان دونوں کو دور ہی سے دیکھ کر میں ہوشیار ہو گیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کی خبر دے رہی تھی۔ وہ دونوں کسی تیسرے شخص کو اٹھ کر لا رہے تھے۔ فاصلے کے سبب میں تیسرے شخص کو نہ پہچان سکا۔

”ارے یہ تو اپنا رگھویر معلوم ہوتا ہے۔“ ان دونوں کے کچھ اور قریب آنے پر روپا بول اٹھا۔ جب وہ دونوں قریب آگئے تو روپا نے ان سے سوال کیا۔ ”اس کا پیر زخمی ہے، مگر یہ تمہیں کہاں ملا؟“

”میاں سے کوئی دو میل دور یہ بے ہوش پڑا تھا۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”ہم اسے پہچان گئے تو یہاں اٹھا لائے۔“

”جلدی کرو، اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارو۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔“ میں نے حکم دیا۔

پھر میں نے رگھویر کے زخمی پیر کا معائنہ کیا۔ اس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی۔ زخم دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ خون کافی بہہ چکا ہے۔

روپا نے اپنے خنجر کی نوک زخم میں ڈال کر گولی نکالی۔ میری نظرس رگھویر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے رگھویر کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ کیونکہ وہ میرا خنجر تھا۔ وہ یقیناً کوئی اہم اطلاع مجھ تک پہنچائے گا، مجھے یقین تھا۔ رگھویر، پولیس کے محلے میں ملازم تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کوئی خاص خبر لے کر

☆=====☆

”تایا! تمہارا خیال درست ثابت ہوا۔“ روپا کی آواز سنائی دی۔ ”وہ کشتیوں کے ذریعے دریا پار کر کے ادھر آ رہے ہیں۔“ روپا کی آواز میں جوش تھا اور خوشی بھی۔ ”وہ دو کشتیوں پر سوار ہیں۔ اندازے کے مطابق دونوں کشتیوں میں بیس پچیس پولیس والے ہوں گے۔“

”بس تو اب انہیں سبق دینے کا وقت آ گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”روپا! تم میرے بازو پر رہو، میں درمیان میں رہوں گا۔ سنو، گولی پہلے میں چلاؤں گا۔ جیسے ہی میری طرف سے فائر ہو تینوں جانب سے فائرنگ شروع ہو جانی چاہئے۔“

میں تین دن سے اس موقع کا منتظر تھا۔ ڈاکوؤں کا یہ اصول تھا کہ پولیس کے بارے میں خبر ہوتے ہی وہ فرار ہو جاتے تھے۔ ڈاکو کبھی خود اس کی کوشش نہیں کرتے کہ پولیس سے معرکہ آرائی ہو۔ یہی اصول میرا بھی تھا۔ میں بھی ہر ممکن طور پر پولیس سے نہ لڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معرکہ آرائی کی صورت میں کارٹوس بہت ضائع ہوتے ہیں جو ڈاکوؤں کے لئے بہت قیمتی ہوتے ہیں، لیکن اس رات مجھے جوش آ گیا تھا۔ کیپٹن شرمن کو میں ایسا سبق دینا چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے۔ رگھویر کی موت نے مجھے غیرت دلا دی تھی۔ اس کی خبر صحیح ثابت ہوئی تھی۔ پولیس مجھے پھانسنے کے لئے اندھیرے کا انتظار کر رہی تھی۔

اگر خبر نہ ملتی تو کیا ہوتا؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے کنارے کے کٹاؤ میں کھڑے ہو کر اپنی راکفل کا ٹریگر دبا دیا۔ قریب ہونے والی کشتیوں پر میری نظر جمی ہوئی تھی۔ مجھ سے تقریباً پانچ گز دور روپا چند ساتھیوں کے درمیان کشتیوں کا نشانہ لئے بیٹھا تھا۔ وہ تو پولیس کا نام سن کر ہی غضب ناک ہو جاتا تھا، مگر آج وہ پولیس والوں کو سامنے دیکھ کر بھی اب تک خاموش رہا تھا کیونکہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے فائر ہی کا منتظر تھا۔ میں نے اس وقت فائر کیا تھا جب دونوں کشتیاں دریا کے نیچوں بیچ پہنچ چکی تھیں۔ میرے فائر کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ میرا فائر خالی گیا مگر مجھے محسوس ہو گیا کہ اچانک فائر سے پولیس والے گھبرا گئے ہیں۔

معاً میں نے ایک کشتی میں روشنی دیکھی۔ روشنی کی وہ لکیر اندھیرے کو چیرتی ہوئی کنارے پر پڑی۔ مجھے میرا ہدف مل گیا اور اس مرتبہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ کشتی ایک بار پھر اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میں نے کشتی کو ہتھکولے کھاتے دیکھا۔ اسی لمحے سامنے سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ کشتی سے ایک چیخ بلند ہوئی اور زوردار جھپکا ہوا۔ یقیناً کوئی سپاہی گولی کھا کر دریا میں گرا تھا۔ جھپکے ہی کے ساتھ چیخ بھی سنائی دی تھی۔ چند ہی لمحوں میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

تین اطراف سے کشتیوں پر فائرنگ ہونے لگی اور پھر دونوں کشتیوں سے بھی کنارے کی جانب گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ دوسرے کنارے پر موجود پولیس والے غالباً کچھ نہ کچھ کر خاموشی سے راکفلیں تھامے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ یقیناً وہ الجھن کا شکار تھے۔ میں پہلے ہی ان کی نقل و حرکت دیکھ چکا تھا۔ وہ شاید کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

پولیس والوں کے مقابلے میں ہم محفوظ تھے۔ ہمیں اپنے جال میں پھنسانے کی بجائے خود پولیس والے ہمارے جال میں پھنس گئے تھے۔ رات کے اندھیرے کے باوجود کشتیوں کا نشانہ لینا آسان تھا، لیکن ہم پولیس والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ ہم کناروں کے کٹاؤ میں بالکل محفوظ تھے۔ پھر کنارے کی طرف سے یہ ایک وقت تین گولیاں چلیں۔ ان میں سے ایک گولی نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ یہ گولی میں نے چلائی تھی اور اس کا مقصد یہی تھا۔ دوسری گولی جو روپا نے چلائی تھی، ایک پولیس والے کی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی اور تیسری گولی نے بھی کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک پولیس والے کا سینہ چھید دیا۔ میں نے پے درپے دو چیخیں سنی تھیں۔

”پانی میں کود پڑو۔“ گھڑے ہوئے اردو لہجے میں ایک تیز آواز سنائی دی۔

یہ حکم دینے والا یقیناً انگریز کیپٹن شرمن تھا۔ لہجے سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ کیپٹن شرمن کے حکم سے پہلے ہی تقریباً دس گیارہ پولیس والے پانی میں کود چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جابیں بچانے کے لئے کیپٹن شرمن کے حکم کا انتظار نہیں کیا تھا۔

پھر پانی میں دھماکے ہونے لگے۔ روپا یہ موقع کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک کشتی سے کودتے ہوئے پولیس والے کو فضا ہی میں بھون دیا۔ لگتا تھا کہ کیپٹن شرمن کے سوا تمام پولیس والے حواس کھو بیٹھے تھے۔ کمر تک پانی میں کھڑے ہو کر کیپٹن شرمن نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔ روپا اس وقت تک کٹاؤ کی آڑ سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ اسے شاید یہ افسوس تھا کہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کیپٹن شرمن نظر نہیں آ رہا تھا۔ پولیس کو پسپا ہوتے دیکھ کر اس کا حوصلہ یقیناً بہت بڑھ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے سرکنا ہوا پانی کے قریب پہنچ گیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک تھی۔

”روپا! واپس آ جاؤ۔“ میں چیخ اٹھا۔ روپا کو خطرے میں دیکھ کر میری آواز بھرا سی گئی۔

میری آواز جیسے روپا نے سنی ہی نہیں۔ اس نے ایک اور فائر جھونک مارا۔ غالباً کیپٹن شرمن بھی زوراً یہ سمجھ گیا کہ کوئی کنارے پر آ کر گولی چلا رہا ہے۔ تقریباً دس پولیس والے واپس دوسرے کنارے کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک کشتی الٹ گئی تھی۔

”بھتی جلدی ممکن ہو کنارے پر کھڑی ہوئی کسی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔“ گبڑی ہوئی اردو میں اپنے باقی ماندہ سپاہیوں کو یہ حکم دینے والا بھی کیپٹن شرمن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ اب کنارے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ معلوم نہیں عیار انگریز کیا چاہتا تھا۔

سپاہی اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ کچھ دیر کو فائرنگ رک گئی۔ اسی وقت میں نے ایک بار پھر روپا کو پکارا۔ اس کی وجہ سے سارا کھیل بگڑا جا رہا تھا۔ وہ درمیان میں آ گیا تھا اس لئے میں یا میرے ساتھی سپاہیوں پر گولی چلانے سے قاصر تھے۔ کوئی بھی بھولی بھٹکی گولی روپا کو موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ میرے خیال میں روپا نے درمیان میں آ کر سخت حماقت کی تھی۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ روپا میرے کٹنے کے مطابق واپس نہیں ہو رہا تو مجبوراً مجھے بھی ایک خطرناک قدم اٹھانا پڑا۔ اس کے سوا اب میرے

لئے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

میں بھی کٹاؤ سے نکل کر سینے کے بل ریٹکتا ہوا روپا کے پاس پہنچ گیا۔ کیپٹن شرمن اور پولیس واسے اس وقت تک ایک کشتی میں سوار ہو چکے تھے۔ روپا ان کا نشانہ لے رہا تھا۔

”ٹھہر جاؤ۔“ میں نے روپا کو فاز کرنے سے روک دیا۔ ”پہلے یہ دیکھو وہ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“

”تایا! وہ اس طرح فرار ہونا چاہتے ہیں۔ وہ اور کیا کر سکتے ہیں۔“ روپا نے جواب دیا۔

روپا کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کشتی ان دونوں کی جانب بڑھنے لگی۔ روپا یہ دیکھ کر پھر گیا اور اس نے فاز کر دیا۔ سنسناتی ہوئی گولی کشتی کے اوپر سے گزر گئی۔ کیپٹن شرمن نے فاز کا جواب فوراً دیا۔ اب پولیس والوں پر بھی جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل فاز کر رہے تھے۔ ایک گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ مجبوراً میرے ساتھیوں نے پیچھے سے فازنگ شروع کر دی۔ تقریباً پانچ منٹ تک دونوں جانب سے فازنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ زخموں کی چیخیں ان دھماکوں میں دب گئیں۔

اس وقت تک دوسرے کنارے پر موجود پولیس والوں کو عقل آگئی تھی۔ انہوں نے بھی اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ گہرا اندھیرا اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی گولیاں ضائع ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود فازنگ جاری تھی۔

کیپٹن شرمن کی کشتی قریب آ رہی تھی۔ میں نے اس کشتی میں موجود کئی سپاہیوں کو زخمی کر دیا مگر پھر بھی کشتی آگے بڑھتی رہی۔ کشتی اور ہمارے درمیان میں پچیس گز کا فاصلہ تھا۔ اچانک کیپٹن شرمن کی تیز آواز سنائی دی۔ ”باہر کو پڑو۔“

میری سمجھ میں اب بھی نہ آیا کہ وہ عیار انگریز کیا چاہتا ہے۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ سرخ و سفید کتنا کیا کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں فوراً کٹاؤ میں پناہ لے لینا چاہئے۔ یقیناً وہ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔“ میں نے روپا سے کہا۔

”تایا! آپ کٹاؤ میں چھپ جائیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ روپا نے اس طرح جواب دیا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

کچھ دیر کے لئے رائفلیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک جانب اکٹھا کیا۔ دوسری جانب کیپٹن شرمن نے پولیس والوں کے ہمراہ ایک کشتی کی آڑ لے رکھی تھی۔ تھیں وہاں پر گھنٹوں گھنٹوں پانی تھا۔ کیپٹن شرمن نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”آہستہ آہستہ کشتی کو دھکیلے ہوئے آگے بڑھو۔ مخالف سمت سے کتنے ہی فاز کیوں نہ ہوں، کشتی رکتی نہیں چاہئے۔ جو بھی پیچھے ہٹا، اسے میں گولی مار دوں گا۔“ کیپٹن شرمن کو میں نے اس کے لمبے سے پچھانا۔

کیپٹن شرمن شاید کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔ کٹاؤ میں میرا پورا گردہ موجود تھا اور ان کے سامنے وہ دس بارہ پولیس والوں کو لے کر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ معاً میں نے دیکھا کہ وہ نے سپاہیوں پر فازنگ شروع کر دی، مگر اس کی کوشش لاعاصل ہی رہی۔ گولیاں کشتی سے ٹکرا کر بیکار ہو جاتی تھیں۔ میں نے بھی سپاہیوں پر فازنگ شروع کرادی۔ اس کے باوجود کیپٹن شرمن کی پیش قدمی نہ

رکی۔

یہ دیکھ کر میں گرجا۔ ”روپا! واپس آ جاؤ روپا!“

میں اب چونکا ہو چکا تھا۔ کیپٹن شرمن اپنی جان کی بازی لگا کر میرے سامنے آنا چاہتا تھا۔ معاً میری نگاہ اپنی کارٹوس کی پٹی پر گئی۔ پٹی میں اب صرف تین چار کارٹوس باقی تھے۔ کیپٹن شرمن اب سپاہیوں کے ہمراہ کنارے سے صرف دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت میں نے روپا کو بھی چونک کر پیچھے کی طرف سرکتے دیکھا۔ کٹاؤ تک پہنچنے کے لئے اسے تیس چالیس قدم پیچھے ہٹنا تھا۔ پھر بھی شاید اسے خیال تھا کہ وہ دشمن کی نظر میں نہ آ جائے اور دشمن اس پر حملہ نہ کر دے۔ وہ اسی لئے گھنٹوں کے بل آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اسے ابھی کٹاؤ تک پہنچنے کے لئے مزید دس قدم پیچھے ہٹنا تھا، مگر اس وقت تک کیپٹن شرمن اپنے سپاہیوں کے ہمراہ کنارے تک پہنچ چکا تھا۔

”صاحب! وہ بھاگ رہا ہے۔“ ایک سپاہی نے انگلی سے روپا کی طرف اشارہ کیا۔

یہ سنتے ہی کیپٹن شرمن نے ٹریگر دبا دیا۔ روپا ابھی کھڑا ہو کر کٹاؤ کی آڑ لینے ہی والا تھا کہ اسی لمحے گولی اس کی پنڈلی میں گھس گئی اور وہ الٹ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے دشمنوں پر جنم کے دہانے کھول دیئے۔ روپا کی طرف اشارہ کرنے والا چیخ کر دریا میں جاگرا۔ میں نے اس کے سینے کو نشانہ بنایا تھا۔ میری دوسری گولی کیپٹن شرمن کے شانے کو چیر کر نکل گئی۔ اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ دوسرے پولیس والے تیزی سے کنارے پر کھڑی دو تین کشتیوں کی آڑ میں چھپ گئے۔ خود کیپٹن شرمن زمین سے چپک کر بمشکل ریٹکتا ہوا ایک کشتی کی آڑ میں پہنچ سکا۔ اس کے بازو سے میں نے خون بہتے دیکھا تھا۔ اس نے زخمی بازو پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”فازنگ نہیں رکتی چاہئے، اپنی رائفلیں سنبھالو!“ کیپٹن شرمن نے اپنے سپاہیوں کو کراہتے ہوئے حکم دیا۔

مجھے اس وقت کیپٹن شرمن سے زیادہ روپا کی فکر تھی ورنہ شاید میری پٹی کا آخری کارٹوس عیار انگریز کو جنم میں پہنچا دیتا۔

”گولی کہاں لگی؟“ میں نے روپا کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔ سوال کرتے ہوئے میری آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”کوئی خاص زخم نہیں آیا۔ میری فکر نہ کریں، دشمنوں کی خبر لیں۔“ روپا یہ کہتے ہوئے بیٹھ کر اپنی رائفل لوڈ کرنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ روپا کی پنڈلی خون سے تر تھی۔ اپنے سر سے پگڑی کھول کر میں نے روپا کے زخم پر باندھ دی۔ کچھ ہی دیر میں پگڑی خون سے بھر گئی۔

”چلو بھاگ چلیں۔“ میں نے روپا کو سارا دے کر کھڑا کیا۔ دوسرے دو ساتھیوں نے بھی اسے سہارا دینا چاہتا۔

روپا نے ان دونوں کو دھکا دے کر الگ کیا اور کہنے لگا۔ ”نہیں تایا! وہ صرف پولیس کے دس آدمی

ہیں۔ انہیں ٹھکانے لگانا مشکل نہیں ہے۔“
”روپا!“ میری آواز میں سختی آگئی۔ ”میں کہہ رہا ہوں‘ فرار ہونا ہے اور تم ضد کر رہے ہو۔“ زیادہ خون بہ جانے کی صورت میں روپا کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی‘ یہ میں سمجھ چکا تھا۔

اس میں میرا حکم ٹالنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اسی لئے روپا کی آواز میں بولا۔ ”جو آپ کہیں گے وہی ہو گا۔ روپا آپ کا غلام ہے۔ ہم کیپٹن شرمن سے پھر کبھی نمٹ لیں گے۔“
اچانک کیپٹن شرمن نے فائزنگ رکوا دی۔ ”ڈاکوؤں کی طرف سے کوئی نقل و حرکت نہیں ہو رہی‘ رک جاؤ۔“ فرار ہوتے وقت میں نے کیپٹن شرمن کے آخری الفاظ سنے۔

اس خوفناک معرکے میں فرار ہوتے وقت میرے چار ساتھیوں کو پولیس والوں نے ایک قریبی گاؤں سے گرفتار کر لیا۔ یہ خبر سن کر مجھے تو بہت رنج ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کوئی بھی ساتھی اعتراف جرم نہیں کرے گا۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ پولیس‘ گرفتار ہونے والوں کو پریشان ضرور کرے گی‘ جھوٹے گواہ عدالت میں پیش کئے جائیں گے۔ میں نے بھی سوچ کر اپنے مجبور کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ اگر کوئی بھی شخص گواہی دینے یا میرے ساتھیوں کو شناخت کرنے جائے گا تو میں اس کے سارے خاندان کو ختم کر دوں گا۔

میری اس دھمکی کے بعد کس میں اتنی ہمت تھی جو مجھ سے دشمنی مول لے کر پولیس کا ساتھ دیتا۔

جلد ہی مجھے یہ اطلاعات بھی مل گئیں کہ پولیس نے لوگوں کو لالچ بھی دیا اور دھمکیاں بھی دیں کہ کوئی گواہی دینے کو تیار ہو جائے‘ لیکن کوئی بھی شخص‘ پولیس کی طرف سے عدالت میں قدم رکھنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ لوگ صاف کہہ دیتے کہ ہم سے کوئی بھی کام لے لیا جائے مگر ہم گواہی نہیں دے سکتے۔

کیپٹن شرمن اس صورت حال سے مایوس ہو گیا۔ مجبوراً اسے دو ماہ کے اندر میرے چاروں ساتھیوں کو رہا کر دینا پڑا۔ ہم نے پولیس کی بے بسی کا خوب مذاق اڑایا۔ لوگ اب کھلے عام کہتے پھرتے تھے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت سہی‘ مگر چنبل کا راجا تو ٹھاکر بلونت سنگھ ہے۔ اس پر مجھے عجب سا فخر محسوس ہوتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میرا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ پولیس سے میری معرکہ آرائیاں جاری رہیں۔

تیسری رام کے بیٹے نیتا رام کو قتل کرنے کے لئے میں ایک روز دن دیر ساڑھے کھیزا راتھور گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں کھیتوں پر کام کرنے والے چوکنا ہو گئے۔

”اگر کبھی نیتا رام نے کھیتوں کا سرخ کیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا؟“ میں نے کھلے عام گاؤں والوں کو دھمکی دی۔

نیتا رام پہلے ہی خوفزدہ ہو کر کہیں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تمام فصل میں آگ لگا دی۔ نیتا رام کی حویلی پر بھی میں نے حملہ کیا۔ وہ حویلی میں بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ اطلاع ملی کہ نیتا رام

نے گاؤں نہیں چھوڑا۔ مجھے یہ خبر بھی ملی کہ کیپٹن شرمن مجھ پر جال پھینکنے کے لئے کوئی نیا منصوبہ بنا رہا ہے‘ لیکن اس منصوبے کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

☆=====☆=====☆

وہ چاروں ایک نوجوان کو زد و کوب کرتے اور تقریباً کھینچتے ہوئے میرے سامنے لائے۔ نوجوان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”ٹھاکر! یہ نوجوان دو تین دن سے غاروں میں بھٹک رہا ہے۔ ہم نے اس سے سبب دریافت کیا تو یہ کہنے لگا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ کی تلاش میں ہے۔“ ان چاروں میں سے ایک شخص نے مجھے بتایا۔ ان چاروں کا تعلق میرے ہی گروہ سے تھا۔

”اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دو۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

اس نوجوان کے چہلے اور لباس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ روپا مشتہ اور تیز نظروں سے اس نوجوان کو گھور رہا تھا۔ آنکھوں سے پٹی کھولے جانے کے بعد بھی کچھ دیر نوجوان کی آنکھیں بند رہیں۔ غالباً اس کا سبب روشنی تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول ہی دیں۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو احسوس کی طرح دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں وہاں موجود تمام افراد پر سے گزر کر میرے چہرے پر جم گئیں۔ وہ خاموشی سے میری بڑی بڑی مونچھوں‘ تیز چمک دار آنکھوں اور بھرے بھرے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

روپا کو شاید اس نوجوان کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس نے اسی لئے تیز اور سخت لہجے میں نوجوان سے سوال کیا۔ ”اے لڑکے! تجھے کس نے بھیجا ہے؟“

کوئی کمزور دل شخص ہوتا تو روپا کے لہجے سے ڈر جاتا‘ مگر نوجوان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے خود کو لڑاکا کہے جانے پر ہنسی آگئی ہو۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے روپا کے سوال کا جواب دیا۔ ”مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔“ پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں تمہارے ساتھ کام کرنے آیا ہوں باپو بلونت سنگھ!“ پھر اس نے اپنی درو بھری کہانی سنائی۔ اس روداد کے مطابق اس کے باپ کو ایک قتل کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ تفصیل بتاتے لگا۔ ”ایک نوجوان گوبند نے میری جوان بہن کو چھیڑا اس پر میرے پتا جی کو غصہ آ گیا۔ بھلا کون باپ ایسا بوجو گا جو یہ برداشت کر سکے۔ میرے پتا جی نے گوبند پر کلہاڑی سے وار کیا۔ کلہاڑی کے وار سے گوبند کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل کر گرا۔ گوبند موقع ہی پر دم توڑ گیا اور میرے پتا جی کو پکڑ لیا گیا۔ انہیں بہت سے لوگوں نے گوبند پر کلہاڑی سے وار کرتے دیکھا تھا۔ میرا تعلق خود سی آئی ڈی کے محکمے سے تھا۔ اس کے باوجود میرے پتا جی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی بلکہ بطور سزا مجھے بھی محکمے سے الگ کر دیا گیا حالانکہ اس واقعے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔“

یہ سنتے ہی روپا پھر گیا اور تیز آواز میں بولا۔ ”مظلوم بن کر ہماری ہمدردی حاصل کرنے آیا ہے۔ ہمارے سامنے اداکاری کر رہا ہے۔ تجھے یقیناً پولیس نے بھیجا ہے۔“ روپا یہ کہتے ہی اس نوجوان پر جھپٹا اور

”نہیں تایا، پولیس کے آدمی پر کسی طرح اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ آپ کو اس کی مدد کرنی ہو تو کر دیں مگر اسے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ روپا نے میری بات سے اختلاف کیا۔ ”ہمیں ضرورت بھی کیا ہے کہ اسے اپنے گروہ میں شامل کریں۔“

”روپا! وہ اپنے باپ کا انتقام لینے میاں آیا ہے۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے، مجھے وہ بالکل اپنی اولاد کی طرح محسوس ہو رہا ہے۔ جیوت بھی تو اپنے باپ، یعنی میرا بدلہ لینے کے لئے ڈاکو بنا تھا اور ہمارا گھانا۔ میں نہیں چاہتا کہ وکرم بھی اسی طرح مارا جائے۔“ میں جذباتی سا ہو گیا۔ روپا میری بات سن کر کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ”یہ بات مجھے بھی محسوس ہوئی کہ وکرم جیسے تعلیم یافتہ نوجوان کو جرم کی راہ پر کیوں چلایا جائے۔ اسے سمجھا بھگا کر واپس بھیج دینا چاہئے۔ ہم اس کے باپ کو جیل سے رہا کرالیں، مگر..... اب اسے واپس بھیجنا خطرے سے خالی نہیں۔ جوش میں آکر وہ اپنے دوستوں سے کہہ آیا ہے کہ وہ جیل کے غاروں میں جا رہا ہے اور وہاں ٹھاکر بلونت سنگھ کے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ میاں سے واپس گیا تو پولیس اسے پریشان کرے گی۔ اس بات کا وہ کیا جواب دے گا کہ اتنے دن کہاں رہا۔“

”آپ کو پتا ہے کہ وہ سارا دن کچھ لکھتا رہتا ہے۔“ روپا کو کچھ اور نہ سوجھا تو بولا۔ ”یقیناً وہ ہماری سرگرمیاں نوٹ کر رہا ہے۔ جنہیں موقع ملے ہی پولیس کو بھیج دے گا۔“

”مگر وہ اپنی ڈائری میرے سپرد کر دیتا ہے۔ میری اس سے یہی شرط ہے۔“ میں نے بتایا۔ روپا اس پر ہنس دیا، پھر کہنے لگا۔ ”تایا! ڈائری آپ کے حوالے کرنے میں اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی انگریزی پڑھا ہوا نہیں ہے۔ وہ سب کچھ انگریزی میں لکھتا ہے۔ اس کی آخر ضرورت کیا ہے؟ کیوں لکھتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ؟“ آخر میں روپا نے اعتراض کیا۔

”روپا! تمہاری طرح اس بات پر مجھے بھی شک ہو گیا تھا۔ پھر اسی نے مجھے سمجھایا کہ وہ غیر ملکی اخبارات کے لئے ہمارے کارنامے لکھ رہا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں مجھ سے بہت سے سوالات بھی کئے کہ میں ڈاکو کو کیوں بناؤں؟ ڈاکو بن کر اب میں کیا محسوس کرتا ہوں؟ روپا! پولیس ہمارے متعلق الٹی سیدھی باتیں چھپو کر ہمیں بدنام کرتی ہے۔ اس کی بجائے کبھی نہ کبھی وکرم کی ڈائری کے ذریعے ہمارے اصل واقعات بھی لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔ اس میں بھلا ہمارا کیا نقصان ہے؟“ میں نے روپا کے اعتراض کا تفصیل سے جواب دیا۔

روپا کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ مزید بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اسے معلوم تھا کہ جب میں ایک بار کسی پر اعتماد کر لوں تو جلد اس کی طرف سے بدظن نہیں ہوتا۔

”میں اس طرح وکرم پر اعتماد نہیں کروں گا۔“ میں نے روپا کو مزید مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ ”میں اس سے دو ایک قتل بھی کرواؤں گا۔ اسی کے بعد میں اسے اپنا پڑا اعتماد ساتھی بناؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ اس کے بعد تو تمہیں کوئی اختلاف نہیں ہو گا؟“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ روپا بھیجی ہوئی سی آواز میں بولا۔ میں سمجھ گیا کہ ذہنی طور پر وہ اب بھی

اس کے جبرے پر اٹھنے ہاتھ کا زور دار تھپڑ مارا۔

نوجوان اپنا جبراً سلاتے ہوئے مظلوم نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”میرا نام وکرم ہے۔ تم جس طرح چاہو مجھے آزماؤ۔ مجھے تم جتنا چاہے مارو مگر میں میاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ میں، پولیس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میرے پتا جی نے اپنی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے والے ایک نوجوان کو سزا دی جسے میں غلط نہیں سمجھتا، لیکن ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی اور میرے ساتھ بھی۔“ نوجوان نے کہا۔

روپا پھر اسے مارنے اٹھا تو میں بول اٹھا۔ ”نہیں روپا! اسے نہ مارو۔ فی الحال یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ میں اسے سمجھا بھگا کر واپس بھیج دوں گا۔“

میں نے روپا کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے یقیناً میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی، مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھلا میرے حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ روپا کیا سوچ رہا ہو گا۔ سی آئی ڈی کے محکمے کا کوئی نوجوان، ڈاکوؤں کے گروہ میں کس طرح شامل ہو سکتا تھا۔ اس کے باپ نے کسی کو قتل کیا تھا اور پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ اس نوجوان کو محکمے سے نکال دیا گیا تو اس نے جیل کے غاروں کا رخ کیا۔ روپا کا ذہن شاید اس کمائی کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

انتقام کی آگ آدمی کو ہر راستے پر ڈال سکتی ہے، اس کا تجربہ خود روپا کو بھی تھا، مگر ایک تعلیم یافتہ نوجوان غالباً روپا کے خیال میں اس طرح جرم کی راہ نہیں اپنا سکتا۔ روپا اپنے اس شک کا واضح الفاظ میں اظہار کر چکا تھا کہ وکرم کو پولیس نے غاروں کی طرف بھیجا ہے تاکہ وہ ڈاکوؤں کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکے اور وقت آنے پر پولیس کی رہنمائی کرے۔ اس دن کے بعد کئی دفعہ روپا نے تمنا کی میں بھی مجھ سے وکرم پر اپنے شک کا اظہار کیا۔ میں نے اسے سمجھا بھگا کے خاموش کر دیا۔

میں نے یہ اندازہ بھی لگایا اور خود وکرم بھی سمجھ چکا ہے کہ روپا کا اعتماد حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ روپا اسے گروہ میں نہیں رہنے دے گا۔ پھر بھی وہ روپا کے سامنے مسکراتا رہتا۔

ایک مرتبہ میں نے روپا کو وکرم سے یہ کہتے بھی سنا۔ ”اگر تیرے دل میں پاپ ہے تو وہ ہمیشہ نہیں چھپ سکے گا۔ میں ایک دن تیرا سینہ چیر کر تیرے دل کو باہر نکال لوں گا۔“

وکرم سے روپا عمر میں چھوٹا تھا، مگر اس سے زیادہ ظالم، خوفناک اور خونخوار تھا۔

چار دن کے اندر اندر میں نے وکرم کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں۔ اس کا باپ واقعی قتل کے جرم میں گرفتار تھا۔ یہ بات سچ تھی۔ سی آئی ڈی کے محکمے سے نکالے جانے کے بعد وکرم اچانک غائب ہو گیا تھا، اس پر حیرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ میرے ایک مخبر نے یہ بھی بتایا کہ انگریز پولیس افسر شرمین کو شک ہے، وکرم ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر پولیس سے انتقام لے گا۔ یہ اطلاعات وکرم پر اعتماد کرنے کے لئے کافی تھیں۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، درست ثابت ہوا تھا۔

ان اطلاعات کے بعد روپا سے میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے روپا کہ اب ہم وکرم کو باقاعدہ اپنے گروہ میں شامل کر لیں۔“

مجھ سے متفق نہیں۔

نشانے بازی میں وکرم کامیاب رہا۔ میں نے اس سے اڑتے ہوئے پرندے کا نشانہ لینے کو کہا۔ اس نے فائر کر کے پرندے کو نیچے گرا دیا۔

”لڑکے!“ میں نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”تم اچھا نشانہ لے سکتے ہو، لیکن اب تک تم ہمارے روپا کی طرح قابل نہیں ہوئے۔“

”ٹھاکر! میں آپ کی رفاقت میں سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔“ وکرم ادب سے بولا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ روپا، وکرم سے خار کھاتا ہے۔ کچھ ہی دونوں میں وکرم نے روپا کے سوا اپنے رویے کے سبب گروہ کے تمام ہی افراد کو دوست بنا لیا۔ گروہ کے افراد فرصت کے اوقات میں وکرم کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے۔ خصوصاً اس وقت جب روپا کسی کام سے باہر گیا ہوتا تو یہ محفل خوب جمتی۔ وکرم انہیں سی آئی ڈی کے محکمے کے بارے میں بتاتا کہ وہاں لوگوں کو کس طرح تربیت دی جاتی ہے۔ وہ انہیں مثالیں دے کر سمجھاتا۔ اسکاٹ لینڈ پولیس کتنی ہوشیار ہے؟ وہ کس طرح مجرموں کو پکڑتی ہے۔

جو لوگ میرے گروہ میں شامل تھے، وہ کبھی اپنے دیہات اور قصبوں سے باہر نہیں گئے تھے۔ غربت کے ماحول میں پروان چڑھنے والے ڈاکو۔ دیس بدیس کی باتیں بڑے شوق سے سنتے۔ اس طرح وکرم سارے گروہ میں ہر واعرز ہو گیا۔ وہ تنہا ہوتا تو ڈائری لکھ کر اپنا دل بھلاتا۔ کبھی کبھی وہ خاموشی سے جانے کن سوچوں میں گم ہو جاتا۔

جب وکرم پہلی بار میرے ساتھ ڈاکا ڈالنے روانہ ہوا تو بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔

”کہاں ڈاکا ڈالنا ہے؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”تم نئے ہو اس لئے پہلی مرتبہ تمہیں معاف کرتا ہوں، پھر کبھی یہ سوال نہ کرنا۔“ میں آنکھیں نکال کر بولا۔

میرا یہ اصول تھا کہ جہاں ڈاکا ڈالنا ہوتا، گروہ کے افراد کو آخر وقت تک کچھ نہ بتاتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے پولیس کس طرح کوئی اندازہ لگا سکتی تھی۔

رات کو جانا ہے، یہ بات شام ہی کو بتا دی گئی تھی، اس کے بعد کسی کو بھی کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

نصف شب سے پہلے گروہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ میں نے مختلف مقامات پر اپنے آدمی مقرر کر دیے، پھر دو تین فائر کئے۔ وکرم ایک مکان کی چھت پر میرے دوستوں کے ہمراہ رات گزاری تھی۔ رات کو جانا ہے، یہ بات شام ہی کو بتا دی گئی تھی، اس کے بعد کسی کو بھی کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

گھروں میں چھپ گئے۔ لڑائی کے دوران انہیں خواہ مخواہ جھپٹ میں آ جانے کا بھی خوف تھا۔ جس کی چھت پر وکرم بیٹھا تھا اسی مکان میں روپا کو ساتھ لے کر داخل ہوا۔ میرے ساتھ بلونت سنگھ کا بیٹا صوبیدار اور گوبال بھی تھے۔ روپا اور صوبیدار میرے دائیں بائیں تھے اور گوبال پیچھے تھا۔ وہ اس

لئے بیٹھ میرے پیچھے رہتا تھا کہ عقب سے کہیں کوئی وار کر دے تو میں محفوظ رہ سکوں۔

جس کے گھر ڈاکا ڈالا گیا تھا، وہ مالدار آسامی تھا۔ اس کے پاس ہندوق بھی تھی، لیکن مجھ پر گولی چلانے کی ہمت بھلا کس میں تھی۔ دولت سے زیادہ لوگوں کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ جانتے تھے کہ جو مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر وار کرتا ہے، اس کا خاندان ختم کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکے میں مجھے نقد روپے اور سونا چاندی کے زیورات ملے۔ اسی کے ساتھ میں نے گاؤں میں یہ بھی معلوم کر لیا کہ کسی کے پاس رات گزاری تو نہیں۔ چلتے چلتے میں نے گاؤں سے سات آٹھ ہندوقیں بھی حاصل کر لیں۔ وکرم اس بات سے بے خبر تھا کہ آج ہی رات اس کا امتحان ہونے والا ہے۔ اسے میں بلا سبب ساتھ نہیں لایا تھا۔

”سب نکل چلو۔“ میں نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

میرے ساتھی لوٹ کا مال لے کر گاؤں سے نکل گئے۔ روپا اور صوبیدار کے ساتھ گوبال بھی میرے اشارے پر رک گیا تھا۔

”وکرم! صرف تم رک جاؤ۔“ میں بولا اور محسوس کیا کہ وکرم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی ہیں۔ ”کیوں، کیا گھبرا گئے؟“ میں نے وکرم سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں تو۔“ وکرم نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”وہ تو تمہاری آواز سے پتا چل رہا ہے کہ تم بالکل نہیں گھبرائے۔“ روپا ہنس دیا۔

”تم چپ رہو روپا! مجھے وکرم سے اصل بات کرنے دو۔“ میں بول اٹھا، پھر وکرم کو مخاطب کیا۔ ”اس گاؤں میں پولیس کا ایک مخبر ہے۔ اسے تم قتل کرو گے۔“

وکرم کے جس ہاتھ میں رات گزاری تھی، وہ ہاتھ کاٹنے لگا۔ روپا کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

”ٹھاکر! مجھے پولیس سے بدلہ لینا ہے۔“ وکرم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک ہی بات ہے۔ پولیس کا مخبر بھی کتا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔ ”تو اگر اتنے کمزور دل کا تھا تو میرے ساتھ کیوں آیا؟“

”نہیں! میں نہ کہتا تھا کہ یہ ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھنے آیا ہے۔“ روپا نے موقع پا کر فوراً کہا۔

وکرم چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک روپا نے اپنی رات گزاری اس کی طرف تان لی۔ درخت کے نیچے پانچ آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان پانچوں میں خود میں بھی شامل تھا۔ وکرم کو شاید یقین تھا کہ روپا میرے حکم کے بغیر اس پر گولی نہیں چلائے گا۔ وہ تنے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھاکر! روپا سے کہو کہ وہ اپنی رات گزاری کی ٹال نیچے کر لے۔“ چند لمحے بعد وکرم کی آواز سنائی دی۔ اب اس کی آواز سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”روپا کو اس طرح بات بات پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ میں قتل کرنے کو تیار ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ پیسے میں بیگا ہوا تھا۔ میں نے روپا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ

کر چکیں جھپکائیں۔ اسی کے ماتھے روپانے اپنی رائفل کی ٹال نیچے کر لی۔

”اڑتے پرندے گرانے والے کو پسینہ آگیا۔“ روپا وکرم کے قریب جا کر طنزیہ آواز میں بولا۔

”اس سے پہلے کبھی میں نے کسی جیتے جاگتے آدمی کو قتل نہیں کیا تھا اسی وجہ سے.....“
وکرم اپنی صفائی پیش کر رہا تھا کہ میں بول اٹھا۔ ”روپا! تم چپ رہو..... چلو وکرم! آگے بڑھو۔“

خلاف توقع وکرم اس روز آزمائش سے بچ گیا۔ میں نے گوپال کو پولیس کے مخبر کی تلاش میں بھیجا۔ گوپال نے واپس آ کر بتایا کہ پولیس کا مخبر فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی گاؤں سے فرار ہو گیا۔ شاید وہ پولیس کو اطلاع دینے گیا تھا کہ گاؤں میں ڈاکہ پڑ رہا ہے۔ یہ سن کر میں تھلا کے رہ گیا۔ یہی حال روپا کا تھا۔
”وہ بچ کر جائے گا کہاں۔ کچھ دن بعد سہی۔“ میں بڑبڑایا۔

صبح ہونے سے پہلے پورا گروہ چنبل کے غاروں میں واپس آ گیا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکے کے مال کو تقسیم کیا گیا۔ کل مال چار ہزار روپے کا تھا۔ اس میں سے نصف حصہ میں نے رکھ لیا۔ جن ساتھیوں کے پاس اپنی رائفلیں تھیں انہیں قاعدے کے مطابق زیادہ حصہ ملا۔ کچھ نئے بھرتی ہونے والوں کو صرف معمولی رقم بطور محنت ملی۔

”تمہیں اس بار کچھ نہیں ملے گا۔“ میں نے وکرم کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”تمہاری کمائی ایک قتل کرنے کے بعد شروع ہو گی۔“ سب اپنا اپنا حصہ لے کر چلے گئے تو میں نے وکرم کو پھر مخاطب کیا۔
”جوان! کیا سوچ رہا ہے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جس طرح تیرے بارے میں سوچتا ہوں، تو بھی میرے لئے سوچتا ہو گا۔“

”نہیں۔“ وکرم گھبرا کر بولا۔ پھر اس نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔ ”ٹھاکرا! تمہیں..... تمہیں میرے بارے میں کیا خیال آتے ہیں؟“

میں زور سے ہنس دیا، پھر کہا۔ ”تعلیم یافتہ لوگ واقعی چالاک ہوتے ہیں، یہ بات سچ ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے جواب دینے کے بجائے خود مجھ سے سوال کر دیا..... جانا چاہیے ہو کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟ تو سنو، مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم یہاں پھنس گئے ہو۔ کل رات تم نے پولیس کے ایک مخبر کو قتل کرنے کے لئے کہا گیا۔ تم اس وقت کس قدر گھبرا گئے تھے۔ میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔“ میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ اتر گیا ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں بولا۔ ”تعلیم یافتہ لوگ کسی کی جان لینے سے ڈرتے ہیں۔ اسے یہ لوگ ظلم کتے ہیں، مگر یہی لوگ اپنی شیطانی ذہانت سے اکثر غریبوں کو پامال کرتے رہتے ہیں۔ کبھی تم نے اس بارے میں بھی سوچا ہے؟“ میری آواز پرجوش ہو گئی۔ ”وکرم! پڑھے لکھے لوگ دوسروں کو آپس میں لڑانے کے لئے اپنا علم استعمال کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر کے ان سے بے ایمانی کرتے ہیں۔ خیر..... میں جوش میں بہت بول گیا اور اصل بات بھول ہی گیا۔ تمہیں ہم جیسا ہونے میں وقت لگے گا۔ رفتہ رفتہ تمہاری جھجک نکل جائے گی۔ پھر دشمنوں کی جان لیتے ہوئے تمہارا دل نہیں گھبرائے گا۔ اچھا یہ بات چھوڑو اور بتاؤ، تم ڈاکے کے مال کی

تقسیم کے بارے میں سوچ رہے تھے نا؟“

”ٹھاکرا! آپ کا اندازہ حیرت انگیز طور پر بالکل درست ہے۔“ وکرم نے اعتراف کیا۔ ”میں یہی سوچ رہا تھا۔ آپ نے جس طرح مجھے بانٹنے وہ میری سمجھ میں نہیں آئے۔“

”سیدھی طرح کو کہ تمہارے خیال کے مطابق میں نے زیادہ حصہ لیا۔“ میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں تمہیں سمجھاتا ہوں، مگر یہ بات ڈائری میں نہ لکھتا۔ میں نے جو ادھا حصہ رکھا، وہ صرف میرے لئے نہیں ہے۔ اکثر ہمارے ساتھی یا مخبر گرفتار ہو جاتے ہیں تو انہیں رہا کرانے کے لئے پولیس کو ہماری رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اسلحہ بھی خریدنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اخراجات اسی آدمی سے لے لئے جاتے ہیں۔“

میں کیونکہ ٹھاکرا بلونت سنگھ کے جسم میں تھا۔ جو راجپوت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راجپوت خاص طور پر میرا خیال رکھتے تھے۔ جواب میں مجھے بھی گویا خود ان کو کاہنہ درو غاہر کرنا پڑتا تھا۔ میں ہر معاملے میں ان کی پوری مدد کرتا تھا۔ پوری ضلع کے ایک راجپوت کی زمین پٹواری نے رشوت لے کر دوسرے کے نام کر دی۔ اس راجپوت نے مجھ سے فریاد کی۔ ”تمہارے ہوتے میری زمین چھین لی گئی ٹھاکرا! پٹواری کہتا ہے، تمہیں جس عدالت میں جانا ہے جاؤ، لیکن ٹھاکر! میں جانتا ہوں کہ مجھے کسی عدالت میں انصاف نہیں ملے گا۔“

”تم جاؤ، میں پٹواری کو دیکھ لوں گا۔ مطمئن رہو، زمین چھین لینے والے سے میں اس کی زندگی چھین لوں گا۔“ میں نے اس راجپوت سے صرف اتنا کہا۔

”ٹھاکرا! پٹواری کی جان لینے سے انصاف کس طرح ہو گا؟“ وکرم نے مجھ سے اس وقت یہ سوال کیا جب وہ راجپوت چلا گیا۔

”وکرم! تم بتایا کہ انصاف پر شک کرتے ہو۔“ روپا کو وکرم کی مداخلت غالباً گراں گزری۔

”روپا! یہ مجھ پر شک نہیں کر رہا بلکہ بات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔“ میں نے روپا سے کہا، پھر وکرم سے مخاطب ہوا۔ ”تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں دیکھے بھالے بغیر پٹواری کو سزا دے دوں گا۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلے میں اپنا اطمینان کروں گا کہ یہ زمین فریاد کرنے والے ہی کی ہے، پھر پٹواری کو مملت دوں گا تاکہ جس کی زمین ہے، اس واپس دلا دے۔ اس پر بھی پٹواری نہیں مانا تو.....“ میں نے اپنا فقرہ ادھر ادھر چھوڑ کر رائفل پر ہاتھ پھیرا جس کا مطلب سمجھنا یقیناً وکرم کے لئے مشکل نہیں تھا۔
”پھر ٹھاکر! عدالتیں کس کام کی؟“ وکرم نے بحث کی۔

میں حدات آمیز انداز میں ہنس کر بولا۔ ”لڑکے! تمہارے دماغ سے ابھی تعلیم کی بو نہیں گئی۔ عدالتیں کون چلاتا ہے.....؟ حکومت..... انگریز..... اگر عدالت کا انصاف سچا ہوتا تو آزادی کا نعرو لگانے والوں کو جیلوں میں کیوں ڈالا جاتا؟ انگریز کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے کی بات کیوں ہوتی؟ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“

”مگر وہ انصاف کے لئے کسی کی جان نہیں لیتے بلکہ جان دینے کا سبق دیتے ہیں۔“ وکرم نے کہا۔

انگریز حکومت کی حمایت لینے پر میں نے وکرم کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولا۔
میں ایک صبح اپنے گروہ کے ساتھ کھاگاری نگر پہنچا تو یاد آیا کہ زمین کا حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ پٹواری نے واقعی بے ایمانی کی تھی اور اسے دی ہوئی مملکت بھی ختم ہو چکی تھی۔
”تایا! ہم پٹواری کے گھر جا کر حساب صاف کر لیں گے۔“ روپا نے مجھ سے درخواست کی۔
”نہیں۔“ میں نے گھر سے دو فرلانگ دور انتظار کرنے کو کہا۔ ”اسے بال بچوں کے سامنے نہیں مارنا۔ ہم اسے باہر بلائیں گے۔“

اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پٹواری خود ہی گھر سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوٹا تھا اور رخ جنگل کی طرف تھا۔

”وکرم! تم اسے آواز دے کر ادھر بلاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔

میرے حکم کی تعمیل میں وکرم نے پٹواری کو آواز دی۔ پٹواری چونک اٹھا اور ہم لوگوں کی جانب دیکھنے لگا۔ ہم سبھی کے پاس رائفلیں تھیں اور ہم بیڑے کے نیچے کھڑے تھے۔ پٹواری شاید یہ سمجھ گیا کہ میں نے اسے جو دھکی دی تھی اس پر عمل کرنے آ پہنچا ہوں۔ میں نے اسے کانپتے ہوئے دیکھا۔
”ممکن ہے اسے ختم کرنے کے لئے گولی چلانا پڑے“ یہ کام تمہیں کرنا ہے۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

وکرم کے چہرے پر میرا حکم سن کر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پٹواری آگے بڑھنے کے بجائے مڑ کر گھر کی طرف بھاگا۔ دوڑتے ہوئے اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور میں نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ سنسنائی ہوئی گولی چلی۔ پٹواری کے اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ سے گزر کر گولی اس کے سینے میں گھس گئی۔ پٹواری اس طرح الٹ گیا جیسے اسے سخت دھکا لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا۔ اپنے سینے کو اس نے ہاتھ سے دبا لیا۔ وکرم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اسی لمحے پٹواری کے گھر سے سنسنائی ہوئی ایک گولی میری طرف لپکی اور میرے پیچھے میں گھس گئی۔

”تایا پر گولی کس نے چلائی؟“ روپا چیخ اٹھا۔

اسی لمحے دوسری گولی چلی جسے روپا نے جھک کر ضائع کر دیا ورنہ اس گولی کا شکار ہو جاتا۔

اچانک میرے ساتھیوں نے پٹواری کے مکان پر گولیوں کی بارش کر دی۔ فائرنگ کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ نہ جانے کتنے کارٹوس ضائع ہو گئے۔ سب سے پہلے روپا پٹواری کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی دیکھا کہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پٹواری کا جوان بیٹا چت پڑا تھا۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ اس کی رائفل کچھ ہی دور پڑی ہوئی تھی۔ باہر باپ کی لاش پڑی تھی اور گھر میں جوان بیٹے کی لاش۔

”کتا!“ روپا نے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری۔ میں دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ”میرے تایا پر تو نے گولی چلائی..... تیری یہ مجال۔“

فائرنگ کے باوجود اس گاؤں کے باشندوں میں سے کوئی بھی باہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ روپا کا غصہ شاید

لہذا نہیں ہوا۔ اس نے پٹواری کے جوان بیٹے کی لاش کو چار آدمیوں سے اٹھوا لیا۔ پھر ہم سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ چنبل کے کنارے پہنچ کر روپا نے پٹواری کے جوان بیٹے کی لاش کو جس طرح چیرا ہارازا، وہ مجھ سے اس کی محبت کا ثبوت تھا۔
مجھے ہتھار کون سلائی کرتا تھا اس سے میرے بیٹے تک لاعلم تھے۔ کچھ لوگ مجھے خوش کرنے کے لئے بھی بطور تحفہ ہتھیار دیتے تھے۔

کھیزا راغور گاؤں کا ایک راجپوت مجھ سے ملنے آئے والا تھا۔ جنگل میں اس سے ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے اپنے کچھ خاص آدمیوں کو ساتھ رکھا۔ انہی میں وکرم بھی تھا۔ مہمان کے ساتھ ایک آدمی اور بھی آیا تھا۔ وکرم منہ پھیرے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر میں نے اپنے مہمان کو مخاطب کیا۔ ”آپ کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کیا خبریں ہیں؟“

اس موقع پر وکرم نے گردن گھما کر دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے جیسے مہمان کو دیکھ کر اس کے ذہن کو جھکا لگا ہو۔ میرا وہ مہمان ایک پولیس افسر تھا۔ وکرم کی حیرت میرے لئے بے معنی نہیں تھی۔ اسے یقیناً یہ توقع نہیں ہو گی کہ کوئی پولیس افسر بھی مجھ سے ملنے آ سکتا ہے۔

”ٹھاکر! ابھی پولیس کی طرف سے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میرے مہمان نے کہا۔
”کیپٹن شرمین اپنا بوریا مسز باندھ کر اپنے وطن واپس جا رہا ہے۔ اس کے بعد حالات کو ذرا سنبھالنا پڑے گا۔“ پھر میرے مہمان نے ایک صندوق کھولا اور اس میں سے ایک ٹی سی ایم گن نکالی۔ وہ گن اس نے مجھے پیش کی۔ ”یہ گن میں نے خاص طور پر آپ کے لئے حاصل کی ہے ٹھاکر! اس کے علاوہ صندوق میں ایک ہزار کارٹوس بھی ہیں۔“ صندوق وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

میں نے اس نذرانے کے بدلے میں بخشش دی۔ بخشش کے طور پر میں نے سونے کی گیارہ مہرس دی تھیں۔ نذرانہ اور بخشش کا تو محض نام تھے ورنہ یہ ایک سودا تھا۔ اسلحہ بچا اور خرید گیا تھا۔ پھر پولیس افسر کی نگاہ وکرم کی طرف اٹھی گئی۔

”غالباً یہ کوئی نیا آدمی ہے؟“ مہمان پولیس افسر نے وکرم کے بارے میں مجھ سے سوال کیا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی شناخت بھی کرانی ہے۔ یہ آپ ہی کے ٹھکے کا آدمی ہے۔“ وکرم اور پولیس افسر کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو میں نے کہا۔ ”یہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا، لیکن اب ہمارا ساتھی ہے۔“ میں نے پولیس افسر کو وکرم کے بارے میں بتایا۔

مہمان پولیس افسر کے چہرے پر مسرت کا اظہار ہونے لگا۔ وہ بولا۔ ”اس نے اچھا کیا کہ آپ کے پاس آ گیا۔ یہاں یہ سکھ رہے گا۔“

پھر مہمان رخصت ہو گئے۔ دو روز کے بعد میرا ایک مخبر مجھ سے ملنے آیا۔

”ٹھاکر! وہ بوہری“ پولیس سے مل گیا ہے۔ آج کل وہ پولیس والوں کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔“ مخبر نے مجھے اطلاع دی۔

”اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”اس نے میرے بارے میں بھی پولیس کو مطلع کر دیا ہے۔ فوجدار نے مجھ سے بلا کر کہا ہے کہ بوہری پولیس سے مل گیا ہے اور میں بھی پولیس سے مل جاؤں ورنہ مجھے نقصان اٹھانا پڑے گا۔“ مجھ نے جواب دیا۔ میرے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ پولیس سے مل جانے والے کو میں کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔

”جاؤ“ جا کر بوہری کو خبردار کر دو۔ اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ دو دن کے بعد وہ کیراگڑھ کے کٹاؤ میں مجھ سے ملے۔“ میں نے مجھے سے کہا۔

دو دن کے بعد میں نے کیراگڑھ کے کٹاؤ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پڑاؤ ڈالا۔

اب تک میں نے وکرم کو راکٹل نہیں دی تھی جسے وہ مستقل طور پر اپنے پاس رکھ سکتا۔ اس روز میں نے وکرم کی طرف ایک راکٹل بڑھائی اور بولا۔ ”لو یہ راکٹل! بہت دن بعد تمہاری مراد پوری ہو رہی ہے۔ آج وقت آئی گیا کہ تم آزمائش پر پورے اتر سکو۔“

وکرم نے انہی دو دنوں کے درمیان مجھ سے راکٹل رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے مجھ سے راکٹل لے لی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس کے ہاتھ کاپ رہے تھے۔

”ٹھاکر! مجھے کون سی مراد پوری کرنا ہے؟“ وکرم نے سوال کیا۔

اسی وقت بوہری دور سے آتا دکھائی دیا۔ روپا نے بھی اپنی راکٹل منہائی، مگر میں نے اسے روک دیا۔ ”نہیں روپا! یہ کام وکرم کو کرنا ہے۔“ پھر میں، وکرم سے مخاطب ہوا۔ ”یہ جو آ رہا ہے، ہمارا تجربہ تھا“ لیکن اب پولیس سے مل گیا ہے۔ تمہیں اس کو گولی مارنا ہے۔“

وکرم نے دور سے آتے ہوئے شخص کی طرف نظر اٹھائی، پھر چند لمحے بعد مجھ سے کہنے لگا۔ ”ٹھاکر! اسے صفائی کا ایک موقع تو دے دیں۔“

”تم اپنی مت چلاؤ! میں جو کہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ مجھے وکرم کے مشورے پر غصہ آ گیا۔

”ہر بار کوئی بہانہ بنا کر چھوٹ جاتا ہے۔ چل، راکٹل اٹھا۔“ روپا نے بھی ٹکڑا لگایا۔

وکرم نے جواب میں کچھ کہے بغیر راکٹل کی ٹال بلند کی۔

”نہیں وکرم!“ میں بول اٹھا۔ ”اس درخت کے عقب میں کھڑے ہو کر نشانہ لو۔ بوہری کو پہلے سے پتا نہیں لگتا چاہئے کہ اسے گولی ماری جا رہی ہے۔“

وکرم مشینی انداز میں اٹھ کھڑا اور درخت کی آڑ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

بوہری جب تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ یہ وکرم کے لئے اشارہ تھا۔ بوہری یہی سمجھا ہو گا کہ اس طرح گویا میں اس کا استقبال کر رہا ہوں۔ معاً ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وکرم نے گولی چلا دی تھی۔ گولی بوہری کی گردن میں گھس گئی۔

”شاباش!“ میں نے وکرم کے نشانے کی تعریف کی۔ ”تم نے صحیح نشانہ لیا۔“

میں نے دیکھا کہ وکرم کا چہرہ پسینے سے بھگیا ہوا تھا۔ میری تعریف سن کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”پہلی بار ذرا دل پر اثر ہو گا۔ عادت ہو جانے کے بعد تمہارے ہاتھ راکٹل چلانے کے لئے بے

چین ہو جایا کریں گے۔“ میں نے مزید کہا۔

چند ہی روز بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بوہری بے گناہ تھا تو میں کھول کر رہ گیا۔ وہ دراصل پولیس سے مل جانے کا دکھاوا کرتا تھا تاکہ مجھے معلومات فراہم کر سکے۔ جس خبر نے اس کے خلاف چٹلی کھائی تھی، اسے بوہری سے عداوت تھی۔ اس نے اسی لئے بوہری کو میرے ہاتھوں ٹھکانے لگوا دیا تھا۔

”وکرم! اگر میں نے اس وقت تمہارا کمان لیا ہوتا تو اس بے گناہ کی جان بچ جاتی۔ اسے صفائی کا موقع ضرور دینا چاہئے تھا۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

بوہری کے ناحق مارے جانے کا مجھے بہت رنج تھا۔ میں نے اسی رنج میں سارا دن کچھ نہیں کھایا۔

بے گناہ بوہری کے خلاف چٹلی کھانے والے تجربے میں نے کچھ ہی دن میں بدلہ لے لیا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ یوں گویا میرے دو تجربہ دارے گئے۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ اب میں، نیتا رام کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھا۔ دو مرتبہ میں، کھیزارا ٹھور گاؤں میں چھاپہ مار آیا تھا مگر نیتا رام میرے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ ہاں میں، نیتا رام کے کھیتوں اور حویلی کو خاصا نقصان پہنچا آیا تھا۔ نیتا رام دراصل پولیس کی نگرانی اور حفاظت میں تھا۔ میں نے تیسری مرتبہ چھاپا مارنے سے پہلے ایک خط بھیجا۔ میں نے اسے لکھا۔ ”نیتا رام! اگر تم نے آٹھ دن کے اندر اندر کھیزارا ٹھور نہیں چھوڑا تو پامال کر دیئے جاؤ گے۔“

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مجھے اپنے مخبروں سے تفصیل معلوم ہو گئی۔ پولیس نے نیتا رام کو بہت سمجھایا کہ وہ دھمکی سے خوفزدہ نہ ہو، میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکوں گا، مگر نیتا رام جو بیس گھنٹے کے اندر اندر ہی جی چھوڑ بیٹھا۔ اس نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ گویا میری آدمی جیت تھی۔ میں دراصل نیتا رام کو گاؤں سے نکال کر دوسری جگہ اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا، لیکن نیتا رام میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ وہ کچھ ہی دنوں میں صوبہ یوپی چھوڑ کر اتنی دور چلا گیا جہاں میرے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔

☆=====☆

میرے گردہ میں شامل افراد کی تعداد اب خاصی ہو گئی تھی۔ گردہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تہما مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور میرے ساتھ آٹے تھے۔ پولیس بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ داری تھی۔

میرے گردہ میں شامل ہونے والے ایک نئے نوجوان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ میں نے ایک روز وکرم کو اس سے گفتگو کرتے دیکھا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں آڑ میں ہو کر سننے لگا۔

وکرم نے اس نوجوان سے پوچھا۔ ”تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ راہ کیسے اپنائی؟“

”پولیس کے مخبر اس طرح حکومت کرتے ہیں جیسے ان کے باپ کی حکومت ہو۔“ نوجوان نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک مرتبہ انہوں نے کسی وجہ کے بغیر مجھے سر بازار پیاب میں پولیس چوکی میں فرما کر لے گیا۔ جب میں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کا نام لیا تو میری رپورٹ لکھنے کی بجائے

پولیس والے مجھ پر ہنسنے لگے اور بولے کہ تم اس کی رپورٹ لکھانے آئے ہو۔ بات یہ ہو گی کہ اس کے ہاتھوں میں کھلی ہوئے لگی ہو گی۔ اسی کھلی کو دور کرنے کے لئے اس نے تمہیں مارا ہو گا۔ پھر ایک سیاہی گھٹیا اور بازاری لہجے میں مجھ سے کہنے لگا کہ اس وقت تو دن کا اجالا تھا اس لئے تم صرف پٹ کر بیچ گئے۔ اگر تم رات کے وقت اسے کہیں تماثل جاتے تو نہ جانے اور کیا کرتی۔ بھگوان رکھے، تمہاری صورت شکل ایسی بری بھی نہیں کہ کسی کا دل نہ موہ سکے۔ یہ گھٹیا مذاق میں برداشت نہ کر سکا۔ پھر ایک بار موقع دیکھ کر میں نے اس مخبر کے سر پر کھڑائی کا بھرپور وار کیا اور فرار ہو گیا۔ پھر میں نے میاں کی راہ لی۔“

اس نوجوان کی چٹان کر و کر کم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اسے اب شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکوؤں کو ختم کرنے کے لئے دن رات سرگرداں رہنے والے خود لوگوں کو ڈاکو بنا رہے تھے۔ اگر اس نوجوان کے ساتھ انصاف کیا گیا ہوتا تو وہ ڈاکو نہ بنتا۔ وکر کم نے یقیناً سی آئی ڈی کے جھکے میں رہ کر تصویر کا صرف ایک رخ ہی دیکھا تھا، لیکن اب وہ میرے گردہ میں شامل ہو کر تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے گردہ میں شامل ایک نوجوان تو اس نوجوان سے بھی چھوٹا تھا۔ اس کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ ابھی اس کی ریشیں ہی نکلی تھیں۔

جن ڈاکوؤں تک پہنچنے کے لئے پولیس اپنے مخبر بناتی ہے، انہی مخبروں کے ظلم سے ڈاکو بننے کا دوسرا ثبوت یہ سولہ سال کا نوجوان تھا۔ اس نوجوان کا نام گھا تھا۔ گھا کی چچی کو پولیس کے ایک مخبر نے اغوا کر لیا تھا۔ اس دوران اس نے جوان عورت کی عزت و آبرو پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ گھا کے خاندان پر ٹکک کا ٹیکا لگ گیا۔ وہ بے آبرو ہو گیا۔ گھانے اپنے چار چھ دوستوں سے مدد مانگی۔ مخبر پر کاش کی پشت پر پولیس کا ہاتھ تھا۔ گھا غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ پھر اس سے ایک ایسا زہریلا فقرہ کہا گیا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ ”اب تو اس چاچی کو چھڑا کے کیا کرے گا۔ خراب کی جا چکی ہے۔ اچھا ہے، اسے مزے کرنے دے۔“

گھا یہ سن کر اپنے گھر گیا اور بھائی کو مخاطب کیا۔ ”تم میرے ساتھ آتے ہو؟ مجھے پرکاش کا حساب صاف کرنا ہے۔“

عمر میں گھا سے ڈیڑھ دو سال بڑا بھائی انکار نہ کر سکا۔ دونوں بھائی پرکاش کی تلاش میں روانہ ہوئے، مگر پرکاش کی بجائے ان سے پرکاش کا بھائی نکلا گیا۔ انہیں تو انتقام لینا ہی تھا۔ جوش ٹھنڈا پڑ جانے سے پہلے انہیں کچھ کر گزرنہ تھا۔ سو ان دونوں نے پرکاش کے بھائی کو ٹھکانے لگا دیا۔ وہ فرار ہونے سے پہلے وہاں موجود لوگوں سے کہہ آئے کہ فی الحال تو پینبل کے عماروں میں جا رہے ہیں، لیکن انہوں نے پرکاش کے خاندان کو ختم کرنے کی قسم کھائی ہے۔

گھا سے یہ کہانی وکر کم نے بھی سنی۔ اس کی آنکھوں سے بھی غصے کے سبب شعلے سے نکلنے لگے۔ ایک مرتبہ وکر کم ڈائری لکھ رہا تھا کہ میں پہنچ گیا اور وہ چونک اٹھا۔

”تمہاری ڈائری کے صفحے ختم ہونے لگے ہیں، دوسری منگوا دوں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں ٹھاکر! بہت لکھ لیا، دوسری ڈائری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وکر کم نے جواب دیا۔

”کبھی تمہیں اپنی ڈائری کی تحریر پڑھ کر مجھے شانا ہو گی۔“ میں نے وکر کم سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آپ جب کہیں ٹھاکر!.....! لہجے ابھی سنا ہوں۔“ وکر کم بول اٹھا۔

”نہیں، آج نہیں پھر کبھی۔ ہم دونوں کو کل باہر جانا ہے، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“ میں نے لفظ ”دونوں“ پر زور دے کر کہا۔

اب تک میں کبھی وکر کم کو تمنا اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ وکر کم کے چہرے پر شاید اسی لئے حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

دوسرے دن صبح میں نے وکر کم کو راتفل اور کار تو سوں کی پٹی تھادی۔ وہ اس بات سے ظاہر ہے لاعلم ہی تھا کہ آج اسے ایک بڑے امتحان سے گزرنا تھا۔

”چلو، اب چلیں۔“ میں نے وکر کم سے کہا۔

وکر کم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں چلنا ہے۔ ہاں اس نے یہ سوال ضرور کیا۔ ”ٹھاکر! ڈائری لے لی؟“

میں ایک جھٹکے سے رک کر کھڑا ہو گیا اور اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”ٹھاکر! آپ..... آپ نے کہا تھا نا کہ جب ہم دونوں اکیلے ہوں تو ڈائری سنانا۔“ وکر کم گھبرا کر کہنے لگا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تمہاری طرح میں بھی اسی کی فکر میں رہتا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے بغلی تھیلی سے ڈائری نکال کر دکھائی۔

وکر کم شرمندہ سا ہو کر میرے ساتھ چلنے لگا۔

”راتفل میں کار تو س موجود ہے؟“ اچانک میں نے وکر کم سے سوال کیا۔

”ٹھاکر! آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“ وکر کم نے مجھ سے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں نے تمہیں راتفل لوڈ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

”راتفل کبھی خالی نہیں رکھنا چاہئے تاکہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر گولی چلائی جاسکے۔“

”فکر نہ کریں ٹھاکر! راتفل لوڈ ہے۔“ وکر کم نے جواب دیا۔

میں اور وکر کم پہلو پہلو چل رہے تھے۔ وکر کم میرے ساتھ چلتے ہوئے بونا دکھائی دے رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک مرتبہ وکر کم تھوڑا پیچھے رہ گیا تو میں نے رک کر فوراً پیچھے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے وکر کم سے پوچھا۔

”ٹک..... کچھ نہیں۔“ وکر کم نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

راتے میں ہم دونوں کو آرام کے لئے ایک جھونپڑے میں قیام کرنا پڑا۔ میرا شاندار استقبال کیا گیا جیسے ان لوگوں کے گھر کوئی راجہ آیا ہو۔ یوں بھی لوگ مجھے چہل کا راجا ہی کہتے تھے۔ میں نے اپنے میزبان سے سوال کیا۔ ”ارے تیری بیٹی تو سرال میں سکھی ہے؟“

”ٹھاکرا کنیا دان میں تمہاری دی ہوئی چیز ہو تو وہ کبھی ہی رہے گی۔“ غریب میزبان نے جواب دیا۔ میں نے اس غریب شخص کی بیٹی کے جیز میں زیورات چڑھائے تھے۔

سورج نصف النہار پر آیا تو ہم پچاس ساٹھ جھونپڑیوں پر مشتمل ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں بھی میرے پیچھے ہی ”ٹھاکرا آئے“ ٹھاکر آئے“ کا شور ہونے لگا۔ اس پر میں نے وکرم کو حیران سا دیکھا۔ وکرم کو اپنے ساتھ لئے میں ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ گاؤں کے کھیا نے ہمارا استقبال کیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ہم دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”خاموش کیوں ہو وکرم؟“ میں نے وکرم کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھاکرا! آپ کو گاؤں میں آتے سب نے دیکھا، مگر پھر بھی.....“

”پھر بھی مجھے ڈر کیوں نہیں لگتا؟ تمہیں اسی پر حیرت ہے نا؟“ میں نے وکرم کی بات کاٹ دی۔ ”ہم اس گاؤں کے مہمان ہیں۔ اب ہماری سلامتی کی ذمہ داری گاؤں والوں کی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے کھیا کی طرف دیکھا۔ ”کیوں کھیا جی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی ہاں ٹھاکرا! بالکل بالکل۔“ کھیا نے جواب دیا۔

”جب تک ہم یہاں ہیں اس گاؤں کی طرف آنے والے دونوں راستوں پر دو دو میل کے بعد چار چار آدمی پہرہ دیتے رہیں گے کیونکہ کتے اچانک کہیں بھی آ سکتے ہیں۔“ میں بولا۔ پولیس والوں کو میں ایسے ہی القابات سے نوازتا تھا۔ ”کھیا جی! اسے خبر بھیجی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں ٹھاکرا! وہ دوپہر ڈھلنے تک آجائے گا۔“ کھیا نے نام لئے بغیر جواب دیا۔

کھانا کھا کر میں اور وکرم آرام کرنے چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ وکرم مجھے کچھ فکرمند سا نظر آ رہا تھا، شاید اس کی وجہ اجنبی ماحول تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ وکرم بار بار میری طرف چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رانفل میرے پاس تھی جسے چیک کرنے کے لئے میں ایک بار اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر کچھ دیر بعد لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

معاذ مجھے محسوس ہوا کہ وکرم اٹھ رہا ہے تو میں نے آنکھیں کھول کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”پیشاب کرنا ہے۔“ وکرم نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں بتایا۔

”جھونپڑے کے پیچھے چلے جاؤ۔“ میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

دوپہر ڈھلنے ہی کھیا نے مجھے بیدار کیا اور کہا۔ ”ٹھاکرا! وہ آ گیا ہے۔“

وکرم بھی یہ سن کر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حلقوں میں گردش کرنے لگیں اور جبرؤں کی رگیں کھینچ گئیں۔

”اسے اندر بھیج دو۔“ میری آواز میں نہ جلد بازی تھی نہ جوش تھا۔

ذرا ہی دیر کے بعد دہلا چلا ایک آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔ وہ دھوئی باندھے ہوئے تھا۔ دھوئی پر کرتہ اور کرتے پر اس نے واسٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر وہ کپڑے کی سلی ہوئی ٹوپی لگائے ہوئے تھا۔

اپنے حلقے سے وہ کپھری کے کسی پیش کار کی طرح لگ رہا تھا۔

”نمتے!“ آنے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”آئیے ماسٹر جی! کہیں اسکول ادھورا چھوڑ کر تو نہیں چلے آئے؟“ میں نے آنے والے کو مخاطب کیا۔

”نہیں تایا جی! آج کل اسکول صبح کا ہے۔ لڑکوں کا امتحان لے کر آ رہا ہوں۔“ آنے والے نے جواب دیا۔

آنے والا ایک اسکول ماسٹر تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلیا تھا۔

تھیلے سے تین چار سردے نکال کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”بہت میٹھے ہیں یہ ٹھاکرا!“ اس نے سردے مجھے پیش کئے۔

”ماسٹر جی! تم تو سب کا امتحان لیتے ہو، آج ہمیں تمہارا امتحان لینا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈائری نکالی۔

”بیٹھ جاؤ! ہمارے تعلیم یافتہ ساتھی نے اس میں کیا لکھا ہے، پڑھ کر سناؤ۔“

ماسٹر ڈائری لے کر اس کے صفحات اٹھنے لگا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کیوں کیا الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے؟“ میں نے ہزار ہو کر کچھ دیر بعد پوچھا۔

”تایا جی! الفاظ تو موتی کے دانوں کی طرح صاف لکھے ہیں، مگر.....“ ماسٹر جملہ ادھورا چھوڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

”مگر کیا؟“ میں نے وکرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”زبان سمجھ میں نہیں آتی۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

اسی وقت وکرم ہنسنے لگا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اس کے چہرے سے شرمندگی کا اظہار ہونے لگا۔

”ٹھاکرا! یہ ماسٹر صاحب کے بس کی بات نہیں۔ الفاظ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھے ہیں۔“ وکرم نے بتایا۔

”مختصر الفاظ میں لکھنے کو شارٹ ہینڈ کہتے ہیں۔ اس طرح صرف دو لفظوں میں پوری سطر آ جاتی ہے۔ یہ علم سب کو نہیں آتا۔“

”مجھے بھی معلوم ہے۔“ میں بولا۔ ”میں سمجھ رہا تھا کہ شاید ماسٹر کو شارٹ ہینڈ آتی ہوگی، لیکن تم نے شارٹ ہینڈ میں ڈائری کیوں لکھی؟“

”ٹھاکرا! میں نے ایسا اس لئے کیا کہ اگر ڈائری غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کوئی اسے پڑھ نہ سکے۔

اس طرح اپنا راز باہر نہیں جاسکتا۔ آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیا ہے تو مجھے بھی ہر طرح چوکنا رہنا چاہئے۔“

وکرم نے جواب دیا۔

میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ ماسٹر چلا گیا تو کھیا کہنے لگا۔ ”ٹھاکرا! پونم کا مہینہ آ رہا ہے۔

مہادیو کی آرتی سوموار کو آپ کے ہاتھوں اتاری جائے تو اچھا ہے۔“

”ٹھیک ہے، مگر یہ بات ابھی تو چھپائے ہی رکھنا۔“ میں نے جواب دیا، پھر وکرم کی طرف دیکھا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو وکرم؟“

”پونم آرہا ہے اس لئے مجھے رادھا یاد آ رہی ہے۔“ وکرم نے بتایا۔

”رادھا کون؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ میری منگیت ہے ٹھاکرا“ وکرم بولا۔ ”میری طرف سے کوئی خبر نہیں گئی اس لئے وہ بے چاری فکر مند ہو گئی۔“

”تمہیں اس کے پاس اپنی خیریت کی خبر بھیجنا ہے؟“ میں نے معلوم کیا، پھر خود ہی کہا۔ ”اسے خط لکھ دو۔“ اس کے بعد کھیا سے میں بولا۔ ”اسے ایک پوسٹ کارڈ دو۔“

”ٹھاکرا! اگر میں نے پوسٹ کارڈ لکھا تو شارٹ ہینڈ میں لکھنا پڑے گا کیونکہ کسی نے پڑھ لیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“ وکرم کہنے لگا۔

”تمہاری منگیت شارٹ ہینڈ جانتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، اس نے مجھی سے سیکھی تھی۔“ وکرم نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد کھیا نے پوسٹ کارڈ منگوا دیا اور وکرم نے اس پر شارٹ ہینڈ میں کچھ لکھ دیا۔

”کیا لکھا تم نے؟“ میں نے پوسٹ کارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم کیا۔

”میری فکر نہ کرنا۔“ وکرم پوسٹ کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔ ”شکر بھگوان کی کپا (مہربانی) ہوئی تو جلد ملاقات ہوگی۔“ پھر وکرم نے پوسٹ کارڈ پر ہندی میں رادھا کا پتا لکھا۔ وکرم سے پوسٹ کارڈ لے کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”چلو، ذرا باہر گھومتے ہیں۔“ میں نے وکرم سے کہا۔

اس جھوپڑی کے پیچھے پہنچ کر میں نے ایک سردا اپنے ہاتھ سے اٹھایا، پھر دائیں ہتھیلی اونچی کی جس پر سردا رکھا تھا اور کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تیری نشانے بازی کا امتحان لینا ہے۔“ میں نے وکرم کو مخاطب کیا اور اس سے تقریباً پندرہ گز دور کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھنا، سروے کا نشانہ لینا، میرا ہاتھ نہ چھید دینا!“

وکرم پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا وہ ہاتھ کانپنے لگا جس میں رائفل تھی۔ ”چلو نشانہ لو۔“ میں زور سے بولا۔

معا میں نے وکرم کو ہاتھ سے رائفل پھینکتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”نہیں ٹھاکر، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔“

یہ سن کر میں مسکراتا ہوا وکرم کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر رائفل زمین سے اٹھالی۔ پھر میں نے اچانک رائفل کی ٹال وکرم کے سینے پر رکھ دی۔ ”تیرا امتحان پورا ہوا، نیسے یاد کرتا ہے یاد کر لے۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا۔“ اس کے بعد وکرم کے سینے کا نشانہ لئے ہوئے میں چند قدم پیچھے ہٹا۔

میں نے دیکھا کہ وکرم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت میں نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا اور

زبردست دھماکہ ہوا۔ اسی کے ساتھ میں زور سے ہٹا۔

وکرم اب بھی اپنی جگہ زندہ سلامت کھڑا تھا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ رائشانہ خطا ہو گیا ہے، مگر حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

”کیا ڈر گیا؟“ میں نے قریب پہنچ کر اس کی پشت تھپکی۔ ”اس بیلٹ میں نقلی کارٹوس ہیں کیونکہ وہ تیرا امتحان لینا تھا کہ تو تنہائی میں بھی میرا وفادار رہتا ہے یا نہیں۔“

☆=====☆=====☆

پونم کے سینے کے پہلے پیر کو دوسرے کے بعد اپنے ساتھیوں کو لے کر میں اس گاؤں کی طرف روانہ ہوا جس کے کھیا نے آرتی کے وقت آنے کا مجھ سے وعدہ لیا تھا۔

”روپا! ہمیں جلدی کرنا چاہئے کیونکہ شام ہو رہی ہے۔ مہادیوی آرتی میں دیر نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے روپا سے کہا۔ ہندوؤں کے درمیان اتنے دن رہنے کی وجہ سے میں ان کے مذہبی عقائد اور رسوم سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے میں نے تیز چلنے کو کہا۔

مندر ابھی تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا کہ اچانک رائفل کا دھماکہ سنائی دیا۔ میرا پورا گردہ چونک کر یک دم ساکت ہو گیا۔ میں نے روپا کی طرف دیکھا۔ جسے جو آڑ ملی اس کے پیچھے پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ روپا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”نایا! کتے ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ اس کے لمبے میں غصہ تھا۔

”کس نے مخبری کی؟“ میری آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے خون اتر آیا۔ ”ہماری بیباں آمد کے متعلق کھیا کے سوا سب لاعلم تھے اور وہ مخبری نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا بیٹا ہمارے ساتھ ہے۔“ میں نے سوچا، بس وقت آرتی کا پروگرام بنا تھا، وکرم بھی موجود تھا۔ میں بنے وکرم کو گھور کر دیکھا۔ اسی وقت مخالف سمت سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ کئی گولیاں میرے سر پر سے گزر گئیں۔ ”سب بکھر جاؤ۔“ یہ کہتے میں گر جا۔ پھر میں نے روپا سے کہا۔ ”وکرم پر نظر رکھنا۔ مجھے اس پر شک ہے۔“

روپا، وکرم کی تلاش میں کچھ دور ہٹ گیا۔

پھر میں نے پولیس کی فائزنگ کا جواب دیا اور باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ میرے تمام ساتھی، پولیس کی فائزنگ کا جواب دینے کے لئے محفوظ مقامات پر چھپ گئے۔ اچانک پولیس سے مقابلہ ہونے کی صورت میں عموماً میں فرار ہوتا، پسند نہیں کرتا تھا۔ اس طرح پھنس جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ روپا اور وکرم کے درمیان چوہے اور ملی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ دونوں زمین سے سینہ لگائے آگے بڑھ رہے تھے۔ سر اٹھانے کی صورت میں وہ پولیس کی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ اس دوران ایک سپاہی، روپا کی نظر میں آ گیا۔ اس نے فائزنگ کے سپاہی کو ختم کر دیا۔ اتنی دیر میں وکرم دور نکل گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور میں بھرا ہوا تھا۔ صوبیدار مجھ سے فرار ہونے کے بارے میں بولا تو میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ بلونت سنگھ کے جسم کے ناتے وہ میرا بیٹا تھا۔ روپا، وکرم پر ہاتھ ڈالنے کے پکر میں تھا۔ درمیان میں زخموں کی چھین گونج رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق مقابلے پر کیپٹن شرمن ہی تھا۔ اس بہادری کے ساتھ وہی عیار انگریز لڑاتا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کیپٹن شرمن چھوٹی سی پھاڑی کے

جوان بیٹوں کا انتقام لینے کے لئے ہمیں ہر حال میں نیتا رام کو تلاش کرنا پڑے گا۔" میرا یہی خیال تھا کہ نواب سنگھ کے سینے میں انتقام کی آگ بجھی نہیں۔ میرا خیال درست نکلا۔

"آپ کچھ دن آرام کریں۔ نیتا رام کو ختم کرنے کا کام مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے اسے تسلی دی، پھر پڑا طمیتان لہجے میں بولا۔ "پہلے تو ہمیں بھرت کی شادی کرنا ہے۔ ہم جونت کے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کریں گے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" نواب سنگھ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ گھر میں پوتے جوان ہو چکے ہیں۔" پھر وہ مسکرایا۔ "دشمن سے انتقام لینے کے ساتھ ساتھ اب ہمیں بچوں کی شادی بیاہ کا حساب بھی رکھنا پڑے گا۔"

ڈاکوں سے میں نے بڑی دولت کمائی تھی۔ اس سے میں نے گڑھی کی صورت بدل دی۔ رکنی اس طرح خوش تھی جیسے اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ میرے گھر واپس آ جانے سے روٹھی ہوئی ہمارے جیسے پھر لوٹ آئی تھی۔ جونت کے بیٹے بھرت کی شادی کے لئے زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔

نئی حکومت ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ اسے ابھی انتظامی امور کو چھوڑ کر اتنی فرصت نہیں تھی کہ ڈاکوں سے نبرد آزما ہو کر اپنے لئے درد سر مول لیتی۔ میں بڑے رعب سے گڑھی میں رہتا تھا۔ اس کے باوجود مصلحت میں نے ابھی اپنا گروہ ختم نہیں کیا تھا۔ میں پہلے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پولیس میرے سلسلے میں کیا قدم اٹھاتی ہے۔

اسی عرصے میں میں نے بھرت سنگھ کی شادی کر دی۔ گڑھی میں جو مسمان آئے، ان میں وہ پولیس افسران بھی تھے جن سے میرے تعلقات تھے۔ میں نے ان سے مختلف سوالات کئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ شادی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی اور پھر یہی ہوا۔

میں نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ پانچ شاندار کادیں اور تین ہاتھی برات میں آگے آگے تھے۔ اس شادی میں سبھی جاننے والوں نے شرکت کی۔

شادی کے بعد ناچ گانے اور کھانے کی دعوت میں تحصیل دار، زمیندار، ڈاکٹر اور پولیس کے افسران تک موجود تھے۔ اسی عرصے میں مجھے خدار و کرم کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے ڈاکو سمجھ کر مار دیا تھا۔

کچھ بڑے لوگوں نے مجھ سے اپنے تعلقات استوار رکھنے کی غرض سے اپنے نمائندے شادی میں بھیجے تھے۔ وہ جیسے یہ بات بھول ہی گئے تھے کہ میں ڈاکو ہوں اور میری گرفتاری پر حکومت کی طرف سے انعام مقرر ہے۔ میں کہ جسے گرفتار کر کے پھانسی کا حکم سنایا جاسکتا تھا، بڑی دھوم دھام سے گویا اپنے پوتے کی شادی کر رہا تھا۔

ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد میں کھلے عام کھڑا راٹھور واپس آ گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نئی حکومت میرے جرائم معاف کر دے گی، مگر میرا اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔

نئی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی راجاؤں اور نوابوں پر ہاتھ ڈالا تھا تو پھر وہ مستحکم ہونے کے بعد

نیچے کھنڈر میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔

معا کی نے میرا نشانہ لے کر فائر کیا، مگر میں بال بال بچ گیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے سنٹائی ہوئی گزر گئی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ میرے اوپر پولیس کی طرف سے فائر نہیں ہوا تھا۔ مجھ پر گولی چلانے والا خدار و کرم ہی ہو سکتا تھا۔ گولی کی سمت سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ میں نے وکرم پر تین چھار فائر جھونک دیئے۔ روپا بھی غضب ناک ہو گیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اس نے وکرم کی طرف فائرنگ شروع کر دی۔

پولیس کی جانب سے اچانک فائرنگ بند کر دی گئی۔ اس موقع کو میں نے گنوا یا نہیں اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو گیا۔

☆=====☆

آزادی ملنے کی خوشی میں بھارت سرکار نے ملک بھر کی جیلوں سے بہت سے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس سے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ کو بھی فائدہ پہنچا جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہا تھا۔ میں جب گڑھی پہنچا تو رکنی نے خوش خبری سنائی۔ "جیٹھ جی رہا ہو گئے۔"

"سارے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کرو۔" میں نے اظہار مسرت کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ نواب سنگھ مجھ سے پوچھے گا کہ اپنے اور اس کے بیٹے کا پورا انتقام کیوں نہیں لیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا کہ ابھی تک دشمن کیوں زندہ ہے؟

راچپوت کیسے ہی حالات میں کیوں نہ ہوں مگر ان کے لو میں جو ایک کاٹ ہوتی ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے تسلی رام، اس کے بھانجوں اور بھتیجیوں کو ختم کر دیا تھا لیکن تسلی رام کا بیٹا نیتا رام اب بھی زندہ تھا۔ دشمنی کا حساب اس وقت تک بے باقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ نیتا رام کو بھی ٹھکانے نہ لگا دیا جاتا۔

نواب سنگھ کی طرح ممکن ہے حکومت میرے جرائم کو بھی معاف کر دیتی مگر ابھی تو میرے ہاتھوں متعدد آدم زادوں کو سفر آخرت پر روانہ ہونا تھا۔ پھر یہ کس طرح ہو جاتا۔

درازا کے بعد نواب سنگھ نے مجھے، یعنی اپنے بھائی بلونت سنگھ کو دیکھا تو سینے سے لگالیا۔ "چھوٹے! تم نے بڑا نام پیدا کیا۔ ہر علاقے میں تمہاری شہرت ہے۔ میں نے تو قید ہی میں اپنی زندگی رائیگاں کر دی۔" نواب سنگھ نے محبت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کے سفید بال بڑھاپے کی چٹلی کھا رہے تھے۔ میں اس کے کیم ضخیم جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"بڑے بھائی! میں نے آپ کو جیل سے رہا کرانے کے بارے میں کئی بار سوچا، مگر وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا اس لئے مجبور ہو گیا۔" میں بولا۔

"اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔ جہاں انسان کے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے، بھگوان کے ہاتھ پہنچ جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" پھر چند ہی لمحے بعد نواب سنگھ کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر کھچاؤ آ گیا۔ معاذ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اپنے

لکھنؤ میں اعلیٰ سرکاری افسران جمع ہوئے۔ چنبل کے غاروں کا ظلم ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا جوش بڑھ گیا۔ طے کیا گیا کہ اگر اس سلسلے میں پولیس ناکام رہے تو یہ کام فوج کے سپرد کیا جائے گا، لیکن ٹھاکر بلونت سنگھ کو حکومت کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گی۔ حکومت عوام کے سامنے جواب دہ تھی۔ ارکان حکومت عوام سے ووٹ لینے جائیں گے تو عوام کو کیا منہ دکھائیں گے؟ حکومت کے کرتا دھرتا سوچنے لگے۔ پولیس کو اس سلسلے میں ہر طرح مستعد اور تیار کیا گیا تاکہ کسی بھی قیمت پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو ختم کر دیا جائے۔ میرے گروہ کی تلاش میں آخر کار پولیس متحرک ہو گئی۔

چنبل کے کنارے پوری ایک گارو لگا دی گئی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں کھیزا رانھور میں داخل ہو کر بتا رام کا بال بیک نہ کر سکوں۔ اب یہ معاملہ پولیس کی عزت کا مسئلہ بن چکا تھا کہ ایک ڈاکو ان کے علم و اطلاع کے باوجود کسی شخص کو قتل کر دے۔

تمام خبریں مجھ تک پہنچ گئیں تو میں نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا اور روپا سے کہا۔ ”اب صحیح معنوں میں کھیل شروع ہوا ہے۔ حکومت اپنی قوت آزمانا چاہتی ہے۔“

”تایا! ہمیں تو اسی میں مزہ آتا ہے۔“ روپا جواب میں کہنے لگا۔ ”مرنا تو ایک دن ہے۔ سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم لڑتے ہوئے مریں اور یہی غار ہماری آخری آرام گاہ بن جائیں جہاں ہم نے بہت سی یادگار راتیں گزاری ہیں۔“ روپا کا جواب اس کے مزاج کے مطابق تھا۔

میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ بہت جلد میرے گرد گھیرا تنگ کیا جائے والا ہے۔ میں نے سوچا! آئندہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی محبوبہ رکنی کی تھی۔ اپنے گروہ کو از سر نو بنانے اور اسلحہ جمع کرنے کی غرض سے میں تقریباً تین مہینے سے کھیزا رانھور میں جاسکا تھا۔ رکنی مجھے بہت یاد آ رہی تھی۔

میں نے اپنے اس خیال کا اظہار روپا سے کیا کہ گاؤں جانا چاہتا ہوں تو وہ بولا۔ ”تایا! ایسا نہ کریں۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ گاؤں تک پہنچنے کے تمام راستوں کو پولیس والوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

اگر میں اپنی محبوبہ ہی سے نہ مل سکوں تو پھر میرے یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ میں نے سوچا۔ پھر بلونت سنگھ کے جسم ہی میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر میں یہ باتیں روپا سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔ اس طرح میں بلا خوف و خطر رکنی سے مل کر غاروں میں بحفاظت واپس آ سکتا تھا۔

اس وقت ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔

”چل روپا! میرے ساتھ چل۔“ سوچتے سوچتے اچانک میں نے روپا کو مخاطب کیا۔

”کہاں تائیا؟“ روپا نے حیرت سے پوچھا۔

”جہاں بھی میں تجھے لے جاؤں۔“

”ٹھیک ہے تائیا!“ روپا نے اقرار میں سر ہلایا۔

مجھ جیسے شخص کو کیسے نظر انداز کر دیتی جو راجاؤں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کیا قانون میرے سامنے مجبور تھا کہ میرے خوف سے بتا رام اپنے آبائی گاؤں میں بھی نہ آ پاتا؟ ایک بار پھر کھٹ پٹ شروع ہو گئی اور مجھ تک نئی نئی اطلاعات پہنچنے لگیں۔ مجھے جیل بھیجنے کا جوش پیدا ہونے لگا، لیکن اب میں جیل جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے نئی حکومت کی زیادہ پردہ نہیں تھی۔ چنبل کے کٹاؤ دار غار اب بھی سلامت تھے۔ اعلیٰ افسران کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر ڈرنا کیسا؟ میں نے ایک دن بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ سے کہہ ہی دیا۔ ”بڑے بھائی! گھر کا سکھ اب کاٹنے لگا ہے۔ آپ اور باپو سب گھر والوں کی دیکھ بھال کیجئے گا، مجھے تو چنبل کے غاروں میں رہنا پسند ہے۔“

”مگر کیوں چھوئے؟“ نواب سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے بڑے بھائی، مجھے پتا چل چکا ہے کہ بہت جلد پولیس میرے خلاف حرکت میں آنے والی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”تمہیں کسی نے غلط خبر تو نہیں دے دی؟“

”نہیں، خبر بالکل درست ہے۔ جو پولیس افسران میرے ہی خواہ اور دوست ہیں، انہی کی طرف سے مجھے یہ خبر ملی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن یہ یہ تو بہت برا ہوا۔“ نواب سنگھ نے اظہار افسوس کیا۔

”اب جو بھی ہو، قسمت کے فیصلے کو تو ہر حال میں قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا چھوئے کہ تم غاروں میں بھٹکتے پھرو اور میں گڑھی میں عیش کروں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ بہت دن سے میرے ہاتھوں میں بھی رانقل چلانے کے لئے کھجلی ہو رہی ہے۔“ نواب سنگھ پر جوش آواز میں بولا۔

”مجھ سے ہرگز یہ گوارا نہیں ہو گا کہ میرے بڑے بھائی کی آخری عمر بھٹکتے میں گزرے۔“ میں نے نواب سنگھ کو سمجھایا۔

نواب سنگھ کو میں اپنے ساتھ اس لئے بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ عیاش تھا۔ گروہ کے دوسرے افراد بھی اس کی عیاشی سے متاثر ہو سکتے تھے۔ بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے میں نواب سنگھ پر اس معاملے میں سختی بھی نہ کر پاتا۔ اس طرح گروہ کے دوسرے افراد کو بھی چھوٹ مل جاتی جو میں نہیں چاہتا تھا۔

”آپ کچھ دن یہاں ٹھہریں۔“ میں نے نواب سنگھ سے مزید کہا۔ ”بتا رام کے گاؤں آنے کی افواہ گرم ہے۔ اس وقت آپ گاؤں میں ہوں گے تو ہماری طاقت دگنی ہو گی۔“

یہ بات نواب سنگھ کی سمجھ میں آگئی اور وہ گاؤں میں رہنے پر راضی ہو گیا۔

اس طرح میری زندگی دوبارہ اسی ڈگر پر چل پڑی جسے میں فراموش کر آیا تھا۔

چند ہی روز میں میرے نام کا ڈنکا پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ بجنے لگا۔ پولیس کے محکمے کو اسی لئے فوری طور پر میرے خلاف عملی اقدام کی فکر ہوئی۔ مجھے اطلاعات ملتی رہیں۔

پولیس والے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ ہم کوئی دھیمی سی آواز پیدا کئے بغیر ان کی لاشیں خیمے کے شگاف سے باہر نکال کر لے آئے۔ روپا کو معلوم تھا کہ اب کیا کرتا ہے۔

جلدی جلدی ہم نے ان دونوں کی وردیاں اتار لیں۔ مرنے والوں میں سے ایک قدرے بھاری جسم کا تھا۔ اس کی وردی میں نے پین لی۔ دوسرے مقتول کی وردی روپا کے کام آئی۔ اس طرح وہ بلا خوف و خطر غاروں کی طرف واپس جاسکتا تھا۔ روپا کو وہیں سے واپس جانا تھا اور مجھے کھیزا رانھور پہنچنا تھا۔ عورت بھی قدرت کی عجیب مخلوق ہے کہ جس کے حصول کی خاطر مرد اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ مجھ سے بھی ایک جن زاد ہو کر ایسی ہی حماقت سرزد ہوئی تھی۔

لاشوں کو وہیں خیمے کے اندر ڈال کر ہم دونوں اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پولیس کی وردی جسم پر ہونے کے سبب اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک جانب سے کسی کی بھاری آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

میں نے تیزی سے ادھر پلٹ کر دیکھا۔ مجھے ایک پولیس پارٹی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں رک گیا کہ ان کی نظر میں آچکا تھا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اس وقت کسی پولیس والے کا تنہا کسی طرف جانا اسے بہر حال مشتبہ بنا سکتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

”کدھر جا رہے ہو تم اس وقت؟“ ایک پولیس والے نے مجھ سے سوال کیا جو اس پولیس کا نگراں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر موجود وردی سے میں سمجھ گیا کہ وہ اے ایس آئی ہے۔ میں بہر حال ایک کانسٹیبل کی وردی پہنے ہوئے تھا اور اس سے رتبے میں کم تھا۔

”سر! آپ کی بہت مہربانی ہوگی، اگر مجھے جانے دیں۔“ میں عاجزی سے بولا۔

”لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟“ اے ایس آئی نے حیرت سے پوچھا۔

”کھیزا رانھور گاؤں، اپنے بیوی بچوں سے ملنے۔ تین مہینے سے میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ سر! آپ یقین کریں کہ میں صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔“

”ہوں۔ تو یہ پکڑ ہے۔“ اے ایس آئی نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا، پھر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ایک شرط پر تمہیں جانے دوں گا کہ تم سچ بول دو۔ بچوں کی زیادہ یاد آ رہی تھی تمہیں یہ بیوی سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا؟“

”ویسے تو سر، بچوں کی یاد بھی آ رہی تھی، لیکن“ میں نے شرمندہ ہونے کی بھرپور ادارکاری کی اور دانست اپنا جملہ ادھر ادھر اچھوڑ دیا۔

اے ایس آئی ہنس پڑا اور بولا۔ ”اچھا جا، کیا یاد کرے گا، عیش کر، مگر صبح سے پہلے ضرور واپس آ جانا۔“

”بالکل سر، بالکل۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

یوں اس پولیس پارٹی سے میری جان چھوٹی۔ ان پولیس والوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا

میں آج ہی رات کھیزا رانھور پہنچنا چاہتا تھا، مگر پہلے اس کے لئے بندوبست کرنا تھا۔ میں اس وقت وہی بندوبست کرنے غاروں سے نکلا تھا۔ جلد ہی کوئی نصف گھنٹے کے بعد ہم اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں پولیس نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ راستے میں روپا کو میں نے اپنے خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔

اندھیرے میں خیموں کے بیولے دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ معاً میں نے دور سے بھاری قدموں کی چاپ قریب آتے سنی تو چونک اٹھا۔ آنے والا تھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے روپا کا ہاتھ پکڑا اور تیزی کے ساتھ ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد آٹھ دس پولیس والے کچھ فاصلے سے گزرے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پولیس کی ایک گشتی پارٹی تھی۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ ایسی ہی کچھ اور پارٹیاں بھی گشت پر ہوں۔ ظاہر ہے ان پارٹیوں کے گشت کا مقصد خطرے کے وقت اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دینا ہو گا جو آرام سے سو رہے تھے۔ ان کی وجہ سے میرے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا، پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔

پولیس پارٹی دور نکل گئی تو میں نے جینی میں لگا ہوا خنجر باہر کھینچا، پھر روپا سے سرگوشی کی۔ ”پہلے اسی خیمے کو دیکھتے ہیں، ممکن ہے اس میں زیادہ پولیس والے نہ ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے خنجر کی نوک خیمے کے کپڑے میں اتار دی۔ پھر جب پھٹے ہوئے حصے کے شگاف سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو مایوسی کے ساتھ سر ہلا کر رہ گیا۔

”کیا ہوا تانا؟“ روپا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”میں اس چندرہ پولیس والے ایک قطار میں سو رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کوئی ایسا

خیمہ تلاش کرنا ہے جہاں دو تین پولیس والوں سے زیادہ نہ ہوں۔“

”یہ تو مشکل لگتا ہے تانا۔“ روپا بولا، پھر ایک تجویز پیش کی۔

روپا کی تجویز خطرناک تو ضرور تھی، مگر اس پر عمل کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس تجویز سے زیادہ خطرہ کسی ایسے خیمے کی تلاش ہوتا میں جس میں دو تین پولیس والوں سے زیادہ نہ ہوتے۔ اس تلاش میں ہم خیموں کے درمیان اور اطراف گشت کرنے والی کسی پولیس پارٹی کی نظر میں آ جاتے تو پھر ہمارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ ہمارے چاروں طرف پولیس والے ہوتے اور ہمیں با آسانی شکار کر لیا جاتا۔

”ٹھیک ہے روپا۔“ میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

خیمے کے شگاف کو وسیع کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ روپا اور میں اب اس شگاف سے اندر

داخل ہو سکتے تھے۔

اس شگاف کے قریب ہی جو دو پولیس والے سو رہے تھے، ہم دونوں ان پر اس طرح جھپٹے جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ہماری کامیابی کا دار و مدار اس پر تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی آواز نہ نکال سکے۔ میں نے اپنے شکار کے سینے پر چڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبا لی اور اس وقت تک دباؤ برقرار رکھا جب تک میرے شکار کا جسم ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔ ایسا ہی یقیناً روپا نے بھی کیا تھا۔ دونوں

ہو گا کہ جس ٹھاکر بلونت سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے انہوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے، وہ انہیں بڑی صفائی سے بے وقوف بنا کر چلا گیا ہے۔

میں جب اپنی گڑھی میں داخل ہو کر گھر کا صدر دروازہ کھلو کر اندر پہنچا تو سبھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ میری آمد کی وجہ سے سبھی جاگ اٹھے تھے۔ بھرت کی نو بیاہتا بیوی نے آکر میرے پیچھے چھوئے۔ رکنی ایک طرف کھڑی تھی اور میری نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”کچھ دیر آرام کر کے میں چلا جاؤں گا، رکنی دروازہ بند کر لے گی۔“ میں نے پہلے ہی سے کہہ دیا۔

”ہاں چھوٹے، صبح سے پہلے تمہاری واپسی ضروری ہے، بھول نہ جانا۔“ نواب سنگھ کہنے لگا۔

”یہ بات بھی بھلا بھولنے والی ہے۔“ میں یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رکنی میرے پیچھے پیچھے تھی۔

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی رکنی میری بانہوں میں سٹ آئی۔

”پہلے میرے بیٹوں کی خیریت تو دے دو۔“ وہ بولی۔

”سب خیریت سے ہیں، ایک میں ہی خیریت سے نہیں تھا۔“

”کیوں، کیا ہوا؟ بھگوان نہ کرے طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی تھی؟“ اس کے لہجے میں بلا کا بچا تھا۔

”طبیعت تو تمہیں دیکھ کر خراب ہو رہی ہے۔“

واپسی میں پھر دو پولیس پارٹیاں ملیں، مگر کسی نے مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روکا۔ ان میں سے ایک ونی پارٹی تھی جو پہلے جاتے وقت ملی تھی۔

اس وقت تک سورج نکلنا نہیں تھا جب میں غاروں میں پہنچ گیا تھا۔

رکنی سے ملاقات کے بعد میرے دل کو بڑی حد تک قرار آ گیا تھا۔ سو میں، پولیس کی نقل حرکت کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ میرے تجربوں کی دوڑ دھوپ بڑھ گئی۔ مجھے تمام اطلاعات مل گئیں کہ پولیس کس طرف سے آگے بڑھ رہی ہے اور اس نے کہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔ کٹاؤ کے اندر میں بار ٹھکانے بدلنے لگا۔ پھر یو پی میں مجھ پر زیادہ دباؤ بڑھا تو میں مدھیہ پردیش میں جا گھسا۔ میں نے گواہ میں اپنا ٹھکانا بنایا اور پھر وہاں کے دیہات پر حملے کرنے لگا۔

میں کچھ ہی دن میں گوالیار پولیس کے لئے دردسہ بن گیا۔ اخبارات کے صفحات میری لوٹ مار، قتل و غارت گری کی خبروں کے لئے زیادہ جگہ دینے لگے۔ حکومت پر تنقید ہونے لگی۔ لوگ پوچھ رہے تھے کہ کیا ہماری حکومت، پولیس اور فوج سب کے سب سو رہے تھے؟

اگرے کا ایڈیشنل ایس پی گوریلا پولیس کی ایک گارڈ لے کر میری تلاش میں روانہ ہوا۔ اس اپنے خیال کا اظہار کیا تھا کہ ڈاکوؤں کا مقابلہ خود انہی کے انداز میں کیا جائے۔ بھیڑ کا ایک پولیس اہل چیل بھی میدان میں اترا کہ میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔

میرا پہلا ٹھکانہ مہادیر گاؤں کے قریب پٹیل ہی سے ہوا۔ اطلاعات کے مطابق حکومت بڑی بے چینی سے میری گرفتاری یا موت کی خبر سننے کا انتظار کر رہی تھی، مگر مہادیر گاؤں کے ٹھکانہ میں بڑی صفائی سے میں چکر دے کر نکل گیا۔ اگرے کا ایس بی مہادیر اور پٹیل دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ان دونوں نے مشترکہ طور پر مجھے گھیر کر ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر وہ کامیاب تو اس وقت ہوتے جب میں بے خبر ہوتا۔ میرے خبر پوری تن دی سے مجھے درست اطلاعات فراہم کر رہے تھے۔ مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ مہادیر اور پٹیل باری باری مجھے دونوں طرف سے گھیریں گے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پٹیل مجھ پر ایک طرف سے دباؤ ڈالے گا تو میں لازماً مخالف سمت جاؤں گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں تیسری سمت بچ کر فرار ہو گیا۔ پٹیل سے میرے ٹھکانہ کی اطلاع ملنے ہی مہادیر نے حفظ ماتقدم کے طور پر عقب سے پیش قدمی شروع کر دی، لیکن اس وقت تک میں بہت دور جا چکا تھا۔ یو پی کے علاوہ صوبہ مدھیہ پردیش نے بھی میرے خلاف طاقت آزمائی شروع کر دی۔ گوالیار کے کرٹل مکمل سنگھ کی کمان میں فوج کی ایک تربیت یافتہ کمپنی نے میرا تعاقب شروع کر دیا۔ دن رات یہ تعاقب جاری رہتا تھا کہ کہیں تو مجھ سے ٹکراؤ ہو گا ہی۔

میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ میں ایک رات بھی کہیں چین سے نہیں گزار سکتا تھا۔ اس دوران مجھے کہیں ڈاکا ڈالنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ میں ہر وقت پولیس کی دسترس سے دور رہنے کے لئے فوسر رہتا تھا۔

بار بار پولیس سے میرا مقابلہ ہوتا، سخت لڑائی ہوتی۔ پھر جب کار توں کم پڑنے لگتے میں فرار ہو جاتا۔ یہ حقیقت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ ان مقابلوں کی صورت میں، میں کچھ دب گیا۔ میں بہر حال ایک جن زاد تھا اسی لئے بار بار خیال آتا کہ اگر کسی طرح میری جناتی صفات مجھے واپس مل جائیں تو ان پولیس والوں سے بھگت لوں۔ کچھ لمحے دعا کی قبولیت کے ہوتے ہیں، سو میرے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی دعا کم از کم ایک حد تک قبول ہو گئی، مگر فوری طور پر نہیں۔ دعا کی قبولیت کو عملی شکل اختیار کرنے میں ایک عرصہ لگا۔ یہ الگ بات کہ اپنے اندر خود بخود پیدا ہو جانے والی اس پراسرار قوت سے مجھے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کا تفصیلی ذکر میں اپنے آئندہ پیش آنے والے واقعات میں کروں گا۔

میرے پاس خاصی دولت تھی۔ میں طویل عرصے تک ڈاکا ڈالے بغیر خوش حال زندگی گزار سکتا تھا۔ اپنے کردہ کے اخراجات برداشت کرنا بھی میرے بس میں تھا۔ میں نے اسی لئے ایک فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ بڑے نزدیک حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت مناسب تھا۔ اس فیصلے کا محرک روپا تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ”تایا! ہم کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے؟“

”روپا! اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں اس کھیل کو ختم کرنے کے متعلق پلے ہی بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

روپا جانے کیا سمجھا اور پوچھنے لگا۔ ”کون سا کھیل تایا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”میں چوہے اور بلی کا کھیل۔ اس کے لئے ہمیں کچھ قربانی دینا پڑے گی۔“

”قربانی؟“

”ہاں روپا۔ مال کی قربانی۔ اب اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔“
”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھتا۔“

”پڑھا لکھا ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”بول پولیس کے اور ہمارے درمیان کس بات پر جھگڑا ہے.....؟ یہی ناکہ وہ خود کو قانون کا محافظ کہتی ہے اور ہم قانون شکن ہیں۔ ہم ڈاکے ڈالنا چاہتے ہیں اور پولیس ہمیں ایسا نہیں کرنے دے رہی۔ فرض کر کے ہم وقتی طور پر کچھ عرصے کے لئے پولیس کو دھوکا دینے کی خاطر قانون شکنی چھوڑ دیں، کہیں ڈاکا ڈالنے کی کوشش نہ کریں، بالکل خاموش بیٹھ جائیں تو ہمارے اور پولیس کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں رہے گا نا..... ظاہر ہے کہ اس طرح ہمیں مالی نقصان ہوگا۔ میں نے اسی کو مال کی قربانی کا نام دیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم با آسانی چار پانچ مہینے گزار سکتے ہیں۔ ان چار پانچ مہینوں میں ہم.....“ میں نے روپا کو آئندہ اقدامات سے آگاہ کیا۔

میری بات میں بہر حال اتنا وزن تھا کہ روپا قائل ہو گیا۔
پھر چار پانچ مہینے اسی طرح خاموشی سے گزر گئے جیسے ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی میرا کہیں اور کبھی وجہ ہی نہیں تھا، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں اس دوران ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ میں اس عرصے میں اپنے گھر کو اور مضبوط کر لیا تھا۔ ہتھیاروں کی کمی میں نے پوری کر لی تھی۔ میرے پار اب کار توں بھی کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ ان تمام تیاریوں کے باوجود میں اپنی مجاہدہ رکنی کو نہیں بھولا تھا۔ مہینے میں ایک بار میں اس سے ضرور ملتا تھا۔

ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر میں میدان میں آ گیا۔ مجھے اب سے بڑی فکر اپنے دشمن نیتارام کو ختم کرنے کی تھی۔ کچھ بھروسہ نہیں تھا کہ مجھے کب بلونت سنگھ کا ج چھوڑنا پڑتا۔ پولیس سے معرکہ آرائی کے نتیجے میں کسی وقت بھی یہ مرحلہ آ سکتا تھا۔ میری محبوبہ رکنی خواہش بھی یہی تھی۔ میں بھلا رکنی کی خواہش کیسے پوری نہ کرتا۔ میں اگر نیتارام کو قتل کئے بغیر بلونت سنگھ کا جسم چھوڑ دیتا تو رکنی ہمیشہ بے چین رہتی۔

بلونت سنگھ کا بڑا بھائی نواب سنگھ بھی گھر میں بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا تھا اور پولیس بھی کسی طرح اچھٹانے کے چکر میں تھی۔ نواب سنگھ کئی مرتبہ مجھ سے اس بات کا اظہار کر چکا تھا۔ اب تک میں اٹالتا رہا تھا، لیکن پولیس کی طرف سے خطرے کے سبب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ نیتارام پولیس کی حفاظت میں تھا۔ آخر نواب سنگھ نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا اور میرے پاس چنبل کے غاروں میں آ گیا۔ چند ہی روز کے بعد روپا نے ایک مخبر کی طرف سے موصول ہونے والی اطلاع سے مجھے آگاہ کیا۔ ”نیتارام کا لڑکا اور لڑکی اپنی نانی کے گھر گئے ہیں۔ انہیں وہاں سے گاؤں واپس لانے کے لئے پولے ایک آدمی جانے والا ہے۔“

میں نے روپا کا مقصد سمجھ لیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اسی لئے بولا۔ ”روپا! پہلے باپ کو ختم کرو، ان“

بچوں پر ہاتھ اٹھانا.....“

میری بات ادھوری رہ گئی اور نواب سنگھ بول اٹھا۔ ”بلونت سنگھ! ایسی کمزوری نہ دکھانا.....“
”جیسے اور میرے بیٹے کون سے پوری طرح جوان ہو گئے تھے؟ ابھی تو ان کی صرف متیں ہی بیٹگی تھیں اور اس عمر میں انہیں ختم کر دیا گیا۔ نیتارام پولیس کی حفاظت میں ہونے کے سبب بڑا ہانک رہا ہے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اب کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ جب وہ اپنی اولاد کے بارے میں سنے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ کون کتنے دن کا مہمان ہے۔“

روپا یہی چاہتا تھا۔ نواب سنگھ کے آنے سے اسے بڑا سہارا مل گیا تھا۔ وہ جلدی سے کہنے لگا۔ ”ہاں“
”ہاں، بڑے ابا ٹھیک کہتے ہیں۔ نیتارام نے میرے بے گناہ چاچا کو پولیس کے ہاتھوں مرادیا، یہ اس قتل کے بدلے لینے کا وقت ہے۔“

نواب سنگھ اور روپا کے اصرار پر میں نے دل مضبوط کر کے کہہ ہی دیا۔ ”اچھا تم لوگ یہی چاہتے ہو تو پہلے ڈالی کاٹ دیتے ہیں، تنے کی باری بعد میں۔“

میں پوری ضلع کے کان گرا گاؤں میں پولیس کے مخبر رام سروپ کو نیتارام کے لڑکے اور لڑکی کو بلانے بھیجا گیا تھا۔ یہ بات بہت خفیہ رکھی گئی تھی۔ خود نیتارام پولیس کی نگرانی میں تھا۔ اسے بچوں کو لینے نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق اٹھتے بیٹھتے اسے میرا خیال ستاتا رہتا تھا۔ اسے پولیس کے آدمی سادہ لباس میں باہر لے جاتے۔ سادہ لباس پولیس والے ہی اس کے بچوں کی حفاظت کرتے۔ اسکول میں سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو اس نے بچوں کو نانا کے گھر بھیج دیا۔
میں نے پولیس کی دسترس سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے ساتھیوں میں سے اکثر کے لئے پولیس کی وردیوں کا بندوبست کر دیا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ رام سروپ گلی کے کنویں پر نما رہا تھا۔ دوسری طرف - بچے برتن اٹھا رہے تھے۔ ابھی وہ نما ہی رہا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ ہم سب کے جسموں پر پولیس کی وردیاں تھیں۔ خاکی لباس میں مسلح افراد کو دیکھ کر گاؤں والے ہمیں پولیس والے ہی سمجھے، مگر رام سروپ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا جو اٹھا کا اٹھا رہا تھا۔ رام سروپ مجھے پہچانتا تھا۔ اب یہ بات گلی راز نہیں رہی تھی کہ میں اور میرے ساتھی، پولیس کی وردیاں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں۔
”ارے باپ رے!“ رام سروپ اچانک چیخ اٹھا۔ ”ڈاکو..... ڈاکو آئے..... بھاگو۔“ پھر ان نے لوٹا پھینک کر کنویں پر سے جست لگائی۔

برتن مٹھتی ہوئی عورتیں گھبرا گھبرا کر بھاگنے لگیں۔ گلی میں کھیتے ہوئے بچے چھپ گئے۔ رام سروپ پانی پٹکاٹی ہوئی دھوتی سنبھالتا بھاگ رہا تھا۔ میں اسے پہلے ہی پہچان چکا تھا۔ میں نے اپنی رائفل الٹ کر اس کی طرف سیدھی کی اور پھر دوسرے ہی لمحے فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔

پہلے جس جسم سے پانی ٹپک رہا تھا، اب اسی جسم سے خون ٹپکنے لگا۔ میں قریب پہنچا تو رام سروپ گم ہو چکا تھا۔ میں خاص طور پر پولیس کے ایسے مخبروں کو زندہ نہیں چھوڑتا تھا جو مجھے پہچانتے تھے۔ رام سروپ بھی انہی میں سے ایک تھا۔

نیتارام ہوگا۔ پولیس کے سخت پورے کے باوجود اگر میں نیتارام کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو حکومت اس داغ کو نہ دھوپائی۔ نیتارام کی سلامتی گویا پولیس کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

میں کچھ دن بے چین رہا۔ بار بار میری آنکھوں میں نیتارام کے معصوم بیٹے کا چہرہ گھونٹنے لگتا اور ہر دل بے چین ہو جاتا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنے دل کو سمجھانا شروع کیا، میں کوئی آدم زاد نہیں ایک جن زاد ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنی رکنی کی خاطر کیا ہے۔ میں نے اپنی محبوبہ سے عہد کیا تھا کہ تلسی رام کے پورے خاندان کو ختم کر دوں گا۔ پھر بھلا میں نے نیتارام کے بیٹے کو مار کے کیا قصور کیا تھا۔ مجھے تو دشمن کا خون بہانا تھا تو پھر خون کسی جوان کا ہو یا بچے کا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب مجھے صرف نیتارام کو قتل کرنا تھا۔ اس کے بعد میرا عہد پورا ہو جاتا۔ پھر چاہے مجھے بلونت سنگھ کا جسم چھوڑنا پڑتا، کوئی پروا نہ ہوتی۔

☆=====☆=====☆

میں بہر حال اپنا عہد پورا کرنا چاہتا تھا۔ اسی خیال کے تحت ایک روز میں نے روپا سے کہا۔ ”روپا! نیتارام کبھی پولیس کی حفاظت سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس انتظار میں برسوں گزر جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ تدبیر لازمی ہے۔“

”تایا! آپ مجھے اجازت دیں تو میں پولیس کی حفاظت کے باوجود اسے قتل کر آؤں گا۔“ روپا بڑے اعتماد سے بولا۔

روپا نے بات پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا، مگر مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ جس طرح شکاری کسی درندے کو شکار کرنے کی غرض سے جانور کو چارے کے طور پر استعمال کرتا ہے اسی طرح پولیس نیتارام کے ذریعے مجھے پھانسا چاہتی تھی۔

”روپا! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام کسی دوسرے کے سپرد کیا جائے جسے پولیس پہچانتی نہ ہو۔ وہ نیتارام تک پہنچ بھی جائے تو پولیس کو شک نہ ہو۔“ میں نے پہلی مرتبہ اپنے مزاج کے خلاف بات کی۔ پہلے میں یہ ضد تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے نیتارام کو قتل کروں گا۔

روپا نے میری بات سن کر اظہار حیرت کیا۔ ”یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں تایا؟“ پھر وہ خود ہی بولا۔ ”ویسے یہ ٹھیک ہی ہے۔ اس طرح آپ کی زندگی خطرے میں نہیں پڑے گی۔“ روپا کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ اس کا اندازہ مجھے بھی تھا کہ روپا یہی چاہتا تھا، مگر سوال یہ تھا کہ یہ کام کس کے سپرد کیا جائے؟

میرے لئے الجھن بڑھ رہی تھی۔ پولیس میرے تعاقب میں تھی۔ آخر میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا۔ ”میرے گردہ میں سے جو شخص نیتارام کو ختم کرے گا اسے میں دس ہزار روپے نقد انعام دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے ساتھیوں کے چروں کا جائزہ لیا۔ ان کے چروں سے بے یقینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں پھر بولنے لگا۔ ”مگر یہ بات یاد رکھنا کہ یہ کام جان پر کھیل کر ہی ہو سکتا ہے۔ نیتارام کو پولیس ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ وہاں تک پہنچنا پہلا خطرہ ہے۔

کنویں کے قریب ہی ایک گھر تھا۔ راتفل کا دھماکہ سن کر کوئی اس گھر کے کھلے ہوئے دروازے کو بند کرنے آیا۔ روپا نے آگے بڑھ کر اس دروازے پر ٹھوکر ماری، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تایا! اطلاع کے مطابق نیتارام کے بچے اسی گھر میں ہیں۔“

روپا نے ٹھوکر مار کر اس گھر کا دروازہ بند نہیں ہونے دیا تھا۔ نتیجتاً وہ دندنا ہوا گھر میں گھس گیا۔ میں بھی روپا کے پیچھے لپکا۔

”کہاں ہے نیتارام کا بیٹا؟“ میری گرج سن کر کونے میں چھپی ہوئی عورتیں کانپنے لگیں۔ ”جلدی بتاؤ ورنہ گھر میں جتنے بھی افراد ہیں سب کو ختم کر دوں گا۔“

”اسے نہ مارو..... میرے بھائی کو نہ مارو۔“ نیتارام کی بچی اپنی بھائی کا بازو پکڑ کر بلکنے لگی۔

میں اس معصوم بچی کے آنسو نہ دیکھ سکا، غراب واپسی ناممکن تھی۔ روپا آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی کا بازو تھاما اور اسے دور پھینک دیا۔

”تم خواہ مخواہ ختم ہو جاؤ گی۔“ روپا غصے سے چیخا۔

میں نے راتفل کی ٹال سیدھی کی۔ میرے سامنے ایک آٹھ سالہ بچہ سما ہوا کھڑا تھا۔ اس بچے کی معصوم آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بھاگا اور دیوار میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ کچھ دیر کو میرے دل میں رحم کا جو جذبہ جاگا تھا، اسے میں نے تھک کر سلا دیا اور بے رحم بن گیا۔ لڑکے نے اگر دیوار کی طرف منہ نہ کیا ہوتا تو شاید میں اسے جھوڑ دیتا۔ پھر بھی میں اس معصوم بچے پر فائز کرتے ہوئے اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔ آخر کار میں نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دھیمی سی ایک چیخ سنائی دی جو میرے دل میں اتر گئی۔ اگر وہ بچہ میرے دشمن نیتارام کا نہ ہوتا تو شاید مجھ میں اسے قتل کرنے کی ہمت پیدا نہ ہوتی۔ دشمنی نے مجھے بہت بے رحم بنا دیا تھا۔

چھوٹے بھائی کی لہولہان لاش سے چمٹ کر جس طرح معصوم بہن روئی، وہ منظر دیکھنا میرے لئے ممکن نہ ہوا۔ میں اس طرف سے منہ پھیر کر بھاری قدموں کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔ روپا ابھی گھر کے

میں تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ روپا کا دل ابھی بھی نہیں بھرا ہوگا۔ وہ نیتارام کی بیٹی کو بھی شاید زندہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لئے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”روپا! جلدی واپس چلو۔“ میری آواز خود بخود بھرا گئی۔ جنبل کے غاروں تک پہنچنے سے پہلے میں نے زبان نہیں کھولی۔

اپنے مخبروں کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ بیٹے کی موت نے نیتارام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جھولی بچہ پھیلا کر مجھے بدعنائیں دے رہا تھا۔

اس ہولناک واقعے سے پولیس کی عزت پر داغ لگ گیا۔ مجھے اطلاعات ملنے لگیں کہ اب پہلے بھی زیادہ زور و شور سے ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرنے کی تیاریاں ہونے لگی ہیں۔ مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرانے والے کو اب ایک لاکھ کی چوتھی یعنی پچیس ہزار روپے انعام دیے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ اب پولیس کو اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میرا دوسرا

یہ ایک طرح سے دس ہزار روپے میں موت کا سودا ہے۔” وہاں بہت سے خطرناک لوگ موجود تھے۔ مجھے معلوم تھا اس بات کا بھی کو اندازہ تھا کہ میں جو کام کسی کے سپرد کر رہا ہوں، وہ انتہائی خطرناک ہی ہو سکتا ہے۔

”فرض کریں سردار کہ نیتارام کو قتل کرنے والا خود بھی مارا جائے تو پھر؟“ کسی نے سوال کیا۔

”تو کیا تایا دس ہزار روپے نہیں دیں گے؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ روپا گرم ہو گیا۔

”نہیں روپا! اس کا سوال غلط نہیں۔ تمہیں اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے روپا سے کہا، پھر بولا۔ ”اگر ایسا ہوا تو کام ختم ہونے کے بعد نیتارام کو قتل کرنے والا شخص دس ہزار روپے جس کو دینے کے لئے کہہ جائے گا، اسے ادا کر دیئے جائیں گے۔“

”پھر میں تیار ہوں۔“ ایک پر عزم و مضبوط آواز سنائی دی۔

سب کی نظریں اس نوجوان پر جم گئیں۔ میں نے اس کے چہرے پر حوصلے کی جھلک دیکھ لی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جوان کام کر گزرے گا۔

”ٹیکا! ابھی تم نے ہو مگر مجھے تمہاری طاقت پر اعتماد ہے، بولو کب جا رہے ہو؟“ میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

”ٹھیک! میں کام تو پورا کروں گا، لیکن زندہ واپس نہ ہوا تو دوسرا کام رہ جائے گا۔“ ٹیکا چند لمبے رک کر بولا۔ ”میری بہن کو حکم سنکھ نے زبردستی اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ اسی کو آزادی دلانے کی خاطر میں نے جنبل کا رخ کیا تھا۔“

میں نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے ٹیکا۔“ میں سمجھ گیا کہ ٹیکا کو دس ہزار روپے سے زیادہ اپنی بہن کی فکر ہے۔ سو میں نے مزید کہا۔ ”اگر تم گرفتار ہو گئے یا مارے گئے تو تمہاری بہن کی رہائی کا میں ذمہ دار ہوں اور رقم کا بھی۔“

”سردار! آپ کو میری مدد کے لئے دو آدمی ساتھ کرنا پڑیں گے۔“ ٹیکا نے کہا۔

”گنجادھر برہمن اور میرا بیٹا صوبیدار تمہاری مدد کے لئے ساتھ جائیں گے۔“ میں راضی ہو گیا۔ ”مگر ایک بات کا خیال رکھنا، گاؤں کے سارے لوگ میرے بیٹے کو پہچانتے ہیں، اسے انتہائی ضرورت کے وقت گاؤں کے اندر لے جانا۔“

صوبیدار سنکھ کو ٹیکا کے ساتھ بھیجنے سے مجھے یہ تسلی تھی کہ میں نے سارا کام غیر کے سپرد نہیں کیا۔ ٹیکا نے صوبیدار کو ساتھ تو لیا مگر وہ اسے خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ وعدہ کر لیا تھا۔ ٹیکا کے لہجے سے سچائی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وار کرتے وقت میں گنجادھر کو آگے بڑھاؤں گا۔

اسی رات کو تینوں طے شدہ وقت پر روانہ ہو گئے۔

کھیزا راٹھور میں میرے جو تجربے تھے، وہ مجھے نیتارام کے معمولات سے آگاہ کر چکے تھے۔ ٹیکا اور بقیہ دونوں افراد کو میں نے ان معلومات سے آگاہ کر دیا تھا۔

نیتارام کا بیشتر وقت پولیس تھانے میں گزرتا تھا۔ دہرے کے وقت وہ تھانے کے قریب آشادرام مٹھائی والے کی دکان پر جا بیٹھتا، مگر صرف شام چار بجے تک۔ شام ہی کو میرے خوف سے گاؤں کا سارا بازار بند ہو جاتا تھا۔ نیتارام بازار بند ہونے سے پہلے ہی تھانے میں گھس جاتا تھا۔ وہ اس امید پر یہ مصیبت اٹھا رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو میں مارا ہی جاؤں گا۔ پھر وہ کھلے عام جہاں چاہے آ جاسکے گا۔

یہی وہ رات تھی کہ جب میرے اندر ایک نئی پراسرار قوت بیدار ہوئی۔ ٹیکا، صوبیدار اور گنجادھر کی روانگی کے بعد میں کوشش کے باوجود سو نہیں سکا۔ مجھے اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے صوبیدار کو ٹیکا کے ساتھ نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ وہ میرا بیٹا نہ سہی مگر میری محبوبہ رکشی کا بیٹا تو تھا۔ اسے اگر کچھ ہو جاتا تو میں بھلا رکشی کو کیا منہ دکھاتا۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں صوبیدار کا چہرہ ابھرا اور میں چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ میں نے ٹیکا اور گنجادھر کو بھی واضح طور پر جنبل کے غاروں سے باہر نکلنے دیکھا۔ میں آنکھیں بند کئے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح جب بیدار ہوا تو رات کو پیش آنے والا پراسرار واقعہ یاد آیا۔ میں نے سوچا، کیا اب بھی ان تینوں کو آنکھیں بند کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے صوبیدار کے چہرے کا دھیان کیا، اس امید پر کہ وہ مجھے نظر آ جائے گا۔ میری توقع بے سود ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے صوبیدار کو ٹیکا اور گنجادھر کے ساتھ گاؤں سے باہر باجرے کے ایک کھیت میں چھپے دیکھا۔ میرا دل مطمئن ہو گیا کہ وہ تینوں خیریت سے تھے۔

ٹیکا مجھے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کر کے گیا تھا۔ میں نے اسی لئے اس وقت پھر اپنے غار کی راہ لی، جب سورج سر پر آ گیا۔ اپنے ساتھیوں کو میں یہ تاکید کرنا نہیں بھولا تھا کہ کسی کو بھی میرے غار میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

کچھ ہی دیر کے بعد ایک بار پھر میں اسی پراسرار تجربے سے گزر رہا تھا جس سے دو مرتبہ پہلے بھی گزر چکا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کرتے ہی باجرے کا وہی کھیت دیکھا جو صبح دم دیکھ چکا تھا۔ ٹیکا اور گنجادھر بھیں بدل کر اس کھیت سے باہر نکل رہے تھے۔ سائینسروالی خود کار گمن اور دستی بموں کی پوٹلی ٹیکا نے اپنے سر پر اٹھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاؤں کا کوئی کسان بازار میں خرید و فروخت کے لئے آیا ہو۔

پھر میں نے واضح طور پر ٹیکا کی آواز بھی سنی۔ وہ گنجادھر سے مخاطب تھا۔ ”سنو! نیتارام کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایک کی بجائے دوسرے کو مار دیا جائے تو زحمت الگ ہوگی اور جان خطرے میں الگ پڑے گی۔“

جواب میں گنجادھر کی آواز سنائی دی۔ ”نہیں ٹیکا! ایسی غلطی نہیں ہو سکتی۔ سب کہتے ہیں کہ نیتارام اپنے باپ کا ہم شکل ہے۔ میں نے اس کے باپ کو اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ مجھے آج

مٹھائی والا اندر جلیبی قتل رہا تھا۔ نیتارام نے اسے زحمت نہ دینے کی غرض سے ترازو کے پلڑے میں دس سیر کا باٹ رکھا، دوسرے ہاتھ سے بتاشوں کی مٹھی بھر لے گا۔ اسی لمحے میکا نے گن باہر نکال لی۔

”نیتارام! آج ٹھاکر بلونت سنگھ کا پلڑا بھاری ہے۔“ یہ کہتے ہی میکا نے گولی چلا دی۔

نیتارام کو مارنے کے لئے ایک گولی کافی تھی، لیکن میکا نے پھر بھی تین چار گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ نیتارام چیخ بھی نہ سکا۔ جس طرح بیضا تھا اسی طرح لڑکھ گیا۔ ترازو کے پلڑے میں دس سیر کا باٹ رکھا تھا اور دوسرے پلڑے میں نیتارام کے بے جان ہاتھ کی کلائی تھی۔

سارے بازار میں شور مچ گیا۔ گنجادھر اور میکا بھاگے۔ فرار ہوتے وقت گنجادھر کو میں نے جانوروں کے اسپتال کے کپاؤنڈر کرشن سے ٹکراتے دیکھا۔ کرشن نے گنجادھر کو پکڑنا چاہا، لیکن گنجادھر نے کرشن پر گولی چلا دی۔ گولی کرشن کی کلائی کو گرزتی ہوئی گزر گئی۔ پھر بھی کرشن پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ گنجادھر کے پیچھے بھاگا۔ اسے اپنے تعاقب سے روکنے کے لئے گنجادھر نے دستی بم پھینکا، مگر جلدی میں وہ بم کی پن نہیں کھینچ سکا، لہذا وار خالی گیا۔ سامنے سے فوربیک ڈرائیور آ رہا تھا۔ اسی وقت مجھے تھانے سے کچھ سپاہی نکلتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ وہ سب انسپکٹر گنجادھر کو پکڑتا تھا۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنا پستول نکالا اور گنجادھر کا سینہ چھد ڈالا۔ لوگ سکتے میں آ گئے۔

”زندہ ہاتھ لگا تھا، پھر اسے ختم کیوں کر دیا؟“ کسی طرف سے آواز آئی۔

”ایسے شخص کو ختم کرنے ہی میں ہماری سلامتی ہے۔ ان لوگوں کے خلاف عدالت میں کوئی گواہی نہیں دیتا۔ پھر اگر یہ عدم ثبوت کی وجہ سے رہا ہو جائیں تو بدنامی ہمارے سر آتی ہے۔“ سب انسپکٹر نے اپنی صفائی پیش کی۔

مجھے میکا کی فکر ہوئی۔ میرے دھیان میں اس کا چہرہ ابھرا۔ پھر وہ مجھے نظر آ گیا۔ میکا کا بھی وہی حال ہوا۔ ایک پولیس والا خالی لوٹا لئے سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے میکا کے ہاتھ سے گن چھیننے کی کوشش کی، مگر میکا نے اسے بھون دیا۔ اسی وقت پولیس کا ایک خبر دو سارا رام ادھر آ نکلا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔ اس نے میکا کو ختم کر دیا۔

ہر چند کہ صوبیدار گاؤں سے باہر تھا مگر اپنے دو ساتھیوں کے قتل سے میں گھبرا گیا۔ ذرا ہی دیر کے بعد میری چشم تصور نے اسے بھی دیکھ لیا۔

دھاکوں کی آوازیں یقیناً اس نے بھی سن لی تھیں۔ گاؤں کے کنارے ہی میرے ایک مخبر کا گھر تھا۔ میں نے صوبیدار کو باجرے کے کھیت سے نکل کر ادھر جاتے دیکھا۔ صوبیدار اس مخبر کے ذریعے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، میں سمجھ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ اس مخبر کو پہلے ہی حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے ایک ساتھی کو مجھے یہ اطلاع پہنچانے روانہ کر دیا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ صوبیدار نے سمجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔“

”ہاں چھوٹے ٹھاکر، آپ جائیں۔ یہاں آپ کے لئے خطرہ ہے۔“ مخبر نے تاکید کی۔

صوبیدار نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنے غار

بھی یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں دیکھنے ہی نیتارام کو پہچان لوں گا۔“

پھر میں نے ان دونوں کو گاؤں کے بازار میں داخل ہوتے دیکھا۔ شام ابھی کافی دور تھی۔ پولیس تھانے کے پاس سے گزرتے ہوئے میکا چونکا دکھائی دینے لگا۔ برابر میں مٹھائی والے کی دکان تھی۔ نیتارام اسی وقت دکان پر آ کر بیٹھتا تھا۔ میں نے مٹھائی کی دکان پر کھلے جسم والے ایک شخص کو بیٹھے دیکھا اور میرے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ برہمنوں کی طرح اس کے جسم پر بھی جینیو پڑا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں گنجادھر دھوکا نہ کھا جائے۔ کیونکہ وہ نیتارام نہیں گاؤں کا ایک اور شخص رام گوپال تھا۔ میکا نے سوالیہ نظروں سے گنجادھر کی طرف دیکھا۔ گنجادھر اس شخص کو کن آنکھوں سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

معاً مجھے گنجادھر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”وہ اتنا دلا نہیں ہو سکتا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا۔“

دونوں آگے نکل گئے تو مجھے اطمینان ہوا۔ گنجادھر نے وہ غلطی نہیں کی تھی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میکا اور گنجادھر خریداری کے بہانے آدھے گھنٹے سے زیادہ ادھر ادھر گھومتے رہے، پھر تھانے کی طرف لوٹے۔ انہوں نے بیک وقت مٹھائی کی دکان کی طرف دیکھا۔ ایک مرتبہ پھر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب دکان پر رام گوپال کی جگہ نیتارام بیٹھا تھا۔ میں نے نیتارام کو پہچان لیا تھا۔ گنجادھر کی آنکھوں میں مجھے چمک نظر آئی۔

”میکا! یہی نیتارام لگتا ہے۔“ گنجادھر کی سرگوشی ابھری۔

میکا کے لئے محض یہ الفاظ کافی نہیں تھے۔ وہ شاید پتہ یقین کر لینا چاہتا تھا۔ نزدیک ہی بیڑی اور تمباکو والے کی دکان تھی۔ وہاں جا کر وہ تمباکو خریدنے لگے۔

باتوں باتوں میں میکا نے دکان دار سے پوچھ لیا۔ ”وہ مٹھائی کی دکان پر نیتارام جی ہی بیٹھے جان پڑتے ہیں؟“

”جی ہاں، وہ نیتارام ہی ہیں۔“ دکان دار نے تصدیق کر دی۔

یقیناً دکان دار کو علم نہیں تھا کہ اس کے جواب پر نیتارام کی زندگی کا دارومدار تھا۔ تمباکو کی پڑیالے کر وہ دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

”گنجادھر! اب معاملہ ختم کرنا ہے۔ پھر تم گاؤں کی طرف دوڑ لگانا اور میں دوسری جانب۔ اگر کوئی درمیان میں آئے تو گولی چلاتے ہوئے نہ ہچکچاتا، سمجھ گئے۔“

جواب میں گنجادھر نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔“

اس کے بعد ان دونوں کو میں نے مٹھائی کی دکان جا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

”بیٹاشے ہیں؟“ میکا نے ہچکچائے بغیر پوچھا۔ وہ نیتارام ہی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ نیتارام کو دکان دار سمجھتا ہو۔

”جی ہاں، ہیں۔“ نیتارام جھٹ سے بولا۔

”دس سیر دے دو۔“ یہ کہتے ہوئے میکا نے سر سے پولی اتاری اور اس کی گرہ کھولنے لگا۔

سے باہر آگیا۔

ظاہر ہے کہ میں جس پراسرار تجربے سے گزر چکا تھا اس کے متعلق اپنے ساتھیوں کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹیکا وغیرہ کا انتظار کرنے لگا جن میں سے اب صرف صوبیدار کو واپس آنا تھا۔ ٹیکا اور گنجادھر کا انجام تو میں خود ہی دیکھ چکا تھا۔

پہلے مخبر پنچا اور اس نے ٹیکا کے ساتھ ہی گنجادھر کے مارے جانے کی اطلاع دی۔ صوبیدار کے بارے میں اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میرا دل تو اپنے دو ساتھیوں کی طرف سے فکر مند تھا، مگر یہ فکر مندی زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ذرا ہی دیر کے بعد روپا خوشی سے ججی اٹھا۔ ”ارے تبا! دیکھنا وہ صوبیدار آ رہا ہے۔“ روپا نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اپنی مسرت نہ چھپا سکا اور اٹھ کر صوبیدار کی طرف دوڑا۔ وہ میرا نہیں تو میری محبوبہ رکنی کا بیٹا تو تھا ہی۔ میں اپنی محبوبہ رکنی کے سامنے شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ اسے میں نے گلے سے لگا لیا اور رخسار چوم کر کہا۔ ”بھوانی دیوی تیری حفاظت کرے بیٹا۔“

”باپو! ہمارا دشمن نیٹارام تو ختم ہو گیا مگر ٹیکا اور گنجادھر بھی نہیں بچ سکے۔“ صوبیدار نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

”مجھے خبر مل چکی ہے بیٹے۔“ میں بولا، پھر روپا سے مخاطب ہوا۔ ”معلوم کرو کہ ان دونوں کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ ساتھیوں کی موت کا فوری بدلہ چکانا ہے۔“ میں نے دانستہ یہ الفاظ کہے تھے ورنہ تو اپنے ساتھیوں کے قاتلوں کو خود ہی دیکھ چکا تھا۔

یوں دشمن تو ختم ہو گیا مگر دشمنی ختم نہیں ہوئی۔ پولیس کے خلاف میرا غصہ بڑھ گیا۔ دوسری جانب نیٹارام کے قتل نے پولیس کی کارروائی پر داغ لگا دیا۔ مجھے اطلاع ملی کہ چنبیل کے تین سرحدی اضلاع کے افسران کو اوپر سے احکام بھیجے گئے ہیں۔ ”اب حد ہو چکی ہے۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرو یا پھر استعفیے دے کر گھر بیٹھو۔ بلونت سنگھ کی زندگی حکومت کی عزت کا نیلام ہے۔“

ان احکام کے نتیجے میں پولیس نے اپنا پورا زور لگا دیا۔ میں نے بھی مقابلے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ نیٹارام ختم ہو چکا تھا اور اب مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی محبوبہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ میرا گردہ بار بار پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتا۔ رہنمائی کرنے والوں کے ساتھ پولیس چنبیل کے غاروں کو روندنے لگی۔ نتیجاً یہ سنگش شروع ہو گئی کہ پہلے کون تھکتا ہے۔

پھر یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں بری طرح گھری گیا۔

اس وقت ہم راجستھان کے علاقے میں تھے۔ رکنی کا چھوٹا بیٹا دھمن سنگھ بخار میں پینک رہا تھا۔ دن رات بھٹکنے سے اس کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کسی محفوظ جگہ پہنچانا بہت ضروری تھا۔ ایک ہی ٹھکانا میری نظر میں تھا۔ بلونت سنگھ کی سرال اوریت پورہ میں تھی۔ اگر دھمن سنگھ کو وہاں پہنچا دیا جاتا تو پھر مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔ اوریت پورہ پہنچنے کے لئے راجستھان کی سرحد پر بنے ہوئے دریائے چنبیل کو پار کرنا لازمی تھا۔ اس کے بعد میں مدھیہ پردیش میں بھی داخل ہو سکتا تھا۔ پولیس

تقاب میں تھی اور دھمن سنگھ سخت بیمار تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

”چلو، دھمن کو اوریت پورہ چھوڑ آئیں۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

دھمن سنگھ کی بگڑتی حالت سے سب گھبرائے ہوئے تھے۔ دھمن کی وجہ سے انہیں راستے میں آرام کرنے کے لئے رکتا پڑتا تھا۔

میری بات کے جواب میں روپا نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تبا! چنبیل کا پانی گہرا ہے اور اطراف میں کشتیاں بھی نہیں ہیں۔“

”ہم پانی میں اتر کر دریا پار کریں گے۔“ میں فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”علاج کے بغیر یہ.....“ میری آواز بھاری ہو گئی اور میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ میں ایک مرتبہ پھر آزمائش میں پڑ گیا تھا۔ دھمن سنگھ کو اگر کچھ ہو جاتا تو میں رکنی کو کیا مت دکھاتا۔

میرے حکم پر سب لوگ پانی میں اتر گئے۔ پانی ان کے شانوں تک آ رہا تھا۔ بخار میں پھٹکتے ہوئے دھمن کو چار افراد نے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ٹھنڈے پانی میں ڈیرے فرلانگ کا فاصلہ، اوپر سے سخت سردی اور تیز ہوا۔ ہمت کر کے سب آگے بڑھے اور کنارے تک پہنچے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

”ہا!“ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”اب خطرہ نہیں ہے۔“

میں بھی اس وقت خطرے سے بے خبر تھا۔ مدھیہ پردیش کی سرحد میں داخل ہو کر ہم بھینڈ کی جانب بڑھ رہے تھے تو ایک مخبر نے اطلاع دی۔ ”پولیس کی ایک کلڑی ادھر بڑھ رہی ہے۔“

یہ خبر سن کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ مجھے پولیس کا ڈر نہیں تھا، ہنگامے کی پرواہ نہیں تھی، لیکن اس وقت معاملہ نازک تھا۔ آگے بڑھ کر سامنا کرتا تو راجستھانی پولیس جھپٹ پڑتی۔ پھر دونوں جانب سے گھر جانے کا امکان تھا۔

میں سوچنے لگا، کیا کیا جائے؟ واپسی کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اس حالت میں واپسی بھی ناممکن تھی۔ میں حکمت بھی جانتا تھا۔ مجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ دھمن کی حالت تشویشناک ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ دھمن کو ہچکیاں آنے لگیں۔ اسے ریت پر کپڑا بچھا کر لٹا دیا گیا۔ میں بے بسی کے عالم میں اپنی محبوبہ کے بیٹے کی موت کی گھڑیاں گنتے لگا۔ دھمن کی چلتیاں چڑھنے لگیں اور آواز بند ہو گئی۔

وہ اندھیری رات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے بڑی محبت سے باپو کہنے والا میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے نیٹارام کا معصوم و بے گناہ بیٹا یاد آ گیا۔ موت کو خود سے قریب دیکھ کر اس کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ کیا قدرت مجھ سے اسی کا انتقام لے رہی ہے؟ میں نے سوچا۔ رکنی کے بیٹوں سے رفتہ رفتہ مجھے بھی ایسی محبت ہو گئی تھی جیسے واقعی میں ان کا باپ ہوں۔ دھمن کی جان بچانے کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ میں اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا سکتا تھا، مگر قدرت کو جو منظور تھا وہی ہوا۔ دھمن سنگھ نے چنبیل کے کنارے آخری سانس لیا۔ اس کی آخری رسوم ادا کرنے کا بھی انتظام نہیں تھا۔ چتا کی آگ پولیس کو ہوشیار کر سکتی تھی۔ میں نے سینے پر

ہاتھ رکھ کر دھمن کی لاش ایک کپڑے میں باندھی اور پھر اسے چنبیل کی لہروں کے سپرد کر دیا۔
 ”چنبیل! میں اپنے لاڈلے دھمن کو تیرے حوالے کر رہا ہوں۔“ میں نے آنسو ضبط کر لئے۔ پھر مجھے پولیس پر غصہ آ گیا۔ ”میں ان کتوں کو نہیں بخشوں گا۔“
 مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ ابھی اس سے بھی بڑا خطرہ میرے سامنے آنے والا ہے۔

☆=====☆

دھمن کی موت کے بعد میں اپنی محبوبہ رکنی کا سامنا کرتے ہوئے کترانے لگا۔ ایک ماں کو اس کے جوان بیٹے کی موت کی خبر کیسے دی جاسکتی ہے مگر کب تک میں یہ خبر رکنی سے چھپا سکتا تھا۔ میں جب اس سے ملا تو وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی کھٹک گئی۔

”کیا بات ہے ہٹاکر“ آپ کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔“ رکنی بول اٹھی۔
 ”کچھ..... کچھ نہیں“ بس ذرا تھک گیا ہوں۔“ میں نے اصل بات کو ٹالنا چاہا۔
 یہ سنتے ہی رکنی میرے پاؤں دبانے لگی۔ عام حالات میں اس کے جسم کا ذرا سا لمس مجھے دیوانہ دیا تھا، مگر اس رات تو بات ہی اور تھی۔ میں نے ہمت کر کے تمہید باندھی۔

”دھمن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“
 وہ ایک دم چونک کر بولی۔ ”کیا ہوا میرے دھمن کو؟“
 میرا سر جھک گیا۔ ”وہ..... وہ.....“ میری آواز بھرا گئی۔
 ”ٹھاکرا“ رکنی ایک دم چیخ اٹھی۔ ”جلدی بتائیں کیا ہوا اسے؟“
 ”مم..... میں اسے نہیں بچا سکا۔“ دل پر جبر کر کے میں نے بتا ہی دیا۔
 ”نہیں۔“ وہ اتنی زور سے چیخی کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔

حقیقت کا علم ہوا تو سارے ہی گھر میں کھرام پٹا ہو گیا۔ یہ میرے لئے خطرے کی بات تھی۔ نصف شب گزر چکی تھی اور رونے کی آوازیں دور دور تک جا رہی تھیں۔ میں کس کس کو صبر کی تلقین کرتا۔ کس کس کو میں یہ بتاتا کہ رونے کی آوازیں سن کر گاؤں والے ادھر متوجہ ہو جائیں گے اور پھر انہیں بھی پتا چل جائے گا کہ میں بھی گڑھی میں موجود ہوں۔ سو میں خطرہ بھانپ کر رکنی کو روتے بلکتے چھوڑ کر گڑھی سے خاموشی سے فرار ہو گیا۔

بیٹے کی موت نے رکنی پر بہت اثر کیا۔ چند ہی روز میں وہ کچھ سے کچھ نظر آنے لگی۔ آدم زاد جسم کیونکہ مٹی سے بنا ہے اس لئے جلد ڈھلنے لگتا ہے۔ اس مرتبہ میں نے جو جسم اپنایا تھا پہلے ہی۔ ادھیڑ تھا۔ پھر یہ بات کہ مجھے اس جسم میں رہتے ہوئے یوں بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ رک کے دکھ کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ اسی کے نتیجے میں میرے جسم پر بڑھاپا طاری ہونے لگا۔ میرے بھرے بھرے چہرے پر بھریاں دکھائی دینے لگیں، پیشانی پر سلونوں میں اضافہ ہونے لگا، سر اور مونچھوں کے بال سفید کا لباس پہننے میں شرط لگا رہے تھے، کمر میں اس طرح خم آ گیا تھا جیسے پشت پر اپنی محبت کی لاش لئے گھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود ابھی میرے سینے میں انتقام کے شعلے ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے۔ جب میں کسی

پر راتقل لے کر نکلتا تو کسی شیر کی طرح نظر آتا۔
 برسوں پہلے میں نے موجودہ جسم اپنایا تھا۔ میں نے بے شمار قتل کئے، ڈاکے ڈالے، بہت سے گھر اجاڑے اور کئی خاندان ختم کئے تھے۔ دوسری طرف میں نے دل کھول کر خیرات بھی دی تھی۔ میں نے غریبوں کی مدد کی، بے سہارا لڑکیوں کی شادیاں کرانے کے علاوہ بچے اور نیک آدمیوں کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ میرے اندر خیر و شر کی پیکار تھی۔ انتقام و جنون کا ہیمنہ خوفناک و زندہ بھی مجھ میں تھا اور ایک بہادر اور رحم دل وجود بھی۔ میں وہی ٹھاکر بلونت سنگھ اب اپنی محبوبہ رکنی کے غم میں برابر کا شریک ہو کر بوڑھا ہو گیا تھا۔ جسم سے زیادہ میرا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے رکنی کے ناتے سے یوں محسوس ہوتا جیسے دھمن میرا ہی بیٹا تھا۔ میں آخر رکنی کے زخموں پر کیسے مرہم لگاؤں گا؟ یہ سوچ کر میں پیروں گم گم رہتا۔

”مجھے معلوم ہے تھاکر کہ آپ کو دھمن کی جدائی کا دکھ ہے۔“ روپا تسلی بھرے لہجے میں کہتا۔ ”آپ کام میں جی لگائیں تو غم کم ہو جائے گا۔“
 ”رنج تو یہ ہے کہ دھمن بخار میں پھنکتا رہا اور میں اس کی دوا نہ کر سکا، اسے کسی ڈاکٹر، حکیم کو بھی نہ دکھا سکا۔“ میں افسردہ آواز میں اپنے غم کا اظہار کرتا۔

”تھاکر! دو چار خون کر ڈالو، دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ زہر کا علاج زہر ہی سے ہو سکتا ہے۔“
 ”میں سمجھتا ہوں روپا بیٹا!“ میں ٹھنڈا سا نس بھرتا۔ ”فکر نہ کرو، تمہارا تایا ہار نہیں مانے گا۔ وقت آنے پر میں جوانی کے جوش کو پھر سے بیدار کر لوں گا اور دشمنوں کے لئے فولاد بن جاؤں گا، لیکن اب..... اب میرے لئے ہندوؤں کی بجائے ایک لاشی بہت ہے۔ تمہاری، صوبیدار اور تحصیل دار کی موجودگی میں اب مجھے ہندوؤں کے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“

میری محبوبہ رکنی کے چار بیٹے تھے جن میں سے جسونت اور دھمن اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے البتہ صوبیدار اور تحصیل دار زندہ تھے۔ میرا اشارہ انہی کی طرف تھا۔ روپا کو بھی میں اپنے بیٹوں ہی کی طرح سمجھتا تھا اس لئے صوبیدار اور تحصیل دار کے ساتھ اس کا نام بھی لیا تھا۔ میں نے روپا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر میں نے کہا۔ ”یہ بات نہ بھولنا روپا کہ شیر بوڑھا ہو کر بھی شکار کرنا نہیں چھوڑتا۔“

میں اپنے دل کے زخم سب سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اب بڑی مشکل سے نیند آتی تھی۔ میری آدمی سے زیادہ رات جاگتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں رکنی کا سوگوار چہرہ گھومتا رہتا تھا۔ چنبیل کے کٹاؤں میں سے سنسناتی، شور کرتی ہوئی خوفناک رات اس طرح گزرتی جیسے ہزاروں بدروہیں ایک ساتھ چیخ رہی ہوں۔ آنکھ لگ جاتی تو خواب میں نیتارام کے معصوم بیٹے کا چہرہ نظر آتا، فرادی چہرہ، رحم طلب چہرہ۔ کبھی مرتے ہوئے دھمن کا چہرہ دکھائی دیتا جس کی آنکھوں سے موت کا خوف جھانکتا۔ سوتے سوتے میری آنکھ کھل جاتی۔ میں نے اب سکون دل کی خاطر ہندوؤں ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ اپنے گروہ کی سرداری میں نے محض اس لئے سنبھال رکھی تھی کہ روپا اور رکنی کے بیٹے مایوس نہ ہوں۔ شاید

میں نے خون بہانے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی ہوتی مگر ایک اور بڑے صدمے کی کھڑی قریب آ رہی تھی جس سے میں لاعلم تھا۔

☆=====☆=====☆

جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں اس کا علم مجھے بعد میں وقت گزرنے پر ہوا ورنہ ایک غدار میری گولی سے پہلے ہی مارا جاتا۔ وہ غدار میرے ہی گروہ کا ایک فرو جگن ناٹھ تھا۔ ہوا یہ کہ جب معرکہ آرائی میں قانون مجھے مات نہ دے سکا تو میرے خلاف ایک سازش کا جال بنا جانے لگا۔ حکومت نے دوسرے طریقے آزمانے شروع کر دیئے۔ میرے گروہ میں جگن ناٹھ دو سال پہلے شامل ہوا تھا جو پولیس کے لالچ میں آ گیا۔ اسے دس ہزار روپے نقد اور ایک گاؤں کے حقے کا لالچ دیا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں پولیس سے ٹکراؤ کے دوران جگن ناٹھ کو مجھے زخمی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے قتل کر کے وہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔

جگن ناٹھ نے اسی سبب پولیس افسران سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شیر کو مارنے کا کام تمہارا ہے، میں تو اسے زخمی کر کے تمہارا کام آسان بنا دوں گا۔ پھر پولیس کو رضامند دیکھ کر اس نے مطالبہ کیا۔ ”یہ انعام صرفہ ٹھاکر بلونت سنگھ کو زخمی کرنے کا ہو تو مجھے سودا منظور نہیں۔ گولی شاید روپا کو لگے یا اس کے دونوں بیٹوں میں سے کسی کو گھائل کر دے۔ تم کو اس کا معاوضہ بھی دینا چاہئے۔“

”مگر ایسی صورت میں دس ہزار نہیں ملیں گے۔“ ایک پولیس افسر بولا۔ ”بلونت سنگھ کے علاوہ دوسروں کی قیمت ہم طے کریں گے۔ روپا کے سات ہزار، ٹھاکر کے بیٹوں کے چار چار ہزار روپے۔ بولو منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ جگن ناٹھ نے آمادگی ظاہر کر دی اور یوں یہ سودا طے ہو گیا۔

جگن ناٹھ بڑا چالاک تھا۔ آزادی ملنے کے بعد اس کے دو چار گاؤں سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ سالانہ پیداوار کی رقم سے جیب خرچ بھی نہیں نکلتا تھا۔ باپ دادا کے اچھے وقت کا غرور اس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا۔ کسی اور کی غلامی کر کے پیٹ پالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سے تو چنبل کی راہ بہتر تھی جہاں اس کا ٹھاکر پن محفوظ تھا۔ جگن ناٹھ بھی کیونکہ ٹھاکر تھا اس لئے ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی مجھے جھوڑ کر اور کہاں جاتا، لیکن وہی جگن ناٹھ ہند ہزار روپے اور ایک گاؤں کے بدلے مجھ سے غداری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے پولیس سے جو سودا کیا تھا اس میں خطرہ بہت کم تھا۔ کام نشتے کے بعد بدنامی بھی نہ ہو، جگن ناٹھ نے اس کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ پولیس افسران نے اس کا نام پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر لیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

موسم برسات کے وہ آخری دن تھے۔ دریائے چنبل بھر پور انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس کے پاگل دھارے نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کافی تاراجی کی تھی۔ نئے کٹاؤ اور غار بن گئے تھے۔ زمین دھل چکی تھی۔ جنگل اور گھنے ہو گئے تھے۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔

تقریباً دو ماہ کے بعد پولیس کی سرگرمیاں ایک مرتبہ پھر زور پکڑنے لگیں۔ میرا گروہ بھی موسم

برسات میں آرام کرنے کے بعد دھرتی کا پسینہ کپکنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

میں ایک اہم ڈاکا ڈالنے نکلا۔ دوپہر ہونے والی تھی اور شام تک وہاں پہنچ جانا تھا جہاں ڈاکا ڈالنا تھا۔ رات کو کام ختم کر کے صبح تک ٹھکانے پر واپس آنا تھا۔ میں نے بلونت سنگھ کے بڑے بھائی نواب سنگھ کو ساتھ نہیں لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اب وہ زیادہ محنت اور بھگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔

اوریت پورہ کے جنگل سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے ایک مخبر سے پولیس کی موجودگی کا علم ہوا۔ میرے حکم پر سب ساتھیوں نے درختوں کے تنوں کی آڑ لے لی اور پولیس سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اطلاع کے مطابق پولیس چار دن سے اوریت پورہ کے جنگل میں گھیرا ڈالے پڑی تھی۔ پندرہ پندرہ بیس بیس افراد کی ٹکڑیوں میں پولیس دو چار فرلانگ کے فاصلے پر رکی ہوئی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

”روپا! ہمارے دو ساتھی پہلے یہاں آ کر دیکھ گئے تھے، پھر بھی انہیں پولیس کی بو نہیں ملی۔“ میں نے کہا۔ مجھے شک ہو گیا کہ گروہ کے کسی شخص نے مخبر کی ہے اور وہ پولیس سے مل گیا ہے، ورنہ اتنے بڑے جنگل میں پولیس اسی جگہ راستہ روک کر کیوں کھڑی ہوتی۔ اسی خیال کے تحت میں نے مزید کہا۔ ”اس میں پولیس کی کوئی چال ضرور ہے روپا، مگر پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں، پھر بات بنے۔ تین چار خاص آدمیوں کے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہمیں اس راستے سے گزرنہ ہے۔“

”پھر بھی فکر نہ کرو تایا۔“ روپا دور بین سے جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ہم پوری ایک ہائی لین کو اس جنگل میں چھکا دے سکتے ہیں۔“

زرا ہی دیر میں پولیس نے دور ہی سے فائرنگ شروع کر دی۔

روپا کی دو ٹالی مگر جتنے لگی۔ ”سارے بہت دنوں بعد مقابلے پر آئے ہیں۔ دو چار کو جنم رسید کرنے کی نیکی آج ضرور کروں گا۔“ روپا بڑبڑایا۔

پولیس کی عادات سے میں واقف ہو چکا تھا۔ متعدد بار پولیس سے اس طرح کے مقابلے ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک فائرنگ کر کے واپس ہونے والی پولیس بعد میں شور مچاتی کہ بڑا مقابلہ ہوا، گھنٹوں فائرنگ ہوئی۔ ڈاکو بری طرح پھنس گئے تھے، لیکن بمشکل جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے پولیس کے خیالات کا علم تھا۔ پولیس والوں کو یقین تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ ان کی گولی سے مرے والا نہیں، پھر کیوں اپنی جان گنوائی جائے۔

جگن ناٹھ سرکٹا ہوا میرے مقابل آ گیا تاکہ یہی خیال کیا جائے، پولیس کی کوئی گولی کام کر گئی، مگر اس وقت تک میں جگن ناٹھ کی غداری سے بے خبر تھا۔ میری ایک جانب روپا اور دوسری طرف صوبیدار تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر دونوں مجھے آڑ میں لے کر بچا سکیں۔ قریب ہی تحصیل دار موجود تھا۔

پولیس کی جانب سے فائرنگ کا زور کم ہوا تو میں نے روپا کو مخاطب کیا۔ ”اب ہم مورچہ بدلیں گے۔ شام کو ہمیں اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس سے مزید الجھنے کی بجائے ہم آڑ سے تہمتے ہو کر سرک جائیں۔ خواہ خواہ کار تو س ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔“

مورچہ بدلنے کے لئے میرے پہلو میں لیٹا ہوا تحصیل دار اٹھٹایا چاہتا تھا کہ ایک گولی اس کی جانب

لگی۔ مارنے والے نے پلو کا نشانہ لیا ہوگا، لیکن عین وقت پر ہلنے کی وجہ سے گولی پنڈلی کو چسید گئی۔ تحصیل دار کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تو میرا دل دہل گیا۔

”تحصیل بیٹے! زخم زیادہ تو نہیں آیا؟“ میں سرکتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا۔

روپا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ گالیاں بٹکا ہوا دانت پیس کر مخالف سمت میں گولیوں کی بارش کرنے لگا۔ مخالف سمت سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگا۔ میں تحصیل دار کا زخم دیکھ رہا تھا۔ صوبیدار نے مجھے متوجہ کیا۔ ”باپو! روپا آگے بڑھ رہا ہے۔“

”روپا! میں نے آواز دی۔“ واپس آ جا روپا۔ تحصیل دار کو معمولی زخم آیا ہے۔“

میں اس بات سے لاعلم تھا کہ تحصیل دار پر گولی چلانے والا غدار جنگن ناتھ تھا۔ گولی چلاتے ہی اس نے اپنی جگہ تبدیل کر لی تھی۔

روپا میری آواز سن کر لوٹ آیا اور بولا۔ ”بزدل بھاگ گئے۔“ پھر اس نے بھی تحصیل دار کے زخم کو دیکھا اور مجھے اطمینان دلایا۔ ”تایا! زخم گہرا نہیں ہے، مگر.....“

”مگر کیا؟“ میں نے اسے چپ دیکھ کر سوال کیا۔ ”بول کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”یہ بتایا کہ اب تحصیل دار کو ساتھ نہیں لے جانا چاہئے۔“ روپا نے قدرے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے روپا!“ میں نے تائید کی، پھر تحصیل دار کی پشت پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”پہلے ہم اسے کو محفوظ جگہ پر پہنچائیں گے۔“ اس کے بعد میں نے تحصیل دار کو مخاطب کیا۔ ”بیٹا! ضد نہ کرنا۔ دو چار دن آرام کر لو۔ ایک آدمی تمہیں تمہارے نانا کے گھر چھوڑ آئے گا۔ اس بہانے تمہاری ماں بھی تم سے دہار آ کر مل لے گی۔“

تحصیل دار کی پنڈلی سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اچھی طرح کس کر پٹی باندھنے کے باوجود دس منٹ میں پٹی خون سے تر ہو گئی۔

میں نے روپا، صوبیدار اور دوسرے ساتھیوں کو آگے رواگئی کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ آگے گاؤں جا کر ضروری انتظام کرو، ہم تحصیل دار کو اپنے ساتھ لے آ رہے ہیں۔ میرے ساتھ لو لکٹا اور دم رہیں گے۔“

لو لکٹا کو سارے ہی گروہ والے لقمان پنڈت کہتے تھے۔ وہ جوان پنڈت، روپا ہی کی طرح خوفناک اور دلیر تھا۔ دوسرا دمرو تھا جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ گروہ میں وہ میرا لاڈلا مشور تھا۔ غصہ در اور خیم خیم دم دو چار کے لئے اکیلا ہی کافی تھا۔ اس نے تحصیل دار کو اپنی پشت پر اٹھالیا۔

”تحصیل دار! تم تو کافی بھاری اور تندرست ہو۔“ دمرو نے ہنس کر کہا۔ اس کا مقصد تحصیل دار کا ہمت بڑھانا تھا۔

”دمرو!“ تحصیل دار نے سسکی لی۔ ”تجھ جیسے پہلوان کو میرا وزن کیا محسوس ہوگا۔“

میں زخمی تحصیل دار کو لے کر اگلے گاؤں بحفاظت پہنچ گیا۔ وہ چماروں کا گاؤں تھا اس لئے گھوا

کہیں سے ہاتھ نہیں لگا، لیکن روپا نے دو چار چمار تیار کر رکھے تھے۔ تحصیل دار کو ایک چارپائی پر ڈال کر انہوں نے اٹھالیا۔ اب وہ تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔

دوسرے گاؤں سے جب گھوڑوں کا بندوبست ہوا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ میں زخمی تحصیل دار سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ اس وقت مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں ’تحصیل دار‘ سے بیش کسے لئے جدا ہونے والا ہوں۔

جدا ہوتے وقت میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”رنجیت! اسے سنبھال کر پہنچانا۔“

”ٹھاکرا! آپ چتا (نکمر) نہ کریں، میں چھوٹے ٹھاکر کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔“

را نکل، کار توں کی تھیلی اور دوسرے ہتھیار چیک کرنے کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ میں انہیں کافی دیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب رکنی کا صرف ایک بیٹا صوبیدار میرے پاس رہ گیا تھا۔ جب گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اس رات میں نے ڈاکا ڈالنے کا پروگرام منسوخ کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چنبل کے غاروں میں پہنچ گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے غار میں اکیلا تھا اور تحصیل دار ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اسی پراسرار تجربے سے گزرا جو ایک مرتبہ پہلے بھی میرے لئے حیران کن ثابت ہوا تھا۔

میری آنکھیں بند تھیں اور مجھے تحصیل دار کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھ پر ارد گرد کا منظر بھی روشن ہو گیا۔ دوسرے گھوڑے پر میں نے رنجیت کو دیکھا۔ وہ دونوں دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر ان کے گھوڑوں کو میں نے بھیڑ کے جنگل میں داخل ہوتے دیکھا۔

رنجیت کے چہرے سے اب اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس نے تحصیل دار سے کہا۔ ”چھوٹے ٹھاکرا اب خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم یہ جنگل پار کر جائیں گے۔“

جواب میں تحصیل دار نے سر ہلانے پر اکتفا کیا، مگر چند منٹ بعد ہی رنجیت نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی لی۔

”کیا ہوا؟“ تحصیل دار نے چونک کر پوچھا۔

رنجیت کے چہرے پر اب خوف کے تاثرات تھے۔ اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ ”ٹھاکرا! ہمیں اترنا پڑے گا۔ مجھے پولیس کی نقل و حرکت محسوس ہو رہی ہے۔“

یہ سنتے ہی تحصیل دار نے اپنے گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا دی۔ جوش میں وہ شاید اپنے زخمی بیکر کو بھول گیا تھا۔ زخمی بیکر پر وزن پڑتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر شدید کرب و اذیت کے آثار دیکھے، مگر اس نے ہونٹ بھیج لئے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تکلیف سے چیخ اٹھتا۔

”ٹھاکرا! سنبھل کر۔“ رنجیت بولا۔

”تم گھوڑوں کو آزاد چھوڑ دو، دوسری جانب چرتے رہیں گے۔ پولیس کو ہماری موجودگی کا پتا نہ چلا تو اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کھسک چلیں گے۔“ تحصیل دار نے کہا۔

رنجیت نے گھوڑوں کی پشت پر سے سامان اتار لیا۔ گھوڑوں کو چھوڑ کر دونوں قریب ہی موجود ایک کٹے نالے میں اتر گئے، مگر ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ پولیس کی نظروں میں آ چکے تھے۔ اس طرح چھپ جانے سے وہ پولیس کی نظروں میں مشتبہ ہو گئے تھے۔

میں نے تین طرف سے گھیرا ڈال کر پولیس کو آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا اور میرا دل بیٹھے لگا۔ اس پراسرار تجربے سے گزرنے کے باوجود میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ اگر میں اسی وقت جنیل کے غاروں سے نکل کر بھیڑ کے جنگل کی طرف روانہ ہوتا تو وہاں تک صبح سے پہلے پہنچنا ناممکن تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود قطعی طور پر بے بس تھا۔ تحصیل دار کی مدد کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

”رنجیت..... کتے ہماری طرف آرہے ہیں۔“ میں نے تحصیل دار کی آواز سنی۔ ”آج میں ان کا خانہ خراب کر دوں گا۔“ مگر چند ہی لمحے میں اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ”ارے یہ تو دوسری رائفل ہے۔ کارٹوس بھی جلدی میں دوسری رائفل کے لئے۔ تمہاری رائفل میں کتنے کارٹوس ہیں؟“

”تین۔“ رنجیت نے مردہ سی آواز میں بتایا۔

”پھر؟“ تحصیل دار اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

قدرت نے ان کے ساتھ کیسا عجیب تماشا کیا تھا۔ ان دونوں کے پاس بہترین رائفلیں تھیں، کارٹوس بھی تھے، مگر ایک دوسرے کے لئے بیکار۔ رنجیت کی تین گولیوں سے کیا مقابلہ ہوتا۔ دونوں کیسی بے وقوفی کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کو بھی چھوڑ دیا تھا ورنہ گولی چلا کر فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ تین گولیاں فرار ہونے کے کام تو آ سکتی تھیں۔ ان سے بہر حال مسلح پولیس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ذرا دیر کے بعد رنجیت نے سر اٹھا کر نالے سے جھانکا اور اس کے چہرے پر خوف کی چادر پھیل گئی۔ پولیس والے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

”ٹھاکر! گولی چلاؤ..... دشمن نزدیک آ رہا ہے۔“ رنجیت کی آواز یہ کہتے ہوئے کانپ اٹھی۔

”تین گولیوں سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں تو طاقت ہے نہیں۔“ تحصیل دار کھوکھلے انداز میں ہنسا۔

”رنجیت! اب تو ہمیں اوپر والا ہی بچا سکتا ہے۔“

پھر تحصیل دار نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پولیس افریچھے تھا اور سپاہی آگے تھے۔ اس نے سپاہیوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

گولی چلانے کی بجائے تحصیل دار نے اچانک بلند آواز میں پولیس والوں کو للکارا۔ ”کتو! واپس چلا جاؤ ورنہ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“

تحصیل دار کا خیال شاید یہ تھا کہ اس طرح پولیس والے ڈر جائیں گے، لیکن اس کی للکار کا الٹا اثر ہوا۔ ادھر سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

”ٹھاکر! دو ایک ہی فائر کر دو۔“ رنجیت نے مشورہ دیا۔ ”پھر شاید وہ بھاگ جائیں۔“

اس کی بجائے تحصیل دار نے ایک بار پھر پولیس والوں کو للکارا۔ جواب میں فائرنگ ہوتی رہی۔ تب

تحصیل دار پھر اٹھا۔ فی الحال اس کی ایک گولی پولیس کی سینکڑوں گولیوں سے زیادہ قیمتی تھی۔ آخر کار میں نے تحصیل دار کو گولی چلائے دیکھا۔ سنسناتی ہوئی گولی ایک پولیس والے کی ران میں گھس گئی اور وہ الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر نالے سے دس قدم کے فاصلے پر آگری۔ پولیس والے اس حملے سے کچھ گھبرا گئے۔

”رنجیت!“ تحصیل دار نے جلدی سے کہا۔ ”جاؤ رائفل اٹھالو، وہ ہاتھ لگے تو ہم کچھ چنکار (جادو) دکھائیں۔“

میں نے رنجیت کو نالے سے نکل کر ایک درخت کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھا، لیکن ایک پولیس والے نے اسی طرح آگے بڑھ کر رنجیت سے پہلے رائفل اٹھالی۔ تحصیل دار کو یقیناً اس پر غصہ آ گیا۔ اس پولیس والے کو تحصیل دار نے بھون دیا۔ گولی کھا کر سینہ پکڑے ہوئے وہ پیچھے جا پڑا، لیکن رنجیت کو واپس نالے میں اترنا پڑا۔ اس نے بروقت خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اگر اس سے چند لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو کئی گولیاں بہ یک وقت جسم میں اتر جاتیں۔

”رنجیت! تم جاؤ، میں اس ایک گولی کے سہارے رات کاٹ دوں گا۔ اب چاند گرے بادلوں میں چھپ چکا ہے۔ اس اندھیرے میں اور اپنے ایک ساتھی کی جان گنوا کر وہ شاید اب مجھے نہیں چھیڑیں گے۔ انہیں ابھی خبر نہیں کہ ہمارے پاس کارٹوس ختم ہو چکے ہیں۔“ تحصیل دار نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم باپو کو خبر کر دو کہ وہ جلد سے جلد یہاں آ جائیں۔“

یہ کہتے ہوئے تحصیل دار اس جگہ سے جنیل کے غاروں کا فاصلہ نظر انداز کر گیا تھا۔ وہ جن حالات کا شکار تھا ان میں اسی طرح عقل خط ہو جاتی ہے۔

”میں ٹھاکر، میں تمہیں یہاں دشمنوں کے گھیرے میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا ہے۔“ رنجیت نے ضد کی۔ ”اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ٹھاکر میری کھال کھینچ لیں گے۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس طرح میں زندہ بچ سکتا ہوں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے سے بہتر ہے کہ تم باپو کے پاس چلے جاؤ۔“ تحصیل دار نے رنجیت کو سمجھایا۔ ”یہ بھی میری مدد ہوگی۔“ پھر رنجیت کو نیم راضی دیکھ کر تحصیل دار مزید بولا۔ ”یہ رائفل اور کارٹوس لے جانا، یہ ہمارے لئے بیکار ہیں۔ ہاں یہ ہائی کی قفل بھی لے لو، راستے میں کام آئے گی۔“

تقدیر میرے ساتھ عجیب مذاق کر رہی تھی۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، مجھے سب معلوم تھا اور تحصیل دار مجھی کو مطلع کرنے رنجیت سنگھ کو بھیج رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر میرا دل خون کے آنسو روئے لگا۔ رنجیت اندھیرے میں سرک گیا۔

جنگل میں اندھیرا چھایا ہوا تھا، پھر بھی مجھے سب کچھ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ درندوں کی آوازیں باجول کو خوفناک بنا رہی تھی۔ تحصیل دار پوک میں نے کراہتے ہوئے سنا۔ یقیناً اس کے زخمی پیر کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے پانی اپنے پاس نہ رکھ کر بھی غلطی ہی کی تھی۔ پھر بھی وہ رکشی کا بیٹا تھا اور اس کی تربیت میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس نے اسی لئے آخر تک لڑنا

انتظام لیں گے۔

روپا صوبیدار اور نواب سنگھ سبھی میری طرح باپوس ہو چکے تھے۔ میں نے پھر راکفل اٹھالی تھی اس کے باوجود تحصیل دار کی رہائی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک روز اسی عرصے میں روپا نے مجھ سے کہا۔ ”تایا! ہم اتنے سارے لوگ ہیں ایک دو ختم بھی ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، مگر تحصیل دار کو جیل میں نہیں رہنے دیں گے۔“

یہ سن کر میرے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے ذہن میں بھی یہ خیال آ چکا تھا۔ تحصیل دار کو کہاں رکھا گیا تھا؟ یہ اطلاع بھی میں نے حاصل کر لی تھی۔ پھر بھی روپا جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ ممکن نہیں تھا۔

”اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے میں تم لوگوں میں سے کسی کی قربانی کیسے دے سکتا ہوں روپا۔“ میری پشیمانی پر بل پڑ گئے۔ ”اٹاؤہ جیل کے قریب تمام درخت پولیس نے کاٹ دیئے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق پولیس پوری طرح چوکنا ہے۔ اگر اس طرح تحصیل دار بچ سکتا تو میں اور صوبیدار پہلے ہی یہ خطرہ مول لے چکے ہوتے۔“

”کیا آپ مجھے صوبیدار سے الگ سمجھتے ہیں؟“ روپا نے مغموں لہجے میں سوال کیا۔

”تم سمجھتے نہیں روپا!“ میں زری سے بولا۔ ”میرے بعد گروہ کے سردار تم ہی ہو گے۔ بلونت سنگھ نہ بھی ہوا تو تم اس کے نام کو زندہ رکھو گے، مجھے اس کا یقین ہے۔ میں اسی لئے تمہیں یہ خطرہ مول نہیں لینے دوں گا۔“

”تایا! تحصیل دار کی گرفتاری سے پولیس بہت خوش ہے، مگر ہم اس کی یہ خوشی خاک میں ملا سکتے ہیں۔“

روپا کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”تحصیل دار پر مقدمہ چلانے کے لئے پولیس کو گواہوں کی ضرورت پیش آئے گی۔“ روپا نے دانت پیٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”کس کی مجال ہے کہ وہ ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کے خلاف عدالت میں گواہی دے سکے۔ میں ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“

بس پھر قبر برسنے لگا۔ میں اور میرے ساتھی موت کے ہرکارے بن گئے۔ ہمیں جیسے ہی اطلاع ملتی کہ پولیس کسی شخص کو گواہ بنا رہی ہے تو ہم اس پر ٹوٹ پڑتے۔ پولیس کو دوسرے دن پتا چلا کہ ایک اور خون ہو گیا اور اب دوسرا گواہ تلاش کرنا پڑے گا۔

ہم دونوں ہی حریفوں کو ضد ہو گئی تھی۔ پولیس نے تحصیل دار کو پھانسی پر چڑھانے کی ضد پکڑ لی اور میں اس کی امیدوں کو خاک میں ملانے کے لئے پوری قوت سے خون بہانے پر اتر آیا۔ پھر قتل ہونے والوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔

”باپ کی زندگی میں بیٹا پھانسی پر چڑھے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ میں بار بار یہی کہتا۔ پولیس ایک زندگی کو ختم کرنے کے پیچھے پڑی تھی، اس کے بدلے میں اسے متعدد افراد کی زندگی

سیکھا تھا۔ وہ دل پر جبر کئے کراہتا رہا اور دھیرے دھیرے رات گزرتی رہی۔ اس کا یہ اندازہ بہر حال درست ثابت ہوا تھا کہ رات کے وقت اب پولیس اسے نہیں چھیڑے گی۔ اس نے راکفل کی ٹالی نالے کے کنارے پر ٹکا رکھی تھی تاکہ پولیس ڈر کر دور رہے۔

پھر صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے آخری حربہ آزمایا۔

”میرے کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔“ تحصیل دار بلند آواز میں بولا۔ ”تم لوگ آ کر مجھے گرفتار کر لو۔“ پھر تحصیل دار نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کون ہے۔

جواب میں پولیس والے ہنس دیئے اور کہا۔ ”ٹھاکرا ہمیں بے وقوف نہ بناؤ۔ ابھی دوسری پلٹن ادھر آتی ہوگی، پھر ہم تمہیں گھیر لیں گے۔“

پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد تحصیل دار گرجا۔ ”اگر تم لوگ مجھے زندہ پکڑنے کا دھچن نہیں دو گے تو میں آخری گولی اپنے سینے میں اتار لوں گا۔“

میں نے پولیس افسر کو اپنے ماتحت سے کہتے سنا۔ ”ممکن ہے، یہ سچ ہو۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کا بیٹا اتنی دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ ممکن ہے اس کی مدد کے لئے ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی ادھر آ جائے۔ ایسی صورت میں ہنگامہ بڑھ جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں سر۔“ پولیس افسر کے ماتحت نے تائید کی۔

کچھ دیر آپس میں مزید صلاح و مشورہ کرنے کے بعد پولیس افسر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”بہتر ہے۔ تم اپنے سامان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ہم نزدیک آئیں تو کوئی گز بڑ نہ کرنا۔ اگر ذرا سے بھی ہلے تو بھون کر رکھ دیئے جاؤ گے۔“

پھر صرف چند منٹ کے اندر تحصیل دار آسانی سے گرفتار ہو گیا۔ پولیس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

اب پوری طرح صبح ہو چکی تھی اور رنجیت جنیل کے غاروں میں پہنچ چکا تھا۔ مجھے اس کے آنے کی اطلاع روپا نے دی۔ میں اس وقت غصے سے پھرا ہوا تھا۔ میری آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی لاشی میں نے دور پھینک دی۔

”تایا!..... وہ تحصیل دار.....“ روپا نے پوری روداد بیان کر دی۔

”تو کیا تیرے خیال میں اب تک تحصیل دار کو گرفتار نہیں کر لیا گیا ہوگا؟“ میں چیخ اٹھا۔

روپا کا سر جھک گیا اور پھر اسی روز دوپہر تک تصدیق ہو گئی۔ مجبوروں نے خبر دے دی تھی۔

”دیکھا تو نے روپا! میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا.....! مجھے راکفل دے دے۔ میں، تحصیل دار کو گرفتار کرنے والوں کا نام و نشان مٹا دوں گا۔“ میں گرجا۔

تحصیل دار کی گرفتاری نے جہاں میرے غصے کو بھڑکا دیا وہیں میرا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اب میں اپنی محبوبہ رکنی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مجھے ملال تھا کہ میں اس کے بیٹوں کی حفاظت نہیں کر سکا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ پولیس والے، تحصیل دار پر ظلم کی ہمتا کر دیں گے۔ وہ تحصیل دار سے میرا

گنونا پڑ رہی تھی۔

لوگ بے درپے قتل ہونے لگے تو عوام میں شور مچ گیا۔ برسرِ اقتدار لوگ بھی پولیس سے ناراض ہو گئے۔ وہ کہتے: ”اتنی پولیس اسے ختم نہیں کر سکتی؟ کیا ٹھاکر بلونت سنگھ کے ہاتھ میں موت کی لکیر ہی نہیں ہے؟ یہ قتل و غارت گری آخر تک جاری رہے گی؟“

مجھے پھسانے کے لئے ہر قسم کے طریقے آزمائے گئے۔ گاؤں گاؤں ایسے آدمی تلاش کئے گئے جو دھوکا دے کر مجھے پھنسا سکیں۔ مجھے تمام خبریں ملتی رہیں۔

میرا جوش برقرار رکھنے کی خاطر روپا مجھے دوسرے کاموں میں پھنسائے رکھا۔ کسی گاؤں میں اگر جھگڑا ہو جاتا تو کوئی عدالت کا رخ نہ کرتا۔ میرا فیصلہ سب مانتے تھے، مگر دھمن کی موت کے بعد میں نے اس طرف دلچسپی لینا کم کر دی تھی۔ پھر تحصیل دار کی گرفتاری کے بعد تو میرا وجود جیسے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ میں کافی عرصے سے اپنی محبوبہ رکنی سے بھی نہیں ملا تھا۔ آخر میں اس کے پاس کیا منہ لے کر جاتا۔ مجھے جب بھی کسی شخص کے بارے میں اطلاع ملتی کہ وہ تحصیل دار کے کیس میں پولیس کی طرف سے گواہی دینے پر تیار ہو گیا ہے تو میرا خون جوش مارنے لگتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور میں بھول جاتا کہ میرا جسم بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔

”نایا!“ روپا نے ایک روز پھر موقع دیکھ کر کہا۔ ”جب تک آپ مصالحت نہیں کرائیں گے، جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔ ایک رات کا کام ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ٹھاکر جو بھی فیصلہ دیں گے، ہمیں منظور ہوگا۔ مان جائیں نا نایا۔“

اس سے پہلے تین چار مرتبہ میں روپا کو ٹال چکا تھا، لیکن اس مرتبہ اس کی ضد کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

”ٹھیک ہے روپا۔“ میں بولا۔ ”اس گاؤں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ وہاں ایک شخص بھی تحصیل دار کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں ہوا۔ ہم آج شام وہاں پہنچ کر صبح تک واپس آ جائیں گے۔ پھر یہ کہ وہ تمہارے رشتے دار بھی ہیں۔“

روپا کے رشتے داروں اور ان کے حریفوں میں، میں نے صلح کرا دی۔ مصالحت کرانے کی غرض سے مجھے اور روپا کو رات اسی گاؤں میں گزارنا پڑی۔ صبح ہماری روانگی سے پہلے روپا کا ایک رشتے دار رام دیال ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

”ہاں بولو۔“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”روپا پنڈت!“ وہ میری بجائے روپا سے مخاطب ہوا۔ ”تم ٹھاکر کو میرے گھر لے آؤ۔ اس غریب برہمن کے بھاک (نصیب) جاگ جائیں گے۔ ساری زندگی مجھے یہ فخر رہے گا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ میرے گھر آئے تھے۔“

روپا نے میری طرف دیکھا۔

”تمہارا رشتے دار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سوچے گا بلونت سنگھ نے برہمن کے گھر آنے سے انکار کر

دیا۔ چلو ایک چکر لگا آئیں۔ کھڑے کھڑے واپس آ جائیں گے۔“

”میرے اچھے نصیب۔“ رام دیال پُرسرت انداز میں آگے بڑھا۔ ”زیادہ دیر روکوں گا بھی نہیں۔ کبھی دودھ بنا رکھا ہے، پی کر چلے آتا۔“

میں اور روپا، رام دیال کے ساتھ ہوئے۔ برآمدے میں چار پائیاں ڈال کر میزبان دودھ کے گلاس لینے گھر کے اندر چلا گیا۔

”یہ تمہارا رشتہ دار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

روپا میرا اشارہ سمجھ گیا اور کہا۔ ”نایا! بات یہ ہے کہ ڈاکو بن جانے کے بعد بہت سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر پولیس پوچھ گچھ کرنے آتی ہے تو کہتے ہیں: یہاں ڈاکو کا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا، اگر ہو تب بھی ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن کسی سے جھگڑا ہو جائے تو حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں، خبردار کوئی مقابلے پر آیا، میرا فلاں ڈاکو رشتے دار ہے، اگر اسے اشارہ کر دیا تو فنا ہو جاؤ گے۔“

روپا کے لہجے میں تمسخر تھا، مگر مجھے ہنسی نہیں آئی۔ اس وقت رام دیال گلاس لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے میرے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ خلاف توقع وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بھی کا پتے دیکھا۔ روپا بھی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ٹھاکر! آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔“ رام دیال جلدی سے بولا۔ ”اب آپ لوگ دودھ پیئیں۔“

میں نے کسی انجانے خطرے کو بھانپ لیا۔ میری اور روپا کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ پلکیں جھپکا کر روپا نے مجھے مخصوص اشارہ کیا اور میں نے سر ہلا دیا۔ اس نے گویا خطرے کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ اسی لئے فوراً بول اٹھا۔ ”رام دیال جی!“ روپا نے رام دیال کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے چہرے کا رنگ پل پل بدل رہا تھا۔ ”جب ہم کسی کے مہمان ہوتے ہیں تو میزبان کے بغیر کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ رام دیال نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اگر..... اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔“ پھر رام دیال نے گہری طرف منہ کر کے آواز دی۔ ”لو! میرے لئے بھی دودھ کا کٹورا لے آؤ۔“

کچھ ہی دیر کے بعد آٹھ سال کا ایک بچہ دودھ کا گلاس لے کر آ گیا۔ جب تک دودھ نہیں آیا رام دیال بے چین رہا۔ میں اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

رام دیال جیسے ہی گلاس پکڑ کر منہ کی طرف لے جانے لگا، روپا نے اسے روک دیا۔ ”رام دیال کجا! یہ کیا.....؟ مہمان سے زیادہ آپ کا گلاس بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔“ روپا کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مذاق کر رہا ہو۔ ”یہ مہمان داری کے خلاف بات ہے۔ اس سے ہم برہمنوں کی عزت پر حرف آ جائے گا۔ آپ اپنا گلاس تیا سے بدل لیں۔“

جن زاد ☆ 85 ☆ تیسرا حصہ

”ہمت بہادر بن رہے ہو، جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔“ میں نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ ”چلو قدم بڑھاؤ۔“

پھر بھی جگن ناتھ پیچھے رہ گیا۔ گھانٹی گاؤں سے گزرتے وقت سورج سر پر آچکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو درختوں کے سائے میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ کچھ ساتھی گاؤں سے کھانالے آئے۔ سب لوگ کھانا کھا کر درختوں کی چھاؤں میں لیٹ گئے۔

ہمیں لیٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک فائزوں کی آوازوں سے سناٹا گونج اٹھا۔ اس کا علم مجھے اپنے تجربوں کے ذریعے بعد میں ہوا کہ پولیس نے مجھے ختم کرنے کے لئے کیا سازش تیار کی تھی۔ مجھے زہریلا دودھ پلانے کے بعد رام دیال کو پولیس سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ وہ کوئی ایسا زہر نہیں تھا کہ فوری طور پر مجھے ہلاک کر دیتا۔ زہر پولیس ہی نے رام دیال کو فراہم کیا تھا۔ اس زہر کا اثر تقریباً آدھے گھنٹے بعد شروع ہوتا۔ جب مقررہ وقت پر رام دیال نے پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا تو پولیس اس کے گاؤں جا پہنچی۔ وہاں اسے رام دیال کے قتل اور میرے فرار کا علم ہوا۔ پھر وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس پولیس ٹولی کے افسر کو یقین تھا کہ میں زیادہ دور نہیں گیا ہوں گا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا مجھ تک پہنچ ہی گیا۔ دھیرے دھیرے تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے درختوں کے سائے میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو آرام کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

گولیوں کی بارش ہوئی تو میں اور میرے ساتھی بھی بھڑک اٹھے۔ ہم نے بھی ہتھیار سنبھال لئے۔ پولیس کے اچانک حملے نے میرے دوستوں کو الٹ دیا۔

”کتوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دو۔“ میں گرجا۔

ہنگامہ مچ گیا۔ غدار جگن ناتھ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے بھی فائزنگ کی، مگر وہ سب سے پیچھے رہا تاکہ پولیس کی جھپٹ میں نہ آجائے۔ ہم لوگ اونچائی پر تھے اس لئے آسانی سے پولیس کا نشانہ بن رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے چار پانچ ساتھیوں کی لاشیں مریں۔ میرے لئے راہ فرار اختیار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میرا اصول تھا کہ کسی ساتھی کی لاش پولیس کے ہاتھ نہ لگے۔ اب مجھے دو کام کرنا تھے، پولیس سے مقابلہ کرنا اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں گھینتے ہوئے پیچھے ہٹنا۔

جگن ناتھ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اب بری طرح پھنس چکا ہوں۔ پھر بھی اس نے غضب سے مجھ پر اس لئے گولی نہیں چلائی کہ نظریں آجاتا۔ ایسی صورت میں اس کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ اسے تو اب فرار کی فکر تھی۔

معاً رویا نے ایک ساتھی لاکھن کے کان میں سرگوشی کی۔ ”تم دائیں جانب سے نیچے اتر کر پولیس پر فائر کرو۔ میں بائیں طرف سے فائر کرتا ہوں۔“

رویہ کی یہ چال کامیاب ثابت ہوئی۔ پولیس گھبرا گئی۔ کئی پولیس والے مقابلے میں مارے جا چکے تھے اور بہت سے زخمی تھے۔ غرض کہ پولیس کی ہمت جواب دے گئی۔ پولیس افسر نے لاکھ جوش دلایا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ پولیس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت اوپر سے میں نے اور صوبیدار

رویہ کے آخری جملے میں سختی آگئی تھی۔ رام دیال آنکھیں پھیلا کر رویہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا اور اسے آہستہ سے رام دیال کی طرف بڑھا دیا۔ میں اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رام دیال نے اپنے ہاتھ کی لرزش چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مجھ سے نظریں ملائے بغیر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت سبھی سانس روکے ہوئے تھے، صرف آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔

اچانک رام دیال کے ہاتھ سے وہ گلاس چھوٹ کر گر گیا جو اس نے مجھ سے لیا تھا۔

”ارے یہ یہ کیا ہو گیا؟“ رام دیال خوفزدہ سی آواز میں بولا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

رویہ اور میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہماری تیز نظروں کی تاب نہ لا کر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بھاگا۔

”خبردار!“ رویہ گرجا۔ ”بھاگنے کی کوشش نہ کرنا رک جاؤ۔ تم نے آج برہمنوں کی مہمان نوازی کو شرما دیا ہے۔“

اس کے باوجود رام دیال رکا نہیں۔ تب رویہ نے اپنی رائفل کی ٹال سیدھی کی اور گولی چلا دی۔ بھاگتا ہوا رام دیال اوندھے منہ زمین پر گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں اور رویہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔

چند قدم آگے بڑھتے ہی رویہ نے مجھے اس طرح مخاطب کیا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ ”ذرا رکنا تایا۔“

میں رک گیا۔ رویہ پلٹ کر رام دیال کے گھر کی طرف چلا گیا اور وہاں سے دودھ کا وہ گلاس اٹھا لیا جو رام دیال نے اسے دیا تھا۔ اس گلاس میں دودھ موجود تھا۔ وہ گلاس رویہ نے گلی کے ایک کتے کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے گلاس میں زبان ڈال دی، مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

”صرف تمہارے گلاس میں زہر تھا۔“ رویہ کہنے لگا۔

”چلو ایک موقع اور مل گیا۔“ میں نے ٹھنڈا سانس لیا، پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”پولیس کے کتے طاقت آزما کر تھک گئے ہیں اور اب ایسی چالیں چل رہے ہیں۔“

ہم دونوں گاؤں سے باہر آگئے جہاں ہمارے دوسرے ساتھی انتظار کر رہے تھے۔

”آس پاس تم لوگوں نے پولیس کی نقل و حرکت تو نہیں دیکھی؟“ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

”نہیں ٹھاکرا“ ایک ساتھی نے جواب دیا۔

”چلو جلد از جلد یہاں سے نکل چلو۔“

”ٹھاکرا“ جگن ناتھ بولا۔ ”ہم کافی تعداد میں ہیں، پھر پولیس سے کیا ڈرنا۔ مقابلہ ہو گیا تو مزہ آجائے گا۔“

نے پولیس والوں پر شدید فائرنگ کی۔ اس قدر فائرنگ ہونے کے باوجود پولیس کو ابھی تک ملک نہیں ملی تھی۔ مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر جو انعام مقرر تھا، وہ بہر حال جان سے زیادہ نہیں تھا۔ پولیس پیچھے ہٹی تو ہمارے محلے میں شدت آگئی۔ ہتھیاروں سے زیادہ لڑنے والوں کا جذبہ کام آہم ہے۔ ہم جان پر کھیل رہے تھے جبکہ پولیس والے جان بچا کر لڑ رہے تھے۔ یہ فرق میرے لئے مددگار ثابت ہوا۔ ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر ہم آہستہ آہستہ چنبل کی طرف سرک گئے۔ پولیس افسر نے یہ دکھانے کی خاطر کہ اس نے ہمیں مار بیٹھا ہے، کچھ دور تک ہمارا تعاقب کیا ورنہ تو وہ حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔

آسمان نے گھائی چولا بدلا۔ اسی کے ساتھ چنبل کے کنارے میں پانچ چٹائیں جل اٹھیں۔ میں اور میرے ساتھی سوگ میں ڈوبے ہوئے بمزکتی چٹاؤں کے سامنے بیٹھے تھے۔ روپا خود کو اس تمام واقعے کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ نہ وہ ضد کر کے مجھے گاؤں کے بھگڑے کو نمٹانے لے جاتا، نہ پانچ ساتھیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

اچانک لاکھن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”اپنا ایک اور ساتھی کم معلوم ہوتا ہے۔“ پھر وہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”جگن ناتھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”وہ زخمی تو نہیں ہوا تھا؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔ وہ کار تو س ختم ہو جانے کا بہانہ کر کے پیچھے چلا گیا تھا۔“ لاکھن نے جواب دیا۔

”پھر کہاں گیا؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کے پلھن اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ زخمی تحصیل دار کو پولیس نے گھیرا تھا تبھی مجھے شک ہوا تھا اور اس وقت پولیس تعاقب کرتی ہوئی ہم تک پہنچی تو مجھے پتہ نہیں ہو گیا تھا کہ ہمارا کوئی ساتھی غداری پر اتر آیا ہے۔“

”تو کیا ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گیا؟“ لاکھن بڑبڑایا۔ ”آخر وہ کہاں جائے گا؟“

مجھے شدید غصہ آنے لگا اور میں نے کہا۔ ”تحصیل دار کی گرفتاری اور میرے پانچ ساتھیوں کے مرنے کی اسے بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔“

فوری طور پر خبر دوڑائے گئے، لیکن غدار جگن ناتھ ہاتھ نہیں آیا۔ کافی دنوں بعد پتا چلا کہ پولیس کی پناہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ پولیس سے اس کی ساز باز کا تمام احوال بھی معلوم ہو گیا۔ اسے نظر پید ہوا ہو گیا تھا کہ اس کا راز اب زیادہ دن نہیں چھپ سکتا اسی لئے وہ فرار ہو گیا تھا۔

جگن ناتھ کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا تو روپا نے مجھ سے کہا۔ ”میں عہد کرتا ہوں تباہ اسے زندہ پکڑ کر موت کے حوالے کر دوں گا۔“

کچھ دیر تک کوئی نہ بولا۔ میں نے لاکھن کو کسی سوچ میں دیکھ کر پوچھا۔ ”تو کیا سوچ رہا ہے؟“ ”تحصیل دار کو گرفتار کرنے والا پولیس افسر ہماری نظروں سے کیوں نکل گیا تھا؟“ لاکھن کہنے لگا۔ ”پولیس افسر رام گوبال سرکار کی آشرवाद لئے فخریہ گھوم رہا ہے کہ اس نے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے زندہ پکڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے، پہلے اب ہم اسی کو ٹھکانے لگائیں گے۔“ میں نے فیصلہ سنا دیا۔

لاکھن اور روپا رام گوبال کو ختم کرنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ رام گوبال کا تبادلہ ضلع متھرا کے ایک گاؤں بھدریا میں ہوا تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی لاکھن نے مجھے اپنے اور روپا کے بنائے ہوئے منصوبے کی تفصیل بتائی، پھر آخر میں بولا۔ ”ٹھاکرا ہم اسے پولیس چوکی سے اٹھا لائیں گے۔“

☆=====☆=====☆

صبح گیارہ بجے کے قریب بھدریا گاؤں میں ایک ٹرک داخل ہوا۔ خاکی دروہوں میں ملبوس اتنے بہت سے پولیس والوں کو دیکھ کر گاؤں کے لوگوں میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ اس کا اظہار ان کے چروں سے ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے دیکھا۔

کسی کی دھیمی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ایک اور گاؤں والے سے یہ قیاس آرائی کر رہا تھا کہ شاید ڈاکو اس طرف آئے ہیں۔ یہ پولیس والے ان کا تعاقب کر رہے ہوں گے۔

ٹرک پولیس چوکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس میں سوار سارے لوگ نیچے کود گئے۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ پولیس انچارج نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان مسلح پولیس والوں کو دیکھا۔ وہ غالباً یہی سمجھا تھا کہ کوئی بڑا پولیس افسر راؤنڈ پر آیا ہے۔ وہ اپنا لباس درست کرتا ہوا دفتر سے باہر آیا۔

نزدیک آتے ہی میں نے اس سے سوال کیا۔ ”رام گوبال تمہارا نام ہے؟“ میرے لمبے میں زعب تھا۔ میرے جسم پر پولیس افسر کی وردی تھی۔

”یس سر!“ اس نے مجھے سیلوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظرس میرے چہرے پر تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔

اس کا جواب سنتے ہی کہ وہ رام گوبال ہے، میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جڑے پر میرا گھونسا پڑا۔ اسی کے ساتھ میں نے کہا۔ ”ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کو تم نے گرفتار کیا تھا۔ میں اسی کا انتقام لینے آیا ہوں۔“

گھونسا کھا کر وہ دودھم پیچھے جا کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر خوفزدہ آواز میں انک نک کر بولا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ؟“ ٹھاکر بلونت..... ٹھاکر بلونت.....

”ہاں ٹھاکر بلونت سنگھ!“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تمہاری موت۔“ پولیس کی دروہوں میں ملبوس میرے مسلح ساتھیوں نے چوکی کو گھیر لیا۔ چار پانچ پولیس والے ڈیوٹی پر تھے۔ ان سے ہتھیار چھین کر انہیں قابو میں کر لیا گیا۔

چوکی کے لاک اپ پر روپا کی نظریڈی تو اسے مذاق سوجھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ان ملاؤں کو بھی حوالات میں بند کر دو۔“

حوالات میں پانچ چھ چور اچکے بند تھے۔ وہ یہ تماشا دیکھ کر خوش نظر آنے لگے۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ! ہمیں بھی رہا کرادو۔“ ایک حوالاتی عاجزی سے بولا۔

روپا کو ہنسی آگئی۔ پولیس والوں کو اس نے اندر دھکیلا اور والوں کو باہر نکال دیا۔

رام گوپال میری دو چار ٹھوکریں کھا کر ہی دروازے پر نیم جاں سا پڑا تھا۔ میں نے لاکھن اور روپا اس کے بارے میں حکم دیا۔ ”سالے کو ساتھ لے چلو۔ تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھ کر اس کے پبلو میں ایک اور ٹھوکر ماری۔

ٹھوکر کھا کر وہ چیخ اٹھا۔ روپا اور لاکھن نے اس کا ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا اور باہر کی جانب تھینے لگے ”جھگوان کے لئے مجھ پر دیا (رحم) کرو۔“ رام گوپال گڑگڑانے لگا۔

”حکومت کا مال کھا کر سالہا بھاری ہو گیا ہے۔“ روپا غصے سے بولا۔

”آج اس کی کھال اتاریں گے۔“ میں نے گھٹنٹے ہوئے رام گوپال کو پھر ایک ٹھوکر ماری اور دم دی۔ ”چینچا تو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔“

چتپتی دوپہر میں گاؤں کے کنارے تڑپتے ہوئے رام گوپال کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ اپنی بے اختیار چیخوں پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

”میں تو تحصیل دار کو تم لوگوں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔“ رام گوپال گڑگڑا رہا تھا۔ ”سرکار سے زبا مجھے تم لوگوں سے انعام ملنے کی آشا (امید) تھی لیکن میرا بڑا افسر آگیا تھا۔ اس کی آمد کے سبب میں بس ہو گیا تھا۔“

”سالے! اب بد معاشی رہنے دے۔“ لاکھن نے یہ کہتے ہی اپنی کمر سے بندھانوکدر خنجر لیا اور گوپال کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔ ”اس دنیا کا آخری درشن کر لے کیونکہ میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑنے والا ہوں۔“

”نا..... نا..... نہیں۔“ رام گوپال گلا پھاڑ کر چیخا۔

لاکھن نے یکے بعد دیگرے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں، پھر کہا۔ ”ہمیں سب معلوم ہے کہ سارے گاؤں میں آکر تڑپتا تھا کہ میں نے ٹھاکر بلونت سنگھ کے بیٹے کو گرفتار کیا ہے۔ جس زبان سے یہ الفاظ ادا کئے، آج وہ بھی کاٹ دی جائے گی۔“ پھر لاکھن نے اس کی زبان بھی کاٹ دی۔

رام گوپال کی لاش کے ٹکڑے کر کے جب ہم چنبل کی طرف لوٹ رہے تھے تو راستے میں ایک نے مجھے بڑی ہولناک اطلاع دی۔ معلوم نہیں کب اور کیسے پولیس نے انتہائی رازداری کے ساتھ عدا میں جھوٹے گواہ پیش کر دیئے تھے۔ ان جھوٹے گواہوں نے عدالت کے سامنے یہ بیانات دیئے تھے کہ نے خود اپنی آنکھوں سے تحصیل دار کو ڈاکے ڈالنے اور لوگوں کو قتل کرتے دیکھا ہے۔ عدالت نے بیانات کو بنیاد بنا کر تحصیل دار کو سزائے موت سنادی تھی۔

میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ ”میری زندگی میں میرا بیٹا چھانی چڑھے گا؟“ یہ کہتے ہی میری آواز بھرا سی گئی۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ آدم زادوں سے میرے کیا رشتے بناتے۔ تو ایک جن زاد ہوں اور بڑھاپے کی طرف ناکل یہ جسم میرا ایک عارضی ٹھکانا ہے۔

میری بات سن کر روپا نے مجھے تسلی دی۔ ”نایا! یہ تو پہلی عدالت کا فیصلہ ہے۔ ہم بڑے سے بڑا وکیل کر کے اوپر والی عدالت میں کیس لڑیں گے۔ تحصیل دار کی زندگی اتنی مختصر نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہاتھ میں جیون رکھا (زندگی کی لکیر) خاصی لمبی ہے۔“

”نہیں روپا!“ مجھے روپا کی یہ تسلی بے معنی معلوم ہوئی۔ ”اب مجھے تمہارے جیوتش پر یقین نہیں رہا۔“

روپا کی نظریں جھک گئیں۔ پھر وہ تحصیل دار کی سزائے موت کے جواب میں قبر بن گیا۔ ڈاکا، قتل اور اغوا کے پے درپے اتنے واقعات ہوئے کہ حکومت قمر اٹھی۔

مدھیہ پردیش کے ہوم منسٹر نے ہنگامی پریس کانفرنس بلا کر حلفیہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک سال میں ٹھاکر بلونت سنگھ زندہ یا مردہ ہاتھ نہ آیا تو میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دوں گا۔ مجھے اس پریس کانفرنس کی پوری تفصیل اپنے خبروں کے ذریعے مل گئی۔

صوبائی ہوم منسٹر کے اس بیان پر اخباری نمائندے مسکرا کر رہ گئے تھے کیونکہ حکومت کی طرف سے اس طرح کے بیانات پہلے بھی دیئے جاتے رہے تھے۔ پھر بھی دوسرے دن کے تمام اخبارات میں یہ خبر پہلے صفحے پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صوبائی ہوم منسٹر اپنی کرسی نہیں بچا سکے گا۔

مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ پولیس افسران کو احکام دے کر صوبائی ہوم منسٹر میرے گرد گھیرا جگ کرنے کے لئے کچھ اور بھی اقدامات کرنے والا ہے۔ ان اقدامات کی تفصیل ابھی معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ایک سال کی مدت کے بارے میں سن کر میں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے اگر فکر تھی تو صرف اپنی محبوبہ رکشی کی۔ مجھے اس سے ملے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس رہی تھیں، لیکن مسئلہ یہی تھا کہ میں اس کا سامنا کیسے کرتا۔

پھر وقت دبے پاؤں گزر گیا اور تحصیل دار کی سزائے موت ہائی کورٹ نے برقرار رکھی۔ تب میں ٹوٹ سا گیا۔

”نہیں نہیں، میں اپنے بیٹے کو چھانی نہیں چڑھنے دوں گا۔“ چنبل کے غار میری آواز سے گونج اٹھے۔

روپا سر جھکائے میرے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ کہنے کے لئے اس کی زبان نہیں کھل رہی تھی۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ تحصیل دار کے ہاتھ میں جیون رکھا خاصی لمبی ہے۔ اس کی زندگی اتنی مختصر نہیں ہو سکتی۔ اب وہ بھلا کس طرح اور کیا کہہ کر مجھے تسلی دیتا۔

میں اپنے غار میں آگیا اور ساتھیوں کو حکم دے دیا کہ کوئی میری تنہائی میں غل نہ ہو۔ مجھے دراصل رکشی بری طرح یاد آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جوان بیٹے کی سزائے موت بحال رہنے پر اس کا کیا حال ہوگا؟ میں جس پراسرار تجربے سے پہلے بھی گزر چکا تھا، مجھے اس کا خیال آیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں پوری شدت سے اپنی محبوبہ رکشی کا تصور کر رہا تھا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرے صفحہ ذہن پر رکنی کا چہرہ ابھرا اور پھر میں نے اس کی آواز سنی۔
”میرا تحصیل دار بیٹا۔“ اس کے بعد وہ چیخ اٹھی۔ اس کی چیخ سے کھیزا راٹھور کی گڑھی کے جیسے پتھر بل گئے۔
”کوئی تو میرے بیٹے کو بچاؤ۔“ وہ بین کرنے لگی۔

گھر کے بچے روتی ہوئی رکنی کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک بچے نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”دادی! روتی کیوں ہو؟ اپنے باپو (بلونت سنگھ) تحصیل دار چاچا کو رہا کر لائیں گے۔ پولیس ان سے بت ڈرتی ہے۔“
رکنی کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے معصوم بچوں کی تسلی سے رکنی کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔ میں اس کی مشکل سمجھ رہا تھا۔ وہ بچوں کو کیسے سمجھاتی کہ اب تحصیل دار کو پولیس کے قبضے سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ پولیس اسے موت کے منہ میں دھکیل کے رہے گی۔

ذرا ہی دیر کے بعد میں نے بلونت سنگھ کے عزیز رشتے داروں کو گڑھی میں جمع ہوتے دیکھا۔ ان سبھی کو تحصیل دار کی سزائے موت کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔
”ابھی ایک علاج ہے۔“ ایک شخص نے رکنی کو مخاطب کیا۔ ”حکومت سے رحم کی اپیل کر دو کہ پھانسی معاف کر کے عرقیدے دے۔“

”میں حکومت سے رحم کی اپیل کروں؟“ رکنی کی آنکھوں سے سرفی جھلکنے لگی۔ ”رحم کے لئے عاجزی کروں؟ اپنے دشمنوں کے سامنے ہاتھ جوڑوں؟ ان کی خوشامد کروں..... ان کی خوشامد کروں جو میرے سہاگ کے دشمن ہیں؟“

”لیکن تم یہ کیوں بھول رہی ہو رکنی کہ تم ایک ماں بھی ہو۔“ ایک بوڑھی عورت بول اٹھی۔
”کیا اپنے جوان بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے ماں اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتی؟“ ایک اور عورت نے کہا۔

کچھ دیر تک رکنی خاموش رہی، پھر ایک دم کہنے لگی۔ ”تحصیل دار کی خاطر میں اپنا سر جھکا دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ ”میں حکومت کے سامنے ہاتھ جوڑ لوں گی.....
بیٹے تحصیل دار! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تیری نازک گردن میں پھندا پڑے۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”مگر..... مگر کیا سرکار میری بات سنے گی؟ اس کی نظر تو تحصیل دار کے باپ پر ہے۔ حکومت مجھ سے کہے گی کہ بیٹے کو بچانا ہے تو باپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ پھر.....؟ پھر کیا ہوگا؟“ رکنی بہت دور تک اور صحیح خطوط پر سوچ رہی تھی۔

اسی روز میرے ایک مخبر نے مجھے خلاف توقع خبر دی۔ معلوم ہوا کہ صوبائی وزیر داخلہ میری محبوبہ رکنی سے ملنے اس کے میکے جانے والا ہے۔ رکنی سے وہ کیوں ملنے والا تھا اس سلسلے میں صرف اندازے ہی لگائے جا سکتے تھے۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ وہ اگلے روز صبح رکنی سے ملے گا۔

دوسرے دن صبح میں نے ایک بار پھر رکنی کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے رکنی کا اداس چہرہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ اپنے میکے اور بیت پورہ میں تھی۔ اس وقت بھی رکنی کے پاس کئی عزیز رشتے دار بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ حکومت کے نام رکنی کی طرف سے تحصیل دار کے لئے رحم کی

درخواست لکھی جا چکی ہے۔

اسی وقت کسی نے باہر سے آکر بتایا کہ پولیس کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں میں داخل ہوا ہے۔

”معلوم کرو، وہ کون لوگ ہیں اور کیوں آئے ہیں؟“ رکنی نے بارعب آواز میں حکم دیا۔

ذرا ہی دیر میں رکنی کو حقیقت کا علم ہو گیا۔

پولیس چپوں کے ساتھ صوبائی وزیر داخلہ کی کار دخول اڑاتی رکنی کے گھر کے سامنے رک گئی۔

اندر خبر کی گئی اور رکنی نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔“ رکنی کے رشتے کا ایک بھائی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔ ”خود حکومت کا ایک وزیر ہمارے دروازے تک آ گیا۔“

جواب میں رکنی کچھ نہ بولی۔ اس وقت تک صوبائی وزیر کیلاش ناتھ اور ایس ایس پی منوہر سنگھ کو نشست گاہ میں بٹھایا جا چکا تھا۔

رکنی بڑے باوقار انداز میں چلتی ہوئی نشست گاہ میں داخل ہوئی۔

”رکنی جی! یہ صوبائی ہوم منسٹر کیلاش ناتھ جی ہیں۔“ ایس ایس پی منوہر سنگھ نے کیلاش ناتھ کا تعارف کرایا۔

رکنی نے کیلاش ناتھ کی طرف تاپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ پولیس والوں کے وزیر ہیں۔“ رکنی کے بھائی نے اسے سمجھایا۔

رکنی کے چہرے سے سختی کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے منہ پھیر لیا۔ وہ بہر حال ایک راجپوت گھرانے کی بیٹی تھی۔

ایس ایس پی منوہر سنگھ نے رکنی کے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”منسٹر صاحب خود آپ کے گھر آئے ہیں، پھر بھی ان سے ایسا برتاؤ۔“

”ہمیں ان کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھنا چاہئے۔“ کیلاش ناتھ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یہ ٹھاکر بلونت سنگھ کی بیٹی (بیوی) ہیں اور میں پولیس کا وزیر ہوں۔ لہذا مجھ کو دیکھ کر ان کا یہ رد عمل فطری ہے۔ میں اس ٹھکے کا وزیر ہوں جس نے ان کے جوان بیٹے کو پھانسی کی سزا دلوائی ہے۔

رکنی جی کو مجھ سے نفرت کرنے کا پورا حق ہے۔ ہم ان سے یہ حق نہیں چھین سکتے۔“

صوبائی وزیر داخلہ کیلاش ناتھ مجھے میٹھی چھری محسوس ہوا۔ اس کے نرم اور سچے الفاظ نے یقیناً

رکنی پر اچھا اثر چھوڑا تھا۔ اب رکنی کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔ اسی وقت رکنی کے بھائی نے قریب

آکر اس سے سرگوشی کی۔ ”رکنی بہن! مت بھولو کہ ہم راجپوت ہیں اور راجپوت کبھی گھر آنے والے کی بے عزتی نہیں کرتے۔“

رکنی نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کیلاش ناتھ کو مخاطب کیا۔ ”آپ تشریف رکھیں، میں ابھی آتی

ہوں۔“ رکنی کے لمحے میں اب تاپسندیدگی یا نفرت نہیں تھی۔

اندر جا کر رکنی نے ایک الماری سے گزشتہ روز لکھی جانے والی درخواست نکالی اور پھر واپس

”تم موت کی دھمکی کے دے رہے ہو؟“ رکنی گرجی۔ ”جاؤ تم سے جو ہو سکے، وہ کر لیتا۔ میرے گھر آ کر اور میرے سامنے ٹھاکر کے خلاف بول رہے ہو۔“ رکنی کی آنکھوں سے آگ سی برس رہی تھی۔ اس نے کیلاش ناتھ کے ہاتھ سے رحم کی درخواست چھین لی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بے قابو سانسوں کو درست کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور دھاڑی۔ ”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

☆=====☆=====☆

رکنی ایک بہادر راجپوت عورت تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ کو یوں اپنے گھر سے نکال دینا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اتنا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس نے ایک فشر کی توہین کی تھی، صرف اس لئے کہ فشر نے مجھے برا کہا تھا۔ یوں گویا رکنی نے تحصیل دار کی قسمت پر مرگ لادی تھی۔

ایک سال کی مہلت کے دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ میرے اندر اب تک اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ رکنی سے مل سکوں۔ اس عرصے میں تحصیل دار کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کی لاش آخری رسوم کے لئے رکنی کے حوالے نہیں کی گئی تھی اور یہ سراسر ظلم تھا۔ حکومت اپنے ایک فشر کی توہین کا پورا بدلہ لے رہی تھی۔ لاش کو درخاء کے حوالے نہ کرنے کا یہ جواز تلاش کیا گیا تھا کہ اس سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔ اطلاع کے مطابق تحصیل دار کو پھانسی دینے سے پہلے رکنی کو ملاقات کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ بیٹے سے اس کی یہ آخری ملاقات ہے اور آئندہ روز صبح تحصیل دار کو پھانسی دی جانے والی ہے۔

رفتہ رفتہ اب میں اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا تھا کہ مجھے ٹھاکر بلونت سنگھ کا جسم چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اب اس جسم میں رہنے کا حاصل بھی کیا تھا۔

مجھے اطلاعات مل رہی تھیں کہ ٹھاکر بلونت سنگھ، یعنی میرے موجودہ جسم کو ختم کرنے کے لئے پولیس زبردست انتظامات کر رہی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ کیلاش ناتھ کے استعفیے سے بڑی بدنامی اور کیا ہوئی۔ مجھے ختم کرنے کی غرض سے تھرڈ ایجنٹ آری فورس بنائی گئی۔ اس فورس میں چھانٹ چھانٹ کر پھاڑی اور گورکھے سپاہی لئے گئے جنہیں خصوصی تربیت دی گئی۔ چھیل کے راستے مسدود کرنے کے بعد میرے گروہ سے اس نئی آری فورس کے مقابلے شروع ہو گئے۔ چاند پور، بڑگاری، جی اولاری، ہر جگہ ٹکراؤ ہوا۔ پھر بھی نہ تو مجھے پکڑا جاسکا، نہ ہی زخمی کیا جاسکا۔ یہ آنکھ بھولی مسلسل جاری تھی۔ یہ اطلاع بھی ملی کہ آری فورس کے ساتھ پولیس کے کچھ دستے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ پولیس والے تھے جن سے پہلے بھی میرا ٹکراؤ ہوتا رہا تھا اور وہ چھیل کے پورے علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہی میں ایک سینئر پولیس افسر رنجی سنگھ بھی تھا جس کا تعلق امرتسر کے ایک گاؤں سے تھا۔ متعدد بار اس سے میرے مقابلے ہو چکے تھے۔ خود میں بھی اس کی بہادری کا معترف تھا۔

میں نے اب راکٹل چھوڑ کر ہاتھ میں لائٹھی تمام لی تھی۔ میری کلائی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور ہاتھ کی غٹوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ بیٹے کو پھانسی ہونے کی

نشت گاہ میں آگئی۔ رکنی نے کیلاش ناتھ کے ہاتھ میں وہ درخواست تھما دی۔ کیلاش ناتھ درخواست پڑھنے لگا۔ میری توجہ اب اس درخواست کی عبارت پر تھی۔

درخواست میں رکنی نے اپنے بیٹے تحصیل دار کے لئے رحم کی اپیل کی تھی۔ میں نے کیلاش ناتھ کے ہونٹوں پر بڑی عیارانہ مسکراہٹ رقص کرتے ہوئے دیکھی۔ اس نے درخواست پڑھ کر کہا۔ ”رکنی جی! میں اسی لئے آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ کے جوان بیٹے کی سزائے موت عمر قید میں بدل سکتی ہے، مگر اس کی ایک شرط ہوگی۔“

”وہ کیا؟“ رکنی ایک دم بول اٹھی۔

”شرط یہ ہے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ خود کو قانون کے حوالے کر دے۔“ کیلاش ناتھ نے شرط بتائی۔

اب میں اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر رکنی بولی۔ ”حکومت اگر ٹھاکر کو معافی دے دے تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ ڈاکے ڈالنا چھوڑ دیں گے۔ میں انہیں اس پر راضی کر لوں گی۔ وہ میری بات مان جائیں گے۔ اپنی حکومت کے دور میں ٹھاکر خود بھی ڈاکے ڈالنے سے خوش نہیں ہیں۔“ رکنی بڑے بے تے الفاظ میں بول رہی تھی۔ ”اگر سرکار مان جائے تو ٹھاکر باقی زندگی اپنے بچوں کے درمیان گزار دیں گے۔“ رکنی یہ کہہ کر پرامید نظروں سے کیلاش ناتھ کی طرف دیکھنے لگی۔

چند منٹ تک کیلاش ناتھ چپ رہا۔ اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر وہ بولا۔ ”تم اپنے پتی (شوہرا) کو سمجھاؤ کہ وہ گرفتاری پیش کر دے۔“

”پھر آپ ان پر مقدمہ تو نہیں چلائیں گے؟“ رکنی نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ اچانک کیلاش ناتھ کا لہجہ بدل گیا۔ ”اس جیسے بدنام ڈاکو کو حکومت

کس طرح معاف کر سکتی ہے۔“

”بدنام ڈاکو۔“ رکنی کی بھنوں تن گئیں۔ اس کے لہجے کی نرمی اب ختم ہو چکی تھی۔ ”جا کر پورے علاقے میں پوچھو، گاؤں گاؤں معلوم کرو، اگر ایک شخص بھی ٹھاکر کو بدنام ڈاکو کہہ دے تو میں خود انہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں گی۔ لوگ تو انہیں انصاف کرنے والا سمجھتے ہیں، ان سے اپنے فیصلے کراتے ہیں۔“

”حکومت ٹھاکر بلونت سنگھ کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اس کے سیاہ کارناموں کی طویل فہرست ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر وہ اپنے جوان بیٹے کو سزائے موت ہونے کی وجہ سے چھپتا رہا ہو تو خود کو ہمارے سپرد کر دے۔ سرکار ایسی صورت میں اس کی قانونی مدد کرے گی۔ اگر وہ عدالت کے سامنے خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب رہا تو اسے سزائے موت نہیں ہوگی۔“ پھر کیلاش ناتھ نے دھمکی دی۔ ”نہیں تو وہ پولیس کے سامنے زیادہ دن تک نہیں ٹک سکے گا، بری طرح مارا جائے گا۔“

اس سے پہلے کبھی کسی نے رکنی سے ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ لوگ اس کا ادب کرتے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ رکنی کے سامنے مجھ برا کہہ سکے۔

بلونت سنگھ کو اس کا پتا بھی نہیں چلے گا۔

شادی کی یہ دعوت ہی اس غدار کی موت کا سبب ہوئی۔ میں نے روپا کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔

جس روز اور جس وقت جگن ناتھ کو شادی میں شرکت کرنا تھی، میں نے اس کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا منہ میرے سامنے تھا۔ وہ بنا ٹھٹھا نظر آ رہا تھا۔

”بس دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے پولیس والوں سے کہا۔ ”ڈر کے مارے بند ہو کر رہ گیا تھا۔“

”دو مسلح آدمی ساتھ لیتے جاؤ۔“ ایک پولیس افسر نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں۔“ جگن ناتھ نے انکار کر دیا۔ ”یہ میرے ٹھاکر پن کی بے عزتی ہے۔ بلونت سنگھ ٹھاکر ہے تو میں بھی ٹھاکر ہوں۔ پھر یہ کہ پولیس والے میرے ساتھ ہوئے تو میں دوسروں کی نظر میں بھی آ سکتا ہوں۔“ بات کرتے ہوئے پہلے تو اس نے سینہ تان لیا، پھر چہرے سے قدرے خوف جھلکنے لگا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ پولیس نے کہہ دیا۔

لیکن اصل مرضی تو قدرت کی تھی۔ جگن ناتھ کو اس کی موت بلاری تھی۔

گاؤں میں داخل ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وہ اپنی بہادری کی بڑبانگ رہا تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے چونکا دیا۔ ایک گھڑ سوار ہاتھ میں رائفل تانے بڑی دلیری کے ساتھ چھینٹا ہوا چلا آ رہا تھا۔ جگن ناتھ نے اسے اپنی ہی طرف لپکتے دیکھا تو اس کی تپتی ہوئی گروں، ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر مجھے پسینہ بہتا ہوا نظر آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔

پھر اس سے پہلے کہ جگن ناتھ بھاگ جاتا، اسے مسلح افراد نے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

”کئے!“ روپا اس کا گریبان پکڑ کر گر جا۔

جگن ناتھ جھٹکا کھا کر پانچ گز دور جا گرا۔ روپا گھوڑے سے کودا۔ پھر اس نے چت پڑے ہوئے جگن ناتھ کے سینے پر پیر رکھ دیا۔

”بے ایمان.....! غدار.....! تیرا وقت ختم ہو گیا۔“ روپا ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھا۔

جگن ناتھ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے روپا کو رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑنا چاہا۔ اسی وقت روپا نے اس کے چہرے پر ٹھوکر ماری۔ زبردست ٹھوکر سے جگن ناتھ کا ایک رخسار پھٹ گیا۔

اس وقت دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ لوگ کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے جگن ناتھ کا انجام دیکھ رہے تھے۔

”سالے کو رسی سے باندھ لو۔“ روپا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

وجہ سے میری کمرٹ گئی ہے۔ اب میرے چہرے سے واضح طور پر بڑھاپا جھلکنے لگا تھا۔ بات تھی بھی سچ۔ رکنی سے جدائی برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ راتوں کو میں اکثر جاگتا رہتا اور کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آتی۔ اسی دوران ایک روز میں روپا سے مخاطب ہوا۔ ”روپا! پولیس کی دھمکی چاہے غلط ثابت ہو، مگر لگتا ہے اب اوپر والا مجھے مہلت نہیں دے گا۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ کسی دن اچانک میرا بلاوا آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں ذہنی طور پر روپا کو تیار کر رہا تھا کہ یہ جسم چھوڑ کر چلا جاؤں تو اسے زیادہ ملال نہ ہو۔ یہ جسم چھوڑنے کا مطلب ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت ہی ہوتی۔ ”روپا! اس سے پہلے کہ میری آنکھیں بند ہوں جگن ناتھ کو کسی طرح اس کی غداری کی سزا ملنی چاہئے۔“ میں ابھی تک غدار جگن ناتھ کو بھولا نہیں تھا۔ میرے دل میں یہ کانٹا بڑی طرح کھک رہا تھا۔ جگن ناتھ کی غداری کے نتیجے ہی میں تحصیل دار پہلے زخمی اور پھر گرفتار ہوا تھا۔ جب تک جگن ناتھ زندہ تھا، میں سکون سے کیسے رہ سکتا تھا۔

”تاما! میں بھی اسی کی فکر میں ہوں۔“ روپا نے جواب دیا۔ ”میں نے اس پر کڑی نظر رکھی ہوئی ہے۔ ہمارا مخبر ہر وقت اس کی ناک میں رہتا ہے۔“ پھر اس نے دانت پیسے اور کئے لگا۔ ”لیکن وہ بزدل پولیس کے پہرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔“

روپا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھ سے بہتر بھلا کون اس بات کو جانتا۔ میں اپنے تصور کی پراسرار قوت کو کام میں لا کر کئی بار غدار جگن ناتھ کو پولیس کے تخت پہرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے روپا سے کہا۔ ”دیکھنا اس سے پہلے ہی میری روح جسم کا ساتھ نہ چھوڑ جائے۔“ یہ کہہ کر میں نے ٹھٹھا سانس بھرا۔

میرے ان الفاظ نے روپا کو جیسے مجسم شعلہ بنا دیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ”جان خطرے میں ڈال کر بھی اسے ختم کر دوں گا۔“

جگن ناتھ کے بارے میں مخبروں سے بھی مجھے اطلاعات مل رہی تھیں۔ ان سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ موت اس کے سر پر منزل لا رہی ہے۔ اسے یہ نظر بندی کھک رہی تھی جس کا وہ کئی افراد سے اعتماد بھی کر چکا تھا۔ مجھ سے غداری کے صلے میں اسے زمین اور نقد رقم ملی، مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ چوبیس گھنٹے پولیس کے گھیرے میں رہتا۔ یہ جیل جیسی زندگی تھی۔ لوگ آزادانہ گھومتے اور مزے اڑاتے، لیکن پیسے ہونے کے باوجود وہ مجبور تھا۔ غم بھلانے کے لئے وہ شراب پیتا۔

گاؤں کے ایک رشتے دار نے اسے شادی کا دعوت نامہ بھیجا تو وہ چڑ گیا۔ مجھے بھی اس کی خبر مل گئی کہ جگن ناتھ نے اپنے چند خاص دوستوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ ذلیل لوگ مجھے مدعو کر کے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں باہر نہیں نکل سکتا۔ اب میں شادی میں شریک نہ ہوا تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے کہ دیکھا، جگن ناتھ نہیں آیا۔ کیسے آئے کہ اس کا باپ ٹھاکر بلونت سنگھ جو سینے پر سوار ہے۔ نہیں نہیں، اس مرتبہ میں لوگوں کو یہ موقع نہیں دوں گا کہ وہ میرا مذاق اڑا سکیں۔ میں خاموشی کے ساتھ شادی میں شرکت کر کے سب کو حیرت زدہ کر دوں گا۔ میں دو گھنٹے کے اندر اندر لوٹ آؤں گا۔ ٹھاکر

روپا کی بے رحمی سے جگن ناتھ اچھی طرح واقف تھا۔ شاید اسی لئے وقت سے پہلے ہی اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی تھی۔ جب اسے باندھا گیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ روپا گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھی دور نکل گئے تو روپا نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا الف ہو گیا تو اس نے ایک دم لگام چھوڑ دی۔ گھوڑے نے دوڑ لگائی اور جگن ناتھ پیچھے گھسٹنے لگا۔

لوگوں نے جگن ناتھ کو گھسٹتا، ٹکراتا اور چپٹا چلاتا دیکھا تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں کہ بند آنکھوں سے مجھے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ غدار جگن ناتھ کو روپا میرے ہی پاس لے کر آتا۔

پھر جب روپا نے جگن ناتھ کو میرے سامنے پیش کیا تو اس کا عضو عضو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس غدار کو اپنے سامنے دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور چیخ اٹھا۔ ”ذلیل بے ایمان غدار کتے“ ایک ایک گالی کے ساتھ جگن ناتھ پر میری لاشیں برسے لگی۔

ذرا سی دیر میں جگن ناتھ کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑ گئے۔ اس کی آخری چیخیں چنبل کے کٹاؤ میں دفن ہو چکی تھیں۔

جگن ناتھ کی لاش اسی رات اس کے گاؤں میں پھونکا دی گئی۔

دوسرے دن مجھے اپنے ایک تجربے سے پولیس کا رد عمل معلوم ہوا۔ جگن ناتھ کے قتل نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پولیس کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھی جگن ناتھ کا انتظار کر رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب کوئی میری خبری کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ پولیس کو براہ راست مجھ سے ٹکراتا ہو گا۔

☆=====☆

اگلے تین ماہ چنبل کے کٹاؤ گولیوں کی آدازوں سے گونجتے رہے۔ پولیس کے مسلح دستے دن رات میری تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر بھاگتا رہا۔ موقع ملنے ہی میں ڈاکا ڈا کر پولیس کے منہ پر چائنا مار دیتا۔ میں اور پولیس دونوں ہی مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

سورج مغرب کی جانب جھک رہا تھا۔ جگہ جگہ چنبل کے کنارے پولیس کی پٹریں پڑاؤ ڈالے ہو۔ تمہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو لئے پچا پچاتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں میری دانست میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کئی روز سے دن رات بھاگتے بھاگتے میرے ساتھی تھک چکے تھے۔ میرے حکم پر سب آرام کرنے لگے مجھے گمان بھی نہ تھا کہ رکنی سے بیشہ کے لئے پھرنے کی گھڑی آ پہنچی ہے، نہ یہ خبر تھی کہ ڈاکا بولنت سنگھ کے جسم میں وہ میرا آخری دن ہے۔

بس اچانک ہی مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر جنم کے دہانے کھل گئے تھے۔ سنسناتی ہوئی پہلی م لاکھن کے شانے کو چسپید گئی۔ میرے ساتھیوں نے ہوشیار ہو کر ہتھیار اٹھائے۔ روپا اور صوبیدار نے آ ساتھ ٹریگر دبائے تھے۔ میں نے ایک درخت کی آڑ لے لی تھی۔ صورت حال کا اندازہ لگانے کے لئے

نے پیچھے ہی درخت کے تنے سے سر نکال کر باہر جھانکا، ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے پہلو سے گزر گئی۔ لمحے بھر کو مجھے خیال آیا کہ میں اب تک بہت خطرناک کھیل کھیلتا رہا ہوں۔ اگر مجھے گولی لگ جائے اور میں اس جسم سے فرار نہ ہو سکوں تو جن زاد ہونے کے باوجود میرا ”دی اینڈ“ لگتے دیر نہیں لگے گی۔ میں نے سوچا، لیکن اسی کے ساتھ خود کو نشانہ بنائے جانے پر میں شیر کی طرح بپھر گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی لاشی پھینک کر رائفل اٹھالی۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ میرے مقابلے پر زرنجن سنگھ ہے۔ میں تو اس وقت چونکا جب مجھے اس کی بلند آواز سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ”بوڑھا بلونت سنگھ!“ زرنجن سنگھ نے چیخ کر کہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر زرنجن سنگھ پر گولی چلاتا، اس کی گولی میرے پیر کو رگڑتی ہوئی گزر گئی۔

لاکھن زخمی ہونے کے باوجود مجھے آڑ میں لے کر فائرنگ کر رہا تھا۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ ”نہیں لاکھن، مجھے لڑنے دے۔ کتوں کو ختم کرنے کا اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔“

زرنجن سنگھ کے ساتھ ہی ایس پی گوہند تھا بھی تھا۔ وہ جوش میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نشانہ لیتے دیکھا۔ اسی لمحے خود میں بھی اس کا نشانہ لے چکا تھا۔ یقیناً وہ ایک ہی لمحہ تھا کہ جب گوہند تھا اور میں نے ایک دوسرے پر گولی چلائی۔ دورا نکلوں کے ٹریگر ایک ساتھ دبے۔ ادھر گوہند ٹپا اپنا سینہ تھامے گرا، ادھر میرے سینے میں آگ سی بھر گئی۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اب ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم کو چھوڑنے کا وقت آ گیا۔ میں نے اگر ایسا کرنے میں تاخیر کی تو مارا جاؤں گا۔ میرے آنکھوں کے آگے اندھیرا رقص کرنے لگا تھا۔ میرے سینے سے گرم گرم خون بہہ کر زمین کو سرخ کر رہا تھا۔ میرا سانس گھٹنے لگا، رگیں ٹوٹنے لگیں۔ اسی وقت میری زبان ذرا سی سرسرائی اور ہونٹ پھڑپھڑائے۔ ”بے بھوانی۔“

پھر میں ایک ہی جھٹکے میں ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم سے باہر آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے بلونت سنگھ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”تایا!“ روپا چیخ اٹھا۔ اس پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بلونت سنگھ کے مردہ جسم کے قریب کھڑا ہوا گولیاں برسانے لگا۔ ”ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔“ وہ پھر گیا۔

بلونت سنگھ کے مرنے سے پولیس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ زرنجن سنگھ نے پولیس والوں کو لٹکارا۔ جب سے میں نے بھوانی کا جاب کیا تھا، زیادہ دیر کسی آدم زاد کے جسم سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے لئے کوئی نہ کوئی قالب ضروری تھا، خواہ وہ قالب حیوانی ہی کیوں نہ ہو۔ ذرا سی دیر میں مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہونے لگا اور میرے وجود میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

”کچھ لوگ عقب میں چلے جاؤ۔ ڈاکوؤں کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔“ زرنجن سنگھ کی آواز مجھے سنائی دی۔

میرے ایک ماتحت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”سر! ہماری مدد کے لئے پولیس کی ایک اور کھڑی آگئی ہے۔“
میں اس وقت تک زنجن سنگھ کے جسم سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔

☆=====☆

صوبائی ہوم منسٹر کیلاش ناتھ نے رات کو دس بجے ہنگامی طور پر پریس کانفرنس بلائی۔ اس پریس کانفرنس میں ڈی آئی جی کراچی کی حیثیت سے میں بھی موجود تھا۔ کیلاش ناتھ کا چہرہ خوشی سے تھم رہا تھا۔
”ٹھاکر بلونت سنگھ کو اس کے انجام تک پہنچا دیا گیا۔ وہ ختم کر دیا گیا۔“ کیلاش ناتھ نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا۔ ”بلونت سنگھ کے ساتھ ساتھ ہی اس کا بیٹا صوبیدار بھی مارا گیا۔“
اخباری نمائندے اس غیر متوقع اعلان پر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ”ناممکن..... یہ نہیں ہو سکتا۔“

پھر اخباری نمائندوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ”کہاں؟ کیسے؟ کس جگہ؟ ٹھاکر بلونت سنگھ کس کے ہاتھوں مارا گیا تھا؟“

کیلاش ناتھ نے ہر سوال کا جواب بہت اطمینان سے دیا۔

”ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا کیا ثبوت ہے؟“ کسی اخباری نمائندے نے سوال کیا۔ کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ یہ سوال کرنے والے کا ٹکٹ صحیح تھا۔ پہلے بھی ٹھاکر بلونت سنگھ کے مرنے کی افواہیں کئی بار گفت کر چکی تھیں۔ جھوٹی خبریں چھاپ کر اخبار والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”آپ کو ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا یقین آجائے گا۔“ کچھ دیر بعد کیلاش ناتھ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بلونت سنگھ کی بیوی اس کا یقین دلائے گی۔“

پھر پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔ کیلاش ناتھ نے میری توقع کے مطابق مجھی کو حکم دیا کہ رکنی کو ساتھ لے کر آؤں۔

میں ادریت پورہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس وقت میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جانے میری محبوبہ کس حال میں ہوگی۔

میری جیب آخر کار ادریت پورہ پہنچ گئی۔ جیب کو میں نے رکنی کے گھر کے سامنے ہی کھڑا کیا تھا۔ دستک دینے پر رکنی کا بھائی باہر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک لاش کی شناخت کرانے کے لئے رکنی کو ساتھ لے جانا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے سے لگا ہوا سب کچھ سن رہا ہے۔ میرے خیال کے مطابق وہ رکنی ہی ہو سکتی تھی۔

رکنی کا بھائی اندر چلا گیا اور پھر کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ وہ رکنی ہی سے مخاطب تھا۔
”بہن! ڈی آئی جی صاحب آئے ہیں۔“

”کیا کام ہے؟“ رکنی کی اداس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”کسی لاش کی شناخت کرانا ہے۔“ رکنی کے بھائی نے بتایا۔

”لاش!“ رکنی کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”کس کی لاش؟“

زنجن سنگھ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے میری محبوبہ رکنی سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہے۔ اسے اس کی سزا ضرور ملنا چاہئے۔ میں نے سوچا اور سزا کا فیصلہ کر لیا۔
سزا، سزائے موت ہی تھی۔

جس وقت میں ’زنجن سنگھ کے قریب پہنچا‘ لاکھن کو گولی کھا کر مرتے دیکھا۔ وہ جس سردار بلونت سنگھ کی زندگی بھر تمکبانی کرتا رہا تھا، اسی کے قریب لیٹ گیا۔

”روپا! تم پولیس کو سنبھالو، میں باپو کا جسم بھاتا ہوں۔“ میں نے صوبیدار کی آواز سنی جسے بلونت سنگھ کے مردہ جسم کی فکر تھی۔ باپ کی موت پر آنسو بہانے کا یہ موقع نہیں تھا۔ صوبیدار کو اپنے باپ کے مردہ جسم کی فکر اس لئے تھی کہ ہندو عقیدے کے مطابق بیٹے کے ہاتھوں آخری رسوم ادا ہونے ہی مرنے والے کی روح کو سکون ملتا تھا۔ صوبیدار کے لئے اسی سبب رونے کی بجائے یہ جان لٹا دینے کی گھڑی تھی۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کسی صورت پولیس کے ہاتھ نہ لگے، اس کی یہی کوشش تھی۔

روپا اور دوسرے ساتھی، پولیس کو الجھانے کی خاطر تیزی سے فائرنگ کرنے لگے۔ کبھی کبھ صوبیدار بھی اپنے باپ کی لاش گھینٹتے ہوئے فائر کرتا۔

زنجن سنگھ اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”بلونت سنگھ کی لاش ہمارے ہاتھ سے نہ جانے پائے ورنہ ثبوت ختم ہو جائے گا کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور.....“ اس جملہ ادھر وادی رہ گیا۔ میں اس کے جسم میں داخل ہو گیا تھا۔

حسب معمول مجھے اس نئے آدم زاد کے جسم میں داخل ہو کر رگ و ریشے میں اترتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، مگر اس طرح جیسے وہ کوئی خواب ہو۔ اسی عرصے میں صوبیدار نے باپ کی لاش کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ اسے غالباً لاش کو گھسیٹنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میرے ایک ماتحت بنواری نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے صوبیدار پر گولی چلائی اور یوں صوبیدار بھی مارا گیا۔ باپ اور بیٹے کی لاشیں لڑھک کر ایک جھاڑی میں اٹک گئیں۔

روپا سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور دردناک آواز میں بولا۔
”ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا..... باپ جیسا تایا اور بھائی جیسا صوبیدار دونوں گئے..... نہیں نہیں، نہیں ہو سکتا۔“ وہ چیختا ہوا لاشوں کی طرف بڑھا۔

لاشیں پندرہ بیس گز دور پڑی تھیں اور اب لاشوں پر قبضہ کرنے کے لئے زور آزمائی شروع ہو چکی تھی۔

روپا آہستہ آہستہ لاشوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی اسے آڑ میں لئے ہوئے تھے اب سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

”لوٹ جاؤ کتو!“ روپا کی بلند آواز آئی۔

جواب میں پولیس کی طرف سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ روپا کو شاید یہ آس تھی کہ اندھیرے آوج سے پولیس آگے نہیں بڑھے گی اور صحیح نشانہ بھی نہیں لے سکے گی، مگر پھر یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔

”یہ انہوں نے نہیں بتایا۔“

مجھے علم تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اور صوبیدار کا نام سن کر رکنی پھر جاتی پھر اسے گوالیار لے جانا مشکل ہو جاتا۔

ذرا ہی دیر میں رکنی چادر اوڑھے باہر آئی تو اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اسے خالص عرصے بعد دیکھا تھا۔ اس عرصے میں وہ بالکل ڈھے گئی تھی۔ پھول بالکل مرجھا گیا تھا۔ اس پر خزاں چھا گئی تھی۔ یہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کے بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا حسین جسم ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہا تھا۔ یقیناً یہ وہ رکنی ہرگز نہیں تھی جو میری محبوبہ تھی اور میں جس کا دیوانہ تھا۔ جوان بیٹوں کا غم اسے کھا گیا تھا۔

جو سوال اس نے اپنے بھائی سے کیا تھا، مجھ سے بھی کیا کہ لاش کس کی ہے؟

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے دانستہ نہیں بتایا۔ ”مجھے تو اوپر سے حکم ملا تھا کہ آپ کو گوالیار پہنچا دوں۔“

رکنی کے ساتھ اس کا بھائی بھی تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ جیب میں بیٹھ گئی۔ گوالیار تک خاموشی رہی۔

آخر وہ بری گھڑی آ ہی گئی۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی سانسے پڑی تھی۔ رکنی کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے اشارے پر ایک پولیس والا لاش کے چہرے سے چادر ہٹانے کو جھکا۔

چادر ہٹتے ہی رکنی کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ ”ٹھاکر!“ اس نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔ رکنی کو یوں بین کرتے دیکھ کر میرے دل پر بھی چوٹ سی گئی۔

وہ مظلوم عورت بے خبر تھی کہ اس کا شوہر ٹھاکر بلونت سنگھ تو بہت عرصے پہلے مر چکا تھا، اس وقت جب میں نے اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا۔ رکنی سے تو میں عشق کرتا رہا تھا جو آج بھی زندہ سلامت تھا، ہاں اب جسم دوسرا تھا۔ میں زنجبیں سنگھ کے جسم میں تھا۔

ٹھاکر بلونت سنگھ کی موت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔

مسکراتا چہرہ، سفید مونچھیں، تین چار دن کی بڑھی ہوئی داڑھی، پیشانی پر ابھری ہوئی شکنیں، چپکتی ہوئی بے جان آنکھیں، یہ بلونت سنگھ ہی تھا جو شیر کی طرح زندہ رہا تھا اور شیر کی طرح مر رہا تھا۔ رکنی نے جبکہ کر بلونت سنگھ کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ آخری ملاپ تھا اور پھر بیشک کی جدائی تھی۔

معا رکنی کے بچتے ہوئے آنسو ختم گئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی کی طرف بڑھایا اور بلونت سنگھ کی بے جان کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے ساگ کا نشان مٹا دیا، کلائی کی سبز چوڑیاں توڑ دیں۔ یہ چوڑیاں میں نے ہی اسے لاکر دی تھیں۔ چوڑیوں کے ٹکڑے رکنی کی پیوگی کی چٹلی کھاتے ہوئے زمین پر بکھر گئے۔

”اب دوسری لاش کی شناخت کرنا ہے۔“ میرے ہونٹ ہلے۔

رکنی چونک اٹھی اور پھر کہنے لگی۔ ”ارے بے رحم! تم ایک عورت کے دل پر کتنے زخم لگاؤ گے؟“

پھر جب صوبیدار کی لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی تو رکنی نے آنسو نہیں بہائے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ”باپ کے لئے ایک بیٹے نے بھی اپنی جان دے دی۔“ جب رکنی کو لاشوں کے پاس سے ہٹا دینے کی بادی آئی تو اس کے چہرے پر سختی آ گئی۔ وہ بولی۔ ”لاشیں میں لے جاؤں گی۔“

صوبائی وزیر داخلہ کی لاش ناٹھ پہلے ہی یہ حکم جاری کر چکا تھا کہ لاشیں رکنی کے حوالے نہ کی جائیں۔ میں نے اسی لئے جی کڑا کر کہہ ہی دیا۔ ”یہ..... یہ نہیں ہو سکتا۔ لاشیں لے جانے کا حکم نہیں ہے۔“ جو بہانہ تحصیل دار کی لاش کے سلسلے میں کیا گیا تھا، اس مرتبہ بھی وہی بہانہ حکومت نے کیا تھا کہ ایسا کرنے سے نقص امن کا اندیشہ ہے۔

”ارے ظالمو!“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”ہمیں تم باپ بیٹے کی آخری رسوم بھی ادا نہیں کرنے دو گے؟“

خردوں کے ساتھ بھی دشمنی کر رہے ہو۔

رکنی بہت گڑگڑائی، اس نے بہت آنسو بہائے، مگر میں مجبور تھا۔ خالی پیشانی، بغیر چوڑیوں کے ہاتھ، زخمی دل اور مایوس قدموں کے ساتھ رکنی پلٹی اور پھر چند ہی قدم چل کر ڈھیر ہو گئی۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا، لیکن وہ میرے پہنچنے تک دم توڑ چکی تھی۔ اس سے شوہر اور جوان بیٹے کی موت کا دہرا صدمہ برداشت نہیں ہو سکا تھا۔

☆=====☆=====☆

گوالیار کے کیمپ کا میدان انسانی سروں سے بھر چکا تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے وزیراعظم کی تقریر سننے نہیں آئے تھے، اس شخص کو دیکھنے آئے تھے جس کے متعلق انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن اب تک اسے دیکھا نہیں تھا۔

پولیس والے شاید لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ٹھاکر بلونت سنگھ اب زندہ نہیں رہا یا پھر وہ اپنی بہادری کی نمائش کر رہے تھے۔ ایک ایک پولیس افسر جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ ہر ایک سینہ پھلائے کھڑا تھا۔ سب کے چہروں سے غور جھلک رہا تھا۔ ہر افسر کی آنکھیں گویا ایک ہی بات کہہ رہی تھیں کہ آخر کار ہم بلونت سنگھ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں ہرگز یہ علم نہیں تھا کہ ٹھاکر بلونت سنگھ تو بہت پہلے رہائی پانے سے قبل ہی مر چکا تھا۔ وہ تو ایک جن زاد، یعنی میں تھا جو اتنے عرصے پولیس سے برسریکا رہا تھا اور آج بھی ان کے درمیان موجود تھا۔ وہ مجھے ختم نہیں کر سکے تھے۔ میں خود کو اس بھیڑ میں تھا تھا سا محسوس کر رہا تھا۔

ٹھاکر بلونت سنگھ کے مردہ جسم کو چارپائی سے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ چارپائی اتنی اونچائی پر رکھی گئی تھی کہ سب لوگ دیکھ سکیں۔ ہلکے سبز رنگ کی چپک کی قمیض، گلے میں کالا، لمبا قد، رعب دار چہرہ، یہ جگل کا شیر ٹھاکر بلونت سنگھ تھا جس نے پورے اکیس سال تک پولیس کو اپنی انگلیوں پر نچایا تھا۔ اس نے

میں نے اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا۔ اب تو مجھے بس اس کے مردہ جسم سے نجات حاصل کرنا تھی۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھا کر مجھے اسی روز شام کو یہ موقع مل گیا، مگر ایک آدم زاد کے جسم کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدم زاد کے جسم میں داخل ہوتے وقت اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی دشواری محسوس نہیں کی تھی۔

وہ زنجن سنگھ کا نوجوان، وجہ اور خوبصورت، بہتجاوے سنگھ تھا۔ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ اچھی صحت کی وجہ سے چھ سات سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔ برسوں بعد وہ گزشتہ روز ہی اپنی نھیال سے ناک پور آیا تھا۔

زنجن سنگھ کا بڑا بھائی سوہن سنگھ تھا جو اپنے چھوٹے بیٹے وجے کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا۔ زنجن سنگھ کا بہتجاوے مجھے پسند آیا۔ وہ دونوں مجھ سے مل کر گئے تو میں نے زنجن سنگھ کی بیوی سے کہا۔ ”میں اندر کمرے میں کچھ دیر آرام کرنے جا رہا ہوں۔ کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں ہاتھ پیر دبا دوں“ تھکن اتر جائے گی۔“ زنجن سنگھ کی بیوی معنی خیر لہجے میں بولی۔ وہ خاصے ذہل ڈول کی مالک تھی۔

”نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا اور اندر والے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا۔

یہ اس شخص کا جسم تھا کہ جس کی وجہ سے ٹھاکر بلونت سنگھ مارا گیا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر میں نے اس سے انتقام لے لیا تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پڑی تھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اس پر لیٹ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے ”بے جھوٹی“ کا نعرہ لگا کر زنجن سنگھ کے جسم سے باہر آ گیا۔ میں نے زنجن سنگھ کے مردہ جسم پر آخری نگاہ ڈالی اور اس بند کمرے سے نکل آیا۔

وجے اپنے باپ کے ساتھ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ میں نے اس کے جسم میں داخل ہونا چاہا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ میرے وجود کو جھٹکا سا لگا اور میں دور جا کر ا۔ میری حالت خراب ہونے لگی۔ میرے لئے یہ بات شدید حیرت کا سبب تھی کہ میں کسی آدم زاد کے جسم میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔

وہ دونوں باپ بیٹے آگے بڑھ چکے تھے۔ میں ایک بار پھر ان کے پیچھے لپکا۔ اس مرتبہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ وجے پر حملہ کیا۔ وجے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے باپ سوہن سنگھ نے گہرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا بیٹے؟“

وجے اس قابل نہیں تھا کہ کوئی جواب دے پاتا۔ وہ تو اپنا سینہ پکڑے جھٹکا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے آدھے جسم میں اتر چکا تھا۔ سوہن سنگھ نے اپنے جھٹکے ہوئے بیٹے کو سنبھال لیا۔ معاً مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت کے ساتھ میرے وجود کو وجے کے جسم سے باہر دھکیل دیا ہو۔ میں اس کے جسم سے چل کر باہر آ کر ا۔

گیارہ سو ڈاکے ڈالے تھے اور ایک سو پچاس خون کر چکا تھا۔ آخری سال میں اس نے پولیس سے تقریباً (81) مقابلے کئے۔ ان مقابلوں میں دو درجن کے قریب پولیس والے ہلاک ہوئے تھے اور ایک درجن سے زیادہ اس کے ساتھی مارے گئے تھے۔ اسے ختم کرنے کے لئے پولیس نے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے تھے۔ اسی ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کو دیکھ کر لوگ رونے لگے تھے۔ کیا وہ لوگ پاگل تھے؟ ایک ڈاکو کی موت کا سوگ کیوں منایا جا رہا تھا؟

مجھے اس کا سبب معلوم تھا۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کی لاش کا دیدار کرنے والوں میں بہت سے لوگ وہ تھے جن کی مدد اگر بلونت سنگھ نہ کرتا تو ان کی جوان بیٹیوں کی کبھی ڈولی نہ اٹھتی۔ ایسے لڑکے بھی تھے جو بلونت سنگھ کے تعمیر کئے ہوئے اسکولوں میں پڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ ایسے مسافر بھی تھے جو بلونت سنگھ کے تعمیر کردہ مسافر خانوں میں رہ چکے تھے۔ بھلا وہ لوگ بلونت سنگھ کی موت پر کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ انہیں رنج تھا کہ ان کے سردوں پر ہاتھ رکھنے والا ان سے جدا ہو گیا۔

یہ تماشا میں زیادہ دیر نہ دیکھ سکا اور بقیہ کارروائی اپنے ماتحتوں کے سپرد کر کے چلا آیا۔ پولیس ہیڈ آفس پہنچ کر اپنے کمرے میں بیٹھے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آئی جی پولیس نے طلب کر لیا۔

میں آئی جی کے کمرے میں پہنچا تو اس نے کہا۔ ”ہوم فیسٹر کی لاش ناٹھ جی تم سے بہت خوش ہیں۔ تم کیونکہ ایک طویل عرصے تک ٹھاکر بلونت سنگھ کو ختم کرنے کے لئے اس سے برسرِ پیکار رہے ہو اس لئے اگر چاہو تو چند مہینے آرام کر سکتے ہو۔ چھٹی کی درخواست لکھ دو، میں فوراً منظور کر لوں گا۔“

میں فوراً اس پر آمادہ ہو گیا۔ یوں بھی مجھے اب اس علاقے میں رہتے ہوئے دشت ہو رہی تھی۔ میں وہاں سے کہیں بہت دور نکل جانا چاہتا تھا، کسی ایسی جگہ جہاں کوئی ٹھاکر بلونت سنگھ کا نام لینے والا نہ ہو، جہاں ماضی کی یادوں کا غبار میرے دل سے نکل جائے۔ اس کے علاوہ مجھے ادویز عمر زنجن سنگھ کے موجودہ جسم سے بھی نجات حاصل کرنا تھی۔ میں اب کسی نوجوان کے جسم کو اپنانا چاہتا تھا۔

میں نے فوراً تین مہینے کی چھٹی کے لئے درخواست دے دی جو آئی جی نے اسی روز منظور کر لی۔ دوسرے ہی روز اپنے ایک ماتحت کو چارج دے کر میں امرتسر کے ایک گاؤں ناک پور کے لئے روانہ ہو گیا۔ زنجن سنگھ پنجاب کے اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پنجاب تک کا سفر زنجن سنگھ کے جسم ہی میں کروں گا اور پھر وہاں پہنچ کر پنجاب کے کسی گھروں نوجوان کے جسم میں داخل ہو جاؤں گا۔

پنجاب کے سرسبز و شاداب علاقے میں داخل ہو کر مجھے عجیب سی تازگی اور فرحت کا احساس ہوا۔ ناک پور بڑا خوبصورت گاؤں تھا۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے جب میں ’زنجن سنگھ کے گھر میں داخل ہوا۔ سارے گھر میں میری آمد سے خوشی کی لہری دوڑ گئی۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ جلد ہی یہ گھر ماتم کدہ بننے والا ہے۔ زنجن سنگھ کو میں اپنے عہد کے مطابق پہلے ہی سزائے موت دے چکا تھا۔ وہ تو اسی دم مر گیا تھا جب

لبے لبے سانس لیتا ہوا دے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ سوہن سنگھ کے استفسار پر ہانپتے ہوئے اسے بتانے لگا۔ ”کوئی..... نہ جانے کون میرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دو..... دو مرتبہ وہ مجھ پر حملہ کر چکا ہے۔“

سوہن سنگھ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ وجہ کی بات سمجھنے سے قاصر ہو۔

میرے وجود میں شعلے سے بھرنے لگے تھے اور میں انتہائی اذیت سے گزر رہا تھا۔ تیسری مرتبہ اپنی پوری قوت کے ساتھ میں نے وجہ کو دبوچ لیا۔

وجہ کے جسم میں قرار پانے اور اس کے رگ وریشے میں اترنے کے لئے مجھے انتہائی جدوجہد کرنا پڑی، لیکن اس بار میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے وجہ کے جسم پر فٹ پائی تھی۔ میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے دیکھا، سوہن سنگھ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کچھ بتا تو سہی بیٹے کہ تجھے ہوا کیا.....؟ بول نا۔“ سوہن سنگھ گھبرا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں..... اب ٹھیک ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور وہ..... وہ جو تیرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا.....“

”بھاگ گیا۔“ میں بول اٹھا۔

”اچھا چل، جلدی گھر چل۔“ سوہن سنگھ میرا بازو پکڑ کر اپنی دانست میں سہارا دینے لگا۔

”مجھے سارے کی ضرورت نہیں باپو۔“ میں بولا۔ ”میں خود چل سکتا ہوں۔“

”تیرے نانا کو آج ہی اپنے گاؤں واپس جانا ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے گردن ہلا دی۔

جلد ہی میں، سوہن سنگھ کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے سوہن سنگھ کی ادھیڑ عمر بیوی اور ایک بوڑھے کو دیکھا۔ یہی بوڑھا، سوہن سنگھ کا سر تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری سماعت سے جو الفاظ ٹکرائے انہیں سن کر میں چونک اٹھا۔ بوڑھ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ بتا کہ اب تیرا دے دشمنوں سے بدلہ لینے کے قابل ہو گیا ہے یا نہیں؟“

سوہن سنگھ کی بیوی کوئی جواب دینے بغیر ایک دم اٹھی اور بولی۔ ”میں ابھی آئی بابا۔“

بوڑھے کے برابر ہی چار بابائی پر سوہن سنگھ بیٹھ گیا۔ مجھے اس کے چہرے پر فکر مندی کے سے آثار نظر آرہے تھے۔ اس فکر مندی کی وجہ فوری طور پر میں نہ سمجھ سکا۔

ذرا ہی دیر کے بعد سوہن سنگھ کی بیوی تین بڑے بڑے گھاسوں میں لسی بنا کر لے آئی۔ بوڑھے نے اپنی بیٹی سے گھاس تولے لیا مگر اسے پیئے ہوئے جھینکنے لگا۔ یہ دیکھ کر سوہن سنگھ کی بیوی مسکرائی اور بولی۔ ”بابا! یہ تمہاری ہی دی ہوئی بھینس کے دودھ کی لسی ہے۔ چار سال پہلے تم ہی تو بھینس بھجوائی تھی کیا بھول گئے۔“

بوڑھا بھی مسکرا دیا اور لسی پینے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اکثر ہندو اور سکھ گھرانے کے لوگ ہن

بیٹیوں کے گھر کھانا پینا پسند نہیں کرتے۔

اسی وقت پڑوس کے گھر سے ایک دراز قد اور متناسب جسم کی ایک عورت گھونگھٹ کاڑھے اور ہاتھ میں خالی مٹکا اٹھائے نکلی۔

”کون ہے یہ عورت؟“ بوڑھے نے دھیمی آواز میں اپنی بیٹی سے پوچھا۔

”یہ کلنٹا ہے، پڑوس کی بڑی ہو۔“ بوڑھے کو جواب ملا۔

اس نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ دیا۔ ”دشمن کو پڑوسی کہتی ہے۔ خبردار یہ دشمن ہیں۔ انہیں کبھی پڑوسی مت کہنا۔ دشمن کو دشمن۔“

مایاکور، یعنی وجہ کی ماں بولی۔ ”لیکن یہ کلنٹا تو بڑی بھلی عورت ہے۔“

”اگر بھلی ہوگی تو اپنے لئے ہوگی۔“ بوڑھا غصے سے کہنے لگا۔ ”جانے کس کینے نے اس بد نصیب کو ان بد معاشوں کے گھر بھیج دیا۔ تو اسے اچھا سمجھتی ہے، مگر یہ سوچا ہے کہ اسی کے پیٹ سے تیری اولاد کے دشمن پیدا ہوں گے۔ میرے اور تیرے بیٹے کو قتل کرنے والے اسی کی کوکھ سے جنم لے کر پالنے میں جھولیں گے۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت ہے۔“ بوڑھا غصے کی وجہ سے کانپنے لگا۔

میں دور کھڑا ہوا اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میری نظریں جاتی ہوئی عورت کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی چال میں بلا کی نزاکت تھی۔ مجھے اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی کمر کی لچک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا، یہ عورت سامنے سے کیسی ہوگی؟

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سوہن سنگھ نے بات بدلنے کے لئے اپنے بوڑھے سر سے اس کے گاؤں اور رشتے داروں کی خیر خیریت پوچھنا شروع کر دی۔ اس کی بیوی کھانا پکانے کے لئے رسوئی (بادرچی خانہ) کی طرف چلی گئی۔

میں نے دونوں بزرگوں کو باتوں میں مگن دیکھا تو سوچا، کم از کم اس گھر کو تو دیکھ ہی لیتا چاہئے جہاں اب مجھے رہنا ہے۔ اس طرف آتے ہوئے میں نے اس گھر کی اوپری منزل پر دو کمرے بنے دیکھے تھے۔ سو میں گھر کی اوپری منزل پر چلا گیا۔

دونوں کمرے صاف ستھرے تھے۔ ایک کمرے کی دیوار پر گردناتک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی صفائی اگر روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور ہوتی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں مجھے صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے صندوق کھول کر دیکھا تو اس میں مردانہ کپڑے، کپانیں اور تلواریں رکھی تھیں۔ کپڑوں میں سے میں نے ایک کرتہ نکالا اور اپنے جسم پر رکھ کر ناپنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کرتہ میرے موجودہ جسم کے ناپ کا تھا۔ وہ کرتہ میں نے پہن لیا اور آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، سرخ و سفید رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ اور بڑگوشت بازو۔ پھر میں نے صندوق سے تلوار نکالی۔ تلوار خوبصورت اور چمکدار تھی۔

مرف کپڑے سوکنے کے لئے پڑے تھے۔ ابھی میں اس عورت شکلتا کے دھیان میں غم تھا کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بوڑھا نانا کھڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا اس وقت پڑوس کی چھت پر شکلتا نہیں ہے۔ اگر بوڑھا اسے دیکھ لیتا تو جانے کیا سوچتا۔

”وجے۔“ بوڑھا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں دھرم نگر واپس جا رہا ہوں۔ ابھی روانہ ہو گیا تو اڑے پر بس مل جائے گی۔“ بوڑھا میرے کچھ اور قریب آ گیا اور کہنے لگا۔ ”بیٹے! میرا دیا ہوا سبق بھولنا مت۔“

میں نے جبکہ کر بوڑھے کے پیر چھونا چاہے۔ بوڑھے نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر سینے سے لپٹا لیا۔ ”یہ میری ڈانگ تو رکھ لے۔“ بوڑھے نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈانگ مجھے دے دی۔ ”تجھے معلوم ہے، میں یہ ڈانگ سوتے ہوئے بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔“

”تو پھر نانا، مجھے اپنی ڈانگ کیوں دے رہے ہیں، میرے پاس بھی تو ڈانگ موجود ہے۔“ میں بولا۔ بوڑھا مسکرایا اور کہا۔ ”وجے! تجھے یہ ڈانگ جیسی نظر آ رہی ہے ویسی نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈانگ کا ایک سرا پکڑ کر زور لگایا تو ڈانگ کے اندر سے دوسرے سرے پر مگی ہوئی برچھی نکلی۔ بوڑھا بولا۔ ”تو اب سمجھ گیا ہو گا کہ میں یہ ڈانگ تجھے کیوں دے رہا ہوں۔ اس کو بڑی حفاظت سے رکھنا۔ قانوناً یہ ہتھیار رکھنا منع ہے، مگر تجھے ان چاروں سے نمٹنے کے لئے قانون وغیرہ کا خیال نہیں کرنا۔ تو اکیلا ضرور ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تو اب دشمنوں پر بھائی رہے گا۔“ یہ کہتے ہوئے بوڑھے نے بڑی حقارت سے پڑوس کے گھر پر نظر ڈالی، پھر کہا۔ ”میں تھوڑے دنوں میں خشونت سیکھ کر بھی یہاں بھیج دوں گا تاکہ تیری تھائی ختم ہو جائے۔“ دونوں ماموں بھانجے مل کر رہنا۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں مل کر اس گاؤں پر راج کرو گے۔“

پھر وہ بوڑھا مجھے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ چند ہی روز میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا، اسے جان کر میں نیرت زدہ رہ گیا۔ اس نئے جسم کو اپنا کر بھی نفرت و انتقام کا کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔

سوہن سنگھ، یعنی وجے کا باپ بھی ایک پولیس افسر رہ چکا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد اب اس کی گزر برزداشت پر تھی۔ پڑوسی جاٹ خاندان سے وجے کے خاندان کی دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جھگڑا دشمن پر ہوا تھا۔ جب بھی دونوں خاندانوں میں لڑائی ہوتی کوئی نہ کوئی مارا جاتا یا پھر اتنا شدید زخمی ہو جاتا کہ بات پولیس تک جا پہنچتی۔ وقتی طور پر خون خرابے کے بعد بات ختم ہو جاتی، مگر دلوں میں دشمنی کی ہنگامیاں اس وقت تک زندہ رہتیں جب تک نئی نسل بڑی ہو کر لڑنے کے قابل نہ ہو جاتی۔ ہمیشہ دونوں طرف سے آئندہ نسلوں پر نگاہیں ضرور ہوتیں۔ وجے کے دو بڑے بھائی اور ماموں ایسی ہی لڑائیوں میں نکل ہو چکے تھے۔ اس وقت وجے کا بڑا بھائی اے بیس سال کا اور اس سے چھوٹا بھائی بیس برس کا تھا۔ اس کے ماموں کی عمر بھی اتنی ہی رہی ہوگی۔ پورے علاقے میں ان تینوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وجے کا باپ سوہن سنگھ اس وقت پولیس افسر تھا۔ وجے اس کا سب سے چھوٹا

اتنے میں کہیں قریب ہی مجھے چوڑیوں کی ٹھکنٹا ہٹ سنائی دی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پڑوس کی عورت کپڑے سکھانے کے لئے چھت پر ڈال رہی تھی۔ یہ وہی دراز قد عورت تھی جو کچھ دیر پہلے گھر کے دروازے کے پاس سے پانی بھرنے نکلی تھی۔ اس کی چال مجھے اب تک یاد تھی۔ میں اسے دیکھ جا رہا تھا۔ واقعی وہ بلا کی حسین تھی۔ عورت کے سر پر دوپٹا نہیں تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال کٹے ہوئے تھے۔ میں نے تلواریں واپس صندوق میں رکھ دی اور کمرے سے نکل کر اس عورت کو دیکھنے لگا۔ وہ کپڑے پھیلائے سے پہلے جھکتی تاکہ سلوٹیں دور ہو جائیں۔ جھکے کے ساتھ اس کے جسم کے خوبصورت اور حسین زادیئے مزید واضح ہو جاتے۔

اچانک اس عورت نے نظر اٹھائی۔ میری نظروں سے اس کی نظریں ٹکرائیں۔ میں سمجھا تھا کہ عورت شرما کر نظریں جھکا لے گی اور پھر شاید سامنے سے بھاگ بھی جائے گی، مگر اس کی نظریں تو جیسے پلٹا بھول گئی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر مجھے دیکھ جا رہی تھی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کو چھپانا چاہا، لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ کچھ اور کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ میرے سارے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں وہاں سے ہٹ گیا۔ ابھی میں مڑا ہی تھا کہ چوڑیوں کی ٹھکنٹ پھر سنائی دی۔ وہ اب ہلکے ہلکے ٹروں میں ایک گیت گنگنا رہی تھی۔ اس پنجابی لوک گیت کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ”سوہنے کھڑے والے آج تجھے پہلی مرتبہ دیکھا ہے، مگر ایسا لگتا ہے جیسے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تجھے کہاں دیکھا ہے، شاید خوابوں میں دیکھا ہو۔“

گیت کے بول سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے سوچا، یہ تو شادی شدہ عورت ہے۔ پھر یہ مجھے دیکھ کر ایسا گیت کیوں گا رہی ہے؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عورت کے گانے کی آواز پھر آنے لگی۔ ”تیرے ہونٹوں کی زمین پر سبزے کا آغاز ہے۔ تو جوان ہو گیا۔ تیرا رنگ بھی گورا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ یقیناً وہ عورت میرے ہی لئے گیت گا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت گھر میں اس عورت کا مرد نہیں ہو گا، جیسی وہ ایسا گیت گا رہی ہے۔ اس گھر کے مرد کا خیال آتے ہی مجھے اس بوڑھے کے الفاظ یاد آ گئے جو میرے موجودہ جسم کے ناتے میرا نانا تھا۔ ”دشمن کی بیوی کی کوکھ سے دشمن ہی جنم لیں گے۔“ پھر مجھے سوہن سنگھ کی بیوی کا جملہ بھی یاد آیا۔ ”یہ اچھی عورت ہے۔“ میں نے سوچا، عورت بھلی سہی مگر ہے تو اس خاندان کے دشمن کی عورت۔ کہیں اس میں بھی دشمن کی کوئی چال نہ ہو۔ پہلے اس عورت نے سوہن سنگھ کی بیوی پر چادو چلایا اور اب مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ پھر میں نے سوچا، یہ موقع اچھا ہے۔ مجھے دوستی دشمنی سے کیا لینا۔ عورت بہر حال حسین ہے۔ دشمن کی بیوی سے پیار جتا کر میں گاؤں بھر میں اسے بدنام کر سکتا ہوں۔ کسی جاٹ خاندان کے لئے اس سے زیادہ ذلت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی عورت کی دشمن سے آشنائی ہو۔ میں گویا اس عورت کے قرب کی خاطر ہمارے ڈھونڈ رہا تھا۔

اب میں کمرے میں واپس آ گیا تھا۔ میں نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو پڑوس کی چھت خالی تھی۔

بیٹا تھا۔ جس خاندان سے دشمنی تھی، اس کے کھیت و بے کے خاندان والوں کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ آئے دن ایک دوسرے کے گھر سے کالم گلوچ اور جھگڑے ہوتے رہتے۔ ذرا سا بھانہ ملنے کی دیر ہوئی کہ کرباپیں، خنجر اور بھالے نکل آتے۔ پھر جب تک کسی ایک طرف کی لاشوں پہ لاشیں نہ گر جاتیں دوسروں کو چین نہ آتا۔

وہ اس وقت چھوٹا ہی تھا جب ایک روز کسی نے سوہن سنگھ کو آکر خبر دی۔ ”کھیتوں پر جھگڑا ہو گیا ہے اور چار پانچ آدمی مارے گئے ہیں، جلد پہنچو۔“

سوہن سنگھ نے ہاتھ میں کھانڈی تھامی اور صافہ باندھے بغیر لپک کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ پولیس وہاں سوہن سنگھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ سوہن سنگھ نے جلدی سے اپنی کھانڈی جھاڑیوں میں چھپا دی اور آہستہ آہستہ اس طرف بڑھا جہاں پولیس بیانات لے رہی تھی۔ زمین پر کچھ ذور تین لاشیں پڑی تھیں جن سے اب بھی خون بہہ کر دھرتی کی پیاس بجھا رہا تھا۔

ان لاشوں سے کچھ فاصلے پر سوہن سنگھ کا بیٹا خنچے زخمی حالت میں کھڑا تھا۔ خنچے کا ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، مگر دوسرے ہاتھ میں اس کی شام لگی ڈانگ اب بھی موجود تھی جس پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ سوہن سنگھ لپک کر خنچے کے پاس پہنچا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کیا اے مارا گیا؟“ یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز مرتعش تھی۔

خنچے نے بھی آہستہ آواز میں بتایا۔ ”ہماری طرف سے ماما (ماموں) مارا گیا اور بڑا بھائی بھاگ گیا۔ اس کا اشارہ اے کی طرف تھا۔“ سامنے والوں کے دو آدمی مارے گئے۔“

بیٹے سے یہ سن کر سوہن سنگھ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس کی دانست میں اے نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ پولیس کے ہاتھ آنے سے پہلے بھاگ جانا ہی بہتر تھا۔ تاکہ جب بھی موقع ملے، دشمن کے دو چار آدمیوں کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔ کسی نہ کسی روز اے کو پولیس کے ہاتھ تو آنا ہی تھا۔ گرفتار ہونے کے بعد اے کو پھانسی ہی کی سزا ہوتی۔ ان حالات میں اس نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔

اس مرتبہ جب جھگڑا شروع ہوا تو بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ دشمن کے دو آدمیوں نے الزام لگایا کہ تمہارے جانور ہمارے کھیتوں میں آگئے تھے اور انہوں نے ہماری فصل برباد کر دی۔ بولو، تم نے ایسا کیوں کیا؟ اپنے جانوروں کو ہمارے کھیتوں میں کیوں ہانک دیا؟

پھر اس سے پہلے کہ وہ جواب کا انتظار کرتے انہوں نے وجہ کے ماما پر حملہ کر دیا۔ اے نے غصے میں کرباپان نکال لی اور ان پر بھینٹ پڑا۔ ذرا ہی دیر میں وہاں دو آدمیوں کی لاشیں خون میں نہا گئیں۔ اسی دوران دونوں طرف کے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ جو ہتھیار بھی جس کے ہاتھ لگا، اس سے لڑنے لگا۔ اے پولیس کے آنے سے قبل ہی گھوڑی پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ خنچے نے ماما کی تڑپتی ہوئی لاش کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ ماما، میں تیرے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔

کیس چلا۔ دو آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور باقی چھوڑ دیئے گئے۔ چھوڑے جانے والوں میں خنچے بھی تھا۔ ٹانگ پور جانے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچا ہی تھا کہ ایک سمت سے تین گولیاں چلیں اور

خنچے کا کام تمام کر گئیں۔ دشمن خنچے سے زیادہ ہوشیار نکلے تھے۔

خنچے کے قتل کی خبر گاؤں پہنچنے کے ساتھ ساتھ مفرد بھائی اے تک بھی پہنچی۔ اے اسی انتظار میں رہا کہ چھوٹا بھائی پولیس سے چھوٹ کر گھر پہنچے تو اسے سمجھائے کہ ماں باپ کی آرزوؤں کا اب تو ہی راز ہے، مجھے تو کسی نہ کسی دن پھانسی چڑھنا ہے اس لئے دشمن کے چاروں بیٹوں کو قتل کرنے کی ذمہ داری تمہاری ہی رہنے دے تو درمیان میں نہ آ۔ تجھے ماں باپ کی خدمت کرنا ہے، وجہ کو پڑھانا لکھنا ہے۔ گھر کے لئے میں جو کرنا چاہتا تھا اب نہ کر سکوں گا۔ آئیں اور تو ذمہ داریاں بانٹ لیتے ہیں۔ گھر کو تو بچہ باہر کی ذمہ داریاں مجھ پر۔ مگر دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ خنچے کو خالوں نے راستے ہی میں مار ڈالا۔ اے اب انتقام کی ایسی آگ میں جل رہا تھا جو صرف دشمن کے خون سے ہی بجھ سکتی تھی۔ خنچے کے قتل نے اس پر دیوانگی سی طاری کر دی تھی۔

مجبوری یہ تھی کہ پولیس ہر طرف پھیل کر اے کو تلاش کر رہی تھی۔ دشمن تک پہنچنا اے کے لئے اسی سبب مشکل ہو گیا تھا۔ ادھر اے سے بچنے کے لئے دشمن کے آدمی خود کو گاؤں میں محفوظ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اے پولیس کی نظریں آئے بغیر گاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وجہ کی طرف سے دشمن کو خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ گاؤں کے ہر آدمی کو معلوم تھا کہ پولیس گاؤں کی اطراف پھیل کر اے کو تلاش کر رہی ہے۔ اے ایسے میں گاؤں کا رخ نہیں کر سکتا، مگر ماں کا دل میں مانتا تھا۔ وجہ کی ماں مایاکور بے چین تھی۔ وہ اکثر راتوں کو دروازہ کھولے دیر تک کھڑی رہتی۔ ہر ہٹ پر وہ چونک اٹھتی۔ ہوا کی سرسراہٹ تک اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ وہ سمجھتی کہ شاید اس کا ہاتھ آیا ہے، مگر وہاں کوئی نہ ہوتا۔ رات گزر جاتی اور مایاکور آئندہ رات کا انتظار کرنے لگتی۔ وجہ ماں بے چین دیکھتا، مگر کچھ نہ کر پاتا۔

وہ رات اندھیری تھی جب اے اپنے دشمنوں کے خون سے پیاس بجھانے گاؤں کی طرف آیا۔ اس نے پگڑی اتار کر آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ابھی وہ گئے کے کھیتوں میں گھسنے ہی والا تھا کہ کسی اندھے نے پکار کر مدد چاہی۔ ”ہے کوئی جو اندھے کو راستہ بتائے۔“

اے نے آواز سنی اور قریب پہنچ کر اندھے کا ہاتھ تھام لیا۔ اندھے کو اس نے گئے کے کھیتوں سے انکر راستے پر لا کھڑا کیا۔ پھر اندھے کو وہاں چھوڑ کر وہ خود گئے کے کھیت میں جا پہنچا۔ اے بے خبر تھا کہ پولیس نے اس کے لئے کھیتوں میں بھی جال پھیلانے ہوئے ہیں۔ ابھی اسے کھیت میں داخل ہوئے ذرا مایہ ہوئی تھی کہ خطرے کی بو سونگھ لی۔ اے سمجھ گیا کہ پولیس کہیں قریب ہی موجود ہے۔ اس نے ذرا سے اندر ہی اندر بڑھنا شروع کیا۔ وہ کھیت کے پتوں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسی دوران اس نے ذرا ملے پر کچھ شعلیں روشن ہوتے دیکھیں جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ شعلوں کی روشنی میں اسے پولیس والے حرکت کرتے نظر آئے۔ اے سارا معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے رات ہونے ہی میں بہتری ہے، پکڑا گیا تو دل کی آگ نہیں بجھ سکوں گا، پھر بھائی کا انتقام کون لے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اے بے حس و حرکت کھیت میں پڑا رہا تاکہ پولیس کو یقین ہو جائے کہ وہ

فرار ہو چکا ہے، لیکن پولیس والوں نے تو جیسے نہ بٹنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگر اسی طرح رات گزر جاتی تو دن کا اجالا پھیلتے ہی وہ پولیس کی نظریں آ جاتا۔ اب نے یہ خطرہ محسوس کر کے پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ راستہ ملتے ہی نکل جائے، مگر راستے ہر طرف سے مسدود تھے۔ پولیس اتنی چوکنا تھی کہ ذرا بھی آہر ہوتی تو رائفلیں شعلے اگلنے لگتیں۔ آخر اب نے پولیس سے بچنے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ اس نے ایک طرف گولی چلائی اور تیزی کے ساتھ دوسری سمت نکل گیا، لیکن یہ حربہ بھی ناکام ہوا۔

جس طرف اب نے گولی چلاتا، پولیس والے ادھر فائرنگ ضرور کرتے مگر اس سمت میں پوری پولیس پارٹی نہ بڑھتی۔ باقی سپاہی دوسری جانب نظر رکھتے۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ رات کے سنائے میں گولیوں کی آوازیں دور تک سنی جاسکتی تھیں۔

ان کھیتوں سے صرف نصف میل دور نانک پور گاؤں آباد تھا۔ اب کے ماں باپ گولیاں چلنے کی آوازیں سننے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے کان اس وقت آنکھوں کا کام کر رہے تھے۔ آدھے میل دور چلتی ہوئی ہر گولی انہیں اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اب نے گاؤں کی طرف آیا ہو گا اور یہ چھڑپ پولیس کے ساتھ ہو رہی ہے۔

رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ رات بھر سارا گاؤں جانتا رہا۔ کبھی اگر گولیاں چلنا بند ہو جاتیں تو اب کے والدین کے چہرے اتر جاتے اور دل ڈوبنے لگتے کیونکہ گولیوں کا نہ چلنا اب کے موت کا اشارہ تھا۔ رات بھر وہ دعائیں مانگتے رہے، بیٹے کی زندگی کی دعائیں، گولیاں چلنے کی دعائیں، یہی گولیاں تو اب کی زندگی کا ثبوت تھیں۔ رات گزرتی رہی دلیل صبح کے ساتھ گولیوں کی آوازیں میں کمی ہو گئی۔

اب کے پاس کار تو س ختم ہو گئے۔ وہ اسی لئے پریشان ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پولیس برابر گولیاں چلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب نے بندوق ایک ہاتھ میں تھامی اور دوسرے ہاتھ کو زمین پر رکھ کر نانک پور گاؤں کی مٹی بھر مٹی اٹھا لی۔ ابھی وہ اس مٹی کو چوم کر اپنے ماتھے تک لایا ہی تھا کہ گولیوں کے پاؤں نے اس کے جسم میں شعلے ہی شعلے بھر دیئے۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اعصاب کھینچ گئے۔ پولیس اب بھی گولیاں پھلا رہی تھی، لیکن اب ان سے بچنے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر گولیوں کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔

وہ سننے کی مسلسل جنگ کے بعد سنا ہوا تو مایا کو کراہنے میں رک گیا۔ وہ جان گئی کہ بیٹا مار گیا۔ اس کی بانیں برس کی کھائی لٹ گئی۔ اب وہ کبھی اب کے صورت نہیں دیکھ سکے گی۔ آج اس کا ایک اور بیٹا خاندانی دشمنی کی جھینٹ چڑھ گیا تھا۔

اب کے موت کے باوجود نہ جانے کتنی گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس جب اب کے لاش کے قریب پہنچی تو اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں گاؤں کی مٹی تھی۔ اب کو اپنی مٹی سے بہت پتا تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ پولیس والوں کی آنکھوں میں بادل سے امنڈے، لیکن ہر دفعہ بادل برسائیں کرتے۔ پولیس کے ہاتھوں اب کے موت کا یہ واقعہ خود کچھ پولیس والوں کے بیانات اور مفروضات پر مبنی تھا کیونکہ اب پر جو کچھ گزری، وہ اسے سننے کے لئے زندہ نہیں رہا تھا۔ پھر یہی واقعہ میں نے بھی سنا۔

وہ اپنے نانا کے کہنے پر عمل کرتا۔ شراب پی کر فٹے میں وہ خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑے کرتا، ان سے لڑتا اور اپنے سے بڑوں کے مقابلے پر بھی جم جاتا۔ اب اسے بھی لڑائی جھگڑے میں مزہ آنے لگا تھا۔ لڑائی جھگڑے میں طاق کر کے نانا نے اب اسے چوری کی تربیت بھی دینا شروع کی۔ وہ کبھی کسی کی مرغی، کسی کی بکری، کسی بھینس چالاتا اور نانا اسے اس "کارنامے" پر شاباشی دیتا۔ چوری چکاری میں بھی وہ بہت جلد ہوشیار ہو گیا۔

کئی دفعہ وہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھا۔ بوڑھا نانا اسے باتیں بنا کر چھڑا لاتا کہ ابھی تو یہ بچہ ہے، چوری دوری کا اسے کیا پتا۔ دوسروں کے سامنے تو بوڑھا، وہ کو معصوم ہی کہتا، مگر اکیلے میں ہمیشہ تعریف کرتے ہوئے وہ بچے سے کہتا۔ "بیٹا! بڑے ہو کر خطرناک ڈاکو بننے کا یہی راستہ ہے۔"

وقت گزرتا گیا۔ گاؤں کے آوارہ لڑکوں میں سے وہ بچے کے بھی کچھ دوست بن گئے تھے۔ ان لڑکوں نے وہ بچے کی سرکردگی میں ڈاکا ڈالنے کا چھوٹا سا منصوبہ بنایا۔ پہلا ڈاکا انہوں نے ایک حلوائی کی دکان پر ڈالا۔ مٹھائی چرائی گئی، ساتھ ہی سونے کا پانی چڑھا ہوا ایک کڑا بھی ان کے ہاتھ اگلا۔ مٹھائی لے کر وہ سب کے سب کھیتوں میں چلے گئے۔ جتنی مٹھائی خود کھائی گئی، کھائی باقی ڈھور ڈھور کو کھلا دی۔ اس کے بعد کڑا دس روپے میں بیچ کر پیسے بانٹ لئے گئے۔

چوری کی اس واردات کا پتا لگانا پولیس والوں کے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ لوگوں نے دیکھا تھا کہ وہ بچے نے ڈھور ڈھور کو مٹھائی کھائی ہے۔ پولیس نے وہ بچہ کو گرفتار کر لیا۔ بوڑھا نانا اس مرتبہ بھی آڑے آیا اور وہ بچہ کو نادان کہہ کر چھڑا لایا۔

وہ بچہ سولہ سال کا ہوا تو اپنے ذیل ڈول سے بیس ایکس برس کا لگنے لگا۔ نانا نے سوچا، وہ بچہ اب جوان ہو گیا ہے، اسے ماں باپ کے پاس لے جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ نانا چاہتا تھا، وہ بچہ یہ جان لے کہ اسے اپنی طاقت کس کے خلاف استعمال کرنی ہے۔ نانا کو یقین تھا کہ دشمن کو دیکھ کر وہ بچہ کا خون ضرور جوش مارے گا اور اسے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ ماموں کی موت بھی یاد آ جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ بوڑھا، وہ بچہ کو نانک پور لے کر آیا تھا۔

وہ بچے کے ساتھ ساتھ مجھے شکنتلا کے بارے میں بھی سب کچھ پتا چل گیا۔ شکنتلا کی عمر مشکل سے اٹھارہ سال تھی۔ اس کا شوہر پچاس سال کا تھا۔ تین سال پہلے پچاس سالہ بوڑھے سے اس کی شادی ہوئی

۷۔ اس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اب تک اس سے میری براہ راست گفتگو یا ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے ہی روز میری یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں تھا کہ وجے کی ماں نے جو اب گویا میری ماں تھی، مجھے نیچے سے آواز دی۔ ”وجے! او وجے! ذرا نیچے تو آ۔“

میں نیچے پہنچا تو وہ عارت گر ہوش و خرد بھی موجود تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہے ماں؟“

”کھانا نہیں کھائے گا کیا! شکتلا پراٹھے بت اچھے پکاتی ہے، کھائے گا تو انگلیاں چائنا رہ جائے گا۔“ میں نے شرارتی نظروں سے شکتلا کی طرف دیکھا، پھر بڑے بھولپن سے پوچھا۔ ”کس کی انگلیاں ماں؟“

میرا جملہ سن کر شکتلا شرما گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

ماں نے مجھے ڈانٹا۔ ”وجے! ثواب جو ان ہو گیا ہے، منہ سے ذرا سوچ سمجھ کر بات نکالا کر۔“

شکتلا جلدی سے بارہی خانے میں چلی گئی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر چارپائی پر آ بیٹھا۔ ذرا ہی دیر بعد ماں نے کھانا سامنے لا کر رکھا۔ پراٹھوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے میری بھوک چکا دی۔ میں نے شکتلا کو ترجمانی نظروں سے دیکھا اور بے خیالی میں گرم گرم پراٹھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پراٹھوں کے گرم سگی سے میری انگلیاں جل گئیں اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسی لمحے شکتلا کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ دور سے ہنس دی۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔

ماں نے میری حالت دیکھ کر کہا۔ ”کھانا کھاتے ہوئے دھیان کھانے کی طرف رکھتے ہیں، ادھر ادھر کی نہیں سوچتے۔“

پراٹھے کھاتے ہوئے میں کن انکھیوں سے شکتلا کی طرف بھی دیکھتا جاتا۔ جب میں شکتلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو جھپٹتی مسوں پر ہاتھ پھیرنے لگتا اور کبھی اپنی پگڑی سنبھالنے لگتا۔ میں اس طرح اسے وہ گیت یاد دلانا رہا تھا جو اس نے پہلی مرتبہ مجھے دیکھ کر گایا تھا۔

وقت گزر گیا۔ دن سے رات ہو گئی اور میں، شکتلا کے دھیان میں کھویا رہا۔

اس رات پہلی مرتبہ مجھے اپنی وجود میں پیدا ہو جانے والی ایک پراسرار قوت کا خیال آیا۔ یہ قوت مجھ میں خود بخود ہی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت جب میں، ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم میں تھا۔ اپنی اس قوت کو آنانے کی خاطر میں نے آنکھیں بند کر کے شکتلا کے حسین چہرے کا دھیان کیا اور میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ میں کامیاب رہا تھا اور بند آنکھوں سے شکتلا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا بوڑھا شوہر چارپائی پر پڑا پاؤں دبوڑا رہا تھا۔ شکتلا پاؤں دباتے دباتے جانے کن خیالوں میں کھو گئی اور اس کے ہاتھ رک گئے۔

”کیا سوچ رہی ہے؟“ اس کا شوہر چیخ اٹھا۔ ”ہاتھ کیوں نہیں چل رہے تیرے؟“

شوہر سے ڈانٹ کھا کر بھی شکتلا کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر نہیں آئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب تک بلا سبب ہی ڈانٹ کھاتی رہی تھی، لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میرا وجود اس کا جواز بن

تھی۔ وہ جب سوہن کر اس گھر میں آئی تو گھر اسے پھاڑ کھانے کو دوڑنے لگا۔ تھائی کا احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ اس کا بوڑھا شوہر تقریباً ناکارہ تھا۔ گھر میں شکتلا کی عمر سے بڑے تین دیور اور تنگی عمر کا شوہر تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ بد معاش بڑھا اپنی جوان بیوی کی ہر بات پر شک کرتا تھا۔ جب عورت پر اسی کے گھر میں شک کیا جانے لگے تو اسے دشمن بھی اچھے لگتے ہیں۔ شکتلا خود اس گھر میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اس گھر کے جھگڑوں اور بد معاشیوں کا پتا تھا۔ اسی بنا پر اس گھر کے بڑے لڑکے کی شادی جوانی میں نہ ہو سکی۔ جب شکتلا اس کی بیوی بنی تو وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ شکتلا کے گھر والے بھی جانتے تھے کہ دشمنی سوہن سنگھ جاٹ جیسے بہادر خاندان سے ہے۔ سوہن سنگھ کے دو بیٹوں کی موت کے بعد یہ جھگڑے ذرا بند ہو گئے تھے اس لئے شکتلا کے لالچی باپ نے اسے اس جنم میں دھکیل دیا تھا۔ شکتلا نے اس پر بہت احتجاج کیا، بہت روٹی پیٹی مگر اسے باپ کی ضد کے آگے جھکتا ہی پڑا۔ پہلی رات ہی شکتلا نے پیار کے بولوں کی جگہ احکام سنے۔ اس کے شوہر نے پہلا حکم یہ دیا کہ کبھی تھائی میں جوان دیوروں کے پاس نہ جانا بلکہ کسی بھی جوان مرد کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔

شکتلا سمجھ گئی کہ سہاگ رات نصیحتوں میں گزرے گی۔ اس نے کروٹ لی اور سو گئی۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ چیخ مار کے جاگ اٹھی۔ اس کے اذیت پسند بوڑھے شوہر نے نازک سے مہندی لگے ہاتھ پر جلتی ہوئی سگریٹ بجا دی تھی۔ شکتلا ہاتھ کی جلن سے تڑپ رہی تھی اور بڑھا ہنس رہا تھا۔ سہاگ رات سے شروع ہونے والے ظالم بڑھتے ہی گئے۔ دن گزرتے گئے اور شکی شوہر نے خود کو شکتلا کی نظروں سے بالکل گرا لیا۔ شکتلا نے وجے کی ماں مایا کو رے ملنا شروع کر دیا۔ جو محبت اسے یہاں ملی اس نے شکتلا کا دل موہ لیا۔ مایا کو ر، شکتلا کی مظلومیت پر آنسو بہاتی اور اسے اپنے دونوں بیٹوں کے مارے جانے کے واقعات سناتی۔ دونوں دیکھی تھیں، سوانہوں نے ایک دوسرے کا دکھ بانٹ لیا۔ اس طرح ان کی دوستی میں اضافہ ہو گیا۔ سبھی ان کے میل ملاپ سے واقف تھے۔

اسی عرصے میں زرنجن سنگھ کی اچانک موت بھی اس خاندان کے لئے صدمے کا سبب ہوئی تھی۔ زرنجن سنگھ کیونکہ پولیس کے محکمے میں ایک بڑے عہدے پر تھا اس لئے سوہن سنگھ کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ پولیس والے اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود سوہن سنگھ پولیس افسر رہ چکا تھا۔

موجودہ صورت حال میں میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں، وجے کے جسم کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتا یا پھر اس خاندانی دشمنی سے الگ تھلک رہتا۔ ٹھاکر بلونت سنگھ کے جسم میں طویل عرصے رہ کر میں دشمنی اور انتقام کے انجام سے آگاہ ہو چکا تھا۔

کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس فیصلے میں شکتلا کے قرب کی آرزو کو بھی بہت دخل تھا۔

ایک روز میں، شکتلا کے دیدار کی خاطر چھت پر گیا تو وہ مجھے نظر نہ آئی۔ شکتلا اس وقت اپنے بارہی خانے میں مصروف تھی۔ میں نے چھت سے ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ ٹکڑا اس کی کمرے

گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ان لمحات کے تصور میں گم تھی جب میری اور اس کی نظریں ملی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ آج بڑی خوش نظر آ رہی ہے؟“ اس کے شوہر نے پوچھا۔

شکنتلا نے فوراً بات بنا دی۔ ”آج صبح جب میں گردوارے گئی تھی تو وہاں سادتری چاچی ملی تھی۔ وہ پرسوں گاؤں جا رہی ہے۔ اگر تم کو تو میں بھی ماں سے مل آؤں۔“

”چھایہ بات ہے۔“ شوہر نے طویل سانس لیا۔ ”چلی جانا، مگر واپس آ جانا۔“ یہ کہہ کر اس کا شوہر کرتار سنگھ کروٹ بدل کر سو گیا۔

شکنتلا نے اپنا بستر نیچے فرش پر بچھالیا۔ میاں بیوی ایک چھت کے نیچے سو رہے تھے، مگر وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔

معاً مجھے بڑھے کرتار سنگھ کے تینوں بھائیوں کا خیال آیا اور ان کے چہرے میرے صفحہ ذہن پر ابھر آئے۔ تینوں بھائی گھر کی چھت پر لیٹے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کا موضوع گفتگو دسبے، لیز میں ہی تھا۔ گھنشیام کہنے لگا۔ ”پڑوس میں دسبے آ گیا ہے، مگر بڑے بھائی کو کچھ فکر ہی نہیں۔“

دوسرا بھائی گوپال بولا۔ ”بڑے بھائی کو اپنی جوان بیوی کے خڑے اٹھانے سے فرصت ہو تو کچھ سوچیں۔ انہیں کیا فکر۔ وہ تو بند کمرے میں سوتے ہیں۔ مرنا تو ہمیں پڑے گا۔“

تیسرے بھائی آنند نے کہا۔ ”ہاں یار، بڑے بھائی کو جوان اور حسین بیوی کے ساتھ دیکھ کر تو میری بھی طبیعت اب شادی کرنے کو چاہنے لگی ہے۔“

گوپال نے آنند کو ڈانٹا۔ ”تجھے شادی کی سوجھ رہی ہے، ارے کم بخت! اس وقت تو ہمیں دسبے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ اس کا نانا جب یہاں سے واپس جا رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ جلد ہی خشونت سنگھ کو بھی بھیج دوں گا۔ بڑھا یقیناً ہم چاروں کے لئے ہی اپنے بیٹے اور نواسے کو تیار کر رہا ہو گا تاکہ وہ دونوں مل کر ہم چاروں کو.....“

اسی وقت آنند بول اٹھا۔ ”بھول جاؤ چار کو۔ اس لئے کہ بڑا بھائی تو کسی کام کا نہیں رہا۔ اسے جوان بیوی کے آچل میں منہ چھپانے ہی سے فرصت نہیں۔ ہم اب صرف تین ہیں۔“

گھنشیام نے آنند کی بات سمجھتے ہوئے تائید میں کہا۔ ”اور اب ہم تینوں کو ہر وقت ساتھ رہنا چاہئے۔ خبردار بغیر ہتھیار کے کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔“

میرے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں اور میں آنکھیں بند کر کے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرا دھیان ایک مرتبہ پھر شکنتلا کی طرف چلا گیا۔ اسے میں نے بے خبر سوتے دیکھ کر آنکھیں کھول دیں اور دھیان سلسلہ نوٹ کیا۔ میں کروٹیں بدلتے ہوئے سوچنے لگا کہ شکنتلا میرے دل میں کیوں گھر کرتی جا رہی ہے؟ تو ایک شادی شدہ عورت ہے۔ ہر چند کہ اپنے شوہر سے اس کے ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہو سکے، وہ شادی سے پہلے جیسی تھی، ویسی ہی اب بھی ہے لیکن میرے موجودہ جسم کے ناتے وہ دشمن کی بیوی تھی۔ پھر میرے دل میں اس کے قرب کی آرزو کیوں چل رہی ہے؟ انہی خیالوں میں گم، جانے کب میری آنکھ

لگ گئی۔ خواب میں بھی مجھے شکنتلا ہی نظر آتی رہی۔

☆-----☆-----☆

صبح جب میں جاگا تو سوہن سنگھ کھیتوں پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بابا! میں بھی تمہارے ساتھ کھیتوں پر چلوں گا۔“

”نہیں دسبے! ابھی تم آرام کرو۔ خشونت سنگھ دو چار دن میں آ جائے گا تو دونوں ساتھ ساتھ کھیتوں پر جایا کرنا۔“ سوہن سنگھ نے جواب دیا۔

پھر مایاکور مجھے سمجھانے لگی۔ ”دسبے! یہاں کسی سے لڑنا بھڑنات۔“

میں کچھ نہ بولا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دسبے کے ماں باپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خاندانی دشمنی کو بھول جانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ بھی شکنتلا کے جادو کا اثر ہے یا مایاکور نے اپنے بیٹے کے لئے شکنتلا جیسی کوئی بو ڈھونڈ لی ہے؟ میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سوہن سنگھ کھیتوں پر چلا گیا۔ مایاکور باورچی خانے میں مصروف ہو گئی۔ میں اوپر چھت پر آ گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے آہٹ سنائی دی۔ مایاکور کام میں مصروف تھی۔ سوہن سنگھ جا چکا تھا۔ پھر یہ اوپر کون آیا ہے؟ میں چونکا ہو کر اٹھا اور ڈانگ سے برہمی نکال کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ جس طرح شیر کے شکاری کے سامنے اچانک کوئی ہرنی آ جائے تو اس کا جو حال ممکن ہے، وہی میرا ہوا۔ بڑی بڑی آنکھوں والی ایک خوبصورت ”ہرنی“ کو میں نے دوسرے کمرے میں دیکھا۔ وہ شکنتلا تھی جو کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔

”تو یہاں کیوں آئی ہے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”چوری کرنے۔“ شکنتلا دھیرے سے ہنس دی۔ ”میں تو یہاں ہر تیسرے چوتھے دن آتی ہوں اور اس گھر کی مٹی لے جاتی ہوں۔ یہ چوری ہی تو ہوئی۔“

میرے ہاتھ میں اب تک برہمی تھی اور اس پر مجھے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

شکنتلا مجھے نگاہ غلط انداز سے دیکھتے ہوئے مزید بولی۔ ”تم بہت دنوں کے بعد گاؤں واپس آئے ہو اس لئے تمہیں شاید پتا نہیں کہ اب اس گاؤں میں چور ڈاکو نہیں رہتے جن کے لئے ایسے خطرناک ہتھیار کی ضرورت ہو۔“

”شکنتلا!“ میرے لمبے میں سختی آ گئی۔ ”یہ ہتھیار چور ڈاکوؤں کے لئے نہیں، دشمنوں کے لئے ہے..... تیرے شوہر اور دیوروں کے لئے۔ سمجھی۔“

میں نے شکنتلا کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا۔ اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

مجھے فوری طور پر یہ احساس ہو گیا کہ اس سے سخت لمبے میں بات نہ کرنا چاہئے تھی۔ یہ سوچ کر میں اس کے قریب آ کر بولا۔ ”شکنتلا! تجھے دونوں خاندانوں کی دشمنی کا پتہ ہے، پھر تو یہاں کیوں آتی ہے؟ تو آخر ہمارے گھر کا کام کیوں کرتی ہے؟“

”دشمنی تو مردوں کے درمیان ہے۔“ وہ بھولپن سے بولی۔ ”اس میں ہم عورتوں کا کیا بیج۔ کیا تیری ماں میری دشمن ہے؟ رہے تم باپ بیٹے، تو تم لوگوں کی بھی مجھ سے دشمنی نہیں۔“

میں نے آگے بڑھ کر شکلتا کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔ ”میں تیرا دشمن نہیں ہوں شکلتا۔ ہم تو دوست ہیں۔ بول دوستی کرے گی مجھ سے؟“

میرے ہاتھ میں بہت دن بعد کسی عورت کا ہاتھ آیا تھا۔ سو میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ میں نے شکلتا کے چہرے پر عجیب سکون سا محسوس کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”ارے! دروازہ تو کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔“ شکلتا خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”تیری ماں آ جاتی تو؟“

”جب دل کا دروازہ کھل جاتا ہے تو پھر کسی دروازے کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔“ میں نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ ”بول اب تو پکی دوستی ہو گئی نا؟“

اس نے شرما کر میرے سینے میں منہ چھپا لیا، پھر بولی۔ ”یہ دوستی مجھے کتنی مہنگی پڑے گی، تجھے کیا پتا۔ میرے شوہر نے آج صبح ہی منع کیا تھا کہ اب دشمنوں کے گھر نہ جایا کر۔ وہاں ایک جوان لڑکا آگیا ہے۔ پھر بھی تیری محبت مجھے یہاں بھیج لائی۔“

مجھے شرارت سو جھی اور کہا۔ ”میں نے بھی تجھے مایوس نہیں کیا۔“

”بڑا بے شرم ہے تو۔“ وہ تڑپ کر میری آغوش سے نکل گئی اور پھر زینے کی طرف بھاگتی ہوئی بولی۔ ”کل نہیں آؤں گی، انتظار نہ کرنا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے میکے جا رہی ہے۔ پھر شکلتا دو روز تک نہیں آئی۔ میں سوچنے لگا کہ ہر وقت دشمنی ہی کیوں؟ دنیا میں اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ اس دنیا میں محبت بھی تو ہے۔ پھر ہم محبت کیوں نہیں کرتے؟ ہم آخر دشمنی کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ میں نے خود کو اتنا الجھا ہوا کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ شکلتا نے مجھے ایک نئی الجھن میں گرفتار کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے قبضے میں تھی کہ جس سے وجہ کے خاندان کی دشمنی تھی۔ شکلتا چاہتی تو میرے بازوؤں کو جھٹک دیتی، میری آرزوؤں کی تکمیل نہ ہونے دیتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ خود کو اس نے میرے سپرد کر دیا۔

گھر میں رہتے ہوئے مجھے وحشت سی ہونے لگی تو میں باہر نکل آیا۔ اس عرصے میں وجہ کے بہت سے دوستوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ وجہ کے بچپن کے دوست تھے۔ میں نے وجہ کے جنم میں آکر ایک اور بات محسوس کی۔ یہ شراب کی طلب تھی۔ وجہ کا جسم شراب نوشی کا عادی تھا۔

ذرا سی دیر میں وجہ کے کچھ پرانے دوستوں کو میں نے تلاش کر لیا۔ ان کے ساتھ میں نے شراب نوشی کا پروگرام بنایا۔ ہم نے دارو (شراب) لی اور پھر سب کے سب بستی کے باہر ایک ویران سے کنویں کے پاس آ بیٹھے۔ دور پر دور چلے، باتیں ہوئیں، آپس کی باتیں، غیروں کی باتیں۔ وقت گزرتا گیا۔ جب مجھے گھر کا خیال آیا تو شام سے رات ہو چکی تھی۔ سب اٹھنے لگے مگر میں بیٹھا رہا۔ گھر کا خیال آنے کے باوجود بھی میں اس مدھوشی کے عالم میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔

”کب تک بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟“ ہری نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کسی کا انتظار تو نہیں ہے؟“

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا اور پوچھا۔ ”کس کا انتظار؟“

”ارے تجھے خبر نہیں، یہ بات تو سارا گاؤں جانتا ہے کہ اس کنویں کے اندر سے رات گئے چوہدری کی عورت کے رونے کی آواز آتی ہے۔“ ہری نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کر۔“ میں بولا۔

”بات سننے کے چکر میں رہا تو شاید اس کے آنے کا وقت ہو جائے۔“ ہری نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”بات یہ ہے کہ اپنے برابر والے گاؤں کے چوہدری نے ایک جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ سنا ہے کہ لڑکی بہت ہی سندر تھی۔ جانے کیوں چوہدری کو یہ احساس ہو گیا کہ بڑھاپے میں جوان اور خوبصورت بیوی آفت سے کم نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہ عورت اپنی ذات سے بہت نیک اور اچھی تھی مگر چوہدری کو شک و شبہ نے پاگل کر دیا۔ ایک دن وہ اپنی جوان بیوی کو میکے پہنچانے کے بہانے یہاں لایا اور اس کنویں میں دھکیل دیا۔ بس اسی روز سے ہر رات اس کنویں میں اس بے گناہ کے رونے کی آواز آتی ہے۔“

ہری کی زبانی چوہدری کی حسین و جوان بیوی کا یہ انجام سن کر میں چونک اٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں شکلتا کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

”کیوں؟ بس ڈر گیا؟“ ہری کہنے لگا۔

میں تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ ہری کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ہری سے پوچھا۔ ”وہ چوہدری ابھی تک زندہ ہے؟“

”تجھے اس سے کیا کام ہے؟ وہ غریب تو دوسرے ہی دن پاگل ہو گیا تھا۔ چل اب چلیں۔“

میں اور ہری گھروں کی طرف چل دیئے۔ ہری نے جو واقعہ سنایا تھا، اس سے مجھے شکلتا اور اس کا بوڑھا شوہر کر تار سنگھ یاد آ گیا تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم آگے بڑھ رہا تھا کہ ہری کہنے لگا۔ ”یار وجہ! میری نظر میں ایک جگہ ہے جہاں سے بہت مال مل سکتا ہے۔ اگر تو ہمت کرے تو کام بن جائے گا۔“

”کس کا گھر ہے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ تقدیر مجھے ایک بار پھر ماضی کی ڈگر پر لے جا رہی تھی۔

ہری ہنس کر بولا۔ ”نہ وہ گھر کسی جاٹ کا ہے نہ اس گاؤں میں ہے۔ اس کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔ بہت سارے زیورات اس نے ہوا رکھے ہیں۔ ہم نے بھی بند دست تو سب کر لیا ہے۔ اگر تو ساتھ دے تو تیسرا حصہ تیرا۔“

”تیسرا حصہ کیوں؟“ میں غصے اور حیرانی سے بولا۔

”ہم تین ہیں۔ پریم سنگھ سے بھی بات ہو چکی ہے۔ یہاں سے چار میل دور جانا ہو گا۔ دو گھنٹے بعد ہم یہاں سے نکلے تو صبح تک واپس آ جائیں گے۔“ ہری نے بتایا۔

”آج نہیں، کل چلیں گے ہری۔“ میں نے کہا۔

”کل آخری رات ہوگی۔ پرسوں شادی ہے، یہ مت بھولنا۔“ ہری کہنے لگا۔

”ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ کل بیس مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر میں، ٹکٹا کے خیالوں میں گم گھر کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب ٹکٹا میرے پاس آئی تو کہہ دوں گا، تو میرے پاس نہ آیا کہ۔ تیرے شوہر کو شک ہو گیا تو وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسی سوچ بچار میں گھر آ گیا۔ ماں نے دروازہ کھولا اور میں نے اوپر کی راہ لی کہ وہیں سوتا تھا۔ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جیسے میرے کمرے میں بہار آ گئی۔ ٹکٹا ہنسی مسکراتی ہوئی بالوں میں پھول لگائے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے کے بعد مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر جو کچھ میں نے سوچا تھا، کہوں گا سب بھول گیا۔ سفید بلاؤز اور سفید ساڑھی میں لمبوس ٹکٹا نے مجھے گم سم کر دیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے، یوں جیسے جدائی کی تسکین اتار رہے ہوں۔ پھر ٹکٹا نے پلکیں جھپکائیں اور مسکراتے ہوئے ایک ڈبا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لے میں تیرے لے گا جڑ کا حلوا لائی ہوں۔“ میں اب تک پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ جا رہا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ کہنے لگی۔ ”تجھے پسند ہے اس لئے اپنے ہاتھ سے بنا کر لائی ہوں، بابل کے گھر سے۔ یہ نہ سمجھنا کہ دشمنوں کے گھر سے آیا ہے۔“

میں مسکرا دیا اور ڈبا کھولا۔ ڈبے سے تھوڑا سا حلوہ نکال کر میں نے کھایا اور کہا۔ ”بہت مزیدار ہے“ لیکن یہ بتا اس میں زہر ملا کر تو نہیں لائی؟ تو بہر حال دشمن کی بیوی ہے اس لئے یہ بات پوچھ رہا ہوں۔“

”اور تیری کون ہوں؟“ وہ ایک ادا سے قریب آ کر بولی۔

”میری زندگی۔“ میں اب مزید برداشت نہ کر سکا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس میں تو پہلے سے اتنا زہر بھرا ہے کہ قاتل سے قاتل زہر اثر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں تیری ماں سے پوچھ آتی ہوں کہ چینی کے ساتھ حلوے میں کتنا زہر ڈالنا چاہئے؟ کیونکہ حلوہ بنانا تو مجھے تیری ماں ہی نے سکھایا ہے۔“

میں ہنسا اور اسی وقت میری نگاہ اس کی گردن پر پڑی جس پر نیل پڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تیری گردن پر یہ نشان کیا ہے؟“

”تجھ سے دوستی کی سزا ملی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں منع کرنے کے باوجود تیرے گھر آئی تھی۔“

”ٹکٹا! تیرا شوہر ہو کر بھی وہ تجھے جانوروں کی طرح مارتا ہے۔“ میں دکھی لہجے میں بولا۔

”وہ بھی کیا کرے۔ دن بھر جانوروں کے ساتھ رہ کر عادتیں بھی جانوروں کی سی پڑ گئی ہیں۔ کچھ اور تو بس میں نہیں، اسی طرح اپنی مردانگی جتایا ہے۔“

”پھر بھی تو مجھ سے ملنے چلی آئی؟“

”ہاں۔“ تجھے زہر ملا حلوہ بھی تو کھلا تھا۔“ وہ ہنس دی اور میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر ٹکٹا نے اپنی ساڑھی کے پلو سے بندھا ہوا ایک تعویذ کھول کر میری طرف بڑھایا۔ ”لے، یہ تعویذ پن لے، تیرے

لے بنا کر لائی ہوں۔ جب میں، ماں کے گھر جا رہی تھی تو پتا چلا تھا کہ گاؤں میں کوئی پیر آیا ہوا ہے جو تعویذ دیتا ہے۔ میں اس کے پاس گئی تو وہ سمجھا، اولاد کے لئے تعویذ لینے آئی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ایسا تعویذ لکھ دو جو پسینے والے کی ہمیشہ حفاظت کرے۔“

میں بولا۔ ”تو پھر یہ تعویذ مجھے کیوں دے رہی ہے؟ اپنے شوہر کو دے۔ میں تو اس کا دشمن ہوں۔ جو آدمی تیرے سہاگ کو لونے والا ہے، تجھے اس کی زندگی کا اتنا خیال کیوں ہے؟“

وہ مسکرائی اور پھر کہنے لگی۔ ”تجھے یہ تعویذ دے کر میں اپنے سہاگ ہی کی تو حفاظت کر رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”تو مجھے اپنا سہاگ کہہ کر کیوں گناہ میں شامل کر رہی ہے۔“

”اگر کسی ماں کے اکٹوتے بیٹے کی زندگی اور گھر میں آنے والی بو کے سہاگ کی حفاظت کرنا گناہ ہے تو یہ گناہ بھی مجھے منظور ہے۔“

”یہ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے ٹکٹا؟ کیا تو..... تو کسی اور عورت کو میرے ساتھ برداشت کر لے گی؟“

”ہاں۔“ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے۔ میں نے اپنے صدمے کی محبت تجھ سے وصول کر لی اور..... اور

زندگی آرزو نہیں۔ سارا جیون بیتانے کے لئے یہ بھی بہت ہے۔“

ٹکٹا کے ہاتھ میں اب تک تعویذ موجود تھا۔ میں نے اس سے تعویذ لے لیا اور بولا۔ ”میں بھی تجھے کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

تو نے مجھے پہلے ہی بہت کچھ دے دیا ہے، وہ جس کا میں صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ مجھے اور کچھ میں چاہئے۔“

”لیکن میں تو تجھے اپنی محبت کی نشانی دینا چاہتا ہوں۔ بول کیا تو میری محبت کا تحفہ قبول نہیں کرے لی؟“

”مگر وہ تحفہ ہے کیا؟ یہ تو بتا دے۔“

”ابھی نہیں بتا سکتا، لیکن وعدہ کر جب کچھ دوں گا تو انکار نہیں کرے گی۔ اس وعدے کے بعد ہی یہ تعویذ گلے میں ڈالوں گا۔“

میری بات ختم ہوتے ہی ٹکٹا بول اٹھی۔ ”دبے! تو جو کچھ بھی مجھے دے گا، انکار نہیں کروں گی، لہجے میری قسم ہے، آج کے بعد کبھی تعویذ کو خود سے الگ نہ کرنا۔“

پھر وہ چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کی چال میں بلا کا اعتماد تھا۔

☆=====☆=====☆

رات ہوئی تو میں، بری سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق گھر سے نکلا۔ آج رات گھر سے غائب ہونے کے لئے بہانہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ برابر کے گاؤں میں رام لیا تھی۔ آس پاس کے گاؤں والے رام لادیکھنے جا رہے تھے۔ دس بجے کی ماں مایا کو نے مجھے روکنا چاہا، مگر دوستوں کے ساتھ جانے کا سن کر مطمئن

”منظور ہے۔“ میں نے اور پریم نے وعدہ کر لیا۔ مجھے تو یوں بھی لگن نہیں بیچتا تھے۔
میں گھر پہنچا تو مایاکور جاگ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔ ”بیٹے! جلدی لوٹ آئے؟“

پھر میں اوپر جا کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ گیا اور ننگن نکال کر ان پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شکنتلا کے خوبصورت ہاتھوں میں وہ ننگن کیسے لگیں گے۔ پھر میں نے تصور میں شکنتلا کو وہ ننگن پہنا دیئے۔ چند ہی لمحے بعد میرے دھیان میں شکنتلا کا چہرہ ابھرا جسے دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا شوہر اسے بری بری گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے سنا۔ ”حرامزادی! ذرا سی مار برداشت نہیں ہوئی اور آنسو بہانے لگی۔ ابھی تو میں تجھے اور سزا دوں گا..... بے حیا.....“

ذلیل..... کیتا..... میں نے تجھے منع کر دیا تھا پھر بھی اس غمزدگی سے گھر گئی۔ آخر اس سے تیرا کون سا رشتہ ہے جو ملے بغیر تجھے جین نہیں پڑتا۔ مجھے تو میرے ایک آدمی نے کھتوت ہی میں اسی وقت خبر کر دی تھی جب تو اپنے یار سے مل کر لوٹی تھی۔“ شکنتلا زمین پر پڑی تھی۔ اس کا بوڑھا خالم شوہر غصے سے بھرا قریب آیا اور سر کے بال پکڑ کر کھینچنے لگا۔ معلوم نہیں وہ خالم کب سے شکنتلا پر ظلم ڈھا رہا تھا۔ شکنتلا کے حسین چہرے پر کرب و اذیت کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ سمجھن رکھے تھے شاید اس خیال سے کہ اس کی چیخیں میں نہ سن لوں۔ بوڑھے کو تار سنگھ کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اذیت پسند شخص غالباً شکنتلا کی چیخیں سننا چاہتا تھا۔ جب اس کے حیوانی جذبے کی تسکین نہ ہوئی تو وہ چیخ کر کہنے لگا۔ ”آج تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو زندگی بھر مادر رکھے گی۔“

شکنتلا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بہتے بہتے کتر سنگھ پھر گالیاں کہنے لگا۔ وہ شکنتلا پر الزام لگا رہا تھا کہ میرے ساتھ اس نے ناجائز تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ اسے یقیناً خبر نہیں تھی کہ یہ الزام نہیں،

”میں نے ننگن اس لئے نہیں رکھے کہ یہ قیمتی ہیں۔ میں تو انہیں چوری کی یاد کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”مجھے حصہ دینا ہے تو ننگن دو ورنہ کچھ بھی نہیں چاہئے۔“ دراصل میں وہ ننگن شکلتلا کو تحفے میں دینے کے لئے پسند کر چکا تھا۔ شکلتلا کی گوری گوری کلائیوں میں وہ ننگن بہت تھیں۔ میری بات سن کر خاموشی چھا گئی۔ پھر ہری اور پریم نے اپنے اپنے حصے اٹھائے۔ انہوں نے میرا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ میں نے بھی ننگن لے لئے اور کھڑا ہو گیا۔

حقیقت ہے۔ شکلتا نے ایک مرتبہ بھی الزام کی تردید نہیں کی تھی۔

سو نے سے پہلے کرتا شکلتا نے دھکی دی۔ ”اگر تو نے اپنے ہاتھ پایوں کے نیچے سے نکالے تو تیرے ہاتھ ہی کاٹ ڈالوں گا۔“

پھر ذرا ہی دیر میں ظالم کرتا شکلتا سو گیا۔ شکلتا سستی رہی، مگر کرتا شکلتا بے خبر سوتا رہا۔

میرا جی چاہا کہ ابھی جا کر ظالم بوڑھے کے سینے میں کرپاں اتار دوں جو میری محبوبہ کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔ قانون اور سماج کی نظر میں شکلتا اس بوڑھے کی بیوی تھی۔ مجھے اس معاملے میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ رات میں نے جیسے انگاروں پر لوٹنے ہوئے گزاری۔ ایک لمحے کو بھی میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ صبح ہوئی تو میں نے برابر والی چھت پر دیکھا۔ شکلتا مجھے نظر نہیں آئی تو میں نیچے آ گیا کہ شاید وہ مایاکور سے ملنے آئی ہو، لیکن وہ باورچی خانے میں اکیلی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل بگھ گیا۔ مایاکور مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”چل اب جلدی سے ناشتا کر لے۔ آج تو نے بڑی دیر کر دی سو کے اٹھنے میں۔“

میرا جی چاہا، پوچھ لوں کہ کیا شکلتا آئی تھی، لیکن یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کچھ لمحے تذبذب میں گزرے۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچ لی اور بولا۔ ”ماں! تو نے مجھے جلدی کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا شکلتا کے ساتھ باتیں کرنے میں لگی رہی؟“

”نہیں بیٹے! رات کو تو دیر سے آیا تھا تاں اس لئے میں نے سوچا، ذرا آرام کر لے۔ شکلتا تو آج صبح سے آئی ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا، پھر فوراً ہی ہنستے ہوئے بات بدل دی۔ ”اگر ایک دن شکلتا نہیں آئی تو کیا ہو گیا۔“

”تو نہیں جانتا بیٹا، وہ بڑی بھلی عورت ہے۔ میرا اس سے دل لگ گیا ہے۔“ مایاکور نے کہا۔

”پھر تو ماں تجھے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کیوں نہیں آئی؟ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟“

ناشتا کرنے کے بعد میرے ممبر کا بیٹا نہ لبرز ہو گیا۔ میں نے مایاکور سے ”ابھی آیا“ کہا اور گھر سے نکل گیا۔ باہر آ کے میں سیدھا شکلتا کے گھر کے پاس رکا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر میں ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ ایک کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر شکلتا پر پڑی۔ وہ سامنے کمرے میں چرخا کات رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے نظریں اٹھائیں اور چونک اٹھی۔

”دبے! تو یہاں؟“ وہ سسے ہوئے لمبے میں بولی اور جلدی سے چارپائی پر پڑا ہوا دوپٹا اوڑھ لیا۔ زخمی ہاتھ اس نے کمرے کے پیچھے چھپا لئے تھے۔ میں خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ پھر بول اٹھی۔ ”تو یہاں کیوں آ گیا؟“

”جب تو وہاں نہیں آئی تو میں خود یہاں چلا آیا۔“ میں نے جواب دیا۔

شکلتا کی نظریں کھلے ہوئے دروازے پر جم گئیں۔

میں سمجھ گیا کہ شکلتا مجھے اپنے گھر میں اچانک دیکھ کر گھبرا رہی ہے، اسی لئے بولا۔ ”تو بیٹھ، میں دروازہ بند کئے دیتا ہوں۔“ دروازے کی کنڈی لگا کر جب میں واپس آیا تو شکلتا کے چہرے پر اطمینان جھلکے لگا۔ میں نے اپنی جیب سے ڈبا نکالا اور اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”شکلتا! میں تجھے یہ دینے کے لئے آیا ہوں۔“

میرے ہاتھ میں وہی ڈبا تھا جس میں شکلتا اپنے میکے سے میرے لئے حلوا لائی تھی۔ ڈبے کو دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”اسے واپس دینے کی اتنی جلدی کیا تھی؟ یا اس ہانے تو مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے؟ بول، میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں نا؟“ اس نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”تجھ سے ملنے کے لئے اب مجھے کسی ہانے کی ضرورت نہیں ہے شکلتا! تو آج گھر نہیں آئی تو ماں کو فکر تھی۔ ماں تو یہاں آ نہیں سکتی۔ یہ دشمن کا گھر ہے نا۔ اس لئے میں آیا ہوں۔ تیری میری تو پکی دوستی ہے نا اور ہاں یہ ڈبا خالی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بند ڈبا شکلتا کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اب بھی اپنے دونوں ہاتھ چھپائے خاموش بیٹھی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جو بات چھپا رہی ہے، مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ میں نے مزید کہا۔ ”تو نے یہ ہاتھ کیوں چھپا رکھے ہیں؟ کیا مجھ سے ڈر لگ رہا ہے کہ تیری کلائی.....“

”نہیں۔“ وہ بول اٹھی۔ ”تجھ سے بھلا میں کیوں ڈرنے لگی۔“

”تو پھر ڈبا کھول کر دیکھتی کیوں نہیں کہ میں کیا لایا ہوں۔“

”کیا لایا ہے، تو ہی دکھا دے نا۔“

”اچھا، لے دیکھ۔“ میں نے ڈبا کھول کر سونے کے کنگن اور انگوٹھی اس کے سامنے رکھ دی۔

شکلتا حیران رہ گئی۔ اسے یقیناً کسی ایسے قیمتی تحفے کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس نے شوہر کو دیا جانے والا تعویذ مجھے دیا تھا اور میں کسی بیوی کو دیا جانے والا تحفہ اسے دے رہا تھا۔

میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”کیا سوچ رہی ہے شکلتا؟ شاید تجھے میرا تحفہ پسند نہیں آیا۔“ پھر میں نے جان بوجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”لا، اپنے ہاتھ ادھر لا۔ دیکھو تیری گوری گوری کلائیوں میں یہ کنگن کیسے لگتے ہیں؟ ٹھیک بھی آتے ہیں یا نہیں۔“

شکلتا پیچھے ہٹ گئی۔ میں اس پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کے اوپر ہونے والے ظلم کا علم ہے۔ بہر حال میں نے اس کے ہاتھ پکڑی لئے۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ ہاتھ زخمی ہوں گے مگر اتنے زیادہ زخمی ہونے کا گمان نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت سے وہ تڑپ اٹھی حالانکہ گرفت زیادہ سخت نہیں تھی۔ میں نے اس کے شدید زخمی ہاتھ دیکھے تو لرز گیا۔ شکلتا کا چہرہ اس طرح دھواں دھواں ہو رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

سب کچھ جانتے بوجھتے میں نے غصے میں پوچھا۔ ”کیا یہ تیرے شوہر کی حرکت ہے؟ تو مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپا رہی تھی؟ دیکھتا ہوں، اب وہ بڑھا مجھ سے بچ کر کہاں جاتا ہے۔“

مجھے غصے میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور پھر غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے میرے سینے سے آگئی۔
 ”ٹکٹلا! مجھے بتاؤ یہ سب کیوں برداشت کرتی ہے؟ تجھے جو سزا ملی، وہ مجھے ملنی چاہئے۔ میری ہی وجہ سے تجھے یہ ظلم برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ میں ٹھیک کہتا ہوں نا۔“

”بتاتی ہوں‘ سب بتاتی ہوں۔“ وہ بولی اور پھر گزشتہ رات کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور میں اچھل پڑا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ کسی شخص نے گھر میں میری موجودگی کی اطلاع کھیتوں پر دشمنوں کو پہنچا دی تھی۔ دروازے پر اب ڈنڈے برسائے جا رہے تھے۔ چاروں بھائی مسلح ہو کر آئے تھے۔ ٹکٹلا سہم گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”ٹکٹلا! تو ہمت رکھ‘ میں اکیلا ہی ان بزدلوں سے نمٹ لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔

ٹکٹلا نے میرا راستہ روک لیا اور بولی۔ ”کیا تو مجھے اس طرح بدنام کرنا چاہتا ہے.....؟ اگر نہیں تو دبے‘ تجھے میرے پیار کی قسم جس طرح چپ چاپ میاں آیا تھا اسی طرح خاموشی کے ساتھ واپس چلا جا۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اس نے پچھلی کھڑکی سے مجھے باہر نکال دیا۔ میں تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی اوپری منزل پر پہنچ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ میرے پیچھے ٹکٹلا پر کیا گزری۔ میں نے اس کا دھیان کیا۔ وہ گھر کے دروازے کی کھنڈی کھول رہی تھی۔ جس ڈبے میں کنگن اور انگوٹھی تھی‘ اس نے کیں چمپا دیا تھا۔ دروازے کھلتے ہی سب سے پہلے کر تار سنگھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔

”اتنی دیر میں دروازہ کیوں کھولا؟ کیا اپنے یار سے.....“ کر تار سنگھ نے چیخ کر ایسی بات کہی جو کسی بھی غیر مت مند شخص کی زبان پر نہیں آ سکتی۔

ٹکٹلا نے اس کی فحش کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ذرا نیند آگئی تھی۔“

”جھوٹی حرامزادی۔“ کر تار سنگھ چیخا۔ ”اور کون ہے تیرے ساتھ اندر؟“

ٹکٹلا انجان بن گئی۔ ”اندر.....؟ اندر تو کوئی نہیں..... اندر کون ہوتا۔“

اتنی دیر میں کر تار سنگھ کے تینوں بھائیوں نے پوری تلاشی لے لی تھی۔ کر تار سنگھ نے ٹکٹلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے پوچھا۔ ”بتا کہاں ہے وہ؟“

پھر اس سے پہلے کہ ٹکٹلا کچھ کہتی‘ کر تار سنگھ اسے مارنے لگا۔ ٹکٹلا زمین پر گر پڑی۔

”میاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ آئند نے بھائی کو بتایا۔

”ٹھیک طرح سے دیکھ آئند‘ آج بچ کر کہاں جائے گا وہ۔“ کر تار سنگھ نے یہ کہتے ہوئے ٹکٹلا کی پیٹھ پر زور سے ڈنڈا مارا۔ ٹکٹلا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس ظلم پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میری محبوبہ ایک ظالم کے ظلم

ہائٹانہ بن رہی تھی‘ میں کس طرح یہ برداشت کر لیتا۔ وہ کھلے عام میرا نام لے رہا تھا کہ گھر میں ٹکٹلا کے ساتھ رنگ رلیاں مٹا رہا تھا‘ اس کے ایک آدمی نے مجھے گھر میں گھستے دیکھا تھا۔ ٹکٹلا کی چیخ جیسے میرے وجود کو دوہیم کر گئی۔ میں غصے میں ہوش کھو بیٹھا۔ میں نے اپنی ڈانگ اٹھائی اور پھر برجمی نکال کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس وقت کر تار سنگھ دوبارہ ٹکٹلا کو ڈنڈا مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا۔

”شیطان کے بیٹے۔“ میں چیخ اٹھا۔ ”عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے‘ مرد ہے تو میرے سامنے آ۔“

کر تار سنگھ نے مڑ کر مجھے دیکھا تو چہرے پر خوف پھیل گیا۔ اس کے تینوں بھائی بھی قریب آ گئے۔ میں نے انہیں پھر لٹکارا۔

اب عجیب صورت حال تھی۔ پیچھے ہٹنے پر عورت کے سامنے ان کی بیٹی ہوتی تھی۔ چاروں نے ہتھیار سنبھالے اور سامنے آ گئے۔ میں بھی تیار کھڑا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی تھی اور طاقت بھی کہ ان چاروں سے تھلاؤ سکتا۔ پھر یہ کہ وہ نیچے تھے اور میں دیوار پر کھڑا تھا۔

نکارا بڑھنے لگی۔ اس دوران گوپال اور آئند نے دیوار پر چڑھنا چاہا‘ لیکن میں نے انہیں نیچے گرا دیا۔ اس پر گوپال آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک برجمی تھی۔ اس نے اچھل کر مجھ پر وار کرنا چاہا۔ میں اس وقت تک ڈانگ میں لگی ہوئی برجمی سے گوپال کی گردن کا نشانہ لے چکا تھا۔ قریب تھا کہ میری برجمی گوپال کا کام تمام کر دیتی کہ شور و غل سن کر اسی وقت دبے کی ماں مایا کو کمرے سے نکل کر آگن میں آگئی۔ اس نے میرے دونوں پیر پکڑ لئے۔

”بس بیٹا‘ بس! نیچے اتر آ۔“ مایا کو ر کی آواز میں التجا تھی۔

یوں گوپال اس روز بچ گیا اور نہ اس کی موت یقینی تھی۔ چیخ و پکار سے تمام محلہ جمع ہو گیا۔ غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج یہ قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔ خاص طور پر میں‘ ٹکٹلا کے شوہر کر تار سنگھ کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ٹکٹلا پر ظلم کرنے والے اس بڑھے کو ختم کرنا ضروری تھا۔ سو میں نے اس کا نشانہ لیا۔

”دبے!“ مایا کو ر چیخ اٹھی۔ ”تجھے میری قسم جو اب ہاتھ اٹھائے۔“

وہ عورت جو اس جسم کے ناتے میری ماں تھی‘ اس نے جیسے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ محلے کے لوگ بھی چیخ میں آ گئے۔ پھر بھی اس جھگڑے میں گھنشیام اور آئند کے سر پھٹ چکے تھے۔ گوپال بھی شدید زخمی ہو گیا تھا‘ مگر بڑھا حرامزادہ کر تار سنگھ ٹھیک تھا۔ وہ کینہ اور بزدل آگے ہی نہیں آیا تھا۔

محلے کے لوگ دونوں گھروں کے درمیان جمع ہو گئے تھے اور سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ پانی دشمنی پھر شروع ہو گئی‘ کون جانے اب کیا ہو۔

دوپہر کے وقت جو جھگڑا ہوا تھا‘ اس کی خبر شام تک دھرم گھر پہنچ گئی۔ جاٹوں کا اصول ہے کہ وہ جس طرح بیٹی کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے‘ اسی طرح بیٹی کی سرال کی دشمنی بھی اپنے سر نہیں لیتے۔ ایسا نہ ہوتا تو دبے کا بوڑھا نانائک کا خود انتقام لے چکا ہوتا۔

دبے کی ماں پیش آنے والے واقعے سے بہت پریشان تھی کہ اگلے ہی روز اس کے سیکے سے

واقعات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کر دیا، مگر شکلتا کا نام گول کر گیا۔ عمروں کے فرق کے باوجود میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وجہ اور خشونت کے درمیان دوستی تھی۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ جلد از جلد دو ایک دشمنوں کو موت کی نیند سلا دینا چاہئے۔ کسی کو قتل کرنا میرے لئے کون سی نئی بات تھی۔ جانے کتنے آدم زاد میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ خشونت اور وجہ کی دوستی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ اس کے آجانے سے میری ہمت مزید بڑھ گئی تھی۔ مجھے اس کی موجودگی سے اگر کوئی خطرہ تھا تو صرف یہ کہ میں شکلتا سے نہیں مل سکوں گا، اگر ملا بھی تو پہلے جیسی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔

میں اور خشونت ناشتا کر رہے تھے کہ اس نے مایاکور سے کہا۔ ”بہن! باپو نے کہا ہے کہ آئندہ تم مردوں کے جھگڑے میں نہ پڑنا۔“

مایاکور کے چہرے پر دکھوں کی چادر پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔

”باپو نے یہ بھی کہلوایا ہے کہ تم جھگڑے میں پڑیں تو وہ کبھی تمہارا منہ نہیں دیکھیں گے۔“

خشونت نے مزید کہا۔

ناشتا کر کے میں چھت پر چلا آیا۔ سامنے ہی شکلتا کا صحن نظر آ رہا تھا۔ وہ میری طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ معاً اس نے پلٹ کر چھت کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں اسے کس طرح چھت پر میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ ہم دونوں کی نظریں دیر تک ایک دوسرے ملی رہیں۔

اچانک نیچے سے خشونت نے آواز دی۔ ”وجہ! نیچے آ۔ تیرا کوئی دوست ملنے آیا ہے۔“

میں چونکا کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ نیچے آ کر دیکھا تو وہ پریم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”آؤ پریم! کیسے آئے؟“

”ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“ پھر اس نے بتایا۔ ”غصیب ہو گیا وجہ! چوہدری کے گھر چوری کے شے میں پولیس نے ہری کو پکڑ لیا ہے۔“

”کب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”آج صبح۔“ پریم نے جواب دیا۔ ”چوری کی تفتیش کے لئے امرتسر سے ایک پولیس افسر آیا ہے۔ مشتبہ لوگوں میں ہری کا نام بھی ہے کیونکہ ہری اس رات گاؤں میں نہیں تھا اور ادھی رات تک گھر سے غائب رہا تھا۔ پولیس کے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے۔ اب پولیس مارپیٹ کر کے اس سے سب کچھ اگوا لے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہری ہم دونوں کا بھی نام نہ لے دے۔“ پریم کے چہرے پر یہ کتنے ہونے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

پریم کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا اور بولا۔ ”خبردار پریم! ہری کے متعلق ایسا سوچنا بھی مت۔ وہ انکار دوست ہے۔ پولیس ظلم کرنے کے باوجود اس سے کچھ بھی نہیں اگوا سکے گی۔“ پھر میں نے معلوم کیا۔ ”یہ بتاؤ ہری کے گھر سے چوری کا سامان تو برآمد نہیں ہوا؟“

”نہیں، اس کے گھر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔“ پریم نے جواب دیا۔

”پھر تو کوئی پرواہ کی بات نہیں۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”اب تو جا اور معلوم کر کہ ہری پر

خشونت سنگھ آگیا۔ میں نے اب تک اس کا نام ہی نام سنا تھا۔ وہ وجہ کا ماموں تھا اور میرے موجودہ جم کی عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا۔

نانا نے وہ گھوڑی بھی بھیجی تھی جو وجہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ گھوڑی کا نام مانک تھا۔ مایاکور سمجھ گئی کہ اس کے باپ نے ہی خشونت کو بھیجا ہوگا۔

”مجھے دیکھ کر کس سوچ میں پڑ گئیں بہن؟“ خشونت نے سوال کیا۔

”بابا نے تجھے یہاں رہنے کو بھیجا ہے تو پھر مانک کو ساتھ کیوں لایا ہے؟“ مایاکور بولی۔

خشونت نے جواب دیا۔ ”باپو نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ جب تک اس دشمنی کا فیصلہ نہ ہو جائے، میں یہیں رہ کر وجہ کی مدد کروں۔“

ناشتا کر کے سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ وجہ... بھی آگیا ہے۔ گزشتہ رات سے تقریباً ہر گھر دشمنوں کی دشمنی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ بوزیہ اپنی یادیں تازہ کر رہے تھے کہ ان خاندانوں کی دشمنی کے سبب اب تک کتنے لوگ مارے جا چکے تھے۔ کتنے بچے یتیم اور کتنی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی لوگ یہ پیش گوئی بھی کر رہے تھے کہ اب جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ مجھے تمام خیریت اپنے دوستوں کے ذریعے مل رہی تھیں۔ خشونت کی آمد سے لوگوں کے شکوک یقین میں بدل گئے تھے کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔

میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ مجھے یہ جاننے کی فکر تھی کہ خشونت کی آمد کا ان پر کیا رد عمل ہوا ہے۔ اس کے لئے میں نے اپنے دھیان کی پراسرار قوت آزمائی جس کے ذریعے میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا اور کانوں سے سن سکتا تھا۔

”آہستہ بولو۔“ کرتار سنگھ بولا اور کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں شکلتا موجود تھی۔ ”کہیں وہ نہ سن لے۔“ بوڑھے کو اب اپنی بیوی پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ ”وہ اپنی ضد کی پکی ہے، رات سے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اسے مارا بھی کہ کھانا کھالے، مگر نہیں مانی اور نہ ہی اس نے یہ اقرار کیا کہ دشمن کے گھر نہیں جائے گی۔“

شکلتا کمرے سے نکل کر گھر کے کام میں لگ گئی۔ چاروں بھائی اسے گھورنے لگے۔ گھنشیام نے اس پر جملہ کسا۔ ”آج چال کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔“

گوپال بولا۔ ”چال کیوں نہیں بدلے گی۔ مارتو اتھے اچھوں کے کس بل نکال دیتی ہے۔“

چاروں بھائیوں نے کھیتوں پر جانے سے پہلے چھت پر جانے والے زینے کے دروازے میں تالا لگا دیا کہ شکلتا اوپر نہ جاسکے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے سارے گھر کی کڑکیاں بھی مقفل کر دیں۔ اس طرح گویا انہوں نے شکلتا کو گھر میں قید کر دیا تھا۔ گھر کے صدر دروازے پر بھی وہ تالا لگا گئے تھے۔ دشمنوں کی طرف سے باخبر ہو کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی کے ساتھ شکلتا کا مظلوم چہرہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دشمنوں کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد خشونت سنگھ کو میں نے اب تک پیش آنے والے

کیا جی۔ شام سے پہلے مجھے آکر جانا۔

پریم آگے بڑھا ہی تھا کہ خشونت باہر آگیا اور مجھ سے پوچھا۔ ”کیا کوئی پھندا ہو گیا تھا؟“

میں چونک اٹھا اور پھر سوچا کہ خشونت تو میرا ساتھ ہی دینے کے لئے آیا ہے اس سے کیا پردہ ہو میں بولا۔ ”ہاں! میاں آکر ایک جگہ پر ہاتھ مارا تھا۔ آج میرے ایک ساتھی کو پولیس نے دھرا لیا ہے۔ اسی کی خبر دینے پریم آیا تھا“ لیکن مال میرے ساتھی ہری کے گھر سے برآمد نہیں ہوا اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔“

خشونت نے میری پیٹھ پر تھکی دی اور کہنے لگا۔ ”واہ! تُو نے میاں آتے ہی کام دکھا دیا لیکن تیرے حصے کا مال تو گھر میں نہیں ہے؟ اگر مال گھر میں موجود ہے تو اسے جلد سے جلد ٹھکانے لگا دے۔ پولیس کی مار سے تو اچھے اچھوں کا پانی اتر جاتا ہے۔“

”نہیں! میں نے تو اپنے حصے کا مال کل ہی ٹھکانے لگا دیا تھا۔“

میں نے کہنے کو تو یہ الفاظ کہہ دیئے، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کل کے ہنگامے میں ننگن اور انگوٹھی، شکلتا کے شوہر یا دیوروں کے ہاتھ آگے ہوں گے تو کیا ہوگا؟ مجھ پر اگر چوری کا الزام آگیا تو ایک سابق پولیس افسر، یعنی وجے کے باپ کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔

میں نے سوچا، مجھے جلد از جلد شکلتا سے انگوٹھی اور ننگن کے بارے میں معلوم کر لینا چاہئے، مگر اس وقت خشونت کی موجودگی میں یہ کام مشکل تھا۔ مجبوراً میں ’خشونت کے ساتھ کھیتوں پر چلا آیا۔ آس پاس کے کھیتوں میں جا کر خشونت نے وجے کے دوستوں سے ملاقات کی۔ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ دشمنوں سے لڑائی کے وقت وہ کیا مدد کر سکتے تھے۔ وہ میرے ساتھ جہاں جہاں بھی گیا، سب نے اسے یقین دلایا اور مدد کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ تم دونوں کوئی قدم تو اٹھاؤ، ہم ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں۔

خشونت کو یقین ہو گیا کہ میرا پلہ بھاری ہے۔

دوسری طرف ہمارے دشمن کرتار سنگھ اور اس کے بھائی بھی اسی فکر میں تھے۔ اطلاعات کے مطابق انہوں نے چار غنڈوں کو نوکر رکھ لیا تھا۔ وہ ان کرائے کے غنڈوں کے ذریعے مجھے ختم کرا دینا چاہتے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب کھیتوں پر میں اور خشونت اکیلے ہوں تو ہم پر حملہ کر دیا جائے تاکہ اچانک حملے کی صورت میں ہمیں بچنے کا موقع نہ مل سکے۔ میں ان اطلاعات کے باوجود ظاہر ہے کہ خوفزدہ یا پریشان نہیں تھا۔

شام کو پریم مجھ سے ملنے کھیتوں پر آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”کیا ہوا پریم؟ ہری کر حال میں ہے؟“

پریم نے بتایا۔ ”ایک حوالدار کے ذریعے پتا چلا ہے کہ پولیس نے ہری کو بہت مارا ہے، لیکن ہرگز اب تک یہی کہہ رہا ہے، چوری والی رات کو میں بایرا گاؤں میں رام لیلا دیکھنے گیا ہوا تھا۔ میں چوری کے بارے میں نہیں جانتا۔“

”پھر اب پولیس کیا کہتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”پولیس، ہری سے کہہ رہی ہے کہ اگر تُو رام لیلا دیکھنے گیا تھا تو کوئی گواہ پیش کر۔ ہری جواب میں کہہ رہا ہے کہ گواہ کی بجائے تم گاؤں کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو کہ میں اس رات وہاں تھا یا نہیں؟ کوئی تو مجھے پہچان ہی لے گا۔ ٹانگ پور کے بہت سے لوگ بھی وہاں گئے تھے۔“

میں سمجھ گیا کہ ہری اپنا عہد نبھا رہا ہے۔ پولیس کے تشدد سے اسے بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ میرے دل میں ہری کی وقعت بڑھ گئی تھی۔ آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور پریم سے بولا۔ ”پریم! میں تھانے جا رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ پریم نے پوچھا۔ ”تُو وہاں جا کر کیا کرے گا؟“

”گوای دوں گا کہ میں نے ہری کو رام لیلا میں دیکھا تھا۔ ہری پر پولیس ظلم ڈھائے اور ہم چپ بیٹھے رہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ گزشتہ روز جب کرتار سنگھ اور اس کے بھائیوں سے میرا جھگڑا ہوا تھا تو وجے کے باپ سوہن سنگھ نے اپنی کوشش سے تھانے میں اس کیس کو درج ہونے سے روک لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ’پولیس کی نظروں میں نہ آؤں۔ اس کا بڑا بیٹا ہے، پولیس ہی سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اور پریشان تھا۔ اپنی اس پریشانی کا اظہار سوہن سنگھ نے مایا کور سے بھی کیا تھا۔ جب تک وجے اپنے تاتا کے پاس تھا، سوہن سنگھ بے فکر رہا، لیکن اس کے گھر آتے ہی سوہن سنگھ کے دل میں طرح طرح کے دوسروں نے جگہ بنا لی تھی۔ گاؤں کا تھانیدار اس کا دوست تھا۔ سابق پولیس افسر ہونے کی وجہ سے پولیس کے محکمے میں اس کی عزت تھی۔ میرے تحفظ کی خاطر وہ آج کل پولیس والوں کے ساتھ زیادہ اچھے بیٹھے لگا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں ’پولیس تھانے سے دور ہی رہوں۔

جب میں تھانے جا رہا تھا تو خشونت نے بھی مجھے اس سے منع کیا تھا کہ میں ’پولیس کی نظروں میں نہ آؤں، مگر ظاہر ہے مجھے یہ مشورہ قبول نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، صرف یہی گواہی تو دینا تھی کہ ہری کو میں نے رام لیلا میں دیکھا تھا۔

میں نے تھانے میں اقدم رکھا تو پولیس کا ایک بڑا افسر متا، تھانیدار سے خوش گہیوں میں مصروف تھا۔ یہی پولیس افسر امرتسر سے اس کیس کی تفتیش کرنے آیا تھا۔ ہری پر تشدد کر کے پولیس تھک چکی تھی، مگر اس نے قرار جرم نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے گھر سے مال بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ میرا قیاس یہ تھا کہ محض شہبے کی بنیاد پر کوئی ذمہ دار پولیس افسر ہری کو مجرم قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ہری کے خلاف پولیس کے پاس کوئی بھی ثبوت نہیں تھا۔

میں نے پیغام بھجوایا تو متا نے مجھے بلوا لیا۔ متا اور تھانیدار کے سامنے پہنچنے ہی میں نے انہیں سلام کیا اور معصومیت سے بولا۔ ”صاحب! ہری اس رات واقعی رام لیلا دیکھنے بایرا گاؤں گیا تھا۔ میں نے خود اسے وہاں دیکھا تھا۔ میں یہی کہنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔“

متا اور تھانیدار دونوں ہی میرے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔ وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ ہری کی بے گناہی ثابت کرنے اور گواہی دینے میں ہی تھانے کیوں آیا ہوں؟

تھانے دار نے متا کو خاموش دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا۔ ”یہ نوجوان‘ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر سوہن سنگھ کا بیٹا ہے۔ ٹانگ پور آئے ہوئے ابھی اسے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے یہ اپنے تاتا کے پاس دھرم مندر میں رہتا تھا۔ سوہن سنگھ کو میں جانتا ہوں‘ اچھے آدمی ہیں۔ یہ نوجوان اچھے خاندان کا ہے۔“

”تو ہری کو کب سے جانتا ہے؟“ متانے کرخت لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

”ہم تو بچپن سے ساتھ کھیلتے آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تیری عمر کیا ہے؟“ متانے پوچھا۔

”میرے باپو کہتے ہیں‘ سترہ سال کا ہوں۔ ویسے میں دیکھنے والوں کو اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا ہوں

تاصاحب؟“

میری بات پر متا مسکرانے لگا اور تھانیدار بھی دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر متانے کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ اگر کوئی بغیر بلائے خود کسی ملزم کی گواہی دینے آ جائے تو پولیس گواہی دینے والے پر بھی شبہ کر سکتی ہے؟“

متا کے یہ الفاظ سن کر میں دل ہی دل میں ہنسا‘ پھر بڑی معصومیت سے بولا۔ ”مجھ پر شبہ کیوں ہوگا صاحب۔ ہم جاٹ لوگ چوری تو کبھی کرتے ہی نہیں۔ آپ تو خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے۔“

کچھ دیر متانے غور کیا‘ پھر تھانیدار سے انگریزی میں کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے‘ یہ لڑکا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ہری کو چھوڑ دینا‘ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دینا کہ یہاں کی باریشٹ کا باہر ذکر نہ کرے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ پھر وہ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھ اس وقت تو میں‘ ہری کو تیری گواہی پر چھوڑے دے رہا ہوں‘ لیکن اگر چور پکڑے نہ گئے تو اسے اور تجھے دونوں کو بند کر دوں گا۔ سمجھ گیا؟“

”جی سمجھ گیا صاحب۔“ میں جلدی سے بول اٹھا‘ پھر واپسی کے لئے مڑنے سے پہلے ایک بار پھر متا کو سلام کیا۔

متا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”کیا کرتا ہے تو؟“

”باپو کے ساتھ کھیتوں پر جاتا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”تیرے باپو پولیس کے محکمے میں ملازمت کر چکے ہیں‘ تو بھی پولیس میں بھرتی ہو جا‘ مگر ابھی تیری عمر کم ہے۔“ متا کے لہجے میں بے تکلفی آگئی۔

”جی ہاں صاحب‘ میرے باپو بھی یہی کہتے ہیں۔“ میں بولا۔

متا کو مجھ سے اس انداز میں بات کرتے دیکھ کر تھانیدار کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ پھر متا چلا گیا اور تھانیدار نے ہری کو حوالات سے نکالا۔

میں نے ہری کو لولہمان دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ پھر بھی خاموش رہنے ہی میں مجھے بہتری نظر آئی۔ ہری کی حالت ایک ہی دن میں ایسی ہو گئی تھی جیسے وہ برسوں کی جیل کاٹ کر آیا ہو۔ تھانیدار نے

ہری کو بتایا۔ ”دبے نے تیری بے گناہی کی گواہی دی اور متا صاحب مان گئے۔ تو اس لئے بچ گیا ورنہ میں تجھے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اب جا اور رات کو ادھر ادھر آوارہ نہ گھوما کر ورنہ کسی دن بے موت مارا ائے گا۔“

ہری کے چہرے پر بے یقینی سی نظر آئی۔ پھر وہ میرے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ باہر آتے ہی مجھے بے کاپ سوہن سنگھ نظر آیا۔ وہ مجھے غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خشونت ہی نے میرے تھانے جانے کی خبر دی ہوگی۔ اندر سے تھانیدار کی نظر سوہن سنگھ پر پڑی تو وہ بھی باہر آ گیا۔

”سوہن سنگھ جی۔“ تھانیدار قریب آ کر بولا۔ ”تمہارے دبے نے تو آج کمال کر دیا۔ جب یہ ائے آیا تو مجھے اس کی بے وقوفی پر بڑا غصہ آ رہا تھا‘ مگر اس نے تو متا صاحب جیسے سخت انسر پر دیکھتے ہی ہلچے جادو سا کر دیا۔ وہ بڑی دیر دبے سے باتیں کرتے رہے‘ پھر خود ہی ہری کی رہائی کا حکم بھی دے گئے۔ تمہارا بیٹا تو بڑا بہادر اور ذہین ہے‘ متا صاحب سے ذرا بھی نہیں ڈرا۔“

سوہن سنگھ کے چہرے سے غصے کے آثار غائب ہو گئے۔ وہ مجھے اور ہری کو چھوڑ کر تھانیدار کے اٹھ اندر چلا گیا اور اس سے ہنس کر باتیں کرنے لگا۔

ہری اتنا زخمی تھا کہ مجھے اسے سہارا دے کر چلنا پڑ رہا تھا۔ یہ منظر پورے گاؤں نے دیکھا۔ گاؤں لوں کو بھی خبر تھی کہ میں تھانے گیا ہوں‘ لیکن انہیں غالباً یقین نہیں تھا کہ میں‘ ہری کو چھڑا لاؤں گا۔ شاید اسی لئے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور ہری کو ساتھ ساتھ دیکھ کر ذرا سی دیر میں اسے گاؤں کو یہ خبر مل گئی کہ میں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ہری جب اپنے گھر پہنچا تو جذبات پر قابو نہ آ سکا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا۔ ”دبے! یار ہو تو تجھ جیسا‘ تو یقین کر‘ میں مر جاتا پھر بھی را اور پریم کا نام میری زبان پر نہ آتا‘ مگر تو نے تھانے آنے کی ہمت کر لی اس کے لئے میں.....“

مے اسے آسوؤں نے اسے بولنے نہ دیا۔

میں نے بھی ہری کو لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تو ہمارا نام نہیں لے گا‘ رتھ پر تھانے میں جو ظلم ہو رہے تھے‘ وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے۔“

ہری کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ”ہاں یار‘ لوں نے دن میں تارے دکھا دیے۔“ پھر آنسو پونچھ کر بولا۔ ”دبے! میں قسم کھاتا ہوں کہ تو اگر کبھی بہت میں ہو گا تو ہری بھی اپنی جان کی پروا کئے بغیر تیرے ساتھ ہی کھڑا ہوگا۔ اگر تو کے تو میں آج ہی ت تیرے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دوں۔“

میں نے اسے سمجھایا اور گفتگو کا موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ”ہری! ابھی تک چوری کا شبہ ہم سے نہیں ہوا اس لئے ہوشیار رہنا‘ کوئی غلطی نہ ہو۔“

پھر میں گھر آ گیا تو دیکھا سوہن سنگھ بھی تھانے سے واپس آ چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی مایا کو اور خشونت میری ہی باتیں کر رہا تھا۔ میری ہمت پر سب خوش تھے۔

کلکٹلا کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی۔ اسی روز رات کو میں نے اپنے دشمنوں کا دھیان کیا۔ اس سے

میرا مقصد ان کا رد عمل معلوم کرنا تھا۔ گویا کہ رہا تھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ زیور کی چوری میں وجہ کا بھی ہاتھ ہے۔“ گویا کہ علاوہ اس کے بقیہ بھائی بھی میرے خلاف ذہرا گل رہے تھے۔

☆=====☆

دوسرے دن جب سورج ڈھل رہا تھا تو خلاف توقع مجھ پر اور خشونت پر اچانک پانچ آدمی ٹوٹ پڑے۔ ہم دونوں کھیتوں پر تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھل پاتے دشمن پہلا وار کر چکے تھے۔ گویا نے چار بد معاشوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھلا تھا، کسی کے ہاتھ میں برہمی۔ میرے پاس وہی ٹانہ کی وہی ہوئی ڈانگ تھی، لیکن خشونت کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں دشمنوں کو جواب دینے کے لئے ان پر ٹوٹ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے دو آدمیوں کو میں نے گرا لیا۔ میری ڈانگ میں لگی ہوئی برہمی سے ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اسی وقت میرے پیروں میں بھی بھلا لگا۔ میں نے مز کر بھالے والے کو بھی برہمی ماری اور نیچے گرا دیا۔ خشونت کے ہاتھ ایک بانس لگ گیا تھا۔ وہ اسی کو گھما رہا تھا۔ معاً دور کھڑا ہوا گویا، خشونت پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ میں نے گویا کو بڑستے دیکھ کر للکارا۔ ”مرد ہے تو میرے سامنے آ۔ ہتھیار لے کر نیتے کی طرف کہاں بڑھ رہا ہے۔“

میری للکار سن کر گویا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے سے خوف جھلکے لگا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ابھی ایک آدمی تھا۔ میں اس آدمی کو راستے سے ہٹا کر جلد از جلد گویا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اتنے میں شور و غل سن کر قریبی کھیتوں سے سوبہن سنگھ کے رشتے دار دوڑتے ہوئے اس طرف آئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔

انہیں آتا دیکھ کر گویا نے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کہا۔ ”بھاگو۔“

دشمنوں میں سے گویا سمیت صرف تین افراد بھاگ سکے۔ ان کے دو آدمی زخمی پڑے تھے۔ خشونت کے پیٹ اور کمر میں زخم آئے تھے۔ ہماری مدد کو آنے والے اس پر افسوس کرنے لگے کہ جلد نہ پہنچ سکے ورنہ ایک بھی دشمن بچ کر نہ لکھا۔ مجھے خشونت کی فکر تھی۔ میں نے دو آدمیوں کو بھیج کر دوا کا بندوبست کیا۔ خود میرا ایک پاؤں بھی زخمی تھا۔ ہم دونوں کے زخموں پر چٹاں باندھ دی گئیں۔ دشمن کے آدمیوں کو کیا سزا دینا چاہئے؟ اب ہم یہ سوچ رہے تھے۔

”ان دونوں کو رسی سے باندھ کر کنویں میں لٹکا دو۔“ کسی نے تجویز پیش کی۔

”بالکل ٹھیک۔“ دوسرے شخص نے تائید کی۔ ”میرا کتا رات بھر پہرا دے گا۔“

سزا ملے ہوئی تو چار آدمی، دونوں زخموں کو تھپتھپ کر کنویں کے پاس لے گئے۔ ان کے زخموں پر خون جم چکا تھا۔ ابھی انہیں باندھا ہی جا رہا تھا کہ ان میں سے ایک کو ہوش آ گیا۔ خود کو اتنے آدمیوں میں گھرا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر وہ دوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے چھوڑ دو، پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔“ اس نے ہاتھ جوڑے۔ ”میرے بیوی بچے پریشان ہو جائیں گے۔ پیٹ کی خاطر ہم گویا کے ہرکادے میں آگئے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ بزدل ہمیں آگے کر کے خود بھاگ جائے گا۔ مرو کر تہ

صاحب کی قسم کھا کر کہتا ہوں، اس مرتبہ مجھے جانے دو، پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔“ اس شخص کو روتے دیکھ کر مجھے رحم آ گیا اور بولا۔ ”اسے جانے دو۔ کرائے کے آدمی کو مارنے سے کیا فائدہ۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ تیرا ساتھی بھی کیا بھئی جیسا ہے؟ یہ بھی کیا پیسوں کے لالچ میں پھنس گیا تھا؟“ یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں کہ جھوٹ یا جھگڑا کا اندازہ لگا سکوں۔

”ہاں۔ ہم دو دوسمن گیسوں کے لالچ میں گرفتار سنگھ کی باتوں میں آگئے تھے۔“

میں مسکرا دیا کہ کرائے کے آدمی بہر حال قابل اعتماد نہیں ہوتے۔ دشمنوں نے ان پر بھروسہ کر کے غلطی کی تھی۔ پھر میرے ایما پر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں گرفتار سنگھ اور اس کے بھائیوں کو گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ دوسرے زخمی کو بھی اس عرصے میں ہوش آ گیا تھا۔

اس وقت رات ہو چکی تھی، میں، خشونت اور آٹھ دس رشتے دار بیٹھ کر سوچنے لگے کہ آج کے اس حملے کا انتقام کس طرح لیا جائے؟

”ہمیں ان کے کھیتوں پر نہ جانا پڑے بلکہ وہ خود میاں آکر لڑیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی تدبیر سوچو تاکہ ہم سب مل کر ان پر حملہ کر سکیں۔“

”مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟“ خشونت نے سوال کیا۔

سب سوچنے لگے۔ پھر ایک رشتے دار بولا۔ ”یہ تو بہت آسان ہے۔ تم ان کا پانی بند کر دو تو وہ خود ہی میاں لڑنے آجائیں گے۔“

یہ تجویز سب کو پسند آگئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لئے ایک ہی بڑی سی ٹالی بنی ہوئی تھی۔ ہر کھیت کے لئے وقت مقرر تھا۔ ہمارے کھیتوں کو پانی مل جانے کے بعد گرفتار سنگھ کے کھیتوں کی باری آتی تھی۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ طے پایا کہ میں اور خشونت پانی روک کر بیٹھے رہیں اور باقی سب لوگ ہتھیار لے کر پاس ہی چھپ جائیں۔ جب دشمن فراد کرتے ہوئے میاں آئیں تو ان پر ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔

بات طے ہوتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ میں اور خشونت بھی گھر آگئے۔ ہم نے گھر والوں کو اس ہنگامے کی ہوا نہ لگنے دی اور جلدی جلدی کھانا کھا کر اوپری منزل پر چلے گئے تاکہ آئندہ روز متوقع معرکے کے لئے صبح تازہ دم انہیں۔

وہ رات دوسرے دن کے انتظار میں گزری۔ گرمیوں کا سورج اپنے دامن میں سرخ سرخ انگارے لئے صبح کا پیغام لے کر آیا۔ دوپہر تک چلچلاتی ہوئی دھوپ اور لو کے جھکڑوں نے لوگوں کے اوسان خطا کر دیے۔ میں اور خشونت کھانا کھانے کے بعد ہی سے پانی روک کر بیٹھے تھے۔

گرفتار سنگھ کے کھیتوں میں پانی پہنچنے کا وقت گزر چکا تھا، مگر اب تک ادھر خاموشی تھی۔ میں آج اپنے ساتھ ٹانہ کی دی ہوئی تلوار بھی لایا تھا۔ قریب پڑے ہوئے اناج کے ڈھیر کی آڑ میں ہمارے کئی ساتھی ہتھیاروں سے لیس چھپے بیٹھے تھے کہ دشمن کے کھیتوں میں ذرا بھی زندگی نظر آئے تو حملہ کر دیں، لیکن اب تک ادھر سناٹا ہی تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر منہ پر چھینٹے مارے اور پھر گرفتار سنگھ

کے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”وجہ!“ خشونت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”وہاں تو اب تک خاموشی ہے۔“

میں نے خشونت کی بات سن کر کہا۔ ”جلدی کیا ہے اما! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔“

کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کرتار سنگھ کے دو بھائی پچھلے نکل کر کھیت میں دوسری طرف

جار ہے ہیں۔

”ان پر اثر ہو رہا ہے اما۔“ میں بولا۔ ”مگر یہ اس طرف کیوں گئے ہیں اور کیوں نہیں آئے؟“

خشونت نے جواب دیا۔ ”وہ اکیلے ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ انہیں کرائے کے آدمیوں کا

انتظار ہو گا۔ تو دیکھتا نہیں کہ وہ گھبرائے ہوئے ہیں۔“

خشونت کی بات صحیح نکلی۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے دونوں بھائی واپس آتے دکھائی دیئے۔ اب

ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے انہیں دیکھ کر ایک ساتھی بولا۔ ”معلوم

ہوتا ہے آج ہنگامہ زور دار ہو گا۔“

”آئے دے“ ہم بھی تیار ہیں۔“ میں نے جواب دے کر ڈانگ میں لگی ہوئی برچھی نکال لی اور دل

ہی دل میں بولا ”چار بھائیوں میں سے آج کرتار سنگھ اور گوپال کا قصہ تو میں پاک کر ہی دوں گا۔ شکنتلا“

شوہر کرتار سنگھ تو یوں بھی میرا رقیب تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ کرتار سنگھ کے کھیتوں کا پانی بند کر کے میں نے دشمنوں کو مشتعل کر دیا تھا

پھر بھی ان کی خاموشی معنی خیز تھی۔ جھگڑے کے بعد مجھے اس معنی خیز خاموشی کی تفصیلات کا علم ہوا۔

جاٹ قبیلے میں دو گروہ تھے۔ سوہن سنگھ کے مخالفوں کے پاس جا کر کرتار سنگھ اور اس کے بھائیوں نے کہ

تھا۔ ”حد ہو گئی جنو! وہ ہمارے کھیتوں کا پانی روکیں، پھر بھی ہم خاموش بیٹھے رہیں۔ اگر انہیں ایسا کرنے

سے ابھی نہ روکا تو آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، کل تم لوگ بھی اس سے نہ بچ سکو گے۔ یہ لڑکے

پورے گاؤں کو اپنے مقابلے پر کمزور سمجھتے ہیں۔ انہیں بتا دو کہ یہ ان کی نادانی ہے۔ اس وقت سوال ان

سے ہماری دشمنی کا نہیں، سوال ظلم اور نا انصافی کا ہے۔“

دشمنوں کی چال کامیاب رہی۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ باتیں سن کر لوگوں کے جذبات

ہمارے خلاف بھڑک اٹھیں۔ اٹھ دس آدمی اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے ان کے ساتھ چلتے پر آنا

ہو گئے۔

گوپال نے انہیں خالی ہاتھ چلتے دیکھ کر کہا۔ ”وہاں خالی ہاتھ جانے میں خطرہ ہے۔ وجہ او

خشونت بات بات پر ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ پرسوں ہی ہمارے ملازموں کو انہوں نے بلا کسی وجہ کے اتار

کہ ان میں سے کوئی ہمارے کھیتوں پر کام کرنے نہیں آسکا۔ آخر اس گاؤں میں یہ بد معاشریاں کب تک

چلیں گی۔ کیا پانی صرف وجہ کے باپ کی ملکیت ہے؟ پانی پر کیا انہی لوگوں کا حق ہے؟“

لوگوں نے یہ بات سنی تو اپنے ہتھیار اٹھا لئے اور کرتار سنگھ کے ساتھ اس کے کھیتوں کی طرف

چل پڑے۔

میرے ساتھیوں میں سے چھ آچکے تھے، مگر چار ساتھی پولیس کے ڈر سے گول ہو گئے تھے۔ میں

نے دشمنوں کی ٹولی کو دور سے آتے دیکھا تو خشونت سے بولا۔ ”اما! آج تو یہ بت سے حامیوں کو لے کر آ

رہا ہے۔ عیار کرتار سنگھ نے کوئی چال ضرور چلی ہے ورنہ اس کے ساتھ اتنے آدمی نہ ہوتے۔“

”یہ خیال رکھنا وجہ کہ ہمارا نشانہ کرتار سنگھ اور اس کے بھائی ہیں۔“ خشونت نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں اما!“ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

اتنی دیر میں وہ لوگ قریب آ گئے۔ گوپال سب سے آگے تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔

”وجہ! تو نے ہمارے کھیتوں کا پانی کیوں بند کیا ہے؟“

جواب میں خشونت نے چلو میں پانی بھرا اور سامنے والوں پر اچھال دیا۔

گوپال نے جھنجھلا کر اپنے حامیوں کی طرف دیکھا اور جذبات کو بھڑکانے کے لئے غصے سے بولا۔

”دیکھا آپ لوگوں نے ان حرام زادوں کو۔“

گوپال کا جملہ سن کر ٹولی میں سے ایک آدمی میرے قریب آ کے کہنے لگا۔ ”دیکھ لڑکے، اس پانی پر

ہم سب کا حق ہے۔ یہ شرارت تجھے بت مٹھی پڑے گی۔“

اس آدمی کی بات سنتے ہی خشونت نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور بولا۔ ”مٹھی سستی بعد میں

کرنا چاہا! جن کی حمایت کرنے آئے ہو پہلے ان سے پوچھو کہ کل یہ ہمارے کھیتوں پر کس سے لڑنے

آئے تھے؟“

کرتار سنگھ کے سب سے چھوٹے بھائی آنند نے مجھے اور خشونت کو شاید تنہا سمجھ کر کہا۔ ”تو ہی

پوچھ اپنے بھانجے سے کہ یہ ہمارے گھر میں کس لئے گھسا تھا اور پھر بھائی.....“

میں نے آنند کی بات کاٹ دی اور کڑک کر بولا۔ ”خبردار جو تو نے اپنی بھابی کا نام لیا، دو ٹکڑے کر

دوں گا۔“

”مار ڈالو ان حرامی پلوں کو۔“ کرتار سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

یہ سنتے ہی دو تین آدمی آگے بڑھے۔ اسی وقت ہمارے ساتھی اناج کے ڈھیر کی آڑ سے نکل

آئے۔ کرتار سنگھ کے آدمی رک گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ خشونت نے مجھ

سے کہا۔ ”یہی وقت ہے وجہ! دشمن غافل ہے، پہل تم کرو۔“

میں نے خشونت کی بات سنی اور ڈانگ اٹھا کر سامنے والے شخص کے سر پر گھمادی۔ وہ شخص وہیں

ڈھیر ہو گیا۔ ایک شخص کا گرتا تھا کہ شور مچاتے ہوئے لوگ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ خشونت کی

نگاہیں ان چاروں بھائیوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بھاگ رہے تھے۔ کرتار سنگھ اور آنند دائیں طرف،

گھنٹیاں اور گوپال بائیں طرف بھاگے جا رہے تھے۔ غالباً پہلے ہی سے ان کا منصوبہ یہ تھا کہ مجھے اور

خشونت کو دوسروں سے لڑوا دیا جائے اور چاروں فرار ہو جائیں۔

انہیں بھاگتے دیکھ کر میں نے زور سے کہا۔ ”دیکھنا اما! دشمن بھاگنے نہ پائیں۔ تم ان دونوں کو

سنبھالو، میں ادھر کرتار سنگھ کی طرف دوڑتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں، کرتار سنگھ اور آنند کی جانب لپکا۔

کرنا سگھ نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔

”حرام زادے۔“ کرنا سگھ چیخا۔ ”جلدی بھاگ۔ وہ تیرا باپ پیچھے آ رہا ہے۔“ کرنا سگھ اپنے بھائی آئندہ سے مخاطب تھا۔

میں نگاہیں جمائے ان دونوں کا پیچھا کر رہا تھا کہ میرا پاؤں ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پاؤں میں موج آ گئی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کر ان دونوں کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔ اس وقت تک وہ دونوں کافی دور نکل چکے تھے۔

جب میں واپس کھیتوں کی طرف آیا تو دیکھا کہ آدھے گھنٹے کی لڑائی میں پانچ جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ گھنٹیاں اور گوبال بھی خشونت کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔ میں ابھی وہاں گم صم کھڑا تھا کہ پولیس جب کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی برچی کو ڈانگ میں چھپا لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ پولیس کو اطلاع ہمارے دشمنوں ہی نے دی تھی۔ مجھے خشونت بھی نظر نہیں آئی۔ اس بات کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ خشونت نے بھی پولیس کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ زخمی کر لئے تھے اور بے ہوش بن کر زمین پر گر گیا تھا۔

پولیس نے کھیتوں سے پانچ لاشیں اکٹھا کیں۔ سات زخموں کو ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ پولیس والے گھنٹیاں، گوبال، خشونت اور مجھ کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔ کرنا سگھ اور آئندہ پہلے سے تھانے میں موجود تھے۔ گاؤں بھر میں کبرام چیخا گیا۔ ہر مرنے والے کے گھر سے بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھانے میں کرنا سگھ اور آئندہ نے بیان دیا کہ میں نے ان کا جینا دودھ کر دیا ہے۔ میں ہر وقت انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتا ہوں۔ تھانیدار نے ان دونوں کے بیانات سے یہ مطلب نکالا کہ جھگڑے کے وقت میں موقعہ واردات پر موجود نہیں تھا۔ اس نے مجھے جھوٹا دیا۔ خشونت، گھنٹیاں، گوبال اور دوسرے دو آدمیوں کو اس نے حوالات میں بند کر دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ تھانیدار نے میرے معاملے میں جانبداری کا ثبوت دیا تھا۔ چلتے ہوئے میں نے خشونت سے سرگوشی کی۔ تھانیدار پر کسی ایک پارٹی کے ساتھ جانبداری کا الزام نہ آئے اس لئے کرنا سگھ اور آئندہ کو بھی اس نے جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت تک میں وہیں تھا۔

کرنا سگھ نے تھانیدار کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑ گڑانے لگا۔ ”صاحب! ہمیں جان کا خطرہ ہے۔ ہماری حفاظت کے لئے پولیس والوں کو ساتھ بھیج دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ وجہ..... یہ..... بھی ہمارے ساتھ ہی تھانے سے نکلے گا۔ کیا پتا راستے میں ہمیں..... ہم پر حملہ کر دے۔“

اس عیار نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہی ارادہ تھا۔ خشونت سے میں نے یہی سرگوشی کی تھی۔ کرنا سگھ کی حالت دیکھ کر تھانیدار زور سے ہنسا۔ پھر بولا۔ ”تم دو آدمی ہو کر اس اکیلے چھو کرے سے ڈرتے ہو۔“

اب بھی کرنا سگھ کی حالت غیر تھی۔ وہ پھر گڑ گڑایا۔

”آ..... آپ جانتے ہیں صاحب کہ یہ چھو کرنا بہت خطرناک ہے۔ ابھی اپنے ماما سے کان میں

کچھ کہہ رہا تھا۔“

تھانیدار نے آخر ان دونوں بھائیوں کے ساتھ دو پولیس والوں کو بھیج دیا۔ میری آرزو دل میں ہی رہ گئی ورنہ کرنا سگھ کو تو ضرور ٹھنڈا کر دیتا۔

تھانے سے نکل کر میں سیدھا ہری کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”تیرے گھر سے آ رہا ہوں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے بڑی فکر تھی۔ پولیس نے تجھے کیسے چھوڑ دیا؟“

”پولیس یہ سمجھی کہ میں اس لڑائی میں شامل نہیں تھا، مگر انہوں نے ماما کو پکڑ لیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے اس جھگڑے میں دوسرے پانچ آدمی مارے گئے۔“ میں نے بتایا۔ ”ہری! ذرا اس کیس کو ختم ہونے دے، پھر دیکھنا میں ان چاروں کا کیسے صفایا کرتا ہوں۔“

”لیکن ہری، تو نے اس لڑائی میں مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟ مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہے گا۔ آئندہ کبھی مجھے ایسے موقعوں پر نہ بھولنا۔“ ہری نے کہا۔

”وقت آنے دے، دیکھ لیں گے۔“ میں بولا۔ ”یہ بتا ہری، کہیں سے کچھ رقم کا بندوبست ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ تجھے تو معلوم ہے کہ اب پولیس اور عدالت کے چکر میں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پڑے گی۔“

”وجہ! ابھی ہم نے کچھ دن پہلے جو چوری کی تھی، پولیس اسی کے سلسلے میں مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے اس لئے رقم کا کوئی اور طریقہ سوچنا ہوں۔ ایسے میں کہیں اور ہاتھ مارنا قطعی مناسب نہیں ہے۔ تو گھر جا، میں کل صبح تیرے پاس آؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“

میں، ہری سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو مایاکور دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سوہن سگھ، تھانیدار کا شکریہ ادا کرتے تھانے گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ تھانیدار نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ سوہن سگھ تھانے سے لوٹ کر آیا تو وہ بھی رقم کی طرف سے گرمند تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ دو ایک روز میں رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔ خشونت کے لئے اچھے سے اچھا وکیل کرو۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ پھر بھی وہ امر تر جانے کو تیار ہو گیا۔

شوہر کے جاتے ہی مایاکور مجھے سمجھانے لگی۔ یہ دوسرے دن صبح کا ذکر ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ ”وجہ! اب اس دشمنی کا انجام دیکھنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جائیے! آج گردوارے جا کر دعا مانگوں گی کہ کرو، دلوں میں محبت پیدا کر دو۔“ پھر وہ گردوارے چلی گئی۔

کچھ دیر میں جب مایاکور گردوارے سے لوٹی تو مجھ سے بولی۔ ”شکنتلا مجھے گردوارے میں ملی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے رومال میں بندھی ہوئی کچھ چیزیں میری طرف بڑھا دیں۔

”شکنتلا نے تجھے یہ بھجوایا ہے۔“

شکنتلا کا نام سن کر میں چونک اٹھا اور رومال لے کر فوراً چھت پر چلا گیا۔ رومال کی گرہ کھولتے ہی میں حیران رہ گیا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک خط پر پڑی۔ میں وہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر بلی حیرت ہوئی کہ وہ خط شکنتلا نے میرے نام لکھا تھا۔ میرے لئے یہ بات بھی حیرانی کا سبب تھی کہ شکنتلا

پڑھ لکھ سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ شکلتا کا خط پڑھا اور اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے مجھے دشمنوں کے ارادوں سے باخبر کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عشق کے تقاضے بھی نہیں بھولی تھی۔ وہ میرے دشمنوں کی نہیں میری وفادار تھی، میری محبوبہ تھی۔

شکلتا نے خط میں لکھا تھا۔ ”وہ! برا نہ مانا۔ میں تمہارا دیا ہوا تحفہ واپس بھیج رہی ہوں۔ اس وقت انگوٹھی اور کنکین بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لو۔ وقت آئے گا تو میں اس سے بھی قیمتی تحفہ لے لوں گی۔“ پھر میں خط کی بقیہ عبارت پڑھنے لگا جس سے معلوم ہوا کہ شکلتا کو میری ضرورت کا کس طرح ہوا چلا۔ اس نے پوری تفصیل لکھ دی تھی۔

بات یہ تھی کہ جس رات ہنگامہ ہوا، اس رات شکلتا نے اپنے شوہر اور دو اور آئند کی باتیں سن لی تھیں۔ کرتار سنگھ کہہ رہا تھا۔ ”روپا چاہے کتنا ہی خرچ ہو آئند، گوپال اور گھنشیام کو ہمیں چھڑوا ہی لینا ہے۔ مزہ تو جب آئے گا کہ خشونت کو پانچ سال جیل میں سڑنا پڑے گا۔ وجے کے باپ کے پاس دو نیچے زمین اور مکان کے سوا اور کیا ہے۔“

آئند اپنے بھائی کی بات کو سنی آن سنی کر کے بولا۔ ”اب میں چھت پر اکیلا نہیں سوؤں گا۔ میرا ہنر بھی تم دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ ہی کرے میں گلوں۔“

کرتار سنگھ نے اس پر ایک تجویز پیش کی۔ ”ایسا کریں گے کہ میں اور تو کمرے میں سو جائیں گے۔ تیری بھالی الگ سو جا کر رہے گی۔“

شکلتا نے شوہر کے منہ سے ایسی بزدلی کی بات سنی تو اس کا دل نفرت سے بھر گیا۔ کرتار سنگھ اذر کرے میں آیا اور شکلتا سے کہا۔ ”میرے اور آئند کے بستر کمرے میں لگا دینا۔“

”اور مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟“ شکلتا حیران ہو کر بولی۔

”کیوں، تجھے اکیلے سونے میں کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے تمہارے بغیر نیند کیسے آئے گی؟“ شکلتا نے اسے آتو بنایا۔

”اب آتی جا رہی ہے تو راستے پر۔“ کرتار سنگھ خوش ہو گیا، پھر بولا۔ ”کچھ دن کی بات ہے، پھر ہم

لوگ ساتھ ہوں گے۔“

”کل صبح سنت بابا کے درشن کو جاؤں گی۔ مجھے تھوڑے سے پھول منگوا دینا تاکہ بابا کو ہار پہنا کر اپنے پرپی کے لئے دعا مانگ سکوں۔“

یوں شکلتا نے گردوارے جانے کا موقع نکال لیا۔ ابھی میں اسی کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نیچے سے ہری کی آواز سنائی دی۔ میں نیچے آ گیا اور دیکھا کہ ہری کے پاس ایک پوٹلی ہے۔ ہری نے پوٹلی مجھے دے دی۔

”یہ کیا ہے ہری؟“ میں نے پوچھا۔

وہ مسکراتے لگا۔ میں نے خود ہی پوٹلی کھول کر دیکھی۔ یہ وہی زیورات تھیں جو چوری کی رات ہری کے حصے میں آئے تھے۔ میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر ہری بول اٹھا۔ ”دیکھ وجے، کچھ بولنا مت۔ تجھے

ابھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان زیورات سے کچھ نہ کچھ تو کام چل ہی جائے گا۔“

”مگر میں تیرا احسان کس طرح اتاروں گا؟“ میں تذبذب میں پڑ گیا۔

”تو اسے احسان سمجھتا ہے وجے! پھر تو یاری کچھ نہ ہوئی۔ تو مجھے تھانے سے چھڑانے آیا تھا تو احسان ہی کرنے آیا ہو گا۔“

”بات یہ ہے، ہری کہ ابھی تیرے حصے کے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر میں گھر کی اوپری منزل کے کمرے سے انگوٹھی اور کنکین لے آیا اور پھر ہری سے بولا۔ ”یہ لے، انہیں بیچ کر مجھے پیسے لاوے۔ ہے زرا جان جو کھم کا کام، لیکن چوری کا مال خریدنے والے قابل اعتماد سناڑوں سے ڈبی واقف ہو گا۔ ہے نا! اور ہاں گاؤں سے کم از کم پانچ میل دور جا کر اس مال کا سودا کرنا۔ کوشش یہ کرنا کہ سناڑ تیرے سامنے ہی زیور دکھا ڈالے۔“

میری بات سن کر ہری مسکرایا اور بولا۔ ”تجھے یہ سب سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو میرے اگلے ہاتھ کا کام ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ہری نے سر سے پگڑی کھولی، اپنے اور میرے زیورات اس میں باندھے، پھر شام سے پہلے آنے کا وعدہ کر کے چل دیا۔

مقدمہ سوا مہینے تک چلتا رہا۔ فریقین انصاف کے پلڑے اپنی اپنی طرف جھکانے کے لئے پورا پورا زور لگاتے ہوئے تھے۔ وجے کا نانا بھی اپنے تمام تعلقات اور پرانے مراسم استعمال کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پیسا بھی پانی کی طرح بہتا رہا۔ آخر کار وہی ہوا جو سوہن سنگھ اور میں چاہتا تھا۔ قتل کے الزام سے خشونت کو بری کر دیا گیا، لیکن گوپال اور گھنشیام بھی ساتھ ہی بری ہوئے اس لئے کہ پولیس کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی۔

قتل کے جو معنی شائد تھے، وہ سب کے سب خود اس بلوے میں شریک تھے۔ پھر یہ کہ قتل ہونے والے کسی ایک گھریا خاندان کے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس لئے یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس نے کس کو مارا۔ جب کہ مرنے والوں سے نہ وجے کی کوئی دشمنی تھی نہ کرتار سنگھ کی۔ اس خونیں ڈرامے کو ایک بلوے کی شکل دے دی گئی۔ اتنا بڑا ہنگامہ کرنے کے الزام میں خشونت کو سوا سال، گھنشیام اور گوپال کو نو مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔

قتل کا مقدمہ تو ختم ہو گیا، مگر خشونت کی سزا سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ دونوں دشمنوں کو خشونت سے کم سزا ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گھنشیام اور گوپال بری ہو گئے تو میں عدالت سے باہر نکلتے ہی حساب چکا دوں گا، مگر اس غیر متوقع فیصلے نے میری ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دوران خون بڑھ گیا۔ بار بار مجھے اپنی جاتی صفات کا خیال آتا۔ اگر وہ مجھ سے نہ جھمن جاتیں تو یہ سارا قصہ چند لمحوں کا تھا۔

پھر میں نے سوچا، قدرت کو اگر نو مہینے انتظار کرانا مقصود ہے تو یہی سسی۔ چاروں بھائیوں کو میں نے ایک ساتھ ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میری محبوبہ شکلتا پر اس کا بوڑھا اور ناکارہ شوہر کرتار سنگھ جو ظلم ڈھا رہا تھا، اسے سوچ سوچ کر

میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ اسی بے چینی کے عالم میں وجہ کے نانا کی بھیجی ہوئی گھوڑی مانک کوئی نے تیار کیا اور اس پر سوار ہو کر ایڑ لگا دی۔ مانک آن کی آن میں ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ وجہ کے جسم سے مانوس تھی۔ اس کے ایک ایک اشارے پر عمل کرتی تھی۔ مجھے یہ ملال تھا کہ میں ایک جن زاد ہو کر آدم زادوں کے جسوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کئی بار مجھے یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ کسی آدم زاد کے جسم سے نکل کر میں کسی دوسرے آدم زاد کا جسم اپنا بے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کسی آدم زاد کا جہ چھوڑ کر میں ایک ناقابل بیان کرب و اذیت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایسا اس وقت سے ہوا تھا جب میں بھوانی دیوی کا جاپ کیا تھا۔ یہ سزا جانے کب تک مجھے بھگتنا تھی۔

وہ دوسرا کا وقت تھا مگر اس روز گرمی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میری گھوڑی کے ساتھ ساتھ بادل بھی دوڑ رہے تھے۔ بادل اور میں، ہم دونوں ہی اپنی منزل سے بیگانہ تھے۔ ہم بے غم تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

مانک دوڑتی رہی۔ اب مجھے ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ پیڑ اور پودے جیسے بارڈر کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھے۔ زمین کی دھول اڑا کر بادلوں سے ہم کنار ہونے کو بے چین تھی۔ دھول اڑتی تو پیڑ بھی جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگتے۔ موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ ایسے میں مجھے اپنی محبوبہ شکنتلا یاد آگئی۔ اس کے قرب کا ایک ایک زاویہ میری آنکھوں میں گھونسنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے میں دل ٹھہر جائے گا۔ میں نے تیزی سے مانک کی لگام کھینچی اور اسے واپس مو لیا۔ تیز رفتار گھوڑی رکتے رکتے بھی کچھ فاصلہ طے کر گئی تھی۔

میں نے مانک کی پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ”چل، گھر واپس چل۔“
گھوڑی نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ابھی میں کچھ ہی فاصلہ طے کر سکا تھا کہ بادل ٹوٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ مانک سر جھکائے بھاگی جا رہی تھی۔ میں اپنی شکنتلا کی یاد میں گم بارش سے شرابور ہو رہا تھا۔ تازہ ہوا میں اب پیاسی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک شامل ہو گئی تھی۔ موسم کی پہلی بارش ہو اور پنجاب کے دیہات خاموش رہیں، ناممکنات میں سے ہے۔ سب بارش انتظار کرتے ہیں۔ بارش ہونے کی دیر تھی، ننگ و مڑنگ بچے گلیوں میں شور مچاتے بارش کے مزہ اڑانے نکل آتے۔

سہاگین چھتوں پر جا کر پڑوسنوں سے باتیں کرتے ہوئے برسات کا لطف لے رہی تھیں۔ گھر پہنچا میں نے لباس تبدیل کیا اور ادوری منزل پر اپنے کمرے میں بچے بستر لیٹ گیا۔ بھیکے موسم نے جیسے میرے انگ انگ میں آگ سی لگا دی تھی۔ میں نے بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر شکنتلا کا چہرہ اب میرے سامنے تھا۔

شکنتلا اس وقت بھی اپنے گھر کی چار دیواری میں قید تھی۔ کھلے صحن کو آج صبح ڈھانپ دیا گیا تھا چھت پر جانے والے زینے کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شکنتلا کا شوہر کرتا سنگھ شہر پینے کا شوقین بھی تھا۔ ایسے موسم میں تو اور بھی بے نوشی کا لطف آتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے ہم عمروں -

مانگ شراب نوشی میں مصروف ہو گا۔ پھر مجھے شکنتلا کے سب سے چھوٹے دیور آند کا خیال آیا۔ اس کی لطف سے بھی میں فکر مند تھا۔ شکنتلا کے لئے آند کی آنکھوں میں کئی بار میں نے ہوس کے سائے ٹاپتے دیکھے تھے۔ آند کا دھیان آتے ہی اس کا چہرہ میرے سامنے آگیا اور میں چونک اٹھا۔ آند مجھے اپنے گھر کے سامنے رکتا نظر آیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گھر کے دروازے پر تالا ہوا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔

شکنتلا باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی چولہا پھونک رہی تھی۔ آند نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بڑے لمبے لمبے میں بولا۔ ”کیوں بھائی، کیا ہو رہا ہے؟“

”کیا تو اور تیرا بھائی آج جلدی گھر لوٹ آئے؟“ شکنتلا نے پوچھا۔ وہ شاید اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ کرتا سنگھ بھی آند کے ساتھ گھر آیا ہو گا۔

”بھائی تو اس بھیکے موسم کا مزہ لینے دوستوں کے ساتھ کہیں دارو پی رہا ہو گا، مگر مجھے تمہارا خیال آ گیا بھائی۔ اس لئے گھر چلا آیا۔“ آند بولا۔ ”تم بھی کیا ہو بھائی۔ ہر وقت چولہا پکلی کرتی رہتی ہو۔ ذرا دیکھو تو گھاؤں کی عورتیں چھتوں پر بارش کے مزے لوٹ رہی ہیں اور تم رسوئی (باورچی خانہ) میں گھسی بیٹھی ہو۔“

یہ سن کر شکنتلا نے آند کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ شاید آند کے چہرے سے اس کے دل میں چھپے ارادوں کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

چند لمبے رک کر آند پھر محبت بھرے لمبے میں بولا۔ ”مگر اس میں تمہارا بھی کیا قصور بھائی۔ گھر میں ہر طرف تو تالے پڑے ہیں۔ پھر تم کیا کر سکتی ہو۔ ٹھہرو، میں ابھی تمہارے لئے چھت پر جانے والے زینے کے دروازے کا تالا کھولے دیتا ہوں۔“

پھر آند نے جو کہا تھا وہی کیا۔ اس نے زینے کے دروازے کا تالا کھول دیا تھا۔

”بھائی! تم جلدی سے چھت پر جا کر نما لو۔“ آند نے زور سے کہا۔ ”ورنہ بارش کا زور ٹوٹ جائے گا۔ بھائی آگیا تو تمہیں آواز دے کر نیچے بلا لوں گا۔“

میں نے بند آنکھوں سے شکنتلا کو زینہ چڑھتے دیکھا۔ بارش خوب ہو رہی تھی۔ وہ بارش میں نہانے لگی۔

شکنتلا کو ابھی چھت پر زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نیچے سے آند کی آواز آئی۔ ”بھائی! جلدی سے نیچے آؤ۔“

اس عرصے میں آند نے بھیکے ہوئے کپڑے اتار دیئے تھے اب اس کے جسم پر صرف چھوٹا سا ایک ٹکڑا تھا۔

آند کی آواز سن کر شکنتلا شاید یہی سمجھی کہ اس کا شوہر کرتا سنگھ بھی گھر واپس آ گیا ہے۔ اس کے بھیکے کپڑے جسم سے چٹے ہوئے تھے، اس طرح کہ لباس اور بے لباسی میں فرق نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے نیچے اتر آئی اور بھیکے ہوئے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اس وقت میں نے آند

لے آئے بڑھاپی تھا کہ ٹکٹلا نے اس کے پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس سے ہاتھ سے جلتی ہوئی لکڑی چھوٹ گئی۔ ٹکٹلا نے جلدی جلدی منہ پر بندھی ہوئی چادر کھولی۔

میں نے اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ میرا خیال تھا کہ آئندہ دستک سن کر یہ سمجھے گا، اس کا بھائی کرنا سنگھ آ گیا ہے۔ پھر دی دروازہ کھولے گا، مگر جب ٹکٹلا نے دروازہ کھولا تو میں مایوس ہو گیا۔ لمحے بھر کو اس کی اور میری نظریں ملیں اور پھر میں تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر آئندہ دروازہ کھولتا تو میں اسے ٹھنڈا کر دیتا کہ میرا یہی ارادہ تھا۔ ٹکٹلا کی آبرو بہر حال بچ گئی تھی۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔ آئندہ اب دوبارہ اسے قابو میں نہیں کر سکتا تھا۔ میں پھر بھی ٹکٹلا کی طرف سے ناظم نہیں رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک بار پھر اس کا دھیان کیا۔

اس مرتبہ وہ مجھے باورچی خانے میں نظر آئی۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے شوہر کرنا سنگھ کو بھی دیکھا۔ وہ گھروٹ آیا تھا۔

”تالا کس نے کھولا؟“ کرنا سنگھ نے غصے میں ٹکٹلا سے پوچھا۔

”تمہارے بھائی نے۔“ ٹکٹلا نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”وہ اتنی جلدی گھر کیسے آ گیا؟“

”اسی سے پوچھ لو۔“

پھر میں نے کرنا سنگھ کو اندر کمرے میں جاتے دیکھا۔ وہاں آئندہ دونوں ہانوں سے پیٹ پکڑے چارپائی پر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرنا سنگھ کچھ پوچھتا، آئندہ نے خود ہی اپنی صانائی پیش کی۔ ”پیٹ میں بڑے زور کا درد ہو رہا تھا اس لئے چلا آیا، ابھی ابھی آیا ہوں۔“

اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی کہ ٹکٹلا کا شوہر گھر واپس آ چکا تھا۔ میں نے اسی لئے آنکھیں کھول دیں۔ آئندہ کے الفاظ اب بھی میرے ذہن پر ضرر میں لگا رہے تھے۔ میرے اوپر اتنا بڑا الزام لگا کر آئندہ کا زندہ رہنا، میرے لئے بہت بڑی گالی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ ٹکٹلا جب بھی میرے سامنے آتی، میں اپنا سارا غصہ بھول جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرا وجود صرف محبت ہی محبت ہے۔ نفرت جانے کہاں چھپ جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ ٹکٹلا نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور اس سے میری نظریں ملی تھیں، نفرت و انتقام کے جذبات سرد ہو گئے تھے ورنہ میں اپنی محبوبہ کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے والے کو زندہ نہ چھوڑتا۔

اپنی اس کمزوری کا خود مجھے بھی احساس ہو چکا تھا کہ میں، ٹکٹلا کے سامنے موم کی طرح پگھل جاتا ہوں۔ جب بھی ایسا ہوتا میں خود کو اپنے اندر بہت تنہا محسوس کرتا۔ اس وقت بھی میرا یہی کیفیت تھی۔ میں گھر سے نکل گیا اور گاؤں کی گلیوں میں یونہی بے مقصد گھومنے لگا۔ اسی دوران مجھے ہری مل گیا۔

”یارا! میں تجھی کو تلاش کر رہا تھا۔“ ہری مجھ سے بولا۔ ”آج موسم کی پہلی بارش ہوئی ہے۔ ایسی سلونی شام پیئے بغیر گزارنا ظلم ہے۔ چل، گتے میں چلتے ہیں۔“

میرے جسم کی بھی اس وقت یہی طلب تھی۔ سو میں راضی ہو گیا۔

کی آنکھوں میں انگارے سے دیکھتے دیکھے۔ ٹکٹلا کو اس حالت میں دیکھ کر یقیناً آئندہ کی ہوس جاگ اٹھی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ ٹکٹلا کے کمرے میں گھس گیا۔ اس سے پہلے وہ باورچی خانے میں گیا تھا۔

ٹکٹلا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اب آئندہ اس کے سامنے تھا۔ آئندہ کی آنکھوں میں ہوس کے شعلے ناچ رہے تھے۔ آئندہ نے بڑی پھرتی سے ٹکٹلا کو پکڑ کر اس کے منہ پر چادر باندھ دی۔ ٹکٹلا نے اپنے منہ پر بندھی ہوئی چادر کھولنے کے لئے ہاتھ اٹھائے، مگر اسی وقت آئندہ نے لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا۔ ”آج تو میری نہ ہوئی تو تجھے زندہ جلا دوں گا۔“

آئندہ باورچی خانے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لیا تھا جو زمین پر پڑی تھی۔ اس نے جھک کر وہ لکڑی اٹھا لی۔

ٹکٹلا غصے کے مارے کاپٹے لگی۔ اسے غالباً یہ توقع نہیں تھی کہ اس کا دیور یہاں تک گر سکتا ہے۔ اس کا منہ چادر سے بندھا ہوا تھا اور جلتی ہوئی لکڑی جسم سے بہت قریب تھی۔ ٹکٹلا کی آنکھوں میں نیچے غصے کے ساتھ ہی خوف کے سائے بھی نظر آئے۔

آئندہ نے ٹکٹلا کے غصے کو محسوس کر لیا اور بڑے واہیات لہجے میں کہنے لگا۔ ”ہائے بیگیا بدن اور یہ غصہ۔ آج تو تو اور غضب ڈھارہی ہے۔“

ابھی آئندہ کی بات ختم ہوئی تھی کہ ٹکٹلا نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا، مگر وہ ہوشیار تھا۔ اس نے ٹکٹلا کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔

”آج تیرا زور نہیں چلے دوں گا۔“ آئندہ بولا۔ ”ترسائی کیوں ہے؟ مان جا..... دل کی آگ بجھا دے۔“ یہ کہتے ہی آئندہ نے ٹکٹلا کو اپنی طرف کھینچا۔ ٹکٹلا نے زور لگا کر آئندہ کو دھکا دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

اب میرے لئے یہ مناظر ناقابل برداشت ہو گئے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ کوئی میری موجودگی میں زبردستی ٹکٹلا کو بے آبرو کر دیتا۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے برابر والی جھٹ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ تیزی کے ساتھ میں ٹکٹلا کے کمرے تک پہنچا جس کا دروازہ بند تھا۔ اسی وقت میری سماعت سے آئندہ کی آواز نکلائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس وقت ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہاں کہہ دے۔ اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لئے بس دو گھڑی کے لئے آنکھیں بند کر لے۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ تو راضی ہے۔ پھر میں تیرا منہ کھول دوں گا۔ دیکھ مجھ سے زیادہ خڑے نہ دکھا..... انگارے میں سر نہ ہلا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے بھالی کہ وجہ تجھ کو خراب کر چکا ہے۔ پھر بھی میں اس میں تیرا قصور نہیں سمجھتا۔ آخر بوڑھے اور جوان کی کیسے جھگڑا سکتی ہے۔ تین سال شادی کو ہو چکے، مگر تو ماں نہیں بن سکی۔ مجھے تجھ سے صرف ایک شکایت ہے کہ مجھ جیسا مرد جب گھر میں موجود تھا تو تجھے وجہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔“

میں نے کمرے کے اندر موجود ٹکٹلا کا تصور کیا کہ دیکھوں وہ کس حال میں ہے؟ کہیں آئندہ نے اس پر قابو تو نہیں پالیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے ٹکٹلا نظر آگئی۔ آئندہ اسے اپنی ہانوں میں بھرنے کے

پیتے ہوئے بھی میں شکنتلا کے دھیان میں گم تھا۔ ہری نے میرے کھوئے کھوئے پن کو محسوس کر لیا اور کہا۔ ”یار دے! تو میرا بگڑی دوست ہے۔ تیرا چپ رہتا مجھے پریشان کر رہا ہے۔ جو بھی بات ہو مجھے بتا دے۔ میں تیرے لئے جان بھی دینے کو تیار ہوں۔“

میں نے ہری کی بات کا مختصر سا جواب دیا۔ ”ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے جس کا ذکر جائے۔“ پھر سامنے گئے ہوئے ایک پوسٹر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس پوسٹر میں ایک جوان فوجی وردی پہ بندوق ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”فوج میں بھرتی کھلی ہے۔“

ہری نے مجھے ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں دیکھ رہا ہے دیوار پر لگے ہوئے اس پوسٹر کو؟ کیا فوجی بننے کا ارادہ ہے؟ یاد ہے ایک مرتبہ انکپٹر متانے بھی تجھے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا۔“ ہری نے یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر پوسٹر پر نظریں جمادیں اور بولا۔ ”ویسے یہ وردی تجھ پر بچنے کی ہمت اور فوجی رعب دار لگے گا۔“

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا اور پوسٹر کو دیکھ کر کہا۔ ”مجھے وردی سے نہیں، بندوق سے دلچسپی ہے۔“ پھر یوں ہی جھوٹ بول دیا۔ ”مجھے بندوق چلانا اب تک نہیں آیا۔“ پھر کچھ دیر کے بعد ہری کے ساتھ میں اس دسویں شراب خانے سے اٹھ آیا۔ پوسٹر میں بھرتی کے لئے انبالہ فوجی چھاؤنی کا پتا لکھا تھا۔ وہ پوسٹر دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور ہی انوکھا خیال آیا تھا۔ ہری اپنے گھر چلا گیا اور میں نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔

دبے کی ماں مایا کو رکھانے کے لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کھانے کو کہا تو میں بولا۔ ”میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا ماں، تو کھالے۔“

پھر میں اوپری منزل پر چلا آیا۔ کپڑے بدلے بغیر ہی میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ خاصی بارش ہو جانے کے باوجود آسمان اب بھی ابر آلود تھا۔ بادل ہوا سے انگلیاں کر رہے تھے۔ تیز ہوا چلتی تو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگتے لیکن ہوا ہر جگہ انہیں چھیننے لگی جاتی۔

میں بہت دیر تک یہ آنکھ پھولی دیکھتا رہا، پھر آنکھیں موند کر کرٹ لے لی۔ اب اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ برسات کی رات میں جھینگڑوں کی آوازیں عجیب سے تسلسل کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ مٹا میں چونک اٹھا۔ اس وقت میں، اپنے رقیب آئندہ کی بارے میں آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا کہ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

آئندہ کے چہرے پر مجھے تکلیف کے آثار نظر آئے۔ تکلیف کے سبب ہی یقیناً وہ سو نہیں سکا تھا۔ مجھے اس تکلیف کی وجہ معلوم تھی۔ شکنتلا نے اس کے پیٹ پر بڑی زور کی لات ماری تھی۔ وہ اس وقت بھی وہ کہہ رہا تھا۔ کرتار سنگھ اس کے برابر ہی سونے کے لئے لیٹا تھا۔ مگر کراہنے کی وجہ سے بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔

”آئندہ! آخر کرتار سنگھ بول ہی اٹھا۔ اگر تیرے پیٹ میں درد ہے تو اٹھ کر جنگل ہو آ۔“

بڑے بھائی کی بات سن کر آئندہ کے چہرے سے خوف جھلکنے لگا۔ خوف کی وجہ باہر کا سنائی ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس نے کرتار سنگھ کی طرف سے کرٹ لے لی۔ جیسے سونا چاہتا ہو، لیکن چند ہی لمحوں بعد اس کے منہ سے پھر زوردار کراہ نکل گئی۔ اس نے تکیہ اپنے پیٹ کے نیچے دیا، مگر کراہے بغیر نہ رہ سکا۔ کرتار سنگھ نے پہلے پیار سے پھر سختی سے ڈانٹا۔ ”جب اتنی ہی تکلیف ہے تو پھر کتنا کیوں نہیں دیتا۔“

ڈانٹ کھا کر آئندہ کو اٹھنا ہی پڑا اور بولا۔ ”میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ پھر اس نے ایک ہاتھ میں لوٹا اٹھالیا۔

”آئندہ! لائین اور ڈانگ بھی لے لے تاکہ کچھ میں پھسل و سل نہ جائے۔“ کرتار سنگھ نے اندر سے کڑی لگائی۔

انتقام! انتقام! کوئی میرے اندر جیسے چیخ اٹھا۔ آئندہ کو ٹھکانے لگانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ میں نے جھپٹتے ہی چارپائی کے پاس رکھی ہوئی اپنی مخصوص ڈانگ اٹھائی، پھر میڑھیاں اتر کر صحن سے گزرتا ہوا لک کے اصطبل میں آ گیا۔ میں نے گھوڑی کھولی اور پھر بڑی آہستگی کے ساتھ گھر سے نکل کر اندھیرے کا نہ بن گیا۔ بڑی خاموشی سے ایک لمبا چکر کاٹ کر میں گھرے ہوئے ایک مکان کے پاس پہنچا۔ میرے رازے کے مطابق آئندہ یہاں سے آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ میں ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں ہپ گیا۔ قریب ہی درخت لگے ہوئے تھے۔

آئندہ مجھے دور ہی سے آتا دکھائی دے گیا۔ اس کے ہاتھ میں چلتی ہوئی لائین تھی جس کی لو بار بار اسے بھڑک رہی تھی۔ وہ چند ہی قدم اور چلا ہو گا کہ تیز ہوا کے ایک جھونکے سے لائینیں بھج گئیں۔ می ہوئی لائین اس نے ایک قریبی بیڑ کے نیچے رکھ دی، شاید اس خیال سے کہ وہاں ہی میں لیٹا جائے گا۔ سنسان ماحول، ہوا کی سرسراہٹ، بیڑوں کے شور بچاتے پتے ساری فضا کو خوفناک بنائے ہوئے تھے۔ میں جس مکان کے کھنڈر میں چھپا بیٹھا تھا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ کچے راستے کی لائن بارش کے بعد کچھڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اونچے نیچے راستے پر تھوڑا تھوڑا پانی موجود تھا۔ نڈکے تیز چلنے سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔

آئندہ کو خبر نہیں تھی کہ وہ اپنی موت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ کھنڈر کی ایک دیوار سے چپکا ہوا ناہنی ڈانگ میں لگی ہوئی برجھی تولے آئندہ کا خنجر تھا۔ اپنی گھوڑی مانک کو میں اس کھنڈر کی دوسری طرف بیڑوں کے پیچھے باندھ آیا تھا تاکہ آئندہ کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔

جیسے جیسے آئندہ کے قدموں کی ”چمپ چمپ“ قریب آ رہی تھی، میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون نام کے جلتے ہوئے زخموں کی تپش سے کھول کر باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا جب آئندہ میری محبوبہ کو بے آہود کرنے والا تھا۔

آئندہ نے کھنڈر کی پہلی دیوار کے پاس پڑے اینٹوں کے ڈھیر پر پاؤں رکھا اور میرے ہاتھ کی گرفت میں لگی برجھی پر سخت ہو گئی۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا کہ کہیں سانس کی آواز سن کر آئندہ

چوکننا نہ ہو جائے۔ رحم، ظلم، گناہ اور ثواب ان سب باتوں سے میں اس وقت بے بہرہ تھا۔ اگر مجھے پکڑا ہوا تھا تو صرف قتل، بدلہ اور انتقام۔ آئندہ اینٹوں کے ڈھیر سے اتر کر دیوار کے قریب آیا ہی تھا کہ میں نے اپنے پاؤں سے اڑنکا لگا دیا۔ آئندہ میرے پیر سے الجھ کر اس طرح گرا کہ اس کے ہاتھ سے لوٹا اور لاٹھی دونوں چھوٹ گئے۔ آئندہ شاید یہ سمجھا کہ کسی پتھر وغیرہ سے ٹھوکر لگی ہے اور اندھیرے کو گالیاں دیتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اب میں اسے مزید مہلت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں برچھی تھی۔ اس نے چیخنے کے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے تیزی سے اپنا ایک پاؤں اس کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ وہ تڑپا، مگر میں نے ایک مرتبہ پھر پاؤں پر زور دے کر اس کا منہ ایسے کچلا جیسے وہ ساپ کا منہ ہو۔ اس کے بعد میں نے دانت چس کر کہا۔ ”سائل، حرائ، بچ، ٹوٹے اسی زبان سے کہا تھا کہ میں نے تیری بھالی کو خراب کیا ہے۔ آج میں اس زبان کو اس قابل ہی نہ چھوڑوں گا کہ پھر کوئی لفظ ادا کر سکے۔ اپنی مردانگی تو ایک کمزور عورت کو دکھا رہا تھا کہتے۔“

آئندہ نے معافی مانگنے کے لئے دونوں ہاتھ جوڑے، مگر مجھے اس پر رحم نہ آیا۔ میں نے برچھی اس کے پیٹ میں گھسیڑ دی۔ وہ تڑپا اور دونوں ہاتھوں سے برچھی پکڑ لی، مگر برچھی اپنا کام کر چکی تھی۔ میں نے ذرا سا زور لگایا اور برچھی کو جب ترچھا آڑا کر کے اوپر کھینچا تو برچھی پیٹ کو ناف سے سینے تک چیرتی ہوئی باہر آگئی۔ اسی کے ساتھ خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آئندہ آن کی آن میں ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اپنا پیر آئندہ کے منہ سے ہٹایا، کچڑ اور اینٹوں کے درمیان پڑی لاش پر نفرت سے نگاہ ڈالی۔ پھر اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔ ”اب میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تیرے بھائیوں کو بھی موت کی نیند نہ سلا دوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی خون آلود برچھی کو مقتول آئندہ کے کپڑوں سے صاف کیا، تیزی سے مانک کے پاس پہنچا اور اس پر سوار ہو گیا۔

گھوڑی کے اٹھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ میں، مانک پور سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی میں کچھ ہی دور چلا تھا کہ اچانک بارش ہونے لگی۔ میں اس لئے نانک پور سے بھاگا تھا کہ آئندہ کے قتل کا شبہ مجھی پر کیا جاتا اور پولیس مجھے گرفتار کر لیتی۔ وہ علاقہ میرے لئے نیا تھا۔ مجھے نہ راستوں کا علم تھا نہ منزل کا پتہ۔ میں بس آئندہ کے قتل کا راز فاش ہونے سے پہلے پہلے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ بارش کی وجہ سے ہر طرف قیامت خیز طوفان آیا ہوا تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میرے راستے میں آ جانے والی ندی اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو ہالے جانے پر آمادہ تھی۔ یہ دیکھ کر میں ندی کے کنارے رک گیا، مگر قدم پیچھے ہٹاتا تو بھی موت کا سامنا تھا۔ سامنے بڑھنے پر بھی ندی کی طوفانی لہروں میں مجھے موت کی پرچمائیاں لہرائی نظر آرہی تھیں۔ مانک میرے حکم کی خاطر تھی۔

کڑکٹی بجلی اور موسلا دھار بارش میں آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ گھوڑی کو میں نے خدا کے بھروسے پر پانی میں اتار دیا۔ میں جتنا آگے بڑھ رہا تھا، پانی کے بہاؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، جیسے پانی کے تیز ریلے کہہ رہے ہوں، واپس چلا جا۔ ہم تجھے دوسرے کنارے کی بجائے دوسری دشا

میں پہنچا دیں گے۔ پھر بھی میں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ اچانک میرا ہاتھ اس تحویذ سے ٹکرایا جو ٹکٹلانے لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے جیسے میرے جسم میں ایک انجانی طاقت آگئی۔ میں نے تیز نظروں سے سامنے کے کنارے کو دیکھا۔ گھوڑی زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھنے کے لئے برابر زور لگا رہی تھی۔ پانی بار بار اس کا راست روک رہا تھا۔ میں مانک کی گردن سے لپٹ گیا۔ آدھا راست طے کر لینے کے بعد میرا اور مانک کا حوصلہ پھر جواب دینے لگا۔ موت قریب سے قریب تر ہونے لگی، لیکن میں ہر قیمت پر اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتا تھا۔

پانی کے زور دار ریلوں میں تقریباً آدھے میل میں ٹکٹا رہا۔ اچانک میرا سر ایک پیڑ کی شاخ سے ٹکرایا۔ میں نے اس شاخ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سارا ہلنے ہی میرے ہوش بجا ہوئے تھے تو مجھے سامنے والا کنارہ بالکل ہی قریب نظر آیا۔ یہاں پانی کا بہاؤ بھی کم تھا۔ مانک بہ آسانی ندی سے نکل کر سامنے کے کنارے پر کھڑی ہو چکی تھی۔ جب میں نے زمین پر پاؤں رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے نئی زندگی ملی ہو۔ میں نے پیار سے مانک کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو اس نے بھی میرے شانوں میں گردن ڈال دی۔

میں گھوڑی پر سوار ہو کر آگے بڑھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ مجھے بہر حال رات کی زیادہ سے زیادہ سفر کر کے دور نکل جانا تھا۔ دو تین فرلانگ ہی آگے جا کر میں نے عجیب سی آواز سنی۔ ذرا غور کرنے پر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ آواز ریلوے کے انجن کی ہے۔ یہ جانتے ہی میں نے مانک کی رفتار تیز کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ قدرت میری مدد کر رہی ہے۔ ذرا آگے جا کر مجھے ایک مال گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں تیزی سے مانک کو اس کے قریب لے آیا۔

اندھیرے میں گھوڑی پر سفر کرنا خطرناک تھا۔ میں نے اپنی ڈانگ مانک کی پیٹھ پر باندھ دی اور خود مال گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اسی وقت انجن کی سٹی سنائی دی۔ میں نے مانک کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”مانک! تانا کے گھر پہنچ جانا۔“

مال گاڑی چل پڑی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مانک مخالف سمت میں خٹا بھاگی جا رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور پھر آنکھیں بند کر کے اپنے دھیان کی قوت آزمانے لگا۔

☆=====☆

سورج کی پہلی کرن اور لوگوں کی آوازیں سے میں چوکننا ہو گیا۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو گاڑی ابلالہ کے ریلوے یارڈ میں کھڑی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر میں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ پھر میں پولیس کی نگاہ سے چھپ کر دو دن تک روزگار کی تلاش میں گھومتا رہا۔ وہ شہر میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔

اس نئے شہر میں آ کر میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ وجہ کا جسم چھوڑ کر کسی اور آدم زاد کے جسم میں پناہ لے لوں۔ مجھے اس وقت تک یہ علم نہیں تھا کہ اب وجہ کا جسم بھی حسن علی کی طرح میرے لئے ایک قید خانہ بن چکا ہے۔

ہوا یہ کہ میں نے ایک صحت مند اور خوب صورت نوجوان کو کبھی میں بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ اپنے لباس اور رکھ کھاؤ سے وہ کسی امیر گھرانے کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا

ڈراک، ورزش اور چڑھتی جوانی نے مجھے بدل کر رکھ دیا، لیکن اندر سے میں اب بھی وہی تھا، ٹکٹا کا ماسٹر وجے۔ اس ظالم کو میں ابھی بھولا نہیں تھا اور اسی کے ناتے میں نے اس عرصے میں اپنے دھیان کی قوت کو کئی بار آزمایا تھا۔ میں اسی کی وجہ سے ٹانگ پور میں پیش آنے والے ان واقعات سے بھی آگاہ تھا جو میرے بعد وہاں رونما ہوئے تھے۔ مجھے اسی دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ وجے کے لئے اس کی ماں مایاکور نے ایک لڑکی سرونج بھی پسند کر لی تھی۔

اس رات جب میں ٹانگ پور سے فرار ہوا تھا تو آئندہ کے واپس نہ آنے سے اس کے بڑے بھائی کرہار سنگھ کو فکر ہوئی۔ اس وقت تک بارش شروع ہو چکی تھی۔ کرہار سنگھ بارش ہی میں سر پر ٹاٹ ڈال کر گھر سے نکلا اور قریب میں رہنے والے رشتے داروں کو جگایا۔ آئندہ کے بارے میں جان کر سب پریشان ہو گئے۔ تلاش کرنے پر اس کی لاش مکان کے کھنڈر سے برآمد ہو ہی گئی۔ کرہار سنگھ کی چیخوں سے سارا گاؤں ہی جاگ گیا۔ اس نے اپنے بھائی کے قتل کا الزام وجے، یعنی مجھی پر لگایا تھا۔ مایاکور اور سوہن سنگھ ہی جاگ اٹھے۔ سوہن سنگھ نے صحن میں دیکھا تو وہاں گھوڑی نہیں تھی۔ پھر اس نے اوپری منزل پر جا کے مجھے بھی نہ پایا۔ وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔

پھر پولیس آگئی۔ تھانیدار نے سوہن سنگھ سے میرے بارے میں پوچھا اور پھر سپاہیوں کو گھر کی لاش لینے اندر بھیج دیا۔

”وجے تو شام سے گھر پر نہیں ہے۔ وہ تو اپنے نانا سے ملنے دھرم گھر گیا ہے۔“ سوہن سنگھ نے تھانیدار سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

تھانیدار بولا۔ ”کرہار سنگھ کے چھوٹے بھائی آئندہ کو قتل کر دیا گیا ہے، معلوم ہے؟ اور اس خاندان سے تمہاری کئی پشتوں کی دشمنی چل رہی ہے نا؟“

اتنے میں سپاہیوں نے آکر اطلاع دی۔ ”گھر میں بڑھیا اکیلی ہے، کوئی اور نہیں ہے۔“

”سوہن سنگھ۔“ تھانیدار نے پوچھا۔ ”وجے گھوڑی لے کر گیا ہے؟“

سوہن سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آئندہ کی لاش کے قریب ہی کچڑ میں گھوڑی کے سموں کے نشان ملے ہیں۔“ تھانیدار نے گویا شاف کیا۔ پھر اس نے مڑ کر حکم دیا۔ ”چار آدمی جب لے دھرم مگر تک تعاقب کرو۔ دوسرے سپاہیوں سے کہہ دو کہ پورے گاؤں کو چھان ڈالیں اور ہاں اس ہری کی بھی اچھی طرح خبر لے لیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں، جلدی اطلاع دینا۔“ سپاہی چلے گئے تو تھانیدار نے پھر سوہن سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا بیٹا میری لڑکی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ متا صاحب صبح ہی غصے میں پھٹکے ہوئے آن دھکیں گے۔ اس روز تو متا اب نے تمہارے بیٹے کو بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ یہ بچہ اب ہمارے ہی دل پر ایلے تھاپنے لگا ہے۔“

اسی طرح آدھا گھنٹا گزر گیا۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

معاذ جب کی آواز سن کر سب چونک اٹھے۔ تھانیدار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”معلوم ہوتا ہے، پکڑا

اور وجے کے جسم سے نکلنے کے لئے ”جے بھوانی“ کا نعرو لگایا۔ وجے کے جسم کو شدید جھٹکا لگا، مگر میں اس سے باہر نہیں نکل سکا۔ جھٹکا لگنے سے البتہ یہ ضرور ہوا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ امیر نوجوان کی کبھی آگے نکل چکی تھی اور میں سڑک کے کنارے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ وجے کے جسم سے نکلنے کے لئے زور لگایا اور بھوانی دیوی کا نعرو بھی مارا، مگر بے سود۔ یہ میرے لئے بڑی بول ٹانگ بات تھی کہ اب میں ایک آدم زاد کے جسم کو چھوڑ کر کسی دوسرے آدم زاد کے جسم میں نہیں اتر سکتا تھا۔ میں سخت پریشان ہو گیا۔ نئی صورت حال میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ جیسے تیسے تو بھوانی دیوی کا جاپ کر کے میری یہ جنتی صفت مجھے واپس ملی تھی کہ میں آدم زادوں کے جسموں پر قبضہ کر سکتا تھا اب یہ صفت بھی مجھ سے چھن گئی تھی۔

دیر تک میں اسی سڑک کے کنارے گم مسم کھڑا رہا۔ آدم زادوں سے عشق کا انجام آخر کار یہ ہوگا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک جن زاد ہونے کے باوجود کسی آدم زاد اور مجھ میں اب فرق ہی کیا رہا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ میں ایک نوجوان جسم میں تھا ورنہ تو کوئی اچیز عمر جسم بھی میرا مقدر بن سکتا تھا۔ خود کو میں نے کبھی اس سے پہلے اتنا بے بس اور مجبور محسوس نہیں کیا تھا۔ تصور کی پراسرار قوت کے بارے میں اب بھی میں پریقین نہیں رہا تھا کہ جانے وہ بھی کب چھن جاتی۔ مجھے یاد آیا کہ وجے کے جسم میں داخل ہوتے وقت بھی بڑی دقت پیش آئی تھی۔ میں آسانی سے اس کے جسم پر قبضہ نہیں کر سکا تھا۔ کئی بار کوشش کے بعد مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ میں اس وقت ایک ایسے نوجوان کے جسم میں گویا قید تھا جو ایک شخص کو قتل کر چکا تھا۔ میں قانون کی نظر میں بہر حال ایک مجرم تھا۔ مجھے اگر گرفتار کر لیا جاتا تو لازماً آئندہ کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی ہو جاتی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ پھانسی ایک آدم زاد کو نہیں ایک جن زاد علیالیش، یعنی مجھے ہوئی ہے۔ یوں وجے کے جسم میں قید ہو جانے کے سبب میں بھی مارا جا۔ مجھے اب اسی لئے ہر قیمت پر اپنے موجودہ جسم کو قانون کی گرفت سے بچانا تھا۔

اس سال پنجاب کے تمام دریاؤں میں سیلاب آ جانے سے تباہی مچ گئی تھی۔ سینکڑوں گاؤں ڈوب گئے تھے۔ ہر طرف انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کے ڈھیر تھے۔ بے گھر ہونے والوں کے لئے ریف کیمپ کھل چکے تھے۔ ان کے لئے فنڈز جمع کئے گئے تھے، لیکن میرے لئے ان کیمپوں میں آسرا لینا مناسب نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ پولیس میری تلاش میں وہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔

میں ابھی اسی فکر میں تھا کہ کیا کروں، مجھے ایک مرتبہ پھر وہی پوسٹر نظر آیا جس میں جوانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ پوسٹر میں ٹانگ پور میں دیکھ چکا تھا۔ مجھے یہی ایک آسان اور محفوظ راستہ نظر آیا اور میں چھاؤنی کی طرف چل پڑا۔

فوجی چھاؤنی میں جب مجھ سے میرا نام پوچھا گیا تو میں نے ایک فرضی نام تارا سنگھ بتا دیا۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرا گھر اور گھر کے تمام افراد سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں اور اب دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں نے اسی لئے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

خاکی چٹون، خاکی قیض اور سر پر پگڑی، میں اس لباس میں، بالکل بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ فوجی

گیا۔ آخر پچھ ہے نا۔ پولیس سے کہاں تک بھاگتا۔
لیکن سپاہیوں نے آکر اور ہی بات کی۔ ”صاحب! ہم ندی تک گئے، لیکن ندی میں تو بڑا زبردست طوفان آیا ہوا ہے۔ کوئی بھی ندی کو پار نہیں کر سکتا۔ راستے میں ایک گاڑی والے نے یہ ضرور بتایا کہ اس نے ایک گھڑسوار کو ندی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“
تھانیدار حیرت سے بولا۔ ”تو کیا اس لڑکے نے ایسے طوفان میں اپنی گھوڑی ندی کے اندر اتار دی ہوگی؟ شاید اسے قانون سے بچنے کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دینا آسان لگا ہوگا۔ نادان کہیں کا۔“
ایسی باتوں سے سبوں کو سوگوار کر کے تھانیدار چلا گیا۔ سامنے والے گھر میں تڑپا دینے والے میں اب تک جاری تھے۔

میں نے وجہ کے نانا کا بھی دھیان کیا۔ آدمی رات گزر چکی تھی، مگر بوڑھا حسب عادت جاگ رہا تھا۔ موسلا دھار بارش اور بادلوں کے گرجنے کی آوازوں کے درمیان اچانک بوڑھے نے دروازے پر زور سے دستک ہوتے سنی۔ ہاتھ میں لالٹین لئے وہ دروازے پر آیا، کنڈی کھولی تو سامنے گھوڑی نظر آئی۔ ”ارے مانک۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر گھوڑی کو کسی سوار کے بغیر دیکھ کر اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے گھوڑی کی زین کے ساتھ ڈانگ بھی بندھی ہوئی دیکھی۔ یہ دی ڈانگ تھی جو اس نے مجھے دی تھی۔
بوڑھے نے آگے بڑھ کر گھوڑی کے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مانک! اکیلی کیوں آئی؟ یہ ڈانگ تو وجہ کی ہے۔ اسے کہاں چھوڑا؟ چل، مجھے بھی وہاں لے چل۔“ بوڑھا گھوڑی سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے گھوڑی سب کچھ سمجھتی ہے۔ گھوڑی نے دو ایک بار گردن ہلائی، لیکن جب بوڑھا اس پر سوار ہونے لگا تو وہ جلدی سے ہٹ کر گھر میں گھس گئی۔ بوڑھے کے چہرے پر الجھن دکھائی دینے لگی۔ اندر آکر اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر سے زین اتار دی، ڈانگ کو گھر میں چھپایا اور گھوڑی کو محسن میں باندھ دیا۔ اتنے میں باہر سے کسی نے پکارا۔ ”بابا! جاگ رہے ہو کیا؟“ آواز چوکیدار کی تھی۔ وہ کھلے دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔
چوکیدار بولا۔ ”گھوڑی کو کسی سوار کے بغیر آتے دیکھ کر میں پیچھے پیچھے چلا آیا۔ خیر تو ہے؟“
”مجھے بھی اس بات پر تعجب ہو رہا ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ مانک میری بیٹی کے گاؤں سے بھاگ آئی ہے۔“

”لیکن بابا! ندی میں تو سخت طوفان ہے۔ گھوڑی اکیلی تو آ ہی نہیں سکتی۔“ چوکیدار کہنے لگا۔
بوڑھے کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کا نواسا وجہ ندی پار کرتے ہوئے ڈوب تو نہیں گیا؟
چوکیدار چلا گیا اور وجہ کا نانا پوری رات واقعات کے تانے بانے بننے کی کوشش ہی میں غالباً جاگ رہا تھا۔

اس روز بھی میں اپنی محبوبہ شکنتلا کے دھیان میں گم تھا کہ میرے دوستوں نے مجھے پکارا۔ ”نارا! آج تو ہمیں کچھ کرنا ہے۔“
میرے فوری دوست جانتے تھے کہ اکثر میں اسی طرح خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔ میرا دوست وہی سنگھ میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔ ”نارا! یار ہم کب سے تجھے آوازیں دے رہے ہیں، آج تو نے پہلی بار بددق چلائی ہے، اس لئے دوستوں کو پارٹی دینا ہوگی۔“
”یار، تو ہم سے بھی“
”مومن ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ رکھویر اور شکر بھی آ گئے۔ رکھویر بولا۔ ”یار، تو ہم سے بھی“
”کے نکل گیا۔“
”انہیں علم نہیں تھا کہ بددق اور رائفل تو ایک عرصے سے میرے لئے کھلونے کی حیثیت رکھتے تھے۔“

ہی جائے گا اور یوں سوہن سنگھ میری خیریت کے ساتھ ساتھ بات کی تہہ تک پہنچ جائے گا۔ پولیس کی طرف سے بھی میں پوری طرح چوکنا تھا۔ اسی سبب ہری کو خط لکھنے کے بعد میں 'ٹانک پور گاؤں کی طرف سے غافل نہیں رہا۔

یہ وہ دن تھا کہ جب میرے اندازے کے مطابق ہری کو لکھا جانے والا خط ٹانک پور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے تصور کی قوت کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت مجھے پولیس انچارج متا کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ متا کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ سوہن نے ہری کا تصور کرنے سے پہلے متا ہی کا دھیان کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ متا 'ٹانک پور کے راؤنڈ پر آیا ہوا تھا' وہ اس وقت ٹانک پور تھانے کے لان میں تھانیدار کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ پوسٹ مین تھانے کی ڈاک دینے کے لئے آیا۔ ڈاکے کو دیکھ کر تھانے اے مخاطب کیا۔ "سوہن سنگھ کی ڈاک بھی کبھی آتی ہے یا نہیں؟"

"نہیں صاحب! آتی تو آپ کو نہ بتاتا۔" ڈاکیا بولا۔ پھر ذرا رک کر اس نے کہا۔ "لیکن صاحب! آج ایک عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ ہری کے نام خط آیا ہے۔ جس پر فوج کی مرہ ہے۔ مجھے تو یاد نہیں کہ ہری کے نام اس سے پہلے کبھی کوئی خط آیا ہو۔"

ڈاکے سے یہ سنتے ہی متا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈاکے سے وہ لفافہ لے لیا جو میں نے ہری کو بھیجا تھا۔ پھر وہ اندر کمرے کی طرف بڑھا۔ جاتے جاتے اس نے ڈاکے سے کہا۔ "ذرا ٹھہرو" میں ابھی آتا ہوں۔"

اندر پہنچ کر متا نے احتیاط سے لفافہ کھولا، اس طرح کہ لفافے کو دوبارہ چپکا کر بند کیا جاسکے۔ میرے خط کے مضمون پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ متا حقیقت تک پہنچ گیا ہے۔ وہ یقیناً سمجھ گیا ہے کہ ہری کو خط میں نے لکھا ہے۔ بہر حال اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں اور لفافے کو دوبارہ چپکا دیا۔

کمرے سے باہر آ کر متا نے ڈاکے کو مخاطب کیا۔ "اس میں کیا ہوگا؟ جاؤ اسے ہری کو دے دو۔" ڈاکیا لفافہ لے کر چلا گیا۔

"فورا کسی کو ہری پر نگاہ رکھنے کے لئے بھیج دو۔" متا نے تھانیدار کو حکم دیا۔ "اگر ہری خط لے کر وجے کے باپ سوہن سنگھ کے پاس جائے تو سمجھ لینا کہ آئندہ کا قاتل بہت جلد گرفتار ہو جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔"

امر تر ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس متا کے اقدامات جاننے کے بعد میں نے اپنے دوست ہری کا دھیان کیا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوا ڈاکے سے ہنس کر کہہ رہا تھا "عبدل چاچا! آج اس گھر کے دروازے پر کیسے آگئے؟ میرے گھر پر تو پولیس وارنٹ لے کر آتی ہے" ڈاک تو کبھی نہیں آتی۔"

"ہاں بھائی، مگر میں آج تمہارا خط لے کر آیا ہوں۔" ڈاکے عبدل نے میرا بھیجا ہوا لفافہ ہری کے

چار ماہ اور گزر گئے۔ میں اب حوالدار بن گیا تھا۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ میں بہت جلد بیچر بھی بن جاؤں گا۔ سبھی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ وہ میرے نشانے کے بھی معترف تھے۔ ایک مرتبہ کرم ہوشیار سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "تارا سنگھ! اگر تم اسی طرح محنت سے سیکھتے رہے تو پانچ سال میں میرے عہدے تک پہنچ جاؤ گے۔"

مجھے کرل یا جنرل بننے کی تمنا نہیں تھی۔ میرے سامنے تو صرف تین دشمنوں کے چہرے تھے جنہیں میں ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک میرا رقیب، یعنی میری محبوبہ کا شوہر کرتار سنگھ تھا اور دوسرے کے بھائی جنہوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ گھنٹیاں اور گویاں کی رہائی میں اب صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ ان کی سزا پوری ہونے والی تھی۔

ہر اتوار کے روز فوج کے جوان اپنے رشتے داروں اور احباب کو خطوط لکھتے۔ جواب آنے پر وہ شوق سے خطوط پڑھتے اور دوستوں کو بھی سناتے۔ ایک میں ہی ایسا تھا جس نے اتنے عرصے میں کبھی کسی کوئی خط نہیں لکھا۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ وجے کے والدین کو اپنی خیریت سے آگاہ کر دوں۔ وہ بہر حال ایک جوان بیٹے کے ماں باپ تھے اور مجھے اپنا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ میری اچانک گمشدگی ظاہر ہے ان کے لئے شدید صدمے کا سبب ہوگی۔ میں انہیں خط اس لئے نہ لکھتا کہ مجھے علم تھا، ان کی گھرائی ہو رہی ہے۔ پولیس کو علم ہو جاتا کہ میں نے انہیں خط لکھا ہے اور یہ بھی کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں۔ بہت سوز و گداز کے بعد میں نے سوہن سے ہری کے نام خط لکھوایا۔ اس سے خط لکھوانے کی وجہ یہ تھی کہ میرا رائٹنگ کسی کی نظر میں نہ آئے۔

جب میں نے سوہن سے خط لکھنے کو کہا تو خود ہی وضاحت کر دی۔ "سوہن! دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار تو ہے نہیں، بس بچپن کا ایک دوست ہے جو اکثر یاد آتا ہے۔ اسے خط لکھ کر اپنی ترقی کی خبر دینے کی جی چاہتا ہے۔"

سوہن سر ہلا کر کہنے لگا۔ "ضرور، بالکل لکھواؤ۔" میں بولنے لگا اور سوہن لکھنے لگا۔ میں نے ہری کو خط لکھوایا۔ "ہری! میرے دوست! تجھے یہ جلا کر یقیناً حیرت ہوگی کہ میں فوج میں ملازم ہو گیا ہوں۔ تو شاید اب تک مجھے بھول گیا ہو، لیکن مجھے سب کچھ یاد ہے۔ جب بھی میں نانا کے گاؤں سے آتا تھا تو ہم ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم گاؤں کے ویران کنویں، جاتے اور بموت پرست کی باتیں کرتے۔ کچھ یاد آیا؟ ہاں تو میں یہاں حوالدار بن گیا ہوں اور تھوڑے عرصے میں شاید میجر بھی بن جاؤں گا۔ وہاں موجود دوستوں کے بارے میں لکھتا۔ تیرا جواب ملنے پر ہم چھٹی لے کر تھوڑے دن کے لئے آؤں گا۔ خط کا جواب جلد دینا۔ تیرا یار! تارا سنگھ۔"

خط پوسٹ کر دیا گیا۔ ہری کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ چھ ماہ کی سزا بھگت کر جیل سے رہا ہو چکا تھا۔ اسی دوران اس کی بوڑھی ماں بھی مر چکی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ہری پڑھا لکھا نہیں اور وہ میرا خط پڑھوانے وجے کے باپ سوہن سنگھ کے پاس

ہاتھ میں دے دیا۔

”چاچا! غلطی تو نہیں ہو رہی؟ اچھی طرح دیکھ تو لیا ہے، کسی اور کا تو خط نہیں ہے؟ مجھے تو نہ خط لکھنا آتا ہے نہ پڑھنا۔ مجھے کون خط لکھے گا؟“

”مگر یہ خط تیرا ہی ہے بیٹے! اس گاؤں میں اور کون ہری ہے۔“ عبدل نے کہا اور چلا گیا۔

ہری نے لفافے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر اسے ادھر ادھر پلٹا۔ اس کے باوجود کہ اسے پڑھنا نہیں آتا تھا، لفافہ کھول لیا۔ عبارت پر نظر ڈال کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ ”یہ خط کس کا ہو سکتا ہے؟ مجھے کون خط لکھے گا؟..... ہاں! ہاں شاید یہ وجہ کا خط ہو، لیکن یہ خط کس سے پڑھاؤں؟“ اس کے بعد وہی ہوا جو میرا قیاس تھا۔ ہری فوراً سوہن سنگھ کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ اس سے بے خبر تھا کہ ایک آدمی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ہری، سوہن سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔ سوہن سنگھ گھر کے صحن میں بیٹھا تھا۔

”چاچا جی! یہ خط تو پڑھ دو۔ معلوم نہیں مجھے یہ خط کس نے لکھ دیا ہے۔“ ہری نے آگے بڑھ کر

خط سوہن سنگھ کے ہاتھ میں دے دیا۔

سوہن سنگھ نے ہری کو اپنے قریب چارپائی پر بٹھالیا اور خط کھولا۔ پھر مجھے وجہ کی ماں مایا کو نظر آئی۔ اس نے ہری کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ آٹھ ہی مہینے میں وجہ کی ماں بدل سی گئی تھی۔ اس کی کمر، شانے، سر اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گزرے ہوئے دنوں کے زخم اور آنے والے دنوں کے ممکنہ اندیشوں کا بوجھ نہ اٹھا سکتی ہو۔ مجھے اس عورت پر بہت ترس آیا۔

پورا خط پڑھ کر سوہن سنگھ بے چین دکھائی دینے لگا۔ اس نے خط ایک بار پھر پڑھا۔ ہری قریب ہی بیٹھا اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ہری بھی اضطراب کا شکار ہو رہا تھا۔ سوہن سنگھ اب تک چپ تھا۔ معاً سوہن سنگھ کی نگاہ اس کھڑکی کی طرف اٹھی جو گھر کے باہر کھلتی تھی۔ اس نے ہری سے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ”اٹھ کر کھڑکی بند کر دے۔“

ہری نے سوہن سنگھ کے کہنے پر عمل کیا اور دوبارہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ہری کو بے چین دیکھ کر سوہن سنگھ نے دھیمی آواز میں اسے خط سنایا۔ پھر وہ ہری کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ہری کے چہرے پر حیرانی تھی۔ شاید وہ کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ پیشانی پر اپنی انگلی رکھ کر بولا۔ ”چاچا جی! مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا کہ بچپن میں میرا کوئی دوست تارا سنگھ بھی تھا۔ یہ کہاں سے میرا دوست نکل آیا..... چلو پھوڑو، جانے کس کا ہو گا یہ خط۔ میں تو سمجھا تھا وجہ نے لکھا ہو گا۔“

”ارے عقل کے دشمن، یہ اسی کا تو خط ہے۔“ سوہن سنگھ مسکرائے لگا۔

سوہن سنگھ کی بات سن کر ہری خوشی سے اچھل پڑا اور زور سے بولا۔ ”کس کا؟..... وجہ کا

خط ہے یہ؟“

تیزی کے ساتھ سوہن سنگھ نے ہری کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ”ارے پگے، آہستہ بول، کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔“ پھر وہ خود بھی دھیمی آواز میں بولا۔ ”وجہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے،

خبر تو اچھی ہے، مگر تجھے یہ خط لاتے کسی اور نے تو نہیں دیکھا؟“

ہری نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تو سیدھا بیٹن لایا ہوں۔ آخر مجھے وجہ نے یاد کر ہی لیا۔ چاچا جی! ایک بار پھر پڑھ کر سنا دو۔ پہلی دفعہ تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا کہ کیا لکھا ہے۔“ ہری نے بڑی محنت کے ساتھ میرا خط دوبارہ شانے کی فرمائش کر دی۔

”اچھا ابھی سناتا ہوں، ذرا ٹھہر۔“ سوہن سنگھ نے ہری سے یہ کہہ کر اپنی بیوی مایا کو کو آواز دی۔ ”وجہ کی ماں! ذرا یہاں تو آنا۔“ جب مایا کو آگئی تو سوہن سنگھ نے اسے خط دکھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ خط آیا ہے، ذرا غور سے سننا۔“ وہ خط پڑھنے لگا۔ اس مرتبہ خط پڑھتے پڑھتے اس کی آواز بھرا گئی۔

وجہ کی ماں زار و قطار رو رہی تھی۔ ہری کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ گاؤں کی اس ان پڑھ بڑھیا نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ خط اس کے بیٹے نے لکھا ہے۔ تینوں توڑی دیر تک خاموش رہے۔ پورے آٹھ مہینے بعد بیٹے کی خیریت ملی تھی اس لئے ماں باپ، دونوں ہی کے چروں پر خوشی رقص کر رہی تھی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ایک خطرہ بھی وجہ پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔

”چاچا جی! تمہی میری طرف سے جواب لکھ دو۔“ ہری کی آواز نے سکوت توڑا۔ ”لکھ دو کہ میں بھی فوج میں بھرتی ہونے تیرے پاس آ رہا ہوں۔“

”اتنی بے قراری مت دکھا ہری، ہم لوگوں کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔“ وجہ کے باپ نے کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ میرے گھر پر پولیس کی ہر وقت نگاہ رہتی ہے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ تجھے کسی نے یہاں آتے نہ دیکھ لیا ہو۔“ سوہن سنگھ نے ہری کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

ہری کو میں نے سوہن سنگھ کی بات پر چونکتے دیکھا۔ شاید اسے صورت حال کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر کھڑکی کھول کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ کھڑکی کو آہستہ سے دوبارہ بند کر کے واپس ہوا تو اس کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔

”چاچا جی! تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ ہری قریب آ کر دھیمی آواز میں سوہن سنگھ سے بولا۔ ”اب مجھے یاد آیا ہے کہ جب تمہارے کہنے پر میں نے کھڑکی بند کی تھی تو ایک شخص قریب ہی کھڑا ہوا تھا جس پر میں نے دھیان نہیں دیا۔ اب بھی وہی شخص کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا پیچھا کیا گیا ہے۔ کو تو ابھی جا کر اس کی گردن دبا دوں تاکہ.....“

”تجھے تو بات بے بات لڑائی کی سوجھتی ہے، کبھی دماغ سے بھی کام لے لیا کہ۔“ سوہن سنگھ یہ کہہ کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

وجہ کی ماں مایا کو اب تک خاموش تھی۔ اس نے آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میری ماں تو بیٹے کو وہیں رہنے دو جہاں وہ ہے۔ اس کا منہ دیکھنے کو نہ ملے گا تو نہ سہی، لیکن اب اسے اس کچھڑے میں لانے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم لوگوں نے اسے انتقام کی راہ پر نہ ڈالا ہوتا تو میرا

بادر بیٹا ضرور کوئی بڑا افسری بنتا۔ اب بھگوان نے راستہ دکھایا ہے تو مجھ پر رحم کرو۔ اسے اس راستے سے واپس نہ بلانا۔" یہ کہہ کر وہ روئے گئی۔

سوہن سنگھ اٹھ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔ "خط کو میں نے جلا دیا ہے۔ ہری! تو بھی بھول جا کہ تجھے کبھی کوئی خط ملا تھا۔"

ہری بے چین سا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "وہے کا پتا تو لکھ لیا ہوتا چاہی۔"

"اس کا پتا تو میرے دل پر نقش ہو گیا ہے ہری۔" سوہن سنگھ نے جذبات سے بھرپور آواز میں جواب دیا۔ "اور ہاں ہری! تجھ سے کوئی کچھ پوچھتے تو بتانا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو چاہی! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے جیل میں کم ظلم سے ہیں لیکن ایک لفظ جو منہ سے نکلا ہو۔"

سوہن سنگھ نے ہری کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہے نے لکھا ہے کہ دوستوں کا حال لکھنا۔ تو شاید اس کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ اس نے گھنٹیاں اور گوپال کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ اب سمجھا کچھ کہ نہیں۔" سوہن سنگھ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

ہری چونک اٹھا۔ "کمال ہے" وہے نے اتنے پراسرار انداز میں خط لکھا ہے۔"

"سنو ہری! تم اگر زیادہ دیر یہاں رہے تو پولیس کو شک ہو جائے گا اس لئے تمہارا جانا ہی مناسب ہے۔ تم جاؤ۔" سوہن سنگھ نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو چاہی! میں چلتا ہوں۔" ہری یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

ہری چلا گیا تو سوہن سنگھ نے اپنی بیوی لیاگور کو مخاطب کیا۔ "میں کل تمہارے باپ کے پاس دھرم مگر جا کر یہ خوش خبری سناؤں گا۔ ہولی کا تہوار سر پر ہے تم بھی ساتھ چلی چلا۔ ہمارے اس وقت وہاں جانے سے کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

شوہر کی بات سن کر وہے کی ماں بولی۔ "میں اس وقت تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی جب تک وہے کا منہ نہیں دیکھ لیتی۔ تم باپ ہو، تمہیں کیا خبر کہ جس ماں کا جوان بیٹا اس سے دور ہو تو ماں کے دل میں روز ہی ہولی جلتی ہے۔"

وہے کے ماں باپ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مجھے متا کی فکر ہوئی کہ وہ اب حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے بعد کیا قدم اٹھاتا ہے۔ میں نے متا کا دھیان کیا اور مجھے اس کے روعلم کا علم ہوا۔ اس تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ ہری، سوہن سنگھ سے ملا ہے۔ اسی کی روشنی میں اس نے ساری کڑیاں جوڑ لی تھیں۔ متا نے اسی روز انبالہ چھاؤنی کی سکھ رجسٹر کو تار بھیجا کہ متا سنگھ نامی حوالدار پر نظر رکھی جائے۔ ہم ایک قاتل کی تلاش میں ہیں اور بہت جلد ضروری کاغذات لے کر چھاؤنی پہنچ جائیں گے۔ تار پر "ہاپ سیکرٹ" کی مہر تھی۔

خطرہ اب کھل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ میری محفوظ پناہ گاہ اب میرے لئے محفوظ نہیں رہی تھی۔ مجھے اب جلد از جلد وہاں سے فرار ہونا تھا۔

میں نے دانستہ فوج میں ایسے دوست منتخب کئے تھے جو معاشرے سے غیر مطمئن اور آمادہ بغاوت تھے۔ موہن، باپ سے بھٹنا کر کے فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ شکر محبت میں ناکام ہو کر چھاؤنی آیا تھا اور رگھو دیر کے باپ کی زمین، ایک زمیندار نے ہتھیالی تھی۔ ہم چاروں کی دوستی، ہمت اور ذہانت پوری سکھ رجسٹر میں مشہور تھی۔

میں جس مقصد سے فوج میں بھرتی ہوا تھا، مجھے اس میں کامیابی ہوئی تھی۔ میں پولیس کی گرفت سے بچا رہا تھا، لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ ہری کو خط لکھتا میرے لئے اس حد تک خطرناک ثابت ہوگا، یہ بات میرے دہم و دگان میں بھی نہیں تھی۔ ایک نہ ایک دن مجھے فوج سے فرار ہونا ہی تھا، مگر اپنے دل کی بات میں نے دوستوں سے نہیں کہی تھی۔ جب پانی سر تک پہنچ گیا تو مجھے زبان کھولنا ہی پڑی۔

میری تجویز سن کر دوستوں نے پوچھا کہ فوج سے فرار ہو کر ہم کریں گے کیا؟

"پہلے تو مجھے اپنا ایک پرانا حساب چکانا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

رگھو دیر میری اس بات کو مذاق سمجھ کر بولا۔ "تجھے کس کا حساب چکانا ہے؟ حیرے اپنے تو سیلاب کی نذر ہو گئے۔ کیا ان کا انتقام بھگوان سے لے گا؟"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے رگھو دیر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بھگوان سے میری دشمنی نہیں ہے۔ بھگوان کا تو احسان مند ہوں۔ اگر اس رات سیلاب نہ آتا تو میں آج شاید جیل میں ہوتا۔ آج میں تم دوستوں کو پوری حقیقت بتاتا ہوں۔ دوستو! تم لوگ مجھے تمہارا سنگھ کہتے ہو، لیکن میرا اصل نام وہے ہے اور مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ میرے ماں، باپ، نانا، ماموں سب زندہ ہیں۔ کبھی میرے بڑے بھائی بھی تھے۔ میں اپنے دوستوں کو اعتماد میں لینے کی خاطر درحقیقت وہے کے متعلق بتا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہی اور مظلوم بن کر دوسروں کی ہمدردیاں بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں نے اسی لئے اپنی آواز میں دروشاں کر لیا اور قدرے توقف سے کہنے لگا۔ "آج اگر میرے بھائی زندہ ہوتے تو تمہارا گھر ملاہوں کی جھانجوں اور بھتیجیوں کے شور سے گونج رہا ہوتا، لیکن میرے دونوں بڑے بھائی، باپ دادا کے نظام کا قرض وصول کرنے میں کام آ گئے۔ ایک بھائی کو دشمنوں نے چھپ کر پیچھے سے گولی مار دی، دوسرے کو پولیس نے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا اور میں آج تک ان دونوں کے زخموں کو دل سے لگائے زندہ ہوں۔"

میری باتیں سن کر تینوں دوست رنجیدہ ہو گئے۔ پھر شکر بولا۔ "تو اب حساب چکانے میں کس بات کا انتظار ہے تمہارا سنگھ؟"

"تمہارا سنگھ نہیں، وہے سنگھ کو" وہے۔" میں نے شکر کو یاد دہانی کرائی۔

"وہے! دشمن کہتے ہیں؟"

"تین زندہ ہیں، مگر ان میں سے دو ابھی جیل میں ہیں۔ بہر حال اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایک دشمن جو باہر ہے، اسے تو میں ٹھکانے لگا ہی سکتا ہوں۔"

یہ سن کر شکر کہنے لگا۔ "وہے! اب تم اکیلے نہیں جا سکتے۔ ہم چاروں ساتھ ہی رہیں گے، جنہیں

گے تو ساتھ ساتھ اور مرس گے تو ایک ساتھ۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کرنا کیا ہے؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

مجھے اپنے پر خلوص دوستوں سے یہی توقع بھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”دوستو! میں بھی تم سے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کرتا ہوں۔ مرتے دم تک میں اپنا عہد نبھاؤں گا۔ سب سے پہلے میں اپنے دشمنوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم قانون سے بغاوت کریں گے، اس قانون سے بغاوت جو مظلوم کو ظلم سے نہیں بچا سکتا، جو حق دار کو اس کا حق دلانے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ ہم انہیں لوٹیں گے جو غریبوں کو لوٹتے ہیں، مزدوروں اور کسانوں کے خون پسینے کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں۔“

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد اپنے دوستوں کو میں راہ پر لے آیا۔ میرے اندر ٹھاکر بلونت سنگھ جیسے ایک بار پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اس کے سوا پولیس سے بچنے کی میرے پاس کوئی اور راہ بھی تو نہیں تھی۔ میری سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ میں وجہ کا جسم نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”ہمیں یہ بھی منظور ہے۔“ انہوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

اس کے ہم فرار کی تیاریاں کرتے گئے۔ ہم میں سے ہر ایک نے ایک ایک راکفل اور زیادہ سے زیادہ کارٹوس ساتھ لے لئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم ایک جیپ میں بیٹھے ہوئے ملٹری کیمپ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

رات کے اندھیرے میں جب تیز رفتاری سے فاصلوں کو سمیٹ رہی تھی۔ موہن ایشیترنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ جیپ کی منزل ٹانگ پور تھی، وجہ کا آبائی گاؤں ٹانگ پور۔ میرے اندازے کے مطابق ایس پی متا کو آج ہی رات انبالہ چھوڑنی پہنچ جانا چاہئے تھا اور میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے تصور کی پراسرار قوت آزمائی۔ دوسرے ہی لمحے متا مجھے نظر آ گیا۔ وہ کرنل ہوشیار سنگھ کے دفتر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”میں پولیس سپرنٹنڈنٹ متا ہوں۔ میرا ٹیلی گرام آپ کو مل گیا ہوگا۔“

”ٹیلی گرام؟“ کب بھیجا تھا آپ نے؟ میں نے آپ کا کوئی ٹیلی گرام نہیں دیکھا۔“ کرنل کا لہجہ سناٹ تھا۔

متا کا چہرہ اتر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں کرنل سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں کرنل صاحب! آپ کو میرا کوئی تار نہیں ملا؟ آج آج ہی صبح تو میں نے آپ کو تار بھیجا تھا۔ حیرت ہے کہ آپ کو“

”میں چھٹی پر تھا۔“ کرنل بول اٹھا۔ ”ہولی ہے نا۔ اس وقت ہم کچھ دوست فلم کے آخری شو سے واپس آئے ہیں۔ بہر حال میں ابھی ڈاک دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کرنل ڈاک کی ٹرے دیکھنے لگا۔ پھر اسے تار مل گیا۔ وہ متا کی طرف مڑا۔ ”آپ نے کیا کوئی ضروری پیغام بھیجا تھا؟“ بات کرتے ہوئے اس نے

لفافہ کھولا اور تار کا مضمون پڑھنے لگا۔ پھر طویل سانس لے کر کہا۔ ”تو آپ کو ہمارے حوالدار تارا سنگھ پر شبہ ہے؟“ یہ بات کرنل نے کچھ اس انداز میں کہی جیسے اسے متا سے اتفاق نہ ہو۔

”کرنل صاحب!“ متا بولا۔ ”ہم کئی مہینے سے اس مجرم کی تلاش میں ہیں۔ ایک خط اس کے دوست کے نام سنگھ رجنت سے پہنچا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ یہاں ہے۔ اس کا اصل نام بھی تارا سنگھ نہیں وجہ سنگھ ہے۔“

کرنل ہوشیار سنگھ نے متا کی باتیں سنیں اور ذرا سا سوچ کر اس کی بے قراری کی پروا کئے بغیر کہنے لگا۔ ”مسٹر متا! آپ کے پاس اس کا کوئی فوٹو ہو تو دکھائیے۔ میں شناخت کر کے بتا دوں گا کہ آپ کا شبہ درست ہے یا نہیں؟“

”سر! اس کا فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے، لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ مجھے اس کے سامنے لے جائیں، پھر دیکھ لیجئے گا کہ قاتل کا چہرہ خود بولنے لگے گا۔“

”ٹھیک ہے، آپ اصرار کرتے ہیں تو آئیے، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ تارا سنگھ قاتل ہو سکتا ہے۔“ کرنل یہ کہتا ہوا کرسی سے اٹھا۔

پھر ہم چاروں دوستوں کے فرار کا راز کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

”آئی ایم سوری مسٹر متا۔“ کرنل ہوشیار سنگھ بولا۔ ”اب وہ آپ کا ہی نہیں فوج کا بھی مجرم ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع“

اسی وقت شکر نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا سو گئے وجہ؟“

شکر کی آواز کے ساتھ ہی میرے دھیان کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔

”نہیں جاگ رہا ہوں۔“

”آنکھیں بند دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید تمہاری آنکھ لگ گئی ہے۔“ شکر نے کہا۔

رات کے دوسرے پہر جب ’ٹانگ پور کی حدود میں داخل ہوئی اور میں چوکننا ہو گیا۔ ہولی کی اجلی رات تھی۔ دن بھر تک کھیل کھیل کر تھکنے کے بعد گاؤں والے نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے تھے۔ اپنے دشمن اور رقیب کو تارا سنگھ کو ٹھکانے لگانے سے قبل میں ’وجہ کی ماں مایاکور سے ملا۔ سوہن سنگھ، دھرم نگر گیا ہوا تھا۔ مایاکور گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے مجھے اپنا بیٹا وجہ سمجھ کر گلے سے لگا لیا۔

”اگر تو بھگوان کو مانتا ہے بیٹا تو میری ایک بات مان لے۔“ مایاکور مجھ سے بولی۔ ”اب برائی کے راستے پر مت جا، تو اس فوجی لباس میں کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ تجھے کیا خبر کہ ہر ماں چاہتی ہے، اس کا بیٹا اچھے آدمی کی حیثیت سے نام پیدا کرے۔ پرانے راستوں کو بھول جا۔“

”اب دیر ہو چکی ہے ماں۔ تجھے پتا ہے کہ اگر میں پولیس کے ہاتھ آ گیا تو مجھے چھانسی دے دی جائے گی۔ پھر یہ کہ اب میں اکیلا بھی نہیں۔ میرے یہ تینوں دوست بھی فوج چھوڑ کر میرے ساتھ آئے ہیں۔ میں تو تمہیں دیکھنے اور اپنی صورت دکھانے آیا ہوں دوبارہ کب ملاقات ہوگی، کسے خبر۔“

میری بات سن کر شاید مایاکور کو بھی خیال آ گیا کہ میں اکیلا نہیں۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے

بلند کر کے اشارہ کیا اور لبلیباں دبا دی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے گولیاں دشمنوں کے سینوں میں اتر گئیں۔ ان کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

ہم چاروں دوست فوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر لوگ جاگ نکلے تھے۔ کمرکیاں اور دروازے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

راستے میں گاؤں سے نکلے ہوئے ہم ہری کے گھر کے پاس رکے، لیکن وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اسی وقت کسی نے دور سے پوچھا۔ ”ارے بھی یہ گولیاں چلنے کی آواز کیسی تھی؟“

”بھئی ہم لوگ شکار کے لئے نکلے ہیں۔“ موہن نے جواب دیا اور جیب آگے بڑھادی۔ پھر غالباً یہی بات گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ مطمئن ہو کر سو گئے۔ جب میں پہلی بار تانک پور سے اتر رہا تھا تو ندی میں زبردست طوفان تھا، لیکن آج اس میں پھرتے۔ ندی کو پار کر کے جیب جب لے نکل تو ایک شخص یکایک سامنے آ کر مرتے مرتے بچا۔ وہ جیب سے ٹکرا کر دس پندرہ فٹ دور جاگرا۔ ہانے وہیں سے گالی دے کر کہا۔ ”تمہاری..... اندھے ہو کیا؟“

گالی سننے ہی میں چونک اٹھا۔ وہ آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ پھر بھی فوری طور پر مجھے کچھ یاد آسکا۔ میں نے جیب رکوالی اور اتر اس کے شخص کے قریب پہنچا جواب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے بے پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ارے ہری، تُو!“

”ہاں میں!“ ہری نے مجھے یہ کہہ کر سینے سے لگا لیا۔ میں نے اسے زور سے بھیجا تو کہنے لگا۔ ”اب میرے جسم میں فوج کا زور بھی آگیا ہے۔“

”نہیں ہری! یہ کسی فوج کا زور نہیں، ایک ڈاکو کا زور ہے۔“ میں نے کہا۔

”ڈاکو؟“ ہری حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ ابھی ابھی دشمنوں کا مصفا کر کے آ رہا ہوں۔ چلو بیٹھ جاؤ جیب میں ابھی ہمیں اور بہت سی بات کرنی ہیں۔“ جب ہری جیب میں بیٹھ گیا تو میں نے موہن سے کہا۔ ”تُو نے اسے ٹکرا کر اچھا کیا۔ مجھے تلاش کر رہے تھے، وہ ہری یہی ہے۔“ پھر میں نے ہری کو بتایا۔ ”میں نے تجھے جو خط لکھا تھا، اس میں اس کی مٹکا کو میرا پتہ لکھا تھا اس لئے ہمیں فوج سے فرار ہونا پڑا۔ ہاں یہ بتا ہری کہ اس وقت تُو کہاں آ رہا ہے؟“

”میں دھرم نگر گیا تھا، تیرے باپ کو خبردار کرنے کے لئے۔“ ہری نے جواب دیا۔

”کس بات سے خبردار کرنے؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔

”گھنشیام اور گوپال نے ان کا پتا کانٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ شام کو بنواری نے نشے میں میرے سامنے دروازہ اگل دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ آج ہی رات باپ کو قتل نہ کر دیں۔ چنانچہ میں فوراً دھرم نگر روانہ ہوا۔“ ہری نے تفصیل سے بتایا۔

میں نے اس کی پیٹھ تھپکی اور بولا۔ ”قدرت مجھ پر کتنی مہربان ہے کہ اس نے مجھے تجھ جیسے دوست دیے۔“ پھر میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کا ہری سے تعارف کرایا۔ ”یہ میری ٹولی کے ساتھی ہیں۔“

اور پھر باورچی خانے سے گاجر کا طوطہ لے آئی۔ پھر اس نے ہمارے لئے لسی بنائی اور گلاسوں میں لے آئی۔ اب خاصا وقت ہو گیا تھا اس لئے میں نے باتوں باتوں میں گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔

”وہ بے چاری ہمیشہ تیری خیریت پوچھتی رہتی ہے۔ ہولی منانے وہ اپنے سیکے گئی ہے۔ اس کامیاب بھی ساتھ گیا ہے۔“

مایاکور کی بات سن کر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ پھر بھی میں سنبھل کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اس وقت برابر کے گھر میں کوئی نہیں؟“

میرے سوال پر مایاکور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی بات مجھ سے چھپا رہی ہو۔ پھر بڑی مشکل سے اس نے زبان کھولی۔ معلوم ہوا کہ نیک چلنی کے سبب تنوار سے پہلے ایک ماہ قبل گھنشیام اور گوپال کو جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اپنے گھر میں موجود تھے۔ اس دوران کرناٹک کے رشتے کی ایک بیوہ چچی اپنے بیٹے بنواری کے ساتھ وہاں آ کر رہنے لگی تھی۔ چچی اور اس کا جوان بیٹا بنواری بھی گھر میں تھے۔

مایاکور یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس لئے جھجک رہی تھی کہ کہیں میں، ان دونوں بھائیوں کو قتل نہ کر دوں۔ میں نے اسی لئے اسے جھوٹی تسلی دی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر مجھے اطمینان کی جھلک نظر نہیں آئی۔ میرے اندازے کے مطابق دونوں بھائیوں اور بنواری کو گھر کی چھت ہی پر سونا چاہئے تھا۔

”میری چند چیزیں اوپر کمرے میں ہیں، وہ لے لوں ماں۔“ یہ بمانہ بنا کر میں اوپری منزل پر آ گیا۔ میں نے سامنے والے مکان کی چھت پر تین آدمیوں کو سوتے دیکھا۔ نیچے تین دوست اور چھت پر تین دشمن۔ میں نے فیصلہ کیا اور نیچے آ گیا۔

نیچے آ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے تینوں دوست بے چین ہیں۔ انہیں شاید یہ خدشہ تھا کہ باہر کھڑی ہوئی فوجی جیب کو کوئی دیکھ نہ لے۔ صبح سے پہلے ہمیں کافی دور نکل جانا تھا۔ وہ تینوں بیٹھک میں تھے۔ انہیں میں نے صورت حال سے آگاہ کر دیا اور آخر میں کہا۔ ”تم تینوں سامنے والے مکان کے پچھواڑے چھپ جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“

تینوں دوست چلے گئے تو میں اندر والے کمرے میں پہنچا کہ مایاکور سے آخری بار مل لوں۔ اس نے مجھے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ میں گھر سے باہر آیا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔

میرے پہنچنے ہی گفتگو کے گھر کے پچھلے حصے سے میں اور تینوں دوست چھت پر چڑھ گئے۔

گھنشیام، گوپال اور بنواری کمری نیند میں تھے۔ تینوں دشمنوں کو ابدی نیند سلا کر جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے تینوں دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ ان تینوں کو دشمنوں پر ایک ساتھ فائر کرنا ہے۔ ہر چند کہ وہ میرے دوست تھے، مگر میرے نزدیک یہ ضروری تھا کہ قانون سے بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے سر ایک ایک قتل کا الزام ضرور ہو تاکہ کوئی دغا نہ کر سکے۔ میں نے اسی لئے اس وقت غیروں کے ہاتھوں بھی اپنے دشمنوں کی موت منظور کر لی تھی۔

شکر، موہن اور رگھو دیر نے اپنی اپنی رائفلوں کی ٹائیس دشمنوں کے سینوں پر رکھ دیں۔ میں نے

ہری میری بات سنتے ہی بگڑ گیا اور بولا۔ ”اس کا مطلب ہے تو مجھے اپنی ٹولی سے الگ رکھنا ہے؟ لیکن سن لے کہ اب میں اس جیب سے نہیں اتروں گا۔ تیری ٹولی میں شامل ہونے کی جو فیس ہاں دے۔“

”بس ایک قتل۔“ میری بجائے شکر نے جواب دیا۔

”بس..... وہ تو اگر تم لوگ نہ ملتے تو بھی ایک قتل کرنے والا تھا۔“ ہری یہ کہہ کر زور ہٹا۔

”کس کا قتل؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”پریم کا۔“ ہری نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے ڈر کر فرار ہو گیا تھا، مگر کئی دن کی تلاش کے بعد میں نے اس کا پتا لگا ہی لیا۔ جو بیس گھنٹے کے اندر اندر میں تمہاری فیس ادا کر دوں گا۔“

ہری سے باتیں ہوتی رہیں اور دھرم مگر آگیا۔ میں نے ہری کے کہنے پر جیب کو وجہ کے بتا کر گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک چڑ کے نیچے رکوایا۔ نانا کے گھر تک ہری نے خود ہی موہن کی رہنمائی تھی ورنہ میں تو پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا۔

”میں ابھی نانا اور باپو سے مل کر آتا ہوں۔“ میں نے جیب سے اترتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم لوگ چونکا رہنا۔“

میرے ساتھ ہی ہری بھی جیب سے اتر گیا اور بولا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں وجہ۔“

”چلو!“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھا۔

ہری نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں ہری۔“ ہری نے جواب دیا۔

نانا نے دروازہ کھولا۔ ہری کے ساتھ مجھے فوجی لباس میں دیکھ کر بوڑھے کی نظرس بھی دھوکا آ گئیں۔ اس نے فوراً پیٹھ پھیر لی اور قدرے ناگواری سے کہنے لگا۔ ”پولیس کے آدمی کو لے کر آدم رات کے وقت کیسے آنا ہوا ہری؟“ رات ہونے کے سبب وہ بوڑھا پولیس اور فوج کی وردی میں تیز تیز کر سکا تھا۔

میں نے ہری کو آنکھ سے اشارہ کیا، مقصد محض شرارت تھا۔ ہری نے میرا اشارہ پا کر کہا۔ ”نانا کی پولیس کا آدمی نہیں، فوج کا افسر ہے۔ وجہ فوج سے فرار ہو گیا ہے۔ یہ اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔ نانا کو پور میں بھی اس نے وجہ کو ڈھونڈا، مگر وہ وہاں بھی نہیں ملا۔“

میری نظر دروازے کے قریب ہی کھڑے ہوئے سوہن سنگھ پر پڑی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ ”ان کو تلاشی لینے دو۔ وجہ یہاں نہیں آیا۔“

”وجہ یہاں آیا ہے۔“ ہری زور دے کر کہنے لگا۔ ”میں نے اسے اپنی آنکھوں سے یہاں آتا دیکھا ہے۔“

بوڑھے نانا کے چہرے سے شدید غصہ جھلکنے لگا اور وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ ”کینے، دہری چال چل ہاں

ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ زیادہ مذاق اب منگنا پڑ جائے گا۔ فوراً ہی میں، نانا اور ہری کے درمیان آگیا اور بولا۔ ”نانا! خفا ہونے کی کیا بات ہے، وجہ واقعی یہاں آیا ہے۔ یہ دیکھو، وجہ تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہے۔“

”کیا؟“ نانا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ وہ یقیناً مجھے میری آواز سے پہچان گیا تھا۔

میں اور ہری، نانا کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئے۔ ہری نے دروازہ بند کر دیا۔ سوہن سنگھ بھی لپک کر قریب آگیا۔

”نانا! میں تین دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آیا ہوں۔“ میں نے فخریہ لہجے میں نانا کو بتایا۔

نانا نے مزید گرجوٹی کے اظہار کی خاطر مجھے سینے سے لگا کر دبایا اور پھر میری پیشانی چوم کر کہا۔ ”شبابش بیٹے، شاباش۔ تو نے سارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔“

”نہیں نانا! بڑا ابھی باقی رہ گیا ہے۔ تین میں تیسرا تو اس کے چچا کا بیٹا بنواری تھا۔ بڑا گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے۔“ میں بولا۔

نانا کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ بے مزہ ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”اس حرام زادے کو بھی آج ہی باہر جانا تھا۔ ارے اس شادی شدہ کو تو پہلے مارنا چاہئے ورنہ کہیں اس کے گھر بیٹا پیدا ہو گیا تو ہمیں اس کے جوان ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس طرح انتقام کا حساب باقی رہ جائے گا۔“

بوڑھے کا خدشہ غلط تھا، مگر میں اس کا نواسہ ہونے کے ناطے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسی وقت سوہن سنگھ نے مجھے مخاطب کیا اور میں اس آزمائش سے بچ گیا کہ بوڑھے کی بات کے جواب میں کچھ کہتا۔ سوہن سنگھ نے مجھ سے کہا۔ ”اپنی ماں سے مل آئے بیٹا؟“

”ہاں باپو۔“ یہ کہہ کر میں نے رخصت کی اجازت طلب کی۔ ”اس وقت تو میں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ فوج سے فرار ہونے والے تین ساتھی اور ہیں۔ ہری بھی ہمارے گردہ میں شامل ہو گیا ہے۔ آج سے ہم قانون کے باغی بن رہے ہیں۔“

میں نے بوڑھے نانا کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھے دعا دی۔ ”جانیے! بھگوان تجھے ہمیشہ فتح مند کرے، لیکن میری ایک بات اور یاد رکھنا، غریب آدمی کو کبھی تنگ نہ کرنا اور امیر پر رحم نہ کرنا۔“ ہری اور میں مڑ کر دروازے تک پہنچے تو بوڑھے کی آواز پھر سنائی دی۔ ”ٹھہرنا! گھوڑی اور ڈانک بھی لیتے جانا۔“ کچھ ہی دیر بعد گھوڑی کی لگام میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔ ”آج سے مانک تیری ہے۔ اس کی دقاری پر بھروسہ کرنا۔“

جب یہ باتیں ہوئیں، رات کے دو بج رہے تھے۔ بوڑھے نانا اور سوہن سنگھ سے رخصت ہو کر ہم باپچوں دوست کہیں کے کہیں نکل گئے۔

جیب ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے گھوڑی بھی اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ مجھے کافی

ہوشیار رہو۔ میں دوسرے تک پہنچ رہا ہوں۔ اس وقت صبح ہی صبح پولیس کا وہی دستہ ٹانک پور پہنچا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ متا کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں انبالہ جھاڑی میں ہوں تو اس نے کامیابی کے نشے میں سوہن سنگھ اور دھرم گمر میں وجے کے نانا کے گھروں سے گمرانی ختم کرا دی۔ مجھے اسی لئے وجے کے گھر جا کر کامیابی سے واپسی کا موقع بھی مل گیا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ختم کر دیا۔

ٹانک پور کے تھانیدار کو امر ترسے آنے والے پولیس کے دستے نے جگایا اور ایس پی متا کا پیغام دیا۔ وہ فوراً ہی تیار ہو کر تھانے سے نکلا۔ اس کے ساتھ پولیس والے بھی تھے۔

تھانیدار سیدھا وجے کے گھر پہنچا۔ وہاں خاموشی طاری تھی۔ دستک دینے پر بھی جب خاصی دیر دروازہ نہیں کھلا تو تھانیدار کے حکم پر ایک سپاہی اندر کود گیا اور کھڑی کھول دی۔ دروازے کے قریب ہی مایاکور بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی پیشانی کے ایک حصے پر خون جما ہوا تھا۔ زمین پر بھی خون کا دھبہ پڑا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ تھانیدار اسے ہوش میں لانے کے لئے اندر پانی لینے گیا تو ایک کونے میں اس نے چار گلاس رکھے دیکھے۔ گلاسوں کے کناروں پر لمبی کے جھاگ اب تک نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ جلدی سے پانی لے کر باہر آ گیا۔

مایاکور کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو اسے کچھ کچھ ہوش آیا۔ وہ کچھ بڑبڑائی، آنکھیں ذرا کھلیں، لیکن فوراً ہی پھر بند ہو گئیں۔ اسی حالت میں مایاکور نے برابر بیٹھے ہوئے تھانیدار کا ہاتھ تھاما اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وجے! میں تجھے نہیں جانے دوں گی بیٹے۔“

مایاکور کے یہ الفاظ سن کر تھانیدار کے لئے یہ سمجھ لینا بہر حال مشکل نہیں تھا کہ رات کو وجے وہاں ضرور آیا ہوگا۔ اسی کے جانے کے غم سے بڑھیا پر بے ہوشی طاری ہوئی ہوگی۔ تھانیدار کے ساتھ امر ترسے آنے والا ایک پولیس انسپکٹر بھی تھا۔ تھانیدار اس سے مخاطب ہوا۔ ”وجے آکر چلا گیا انسپکٹر۔“

”وہ اپنا دار کر گیا اور تم لوگ سو تے رہ گئے۔“ انسپکٹر نے خفا ہو کر کہا۔ تھانیدار شرمندہ نظر آنے لگا۔ انسپکٹر غصے سے مزید بولا۔ ”اب کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، سامنے والے گھر میں معلوم کرو کہ اندر کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں؟“

انسپکٹر کا حکم سن کر تھانیدار نے کرتار سنگھ کے دروازے پر دستک دی۔ فوری طور پر کوئی جواب نہیں ملا تو تھانیدار مردہ سی آواز میں پکارا۔ ”کرتار سنگھ گھر پر ہے؟ دروازہ کھولو۔“ پھر وہ بار بار دروازے پر دستک دینے لگا۔

کانی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا کا چہرہ نظر آیا جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کرتار سنگھ کی چچی ہے۔

”گھر میں کوئی مرد ہو تو اسے فوراً جگاؤ۔“ تھانیدار نے بارعب آواز میں کہا۔

”کرتار تو اپنی بیوی کے ساتھ سسرال گیا ہے، گھنٹیاں، گوپال اور میرا بیٹا چھت پر سو رہے ہیں۔“ چچی نے بتایا۔

عرسے کے بعد ٹانک پر سواری کا موقع ملا تھا اس لئے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ سارے کام آسانی سے انجام پاتے جا رہے تھے۔ ہری تو مل گیا تھا مگر مجھے اس کا افسوس ضرور تھا کہ ٹکلتلا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ اپنے رقیب کرتار سنگھ کے زندہ بچ جانے پر بھی میں اداس تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ٹکلتلا سے ملاقات نہ ہونا ایک طرح سے میرے حق میں بہتری ہوا تھا کیوں کہ میں ٹکلتلا کے سامنے شاید کسی کو قتل نہ کر سکتا۔ جس عورت نے میری خاطر بے شمار ظلم سے، جس نے اپنا وجود مجھے سوہن دیا، کیا میں اس کے سہاگ کو اجاڑ سکتا تھا۔ اور کیا میرے ساتھی کرتار سنگھ کو زندہ چھوڑ جانے پر رضامند ہوتے۔ اپنے ساتھیوں کو اب تک میں نے ٹکلتلا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر وجے کا نانا بھی کرتار سنگھ کو زندہ چھوڑنے پر ناراض ہوتا۔ یہی ساری باتیں اس وقت میرے ذہن میں چکر ا رہی تھیں۔ اسی وقت ہری نے مخاطب کیا اور پریم کے بارے میں بتانے لگا۔

ہولی پر پریم کی خالہ، ٹانک پور آئی تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کو خالہ نے سنت گڑھ میں پریم کے لئے پسند کیا تھا۔ اب وہ بہن اور بہنوئی کو دکھانے کے لئے لڑکی کو ساتھ لائی تھی۔ ہری کو بھی اس کا پتا چل گیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہری جس کی تلاش میں ہے، وہ سنت گڑھ میں اپنے خالو کا ہوٹل چلا کر مزے کر رہا ہے۔ ہری نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مفتی ہونے سے پہلے پریم کو ختم کر دے گا۔ ایسے میں اس کی ملاقات مجھ سے ہو گئی۔

جیب تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ ہری نے موہن سے پوچھا۔ ”سنت گڑھ یہاں سے کتنی دور ہوگا؟“

”سنت گڑھ تو دوسری طرف ہے۔ کیوں وہاں کیا کام ہے؟“

”میرا شکار پریم وہیں ہے۔ اگر یہ کام کر لیا تو سر سے ایک بوجھ اتر جائے گا۔“ ہری نے جواب دیا۔

”یار! اب ذرا آرام کی بات کر۔“ شکر نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”جیب میں بیٹھے بیٹھے اب تو جم بھی دیکھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر سوئیں گے، تھوڑا نشہ پانی کریں گے، ایک آدھ مرغی کھائیں گے، پھر دوسرے کام کی بات ہوگی۔“

پھر ہم سب ایک گاؤں میں پہنچ گئے جہاں رات کا بقیہ حصہ گردوارے سے ملحق ایک سرائے میں گزرا۔

صبح ہی صبح اپنے ساتھیوں سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ٹانک پور کا خیال آیا جہاں گزشتہ رات تین افراد کا قتل ہوا تھا۔ میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں پولیس کا کیا رد عمل ہے۔ ٹانک پور سے دور رہنے کے باوجود میں اپنے دھیان کی پراسرار قوت کے ذریعے سب کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ پولیس کہیں وجے کی ماں مایاکور کو پریشان نہ کرے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ٹانک پور تھانے کا تصور کیا۔ پھر مجھے جو معلوم کرنا تھا، پتا چل گیا۔

ایس پی متا نے انبالہ جھاڑی سے امر ترسے پولیس کو اطلاع دی کہ مجرم، فوج سے بھی فرار ہو گیا ہے۔ مسلح پولیس کے ایک دستے کو فوراً ٹانک پور روانہ کیا جائے۔ مجرم رانٹلیں اور جیب لے کر بھاگے ہیں۔

”ارے ماں، جو بھی ہو اسے جلدی حاضر کرو۔“

بڑھیا گھبرا کر پوچھنے لگی۔ ”ان سے کوئی قصور ہو گیا ہے کیا؟“

اس وقت تک انسپکٹر بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑھیا کو یوں گھورا کہ وہ جواب سننے کے لئے نہ رک سکی اور جلدی سے چھت کی میڑھیاں چڑھنے لگی۔ انسپکٹر اور تھانیدار نیچے کھڑے تھے۔ ذرا ہی دیر میں ایک دل دوزخ سنائی دی۔ بڑھ رو رو کر بین کئے جا رہی تھی۔ ”ارے میں لٹ گئی۔ کسی نے میرے بیٹے اور دونوں بھتیجیوں کو مار ڈالا۔“

بڑھیا کے بین سن کر انسپکٹر اور تھانیدار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر لپک کر میڑھیاں چڑھ گئے۔ چھت پر تین لاشیں پڑی تھیں۔ گھنشیام اور گوپال رات کو ہوئی کے رنگ برنگ کپڑے پہن کر ہی سو گئے تھے، مگر اس وقت ان سارے رنگوں میں خون کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ زمین پر بھی خون جم گیا تھا۔ گھنشیام کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ گوپال کا ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ منظر ہلا دینے والا تھا۔ بڑھیا اپنے بیٹے بنواری کی لاش سے ایسے لپٹ گئی تھی جیسے اس طرح بنواری ابدی نیند سے جاگ جائے گا۔

ذرا سی دیر میں گاؤں بھر کے لوگ جمع ہو گئے۔ سبھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس کس کو قتل کیا گیا ہے۔ سب کو پتا تھا کہ اگر وجہ زندہ ہے تو وہ واپس آئے گا اور قیامت بپا کر دے گا۔ لوگ یہی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وجہ کہاں سے آیا؟ اس کے ساتھ اور کون تھا؟ اس بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ وجہ کو پتا چل گیا کہ کرتار سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ سسرال گیا ہے تو وہ اس کا بھی وہیں کام تمام کر دے گا۔

ایک شخص نے سپاہیوں کو دیکھ کر طنز کیا۔ ”یہ لوگ تو ہمیشہ کام پورا ہو جانے کے بعد ہی تماشا دیکھنے آتے ہیں۔“

پانچ آدمیوں کو بلا کر تھانیدار نے مشیر نامہ تیار کیا۔ چچی کو چار پانچ عورتوں نے پکڑ کر ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ وہ اب اچھی بین کر کے سر پیٹ رہی تھی۔

انسپکٹر نے دو پولیس والوں کو امر تر روانہ کر دیا تاکہ ایس پی متا کو تفصیلی رپورٹ دی جاسکے اور وہ ٹانک پور آ جائے۔ چار چھ پولیس والوں کو قاتلوں کا پیچھا کرنے اور سراغ لگانے کے لئے بھیجا گیا۔ دو پولیس والوں کو دھرم نگر روانہ کیا گیا تاکہ وجہ کے تانا سے کوئی اطلاع مل سکے تو لے آئیں۔

تینوں لاشوں کو نیچے لاکر محن میں رکھا گیا۔ اب مزید کارروائی کے لئے ان لاشوں کا ہسپتال لے جانا باقی تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کرتار سنگھ، گھنٹلا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ لوگ کیوں جمع ہیں؟“ کرتار سنگھ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ذرا دل کو مضبوط رکھنا کرتار سنگھ۔ بڑا افسوس ناک واقعہ ہو گیا ہے۔“ کسی نے جواب دیا۔

کرتار سنگھ بوکھلایا ہوا سا اپنے گھر میں داخل ہوا۔ دلہیز پر قدم رکھتے ہی وہ ٹھک کر رک گیا۔ اس

کی نظریں محن میں تین لاشوں پر جمی ہوئی تھیں جنہیں سفید چادروں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گھنٹلا کے ہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر گاؤں والوں نے لاشوں کے چروں سے ادا رہیں بٹا دیں۔ کرتار سنگھ مردہ بھائیوں کی صورتیں دیکھ کر دوڑا اور چارپائیوں کے پاس بیٹھ کر ان کے روتے ہوئے ہاتھ پھیرتے ہوئے دہائیں مار مار کر رونے لگا۔

گھنٹلا اندر جا کر چچی سے لپٹ کر رونے لگی۔ پہلے تو چچی نے اسے سینے سے لگا کر بین کئے، پھر دھکا دے کر دور بٹھا دیا اور بولی۔ ”ڈھونگ رہنے دے۔ تجھے پتا ہو گیا تھا کہ وجہ نہ کام کرنے کے لئے آئے۔ جانے سے پہلے تو اس کی ماں سے ملنے گئی۔ تو اسی لئے اپنے میاں کو بچانے کے لئے اسے میکے لے گئی۔ بچ۔ حرافہ۔ کیتا۔“

گھنٹلا حیران حیران سی نظروں سے چچی کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ دنیا یہ گالیاں اور الزام اس کے لئے ناقابل برداشت ہوں گے۔ وہ دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کرتار سنگھ بھی اس کے پیچھے لپکا اور اسے روٹی کی طرح دھنکے لگا۔

اپنی محبوبہ کو رقیب کے ہاتھوں پختہ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں آپ ہی آپ اسے برا بھلا کہنے لگا۔

”ارے وجہ، تو یہ کسے گالیاں بک رہا ہے خواب میں میرے بار۔“ میری سماعت سے ہری کی آواز لڑائی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسی کے ساتھ میرے دھیان کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ منظر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا جس نے میرا خون کھولا دیا تھا۔

ہری کے علاوہ میرے تینوں فوجی دوست بھی جاگ چکے تھے۔ آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے وہ مجھے بدن میں سمجھتے تھے اور جگایا نہیں تھا۔ پھر جب میں غصے میں بڑبڑانے لگا تو ہری نے مجھے مخاطب کر ہی لیا۔

”ج ہو چکی تھی اور میرے دوست کو پیٹ پوجا کی فکر تھی۔“

فکر نے مرغی کی فرمائش کی۔ رگھو دیر نے کہا۔ ”میں اس گاؤں میں پہلے بھی آچکا ہوں یہاں ایک دیوی کا مندر بھی ہے۔ عقیدت مند اس کی منت مانتے ہیں اور منت پوری ہونے پر بکرے کی جینٹ لڑاتے ہیں۔ وجہ کی بھی آج منت پوری ہوئی ہے۔ اس نے اپنے دشمنوں کو گھنٹلا کر دیا ہے۔ کیا خیال ہے؟“ آن دیوی کے پرشاد سے پیٹ نہ بھرا جائے؟“ یہ کہہ کر رگھو دیر ہم سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ تجویز سبھی کو پسند آئی۔ طے یہ ہوا کہ ہری، مندر میں جائے۔ فوج سے فرار ہوتے وقت جو ٹانھ ستر روپے سب لے کر چلے تھے، وہ موجود تھے۔ آنے والے دن کس طرح گزریں گے؟ اس کی فکر کہیں سے کسی کو نہیں تھی۔ اس زمانے میں خاصا موٹا تازہ بکرا بچتیس تیس روپے میں آ جاتا تھا۔ ہری کو دلپے دے دیئے گئے۔

ہری گھوڑی پر روانہ ہو گیا۔ ہم چاروں ساتھیوں نے آئندہ کے بارے میں بات شروع کر دی۔ نما نے کہا۔ ”سب سے پہلے تو ہمیں اس فوجی جیپ سے جان چھڑانی چاہئے۔ جیپ کی جگہ اب ہمیں چار

”بھئی میں تو اپنے باپ سے لڑ کر آیا ہوں۔ ظاہر ہے، اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔“ موہن نے اس طرح کہا جیسے اسے سخت افسوس ہو کہ اس کی کسی سے عداوت نہیں۔

”یار! یہاں تو تمہیں ہی جھکنا ہوگا۔“ میں نے گویا فیصلہ منادیا۔

اتنے میں ہری، مندر سے لوٹ آیا اور ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بکری کا سر تو دیوی کے قدموں میں ڈال آیا تھا، مگر باقی بکرا ساتھ لے کر آیا تھا۔

رگھویر نے فوراً بکری کو پکانے کا بندوبست کیا۔ ضروری سامان ہری ساتھ ہی لایا تھا۔ واپسی میں اس نے شراب کی کچھ بوتلیں بھی خرید لی تھیں تاکہ دوبارہ نہ جانا پڑے۔ اب ہری کو میں نے دوسرا کام بتایا۔ ”ہمیں اس جپ کو چھٹی دینی ہے، لیکن نہ ہم اسے کہیں راستے میں چھوڑیں گے، نہ ہی کسی کو مفت دیں گے۔ سنت گڑھ جانے کے لئے دوسری گاڑی درکار ہے۔ اب کوئی ترکیب سوچو۔ دیے مجھے معلوم ہے تمہارا دماغ زیادہ کام نہیں کرتا۔“

یہ سن کر ہری نے اپنی پیشانی پر ایک مکا مارا اور بولا۔ ”مجھے تمہارے اس طعنے سے بچنے کے لئے کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ ذرا کھلی ہوا میں جا کر چکر لگاتا ہوں، شاید کوئی ترکیب آجائے دماغ میں۔“ یہ کہہ کر ہری ہنستا ہوا چلا گیا۔

ہری جب واپس آیا تو میں اور میرے تینوں فوجی ساتھی نما دھو کر تیار ہو چکے تھے۔ فوجی لباس بھی ہمارے لئے خطرے کی علامت ہی تھا، مگر ہم نے اسے مزید ایک روز استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فوری طور پر کہیں سے دوسرے لباس کا بندوبست کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔

ہری نے آتے ہی کہا۔ ”وہج! اب میرا دماغ کچھ کچھ کام کرنے لگا ہے۔ گاؤں میں ایک سردار جی موٹر سائیکل کا کام کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس سے جپ کے بدلے میں وہ گاڑی نہ لے لی جائے۔“

میں ہنس کر بولا۔ ”ہری! تو نے ترکیب تو اچھی سوچی ہے، لیکن اس طرح گاڑی بدلنا آسان تو نہیں۔ فوجی گاڑی کون لے گا؟ اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو اٹلے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر بھی تو نے جگہ ڈھونڈی ہے تو میں بھی کوئی راستہ نکالوں گا۔ کھانا کھا کر نکلتے ہیں۔“

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جب ہم سرائے سے نکلے تو سورج سر پر آچکا تھا۔ ہلکی گرم ہوا گرمیوں کی آمد آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ہری گھوڑی پر سب سے آگے روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے چلتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ ہم تمہارے پیچھے چل رہے ہیں۔ سردار جی کے گھرانے کے پاس ہم جپ روک لیں تو بھی تم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہنا۔“

گیرج کے قریب پہنچ کر میں نے جپ رکوائی اور موہن سے سرگوشی کر کے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ”کیا حال ہے سردار جی؟“

”آئیے سرکار، آئیے۔“ سردار جی نے ہمیں گاہک سمجھ کر ہمارا استقبال کیا۔

”ایک ٹھیکانہ پر ڈول چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے گیرج کے کونے میں کھڑی فورڈ کار میں نے دیکھ لی۔

گھوڑوں کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ ہری کو پریم کے قتل کا جو فریضہ انجام دینا ہے، وہ آج شام تک ادا ہو جانا چاہئے۔ اس کے بعد رات ہم کسی جنگل میں بسر کریں گے۔ ہری کے لئے ایک راکفل کا بندوبست بھی کرنا ضروری ہے۔ پریم کے قتل کرنے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر راند رکھیں نہ کہیں ہمیں ڈاکا بھی ڈالا جائے تاکہ پولیس کو اوپر تلے کئی جھٹکے محسوس ہوں۔“ میں پولیس سے معرکہ آرائی کے معاملے میں ”پرانا پانی“ تھا، ظاہر ہے یہ بات میرے ساتھیوں کو پتا نہیں تھی۔ میں اسی لئے اپنے گزشتہ تجربات کی روشنی میں پلاننگ کر رہا تھا۔ مجھ سے ہتر پولیس والوں کی نفسیات کو اور کون سمجھتا۔ میرے ساتھی تو اس معاملے میں قطعی نا تجربہ کار تھے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولا۔ ”ڈاکا ڈالنے سے ہمیں بھی کار تو س خریدنے کے لئے پیسے مل جائیں گے۔ پولیس پر اس ڈاکے کا الگ رعب پڑے گا۔ کسی ایک مقام پر ہم بارہ گھنٹے سے زیادہ فی الحال نہیں رکھیں گے۔ ہر جگہ ہمیں ایسے آدمیوں کو تلاش کرنا ہوگا جو آہرا دے سکیں۔ اگر کسی کو دھمکی دینے یا ڈرانے سے کام نکل جائے تو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی بے وفائی کرے یا پولیس کا پیارا بننے کی کوشش کرے تو اسے ڈھیر کرنے میں دیر نہیں لگانی۔ بس اتنا یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ پولیس ہماری دشمن، مادر ہمارے شکار اور غریب عوام ہمارے دوست ہیں۔“ میں نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کے چروں کا جائزہ لیا، پھر کہا۔

”کسی کو کوئی اعتراض؟“

”ہمیں منظور ہے۔“ سب یک زبان ہو کر بولے۔

پھر رگھویر بولا۔ ”میرے باپ کی زمین چھیننے والے جاگیردار سے بھی انتقام لینے کے بارے میں سوچنا ہے۔“

”رگھویر! اب وہ تمہارا دشمن نہیں ہے۔ وہ ہماری پوری ٹولی کا شکار ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، اس کی بھی ہم اچھی طرح خبر لیں گے۔“

شکر کہنے لگا۔ ”میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، اس کے باپ نے کہیں اور اس کی شادی کر دی۔ مجھے اس کا بہت صدمہ ہے۔“

شکر کی بات سن کر مجھے شکستہ یاد آگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کل یہی سوال میرے سامنے بھی آ سکتا ہے۔ جو اصول بنایا جائے گا اس پر مجھے بھی عمل کرنا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ ”شکر! یہ ایک نازک سا جذباتی مسئلہ ہے۔ کسی عورت سے سب روستی کرنا نا انسانی ہے۔ ہم قانون کی کھل کر خلاف ورزی کریں گے، لیکن قدرت کے قوانین کا ہمیں پاس رکھنا ہوگا ورنہ ہم راہ سے ہٹک جائیں گے اور زیادہ عرصے اپنی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکیں گے۔“ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود شکر مجھے مطمئن نظر نہیں آیا تو بولا۔ ”ہاں اگر وہ لڑکی اپنے شوہر سے ناخوش ہو اور اب بھی تم سے پیار کرتی ہو تو میں خود جا کر اسے اپنے ساتھ لاؤں گا۔“

میری بات سن کر شکر کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ یقیناً اسے اپنی محبت پر بھروسہ ہوگا۔

اب میں موہن سے مخاطب ہوا۔ ”موہن! تمہیں کچھ نہیں کہنا؟“

سردار جی نے فوراً اپنے لڑکے کو ایک گیلن پٹرول جیب میں ڈالنے کا حکم دیا۔ میں اتنی دیر میں قریب سے کار کا معائنہ کر چکا تھا۔

”سردار جی! اس گاؤں میں کیا ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس موٹر گاڑیاں ہیں؟“ میں نے ذرا حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں سرکار! گاؤں میں یہ ایک ہی گاڑی ہے، لیکن یہ بھی اب جاری ہے۔ جاگیردار صاحب نے اسے دو سال پہلے خریدا تھا، مگر اب ان کی حالت پتلی ہو گئی ہے اس لئے بیچنے کو کہتے ہیں۔ یہاں کیوں کہ اکثر مالدار یا تری آتے رہتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے، کوئی گاہک مل جائے گا۔“ سردار جی نے تفصیل سے جواب دیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں گاڑی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ غالباً اسی خیال سے اس نے گاڑی کی تعریف شروع کر دی۔ ”ایک دم چالو ہے۔ تیس میل دیتی ہے۔ دو سال میں ایک مرتبہ بھی مرمت کی ضرورت نہیں پڑی۔ انجن کا تو جواب ہی نہیں۔“

”پھر تو گاڑی واقعی اچھی ہے۔ ہمارے کرنل صاحب بھی آج کل کسی اچھی گاڑی کی تلاش میں ہیں۔ میں ان سے بات کروں گا۔“ میں نے سردار جی کو دانہ ڈالا۔

سردار جی خوش ہو گیا۔ اس نے لڑکے کو چار گلاس لسی لائے کو کہا۔ میں نے موہن کو بلا کر گاڑی کا انجن وغیرہ چیک کرنے کی ہدایت دی۔

”اگر آپ کے کرنل صاحب یہاں نہ آسکیں تو میں گاڑی آپ کہیں تو وہاں لے آؤں گا۔“ سردار جی نے سودا پکا کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔

”نہیں، فی الحال تو وہ چھٹی پر ہیں اور سنت گڑھ میں ہیں، خود آکر دیکھ لیں گے۔“ میں بولا۔ ”ہم انہی سے ملنے کے لئے جا رہے ہیں۔ میں بات کر لوں گا، لیکن گاڑی کے دام مناسب ہونے چاہئیں۔“ اسے پھینتے دیکھ کر میں نے ڈور کو مزید ڈھیل دی۔

”ارے سرکار، یہ بھی کہنے کی بات ہے۔ اپنے کو تو سو پچاس روپے دلالی مل جائے، بہت ہے۔ ہم تو بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کے فائدے کی سوچتے ہیں۔“

سردار جی نے کہا اور پھر ہم سب کو لسی کے گلاس تھما دیئے جو لڑکے کے پاس آ رہا تھا۔ لسی پینے کے بعد پٹرول کے پیسے دے کر ہم چاروں جیب میں سوار ہو گئے۔ موہن جیب کو اشارت کر رہا تھا کہ میں نے ایک نوکیلی سلاخ ٹائر میں لگا دی۔ جیب ذرا ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا سننے ہی سردار جی دوڑا دوڑا آیا۔

”مصیبت ہو گئی سردار جی۔“ میں نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

”کوئی بات نہیں، میں ابھی پیچھے لگائے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سردار جی وہیل کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اسی وقت سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بول اٹھا۔ ”لیکن ہمیں فوراً کرنل صاحب کے پاس پہنچنا تھا۔ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اگر ہم دیر سے پہنچے تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔“

سردار جی نے ذرا دیر کچھ سوچا، پھر خوش ہو کر کہا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ فورڈ کار لے

ہے۔ اس طرح کرنل صاحب کو گاڑی بھی دکھا سکیں گے اور اس میں سڑکر کے آپ کو گاڑی کی حالت بھی بتا چل جائے گا۔“

سردار آخر زبردست آہی گیا۔ میں نے چہرے سے اپنی دلی کیفیات کا اظہار نہ ہونے دیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، بات تو صحیح ہے۔ اگر کرنل صاحب کو یہ گاڑی پسند آگئی تو ہم انہیں اسی گاڑی میں ساتھ لے آئیں گے تاکہ سودا ہونے کی صورت میں فوری ادائیگی بھی ہو جائے۔“

سردار جی نے لڑکے کو گاڑی صاف کرنے کا حکم دیا اور اس میں دو گیلن پٹرول بھی ڈلوادیا۔ پھر اس نے جالی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تک آپ واپس آئیں گے، جیب ایک دم ریڈی ہوگی۔“

مجھے پوری امید ہے کہ کرنل صاحب کو گاڑی پسند آجائے گی۔“

فوجی جیب اس کار سے بہر حال منگنی تھی اس لئے سردار جی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہم جیب کے بدلے وہ کار لے آئیں گے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے بات بن جائے گی۔ اگر سردار جی کو وہ کار پہنچی نہ ہوتی تو میں کوئی اور راستہ نکالتا۔

ہم چاروں دوست کھلی فورڈ میں بیٹھ گئے اور اسے اشارت کر دیا۔ فورڈ کو بھی موہن ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

ہری گھوڑی پر آگے جا رہا تھا۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ جب کار، گھوڑی کے پاس پہنچی تو میں نے ہری سے مذاق کیا۔ ”اوتے مسافر، سنت گڑھ کا راستہ کون سا ہے؟“

ہری گھوڑی سے کود کر نیچے آگیا اور بولا۔ ”یار! تو تو دنیا کے تمام راستوں سے واقف ہے، آخر سردار جی سے گاڑی لے ہی آیا۔“

اب میں مانک پر سوار ہو گیا اور کہا۔ ”گاڑی کے بدلے اسے جیب ہم دے آئے ہیں۔ شام تک بے چارہ بڑی لگن سے ہمارا انتظار کرے گا۔ پھر وہ جائے اور اس کا کام۔“

اس کے بعد کار آگے بڑھ گئی۔ سنت گڑھ آگیا تو میں نے گھوڑی ہری کے حوالے کر دی۔ راستے میں، میں نے پریم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

”جا ہری، چھپ کر معلوم کر کے آ کہ پریم ہوٹل میں ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کس جگہ بیٹھا ہے؟“ میں نے ہری کو مخاطب کیا۔

ہری گیا اور ذرا ہی دیر میں واپس آگیا۔ اس نے بتایا۔ ”وجہ! وہ ہوٹل میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں بولا۔ ”تو مجھے دور سے وہ ہوٹل دکھا کر واپس آ جا۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح ہوٹل سے باہر نکالتا ہوں۔ آگے کا کام تم لوگوں کو کرنا ہے۔“ پھر میں نے اپنے منصوبے کی تفصیل سے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔

ہری نے خوش ہو کر کہا۔ ”یار وجہ! تیرا دماغ بھی کمال ہے۔ اس میں ترکیبوں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔“

میرے ایما پر ہری مجھے ہوٹل تک چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ میرے ہاتھ میں ڈانگ تھی۔ میں کاؤنٹر پر

”ہاں میں، تیری موت۔“ ہری نے رانقل کی ٹالی اس کے سینے پر رکھ دی۔ یہ رانقل قریب بیٹھے ہوئے موہن کی تھی۔

اسی وقت موہن نے کار روک لی اور پریم گڑگڑانے لگا۔ ”ہری! مجھے معاف کر دے۔ میں تیرا غلام نہ کر رہوں گا۔“

”مجھے غلام کی ضرورت نہیں، دوست کی ضرورت ہے اور تو ہمارا بے وفا دوست ثابت ہوا ہے۔“ ہری نے جواب دیا۔ ”غدار کی کا انعام تجھے ابھی مل جائے گا۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں ہری کار ہی میں گولی مار کر پریم کو ٹھنڈا نہ کر دے، اسے مخاطب کیا۔

”نہیں ہری! اسے کار سے اترنے دو۔“

پریم شاید میری بات کا کچھ اور ہی مطلب سمجھا اور راستے ملتے ہی کار سے اتر کر ایک طرف بھاگا۔ شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی جان بخش دی ہے۔ پریم کے قتل کی ذمہ داری مجھ نہیں، ہری پر تھی۔ میں نے اسی لئے اپنی گھوڑی اور ڈانگ اس کے حوالے کر دی۔

”ہری! اسے زیادہ اذیت مت دیجو۔“ میں نے اس وقت کہا جب ہری گھوڑی پر سوار ہو رہا تھا۔

ہری نے اقرار میں گردن ہلا کر گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ پریم زیادہ دور نہیں جاسکا تھا کہ ہری گھوڑی اڑاتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ہری نے گھوڑی کی لگام کھینچی اور گھوڑی اپنی اگلی دو ٹانگیں اونچی کر کے لگ گئی۔ ہری نے برہمی گلی ڈانگ بلند کی اور آن کی آن میں برہمی پریم کے شانے کو چھیدتی ہوئی نکل لی۔ وہ وہیں پیٹ کے بل گر گیا۔ ہری گھوڑی سے کودا اور لات مار کر پریم کو سیدھا کیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے پریم کے پیٹ میں برہمی گھونپ دی اور جب برہمی نکالی تو خون کا زبردست فوارہ سا بلند ہوا۔

اس وقت تک ہم بھی کار آگے بڑھا کر وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ ہری نے برہمی کو مٹی لگا کر صاف یا اور پھر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔

چند ہی لمحے بعد ہماری کار اور گھوڑی تیزی سے منزل طے کر رہے تھے۔ ذرا آگے جا کر میں نے بل پولیس والے کو آتے دیکھا تو کار رکوا لی اور پولیس والے کو مخاطب کیا۔ ”ارے او! یہ راستہ کس طرف جاتا ہے؟“

پولیس والا ہمارے جسموں پر فوجی وردی دیکھ کر مرعوب سا نظر آنے لگا۔ اس نے بتایا۔ ”صاحب! وڈا آگے جا کر یہ راستہ دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ ایک راستہ جنگل کی طرف جاتا ہے، دوسرا ٹانگ پور طرف۔“

میں نے یہ سننے کے بعد کہا۔ ”اچھا اب میری بات غور سے سنو۔ یہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے ایک لاش پڑی ہے۔ ہمارے بہادر ساتھی ہری نے پریم کو قتل کیا ہے۔ ہوش والے کو اس کے لپٹے کے قتل کی اطلاع دے دیا، پھر امرتسر پولیس کے ایس پی متا کو اطلاع دینا کہ وجہ کی ٹولی نے ٹیس گھنٹے میں یہ پوچھا تھا کیا ہے۔ اگر متا کو زندگی پیاری ہو تو پنجاب چھوڑ کر چلا جائے ورنہ گالیاں اور

بیٹھے پریم کی نظر بچا کر ہوٹل میں داخل ہو گیا اور ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میری پشت پریم کی طرف تھی۔ نے دیکھا، پریم کے برابر ایک اندھا بیٹھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پریم کا خالو ہوگا۔

لٹی پینے کے بعد میں تھڑے (کاؤنٹر) پر گیا اور پانچ روپے کا نوٹ رکھا۔ پریم نے میری طرف رخ بغیر کہا۔ ”ارے بھائی! ابھی تو دکان داری کہاں ہوئی ہے۔ کھلے پیسے دو۔“ یہ کہہ کر اس نے نظر اٹھائی اور مجھے دیکھتے ہی جیسے اس کے ہوش اڑ گئے۔

پریم کی حالت دیکھ کر پہلے تو میں ہنسا، پھر اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر فرار کی راہ ڈھونڈ رہا ہو۔ میرے ہاتھ میں برہمی دالی ڈانگ دیکھ کر وہ لرز رہا تھا۔ میں بھی جان بوجھ کر فاصلے پر کھڑا تھا تاکہ پریم کو بھاگنے کا راستہ مل جائے۔ دوسرے ہی لمحے پریم تھڑے سے کود کر بھاگنے لگا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ پریم ہوٹل سے نکلے ہی دو فوجیوں سے ٹکرایا۔ انہوں نے پریم کو روکا اور مجھے دیکھ کر ایک فوجی نے میری طرف رانقل تان لی۔ میں رک گیا۔

پریم نے فوراً کہا۔ ”بچائیے..... مجھے بچائیے۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔“ وہ میرے ہی ساتھی فخر اور رگھویر سے فریاد کر رہا تھا۔

”ہمت دیکھو ہیں مارنے والے۔“ فخر بولا اور مجھے برا بھلا کہنے لگا۔

رگھویر نے پریم کو کار میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”چل بیٹھ جا، ہم تجھے تیرے گھر چھوڑ آتے ہیں۔“

کار لے کر وہ ہوٹل کے قریب ہی آگئے تھے۔

پریم کے کار میں بیٹھتے ہی موہن نے کار آگے بڑھا دی۔ ہری موہن کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ پچ ایک طرف رگھویر اور دوسری طرف فخر اور درمیان میں پریم تھا۔ میں گھوڑی پر کار کے پیچھے ہی چلا رہا تھا۔ دوسرا ہو گئی تھی اور اس لئے سڑک پر زیادہ لوگ نہ تھے، جو تھے بھی تو ان کی سمجھ میں بات آ۔ سے پہلے ہی کار اور گھوڑی ان کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ میں کار کے بالکل پیچھے پیچھے گھوڑی دو رہا تھا۔

مجھے پیچھے آتے دیکھ کر پریم تقریباً چیخ کر بولا۔ ”فوجی بھائیو! وہ..... وہ دیکھو۔ میرا تعاقب کر رہے، وہ مجھے..... مجھے اس سے بچالینا۔“

آگے بیٹھے ہوئے موہن نے کہا۔ ”کوئی پرانی دشمنی معلوم ہوتی ہے۔ ٹھہرو! ہم ابھی گاڑی روک فیصلہ کئے دیجے ہیں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ پریم زور سے بولا۔ ”اس بد معاش اور اس کے ایک دوست کی باتوں میں کر میں پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی، لیکن وہ یہاں تک آپہنچا۔ یہ نامزد جو گھوڑی بیٹھا پیچھا کر رہا ہے کسی کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔“

پریم کے منہ سے آخری الفاظ نکلے ہی میں نے دیکھا کہ ہری نے مرکز ایک زوردار تھپڑ اس منہ پر جڑ دیا اور چیخا۔ ”کتے! تو نامزد کسے کہہ رہا ہے۔“

”ہری..... ہری۔ تہ..... تہ۔“ پریم ہلکا کر رہ گیا۔

گولیاں کھانے کے لئے تیار رہے۔

پولیس والے کے پاس صرف ایک لاشی تھی۔ ہم سب مسلح تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑکیا پھر چند ہی لمبے بعد وہ آنکھیں بند کر کے گاؤں کی طرف اس طرح بھاگا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا۔ سپاہی کی اس حرکت پر ہم بھی کو ہنسی آگئی۔

”چلو! گاڑی دوڑا دو۔ آج کی رات ہم جنگل میں بسر کریں گے۔“ میں نے موہن سے کہا۔
کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی اس دوراہے پر آگئی، سپاہی نے جس کی نشاندہی کی تھی۔ موہن نے گاڑی کو جنگل کے راستے پر ڈال دیا۔

اس وقت دن ڈھل چکا تھا جب ہم جنگل میں داخل ہوئے۔ دونوں طرف اکی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر گاڑی سے آگے ہری ”ٹانک“ پر سوار اڑا جا رہا تھا۔ ہم کافی دیر اور کافی دور تک جنگل میں بڑھتے رہے۔ جب اندھیرا ہو گیا تو ہم رک گئے۔ ہم نے ہری کو گھوڑی پر بیٹھ کر کہ آس پاس کوئی آبادی ہو تو اس کا ہانکا کر جلد واپس آئے۔ باقی دوست سستانے لگے۔

کچھ دیر میں ہری لوٹ آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آتے ہی اس نے خبر دی کہ یہاں سے تھوڑی دور بنجاروں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور اس وقت وہ آگ جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہیں۔ ہری کی بات سنتے ہی میں بول اٹھا۔ ”بہت اچھی خبر لائے ہو تم۔ آج کی رات کھانے پر ہم انہی بنجاروں کے مہمان بنیں گے۔“

پھر ہم لوگ کار میں سوار ہو کر ہری کے ساتھ بنجاروں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں شکر کی مرغی کھانے کی خواہش بھی آسانی سے پوری ہو گئی تھی۔ فوج میں کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا سکھ، سبھی گوشت خور تھے۔ اکا دکا ہی کوئی کٹر قسم کا ہندو گوشت نہیں کھاتا تھا اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ شراب اذر گوشت خوری ہم سبھی دوستوں کی عادت تھی۔

جب کھانا ختم ہوا تو بنجاروں نے ناچ گانے کی محفل جمادی۔ ہم لوگوں کے علاوہ صرف بنجاروں کے قافلے میں عورتیں اور بچے ملا کر ساٹھ افراد بنتے تھے۔ یہ محفل رات گئے تک جی رہی۔ اس کے بعد ہم سب دوست بنجاروں کے فراہم کردہ بستر پر جا کر ایسے سوئے کہ پانچ چھ گھنٹے بعد آنکھ کھلی۔ آرام کر کے ہم اب پہلے سے زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ہم نے بنجاروں کے سردار کو بلایا۔

سردار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”مہمان نوازی کا شکریہ! مگر جاتے جاتے ہم تمہیں ایک حقیقت بتائے دیتے ہیں۔ ہمارا تعلق فوج سے نہیں ہے، ہاں پہلے ہم فوجی ضرور تھے، مگر اب ڈاکو ہیں۔“

میری بات سن کر سردار چونکا، پھر بڑے تفسلے میں کہنے لگا۔ ”یارو! اگر پہلے یہ پتا چل جاتا کہ تم فوج میں ڈاکو ہو تو اس سے زیادہ خاطر کرتا۔“

”خیر پھر کبھی ملاقات ہونے پر کسر نکال لینا، فی الحال یہ بتاؤ کہ یہاں کہیں سواری کے اچھے گھوڑے مل سکتے ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

سردار نے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس چند ہیں، لیکن وہ تمہارے کام نہیں آئیں گے اگر لے جانا چاہو تو خوشی سے لے جاؤ۔ وہی گھوڑوں کی بات تو جنگل پار کر کے تمہیں چھوٹا سا ایک جنگل نظر آئے گا۔ اس کا مالک کبھی کبھی آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آتا ہے۔ اسے گھوڑے پالنے کا شوق ہے۔ وہاں پر گھوڑے ہیں بھی اچھے۔ اب تک ان پر ہماری نظر تھی، مگر تمہیں ہم سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ تم ان گھوڑوں کو لے جا سکتے ہو۔“ اس کے بعد سردار ہم سب سے باری باری گلے ملا اور بولا۔ ”تم لوگ ڈاکے ڈالتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہو گے اس لئے ہماری ملاقات کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔ کبھی بھی تم ہمارے مہمان بننے میں خطرہ محسوس نہ کرنا۔ ہم تم پر کبھی آنچ نہیں آنے دیں گے۔“ ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لئے کار میں بیٹھ گئے۔ ہری نے گھوڑی کی باگ تھام لی۔

موہن نے ابھی کار اشارت کی ہی تھی کہ سردار نے آواز دے کر ہمیں روکا اور کہا۔ ”دوستو! اس جنگل میں نوکروں کے علاوہ زمیندار کے پالتو شکار کتے بھی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیں گے۔ ان کی طرف سے خبردار رہنا۔“

مجھے بوڑھے سردار کی بات سن کر اس کی دوستی پر اعتماد سا ہو گیا۔ میں نے اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”بھلا! کتوں وغیرہ کی کوئی پرواہ ہمیں نہیں ہے کیونکہ ہم زمیندار کو ہوشیار کر کے اس سے گھوڑے چھینیں گے، چوری نہیں کریں گے۔“

”شباباش جوانو! بہادری اسی کا نام ہے۔“ سردار نے ہماری دلیری کی داد دی۔

ہم وہاں سے دار نہ ہو گئے۔ اب دن نکل آیا تھا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ دہر اور رات کا کھانا سردار نے ہمارے ساتھ باندھ دیا تھا۔ جنگل سے نکل کر زمیندار کے جنگلے پر دھادا بولنا رات ہی کو زیادہ مناسب تھا۔ ہم نے اسی لئے وہ دن جنگل ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

میرے لئے اس طرح کی زندگی کوئی نئی نہیں تھی۔ برسوں میں نے یونہی بھٹکتے ہوئے گزارے تھے۔ وہ جنگل خامے وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور وہاں پھل دار درخت بھی تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو ایک جگہ چھوڑ کر جنگل کا جائزہ لینے نکل گیا۔

بعض جگہ تو وہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ دن پر بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔ جنگل کے ایک ایسے ہی حصے سے گزرتے ہوئے اچانک میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے مجھے آواز دی ہو۔

”اے علیالیش! آ جا کہ ہم تیرا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ اس مرتبہ وہ ہماری اور گونج دار آواز واضح طور پر دائیں جانب سے سنائی دی۔

میرے سارے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی۔ وہ کون تھا جو میری حقیقت سے واقف تھا؟ میرے ذہن میں آنڈھیاں سی چلنے لگیں۔

”اے بھگ جانے والے! خوفزدہ نہ ہو اور ہمارے پاس چلا آ۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی انجانی کشش دائیں جانب کشاں کشاں لے جا رہی ہو۔ اس طرف اتنے گھنے درخت تھے کہ تقریباً اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے دو چراغ سے روشن نظر آئے

اور میں ان کی طرف کھنچا چلا گیا۔

میں جنہیں دو روشن چراغ سمجھا تھا، وہ دو آنکھیں تھیں۔ وہی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دھبہ رہی تھیں۔ میں نے وہ چہرہ دیکھا تو لرز کے رہ گیا۔ وہ فقیر میرے لئے اجنبی نہیں تھا جو زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

”آگیا چڑیا کے۔“ فقیر کے لمبے میں میرے لئے تسخّر تھا۔

یہ وہی مجذوب فقیر تھا جو برسوں پہلے مجھے ملتان میں شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مقبرے پر ملا تھا۔ میرے ذہن میں برسوں پہلے کا اندوہناک واقعہ تازہ ہو گیا۔

میں ملتان میں ایک حکیم نبراس الدین کے جسم پر قابض تھا۔ ایک روز میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ملتان میں جن بزرگان دین کے مقابر ہیں، میں ان کی زیارت کروں۔ ابھی میں مقبرے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ میری پشت پر ایک ڈھیلا آکر لگا۔ میں غصے میں تیزی سے مڑا تو کچھ ہی فاصلے پر اسی فقیر کو دیکھا جو چہرے سے کوئی مجذوب لگتا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں مجھے ڈھیلے نظر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور پھر ڈھیلا کھینچ مارا۔ یہ ڈھیلا میرے سر پر لگا۔

”بھاگ لے یہاں سے چڑیا کے۔“ فقیر ہستے ہستے ایک دم جیسے خفا ہو کر غرایا۔ ”تجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں۔“

”کیوں! تو شہر کو توال لگا ہوا ہے۔“ میں اس کی طرف لپکا، اسی کے ساتھ اسے برا بھلا بھی کہا۔

”کہہ دیا تجھ سے کہ چلا جا یہاں سے ورنہ ایسی سزا دوں گا.....“ فقیر کا جملہ پورا نہ ہوسکا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی تھی۔

غصے کے سبب میں بے قابو ہو گیا تھا۔ فقیر کی گردن دباتے ہوئے اچانک مجھے جھٹکا سا لگا اور پھر زندگی میں پہلی بار مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ حکیم نبراس الدین کے جسم میں میرا دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر میں نے فقیر کی گردن چھوڑ دی۔

”اب اس جسم کو بھی چھوڑ دے گستاخ ورنہ اسی کے اندر گھٹ کے مر جائے گا۔“ فقیر نے مجھے نفرت و خدات سے مخاطب کیا۔

فقیر اگر مجھے ایسا کرنے کو نہ بھی کہتا تو اب حکیم کے جسم میں میرا مزید ٹھہرنا ممکن نہیں تھا۔ سو میں، حکیم کے جسم سے باہر آ گیا۔ اسی وقت مجھے فقیر کے ہاتھ میں بول کی ایک خاردار شاخ نظر آئی۔ میرا وجود اب ناپید تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وہ فقیر مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور وہ مجھے کانٹوں بھری شاخ سے مارنے لگا۔ میرے وجود میں خنجر سے اتر گئے۔ میں اس کی مار سے بچنے کے لئے مقبرے کی طرف بھاگا، لیکن اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سامنے ہی مجھے ایک مرد اور عورت نظر آئے جن کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس فقیر کی نظروں سے چھپنے کے لئے میں، بچے کے جسم میں اتر گیا۔

ایک مرتبہ پھر فقیر زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ”بس اب تو قید ہو گیا۔ اس قید خانے سے تیرا نکلتا بہت محال ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں سے چلا جا مگر تو گستاخی پر اتر آیا اور نہ گیا“ سو اب سز بھگت

..... لمبی سزا۔ تیری صفات میں نے تجھ سے چھین لیں۔“

پھر وہی ہوا جو فقیر نے کہا تھا۔ میں اس بچے حسن کے جسم میں قید ہو گیا۔ کوشش کے باوجود میں اس کے جسم سے نہ نکل سکا۔

”یاد آگیا تجھے سب کچھ۔“ فقیر نے اس طرح کہا جیسے وہ میرا ذہن پڑھ لینے پر قادر ہو۔ ”پھر یہ ہوا کہ تو بھگت کر سفلی طاقتوں کا غلام بن گیا اور یہ بھول گیا کہ تو اہل ایمان میں سے ہے۔ تجھے سزا دی گئی تھی، لمبی سزا، نافرمانی کی سزا۔ کیا تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سزا کبھی پوری نہیں ہوگی اور تجھے بدی کی راہ پر ہی چلنے دیا جائے گا۔ ہمیں اندازہ نہ تھا کہ تیرا ایمان اتنا کمزور ہوگا۔ سن کہ تیری سزا کی مدت ختم ہوئی، مگر اب تجھے بے گلیل نہیں چھوڑا جائے گا۔ کچھ سمجھا چڑیا کے۔“

”ہاں اے اللہ کے نیک بندے۔ میں غلطی پر تھا۔“ میں فوراً بول اٹھا۔

”تو پھر توبہ کر اور کلمہ پڑھ۔“ اس نے مجھے تاکید کی۔

میں نے فوراً اس کے حکم پر عمل کیا۔

”سن کہ ہم نے تیری تمام تر جناتی صفات جو چھین لی تھیں، واپس کر دیں، لیکن تو اپنے گزشتہ اعمال کے سبب اب صاحب اختیار نہیں رہا۔ تیری صفات اللہ کے حکم سے جب رو بہ عمل ہونا چاہیں گی، ہوں گی اور جب خدا کو ایسا منظور نہ ہوگا تو بے بس ہو جائے گا اور کچھ نہ کر پائے گا۔“ فقیر بولا، پھر کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا اور کہا۔ ”اے علیالیش! اللہ کے حکم سے اس آدم زاد کے جسم سے نکل اور پھر اسی میں داخل ہو جا۔“

اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود سے کوئی گرفت ہٹ گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں، وجے کے جسم سے باہر آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ وجے مرا نہیں، زندہ تھا۔ فقیر کے حکم سے میں پھر بے ہوش وجے کے جسم میں اتر گیا۔

پھر جب مجھے وجے کے جسم میں قرار آیا تو دیکھا، فقیر غائب ہو چکا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے اپنی جناتی صفات واپس مل جانے پر کتنی خوش تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ افسوس بھی تھا کہ میں پورے طور پر اپنی مرضی کے مطابق ان جناتی صفات کو بروئے کار لانے کا اہل نہیں رہا تھا۔

میں کچھ دیر تک کم م م سا اسی جگہ کھڑا رہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک الٹا کھا خیال آیا۔ جناتی صفات واپس مل جانے کے بعد اب کوئی مسئلہ میرے لئے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ میں ایک بار پھر وجے کے جسم سے باہر نکل آیا اور اس پر گہری بے ہوشی طاری کر دی۔ اب وجے اسی وقت ہوش میں آتا، جب میں ہاتھتا۔ یہ طور احتیاط میں نے وجے کے جسم کو خشک چوں میں چھپا دیا۔ کھلی فضا میں آزادی سے پرواز کرتے ہوئے مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی۔

جلد ہی میں اس جنگل سے نکل کر زمیندار کے جنگل تک پہنچ گیا۔ جنگل کا جائزہ لینے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ امصبل میں مجھے اعلیٰ نسل کے چھ سات گھوڑے بندھے نظر آئے۔ مجھے صرف چار گھوڑوں کی ضرورت تھی۔ میں نے گھوڑے پسند کر لئے، مگر فوری طور پر گھوڑوں کو نہیں کھولا۔ اس جنگل کے ایک

کمرے میں مجھے تجوری نظر آگئی تھی۔ زمیندار اس وقت بیٹکے پر نہیں تھا۔ بیٹکے میں صرف تین ملازم تھے۔ بقیہ ملازموں کو شاید زمیندار اپنے ساتھ شکار پر لے گیا تھا۔

جس کمرے میں تجوری تھی، وہ باہر سے متقل تھا۔ میں نے اس میں تالا لگا رہنے دیا اور کمرے میں پہنچ گیا۔ تجوری کا قفل ایک ہی جھٹکے میں کھل گیا۔ میں نے تجوری صاف کرنے میں دیر نہیں کی۔ اسی کے ساتھ مجھے کپڑوں کی فکر ہوئی۔ مختلف سائز کے مردانہ لباس میں نے ایک سوٹ کیس میں بھر لئے اور کمرے سے نکل آیا۔ کمرے کے دروازے پر بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ یہ اپنے انداز کی انوکھی ڈکیتی تھی۔ احتیاطاً میں نے ملازموں پر بے ہوشی طاری کر دی اور پھر گھوڑے کھول کر جنگل کی راہ لی۔ بہت جلد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں وجہ کے بے ہوش جسم کو چھپا گیا تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں ایک بار پھر وجہ کے جسم میں اتر گیا۔ اب میرے پاس چار تندرست و توانا گھوڑے اور ایک سوٹ کیس تھا۔ میں نے گھوڑوں کو دیہی نیم تاریکی میں باندھ دیا اور سوٹ کیس بھی چھپا دیا جس میں کپڑے اور ہزاروں روپے تھے۔

میں ابھی وہاں سے کچھ ہی دور چلا تھا کہ شکر اور رگھویر کو اسی طرف آتے دیکھا۔
”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ قریب آکر بولے۔ ”تمہیں اتنی دیر ہو گئی لوٹنے میں تو ہم فکر مند ہو گئے۔ ہری اور موہن تمہاری تلاش میں دوسری طرف گئے ہیں۔“

”میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں یا رو کہ جنگل میں کھو جاؤ۔“ میں اطمینان سے بولا۔ ”ایک ضروری کام سے گیا تھا۔ تم لوگ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”پھر بتاؤ ناکہ کہاں گئے تھے؟“ شکر نے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔
”ڈاکا ڈالنے گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اس وقت ڈاکا ڈالنے گئے تھے، دن میں؟“ رگھویر ناقابل یقین لہجے میں بولا۔

”ہاں یار! ڈاکے کا مال میں نے ایک جگہ جنگل میں چھپا دیا ہے۔“
”لگتا ہے کہ اس کا داغ چل گیا ہے۔“ رگھویر نے شکر کی طرف دیکھا۔
”ہماری بھی تو زیادہ پڑ رہی ہے نا۔“ یہ کہہ کر شکر ہنس پڑا۔
”ٹھیک ہے، ابھی کچھ دیر بعد جب ڈاکے کا مال دیکھو گے تو پتا چل جائے گا کہ کس کا داغ چل گیا ہے۔ میرا یا تم دونوں کا۔“

”اگر تم ج کمرہ رہے ہو تو ہمیں اس جگہ لے چلوں جہاں ڈاکے کا مال چھپایا ہے۔“
”ہری اور موہن بھی ساتھ ہوں گے تو ادھر چلوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بھی مل گئے۔ شکر نے جب ان سے ڈاکے کا ذکر کیا تو بھی وہ ہنسنے لگا۔
”اچھے اچھے خواب دیکھنے میں کوئی برائی نہیں۔“ موہن نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”بس آدمی کو ذرا دن اور رات کا خیال رکھنا چاہئے۔“

”تو تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو۔“ میں نے مصنوعی حقکی کا اظہار کیا۔ ”تم لوگوں کی خاطر میں نے دن دہاڑے جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈاکا ڈالا اور تم ہی میرا مذاق اڑا رہے ہو بولو، کیا تمہیں گھوڑوں کی ضرورت نہیں؟ کیا تمہیں اس فوجی وردی کی بجائے سادہ لباس نہیں چاہئے؟ کیا روپے نہیں چاہئیں خرچے کے لئے؟“

”چاہئے تو بہت کچھ، مگر خواب میں نہیں۔“ شکر نے چوٹ کی۔
”اچھا تو پھر چلو میرے ساتھ۔“ میں سخت لہجے میں بولا۔ ”خواب اور حقیقت کا فرق ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

وہ سب میرے ساتھ ہوئے۔ پھر جب میں انہیں اس جگہ لے کر پہنچا جہاں گھوڑے باندھ کر گیا تھا تو وہ حیران رہ گئے۔

”یہ یہ گھوڑے تم کہاں سے لے آئے؟“ شکر نے حیران ہو کر سوال کیا۔
”اسی زمیندار کے بیٹکے سے جس کا پتا بخاروں کے سردار نے بتایا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک بیڑ کی آڑ میں رکھا ہوا سوٹ کیس بھی اٹھالیا اور بولا۔ ”اس میں ہم سب کے لئے کپڑے اور روپے ہیں۔“
”لیکن یہ یہ سب ہوا کیسے؟ اور تم نے ہمیں پہلے سے کچھ کیوں نہیں بتایا؟“ رگھویر نے پوچھا۔

”اگر بتا دیتا تو تم لوگ مجھے کبھی اکیلا نہ جانے دیتے۔“ میں نے جواب دیا۔
”مگر وجہ، تجھے کچھ ہو جاتا پھر؟“ اس مرتبہ ہری بول اٹھا۔

پھر بڑی مشکل سے میں اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر سکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ زمیندار اپنے ملازموں کو لے کر شکار کھیلنے گیا اور خوش قسمتی سے بیٹکے پر صرف ایک چوکیدار تھا جسے بے ہوش کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

اس کے بعد موہن کار میں اور ہری گھوڑی پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں کو وہ کار جنگل سے کہیں دور جھوڑنا تھی۔ پولیس کو پکڑ میں ڈالنے کے لئے میں نے موہن سے کہا تھا کہ اس کار کو وہ سرائے والے گاؤں میں سردارسی کے حوالے ہی کر آئے کہ کرنل صاحب کو کار پسند نہیں آئی۔

”اور اس نے جیب ساتھ کر دی تو؟“ ہری نے اعتراض کیا۔
”اس سے کہنا کہ ہم کل صبح جیب آکر لے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کبھی اپنی کھوپڑی بھی استعمال کر لیا کرو۔“

ہری اور موہن دوپہر کا کھانا کھا کر گئے تھے اور شام کو لوٹے۔ وہ اپنا کام کر آئے تھے۔ فوجی وردیاں ہم نے کسی آڑے وقت کے لئے استعمال کر رکھ لیں اور لباس تبدیل کر لئے۔

اپنے منصوبے کے تحت میں نے بے درپے کئی وارداتیں کیں جنہوں نے امرتسر ضلع کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیا۔ سارے علاقے میں میری دھماک بیٹھ گئی تھی۔ ایس پی متا کو بھی یقیناً اب یہ احساس ہو چکا تھا کہ جس کام وہ اتنا آسان سمجھا تھا، وہ اتنا آسان نہیں۔ اس لئے وہ دم دگمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ

اپنے رقب اور دشمن کرتار سنگھ کی طرف سے بھی میں اس عرصے میں غافل نہیں رہا۔ کرتار سنگھ اپنی زندگی سے یاموس ہو چکا تھا۔ برابر کے تین جوان بھائیوں کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتا کہ کسی دن میں بھی زندگی کی بازی ہار جاؤں گا۔ میرے خوف سے اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ دن میں بھی گھر سے باہر جاتے ہوئے اسے موت کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جان کے خوف نے ہر کام سے اس کا جی اچاٹ کر دیا۔ آخر اس نے اپنے کھیت ٹھیکے پر دے دیئے تاکہ آمدنی کا ذریعہ برقرار رہے۔ بیٹھے بیٹھے پیسا آنا شروع ہوا تو اسے نئے نئے فحشل سوتھے۔ گاؤں کے چند جوار یوں سے اس کا یار نہ ہو گیا۔ ان میں سے تین لٹکے تھے۔ وہ سب روزانہ دوپہر میں کرتار سنگھ کے گھر آکر جم جاتے اور شراب نوشی کرتے ہوئے تاش سے دل بہلایا کرتے۔ بڑی بڑی بازیاں جیتیں، ٹھٹھول ہوتے۔ میری محبوبہ گلشنیا یہ سب کچھ بڑی بے بسی سے دیکھتی۔ اس کا گھر آوارہ گردوں کا اڈا بن گیا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کرتار سنگھ کے یہ نئے دوست آتے جاتے گلشنیا پر بھی میلی نگاہ ڈالتے اور اکثر ان کے ٹھٹھول میں پھت پر گونجتے قہقروں کے درمیان گلشنیا اپنا نام بھی سنتی۔ کئی دفعہ اس نے ان آوارہ گردوں کے طعنے بھی سنے تھے۔

وہ کرتار سنگھ سے کہتے، یار کرتار! گھر میں حسن کی دیوی ہے، اچھی خاصی بندھی ہوئی آمدنی آتی ہے، لیکن گھر کے وارث کا اب تک پتا نہیں۔ گلشنیا کو کبھی کبھی پانی یا لسی کے گلاس دینے یا خالی گلاس واپس لینے اور جانا پڑتا تو چوہدری کا بیٹا منوہر اسے ایسے گھورتا جیسے آنکھوں کے راستے کچا ہی اپنے اندر اتار لے گا۔ کبھی کبھی وہ گلشنیا کو دیکھتے ہی کسی پھر اور گھٹایا کر لے گا کوئی ٹکڑا بھی منگوائے گا تاکہ شاید گلشنیا اس طرح متوجہ ہو جائے۔ ایک بار گلشنیا سے گلاس لینے ہوئے اس نے گلشنیا کی انگلی دبا دی۔ بس اس دن کے بعد سے گلشنیا اوپر جانے سے کترانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان لوگوں کے دل میں اس کے لئے میل ہی میل بھرا ہوا ہے۔ وہ اب کرتار سنگھ کی چچی کو اوپر بھیجنے لگی۔ منوہر بھی کچھ حالات کو جان گیا۔ اس نے بڑی چالاکی سے کام لے کر اب چچی پر پانسا پھینکا۔ ایک مرتبہ گلشنیا نے بھی منوہر اور چچی کو کھٹھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اس کے بعد اکثر چچی اور منوہر میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ منوہر ہر حال میں گلشنیا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔

ہر چند کہ مجھے گلشنیا پر پورا بھروسہ تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ منوہر کو کسی صورت اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی، پھر بھی یہ صورت حال میرے لئے تشویش کا سبب تھی۔ اب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی تھا۔ میری نظر میں اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جو شخص ان تمام باتوں کا ذمہ دار تھا، یعنی کرتار سنگھ، میں اسی کو ٹھکانے لگا دیتا۔ نہ ہوتا بائس نہ بھتی بائسری۔ پھر گلشنیا کا کیا ہوتا؟ یہ سوال اور اس سے متعلق دوسرے سوالات مجھے پریشان کر دیتے۔ میں جو زندگی گزار رہا تھا، آج میرا تو کل وہاں، کیا ایسے میں گلشنیا کو اپنے ساتھ رکھ لیتا؟ کیا گلشنیا میرے ساتھ در بہ در بھٹکنے پر آمادہ ہو جاتی؟ اگر میری خاطر وہ آمادہ ہو بھی جاتی تو کیا یہ زندگی اس کے لئے آسان ہوتی؟

ابھی میں کسی نتیجے پر یا فیصلے تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ خود میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔

میں اتنے کم عرصے میں طوفان بن کر چھا جاؤں گا۔ میں اور میرے ساتھی کسی بھی وقت اچانک کہیں نمودار ہوتے اور واردات کر کے اس طرح غائب ہو جاتے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ جب پولیس جائے واردات پر پہنچتی تو کوئی بیان یا گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا حتیٰ کہ لئے والا تک یہی کہتا۔ ”چھوڑیے صاحب، جانے دیجئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کوئی بات ہوئی اور وہ دوبارہ آ گیا تو جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔“

میں نے پہلا بڑا ڈاکا اپنے ساتھی رگھویر کے باپ کی زمین بھتیا لینے والے زمیندار کے ہاں ڈالا۔ دوپہر کے وقت میں نے آرام کرتے ہوئے زمیندار کو جگایا اور رگھویر کے باپ کی زمین کے کاغذات نکلائے جو زمین گردی رکھنے کے سلسلے میں زمیندار نے بنائے تھے۔ میں نے ان کاغذات کو اسی وقت وہیں جلا دیا۔ پھر مڑ کر زمیندار کو دیکھا تو وہ منہ زور اور مغرور زمیندار کانپتے ہوئے بولا۔ ”دبے جی! اب کے معاف کر دو، پھر کبھی رگھویر کے باپ کی زمین پر قدم بھی رکھوں تو دوبار کا سمجھنا۔“ یہ سن کر میں نے زمیندار کی پھولی ہوئی توند پر رانٹل کی نال رکھ دی اور کہا۔ ”لیکن تو نے اب تک اس غریب کو جو اذیتیں دیں، ان کا کیا ہو گا؟“

”اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا مائی باپ۔“ زمیندار بری طرح کانپ رہا تھا۔ ”نہیں، اس طرح سودا نہیں چٹ سکتا۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”تو نے ایک غریب کو قرض دے کر اور سود لگا لگا کر اس کی زمین بھتیائی تھی۔ اتنے سال تک اس زمین پر جو فصل ہوئی تو اسے کھاتا رہا اور اپنی تجوری بھرتا رہا۔ اس کمائی کو میں بھی سود کے ساتھ وصول کرنا چاہتا ہوں اور سن کہ یہ سود کسی ساہوکار کا نہیں، ایک ڈاکو کا سود ہے؟“ میں نے یہ کہہ کر زمیندار سے تجوری کھلوائی۔ تجوری سے میں نے بہت سا نقد روپیا اور زیورات کا ایک بڑا بکس نکال لیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو لے کر میں ذرا سی دیر میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

پولیس ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک سمت سے دوسری سمت تک میرے گردہ کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ایس بی متا کا حکم تھا کہ اگر مجھ سے کہیں سامنا ہو جائے تو مار دینا یا مر جانا۔ اس کے ساتھ ساتھ متا کو یہ بھی انتظار تھا کہ جب میں ٹانگ پور آؤں تو مجھے گھیر لیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ میں کبھی نہ کبھی ضرور اپنے ماں باپ سے ملنے گھر آؤں گا۔ اپنے قصور کی پراسرار قوت کے ذریعے میں ایس بی متا پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

جتنی صفات واپس مل جانے کے بعد سوائے ایک مرتبہ کے جب بھی میں نے تھا کہیں ڈاکا ڈالنے کی غرض سے دبے کا جسم چھوڑنا چاہا تو اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری سماعت میں ایسے مواقع، مجذوب کے الفاظ گونجتے رہتے۔ ”اب تجھے بے تکلیف نہیں چھوڑا جائے گا.....“ تو اب اپنے مرکز اعمال کے سبب صاحب اختیار نہیں رہا۔

اب میں، دبے کے جسم میں رہتا یا کسی اور آدم زاد کے جسم میں، بات ایک ہی تھی۔ سو، فی الحال میں نے دبے کے جسم ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

میں گردش روز و شب میں سوای اوم پرکاش کو تو بالکل بھول ہی گیا تھا جو شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے مجھے راہ راست سے بھٹکا کر بھوانی دیوی کا داس بنا دیا تھا، لیکن اب مجذب فقیر کے ایما پر میں صدق دل سے توبہ کر چکا تھا۔

ہوا یہ کہ ایک رات میں سو رہا تھا، مجھے اچانک گھٹن کا احساس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ سوای اوم پرکاش میرے سینے پر ایک پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آہنی ترشول (تین ٹوکوں والا ایک طرح کا بھالا) تھا۔ ترشول اس نے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے مجھ پر حملہ کرنے والا ہو۔ پھر میں نے اس کے موٹے موٹے کالے ہونٹ ہلکے دیکھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا بھول گیا کہ تو بھوانی دیوی کا داس ہے؟ بول تو نے اپنا دھرم کیوں چھوڑا؟ تجھے خبر ہے کہ اس کی کتنی بڑی سزا ہے۔ اگر تجھے اپنا جیون پیارا ہے تو بول بھوانی دیوی کی ہے۔“ اس کے لہجے میں حکم تھا۔

اس شیطان سے بچنے کی خاطر میں نے وجہ کے جسم کو چھوڑنا چاہا، لیکن اپنی کوشش میں ناکام رہا تو گھبرا گیا۔

سوای نے کریمہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”بھانگنا چاہتا ہے تو سن کہ تیری شکتی میرے سامنے کام نہیں کرے گی۔ اب بھی سے ہے، بھوانی کی بے بول وے درندہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے ترشول میری گردن پر رکھ دیا۔ ”بول بھوانی دیوی کی ہے درندہ ابھی ترشول تیری گردن میں اتار دوں گا۔“ میں جو سچے دل سے توبہ کر چکا تھا، سوچا کہ چاہے میری جان چلی جائے، کلمہ کفر زبان پر نہیں لاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کلمہ شادت پڑھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

☆=====☆=====☆

اپنی زندگی سے میں باپس ہو چکا تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا۔ جنات کے عالم ہاموس نے مجھے بدی کی قوتوں سے نمٹنے کے لئے ایک وظیفہ تعلیم کیا تھا۔ اس کے الفاظ مجھے یاد تھے۔ یہ آزمودہ وظیفہ تھا۔ ایک مرتبہ یہی وظیفہ پڑھنے سے میری جان بچ چکی تھی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں نے وہی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وظیفے کے آخری الفاظ ادا کرنے کے ساتھ ہی میں نے سوای اوم پرکاش کی تیز چیخ سنی اور آنکھیں کھول دیں۔

سوای اوم پرکاش کی لمبی داڑھی اور سر کے بڑے بڑے بالوں میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ چیختا ہوا بھاگا اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ میرے سامنے قریب ہی سو رہے تھے، اتنی چیخ و پکار کے باوجود ان میں سے کوئی نہیں جاگا تھا۔

وقت کا پیہہ گردش کرتا رہا اور قرب و جوار کے علاقوں میں میری دھاک بیٹھتی چلی گئی۔ میرا نام سنتے ہی ظالم زمینداروں، سود خوروں اور اجارہ داروں کے دل کانپ جاتے۔ ایسے لوگوں نے نقدی اور زیورات گھر میں رکھنا چھوڑ دیئے۔ غریبوں کو تنگ کرنے والے سنجوس مالدار اب نرم پڑنے لگے تھے۔

قرض اور سود کے مارے ہوئے کسانوں کی زمین چھینتے ہوئے زمینداروں کو اب سوچنا پڑتا، اگر مجھے علم ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ میں، کسان کو زمین واپس کروا دوں گا بلکہ ان کی دولت بھی لوٹ لے جاؤں گا۔ جن باتوں سے مالدار ڈرتے تھے، انہی باتوں کی وجہ سے غریب میری عزت کرتے تھے۔ وہ کہتے، اب تک ہمارے ساتھ نا انصافی ہوتی تھی تو کورٹ پکھری میں برسوں کے بعد کہیں سنوائی ہوتی تھی لیکن اب تو وجہ کو خبر ہوئی اور چند ہی دنوں میں فیصلہ ہو گیا۔

اب مجھے اپنی زندگی کا ایک مقصد مل گیا تھا۔ مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے نجات دلاتے ہوئے مجھے بے پناہ خوشی ہوتی، میری روح کو ایک ایسی مسرت حاصل ہوتی جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں مجھے اور میرے ساتھیوں کو آسرا دینے والے نہ ہوں۔ جس رات میں کسی گاؤں میں جاتا، سنانا سا چھا جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ میں کہاں چھپا ہوں۔ لوگ کہتے کہ جب وجہ ہمارے گاؤں میں ہو تو اسے نقصان نہیں پہنچنا چاہئے ورنہ گاؤں کی عزت پر داغ لگ جائے گا۔

میری شہرت و عزت سے اب چند جمل ساز بھی فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ کبھی کبھی میرے نام پر چھوٹی موٹی چوریاں بھی ہو جاتیں۔

دو چار مرتبہ تو میں نے اس قسم کی وارداتوں پر توجہ نہ دی لیکن پھر محسوس کیا کہ ان واقعات کی وجہ سے بدنامی ہو رہی ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے نام سے واردات کرنے والے ایک گروہ کو پکڑ کر ایسی عبرت ناک سزا دی کہ پھر کسی نے ایسی ہمت ہی نہیں کی۔

بہت سے افراد میرے گروہ میں شامل ہونے کے آرزو مند تھے۔ میں ایسے افراد کو بلاتا اور انہیں کوئی پر پرکتا۔ اگر آدمی مجھے مناسب اور معقول معلوم ہوتا تو میں کہتا۔ ”پہلے تم چھ مہینے ہمارے لئے اطلاعات پہنچانے کا کام کرو، آس پاس کے دیہات میں ڈاکا ڈالنے کے لائق مقامات کے پتے بتاتے رہو اور پولیس پر نگاہ رکھ کر ہمیں رپورٹ دو۔ اگر اس کوئی میں کامیاب ہوئے تو ہم تمہیں اپنے گروہ میں شامل کر لیں گے۔“

میں نے اس طرح کے پندرہ آدمی پورے امر تر ضلع میں جگہ جگہ متعین کر رکھے تھے جو آگے چل کر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

ہر قدم میں بڑی ہوشیاری سے اٹھاتا۔ میں اپنے مخبروں پر بھروسہ کرنے سے پہلے ان کی ایمانداری کو پوری طرح پرکھ لیتا۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں مجھے علم تھا کہ ڈاکو بننے والے لوگ تھوڑی سی کامیابی کے بعد ہی ہلک جاتے ہیں، ان میں بے پروائی آ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔ میں اسی وجہ سے غلط اطلاع دینے والے پر قطعی رحم نہیں کرتا تھا۔

نئے کار توس، ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدنے کے لئے مجھے پیسے کی ضرورت تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب بھی پولیس سے ٹکرائے ہوئی کار توس اور ہتھیار بڑی تعداد میں درکار ہوں گے۔ چند پستولوں کی بھی ضرورت تھی کیوں کہ گھڑ سواری کرتے ہوئے نشانے بازی کرنے کے لئے راکٹل سے زیادہ پستول کار آمد ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ تین چار ہزار روپوں کی فوری ضرورت تھی۔ انہی دنوں مجھے اطلاع ملی کہ مادھوپور

کے ایک سنجوس سکھ کے گھر سے کافی مال مل سکتا ہے۔ میں نے اس کے گھر ڈاکا ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے ہری کو بھیجا لیکن سکھ سے ملاقات نہ ہو سکی چنانچہ بغیر اطلاع کے ڈاکا ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔

رات کا ایک بج رہا تھا جب ہم مادھوپور اس سکھ کے گھر کے پاس اپنے گھوڑوں سے اترے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک کتے نے بھونکنے شروع کیا تو ہری نے رولی کا کلزا پھینک کر اسے خاموش کر دیا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ میں دھیمی آواز سے بولا۔
”دروازہ کھولو۔“

پھر بھی جواب نہیں ملا۔ اتنی دیر میں شکر نے گھر کے آس پاس گھوم کر جائزہ لے لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اگر وہ واقعی بت سنجوس ہے تو اس وقت دروازہ کھولنے کا خطرہ کبھی مول نہ لے گا۔ میرا خیال ہے، ہم دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جائیں۔“

ہری نے اپنے گھوڑے کو دیوار کے پاس کھڑا کیا۔ شکر اس پر چڑھ کر اور دیوار پھلانگ کر گھر میں کود گیا۔ اس کے باوجود گھر میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ ہری بھی اندر پہنچ گیا اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ہم سب گھوڑوں سمیت اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

ہم سب نے رانٹھلیں ہاتھ میں لیں اور اوپری منزل پر پہنچ گئے، مگر وہاں بھی جالی والا دروازہ بند تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے جالی سے بیڑی کی روشنی اندر چھینکی۔ اسی کے ساتھ ایک چھوٹے بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں نے ڈانٹا۔ ”خاموشی سے دروازہ کھول دو ورنہ خیریت نہیں۔ میں سب کو مار ڈالوں گا۔“ دھمکی کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا مارا۔ دوسرا اور پھر تیسرا دھکا لگنے سے دروازہ ٹوٹ گیا۔

ہم پانچوں ساتھی اندر داخل ہوئے۔ دیکھا تو ایک بوڑھا، ایک بڑھیا اور تقریباً سات سالہ بچہ ایک دوسرے سے چپے ہوئے کانپ رہے تھے۔
مجھے اس وقت اتنا غصہ تھا کہ اگر وہاں کوئی جوان ہوتا تو اس کا بھرکس نکال دیتا لیکن بوڑھے اور بچے کو دیکھ کر میں غصہ پی گیا۔

”جو کچھ ہے نکالو۔“ میں نے بوڑھے پر رانٹھل تان لی۔
بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ اتنی شدت سے کانپ رہے تھے کہ کوشش کے باوجود شاید وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ جب میں نے رانٹھل کی ٹال اس کے شانے میں چھوئی تو بولا۔ ”گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

بڑھیا، بچے کے منہ کو ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی۔ بچہ خوفزدہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔
میں نے بڑھیا کو دھمکایا۔ ”بڑھیا! ہمیں پتا ہے کہ اس گھر میں کافی مال ہے۔ تم لوگ ہمیں

دوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو ورنہ.....“

اس موقع پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے منہ پر بڑھیا کا ہاتھ تھا۔ اس دوران شکر اور ہری برابر کے کمرے میں گھوم آئے لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ رگھویر اور موہن مکان کے پچھلے حصے میں دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔
بوڑھا بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ”گھر میں کچھ نہیں۔ کیوں ہم غریبوں کو تنگ کرتے ہو؟“ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ میں نے بوڑھے کی پہلی میں ایک گھونسا جمایا اور بولا۔ ”جھوٹے، غریب بن رہا ہے۔ اگر مجھے اطلاع دینے والا جھوٹا ہے تو میں اس کی زبان کاٹ دوں گا لیکن اس سے پہلے تجھے ضرور سبق سکھاؤں گا۔ سنجوس کہیں کے۔“ پھر میں نے ہری سے کہا۔ ”ایک کرسی لے آؤ۔“ اس کے بعد بوڑھے کو پکڑ کر میں نے برابر پڑی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا، اسی کے ساتھ تاکید کی۔ ”اگر تم تینوں میں سے کسی نے آواز نکالی تو ہماری رانٹھلیں بھی چیخ اٹھیں گی۔“

ہری اور شکر نے بوڑھے کو چارپائی سے کس کر باندھ دیا۔ بڑھیا سسکتی ہوئی اس منظر کو دیکھتی رہی۔ اب بچہ بھی رونے لگا تھا۔

”ہری! چارپائی کے نیچے آگ جلا دے۔ دیکھتا ہوں بوڑھا کب تک سچ نہیں بولتا۔“ میں نے حکم دیا۔

کھوٹی پر سے ہری نے بوڑھے کا صافہ اتارا اور چارپائی کے نیچے رکھا، پھر جلتی ہوئی لالہین سے تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ فوراً ہی شعلے اٹھنے لگے اور بوڑھے کی پیٹھ جلنے لگی۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ پھر بھی اس کی زبان پر وہ بات نہ آئی جو میں سننا چاہتا تھا۔

اب میں شدید غصے میں چیخ اٹھا۔ ”بڑھے! اب بھی بتا دے مال کہاں ہے ورنہ اسی طرح تجھے زندہ جلا کر مار ڈالوں گا۔“

بڑھیا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ بول اٹھی۔ ”اب بتا دو نا۔“
مجھے یہی چاہئے تھا۔ میں نے ہری کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً بوٹ سے آگ بجھا دی لیکن بڑھا اب بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ”تم چاہے مجھے مار ڈالو لیکن اس گھر سے کچھ نہیں ملے گا۔“

میں نے کمر کی بیلٹ میں لگا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بوڑھا جان دے دے گا لیکن مال نہیں دے گا۔ میری نگاہ بچے پر پڑی میں نے سوچا، کسی ترکیب کے بغیر بڑھا زبان نہیں کھولے گا۔ بچے کو میں نے گردن سے پکڑ کر اٹھالیا اور ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر خنجر والا ہاتھ اونچا کیا۔ بڑھیا کی چیخ نکلتے ہی دالی تھی کہ ہری نے اس کا منہ دبا دیا۔ بڑھیا اس کے ہاتھوں میں جمول گئی۔

”بڑھے! اگر تو چاہتا ہے کہ اس معصوم کی جان میرے ہاتھ سے نہ جائے تو بتا دے مال کہاں ہے؟“ میں سخت لہجے میں بڑھے سے مخاطب ہوا۔ پھر میں نے ہاتھ کو اس طرح جھکا دیا کہ جیسے میں واقعی بچے کو قتل کرنے والا ہوں حالانکہ میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا۔

لڑکی کا گلا رندہ گیا۔

”اوپر جو زیورات اور روپیہ ایک دیوار میں چھپا ہوا تھا کیا وہ تیری شادی کے لئے.....“ میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

لڑکی نے کہا۔ ”ہاں“ مجھے سب بد نصیب کئے گئے تھے اس لئے میری شادی کی خاطر زیادہ چیز کی ضرورت تھی۔“ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ تین روز بعد اس کی شادی تھی۔

میں نے راتقل شانے پر لٹکائی اور دایاں ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھ دیا۔ ”تو نے وجے کو بھائی کہا ہے نا اب وجے بھی اس تاتے کو پوری طرح بھائے گا۔ چل آ میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر میں تیز قدموں سے پھر اوپر لوٹ گیا۔ میرے ساتھی مجھے فوراً واپس آ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”کیوں کیا ہوا کوئی خطرہ ہے کیا؟“ ہری نے پوچھا۔

جواب میں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر میں بولا۔ ”ان دونوں کے منہ کھول دو“ بڑھے کے منہ پر پانی ڈال کر اسے جلدی ہوش میں لاؤ۔“ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ ”یہ بڑھا جو زبان نہیں کھول رہا تھا اس کا سبب کجوسی نہیں تھی بلکہ گھر میں تین دن بعد ہونے والی شادی تھی۔“

اسی عرصے میں لڑکی ہاتھ میں مٹھائی کی تھالی لئے اوپر آ گئی۔

”دوستو! اس نے مجھے بھائی کہا ہے۔ اب ہم اس گھر کی کسی چیز کو نہیں چھو سکتے۔ ہری! سارا مال واپس کر دے۔“ میں بولا۔

بچہ دوڑ کر لڑکی سے لپٹ گیا۔ بڑھا بڑھے کو جھنجھوڑنے لگی۔ ”ارے دیکھو یہ لوگ سب مال واپس کر رہے ہیں۔ کلدیپ کو وجے نے بہن بنا لیا ہے۔“

بڑھے نے آنکھیں کھولیں تو یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میرے ساتھیوں کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔

میں نے کلدیپ کے ہاتھ سے تھالی لے کر مٹھائی ایک کپڑے میں ڈالی اور بولا۔ ”یہ میری بہن کی شادی کی مٹھائی ہے۔ چلو اب ہم چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی میرے چاروں دوست بھی ہم قدم تھے۔

اس لڑکی کلدیپ کو میں نے بہن کہا تھا۔ دوسری ہی رات میں نے ایک بہت بڑا ہاتھ مارا۔ اس واقعے کے تیسرے دن میں نے ایک مخبر کے ذریعے پانچ سو روپے نقد اور پانچ جوڑے بیجیہ۔ انہی کے ساتھ پانچ گھوڑے اور پانچ بھینسیں بھی میں نے کلدیپ کے جیز کے لئے بھیجی تھیں۔

بعد میں مجھے اپنے مخبر کے ذریعے معلوم ہوا کہ کلدیپ نے مجھے جھولی پھیلا کر دعادی تھی۔ جب یہ بات مادھوپور گاؤں میں پھیلی تو لوگ حیرت سے کہنے لگے کہ کیا واقعی وجے ڈاکو ہے؟ اس واقعے کے بعد میرے دل کو ایک عجیب سی راحت اور سکون محسوس ہوا۔

☆=====☆

کافی سوچ بچار کے باوجود اب تک میں اپنی محبوبہ گلستا کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا

یہ دیکھتے ہی بڑھا بول اٹھا۔ ”اس معصوم کو مت مارنا میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔“
بوڑھے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ بوڑھے نے بتا دیا کہ سارا مال و متاع اس نے ایک دیوار میں چن رکھا ہے۔

مال نکالنے کے لئے دیوار میں کئی شکاف کرنے پڑے تو دیوار سے زیورات کی ایک اور نقدی کی دو پوٹلیاں برآمد ہوئیں۔ بوڑھے کو کھول دیا گیا تھا۔

بڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مال ہمارے حوالے کیا اور چکرا کر بے ہوش ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔

”میں نیچے جا کر معلوم کرتا ہوں راستہ صاف ہے کہ نہیں۔ اس وقت تک تم بڑھیا اور لڑکے کے منہ بند رکھو۔ جب میں سین بیجاؤں تو انہیں کمرے میں بند کر کے نیچے آ جانا۔“ اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید کر کے میں آہستہ قدموں سے بیڑھیاں اترنے لگا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اب چاند کی روشنی بھی بڑھ گئی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وقت کافی گزر چکا ہے اس لئے جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ مادھوپور سے ہمیں دس بارہ میل دور جانا تھا۔

آس پاس نگاہ دوڑاتے ہوئے میں نے آخری بیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ کسی کو کہتے سنا۔ ”دیر جی!“

یہ سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ سنان رات میں اس دھیمی، میٹھی اور نرم آواز نے میرے دل کو جیسے چھو لیا تھا۔ آواز کیوں کہ نسوانی تھی اس لئے مجھے حیرت بھی ہوئی۔ پھر بھی عادت کے مطابق میری انگلی راتقل کی لہلی پر آ گئی۔

”کون ہے؟“ میں نے دھیمی لیکن مستحکم آواز میں دریافت کیا۔

اسی وقت ایک نوجوان لڑکی سامنے آ گئی۔ اس کی بادی آنکھوں سے معصومیت اور بے خوفی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جس میں طرح طرح کی مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میں لڑکی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ بولی۔ ”دیر جی! جانے سے پہلے منہ میٹھا کرتے جاؤ۔“

ڈاکو بننے کے بعد آج پہلی مرتبہ کسی عورت نے مجھے دیر، یعنی بھائی کہہ کر پکارا تھا۔ یہ سن کر میرا پتھر سادل پھول بن گیا۔ میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان سامنڈ آیا۔ لڑکی نے جب ہاتھ بڑھا کر تھالی میرے سامنے کی تو میں نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ اسی وقت میری نگاہ لڑکی کے منہ کی طرف گئی۔

”بہن! کیا تیری شادی ہونے والی ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

لڑکی نے آہستہ سے سر ہلا کر نظریں جھکا لیں۔

”اوپر جو بڑھا اور بڑھیا ہیں کیا وہ تیرے ماں باپ ہیں؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”وہ میرے دادا اور دادی ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرے باپ کا دو سال پہلے ہی سے انتقال ہو گیا تھا۔ ماں اس کے بعد پاگل ہو گئی۔ گئے سال وہ بھی ایک کنویں میں گر کر مر گئی۔“ یہ کہتے ہوئے

تھا۔ اسی دوران میری زندگی نے ایک اور غمی کروٹ لی۔ ہوا یہ کہ وجے کے ماں باپ کی خیریت جاننے کے لئے میں نے اپنے تصور کی پراسرار قوت آزمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں 'پولیس' کے گھنٹیا حروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ قانون کے کسی باغی پر دباؤ ڈالنے کے لئے پولیس عموماً اس کے قریبی عزیز و اقارب کو بھی تنگ کرتی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیسے مایا کو اور سوہن سنگھ کے ساتھ بھی تو ایسا نہیں ہو رہا۔

معلوم ہوا کہ پولیس ان کے گھر کی نگرانی کر رہی تھی۔ یہ جاننے کی خاطر انہیں تنگ تو نہیں کیا جا رہا، میں نے ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو ایک اور ہی عقدہ کھلا۔ مایا کو اپنے شوہر کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ دو دھیا گاؤں جا کر وجے کا رشتہ ختم کر آئے۔

”کل چلا جاؤں گا، جلدی کیا ہے۔“ سوہن سنگھ نے جواب دیا۔

”کل کل کر کے تم نے کتنے دن گزار دیئے۔ بیساکھ بھی آگیا۔ ایک بات جو ہونی ہے تو طے ہوئی جائے تاکہ اس بے چاری سروج کا کبھی اور ٹھکانہ ہو جائے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم خود ہی اس کا کوئی دوسرا اچھا سا رشتہ کرا دیں تو بہتر ہو۔ بھگوان اسے سکھی رکھے۔“ مایا کو نے کہا۔ پھر سوہن سنگھ چپ رہا تو وہ بولی۔ ”آج شام تک تم سوجھی کے یہاں نہیں گئے تو مجھ پر اناج کا دانہ حرام ہے۔“ یہ کہہ کر گویا مایا کو نے اپنے شوہر پر مزید دباؤ ڈالا۔

”جیسی تمہاری مرضی، میں شام کو روانہ ہو جاؤں گا۔“ سوہن سنگھ کو آخر کہنا ہی پڑا۔

نانک پور کے دوران قیام ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وجے سے سروج کی منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ دونوں کے باپ پولیس کے محکمے میں رہے تھے۔ نوکری کے دنوں میں وہ برسوں ایک ساتھ رہے تھے۔ اس وقت وجے کی عمر چھ سال تھی اور سروج دو ڈھائی سال کی ہو گئی۔ دونوں گھروں کے درمیان تعلقات بڑھتے رہے۔ ان تعلقات کو مزید بڑھانے کے لئے دونوں کے بزرگوں نے وجے اور سروج کی منگنی کر دی۔ پھر سوہن سنگھ نانک پور چلا آیا۔ وجے بھی اس کے ساتھ تھا۔

خاندانی حالات کے پیش نظر وجے اپنے نانا کے گھر چلا بڑھا۔ سروج کے باپ بشن سنگھ کو جب اطلاع ملی کہ وجے اب نانک پور واپس آ گیا ہے تو اس نے سوہن سنگھ سے کہلوا یا لڑکی اب شاید کے قابل ہو گئی ہے، برات لے کر آؤ تو اس کے ہاتھ پہلے کر دیں لیکن قسمت کچھ اور ہی کھیل کھیل رہی تھی۔ میں اس وقت تک وجے کے جسم پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ سروج کے ہاتھ پہلے ہوتے میں نے انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ سرخ کر لئے۔ بشن سنگھ نے جب یہ سنا تو خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

شام کو جب سوہن سنگھ گھر سے روانہ ہو کر دو دھیا گاؤں میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت بڑا بوجھ بھی تھا جس کی بنا پر اس کا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا۔ یہ تھی اس کے شانے پر رکھی ہوئی وہ پوٹلی جس میں وجے اور سروج کے شگون کے پانچ روپے، چاول، بادام، کنکھش اور پانچ کٹڑے سپاری کے بندھے ہوئے تھے۔ وجے کی ماں مایا کو نے اتنے برسوں تک ان چیزوں کو بڑے شوق اور چاؤ سے منبھال کر رکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس پوٹلی میں ہماری آنے والی لسوں کا بیج ہے لیکن میری وجہ سے حالات

ایسے بدلے کہ سوہن سنگھ آج وہی پوٹلی واپس کرنے آیا تھا۔

پھر بشن سنگھ کا گھر آ گیا اور اسی کے ساتھ میرے رگ و پے میں لبو کی گردش تیز ہو گئی۔ بڑی بڑی ہرنیوں جیسی بھولی آنکھوں والی وہ نوجوان لڑکی بے حد حسین تھی۔ ہری ساڑھی میں اس کا ہرا ہرا موج موج بدن قیامت ڈھا رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت ایسی تھی جیسے دودھ شہد آپس میں ملے ہوں۔ ستواں ہانک، ہلالی ابرو، کتلی چوہ، ابھرے ابھرے سرخ ہونٹ، پھول سے رخسار، یہ تھی سروج۔ کاش میں نے اسے پہلے دیکھا ہوتا۔ سادوں کی گھٹا اس کے دونوں شانوں پر بالوں کی صورت میں مجھوم رہی تھی۔ زرخس اور سریتابی کی طرح اس کا حسن بھی مثالی تھا۔ مجھے بڑا رنج ہوا کہ وجے، یعنی میرا رشتہ اس سے توڑا جائے والا تھا۔

سوہن سنگھ کو آتا دیکھ کر بھینس کا دودھ دوہتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ ساڑھی کا آنچل منبھالتی ہوئی وہ دوڑ کر گھر میں گئی اور میں نے اس کی آواز پہلی مرتبہ سنی۔ اس کے جسم کی طرح اس کی آواز بھی نشیلی تھی۔ ”باپو! نانک پور سے آیا آئے ہیں۔“

بشن سنگھ، بیٹی کی آواز سننے ہی اٹھا اور چارپائی پر نئی چادر بچھائی، پھر آنگن میں آکر سوہن سنگھ کو گلے لگا لیا، پھر کہا۔ ”پہلے سے کہلوا یا ہوتا تو گاڑی بھجوا دیتا۔“

”کئی روز سے آنے کی کر رہا تھا لیکن آنہ سکا۔ آج تمہاری سوجھی نے اصرار کر کے مجھے مجبور کر ہی دیا۔“

”بھائی کیسی ہیں؟“ بشن سنگھ نے پوچھا۔

اسی وقت سروج نے آکر سوہن سنگھ کے پیر چھوئے اور پھر لسی لینے اندر چلی گئی۔ سوہن سنگھ نے بشن سنگھ کو اپنی بیوی کی خیریت سے آگاہ کیا۔

”ہمارے داماد کے بارے میں کیا خبر ہے؟“ بشن سنگھ نے سوال کیا۔

سوہن سنگھ اس سوال پر چونکا، پھر جواب دیا۔ ”جو خبریں باہر سے آتی ہیں، ہم بھی سن لیتے ہیں۔“

”ہاں، باہر کی خبریں تو ہم بھی رکھتے ہیں۔ ہماری سروج، وجے کی روز بیتی خبریں لاتی ہے۔ جب وہ کنویں سے پانی بھر کے لوٹی ہے تو ساری باتیں جو اس کی ملنے والیوں نے سنائی ہوتی ہیں، ہمیں آکر بتاتی ہے کہ آج کہاں ڈاکا پڑا، آج وجے کو کہاں وجے (فج) ملی، آج کس کسان کی خاطر وجے نے کس زمیندار کو دھمکی دے دی۔“

سوہن سنگھ بہت غور سے بشن سنگھ کی باتیں سن رہا تھا۔ سروج لسی کا گھاس دے کر چلی گئی۔ اس کے رخساروں پر گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ سوہن سنگھ نے ایک سرد آہ بھری۔ یقیناً اسے بھی رشتہ توڑنے پر بے حد رنج تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہو۔ بڑی دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر ہمت کر کے شانے پر لٹکی ہوئی پوٹلی اتاری اور بشن سنگھ کے سامنے رکھ دی۔

”کیا لے آئے بھائی صاحب؟ کیا میری بیٹی کے لئے ساس نے کوئی تحفہ بھجوا یا ہے؟“ بشن سنگھ نے

ہتے ہوئے یہ الفاظ زور سے ادا کئے۔

سروج کے بڑھتے ہوئے قدم دروازے پر رک گئے۔ وہ دروازے کی آڑ لے کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب کچھ اور سرخ ہو گئے تھے۔

بشن نے بڑے شوق سے پوٹلی کھولی لیکن پوٹلی کے کھولتے ہی وہ گم سم ہو گیا۔ خاموشی محسوس کر کے سروج نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا، مگر پوٹلی اس کے احاطہ نگاہ سے باہر تھی۔ پھر چند لمبے بعد بشن کی آواز جیسے گہرے کنویں سے آئی۔ ”سوہن سنگھ جی! یہ سب کیا ہے؟“

سوہن گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ شاید اس میں بشن سے نظرس ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”بشن! تمہاری بھالی نے شگون واپس کر دیئے ہیں۔“ پھر وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ”دیکھو بشن سنگھ! میں جانتا ہوں تمہیں یہ بات بڑی گئی ہو گی، گنتی بھی چاہئے۔ تمہاری یہ شرافت ہی تھی کہ اب تک اپنی زبان کا پاس کیا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو دجے کے ڈاکو بننے ہی معنی توڑ دیتا، مگر ہمارا رشتہ دوستی کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ سروج تمہاری ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔ وجہ کی ماں کو گھر میں بھولانے کا کتنا زیادہ ارمان تھا لیکن.....“ سوہن سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اس نے گاڑی سے چہرہ پونچھنے کے بھانے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور بولا۔ ”ہمارا ایک ہی بیٹا زندہ رہ گیا ہے۔ اس کے بیاہ کا کیا کیا ارمان ہمیں نہ ہو گا لیکن اس نے جو راستہ اختیار کر لیا ہے، اس کا انجام بھی ہم جانتے ہیں۔“

”کیا شگون واپس کرنے کے لئے دجے نے کھلوا یا ہے؟“ بشن نے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں“ اسے تو اس کا خیال بھی نہیں آیا ہو گا۔ وہ ایک مرتبہ جانے کے بعد ہم سے ملنے بھی نہیں آیا۔ تمہاری بھالی کہتی ہے کہ اب گھر میں بھولانے سے کیا حاصل۔ کسی معصوم کو بیوہ بنانے کے لئے اسے ہم اپنی ہو کیوں بنائیں۔ اس معصوم کی کیا خطا ہے؟“ کچھ دیر خاموشی کے بعد سوہن پھر بولا۔ ”میں یہاں آنے پر راضی نہیں تھا، مگر دجے کی ماں نہیں مانی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں دو چار دن یہاں رک کر لوٹوں اور اس عرصے میں کہیں اور سروج کا اچھا سا رشتہ کر کے آؤں۔“

آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بشن نے پوٹلی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سروج تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں اتنی دیر میں سرخ ہو گئی تھیں، ہاتھ پر پینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔ ”نصرو باپو!“ پھر وہ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے سوہن سنگھ کے رو برو آکر بولی۔ ”نیا جی! اب سروج کو آپ کے گھر کے سوا کوئی اور گھر نہیں چاہئے۔ جس سانس نے میرا اتنا انتظار اور خیال کیا ہے، مجھے بھی اس کے بڑھاپے کی فکر ہے۔ ٹھیک ہے، مجھے شوہر کا پیار اور سکھ نہ ملے تو نہ سہی لیکن آپ کو اور ماں جی کو کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے پوٹلی، سوہن سنگھ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کے بیٹے کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس سے کھلوا دیجئے کہ جب بھی فرصت ملے گھوڑے پر چڑھ کر ایک بار میرے پاس آجائے“ میں اس کے گلے میں در ملا پستا دوں گی۔ پھر چاہے وہ اسی وقت جہاں جانا چاہے، چلا جائے۔ یہ میرا فیصلہ

ہے کہ سوہن کر رہوں یا بیوہ بن کر رہوں گی اسی گھر میں۔“ سروج نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں یہ سب کچھ کہا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ دونوں بوڑھے اس کنواری دلیر خیار کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ پھر سوہن سنگھ کھانا کھا کر واپسی کے لئے تیار ہو گیا۔

سروج نے آکر اس کے پیچھے چھوئے، پھر جلدی سے رسی کا ایک ٹکڑا سر کو دیتے ہوئے بولی۔ ”تایا جی! یہ میری کلائی کا ٹاپ ہے۔ ماں جی سے کہئے گا کہ سوہا جی (خوش قسمتی) نشانی کے طور پر دو ٹکٹن بھوا کر ابھی سے رکھ لیں، موقع پر کام آئیں گے۔ کیا جانے انہیں کب میرے گھر آنے کا موقع مل جائے اور اس کی فوری ضرورت پڑ جائے۔“ سروج یہ کہہ کر خود ہی شرما گئی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو ساڑھی کے آچل کی آڑ میں کر کے کھڑی ہو گئی۔

سوہن سنگھ نے لاج سے دہری ہوتی سروج کو دیکھا اور رسی کا ٹکڑا احتیاط سے جبب میں رکھتے ہوئے دعا دی۔ ”سدا ساکن رہے بیٹی!“ چلتے وقت اس نے بشن سنگھ سے کہا۔ ”تم دونوں باپ بیٹی نے میری اور میرے خاندان کی جو عزت رکھی، اسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اب مجھے ایسا جان پڑتا ہے بشن سنگھ کہ ہمارا خاندان آگے چل پڑے گا۔ میں جانتے ہی کسی صورت بھی دجے کو سروج کا یہ پیغام بھجوا دوں گا کہ وہ ایک بار گھوڑے پر چڑھ کر تمہارے دروازے تک آئے تاکہ ہم ہو کو وداع کرالیں۔“

پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے پٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب مزید کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سروج کو دیکھ کر رشتہ ٹوٹنے پر مجھے جو ملال ہو رہا تھا، وہ خوشی میں بدل گیا۔ اس کا سبب خود سروج ہی تھی۔ اس کے دلیرانہ اقدام نے میری ہار کو جیت میں بدل دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ سوہن سنگھ کسی صورت پیغام بھیجنے کے لئے مجھ سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ میں نے اسی لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے پر میرے دو جاں نثار ساتھیوں ہری اور شکر کو عمل کرنا تھا۔ منصوبہ بناتے ہوئے میں نے یہ خیال بھی رکھا تھا کہ سوہن سنگھ کے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے۔ منصوبہ بنانے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو اس سے آگاہ کیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق شکر اور ہری، ناک پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ ساتھیوں کو میں نے یہی بتایا تھا کہ اس طرح میں اپنے والدین کی خیریت لینا چاہتا ہوں۔

میرے اندازے کے مطابق جب ہری اور شکر، ناک پور پہنچ گئے تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں انہیں خطرے میں بھیج کر ان کی طرف سے غافل رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے تصور کی پراسرار قوت آنکھیں بند کرتے ہی متحرک ہو گئی۔

میں نے سوہن سنگھ کے گھر کے پاس ایک بیل گاڑی کو رکتے دیکھا۔ گاڑی میں ایک مرد کے ساتھ بزرگ پوش عورت بھی تھی۔ مرد نے بیل گاڑی سے عورت کو اتار کر اس کا ایک پیسہ اٹک کیا۔ پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوا جو بڑی دیر سے وہیں آس پاس گھوم رہا تھا۔ ”بھائی! ہمیں یہاں سے پانچ چھ میل آگے جانا ہے۔ میری گاڑی کا پیسہ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں قریب میں کوئی لوہار ہو گا؟“

مخاطب کئے جانے والے شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں! ہائیں ہاتھ کی گلی میں لوہار کی ایک دکان ہے۔“ وہ شخص مجھے سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہی معلوم ہوا۔

مرد نے یہ سن کر آگے قدم بڑھائے، لیکن کچھ خیال آتے ہی فوراً مڑا اور اسی شخص سے پوچھا۔ ”اتنی دیر کے لئے میری بیوی کو یہاں کہیں آسرا مل جائے گا کیا؟“ پھر اس نے سوہن سنگھ کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس کے دروازے پر میں نے ابھی ایک بڑھیا کو دیکھا تھا جو دروازہ بند کر رہی تھی۔ اگر یہ لوگ قابل اعتماد ہوں تو میں اپنی بیوی کو یہاں چھوڑ دوں؟ پیسہ ٹھیک کرا کے میں ابھی لوٹ آؤں گا۔“

”میاں جی! اس گاؤں میں تو سارے ہی ایسے لوگ ہیں۔ آدھے پونے گھنٹے میں تمہاری بیوی کو کوئی اغوا نہیں کر لے گا، پہنچا دو اندر۔“

نیل گاڑی والے نے یہ سن کر سوہن سنگھ کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ دروازہ دھکے کی مار مار کر کھولا۔ نیل گاڑی والا اس سے بولا۔ ”ماں جی! میری نیل گاڑی کا پیسہ خراب ہو گیا ہے، اسے ٹھیک کرانے جا رہا ہوں۔ اتنی دیر تک میری بیوی کو اگر آپ کے گھر میں سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو احسان مانوں گا۔“

دھکے کی مار مارنے انجینی کی بات سنتے ہی پورا دروازہ کھول دیا اور کہا۔ ”احسان کی کیا بات ہے بھائی! اپنی بیوی کو اندر بھیج دو۔ اتنی تیز دھوپ میں تو وہ بے چاری برقعے میں اور بھی پسینے پسینے ہو گئی ہوگی۔“ اس کے لیے میں ہمدردی اور خلوص کی جھلک تھی۔

برقعے والی گھر میں آگئی۔ سوہن سنگھ برقعے والی کو گھر میں دیکھ کر پردے کے خیال سے باہر جانے لگا تو برقعے والی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ سوہن سنگھ کو دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مایا کو ابھی حیران ہو گئی لیکن اسی لمحے عورت نے نقاب الٹ دی۔

مایا کو اور سوہن سنگھ حیرت زدہ رہ گئے۔ برقعے میں بڑی بڑی مونچھوں والا ہری تھا۔ حیرت کے بعد دھکے کے والدین اپنی ہنسی روکنے لگے۔ سوہن سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر وہ تینوں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر پہنچتے ہی مایا کو بول اٹھی۔ ”ہری بیٹے! پہلے یہ بتا میرا دھکے کیا ہے؟“

”ارے ماں جی! میرے بارے چند ہی دنوں میں جو نام پیدا کیا ہے، جو عزت بنائی ہے، وہ سارا پنجاب کبھی نہ بھلا سکے گا۔ وہ جہاں جاتا ہے لوگ مسلمانوں کی طرح اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مقابلے پر آنے والا اس کی ایک ہی بڑھک سن کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے، گولی چلانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ غریب لوگ تو اسے اپنا بلی اور رکھوالا سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب کسی غریب کی بیٹی جیز نہ ہونے کی وجہ سے کنواری نہیں بیٹھی رہتی۔ جیز کا انتظام اپنا دھکے کر دیتا ہے۔“ ہری نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ مایا کو ابھی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ”میں نے ہمیشہ اسے برا بھلا ہی کہا تھا لیکن اس نے ڈاکو بن کر بھی خاندانی شرافت نہیں چھوڑی۔“

”مجھے دھکے نے آپ کی خیریت معلوم کرنے بھیجا ہے۔“ ہری نے کہا۔ ”اس نے کھلویا ہے کہ میں ایک بار آؤں گا اور بڑی فرصت سے آؤں گا۔“

مایا کو نے ہری کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہنے لگی۔ ”بیٹے! جن آنکھوں سے تو روز دھکے کو دیکھتا ہے، مجھے بھی ان میں جھانک لینے دے۔ اسی طرح شاید سکون مل جائے۔ اس سے کہہ دینا کہ یہاں آکر جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں اور تو بھی دوبارہ اس طرح یہاں مت آ۔ پولیس والوں کی نگاہیں ہر وقت اسی گھر پر رہتی ہیں۔“

”ارے بھانگوان! ہری اس وقت تو بڑے موقع پر آ گیا ہے۔ اس کے ہاتھ دھکے کو پیغام بھجوا دیجئے ہیں۔“ سوہن سنگھ نے جلدی سے کہا۔ پھر سوہن سنگھ نے ہری کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور کانوں سے سنا تھا۔ سوہن سنگھ کے خاموش ہوتے ہی مایا کو بولی۔ ”ہاں ہری! دھکے سے کہنا کہ اب وہی اپنی ماں کے قول کا پاس رکھنے والا ہے، بغیر وقت گموائے جلد سے جلد سرج کو بیاہنے کے لئے آجائے۔“

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ باہر فکری آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے ظالم! تو نے ڈاکو کا گھر بتا دیا۔ میری بیوی کو اگر پتا چلا ہو گا کہ یہ دھکے کا گھر ہے تو وہ ڈر کے مارے مر ہی گئی ہوگی۔ اللہ کے بندے! تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“

ہری نے یہ سن کر دھکے کے والدین کو مخاطب کیا۔ ”یہ جو میرا میاں بنا ہوا ہے، ہمارا ہی ساتھی فکری ہے جو دھکے کے ساتھ فوجی وردی میں ایک بار یہاں آ چکا ہے۔ باہر پولیس کا آؤی جو بار بار گھر کے چکر کاٹ رہا تھا، اسے چکر دینے کے لئے خود دھکے نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ دھکے کو پہلے سے معلوم تھا کہ پولیس اس گھر کی نگرانی کر رہی ہوگی۔ گاڑی کا پیسہ بھی ہم نے خود جان بوجھ کر خراب کیا تھا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں بلکہ..... چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ہری دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

فکری اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”ارے تیرے گھنے دھکے تو سلامت ہیں نا؟..... میرا بھی داغ چل گیا تھا جو ڈاکو کے گھر پہنچے چھوڑ گیا۔ چل جلدی، یہ ڈاکو کا گھر ہے۔“

ہری یہ سن کر تیز تیز چال سے نیل گاڑی تک پہنچا اور اندر بیٹھ گیا۔ نیل گاڑی کا پیسہ لگا ہوا تھا۔ فکری نے فوراً گاڑی چلا دی۔

جب ہری اور فکری واپس آ گئے تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہری نے زنانہ لباس میں مردوں والا کام کیا ہے۔“

بسجی میرے ان الفاظ پر ہنس پڑے۔ ہری نے ساری بات بتا دی تو مجھے فکرتنا کا خیال آیا اور سوچا، اگر ہری اس کی بھی خیریت لے آتا تو فکرتنا کو اطمینان ہو جاتا، مگر میں نے خود ہی ہری سے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔

رگھو دیر نے ساری بات سن کر کہا۔ ”یار دھکے! تجھے بیوی بھی بہادر ملی ہے۔ تو نے حکومت سے بغاوت کی، اس نے غیر ضروری اور روایتی شرم سے بغاوت کر دی اور کچھ عام تجھے اپنانے کا فیصلہ بنا دیا۔“

چل 'آج رات ہی رات لے کر چلتے ہیں۔ سردار کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہئے..... یار! کچھ بول نا' چپ کیوں ہے؟"

"دوستو! میں بڑی الجھن میں گرفتار ہوں۔" میں سنجیدگی سے بولا۔

"کچھ ہمیں بھی تو بتا کہ کیا الجھن ہے وہ۔" موہن نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ "ہم نے جو راہ اختیار کی ہے، اس پر چلتے ہوئے کسی سے شادی کرنا اس کی زندگی کو برباد کرنے کے برابر ہے۔" میں جذبات سے قطع نظر جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ میرے دل کی آواز تھی۔ "پھر بھی میں پہلے سرون سے ملاقات کروں گا پھر ہم سب مل کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات پریشان کر رہی ہے۔"

دوستوں نے میری پریشانی کی وجہ دریافت کی۔

میری پریشانی کی وجہ کھلتا تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر کھلتا کو گھر میں آسرا دینا پڑا تو کیا سرونج اسے برداشت کر لے گی؟ دوستوں کے سامنے اس مسئلے کو چھیڑنا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اچانک مجھے ایک اور بات یاد آگئی اور میں نے کہا۔ "جب ہم نے بغاوت کی تھی، اس وقت میں نے ایک وعدہ کیا تھا کہ شکر کی محبوبہ سے اسے ضرور ملاؤں گا۔ اگر وہ اب بھی شادی ہونے کے بعد شکر کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو تو اسے شکر کے گھر لانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ میں اسی لئے یہ ذمہ داری پوری کئے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں 'سرونج اور اس کے والدین کو سمجھاؤں گا کہ اگر شادی کرنی ہے تو وہ کچھ دن اور انتظار کر لیں۔"

میں اپنے ساتھیوں کے جذبات کا پوری طرح خیال رکھتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میری شادی کے ذکر پر شکر کو یقیناً اپنی محبوبہ یاد آگئی ہو گی جسے اس کے باپ نے کسی اور سے بیاہ دیا تھا۔ میں نے اس وقت اسی لئے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ میں گروہ کا سردار ہونے کے باوجود ڈاکے میں آئے ہوئے مال کے پانچ حصے کرتا تھا تاکہ ہر ساتھی کے گھر رقم بروقت پہنچ سکے۔

اپنے ساتھیوں کو میں بیش نیکی اور ایمانداری کا سبق دیتا اور کہتا۔ "جب تک ہمارے درمیان مکدورت اور برائی نہیں آئے گی، قدرت ہماری مدد کرتی رہے گی۔"

یہی وجہ تھی کہ ہم پانچوں دوست پانچ پانڈوں کی طرح اتحاد سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی تنگی جھیل لیتے تھے۔

"چلو اب ہم جو گیندر دالے ڈاکے کی تیاری کریں۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا۔ "پھر ذیہ کام ختم کر کے میں اور ہری 'دودھیا گاؤں کا چکر لگا آئیں گے۔"

جلد ہی ہم پانچوں ساتھی تیار ہو گئے۔ میں نے چلنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم روانہ ہوئے تو آسمان پر بادلوں کی چادر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے ابھی برکھا رانی بادلوں کی چادر چیر کر اپنے دھرتی دیوتا سے آٹے کی۔ پھر اپنے من کی پیاس بجھانے کے لئے دھرتی دیوتا کے قدموں میں گر کر پیار کا وہ گیت گائے گی جسے سن کر دھرتی کے بیٹے اپنے کھیتوں کی طرف دیکھ کر جھوم

اٹھتے ہیں۔

جو گیندر میرے گروہ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ اس کے متعلق اطلاعات فراہم ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ دنگ ہونے کے باوجود قابل اعتماد ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی میں نے اس کے امتحان کا فیصلہ کیا۔ جو گیندر نے اطلاع دی تھی کہ اس کے گاؤں میں ایک ہندو سرمائے دار ہے۔ اس کے یہاں ڈاکہ ڈالا جائے تو اچھی دولت ہاتھ لگ سکتی ہے۔

میرا اصول تھا کہ ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا کر بھی، میں آخر وقت تک مخبر کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اچانک ہی میری پادری حملہ کرنے کے لئے مخبر کو ساتھ لے کر روانہ ہوتی اور کامیاب ڈاکہ ڈال کر واپس ہوتی۔ جو گیندر کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر ہم نے آدمی رات کے بعد بلا بولا۔ پیواری مال خریدنے کے لئے امر تر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف اس کی ماں اور جوان بیوی موجود تھیں۔ جو گیندر ساتھ تھا۔ اسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی ہم سب تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا جس نے دروازہ کھولا تھا، ہمیں مسلح دیکھ کر کانپنے لگی لیکن اس کی جوان و حسین ہو، جو گیندر پر نظر پڑتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ یقیناً جو گیندر سے واقف تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جو گیندر اس حسین شادی شدہ عورت کو اشاروں اور فحش حرکات کر کے چھیڑتا تھا، نیز اس پر فقرے بھی کستارہتا تھا۔ "پیواری رو! جیسا تیرا نام ہے ویسی ہی تو روپ رنگ میں منفرد ہے۔"

ایک بار جان بوجھ کر وہ روپا سے راستے میں ٹکرا گیا تھا۔ روپا نے غصے میں پھر کر کہا تھا۔ "گاؤں کی بیابانا عورتوں کو ستاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں۔"

جو گیندر دانت پیس کر بولا۔ "اچھا! یہ بات ہے، اب دیکھ میں تجھے کس طرح قابو میں کرتا ہوں۔" وہی جو گیندر ہمیں ساتھ لے کر روپا کے شوہر کی غیر موجودگی میں آدمی رات کو آیا تھا۔

"شوہر بچانے کی ضرورت نہیں۔" میں گرجا۔ "وہ تمہارے گھر ڈاکہ ڈالنے آیا ہے۔" میں نے روپا کے چہرے پر اس وقت اطمینان کی جھلک دیکھی۔ میری یہ شہرت عام تھی کہ نہ میں کسی عورت کو بے آبرو کرتا ہوں نہ کسی کو ایسا کرنے دیتا ہوں۔

رگھو پر اور شکر دروازے کے پاس چوکس کھڑے تھے۔ موہن کے سپرد بڑھیا کو داخل دھکا کر چپ رکھنے کی ذمہ داری تھی۔ میں 'ہری اور جو گیندر اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔ کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر روپا نے تجوری کی چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔ روپا کی گھرائی کا کام جو گیندر نے خود نبھال لیا۔ میں اور ہری دوسرے کمرے میں تجوری اور الماری کھٹکا لے گئے۔ تجوری میں بمشکل پچاس ساٹھ روپے ملے۔ تمام کپڑے وغیرہ ہم نے الماری سے نکال کر باہر پھینک دیے، مگر ایک ہی زیور ہاتھ نہ لگ سکا۔

ہری نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس عورت نے تجوری کی چابیاں جس آسانی سے ہمارے حوالے کی تھیں اسی سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ پھیرا بیکار ہو گا۔"

"لیکن جو گیندر نے تو ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہزاروں کا مال ہاتھ لگے گا۔" میں اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ہری! کیوں نہ اس عورت کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ ممکن ہے اس طرح کام بن جائے۔ تم

ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آیا۔

خلاف توقع برابر والے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ دبے پاؤں آگے بڑھ کر میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسی کمرے میں جوگیندر اور رپا کو چھوڑ کر کچھ دیر پہلے میں گیا تھا۔ دروازے کی ایک جھری سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے وہ منظر یاد آگیا جب میرے ہاتھوں قتل ہونے والا آئندہ، ٹھٹھکا کو زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والا تھا۔ رپا کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور جوگیندر نے اسے زمین پر گر لیا تھا۔ پھر بھی رپا ٹانگیں چلائے جا رہی تھی۔

"اب ٹوچ نہیں سکتی اس لئے چپ چاپ پڑی رہ۔" جوگیندر نے آخر اس بے بس عورت کو قابو میں کر بی لیا۔

پھر اس سے پہلے کہ جوگیندر اس کی عزت لوٹ لیتا، میں نے زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ جوگیندر اچھل پڑا اور جلدی جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کر کے رپا کے منہ سے کپڑا کھول دیا اور اسے دھمکی دی کہ اپنی زبان بند رکھے۔ زرا دیر میں جوگیندر نے دروازہ کھول دیا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے جوگیندر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم اندر دروازہ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟"

"اس کی زبان کھلوا رہا تھا۔" جوگیندر نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "مجھے شک ہے کہ گھر میں مال نہیں۔"

"پھر کیا بتایا اس نے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے شوہر نے اپنی دکان کے نیچے تمہ خاٹے میں تمام سرمایہ اور زیورات چھپا دیئے ہیں۔" جوگیندر نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ جوگیندر کو پہلے ہی سے یہ بات معلوم ہوگی۔ ہمیں یہاں لے کر آنے مقصد تو رپا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا تھا۔

"تو پھر چلو، واپس چلتے ہیں۔" میں نے جوگیندر سے کہا۔

اس کے بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم سب گاؤں سے باہر آ گئے۔ جوگیندر گاؤں ہی میں رہ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اس سے ضروری بات کرنے کا بہانہ بنا دیا۔ جوگیندر کو میں نے ہری کے ساتھ گھوڑے پر بٹھایا تھا۔ ہری کو میں نے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

جب ہری دور نکل گیا تو میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو بتایا۔ "یہ جوگیندر بے ایمان اور مطلبی آدمی ہے۔ وہ اس حسین عورت کو بے آبرو کرنے کی خاطر ہمیں یہاں لایا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے جو دیکھا تھا بتا دیا۔ پھر بولا۔ "جوگیندر کو اس کی اس حرکت کی سزا دی جائے گی۔"

گاؤں سے تقریباً چار میل دور نکل آنے کے بعد ہم سب ایک کنویں کے قریب ٹھہر گئے۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لے کر جوگیندر کو اپنے قریب بلایا۔

"ہمیں پیاس لگی ہے لہذا یہاں کچھ دیر سٹالینے ہیں۔" میں بولا۔ "تم سے مجھے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔ پھر تم اپنے گاؤں واپس چلے جانا، ہم تمہیں گاؤں کے باہر چھوڑ دیں گے۔ آؤ ذرا ادھر آ جاؤ۔" میں اسے کنویں کے قریب لے گیا۔ پھر کہا۔ "یار! وہ عورت تو بلا کی حسین تھی، تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"اس پر میری بہت دن سے نظر تھی۔" جوگیندر فوراً ہی کھل گیا۔ "غلطی مجھی سے ہو گئی ورنہ آج کام بن گیا ہوتا۔" پھر اس نے رپا پر فقرے بازی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "مگر میں نے تو تمہارے بارے میں یہ سنا تھا کہ تم کبھی کسی عورت پر بڑی نظر نہیں ڈالتے..... خیر تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں آج ہی رات اپنے ارمان پورے کر لوں گا۔"

عین اسی لمحے میری راکٹل تیزی سے حرکت میں آئی۔ گولی جوگیندر کے سینے میں اتر گئی۔ اس کے قدم لڑکھرائے اور پھر وہ کنویں میں گر گیا۔ ایک بڑا آدمی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے آسمان پر چپکتے ہوئے لاتعداد ستاروں کی طرف دیکھا۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں اور ہری دودھیا گاؤں جا کر صبح ہونے سے پہلے واپس آ سکتے ہیں۔"

اس موقع پر مومن کہنے لگا۔ "وہ! ہم لوگ ہمیشہ کہیں بھی ایک ساتھ ہی جاتے ہیں، کیوں نہ اکٹھے چلیں۔ ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

"نہیں دوستو!" میں نے انکار کر دیا۔ "خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ ہری میرے ساتھ کافی ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد کسی نے بحث نہیں کی۔ ہم پانچوں، گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ایک کچے راستے پر آ نکلے۔ کچھ آگے بڑھ کر میں ایک چوراہے پر رک گیا۔ سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باتیں سمجھ لیں۔ ڈاکے ڈالنے کے سبب مجھے پورے ضلع کا ایک ایک راستہ یاد ہو گیا تھا۔

میں نے ایک راستے کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ راستہ جنگل میں ہمارے نئے ٹھکانے کی طرف جاتا ہے۔ تم تینوں وہاں پہنچو۔ ہم دونوں دودھیا گاؤں سے واپس آ کر تم سے آ ملیں گے۔ ہماری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔"

سب نے اثبات میں سر ہلائے اور میرے بتائے ہوئے راستے پر اپنے گھوڑوں کو ڈال دیا۔ اپنے ساتھیوں کی فکر مندی کا سب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ ایس بی متانے حکومت کی طرف سے میری گرفتاری پر دو ہزار روپے کا اعلان کر دیا تھا۔ اعلان یہ تھا کہ جو کوئی مجھے زندہ یا مردہ گرفتار کرے گا یا میرے بارے میں اطلاع دے گا اور اس اطلاع کی بنا پر میں پکڑا گیا تو اطلاع دینے والے کو انعام دیا جائے گا۔

یہ گزشتہ ہفتے ہی کی بات تھی۔ مخبروں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہر طرف اس اعلان کا چرچا تھا۔ وہ سستے کا زمانہ تھا۔ دو ہزار روپے کی رقم بہت بڑی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود بھی اکثر لوگ

انعام کے اعلان پر ہنس کر کہتے کہ صرف دو ہزار روپے؟ دو ہزار روپے کی ضرورت ہو تو وجے کے خلاف مجبوری کیوں کی جائے، خود وجے کے پاس جا کر اس سے دو ہزار روپے کیوں نہ مانگ لئے جائیں۔ بھلا اس غریبوں کے بیلے نے کب کسی کی مدد کرنے سے انکار کیا ہے۔

کوئی کتا، وجے جیسے مرد سے بے ایمانی کرنا مردوں کا کام نہیں۔ پولیس والے سرکاری روٹیاں کھا کر کافی بھگڑے ہو گئے ہیں، ذرا وجے کو تلاش کر لیں گے تو چربی ہی کم ہوگی۔ کرنے دو تلاش، دیکھیں گے وجے کو کیسے گرفتار کرتے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ یہاں تک کہ کچھ عورتوں کو تو یہ تک کہتے سنا گیا کہ ہمارے باپ کے پاس دینے کو جیزنہ تھا اس لئے ایک بوڑھے کھوسٹ سے شادی ہو گئی۔ اگر ہماری جوانی میں بھی وجے ہوتا تو ایسا کاہے کو ہوتا۔

کچھ لوگ اس انعام کا اعلان سن کر شیخ چلی بھی بن گئے تھے اور پہلے سے انعام کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کبڑا مناسکھ تھا۔ اس کے بارے میں تفصیلات کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اس بد بخت کبڑے کی وجہ سے مجھے بہت پریشان ہونا پڑا۔

کبڑے منا کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ اسے شادی کرنے کا بڑا ارمان تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جوانی میں پیچک کا مرض ہو جانے سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی، رنگ پہلے ہی آبنوی تھا۔ پھر ایک آنکھ بھی گئی، پیچک نے اس کی شکل اور بگاڑ دی۔ لوگ اسے رات برات دیکھ لیتے تو زور دیتے۔ ایسے میں اسے لڑکی کون دیتا لیکن اس کا خیال یہی تھا کہ اگر جیب میں دولت ہو تو شادی ہو سکتی ہے۔

جس گاڑی والے نے سوہن سنگھ کو ناک پور واپس پہنچایا تھا، کبڑے نے اس سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سوہن سنگھ کس گاڑی میں اور کس کے گھر گیا تھا۔ دوسرے دن وہ بھی بشن سنگھ کے گاڑی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے میرے اور سروج کے گھریلو تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس گاڑی میں کبڑے کا ایک رشتے دار بھی رہتا تھا۔ کبڑے کا کام اسی لئے آسان ہو گیا۔ اس نے بقیہ معلومات حاصل کرنے کے لئے وہیں رہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆=====☆

ستاروں کی وندلی روشنی میں میری سفید گھوڑی اور ہری کاسیہ گھوڑا قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہا تھا۔ ہم دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ہری نے ایک مرتبہ بھی شکنتلا کا ذکر نہیں کیا حالانکہ میں اس سے ناک پور میں وجے کے والدین ہی کے متعلق تفصیل معلوم کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا حالات سے تنگ آکر شکنتلا اپنے شوہر کر تار سنگھ کو چھوڑ کر میکے چلی گئی ہوگی؟ وہ یا پھر کر تار سنگھ نے اسے گھر میں قید کر دیا ہوگا؟ بہر حال میری محبت تھی۔ مجھے اسی لئے شکنتلا اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھا دینے والی موجودہ زندگی بہت کھل رہی تھی۔

”ہری! ماں جی نے شکنتلا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ مجبور ہو کر آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔
”وجے! تمہارے ماں باپ نے سروج کے بارے میں اتنی باتیں کیں کہ مزید کچھ معلوم کرنے کا

مجھے موقع ہی نہیں ملا اور میں چلا آیا۔“ ہری نے جواب دیا۔

پھر میں نے ہری سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ رات کے پچھلے پہر ہم دووہیا گاڑیوں میں داخل ہوئے۔ اس وقت گاڑی گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں گھوڑی کی لگام اور دوسرے میں پستول تھا۔ ذرا دیر میں ہم بشن سنگھ کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ گھوڑی سے اتر کر میں نے دروازے کی کڑی کھٹکھٹائی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ سروج کے گھر والے شاید گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

دوسری اور پھر تیسری بار دستک دینے پر کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”مہمان۔“ میں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

بڑے دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور لالین کی روشنی دکھائی دی۔

”کون ہے بھائی؟“ پھر سوال کیا گیا۔

”رات کا مہمان۔“ میں بولا۔

کھڑکی میں ایک بوڑھا چہرہ نظر آیا اور حلقے سے میں سمجھ گیا کہ وہی بشن سنگھ ہو سکتا ہے۔ بوڑھے کے چہرے پر آشنائی کے آثار نظر آئے۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ میں اپنی گھوڑی اندر لے گیا تو بوڑھا دروازہ بند کرنے لگا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو روک دیا اور کہا۔ ”میرا ایک دوست بھی ساتھ ہے، اسے بھی اندر بلا لیں۔“

پھر ہری بھی اندر آ گیا اور دروازہ بند کر لیا گیا۔

بشن سنگھ کے مکان کے سامنے ایک مندر تھا۔ اس مندر کے باہر چوتھے پر کبڑا مناسکھ ہماری آمد سے جاگ اٹھا تھا۔ وہ کھانا بھی تھا، مگر میں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ اتنی رات گئے کون آیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے سروج بھی گھر کے صحن میں آ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ اس وقت شلوار قمیض میں لمبوس تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میرے دل پر جیسے قیامت سی گزر گئی۔ وہ تھی بھی تو سراپا قیامت۔ جلدی میں وہ دوپٹے کے بغیر باہر آ گئی تھی۔ غالباً اسے جلد ہی یہ خیال آ گیا اور اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ کر کے شرمیلے انداز میں منہ پھیر لیا۔ پھر وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

”میں آپ سے چند اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔“ میں نے بشن سنگھ کو مخاطب کیا، پھر ہری سے کہا۔ ”ہری! چھت پر جا کر تم اطراف کا جائزہ لے لو کہ کسی قسم کا خطرہ تو نہیں۔“

ہری کے ساتھ ہی بشن سنگھ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تمہیں جو ضروری باتیں کرنا ہیں، سروج سے کر لو۔ میں اس سے معلوم کر لوں گا۔ میں بھی تمہارے ساتھی کے ہمراہ جا رہا ہوں۔“

بشن سنگھ اور ہری چلے گئے اور میں اندر کمرے میں داخل ہو گیا جہاں سروج موجود تھی۔ کچھ دیر کم صم ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سروج ہی دھیمی آواز میں نظریں جھکا کر بولی۔ ”تمہیں یاد تو ہے ناکہ بیچن میں تم میرے سوا کسی اور کے ساتھ کھیلتا پسند نہیں کرتے تھے۔“ سروج بیچن کی یادوں میں کم ہو کر کے جا رہی تھی۔ ”جب ہم آنکھ پھولی کھیلتے تھے تو تم بھی کو تلاش کر کے پکڑ لیتے تھے

اور میں رونی صورت بنا کر کہتی تھی، تم میرے سوا کسی اور کو نہیں پکڑتے۔ جاؤ ہم تم سے نہیں کھیلنے۔“
میں نے جواب میں کہا۔ ”اور اب تم ہی نے یہ کہلویا تھا کہ میرے سوا کسی کے ساتھ نہیں کھیلو گی۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”تم نے اسی لئے رشتہ توڑنے کی اجازت نہیں دی۔“
سروج نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ سینے کے اتار چڑھاؤ سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
”تم نے بڑی ہمت کر کے مجھے شادی کی دعوت بھیجی تھی۔ میں تمہاری دعوت قبول کر کے آ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔
سروج نے چونک کر اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں پیار کے موتی چمک رہے تھے اور پلکوں نے بولتی آنکھوں پر حیا کی چادر ڈال دی تھی۔
”میں اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر ضرور آیا ہوں مگر شادی کے ارادے سے نہیں۔“ میں نے صاف صاف بات کہہ دی۔ ”میں تمہیں قول دینے سے پہلے صاف صاف بات کر دیتا ضروری سمجھتا ہوں۔“
”کو۔“ اس کے حسین ہونٹ ہلے۔

”تم جانتی ہو سروج کہ میری زندگی کس دورا ہے پر کھڑی ہے۔ ہم نہ جانے کب ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں۔ کیا تم اس کے باوجود میرے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہو گی؟ ملاپ چند ساعتوں کا اور جدائی عمر بھر کی؟ بولو سروج! کیا تمہیں یہ سب کچھ منظور ہے؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔
مجھے اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اپنے متغیر وجہ کو دل کی گمراہیوں سے جانتی ہے۔ ظاہر ہے اسے کیا خبر تھی کہ اس کے متغیر کے جسم پر ایک جن زاد، یعنی میں قبضہ کر چکا ہوں۔ چند لمحے بعد وہ دھیمی آواز سے بولی۔ ”وہ! تم نے جس جدائی کی بات چھیڑی ہے تو تمہاری ماں بھی اسی جدائی میں رت پ رہی ہے۔ ہم ایک ہی جگہ دو عورتیں مل کر جدائی کے اس بوجھ کو بانٹ لیں گے۔“

یہ جواب ملنے کے بعد مزید کسی سوال کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سروج ہر قیمت پر مجھے اپنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اب صرف اس سے ایک بات کرنا باقی تھی۔ سو میں بولا۔
”سروج! تمہیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ جرم و بے نادت کے راستے پر مجھے خاندانی عداوت کے علاوہ دشمن کی عورت لے کر آئی ہے۔“

سروج نے جلدی سے کہا۔ ”تم شکنتلا کی بات کر رہے ہو؟“
میں حیرت سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم میرے متعلق تمام اطلاعات رکھتی ہو۔ یہ تو اچھا ہے، اب میں تم سے کھل کر بات کر سکوں گا۔ دیکھو سروج! شکنتلا نے میری خاطر بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ اس کی خاطر اسی لئے مجھے کتنا بھی خطرہ مول لینا پڑے میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“
سروج نے یہ سن کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہماری شادی کی بات میں شکنتلا کا ذکر کیوں؟“

”ضرورت پڑنے پر مجھے شاید شکنتلا کو اغوا بھی کرنا پڑے۔ اس وقت تم یہ نہ کہہ سکو کہ میں نے پہلے سے نہیں بتایا اسی لئے شکنتلا کا ذکر میں نے کیا ہے۔“
”تم کہہ چکے ہو تو سنو کہ میں شکایت نہیں کروں گی۔ اور کچھ؟“ وہ مسکرا دی اور مجھے اس پر بہت آیا۔

میرا جی چاہا کہ سروج کو اپنی بانہوں میں لے لوں، پھر یہ سوچ کر خود پر قابو پا لیا کہ وہ تو تھی ہی نا، جلد بازی کی کیا ضرورت تھی۔ آج نہیں تو کل اسے میری بانہوں میں سمٹا تھا۔
میں اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔ ”تمہیں تین چار مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ برسات کے بعد دیوالی رتے ہی میں گھوڑے پر سوار ہو کر تمہیں اپنانے آ جاؤں گا۔“ پھر میں نے اس کا گورا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے دلیا۔ سروج کا چہرہ حیا کی چادر سے چھپ گیا۔
اسی وقت باہر قدموں کی چاپ ابھری اور میں نے سروج کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کمرے میں آنے والا تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔
ہری نے بتایا۔ ”ایک شخص مکان کے گرد چکر لگا رہا ہے۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا میں راکفل کا امداد کر اسے بے ہوش کر دوں؟“

خطرہ محسوس کرتے ہی میرا ہاتھ پستول پر جم گیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے سروج کی طرف دیکھا پھر ہری کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ ہری نے آگے بڑھ کر دروازے میں موجود کھڑکی کھول دی۔
ادوار سے لگا کھڑا تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اپنی پشت پر پڑا ہوا کپڑا میں نے کبڑے کے بے پرکس کر لپیٹ دیا۔ میں نے اسے پیچھے سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا۔ اسی اثنا میں ہری میرے پیچھے گیا۔

اسی وقت گھوڑے لائے گئے۔ میں نے پستول کی نال پر کبڑے کو بانک پر سوار ہونے کے لئے مجبور دیا اور خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دونوں گھوڑے دوڑتے ہوئے گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئے۔
بادومیل کا فاصلہ طے کر کے میں نے کبڑے کو گھوڑی سے اتار دیا۔ ہری راکفل تانے کبڑے کے پیچھے چلا گیا۔

میں نے کبڑے کے منہ سے کپڑا کھول دیا۔ اس کا کمرہ چہرہ دیکھ کر مجھے گھن سی آئی۔
”بول وہاں کیا کر رہا تھا؟“ میں نے سخت آواز میں کبڑے سے سوال کیا۔
کبڑا کانپنے لگا۔ اس نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! میں چوری وغیرہ کی نیت سے نہیں کھڑا تھا بلکہ دیوار کے پاس.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی چھوٹی انگلی اٹھائی اور اپنی سے میری طرف رحم طلب انداز میں دیکھا۔
ہری نے پیچھے سے راکفل کا کندا کبڑے کی پشت پر مارا اور بولا۔ ”جھوٹ بکنا ہے۔ اس میں چندہ نہیں لگتے۔“
”میرے باپ! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ پتھری کی بیماری کے سبب مجھے آدھے آدھے گھٹنے پریشان

ہونا پڑتا ہے۔“ کبڑے نے ہمانہ بنا دیا۔

مجھ سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں نے یہ بھی غلط ہی سمجھا کہ کبڑا مجھے پہچانا۔ میرے خیال میں وہ پولیس کا تجربہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس چکر میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں سمجھا۔ سو اسے آزاد کر دیا اور کہا۔ ”جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔ اگر پولیس کے ہاتھ لگ جائے تجھے جابر مار کر ادھ موا کر دیتی، سمجھا۔“

یہ سنتے ہی کبڑے نے ہاتھ جوڑے اور وہاں سے گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگ اٹھا۔ اس پر ہری کہنے لگا۔ ”وہ! تم نے اسے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کی حرکات شک میں والی تھیں۔“

”جانے بھی دوا سے۔“ میں بولا۔ ”ہم تو ہر ایک پر شک کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔“ میں گم پر سوار ہو گیا۔ ”اب ہمیں جلدی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے۔ ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ ہمیں زیادہ دیر ہو گئی تو وہ فکر کریں گے۔“

آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے۔ برسات کے آثار نہیں رہے تھے۔

☆=====☆

برکھا کے موسم میں پورے علاقے میں تین نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ میں برق کی طرح حمل ہوتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد طوفان کی طرح غائب ہو جاتا۔ موسلا دھار بارش کی سیاہ راتوں میں کچھ لبریز گینڈنوں اور گندے پانی سے چھلکتے ہوئے نالوں سے گزرتا ہوا میرا چھوٹا سا گردہ مخصوص ٹھکانا اچانک چھاپے مار کر جاگیر داروں اور سرمائے داروں کے گھروں میں چھپائی ہوئی یا زمین میں دبائی گئی کو برآمد کر لیتا تھا۔

میرا نام سن کر زمینداروں کے دل دہل جاتے تھے۔ مال حوالے کرنے میں اگر کوئی پس و پیش میری تیز نظریں اس کے حواس غائب کر دیتی تھیں۔

چھاپے مارنے سے پہلے میں معلوم کر لیتا تھا کہ کتنا مال اور دولت کس جگہ موجود ہے۔ یہی وہ کہ میں اپنے نشانے پر پہنچ کر اپنے شکار کو حکم دیتا، جلدی مال نکالوں میں جانتا ہوں مال تم نے کہا رکھا ہے۔ بے چارے شکار کے حواس ہوا ہو جاتے تھے۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ مجھے پوری اطلاع مل چکی کہ مال کہاں ہے۔

میرا اتنا رعب طاری ہو چکا تھا کہ لوگ جھوٹ بولنے سے گریز کرتے تھے۔ لوگوں کو علم تھا کہ جھوٹ بولنے والے پر رحم نہیں کرتا۔ جھوٹ بولنے کی صورت میں پیٹ پر پڑنے والا گھوٹا طاقتور طاقتور آدمی کو بھی زمین چلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

ایک بار ایک سود خور بیوپاری کے گھر میں نے ڈاکا ڈالا۔ بیوپاری کو سن گن گن گئی تھی۔ اسے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی، مگر میرے ساتھیوں نے اس کے بیٹے کو پکڑ لیا۔ بیوپاری اور اس کے بیٹے کو گھر میں موجود کنوئیں کے اندر لٹکا دیا گیا اور ساری دولت لوٹ لی گئی۔ میرے ایما پر رگھو ورنے

مٹا کے نام ایک خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی:

وہجے تحریر کر رہا ہے ایس پی مٹا کہ تمہارا محکمہ بہت کجس ہے۔ میرے سر کی قیمت صرف دو ہزار مقرر کر کے تم نے میری ہنگ اور اپنی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ انعام کے لالچ میں آنے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑتا۔ اس ضمن میں جتنے لوگ بھی میرے ہاتھوں مارے گئے، ان کے قتل کی ذمہ داری تمہارے محکمے پر ہوگی۔ تم لوگوں میں بہت ہے تو خود میرے مقابلے پر آؤ۔ ہم ہر وقت کھلے عام سر سے کفن باندھ کر گھوم رہے ہیں اور تم حکومت سے تنخواہ پا کر بھی موت سے ڈرتے ہوں۔ دوسروں کو موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی دعوت مت دو۔ میں کسی بھی وقت اور کہیں بھی تم سے مقابلے کے لئے تیار ہو۔

یہ خط بیوپاری کے گھر چھوڑ دیا اور پھر جلد ہی اس کا رد عمل سامنے آ گیا۔ ایس پی مٹا نے اعلان کیا آج سے چھ ماہ کے اندر اندر میں اگر وہجے کو ختم نہ کر سکا تو اپنے محکمے سے استعفیٰ دے دوں گا۔ اس ساتھ ہی مٹا نے میرے سر کی قیمت میں اضافہ کر دیا۔ میری گرفتاری پر اب انعام کی رقم پانچ ہزار کر لی۔

دیوالی آنے تک میں نے اپنے گردہ کو اچھی طرح منظم کر لیا۔ اب میرے ہمراہ بااعتماد اور ہمدرد کے علاوہ ایسے ذہین لوگ بھی تھے جو میرے لئے تجربی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ گردہ میں ان نو دن کی مکمل تربیت اور سنے اسلحے کی فراہمی کے لئے میں نے پے در پے کئی کامیاب ڈاکے ڈالے۔

میری خواہش تھی کہ ضلع امرتسر سے نکل کر آہستہ آہستہ پورے پنجاب پر چھا جاؤں۔ اس کے مجھے مزید جاں نثاروں کی ضرورت تھی۔ اپنے تجربوں کے ذریعے مجھے پولیس کی نقل و حرکت کی تمام مالتی رہتی تھیں۔ اب خود پولیس کے محکمے میں بھی میرے تجربے موجود تھے۔ اس کے علاوہ اپنے بول پر بھی میری کڑی نظر تھی کہ کوئی غداری نہ کر جائے۔

اب تک پولیس سے میرے گردہ کا صرف دو مرتبہ مقابلہ ہوا تھا، مگر وہ صرف معمولی نوعیت کی تھیں۔

دیوالی میں ہفتہ بھریاتی رہ گیا کہ میں نے اپنے ساتھی شکر سے کہا۔ ”چلو، آج تمہاری محبوبہ کے گھر کے معاملہ بھی نمٹا دیتے ہیں۔“

میں اور شکر اس کے گاؤں میں پہنچے جہاں شکر کی محبوبہ پدمنی رہتی تھی۔ رات کے نو بج چکے

پدمنی کے بارے میں شکر مجھے پہلے ہی تمام تفصیل بتا چکا تھا۔ پدمنی اس کے بچپن کا پیار تھی۔ اور شکر دونوں ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ دو سال پہلے پدمنی کے باپ نے اسے کسی سے بیاہ دیا تو شکر کا خون کھول اٹھا۔ جانتے بوجھے اس بوڑھے نے ایسا کیا تھا۔ وہ شکر اور پدمنی کی ناسے بے خبر نہیں تھا۔ پدمنی کے جواری باپ نے دولت کے لالچ میں ایسا کیا تھا۔ شکستہ دل شکر

بے شوہر کے درمیان پدمنی دو کام ایک ساتھ انجام دے رہی تھی۔ دائیں ہاتھ سے وہ اپنے شوہر کے میں روٹی کا ٹوالہ دے رہی تھی اور اس کا بائیں ہاتھ جھولے کو ہلاتا تھا۔ اس منظر نے میرا دل ہلا دیا۔ چارپائی کے قریب رکھا ہوا پانی کا گلاس میں نے اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

”میں نے ابھی سنا ہے کہ آپ فکسر کے دوست ہیں۔“ پدمنی کا شوہر بولا اور پھر اپنا تعارف کرایا۔
 ”نام بلویر سنگھ تھا۔“ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے اگر مجھے اس بات کا پتا چل جاتا تو یقیناً میں پدمنی کے ساتھ شادی سے انکار کر دیتا۔“ اس عرصے میں پدمنی اپنے کام میں مصروف رہی۔ بلویر نے مزید کہا۔ ”دیے بھی مجھ سے بیاہ کر اس بے چاری کو کون سا سکھ ملا ہے۔ ایک طرف گھر میں جھولا ہا دوسری طرف میرے ہاتھ کٹ گئے۔ کارخانے کی مشین سے یہ حادثہ ہوا۔“

اپنے شوہر کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگاتے ہوئے پدمنی بولی۔ ”پہلے آپ اطمینان سے کھانا کھا پھر باتیں کر لیجئے گا۔“

پانی پی کر بلویر کہنے لگا۔ ”بچے اور شوہر کی تیار داری کا بار اٹھا کر پدمنی اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ اس کے گھر کام کاج کر کے تھوڑا بہت کمالاتی ہے اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس وقت مجھے کھانا کھانا پانا ہے۔“

میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ پھر میں نے معلوم کیا۔ ”کارخانے کے مالک نے اس کا کوئی معاوضہ دیا؟“
 ”معاوضہ؟“ بلویر کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”اس نے مجھے دھکے دے کر نکال دیا۔ اگلے بڑی عاجزی سے کیا سینٹھ صاحب‘ اپنے پیروں سے میں جو کام کر سکوں گا، کرنے کو تیار ہوں‘ کی روزی نہ چھینیں‘ مگر اس نے ہاتھ کٹنے کے بعد علاج تک کے لئے پھونٹی کوڑی نہیں دی۔ وہ روزی دیتا۔“

بلویر کھانا کھا چکا تو پدمنی نے بھیجے ہوئے ہاتھ سے اس کا چہرہ صاف کیا۔
 کھانے سے فارغ ہو کر اٹھتے ہوئے اس نے پدمنی سے کہا۔ ”اب تم بھی کھانا کھاؤ‘ میں اتنی دیر سے باتیں کر لوں۔“

میں نے دیکھا‘ بلویر کے برتن میں جو جو ٹھنپا ہوا تھا‘ پدمنی دبی کھانے لگی۔ شاید یہ اس کے روز کا دل تھا۔ اب تک میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا‘ اس سے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ میں سخت کشش میں تھا اور سوچ رہا تھا‘ قدرت نے جس شخص کے ہاتھ چھین لئے ہوں‘ کیا ایسے اپالاج سے اس کی بیوی کو اجا سکا ہے؟

بلویر نے مجھ سے میرا نام پتا اور کام دریافت کیا۔ میں بات کو ٹال گیا۔ فکسر کے بارے میں سوالات کا پ دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ”وہ پہلے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا‘ پھر وہاں سے فرار ہو کر اب ڈاکو دہے گردہ میں شامل ہو گیا ہے۔“

دونوں میاں بیوی کے چہروں پر حیرت نظر آئی۔ پدمنی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ سب کچھ ماجہ سے ہوا ہے۔“

پدمنی کے باپ کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا‘ مگر اس سے پہلے ہی قدرت نے بوڑھے کو سزا دے دی۔ جو میں بوڑھے کا ایک شخص سے بچنا ہو گیا۔ بوڑھے نے اس شخص کو قتل کر دیا اور اسے عمر قید کی سزا سنائی۔ اس کے بعد پدمنی تنہا رہ گئی۔ اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی اور بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔
 دل شکستہ فکسر فوج میں بھرتی ہو گیا‘ مگر وہ پدمنی کو نہیں بھول سکا جو اس کی روح میں سمائی ہو تھی۔ کوشش کے باوجود فکسر‘ پدمنی کی یادوں کے نقوش اپنے دل سے نہ مٹا سکا۔ اسے یقین تھا کہ پدمنی کے دل میں بھی ابھی تک اس کی محبت کا چراغ روشن ہو گا۔

بچے در بچے گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔
 ”فکسر! میں اکیلا اندر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنی رائفل مجھے دے دو اور میرا ہسپتال پاس رکھ لو۔ اس طرح کوئے میں چھپ کر یوں کھڑے ہو جاؤ کہ کسی کو تم پر شک نہ ہو۔ میں جب پدمنی کو لے کر باہر آؤں تو تم فوراً ہی اسے کھوڑی پر بٹھا کر فرار ہو جانا۔ باقی کام میں خود غمتالوں گا۔“
 فکسر نے میری ہدایت پر عمل کیا اور میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ جلدی ہی کھل گیا مجھے دیکھنے کے لئے لائینر بلند کی گئی۔ وہ ایک حسین عورت تھی۔ میں سمجھ گیا وہی پدمنی ہے۔

”کس کو تلاش کر رہے ہیں؟“ پدمنی نے مجھ سے دریافت کیا۔ اس کی نظر میری رائفل پر پڑا وہ کچھ پیچھے ہٹ گئی۔

”پدمنی بہن آپ ہی کا نام ہے؟“ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لئے پوچھا۔ ”میں آپ کے رشتے داروں کی جانب سے آیا ہوں‘ فکسر کا دوست ہوں۔“
 میں نے دیکھا کہ پدمنی کا چہرہ کھل اٹھا‘ مگر دوسرے ہی لمحے اس پر دکھ کے سائے منڈلائے۔ اس کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی‘ مگر شاید اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ”تشریف لائیے‘ وہ جب کھانا کھا رہے ہیں‘ آپ بیٹھئے۔“ پدمنی نے مجھے اندر بلا کر چارپائی بچھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اس کے شوہر کی آواز آئی۔ ”کون آیا ہے؟“ دونوں کمرؤں کے دروازوں کے درمیان لائینر لٹک رہی تھی جس سے کمرؤں میں مدھم مدھم سی روشنی تھی۔ گھر کی حالت اچھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پدمنی کے حسین چہرے پر بھی سکھ کی لالی نہیں تھی۔

زبردستی بیاہے جانے والی پدمنی اب میرے دوست فکسر کا گھر آباد کرے گی۔ مجھے وہ اپنے کے لئے پسند آ گئی تھی۔ میں فکسر کے پیار کی عظمت کا قائل ہو گیا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت کو اپنا آبادہ تھا جو کسی اوز کے پہلو کو آباد کر چکی تھی۔

”بھائی! اندر آ جائیے۔“ مردانہ آواز نے مجھے مخاطب کیا۔
 میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ پدمنی نے وہی چارپائی جلدی سے وہاں بچھا دی۔ میری پہلی نظر جھولے پر پڑی اور وہاں سے گزرتی ہوئی پدمنی کے شوہر پر آ کر جم گئی۔ حیرت سے آنکھیں پھیلائے اسے دیکھنے لگا۔ اس جوان شخص کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے اس نے کٹے ہوئے ہاتھ بلا کر میرا استقبال کیا۔ جھولے میں سوئے ہوئے بچے اور کھانے کے

اس پر بلور بول اٹھا۔ ”نہیں! اگر میں پدمنی سے شادی نہ کرتا تو شکر اس راستے پر نہ چلتا۔“
میں نے پدمنی کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہونے لگا۔ یہ
موقع تھا کہ میں کچھ حاصل کرنے آیا تھا اور خالی ہاتھ لوٹنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اسی وقت مجھے شکر سے
ہوا وعدہ یاد آیا لیکن میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور بلور کو مخاطب کیا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ
میں پدمنی بہن سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے خوشی سے..... اگر کہیں تو میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔“ بلور اٹھتے ہوئے کہنے لگا
”تمہارا سہاگ سلامت رہے میری بہن!“ میں نے پدمنی کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا۔
میں نے اٹھ کر بچے کے سر پر ہاتھ پیرا اور روپوں کی تھیلی جھولے میں رکھ کر تیزی سے کمرے سے
آیا۔ میرے قدم دروازے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ روانگی سے قبل پدمنی کو میں نے بتا دیا تھا کہ یہ
نام وجہ ہے۔ پدمنی نے بھی مجھ سے ایک بات کہی تھی۔

میں باہر پہنچا تو مجھے اداس دیکھ کر شکر نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم دونوں خاموشی سے گھوڑا
سوار ہو کر دور نکل آئے۔

پھر شکر نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا ہوا ہے! پدمنی کیوں تمہارے ساتھ نہیں آئی؟ کیا اس
شوہر نے اسے روک لیا؟“ پھر اس کی آواز میں تلخی آگئی۔ ”کیا اس کا شوہر اتنا بھادر تھا کہ تم جیسے فتنہ
بھی وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا پڑا؟“

”وہ اتنا کمزور تھا کہ میں اس کی بیوی کو نہ چھین سکا۔ پدمنی کے شوہر کے ہاتھ کٹ گئے ہیں!
ایک بچے کا باپ بھی ہے۔“ میں نے بتایا۔ پھر میں نے شکر کو سب کچھ بتا دیا۔ شکر سوچ میں گم ہو
تھائی میں پدمنی نے مجھ سے جو بات کہی تھی، میں نے شکر کو اس سے بھی آگاہ کر دیا۔ پدمنی نے کہا
”وجہ بھائی! میرے شوہر کو میری ضرورت ہے۔ اس وقت اگر میں اسے چھوڑ کر چلی گئی تو عورت
پر دھبہ لگ جائے گا۔ آپ شکر کا خیال رکھئے گا۔ اسے کسی اچھی سی لڑکی سے بیاہ دینا۔ اپنے بچے
بھی میں نے شکر ہی رکھا ہے، اسے بتا دینا۔“

سب کچھ سن کر بہت دیر تک شکر خاموش رہا۔ میں اس کا دکھ محسوس کر سکتا تھا۔
”مرد ہو کر اتنے کم ہمت نہ بنو میرے دوست!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”اب میں نے تمہا
رے میں سے ہر ماہ کچھ رقم پدمنی کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس طرح تم اسے خوش رکھ رہے
ہو جو بھلا کر سکتے ہو۔“

شکر نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ شاید اس کی قوت گویائی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
شکر کے معاملے سے نمٹ کر میں نے اپنے ایک تجربے کے ذریعے وجہ کے والدین کو پیغام
شادی کا دن اور وقت مقرر کر لیا۔ اس میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے کھلوا دیا تھا کہ
کی تمام تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور یہ کہ شادی کی رسوم آدمی رات کے وقت کسی انجان جگہ
میں جس کے متعلق تین دن پہلے آگاہ کر دیا جائے گا۔ میں نے یہ بھی کھلوا دیا تھا کہ شادی کے بعد

پہانہ چلے، صرف گھر کے افراد بیاہ میں شرکت کریں۔
اسی عرس میں مجھے یہ خبر بھی مل گئی کہ وجہ کا ماہوں خشونت سنگھ جیل سے رہا ہو کر ٹانک پور پہنچ
گئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وجہ کا باپ سوہن سنگھ نے دودھیا گاؤں جا کر بش سنگھ کو شادی کے
نکار بنگ سے آگاہ کر دیا ہے۔

میں اس سے بے خبری رہا کہ کبڑا مناسکھ نے اس عرس میں کیا نئی چال چلی ہے۔ اس کا علم مجھے
میں ہوا کہ کبڑا، بش سنگھ کے گھر میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے متا کو بھی شادی کی خبر پہنچا دی تھی
ہر بے مقام نہیں بتا سکا۔

میرے خبروں نے مجھے اطلاع پہنچا دی کہ پولیس کو کسی ذریعے سے سب کچھ علم ہو چکا ہے۔ میں
ہو گیا۔ فوراً ہی میں نے ایک آدمی کو ٹانک پور بھیجا اور شادی کی تاریخ مزید آگے بڑھا دی۔ میں
نت سے کھلوا دیا تھا کہ کسی نے ہمارے متعلق پولیس کو اطلاع دی ہے، اس کا کھوج لگائیں۔ جس پر
شبہ ہو، اس کے نام اور ٹھکانے سے مجھے آگاہ کریں۔ بش سنگھ کے یہاں بھی خبری ہونے کی خبر
ماں سے کہہ دیں کہ تیرے بیٹے کی شادی روکنے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یقین
ہے ایک ماہ کے اندر ان کی ہوان کے آنگن میں پہنچ جائے گی۔ میرا خون جوش غضب سے گرم ہو
متا کی عیاری کا جواب میں نے اسی رات دینے کا فیصلہ کر لیا۔

گلے ہی روز میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جس رات متا کی پولیس پارٹی مجھے پھنسانے کے لئے گوبند
ماں میں جال بچھائے بیٹھی ہو گی، اسی رات دوسرے قریبی گاؤں میں ڈاک ڈالا جائے گا۔ میں اس
کو دہری شکست دینا چاہتا تھا۔

میں نے شکر کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔ ”کل اس کا رخانے کے مالک کے گھر ڈاک ڈالا جائے گا
پدمنی کے شوہر بلور کے ہاتھ کٹ جانے پر بھی اسے معاوضہ نہیں دیا اور مازمت سے نکال دیا۔
ام لینا ہمارا فرض ہے۔ خوابوں میں بھی مجھے وہ معذور شخص نظر آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا
را تمہیں اس کا رخانے کے مالک کا پورا پتا معلوم کرنا ہو گا۔“
ماں سے معلوم کروں؟“ شکر الجھے ہوئے لمبے میں کہنے لگا۔

پدمنی کے گھر سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں اس کے گھر جا چکے ہیں۔ تمہارے اور
وہاں کسی اور کا جانا ٹھیک نہیں۔ تم نے اس کے شوہر کو نہیں دیکھا۔ اگر میں نے اسے دوبارہ
مجھے ڈر ہے کہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لئے
اسے پہلے لوٹ آؤ۔“

میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میرے کہنے کو ٹال سکے۔ وہ روانگی کی تیاری کر لے لگا۔
موقع پر میں نے شکر سے کہا۔ ”دیکھنا ایک مرد کی طرح باہمت رہنا“ پدمنی کو دیکھ کر کہیں اپنے
ٹال کا اظہار نہ کر دینا ورنہ اس کے شوہر کو صدمہ ہو گا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام کرنا۔ اسے
بیت کا امتحان بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”یار! اگر ایسا ہی ہوتا تو میں اس رات تم سے جھگڑا کر کے بھی پد منی کو اغوا کر لیتا۔“ پھر مگر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مزید کہا۔ ”میں تمہاری دوستی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مردانگی کا مظاہرہ کر گا اور اپنی محبت پر آج نہیں آنے دوں گا۔“

میں نے اسے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ میں سوچنے لگا کہ جب دو محبت کرنے والے دوسرے کا سامنا کریں گے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ شکر واپس آیا چلا کہ پد منی سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ پد منی اس وقت کسی کے گھر کام کرنے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اکیلا بچے کے ساتھ تھا۔ بر حال وہ پتالے آیا تھا۔ اسی رات کو میں نے کارخانے کے مالک کے پر ڈاکہ ڈالا جس رات پولیس گویند پور میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

پانچ ہزار کی رقم چھیننے کے بعد میں نے کارخانے کے مالک کو دھمکی دی۔ ”تم لوگ غریبوں کا چوس کر سرمائے دار بنے ہو۔ پھر انہی مظلوموں کی آہوں سے ہم جیسے ڈاکو وجود میں آتے ہیں۔ تم ان شخص کے ہاتھ کٹ گئے اسے تم نے معاوضہ کیوں نہیں دیا؟“

”کک..... کے جناب!“ کارخانے کے مالک نے کانپتے ہوئے پوچھا۔
میں نے طیش میں آ کر ایک گھونسا اس کے جڑے پر مار کر کہا۔ ”یہ بھی بھول گئے، شہر رہے اور نفع تمہاری جیب میں جمع ہوتا رہے۔ مزدور جیسے یا مرس نہیں کیا۔“
”مگر جناب! اس کی غفلت کے سبب ہی ہاتھ کٹے تھے۔ اس میں میرا کیا قصور؟“
”کیونکہ! مجھ سے بحث کرتا ہے۔“ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ”مجھے پچیس سال تک خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔“

”پچیس سال..... مگر وہ اپناج تو اس وقت مجھ سے صرف پچاس روپے مانگ رہا تھا۔“
”اور تم نے اسے اتنا معاوضہ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ پچیس سال بعد اس کا بیٹا جوان ہو وقت تک سال کے کم سے کم دو سو روپے کے حساب سے جتنا معاوضہ بنتا ہے تمہیں بلویر سکھ کو اگا گا۔ نہیں تو.....“

”مگر حضور! اس طرح تو پانچ ہزار روپے بنتے ہیں۔“ سیٹھ میری بات کاٹ کر بول اٹھا۔
پچاس روپے کہاں پانچ ہزار! یہ تو.....“

اسی وقت میں نے سیٹھ کی گردن پر راکفل کی نال رکھ دی اور بولا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا، رقم بلویر کے گھر پہنچ جانا چاہئے۔ دوسری صورت میں میں تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دوں گا۔“
وے کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے واپس آ گیا۔

اس طرح میں نے ایس پی متا کو دہری شکست دی۔ پھر مخبروں کے ذریعے پتا چلا کہ یہ ہے، میں نے شادی ضرور ملتوی کی ہے، رشتہ ختم نہیں کروں گا۔

چھ دن بعد ہی میں نے شادی کی دوسری تاریخ مقرر کر دی۔ اس کی خبر بھی کپڑے لے دی۔ میں نے اس بار دوسرا داؤ کھیلایا۔ پولیس تک انفارمیشن پہنچ رہی ہے، یا نہیں؟ یہ جاننے

نے اپنے چاروں قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ان چاروں پر بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ گھر میں وجے کے والدین اور خشونت کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں سرج کے یہاں سے توجات باہر نہیں نکل جاتی؟

پولیس نے دوسری مرتبہ انتہائی رازداری سے کام لیا، مگر میں نے تو اس مرتبہ محض پولیس کو بے وقوف بنانے کے لئے تاریخ دی تھی۔ حقیقتاً میں نے گھریہ اطلاع پہنچائی تھی کہ تیاریاں اس طرح کرنا چاہیے واقعی شادی ہونے والی ہے، مگر آخری وقت پر دو گرام ملتوی کر دینا۔

اس طرح دوسری بار بھی کچھ نہ ہوا۔ تیسری مرتبہ سرج کی خالہ کے گاؤں میں شادی کا پروگرام طے کیا گیا۔ مجھے آدمی رات کے قریب چار ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچنا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے حکم دیا تھا پولیس اس سے پہلے حملہ آور ہو تو ہنگامہ شروع کر دیا جائے۔

مجھے اطلاع ملی کہ پولیس نے مجھے زیر دام لانے کے لئے دھرا منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ اس بار متا نے پچیس پولیس والوں کو پیدل اور کچھ کو تین چار کشتیوں میں روانہ کیا۔ کشتیاں جیسے ہی گاؤں کے قریب پہنچیں انہوں نے نارنج کی روشنی کنارے پر ڈال کر جائزہ لیا۔ میرے ساتھی سمجھ گئے کہ پولیس آ گئی ہے۔

تقریباً گیارہ بجے پہلی سنساتی ہوئی گولی کشتیوں کی جانب بڑھی۔ فوراً جواب میں کئی فائر ہوئے۔ پھر دونوں کناروں سے باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی۔ گھرے اندھیرے کی چادر بھیلی ہوئی تھی۔ صرف آواز اور حرکت پر نشانہ لے کر فائرنگ ہو سکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔

اندھیرے میں کسے کتنا نقصان ہوا، اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس گزیر میں پولیس کی کشتیاں بڑی طرح ڈولنے لگیں۔

پولیس والے کشتیوں کی آڑ سے ہوا میں فائرنگ کر رہے تھے۔ میرے ساتھی خبردار ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ پولیس کا کوئی دستہ پیدل بھی آ رہا ہے۔ اسی لئے دریا والی پولیس سکنل کے طور پر ہوائی فائر کر رہی ہے۔ گھبرے جانے سے پہلے وہ فرار ہونے لگے۔ دوسری جانب اس فائرنگ سے متا کا پیدل دستہ، میں اور میرے ساتھی چونکنا ہو گئے۔

دریا کے کنارے سے دور ایک غار میں، مجھے پناہ مل گئی۔ پھر اپنے چاروں ساتھیوں کو میں نے مختلف سمتوں میں روانہ کر دیا۔ قریب ہی ان بخاروں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا جو ایک مرتبہ پہلے بھی مجھے پناہ دے چکے تھے۔ پولیس کے گھوڑوں کی ٹاپیں قریب ہی گونجنے لگیں۔

بخاروں کے پوڑھے سردار نے مجھے پہچان لیا اور بولا۔ ”تم ہماری عورتوں کے درمیان جا کر کسی بھی چارپائی پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جاؤ، باقی سب کچھ میں منٹ لوں گا۔“

میں پہلے ہچکچایا، مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ گھوڑوں پر سوار پولیس والے کسی بھی لئے پہنچ سکتے تھے۔

وہاں دس بارہ چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر عورتیں لیٹی ہوئی تھیں۔ سردار کے کہنے پر ایک

عورت اٹھ کر قریبی چارپائی پر سوئی ہوئی دوسری عورت کے لحاف میں گھس گئی۔ یوں ایک چارپائی میرے لئے خالی ہو گئی۔ میں اس پر عورتوں کے درمیان لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ بوڑھا سردار آگ کے الاؤ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میری گھوڑی، بخاروں کے گھوڑوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی، ذرا ہی دیر میں ایس بی متا اور اس کے ماتحت کبڑے مناسکھ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ میں لحاف میں بھری بنا کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کبڑے کو دیکھ کر مجھ پر یہ عقدہ کھل گیا کہ پولیس کو اب تک اطلاعات کون پہنچاتا رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ راکفل میرے پاس ہی تھی، جی چاہا ابھی کبڑے کو بھون دوں، مگر خود پر قابو پا لیا۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر بخاروں کا سردار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

”اے بوڑھے! یہاں کوئی ڈاکو آیا ہے؟“ متا کے ایک ماتحت نے دبنگ آواز میں سردار سے پوچھا۔

”ڈاکو..... صاحب! کچھ دیر پہلے ادھر سے چار گھڑسوار گزرے تھے۔ کیا وہ ڈاکو تھے؟“ یہ کہہ کر سردار خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ”بھگوان بھلا کرے کہ ہم بچ گئے۔ ہمارے قافلے میں آج کی رات ویسے بھی کوئی مرد نہیں ہے۔ میرے سوا سب ایک دوسرے گاؤں گئے ہوئے ہیں جہاں کل ہمارا پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے۔ اپنی عورتیں اور بچے وہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اگر ان عورتوں پر ڈاکوؤں کی بڑی نظر پڑ جاتی تو جانے کیا ہوتا۔“

سردار کی باتیں سنتے ہوئے متا نے تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر وہ مضبوط قدموں سے چارپائیوں کی طرف بڑھا۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اسی لمحے میں نے وجہ کے جسم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے وجہ کے جسم سے نکل کر تیزی کے ساتھ عدار کبڑے کی طرف لپکا۔ مجھے وجہ کے جسم کو بھی پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچانا تھا کیوں کہ میں ابھی اس کے جسم سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

کبڑے کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے پہلو پر ضرب لگائی اور وہ چیخ اٹھا۔ متا کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”کیوں کیا ہوا؟“ متا نے پلٹ کر پوچھا۔

”چپ حرامزادے!“ میں نے متا کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا؟“ متا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”مجھے کس نے گالی دی؟“

”کبڑے بد معاش نے۔“ میں دھیرے سے پھر اس کے کان میں بولا۔ ”یہ کبڑا“ وجہ سے ملا ہوا ہے۔“

”کیوں بے کبڑے! تو مجھے ڈبل کر اس کر رہا ہے؟“ متا نے آگے بڑھ کر کبڑے کا گریبان پکڑ لیا۔ اسی وقت میں کبڑے کے جسم میں گھس گیا۔

”نن..... نہیں تو سرکار!..... میں تو وجہ کا بھڑے ہوں۔“ کبڑے کی زبان میں اب میں

دل رہا تھا۔

”بھرقار کر لو اسے۔ اس کیلئے نے اعتراف جرم کر ہی لیا آخر۔“ متا نے پولیس والوں کو حکم دیا۔

”اے او متا! تو مجھے پکڑ سکتا ہے مگر وجہ کو تیرا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا۔“ میں نے متا کو مخاطب کیا۔

پھر ادھر متا کا ہاتھ گھوما اور ادھر میں کبڑے کے جسم سے باہر آ گیا۔ کبڑے کے منہ پر بڑا زوردار تھپڑ پڑا تھا۔

”صاحب! مجھ..... مجھ غریب کو کیوں مار رہے ہیں؟“ لمحے بعد ہی کبڑے نے روتے ہوئے پوچھا۔

”کتنے! میں تجھے یہ تھانے چل کر بتاؤں گا۔“ متا نے دانت پس کر کہا۔

اس وقت تک کبڑے کو ہتھکڑیاں پہنائی جا چکی تھیں، مگر وہ پولیس کا نہیں میرا مجرم تھا۔ میں نے اسی لئے پھر اس کی دھنائی شروع کر دی۔

”ہائے مر گیا..... مر گیا۔“ کبڑا زمین پر گر کر ترپنے لگا۔

اسی لمحے میں نے کبڑے کو زمین سے اٹھا کر دوبارہ بچ دیا۔ دیکھنے والوں کو یہی نظر آیا ہو گا کہ کبڑا اچھل کر خود سر کے بل زمین پر گرا ہے۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ ایسا ہی کیا اور کبڑے کی کھوپڑی بچ گئی۔

متا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں کبڑے نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ وجہ کا کوئی وفادار ساتھی تھا اسی لئے خودکشی کر کے مر گیا تاکہ پولیس اس کی زبان نہ کھلوا سکے۔ اس کی لاش اٹھاؤ اور چلو۔“

پولیس ذرا ہی دیر میں کبڑے کی لاش اٹھا کر وہاں سے چلی گئی اور میں دوبارہ وجہ کے جسم میں اتر گیا۔ پھر صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے چل دیا۔

جلدی ہی میں اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ گیا جو ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔

”مکھان اور کندن زخمی ہیں۔ مرہم پٹی کر کے انہیں سلا دیا گیا ہے۔“ ہری نے رپورٹ دی، پھر پوچھا۔ ”تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟“

میں نے اپنے ساتھیوں کو کبڑے مناسکھ کی غداری سے آگاہ کر دیا، اسی کے ساتھ کبڑے کو انجام تک پہنچا دینے کی خبر بھی سنا دی۔ اس کے لئے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا۔ ظاہر ہے میں انہیں حقیقت سے کس طرح آگاہ کر دیتا۔ میں نے بات بنائی کہ ایس بی متا دو ایک بخاروں کے لحاف اٹھا کر دیکھنے اور مطمئن ہونے کے بعد چلا گیا۔ کبڑا بخاروں کے ساتھ عیش کرنے کے لالچ میں وہیں رہ گیا۔ کبڑے نے اس سلسلے میں سردار سے بات کی۔ پولیس جا ہی چکی تھی۔ موقع دیکھتے ہی میں نے کبڑے کو دیوچ لیا۔ اسے چیتنے تک کی مصلحت نہیں ملی۔ میں نے آخر میں کہا۔ ”مجھے اس بخارے سردار کی دوستی پر فخر ہے جس نے مجھ پر اعتماد کیا اور اپنی عورتوں کے درمیان سلا دیا تاکہ میری جان بچ جائے۔ جب تک ہماری نیت ٹھیک

ہے، کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

☆=====☆

چار دن بعد میں پھر گھوڑی پر سوار ہو کر شادی کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس بار میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کر کے ہی لوٹوں گا۔ میرے ساتھی بھی یہی فیصلہ کر چکے تھے۔ بار بار پولیس کے خوف سے شادی ملتوی کرنا میری بے عزتی تھی۔ میں چاہتا تو کبڑے ہی کی طرح ایس بی متا کو بھی ختم کر سکتا تھا، مگر میرے نزدیک یہ بے سود تھا۔ اس سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ میں اسے مار دیتا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ آ جاتا اور ممکن ہے کہ وہ متا کی طرح ہمارے نہ ہو۔ دشمن بھی مجھے چھوٹا پسند نہیں تھا۔ ہری نے اس موقع پر بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ ”اس بار چاہے کچھ ہو جائے ہم وجہ کو بیاہ کر ہی لائیں گے۔“

تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر لئے گئے تھے۔ اس مرتبہ وجہ کے رشتے کے ایک چچا کی بستی میں شادی کا بندوبست کیا گیا۔ سروج کو شادی کے منڈپ تک میک اپ میں لانے کی ذمہ داری میرے ساتھیوں کی تھی۔ وجہ کی ماں مایا کور کو پولیس کی نظروں سے بچا کر وہاں پہنچانے کا کام وجہ کے ماموں خشونت کے سپرد تھا۔

میں نے اپنے منصوبے کے مطابق گردہ کے دو حصے کر دیے۔ ہری اور شکر میں ساتھیوں کے ہمراہ شادی کی تمام رسوم کے ذمے دار تھے۔ دوسرے گروپ کو شادی کے وقت ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالنا تھا تاکہ پولیس کی توجہ شادی کی طرف سے ہٹائی جاسکے۔ رات کے تین بجے یہ ڈاکہ ڈالا جانا تھا۔ شادی کا وقت صبح کے قریب رکھا گیا تھا۔

متانے اب سروج کے گھر کی نگرانی بھی شروع کرادی تھی۔ نگرانی کرنے والوں کو ڈانچ دے کر میرے ساتھی، سروج کو نکال لائے۔ یہ پروگرام طے کیا گیا تھا کہ کنیادان کے لئے بٹن سنگھ رات کو اپنے گھر سے چلے گا۔ گاؤں کے باہر ایک گھڑسوار اسے لانے کے لئے موجود تھا۔ شادی کی رسوم کے لئے دھرم گرو کا انتظام وجہ کے چچانے کیا تھا۔ میں اپنی زندگی کا ایک سنسنی خیز خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔

بعد میں اپنے مخبروں اور دوسرے ذرائع سے مجھے جن واقعات کا علم ہوا، انہیں میں واقعات کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے پہلے ہی بیان کئے دے رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ دو دھیا گاؤں میں ایس بی متا نے جن سادہ لباس پولیس والوں کو بٹن سنگھ کے گھر کی نگرانی پر مامور کیا تھا، انہی میں سے ایک نصف شب کے بعد متا کے پاس پہنچا۔ متا اس وقت سو رہا تھا۔ اسے جگایا گیا۔ نگرانی کرنے والے نے متا کو بتایا۔ ”سر! سروج کا باپ اپنے گھر سے غائب ہو چکا ہے۔ مکان میں روشنی ہو رہی ہے، مگر دروازہ پینے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ برآمدے کی دیوار پھاند کر اندر جانے پر ہمیں پتا چلا کہ باپ بیٹی دونوں غائب ہیں۔“

”تمہیں جبک مارنے کے لئے وہاں نگرانی کرنے چھوڑا گیا تھا؟“ متانے غصے میں چیخ کر کہا۔

اس نے جلدی جلدی اپنی وردی پسینی اور بیٹل میں پستول پھنسا کر فوراً ہی باہر آگیا۔

”جاؤ دیکھو وجہ کے گھر میں اس کے ماں باپ بھی ہیں یا نہیں؟“ متانے حکم دیا۔ ”اگر وجہ آج رات شادی کر رہا ہے تو اس کے والدین بھی گھر پر نہیں ہوں گے۔ کسی نہ کسی طرح مکان میں داخل ہو کر انہیں چیک کرو، سمجھو، مجھے ایک گھنٹے کے اندر جواب چاہئے۔“

”بہتر جناب!“ سادہ لباس پولیس والے نے متا کو سیلوٹ کیا، پھر پوچھا۔ ”اگر وہاں نہ ملیں سر! تو پھر؟“

”پھر بھی تم اپنی مخسوس شکل مجھے ضرور دکھاؤ گے۔“ متانے جواب دیا۔

وہ ایک گھنٹہ ایس بی متانے اضطرابی کیفیت میں گزارا۔ علاقے کے چھوٹے بڑے ڈھائی سو دیہات میں میری شادی کس گاؤں میں ہو رہی تھی، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

برق رفتار گھڑسوار پولیس والا گھنٹے بھر میں لوٹ آیا اور متا کو بتایا۔ ”گھر میں وجہ کا باپ تو موجود ہے مگر ماں نہیں ہے۔ ہمارے دریافت کرنے پر پہلے تو سوہن سنگھ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا، پھر بتایا کہ وجہ کی ماں مایا کور اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔“

”وجہ کا ماموں خشونت سنگھ نظر آیا؟“ متانے سوال کیا۔

”نہیں، وہ بھی مایا کور کے ساتھ گیا ہے۔“ جواب ملا۔

”تب تو وہ آج ہی رات شادی کرے گا۔ مجھے اپنی عزت خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ کتنے انوس کی بات ہے کہ پولیس کا محکمہ سوتا رہتا ہے۔ تم لوگوں سے بہتر تو گلی کے خارش زدہ کتے ہیں جو رات بھر ایک اچھے چوکیدار کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وجہ دھرم نگرانی میں شادی کر رہا ہے۔“

پھر متانے اپنے ساتھ بیس مسلح پولیس والے لئے اور دھرم نگرانی کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ اس نے وجہ کے نانا کے گھر ایک سادہ لباس پولیس والے کو بھیجا۔ پولیس والے نے گھر کے دروازے پر دستک دی اور بلند آواز میں پوچھا۔ ”مکان میں کوئی ہے؟“

بوڑھے نانا نے ذرا ہی دیر میں دروازہ کھول دیا۔ اسے ایک شخص گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا نظر آیا جس کے چہرے سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔

”کیوں بھائی! کیا بات ہے؟“ بوڑھے نانا نے اجنبی شخص سے معلوم کیا۔

پولیس والا جواب میں بولا۔ ”میرے بزرگ! میں ٹانک پور سے آرہا ہوں۔ اہم اطلاع پہنچانی ہے۔ سوہن سنگھ کے سینے میں اچانک درد ہو گیا ہے لہذا وہ وجہ کی ماں کو یاد کر رہے ہیں۔ میں انہیں لینے آیا ہوں۔“ پولیس والا، متا کا پڑھایا ہوا سبق دہرانے لگا۔

”آپ اکیلے آئے ہیں کیا؟“ بوڑھے نانا نے پوچھا۔

وہ شخص بوکھلا سا گیا اور پھر اس نے سنبھل کر چاروں طرف دیکھا۔ ”جی ہاں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”خشونت، وجہ کے والد کی خدمت اور دیکھ بھال کر رہا ہے۔“

بوڑھے نانا نے بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اجنبی شخص اسے بے

وقوف بنا رہا ہے۔ یقیناً یہ کوئی چکر ہے۔

”وہے کی ماں یہاں نہیں ہے۔“ جہاں دیدہ بوڑھے نانا نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں ہیں؟“ اجنبی حیرت سے بولا۔ ”تب پھر وہ کہاں ہے آپ مجھے بتائیں تاکہ میں وہاں جا کر انہیں اطلاع کر دوں۔“

بوڑھا نانا دھکلی آنکھوں سے اجنبی شخص کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آئے والا شخص کس کے اشارے پر جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے تو صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ وہے کی ماں کہاں ہے۔ اجنبی کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ پولیس کو اگلے راستے پر لگانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ بوڑھا اسی لئے نرم سے بولا۔ ”وہے کی ماں تو اس وقت ٹانگ پور پہنچ چکی ہو گی۔ کیا تمہیں راستے میں کوئی ریزھا نظر نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ اجنبی نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانگنی تھی۔

اجنبی واپس جانے لگا تو بوڑھے نانا نے اس سے کہا۔ ”سوہن سنگھ سے کتا“ صبح میں اسے دیکھنے آؤں گا۔“

متا کو یہاں بھی ٹھکانی ہوئی۔ اس کی عیاری کا جواب وہے کے بوڑھے نانا نے دے دیا تھا۔ متا بات سمجھ گیا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی منزل طے کر رہی تھیں۔ متا کی حالت کسی ہینکے ہوئے مسافر کی طرح تھی جو اندھیرے میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔ وہ دوبارہ پولیس اسٹیشن آگیا۔ وہاں ایک شخص اس کا منتظر تھا۔

”جناب! جلدی کیجئے۔“ وہ شخص تیزی سے بولا۔ ”ہمارے گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ شاید وہ وہے کا گروہ ہے۔“

متا کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”تم کون ہو؟ تمہیں اطلاع دینے کس نے بھیجا ہے؟“ متا نے دریافت کیا۔

”گاؤں کے کھیا نے مجھے بھیجا ہے۔ تقریباً تین بجے وہ گاؤں میں داخل ہوئے ہیں۔“ متا نے پاکٹ واک پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چار بج چکے تھے۔ پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ پچیس تیس مسلح پولیس والوں کو ساتھ لے کر وہ متاثرہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے گھیرے میں لینے کی امگ اسے تیز رفتاری پر آکساری تھی۔

وہ مطلوبہ گاؤں پہنچا تو لوگوں نے کہا کہ ہمیشہ ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بعد پولیس آتی ہے۔ لٹ جانے والوں کو تسلی دے کر آپ بھی لوٹ جائیں گے۔

پوچھ گچھ کرنے پر پتا چلا کہ میرے ہی گروہ نے وہاں ڈاکا ڈالا ہے۔ وہاں شادی وغیرہ کا چکر نہیں تھا۔ متا چکر کر رہ گیا۔

”گروہ میں وہے خود بھی موجود تھا یا نہیں؟“ متا نے معلوم کیا۔

”اسے کوئی جانتا ہو تو پتا چلتا جناب! پھر چروں پر ڈھائے باندھے ہوئے ڈاکوؤں کی پہچان کس طرح ہو سکتی ہے۔“

”پھر تم لوگوں نے مجھے اتنی دیر میں کیوں خبر بھیجی؟“ متا غصے سے بولا۔

”خبر! گاؤں کا کھیا حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔ ”ڈاکو گاؤں کا عاصروہ کئے ہوئے تھے، ایسے میں آپ کے پاس ہم خبر کیسے بھیجتے جناب! ڈاکوؤں نے گاؤں سے باہر جانے والوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی تھی۔“

”مگر میرے پاس خبر لانے والے نے تو بتایا تھا کہ اسے اطلاع پہنچانے کے لئے تم نے بھیجا ہے۔“ متا کو اس معاملے میں کوئی اور ہی چکر نظر آیا۔ کھیا کہنے لگا۔ ”ہم میں سے کسی نے آپ کے پاس اطلاع نہیں بھیجی جناب! آپ کے آنے پر تو ہم خود حیران تھے۔“

پھر متا کچھ نہ بولا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ ”ضرور اس میں کوئی چال ہے۔“ اس کا انداز خود کھامی کا سا تھا۔ ”تو کیا وہ آدمی وہے کا تھا؟ مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟“

کچھ سپاہیوں کو مفرد ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ کیا گیا، کچھ کو وہاں تفتیش کی غرض سے روک دیا گیا تاکہ وہ رپورٹ تیار کر سکیں۔ خود متا پولیس افسران کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ وہے نے کوئی چکر دینے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ متا کے قریبی ماتحتوں میں میرے تجربے موجود تھے۔

گھر واپس پہنچنے کے بعد ابھی متا سستایا بھی نہیں تھا کہ ایک شخص لنگڑاٹا اور ہانپتا ہوا آیا۔ وہ متا کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

”صاحب!“ یہ کہتے ہوئے وہ بڑی طرح لڑکھڑایا۔

متا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ متا نے دیکھا، اس شخص کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا، آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور تیزی سے چلنے والا سانس اس کے خون کی تیز گردش کا ہتادے رہا تھا۔ متا نے اسے فرش پر لٹایا اور کہا۔ ”تم بہت زیادہ زخمی ہو۔ ہسپتال جانے کی بجائے میرے پاس کیوں آ گئے؟“

”صاحب!.....“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

متا نے پانی کا گلاس منگوا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ زخمی شخص جلدی جلدی پانی پینے لگا جیسے بھاس سے اس کا حلق خشک ہو۔ متا سمجھ چکا تھا کہ زخمی شخص اس کے لئے کوئی اہم اطلاع لے کر آیا ہے۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

زخمی شخص بڑی مشکل سے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ”ہمارے گاؤں میں وہے کی شادی ہو رہی ہے۔ میں یہی اطلاع دینے کی غرض سے چھپ کر گاؤں سے باہر آیا، مگر ڈاکوؤں کو پتا چل گیا۔ میں بھاگا تو ایک ڈاکو کی گولی نے میری ران چیر دی۔ بڑی مشکل سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ غریب آدمی ہوں حضور! لہذا انعام مجھی کو دلانیے گا۔“

آخری الفاظ کے ساتھ ہی زخمی شخص پر ہتھیوں کا دورہ پڑ گیا۔ پھر اس نے ایک لمبی ہتھی لی اور روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔

میتا اس شخص کے بے جان چہرے کو دیکھنے لگا جو اس کے لئے بہت قیمتی خبر لے کر آیا تھا، مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مرنے والا شخص اپنے گاؤں کا نام نہیں بتا سکا تھا۔ میتا کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پوری اطلاع بے سود ہو گئی تھی۔ وہ غور سے مقتول کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے مگر زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔ اب وہ میتا کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میتا مایوس ہو جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کی نظریں دروازے کے باہر سے مقتول کے جسم تک خون کی لکیر پر جم گئیں اور اس کی آنکھیں اسی کے ساتھ چمک اٹھیں۔ وہ تیزی سے پلٹا اور خون کی لکیر دیکھتا ہوا اپنے مکان سے باہر سڑک پر آ گیا۔ مزید کچھ سوچنا لاحاصل ہی تھا۔ آٹھ دس سپاہیوں کے ساتھ وہ خون کی لکیر کے سارے آگے بڑھنے لگا۔

☆=====☆=====☆

آسمان سے سورج کی پہلی کرن نے زمین پر آ کر صبح کا اعلان کیا۔ اسی وقت میں اور سورج مقدس گرد گرنتھ کے سامنے بیٹھ کر دھرم گرد کی آوازیں اپنی آواز ملا کر مقدس کتاب کے الفاظ دہرانے لگے۔ پھر پھیرے شروع ہوئے۔ جہاں تک مقدس الفاظ کی ایک سطر پوری ہوتی ہم گرنتھ صاحب کا پورا پکر لگاتے ہوئے بیٹھ جاتے۔ میرے سر پر سرا بندھا ہوا تھا اور سورج کا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ آئین میں بندھے ہوئے شامیانے کے نیچے شادی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں۔ وجہ کی ماں، سورج کا باپ، خشونت سنگھ اور دوسرے کچھ قریبی رشتے دار موجود تھے۔ دھرم گرد (سکھوں کا مذہبی رہنما) جب مقدس کتاب کے چار پھیرے کے الفاظ پڑھ لے تو شادی کی رسم پوری ہوتی ہے۔ مجھے اور سورج کو پھیرے لگاتے دیکھ کر مسرت سے لبریز مسکراہٹ کے ساتھ وجہ کی ماں مایا کور بھگوان کا شکر ادا کر رہی تھی۔ ”بھگوان! میرے خاندان کی لاج رکھنا۔“

چوتھا پھیرا ختم ہوتے ہی دور سے رانگل کا دھماکہ سنائی دیا۔ سب چونک کر ہوشیار ہو گئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری شادی کی خوشی میں پولیس موت کا پیغام بن کر آگئی ہو۔ ہر لمحہ لوگوں کو جیسے ایک یقینی موت سے قریب کر رہا تھا۔ سب سنائے میں تھے۔

”آپ رسم جاری رکھیں۔ ہم پھیرے کرتے رہیں گے۔ اب شادی نہیں رکے گی۔“ میری مضبوط اور ٹھہری ہوئی آواز سنائے میں گونجی۔

چار پھیرے ایک طرح سے لازمی ہیں اور بقیہ تین پھیرے خوش بختی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ دنا دن گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سورج نظریں جھکائے ہوئے میرے ساتھ بقیہ پھیرے کر رہی تھی۔ ان تینوں پھیروں کا ثواب عقیدے کے مطابق الگ سے ملتا ہے۔ سورج کے قدم مضبوطی سے حرکت کر رہے تھے۔ نئی زندگی کے راستے پر چلتے ہوئے اس کے قدموں میں ذرا سی بھی نفرت نہیں آ رہی تھی۔

جیسے ہی پھیرے پورے ہوئے میں نے اپنے چہرے سے سرا اٹھایا اور سورج کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر ہم دونوں بطور تعظیم مایا کور کے آگے جھک گئے۔

”تمہاری جوڑی سلامت رہے۔“ مایا کور نے ہمیں دعا دی۔

رانگلوں کے دھماکوں کی آوازیں اب قریب سنائی دے رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ شور بھی تھا۔ مایا کور نے مجھے اور سورج کو مکان کے دروازے کے درمیان کھڑا کر کے جلدی جلدی رسوم ادا کیں۔ اسی کے بعد میں فوراً اپنی گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اسے ایڑ لگائی۔

وہاں سے میرے فرار کے بعد جو کچھ ہوا مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ایس پی میتا اس وقت وہاں پہنچا جب میں فرار ہو رہا تھا۔ اٹھتے ہوئے غبار کی جانب اس نے پستول کا رخ کر کے فائرنگ شروع کر دی، مگر پستول کے فائر کی ریخ کم تھی، فائر بیکار ثابت ہوئے۔ اس نے گرج کر سپاہیوں سے کہا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو، گولی چلاؤ۔“

پستول سے زیادہ رانگل لہا فائر کر سکتی تھی، مگر میری گھوڑی سمجھدار تھی۔ نشانہ خالی دینے کے لئے میں نے لگام سے اسے اشارہ دیا اور نامک تیزی سے لہرائی ہوئی دوڑنے لگی۔ مضطرب میتا نے ایک سپاہی سے رانگل لے کر دو ایک فائر داغ دیے، مگر کامیاب نہیں ہوا اور گھوڑی اپنے سوار کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میتا ہاتھ لگی بازی ہار گیا اور تحسک سے مغلوب ہو کر بیٹھ گیا۔ آج آدمی رات کے بعد وہ چند لمحوں کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ مایا کور اندر گئی اور پانی کا گلاس میتا کے لئے لے آئی۔ اپنے لاڈلے بیٹے پر گولی چلانے والے پولیس افسر کو پانی کا بھرا ہوا گلاس دینے والی بہادر ماں کو متا حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میتا پانی پی کر کچھ کتا، مایا کور نے اپنی نئی ٹوبلی ہو سورج کو حکم دیا۔ ”ہو بیٹی! میتا صاحب کے چرن چھوؤ۔“

ساس کا پہلا حکم سورج کے لئے امتحان تھا۔ جو شخص اس کا سہاگ لوٹنے شادی کے منڈپ تک آ پہنچا تھا، اس کے پیر چھوٹے کا حکم تھا۔ پھر بھی وہ اپنی ساس کے حکم کی تعمیل میں جھک گئی۔ اس نے میتا کے سامنے سر جھکایا۔ میتا جیسے امتحان میں پڑ گیا۔ ابھی ابھی بیانی ہوئی لڑکی اس کے پیر چھو رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائے دیتا تو یہ ظلم ہوتا۔ پستول اس نے بیٹھ میں بنے ہوئے کیس کے اندر رکھ لیا۔

میتا نے سورج کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ”چند لمحے پہلے میں تمہارے شوہر پر گولی چلا رہا تھا، مگر اس وقت میں قانون کے نگہبان کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اب تمہارے بزرگ کی حیثیت سے اور تمہیں اپنی بیٹی سان (کی طرح) سمجھ کر دعا دیتا ہوں کہ تمہارا سہاگ ہمیشہ سلامت رہے۔“

پھر مایا کور، دولہا کے بغیر اپنی ہو کو نانک پور لے آئی۔ ایس پی میتا پرامید تھا کہ میں سہاگ رات منانے نانک پور ضرور آؤں گا۔ اس وقت اسے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ مجھے تمام اطلاعات مل گئیں کہ نانک پور کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

شادی کر کے سورج سے نہ ملنا خود سورج کے ساتھ بھی ظلم تھا اور اپنے ساتھ بھی۔ یہی سوچ کر

شادی کے پانچویں دن میں نے اپنے خیر کو ناک پور بھیجا۔ میں نے اس کے ذریعے وجہ کے گھر یہ کہلوا یا تھا کہ میرا ناک پور آنا خطرے سے خالی نہیں لہذا سرج کو ناک پور سے بھیجنا پڑے گا۔ میں نے سرج کو نہایت رازداری کے ساتھ اس کے میکے بھجوانے کو کہا تھا۔ ساتویں دن شام کو سرج مردانہ لباس میں لوگوں کی آنکھوں سے بچ کر اپنے میکے دودھیا گاؤں پہنچ گئی۔ خجروں نے مجھ تک یہ خبر پہنچادی۔

میں اسی رات دودھیا گاؤں پہنچ گیا۔ آدمی رات کے قریب میں نے مکان کے عقبی دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے ایک کمرے میں سرج دلن بی بی بیٹی تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر سرج نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ سٹ گئی اور منہ پھیر لیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں آگے بڑھا اور مسہری پر بیٹھ کر سرج کی پشت پر ہاتھ رکھا۔

سرج شرما کر کچھ آگے ہو گئی، پھر کہنے لگی۔ ”ٹھہریے“ میں آپ کے لئے کچھ لاتی ہوں۔“ وہ یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

زرا دیر بعد وہ تھالی میں چاندی کا پیالہ لے کر واپس ہوئی۔ میں اسے پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حسن کا ایسا شاہکار تھی جس نے میرے دل کا سکون چھین لیا تھا۔

بستر پر بیٹھتے ہوئے سرج نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ذعفرانی دودھ ہے۔“ اس کا نازک ہاتھ میری طرف بڑھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے پیالہ لیا اور دوسرے سے سرج کی کلائی تھام لی۔ شرم سے سٹ کر ہاتھ کھینچتی ہوئی سرج کو میں نے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم اس طرح شرماتی رہو گی تو صبح ہو جائے گی اور مجھے صبح ہونے سے پہلے چلے جانا ہے۔“ پھر دودھ کا پیالہ ایک طرف رکھ کر اس آدم زاد کو میں نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

رات کی خاموشی میں دو دل ایک دوسرے میں سما جانا چاہتے تھے۔ سرج نے چمت کی جانب چلتی ہوئی لالین کو دیکھ کر اشارہ کیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اٹھ کر لالین بچادی۔ سرج نے میرے قدموں پر گر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کے سکھ کی خاطر سب کچھ کروں گی۔“

اس کو اپنے قدموں سے اٹھا کر میں نے پہلو میں بٹھالیا اور بولا۔ ”میرے سکون کی خاطر؟ میرے ماں باپ کے سکون کی خاطر نہیں؟“

”آپ کے ماتا پتا کے سکھ الگ کب ہیں؟“ اب سرج کی قوت گویائی جیسے واپس آ گئی۔ وہ بلا جھجک بول رہی تھی۔

”نہیں سرج! یہ بات نہیں۔ میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میرے ماں باپ کو مجھ سے جو امیدیں“ سکتی تھیں، انہیں پورا کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ تمہاری ذمے داری اسی لئے بڑھ گئی ہے۔“ میں نے بے بات اس لئے کہی کہ وجہ کے والدین کو سرج اپنے والدین کی طرح سمجھے۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ان کے کسی حکم کو میں نہیں ٹھکراؤں گی“ اس کا آپ یقین رکھیں اور کچھ؟“

”اور ہاں..... دوسری بات، مجھے ناچ گانے سے سخت نفرت ہے، تم اس بات کا خیال رکھنا۔“ پھر سرج کو دوبارہ میں نے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ لمحہ لمحہ بانہوں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد سرج کے چڑھتے ہوئے سانہوں کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار کا جلتنگ کمرے میں گونجنے لگا۔ رات کا ثبات اپنی منزل طے کر رہا تھا۔

میں صبح ٹھکانے پر واپس پہنچا تو میرے چاروں قریبی ساتھیوں نے شریر مسکراہٹوں سے میرا استقبال کیا۔ ہری نے شرارت کا آغاز کیا۔ ”بھابی کی بانہوں سے بہت جلد نکل آئے؟ آخر ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“

”بیٹے! تیری بھی باری آئے گی۔“ میں بولا، پھر اسے چھیڑا۔ ”سرج نے تیرے لئے ایک لڑکی تلاش کر لی ہے۔“

”میرے لئے؟“ ہری نے حیرت سے کہا۔ ”تعب ہے کہ بھابی آتے ہی میرے لئے فکر کرنے لگی ہیں۔ بتاؤ تو وہ لڑکی کیسی ہے؟“

میں نے اپنے بقیہ تینوں ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی کی وہ بہت تعریف کر رہی تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے، ایک بار دیکھ کر بھلائی نہیں جاسکتی۔ ذاتی طور پر تیرے لئے مجھے وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔“

”مگر مجھ جیسے آوارہ گرد سے وہ شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی؟“ ہری نے پزمرت لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں کرے گی؟ وہ تیری بھابی کی ہر بات مانتی ہے، انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر میں دانستہ دوسری باتیں کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں ہری کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی اٹھا۔ ”ابھی تم بھابی سے ملاقات کر کے آئے ہو“ دوسری باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ کوئی دلچسپ بات کرو کہ لطف بھی آئے۔“

”کیا دلچسپ بات کروں؟“ میں نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے سوال کیا۔

”اسی لڑکی کی بات۔ وہ کیسی ہے؟ کچھ اس کی بات کرو۔“ ہری دل کی بات زبان پر لے آیا۔

”اچھا تو سنو۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”وہ لڑکی بہت زیادہ حسین ہے، صرف ایک کمزوری ہے کہ کافی ہے لیکن یہ کوئی خاص برائی نہیں ہے۔“ میں نے تینوں ساتھیوں کو پھر مخصوص اشارہ کیا۔

”ہاں ہری!..... کافی لڑکی تو اچھی رہے گی۔ ایک آنکھ سے وہ صرف تم ہی کو دیکھے گی۔“ رگھوپر بھی میری تائید میں سنجیدگی سے بولا۔

شکر بھی پیچھے نہ رہا۔ اس نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔ ”پھر ایک اور بھی فائدہ ہے۔ وہ ہماری طرف یا کسی دوسرے کی جانب دیکھ ہی نہ سکے گی۔ ہری کے لئے یہی لڑکی مناسب رہے گی۔“

ہری نے خاموشی اختیار کر لی تو میں نے مزید کہا۔ ”اس کی آواز کسی کو نکل کی طرح ہے۔ تیری بھابی تعریف کر رہی تھی۔ بس سنے جاؤ، دل ہی نہ بھرے لیکن ذرا ہلکاتی ہے۔ جب تک وہ اپنی بات پوری نہ کر لے، انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ اس مرتبہ موہن بول اٹھا۔ ”وہ مرد خوش نصیب ہوتا ہے جس کی بیوی زبان دراز نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں ہری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

”ہاں ایک بات اور یاد آئی۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں لیکن.....“

ہری کی قوت برداشت جواب دے گئی بولا۔ ”اس میں بھی کچھ ہے؟“

”ہاں یار! اس کے اگلے دانت تھوڑے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ پاؤں بڑے خوبصورت ہیں، مگر ذرا مالتھاتی ہے اور پشت پر چھوٹا سا کبڑ ہے۔ ویسے لڑکی حسین ہے۔“

”بس بس بہت ہو گیا۔“ ہری غصے سے چیخ اٹھا۔ ”مطلب یہ ہے، اس کے جسم کا کوئی حصہ صحیح نہیں ہے اور میرے لئے بھابی نے ایسی لڑکی پسند کی ہے۔“

ہری کے چہرے کو دیکھ کر ہم سب کی ہنسی پھوٹ گئی۔

”ایسی لنگوڑی کو بیاہنے سے تو کل دالی خن بانو بہتر ہے۔ اس سے کبھی کبھی ملاقات ہو جائے تو بہتر ہے۔“ ہری نے کہا۔

”کل دالی خن بانو؟“ میری پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”کل رات تم لوگ کہاں گئے تھے؟“ میرے لہجے میں سختی آگئی۔

چاروں ساتھی ایک دوسرے کو مجرموں کی طرح دیکھنے لگے۔ ہری کی زبان پر یقیناً ایسی بات آگئی تھی جو ان لوگوں کو مجھ سے چھپانا تھی۔ وہ سب خاموش رہے اور میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان کی خاموشی میں کسی اخلاقی جرم کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو سختی سے یہ تاکید کر رکھی تھی کہ وہ بازاری عورتوں سے دور رہیں۔ میری غیر حاضری میں وہ یہ ہدایت بھول گئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے ساتھیوں نے میرا کوئی حکم نہیں مانا تھا۔ میرے نزدیک یہ کافی سنجیدہ معاملہ تھا۔

”تم لوگوں کو میں نے منع کیا تھا۔“ میں پھر سختی سے بولا۔ ”اس کے باوجود تم لوگ اسی راستے.....“

”ہم نے وہاں جا کر کوئی پاپ (گناہ) نہیں کیا۔“ شکر بول اٹھا۔ ”ناچ دیکھنا کوئی جرم یا پاپ تو نہیں۔“

”ناچ؟“ مجھے غصہ آگیا۔ ”تم لوگ پاپ کی بات کر رہے ہو، مجھے ناچ سے سخت نفرت ہے، مگر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں پاپ کو بھی درمیان میں لانا نہیں چاہتا۔ بے گناہی پر کمر کرنے والوں کو جس بات سے بچنا چاہئے سوال اس کا ہے۔ بازاری عورت کسی کی رشتے دار نہیں ہوتی۔ وہ تو تمہیں دو گھڑی خوش کرنے کے لئے اپنے جسم کو تھرکاتی ہے، صرف پیسے کی خاطر۔ وہ پیسے کے لالچ میں کیا تمہیں گرفتار نہیں کر دے

گی، اس کا کیا ثبوت ہے؟“ میری آواز تیز ہوتی گئی۔ ”قانون سے بے گناہی کرنے والے بڑے بڑے جی دار ایسی ہی پیشہ ور عورتوں کے جال میں پھنس کر مارے گئے۔ ایسا ہی سنہرا جال بچھا کر پولیس جہیں دھرے، اس سے زیادہ ایک ڈاکو کے لئے کوئی بے عزتی نہیں۔ کسی ٹاپنے والی کی پائل سے گھائل ہو جانا بڑی ذلت کی بات ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ہم گولیوں کا راگ سننے ہوئے موت کو گلے سے لگا لیں۔ آج ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ کون کیا چاہتا ہے۔“ میں شدید غصے میں تھا۔ اس سے پہلے میرے ساتھیوں نے مجھے اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اسی لئے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ میں کچھ دیر بعد نرم پڑ گیا اور دھیسے لہجے میں کہا۔ ”مرد کی ہوس کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، مگر اس کے لئے تمہیں شادی کر لینا چاہئے۔ جان جو کھوں میں ڈال کر میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ پھر میں کوئی کچھ نہ بولا تو مجھے دوبارہ غصہ آنے لگا۔ ”میں ہی مسلسل بولے جا رہا ہوں، تم لوگ بھی تو جواب میں کچھ بکو۔“

”وہ! تمہاری بات صحیح ہے۔“ ہری ہمت کر کے بولا۔ ”اس حسن بانو نے جھک جھک کر بڑے پیارے انداز میں ہمیں پھر آنے کی دعوت دی ہے، یہاں تک کہ اس نے دوبارہ آنے کے بارے میں ہم سے تاریخ بھی معلوم کی۔ شاید وہ ہمیں پہچان گئی ہے۔ ہماری اس غلطی پر تم ہمیں جو چاہو سزا دے سکتے ہو۔“

”سزا۔“ میں نے ٹٹلتے ہوئے کہا۔ ”سزا تو میں اپنے آپ کو دوں گا۔ میں اب کبھی اپنی عورت سے نہیں ملوں گا۔ یہی ہمارے لئے بہتر ہے۔“

میری بات پر شکر کو غصہ آگیا اور بولا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو وہ! کیا تمہارے خیال میں ہم اتنے کم ظرف ہیں کہ اپنے دوست کے سکھ سے جلتے ہوں۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر۔“ پھر اس نے شانے سے راکٹل اور کارتوسوں کی بیٹل اتار کر میرے پیروں میں پھینک دی۔ ”سلام ہے ایسی دوستی کو۔“

شکر ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ میں نے اسے بلند آواز میں مخاطب کیا۔ ”شکر! اب تم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاؤ گے۔“ وہ رک گیا تو میں نے اس کی راکٹل اور کارتوسوں کی بیٹل اٹھائی۔ پھر میں آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولا۔ ”آخری لمحات تک ساتھ بھالنے کا قول و قرار کرنے کے بعد تم اس طرح چلے جاؤ گے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ تمہاری بھابی سے میں ملتا رہوں گا مگر مینے میں صرف ایک بار۔“

شکر کی آنکھوں سے پیار کے جشے ابل پڑے۔ وہ پلٹا اور میرے سینے سے لگ گیا۔ اسی وقت ہری چکا۔ ”چلو میں اس اونٹ مار کا لڑکی سے شادی کر لوں گا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ حسن بانو جہنم میں جائے۔“

اس پر ہم سبھی ہنس پڑے۔

☆-----☆-----☆

میری شادی کے بعد دو ہفتے کسی سرگرمی کے بغیر گزر گئے۔ شادی سے قطع نظر درمیان میں اس طرح آرام کرنا میرا اصول تھا۔ میں اس عرصے میں نئے اسلحہ کی خریداری اور نئے آدمیوں کی بھرتی کا کام

انجام دیتا۔ ڈاکے ڈالنے کے متعلق مجبوروں کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق تمام منصوبے بھی انہی دلوں میں تیار ہو جاتے۔ آدمی کتنے ہی قابل اعتماد کیوں نہ ہوں، میں اچانک ہی اپنے قیام کی جگہ بدل دیتا۔ کسی بھی وقت میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا کہ سامان باندھ لو۔ میرے ساتھی سمجھ جاتے کہ جگہ تبدیل کی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ مجھے محفوظ مقامات پر آسرا مل جاتا۔ میرے مقامی ساتھی اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی میری حفاظت کرنے کے سلسلے میں ہوشیار رہتے۔

ایک روز رات کے کھانے کے بعد ہم الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے ہاتھ گرم کر رہے تھے کہ ایک خبر آ پونچا۔

”ایک برات ریڑھے کے کچے راستے پر آ رہی ہے۔ وہ کسی زمیندار کی برات لگتی ہے۔ برات میں خاصے لوگ ہیں۔ اچھا مال ہاتھ آنے کی امید ہے۔“ خبر نے تفصیل بتائی۔

سب لوگ ہوشیار ہو گئے۔ برات کہاں۔ یہ روانہ ہوئی ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ یہ تفصیل معلوم کی۔ اندازاً برات کے ساتھ کتنے مسلح افراد ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی معلوم کر لیا گیا۔ کچھ خبر برات کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ میں نے کچھ ہی دیر میں اندازہ کر لیا کہ برات دو گھنٹے بعد ایک مخصوص جگہ سے گزرے گی۔ برات کو اس جگہ گھیرنے کا منصوبہ بنا کر میں اپنے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ مقررہ مقام تک پہنچ کر دو بلند چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ریڑھے کے کچے راستے پر اپنے گردہ کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ راستے کے دونوں جانب میری ہدایت پر ساتھیوں نے مورچے بنا لئے۔ سردی کم کرنے کے لئے دو جگہ چھوٹے چھوٹے الاؤ جلائے گئے اور برات کا انتظار ہونے لگا۔ ساتھ ہی تین چار مشعلیں بھی تیار تھیں۔ ڈاکہ ڈالتے وقت انہیں چلانا تھا۔ برات لوٹنے کے طریقے سے سبھی واقف تھے۔ پھر بھی میں نے انہیں سنبھالنا۔ ”دلہن کے جسم سے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری عورتوں کو پریشان کئے بغیر ان کے زیورات پر قبضہ کرنا ہے۔ میرا اگر مداخلت کریں تو ان کی حرمت کرنے کے سوا تمہیں قتل و غارت گری سے کام نہیں لینا۔ جیسے ہی میں آواز دوں چند آدمی سامنے اور چند عقب سے اور کچھ افراد درمیان سے انہیں پوری طرح گھیر لیں گے۔“

میری ہدایات سن کر سب نے اہانت میں سر ہلا دیئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد دور ہمیں روشنیاں حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔ روشنیوں کی قطار دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ برات کے سب سے پہلے ریڑھے آ رہے ہیں۔ میں نے دھیمی آواز میں اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا۔ سب کی نظریں اندھیرے کے پار حرکت کرتی ہوئی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

اونچے نیچے راستے پر لڑھکتے ہوئے ریڑھے آہستگی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ریڑھوں میں لکڑی کی چھت سے لٹکی ہوئی لائینیں ریڑھوں کی حرکت کے ساتھ ہلتی ہوئی عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں جیسے اندھیرے میں ستارے ٹٹھرا رہے ہوں۔ ڈاکوؤں کا خطرہ ہونے کے باوجود برات رات کو کیوں آ رہی تھی اس پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو حیرت تھی۔

رات کے سنانے کو چرتی ہوئی بیلوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں عجیب سا ساز بجا رہی

تھیں۔

میں نے ایک مشعل الاؤ پر رکھ کر چلائی اور ریڑھوں کو گنا ان کی تعداد سات تھی۔ دونوں چٹانوں کے درمیان سامنے والے ریڑھے داخل ہو گئے۔ اسی لمحے میں نے اپنی رائفل سے فائر کیا اور فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ یہ ہوائی فائر تھا۔ پھر میں بلند آواز میں بولا۔ ”رک جاؤ۔“

ریڑھے والوں نے بیلوں کی لگائیں کھینچ لیں۔ میں مشعل بلند کر کے زمین پر اوندھا لٹ گیا۔ ”کون ہے، کون ہے؟“ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ”دنا دان“ کی آواز کے ساتھ دو گولیاں سنسناتی ہوئی مشعل کے قریب سے گزر گئیں۔ تیل فائرنگ سے بدکنے لگے۔ میں کسی قسم کی حرکت کے بغیر زمین پر لیٹا رہا۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید اور بھی جوانی فائرنگ میں ہوگی لیکن اس عرصے میں میرے ساتھیوں نے اندھیرے سے نکل کر پوری برات کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

”خبردار! اگر کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔“ ہری کی گرجدار آواز سنائی دی۔

ان ریڑھوں میں سے تیسرے ریڑھے کے بیلوں کی آڑ میں ایک ہندوق بردار براتی چھپ گیا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہری کے سر کا نشانہ لیا، مگر مشعل کی روشنی میں فکر نے اس براتی کو دیکھ لیا پھر شکر نے جیتے کی طرح جست لگا کر اس براتی کی پشت پر جلتی ہوئی مشعل لگا دی۔

اس براتی کے منہ سے دل خراش چیخ نکل کر فضا میں بکھر گئی۔ رگھویر نے بھی اسی وقت گولی چلائی، مگر براتی اپنی جگہ سے ہل چکا تھا۔ سنسناتی ہوئی گولی ایک تیل کی گردن کے آر پار ہو گئی۔ تیل زور سے چیخا ہوا کودا۔ ساتھ ہی اس ریڑھے سے بندھی ہوئی رسی بھی ٹوٹ گئی۔ ریڑھا ایک طرف الٹ گیا۔ مسلح براتی اسی کے نیچے دب گیا۔ اندر بیٹھے ہوئے تین آدمی باہر کی طرف گرے۔ دولہا اپنی گلوں کے ساتھ زمین پر چت گرا۔ ہری کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر وہ کپکپانے لگا۔

میں اسی عرصے میں اوپر سے اتر کر ان کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے تڑپتے ہوئے تیل کو گولی مار کی ٹھنڈا کر دیا، پھر زوردار آواز میں گرجا۔ ”تم لوگوں نے ذرا بھی چالاکی دکھانا چاہی تو چالاکی دکھانے والے کی لاش بھی مردہ تیل کے قریب نظر آئے گی۔“ قابو میں آئے ہوئے لوگوں کو وجہ بھی پریشان نہیں کرتا لیکن مقابلہ کرنے والوں کو معاف بھی نہیں کرنا۔“ یہ کہتے ہی میں نے اپنے ساتھیوں کو برات لوٹنے کا اشارہ کیا۔

میں نے دانستہ انہیں اپنا نام بتایا تھا۔ اس کا رد عمل توقع کے مطابق ہوا۔ براتی حواس باختہ نظر آنے لگی۔

عورتوں کی ناک، کان، گردنوں اور ہاتھوں پر سے سونے کے زیورات اترنے لگے۔ سخت سردی میں ہمارے خوف سے کپکپاتے ہوئے براتیوں میں سے ایک شخص نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا۔ ”تمہارا نام ہم نے بت سنا ہے۔ تمہاری پارٹی کبھی عورتوں کو نہیں لومتی یہ بھی ہم نے سنا ہے۔“

رہا ہے۔“

میں نے گھوڑی کی لگام کھینچ کر ایڑ لگائی اور گھوڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے روانگی سے قبل اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا تھا۔ ”کوئی غریب بچی چیز کی وجہ سے کنواری رہ جائے، یہ ناانسانی میں برداشت نہیں کروں گا۔“

منزل مقصود سے پہلے ہی ہم گھوڑوں سے اتر گئے اور پھر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ ہم نے گھوڑوں کی لگامیں تھام رکھی تھیں۔

مطلوبہ مکان کے قریب رک کر میں نے سن گمن لی۔ منڈپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے جہاں شہنائیاں گونج رہی ہوں گی، وہاں سے اب ایک ارمان بھری کنواری کی ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ لڑکی کا غریب اور کمزور باپ سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہا تھا۔ لڑکی کی سوتیلی ماں کی زبان اس وقت قہقہی کی طرح چل رہی تھی۔ دھیمی آواز میں دولہے کے باپ نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کون ہیں۔

”اس لڑکی کے نصیب ہی خراب ہیں۔“ سوتیلی ماں زہرا گل رہی تھی۔ ”منڈپ تک آیا ہوا دولہا شادی کے بغیر لوٹ گیا۔ اب بیٹھی ہوئی رونے کا ڈھونگ رہا رہی ہے۔ اری بد نصیب، رونے سے تو یہ اچھا ہے کہ کسی کنوئیں میں ڈوب کے مر جا۔“

لڑکی کے نانا اور دوسرے گھر کے لوگ، لڑکی کی حمایت میں بولے کہ تم لڑکی کو تسلی دینے کے بجائے طعنے دے رہی ہو۔ برات واپس چلی گئی تو اس میں لڑکی کا کیا قصور ہے؟ قصور تو تمہارے گئے بیٹے کا ہے جو سوتیلی بہن کے زیورات لے کر فرار ہو گیا۔

”خبردار جو تم لوگوں نے میرے بیٹے کا نام لیا۔“ لڑکی کی سوتیلی ماں بھڑک اٹھی۔ ”وہ بے چارہ تو اپنے باپ کے ظلم سے تنگ آ کر گھر سے گیا ہے۔ زیورات چرانے کا اس پر الزام لگاتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ بھلا میرا بیٹا ایسا کیوں کرنے لگا۔“

زبانی جھگڑا مار دھاڑ میں تبدیل ہو رہا تھا کیوں کہ لڑکی کی سوتیلی ماں کے میکے والے بھی وہاں موجود تھے۔ اسی وقت ہم سب اندھیرے سے نکل کر وہاں پہنچ گئے۔ سب لوگ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ میرے ہاتھ میں پتول تھا اور شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔

”احق کے بچے! نیچے اتر۔“ میں نے دولہے کو بازو سے پکڑ کر گھوڑی سے اتارا۔

ہری نے زمیندار کو گھوڑی سے نیچے کھینچ لیا۔

”لڑکی کا باپ ادھر آئے۔“ میں نے بوڑھے کو قریب بلایا، پھر کہا۔ ”فوراً دھرم گرد کو بلاؤ اور شادی کا انتظام کرو۔“

یہ الفاظ سنتے ہی سسکتی ہوئی لڑکی نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ درود کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کا کاجل آنسوؤں کے ساتھ ہمہ کر اس کے رخساروں پر پھیل گیا تھا۔ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

”تم نے غلط سنا ہے میرے دوست!“ میں تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”میں کسی عورت کی عزت نہیں لوٹا۔ عورت اگر اکیلی ہو تو اس کے زیورات پر بھی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیسے مرد عورت کی آڑ لے کر جس قدر ممکن ہو مال بچانے کی کوشش کرتے ہو۔ تمہاری چال میں سمجھ چکا ہوں۔ اس کے باوجود دلہن کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔“

”اس برات کے ساتھ دلہن نہیں ہے۔ دولہا بغیر شادی کے برات واپس لے جا رہا ہے۔“ دولہا کے باپ نے عاجزانہ لہجے میں بتایا۔ ”حضور! ہم تو دو طرف سے لٹے ہیں۔ لڑکی کا باپ بے ایمان نکلا۔ اس نے پہلے سے طے کیا ہوا چیز نہیں دیا اور واپسی میں یہاں بھی لٹے۔ بھگوان کے لئے ہمیں جانے دیں۔“

میں سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ ”برات منڈپ سے واپس آگئی۔ باپ کی عہد شکنی کا بدلہ تم نے بیٹی سے لیا۔ اس کا تم لوگوں نے بالکل خیال نہیں کیا؟“

”ہم اپنے بیٹے کو بیاہنے ہی تو گئے تھے۔“ دولہا کے باپ نے صفائی پیش کی۔ ”مگر طے شدہ چیز تو ملنا چاہئے تھا۔ آپ چیز دلوادیں تو ہم منڈپ کی طرف لوٹنے کو تیار ہیں۔“

میں نے اس کی پہلی پر گھونسا مار دیا۔ ”احق کے بچے! تو مجھ سے سودے بازی کر رہا ہے۔ مجھے لڑکی کا باپ سمجھتا ہے۔“ میں غصے سے پھر گیا۔ پھر دولہا کی فیض کا کار تھام کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ ”اٹو کے شے! تجھے بھی اپنی ہونے والی بیوی پر رحم نہیں آیا جو تو اسی طرح شادی کے بغیر بیرنگ لفافے کی طرح پلٹ آیا۔“

دولہا کے چہرے کا بچہ لگے اور اس نے جواب دیا۔ ”کیا کرتا، میرے باپو نے حکم دیا تو مجھے واپس آنا پڑا ورنہ مجھے خود بھی لڑ لڑی پسند ہے۔“

میں نے اسے دھکا دے کر الگ ہٹا دیا۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ پتلو سے اپنا پتول نکال کر میں نے آواز لگائی۔ ”ہری..... شکر!“ وہ دونوں میرے سامنے آگئے تو میں بولا۔ ”میری گھوڑی اور تم دونوں اپنے گھوڑے یہاں لے آؤ۔“ پھر میں نے موہن اور رگھو دیر کو بلا کر ہدایات دیں۔

میں کیا کرنا چاہتا ہوں، ظاہر ہے دولہا کا باپ کیا سمجھتا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہوا تھا۔

شکر اور ہری گھوڑے لے آئے تو میں نے زمیندار کو حکم دیا۔ ”چل گھوڑے پر سوار ہو جا۔“ پھر میں نے ہری سے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میں دولہے کو اپنی گھوڑی پر بٹھالیتا ہوں۔ ایک اور شخص بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔“

”مگر ہمیں آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟“ دولہے کے زمیندار باپ نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

”منڈپ میں۔ ہم تمہارے بیٹے کی شادی کرائیں گے۔“ میں نے زہر لی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

زمیندار کچھ کستا ہی چاہتا تھا کہ ہری نے اس کی پشت پر گھونسا جڑتے ہوئے کہا۔ ”چپ رہو، ہم کہتے ہیں، تم لوگ اسی طرح کرو گے۔ تم خوش نصیب ہو کہ وجہ تمہارے بیٹے کی شادی میں شرکت کر

وہیں کا مقابلہ کرتے ہوئے پولیس والے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ پولیس کے ساتھ لڑکی کا سوتیلا بھائی تھا جسے پھٹکڑی لگی ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں چھوٹا صندوق نما ڈبا تھا۔ اس نے دلہن کے پاس سے کہا۔ ”تمہارا یہ صاب زادہ اچانک ہمارے ہت لگ گیا۔ ہم لوگ ڈاکوؤں کی تلاش میں گشت کر رہے تھے۔ یہ زورات کا ڈبا لے کر بھگ رہا تھا۔ ہم نے اس کو پکڑ کر مارا تو پتا چلا کہ یہ زورات چرا کر رو رہا ہے۔“

لڑکی کے باپ نے دانت پیس کر اپنے بیٹے کو دو چائے جڑ دیئے۔ ”کتے! بہن کی امانت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔“

دولہے کا باپ خوش ہو گیا۔ ”شاباش انس پک ٹر صاب! آپ نے ہم پر ایشان کیتا ہے۔“ یہ کہہ کر نے زورات کا ڈبا لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

سب انسپکٹر گرجا۔ ”اوائے چھڑ دے، عدالت میں مکدا چلے گا فریہ آپ کو ملیں گے۔ اس وکت یہ زورات سرکاری ہیں۔“

دولہا کا باپ جھینپ گیا۔ اسی کے ساتھ پولیس کی موجودگی میں اس کی اصلیت واپس آگئی۔ وہ سب پکڑ کو ایک طرف لے جا کر کچھ کہنے لگا۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں سن نہ سکا ہاں یہ ضرور دیکھا کہ ب انسپکٹر کی آنکھیں احمقوں کی طرح پھیل گئیں۔ چرے کے تاثرات سے میں سمجھ گیا کہ دولہا کے معاش باپ نے سب انسپکٹر سے کیا کہا ہو گا۔ سب انسپکٹر نے پستول کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا، یوں ا اپنی ”بمادری“ کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دے گا۔ اس نے اپنی ”بمادری“ کا پسلا مظاہرہ آخر کری

”مکان کو گھیر لو۔“ سب انسپکٹر دھاڑا۔ ”خبردار ڈاکو مفور نہ ہونے پائیں۔“

اب مزید وقت نہیں رہا تھا، اس لئے میں نے لپک کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

”تو یہ کیا کر رہا ہے وجہ؟“ ہری بول اٹھا۔

”وہی جو کرنا چاہئے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جلدی کرو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

”لگتا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے۔“ ہری کہنے لگا۔ ”کمرے کا دروازہ بند کر کے نکلنے کی بات.....“

”بحث مت کرو۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ پھر میں اس کمرے میں بھیجی ہوئی چارپائی کی طرف بڑھا۔

پائی پر شکر اور ہری بیٹھے ہوئے تھے۔

”شاید خطرہ ہے۔“ شکر نے کہا اور چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شانے پر لٹکی ہوئی گن ہاتھ ماسے لی تھی۔

”شاید نہیں، اس مکان کو پولیس گھیرے میں لے رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

جس کمرے میں ہم تھے، اس کی چھت گھاس پھوس، مٹی اور لکڑی کے شہتیروں کی بنی ہوئی تھی۔ شہتیر نکلا ہوا تھا جہاں سے مٹی جھڑ رہی تھی۔ میں نے ایک، ہی نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ فرار کا سہ صرف یہی ہے۔

میں نے لڑکی کے قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”بہن! کھڑی ہو جا۔ میں تیرے دولہے کو واپس لے آیا ہوں۔“

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو پھٹک پڑے۔ اس نے احسان مندانہ انداز میں سر جھکا کر پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں کون ہوں، یہ جان کر تم کیا کرو گی؟..... پھر بھی میں بتا دیتا ہوں۔ تم نے وجہ ڈاکو کا ہا تو سنا ہو گا۔ میں وہی ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پھر اس کا سر میرے قدموں میں جھک گیا۔ وہ بلیک بلیک کر رونے لگی۔ میں نے اسے دونوں شانے تھام کر اٹھایا اور وہ کسی بہن ہی کی طرح میرے سینے سے سر چھاکر رونے لگی۔ میں پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ ایک الگ ہی جذبہ، الگ ہی خوشی تھی، کسی آدم زادی کے قرب سے کہیں بڑھ کر خوشی۔

پھر دھرم گرد آ گیا۔ میں نے دولہے کو گھورتے ہوئے دلہن کے ساتھ مقدس گرنٹھ کے قریب بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ دولہا سدھائے ہوئے جانور کی طرح دلہن کے قریب بیٹھ گیا۔

لڑکی کا باپ میرے سامنے بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم ڈاکو نہیں، دیو تلو ہو۔ اگر تم عین موقع پر میری مدد کو نہ آتے تو میں آتم ہتھیا (خودکشی) کر لیتا۔ اب اتنا احسان مجھ پر اور کرو کہ کھانا کھا کر جاؤ۔“

میں نے اسے آہستگی سے کھڑا کیا اور مسکرا کر کہا۔ ”جب تک لڑکی ڈولی میں نہیں بیٹھ جاتی، ہم یہیں رہیں گے۔ وہ وجہ کی بہن ہے لہذا اسے سسرال میں کوئی تکلیف نہ ہو، یہ دیکھنا میرا کام ہے۔ آپ فوراً ساری رسوم پوری کریں۔“ پھر میں وہاں موجود افراد کی طرف گھوم کر بولا۔ ”خبردار کوئی منڈپ کے باہر نہیں جائے گا ورنہ اسے گولی مار دی جائے گی۔“ سب کے چروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دھرم گرد مقدس کتاب پڑھنے لگا۔ لڑکی کے خاندان والوں کے چروں پر روشنی سی چھا گئی۔ دولہے کے زمیندار باپ کا چہرہ اتر گیا۔ میں نے اپنے چوتھے ساتھی کو چوکیداری کی غرض سے مکان کے پچھلے حصے میں بھیج دیا، پھر خود ہری اور شکر کے ساتھ اوپری منزل پر آ گیا۔

دلہن والوں نے ہمارے لئے مٹھائی کا تھال اور کھانا اوپر بھیج دیا۔ میں اوپر منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے نیچے کا جائزہ لے رہا تھا۔

شادی کی رسم پوری ہونے کے بعد دولہا اور دلہن نے اپنے بزرگوں کے پیر چھوئے۔ اسی وقت ایک سب انسپکٹر چند مسلح پولیس والوں کے ساتھ منڈپ میں داخل ہوا اور میں چونک اٹھا۔ میرے لئے پولیس کا وہاں پہنچ جانا حیرت انگیز ہی تھا۔ اوپری منزل سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں چکر کے رہ گیا اگر میں وجہ کے جسم کو چھوڑ کر وہاں سے فرار بھی ہو جاتا تو میرے ساتھی یقیناً مارے جاتے اور مجھے یہ کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔

کھڑکی سے نیچے کا جائزہ لینے ہوئے میں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شاید

نی کہ وہ نبیوں کو دیکھتا ہے۔ وہ ہماری شہرہ رگ کے قریب ہے۔

میں نے پڑھا، سب سے بڑی کتاب میں پڑھا:

”اور لوگوں میں بعض ایسے جو کہتے ہیں، ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر، حال آنکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں۔ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور حقیقت میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بے جا اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے ان کا مرض، اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین پر، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو، بے شک یہی لوگ مفید ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں، کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا ایمان لائے ہیں بے وقوف، یاد رکھو، بے شک وہی ہیں بے وقوف لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزا کیا کرتے ہیں۔ اللہ ہی استہزا کر رہا ہے ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے، تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ ٹھیک طریقے پر چلے۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو، پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے جو کچھ گرد اس کے تھا، سب کر لیا ہو اللہ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے نہ ہوں۔ برے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ اب رجوع نہ ہوں گے۔ یا (ان کی مثال، جیسے بارش ہو آسمان سے اندھیرے میں، جس میں گرج اور بجلی بھی ہو، وہ کڑک سے، موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہوں، اور اللہ، کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ قریب ہے کہ ان کی بینائی، بجلی لے جائے، جب بجلی چمکی تو چلنا شروع کیا اور جب اندھیرا ہوا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سماعت و بینائی سلب کر لے، بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔“

(ترجمہ سورہ بقرہ، آیت: 8 سے آیت: 20 تک)

پھر میں نے تاریخ کی کتابوں میں یہ بھی پڑھا، اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا اور ایک شاعر کی بیاض بھی میری نظر سے گزری:

”زبردست دھماکے ہو رہے ہیں، عورتوں، مردوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ ہر طرف شور ہی شور ہے اور گھروں کی دیواریں گر رہی ہیں۔ لوگ عبادت گاہوں میں جمع ہیں اور اللہ کے

جھٹ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چارپائی کو میں نے دیوار سے لگایا اور اوپر چڑھ گیا۔ جس جگہ سے شہر نکل گیا تھا، جھٹ کے کونے میں تھی۔ ذرا سی دیر میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا کہ ایک آدمی آسانی سے جھٹ کے اوپر پہنچ سکے۔

”ہری! پہلے تو نکل۔“ نیچے اتر کر میں بولا۔

پھر ہری کے بعد شکر جھٹ پر پہنچا اور میں ان دونوں کے بعد۔ بے وقوف سب انکسٹر کے حکم، جب تک پولیس اس مکان کو گھیرے میں لیتی، ہم تینوں ساتھی بہت دور نکل چکے تھے۔ گھوڑوں کو وقتی طور پر صبر کرنا پڑا لیکن میری گھوڑی مانک چھچھا کرتی ہوئی نکل آئی۔

برات کو ہم نے جہاں روکا تھا، وہیں رکی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر گھن فضا میں بلند کی اور فائر کیا۔ یہ واپسی کا اشارہ تھا۔

جنگل میں پہنچ کر کئی دن مجھ پر چپ سی لگی رہی۔ یہ سب کچھ کیوں؟ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا۔ اس کے بعد ایک سوال سے دوسرا اور پھر تیسرا سوال۔ کیا میں صرف ایک ڈاکو ہوں؟ ایک جسم کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا جسم۔ کیا میں وقت اور حالات کے جبر کا شکار ہوں؟ میں نہ وجہ ہوں نہ ٹھاکر بلونت سنگھ، نہ رنجیت۔ میں تو ایک جن زاد علیا لیش ہوں۔ سارے رشتے ناتے جھوٹے تھے۔ کوئی سریتا میری تھی، نہ کوئی رکنی اور نہ کوئی شکنتلا یا سروج۔ میں تو مسلمان ہوں۔ اگر آدم زادیوں کے درمیان ہی رہتا ہے تو پھر ہندو یا سکھ بن کر کیوں رہوں؟ یہ وہ آخری سوال تھا جس نے میری سوچ کو ایک نئی نچ پر ڈال دیا۔

ساری زمین اللہ کی ہے اور سب اسی کے بندے ہیں، مجھے یہ بھی خیال تھا لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ اللہ کی زمین پر لکیریں کھینچنے والے خوش تھے کہ انہوں نے ساری دنیا میں مسلمانوں کا بانٹ دیا ہے۔ اس بندر بانٹ کے نتیجے میں جو ہوا، وہ سب کتابوں میں لکھا ہے۔ میں نے کتابیں پڑی ہیں۔

مسلمان کون تھے؟ یہ وہ تھے کہ جن کی ہیبت سے یہودی اور عیسائی اپنی اپنی عبادت گاہوں میں گھنٹوں کے بل دست دعا بلند کئے اللہ کے حضور گڑگڑاتے تھے۔ ”اے اللہ اے یسوع کے باپ! ہمیں بچالے۔ ہمیں مسلمانوں کی یلغار سے پناہ دے۔ وہ ہم پر اگنی بان چھوڑتے ہیں، آگ برساتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہو جائیں یا پھر ان کے خلاف سازشیں کرنا چھوڑ دیں۔ اے یسوع! ہم اعتزال کرتے ہیں کہ وہ بچے اور ہم جھوٹے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم چاہیں تو اپنے دین پر قائم رہیں۔ عجیب لوگ ہیں۔ ساری دنیا میں انہی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہمارے دل بٹا جاتے ہیں۔ بچالے، ہمیں بچالے اے یسوع!“

بڑی بڑی داڑھیوں والے یہودی اور عیسائی روتے۔ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ وہ بے عمل تھے۔ ان کے اندر کھوٹ چھپا تھا۔ وہ جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ جسے ”اگنی بان“ یعنی آگ کے تیر سمجھ رہے ہیں، کیا ہیں۔ سو اللہ نے ان کی

سامنے دست دعا بلند کئے گزگڑا رہے ہیں کہ اے اللہ! وہ ہمارے گھروں میں کھس آئے ہیں۔ آگن آگن ہرے درختوں کے نیچے ان کی فتح کے پرچم گڑے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تُو نے ہی تو آنے والوں اور ان کے جنگی طیاروں کو ہم پر بلند کیا ہے۔ کیا تو انہیں ہلاکت خیز دیا کی صورت زمین پر پھیلنے اور بڑھنے سے نہیں روکے گا؟ وہ ہم پر تیز آگ برساتے ہیں۔ ہمارے شیردل پلٹتے ہیں اور اپنی حدود میں سر جاتے ہیں۔ اے اللہ! دیکھ کہ وہ ہوا کے دوش پر آتے ہیں اور ہمارے سارے جنگی طیاروں کو اڑنے سے پہلے ہی میٹھی نیند سلا جاتے ہیں۔ ان کا سورج، ان کی حدود میں کبھی نہیں ڈوبتا۔ ان کا لوبو پیچھے نہیں آگے روشنی پھیلاتا ہے۔ اے اللہ! اے معبود! اے خدائے ذوالجلال! انہوں نے ہمارے ساتھ بہت برا کیا۔ وہ ہم سے ہماری آنے والی نسلوں کو چھین لے گئے۔ انہوں نے ہماری بیٹیوں کو بے حیا بنا دیا۔ اب وہ بھی نائٹ کلبوں میں کولھے منکاتی ہیں۔ ہمارے بیٹے انہیں دیکھتے ہیں اور ہمیں بیک روڑ کتے ہیں۔ وہ ہماری روحوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ہمارے اندر تک فتح کر لیا ہے۔ اے خدائے بزرگ و برتر! پناہ دے ہمیں، ہمیں ان کی دیکھی اور آن دیکھی یلغار سے پناہ دے۔“

دنیا کے اسٹیج پر پہلا منظر یودیوں اور عیسائیوں کا تھا اور ابھی جو دوسرا منظر میں نے ایک شاعر کی بیاض میں لکھا، اس میں اور پہلے منظر میں صدیوں کا انٹرول ہے۔ شاعر نے جو کچھ بھی لکھا، وہ سب تدریج ہی تو ہے۔ پہلا منظر مسلمانوں کے غروب اور دوسرا منظر زوال کا ہے۔

ماضی کی رزم گاہوں سے میں زمانہ حال میں آگیا۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بے عمل ہیں۔ ہمارے اندر کوٹ چھپا ہے۔ ہم جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے بے خبر ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ اور یوں بھی ہوا کہ اپنے مفادات کی خاطر ہم جان کر انجان بن گئے۔ ہمارے سینوں میں لکیروں سے بنا ہوا ایک خنجر اتار دیا گیا۔ مسلمانوں کی آخری نشانی ”خلافت عثمانیہ“ ختم کر دی گئی۔ ہمیں بانٹ دیا گیا اور ہم بانٹے جانے پر آمادہ ہو گئے۔

”اسٹیج شو“ جاری رہا اور جاری ہے لیکن اس میں میرا کردار کیا ہے؟

میں تو آدم زاد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک جن زاد ہوں۔ میری بساط ہی کیا۔“

اشرف المخلوقات ہے اور میں؟

جواب ملا کہ میں صرف آدم زاد کی مدد کر سکتا ہوں، اسے خود اسی کے شرے بچنے میں مدد کر سکتا ہوں کہ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہے۔

میں نے دنیا کے نقشے پر کھینچی ہوئی نئی لکیروں کو دیکھا۔ میں کہاں ہوں؟ لاہور مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں زرخس تھی۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ میں نے خاموشی کے ساتھ وجہ کے جسم کو چھوڑ دیا اور جنگل سے نکل آیا۔ اب میں صرف علیالیش تھا اور مجھے کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ 1948ء کے آخری مہینے تھے۔ قائد اعظم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے۔ وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ مسلمانوں کی اس نئی مملکت کا دارالحکومت کراچی تھی جسے کبھی کانچی کہتے تھے۔ یہ مجھیروں کی بستی تھی۔

پاکستان کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت ہوتی گئی۔

ہندوستان کے صوبے گجرات اور سندھ (سندھ جس میں پہلے بمبئی، پونا اور اس کا گرد و نواح شامل تھا) میں آباد گجراتی زبان بولنے والے سب سے پہلے کراچی آئے اور انہوں نے اس شہر کے کاروباری مراکز منبھال لئے۔ ان میں سے بیشتر، قیام پاکستان سے پہلے کراچی آ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کراچی ہی نئی مملکت کا دارالحکومت ہو گا۔ انہی ہجرت کرنے والوں میں جنوبی ہند کے لمباری بھی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب قائد اعظم بمبئی میں رہتے تھے۔ 1936ء سے پہلے سندھ الگ صوبہ نہیں تھا بلکہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ جو صوبہ بمبئی کے گورنر تھے، انہوں نے 1936ء میں صوبہ بمبئی سے صوبہ سندھ کو الگ کر لیا اور انگریزوں سے اس صوبے کی الگ حیثیت منوائی۔ صوبہ بمبئی اور حالیہ صوبہ سندھ پہلے ایک ہی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم شہر بمبئی سے کراچی منتقل ہو گئے اور پہلے گورنر جنرل بنے۔ 11 ستمبر 1948ء کو بمقام کراچی، زیارت سے واپسی پر قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔

1948ء کے آخری مہینوں تک، ہندوستان کے مہاجرین پاکستان آ رہے تھے جن کی حالت بہت اتر تھی۔

میں لاہور پہنچ کر حیرت میں رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور شہر میں آ گیا ہوں۔ شہر کے اندر اور باہر عجب افرا تفری کا عالم تھا اور تو اور بھائی دروازہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ ”بھائی“ کے معنی بدل گئے تھے۔ شاہی قلعے کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر جو گلیاں تھیں، ان میں اب پیشہ ور عورتیں آ بی تھیں۔ میں وہاں سے پلٹا اور چوراہے پر آ گیا۔ کونے پر مسجد تھی، میں ادھر مڑ گیا کہ شاید کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ جائے۔ اسی سڑک پر آگے جا کر ایک گلی تھی جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

انہی گلیوں میں اک ایسی گلی ہے

جو میرے نام سے تیار رہی ہے

میں نے سوچا اور اس گلی میں پہنچ گیا۔ ابھی تک میں نے کوئی قالب اختیار نہیں کیا تھا۔ زرخس، اقبال، مولوی کفایت اللہ، نہ جانے کتنے چہرے یاد آئے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے، کیوں چلے گئے؟ اگر یہاں کوئی بھی نہیں تو پھر میں کیوں بھگ رہا ہوں؟ سوالوں کے گرداب میں ڈوبنے سے پہلے میں نے بہت اونچی پرواز کی۔ ایک وحشت سی میرے وجود میں رقص کرنے لگی۔ میں نے خود کو سمجھایا پھر کبھی سی۔ ایک زرخس اگر مجھ سے بچھڑ گئی ہے تو کیا، کتنے لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ اسے علیالیش، اسے جن زاد، ان گھروں کے شب افروز روزنوں کو نہ دیکھ، کیا خبر کون اپنے گھر میں چراغ جلا چھوڑ گیا ہو۔

پھر مجھے قرار آ گیا اور میں آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ میں نے مہاجریمپ دیکھے اور لرز گیا، وہ سب دیکھائے بیان کرنے کی تاب نہیں۔ وحشت پھر بڑھنے لگی تو میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور پرواز کرتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ ایک نئی مملکت بننے کے بعد جو کچھ لاہور شہر میں ہوا، مجھے معلوم ہو گیا تھا۔

☆-----☆-----☆

اسی عرصے میں مجھے ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ قائد آباد سے کیمائری تک روز پیدل جاتا اور لوٹ آتا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس نوجوان کی سرخ سرخ آنکھوں میں مجھے وحشت سی ناہنجی دکھائی دی۔ میرے لئے یہ جان لینا کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ نوجوان کون ہے۔ میں بھی اس کا ہم سفر بن گیا۔ وہ اس قدر کھویا کھویا رہتا کہ میں ساتھ چلتا رہتا اور اسے خبر بھی نہ ہوتی۔

وحشت زدہ سادہ نوجوان بھی قائد آباد کی ایک جنگلی میں رہتا تھا۔ اس پاس کی جھگیوں والے اسے کچھ کھانے کو دے دیتے تو کھا لیتا۔ ان جھگیوں میں رہنے والوں نے اسے اپنی ڈسے داری بتا لیا تھا، کوئی کھڑے میں پانی بھر جاتا، کوئی جنگلی کی صفائی کر دیتا، شام ہو جاتی تو کوئی لائینن جلا جاتا وغیرہ۔ جھگیوں والے اسے کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھتے تھے، کیوں کہ وہ کبھی کبھار ہی بولتا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط ہوتیں لیکن لوگ ان میں ربط ڈھونڈ لیتے۔

ایک روز حسب معمول وہ قائد آباد کی طرف لوٹ رہا تھا کہ پیچھے سے میں نے اسے آواز دی۔ وہ کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح پلٹا۔

”کیا ہے؟“ قریب آکر اس نے مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا۔

میں بولا۔ ”میرا نام مقصود ہے۔“

”مقصود، مشہور، مردود!“ وہ بڑبڑایا، پھر ایک دم چیخ اٹھا۔ ”بھاگ جا۔“

”تمہاری طرح میرا بھی کوئی گھر نہیں۔“

”گھر، در، بھر، مر۔“ وہ یہ کہہ کر پھر اپنی راہ ہو لیا۔

میں مسکرا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

قائد آباد میں اپنی جنگلی تک پہنچ کر وہ رکا اور پلٹ کر مجھے گالیاں بکنے لگا۔ جھگیوں والے میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور وہ نوجوان اپنی جنگلی میں چلا گیا۔ میں نے حکمت سمجھنے کے لئے بڑے پاؤں پیٹے تھے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ میں جن دنوں ملتان میں تھا تو حکیم نیراس الدین کے جسم پر قابض ہو کر مطب بھی آیا گیا تھا۔ مجھے بہت سے تیرہ برف لئے یاد آگئے۔ یوسف کو علاج کی ضرورت تھی۔

کبھی تو میں انسانی قالب اختیار کر کے مقصود بن جاتا اور کبھی علیالیش۔

یوسف کو علم بھی نہ ہوا اور میں اس کا علاج کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جلد ہی اپنے حواسوں میں لوٹ آیا۔ اس چکر میں قائد آباد کی جھگیوں والے مجھے بھی کوئی ”پہنچا ہوا فقیر“ سمجھنے لگے۔ چٹکی بجاتے میں ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔

وہ دن میرے لئے بڑی خوشی کا تھا جب یوسف صحت یاب ہوا۔ علاج کے دوران میں وہ مجھے کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا۔

میں اکثر یوسف ہی کی جنگلی میں رہتا۔ ایک رات بہت سردی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں جنگلی سے نکل آیا کہ یوسف کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مجھے ایک کبل کا بندوبست کرنے کی دیر نہ لگی۔

مجھروں کی بستی کلاچی اب کراچی کسلاقی تھی اور میں وہیں آ نکلا تھا۔

ایک جن زاد ہونے کے ناتے جنون عشق سے بچنے کی خاطر میں نے اپنے ہی انداز میں سوچا۔ میرے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ میں کراچی آکر بھی زمرس کو نہیں بھول سکا۔ سو میں نے اپنی روح کے زخموں پر لفظوں کا مرہم رکھ دیا۔

وہ اپنے جسم کی اک آخری اڑان کے بعد

مجھے یقین ہے میرے ہی گھر پہ اترے گا

خود فریبی..... ہاں یہ خود فریبی ہی تو ہے۔ اس کے گھر پہ تو میں اترتا تھا، وہ کوئی جنیہ تو نہیں تھی کہ میرے گھر پر اڑتی، میری طرح فضا میں پرواز کرتی۔

اپنی آدم زاد محبوبہ زمرس کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے میں کیمائری پر اتر گیا۔ کئی دن تک میں کراچی میں گھومتا رہا۔ یہاں کی بڑی سڑک بندر روڈ تھی۔ بندر گاہ کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا تھا۔ دور سے قائد اعظم کا مزار نظر آتا جو بلندی پر تھا۔ مزار کے اوپر شامیانہ لگا تھا اور فوجی کھڑے رہتے تھے۔ کیمائری سے آتے ہوئے مزار سے ذرا پہلے دائیں جانب جھگیوں کا ایک شہر سا آباد تھا جو دور تک چلا گیا تھا، قائد آباد، نمائش، جٹ لائن، اے بی سینا لائن اور نہ جانے کتنی لائینیں۔ حالت یہاں بھی لاہور جیسی تھی لیکن کچھ فرق تھا۔ نفسا نفسی کے باوجود سارے شہر پر سوگوار سی طاری تھی۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ان کی بولیاں الگ تھیں، مگر دل ایک تھے۔ سب جیسے کسی آن دیکھی ڈور میں بندھے تھے۔ تہذیب، رسم رواج، لباس، رہن سہن، مختلف سہی لیکن جذبہ ایک تھا۔ انہی میں جرائم پیشہ بھی تھے اور شریف بھی۔ عزت دار بھی تھے اور رذیل بھی۔ کھرے بھی تھے اور کھوٹے بھی۔ امیر بھی تھے اور غریب بھی۔ گھربار لٹانے والے بھی تھے اور لوٹنے والے بھی۔ دیسی بھی تھے اور پردیسی بھی۔ لاہور بڑا شہر تھا، مگر چھوٹا سا یہ شہر بھی مجھے اچھا لگا۔ جی لگانے کے سوا بہانے ہوتے ہیں، سو میں نے بھی یہاں جی لگا لیا۔ مصیبت کے مارے اور آن پڑھ لوگ وہم کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ جو لوگ جھگیوں میں پڑے تھے ان کی زبانی میں نے جنات کے قصے بھی سنے۔ میں ذرا کھٹکا اور جھگیوں کے پھیرے پہ پھیرے لگائے۔ اپنے سوا میں نے وہاں کسی جن زاد کو نہ دیکھا، نہ محسوس کیا۔

بندر روڈ ہی پر میں نے کھٹار اسی ایک ٹرام بھی چلتے دیکھی۔ یہ محمد علی ٹراموے کمپنی کسلاقی تھی۔ بندر روڈ ہی پر ٹرام ڈپو بھی تھا۔ اس کمپنی کی ٹرامیں شہر کے مختلف راستوں سے گزرتیں۔ ٹرامیں چلتی رہتیں، مسافران میں چڑھتے اور اترتے رہتے۔ انہی میں سے ایک ٹرام سیدھی بندر روڈ پر چلتی۔ چلتی ہوئی ٹرام میں چڑھنے اور اترنے کا تماشہ مجھے بڑا دلچسپ محسوس ہوا۔ میں بھی اس تماشے کا حصہ بن جاتا اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔

پھر میں نے کسی آدم زاد کے جسم پر قبضہ کرنے کی بجائے ایک آدمی کی ہیئت اختیار کر لی اور اپنا اچھا سا ایک نام بھی رکھ لیا۔ لاہور سے لٹ پٹ کر تو میں بھی آیا تھا، شاید اسی لئے مہاجر بن گیا۔ ہر کوئی مجھے میرے چلنے کی وجہ سے مہاجر ہی سمجھتا۔

یوسف نے ابھی مجھے اپنی زبانی کچھ نہیں بتایا تھا، نہ میں نے دانستہ کچھ پوچھا۔
جنگلی میں لالٹین کی لودھی تھی۔ یوسف میلی سی ایک چادر اوڑھے دری پر سنا سنا پڑا ہوا تھا۔
جب میں نے اسے کبل اوڑھایا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔
”کون، مقصود؟“ وہ مندا سی آواز میں بول اٹھا۔

”سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”مگر تم یہ کبل کہاں سے لے آئے؟ اور..... اور پھر تم..... تمہیں بھی تو سردی لگ رہی ہو گی۔“

میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ”میں چادر اوڑھ کر سو جاؤں گا۔ تم چادر مجھے دے دو۔“

”نہیں۔ تم بھی میرے پاس کبل میں آ جاؤ۔“ اب اس کی آواز پر نیند کا غلبہ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور کبل میں گھس گیا۔

”مقصود! تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو؟“ اس نے میری طرف کر دٹ لے لی۔

”نہیں تو۔ میں نے تو خود تمہارے پاس پناہ لی ہے۔ ہم لوگ پناہ گیر ہیں نا!“

”ہم پناہ گیر نہیں ہیں۔“ اس کی آواز میں غصہ تھا۔

”پھر کون ہو تم، کون ہوں میں؟ اس شر کے باسی تو ہمیں یہی کہتے ہیں، ماکڑ بھی کہتے ہیں۔“

”غلط کہتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں معلوم۔“

”پھر کے معلوم ہے؟“

”مجھے..... مجھے معلوم ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔

”لیٹ جاؤ، تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”نہیں، آج میں نہیں لیٹوں گا۔“ وہ ضد کرنے لگا۔

”مجبوراً مجھے بھی اٹھنا پڑا۔“ کیوں نہیں لیٹو گے؟“ میں نے زری کے ساتھ کہا۔

”سنو..... سنو، مقصود کہ میرے والد مولوی عبدالحکیم صدیقی کیا کہتے تھے۔ میں انہی کا بیٹا تھا۔

یوسف صدیقی ہوں۔“ ابھی تک وہ غصے میں تھا۔

میں اٹھا اور قریب رکھے ہوئے گھرے سے کٹورے میں پانی انڈیل کر لے آیا۔

”پہلے تم پانی پی لو کہ غصہ حرام ہے۔ پھر تم جو بھی کو گے میں سنوں گا۔“ میں نے کنوڑا اس کے

ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے کسی حجت کے بغیر پانی پی لیا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”میرے والد مجھ سے کہتے تھے، ہمیں معلوم ہے کہ ہم جہاں رہتے ہیں، یہ حصہ نئی مملکت میں شامل نہیں ہو گا۔ اس کے باوجود ہم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ مسلمان جہاں بس جائے وہی اس کا وطن ہے۔ ہجرت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے۔ ہجرت ہماری مجبوری نہیں، ضرورت ہے۔ تم نہیں جانتے ہو گے، میرے والد کون

تھے..... اور کسی کا کچھ جانتا ضروری بھی نہیں۔ تم نے مولوی محمد اسلمیل میرٹھی کا نام سنا ہے۔“
”ہاں، بچپن میں ان کی ایک نظم پڑھی تھی، وہی پن چکی والی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مولوی صاحب بچوں کے لئے نظمیں لکھتے تھے..... نمبر پر چل رہی ہے پن چکی، دھن کی پوری ہے کام کی پکی..... یہی نظم ہے نا ان کی؟“

”یہی ہے۔“ پھر یوسف جیسے خواب کے سے عالم میں بولنے لگا۔ ”ہم اسی گلی میں رہتے تھے جہاں کبھی مولوی محمد اسلمیل میرٹھی رہتے تھے۔ پھر مولوی صاحب کے بیٹے خان بہادر محمد سلیم سیفی بھی اسی گھر میں رہے۔ مولانا شاہ عبدالحکیم صدیقی، مولوی اسلمیل میرٹھی کے بھائی تھے۔ یہ اوپر کوٹ تھا جسے ہم میرٹھ والے اندر کوٹ کہتے ہیں۔ اس اندر کوٹ میں ایک محلہ مشائخان بھی تھا..... اور بھی محلے تھے، قاضی واڑہ، مفتی واڑہ وغیرہ۔ مولوی محمد اسلمیل میرٹھی اور ہمارا گھر انا اسی محلے مشائخان میں رہتا تھا۔ تم نے بیگم پل کا نام سنا ہو گا۔ بیگم پل کے چوراہے کی طرف سے آگے بڑھو گے تو اگلے ہاتھ ذرا دور ایک سڑک جاتی ہے، اس پر ایک سینما تھا، سینما کے بعد ہی ایک ہوٹل جس میں شراب خانہ بھی تھا، اس پر لعنت پڑو۔ پھر بیگم پل والی بڑی سڑک پر آ جاؤ۔ میں تمہیں محلہ مشائخان پہنچا دیتا ہوں۔ اندر کوٹ، محلہ مشائخان اور ہمارا گھر۔ اپنے والد کا نام میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مولوی عبدالحکیم صدیقی، میری والدہ کا نام شکیلہ اور بہن کا نام جلیلہ تھا۔ ہمارے ہی گھر کے بالکل سامنے مولوی محمد ارشد کا مکان تھا جو ارشد میاں کہلاتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد احمد تھے، انہیں لوگ احمد میاں کہتے۔ احمد میاں نے شادی نہیں کی تھی۔ ارشد میاں سن سینتالیس سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ بچپن..... میرا بچپن..... اور ارشد میاں کی بیٹی کا بھی بچپن، اس کا نام سلمیٰ تھا۔“

کچھ دیر کو یوسف چپ ہو گیا، مگر میں نے اسے نہیں ٹوکا۔

”سلمیٰ مجھے بچپن سے اچھی لگتی تھی۔“ یوسف کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔ ”وہ زمانہ خاندانوں سے باہر رشتے کرنے کا نہیں تھا۔ سلمیٰ اور میرا خاندان الگ الگ تھا۔ جب ہم دونوں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کا احساس ہوا۔ ماں..... ماں کا دل بہت گداز ہوتا ہے۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اپنی ماں سے ارادہ ظاہر کر دیا۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں۔ پھر بھی یہ بات میری ماں کے ذریعے والد تک پہنچ گئی۔ وہ اس پر خفا ہوئے، مگر باپ تھے۔ انہوں نے فنگلی کے باوجود مولوی محمد ارشد سے بات کی اور انکار میں جواب مل گیا۔ قصہ ختم..... مگر قصہ، عشق ختم تو نہیں ہوتا۔ چھو..... چھوڑو، چھوڑو یہ قصہ..... ایک اور قصہ سنو..... میں تمہیں اپنے والد عبدالحکیم صدیقی کا قصہ سناتا ہوں۔ وہ مسلمانوں کی نئی مملکت کے بہت بڑے حامی تھے۔ ریڈیو سے اعلان ہوتے ہی انہوں نے سامان باندھ لیا۔ سامان..... صرف زیورات اور روپے۔ موٹر وہ خود بھی چلا لیتے تھے۔ میرٹھ میں اس وقت تک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا، ہاں جھگی مچی ہوئی تھی۔ والد بولے، ہم بلند شہر روڈ سے گزرتے ہوئے دہلی پہنچیں گے، کیوں کہ ریل اور کوئی دوسری سواری محفوظ نہیں، موٹر ٹھیک ہے۔ ان کے آگے کون دم مارتا۔ مجھے، ماں اور چھوٹی بہن جلیلہ کے ساتھ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور میرٹھ سے نکل گئے۔ بلند شہر

یوسف نے یہ سب کچھ مجھے اس رات نہیں بتایا اور میں نے اسے سلا دیا۔ بعد میں رفتہ رفتہ وہ کھلتا گیا، خود ہی اشاروں اشاروں میں وہ خوں چکاں واقعات مجھے بتا دیئے جو ابھی میں نے بیان کئے ہیں۔ علاج کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی طرح مریض کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ میں نے بھی یوسف کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے اسے بولے دیا، ٹوکا نہیں۔ دہلی میں ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر اس پر جو گزری، اسی کی زبانی میں نے سنا۔

یوسف نے ایک رات مجھ سے کہا۔ ”تمہیں تو خبر ہوگی مقصود کہ آخری مغلیہ تاج دار بہادر شاہ ظفر نے بھی لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی۔“

”ہاں، سنا ہے میں نے۔“ اسے بولے پر اکسانے کے لئے میں بولا۔

”خود دہلی شہر والوں نے بھی وہیں پناہ لے رکھی تھی، خاص طور پر ان دہلی والوں نے کہ جو ہندوؤں کے محلوں میں گھرے ہوئے تھے۔“ یوسف بولنے لگا۔ ”ایک وجہ اور بھی تھی۔ شرے بستی نظام الدین کا فاصلہ کافی ہے، درمیان میں آبادیاں نہیں۔ بستی نظام الدین کا شمار نواح شہر میں ہوتا ہے۔ اتنے بڑے رقبے پر پھیلے ہوئے مقبرے میں کسی کو پناہ تھا، کون کہاں ہے۔ میں بھی اپنی ماں کو لے کر ایک جگہ پڑا رہا۔ پھر وہ بھی ایک روز میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اتنے سارے غم لے کر کوئی جیئے بھی کیسے، بستی نظام الدین کے قبرستان میں، انہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔“ یوسف کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میں نے اس نازک مرحلے پر یوسف کے دل و دماغ کو قابو میں رکھا کہ کہیں وہ پھر نہ بکھرے لگے۔ اس کے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر رکھنے کی ضرورت تھی اور میں نے یہی کیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ ابھی تو اس کے ذہن کی بست سی گریں کھلنا باقی تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم مقصود کہ اللہ نے مجھے کیسے صبر دیا، ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ کہ سلسلی کو میں نے اپنے قریب دیکھا۔ اب وہ دن کسی بھیاںک خواب کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود! یہ بتاؤ، مرنے والوں کو تو آدمی صبر کر لیتا ہے، کیا انہیں بھی صبر کیا جاسکتا ہے جو زندہ ہوں؟“

یوسف کے سوال کا جواب ضروری سمجھ کر میں نے کہا۔ ”ہاں زندگی کو صبر کرنا بہت مشکل کام ہے۔“ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”سلسلی کے بارے میں تم مجھے بتا چکے ہو لیکن وہ میرا بھائی ہے۔ دہلی کس طرح پہنچ گئی؟“

”اپنے چچا احمد میاں کے ساتھ۔“ یوسف نے جواب دیا۔ ”اپنے بڑے بھائی کی موت کے بعد احمد میاں ہی نے تو سلسلی کو اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ احمد میاں اپنی بھتیجی کو لے کر کسی طرح دہلی پہنچ گئے ہوں گے۔“

”ہاں، وہ ہم سے ایک روز پہلے میرٹھ سے چل دیئے تھے۔ دہلی شہر فساد کی زد میں تھا اس لئے سلسلی کے ساتھ وہ بھی ہمایوں کے مقبرے میں رہے۔“ یوسف نے سرد آہ بھری اور پھر بتاتے لگا۔ ”کیسے دکھ کی بات ہے مقصود کہ ایک ہی محلے، ایک ہی گلی میں برسوں سے آنے والے رہنے والے ایک دوسرے کے

روڈ پر قصبہ سکندر آباد سے کچھ پہلے ہندو جاٹوں نے ہماری موٹر پر حملہ کر دیا اور اور“

یوسف کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بنے لگے۔

”بس کرو یوسف، بس کرو۔“ میں بول اٹھا اور وہ مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں بھرنے لگا۔

مجھے یوسف کے دکھ کا علم تھا۔ اس کے باپ مولوی عبدالکیم کو ہندو جاٹوں نے شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو جاٹ بڑے کینے تھے۔ میں نے ان کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ مغلوں کے زمانے سے (میری مراد مغلوں کے دور زوال سے ہے) یہ کینگیں پر آمادہ تھے۔ دہلی آنے والوں کے لئے یہ شاہراہ بہت اہم تھی۔ یہ جاٹ موقع سے فائدہ اٹھاتے اور دہلی پر ٹوٹ پڑتے، لوٹ مار کرتے، پھر بھاگ لیتے۔ مغلوں کے بعد انگریزوں کا زمانہ آیا، سلیس بدل گئیں۔ مگر جاٹوں کی سرشت نہیں بدلی۔ ایک مرتبہ انہیں پھر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے اور لوٹ مار کا موقع مل گیا۔

اپنے باپ کی شہادت کے بعد بھی نوجوان یوسف نے حوصلہ برقرار رکھا۔ وہ اپنی بہن جلیلہ کو تو نہ بچا سکا، مگر حواس باختہ ماں کو لے کر کھیتوں میں ریک گیا۔ اپنی بہن یاں، دونوں میں سے وہ کسی ایک ہی کو بچا سکتا تھا۔ کوشش تو اس نے کی کہ بہن کو بھی بچالے مگر ناکام رہا۔ یوسف کے لئے وہ گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں کہ جب اس کی سماعت سے بہن کے چیخنے کی آخری آواز ٹکرائی۔ یوسف کی ماں شکیلہ نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ یوسف کی بہن جلیلہ پر کیا گزری اور شاید یوسف کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جاٹوں نے اس کا منہ باندھ دیا تھا۔ اسی وقت وہ چیخی تھی۔ پھر اجتماعی بے حرمتی کے بعد اس معصوم آدم زادی کو قتل کر دیا گیا تھا۔

جاٹ، زیورات اور روپے لوٹ لے گئے، موٹر جلا دی۔ اس عرصے میں یوسف کھیتوں کھیتوں خاصی دور نکل آیا تھا۔

سکندر آباد کی آبادی قریب تھی اور وہاں بھی قاضی داڑے تھا۔ مسلمانوں کے محلے قاضی داڑے میں یوسف کے عزیز رہتے تھے۔ میرٹھ، علی گڑھ، بلند شہر (قدیم نام برن) دہلی اور آس پاس کے شہروں میں لوگوں کی عزیز داریاں تھیں۔ قاضی داڑے میں یوسف اپنی ماں کو ساتھ لئے ایک عزیز کے گھر پہنچ گیا اور پھر وقتی طور پر حواسوں میں نہ رہا۔ گھر گھر صف ماتم بچھی تھی، کون کس کو پوچھتا۔ کسے یہ فکر ہوتی کہ ایک گھر سے آہ و بکا کی آوازیں کیوں آرہی ہیں لیکن اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ یوسف نے سنبھالا لیا تو پتا چلا کہ سکندر آباد کے مسلمان بھی تمام تر تیاریوں کے باوجود زیادہ محفوظ نہیں ہیں۔

”پھر محفوظ علاقہ کون سا ہے؟ میں اپنی ماں کو کہاں لے جاؤں؟“ یوسف کی آواز میں بڑا کرب تھا۔

جواب ملا کہ رات ہونے دو، بندوبست ہو جائے گا۔

پھر بندوبست ہو گیا۔ ایک بااعتماد تانگے والے نے یوسف اور اس کی ماں شکیلہ کو دہلی میں ہمایوں کے مقبرے پہنچا دیا۔ یہ الگ بات کہ واپس میں وہ تانگے والا بھی مارا گیا لیکن اس نے جو عہد کیا تھا، نباہ دیا۔ آدم زادوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔

حال سے بے خبر تھے۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میرا سربایہ حیات کب میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں تو اس روز میرٹھ کالج کا پھیرا لگانے گیا تھا کہ ان در دیوار پر آخری نظر ڈال لوں۔ میں تو دیوانوں کی طرح گھوم رہا تھا، کبھی تحصیل کی عمارت کے سامنے، کبھی سپٹ بازار کے چوراہے پر، کبھی بیگم پل پر اور کبھی اپنے ہم عمروں کے ساتھ نعرے لگاتا ہوں۔ گلیوں گلیوں کو چپے کو چپے اک دیوانہ گھومے جا رہا تھا اور..... اور وہ..... سسلی مجھے ایک نظر دیکھ لینے کو بے چین تھی۔ سسلی ہی نے مجھے یہ باتیں ہمایوں کے مقبرے میں بتائیں کہ احمد میاں سارا گھر بونہی کھلا چھوڑ کر اسے ساتھ لئے چل دیئے۔ احمد میاں سمجھ چکے تھے کہ اب اگر میرٹھ سے نہیں نکلے تو پھر موقع نصیب نہ ہو گا۔ وہ اپنے بچپا سے کیا کہتی۔ سر نیوڑائے ساتھ ہوئی۔ جب سسلی مجھے ہمایوں کے مقبرے میں ملی، احمد میاں ملے تو میری حالت ہوش اور بے ہوشی کے درمیان تھی۔ سسلی اور احمد میاں نے میرے دکھ بانٹ لئے اور مجھے اپنے ساتھ میاں پاکستان آنے پر آمادہ کر لیا۔ احمد میاں کو ہماری معصوم محبت کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے مرحوم بڑے بھائی ارشد میاں رشتے سے انکار کر چکے تھے، پھر بھی انہیں میری حالت پر رحم آگیا۔ اسی حالت میں احمد میاں نے مجھ سے وہ سب کچھ پوچھ لیا جو گزر چکی تھی۔ پھر احمد میاں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ سسلی ایک دیوانہ کی زنجیروں سے کیوں کھیل رہی ہے۔ مجھے تو اس نے بہت پہلے زنجیر کر لیا تھا۔ وہ..... وہ شاید چند ہی روز تھے۔ میں نے اسی عرصے میں طالب علموں کی ایک جماعت کو بہت سرگرم دیکھا۔ ان طلبہ کا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تھا۔ میرٹھ میں رہتے ہوئے بھی ہمیں خبر تھی کہ علی گڑھ کی یہ درس گاہ چھوٹا پاکستان کھلاتی ہے۔ غالباً انہی طلبہ میں سے کسی نے احمد میاں کو بتایا کہ دہلی اور لاہور کے درمیان سرکاری سطح پر جو ٹرینیں چل رہی ہیں، فساد کے سبب دہلی شہر اور دہلی کینٹ ریلوے اسٹیشنوں پہ نہیں رکیں گی۔ جن لوگوں کو لاہور جانا ہے، وہ بستی نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا تعلق علی گڑھ شہر سے بھی تھا اور دیگر شہروں سے بھی۔ وہ اسی لئے دہلی پہنچے تھے کہ لاہور جانے والی ٹرینوں میں خانہ بربادوں کو سوار کرا سکیں لیکن مقصود! تم..... تم کس طرح یہاں پہنچے؟

میں چونک اٹھا۔ یوسف نے اچانک یہ سوال کر دیا تھا۔ میں ٹھہرا ایک جن زاد، میرے لئے کہیں سے بھی کہیں پہنچ جانا کون سا مشکل ہوتا لیکن یوسف پر میں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا اور بولا۔ ”میں بھی تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گا“ کون ہوں۔ مگر بہتر یہ ہے، تم اپنی بات کہہ لو۔ فی الحال بس اتنا سمجھ لو کہ میں بھی تمہاری ہی طرح ڈر بدر ہو کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ یوسف! میرے بھائی، میرے دوست! کسی نا سینہ درد سے خالی نہیں، تم کس کس آنکھ میں جھانکو گے، کس کس کی آنکھوں سے بندھاؤ گے۔“

”کیا کوئی کسی کی آنکھ بندھا سکتا ہے مقصود؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے حوصلہ افزا جواب دیا۔

”میرا خیال یہ ہے مقصود کہ ایسا ممکن نہیں۔“

”تمہارے اس خیال کی کوئی وجہ؟“

”وجہ؟“ وہ یوں دھیرے سے ہنسا جیسے رو دے گا۔

میں اسے گھیر کھا۔ کچھ اسی مرحلے پر لے آیا جہاں سے وہ ہٹا تھا۔

”اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طلبہ نے ہم تینوں کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ شاید انہیں ہم قابل رحم نظر آئے ہوں۔ ایک بوڑھا، ایک نیم دیوانہ اور ایک بے سارا نوجوان لڑکی۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں پر ان کی پوری توجہ تھی۔ وہ طلبہ ہمیں ہمایوں کے مقبرے سے نکال کر ریلوے اسٹیشن تک لے گئے۔ ہمیں انہوں نے ایک ٹرین میں سوار کرا دیا جو لاہور جا رہی تھی۔ کسی ٹرین میں تین افراد کو سیٹ مل جانا حیران کن ہی تھا۔ جس ڈبے میں ہم بیٹھے تھے اس میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ ٹرین زیادہ دیر نہ رکی اور چل دی۔ ڈبوں کی چھتوں پر بھی لوگ سوار تھے۔ جھپٹے ہوئے چہرے، پتے ہونٹ، پیاسی آنکھیں اور آنکھوں میں خواب۔ ہر طرف اندھیرا، ہر سمت لب ہائے فریاد، دلوں میں جانے کیا کیا۔ کس ماں کا ہاتھ اس کے بیٹے سے چھڑا دیا گیا، کس بھائی نے اپنی بہن کی آخری چیخ سنی، کس باپ نے اپنے معصوم بچوں اور اپنی شریک حیات کا تحفظ کرتے ہوئے سینے کو سپر بنا لیا، کسے ہوش تھا اور اگر ہوا ہو گا بھی تو ایسے ہوش سے بے ہوشی اچھی ہے۔“ یوسف بلکنے لگا۔

اسے میں نے بلکنے دیا، رونے دیا اور پھر سلا دیا۔

اس رات کے بعد یوسف نے جو کچھ بیان کیا، میرے علم میں ہونے کے باوجود بہت ہولناک تھا۔ میرے اس کے درمیان اب شب و روز کی تخصیص نہیں رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ گھومتا ہوا کبھی کبھار کھار اور گلیوں میں نکل جاتا اور کبھی مارش کوارٹرز تک۔ میں اسے یہ احساس نہ ہونے دیتا کہ کھانے پینے کو کہاں سے آ رہا ہے لیکن ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا، بولا۔ ”مقصود! یہ تمہارے پاس چاٹ کھانے کے لئے پیسے کہاں سے آ جاتے ہیں؟“

”جھکیوں والے اب بھی ہم پر ترس کھاتے ہیں۔ میں لاکھ منع کرتا ہوں خرچے پانی کو پیسے دے دیتے ہیں۔“

”لیکن یہ تو غلط بات ہے، ہم کوئی فقیر تو نہیں ہیں۔“

”تو امیر بھی نہیں ہیں۔“ میں نے برجستہ جواب دیا۔

”پھر بھی میرا ضمیر اسے گوارا نہیں کرتا۔“

”ضمیر صاحب کا انتقال ہوئے تو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا۔“ میں نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

یوسف غم کھا گیا اور پوچھا۔ ”کون ضمیر صاحب؟“

دہی جن کا ابھی تم ذکر کر رہے تھے۔“

وہ ہنس دیا۔ بڑی کڑواہٹ تھی اس کی ہنسی میں۔

”آؤ چلو گول گپے کھاتے ہیں، اوپر سے سوٹ کا پانی پییں گے، مزہ آ جائے گا۔“ میں نے اس کا

دھیان ہٹانے کو کہا اور وہ مان گیا۔ تھوڑا بہت چٹورا وہ بھی تھا۔ میں ایک جن زاد اور وہ آدم زاد۔ پھر بھی اس کی داستان الم ایسی تھی کہ اس کی زبانی سن کر میری روح بھی ترپ اٹھی۔ جس پر گزری ہو، وہ بتائے

تو کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے۔ دہلی سے جو ٹرین لاہور کے لئے چلی تھی، انبالہ چھاؤنی کے قریب اسے روک لیا گیا۔

”ست سری اکال، ست سری اکال۔“ ہر طرف سے یہی نعرے سنائی دینے لگے۔

انتہا پسند ہندوؤں کی شہ پاکر سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔

زندگی اور موت کی جنگ میں آدم زاد ہو کہ جن زاد آخری لمحے تک لڑتا ہے۔ زندگی کے پیاری نہیں ہوتی۔ دیوانگی سے فرزانگی کی حد پار کرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پھر یوسف تو پوری طرح دیوانہ بھی نہیں تھا۔ اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ اسے اپنی جان کی پرواہ ہو کہ نہ ہو، سہلی کی زندگی ضرور عزیز تھی۔

درندے اس ڈبے میں کھس آئے تھے۔ کپائیں، بلم، چھراں، لاشیاں، ان کے پانس کیا نہیں تھا۔ اس ٹرین کا انبالہ فوجی چھاؤنی کے قریب روکے جانا بھی بے سبب نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قاتلوں کو ہندوستانی فوج کا تحفظ حاصل رہے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو پہلے ہی جن جن کر قتل کیا جا چکا تھا۔ جالندھر، امرتسر، لدھیانہ، اطراف کی بستیوں، گاؤں وغیرہ، کون سا ایسا شہر تھا کہ جہاں ایک بھی مسلمان زندہ چھوڑا گیا ہو۔ ان میں بیشرایے تھے جن کی رشتے داریاں پہلے ہی سے لاہور وغیرہ میں تھیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی یہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر مسلم اکثریت والے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں کون سے علاقے شامل ہوں گے اور معلوم کئے نہیں تھا، سارے ہندوستانی مسلمان اس سے واقف تھے۔ یہ تو فائدے کا سودا تھا۔ اس میں فائدہ کسے ہوا اور کون گھائے میں رہا؟ یہ آدم زاد جائیں۔ میں ٹھہرا ایک جن زاد مجھے اس سے کیا غرض، کیا واسطہ۔ میں تو وہ باتیں بتا رہا ہوں جو مجھے ایک آدم زاد، یعنی یوسف کے ذریعے معلوم ہوئیں۔

بڑا ہی دل ہلا دینے والا وہ منظر تھا جو یوسف نے بیان کیا۔

اس پورے ڈبے میں اب صرف تین زندہ افراد بچے تھے۔ ان میں سولہ برس کی دو شیرہ، یوسف کی محبوبہ سہلی بھی تھی۔ دس برس کی معصوم بچیوں سے لے کر سولہ برس کی دو شیراؤں کو قتل نہیں کیا گیا۔ انہیں سکھ اغوا کر کے لے گئے۔ یہ وہ بچیاں اور دو شیرائیں تھیں جن کے ماں باپ، بھائی، بہن، اقارب، سرپرست اور سارے گھر والے مار دیئے گئے۔ اس کی وجہ بہت سے آدم زادوں کو معلوم ہے اور مجھے بھی کہ اسی عمر کی بچیوں اور دو شیراؤں کو اغوا کیوں کیا گیا۔

مذہب کی آڑ میں درندگی کی حدود کو عبور کرنے والے وہ نام نہاد سکھ اغوا ہونے والیوں سے وہی کھیل کھیلتے جو میرا جن زاد ساتھی یاسف کھیلا کرتا۔ خود میں بھی کون سا پارسا ہوں۔ میں نے کیا نہیں کیا۔

شیطان تو سب کے پیچھے لگا ہوا ہے، کیا جن زاد اور کیا آدم زاد (لیکن درندگی کی بھی ایک حد ہوتی ہے) بعد میں انہی آدم زادوں پر انتہائی تشدد کیا گیا۔ درندوں نے کہا، اپنے مذہب کو چھوڑ دو، ورنہ ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔ وہ آدم زاداں کہ جن کا اب اس دنیا میں کوئی زندہ نہیں بچا تھا، وہ کہ جن کے سامنے گلوں پر چھراں پھیری گئیں، سینوں میں کپائیں اتار دی گئیں، نوک دار بھالوں پر پھول سے

بچوں کو اچھالا گیا، ان کی ذہنی حالت کیا ہو گی۔ خود آدم زاد نے یہ احوال لکھا ہے، میں کیا بتاؤں۔ میں تو ان میں صرف ایک آدم زاد سہلی کے اغوا ہونے کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ تو کتنی سلمانیں، سکھوں کی بیویاں بن کر زندہ رہیں، کون جانتا ہے۔

مشرقی پنجاب کے بعد اب یوپی سے لاہور جانے والوں کی بدمذہبی تھی۔ سو ٹرینیں کالی گئیں۔

اپنی بھتیجی سہلی کو سہلی اولاد کی طرح چاہنے والا احمد میاں پھانسیا گیا کہ وہ دھال کیوں بنا۔ جو آدم زاد کسی معاملے میں جذباتی ہو جاتے ہیں، ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ سکھوں نے احمد میاں کے سارے جسم کو چھید ڈالا۔ وہ کیا یوسف تو وہ بھی کب تک لڑتا۔ آخر گری گیا۔ درندوں کو سہلی کی فکر تھی کہ وہ کس کے حصے میں آتی ہے۔ ان میں ٹھن گئی لیکن اس طرح کہ شکار بچ کر نہ بھاگ لے۔ ایک درندہ ذرا قوی تھا، سو وہ سب پر بھاری پڑا۔ اس نے نیم بے ہوش سہلی کو کندھے پر ڈالا اور بقیہ درندے اس کے پیچھے دوڑے۔ اس سے بس یہ ہوا کہ یوسف کی جان بچ گئی۔ درندوں نے یہی سمجھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔ وہ یہ بھول گئے کہ موت و زندگی ان کے نہیں اللہ کے اختیار میں ہے۔

یوسف نے مجھے وہیں تک واقعہ بتایا کہ جب تک وہ شدید زخمی ہو کر گرا نہیں تھا، باقی سب کچھ میں نے خود معلوم کیا۔

یہ ٹرین لاشوں اور شدید زخموں کو لے کر لاہور پہنچی۔ وہاں اور ہی سماں تھا۔ آگ اور خون کے دریا سے گزر کر جو لوگ لاہور پہنچ رہے تھے، ان کے لئے حکومت کی طرف سے مہاجر کیمپ لگے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کو صرف ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ایک قیامت بیت گئی۔ اس وقت پاکستان کی بری فوج کا کمانڈر انچیف ایک انگریز جنرل فرینک میسروی تھا، نزل ڈکلس گریسی کو فرینک میسروی کے بعد کمانڈر انچیف بنایا گیا۔

کچھ پنجابی ہندو (شرناتھی) اب بھی لاہور میں موجود تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ کسی طرح ہندوستان بھاگ جائیں۔ راولپنڈی اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے پنجابی ہندو بھی لاہور آگئے تھے کہ موقع دیکھتے ہی ہندوستان جانے والی کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں۔ یوں گویا لاہور شہر اس وقت ہندو اور مسلمان مہاجروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مادری زبان تحفظ کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان شرناتیوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، سکھوں نے بھی انہی کا ساتھ دیا۔

لاہور میں رہنے بسنے والے شرناتیوں اور سکھوں کا برائے نام نقصان ہوا۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنی جائیداد مقامی لوگوں کو فروخت کر کے نقد رقم بنا لی۔ انہی شرناتیوں کی سازشوں کے نتیجے میں کم ہی مسلمان مہاجر، لاہور میں ٹک سکے۔ انہوں نے سندھ کا رخ کیا۔ کچھ مہاجر تو سندھ کے دوسرے شہروں میں بس رہے، زیادہ تعداد کراچی آگئی۔

سہلی کو اغوا کئے جانے کے بعد یوسف ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے رضاکاروں نے شدید زخمی لوگوں کو ان کیسپوں میں پہنچا دیا جہاں زندہ بچ جانے والے زیر علاج تھے۔ جسم کے زخم مندمل ہو گئے لیکن روح کے زخم نہیں بھرے۔ ایک روز یوسف وہاں سے نکل بھاگا۔ وہ مہاجرین

جو چہار کہلاتی ہے۔

میں، یوسف کے ساتھ گویا گردش کرتا رہا۔

”اور کیا۔ تمہیں ابھی یہاں آئے جمہ جمعہ چار ہی دن تو ہوئے ہیں۔“

”میری اردو ذرا کمزور ہے۔“

”لیکن تم کبھی کبھی تو اہل زبان کی طرح بولنے لگتے ہو۔“

”تمہارے ساتھ رہنے کا اثر ہے“ ورنہ تو میرا تعلق شرعی گڑھ کے ایک گاؤں سے ہے۔“ میں

”کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟“ اسے میرے فرضی کردار کے متعلق کچھ جان لینے کا موقع مل گیا۔

”تم ہی بتاؤ‘ مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔“ وہ پُر تجسس نظر آنے لگا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... متھرا‘ پوہی کا بڑا قدیم شہر ہے۔ وہاں اورنگ زیب عالمگیر نے ایک

”یوسف! تمہیں اور کچھ بھی یاد ہے، اس مسجد کے بارے میں؟“

”اور اس کی وجہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں، مگر بتاؤں گا نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ وجہ تو یہ تانی پڑے گی تمہیں مقصوداً“ وہ بھند ہو گیا۔

”بھائی میرے شریف بچوں کے لئے ایسی باتوں کا جاننا ضروری نہیں۔ جو بات تمہارے والد مرحوم

یوسف نے لاجول بڑھ کر پھر جو تک کر دریافت کیا۔ ”تم تو ابھی کہہ رہے تھے‘ علی گڑھ کے ایک

”تم میرٹھ سے محلے مشائخان سے متعرا جاسکتے ہو تو کیا مجھ پر کوئی پابندی ہے۔ میں بھی سکڑے

دکھی لوگ ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ سو وہ یوسف پر ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ کراچی

خانہ بربادوں، شریفوں اور غریبوں نے شہر کراچی میں جگہ جگہ جھلیاں ڈال لیں۔

یہ اسی دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے سنا خواجہ ناظم الدین مسجد حفرہ میں نماز پڑھنے جا رہے۔

”چلتے ہو لارنس روڈ؟“ میں نے یوسف سے پوچھا۔

”کیوں، وہاں کیا ہے؟“ وہ بولا۔

”جمعہ ہے آج“ وہیں جمعے کی نماز پڑھیں گے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”خواجہ صاحب شہر کی

جب میں نے تفصیل بتائی تو وہ راضی ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ لارنس روڈ پر دواغ مسجد کے

جمعے کی نماز پڑھ کر یوسف کے ہاتھ، میں اس علاقے میں کھونے نکل گیا۔

”تم بھی سیلابی آدمی ہو مقصود!“ یوسف نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم مجھے کہاں

”ارے تم اس جگہ کو نہیں پہچانتے۔ یہ چرچ مٹن سینکڈری اسکول ہے، یہ جو سامنے نظر آ رہا ہے

”ہو گا چرچ مشن اسکول“ مجھے کیا۔ میرٹھ میں بھی عیسائیوں کا ایک مشن اسکول تھا۔ میرے والد

”پھر یہ کہ میں تمہاری معلومات میں اضافے کے لئے تمہیں یہاں لایا ہوں۔ یہ وہ اسکول ہے جہاں

قائد اعظمؒ کا نام سن کر وہ سنجیدہ اور کچھ رنجیدہ ہو گیا۔ میں اسے نہ تو سنجیدہ دیکھنے کے موڑ میں تھا۔

نہ رنجیدہ۔ اسی سبب میں اسے ساتھ لئے آگے بڑھ گیا۔ اسکول کے عقب میں اکال ہونگا (سکھوں)

ٹرسٹ) تھا۔ وہاں کرو دوارا تھا۔ اب ہم ہر چند رائے روڈ پر تھے، آنکھوں کے ہسپتال (ایپسرونی ہاؤس)

جائے والے راستے پر۔ اسی روڈ کی طرف سیکھ داروں کی آبادی تھی۔ سیکھ دار ہندوؤں کی ایک ذات ہے۔

بھرتا کبھی وہاں پہنچ گیا ہوں گا۔

وہ لاجواب سا ہو گیا، پھر ایک دم چونک کر پوچھنے لگا۔ ”تم ان جگہوں میں آباد لوگوں کے متعلق کچھ بتا رہے تھے۔ کیا یہاں متھرا کے کچھ خاندانی لوگ آباد ہیں؟“

”خاندانی تو تبھی ہوتے ہیں جان من!..... تمہارا مطلب ”خاندانی لوگ“ سے کیا ہے؟“

”نسلا شریف، نیک اور معزز لوگ۔“ اس کی گردن ذرا سی تن گئی۔

ان آدم زادوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ کسی کی شرافت، نیکی اور عزت کو اس کے پیشے سے آئکتے ہیں۔

”شریف، نیک اور معزز تو ان جگہوں میں بسنے والے بھی ہیں۔“ میں نے بات کو مختصر کر دیا۔ ”خیر یہ اپنے اپنے سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ ان جگہوں میں آباد زیادہ تر لوگ، متھرا شہر کے سبزی فروش ہیں..... آؤ پہلے کچھ کھاتے پیتے ہیں، بھوک لگ رہی ہے۔“

نگار سینما سے پہلے دائیں جانب بصیم پورہ تھا جہاں کچھ، میمن اور بوہری رہتے تھے۔ یوسف کے ساتھ میں وہیں ایک ”پینچ ہوٹل“ میں آ بیٹھا۔ پیٹ کا بھرتا ہی کیا!

دوسرے کا کھانا کھانے کے بعد یوں تو صحت کی خاطر آرام کرنا ضروری ہے لیکن یہ چونچلے آدم زادوں کے ہیں۔ جن آدم زادوں کو اتنی فرصت ہوتی ہے اور عیش کرتے ہیں، ان میں اب یوسف شامل نہیں رہا تھا۔ ماضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس تھا بھی کیا۔ عام طور پر ایسے آدم زاد فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ خود انہیں بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ تلخ اور بھیاںک یادوں کے عذاب سے دامن بچا رہے ہیں۔ تقریباً یہی حال یوسف کا تھا۔ کھانا کھا کر مجھ سے بولا۔ ”مقصود! آج گھومنے نکل ہی آئے ہیں تو اسی علاقے میں اور گھومتے ہیں۔ یہاں قائد اعظم“.....

”وہ جگہ یہاں سے دور ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کون سی جگہ؟“

”وزیر مینشن“ جہاں قائد اعظم پیدا ہوئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پھر کبھی ادھر چلیں گے۔ قائد اعظم“ کی نشانیاں یا ان سے وابستہ جگہیں اور بہت سی ہیں، مثلاً اسٹیٹ بینک آف پاکستان۔ اس بینک کا افتتاح قائد اعظم ہی نے کیا تھا، مگر اس کے لئے بولٹن مارکیٹ تک مارچ کرنا پڑے گا، فی الحال آس پاس ہی منڈلاتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”تمہاری اردو واقعی بہت کمزور ہے۔ پرندے منڈلاتے ہیں، آدمی نہیں۔ برا نہ مانا، مقصود! تم ہو واقعی کسی گاؤں کے۔“

”لو“ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے..... میں گاؤں کا رہنے والا ہوں، اس لئے تم مجھے منڈلانے سے نہیں روک سکتے..... ویسے یہ الگ بات ہے کہ منڈلانے کا شمار بھی اردو محاورے میں ہوتا ہے۔“

”بحث بہت کرتے ہو تم۔“ وہ بولا۔ ”اب یہیں کھڑے رہو گے کہ کدھر ہی چلو گے بھی۔“

”میں چلتے چلتے ہی تو یہاں آ کے رکا ہوں۔“

”یہاں کیا ہے؟“

”جو متھرا میں تھا، جس پر تم نے لاجول پڑھی تھی۔“

”تو کیا یہاں بھی..... پاکستان میں بھی.....“ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔

”کہاں کیا نہیں ہوتا۔ بس یہ ہے کہ ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔“

”چلو یہاں سے مقصود!“

”جان من! دیکھنے کے پیسے نہیں لگتے۔ یوں بھی اس وقت دیکھنے کو کچھ نہیں، بس بلڈنگیں ہیں دیکھ لو۔ طبلہ تو رات کو گھنگٹا ہے، زخمی پائل کے گھنگرو تو رات کو بجتے ہیں، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں چہرے تو رات کو بجتے ہیں۔ میں اس لئے تمہیں یہاں گھما رہا ہوں کہ تم بھولے آدمی ہو۔ تمہیں کوئی بد معاش بکا کر یہاں نہ لے آئے۔“

وہ جھانپنے میں آ گیا اور بولا۔ ”بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ راستہ چلتے ہوئے یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ گڑھا کہاں ہے۔“

”ادھر یہ نگار سینما ہے۔ اس کے سامنے جو بلڈنگیں تمہیں نظر آ رہی ہیں، یہاں پیشہ ور آدم زاد..... میرا مطلب ہے کہ پیشہ کرنے والیاں رہتی ہیں۔ جو نامارکیٹ کی جانب بلڈنگوں میں طوائفیں آباد ہیں۔ ان میں گانے والیاں بھی ہیں اور پیشہ ور بھی۔ درمیان میں جاپانی روڈ ہے جس پر ٹرام چلتی ہے۔ ایک ٹرام سیدھی چاکڈواڑے تک جاتی ہے، دوسری ادھر نگار سینما سے لارنس روڈ کی طرف مڑ جاتی ہے۔ ایک انگریز تھا، نیپیر، اسی کے نام پر پیشہ ور عورتوں کا علاقہ نیپیر روڈ کہلاتا ہے۔ ٹھوکر گلی دیکھو گے؟..... کسی دل چلنے کی اچھا نام رکھا ہے۔ جہاں آدمی ٹھوکر کھا جائے، اسے یہی کہنا چاہئے نا۔“ میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

جلدی ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ یوسف کی حالت اس اونٹ جیسی ہے جو کسی باؤلے گاؤں میں آ گیا ہو۔ میں نے اس پر ترس کھایا اور دوبارہ گرد دوارے کی طرف نکل آیا۔ گرد دوارے کی زمین پر تختوں کی باڑھ بنی تھی اور اس باڑھ کے ساتھ جھگیاں تھیں۔

”یوسف! تم بھی کیوں کہ ایک جگہ میں رہتے ہو، اس لئے میں تمہیں ادھر لے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تم جگہ کیوں کہتے ہو، جھوپڑی نہیں کہہ سکتے؟“

”اس لئے کہ یہ میرٹھ یا علی گڑھ نہیں، کراچی ہے پیارے! جیسا دس دس بولی۔ دس کے ساتھ بھیس میں ہرگز نہیں بولوں گا۔“

وہ فہم دیا اور میں خوش ہو گیا۔ کسی کا دل رکھنا بھی تو ثواب ہے۔ کچھ دیر مزید گھوم گھام کر وہ اداس سا ہو گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ ”تم سے مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی، لیکن بار بار سوچ کے رہ جاتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

پڑھا لکھا ہوں، کوئی بھی کام مل جائے گا۔“

”جندا باد!“

”نہیں مقصود! پاکستان زندہ باد کو۔“

”پاکستان زندہ باد! اب خوش؟“

اور وہ خوش ہو گیا، پوچھنے لگا۔ ”کب جا رہے ہو ہندوستان؟“

”کل صبح چلا جاؤں گا۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ حالانکہ مجھے کہیں بھی آنا جانا نہیں تھا۔ مجھے تو یوسف کے ساتھ ہی رہنا تھا اور اس سے الگ بھی لیکن مقصود بن کر نہیں، علیا پیش کی حیثیت سے۔ اس پچارے کو کیا پتا تھا ”کس نئی پر سد کہ بھیا کیتی!“ اس وقت پڑھا بے پڑھا سب ہی برابر تھے۔

کون سنتا ہے فغان درویش

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے تھے اور انسان؟ مجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سرکاری دفاتر کا حال مجھ پر عیاں تھا، جو عیاں نہیں تھا، میں نے معلوم کر لیا۔ نجی ادارے لوٹ کھسوٹ میں لگے تھے۔ کون عزت دار ہے، کون ہندوستان میں بے عزت تھا، کون تیلی اور کون واقعی فارسی پڑھا ہوا تھا، کس کو پڑی تھی کہ پوچھتا۔ جن کا سب کچھ اجڑ گیا، چپ رہے اور جنہوں نے نفع کمایا، مظلوم بن گئے۔ ظالم اور مظلوم کی پہچان ختم ہو گئی۔ سبھی مظلوم بنے ہوئے تھے۔ ”ہم تو ہندوستان میں کئی پشتوں سے امیر تھے۔“ کوئی کتا، چاہے کئی پشتوں سے بھیک مانگتا پیشہ رہا ہو۔ کوئی دون کی لیتا کہ جناب، ہمارے بارے میں کیا پوچھتے ہیں، فیکٹریاں تمہیں ہماری۔ ایک ایک فیکٹری میں کئی کئی سولازم تھے۔ اگر کھوج لگاؤ تو پتا چلے کہ وہ حضرت کسی چھوٹے سے کارخانے میں ”بڈ حرام“ قسم کے معمولی کاریگر تھے اور ان کے ”قبلہ ابا حضور، دادا حضور“ بھی کاریگر ہی تھے۔ وہ جن کی واقعی فیکٹریاں یا کارخانے تھے، ایک حرف زبان پر نہ لاتے۔ اس بہتی میں اگر سبھی سچے تھے تو انہوں نے خود کو جھوٹا کھلوانا قبول کر لیا۔ ایسے خانہ خراب تو نظر جھکائے گزر جاتے کہ انہیں کوئی پہچان نہ لے۔ عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ قاتل کہتے کہ ہم تو سدا کے اللہ والے ہیں اور اللہ والے ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ کوئی دل جلا حسب نسب کھول کے رکھ دیتا کہ ابے تو اور تیرا باپ بھی اٹھائی گرا تھا تو مار پیٹ پر نوبت پہنچ جاتی۔ ایک بڑے کو میں نے کہتے سنا، ہندوستان میں ہماری بہت بڑی جائیداد تھی، یہ بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ یہاں میں نے کلیم داخل کر کے اپنی جائیداد کے بدلے کئی بلڈنگیں لے لی ہیں۔ ہم نے آخر پاکستان کی خاطر قربانی دی ہے۔ پاکستان پر ہمارا حق ہے۔ میں نے سراغ لگایا تو پتا چلا، وہاں ایک چھوٹے سے گھر میں پورا ”میر“ رہتا تھا جن کی جائیداد تھی، وہ یہاں وہاں جھگیوں میں پڑے تھے، کوئی بھیم پورہ میں، کوئی قائد آباد میں۔

ہائے رے آدم زاد، تو واقعی ”اشراف المخلوقات“ ہے۔

ایسے میں بھلا میں یوسف کو کس طرح اکیلا چھوڑ دیتا۔

”میں تمہیں اسٹیشن تک چھوڑنے چلوں گا مقصود!“ یوسف بول اٹھا۔

”وہ کس خوشی میں پیارے بھائی؟“ میں نے کہا۔ ”جب آنکھ کھلی نکل لوں گا، تمہاری فیند کیوں خراب کروں۔“

یوسف بھی ایک ہی ”اڑیل گھوڑا“ تھا، کہنے لگا۔ ”میں جاگ جاؤں گا۔“

”اور اس پکر میں تم رات بھر آنکھوں میں کاٹ دو گے۔“

اے علم نہیں تھا کہ میں اس پر فیند بھی مسلط کر سکتا ہوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن فجر سے پہلے میں، مقصود سے علیا پیش بن گیا۔ یوسف بے خبر سوتا رہا اور میں، قائد آباد کی اس جھگی سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

شراب انگڑائی لے کر جاگنے والا تھا۔ کچھ دیر میں ہر طرف سے اذانوں کی آواز آنے لگی۔ اللہ نے میرے دل میں نیکی ڈالی، سوچا کہ اے بد بخت علیا پیش! کبھی نماز بھی پڑھ لیا کر۔ اڑتا ہوا ایک مسجد میں پہنچ گیا۔ نماز پڑھنے کے لئے وضو کیا۔ ملا جی اذان دے کر لیٹ گئے تھے کہ کچھ دیر کو کمر سیدھی کر لیں۔ اسی وقت ایک نوجوان آدم زاد مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے گلے سے لگتا تھا کہ رات بھر کا جاگا ہوا ہے، بال نکھرے ہوئے اور چہرے پر ہلاکی اداسی۔ لگتا تھا، وہ مسجد میں نماز پڑھنے نہیں کسی اور کام سے آیا ہے۔ لپک کر وہ ملا جی کے پاس پہنچ گیا۔ اب میں نے ذرا غور سے ملا جی کو دیکھا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی اور صحت مند بھی تھے۔

”ملا جی اٹھ کر بیٹھ گئے۔“ ”ارے شریف! تم۔“

”ہاں ملا جی! آپ سے ایک ضروری کام تھا۔“

”ابھی تو جماعت کھڑی ہونے والی ہے، پھر آنا.....“ بلکہ وضو کر لو، نماز پڑھ کر اللہ سے جو مانگنا ہے، مانگ لو۔ وہ تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ تم کس پریشانی میں ہو، مجھے معلوم ہے جب سارے نمازی چلے جائیں گے تو بات کریں گے، وہ بھی مسجد میں نہیں۔“

”اچھا۔“ شریف نے بس اتنا کہا اور وضو کر کے ایک طرف آ بیٹھا۔

اکا کا نمازی آنے لگے۔ پھر نماز کا وقت ہو گیا۔ ملا جی نے نماز پڑھائی۔ میں کیوں کہ آدم زاد نہیں، جن زاد تھا، اس لئے احتیاط سے کام لیا۔ کسی آدم زاد کو مسجد میں میری موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ ملا جی نے بڑی رقت آمیز آواز میں دعا مانگی۔ انہوں نے کیا دعا کی، میرے سوا کوئی نہ جان سکا۔ مجھے اس ملا پڑا غصہ آیا۔

وین ملا فی سبیل اللہ فساد

وہ جھلی ملا تھا، اوپر کچھ اندر کچھ۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ نماز پڑھ کر شرافت کے ساتھ وہاں سے نکل لوں گا، مگر مجبوراً مجھے رکنا پڑا۔

ملا نے مسجد کی حدود ہی میں ایک طرف اپنا حجرہ بنا رکھا تھا، حجرہ کیا، اچھا خاصا کمرہ تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ مسجد کی جانب اور دوسرا بیرونی سمت کھلتا تھا۔

دعا مانگ کر مائے مقتدیوں سے مصافحہ کیا۔ شریف بھی مصافحہ کرنے والوں میں شامل تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے مائے شریف کا ہاتھ دبایا کہ وہ کہیں پھوٹ نہ لے۔ جو مقتدی تھے، شریف کو قابل رحم نظروں سے دیکھتے ہوئے چل دیئے۔ وہ اسی محلے کے لوگ تھے اور شریف بھی وہیں رہتا تھا۔

”چلو اب حجرے میں چلتے ہیں، وہاں بات ہو گی۔“ مائے شریف سے کہا اور اسے حجرے میں لے آیا۔

حجرے کا بیرونی دروازہ پہلے سے بند تھا، مائے مسجد کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی لگا دیا۔

”بیٹھو۔“

شریف نرم و گداز گدے پر بیٹھ گیا جس پر سفید شفاف چادر بچھی تھی۔ کمرہ عطر حنائے مہک رہا تھا۔

”دیکھو شریف! تین مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر عورت کی طرف رجوع کرنے کی گنجائش نہیں۔ وہ تمہاری بیوی تھی لیکن اب نہیں رہی۔ اسے اپنے ”کوارٹر“ سے نکال دو۔“

”مگر وہ جائے گی کہاں؟ اس کا تو کوئی عزیز رشتہ دار زندہ نہیں بچا۔“ شریف نے جیسے فریاد کی۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ وہ تم پر حرام ہو گئی۔ اگر تم نے اسے اپنے ”کوارٹر“ سے نہیں نکالا تو ایک دن محلے والے نکال دیں گے۔ شرع کی رو سے بس ایک ہی.....“

”لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں اور..... اور وہ..... وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔“

”پھر تم نے اسے طلاق کیوں دی؟“

”غصے میں زبان پر یہ لفظ آ گیا۔“

”کچھ بھی ہو، طلاق تو طلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لئے طلاق کو ناپسند فرمایا ہے۔“

”تو اب کیا ہو مائے جی! نہ میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں، نہ وہ مجھے۔“

”شرع کی رو سے میں اس مسئلے کا ایک حل بتا رہا تھا، مگر تم بول اٹھے۔“

”بولوں بھی نہیں مائے جی! پھر کیا کروں؟ جی چاہتا ہے، دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤں۔“

شریف رونے لگا۔

”خودکشی حرام ہے۔“

”حرام..... حرام..... حرام! کیا زندہ رہنا بھی حرام ہے؟“

”حرام اور حلال میں بال برابر فرق ہے۔ تلواری و حار پر چلنا پڑتا ہے میاں! تم ان باریکیوں کو

نہیں سمجھو گے۔ اگر تم شاہین سے اس کا ذکر نہ کرو تو تمہیں ایک بات.....“

”مائے جی!“ شریف تقریباً چیخ اٹھا۔ ”تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”آرام سے بیٹھو شریف! اونچی آواز میں بولے تو تمہاری ہی رسوائی ہو گی، میرا کچھ نہیں جانے

گا۔“ مائے ایک طرح سے دھمکی دی۔

”دیکھو جی مائے جی! تم..... تمہاری زبان پر اب اگر میری بیوی.....“

”اب وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ کتنی دفعہ میں یہ بات کہوں اور جب وہ مجھ سے ملنے خود آئی تو بھی تمہارے نکاح سے باہر ہو چکی تھی۔“

”تو شاہین تم سے ملنے بھی آ چکی ہے..... ٹھیک ہے..... اس نے مجھے..... مجھ سے یہ بات چھپائی۔“ شریف نے مائے کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔ ”مائے جی! اگر یہ بات غلط لگی تو میں کم سے کم تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہتے ہی شریف تیزی سے اٹھا۔

شریف لاکھ نوجوان سہی مگر مائے اس سے کہیں زیادہ طاقتور اور عیار آدم زاد تھا۔ وہ بھی تیزی کے ساتھ اٹھا اور شریف کی کلائی پکڑ لی، پھر سخت آواز میں بولا۔ ”بیٹھ جاؤ، زیادہ بہادر بننے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اتنا ہی گھمنڈ ہے تو اپنی کلائی چھڑا کر دکھا دو۔“

شریف جنونی ہو رہا تھا۔ اس نے مائے کا چیلنج قبول کر لیا اور زور لگایا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں خاموش تماشا کی بنا رہا۔ ابھی مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مائے نے چولا بدلا اور نرمی کے ساتھ شریف کو مخاطب کیا۔ ”میں تمہارا اور شاہین، دونوں کا بھلا چاہتا ہوں، مجھے غلط مت سمجھو۔ جس معاملے میں تم مجھ سے مشورہ لینے اور مسئلہ پوچھنے آئے ہو، وہ بھی اسی لئے آئی تھی۔ میں نے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہاں کوئی اسے میرے حجرے میں نہ دیکھ لے، اس خیال سے دروازے ضرور بند کر دیئے تھے۔“ یہ کہہ کر مائے نے شریف کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔“

شریف کے چہرے پر پہلے الجھن نظر آئی، پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مائے اس سے پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔ ”مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میری طرف سے تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی۔ میں تو تم دونوں کا گھر بنا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ شریف نے ایک دم سراٹھا کر سوال کیا۔

”ہاں ہاں، اور کیا۔ مجھے تم دونوں ہی سے ہمدردی ہے۔“

”ہمدردی اسے کہتے ہیں کہ میں اسے اپنے گھر سے نکال دوں؟“

”وہ تو میں نے شرعی مسئلہ بتایا تھا۔ مسئلہ تو اپنی جگہ مسئلہ ہے لیکن اس مسئلے کا بھی ایک حل ہے۔“ مائے بولا۔ ”اپنے کسی ایسے دوست یا عزیز کو تلاش کرو جو تمہاری خاطر قربانی دے سکے، تم اس پر پوری طرح بھروسہ کر سکو، اس کے ذریعے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”لیکن کیسے؟“ شریف اعتدال پر آنے لگا۔

”تمہارا وہ بااعتماد دوست یا عزیز عارضی طور پر شاہین سے نکاح پڑھوا لے اور پھر اسے فوراً طلاق دے دے۔ شاہین عدت میں بیٹھے اور عدت کے دن پورے کر کے دوبارہ تم سے نکاح کر لے۔ اب سمجھ گئے پورا مسئلہ، اسے حلال کہتے ہیں، یعنی وہی عورت کہ جسے طلاق دی جا چکی ہو، دوبارہ اپنے خاوند پر حلال ہو سکتی ہے۔“

شریف سوچ میں پڑ گیا، ”کرے تو کیا کرے۔“

”شاہین نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میں نے اسے سمجھا بھرا کر ٹال دیا کیوں کہ یہ بات اس سے کہنے کی نہیں تھی۔“

ملا کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ شریف پھر پہلے کی طرح ”ملا جی“ کہنے لگا۔ ”میرا ایک دوست تو ہے ملا جی! وہ بھی آکرے گا ہے لیکن اس معاملے میں..... نہیں“ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ کناری بازار کے پھیرے بھی لگاتا رہا ہے۔“

”توبہ توبہ۔“ ملا نے کہا۔ ”وہ بازار تو..... مجھے تمہارے ہی شہر کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہاں تو طوائفوں کے کوٹھے تھے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟“ ملا بھولا بن گیا۔

”ہاں ملا جی! آپ کو جس نے بھی یہ بات بتائی ہے، وہ غلط نہیں۔“ شریف نے تصدیق کر دی۔

”پھر کسی عزیز رشتے دار سے بات کرو۔“

”کون عزیز؟ کس کا رشتے دار؟..... رشتے دار تو سلگتی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہیں۔ ایک ہی خاندان کے لوگ، تاج گنج میں برسوں ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ یہاں آکر تو دنیا ہی بدل گئی ملا جی! کس پر بھروسہ کیا جائے؟ کسے اپنا کہا جائے؟ اگر اپنے ہی اپنے ہوتے تو میں اس حال کو کیوں پہنچتا..... کچھ بھی ہو جائے ملا جی! مجھے چاہے یہ شہر چھوڑنا پڑے، اپنا کوارٹر بیچنا پڑے، در بدر ہونا پڑے، شاہین کو میں کسی دوسرے سے حوالے نہیں کروں گا۔“ شریف کے آخری الفاظ فیصلہ کن تھے۔

میں نے سوچا، ان آدم زادوں میں ہر ایک کی الگ الگ پتا ہے۔ شریف نے جب خود ہی ایک فیصلہ کر لیا ہے تو پھر مجھے اس معاملے میں اپنی ”نادیدہ ٹانگ“ پھنسانے کی کیا پڑی ہے۔ جعلی ملا کو پھر کبھی بھگت لوں گا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے بے چارے شریف کی بیوی شاہین پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا، یہ بات میں نے اچھی طرح سمجھ لی تھی۔

شریف اور یوسف میں بڑا فرق تھا، ایک کی سکونت کوارٹر میں تھی، دوسرا جھگی نشین تھا، ایک میں زمانے سے ٹکر لینے کی ہمت تھی، چالاک تھا، دوسرا بالکل سیدھا سادا تھا۔ یوسف کو تو کوئی کھڑے کھڑے بچ بھی دیتا تو اسے خبر نہ ہوتی اور کتا، اچھا تو مجھے بچ دیا گیا ہے، خیر کوئی بات نہیں۔ اسے کس نے بیچا؟ کس کے ہاتھ اور کتنے مین بیچا؟ وہ ہرگز ایسے سوالات کر کے اپنا ”قیمتی دقت“ ضائع نہ کرنا۔ خود کو بیچ جانے پر وہ ممبر کر لیتا۔ بڑے شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور کراچی شہر میں بڑا شہر بن جانے کے تمام ”جراثیم“ موجود تھے۔ بندرگاہ کسی بھی بڑے شہر کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، خواہ وہاں ”بندر“ ہوں نہ ہوں۔ پھر یہ کہ ہر ملک کا دارالحکومت ”سکندر و دارا“ کا مسکن ہوتا ہے، خواہ وہاں آدم زادوں کو دار ہی پر کیوں نہ کھینچا جاتا ہو۔ ریوڑیاں بانٹنے اور ریوڑیاں کھانے والے، سبھی دارالحکومت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں اس وقت کراچی کا معاملہ دوسرے دارالحکومتوں سے ذرا مختلف تھا۔ یہ دارالحکومت ابھی ”ان میٹنگ“ تھا۔

میں وہاں سے سیدھا قائد آباد میں یوسف کے پاس پہنچ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ اٹھنے کو بے

قول رہا تھا۔ (پر تو نا بھی ایک معاوہ ہے، ورنہ آدم زادوں کے پر نہیں ہوتے، اگر پر ہوا کرتے تو وہ بے پر کی نہ اڑایا کرتے)۔

یوسف نے کروٹ لی اور کلمہ پڑھ کر اٹھا، پھر بڑبڑایا۔ ”معلوم نہیں، کیا ہو گیا تھا مجھے..... ایسی سہری نیند تو مجھے بہت دن کے بعد آئی ہے۔“ اسے میرا خیال آیا تو آنکھیں مل کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ ”مقصود سے میں کہہ رہا تھا، جاگ جاؤں گا اور وہ چلا گیا..... معلوم نہیں چلا گیا ہو گا وہ کہ اب تک کسی ٹرین کے انتظار میں ہو گا۔“ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ ”خیر اب تو چلا ہی گیا، کیا کیا جاسکتا ہے..... لیکن مقصود کو جانے سے پہلے مجھے جگا لینا چاہئے تھا۔ عجب ہے وہ بھی۔“

میں اس کی بڑبڑاہٹ سننا رہا، کچھ بولا نہیں کہ وہ کہیں ”ہشک“ نہ جائے۔ بعض آدم زاد بڑے وہمی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اس پر بھی شک کرنے لگتے ہیں کہ ان کا وجود ہے بھی کہ نہیں، سوچتا ہوں تو ہوں مگر کیا ہوں؟ اب انہیں کون بتائے کہ بھائی میرے، تم آدم کی نسل سے ہو، آدم زاد ہو لیکن وہم کی دوا تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ یہ بھی آدم زاد کہتے ہیں، میں نہیں۔ ایک آدم زاد شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

سب تو ہم کا کارخانہ ہے

یاں دی ہے جو اعتبار کیا

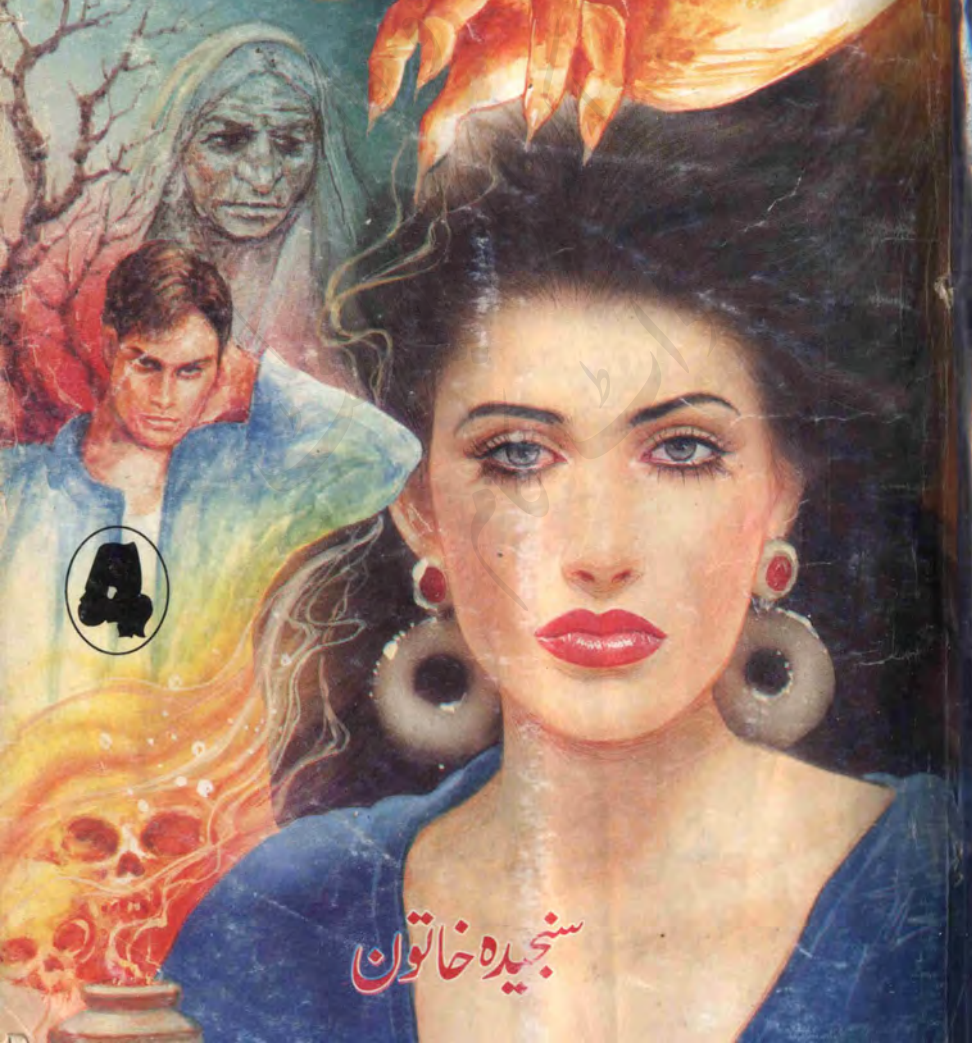
یہ آدم زاد اعتبار اور بے اعتباری کے درمیان جھولا جھولتے رہتے ہیں۔

یوسف کو یاد تھا کہ اسے کوئی کام تلاش کرنا ہے۔ اسے پڑھا لکھا ہونے پر بھی تھوڑا بہت ناز تھا۔ یہ ”چائس“ سو فیصد تھا کہ اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس لگ جائے۔ ”خیال خاطر یوسف“ کے سبب کہ اس کے آکھینے کو ٹھیس نہ لگ جائے، میں اس کا ”کبل“ بنا ہوا تھا۔ جیسے تیسے وہ تیار ہو کر جھگی سے نکلا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جنات اور کالے علم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

جنت زار



سنجیدہ خاتون

جزائر

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

یوسف کے لئے کراچی ایک اجنبی شہر تھا۔ وہ محسوس نہ کر سکے، میں نے اس طرح اسے شی کورٹ تک پہنچا دیا۔ وہ ناحق سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹتا اور کچھ ہاتھ نہ آتا۔ ”یہ میں کدھر نکل آیا؟“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے تو کہیں اور جانا تھا۔“ اس وقت تک شی کورٹ میں چہل پل شروع ہو چکی تھی۔

میں نے اتنی سی دیر میں کام دکھا دیا۔ ایک وکیل نے خود یوسف کو آواز دی۔ ”ذرا سننا میاں!“ وکیل کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ یوسف نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا اور پھر اس وکیل کے پاس پہنچ کر بولا۔ ”جی فرمائیے!..... آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟“

”کام تو مجھ سے تمہیں ہے میاں!“ وکیل مسکرایا۔
”لے..... لیکن میں آپ..... آپ کو پہچانتا نہیں۔“
”جان پہچان اگر رکاوٹ ہے تو ان جان بن کر.....“
”آ..... آپ میرے لئے رہنے والے تو نہیں ہیں؟“
”نہیں میاں! میرا تعلق پہلی بھیت سے ہے، ہوں ویسے تمہارے ہی صوبے کا۔“ وکیل نے نرمی کے ساتھ جواب دیا۔

”صوبے؟..... کیسے صوبے؟..... ہم سب مسلمان ہیں۔ ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب۔“

”اور ایک زبان بھی تو کو۔“ وکیل نے جرح کی۔
”زبان کی بات نہ کیجئے..... اب ہماری کوئی زبان نہیں اور.....“

”میاں! کیا تم قائد اعظم کی ڈھاکا والی تقریر بھول گئے؟“ وکیل نے یوسف کی بات کاٹ دی۔
لطیفہ اس گفتگو میں یہ تھا کہ وکیل اور یوسف ایک دوسرے سے وہی کچھ کہہ رہے تھے جو میں ان
سے کہلوا رہا تھا۔ یوسف بھلا اتنی بحث کرنے والا کہاں تھا۔ پہلی بحیثیت کارہنہ والا وہ وکیل بھی بغیر پیسے کے
یوسف سے جرح نہ کرتا۔

”قائد اعظم کی ہر تقریر کا ایک ایک لفظ مجھے یاد ہے قبلہ! کہاں اور کب، کس موقع پر انہوں نے کیا
فرمایا۔“ یوسف بولا۔

”پھر تو تم بڑے کام کے بندے ہو، آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔“ وکیل نے اپنی کالی چٹی ایک طرف کھسکا دی
اور کہنے لگا۔ ”مجھے ایک پڑھے لکھے محرر کی ضرورت ہے۔“

”دو کی ضرورت کیوں نہیں؟“ میں نے وکیل کو گھیننے کی خاطر یوسف کی زبانی کہلوا دیا۔ ”اتنا کتنا کافی
ہے کہ آپ کو پڑھے لکھے محرر کی ضرورت ہے، لفظ ایک زائد ہے۔“

وکیل چکرا گیا، پھر کہا۔ ”تم تو اچھی خاصی جرح کر لیتے ہو۔ کبھی میں کورٹ میں نہ ہوا تو
تم.....“

”جی نہیں، میرے پاس وکالت کی ڈگری نہیں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم کیس اسٹڈی کر کے مجھے مشورہ تو دے سکتے ہو؟“

”جی ہاں، یہ ممکن ہے۔“

”بس تو پھر بن گئی بات.....“ وکیل نے اپنی پینٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپے کا
نوٹ یوسف کو تھما دیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”تمہارا معاوضہ۔“

”لیکن ابھی میں نے محنت کب کی ہے؟“

”یہ جو تم نے مجھ سے اتنی باتیں کی ہیں، ان کے بھی پیسے ہوتے ہیں۔“

”باتوں کے پیسے؟“ یوسف نے حیرت کا اظہار کیا۔

”میاں! تم بھی خوب آدمی ہو۔ ہم باتیں بناتے ہی کا تو کھاتے ہیں اور باتیں کون نہیں بناتا؟ لیڈر
باتیں نہیں بناتے؟ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو لوگ پڑھاتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں؟ اور بیچے
جاؤ تو ارسطو باتیں کرنے کے سوا کیا کرتا تھا؟ یونان کے شہر ایتھنز کا نام سنا ہے، تم نے؟“

”کیوں نہیں سنا؟“

”تو بس میاں، فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ باتیں کرنے کے پیسے بنا لیتے ہیں، کچھ لوگوں کو پھوٹی کوڑی
نہیں ملتی۔ ارسطو، سکندر اعظم کا استاد تھا۔ سکندر اس کی بڑی عزت کرتا تھا اور اسے مال بھی دیتا تھا۔ میں
فاتح اعظم سکندر کی بات کر رہا ہوں جو اس علاقے سے بھی گزرا تھا۔“ وکیل کو میں نے ”علم دریاؤ“ بنا دیا
اور اس مرتبہ یوسف کو چند لمحے کے لئے ”ہنر اینڈ بزنس“ کر دیا۔ وہ خالی الذہن سا ہو کر وکیل کا منہ دیکھنے

لگا۔

”میاں! جہاں ہم اور تم اس وقت موجود ہیں، میرا مطلب پاکستان سے ہے۔ جب سکندر اعظم دنیا کو
فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تو ادھر بھی آیا۔ پورے والا میں اس کا پیارا گھوڑا مر گیا۔ سکندر تو سکندر تھا،
اس نے کیا کیا کہ پورے والا میں.....“

”پورے والا کون ہے؟“ یوسف ”چکر پدم“ بنا ہوا تھا۔

”یہ کوئی آدمی نہیں میاں! ایک جگہ کا نام ہے۔“

”جگہ کا نام؟“

”اور کیا میرے ابا کا نام..... ابھی تو تم بڑی قابلیت چھانٹ رہے تھے، بول گئے ہیں؟“

”ہرگز ہرگز نہیں، میں جیس نہیں بول سکتا۔“ یوسف نے پلٹا کھایا، اور پلٹا کھانے والا میں تھا۔

یوسف کی زبان سے میں نے کہلوا دیا۔ ”وکیل صاحب! میں تو آپ کا امتحان لے رہا تھا۔“

”میرا امتحان؟“ وکیل سٹ پٹا گیا۔

”جی جناب والا، قبلہ وکیل صاحب! آپ سے زیادہ جغرافیہ میں نے پڑھا ہے۔ پورے والا صوبہ
پنجاب میں ہے۔“

”ابھی تو تم صوبوں کے خلاف بول رہے تھے۔“ وکیل نے یوسف کی ٹانگ کھینچی۔

”میری مرضی..... یہی تو وکالت ہے۔ ایک اچھے وکیل کو سکے کے دونوں رخ کا پتا ہونا چاہئے

..... یوں بھی ہے اور یوں بھی۔“

”میاں! تم وہاں کے رہنے والے تو نہیں جہاں کی قبینہ مشہور ہے؟“

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”اس طرح کہ تمہاری زبان بالکل قبینہ کی طرح چل رہی ہے۔“ وکیل نے جواب دیا۔

”وکیل صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟“

”قدرت اللہ..... یہ سب قدرت کا کھیل ہی تو ہے میاں!..... اچھا اب تم اپنا نام بھی بتا

ہی دو۔ روپیہ جب میں رکھ لو۔ تم میری جگہ بیٹھو، میں ذرا ایک حلف نامہ ٹائپ کرا لاؤں۔ صبح سے اب

تک کھیاں مار رہا ہوں، کوئی مرغا نہیں پھنسا۔“

”مرغا؟..... مرغا کسے کہہ رہے ہیں آپ؟“

”دیکھو میاں..... کیا نام..... ہاں ابھی تم نے اپنا نام بتایا ہی کب ہے۔“ وکیل قدرت اللہ

اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میرا نام محمد یوسف صدیقی ہے اور میرے والد.....“

”چھوڑو میاں، مجھے تمہارے والد کا نام جاننے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں جان لیا بس یہی کافی ہے۔

باقی باتیں پھر..... اور سنو، ایک آدمی آئے گا سو بھر بازار سے، اس کا نام..... نام بھول گیا میں

..... شاعر ٹائپ آدمی ہے، میری طرح..... میں بھی شاعر ہوں قدرت اللہ قدرت پٹلی بھتی۔“

”بہت جھوٹا نام ہے آپ کا قدرت اللہ قدرت پبلی بھیتی۔“
”قدرت کے نام سے مشہور تھا، چھتیس اڑا دیتا تھا مشاعروں کی۔“
”مشاعروں کی چھتیس بھی ہوتی تھیں؟“

قدرت اللہ نے یوسف کو اس طرح دیکھا کہ جیسے کھا جائے گا۔ پھر وہ یوسف کو اپنی جگہ بیٹھا چھوڑ کر چل دیا۔ اسے ایک آدم زاد کا حلف نامہ ٹاپ کرنا تھا۔ حلف نامے جھوٹے سچ ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

یوسف ”رہاڑی“ سے لگ گیا تھا، مجھے اب شریف کی فکر ہوئی کہ وہ کیس جلی ملا کے چکر میں نہ آجائے۔

سٹی کورٹ سے میں جلی ملا کے ”حجرے“ میں پہنچا تو بڑی حیرت ہوئی۔ شریف اب تک وہیں موجود تھا۔ وہ ملا کے داؤ میں آگیا۔

”ایک بات سن لیں ملا جی!“ شریف بولا۔ ”ادھر شاہین سے آپ کا نکاح ہو گا، ادھر اسی وقت طلاق دینا ہو گی۔“

”پہلے نکاح تو ہو جانے دو۔ میں تو سب کچھ تمہاری خاطر کر رہا ہوں کہ تم اور شاہین کسی طرح دوبارہ ایک ہو جاؤ۔“

”ابے جعلے کیوں کو اس کر رہا ہے۔ ابھی تجھے اٹھا کر شیخ دوں گا۔“ مجھے بولنا ہی پڑا۔

ملا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی، شریف پر رعب ڈالنے کے لئے ”چھوٹھا“ کرنے لگا۔ تھا تو وہ جلی، میں اس لئے کیوں ڈرتا۔ جس کمرے کے دونوں دروازے بند تھے اور جہاں شریف اور اس آدم زاد ملا کے سوا کوئی نہیں تھا، وہاں تیسرا وجود کہاں سے آگیا؟ شریف تو یہ سوچنے میں لگا اور میں نے ملا کو ”چپتیا نہ“ شروع کر دیا۔

”ابے ہٹ خبیث!“ ملا ہوا میں ہاتھ چلانے لگا۔

”خبیث تو ہے..... شیطان نمبر ایک۔“ میں نے کہا۔ ”بتاؤں تجھے کہ تو کہاں سے بھاگ کر اس شہر میں آیا ہے۔“

”اچھا بتا، میں بھی تو دیکھوں تو کتنے پانی میں ہے؟“

”خود ہی بتا دیا تو نے میں کیا بتاؤں..... پانی سے تو تیرا بڑا قریبی رشتہ ہے۔ جہاں کے ٹھک مشہور ہیں، وہیں کا ہے تو لیکن میں تجھے شریف کو نہیں ٹھکنے دوں گا۔ تیرے شہر کی صبح بہت حسین ہے مگر تو بڑا کمین ہے۔ صبح بنارس تو دیکھ لی تو نے اب میں تجھے شام اودھ دکھاؤں گا۔ بول چلتا ہے گوشتی کے کنارے؟ بولی بھی بدل لی میراں آکر؟ اگر تو ٹھگ کر میراں نہ آتا تو وہیں ”تھم بو“ ہو جاتا۔ ہندو تجھے کاٹ ڈالتے۔ ایک ہندو لڑکی کے لئے تو نے اپنے بچوں اور بیوی کو بھی چھوڑ دیا بے غیرت!“

ملا بٹتا رہا اور میں نے اس کی ”پڑیا“ بنا دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ملا کو تو میں نے اس کا اصل چہرہ دکھا دیا لیکن اب شریف اور شاہین کا مسئلہ میرے سامنے تھا۔ سارا فساد ملا کا پھیلایا ہوا تھا۔

شریف اور شاہین دونوں ہی غلط فہمی کا شکار تھے۔ غصے کی حالت میں شاہین سے شریف نے بس اتنا کہا تھا کہ اگر تو نے میری بات نہ مانی تو میں تجھے چھوڑ بھی سکتا ہوں۔ پھر وہ بڑبڑاتا ہوا کوارٹر سے نکل گیا۔ آدم زادوں میں ”کنٹیاں“ بھی ہوتی ہیں۔ ایک بڑھیا نے بھی شریف کے یہ الفاظ سن لئے۔ اس کنٹنی نے سارے محلے میں یہ اڑا دی کہ شریف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ وہ آدم زاد کنٹنی، شاہین کی ”خالہ“ بنی ہوئی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ لفظ: ”چھوڑنا“ کو یار لوگوں نے طلاق میں تبدیل کر دیا۔ ملا کو خبر ہوئی تو اس کے اندر اک ٹھک جاگ اٹھا۔ بد معاش نے محلے والوں کو ہموار کر لیا، پھر کنٹنی بڑھیا کے ذریعے شاہین پر جال پھینکا۔ محلے والوں میں کچھ نیک آدم زاد بھی تھے۔ یہ وہی تھے جو شریف کو قابل رحم نظروں سے دیکھتے ہوئے چل دیئے تھے اسی روز فجر کی نماز کے بعد۔

شریف کو وہیں چھوڑ کر میں نے ملا کو منبھالا۔ ٹھک تو ٹھک ہوتا ہے۔ شریف کو نہ ٹھکتا تو ملا کسی اور کو اپنا آلہ کار بنا لیتا۔ میں نے سوچا کہ وہ بنارس کا ٹھک ہے۔ ٹھکوں کو ٹھکوں میں رہنا چاہئے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں اس سے شام اودھ دکھانے کو کہہ چکا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ میں، ملا کو اٹھا کر اودھ، یعنی لکھنؤ بھیج گیا۔ ملا بے ہوش تھا۔ اسے گوشتی (دریا) کے کنارے ڈال کر میں شہر میں ”مرگفت“ کرنے لگا۔

لکھنؤ کے ”بانکے“ مجھے کیس نظر نہ آئے۔ یہ میرا بریلی انیس کا شہر تھا۔ یہیں اردو زبان کے بڑے شاعر میر تقی میر نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے۔

شام ہونے تک میں نے حضرت شیخ اور چوک امین آباد کے کئی چکر لگائے اور پھر ملا کی خبر لی۔ وہ ابھی تک گوشتی کے کنارے تقریباً مردہ حالت میں پڑا تھا۔ میں اسے ہوش میں لایا اور بولا۔ ”ابے او ٹھک..... دیکھ شام اودھ۔“

۔ بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے
بنارس کا وہ ٹھک بھی بھڑک اٹھا حالانکہ یہ وقت صبح کا نہیں شام کا تھا۔ اس نے دریائے گوشتی کی آغوش میں پناہ لے لی۔ خس کم جہاں پاک، میں کراچی لوٹ آیا۔ سٹی کورٹ یا قائد آباد جانے کے بجائے میں شریف کے محلے میں آگیا۔

اس وقت محلے والے مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔

”معلوم نہیں، ملا جی کہاں چلے گئے؟“ ایک نمازی نے دوسرے نمازی سے کہا۔

دوسرا بولا۔ ”ان کا جہرہ کھلا پڑا ہے۔“

”وہ بنارس کا ٹھک تھا۔“ میں نے ایک نمازی کی زبان سے کھلوا دیا۔

”شریف بھی تو سب سے ایسی ہی عجیب طرح کی باتیں کہتا پھر رہا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے وہ۔“ میں نے دھیرے سے ایک نمازی کے کان میں کہا۔

”یہ کون بول رہا ہے؟“ وہ نمازی اچھل پڑا۔

”کہاں؟“

”میرے کان میں۔“

”تمہارے کان بج رہے ہوں گے۔“

”نہیں! میں نے خود ایک پراسرار آواز سنی ہے۔“

دُور سے نمازی اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ میں نے شریف کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ اپنے کوارٹر میں گھسا۔ پہلی مرتبہ مجھے شاہین دکھائی دی۔ بھولی سی وہ آدم زادی نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی۔ ”اے اللہ! مجھے نیک راہ دکھا۔“ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی لمحے منہ بولی ”خالہ“ نے باہر ہی سے ہانک لگائی۔ ”اری او شاہین بیٹی! نماز پڑھ لی؟“ شاہین تو جیسے کہیں اور ہی تھی، وہ دعا مانگتی رہی۔ شریف کو معلوم تھا کہ وہ ”خالہ“ کتنی آفت کی پڑیا ہے۔

”کیا بات ہے خالہ؟“ شریف نے شرافت کا ثبوت دیا۔

”نماز پڑھ کے ذرا شاہین بیٹی کی خیر خیریت لینے آئی تھی۔“ بڑھیا اندر آگئی اور لالین کی روشنی میں ادھر ادھر دیدے گھمانے لگی۔ پھر اس نے شریف کے لئے لے لئے۔ ”تو اب حد سے بڑھ رہا ہے شریف! اگر تو اگرے گا ہے تو میں بھی جھانسی کی ہوں، تیرے جھانے میں نہیں آنے کی۔“

”کیسا جھانسا خالہ! کیا کہہ رہی ہو تم؟“ شریف ٹیڑھا ہو گیا۔

اتنے میں شاہین نے دعا مانگ کر مصلیٰ اٹھایا تو بڑھیا اور پھیل گئی۔ اس نے شاہین کو مخاطب کیا۔ ”اے بیٹی! میں تجھے کتنی دفعہ سمجھا چکی ہوں کہ میرے کوارٹر میں آ جا۔ تجھے شریف کے ساتھ اب نہیں رہنا، مگر تو سنتی ہی نہیں۔“

”او بڑھیا! نکل میرے کوارٹر سے۔ تو کون ہوتی ہے شاہین کو اپنے کوارٹر میں رکھنے والی؟“ شریف پھر گیا۔ ”مجھے کیا جتا رہی ہے کہ تو جھانسی کی ہے؟“

”تو تراخ کر رہا ہے مجھ سے ارے میں میں کراؤں گی اپنی بچی کا دوسرا نکاح ماں کی جگہ ہوں خالہ ہوں شاہین کی۔“

اس سے پہلے کہ شریف بڑھیا پر ہاتھ اٹھا دیتا، شاہین درمیان میں آگئی اور بولی۔ ”خالہ! تم اس وقت چلی جاؤ، بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

مگر مجھ کے آنسو کسی نے دیکھے ہوں نہ دیکھے ہوں، میں نے دیکھ لئے۔ بڑھیا رونے لگی، پھر کہا۔ ”ملا جی نہ ہوئے ورنہ اسے تو میں ابھی دیکھ لیتی۔ صبح سے سارا محلہ انہیں ڈھونڈ رہا ہے۔“

”وہ ٹھک تو اس کی بات کر رہی ہے۔ سمجھ گیا میں سب سمجھ گیا۔“ شریف کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے شریف اور شاہین کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی دور کر دی۔ دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ شاہین نے خود ہی اس ”کٹنی“ بڑھیا کو اپنے کوارٹر سے نکال دیا۔

بڑھیا ذلیل ہو کر مزید پھیل جانے کے قابل نہیں رہی۔ وہ جو خود کو ”جھانسی کی رانی“ سمجھی تھی،

اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

میں خاموشی کے ساتھ اڑنے کو تیار ہو گیا۔ شریف اور شاہین ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر ہچکیاں بھرنے لگے۔

”پہلے کوارٹر کا دروازہ بند کر لو اے نیک بختو! پھر آرام سے روتے رہنا۔“ میں نے کہا اور پھر وہاں رکا نہیں۔

☆=====☆=====☆

جب میں قائد آباد پہنچا تو یوسف لالین کی کو تیر کے ہوئے گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی سے بارہ بج رہے تھے۔ درہی پر ایک فائل پڑی تھی۔

دن بھر میں ایک اور ہی ”کیس“ نمٹاتا رہا۔ اس عرصے میں میرٹھ والے محمد یوسف صدیقی نے کیا پاپڑ بیٹے، مجھے جن زاد ہونے کی وجہ سے پتا چل گیا۔

پہلی بھیت کا قدرت اللہ قدرت پہلی بھیتی فوجداری مقدموں کا وکیل تھا۔ پہلی بھیت بڑا سرسبز و شاداب اور خوب صورت علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ بھی بڑے لٹسار اور اچھے ہیں۔ آدم زاد کیس کے بھی ہوں، ان میں اچھے بڑے ہر جگہ ملیں گے۔ بنارس ہو کہ لکھنؤ، مراد آباد ہو کہ الہ آباد، جھانسی ہو کہ گوالیار، لاہور ہو کہ کوئی اور شہر، ایک ملک ہو کہ دوسرا ملک، ساری زمین پر آدم زادوں کی بستی ہیں۔ ہم ٹھہرے جن زاد ہمیں کون پوچھے۔ ہوا کے لئے کوئی سرحد نہیں، کبھی اس ٹکڑے اس دیں۔ آگ اور ہوا کی رگڑ سے پیدا ایک مخلوق میں کہ ایک جن زاد علیا لیش، کسی علاقے کے آدم زاد کی دل آزاری میرا مقصد نہیں۔ میرے نزدیک سب ایک ہیں۔ یہ میں اپنی صفائی میں بیان نہیں دے رہا بلکہ حقیقت یہی ہے۔ بیان بازی عدالتوں میں ہوتی ہے اور میرا ایمان صرف ایک عدالت پر ہے، سب سے بڑی عدالت۔ اس کی عدالت کہ جہاں آدم زاد ہو کہ جن زاد سب کے ساتھ انصاف ہوتا ہے۔

آدم زادوں نے زمین پر عدالتیں لگا رکھی ہیں۔ وہاں بھی انصاف کے حصول کی کوشش ہوتی ہے۔ اسی کوشش میں یوسف سر کھپا رہا تھا۔ انصاف کا حصول میری نظر میں نیک کام ہے، خواہ وہ کوئی بھی کرے۔

وہ قتل کا ایک کیس تھا، یوسف کے لئے امتحانی پرچہ۔ یوسف کی جگہ اگر اس کے والد مرحوم و مغفور بھی ہوتے تو یہ امتحانی پرچہ انہیں چکرا کے رکھ دیتا۔ میں نے اسی لئے یوسف کو عشاء کے بعد سلا دیا اور خود جاگتا رہا۔

مذکورہ کیس کی فائل پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ قدرت اللہ نرا شاعر تھا۔ جانے کس ظالم آدم زاد نے اسے وکالت کے پیشے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سے تو اچھا یہ ہوتا کہ وہ مشاعروں کی چھتیں، یعنی نادیہ چھتیں اڑاتا رہتا۔

ادھر۔ بالوں میں کٹھنسی ہو رہی ہے
ادھر دل ہے کہ اچھا جا رہا ہے

یہ میرا نہیں، قدرت اللہ قدرت کا شعر ہے جو اس نے کیس کے فائل کور پر پنسل سے گھسیٹ کر نیچے قدرت اللہ قدرت لکھ دیا تھا۔ کیا خبر اس کی یہ ”خلیق“ کب کی تھی۔ کون آدم زادی اور کس عمر کی آدم زادی بالوں میں کنگھی کر کے اپنے سر سے جوئیں نکال رہی ہوگی، مجھے یہ جاننے سے کیا ملتا۔ میں نے سوچا، ہوگی کوئی مجھے کیا لینا دینا۔ قدرت اللہ قدرت کا دل الجھا جا رہا ہے تو اچھے یا سلجھے، یہ معاملہ کنگھی کرنے والی اور قدرت اللہ قدرت کے درمیان رہنا چاہئے۔

اس نتیجے پر پہنچ کر صرف یوسف کی خاطر میں نے اس کیس پر سوچنا شروع کیا اور سوچے ہی چلا گیا۔ صبح فجر کی اذان کے وقت میری واپسی ہوئی، ٹارزن کی واپسی نہیں، میری واپسی۔ اور پھر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ امتحانی پرچہ حل ہو چکا تھا۔

یوسف کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اذان ہوتے ہی وہ خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شر خورشید کا دروازہ ہوا تو یوسف نے سنی کورٹ کا رستہ ناپنا شروع کر دیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اکیلا بھلا وہ کس طرح قدرت اللہ کو بھگت لیتا۔ ٹرام میں بیٹھ کر وہ سنی کورٹ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں کیس کی فائل تو تھی مگر الجھا الجھا سا تھا۔

دکیل قدرت اللہ، یوسف کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی بھانپ گیا کہ اس سے امتحانی پرچہ حل نہیں ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر اب تک یوسف کے ذہن پر قبضہ نہیں جمایا تھا اور نہ قدرت اللہ ہی کو چھیڑا۔ میری موجودگی میں ان دونوں کے درمیان مکالمے بازی شروع ہو گئی۔

”لگتا ہے میاں یوسف کہ تم کوئی تیر نہیں مار سکے۔“ قدرت اللہ نے یوسف پر طنز کیا۔ ”کبھی بھار آدمی کا اندازہ غلط بھی ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں خواہ مخواہ ذہین سمجھ بیٹھا تھا۔ میرٹھ میں شاید تم قینچیاں بناتے ہو گے۔“

”دکیل صاحب! آپ کو کوئی حق نہیں کہ میری ذات پر براہ راست حملہ کریں۔“

”میاں! یہ ذات بڑی بد ذات ہوتی ہے۔“

”دیکھئے میں آپ سے پھر کہہ رہا ہوں کہ ذاتیات پر نہ اتریں۔“

”ورنہ تم مجھ پر عزت ہتک کا دعویٰ دائر کر دو گے۔ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟“ قدرت اللہ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ ”ایک دن تم پر رحم کھا کر میں نے تمہیں اپنی جگہ کیا بٹھا دیا کہ خود کو قابل سمجھنے لگے۔“

”آپ کی عمر کا خیال کر کے میں کچھ نہیں بول رہا تو اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔“ یوسف کو غصہ آ ہی گیا۔ ”پڑھ لی میں نے فائل۔ آپ نے جس شخص کا کیس لیا ہے، وہ قاتل ہے۔ قاتلوں کی حمایت کرتے ہیں آپ اور اس پر مجھ سے کہتے ہیں کہ اسے بچانا ہے، کوئی نکتہ ڈھونڈو۔ میری نظر میں جرم کی حمایت کرنے والا بھی مجرم ہے۔“

”میاں! تم کیا اور تمہاری نظر کیا۔“ قدرت اللہ نے یوسف کو اور تپا دیا۔ ”فوج داری کی ایک دفعہ ہے، ایک سو سات پلاسترو، اب اگر تم اونچی آواز سے بولے تو یہ دفعہ لاگو ہو جائے گی۔ تمہیں تو یہ بھی

معلوم نہیں ہو گا کہ نقص امن پر یہ دفعہ لگتی ہے اور اس میں آسانی سے ضمانت بھی نہیں ہوتی۔“ ”آپ مجھے پکڑوانے کی دھمکی دے رہے ہیں..... مجھے..... مولوی عبدالحکیم صدیقی کے بیٹے کو دھمکی۔“ یوسف کے صبر کا پیمانہ پھٹک اٹھا۔

شدید غصے یا شدید جذباتی تہجان میں اکثر آدم زادوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ سچ بولنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت کوئی مصلحت دامن گیر نہیں ہوتی، ورنہ تو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر دکھانا آدم زادوں کے بایں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک بد بخت آدم زاد تو ایسا تھا، جو کہتا تھا، اتنا جھوٹ بولو کہ جھوٹ بھی سچ معلوم ہونے لگے۔ اس کا تو خیر جو حشر ہوتا تھا ہوا لیکن عیار قسم کے ذہن آدم زادوں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ ابھی میں نے جس کا قول بیان کیا، اس کا نام بھڑ تھا۔ وہ بھی دوسرے خنثی آدم زادوں کی طرح ساری دنیا کو فوج کرنے نکلا تھا۔ آدمی ہی تو ہے جو بھی سودا اس کے سر میں سما جائے۔ ذاتی طور پر مجھے اس قبیلے کے آدم زاد کبھی پسند نہیں آئے۔ ایسے آدم زادوں کو عام طور پر بہرہ وینا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کوئی فلاح اعظم سکندر کہلاتا ہے، کوئی چنگیز خان دی گریٹ وغیرہ وغیرہ۔ جو مارے سومیر والی بات ہے۔ یا اسے یوں کہہ لیں کہ جس کی لاشیں، اس کی بھینس۔ بھلا یہ کوئی شرافت ہے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی اٹھے اور سردوں کے مینار لگاتا چلا جائے۔ کسی کو قتل کرنا کون سا نیک کام ہے؟ میں تو ایسے آدم زادوں کو قہر خداوندی کہتا ہوں۔ کوئی بڑا شیطان، کوئی پاکٹ سائزر۔ آدم زادوں کا قصہ یا مجبوری یہ ہے کہ وہ بڑے شیطانوں کو ہمیشہ سلیوٹ مارتے آئے ہیں۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ بھائی، جان بچانا بھی تو فرض ہے۔ دور کیوں جاؤں، جن زادوں میں بھی مجھ سمیت یہی مرض ہے۔ کسی کو تو اپنے مرض کا پتا چل جاتا ہے اور وہ علاج پر توجہ دیتا ہے، کوئی بے جانے بوجھے اللہ میاں کو پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ میاں نے کبھی اپنی کسی مخلوق کو یہ حق نہیں دیا (خاص طور پر ہم جن زادوں اور آدم زادوں کو) کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کر دیں۔ واضح طور پر اس کے لئے منع کیا گیا ہے۔

میں نے جو گزشتہ شب امتحانی پرچہ حل کیا، وہ بھی ایک آدم زادی کے قتل کا تھا۔ اس میں ایک نکتہ ایسا تھا کہ سچ کو بڑی آسانی سے جھوٹ ثابت کیا جاتا، ممکن تھا۔ یعنی گواہ، یعنی جنہوں نے اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا، موجود تھے۔ قتل ہونے والی ایک طوائف تھی اور قاتل اس کا ایک عاشق۔ بے وقوف موقع پر پکڑا گیا۔ اس میں بخت کا خانہ کہیں نہیں تھا۔ قدرت اللہ کا کیس یہ تھا کہ اس نے قاتل کے قریبی عزیزوں سے خاصی رقم اس میں ایشی لی تھی۔ نہ اگلنے کا، نہ لگنے کا۔ یہ کیس اس نے یوسف کو تمنا دیا۔ ایسے کیسوں میں ہر دو جانب سے پیش کئے جانے والے گواہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ دکیل صفائی کو اور بھی چکر چلانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر عدالت کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ قتل کا وقت بھی اہم ہے، یعنی اتنے بجے قتل ہوا۔ چر بھائز، یعنی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی دکیل کو بہت غور سے پڑھنی ہوتی ہے۔ غور کرنے کو نہ تو قدرت اللہ کے پاس وقت تھا، نہ دماغ۔ اسے تو مفت میں مال کمانے کی پڑی ہوئی تھی، اس لئے یوسف کو بانس پر چڑھا رہا تھا۔ یوسف بانس پر چڑھنے کو آمادہ نہ ہوا تو وہ اپنی اصلیت پر آ گیا۔

مجھے مزید دو تین دن یوسف کو بیس الجھائے رکھنا تھا۔ اس سے یہ ہوتا کہ اسے یقین آجاتا، میں مشرقی پنجاب کا پھیرا مار آیا ہوں۔ اس مرحلے پر قدرت اللہ اور یوسف کے درمیان ٹھن جاتی تو بات نہ بنتی۔ مرزا غالب نے وکالت تو خیر نہیں کی لیکن ایک طوائف کے چکر میں ضرور تھے۔ مجھے مرزا جی اس لئے یاد آئے کہ یہ بھی ایک طوائف کا قصہ ہے۔ بات نہ بننے پر انہوں نے اپنی ایک غزل میں لکھا ہے۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

خیر تو ہوا یہ کہ میں نے منہ زور آدم زاد وکیل قدرت اللہ کی لگائیں کھینچ لیں، دوسری طرف یوسف کو ٹھنڈا کیا اور استحانی پرچے کا حل اس کے دماغ میں ڈال دیا۔ پھر جو تماشا ہوا، وہ قاتل دید اور قاتل شنید، یعنی دیکھنے اور سننے کے قاتل ہے۔ دیکھتے تو آپ تصور کی آنکھ سے بیٹے مجھ سے۔

پکڑی کے ماحول کی تصویر کشی کو صبر کیجئے کہ کبھی نہ کبھی بندہ وہاں جا کر پھنس ہی جاتا ہے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ وہاں کیا ”مچھلی بازار“ لگتا ہے۔

وکیل قدرت اللہ اپنی ٹانگ گھسیٹے جانے پر ایک دم آسمان سے گرا اور کھجور میں انک گیا، بولا۔ ”ارے میاں! تم اتنے بڑے آدمی کے بیٹے ہو۔ مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میرٹھ کے مولوی عبد الکیم صدیقی صاحب کو بھلا کون نہیں جانتا۔“

ذرا کی ذرا میں یوسف شیر اور قدرت اللہ بکری بن گیا، حالانکہ اسے بکرا کہنا زیادہ مناسب ہے، مگر یہ مجبوری بھی تو ہے کہ مولوی اسماعیل میرٹھی نے ایسے موقعوں کے لئے اپنی ایک نظم میں بکرا نہیں، بکری لکھا ہے ”آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مرگئی بکری۔“

”جی ہاں“ میں انہی کا بیٹا ہوں۔ ”یوسف کا سینہ پھول گیا۔“ اب آپ فرمائیے، کیا فرما رہے تھے؟ ”میاں! اب فرمنا کیا“ میں تو عرض کر سکتا ہوں تمہارے سامنے۔ یہاں بیٹھ جاؤ، کل کی طرح میری جگہ اور یہ لو دو روپے۔ پھر کیس پر بات ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے کوئی نہ کوئی نقطہ ڈھونڈ ہی لیا ہوگا۔“

”نقطہ نہیں، نکتہ بولے۔“ یوسف نے اپنی زبان دانی دکھائی۔ ”نقطے اور نکتے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نقطہ خط کی انتہا، صفر یا مرکز کو کہتے ہیں۔ نکتہ ’راز‘، ہجید، باریک بات جسے ہر ایک نہ سمجھ سکے۔ جو لوگ اردو زبان کا علم نہیں رکھتے، وہ اکثر نکتے کی جگہ نقطہ بول اور لکھ جاتے ہیں۔“

”میاں! تم تو اچھے خاصے پڑھے لکھے ہو، کہیں بند نہیں۔ میں تو سوچ رہا ہوں اب کہ اسے اشعار بھی تھی کو دکھالیا کروں گا۔ واقعی علم کا تعلق عمر سے نہیں۔ میں عمر میں لاکھ تم سے بڑا سنی، علم تمہارا بڑا ہے۔“ قدرت اللہ چالپوسی کرنے لگا۔ ”اس طرح تو نکتہ نظر لگتا ہی غلط ہوا؟“

”جی ہاں“ نقطہ نظر صحیح ہے۔ ”یوسف بولا۔ ”بہرہ تو اس بحث کو چھوڑیے، تارا بائی کے قتل اور کیس کی فائل میں موجود ناقابل تردید شواہد پر گفتگو کرتے ہیں۔“

”سبحان اللہ میاں! اب کی نہ تم نے تو تولے ہاون رتی پکی بات۔“ قدرت اللہ اس طرح بولا جیسے کسی شعر پر داد دے رہا ہو۔

یوسف نے کیس کی فائل کھولی اور کہنے لگا۔ ”یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے۔ اس کے مطابق شام چار اور چھ بجے کے درمیان قتل ہوا۔ فرض کیجئے کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ قتل کا وقت.....“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ بدلنا ممکن نہیں۔“ قدرت اللہ بول اٹھا۔

”میں نے رپورٹ بدلنے کو نہیں کہا۔ قتل کا وقت یہی رہے گا جو رپورٹ میں لکھا ہے۔ دراصل آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ جس وقت قاتل کو تارا بائی کے پاس دیکھا گیا، وہ مردہ تھی، یعنی اس سے پہلے ہی قتل کی جا چکی تھی۔“ یوسف نے قدرت اللہ کو اس طرح سمجھایا جیسے استاد اپنے کسی شاگرد کو سبق پڑھاتا ہے۔

”بات پھر وہی قتل کے وقت کی ہو گئی نا۔“

”پہلے آپ میری پوری بات سن لیجئے..... واقعہ یوں ہے کہ جب قاتل نے تارا بائی کا گلا دبا تو وہ آواز بند ہونے سے پہلے جدوجہد کرتے ہوئے چیخی۔ اسی کی چیخ سن کر ٹانیکا، دو تماش بین اور ایک سارنگی بجانے والا، وہاں پہنچے جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ قتل کے اس مقدمے میں یہی چار افراد یعنی شاہدین ہیں۔ ان چاروں کے بیانات بھی میں نے پڑھ لئے ہیں۔ یہ وہ بیانات ہیں جو انہوں نے قتل کے بعد پولیس کو دیئے اور.....“

”مجھے بار بار درمیان میں بولنا پڑ رہا ہے۔ تم شاید اس نقطہ..... نقطے نہیں بلکہ نکتے پر شاید کچھ کہنا چاہتے ہو گے کہ یعنی شاہدوں میں سے کسی کو کچھ لے دے کر یا ڈرا دھمکا کر عدالت میں بیان بدلوادیا جائے۔ تو میاں! میں صرف یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ان چاروں میں سے کسی ایک گواہ کو کبھی نہیں توڑا جا سکتا۔ ٹانیکا تو خیر تارا بائی کی سگی ماں ہے، رہا سارنگی بجانے والا بوڑھا تو وہ ٹانیکا کے ساتھ گزشتہ پچیس برسوں سے ہے۔ تارا بائی کو اس نے گود میں کھلایا ہے۔ اب رہے وہ تماش بین تو ان دونوں میں سے ایک کی حیثیت ذرا مختلف ہے۔ تارا بائی اس کی رکھیل تھی۔ رہا دوسرا تماش بین نوجوان تو وہ تارا بھائی کے ایسے عاشقوں میں سے تھا کہ تارا بائی کو شے سے چھلانگ لگانے کو کہہ دیتی تو انکار نہ کرتا۔ مجھے یہ ساری باتیں سائیں مراد علی نے خود بتائی ہیں۔ سائیں مراد علی بہت بڑا ڈیرا ہے اور قاتل ارشاد علی اسی کا بیٹا ہے۔ اب کو تمہیں جو کہنا ہو۔“

”معاف کیجئے گا وکیل صاحب! مجھے یہ معلوم ہے کہ کوئی بھی گواہ عدالت کے روبرو اپنا بیان بدلنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ وہ یہ جواز پیش کر سکتا ہے کہ پولیس کے خوف سے اس نے یہ بیان دیا یا پولیس نے تشدد کر کے زبردستی بیان لیا۔ میں تو کچھ اور ہی بات کہہ رہا تھا لیکن آپ سننے کے لئے.....“

”اچھا یوسف میاں! اب میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری بات نہ کاٹوں۔ ہاں کو کیا کہہ رہے تھے؟“

”تارا بائی کا قتل شام کو چھ بجے ہوا۔ اس کے یعنی شاہد بھی موجود ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ اس کی موت گلا دبائے جانے سے ہوئی۔ قاتل ارشاد علی نے یقیناً وقتی اشتعال میں آکر تارا بائی کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کے لئے پہلے سے منصوبہ بنایا ہوگا۔“ یوسف بولنے لگا۔ ”وجہ قتل بھی ظاہر

ہے۔ تارا بانی ایک شخص کی رکھیل، یعنی پابند تھی اور ارشاد علی اسے بے وفائی پر اکسا رہا تھا۔ وہ نہیں مانی تو ارشاد علی نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ بنانے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ پہلے سے دستانے پہن کر آیا تھا۔ مقتولہ کی گردن پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ تارا بانی کے معدے میں کھانا آدھا ہضم ہوا تھا اور یہی سب سے اہم بات ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

”میاں! وہ کیسے؟“ قدرت اللہ باؤلوں کی طرح یوسف کا منہ دیکھنے لگا۔

”اس کے لئے آپ کو عدالت میں اپنی طرف سے ایک گواہ پیش کرنا پڑے گا۔“ یوسف نے بتایا۔ ”اس گواہ پر مختلف وکیل شاید ہی جرح کریں، کیوں کہ گواہ صرف یہ بیان دے گا کہ جب وہ دوپہر ایک بجے تارا بانی سے ملا تو تارا بانی کھانا کھا رہی تھی۔ تارا بانی کو اس گواہ نے کچھڑی کھاتے دیکھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے عموماً لوگ مونگ کی دال کی کچھڑی پودینے کی چٹنی کے ساتھ شوق سے کھاتے ہیں۔ گواہ اگر کوئی عورت ہو، اسی بازار کے کسی کوٹھے کی عورت تو اور بھی اچھا ہے پھر اس عورت کا بیان یہ ہو گا کہ وہ تارا بانی کے لئے خود کچھڑی اور چٹنی!، گر گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی غیر متوقع بات نہیں۔ پڑو تو چاہے پیٹے کے انتھارے سے بڑے ہوں، ایک دوسرے سے میل جول رکھتے ہیں۔ دوپہر ایک بجے تک تارا بانی کا کچھ نہ کھانا پینا، پیٹے کی مجبوری ہو سکتی ہے۔ عموماً ناپے گانے والیاں رات کو دیر سے سوتی ہیں اور دن کے وقت جلدی نہیں اٹھتیں۔ ایسی عورت کوئی پڑوسی نایکا ہو۔ عدالت اس کی گواہی اور بے ضرر بیان پر شک نہیں کرے گی۔“

”یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ تارا بانی کی کسی پڑوسی نایکا سے یہ بیان عدالت میں دلویا جائے؟“ قدرت اللہ نے وضاحت چاہی۔

”جی ہاں۔“ یوسف نے واضح کیا۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ سائیں مراد علی کے ذریعے کسی بھی نیکا کو خریدا جاسکتا ہے لیکن ابھی تک اس گواہ کی پوری اہمیت میں سمجھ نہیں سکا۔“

”اب اس میں نہ سمجھنے والی کیا ہے؟“ یوسف مسکرایا۔ ”تارا بانی کے معدے میں آدھا کھانا ہضم نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوپہر ایک بجے نہیں، اس نے تین اور چار بجے کے درمیان کھانا کھایا ہو گا۔ میں نے قتل کا وقت نہیں، کھانا کھانے کا وقت بدلا ہے۔ مونگ کی دال کی کچھڑی کھائی تو شام کو چھ بجے تک کچھڑی کو ہر حال ہضم ہو جانا چاہئے۔ تارا بانی جوان اور تندرست بھی ہو گی، اس لئے پانچ گھنٹے کے دوام میں کچھڑی کا ہضم ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جب ارشاد علی کو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو تارا بانی زندہ نہیں تھی۔“

”پھر وہ چیخ کس کی تھی؟ یعنی شاہدوں نے اپنے بیانات میں یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے تارا بانی کی چیخ سنی تو دوڑ کر موقعہ واردات پر پہنچے۔“ قدرت اللہ نے اعتراض کیا۔

”یعنی گواہوں سے جرح کرتے ہوئے آپ کو یہ خیال رکھنا ہو گا کہ عدالت کے سامنے وہ صرف یہ

بیانات دے سکیں، انہوں نے ایک چیخ سنی اور تیزی سے دوڑے۔ وہ چیخ کس کی تھی، یہ آپ بتائیں گے۔“ یوسف نے کہا۔

”تو بتاؤ نا کہ وہ چیخ کس کی ظاہر ہو؟“

”ارشاد علی جب تارا بھائی کے کوٹھے پر پہنچا تو اس نے تارا بانی کو موقعہ واردات پر ساکت پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ قریب پہنچا اور اس نے دل کی حرکت محسوس کرنے کی غرض سے گلے کے نیچے ہاتھ رکھا، پھر سانس چل رہا ہے یا نہیں، یہ جاننے کے لئے منہ کے قریب ایک ہاتھ لے گیا۔ عین اسی لمحے ارشاد علی کے منہ سے چیخ نکل گئی، کیوں کہ تارا بانی مر چکی تھی۔ ارشاد علی کی چیخ سن کر ہی یعنی شاہد وہاں پہنچے جنہوں نے یہ دیکھا کہ ارشاد علی کا ایک ہاتھ مقتولہ کی گردن پر ہے اور دوسرا ہاتھ منہ پر۔ پھر انہوں نے حواس باختہ ارشاد علی کو تارا بانی کا قاتل سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔“

”چلو تمہاری یہ ساری باتیں مان لیں، مگر تارا بانی کو ارشاد علی کی بجائے کون قتل کر گیا؟“ قدرت اللہ کا یہ سوال احمقانہ تھا۔

اس پر یوسف ہنس کر بولا۔ ”وکیل صاحب! اول تو یہ آپ کا درد سر نہیں، پھر بھی عرض کر دوں کہ ایک طوائف کو اس کا کوئی بھی عاشق کسی سبب قتل کر سکتا ہے۔ کھانا آدھا ہضم ہوا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تارا بانی کو چھ بجے نہیں بلکہ تقریباً تین اور چار بجے کے درمیان قتل کیا گیا۔ اب سمجھے آپ۔“

”میاں! تم بھی وکیلوں کی طرح بڑے چکر دیتے ہو۔ پہلے کہہ رہے تھے کہ وقت قتل نہیں بدلے گا اور اب صاف صاف بدل دیا۔“

”قتل کا وقت تو پھر بھی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق رہا، یعنی چار اور چھ بجے کے درمیان۔ آپ تو یہ ثابت کریں گے کہ چار بجے تارا بانی قتل کی جا چکی تھی۔ اس طرح ارشاد علی قتل کے الزام سے بچ جائے گا۔ آپ کو اور کیا چاہئے۔ آپ ایک قاتل کو بے گناہ ثابت کر دیں گے۔“ یوسف طنزیہ لہجے میں بولا۔

یوسف اب قدرت اللہ پر طنز کرتا یا اسے بھری پکھری میں مرغا بنا دیتا کوئی فرق نہ پڑتا۔ دودھ دینے والی گائے کی دولاتیں بھی برداشت کر لی جاتی ہیں۔ یوسف تو یوں بھی اللہ میاں کی گائے تھا۔ اس کے تو ابھی سینک بھی نہیں نکلے تھے۔ یہ سینک، نادیہ سینک بھی اس کے اندر سے میں نے ہی نکالے تھے۔ کوئی اس پر حملہ کرتا تو وہ اپنے دفاع میں سینک تو مار دیتا۔ آپ بڑا نہ ماننے گا، میرا تجربہ یہی ہے کہ ہر آدم زاد کے اندر ایک ”نادیہ سینک“ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے ورنہ تو ہر ایرا غیرا شریف آدمی کا جینا دو بھر کر دے۔

نئی کورٹ کے عقب میں پرنس اسٹریٹ تھی جہاں کبھی پرنس، یعنی شہزادے رہا کرتے ہوں گے۔ یہیں لیڈی ڈفرن ہسپتال ہے۔ شام کو میرے جی میں آئی کہ پرنس اسٹریٹ کا پھیرا لگاتے ہیں۔ قدرت اللہ اپنا بستر پلینے والا تھا۔ یوسف کی جیب گرم تھی۔ اس کے پاس اب مبلغ دس روپے تھے۔ جس آدم زاد کے پاس دس روپے ہوں، کسی پرنس سے کم نہیں ہوتا۔ پرنس اور لیڈی کے درمیان جو وشتہ ہے، کسے نہیں

معلوم۔ میں کوئی پرنس نہ سہی، یوسف ضرور پرنس تھا۔
سارے دن قدرت اللہ نے یوسف کے ناز اٹھائے تھے۔ میرے ایما پر یوسف نے ”جھٹی“ مانگی تو فوراً کام ہو گیا۔

”میاں یوسف! ذرا رکنا۔“ قدرت اللہ نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“

”میں نے اب تک تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ رہتے کہاں ہو؟“

”قائد آباد کی ایک جھگی میں۔“ یوسف نے جواب دیا۔

”کیوں مذاق کر رہے ہو میاں! مجھ بوڑھے آدمی سے۔“

”قبلہ وکیل صاحب! یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔“

”اگر حقیقت ہے تو میں اس پر حیرت ہی کر سکتا ہوں۔“

”تو کیجئے حیرت، مجھے اجازت دیجئے۔“

”میاں! تم نے اپنی جائیداد کا کلیم داخل نہیں کیا؟“

”کوئی کلیم ہوتا تو داخل بھی کرتا۔“ یوسف کہنے لگا۔ ”کلیم کا مطلب تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ یہ

انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے، مانگنا، اس کے علاوہ استغاثہ کرتا۔ آپ کی اطلاع کے لئے

عرض ہے کہ مولوی عبد کلیم صدیقی کا بیٹا مانگنے والوں میں سے نہیں۔“

”میاں! مانگنے کی اس میں کیا بات ہے۔ یہ تو اپنا حق لینے کی بات ہے۔ خیر اس موضوع پر کل بات

ہوگی۔ گھر جا کر مجھے ابھی اس کیس کو بھی دیکھنا ہے، کل پیش ہے۔“

”اچھا تو پھر خدا حافظ!“ یوسف چل دیا۔

”خدا ہی حافظ!“ قدرت اللہ نے اپنا کالا کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

دو تین دن جیسے چٹکی بجاتے گزر گئے۔ وہ اتوار کی صبح تھی جب میں مقصود بن کر قائد آباد جا پہنچا۔

یوسف سو کر اٹھنے کے بعد ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکا تھا۔

”مقصود! تم لوٹ آئے۔“ لپک کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگایا۔

”آج تو تمہاری چھٹی ہوگی۔“ میں بولا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“ وہ مجھ سے الگ ہو کر حیرت سے کہنے لگا۔

”لو، بھلا بتاؤ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں پڑھا لکھا ہوں، کوئی

بھی کام مل جائے گا۔“ میں بھولا بن گیا۔

”کام تو خیر مل گیا مقصود! مگر مجھے پسند نہیں۔“..... ہاں وہ تم اس روز مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے

انبالہ۔ میری آنکھ لگ گئی تھی تو مجھے جگا لیتے۔“

”شکایت کر رہے ہو یا واقعی میں تمہیں یاد آ رہا تھا؟..... تمہیں تو سہلی یاد آ رہی ہوگی۔“

میری بات سن کر چند لمحوں میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر وہ بولا تو اس سے بولا

نہ گیا۔

”جان من! تمہارے لئے میں ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”خوشخبری؟“

”ہاں سہلی زندہ ہے اور میں نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔“

”تم سہلی کو کس طرح پہچان سکتے ہو؟..... تم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔“

”خود تم ہی نے تو مجھے اس کا پورا حلیہ بتایا تھا۔“ میں نے اسے بے وقوف بنایا۔ آدم زادوں کو بے

وقوف بنانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

”ہاں کچھ یاد تو پڑتا ہے مقصود کہ تم نے شاید مجھ سے..... پوچھا تھا حلیہ لیکن اس طے کی کوئی

اور..... اور بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے کہ وہ احمد میاں کی بھتیجی ہے۔ مولوی محمد ارشاد اس کے والد کا

نام تھا۔ میرٹھ کے محلے میں مشائخان میں وہ رہتی تھی۔“

”مگر یہ سب باتیں تمہیں بتائیں کس نے؟“ یوسف کو اب بھی میری بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کالے چور نے بتائیں، تمہیں اس سے کیا۔ آم کھانے سے مطلب ہے تمہیں کہ گٹھلیاں گٹھنے

سے۔“

”اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ وہ زندہ ہے۔“

”اور کیا تم یہ چاہتے تھے کہ مر جائے؟“

”اللہ نہ کرے۔ میں اس کے دشمن۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اس کے دشمنوں ہی کو مارنے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”لیکن کہاں؟“

”امر ترس۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ امر ترس شر کے ایک نواحی علاقے میں۔“

”اے تو انبالہ چھاؤنی کے قریب.....“

”تو کیا اسے اغوا کر کے لے جانے والے آج تک وہیں رک کر تمہاری آمد کا انتظار کرتے رہتے کہ

تم کب آؤ اور دشمنوں کے چنگل سے اسے نکال لے جاؤ۔“

جب یوسف کو میری بات پر یقین ہو گیا تو ضد لسنے لگا کہ مقصود آج ہی امر ترس چلو۔ مجبوراً مجھے

ہاٹی بھرنا پڑی۔

یوسف جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے لئے یہ خوشخبری کم نہ تھی کہ سہلی زندہ ہے۔ میں نے اس کے

جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ وہ ایک دکھی آدم زاد تھا اور میں ایک جن زاد

پھر بھی ہم دونوں کے درمیان کئی مضبوط رشتے تھے۔ اللہ کی مخلوق وہ بھی تھا اور میں بھی۔ خلق خدا کے

لئے اس کا دل بھی گداز تھا اور مجھے بھی اب خلق خدا کے زخموں پر مرہم رکھ کر بڑا سکون ملتا تھا۔ زندگی

کی بھیڑ میں میری محبوبہ زمر سے بچھڑ گئی تھی تو یوسف کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ہم دونوں ہی عشق کے مارے تھے۔ ہاں اس عشق میں اب ہوس کو دخل نہیں رہا تھا۔ یوسف سے میری دوستی کا شاید ایک سبب یہ رشتے بھی ہوں۔ میرا اور اس کا معاملہ جدا جدا سی لیکن کہیں نہ کہیں قدر مشترک ضرور تھی۔ جن زاد ہونے کے باوجود میری بھی کچھ مجبوریاں تھیں، کچھ حدود تھیں جن سے میں تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ ایسی ہی مجبوریاں ایک آدم زاد ہونے کے ناتے یوسف کا مقدر بھی تھیں۔ مجھے اپنی اور اسی کی، دونوں کی حدود کا احساس تھا۔

غریب الوطنی میں سامان سفر ہوتا بھی کیا ہے جو یوسف کے پاس ہوتا۔ اس کی جھگی میں جو تھوڑا بہت ساز و سامان تھا یا تو میرا لایا ہوا تھا یا آس پاس کی جھگیوں والوں کا دیا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور چھٹی کا دن، اس لئے زیادہ ترپاس پڑوس والے اپنی اپنی جھگیوں ہی میں تھے۔

سامان باندھنے سے پہلے یوسف کو ساتھ لے کر میں پڑوسیوں سے ملنے نکل گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کچھ دن کے لئے ایک ضروری کام سے ہم دونوں باہر جا رہے ہیں، وہ ہماری جھگی کا خیال رکھیں کہ جھگی خالی دیکھ کر کوئی اور اس پر قبضہ نہ کر لے۔ ان لوگوں سے میرا اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ انہوں نے یقین دلایا کہ کراچی سے ہماری غیر حاضری کے دوران خالی جھگی پر کسی کو قبضہ نہیں کھانے دیں گے۔

میں نے یہ سب کچھ بلا سبب نہیں کیا۔ وہ زمانہ تھا ہی ایسا۔ خانہ بربادوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

جھگی میں واپس آ کر میں سامان باندھنے لگا۔ یوسف بھی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ تھوڑا سا سامان سفر تھا جسے ہم دونوں اٹھا کر باہر آ گئے۔ یوسف نے جھگی کے دروازے پر تلا ڈال دیا۔ جھگیوں کی قطاروں سے نکل کر ہم بندر روڈ پر آئے اور ٹی ریلوے اسٹیشن کے لئے ایک سانیکل رکشا کر لیا۔

”یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے مقصود!“ رکشا چل دیا تو یوسف مجھ سے بولا۔ ”آدی اوپر سے کچھ نظر آتا ہے، اندر کچھ اور ہوتا ہے۔“ پھر یوسف مجھے وکیل قدرت اللہ کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کتنا مطلبی اور خود غرض ہے۔

”ہاں میرے دوست! اسی کا نام دنیا ہے۔ یہاں سب تمہاری طرح نہیں۔ خیر چھوڑو، واپس آ کر کوئی اور کام تلاش کر لینا۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

”کوئی اور کام تو تلاش کرنا ہی پڑے گا۔ کیوں کہ ان وکیل سے میری بے گئی نہیں۔“ یوسف نے ٹی اسٹیشن جاتے ہوئے مجھ سے جو کچھ کہا، میرے علم میں تھا۔ پھر بھی میں اس کے سینے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ساری باتیں سنتا رہا۔ اس کے لئے یہ بھی بڑی بات تھی کہ کوئی اس کے دکھ محسوس کرنے والا تو تھا۔

باتوں باتوں میں رستہ کٹ گیا اور ہم ریلوے ٹی اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریلوے اسٹیشنوں کی اپنی ہی ایک الگ فضا ہوتی ہے۔ لگتا ہے جیسے سارا زمانہ سفر میں ہے۔ یوسف کو میں نے ایک جگہ سامان کے پاس

بٹھایا اور لاہور کے دو ٹکٹ لینے ایک کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

ان دنوں کراچی آنے والے زیادہ اور جانے والے کم تھے، اس لئے ٹکٹ ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ٹرین کو ایک گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ اگلے روز شام کو وہ ٹرین لاہور پہنچنا تھی۔ سفر لمبا تھا اس لئے میں نے اسٹیشن ہی سے کھانے پینے کا کچھ سامان خرید لیا اور پھر یوسف کے پاس آ گیا۔

”چلو اب اندر پلیٹ فارم پر چلتے ہیں۔“ میں نے یوسف سے کہا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

روانگی کے وقت سے پہلے ہی ٹرین، پلیٹ فارم پر آ گئی اور ہم اطمینان سے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ ٹرین کے روانہ ہونے تک خاصے مسافر اس ڈبے میں سوار ہوئے لیکن جگہ سب کو مل گئی۔ اوپر والی سیٹ پر سامان رکھ کر میں نے ایک چادر بچھا دی تھی کہ باری باری ہم دونوں آرام کر سکیں۔ کھڑکی کے برابر تین بیٹھا اور میرے ساتھ یوسف۔ بقیہ دو سیٹوں پر دو افراد آ بیٹھے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا، دوسرا ادھیڑ عمر۔ سامنے والی سیٹوں پر ایک بڑے میاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بڑے میاں نے بھی اوپر والی سیٹ قبضے میں کر لی تھی۔ مگر ان کا سامان اتنا تھا کہ لینے کی جگہ نہیں بچی تھی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے ٹرین نے تین سیٹیاں دیں اور چل پڑی۔ سفر شروع ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر، یعنی کامیابی کا وسیلہ ہوتا ہے۔ لیکن تو مجھے بھی تھا کہ امر ترے کامیاب لونوں کا لیکن غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ کبھی کبھی سارے اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ سارے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا اختیار کہاں تک ہے اور کہاں وہ قدرت کے آگے بے بس ہے۔ بندہ خواہ آدم زاد ہو کہ جن زاد، بہر حال بندہ ہے۔

یوسف کی محبوبہ سلمیٰ کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ بہت روح فرسا تھیں۔ میرے نزدیک یوسف سے ان کا ذکر کرنا اسے رنج پہنچانا ہوتا۔ سو میں نے جان بوجھ کر اسے کچھ نہیں بتایا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ جن حالات میں زندہ تھی، وہ موت سے بدتر تھے۔ اسے درندوں کے چنگل سے نکالنا ضروری تھا۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ میں نے ایک آدم زاد کی ہیئت اختیار کی تھی، اس لئے ایک آدم زاد ہی کی طرح اس معاملے کو نمٹانا چاہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر میں اپنی جنائی صفات سے بھی کام لیتا، مگر اس طرح کہ یوسف کو مجھ پر شک نہ ہو۔ کسی بھی آدم زاد کے علم میں یہ آ جانا کہ ہم ان میں سے نہیں اور جن زاد ہیں۔ ہمارے لئے سودمند ثابت نہیں ہوتا۔ آدم زاد ہم سے ڈرتے بھی ہیں اور ہمیں اپنا غلام بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں بات بگڑ جاتی ہے۔ ہمیں اسی لئے کسی کی مدد کرتے ہوئے بھی بہت چوکنا اور محتاط رہنا پڑتا ہے۔

ہر چند کہ یوسف ایک بے ضرر سانچہ نوجوان تھا، اس پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا لیکن اسے یہ پتا چل جانا خطرناک ہوتا کہ میں آدم زاد نہیں، ایک جن زاد ہوں۔ پھر اس کا رد عمل کیا ہوتا، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ مجھ پر اعتماد نہ کرتا یا شاید مجھ سے خوفزدہ ہو جاتا یا پھر وہی اور ہی صورت حال ہوتی۔ یوسف کو میں اسی لئے اپنے ساتھ امر تر لے جا رہا تھا کہ سب کچھ بظاہر معمول کے مطابق معلوم ہو۔

سفر کے ابتدائی مرحلے میں ہم سفر ایک دوسرے سے زیادہ مانوس نہیں ہوتے، رفتہ رفتہ ہی قریب

آتے ہیں۔ گفتگو کا آغاز عموماً اس طرح کے سوال سے ہوتا ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ پھر باقی سوال جواب شروع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو بارش بڑے میاں بیٹھے تھے، ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو گئی۔ بڑی بی برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان تینوں افراد کے علاوہ تین بچے اور تھے جو لڑکی سے چھوٹے تھے۔ چار سیٹوں پر بڑے میاں اور ان کے اہل خانہ کسی طرح سمٹ سمٹ کر بیٹھ گئے تھے۔

یوسف تو اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا، اس لئے بڑے میاں نے مجھی کو مخاطب کیا۔ سوال وہی تھا جس کی مجھے توقع تھی۔

”نی اچال تو لاہور تک کا ارادہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ لاہور تک تو ساتھ رہے گا۔“ بڑے میاں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

”جی۔“ میں نے یہ کہہ کر اپنی دانست میں بات ختم کر دی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بڑے میاں نے پھر باتیں شروع کر دیں۔

بڑے میاں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ پھر ہندوستان واپس جا رہے تھے۔ وہ کانپور کے رہنے والے تھے۔ جہاں ان کی والدہ اور دیگر بھائی بند رہ گئے تھے۔ ان سب کا اصرار تھا کہ بڑے میاں کانپور واپس آ جائیں۔ ان کی والدہ بھی سخت علیل تھیں۔

میرے ایک سوال کے جواب میں بڑے میاں نے بتایا کہ میں سن چھالیس ہی میں لاہور آ گیا تھا۔ میرے بچپن کے بڑے بیٹے یہاں لاہور میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر جب پاکستان بن گیا تو میں کراچی چلا گیا۔ وہاں کسی طرح گزر بسر ہو رہی تھی لیکن والدہ کی علالت اور بھائیوں کے مجبور کرنے پر دوبارہ مجھے ترک وطن کرنا پڑ رہا ہے۔ بس قسمت میں جو لکھا ہے، وہ پورا ہو کے رہے گا۔

بڑے میاں خوش قسمت تھے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہی لاہور آ گئے ورنہ یوسف کی طرح انہیں بھی آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑتا۔ ایسے خوش نصیب خال خال ہی ہوں گے۔ میں نے تو یہی دیکھا۔ بڑے میاں کا نام فشی عبدالواحد تھا۔ صورت سے بھی وہ فشی ہی لگتے تھے۔ میں نے بھی ان کے پوچھنے پر اپنا نام مقصود بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ میرے ساتھ میرا دوست یوسف ہے۔

فشی عبدالواحد اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو میں بقیہ دونوں ہم سبز بھی دلچسپی لینے لگے۔ ان دونوں سے بھی تعارف ہو گیا۔ نوجوان کا نام مشرف تھا۔ اسے بابلپور جانا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص قادر حیدر آباد تک ہمارا ہم سفر تھا۔

باتیں کرتے کرتے مشرف، فشی جی کی نوجوان بیٹی کو بار بار کنکھیوں سے دیکھنے لگتا۔ لڑکی نے بھی یقیناً یہ بات محسوس کر لی اور مزید سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر میں نے خوف کے آثار دیکھے۔ فشی جی اپنی رو میں مجھ سے دنیا جہاں کی باتیں کئے جا رہے تھے۔ فشی جی کی لڑکی، مشرف کے بالکل سامنے ہی بیٹھی تھی۔ لڑکی نے اپنی گود میں دس سالہ چھوٹی بہن کو بٹھا رکھا تھا۔ بڑی بی بی اپنی بیٹی کی طرف سے پیٹھ

موڑے پردے کی بولوبولی بیٹھی تھیں۔ نہ فشی جی کو خبر تھی نہ بڑی بی کو کہ ان کی نوجوان بیٹی کس مشکل میں گرفتار ہے۔ سیدھے سادے نیک اور شریف لوگ اپنی طرح دوسروں کو بھی شریف سمجھنے لگتے ہیں۔

جب میں نے یہ محسوس کر لیا کہ مشرف اب آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے بازی پر بھی اتر آیا ہے تو خاموش تماشائی بنا نہ رہ سکا۔ پھر بھی میں نے بات نہ بڑھانے کی خواہش مشرف سے کچھ نہ کہا اور فشی جی سے بولا۔ ”بچی کو آپ اپنی جگہ کھڑکی کے پاس بٹھادیں اور خود اس کی جگہ بیٹھ جائیں۔“

اس سے پہلے کہ فشی جی مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے، جس کی داڑھی میں تھکا تھا، بول اٹھا۔ ”کیوں بھی، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کون کہاں بیٹھا ہے تم سے مطلب؟“

”میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا، پھر تم کیوں درمیان میں بول رہے ہو؟“ میں نے مشرف کی طرح سخت لہجہ اختیار نہیں کیا۔

”کیوں“ بولنے پر کوئی پابندی ہے؟“ مشرف نے ذرا آگے ہو کر مجھ سے کہا، ”کیوں کہ اس کے ہاؤس میرے درمیان یوسف بیٹھا تھا، مشرف کا انداز ایسا تھا کہ جیسے ابھی مجھ سے لڑنے لگے گا۔ یوسف بھی اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا اور چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

فشی جی بولے۔ ”آخر معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں بات۔“ مشرف نے زہر اٹھا۔ ”یہ تمہاری بیٹی کو اپنے سامنے بٹھانا چاہتا ہے۔“ مشرف نے میری طرف اشارہ کیا۔

مشرف مجھ پر اور دس الزام لگا دیتا مجھے پرواہ نہ ہوتی لیکن وہ ایک عزت دار آدمی کی معصوم بیٹی کو برسرعام رسوا کر رہا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا، میرا خون ہی تو کھول اٹھا۔ اس عرصے میں بڑی بی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ لڑکی نے ان کی طرف جھک کر کچھ کہا اور بڑی بی نے فشی جی سے سرگوشی کی۔ میں سمجھ گیا کہ لڑکی نے اپنی ماں سے کیا کہا ہو گا۔ فشی جی بوڑھے آدمی تھے، غصے کی وجہ سے کانپنے لگے۔ وہ اٹھے تو ان سے اٹھا نہ گیا۔

”آپ اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔“ میں نے فشی جی سے کہا۔ ”میں اس لفنگے کا دماغ درست کرتا ہوں۔“

میں اپنی سیٹ سے اٹھا ہی تھا کہ مشرف نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور چیخ اٹھا۔ ”مجھے لفنگا کہہ رہا ہے، میرا دماغ درست کرے گا تو! ابھی تجھے بتاتا ہوں۔“ اس نے جھکا دے کر مجھے اپنی طرف گھمیت لیا۔

میرا ہرگز یہ فٹان نہ تھا کہ سفر کے دوران کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے جس کی وجہ سے مجھے کسی آدم زاد کے ساتھ الجھنا پڑے۔ یوسف بھی اس سے ناواقف پریشان ہوتا لیکن آدم زادوں کی طرح ہم جن زاد بھی عزت نفس رکھتے ہیں۔ ہمیں بھی غصہ آ جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے خود پر قابو رکھا اور مشرف سے اپنا گریبان چھڑا کر اسے سیٹوں کے درمیان سے باہر لے آیا، کیوں کہ وہاں جگہ تنگ تھی۔

بات نہ بڑھے اور فشی جی بھی تماشاً نہ بنیں، اس لئے مجھے مجبوراً اپنی جناتی صفات کو کام میں لانا

پڑا۔ کچھ تو مشرف پر اپنا غصہ اتارنے اور کچھ دکھاوے کے لئے میں نے دو چار ہاتھ جڑ دیئے ورنہ تو اس کے دماغ پر پہلے ہی میرا قبضہ ہو چکا تھا۔ میں جو چاہتا وہ کتا اور کرتا یہی ہوا۔ وہ مجھ سے معافی مانگتے لگا۔ لوگ جمع ہو گئے اور عادات کے مطابق پوچھ گچھ کرنے لگے کہ کیا بات ہے؟

”یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں، کوئی خاص بات نہیں۔ بس ذرا سی غلط فہمی ہو گئی تھی۔“ لوگوں سے یہ کہہ کر میں نے مشرف کو مخاطب کیا۔ ”آؤ مشرف! اب تم بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔“

مشرف مزید کچھ کے بغیر دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا لیکن اب اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں فشی جی نے اپنی جگہ بدل لی تھی اور اپنی بیٹی کو کھڑکی کے پاس بٹھا دیا تھا۔ یوسف کو میں نے اپنی سیٹ پر بٹھایا اور خود مشرف کے پاس بیٹھ گیا۔

”اسے دوبارہ یہاں نہیں بٹھانا چاہئے تھا۔“ ادھیڑ عمر ہم سفر قادر نے مجھ سے کہا۔

”حیدر آباد آنے والا ہے، یہ وہاں اتر کر کسی اور ڈبے میں بیٹھ جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر مشرف سے بولا کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا کہ تم کسی اور ڈبے میں جا کر بیٹھ جاؤ گے؟

اس نے ہائی بھر لی اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ مشرف کسی معمول کی طرح اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر وہاں اتر گیا۔ قادر بھی اس کے ساتھ ہی اترے۔ فشی جی کے چہرے سے اس وقت تک اطمینان کا اظہار نہ ہوا جب تک گاڑی حیدر آباد سے چل نہ دی۔ خالی سیٹوں پر کوئی اور آ کر نہ بیٹھ جائے، یہ سوچ کر میں نے فشی جی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ بٹھالیا۔ فشی جی کو سفر کا خاصا تجربہ تھا، اس لئے انہوں نے ایک اور ترکیب کی۔ وہ اٹھے اور اپنے بستر بند کو کھول کر ایک چادر نکال لی۔ اس چادر کو انہوں نے اوپر والی دونوں سیٹوں سے باندھ دیا۔ اس طرح یہ حصہ بقیہ ڈبے سے الگ ہو گیا۔

”تم دونوں تو خیر اپنے ہو۔“ فشی جی مجھ سے بولے۔ ”چادر بندھنے کے بعد اب کوئی اور اجنبی مسافر ادھر نہیں آئے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

”جی ہاں۔“ میں نے تصدیق کر دی۔

زرا دیر کو خاموشی ہوئی تو یوسف نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ”مقصود! آخر یہ قصہ کیا تھا؟“ ”ہو گا کوئی قصہ، ہمیں کیا۔ خاک ڈالو۔“ میں نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ”سفر میں اچھے بڑے ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔“

”مگر وہ تو تم سے ہاتھ پائی کرنے لگا تھا۔“

”اور پھر معافی بھی مانگ لی تھی، یہ کیوں بھول رہے ہو۔“

”اسی پر تو حیرت ہے مجھے، پہلے تو اتنا شیریں رہا تھا اور پھر دو چار ہاتھ کھا کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔“

”ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی۔“ میں بولا اور پھر گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے یوسف سے کہاں ”تم اگر بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو تو اوپر جا کر لیٹ جاؤ۔“ ”نہیں ابھی تھکن کیسی۔ گاڑی میں بیٹھے چند ہی گھنٹے تو ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

وہ دن گزرا رات ہوئی اور پھر رات بھی گزر ہی گئی۔ مسافر ٹرین میں چڑھتے رہے، اترتے رہے، مٹھری لے رہے لیکن ایک تلخ واقعے کے بعد لاہور تک کوئی اور ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

فشی جی لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتر کر مجھ سے اور یوسف سے اس طرح گلے ملے جیسے ہم دونوں ان کے عزیز ہوں۔

”کہاں چل رہے ہو مقصود؟“ یوسف نے تانگے کے آگے بڑھتے ہی سوال کیا۔

”کسی ہوٹل میں ایک رات گزارنا پڑے گی۔ کل صبح آگے چلیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مگر ہوٹل تو اسٹیشن کے پاس بھی تھے، وہاں ٹھہر جاتے۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ اسٹیشن کے قریب جو ہوٹل ہوتے ہیں، وہ زیادہ کرایہ لیتے ہیں اور وہاں آرام بھی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ رات کے وقت چیک پوسٹ دونوں طرف بند کر دی جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ ہم تھکے ہوئے بھی ہیں۔ طویل سفر کی وجہ سے حلیہ بھی بگڑ گیا ہے۔

”تم مجھ سے زیادہ تجربے کار ہو، تم جانو۔“ یوسف نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

اتر کھلی بازار میں ہم ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ نمدھو کر کپڑے بدلے، کھانا کھایا اور پھر ایسے سوئے کہ دوسرے دن صبح ہی آنکھ کھلی۔ لاہور شہر میں میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں، مگر میں نے یادوں کے غبار کو دل سے نکال دیا کہ یادیں بڑا دکھ دیتی ہیں۔

جیسے جیسے منزل قریب آتی جا رہی تھی، یوسف کا جذباتی بیجان بڑھ رہا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ مجھ سے بولا۔ ”مقصود! تم نے سہلی کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”اب تم میرے ساتھ چل رہے ہو تو خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ میرے دوست! تم نے جہاں اتنا مہربان ہے تو کچھ اور مہربان نہ کر لو۔ کیا تمہارے لئے یہ بات سکون و اطمینان کا سبب نہیں کہ وہ ابھی تک زندہ ہے؟“ میں نے اسے تسلی دی۔

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن..... لیکن میرے دل کو قرار کیوں نہیں آتا؟ اک بے کلی سی ہے کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے؟“

”سہلی کو زندہ سلامت دیکھو گے تو تمہارے بے قرار دل کو قرار آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے ذہن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی تاکہ اس کے جذباتی بیجان میں کمی آ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے چپ سی لگ گئی، مگر عارضی طور پر۔ یہی میرا مقصد بھی تھا۔

لاہور سے ہمیں گنڈا سنگھ والہ چیک پوسٹ پہنچنا تھا۔ یہ چیک پوسٹ پاکستان کی حدود میں تھی۔ ہم نے وہاں کے لئے تانگہ کیا اور روانہ ہو گئے۔ گنڈا سنگھ والہ چیک پوسٹ پر واجبی پوچھ گچھ کے بعد فوجیوں

نے ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ ہم نے پیدل چل کر طے کیا اور حسینی والا چیک پوسٹ تک پہنچ گئے۔ اب ہم ہندوستان کی حدود میں تھے۔
درشت چہرے والے سکھوں نے ہمیں اس طرح گھورا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچا چبا جائیں گے۔

”مکدھر جانا ہے تم دونوں کو؟“ ایک سکھ فوجی نے اکھڑے میں سوال کیا۔
میں نے مصلحت کے تحت نرمی سے جواب دیا۔ ”سردار جی! اب تو ادھر آ ہی گئے ہیں‘ یہیں رہیں گے۔“

”اچھا تو یہ ارادے ہیں۔“ سکھ فوجی اس طرح بولا جیسے ہندوستان میں مسلمانوں کا رہنا جرم ہو۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”تم نے بتایا نہیں کہاں جاؤ گے؟“

اس سکھ فوجی کو کون سا ہم دونوں کے پیچھے پیچھے آنا تھا‘ وہ تو بس ضابطے کی خانہ پزی کرتے ہوئے ناحق ہمیں رعب میں لے رہا تھا۔ میں نے اسی لئے اس کے رعب میں آئے بغیر جو بھی جی میں آیا کہہ دیا۔

ضروری خانہ پزی کے بعد سکھ فوجی نے مجھے اپنی دانست میں نصیحت کی۔ ”اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو بیچ میں کہیں رکتا نہیں۔ سیدھے وہیں جانا جہاں کا کھانا ہے۔ یہ ہمارا فرض تھا‘ تمہیں بتا دیا‘ باقی تم جانو۔“

”شکریہ سردار جی!“ میں یہ کہہ کر سامان اٹھانے لگا۔
سامان کی چیکنگ کے بہانے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آنے جانے والوں کو سکھ فوجی لوٹ رہے تھے۔ ہمارے پاس تھا ہی کیا جو وہ لوٹتے۔ ہاں اس پر جھنجھلائے ضرور۔ کرنسی میرے پاس تھی اس لئے وہ بھی ان کے پیسے نہ چڑھ سکی۔
حسینی والا چیک پوسٹ سے بھی ہمیں فیروز پور پہنچنے کے لئے تانگہ ہی ملا۔ فیروز پور سے ہماری اگلی منزل امرتسر تھی۔

ہمارا تانگہ جب فیروز پور ریلوے اسٹیشن تک جانے کی غرض سے آبادی میں داخل ہوا تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ ابھی پتوں پر بٹلے ٹکوں کی تحریریں باقی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس گلستان پر کبھی بجلی گر چکی ہے۔ میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھے جو ناقابل بیان ہیں۔ نمازی ہی نہ رہے تو مسجدیں کیسے ویران نہ ہوتیں۔ ہوائیں اجڑے گھروں میں جیسے بین کرتی پھر رہی تھیں۔ فیروز پور کے اس محلے میں شاید کبھی مسلمانوں کے گھر بھی ہوں گے ورنہ وہاں مسجد کیوں ہوتی جو اب سکھوں کے تصرف میں تھی۔ مسجد کا آدھا حصہ منہدم تھا۔ میں نے ادھر سے نظریں پھیر لیں کہ ایک سکھ وہاں اپنے گھوڑے کو باندھنے لے جا رہا تھا۔

”تم..... تم دیکھ رہے ہو مقصود کہ..... کہ یہاں..... یہ کیا..... کیا ہو رہا ہے۔“
یوسف کی آواز مجھے جیسے کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

”نہیں یوسف! میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا اور..... اور میرے دوست! تم بھی کچھ نہ دیکھو۔“
میں خواب کے سے عالم میں بولا۔

جواب میں یوسف نے سرد آہ بھری اور کہنے لگا۔ ”ہاں مقصود! اب دیکھنے کو رہا بھی کیا ہے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھ لیا۔“

آدم زادوں کے دکھوں کو میں ایک آدم زاد ہی کی طرح محسوس کر رہا تھا اور یہ تجربہ میرے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ جنات میں سے شاید ہی کسی نے آدم زادوں کو میری طرح اتنے قریب سے دیکھا ہو۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔ یوسف کے جذبات بھی مجھ سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اسے فیروز پور کی مسلمان آبادیوں اور ویران گھروں کو دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔ خود اس پر بھی کیا کچھ نہیں گزری تھی اور اب بھی وہ کون سا سکھی تھا۔

فیروز پور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ہم نے امرتسر جانے والی پہلی ٹرین پکڑی۔ ہم نے وہاں مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزارا ہو گا۔ قیام پاکستان کے وقت جو مار کاٹ ہوئی تھی‘ اب اس میں وقفہ آچکا تھا۔ کشیدگی تو تھی‘ چہرے پر نفرتیں تو لکھی تھیں مگر تشدد کی صورت میں ان کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ سکھ بھی اب کچھ کچھ سمجھ چکے تھے کہ انتہا پسند ہندوؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر انہیں استعمال کیا ہے۔ سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے بیانات بھی اب پچھتاوے کی خبر دے رہے تھے۔ اس کی یہ خوش گمانی دور ہوتی جا رہی تھی کہ ہندوستان کو آزادی ملنے اور قیام پاکستان کے ساتھ ساتھ سکھوں کو بھی ان کے حقوق مل جائیں گے۔ اس کے باوجود سکھ عوام کی اکثریت ابھی تک حقائق سے بے خبر تھی۔ ان کے ساتھ ہندو برہمن سامراج نے کیا کھیل کھیلا ہے‘ انہیں علم نہیں تھا۔

میں اور یوسف اپنے حلیوں کی وجہ سے الگ ہی پہچانے جاتے تھے۔ ٹرین میں اور لوگ بھی سفر کر رہے تھے۔ ان میں ہندو‘ مسلمان‘ سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ مسافروں کی بڑی تعداد دہلی جا رہی تھی۔ راستے میں اترنے والے کم ہی تھے۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن آگیا تو وہاں بھی چند سکھ مسافر ہی اترے۔ انہی کے ساتھ ساتھ ہم بھی تھے۔ ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی مسلمان مسافر نہیں اترتا۔

چھپتی ہوئی نظروں کے تیر مجھے اپنے جسم کے آر پار محسوس ہوتے رہے۔ میں نے لوگوں کے چہروں پر حیرت دیکھی‘ اسی کے ساتھ نفرت اور تجسس بھی۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر دو مسلمانوں کا اترنا ان کے لئے حیران کن ہی رہا ہو گا۔ پھر بھی کوئی ہمارے قریب نہیں آیا اور نہ کوئی نازیبا حرکت کی۔
”مقصود! سکھ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔“ یوسف نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

”تم ان کی کوئی پروا نہ کرو‘ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہو۔“ میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

یوسف نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میرے ساتھ اس گیٹ تک آگیا جہاں ریلوے کے محکمے کا ایک باوردی سکھ مسافروں کے ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ اسے ٹکٹ تھما کر ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کی عمارت

سے باہر آ گئے۔

”کتنے جانڑا اے سو نہ ہو؟“ ایک تانگے والے نے ہمیں دیکھ کر ہانک لگائی۔

کئی اور تانگے والے بھی اپنے اپنے تانگے لے کر ہمارے قریب آ گئے۔ میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ امرتسر پہنچ کر مجھے کیا قدم اٹھانا ہے۔

میں نے ایک تانگے میں سامان رکھ دیا اور تانگے والے سے بولا۔ ”ہمیں گولڈن ٹیمپل جانا ہے۔“ ہندوستان میں سکھوں کے سب سے بڑے گرو دوارے کا نام گولڈن ٹیمپل ہے جہاں صرف سکھوں ہی کو داخلے کی اجازت ہے۔ تانگے والا اسی لئے مجھے حیرت سے دیکھنے لگا اور کہا۔ ”مگر تم لوگ تو مجھے مسلمان لگتے ہو۔“

”ہاں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہمیں گولڈن ٹیمپل کے قریب ہی گرو گیان سنگھ جی کے گھر جانا ہے۔ ہم انہی کے مہمان ہیں۔“

”یہ نہیں جانتا تو آپ لوگ میرے تانگے میں چلو۔ میں گرو جی کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔“ ایک اور تانگے والا قریب آ کر کہنے لگا۔

نفرت اور تعجب اپنی جگہ ’روزی روٹی اپنی جگہ۔ تانگے والا چاہے لاہور کا ہو یا امرتسر کا، ہے تو ایک ہی طبقے کا۔ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہے، روٹی تو سب کو چاہئے۔ سو جس تانگے میں، میں نے سامان رکھا تھا وہ تانگے والا دوسرے تانگے والے پر گرم ہو گیا۔ ”یہ میری سواری ہے، تو اسے نہیں لے جا سکتا۔“ میں نے یوسف کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے نے جلدی سے اپنا تانگہ آگے بڑھا دیا۔

تانگہ کچھ دور چلا ہو گا کہ یوسف نے میری طرف جھک کر دھیمی آواز میں سوال کیا۔ ”مقصود! یہ گرو گیان سنگھ کون ہے اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”تمہیں میں نے بتایا تو تھا کہ پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ رہے گرو جی تو ہم وہیں چل رہے ہیں۔ تم خود ہی انہیں دیکھ لو گے۔ جس طرح ہمارے میاں مفتی اور واعظ یا مولانا ہوتے ہیں اسی طرح سکھوں میں گرو ہوتے ہیں۔ گرو گیان سنگھ جی، گولڈن ٹیمپل میں درس دیتے ہیں سمجھ گئے؟“

معلوم نہیں یوسف کچھ سمجھا کہ نہیں سمجھا، مگر اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

انجانے رستوں سے تانگہ گزرتا ہوا گولڈن ٹیمپل کے علاقے میں داخل ہوا۔ سونے کے بنے ہوئے اونچے کلس دور ہی سے نظر آنے لگے۔ انہی برجوں اور کلس کی وجہ سے سکھوں کا وہ سب سے بڑا گرو دوارا گولڈن ٹیمپل، یعنی سونے کا مندر کہلاتا تھا۔

گرو گیان سنگھ امرتسر والوں کے لئے ایک جانا پہچانا نام تھا۔ چند روز پہلے جب میں نے امرتسر کا پھیرا لگایا تھا تو گرو کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ امرتسر شہر میں گرو گیان سنگھ کا گھر ہی میرے لئے جائے پناہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بڑی سڑک سیدھی گولڈن ٹیمپل کی طرف جاری تھی۔ اس سے پہلے ہی تانگہ بائیں جانب ایک پختہ

گلی میں مڑ گیا۔ اسی گلی کے وسط میں گرو گیان سنگھ کا گھر تھا۔ اونچی کرسی والے ایک مکان کے سامنے تانگہ رک گیا۔ میں نے تانگے سے سامان اتار کر راہ ادا کیا۔ یوسف بھی میرا ہاتھ بنا رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر سراسیمگی اور خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

تانگہ واپسی کے لئے مڑ گیا تو میں نے یوسف کو مخاطب کیا۔ ”گھبراؤ مت یوسف! اللہ جو کرے گا، ہمارے حق میں بہتری ہو گا۔“

یوسف جواب میں کہتا بھی کیا، خاموش رہا۔ اس کی حیران حیران سی نظرس گرو گیان سنگھ کے گھر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے پتھر سے بنی ہوئی چوڑی سیڑھیاں تھیں اور سیڑھیوں کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دو چوڑے تھے۔

شام ہونے والی تھی۔ لوگ گلی میں آ جا رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے، بوڑھے اور جوان بھی۔ کسی سے کچھ کہنے بغیر میں اور یوسف سامان اٹھائے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اسی وقت پیچھے سے چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور ہم سے بولا۔ ”کیوں جی! کیا تم میرے گھر آئے ہو؟“

”ہاں ہمیں گرو جی سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں ابھی پتا جی کو بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکا تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر صدر دروازے تک پہنچ گیا۔

”یوسف! تم کیوں رک گئے؟“ میں نے پیچھے مڑ کر کہا۔ یوسف کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ لڑکے کو ایک نکل دیکھ جا رہا تھا۔

”وہ..... وہ.....“ یوسف ہکا کر رہ گیا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے، تم آؤ۔“ ایک ہاتھ سے سامان اٹھائے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے یوسف کا بازو پکڑ کر اسے سارا دیا۔

”یہ..... یہ تم مجھے کہاں..... کہاں لے آئے مقصود!“

”وہیں کہ جہاں لانا چاہئے تھا۔ اپنے اوپر قابو رکھو میرے دوست!“ میں بولا اور یوسف سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس عرصے میں لڑکا گھر کے اندر جا چکا تھا۔ میں اور یوسف اوپر چڑھ کر دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

ذرا ہی دیر بعد ایک بوڑھا سکھ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ میں اسے پہچان گیا۔ یہی گرو گیان سنگھ تھا۔ فوری طور پر میں نے اسے اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے بجائے شناسائی نظر آنے لگی۔

”ارے مقصود! تم آ گئے۔ آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ گرو گیان سنگھ اس طرح بولا جیسے برسوں سے مجھے جانتا ہو۔

”ہاں گرو جی! آپ کے پاس آنا تو تھا ہی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”یہ تمہارا دوست یوسف لگتا ہے جس کا تم نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔“
”جی گرو جی! یہی یوسف ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر گرو گیان سنگھ ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گیا اور بیٹھک میں بٹھا دیا۔

”تم لوگ آرام سے بیٹھو! میں تمہارے لئے گھر کا پچھلا کمرہ ٹھیک کرنا ہوں تاکہ تم وہاں رہ سکو۔ میں آتا ہوں ابھی۔“ گرو گیان سنگھ یہ کہہ کر چلا گیا۔ یوسف کے چہرے پر شدید حیرت تھی، اسی کے ساتھ خوف بھی۔ ہم دونوں بیٹھک میں اکیلے رہ گئے تو یوسف نے سہمی ہوئی سی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”مقصود! وہ لڑکا..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اسے..... اسے میں نے پہلے بھی کیس دیکھا ہے۔“
”تم نے اس سے پہلے اس لڑکے کو کیس نہیں دیکھا؟ یہ تمہارا محض وہم ہے۔ میں اس وہم کی وجہ جانتا ہوں اور یہ وجہ تمہیں بھی معلوم ہو جائے گی۔ فی الحال اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو۔ تمہیں رفتہ رفتہ خود ہی سب کچھ پتا چل جائے گا۔“

قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی تو میں نے یوسف کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ آنے والا گرو گیان سنگھ ہی تھا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

”گرو جی! کیا یوں کھلے عام ہم دونوں کا آپ کے گھر میں رہنا مناسب ہو گا؟“ میں نے گرو گیان سنگھ سے پوچھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا مقصود! لیکن اس کا حل کیا ہو؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ گرو گیان سنگھ جواب میں بولا۔

”اس کا ایک حل ہے میری نظر میں۔ کچھ دیر ہم یہاں رک کر واپس چلے جاتے ہیں تاکہ لوگ یہ دیکھ لیں کہ آپ کے گھر جو دو مسلمان آئے تھے، واپس چلے گئے۔ آپ ہمارے لئے تانگہ منگوا دیجئے گا۔ رات کو جب سناٹا پھیل جائے گا تو ہم پھر آجائیں گے۔“

”لیکن یہ وقت تم لوگ کہاں گزارو گے؟“ گرو گیان سنگھ نے دریافت کیا۔
ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے، مگر یہاں سے اسٹیشن ذرا دور ہے۔ تم لوگوں کو رات کے وقت ادھر لوٹنے ہوئے پریشانی ہو گی۔“

”اتنی پریشانی تو اٹھانا پڑے گی گرو جی! ہمیں آپ کا بھی تو خیال رکھنا ہے کہ لوگ ہماری وجہ سے آپ کے خلاف نہ ہو جائیں۔ ہاں مجھے یاد آیا کہ اس گھر کا پچھلا دروازہ بھی تو ہے۔ ہم اسی دروازے سے گھر میں آجائیں گے۔ آپ دروازے کی کنڈی کھلی چھوڑ دیجئے گا۔“

”اور اسی دروازے سے لگا ہوا وہ پچھلا کمرہ ہے، میں نے جس میں تم دونوں کے رہنے کا بندوبست کیا ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ میں تمہارے آنے تک خود جاگتا رہوں گا تاکہ کوئی گزب نہ ہو۔“ گرو گیان سنگھ نے میری تجویز مان لی۔

”پھر باقی باتیں رات ہی کو ہوں گی۔“ میں بولا۔

”تم دونوں تھکے ہوئے لگتے ہو، کچھ دیر کو کمر سیدھی کر لو، اتنے میں تمہارے کھانے پینے کو کچھ بھیجتا ہوں۔“ گرو گیان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”شکریہ گرو جی!“

”ارے اس میں شکریے کی کیا بات ہے، یہ تو تمہارا ہی گھر ہے۔“ یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔
گرو گیان سنگھ کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو یوسف نے مجھ سے کہا۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا مقصود! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”آجائے گا سمجھ میں، رات تو ہونے دو۔“ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا پھر بولا۔ ”لیٹ جاؤ، تھک گئے ہو گے۔“

بیٹھک میں چاندنی پٹی تھی اور گاؤں تکٹے بھی موجود تھے۔ سالن میں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ مجھے لینے دیکھ کر یوسف نے بھی میرے مشورے پر عمل کیا۔ دانستہ میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ یوسف باتیں نہ کرے۔

کوئی آدھے پونے گھنٹے کے بعد وہی لڑکا بیٹھک میں داخل ہوا جس کا چہرہ یوسف کو جانا پہچانا لگا تھا۔
میں اور یوسف دونوں ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”پتا جی کہتے ہیں کہ ہاتھ منہ دھولیں۔“ لڑکے نے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

”کرتار سنگھ۔“ لڑکے نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”میرے ساتھ چلیں، میں ہاتھ منہ دھلوا دیتا ہوں۔ پھر گرم گرم پوریاں اور آلو کی بھابی لے آؤں گا۔“

میں اور یوسف بیٹھک کے اندرونی دروازے سے غسل خانے تک پہنچے۔ کرتار ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ غسل خانہ خاصا بڑا تھا۔ دو بالٹیوں میں نیم گرم پانی بھرا ہوا تھا۔ کرتار لوٹنے میں پانی بھرنے لگا تو میں نے اسے منع کر دیا کہ ہم خود ہی ہاتھ منہ دھولیں گے۔ وہ غسل خانے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

غسل خانے سے ہاتھ منہ دھو کر ہمیں بیٹھک تک آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گرو گیان سنگھ کا چھوٹا بیٹا کرتار دو چھوٹی چھوٹی تھالیوں میں پوریاں اور آلو کی بھابی لے آیا۔ ایک بڑے لوٹے میں پانی اور ادھاس بھی وہ رکھ گیا۔

کرتار گھر کے اندر سے گرم گرم پوریاں لاتا رہا اور ہم کھاتے رہے۔ یوسف نے بھی اب ذہنی طور پر حالات سے مصالحت کر لی تھی۔ اس کے باوجود وہ بار بار کرتار کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک بار میں نے اسے شوکا بھی دیا اور وہ سنبھل گیا۔

”کسی کو بھی اس طرح گھور گھور کر نہیں دیکھتے۔“ میں نے یوسف کو تاکید کی۔ اس وقت تک ہم کھانا کھا چکے تھے۔ کرتار تھالیاں اٹھا کر اندر لے گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، اب میں اس لڑکے کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ کیا کروں مقصود! وہ سامنے آتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف نظر اٹھ جاتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میرا مقصد تو یہ تھا کہ لڑکے کو اس بات کا احساس نہ ہو جائے۔ ویسے بھی اب ہم یہاں سے چلنے والے ہیں، رات کو جب لوٹیں گے تو وہ لڑکا سوچکا ہو گا جو تمہارے لئے الجھن کا سبب بنا ہوا ہے۔“ میں دھیمی آواز میں بولا، کیوں کہ میرے اندازے کے مطابق گروگیان سنگھ ادھر آ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ مجھے سنائی دے رہی تھی۔

”ہاں بھی مقصود! تم نے اور تمہارے دوست نے کھانا کھالیا پیٹ بھر کے۔ جلدی میں بس یہی ہو سکا۔“ گروگیان سنگھ ہنسنے میں آتے ہی بولا۔

”خوب پیٹ بھر کر پوریاں کھائی ہیں گرو جی! اب رات کو کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

”خیر یہ تو میرا فرض تھا کہ تم دونوں میرے مہمان ہو۔ میں نے خود ہی تم لوگوں کے لئے گوشت نہیں بھیجا حالانکہ گھر میں موجود تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ جھینکے کا گوشت نہیں کھاتے۔“ گروگیان سنگھ ہم دونوں کے درمیان آ بیٹھا۔ ”اب کو تو کرتار کو بھیج کر تمہارے لئے تانگے منگوادوں؟“

”ہاں اب ہمیں چل دینا چاہئے تاکہ لوگ ہمیں جاتے ہوئے دیکھ لیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں گیتا تھا باہر تو محلے والے تم لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔“ گروگیان سنگھ نے بتایا۔ ”میں نے وہی جواب دیا جو تم نے پہلی ملاقات میں کہا تھا۔“

گروگیان سنگھ کو اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے کر میں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ میں پہلے بھی اس سے مل چکا ہوں۔ جو کچھ میں نے اس کے ذہن میں بٹھا دیا تھا، وہ اب تک اسی پر عمل کر رہا تھا۔ ”تو لوگ مطمئن ہو گئے گرو جی!“ میں نے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں، میں نے ان سے کوئی غلط بات بھی نہیں کہی۔ پھر یہ کہ وہ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ لوگوں کو زیادہ اطمینان اس بات سے ہوا کہ میں تمہیں سمجھا کر واپس بھیج رہا ہوں۔ اب وہ تم دونوں کو اپنی آنکھوں سے واپس جاتے ہوئے دیکھیں گے تو انہیں اور بھی میری بات پر یقین آ جائے گا۔“

پھر میرے کہنے پر گروگیان سنگھ نے کرتار کو آواز دے کر بلایا اور ریلوے اسٹیشن کے لئے تانگے لانے بھیج دیا۔

”تم لوگوں کو یہاں میرے گھر میں کسی طرح گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ گروگیان سنگھ بولا۔ ”یہ بات میں تمہارے دوست یوسف سے خاص طور پر کہہ رہا ہوں، کیوں کہ یہ مجھے کچھ ڈرا ڈرا سا لگتا ہے۔ جو بھی ہو گا، میں بھگت لوں گا۔“

یوسف اپنے ذکر پر چونکا اور پھر مردہ سی آواز میں کہنے لگا۔ ”مجھے بھی آپ پر بھروسہ ہے۔ مقصود میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔“

”ہاں تمہارا دوست وفادار بھی ہے اور راجی دار بھی۔“ گروگیان سنگھ نے کہا۔ ”اس کی وفاداری کبھی شک نہ کرنا۔ ایسے دوست مشکل ہی سے ملتے ہیں۔“

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ کرتار نے آکر بتایا، تانگے لے آیا ہے۔ ہم نے سامان اٹھایا اور گروگیان سنگھ کے گھر سے نکل آئے۔ اس وقت شام رخصت ہو رہی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو گلی میں اتنی چل پل نہیں تھی لیکن اب خاصے لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

سامنے ہی تانگہ کھڑا تھا۔ ہم بیڑھیوں سے گروگیان سنگھ کے ساتھ ساتھ اترے اور تانگے میں سامان رکھ کر بیٹھ گئے۔

”رب راکھا۔“ گروگیان سنگھ نے رخصتی انداز میں ہاتھ بلایا۔ پھر وہ تانگے والے کے پاس گیا۔ میں نے بھی جواب میں یہی الفاظ دہرائے اور تانگے آگے بڑھ گیا۔

گروگیان سنگھ سے میری یہ ملاقات اس لئے ضروری تھی کہ میں اسے اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے سکوں اور یوسف بھی مجھے اپنی ہی طرح ایک آدم زاد سمجھے۔ میں جو قدم بھی اٹھا رہا تھا پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہی تھا۔

ہم امرتسر ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ تانگے سے سامان سزا تارنے کے بعد ہم دونوں اسٹیشن سے ملحق مسافر خانے میں داخل ہوئے۔ گروگیان سنگھ نے تانگے والے کو پہلے ہی کرایہ دے دیا تھا۔ تانگے والے نے ہم سے کرایہ نہیں لیا۔

مسافر خانے میں ہمارے علاوہ چند ہی مسافر تھے جو تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بستر بچھائے بیٹھے تھے۔ ہم نے بھی ایک طرف خالی جگہ دیکھ کر ڈیرا جمالیا۔ دو چادریں بھی میں نے سامان سے نکال لیں۔

”یوسف! اب کچھ خنکی ہو گئی ہے، یہ چادر اوڑھ لو۔“ میں نے ایک چادر یوسف کو دے دی۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ”اس طرح چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ کہ تمہارے چہرے پر کم سے کم لوگوں کی نظر پڑے۔“ مصلحت کے تحت میں نے یوسف کو لیٹنے کا مشورہ دیا تھا۔

”کیوں، کیا یہاں کوئی خطرہ ہے؟“ اس نے چادر اوڑھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کوئی خطرہ نہیں۔ میں تو صرف احتیاط کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہوں تاکہ داڑھی والوں کے

درمیان ہم دونوں الگ معلوم نہ ہوں۔ یوں بھی ہمیں یہاں صرف چند گھنٹے گزارنے ہیں۔ اس کے بعد ہم محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے۔ پھر چہرے چھپانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

یوسف میری بات سمجھ گیا اور پھر اس نے میرے مشورے پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ کہنے کو تو میں نے یوسف سے یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی خطرہ نہ ہو، مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ میں نے

خطرے کی بوسو گھ لی تھی۔ وہ امرتسر تھا، سکھوں کا گڑھ۔ ہمیں وہاں ریلوے اسٹیشن پر اترتے دیکھا گیا تھا۔ پھر گولڈن ٹمپل کے علاقے میں جاتے اور آتے بھی دیکھا گیا ہو گا۔ یہ کوئی کمال یا معجزہ نہیں تھا کہ اس شہر میں ہم اب تک زندہ سلامت تھے۔ شریہند سکھوں کو رات ہونے کا انتظار تھا کہ ہمیں ٹھنڈا کر دیں۔ وہ بھلا اپنے شہر میں دو مسلمانوں کے وجود کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔

رات کا انتظار ہمیں بھی تھا اور ہمارے قاتلوں کو بھی۔ رات کی تاریکی سے وہ بھی فائدہ اٹھانا چاہتے

میں دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مسافر خانے میں جو چند مسافر ادگھ رہے تھے، جاگ اٹھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ایک دم اندھرا کیسے ہو گیا؟
 ذرا ہی دیر کے بعد مسلح نوجوانوں کا گروہ مسافر خانے کے اندر گھسنے کے لئے سرگوشیاں کرنے لگا۔ پھر دبے پاؤں دو نوجوان آگے بڑھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ ان کو دیا۔ اسی کے ساتھ دونوں نوجوانوں کی ٹانگ پکڑ کر تھمیت لیا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے منہ کے بل گرے۔ ان دونوں کے پیچھے جو نوجوان تھے، ٹھک کر رک گئے۔ جو کچھ ہوا تھا، ان کے لئے توقع کے خلاف ہی تھا۔

”زندہ نہیں چھوڑوں گا تجھے، مار ڈالوں گا۔“ کوئی نوجوان چوٹ یا زخم کھا کر چیخا۔
اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر میں تیزی سے بجلی کے کھمبے تک پہنچ گیا۔ میں نے بجلی کے تار توڑ دیے اور پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہر طرف ”جج“ پکار مچی ہوئی تھی۔ مسافر خانے میں واپس آ کر میں نے یوسف کو جگا دیا اور سامان سینٹے میں دیر نہیں کی۔ اب میں نے مقصود کی میت اپنا لی تھی۔
”مقصود! اندھیرا کیسے ہو گیا؟ اور اور یہ ہنگامہ کیا ہے؟“ یوسف کی گھبرائی ہوئی آواز میں نے سنی۔

”میرا ہاتھ پکڑو اور یہاں سے نکل چلو۔ یہ وقت سوال جواب کا نہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔
یوسف نے پھر کچھ نہیں کہا۔ میں اسے ساتھ لئے مسافر خانے کے دوسرے دروازے سے نکل
چوڑی سی ایک گلی میں آ گیا۔ وہ گلی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ دائیں جانب مال گودام تھا اور بائیں جانب
اندھیرے میں ڈوبی ہوئی سڑک۔

بچے سے ہنگامے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ میں تیز تیز چلتا ہوا سونی اور اندھیری سڑک اسٹیشن سے دور نکل آیا۔ گولڈن ٹیمپل کی سمت مجھے یاد تھی اور میں اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ پولیس کی ایک تہذرفلد جیب کو بھی میں نے اسٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔

کچھ دور چل کر روشنی نظر آنے لگی تو میں ایک نیم تاریک گلی میں گھس گیا۔ گولڈن ٹیمپل اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یوسف نے پھر ایک بار مجھ سے ہنگامے کے بارے میں استفسار کیا۔

یوسف کو یہ بتانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا کہ شریہ نہ مل سکے نوجوان مجھے اور اسے قتل کرے۔

مسافر خانے میں آنے کے بعد میں نے محسوس کر لیا تھا کہ کچھ سکھ نوجوان ہماری عمرانی کر رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی اندر آ کر پھیرا مار جاتا۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں تھی البتہ یوسف کا ضرور خیال تھا۔
وقت گزر رہا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ گھما گھسی ختم ہوتی گئی۔

وہ جو مجھے اور یوسف کو قتل کرنے کے درپے تھے، وہ جنہیں یہ غلط فہمی تھی کہ موت اور زندگی ان کے اختیار میں ہے، انہیں سزا دینا ضروری تھا۔ اسی خیال سے میں نے یوسف کو سلا دیا اور مقصود سے علیالیش بن گیا۔ اب میرے ساتھ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ میں ان درندوں سے اچھی طرح نمٹ لیتا۔ بھلا وہ ایک جن زاد کا مقابلہ کیسے کرتے جو انہیں دکھائی بھی نہ دیتا۔ میں جہاں لیٹا تھا، وہاں تکیہ اور دوسرا سامان اس طرح رکھ دیا کہ دور سے دیکھنے پر معلوم ہو، کوئی وہاں لیٹا ہے۔

اگر ان ظالموں کو سبق نہ دینا ہوتا تو میں کسی نہ کسی طرح یوسف کو وہاں سے لے کر نکل جاتا۔ علیالیش بن جانے کے بعد میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ ہوتا۔

بہ ظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ مسافر خانے میں موجود سبھی مسافر سو رہے ہوں۔ میں نے وہاں سے نکل کر دیکھا تو مجھے مسلح سکھ نوجوانوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بھلا تھا، کسی کے پاس تلوار اور کرپان، سڑک پر اکا دکا ساری آ جا رہی تھی۔ وہ سب مسافر خانے کی دیوار کے قریب نیم تارکی میں کھڑے ہوئے تھے۔ دھیمی آوازوں میں وہ ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے کہ ہمیں قتل کر کے فرار ہونے کے لئے یہ وقت مناسب ہے، یا ابھی اور انتظار کیا جائے۔

”اب کیسا انتظار کاٹ دیتے ہیں، ان مٹلوں کو۔“ ان میں سے ایک سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔
 ”ان کی ہمت تو دیکھو کہ دن دہماڑے ہمارے شہر میں گھس آئے۔“ ایک اور زہریلی آواز میں
 بولا۔

”سمجھ رہے ہوں گے کہ یہاں سے زندہ بچ کر نکل جائیں گے۔“ کوئی طنزیہ انداز میں نہا۔
 ”اچھا تو پھر چلو، ہلا بول دیتے ہیں۔“ ایک نوجوان نے اپنی کرپاں لہرائی۔
 ”لیکن پہلے اندر کی لائٹ تو بجھا دو تاکہ پولیس آجائے تو بھاگنے میں آسانی ہو۔“
 ”میں نے سوچ دیکھ لیا ہے۔ اندر گھتے ہی سیدھے ہاتھ پر ہے۔“
 ”تو پھر جلدی سے جاؤ۔ ادھر تم نے بلب بجھا، ادھر ہم اندر کھس آئیں گے۔“

ابھی وہ شریں نے اپنی بات پوری کر پایا تھا کہ میں نے خود سوچ آف کر دیا۔ میں دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ مرل پیلے بلب کی روشنی غائب ہو گئی۔

”ارے یہ بتی تو خود بخود بجھ گئی۔ فیوز اڑ گیا ہو گا۔ چلو اور بھی اچھا ہوا۔“ نیم تاریکی میں کسی کی

آواز سنائی دی۔

والے تھے اور ہنگامہ اسی کا نتیجہ ہے۔
”میں تو خود تمہاری طرح سو گیا تھا کہ اچانک اندھیرا ہو گیا۔ پھر چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔
یوں لگ رہا تھا جیسے دو گروہوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ مسافر اٹھ کر بھاگنے لگے تو میں نے
بڑی مشکل سے تمہیں جگایا۔ تم گہری نیند میں تھے۔ اس مسافر خانے سے نکلنے والے آخری افراد ہی دونوں
تھے۔ ویسے بھی ہمیں وہاں اب رکتا نہیں تھا۔ میں اس لئے تمہیں وہاں سے نکال کر لے آیا کہ ہم کسی
چکر میں نہ پھنس جائیں۔“ میں اسے مطمئن کرنے کے لئے انجان بن گیا تاکہ وہ مزید نہ ڈر جائے۔ اپنی
آواز میں نے دھیمی ہی رکھی تھی، کیوں کہ رات کے سنانے میں آواز دور تک جاتی ہے۔

”یہ تو خیر تم نے اچھا کیا مقصود! لیکن ابھی تک میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آرہیں۔ کوئی
سکھ“ وہ بھی سکھوں کا گرو اور مذہبی آدمی بھلا ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے
مقصود!“ یوسف کے دل میں جو اندیشہ تھا اس نے ظاہر کر دیا۔
”ضروری نہیں میرے دوست کہ سارے ہی سکھ ایک جیسے ہوں۔“ میں نے یوسف کا بات کا
جواب دیا۔ ”اتجھے بڑے ہر مذہب کے ماننے والوں میں ہوتے ہیں لیکن قاتلوں اور درندوں کا کوئی مذہب
نہیں ہوتا۔ وہ صرف قاتل اور درندے ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میرے دوست کہ وہ خود
کو کس مذہب کا ماننے والا کہتے ہیں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ کسی بھی مذہب پر پختہ یقین رکھنے والا مذہبی
آدمی کسی دوسرے مذہب والے کا دوست نہیں ہو سکتا۔ تم نے گرو گیان سنگھ کا رویہ نہیں دیکھا۔ اس
کے لیے میں کتنی نری تھی۔ وہ اس شہر کا بااثر آدمی ہے۔ اس کے ایک اشارے پر ہمارے ساتھ کچھ بھی
ہو سکتا تھا۔ بولو! اگر وہ ہمارا دشمن ہوتا تو کیا اب تک ہم زندہ ہوتے؟ اس کے گھر اور محلے سے یوں زندہ
بچ کر آ جاتے؟“

یوسف کو میں نے اپنے دلائل سے بڑی حد تک قائل کر دیا۔ اس نے خود بھی اقرار کر لیا کہ وہ گرو
گیان سنگھ کو غلط سمجھا تھا۔
”گرو گیان سنگھ کی حد تک تو تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے لیکن..... لیکن اس کے بیٹے
کرنا پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں میرا خون جوش مارنے لگتا ہے؟“
”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ کچھ باتیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔ اب خاموش رہو، ہم گرو گیان سنگھ کے گھر کی پچھلی گلی میں داخل
ہونے والے ہیں۔“

اس پتلی سی گلی میں برائے نام روشنی تھی۔ ہم دونوں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے کہ کسی
پتھر سے ٹھوکر نہ کھا جائیں۔ ہمارے پاس سامان بھی تھا اس لئے مزید محتاط تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے
بائیں جانب مجھے دور ہی سے روشنی نظر آنے لگی۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے تو ایک نیم دار دروازہ دکھائی دیا۔
روشنی اسی دروازے سے باہر آرہی تھی۔ دروازے تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔
قرب جانے پر میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ گرو گیان سنگھ کے گھر کا پچھلا دروازہ ہی تھا۔ اس نے

یوسف کو میں نے اپنے دلائل سے بڑی حد تک قائل کر دیا۔ اس نے خود بھی اقرار کر لیا کہ وہ گرو
گیان سنگھ کو غلط سمجھا تھا۔
”گرو گیان سنگھ کی حد تک تو تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے لیکن..... لیکن اس کے بیٹے
کرنا پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں میرا خون جوش مارنے لگتا ہے؟“
”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ کچھ باتیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔ اب خاموش رہو، ہم گرو گیان سنگھ کے گھر کی پچھلی گلی میں داخل
ہونے والے ہیں۔“

اس پتلی سی گلی میں برائے نام روشنی تھی۔ ہم دونوں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے کہ کسی
پتھر سے ٹھوکر نہ کھا جائیں۔ ہمارے پاس سامان بھی تھا اس لئے مزید محتاط تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے
بائیں جانب مجھے دور ہی سے روشنی نظر آنے لگی۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے تو ایک نیم دار دروازہ دکھائی دیا۔
روشنی اسی دروازے سے باہر آرہی تھی۔ دروازے تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔
قرب جانے پر میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ گرو گیان سنگھ کے گھر کا پچھلا دروازہ ہی تھا۔ اس نے

یوسف کو میں نے اپنے دلائل سے بڑی حد تک قائل کر دیا۔ اس نے خود بھی اقرار کر لیا کہ وہ گرو
گیان سنگھ کو غلط سمجھا تھا۔
”گرو گیان سنگھ کی حد تک تو تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے لیکن..... لیکن اس کے بیٹے
کرنا پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں میرا خون جوش مارنے لگتا ہے؟“
”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ کچھ باتیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔ اب خاموش رہو، ہم گرو گیان سنگھ کے گھر کی پچھلی گلی میں داخل
ہونے والے ہیں۔“

اس پتلی سی گلی میں برائے نام روشنی تھی۔ ہم دونوں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے کہ کسی
پتھر سے ٹھوکر نہ کھا جائیں۔ ہمارے پاس سامان بھی تھا اس لئے مزید محتاط تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے
بائیں جانب مجھے دور ہی سے روشنی نظر آنے لگی۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے تو ایک نیم دار دروازہ دکھائی دیا۔
روشنی اسی دروازے سے باہر آرہی تھی۔ دروازے تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔
قرب جانے پر میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ گرو گیان سنگھ کے گھر کا پچھلا دروازہ ہی تھا۔ اس نے

یوسف کو میں نے اپنے دلائل سے بڑی حد تک قائل کر دیا۔ اس نے خود بھی اقرار کر لیا کہ وہ گرو
گیان سنگھ کو غلط سمجھا تھا۔
”گرو گیان سنگھ کی حد تک تو تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے لیکن..... لیکن اس کے بیٹے
کرنا پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں میرا خون جوش مارنے لگتا ہے؟“
”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ کچھ باتیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔ اب خاموش رہو، ہم گرو گیان سنگھ کے گھر کی پچھلی گلی میں داخل
ہونے والے ہیں۔“

اس پتلی سی گلی میں برائے نام روشنی تھی۔ ہم دونوں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے کہ کسی
پتھر سے ٹھوکر نہ کھا جائیں۔ ہمارے پاس سامان بھی تھا اس لئے مزید محتاط تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے
بائیں جانب مجھے دور ہی سے روشنی نظر آنے لگی۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے تو ایک نیم دار دروازہ دکھائی دیا۔
روشنی اسی دروازے سے باہر آرہی تھی۔ دروازے تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔
قرب جانے پر میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ وہ گرو گیان سنگھ کے گھر کا پچھلا دروازہ ہی تھا۔ اس نے

یوسف کو میں نے اپنے دلائل سے بڑی حد تک قائل کر دیا۔ اس نے خود بھی اقرار کر لیا کہ وہ گرو
گیان سنگھ کو غلط سمجھا تھا۔
”گرو گیان سنگھ کی حد تک تو تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے لیکن..... لیکن اس کے بیٹے
کرنا پر نظر پڑتے ہی جانے کیوں میرا خون جوش مارنے لگتا ہے؟“
”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ کچھ باتیں خود سامنے آ جاتی ہیں۔ اب خاموش رہو، ہم گرو گیان سنگھ کے گھر کی پچھلی گلی میں داخل
ہونے والے ہیں۔“

”چائے پیو یوسف!“ میں نے تھالی سے ایک پیالہ اٹھا کر یوسف کو دے دیا۔

یوسف کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے اپنے جذبات پر قابو پانے میں دقت ہو رہی ہے۔ اسی کے پیش نظر میں نے گردو گیان سنگھ سے اس کے بڑے بیٹے بلویر کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔

گردو گیان سنگھ بولا۔ ”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے مقصود کہ میں نے اس نافرمان کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔“

”ہاں گردو جی! مجھے خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”کبھی کبھار چوری چھپے وہ اپنی ماں سے ملنے آ جاتا ہے، وہ بھی ایسے وقت کہ جب میں گردو دارے میں ہوتا ہوں۔ یہ بات مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کرتار سے پتا چلی۔ میں نے اس پر بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو کرتار کی ماں رونے لگی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے مقصود! میں نے اسی لئے اس پر سختی کرنا چھوڑ دی۔“

گردو گیان سنگھ کی آواز بھاری ہوتی گئی۔ ”اس واقعے کو کافی عرصہ ہو گیا مقصود! لیکن کل کی سی بات لگتی ہے۔ جب برہمنی سامراج کی سازش کے تحت پنجاب کو دو حصوں میں بانٹ دینے کا فیصلہ ہوا تو سارے پنجاب میں آگ سی لگ گئی۔ ان دکھ بھرے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم بھی جانتے ہو کہ کیا ہوا اور ساری دنیا کو خبر ہے۔ نفرتوں اور تعصب کی آندھی چلی تو میرا گھر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ میرا اپنا خون، میرا بیٹا مجھ سے باغی ہو گیا۔ میں اپنے گھر کے چراغ کو اس آندھی سے نہ بچا سکا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ بلویر بھی دوسرے سکھ نوجوانوں کی طرح لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں شامل ہے تو میں نے اس کے لئے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیئے۔ اس سے بلویر کو اور کھلی چھٹی مل گئی۔ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے نوجوانوں کی طرح دور دور تک دھاوے بھرنے لگا۔ اب وہ میرا بیٹا نہیں رہا تھا، ایک درندہ بن چکا تھا۔ اس کے منہ کو خون لگ گیا۔ ایک بار میں نے اس کے بارے میں یہ سنا کہ وہ کسی نوجوان مسلمان دو شیرہ کو اغوا کر کے لے آیا ہے۔ میں نے اپنے طور پر معلوم کیا کہ اس لڑکی کو انبالہ چھاؤنی کے قریب ایک زین سے اغوا کیا گیا تھا اور یہ کہ اس لڑکی کا نام سلی ہے۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ پھر میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس معصوم لڑکی کو بلویر اور اس کے ساتھیوں سے رہائی دلوا دوں، مگر ناکام رہا۔ ہندوؤں کے آلہ کار سکھ نوجوان میری کوئی بھی بات سننے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مقصود! مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ایک میں ہی کیا، میری پوری قوم ہار گئی۔ ہمارے ساتھ ہندوؤں نے بڑا دھوکا کیا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری قوم کو اب تک پوری طرح اس دھوکے کا احساس نہیں ہوا۔ آندھی کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ مگر ابھی تک بڑی تیز ہوا چل رہی ہے۔ ابھی کچھ طے نہیں کہ کب یہ تیز ہوا پھر آندھی بن جائے اور ہمارے گھروں کے چراغوں کو بجھا دے۔“ یہ کہتے ہوئے گردو گیان سنگھ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے گردو گیان سنگھ کی آنکھوں میں آنسو چھلکے دیکھے اور پھر اسے منہ پھر کر اپنی پگڑی سے آنسو پونچھتے بھی دیکھا۔ مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس بوڑھے کا دل اندر سے اتنا زخم زخم ہو گا۔ اس نے

اپنے بستر کھول کر بچالو۔ اس وقت کچھ ٹھنڈ ہے، میں تمہارے لئے چائے لے کر آتا ہوں۔“

”مہم اپنے بستر بچائے لیتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور چائے بنوانے کی کیوں تکلیف کرتے ہیں گردو جی! رہنے دیں۔“

”چائے تو پہلے کی بنی رکھی ہے، صرف گرم ہی کرتا ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چائے پی لوں گا“

مجھے بھی چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ پھر یہ کہ چائے پیتے ہوئے تم سے وہ باتیں بھی تو کرنی ہیں جس کے لئے تم اتنا طویل سفر کر کے میاں تک آئے ہو۔“

”ہاں گردو جی! یہ بات تو ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”ابھی آپ سے اصل مسئلے پر تو بات ہوئی ہی نہیں۔“

”اچھا تو پھر میں چائے لے کر آتا ہوں۔“

گردو گیان سنگھ اٹھ کر چلا گیا تو میں نے سامان سفر کھول کر بستر بچائے شروع کر دیئے۔ یوسف سے مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بھی میرا ہاتھ پٹانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میرے اور گردو گیان سنگھ کے درمیان ہونے والی اب تک کی مختصر گفتگو سے وہ شاید کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ یوسف نے مجھ سے صرف ایک سوال کیا کہ کیا گردو گیان سنگھ کو سلی کے اغوا ہو جانے کا علم ہے؟

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”مگر کیسے؟“

”سلی کو اغوا کرنے والا اسی کا بڑا بیٹا بلویر سنگھ ہے۔“ میں نے آخر یوسف کو بتایا دیا۔

میرا جواب سن کر یوسف چونک اٹھا۔

”یوسف میرے دوست! اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ گردو گیان سنگھ کے چھوٹے بیٹے کرتار کا چہرہ تمہیں کیوں جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ اس کا چہرہ اپنے بڑے بھائی بلویر سنگھ سے بہت ملتا ہے۔“ میں نے یوسف کی ایک اور الجھن ختم کر دی۔

”تو..... تو کیا مقصود..... سل..... سلی یہیں..... اسی گھر میں موجود ہے۔“ یہ سوال کرتے ہوئے یوسف کا سانس جذبات کی شدت کے سبب تیز تیز چلنے لگا۔

”نہیں یوسف!..... سلی میاں نہیں ہے۔“

”پھر..... پھر وہ کہاں ہے؟..... تم نے تو کہا تھا کہ وہ.....“ یوسف کی بات ادھوری رہ گئی، کیوں کہ گردو گیان سنگھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اسی کو آتے دیکھ کر یوسف خاموش ہو گیا تھا۔ گردو گیان سنگھ کے ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جس میں چائے کے تین پیالے رکھے ہوئے تھے۔ پیالوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

”لو بھی مقصود! پہلے چائے پیو۔“ گردو گیان سنگھ نے تھالی ہمارے درمیان رکھ دی اور خود بھی ساتھ

جواب میں یوسف نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اس عرصے میں یوسف کے مشتعل جذبات کو چھپایا دے کر سلا دیا تھا۔ اب وہ سر جھکائے گم سم بیٹھا تھا۔

”گرو جی!“ میں نے بوڑھے گیان سنگھ کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے جب ایک عہد کر لیا ہے تو میں آپ سے عہد شکنی کے لئے نہیں کہوں گا۔ ہاں اتنی درخواست ضرور کروں گا کہ اپنی زندگی کو داؤ پر نہ لگائیں۔ ابھی کرنا بہت چھوٹا ہے اور اسے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ سسلی کو بلویر اور اس کے ساتھیوں کی قید سے رہائی دلانے کی آخری کوشش ضرور کریں مگر اس کوشش میں اپنی جان نہ گنوائیں۔ مجھے اور میرے دوست یوسف کو اس شہر میں کسی پناہ کی تلاش تھی۔ ہم دونوں کو آپ کے گھر پناہ مل گئی، ہمارے لئے یہ بھی بڑی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے مقصود! میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ بات اس حد تک آگے نہ بڑھے، آگے واہے گرو جی جانیں۔“ گرو گیان سنگھ نے ایک حد تک میری بات مان لی۔

”اب آپ جا کر سو جائیں گرو جی! صبح ملاقات ہوگی، رات خاصی گزر چکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں مقصود! رات گزر رہی ہے اور اس رات کے بعد صبح ضرور ہوگی۔ تم لوگ بھی تھک گئے ہو گے، آرام کرو، میں چلتا ہوں۔“ گیان سنگھ اٹھ گیا۔

جانے سے پہلے گیان سنگھ نے کمرے کے قریب ہی غسل خانہ وغیرہ بھی دکھا دیا تاکہ ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ وہ گھر خاصا بڑا تھا جس میں صرف تین افراد رہتے تھے۔ گرو گیان سنگھ، اس کا چھوٹا بیٹا کرتار اور کرتار کی ماں۔ ہمارے لئے اسی سبب وہاں الگ ایک کمرے کی گنجائش نکل آئی تھی۔ یہ بھی ہمارے لئے سوومند ثابت ہوا تھا کہ اس کمرے سے گھر کا پچھلا دروازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے گیان سنگھ سے جو کچھ کہا، وہ قطعی درست تھا۔ مجھے تو اپنی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ایک جن زاد تھا، لیکن میرے ساتھ ایک آدم زاد یوسف بھی تھا۔ مجھے اس کی جان بچانے کے لئے کہیں پناہ کی ضرورت تھی۔

”بچی جلی رہے دوں یوسف کہ بجھا دوں؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ یوسف نڈھال سی آواز میں بولا۔ بیجان خیزی کے بعد آدمی پر ایسا ہی اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔

”بجھا ہی دیتا ہوں۔“ میں نے اٹھ کر سوئچ آف کر دیا اور یوسف کے قریب ہی بستر پر آکر لیٹ گیا۔ پھر میں نے یوسف سے سو جانے کو کہا۔

ذرا سی دیر میں یوسف بے خبر سو گیا۔ یوسف کے ارادے کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے میں نے سلا دیا تھا۔ ابھی آدمی رات ہی گزری تھی اور صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے سسلی کو درندوں کے چنگل سے چھڑا لینا تھا۔ یوسف کو میں نے اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا ورنہ وہ میرے لئے مسئلہ بن جاتا۔

مقصود سے علیالیش بن جانے میں مجھے بس چند ہی لمحے لگے۔ اب میں مجبور نہیں تھا۔ آدم زادوں سے نمٹنا اب میرے لئے آسان تھا، ایسے آدم زاد جو آدم زادوں پر ایک تھمت تھے۔ وہ جو آدمی سے درندے بن گئے تھے۔

جو کچھ بھی کہا، مجھے حقیقت معلوم ہوا۔ کچھ دیر کو کمرے کی فضا میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ پھر یہ خاموشی یوسف کی مضطرب آواز سے ٹوٹ گئی۔ اس نے گرو گیان سنگھ کو مخاطب کیا۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں چڑھتے دریا جیسی بلاخیزی تھی۔

”میں نہیں جانتا اور نہ جانتا چاہتا ہوں کہ کس نے کس کے ساتھ دھوکا کیا۔ کس کی جیت ہوئی اور کون ہار گیا۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ میری سسلی کو تمہارے بیٹے نے اغوا کیا ہے اور تم خود بھی اس کا اعتراف کر چکے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا بیٹا کہاں ہے؟ سسلی کہاں ہے؟“

”یوسف میرے دوست! ذرا صبر سے کام لوں“ میں بول اٹھا۔ ”تمہیں اس انداز میں گرو جی سے جواب طلبی نہیں کرنی چاہئے۔“

”نہیں مقصود! یہ جو کہتا چاہتا ہے، اسے کہنے دو۔ اس کا دکھ مجھ سے بڑا ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ یہ ایک درندے کے باپ سے جواب طلب کر سکے۔“ گرو گیان سنگھ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”اس نے مجھ سے جو کچھ پوچھا ہے، میں اس کا جواب دے سکتا ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں گرو جی کہ اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیوں نہیں ضرورت؟“ یوسف کے تیور اب تک بگڑے ہوئے تھے۔

”اس لئے میرے دوست کہ گرو جی جو کچھ بتائیں گے، خود مجھے بھی معلوم ہے۔“

”یعنی تمہیں معلوم ہے کہ بلویر کہاں ہے اور اس نے سسلی کو کہاں رکھا ہے؟“ یوسف نے تیز آواز میں پوچھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔

”مقصود! اگر تمہیں معلوم تھا کہ سسلی کہاں ہے تو پھر تم مجھے یہاں کیوں لے آئے؟“

”اس لئے میرے دوست کہ مجھے تمہاری زندگی عزیز تھی۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ اس وقت کہاں ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں اس شہر میں کہیں امان مل سکتی ہے؟ تمہیں یہاں کوئی پناہ دے سکتا ہے؟ کیا یہ کوئی معمولی واقعہ ہے کہ ہم اب تک زندہ ہیں؟“

”مگر ایسی زندگی کا کیا فائدہ مقصود کہ موت جس سے بہتر ہو۔“ یوسف سسک اٹھا۔

گرو گیان سنگھ نے یوسف کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ولاس دے کر بولا۔ ”کل میں خود بلویر سے جا کر ملوں گا۔ مجھے آخری بار کوشش کر لینے دو۔ وہ اسی شہر کے ایک نواحی علاقے میں رہتا ہے۔ جس گھر پر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے قبضہ کر رکھا ہے، وہاں کبھی کوئی مسلمان گھرانہ آباد تھا۔ ان لوگوں پر کیا جیتی کچھ خبر نہیں۔ معلوم نہیں، وہ زندہ بھی بیچے ہوں گے کہ جنونیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے۔ ہاں مجھے یہ ضرور خبر ہے کہ اس گھر کے در و دیوار ایک بے گناہ مسلمان لڑکی کے لئے قید خانہ بن گئے ہیں۔“ پھر بوڑھا گیان سنگھ بھی جذباتی ہو گیا۔ اس نے یوسف سے کہا۔ ”کل یا تو وہاں سے میری لاش واپس آئے گی یا پھر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم دیکھو گے کہ میں اپنے قول سے پھرنے والا نہیں ہوں۔“

میں اس گھر سے نکلا اور پرواز شروع کر دی۔ کھلی فضا میں اڑتے ہوئے میں 'امر تر کی اس نوازی آبادی تک پہنچ گیا جس کا سراغ پہلے ہی لگا چکا تھا۔
اس آبادی کے اکثر گھروں پر اڑے تھے۔ کہیں کہیں کسی گھر میں زندگی کے آثار تھے۔ آبادی پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ان درندوں نے جانے کتنے گھروں کے چراغ بجھائے تھے، کتنے دل دکھائے تھے، کس کس کا لبو ان کے دامن پر تھا؟ انہوں نے کتنی ماؤں کو زندہ درگور کیا تھا۔ قدرت نے شاید اسی کی سزا دینے مجھے ذریعہ بنا کر وہاں بھیجا تھا۔

میں نے یہاں آنے سے پہلے سہلی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ اگر میں 'سہلی' پر ہونے والے روح فرسا مظالم سے یوسف کو آگاہ کر دیتا تو یقیناً وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا۔ کبھی کبھی خالق پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہوتا ہے۔ کھردری سچائیاں سینہ چھلنی کر دیتی ہیں۔

دشمنی بلور سنگھ 'سہلی' کو اغوا کر کے بھاگا تو اسی جیسے دوسرے درندوں نے اس کا پیچھا کیا۔ عیار بلور سنگھ انہیں جل دے کر نکل گیا۔ امر تر واپس پہنچنے سے پہلے اس نے سہلی کی عزت و آبرو کو پامال کر دیا۔ پھر بھی اس نے نیم جاں سہلی کو نہ چھوڑا۔ وہ اگر چاہتا تو سہلی کو قتل کر دیتا، مگر اب اس کا ارادہ بدل چکا تھا۔ اسے سہلی پسند آگئی تھی۔ سہلی کو وہ اپنی بیوی بنانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کے کئی ساتھی ایسا کر چکے تھے۔ درندہ بن جانے کے باوجود بلور سنگھ کو یہ احساس تھا کہ اس کے والدین 'سہلی' کو اس کی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کریں گے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ سہلی اپنی خوشی سے یا تشدد کے ذریعے اپنا مذہب ترک کر دے۔ وہ سہلی کو لے کر امر تر پہنچا تو اس کے ساتھیوں نے اسے تلاش کر لیا۔ بلور سنگھ نے انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سہلی وقتی طور پر اجتماعی بے حرمتی اور پھر قتل ہونے سے بچ گئی۔ بلور سنگھ کے ساتھیوں نے اس کی بات مان لی تھی۔

پہلے تو بلور سنگھ نے سہلی کے ساتھ بڑی نرمی کا سلوک کیا اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سہلی کو رعب و صحت ہونے دیا۔ اس دوران بلور سنگھ نے سہلی کو یہ فریب دیا کہ میں تجھے پاکستان لے جا کر تیرے اپنوں میں چھوڑ آؤں گا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان سہلی جیتی رہی، خود کو دانستہ فریب دیتی رہی کہ بلور سنگھ سچ بول رہا ہے۔ یہ مجھے میرے یوسف کے پاس چھوڑ کر آئے گا۔ اسی خود فریبی کی حالت میں اس نے بلور سنگھ کو اپنے ماضی سے آگاہ کر دیا۔

آخر بلور سنگھ کے اندر کا درندہ کب تک سوتا رہتا۔ سہلی اب صحت یاب ہو چکی تھی۔ بلور سنگھ نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تجھے اپنا چاہتا ہوں، تو اپنا دھرم چھوڑ کر میری ہو جا۔ سہلی خود فریبی کے حصار سے نکل آئی اور اس نے بلور سنگھ کا اصل چہرہ دیکھ لیا۔ وہ بلور سنگھ سے بولی کہ میں مرتو سکتی ہوں لیکن تیری بات نہیں مان سکتی۔ بلور سنگھ پھر گیا اور تشدد پر اتر آیا۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی مگر سہلی نہ جھکی۔ بلور سنگھ کے ساتھی اسی دن کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بلور سنگھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ سہلی کو ان کے حوالے کر دے۔ سہلی سے اس کی ضد کا انتقام لینے کے لئے بلور سنگھ

نے آخر ایک رات اپنے ساتھیوں کی بات مان لی۔ وہ رات سہلی پر قیامت بن کر گزری۔ اسے اجتماعی بے حرمتی کا شکار ہونا پڑا۔ اس رات کے بعد سہلی نے خودکشی کر لینا چاہی لیکن اسے ایسا بھی نہیں کرنے دیا گیا۔ بلور سنگھ اسے انتقاماً زندہ رکھنا چاہتا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ اس نے سہلی کو جانوروں کی طرح باندھ کر رکھا اور زبردستی کھانے پینے پر مجبور کیا۔

یہ سہلی جیسی ہی باہمت لڑکی کا حوصلہ تھا کہ اس قدر ظلم سینے کے باوجود وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوئی۔ قدرت نے آدم زادوں کو صبر اور حوصلے کی اتنی بڑی دولت عطا کی ہے کہ ہم جن زاد بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ شاید قدرت نے سہلی کو مکافات عمل کے لئے اب تک زندہ رکھا ہو۔ سہلی اگر زندہ نہ ہوتی تو میں آخر یوسف کو لے کر یوں امر تر آتا۔

مجھے علم تھا کہ سہلی اس دیران ہی آبادی کے کسی گھر میں قید ہے۔ میں اس گھر میں داخل ہو گیا۔ بلور سنگھ کے علاوہ اس کے دو ساتھی وہاں اور سو رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی میرا جی چلا کہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں لیکن میں کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا۔

وہ ایک نیم شکستہ سا کمرہ تھا جہاں وہ تینوں درندے اپنی موت سے بے خبر غافل پڑے تھے۔ سونے سے پہلے انہیں گمان بھی نہ ہو گا کہ یہ ان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک اور کمرے کا دروازہ تھا جس کی کڑی لگی ہوئی تھی۔ لالین کی دھیمی روشنی کے باوجود مجھے سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ میں کڑی کھول کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ باہر والے کمرے میں جلتی ہوئی لالین کی روشنی آدھی تر چھی لکیریں بنانے لگی۔ اسی کمرے کے کچے فرش پر سہلی گھڑی سی بنی پڑی تھی۔ وہ سردی سے اکڑ کر مر رہی تھی، شاید اسی خیال سے ایک بھٹی ہوئی رضائی درندوں نے اس کے اوپر ڈال دی تھی۔ میں نے سہلی کے اوپر سے رضائی ہٹائی تو پتا چلا کہ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔

رضائی ہٹائے جانے پر وہ کچھ کسمائی اور دوبارہ بے سدھ ہو گئی۔ اسے میں نے اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے لیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ جاگتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر تیزی کے ساتھ باہر والے کمرے کی طرف لپکی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سہلی میرے ہی ایما اور مرضی کے مطابق سب کچھ کر رہی تھی۔ باہر آ کر اس نے بلور سنگھ کے قریب رکھی ہوئی تلوار نیام سے کھینچ لی۔
"اٹھ جا بلور سنگھ کہ آج انتقام کی رات ہے، تیری زندگی کی آخری رات۔" سہلی چپٹی اور اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی تلوار فضا میں لہرائی۔

بلور سنگھ اور اس کے دونوں ساتھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔
"ابے کیا آج تم دونوں نشے میں کڑی لگانا بھول گئے تھے جو یہ چوبہا باہر نکل آئی؟" بلور سنگھ اپنے ساتھیوں سے اس طرح بولا جیسے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہو۔ "کیا آج اس کے ہاتھ پیر بھی نہیں باندھے تھے؟"

"تو پیچھے ہٹ جا۔ ابھی ہم اسے قابو میں کر لیتے ہیں۔" دونوں درندوں میں سے ایک نے بلور سے کہا۔

پھر وہ دونوں اس کی پردہ کئے بغیر کہ سلی کے ہاتھ میں تلوار ہے، اس پر جھپٹ پڑے۔

سلی نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر بلور کے ایک ساتھی کے بازو پر تلوار کی ضرب لگائی۔ اس کا ہاتھ بازو سے کٹ کر نیچے گرا۔ کٹے ہوئے بازو سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ پھر وہ چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے سلی نے پلٹ کر دوسرے درندے کے سینے میں تلوار اتار دی۔ وہ بھی ”اوغ“ کی آواز منہ سے نکالتا ہوا منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

”کیئن! اب تیری باری ہے لیکن تجھے میں اتنی جلدی نہیں مرنے دوں گی۔“ سلی نے بڑے درندے، یعنی بلور کو مخاطب کیا۔

”تیری یہ مجال۔“ بلور نے یہ کہتے ہوئے اپنی کمر سے بندھی کرپان باہر نکال لی اور غریبا۔ ”تلوار پھینک دے ورنہ تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔“

”ٹکڑے تو آج میں کروں گی تیرے۔“ سلی گرجی۔

”گلتا ہے کہ آج تو میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچے گی۔ تو شاید میری مار بھول گئی ہے۔ تجھے یاد نہیں رہا کہ میرا نام بلور سنگھ ہے۔ میں تیرے سارے بل نکال دوں گا۔“ بلور سنگھ غصے میں پھنکارا ہوا آگے بڑھا۔

سلی اور بلور سنگھ کے درمیان دو درندے اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک دم توڑ چکا تھا اور دوسرا بے ہوش تھا۔ ارد گرد خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ بلور کی نظرس سلی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کرپان آگے کئے خوفناک انداز میں قدم اٹھا رہا تھا کہ خون پر پاؤں پڑتے ہی پھسل گیا۔ سلی نے دیر نہیں کہ اور اس کے ماتھے پر تلوار کا چرکا لگایا، پھر اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ دیں۔ کرپان دور جا پڑی۔

جو کچھ سلی نے کہا تھا، وہی کیا بلور سنگھ کو اس نے اتنے چرکے لگائے کہ وہ بے ہوشی کی سرحدوں کو چھونے لگا۔

”ابھی آنکھیں بند نہ کر بیٹریے اور دیکھ کہ میں کس طرح تیرا سینہ چھیدتی ہوں۔“ سلی نے اس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھ دی۔

بلور سنگھ نے آخری بار آنکھیں کھولیں۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار جم سے گئے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکا۔ سلی نے آخر اس کے سینے میں تلوار کی نوک اتار ہی دی۔ پھر وہ جنونی انداز میں بار بار بلور کا سینہ چھیدتی رہی اور اسی عالم میں اس نے بلور کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ بلور کا جو ایک ساتھی بے ہوش تھا۔ سلی نے اس کی گردن بھی کاٹ دی۔ وہ دونوں بھی سلی کی بے حرمتی کرتے رہے تھے۔

تینوں درندے اپنے انجام کو پہنچ گئے تو میں نے سلی کے جنون کو پابند ہوش کر دیا لیکن اسے اپنی جناتی صفات کے اثر سے آزاد نہیں کیا۔ سلی اب بھی کسی معمول کی طرح میرے احکام پر عمل کر رہی تھیں وہ پرسکون ہو گئی، یوں جیسے اس نے کچھ بھی نہ کیا ہو۔

اندر والے کمرے ہی میں لکڑی کا ایک صندوق رکھا تھا۔ سلی نے اس میں سے کپڑے نکالے۔ میں باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد سلی باہر آئی تو لباس تبدیل کر چکی تھی۔ پھر اس نے چھوٹے سے صحن میں رکھی ہوئی بانٹی سے منہ ہاتھ دھویا اور کہیں سے وہ سینڈل بھی نکال لائی جو اسی کے تھے۔ سلی اس طرح سکون و اطمینان سے تیار ہوئی جیسے اسے کسی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے جانا ہو۔

جب اس کی حالت میری مرضی کے مطابق ہو گئی تو میں نے اسے بے ہوش کر دیا۔ خاصا وقت گزر چکا تھا اور اب مجھے جلدی تھی۔ میرے اوپر اب دہری ڈسے داری آن پڑی تھی۔ یوسف کے ساتھ ساتھ مجھے اب سلی کو بھی درندوں کی اس بستی سے زندہ سلامت نکال کر لے جانا تھا۔

بے ہوش سلی کو اٹھا کر گردو گیان سنگھ کے گھر تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گھر کے اس کمرے میں پہنچتے ہی میں، سلی کو ہوش میں لے آیا جہاں یوسف کو سوتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ کمرے میں میں نے روشنی کر دی تھی، اسی کے ساتھ میں علیا لیش سے ایک بار پھر مقصود بن گیا تھا۔ سلی ابھی تک میرے زیر اثر تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر یوسف کو جگا دیا اور کہا۔ ”یوسف! دیکھو کون آیا ہے۔“

”سل..... سلی..... نن..... نہیں شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔“ یوسف بار بار پلکیں جھپکنے لگا۔ سلی اس کے روبرو بیٹھی تھی۔

”یوسف!“ سلی نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ مقصود بھائی مجھے تمہارے پاس لے کر آئے ہیں۔“

”مقصود! تم..... تم تن تنہا سلی کو ان درندوں کے چنگل سے نکال لائے؟“ یوسف کے لہجے سے اب بھی بے یقینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا یوسف! میں تو اس وقت وہاں پہنچا جب سلی ان تینوں درندوں کو ٹھکانے لگا چکی تھی۔ انہی درندوں میں سے ایک بلور سنگھ بھی تھا۔“ میں بولا۔ ”اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو سلی سے پوچھ لو۔“

”یوسف! مقصود بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آج وہ درندے میرے ہاتھ پیر باندھنا بھول گئے تھے اور اس کمرے کی کنڈی لگانا بھی انہیں یاد نہیں رہا جہاں مجھے قید کر رکھا تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ان کے بے خبر سو جانے کا انتظار کرتی رہی۔“ پھر سلی نے پورا واقعہ بیان کر دیا جو میرے سامنے پیش آیا تھا۔ یہ واقعہ بیان کر کے اس نے یوسف کو بتایا۔ ”میں وہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر چکی تھی کہ مقصود بھائی وہاں پہنچ گئے۔“

”لیکن تم..... تم مقصود کو کس طرح جانتی ہو؟“ یوسف نے پوچھا۔

”خود مقصود بھائی نے مجھے اپنے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ تم انہی کے ساتھ میری تلاش میں امر تر آئے ہو۔ مجھے اگر مقصود بھائی کی باتوں پر یقین نہ آ جاتا تو ان کے ساتھ کس طرح آ جاتی۔ انہیں تو آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔“ سلی نے وضاحت کر دی۔

یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا اور سلی کی طرف دیکھ کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ سلی کی ذہنی اور جسمانی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ طویل عرصے جبر و تشدد کا شکار رہ کر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ سی گئی تھی۔ اگر وہ میری جناتی صفات کے زیر اثر نہ ہوتی تو اتنی ہمت و جرأت کے ساتھ یوسف کو دشمنوں کی قید سے نکلنے کی روداد نہ سن پاتی۔ میں نے اپنی سی پوری کوشش کر لی تھی کہ یوسف اتنی مدت کے بعد جب سلی کو دیکھے تو اس کے ذہن کو دھچکانہ لگے، پھر بھی مجھے اس کوشش میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ سلی کی حالت یوسف سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اسی لئے سلی کو دیکھ کر جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔

”یوسف!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تم کن سوچوں میں کھو گئے ہو میرے دوست! صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ ہمیں اس شر سے لگنا ہے۔“

وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ”ہاں..... اور اب تو سلی بھی ہمارے ساتھ ہے۔“

”تم اور سلی جلدی سے سامان سمیٹو، میں اتنے میں گرد گیان سنگھ کے نام ایک خط لکھتا ہوں۔ یہ خط ہم یہاں چھوڑ جائیں گے تاکہ گیان سنگھ کو اچانک ہمارے غائب ہو جانے پر حیرت اور تشویش نہ ہو۔“ میں بولا۔

یوسف اٹھ کھڑا ہوا اور میں جلدی جلدی گرد گیان سنگھ کو خط لکھنے لگا: ”مرو جی! آپ نے مجھے اور میرے دوست یوسف کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ سلی کو میں نے آپ کے بیٹے بلویر سنگھ کی قید سے آزاد کر لیا ہے اور اب اسے لے کر واپس جا رہا ہوں۔ معاف کر دیجئے گا کہ ملتے وقت آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کا احسان مند..... مقصود۔“

خط میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس عرصے میں یوسف اور سلی روانگی کے لئے سامان سفر باندھ چکے تھے۔

جس طرح میں رات کی تاریکی میں وہاں آیا تھا اسی طرح یوسف اور سلی کو ساتھ لئے گھر کے پچھلے دروازے سے باہر آ گیا۔

صبح کے چھپنے میں ہم گولڈن ٹیمپل کے علاقے سے خاصی دور نکل آئے۔ اب ہمارے قدم ایک بار پھر امرتسر ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہم نے اپنے جسموں کو ممکنہ حد تک چادروں میں چھپا رکھا تھا۔

قدرت کی طرف سے اسے مدد ہی کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچنے کے کچھ ہی دیر کے بعد فیروز پور پہنچنے والی ایک ٹرین مل گئی۔

فیروز پور سے ہم لاہور پہنچے اور پھر چند گھنٹے وہاں رک کر کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ طویل اور ٹکا دینے والے مسلسل سفر نے یوسف اور سلی کو بڑھال کر دیا تھا۔ اب ہم کراچی پہنچے تھے۔ قائد آباد کی جھلی ایک بار پھر آباد ہو گئی۔ یوسف اور سلی سو گئے تو میں بھی ایک طرف آرام کرنے کو لیت گیا اور نیند میری آنکھوں میں جال بننے لگی۔ سلی کو اب میں نے اپنی جناتی صفات کے اثر سے آزاد کر دیا تھا۔ میرے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

معلوم نہیں میں کب تک بے خبر سوتا رہا۔ کسی کے رونے اور ہچکیاں لینے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ سلی تھی جو روتے ہوئے یوسف سے کہہ رہی تھی۔

”میں..... میں اب تمہارے قابل نہیں رہی یوسف! سب..... سب کچھ گنوا چکی ہوں۔ میں..... میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔“

”لیکن..... لیکن سلی! میں..... میں..... میں تمہیں اب بھی قبول کرنے کو تیار ہوں۔“ یوسف کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تمہارے ساتھ جو بھی گزری، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میرے لئے یہ بھی بہت ہے کہ تم مجھے دوبارہ مل سکیں۔ تقدیر کے قسم تو تم نے بھی سے ہیں اور میں نے بھی۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ بانٹ لیں گے۔“

”مگر یوسف! یہ تمہارے ساتھ ظلم ہو گا اور..... اور میں ظالم نہیں ہوں۔“ سلی ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔

میں نے ان قسم زدوں کو سینوں کا بوجھ ہلکا کرنے دیا اور خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ لیٹا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد خود انہی دونوں کو یہ خیال آیا کہ ان کے علاوہ میں بھی جھگی میں موجود ہوں۔ سلی نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور یوسف نے آس سے کہا۔ ”یہ مقصود ابھی تک سو کر نہیں اٹھا، دوپہر ہو رہی ہے۔ تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔ مقصود کو اٹھاتا ہوں میں۔“

یوسف نے کئی دفعہ مجھے پکارا تو میں اس طرح اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے ابھی ابھی آنکھ کھلی ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر میں ان دونوں اور اپنے لئے کھانا لے آیا۔ کھانا کھاتے ہوئے یوسف مجھ سے بولا۔

”مقصود! تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔“

”یہ کہہ کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو میرے دوست! میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔“ میں نے کہا اور سلی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اب وہ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی اسے مزید گنہداشت اور توجہ کی ضرورت ہے۔

اس دن کے بعد سے میں نے بہت کوشش کی کہ سلی تلخ یادوں کے حصار سے نکل آئے، مگر ناکام رہا وہ اندر ہی اندر گھلتی گئی، پھر ایک شام اس کی زندگی کا چراغ بجھ ہی گیا۔ یوسف یہ صدمہ نہ جھیل سکا اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔

خواہ وہ آدم زاد ہو کہ جن زاد، قدرت کے اٹل فیصلوں کو نہیں بدل سکتا۔ میرے اختیار کی حد ختم ہو گئی۔ پھر بھی یوسف کو میں پتھر کھاتے کیسے دیکھ لیتا۔ میں اسے کراچی سے گدو بندر لے گیا۔ پاگل خانے میں کم از کم وہ پھردوں سے تو محفوظ رہتا۔

میں نے پہلی بار کوئی پاگل خانہ دیکھا تھا۔ میرے سامنے یوسف کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ اسی کوٹھری کے قریب دوسری برابر والی کوٹھری میں ایک عورت بند تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر سلاخوں والے آہنی دروازے کے قریب آ گئی۔

”سنو!“ اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں۔“

پاگل خانے کے جو دو کارکن میرے ساتھ تھے، ان میں سے ایک نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”اس عورت کی باتوں میں نہ آئیں جناب! یہی عورت کیا، یہاں تو ہر پاگل رٹ لگاتے رہتا ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“

”کسی اور کے بارے میں تو میں خیر کچھ نہیں کہتا لیکن یہ عورت مجھے پاگل نہیں لگتی۔“ میں اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم..... تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ عورت زور سے بولی۔ ”اللہ کے واسطے مجھے یہاں سے رہائی دلا دو ورنہ میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی۔“

”چھوڑیں جناب! آپ چلیں اور اس عورت کو بکواس کرنے دیں۔ یہ ہر ایک سے اسی طرح کہتی رہتی ہے۔“ پاگل خانے کے دوسرے کارکن نے مجھ سے کہا۔

میں وہاں سے چلا تو آیا، مگر اس عورت کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ مجھے وہ عورت ہوش و حواس سے بیگانہ معلوم نہیں ہوئی۔

میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ میں اسی عالم میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ ”اے علیالیش! تو کب تک آدم زادوں کے درمیان رہ کر ان کے دکھوں کی فصل کاٹتا رہے گا؟ تو جس دل کو ٹٹول کر دیکھے گا، درد سے خالی نہ ہو گا۔ بھاگ جا، ان آدم زادوں کی بستی سے۔“ میرے اندر سے شکست کی یہ آواز چند لمحوں کو ابھری اور پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں سوچنے لگا کہ تقدیر تو میرا بس نہیں، پھر بھی اپنی سی کئے جاؤں گا۔ مجھے حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ میں اگر ایک سسلی کو موت کی دہلیز تک جانے سے نہیں چپاسکا، اگر ایک یوسف کی زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار نہ کر پایا تو ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ میرے ساتھ ایسا ہی ہو۔ میرے اندر ایک نیا حوصلہ بیدار ہو گیا۔ میں اس عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا جسے پاگل خانے کی ایک کوشٹری میں دیکھا تھا۔ یوں آدم زادوں کی سفاکی اور بے رحمی کی ایک اور داستان میرے علم میں آئی لیکن ابھی مجھے بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔

☆=====☆

اس عورت کی عمر پچاس برس سے کچھ کم ہوگی۔ اس کا نام رابعہ تھا۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرانے والا کوئی غیر نہیں اسی کا شوہر محمود حسن تھا۔ رابعہ کو پاگل خانے میں رہتے ہوئے ابھی دو مہینے ہوئے تھے۔

اس معاملے میں پڑنے سے پہلے مجھے علم نہ تھا کہ محمود حسن میرے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم ہو بھی جاتا تو شاید میں پیچھے نہ ہٹتا۔ محمود حسن کا تعلق بھی کراچی ہی سے تھا۔ کراچی میں اس کی سکونت حبشہ روڈ کی ایک بڑی سی کوشٹری میں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا کہ جنہوں نے ہندوستان سے پاکستان آکر نفع ہی نفع کھایا تھا۔

یوسف بڑی محبت سے مجھے مقصود کہتا تھا۔ مجھے اسی لئے اس نام سے ایک انس ہو گیا۔ جب میں نے دوبارہ ایک جن زاد سے انسانی قالب اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو علیالیش سے مقصود ہی بننا پسند کیا۔

میں ایک شام مقصود بن کر محمود حسن کی کوشٹری پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسے کسی ملازم کی ضرورت ہے۔

محمود حسن اپنی موٹر سے اتر کر کوشٹری کے اندر جا رہا تھا کہ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند تھا۔ اس کے چہرے پر خوشنودی داڑھی تھی، آنکھوں پر مونے فریم کا چشمہ تھا، سر کے بالوں میں بچ سے مانگ لگی ہوئی تھی۔ گرم شیروانی اور ڈھیلے پائنجوں کا پاجامہ پہنے ہوئے وہ خاصا بارعبد آدمی معلوم ہو رہا تھا۔

مجھے راستہ روکنے دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام مقصود ہے جناب!“ میں نے اپنا تعارف کرایا۔

”تو پھر کیا کروں؟“

”جناب! مجھے محکمہ روزگار والوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ میں بولا۔

”ہاں میں نے ان سے ایک ملازم کا بندوبست کرنے کے لئے کہا تھا لیکن تم..... تم مجھے کام کے آدمی نہیں لگتے؟“

”میں آپ کی ہر خدمت کروں گا جناب! آپ مجھے ایک موقع تو دیں۔“

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ کوشٹری کے برآمدے میں مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی قریب آگئی اور محمود حسن سے بولی۔ ”میں نے موٹر کی آواز سن لی تھی۔ آپ شاید ابھی آئے ہیں۔“ پھر اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پوچھا۔ ”یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟“

”اے میں اپنے ساتھ لے کر نہیں آیا۔ یہ خود ہی آیا ہے۔ میرے یہاں ملازمت کرنا چاہتا ہے۔“ محمود حسن نے بتایا۔

”تو پھر اسے ملازم رکھ لیجئے نا۔“ وہ ایک ادا سے اٹھلا کر بولی۔ وہ بیس برس سے زیادہ کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

”لیکن صائمہ! ابھی اس کے بارے میں کچھ معلوم تو ہو جائے، کون ہے، کہاں رہتا ہے۔“ محمود حسن بولا۔

”اچھا تو پھر چلے، ادھر برآمدے میں چل کر بیٹھتے ہیں اور اس سے بات کر لیتے ہیں۔ میں بتول سے حتمی ہوں کہ آپ کے لئے چائے بنا لائے۔“ صائمہ نے سر تا پا میرا جائزہ لیا۔

”تمہیں تو ہر کام کی جلدی لگ جاتی ہے۔ خیر چلو، پہلے یہی سہی۔ کپڑے بند میں بدل لوں گا۔“ یہ کہہ کر محمود حسن مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ..... کیا نام بتایا تھا تم نے نہ؟“

”مقصود جناب!“ میں نے کہا اور پھر محمود حسن کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

برآمدے میں آرام وہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ محمود حسن اپنی شیروانی کے اوپری بٹن کھولنے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں ابھی چائے کے لئے کہہ کر آئی۔“ صائمہ یہ کہتی ہوئی اند چلی گئی۔

”ہاں تو میاں مقصود! یہ بتاؤ کہ تم رہتے کہاں ہو؟“ محمود حسن نے مجھ سے پہلا سوال کیا۔

”قائد آباد کی ایک جھگی میں جناب!“ میں نے جواب دیا۔

”کوئی آگے پیچھے بھی ہے یا.....“ محمود حسن نے سوالیہ انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جی نہیں، اکیلا ہوں۔ فسادات میں.....“

”بس بس!“ محمود حسن نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ اس کے چہرے پر رعوت

تھی۔ ”یہ کمائیاں بہت سنی ہوئی ہیں، زیادہ مظلوم بننے کی ضرورت نہیں۔ میں ایسے لوگوں کو بالکل پسند

نہیں کرتا جو خود کو قابل رحم ظاہر کرتے ہیں۔ تم سے جو پوچھوں اس کا مختصر جواب دو۔“

”بہت بہتر جناب!“ یہ کہہ کر میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”تمہارے جان پہچان والوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو تمہاری ضمانت لے سکے؟“

”کس بات کی ضمانت جناب؟“ میں نے معلوم کیا۔

”کل کو تم میری کوٹھی سے کوئی چیز لے کر بھاگ جاؤ تو کون ذمے دار ہو گا؟“

”جناب! میں ایسا نہیں ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”میرا تعلق ایک باعزت خاندان سے

ہے۔ وقت پڑ گیا ہے تو.....“

”تم پھر مظلوم بننے کی کوشش کرنے لگے۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔

اسی وقت صائمہ اندر سے آگئی اور محمود حسن سے کہنے لگی۔ ”آپ نے پھر وہی ڈانٹ ڈپٹ

شروع کر دی۔ اسی وجہ سے تو کوئی ملازم ہمارے میاں نہیں نکلتا۔ آپ کو تو میرا ذرا خیال نہیں۔ ایک

بڑھیا بٹول گھر کے کیا کیا کام کرے۔“

”صائمہ بیگم! تمہاری ایسی ہی باتوں سے تو ملازموں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔“ محمود حسن

کسی قدر نرمی سے بولا، پھر مجھ سے کہنے لگا۔ ”یہ بیگم صاحبہ ہیں۔ بیگم کا مطلب سمجھتے ہو تم؟“ اس نے

صائمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی جناب! میں تو ڈا بہت پڑھا لکھا بھی ہوں۔“

”صورت سے تو آواز پڑھ لگتے ہو۔ تم کہتے ہو تو تمہیں پڑھا لکھنا ملے لیتا ہوں۔ بہر حال پہلی بات تو

یہ سن لو کہ تمہیں اپنی جھگی چھوڑ کر یہیں رہنا پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ دو وقت کھانے اور ناشتے کے علاوہ

پچاس روپے تنخواہ ملے گی۔ بولو منظور ہے؟“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، صائمہ نے مجھے لالچ دیا۔ ”میں تمہیں صاحب کے پرانے

کپڑے بھی پہننے کو دے دیا کروں گی۔“

مجھے تو راضی ہونا ہی تھا، سو بولا۔ ”جو آپ کا حکم۔“ مجھے تو آپ دونوں کی خدمت کر کے خوشی ہو

گی۔ پیٹ بھرے کو روٹی بھی مل رہی ہے اور تنخواہ بھی اور کیا چاہئے۔“

”چاہو تو جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ ویسے تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ تم سے پہلے ہمارے

پاس جو ملازم تھا، بیگم نے اس کے لئے بہتر وغیرہ سب کچھ بنوا دیا تھا۔ تمہیں ضرورت کی ہر چیز اس کے

میں مل جائے گی جہاں ہمارا پہلا ملازم رہتا تھا۔“ محمود حسن نے بتایا۔

”اگر ایسی بات ہے جناب! تو پھر مجھے کیا لانا ہے۔“ میں بولا۔

”تو پھر خود کو آج اور اسی وقت سے ملازم سمجھو۔“ صائمہ نے کہا۔ ”ابھی بٹول چائے لے کر آئے

گی تو تم وہ کمرہ دیکھ آنا جہاں رہنا ہے۔ اسی کے ساتھ تم کوٹھی کا ایک چکر بھی لگا لو تو اچھا ہے۔ تمہیں

بٹول کے ساتھ مل کر سارا کام سنبھالنا ہے۔“

”اطمینان رکھیں بیگم صاحبہ! آپ کو میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

میرے چپ ہوتے ہی محمود حسن بول اٹھا۔ ”اچھا تو پھر ادھر آؤ اور میاں بیٹھ کر ذرا میری پنڈلیاں

دباؤ۔ دیکھتا ہوں کہ تم کتنے خدمت گزار ہو۔“

مجبوراً مجھے برآمدے کے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر محمود حسن کی پنڈلیاں دبانا پڑیں۔ مجھے آخر خدمت

گزاری کا ثبوت تو دینا ہی تھا۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اتنی ذلت برداشت

کرنا پڑ رہی تھی۔ پھر بھی میں مطمئن تھا، اس لئے کہ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں تھا۔ پھر اسی وقت میری

جان چھوئی کہ جب ملازمہ بٹول چائے لے کر آگئی۔ صائمہ نے مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا۔

ادھیر عمر بٹول بھی اسی کوٹھی کے ایک حصے میں رہتی تھی۔ صورت سے وہ مجھے سیدھی امر مظلوم

سی لگی۔ اس سے مختصر سی گفتگو کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی ان ہزاروں عورتوں میں سے ایک تھی

جو بے سارا رہ گئی تھیں۔

کوٹھی کی بائیں جانب تین چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک کمرہ بٹول کا

تھا۔ اسی کے برابر والا کمرہ کھولتے ہوئے وہ مجھ سے بولی۔ ”میاں تم رہ سکتے ہو۔ میں صفائی کرتی رہی ہوں،

پھر بھی جھاڑ پونچھ کر لینا۔“

”تم کب سے میاں ملازمت کر رہی ہو؟“ میں نے بٹول سے پوچھا۔

”تقریباً سال بھر ہو گیا۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے بڑی بیگم صاحبہ نے ملازم رکھا تھا۔ وہ بڑی نیک اور

رحم دل تھیں۔“

”اور چھوٹی بیگم صاحبہ؟“

”یہ بھی ٹھیک ہیں۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ محنت کر کے پیٹ کا دوزخ بھرتا ہے۔ جب

تک ہاتھ جیر چل رہے ہیں، دو پیسے جمع کر لوں گی کہ بڑھاپے میں اور بڑے وقت میں کام آئیں۔ ہاتھ

بیروں نے کام کرنا چھوڑ دیا تو پھر کوئی ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ آؤ چلو، تمہیں بیگم صاحبہ اور صاحب کے

کمرے دکھا دوں۔ صاحب ذرا غصے کے تیز ہیں، مگر دل کے بڑے نہیں، ایک مرتبہ میرے سر میں بہت تیز

درد ہو رہا تھا۔ صاحب نے دم کر دیا تو فوراً درد جاتا رہا۔ میں نے تو انہیں ایک دفعہ رات کے وقت کوئی

ونیفہ بھی پڑھتے دیکھا تھا۔ مجھ سے انہوں نے وضو کرنے کے لئے پانی گرم کروایا تھا۔“ بٹول میرے ساتھ

ساتھ چلتی ہوئی کہتی رہی۔

محمود حسن کے بارے میں بٹول نے جو بتایا، اسے سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ پھر بھی میں زیادہ گھبراہٹ

کوئی کام لیا جاسکتا ہے۔ تم اس پر زبان نہیں کھولو گے۔ بد زبان ملازموں کو میں زیادہ دن برداشت نہیں کرتا۔“ محمود حسن کا لہجہ اور انداز ایسا تھا جیسے مجھے جھڑک رہا ہو۔

”پہلے ہی دن اس غریب کو آپ کیوں اتنا ڈرائے دے رہے ہیں۔“ صائمہ بول اٹھی۔
 ”صائمہ بیگم! تمام باتیں پہلے سے بتا دینا اچھا ہوتا ہے کہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ میرا مقصد اسے ڈرانا یا یہاں سے بھگانا نہیں بلکہ یہ سمجھانا ہے، اپنا دماغ عرش پر نہیں، فرش پر رکھے۔“ پھر محمود حسن میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی؟“

”اچھی طرح جناب!“ میں بولا۔ ”جب آپ نے مجھ سے یہ کہنا تھا کہ مجھے یہیں رہنا پڑے گا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا، اس کا مطلب کیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ دن رات آپ کی خدمت گزاری میں لگا رہوں۔“

”جب ہم کوئی نیا ملازم رکھتے ہیں تو وہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے تمہاری ہی طرح خدمت گزاری کے لیے چوڑے وعدے کرتا ہے۔ کچھ دن گزر جاتے ہیں تو وہ اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ خیر تمہیں بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

محمود حسن مجھے ایسے آدم زادوں میں سے لگا جو اپنے ہی جیسے دوسرے آدم زادوں کو ان کی مجبوری اور غربت کا احساس دلا کر خوش ہوتے ہیں۔

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بول اٹھا۔ ”بتول کے کمرے کی طرح تمہارے کمرے میں بھی بجلی کی کھنٹی لگی ہے۔ دن ہو کہ رات کھنٹی بجتے ہی تمہیں حاضر ہو جانا ہے۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں، انہیں ذہن میں رکھو۔ کل پہلی تاریخ ہے اس لئے تمہاری تنخواہ کل ہی سے لگے گی۔ آج کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ تم بتول سے کام سمجھ لو۔“

میں، بتول کے ساتھ محمود حسن کے کمرے سے باہر آ گیا۔
 ”تم نے کچھ کھایا یا پیا بھی ہے کہ نہیں؟ دوپہر کو روٹی تو کھالی تھی؟“ بتول نے ساتھ چلتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

”ہاں کھانا کھالیا تھا دوپہر کو میں نے۔“
 پھر بتول مجھے گھر کے کام کاج سمجھانے لگی۔ میں اس کی باتیں اس طرح توجہ سے سنتا رہا جیسے وہاں واقعی نوکری کرنا ہو۔

رات کو جب محمود حسن اور صائمہ نے کھانا کھالیا تو بتول اپنے اور میرے لئے کھانے آئی۔ وہ میرے ہی کمرے میں آگئی تھی۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے بتول سے محمود حسن کی پہلی بیوی رابعہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ رابعہ کو میں پاگل خانے میں دیکھ چکا تھا۔ بتول سے یہ سوال کرنے کا مقصد رابعہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا تھا۔

”آہستہ بولو، تم بہت اونچی آواز میں بات کرتے ہو۔“ بتول کی قدر سم کر بولی۔ ”صاحب اور

نہیں۔ وجہ یہ کہ اب تک کی معلومات یہی تھیں کہ محمود حسن کوئی نیک آدمی نہیں ہے، اس طرح کا نیک اور صاحب علم آدمی جیسا نرگس کا باپ مولوی کفایت اللہ تھا۔

وخلائف بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں رحمانی وخلائف بھی ہیں اور شیطانی بھی۔ محمود حسن جیسے آدم زاد سے مجھے یہ توقع بہر حال نہیں تھی کہ وہ کوئی رحمانی وظیفہ پڑھتا ہو گا۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اکثر آدم زاد لوگوں پر رعب ڈالنے کے لئے بھی خود کو عالم و فاضل ظاہر کرتے ہیں۔ کیا خبر محمود حسن بھی ایسے ہی آدم زادوں میں سے ہو۔

بتول کے ساتھ ساتھ میں کوٹھی کا اندرونی حصہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک جگہ رک کر بولی۔ ”یہ سید بادشاہ کی چوکت ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ نے مجھے اس چوکت کو پار کرنے سے منع کیا تھا۔ چھوٹی بیگم اور صاحب بھی اس چوکت کو پار کر کے کبھی کوٹھری کے اندر نہیں جاتے۔ صاحب کا حکم ہے کہ مغرب کے وقت اس چوکت پر اگر بتیاں سلگا دی جائیں۔ ایک دفعہ میں اگر بتیاں جلاتا بھول گئی تھی تو رات بھر بخار میں پھنکتی رہی۔“

میں نے اس چوکت کو فور سے دیکھا تو اس کی جھریوں میں مجھے کئی اگر بتیوں کے ادھ جلتے ٹکڑے دکھائی دیے۔ اس کوٹھی میں میرے لئے وہ کوٹھری بھی خطرے کی ایک علامت تھی۔ میں نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے ہی کسی ہم جنس کی وہاں موجودگی کا سراغ لگانا چاہا۔ اگر وہ کسی جن زاد کا ٹھکانا ہو تا تو مجھے اس کی بو محسوس ہو جاتی لیکن اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

یہ بات میرے علم میں تھی اور خود مجھے بھی اس کا تجربہ تھا کہ جنات اپنے ٹھکانے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ میں نے اسی لئے اپنے دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے کبھی وہاں کوئی جن زاد رہتا ہو اور اب اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا ہو۔ جنات عموماً ایران اور غیر آباد جگہوں پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے کسی جگہ پر ان کا قبضہ ہو تو وہاں سے آدم زادوں کو ڈرا کر بھگا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے یہ امکان بھی مد نظر رکھا کہ کیا خبر اس وقت میرا وہ ہم قوم و ہم جنس کہیں گیا ہو۔

بتول مجھے گھما پھرا کر محمود حسن کے کمرے میں لے آئی جو اب لباس تبدیل کر چکا تھا۔ صائمہ بھی اسی کے کمرے میں تھی۔

”ہاں میاں مقصود! دیکھ لی ہماری کوٹھی۔ وہ کمرہ بھی دیکھ آئے کہ نہیں جہاں تمہیں رہنا ہے؟“
 محمود حسن نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ مسمری پر نیم دراز تھا اور صائمہ اس کے سرہانے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔
 ”جی ہاں جناب! بتول نے مجھے پوری کوٹھی دکھا دی ہے۔ اپنا کمرہ بھی میں نے دیکھ لیا ہے۔“ میں نظر جھکا کر بولا۔

”بتول! تم نے اسے سید بادشاہ کی چوکت کے بارے میں بتا دیا ہے نا؟ کہیں یہ بھولے سے اس کوٹھری میں گھس جائے۔“ محمود حسن نے بتول سے پوچھا۔

”جی صاحب! بتا دیا ہے۔“ بتول نے جواب دیا۔
 ”ایک بات اپنے ذہن میں رکھنا میاں مقصود کہ تم جو میں گھسنے کے ملازم ہو۔ کسی وقت بھی تم سے

چھوٹی بیگم، دونوں ہی بڑی بیگم صاحبہ کے بارے میں باتیں کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ تم سے بڑی بیگم کی باتیں نہ ہی کرتی تو اچھا تھا۔

”تو اس میں اتنے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہاں کون ہماری باتیں سن رہا ہے۔“ میں نرمی سے بولا۔
بتول سیدھی سادی عورت تھی، کہنے لگی۔ ”اگر تم یہ وعدہ کرو کہ کسی کے سامنے یہ باتیں نہیں کہو گے تو میں بڑی بیگم صاحبہ کے بارے میں مجھے جو معلوم ہے بتا دوں۔ میرا تو خود یہ دل چاہتا ہے کہ کسی سے ان کی باتیں کروں۔ وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ لگتا ہے کہ ابھی کسی طرف سے مجھے آواز دیتی ہوئی چلی آئیں گی۔“

”تمہارے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا ہو گا۔ وہ یقیناً صاحب کے مزاج سے مختلف ہوں گی۔“ میں نے بتول کو بولنے پر اکسایا۔

”ہاں وہ بڑے نرم مزاج کی تھیں۔ بس چھوٹی بیگم کا غم انہیں کھا گیا ورنہ تو وہ اچھی خاصی تھیں۔ ایک وہی کیا، دوسری عورت کو کوئی بھی عورت خوشی سے قبول نہیں کرتی۔ پھر بھی بڑی بیگم ہی کا دل تھا کہ انہوں نے پورے چھ مہینے تک ہر ظلم برداشت کیا اور اف تک نہ کی۔ پھر دماغ تو الٹا ہی تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ صاحب نے انہیں پاگل خانے میں داخل کرا دیا ہے۔“
”کیا بڑی بیگم واقعی پاگل ہو گئی تھیں؟“

میرے اس سوال پر بتول کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔ ”وہ اسی وقت چینی چلاتی تھیں جب صاحب انہیں مارتے تھے۔“

”کیا؟“ میں بول اٹھا۔ ”کیا صاحب، بڑی بیگم کو مارتے پینتے بھی تھے؟“
”کسی سے کہنا مت،“ میں نے خود ان گنگار آنکھوں سے صاحب کے ہاتھوں کئی دفعہ مار کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔“ بتول نے دھیمی آواز میں بتایا۔
”لیکن اس مار پیٹ کی کوئی وجہ تو ہو گی۔“

”تمہی بتاؤ اگر کسی عورت کے اولاد نہ ہو تو اس میں عورت کا کیا قصور؟ صاحب انہیں بانجھ ہونے کا طعنہ دیتے اور اکثر کہتے کہ بے اولاد ہونے کے دکھ نے تجھے پاگل کر دیا ہے۔ جواب میں بڑی بیگم زبان کھولتیں تو انہیں مار کھاتی پڑتی۔“

پھر بتول ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ خود رابعہ نے اپنے شوہر محمود حسن کے لئے صائمہ کو تلاش کیا تھا۔ کچھ آدم زادیاں وقت اور حالات سے مصالحت کرنے کے لئے اس حد تک قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ رابعہ کو یہ غلط فہمی تھی کہ شاید وہ اس طرح اپنے آشیانے کے بکھرتے ہوئے نکلوں کو تیز ہوا سے بچالے گی۔ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی صائمہ نے جلد ہی پڑ پڑے نکال لئے لیکن اس میں پورا قصور صائمہ ہی کا نہیں تھا۔ محمود حسن ایک اور ہی کھیل کھیل رہا تھا۔ یہ بات بتول نے مجھ سے نہیں کہی بلکہ خود میں نے اپنے طور پر حالات کا تجزیہ کر کے معلوم کی۔

آدم زادوں کے درمیان رہ کر اب تک کے تجربات کی روشنی میں بہت محتاط ہو گیا تھا۔ ان کے

معاملات میں مداخلت کبھی کبھی ہم جن زادوں کو بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اسی سبب سے رابعہ کے معاملے میں بھی میں نے جگت سے کام نہیں لیا۔

غریب و افلاس کی گود میں پرورش پانے والی صائمہ جیسی لڑکیاں زندگی کی آسانسٹوں اور عیش و عشرت کی خاطر اپنی عمر سے دگنے بگٹنے مردوں کو بھی قبول کر لیتی ہیں۔ صائمہ بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے تھی۔ محمود حسن اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ آدم زادوں میں ایسی بے جوڑ دایاں کوئی نئی بات نہیں اور نہ کسی عورت کا بے اولاد ہونا کوئی ایسی انوکھی بات ہے۔ کیا خبر رابعہ اور محمود حسن میں سے کون اس کا ذمے دار تھا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے سرگرداں تھا۔

جب اس رات ہر طرف چھم چھام ہو گئی تو میں نے انسانی ہیئت ترک کر دی۔ بلاشبہ مجھے محمود حسن پر بھی غصہ تھا۔ وہ مغرور و سرکش آدم زاد خود کو روزی رساں سمجھ رہا تھا۔ مجھے اپنا ملازم جان کر اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا، میری عزت نفس پر جس جس طرح کے لگائے، میں انہیں کیسے نظر انداز کر دیتا۔ ہم جن زاد، آدم زادوں کے مقابلے میں لاکھ کم رتبہ سہی مگر مخلوق خدا میں ہمارا بھی شمار ہے۔ آدم زادوں کو اللہ نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کی دوسری مخلوقات کو ذلیل و رسوا کریں۔

جنات کے عالم ہاموس نے ایک بار مجھ سے بڑے بچے کی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا، اے علیالیش! اس بات کو گرہ میں باندھ رکھ کہ برائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہیں دینا چاہئے لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ ظلم نہ سہو، اگر تمہارے لئے ممکن ہو تو ظالم کو ظلم سے روک دو اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرو۔ مجھے اس رات ہاموس کی یہ بات یاد آئی۔ عالم، جنات میں سے ہوں کہ آدم زادوں میں سے، وہ جو کچھ کہتے ہیں، اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں کہتے ہیں۔

محمود حسن بھی میرے نزدیک ایک ظالم آدمی ہی تھا، میں اس کے ساتھ جواباً جو کچھ کرتا حق بجانب ہوتا۔

دوسو سو اور اندیشوں کو جھٹک کر میں پہلے اس کوٹھی کا ایک چکر لگایا کہ وہاں مجھ جیسا کوئی اور جن زاد تو موجود نہیں۔ پھر بھی بطور احتیاط میں نے سید بادشاہ کی چوکھٹ عبور نہیں کی۔ وہاں میرے سوا کوئی اور جن زاد نہیں، یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا۔

میں جب کوٹھی کا پھیرا لگا کر محمود حسن کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو برابر والے کمرے کی جتنی ایک دم جلی اور مجھے رکنا پڑا۔ یہ صائمہ کی خواب گاہ تھی۔ پھر جتنی بجھ گئی اور میں نے صائمہ کو اس کی خواب گاہ سے باہر آتے دیکھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ اپنے شوہر کے کمرے میں جا رہی ہو گی۔ میرا جو ارادہ تھا، صائمہ اس میں رکاوٹ بنتی۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ موجودہ صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے کہ صائمہ کے قدم مخالف سمت اٹھنے لگے۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ایک گرم شال اوڑھے ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا کہ دیکھوں وہ کہاں جاتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں نوجوانی کے تقاضوں نے اسے غلط راہ پر تو نہیں ڈال دیا۔ اس کا شوہر محمود حسن صحت مند ہونے کے باوجود بہر حال بوڑھا تھا اور وہ جوان تھی۔ مجھے اپنے ساتھ اس کا رویہ بھی یاد آیا۔ اسی کی ضد پر

محمود حسن نے مجھے ملازم رکھا تھا لیکن میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ صائمہ نے میرے کمرے کا رخ نہیں کیا۔

میں اس وقت چونکا جب صائمہ کو غصے کے اس حصے میں پہنچی جہاں سید بادشاہ کی چوکھٹ تھی۔ اسے میں نے چوکھٹ کے سامنے رکھتے اور پھر آگرتیاں سلگاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے دعا کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی۔ صائمہ کے قریب ہی کھڑا ہوا میں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کیا پڑھ رہی تھی اور کیوں پڑھ رہی تھی۔

مردوں کی نسبت عورتیں کچھ زیادہ ہی ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ صاحب اولاد ہونے کے لئے دعا مانگ رہی ہے۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس کی آواز کسی قدر بلند ہو گئی۔ آواز اب بھی دھیمی ہی تھی، مگر میں چند الفاظ سننے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ الفاظ مجھ پر جیسے بجلی بن کر گرے۔ ”اے سید بادشاہ! مجھے پیوہ کر دے۔“

مجھے اس آدم زادی سے نفرت محسوس ہوئی، ایک تو اس لئے کہ وہ اللہ سے کچھ مانگنے کے بجائے ایک غیر اللہ کے آگے دست دعا بلند کئے ہوئے تھی، دوسرے یہ کہ وہ اپنے شوہر کے لئے بددعا کر رہی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود حسن کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنی دولت کے بل پر صائمہ کی مجبوریوں کو خرید لیا تھا۔ پھر بھی یہ انتہائی خود غرضی تھی کہ صائمہ اس کے مرنے کی آرزو کرے۔ آدم زادوں کے بھی کتنے روپ، کتنے چہرے ہیں۔ میں نے اسی صائمہ کو محمود حسن کے سامنے ناز و انداز کا اظہار کرتے دیکھا تھا اور یہی صائمہ اب کچھ سے کچھ نظر آ رہی تھی۔ صائمہ نے اپنی بیوی کے لئے کیوں دعا کی؟ اس سوال کا ایک جواب تو بالکل سامنے کا تھا۔ یعنی وہ محمود حسن کی دولت حاصل کرنا چاہتی ہو گی لیکن ان آدم زادوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کو اکب کچھ ہوتے ہیں، نظر کچھ آتے ہیں۔

میں ابھی اپنی جگہ حیران و سرگرداں کھڑا ہوا تھا کہ صائمہ کو پلٹتے دیکھا۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس وقت صائمہ کی راہ میں آتا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ اب مجھے ایک بار پھر کو غصے میں مکمل خاموش ہو جانے کا انتظار تھا۔ صائمہ کے کمرے کی جی پھر جلی اور بجھ گئی۔ میں سوچنے لگا کہ معلوم نہیں، وہ کتنی دیر میں سوئے، کیوں نہ اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا جائے۔ ایسا سوچنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اسی کے سبب مجھے بتول کا دھیان بھی آیا۔ میں جو قدم اٹھانے والا تھا، بتول بھی اس سے جاگ سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے بتول اور صائمہ کو بے ہوشی کی سرحد تک پہنچانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہو کر محمود حسن کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہلکے نیلے بلب کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مسمری کی طرف دیکھا۔ محمود حسن ریشمی لحاف اوڑھے ایک کروٹ سے سو رہا تھا۔ اسے

خبر بھی نہ تھی کہ چند ہی لمحے بعد اس پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔ آگے بڑھ کر میں نے اس کے اوپر سے لحاف کھینچ لیا۔

”محمود حسن!“ میں نے اسے آواز دی۔

لحاف کی بھبھ ختم ہوتے ہی اس نے کسماکر آنکھیں کھول دیں۔

”اے کینے اور بد ذات شخص! بتا کہ تو شیطان کا آلہ کار کیوں بنا ہوا ہے؟ کیا تجھے اپنی عاقبت کی کوئی فکر نہیں؟ کیا تو روز حساب سے نہیں ڈرتا کہ جب تیرا اعمال نامہ تیرے دائیں ہاتھ میں نہیں بائیں ہاتھ میں ہو گا؟“ میں نے بارعب آواز میں اسے مخاطب کیا۔

پہلے میں نے محمود حسن کے چہرے پر کسی قدر خوف کے آثار دیکھے، اس کے بعد خوف کی جگہ حیرت نے لے لی اور وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ بڑی تیز نظروں سے خواب گاہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ میں نے اسے گمرے گمرے سانس لیتے بھی دیکھا۔

”کون ہے تو؟“ وہ بولا تو اس کی آواز میں خوف نہیں تھا۔ ”کسی سوئے ہوئے شخص پر وار کرنا بدلی ہے۔ سامنے آ، چھپ کیوں رہا ہے؟“

”بڑا دیدہ دلیر ہے تو! لگتا ہے کہ تیرا قلب سیاہ ہو چکا ہے۔ میں اس لئے تیرے سامنے نہیں آ رہا کہ تو مجھے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکے گا۔“ یہ کہہ کر میں اس کی طرف جھپٹا اور ایک ٹانگ پکڑ کر مسمری سے نیچے گھسٹ لیا۔

اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ زور سے بولا۔ ”میں سمجھ چکا ہوں کہ تو کوئی غیث روح ہے۔ تیری بو مجھے محسوس ہو گئی ہے۔ تجھے یقیناً اسی حرافہ نے بھیجا ہو گا جو پیر منگھو کی مائی کلماتی ہے۔ میں ابھی تجھے تیری خباثت کا مزہ چکھاتا ہوں۔“

پتا نہیں پیر منگھو کی مائی کون تھی اور اس سے محمود حسن کا کیا جھگڑا تھا۔ یہ ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے محمود حسن کے ہونٹوں کی تیز حرکت دیکھ لی تھی۔ اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنا خطرناک ہوتا۔ لپک کر میں نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا اور پھر اسے اٹھا کر دوبارہ مسمری پر پھیٹک دیا۔ وہ بھی ایک ہی بے غیرت اور ڈھیٹ تھا۔ طمانچہ کھانے اور مسمری پر پٹنے جانے کے باوجود اس کے ہونٹ حرکت کرتے رہے۔

میں بھی باز آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس بار ماتھے پر ضرب لگائی۔ بھول یا جلد بازی میں کھیل بگڑ گیا۔ ماتھے پر پڑنے والی ضرب کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ مجھ پر جوابی حملہ کرنے کے لئے یقیناً کوئی عمل کر رہا تھا۔ اس کا عمل پڑھنا تو رک گیا لیکن میں اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا نہ پوچھ سکا۔ میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اسے ہوش میں لا کر دوبارہ یہی کوشش کرتا لیکن ایک تو مجھے زیادہ جلدی نہیں تھی، دوسرے وہ عیار چوکنا ہو چکا تھا۔

اب میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ محمود حسن آسانی سے قابو میں آنے والا شیطان نہیں ہے۔ ایک نابدیدہ وجود سے اس کا خوفزدہ نہ ہونا، اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسے شیطانی دغائے اور

عملیات پر کچھ نہ کچھ دسترس حاصل ضرور تھی۔ محمود حسن کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا اور اسے یہ واقعہ پیش آتا تو خوف سے اس کی ہنگامی بندھ جاتی۔

چلتے چلتے میں نے محمود کو سبق دینے کے لئے ایک کام اور کیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ اس نے حرام کی کمانی سے یہ ٹھٹھاٹ بنا لئے ہیں، اس لئے اپنے کئے پر میں پچھتا نہیں۔ محمود حسن کی خواب گاہ کو میں نے ذرا سی دیر میں کباڑ خانہ بنا دیا۔ مسری، الماریاں، سامان آرائش و زیبائش، آئینے، غرض کہ جو کچھ بھی وہاں تھا قابل استعمال نہ چھوڑا، توڑ پھوڑ دیا، پھاڑ ڈالا۔ اسی کباڑ خانے میں محمود حسن کو بھی میں نے ہاتھ پیر باندھ کر اوندھے منہ ایک طرف ڈال دیا۔

آج رات اس ملعون کے لئے اتنی سزا ہی کافی تھی۔ میں اسی لئے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ محمود حسن سے زیادہ خائف نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ میری نظریں کم خطرناک تھا۔ شیطانی عملیات کی اسے کچھ شدید تو ہوگی، مگر کامل نہ ہوگا۔ وہ اگر ایسا ہی ماہر عملیات ہوتا تو مجھ سے دھوکا نہ کھا جاتا۔ مجھے وہ اسی وقت پہچان لیتا جب میں انسانی قالب اختیار کر کے اس سے ملا تھا۔ کچھ آدم زادوں کا علم ادھور بھی ہوتا ہے اور اس ادھورے علم کے باوجود وہ خود کو کسی تیس مار خان سے کم نہیں سمجھتے۔ اسی کی وجہ سے ان میں غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مقابلے میں ہر ایک کو حقیر جانتے ہیں۔ محمود حسن بھی مجھے ایسا ہی لگا۔

اس رات کی صبح بڑی ہنگامہ آرا تھی۔ محمود حسن نے ساری کوٹھی سر پر اٹھالی۔ میرے کمرے کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی تو بجتی ہی چلی گئی۔ میں لپکتا جھپکتا محمود حسن کے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہاں صائمہ اور بتول پہلے سے موجود تھیں۔

وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی برس پڑا۔ ”کیا ملازم اس لئے ہوتے ہیں کہ گھر میں ڈاکہ پڑ جائے اور وہ گھوڑے بچ کر سو جائیں۔“

اس عیار کو میں حیرت سے دیکھتا رہ گیا جس نے بڑی چالاکی سے ایک غیر معمولی اور پراسرار واقعے کو ڈاکے میں تبدیل کر دیا تھا۔

”دیکھو، خود اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ڈاکوؤں نے میری خواب گاہ کا کیا حشر بنایا ہے۔“ اس نے پلٹ کر ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس وقت اپنی خواب گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

مجھے کیا دیکھنا تھا؟ یوں ہی جھانک کر اندر ایک نظر ڈال لی اور محمود حسن سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”معاف کر دیجئے جناب! بہت دن بعد مجھے سکون کی نیند آئی تھی۔ اس لئے غافل ہو گیا ورنہ تو میں بہت چوکناسوتا ہوں۔“

”کل شام تمہیں میں نے نوکر رکھا ہے اور آج رات ہی میری کوٹھی میں ڈاکہ پڑ گیا۔ کیا مطلب ہوا اس کا؟ بولو..... پتا ہے تمہیں کہ بیس ہزار کیش ڈاکو لوٹ لے گئے جو ایک الماری میں رکھا تھا اور سونے کے دو بھاری سیٹ الگ تھے۔ انکم ٹیکس والے تو ہم کاروباری لوگوں کی کھال اتار لیتے ہیں، انہیں اس سے کیا کہ کون کہاں لٹ گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکوؤں نے جو توڑ پھوڑ کی ہے، اس سے بھی مجھے

ہزاروں روپے کا نقصان ہوا ہے۔ کچھ بھی نہیں تو کم سے کم پچاس ساٹھ ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے۔“ محمود حسن بولے چلا گیا۔ ”اب دیکھنا یہ ہے کہ انکم ٹیکس کا ٹکڑہ میرے اتنے بڑے نقصان پر مجھے کیا چھوٹ دیتا ہے..... خیر یہ باتیں تم جیسے کم عقلوں کی سمجھ میں کہاں آئیں گی۔ ابھی تو مجھے ڈاکے کی رپورٹ بھی لکھوائی ہے، مگر پہلے تم لوگوں سے تو نمٹ لوں ورنہ تو پولیس تمہیں الٹا لٹکا کر تمہارے سارے کس بل نکال دے گی۔ ہاں تو بولو۔“ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

”کیا بولوں جناب! میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔ مجھے تو ابھی یہ تک معلوم نہیں کہ ڈاکہ پڑا کب؟ اور..... اور اس وقت آپ..... آپ کہاں تھے؟“

”مجھے باندھ کر ڈال گئے تھے وہ لیٹرے۔ یہی سننا چاہتے ہو تم۔ پوچھو اپنی بیگم صاحبہ سے کہ انہوں نے ہی میرے بندھے ہوئے ہاتھ پیر کھولے تھے کہ نہیں..... اگر وہ میرے ہاتھ پیر سوتے ہی میں نہ باندھ دیتے تو ایک ایک کو گولی مار دیتا..... بولو نا بیگم! تمہیں آخر پولیس کے سامنے بیان دینا ہے۔“ وہ صائمہ کی طرف مڑا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ معلوم نہیں میری آنکھ کیوں نہیں کھلی۔ مجھے تو خود اس پر حیرت ہے۔“ صائمہ معصوم سی صورت بنا کر بولی۔ ”مجھے تو خوشی یہ ہے کہ ان ڈاکوؤں نے آپ سے کچھ نہیں کہا۔ مال کیا ہے، جان کا صدقہ ہے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ اس نے آپ کی جان بچالی، شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔“

میراجی چاہا کہ اس دوغلی اور جھوٹی آدم زادی کو ایسی سزا دوں جو اسے زندگی بھر یاد رہے۔ ”ایک بات ہو سکتی ہے بیگم!“ محمود حسن نے ڈاکے کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے کہا۔ ”ممکن ہے، ڈاکوؤں نے میرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں بے ہوشی کی دوا سنگھا دی ہو۔“

”جی صاحب! مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ رات کو دو تین دفعہ تو میری آنکھ ضرور کھلتی ہے، مگر رات کو ایک بار بھی آنکھ نہیں کھلی۔ مجھے بھی ڈاکوؤں نے بے ہوش کر دیا ہوگا۔ ورنہ اتنی توڑ پھوڑ ہونے پر میری آنکھ ضرور کھل جاتی۔“ بتول بولی۔

اس موقع کو غنیمت جان کر میں نے بھی بتول کی ہاں میں ہاں ملائی تاکہ اس بہانے میری جان بھی بچ جائے، محمود حسن جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر ٹیک کی بنیاد پر مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ پولیس سے تو خیر میں نمٹ ہی لیتا، مگر دوبارہ محمود حسن تک پہنچنے کے لئے مجھے کوئی اور ہی راستہ تلاش کرنا پڑتا۔ بتول کے خیال کی تصدیق کر کے میں بولا۔ ”ڈاکوؤں نے مجھے بھی دوا سنگھا دی ہوگی۔“

محمود حسن دوسروں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا تھا، کہنے لگا۔ ”اگر تمہیں ڈاکو بے ہوش نہ کر دیتے تو تم مجھ پر اپنی جان قربان کر دیتے۔ ہے نا، بڑے رستم زماں ہو تم۔ ایک ہاتھ پڑے تو دو پنڈلیاں کھاؤ۔ دم نہ درد، چلے ہیں بہادر خان بننے..... اچھا صائمہ بیگم! تم ذرا میری بات سنو، پھر میں

تھانے جا کر رپورٹ لکھواتا ہوں۔“
صائمہ کو ساتھ لئے محمود حسن اس کے کمرے میں چلا گیا۔ بتول اور میں وہیں کھڑے رہے۔ وہ

غریب بہت ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ ”تمہیں آخر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ڈاکہ پڑ گیا تو اس میں تمہارا یا میرا کیا قصور۔“
”مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ معلوم نہیں پولیس والے مجھ سے کیا لائے سیدھے سوال کریں۔ مجھ سے تو بات کرنا بھی نہیں آتی۔“ بتول روہانسی ہو گئی۔ میں بتول کا حوصلہ بڑھا رہا تھا کہ محمود حسن اور صائمہ کمرے سے نکل آئے۔

”بتول! تم جلدی سے بس اپنے صاحب کے لئے ناشتہ بنا دو، اتنے میں وہ نما کر کپڑے بدل لیں گے۔ بھلا اس حالت میں کوئی تھانے جاتے اچھے لگیں گے۔ پولیس والے آخر دیکھ کر کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا آدمی اور اس حالت میں..... اور تم مقصود..... تم بھی جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ جب ضرورت ہوگی، میں تمہیں گھنٹی بجا کر بلا لوں گی۔ تم اپنے کمرے ہی میں رہنا، ادھر ادھر نہ جانا۔“ صائمہ نے بتول کو اور پھر مجھے مخاطب کیا۔

میں سمجھ گیا کہ محمود حسن نے صائمہ کو جو پٹی پڑھائی ہوگی، وہ اسی پر عمل کرنے کی غرض سے مجھے اور بتول کو وہاں سے ہٹا رہی ہے، محمود حسن کی خواب گاہ کی کسی الماری میں نقدی اور سونے کے سیٹ بھی ہوں گے۔ انہیں بھی تو آخر غائب کرنا ہو گا۔
محمود حسن غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ بتول نے باورچی خانے کی راہ لی اور میں ”جی ہتر ہے بیگم صاحبہ!“ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ کچھ دور چل کر جب میں نے دیکھا کہ آس پاس کوئی نہیں تو فوراً انسانی قالب چھوڑ کر جن زاد بن گیا۔ محمود حسن جو نئی چال چل رہا تھا، بھلا میں اسے کس طرح کامیاب ہو جانے دیتا۔

میں تیزی سے پلٹا اور محمود حسن کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ صائمہ کھلی ہوئی ایک الماری کی تجوری کے قفل میں کتنی ڈال رہی تھی۔ میں اس کے قریب پیچھے جا کھڑا ہوا۔
”ارے تم یہ کیا کر رہی ہو صائمہ! تم اس کینے کی مدد کر رہی ہو جس کے لئے رات کو بددعا کر رہی تھیں۔“ میں نے دھیمی آواز میں صائمہ سے کہا۔

وہ اچھل پڑی۔ اسی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چابیوں کا کچھا پھوٹ گیا۔ پلٹ کر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، کیوں کہ اسے بولنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ ”سید..... سید بادشاہ“ کتنی ہوئی وہ تورا کر گری اور بے سدھ ہو گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے تجوری کی چابیوں کا کچھا لے لیا اور عین اسی لمحے ایک دہشت ناک آواز نے میرے پورے وجود پر لرزہ طاری کر دیا۔

وہ دہشت ناک آواز میرے لئے نئی نہیں تھی۔ پہلے بھی کئی بار یہ دل ہلا دینے والی آواز میں سن چکا تھا۔ زمین کے نیچے ناناؤں سی زبردست گڑگڑاہٹ ہوئی اور پھر یوں لگا جیسے اس کو ٹھکی کے در و دیوار

بل رہے ہوں۔ جیسے وہ کوٹھی طے کا ڈھیر بننے والی ہو ہر طرف سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے لئے اب وہاں مزید رکنا ممکن نہیں تھا۔

اسی وقت دور کہیں سے آوازوں کی آوازیں آنے لگیں کہ یہ اللہ کو ہی یاد کرنے کے لمحات تھے۔ وہ جو رحیم و کریم ہے، قہار و جبار بھی ہے اور مخلوق خدا کی بھول جاتی ہے۔ یہ اسی ذات برحق سے پناہ مانگنے کا وقت تھا کہ وہی پناہ دینے والا، مارنے اور جلائے والا ہے۔ میں نے اس کو ٹھکی سے نکل کر اونچی پرواز کی اور پھر آدم زادوں کو بدحواس ہو کر گھروں سے بھاگتے دیکھا۔

کبھی بچی اور کبھی اونچی پرواز کرتے ہوئے شہر کی عمارتیں مجھے کھلونوں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کھلونوں کو کوئی آن دیکھی طاقت جھٹکے دے رہی تھی۔ کوئی مصیبت آپڑے تو یوں لگتا ہے کہ وقت کی گردش رک گئی ہو۔ ایسا ہی کچھ ان لمحات میں بھی ہوا۔ زلزلے کے وہ جھٹکے ایک منٹ سے بھی کم میں رک گئے۔

افرا تفری ختم ہوئی اور ہنگامہ تھا تو میں دوبارہ محمود حسن کی کوٹھی میں جا پہنچا۔ اس بدبخت کی کوٹھی کو زلزلے کے جھٹکوں سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ بس ایک آدھ دیوار میں بال پڑ گیا تھا۔

مجھ پر پھر وہی دھن سوار ہو گئی کہ محمود حسن کی سازش کو کامیاب نہ ہونے دوں۔ ابھی تک میں علیالیش ہی تھا، ایک جن زاد۔

جس کے قلب پر سیاہی پھر گئی ہو، وہ باز نہیں آتا۔ محمود حسن بھی باز نہ آیا۔ میری غیر موجودگی میں اس نے اپنی تجوری صاف کر دی۔ چابیوں کا کچھا میں وہیں پھینک گیا تھا۔ صائمہ ہوش میں آ چکی تھی۔ بتول کے ہاتھ پیراب بھی کانپ رہے تھے۔ اسے اور محمود حسن کو میں نے صائمہ کے کمرے میں دیکھا۔ شاید محمود حسن ہی اسے اپنی خواب گاہ سے وہاں اٹھالایا ہو گا۔

”اس حرام خور کو دیکھو کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔“ محمود حسن نے بتول سے کہا۔ ”کئی مرتبہ اس کے کمرے کی گھنٹی بجا چکا ہوں، مگر اس کے کان پر جوں نہیں رنگی۔ دیکھو تو سہی کہ وہ اپنے کمرے میں ہے بھی کہ نہیں۔“

”اور..... اور صاحب، ناشتہ..... آپ کو ناشتہ بھی تو کرنا ہے پہلے آپ کے لئے ناشتہ نہ بنا دوں۔“ بتول نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”بھاڑ میں جھوٹو ناشتہ کو۔ پہلے مجھے اب تھانے جانا ہے، وہاں سے واپس آ کر ناشتہ کروں گا۔“

صورت حال کا جائزہ لے کر میں باہر کی طرف لپکا اور پھر انسانی ہیئت اختیار کر کے تقریباً بھاگتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔

محمود حسن اس وقت صائمہ کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

”زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔“ اس نے منہ بنایا، پھر بولا۔ ”میں تھانے جا رہا ہوں، تم بیگم صاحبہ کا خیال رکھو۔ زلزلے کے خوف سے وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب تک پولیس نہ آ جائے، کوئی سامان

صائمہ بولی۔ اس کی گوری رنگت سے اب زردی کی تہہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا تو ٹھیک ٹھاک ہی لگی۔ یہ اس کی عمر کا موسم بہار تھا اور بہار میں تو وہ پھول بھی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں جو خوشبو سے محروم ہوتے ہیں۔ صائمہ خوشبو سے محروم کوئی پھول تھی یا نہیں، اس سے قطع نظر مجھے تو اتنا معلوم تھا کہ وہ خزاں کی چھاؤں میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ محمود حسن اس کے لئے خزاں کی چھاؤں ہی تھا۔ بتول چل گئی تو اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔

”جی بیگم صاحبہ!“ میں فوراً بول اٹھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”تھانے جاتے ہوئے صاحب مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں، کیا میں بچی ہوں جس کا خیال رکھنا ضروری ہو؟“ وہ تنک کر بولی۔

”یہ تو صاحب ہی جانیں بیگم صاحبہ! میں تو ان کے حکم پر عمل کر رہا ہوں۔“

”تو میرے سر پر کیوں سوار ہو؟ کرسی لو اور دروازے کے باہر جا کر بیٹھ جاؤ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو آواز دے کر بلا لوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی مسکری پر بچھے ہوئے گدے کو ایک طرف سے دبانے لگی۔ گدا ادر سے کچھ اٹھا ہوا تھا۔

میری نظریں اسی طرف تھیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ گدے کے نیچے زیورات کا ایک ڈبہ دبا ہوا ہے۔ صائمہ اسی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جلدی میں شاید محمود حسن یا پھر صائمہ اس ڈبے کو گدے کے نیچے ٹھیک طرح چھپا نہیں سکے تھے۔ صائمہ شاید مجھے اسی لئے کمرے سے باہر بھیج رہی تھی کہ تجوری سے غائب کی جانے والی نقدی اور زیورات کو اچھی طرح چھپا دے۔

میں چاہتا تو صائمہ کے کتنے پر خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا، مگر ایسا نہیں کیا اور صائمہ سے بولا۔ ”بیگم صاحبہ! اگر آپ کا حکم ہو تو میں گدے کے نیچے دبا ہوا ڈبہ کہیں اور سنبھال کر رکھ دوں؟ یہ زیورات کا ڈبہ لگتا ہے، اسے کہیں حفاظت سے رکھا جانا چاہیے۔ رات ہی کو ڈاکہ پڑ چکا ہے۔ کیا خبر ڈاکو دوبارہ بچا کچھ مال لوٹنے آجائیں۔“

”ڈبہ..... کیسا ڈبہ؟“ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، چہرے پر گہرا ہٹ نظر آنے لگی۔ ”گدے..... میرے گدے کے نیچے زیورات کا ڈبہ کہاں سے آگیا؟..... میرے زیورات تو میری الماری کی تجوری میں بند ہیں۔“

میں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر ڈبہ باہر کھینچ لیا اور اسے صائمہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”وہ ڈبہ یہ رہا بیگم صاحبہ!“

اس نے زیورات کا ڈبہ مجھ سے لے کر اپنے تکتے کے نیچے رکھ دیا، پھر مجھ سے بولی۔ ”یہ اسی ہلکی کے زیورات کا ڈبہ لگتا ہے، تمہارے صاحب تھانے سے واپس آجائیں تو انہیں دے دوں گی۔ معلوم نہیں، یہ ڈبہ میرے بستر کے نیچے کہاں سے آگیا۔“ وہ بات بیانے کی کوشش تو کر رہی تھی مگر اس سے

ادھر سے ادھر نہیں ہونا چاہئے۔“

”گستاخی معاف جناب! میرا خیال یہ ہے کہ زلزلہ آنے کی وجہ سے ہر شخص کی طرح پولیس والے بھی ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہوں گے۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے بعد تھانے جاتے تو اچھا تھا۔“ میں بولا۔

”مجھے زیادہ مشورے دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ پولیس والوں کے اس سوال کا جواب کیا تم دو گے کہ جب رات کو ڈاکہ پڑا تھا تو اتنی دیر میں رپورٹ کیوں لکھائی گئی؟“ محمود حسن نے مجھے گھور کر کہا۔

”آپ کی مرضی جناب! میں تو آپ کے بھلے کے لئے ہی کر رہا تھا۔“

”نہیں چاہئے مجھے تمہاری بھلائی۔ اگر میں تم جیسے دو پیسے کے آدمیوں کا مشورہ ماننے لگوں تو پھر بن گئے سارے کام اگر تم اتنے ہی قابل ہوتے تو تیرے میرے ٹکڑوں پر نہ چل رہے ہوتے اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے یہاں نہ پہنچتے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جو لوگ کوئی کام دھندا نہیں کر سکتے یا ان میں کوئی اہلیت نہیں ہوتی، وہی جا کر محکمہ بے روزگاری میں اپنا نام لکھواتے ہیں۔“

میں سر جھکائے اس کی توہین آمیز باتیں سنتا رہا کہ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ وہ مجھے اپنی دانست میں اچھی طرح ذلیل کرنے کے بعد ہی وہاں سے ملا اور میں اس کی دوسری پیوی صائمہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت بتول مجھے ڈھونڈتی ہوئی کہاں آگئی۔

”ارے تم یہاں ہو اور میں تمہیں کہاں کہاں دیکھ آئی۔“ وہ بولی۔ ”کہاں چلے گئے تھے؟“

اسے بھی میں نے وہی کمائی سادی جو محمود حسن کو سنا چکا تھا۔

”صاحب بہت ناراض ہو رہے تھے۔ اب اس طرح کے سنے بغیر نہ جانا۔“ بتول نے مجھے تاکید کی،

لجے میں نرمی اور خلوص ہی تھا۔

”میں صاحب کے سامنے ہی آگیا تھا، تم اس وقت نہیں تھیں۔“ میں نے بتایا۔

”تم دونوں آپس ہی میں باتیں کئے جاؤ گے کہ میری بھی سونگے۔“ صائمہ بول اٹھی۔ وہ مسکری پر تقریباً نیم دراز تھی۔ اس کے چہرے سے اب بھی کسی قدر خوف جھلک رہا تھا لیکن شاید اس عرصے میں وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے پانی مانگا۔

بتول نے پانی لا کر دے دیا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔

”کمزوری محسوس ہو رہی مجھے۔“ صائمہ نے بتول سے کہا۔ ”تم باورچی خانے میں جا کر میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لے آؤ۔“

”موسمیوں کا رس پی لیں بیگم صاحبہ! طاقت آجائے گی۔“ بتول نے کہا۔ ”کچھ دیر بعد آپ کے لئے ناشتہ بنا دوں گی۔“

”اچھا تو پہلے رس ہی نکال کر پلا دے۔ تیرے صاحب تو جانے کب تھانے سے لوٹ کر آئیں۔“

بات بن نہیں رہی تھی۔ اس پر ایک اضطرابی کیفیت سی طاری تھی۔
”بگلی کون، بیگم صاحبہ؟“ میں نے دانستہ یہ سوال کیا۔

”تمہیں اس سے کیا ہو گی کوئی۔ تم سے میں کہہ چکی ہوں کہ باہر جا کر بیٹھو۔ خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کر کے میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔“

اس کی فحش کلام میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور نرمی سے بولا۔ ”آپ کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں لیکن یہ نہ بھولیں کہ رات کو اس کو بھی میں ڈاکہ پڑ چکا ہے۔ آپ کے شوہر تھانے میں زیورات اور نقدی لٹ جانے کی رپورٹ لکھوانے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ پولیس کو وہ اپنے ساتھ ہی لے کر آئیں۔ پولیس نے اگر آپ کے کمرے کی تلاشی لی اور یہاں سے زیورات برآمد ہو گئے تو پھر صاحب بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ بخول بڑے سے ایک کلاس میں موسمیوں کا رس نکال کر لے آئی۔

میں کمرے کے دروازے کی طرف قدم اٹھا رہا تھا کہ صائمہ نے مجھے آواز دی۔ ”مقصود! تم ابھی یہیں ٹھہرو۔“

میرے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ صائمہ نے بتول سے گلاس لے کر اسے ناشتہ بنانے کو بھیج دیا۔
بتول کے جاتے ہی میں نے صائمہ کے قریب جا کر کہا۔ ”جی بیگم صاحبہ! فرمائیے۔“

”سنو، تمہاری بات میرے دل کو لگتی ہے، مگر..... وہ تمہارے صاحب، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پولیس کے آنے اور..... اور پھر واپس جانے تک اپنے بستر ہی پر آرام کرتی رہوں۔ ویسے بھی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے لیکن تم..... تم نے مجھے ایک نئی الجھن میں پھنسا دیا ہے۔ یہ..... یہ بات میرے ذہن میں جانے کیوں نہیں آئی۔“ پھر اس نے اصل بات پر پردہ ڈالنے کے لئے کہا۔ ”مجھے کچھ معلوم ہوتا جب نا۔ میں کیا جانوں کہ یہ وہاں کہاں سے میرے کمرے میں آ گیا۔“ وہ تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کروں تو کیا کروں۔“

”آپ حکم دیں تو میں اس وہاں کو وہیں پیمینک آؤں کہ جہاں اسے ہونا چاہئے۔“ میں نے اس کے رنگ بدلتے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہیں کیا خبر کہ یہ زیورات وغیرہ کہاں رکھے تھے۔“ اس نے چونک کر شبہ کی نظر سے مجھے دیکھا۔

”ظاہر ہے بیگم صاحبہ کہ جب یہ زیورات آپ کے نہیں ہیں تو صاحب کے پاس ہی ہوں گے۔ میں ان کو وہیں کسی الماری میں ڈال آؤں گا۔“ میں بولا۔ ”اس طرح آپ پر تو کوئی الزام نہیں آئے گا“

آپ تو خطرے سے بچ جائیں.....
”نہیں۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”یہ..... یہ نہیں ہو سکتا..... تم جاؤ یہاں سے..... اور سنو، تم اپنی زبان بند رکھو گے..... کسی سے بھی تم اس زیورات کے ڈبے کا ذکر نہیں کرو

گے۔ تم غریب آدمی ہو اور میں نہیں چاہتی کہ ڈاکے کے شہے میں تمہارے صاحب تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں۔ تم ابھی انہیں نہیں جانتے۔ وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ میں..... میں خود کوئی ترکیب سوچتی ہوں۔ تم باہر بیٹھو۔“

صائمہ کے کمرے سے میں باہر آ گیا۔ محمود حسن کی سازش اب پوری طرح مجھ پر کھل چکی تھی۔ تجوری صاف کر کے اس نے نقدی اور زیورات صائمہ کے کمرے میں چھپا دیئے تھے۔ محمود حسن نے اس سازش میں صائمہ کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے تاکید کر گیا ہو گا کہ بستر پر پیار بن کر پڑی رہے تاکہ پولیس اس کے کمرے میں آئے بھی تو زیورات وغیرہ برآمد نہ کر سکے۔

محمود حسن تھانے سے واپس آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اس عرصے میں سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ محمود حسن نے کچھ تو اپنا غصہ مجھ پر اتارا اور کچھ بے چاری بتول پر، کیونکہ پولیس والے فوری طور پر تفتیش کرنے اس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔

”ان لوگوں کے منہ کو حرام لگ گیا ہے۔“ محمود حسن، پولیس والوں کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”کوئی لٹ جائے کہ مر جائے ان کی بلا سے۔ ڈاکے کی رپورٹ بھی لکھ لی تو بڑا احسان کر دیا مجھ پر۔ کہتے ہیں کہ تھانیدار صاحب آجائیں تو پھر ان کے حکم پر کارروائی ہو گی۔ ہونہ۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تمہاری زبان بڑی کالی ہے۔ جب میں تھانے جا رہا تھا تو اسی وقت تم نے نوکاناکی شروع کر دی تھی۔ آئندہ کے لئے یہ بات یاد رکھو کہ جب میں گھر سے نکلوں تو ہرگز نہ ٹوکنا۔“

”آئندہ ایسا ہی ہو گا جناب!“
”دفع ہو جاؤ اور اس بتول کو جا کر دیکھو، کیا شام تک ناشتہ بنا کر لائے گی۔ صبح سے ناشتہ تک نہیں ملا۔ کسی کو میرا کوئی خیال ہی نہیں۔“

محمود حسن اس وقت صائمہ کے کمرے میں تھا۔ وہ مسہری سے اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آپ خفانہ ہوں، میں جا کر دیکھتی ہوں۔“

”جب میں تمہیں ایک دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اور تمہیں آرام کرنا ہے تو پھر کیوں اٹھ رہی ہو، یہ تو کس مرض کی دوا ہے؟“

میں جھپٹ کر صائمہ کے کمرے سے نکلا اور بتول سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو محمود حسن کے لئے ناشتہ بنا کر لے آئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تھانیدار چند پولیس والوں کو ساتھ لے کر موقعہ واردات کا معائنہ کرنے آ گیا۔

محمود حسن جو پولیس والوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا، تھانیدار کی خاطر مدارات کرنے لگا۔
”آپ لوگ قانون کے رکھوالے اور قابل عزت لوگ ہیں۔ میں دل سے آپ کے جھگے کی قدر کرتا ہوں۔“ محمود حسن نے تھانیدار سے کہا۔

”وہ تو خیر آپ کی مرہانی ہے جناب والا!“ تھانیدار بولا۔ ”مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ

کس مائی کے لال نے میرے علم و اطلاع کے بغیر میرے تھانے کی حدود میں اتنی بڑی واردات کر دی۔
میں بھی اس وقت تھانیدار کے سامنے پھلوں کی پلیٹ رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ جائے
واردات کا ایک نظر معائنہ کر کے تھانیدار اب محمود حسن کے ساتھ کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا تھا۔
کچھ پولیس والے محمود حسن کی خواب گاہ کے باہر کھڑے تھے، کچھ ڈرائنگ روم کے دروازے پر۔
تھانیدار کی بات سن کر میرا جی چاہا کہ اس سے ایک بات تو پوچھ ہی لوں۔ کیا اس کے علم میں آئے بغیر
کوئی واردات نہیں ہوتی لیکن کچھ کہنا خود اپنے لئے مصیبت مول لینا ہوتا، اس لئے میں خاموش ہی رہا۔
”جو بھی ہونا تھا، میرا مقدر۔“ محمود حسن نے بڑی چالاکی سے بات کا رخ موڑا۔ ”آپ تو بس اپنی
تفتیش کی رپورٹ لکھ دیں۔“

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے جناب! ضابطے کی کارروائی تو پوری کرنی ہی پڑے گی۔“ تھانیدار نے
انکار میں سر ہلایا۔ ”پورے پچاس ہزار روپے کا معاملہ ہے۔ یہ کوئی ہنسی کھیل تو نہیں۔ اپنے اوپر والوں کو
میں کیا جواب دوں گا۔“ اس نے پھلوں کی پلیٹ سے ایک سیب اٹھا کر اپنے ایک ماتحت کو آواز دی اور
محمود حسن سے بولا۔ ”پہلے آپ اپنا بیان لکھوائیں۔“

ایک اے ایس آئی کاغذ قلم لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

”ہاں تو جناب! پہلے یہ بتائیں کہ ڈاکوؤں کی تعداد کتنی تھی؟“ تھانیدار نے محمود حسن سے پہلا
سوال کیا۔

”تین..... ہاں چار تو ہوں گے ہی وہ۔“ محمود حسن سوال و جواب سے کچھ گھبرایا۔

”تین یا چار، ایک بات بتائیں۔“

”مجھے کیوں کہ انہوں نے سوتے ہی میں باندھ کر ایک طرف اوندھے منہ ڈال دیا تھا اس لئے
انہیں ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکا۔“

”پھر تو آپ ان کے حلقے بھی نہیں بتا سکتے۔ کیس تو پھر شروع ہی سے کمزور ہو جائے گا۔“ تھانیدار
نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک بات کہوں۔“ اے ایس آئی بولا۔

”ہاں بھئی، تو بھی بول، تو کیوں پیچھے رہ جائے۔“ تھانیدار نے سگریٹ سگائی۔

”مجھے تو سر! یہ کوئی دشمنی کا کیس لگتا ہے۔“

”وہ کس طرح؟ یہ بھی تو بتا۔“

”ڈاکوؤں کو اگر مال ہی لوٹنا تھا تو انہیں توڑ پھوڑ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ کوئی مزاحمت
بھی نہیں ہوئی۔“

”ہاں بھئی زمان علی! یہ بات تو پتے کی کسی ٹوٹے۔ یہ کوئی خاندانی دشمنی کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔“
اس موقع پر محمود حسن بول اٹھا۔ ”کسی سے میری کوئی خاندانی دشمنی نہیں۔ یہ سیدھی سیدھی
ڈاکے کی واردات ہے۔ آپ میرا بیان لکھیں۔“

”بیان بھی لکھ لیں گے، پہلے تفتیش تو پوری ہو جائے۔“ تھانیدار نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے کہا۔ ”ایک بات ابھی اور میرے دماغ میں آئی ہے کہ ڈاکوؤں نے اتنی توڑ پھوڑ کی، اس قدر ہنگامہ
کیا اور آپ کی بیگم صاحبہ اور دونوں ملازم مزے سے سوتے رہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“
محمود حسن پہلے ہی اس سوال کا جواب سوچ چکا تھا۔ اس نے بے ہوشی کی دوا سٹکھائے جانے کا
بمانہ کر دیا۔ تھانیدار انکار میں سر ہلانے لگا تو مجبوراً محمود حسن نے آخری حربہ استعمال کیا۔ اس نے
تھانیدار کی مٹھی گرم کر دی۔

”تو یوں بولیں جناب کہ آپ اپنی مرضی کا بیان لکھوانا چاہتے ہیں۔“ تھانیدار نے سگریٹ کا پیکٹ
جیب میں رکھتے ہوئے سو سو روپے کے دو نوٹ بھی اندر سر کالئے اور اے ایس آئی سے کہا۔ ”لکھ بھئی
زمان علی! جو یہ کہتے ہیں۔“

”مقبوض! تم یہاں کیا کر رہے ہو، جا کر چلئے، بخواؤ تھانیدار صاحب کے لئے۔“ محمود حسن نے مجھے
حکم دیا۔

”ابھی بخوا کر لایا جناب!“ میں جلدی سے بولا۔

”اور جناب!“ تھانیدار نے محمود حسن سے کہا۔ ”یہ جو میرے ساتھ بے چارے سپاہی موقعہ کا
معائنہ کرنے آئے ہوئے ہیں، انہوں نے بھی ناشتہ پانی نہیں کیا۔ صبح ہی صبح میرے حکم پر اسی طرح کچھ
کھائے پئے بغیر تھانے سے اٹھ کر چلے آئے ہیں۔ کچھ ان کا بھی خیال کریں۔ کیوں بھئی زمان علی!“
”بالکل ٹھیک کہا آپ نے سر! میں نے بھی ابھی ناشتہ نہیں کیا۔“

پھر دوپہر کے ساڑھے گیارہ بجے تھانیدار اور سپاہیوں نے خوب ڈٹ کر ”صبح“ کا ناشتہ کیا۔ بٹول کی
آفت آ گئی۔ میں اس کا ہاتھ نہ بٹاتا تو وہ بلا جلدی نہ ملتی۔ بٹول کا اور میرا بیان بھی لیا گیا۔ اسی کے ساتھ
خانہ بڑی کے لئے تھانیدار نے صائمہ کا نام بھی لیا، بولا۔ ”آپ کی بیگم صاحبہ نظر نہیں آئیں جناب! ان کا
بیان بھی ہو جاتا تو بات سچی ہو جاتی۔“ یہ کہہ کر تھانیدار نے زوردار ڈکار لی۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا۔
محمود حسن تو کمبل سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا، مگر کمبل جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔

”دراصل بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے۔“ محمود حسن نے بتایا۔ ”وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ ایک
تورات کو پڑنے والے ڈاکے نے ان کے اعصاب پر اچھا اثر نہیں ڈالا، دوسرے اچانک زلزلہ آ جانے کی
وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئیں۔ جو بیان میرے دونوں نوکروں نے دیا ہے، وہی ان کا بیان لکھ لیں۔“
”لیکن جناب! بیان پر ان کے دستخط بھی تو کرانے پڑیں گے۔“ اے ایس آئی زمان علی بول اٹھا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ تھانیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر محمود حسن سے بولا۔ ”زمان علی ان کا بیان
لکھ لیتا ہے۔ بیگم صاحبہ کے دستخط میں خود آپ کے ساتھ جا کر ان کے کمرے ہی میں کرا لیتا ہوں۔ لکھ
بھئی زمان علی کہ..... بیگم صاحبہ کی طرف سے کہ رات کو میں سوئی تو صبح ہی میری آنکھ کھلی۔ صبح
جب میں اٹھی تو میرا سر کچھ بھاری بھاری تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ ڈاکوؤں نے مجھ کو سوتے میں بے ہوشی
کی دوا سٹکھا دی تھی پھر میں اپنے شوہر کے کمرے میں گئی تو وہ بندھے پڑے تھے۔ ان کے منہ پر بھی کپڑا

بندھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کھولا تو پھر مجھے ان کے کمرے میں توڑ پھوڑ اور ڈاکہ پڑنے کے بارے میں معلوم ہوا۔" یہ کہہ کر تھانیدار نے داد وصول کرنے کے انداز میں محمود حسن کی طرف دیکھا کر کہا۔ "کیوں جناب" میں نے بیگم صاحبہ کا بیان ٹھیک لکھوایا ہے نا؟"

محمود حسن مسکرایا اور بولا۔ "بھلا آپ کوئی غلط بات لکھوا سکتے ہیں" آپ جیسے ذہین لوگوں پر تو پولیس کے محکمے کو فخر کرنا چاہئے۔"

"بس جناب! اب آپ کو کیا بتاؤں۔ ہم جیسے لوگوں کی تو کوئی قدر نہیں کرتا۔ میری بھی کہیں اوپر پہنچ ہوتی تو آج کم سے کم ڈی ایس بی لگا ہوتا۔ آپ جیسے کرم فرمانہ ہوں تو ہم لوگ بھوکے مرجائیں۔ ہندوستان سے میاں تک پولیس کے محکمے کی خدمت کرتا آ رہا ہوں۔ مگر صلہ کچھ نہیں ملا۔ ابھی تو یہ کیس فائل کرنے کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔ آپ تھانے آتے جاتے رہیں تاکہ آپ کے علم میں بھی ساری بات رہے۔" تھانیدار نے آخری جملہ معنی خیز انداز میں ادا کیا اور اس طرح آئندہ کے لئے بھی "اپنا" راستہ ہموار کر لیا۔

میں اس وقت ڈرائنگ روم سے کھانے پینے کے برتن اٹھا رہا تھا۔

محمود حسن، تھانیدار کو ساتھ لے کر صائمہ کے کمرے میں چلا گیا اور پھر جلد ہی وہاں سے باہر آ گیا۔ "آپ کی بیگم صاحبہ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شاید یہ آپ کی تیسری یا چوتھی شادی ہے۔" تھانیدار نے محمود حسن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، دوسری شادی ہے۔ وہ بھی اس مجبوری کی وجہ سے کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔" محمود حسن کے چہرے پر ناگواری سی پھیل گئی۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلنے کی خاطر کہا۔ "آپ کے تعاون اور فرض شناسی کا بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب! آئیے میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔" چلتے چلتے تھانیدار نے ایک مرتبہ پھر محمود حسن کو یاد دلایا کہ اگلے روز اسے تھانے ضرور آنا ہے۔ محمود حسن کو چار دنا چار تھانیدار کی بات ماننی پڑی۔

محمود حسن کے لئے یہ سودا منگنا نہیں تھا۔ تھانیدار کو دو سو روپے رشوت دے کر اور کھلا پلا کر اس نے پورے پچاس ہزار روپے کمائے تھے۔ مگر صرف اپنی دانست میں۔ اسے میں کس طرح یہ مال ہضم کر لینے دیتا۔

صائمہ نے اب بیماری کا ڈھونگ ختم کر دیا اور اپنے کمرے سے نکل آئی۔ محمود حسن اس سے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں کہ مجھے بینک بھی جانا ہے۔ وہاں سے میں دکان پر جاؤں گا اور ملازموں کو بھیج دوں گا۔ وہ کسی کباڑیے کو ساتھ لائیں گے کہ وہ میرے کمرے کا ٹوٹا پھوٹا سامان اٹھا کر لے جائے گا۔ شام تک میں نیا فرنیچر بھجوا دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" صائمہ نے اطمینان دلایا۔ "کہاؤ یہ سامان اٹھا کر لے گیا تو میں، بتول اور مقصود سے کمرے کی صفائی کرا دوں گی۔"

بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں محمود حسن نے اپنے کاروبار کی بساط بچھا رکھی تھی۔ ہول سیل کی دو بڑی دکانیں تھیں، گودام تھے اور وہیں چھوٹا سا ایک دفتر تھا۔ دنیا بھر کا سامان اس کی دکانوں پر مل جاتا تھا۔ کراچی کی بندرگاہ جو قریب تھی، مال آتا اور ہاتھوں ہاتھ محمود حسن کے گوداموں میں پہنچ جاتا۔ پھر یہی مال اس کی دکانوں پر دگنے گگنے تکتے داموں بکتا۔ محمود حسن پیسے میں کھیل رہا تھا، پھر بھی پیسے کی ہوس کم نہیں ہوئی تھی۔ محمود حسن جیسے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ حرام و حلال کے بارے میں سوچیں۔ انہیں کبھی اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ ایسے لوگ تو کسی نہ کسی بہانے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کے نئے نئے حربے آزما رہے ہیں کہ کیا خبر پھر یہ مہلت ملے نہ ملے، موقع سے فائدہ اٹھا کر جو بھی ہاتھ لگے سمیٹ لو کہ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

پولیس والوں کے لئے جو ناشتہ بنا، اتنا تھا کہ بتول کو دوبارہ ناشتہ بنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انہی کا بچا کھچا میں نے اور بتول نے کھا لیا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج چکے تھے کہ جب ہم دونوں کو ناشتہ نصیب ہوا۔ اس پر بھی صائمہ کی تیوریوں پر بل پڑے رہے۔ جن کو طرف سے زیادہ مل جاتا ہے وہ اسی طرح پھٹکتے لگتے ہیں۔

"اللہ کی مار، دوپہر ہونے کو آئی اور تمہیں یہ ہوش نہیں کہ کھانا بھی پکنا ہے۔ آج میں دال دھپال نہیں کھانے کی۔" صائمہ نے بتول سے کہا۔ "اب تو تم اکیلی نہیں ہو کہ تمہیں گھر کا سودا بھی لانا پڑے۔ مقصود کو بازار بھیج کر مرغی منگوا لو۔"

میں تو خود اس فکر میں تھا کہ کسی بہانے صائمہ اور بتول کی نظروں سے غائب ہونے کا موقع مل جائے، فوراً نوکری اٹھا کر چل دیا۔

کوٹھی کے برآمدے تک پہنچتے ہی میں نے انسانی ہیئت ترک کر دی۔ اب میرے لئے ہر کام آسان تھا۔ منٹوں سیکنڈوں میں بنی بنائی مرغی لا کر میں نے اپنے کمرے کے اندر رکھ دی اور تھانے پہنچ گیا۔ تھانیدار مجھے اپنے کمرے میں اکیلا ہی مل گیا۔ وہ اپنے سامنے کاغذات پھیلائے کچھ لکھ رہا تھا۔ "السلام علیکم؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے سر اٹھائے بغیر رواروی میں جواب دیا اور پھر چونک کر سامنے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ بظاہر وہ کمرے میں اکیلا ہی تھا، سو بڑبڑانے لگا۔ "معلوم نہیں میرا وہم ہے یا کسی نے واقعی مجھے سلام کیا تھا۔"

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہیں میں نے سلام کیا تھا۔" میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"لل..... لیکن تم..... تم نظر..... نظر کیوں نہیں آرہے؟ ت..... تم ہو کون؟" وہ حوصلہ کر کے بولا۔

"اگر تم اپنا بھلا چاہتے ہو تو باہر کھڑے ہوئے اپنے اردلی سے کہہ دو کہ کسی کو تمہارے کمرے میں نہ آنے دے۔ بہتر یہ ہے کہ تم دروازہ بھی اندر سے بند کر لو، میں پھر ایک بار تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ

میں تمہارا فائدہ ہی چاہتا ہوں۔ چلو اٹھو جلدی۔“ یہ کہتے ہی تھانیدار کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے چلانے نہ لگے۔ میں نے صرف اس حد تک اس کے حواس کو قابو میں رکھا کہ وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے ڈرے نہیں۔

تھانیدار نے میرے حکم پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی اور دوبارہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

”یہ بتاؤ کہ تم اپنی ترقی چاہتے ہو؟“ میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔

”کیوں..... کیوں نہیں! کون ترقی نہیں چاہتا!“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن تم محمود حسن والے کیس میں پھنس جاؤ گے۔ ترقی کو تو چھوڑو، تمہیں اپنی نوکری بچانا مشکل ہو جائے گی۔ تم نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ پچاس ہزار روپے کا نقصان ہو جانے کے باوجود تمہیں اس نے دو سو روپے رشوت کیوں دی؟“

”ہاں..... ہاں واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا..... لیکن اب..... اب کیا ہو گا؟“

”ڈاکے کا مال محمود حسن کے گھر ہی میں موجود ہے۔“ میں نے بتا دیا۔

”کیا؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”مگر یہ..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ اگر یہی بات تھی تو

..... تو پھر اس نے اتنا لمبا چکر کیوں چلایا؟“

”یہی بات تو تمہاری موٹی عقل میں نہیں آئی۔ جسم کے ساتھ ساتھ تمہاری آنکھوں پر بھی چربی چڑھ گئی ہے۔“

میری بات کا اس نے برا نہیں مانا اور عاجزی سے بولا۔ ”میں تو واقعی اس چکر کو نہیں سمجھا، تم بتا دو۔“

”یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ وہ دولت مند آدمی ہے۔ حرام کی جتنی دولت اس کے پاس ہے، تمہارے پاس تو اس کا پانسہ بھی نہیں ہو گا۔“ میں بولا۔ ”ایک شخص سے محمود حسن کی کاروباری رقابت چل رہی ہے۔ وہ شخص خود بھی ایک امیر آدمی ہے۔ اسی نے اپنے غنڈے بھیج کر محمود حسن کو ڈرایا دھمکایا تھا۔ انہی غنڈوں نے محمود حسن کی خواب گاہ میں توڑ پھوڑ کی تھی لیکن نہ تو وہ زیورات لوٹ کر لے گئے، نہ تجوری کھول کر نقدی نکالی۔ ان کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ انہیں جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا، انہوں نے صرف وہی کیا اور چلے گئے۔ محمود حسن نے اس واقعے سے بھی فائدہ اٹھایا۔ پچاس ہزار روپے کا ڈاکہ ظاہر کر کے وہ انکم ٹیکس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے۔ اب آیا تمہاری سمجھ میں کچھ؟“

”بالکل سمجھ گیا، پکا پکا سمجھ گیا۔ یہ محمود حسن تو بڑا عیار نکلا کہ اس نے مجھے بھی آلو بنا دیا۔“ وہ پرجوش نظر آنے لگا۔

”بڑا نہ مانا، تمہیں اپنے بارے میں غلط فہمی ہے کہ تم بہت عقلمند ہو۔“

”مگر یہ تو بتا دو کہ اس نے مال کہاں چھپایا ہے؟ پھر میں اسی پر چار سو بیسی کا کیس بنا دوں گا۔ میں ابھی گارد لے کر جاؤں گا اور مال برآمد کر لوں گا۔ یہ کیس میرے افسران کی نظر میں بھی آجائے گا تو یقیناً

جیسا کہ تم نے کہا ہے، میری ترقی ہو جائے گی۔“

”اس کی ایک ہی شرط ہے کہ تم کسی کو بھی اصل بات نہیں بتاؤ گے۔ یعنی یہ کہ کسی نے اس سلسلے میں تمہاری مدد یا راہنمائی کی تھی۔“

”میں کیوں کسی کو کچھ بتانے لگا، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کون ہو اور کیوں میری مدد کر رہے ہو..... ایک مرتبہ میں نے اپنی دوسری بیوی کے کہنے پر ایک بزرگ کے مزار مبارک پہ چادر چڑھائی تھی۔ شاید یہ اسی کا فیض ہے۔ اب میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسی باتوں کا کسی سے ذکر کر دوں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ تھانیدار عجز و انکسار کا نمونہ بن گیا۔

”تو کیا تم نے بھی محمود حسن کی طرح دوسری بیوی کر رکھی ہے، کیا پہلی بیوی مر گئی؟“

”اللہ کے فضل سے زندہ ہے، وہ بھی۔ دوسری شادی تو میں نے ہندوستان ہی میں کر لی تھی۔ اب تو تیسری کو بھی سال بھر ہونے کو آیا۔ اب تم سے کیا چھپانا، سب سے سچے ہیں اور پورا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“ تھانیدار کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”اگر تمہیں صرف تنخواہ میں گزر بسر کرنی پڑتی تو پتا چلتا۔ ایک بیوی کا خرچہ پورا کرنا مشکل ہو جاتا۔ تمہیں کیا خبر کہ کتنے گھروں میں چولہے نہیں جلتے اور کتنی غریب مائیں اپنے بھوکے بچوں کو تھک تھک کر سلا دیتی ہیں..... لیکن ایک تم ہی کیا اور کتنے تم جیسے بے حس ہیں۔“ میری آواز میں تلخی گھل گئی۔

تھانیدار بھی ایک ہی ڈھیت تھا، کہنے لگا۔ ”تین شادیاں کر کے میں نے ناجائز کام تو نہیں کیا نا؟“

”جائز اور ناجائز سے تمہارا کیا تعلق، چھوڑو اس بحث کو۔ مجھے سبق نہ پڑھاؤ۔“

”معاف کرنا مجھ سے غلطی ہو گئی، میں یہ بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے تم سے یہ بھی پوچھنا ہے.....“

”کہ مال کہاں سے برآمد کرنا ہے۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”ہاں ہاں، یہی معلوم کرنا تھا۔“

میں نے اسے بتا دیا کہ زیورات اور نقدی کہاں چھپائی گئی ہے۔

”اب سمجھائیں کہ محمود حسن کی جوان بیوی بستر سے اٹھ کیوں نہیں رہی تھی..... بس ابھی میں نے چھاپہ مار کے مال برآمد کیا۔“ جذبات کے جوش میں وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور پھر اپنے ماتحتوں کو آوازیں دینے لگا۔ ”زنان علی!..... رب نواز! فوراً الارٹ ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت چھاپہ.....“

”بے وقوف کہیں کے، پہلے اپنے کمرے کا دروازہ تو کھول دو۔“

یہ سنتے ہی تھانیدار دروازے کی طرف لپکا اور میں تھانے سے نکل کر کوٹھی پہنچ گیا۔

☆=====☆=====☆

صائمہ کپڑے بدل کر غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ بتول کو میں نے باورچی خانے میں دیکھا۔ میں یہ تصدیق کرنے کے لئے زیورات اور نقدی بستر کے نیچے ہے، صائمہ کے کمرے میں گھس گیا۔ صائمہ نے

فرار بھی ہو گئے تھے۔

”ابے کیسا ڈاکہ اور کیسے ڈاکہ! تیرے مالک سے بڑا ڈاکو اور کون ہو گا۔ تو بھی اسی کا پڑھایا ہوا سبق سنا رہا ہے مجھے۔“ تھانیدار نے مجھے ڈانٹا اور پھر ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ ”یہ بھی ڈاکے کی سازش میں شریک معلوم ہوتا ہے، گرفتار کر لو اسے۔“

میں ”ارے ارے“ ہی کرتا رہ گیا اور ایک پولیس والے نے فوراً مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ تھانیدار کی اس بے جا بہادری پر میں دل ہی دل میں بہت ہنسنا۔ عام حالات میں شاید میں تھانیدار کی اس حماقت کو نظر انداز کر دیتا لیکن تھا تو ایک جن زاد۔ کب تک آدم زادوں کے ہاتھوں قدم قدم پر ذلت برداشت کرتا رہتا۔ مجھے گرفتار کرنے کا تھانیدار کے پاس کوئی مناسب جواز نہیں تھا۔ مجھے غصہ اس بات پر آیا کہ میں نے ہی تو اسے ”بہادر خان“ بننے کا یہ موقع فراہم کیا اور اس نے سب سے پہلے مجھی پر اپنی بہادری کی دھاک بٹھائی۔

اس شور شرابے کی آوازیں سن کر ادھر تو صائمہ برآمدے تک آئی، ادھر میں ہتھکڑی چھوڑ چھاڑ کر غائب ہو گیا۔ وہ سپاہی جو ہتھکڑی کی زنجیر تھا سہ ساتھ چل رہا تھا، چیخ اٹھا۔ ”سر جی!..... سر جی! مجرم فرار ہو گیا۔“

تھانیدار جو برآمدے میں پہنچ چکا تھا، مڑ کر زور سے بولا۔ ”کیا کیوں کرتا ہے؟ کون فرار.....“

”یہ آپ لوگوں نے کیا ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔“ صائمہ نے تھانیدار کی بات کاٹ دی۔ ”آپ دوبارہ کس لئے آگئے؟ کسی نے آپ کو غلط خبر دے دی ہو گی کہ ہماری کوٹھی میں دوبارہ ڈاکہ پڑ رہا ہے۔“

”ابھی بتاتے ہیں بیگم صاحبہ!“ تھانیدار طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوا جاتا ہے۔ پہلے میرے سپاہی آپ کے اس چال باز ملازم کو تو پکڑ لیں جو ہتھکڑی پہنائے جانے کے باوجود غائب ہو گیا۔ وہ مجھے کوئی عادی مجرم لگتا ہے۔ یہ کسی ایسے ویسے مجرم کا کام نہیں ہو سکتا کہ آہنی حلقے سے اپنا ہاتھ نکال کر بھاگ جائے۔ ہونہ ہو وہ فرار ہو کر آپ کے شوہر محمود حسن کو کوٹھی پر چھاپ پڑ جانے کی خبر دینے گیا ہو گا..... مگر میں نے بھی کچھ گولیاں نہیں کھیلیں، عمر گزار دی ہے پولیس کے محکمے میں۔“

”تھانیدار صاحب! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ آپ یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔“ صائمہ کی آواز سے اب فکر مند ی ظاہر ہونے لگی۔ ”کہیں آپ ہمارے ملازم مقصود کی بات تو نہیں کر رہے۔ وہ تو اندر کسی کمرے کی صفائی کر رہا ہو گا۔“ بتول بھی اس عرصے میں گھبرائی گھبرائی صائمہ کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی۔ صائمہ اس سے بولی۔ ”زرا دیکھ تو مقصود کہاں ہے؟“

”رہنے دیں بس۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”یہ آپ سب لوگوں کی ملی بھگت معلوم ہوتی ہے۔“

اسی وقت میں نے تھانیدار سے سرگوشی کی۔ ”تم کیوں فضول میں وقت برباد کر رہے ہو؟ اس ملازم سے تمہیں کیا لینا دینا۔ میرے کہنے پر تم یہاں مال برآمد کرنے آئے ہو کہ اپنا رعب جمانے۔ اس

جگہ تبدیل نہیں کی، اس اطمینان کے بعد اپنے کمرے میں جا کر میں نے نوکری اٹھائی اور کوٹھی کے برآمدے تک آ گیا۔ اطراف پر ایک نظر ڈال کر میں نے آدم زاد کی ہیئت اختیار کر لی اور اطمینان کے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔

صائمہ کے استفسار پر کہ اتنی دیر کیوں لگی۔ میں نے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! بازار میں بھڑ بہت تھی۔“

”اچھا جاؤ، بتول کو گوشت دے دو۔ اس سے کتنا کہ مرغی بھوتے ہوئے میرے لئے دونوں رانیں بھنی ہوئی نکال کر دے جائے، پھر سالن پکاتی رہے۔“

میں نے باورچی خانے میں جا کر نوکری بتول کے حوالے کر دی اور اسے صائمہ کا حکم بھی سنا دیا۔

”مجھے معلوم ہے، چھوٹی بیگم صاحبہ بھنا ہوا گوشت ہی کھاتی ہیں۔“ بتول نے کہا اور مجھے بتانے لگی کہ میں سب سے پہلے صائمہ کے کمرے کی صفائی کر دوں، پھر کچھ اور کروں۔ گزشتہ رات ہی کو وہ مجھے سمجھا چکی تھی کہ مجھے گھر کے کیا کام کرنے ہیں۔

باورچی خانے سے نکل کر میں، صائمہ کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔

”تم کیوں آگئے یہاں؟ میں نے تو نہیں بلایا۔“ اس نے مڑ کر مجھ سے کہا۔

”بتول کہہ رہی تھی کہ میں پہلے آپ کے کمرے کی صفائی کر دوں۔“

”تمہیں دکھائی نہیں دے رہا کہ میں چوٹی باندھ رہی ہوں..... کبھی تو تم بڑی عقلندی کی باتیں کرتے ہو اور کبھی فضول باتیں کر کے حیرت میں ڈال دیتے ہو۔ عجیب آدمی ہو، تم بھی، اتنے میں کیا تم کسی اور کمرے کی صفائی نہیں کر سکتے..... ویسے بھی میرا کمرہ بالکل صاف پڑا ہے، کل کرنا صفائی۔“

”جی اچھا بیگم صاحبہ!“ میں نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

صائمہ جیسی آدم زادیاں میں نے کم ہی دیکھی تھیں۔ انسانی ہیئت اختیار کرنے کے بعد میرا جسم اور چہرہ ایسا بھی بے وقعت نہیں تھا کہ کوئی صائمہ جیسی عمر کی لڑکی میری طرف التفات کی ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرے۔ میرے اندازے کے مطابق صائمہ کے فطری تقاضے حصول دولت اور آسائشوں کی نذر ہو گئے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی جو ابھی تک میرے علم میں نہیں آ سکی تھی۔ مجھے اس کی نظر التفات کی ضرورت نہیں تھی، اگر ہوتی بھی تو وہ مزاحمت نہ کر پاتی لیکن اس کے رویے سے خواہ مخواہ مجھے احساس کمتری سامعوس ہوتا۔

میں ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہا تھا کہ ایک دم ”ہوشیار، خبردار“ کا شور بلند ہوا۔ میں ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔

”خبردار، کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔“ میں نے تھانیدار کی آواز سنی۔ وہ برآمدے کی بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں پتول تھا، دائیں بائیں بندوقیں سنبھالے پولیس والے بھی تھے۔

میں آگے بڑھ کر بولا۔ ”کیا ہوا جناب تھانیدار صاحب؟ ڈاکہ تو رات کو پڑا تھا۔ رات ہی کو ڈاکو

بے گنا، ملازم کو خود میں نے ہی میاں سے غائب کر کے اندر کو بھی میں پہنچا دیا ہے۔ اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ سمجھے کہ نہیں؟“ میرا لہجہ تاکید تھا۔

تھانیدار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسی سے ذرا سے فاصلے پر اے ایس آئی زبان علی کھڑا تھا۔ اس نے تھانیدار کو مخاطب کیا۔ ”کیا ہوا سرا!“ اس سے پہلے کہ تھانیدار جواب میں کچھ کہتا، میں وہاں سے کو بھی کے اندر چلا گیا اور پھر انسانی ہیئت میں تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک سپاہی جچ اٹھا۔ ”سرجی! مفرد مجرم وہ رہا۔“

”بکواس نہ کرو۔“ تھانیدار نے سپاہی کو ڈانٹ دیا اور سپاہی اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ میری آواز سن کر تھانیدار پر جو خوف غالب آ گیا تھا، غصے کے زیر اثر دب گیا۔ چند لمبے بعد وہ ذرا سنبھل کر صائمہ سے مخاطب ہوا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ ہمارے ساتھ رہیں اور اپنے دونوں ملازموں کو اپنے ساتھ رکھیں۔ ہمیں آپ کے کمرے کی تلاشی لینی ہے۔“

میں نے تھانیدار کو دانستہ تنگ کرنے کے لئے پوچھا۔ ”تھانیدار صاحب! آپ بیگم صاحبہ کے کمرے کی تلاشی ضرور لیں۔ آپ کے خیال میں اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی، مگر کیا آپ کے پاس تلاشی کا وارنٹ موجود ہے؟“

”دیکھ بھی، تو مجھ سے اٹکنے کی کوشش نہ کر۔“ تھانیدار نے اپنے پستول کو ہولسٹر میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ میں نے قانون پڑھا ہے۔ جتنی تیری عمر ہے، اس سے زیادہ میرا تجربہ ہے۔ اسی تجربے کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس معاملے سے تیرا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی تیری تسلی کے لئے یہ بتا دوں کہ ہم پولیس والوں کے پاس بہت اختیارات ہوتے ہیں۔ شبے کی بنا پر بھی ہم کسی کو پکڑ سکتے ہیں اور اس سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہمیں شک ہو جائے کہ کوئی بھی شخص قانون کے رکھوالوں کو غلط راہ پر ڈال کر مالی فائدہ اٹھا رہا ہے تو ہم اس کا توڑ بھی جانتے ہیں۔ تمہارے مالک محمود حسن نے پہلے ڈاکے کی رپورٹ لکھائی، پھر تفتیش کے وقت بھی یہ بیان دیا کہ ڈاکو پچاس ہزار روپے نقدی اور زیورات کی شکل میں لوٹ کر لے گئے۔ ان کا بیان ہمارے پاس موجود ہے جس پر انہوں نے دستخط بھی کئے ہیں۔ محمود حسن نے غلط رپورٹ لکھائی اور جھوٹا بیان دیا جو کہ جرم ہے۔“

”لیکن آپ اس الزام کو کس طرح ثابت کر سکتے ہیں؟“ میں نے یہ سوال کر کے تھانیدار کو تلاشی پر اکسایا۔

”ابھی ثابت ہوا جاتا ہے، چلیں اندر۔“ تھانیدار بولا اور پھر اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

صائمہ، میں اور بتول، سپاہیوں کے حلقے میں اندر پہنچے۔ تھانیدار سیدھا صائمہ کے کمرے میں گھس گیا۔

”بیگم صاحبہ! اب آپ خود ہی اپنی مسری کا گدا ہٹا کر زیورات اور نقد رقم ہمارے حوالے کر دیں۔“ تھانیدار نے صائمہ سے کہا۔

صائمہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھی اور مسری پر بچھا ہوا گدا الٹ دیا۔ گدے کے نیچے ایک دری تھی۔ دری کے درمیان زیورات کے دو ڈبے اور نوٹوں کی گڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”چل بھی زمان علی۔ مال برآمد ہو گیا۔ رب نواز! تو بھی ادھر آ جا.....“ آپ ایک طرف بیٹھ جائیں بیگم صاحبہ اور ہمیں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے دیں۔“ تھانیدار نے ایک کرسی گھسیٹی اور مسری کے قریب بیٹھ گیا۔ ”دو عدد سونے کے کڑے، ایک پہنچی، ایک ہارنگ لگا ہوا، تین انگوٹھیاں، ایک تھہ اور.....“ تھانیدار زیورات کی تفصیل لکھواتا رہا۔

صائمہ سنگھار میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ فق تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں صائمہ کو مخاطب کیا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ! اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں۔ آپ نے تو وہی کیا ہو گا جو صاحب نے آپ سے کہا ہو گا۔“

”لے..... لیکن یہ پولیس والے مجھے..... مجھے اس جرم میں پکڑ لے گئے تو..... تو کیا ہو گا؟“ صائمہ نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”جو بات بھی ہے آپ صاف صاف تھانیدار کو بتا دیں۔ اس طرح آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“ میں نے اسے دانستہ یہ مشورہ دیا۔

صائمہ کے چہرے سے الجھن اور تشویش کا اظہار ہونے لگا جیسے اسے کسی فیصلے تک پہنچنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ ابھی اس کی عمری کیا تھی، اس نے دنیا ہی کتنی جھیلی تھی۔ جن حالات سے وہ دوچار تھی، اس کے لئے غیر معمولی ہی رہے ہوں گے۔ ایک طرف اسے اپنے شوہر محمود حسن کا خیال ہو گا کہ بچ بولنے کی صورت میں سارا الزام اس پر آ جائے گا، دوسری طرف اپنے بچے کی فکر ہو گی۔

ڈبوں میں موجود زیورات کی تفصیل لکھوا کر تھانیدار نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر وہ میری طرف مڑا اور بولا۔ ”آج بھی، تو بھی میاں آ جا اور نوکرائی کو بھی ساتھ لے آ۔ تم دونوں کو گواہ کے طور پر دستخط کرنے ہوں گے کہ تمہارے سامنے میاں سے یہ مال برآمد ہوا ہے۔“

بتول اور میں قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

”ایک ایک روپے کے نوٹوں کی آٹھ گڈیاں۔“ تھانیدار نے ہانک لگائی۔ ”تو لکھتا جا رہا ہے نا زمان علی؟“ تھانیدار نے ایک ایک کر کے نوٹوں کی وہ گڈیاں نیچے بھیجی ہوئی چادر پر پھینکنا شروع کیں۔ ”یہ ایک..... یہ دو اور تین.....“

زمان علی کاغذ کے ایک پیڑ پر تیزی سے پسل گھسیٹا رہا۔

ابھی یہ کارروائی جاری تھی کہ محمود حسن کے بھیجے ہوئے ملازم ایک کباڑیہ کو اپنے ساتھ لئے ہاں پہنچ گئے۔ دو پولیس والے انہیں صائمہ کے کمرے میں لے آئے۔ وہ حیران و پریشان سے کمرے کا منظر دیکھنے لگے۔ پولیس والوں نے تھانیدار کو بتایا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیوں آئے ہیں؟

تھانیدار نے ان ملازموں سے کہا۔ ”جب تک کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی، کوئی سامان میاں سے

مکرم روئیاں اور بھی ہوئی مرغیاں آ جاتی ہیں۔" میں دیکھ چکا تھا کہ کھانا پینا تھانیدار کی کمزوری ہے۔ میں نے اسی لئے اس کی دھکتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"کیوں بھی زمان علی! کیا خیال ہے؟" تھانیدار نرم پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر یہ اتنی ہی ضد کر رہا ہے تو کھانا کھا کر چلتے ہیں۔" زمان علی، تھانیدار کا مزاج بیاس معلوم ہوتا تھا۔

"یہ سمجھ لے بھی کہ زیادہ دیر نہیں لگنی چاہئے۔ مجھ سے زیادہ دیر بھوک برداشت نہیں ہوتی۔" تھانیدار مجھ سے بولا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں جناب! بس یوں گیا اور یوں آیا۔" میں نے چٹکی بجائی، پھر صائمہ کی طرف مڑا۔ "بیگم صاحبہ! پیسے دے دیں۔"

سنگھار میز پر صائمہ کا ہینڈ بیگ کھول کر کئی بڑے نوٹ مجھے دے دیئے۔

"رب نواز! تو بھی اس کے ساتھ چلا جا۔ سامان زیادہ ہو گا، اسے پریشانی ہو گی۔" تھانیدار نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ "چاند خان ہوٹل والے سے میرا نام لے دینا تاکہ وہ دنا میں دیکھ بھال کر دے۔ ہاں، سنو، مرغی کا گوشت کم ہو تو اپنے لئے بکرے کا بھنا ہوا گوشت لے لینا۔"

تھانیدار نے خواہ مخواہ اپنے ماتحت رب نواز کو میرے ساتھ کر دیا ورنہ میں واپسی میں زیادہ دیر نہ کرتا۔

میں کھانا لے کر لوٹا تو تھانیدار نے ڈرائنگ روم میں ڈیرا بجالایا تھا۔ صائمہ کے کمرے کو بند کر کے اس نے تالا ڈال دیا تھا۔ کوٹھی کے صدر دروازے پر دو سپاہی تعینات تھے۔ صائمہ اور بتول کو کوٹھی کے اندر نقل و حرکت کی آزادی مل گئی تھی۔

ڈرائنگ روم میں تھانیدار اور پولیس والوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کر کے میں اندر چلا گیا۔ صائمہ باورچی خانے کے سامنے ایک کرسی پر نڈھال سی بیٹھی تھی۔ بتول باورچی خانے میں کام میں لگی ہوئی تھی۔

"آپ اتنی کیوں پریشان ہیں بیگم صاحبہ! صاحب کو آ جانے دیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے صائمہ کو سمجھایا۔

صائمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہی ہوں مقصود کہ اس مصیبت کے وقت اگر تم نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ تھانیدار تو مجھے تھانے لے جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ پتا نہیں تمہارے صاحب کب تک آئیں گے اور پھر نہ جانے کیا ہو گا۔ تھانیدار کہیں انہیں پکڑ کر نہ لے جائے۔"

"صاحب کو آپ مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ انہوں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ وہ اس معاملے کو کسی نہ کسی طرح سنھال لیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ان مفت خوروں کو جا کر دیکھتا ہوں کہ انہیں کسی

ادھر ادھر نہیں ہو گا۔ تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے مالک کو فوراً یہاں بھیج دو۔ اگر میں یہاں نہ ملوں تو ان سے کہنا کہ وہ تھانے آ جائیں۔ انہوں نے آنے میں دیر کی تو یہ انہی کے لئے برا ہو گا۔ میں ان کی بیگم کو بھی ان کے جرم میں برابر کا شریک ہونے کی بنا پر حوالات میں بند کر سکتا ہوں۔"

ملازم آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اسی وقت کبازیا بول اٹھا۔ "تھانیدار جی! مجھے تو یہ لوگ سامان کا سودا کرنے ساتھ لائے تھے۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھ کو بھی جانے دیں۔ مجھے ہرگز یہ پتا نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھ سے چوری کے سامان کا سودا کر رہے ہیں۔ اونچی دکان پھیکا پکوان، آئندہ کبھی ادھر آ جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"اسے جانے دو۔" تھانیدار نے سپاہیوں سے کہا۔

کبازیا اس طرح سر پر پیر رکھ کر بھاگا کہ ایک لمحے کو بھی اور وہاں رک گیا تو تھانے کی ہوا کھانی پڑ جائے گی۔

میں نے محمود حسن کے ملازموں کو مختصر صورت حال سے آگاہ کر دیا اور وہ بھی تھانیدار سے اجازت لے کر چلے گئے۔

وہ کارروائی جو پندرہ بیس منٹ میں پوری ہو سکتی تھی، تھانیدار نے اس میں بہت دیر لگا دی۔ میرے اندازے کے مطابق شاید اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا۔ جس چادر میں زیورات اور نقدی تھی، اسے باندھ کر تھانیدار نے سیل کر دیا۔ برآمد ہونے والے مال کی فہرست پر زمان علی نے میرے اور بتول کے دستخط لے لئے۔ اس کے بعد تھانیدار نے سہمی ہوئی صائمہ کو مخاطب کیا۔ "جی بیگم صاحبہ! یہ بتائیں کہ آپ کے پہلے بیان کو سچ سمجھا جائے یا کوئی نیا بیان دینا چاہتی ہیں۔ بیان تھانے چل کر دیں گی کہ یہیں سب کچھ سچ اگل دیں گی؟"

صائمہ نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے تھانیدار سے کہا۔ "تھانیدار صاحب! بہتر یہ ہے کہ صاحب کو آ جانے دیں، بیگم صاحبہ نے جو کچھ بھی کیا ہے انہی کے کہنے پر کیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ جرم میں برابر کی شریک یہ بھی ہیں۔ کیس تو ان پر بھی بنے گا۔ یہ کس طرح سچ سکتی ہیں۔" تھانیدار کہنے لگا پھر اس کی سرشت عود کر آئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہل پڑتے دیکھے۔ وہ مجھے گھور کر بولا۔ "تو کیوں دیکھ بنا ہوا ہے بھی؟ لگتا ہے کہ میری نرمی سے تو کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کیا میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا کہ تو بول پڑا؟ میں کیا کسی کے باپ کا نوکر ہوں کہ یہاں بیٹھ کر تیرے صاحب کے آنے کا انتظار کرتا رہوں..... واہ بھی واہ۔ یہ بھی خوب رہی، نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ ذرا کسی کو ڈھیل دے دو تو وہ سر ہی پر چڑھنے لگتا ہے۔ دوسرہ ہو گئی اور ابھی تک میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس سے پہلے کہ تھانیدار مزید اپنی اصلیت پر اترتا، میں بول اٹھا۔ "جناب محترم قبلہ تھانیدار صاحب! کھانے کی بھی آپ نے بھلی فکر کی۔ ہم خادم آخر کس لئے ہیں۔ آپ تشریف تو رکھیں۔ ابھی گرا

میں لپکتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ مال مفت دل بے رحم کا نمونہ بنے ہوئے تھانیدار اور پولیس والے اس طرح کھانا کھا رہے تھے کہ ذرا بھی دیر لگائی تو کھانا غائب ہو جائے گا۔ تھانیدار نے مجھے دیکھا تو کھانے کے بعد پھلوں کی فرمائش کر دی۔ کہنے لگا۔ ”کھانے کے بعد اگر میں پھل نہ کھاؤں تو ایسا لگتا ہے جیسے کھانا ہی نہ کھایا ہو۔“

ڈرائنگ روم سے میں اگلے قدموں لوٹ رہا تھا کہ محمود حسن بوکھلایا سا آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

”مقصود!“ اس نے دور ہی سے مجھے آواز دی۔

”جی صاحب! آیا ابھی۔“ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

اپنے ساتھ آنے والوں کو محمود حسن نے برآمدے میں بھیج کر سیوں پر بٹھا دیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر صورت حال معلوم کی۔

”شاباش۔“ اس نے میری پشت تھپکی۔ ”نو کروں کو تمہاری ہی طرح وفادار اور عقلمند ہونا چاہئے۔ اچھا ہوا کہ تم نے کتوں کے آگے ہڈیاں ڈال دیں۔ اب میں ان سے بھگت لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

محمود حسن اپنے ساتھ جن دو آدمیوں کو لایا تھا، وہ خاصے بار سوخ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان کی پہنچ تھی۔ تھانیدار سے بھی ایک شخص کی یاد اللہ تھی۔ تھانیدار کھاپی کر ڈکار لیتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکلا تو محمود حسن اسے برآمدے میں لے گیا۔

”ارے حاجی صاحب! آپ اور میاں۔“ تھانیدار نے نوادروں میں سے ایک کو دیکھ کر کہا۔ اس کے لمبے میں حیرت تھی۔

”ہاں بھائی! جب تم اپنے پرانے کسی کا خیال نہیں کرو گے تو پھر.....“

”جناب! آپ نے مجھے اپنی کوٹھی پر بلوایا ہوتا۔“ تھانیدار بول اٹھا۔ ”ڈی ایس پی صاحب کو پتا چل گیا کہ آپ کو زحمت کرنا پڑی تو وہ کیا سوچیں گے، مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ محمود حسن صاحب آپ کے دوست ہوں گے۔“

”چلو خیر! اب تو معلوم ہو گیا۔ اس معاملے کو رفع دفع کرو۔“ حاجی صاحب نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔ وہ کہیں سے بھی حاجی صاحب معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ نہ تو ان کے چہرے پر دازھی تھی، نہ بزرگی کی کوئی اور نشانی بظاہر نظر آ رہی تھی۔ بش کوٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھے، عمر بھی کوئی زیادہ نہیں تھی۔

تھانیدار نے حاجی صاحب کی بات سن کر کہا۔ ”حاجی صاحب! جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ میں نے بھی گھٹا گھٹا کاپانی پیا ہے ورنہ تو آج پھنس گیا ہوتا۔“

”کیوں! ایسی کیا بات ہو گی؟“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر تھانیدار نے اپنے ماتحت زمان علی کو آواز دے کر بلایا اور اسے بولا۔

”ہاں ابھی زمان علی کہ محمود حسن صاحب کی کچی رپورٹ لکھی گئی ہے کہ کچی؟ روزنامے میں تو ابھی ان کی رپورٹ کا اندراج نہیں ہوا؟“

”جی نہیں! تقیٹش کے بغیر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے ممکن ہے سرا! زمان علی نے فوراً جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری رپورٹ ہی نہیں لکھی گئی۔“ محمود حسن بولا۔

”رپورٹ لکھ کر کیا اپنی گردن پھنسانی تھی جناب! اوپر والوں کو میں کیا جواب دیتا کہ میرے تھانے کی حدود میں اتنا بڑا ڈاکہ پڑ گیا اور میں مجرموں کو نہیں پکڑ سکا۔ آپ کو پتا نہیں جناب کہ ہم لوگوں کو کتنا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔“ تھانیدار نے اپنی صفائی پیش کی۔

حاجی صاحب کے برابر جو دوسرا شخص بیٹھا تھا، وہ کہنے لگا۔ ”بھائی محمود حسن! اب تم اس معاملے کو ختم کر دو تو بہتر ہے۔“

”ہاں اور کیا۔“ حاجی صاحب نے بھی گردن ہلائی۔ ”بھول جاؤ کہ تم نے کوئی رپورٹ لکھوائی تھی۔“

”آپ کا یہی مشورہ ہے تو پھر ٹھیک ہے۔“ محمود حسن نے آخر ہتھیار ڈال ہی دیے۔

”بس تو پھر معاملہ ختم۔“ حاجی صاحب نے تھانیدار کو مخاطب کیا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر حاجی صاحب!“ یہ کہتے ہوئے تھانیدار نے صائمہ کے کمرے کی چابی اپنی جیب سے نکال کر محمود حسن کے حوالے کر دی۔ اسی کے ساتھ اس نے زمان علی سے لے کر وہ

فرت بھی پھاڑ دی جس میں زیورات اور نقدی کی تفصیل لکھوائی تھی۔ پھر وہ محمود حسن سے بولا۔ ”جناب! اب آپ بے فکر ہو جائیں، تھانے جا کر میں آپ کی لکھائی ہوئی کچی رپورٹ بھی پھاڑ دوں گا۔“

میں برآمدے کے اندرونی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ محمود حسن کی سازش کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ عیار اگر چار سو بیسی کے کیس میں پھنس جاتا تو کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتا۔ اب تو اس کی کوٹھی میں مجھے یہ دوسرا ہی دن تھا۔ رات تو پھر آنے والی تھی۔

پہلے تو تھانیدار اپنے سپاہیوں کو لے کر رخصت ہوا، پھر حاجی صاحب نے کہا۔ ”اچھا تو محمود حسن! اب ہم بھی چلتے ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، چائے تو پی کر جائیں۔“ محمود حسن نے یہ کہہ کر مجھے مخاطب کیا۔ ”جاؤ اچھی کی چائے.....“

حاجی صاحب نے بات کاٹ دی۔ ”نہیں! میں دوپہر کے وقت چائے نہیں پیتا۔ اب چلے ہی دو، تمہاری وجہ سے ایک ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”پھر تو میں آپ کو نہیں روکوں گا۔“ محمود حسن نے کہا۔

حاجی صاحب اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ دوسرا شخص بھی انہی کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں اپنی موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔

صائمہ کے اجازت چرے کی رونق لوٹ آئی۔ رات ہونے تک محمود حسن کی خواب گاہ کی صفائی ہو گئی اور نیا فرنیچر آگیا۔ اس نے اپنی دکان سے ملازموں کو دوبارہ بلوایا تھا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ کام کرنا پڑا۔

رات کو جب محمود حسن کھانا کھا کر چائے پی رہا تھا تو صائمہ سے بولا۔ ”آج کا دن بہت ہی بڑا مگر۔“

”واقعی۔“ صائمہ نے گردن ہلائی۔ ”اللہ ہی دور رکھے ان پولیس والوں سے۔ میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔“

”بندر بھکیاں دیتے ہیں یہ پولیس والے۔ تھانیدار کو تم دیکھتیں تو حیران رہ جاتیں۔ حاجی صاحب کے سامنے بالکل بھیگی بلی بن گیا تھا۔“ محمود حسن نے یہ کہہ کر تائیدی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں مقصود! تم تو موجود تھے اس وقت۔“

”بالکل بیگم صاحب! ساری اکڑنوں نکل گئی اس کی۔ میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ صاحب کو آجانے دیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہی ہوا۔“ میں نے محمود حسن کی تائید کر دی۔ ”ہمارے کمرے کا نیا فرنیچر تمہیں کیسا لگا مقصود! ہماری شان کے مطابق تو ہے نا؟“

”لاجواب ہے جناب!“ یہ کہہ کر میں نے دانستہ اسے گزشتہ رات کا واقعہ یاد دلایا۔ ”آج کی رات ذرا چوکنا سونا پڑے گا۔ وہ کم بخت ڈاکو جو کل توڑ پھوڑ کر کے فرار ہو گئے تھے، کہیں دوبارہ نہ آجائیں۔“ چند لمحوں کو محمود حسن کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا صائمہ بول اٹھی۔ ”مجھے تو اکیلے کمرے میں سوتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کہیں تو میں اپنے کمرے میں بتول کو سلا لوں۔“

”مقصود! تم بھی عقل سے بالکل پیدل ہو۔“ محمود حسن مجھ پر گرم ہو گیا۔ ”تمہیں اس منہوں واقعے کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی اس وقت؟“

”میں نے تو جناب احتیاطیہ بات کہہ دی تھی۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔“

”زیادہ قابلیت نہ بگھارا کرو۔ آدمی کو اپنی اوقات دیکھ کر منہ کھولنا چاہئے۔“ محمود حسن نے سرگرم کی طرح رنگ بدل لیا۔ ”جاء! اپنے کمرے میں، جب دیکھو سر پر سوار کھڑے رہتے ہو۔ ضرورت ہوئی تو گھنٹی بجاکر بلا لوں گا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نوکروں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہئے۔“

میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ اگر ایک مظلوم آدم زاد کی مدد کرنا میرا مقصد نہ ہوتا تو محمود حسن کا سارا بڑبڑلا پن خاک میں ملا دیتا، بعد میں جو بھی ہوتا کسی طرح بھگت ہی لیتا۔ مجھے بھی اس آدم زادوں کے درمیان رہتے ہوئے خاصے دن ہو گئے تھے۔ ایک سے ایک ٹیڑھے آدم زاد سے واسطہ نہ چکا تھا۔ محمود حسن لاکھ الگ مزاج و انداز کا سہی، تھا تو آدم زاد۔

☆=====☆

اپنے کمرے میں آکر میں نے ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کیا۔ جذبات کی دھند میں بعض

اوقات حقائق چھپ جاتے ہیں۔ میں نے اسی لئے محمود حسن کے رویے کو پس پشت ڈال دیا۔ میرے سامنے کئی راہیں تھیں اور مجھے فی الحال کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ رات کا سناٹا پھیلنے سے پہلے میں ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔ میں نے دانستہ انسانی ہیئت ترک نہیں کی اور دبے قدموں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ جن زاد بننے میں مجھے دیر ہی کتنی لگتی۔

بتول مجھے بتا چکی تھی کہ ملازموں کو کسی ضرورت سے رات کے وقت بلانے کے لئے کوٹھی کے دائیں پہلو کی طرف ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے۔ میں اسی بھڑے ہوئے دروازے کو کھول کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ چھوٹی سی ایک راہداری عبور کر کے میں ایک دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ یہ وہ حصہ تھا کہ جہاں ”سید بادشاہ کی چوکھٹ“ تھی۔ خلاف معمول کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک سایہ سا متحرک نظر آیا۔ وہ سایہ چوکھٹ ہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے ہوئے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔

چند ہی لمحے بعد ہلکی سی آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازہ کھولا گیا ہو۔ میں نے آڑ سے نکل کر دیکھا تو وہ سایہ چوکھٹ عبور کر کے کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ پھر میں نے ایسی آواز سنی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوٹھری کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا گیا ہے۔

میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور میں بچوں کے بل دوڑتا ہوا محمود حسن کی خواب گاہ تک پہنچا۔

اس کی خواب گاہ میں حسب معمول ہلکے نیلے بلب کی روشنی پھیل ہوئی تھی لیکن مسہری پر محمود حسن موجود نہیں تھا۔

ایک اور معمر، میرا ذہن الجھ گیا۔ اگر وہ سایہ محمود حسن ہی کا تھا تو وہ اس کوٹھری میں رات کے وقت کیا کرنے گیا تھا؟

سید بادشاہ کی چوکھٹ سے وابستہ تمام باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد آیا کہ محمود حسن نے گزشتہ رات پیر منگھو کی کسی مائی کا ذکر بھی کیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”میں سمجھ چکا ہوں کہ تو کوئی غیبت روح ہے۔ تیری بو مجھے محسوس ہو گئی ہے۔ تجھے یقیناً اسی حرافہ نے بھیجا ہو گا جو پیر منگھو کی مائی کھلاتی ہے۔ میں ابھی تجھے تیری خباثت کا مزہ چکھاتا ہوں۔“

اسی کے فوراً بعد محمود حسن نے کوئی عمل پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اسے عمل پورا نہ کرنے دیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر منگھو کی مائی کوئی نہ کوئی تھی ضرور۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ محمود حسن اور اس مائی کے درمیان کسی معاملے پر کوئی چپقلش بھی چل رہی تھی۔ میں نے سوچا، تو کیا محمود حسن اس وقت سید بادشاہ کی کوٹھری میں کوئی شیطانی عمل پڑھنے گیا ہے؟

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ چونک اٹھا۔ میں نے کہیں دور سے آتی ہوئی کسی کے قدموں کی چاپ کُن لی تھی۔

گزشتہ رات بھی محمود حسن سے الجھ کر مجھے کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ بس اتنا ہی تو ہوا کہ میں نے

اسے اس کی خود سری کا مزہ پکھا دیا۔ اصل معاملہ تو اپنی جگہ رہا۔ اس پر اوجھا ہاتھ ڈالنا فضول ہی ہوتا۔ پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اس کے بچ کر نکلنے کی تمام راہیں مسدود کر دوں۔ جلد بازی کی صورت میں یہ بھی امکان تھا کہ میرا راز کھل جاتا۔ پھر وہ مجھے لمحے بھر کو بھی اپنی کوٹھی میں پروا نہ کرتا۔

سید بادشاہ کی کوٹھری سے اتنی جلدی واپسی سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ محمود حسن وہاں کسی اور ہی سبب سے گیا ہو گا۔ قریب آتی ہوئی قدموں کی چاپ محمود حسن کے سوا اور کس کی ہوتی۔ میں اسی لئے فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب انسانی ہمت اختیار کئے رہتا میرے لئے خطرناک ہوتا۔

میں نے یہ اندازہ تو پہلے ہی لگا لیا تھا کہ سید بادشاہ کی کوٹھری میں میرا کوئی ہم جنس موجود نہیں۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو اب تک ظاہر ہو جاتا۔ پہلے میں اسی عقدے کو حل کرنے وہاں پہنچ گیا۔ محمود حسن کی خواب گاہ وہاں سے دور تھی، پھر بھی میں نے جگت سے کام نہ لیا۔

چو کھٹ کے سامنے جا کر میں وقت گزرنے کا انتظام کرتا رہا کہ اس عرصے میں محمود حسن سو جائے۔ اسی کے ساتھ احتیاط کے طور پر گمرے گمرے سانس لئے کہ اگر وہاں اس وقت کوئی جن زاد ہو تو مجھے اس کی بو آجائے۔ میں نے کوئی بو محسوس نہ کی اور مطمئن ہو گیا۔

کچھ وقت گزر گیا تو میں نے کوٹھری کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ہم جن زاد اندھیرے میں بھی چیزوں کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ کوٹھری بالکل خالی تھی، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ وہاں گرد و غبار نہیں تھا جیسے اس کی صفائی کی جاتی رہی ہو۔ سامنے ہی چھوٹے سے ایک آتش دان کے اوپر بدہمت سا ایک مجسمہ رکھا ہوا دکھائی دیا۔ چاروں طرف سپاٹ دیواریں تھیں۔

اللہ کا نام لے کر میں کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس بدہمت مجسمے کو قریب سے دیکھنے کے لئے میں آگے بڑھا کہ وہاں اسے دیکھنے کے سوا اور کچھ تھا بھی نہیں۔ میں جیسے ہی آتش دان کے پاس پہنچا، روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسی کے ساتھ ٹانوں کی ایک آواز اتنی زور سے ابھری کہ ساری کوٹھی گونج اٹھی۔ مجھے اگر محمود حسن کے بیدار ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تا تو ہرگز وہاں سے نہ بھاگتا۔

ایک لمحے بھی وہاں مزید رکے بغیر میں اپنے کمرے میں آ گیا اور انسانی قالب اختیار کر لیا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ کوٹھی کے اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور جی بھی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے یوں لگا کہ کوئی اسی طرف دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کے بعد کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

”کون..... کون؟..... کون ہے؟“ میں نے چند لمحے بعد خوفزدہ سی آواز میں زور سے پوچھا۔

”دروازہ کھولو!“ کوئی باہر سے بیخفا یہ محمود حسن کی آواز تھی۔

”ابھی کھولتا ہوں صاحب!“ میں جلدی سے اٹھا اور جی جلا کر دروازہ کھول دیا۔

”کیا کر رہے تھے تم؟“ محمود نے مجھے گھور کر پوچھا۔

”سو رہا تھا جناب!“ میں نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”کبھی کی تھنی، بجا کر مجھے بلایا ہوتا جناب! میں خود حاضر ہو جاتا۔“

”مجھے خود اس لئے آنا پڑا کہ تم بہرے ہو۔“

”نہیں..... نہیں تو جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تو سب کچھ صاف صاف سنائی دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دروازے پر دستک سن کر میں نے شاید دروازہ کھولنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔“ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ اس عیار شخص نے مجھے گھٹی بجا کر کیوں نہیں بلایا۔ یقیناً وہ یہ دیکھنا چاہتا ہو گا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں کہ نہیں۔

”کوٹھی میں اتنا ہنگامہ ہوتا رہا اور تم بے خبر سوتے رہے؟“ محمود حسن چپیتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا..... کیا آج..... آج رات بھی کوٹھی میں ڈاکو گھس آئے تھے جناب!“ میں نے سہمی ہوئی سی آواز میں دریافت کیا۔

”جنم میں جھوٹو ڈاکوؤں کو اور میرے ساتھ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے پلٹا۔

”سر دی ہے جناب! ذرا چادر اوڑھ لوں۔“ میں نے بستر سے چادر اٹھائی اور اسے اوڑھ کر محمود حسن کے ساتھ چل دیا۔

محمود حسن مجھے ساتھ لئے سیدھا صائمہ کے کمرے میں آ گیا۔ صائمہ کے کمرے ہی میں بتول فرش پر بستر بچا کر سوئی تھی۔ اس کی حالت غیر تھی۔ صائمہ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ کوٹھی میں اب وہ تیز غیر مانوس آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔

”ایک گلاس پانی دو مجھے۔“ محمود حسن نے مجھے حکم دیا۔

صائمہ کی خواہ گاہ میں پانی موجود تھا، میں نے جلدی سے گلاس میں پانی لا کر دے دیا۔

محمود حسن نے کچھ پڑھ کر پانی پر دم کیا اور پھر بتول کے قریب بیٹھ گیا۔ بتول کے ہاتھ پیرا کڑے جا رہے تھے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

”اے سارا دے کر اٹھاؤ۔“ محمود حسن نے مجھ سے کہا۔

دم کیا ہوا پانی پی کر حیرت انگیز طور پر ذرا ہی دیر میں بتول کی حالت سنبھل گئی۔

”صائمہ بیگم! تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟“ محمود حسن اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

”یہ..... یہ تو آپ..... آپ ہی جان سکتے ہیں۔ میں..... میں کس طرح ایسی باتیں

سمجھ سکتی ہوں۔“ صائمہ خوفزدہ سی آواز میں کہنے لگی۔ ”میری آنکھ تو اس وقت کھلی کہ جب بتول زور زور سے چیختی لگی اور..... اور پھر میں بھی ہر طرف سے آنے والی ایک تیز آواز سے ڈر گئی۔ آپ اگر

نہ آجاتے تو شاید میں بے ہوش ہو جاتی۔ اللہ خیر کرے، جانے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ محمود حسن بولا۔ ”کسی نے آج رات سید بادشاہ کی چو کھٹ پار کی تھی۔“

”نن..... نہیں!“ صائمہ اور سسم گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اسی وجہ سے سید بادشاہ کو جلال آگیا۔“ محمود حسن نے بتایا۔ اس کے لہجے سے عیاری جھلک رہی تھی۔

”لیکن..... لیکن ایسا کون کر سکتا ہے؟“ صائمہ نے سوال کیا۔

”کوئی ہے میرا دشمن جو مجھے اس طرح نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ کسی دن تو وہ میرے ہتھے چڑھ ہی جائے گا۔ آج رات تو وہ ڈر کر بھاگ گیا۔ اگر فرار نہ ہو جاتا تو سید بادشاہ اس کی بے ادبی پر اسے جلا کر خاک کر دیتے۔ اب تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے ہر طرف دم کر دیا ہے۔ اب وہ کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا۔“ محمود حسن نے اپنی بیوی کو دلاسا دیا۔

”کل رات بھی شاید آپ کے اسی دشمن نے توڑ پھوڑ کی ہوگی۔“ صائمہ بولی۔

”کل کی بات چھوڑو۔ کل رات کا آج کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اور معاملہ تھا، یہ اور پکڑ ہے۔ یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں۔ اب تم سونے کی کوشش کرو اور کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کو بھول جاؤ۔“ محمود حسن نے تاکید کی۔

”مجھے نیند..... نیند نہیں آئے گی۔ آپ یا تو میرے ہی کمرے میں آ جائیں یا پھر مجھے اپنے کمرے.....“

محمود حسن اپنی بیوی کی بات پر ہنس دیا۔ ”میری بیوی ہو کر اتنا ڈرتی ہو تم..... خیر، کرتے ہیں کچھ۔“ یہ کہہ کر محمود حسن میری طرف پلٹا۔ ”سنو میاں بہرے خان! یہ بتول بھی ڈری ہوئی ہے۔ اب اس کی حالت ٹھیک ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں، تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یا تو تم اس کے کمرے میں اپنی چارپائی بچھا لو یا چاہو تو اس کی چارپائی اپنے کمرے میں اٹھا لانا۔ اب اگر آئندہ تم اس طرح غافل سوئے تو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دوں گا۔ ایسا تو نہیں کہ تم کوئی نشہ دہ کرتے ہو کہ اٹھا لگایا اور غیس ہو گئے۔“

”جی نہیں جناب! میں ایسا نہیں ہوں۔ آپ چاہیں تو میرے کمرے کی تلاشی لے لیں۔“ میں نے صفائی پیش کی۔

”کبھی تم نے کسی چیل کے گھونسلے میں گوشت دیکھا ہے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا جناب!“

”اس لئے نہیں سمجھے کہ تمہاری کھوپڑی میں گودا ہی نہیں، خالی ہے بالکل..... اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے بے وقوف آدمی! جس طرح چیل کے گھونسلے میں گوشت نہیں ہوتا، وہ اسے فوراً پٹ کر جاتی ہے، یہی حالت نشے باز کی ہوتی ہے، وہ انیون کھاتا ہو کہ چرس پیتا ہو، جب تک کھانہ لے یا پی نہ جائے اسے چین نہیں آتا۔ یہی حال شرابیوں کا ہوتا ہے۔ عادی شرابیوں کے پاس تمہیں کبھی شراب نہیں ملے گی، جتنی بھی ہو چڑھا جاتے ہیں۔ اب میری بات سمجھے کہ میں تمہارے کمرے کی تلاشی کیوں نہیں لیتا چاہتا۔“ محمود حسن اپنی عادت کے مطابق میری ہنک کرنے سے باز نہ آیا۔ دوسروں کو ذہنی

اذیت پہنچا کر وہ خوش ہوتا ہے، یہ بات اب میرے لئے نئی نہیں رہی تھی۔

میں نے اپنی صفائی میں صرف اتنا ہی کہا۔ ”یہ کہتا تو بے ادبی ہے جناب کہ آپ کو میری طرف سے غلط فہمی ہو گئی ہے، ہاں اتنا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ غلطی میری ہی ہے کہ مجھے اس طرح بے خبر نہیں سونا چاہئے تھا۔“

”دفا دار اور سمجھ دار نوکر اپنی غلطی پر معافی مانگ لیتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ بھی سکھانا پڑے گا۔“ وہ اور ایشہ گیا۔

بتول نے مجھ سے سرگوشی کی۔ ”معافی مانگ لو، اس سے صاحب خوش ہو جاتے ہیں۔“

”جناب! مجھے معاف کر دیجئے۔“ میں نے جان چھڑانے کے لئے بتول کا مشورہ فوراً مان لیا۔

”شباب! معاف کیا تمہیں۔“ یہ کہتے ہوئے محمود حسن کی باپھیں کھل گئیں۔ ”اب جاؤ تم دونوں۔“

محمود حسن کو پیسے کی گرمی چڑھ گئی تھی اور جسے پیسے کی گرمی چڑھ جائے اس کا دماغ اسی طرح خراب ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو عقل کل اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ میں اندر ہی اندر چیخ و تاب کھاتا ہوا بتول کو ساتھ لئے صائمہ کے کمرے سے نکل آیا۔ بتول کا بستر میں نے لیٹ کر بغل میں دبایا تھا۔ آدم زاد ہو کہ جن زاد اپنی تذلیل پر غصہ کسے نہیں آتا۔ ہم جن زادوں کی اکثریت تو فطرتاً کچھ زیادہ ہی غصہ ور ہوتی ہے۔ اس میں کچھ ہمارے خمیر کو بھی دخل ہے۔ ہر چند کہ پہلے میں نے محمود حسن کو نہ ستانے کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر وہ فرعون بے ساماں بنا ہوا تھا، میں بھی آخر تک برداشت کرتا۔ مجھے غریب، ضرورت مند اور بے سارا جان کر وہ حد سے تجاوز کر رہا تھا۔

بتول کی چارپائی میں اپنے کمرے ہی میں اٹھا لایا اور بستر بچھا کر اسے گہری نیند سلا دیا۔ اب وہ صبح ہونے سے پہلے نہ اٹھتی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنی اصلیت پر آگیا، یعنی آدم زاد سے جن زاد بن گیا۔

محمود حسن مجھے اپنی خواب گاہ میں ہی ملا۔ اب تک وہ سویا نہیں تھا۔ صائمہ اس کی مسہری کے قریب ہی نیچے فرش پر بستر بچھائے لیٹی تھی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تناسونے کی عادت ہے۔“ محمود حسن کروٹ لے کر بولا۔

”جی..... مجھے معلوم ہے۔“ یہ کہتے ہوئے صائمہ نے سسکی سی لی اور اپنا بازو سہلانے لگی۔ پھر وہ بولی۔ ”آ..... آپ نے میرے بازو پر اتنی..... اتنی زور سے چنگلی لی ہے کہ..... کہ نیل پڑ گیا ہے۔ اس سے آپ کو کیا..... کیا مل جاتا ہے۔“

”بس اچھا لگتا ہے مجھے تمہیں سسکتے جھلکتے دیکھ کر..... مزہ آتا ہے مجھے۔“ پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”یہی بستر ہے کہ شرافت کے ساتھ سو جاؤ ورنہ وہی شکر دوں گا جو پچھلے ہفتے کیا تھا۔ زیادہ نخرے نہ دکھایا کرو مجھے..... جٹ لائن کی اس جھلکی کو مت بھولا کر دو کہ جہاں پڑی تم سڑ رہی تھیں..... دعا دو راجہ کو کہ وہ تمہیں اس گندگی سے نکال کر یہاں تک لے آئی۔ تم سے تو ذرا سی مار برداشت نہیں

ہوتی۔ ایک رابعہ تھی کہ اس نے ساری زندگی مار کھا کے گزار دی۔ کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جب چاہوں تم جیسی دس عورتیں بیاہ کر لے آؤں۔ سونے دو مجھے ورنہ منہ پر کپڑا باندھ کر اتنی مار لگاؤں گا کہ کئی دن تک بستر پر پیار بنی پڑی رہو گی..... اب تمہاری منحوس آواز مجھے سنائی نہ دے۔“

صائمہ نے چپ سا دل۔ محمود حسن نے اس کی طرف سے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ محمود حسن سوچکا ہے تو بتول ہی کی طرح صائمہ کو بھی غافل کر دیا۔ پھر محمود حسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بڑی حد تک اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ گزشتہ رات سید بادشاہ کی چوکھٹ کے سامنے صائمہ بیوہ ہو جانے کی دعا کیوں مانگ رہی تھی۔ میرے ساتھ محمود حسن کا سلوک صائمہ کے مقابلے میں عشرِ عشر بھی نہیں تھا۔ مجھے اس وقت اتنا ہی غصہ آگیا کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر میں نے سوتے ہوئے محمود حسن کی دھنائی شروع کر دی۔

”بھول انسان بنے گا یا نہیں؟“ میں غصے کے عالم میں اسے مارتے ہوئے چیختی لگا۔
”تُو..... تُو پھر..... پھر آگیا۔“ وہ بھی پختے ہوئے چیخا۔ ”پیر منگھو کی مائی..... ہائے..... تجھے دیکھ لوں گا میں۔“

اس ڈھیٹ کو میں نے جیسے ہی کچھ پڑھتے دیکھا، وہاں سے غائب ہو گیا۔ صبح ہونے تک میں نے کئی بار اس کی پٹائی کی۔ وہ جب بھی نڈھال ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگتا، میں کبھی اسے گھسیٹ کر مسہری سے نیچے گرا کر بھاگ جاتا، کبھی ٹھنڈا پانی لا کر اس پر ڈال دیتا اور کبھی جسم کے کسی حصے پر ضرب لگا کر راہ فرار اختیار کر لیتا۔ میں نے اسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کوئی شیطانی عمل پڑھ کر مجھے نقصان پہنچاتا۔ اسی کے ساتھ اسے مارتے پیٹتے ہوئے میں نے حد سے تجاوز نہیں کیا۔ اسے میں نے اذیت تو پہنچائی مگر اتنی کہ وہ برداشت کر سکے۔ خود وہ بھی تو صائمہ کے ساتھ ایسا ہی کر رہا تھا۔

ابھی صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے کہ میرے کمرے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ بتول سوتے سوتے ایک دم گھبرا کر اٹھ گئی۔ میں اب علیالیش سے مقصود بن چکا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اپنے بستر پر آ کے لیٹا تھا۔

”مقصود..... اے مقصود! گھنٹی بج رہی ہے، اٹھ جاؤ۔“ بتول مجھے زور زور سے آوازیں دینے لگی۔

”ہاں..... آں اٹھتا ہوں۔“ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے اس طرح کہا جیسے ابھی آنکھ کھلی ہو۔
”جلدی سے اٹھ کر چلے جاؤ ورنہ صاحب ناراض ہوں گے۔“ بتول بولی۔ ”میں بھی چلتی ہوں۔ پتا نہیں صبح ہی صبح کیا کام پڑ گیا۔“

میں اور بتول آگے پیچھے تیز تیز چلتے ہوئے کوٹھی کے اندر پہنچے تو دور ہی سے محمود حسن کے چیخنے

کی آواز آنے لگی۔ ”دفع ہو جا میرے کمرے سے، تجھ جیسی بے حس اور حرام خور عورت نہیں دیکھی میں نے۔ اتنی آوازیں دیتا رہا کہ اٹھ جا صائمہ، اٹھ جا، مگر مکر بنائے پڑی رہی۔ ذلیل کہیں کی۔“
”صاحب بہت زیادہ غصے میں معلوم ہوتے ہیں، اللہ ہی خیر کرے۔“ بتول کا پختی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

ہم دونوں وہاں پہنچے تو صائمہ کو تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں گھستے دیکھا۔ وہ یقیناً ہم نوکروں کے سامنے اپنی بے عزتی نہیں چاہتی ہوں گی۔

”کہاں مر گئے تھے تم دونوں؟ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہا ہوں۔“ محمود حسن ہمیں دیکھتے ہی دھاڑا۔
اس کی حالت قابلِ رحم ہی تھی۔ رات بھر گائے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بیٹھے ہوئے کپڑے اس نے بدل کر گرم شال اوڑھ لی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ بھی لگا ہوا تھا، مگر چہرے پر سوچن تھی اور سر کے بال بھی بے ترتیب تھے۔

”جناب! گھنٹی کی آواز سننے ہی ہم دونوں بھاگے ہوئے آرہے ہیں۔ حکم فرمائیں۔“ میں جواب میں بولا۔

”کیا تم اندھے ہو۔ نظر نہیں آ رہا کہ میرے کمرے کی کیا حالت ہے؟ میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا بستر اٹھاؤ میاں، الماری سے دوسرا بستر نکال کر بچھاؤ..... ہیر چیر اپنی جگہ ہونی چاہئے۔“ یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا۔

کام اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا محمود حسن نے شور مچایا تھا۔ گیلیا بستر سوکھنے کے لئے میں لان میں ڈال آیا، پھر دیوار گیر بڑی الماری کے نیچے والے کمرے سے درمی پتلا سا ایک گدا، کبل اور چادر نکال کر مسہری پر بستر بچھا دیا۔ اس عرصے میں بتول چائے بنا کر محمود حسن کو دے آئی اور صائمہ کا بستر بھی وہاں سے اٹھا لے گئی۔

اٹھ بجے کے قریب جب محمود حسن ناشتہ وغیرہ کر کے تیار ہو گیا تو اس نے مجھے بلا کر کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”کہاں جناب؟“ میں نے پوچھا۔
”جنم میں۔“ اسے غصہ آگیا۔ ”تم میرے نوکر ہو کہ کچھ اور؟ بولو۔“

”آپ کا نوکر ہوں جناب!“ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہہ دیا۔ کیوں کہ غصے کی اصل وجہ مجھے معلوم تھی۔ اس کا غصہ میری ہی مار پیٹ کا نتیجہ تھا۔ میں نے اسی لئے اس وقت اس کے بھلانے اور آپے سے باہر ہونے کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

”تو پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ نوکروں کو سوال کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ جو میں کہوں، وہ کرتے رہو۔ جاؤ اور جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔ صورت پر پھنکار برس رہی ہے۔ بیگم صاحبہ نے اپنے پہلے نوکر کے لئے عید کے موقع پر ایک نیا جوڑا بنوایا تھا، تمہارے کمرے میں جو بکس ہے اسی میں پڑا ہو گا وہ جوڑا پہن لو۔ اگر بکس میں نہ ملے تو بیگم صاحبہ سے معلوم کر لینا۔“

”ارے واہ، تم نے تو واقعی انجن اشارت.....“

ابھی محمود حسن پورا جملہ ادا نہ کر سکا تھا کہ میں نے موٹر کو سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا۔
”لگتا ہے کہ تم عقل سے بالکل ہی پیدل نہیں ہو۔ چلو اسی خوشی میں تمہاری تنخواہ میں نے دو روپے مہینہ اور بڑھادی، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی سختی سے واسطہ پڑا تھا۔ آج کے بعد سے تم اب روز مجھے دفتر چھوڑو گے اور کوٹھی واپس لے کر آؤ گے۔ تمہارے لئے میں ایک دردی بھی سلوا دوں گا۔ موٹر کے ساتھ ڈرائیور بھی ہو تو ذرا شان بڑھ جاتی ہے۔ بس یہ ہے کہ صورت سے تم کچھ جتن قاتی لگتے ہو۔ سو یہ میں گوارا کر لوں گا۔“ آخر میں اپنی نفرت کے مطابق وہ کسی بچھو کی طرح ڈنک مارنے سے نہ چوکا۔
بولٹن مارکیٹ پہنچ کر اس نے ایک جگہ موٹر کو روکایا تو میں نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں جناب! میں ابھی اتر کر دروازہ کھولتا ہوں۔“

میں نے جلدی سے اتر کر اس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ موٹر سے اتر کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ مقصد یہی رہا ہو گا کہ کسی نے اسے موٹر سے اترتے دیکھا بھی یا نہیں اور یہ کہ اس کے ساتھ ڈرائیور بھی ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ اکا دکا آدمی ہی آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شاید اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، یعنی شان دکھانے کا موقع نہیں ملا۔

”چلو آؤ میرے ساتھ۔ موٹر کی چابی ادھر دو۔“ محمود حسن اس طرح بولا جیسے مجھے ڈانٹ رہا ہو۔

میں نے موٹر کی چابی اسے تمھادی اور اس کے پیچھے چلنے لگا۔

وہ پرانی سی ایک عمارت تھی کہ جس کی پہلی منزل پر محمود حسن کا دفتر تھا۔ دفتر کے سامنے پہلے ہی سے ایک آدمی کو میں نے کھڑے ہوئے دیکھا۔ محمود حسن کو اس نے جھک کر سلام کیا۔ جواب میں صرف سر ہلا کر محمود حسن نے اپنی شیردانی کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس آدمی کو دیا اور بولا۔ ”آج میں زیادہ دیر دفتر میں نہیں بیٹھوں گا۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ نیچے جا کر دکانیں کھولو، متین آ جائے تو اسے میرے پاس اوپر بھیج دینا اور ہاں یہ میری کوٹھی کا ملازم ہے، اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، مقصود نام ہے اس کا۔ متین سے بھی میں کہہ دوں گا کہ اسے خالی نہ بیٹھنے دے، تم بھی اسے مفت کی روٹی نہ توڑنے دینا۔ سمجھ کہ نہیں۔“

”جی انصو! سمجھ گیا۔ حکم کی تعمیل ہو گی۔“ کچے گندی رنگ والا وہ ادھیڑ عمر آدمی جواب میں بولا۔ پھندنے والی تری ٹوپی لگائے ہوئے وہ مجھے قدیم زمانے کی یادگار معلوم ہوا۔

”اور تم سنو مقصود!“ محمود حسن نے مجھے مخاطب کیا۔ ”دوپہر کے بعد کوٹھی پہنچ جانا۔ تمہیں گھر کا کام کاج بھی دیکھنا ہے۔ یہ بات اپنے دماغ میں بٹھالینا کہ تمہاری خدمت گزاری سے خوش ہو کر میں اگر تنخواہ میں اضافہ کر سکتا ہوں تو نافرمانی پر بطور سزا تنخواہ میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ متین سے تم واپسی کا کرایہ لے لیتا۔ اب جاؤ صادق کے ساتھ اور محنت سے کام کرو۔“

”چلو میاں مقصود! اب تک بھائی متین آگئے ہوں گے۔“ صادق نے مجھے شوکا دیا۔ قاف کی جگہ

میں نے فرماں برداری کے اظہار میں سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

میرے پیچھے پیچھے ہی بتول ناشتہ لے کر آگئی اور بولی۔ ”جلدی سے دو چار نوالے پرائٹے کے کھا کر چائے پی لو، کیا خبر کب لوٹنا ہو۔ اتنے میں تمہارے لئے کپڑے نکالتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ صاحب کون سا جوڑا پہننے کو کہہ رہے ہیں۔“

وہ بڑی ہمدرد اور اچھی عورت تھی۔ میں نے پرائٹے سے لقمہ توڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”تم نے بھی ناشتہ کر لیا یا نہیں؟“

”میرا کیا ہے، مجھے کون سا کہیں جانا ہے۔ ابھی تو میں نے بیگم صاحبہ کو ناشتہ کرایا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔“ بتول یہ کہتی ہوئی ایک طرف دیوار کے قریب رکھے ہوئے بکس کو کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔
بتول مجھے کپڑے دے کر کمرے سے نکل گئی۔ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ محمود حسن آخر مجھے اپنے ساتھ کہاں اور کیوں لے جا رہا ہے؟ کپڑے بدل کر میں کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔

میں بھاگ بھاگ اندر پہنچا تو بتول نے بتایا۔ ”صاحب ابھی باہر نکلے ہیں، کہہ گئے ہیں کہ تمہیں فوراً باہر بھیج دوں۔“

میں لپکتا ہوا اس کوٹھی کے برآمدے تک پہنچا تو محمود حسن کو موٹر میں بیٹھے دیکھا۔ قریب پہنچنے پر اس نے پھر ڈانٹ پلائی۔ ”بے وقوف آدمی! اتنی دیر لگا دی۔ چلو بیٹھو پیچھے، جلدی کرو۔“

دروازہ کھول کر بیٹھ بھی نہیں سکا تھا کہ اس نے موٹر اشارت کر دی۔ میں سیٹ پر گر پڑا تو وہ ہنسنے لگا۔ میرے خیال میں اس نے دانستہ یہ حرکت کی تھی اذیت پسند جو ٹھہرا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ تم اس سے پہلے کبھی موٹر میں بیٹھے نہیں۔“ اس نے مجھ پر طنز کیا۔

”اب ایسی بات بھی نہیں ہے جناب!“ میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”مجھے موٹر چلانی بھی آتی ہے۔“

”کیا کہا؟..... تم موٹر بھی چلانا جانتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا، پھر بولا۔ ”تم ہنساتے بہت ہو۔“

”اگر آپ میری بات کو جھوٹ سمجھ رہے ہیں تو آزما کر دیکھ لیں جناب!“

”یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں اپنی جگہ بٹھا کر اپنی موٹر کا بیڑا غرق کر لوں۔ خیر ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ تمہیں اگر موٹر چلانا آتی تو یوں دھکے نہ کھاتے پھرتے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سڑک کے کنارے موٹر روک لی، پھر کہا۔

”آؤ ذرا آگے۔“ میں پچھلا دروازہ کھول کر اترتا ہوا وہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

بڑے اعتماد کے ساتھ میں نے اگلا دروازہ کھولا اور پھر سیٹ پر بیٹھے ہی موٹر کا انجن اشارت کر دیا جو محمود حسن نے بند کر دیا تھا۔

لوگ بھی کسی کڑی کی طرح اپنے شکار کے گرد ایسا جال بننے ہیں کہ شکار ان کے جال سے نکل نہ سکے۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے اپنے مستقبل کے لئے جو راہ متعین کی، اس کا مقصد ہی مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلانا تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ راہ آسان نہیں اور اس میں بڑے سخت مقام آئیں گے۔ محمود حسن تو اس مقصد کے حصول کی خاطر پہلی میڑھی تھا۔ ابھی تو مجھے بت آگے جانا تھا۔ کتنے ہی ایسے ظالم آدم زادوں سے نمٹنا تھا۔ سو میں نے اسی دن سے ایک طریقہ کار وضع کر کے اس پر عمل شروع کر دیا۔ میں اپنی دانست میں ہر اونچ نیچ پر غور کر چکا تھا۔

متین لوٹ کر آیا تو اس نے صادق والی دکان سے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ محمود حسن نے شاید اسے میرے بارے میں کوئی خاص ہدایت دی تھی۔ اس نے ایک ملازم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ گودام چلے جاؤ، وہاں سے کچھ سامان اٹھا کر لانا ہے۔“

”لیکن یہاں تو پہلے ہی ساری دکان بھری پڑی ہے، مزید سامان آکیا تو کہاں رکھا جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میاں! اگر تمہیں کہیں جگہ نظر نہ آئے تو وہ سامان میری چاند پر رکھ دینا۔ ٹھیک ہے نا۔“ متین منہ بنا کر بولا۔ ”ہم تو یہاں اتنے دن سے گھاس کاٹ رہے ہیں۔ تم بتاؤ گے ہمیں کہ کیا کرنا ہے۔ زیادہ قابلیت نہ بھاڑو اور جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“

میں جواب میں کچھ کے بغیر اس ملازم کے ساتھ ہو لیا۔ اسی مارکیٹ کے پچھلے حصے میں وہ گودام تھا جہاں پہلے سے دو آدمی موجود تھے۔ گودام کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لکڑی کی دو بند پیٹیوں میں سے ایک اس ملازم نے اٹھالی اور دوسری پیٹی مجھ سے اٹھانے کو کہا۔ پیٹی بھاری تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میں اٹھانہ پاتا۔ ملازم کے ساتھ پیٹی اٹھائے ہوئے میں دکان پر واپس آ گیا۔ متین نے وہ دونوں پیٹیاں دکان کے قعرے کے نیچے ایک طرف رکھوا دیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد بازار میں خاصی چل پھل شروع ہو گئی۔ آنے والے سارے آدمی دونوں ہی دکانوں پر بھیڑ ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہاں مفت سامان بٹ رہا ہو۔ ”تین درجن یہ دینا، ایک گرس وہ دینا۔“ میں بھانت بھانت کی بولیاں سنتا رہا۔

”نمبر دو چاہئے، نمبر دو..... بھائی تمہیں یہ پیسے لینا۔“

دکان کے سارے ملازم جیسے پھر کئی بنے ہوئے تھے۔ میرا حال بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔ گوداموں کے پھیرے لگتے رہے، سامان آتا رہا، سیل ہوتا رہا۔ متین کاؤنٹر پر بیٹھا تھا، مگر نوٹ گنتے ہوئے بھی اس کی نظریں ادھر ادھر متحرک تھیں۔ مصروفیت کے باوجود میں اس دھندے کا خاموشی کے ساتھ جائزہ لیتا رہا۔ ابھی تک میں نے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔

اسی عرصے میں ایک گاہک سے متین کی تکرار ہو گئی۔

”تم نے مجھ سے نمبر ایک کے دام وصول کئے تھے اور مجھے دو نمبر مال بھیڑ دیا۔ یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔“ گاہک غصے میں کہنے لگا۔

”چینو مت اور ادھر آ جاؤ، دکانداری خراب نہ کرو۔“ متین نے اس گاہک کو اپنے پاس بلا لیا۔ ”ہاں

اس نے ”خ“ بولا تو میں سمجھ گیا کہ اس ادھیڑ عمر آدمی کا تعلق ہندوستان کے ایک علاقے حیدر آباد دکن سے ہے۔

اسی بلڈنگ کے نیچے مارکیٹ تھی۔ محمود حسن کی دونوں بڑی دکانیں آنے والی تھیں۔ ایک دکان کی ذمہ داری صادق پر تھی اور دوسری دکان کا ذمہ دار متین تھا۔ متین کی حیثیت محمود حسن کے دست راست کی تھی۔ یہ باتیں مجھے اسی روز معلوم ہو گئیں۔

میں صادق کے ساتھ نیچے پہنچا تو کئی ملازم آچکے تھے۔ انہی میں سے ایک متین تھا۔ وہ بھی صادق ہی کی عمر کا ہو گا۔ وہ مجھے صورت ہی سے چلتا پرزہ معلوم ہوا۔ دکانیں کھل گئیں تو میں نے دیکھا کہ ان میں دنیا بھر کا سامان بھرا پڑا ہے۔ سامان اتنا تھا کہ سیل مینوں کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نام کو تھی۔ انہی ملازموں میں مجھے وہ لوگ بھی دکھائی دیئے جو گزشتہ روز ایک کباڑیے کو ساتھ لے کر کوٹھی پہنچے تھے۔

اس سے پہلے کہ صادق، متین کو محمود حسن کا پیغام دیتا، متین مجھے دیکھ کر اس سے کہنے لگا۔ ”بھائی صادق! یہ آج تم کس نئے پنچھی کو گھیر لائے؟“

”بھائی متین! یہ حضور والا کا ذاتی ملازم ہے۔“ پھر اس نے متین سے میرا تعارف کرایا، اسی کے ساتھ محمود حسن نے جو کچھ کہا تھا، وہ بھی بتا دیا۔

”تم بھی ایک ہی شے ہو بھائی صادق! پہلے ہی بتا دیا ہو تاکہ طلبی ہے۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہتیں۔ اب اگر ڈانٹ کھائی پڑی تو میں سیدھے سیدھے تمہارا نام لے دوں گا۔ اللہ کے بندے! دکانیں کھلواتے رہتے۔ صوبہ صوبہ کون سے گاہک نیچے پڑ رہے ہیں؟“

”تمہیں اللہ کا واسطہ بھائی متین! میرا نام ہرگز نہ لینا۔ حضور کا مزاج آج کچھ برہم لگتا ہے۔“ صادق عاجزی سے بولا۔

”اچھا تو پھر میں ڈانٹ کھا کر ابھی آیا۔ اب تو کچھ عادت سی ہو گئی ہے ڈانٹ پھینکار کی۔ جس دن تمہارے حضور والا سے دو چار باتیں نہ سن لوں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ یہ کہہ کر متین لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ آدم زاد بھی کتنی قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی عزت نفس کی خاطر دولت و اقتدار کو ٹھکرا دیتا ہے اور اپنے خاک نشیں ہونے پر فخر کرتا ہے اور کوئی ذلت و خواری کو اپنی فطرت کا حصہ بنا لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظلوم رابعہ کا معاملہ میرے نزدیک سرفہرست تھا لیکن اب میں محمود حسن سے ملنے کے بعد اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دشمن کو زیر کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ میں نے انہی میں سے ایک پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ دشمن کی مجبوری بن جانا بھی ایک راستہ ہے۔ محمود حسن پر میں نے بلا سبب یہ ظاہر نہیں کیا کہ مجھ کو ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔

میرے خیال میں محمود حسن جیسے لوگ اپنی عیاری اور مکاری کے بل بوتے پر دوسرے آدم زادوں کے حقوق ان سے چھین لیتے ہیں۔ انہیں اپنے مخصوص جھکڑے استعمال کر کے پنپنے نہیں دیتے۔ یہ

اب کو، کیا بات ہے؟

وہ گاہک ایک بیگ میں سامان بھر کے لایا تھا۔ اس نے وہ بیگ، شوکیں پر رکھ دیا، پھر بیگ کو کھول کر سامان نکالتے ہوئے بولا۔ ”اس پر جعلی مر لگی ہوئی ہے۔ اتنی انگریزی مجھے بھی آتی ہے۔ میڈ ان انگلینڈ کی بجائے اس پر میڈ ان انگلینڈ کی مر لگی ہوئی ہے۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے نمبر ایک کے پیسے دیئے تھے؟“ متین حجت کرنے لگا۔
”اب تم ثبوت مانگو گے مجھ سے۔ اتنے دن ہو گئے تم سے لین دین کرتے ہوئے کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے؟“

”جھوٹ سچ کو بھاڑ میں ڈالو، تم نے مال لیتے وقت کیوں نہیں دیکھا؟ صبح سے شام تک پیسیوں گاہک آتے ہیں۔ اگر میں اسی طرح سب کی بات پر یقین کر لوں تو ہو گئی دکنداری۔“ متین نے کہا۔ ”مال واپس نہیں ہو گا۔“

”یہ مت بھولو متین کہ تمہاری دکان کا پرانا گاہک ہوں۔ محمود حسن صاحب کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بات ان تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ پھر تم مجھ سے شکایت نہ کرنا کہ میں نے پرانے تعلقات کا خیال بھی نہیں کیا۔“

میں نے اتنی دیر میں معلوم کر لیا کہ وہ گاہک غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پتا چل گیا کہ متین نے بھی دانت اسے دھوکا نہیں دیا، بھولے سے ایک ملازم نے نمبر دو مال دے دیا تھا۔ یہ بات بھی اس گاہک نے ٹھیک ہی کہی تھی کہ محمود حسن سے اس کی اچھی خاصی واقفیت تھی۔

”دودو صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے متین کو مخاطب کیا۔ ”نمبر دو مال واپس لے کر انہیں نمبر ایک مال دے دیں۔“

”کیا؟“ متین نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”تم انہیں کس طرح جانتے ہو اور تمہیں کیا معلوم کہ یہ سچ بول رہے ہیں؟“

”فضول باتیں چھوڑیں متین صاحب! جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کریں۔“ میں نے متین کو اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے لیا۔

”بہتر ہے مقصود میاں!“ متین بولا۔ پھر اس نے ایک ملازم سے گاہک کا مال واپس کر کے نمبر ایک مال دینے کو کہہ دیا۔

”تم نے دیکھا متین! اس نوجوان کو، یہ تم سے زیادہ مردم شناس ہے، تمہیں آدمی کی پہچان نہیں۔“

اب میری باری تھی، سو میں نے کہا۔ ”گلتا ہے کہ متین صاحب نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے ہیں۔“

متین کان دبائے میری باتیں سنتا رہا اور دکان کے دوسرے ملازم اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”تم مجھے بہت ڈپین، بردبار اور کاروباری معلوم ہوتے ہو۔ میں محمود حسن صاحب سے کوں گا کہ

متین کی جگہ تمہیں اس دکان کی ذمہ داری سونپ دیں۔ تمہیں آج میں نے پہلی بار دکان پر دیکھا ہے، پہلے کہاں تھے؟“ گاہک دودو نے مجھ سے پوچھا۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی متین نوٹ گنتے گنتے بول اٹھا۔ ”مقصود میاں! مالک کے خاص آدمی ہیں۔ یہ ان کی کوٹھی پر ہوتے ہیں۔ آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لئے انہیں دکان پر آنا پڑا۔“

”اچھا تو یوں کو، تبھی تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ تم نے اتنی جلدی مقصود میاں کی بات کیسے مان لی۔ تم سے مل کر بہت ہی خوشی ہوئی مقصود میاں! اتنی سی عمر میں اللہ نے تمہیں بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔“ دودو میری تعریف کرنے لگا۔

پھر دودو تو چلا گیا اور میں نے عملاً متین کی جگہ سنبھال لی۔ میرے ہی ایما پر اس نے بعد ہو کر مجھے اپنی جگہ کاؤنٹر پر بٹھا دیا تھا۔

صادق کو کسی مال کا سودا کرنے کے لئے متین سے مشورے کی ضرورت پڑی۔ وہ اپنی دکان سے اٹھ کر متین کے پاس آیا۔ اس نے جو مجھے متین کی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔ ”ارے میاں مقصود! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ بھائی متین نے تم کو اپنی جگہ کیسے بٹھا دیا؟“

”بھائی میرے، یہ تو آپ متین صاحب ہی سے پوچھیں۔“ میں نے ایک ملازم سے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

صادق نے اپنی دکان پر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اب تک یہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ متین کی حیثیت اب نمبر دو ہو چکی ہے۔

”تم کو بھائی صادق! بات کیا ہے؟“ متین نے صادق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ولایتی شراب کے چپکس کرٹ سستے داموں مل رہے ہیں، تم کو تو سودا کر لوں؟“ صادق نے رازدارانہ انداز میں متین کی طرف جھک کر کہا۔

اس سے پہلے کہ متین کچھ کہتا، میں بول اٹھا۔ ”نہیں، دو ایک روز میں بھاؤ گرنے والا ہے، کیوں کہ مارکیٹ میں خاصا مال آ گیا ہے۔ اب اتنی کھت نہیں ہو گی۔ کئی غیر ملکی جہاز بندر گاہ پر آ کے لگے ہیں۔ شام تک خود آپ کو پتا چل جائے گا۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھا کریں۔“

صادق حیران حیران سی نظروں سے کبھی متین کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔ ”تو پھر پانی کو واپس کر دوں؟“

متین بولا۔ ”جب مقصود میاں نے ایک فیصلہ کر دیا ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں ہے۔“

صادق یہ سن کر اپنی دکان پر واپس چلا گیا۔ مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ ایک اور ”پارٹی“ وہی سودا کرنے آ گئی۔ وہ پہلی پارٹی سے کم دام میں سودا کرنے پر آمادہ تھی۔ صادق اور متین دونوں ہی میری دوزاندیشی اور باخبری کے قائل ہو گئے۔ اسی کلا بعد میں نے ایک اجنبی شخص سے ولایتی کپڑے کے دل تھان خرید لئے اور اسے ادا لگی کر دی۔ صادق نے دبی دبی زبان میں کہہ ہی دیا کہ میں نے منگے

داموں سودا کیا ہے۔

”آپ کو خبر نہیں صادق صاحب کہ غیر ملکی کپڑا کسی بھاؤ اس وقت بازار میں نہیں مل رہا۔“ میں نے بتایا۔ ”یقین نہ ہو تو کسی کو کپڑا مارکیٹ بھیج کر پتا لگالیں۔ غیر ملکی کپڑا تو الگ رہا، ویسی لٹے کا بھاؤ بھی چڑھنے والا ہے۔“

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میری اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی۔

گزشتہ روز جو حاجی صاحب کو بھی پر آئے تھے، وہ دکان پر آ گئے۔ یہ وہی حاجی صاحب تھے کہ جنہوں نے محمود حسن کے خلاف بننے والا چار سو بیس کا کیس ختم کرایا تھا۔

”بھئی یہ آج محمود حسن صاحب کا دفتر کیسے بند ہے، کیا آج وہ آئے نہیں؟“ انہوں نے متین سے پوچھا۔

میں اسی وقت ایک گودام کا پھیرا لگا کر آیا تھا۔ تسلیم کے بنے ہوئے آئینے مجھے احتیاط سے گودام میں رکھوانے تھے۔

• ”معلوم نہیں جی، دفتر اگر بند ہے تو وہ نہیں آئے ہوں گے۔“ متین ایک ملازم کو غیر ملکی سینٹ کی تین شیشیاں پکڑاتے ہوئے بولا۔

حاجی صاحب کے چہرے پر ردکھا سایہ جو اب سن کر ناگواری کا تاثر پھیل گیا۔ میں نے اسی وقت حاجی صاحب کو مخاطب کیا۔ ”آپ حکم فرمائیں حاجی صاحب! اگر صاحب نہیں آئے تو ہم جو آپ کی خدمت کو یہاں موجود ہیں۔ صاحب کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں۔“

حاجی صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”میاں! تمہارا چہرہ کچھ دیکھا بھالا سا لگتا ہے۔ تم ہمیں کیسے جانتے ہو؟“

”آپ کل ہی تو کوٹھی پر تشریف لائے تھے۔ اتنی جلدی یہ خادم آپ کو کیسے بھول جاتا۔“

”خوش رہو میاں! اگر تم نہ ہوتے دکان پر تو شاید ہمیں مایوس ہی لوٹنا پڑتا۔ تم جیسے لائق ملازمین قسمت ہی سے لوگوں کو ملتے ہیں۔“ حاجی صاحب خوش نظر آنے لگے۔ پھر انہوں نے میرا نام پوچھا۔

”خادم کو مقصود کہتے ہیں۔“

”تمہارا نام یاد رہے گا مجھے، محمود کا ہم ضافیہ ہے۔ محمود حسن سے اب ملاقات ہوئی تو تمہاری لائق کا ذکر ضرور کروں گا۔ دراصل مجھے غیر ملکی کپڑے کے ایک تھان کی ضرورت تھی۔ ایک بڑے افر کو ختم

میں دیتا ہے۔ میں نے سوچا کہ خود کپڑا دیکھ لوں تو اچھا ہے۔ تمہیں تو خبر ہوگی کہ آج کل دو نمبر مال بہت چل رہا ہے۔ کسی ملازم کو بھیجتا تو مجھے تسلی نہ ہوتی، اس لئے خود چلا آیا۔ کئی جگہ کپڑا تلاش کیا، مگر کہیں نہیں ملا تو محمود حسن کا خیال آیا کہ شاید یہاں مل جائے۔“

”آپ ہماری دکان پر تشریف لائے، یہ تو ہماری عزت افزائی ہے۔“ میں نے کہا۔

”جیتے رہو مقصود میاں! مجھے مردانہ سوٹ کا کوئی اچھا سا غیر ملکی تھان چاہئے۔ چیک میں مل جائے تو کیا ہی کہنے۔“

میں نے غیر ملکی کپڑے کے جو دس تھان خریدے تھے، وہ مردانہ گرم سوٹوں کے لئے ہی تھے۔ گودام سے میں نے وہ سارے تھان منگوا لئے۔ حاجی صاحب نے ان میں سے ایک تھان پسند کر لیا اور مجھ سے اس کی قیمت پوچھی۔

”قیمت معلوم کر کے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں حاجی صاحب! یہ تو آپ ہی کی دکان ہے۔ میں آپ سے پیسے کیسے لے سکتا ہوں۔ صاحب کو پتا چل گیا تو وہ بت ناراض ہوں گے کہ جب تم حاجی صاحب کو بانٹے بچانے تھے تو ان سے پیسے کیوں لئے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو میاں مقصود! تعلقات اپنی جگہ لیکن گھوڑا اگر گھاس سے باری کرے گا تو کھائے گا کیا۔ پیسے تو میں ضرور دوں گا۔“ حاجی صاحب ضد کرنے لگے۔ ”تم نے بھی تو آخر یہ تھان پیسے خرچ کر کے ہی خریدا ہو گا۔ میں تمہاری اتنی بات مان سکتا ہوں کہ جتنی لاگت ہے، لے لو، نفع چاہے نہ لو۔“

میں نے دام کے دام حاجی صاحب کو وہ تھان دے دیا جو انہیں بازار میں دگنے داموں بھی نہ ملتا۔

حاجی صاحب چلے گئے تو متین نے مجھ سے کہا۔ ”معاف کرنا مقصود میاں! مجھے معلوم نہیں تھا کہ حاجی صاحب ہمارے مالک کے دوستوں میں سے ہیں۔ آئندہ میں ان کا خیال رکھوں گا۔ مالک سے تم یہ

ذکر نہ کرنا کہ میں نے حاجی صاحب کو یوں ہی خریدا دیا چاہا تھا۔“

”متین صاحب! میں غیبت کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ابھی آپ مجھے سمجھے نہیں ہیں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

کچھ دیر بعد دو گاہکوں کا ہجوم ذرا کم ہو گیا۔ کیوں کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔

”کام دھندا تو سب چلتا ہی رہتا ہے متین صاحب!“ میں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ ”جان ہے تو جمان ہے، آدمی کو اپنی صحت کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔“ محمود حسن کے ملازموں کو میں اپنا گرویدہ بنا لینا چاہتا تھا۔

میری بات سن کر متین چونک اٹھا اور بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم مقصود میاں کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے؟“

”تھوڑی بہت حکمت سیکھی ہے میں نے، کچھ عرصے میں ملتان کے ایک مشہور طبیب کے ساتھ بھی لڑ چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن تمہاری عمر تو مجھے پچیس تیس برس سے زیادہ نہیں لگتی۔“ متین نے کہا۔

”یہ بھی انہی حکیم صاحب کی جوتیاں سیدھی کرنے کا فیض ہے۔ میری اصل عمر کا آپ ہی کیا کوئی بڑا اندازہ نہیں لگا سکتا۔“

”پھر بھی کتنی عمر ہوگی؟ کچھ تو پتا چلے۔“

”یقین کر لیں گے آپ کہ میں پچاس برس سے اوپر ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دھیرے سے منہ دکان کے دوسرے ملازموں کے کان بھی کھڑے ہوئے اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ متین نے

کہا۔ ”پھر تو مقصود میاں! تم مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہو گے، میں بچپن کا ہوں۔ تمہاری صحت دیکھ کر مجھے

و رسل آرہا ہے۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے گردوں میں تکلیف رہتی ہے نا متین صاحب؟“

”ہاں واقعی، تم تو مقصود میاں! کمال کے آدمی لگتے ہو۔“ متین حیران رہ گیا۔

”میں تو صورت دیکھ کر بتا دوں کہ آدمی کس تکلیف میں ہے۔ نبض دیکھنا تو دور کی بات ہے۔“ میں بولا۔ ”ذرا ایک کانٹہ دو“ میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔“

متین نے جلدی سے کانٹہ اور قلم مجھے تھما دیا۔ اس کے گردوں میں واقعی درد ہوتا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

ہر ایک کو چھوٹا موٹا کوئی نہ کوئی مرض لگا ہی رہتا ہے۔ پھر جب تک میں دکان پر رہا اور دوسرے کاموں کے ساتھ ملازموں کو نسخے لکھ لکھ کر بھی دیتا رہا۔ دوسرے کو ایک بیج سے دو بیج تک سیل بند کر دی جاتی تھی تاکہ ملازم اطمینان سے کھانا کھالیں۔ صادق بھی گویا میرا مرید ہو گیا۔ اسے سانس کا مرض تھا۔ اس نے بھی مجھ سے اپنے لئے نسخہ لکھوا لیا۔ کھانے کے وقت میری بڑی خاطر مدارات ہوئی۔ اکثر ملازم اپنے گھروں سے کھانا لے کر آئے تھے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ دو ایک لفٹے ضرور کھا لوں۔

”مقصود میاں! ہم سب مل کر حضور والا سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی کوٹھی پر کسی اندر کو رکھ لیں، تمہیں یہاں بھیج دیں۔ کیوں بھائی متین!“ صادق نے اپنے خیال کی تائید کے لئے متین کی طرف دیکھا۔

متین اور پھر دوسرے ملازموں نے بھی صادق کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”پھر آج کی سیل تو دیکھو بھائی صادق! روز سے دگنی لگنی سیل ہے، حالانکہ ابھی دوسرے ہی ہوئی ہے۔“

محمود حسن کو متین ”مالک“ اور صادق ”حضور والا“ کہتا تھا۔

دوسرے دو بیج کے بعد میں وہاں سے چل دیا۔ متین نے زبردستی کرائے کی مدت میں دو روپے میری جیب میں ڈال دیئے اور کہا۔ ”مقصود میاں! تم رکشا کر لیتا۔“

”اور تمہارے مالک نے اس دریا دلی پر تمہیں ڈانٹا تو پھر؟“ بھی دوسرے سے ہنس دیا۔

”انہیں کوئی پتا ہے گا جب نا رہی ڈانٹ پھٹکار، وہ تو خیر ہمارے نصیب میں ہے۔“

”رکھ لو یہ روپے، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے روپے واپس کر دیئے اور بولا۔ ”بس ایک کٹی دے دو، کافی ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے صاحب کو تمہاری دیانت پر شک ہو جائے۔ تمہیں پردہ پوشی کے لئے جھوٹ بولنا پڑے۔ تم پر صاحب اعتماد کرتے ہیں اور اس اعتماد کو قائم رہنا چاہئے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے مقصود میاں! ہمارے مالک بھی تمہاری طرح کمال کے آدمی ہیں۔ کبھی بھی تو

ان سے خوف آنے لگتا ہے۔ کئی دفعہ تو انہوں نے یہ تک بتا دیا کہ آج دونوں دکانوں پر کتنی سیل ہوئی ہے اور کیش کتنا ہے۔ تم شاید یقین نہ کرو کہ واقعی اس روز اتنا ہی کیش نکلا۔“ متین نے بتایا۔

متین کی بات میرے لئے زیادہ حیران کن نہیں تھی۔ محمود حسن جیسا شخص یہ کرتب دکھا سکتا تھا۔ اگر وہ ایسی ہی شیطانی صفات کا مالک نہ ہوتا تو روپے پیسے کے معاملے میں صادق یا متین پر کس طرح بھروسہ کر لیتا۔ اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ محمود حسن نے اپنے ملازموں میں کچھ ”مخبر“ بھی پال رکھے ہیں۔ ان خبروں کا تعلق گوداموں سے تھا۔ جو سامان بھی گوداموں میں آتا اور جاتا وہ اس کی تفصیلی رپورٹ محمود حسن کو دیتے۔ ان ملازموں کے علاوہ دو کلرک اور ایک گھاگ قسم کے منشی جی بھی محمود حسن کے ملازم تھے۔ یہ اس کے حساب کتاب کا شعبہ تھا۔ اپنے دفتر کے علاوہ بلڈنگ کے اوپری حصے ہی میں اس نے ایک چھوٹی سی جگہ کرائے پر اور لے رکھی تھی۔ منشی جی کچے اور کچے دونوں طرح کے کھاتے بنانے میں ماہر تھے۔

محمود حسن کے تقریباً سارے ہی کاروباری راز میں نے آدھے دن میں معلوم کر لئے۔ پھر میں اس کے ملازموں سے رخصت ہو کر بازار کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ فضا میں پرواز کرنے کا ایک الگ ہی لطف ہے جسے ہم جن زاد ہی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ میں بھیڑ میں اسی لئے گم ہوا تھا کہ آدم زاد سے جن زاد بن سکوں۔ بولٹن مارکیٹ سے جشید روڈ پہنچنے میں اسی لئے مجھے دیر نہ لگی۔

کوٹھی میں داخل ہو کر بھی میں علیالیش ہی بنا رہا کہ دیکھوں محمود حسن کا کیا حال ہے۔ وہ اپنی خواب گاہ ہی میں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا ہو۔ صائمہ کو اس کے پاس دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ محمود حسن کے سرہانے بیٹھی اس کا ایک ہاتھ دبا رہی تھی۔ اب اس کے چہرے سے اذیت یا حزن و ملال کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

آدم زادوں کے پاس بھی انداز واداکے ہزار حربے ہوتے ہیں۔ وہ سخت گیر سے سخت گیر آدم زاد کو بھی کسی نہ کسی طرح قابو میں کر بی لیتی ہیں۔ ان میں مردوں سے زیادہ قوت برداشت ہوتی ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں جینے کی راہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔

”مجھے معلوم ہے، آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔“ صائمہ کہہ رہی تھی۔ ”رات کو آپ ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکے۔“

”صائمہ بیگم! کبھی کبھی تم مجھے بہت بھولی اور اچھی لگتی ہو۔“ محمود حسن بھی اس وقت شرافت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

”کل سے آپ بہت پریشان ہیں، مجھے اس کا بھی خیال ہے۔“ صائمہ بولی۔

”ظاہر ہے تمہیں میرا خیال نہ ہو گا تو اور کے ہو گا..... کھانا کھالیا تم نے؟“

”آپ کے بغیر کیسے کھالیتی، آج میں نے خود اپنے ہاتھ سے آپ کے لئے شہی کباب بنائے ہیں۔ کباب آپ شوق سے کھاتے ہیں نا!“

”اچھا تو پھر اٹھنے دو میں نما کر ذرا تازہ دم ہوتا ہوں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔“ محمود حسن یہ کہہ کر

محمود حسن سے بولے۔ ”تمہارا یہ ملازم مقصود میرا ہے۔ اس کی وجہ سے آج میرا ایک بڑا کام بن گیا۔ کوئی ایک مہینے سے میں اپنا ایک ٹینڈر منظور کرائے کی جدوجہد میں تھا‘ آج بات بن ہی گئی۔“

”وہ کیسے حاجی صاحب!..... اور اس میں مقصود کا کیا ذکر؟“ محمود حسن نے حیران ہو کر پوچھا۔ جواب میں حاجی صاحب نے اپنے ساتھ میرے سلوک اور غیر ملکی کپڑے کے تھان کا قصہ سنا دیا‘ پھر کہنے لگے ”مجھے آج تک کوئی ایسا منڈب اور سمجھ دار ملازم نہیں ملا۔ تم خوش قسمت ہو۔ اسی سے مجھے تمہاری طبیعت کی ناسازی کا علم ہوا‘ سو چلا آیا۔“

”مجھے تو آپ کی زبانی اس کے بارے میں یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے‘ اسے بھلا کاروبار کی کیا سوجھ بوجھ۔“

”سوجھ بوجھ نہ ہوتی تو تمہاری دکان کے ملازم اس کے اشاروں پر نہ چلتے۔ اسی نے تو تمہاری دکان کے ایک ملازم کو گودام بھیج کر غیر ملکی کپڑے کے دس تھان نکلا کر مجھے دکھائے تھے۔“ حاجی صاحب نے بتایا۔

محمود حسن کے چہرے سے یہ ظاہر ہونے لگا جیسے اسے حاجی صاحب کی باتوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ وہ خاموش ہی رہا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم اندر جاؤ مقصود! ضرورت ہوئی تو آواز دے کر بلا لوں گا۔“ میں ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ کچھ دیر بیٹھ کر حاجی صاحب چلے گئے۔ محمود حسن نے ان کی موجودگی میں مجھے دوبارہ نہیں بلایا۔

اسی روز جب میں‘ محمود حسن کے ساتھ اس کی موٹر ڈرائیو کرتے ہوئے بولٹن مارکیٹ جا رہا تھا تو وہ مجھ سے بولا۔ ”میں تمہیں سمجھ نہیں سکا مقصود کہ تم چیز کیا ہو؟ مجھے تو اس پر حیرانی ہے کہ تم نے حاجی صاحب جیسے بڑے آدمی کو کس طرح شیشے میں اتار لیا۔“

”میں تو جناب آپ کا خادم ہوں۔“ میں نے انکساری کا اظہار کیا۔ ”مجھے بہت سے کام آتے ہیں لیکن اسے میں اپنی قسمت کی خرابی ہی کہتا ہوں کہ کبھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”ہوں۔“ محمود حسن کچھ سوچنے لگا‘ پھر بولا۔ ”تین سے تمہارے بارے میں پوچھوں گا‘ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتا ہے۔ پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔“

بولٹن مارکیٹ پہنچ کر محمود حسن نے اپنے دفتر کا رخ نہیں کیا بلکہ دکانوں کی طرف گیا اور اپنے سامنے دونوں دکانیں بند کرائیں‘ پھر کیش سنبھالا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ تین اور صادق آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔ پہل متین ہی نے کی۔ ”مالک! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔“

”تو پھر چلو‘ اوپر دفتر میں بیٹھ کر بات ہوگی۔ صادق! تم بھی آ جاؤ۔“ محمود حسن نے کہا۔ ”مجھے بھی تم دونوں سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”بہتر ہے حضور والا!“ اور ”جی مالک!“ کہہ کر صادق اور متین ساتھ ہو لئے۔ دکانیں بند کرائے سے پہلے ہی متین گوداموں کی چابیاں بھی محمود حسن کے حوالے کر چکا تھا۔ کاروبار بند ہونے تک اس روز

بستر سے اٹھ گیا۔ اب وہ بڑی حد تک اعتدال پر نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر چپے ہوئے شیطان نے شاید وقتی طور پر آنکھیں موند لی تھیں۔

مجھے اس وقت اچانک ہی یہ خیال آیا کہ محمود حسن کو اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لے سکتا ہوں یا نہیں؟ وہ میری طرف سے بے خبر تھا اور ایسے میں یہ یہ کوشش ممکن تھی۔ میں واقف تھا کہ یہ ایک خطرناک قدم ہے اور اس سے مجھے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے ہمت کر لی۔ صائمہ باورچی خانے میں جا چکی تھی اور محمود حسن اکیلا غسل خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

محمود حسن پر میں مسلط ہوا ہی تھا کہ خلاف توقع اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ میں اسے اپنے اثر میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ معاً اس نے جھرجھری لی۔ اسی کے ساتھ میں نے چند نامانوس الفاظ سنے۔

”وہ چند ہی لمحے ہوں گے کہ میں‘ محمود حسن کو قابو میں کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ پھر مجھے زوردار جھک لگا اور میں دور جاگرا۔ محمود حسن میری گرفت سے آزاد ہو گیا۔ ممکن ہے کہ میں وہاں مزید ٹھہرتا تو وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا دیتا۔ میں نے فرار ہو جانا ہی مناسب سمجھا‘ کیوں کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔“

اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ میں باآسانی دوسرے آدم زادوں کی طرح محمود حسن پر قابو نہیں پاسکتا۔ یہ کوشش میرے لئے خطرناک تو ثابت نہ ہوئی کہ میں کسی اذیت کا شکار ہو جاتا‘ مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔

مزید کچھ دیر فضا میں پرواز کر کے میں اس کی کونکھی کے سامنے اتر گیا اور انسانی ہیئت اختیار کر لی۔ میں اندر پہنچا تو دیکھا محمود حسن اور صائمہ باورچی خانے کے سامنے بیٹھی ہوئی میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ بتول گرم گرم روٹیاں ڈال رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔ ”واپسی میں اتنی دیر کیسے لگ گئی؟“ لہجے میں کسی قدر برہمی تھی۔ برہمی کی وجہ میرے لئے سمجھتا محال نہیں تھا۔ میں نے ہی تو اس پر مسلط ہونے کی کوشش کی تھی۔

”جناب! آپ ہی نے تو مجھ سے دہرے کے بعد آنے کو کہا تھا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”اچھا ٹھیک ہے جاؤ اور کپڑے بدل لو۔“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ ”یہی کپڑے پہن کر شام کو پھر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”تم نے کھانا تو کھا لیا ہو گا مقصود!“ صائمہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ میرے بولنے سے پہلے ہی محمود حسن نے کہا۔ ”اور کیا یہ اب تک بھوکا ہو گا۔ کھانے پینے کے معاملے میں یہ لوگ کبھی پیچھے نہیں رہتے۔“

میں اپنے کمرے سے کپڑے تبدیل کر کے دوبارہ اندر پہنچا اور گھر کے کام کاج میں بتول کا ہاتھ بٹانے لگا۔

شام کو چار بجے کے قریب حاجی صاحب آ گئے۔ ان کی آمد توقع کے خلاف تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ محمود حسن کی مزاج پرسی کے لئے آئے ہیں۔ جب میں ان کے لئے ڈرائنگ روم میں چائے لے کر گیا تو وہ

کی لکھت پڑھت آئندہ روز صبح ہوتی تھی۔ دکانوں، گوداموں، دفتر وغیرہ کی چابیاں محمود حسن اپنے پاس ہی رکھتا۔ رات بھر میرے ہاتھوں اذیت سننے کے باوجود اسی لئے دفتر پہنچا تھا کہ دکانیں وغیرہ کھلو اسکے۔ تھوڑے بہت چھوٹے نوٹ، کھیرج وغیرہ دکانوں پر چھوڑ کر بڑی رقم اس نے چھڑے کے ایک بڑے تھیلے میں رکھ لی تھی۔

اور دفتر میں پہنچ کر صادق اور متین نے محمود حسن سے میرے بارے میں وہی باتیں کیں جن کی مجھے توقع تھی۔

محمود حسن پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا، پھر بولا۔ ”اس کا تو سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ مقصود تم دونوں سے بھی زیادہ کام کا آدمی نکلا۔ آج کی سیل بھی اور دنوں سے بہت اچھی رہی۔ راستے میں مقصود مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے آج تک کبھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ کیا خبر یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ کبھی کبھی کسی آدمی کے ساتھ ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ تم دونوں کی سفارش پر میں اسے یہ موقع دے رہا ہوں لیکن یہ باغ خوب سمجھ لو کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تم ہی دونوں کو پکڑوں گا۔ تم دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کاروبار کے معاملے میں کسی طرح کی کوتاہی یا نااہلی برداشت نہیں کرتا۔ مقصود میری کوٹھی ہی میں رہے گا اور روز میرے ہی ساتھ آئے گا جائے گا۔ گھر کے کام کاج کے لئے تو کوئی اور ملازم بھی مل جائے گا۔ تم لوگ بھی کسی اعتماد کے آدمی کی تلاش جاری رکھنا۔ ویسے تو جو ملازم ہے اس سے کام چل ہی رہا ہے۔ میں دراصل کسی ایرے غیرے کو اپنی کوٹھی میں رکھنا نہیں چاہتا ورنہ تو نوکر بہت۔“

جو کچھ محمود حسن نے کہا، میری مرضی کے مطابق ہی تھا۔ صادق اور متین کے چروں سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ اس پر انہوں نے محمود حسن کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ وہ پہلے ہی کی طرح پوری ذمہ داری کا ثبوت دیں گے۔

بولٹن مارکیٹ سے جمشید روڈ واپس چلتے ہوئے محمود حسن نے مجھ سے کہا۔ ”ابھی میں تمہاری تنخواہ نہیں بڑھاؤں گا، پہلے تمہارا کام دیکھ لوں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ شروع شروع میں تمہاری طرح سبھی کارکردگی دکھاتے ہیں اور پھر اپنی اصلیت پر آ جاتے ہیں۔ تمہیں یہ موقع دے کر میں تم پر ایک احسان کر رہا ہوں۔ میرا یہ احسان کبھی بھولنا نہیں۔ جو لوگ اپنے محسنوں کے ساتھ دفا کرتے ہیں، کبھی پھلتے پھولتے نہیں۔“

”میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا جناب!“ میں نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔
”وہ تو خیر وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا، زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔“ محمود حسن نے کہا۔ پھر میں نے اسے کسی سوچ میں گم ہوتے دیکھا۔ میرے ذہن میں جانے کیوں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس کی خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ کئی بار میرے چہرے کا جائزہ بھی لے چکا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ بول اٹھا۔ ”مقصود! موٹر کو سڑک کے ایک کنارے کھڑا کر دو۔“

میں چکرایا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے؟ پھر بھی میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور موٹر ایک طرف کھڑی کر دی۔

”ادھر دیکھو مقصود! میری طرف۔“ محمود حسن بولا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں میرا راز کھل تو نہیں گیا؟ محمود حسن بہر حال کوئی عام قسم کا آدم زاد نہیں تھا۔ اسے اپنی جناتی صفات کے زیر اثر لینے میں مجھے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ مجبوراً میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔

”یہ بتاؤ مقصود کہ تم سید بادشاہ کی کوٹھری میں کیوں گئے تھے؟“ محمود حسن نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سوال کیا۔

میں گھبرا گیا اور سوچا کہ شاید میرا اندیشہ درست ہے۔ محمود حسن میری حقیقت جان چکا ہے ورنہ وہ یہ سوال کیوں کرتا۔ مجھے اس لمحے مولوی کفایت اللہ یاد آیا۔ میں نے نرگس کے محبوب اقبال کے جسم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مولوی کفایت اللہ نے بھی آنکھیں دیکھ کر یہ سراغ لگایا تھا کہ میں جن زاد ہوں۔

وہ لمحات میرے لئے بڑے مہر آزماتھے۔ مجھے اپنے حواس پر قابو پانے میں دشواری ہوئی پھر ایک خیال کی رونے میرے حوصلے کی دیوار کو گرنے سے بچالیا۔ محمود حسن اب تک اپنی تمام تر شیطانی صفات کے باوجود جب مجھے نہیں پہچان سکا تو اس وقت اچانک کس طرح اس پر میرا راز کھل گیا؟ اس عرصے میں اسے بحیثیت جن زاد کئی مرتبہ میں نے سخت اذیت پہنچائی تو بھی وہ میری حقیقت نہ جان سکا۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ محمود حسن نے اندھیرے میں ایک تیر چلایا ہے کہ شاید یہ تیر نشانے پر پہنچ جائے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!“ میں سراپا حیرت بن گیا۔ ”میری یہ مجال کہاں کہ سید بادشاہ کی چوکھٹ عبور کرنا تو بڑی بات ہے، ایسا سوچ بھی سکوں۔ میں ایسا کرتا تو اس وقت آپ کے سامنے زندہ نہ ہوتا۔“ اپنی آواز سے میں نے خوف کا اظہار کیا۔ ”سید بادشاہ تو مجھے جلا کر خاک کر دیتے۔“

”کیا واقعی؟“ محمود حسن عجب سے انداز میں مسکرایا۔ ”کیا تمہیں اس بات پر پورا یقین ہے جو تم نے ابھی کہی ہے؟“

”یقین کیوں نہ ہوتا جناب! خود آپ نے بھی کل رات بیگم صاحبہ کو میرے سامنے بتایا تھا کہ سید بادشاہ کو جلال آ گیا تھا۔ مجھے تو جناب، ایسی باتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ پھر میں نے اپنی صفائی میں اسے یاد دلایا۔ ”میں تو اس وقت گمری نیند سو رہا تھا اپنے کمرے میں۔“

”جب میں نے تمہیں جا کر بگایا تو اس واقعے کو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس عرصے میں تم واپس اپنے کمرے تک پہنچ سکتے تھے۔“ اس کی نظریں ابھی تک میرے چہرے سے ہٹی نہیں تھیں۔

”لیکن جناب! مجھے بھلا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت کیا تھی، جانتے بوجھتے میں ایسا کیوں کرتا؟“

”تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے تمہارے خیال میں؟“ ابھی تک وہ میری جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔

”میں تو جناب! یہی سمجھ سکا ہوں کہ یہ کوئی پراسرار معاملہ ہے ورنہ سید بادشاہ کی چوکت پار کرنا کسی آدمی کے بس کا تو کام نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ آدمی یا کچھ اور؟“ اس نے پھر ایک عجیب سوال کیا۔

”معاف کیجئے گا، آپ کو بھی میں آدمی ہی سمجھتا ہوں۔“

”اگر تم مجھے سید بادشاہ کی چوکت پار کرتے ہوئے دیکھ لو تو پھر کیا سمجھو گے؟“ اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”اڈل تو آپ ایسا کیوں کرنے لگے جناب!..... لیکن جب..... آپ اپنے علم کے زور پر یہ بتا سکتے ہیں کہ کسی نے سید بادشاہ کی چوکت کو پار کیا تھا تو..... تو پھر شاید..... میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب!“ میں بہت محتاط ہو کر بول رہا تھا۔ یہ تو اب میں سمجھ چکا تھا کہ اس پر میری حقیقت نہیں کھلی، پھر بھی وہ ایک عیار آدم زاد تھا اسی لئے چونکا رہنے کی ضرورت تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”میں نے ایک بات اپنے بزرگوں سے ضرور سنی ہے کہ کچھ لوگوں کو اللہ نے ایسا علم دیا ہے کہ وہ پراسرار چیزوں سے بھی نہیں ڈرتے۔“

”اب کی تم نے پتے کی بات۔“ محمود حسن نے پینترا بدلا۔ ”تمہیں میں یہی بتانا چاہتا تھا۔ مجھے کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں صاف صاف یہ بتا دوں کہ بہت سی باتیں مجھے خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے؟“ اس کے لہجے سے واضح طور پر پتا چل رہا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ”بس یہ سمجھ لو کہ سب کچھ ایک بزرگ کی دعا کا اثر ہے۔ میں راجستھان کے ایک شرارائے پور کارہنے والا ہوں۔ وہاں ایک چادر والے بابا تھے۔ وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ بابا نے ایک دفعہ مجھ پر اپنی چادر ڈال دی تھی۔ بس پھر نہ پوچھو، میری دنیا ہی بدل گئی۔ یہ اور ہی معاملے ہیں، تم نہیں سمجھ سکو گے۔“

”ہاں جناب! میں کہاں ان باتوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے اس کی تسلی کے لئے کہہ دیا۔

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر نہ بیٹھا تو اس نے مجھے چادر والے بابا کی کمائی سنا کر رعب میں لینا چاہا۔

”یہ باتیں جو میں نے اس وقت تم سے اکیلے میں کی ہیں، کسی سے ان کا ذکر نہ کرنا..... اب چلو دیر ہو رہی ہے۔“

میں نے اسے یقین دلایا کہ کبھی میری زبان پر یہ باتیں نہیں آئیں گی، پھر موٹر کا انجن اشارت کر دیا۔

☆=====☆=====☆

اس رات بھی میں نے علیالیش بن کر محمود حسن پر نظر رکھی۔ اس نے نہ تو صائمہ پر تشدد کیا، نہ سید بادشاہ کی کونھری میں گیا۔

رات آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی۔ محمود حسن بے خبر اپنی خواب گاہ میں سو رہا تھا۔ اسے میں نے نہیں چھیڑا اور صائمہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ سوتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ”نن..... نہیں راجہ! میرا گلانہ دباؤ..... میں..... میرا کوئی قصور نہیں۔“ پھر اس کے الفاظ بے ربط ہو گئے۔ وہ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی اور وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

آج رات میں، صائمہ کی خواب گاہ میں بے سبب نہیں آیا تھا۔ مجھے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی کہ جب شیطان صفت محمود حسن غافل ہو۔

صائمہ ریشمی لحاف اوڑھے سو رہی تھی، چہرہ البتہ لحاف کے اندر نہیں تھا۔ میں نے بہت نرمی اور احتیاط کے ساتھ اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں خوفزدہ ہو کر وہ چیخنا شروع نہ کر دے۔

”صائمہ!“ میں نے اسے دھیرے سے آواز دی اور دوبارہ شانے پر دباؤ ڈالا۔

کئی بار آوازیں دینے پر وہ جاگ ہی گئی۔ میں دور ہٹ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اسے صرف اس حد تک اپنے اثر میں لے لیا کہ وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر کو خوف کا شکار نہ ہو۔

”بول اے صائمہ کہ تو سید بادشاہ سے کیا چاہتی ہے؟“ میں نے اسے نرمی کے ساتھ مخاطب کیا۔

”آپ..... آپ سید بادشاہ..... آپ!“ وہ رک رک کر بولی اور پھر میں نے اسے اٹھ کر بیٹھنے دیکھا۔ اس نے اپنے سر کو چادر سے ڈھک لیا۔

”ہاں میں صائمہ!“ میں دھیرے سے بولا۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے وہم کو حقیقت میں بدل دیا، پھر کہا۔ ”تیرے دل میں جو بھی ہے، مجھے معلوم ہے لیکن میں تیری زبانی سننا چاہتا ہوں۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تیرے اندر سچ بولنے کا کتنا حوصلہ ہے۔ بول کہ تو مجھ سے سچ بولے گی؟ بتا کہ تجھ سے میں جو سوال بھی کروں گا، تو ان کے صحیح جواب دے گی؟“

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور کہنے لگی۔ ”جب آپ میرے دل کا حال جانتے ہیں تو پھر میں کوئی بات کیسے چھپا سکتی ہوں۔“

”تو پھر میرا پہلا سوال سن اور جواب دے۔ کیا تیرے ضمیر پر یہ بوجھ نہیں کہ تو نے اپنے شوہر کی پہلی بیوی راجہ کے ساتھ بڑا کیا؟“

”میری آنکھوں پر لالچ کا پردہ پڑ گیا تھا اے سید بادشاہ! اور..... اور اب بھی یہ پردہ پوری طرح میری آنکھوں سے نہیں ہٹا۔ میں..... میں بیوہ ہو جانا چاہتی ہوں اور آپ کی چوکت کے آگے بھی کئی بار یہ دعا کر چکی ہوں۔“ صائمہ نے اعتراف کیا۔

میں بول اٹھا۔ ”یہ بھی تو کہہ اے صائمہ کہ تو اپنے شوہر کے ظلم و تشدد سے بھی تنگ ہے۔ تو یہ بھی چاہتی ہے کہ شوہر کی موت کے بعد اس کی دولت تیرے قبضے میں آجائے۔ پھر تو تیرے ضمیر پر بوجھ رہے گا۔ بتا کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ تیرے عیار شوہر نے راجہ کو پاگل خانے میں کیوں ڈال رکھا ہے؟

جب کہ وہ پاگل نہیں ہے۔“

”ہاں میں جانتی ہوں اے سید بادشاہ کہ رابعہ پاگل نہیں۔“ پھر صائمہ بولتی رہی۔ اس نے میرے ہر سوال کا جواب دیا۔

کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ جن سے صائمہ بھی بے خبر تھی۔ ایسی بہت سی باتیں میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔

محمود حسن نے کم از کم مجھے یہ بات سچ ہی بتائی تھی کہ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک شہر رائے پور سے ہے۔ اس کی باقی باتیں محض افسانہ تھیں۔ رائے پور میں وہ مفلوک الحال تھا۔ یہ برسوں پہلے کی باتیں تھیں۔ رابعہ کا تعلق رائے پور کے ایک بڑے اور معزز گھرانے سے تھا۔ محمود حسن کا باپ اس کے گھر میں ملازم تھا۔ یوں محمود حسن کو رابعہ کے گھر میں آنے جانے اور پھر اس پر عشق کا جال پھینکنے کا موقع مل گیا۔ جلد ہی محمود حسن معاملات کو اس منہج پر لے آیا کہ اس باعزت گھرانے کے افراد نے اپنی عزت و آبرو بچانے کی خاطر عشق میں اندھی رابعہ کی شادی محمود حسن سے کر دی۔ انہوں نے محمود حسن کو اپنی سطح پر لانے کے لئے ایک بڑی جائیداد رابعہ کے نام کر دی۔ کچھ عرصے کے لئے محمود حسن، رابعہ کو اپنے ساتھ لے کر رائے پور سے بے پور چلا گیا۔ وہ غربت و افلاس کے گرداب سے نکل آیا۔ پھر جب وہ رائے پور لوٹ کر آیا تو ایک اور ہی محمود حسن تھا۔ جب تک وہ ہندوستان میں رہا، رابعہ کے گھر والوں نے اسے آپے سے باہر نہ ہونے دیا۔ قیام پاکستان کا وقت آیا تو محمود حسن بمبئی بھاگ گیا۔ مگر وہ خالی ہاتھ نہ تھا۔ رائے پور سے بھاگتے ہوئے اس نے تھوڑی بہت دولت سمیٹ لی تھی۔ رابعہ کی جائیداد کے کاغذات بھی اس کے پاس تھے۔ اس نے رابعہ کی طرف سے کلیم داخل کر دیا۔ پاکستان آ کر وہ گھانے میں نہ رہا۔ کلیم میں ملنے والی جائیداد کا ایک بڑا حصہ بیچ کر اس نے ایک ایسے کاروبار کی داغ بیل ڈال دی کہ جس میں راتوں رات لوگ فقیر سے امیر بن جاتے ہیں۔

رابعہ کی آنکھیں اس وقت کھلیں کہ جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس نے بانجھ ہونے کے طعنے سنے، تشدد برداشت کیا۔ محمود حسن کو رام کرنے کی خاطر بیچ جانے والی بقیہ جائیداد بھی ایک دن اس نے ظلم و تشدد سے تنگ آ کر محمود حسن کے نام کر دی۔ پھر بانجھ پن کے طعنوں سے بچنے کے لئے وہ صائمہ کو اپنی سوکھ بنا کر لے آئی۔

ایک غلطی کے بعد رابعہ نے یہ دوسری بڑی غلطی کی۔ اب وہ پوری طرح محمود حسن کے رحم و کرم پر تھی۔ جب محمود حسن کا ظلم اپنی انتہا کو چھونے لگا تو رابعہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اسی عالم میں ایک روز اس نے محمود حسن کو یہ دھمکی دی کہ میں عدالت کا دروازہ کھٹکھاؤں گی اور یہ بیان دوں گی کہ تم نے زبردستی مجھ سے ساری جائیداد اپنے نام لکھوائی ہے۔ تمہاری جھوٹی عزت کو میں خاک میں ملا دوں گی۔ میں تمہارے ماضی سے پردہ اٹھا دوں گی، لوگوں کو تمہارا اصل چہرہ دکھا دوں گی کہ تم کون تھے اور اب کیا ہو۔

اس آخری غلطی نے مظلوم رابعہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

خالم محمود حسن نے رابعہ کو زندہ رکھا اور ایک ایسا راست اختیار کیا کہ جب تک وہ جیئے تڑپتی اور سستی رہے۔ اس نے کچھ پیسے خرچ کر کے رابعہ کے پاگل ہو جانے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور پھر گدو بندر کے پاگل خانے کے کچھ لالچی افراد پر جال پھینکا۔ ایک طرف تو دولت، دوسری جانب شیطانی عمل۔ پھر محمود حسن کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔ اگر وہ اپنی خالمانہ فطرت سے مجبور نہ ہوتا تو کسی شیطانی عمل کے ذریعہ رابعہ کا قصہ ہی پاک کر دیتا۔ یوں رابعہ پاگل نہ ہونے کے باوجود پاگل خانے میں تھی۔

رابعہ کی یہ خوش گمانی ہی تھی کہ محمود حسن جیسا عیار اس کی دھمکی سے خوف کھا جائے گا یا وہ عدالت کے دروازے تک پہنچ کر اپنا حق وصول کر لے گی۔ وہ تو پہلے ہی اپنے ہاتھ کٹا چکی تھی۔ قانون اس کی کیا مدد کرتا۔ پھر یہ کہ محمود حسن سے قانونی جنگ کے لئے اس کے پاس تھا بھی کیا۔ وہ کسے وکیل کرتی، کس سے منصفی چاہتی؟ اس کی سنا کون؟ اسی کے ساتھ یہ کہ محمود حسن اسے عدالت تک کیسے پہنچ جانے دیتا؟ کیا انصاف کا حصول اتنا ہی آسان ہے؟ وہ بھی ایک بے سہارا اور حتمی دست عورت کے لئے۔ جذبات کی رو میں ہمہ کر یقیناً رابعہ نے ان باتوں پر غور بھی نہیں کیا ہو گا۔ ان حالات میں اگر رابعہ کو کوئی سہارا مل بھی جاتا تو بس اتنا ہی ہوتا کہ محمود حسن کو وقتی طور پر بدنامی برداشت کرنا پڑتی۔

صائمہ، رابعہ کے معاملے میں اس حد تک قصور وار ضرور تھی کہ اس نے محمود حسن کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس کی یہ خاموشی یقیناً جرمانہ اور لالچ کے سبب ہی تھی۔ صائمہ کو اب اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ دو ہی مہینے میں وہ بیوہ ہو جانے کی دعائیں مانگنے لگی تھی۔ رابعہ کو پاگل خانے پہنچا کر محمود حسن کی اذیت پسند فطرت نے صائمہ کو اپنا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

اس رات صائمہ نے ہر وہ بات مجھے بتا دی جو اسے معلوم تھی۔ پھر وہ میری منت سماجت کرنے لگی۔ ”اے سید بادشاہ! آپ مجھے بچالیں۔“

”یہ تو پہلے سوچا ہوتا تو نے اے صائمہ! تیری دعا کہ جو دراصل تیرے شوہر کے لئے بددعا ہے، اس سے تجھے کیا ملے گا؟ ہر جان دار کی موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ گھڑی نہ پہلے آ سکتی ہے، نہ بعد میں۔ تو یہ کیوں بھول گئی کہ تیرا جو حق تھا، تو نے اس سے زیادہ کی ہوس کی۔ بتا کہ تیرے شوہر کے مال پر کیا صرف تیرا ہی حق ہے؟ اس عورت رابعہ کا کوئی حق نہیں کہ جس کے حق پر تیرے شوہر نے ڈاکہ ڈالا۔ وہ عورت جو زندہ ہے لیکن اس کا شمار زندوں میں نہیں۔ کیا تو اس سے بہتر حالت میں نہیں؟“

صائمہ خاموشی سے سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

”سن اے صائمہ کہ تو نے غلط راہ اپنائی۔ اس سے دعا کر کہ جو سب کی سنتا ہے۔ تو اگر ایسا کرے گی، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے گی تو پھر تجھے کسی سید بادشاہ کی چوکھٹ کے سامنے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب بھی وقت ہے کہ تو سدھر جا۔ یاد رکھ کہ اپنے حق سے زیادہ کی طلب عذابوں میں گرفتار کر دیتی ہے۔ سوچ کہ دولت کی ہوس نے کتنوں کو دیوانہ بنا دیا۔ اگر تیرا شوہر مر بھی گیا تو کیا تو ہمیشہ زندہ رہے گی؟ کیا تجھے خبر ہے کہ خود تیری زندگی کتنی ہے؟ سیدھی راہ پر آ جا صائمہ کہ یہی تیرے لئے بہتر ہے۔ اپنی آنکھوں پر پڑا ہوا لالچ کا پردہ ہٹا دے اور کئے کی سزا تو سب کو ملتی ہے۔ تو اس

سے کیسے بچ جائے گی؟ اب اگر تو پکارے تو مجھے نہ پکاریو، اپنے اللہ کو پکاریو کہ وہی تیری سنے گا۔ وہی معاف کرنے والا اور خطاؤں کو درگزر کرنے والا ہے۔ سو جا اب اور اسے یاد کر کہ جس کی یاد ہر یاد سے بہتر ہے۔ آنسو بہا مگر اس کے سامنے کہ جو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔“ میں نے اس سے کہا اور پھر اسے سلام دیا۔

☆=====☆

اس رات کئی عقدے کھل گئے۔ صائمہ راہِ راست پر آئی کہ نہ آتی مگر میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس کے ذہن میں ابھی ناچنگی تھی اور یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ رہی مظلوم رابعہ تو میں جب چاہتا اسے پاگل خانے سے نکال کر لے آتا لیکن ایسی صورت میں وہ کہاں جاتی؟ اس کے علاوہ یہ کہ شیطان صفت محمود حسن بھڑک اٹھتا۔ پھر شاید وہ بدنامی سے بچنے کے لئے کسی نہ کسی طرح رابعہ کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا۔ موجودہ حالات میں جب تک کہ محمود حسن اپنے انجام کو نہ پہنچ جاتا، رابعہ پاگل خانے ہی میں محفوظ تھی۔

دوسرے دن محمود حسن مجھے اپنے ساتھ مارکیٹ لے گیا۔ اسی دن سے میں نے اس کے گرد جال بنا شروع کر دیا، ایسا جال کہ جسے توڑ کر وہ نکل نہ سکے۔ دن بھر میں محمود حسن نے کئی بار مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور اپنی دانست میں میرا امتحان لیا۔

شام ہونے سے پہلے اس نے مجھے ایک شخص سے ملوایا۔ اس شخص کی عمر چالیس برس سے کچھ اوپر ہو گی۔ صورت ہی سے وہ مجھے گھاگ معلوم ہوا۔ اس کے بارے میں یہ میرا تجربہ تھا ورنہ تو اسے جو بھی دیکھتا رعب میں آ جاتا۔ اونچا پورا قد، سرخ و سفید رنگ، چہرہ بھرا ہوا اور جسم بھی۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں جن میں ہلکا سا بھورا پن، سر پر انگریزی وضع کے بال، جسم پر تھری پیس سوٹ۔ میز پر اس کے سامنے غیر ملکی سگریٹ کا بیگٹ اور خوبصورت لائٹ رکھا تھا۔

”شرافت صاحب! یہ میرا وفادار نوکر مقصود ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا اس کے بارے میں؟“ محمود حسن نے اس شخص سے پوچھا۔

اس شخص شرافت نے میری طرف نگاہ اٹھائی، پھر بارعب آواز میں کہا۔ ”میاں جنا جڑاے! ذرا ادھر سامنے آکر اپنا دیدار کراؤ۔“

میں جو اس کی کرسی کے قریب کھڑا تھا، ذرا سا ہٹ کر جا کھڑا ہوا۔ شرافت نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا، پھر معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ ”کچھ گہرا لگتا ہے، مگر ہے کام کا۔“

”اور مقصود! اب میں ان سے تمہارا تعارف کرا دوں۔“ محمود حسن مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”شرافت صاحب، پولیس ہیڈ آفس کی اسٹیشنل براؤچ میں ایک بڑے عہدے پر ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ یہ تمہیں کیسے لگے؟“

میں اس عرصے میں ”شرافت“ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

”آدی یہ بھی کام کے ہیں۔ شرافت صاحب!“ میں نے بغیر کسی رو رعایت کے صاف صاف کہہ دیا۔ ”سوانگ بھرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ یہ ہر کردار بہت اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں۔ اسٹیشنل براؤچ کے بڑے افسرین جاسیں یا کسم کے کوئی بڑے عہدے دار، انہیں پہچان لینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔“

ممکن ہے، میں یہ سب کچھ نہ کتا لیکن مجھے پتا چل گیا تھا کہ محمود حسن نے میرا امتحان لینے کی غرض ہی سے اس جعل ساز کو بلوایا ہے۔

نہ تو محمود حسن جیسا عیار اتنی جلدی ہار ماننے والا تھا، نہ طرح طرح کے بھیس بھرنے والا وہ شخص شہادت کہ جس کا نام مجھے شرافت بتایا گیا تھا۔ پہلے وہی شخص جھنجھلا کر مجھ سے بولا۔ ”تم بہت بد تمیز آدی ہو، تم نے جس طرح میرا نام بگاڑا ہے، میں تمہارا حلیہ بگاڑ سکتا ہوں۔ محمود حسن صاحب کا خیال کر رہا ہوں ورنہ اب تک.....“

”بس بس شرافت صاحب!“ محمود حسن بول اٹھا۔ ”یہ بے وقوف ہے، اسے معاف کر دیں، میری خاطر۔“

”لے یہ دیکھ جاہل کہیں کے۔“ اس شخص نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ کانڈات نکال کر میرے سامنے پھینک دیئے۔ ”یہ میرے گلے کا جاری کردہ شناختی کارڈ ہے اور یہ.....“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے وہ کانڈات میز سے اٹھا لئے۔ احمق شہادت نے مجھے رعب میں لینے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ سب سے اوپر ہی جعلی کارڈ تھا جو اسے پولیس کا اسٹیشنل براؤچ کا افسر ظاہر کرتا تھا، کارڈ پر اس کی تصویر بھی لگی تھی۔ اسی کارڈ کے ساتھ کچھ کانڈات کے نیچے ایک اور جعلی کارڈ تھا، شہادت کی تصویر اس پر بھی چپاں تھی۔ اس کارڈ پر شہادت کا نام عظمت اللہ خان درج تھا۔ کارڈ کے مطابق شہادت، حکومت کے محکمہ خوراک میں راشن افسر تھا۔ انہی کانڈات میں مجھے ایک لفافہ بھی ملا۔ اس لفافے پر پتے کی جگہ سب سے اوپر شہادت احمد خان لکھا ہوا تھا۔ میں نے اتنی تیزی دکھائی کہ شہادت اور محمود حسن دونوں ہی منہ دیکھتے رہ گئے۔

”بھائی شہادت!“ میں نے بڑی نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ”ہر کارڈ الگ الگ جیبوں میں رکھا کریں تاکہ کہیں پھنس نہ جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولا کریں کہ ذاتی قسم کے خطوط وغیرہ ہر جگہ ساتھ نہیں لئے پھرتے۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی کام بگاڑ دیتی ہے۔ یہ لیں اپنے کانڈات اور انہیں منہ بال کر الگ رکھیں۔“

”زندہ باد میاں!“ شہادت مجھ سے کانڈات لے کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم کہیں مار نہیں کھاؤ گے۔ ابھی سے تمہارا یہ عالم ہے تو آگے کیا غضب ڈھاؤ گے۔ آؤ گلے سے لگ جاؤ۔“

محمود حسن بھی زور سے ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”کیوں بھی شہادت! کیسی رہی؟“

”بہت عمدہ۔“ شہادت نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”جان برادر! تمہارا یہ آدی کسی جھٹلے کے رعب میں آنے والا نہیں ہے۔ تم اس پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ اسے اب تک تم نے چھپا کر کہاں

بازہ لیتا رہا۔ اس نے نوٹوں کی وہ گڈیاں چمڑے کے ایک بڑے تھیلے میں بھریں اور تجوری بند کر کے الماری پر تالا ڈال دیا۔ کچھ دیر وہ تھیلا ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ یوں لگا جیسے وہ سن گن لے رہا ہو کہ کوٹھی میں واقعی سناٹا پھیلا ہوا ہے یا نہیں۔ ذرا توقف کے بعد وہ اپنی خواب گاہ سے نکلا۔ میں اس سے خاصے فاصلے پر رہا۔

محمود حسن دبے پاؤں چوکنا انداز میں آخر سید بادشاہ کی کوٹھری تک پہنچ ہی گیا۔

کوٹھری کا دروازہ کھول کر محمود حسن اندر چلا گیا اور پھر دروازے کو بند کر لیا۔

ہم جن زادوں کے لئے بند دروازے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مجھے اگر کوئی اندیشہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں وہ عیار کوٹھری میں میری موجودگی کو محسوس نہ کر لے۔ یہ سوچ کر کہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا مجھے بھاگنا پڑے گا، خطرہ مول لے ہی لیا۔

میں اندر پہنچا اور محمود حسن سے دور رہنے کے لئے کوٹھری کی چھت سے جا لگا۔

محمود حسن نے ایک موم بتی جلا کر آتش دان کے اوپر رکھ دی۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ وہ سامنے کے رخ سے آتش دان تک نہیں گیا اور دائیں جانب سے ہاتھ بڑھا کر موم بتی رکھی۔ پھر وہ جھکا اور آتش دان میں لگے ہوئے چوکور پتھروں میں سے ایک پر دباؤ ڈالا۔ اسی کے ساتھ بائیں طرف کی دیوار بہت ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک جانب کھسک گئی۔

دیوار کے کھسکنے ہی قد آدم بڑی بڑی دو تجوریاں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک کو کھول کر محمود حسن نے نوٹوں کی گڈیاں اندر رکھ دیں۔ تجوری بند کر کے وہ محتاط انداز میں دوبارہ آتش دان تک پہنچا اور دیوار اپنی جگہ آگئی۔

میرے لئے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ مجھے پہلے بھی اسی طرح کا شبہ تھا۔ کالے دھن کو چپا کر رکھنے کے لئے محمود حسن جیسے لوگ ایسے ہی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اب میرے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل نہ رہا کہ کوٹھری کے آتش دان پر وہ بدہمت مجسمہ کیوں رکھا گیا ہو گا۔ وہاں داخل ہونے والا شخص کے سبب سب سے پہلے اسی کی طرف متوجہ ہوتا۔ کوٹھری کے فرش پر آتش دان کے سامنے کوئی جگہ ایسی ہو گی کہ جس پر دباؤ پڑنے سے آتش دان میں بجلی کے کسی بلب کا جھماکا ہو، اسی کے ساتھ وہیں گھبی ہوئی کسی شے سے غیر مانوس آواز سنائی دینے لگے۔

محمود حسن کے شیطانی ذہن ہی نے اس کوٹھری کو پراسرار بنا رکھا تھا۔ ”سید بادشاہ“ اسی کے ذہن کی تخلیق تھا۔ اگر واقعی وہ کوئی پراسرار وجود ہوتا تو اب تک میں اتنی آزادی کے ساتھ اس کوٹھی میں نہ رہ پاتا۔

وہاں مزید رکے بغیر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ محمود حسن کی شخصیت سے وابستہ اب ایک اور معمہ حل طلب رہ گیا تھا۔ پیر منکھو کی مائی کو میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ بہت سے لوگ مختلف بزرگوں کے مزاروں سے وابستہ ہو جانے کے سبب انہی مزاروں کی نسبت سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ واقعی اللہ والے ہوتے ہیں اور بیشتر خلق خدا کو فریب دے کر مال کماتے

رکھا تھا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی زبردستی اپنے برابر والی کرسی پر بٹھالیا۔ ”بیٹھو یا! تم سے اب کیا پردہ۔“

”نہیں شبہات! تم اسے نیچے دکان پر جانے دو۔“ محمود حسن بول اٹھا۔ ”دیے بھی میں نوکروں کو اپنے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔“

”لیکن برادر! نوکر نوکر میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔“ شبہات نے کہا۔

میں اس وقت تک اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ محمود حسن نے مجھے جانے کا اشارہ کیا اور میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔

اب تک ہر بات میرے حق میں جاری تھی۔ گزشتہ روز میں نے متین، صادق اور دوسرے ملازموں کو جو نئے لکھ کر دیئے تھے، ان سے فوری طور پر سبھی کو اتفاق ہوا۔ ایک دکان سے دوسری اور تیسری دکان پھر تقریباً ساری ہی مارکیٹ میں یہ بات پھیل گئی کہ مجھے حکمت بھی آتی ہے۔ محمود حسن جب دکانیں بند کرانے آیا تو میں ’صادق کی سفارش پر اسی مارکیٹ کے ایک دکان دار کے لئے نسخہ لکھ رہا تھا۔ اس وقت تو محمود حسن نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، مگر واپسی میں میری ٹانگ تھسینی، بولا۔ ”مقصود! تم نے یہ کیا نیا چکر چلا دیا؟“

”کون سا چکر جناب!“ میں انجان بن گیا۔

”یہی نئے لکھ کر دینے والا چکر۔“ اس کے لہجے سے قدرے خفگی جھلک رہی تھی۔

”جناب! یہ تو خلق خدا کی خدمت ہے۔ میرا کیا جاتا ہے۔ میں کسی سے کچھ لیتا نہیں نسخہ لکھنے کا۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

”اچھا تو اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ سینہ بہ سینہ کچھ خاندانی نسخے تم تک پہنچے ہیں۔“ محمود حسن طنزیہ انداز میں بولا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب!“ پھر میں نے اسے بھی دبی سب کچھ بتا دیا جو متین سے کہا تھا۔

”یہ کس سن عیسوی کی بات ہے برخوردار؟“ محمود حسن کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

”پاکستان کے قیام سے پہلے یہ اس وقت کا ذکر ہے جناب کہ میں جب ملتان میں تھا۔“

”بہت عمدہ جا رہے ہو تم..... کچھ ہی دنوں میں شبہات تمہاری شاگردی اختیار کر لے گا۔ دیکھو مقصود! میری بلا سے تم جو چاہے کرو بس اتنا خیال رکھنا کہ جھوٹ ایسا بولو کہ جس پر یقین آ جائے۔“ اس نے مجھے نصیحت کی۔

”آئندہ خیال رکھو جناب!“ مصلحت کے تحت میں نے پہائی اختیار کر لی۔

وہ رات بھی میں نے خالی نہ جانے دی۔ محمود حسن کا ایک اور راز مجھے پتا چل گیا۔ اس کا تعلق سید بادشاہ کی کوٹھری سے تھا۔

ہوا یہ کہ میں گزشتہ رات کی طرح جن زاد بن کر محمود حسن کی خواب گاہ میں پہنچا تو وہ ایک الماری کھول کر اس کی تجوری سے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکال رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی نقل و حرکت کا

ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ان میں نظر آتے ہیں جو خط الحواس اور ذہنی عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں۔ تو ہم پرست افراد انہیں پہنچا ہوا مشہور کر دیتے ہیں۔

پیر منگھو کی مائی کا تعلق ایسے آدم زادوں کے کس گروہ سے تھا، یہ جاننا میں نے ضروری ہی سمجھا۔ مجھ سے نبرد آزمائی کے وقت محمود حسن کا یہ کہنا کہ مجھے پیر منگھو کی مائی نے بھیجا ہو گا، بلا سبب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سید بادشاہ کی طرح پیر منگھو کی مائی بھی محمود حسن کے ذہن کی ایچ ہو گی۔ یہ ماننے پر میرا ذہن آمادہ نہ ہوا۔ محمود حسن تک پہنچنے ہوئے ابھی مجھے چند روز ہوئے تھے۔ میں نے اسی لئے غلٹ سے کام لیا۔ اس معاملے کو میں نے آئندہ کسی وقت کے لئے چھوڑ دیا۔ مختصر عرصے میں مجھے محمود حسن کے بارے میں خاصی کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ اب ذرا صبر و تحمل کی ضرورت تھی تاکہ میں اس پر بھرپور ہاتھ ڈال سکوں۔

میں چند ہی دنوں میں محمود حسن کی مجبوری بن گیا۔ اب وہ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتا۔ میرے ٹھٹھٹ بات ہی کچھ اور ہو گئے۔ محمود حسن نے کہیں کسی کام سے آنے جانے کے لئے مجھے اپنی موٹر استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں کاروباری حلقے میں اجنبی نہیں رہا۔ حاجی صاحب اور دوسرے بااثر و بااختیار لوگ بھی مجھے اہمیت دینے لگے۔ میرے جسم پر بہترین لباس ہوتا۔ میری حیثیت محمود حسن کے ملازم کی نہ رہی۔ معاون جیسی ہو گئی۔ محمود حسن مجھے اب اپنے ساتھ ہی اوپر دفتر میں بٹھاتا۔ میں اس کے لئے سونے کی چڑیا ثابت ہو رہا تھا۔ کاروباری حلقوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ مقصود مٹی کو بھی ہاتھ لگا دے تو سونا بن جاتی ہے۔ محمود حسن کی طرف سے میرے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میں بغیر کچھ لئے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔ گھر کے کام کاج کے لئے ایک ملازم رکھ لیا گیا۔ مجھے محمود حسن نے کوٹھی کے اندر ہی رہنے کو ایک کمرہ دے دیا۔

ایک مرتبہ حاجی صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں مدعو کیا۔ انہوں نے اپنے چڑاسی کو بلا کر کہہ دیا کہ کسی کو بھی اندر کمرے میں نہ آنے دے۔

”جی حاجی صاحب! فرمائیے کیا حکم ہے؟“ میں نے آرام دہ صوفے میں تقریباً دھنستے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

”مقصود میاں! کیسی باتیں کرتے ہو، میں تمہیں کیا حکم دوں گا۔ تمہیں میں نے ایک اہم بات کرنے کے لئے بلایا ہے لیکن پہلے یہ بتا دو کہ میرے اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو محمود حسن کے علم میں تو نہیں آئے گی؟“ حاجی صاحب نے کہا۔

”اگر گفتگو کی یہی شرط ہے تو مجھے منظور ہے۔“ میں نے کہہ دیا۔

”دراصل میں یہ نہیں چاہتا کہ محمود حسن خواہ مخواہ میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔“

”آپ بات تو کریں۔“ میں بولا۔

”تم عبدالرزاق صاحب کو تو جانتے ہو گے۔“

”ہاں ایک مرتبہ ان سے مل چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”وہ براہ راست تم سے یہ بات کرتے ہوئے تنجک رہے تھے۔ انہوں نے اسی لئے مجھے درمیان میں ڈالا ہے۔ بھائی عبدالرزاق تمہیں اپنا ورکنگ پارٹنر بنانا چاہتے ہیں۔ پیسہ ان کا ہو گا، محنت تمہاری۔ خود میرا خیال بھی یہ ہے کہ تم اس پیشکش کو قبول کر لو اور اپنی ملازمتوں کو محدود نہ کرو۔ تمہاری ترقی سے مجھے ذاتی طور پر بڑی خوشی ہو گی۔“ حاجی صاحب یہ کہہ کر میری طرف متوقع نظروں سے دیکھنے لگے۔

”میں آپ کا ممنون ہوں حاجی صاحب کہ آپ نے میری ترقی اور بہتری کے لئے سوچا۔“ میں نے جواب میں کہا۔

ابھی میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ حاجی صاحب بول اٹھے۔ ”تو پھر میں بھائی عبدالرزاق سے ہاں کر دوں؟“

”اقرار یا انکار کی نوبت ابھی کہاں آئی ہے حاجی صاحب! پہلے آپ میری پوری بات تو سن لیں۔“

”ہاں بولو، اگر اس سلسلے میں تمہاری کچھ شرائط ہیں یا تم کسی طرح کا تحفظ چاہتے ہو تو کہہ دو مجھ سے۔ باقاعدہ پارٹنرشپ ڈیڈ بنے گی۔ اس پر بطور گواہ میں بھی دستخط کر دوں گا۔ تم اگر چاہو تو میں اپنے وکیل سے کاغذات تیار کرادوں۔ بھائی عبدالرزاق کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ان کا کاروبار کتنا پھیلا ہوا ہے۔ برا نہ مانا، محمود حسن کی حیثیت ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔“

”حاجی صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ درست کہہ رہے ہیں اور.....“

انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ”پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”عرض کئے دیتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”یہ بتائیے کہ آپ کو خبر ہے یا نہیں، میں اکیلا آدمی ہوں، کوئی میرے آگے پیچھے نہیں۔“

”ہاں معلوم ہے، پھر؟“

”تو پھر میں کس لئے اور کس کے لئے یہ سب کچھ کروں؟ کسی کیا ہے مجھے؟ اچھے سے اچھا کھاتا ہوں، پہنتا ہوں۔ رہنے کو بھی مجھے اچھی جگہ ملی ہوئی ہے۔ کوئی فکر، کوئی غم نہیں۔ کیوں آخر میں یہ نیا روگ اپنی جان کو لگاؤں؟“ میں نے لاگ لپیٹ کے بغیر سیدھی بات کہہ دی۔

”تمہاری بات سن لی میں نے مقصود میاں! اب مجھے کچھ کہنے دو۔ کیا تمہارا ارادہ زندگی بھر تمہارے کاپے؟ مستقبل کی تمہیں کوئی فکر نہیں؟“

”آپ تو جانتے ہیں حاجی صاحب کہ محمود حسن کے میاں میری کیا حیثیت تھی اور اب کیا صورت ہے۔ اس وقت بھی میں نے ایک ہی ذات پر بھروسہ کیا تھا اور آج بھی اسی پر تکیہ ہے۔ کل کیا ہو گا، کون جانتا ہے۔ کب کس کے سانس کی ڈور ٹوٹ جائے کے معلوم؟“

”معاف کرنا مقصود میاں! اگر سبھی تمہاری طرح سوچنے لگیں تو یہ کاروبار دنیا ہی ٹھپ ہو جائے۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ اگر تم اس وقت ایسا نہیں چاہتے تو میں کوئی دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ کبھی تنہائی میں ٹھنڈے دل سے میری باتوں پر غور کرنا۔ ہر آدمی کی زندگی میں ترقی کرنے کے مواقع آتے ہیں۔ کچھ لوگ

یہ موقع کھو دیتے ہیں اور بعد میں انہیں پچھتاوا ہوتا ہے۔ تم سوچ کر مجھے جواب دے دیتا۔“

میں نے بھی انہیں ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ اس پیشکش پر غور کروں گا۔

”اچھا یہ بات تو رہی ایک طرف اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ میں نے تمہاری یہ شہرت بھی سنی ہے کہ مختلف امراض کے بڑے تیر بہ ہدف نئے تمہارے پاس ہیں۔ میرے ایک بہت عزیز دوست کی بیوی عرصہ دراز سے مفلوج ہیں۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ بہت علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ پردہ نظر خاتون ہیں۔ میرے دوست عامر صاحب اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کے سبب بہت پریشان رہتے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ کا علاج کر سکو تو یہ مجھ پر تمہارا احسان ہو گا۔“

”حاجی صاحب! اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ میں تو فی سبیل اللہ خلق خدا کی خدمت کر ہوں۔ مجھے تو اس وقت روحانی سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے جب اللہ کسی کو میرے ذریعے شفا عطا دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر مقصود میاں! ابھی نسخہ لکھ دو۔“ حاجی صاحب فوراً بولے۔

”اس کے لئے مجھے مریضہ کو دیکھنا پڑے گا۔“

”اچھا تو میں عامر صاحب سے بات کر لیتا ہوں آج ہی کل تمہیں بتا دوں گا۔ ویسے عامر صاحب پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ کسی طبیب یا ڈاکٹر سے کیا پردہ۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے عامر صاحب اس پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔“

اس گفتگو کے بعد میں حاجی صاحب کے دفتر سے اٹھ کر چلا آیا۔ اسی دن میں نے عامر صاحب کی بیگم کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں اور حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے ہندوستان کے ایک مشہور معروف حکیم صاحب کا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ معاملہ اس سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا۔

دوسرے دن مجھے دفتر پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ حاجی صاحب آ گئے۔

محمود حسن ان کی خاطر مدارات میں لگ گیا کیوں کہ حاجی صاحب کبھی کبھار ہی آتے تھے۔

”میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا کیوں کہ مجھے مقصود میاں کو ساتھ لے جانا ہے۔“ حاجی صاحب نے محمود حسن سے کہا۔

”کہاں لے جا رہے ہیں ان حضرت کو؟“ محمود حسن نے مسکرا کر پوچھا۔

”عامر صدیقی صاحب کی کوٹھی پر۔“ حاجی صاحب نے بتایا۔

محمود حسن یہ سن کر چونک اٹھا اور پھر کہنے لگا۔ ”میں نے تو سنا ہے انہیں کوئی وزارت ملنے والا ہے۔“

”افواہ ہے ابھی تو ایسی افواہیں عامر صاحب جیسے لوگوں کے لئے اڑتی ہی رہتی ہیں۔“ حاجی صاحب بولے۔

”خاندانی رئیس ہیں انہیں وزارت وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس موضوع پر ان میری بات ہو چکی ہے۔“ پھر حاجی صاحب نے میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر کہا۔ ”کچھ لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ نہ انہیں دولت کے حصول سے زیادہ رغبت ہوتی ہے نہ اقتدار سے۔“

میں اس بات پر زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

”لیکن حاجی صاحب انہیں آخر مقصود میاں سے کیا کام پڑ گیا؟“ محمود حسن نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ خبر نہیں ہوتی محمود حسن کہ کب کون بندہ کہاں کام آ جائے۔ یہ مقصود میاں بھی خوب آدمی ہیں۔ ان کی کیا خوبیاں گنوائی جائیں۔ مجھ سے زیادہ تو تم انہیں جانتے ہو کہ چوبیس گھنٹے کا ساتھ ہے۔ یاد کرو محمود حسن! میں نے تم سے ان کے لئے کیا کہا تھا تمہیں ہیرا مل گیا ہے۔“

”ہاں یاد ہے حاجی صاحب! آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آپ کی بات سولہ آنے صحیح نکلی۔ ہاں وہ اصل بات تو یہ ہی گئی کہ عامر صاحب.....“

”بتاتا ہوں۔“ حاجی صاحب بول اٹھے اور پھر مختصراً مجھے عامر صاحب کی کوٹھی پر لے جانے کی وجہ بتا دی۔

”اب تک تو میں نے خود بھی اس سلسلے میں مقصود میاں کی تعریفیں ہی سنی ہیں۔ خدا کرے بیگم صاحبہ بھی صحت یاب ہو جائیں۔“ محمود حسن بولے۔

”اس کی بھی ایک بڑی وجہ ہے محمود حسن! دراصل مقصود میاں بے غرض ہو کر اور کسی سے پھوٹی کوڑی قبول کئے بغیر لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ اچھا ابھی چلو اب مقصود میاں! دیر ہو رہی ہے۔“ حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہو گئے۔

میں بھی اٹھا تو محمود حسن نے اپنی موٹر کی چابیاں میری طرف بڑھادیں۔

”رہنے دو مقصود میاں کو میں خود واپس چھوڑ جاؤں گا۔ کیا پتا واپسی میں کتنی دیر لگ جائے اور تمہیں کسی کام سے کہیں جانا ہو۔“ حاجی صاحب نے کہا۔

ہم نیچے آ گئے تو حاجی صاحب کے ڈرائیور نے ہمارے لئے موٹر کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

عامر صاحب کی کوٹھی تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ قدیم وضع کی بڑی سی کوٹھی تھی۔

عامر صاحب ہمارے ہی منتظر تھے۔ مجھ سے تعارف کے بعد وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملے۔ ایک ملازم

چاندی کی طشتی میں ہمارے لئے خشک میوہ لے کر آ گیا۔ انہوں نے ہمیں اپنی نشست گاہ میں بٹھایا تھا جو ان کے شایان شان تھی۔

”حاجی صاحب سے آپ کی بڑی تعریف سنی تو زحمت دے دی۔ تبادلہ فرمائیے۔“ انہوں نے میز پر

رکھی ہوئی طشتی کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم جا چکا تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ سے عامر صاحب خاندانی رئیس ہی

معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے لمبے میں نام کو بھی تکبر نہیں تھا۔

”ایک بات عرض کرنا تھی آپ سے۔“ میں نے اخلاقاً طشتی میں سے چند کاجو اٹھاتے ہوئے عامر صاحب سے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ عامر صاحب بولے۔

”بیگم صاحبہ کو میں خلوت میں دیکھوں گا۔ وہاں ان کے اور میرے سوا کوئی اور نہیں ہونا چاہئے۔“

عامر صاحب چند لمبے خاموش رہے پھر کہنے لگے۔ ”گستاخی معاف اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وجہ نہ ہوتی تو میں یہ کہنے کی جسارت نہ کرتا۔“
 ”وہ تو بالکل معذور ہیں، بول بھی نہیں سکتیں، نہ اٹھ کر خود چل سکتی ہیں۔ جہاں بٹھا دیا جائے کسی مجسمے کی طرح تصویر بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ اپنے مرض کے متعلق نہ وہ آپ کے کسی سوال کا جواب دے پائیں گی، نہ آپ کچھ معلوم کر سکیں گے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں عرض کروں کہ گزشتہ.....“
 ”قطع کلائی کے لئے معذرت! مریضہ کو دیکھ بغیر میں پہلے سے کوئی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا۔“ میں بولا۔

”بہتر ہے۔ میں ملازموں سے کہتا ہوں کہ وہ بیگم صاحبہ کو وہیل چیئر پر بٹھا دیں۔ پھر آپ کو میں ان کے کمرے میں لے جاؤں گا۔ میں ابھی حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ آپ تشریف رکھئے۔“ یہ کہہ کر عامر صاحب نشست گاہ سے اٹھ کر اندر چلے گئے۔
 ”مقصود میاں! تمہاری یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حاجی صاحب نے دھیمی آواز میں میری طرف جھک کر کہا۔ ”تمہیں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ بیگم صاحبہ ایک پردہ نشیں خاتون ہیں۔ یہاں تک بھی بات مناسب تھی کہ ایک معالج کی حیثیت سے تم انہیں دیکھ لیتے لیکن ان سے تنہائی میں ملاقات کچھ عجیب سی بات ہے۔ ممکن ہے تمہیں ان کی نبض دیکھنی ہو تو اس کے لئے بھی کسی کا بھی وہاں موجود نہ ہونا ایسا کیا ضروری تھا؟“

”یہ ضروری نہ ہوتا حاجی صاحب تو میں اس کے لئے نہ کہتا۔“ میں نے نرم آواز میں جواب دیا۔ ”ابھی کچھ دیر ہی کے بعد خود آپ کو بھی اس کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔ پھر میری اگر آپ یا عامر صاحب اس پر متعرض ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔“
 ”یعنی یہ کہ تم بیگم صاحبہ کو دیکھ بغیر بھی ان کے لئے کوئی نسخہ تجویز کر سکتے ہو؟“ حاجی صاحب جلدی سے بولے۔

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں بیگم صاحبہ کا علاج کرنے کے لئے ضد نہیں کروں گا۔“
 ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مقصود میاں! دراصل اس خاندان کی روایات سے تم واقف نہیں، میں تو اس لئے کہہ رہا تھا ورنہ تو عامر صاحب نے اس کے باوجود تمہاری بات مان لی ہے۔“
 پھر حاجی صاحب نے خاموشی اختیار کر لی اور میں بھی کچھ نہ بولا۔ عامر صاحب نشست گاہ میں لوٹ کر آئے تو مجھ سے کہا۔ ”تشریف لائیے۔“

میں اٹھ کر عامر صاحب کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ان کے چہرے سے فکر و تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر عامر صاحب رک گئے اور بولے۔ ”بیگم صاحبہ اندر اکیلی ہیں۔ کوئی خادمہ تک ان کے پاس نہیں۔ آپ انہیں جا کر دیکھ لیجئے۔ میں باہر آپ کا منتظر ہوں کہ نشست گاہ تک آپ کی رہنمائی کر سکوں۔“

”آپ کو یہ زحمت دینا کہ باہر کھڑے رہ کر میرا انتظار کریں، کچھ زیب نہیں دیتا۔ آپ نشست گاہ ہی میں تشریف رکھئے، میں بیگم صاحبہ کا معائنہ کر کے خود حاضر ہو جاؤں گا۔ یہاں سے نشست گاہ دوری

تھی ہے۔“

میری بات سن کر عامر صاحب کے چہرے پر تذبذب کے آثار جھلکے پھر انہوں نے گہرا سانس لے کر چہے کچھ سوچا اور دھیرے سے بولے۔ ”بہتر ہے۔“
 وہ پلٹ کر نشست گاہ کی طرف چلے گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔

کچھ ہی فاصلے پر میں نے ایک وہیل چیئر پر بیگم صاحبہ کو نظریں جھکائے بیٹھے ہوئے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس عمر کی کوئی بارعب اور حسین آدم زادی میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

دیرِ قالمیں پر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا میں ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ان کی بڑی بڑی پلکیں اب تک جھکی ہوئی تھیں اور گلابی رخسار حیا کی وجہ سے کچھ اور گلابی دکھائی دے رہے تھے، وہ سبز ہلکے رنگ کی کشمیری شال اوڑھے ہوئی تھیں۔

”ذرا اپنی حسین پلکیں تو اٹھائیں کہ میں آپ کی بڑی بڑی آنکھوں میں اپنے چہرے کا عکس تو دیکھ سکوں۔“ میں نے غدار آلود سی آواز میں انہیں مخاطب کیا اور ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔

ان کی چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے اور سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔ پھر انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ مجھے ان کی آنکھوں میں جلیاں سی کوندتی محسوس ہوئیں۔ شدید غصے اور ناگواری کے ساتھ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔

میں نے جواب میں مسکرا کر اردو زبان کے ایک مشہور و معروف شاعر استاد داغ دہلوی کا ایک شعر پڑھا۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ

ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

اس شعر کے رد عمل میں ان کی آنکھوں کی سرفخی کچھ اور بڑھ گئی۔

میں ان کے غصے کی پرواہ کئے بغیر مسکرا کر ان کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”آپ کو شاید خود بھی اپنے حسن کی قیامت خیزی کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ شراب سی آنکھیں، یہ کمان سے اردو رخسار ہیں کہ کشمیر شاداب چمن، پیشانی ہے کہ زرباش ہلال، لب لعلیں ہیں کہ گلاب کی چٹکھڑیاں، جسم ہے کہ بسترِ دیباہ حریر، آپ کا انداز خرام جنبش شاخ طوطی کی طرح ہو گا، گھنی زلفیں کھولتی ہوں گی تو گھٹائیں چھا جاتی ہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں ان کے اور قریب ہو گیا۔ ”آپ کے بدن کی مینا اور لبوں کے ساغر کسی زاہد خشک کی توبہ توڑ دینے کے لئے کافی ہیں۔ آپ کو دیکھ کر جس دل میں جذبات کا طوفان کر دیتا ہے، وہ دل، دل ہی نہیں۔“

ان کے شخص کی رفتار ایک دم بڑھ گئی، ہونٹ کانپنے لگے۔

میں اسی لمحے میں نے خواب آلود سی آواز میں کہا۔ ”یہاں میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں تو

پھر حجاب کیا۔ مجھے اپنی آنکھوں کی پیاس تو بجھالینے دیں۔" پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ کشمیری شال ایک جھٹکے سے کھینچ لی جو وہ ادڑھے ہوئے تھیں۔

"گس..... گستن..... بے..... بے ادب!" وہ چیخ اٹھیں۔ اسی کے ساتھ ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر ان کا دایاں ہاتھ تیزی سے اٹھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور وہ چیخنے لگیں۔ "نکل جاؤ یہاں سے..... ورنہ..... ورنہ ہم تمہیں جان سے مار دیں گے۔" انہوں نے میری طرف قدم بڑھائے اور میں پیچھے ہٹا گیا۔

وہ چیخے جا رہی تھیں اور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن رہا تھا۔ ساری کوٹھی جیسے ان کے چیخنے چلانے سے گونج رہی تھی۔

سب سے پہلے عامر صاحب اس کمرے میں ہانپتے ہوئے پہنچے۔
"آپ اس ذلیل آدمی کو ہمارے کمرے سے نکال دیں ورنہ ہم اس کا خون کر دیں گے۔" بیگم صاحبہ نے عامر صاحب کو دیکھتے ہی چیخ کر کہا۔

عامر صاحب کے چہرے پر ہلاکی حیرت تھی۔ کبھی وہ بیگم صاحبہ کی طرف دیکھتے جو وہیل چیئر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور ان کی قوت گویائی لوٹ آئی تھی اور کبھی ان کی نگاہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔

پھر میں نے ہی پڑ سکون آواز میں عامر صاحب کو مخاطب کیا۔ "آپ کو مبارک ہو عامر صاحب کہ بیگم صاحبہ اپنے قدموں پر کھڑی ہیں اور ان کی زبان کی گرہ بھی کھل گئی ہے۔ انہیں آپ سارا دے کر مسمری تک لے جائیے کہ ان کا جسم کانپ رہا ہے۔ ابھی یہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتیں۔ میں نشست گاہ میں چل کر ایک نسخہ لکھتا ہوں۔ آپ کسی ملازم کو بھیج کر عطار سے تجویز کردہ دوائیں منگوا لیجئے۔"

"یہ شخص بدکردار اور کمینہ ہے۔ اس..... اس نے ہم پر دست درازی کی ہے۔ آپ..... آپ اسے سزا دیں۔ یہ..... یہ کوئی طبیب نہیں ہے۔" بیگم صاحبہ نے عامر صاحب سے بلند آواز میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم انہیں ضرور سزا دیں گے۔ آئیے آپ کو ہم مسمری تک لے چلیں۔" عامر صاحب نے اپنی بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔

اس وقت تک کئی خادماں کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے ان سے چلے جانے کو کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

نشست گاہ میں حاجی صاحب ہراساں اور خوفزدہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جیسے ہی نشست گاہ میں قدم رکھا، وہ بول اٹھے۔ "کیا ہوا؟..... مقصود میاں! اندر سے یہ چیخ پکار کی آوازیں کیوں آ رہی تھیں؟ کون جھج رہا تھا؟"

میں اطمینان سے ان کے برابر والی نشست پر جا بیٹھا اور بولا۔ "بیگم صاحبہ جھج رہی تھیں۔" "بیگم صاحبہ؟..... لیکن وہ..... وہ تو بول نہیں سکتیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "ایسا ہو گیا ہے حاجی صاحب! بیگم صاحبہ اب مفلوج نہیں رہیں۔" میں نے بتایا۔

"مگر کس طرح مقصود میاں؟"

"مجھے معاف کر دیجئے گا حاجی صاحب! میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ اس معاملے کو بیگم صاحبہ، عامر صاحب اور میرے درمیان ہی رہنے دیں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی پردہ پوشی ضروری ہوتی ہے۔"

"اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو پھر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ کچھ بتاؤ اور نہ ہی عامر صاحب سے کچھ پوچھوں گا۔"

عامر صاحب کو نشست گاہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے نسخہ لکھ دیا تو انہوں نے ایک ملازم کو ڈرائیور کے ساتھ فوراً نسخہ بندھوا کر لانے کو بھیج دیا۔ نشست گاہ خاصی بڑھی تھی۔ میں نے عامر صاحب کو مخاطب کیا۔ "زحمت تو ہو گی آپ کو، ذرا ادھر سامنے والی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔" پھر میں نے حاجی صاحب سے کہا۔ "آپ خیال نہ کیجئے گا کہ میں آپ سے رازداری برت رہا ہوں۔"

"ارے نہیں مقصود میاں! تم ایسا سوچنا بھی نہیں۔"

میں اور عامر صاحب دور جا کر بیٹھ گئے۔

"بیگم صاحبہ یقیناً ابھی تک سخت غصے میں ہوں گی اور مجھے برا بھلا کہہ رہی ہوں گی۔" میں دھیمی آواز میں بولا۔

"جی ہاں، آپ درست کہہ رہے ہیں۔" عامر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں نے جو گستاخی کی، اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میرے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اگر میں پہلے سے آپ کو بتا دیتا کہ میرا کیا ارادہ ہے تو شاید آپ مجھے اس جرات کی اجازت نہ دیتے۔ میں نے جو نسخہ تجویز کیا ہے، وہ فوری طور پر اثر کرے گا۔ نسخے میں ایک دوا ایسی ہے جو انہیں سنگھانی ہے۔ اس سے ان کی حالت اعتدال پر آ جائے گی۔ ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پھر میں ان سے خود معافی مانگ لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ مجھے معاف کر دیں گی۔ انہیں شدید ذہنی صدمہ پہنچائے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ذہن میں جو گرہ پڑ گئی تھی، وہ کھل جاتی۔ میں نے انہیں یہ صدمہ اس لئے پہنچایا کہ وہ بھول جائیں، مفلوج ہیں۔ جب تک ان کی حالت اعتدال پر نہیں آ جاتی، میں یہیں ہوں۔"

عامر صاحب چند لمبے خاموش رہ کر بولے۔ "بلاشبہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ آپ نے جو انتہائی قدم اٹھایا، اس کا علم مجھے پہلے سے ہو جاتا تو میں ہرگز اس کی اجازت نہ دیتا لیکن پھر..... پھر شاید بیگم صاحبہ کا علاج بھی نہ ہو پاتا۔"

"جو کچھ بھی ہوا وہ بیگم صاحبہ اور آپ کے سوا کسی کو کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔" میں نے عامر صاحب کو یقین دہانی کرائی۔

"یہ آپ کی اعلیٰ طرفی ہے۔ اس پر میں زندگی بھر آپ کا ممنون احسان رہوں گا۔" عامر صاحب

کے لیے میں احسان مندی تھی۔ پھر انہوں نے حاجی صاحب کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا قیاس یہ ہے کہ آپ نے اس ضمن میں حاجی صاحب کو بھی لاعلم ہی رکھا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے ایک بات پر انتہائی حیرت ہے،“ آپ نے بیگم صاحبہ کی کیفیت معلوم کے بغیر کس طرح اندازہ لگا لیا کہ انہیں ذہنی صدمہ پہنچانا ضروری ہے۔“

”آپ نے شاید سنا ہو کہ چمرے بھی بولتے ہیں۔ چہرہ شناسی الگ ایک فن ہے۔ اسے خود ستائی نہ سمجھئے گا۔ معالج اگر چہرہ شناس بھی ہے تو مریض یا مریضہ کو صرف ایک نظر دیکھ کر بھی بہت سی باتیں جان لیتا ہے۔“ میں نے اپنی پردہ پوشی کے لئے کہا۔

ابھی میرے اور عامر صاحب کے درمیان یہی گفتگو جاری تھی کہ ان کا ملازم نسخہ بند ہوا کر لے آیا۔ میرے ایما پر عامر صاحب خود اپنی بیگم کو دوا سگھانے اٹھ کر چلے گئے۔ باقی دوائیں بعد میں دینا تھیں جنہیں استعمال کرائے جانے کے بعد بیگم صاحبہ کو پُر سکون نیند آ جاتی۔ پھر وہ سو کر اٹھتیں تو قطعی طور پر صحت یاب ہوتیں۔ میں اٹھ کر حاجی صاحب کے پاس آ بیٹھا۔

بیگم صاحبہ کے بارے میں مجھے گزشتہ روز ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی یہ حالت تقریباً سال بھر سے ہے۔ ایک سال پہلے ان کی بارہ سالہ اکلوتی بیٹی ڈپ تھیریا کا شکار ہو کر چل بسی تھی۔ یہ صدمہ بیگم صاحبہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہوا۔ ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ پھر وہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ اس کی ابتدا لگت سے ہوئی اور پھر اعصابی دباؤ اتنا بڑھا کہ انہوں نے بولنا چھوڑ دیا۔ بقیہ جسم بھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں وہ قطعی معذور ہو گئیں۔ ان کے ذہن میں یہ گرہ پڑ گئی کہ اب وہ نہ چل پھر سکتی ہیں، نہ بول سکتی ہیں۔ ذہنی سکون پہنچانے کے لئے طبیعوں اور ڈاکٹروں نے انہیں مسکن دوائیں استعمال کرائیں جن کا الٹا ہی اثر ہوا۔ کسی سے بھی صحیح تشخیص نہ ہو پائی۔

چند منٹ کے بعد عامر صاحب نے آ کر اطلاع دی کہ بیگم صاحبہ کی حالت بڑی حد تک اب معمول پر آ چکی ہے۔

میں اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ عامر صاحب نے فی الحال کسی بھی ملازم یا ملازمہ کو کوٹھی کے اس حصے میں آنے سے منع کر دیا تھا۔

میرے ساتھ چلتے ہوئے انہوں دھیمی آواز میں کہا۔ ”بیگم صاحبہ کو میں نے اپنے طور پر بھی سمجھا دیا ہے۔ جواب میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔“

”یہ بھی بہتری ہی کی علامت ہے۔“ میں بولا۔

بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے انہیں اپنی جناتی صفات کے اثر میں لے لیا۔ وہ ایک گرم چادر اوڑھے مسہری پر نیم دراز تھیں۔ ان سے معافی مانگنا تو محض ایک ہمانہ تھا۔ اگر میں انہیں اپنے اثر میں نہ لیتا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ پھر بے قابو ہو کر چیخنے لگتیں۔ انہیں میری دست درازی یاد آ جاتی۔ ان جیسی باحیا، باپردہ اور عزت دار خاتون کے لئے یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ ایک اجنبی شخص نے تنہائی

اور معذوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نازیبا کلمات ادا کئے اور پھر ان کی مثال اتار کر پھینک دی۔

”آداب بیگم صاحبہ!“ میں نے قریب پہنچ کر انہیں مخاطب کیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”وعلیکم آداب!“

”بیگم صاحبہ! میں آپ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگتے حاضر ہوا ہوں۔“

”ہم نے اور ہمارے خدا نے آپ کو معاف کیا۔“ انہوں نے کہا۔ ”آپ کی نیت صاف تھی اور مقصد نیک تھا، اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔ ہم تو آپ کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ ہمیشہ کی معذوری سے بچ گئے۔“

”بڑی عنایت بیگم صاحبہ کہ آپ نے حقیقت جان لی۔ آپ کا بے حد شکریہ!“

میں نے اسی عرصے میں بیگم صاحبہ کے ذہن سے اکلوتی بیٹی کی اچانک موت کا صدمہ بھی خاصی حد تک محو کر دیا۔ اسی وقت میری نظر عامر صاحب کی طرف اٹھی تو ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

پھر جب میں ان کی بیگم کمرے سے نکل کر نشست گاہ کی طرف قدم اٹھا رہا تھا تو انہوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک مرتبہ پھر منونیت اور احسان مندی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لئے نشست گاہ میں آ گئے اور حاجی صاحب کو مخاطب کیا۔ ”آپ اگر مجھے ان سے نہ ملواتے اور انہیں خود لے کر یہاں نہ آتے تو حاجی صاحب! بیگم صاحبہ شاید کبھی صحت یاب نہ ہو پاتیں۔“ پھر انہوں نے حاجی صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا۔

”عامر صاحب! یہ آپ کیا غیروں جیسی باتیں کرنے لگے۔ مجھے یہ بتائیں کہ اب کیا حال ہے بیگم صاحبہ؟“

میں بول اٹھا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ انشاء اللہ کل تک قطعی طور پر صحت یاب ہو جائیں گی۔“ پھر میں نے حاجی صاحب کو مطمئن کرنے کے لئے بات بنائی۔ ”میں ایک دوا اپنے ساتھ بھی لے کر آیا تھا۔ وہی دوا سگھانے کے سبب بیگم صاحبہ چیخنے لگی تھیں اور ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ آپ کیوں کہ عامر صاحب کے قریبی دوست ہیں، اس لئے انہی کی اجازت کے بعد بیگم صاحبہ کے مرض کی بابت عرض کئے دے رہا ہوں۔ یقیناً آپ اس بات کو اپنی حد تک ہی رکھیں گے۔ دماغ کے متعدد امراض ہیں اور ہمارا جسم دماغ ہی کے تابع ہے۔ بیگم صاحبہ کو بھی ایسا ہی ایک دماغی عارض لاحق ہو گیا تھا۔ میری تشخیص کے مطابق اس کی وجہ کوئی شدید صدمہ ہو گا۔“

”بالکل مقصود میاں! تمہاری تشخیص سو فیصد درست ثابت ہوئی۔“ حاجی صاحب نے یہ کہہ کر صدمے کی وضاحت کر دی، پھر بولے۔ ”بڑی ہی معصوم بچی تھی وہ، میں یہ ذکر چھپنے سے گریز کر رہا تھا لیکن.....“ وہ عامر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کچھ کہنے سے رک گئے۔

عامر صاحب کی کیفیت دیکھ کر میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ کون سا ایسا باپ ہو گا جسے اپنی اکلوتی بیٹی سے محبت نہ ہوگی اور بیٹی کی اچانک موت پر اس کا دل خون کے آنسو نہ روتا ہو گا۔

ذرا ہی دیر کے بعد عامر صاحب کی کوٹھی میں جشن کا سا سماں نظر آنے لگا۔ انہوں نے مجھے اور

حاجی صاحب کو منہ میٹھا کرائے بغیر نہ اٹھنے دیا۔

واپسی میں مجھے عجیب سی روحانی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ حاجی صاحب بھی بے حد خوش تھے۔ انہوں نے مجھے میرے دفتری بلڈنگ کے سامنے اتارا اور رخصت ہوتے وقت کہنے لگے۔ ”مقصود میاں! اب ملاقاتیں ہوتی رہنی چاہئیں۔“

”جی۔“ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور وہ اپنی موٹر میں بیٹھ گئے۔

اپنے دفتری بیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ شرافت کسی کی میراث نہیں۔ عامر صاحب، محمود حسن سے کہیں زیادہ دولت مند تھے لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ خرابی دولت میں نہیں، اس کی ہوس میں ہے۔ اسی ہوس نے محمود حسن کو انسان سے شیطان بنا دیا تھا۔ میں اب اس شیطان کو اس کے انجام تک پہنچانے پر غور کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے۔ اگر واقعی پیر منگھو کی مائی سے محمود حسن کی کوئی دشمنی تھی تو یہ بات میرے حق میں جاتی۔ اب اس کی تلاش کا وقت آ گیا تھا۔ اگلے ہی روز میں نے اس کا سراغ لگا لیا۔ میرا یہ اندازہ صحیح ثابت نہ ہو سکا کہ وہ ایک بزرگ منگھو پیر کے مزار پر ملے گی لیکن اس کی شہرت کا سبب وہی مزار تھا۔ پتا چلا کہ وہ برسوں اسی مزار کے آس پاس دیکھی جاتی رہی تھی۔ لوگ اسی لئے اسے پیر منگھو کی مائی کہنے لگے تھے۔ اب وہ کراچی کی ایک اور نواحی بستی ملیر میں آ گئی تھی۔ ملیرندی سے کچھ ہی فاصلے پر چھوٹا سا ایک مندر تھا۔ اسی کے سامنے والے میدان میں مائی نے اپنا ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ منگھو پیر کے علاقے سے تنگ آ کر وہ یہاں آئی تھی، مگر لوگوں نے یہاں بھی اس کی جان نہیں چھوڑی۔

غرض تو باؤلی ہوتی ہے، لوگ اس سے مار کھانے وہاں بھی پہنچ جاتے۔

”بھاگ جاؤ بد بختو!“ وہ چیختی اور کنکر پھرتا تھا کہ مارنے لگتی۔

عجیب بات یہ تھی کہ ہر ایک کے کنکر یا پتھر نہ لگتا۔ جس شخص کو کوئی پتھر آ کر لگ جاتا، وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جس کے پتھر آ کر لگ جائے اس کا کام بن جاتا ہے۔

وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی، اس سلسلے میں مختلف روایتیں مشہور تھیں۔ انہی میں ایک قصہ یہ مشہور تھا کہ جب وہ بچی تھی تو کوئی شخص اسے منگھو پیر کے مزار پر چھوڑ گیا تھا۔ ان روایتوں سے قطع نظر مجھے تو یہ جستجو تھی کہ وہ حقیقتاً غیر معمولی پراسرار قوتوں کی مالک تھی یا لوگوں نے توہم کے سبب اسے ایک پراسرار شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے بارے میں بہت کچھ جان لینے کے باوجود ابھی تشکیکی باقی تھی۔ کوشش کے باوجود کچھ باتیں میرے علم میں نہیں آ سکیں۔ اس سے ملے بغیر میں تذبذب ہی کا شکار رہا۔

میں رات کے وقت فضا میں پرواز کرتا ہوا ملیر مندر پہنچا۔ میں نے دانستہ اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ ندی کی سمت اس میدان میں دور ہی سے مجھے ایک دیا سا ٹمٹاتا نظر آیا۔ میں اس میدان میں اتر گیا۔

قریب پہنچ کر میں نے ایک جھوپڑی میں چراغ جلتے دیکھا۔ اندر زمین پر کپڑا بچھائے ایک عورت دو

زانو بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی لیکن اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ اس کے سر پر چادر تھی اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

میں اسے دیکھ کر دنگ رہی گیا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ پرسکون اور پرکشش تھا۔ اسے اس حال میں کوئی دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ وہ لوگوں کو پتھر مار کر بھگا دیتی ہوگی۔

ابھی میں جھوپڑی میں داخل ہوا ہی تھا کہ وہ زیر لب کچھ پڑھتے پڑھتے ایک دم چونک اٹھی۔ چند ہی لمحوں بعد جب میں نے اچانک اس کی آواز سنی تو جیسے میرے ہوش گم ہو گئے۔ ”اے علیالیش! آج تک کسی جن زاد نے میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ میں اگر چاہوں تو اس خطا پر تجھے سزا بھی دے سکتی ہوں لیکن معاف کر دینا سزا سے بہتر ہے۔ آج تو یوں بھی میرے وصال کی رات ہے اور پھر یہ کہ تو کسی بڑے ارادے سے نہیں آیا۔ دیکھ کہ ادھر میرا کفن رکھا ہے۔ میں کفن اوڑھ کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گی اور پھر خود ہی اپنے جنازے کی نماز پڑھوں گی۔“ میں اس کی آواز سنتا رہا۔ ”تو آیا بھی تو کب آیا، تجھے جو کہتا ہے اور تو جو چاہتا ہے، مجھے معلوم ہے، مگر اب وقت گزر چکا۔ کیا تو اس شیطان سے خوف کھا گیا کہ جس نے ایک دفعہ مجھ پر بڑی نظری ڈالی تھی؟ پھر پورے تین دن تک اسے ایسی سزا دی کہ زندگی بھر نہ بھول سکے۔ اس کے بعد وہ کبھی میری طرف پلٹ کر نہیں آیا اور دور ہی دور سے مجھ پر وار کرنے کے لئے شیطانی حربے آزماتا رہا اور ناکام ہو کر اپنی ہی یونیاں نوچتا رہا۔ اس حقیر شخص نے میری برابری کے لئے مجھے اپنا دشمن سمجھ لیا لیکن میں نے اسے اس قابل بھی نہیں جانا کہ پھر کوئی سزا دیتی۔ اسے سزا دینے کی ضرورت بھی نہیں کیا تھی کہ وہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھود رہا تھا۔ اب گنتی کے کچھ ہی دن تو باقی رہ گئے ہیں۔ جا اے علیالیش کہ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔ تو نے جو سوچا ہے سو کر اور اب میرے پاس نہ ٹھہر۔“

میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”مجھے معاف کر دے اے مائی کہ میں نے تیری عبادت میں خلل ڈالا۔“

”تجھے میں پہلے ہی معاف کر چکی ہوں اے علیالیش، اے جن زاد!“ یہ کہتے ہی وہ پھر عبادت میں مصروف ہو گئی۔

پھر میں وہاں ایک لمحوں کو بھی نہیں رکا۔

مائی کی زبان پر ایک مرتبہ بھی محمود حسن کا نام نہیں آیا لیکن میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ مجھے اس پر ملال سا ہوا کہ اس نیک آدم زاد کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب وہ دنیا سے منہ موڑ کر جا رہی تھی۔ وہ اپنی خدمت کا موقع دیتی تو یقیناً مجھے خوشی ہوتی۔ اس نے محمود حسن کے بارے میں میرے اس یقین کو مزید پختہ کر دیا کہ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

اس رات میری سماعت میں پیر منگھو کی مائی کے یہ الفاظ بار بار گونجتے رہے کہ اب گنتی کے کچھ ہی دن تو باقی رہ گئے ہیں۔

دوسرے ہی روز میں نے محمود حسن پر پہلا وار کیا۔

ہے تمہیں اپنے ٹکے سے؟ تم ہو کس گنتی شمار میں، تمہارے افسران بکاؤ مال ہیں۔“ محمود حسن کی قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا۔

”تم نے میری توہین کی ہے اور میں میں اپنی اس توہین کا بدلہ ضرور لوں گا۔“ انکم ٹیکس افسر نے زور سے میز پر ہاتھ مارا۔ ”ایسی رپورٹ لکھوں گا کہ کوئی بڑے سے بڑا افسر اس کا توڑ نہ کر سکے۔“ یہ کہتے ہی وہ تیزی سے مڑا اور دفتر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

”کیا کر دیا یہ آپ نے۔“ میں بول اٹھا۔

”جو کرنا چاہئے تھا۔“ محمود حسن نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”ایسے کینوں کے ساتھ اسی طرح پیش آنا چاہئے۔ تم اب تماشا دیکھنا مقصود! دولت میں بڑی طاقت ہے۔ اسے کھاتے لے کر چلا جائے دو، انکم ٹیکس کشنر سے ملتے ہیں آج ہی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار میں اسے ہڈی ڈال چکا ہوں۔ اس انکم ٹیکس افسر کی نوکری اگر تیل نہ کرا دی تو میرا نام بھی محمود حسن نہیں۔ دس بیس ہزار بھی خرچ ہو جائیں تو پرواہ نہیں۔ میں سمجھوں گا کہ کچھ دن نہیں کمایا۔ مجھے محمود حسن کو میرے ہی دفتر میں میز پر ہاتھ مار کے دھمکی دے رہا تھا۔“

محمود حسن کی حماقت اور خوش فہمی پر میں دل ہی دل میں ہنستا رہا۔ میرے پھیلانے ہوئے جال کو تو ذکر وہ کیسے باہر نکل جاتا۔

”تم کس بات پر مسکرا رہے ہو مقصود!“ محمود حسن نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

”انکم ٹیکس افسر کی بے وقوفی پر۔“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

”ہاں اسے آج ہی اس کا اندازہ ہو جائے گا۔“ محمود حسن کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

اس گندے تالاب میں کم و بیش ساری ہی مچھلیاں ایک جیسی تھیں۔ انکم ٹیکس والوں کا چھاپہ محمود حسن پر پڑا مگر نصیحت دوسروں نے بھی پکڑی۔ کوئی جھوٹا چور تھا کوئی بڑا۔ سبھی چونکا ہو گئے۔ انکم ٹیکس افسر اپنے عملے کے ساتھ کارروائی مکمل کر کے چلا گیا تو محمود حسن کے دفتر میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب یہ ہی جانتا چاہتے تھے کہ آخر ہوا کیا؟ انہیں محمود حسن سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ یہ الگ بات کہ بظاہر ہمدردی جتا رہے تھے۔ ان کو تو یہ فکر تھی کہ کل کو یہ چکر اگر چل ہی گیا ہے تو کہیں وہ بھی جھپٹ میں نہ آجائیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ محمود حسن اس جال سے نکلنے کے لئے کیا کرے گا؟ وہ بھی یہی داؤ آزمانے۔

محمود حسن نے اپنی عادت کے مطابق کسی کو زیادہ منہ نہیں لگایا اور اس کی گردن مزید اکر گئی۔ کہنے لگا۔ ”آپ لوگ میری فکر نہ کریں۔ سارے ٹکے کو انگلی پر نچا دوں گا۔ انہوں نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے“ اوپر تک پہنچ ہے میری۔“

”پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ یہ بلا ہماری مارکیٹ تک کیسے پہنچ گئی؟“ ایک دکان دار نے پوچھا۔ ”پیسے بھی کھاتے ہیں اور آنکھیں بھی دکھاتے ہیں۔ یہ تو زیادتی ہے نا۔“

”ہوتا ہے یہ سب کچھ، کوئی نئی بات نہیں۔“ محمود حسن نے ٹال دیا۔ ”مجھے زرا جانا ہے، پھر بات

انکم ٹیکس والوں نے اچانک چھاپہ مارا اور جعلی کھاتے اپنے قبضے میں لے لئے۔ محمود حسن نے انکم ٹیکس افسر اور اس کے عملے کو دھونس میں لینا چاہا۔ ”تم لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ تمہارے کشنر صاحب سے میرے کتنے گہرے اور پرانے مراسم ہیں۔ تمہیں اپنے کئے پر بچھتنا پڑے گا۔“

”بعد میں دیکھا جائے گا جناب کہ کون بچھتا ہے۔ فی الحال آپ ہمیں اپنی کارروائی مکمل کرنے دیں۔“ انکم ٹیکس افسر بولا جسے میں اپنے اثر میں لے چکا تھا۔ ”اگر آپ نے قانونی کارروائی میں بے جا مداخلت کی تو ہم اپنی مدد کے لئے پولیس کو بھی طلب کر سکتے ہیں۔“

محمود حسن میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ”تمہیں کچھ کرو مقصود! اینسپکٹر تو میرے قابو ہی میں نہیں آ رہا۔ اسی مرحلے پر اگر یہ معاملہ دبا نہ دیا گیا تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ نیچے دکانوں سے جتنا چاہے کیش لے لو اور اس اینسپکٹر کا منہ بند کر دو۔ کھاتے ان کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت بڑا ہو گا۔ جاؤ جلدی کر دو۔ یہ تو موقع ہے تمہاری ذہانت کی آزمائش کا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ناکامی نہیں ہو گی۔“

سب کچھ میرا ہی تو کیا دھرا تھا، سو میں کس طرح محمود حسن کی چکنی چڑی باتوں میں آ جاتا۔ میں نیچے جا کر کیش تولے آیا لیکن معاملے کو اور بگاڑ دیا۔ میں نے محمود حسن کو مشورہ دیا۔ ”میں اس انکم ٹیکس افسر کو آپ کے دفتر میں بلاتا ہوں۔ میری اور آپ کی حیثیت میں بہرحال فرق ہے۔ آپ خود اسے رشوت دیں گے تو اس پر زیادہ اثر پڑے گا۔“

محمود حسن نے مضطرب سی آواز میں پوچھا۔ ”کیا وہ تمہارے کہنے پر یہاں آ جائے گا؟“

”بالکل آ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے کیش اس کے حوالے کر دیا۔

انکم ٹیکس افسر اور اس کا عملہ بلڈنگ کی اسی منزل پر اس کمرے میں تھا کہ جہاں نشی جی اور کلرک بیٹھتے تھے۔ میں ادھر چلا گیا۔

انکم ٹیکس افسر میرے ایک اشارے پر ساتھ چلا آیا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ محمود حسن کے دفتر میں داخل ہوئے تو اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

”آئیے جناب! تشریف رکھئے۔“ عیار محمود حسن مجسم انکسار بن گیا۔

”جی فرمائیے، کیوں بلایا مجھے آپ نے؟“ انکم ٹیکس افسر کھڑا ہی رہا اور کرسی پر نہیں بیٹھا۔

”بہنصیں تو آپ۔“ محمود حسن زری سے بولا۔ ”ایک امانت تھی آپ کی میرے پاس، وہ دینی تھی۔“ محمود حسن نے میز کی اوپر والی دراز کھولی۔

”کیسی امانت؟..... کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مجھے آپ اتنا نادان نہ سمجھیں کہ میں امانت جیسے لفظوں کا مطلب نہ سمجھ سکوں۔“ انکم ٹیکس افسر کو غصہ آ گیا۔ ”آپ مجھے رشوت دینا چاہتے ہیں؟ بکاؤ مال سمجھ رہے ہیں مجھے؟“

اس عرصے میں محمود حسن نوٹوں کی گڈیاں نکال چکا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور گھور کر انکم ٹیکس افسر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کر رہے ہو۔ ہو کیا تم؟ کتنی تحفہ ملتی

ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔
لوگوں کی دال نہ گلی تو ایک ایک کر کے دفتر سے نکل گئے۔

چلتے وقت میں نے محمود حسن سے دریافت کیا۔ "کیش ساتھ لے چلتا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "پہلے بات ہو جانے دو۔ دفتر میں وہ کبھی کیش نہیں لیتا۔ تمہیں اس کا تجربہ نہیں۔ بس تم ساتھ رہو، ذرا میری ہمت بندھی رہے گی۔"

وہ مجھے ساتھ رکھ کر اپنی ہی کم بختی کو آواز دے رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو میں کوئی اور راستہ نکال لیتا۔ اس معاملے کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ خود انکم ٹیکس کمشنر کے حکم پر یہ کارروائی ہوئی تھی۔ کمشنر کو میں نے ایسا کرنے پر اکسایا تھا اور محمود حسن اسی کو چارہ ڈالنے جا رہا تھا۔

انکم ٹیکس کے دفتر پہنچ کر محمود حسن کو پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ کمشنر نے اس کی توقع کے مطابق اسے فوری طور پر اپنے کمرے میں نہیں بلوایا۔

جب خاصی دیر ہو گئی تو مجھ سے محمود حسن نے کہا۔ "ذرا اس چڑاسی سے توبت کرو، اس نے میرا وزینگ کارڈ اپنے صاحب کو دیا بھی ہے کہ نہیں؟"

میں نے چڑاسی سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔ محمود حسن نے بھی چڑاسی کے یہ الفاظ سن لئے اور برا سامنہ بنایا۔

"ایک تو ان سرکاری افسروں نے میٹنگ کا بہانہ خوب ڈھونڈ رکھا ہے۔ جس دفتر میں جب بھی جاؤ میٹنگ سے نجات نہیں ملتی۔ معلوم نہیں یہ لوگ کچھ کام بھی کرتے ہیں یا صرف میٹنگ کرتے رہتے ہیں۔

لوگ اپنے کاموں کے لئے ادھر ادھر دھکے کھاتے پھرس اور یہ میٹنگ کرتے رہیں۔" محمود حسن نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

میں نے اسے بتانے کے لئے کہا۔ "میٹنگ بھی تو ایک کام ہے۔ ان میٹنگز میں تو یہ طے کیا جاتا ہے کہ دفتر کی کارروائی کس طرح چلائی جائے۔"

"تم حمایت نہ لو ان لوگوں کی، تمہیں نہیں معلوم کہ میٹنگز کی آڑ میں یہ لوگ اکثر اپنے ذاتی کام کرتے رہتے ہیں۔"

میں چپ ہو گیا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد چڑاسی نے ہمیں اندر بھیجا۔ کمرے میں ایک فیشن ایبل عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اٹھلاتی ہوئی انگی اور کمشنر سے بولی۔ "تو پھر اب میں چلتی ہوں۔ کام تو ہو جائے گا نا اب؟"

"آپ خود ہی آگئی ہیں تو پھر کام کیسے نہیں ہو گا۔ اشرف صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ کل شام گھر پر مجھ سے مل لیں۔" کمشنر نے اس عورت سے کہا، پھر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ "جی؟..... بینیں

آپ لوگ۔" اس عرصے میں وہ عورت کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

کمشنر سوٹ پہنے ہوئے تھا، سر پر بال برائے نام تھے، آنکھوں پر محمود حسن کی طرح چشمہ اور ہاتھ میں پارکر پین تھا۔ اس کے سامنے ایک فائل کھلی رکھی تھیں فائل کو بند کر کے اس نے ایک طرف رکھ دیا

اور محمود حسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"درانی صاحب!" محمود حسن نے بات شروع کی۔ "آپ جیسے کرم فرما کی موجودگی میں یہ امید نہیں تھی کہ ایک معمولی افسر آکر میری بے عزتی....."

کمشنر نے بات کاٹ دی اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مجھے ساری رپورٹ مل چکی ہے۔ اس نے نہیں، آپ نے بدتمیزی کی ہے۔ اتنی ہمت کیسے ہوئی آپ کی کہ مجھے بھی بکاؤ مال کہہ دیا؟" کمشنر کا لہجہ بدل گیا۔ "ہیرا پھیری اور جعل سازی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ مجھ سے ملنے کیسے چلے آئے؟"

"اب آپ سے بھی فریاد نہ کریں تو ہم جیسے لوگ کہاں جائیں؟" محمود حسن ڈھیٹ بنا رہا۔

"جہنم میں۔" کمشنر کے لہجے میں مزید سختی آگئی۔ "بہتر یہ ہے کہ آپ چلے جائیں میاں سے، درنہ میں آپ کے گودام بھی میل کرا سکتا ہوں۔"

محمود حسن جتنی منت سماجت کرتا رہا، انکم ٹیکس کمشنر اتنا ہی برہم ہوتا گیا۔ اس نے جھوٹی قسم کھا کر کمشنر کو یہ یقین بھی دلانا چاہا کہ انکم ٹیکس افسر نے غلط بیانی کی ہے، مگر کمشنر نے اس کی ایک نہ سنی۔ سننا بھی کیسے کہ میں وہاں موجود تھا۔

"لگتا ہے کہ اس وقت آپ کا موڈ بہت خراب ہے۔ میں شام کو آپ سے کوٹھی پر ملنے آؤں گا۔" محمود حسن نے آخری چال چلی۔

"ہرگز نہیں۔" کمشنر نے انکار کر دیا۔ "میں آپ جیسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہی کمشنر نے چڑاسی کو بلانے کے لئے کھٹی بجائی۔

محمود حسن کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ کمشنر اور اس کی گفتگو کے وقت میں خاموش رہا۔

دفتر کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے محمود حسن سے کہا۔ "آپ تو کہہ رہے تھے دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس نے تو صاف جواب دے دیا۔"

"غلطی مجھی سے ہو گئی، مجھے اپنے ساتھ تمہیں نہیں لے جانا چاہئے تھا۔ میرے ساتھ کسی اور کو بھی دیکھ کر اس نے معاملے کی بات نہیں کی۔ ایسی باتیں اکیلے میں ہوتی ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں آج شام اکیلا اس کی کوٹھی پر جا کے بات کروں گا۔"

اس کے بعد محمود حسن نے لاکھ سرامار مگر بات بنی نہیں۔ وہ لمبا بھنس گیا۔ انکم ٹیکس والوں نے اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر دی۔ اسی کے ساتھ اس پر جعل سازی کا کیس بھی بنا کر عدالت میں گھسیٹ لیا۔ اس نے پانی کی طرح پیسہ ہیلیا اور دلدل میں دھنسا چلا گیا۔

محمود حسن نے اس عرصے میں شیطانی و ظائف کا سہارا بھی لیا لیکن ان سے کسی کو نقصان پہنچانا تو ممکن تھا، وظیفہ پڑھنے والے کو کسی فائدے کی امید نہیں تھیں وہ اپنی دانست میں اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچاتا رہا۔ یہ محض انتقامی کارروائی تھی جس سے محمود حسن کو کچھ حاصل نہ ہوا۔

ابھی وہ اس چکر سے نہیں نکلا تھا کہ میں نے اس پر دوسرا وار کر دیا اور وہ لمبلا کر رہ گیا۔ وہ دوسرا

چھاپے اس کے گوداموں پر پڑا جہاں سے اسمگلنگ کا مال برآمد کر لیا گیا۔ اس کے گودام سر بمبر کے رہ گئے۔ اس کارروائی کے دوران صادق اور متین نے دونوں دکانوں سے رسیدوں کے بغیر خرید ہوا ہوا غائب کر دیا درجن دکانیں بھی بند کر دی جاتیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی مگر میں دانستہ طرح دے گیا۔ ابھی محمود حسن کو اور تڑپانا تھا۔

اس روز محمود حسن بہت پریشان تھا۔ کوشی پہنچے ہی وہ خود میرہ، کمرے میں آگیا۔ بتول بچائے صائمہ میرے اور اس کے لئے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر لائی۔
 ”چلی جاؤ یہاں سے منحوس عورت!“ وہ صائمہ پر برس پڑا۔ ”تم سے کس نے چائے لانے کو کہا؟“

صائمہ سہم کر بولی۔ ”دفتر سے آکر آپ روز ہی چائے پیتے ہیں اس لئے.....“

محمود حسن نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اسے ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا، پھر بڑے کہنے لگا۔ ”اس عورت نے میرا دماغ اور خراب کر رکھا ہے..... اس سے اچھی تو وہ تھی کہ جو کچھ کہے سنے بغیر اندازہ کر لیتی تھی، مجھے کس وقت کیا چاہئے اور کب اسے میرے پاس نہیں آنا چاہئے۔“

رداروی میں محمود حسن کی زبان پر یہ بات آگئی تو میں نے انجان بن کر پوچھ لیا۔ ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

میرے سوال پر وہ چونک اٹھا، پھر زرا توقف سے بولا۔ ”تھی کوئی چھوڑ اس کا ذکر۔“
 ”اب کہاں ہے وہ؟“ میں نے دوسرا سوال بھی کر ہی دیا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”میں اس وقت تم سے کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں اور تم ادھر ادھر کی باتیں کئے جا رہے ہو۔“

”آپ ناراض نہ ہوں۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”دراصل مصیبت کے وقت کسی ہمدرد کا یاد آ جانا فطری سی بات ہے۔“

”تمہیں کیا خبر وہ میری ہمدرد تھی یا نہیں؟ کہیں تم نے بتول یا صائمہ سے تو اس پاگل عورت کے بارے میں کچھ نہیں سن لیا؟“ وہ چونکا سنا ہو گیا۔

”ایک میں ہی کیا، کوئی بھی اتنے عرصے اس کو خُشی میں رہتا تو اسے پتا چل ہی جاتا کہ یہاں چھوٹا بیگم ہیں تو بڑی بیگم صاحبہ بھی ہوں گی۔“ میں نے اسے چونکنا دیکھ کر بات بتا دی۔

”بڑی بیگم صاحبہ!“ وہ طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا، پھر بولا۔ ”خاک ڈالو اس پر اور کام کی بات کرو۔“

”بولیں کیا بات ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔
وہ کچھ دیر تک چپ رہا، پھر دھیمی اور رازدارانہ آواز میں کہنے لگا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے مقصود کوئی دشمن..... بہت ہی خطرناک دشمن میرے پیچھے لگ گیا ہے اور..... اور وہ مجھے تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے وہ؟“

میں نے آدم زادوں کے درمیان رہنے، خلق خدا کی مدد کرنے اور اپنے مستقبل کے لئے جو غار بنایا تھا، اب اس میں رنگ بھرنے کی ضرورت تھی۔ اس رنگ آمیزی کے لئے میں ابھی سے راہ ہموار رہا تھا۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ میں، عامر صاحب سے ملا۔ توقع کے مطابق وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ بڑے سے ملے۔ عمر میں کوئی ان سے چھوٹا ہو کہ بڑا وہ اسے احترام ہی سے مخاطب کرتے۔ شاید یہ ان کے مزار اور خاندانی شرافت و تہذیب کا حصہ تھا۔ وہ کہنے لگے۔ ”دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ میں آپ کو کل سے یاد ہی کر رہا تھا۔ حاجی صاحب سے مجھے کچھ ایسی ہی تشویش ناک باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ مجھے سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ ایک ایسے شخص کی کاروباری معاونت کر رہے ہیں جس کا دامن صاف نہیں۔ انہی سے یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ کئی بڑے کاروباری حضرات آپ کو اپنا شریک کار بنانا چاہتے ہیں، مگر آپ اس پر آمادہ نہیں۔ کیا وہ شخص محمود حسن آپ کا کوئی عزیز ہے؟“

میں سمجھ گیا کہ حاجی صاحب سے ان کی تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی ورنہ وہ یہ سوال نہ کرتے۔ ”وہ صاحب میرے عزیز تو نہیں ہاں محسن ضرور ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”اب تک میں نے اتنے لے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اسی سبب سے میں نے کسی نئی پیشکش بھی منظور نہیں کی۔ ان کا دامن دلا دار ہے، اس کا علم بھی مجھے حال ہی میں ہوا۔ میرا قیام انہی کی کوٹھی میں ہے لیکن اب میں زیادہ عرصے وہاں رہنا نہیں چاہتا۔ سکونت کے لئے کوئی مناسب جگہ مل جائے تو میں وہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ مجھے آپ کے ایک عزیز فرید احمد صاحب کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ ڈھاکہ جا رہے ہیں۔“

”جی ہاں لیکن ابھی ان کا ارادہ شاید کوٹھی کو فروخت کرنے کا نہیں۔ یوں بھی ابھی انہیں جانے جاتے بھی کچھ وقت لگ جائے گا۔ ابھی تو وہ مشرقی پاکستان گئے ہوئے ہیں، سنا ہے آئندہ ہفتے تک لوٹیں گے۔ میں ان کا عندیہ لے لوں گا۔ کیا آپ نے اسی لئے زحمت کی تھی؟“

”کچھ یہ بات بھی تھی اور کچھ آپ کے نیاز بھی حاصل کرنے تھے۔ بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں نا؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ اب وہ قطعی طور پر صحت مند ہیں۔“

پھر عامر صاحب نے خاطر مدارات کے بغیر مجھے اٹھنے نہ دیا۔ آئندہ ہفتے ان سے ملاقات کرنے کے لئے کہہ کر میں چلا آیا۔

محمود حسن بے چینی سے میرا منتھر تھا۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا تو اس کا منہ بن گیا اور بولا۔ ”یہ بڑے لوگ بھی بڑے مطلبی ہوتے ہیں۔ وقت پڑ جائے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ تم نے اس کی پانچ بیوی کو بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور اس نے احسان کا یہ بدلہ دیا۔“

”اپنی عزت سب کو پیاری ہوتی ہے۔ کوئی ایسے معاملات میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا لیکن آپ نہیں مانے۔“

”تو کیا کروں میں؟“ وہ جھنجھلا گیا۔

”ایک دفعہ ساکھ بگڑ جائے تو کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ بندھے بندھے گاگ بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ جن دکانوں کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ ان پر چھاپہ پڑ چکا ہے اور وہ قانون کی نظر میں آچکی ہیں، گاگ ادھر نہیں آتے۔ پھر یہ کیوں بھول رہے ہو کہ رسیدی دھندا کرنے میں کچھ نہیں رکھا۔“ محمود حسن انتہائی مایوسی کا شکار تھا۔

”آپ فکر نہ کریں، کل سے میں خود دکانیں سنبھالوں گا۔“ میں نے اس کے کاروبار کی لٹیا ڈبوئے کی راہ ہموار کر لی۔

”یہ بھی کر کے دیکھ لو، مجھے تو کوئی امید نہیں۔“ وہ یہ کہتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا۔ محمود حسن اب خواب آور گولیاں کھا کر سونے لگا تھا، کیوں کہ اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار سید بادشاہ کی کوٹھری میں جاتا لیکن تجوریاں بھرنے کے لئے نہیں، خالی کرنے کے لئے۔ اس رات مجھے مظلوم راجہ کا خیال آیا کہ محمود حسن کا انجام قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، راجہ کو ایک نہ ایک روز تو اس کو ٹھہی میں واپس آنا ہے۔ اگر محمود حسن بالکل ہی کنگال ہو گیا تو راجہ اپنی بقیہ زندگی کس طرح گزارے گی؟ معلوم نہیں ہندوستان میں اس کے گھرانے پر کیا گزری؟ اس کے والدین زندہ بھی تھے یا نہیں؟ اس کے دونوں بھائی کہاں اور کس حال میں تھے؟ محمود حسن نے ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں رکھا تھا۔

اسی رات کو میں نے اپنے سوالوں کے جواب معلوم کر لئے۔ نفرت و تعصب کی آندھی نے جن گھرانوں کو بے چراغ کر دیا، انہی میں سے ایک گھرانہ راجہ کا تھا۔ اس کے والدین کو پہلے تو بیٹی کی جدائی کا غم سنا پڑا، پھر فسادات میں ایک بیٹا مارا گیا۔ وہ یہ دہرا غم برداشت نہ کر سکے۔ پہلے راجہ کی ماں نے اس دنیا سے منہ موڑا اور پھر بوڑھا باپ بھی چل بسا۔ فسادات کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑی تو راجہ کا دوسرا بھائی جان بچا کر رائے پور سے نکل آیا۔ گھر کو لوٹ کر فسادوں نے نذر آتش کر دیا۔ راجہ کا بھائی راشد کھوکھار پارکے راستے سندھ میں داخل ہوا اور میرپور خاص میں آ بسا۔ وہیں دور کے کچھ عزیز پہلے سے موجود تھے، سو تھوڑا بہت سہارا مل گیا۔

راجہ کا ایک چھوٹا بھائی زندہ ہے، پاکستان ہی میں ہے اور چھوٹا موٹا کاروبار کر کے اپنی گزر بسر کر رہا ہے، میرے لئے یہ بات اطمینان بخش تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محمود حسن اگر اپنے انجام کو پہنچ بھی جاتا تو راجہ بالکل بے سارا نہ ہوتی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس مظلوم عورت کو کیوں نہ ابھی پاگل خانے سے نکال کر اس کے بھائی تک پہنچا دیا جائے۔ مگر یہ قدم اٹھانا مجھے قبل از وقت معلوم ہوا۔ رہی صائمہ تو اس کے والدین اور عزیز و اقارب خواہ غریب سہی لیکن زندہ تھے۔ وہ اپنی دنیا میں واپس پہنچ جاتی۔ محمود حسن نے ان سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ نہ وہ صائمہ کو ان سے ملنے دیتا، نہ انہیں اپنی کوٹھی کا رخ کرنے دیتا۔ پھر بھی وہ غریب خوش تھے کہ ان کی بیٹی عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

اب میری راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں رہی کہ محمود حسن کو مزید ڈھیل دیئے جاتا۔

چند ہی روز میں دکانوں پر بھی خاک اڑنے لگی۔ صادق اور متین کے سوا ایک ایک کر کے تمام ملازموں کو جواب دے دیا گیا۔ رسی جل گئی مگر بل نہ گئے۔ محمود حسن اب بھی اپنے دفتری میں بیٹھتا حالانکہ اب اس کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ مجھ سے بار بار یہی کہتا کہ کوئی اس کا دشمن اسے نقصان پہنچا رہا ہے۔ میں نے اس دوران عام صاحب کے ذریعے ان کے عزیز فرید احمد کی کوٹھی خرید لی، مگر محمود حسن کو اس کی ہوا نہ لگنے دی۔ کوٹھی میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ یہ کوٹھی نشتر پارک کے قریب تھی۔

ایک روز حاجی صاحب مجھے دکان سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے اور سمجھایا۔ ”مقصود میاں! تم اب تک محمود حسن کا ساتھ دے کر کیوں بدنامی مول لے رہے ہو؟ پرانے تعلقات اور منت ساجت کرنے کی وجہ سے میں نے اسے جیل کی ہوا کھانے سے تو بچالیا، لیکن بدنام ہونے سے اسے کون بچا سکتا ہے۔ مجھے تو خیر حقیقت کا علم ہے کہ تم اسے اپنا محسن سمجھتے ہو مگر سب کو تو اس بات کی خبر نہیں۔ کچھ لوگ دلی دبی زبان سے اب تمہارے بارے میں بھی ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جنہیں سن کر رنج ہوتا ہے۔ ایک شخص نے تو یہ تک کہہ دیا کہ چور کا بھائی گرہ کٹ۔ تمہی بتاؤ، کیا یہ باتیں قابل برداشت ہیں؟ اگر تمہیں کسی اور پر بھروسہ نہیں تو میرے ساتھ آ جاؤ۔“

بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ ”چور کا بھائی گرہ کٹ۔“ حاجی صاحب بھی تو اسی گندے تالاب کی ایک مچھلی تھے۔ مجھ سے کیا چپا تھا۔

حاجی صاحب میرے بر محل الفاظ کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے اور بولے۔ ”یہ حقیقت ہے کہ لوگ اسی طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”چھوڑیں بھی حاجی صاحب! ایسے لوگوں کی باتیں۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جواب بھی مجھے گھیرے رہتے ہیں؟ اب بھی آپ آئے تھے تو دکان پر کتنے لوگ تھے۔ محض آپ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو انتظار کرنے کے لئے کہہ آیا۔“ میں نے کہا۔

حاجی صاحب مسکرا کر بولے۔ ”ہاں اب وہ ہول سیل جنرل اسٹور کے بجائے کسی طیب کا مطب زیادہ لگتا ہے۔ تمہاری شخصیت کا یہ بھی عجیب ہی رخ ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ”مجھے پتا ہے کہ دور دور سے لوگ تمہارے پاس کھینچے چلے آتے ہیں لیکن ایک طرف تو تم نیک نامی کما رہے ہو، دوسری طرف بدنامی۔ میں نے تمہارے متعلق اور بھی کئی عجیب سی باتیں سنی ہیں۔ کبھی موقع نہیں ملا کہ تم سے ان باتوں کی تصدیق کر سکتا۔ کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ تم نے کسی مریض سے آم کھانے کو کہا۔ مریض نے تمہیں یاد دلایا، آج کل سردیاں ہیں، آم کہاں ملیں گے۔ تم نے کاؤنٹر کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور کئی آم نکال کر اس مریض کو دے دیے۔ میں تو خیر اسے گپ سمجھ کر ٹال گیا لیکن جہاں یہ بات ہو رہی تھی، وہاں کئی افراد نے تمہارے بارے میں ایسی ہی ناقابل یقین باتیں بتائیں۔ آج یہ ذکر چھڑی گیا ہے مقصود میاں! تو بتا دو یہ کیا قصہ ہے؟“

حاجی صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ باتیں حقیقت پر مبنی تھیں اور میں دانستہ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اس میں یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے۔ آپ فرمائیں تو میں ابھی آپ کو یقین دلانے دیتا ہوں۔ ایسا تو آپ بھی کر سکتے ہیں۔“

”وہ کس طرح مقصود میاں!“ حاجی صاحب مجسم حیرت بن گئے۔

میں ان کے دفتریں ایک طرف پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرے برابر ہی دوسرے صوفے پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی ان کی بڑی سی میز اور اس کے پیچھے گھومنے والی کرسی رکھی تھی۔

”بسم اللہ پڑھ کر آپ اپنی میز کی نیچے والی دراز کھولے۔ جائے اس میں سے دو قلبی آم نکال کر لے آئیے۔“

وہ ہنس دیے اور پھر کہنے لگے۔ ”مقصود میاں! تم نے آج تک میرے ساتھ مذاق نہیں کیا۔ میں نے تو یہی محسوس کیا ہے ہمیشہ کہ تم میرا احترام کرتے ہو۔ پھر آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں کہ جب ایسی بے سروپا باتوں پر ہنسی جاسکتا ہے۔“

”آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا اور اسے مذاق سمجھ رہے ہیں تو میں خود آم نکال کر لے آتا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہی صوفے سے اٹھ گیا۔

ہم جن زادوں کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ جن پھلوں کا موسم نہ ہو، وہ بھی فراہم کر دیں۔ سو میں نے جو کہا تھا، کر دکھایا۔ حاجی صاحب کے چہرے پر پہلے تو حیرت اور بے یقینی سی نظر آئی، پھر وہ مجھ سے مرعوب نظر آنے لگے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔

”بات اتنی سی ہے حاجی صاحب کہ میرے بزرگوں نے مجھے کچھ اوراد و وظائف تعلیم کئے تھے۔ یہ سب انہی کا کرشمہ ہے۔“ میں نے یقین دہانی کی خاطر کہہ دیا۔ اگر میں انہیں یہ بتا دیتا کہ ان کی طرح آدم زاد نہیں، جن زاد ہوں تو وہ بے ہوش ہی ہو جاتے۔

”تم نے تو واقعی مجھے حیران کر دیا مقصود میاں! معاف کر دیتا، مجھے خبر نہیں تھی کہ تم صاحب کرامت بزرگوں کی اولاد میں سے ہو۔ آج سے تو میری نظر میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی۔ اب تمہارا بے غرض ہونا میری سمجھ میں آیا۔ خاندانی اور نیک لوگ تمہی جیسے ہوتے ہیں۔“

”میں کیا اور میری بساط کیا حاجی صاحب! سب اللہ کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“

”حاجی صاحب! ان ساری باتوں سے قطع نظر میں آپ کو اپنا خیر خواہ اور بڑا سمجھتا ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ کو کیا پڑی تھی کہ مجھے بلا کر سمجھاتے۔ خود میں بھی کافی دن سے انہی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ انشاء اللہ آپ جلد ہی یہ سن لیں گے کہ میں نے محمود حسن صاحب کی کوٹھی کی سکونت ترک کر دی ہے۔“

”پھر کہاں رہنے کا ارادہ ہے مقصود میاں؟“

”میں اس کا بندہ دست کر چکا ہوں لیکن ابھی اس وجہ سے کچھ بیتا نہیں چاہتا کہ محمود حسن صاحب کو یہ سن کر تکلیف ہوگی۔ آپ بھی ابھی کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔ میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر خود ہی یہ قدم اٹھانے کی راہ ہموار کر لوں گا۔“ تقریباً یہی بات میں نے عامر صاحب سے کہی تھی کہ وہ کوٹھی خریدنے کا معاملہ فی الحال راز ہی میں رکھیں۔

”یہ تمہاری شرافت ہے مقصود میاں کہ محمود حسن کی دل آزاری کا تمہیں اب بھی خیال ہے۔ میری زبان پر بہر حال یہ بات نہیں آئے گی۔“

حاجی صاحب کے دفتر سے لوٹ کر میں دکان پر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ دونوں دکانوں میں سالن اتنا کم رہ گیا تھا کہ محمود حسن نے ایک دکان پر تالا ڈلوا دیا تھا۔ دکان پر حاجت مندوں کی بھیڑ لگتی ہوئی تھی۔ محمود حسن بھی مجھے انہی کے درمیان نظر آیا۔

مجھے دیکھتے ہی محمود حسن کا پارا چڑھ گیا اور چیخا۔ ”تم نے کیا تماشا لگا رکھا ہے، مقصود! جب دیکھو یہاں مفت خورے جمع رہتے ہیں۔ بھگاؤ انہیں یہاں سے۔“

میں دانستہ غصہ پی گیا اور ان لوگوں سے آئندہ روز آنے کو کہہ دیا۔ دکان بند کرا کے کوٹھی کی طرف واپس جاتے ہوئے میں نے محمود حسن سے کہا۔ ”آپ کا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ غصہ کسی مسئلے کا حل نہیں۔“

”تو پھر کیا تمہاری طرح میں بھی مفت خوروں کی بھیڑ کو اپنے پیچھے لگائے رکھوں؟“ وہ چڑ کر بولا۔ ”اب یہ ایک موثر اور کوٹھی میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہی حال رہا تو کسی دن یہ دونوں بھی پک جائیں گی۔ جو چال چلتا ہوں، انہی پڑتی ہے۔“

”جب آدمی کا وقت بگڑ جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”وقت بگڑا نہیں مقصود! کسی نے بگاڑا ہے۔ کوئی نہ کوئی دشمن ضرور ہے میرا، تم اس بات کو نہیں مانتے نہ مانو لیکن میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اگر اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے تو میں بھی اسے اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ تو آپ بڑی خطرناک بات کر رہے ہیں۔“ میں نے دانستہ کہا۔ ”قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔“ میرا مقصد اسے چڑانا تھا۔ اس نے بھی مجھے ابتدا میں کم ذہنی اذیت نہیں دی تھی۔ میری دانستہ میں یہ پچھلا قرض اتارنے کا وقت تھا۔

”کیسا قانون، کس کا قانون؟“ وہ چیخ اٹھا۔ ”میں کسی قانون کو نہیں مانتا۔ تمہارا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اپنے دشمن کو قتل کر دوں گا۔“

”لیکن آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہے کون؟“

”میں تمہیں یہی کمال دکھاؤں گا۔“ غصے کی وجہ سے وہ گمرے گمرے سانس لینے لگا۔ پھر کچھ دیر میں اس نے خود پر قابو پایا اور مجھ سے قدرے پرسکون آواز میں بولا۔ ”سنو، آئندہ تین روز تک تمہی کو

دکان کھلوانی اور بند کرانی ہے۔“

”کیا آپ کہیں باہر جا رہے ہیں؟..... اگر گلدہندہر جانا ہے تو.....“

”یہ کیا کیوں اس شروع کر دی تم نے؟“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”کیا میں تمہیں پاگل نظر آتا ہوں؟“

”ضروری تو نہیں کوئی پاگل ہی وہاں جائے۔ بڑی بیگم صاحبہ بھی تو وہیں ہیں۔“

”تو پھر..... میرا اب کیا تعلق اس پاگل عورت سے؟“ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ”آئندہ کبھی میرے سامنے اس کا نام نہ لینا ورنہ.....“ اس نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پھر بولا۔ ”تم بار بار بے ٹکی باتیں کر کے مجھے غصہ کیوں دلا رہے ہو؟“

”خیال ہے آپ کا ورنہ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کے کسی حکم کی میں نے خلاف ورزی کی ہو۔“ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔ ”تین دن کیا، آپ کا حکم ہو تو میں تین دن جا کر دکان کھلوا سکتا ہوں، مگر شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔“

میرے ان الفاظ نے اچھا اثر ڈالا۔ اس کا چڑھا ہوا پارا اتر گیا۔ اس نے کہا۔ ”مقصود! بس یہ سمجھ لو کہ دشمن راستے سے ہٹ گیا تو ہمارے دن پھر گئے۔“

وہ بے وقوف آدم زاد میرے ہی سامنے مجھے راستے سے ہٹانے کی بات کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آج ہی رات سے وہ کوئی شیطانی عمل شروع کرنے والا ہے۔ ایسا کوئی عمل شروع کرنے کے لئے دشمن کا نام معلوم ہونا ضروری نہیں۔ میرے لئے اس میں تشویش کی صرف ایک ہی بات تھی۔ اگر دشمن کا علم نہ ہو تو اس طرح کا کوئی عمل آدم زادوں کے ساتھ ساتھ ہم جن زادوں کے لئے بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ محمود حسن کے ساتھ ساتھ لگا رہتا آخر میرے کام آئی گی۔ میں اس پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ مجھے محمود حسن کے خطرناک ارادے کا علم تو ہو گیا۔

جن آدم زادوں نے اب تک مجھے اپنا غلام بنانے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، وہ مجھے یاد آنے لگے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے کہ جو میرے ہاتھوں مارے گئے اور کچھ میرے قابو میں نہ آئے۔ مجھے ان سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ محمود حسن سے نمٹنے ہوئے کیا صورت حال پیش آتی، مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔

ہرچند کہ اب میرے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا لیکن زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ آدم زادوں کی طرح ہم جن زادوں کے لئے بھی یہی حکم ہے کہ زندگی بچانا افضل ہے۔ ہمارے دین نے اس تصور کو بدل دیا تھا کہ اگر تمہارے رخسار پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا رخسار بھی اس کے آگے پیش کر دو۔ ہمیں یہ درس دیا گیا کہ اگر دشمن تمہیں ہلاک کر دینے کے درپے ہو تو تم بھی اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرو، ظلم نہ سو۔ سو میری نظر میں محمود حسن جیسا شیطان صفت آدم زاد بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔

میں اس روز انہی باتوں پر غور کرتا رہا۔

کسی آدم زاد کو جنائی صفات کے زیر اثر لینے اور اس کے بہم پر قبضہ کر لینے میں بڑا فرق ہے۔ اپنی

پوری کوشش کے باوجود محمود حسن کو میں اپنے اثر میں نہیں لے سکا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ مجھے اس کے جسم پر قابض ہو جانے میں بھی ناکامی ہوئی۔

مختلف تجربات کی روشنی میں اب تک میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میری بیشتر جناتی صفات مجھے واپس مل چکی ہیں۔ راہِ راست سے بھٹک جانے کے بعد میں نے سچے دل سے توبہ کر لی تھی۔ شاید یہ اسی توبہ کا اثر تھا۔ یقیناً میرے لئے ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے۔ اب صرف ایک ہی کی رہ گئی تھی۔ کسی آدم زاد کے جسم میں اترنے کے بعد جب میں اس کا جسم چھوڑ کر باہر آتا تو وہ آدم زاد زندہ نہ رہتا۔ میرے لئے یہ بڑے دکھ کی بات تھی۔ ایک جسم سے مختصر یا طویل وابستگی کے بعد زندگی سے اس کا محروم ہو جانا مجھے روحانی طور پر بڑی اذیت میں مبتلا کر دیتا۔

اپنی اسی کمی کو میں نے محمود حسن کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ معاملہ اس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ میں یا تو جان دے دیتا یا پھر اپنے دشمن کی جان لے لیتا۔ اس کے سوا اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اچانک محمود حسن کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میں اس کے جسم میں اتر جاؤں گا۔ میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار ایسا کر چکا تھا۔ عموماً شیطانی عملیات کا وقت رات کو زوال کے ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے۔ سویوں میرے پاس رات کو بارہ بجے تک کا وقت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عمل شروع کرتا، میں اس کے جسم پر قابض ہو جاتا۔ اپنی اس کوشش میں کامیابی کے بعد میں نے اور بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

کوٹھی پہنچنے کے بعد میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ صائمہ کے ساتھ محمود حسن کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ محمود حسن نے کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا ہو۔ محمود حسن صائمہ اور میں ایک ساتھ ہی رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

عیار آدم زاد محمود حسن نے مجھے مخاطب کیا۔ ”مقصود! تم دیکھ رہے ہو کہ آج صائمہ بیگم کتنی نکھری نکھری لگ رہی ہیں۔“

صائمہ کے چہرے پر میں نے اس وقت خوف کا سایہ سا دیکھا۔ محمود حسن کے یہ الفاظ سن کر وہ مسکرائی تو ضرور مگر اس کی مسکراہٹ میں جان نہیں تھی۔ جیسے وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بولا۔ ”جی ہاں، بیگم صاحبہ آج واقعی اچھی لگ رہی ہیں۔ انہوں نے لباس کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔“

صائمہ نے بظاہر محمود حسن کی طرف محبت سے دیکھا اور کہا۔ ”چھوڑیئے بھی، آپ مجھے کیوں بنا رہے ہیں۔ مقصود کا کیا ہے؟ یہ تو ہمیشہ آپ کی ہر بات کی تائید ہی کرتے ہیں۔“ صائمہ اب مجھ سے ملازموں کا سا سلوک نہیں کرتی تھی۔ میرے ساتھ اس کا انداز گفتگو خاصے دن سے بدل چکا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی۔ ”ابھی آپ مقصود سے یہ کہہ دیں کہ اس وقت رات نہیں دن ہے تو یہ رات کو دن مان لیں گے۔“

اس پر محمود حسن آہستہ سے ہنسا اور بولا۔ ”کوئی تو ایسا ہے کہ جو میری خاطر اب بھی رات کو دن تسلیم کر لیتا ہے۔“

محمود حسن کا بدلا ہوا رویہ اس وقت میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ حالات کی سخت گرفت میں آ جانے کے باوجود ایک بار پھر پہلے جیسا ہی نظر آ رہا تھا۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا کہ جب میں نے اسی رات دس بجے کے قریب صائمہ کو محمود حسن کی خواب میں جاتے دیکھا۔ میں جن زاد بن کر اس فکر میں تھا کہ محمود حسن کو غافل پاتے ہی اس کے جسم پر قبضہ کر لوں۔

صائمہ کو دبے قدموں اس شیطان کے پاس جاتے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ پھر میں سمجھ ہی گیا کہ زوال کے وقت عمل کا آغاز کرنے کی غرض سے محمود حسن راہ ہموار کر رہا ہے۔ کسی بھی شیطانی عمل کی ابتدا پاک صاف ہونے کی صورت میں ممکن نہیں۔

محمود حسن کی خواب گاہ کا دروازہ بند ہو گیا اور پھر ذرا ہی دیر میں صائمہ کی ہلکی سی چیخ ابھری۔ اذیت پسند محمود حسن نے اپنی درندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ جب محمود حسن پر اچانک حملہ کر کے قابو پایا جاتا۔ اس کی تمام تر توجہ صائمہ کو اذیت پہنچانے پر لگی ہوئی تھی۔

میں مزید ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر محمود حسن کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ صائمہ کو سر کے بال پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے آدم زاد کے بجائے مسمی درندے کا چہرہ معلوم ہوا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر زقہ بھری اور پھر محمود حسن کے جسم میں اتر گیا۔

وہ ایک شیطان صفت آدم زاد کا جسم تھا۔ اس کے رگ و ریشے میں اترتے ہوئے مجھے انتہائی ٹھنن اور شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ مجھے اس کے جسم میں بڑی ہی مشکل سے قرار آ سکا۔ پھر بھی مجھے خوشی یہ تھی کہ اس کی غفلت سے میں نے فائدہ اٹھا کر آخر اسے قابو میں کر ہی لیا۔ اب وہ میرے رحم و کرم پر تھا۔ میں اس کے جسم کو چھوڑ کر جب بھی باہر نکلتا، وہ موت کی گمراہ نیند سو جاتا۔

”چھوڑ دیجئے مجھے..... اللہ کے واسطے میرے سر کے بال چھوڑ دیجئے۔“

صائمہ کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے بالوں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

”مجھے معاف کر دینا صائمہ!“ میں محمود حسن کی آواز میں بولا۔ ”معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

”آپ..... آپ بہت ظالم ہیں۔“ وہ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں..... میں تو اسی وقت ڈر گئی تھی کہ جب آپ کھانا کھاتے ہوئے مقصود سے میری تعریف کر رہے تھے۔“ صائمہ اپنے بالوں کو درست کرتے ہوئے آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

”یقیناً کرو صائمہ کہ اب کبھی ایسا نہیں ہو گا۔ جاؤ اور جا کر آرام سے اپنے کمرے میں سوؤ۔“

صائمہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے یقیناً میری بات پر بھروسہ نہیں ہو گا۔

”پہلے..... پہلے بھی تو آپ نے کئی دفعہ ایسی ہی باتیں کی ہیں اور..... اور پھر..... پھر

یہی ہوا ہے۔“ اس نے سسکی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے کچھ کے بغیر خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا اور اسے مخاطب کیا۔ ”اب یقین آیا تمہیں..... چلی جاؤ۔“

وہ میری طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی پلٹی اور پھر تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی خواب گاہ سے نکل گئی۔

طویل عرصے کے بعد میں نے کسی آدم زاد کے جسم میں پناہ لی تھی، سو مجھے بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ نیند بھی مجھے بڑی دیر میں آئی۔

صبح فجر کے وقت میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنی انسانی ہیئت کا خیال آیا۔ اب میں مقصود نہیں رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا بس اچانک اور مجبوراً ہو گیا۔ پہلے تو میرا ارادہ کچھ اور ہی تھا۔ اب میں اس پر بعد میں عمل کرتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ ”مقصود“ کا اچانک غائب ہو جانا بہت سے لوگوں کے لئے تشویش کا سبب ہو گا۔ خاص طور پر مجھے ان نادار غریب افراد کا خیال آیا کہ جنہیں میں نے علاج کی غرض سے آج محمود کی دکان پر بلایا تھا۔

صائمہ اس رات بڑی سکون کی نیند سوئی اور دیر سے اٹھی۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ چند روز کے لئے مقصود کو ایک ضروری کام سے بھیج دیا ہے۔

میں اس وقت صائمہ کے ساتھ ناشتہ کرنے میز پر بیٹھا تھا۔ بتول ہمارے لئے ناشتہ لگا رہی تھی۔ ”وہ ناشتہ تو کر کے گئے ہوں گے نا؟“ صائمہ نے میری ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بتول بول اٹھی۔ ”نہیں بیگم صاحبہ! صاحب جب ابھی ذرا دیر پہلے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے تھے تو میں نے سوچا کہ مقصود میاں کو جگا دوں۔ میں نے کئی دفعہ ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ نہیں اٹھے تو میں چلی آئی۔ ان کے کمرے کا دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ صاحب کہہ رہے ہیں کہ.....“

میں نے چونک کر بتول کی بات کاٹ دی۔ ”یہ مقصود بھی عجیب ہی آدمی ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ کپڑے بدل کر فوراً چلے جاؤ۔ ناشتہ کہیں بھی کر لیتا۔ میرے سامنے اس نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا کہ کپڑے بدل لے۔ یہ فجر کے وقت کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ جلد بازی میں اندر سے دروازہ بند ہی چھوڑ کر کھڑکی کے راستے نکل گیا ہو گا۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں کہ اس نے یہ کیا کیا۔“

”آپ پہلے ناشتہ کر لیتے۔“ صائمہ مجھے اٹھتے دیکھ کر بولی۔

”آتا ہوں میں ابھی۔“ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔

”غلطی مجھی سے ہو گئی تھی لیکن صبح جب میں اٹھا تھا تو اس کا تدارک ممکن تھا۔ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ رات کو جن زاد بن جانے کے بعد مجھے کوئی دروازہ کھولنے یا بند کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مجھ سے یہ فاش غلطی اسی لئے ہو گئی۔“

مقصود والے کمرے کے عقب میں پہنچ کر میں نے بڑی صفائی سے کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دیا۔ کھڑکی بھی اندر سے بند ہی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی نہیں تھیں۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر چچتی نیچے گرائی اور دونوں پٹ کھول دیئے۔ اس کے بعد میں کمرے میں کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کھڑکی اندر سے بند کر کے اس پر پردہ ڈال دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اندر سے بند دروازہ کھولنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔

صائمہ کے پاس واپس آ کر میں نے کہا۔ ”وہی بات نکلی جو میں کہہ رہا تھا۔ وہ بے وقوف آدمی کھڑکی کھلی چھوڑ گیا تھا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ ملازم کو شیشے والے کی دکان پر بھیج کر شیشہ گوا لیتا۔“

”صاحب! ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، دوبارہ گرم کر لاؤں؟“ بتول بولی۔

”نہیں، دیر ہو رہی ہے۔ مجھے مارکیٹ بھی پہنچنا ہے۔ رہنے دو۔“ میں نے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔ محمود حسن جیسے بڑے آدمی کے جسم میں اتر کر مجھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، مگر مجبوری تھی۔ چند ہی روز تو مجھے اس جسم میں گزارنے تھے۔ مظلوم راجہ کو میں بھولا نہیں تھا۔ محمود حسن کی موت سے پہلے مجھے راجہ کو بھی رہائی دلانی تھی۔

ناشتہ کر کے میں باہر نکلا اور محمود حسن کی موٹر میں بیٹھ کر بولٹن مارکیٹ پہنچ گیا۔

صادق اور متین حسب معمول پہلے ہی آچکے تھے۔ میں نے دکان کھلوائی اور چابیاں متین کے حوالے کر دیں۔ اس سے میں نے کہا۔ ”کچھ دن تک میں بہت مصروف ہوں۔ دکان تمہی کو کھولنی اور بند کرنی ہے۔ چابیاں اپنے پاس ہی رکھ لو۔ مقصود کو کبھی میں نے کراچی سے باہر ایک ضروری کام کے لئے بھیجا ہے۔ وہ بھی نہیں آ سکے گا۔ ویسے بھی اب دکان میں کیا رکھا ہے۔ تھوڑا بہت جو کیش ہو، اسی سے مال خریدتے اور بیچتے رہنا۔“

”جو آپ کا حکم مالک! مگر.....“ متین کچھ کہتے ہوئے رک گیا۔

”بولو کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔

”دن بھر مقصود میاں سے لوگ نئے لکھوانے آتے رہتے ہیں، وہ لوگ.....“

”دس بجے تک میں اوپر دفتر میں بیٹھا ہوں۔ تم ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دینا۔ انہیں بتا دینا کہ مقصود میاں شر سے باہر گئے ہیں، اب وہ چند روز کے بعد آئیں گے۔ آج تو خیر میں ان کے لئے نئے لکھ دوں گا۔“

”جی حضور والا؟“ صادق نے حیران ہو کر تصدیق چاہی۔ ”آپ بخش نفیس نئے تجویز فرمائیں گے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ترکی ٹوپی درست کی۔

”ظاہر ہی بات ہے کہ ان بے چاروں کے لئے ہی تو میں آج کل دس بجے تک دفتر میں بیٹھ رہا ہوں۔ مقصود میاں نے اس عرصے میں تھوڑی بہت حکمت مجھے بھی سکھائی دی ہے۔ کسی طرح کام چلا ہی نوں گا۔ ضرورت مند ہی تو دور دور سے مقصود میاں کے پاس آتے ہوں گے۔“

میرے بدلے ہوئے لیجے اور الفاظ کو سن کر متین کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ گزشتہ روز شام کو انہی دونوں کے سامنے تو محمود حسن نے ان غریب مریضوں کو مفت خورے کما تھا۔

میں اوپر دفتر کھول کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں مریض مجھے تلاش کرتے ہوئے اوپر آنے لگے۔ ان مریضوں میں سے اکثر واپس چلے گئے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہہ دیا کہ ہمیں تو مقصود میاں ہی سے نسخہ لکھوانا تھا۔ مقصود کی جگہ انہوں نے گویا محمود حسن کو قبول نہیں کیا۔ میں بھی بعد نہ ہوا۔

ایک بوڑھی عورت میری شہرت سن کر کراچی کی ایک نواحی بستی سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا ایک نوجوان تھا۔ اس کے منہ سے چھوٹے بچوں کی طرح رال بہ رہی تھی۔ ”آپ ہی جی مقصود میاں ہو؟“ عورت نے مجھے مخاطب کیا۔

”میں مقصود میاں تو نہیں ہوں، مگر انہی کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ تم بتاؤ کیا بات ہے؟“ میں نرمی سے بولا۔

”یہ میری بیٹی کا بیٹا ہے جی، بچپن ہی سے اس پر کسی کا سایہ ہے۔ کبھی کبھی تو جی یہ اپنی ماں اور باپ کو بھی مارنے لگتا ہے۔“ عورت نے بتایا اور اس نوجوان کا بازو پکڑ کر میرے سامنے لے آئی۔

میں نے اس عورت کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے نواسے پر کسی کا سایہ نہیں۔ میں اگر یہ کہتا بھی تو بوڑھی عورت میری بات پر یقین نہ کرتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نوجوان کے ذہن کی نشوونما رک گئی تھی۔ اس کی ذہنی عمر چھ سات برس کے بچے کے برابر تھی۔

بوڑھی عورت کی تسلی کے لئے میں نے ایک گلاس میں دو گھونٹ پانی لیا اور یوں ہی دم کر کے نوجوان کو کسی بچے کی طرح پیار سے اپنے قریب بلایا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم تو بہت ہی اچھے بچے ہو۔“ لویہ پانی پی لو، شاباش۔ ”یہ کہہ کر میں نے اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔

وہ نوجوان کسی بچے ہی کی طرح خوش ہو گیا اور پانی پی لیا۔

بوڑھی عورت مجھے بڑی عقیدت اور احترام سے دیکھنے لگی۔ میں اس سے بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو کچھ دن کے بعد یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دوائی لکھ کر دے رہا ہوں، تم شہر سے لیتی جانا۔ پورے چالیس دن تک اسے صبح، دوپہر اور شام یہ دوا پابندی سے پلانی ہے۔“

”اس کو دم کیا ہوا پانی پلوانے کے لئے کب لانا ہے جی؟“ بوڑھی عورت نے سوال کیا۔

”بس اب اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں دوا پلانے کے لئے سختی نہ کرنا، پیار سے اسی طرح دوا پلانا جیسے میں نے تمہارے سامنے اسے پانی پلایا ہے۔ اگر ایک آدھ دفعہ یہ ضد کرے کہ دوا نہیں پیوں گا تو بھی اسے مارنا بیٹھتا مت۔ کبھی اگر دوا نہ پلا سکو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں یہ بتاؤ کہ دوا بند ہوا کر لے جانے کے لئے تم پیسے بھی لے کر آئی ہو یا نہیں؟“

”میرے پاس تو جی بس واپسی کا کرایہ ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ دوا بھی دو گے۔ خیر کوئی بات نہیں، میں اپنی بیٹی کے شوہر کو شہر بھیج کر دوائی منگوا لوں گی۔ پھر کب آؤں؟“ عورت نے معلوم کیا۔

”ان شاء اللہ اب تمہیں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے کہا، پھر اپنی جیب سے اسے

پیسے نکال کر دیئے۔ ”دوائی لے کر جانا۔“

وہ بوڑھی عورت اپنے نواسے کا ہاتھ تھامے مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

مجھے اگر اسی روز گدو بندر نہ جانا ہوتا تو دن بھر دکھی آدم زادوں کے دکھ بانٹ کر اپنی روح کی تسکین کا سامان کرتا رہتا۔

محمود حسن کے جسم کی بڑی عادتوں سے میں تھوڑا بہت پریشان تو ہوا لیکن انہیں اپنے اوپر غالب نہ آنے دیا۔ دس بجے میں نے دفتر بند کر دیا۔ جن بیماروں کو میں نہ دیکھ سکا ان سے چند روز بعد آنے کو کہہ دیا۔

مارکیٹ میں سیدھا کوٹھی پہنچا اور صائمہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ خلاف توقع میری جلد واپسی پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”صائمہ بیگم! ایمان داری سے ایک بات کا جواب دو کہ رابعہ کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا نہیں؟“ میں نے نرمی کے ساتھ اس سے دریافت کیا۔

”جی..... جی؟“ وہ ہکا بکا رہ گئی، پھر چند لمحوں کے بعد بولی۔ ”جج..... سچی بات تو یہی ہے کہ..... کہ..... آپ خود بھی تو جانتے ہیں۔“ اس نے اپنا دامن بچایا۔

”میرے جانے نہ جانے کو چھوڑو۔ مجھے تو اس پر سخت شرمندگی ہے۔ میرے کاروباری زوال کا سبب یہی ظلم ہے۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میرا ضمیر کافی دنوں سے مجھ پر ملامت کر رہا ہے۔ تم بتاؤ کیا تمہیں بھی اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا؟“

”لیکن اب..... اب کیا ہو سکتا ہے؟“ صائمہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں اسے پاگل خانے میں داخل کرا سکتا ہوں تو وہاں سے نکال کر بھی لانا میرے لئے مشکل نہیں۔“

”کل رات سے آپ مجھے بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔“ صائمہ نے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔

”آپ کو آج اچانک رابعہ آپا کی یاد کیسے آگئی؟“

صائمہ کی زبان سے ”رابعہ آپا“ سن کر مجھے خوشی سی ہوئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ محمود حسن کی بڑی بیوی کو قبول کرنے پر آمادہ تھی۔ مجھے وہ رات بھی یاد آگئی جب میں نے سید شاہاب بن کر صائمہ کو راہ راست پر آ جانے کی نصیحت کی تھی۔ شاید یہ اسی کا اثر تھا۔ صائمہ اپنے اندر سے یقیناً خاصی حد تک بدل گئی تھی۔ طویل سانس لے کر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”صائمہ بیگم! کچھ روز سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اب زیادہ دن نہیں جی سکوں گا۔ اپنی موت سے پہلے جس حد تک بھی ممکن ہے، میں اپنے ضمیر کے بوجھ سے نجات حاصل کر لینا چاہتا ہوں۔“

وہی صائمہ کہ جسے میں نے پیوہ ہو جانے کی دعا کرتے ہوئے دیکھا تھا، میری بات سن کر فوراً بولی۔

”خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آج میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ جو حال اب آپ کا ہے، وہی بہت دنوں سے میرا بھی ہے۔ یقین کریں کہ میں نے دور رو کر اپنے گناہوں سے توبہ کی ہے، اب..... اب مجھے

لگ رہا ہے کہ اللہ نے میری سن لی ہے۔ آپ اگر رابعہ آپا کو پاگل خانے سے لے آئیں گے تو میں ان سے بھی معافی مانگ لوں گی اور اور پھر ایک بڑی بہن کی طرح ان کی عزت کروں گی۔ کاش وہ مجھے اور اور آپ کو بھی معاف کر دیں۔“

صائمہ کا بدل جانا میرے لئے ایک نیک شگون تھا۔ میں کچھ ہی دیر میں گدو کے لئے بائی روڈ روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے موٹر کی ٹنگی بھروالی تھی۔

تیز رفتاری کے باوجود میں دوپہر تک گدو پہنچ سکا۔ بیس ایک کوٹھری میں یوسف بھی بند تھا۔ مجھے اس کا خیال بھی آیا۔

انتظامیہ کے اس شخص کا سراغ لگانے میں مجھے وقت نہ ہوئی کہ جس سے محمود حسن نے ساز باز کر رکھی تھی۔ میری یہ بات سن کر وہ حیران رہ گیا کہ میں ’رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ اور میں ایک الگ کمرے میں تھاتھے۔

”تم سے جو ماہوار رقم ملے تھی اس سے دینی رقم میں لے کر آیا ہوں۔ یہ رکھ لو اور اس معاملے کو ختم سمجھو۔“ میں نے رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے جلدی سے رقم اٹھا کر چھپالی اور بولا۔ ”مجھے بھی تو کچھ بتا چلے کہ اچانک یہ ہوا کیا؟ آپ نے تو کہا تھا کہ.....“

”بھول جاؤ ان ساری باتوں کو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ضروری خانہ پری کر کے اپنے کسی آدمی کو میرے ساتھ کر دو۔ میں انہیں کوٹھری سے نکال کر لاؤں گا۔ جلدی کرو مجھے واپس کراچی بھی پہنچنا ہے۔“

اس شخص نے اپنی بچت کے لئے مجھ سے یہ تحریر لی کہ میں اپنی ذمہ داری پر رابعہ کو پاگل خانے سے لے جا رہا ہوں۔

ضروری کارروائی جلد ہی مکمل ہو گئی۔ ایک آدمی میرے ساتھ ہو لیا۔ میں دانستہ یوسف سے نہیں ملا نہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا کہ اسے دیکھ کر مجھے رنج ہی ہوتا۔ رابعہ کی کوٹھری کے برابر سے اسے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔

جو آدمی میرے ساتھ تھا اس نے رابعہ کی کوٹھری کا مقفل دروازہ کھولنے کے لئے قدم آگے بڑھائے۔ رابعہ کی پشت اس وقت دروازے کی طرف تھی۔ اس کے جسم پر پاگل خانے کا لباس تھا۔ زمین پر بیٹھے ہوئے ایک میلے سے گدے پر وہ بیٹھی تھی، قریب ہی کبل پڑا تھا۔

جیسے ہی کوٹھری کا دروازہ کھلا رابعہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو چند لمحوں کو وہ ساکت سی ہو گئی۔ پھر اچانک ہی وہ ہانگوں کی طرح چیختی ہوئی میری طرف لپکی۔ ”ذلیل، کینے! تو..... تو آگیا یہاں بھی۔“ اس نے میرے قریب پہنچتے ہی گریبان پکڑ لیا اور پھر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”بتا کیوں آیا ہے یہاں؟..... مجھے زہر کا انجکشن دلوانے آیا ہو گا تو۔“

جو اس کے دل میں آیا وہ کبھی نہی اور پھر اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ میں نے شیردانی کی آستین سے اپنا منہ صاف کیا اور اس سے دھیمی آواز میں بولا۔ ”تم نے مجھ سے

جو کچھ کہا رابعہ، وہی بہت کم ہے۔ میں اس سے بھی زیادہ قابل نفرت ہوں۔ مجھے تم سے یہ گلہ بھی نہیں کہ تم نے مجھ پر تھوک دیا۔ تم سے میری صرف اتنی التجا ہے کہ مجھے اور خود کو تماشائے بناؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“

”تجھے میں خوب جانتی ہوں کہ تو کتنا عیار ہے۔ یہ بھی تیری کوئی چال ہوگی۔ تو مجھے یہاں سے اس لئے نکال کر لے جا رہا ہے کہ میرا خون کر دے۔ میں ہرگز تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ چلا جا یہاں سے محمود حسن..... چلا جا۔ اب تو اور زیادہ فریب نہیں دے سکتا۔ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تو اور مجھ سے التجا کرے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ پر نفرت بھری نگاہ ڈالی اور میرا گریبان چھوڑ دیا۔ پھر وہ کوٹھری کے اندر واپس جانے کو پلٹی اور پاگل خانے کے آدمی سے کہا۔ ”بند کر دو مجھے، میں پاگل ہوں، پاگل۔“

”جناب!“ پاگل خانے کے آدمی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ابھی آپ انہیں یہاں سے نہ لے جائیں۔ ان کی دماغی حالت درست نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو میں انہیں ابھی کوٹھری سے نکالتا ہوں۔“ میں نے جواب میں کہا۔

رابعہ کوٹھری میں جا چکی تھی۔ مجھے محمود حسن سمجھ کر اس نے جو سلوک بھی کیا، درست تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس شخص پر رابعہ کس طرح بھروسہ کر لیتی کہ جس نے ایک طویل عرصے تک اسے عذاب میں مبتلا رکھا اور ایک دھوکا دے کر دوسرا دھوکا دیا۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ اسے اپنے اثر میں لے لیتا۔ سو میں نے یہی کیا۔ رابعہ سحر زدہ کی طرح کوٹھری سے نکل کر میرے ساتھ چل دی۔

میں کراچی سے اس کے لئے ایک جوڑا لے کر گیا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے ایک کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ اسی کے ساتھ ہاتھ منہ دھو کر اور اپنا حلیہ درست کر کے وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔

موٹر میں اسے میں نے اپنے برابر اگلی سیٹ پر بٹھایا اور پاگل خانے کی حدود سے نکل آیا۔ جب مجھے یہ خطرہ نہیں رہا کہ وہ میرے لئے کوئی ناقابل برداشت صورت حال پیدا کر سکتی ہے تو میں نے اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

”تو..... محمود حسن! تو مجھے وہاں سے کس طرح نکال کر لے آیا؟ اور..... اور اب کہاں لے جا رہا ہے؟“ اس کی آواز میں خوف کی جھلک تھی۔ ”شاید اب..... اب تو مجھے زندہ رکھنا نہیں چاہتا اور کہیں راستے میں قتل کر دے گا۔“

”مجھ سے ڈرو مت رابعہ! میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ رابعہ! میں وہی تو ہوں کہ نئے تم نے ٹوٹ کر چاہا اور اتنی محبت دی تو شاید کسی عورت نے اپنے شوہر سے نہیں کی ہوگی۔ میں تمہارا مجرم ہوں، گنہگار ہوں میں۔ شرمندہ اور سخت پشیمان ہوں، اپنے کہنے پر۔ میں نے تو تمہارے چھوٹے بھائی راشد کا بھی سراغ لگایا ہے۔ وہ پاکستان ہی میں ہے اور میں بہت جلد تمہیں اس سے ملا دوں گا۔“

”نن..... نہیں۔“ وہ میری طرف بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ ”تم..... تم محمود حسن! پھر مجھے کوئی بہت بڑا فریب دے رہے ہو۔“ اس کا لہجہ بدلنے لگا۔ وہ ”تو“ کہتے کہتے ”تم“ کہنے لگی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، زبردست دھماکا ہوا۔ میں نے لاکھ یہ چاہا کہ موٹر کو بے قابو ہونے دوں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ سڑک کے کنارے ایک پیڑ سے موٹر ٹکرائی اور اسی لمحے میں نے رالو کی تیز چیخ سنی۔ حواس گم ہونے سے پہلے میں سمجھ نہ سکا کہ اچانک کیا ہو گیا۔ میرا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔

☆=====☆=====☆

ہوش و حواس سے بیگانگی کا عرصہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ راجہ البتہ ابھی تک بے حس و حرکت تھی۔ میں نے تین مسلح افراد کو دیکھا۔ ان کے چروں پر ڈھانے بندھے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”سائیں! اس کے پاس یہی نوٹ ملے ہیں۔ عورت خالی ہاتھ ہے، زیور بھی پہنے ہوئے نہیں ہے۔ موٹر والا ہو کر یہ تو نکلتا ہی نکلا۔“ یہ کہتے ہوئے نوٹ اس نے اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیئے۔

”جو مل گیا ٹھیک ہے۔ ایک ہی گولی تو چلائی پڑی۔ اب جنگل میں بھاگ چلو۔ شام ہونے والی ہے اور ہم کو اپنے گونڈھ میں پہنچنا ہے۔“

وہ تینوں راہ زن تھے کہ جو مسافروں کو لوٹ کر بھاگ جاتے ہیں۔ انہی میں سے ایک نے میری موٹر کے ایک پچھلے ٹائر پر فائر کر کے مجھے روک لیا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ مجھے چوٹ نہیں آئی۔ راجہ بھی اچانک یہ افتاد پڑنے سے چیخ اٹھی تھی اور پھر اسی صدمے کے زیر اثر اب تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔

ان جرائم پیشہ آدم زادوں نے میری زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ حادثے کی صورت میں میرا مارا جانا بھی ممکن تھا۔ مجھے محمود حسن کے جسم سے نکلنے کی مہلت نہ ملتی۔ نادانستگی ہی میں سسی، ان خود غرض لیروں نے مجھے اور بے گناہ راجہ کو موت کی سرحد تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ معاف کئے جانے کے قابل نہیں تھے۔ چند لمحوں میں صورت حال واضح ہو گئی۔

وہ پلٹنے ہی والے تھے کہ میں تیزی کے ساتھ موٹر سے اترا اور انہیں للکارا۔ ”مٹھرو۔“

انہوں نے اپنی اپنی رانٹلیں میری طرف سیدھی کر لیں۔ پھر ایک راہ زن نے مجھے دھکی دی۔

”اگر تو مرنا ہی چاہتا ہے تو ہم تیری لاش بھی گرا سکتے ہیں۔“

میں نے ان کے لئے سزا تجویز کر دی اور انہیں اپنے اثر میں لے کر حکم دیا۔ ”تم اب اپنے گونڈھ جانے کے بجائے قریبی تھانے جاؤ گے۔ خود کو تم قانون کے حوالے کر دو گے۔ تم نے اب تک جتنے لوگوں کو لوٹا ہے، پولیس کے سامنے اس کا اقرار کر لو گے۔“

ان کی اٹھی ہوئی رانٹلیں جھک گئیں۔ پھر ایک راہ زن بولا۔ ”سائیں کے حکم پر اب ہم تھانے ہی جائیں گے اور گرفتاری دے دیں گے۔ پولیس تو بہت دن سے ہم کو تلاش کر رہی ہے۔“ بقیہ دو راہ زن

بھی اپنے ساتھی کی تائید کرنے لگے۔

انہوں نے میری شیردانہ کی جیبوں سے جو رقم نکالی تھی، وہ ان سے واپس لے لی اور انہیں جانے دیا۔

راجہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کہ وہ میرے اثر سے آزاد ہوتے ہی کیس پھر چیتنے چلانے نہ گئے، میں عام راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اسی کے سبب ان راہ زنوں سے بڑبھڑ ہو گئی ورنہ ایسا نہ ہوتا۔ لوگ شاید اس راستے سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہوں گے، تبھی آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔

راہ زن چلے گئے تو میں نے پہلے موٹر کا جائزہ لیا۔ درخت سے ٹکرانے کے سبب بھرپور چمک گیا تھا۔ ہیڈلائٹس میں سے ایک چمکا چور ہو گئی تھی۔ ونڈ اسکرین بھی کئی جگہ سے ٹخ گیا تھا۔ اس کے باوجود انجن کو نقصان نہیں پہنچا۔ میں بروقت بریک نہ لگا دیتا تو شاید موٹر قابل استعمال نہ رہتی۔

راجہ کو ہوش میں لانے سے پہلے میں نے گاڑی کا پچھلا پسب بدل دیا۔ اسپر و ہیل موجود تھا ورنہ بڑی پریشانی ہوتی۔ ایسی حالت میں ایسے راستے سے شارع عام تک پہنچنا عذاب ہو جاتا۔

گاڑی کو ریورس گئیر میں ڈال کر میں راستے پر لے آیا اور پھر اسے روک لیا۔ راجہ بے سدھ پڑی تھی۔

جب میں راجہ کو ہوش میں لایا تو اس نے مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھا، پھر بولی۔ ”اب میں..... میں سمجھ گئی محمود حسن کہ تم..... تم مجھے اس ویران راستے پر لے کر کیوں آئے ہو۔ تم..... تم آخر کیسے بدل سکتے ہو۔“ اس کے بعد وہ ایک دم چونک اٹھی اور پوچھنے لگی۔ ”لیکن.....

لیکن وہ..... وہ دھماکا اور..... اور پھر.....“

مختصر اسے میں نے راہ زنوں کے بارے میں بتا دیا۔

”تو..... تو پھر انہوں نے ہمیں زندہ کیسے چھوڑ دیا؟“ راجہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”ان کا مقصد ہمیں صرف لوٹنا تھا، قتل کرنا نہیں۔“ میں نے جواب دیا اور گاڑی کا انجن شارت کرتے ہوئے کہا۔ ”راجہ! تمہارے دل میں میری طرف سے جو بدگمانی ہے، اسے نکال دو۔ میں تم سے

معافی مانگ چکا ہوں۔ کیا تم مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے کہ میرا ضمیر کیوں جاگ اٹھا ہے؟“

”کیا تمہارا ضمیر اب تک زندہ تھا محمود حسن؟“ راجہ کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

”ہاں راجہ!“ میں نے گہرا سانس لیا اور سامنے سڑک پر نظرس جمادیں، پھر بولا۔ ”شاید آخری

وقت آنے سے پہلے ایسا ہی ہوتا ہے، مردہ ضمیر میں جان پڑ جاتی ہے۔ ماضی کے اعمال اور آخرت کا خیال

اس کی روح کو بے چین کر دیتا ہے۔“ میں نے اپنی آواز میں رقت پیدا کر لی۔ ”ساری زندگی میں تمہیں

فریب دیتا رہا۔ رائے پور، بے پور، بمبئی اور پھر کراچی۔ کتنا طویل سفر تھا راجہ کہ تم میرے ساتھ ساتھ

گھس، لیکن اب..... اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے گھانے کا سودا کیا۔ مجھے آخر کیا ملا؟..... کیا پایا

میں نے؟..... میں اس دنیا سے کیا لے جاؤں گا؟..... میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ مجھے

آج بھی یاد ہے کہ میرا باپ تمہارے گھرانے کا ایک معمولی ملازم تھا۔ تم سے کیا چھپا ہے۔ تمہیں تو سب

کچھ معلوم ہے۔ تم نے مجھ سے وفا کی اور میں بے وفائی کرتا رہا۔ میں نے دولت کے حصول ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور پھر انسانیت کی سطح سے اتار کر گیا کہ آج اپنا چہرہ بھی مجھے اجنبی لگتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے رابعہ کہ تم نے بھی میرے منہ پر تھوک دیا۔ میں..... میں تو اس سے بھی کڑی سزا کا مستحق ہوں۔“

میں چپ ہو گیا تو رابعہ اس طرح میری طرف دیکھنے لگی جیسے برسوں بعد مجھے دیکھا ہو۔ پھر وہ بولی کہ اس کی آواز میں بھی بھاری پن تھا۔ ”محمود حسن! جانے کیا بات ہے کہ تم..... تم مجھے اب بھی محمود حسن معلوم نہیں ہو رہے اگر..... اگر میں..... میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہی تو..... تو یہ بڑی..... یہ حقیقت بہت ہی عجیب ہے۔ جو بھی تم نے مجھ سے کہا، مجھے اس پر یقین آ بھی رہا ہے اور میں بھی..... میں یقین اور بے یقینی کے ایک ایسے نل پر کھڑی ہوں جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔ کاش..... کاش محمود حسن مجھے تمہاری باتوں پر یقین آ جائے۔“

”آ جائے گا یقیناً رابعہ! وقت سے بڑا انصاف کرنے والا صرف ایک ہے، ایک ہی ذات۔ اسی نے میری آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ اٹھا دیا ہے اور اب..... اب مجھے ہر شے واضح دکھائی دے رہی ہے۔ خزاں اپنا چہرہ بھی اور دوسرے چہرے بھی مجھے صاف نظر آ رہے ہیں۔“

کراچی پہنچنے تک رابعہ کو آخر میری باتوں پر اعتبار آ ہی گیا۔ اس نے مجھ سے صائمہ کے بارے میں بھی کئی سوال کئے اور میرے جواب سن کر مطمئن ہو گئی۔ اس کے چہرے پر اب اطمینان اور آسودگی کی جھلک تھی۔

رابعہ کو ساتھ لئے ہوئے میں کوٹھی میں داخل ہوا تو صائمہ لپک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”مجھے معاف کر دیں رابعہ آپا۔“ صائمہ سسک اٹھی۔

میں نے رابعہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرتے دیکھے۔ وہ بے طرف اور حوصلے کی عورت تھی۔ ملازمہ بتول حیرت سے یہ منظر دیکھتی رہی۔

وہ رات میرے لئے بڑی آزمائش کی ثابت ہوئی، اگر میں رابعہ کو گمری نیند نہ سلا دیتا۔

وقت اور حالات کی گردش نے بہت سی اہم باتوں کو میرے ذہن سے نوا کر دیا تھا۔ اس رات مجھے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی گئیں اور میں فکر مند ہو گیا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب ملتان کے مجذوب سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس وقت دجے کے جسم میں تھا۔ میری سماعت میں مجذوب کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”سن کہ تیری سزا کی مدت ختم ہوئی، مگر اب تجھے بے کیل نہیں چھوڑا جائے گا۔ تُو اب اپنے گزشتہ اعمال کے سبب با اختیار نہیں رہا..... ہم نے تیری تمام جانی صفات جو چھین لی تھیں، واپس کر دیں..... تیری صفات اللہ کے حکم سے جب دوبارہ عمل ہونا چاہیں گی، ہوں گی اور جب اللہ کو ایسا منظور نہ ہو گا تُو بے بس ہو جائے گا اور کچھ بھی نہ کر پائے گا۔“ پھر کچھ پڑھ کر اس نے مجھ پر پھونکا اور کہا۔ ”اے علیالیش! اللہ کے حکم سے اس آدم زاد کے جسم سے نکل آ اور پھر اسی میں داخل ہو جا۔“

اسی کے ساتھ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی گرفت میرے وجود سے ہٹ گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں

دجے کے جسم سے باہر آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ دجے مرا نہیں زندہ تھا۔ مجذوب کے حکم سے میں پھر بے ہوش دجے کے جسم میں اتر گیا۔

مجھے اپنی جناتی صفات کے واپس مل جانے پر خوشی بھی تھی اور افسوس بھی تھا کہ میں پورے طور پر اپنی مرضی کے مطابق ان صفات کو بروئے کار لانے کا اہل نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد سے جو بھی ہوا میرے اختیار اور بے اختیاری کا ثبوت تھا۔

ان حالات میں میرا یہ فرض کر لینا خام خیال ہی تھی کہ میں، محمود حسن کے جسم کو چھوڑ کر باہر آیا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ ایسا ممکن بھی تھا اور نہیں بھی۔ کسی ذی روح کی موت اور زندگی پر اللہ کو اختیار ہے، مجھے نہیں۔ میں نے سوچا اور ٹھیک ہی سوچا۔ اگر محمود حسن کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے تو وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا ورنہ کسی صورت نہیں۔

اللہ کو جو بھی منظور ہو، یہ سوچ کر مجھے سکون سا آ گیا۔

اسی رات مجھے پیر منگھو کی مائی کے کئے ہوئے الفاظ بھی یاد آئے۔ وہ شاید اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اس نے پیش گوئی کی تھی کہ اب گنتی کے کچھ ہی دن تو باقی رہ گئے ہیں۔ جاے علیالیش کہ وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ پائے گا۔ تُو نے جو سوچا ہے، وہ کر۔“

وہ مائی یقیناً اللہ کی نیک بندی تھی۔ اس کی پیش گوئی کا ایک حصہ سچ ثابت ہو چکا تھا۔ محمود حسن میرا کچھ نہ بگاڑ سکا تھا۔ ”گنتی کے کچھ ہی دن“ کا یقین، بہر حال اس نے نہیں کیا تھا۔

پھر دونوں ہی صورتوں کے لئے میں نے خود کو آمادہ کر لیا۔ محمود حسن ابھی اور زندہ رہتا کہ مارا جاتا، میں نے اسی روشنی میں اپنے آئندہ اقدامات کا فیصلہ کیا۔ مجھے ابھی رابعہ کے بھائی کو بھی اس سے ملوانا تھا۔

میری توقع کے مطابق رابعہ نے دوسرے ہی روز یہ ذکر چھیڑ دیا۔ ”تم نے بتایا نہیں کہ راشد کہاں ہے؟“

”اس سے بہت جلد تمہاری ملاقات ہو جائے گی، گھبراؤ نہیں۔“

”لیکن کب؟“

”یہ بتاؤ کہ تم نے میری خاطر سب کو چھوڑ دیا تھا نا؟ اپنے دونوں بھائیوں کو بھی اور ماں باپ کو بھی۔“

”ہاں..... ہاں محمود حسن! تمہاری محبت نے مجھے زندوں کو صبر کر لینے پر مجبور کیا اور..... میں مجبور ہو گئی۔ شاید محبت سے بڑی مجبوری کوئی اور نہیں، لیکن اب..... اب مجھے احساس ہو رہا ہے مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے اسی بھول کی سزا ملی ہے، ورنہ..... تم سارے عہد دنیاں.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”رابعہ! تلخ یادوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دو کہ ابھی تمہیں بہت کچھ سنا اور برداشت کرنا ہے۔“

”برداشت کرنے کو کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے محمود حسن؟“

”ہاں راجہ، ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ رائے پور کے کچھ لوگوں سے میں نے بڑی اندوہناک باتیں سنی ہیں۔ انہی سے مجھے راشد کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ میرپور خاص میں ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی راجہ کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا اور وہ ساری باتیں کہہ دیں جو معلوم کی تھیں۔ میں اگر ایسا نہ کرتا تو شاید راجہ اپنے والدین اور بھائی کی موت کا صدمہ نہ سہہ پاتی۔

جب میں نے اس کے ذہن کو اپنے اثر سے آزاد کیا تو اس کا وجود رنج کے اندھے کنویں میں در تک گردش کرتا رہا۔ اپنے چھوٹے بھائی سے مل کر اچانک اسے ان روح فرسا واقعات کا علم ہوتا تو شاید وہ ٹوٹ جاتی۔ میں نے اس کے دل و دماغ سے بڑی حد تک صدمے کے اثرات کم کر دیئے کہ اس کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا۔

اسی روز صائمہ نے دوسرے وقت مجھ سے پوچھا۔ ”راجہ آپا کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ کھانا بھی نہیں کھا رہیں۔ کہیں آپ نے تو پھر ان سے کوئی ایسی بات.....“

”نہیں۔“ میں بول اٹھا۔ ”تمہیں اگر وہ باتیں بتا دوں جو راجہ کو بتائی ہیں تو پھر شاید تمہارا دل بھی کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہے گا۔“

”ایسی کوئی بات ہے تو مجھے بھی بتا دیں۔“ صائمہ بہ ضد ہو گئی۔

میں نے مختصر الفاظ میں راجہ کے اوپر گزرنے والے سانحے سے صائمہ کو بھی آگاہ کر دیا۔ وہ بھی ملول ہو گئی۔

وہ سارا دن ہی سوگاری میں گزرا، راجہ اپنے والدین اور بڑے بھائی کے لئے مغفرت کی دعائیں مانگتی رہی۔ صائمہ بھی اس کے دکھ میں شریک تھی۔

گذشتہ رات کی طرح راجہ کو تو میں نے گہری نیند سلا دیا اور صائمہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ پہلے تو وہ کچھ ڈری، پھر میرا نرم رویہ دیکھ کر معمول پر آ گئی۔

”تم نے شاید اب تک یہ اندازہ لگا لیا ہو گا صائمہ کہ میرے پاس جو بھی تھا اور جو کچھ باقی بچا ہے، راجہ ہی کا ہے۔“ میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ ”اس کے باوجود مجھ پر تمہارا حق بھی ہے۔ تم پر بھی میں نے بہت ستم ڈھائے ہیں۔ تمہیں کبھی تمہارے والدین اور عزیزوں سے نہیں ملے دیا۔ آج کے بعد سے تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔ مقصود کو میں نے تمہاری ہی خاطر کراچی سے باہر بھیجا ہے۔ وہ جب بھی تم سے ملے گا، تمہیں تمہارا حق مل جائے گا۔“

”کیا حق؟ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“

”وقت آنے پر سمجھ جاؤ گی۔ فی الحال اتنا ہی جان لو کہ یہ کوٹھی، دکانیں اور اپنا سارا کاروبار میں راجہ کے نام کر رہا ہوں۔ تمہیں تو اس پر کوئی گلہ نہیں؟“

”میں کیوں گلہ کرتی۔“ اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔ ”آپ کا ہر فیصلہ مجھے دل سے قبول ہے۔ مجھے آپ کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں یہ بتا سکیں تو بتا دیں کہ ان باتوں کی کیا کوئی خاص وجہ ہے؟“

”تمہارے اس سوال کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔ مجھے تم سے صرف یہ اور کہنا ہے صائمہ کہ میرے بعد حوصلہ رکھنا۔ ابھی تو تم نے زندگی کا سفر شروع کیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے بھلا دینا۔“

”نہیں۔“ وہ چپ نہ رہ سکی۔ ”آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ ان سے میرا دل کٹنے لگتا ہے۔“ میں مسکرا دیا اور بولا۔ ”تم کہتی ہو تو نہیں کرتا یہ باتیں۔ ہاں تم اگر چاہو تو دو ایک روز کے لئے اپنے والدین سے مل آؤ۔“

”کئی دن سے مجھے امی بہت یاد آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں اب ان کی طبیعت کیسی ہو گی۔ آپ کی اجازت ہو تو میں کل چلی جاؤں۔ دو دن امی کے پاس رہ کر آ جاؤں گی۔“ صائمہ خوش نظر آنے لگی۔

”چلی جانا کل۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ اسی کے تحت میں بولا۔ ”بلکہ کچھ روز تم اپنے میکے ہی میں رہو۔ میں تمہیں خود بلوا لوں گا، مقصود کو بھیج کر۔ ٹھیک ہے نا۔“

”آپ..... آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں جو میکے ہی میں رہنے کو کہہ رہے ہیں۔“

”یہ بات نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے کاروبار کو کتنا دھچکا پہنچا ہے۔ اب میں ساری توجہ ادھر دینا چاہتا ہوں۔ اور ہاں..... یہ کچھ روپے رکھ لو اپنے پاس کام آئیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے والدین کو اپنی بیٹی کی خوش حالی پر کوئی شک ہو۔“

”یقین کریں کہ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ صائمہ نے پُر اعتماد آواز میں کہا اور روپے لے لئے۔

دوسرے دن صائمہ تو ملازم کو ساتھ لے کر اپنے میکے چلی گئی اور میں نے سب کچھ راجہ کے نام کر دیا۔ اسی روز میں نے متین کو میرپور خاص بھیج دیا۔ راجہ کے چھوٹے بھائی راشد کو میں نے ایک خط بھی لکھا تھا، محمود حسن کی طرف سے۔ راشد کا پتا لکھ کر دینے کے ساتھ ساتھ زبانی بھی میں نے متین کو سمجھا دیا تھا۔

شام کو میں کوٹھی پہنچا تو راجہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”میرپور خاص کب چلیں گے ہم؟“

”بس پرسوں تک اور ٹھہر جاؤ۔ جہاں تم نے برسوں صبر کیا ہے، دو روز اور صبر کر لو۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہاں تم نے صائمہ کو اس کے میکے جانے کی اجازت دے کر بہت اچھا کیا۔ وہ بہت خوش تھی۔“

”تم بھی خوش ہو جاؤ گی جب اپنے میکے جاؤ گی۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ راجہ نے سرد آہ بھری اور بولی۔ ”میرا میکا تو اجڑ گیا، میں کہاں جاؤں گی۔“

”بھائی کا گھر بھی تو عورت کے لئے میکا ہی ہوتا ہے۔“ میں بولا۔ وہ جیسے ماضی کی یادوں میں گم ہو کر شاید رائے پور پہنچ گئی۔

”لو یہ کانڈات حفاظت سے اپنے کمرے کی الماری میں رکھ لو۔“ میں نے اسے مخاطب کیا، اسی کے

ساتھ وہ کافذات اس کی طرف بڑھا دیئے جن کی رو سے اب میرا سب کچھ اس کا تھا۔ وہ اتنی پڑھی لکھی ضرور تھی کہ کافذات دیکھ کر ان کا مطلب سمجھ لیتی۔

کافذات مجھ سے لیتے ہوئے وہ چونک اٹھی۔ ”کیسے کافذات ہیں یہ؟“

”خود پڑھ کر دیکھ لو۔“ میں دھیرے سے بولا۔

اس نے کافذات کھول کر دیکھے اور اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ کہنے لگی۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے محمود حسن؟“

”وہی جو بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ مجھے خوشی یہ ہے کہ آج میں نے تمہارا حق تمہیں لوٹا دیا۔ کیا تم مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتیں؟“

”کیسی خوشی ہے یہ؟ اور کیسے دکھوں کا موسم ہے؟“

”اسی کا نام زندگی ہے رابعہ۔“

”میں جو کچھ دیکھ رہی ہوں، سن رہی ہوں، اس پر اعتبار نہیں آ رہا۔ تم تم محمود حسن! اتنے بدل سکتے ہو اگر واقعی اتنے ہی بدل گئے ہو تو تو پھر کیا کروں گی، میں ان کافذات کا؟“ وہ جذباتی ہونے لگی۔

”یہ کافذات ایک دن کام آئیں گے تمہارے اور وہ دن رابعہ وہ دن اب شاید دور نہیں۔“ میں نے بھی دانستہ خود کو جذبات سے مغلوب ظاہر کیا۔ صائمہ کی طرح رابعہ کو بھی میں ذہنی طور پر محمود حسن سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم شاید پہلے بھی کچھ ایسی ہی بات کر رہے تھے، مگر اس وقت میں اسے تمہارا فریب سمجھتی تھی۔“

”ہاں وہ فضا ہی ایسی تھی۔ زندگی بھر جو شخص فریب دیتا آیا ہو، اس کی کس بات کو جھوٹ اور کسے سچ سمجھا جائے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دوسروں کو فریب دیتے دیتے آدمی خود فریب کھا جاتا ہے یا پھر میری طرح اپنے ضمیر کی ملامت سے تنگ آکر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ ممکن ہے آج میری یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، مگر ایک روز یہی باتیں تمہیں یاد آئیں گی اور تم ان کا مطلب سمجھ لو گی۔“

کچھ دیر تک رابعہ گم صم بیٹھی رہی جیسے اسے کسی فیصلے پر پہنچنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ یہ وہی عورت تھی کہ جس نے محمود حسن کی خاطر بھی کچھ سچ دیا تھا اور پھر بچھڑاؤے کی آگ میں بھی جلی تھی۔

”لیکن محمود حسن، تم اب بھی کچھ بھول رہے ہو۔“ رابعہ کچھ سوچتے سوچتے ایک دم بول اٹھی۔

”میں کچھ نہیں بھولا رابعہ۔ تم شاید صائمہ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔“

”تم ٹھیک سمجھو۔ کیا اس طرح صائمہ کی حق تلفی نہیں ہوگی؟“ رابعہ نے سوال کیا۔

”نہیں۔ اس کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔ اسے اس کا حق مل جائے گا۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح

مظلوم ہے، لیکن اس نے مجھے معاف کر دیا۔“

اگلے دن رات کو نو بجے کے قریب متین میرپور خاص سے لوٹا تو اس کے ساتھ رابعہ کا بھائی راشد بھی تھا۔

پچھڑے ہوئے بہن بھائی طویل عرصے کے بعد ملے تو آنسوؤں کی زبان میں ایک دوسرے سے تمام دکھ بیان کر دیئے۔ راشد کو میں نے خط میں جو کچھ لکھا تھا، راشد نے اسی پر عمل کیا۔ محمود حسن کی طرف سے وہ معذرت نامہ تھا کہ جس کے بعد راشد کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یوں بھی عمر میں وہ محمود حسن سے دس برس چھوٹا ہی ہو گا۔ خط کے آخری الفاظ کچھ یوں تھے۔ ”راشد، میرے بھائی! مجھے امید ہے کہ تم میرے اعتراف گناہ کے بعد باضی کا ذکر چھیڑ کر مجھے شرمندہ نہیں کرو گے۔“

صبح ناشتے کے وقت میں نے راشد کو مخاطب کیا۔ ”اب تم بھی کراچی ہی آ جاؤ تاکہ تمہاری بہن کو تنہائی کا احساس نہ رہے۔“

وہ میرے اثر میں تھا اس لئے جواب بھی میری توقع کے مطابق ہی دیا۔ ”لیکن ابھی تو میں، بابی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ چھوٹا سا کاروبار ہے، اسے سمیٹنے میں بھی تو کچھ وقت لگے گا۔“

”تم اپنی بہن کے ساتھ اسی کو بھی میں رہو گے۔ کیوں رابعہ؟“ میں نے رابعہ سے تصدیق چاہی۔

”یہ میرا بھائی ہے۔ میں اسے کہیں اور کیسے رہنے دوں گی۔ رہا کاروبار، تو یہ تمہارا ہاتھ بٹائے گا۔“

رابعہ جواب میں بولی۔

”آپ دونوں ہی میرے بڑے ہیں، مجھے جو حکم دیں گے، اسی پر عمل کروں گا۔“

پھر جب رابعہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ میرپور خاص چلی گئی تو میرے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اگر مجھے وقتی طور پر محمود حسن سے نشینے میں ناکامی بھی ہوتی تو صائمہ اور رابعہ ظلم کا شکار نہ ہوتیں۔ بطور احتیاط میں نے نئے ملازم کو بھی کچھ دن کی چھٹی دے دی۔

”ہفتے بھر کی اس چھٹی کے پیسے نہیں کئیں گے۔“ میں نے اسے بتایا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنا سامان باندھنے چل دیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بتول کو بلا لیا۔

”تمہارا بھانجا رنجوڑ لائن میں رہتا ہے نا؟“ میں نے اس سے کہا۔

”جی جی صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا جی نہیں چاہتا کبھی اس سے ملنے کو، اس کے ساتھ رہنے کو۔“

”جی تو بہت چاہتا ہے، مگر صاحب، آپ آپ ہی نے تو“ وہ اس سے

زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اور نظریں جھکا لیں۔

”تمہیں معلوم ہے کہ چھوٹی اور بڑی بیگم صاحبہ اپنے اپنے میکے گئی ہیں۔ ممکن ہے ایک ضروری کام سے مجھے بھی آج ہی جانا پڑے۔ میرا خیال ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم بھی ایک ہفتے اپنے بھانجے کے پاس رہ آؤ۔“

یوں بتول بھی اسی دن کو ٹھہری سے چلی گئی۔ میں نے محمود حسن کو بالکل تھکا کر دیا۔ اسی رات بارہ بجے سے پہلے وہ نجات آئی گئی جن کا مجھے انتظار تھا میں 'محمود حسن کی خواب گاہ میں اس کے بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں جلتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کی روشنی میں سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

بارہ بجتے میں جب چند منٹ رہ گئے تو میں جس طرح اللہ کا نام لے کر محمود حسن کے جسم میں داخل ہوا تھا، اسی طرح باہر آ گیا۔

محمود حسن کا جسم بے حس و حرکت رہا، لیکن میں اس کے قریب نہیں گیا۔ ابھی تصدیق نہیں ہوئی تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اسی تصدیق کی خاطر میں دور ہی سے اس طرح چنچا کہ اگر وہ زندہ ہو تو آنکھ کھل جائے۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ وہ بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مجبوراً اسے ہوش میں لانے کا خطرہ مول لینا پڑتا۔

وہ شیطان بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری نہ ہوئی، ہاں وہ کچھ دیر کو غافل ضرور ہو گیا تھا۔ جب اس نے میری چیخ سن کر آنکھیں کھول دیں تو مجھے ملال سا ہوا۔

”اچھا تو صائمہ جیتی ہوئی بھاگ گئی۔“ وہ بڑبڑایا۔ نیند میں وہ میری چیخ کو صائمہ کی چیخ سمجھا۔ پھر اس نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”ارے بارہ بجتے والے ہیں اب تو“ اور اور صائمہ دس بجے کے قریب آئی تھی۔ کام بن ہی گیا۔ ”وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔“ لیکن میری آنکھ کیسے لگ گئی؟ مجھے جاگتے رہنا تھا۔ ”یہ بڑبڑاتا ہوا وہ مسری سے اترتا۔ وہ جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔ ”ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی ہے اور میں اپنے دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لئے عمل شروع کر سکتا ہوں۔“ پھر اس نے لپک کر خواب گاہ کا کھلا ہوا دروازہ بند کر دیا۔

میں دور ہونے کے باوجود اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ تیزی سے پھلتا اور مسری کے قریب ہی زمین پر سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔

دیوار گیر گھڑی کے پہلے گھنٹے کی آواز سے کمر گونج اٹھا۔ گھنٹے کی بارہویں گونج کے ساتھ ہی میں نے محمود حسن کے ہونٹوں کو تیزی کے ساتھ حرکت کرتے دیکھا۔ اس کا جسم مخصوص انداز میں بیٹھنے کے سبب اکڑا ہوا سالگ رہا تھا۔

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ محمود حسن نے کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر شیطانی عمل شروع کیا ہے۔ میں نے جب اس کے جسم پر قبضہ کیا تھا تو وہ صائمہ کو تشدد کا شکار بنا رہا تھا۔ اس کا اگلا قدم اپنے سفلی جذبات کی تسکین ہوتا تاکہ شیطانی عمل کی راہ ہموار ہو جاتی۔ میں نے اسے یہ اگلا قدم اٹھانے سے روک دیا۔ جتنے عرصے میں اس کے جسم پر قابض رہا، ذہن سے محو ہو گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ صائمہ اس کے ظلم سے بچ نہیں سکی اور کام بن گیا۔ اسے اگر یہ غلط فہمی نہ ہوتی تو وہ یقیناً شیطانی عمل کا آغاز نہ کرتا۔ اسے اگر حیرت تھی تو صرف اس پر کہ وہ سو کیوں گیا؟ اسے تو جاگتے رہنا تھا۔ میں نے اس سوال پر غور

کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے اسے مہلت نہیں دی۔ بارہ بجتے میں جب چند منٹ رہ گئے تو میں اس کے جسم سے باہر نکل آیا اور پھر چیخ کر اسے جگا دیا۔ اس کے بعد محمود حسن نے جو بھی کیا، میری توقع کے مطابق تھا۔

شیطانی عمل کے وقت محمود حسن کے قریب جانا میرے لئے خطرناک ہوتا۔ سو میں نے یہ خطرہ مول نہیں لیا۔ میں اس سے دور ہی دور رہا۔ اب صرف ایک ہی راہ تھی کہ دور رہتے ہوئے کسی بھی طرح اسے عمل سے روک دیتا۔ کوٹھی میں محمود حسن اور میرے سوا اگر کوئی دوسرا فرد بھی ہوتا تو شاید مجھے دشواری پیش آتی۔ دوراندیشی سے کام لے کر میں نے پہلے ہی مداخلت کا ہر امکان ختم کر دیا۔

عمل کا آغاز کرتے ہی محمود حسن نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ ہر طرف سے مطمئن اور بے خبر تھا کہ میں نے ایک ہیبت ناک ہیبت اختیار کر لی۔ دوسرے ہی لمحے محمود حسن کی خواب گاہ کسی درندے کی خوفناک غراہٹ سے گونجنے لگی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں تو کھول دیں مگر عمل پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مجھے انتہائی خوف کے آثار دکھائی دیے۔ اس کی نظریں میرے ہی ہیبت ناک وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے غرا کر فضا میں اس طرح جست بھری کہ جیسے محمود حسن پر حملہ کرنے والا ہوں۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور آدم زاد ہوتا تو شاید خوف کے سبب اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ پاتا، لیکن وہ بھی ایک ہی عیار نکلا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی کے ساتھ اس کے ہونٹوں کی حرکت میں اضافہ ہو گیا۔ آدم زادوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے ہم جن زادوں کو بہت سے ہنر آتے ہیں۔ چند ہی لمحے بعد میں نے ایسی فضا پیدا کر دی جیسے خواہ گاہ کے در و دیوار بل رہے ہوں۔ محمود حسن کا اکڑا ہوا جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور مجھے کامیابی کی امید ہوئی۔ وہ صرف چند ساعتیں ہوں گی کہ دوبارہ اس کا جسم پہلی حالت پر لوٹ گیا۔ فرق صرف یہ پڑا کہ عمل پڑھتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول کر خوفزدہ انداز میں خواب گاہ کا جائزہ لیا۔ میں نے اسی عرصے میں خود اسی کی ہیبت اپنائی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”تو محمود حسن نہیں، اس کا سایہ ہے۔ محمود حسن تو میں ہوں۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”بول محمود حسن تو ہے کہ میں؟“

یہ ایک اور حربہ تھا جو اس پر رائج ہوا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ وہ عمل پڑھتے پڑھتے رک کر بول اٹھے لیکن یہ نہ ہوا۔

صبح ہونے تک میں طرح طرح کے حربے آزما رہا، پھر بھی محمود حسن میرے کسی داؤ میں نہ آیا۔ فجر کی اذان ہونے سے ذرا پہلے اس نے بلند آواز میں کچھ ننانوس الفاظ تین مرتبہ ادا کئے۔ تینوں مرتبہ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں آتش کوڑے برسے ہوں۔ میں اس کی خواب گاہ سے نکل کر بھاگا تو یہ اذیت ختم ہوئی۔

شیطانی عمل کا وقت رات بارہ بجے سے فجر تک تھا۔ یہ وقت ختم ہو گیا تو میں نے ایک بار پھر مقصود بن کر اس کمرے کا رخ کیا۔ جو میرے لئے مخصوص تھا۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے محمود حسن کے چیختے چلانے کی آواز سنائی دی۔

میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو محمود حسن کو اسی طرف آتے دیکھا۔
”مقصود!“ وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ اٹھا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟ آپ اس قدر غصے میں کیوں ہیں؟“ میں اس کے قریب پہنچ کر نرمی سے پوچھنے لگا۔

”کہاں مر گئے یہ سب؟“ سوال کے جواب میں اس نے سوال ہی کیا۔

”کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“ میں انجان بنا رہا۔

”ملازم جبار، بٹول اور صائمہ کوئی بھی کوٹھی میں نہیں ہے۔“ اس نے سخت برہم آواز میں کہا۔

میں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا، پھر بولا۔ ”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ رات کو تو وہ سب موجود تھے۔“

”یہ بھی میرے خلاف کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔“ غصے کے باوجود اس کی آواز سے فکر مندی جھلکنے لگی۔ ”لیکن..... لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ تم..... موجود ہو۔ اگر تم بھی میرے نادیدہ دشمن کی سازش کا شکار ہو جاتے تو جانے کیا ہوتا۔“

”کیا آپ نے اپنے دشمن کا سراغ لگا لیا ہے کہ وہ کون ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں کسی حد تک۔“ میرے سوال کا جواب دے کر اس نے گہرا سانس لیا۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ کہیں شیطانی عمل کے دوران میں اس نے کوئی صحیح اندازہ تو نہیں لگا لیا؟

میرے کچھ اور پوچھنے سے پہلے ہی وہ خود بول اٹھا۔

”ابھی صرف اتنا پتا چلا ہے کہ وہ کچھ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔“

میں نے اسے غلط راہ پر ڈالنے کے لئے کہا۔ ”وہ آپ کا کوئی کاروباری رقیب بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”اس پر میں بہت پہلے غور کر چکا ہوں۔“ وہ بولا۔ اب اس کی آواز کسی قدر پرسکون ہو چلی تھی،
کہنے لگا۔ ”بظاہر تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔“

”مجھے علی زمان پر شک ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس شک کی کوئی وجہ؟“ وہ چونک اٹھا۔

”پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب سے ہمارے کاروبار کو دھچکا لگا ہے، اس کا کاروبار چمک اٹھا ہے۔ جن

پارٹیوں سے ہمارا لین دین تھا، اب علی زمان کی دکان پر نظر آتی ہیں۔ اس پر شک کرنے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ میں نے علی زمان کے پاس ایک مشتبہ فقیر کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ سائیں ملیر والا کھانا

”سائیں ملیر والا؟“ محمود حسن جیسے کہیں کھو گیا، پھر چند لمحوں بعد خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

”وہ..... وہ بھی تو ملیر چلی گئی تھی۔“

”کون؟“ میں نے فوراً پوچھ لیا۔ محمود حسن کو غلط راہ پر ڈالنے میں مجھے کسی حد تک کامیابی ہوئی جا

رہی تھی۔

”تم..... تم اسے نہیں جانتے۔ وہ..... وہ ایک خطرناک عورت ہے۔ سائیں ملیر والا کو علی

زمان کے پاس وہی بھیج سکتی ہے، پیر منگھو کی ماٹی۔“ محمود حسن یہ کہہ کر کچھ دیر کو خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔ ”تم نے پہلے مجھے یہ باتیں کیوں نہیں بتائیں؟“

”آپ نے اپنے دشمن کے بارے میں یہ کہا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے تو مجھے سائیں کا خیال

آجیاد معاف کیجئے گا میں اس بات سے بے خبر تھا کہ کوئی خطرناک عورت آپ کی دشمن ہے۔ اگر آپ

نے مجھے پہلے اس عورت کے بارے میں کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید آج وہ زندہ نہ ہوتی۔“

میری بات سن کر محمود حسن طنزینہ انداز میں ہنس دیا، پھر بولا۔ ”مقصود! اگر تم اس عورت سے

واقف ہوتے تو..... تو برا نہ ماننا، ایسی بے وقوفی کی بات نہ کرتے۔ جب میں محمود حسن اس کا کچھ

نہیں بگاڑ سکا تو تم کیا کر لیتے۔ تمہاری وفاداری اور جاں نثاری کا میں دل سے قائل ہوں، لیکن یہ اور ہی

معاملہ ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔“

”وہ عورت اگر اتنی ہی خطرناک تھی تو آپ نے اسے اپنا دشمن کیوں بنا لیا؟“

”تم نے اگر اسے دیکھا ہوتا تو یہ سوال بھی نہ کرتے۔“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”عورت چاہے کتنی

ہی خطرناک ہو لیکن عورت تو ہوتی ہے نا..... پھر یہ کہ مجھے اس کی پراسرار قوتوں کا بھی علم نہیں تھا۔

میں اس بات سے بھی آگاہ نہ ہو سکا کہ وہ اپنے فطری تقاضوں کو میٹھی فینڈ سلا چکی ہے۔ خیر..... ان

باتوں پر خاک ڈالو..... میں تو اس پر خوش ہوں کہ مجھے اپنے دشمن کا پتا چل گیا۔ علی زمان تو محض ایک

درمیانی کڑی ہے۔ وہ میرا اصل دشمن نہیں۔ اب تو میں پہلے اس کے سائیں کو ٹھکانے لگاؤں گا، پھر مانی

سے نمٹوں گا۔ اس کے لئے شاید اب تین دن کم پڑیں اور مزید تین دن لگ جائیں۔“

”آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اگر کوئی اور کوٹھی میں نہیں تو میں آپ کی ہر خدمت کروں گا۔“

”لیکن مقصود، یہ ہوا کیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ صائمہ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا

کہ میری اجازت کے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔ بٹول نے بھی زیادہ حیرت مجھے صائمہ پر ہے۔ اگر..... اگر

میں اس وقت تھکا نہ ہوتا تو کم از کم صائمہ کو تو واپس لے ہی آتا۔“

”تو کیا آپ کو خبر ہے کہ وہ کہاں جا سکتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ اپنے ماں باپ کے سوا اس کا کوئی اور ٹھکانا نہیں۔“ محمود حسن نے صحیح اندازہ لگایا اور میں

یہی جانتا چاہتا تھا۔

”ممکن ہے، آپ کی کسی بات سے خفا ہو کر وہ رات ہی کو اپنے والدین کے پاس چلی گئی ہوں۔

جب ان کا غصہ اتر جائے گا تو وہ ایک دن میں خود ہی آ جائیں گی۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”رات کو

کھانے کے وقت تو وہ خوش دکھائی دے رہی تھیں۔“

”صائمہ کس بات سے خوش اور کس سے ناخوش ہوتی ہے، یہ بھی مجھے کو خبر ہے۔“ محمود حسن

شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ”ذرا یہ نازک وقت گزر جانے دو، پھر صائمہ کو پتا چلے گا کہ اس نے گھر سے قدم

نکال کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

”آپ مجھے بہت ٹھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔“ میں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”میں آپ کے لئے ناشتا بنا کر لاتا ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں چلیں۔“

محمود حسن میری بات مان کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اب مجھے اس کے جسم میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا کہ جب میں اس کا جسم چھوڑ کر باہر آؤں گا تو وہ زندگی کی بازی ہار جائے گا۔ اس شیطان سے نمٹنے کی اب دو ہی صورتیں رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں نے گزشتہ رات کو عمل کیا، لیکن ناکام رہا۔ میں اسے شیطانی عمل پڑھنے سے نہ روک سکا۔ آخر میں تو یہ بھی ہوا کہ عمل کے اختتام پر اس نے مجھے اپنی خواب گاہ سے بھگا دیا۔ وقتی طور پر سہی مجھے اذیت سے بھی گزرنا پڑا۔ دوسری صورت ایک اور بھی تھی کہ میں اس کے جسم میں اتر کر اسے خودکشی پر مجبور کر دیتا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی قدم تھا۔ اس کا سیدھا سادا مطلب اسے دانستہ قتل کر دینا ہوتا۔ جب وہ موت کی دہیز تک پہنچ جاتا تو میں اس کا جسم چھوڑ دیتا۔ پہلے بھی میں ایک آدم زاد کے ساتھ ایسا کر چکا تھا۔ یہ واقعہ لاہور کا تھا کہ جب مولوی کفایت اللہ کے ایما پر ایک آدم زاد نے مجھے اپنا غلام بنانے کے لئے ایک عمل شروع کیا اور پھر میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اس وقت میں بھٹکا ہوا تھا، میرے انداز فکر میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب محمود حسن جیسے شیطان صفت آدم زاد کا خون اپنے سر لیتے ہوئے مجھے خوف خدا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسی لئے ایسے دوسرے حربے آزمانے کا فیصلہ کیا کہ خود وہ شیطان اپنی موت مارا جائے۔ ہاں میں نے یہ ضرور کیا کہ اپنے تحفظ کی خاطر اسے غلط راہ پر ڈال دیا۔

اس روز صبح محمود حسن کو ناشتا کرا کے میں مارکیٹ پہنچ گیا اور دن بھر خلق خدا کی خدمت کرتا رہا۔ محمود حسن نے مجھ سے کہا تھا کہ اب میں مغرب کے وقت ہی سو کر اٹھوں گا، تم اس سے پہلے کو بھی پہنچ جانا۔ میں نے ایسا ہی کیا، لیکن کوٹھی میں قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو دھچکا لگا۔ خلاف توقع صائمہ کوٹھی میں موجود تھی۔ اس پر ایک نظر ڈال کر ہی میرے لئے یہ جاننا دشوار نہ ہوا کہ وہ کس کرب و اذیت سے گزر چکی ہے۔

محمود حسن اپنی خواب گاہ میں مسری پر نیم دراز تھا اور صائمہ اس کے لئے چائے بنا کر لائی تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر محمود حسن اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”مقصود! تم اچھے وقت پر آ گئے۔ ہماری چھوٹی بیگم تمہاری خدمت کر کے بھی خوش ہوں گی۔“ اس کی آواز میں نشتر جیسی چھین تھی۔ ”دراصل صائمہ بیگم کا تعلق اس طبقے سے ہے جسے خدمت گزاری ہی کرنی چاہئے۔“ پھر وہ صائمہ سے مخاطب ہوا۔ ”جاؤ بیگم ایک کپ چائے اور بنا کر لاؤ۔“

صائمہ نے محمود حسن کو چائے کا کپ دیا اور واپسی کے لئے پٹی تو میں نے کہا۔ ”نہیں، بیگم صاحبہ میرے لئے چائے بنا کر لائیں یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا۔“

”نہیں جانے دو مقصود۔“ محمود حسن بول اٹھا۔ ”اب تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کوٹھی میں کسی ملازم یا ملازمہ کی ضرورت نہیں۔ آخر تمہاری چھوٹی بیگم صاحبہ کس لئے ہیں..... کیوں صائمہ

بیگم، ٹھیک ہے نا؟“

”جی..... جی ہاں۔“ صائمہ اس طرح بولی جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی خواب گاہ سے نکل گئی۔

”ہوا یہ کہ دوپہر کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔“ محمود حسن مجھے خود ہی بتانے لگا۔ ”مجھے صائمہ کا خیال آیا اور میں کوشش کے باوجود اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ نتیجہ یہ کہ میں خود جا کر صائمہ کو لے آیا۔ یہ مجھے اپنے ماں باپ کے گھر ہی ملی اور خوشی خوشی میرے ساتھ چل آئی۔ وہاں میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ یہاں آ کر جب میں نے اس کی خبر لی تو ایک عجیب ہی داستان سننے کو ملی۔“ یہ کہتے ہی وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ”تم بھی وہ داستان سن لو تو حیران رہ جاؤ۔ لگتا ہے کہ اسے بھی اب پاگل خانے میں داخل کرنا پڑے گا۔ شاید اسے جاگتے میں اچھے اچھے خواب دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔“

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اچانک صورت حال یوں بدل جائے گی۔ مجھے اس پر بہت انوس ہوا۔

”اسے چائے بنا کر لے آئے دو، پھر تمہیں اس کی زبانی وہ عجیب داستان سناؤں گا۔“ محمود حسن نے مزید کہا۔ ”پاگل عورت میرے ہی منہ پر جھوٹ بول رہی تھی کہ میں نے ہی اسے اس کے میکے بھیجا تھا، وہ بھی پتا ہے کب؟..... دو روز پہلے۔“

میں خاموشی کے ساتھ اس ظالم آدم زاد کی باتیں سنتا رہا۔

صائمہ میرے لئے چائے بنا لائی تو محمود حسن نے اسے مخاطب کیا۔ ”ہاں تو صائمہ بیگم، تمہاری راہبہ آپا کب آئیں پاگل خانے سے.....؟“

”آپ..... آپ ہی تو انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ..... یہ دو تین دن پہلے کی بات ہے۔“

صائمہ خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”بار بار آپ یہ..... یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لئے صائمہ بیگم کہ تمہیں بھی تمہاری راہبہ آپا کے پاس بھیج دوں۔“

”نن..... نہیں آپ..... آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں..... میں پاگل نہیں ہوں۔“ وہ سہم گئی۔

”تم نے کچھ سنا مقصود کہ صائمہ بیگم کیا کہہ رہی ہیں۔ انہیں اپنے پاگل ہونے پر یقین نہیں۔ یہی ان کی راہبہ آپا کہتی تھیں۔“ محمود حسن ہنسا، پھر کہنے لگا۔ ”چلو خیر کوئی بات نہیں۔ اب نہیں تو چند روز بعد انہیں یقین آ جائے گا۔“

جسمانی تشدد کرنے کے بعد محمود اب صائمہ کو ذہنی اذیت پہنچا رہا تھا۔

”یہ..... یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ..... آپ تو بالکل بدل گئے ہیں۔“ صائمہ یہ کہتے ہوئے رو پڑی۔

”تمہاری آنکھوں سے بہتے ہوئے یہ آنسو بچے موتیوں کی طرح لگتے ہیں صائمہ بیگم۔ ان موتیوں کو یوں بے دردی سے نہ لٹاؤ کہ یہ پھر کسی وقت کام آئیں گے۔ تمہیں میری پیوی بن جانے کے بعد

تمہاری اوقات سے زیادہ عزت مل گئی، شاید اسی وجہ سے تم اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکیں۔ اچھا وہ داستان مقصود کو سنا دو جو تم نے مجھے سنائی تھی۔“ محمود حسن بدستور صائمہ پر طنز کرتا رہا۔

”خدا کے واسطے رحم کیجئے مجھ پر درندہ میں..... میں واقعی پاگل ہو جاؤں گی۔“

صائمہ کی قابل رحم حالت دیکھ کر میں نے محمود حسن سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ کی طبیعت اس وقت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ انہیں جانے دیں۔“

میرے کہنے پر محمود حسن نے صائمہ کو جانے دیا، پھر کہنے لگا۔ ”تمہیں ابھی اندازہ نہیں مقصود کہ یہ عورتیں اندر سے کچھ اور اوپر سے کچھ ہوتی ہیں۔“ اس کے بعد وہ مجھے ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو پہلے ہی سے میرے علم میں تھیں۔ اس کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی دلچسپ لطیفہ سنار رہا ہو۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”تمہی بتاؤ مقصود کہ اس عورت کا دماغ خراب ہے یا نہیں۔“

”بظاہر تو وہ ہوش و حواس میں لگی ہیں۔“ میں بات کو برابر کرنے کی غرض سے بولا۔ ”آپ کہیں تو میں ان کے لئے کوئی نسخہ تجویز کر دوں؟“

”اے جس دوا کی ضرورت تھی، میں دے چکا ہوں۔ تم اپنی حکمت رہنے ہی دو۔ دو ایک دفعہ اسے دوا کی یہی خوراک اور مل گئی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کا علاج تمہارے پاس نہیں میرے پاس ہے۔“ محمود حسن طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔

میں سمجھ گیا کہ محمود حسن کس دوا اور کس علاج کی بات کر رہا ہے۔ مجھے اس بے رحم آدم زاد سے نفرت ہوئی۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ صائمہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں کسی حد تک میری بے خبری کو بھی دخل تھا۔ میں، محمود حسن کی طرف سے غافل ہو گیا۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ شام ہونے سے پہلے ہی جاگ سکتا ہے۔ صائمہ کے دل میں میری وجہ سے وقتی طور پر جو محبت پیدا ہو گئی تھی، اس کی جگہ پھر نفرت نے لے لی۔ چند روز کے لئے اپنے شوہر کے بدلے ہوئے روپے کو اس نے دھوکا ہی سمجھا ہو گا۔ میں سوچنے لگا کہ محمود حسن کو تو آخر کار اپنے انجام تک پہنچنا ہی ہے۔ موجودہ صورت حال میں صائمہ کو ہمیشہ کے لئے محمود حسن سے بچھڑ کر زیادہ ملال نہ ہوتا۔ اسے تو محمود حسن سے پہلے ہی انتہائی نفرت تھی۔

اس رات بھی محمود حسن نے زوال کے وقت عمل شروع کر دیا، لیکن میں نے اس کے کمرے کا رخ نہیں کیا۔ پہلے میں جن زاد بن کر صائمہ کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک کر اٹھی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سید بادشاہ آپ..... آپ کو میرا خیال آ ہی گیا۔“

”حوصلہ رکھو صائمہ۔“ میری آواز میں نرمی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری آواز سن کر یہی سوچے گی۔ میں نے اسے خوش خبری سنائی۔ ”بہت جلد تمہیں دکھوں سے نجات ملنے والی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری ہدایت پر عمل کیا اور سیدھے راستے پر آ گئیں۔“

”لیکن وہ..... وہ ظالم..... میرا شوہر تو اب بھی مجھ پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ اسے میں نے بچ

دل سے معاف کر دیا تھا، پھر بھی.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم جو کہنے والی ہو۔ تمہیں یاد تو ہو گا صائمہ کہ تم نے کبھی اپنے بیوہ ہو جانے کی دعا کی تھی۔ اب اس دعا کی قبولیت کا وقت قریب آ گیا ہے۔“

”اے سید بادشاہ! یہ تو خود..... خود اس نے بھی مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا تھا اور..... اور پھر آج..... آج وہ دوبارہ جانور بن گیا۔ میری کسی بات پر اس نے یقین نہیں کیا، ہر بات کو جھٹلا دیا۔ راجہ آپا نے ہمیشہ اسے فریبی کہا اور وہ..... وہ بھی فریب کھا گئیں۔ معلوم نہیں وہ درندہ اب ان کا کیا شکر کرے گا..... میری آنکھوں سے تو پردہ ہٹ گیا، مجھے پتا چل گیا کہ اس نے دھوکا دیا تھا۔ وہ نہیں بدلا..... بالکل نہیں بدلا..... مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟..... کیا اسے دھوکا دے کر بھی خوشی حاصل ہوتی ہے؟“ صائمہ کی آواز بھاری ہونے لگی۔

صائمہ کے پاس میں اسی لئے آیا تھا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ محمود حسن نے اسے جو ذہنی اور جسمانی ذلت پہنچائی، اس کا مداوی فی الحال اسی صورت ممکن تھا کہ میں اسے گہری نیند سلا دیتا درندہ شاید وہ ساری رات جاگتی رہتی۔ وہ سو گئی تو میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔

محمود حسن کو میں نے جس غلط راہ پر ڈال دیا تھا، اسے حقیقت کا رنگ دینے کے لئے مجھے خطرہ مول لینا ہی پڑا۔ میں اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو وہ گزشتہ رات کی طرح آن مارے مسہری کے قریب ہی زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ عمل پڑھتے ہوئے اس کی آنکھیں نیم دا تھیں۔

میں نے مفروضہ سانس کی ہیئت اختیار کرتے ہی بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”سنبھل اے محمود حسن! آج رات میرے وار سے تو نہیں بچ سکے گا۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس کے ماتھے کا نشانہ لے کر ایک کنکری ماری۔

وہ اچھل پڑا اور مجھے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر دیکھا، مگر عمل پڑھتا رہا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اس کی پیشانی پر تین کنکریاں ماریں اور پھر غائب ہو گیا۔ یہ محض ایک نفسیاتی حربہ تھا جو میں نے اس رات آزمایا۔ فجر ہونے سے پہلے میں ایک بار پھر اس کی خواب گاہ میں گیا۔

”محمود حسن!“ اس مرتبہ ظاہر ہوئے بغیر اسے میں نے آواز دی، پھر بولا۔ ”تو بے خبر ہے کہ تیرے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو چکا ہے۔ اگر تو چاہے بھی تو اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا..... میرا دار کارگر ہو چکا ہے۔“

اس کے چہرے پر خوف کے آثار ابھرے، اکڑے ہوئے سے جسم میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ پھر مگی اس نے عمل پڑھنا ترک نہیں کیا۔

میں ایک منہ بوس سی امید کا دامن تھامے محمود حسن کی خواب گاہ سے نکل آیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

صبح ہوئی تو محمود حسن مجھے کچھ نڈھال سا دکھائی دیا۔ اسی نے مجھے اپنے ساتھ ناشتا کرنے کے لئے بلایا تھا۔ صائمہ باورچی خانے میں تھی۔

میں ایک گھاس میں پانی لے آیا اور اسے دوا کی دوسری خوراک کھلا دی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ محمود حسن ہی نے مجھے خود اس کا موقع دیا تھا۔ دوا کی پہلی خوراک واقعی جسم کی توانائی بحال کرنے کے لئے تھی، محمود حسن اسی لئے دھوکا کھا گیا۔ دوسری خوراک نے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی اپنا اثر دکھا دیا۔ میں نے محمود حسن کی خواب گاہ میں قدم رکھا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ دوائی تیز اثر تھی کہ اب وہ آئندہ روز صبح ہونے سے پہلے سو کر نہ اٹھا۔

کسی شیطانی عمل کے ادھورے رہ جانے کے نتائج کا مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا۔ دوسرے دن صبح سو کر اٹھنے کے کچھ ہی دیر کے بعد مجھے محمود حسن کی تیز چیخ سنائی دی۔ صائمہ اور میں، دونوں ہی اس کی خواب گاہ کی طرف لپکے۔

میں نے اسے مسکری پر ترپتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے سینے کو تھامتے ہوئے ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھا۔

”مقصود! میرا دل..... میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔“ اس نے بہ مشکل مجھ سے کہا۔ ”کچھ کرو کرو مقصود..... ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے لے کر بھینچ رہا ہے۔ میں..... مر..... رہا ہوں۔ کو..... کوئی دوا.....“ وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا اور چیخنے لگا۔ پھر چند لمبے بعد یوں لگا جیسے اس نے سنبھالا لیا ہو۔ اس کے چہرے پر شدید کھنچاؤ تھا۔ اسی عالم میں وہ رک کر کہنے لگا۔ ”میں..... میں اپنا عمل پورا نہیں کر سکا اور..... اور وہ..... وہ کام کر گیا۔ شاید..... یہ اسی..... اسی کا اثر ہے۔ میرا..... میرا دل..... لیکن تم..... تم تو کوشش کر کے دیکھ لو مقصود۔ کیا خبر میں زندہ ہوں.....“

”آپ ہی نے تو کہا تھا کہ یہ پراسرار معاملات میری سمجھ میں نہیں آسکتے۔ مجھے کسی ایسی دوا کا علم نہیں جو کسی عمل کے ادھورے رہ جانے کی صورت میں کارگر ثابت ہو سکے۔ اب اتنا وقت بھی نہیں رہا۔ لگے پڑھ کر آپ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں۔ مرنے سے پہلے.....“

”نہیں۔“ اس نے چیخ کر میری بات کاٹ دی۔ ”میں..... میں مرنا نہیں چاہتا.....“

”نہیں۔“ اس کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔ ”میرے..... میرے دشمن نے..... مجھے مار ڈالا۔“

میرا جی چاہا کہ اس سے کہہ دوں، محمود حسن! تم خود اپنے دشمن تھے۔ تمہیں تمہارے اعمال نے مار ڈالا۔ میں نے یہ سوچا ضرور مگر اس سے کچھ نہیں کہا۔ میں اگر یہ کہہ بھی دیتا تو کیا حاصل ہوتا۔ اس نے تو میرا یہ مشورہ بھی قبول نہیں کیا کہ اللہ سے گناہوں کی معافی ہی مانگ لیتا۔ محمود حسن جیسے آدم زادوں کو شاید یہ توفیق بھی نہیں ہوتی۔

صائمہ پانی پلانے والی تھی کہ محمود حسن نے ہنگلی لی اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اسے شیطانی عمل پڑھنے سے روک دوں۔ مجھے اسی لئے اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس نہیں ہوا۔

”تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے مقصود۔“ محمود حسن دھیمی آواز میں بولا۔ ”میرا دشمن مجھ پر ظاہر ہو گیا۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”کب؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”آپ تو کو مٹھی سے نکل کر کہیں نہیں گئے۔“

وہ مجھے بے خبر جان کر دھیرے سے ہنسا، لیکن اس کی ہنسی میں پہلے جیسی جان نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں پہلے بھی شاید تم سے کہہ چکا ہوں کہ ان پراسرار قوتوں کو سمجھنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری حکمت میرے بھی کچھ کام آ سکتی ہے؟“

محمود حسن کے اس سوال نے جیسے میرے ذہن میں روشنی سے کر دی۔ پھر بھی میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، مجھے بتائیے؟“

”میں کچھ کمزوری سی محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چلتے ہوئے آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ جاتا ہے۔“

”یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ دراصل آپ کو آرام نہیں مل رہا۔ کل بھی آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی۔ شاید آپ کسی سبب رات بھر جاگتے ہیں۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم کہ میں رات کو جاگتا ہوں۔“

”اگر آپ راتوں کو نہ جاگتے تو پھر دن میں کیوں سوتے۔ یہ تو سیدھی سی سامنے کی بات ہے۔“

میرے جواب پر وہ کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا اور کہا۔ ”ہاں، یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں مجھے رات کو نیند نہیں آ رہی۔“ وہ اصل بات چھپا گیا۔

”مارکیٹ جانے سے پہلے آج میں آپ کو دوا دے کر جاؤں گا۔ دوا کی ایک خوراک آپ کو سونے سے پہلے اور ایک سو کر اٹھنے کے بعد استعمال کرنی ہے۔ اس کے بعد آپ کو کمزوری محسوس نہیں ہوگی۔ دکان آج دیر سے کھل جائے گی۔ ویسے بھی کاروبار تو برائے نام رہ گیا ہے۔“ میں بولا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ ایک دن اگر دکان نہ بھی کھلے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

شام کو میں مارکیٹ سے لوٹا تو وہ میری توقع کے مطابق ہشاش بشاش دکھائی دیا۔ وہ سو کر اٹھ چکا تھا۔

”تمہاری دوا کی ایک ہی خوراک نے کمال کر دیا مقصود۔“ وہ کہنے لگا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے جسم کی توانائی لوٹ آئی ہو۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سو کر اٹھنے کے بعد آپ نے دوسری خوراک نہیں کھائی۔“

”ابھی تو چائے پی کر میں کچھ دیر باہر لان میں ٹھل کر آیا ہوں۔ میرا خیال ہے مقصود کہ اب دوسری خوراک کی ضرورت نہیں رہی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”خیال ہے آپ کا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر آپ نے دوسری خوراک نہیں کھائی تو پہلی خوراک کا اثر آج آدھی رات تک ختم ہو جائے گا۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر لاؤ دوسری خوراک بھی کھلا دو۔ دوا کا اثر ختم نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

محمود حسن کی لاش کو میں نے سرد خانے میں رکھوا دیا تاکہ راجہ میرپور خاص سے کراچی پہنچ جائے۔ صائمہ کی طرف سے میں نے راجہ کو تار دے دیا کہ محمود حسن کا انتقال ہو چکا ہے، اسی کے ساتھ متین اور صادق کو بھی خبر کر دی۔

راجہ کو میرپور خاص سے آنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ دوسرے دن صبح محمود حسن کو سپرد خاک کیا گیا۔ راجہ کا بھائی راشد بھی ساتھ آیا تھا۔

حاجی صاحب اور دوسرے کاروباری لوگ کہ جن سے محمود حسن کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا تھا، عمر، حسن کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے میں شریک ہوئے۔

قبرستان سے واپسی پر حاجی صاحب نے مجھے اپنی کار میں بٹھالیا۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا: ”میری ہی طرح دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ محمود حسن کاروباری صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ تمہارا کیا ہے خیال ہے مقصود میاں؟ تم نے تو آخری وقت تک اس سے وفاداری قائم رکھی۔“

”جی ہاں، لوگ غلط نہیں کہتے۔“ میں نے بات کو مختصر کر دیا۔

”اب کھو، تمہارا کیا ارادہ ہے مقصود میاں۔ ظاہر ہے کہ محمود حسن کے بعد اب تمہارا اس کی کڑی میں رہنا کچھ آسان نہیں۔“

”کیا مناسب ہے حاجی صاحب، کیا نہیں، یہ فیصلہ کرنا ابھی باقی ہے۔“

”جب کوئی فیصلہ کر لو تو اس سے مجھے ضرور آگاہ کر دینا۔ میں نے تمہارے لئے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ تم تو اب ملتے ہی نہیں، کبھی میرے دفتر آؤ تو بات ہو۔“

میں نے ان سے ملنے کا وعدہ کر لیا اور مجھے محمود حسن کی کوٹھی تک چھوڑ کر چلے گئے۔

راشد سے میرا تعارف متین نے کرایا تھا۔ وہی میرے ایما پر راشد کو میرپور خاص سے کراچی لے کر آیا تھا۔ خود راشد ہی نے ابھی مجھ سے کوٹھی میں رہنے کو کہا۔ کچھ سوچ کر میں نے راشد کی یہ پیش کش قبول کر لی۔ کوٹھی میں میرا کمرہ بیرونی سمت تھا۔ راجہ اور صائمہ کو عدت کے دن گزارنے میں میری وجہ سے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

محمود حسن کا کاٹنا ور میان سے نکل جانے کے بعد ان دونوں بے سہارا عورتوں کو چھوڑ کر چلا جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس شیطان صفت شخص کی تباہی کا سبب میں ہی بنا تھا۔ اسی تباہی کا نتیجہ راجہ اور صائمہ کو بھگتنا پڑا۔ مجھے یہ منظور نہ ہوا۔ بتول بھی واپس آگئی اور محمود حسن کا ملازم جبار بھی۔ میرے مشورے پر میرپور خاص سے راشد کراچی منتقل ہو گیا۔ چند ہی روز میں اسے میں نے کاروباری رموز سمجھا دیئے۔ وہ محمود حسن کی جگہ اس کے دفتر میں بیٹھنے لگا۔

ادھر صائمہ اور راجہ کی عدت کے دن پورے ہوئے۔ ادھر میں نے محمود حسن کے کاروبار کو ایک بار پھر کامیابی کی راہ پر ڈال دیا۔ صائمہ سے دو سال بڑا اس کا ایک بھائی حنیف عرصہ دراز سے روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اسے بھی میں نے راشد سے کہہ کر دکان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود حنیف سختی اور ایمان دار تھا۔ دونوں دکانیں اب پہلے کی طرح کھلنے لگیں۔ میری کوششوں کے

نتیجے میں گوداموں پر پڑے ہوئے تانے بھی کھل گئے۔

میں نے اسی عرصے میں اپنے پرستاروں کو نشر پارک کے قریب واقعی کوٹھی پر بلانا شروع کر دیا۔ ان میں غریب اور امیر سبھی ہوتے۔ شام کو دو گھنٹے روز میں اسی کوٹھی میں گزارتا۔ پہلے کی نسبت لوگوں کی عقیدت و محبت مجھ سے اور بڑھ گئی تھی۔ میری کوٹھی کو لوگ اب خود ہی ”مقصود میاں کا آستانہ“ کہنے لگے تھے۔ حاجی صاحب اور کاروباری حلقے کے دوسرے لوگ بھی وہاں آنے لگے۔ وہ میری خوشنودی کے حصول کی خاطر ہر بات مان لیتے اور مجھ سے کاروباری مشورے بھی کرتے۔ رفتہ رفتہ وہ راہ استوار ہونے لگی جو میں نے کافی دن پہلے اپنے مستقبل کے لئے متعین کی تھی۔

راجہ اور صائمہ کے لئے میں اب گھر کے ایک فرد ہی کی طرح تھا۔ صائمہ تو محمود حسن کی زندگی ہی میں مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی، اب راجہ بھی میرے سامنے آنے لگی۔ راشد بھی میری عزت کرتا کہ میری ہی وجہ سے کاروبار چمک اٹھا تھا۔ محمود حسن کی دونوں بیویاں ایک ہی چھت کے نیچے دو بہنوں کی طرح رہتیں اور لوگ ان کی مثالیں دیتے۔ پھر ایک روز میں نے سید بادشاہ کی کوٹھری کا راز بھی افشا کر دیا۔ صائمہ کو اس پر بڑی حیرانی ہوئی۔

”لیکن سید بادشاہ تو خود مجھ سے“

میں نے صائمہ کی بات کاٹ دی۔ ”وہ مجھ سے بھی ملے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ بیشہ کے لئے یہاں سے جا رہے ہیں۔“

راجہ نے بتایا۔ ”اس کوٹھری میں تو کبھی میں بھی نہیں گئی۔ ہاں ایک رات مرحوم محمود حسن کو وہاں جاتے ضرور دیکھا تھا۔ پوچھنے پر وہ کہنے لگے کہ سید بادشاہ نے انہیں اپنی کوٹھری میں آنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ بھائی مقصود! تمہیں کیسے معلوم کہ اس کوٹھری میں خفیہ تجوریوں ہیں؟“

راشد بھی موجود تھا۔ وہ میرے کہنے پر مارکیٹ جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے بھی میری بات سن کر اظہار حیرت کیا۔

صائمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے راجہ کے سوال کا جواب دیا۔ ”چھوٹی بیگم صاحبہ گواہ ہیں کہ مرحوم مجھی پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ مرحوم ہی نے مجھے ان تجویروں کے بارے میں بتایا تھا اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اب ان تجویروں میں زیادہ دولت باقی نہیں رہی۔“

”لیکن ان تجویروں کی چابیاں کہاں ہیں؟“ راشد نے پوچھا۔

”وہ ایسی تجوریوں ہیں جو ایک خاص طریقے سے کھلتی ہیں۔ انہیں کھولنے کے لئے چابیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ میں نے بتایا۔

”آپ نے پہلے کبھی ان تجویروں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی بھی کیا کوئی وجہ تھی مقصود بھائی؟“ راجہ نے دریافت کیا۔

میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا جواب دینا ہے، سو بولا۔ ”سید بادشاہ نے کل رات ہی مجھے اس کی اجازت دی ہے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان تجویروں میں جتنی بھی رقم باقی رہ گئی

ہے۔ چھوٹی اور بڑی بیگم کا اس پر یکساں حق ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ان تینوں کو ساتھ لیا اور کوٹھی کے اس حصے میں آگیا جہاں "سید بادشاہ کی کوٹھری" تھی۔

صائمہ کچھ زیادہ ہی ڈری ہوئی تھی۔ وہ کوٹھری میں جاتے ہوئے جھجکتے لگی۔
"کیا آپ کو یقین نہیں کہ سید بادشاہ یہاں سے جا چکے ہیں؟" میں نے صائمہ کو مخاطب کیا، پھر خور آگے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے کہا۔ "سب سے پہلے میں اندر جاتا ہوں۔" میں نے اندر قدم رکھا تو راشد کی ہمت بھی ہوئی۔ وہ بھی کوٹھری میں آگیا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"مقصود بھائی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں صائمہ۔ جب انہیں اور راشد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تو ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آؤ ہم بھی اندر چلتے ہیں۔" مجھے راجہ کی آواز سنائی تو مڑ کر دیکھا۔ وہ صائمہ کا ہاتھ تھامے ہوئے کوٹھری میں داخل ہو رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے کئی بار عملی مظاہرہ کیا کہ دیوار کس طرح اپنی جگہ سے ہٹی ہے۔ پھر ان تجویروں کو کھول کر دکھایا۔ محمود حسن کو میں اس کی زندگی ہی میں تقریباً لگا ل کر چکا تھا، اس کے بادجو ایک تجوری میں میں ہزار روپے مل گئے۔

"مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہئے مقصود بھائی۔" راجہ نے کہا۔ "یہ ساری رقم صائمہ کو دے دیں۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا کہ یہ سید بادشاہ کی ہدایت کے خلاف ہو گا۔" میں بولا۔
"اگر تجوری ہے تو پھر میں آدھی رقم لے لوں گی۔" راجہ نے رضامندی ظاہر کر دی۔

ابھی سب کو ٹھہری ہی میں تھے کہ میں نے آتش دان کے اندر جھماکے اور غیر مانوس آواز کا راز بھی کھول دیا، پھر خود ہی بتا دیا۔ "مرحوم نے تجویروں کی حفاظت کے لئے ایسا کیا تھا تاکہ ان کے سوا کوئی تجویروں تک نہ پہنچ سکے۔"

"ایسی ہی آواز ایک رات سنائی دی تھی تو وہ..... وہ....." صائمہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"ہاں مجھے بھی یاد ہے۔ مرحوم نے سید بادشاہ کے خفا ہو جانے کے بارے میں کہا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے ٹھیک کہا ہو یا پھر تجویریاں کھولتے ہوئے وہ ہی احتیاط نہ کر سکے ہوں۔ اب بچھلی باتوں کو بھول ہی جائیں چھوٹی بیگم تو اچھا ہے۔" میں نے کہا اور پھر ان تینوں کو ساتھ لئے کوٹھری سے نکل آیا۔

"تو اب..... اب سید بادشاہ کی چوکھٹ پر مغرب کے وقت اگر بتیاں جلانے کی ضرورت نہیں؟" صائمہ نے مجھ سے پوچھا۔

"جب سید بادشاہ ہی یہاں سے چلے گئے تو اب اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا اور بڑے نوٹوں کی آدھی گڈیاں راجہ اور صائمہ کو دے دیں۔

اسی روز راجہ نے میرے سامنے ایک ایسی تجویز رکھی کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ تجویز اس کی نیک دلی اور خاندانی شرافت کا ثبوت تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "مقصود بھائی! میرے مرحوم شوہر اور خود مجھ پر

آپ کے بستہ احسانات ہیں۔ میں اسی لئے آپ سے ایک مشورہ کر رہی ہوں۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد صرف میں ہی ان کے تمام کاروبار کی مالک ہوں، لیکن میرے خیال میں یہ انصاف نہیں۔ صائمہ کو بھی اس میں سے برابر کا حصہ ملنا چاہئے۔" یہ کہہ کر اس نے تصدیق طلب نظروں سے راشد کی طرف بھی دیکھا۔ "اس سلسلے میں آپ کا کیا مشورہ ہے مقصود بھائی؟"

راشد بھی اسی نیک آدم زاد کی بھائی تھا۔ اس نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنی بہن کے فیصلے کی تائید کر دی۔

صائمہ حیران حیران سی راجہ کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے راجہ کی تجویز کو سراہا تو صائمہ بھرائی ہوئی آواز میں بول اٹھی۔ "میں..... راجہ آپا..... میں اس قابل نہیں ہوں۔ آپ..... آپ بھی جانتی ہیں کہ..... کہ میری وجہ سے جو عظم....."

راجہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جو بھی ہوا وہ میری قسمت تھی صائمہ۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ پھر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ میں تمہیں معاف کر چکی ہوں۔ تمہاری طرف سے میرے دل میں کوئی میل نہیں رہا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ تمہیں میں نے اپنی بہن بنا لیا۔ میں یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہوں۔"

اس دن راجہ کے اصرار پر میں نے ایک وکیل سے رابطہ کر کے تمام قانونی کارروائی پوری کرادی۔ راشد بھی میرے ساتھ ساتھ رہا۔ میرے ساتھ اس نے بھی بطور گواہ کاغذات پر دستخط کئے۔ راجہ کی طرف سے راشد اور صائمہ کی طرف سے حنیف کو کاروباری کی نگرانی سونپ دی گئی۔

محمود حسن کی کوٹھی میں اب میرا قیام ضروری نہیں رہا۔ وہ چھٹی کا دن تھا کہ جب میں نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

راجہ یہ سنتے ہی کہنے لگی۔ "یہ نہیں ہو سکتا مقصود بھائی! آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے۔" میں نے اپنا فرض ادا کر دیا بڑی بیگم! اب مجھے نہ روکیے۔ میں اس کو ٹھہری میں ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ یقیناً اب تک آپ کو بھی یہ بات پتا چل گئی ہوگی۔ آج میں جو کچھ ہوں، میری جو عزت ہے، آپ ہی کے گھر کی وجہ سے ہے۔ چھوٹی بیگم تو ہر بات جانتی ہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں مقصود بھائی۔" صائمہ بولی۔ "لیکن آپ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"نہیں چھوٹی بیگم! ایسی بات نہیں میں اسی شہر میں ہوں اور آپ لوگوں سے ملنے آتا رہوں گا۔" "آپ دفتر تو آتے رہیں گے نا۔" راشد نے سوال کیا۔

"شاید مجھے اب اس کی فرصت بھی نہ مل سکے۔ مختصر اس کی وجہ خلق خدا کی خدمت ہے۔ اس کا کچھ اندازہ تو آپ نے بھی لگا لیا ہو گا۔"

"میں جانتا ہوں کہ دفتر آنے کے بعد لوگ آپ کو مہلت نہیں دیتے۔ متین اور صادق سے بھی مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کسی غرض کے بغیر ضرورت مندوں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ آپ تو اپنی

تنخواہ بھی نہیں لیتے۔ پھر بھی جب آپ دفتر آتے ہیں تو میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ آپ نے اب تک مجھے جو بھی کاروباری مشورے دیئے، وہ درست ہی نکلے۔ ان مشوروں سے ہمیشہ فائدہ ہوا۔ روز اول سے آپ ہی نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ورنہ میرے لئے تو یہ کاروبار بالکل نیا تھا۔ جب میں آپ کے کئے پر میرپور خاص سے یہاں آیا تو بہت حیران تھا کہ یہ کاروبار کس طرح چلے گا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نئی راہیں کھلتی گئیں۔ آپ ہی نے تو مجھے کاروبار کے سارے طریقے سکھائے۔ اب آپ مجھے اپنی راہنمائی سے کیوں محروم کر رہے ہیں؟

”یہ آپ کی محرومی نہیں بلکہ میری مجبوری ہے۔“ میں نے نرمی کے ساتھ جواب دیا۔ ”کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ میں دوسرے لوگوں کے بھی کام آؤں؟“

راشد نے جواب سا ہو گیا۔ میں نے اس سے سوال ہی ایسا کیا تھا۔

راجہ، راشد اور سائنہ اس وقت میرے ہی کمرے میں تھے۔ مجھے جب ان سے کوئی بات کرنی ہوتی تو انہیں اپنے کمرے میں بلا لیتا یا وہ خود میرے پاس چلے آتے۔ اس کی وجہ راشد کی بیوی پروین تھی۔ وہ مجھ سے پردہ کرتی اور میں بھی اس کا خیال رکھتا کہ گھر میں آتے جاتے پروین کا اور میرا آئنا سامنا نہ ہو۔ کونٹھ کی بیرونی حصے میں اس کے بچے بھی عموماً آنے سے گریز کرتے کہ مجھے ان کی وجہ سے کوئی پریشانی نہ ہو۔ یقیناً ان کے والدین نے یہ تاکید کر رکھی ہوگی۔

اس روز جب میں کونٹھ سے جانے کی بات کر رہا تھا تو دو بچے آپس میں لڑتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم میرے بھائی نہیں ہو۔“ میں نے ایک بچے کی آواز سنی۔ ”میں تمہیں بھائی جان کیوں کہوں؟ یہ گیند مجھے دے دو ورنہ میں جیہن لوں گا۔“

”یہ گیند مجھے ایلو نے لا کر دی ہے، میں تمہیں نہیں دوں گا۔“ دوسرے بچے کی تیز آواز سنائی دی۔

”تمہارے نہیں میرے ابو ہیں۔“ پہلا بچہ چیخ کر بولا۔

”سمجھ۔“ راشد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے زور سے کہا۔ ”ظفر کو تم کیوں ستا رہے ہو؟ جاؤ اندر جا کر کھیلو۔“

تقریباً دس گیارہ برس کا ایک بچہ دوڑتا ہوا کمرے میں آ گیا اور اس نے راشد کو مخاطب کیا۔ ”ابو! سمجھ مجھ سے زبردستی یہ گیند جیہن رہا ہے۔ بتائیے آپ ہی نے مجھے یہ گیند لا کر دی تھی نا؟“ بچے کی آواز میں بڑی معصومیت تھی۔

”ہاں بیٹا! میں ہی تمہارے لئے یہ گیند لے کر آیا تھا۔ تم جاؤ، میں ابھی سمج کی خبر لیتا ہوں۔“ راشد نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عبت سے کہا۔

بچے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ..... وہ سمج تو مجھ سے یہ بھی کتنا رہتا ہے کہ آپ..... آپ میرے ابو نہیں ہیں۔“

”اچھا چلو میرے ساتھ۔ میں پوچھتا ہوں اس سے کہ وہ تم سے ایسی باتیں کیوں کرتا ہے۔“ راشد اس بچے کو ساتھ لے کر کمرے سے چلا گیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ! کون ہے یہ بچہ؟“ میں نے راجہ سے معلوم کیا۔

”مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے مقصود بھائی کہ یہ بچہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا۔ ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے کھوکھرا پار کے بارڈر پر اسے راشد نے ایک جگہ خوفزدہ بیٹھے روتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر بچے نے بڑی مشکل سے اپنے بارے میں راشد کو کچھ باتیں بتائیں۔ بارڈر پر ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ایسے میں اس بچے کے والدین کو تلاش کرنا راشد کے لئے ممکن نہ ہوا۔ بچے نے اپنا نام ظفر بتایا اور والد کا نام قراحمہ۔ مجبوراً اس بچے کو بے سارا جان کر راشد اپنے ساتھ میرپور خاص لے آیا۔ تبھی سے یہ راشد کے ساتھ ہے۔“ راجہ نے بتایا۔ ”راشد اسے اپنے بچوں ہی کی طرح رکھتا ہے۔ کبھی میں نے راشد سے بچے کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں کی کہ میں اپنے ہی عذابوں میں گرفتار رہی۔ راشد ہی کو تفصیل معلوم ہوگی کہ بچے سے اسے اور کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں۔“

وہ بچہ ظفر مجھے مظلوم نظر آیا اور میں سوچنے لگا کہ اس کے والدین کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ اس کے والدین زندہ ہوں۔

”آپ کیوں اتنے اداس ہو گئے مقصود بھائی۔ ظفر جیسے تو جانے کتنے بچے اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے۔“ راجہ بولی۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ لیکن یہ بچہ معلوم نہیں کیوں مجھے ایسے دوسرے بے سارا بچوں سے مختلف نظر آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

اسی وقت راشد کمرے میں لوٹ آیا اور کہنے لگا۔ ”بچے جتنے بڑے ہوتے جا رہے ہیں، اتنے ہی تنگ کرنے لگے ہیں۔ ہم لوگ اچھی خاصی باتیں کر رہے تھے کہ بچے ادھر آ گئے۔ پروین کو تو کچھ خیال ہی نہیں۔ کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ خاص طور پر ظفر کا دھیان رکھے۔ آپ بھی اسے سمجھائیے گا باجی۔“ وہ راجہ سے مخاطب تھا۔

راجہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ ”ظفر نے اپنے والدین کے بارے میں آپ کو کیا بتایا تھا؟“

میرے اس سوال پر راشد چند لمحے خاموش رہا، پھر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”کئی مرتبہ اس سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت افسوس ناک ہے۔ اپنی سوتیلی ماں کا ذکر کرتے ہوئے اب بھی وہ خوفزدہ سا ہو جاتا ہے۔“

”نام نہیں بتایا اس نے اپنی سوتیلی ماں کا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ میرے اندازے کی کچھ کچھ تصدیق ہونے لگی۔

”وہ اس کا نام اصغری بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بار اس نے اپنی چھوٹی بہن آمنہ کا نام بھی لیا تھا جو اسے بہت یاد آتی ہے۔ آمنہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔“

”اپنی مٹی گالی کے بارے میں کبھی اس نے کچھ نہیں کہا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ کتنا ہے کہ اسے اپنی ماں کا چہرہ ٹھیک سے یاد نہیں۔ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا کہ جب اس کی

ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔" راشد نے جواب دیا۔

"آپ ظفر کو یہاں بلا سکتے ہیں؟" میں بولا۔

"کیوں نہیں، لیکن آپ اس کے لئے کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ میں تو اسے اپنے بچوں ہی کی طرح رکھتا ہوں۔"

"میں آپ کی نیت پر خدا نخواستہ کوئی شک نہیں کر رہا۔ آپ جو کہہ رہے ہیں، بڑی بیگم صاحبہ بھی اس کی تصدیق کر چکی ہیں۔ اس بچے سے بات کرنے کا مقصد تو کچھ اور ہے۔ ممکن ہے اس سے کوئی ایسی نئی بات معلوم ہو جائے جو اس کے والدین کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہو۔"

میری بات سن کر راشد نے کہا۔ "بہتر ہے، میں اسے آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ذرا ہی دیر بعد جب راشد اس بچے کو اپنے ساتھ لے کر آیا تو پچہ سما ہوا تھا۔

"یہاں آؤ ظفر بیٹے۔" میں نے بچے کو نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے اپنے پاس بلایا۔

وہ ڈرتا جھجکتا میرے قریب آ گیا۔ میں نے اسے اپنے اثر میں لے لیا اور اس کے ذہن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اسی کے ساتھ بچے کے چہرے سے خوف کے بادل چھٹ گئے۔ اس کے چہرے کا بھوپلن اور نمایاں ہو گیا۔ میں اس کے ذہن کی گہریں کھولنے لگا۔

"ظفر بیٹے! پہلے یہ بتاؤ کہ جب تم اپنے والدین سے پھڑے تو دونوں میں سے کس کے ساتھ تھے؟ سوئی ماں کے ساتھ یا اپنے والد کے ساتھ؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

بچے نے خواب آلود سی آواز میں میرے سوال کا جواب دیا۔ "بھیز بہت تھی اور میں اپنی سوئی ماں کا دامن تھامے ہوئے ساتھ چل رہا تھا۔ میرے ابو اس سے آگے تھے۔ وہ مجھے کبھی نظر آ جاتے۔

میری سوئی ماں نے اچانک مڑ کر میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اور پھر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میں پیچھے رہ گیا۔ بہت سے آدمی مجھے دھکے دیتے ہوئے ٹرین میں سوار ہونے لگے۔ میں نے اپنے ابو کو بہت آوازیں دیں، مگر وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ ٹرین نے سٹی دی اور چلنے لگی تو میں گھبرا کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔ اس ڈبے میں پولیس والے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور سوچا کہ اس ڈبے سے اتر جاؤں،

مگر ایک پولیس والے نے ڈانٹ کر مجھے ایک طرف بٹھا دیا۔ ان پولیس والوں میں سے کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ میری اتنی بہت ہوئی کہ ان سے کوئی بات کرتا۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ایک پولیس والے نے مجھے اس ڈبے سے نیچے اتار دیا۔ گاڑی وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور میں نے بھاگ کر ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ مجھے بس یہ خیال تھا کہ اسی گاڑی کے کسی ڈبے میں میرے ابو بھی ہوں گے۔

اگر میں گاڑی میں نہ بیٹھا تو کھو جاؤں گا۔ گاڑی چلنے لگی تو ایک بوڑھے آدمی نے مجھے اندر گھسیٹ لیا اور بھیڑی وجہ سے میرا دم گھٹنے لگا۔ معلوم نہیں وہ کون سا اسٹیشن تھا کہ جہاں پہنچ کر گاڑی کے سارے مسافر اتر گئے۔ وہاں بھی بہت سارے آدمی تھے۔ میں ادھر سے ادھر اپنے ابو کو آوازیں دیتے ہوئے دھکے کھاتا رہا اور روتا رہا۔ جب میں تھک گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا۔ پھر ایک آدمی میرے پاس سے گزرتے

ہوئے رکا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کون ہوں اور کیوں رو رہا ہوں؟ وہ وہ پہلا آدمی تھا کہ جس نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور"

"اور پھر اس نیک آدمی نے تم سے وعدہ کیا کہ وہ تمہیں تمہارے ابو کے پاس پہنچا دے گا۔" میں بول اٹھا۔ "اسی نیک آدمی کو اب تم ابو کہتے ہو۔" پھر میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس سے اگلا سوال کیا۔ "پنی بہن آمنہ کے بارے میں بھی تمہیں کچھ معلوم ہے ظفر بیٹے کہ وہ کہاں ہے؟"

اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی، لیکن اب میرے اثر میں ہونے کے باوجود اس کی آواز خواب ناک ہونے کے ساتھ کسی قدر بھاری ہو گئی۔ وہ بتانے لگا۔ "جب ہم اپنے گھر سے چلے تھے تو تو اس سے ایک دن پہلے رات کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ آمنہ اور میں ایک ہی چارپائی پر سو رہے تھے۔ میں نے آمنہ کو دودھ پیتے دیکھا۔ چارپائی کے سرہانے میری سوئی ماں کھڑی تھی۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ابو جب گھر میں نہ ہوتے تو وہ ہم دونوں بہن بھائی کو بہت مارتی اور ڈراتی کہ ابو سے کچھ کماتو سوتے میں گلا دبا دوں گی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں ورنہ تو دودھ پینے کو میرا دل بھی چاہا۔ میں اس پر حیران تھا کہ میری سوئی ماں کو آمنہ پر کیسے پیار آ گیا کہ سوتے سے اٹھا کر اسے دودھ پلا رہی ہے۔ دودھ پی کر آمنہ پھر لیٹ گئی تو میں نے بہت کر کے دوبارہ پلکوں کی جھری سے دیکھا کہ میری سوئی ماں خالی کٹورا لئے دبے پاؤں کمرے سے جاری تھی مگر آمنہ سوئی ہی رہی۔ پھر پھر سوئی ہی رہ گئی۔ ابو نے بھی اسے آکر جگایا، لیکن وہ نہ اٹھی۔ ابو کو میں نے رونے دیکھا اور میں بھی رونے لگا۔ میری سوئی ماں نے بھی رونا پینا شروع کر دیا۔ محلے کی کچھ عورتیں ہمارے گھر آ گئیں۔ انہی میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ کہ میری آمنہ میری بہن مر چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ظفر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

میں نے اس معصوم بچے کی آنکھوں سے آنسو پونچھ دیئے اور اس کے ذہن کو اداسیوں میں ڈوبنے سے بچالیا۔ میری کوشش رائیگاں نہ ہوئی اور وہ پھر اعتدال پر آ گیا۔ پھر میں نے اس سے صرف ایک بات اور معلوم کی۔ "ظفر بیٹے! کیا تم نے اپنے ابو کو یہ بتا دیا تھا کہ رات کو تمہاری سوئی ماں نے آمنہ کو دودھ پلایا تھا؟"

"مجھے اتنا ہوش ہی کب تھا۔ پھر پھر قبرستان سے آتے ہی ابو نے سامان باندھنا شروع کر دیا تھا۔" ظفر نے جواب دیا۔ "میں تو بس رونے جا رہا تھا۔"

ظفر کو میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس سے زیادہ اسے اور کچھ معلوم نہیں تھا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو۔" میں نے اس سے مسکرا کر کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

میں مسکرایا تو اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ظفر چلا گیا تو کمرے میں دیر تک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ راشد، رابعہ اور صائمہ، تینوں ہی

اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ ظفر کے بارے میں انہیں یقیناً یہ ساری باتیں پہلی بار معلوم ہوئی تھیں۔
”اب آپ کی ذمہ داری پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔“ میں نے ہی خاموشی کو توڑا اور راشد کو مخاطب کیا۔ ”ظفر ایک معصوم اور مظلوم بچہ ہے۔“

”مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ آج تک ظفر نے کبھی مجھ سے یہ باتیں نہیں کیں۔ جانے کتنی بار میں نے اس سے اسی طرح کے سوال کئے ہوں گے لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ کو اس نے ایک ہی مرتبہ پوچھنے پر ہر بات بتادی۔ راشد حیرت کے ساتھ بولا۔

”بس اتفاق ہے۔“ میں نے اصل بات پر پردہ ڈالنے کی خاطر کہا۔ ”کبھی کبھی ایک بات یاد آ جائے تو اس سے متعلق دوسری باتیں خود ہی دماغ میں آنے لگتی ہیں۔ آپ نے شاید یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ رکے بغیر بولے ہی چلا جا رہا تھا۔“

”ہاں مقصود بھائی! یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خواب کی سی حالت میں بول رہا ہو لیکن یہ خواب تھا بہت درونگ۔ کچھ عورتیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں، اس بچے نے اپنی سوتیلی ماں کے بارے میں جو باتیں بتائی ہیں، انہیں سن کر تو صاف ہٹا چل رہا ہے کہ وہ خود اپنے باپ سے نہیں بچھڑا۔“

”اور یہ بھی رابعہ آپا کہ اس کی بہن آمنہ کو اسی عورت نے مارا ہے، شاید دودھ میں زہر دے کر۔“ صائمہ نے بھی اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”لیکن زہر دیا جاتا تو ظاہر ہو جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”ظفر نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ کوئی بھی شخص جس کی معصوم بچی کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہو، خاموشی اختیار نہیں کر سکتا۔ زہر دیئے جانے کی صورت میں منہ سے جھگ نکلفے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی ایسی علامات ہیں کہ زہر دیئے جانے کا پتا چل جاتا ہے۔“

”پھر وہ بچی اچانک کیسے مر گئی مقصود میاں؟“ صائمہ نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ مجھے ”مقصود میاں“ کہتی آئی تھی اور اب تک یہی کہتی تھی۔

”یہ تو اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آمنہ کو اسی ظالم عورت اصغری نے ہلاک کیا ہے۔ بہر حال جو بھی ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے راشد کو مخاطب کیا۔ ”ایک بات مجھے آپ سے اور کہنا تھی۔ ظفر سے آپ اب اس سلسلے میں مزید پوچھ گچھ نہ کیجئے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ اب اس کے سامنے یہ ذکر ہی نہ کیا جائے۔ اب یہ باتیں ہوئیں کہ اس نے کیا کیا بتایا ہے تو وہ اور بھی اداس ہو جائے گا۔ اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔“

”اس کے چھوٹے سے دل پر ان باتوں کو یاد کر کے اور چوٹ لگے گی۔“ رابعہ بھی میری تائید میں بولی۔

پھر صائمہ اور راشد نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

”میں آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سناتا تو بھول ہی گیا۔“ میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”میں نے رہنے کے لئے ایک کوٹھی خرید لی ہے۔“

”کہاں مقصود میاں؟“ صائمہ نے پوچھا۔ ”آپ نے بتایا ہی نہیں۔“
”بس یاد ہی نہیں رہا۔ نشتر پارک کے قریب میں ہے وہ کوٹھی۔“ میں بولا۔
”اڑتی اڑتی سی یہ خبر میں نے بھی سنی تھی۔“ راشد نے کہا۔ ”آپ شاید کسی مریض کو اس کوٹھی کا پتا سمجھا رہے تھے کہ شام کو وہاں ملیں گے، پھر مصروفیت کی وجہ سے یہ بات ذہن ہی سے نکل گئی۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔“

میں نے راشد کا شکریہ ادا کیا تو صائمہ بولی۔ ”ہم تو اسی کوٹھی میں چل کر مقصود میاں کو مبارک باد دیں گے۔ کیوں رابعہ آپا؟“

”ہاں ہاں اور کیا۔ مقصود بھائی کو اپنی کوٹھی تو دکھانی ہی پڑے گی تاکہ یہ نہ آئیں تو ہم لوگ وہاں جا کر تو ان سے مل سکیں۔“

”تو پھر آج ہی چلیں۔“ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔
دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹ لیا۔ بٹول کو بھی خبر ہو گئی کہ میں کوٹھی چھوڑ کر جا رہا ہوں تو وہ میرے کمرے میں آ گئی۔

”ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا مقصود میاں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔
”ارے نہیں بٹول۔ معافی تو مجھے تم سے مانگنی چاہئے تھی۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”میں آتا جاتا رہوں گا کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیتا۔“

”ہم تو صاحب کی زندگی ہی میں سمجھ گئے تھے مقصود میاں کہ تم بہت ترقی کرو گے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے اور بہت ترقی دے۔“ وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔
”ہاں بولو مقصود میاں۔“ اس نے کہا۔

”یہ کچھ پیسے وقت ضرورت کے لئے اپنے پاس رکھ لو۔“ میں نے اس کی طرف کچھ نوٹ بڑھا دیئے۔

وہ انکار کرنے لگی اور پھر میرے اصرار پر روپے لے لی۔ غریب ہونے کے باوجود وہ ایک خود دار عورت تھی۔

دو سوٹ کیسوں اور ایک بیگ میں میرے کپڑے نیز ضرورت کا دوسرا سامان آگیا۔ اس عرصے میں راشد نے موٹر چلانا سیکھ لی تھی۔ محمود حسن کی موٹر اب اسی کے استعمال میں رہتی تھی۔ موٹر میں سوٹ کیس اور بیگ رکھ دیا گیا تو رابعہ اور صائمہ چادریں اوڑھ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں، راشد کے ساتھ آگے بیٹھا۔ محمود حسن کی کوٹھی سے میری کوٹھی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔

کوٹھی کے آہنی گیٹ اور عمارت کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ موٹر وہاں کھڑی کر دی گئی۔ موٹر سے سامان اتارنے کے بعد میں نے کوٹھی کا صدر دروازہ کھولا اور ان سب کو اندر لے گیا۔ کوٹھی کا فرنیچر اور دیگر اعلیٰ درجے کا ساز و سامان دیکھ کر ان بھی نے بہت تعریف کی۔ میں نے انہیں نشست گاہ میں بٹھا دیا۔

”لیکن مقصود میاں، یہاں کوئی ملازم تو نظری نہیں آ رہا۔ کیا ابھی کوئی ملازم نہیں رکھا؟“ صائمہ کہنے لگی۔

”چھوٹی بیگم صاحبہ! کیا آپ یہ بھول گئیں کہ میں ایک ملازم کی حیثیت ہی سے تو آپ کی کوٹھی میں آیا تھا۔ سبھی کام تو آتے ہیں مجھے، پھر کسی ملازم کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی کو کبھی اپنا ماضی نہیں بھولنا چاہئے اور میں بھی اپنے ماضی کو یاد رکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے صائمہ کی بات کا جواب دیا۔

”آپ بھی بہت عجیب ہیں مقصود بھائی۔“ راجہ بولی۔ ”آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

”بڑی بیگم صاحبہ! آپ مجھے مقصود بھائی کہتی ہیں تو مجھ کو عجیب سا لگتا ہے۔ مجھ سے عمر میں آپ بہت بڑی ہیں۔ اب سے پہلے میں نے یہ بات اس لئے نہیں کہی کہ آپ کی دل آزادی نہ ہو جائے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کی طرح آپ بھی مجھے مقصود کہا کریں۔“

”آدمی کی بڑائی کا تعلق عمر سے نہیں، اس کے عمل سے ہوتا ہے۔ پھر بھی میں ایک شرط پر آپ کو مقصود میاں کہہ سکتی ہوں۔ آج کے بعد سے آپ بھی مجھے بڑی بیگم صاحبہ نہیں کہیں گے۔ بولیں منظور ہے؟“ راجہ یہ کہہ کر مسکرائی۔

”اور میں تو آپ سے عمر میں بھی چھوٹی ہوں۔“ صائمہ بھی چپ نہ رہی۔ ”مجھے بھی آپ چھوٹی بیگم صاحبہ نہ کہا کریں۔“

”جو رشتے ایک بار قائم ہو جائیں انہیں برقرار رکھنا چاہئے۔“ میں بولا۔ ”ابھی میں ماضی کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اچھا اس بات کو چھوڑیں، میں آپ لوگوں کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔ بڑی بیگم صاحبہ نے تو کبھی میری بنائی ہوئی چائے بھی نہیں پی۔“ یہ کہتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا ہے مقصود بھائی۔“ راجہ بول اٹھی۔ ”رکیے! چائے میں بناؤں گی۔“

”اور میں ہرگز یہ گوارا نہیں کروں گا کہ آپ پہلی مرتبہ یہاں آئیں اور یہ زحمت کریں۔“ میں نے انکار کر دیا اور پھر وہاں رکا نہیں۔

کوٹھی کے باورچی خانے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ان میں خشک دودھ کے ڈبے بھی تھے۔ میں جلدی سے چائے بنا کر نشست گاہ میں آ گیا۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نے بھی چائے پی۔ پھر وہ مجھ سے جلد ملنے کا وعدہ لے کر چلے گئے۔

☆=====☆

ایک جن زاد ہونے کے باوجود میں نے دانستہ ان تمام لوازم کا خیال رکھا تھا جو آدم زادوں کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح مجھے اپنی اصلیت پر پردہ ڈالنے میں آسانی ہو گئی ورنہ تو ان تمام چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تنہائی ملنے ہی مجھے معصوم ظفر کا خیال آ گیا۔ مجھے کسی حد تک پہلے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ظلم و ستم کرنے میں آدم زادیاں بھی آدم زادوں سے کم نہیں ہوتیں لیکن یہ معاملہ ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔ سوتیلی ماؤں کے ظلم کی بہت سی داستانیں میرے علم میں بھی تھیں، مگر اصغری مجھے کچھ زیادہ ہی سفاک اور

بے رحم معلوم ہوئی۔ اس کی گردن پر ایک معصوم بچی کا خون تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک معصوم بچے کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا کہ جب خود میں نے ایک بچے کے جسم میں پناہ لی تھی اور اس میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔

اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر میں نے ظفر کی سوتیلی ماں اصغری کے بارے میں معلومات کرنا چاہیں اور مجھے پہلے بار بڑا عجیب سا تجربہ ہوا۔ ایک عورت کا چہرہ بار بار میرے سامنے آتا اور غائب ہو جاتا۔ میرے اور اس چہرے کے درمیان چند ہی لمحوں بعد اندھیرے کی ایک دیوار سی حائل ہو جاتی۔ اپنے چہرے سے مجھے وہ عورت درمیانی عمر کی معلوم ہوئی۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ اس عورت کا چہرہ انتہائی پُرکشش اور جاذبِ نظر ہے۔ ایسے چہروں والی آدم زادیاں میری نظروں سے کم ہی گزری تھیں۔ بار بار کوٹھی کے باوجود مجھے ناکامی ہوتی رہی تو میں جھنجھلا گیا۔ میری جھنجھلاہٹ کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی مجھے کسی آدم زاد یا آدم زادی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔

اسی عرصے میں لوگوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ میں دروازے کھول کر بیرونی کمرے میں آ بیٹھا کہ یہ میرا معمول تھا۔ اس کمرے میں فرشی نشست تھی تاکہ لوگ آرام سے آکر بیٹھ سکیں۔ آنے والے زیادہ ہوں تو بھی انہیں پریشانی نہ ہو۔ ایک طرف دیوار سے لگی چھوٹی سی چوکی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ جاتا اور باری باری لوگ میرے پاس آتے رہتے۔ کچھ افراد جن سے میری پرانی شناسائی تھی، وہ میری چوکی کے قریب دائیں بائیں اس طرح آ بیٹھتے کہ جو حاجت مند ہیں ان کیلئے آمدورفت کا راستہ رہے۔ ان لوگوں کا تعلق زیادہ تر کاروبار حلقے سے تھا۔ کبھی ان افراد میں حاجی صاحب اور دوسرے ملنے جلنے والے بھی آ بیٹھتے۔ ان کا مقصد عموماً مجھ سے صرف ملاقات یا رسم و راہ قائم رکھنا ہوتا۔ میری کوٹھی کے دروازے امیر غریب سب کے لئے کھلے رہتے۔

اس روز بھی لوگ آکر بیٹھتے رہے اور میں ان کے دکھ سنتا رہا۔ ان میں جانے پہچانے چہرے بھی تھے اور انجانے بھی، عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ عورتوں کے لئے میں نے دائیں جانب ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا۔ وہاں کوئی مرد نہ بیٹھتا۔ کوئی نیا آنے والا ادھر کا رخ کرتا تو لوگ خود ہی اسے وہاں بیٹھنے سے منع کر دیتے۔ کئی عرصے سے یہی سلسلہ چل رہا تھا۔

میں ایک بوڑھے آدمی سے اس کا حال سن رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر چند افراد کا شور سن کر میں چونک اٹھا۔

”پیر صاحب تشریف لا رہے ہیں، راستہ دو۔“ ان نوادروں میں سے ایک دراز قد شخص، دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

کچھ لوگ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، کچھ بیٹھے رہے۔

”تم لوگوں نے یہ کیا شور مچا ہوا ہے۔“ میں نے بلند آواز میں نوادروں کو مخاطب کیا۔

ان میں سے کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور لوگوں سے راستہ دینے کے لئے کہتے رہے۔

نہجوراً مجھے چوکی سے اٹھنا پڑا۔

”یہ ایک فقیر کا ڈیرا ہے۔“ میں چوکی سے اترتے ہوئے زور سے بولا۔ ”یہاں آنے والے سب برابر ہیں۔ کوئی آتا ہے تو آنے دو۔ اس کے لئے راستہ دیئے.....“

”فقیر کو ٹھیوں میں نہیں رہتے۔“ ایک بلند اور بھاری آواز نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے اس طرف نگاہ اٹھائی تو دروازے میں ایک بارعب شخص کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کا بڑا بھاری تھا، رنگت سرخ و سفید اور چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اس کے جسم پر سفید بے داغ کپڑے تھے۔ سفید بند، لمبا سفید کرتا اور کاندھے پر سفید ہی چادر۔ اس کی چوڑی پیشانی پر دائیں جانب کسی زخم کا نشان ہلال کی طرح تھا۔ جو بدینت نظر آنے کے بجائے اس کی شخصیت کی کشش میں اضافہ کر رہا تھا۔ سر پر لمبے بال تھے۔

”ہم نے تمہاری بڑی شہرت سنی تھی مقصود میاں۔“ اس بارعب شخص نے مجھے پھر مخاطب کیا۔ ”ہم اسی لئے خود چل کر تمہارے آستانے تک آگئے۔ کیا تم ہمیں خوش آمدید نہیں کہو گے۔“ وہ چند قدم خود ہی آگے بڑھ آیا۔

اس کی شخصیت اتنی ہی بارعب تھی کہ لوگ خود ہی ادھر ادھر ہو گئے اور اسے آگے بڑھنے کے لئے راستہ دے دیا۔ اس کے ساتھ جو چار پانچ افراد تھے، وہ مودب انداز میں اس کے دائیں بائیں ہو لئے۔

”آپ ضرور تشریف لائیے محترم۔“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، میری نظر میں سب برابر ہیں۔ یہاں آنے والوں میں کسی کو میں چھوٹا بڑا نہیں سمجھتا۔“

”تم غلطی پر ہو مقصود میاں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اور تمہیں جلد ہی اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے گا۔“

”بیٹھ جائیے آپ۔“ اس مرتبہ میری آواز میں کچھ تلخی شامل ہو گئی۔

”ہم تو وہیں بیٹھیں گے کہ جہاں ہمیں بیٹھنا چاہئے۔“ اس نے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ”مقصود میاں! تمہیں حد اب کا خیال رکھنا چاہئے۔ ہم سے بات کرتے ہوئے لوگ ہمارے مرتبے کا خیال رکھتے ہیں۔ تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہئے کہ پیر برکت علی شاہ خود چل کر تمہارے دروازے تک آیا ہے۔“

”میں یقیناً آپ کی آمد پر خوش ہوتا شاہ صاحب، اگر آپ یہاں آنے والوں کو زحمت نہ دیتے۔ میں آپ سے پھر ایک مرتبہ یہی کہوں گا کہ بیٹھ جائیے اور اپنی باری آنے کا انتظار کیجئے۔ میں اس سے پہلے آپ.....“

”کیوں فضول باتیں کرتے ہو مقصود میاں۔“ اس نے پھر میری بات کاٹ دی اور طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ”کیا تم نے ہمیں بھی کوئی ضرورت مند سمجھ رکھا ہے کہ ہم اپنی باری کا انتظار کریں۔“ اب اس کے اور میرے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

”اگر آپ ضرورت مند نہیں ہیں تو واپس چلے جائیے۔“ میں نے کہا۔

”نہ ہم تمہاری مرضی سے یہاں آئے ہیں اور نہ تمہارے کہنے پر واپس جائیں گے مقصود میاں۔“ اس کی آواز میں چھین تھی۔

وہاں موجود افراد کی وجہ سے میں اب تک اپنے غصے پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ شاید اس پیر کو اسی وجہ سے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میں اس سے دب گیا ہوں۔

ابھی میں اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ میرے مقابل آکھڑا ہوا اور بولا۔ ”مقصود میاں! گھر آئے مہمان سے اس طرح کا سلوک نہیں کرتے۔“

”مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ یہ بھی خوب رہی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

خلاف توقع وہ دھیرے سے ہنس دیا اور پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو آج تمہاری جگہ چوکی پر میں بیٹھ جاؤں۔“

”وہ کس خوشی میں؟“ میں نے بھی اس پر طنز کیا۔

”تمہیں صرف یہ دکھانے کے لئے کہ تم پیر برکت علی شاہ کو کوئی جلی پیر نہ سمجھو۔“ اس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔ ”اگر تم اس میں اپنی ہنک محسوس کر رہے ہو مقصود میاں تو ایک صورت اور بھی ہے۔ تم بھی چوکی پر میرے ساتھ ہی بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو جو کرب تم دکھاتے رہتے ہو، میں بھی دکھا سکتا ہوں۔ بولو کیا کہتے ہو؟“ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اور اگر میں تمہیں اس کی اجازت نہ دوں تو؟“ اب میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔

”تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا مقصود میاں۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

ۛۛ

”اچھا تو تم اس طرح نہیں مانو گے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر اسے اپنے اثر میں لینا چاہا۔

”نہیں!“ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یہ بری بات ہے۔ میں نے اب تک تم پر کوئی وار نہیں کیا، تمہیں بھی یہ زیب نہیں دیتا۔“

میں اسے اپنے اثر میں نہیں لے سکا۔ اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ وہ آدم زادوں کے کس گروہ سے ہے۔ اس کی شخصیت بڑی متضاد تھی۔ کبھی تو وہ مجھے کوئی خطرناک آدم زاد محسوس ہوتا جیسا کہ مولوی کفایت اللہ تھا، کبھی یوں لگتا کہ وہ محمود حسن کی طرح شیطان صفت ہے۔ ہاں میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ اس کا ظاہر و باطن ایک نہیں ہے۔ میں نے اس سے نمٹنے کے لئے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔

”او بیٹھ جاؤ، میرے ساتھ۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”اب کی باتم نے شرافت کی زبان میں گفتگو۔“ وہ مسکرایا اور پھر چوکی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے انہوں نے ”اللہ ہو“ ”اللہ ہو“ کے نعرے لگائے اور چوکی سے ہی فاصلے پر بیٹھ گئے، کیونکہ چوکی کے قریب پہلے ہی خاصی بھیڑ تھی۔ میں بھی اس عرسے میں چوکی پر بیٹھا۔ لوگ یہ سارا تماشا حیرت سے دیکھتے رہے۔

پیر برکت علی شاہ نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہاں موجود افراد کو مخاطب کیا۔ ”مقصود میرا ہے مجھے اپنی چوکی پر بٹھا کر جو عزت بخشی ہے اس پر میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ دراصل قصہ ہے کہ مقصود میاں کا اور میرا راستہ الگ الگ نہیں۔ یہ بھی فی سبیل اللہ لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ مجھے بھی کسی کام آکر خوشی ہوتی ہے۔ کسی خدمت کا کوئی معاوضہ مقصود میاں بھی نہیں لیتے اور میں بھی۔ مقصود میاں اور آپ حضرات و خواتین کو میری آمد کی وجہ سے جو زحمت ہوئی اس پر میں ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مجھے معاف کر دیا جائے گا۔“

اس کے الفاظ کچھ تھے اور چہرہ کچھ کہہ رہا تھا، جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو یا میرے ساتھ ہی ہمارا موجود افراد کو بھی بے وقوف بنا رہا ہو۔ پھر بھی میں کچھ بولا نہیں اور خاموشی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مردوں سے پہلے خواتین کا حق ہے۔ کیوں مقصود میاں؟“ اس نے تقریباً طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔

”تم جیسا مناسب سمجھو کرو“ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے جواب تو دے دیا لیکن اس بات پر چونکا ضرور۔

اس نے دائیں جانب عورتوں کے لئے مخصوص حصے کی طرف نگاہ اٹھائی، پھر بلند آواز میں بولا ”بلیقں جہاں پہلے تم آؤ کہ تمہارا معاملہ ترجیحی سلوک کا مستحق ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کئی جگہ مایوس ہو کر پہلی مرتبہ مقصود میاں کے آستانے پر آئی ہو۔“

تقریباً بیس برس کی ایک خوبصورت عورت کو میں نے اٹھتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی اٹھی۔

میں سوچنے لگا کہ کہیں اس پیر نے مجھے مرعوب کرنے کے لئے تو پہلے ہی سے ان دونوں عورتوں کی میری کونسی پر نہیں بھیج دیا؟

بوڑھی عورت کے ساتھ وہ جوان عورت بھی چوکی کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ جوان عورت نے چہرے پر میں نے اداسی دیکھی۔

پیر برکت علی شاہ نے جوان عورت کو مخاطب کیا۔ ”بلیقں جہاں! نظریں اٹھاؤ تاکہ میں تمہارا دل کا حال جان سکوں۔“

اس جوان عورت نے سیاہ برقع پہن رکھا تھا، مگر چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ عمر کا اندازہ میں اس کے چہرے ہی سے لگایا تھا۔ پیر برکت علی شاہ کے کہنے پر اس نے نظریں اٹھائیں تو اسی وقت ساف آئے والی بوڑھی عورت بول اٹھی۔ ”پیر صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ کہوں۔“

”تم خاموش بیٹھو۔“ برکت علی شاہ نے بوڑھی عورت کو ڈانٹ دیا۔ ”مجھے کیا تم بے وقوف سمجھو؟“

”کہ میں پہلے تمہاری بات سنوں۔“

”معاف کر دیجئے پیر صاحب! غلطی ہو گئی۔“ بوڑھی عورت سسم گئی۔

”سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے اور اب بھولی بن رہی ہو۔ بڑا ارمان تھا نا تمہیں اپنے بیٹے کے سر پر مراد باد ہادیکھنے کا۔ دیکھ لیا اس کا انجام۔ تم نے درمیان میں بول کر ہماری توجہ ہٹا دی۔ ہم تو تمہاری پردہ پوشی کی خاطر بلیقں جہاں کے دل کا حال جاننا چاہتے تھے کہ تمہیں یا اس مظلوم کو اپنی زبان سے کچھ نہ لپٹا پڑے۔ اب ایسا کرو کہ اپنی بسو کو لے جا کر ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ جب بھیڑ چھٹ جائے گی تو پھر تم میرے اور تمہاری بسو سے بات ہوگی۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا کہ تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتیں۔“

بوڑھی عورت کے چہرے سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اسی کے ساتھ جوان عورت بھی اٹھ کر چل دی۔ جاتے جاتے جوان عورت نے صرف ایک مرتبہ پلٹ کر رحم طلب نظروں سے گزر کر علی شاہ کی طرف دیکھا۔ مجھے اس لمحے برکت علی شاہ کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرتی لگائی دی۔

اس کے بعد خواتین آتی رہیں اور برکت علی شاہ کسی کو سادہ پانی دم کر کے پلاتا رہا، کسی کے لئے لٹکھ کر دیتا رہا۔ جب وہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت کو نسخہ لکھ کر دینے والا تھا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔ ”یہ نسخہ مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

”کیوں؟ کیا تم میرے تجویز کئے ہوئے نسخے سے متفق نہیں ہو؟“ وہ بولا، مگر اس کے لہجے میں سختی میں نری تھی۔

”ہاں۔“ میں نے بھی نری سے جواب دیا۔ ”تمہاری تفتیش تو درست ہے، لیکن نسخہ اس کے مطابق نہیں۔“

اس نے نسخہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر تم اس میں جو چاہو ترمیم کر دو۔“ ”ترمیم کے بجائے نیا نسخہ لکھنے کی ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے برکت علی شاہ کے لکھے ہوئے نسخے پر قلم پھیر دیا اور اسی کاغذ کی پشت پر نیا نسخہ لکھ کر عورت کو دے دیا اور اس سے کہا۔ ”درد دھنسنے پر انہیں دوا کھانی ہے، پہلے یا بعد میں نہیں۔“

”جی ہوتے ہیں،“ میرا داماد بھی آپ سے نسخہ لکھوا کر لے گیا تھا، اسے تین ہی دن میں فائدہ ہو گیا۔ اے کے کہنے اور پتا بتانے پر میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کی بہت بہت مرہانی۔“ وہ ادھیڑ عمر عورت کہہ کر اٹھ گئی۔

میں نے اس عرسے میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ پیر برکت علی شاہ کو علم طب پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ خود اسے بھی شاید اس کا علم ہو گا ورنہ وہ اتنی آسانی سے میرے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیتا۔

بلیقں جہاں اور اس کی ساتھی بوڑھی عورت کے سوا تمام عورتیں چلی گئیں تو برکت علی شاہ مجھ سے بولا۔ ”میرا خیال ہے مقصود میاں کہ اب اس مظلوم عورت کو مزید انتظار نہیں کرانا چاہئے۔ تم کیا

کہتے ہو؟“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

”پھر کیا کیا جائے؟ ابھی تو مردوں کا بھی ہجوم ہے۔“ میں بولا۔

”ایک تجویز ہے میری“ اگر تم مان لو۔ میں ان دونوں عورتوں کو ساتھ لے کر تہمداری نشست میں چلا جاتا ہوں۔ تم اسے میں مردوں کو دیکھو۔“ اس نے کہا۔ ”پردہ پوشی ضروری نہ ہوتی تو میں براہ ایسا نہ کرتا۔“

”نہیں۔“ میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”خود میں بھی عورتوں سے تنہائی میں نہیں ملتا، پھر تمہیں اس کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔“

”مقصود میاں۔“ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، اسی کے ساتھ لہجہ بھی بدل گیا۔ ”تم حد سے گزر رہے ہو۔“

”اس میں حد سے گزرنے کی کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواباً سختی سے کام چھین لیا۔ ”یہ اپنے اپنے اصول کی بات ہے۔“

”کیا ہر بات برسر عام کہی اور سنی جاسکتی ہے؟“ اس نے مجھے گھور کر کہا۔

”کچھ کہنے اور سننے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ عورت بلیقیں جہاں دائمی مظلوم ہے، لیکن.....“

”غصہ۔“ اس نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تو پھر تم میرے ساتھ نشست گاہ میں چلو۔ تم سے بھی مجھے خلوت میں کچھ کہنا ہے۔ جب دونوں عورتیں چلی جائیں گی تو تمہارے اور میرے درمیان بات ہو جائے گی۔“ اس کی آواز سرگوشی کی حد تک، دھیمی تھی۔

میں بھی اب تک اس سے دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا تاکہ چوکی کے دائیں بیٹھے ہوئے لوگ ہماری باتیں نہ سن سکیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں اگر مجھ سے تنہائی میں کوئی بات کرنی ہے تو پھر کسی وقت بھی آ سکتے ہو۔ یہ اوقات حاجت مندوں کے لئے ہیں۔“

”مقصود میاں! تم سے مجھے کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کرنی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے تم سے جو کہنا ہے، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”رہے حاجت مند تو ان سے تم کوئی معاوضہ یا نذرانہ قبول نہیں کرتے۔ یہ کچھ دیر تمہارا انتظار بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارے پابند ہیں، تم ان کے پابند نہیں ہو۔ تمہیں شاید ابھی اس کا تجربہ نہیں کہ اگر لوگوں پر کوئی احسان کیا جائے تو وہ احسان مندی کے بجائے رفتہ رفتہ اسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ تم اسے نصیحت خیال نہ کرنا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ لوگوں کو جتنا سر چڑھایا جائے، وہ اسی قدر جینا حرام کر دیتے ہیں۔ میں اسی لئے اپنے مریدوں سے فاصلہ قائم رکھتا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ برا نہ مانا ابھی تمہیں اس راستے پر آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور مجھے ایک عمر ہو گئی۔“

پیر برکت علی شاہ کسی گرجٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر لگتا تھا۔ کبھی تو اس کے لہجے میں ایک دم سختی آ جاتی اور کبھی اتنا نرم پڑ جاتا کہ مجھے حیران کر دیتا۔ وہ درحقیقت کیا شے ہے، یہ جاننے کے لئے

انہیں نے اس کی بات مان ہی لی۔

”بلیقیں جہاں! اٹھو اور اپنی ساس کو بھی ساتھ لے لو۔“ برکت علی شاہ بلند آواز میں بولا۔ ”مقصود میاں راضی ہو گئے ہیں کہ پہلے تمہاری ہی بات سن لی جائے۔ پردہ پوشی کی خاطر تم دونوں عورتوں کو میرے اور مقصود میاں کے ساتھ الگ کمرے میں چلنا ہوگا۔“ پھر اسی نے لوگوں سے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لئے کہہ دیا اور اس پر محذرت بھی کی۔

”اچھا مقصود میاں! مجھے تو اجازت دیجئے۔“ ایک شخص بول اٹھا۔ اس کا تعلق کاروباری حلقے سے تھا۔ ”میں تو صرف آپ کے نیاز حاصل کرنے آیا تھا۔“

اسی کے ساتھ کئی اور افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سبھی میرے شناسا تھے۔ وہ مجھ سے مصافحہ کر کے چل دیئے۔ اس عرصے میں بلیقیں جہاں اور اس کی ساس، دونوں انھیں اور چوکی کے قریب آ گئیں۔ میں ان دونوں عورتوں اور پیر برکت علی شاہ کو ساتھ لے کر نشست گاہ میں آ گیا۔ بیرونی کمرے کے برعکس وہاں جدید طرز کا فرنیچر تھا۔ دو صوفوں پر وہ دونوں عورتیں بیٹھ گئیں۔ ان کے مقابل صوفوں پر پیر برکت علی شاہ میرے ساتھ آ بیٹھا۔ درمیان میں چھوٹی سی ایک میز رکھی تھی۔ میں نے برکت علی شاہ کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں بلیقیں جہاں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار ہوئی تو خود ہی بلیقیں جہاں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”سنو بلیقیں جہاں!“ میں بول اٹھا۔

”مقصود میاں۔“ برکت علی شاہ نے مجھے ٹوک دیا۔ ”ان عورتوں سے مجھے بات کرنے دو۔ بلیقیں جہاں کی ساس کو کچھ کہنا تھا، پہلے اس کی بات سن لیتے ہیں۔“

ناگوار کی باوجود میں نے خاموشی اختیار کر لی حالانکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ عورتیں میرے پاس کیوں آئی تھیں۔

”پیر صاحب! اب آپ سے کیا چھپانا۔“ بوڑھی عورت کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے سلام کو اپنے چچا کی بیٹی پسند تھی، وہ اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے کچھ شرمیلا ہے۔ شاید اسی لئے کبھی وہ یہ بات زبان پر نہیں لایا۔ میں دھوکے میں رہی اسی لئے اپنی بہن کی بیٹی، یعنی اس بلیقیں جہاں سے سلام کا رشتہ طے کر دیا۔ سلام نے جب یہ سنا تو شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا، بولا کہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔ میں سمجھی کہ شاید وہ اوپری دل سے یہ بات کر رہا ہے۔ عام طور پر جوان بچے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ میں اس کی بات سنی ان سنی کر گئی اور اسے ڈانٹ دیا۔“

”شادی سے انکار کی وجہ سلام نے تمہیں یہ بتائی ہوگی کہ ابھی وہ برسر روزگار نہیں۔ ہے نا؟“ برکت علی شاہ بولا۔

”جی ہاں پیر صاحب!“ بوڑھی عورت نے تصدیق کر دی۔

”اور پھر اسی ہفتے اسے ایک بینک میں نوکری مل گئی۔“ برکت علی شاہ بول اٹھا۔ ”اس کے بعد شادی سے انکار کرنے کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔“

”یہی بات ہے پیر صاحب!“ عورت کے لہجے میں انتہائی عقیدت کا اظہار ہونے لگا۔ ”آپ تو سب

جانتے ہیں، میں کیا بتاؤں۔“

”نہیں۔“ برکت علی شاہ نے انکار میں سر ہلادیا۔ ”بتانا تھی کو ہے۔“

”جو آپ کا حکم پیر صاحب!“ بوڑھی عورت فوراً بولی۔

میں اس وقت تک خوب کچھ چکا تھا کہ پیر برکت علی شاہ بلا سبب گفتگو کو طول دے رہا ہے۔ بات وہ بوڑھی عورت سے کر رہا تھا مگر نظریں بلیقیں جہاں پر تھیں۔ کسی جوان عورت کے لئے مرد کی نظروں کا منہم جو جان لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ بلیقیں بار بار اسی لئے پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے مجبوراً بولنا ہی پڑا لیکن اس مرتبہ میں نے بلیقیں کی ساس کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں جو بھی کہنا ہے، مختصر الفاظ میں کہہ دو۔ ہمیں سب کچھ پتا ہے۔“

”اے کہہ لینے دو مقصود میاں، تاکہ اس کے دل کی بھڑاس تو نکل جائے۔“ برکت علی شاہ مجھ سے بولا۔

”یہ جو کہے گی، تمہیں خبر ہو کہ نہ ہو، میں بتائے دیتا ہوں۔“ پھر میں نے برکت علی شاہ کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ”اس عورت نے اپنے بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہا کہ اگر شادی سے اب انکار کیا تو میں زہر کھا لوں گی۔ یہ اپنی بہن کی بیٹی کو ہوتا کرانا چاہتی تھی۔ اس کے بیٹے نے ماں کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر یہ بلیقیں جہاں کو بیاہ کر لے آئی۔ یہ واقعہ اب سے تقریباً آٹھ ماہ پہلے کا ہے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی ضد پر سلام نے بلیقیں جہاں سے شادی تو کر لی ہے مگر اسے بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ اس عورت کو یہ بات خود اسی کی بہن نے بتائی۔ شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ اپنی چھوٹی بہن کی جائز شکایت پر اس عورت نے اپنے بیٹے سلام سے بات کی۔ تب سلام نے بتایا کہ وہ اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا، اسی لئے بلیقیں جہاں کو دل سے کبھی قبول نہیں کیا اور نہ بہ حیثیت شوہر حقوق ادا کئے۔ بلیقیں جہاں ہی کیا، کوئی بھی عورت اپنی یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں اگر بلیقیں جہاں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہے تو حق بہ جانب ہے۔“

ابھی میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ بوڑھی عورت بول اٹھی۔ ”لیکن مقصود میاں، کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ تو سن لیں کہ میں آپ کے در تک کیوں آئی ہوں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں اپنی بھانجی کی زندگی کس طرح تباہ ہو جانے دوں؟ اسے سلام نے طلاق دے دی تو کون اس سے شادی کرے گا؟ خود سلام کو بھی اس بات کا احساس ہے۔ اس نے اسی لئے بلیقیں جہاں کو طلاق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے بیٹے پر اس کے چچا نے سٹلی کرا دیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے بوڑھی عورت کو تیز نظروں سے دیکھا۔

”اس لئے کہ یہ بات سارے عزیز رشتے داروں میں پھیل گئی تھی، سلام اپنے چچا کی بیٹی کو چاہتا ہے۔“ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

کس نے پھیلائی یہ بات؟ تم نے یا تمہارے بیٹے نے؟“ میں نے اس مرتبہ قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”وہی دیوانہ ہے میرا بیٹا اور کون۔ اسی نے اپنے دوستوں اور قریبی عزیزوں سے ایسی باتیں کیں

اور سب کو ہٹا چل گیا۔“

”اور تمہارے خیال میں اسی وجہ سے سلام کے چچا نے اس پر سٹلی کرا دیا؟“

”جی ہاں مقصود میاں! ان کی بیٹی جو بدنام ہو گئی۔ جل کر انہوں نے میرے بیٹے کا گھر اجاڑنے کے لئے ایسا کیا۔ تبھی تو بلیقیں طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہ تو سیدھی ہے، اسے کیا معلوم کہ یہ سب سٹلی کا اثر ہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو امیرن؟“ میں نے پہلی مرتبہ بوڑھی عورت کو اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔

”آپ واقعی بڑے اللہ والے ہیں۔ بغیر بتائے آپ کو میرا نام بھی معلوم ہو گیا مقصود میاں۔“

”اس کے باوجود تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہو۔“ میں سختی سے بولا۔

امیرن سٹپا گئی اور کہنے لگی۔ ”آپ مجھ سے چاہے جیسی قسم لے لیں، مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ بلیقیں کی زندگی تباہ ہو جانے کا خیال ہے۔“

برکت علی شاہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے نظر بازی میں مصروف تھا۔ اس کی موجودگی مجھے گراں گزر رہی تھی اسی لئے میں نے بات کو مختصر کرنے کی غرض سے کہا۔ ”تم ایسا کرو امیرن کہ کل اپنے بیٹے سلام کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ اگر تمہارے دیور نے واقعی اس پر سٹلی کرا دیا ہے تو میں اس کا توڑ کر دوں گا۔“

”میں اس سے کون گی، اگر مان گیا تو ضرور.....“

”ماننا پڑے گا اے۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”اگر وہ نہیں مانا تو میں خود اسے یہاں آنے پر مجبور کر دوں گا۔ اب تم جاؤ، کل صبح دس بجے آنا۔“

میری بات ختم ہوتے ہی بلیقیں جہاں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان سا محسوس کیا جیسے اسے کسی عذاب سے نجات مل گئی ہو۔

وہ دونوں عورتیں چلی گئیں تو برکت علی شاہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مقصود میاں! تم نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ بلیقیں جہاں کو تو بولنے دیا ہوتا۔“

”اب ان عورتوں کا قصہ چھوڑو برکت علی شاہ! تم کو کہ تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی تھی۔“

”صرف یہ کہ امغری کو تلاش کرنے کی کوشش چھوڑ دو۔ وہ میری پناہ میں ہے۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے مجھے حکم دے رہا ہو۔

برکت علی شاہ کی زبان سے امغری کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ مظلوم و معصوم ظفر کی سوتیلی ماں کا نام امغری ہی تھا۔

”تم امغری کو کیسے جانتے ہو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں نہیں جانوں گا اے تو پھر کون جانے گا۔ وہ اور اس کا سارا خاندان میرا مرید ہے، تمہارے لئے بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے۔“ یہ کہتے ہی برکت علی شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ برکت علی شاہ! ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔“

”مگر مجھے جو کہتا تھا کہ چکا ہوں، میری بات ختم ہو چکی ہے۔ تم مجھے میری مرضی کے خلاف بیٹھنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔“

”برکت علی شاہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ عورت غلام ہے؟“ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کون غلام ہے اور کون مظلوم؟ تمہیں اس سے کیا مقصود میاں۔ تم اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔“ وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے غافل جان کر ایک مرتبہ پھر اسے اپنے قبضے میں کرنا چاہا۔

وہ مڑا اور ہنسنے ہوئے کہنے لگا۔ ”بیچھے سے دار کرنا مردانگی نہیں مقصود میاں۔ ایک بار منہ کی کھانے کے باوجود تم نہیں مانے۔ میرا ظرف دیکھو کہ اب بھی میں نے پلٹ کر تم پر وار نہیں کیا۔ ابھی تم بچے ہو میرے سامنے۔ تمہاری اس شرارت کو اسی لئے معاف کئے دے رہا ہوں۔“ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نشست گاہ سے نکل گیا۔

میں یہی سمجھا کہ تلخی کے بعد وہ میری کوششی میں رکے گا نہیں، مگر جب بیرونی کمرے میں پہنچا تو اسے اپنی چوکی پر بیٹھے دیکھا۔

”آؤ مقصود میاں!“ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے بیٹھنے کو جگہ دے دی، اس کے بعد بولا۔ ”میری وجہ سے تمہارے حاجت مندوں کو آج بڑی دیر ہو گئی۔“ وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ابھی ذرا دیر پہلے میرے اور اس کے درمیان کوئی تلخ کلائی نہیں ہوئی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ”ایسا کرو کہ تم نئے لکھو، میں دوسرے معاملات نمٹاتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ مقصود میاں۔“

میں خون کا سا گھونٹ پی کر اس کے قریب چوکی پر بیٹھ گیا۔

”جو لوگ جسمانی عارضوں میں مبتلا ہیں، وہ مقصود میاں سے نئے لکھو لیں۔“ برکت علی شاہ نے بلند آواز میں لوگوں سے کہا۔ ”جنہیں روحانی امراض لاحق ہیں دائیں طرف ہو جائیں اور بائیں بائیں میرے پاس آئیں۔“

لوگوں نے اسی پر عمل کیا اور دو حصوں میں بٹ گئے۔

میں نے اسی دوران برکت علی شاہ سے کہا۔ ”نئے لکھنا بھی سیکھ ہی لو۔ اس کے لئے تمہیں میری شاگردی میں آنا پڑے گا۔“

”چوت کر رہے ہو مجھ پر۔“ برکت علی شاہ کا چہرہ غصے کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔

”رنگ بدلنے میں گرگٹ بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے اسے اور غصہ دلایا۔

”مجھ سے لکھ نہ لو مقصود میاں۔ تمہیں پچھتاہٹا پڑے گا۔“ وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

”اب تک تو نہیں پچھتاہٹا۔ اگر تم اتنے ہی.....“ ابھی میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اچانک کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھے اپنی گرفت میں لیا اور پھر کمرے کے باہر پھینک آیا۔ عین اسی لمحے کمرے میں دوبارہ روشنی ہو گئی۔

”ارے دیکھنا، یہ مقصود میاں کہاں چلے گئے؟“ میں نے برکت علی شاہ کی آواز سنی۔

میں اٹھا اور پھر کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو کر اندر کا منظر دیکھنے لگا۔ برکت علی شاہ میری چوکی پر بیٹھا مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تم تو واقعی بڑے کمال کے آدمی ہو مقصود میاں، گھڑی میں اندھیرا، گھڑی میں اجالا اور.....“

پھر برکت علی شاہ بھی اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

کمرے میں ایک مرتبہ پھر اندھیرا ہو گیا اور میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا۔ جھپٹ کر میں چوکی تک پہنچا اور برکت علی شاہ کو اٹھا کر باہر پھینک آیا۔

جب میں اپنی چوکی پر بیٹھا تو پھر کمرے میں روشنی ہو گئی۔ میرے اور برکت علی شاہ کے درمیان کیا مقابلہ جاری ہے، وہاں موجود افراد اس سے بے خبر تھے۔

برکت علی شاہ کے ساتھ آنے والے اس کے مرید ابھی تک کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ”اپنے پیر صاحب کو جا کر دیکھو، کہیں مجھ سے ڈر کر بھاگ تو نہیں گئے؟ ابھی تو وہ بیٹھے تھے۔“

برکت علی شاہ کے لئے میں نے دانستہ تشکیک آمیز الفاظ استعمال کئے۔

”ہمارے پیر صاحب کسی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔“ برکت علی شاہ کا دروازہ قد مرید جواب میں

بولا۔ یہ وہی تھا کہ جس نے ”پیر صاحب آ رہے ہیں، راستہ دو۔“ کا شور مچایا تھا۔ اسی نے مزید کہا۔ ”وہ

جب چاہتے ہیں اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔“

اسی وقت مجھے کمرے کے دروازے پر برکت علی شاہ نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول

اٹھا۔ ”یوں لگتا ہے مقصود میاں کہ تمہیں یہاں ہماری موجودگی پسند نہیں۔ کوئی بات نہیں، ہم پھر کبھی

آئیں گے۔“ پھر اس نے اپنے مریدوں کو چلنے کا حکم دیا۔

”دوبارہ کب آئیں گے برکت علی شاہ! کم سے کم اتنا تو بتاتے جاؤ۔“ میں نے بھی بلند آواز میں اس

سے پوچھا، کیوں کہ میرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔

”ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں مقصود میاں۔ تمہارے تو پابند نہیں، جب چاہیں گے آجائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اسی کے ساتھ اس کے مرید لپکتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

پیر برکت علی شاہ نے پسپائی اختیار کر لی تو میں نے بھی اسے نہیں روکا۔ اس کی یہ پسپائی بھی میرے

لئے حیران کن ہی تھی۔ اس جیسے آدم زاد سے پہلے کبھی میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ بظاہر وہ مجھے خیر و شر کا

مجموعہ نظر آیا، مگر اس میں شر کا پلہ بھاری دکھائی دیا۔ عام طور پر آدم زاد ایسے ہی ہوتے ہیں، یعنی ان کی

شخصیت میں نیکی کا عنصر بھی ہوتا ہے اور بدی کا بھی۔ جن آدم زادوں کو غیر معمولی پراسرار قوتیں حاصل

ہوتی ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو صاحب علم آدم زادوں کی ہے جنہیں ہم جن زاد اپنے

لئے انتہائی خطرناک سمجھتے ہیں۔ ایسے صاحب علم آدم زاد ہم جن زادوں سے بھی نہیں ڈرتے۔ ہم میں

سے جو شریر ہوتے ہیں اور آدم زادوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، یہ صاحب علم آدم زاد انہیں سخت

سزائیں دیتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بطور سزا ہمیں اپنا غلام بنائیں۔ پراسرار قوتوں کے مالک آدم

زادوں کی دوسری قسم شیطانی علوم پر دسترس رکھتی ہے۔ ان پر قابو پانا بھی ہم جن زادوں کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ پیر برکت علی شاہ کا تعلق آدم زادوں کی کون سی قسم سے تھا، میں نہیں سمجھ پایا۔ میں صرف یہی جان سکا کہ وہ پراسرار قوتوں کا مالک یقیناً ہے۔ مجھے اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ وہ کوئی جعلی جبر ہوتا تو میرے مقابل نہ ٹھہرا پاتا۔ اس نے پلٹ کر مجھ پر صرف ایک مرتبہ وار کیا جس کا اسے میں نے جواب دے دیا۔ کسی بھی جگہ اندھیرے کی چادر پھیلا دینا اور پھر اجالا کر دینا، پراسرار قوتوں کے مالک کسی آدم زاد کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ نہ کسی ایسے آدم زاد کے لئے یہ کوئی دشوار بات ہے کہ کسی کو اٹھوا کر کہیں پھینکوا دے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہم جن زادوں کا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ معمولی سا کام ہے۔ جن زاد بچے تک یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود پیر برکت علی شاہ کی زبان پر اگر ظفر کی سوتیلی ماں کا نام نہ آتا تو میں اسے کوئی خاص اہمیت نہ دیتا۔ درمیانی عمر کی اس ظالم عورت اصغری کا صرف چہرہ ہی مجھے نظر آ سکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلاکی کشش اور جاذبیت تھی۔ اصغری کے بارے میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لانے کے باوجود میں کیوں معلومات حاصل نہ کر سکا، یہ راز بھی اب کھل گیا۔ وہ برکت علی شاہ کی پناہ میں تھی۔ ضرورت مندوں کے درمیان گھرا ہونے پر بھی میرے ذہن سے برکت علی شاہ کا خیال نہیں نکل سکا۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی محفل برخاست ہو گئی۔ میں چوکی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جن لوگوں کو میں نہیں دیکھ سکا، ان سے آئندہ روز آنے کو کہہ دیا۔ میرے پاس آنے والوں کو خود بھی اس بات کا علم تھا کہ مغرب کی اذان کے بعد مجھ سے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

لوگ رخصت ہو گئے تو میں نے کوٹھی کے دروازے بند کر دیے اور پھر ذرا ہی دیر میں سناٹا چھا گیا۔ میں ایک بار پھر برکت علی شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے لئے وہ قطعی اجنبی تھا۔ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، اس کی سکونت کہاں تھی، ان میں سے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کیوں ملا، یہ میں ضرور جان گیا۔ اس کے علاوہ میں نے برکت علی شاہ کے بارے میں ایک اندازہ اور لگایا۔ میں نے جو راہ چھوڑ دی تھی، وہ اسی راہ کا مسافر معلوم ہوا۔ وہ بھی مجھے آدم زادوں کے عشق میں گرفتار نظر آیا۔ اصغری کا پُرکشش حسین چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ اسی کے ساتھ بلیقہس جہاں سے اس کی نظر بازی بھی مجھے یاد آگئی۔

اس یقین کے باوجود کہ مجھے ناکامی ہوگی، میں نے برکت علی شاہ کو تلاش کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں بہر حال ایک جن زاد تھا، ایک آدم زاد سے اپنی شکست کس طرح قبول کر لیتا؟ میں وہی علیالیش تو تھا کہ جس نے مولوی کفایت اللہ جیسے خطرناک آدم زاد کو ناکوں پہنے چھوڑا دیئے تھے، لیتا جیسی آدم زادی کی گرفت سے نکل آیا تھا۔ نیکی کی راہ اپنا لینے پر بھی میری فطری سہرشت کیسے بدل جاتی۔ اسی کے نتیجے میں رات بھر میں اندھیروں سے الجھتا رہا اور صبح دم مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ پیر برکت علی شاہ کا مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

☆=====☆

کچھ دیر آرام کر کے میں اٹھا تو صبح کے نو بجے رہے تھے۔ دس بجے میں نے امیرن اور اس کے بیٹے سلام کو اپنی کوٹھی پر بلوایا تھا۔ سو میں نے انسانی قالب اختیار کر لیا۔ گزشتہ روز بلیقہس جہاں کی ساس امیرن سے کے ہوئے الفاظ مجھے یاد تھے۔

مجھے شبہ تھا کہ سلام اپنی ماں کے ساتھ نہیں آئے گا، یہی ہوا۔

سلام کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد گیارہ بجے میں اپنی کوٹھی سے چل دیا۔ مطلوبہ بینک تک پہنچنے کے لئے میں ایک سائیکل رکشہ میں بیٹھ گیا۔ بولٹن مارکیٹ کا علاقہ میرے لئے جانا چھانا تھا۔ میں نے دانستہ یہ کوشش کی کہ کسی پرانے شناسا شخص سے ڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی۔

بڑی سی ایک پرانی عمارت کی پہلی منزل پر مجھے اس بینک کا بورڈ لگا ہوا نظر آ گیا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کا راستہ چوڑی سی ایک گلی میں تھا۔ میں اس گلی میں گھس کر بائیں جانب مڑ گیا۔ نیچے دائیں طرف ڈاک خانہ تھا۔ سامنے خاصے فاصلے پر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بینک میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر مجھے سلام نظر آ گیا۔ اپنی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت اس کا چہرہ میں نے دیکھ لیا تھا، اسی لئے اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی، وہ ایک اونچے سے شول پر بیٹھا سامنے موجود لہجر (کھاتے) میں ایک چیک کا اندراج کر رہا تھا۔

”کیش چیک۔“ سلام نے زور سے آواز لگائی۔ پھر وہ دوسرا لہجر کھولے لگا۔ ادھیڑ عمر اکاؤنٹنٹ اپنی کرسی سے اٹھا اور تیزی کے ساتھ کاؤنٹر تک آ گیا۔

میں اس عرصے میں کاؤنٹر تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سلام کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔

اگر میں وہاں موجود نہ ہوتا تو یقیناً سلام کو جھپٹی نہ ملتی، کیوں کہ یہ بینک کا مصروف وقت تھا۔ سلام کی جگہ ایک اور کلرک آ کھڑا ہوا۔

سلام کو ساتھ لئے میں واپس اپنی کوٹھی پہنچ گیا اور اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ اسے میں نے اپنی نشست گاہ میں بٹھایا تھا۔

”یہ یہ میں کہاں آ گیا؟“ وہ چونک اٹھا۔ ”ابھی تو میں میں بینک میں تھا۔“

”تم وہیں آ گئے ہو سلام کہ جہاں آنے سے تم نے انکار کر دیا تھا۔“ میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری ماں امیرن نے کیا تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اگر تم خود میرے پاس نہیں آئے تو میں تم کو یہاں آنے پر مجبور کر دوں گا؟“

”متی مقصود میاں۔“ وہ ہلکایا۔

”پہچان گئے مجھے تو پھر اب خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لو۔ بولو کہ تم نے اپنی عزت پہچاننے کی خاطر بلیقہس جہاں کی زندگی کیوں تباہ کر دی؟ بتاؤ اسے بے غیرت نوجوان کہ تم نے اپنی بچا زاد سے عشق کا

ڈھونگ رہا کر اسے کیوں بدنام کیا؟“ میں نے سخت لمبے میں پوچھا۔
 وہ گھبرا گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”اپنی ماں..... ماں کی خاطر ہم..... میں نے بلیقیں سے شادی کر لی ورنہ وہ..... وہ زہر کھا لیتیں‘ پہلے..... پہلے تو میں..... میں نے شادی سے انکار ہی کر دیا تھا۔ پھر..... جب شادی ہو ہی گئی تو..... تو میں کیا کرتا؟“

”جھوٹ بول رہے ہو تم۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اب بھی تم ایک نیم حکیم سے اپنا علاج کرا رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بلیقیں جہاں کو طلاق دینے کے بعد بے عزت ہو جاؤ گے۔ تمہاری ماں امیرن کو بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ اس نے بلیقیں جہاں سے تمہاری شادی کرا کے غلطی کی۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ تمہاری ماں تم پر سفلی کرانے جانے کے قصے سناتی پھرتی ہے اور تم اپنی چچا زاد سے عشق کی جھوٹی داستانیں بیان کرتے ہو۔“

سلام ابھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں ایک آشنا آواز سن کر تقریباً اچھل پڑا۔

”مقصود میاں! تم کیوں خدائی فوجدار بن رہے ہو؟ اگر اس نوجوان نے اپنا دامن وانداز ہونے سے بچانے کی خاطر بلیقیں جہاں کو طلاق نہیں دی تو کیا ہو گیا؟“ یہ آواز پیر برکت علی شاہ کی تھی۔ وہ آہستہ قدمی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

کوٹھی کا گیٹ اور صدر دروازہ میں بند کر کے آیا تھا‘ میں نے سوچا۔

”پیر برکت علی شاہ کے لئے بند دروازے خود بہ خود کھل جاتے ہیں مقصود میاں‘ تم خود جا کر دیکھ لو کہ اب دروازے کھلے ہوئے ہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا‘ پھر کہنے لگا۔ ”امغری کی طرح ہم اس نوجوان کو بھی اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔“ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ ”اس کی بیوی بلیقیں جہاں کو ہم کل رات ہی اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔ پھر بھی ہم نے اسے ابھی اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ تمہارے پاس آ سکے‘ تم سے فریاد کر سکے۔ اپنے لٹ جانے کی داستان سنانے کے لئے وہ بھی آنے ہی والی ہوگی۔“

برکت علی شاہ کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی تیز قدموں کی چاپ ابھری اور پھر میں نے بلیقیں جہاں کو نشست گاہ کے دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ برکت علی شاہ پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ اٹھی۔ ”مقصود میاں! اس..... اس کینے پیر نے مجھے..... مجھے برباد کر دیا۔ آپ..... آپ اسے ایسی سزا دیں کہ.....“

”دیکھ لیا تم نے مقصود میاں کہ ہم نے غلط نہیں کہا تھا۔“ برکت علی شاہ نے بلیقیں جہاں کی بات کاٹ دی۔

”ہاں برکت علی شاہ! دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا۔ تیرا اصل چہرہ مجھے نظر آ گیا۔“ ثواب یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا۔

اب اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ میں اس شیطان و بدکار برکت علی شاہ سے نمٹنے کے لئے جن زاد بن جاتا۔ ظفر کی سوتیلی ماں امغری کا حسین و پرکشش چہرہ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ وہ

ایک ظالم عورت تھی۔ خود برکت علی شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ امغری اس کی پناہ میں ہے۔ ابھی اس نے سلام کو بھی اپنی پناہ میں لے لینے کی دھمکی دی تھی۔ سلام اپنی جوان بیوی بلیقیں جہاں پر ظلم کر رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ برکت علی شاہ مظلوموں کے بجائے ظالموں کا حمایتی ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جان گیا کہ برکت علی شاہ اپنی پراسرار شخصیت کی آڑ میں حسین آدم زادوں کے لئے عذاب بنا ہوا ہے۔ کسی آدم زاد یا آدم زادی کو پناہ میں لینے کا مقصد بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

انسانی قالب چھوڑتے ہی میں نے برکت علی شاہ کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے زقند بھری۔ وہ یقیناً پہلے ہی سے چوکتا ہو گا ورنہ میری پہلی ہی کوشش کامیاب رہتی اور وہ میری نشست گاہ سے نکل نہ پاتا۔ پھر بھی میں نے اس کا چچا نہ چھوڑا۔ بھاری بھر کم جسم ہونے کے باوجود اس میں ہلاکی تیزی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچنے کو ہوتا تو وہ اور چند قدم آگے دکھائی دیتا۔ کسی جن زاد کی پکڑ میں نہ آنا‘ غیر معمولی بات ہی تھی۔

اب میں اور وہ کوٹھی کے لان میں تھے۔ وہاں درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ اسے میں نے ایک گھنے بیڑ پر کسی بندر کی طرح چڑھتے دیکھا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ نیچے گرا۔ اسی کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے چشم زدن میں اس کے بھاری جسم کو اٹھایا اور دوبارہ زمین پر پھینچ دیا۔ وہ بھی ایک ہی غصیبت تھا۔ چیخا ہوا اٹھ کر بھاگا۔ ہم جن زادوں کے لئے لحوں میں کہیں سے کہیں پہنچنا ممکن ہے تو بھلا وہ مجھے کس طرح جل دے کر نکل جاتا۔ میں نے اسی لئے اسے مزید حواس باختہ کرنے کی خاطر بھیانک آواز نکالی۔

اس کے باوجود نہ تو برکت علی شاہ خوفزدہ ہوا نہ رکاب اسی وقت مجھے دور سے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور میری توجہ بٹ گئی۔ برکت علی شاہ اسی سے فائدہ اٹھا کر درختوں کی آڑ میں ہو گیا۔ میں جھپٹ کر وہاں پہنچا تو اس جگہ کوئی نہیں تھا۔ اسی وقت مجھے برکت علی شاہ کے ایک مرید کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جب چاہتے ہیں اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ جتنا صفات ہیں جو ہم کی آدم زادوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ یہ بات تو میرے تجربے میں بھی آچکی تھی کہ برکت علی شاہ غیر معمولی پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ میں اس پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ میری اور اس کی قوت تقریباً برابر ہی تھی۔ ہاں میرا پہلے اس لئے ضرور بھاری تھا کہ میں کوئی آدم زاد نہیں جن زاد تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت وہ مجھ سے دانستہ ٹکر لینے آیا تھا۔ پھر بھی میرے مقابلے پر ٹک نہ سکا اور اسے فرار ہونا پڑا۔ ایک اہم سوال میرے ذہن میں یہ بھی ابھرا کہ اگر اس میں غائب ہو جانے کی صلاحیت موجود تھی تو میرے ہاتھوں اپنی اتنی درگت کیوں بنوائی؟ میں نے جب اسے زندہ نہ چھوڑنے کی دھمکی دی تھی اور پھر انسانی قالب سے نکل کر اس پر زقند لگائی تھی تو وہ اسی وقت غائب کیوں نہیں ہوا؟

چند لحوں کے اندر میں نے ساری کوٹھی چھان ماری‘ مگر برکت علی شاہ کہیں نہیں ملا۔ اسی کے ساتھ مجھے اس پر بھی حیرانی ہوئی کہ میرے سوا اب کوٹھی میں کوئی اور نہیں تھا۔ سلام اور اس کی بیوی

رام سوامی کے علاقے میں پہنچ کر میں نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا سلام تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ ہکلیا۔ ”آ..... آپ ہاں خود..... خود تشریف لے آئے۔“

”ہاں، مگر تم میری کوشی سے کیوں بھاگ آئے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔

”ہم..... میں اور..... اور بلیس جہاں دونوں..... دونوں ہی ڈر گئے تھے۔“ اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ وہ سچ بول رہا تھا۔

”کون آیا ہے سلام؟“ اندر سے امیرن کی آواز آئی۔

”آپ ٹھہریے، میں آپ کے لئے بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔“ سلام یہ کہہ کر گھر میں چلا گیا۔

پھر اس نے دھیمی آواز میں اپنی ماں کو میری آمد سے آگاہ کیا۔

چند لمبے بعد امیرن کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ ”تو کیا کہہ رہا ہے سلام۔ وہ..... وہ مقصود میاں خود آگئے؟ خدا ہی جانے اب کیا ہونے والا ہے۔“ اس کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے آنے سے گھبرا گئی ہے۔

گھر کے دروازے کے قریب ہی ایک اور دروازہ تھا۔ سلام نے وہ دروازہ اندر سے میرے لئے کھول دیا، پھر مجھ سے بولا۔ ”آئیے..... تشریف لائیے۔“ وہ اب تک بوکھلایا ہوا تھا۔ وہ یہ کہہ کر مجھے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا۔

جواب میں کچھ کہے بغیر میں اندر داخل ہو گیا۔ بیٹھک میں معمولی سا فرنیچر پڑا تھا۔

”بیٹھک کا دروازہ بند کر دو سلام۔“ میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

سلام نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی اور میرے سامنے منسوب آکھڑا ہوا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے قریب ہی پڑی ہوئی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”پہلے تھی سے بات ہو جائے۔“

”میں بھی حاضر ہو جاؤں سرکار؟“ گھر کے اندر والے دروازے کے پاس مجھے سلام کی ماں امیرن دکھائی دی۔

”نہیں، ابھی تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”تم اندر ہی رہو۔“

اس عرصے میں سلام ڈرتا جھجکتا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”دیکھو سلام، تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے جرم کا اعتراف کر لو۔ تم نے اب تک یہ اندازہ تو لگایا لیا ہو گا کہ مجھے فریب نہیں دے سکتے۔“ میں نرمی سے بولا۔

”جج..... جی ہاں.....“ اس نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ پھر اسے جانے کی سوجھی کہ تیزی سے اٹھا اور میرے پاؤں پکڑ لئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”اب میری عزت مجھے آپ..... آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر..... اگر میں نے بلیس کو طلاق دے دی تو.....“

بلیس؟ ہاں، دونوں ہی نشست گاہ سے غائب تھے۔ اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ شاید وہ دونوں خوفزدہ ہو کر میری کوشی سے بھاگ گئے ہوں گے۔ انہوں نے بھی برکت علی شاہ کے چیتنے چلانے کی آوازیں یقیناً سنی ہوں گی۔ اچانک دیکھتے دیکھتے میرا غائب ہو جانا بھی ان کو خوفزدہ کر گیا ہو گا۔ میں نے جو دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تھی، انہی کی ہو سکتی تھی۔ کوشی میں ان دونوں کے سوا اور تھا بھی کون۔ میں اور برکت علی شاہ کوشی کے باہر لان میں تھے۔ برکت علی شاہ ایک بار پھر مجھے اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ گیا۔ گزشتہ رات بلیس جہاں پر کیا گزری، اس کی تفصیل بھی مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے، برکت علی شاہ تک پہنچنے کے لئے اس تفصیل سے مجھے کوئی راہ مل جاتی۔

اصغری کی طرح بلیس جہاں کو بھی برکت علی شاہ نے اپنی پناہ میں لینے کا دعویٰ کیا تھا، لیکن وہ سلام اور امیرن کو شاید بھول گیا۔ مجھے ان دونوں کے ذریعے بلیس جہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ میری نظر میں بلیس جہاں ایک مظلوم آدم زاد تھی جس پر دہرا ظلم ہوا تھا۔ پہلے تو اس کے شوہر سلام نے اپنی جھوٹی عزت پر قرار رکھنے کی خاطر اسے اپنا پابند رکھا اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیا، پھر برکت علی شاہ نے اسے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ بلیس جہاں کو اس کے ظالم اور خود غرض شوہر سے طلاق دلانا تو میرے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا، لیکن برکت علی شاہ یقیناً آسانی سے اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

میں نے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے صبر و تحمل سے کام لیا۔ جلد بازی سے عموماً معاملات سلجھنے کے بجائے اور الجھتے جاتے ہیں۔

اس موقع پر مجھے استر یاد آیا۔ وہ میرا استاد تھا۔ ہم جن زادوں میں بھی جو نیک اور اہل ایمان ہوتے ہیں، وہ اپنی اولادوں کو بنیادی تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیم آدم زادوں سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ دس سال کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک میں نے استر کے مدرسے میں یہ تعلیم حاصل کی۔ استر بڑا سخت گیر تھا۔ میں جب کوئی سبق یاد نہ کرتا تو وہ مجھے بہت مارتا یا مدرسے نہ پہنچاتا تو دوسرے جن زاد بچوں کو میری تلاش میں بھیج دیتا۔ اگر میں ہتھ چڑھ جاتا تو سزا ملتی۔ تعلیم کے دوران میں مختلف وظائف بھی یاد کرائے جاتے۔ ان وظائف کا اصل مقصد خلق خدا کی مدد کرنا ہوتا، یہ حقوق خواہ جنت میں سے ہو کہ آدم زادوں میں سے۔ مجبوراً میں نے یہ وظائف یاد تو کر لئے مگر ان پر کبھی نہ تو زیادہ توجہ دی نہ عمل کیا۔ میں تو ابتدا ہی سے بری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود اب تک بہت سے وظائف مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں دور تک ایسا کوئی خیال نہ تھا کہ کبھی استر کے تعلیم کئے ہوئے یہ وظائف میرے کام آئیں گے۔ ظالم چاہے کوئی جن زاد ہو کہ آدم زاد کسی مظلوم کو اس کے ظلم سے بچانا، ممکن تھا۔

برکت علی شاہ سے تو میں بعد میں بھی منٹ لیتا، لیکن پہلے بلیس جہاں کا تحفظ ضروری تھا۔ اس کے لئے مجھے بلیس جہاں سے کم از کم ایک بار ملنا پڑتا۔ پھر برکت علی شاہ اس کے قریب بھی نہ آتا۔

اپنی کوشی کو مقفل کر کے میں اسی وقت روانہ ہو گیا۔ اب میں انسانی قالب میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ امیرن کہاں رہتی ہے۔

نکاح پر غصہ آگیا اور اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سخت لمحے میں بول اٹھا۔ ”کھڑے ہو جاؤ اٹھ کر۔ تم اب تک وہی ایک رٹ لگائے جا رہے ہو۔ آدمی کو تمہاری طرح اس قدر خود غرض نہیں ہونا چاہئے۔“

میری ڈانٹ کھا کر وہ اٹھا اور نڈھال سا ہو کر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔

”تمہیں بلیقیں جہاں کو طلاق تو دینا ہی پڑے گی سلام۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”رہی تمہاری بدنامی، تو اس کی ذمہ داری خود تم پر اور تمہاری ماں پر ہے۔ اس کے لئے ایک عورت کی زندگی برباد نہیں کی جاسکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بلیقیں جہاں اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھے۔“

”لیکن وہ..... وہ اپنے میکے والوں سے جو..... جو کچھ کہہ چکی ہے، اسے.....“

”کچھ نہیں کہا اس نے، کوئی غلط بات نہیں کی۔ صرف یہی کہا ہے اس نے کہ تم اپنے چچا کی بیٹی سے محبت کرتے ہو۔ تم نے اسی لئے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ ہر چند کہ یہ بھی جھوٹی داستان ہے، پھر بھی بلیقیں جہاں کو طلاق دینے کا جواز بن سکتی ہے۔“

”مگر ای تو کہتی ہیں کہ جس عورت کے ماتھے پر طلاق کی مہر لگ جاتی ہے، اسے کوئی اور قبول نہیں کرتا۔“ سلام ہمت کر کے بولا۔

”وہ تمہاری ہی ماں ہے نا۔ بظاہر تو وہ اپنی بہو کی ہمدردی ہوئی ہے لیکن حقیقت میں معاملہ برعکس ہے۔ اسے بھی تمہاری بدنامی کا خوف ہے۔ بلاؤ اپنی ماں کو۔“

میرے کہنے پر سلام اٹھ کر اندر گیا اور جب لوٹا تو امیرن بھی اس کے ساتھ تھی۔

”امیرن!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہارے بیٹے کا یہ مسئلہ نہیں کہ طلاق کے بعد بلیقیں جہاں پر کیا گزرے گی، اسے کوئی قبول کرے گا یا نہیں۔ جب تمہاری بہن بشیرن خود تم سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ اس کی بیٹی کو طلاق دلو دو تو پھر تم کیوں اپنی ضد پر اڑی ہوئی.....“

”سرکار۔“ امیرن بول اٹھی۔ ”یہ..... یہ دو گھروں کا تعلق اس طرح ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔ اور..... اور پھر میں شاید اپنی بہن سے بھی نہیں مل سکوں گی۔“

”تم دونوں ہی ماں بیٹے اپنے مفاد کی خاطر مختلف بہانے بنا رہے ہو۔“ میری آواز میں سختی آ گئی۔

”تو..... تو پھر ہم کیا کریں مقصود میاں۔ آپ ہی کوئی فیصلہ کر دیں۔“ امیرن بولی۔ ”میں تو بڑی آس لے کر آپ کے آستانے تک گئی۔“

”اس میں فیصلہ کیا کرتا ہے، سیدھی سی بات ہے کہ تم بلیقیں جہاں کی جان چھوڑ دو۔“

”لیکن پیر صاحب تو مجھ سے کچھ اور ہی کہہ کر گئے تھے۔“ امیرن نے بتایا۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کب آیا تھا وہ؟“

”کل جب میں آپ کے آستانے سے لوٹ کر آئی تو پیر صاحب بھی خود ہی یہاں تشریف لائے تھے۔“ امیرن نے جواب دیا۔ ”انہوں نے فرمایا تھا کہ بلیقیں جہاں کو طلاق ہو گئی تو ہرگز زندہ نہ رہ سکے

گی۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ میں کروں تو کیا کروں؟ ایک طرف پیر صاحب کا حکم ہے، دوسری طرف آپ.....“

”نکواس کرتا ہے وہ، کیا تم اسی کے کہنے پر سلام کو میرے پاس لے کر نہیں آئی تھیں؟“

”جی ہاں۔ پیر صاحب ہی نے فرمایا تھا کہ اب آپ کے آستانے پر جانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا وہ بلیقیں سے بھی تمہاری میں ملا تھا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”جی نہیں۔ وہ صرف مجھ سے مل کر واپس چلے گئے تھے۔ سلام بھی اس وقت گھر میں نہیں تھا۔“

”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو امیرن! وہ پیر مکار ہے۔ آئندہ تم اس کی کسی بات پر عمل نہیں کرو گی۔ تمہیں شاید خبر بھی نہیں، مگر تمہارا بیٹا اس چیر کی حقیقت سمجھ گیا ہے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ سب کچھ جان لینے کے باوجود اب تک تمہارے بیٹے کی آنکھیں نہیں کھلیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے سلام کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا تو میں نے کہا۔ ”سلام! تم بے حسی کی آخری حد تک پہنچ گئے ہو۔ شاید تم جیسے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اپنی بیوی کی حالت دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔ وہ نتائج کی پرواہ نہ کرتا اور.....“ میں خود ہی مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا، کیونکہ وہاں امیرن بھی موجود تھی۔

میں نے امیرن کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ مجھے حیران حیران سی دکھائی دی۔ اس کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے حیرت کی وجہ معلوم ہو گئی۔ بلیقیں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو اس سے اپنی پھوپھی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے میرے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے سلام کے ساتھ گھر واپس آ کر اس نے چپ ساہ لیا اور پوچھنے پر بھی نہ بتایا کہ میرے پاس کیوں گئی تھی۔ سلام نے بھی اسے صرف یہ بتایا تھا کہ بلیقیں اسے میری کوٹھی میں ملی اور وہ اسے ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ بینک سے وہ میرے پاس کیسے پہنچا؟ اس سوال کا جواب بھی وہ امیرن کو نہ دے سکا۔

”اچھا اب تم دونوں جاؤ اور بلیقیں جہاں کو میرے پاس بھیج دو۔“ میں نے امیرن اور سلام سے کہا۔

وہ دونوں خاموشی کے ساتھ چلے گئے اور ذرا ہی دیر کے بعد بلیقیں اجڑی اجڑی سی ہنسیک میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف اور غم کے آثار تھے۔

میں نے اسے سامنے کرسی پر بٹھالیا اور نرمی سے بولا۔ ”تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا بلیقیں، اس کا ازالہ تو کسی صورت ممکن نہیں، لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ اب آئندہ وہ خبیث پیر تمہیں کوئی اذیت نہیں دے سکے گا۔ میں اسے سخت سے سخت سزا دینے کی کوشش کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں اپنی کرسی سے اٹھا اور اسے خاموش رہنے کی تاکید کر کے ایک وظیفہ پڑھنے لگا۔ مختصر وظیفہ پڑھ کر میں نے اس کے دائیں اور بائیں شانوں پر دم کیا اور پھر دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ اب میں مطمئن تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد اسے میں نے پھر مخاطب کیا۔ ”وہ عیاری الٹال تو مجھ سے بچ کر نکل گیا ہے، لیکن جلد ہی میں اسے تلاش کر لوں گا۔ تم سے میں جو سوال کروں، بلا جھجک مگر خوب سوچ سمجھ کر اس کا جواب دو۔ یہ بتاؤ کہ کل رات کس

طرح اور کب وہ حادثہ پیش آیا؟“
 بلقیس کی نظریں جھک گئیں اور کوشش کے باوجود وہ بول نہ سکی۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ کسی شریف اور باحیا عورت کی زبان پر کیسے آتی۔
 ”ٹھیک ہے، تم کچھ نہ کہو۔“ میں بولا۔ ”خود میں ہی معلوم کئے لیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس کے ذہن پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

اس گھر میں بیشک کے علاوہ دو کمرے اور تھے۔ سلام اپنی ماں کے کمرے میں سوتا اور بلقیس جہاں دوسرے کمرے میں اکیلی سوتی۔ گھر میں یہ تین ہی افراد تھے۔ سلام کے باپ کا انتقال ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے۔ آدمی رات کے قریب اچانک بلقیس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیکھا کہ کسی اجنبی جگہ پر ہے۔ وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹی تھی۔ گہرا کر وہ مسمری سے انغمی اور اس کمرے کے ساز و سامان کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ کرا کسی امیر و کبیر شخص کی خواہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ بلقیس ابھی کچھ سمجھ نہ پائی تھی کہ خواب گاہ کے کھلے ہوئے دروازے سے برکت علی شاہ اندر آتا دکھائی دیا۔ گزشتہ ملاقات ہی کے وقت بلقیس نے اس کے شیطانی ارادوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ اسی لئے پریشان ہو گئی۔ برکت علی شاہ نے پہلے نرمی سے اسے رجھانا چاہا، پھر سختی پر اتر آیا۔ شدید مزاحمت کے باوجود بلقیس خود کو اس کے دست ہو س سے نہ بچا سکی۔ اس ضمن میں بلقیس کا ذہن پڑھ کر مجھے جو تفصیلات معلوم ہوئیں، وہ خود میرے لئے بھی انتہائی حیران کن تھیں۔ شاید کوئی بھی آدم زادی خود اپنی زبان سے یہ تفصیلات بیان نہ کر پاتی۔ اس حادثے کے بعد بلقیس جہاں کے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اسی حالت میں اس نے برکت علی شاہ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب میں تجھے تیرے گھر پہنچا دیتا ہوں، کل رات پھر تو میرے پاس ہوگی۔ پھر بلقیس جہاں گہری نیند میں سو گئی اور صبح جاگی تو اپنے گھر کے کمرے میں تھی۔ رات کو جو واقعہ پیش آیا اسے اچھی طرح یاد تھا۔ برکت علی شاہ کے لئے اس نے اپنے دل میں شدید نفرت محسوس کی۔ وہ اداس اداس سی گھر کے کام کاج میں مصروف رہی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو معاً برکت علی شاہ کی منہوس آواز سن کر اچھل پڑی، مگر کرا خالی ہی تھا۔ برکت علی شاہ اسے کہیں نظر نہ آیا، صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”اے بلقیس! تیرے اوپر بڑا ظلم کیا میں نے۔ اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔ تجھ سے بس میری ایک ہی التجا ہے کہ مقصود میاں کے پاس جا کر اس ظلم کی روداد نہ سنانا۔ اگر مقصود میاں کو اس ظلم کی خبر ہو گئی تو وہ مجھے بہت سخت سزا دیں گے۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جا۔ اب میں تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا۔“

اس پر بلقیس بڑبڑائی۔ ”نہیں برکت علی شاہ..... اے کیئے! میں ضرور مقصود میاں کے پاس جاؤں گی اور ان سے تجھے ایسی سزا دلاؤں گی کہ پھر کبھی تو میری طرح کسی اور کو برباد نہ کر سکے۔“
 میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ برکت علی شاہ نے اس طرح خود ہی بلقیس جہاں کو میرے پاس آنے پر مجبور کیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بلقیس جہاں کی آمد سے پہلے ہی میری کونجی میں نہ پہنچ جاتا۔ بلقیس جہاں کا ذہن پڑھ کر میں اور بھی الجھ گیا۔ بات اگر اسی حد تک رہتی کہ برکت علی شاہ

بازرار قوتوں کا مالک کوئی غیر معمولی آدم زاد ہے تو میں شاید اتنا فکرمند نہ ہوتا۔ شواہد سے کچھ اور ہی پتا چل رہا تھا۔ اس معاملے پر مزید غور و فکر کی ضرورت تھی۔

مجھے جب ساری تفصیل معلوم ہو گئی تو میں نے بلقیس جہاں کو مخاطب کیا۔ ”یہ تو یقین رکھو کہ برکت علی شاہ اب تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ یہ بتاؤ کہ اب تم سلام سے طلاق لے کر اپنے میکے جانا چاہتی ہو یا اسی گھر میں رہنے کا ارادہ ہے؟“ یہ سوال میں نے اس سے بلا سبب نہیں کیا تھا۔
 ”میں..... میں اب یہیں رہوں یا طلاق لے کر اپنے میکے چلی جاؤں، اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی سی نمی تھی۔

”مجھے خبر ہے بلقیس جہاں کہ تم پر جو سانحہ گزرا ہے، اس نے تمہاری قوت فیصلہ چھین لی ہے۔ تم نے اب تک بہت صبر کیا ہے، سو کچھ دن اور صبر کر لو۔ چند روز اور گزر جائے دو، پھر یقیناً تم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کر سکو گی۔ میں تم پر اپنی یا کسی کی مرضی مسلط کرنا نہیں چاہتا۔“ مصلحت کے تحت ہی میں نے بلقیس جہاں کو یہ مشورہ دیا ورنہ سلام سے اسے طلاق دلانا کون سا مشکل تھا۔ بلقیس جہاں نے میرے مشورے کو قبول کر لیا۔ اب وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں تھی۔ ہاں اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ضرور تھے۔

میں نے آواز دے سلام اور امیرن کو بھی بلا لیا اور ان سے کہا۔ ”بلقیس جہاں کی مرضی میں نے معلوم کر لی ہے۔ یہ ابھی طلاق لینا نہیں چاہتی۔ اس نے فی الحال اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔

جو کچھ انہوں نے سنا اس پر وہ حیران بھی نظر آئے اور خوش بھی۔
 ”میں سمجھ رہی تھی سرکار کہ آپ ہماری بگڑی ہوئی بات بتانے کے لئے ہی تشریف لائے ہیں۔“ امیرن کہنے لگی۔ اس کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

”بات بتانا یا لگانا ہمارے بس میں نہیں امیرن۔ یہ اختیار تو صرف ایک بہتی کو ہے، پھر بھی یہ بات یاد رکھنا کہ اس فیصلے کی حیثیت عارضی ہے، مستقل نہیں۔ بلقیس جہاں آئندہ اگر کبھی تمہارے بیٹے سے طلاق کا مطالبہ کرے تو تم اس کے مطالبے کو کسی ہمارے ٹالو گی نہیں۔“

”ہم دونوں سرکار کے حکم سے باہر نہیں۔“ امیرن نے یقین دلایا۔
 ”سرکار نے ہمیں اپنی کسی خدمت کا موقع تو دیا ہی نہیں۔ حکم ہو تو سلام کو بھیج کر اس خوشی کے موقع پر مٹھائی منگوا لوں۔“ امیرن بولی۔

”ہم کسی سے خدمت لیتے نہیں، خدمت کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی میں بیشک کے بیرونی دروازے تک پہنچا اور کنڈی کھول کر باہر آ گیا۔
 مجھے اندازہ تھا کہ برکت علی شاہ نے وقتی طور پر پسپائی اختیار کر لی ہے۔ وہ بہ آسانی بلقیس جہاں سے دست بردار نہیں ہوگا، یہ الگ بات کہ میری مداخلت کے سبب اسے اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی ہو۔

بلیس جہاں سے جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں، کسی اور ہی طرف نشان دہی کر رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا تھا کہ برکت علی شاہ نے بھی میری ہی طرح سوانگ بھر رکھا ہے۔ وہ کوئی آدم زاد نہیں، میری ہی طرح ایک جن زاد ہے۔ میری الجھن کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ کوئی جن زاد ہی تھا تو مجھے اس کے وجود کی خوشبو محسوس کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال مجھے شام ہونے تک پریشان کرتا رہا اور پھر حسب معمول حاجت مندوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ میں نے برکت علی شاہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کہ میری توجہ کے مستحق دوسرے لوگ تھے۔

آدم زادوں کے دکھ سن کر میں بھی دکھی ہو جاتا۔ کسی کو روزگار کی تلاش ہوتی۔ کوئی اس وہم کا شکار ہوتا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ مختلف ذہنی بیماریوں کا شکار ہونے والے بھی میرے پاس آتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے جو مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے۔ میں ایسے خود غرضوں کو نرمی کے ساتھ سمجھا دیتا کہ آئندہ وہ میری کوشش کا رخ نہ کریں۔ عموماً میں کسی کے ساتھ سختی سے پیش نہ آتا۔ جائز حد تک مجھ سے جبر کی جو مدد ممکن ہوتی، اس سے گریز نہ کرتا۔ اس روز بھی یہی سب کچھ ہوتا رہا اور پھر مجھ سے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ لوگ چلے گئے تو میں نے کوشش کے دروازے بند کر لئے۔

اب مجھے یہ انتظار تھا کہ تھوڑی رات گزر جائے تو میں کوشش سے نکلوں۔ میں پریقین تھا کہ برکت علی شاہ آدم زاد ہو کہ جن زاد، اتنی جلدی ہار نہیں مانے گا۔ اس تک پہنچنے کی ایک راہ خود بخود استاد ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق آج رات برکت علی شاہ، بلیس جہاں کے پاس ضرور آئے۔ نفس کے غلام اپنے شکار کو آسانی سے نہیں چھوڑتے۔ اس نے خود بھی بلیس جہاں سے یہی کہا تھا کہ وہ آئندہ شب پھر اسی کے پاس ہوگی۔ یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ مجھ سے نبرد آزماؤں اور پھر ہپا ہو کر اس کا ارادہ بدل جائے گا یا وہ مجھ سے ڈر گیا ہوگا۔ ہپا ہو کر بھاگ جانے میں اس کی کوئی مصلحت بھی ممکن تھی۔ خود میں نے اپنی حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے بہت سے اسی طرح کے کھیل کھیلے تھے۔ عشاء کے بعد سناٹا چلنے تک میں انہی خیالوں میں گم رہا۔

انسانی قالب چھوڑ کر جب میں رام سوامی کے علاقے میں پہنچا تو وہاں کے گلی کوچے بھی دیران پڑے تھے۔

میں تقریباً آدمی رات تک بلیس جہاں کے گھر کا پہرا دیتا رہا، پھر اس کے گھر میں اتر گیا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک شعلہ سا بلیس جہاں کے کمرے کی طرف لپکا اور میرے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ کوئی بو محسوس نہ ہونے کے باوجود یہ بھی میرے لئے ایک واضح نشانی تھی۔ وہ شعلہ تو معدوم ہو گیا، مگر میرے شبیہ کی جگہ یقین نے لے لی۔ اس سے پہلے کہ میں بلیس جہاں کے کمرے میں داخل ہوتا اندر سے کھٹی کھٹی سی ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ اسی کے ساتھ بلیس جہاں کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”کک..... کون؟..... کون ہے؟“ چیخ سننے ہی شاید اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کمرے میں گھستے ہی وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اپنی گرفت

لے کر بلیس جہاں کے گھر سے نکل آیا۔ اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی اور یہ میرے ہی وظیفے کا نتیجہ تھا۔ بے خبری میں اس نے بلیس جہاں کے قریب پہنچنے ہی اپنے کئے کی سزا بھگت لی تھی۔

اسے ساتھ لئے اپنی کوششیں تک میں جلد ہی پہنچ گیا۔ اسے ہوش ہوتا تو شاید وہ مجھ سے چھپنے کے لئے اندھیرے کی چادر اوڑھ لیتا۔ ایسی صورت میں بھی میں اسے پک کر نہ جانے دیتا۔ حیرت تو مجھے اس پر تھی کہ وہ ایک مدت کے بعد ملا بھی تو کہاں اور کس حال میں۔ اسے میں اپنی خواب گاہ میں لے آیا تھا۔ اس کی حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”اے یاسف! اے میرے دوست، اے میرے دشمن! تجھے تو میں نے ملتان میں چھوڑا تھا، پھر یہاں کب اور کیسے آ گیا؟ تو نے تو مجھے حیران کر دیا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ.....“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”بس بس رہنے دے! اے علیالیش! تو بڑا بے وفا ہے۔ تو نے لوٹ کر کبھی میری خبر بھی نہیں لی۔“

”اور یہی میں تیرے لئے کوں تو؟“ میں بھی جواب میں بولا۔

”کھلے شکوے تو خیر ہوتے ہی رہیں گے، مگر آج تو نے مجھے مولوی کفایت اللہ کی یاد دلا دی۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تجھے آج مولوی کفایت اللہ کیسے یاد آ گیا؟“

”یاد کر کہ اس مولوی نے اپنی بیٹی زرگس کی چارپائی کے گرد حصار کھینچ رکھا تھا۔ کوئی زرگس کے قریب جائے تو نادیہ حصار سے ٹکرا جانے کے سبب دور جا کرے۔ تو اس مولوی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ یہ مجھے تیری ہی کارستانی معلوم ہوتی ہے کہ میں آج بلیس جہاں کو ہاتھ نہ لگا سکا۔“

”ہاں میں نے ہی بلیس جہاں کی حفاظت کا بندوبست کر لیا تھا اے یاسف۔“ میں نے اعتراف کر لیا۔

”اور ساتھ ہی مجھے بھی اپنی گرفت میں لینے کا بندوبست کر لیا تھا، یہ کیوں نہیں کرتا۔“

”مجھے کیا خبر تھی اے یاسف کہ تو وہاں آئے گا، اور یہ کہ تو ہی برکت علی شاہ کے پردے میں چھپا ہوگا۔ یہ بتا کہ تو نے اپنے وجود کی مخصوص بو مجھے کس طرح محسوس نہ ہونے دی؟ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ میں نے وہ اہم سوال کیا جو میرے لئے الجھن کا سبب بنا ہوا تھا۔

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا، پھر بولا۔ ”یہ دیکھ کہ میں نے تجھے کیسا چکر دیا۔ تجھ کو تو میں پہلے ہی روز پہچان گیا تھا۔ میں جان بوجھ کر تجھ سے دور ہی دور رہا کہ تجھ پر نیکی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ تو مجھے بھی چین سے اس شہر میں نہ رہنے دیتا۔“

”تو پھر بے وفا تو ہوا کہ میں؟ خود ہی تو نے قبول دیا کہ دانستہ میرے قریب نہ آیا، مگر یہ کب کی بات ہے؟“

”تو اس وقت نیا نیا اس شہر میں آیا تھا اور ایک آدم زاد نوجوان کی مدد کر کے نیکیا کما رہا تھا۔“

”ان قصوں کو چھوڑ اور میرے سوال کا جواب دے کہ مجھے تیری بو محسوس کیوں نہ ہوئی؟“ میں

نے یاسف کو یاد دلایا۔

”اس کے لئے مجھے بڑے پابز بیانا پڑے اے علیا لیش۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے کہ جب تو مجھے ملتان میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔“ یاسف مجھے بتانے لگا۔ ”میں تیری ہی تلاش میں بھٹکتا ہوا ملتان کے ایک نواحی علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے ہاموس ہی کی طرح ایک عالم جن زاد ملا۔ وہ ہاموس کی طرح نرم مزاج نہیں تھا۔ اس نے مجھے بے راہ روی کی سزا دینے کے لئے قید کر دیا۔ بڑی منت سہانت اور گریہ و زاری کے بعد اس نے مجھے رہائی دی۔ اس کی شرط یہ تھی کہ میں اولیاء کے شہر ملتان کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ مجھے کچھ دن اپنی خدمت کرنے کا موقع فراہم کر دے۔ وہ مان گیا اور مجھ سے توبہ کرائی کہ اب قوم جنات کو گناہ کے راستے پر چل کر بدنام نہیں کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ وقتی طور پر ہی سہی میں بدل گیا۔ اسی نے مجھے قوی عفریوں سے بچنے کے لئے ایک ایسا عمل تعلیم کیا کہ میرے ہی ہم قوم دوسرے جن زاد بھی میری بومحسوس نہ کر سکیں۔ تجھے تو خبر ہے کہ یکسانی میرے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ سو ایک روز میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے فرار ہو گیا۔ خوفزدہ ہو کر میں اس شہر سے بہت دور نکل آیا۔ تجھ سے بچھڑ جانے کا مجھے بہت رنج تھا۔ سو ایک مرتبہ پھر تیری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا، لیکن اس کے لئے ملتان کی طرف نہ گیا۔“ یاسف کے لہجے میں مجھے اپنے لئے محبت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد مجھ پر کیا گزری! یہ میں تجھ سے نہیں چھپاؤں گا کہ تویی تو میرا ایک دوست ہے، لیکن اے علیا لیش! اپنی سنا کہ تو کہاں چلا گیا تھا؟“

مختصر طور پر اس سے میں نے اپنی روداد بیان کر دی۔

”مجھے پہلے ہی اندازہ تھا اے علیا لیش کہ تو کبھی سدھر نہیں سکتا۔“ یاسف کہنے لگا۔ ”ہم دونوں ایک ہی دریا کے دو کناروں کی طرح ہیں جو ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ نہ میری فطرت بدلے گی نہ تیری سرشت لیکن ہم دونوں کے درمیان جو ایک دوستی کا رشتہ ہے، وہ ضرور قائم رہے گا۔“

پھر یاسف نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ پنجاب کی حدود سے نکل کر وہ ہندوستان کے ایک شہر ناہپور میں جا بسا۔ میری صحبت میں اسے بھی اب آدم زادوں کے درمیان رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ جو فیصلہ میں نے اب کیا، یاسف بہت پہلے کر چکا تھا، لیکن ہم دونوں کا مقصد ایک نہیں تھا۔ وہ پھر اپنی پرانی روش پر آ گیا۔ اس لئے انسانی قالب اختیار کر کے وہ پیر برکت علی شاہ بن گیا۔ اس نے آدم زادوں کو اپنا مرید بنانا شروع کر دیا۔ ان میں اکثریت خوب صورت آدم زادیوں کی تھی۔ وہ اپنی جناتی صفات کو کام میں لا کر ان آدم زادوں کو اپنا گردیدہ بنا لیتا۔ ظفر کی سوتیلی ماں امغری بھی انہی میں سے ایک تھی۔ یاسف کو وہ کچھ زیادہ ہی بھاگتی۔ وہ امغری کے ناز اٹھاتا اور اس کی ہر جا اور بے جا خواہش پوری کرتا۔ امغری کا شوہر قمر احمد بھی اس کا مرید بن گیا۔ یہ بات بھی یاسف کے علم میں تھی کہ اس کی منظور نظر امغری اپنی سوتیلی اولاد سے نفرت کرتی ہے۔ امغری کی ضد پر یاسف کو ایک نقش لکھ کر دینا پڑا۔ اس نقش کو زعفران سے کسی برتن پر لکھ کر اسے دودھ میں ملانا تھا۔ امغری کی معصوم سوتیلی بیٹی آمنہ اسی قابل نقش کا شکار ہوئی۔

امغری ہی کے عشق میں یاسف بھی کراچی آ گیا۔ اس نے یہاں آ کر بھی وہی سلسلہ جاری رکھا۔ سولجر بازار میں ایک قدیم طرز کی کوٹھی پر اس نے قبضہ کر لیا۔ اسی بڑی کوٹھی کے ایک حصے میں وہ خود رہتا اور دوسرے حصے میں امغری اور قمر احمد۔ اپنی محبوبہ امغری کو اس نے ساتھ ساتھ رکھا۔ امغری کے شوہر قمر احمد کو اس نے ایک بڑے سرکاری عہدے سے لگوا دیا۔ امغری کے عشق کے باوجود یاسف اپنی فطرت کے مطابق دوسری آدم زادیوں کی زلفوں کے خم بھی سنوارتا رہا۔ اسی عرصے میں یاسف نے جب مجھے کراچی میں دیکھا تو چونکا ہو گیا۔ اس نے مجھے خبر کی راہ پر گامزن دیکھا تو اپنا دامن بچا گیا۔ مگر میری طرف سے بے خبر نہیں رہا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کبھی نہ کبھی اس سے میری مذہبیز ضرور ہوگی۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد اس کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب میں نے امغری کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو وہ آڑے آ گیا۔ اس نے میرے اور امغری کے درمیان اس لئے بھی اندھیرے کی دیوار حائل کر دی کہ میں کہیں اس کے ٹھکانے تک نہ پہنچ جاؤں۔ پھر بھی اسے یہ اطمینان تھا کہ میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔ وہ اسی لئے بڑی دلیری کے ساتھ پیر برکت علی شاہ بن کر میری کوٹھی تک آ پہنچا۔

یاسف بھی میری طرح ایک جن زاد تھا، سو مقابلہ برابر ہی رہتا۔ وہ اسی لئے نہیں گھبرایا۔ اس کی آمد کا اصل مقصد محض یہ تھا کہ وہ مجھے رعب میں لے کر اپنی محبوبہ امغری کو میری گرفت میں آنے سے بچالے۔ اسی عرصے میں یقیس جہاں اس کی نظر میں آ گئی اور بیس دن مار کھا گیا۔ اپنی شخصیت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ دانستہ میرے مقابلے میں نہ نکلا اور مجھ سے نبرد آزما ہو کر پسپائی کا ڈھونگ بھی رچایا، پھر بھی اس کا راز کھل ہی گیا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر یاسف چاہتا تو میری بے خبری کا فائدہ اٹھا کر مجھے کوئی نقصان پہنچا دیتا، لیکن ایسا نہ کیا۔ اسے بہر حال مجھ سے دیرینہ دوستی کا خیال تھا۔ میں اور وہ ایک دوسرے کے لئے کھلی کتاب کی طرح تھے۔

جب ہم ایک دوسرے سے اپنے اوپر گزرنے والے واقعات بیان کر چکے تو میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اے یاسف! وہ عورت امغری لاکھ تیری کمزوری سہی لیکن اس بات کو مان لے کہ وہ ظالم ہے۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”محبوب تو ہمیشہ ظالم ہی ہوتے ہیں۔ کیا تیری محبوبہ زگرس نے تجھ پر ظلم نہیں کیا؟“

”اے یاسف! وہ اور قصہ تھا، یہ اور معاملہ ہے۔ بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کر۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر تویی بتا دے کہ کیا چاہتا ہے؟“

”ایک معصوم بچہ اپنے باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہو گیا ہے۔ خودی سوچو کیا اسے یہ حق نہیں کہ.....“

”سارا فساد بیس سے شروع ہوا ہے۔“ یاسف نے میری بات کاٹ دی۔ ”نہ وہ آدم زاد بچہ تیری نظر میں آتا، نہ تجھے امغری کی تلاش ہوتی۔ اے علیا لیش! تو بس یہی چاہتا ہے کہ وہ بچہ اپنے باپ تک

پہنچ جائے؟“

”صرف یہی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اے امغری کے ظلم سے بھی بچانا ہے۔ ہرچند کہ وہ ظالم آدم زادی امغری قابل معافی نہیں، لیکن صرف تیری دوستی کی خاطر اور یہ لحاظ کر کے کہ وہ تیری منظور نظر ہے، میں اسے کوئی سزا نہیں دیتا۔ اس نے جو گناہ کئے ہیں، آخرت میں ان کی سزا سے نہ بچ سکے گی۔“

”امغری کو میں خوب جانتا ہوں۔“ یاسف نے بتایا۔ ”تو نے غلط نہیں کہا کہ وہ ظالم عورت ہے۔ اس کی فطرت بدلتا ممکن نہیں۔ وہ کسی صورت اپنے سوتیلے بیٹے کو قبول نہیں کرے گی۔ پہلے بھی میں نے اسے ایک بار سمجھانا چاہا تھا کہ جب وہ اپنی سوتیلی بیٹی کو راستے سے ہٹانے کی ضد کر رہی تھی۔ تب بھی وہ نہیں مانی۔ تو اسے میری کمزوری سمجھ لے یا اسے کوئی اور نام دے لے، میں امغری پر اس معاملے میں کوئی جبر نہیں کر سکتا۔“

یاسف کے درمیان آجانے کی وجہ سے یہ معاملہ الجھ سا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے یاسف سے کہا۔ ”تجھے تو شادی شدہ آدم زادیاں پسند نہیں تھیں، پھر تو نے کس طرح امغری کو اپنا لیا؟ تجھ میں یہ تبدیلی کب اور کیسے آگئی؟“

”تو نے یہ سوال بھی خوب کیا اے علیالیش!“ یاسف ہنس دیا۔ ”ان آدم زادوں کی صحبت نے تھوڑا بہت تو مجھے بھی خراب کر ہی دیا ہے۔ سو مجھ میں اب یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ تو نے سنا ہی ہوگا کہ آدمی کو خراب ہوتے دیر نہیں لگتی تو پھر ہم جن زادان کے ساتھ رہ کر خراب ہونے سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ پھر بھی مجھے یقیں جہاں جیسی آدم زادیاں اب بھی اچھی لگتی ہیں۔“

”یہ تو نے کیا خرافات شروع کر دی۔“ میں بولا۔

”خود تو نے تو یہ ذکر چھیڑا تھا اے علیالیش۔“

”لیکن اس سے میرا مقصد کچھ اور تھا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ مقصد بھی بیان کر ہی دے۔“

”جہاں تک میرا اندازہ ہے تو امغری اور اس کے شوہر کی ازدواجی زندگی میں رخنہ ڈالنے سے باز نہیں آیا ہوگا۔“

”ظاہری بات ہے۔“ یاسف جواب میں بولا۔ ”جب آدم زاد اپنے رقیبوں کو برداشت نہیں کرتے تو ہم جن زاد کس طرح.....“

”اس کے لئے تو نے یقیناً قراحہ کو کوئی فریب دیا ہوگا۔“ میں بول اٹھا۔

”فریب تو خیر اسے نہیں کہا جاسکتا، اسے سچی بات کہنا زیادہ مناسب ہے۔ میں نے قراحہ کو تا پور ہی میں یہ بتا دیا تھا کہ امغری پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔ اگر اب اس نے امغری کی مرضی کے خلاف قریب جانا چاہا تو زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ قراحہ میرا مرید تھا، سو اس نے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی اور اس پر آج تک عمل کر رہا ہے۔“ یاسف نے تفصیلی جواب دیا۔

”اب تو میری ایک اور بات کا جواب دے اے یاسف کہ ایسی صورت میں قراحہ نے تیری

شادی کیوں نہیں کی؟“

”اے علیالیش! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ امغری جب سوتیلی اولاد کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوئی تو اپنی سوکن کو کس طرح برداشت کر لیتی۔ اس سلسلے میں قراحہ نے ایک مرتبہ مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ میں نے امغری سے بات کی تو وہ برہم ہو گئی۔ امغری کو یہ خطرہ تھا کہ قراحہ نے ایک اور شادی کر لی تو اس کے عیش میں کمی آجائے گی۔ وہ بس اپنے ڈھب کی الگ ہی عورت ہے۔ اسے میں نے یہ بھی سمجھایا کہ میری موجودگی میں اس کو مال و دولت اور عیش و آرام کی کیا فکر لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ مجبوراً میں نے قراحہ سے کہہ دیا کہ وہ تیری شادی نہ کرے۔“

”بڑی ہی کمینگی، ذلیل اور گھٹیا عورت ہے وہ۔ اس طرح تو وہ اپنے شوہر پر بھی ظلم کر رہی ہے۔ تجھے کم سے کم اس عورت کی یہ بات تو نہیں ماننا چاہئے تھی۔“ مجھ سے اپنا غصہ برداشت نہ ہو سکا۔

میری صاف گوئی پر یاسف خفا نہ ہوا اور کہنے لگا۔ ”قراحہ بے چارہ تو اب بھی اسی آرزو میں میری ہر خدمت بجالاتا رہتا ہے کہ شاید اسے میں تیری شادی کرنے کی اجازت دے دوں۔ تجھے تو خبر ہے کہ مجھے آدم زادوں پر کم ہی رحم آتا ہے، لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی قراحہ پر ترس آنے لگتا ہے۔ سب کچھ اس کے پاس ہے، پھر بھی اسے سکون نہیں۔ چند ماہ پہلے امغری سے میں نے پھر بات کی تھی۔ پہلے کی نسبت اب اس کے رویے میں کچھ نرمی آگئی ہے۔“

میں نے انکار میں سر ہلایا اور بولا۔ ”تو کچھ بھی کہہ لے اے یاسف! وہ عورت راہ راست پر آنے والی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے یاسف کو مخاطب کیا۔ ”ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی اے یاسف۔ ایک طرف تو قراحہ اپنی بیوی امغری کے قریب نہیں جاسکتا۔ تو نے اسے روک دیا ہے۔ دوسری جانب قراحہ پر ترس بھی آتا ہے۔ پھر یہ امغری اسے تیری شادی بھی نہیں کرنے دیتی۔ ایسا ہے تو پھر ان دونوں کو ضرورت کیا ہے، ساتھ رہنے کی؟ ذرا سوچ کہ اگر قراحہ اس ظالم کو طلاق دے دے تو کیا فرق پڑ جائے گا؟ تجھ پر یا امغری پر؟“

”یہ بات کبھی میرے دھیان ہی میں نہیں آئی۔“ یاسف نے جواب دیا۔ ”کچھ ایسا بھی ہے کہ کبھی مجھے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔“

”لیکن اب اس کی ضرورت ہے۔“ میں نے پُر زور آواز میں کہا۔

”وضاحت کر اپنی بات کی۔“ یاسف بولا۔ ”اب ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے کہ قراحہ سے امغری کو طلاق دلوائی جائے؟“

”ایک بات تو یہ سن لے اے یاسف کہ اس معاملے میں تو مورد الزام نہیں ٹھہرے گا۔ پھر یہ کہ طلاق دینے کا حق مرد کو ہے، عورت کو نہیں۔ تو اپنی صفائی میں، امغری سے یہ کہہ سکتا ہے کہ قراحہ نے طلاق دینے سے پہلے تیری اجازت نہیں لی۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ بہت دن سے تیری شادی کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال یہ تو جانے کہ اپنی محبوبہ کو کس طرح مطمئن کرے گا۔ طلاق ہونے کی صورت میں ظاہر ہے

کہ وہ سفاک عورت امغری، قمر احمد کے ساتھ نہ رہ سکے گی۔ اس طرح ایک معصوم اور بے گناہ بچہ کو اس کا باپ مل جائے گا۔ ایک باپ اور بیٹے کے درمیان حائل ہونے والی دیوار ہمیشہ کے لئے گر جائے گی۔“

میری بات سن کر یاسف کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔ ”جو حالات ہیں ان میں تیری تجویز بری تو نہیں، بس ذرا امغری کو اس سے دھچکا لگے گا۔“

”تو لگا کر دھچکا۔ میری مان یاسف، تو امغری سے نکال پڑھوالے یوں بھی تو نے انسانی قالب اپنا رکھا ہے۔ تجھ پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح تو گناہ سے بھی بچ جائے گا۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”تو نے بھی تو ایک آدم زادی سے نکاح کیا تھا اے علیالیش!“ یاسف نے مجھ پر ٹھوکر مارا۔ ”پھر اسے چھوڑ کر کیوں بھاگ آیا؟ یاد آیا کچھ؟..... وہی پڑا سرا ر تو تیں رکھنے والی لیتا کو جو تجھے لاہور سے اغوا کر کے اپنی ریاست میں لے گئی تھی۔ تو نے ہی تو مجھے سب کچھ بتایا تھا کہ وہ ریاست کے مسلمان فرمانروا کی بیٹی تھی۔ تیری ہی خاطر وہ مسلمان ہوئی اور پھر تیرا جی اس سے بھر گیا تو اسے چھوڑ آیا۔ اب مجھے بڑا نیک اور پارسانہن کر امغری سے نکاح کرنے کو کہہ رہا ہے۔“

”ہاں اے یاسف! مجھے سب یاد ہے۔ میرے دامن پر بھی بہت داغ ہیں اور ان پر میں سخت شرمندہ ہوں۔ میں نے کب اپنی نیکی اور پارسانہی کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے تو تیرے سامنے ایک تجویز رکھی ہے جس میں تجھے کوئی گھانا نہیں۔“ میری آواز میں ندامت تھی۔

یاسف پر اس کا اثر ہوا اور بولا۔ ”اے میرے دوست علیالیش! اتنا طول اور شرمندہ نہ ہو کہ تو نے مجھے کوئی غلط مشورہ نہیں دیا۔ تیرے اس مشورے پر میں غور کروں گا۔ کل تک تجھے میرا جواب مل جائے گا اور کل ہی تجھے میں اپنے ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔ اب مجھے جانے دے کہ بہت تھک گیا ہوں۔“

”کل تو کب تک آئے گا اے یاسف؟“ میں نے پوچھا۔

”دوپہر ہونے سے پہلے۔ مجھے معلوم ہے کہ تو شام کو جمع لگاتا ہے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنسا۔

یاسف تو چلا گیا، مگر اس رات مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ اس نے میرے ماضی کے بہت سے زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ اور بہت سی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ ان باتوں کا تعلق ماضی سے نہیں حال سے تھا۔ یاسف سے مل کر ہی کوئی راہ نکلنے کی امید تھی۔

☆=====☆

دوسرے دن یاسف وعدے کے مطابق وقت پر آگیا۔ اب میں اور وہ ہم دونوں ہی انسانی قابلوں میں تھے۔

”اور کیا حال ہیں مقصود میاں؟“ اس نے آتے ہی مجھے پھینچا۔

”پیر برکت علی شاہ کو رشتہ ازدواج کی بیڑی پہنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ میں نے بھی اسی

کے لہجے میں جواب دیا۔

”میرے سر پر سہرا سجانے سے پہلے دلہن کو تو دیکھ لیا ہوتا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”دلہن کو تو خیر میں دیکھ ہی چکا ہوں، لیکن اس نے بھی تمہیں دیکھا ہے یا نہیں؟“

”نہ دیکھنے کا کیا مطلب؟ برسوں گزر گئے دیکھتے ہوئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں تمہارے ظاہر کی نہیں، باطن کی بات کر رہا ہوں۔ یہ دیکھنا تو نظر کا دھوکا ہے۔ کیا وہ تمہاری حقیقت سے واقف ہے کہ تم جن زاد ہو؟“

”نہیں، میں نے اسے آج تک یہ نہیں بتایا۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ وہ بس یہ جانتی ہے کہ میں پڑا سرا ر قوتوں کا مالک ہوں اور میرے دوسرے مریدوں کو بھی یہی خبر ہے۔ سبھی کو یہ غلط فہمی ہے کہ میرے قبضے میں جنت ہیں۔“

”اور یہ غلط فہمی خود تمہی نے پیدا کی ہوگی تاکہ تمہارے مرید تم سے مرعوب رہیں۔“ میں بولا۔

”دیے ہے یہ دلچسپ بات کہ خود ایک جن زاد یہ غلط فہمی پیدا کر دے کہ خود تو وہ آدم زاد ہے اور اس نے جنت کو قابو میں کر رکھا ہے۔“

”کیا کیا جائے! آدم زادوں کے درمیان رہنا ہے تو اپنی حقیقت چھپائے رکھنے کے لئے یہ کھیل تو کھیلنے ہی پڑتے ہیں۔ خود تمہی نے تو مجھے اس راہ پر ڈالا ہے۔ تم کون سے کم ہو۔ ایک جن زاد ہو کر مقصود میاں بنے بیٹھے ہو۔ بس ایک کمی رہ گئی کہ تمہاری طرح میں نے حکیم جن زاد خاشع سے حکمت نہیں سیکھی۔“

”اچھا ہی ہوا ورنہ وہ تمہیں بھی اپنی شاعری سنانا کر لو لہان کر دیتا۔“ حکیم خاشع کے ذکر پر مجھے بھی ہنسی آگئی۔

”مجھے تو اس پر خوشی ہوئی کہ ملتان کی طرح یہاں بھی تمہیں ایک رابعہ مل گئی۔ تمہیں یاد ہے ہا کہ حکیم نیراس الدین کی بڑی بیوی کا نام رابعہ ہی تھا۔“

”ہاں یاد ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”وہ بھی ایک نیک اور شریف عورت تھی۔“

”تمہاری قسمت میں تو نیک عورتیں ہی لکھی ہیں۔ تمہیں ہی مبارک ہوں یہ نیک اور بوڑھی آدم زادیاں۔“

”اور تمہیں ایک سے ایک بچتی ہوئی ملتی ہے، جیسے یہ امغری ہے۔“

”اچھا تو پھر چلو، اس کے دیدار کر لو۔ دور کے جلوے اور قریب کے جلوے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

”یہ تو بتا دو اے یاسف کہ تم نے میری تجویز قبول کی یا نہیں؟“ انسانی قالب میں ہونے کے سبب ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو تہذیب کے ساتھ مخاطب کر رہے تھے اور ایسا دانستہ نہیں تھا۔ میں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”تم نے مجھ سے آج ہی جواب دینے کو کہا تھا نا۔“

”تو پھر خوش ہو جاؤ مقصود میاں کہ پیر برکت علی شاہ، امغری بیگم کو اپنے عقد میں لینے پر راضی

ہو گیا۔

”مبارک ہو کہ آخر کار تم راہ پر آئی گئے۔“ میں بولا۔ پھر گزشتہ رات کو جو بات میں نے سوچی تھی، وہ بھی میری زبان پر آگئی۔ ”تمہارے لئے تو دلہن کا انتخاب ہو گیا، قمر احمد کے لئے میں نے پہلے ہی دلہن ڈھونڈ رکھی ہے۔“

”سمجھ گیا میں اے علیا لیش! تم بڑے بچپنے ہوئے جن زاد ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”تمہارا اشارہ یقیناً بلیس جہاں کی طرف ہے کہ وہ بھی ٹھکانے لگ جائے۔“

”ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔ اس طرح دو آدم زادوں کو عذابوں سے نجات مل جائے گی۔“

”اور تمہارے نامہ اعمال میں مزید نیکیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ اب سمجھا میں کہ تم نے ایک ہی تیر سے کئی شکار کئے ہیں۔ تم اسی لئے اصغری کو قمر احمد سے طلاق دلوا رہے ہو۔ چلو تمہاری دوستی میں مجھے یہ بھی منظور ہے۔ کسی آدم زادی سے نکاح بھی پڑھوا لیتا ہوں۔“

”آج یہ یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اصغری کو قمر احمد سے طلاق دلواؤ اور میں‘ بلیس جہاں کو سلام سے طلاق دلواتا ہوں۔ طلاق کے بعد اصغری اور بلیس جہاں کی عدت کے دن ایک ساتھ پورے ہوں تو اچھا ہے۔“

”بہتر ہے اے میرے دوست علیا لیش کہ اب تم فتوے بھی دینا شروع کر دو۔ عدت وغیرہ کے دنوں کا شمار تو تم نے شروع کر ہی دیا ہے۔“

یاسف کی بات پر میں صرف ہنس کر رہ گیا اور پھر اس کے ساتھ چل دیا۔

قدیم طرز کی وہ کوٹھی کہ جس پر یاسف نے قبضہ کر لیا تھا، خاصی بڑی تھی۔

”یہاں تو ایک ساتھ کئی خاندان رہ سکتے ہیں۔ اس کے تو کئی حصے ہیں۔“ یاسف کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ ”گلتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی امیر ہندو خاندان رہتا ہو گا جو قیام پاکستان کے بعد یہاں سے ہندوستان چلا گیا ہو گا۔“

”ہاں سنائی ہے۔“ یاسف نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ پھر وہ مجھے اپنی نشست گاہ میں لے آیا۔ وہاں ایک طرف دیوار سے لگا چھوٹا سا تخت پڑا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں سے لگی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نشست گاہ کی اونچی چھت بھی کھمبل کی تھی۔ وہ تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھالیا اور کہنے لگا۔ ”دوسرے لان کی طرف کوٹھی کا جو حصہ ہے، وہاں قمر احمد اور اصغری رہتے ہیں۔ یہ حصہ میرے استعمال میں ہے جو میں نے تمہیں دکھایا ہے۔ بظاہر کوٹھی کے دونوں حصے باہر سے الگ الگ دکھائی دیتے ہیں، مگر اندر سے ملے ہوئے ہیں، اصغری اور میرے دل کی طرح۔ میں اسے بلاتا ہوں، تم یہیں بیٹھو۔“

”کیا وہ پردہ نہیں کرتی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہندوستان میں تھی تو برقع اور مٹھی، یہاں آکر برقع اتار گیا اور اس کی جگہ چادر نے لے لی۔ ناگپور میں اس کا شوہر ایک دفتر میں ہیڈ کلرک تھا، اب وہ بڑا سرکاری افسر ہے تو پھر دن پھر جانے کے ساتھ

ساتھ لباس اور وضع قطع کیسے نہ بدلتی۔ اب تو قمر احمد بھی اصغری کو بیگم صاحبہ کہتا ہے۔“ یاسف یہ کہتا ہوا اٹھ گیا۔

میری کوٹھی کی طرح یہاں بھی کوئی ملازم نہیں تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کوٹھی کے دوسرے حصے میں ملازم ہوں۔ میری طرح یاسف بھی محتاط تھا۔ ملازموں کی موجودگی ہم جن زادوں کی آزادی میں حارج ہوتی ہے کہ کیا خبر کب انسانی قالب چھوڑنا پڑے یا پھر کوئی اور ایسی صورت حال سامنے آجائے جس کے لئے تنہائی ضروری ہو۔

مجھے زیادہ دیر تک یاسف کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ توقع کے مطابق وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اصغری بھی تھی۔ اصغری کا جسم جیسے سانپے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ تیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں ہوگی۔ تھکے نفوش اور پُرکشش حسین چہرے والی اس عورت کو دیکھ کر شاید ہی کوئی یہ اندازہ لگا پاتا کہ وہ اندر سے اتنی سفاک اور بے رحم ہوگی۔

میں اس ظالم عورت کو کم از کم ذہنی اذیت تو پہنچای سکتا تھا، اسی لئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے اصغری بیگم ایک مدت سے اپنے شوہر کو دھوکا دے رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہے۔ پھر بھی کبھی یہ بات میری زبان پر نہیں آئے گی۔“

اصغری کا چہرہ فٹ ہو گیا۔ یاسف نے بھی اندازہ کر لیا کہ میں اس عورت کو دانستہ ذلیل کر رہا ہوں۔ اس نے اسی لئے مجھ سے کہا۔ ”مقصود میاں! پہلی ہی ملاقات میں تمہیں ہماری اصغری بیگم کو اتنا پریشان نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ تو بہت بھولی بھالی ہیں۔“

”ہاں ان کے چہرے سے تو یہی پتا چلتا ہے۔“ میں نے اس عورت کو پھر بھی معاف نہ کیا۔

یاسف کی شہ پار اصغری کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کی آواز میں نرمی نہیں تھی۔ ”آپ ان کے دوست ہیں اس لئے کچھ نہیں کہتی ورنہ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس طرح زبان درازی کرنے پر ہرگز اسے معاف نہ کرتی۔“

”اور یہ بھی نہ بھولو اصغری کہ اس وقت مقصود میاں میرے اور تمہارے دونوں کے مہمان ہیں۔ کسی مہمان سے اس طرح سخت لہجے میں بات نہیں کرتے۔“ یاسف نے اصغری کو سمجھایا۔ ”اچھا اب تم جاؤ۔ قمر احمد کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ وہ مجھ سے تمہاری شکایت کر رہا تھا کہ تم اس کا خیال نہیں رکھتیں۔“

”ہونہ!“ اصغری نے فحقی کے انداز میں گردن کو جھکا دیا۔ ”مجھے پروا نہیں۔ کرتے رہیں وہ آپ سے شکایتیں۔ میں ان کے رعب میں نہیں رہتی۔“

اصغری کی اصلیت ظاہر ہونے لگی۔ آج جو کچھ ہونے والا تھا، یاسف اسی کے لئے یہ تمہید باندھ رہا تھا۔ اسی غرض سے وہ مزید بولا۔ ”کچھ بھی سہی، وہ بہر حال تمہارا شوہر ہے۔ جب وہ دفتر سے آیا کرے تو تم اس سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا کرو۔“

”اگر آپ مجھ سے اسی لئے جانے کو کہہ رہے ہیں تو میں نہیں جاؤں گی۔ میں ان کی بیوی ہوں“

کوئی ملازمہ نہیں کہ جب وہ دفتر سے آئیں تو خدمت کے لئے کھڑی رہوں۔“ اصغری اس طرح بول رہی تھی کہ اچھا خاصا چہرہ بگڑ گیا۔

”میں تو تمہیں اس لئے سمجھا رہا تھا کہ آج کل قمر احمد کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ یاسف نے بات اور آگے بڑھائی۔

”تو کیا بگاڑ لیں گے وہ میرا؟“

”میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، باقی تم جانو۔“

”مجھے تو سمجھا رہے ہیں آپ، انہیں بھی سمجھا دیجئے گا کہ زیادہ اونچے نہ اڑیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے انہی۔

”وہ آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دیتا۔“

”ٹھیک ہے، بھیج دوں گی۔“ یہ کہتی ہوئی وہ نشست گاہ سے چلی گئی۔

سرکاری دفاتر کا وقت دوپہر تک ہی تھا اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ یاسف نے اسی لئے قمر احمد کو بلوایا تھا۔ اصغری چلی گئی تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے قمر احمد کو اس لئے بلوایا ہے کہ تم بھی اس سے بات کر سکو۔ آج کا دن اس کے لئے یقیناً بڑی خوش خبری کا ہوگا۔ اصغری سے تو اس کے کوئی اولاد ہوئی نہیں اسی لئے اسے اکثر اپنا پھڑا ہوا بیٹا یاد آتا رہتا ہے۔ مجھ سے بھی اس نے کئی بار کہا کہ میں اس کے کھوئے ہوئے بیٹے کا سراغ لگاؤں، لیکن اصغری کی وجہ سے اسے ٹال دیا۔ قمر احمد خود یہ دیکھ چکا ہے کہ میں نے اپنی ایک مریدہ کی کھو جانے والی بیٹی کے بارے میں بالکل صحیح پتا نشان بتا دیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر وہ بیٹی مل گئی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قمر احمد کے لئے خوشی ہی کا سبب ہوگی کہ اصغری سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے، یہ کونسی اتنی بڑی ہے کہ اصغری طلاق کے بعد کہیں بھی رہ سکتی ہے۔ اس کے لئے ملازموں کا بندوبست میں کر دوں گا، کیوں کہ اب اس سے گھر کا کام دھندا نہیں ہوتا۔ یوں بھی اصغری جیسی خوب صورت عورتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں تو بس ناز اٹھانے جانے کے لئے ہوتی ہیں۔“

”یہ بھی کہو کہ ناز اٹھانے والا کوئی تم جیسا ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ وہ خالم عورت کیوں کہ میرے دوست یاسف کی منظور نظر تھی اس لئے بات کو میں نے ہنسی میں اڑا دیا ورنہ تو کچھ اور ہی کہتا۔ اس سے کچھ ہی دیر گفتگو کر کے مجھے ظاہر و باطن کے فرق کا پتا چل گیا تھا۔ کسی نے غلط نہیں کہا تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔

میری بات پر یاسف کا چہرہ کھل اٹھا اور بولا۔ ”سبحان اللہ! تم ایسی ہی باتیں کیا کرو تو کتنے اچھے لگو۔“

اسی وقت دور سے کسی کے قدموں کی بھاری آواز سنائی دی۔

”شاید قمر احمد آ رہا ہے۔“ یاسف نے کہا اور سنجیدہ نظر آنے لگا۔

نشست گاہ کے دروازے سے داخل ہونے والا شخص سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی بھی سلیٹے سے

بند ہوئی تھی۔ سوٹ بوٹ اور اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ کوئی بڑا سرکاری افسری دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی لمبی کے سبب دفتر سے آکر اس نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے سے فکر مندی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سیدھا تخت تک آیا۔ یاسف نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس شخص نے ہاتھ چوم کر اسے اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا اور پھر دست بستہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ قمر احمد۔“ یاسف نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”تمہیں یقیناً حیرت ہوگی کہ ہم نے آج اس وقت کیوں طلب کر لیا۔ تو اس کی وجہ ہمارے یہ عزیز دوست مقصود میاں ہیں۔ یہ تم سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ تمہیں لازم تھا کہ ہماری طرح ان کی بھی دست بوسی کرتے۔ دیکھا نہیں تم نے کہ یہ ہمارے قریب تخت پر بیٹھے ہیں۔ آج تک تم نے اس طرح کسی کو ہمارے ساتھ تخت پر بیٹھے دیکھا ہے؟“ یاسف یقیناً اس پر میرا رعب ڈالنا چاہتا ہوگا ورنہ یہ سب کہنے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔

”غلطی ہوگئی حضور۔“ قمر احمد یہ کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا۔ ”نہیں۔“ میں نے اسے روک دیا۔ ”یہ ہمارا طریقہ نہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کسی بندے کو اپنے ہی جیسے دوسرے بندے کے سامنے نہیں جھکتا چاہئے۔“

”یہ جھکتا دراصل تعظیم دینے کا ایک طریقہ ہے۔“ یاسف نے وضاحت کی۔ ”اس کا مقصد کوئی اور نہیں۔“

قمر احمد کے چہرے پر الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایک طرف اس کے پیر کا حکم تھا کہ وہ جھک کر میرے ہاتھ چومے، دوسری طرف میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

”اپنے اپنے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہے۔“ میں نے یاسف نے کہا۔ ”بات صرف نیت کی ہے ورنہ تو اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکتا کسی بھی صورت مناسب نہیں۔“ پھر میں قمر احمد سے مخاطب ہوا۔

”اپنے پیر کی تعظیم اور حکم پر تم اٹھ کھڑے ہوئے یہی کافی ہے۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا، بیٹھ جاؤ اب۔“

اس مرتبہ یاسف کچھ نہ بولا۔ میں نے قمر احمد کے ذہن پر توجہ مرکوز کی تو چونک اٹھا۔ اس وقت قمر احمد کے چہرے پر جو فکر مندی تھی اس کی وجہ ناوقت طلبی نہیں کچھ اور ہی تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کی سرکاری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یاسف نے مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا، نہ میں نے ہی پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ میں تو کسی اور ہی غرض سے آیا تھا، سو پہلے وہی گفتگو ضروری سمجھی۔

”قمر احمد، تم اس وقت جس وجہ سے پریشان ہو، وہ ہم سے چھپی ہوئی نہیں، لیکن اس پریشانی کوئی اگلا بھول جاؤ۔“ میں نے اسے مخاطب کیا تو اس کے چہرے پر توقع کے مطابق حیرت کے آثار ابھرے۔ اس کی عمر چالیس برس کے قریب ہوگی، قد لمبا، رنگ سانولا اور چہرہ کتابی تھا، شخصیت متاثر کن ہی تھی۔ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا جو نااہل ہونے کے باوجود موقع سے فائدہ اٹھا کر یا سفارش و رشوت کی بنا پر بڑے سرکاری عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کی ضعیف الاعتقادی، گھریلو مکون و اطمینان کی بربادی اور خواری کا سبب میرا ہی ہم قوم اور دوست، یعنی ایک جن زاد یاسف تھا۔

میرے دل میں اسی لئے اس کے حالات جان کر ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ اگر چاہتا بھی تو یاسف کی گرفت سے نکل نہ پاتا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں اپنا بیٹا ظفر احمد یاد ہے؟“

میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور دھیمی سی اداس آواز میں بولا۔ ”اے..... اے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ..... وہ جانے کہاں اور..... اور خدا جانے کس حال میں ہوگا، لیکن آپ..... آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“

”ہم تو وہ بھی جانتے ہیں قمر احمد کہ جو تمہیں بھی معلوم نہیں۔ ظفر تم سے کب اور کہاں پھڑ گیا تھا، یہ تو یقیناً تمہیں پتا ہوگا، لیکن.....“ میں دانستہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور اس سے پوچھا۔ ”تمہارا بیٹا کس کے ساتھ تھا اس وقت جب تم نے اسے آخری بار دیکھا؟“ مصلحتاً میں نے قمر احمد سے یہ سوال کیا تھا ورنہ تو مجھے پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔

”میری بیوی اصغری بیگم کے ساتھ تھا وہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر تم جس ٹرین میں سوار ہونے والے تھے، تم نے ظفر کو تلاش کرنے کی غرض سے وہ ٹرین چھوڑ دی۔“

”جی..... جی ہاں یہی ہوا تھا۔“

”اور ظفر یہ سمجھا کہ تم اسی ٹرین پر چڑھ چکے ہو۔“ میں نے بتایا۔ ”یوں وہ اس ٹرین میں کسی طرح سوار ہو گیا اور تم اسے ڈھونڈتے ہوئے وہیں رہ گئے۔ یہ بتاؤ قمر احمد کہ تم نے اپنی بیوی اصغری بیگم سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی ہوگی، اس نے تمہیں کیا کہانی سنائی؟“

”کہانی..... وہ حیرت سے بولا۔ ”اصغری بیگم کا تو خود برا حال تھا۔ ان کی آنکھوں سے ہتے ہوئے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔ وہ تو ظفر کے گم ہو جانے پر مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھیں۔“

قمر احمد کی بات پر میں طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنس دیا اور کہا۔ ”قمر احمد! تم بہت بھولے اور شریف آدمی ہو۔ ایک فریبی عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تم یہ بھی بھول گئے کہ وہ عورت اس معصوم بچے کی سوتیلی ماں تھی۔ میں بتاتا ہوں، ظفر پر کیا گزری۔ اسٹیشن پر بھیڑ بہت تھی اور ظفر، اصغری بیگم کا دامن تھامے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ تم اس سے آگے تھے۔ کبھی کبھی تم ظفر کو نظر آ جاتے۔ اصغری بیگم نے اسی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اچانک چلتے چلتے مڑی اور ظفر کا ہاتھ جھٹک دیا، پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ظفر پیچھے رہ گیا۔ بہت سے آدمی اسے دھکے دیتے ہوئے ٹرین میں سوار ہونے لگے۔ اس نے تمہیں بہت آوازیں دیں، مگر تم اسے نظر نہیں آئے۔ ٹرین نے سٹی دی اور چلتے لگی تو ظفر گھبرا کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔“ اس کے بعد میں نے ظفر کے کھوکھرا پار تک پہنچنے کی روداد سنائی۔

اس عرصے میں قمر احمد بے حس و حرکت خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خواب کے سے عالم میں سب کچھ سن رہا ہو۔ میں چپ ہوا تو وہ اس طرح چونک اٹھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھا ہو۔ اس کے چہرے پر شدید صدمے کی کیفیت تھی۔ آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ایک دم اٹھ جائے تو آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

کچھ دیر کو بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ یاسف بھی کچھ نہ بولا۔ وہ بھی یقیناً سمجھ گیا تھا کہ قمر احمد کو میں نے یہ ساری باتیں کیوں بتائی ہیں۔ میں اس لئے خاموش رہا کہ قمر احمد اپنے جذبات پر قابو پالے۔ سنبھلنے کے لئے اسے تھوڑا سا وقت مل جائے۔ پھر اس خاموشی کو میری ہی آواز نے توڑا۔ ”خدا کا شکر ادا کرد قمر احمد کہ اس نے تمہارے معصوم اور بے گناہ بیٹے کی حفاظت اور پرورش کے لئے ایک نیک دل آدمی کو ذریعہ بنادیا۔ تمہارا بیٹا ظفر اسی شرمیں ہے اور بہت جلد میں تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔“

”لے..... لیکن اصغری..... وہ..... اے میں.....“ قمر احمد بولا تو اس کے الفاظ جذبات کی شدت کے سبب بے ربط تھے۔

”وہ بے رحم اور ظالم عورت تمہارے قابل نہیں۔“ میں بول اٹھا۔

”تو پھر..... پھر؟“ اس نے اپنی سوالیہ نظریں یاسف کی طرف اٹھائیں۔

”مقصود میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں قمر احمد۔“ یاسف نے قمر احمد کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ ”تم اصغری کو طلاق دے دو۔“

”طلاق؟..... اے..... ہاں وہ اسی قابل ہے۔“ قمر احمد اس طرح بڑبڑایا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

میں اگر اسے یہ بتا دیتا کہ اس کی بیٹی کو بھی اصغری ہی نے قتل کیا ہے تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ یہ نہ بتانے کی وجہ یاسف بھی تھا کہ اسی نے اصغری کو نقش لکھ کر دیا تھا۔ زعفران سے لکھے جانے والے نقش عموماً خیر و برکت اور بھلائی کے لئے ہوتے ہیں، لیکن جنت ان سے اور دوسرے کام بھی لیتے ہیں۔ نقش عموماً قرآنی آیات کو ہندسوں میں تبدیل کر کے لکھے جاتے ہیں مثلاً بسم اللہ کے عدد 786 ہیں لیکن ہندسوں کے علاوہ کچھ الفاظ بھی نقش لکھنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ایک الگ ہی علم ہے۔ ہم جنت کو بھی یہ علم سکھایا جاتا ہے۔ جنت میں سے جو بری راہوں پر چل نکلتے ہیں، اس علم سے دوسروں کو نقصان پہنچانے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ یاسف نے بھی قمر احمد کی بیٹی آمنہ کی ہلاکت کے لئے ایسا ہی کوئی نقش لکھا تھا کہ اپنی محبوبہ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

لوہا گرم دیکھ کر یاسف خاموشی سے اٹھا اور اصغری کو وہیں بلا کر لے آیا۔ وہ بے خبری تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔

قمر احمد نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا تو وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”مجھے تو آج تم اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے کپاہی چبا جاؤ گے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کچھ ہوش کے ناخن لو۔“

”اے بد بخت عورت! آج ہی تو مجھے ہوش آیا ہے۔“ پھر یہ کہہ کر قمر احمد نے وہ الفاظ ادا کر دیے جو کسی عورت کو ہمیشہ کے لئے کسی مرد سے دور کر دیتے ہیں۔

اصغری، قمر احمد کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اسی وقت یاسف بول اٹھا۔ ”تم ایسا کرو اصغری کہ اب طلاق ہو جانے کے بعد اپنے رہنے کا بندوبست اسی کو نبھی کے کسی اور حصے میں کر لو۔ تمہارے لئے میں دو ملازموں کا بندوبست کر دوں گا۔“

”مگر یہ یہ کیا ہو گیا؟ کیوں مجھے طلاق کیوں دے دی انہوں نے؟“ یہ کہتے ہوئے امغری کے چہرے پر ہوا نیاں اڑنے لگیں۔

”اب تم جاؤ اور جا کر اپنا سامان سمیٹو، چلو۔“ یاسف کی آواز میں اب حکم تھا۔ ”طلاق تمہیں قمر احمد نے دی ہے، لیکن میں نے تم کو ابھی اپنی مریدی سے خارج نہیں کیا۔ تم اب میری ذمہ داری ہو۔ جو بھی ہوا، وہ تمہاری ہی ضدوں اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ تم ایک بے سارا عورت ہو اس لئے میں تمہیں اپنی مریدی سے خارج نہیں کر رہا ورنہ جو غبی باتیں آج تمہارے بارے میں مقصود میاں کے ذریعہ معلوم ہوئی ہیں انہیں سن کر خود مجھے بھی ہمت رنج ہوا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بڑی سخت سزا دیتا۔“ یاسف نے قمر احمد کو مطمئن کرنے کے لئے یہ باتیں کیں ورنہ تو اسے کیا معلوم نہیں تھا۔

”لیکن یہ تو پتا چلے کہ میرا مقصود کیا ہے؟“ امغری کے تیور بدلنے لگے۔ ”آپ کے دوست نے آج یہاں آکر کیا آگ لگائی ہے؟ میرا گھر کیوں اجاڑ دیا ہے۔“

”امغری۔“ یاسف نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اپنی حد میں رہو اور تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو۔ جاؤ یہاں سے۔“

اس مرتبہ امغری، یاسف کے حکم کو نہ ٹال سکی۔ وہ خاموشی کے ساتھ نفست گاہ سے نکل گئی۔

”میرا خیال ہے قمر احمد کہ اب تم مقصود میاں کے ساتھ چلے جاؤ۔“ یاسف نے کہا، پھر مجھ سے بولا۔ ”کیوں ٹھیک ہے نا مقصود میاں؟“

میں نے اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔ ٹھیک ہے، یہ کام بھی آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ چلو قمر احمد! میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں آج رام سوای بھی تو جانا ہو گا۔“ یاسف معنی خیز لہجے میں بولا۔

”ہاں وہاں بھی جاؤں گا، مگر بعد میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم سے اب کل صبح ملاقات ہو گی۔“

”میں خود ہی تم سے ملنے آ جاؤں گا کل صبح۔“

یاسف مجھے اور قمر احمد کو چھوڑنے باہر تک آیا۔ قمر احمد کے پاس سرکاری کار تھی اور ڈرائیور بھی موجود تھا، مگر میرے کہنے پر اس نے ڈرائیور کو کوٹھی ہی میں چھوڑ دیا۔ خود قمر احمد کو بھی کار ڈرائیو کرنا آتی تھی۔ میں اس کے ساتھ اگلی سیٹ ہی پر بیٹھ گیا۔

کوٹھی کی حدود سے کار نکلی تو میں نے قمر احمد سے پہلے بولٹن مارکیٹ چلنے کو کہا۔

”بولٹن مارکیٹ؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلے تمہیں اس شخص سے ملانا ہے جس نے تمہارے بیٹے کو اب تک اپنی اولاد کی طرح رکھا ہے۔“ پھر میں نے اسے مختصراً راشد کے بارے میں بتا دیا۔

”ٹھیک فرما رہے ہیں آپ۔“ قمر احمد نے کہا۔ ”راشد صاحب کے علم و اطلاع اور اجازت کے بغیر میں ظفر کو کس طرح اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔“

بولٹن مارکیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک مرتبہ پھر قمر احمد کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔ اس کا تعلق وزارت داخلہ کے ایک اہم شعبے سے تھا جو بڑے پیمانے پر ہونے والے جرائم کی روک تھام کرتا ہے۔ قمر احمد ان دنوں اسی سلسلے میں پریشان تھا۔ وزارت داخلہ کے اعلیٰ حکام نے ایک اہم معاملے میں اس سے جواب طلب کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں وفاقی حکومت کے ڈائریکٹر انٹرنی کرپشن ہی سے جواب طلبی کی جا سکتی تھی۔ قمر احمد اسی عہدے پر فائز تھا۔

گزشتہ چند ماہ کے عرصے میں ضروریات زندگی کی چند اشیاء مارکیٹ سے غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ ان اشیاء میں گیسوں، چاول، گھی اور چینی سرفہرست تھے۔ اب تک کی تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ کچھ ملک دشمن ضمیر فروش عناصر مارکیٹ سے یہ اشیاء غائب کر کے پڑوسی ملک کو اسٹیکل کر رہے تھے، لیکن اب تک ان لوگوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اسی ضمن میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ کام غیر ضروری منافع کمانے والے ذخیرہ اندوزوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ قمر احمد کی نظر سے ایک رپورٹ ایسی بھی گزری تھی کہ ان ملک دشمن عناصر کا تعلق دارالحکومت کراچی سے ہے اور ان کا صدر دفتر بھی کراچی ہی میں ہے، لیکن یہ محض قیاسات تھے۔ رپورٹ میں اس کے واضح ثبوت و شواہد موجود نہیں تھے۔ کچھ ”بڑی پھیلیوں“ کے نام بھی اس رپورٹ میں درج تھے کہ جن پر اس سلسلے میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا۔

یہ معاملہ بہر حال ایسا نہیں تھا کہ میں جسے نظر انداز کر جاتا۔ اس سے براہ راست خلق خدا متاثر ہو رہی تھی۔

کچھ سوچتے ہوئے میں نے اچانک قمر احمد کو مخاطب کیا۔ ”قمر احمد! تم ان دنوں جن دفتری معاملات کی وجہ سے مشکل میں گرفتار ہو، ہمارے علم میں آ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ ملک دشمن عناصر زیادہ دن تک یہ کھیل جاری نہیں رکھ سکیں گے۔“

”جی؟“ وہ حیران رہ گیا۔ ”کیا آپ کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے مقصود میاں کہ کہ“

”ہاں سب کچھ معلوم ہے۔“ میں بول اٹھا۔ ”ہم تم سے رابطہ قائم رکھیں گے۔ یہ معاملہ تو خیر ایک طرف رہا، اس کے علاوہ بھی ہم نے تمہارے لئے اور بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ وہ عورت کہ جس کو تم نے ہمارے دوست برکت علی شاہ کے حکم پر طلاق دے دی، وہ بھی تمہارے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ اچھا ہوا کہ تمہیں اس سے نجات مل گئی۔“

”یہ سب آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے حضور۔“ اس نے اظہار عقیدت کیا۔

”ہم تو محض ایک ذریعہ ہیں قمر احمد۔ ورنہ تو جو بھی ہوتا ہے، اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کی مرضی اور فضا کے بغیر تو پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں مل سکتا۔ ہم نے ابھی سے تمہارے لئے ایک نیک اور باجیا عورت کا انتخاب کر لیا ہے۔ تم امغری سے تنگ آ کر تیسری شادی کے خواہش مند تھے تاکہ تمہیں گھریلو سکون اور آسودگی میسر آ سکے تو تمہاری یہ خواہش بھی جلد پوری ہو جائے گی۔“

قراحمہ نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا کہ میں نے اس کے لئے کس عورت کا انتخاب کیا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”آپ کی ہر بات اور ہر فیصلہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ پیر صاحب کو بھی یقیناً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”مجھے اور برکت علی شاہ کو ایک ہی جانو۔“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہہ دیا۔

”ایک اور بات بھی آپ سے عرض کرنا تھی حضور۔“ قراحمہ کی آواز سے کسی قدر خوف ظاہر ہونے لگا۔

”ہاں ہاں، بلا جھجک کو جو بھی کہتا ہے۔“

”آپ تو خود صاحب کشف و کرامت ہیں۔ یقیناً آپ کو بھی یہ علم ہوگا کہ.....“ کہ امغری پر کوئی جن عاشق ہے۔ اسی وجہ سے.....“

”معلوم ہے ہمیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”امغری کو طلاق دے کر تمہیں یہ خطرہ ہے کہ وہ جن تمہارا دشمن نہ ہو جائے۔“

”جی..... جی ہاں حضور۔ میں یہی عرض کرنا چاہتا تھا۔“

”کیا تمہیں خبر نہیں کہ تمہارے پیر برکت علی شاہ کے قبضے میں بھی بہت سے جنات ہیں۔ پھر تمہیں خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تم نے اپنے پیر ہی حکم کی تعمیل میں امغری کو طلاق دی ہے۔ وہ جن جو امغری پر عاشق ہے، اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

قراحمہ کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی لہری دوڑ گئی۔ یاسف نے قراحمہ جیسے پڑھے لکھے آدمی کو جنتی کرتب دکھا کر بے وقوف بنا رکھا تھا۔

بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں پہنچ کر قراحمہ نے میرے ایما پر ایک۔ جگہ کار کھڑی کر دی۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ چل دیا۔

راشد ادبیری دفتر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آئیے..... تشریف لائیے مقصود میاں۔“ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

”بیٹھے آپ اور ان سے ملے۔“ میں یہ کہتے ہوئے قراحمہ کی طرف مڑا۔ ”یہ راشد صاحب ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔“

قراحمہ نے آگے بڑھ کر راشد سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”مجھے قراحمہ کہتے ہیں۔“

”قراحمہ..... قراحمہ؟ یہ..... یہ نام کچھ سنا ہوا سا لگتا ہے۔“ راشد نے کہا۔ ”آپ تشریف رکھئے۔“

”راشد صاحب! آپ کو ہمارے ساتھ کوٹھی تک چلنا ہے ابھی۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے قراحمہ سے بھی دوسری کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ وہ اب تک میرے احترام کی وجہ سے نہیں بیٹھا تھا۔ قراحمہ بیٹھ گیا تو میں نے راشد کو بتایا۔ ”آپ کو شاید یاد ہو کہ میں نے بڑی بیگم صاحب سے ظفر کے بارے میں کہا تھا، یہ بچہ مجھے دوسرے بے سارا بچوں سے مختلف نظر آتا ہے۔“

”جی ہاں یاد ہے مجھے۔“ راشد نے میری بات کی تصدیق کر دی۔

”لیکن آپ یہ بھول گئے کہ ظفر نے اپنے والد کا نام قراحمہ بتایا تھا۔“

”تو..... تو کیا یہ..... ظفر کے والد قراحمہ ہیں؟“ راشد نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی وہ بد نصیب ہوں۔“ قراحمہ خود ہی بول اٹھا۔

”اور..... اور ظفر کی سوتیلی.....“ راشد کچھ کہتے ہوئے رک گیا۔

اس مرتبہ میں نے راشد کو بتایا۔ ”اس عورت کو قراحمہ صاحب طلاق دے چکے ہیں۔“

”یہ بہت ہی اچھا کیا آپ نے قراحمہ صاحب..... لیکن مقصود میاں کو آپ نے کیسے تلاش کر لیا؟“

”میں نے مقصود میاں کو تلاش نہیں کیا بلکہ خود.....“

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ میں نے قراحمہ کی بات کاٹ دی اور راشد سے کوٹھی چلنے کو کہا۔

راشد فوراً ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اپنے چہرے کو بلا کر اس نے کچھ ضروری ہدایات دیں اور ہمارے ساتھ چل دیا۔

جب ہم محمود حسن کی کوٹھی پہنچے تو وہ منظر بڑا رقت انگیز تھا جب ایک باپ برسوں کے بعد اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ کبھی قراحمہ، ظفر کا ماتھا چومنا، کبھی رخسار، ظفر کے ذہن سے بھی باپ کے چہرے کے نقوش مٹے نہیں تھے، وہ بھی سسکیاں لے رہا تھا۔

راجہ اور صائمہ دونوں ہی ڈرائنگ روم کے دروازے سے لگی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے، ہر چند کہ وہ دونوں ہی بے اولاد تھیں، مگر شاید ہر عورت کے دل میں مامتا ہوتی ہے۔ امغری جیسی عورتیں کم ہی ہوتی ہیں۔

میری روح میں مسرت و انبساط کی ایک لہری اترتی چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت قراحمہ نے راشد سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اللہ ہی اس کا اجر دے گا، میں تو اس قابل نہیں کہ بدلہ اتار سکوں۔“

راجہ اور صائمہ نے مجھے بہت روکنا چاہا، مگر میں پھر کسی اور دن آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا کیونکہ اب میری کوٹھی میں حاجت مندوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ راشد تو واپس بولٹن مارکیٹ چلا گیا اور میں، قراحمہ کی پیشکش پر اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے میری کوٹھی کے سامنے اتار دیا اور کہنے لگا کہ اچھا ہوا میں نے حضور کا دولت کدہ دیکھ لیا، اگر اجازت مل جائے تو کسی دن حاضری دوں۔ میں بولا۔

”ہمارے دروازے ہر ضرورت مند کے لئے کھلے رہتے ہیں، تم جب چاہو آ جانا، ویسے ہم خود ہی بہت جلد تم سے ملیں گے۔ تمہیں برکت علی شاہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم کب تمہارے دفتر آئیں گے۔ ہم سے عام ملاقات کا وقت اب سے کچھ ہی دیر بعد شروع ہونے والا ہے۔ یہ وقت مغرب کی اذان کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے اوقات ہیں کہ ہم یقینی طور پر یہاں مل جاتے ہیں۔ یہ بات محض احتیاطاً تمہیں بتا دی ہے کہ ممکن ہے، تم کسی اور وقت آؤ تو ہم نہ مل سکیں۔“

قراحمہ نے میرا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا دی۔ اپنے بیٹے ظفر کو اس نے پہلے ہی کار سے

میرے اترنے کے بعد اگلی سیٹ پر بٹھالیا تھا۔

☆=====☆

اس روز ضرورت مند اور میرے ملاقاتی چلے گئے تو مجھے بلیقں جہاں کا خیال آیا۔ آج ہی اسے بھی سلام سے طلاق دلوانا تھی۔ حالات میری توقع کے خلاف بڑی تیزی سے کروٹ لے رہے تھے۔ میں رام سوامی پتیا تو اس وقت سلام گھر پر نہیں تھا۔ امیرن نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا۔

”سلام کہاں گیا ہے اور کب تک آئے گا؟“ میں نے امیرن سے معلوم کیا جو ادب کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔

”کوئی دوست آیا تھا“ اس کے ساتھ گیا ہے۔“ امیرن نے بتایا۔ ”کچھ کہہ کر نہیں گیا کہ کب تک واپس آئے گا۔ خیریت تو ہے سرکار؟“

اس عرصے میں امیرن کا ذہن پڑھ کر میں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس کی بہن بشیرن کا گھر بھی اسی محلے میں ہے۔

”سلام تو خیر آجائے گا۔ اتنے میں تم بلیقں جہاں کے میکے والوں کو بلا لاؤ۔ اپنی بہن کو ضرور ساتھ لاؤ۔“ میں نے تاکید کی۔

”مگر سرکار“ میں ان سے کہوں کیا کہ کیا بات ہے؟“ امیرن نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

”کہنا کہ تم لوگ طلاق کا جو مطالبہ کر رہے ہو، اسی سلسلے میں بات کرنا ہے۔“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

”کل تو یہ بات ختم ہو گئی تھی سرکار۔ پھر آج.....“

”ہم نے تم سے جو کہا ہے امیرن، اس پر عمل کرو اور بلیقں جہاں کو یہاں بلاؤ۔“

بیٹھک کے اندرونی دروازے پر کھڑے ہو کر امیرن نے بلیقں جہاں کو آواز دی۔ ”بلیقں.....“

اسے بلیقں۔ مقصود میاں بلا رہے ہیں تجھے۔“

جیسے ہی بلیقں جہاں نے بیٹھک میں قدم رکھا، اسے میں نے اپنے اثر میں لے لیا۔ امیرن اس وقت تک بیٹھک ہی میں موجود تھی۔ دانت میں نے بلیقں جہاں سے کہا۔ ”کل تم میرے سمجھانے پر مان گئی تھیں کہ ابھی طلاق نہیں لوگی۔ بعد میں اس معاملے پر میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا، تمہارے ساتھ یہ زیادتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، تمہیں اپنے شوہر سے طلاق چاہئے؟“

”جی ہاں مقصود میاں۔“ بلیقں جہاں میرے زیر اثر ہوئی۔ ”میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔“

”سن لیا تم نے امیرن کہ تمہاری بہن کیا کہہ رہی ہے۔“ میں نے امیرن کو مخاطب کیا۔

”سرکار! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں کچھ دن میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کل آپ ہی نے بتایا تھا کہ ابھی طلاق لینا نہیں چاہتی۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ آج ہی آپ ہی کے سامنے اپنی زبان سے پلٹ گئی۔ نہ میں اسے آپ کے آستانے پر لے جاتی نہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔“

”امیرن! پہلے بھی ہم تمہارے جھوٹ کو معاف کر چکے ہیں۔ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تم نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ فضول باتیں کر کے ہمیں غصہ نہ دلاؤ۔ بولو کیا ہم نے تم سے کل یہ نہیں کہا تھا کہ اگر کبھی بلیقں جہاں تمہارے بیٹے سے طلاق لینے کا مطالبہ کرے تو تم اس کے مطالبے کو کسی بہانے ٹالو گی نہیں؟“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سرکار، مگر میرے بیٹے کا بتایا گھر تو اجڑ جائے گا۔“

”صرف وہم ہے تمہارا کہ تم نے اپنے بیٹے کا گھر بنا دیا تھا۔“ میں نے کہا۔ وہ بڑی ہی ضدی اور ہٹ دھرم قسم کی عورت تھی۔ اس لئے اسے بھی اپنے اثر میں لینا پڑا۔ پھر وہ مجھ سے مزید کج بخشی کرنے کے لئے رکی نہیں اور گھر سے چادر اوڑھ کر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے بلیقں جہاں کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا اور بولا۔ ”میں نے تمہارے والدین کو بلوایا ہے۔ کل تم نے مجھ سے جو بات کی، وہ مناسب نہیں لگتی کہ تم یہاں رہو یا اپنے میکے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے تم سے چند روز صبر کرنے کو کہا تھا، سوا اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ تمہیں سلام سے طلاق لے کر اپنے میکے ہی میں رہنا چاہئے۔ کل رات تم نے کوئی خاص بات محسوس کی تھی۔“

وہ چونک اٹھی اور بتایا۔ ”جی..... جی ہاں۔ کسی کی گھٹی گھٹی سی چیخ سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں گھبرا گئی تھی پھر مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آئی اور میں مختلف آیات پڑھتی رہی۔ وہ کس کی چیخ تھی سرکار؟“

”اسی شیطان کی چیخ کہ جس نے کل رات بھی تمہارے قریب آنا چاہا تھا۔ اسے میں نے بڑی سخت سزا دی۔ اس نے جب اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تو میں نے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ اب وہ کبھی تمہیں نہیں ستائے گا۔ ہاں مجھے ایک تاکید اور کرنا تھی۔ تم پر جو گزر گئی، وہ کسی کے سامنے بھی زبان پر نہیں لاؤ گی۔“

وہ غریب کیا کہتی، اس نے اقرار میں سر ہلایا اور نظریں جھکا لیں۔ میں سوچنے لگا، کاش بلیقں جہاں کو امیرن اس روز میری کوٹھی لے کر نہ پہنچتی جب یاسف، پیر برکت علی شاہ کے انسانی قالب میں مجھ سے ملے آیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے، اگر میرے ہم قوم یاسف کی جگہ کسی اور نے یہ حرکت کی ہوتی تو یقیناً میں اسے معاف نہ کرتا۔ ہم جنات، آدم زادوں کے کتنے ہی ہمدرد اور غم گسار بننے کا دعویٰ کیوں نہ کریں، بہر حال یہ ہماری کمزوری ہے کہ اپنے ہم قوموں کے معاملے میں انہی کی طرف داری کرنے لگتے ہیں۔ بلیقں جہاں پر ایک جن زاد نے ظلم کیا تھا اور میں نے اپنی حد تک اس کا ہوا کرنے کی سبیل بھی نکال لی تھی، پھر بھی میری روح پر ایک بوجھ سا تھا۔

امیرن لوٹ کر آئی تو اس کے ساتھ بلیقں جہاں کے والدین اور اس کا ایک بڑا بھائی صالح بھی تھا۔ بلیقں جہاں کے باپ کا نام حبیب تھا۔ امیرن نے ان لوگوں کو یقیناً میرے بارے میں بتا دیا ہو گا کہ میں کون ہوں۔ وہ اسی لئے متوجہ نظر آ رہے تھے۔ بلیقں جہاں میرے اشارے پر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”جی سرکار! حکم فرمائیے کہ ہمیں کیوں یاد کیا ہے؟“ بلقیس جہاں کے باپ نے گفتگو شروع کی۔
 ”امیرن نے تمہیں بتا ہی دیا ہو گا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ دراصل یہ معاملہ اب اور چلنے والا نہیں ہے۔ ہم بلقیس جہاں کو سلام سے طلاق دلوانے کے لئے آئے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق تم لوگ بھی یہی چاہتے ہو۔ رہا یہ قصہ کہ طلاق کے بعد بلقیس جہاں کا مستقبل کیا ہو گا تو ہم یہ فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔ عدت پوری ہونے کے بعد ہم خود ایک شریف اور باعزت شخص سے اس کا نکاح پڑھوا دیں گے۔ اس سلسلے میں تم لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نرمی کے ساتھ حبیب کو سمجھایا۔
 ”لیکن حضور، سلام تو اس پر کسی طرح راضی ہی نہیں۔ باقی باتیں تو بعد کی ہیں۔“ حبیب نے کہا۔
 ”پھر ان دونوں بہنوئوں کا معاملہ بھی ہے۔“ اس نے امیرن کی طرف اشارہ کیا۔
 ”انہوں نے میری بیوی سے یہ کہا تھا کہ اگر بلقیس نے سلام سے طلاق لے لی تو یہ زندگی بھر ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھیں گی۔“
 میں نے امیرن کی طرف دیکھا تو وہ میرے زیر اثر کہنے لگی۔ ”میں غلطی پر تھی۔ بھلا کبھی خون سے خون بھی جدا ہوا ہے۔“

امیرن کی چھوٹی بہن بشرن اسے حیرت سے دیکھنے لگی اور بولی۔ ”بابی ہمیشہ غصے کی تیز ہیں، لیکن ہیں تو میری بہن۔ آخر انہیں بھی میری بچی پر رحم آ ہی گیا۔“
 ”تو کیا آج ہی فیصلہ ہو جائے گا سرکار؟“ حبیب نے مجھ سے پوچھا۔
 ”ہاں ہم اسی لئے تو آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”لیکن سلام بھائی بھی تو آجائیں۔“ بلقیس جہاں کے بھائی صالح نے کہا۔ ”ان کا تو کچھ پتا ہی نہیں کب آئیں؟“

”ہم ابھی معلوم کئے لیتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔“ یہ کہتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سلام کے چہرے کا تصور کیا۔ پھر مجھے جو کچھ پتا چلا، اس پر غصہ آیا۔ وہ اسی محلے میں اپنے ایک دوست کے گھر گیا تھا، پھر وہاں سے واپس آیا اور گھر میں میری موجودگی محسوس کر کے دروازے ہی سے لوٹ گیا۔ اس نے بیٹھک کے بیرونی دروازے سے کان لگا کر میرے اور بلقیس جہاں کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن لی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی اپنے کینے پن سے باز آنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ اب بھی اسی لئے ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا کہ میں چلا جاؤں تو وہ گھر میں آئے۔ یہ سب جان لینے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں اور سخت لہجے میں بولا۔ ”ہم ابھی اس خبیث کو پکڑ کر لاتے ہیں۔ آخر اس نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا سرکار؟“ حبیب نے مجھ سے سوال کیا۔

”سلام یہاں ہماری موجودگی کی وجہ سے نہیں آیا۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ ہم کیوں آئے ہیں۔“
 میں یہ کہتا ہوا بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔
 مجھے سلام اپنے گھر کے قریب ہی ایک گلی میں مل گیا۔ مجھے پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور سختی سے کہا۔ ”چلو گھر۔“

وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس بزدل میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتا۔

جب میں سلام کو ساتھ لئے بیٹھک میں داخل ہوا تو بھی حیران رہ گئے۔

”امیرن! تم بلقیس کو بلا لاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔ امیرن اندر گھر میں چلی گئی تو میں نے سلام کو ڈانٹا۔

”تم بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ پولو تم نے بیٹھک کے دروازے پر کھڑے ہو کر بلقیس اور میرے درمیان ہونے والی باتیں کیوں سنیں اور پھر واپس کیوں چلے گئے؟“

سلام کا چہرہ اتر گیا اور وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ ”بلقیس کو میں طلاق دینا نہیں چاہتا تھا۔“

”اور اب؟“ یہ سوال کرتے ہی میں نے اسے اپنے اثر میں لے لیا۔

”آپ کا جو حکم ہو گا اس کی تعمیل کروں گا۔“ اس کا لہجہ بدل گیا۔

اسی دوران امیرن کے ساتھ بلقیس بھی بیٹھک میں آ چکی تھی۔ میں نے سلام کو مخاطب کیا۔ ”تو پھر تم ابھی بلقیس جہاں کو طلاق دے دو۔“

سلام نے فوراً میرے حکم پر عمل کیا۔

”اب آپ لوگ بلقیس جہاں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔“ میں نے حبیب سے کہا۔

”جینز میں ہم نے اپنی بہن کو جو زیور دیا تھا، وہ بھی ہمیں واپس چاہئے۔“ صالح بولا۔

”جاؤ امیرن، انہیں زیور لا کر دے دو۔“

میرے حکم پر امیرن اندر گئی اور زیور لے آئی۔ اس نے زیور اپنی بہن کے حوالے کر دیا۔ جب میں اٹھنے لگا تو حبیب نے مجھ سے درخواست کی۔ ”سرکار! اگر کچھ دیر کو میرے غریب خانے کو بھی رونق بخش دیں تو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔“

میں نے اس کے ساتھ چلنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے کیوں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔ دو گلی چھوڑ کر بلقیس جہاں کا میکہ تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ انہوں نے مجھے بہت عزت و احترام کے ساتھ ایک کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کرسی کا ایک ہتھا غائب تھا۔ گھر کی حالت سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غریب لوگ ہیں۔ بلقیس جہاں کا باپ جامع کلا تھ مارکیٹ میں کپڑے کی ایک دکان پر سیل مین تھا۔ اس کی تنخواہ بہت کم تھی۔ سلام کا ہم عمر صالح نہ تو پڑھا لکھا تھا، نہ اسے کوئی ہنر آتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو اس کی شادی ہو سکی تھی، نہ وہ کسی مستقل دھندے سے لگ سکا تھا۔ وہ ادھر ادھر کام کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔ کچھ دن کو کہیں محنت مزدوری کا کوئی کام مل جاتا اور پھر وہی بے روزگاری اس کا مقدر ٹھہرتی۔ بلقیس جہاں کی ایک چھوٹی بہن، نفیس جہاں بھی تھی۔ اس کی عمر بھی اب شادی کے قابل ہو رہی تھی۔ بے چارہ حبیب اور اس کی بیوی بشرن اسی فکر میں کھل رہے تھے کہ اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کیسے اور کہاں سے کریں گے۔ چھوٹا سا یہ خاندان مشکلات اور پریشانیوں کا شکار تھا۔ حصول معاش نے انہیں مار رکھا تھا۔ اس پرستم یہ ہوا کہ بلقیس جہاں کا گھر بھی نہ بس پایا۔ شادی کے

ی دن بعد جھڑے شروع ہو گئے۔ بیٹی اگر سکھ میں نہ ہو تو والدین کو کس طرح سکون آ سکتا ہے۔ اپنی بہن کی غربت دیکھ کر ہی امیرن اور بھی شیر ہو گئی تھی۔ مجھ سے حبیب یا بلیقں جہاں کی ماں نے کچھ نہیں کہا، مگر میں نے ذرا ہی دیر میں سب کچھ معلوم کر لیا۔ اس گھرانے کے حالات جان کر مجھے بہر حال افسوس ہوا اور میں سوچنے لگا، کیا ساری دنیا ہی دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔

”آپ نے یہ فرمایا تھا سرکار کہ ہمیں بلیقں جہاں کے مستقبل کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔“ حبیب نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اور یہ کہ آپ عدت پوری ہونے کے بعد کسی شریف اور باعزت شخص سے اس کا نکاح پڑھوا دیں گے۔ میں اسی سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون اور کیسے لوگ ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں سرکار کہ دودھ کا جلا چھانچہ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ پھر یہ بھی عرض کرنا تھا کہ.....“

”میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس جیز میں دینے.....“

”مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے حبیب کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اللہ پر بھروسہ کرو کہ اب تمہارے دن پھر نہ والے ہیں۔“

”سرکار کی زبان اللہ مبارک کرے۔“ بیٹرن بولی۔ وہ بھی کمرے میں موجود تھی۔ بلیقں البتہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”تم نے شاید سوچا بھی نہیں ہو گا حبیب کہ تمہاری بیٹی بلیقں جہاں اتنے بڑے گھر میں جائے گی۔“ یہ کہنے کے بعد میں نے مختصراً اسے قمر احمد کے بارے میں بتا دیا، پھر بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ بلیقں جہاں وہاں ہر طرح خوش رہے گی اور قمر احمد کی پہلی بیوی کے بیٹے ظفر کو اپنی اولاد ہی کی طرح سمجھے گی۔ میں جب مناسب سمجھوں گا قمر احمد سے تم لوگوں کی ملاقات کرا دوں گا۔ ہاں مجھے تم لوگوں سے یہ جواب ضرور چاہئے کہ تمہیں بھی یہ رشتہ منظور ہے یا نہیں؟“

”سرکار کے فیصلے کے بعد ہماری کیا مجال کہ کچھ کہہ سکیں۔“ حبیب نے جواب دیا۔ ”میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اتنے بڑے افسر ہو کر ہم سے رشتہ کرنے پر آمادہ بھی ہو جائیں گے یا نہیں۔ محل میں ٹاٹ کا پوند گلے والی بات ہے۔ کیوں صالح کی ماں؟“ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”جب سرکار کہہ رہے ہیں تو پھر وہ کیسے انکار کریں گے۔“ بیٹرن فوراً بولی۔

”پھر بھی میں یہ چاہوں گا کہ تم دونوں میاں بیوی، قمر احمد کو دیکھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں تک قمر احمد کی رضامندی یا امیری غریبی کا معاملہ ہے تو یہ تم لوگوں کے سوچنے کی بات نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں یہ ذکر ہی نہ کرتا۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ بلیقں جہاں اب اور دکھ نہ سمے۔ اسے میں نے سلام سے طلاق دلوائی ہے تو اس کا گھر بھی ہوا دوں۔“

یہ سن کر بیٹرن مجھے دعائیں دینے لگی۔ حبیب کے چہرے سے بھی ممنونیت کا اظہار ہونے لگا۔

”یہ بتاؤ حبیب کہ تم اس وقت میرے ساتھ چل سکتے ہو؟“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں سرکار، کیوں نہیں۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا۔

”تو پھر اٹھو۔“

”نفیس جہاں چائے بنا رہی ہے سرکار۔ اگر.....“

میں نے بیٹرن کی بات کاٹ دی۔ ”پھر کبھی سہی، اس وقت ہمیں ذرا جلدی ہے۔“

پھر حبیب کو ساتھ لے کر رام سواری سے میں اپنی کوٹھی آ گیا۔ اسے نشست گاہ میں بٹھا دیا۔ وہ

حیرت سے میری نشست گاہ کے ساز و سامان کو دیکھنے لگا۔

”تم بیٹھو، میں آتا ہوں ابھی۔ ذرا لباس تبدیل کر آؤں۔“ اس بہانے میں اپنی خواب گاہ میں آ گیا

اور وہاں سے مجھے غائب ہوتے دیر نہ لگی۔

کراچی شہر میں ایسے آدم زادوں کی کمی نہیں تھی کہ جن کی تجویروں میں ڈھیروں دولت بھری پڑی تھی۔ خود انہیں بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے۔ ان کا مقصد محض دولت کا حصول تھا خواہ وہ کسی طرح حاصل ہو۔ میں اکثر ایسے خزانے کے سانپوں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ یہ دولت میرے تو کسی کام کی نہیں تھی، ہاں ضرورت مندوں کے کام ضرور آتی رہتی۔ میری نظر میں حبیب بھی ایسا ہی ایک ضرورت مند تھا۔ ضرورت کے بغیر میں کبھی کسی کی تجوری سے دولت غائب نہ کرتا۔ اس روز بھی میں نے یہی کیا اور لوٹ آیا۔ نئے نوٹوں کی وہ گڈیاں میں نے کپڑے کے ایک تھیلے میں رکھیں اور لباس تبدیل کر کے خواب گاہ میں آ گیا۔ بمشکل مجھے اس میں چند منٹ لگے ہوں گے۔ حبیب صوفے سے اٹھا تو میں نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”تم سے مجھے ایک بات معلوم کرنا تھی حبیب۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”فرمائیے سرکار کیا پوچھنا ہے۔“ وہ ادب کے ساتھ بولا۔

”تم خود جامع کلاتھ میں کپڑے کی کوئی دکان کھول کر اسے چلا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں سرکار۔ کانپور میں میری کپڑے کی دکان ہی تو تھی جو فسادات میں لٹ گئی۔ اسی تجربے کی بنیاد پر تو مجھے یہاں فوراً نوکری مل گئی، لیکن یہاں تو میں دکان کھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ

سے کیا چھپانا سرکار، دو وقت چولہا ہی جلتا رہے تو بہت ہے۔“ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

”اگر تمہیں کہیں سے قرض مل جائے، میرا مطلب قرض حسنہ سے ہے، پھر تو تم دکان خرید سکتے

ہو۔“ میں نے کہا۔

”سرکار! مجھ غریب آدمی کو کون قرض دینے لگا۔“ اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”قرض تمہیں ہم دیں گے، لیکن ایک شرط پر کہ تم یہ قرض تب ادا کرو گے جب اس قابل ہو

جاؤ۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

وہ حیرت سے میری صورت دیکھنے لگا اور کچھ دیر کو اس کی زبان گنگ سی ہو گئی۔ پھر وہ بولا تو ہکلا نے

لگا۔ ”سر..... سرکار۔ یہ آ..... آپ کلف..... کیا فرما رہے ہیں؟“

”جو تم سن رہے ہو۔“ میں بولا۔ ”ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنا کہ ہم قرض دینے سے پہلے ہی

اسے معاف کرتے ہیں۔ یہ لو۔“ میں نے کپڑے کا تھیلہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”معافی سے ہمارا

لے کما۔

”تُو نے بلیقں جہاں کو طلاق دلوا دی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور اس کے والدین سے بھی قراحمہ کے رشتے کی بات ہو گئی۔“

”خوب کما لے نیکی اے علیالیش! پھر بھی میری یہ بات گرہ میں باندھ لے کہ آدم زادوں سے بدلے میں تجھے کبھی نیکی نہیں ملے گی۔“

”نہ ملے، میں یہ توقع بھی نہیں رکھتا۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔“

”جس دن نیکی کا یہ دریا بھر گیا، تجھے پتا چلے گا۔“

”چھوڑ ان بیکار باتوں کو اے یاسف! میں تجھ سے ایک بات کہنا نہ بھول جاؤں۔ دیسے تو میں نے پکا بند دوست کر دیا ہے کہ تُو کبھی کسی برے ارادے سے بلیقں جہاں کے قریب نہیں جاسکے گا، پھر بھی سن لے تجھے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ یہ میں خاص طور پر اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ قراحمہ کی بیوی بن جانے کے بعد وہ اسی کوٹھی میں رہے گی۔ تُو سمجھ گیا میری بات یا نہیں؟“ میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوا بولا۔

”اے میرے دوست علیالیش! تُو اگر مجھے یہ تاکید نہ بھی کرتا تو میں ایسا ہی کرتا۔ میں نے تو بلیقں جہاں کو اسی وقت مہر کر لیا تھا جب تُو نے اس معاملے میں اپنی ٹانگ اڑا دی تھی۔ اپنی اصغریٰ اس سے اب بھی لاکھ درجے بہتر ہے۔ کوئی حور پری نہیں ہے بلیقں جہاں کے میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں۔“

”یہ بات تو تجھے پہلے سوچنا چاہئے تھی، خواہ مخواہ تُو نے گناہ مول لیا۔ رہ رہ کر مجھے تیری اس حرکت پر افسوس ہوتا ہے اے یاسف۔“

”اور تُو جو مولوی علیالیش بننے سے پہلے جو حرکتیں کرتا آیا ہے، ان کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ میں بھی آج سے تیری ان حرکتوں پر افسوس کرنے لگتا ہوں۔“ اپنی عادت کے مطابق یاسف ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ پھر بولا۔ ”چل چھوڑ اس قصے کو اور کوئی دوسری بات کر۔“

”اچھا تو پھر اپنی اصغریٰ بیکم کا حال سنا۔ اس کا داغ اب آیا ٹھکانے پر؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”اس کے داغ کی نہ پوچھ۔“ یاسف ہنسا۔ ”تُو شاید یہ سن کر حیران رہ جائے گا کہ کبھی کبھی تو وہ غصے اور جنون کے عالم میں مجھ پر ہاتھ اٹھا بیٹھتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات میں تجھے بہ بتاؤں گا کہ اس سے پتہ کر مجھے بھی مزہ آتا ہے۔“

”لعنت ہو تجھ پر کہ ایک جن زاد ہو کر آدم زادی کے ہاتھوں پٹتا ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے اے علیالیش کہ اصغریٰ سے پہلے کبھی کسی ایسی آدم زادی سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔ وہ بڑی دلیر ہے۔ اسے یہ معلوم نہ سہی کہ میں جن زاد ہوں، لیکن یہ تو خبر ہے میرے قبضے میں جلت ہیں۔ پھر بھی جب اسے غصہ آ جاتا ہے تو ذرا نہیں ڈرتی۔“

”کچھ تُو نے بھی اسے شہ دے رکھی ہوگی تاکہ وہ غصے میں آکر تیری پٹائی کرنے لگے۔ تجھے مزہ جو آنے لگا ہے اس میں۔“

مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ قرض ادا نہ کر سکو تو تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہے۔“

اس نے تھملا لے لیا اور گھبراہٹ ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”یہ..... یہ تو سرکار، بہت بڑی رقم لگتی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ جامع کلا تھ مارکیٹ جیسی جگہ پر دکان خریدنے یا پیگڑی پر لینے کے لئے کم رقم تو نہیں چاہئے۔ پھر دکان کے لئے مال بھی تو لینا ہوگا۔“

مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ کپڑے کے اس تھیلے میں چھوٹے بڑے نئے نوٹوں کی خاصی گڈیاں تھیں۔ وہ تھیلے سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر گننے لگا۔ میں نے اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا کیوں کہ قرض ہی کے بہانے اسے وہ رقم دی تھی۔ مجھے معلوم تھا، اگر میں قرض کا بہانہ نہ کرتا تو وہ شریف اور باعزت آدمی بطور امداد وہ رقم قبول نہ کرتا۔ آدم زادوں کے غریب اور دزمانے طبقے کی اکثریت میں ابھی غیرت باقی تھی۔

رقم گن کر اس نے دوبارہ تھیلے میں رکھ دی اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں بول اٹھا۔ ”بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنی رقم ہے، ہمیں معلوم ہے۔“

”بہتر ہے سرکار۔“ اس کے چہرے سے اب بھی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی۔ رقم کا تھملا سنبھال کر اپنے پاس رکھتے ہوئے اس نے اپنی حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔ ”مجھے تو خبر نہیں سرکار کہ کب میری کس وقت کی دعا اللہ نے قبول کر لی اور کون سی نیکی میرے کام آگئی۔ میں نے پاکستان آنے کے بعد یہ سوچا تک نہیں تھا کہ دوبارہ میرے اچھے دن لوٹ آئیں گے۔ میں تو اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی بچ جانے ہی پر اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔ اللہ نے آج آپ کو میرے لئے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ میں گھر پہنچنے ہی شکرانے کے نفل پڑھوں گا۔“

اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”تمہارا بیٹا صالح روزگار کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، تم اسے بھی اپنے ساتھ دکان پر بٹھالینا۔ اب تم جاؤ۔“

اٹھ کر اس نے عقیدت کے اظہار میں میرے ہاتھ چومنا چاہے تو میں نے منع کر دیا اور اسے خود کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑ کر آیا۔

☆=====☆

دوسرے دن یاسف نے میرے ساتھ یہ شرارت کی کہ صبح ہی صبح آگیا۔ اس وقت تک میں سو کر نہیں اٹھا تھا۔

”اٹھ اے علیالیش! تجھے شاہ جنات نے طلب کیا ہے۔“ میری خواب گاہ میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ وہ آواز بدل کر بولا تھا اور انسانی قالب میں بھی نہیں تھا۔ میں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا تو وہ ہنس پڑا اور میں نے اس کی ہنسی سے اسے پہچان لیا۔ اسی کے ساتھ وہ انسانی قالب میں آگیا۔

”دیکھ لے، کیسا ڈرا میں نے تجھے۔“ وہ میرے قریب ہی مسمری پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”بس رہنے دے، تجھے تو ایک سے ایک نئی شرارت سوچتی ہے۔“ میں نے اپنی خفت مٹانے کے

”کوئی تو ایسا ہو۔“ یاسف نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

تھوڑی دیر نوک جھونک کرنے کے بعد یاسف نے اٹھنے کا قصد کیا تو میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے پوچھا۔ ”تجھے معلوم ہے اے یاسف کہ ان دنوں قراقرم اپنے ایک دفتری معاملے کی وجہ سے بہت پریشان ہے؟ کیا اس نے تجھ سے کوئی بات کی تھی اس سلسلے میں؟“

”ہاں ایک دن کچھ کہہ تو رہا تھا کہ بازار سے ضروری چیزیں غائب ہو رہی ہیں۔ اسی پیکر میں اعلیٰ افسران نے اس کا جواب بھی طلب کر لیا ہے، لیکن میں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہوا کریں چیزیں غائب مجھے کیا۔ ہاں میں نے اس سے یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ جب نوکری خطرے میں پڑنے لگے تو بتا دے، میں کوئی بندوبست کر دوں گا۔“ یاسف نے بتایا۔

”تجھے اس معاملے سے دلچسپی ہو نہ ہو، مجھے ضرور دلچسپی ہے، یہ تو سراسر ظلم ہے کہ اس طرح غریب لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی جائے۔“

”اور تُو نے آج کل غریب آدم زادوں کی زندگی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، اسی لئے ہر شام بھیڑ لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے ملتا کیا ہے اس سے۔“

”روحانی سکون۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھ اے علیالیش، روحانی سکون حاصل کرنے کی خاطر ان آدم زادوں کے معاملات میں زیادہ نہ پڑ۔“ وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ”یہ تجربہ تجھے بھی ہے اور مجھے بھی کہ ان آدم زادوں میں ایک سے ایک خطرناک آدم زاد موجود ہے۔ ان کے معاملوں میں ٹانگ پھسانے کی ہمیں کیا پڑی ہے۔ یہ جانیں، ان کا کام جانے.....“

”تُو مجھے الٹا سبق نہ پڑھا۔ میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے، اس پر ضرور عمل کروں گا۔ ضرورت پڑنے پر تجھے بھی میری مدد کرنا ہوگی۔“

”اچھا جب ضرورت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو مجھے جانے دے۔“

پھر یاسف ہی کے ذریعے میں نے قراقرم سے کھلوا یا کہ آئندہ روز اس کے دفتر آؤں گا۔

اسی روز دوپہر کے بعد خلاف توقع حاجی صاحب مجھ سے ملنے آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا۔ حاجی صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ ”مقصود میاں! تمہیں ناوقت زحمت دینے پر میں معذرت خواہ ہوں۔ شام کو دراصل یہ بات نہیں ہو سکتی تھی اس لئے مجھے اس وقت آنا پڑ گیا۔“

”معذرت کر کے آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں حاجی صاحب۔ فرمائیے کیسے زحمت کی؟“ میں نے خوش اخلاقی کا مظاہر کیا، کیوں کہ وہ میرے دیرینہ شناسا تھے۔

”یہ میرے ایک دوست کے عزیز یعقوب صاحب ہیں۔“ حاجی صاحب نے ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہیں گزشتہ تقریباً ایک مہینے سے قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ دھمکیاں دینے والے کون لوگ ہیں؟ یہ ان سے واقف نہیں ہیں۔ کل رات میرے دوست انہیں لے کر میری کوٹھی پر آئے تھے، مجھ سے یہ مشورہ کرنے لگے کہ اس سلسلے میں کیا قدم اٹھایا جائے؟ پولیس کو بھی یہ قاتلانہ دھمکیوں سے

آگاہ کر چکے ہیں اور رپورٹ بھی درج کرا دی ہے، لیکن تم تو اس مجھے کی کارکردگی جانتے ہی ہو۔ ظاہر ہے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگر پہلے ہی ان سے میری ملاقات ہو جاتی تو میں انہیں تمہارے پاس لے آیا ہوتا۔ قاتلانہ دھمکیاں دینے والے نامعلوم افراد کا تمہی پتا چلا سکتے ہو۔ باقی باتیں تو خود ان سے معلوم کر لو۔“

میں نے اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر واقعی خوف کے آثار تھے۔ پولیس والے عموماً ایسے کسی شخص سے جو سوالات کرتے ہیں، ان سے میں نے دانستہ گریز کیا اور پوچھا۔ ”یعقوب صاحب! کیا کام کرتے ہیں آپ؟“

”چھوٹا موٹا کاروبار ہے، گھی وغیرہ کا۔“ اس شخص نے جواب دیا تو میں چونک اٹھا۔

”لیکن آج کل تو مارکیٹ سے گھی وغیرہ ہوتا جا رہا ہے۔“ میں بولا۔

”میرے پاس ابھی تھوڑا بہت شاگ ہے جسے فی الحال نکالنے کا ارادہ نہیں۔“ اس نے بتایا۔ اپنے لئے میں نے اس کے لمبے میں عقیدت محسوس نہیں کی۔ یا تو وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا ہوگا یا پھر حاجی صاحب نے اسے میرے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی ہوگی۔

”وہ کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس لئے کہ ابھی گھی کے دام اوپر چڑھیں گے۔“ اس نے یہ جواب دینے میں کوئی دیر نہیں کی۔ ”کاروبار میں تو ایسا کرنا پڑتا ہے جناب، لیکن یہ تو بالکل ظلم ہے کہ اگر کوئی اپنا مال نہ بیچنا چاہے تو اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔“

”پھر تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ قاتلانہ دھمکیاں دینے والے کون لوگ ہیں۔“ میں بولا۔ اپنی جتنی صفات کو میں اسی صورت میں بروئے کار لاتا تھا کہ جب کوئی اور چارہ کار نہ رہے ورنہ تو اس شخص سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ جو باتیں یوں ہی معلوم کی جا سکیں ان کے لئے پراسرار قوتیں استعمال کرنا ضروری نہیں۔

”جی نہیں، یہی تو بات ہے۔“ اس نے میری بات کے جواب میں کہا۔

”آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ یہ سلسلہ کس طرح شروع ہوا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”اب سے کوئی مہینے بھر کی بات ہے کہ ایک اجنبی شخص میرے دفتر میں مجھ سے ملا۔ اس نے مجھے پیش کش کی کہ میرے پاس گھی اور چینی کا جتنا اشاک ہے، اس سے سودا کر لوں۔ وہ مجھے بازار کے بھاؤ سے کچھ زیادہ دینے پر تیار تھا۔ ادا جی وہ نقد کرتا۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے لئے بالکل نیا آدمی تھا، دوسرے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بھاؤ کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں رہا تھا۔ میں اسی لئے سودا کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ پہلے تو اس نے نرمی سے بات کی کہ یعقوب بھائی آپ یہ اچھا نہیں کر رہے، پھر تیزی دینے لگا، بولا کہ یہ سودا نہ کرنا آپ کو منگا پڑے گا۔ مجھے غصہ آ گیا اور اس سے کہا، مال میرا ہے۔ میں سودا کروں نہ کروں میری مرضی۔ پھر اسے میں نے دفتر سے نکال دیا۔“

یعقوب ابھی شاید کچھ اور بھی کہتا کہ میں نے پوچھ لیا۔ ”آپ نے اس شخص یا اس کی فرم کا نام

معلوم کیا تھا؟

”ہاں۔ اس سوال پر بھی اس نے بڑا بے ٹکا جواب دیا تھا، کسے لگا کہ آپ مجھے کالا چور سمجھ لیں۔ پیسے لیں، مال دیں بات ختم۔ میں کون ہوں، اس سے آپ کو کیا۔“

”اچھا تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اس واقعے کے دوسرے ہی دن مجھے فون ملا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں کالا چور بول رہا ہوں۔ تمہیں بہت جلد قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے غور کیا تو یہ مجھے اس شخص کی آواز معلوم نہیں ہوئی جو مجھ سے دفتر میں آکر ملا تھا۔ ممکن ہے کہ وہی آواز بدل کر بول رہا ہو۔ میں نے فون بند کر دیا۔ پھر ہر دوسرے تیسرے دن اسی طرح کے فون آنے لگے۔ فون پر ہر مرتبہ کوئی نئی آواز سنائی دیتی۔ پچھلے ہفتے تو ایک عورت کی آواز میں نے فون پر سنی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے گھر اور چینی کا اشاک جلد سے جلد کسی کے بھی ہاتھوں بیچ دو۔ اگر تم نے ایک ہفتے کے اندر اندر ایسا نہ کیا تو تمہیں قتل کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے گوداموں کو بھی آگ لگا دی جائے گی۔ اس عورت نے مجھے جو مہلت دی ہے، وہ کل ختم ہونے والی ہے۔“ یعقوب نے تفصیل کے ساتھ مجھے ساری بات بتا دی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، حاجی صاحب بول اٹھے۔ ”مقصود میاں! یہ تو کوئی منظم گروہ معلوم ہوتا ہے۔“

”جی ہاں، ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں بولا، پھر یعقوب سے مخاطب ہوا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ مال، جان سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ آج ہی اپنا اشاک نکال دیں۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ آپ کسی ایک پارٹی سے مال کا سودا نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ مال انہی لوگوں کو دیں جن سے آپ پہلے بھی لین دین کرتے رہے ہیں۔“

”یہ تو جناب کوئی بات نہ ہوئی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں گھانے میں رہوں۔“ یعقوب کا منہ بن گیا۔ وہ ”چڑی جائے دمڑی نہ جائے۔“ قسم کے آدم زادوں میں سے معلوم ہوتا تھا، مزید کہنے لگا۔

”روز بھاد بڑھ رہا ہے۔ میں نے اس لئے تو اتنے دن اپنی رقم پھنسا کر نہیں رکھی تھی کہ ان لوگوں کی تڑی میں آکر مال بیچ دوں۔“

مجھے اس شخص کی بات پر غصہ تو آیا، مگر پل گیا اور نرمی سے اسے سمجھایا۔ ”اس میں گھانے کی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے آج کے بھاد سے بہت کم بھاد پر مال خریدا ہوگا۔ اس میں تو آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پھر آپ کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ لوگ اس وقت کئی، چینی وغیرہ کے لئے کتنے پریشان ہیں۔ ایسے وقت میں ان چیزوں کا اشاک کر کے منافع کماتا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے تصدیق طلب نظروں سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

”جناب! آپ کو شاید کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں۔“ حاجی صاحب کے بولنے سے پہلے یعقوب نے مجھ سے کہا۔ ”یہی وقت تو کمائی کا ہوتا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے مقصود میاں کہ میں، یعقوب صاحب کو تمہارے بارے میں کچھ بتا نہیں سکا۔ یہ

لا علمی کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“ حاجی صاحب کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”کوئی بات نہیں حاجی صاحب، اگر یہ مجھے نہیں جانتے تو نہ جانیں۔ مجھے جو مشورہ دینا تھا، دے چکا باقی اس مشورے پر عمل کرنا یا نہ کرنا ان کا کام ہے۔“

”یہ تو خیر تو ٹھیک ہے مقصود میاں، لیکن دھمکیاں دینے والوں کا پتا تو چلنا چاہئے۔“ حاجی صاحب کہنے لگے۔

”پتا تو چل ہی جائے گا، لیکن اس میں ذرا دیر لگے گی۔ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ یعقوب صاحب کو اپنی ضد چھوڑ دینا چاہئے۔“ میں بولا۔

”اچھا تو پھر اجازت دو مقصود میاں۔“ حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔“

حاجی صاحب کے ساتھ ہی یعقوب بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا۔ اس شخص یعقوب کو ساتھ لے کر حاجی صاحب چلے گئے تو میں دیر تک اس معاملے میں غور کرتا رہا۔ اس روز پھر کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

دوسرے دن صبح نو بجے کے قریب میں کوٹھی سے روانہ ہوا اور قراچہ کے دفتر پہنچ گیا۔ پرچی پر میں نے اپنا نام مقصود میاں لکھوا کر اندر بھجوا دیا تو خود قراچہ کمرے سے باہر آیا اور مجھے بڑی عزت و احترام کے ساتھ اندر لے گیا۔

کمرے میں پہلے سے ایک شخص بیٹھا تھا، قراچہ نے اس سے کہا۔ ”آپ جاییے، میں آپ کو پھر بلواؤں گا۔“

وہ شخص اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سر! یہ فائل بھی لے جاؤں؟“ اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں! اسے میرے پاس ہی چھوڑ جائیے۔ اس پر پھر بات کریں گے، فائل مجھے دے دیجئے۔“ اس شخص نے فائل اٹھا کر قراچہ کے حوالے کی اور چلا گیا۔ اسی کے ساتھ قراچہ نے ٹھنٹی بجاکر جہڑی کو بلایا اور تاکید کی کہ کسی کو بھی کمرے میں نہ آنے دے۔

چراغی کے جاتے ہی قراچہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”جی سرکار حکم فرمائیں۔ مجھے پیر صاحب کے ذریعے آپ کا پیغام مل گیا تھا کہ آج آپ میرے دفتر تشریف لائیں گے۔“

”ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا قراچہ کہ ملک دشمن عناصر کی سرکوبی کے سلسلے میں تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں ہم یہ اطلاع بھی دینا چاہتے تھے کہ وہ عناصر اب اور زیادہ سرگرم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اب اپنے مقصد کے حصول کی خاطر لوگوں کو قتل کی دھمکیاں بھی دینا شروع کر دی ہیں۔ ممکن ہے کہ کبھی اور چینی کے ایک کاروباری شخص کو کل تک قتل کر دیا جائے اور اس کے گوداموں کو آگ لگا دی جائے۔“ پھر میں نے مختصراً قراچہ کو یعقوب کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔ ”اس لاپٹی ذخیرہ اندوز سے مجھے کوئی خاص ہمدردی نہیں، لیکن تمہارا حکم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کا پورا نام پتا لکھ لو۔ وہ

کھارادر میں رہتا ہے اور جوڑیا بازار میں کاروبار کرتا ہے۔ "گزشتہ رات ہی میں نے یعقوب کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔

قراچہ نے ایک کانڈ پر وہ سب کچھ لکھ لیا جو مجھ سے اسے معلوم ہوا، پھر کہنے لگا۔ "آپ کا ارشاد بجا ہے سرکار، اس شخص کو نظر میں رکھ کر ممکن ہے ہم ان لوگوں تک پہنچ جائیں۔" قراچہ نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ مجھے ان تفصیلات کا علم کیسے ہوا؟

"سمت کا ایک دن بہر حال ابھی باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے، یعقوب ڈر جائے اور اپنی جان بچانے کے لئے آج ہی سارا مال نکال دے۔ اس کے علاوہ یہ امکان بھی ہے کہ وہ اپنی ضد پر اڑا رہے اور اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست کر لے۔ پولیس کو بھی وہ اس کے لئے پیسا کھلا سکتا ہے۔ خیر یہ بات تو ایک طرف رہی۔ تم مجھے اس کیس کی فائل دکھاؤ۔ میں اب تک کی ساری تک و دو کا نتیجہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کے تشریف لانے سے قبل میں اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر سے اسی کیس پر گفتگو کر رہا تھا۔" قراچہ نے بتایا۔ "یہ ہے وہ فائل۔" قراچہ نے ایک فائل اٹھا کر میری طرف بڑھادی۔ یہ وہی فائل تھی جو اس نے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر سے لے کر رکھ لی تھی۔ "اس فائل میں تمام رپورٹس موجود ہیں۔ آپ اطمینان سے ان کا مطالعہ کیجئے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے قراچہ نے وہ کانڈ اٹھا لیا جس پر یعقوب کے متعلق ضروری تفصیلات درج تھیں۔ وہ چاہتا تو اپنے کسی ماتحت کو کمرے میں بلا کر ضروری احکام دے سکتا تھا لیکن اس سے میری یکسوئی میں فرق پڑتا۔ وہ اسی لئے خود اٹھ کر چلا گیا۔

میں نے فائل کھول کر رپورٹس پڑھنا شروع کر دیں۔ اسی دوران قراچہ بھی واپس آ گیا، مگر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ رپورٹس پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام بہر حال ذخیرہ اندوزوں کا نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک واضح مثال یعقوب بھی تھا۔ ذخیرہ اندوز اور موقع سے فائدہ اٹھا کر ناجائز فائدہ اٹھانے والے تو خود پریشان تھے۔ یہ بات مجھے قرن قیاس معلوم ہوئی کہ ان ملک دشمنوں کا صدر مقام کراچی ہی ہوگا۔ اس کی وجہ یہ کہ کراچی شہری تمام تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مشتبہ بڑے کاروباری لوگوں کی فہرست میں سینٹھ عبدالرزاق کا نام دیکھ کر میں ضرور چونکا۔ یہ وہی شخص تھا کہ جس نے حاجی صاحب کے ذریعے مجھے اپنا درکنگ پارٹنر بنانے کے لئے پیشکش کی تھی۔ میں نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ بات اس وقت کی تھی کہ جب محمود حسن زندہ تھا۔ سینٹھ عبدالرزاق کے نام کے ساتھ ہی کئی دوسرے نام بھی درج تھے۔ انہی میں مجھے ایک غیر مسلم شخص رام داس کا نام بھی نظر آیا تھا۔ ناموں کے ساتھ ان لوگوں کے کاروبار کی تفصیلات بھی درج تھیں۔ ان میں صرف دو افراد ایسے تھے کہ جن کا کاروبار ملک کے دوسرے حصے، یعنی بنگال تک پھیلا ہوا تھا۔ کچھ رپورٹس کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس معاملے کو غیر ضروری طور پر الجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

اس فائل کا مطالعہ کرنے اور تفصیلات ذہن میں محفوظ کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں نے وہ فائل بند کر دی اور قراچہ کو دے دی۔ ملک دشمن عناصر کا سراغ لگانے کے لئے جو کوششیں کی گئی

تھیں، فائل میں ان کا بھی تفصیلی ذکر تھا۔ ان پر میں نے خصوصی توجہ دی۔ اسی سے میرا ذہن ایک نتیجے تک پہنچ گیا۔

قراچہ فائل لے کر میری طرف سوائید نظروں سے دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ "قراچہ! کیا تمہارے عملے کے ان افراد سے ملاقات ممکن ہے جنہوں نے رپورٹس لکھی ہیں؟"

"جی ہاں سرکار!" قراچہ نے جواب دیا۔ "لیکن انہی افراد سے ملاقات ہو سکتی ہے جو آج چھٹی پر نہیں ہیں۔ جو لوگ دفتری کے کسی کام سے باہر گئے ہیں، وہ بھی نہیں مل سکتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کیس پر کن کن لوگوں نے اب تک کام کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فائل کھول کر اپنے سامنے رکھ لی اور ایک کانڈ پر کچھ لوگوں کے نام لکھنے لگا۔

"ملاقات کی وضاحت کر دوں قراچہ۔" میں بولا۔

"جی؟" وہ کوئی نام لکھتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم ان لوگوں کو ایک ایک کر کے اپنے کمرے میں بلاؤ گے۔" میں نے بتایا۔ "ان سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم اسی کیس کے متعلق جو چاہو پوچھ گچھ کرتے رہنا۔ مقصد انہیں کسی بہانے اس کمرے میں روکے رکھنا ہے۔"

"جی بہت بہتر ہے حضور۔" یہ کہہ کر قراچہ دوبارہ اس فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جلد ہی اس نے یہ کام مکمل کر لیا اور گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا۔ چپراسی آ گیا تو اس نے کہا۔ "مٹان صاحب سے جا کر کہو کہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

ڈپٹی ڈائریکٹر کا نام مٹان ہی تھا۔ وہ آیا تو میں اسے پہچان گیا۔ میری آمد کے وقت وہی قراچہ کے پاس بیٹھا تھا۔

"مٹان صاحب۔" قراچہ نے اسے مخاطب کیا اور ناموں کی فہرست اسے دے دی۔ "معلوم کر کے بتائیے کہ ان افراد میں سے کون کون اس وقت دفتر میں موجود ہیں۔"

ناموں کی فہرست لے کر مٹان چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد آ کر وہ فہرست قراچہ کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "سر! ان میں جن لوگوں کے نام پر میں نے صحیح کاشان لگایا ہے، وہ دفتر میں موجود ہیں۔ کراس صرف دو ناموں پر ہے۔ یہ دونوں چھٹی پر ہیں۔ آؤٹ ڈور ابھی کوئی نہیں۔"

قراچہ نے فہرست پر ایک نظر ڈالی اور مٹان سے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ جاییے۔ آؤٹ ڈور ابھی کسی کو نہ بھیجیں۔"

پھر قراچہ نے میری ہدایت کے مطابق ایک ایک شخص کو اپنے کمرے میں بلانا شروع کر دیا۔ میری توجہ تو ان کے ذہنوں پر مرکوز رہی۔ قراچہ ان سے اس عرصے میں اسی کیس کے متعلق مختلف سوالات کرتا رہا۔ کمرے میں داخل ہونے والے چوتھے شخص کے ذہن کو پڑتے ہی مجھے امید کی کرن سی نظر آئی۔ اسے فوری طور پر میں نے اپنے اثر میں لے لیا اور بولا۔ "بیٹھ جاؤ جمیل! تمہاری تنخواہ یقیناً اتنی نہیں کہ شام کو کسی بڑے ہوٹل میں بیٹھ سکو۔ ٹھیک ہے نا؟"

”جی ہاں، مجھے اتنی تنخواہ نہیں ملتی۔“ اس شخص جمیل نے خواب آلود سی آواز میں میرے سوال کا جواب دیا۔

”ملک افضل کے بارے میں تمہی نے یہ رپورٹ لکھی تھی کہ وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ملک افضل کا نام انہی بڑے کاروباری لوگوں میں شامل تھا جن پر ایک رپورٹ کے مطابق شبہ کا اظہار کیا گیا تھا، پھر انکواری کی گئی تھی۔

”میں نے ہی وہ رپورٹ لکھی تھی۔“ جمیل نے اقرار کیا۔

”تم جانتے ہو ملک افضل کو؟ اسے دیکھا ہے؟ اس سے ملے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”اور تم نے انکواری بھی نہیں کی؟ انکواری کے بغیر ہی رپورٹ لکھ دی؟ ایک خوب صورت لڑکی الماس ہی کے کہنے پر تم نے ایسا کیا تھا؟“ میں نے پچھلے درپے کئی سوال کئے۔ جمیل نے اعتراف کر لیا کہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی الماس ہی کے ایما پر اس نے ملک افضل کے بارے میں انکواری کے بغیر رپورٹ لکھ دی تھی۔

اس کے بعد میں نے ایک بڑے ہوٹل کا نام لیا اور بولا۔ ”الماس سے تمہاری ملاقاتیں اسی ہوٹل میں ہوتی رہی ہیں اور ہوٹل کے تمام اخراجات بھی وہی برداشت کرتی ہے۔ اس سے ملے ہوئے تمہیں تین دن ہو گئے، یہ بھی ٹھیک ہے نا؟“

”اس نے گزشتہ روز ملے کا وعدہ کیا تھا، مگر ملی نہیں۔“ جمیل نے بتایا۔

”اس کیس کے متعلق بھی وہ باتوں باتوں میں تم سے بہت سی باتیں پوچھتی رہی ہے، یقیناً تم اس کا بھی اقرار کر لو گے۔ تم اب تک اپنی دانت میں الماس کو بے وقوف بنا کر کئی ہزار روپے ادھار لے چکے ہو۔ تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ تم نے اسی لئے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارے دو بچے بھی ہیں۔“ میرے سوالوں کے رد عمل میں جو نیالات جمیل کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے، میری توجہ انہی پر تھی۔ میں انہی کی روشنی میں یہ ساری باتیں کر رہا تھا۔ عموماً کچھ معلوم کرنے کے لئے ذہن کو متحرک کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ذہن کو متحرک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

جمیل نے میری بات کی تصدیق کر دی۔ اس کے ذہن کو اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد اور مزید ضروری معلومات حاصل کر کے اسے میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

وہ چونک کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور قمر احمد سے بولا۔ ”سوری سر کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ آپ نے مجھے طلب کیا تھا سر؟“

اپنے اثر میں لینے کے بعد میں نے اس سے جو کچھ بھی معلوم کیا، اسے یاد نہیں رہا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا ہے اور غلطی سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

قمر احمد کے چہرے پر غصے کے آثار ابھرے اور اس نے غور کر جمیل کو دیکھا۔ اسی وقت میں نے قمر

احمد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”جی..... جی حضور؟“ قمر احمد نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مجھے یہ احساس تھا کہ کمرے میں اس وقت قمر احمد کا ایک باحت موجود ہے اسی لئے لہجہ بدل کر بولا۔ ”آپ سے مجھے خلوت میں ایک ضروری بات کرنا تھی۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اپنے دفتری معاملات بعد میں منسخت رہیں گا۔ انہیں پھر بلا لیجئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے جمیل کی طرف اشارہ کیا۔

قمر احمد چند لمحوں تک حیران سا ہوا، پھر غالباً سمجھ گیا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ اس نے جمیل سے کہا۔ ”تم جاؤ، جب ضرورت ہوگی تمہیں بلوا لوں گا۔“

”شکریہ سر!“ یہ کہہ کر جمیل کمرے سے نکل گیا۔

”فہرست میں اب کتنے افراد کے نام اور باقی ہیں؟“ میں نے قمر احمد سے دریافت کیا۔

”ابھی پانچ افراد اور ہیں سرکار!“ قمر احمد نے بتایا۔

”انہیں بھی ایک ایک کر کے بلوا ہی لو تو اچھا ہے۔ ممکن ہے، کوئی اور کالی بھیڑ پکڑی جائے۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔“

پھر یہی ہوا۔ ایک اور شخص ثاقب اس کیس کے بارے میں سیٹھ عبدالرزاق کو معلومات فراہم کرتا رہا تھا۔ سیٹھ نے باقاعدہ اس کا بھتا باندھ رکھا تھا۔ اس طرح مشتبہ بڑے کاروباری افراد کی فہرست میں سے دو نام سامنے آئے جن کا اس کیس سے کوئی نہ کوئی تعلق ظاہر ہوتا تھا۔ سیٹھ عبدالرزاق سے میں ذاتی طور پر بھی واقف تھا۔ ہاں ملک افضل میرے لئے اجنبی تھا۔

”ثاقب اور جمیل کے سلسلے میں دفتری کارروائی کرنا تمہارا کام ہے قمر احمد۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ کارروائی فی الحال نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ ان دونوں ہی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا بتایا ہے۔ ان کی اس بے خبری سے تم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہو؟ یہ شاید ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”جی ہاں سرکار! ان دونوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھ کر بہت سی اور نئی باتیں سامنے آ سکتی ہیں۔“ قمر احمد میری تائید میں بولا۔ ”میں سمجھ گیا سرکار کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔“

”غالباً تمہارے دفتر میں ہماری آمد کا مقصد خاصی حد تک پورا ہو چکا ہے۔ اب تم ہمارے پاس آؤ گے تاکہ ہم تمہاری مزید رہنمائی کر سکیں۔“

”کب حاضر ہو جاؤں سرکار؟“ قمر احمد نے پوچھا۔

”آج رات ہی مغرب کے بعد آ جاؤ۔“ میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”سرکار! آپ جہاں تشریف لے جانا چاہیں، میں کار میں.....“

”نہیں۔“ میں بول اٹھا اور باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا، کیوں کہ مجھے جلد از جلد سیٹھ عبدالرزاق کے دفتر پہنچنا تھا۔ اس معاملے کو اب میں مزید طول دینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے بلند آواز میں ”خدا حافظ“ کہا اور قمر احمد کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ جواب میں وہ ”خدا حافظ“ بھی نہ کہہ سکا اور پھر میں وہاں نہیں

مینے کی پہلی تاریخ کو بھجوا دیتا ہے۔ میں نے سوچا، میرا کیا جاتا ہے، اگر ایک دوست کا کام بن رہا ہے۔ مجھ کو کیا پتا تھا کہ اس طرح میں خود اپنی گردن میں پھندا ڈال رہا ہوں۔

”انسپکٹر ثاقب نے تمہیں یہ نہیں بتایا سیٹھ کہ اسمگلنگ کے سلسلے میں جن بڑے کاروباری لوگوں پر شبہ کیا جا رہا ہے، تمہارا نام بھی اس میں شامل ہے؟“

”وہ یہ بھی بولا تھا میرے کو اسی لئے تو اور فکر ہو گئی۔ میں نے ملک افضل سے بھی بات کی کہ کیا کرنا چاہئے؟ اس نے میرے کو تسلی دے دی کہ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، جب ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ اس کی بات میرے دل کو گئی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب تمہاری باتوں سے مجھ کو ایسا پتا لگ رہا ہے مقصود میاں کہ ملک افضل نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے ورنہ میرے خلاف انکوائری کیوں شروع ہوتی؟..... اب میرے کو معلوم ہو گیا مقصود میاں، تم میری ہمدردی میں مجھ کو یہ باتیں بتانے آئے ہو۔ حاجی صاحب مجھ سے غلط نہیں بولے تھے کہ تم بہت کام کے آدمی ہو۔ مقصود میاں! اب تم ہی مجھ کو اس لفظ سے نکال سکتے ہو۔ میرے خلاف انکوائری رکوانے میں جتنا پیسا بھی لگے گا، میں تمہارے کو دوں گا۔“

سیٹھ عبدالرزاق کا ذہن پڑھ کر میں یہ معلوم کر چکا تھا کہ وہ اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔ میں نے اسی لئے اس سے کہا۔ ”تم کوئی فکر نہ کرو سیٹھ، مجھ سے تمہارے لئے جو ہو سکا، وہ ضرور کروں گا۔ تم سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ملک افضل سے اس بات کا بالکل ذکر نہ کرنا ورنہ بات بگڑ جائے گی۔“

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیٹھ عبدالرزاق نے ہاتھ بڑھا کر ریسپورڈ اٹھا لیا اور بولا۔ ”ہیلو..... اچھا..... اچھا تم الماس بول رہی ہو..... ہاں بولو..... آج رات کی فلائٹ سے ڈھاکا جا رہی ہو..... ہاں ہاں.....“

الماس کا نام سننے ہی میں نے سیٹھ عبدالرزاق کے ذہن پر توجہ دینا شروع کر دی۔ یہ وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی جس کے ایما پر یہ رپورٹ لکھی گئی تھی کہ ملک افضل ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اب یہ نئی بات سامنے آئی تھی کہ اس لڑکی کا تعلق عبدالرزاق سے بھی ہے۔ اب ملک افضل سے بھی پہلے الماس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ سیٹھ عبدالرزاق نے جیسے ہی الماس سے بات کر کے فون رکھا، میں بول اٹھا۔ ”اچھا سیٹھ، میں چلتا ہوں۔“ میں نے سیٹھ سے الماس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا، کیوں کہ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے ہر بات معلوم ہو چکی تھی۔ میں اگر آج ہی الماس سے نہ ملتا وہ میرے ہاتھ سے نکل جاتی۔

میں جب انھیں والا تھا تو سیٹھ عبدالرزاق نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ ”اب میرے کو پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ ملک افضل نے جان بوجھ کر مجھے اس کیس میں پھنسا دیا ہے اور خود صاف بیچ گیا۔“ وہی کی آڑ میں ملک افضل نے میرے کو فریب..... ”سیٹھ عبدالرزاق کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے اور آنکھیں دفتر کے دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

میری پشت دروازے کی طرف تھی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ درشت چہرے والا ایک دراز

رکا۔

میں چند ہی لمحوں میں سیٹھ عبدالرزاق کے دفتر پہنچ گیا۔ اب میں نے دوبارہ انسانی قالب اختیار کر لیا تھا۔

سیٹھ عبدالرزاق مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ ”مجھ کو معلوم تھا مقصود میاں کہ ایک نہ ایک دن تم خود چل کر میرے پاس آؤ گے۔“

اس کے پاس دو مہمان اور بھی بیٹھے تھے جن سے اس نے معذرت کر لی کہ وہ پھر کسی وقت آکر مل لیں۔ ان مہمانوں کے جاتے ہی میں نے سیٹھ عبدالرزاق کی غلط فہمی دور کر دی اور بولا۔ ”سیٹھ! میں اس وقت تم سے تمہارے کاروبار میں شرکت پر گفتگو کرنے نہیں آیا۔“

”تو پھر کیا بات ہے، بولو نا بابا۔“ سیٹھ عبدالرزاق کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

”یہ بتاؤ سیٹھ کہ تم نے انٹی کرپشن کے انسپکٹر ثاقب کا بھتا کیوں باندھ رکھا ہے؟“ یہ سوال کر کے میں نے اس کے ذہن کو متحرک کر دیا۔

توقع کے مطابق میرے سوال پر وہ چونک اٹھا۔ اب میری توجہ اس کے ذہن میں ابھرنے والے خیالات پر تھی۔ جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور کہنے لگا۔ ”یہ تم کو کس نے کہہ دیا مقصود میاں! میرا کیا تعلق ان لوگوں سے۔ میں تو ایسا دھندا ہی نہیں کرتا بابا۔ مجھے کیا ضرورت ہے کسی کا بھتا باندھنے کی؟“ ”میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا سیٹھ کہ تمہارے خلاف انکوائری شروع ہو گئی ہے۔ تم مجھی سے صحیح بات چھپا رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کس نے تمہارے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔ تم کو تو اس کا نام بھی بتا دوں۔“ میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”دوستی میں بھی کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرتے سیٹھ۔“

میرے آخری الفاظ سننے ہی سیٹھ عبدالرزاق سوچنے لگا پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک افضل نے مجھے پھنسا دیا۔ اسی کے ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اب وہ کسی قدر فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں خاموشی کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”مقصود میاں! تم کو جب اس بات کا پتا چل ہی گیا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو خواہ مخواہ میں پھنس گیا بابا۔ میرے کو سامنے کر کے وہ تو بیچ گیا۔“

”تمہیں اپنے دوست سے یہ تو پوچھنا ہی چاہئے تھا سیٹھ کہ وہ خود انٹی کرپشن کے انسپکٹر سے معاملہ طے کیوں نہیں کر لیتا؟“

”غلطی میری ہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے ہی منہ سے اس کے سامنے ایک دفعہ یہ بات نکل گئی تھی کہ انٹی کرپشن کا ایک آفسیر میرا جاننے والا ہے۔ کچھ ہی دن کے بعد ملک افضل نے میرے کو ایک کام کے لئے بول دیا۔ کہنے لگا کہ اس انسپکٹر سے تمہاری جان پہچان ہے، اس لئے تم ہی بات کر کے اس کا بھتا باندھ دو۔ میں نے انسپکٹر کو بلوا کر اس سے بات کر لی اور وہ مان گیا۔ پہلے بھی میں اس انسپکٹر سے ایک کام لے چکا تھا۔ میرے کو وہ انسپکٹر جو آکر بتاتا ہے، میں ملک افضل کو بول دیتا ہوں۔ بھتا بھی وہ ہر

قد فخص دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آیا۔ ریوالور کی نال سیٹھ عبدالرزاق کی طرف ابھی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کا شاید وہ ہزارواں حصہ ہو گا کہ جب میں اپنی جگہ سے اچھلا اور درشت چرے والے دروازے فخص پر چھلانگ لگا دی۔ کلائی پر ہاتھ ڈالتے ہی میں نے ریوالور کا رخ چھت کی طرف کر دیا۔ سیٹھ عبدالرزاق کا دفتر گولی چلنے کی آواز سے گونج اٹھا۔ دوسرے جھٹکے میں ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ سیٹھ عبدالرزاق کو جیسے سکتے ہو گیا۔ وہ تو پلکیں جھپکاتا تک بھول گیا تھا۔

پھر میں نے درشت چرے والے کو سینٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ آنکھیں پھاڑے زمین پر پڑا تھا۔ سیٹھ عبدالرزاق اس طرح چونکا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اٹھا ہو۔ میں نے اسے ٹیل فون کا ریسور اٹھاتے دیکھا۔

”نہیں سیٹھ۔“ میں بول اٹھا۔ ”پولیس کو بلائے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے حیران سا ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ”پھر..... کیا بولتے ہو تم؟..... ابھی تم میرے کونہ بچاتے ت..... تو یہ مجھ کو خلاص کر دیتا بابا۔“

سیٹھ عبدالرزاق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ ”دروازہ بند کر دو سیٹھ۔ پولیس درمیان میں آگئی تو پھر پتا نہیں چلے گا کہ یہ فخص کون ہے اور کس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔“ میری نظریں یہ کہتے ہوئے بھی اسی درشت چرے والے پر جمی رہیں۔ وہ اب کراہتے ہوئے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرے کہنے پر سیٹھ بڑبڑاتا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”میری کھوپڑی میں تو یہ بات نہیں آئی کہ چوکیدار اور سالا چراسی کدھر مر گیا ہو یہ میرے کو قتل کرنے دفتر میں ڈائریکٹ گھس آیا۔“ سیٹھ نے اب اپنے حواس پر قابو پایا تھا اور دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ درشت چرے والا اٹھ کر خود کھڑا ہوتا، میں نے جھپٹ کر اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور پھر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”مجھ سے ٹکر لے کر تم اچھا نہیں کر رہے۔“ خلاف توقع وہ کسی سانپ کی طرح پھکڑا۔

”میں نے تم سے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب دو ورنہ.....“ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیا۔

”چھوڑ دو میرا گریبان۔“ وہ غریبا۔ ”تمہیں شاید خبر نہیں کہ رحیم دادا کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے والا زندہ نہیں رہتا۔“

”تو رحیم دادا ہو تم۔“ میں نے اچانک اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ ”بہنئی والے رحیم دادا؟“ اب میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز ہو چکی تھی۔

وہ میری بات سن کر چونکا۔ ”تم جانتے ہو مجھے؟“ اس کے لمبے میں حیرت تھی۔

”ہاں رحیم دادا۔“ میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھا اور کرسی کے نیچے پڑا ہوا ریوالور جھک کر اٹھا لیا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے سیٹھ کو قتل کرنے کا سودا کتنے میں کیا تھا۔“ ریوالور کا چیمبر کھول کر میں نے گولیاں نکال لیں اور خالی ریوالور اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ”لپکو“ ریوالور کی گولیاں میں نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔

”تم بھی مجھے کوئی پینے ہوئے لگتے ہو۔“ رحیم دادا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”لیکن..... لیکن تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”اس بات کو چھوڑو رحیم دادا کہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں دیکھا۔“ میں بولا۔ ”آج رات کو دس بجے وہ کالی نقاب والا اگر تم سے وعدے کے مطابق ملنے آئے تو اس کے پچیس ہزار روپے واپس کر دیتا“ بات ختم۔“

”اور میں نے اسے جو زبان دی تھی کہ کام ہو جائے گا؟ کیا اپنی زبان سے پھر جاؤں؟..... اپنے آدمی ہو کر تم یہ کیا بے وقوفی کی باتیں کئے جا رہے ہو۔ سودا کر کے زبان سے پھر جانا، رحیم دادا نے نہیں سیکھا۔ یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔“ وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے میں بھی اسی کی طرح کوئی جرائم پیشہ ہوں۔

”یعنی سیٹھ کو تم ہر حال میں قتل کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔ ”دیکھو مجھے بقیہ پچیس ہزار ملنے نہ ملنے کا کوئی غم نہیں، ملیں نہ ملیں۔“ وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ”بات زبان کی ہے۔“

”چاہے اس کے لئے تمہیں اپنی جان دینی پڑے۔“ میرے تیور بدل گئے۔

”کیا مطلب؟“ اس نے مجھے جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”مطلب صاف ہے رحیم دادا۔ تم سیٹھ کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”تم روکو گے مجھے؟..... تم؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے انتہائی حیرتی کے ساتھ اپنے نینے میں اڑسا ہوا کھٹکے دار چاقو نکال کر کھول لیا۔

میں اس کی ہچکناہ حرکت پر ہنس دیا اور بولا۔ ”کیوں تمہاری کھال کھجاری ہے۔ اتنا پٹ کر بھی تمہاری موتی عقل میں یہ بات نہیں سنا کی کہ سیٹھ کو قتل کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم چاقو دوبارہ اپنے نینے میں اڑس لو اور میں نے جو کچھ کہا ہے مان لو۔“

سیٹھ عبدالرزاق کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسے میں نے ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ رحیم دادا کے ہاتھ سے چاقو چھین لینے اور اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کا چاقو اب میرے ہاتھ میں تھا۔

”سیٹھ! تم اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے دیوار سے لگے ہوئے سیٹھ عبدالرزاق سے کہا۔ ”م..... مگر یہ..... یہ.....“ سیٹھ نے ہکا کر رحیم دادا کی طرف اشارہ کیا۔ ”مق..... مقصود میاں! اسے پولیس کے پینڈ او..... اور کر دو۔“

”ہاں اور کیا۔“ میں نے ہر سکون آواز میں کہا۔ ”اب مزید کہنے سننے کے لئے کیا باقی رہ گیا ہے۔“

..... میرا خیال ہے کہ اب تم چلنے پھرنے کے قابل ہو۔“

”تم سے پھر کبھی ملاقات ہو سکتی ہے؟“ رحیم دادا نے دریافت کیا۔

”ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔“ میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

رحیم دادا دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اٹھا اور پھر لنگڑاتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ سب کچھ سیٹھ عبدالرزاق کے سامنے ہوا تھا، پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا، مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”مقصود میاں! کیا اب وہ واقعی جان..... میری جان نہیں لے گا؟ کیسے وہ..... وہ پھر کسی اور دن نہ آجائے؟“

”اب وہ نہیں آئے گا سیٹھ! تم اتنے گھبرا کیوں رہے ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”میرے کو تو آج معلوم پڑا کہ تم مارا جینی بھی کر لیتے ہو۔“ سیٹھ نے اپنی دانست میں مجھے خوش کرنے کے لئے کہا۔ اس نے زبردستی مسکراتا چلا تھا، مگر چہرے پر اب بھی فکر مندی ہی کے آثار تھے۔ اب اسے یہ تشویش تھی کہ کس نے رحیم دادا کو بھیجا تھا اور کون اسے قتل کرانے کے درپے تھا؟ یہی بات اس کی زبان پر بھی آگئی۔

”مجھے کیا خبر سیٹھ! وہ کون ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خود رحیم دادا کو بھی پتا نہیں۔“

”لیکن تم کسی کالی نقاب والے کا اس سے بولے تھے، میرے کو یاد ہے۔“

”میں نے تو بس ایسے ہی اندھیرے میں تیر چلا دیا تھا جو صحیح نشانے پر بیٹھ گیا۔ ایسے معاملوں میں قتل کرانے والے خود سامنے نہیں آتے۔“ میں نے بات بتا دی۔

”ابھی تو اپن کا کسی سے دشمنی بھی نہیں۔“ وہ بڑبڑانے لگا۔ ”سالا خالی خولی بیٹھے بیٹھے یہ لہذا چل گیا۔“ پھر وہ مجھ سے مشورہ طلب انداز میں بولا۔ ”تم بولو مقصود میاں تو میں کچھ دن کو اپنے ڈھاکا والے دھندے کو چالو کرنے کے لئے ادھر چلا جاؤں؟ لیکن.....“ وہ کچھ کہتے ہوئے چپ ہو گیا، پھر خود ہی کہنے لگا۔ ”لیکن ادھر تو ملک افضل بھی گیا ہے۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تمہارا کاروبار الگ ہے، اس کا الگ۔“ میں بولا۔

”ادھر ابھی مشینری وغیرہ تو سب لگ گیا ہے، کام شروع نہیں ہوا۔ ملک افضل ہی مجھ کو بولا تھا کہ ادھر بہت مال ہے۔ لیبر بہت سستا مل جائے گا۔“

”الماس بھی وہیں جاری ہے۔“ میں نے دانستہ چٹکی لی۔ ”وہ تو ملک افضل اور تمہارا، دونوں ہی کا خیال رکھتی ہے۔“

”تم کو کیسے پتا؟“ سیٹھ عبدالرزاق چونک اٹھا۔ ”تم اس کو جانتے ہو؟“

”جانتا تو نہیں لیکن جان جاؤں گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا، پھر کہا۔ ”میں کیا جانتا ہوں، کیا نہیں، تم اس چکر میں نہ پڑو۔ تمہیں ڈھاکا جانا ہے تو چلے جاؤ۔ ویسے یہاں بھی کم از کم رحیم دادا کی طرف سے تمہاری زندگی کو اب کوئی خطرہ نہیں۔“

”لیکن وہ کالی نقاب والا کسی اور کو مال دے کر میرے پیچھے لگا دے پھر؟“ سیٹھ بولا۔ ”نا بابا! تم

”نہیں۔“ میں نے انکار کر دیا اور بتایا۔ ”اس علاقے کے تھانیدار کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ تمہیں قتل کیا جانے والا ہے۔ رحیم دادا جیسے بندے کبھی کوئی کچا ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اگر پولیس، رحیم دادا کو پکڑ کر لے بھی گئی تھی تو کچھ نہیں ہوگا۔“

”یہ تو بڑا ظلم ہے مقصود میاں! پھر..... پھر تو کوئی قانون ہی نہ ہوا۔“ سیٹھ کے خوف پر غصہ غالب آ گیا۔

”معاف کرنا سیٹھ! تم لوگوں کو قانون اس وقت یاد آتا ہے جب تمہارا کوئی فائدہ ہو ورنہ تو.....“

خیر چھوڑو، یہ ان باتوں کا وقت نہیں، ابھی رحیم دادا سے بھی مجھے معاملہ طے کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے رحیم دادا کی طرف دیکھا جس کے خاصے کس بل نکل گئے تھے۔ اسے میں نے پانی پلایا۔ اسی عرصے میں سیٹھ عبدالرزاق اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اپنی جیب سے پیسے چاقو اور گولیاں نکالیں پھر انہیں رحیم دادا کے سامنے میز پر رکھ کر بولا۔ ”یہ چیزیں میرے کام کی نہیں رحیم دادا! تم انہیں.....“

”ارے بابا! یہ کیا کرتے ہو۔“ سیٹھ عبدالرزاق اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ ”یہ تو میرے کو صفا صفا مار دے گا۔“

رحیم دادا نے اپنے بے قابو سانسوں پر قابو پاتے ہوئے میری طرف نگاہ اٹھائی تو میں دوستانہ انداز میں مسکرا دیا۔ اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”رکھ لو انہیں جیب میں رحیم دادا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

میری توقع کے مطابق رحیم دادا نے دونوں چیزیں اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیں تو سیٹھ کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت واپس آئی۔

”سیٹھ! تم رحیم دادا کو پانچ ہزار روپے دے دو۔“ میں بولا۔

”پانچ ہزار؟..... مگر کس بات کے مقصود میاں؟“

”رحیم دادا نے پانچ ہزار روپے تمہانیدار کو دیئے تھے۔ ان کے پاس پچیس ہزار روپے میں سے اب صرف بیس ہزار روپے باقی ہیں۔ تمہیں قتل کرنے کے جو پچیس ہزار روپے انہوں نے ایک پارٹی سے لئے تھے وہ واپس کرنے ہیں۔ یہ پانچ ہزار کا گھانا کیوں اٹھائیں۔“ سیٹھ عبدالرزاق اور رحیم دادا دونوں مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”جلدی کرو سیٹھ! مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

سیٹھ کو میری ہدایت پر عمل کرنا ہی پڑا پھر بڑبڑایا۔ ”تم بھی خوب آدمی ہو مقصود میاں! جو میرے کو قتل کرنے آیا تھا اسی کو پانچ ہزار روپے دلوا رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے نا رحیم دادا؟ تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں ہوئی نا؟.....“ وہی زبان سے پھر جانے والی بات تو زبان، جان سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی۔ جان ہے تو جمان ہے۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں رحیم دادا! اب تم جاؤ۔“

”جاؤں؟“ رحیم دادا نے اس طرح پوچھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔

میرے کو کراچی سے جانے دو۔“

میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ”تو میں کب تمہیں روک رہا ہوں۔ ضرور جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھہرو مقصود میاں!“ سیٹھ بول اٹھا۔ ”اپنا وعدہ یاد رکھنا کہ میرے خلاف اینٹی کرپشن کی انکوائری رکوا دو گے۔ مال جتنا بھی خرچ ہو جائے کوئی پروا نہیں۔“ پھر اس نے اپنی میز کی اوپر والی درواز کھول کر ایک چیک نکالی اور قلم کھول کر بولا۔ ”ابھی بولو“ کتنے کا چیک کاٹ دوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس ملک افضل کو اس کی ہوا نہ لگنے دینا جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ ہاں ایک بات اور۔ لاڈ پیار میں آکر الماس کو بھی کچھ نہ بتا دینا۔ سمجھ گئے میری بات اچھی طرح؟“ میں نے اسے تاکید کی۔

”بالکل سمجھ گیا بابا! میں کوئی چریا نہیں ہوں کہ سب کو یہ بات بولتا پھروں۔“ سیٹھ نے کہا۔ پھر پارٹنرشپ والی بات دہرائی۔ ”میری آفر اب بھی ہے، سوچ لینا۔“

میں کچھ کہے بغیر مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر آکر دیکھا تو سیٹھ کا چہرہ اسی بے ہوش پڑا تھا۔ رابڈاری میں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا، سو میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا اور پھر ایک فائو سٹار ہوٹل کے بند کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

وہ ایک آرام کرسی پر نیم دراز کسی انگریزی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے کم نہیں ہوگی، مگر جسم کی ساری ٹٹائیں ابھی تک پوری طرح کھینچی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں، قد لمبا، رنگ گورا، چہرہ پر کشش اور جسم پر گہرے سبز رنگ کی ساڑھی، کچھ عورتیں خود کو بہت سنبھال سنبھال کر ”خرچ“ کرتی ہیں، الماس بھی مجھے ایسی ہی آدم زادیوں میں سے لگی۔

الماس ایک ایسے غیر ملکی رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی جو کم از کم پاکستان کی حد تک ممنوع ہی قرار دیا جاسکتا تھا۔ میں نے دانستہ انسانی قالب اختیار نہیں کیا اور اس کے قریب جا کر کہنے لگا۔ ”ایسے رسالے شریف عورتیں نہیں پڑھتیں۔“

وہ اچھل پڑی۔ رسالہ اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر نیچے گر گیا اور حسین و پرکشش چہرے کے نقوش خوف کی وجہ سے بگڑ گئے۔ اس کی آنکھوں نے تیزی سے حرکت کی اور خالی کمرے کا جائزہ لیا، اسی کے ساتھ سانس بھی تیز تیز چلنے لگی۔

”کسے تلاش کر رہی ہو سیتا؟“ میں نے الماس کو اس کا اصل نام لے کر مخاطب کیا۔ ”اس کمرے میں تمہارے سوا اور کون ہے؟“

اس مرتبہ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس کے گلہابی ہونٹ حرکت میں آ گئے۔ میں چونکا ہوا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ مجھے کوئی خطرناک آدم زادی محسوس ہوئی۔ وہاں آنے سے پہلے مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ کسی ایسی عورت سے میرا سامنا ہوگا اور یہ میری غلطی تھی۔ میں ابھی صرف اس کا اصل نام ہی معلوم کر سکا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کے ذہن پر توجہ دی تو جھنجھلا کر رہ گیا۔ میرے خیال کی لہریں جیسے

اندھیرے کی ایک دیوار سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔

دانستہ میں نے اس کے قریب جانے سے گریز کیا اور اپنی جھنجھلاہٹ پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”سنا تھا کہ تمہارا نام الماس ہے، مگر تم سنتا نکلیں۔“

رد عمل میں اس بار سینٹا کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔ اس کے چہرے پر اب خوف نہیں تھا، حیرت کی جگہ اب پہلے جیسی کشش نے لے لی تھی۔ وہ جھکی اور آرام کرسی کے قریب پڑا ہوا انگریزی رسالہ اٹھا کر قریبی میز پر رکھ دیا، پھر دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو، میرے کمرے میں کس طرح داخل ہوئے اور مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے، لیکن اب تمہارا کوئی وار مجھ پر نہیں چلے گا۔ اگر یقین نہیں تو میرے پاس آکر دیکھ لو۔“

”میں تم پر کوئی وار کرنے تو نہیں آیا تھا۔“ میں نے بھی بطور مصلحت نرمی سے کام لیا۔ ”تو پھر کیا صرف میرے درشن (دیدار) کرنے آئے تھے۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی اور پھر دوبارہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

”تمہارا درشن کرنے کے لئے ملک افضل اور سیٹھ عبدالرزاق جیسے بہت سے لوگ موجود ہیں۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے پر کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”مجھے کسی کا جھوٹا کھانا کھانے کا شوق نہیں۔ میں تو تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا تھا، کیوں کہ تمہارا اور میرا مقصد ایک ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ یہ سوال کرتے ہوئے اس کی چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ”اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنا جو ابھی ٹھیک طرح سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔“ میں نے اس آدم زادی کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بولو جب میراں کے عوام بھوکے مرنے لگیں گے، ضروریات زندگی کی اشیاء مارکیٹ سے غائب ہو جائیں گی تو وہ حکومت کے خلاف ہوں گے کہ نہیں؟“

سینٹا کے چہرے پر میری بات سنتے ہوئے کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا ہے۔

”لیکن تم ہو کون؟“ اس کی آواز سے الجھن ظاہر ہونے لگی۔

”میں بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔“

”تو پھر مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟ تم نے اتنی فحشی (طاقت) کیسے پراپت (حاصل) کر لی؟“ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گی، سو فوراً بولا۔ ”میں نے یہ فحشی پراپت کرنے کے لئے

بڑے جتن کئے ہیں۔ برسوں میں نے درگا دیوی کا چاپ کیا ہے۔“

میرا جواب سن کر اس کے چہرے سے کسی قدر اطمینان ہلکنے لگا۔ چند لمحے جیسے وہ کچھ سوچتی رہی، پھر کہا۔ ”اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو تو پھر آدمی کی جون میں کیوں نہیں آ جاتے؟ میں بھی تم سے دوستی چاہتی ہوں۔ میں تو خود ہی درگا دیوی کی داسی ہوں۔“

میں نے انسانی قالب اختیار کرنے میں دیر نہیں کی، لیکن یہ قالب بالکل نیا تھا۔ مقصود کے قالب میں اس کے سامنے ظاہر ہونا مجھے خلاف مصلحت لگا۔ سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنتا نے مجھ سے بیٹھے کو کہا اور میرے سامنے انسانی قالب کا بھرپور جائزہ لیا۔

”تم بھی سندر (خوب صورت) ہو۔“ اس نے مجھ پر اپنے نینن بان (نظروں کے تیر) چلائے۔ ”اور تم آتی سندر (انتہائی خوبصورت) ہو، لیکن کاش تمہیں ایک ویشیا (طوائف) کا روپ نہ دھارنا پڑتا۔“ میں جان بوجھ کر حسرت بھری آواز میں بولا جیسے اس کے حسن نے مجھے متاثر کیا ہو، مگر کردار کی کجی پر دکھ ہو۔

”مجبوری تھی جس کی وجہ سے مجھے اپنے جسم کا سہارا لینا پڑا، لیکن دشواری (یقین) کرو کہ میں ویشیا نہیں ہوں۔“ سنتا نے اپنی صفائی پیش کی۔ میں ان دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو آرام کرسی سے ذرا فاصلے پر بیڈ کے قریب پڑی تھیں۔

”تم مجھے کام کے آدمی جان پڑتے ہو۔“ وہ پھر بولی۔ ”اپنا پرستے (تعارف) نہیں کراؤ گے مجھ سے؟“

”میرا نام سکھ بیر ہے اور میرا سببندھ (تعلق) ہندو مہاسبھا سے ہے۔“ میں نے اپنا تعلق ایک انتہا پسند ہندو سیاسی جماعت سے ظاہر کیا۔

”رہنے والے کہاں کے ہو؟“ سنتا نے پوچھا۔ ”بریلی کا۔“ میں نے بتایا۔ ”جہاں کا سرمہ مشہور ہے اور اس سے (وقت) تمہاری کجکاری آنکھوں میں لگا ہوا ہے۔“

”تمہیں پسند آئیں میری آنکھیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”پسند تو پوری کی پوری آئیں تمہیں، پرنتو.....“ میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”پرنتو کیا؟ بولنا۔ تڑپا کیوں رہے ہو؟“ سنتا نے اس ادا سے کہا کہ اگر میری جگہ یاسف ہو تا تو فوراً ہتھیار ڈال دیتا، مگر میں اب بدل چکا تھا۔ مجھ پر حسین آدم زادیوں کا جادو چلنا مشکل تھا۔ اب یہ حربے میرے ”پتھر دل“ کو نہ پگھلا سکتے۔

سنتا ایک بدکردار عورت تھی۔ میں نے اسی لئے اسے رجھانے اور شیشے میں اتارنے کے لئے ایک ایسا قالب اختیار کیا کہ جس کے حصول کی وہ تنہا کر سکے۔

”لیچھوں سے تمہارے سببندھ نے میرے من کو دکھی کر دیا ہے سنتا۔ اترن اپنوں کی ہو تو بھی آدمی سوچ لے کہ چلو کوئی بات نہیں پرنتو دوسروں.....“

”سکھ بیر۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”بار بار ایسی باتیں نہ کرو۔ مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، بلیدان (قربانی) کسے کہتے ہیں؟“

”تو کیا ایک تہی بلی چڑھنے کو رہ گئی تھیں۔“ میرا لہجہ ایسے عاشقوں جیسا تھا جو کسی سبب اپنی محبوبہ کے قریب نہیں جا پاتے۔

”تمہیں جو دکھ ہے سکھ بیر، تم جس آگ میں جل رہے ہو، اس کی لپیش میرے تن من کو بھی جلائے دے رہی ہیں، پر اب کیا ہو سکتا ہے؟..... کیا تم بھول نہیں سکتے سکھ بیر کہ..... کہ میں نے اپنے دل کی خاطر کوئی بلیدان دیا ہے؟“ یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور میری طرف قدم بڑھانے لگی۔ ”نہیں سنتا۔ رک جاؤ اپنی جگہ۔“ میں بھی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میرے قریب نہ آنا، مجھے نہ چھوٹا۔“

وہ رک گئی اور پھر ہلچلی آواز میں کہنے لگی۔ ”لیکن کیوں سکھ بیر؟..... کیا میں اتنی ہی بری ہوں؟“

”نہیں، تم اوپر سے بہت اچھی ہو اور..... اور اندر سے.....“ ”تم نے ابھی مجھے دیکھا ہی کب ہے..... دیکھنے کی طرح دیکھو گے تو اپنا آپ بھول جاؤ گے۔“ وہ بول اٹھی۔ اس کی آواز میں اعتماد تھا۔

”میں اس روپ میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتا سنتا کہ جس میں تم کو ملک افضل دیکھ چکا ہے۔ تم اگر چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں تو.....“

”نہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور پھر واپس جا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”تمہاری مرضی ہے تو میں تمہارے پاس نہیں آتی، مگر جاؤ کیوں..... ابھی تو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، بہت کچھ جانا اور سمجھنا ہے۔ اس طرح مجھ سے روٹھ کر چلے جاؤ گے تو میں جیون بھر تڑپتی رہوں گی۔“

میرے اور سنتا کے درمیان ذہنی جنگ جاری تھی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پسپا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، وہ اپنی دل کشی و رعنائی سے اور میں اپنے گریز و مردانہ وجاہت سے۔ اپنے کردار کی مضبوطی نیز دیگر وجوہ کی بنا پر میرا پلہ نسبتاً بھاری تھا۔

مجھے گریز یاد دیکھ کر وہ لوٹ گئی تو میں نے کہا۔ ”کیا جانا اور سمجھنا چاہتی ہو بولو۔“ ”تہی نے کہا تھا کہ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے، تو کیا تم میری مدد کرو گے؟“

”ہم دونوں کی منزل ایک سہی مگر راستے الگ الگ ہیں۔“ میں جواب میں بولا۔ ”میرے بچ کو معاف کر دینا سنتا۔ میں نے جو پسنا دیکھا تھا، وہ پورا نہیں ہوا۔“

”کیسا پسنا؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اکھنڈ بھارت کا پسنا۔“ میں نے کہا۔ ”ان دنوں ہمارے دلس پر جن لوگوں کی حکومت ہے، وہ پسنا پورا نہیں ہونے دے رہے۔ بتاؤ کہ کیا تم انہی کے کہنے پر یہاں نہیں آئیں؟..... مجھے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔ میں اسی کارنر (سبب) تمہارے اشاروں پر نہیں چلوں گا۔ میرا اپنا راستہ ہو گا، تمہارا اپنا۔“

پھر بھی ہم ایک دوسرے کی سہایتا (مدد) کر سکتے ہیں۔ صاف بات کہنے سے من پر بوجھ نہیں رہتا، میں نے اسی لئے بچ بول دیا ہے۔“

”اچھا کیا تم نے۔“ اس کی آواز بھگی گئی۔ چند لمحے وہ خاموش رہی، پھر میں نے اس کی آنکھوں میں چمک سی دیکھی، کہنے لگی۔ ”میرے اور تمہارے بیچ ایک سمبندھ بھی تو ہے، یہ کیوں بھول گئے سکھ بیر۔ تم اگر درگادیوی کے داس ہو تو میں بھی دیوی ہی کی داسی ہوں۔“

”ہاں تم نے یہ ٹھیک کہا، ہمارے بیچ یہ رشتہ تو ہے۔“

”میں تو اس ناتے تمہاری بھی داسی بننے کو تیار ہوں، پر تم مجھے سویکار (قبول) نہیں کر رہے۔“ وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔

”ایک ہی دیوی کے داس اور داسی ہونے کے ناتے کو بنائے رکھنے کی ایک شرط ہے سنتا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”تم مجھ سے کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھو گی۔“

”کیسا بھید بھاؤ۔“ اس نے وضاحت چاہی۔

”اپنے من میں کپٹ نہیں رکھو گی اور میں جو پوچھوں گا بتا دو گی۔“ میری زبان پر مطلب کی بات آ ہی گئی۔

وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ”تم دن وے ٹریفک چلانا چاہتے ہو، مجھے تو تم پابند کر رہے ہو، لیکن میری پابندی سے انکاری ہو۔“

”تمہاری مرضی۔“ میں نے کہہ دیا۔ ”نہ مانو میری بات۔ میں تو پہلے ہی یہ سوچ کر تمہارے پاس آیا تھا کہ تم.....“

”نہیں سکھ بیر! یہ بات نہیں ہے، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”کچھ باتیں ایسی ہیں سکھ بیر کہ جنہیں تم شاید نہ سمجھ سکو۔ میری طرح کیوں کہ تم کسی کو جواب دینے کے پابند نہیں ہو۔ میں اسی لئے تم سے ناتا ہونے پر بھی ممکن ہے کوئی بات نہ بتا سکوں۔ ایسے میں تم مجھ پر بھید بھاؤ کا دوش نہیں لگاؤ گے۔“

”اگر ایسی کوئی مجبوری جان پڑی تو میں تمہیں دوش نہیں دوں گا۔“ میں اپنی دانست میں سکھ بیر کا کردار اچھی طرح ادا کر رہا تھا۔ اپنے لہجے اور زبان و بیان پر میری پوری توجہ تھی۔ میں نے مزید کہا۔ ”پھر بھی مجھے یہ گیان ہو گیا کہ تم دھوکا دے رہی ہو تو میں اپنا راستہ بدل دوں گا۔“

”راستہ بدلنے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”سیدھی سی بات ہے، میں یہ بھول جاؤں گا کہ کبھی مجھے کوئی سنتا ملی تھی۔“

”پھر شاید تم تو سکھی رہو سکھ بیر، لیکن میں دکھی رہوں گی۔“

”ایک ہی بار مل کر ایسا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے گمراہ سا سن لیا۔ ”کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ پہلی بار ان سے مل کر یوں لگتا ہے، برسوں کے ساتھی ہوں۔ تم..... تم بھی سکھ بیر انہی میں سے ہو۔“ وہ جذباتی نظر آنے لگی۔

”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ اس لئے مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گی۔“

”ڈھاکے سے کب تک لوٹ آؤ گی؟“ یہ سوال کر کے میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ ہی

دیا۔

توقع کے مطابق وہ چونک اٹھی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“

”نہ جانتا اگر تو آج ہی تم سے ملنے کیوں آ جاتا۔ آج رات کی ایک فلائیٹ سے تم وہاں جا رہی ہو، بولو غلط ہے یہ بات؟“

”صحیح کہہ رہے ہو تم، لیکن پہلے کیوں نہیں ملے؟“

”اس لئے کہ مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ سے نہیں جتا۔ سوچا تھا، مل لوں گا کسی بھی سے، پرنتو آج معلوم ہوا، تم جاری ہو تو جی نہیں مانتا۔“ میں نے جواب دیا، پھر اس پر پھینکے ہوئے جال کی گرفت مضبوط کرنے کے لئے خواب ٹاک سی آواز میں کہنے لگا۔ ”پتا ہے سنتا کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے یوں جان پڑا مانو میرے سپنوں کی رانی مل گئی ہو۔ وہی انگ انگ بولتا ہوا، وہی تن ڈولتا ہوا، وہی سولہ سنگار، وہی کجری کی دھار، وہی نینمن کٹار.....“

”ارے ارے۔“ وہ بول اٹھی۔ ”تم تو مجھے کوئی کوئی (شاعر) لگ رہے ہو۔“

”ہاں سنتا۔“ میں بدستور اداکاری کرتا رہا۔ ”میں نے تمہیں ایک سندھ کویتا (خوبصورت غزل) ہی کی طرح سمجھا اور..... اور پھر جب تمہارے بارے میں جان کاری حاصل کی تو میرا دل بھگ گیا۔ میرے سپن ٹوٹ گئے اور میں نے اپنے من کو مار لیا۔“

”تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو سکھ بیر۔“ اس نے کہا۔ ”تم اب بھی میرے پیار کی ڈور میں بندھے ہو ورنہ آج کیوں کھینچ چلے آتے۔“

”میں اس کی وجہ پتا چکا ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

”چلو مان لیتی ہوں، تمہارا یہ بہانہ بھی۔ تم اسی بہانے میرے سنگ تو رہو گے۔ کبھی تمہیں جیت ہی لوں گی، کبھی تو داسی کو اپنے دیوتا کے چرنوں میں جگہ مل ہی جائے گی۔ کبھی تو پریم ساگر کی پھوار میں بھیگ ہی جاؤں گی میں۔“ مجھے شاعر کہنے والی خود شاعری کرنے لگی۔

میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری ہی طرح کہیں وہ بھی تو اداکاری نہیں کر رہی۔ لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا سنتا۔“

”کس سوال کا جواب؟“ وہ جیسے کوئی حسین خواب دیکھتے جاگ اٹھی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ کہنے لگی۔ ”کچھ خبر نہیں کہ کب لوٹا ہو، بہت سے کام ہیں وہاں، سنو سکھ بیر! تم بھی میرے ساتھ ڈھاکے چلو۔“ میں آج رات کی فلائیٹ سے اپنی سیٹ کینسل کر ادیتی ہوں۔

”چلنے کو تو میں چلا چلا، لیکن وہاں میری پریکا (محبوبہ) کا ایک پری بھی تو پہلے سے موجود ہو گا۔“

”تم شاید ملک افضل کی بات کر رہے ہو۔“ وہ بولی۔ ”میں اسے گھاس نہیں ڈاؤں گی، بس۔“

”اور تمہیں یقیناً یہ بھی ابھی معلوم نہیں کہ تمہارا دوسرا شکار، یعنی سینٹھ عبدالرزاق بھی وہیں

جانے والا ہے۔“

”کیا؟“ وہ تقریباً اچھل پڑی۔ ”یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

”اس طرح کہ رحیم دادا اسے قتل نہیں کر سکا۔ سیٹھ ابھی تک زندہ ہے۔“

”غصرو“ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور بیڈ کی دوسری جانب رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر مطلوبہ نمبر ملانے کو کہا۔ ذرا دیر کے بعد دوسری طرف سے غالباً ریسیور اٹھا لیا گیا تو سنتا ہے۔ ”ہیلو..... ہیلو سینٹھ..... ہاں میں ہی بول رہی ہوں۔ تمہیں یہ بتانا تھا کہ میرا ارادہ بدل گیا ہے، آج رات کی فلائیٹ شاید کینسل کروانی پڑے..... کیا؟..... نہیں، میرا جی کچھ ٹھیک نہیں..... تمہارے ساتھ نہیں چل سکوں گی۔ ویسے تم کب تک کراچی میں ہو؟..... اچھا..... اچھا ٹھیک ہے..... ہاں ہاں، تم جاؤ۔“ یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”آخر سیٹھ عبدالرزاق کو راستے سے ہٹانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ملک افضل کی وجہ سے۔“ سیتا نے بتایا۔ ”اس بے وقوف نے ذرا سے کام کے لئے سیٹھ عبدالرزاق کو بیچ میں ڈال لیا۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کی وجہ سے ملک افضل سامنے آجائے۔ درمیانی کڑی کو اسی لئے غائب کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابھی ملک افضل سے ہمیں کئی کام لینے ہیں۔ بہت بڑے پاگل ہیں یہ لوگ بھی۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میڈم، ہنڈریڈ پرنسٹ کام ہو جائے گا۔ رحیم دادا کسی قیمت پر سیٹھ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ چپکے ہزار روپے الگ فضول میں گئے۔“

”ان روپوں کا کدھ نہ کرو وہ واپس مل جائیں گے۔“

”لیکن کیسے؟ ایسے معاملوں میں روپا واپس نہیں لیا سکھ ہیر۔“ وہ یہ کہتی ہوئی آرام کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

”آج رات کو دس بجے تمہارے آدمی کو رحیم دادا نے ملنا تھا؟“

”مگر وہ تو بقیہ پچیس ہزار روپے دینے جاتا۔“ سینا رفتہ رفتہ کھلتی جا رہی تھی۔

”تو اب پچیس ہزار روپے لینے چلا جائے گا۔“ میں اطمینان کے ساتھ بولا۔ ”یہ گارنٹی میری کہ رحیم دادا روپے واپس کر دے گا۔“

”ایک بات مانی پڑے گی سکھ میر کہ تم ہو بہت باخبر۔“ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ”اور..... اور یہ بات بہت خطرناک ہے۔ اب تک تو میں یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم یہاں جو کھیل کھیل رہے ہیں، کسی کو بھی ہمارے سوا اس کی ہوا نہیں ملے گی۔“

”تمہاری خاطر مجھے یہ سب کرنا پڑا کہ کہیں تم کسی مرحلے پر پھنس نہ جاؤ ورنہ تو میں اپنے طور پر اکیلا ہی کام کر رہا تھا۔“

”اب تو ہمارے ساتھ ہو؟“ اس نے بڑی قاتل نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرائے گی۔

”بس اسی حد تک ساتھ ہوں کہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے اور اس دس میں جس لئے میں آیا ہوں، وہ مقصد بھی پورا ہو جائے۔“ میں نے وضاحت کر دی۔

جن زاد ☆ 237 ☆ چوتھا حصہ

”پھر کیا سوچا تم نے‘ چل رہے ہو میرے ساتھ مشرقی پاکستان؟“

”میری وجہ سے تم اپنی راہ کھوٹی نہ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں جانا ہے‘ تو جاؤ‘ اگر میں نے ضروری سمجھا تو تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا‘ اسی طرح جیسے آج پہنچ گیا۔ ہاں تم سے ایک بات اور کہنی تھی‘ مانو نہ مانو تمہاری مرضی..... بلاوجہ قتل و غارت گری سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے تم خطرے میں پڑ جاؤ گی۔ سیٹھ عبدالرزاق جیسے لوگوں کو قتل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے طریقہ کار کو تھوڑا بدلو۔ مثلاً گھی اور چینی کے اس بیوپاری کو بھی قتل کی دھمکیاں دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی‘ وہی جس کا نام یعقوب ہے اور جسے تم نے کل تک کی مہلت دی ہے۔ وہ اگر اپنا اسٹاک نکالنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا تو سیدھے سیدھے اس کے گوداموں کو آگ.....“

”نہیں سکھ ہیر۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”اس کی ضرورت تھی۔ اسے ایک تیرے کئی شکار کرنا کتے ہیں۔ یعقوب کے قتل سے دوسرے ذخیرہ کرنے والے بھی ڈر جائیں گے۔ پھر ہمارا کوئی آدمی کسی ایسے اسٹاک کرنے والے کے پاس پہنچا تو وہ سودا کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ یہ تو ہوا پہلا فائدہ۔“ سنیا مجھے سمجھانے لگی۔ ”دوسرا فائدہ یہ کہ ضرورت کی چیزیں میاں سے اسمگل ہو کر ہمارے دیس میں پہنچیں گی تو وہاں ان چیزوں کے دام گر جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے عوام خوش حال میاں کے کنگال۔ ہر بات کو دور تک سوچنا پڑتا ہے۔ اب تم سمجھ گئے اس لالچی پیواری کے قتل کی وجہ؟“

”اور اسے بھی سینٹھ عبدالرزاق کی طرح تمہارے آدمی قتل نہ کر سکے تو؟“

وہ ہنس دی، پھر بتایا۔ ”اے مملت کل تک کی ضرور دی گئی ہے، مگر یہ صرف دھوکا ہے تاکہ وہ مطمئن رہے۔ مجھے معلوم ہے، وہ بڑا ضدی ہے، اپنا اسٹاک نہیں نکالے گا۔ اسے آج شام تک ہی قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور سنو۔ گوداموں کو آگ لگانا تو صرف ڈراما ہوگا ورنہ تو انہیں پہلے لوٹا جائے گا، پھر تھوڑے سے مال کو آگ لگا دی جائے گی۔ سیتا کچی گولیاں نہیں کھیلی۔ اس بات کو تو ووندو جی بھی مانتے ہیں۔“

”ونودی!“ ایک نیا نام سامنے آیا۔ سیتا نے جس احترام و عزت کے ساتھ اس شخص کا نام لیا، اس سے یہی نتیجہ نکلا تھا کہ ونودی کی حیثیت سیتا کے مقابلے میں بڑی تھی۔ اس سے میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ غیر ملکی تخریب کاروں کی سرغنہ سیتا ہوگی۔ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک ان دہشت گردوں اور قاتلوں کا جال پھیلا ہوا ہے، یہ سمجھنا بھی میرے لئے دشوار نہ ہوا۔ میں اس معاملے کو جتنا سہل جان رہا تھا اور اسے جتنی جلدی نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا، اب اس پر دوبارہ غور و خوض کرنے کی ضرورت تھی۔ ممکن ہے اس کے لئے مجھے ملک کے دوسرے حصے تک بھی سفر کرنا پڑتا۔

”تم کن سوچوں میں کھو گئے میرے دیوتا؟“ سینٹا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”مجھے ایک ادھر کا کام یاد آ گیا تھا۔“ میں نے فوراً بات بنا دی۔ ”اسی کا دھیان آ گیا تھا۔ تم سے مل کر تو میں سب کچھ بھول ہی گیا۔ میں چلتا ہوں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے وہ انسانی قالب چھوڑ دیا اور سینٹا مجھے آواز سن دیتی رہ گئی۔

وہاں سے میں سیدھا اپنی کونھی پہنچا۔ اس نئی صورت حال پر مجھے سوچ بچار کے بغیر جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا تھا۔ سینا سے مل کر بہت سی باتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق غیر ملکی سازشی، مملکت خداداد کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے جگہ جگہ پورے ملک میں مقامی ضمیر فروشوں اور جرائم پیشہ افراد سے کام لے رہے تھے۔ دشمن کے گرد گھیراؤ کرنے کے لئے پہلے اس سے ہتھیار چھیننا پڑتے ہیں۔ جن مفاد پرستوں نے خود کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا، ان کی حیثیت ایک طرح سے دشمنوں کے ہتھیاروں جیسی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے گرفت میں آجاتے تو پھر دشمن پر قابو پانا آسان ہو جاتا۔ کراچی میں موجود ان مقامی ملک دشمنوں کی بڑی تعداد پر ہاتھ ڈالنے کا موقع اس وقت ملنا ممکن تھا جب وہ یعقوب کے گوداموں کو لوٹ کر انہیں نذر آتش کرنا چاہتے۔ ظاہر ہے اس کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت ہوتی۔ اس کے علاوہ آج ہی رات سینا کا جو آدمی، رحیم دادا سے پچیس ہزار روپے وصول کرنے جاتا، اسے بھی پکڑا جاسکتا تھا۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ گھی اور پینے کا اشاک کرنے والے لالچی کاروباری یعقوب کو بھی قتل ہونے سے بچانے کی ایک ہی واحد صورت تھی۔ خواہ وہ کسی آدم زاد کی زندگی ہو یا کسی جن زاد کی میرے نزدیک قیمتی ہی ہوتی ہے۔ یعقوب کو آج شام تک قتل کر دیا جاتا تھا، میری نظر میں اسی لالچی آدم زاد کی زندگی بچانے کو افضلیت حاصل تھی۔ اب میں بخوبی سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ اپنی کرپشن والوں کے بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ پیشہ ور قاتل اپنا کام کر جاتے اور قانون کے رکھوالے منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس سلسلے میں قمر احمد سے دوبارہ ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے مل کر ہی یہ معلوم ہوتا کہ یعقوب کی نگرانی کے اب تک کیا نتائج برآمد ہوئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ یعقوب کو کسی صورت قتل نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے پہلے میں نے تدبیر بھی سوچ لی۔

میں جس طرح قمر احمد کے کمرے سے غائب ہوا تھا بالکل اسی طرح پھر وہاں پہنچ گیا۔ میں نے انسانی قالب اختیار نہیں کیا۔

قمر احمد اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا نہیں تھا۔ دو اور افراد بھی اس کے کمرے میں موجود تھے۔ ان دونوں کا تعلق اسی کے محلے سے تھا۔ قمر احمد مجھے کچھ پریشان سا لگا۔ پھر اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے افراد کو مخاطب کیا۔ ”لیکن وہ کیا کہاں؟“

”سر! وہ شاید خوفزدہ ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔“ سامنے موجود افراد میں سے ایک نے کہا تو مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

قمر احمد یقیناً اپنے محلے کے افراد سے یعقوب کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

”اسے تلاش کرو کہ وہ کہاں روپوش ہوا ہے۔“ قمر احمد نے حکم دیا۔ ”یہ بہت ضروری ہے ورنہ ہم شاید نہ تو ان ملک دشمنوں پر ہاتھ ڈال سکیں گے، نہ اس لالچی کاروباری یعقوب کو قتل ہونے سے بچا سکیں گے۔ اس ذخیرہ اندوز کو ابھی حراست میں لینے کی ضرورت نہیں، یہ یہ تم لوگوں کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ ”نہیں سر!“ وہ دونوں بیک زبان ہو کر بولے اور قمر احمد کا اشارہ پاتے ہی کمرے سے نکل گئے۔

”قمر احمد! چہرہ اسی کو بلا کر کہہ دو کہ اب نہ وہ خدا ندر آئے نہ دفتر کے کسی آدمی کو تمہارے کمرے میں آنے دے۔“ میں نے قمر احمد کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ کسی کو اس وقت یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو۔ چہرہ اسی تمہارا حکم سن کر چلا جائے گا تو ہم ظاہر ہو جائیں گے۔“ خوف و حیرت کے آثار تو قمر احمد کے چہرے پر ابھرے، مگر جلد ہی وہ سنبھل گیا۔ پھر اس نے وی کیا جو میں نے کہا تھا۔ مقصود کا قالب اپنانے میں مجھے دیر نہ لگی۔

”ہمیں مجبوراً دوبارہ آنا پڑا قمر احمد۔“ اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں دھیمی آواز میں بولا۔ ”ہمیں خدشہ تھا کہ تمہارے محلے والے ناکام رہیں گے۔“ یہ کہہ کر میں نے قمر احمد کو سینا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ضروری ہدایات دیں۔ میرے آخری الفاظ تاکید کی تھے۔ ”کسی ایک بھی مجرم کو بچ کر نہیں نکلنا چاہئے۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی سرکار۔“ قمر احمد نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ ”پولیس فورس کے ساتھ خود میں اس آپریشن کی نگرانی کروں گا۔“

”انہی مجرموں کا ایک ساتھی آج رات ٹھیک دس بجے ایک پیشہ ور قاتل رحیم دادا سے ملے گا، اسے بھی گرفتار کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے رحیم دادا کے ٹھکانے کا پتا بتا دیا، پھر اس ضمن میں جو بقیہ تفصیلات تھیں، ان سے بھی قمر احمد کو آگاہ کر دیا۔

”سرکار! ہمارے شہر میں اتنے بڑے پیمانے پر جرائم ہو رہے ہیں اور ہمیں خبر ہی نہیں۔“ قمر احمد حیرت سے بولا۔

”یہ سب جرائم ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، یہ اندازہ تو تم نے کر لیا ہوگا قمر احمد۔ دراصل جن افراد پر قانون پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری ہے، ان میں جیل اور قاتل جیسی کالی بھیڑیں بھی موجود ہیں۔ تمہارے محلے کے علاوہ وزارت داخلہ کے جو دیگر محلے ہیں مثلاً پولیس وغیرہ، ان کا بھی تم و بیش یہی حال ہے۔ نہایت رنج کی بات یہ ہے قمر احمد کہ یہی محلے جرائم کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ہاں تم اب یعقوب کی طرف سے فکر نہ کرو، اگر وہ ابھی تک قتل نہیں ہوا تو اسے ہم تحفظ فراہم کریں گے۔“

یقیناً سرکار کو پتا ہوگا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔

”نہیں، لیکن ہمارے لئے یہ معلوم کر لینا مشکل نہیں۔ بس اب ہم چلیں گے، تم سے ہمیں جو کتنا تھا، وہ کہہ چکے۔ بعد مغرب اب تمہیں ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے جب ضروری جانا خود تمہارے پاس آ جائیں گے، خواہ تم کہیں بھی ہو۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں گویا کرسی پر بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا۔

یعقوب کا سراغ لگانے میں چند ہی لمحے صرف ہوئے۔ وہ میٹھادر میں اپنے ہم زلف کے گھر پہنچا لے ہوئے تھا۔ اس نے خود کو گھر کے ایک اندرونی کمرے میں قید کر رکھا تھا۔ یعقوب کا ذہن پڑھ کر مجھے خبر ہو گئی کہ اس کے بیوی بچوں کو بھی یہ بات معلوم ہے۔ میرے نزدیک یہ خطرناک بات تھی۔ اس ”چوہے“ کو بل سے نکالنے کے لئے گھاگ مجرم اس کے گھر کا رخ کرتے۔ پھر وہ کوئی بھی ایسی چال چلتے کہ

یعقوب اپنے گھر کی طرف دوڑ لگانے پر مجبور ہو جاتا اور اسے بہ آسانی دوسری دنیا کی سیر کرادی جاتی۔ یعقوب جس کمرے میں تھا وہاں میں پہنچ تو گیا، لیکن خود کو ظاہر نہیں کیا۔ وہ مجھے دیکھنے سے قاصر ہی رہا، لیکن میں اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھتا رہا۔ مجرموں کے متعلق میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ چند ہی منٹ بعد درست ثابت ہو گیا۔ میں اگر وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو یعقوب کا کام تمام ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوتے ہی یعقوب اس طرح اچھل پڑا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے پھنسی پھنسی سی خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ ”کون..... کون ہے؟“

”میں ہوں یعقوب بھائی۔“ جواب میں ایک نسوانی آواز ابھری۔ آواز سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ ”دروازہ کھول دیں۔“

”کک..... کیا بات ہے؟“ یعقوب دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا۔

”یاسمین کا فون آیا ہے گھر سے۔“ باہر سے بتایا گیا۔

یعقوب نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ یاسمین اس کی بیوی کا نام تھا۔ برابر والے کمرے ہی میں فون تھا۔ یعقوب تیزی کے ساتھ اس کمرے میں کھس گیا۔ فون کی اطلاع دینے والی یاسمین کی بڑی بہن فریدہ تھی۔ وہ یعقوب کی جلد بازی اور بوکھلاہٹ کی وجہ سے یہ بھی نہ بتا پائی کہ یاسمین نے اس کو فون پر کیا اطلاع دی تھی۔ فریدہ کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ قصہ یہ تھا کہ چند روز سے یعقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی حمیدہ بیمار تھی۔ معمولی بخار میں اس کا اچانک انتقال ہو جانا، ممکن ہی نہیں تھا۔ کسی گھریلو عورت کے سر پر ریو اور کی نال رکھ کر مجرموں کے لئے یہ کام لینا کون سی مشکل بات رہی ہوگی۔ میں نے کزیاں جوڑ لیں۔

فون پر اپنی بیوی سے یہ اطلاع ملنے ہی یعقوب کے ہوش اڑ گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس حالت میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ خود اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اپنی موت سے بے خبر وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھا۔ فریدہ بھی رو پڑی۔

مکان کی وہ پہلی منزل تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یعقوب کو قتل کرنے والے نیچے گھاٹ لگائے بیٹھے تھے۔ گھر سے نکل کر وہ نیچے جانے کے لئے بیڑھیاں اتر ہی رہا تھا کہ میں اسے لے اڑا۔ اس کے لئے میں نے اسی مکان کی چھت کو استعمال کیا۔ یعقوب نے ہوش و حواس کھو دیئے۔

میں جب بیٹھادار سے یاسف کی کوٹھی میں سولجر بازار پہنچا تو یاسف اپنی تک چڑھی محبوبہ اصغری سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ کوٹھی کے اسی حصے کے ایک کمرے میں بے ہوش یعقوب کو ایک پلنگ پر ڈال کر میں رنگ میں بھگ ملانے مقصود بن کر وہاں جا پہنچا۔

اصغری مجھ پر نظر پڑتے ہی بڑبڑا گئی اور یہی حال یاسف کا ہوا۔

”معاف کرنا اے میرے عزیز از جان دوست، مجھے ایک ضروری کام سے فوراً آنا پڑا۔“ میں نے یاسف کو مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔

”اپنے دوست کو تھوڑی بہت تو تمیز سکھا دو کہ جب کسی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو پہلے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔“ اصغری چیخ کر کہنے لگی۔

”دروازہ تو کھلا ہوا تھا اس لئے دستک کس پر دیتا محترمہ اصغری بیگم۔“ میں نے اسے چڑایا۔

”تو کھائیں ہی دیتے۔“

”کھانسی آ نہیں رہی تھی۔“ میں نے پھر جواز پیش کر دیا۔

اس پر یاسف کی ہنسی چھوٹ گئی اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں تو معلوم ہے کہ اصغری اپنی ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتی۔“ پھر اصغری کو اندر والے کمرے میں بھیج دیا۔

میں اسی کمرے کے ایک پلنگ پر بے ہوش یعقوب کو لٹا کر آیا تھا، لیکن دانستہ اس ظالم عورت کو ستانے کے لئے کچھ بولا نہیں۔ اس کا نتیجہ فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ بوکھلائی ہوئی اصغری چیخیں چلاتی اٹے قدموں دوڑی دوڑی واپس آ گئی۔ اس وقت تک میں نے یاسف کو اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ اچانک کیا ضروری کام پڑ گیا؟ آتے ہی اصغری نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ ”اندر..... کمرے میں کک..... کوئی بے..... بے ہوش پڑا ہے۔“

یاسف چونک اٹھا اور پھر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ تھا تو وہ بھی میری ہی طرح جن زاد، سمجھ گیا کہ یہ حرکت میری ہی ہو سکتی ہے۔

”ڈرو مت! ہم دونوں جا کر دیکھتے ہیں، وہ کون ہے۔ تم بیٹیں رہو۔“ یاسف نے اصغری کو تسلی دی اور پھر مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

اندر والے کمرے میں پہنچتے ہی میں بول اٹھا۔ ”دو تین دن تو اس آدم زاد کو اپنے پاس رکھ لے، پھر میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”مگر یہ ہے کون بلا؟ اور تو اسے میرے سر کیوں منڈھے جا رہا ہے؟“ یاسف نے جڑبڑہو کر پوچھا۔ مختصراً اسے میں نے یعقوب کے بارے میں بتا دیا، پھر بولا۔ ”بس اے یاسف، تو اسے کوٹھی سے باہر نہ نکلنے دیجو۔“

”وہ تو خیر اس کا باپ بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا، لیکن بقول تیرے کچھ آدم زاد اسے قتل کرنے والے تھے تو تجھے کیا پڑی تھی اس مردود کو بچانے کی؟“

”میں اگر تیرے سوال کا جواب دوں گا بھی تو تجھے مطمئن نہیں کر سکتا، اس لئے.....“

”کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔“ یاسف نے میری بات پوری کر دی، پھر کہنے لگا۔ ”اگر میں اسے اٹھا کر تیری کوٹھی میں پھینک آؤں تو؟“

”مجھے معلوم ہے کہ تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ میں اسے اپنی کوٹھی میں بھی رکھ سکتا تھا، لیکن ایک تو یہ کہ اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا، دوسرے میری کوٹھی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔“ میں نے اسے اصل بات بتا دی۔

”میں جانتا ہوں اے علیائش، تو دھیرے دھیرے مجھے بھی خراب کرنا چاہتا ہے، لیکن یاد رکھ، میں

ہٹکے جانے والے جن زادوں میں سے نہیں ہوں۔“
”مجھے بھی معلوم ہے کہ تو اول درجے کا ذہیت ہے اور آسانی سے سیدھی راہ پر آنے والا نہیں، میں نے اسی لئے فی الحال تجھے صبر کر لیا ہے۔“
”فی الحال سے تیری کیا مراد ہے؟“

”یہ تو تجھے آنے والا وقت بتائے گا اے یاسف۔“
”میں اسی لئے اس شہر میں تیری موجودگی کے بارے میں جان کر بھی تجھ سے دور ہی دور رہا، مگر تو میری جان کو آبی گیا۔“

یاسف کی بات پر میں ہنس دیا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔ اصفری کو یعقوب کے متعلق یاسف کیا کہانی سناتا، یہ اس کا درس تھا۔ اس کے علاوہ یعقوب کو ہوش آتا اور ایک اجنبی جگہ خود کو قیدی بنا دیکھ کر کیا کہتا، کیا سمجھتا، مجھے یہ بھی پورا نہیں تھی۔ میں نے اسے قتل ہونے سے بچالیا، یہی بہت تھا۔ بعد میں اسے خود ہی معلوم ہو جاتا کہ اس کی پیار بیٹی حمیدہ زندہ تھی اور یہ بھی کہ دشمنوں نے اسے قتل کرنے کے لئے یہ حربہ آزمایا ہوگا۔ یاسف کو میں نے پورے واقعات نہیں بتائے تھے اور ایسا دانستہ کیا تھا۔ اس لاپچی ذخیرہ اندوز یعقوب کے لئے یہ سزا کافی تھی کہ اپنی بیٹی کے انتقال کی اطلاع ملنے پر بھی وہ اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ اپنی کوٹھی میں آکر میں نے اپنے اندر پیدا ہو جانے والی ایک اور پراسرار قوت کو محسوس کر لیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یعقوب کے قاتلانہ منصوبے کی ناکامی پر الماس کا رد عمل کیا ہے۔ اس کے لئے میں نے سینٹا کے حسین سراپا کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سینٹا مجھے فائو اسٹار ہوٹل کے اسی کمرے میں بے چینی سے شعلتی ہوئی ملی۔ کمرے میں کریمرہ چرے والا ایک اور شخص بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹپٹے ٹپٹے سینٹا ایک دم اس شخص کی طرف پلٹی اور اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ”ارسلان! تمہاری بکواس میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میڈم الماس! میں نے آپ سے جو کچھ بیان کیا ہے، دوسروں سے بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہیں۔“ ارسلان کی آواز بھی اس کے چرے کی طرح کریمرہ تھی۔

”کیوں کر لوں تصدیق؟“ سینٹا اس پر برس پڑی۔ ”مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔ یعقوب کو قتل کرنے کی ذمہ داری میں نے تمہارے سپرد کی تھی، پھر کسی اور سے کس لئے جواب طلب کروں۔ تم نے آکر مجھے ایک کہانی سنا دی۔ تمہارے دو ساتھی زبردستی یعقوب کے گھر میں گھس جاتے ہیں۔ ایک ساتھی یعقوب کے بیٹے اور تین بیٹیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیتا ہے اور دوسرا ساتھی یعقوب کی بیوی کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس طرح تمہیں پتا چل جاتا ہے کہ یعقوب کہاں چھپا ہوا ہے۔ تم وہاں پہنچ جاتے ہو۔ یعقوب کی بیوی فون پر اسے بیٹی کے انتقال کی خبر دیتی ہے تاکہ وہ میٹھادر کے اس مکان سے باہر آ جائے اور تم اسے ٹھنڈا کر دو۔ یہاں تک تمہاری سنانی ہوئی پوری کہانی میں کوئی جھول نہیں۔ بعد میں تم یہ بھی معلوم کر لیتے ہو کہ یعقوب اپنی بیٹی کے انتقال کی جھوٹی اطلاع ملنے ہی اس مکان سے نکل گیا تھا۔ پھر وہ راستے میں کہاں اور کیسے غائب ہو گیا؟ اس بات کا جواب چاہئے مجھے۔“

”راستے کا کیا سوال میڈم الماس! میں تو میٹھادر کے اس مکان کے اتنے قریب تھا کہ جو بھی زینے سے اترتا میری نظر میں آ جاتا۔ ایک لمحے کو بھی میں نے غفلت نہیں برتی۔ میں تو بہت پہلے ہی آپ کے حکم پر یعقوب کا چہرہ کر چکا تھا۔ وہ بھلا کس طرح مجھے جمل دے کر نکل جاتا۔ میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ.....“

”بکواس بند کرو۔“ سینٹا نے چیخ کر ارسلان کی بات کاٹ دی۔ ”آج ہی کی تاریخ میں تم سے یہ دوسری غلطی ہوئی ہے۔ پہلی غلطی یہ کہ سینٹا عبدالرزاق زندہ بچ گیا۔ رحیم دادا اسے ٹھکانے نہیں لگا سکا۔ تم ہی نے مجھ سے رحیم دادا کی تعریف کی تھی اور اس سے پچاس ہزار روپے میں سینٹا کے قتل کا سودا کیا تھا۔ جواب طلبی پر تم نے سینٹا تان کر خود یعقوب کے قتل کی ذمہ داری لی۔ پھر کیا ہوا؟ وہ بھی تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر چل دیا۔ سنو ارسلان! تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ الماس کسی کی بھی تیسری غلطی معاف نہیں کرتی۔ جانتے ہو تا تم؟“

”جج..... جج..... جی میڈم الماس!“ ارسلان ہٹکانے لگا۔ اس کا کریمرہ چہرہ مزید کریمرہ ہو گیا۔ ”آج رات اگر تم رحیم دادا سے پچیس ہزار روپے وصول کر کے مجھے نہ پہنچا سکے تو یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ دفع ہو جاؤ۔“

جب ارسلان کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور میرے صفحہ ذہن سے وہ منظر غائب ہو گیا۔ ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ سینٹا جن مقامی جرائم پیشہ افراد سے کام لے رہی تھی، وہ اسے الماس ہی کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے۔ اس طرح کے کسی معاملے سے پہلے میرا سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لئے یہ ساری باتیں میرے لئے نئی ہی تھیں۔ سینٹا اگر کچھ شیطانی پراسرار قوتوں کی مالک نہ ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے سب کچھ پتا چل جاتا۔

شام ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میرے طلب گار مجھے گھیر لیتے تو پھر آرام کرنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ میں اسی لئے کچھ دیر کو اپنی خواب گاہ میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھنے کے بعد سے اب تک مجھے ایک لمحے کو بھی سکون میسر نہیں آیا تھا۔

اپنے معمول کے مطابق میں نے اس شام کو بھی ”مقصود میاں“ کا کردار ادا کیا۔ حاجت مند روزانہ میری کوٹھی پر آنے کے عادی ہو گئے تھے۔ کچھ کام تو ایسے ہوتے کہ جن کے لئے مجھے اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میرے یہاں اب چھوٹے بڑے سرکاری افسران کی آمد بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان میں وزارت داخلہ کے مختلف محکموں کے اعلیٰ سرکاری افسران بھی تھے۔ کسی کے تبادلے کا مسئلہ ہوتا، کسی کی ترقی کا۔ کوئی جائز کام ہوتا تو میں انہی لوگوں سے کہہ سن کر معاملہ نمٹا دیتا۔ انہی افسران میں سے ایک ڈی آئی جی کرانمرز حسین خان بھی تھا۔ اس روز بھی وہ میرے پاس آیا اور اسے میں نے فکر مند محسوس کیا۔

”تم سے مجھے تھمائی میں کچھ بات کرنی ہے، اس لئے رک جانا۔“ میں نے ڈی آئی جی حسین خان

نیک نیتی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تم اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر چکے ہو۔ اس کی وجہ بھی میرے علم میں ہے۔ اس شر میں بڑھتے ہوئے جرائم کی ذمہ داری تم نے قبول کر لی ہے اور اپنی ناکامی کے اعتراف کے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم اسی فیصلے کی توثیق اور مشورہ طلب کرنے میرے پاس آئے ہو۔ تو سن لو کہ تمہارا فیصلہ غلط ہے۔ اگر حتمی لوگ بدل ہو کر اس محکمے کو چھوڑ گئے تو یہ کسی بھی صورت مناسب نہیں ہوگا۔“

ڈی آئی جی تحسین خان کے ذہن کو پڑھ کر میں نے یہ ساری باتیں کی تھیں۔ اسے میرے پاس آتے ہوئے زیادہ عرصے نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ حیران حیران سا نظر آنے لگا کہ جو بات ابھی اس کی زبان پر نہیں آئی مجھے کس طرح معلوم ہو گئی۔

وہ ابھی حیرت زدہ ہی تھا کہ میں پھر بول اٹھا۔ ”تحسین خان! تم نے میری جاہ و ثروت پر تو اپنی پیشہ ورانہ عادت کے مطابق شک کیا، لیکن کبھی یہ بھی سوچا کہ اس شر میں کتنے افراد ایسے ہیں جو ناجائز ذرائع سے دولت جمع کر کے صاحب ثروت بن بیٹھے ہیں؟ بہت سے تو ایسے ہوں گے کہ جن پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی تمہارے لئے محال ہوگا۔ بڑائی اور عزت کا معیار دولت کو سمجھ لیا گیا ہے، لیکن تمہیں بھی خبر ہے اور مجھے بھی کہ اللہ کی نظر میں بڑا کون ہے۔ تم بھی تو کچھ بولو۔“

چونکہ کر تحسین خان نے میری طرف نگاہ اٹھائی، پھر کہنے لگا۔ ”حضور ہی نے سب کچھ کہہ دیا تو اس خاکسار کے بولنے کی گنجائش کہاں باقی رہی..... حضور کے حکم کی تعمیل میں یہ خادم استعفیٰ نہیں دے گا، لیکن اوپر والوں کو کس طرح مطمئن کیا جائے؟“

”اس شر سے جرائم کا خاتمہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔“ میں نے کہا۔

”یقیناً حضور کو بھی معلوم ہو گا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں، پھر.....“

”پھر یہ کہ اوپر والوں سے مہلت لے لو۔ اللہ نے چاہا تو تمہیں مہلت مل جائے گی۔“ میں بولا۔ ”یہ کام رفتہ رفتہ ہی ممکن ہے، اس بات کو تمہارے حکام بھی جانتے ہوں گے۔ اینٹی کرپشن کے سربراہ قمر احمد نے اس سلسلے میں تم سے جو تعاون طلب کیا ہے، وہ بھی تمہارے لئے نیک فال ثابت ہو گا۔ یہ آپریشن کامیاب ہونا چاہئے۔ میری خواہش یہ ہے کہ قمر احمد کی طرح تم بھی موقع پر موجود رہو۔ اندازہ ہے کہ مسلح مجرموں کی بڑی تعداد آج رات کسی بھی وقت تاجر یعقوب کے گوداموں پر حملہ آور ہوگی۔“

تحسین خان کے چہرے پر موجود حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پُر عقیدت لہجے میں کہا۔ ”معاف کیجئے گا حضور، میں اس معاملے کو اتنا اہم نہیں سمجھ رہا تھا، اسی لئے علاقے کے ایس پی کی ڈیوٹی وہاں لگا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے قمر احمد صاحب سے بھی لاعلمی کے سبب یہ بحث کی تھی کہ اتنی پولیس فورس کی کیا ضرورت ہے۔ حضور کا حکم ہے تو خود میں بھی وہاں موجود رہوں گا۔ اگر حضور اسی طرح میری رہنمائی فرماتے رہے تو انشاء اللہ جلد ہی قانون کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔“

”اس ضمن میں ارسلان بیگ نامی ایک پیشہ ور مجرم بہت اہم ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے

سے کہہ دیا۔

”بہت بہتر ہے حضور۔“ وہ فوراً بول اٹھا۔ ”مجھے تو خود حضور سے ایک درخواست.....“

”میں جانتا ہوں۔ تم اپنی جگہ جا کر بیٹھو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

تحسین خان میری چوکی کے سامنے سے اٹھ کر ایک طرف جا بیٹھا اور دوسرے ضرورت مند باری باری میرے پاس آئے گئے۔ ملک دشمن عناصر سے نمٹنے کے لئے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اپنے معمولات بدل دوں۔ لوگوں کے جمع ہوتے ہی انہیں میں نے اس بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ ”خلق خدا کی بھلائی کے لئے ہی ممکن ہے، کچھ دن میں آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔ اسی سبب آئندہ روز سے شام کی یہ نشست موقوف کی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی یہ سلسلہ پھر جاری ہو جائے گا۔“

میری کوئی غرض تو ان لوگوں سے وابستہ تھی نہیں کہ وہ اس پر احتجاج کرتے، سو خاموشی کے ساتھ انہوں نے میری بات سن لی۔ جو مریض میرے زیر علاج تھے احتیاطاً انہیں میں نے زیادہ دن کے لئے دوائیں لکھ کر دے دیں اور مطمئن ہو گیا۔

نشست برخاست ہو گئی تو تحسین خان میرے کہنے کے مطابق بیٹھا رہا۔ اسے اپنے ساتھ اٹھا کر میں نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ پہلی مرتبہ میری کوٹھی کے اندرونی حصے میں آیا تھا، اس لئے وہاں کے جدید ساز و سامان کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ پولیس کے محکمے سے متعلق افراد کی اپنی ایک الگ نفیات ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک شے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تحسین خان تو پھر بھی ڈی آئی جی کراٹر تھا۔

اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر میں نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”تحسین خان! تم یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ میرا ذریعہ معاش کیا ہے؟“

تحسین خان میرے اس سوال پر بوکھلا گیا اور ہکلائے لگا۔ ”جی..... جی حضور، م..... میں تو بس.....“

”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے عقیدت رکھتے ہو اور یہ بھی علم ہے کہ تمہارا تعلق کس محکمے سے ہے۔ سنو تحسین خان! ہر شخص پر شک نہیں کرتے۔ تمہیں خبر ہے کہ ہم کسی سے کوئی نذرانہ بھی وصول نہیں کرتے۔ ہمیں مال و منال کی تمنا نہیں کہ اللہ نے اس سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جتنی صفات ہیں، ان میں سے بیشتر اس نے اپنے نیک بندوں میں بھی منتقل کر دی ہیں۔ مثلاً صدقہ کے معنی بے نیاز ہونا ہے، اللہ الصمد کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ بے نیاز ہے۔ مجھے نیک ہونے کا دعویٰ تو نہیں کہ اللہ کا ایک گنہگار بندہ ہوں، مگر مجھ پر اس کا فضل ہے۔ اس پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر کروں، کم ہے۔ اللہ شکر بجالانے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کر رہا بلکہ اسے تم اظہار حقیقت جان سکتے ہو۔ جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں، وہ ایک ہی ذات برحق ہے۔“ میں کہتا رہا۔ ”یہ بھی نہ سمجھ لینا میں وعظ کہہ رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں اور تم ایمان والوں میں سے

ارسلان بیگ کے حلقے سے آگاہ کیا، پھر بولا۔ ”ممکن ہے کہ گوداموں پر حملے کی کمان اسی شخص کے سپرد کی گئی ہو۔ اس شخص کو پہلے ہی گرفتار ہو جانا چاہئے۔ اس کا بندوبست بھی میں نے کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں کہ ارسلان بیگ پہلے ہی پکڑا گیا تو اس کی جگہ کوئی اور لے سکتا ہے، لیکن یہ طے ہے کہ یعقوب کے گوداموں کو پہلے لوٹنے اور پھر ان میں آگ لگا دینے کی کوشش ضرور ہوگی۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے جب بھی یہ محسوس ہوا کہ تم لاعلمی میں کوئی غلط قدم اٹھانے والے ہو تو روک دوں گا۔ اس کے علاوہ مجرموں کو گرفت میں لینے یا ان کے گرد حلقہ تنگ کرنے کے سلسلے میں بھی بوقت ضرورت تمہیں آگاہ کرتا رہوں گا۔ میری یقین دہانی کے بعد تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، اسی مثل کے مصداق ڈی آئی جی تحسین خان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ”حضور سے ملاقات کی صورت کیا ہوگی؟ یہ سوال اس خادم نے یہ سوچ کر کیا ہے کہ خود حضور ہی نے شام کی نشست موقوف کر دی ہے۔“

”تمہیں مجھ سے ملاقات کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں خود ہی تمہاری طرف سے باخبر رہوں گا۔“

ڈی آئی جی تحسین خان چلا گیا تو میں نے قمر احمد کا دھیان کر کے آنکھیں موند لیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ قمر احمد کو میں نے اسی کی کوشی کے لان میں دیکھا۔ وہ اپنے بیٹے ظفر کے ساتھ کھیلے ہوئے رکا اور اسے گود میں لے کر سمجھانے لگا۔ ”ممکن ہے، ہمیں آج رات واپس آنے میں دیر ہو جائے۔ تم دودھ پی کر آیا پی کے ساتھ سو جانا۔ ہم تمہیں من کے پاس سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“

”اور مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آئی ابو؟ تو؟“

”آجائے گی۔ تم بس کچھ پڑھتے رہنا۔ تمہیں سارے کچھ تو ہم نے اچھی طرح یاد کرا ہی دیے ہیں۔ اچھے بچے کچھ پڑھ کر سوتے ہیں۔“

ظفر نے بڑی معصومیت سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ قمر احمد نے اسے پیار کیا اور پھر لان سے عمارت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

مطمئن ہو کر میں نے آنکھیں کھول دیں کیونکہ کہ قمر احمد اپنی کوشی سے روانہ ہونے والا تھا۔ ایک طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں نے دوسری جانب توجہ دی اور چونک اٹھا۔ میں نے اسے سامان سمیٹتے ہوئے دیکھا جیسے وہ اس کمرے کو چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو۔ میرے علم و اطلاع کے مطابق اگر اسے جانا ہی تھا تو رات کو بارہ بجے کے بعد اپنے کمرے سے نکلتی۔ دس بجے تو اسے ارسلان بیگ سے اسی کمرے میں ملنا تھا۔ یہ جاننا میں نے ضروری سمجھا کہ اچانک اس کے پروگرام میں کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ممکن تھی اور میں نے اسی پر عمل کیا۔ میں فوری طور پر مقصود کے قالب سے باہر آ گیا۔ پھر سنیتا تک پہنچنے میں مجھے چند لمحے سے زیادہ نہیں لگے۔

”اتنا جلدی میں کہاں جا رہی ہو سنیتا؟“ یہ سوال کرتے ہوئے میں نے سکھ بیر کا قالب اپنا لیا۔

”نت..... تم سکھ بیر۔“ وہ ایک ایئر بیگ اٹھاتے ہوئے چونکی اور میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا، مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہاں میں! تمہارے دھیان کی جوت تو ہر سے جگے رکھتا ہوں میں۔“

”مجھے آشا (امید) نہیں تھی کہ تم آج ہی دوبارہ مجھ سے ملنے آ جاؤ گے۔“ اس نے کہا، پھر میرے سوال کا جواب دیا۔ ”میں یہ کرا چھوڑ کر اسی ہوٹل کے ایک اور کمرے میں جا رہی تھی۔ ساودھان (چوکتا) رہنے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے۔“

”پرنتو ارسلان بیگ تو پچیس ہزار روپے رحیم دادا سے وصول کر کے بیس آئے گانا۔“

”اچھا تو تمہیں اس منحوس شکل والے کے بارے میں بھی پتا چل ہی گیا۔“

”پتا تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ تمہارے ملن کو ایک سندر پسنا سمجھ کر بھول تو گیا ہوں میں، پھر بھی من کو شانتی نہیں مل رہی۔ بس یہی جی کرتا ہے، تمہیں دیکھتا ہی رہوں۔ یہی وچار (خیال) کر کے تو پھر آ گیا میں۔“ میں نے پہلی ملاقات کی طرح دوبارہ اسے محبت کے دام میں پھسانے کی خاطر کہا۔

وہ مجھ پر اپنے نینوں کے تیر چلاتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”تم بھی عجب ہو سکھ بیر! مجھے چاہتے بھی ہو اور پاس بھی نہیں آنے دیتے۔“

میں نے اس کے ناز وادا کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر یہی سوال کیا کہ ارسلان بیگ اسے کس طرح پچیس ہزار روپے پنچائے گا۔

”اپنا سن کلپ (ارادہ) میں نے بدل دیا ہے سکھ بیر۔“ سنیتا بتانے لگی۔ ”اب ارسلان بیگ پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے۔ آزمائے کو آزمائے بے وقوف کھلائے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔ ”رحیم دادا سے ارسلان بیگ کی جگہ اب ہمارا دوسرا آدمی مل لے گا۔ اس نے کون ہی صورت دیکھی تھی ارسلان بیگ کی جو پچان لے گا کہ آدمی بدل گیا ہے؟“

”اور آواز؟“ میں نے سوال کیا۔

”دو پیسے کے ٹانک کرنے والے بھی آواز بدل کر بول لیتے ہیں۔ وہ تو پھر بھی میرا خاص آدمی چندرپال ہے۔ یہاں آنے کے کچھ دن بعد ہی چندرپال کو میں نے بلالیا تھا۔ بہت ہی تیز ہے وہ۔ خطرے کی بو سونگھنے میں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ پہلے میرا وچار تھا کہ یعقوب کے گوداموں کو لوٹنے کا کام ارسلان بیگ ہی کو سونپوں گی، پر بدلے ہوئے حالات میں یہ کام بھی چندرپال ہی کو سونپ دیا۔ میں یہاں سے ڈھاکا چلی جاتی تو چندرپال ہی میری جگہ لیتا۔ اب یوں لگتا ہے اور کچھ دن مجھے یہاں رکنا پڑے گا۔ سیٹ کینسل کرا دی ہے میں نے، اسی کے ساتھ دونوں ہی سے بھی نئے پروگرام کی انوسٹی (اجازت) لے لی ہے۔ میرے رک جانے سے تمہیں خوشی ہوئی کہ نہیں؟ اب تو جی بھر کے مجھے دیکھ سکو گے نا؟“ یہ کہہ کر سنیتا بڑی دل ربائی سے مسکرائی، پھر کہنے لگی۔ ”معلوم ہے تمہیں سب کچھ میں صاف صاف کیوں بتا دیتی ہوں؟“

”نہیں معلوم۔ تم بتا دو۔“ میں نے کہا۔

”لو اس میں معلوم نہ ہونے کی ایسی کیا بات ہے۔“ وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ ”اگر میں نہ بھی بتاؤں تو سب کچھ تم خود ہی معلوم کر لو گے۔“

سینٹا کی یہی غلط فہمی میرے کام آ رہی تھی ورنہ اس جیسی عورت اتنی جلدی زبان نہیں کھولتی۔
”اور دوسری بات بھی جان لو۔“ سینٹا مجھے چپ دیکھ کر مزید بولنے لگی۔ ”کچھ بھی نہ چھپانے کی دوسری وجہ تم خود ہو سکھ بھرا میرے جیون میں آج تک کوئی ایسا..... تم جیسا دیکھتی (محض) نہیں آیا جو مجھے پاسکے اور نہ پانا چاہے۔ میں نے اب تک آتما (روح) کی پکار نہیں سنی تھی، شریر (جسم) ہی کو سب کچھ جانتا تھا۔ تم سے مل کر یہ جانی کہ آتما، شریر سے شاید بڑی چیز ہے۔ ایک آتما سے دوسری آتما کے ملن کو میں سوانگ بھرتا کستی تھی۔ گھڑی بھر کو سوچ لیں کہ یہ سوانگ ہی سہی، پر یہ سوانگ بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ مانو کسی کو پالنے کی آتما، ملن سے بڑھ کر جان پڑتی ہے۔“ سینٹا جیسے کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھتی محسوس ہوئی۔

”مجھے جھما (معاف) کر دینا سینٹا کہ میں تمہارا درشن کرنے کے لوبھ (لاالچ) میں اچانک ملے آ گیا۔“ میں بولا۔ ”تمہیں یہ کراہنا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت ضروری کام ہوں گے۔ رات کو جب تم اپنے کاموں سے نمٹ جاؤ گی تو ممکن ہے میں آ جاؤں۔ تم اگر سو بھی گئیں تو جگائے بنا درشن کر کے لوٹ جاؤں گا۔“

”تم ضرور آنا سکھ بھرا!“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”میں تمہیں جاگتی ملوں گی۔ تمہارے آنے کا انتظار کروں گی میں۔ جو پلاننگ کی ہے، اس کے انوسار (مطابق) سارے کام رات کو زیادہ سے زیادہ ساڑھے گیارہ بجے تک نمٹ جائیں گے اور مجھے ان کی رپورٹ مل جائے گی۔ تمہارے آنے سے پہلے چند رہال کو میں اپنے نئے کمرے کا نمبر بتا چکی ہوں۔ ٹھیک دس بجے چند رہال، رحیم دادا کے پاس پہنچ جائے گا۔ رقم ملے نہ ملے چند رہال صحیح سے پر، یعنی ساڑھے دس بجے ان لوگوں کے بیچ ہوگا جنہیں اس کے حکم پر یعقوب کے گوداموں پر بلہ بولنا ہے۔ اس میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنا۔ لوٹ کا مال اسی سے ایک ٹرک میں بھرنے کے بعد روانہ کر دیا جائے گا، سو کام ختم۔ چند رہال کو فون پر مجھ سے صرف ایک لفظ کہنا ہے، ”گرین“ میں سمجھ جاؤں گی، کام ہو گیا۔ رحیم دادا سے ملنے والی رقم مجھے آج ہی پہنچانا چند رہال کے لئے ضروری نہیں۔ یہ شرط صرف اس محسوس ارسلان بیگ کے لئے تھی۔ یہ سب تمہیں میں نے اس لئے بھی بتایا کہ ایسے کاموں میں ٹائم کی پابندی بڑی ضروری ہوتی ہے۔“

”اور اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”جھگوان نہ کرے ایسا ہو۔“ سینٹا نے جواب دیا۔ ”ایسے ہی دھار کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے چند رہال کو نئے کمرے کا نمبر دیا ہے، کیوں کہ ہر بات فون پر نہیں ہو سکتی۔“
میں نے بات کا رخ بدلنے کی خاطر کہہ دیا۔ ”تم چند رہال کے بہت گن گار رہی ہو۔ کہیں وہ بھی تو ملک افضل اور دوسروں کی طرح تمہارے.....“

”ارے نہیں۔“ سینٹا میری بات کاٹ کر بولی۔ ”اب میں اتنی سستی بھی نہیں۔ چند رہال سے میرا

اتنا افسری اور ماتحتی کا ہے۔ وہ تو میرے سامنے آنکھ بھی نہیں اٹھاتا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، میں رات ہی کو آ سکتا تو آ جاؤں گا۔“

”نہیں۔“ اس نے ضد کی۔ ”تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا کہ ضرور آؤ گے۔“

میں نے سینٹا سے آدھی رات کے بعد آنے کا وعدہ کر لیا اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سینٹا سے اس وقت میرا ملنا بہت کار آمد ثابت ہوا تھا۔ وہ تو میری جنائی صفات سے مرعوب ہو کر مجھے جو کچھ خود بتا دیتی، معلوم ہو جاتا مگر اس کے ماتحت چند رہال سے بہت سی کام کی باتیں پتا لگنے کی امید تھی۔ اب اس معاملے میں براہ راست مداخلت مجھے ضروری محسوس ہوئی۔ اپنی کوٹھی پہنچنے پر میں اسی پر غور کرتا رہا۔ جلد ہی میں نے اس ضمن میں ایک فیصلہ کر لیا۔ سینٹا سے حاصل ہونے والی نئی معلومات میرے نزدیک بہت اہم تھیں۔ ڈی آئی جی کراٹمز تحسین خان اور قمر احمد، دونوں ہی میری نظر میں قابل اعتماد تھے۔ سو میں نے تحسین خان سے ملنے کا ارادہ کیا، کیوں کہ ابھی خاصا وقت تھا۔ وہ ذمے دار آدم زاد مجھے پولیس ہیڈ آفس میں ملا۔ ابھی تک پولیس فورس روانہ نہیں ہوئی تھی۔

تحسین خان کو گمان بھی نہ ہو گا کہ میں آج ہی اس سے ملنے آ جاؤں گا۔ میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ فون پر متعلقہ علاقے کے ایس پی کو فوراً ہیڈ آفس پہنچنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کا مسلح اردلی مجھے اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اس وقت تک مقصود کا قالب نہیں اپنایا تھا۔ تحسین خان کی کرسی کے پیچھے جاتے ہی میں مقصود کے قالب میں ظاہر ہو گیا۔ ریسپور رکھتے ہی میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ قمر احمد ہی کی طرح اچھل پڑا۔

”اطمینان سے بیٹھے رہو تحسین خان۔“ میں نے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”تمہیں ایک ضروری خبر دینی تھی، اسی لئے مجھے آنا پڑا۔“
”کش..... تشریف رکھئے حضور۔“ وہ ابھی تک حواس باختہ سا تھا۔

”یہ ان کلفٹات کا وقت نہیں ہے۔“ میں بدستور آہستہ آواز میں بولا۔ ”پہلے یہ بتاؤ پولیس فورس کو تو خبر نہیں کہ اسے کہاں اور کیوں بھیجا جانے والا ہے؟“

”حضور! یہ علاقے کے ایس پی کی آمد سے پہلے اس سلسلے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔“ تحسین خان نے جواب دیا۔ ”دیپے توقع یہی ہے کہ پولیس فورس کو اب تک اس سے ایس پی نے آگاہ کر دیا ہوگا، کیوں کہ عموماً رازداری نہیں برتی جاتی۔ غالباً حضور کو یہ خدشہ ہے کہ کسی ضمیمہ فروش فرد کے ذریعے یہ خبر مجرموں کو مل سکتی ہے۔“

”یہی بات ہے۔“ میں نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی۔ ”پھر بھی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ پولیس فورس باقاعدہ وردی میں نہ ہو۔“

”یہ خادم بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا، اسی خیال سے ایس پی کو طلب کیا تھا۔“

”ممکن ہے، مجرموں تک یہ خبر پہنچ جانا محض اندیشہ ہی ثابت ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں اس وقت میں گوداموں پر حملے کا وقت بتانے آیا ہوں۔ اس سے تمہارے کام میں یقیناً آسانی ہو جائے گی۔ ٹھیک

ساڑے دس بجے گوداموں پر حملہ ہوگا۔ آس پاس ہی کوئی ٹرک بھی اس علاقے میں موجود ہونا چاہئے۔ اس ٹرک پر تمہارے آدمیوں کو خاص طور پر نظر رکھنی ہے۔“ پھر میں نے تحسین خان کو اس کی وجہ بھی بتادی۔

”آپ نے تو حضور‘ سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ اب بھی اگر ہم.....“

”پہلے پوری بات سن لو۔“ میں بول اٹھا۔ ”ساڑھے دس بجے سے پہلے پولیس فورس مجرموں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائے گی‘ خواہ اسے علاقے میں مجرموں کی موجودگی ہی کا علم ہو کیوں نہ ہو جائے۔ میری اطلاع کے مطابق جوڑیا بازار میں مذکورہ گودام قریب قریب واقع ہیں‘ اس لئے پولیس فورس کو کارروائی کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اچھا اب میں چلوں گا۔ اپنے کمرے میں میری آمد کے متعلق دروازے پر متعین اردلی سے تم استفسار نہ کرنا۔ اس بے چارے کو میرے آنے کا علم نہیں‘ اسی طرح جانے کی خبر بھی نہ ہو پائے گی۔ خدا حافظ تحسین خان۔“ یہ کہتے ہی میں تیزی کے ساتھ اس کی کرسی کے عقب میں جا کر مقصود کے قالب سے نکل آیا۔ کیوں کہ وہ قالب حقیقتاً کسی بھی آدم زاد کا نہیں تھا‘ اس لئے فوری طور پر غائب ہو گیا۔

تحسین خان کی کرسی کے بالکل پیچھے کچھ فاصلے پر ایک کھڑکی تھی۔ وہ غالباً یہی سمجھا کہ میں اسی کھڑکی کے ذریعے کمرے میں آیا تھا اور شاید اسی کو عبور کر کے گیا ہوں۔ وہ اسی لئے تیزی سے پلٹا اور بند کھڑکی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں کچھ بولا نہیں اور چلا آیا۔

اسی رات کو دس بجے سے پہلے میں‘ رحیم دادا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ میں نے اس علاقے میں آتے ہی گھماڑ پولیس والوں کی نقل و حرکت محسوس کر لی تھی۔ اپنی دانست میں انہوں نے رحیم دادا کے ٹھکانے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے ایک پتلی سی گلی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا جس سے بہ مشکل ایک ہی شخص گزر پاتا۔ وہ پتلی سی لمبی گلی ایک اور چوڑی گلی میں نکلتی تھی جہاں کوئی کار وغیرہ کھڑی کی جاسکتی تھی۔ وہاں بھی مجھے کوئی پولیس والا دکھائی نہ دیا۔ پولیس کی اسی نوع کی کوتاہیاں چند رہال جیسے شاطر مجرموں کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں۔

میں اس وقت مقصود کے قالب میں تھا جب رحیم دادا کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خود اسی نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی تقریباً اچھل پڑا۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گے رحیم دادا؟“ میں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

”ہاں ہاں آؤ..... آؤ مقصود میاں۔“ وہ میرا نام بھولا نہیں تھا۔ ”لیکن تم غلط وقت پر آئے۔“

”وہ کیوں رحیم دادا؟“ میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے سوال کیا۔ رحیم دادا جلدی سے دروازہ بند کر کے پلٹا تو میں بولا۔ ”تم ہی نے تو ملاقات کے لئے پوچھا تھا‘ سو میں آ گیا۔“

”یہ زبان بھی سالی بڑی خراب چیز ہے۔“ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اگر میں

نے زبان نہ دی ہوتی کہ چیخیں ہزار روپے اس کالی نقاب والے کو واپس کر دوں گا تو یہاں نظر نہ آتا‘ اس چوہے دان میں..... پھر بھی مجھے کوئی فکر نہیں‘ ایک رستہ ہے نکلے گا۔“

”پتلی گلی۔“ میں بول اٹھا۔ ”اندر والے کمرے کی کھڑکی سے کود کر اس پتلی گلی کے ذریعے فرار ہونا تمہارے لئے مشکل نہیں ہوگا۔“

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم پہلے بھی اس علاقے میں آچکے ہو؟“ ”مقصود کے لئے کہیں آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا رحیم دادا۔“ میں نے اسی کے لب و لہجے میں جواب دیا۔ ”تم شاید مجھے یہ بتانا چاہتے ہو گے کہ اس وقت تمہارے ٹھکانے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میں نے صحیح کہا نا؟“

”ہاں یہی تو بات ہے۔“ اس نے تصدیق میں سر ہلایا۔ ”تمہیں دیکھ کر میں اسی لئے تو گھبرا گیا تھا کہ خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا یا تمہارا خیال رکھوں گا۔ لیکن تم مجھ سے بھی دو جوتے آگے نکلے۔ تم کو تو پہلے سے تمام داؤ گھات آتے ہیں۔ بیٹھو نا۔“ اس نے زمین پر پچھی ہوئی دری کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم کہتے ہو تو بیٹھ بھی جاتے ہیں۔“ میں نے دری پر بیٹھنے میں تکلف نہ کیا۔

رحیم دادا بھی میرے قریب ہی آ بیٹھا اور نیکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پرانی سی ایک جیبی گھڑی نکالی۔ گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ”اس کالی نقاب والے کے آنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں الماری سے روپوں کا تھیلا تو نکال کے رکھ لوں۔“ یہ کہتا ہوا وہ اٹھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے مقصود میاں کہ تم اس وقت بلاوجہ نہیں آئے۔“ وہ کمرے ہی میں موجود لکڑی کی ایک الماری کی طرف بڑھا۔ ”شاید تم یہ دیکھنے آئے ہو کہ رحیم دادا کہیں اپنی زبان سے نہ پھر جائے اور مال پی نہ لے۔“ اس نے الماری کھول کر اس میں سے کپڑے کا ایک تھیلا نکال لیا اور دوبارہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”غلط سمجھ رہے ہو تم رحیم دادا۔ ایسی کوئی بات نہیں‘ کو تو ابھی چلا جاؤں۔“ میں بولا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ ”تو پھر عین اسی وقت آنے کی کوئی تو وجہ ہوگی..... پولیس نے کیوں گھبرا ڈال رکھا ہے‘ یہ بات بھی میرے پلے نہیں پڑی۔ اگر مجھی پر ہاتھ ڈالنے کو یہ جتن کئے ہیں تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔ دور دور رہ کر نقشے بازی کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس کا بھتا پابندی سے میں تھا نہ بھیجتا ہوں۔ یہ رنگ دیکھ کر میں نے اپنے سارے چیلے چائٹوں کو پھینکا دیا۔ انہی میں سے ایک لونڈے نے جاتے جاتے یہ بھی بتایا کہ کوئی بھی پولیس والا ہمارے تھانے کا نہیں۔ ہے نا عجیب سی بات۔ مجھے تو یہ کوئی لمبا چکر معلوم ہو رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے‘ پولیس کہیں اس کالی نقاب والے کو تو دبوچنا نہیں عانتی؟ کیا خبر وہ کوئی اونچا کرد ہو۔“

”پولیس اگر اس کالی نقاب والے کو پکڑنے کے پھیر میں ہے تو وہ ہستے چڑھنے والا نہیں۔“ میں مسکرایا۔

”تمہیں کیسے اس بات کا یقین ہے کہ پولیس اسے نہیں پکڑ سکے گی؟“ رحیم دادا نے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے رحیم دادا۔ جب تمہیں اور مجھے یہاں سے فرار کا رستہ معلوم ہے تو وہ کس طرح بھٹ جائے گا‘ پھر یہ کہ پولیس بھی اس علاقے کی نہیں۔“

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ دروازہ پر چند لمحوں کے درمیانی توقف سے تین مرتبہ دستک

”آگیا۔“ یہ کہتے ہی رحیم دادا تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

میں نے اسی لمحے مقصود کا قالب چھوڑ دیا۔ ذرا دیر میں دروازہ کھلا، لمبے قد والا ایک شخص اندر آیا، رحیم دادا نے دروازہ بند کیا۔ آنے والے کے جسم پر سیاہ پتلون، سیاہ شرٹ اور چہرے پر سیاہ نقاب تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ فریاد: ”تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا“ اس لئے قتل کی پیشگی رقم واپس کر دو۔“

”ابھی لایا۔“ رحیم دادا نے یہ کہتے ہی مرکز دوری کی طرف قدم بڑھائے اور حیرت کی شدت کے سبب اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

تیکے کے قریب رکھا ہوا رقم کا تھیلہ غائب تھا اور میں بھی۔ نقاب پوش کے پاس کھڑا ہوا میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ نقاب پوش نے غراتے ہوئے سوال کیا۔ ”جلدی کرو“ نہیں تو.....“ اس نے

پینٹ کی بیب میں ہاتھ ڈال کر ریو اور نکال لیا۔ اس یقین کے بعد کہ وہ سینٹا کا نائب چندرپال ہے، کوئی اور نہیں، میں نے مزید وقت ضائع نہ کیا۔ پہلے میں نے چندرپال کو ہوش و خرد سے بگاڑ کیا، پھر رحیم دادا کو۔ راہ فرار پہلے ہی میری نظر میں تھی۔ پتلی سی اس اندھیری گلی میں پہنچتے ہی میں نے اونچی پرواز کی۔ چندرپال کو اپنی کوشی میں لا کر میں نے اس کی بے ہوشی کو مزید بڑھا دیا۔ اب وہ اس وقت تک بے خبر پڑا رہتا جب تک میں خود ہی اسے ہوش میں نہ لائے۔ چند ہی لمحوں میں دوبارہ میں اسی علاقے تک جا پہنچا جہاں سے غائب ہوا تھا۔ چندرپال کی کار مجھے پتلی گلی کے کنارے کھڑی مل گئی۔ اندھیرے میں پتلی گلی سے نکلتے ہوئے میں نے چندرپال کی ہیبت اختیار کر لی تھی، فرق اتنا تھا کہ اب میرے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔

کار کا دروازہ مجھے کھلا ملا اور میں بڑے اطمینان کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کی چابی میرے سامنے ہی جمول رہی تھی۔ میں نے کار اشارت کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پولیس والوں کو میں نے اسی علاقے میں مڑ گشت کرتے دیکھا۔ خبر نہیں مقررہ وقت گزر جانے کے بعد انہیں کس بات کا انتظار تھا۔ جسے آتا تھا، وہ آکر وہاں سے نکل بھی گیا اور وہ ڈنڈے بجاتے رہ گئے۔ شاید انہیں گمان ہو گا کہ آنے والا ابھی نہیں آیا ورنہ ان کی نظر سے نہ بچتا۔

مجھے چندرپال کا ذہن پڑھنے کے لئے صرف چند ہی لمحے ملے تھے، سو فوری نوعیت کی باتیں ہی جان سکا۔ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر مجھے انہی معلومات سے کام لینا تھا۔

دن کے وقت جس علاقے میں گما گمی رہتی اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ طوفان آنے سے پہلے جو خاموشی فضا پر مسلط ہو جاتی ہے، اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد مجھے ویسی ہی خاموشی ہر طرف محسوس ہوئی۔ وہاں مجرم بھی چھپے ہوئے تھے اور قانون کے رکھوالے بھی۔ اس کے باوجود کسی طرف سے کوئی خفیف سی آہٹ یا آواز نہیں آئی۔ غیر فطری سے اس سناٹے کو صرف کار کے انجن کی آواز مجروح کر رہی تھی۔ مین روڈ سے گزر کر اندر گھستے ہوئے مجھے وہ ٹرک بھی نظر آ گیا تھا،

سینٹا نے جس کی نشان دہی کی تھی۔ اس ٹرک کی بھی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں جیسے کوئی اندر موجود نہ ہو۔ میں کیوں کہ اس وقت ایک غیر ملکی دہشت گرد کے قالب میں تھا اس لئے خطرہ یہ تھا کہ کوئی غیر ذمے دار پولیس والا مجھ پر فائر نہ کر دے۔ واضح طور پر میں یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وقت سے پہلے کسی مجرم کو نہ پھینچا جائے، پھر بھی اپنی کارکردگی دکھانے کے شوق میں کوئی بے وقوف یہ حرکت کر سکتا تھا۔ میرے سارے اعصاب اسی سبب سے تن سے گئے۔ اندھیرے اور نیم تاریکی میں کسی بھی سمت سے چلائی جانے والی گولی میرا کام تمام کر دیتی اور میں وہ انسانی قالب چھوڑنے سے پہلے ہی سفر آخرت پر روانہ ہو جاتا۔ یہ خطرہ میں نے دانستہ مول لیا تھا، کیوں کہ چندرپال کا حکم ملتے ہی چھپے ہوئے مجرم سامنے آتے اور یعقوب کے گوداموں پر نوٹ پڑتے۔

ٹھیک وقت پر میں نے کار کو مقررہ جگہ روکا اور کار کے اندر روشنی کر دی۔ وہ ایک گلی کا موڑ تھا۔ یعقوب کے گوداموں سے اس موڑ کا فاصلہ خاصا رہا ہو گا۔

کار کے رکھنے ہی دائیں جانب ایک دیوار کی آڑ سے نکل کر نیم تاریکی میں کسی لمبے قد والے کا سایہ دکھائی دیا۔ وہ سایہ کار کی طرف لپکا۔ قریب آنے پر اسے میں نے پہچان لیا۔ وہ ارسلان بیگ تھا جس نے چندرپال کے حکم پر عمل درآمد کرنا تھا۔

میں نے اس سے کچھ کہے بغیر دائیں ہاتھ کی مٹھی باندھ کر انگوٹھا مخصوص انداز میں بلند کیا۔ ارسلان بیگ بھی جواب میں کچھ نہ بولا۔ وہ جدھر سے آیا تھا اسی تیزی کے ساتھ لوٹ گیا۔ کار کے اندر کی جی بجھا کر میں نے انجن اشارت کیا اور کار کو ریورس گیر میں ڈال دیا۔ کار کا رخ اب ایک ایسی گلی کی طرف ہو گیا جو سیدھی مین روڈ پر نکلتی تھی۔ اب مجھے پہلے فائر کا انتظار تھا۔ گوداموں کے تالے توڑنے کے لئے مجرموں کو یہی ہدایت دی گئی تھی تاکہ کام میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو۔ اس کے لئے مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پہلا فائر ہوتے ہی میں نے کار کو روکا اور انسانی قالب سے نکل آیا۔ اسی کے ساتھ کم از کم میرے لئے خطرہ ختم ہو گیا۔

کار سے اترتے ہی میں نے اسے فضا میں بلند کیا۔ خاصی بلندی پر پہنچ کر میں نے ٹھیک اسی جگہ گرایا جہاں سے کار کو اٹھایا تھا۔ زبردست دھماکا ہوا اور کار کے پچھترے اڑ گئے۔ یہ منظر اس علاقے میں موجود مجرموں اور قانون کے رکھوالوں نے بھی دیکھا ہو گا۔ کار خود بہ خود فضا میں بلند ہوتی چلی گئی، پھر بہت اونچائی تک پہنچنے کے بعد ایک دم تیزی سے نیچے گری، پختہ گلی کی زمین سے ٹکرائی، دھماکا ہوا اور اس کے پرچنے اڑتے نظر آئے۔

میں نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا، مجھے یہ جاننے کی جستجو نہیں تھی۔ میں تو جب وہاں سے چلا تو فضا پے در پے دھماکوں سے گونج رہی تھی۔ مسلح مجرموں اور پولیس کے درمیان مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس علاقے کی ناک بندی کے سبب مجھے توقع بھی تھی کہ کوئی مجرم بھی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔

اپنی کوشی کے ایک کمرے میں جس طرح میں چندرپال کو ڈال گیا تھا، وہ مجھے اسی طرح ملا۔ میں اسے ہوش میں لے آیا۔ اسے سینٹا کا موقع دیئے بغیر ہی میں نے اس کو اپنے اثر میں لے لیا۔ میری

جنتی صفات کے زیر اثر آکر اس کا ذہن قابو میں آگیا جسے اب متحرک کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اب انسانی قالب میں تھا۔

”تمہارا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے چندرپال؟“ میں نے اس سے پہلا سوال کیا۔

”شرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں۔“ چندرپال خوابیدہ سی آواز میں بولا۔

چندرپال کا یہ جواب میرے لئے غیر متوقع ہی تھا۔ اپنی کرپشن والوں کا یہ قیاس غلط ثابت ہوا کہ غیر ملکی تحریب کاروں کا مرکز کراچی میں ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں معلوم ہوا کہ کراچی شہر میں ہیڈ کوارٹر کی اہم ذیلی شاخ ہے۔

”اس ملک میں تمہارا سربراہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کا نام پورا نام کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے؟“

”ونودیجی..... ان کا پورا نام ونودیجی ہے اور وہ ڈھاکہ ہی میں رہتے ہیں۔“ جواب دیا گیا۔

”تمہارے اور سینٹا کے علاوہ ملک کے اس حصے میں تمہارے کتنے اور ساتھی ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”ان کے نام اور پتے بھی بتاؤ۔“

”ہم دونوں کے علاوہ صرف دو آدمی ہیں، نارائن اور کلکز۔ ان دونوں کی پوسٹنگ سندھ کے ایک ایسے قصبے میں ہے جو راجستھان کی سرحد سے قریب ہے۔“ پھر چندرپال نے سندھ کے اس قصبے کا نام بھی بتا دیا۔ اس سے مزید سوالات کرنے پر پتا چلا کہ ضروری اشیائے صرف راجستھان کی سرحد سے پڑوسی ملک کو اسمگل کی جا رہی تھیں۔ اس کے لئے انہیں ایک مقامی بااثر وڈیرے کا تعاون حاصل تھا۔

سینٹا نے ملک کے اس پورے حصے میں مقامی جرائم پیشہ اور ضمیر فروشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔

ضروریات زندگی کی یہ اشیاء ملک کی دور دراز منڈیوں سے یا تو پہلے کراچی پختہ یا پھر براہ راست اندرون سندھ روانہ کر دی جاتیں۔ اس ضمن میں کراچی کو کیوں کہ مرکزی حیثیت حاصل تھی اس لئے سینٹا اور چندرپال عموماً ہمیں رہتے۔ میں نے چندرپال سے ایک اور اہم سوال کیا۔ یہ سوال ان مقامی لوگوں سے متعلق تھا جن سے سینٹا کام لے رہی تھی۔

چندرپال کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی۔ اسے صرف چند افراد کے نام اور پتے معلوم تھے۔ سینٹا نے چندرپال کو بھی اب تک لاعلم ہی رکھا تھا۔ ان میں سندھ کے ایک وڈیرے کے سوا بقیہ سب کا تعلق کراچی سے تھا۔ اس پر میں نے کہا۔ ”لیکن سینٹا تو ہمیں یہاں اپنی جگہ چھوڑ کر ڈھاکہ جانے والی تھی، پھر تم کیسے یہ ذمے داری سنبھالتے؟“

”سینٹا جی کا پہلے ہی دھار (خیال) تھا۔ آج ہی وہ مجھے چارج دینے والی تھیں۔ اسی سے وہ مجھے مقامی ایجنٹوں کی فہرست بھی دیتیں، پر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔“ چندرپال نے بتایا۔ وہ اب تک خواب کے سے عالم میں میرے ہر سوال کا جواب دیتے جا رہا تھا۔

چندرپال کا ذہن پڑھ کر دیگر باتوں کے علاوہ یہ پتا چلا کہ وہ بھی سندھ کے راستے پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ سوالات میں نے اس کے ذہن کو متحرک کرنے کے لئے کئے تھے۔ سوال جواب کے

نتیجے میں بھی اور اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کر کے مجھے خاصی باتیں معلوم ہو گئیں۔ دوسرے جرائم کے ساتھ ساتھ اس کی گردن پر کئی بے گناہ افراد کا خون بھی تھا۔ سو وہ مجھے قابل معافی نظر نہ آیا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اس کی لاش سے پتھر باندھ کر اسے گہرے سمندر میں پھینک آیا۔ اس شیطان صفت آدم زاد کے وہم و قیاس میں بھی نہ ہو گا کہ وہ یوں اپنے وطن سے دور مارا جائے گا۔ اس طرح میں بہر حال ایک مردود کو سر زمین پاک سے نابود کر دیا۔

جنت اور کالے سم کے ساحروں کا خوفناک ملاؤ

جنت زار



5

سنجیدہ خاتون

جنزائے

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

ابھی رات کے سوا گیارہ بجے تھے اور میرے پاس وقت تھا۔ جوڑیا بازار میں ہونے والے معرکے سے متعلق میں نے تفصیلات معلوم کر لیں۔ کوئی بھی مجرم فرار نہیں ہو سکا تھا۔ آٹھ مجرموں کو زندہ پکڑ لیا تھا۔ فرار ہونے کی کوشش میں دو جرائم پیشہ افراد پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے تین زخمی تھے، ایک کی حالت نازک تھی۔ پولیس کی کڑی نگرانی میں ان تینوں کو سول ہسپتال بھیج دیا گیا۔

پولیس کی بھاری نفری کے مقابلے میں مجرم زیادہ دیر نہیں ٹک سکے کیوں کہ ان کی تعداد کم تھی۔ لہذا ہی انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ ان مجرموں کے ساتھ ہی دو افراد کو اور حراست میں لے لیا گیا۔ یہ دونوں اس ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جس میں لوٹ کا مال لادا جاتا۔

بقیہ کام اپنے ماتحتوں کے سپرد کر کے ڈی آئی جی کراچی تحسین خان اپنی کار میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ابھی سے کہاں چل دیئے تحسین خان؟“

اس نے چونک کر برابر والی سیٹ کی طرف دیکھا، میں اسی سیٹ پر مقصود کے قالب میں موجود تھا۔ تحسین خان ابھی لمحہ حیرت سے نہیں نکل سکا تھا کہ میں پھر بول اٹھا۔ ”سنو! اس سے پہلے کہ مجرم بوکنا ہو جائیں آج ہی رات انہیں گرفتار کر لو۔“

”حضور! وہ..... وہ تو..... ان میں سے تو کوئی ایک بھی پولیس کا گھیرا توڑ کر نہیں نکل پایا۔“

تحسین خان نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

”ایسا کرو تحسین خان کہ میرے ساتھ اپنے دفتر میں چلو۔ شاید میری اچانک اور غیر متوقع آمد کی وجہ سے ابھی تک تمہارا ذہن ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا۔ سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جو مجرم پکڑے گئے ہیں، ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کی خبر ملتے ہی کیا وہ

روپوش نہیں ہو جائیں گے؟“

”جی..... جی ہاں حضور!..... لے..... لیکن فوری طور پر انہیں کس طرح یہ..... یہ خبر مل سکتی ہے؟“ آخری الفاظ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں ادا کئے۔
”میں تمہیں یہی تو بتانے آیا ہوں۔“ میں بولا۔

”بہتر..... بہتر ہے حضور۔“ یہ کہتے ہی وہ فوراً کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

ذرا دیر بعد ہی میں، تحسین خان کے ساتھ اسی کمرے میں آ بیٹھا جہاں پہلے بھی آ چکا تھا۔

”جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں، میں نے اسے نام بتا دیئے، پھر بولا۔ ”اب وہ نام پتے لکھو جنہیں گرفتار کرنا ہے۔“

تحسین خان تیزی سے میرے بتائے ہوئے نام پتے لکھنے لگا۔ اس نے فوری طور پر ان مجرموں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ یہ ذمہ داری اس نے اپنے ایک ماتحت افسر کے سپرد کی جو اس وقت پولیس ہیڈ آفس میں موجود تھا۔ اس کا یہ ماتحت افسر موجودہ معرکہ آرائی میں بھی ساتھ رہا تھا۔ وہ افسر کمرے سے نکل گیا تو میں نے کہا۔ ”تحسین خان! تم نے کچھ اندازہ لگایا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“

”حضور کا یہ خادم تو صرف وہی باتیں جان سکتا ہے جو سامنے ہیں۔“ تحسین خان نے اپنے عجز کا اظہار کر دیا۔

”میں بتاتا ہوں تمہیں۔“ میں نے بولنا شروع کیا۔ ”جرائم کی جو تازہ لہر چند ماہ سے آئی ہے، اس کی اصل وجہ غیر ملکی تخریب کار ہیں۔“ پھر میں نے اسے مختصراً تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا، لیکن چند باتیں مصلحت کے پیش نظر چھپا گیا۔ یہ باتیں اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھیں۔ سنیٹا اور نوود چڑجی کے نام بھی اسے میں نہیں بتائے اور نہ یہ کہ غیر ملکی تخریب کاروں کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔ ظاہر ہے وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر پاتا۔ میں نے اپنی گفتگو کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”یہ تو میں تمہیں ابھی بتا ہی چکا ہوں کہ غیر ملکی ایجنٹ، مقامی جرائم پیشہ افراد سے کام لے رہے ہیں۔ ان غیر ملکیوں میں سے تین کا سراغ میں نے لگا لیا ہے، ایک میرے ہاتھوں جنم واصل ہو چکا ہے، لیکن دو ابھی زندہ ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے چند رپال، نارائن اور کمار کے نام لئے۔ تحسین خان حیرت کے ساتھ میری باتیں سنتا رہا۔ ”تحسین خان! اگر نارائن اور کمار کی گرفتاری آج ہی رات عمل میں نہ آئی تو انہیں اپنے آقاؤں کی طرف سے سرحد عبور کر جانے کا حکم بھی مل سکتا ہے۔“

”یقیناً حضور!“ تحسین خان نے تائید میں سر ہلایا۔ ”ان حالات میں یہ قرن قیاس ہے۔“ وہ پرجوش نظر آنے لگا۔

میں نے تحسین خان کو سندھ کے مذکورہ قصبے کا نام بتایا، اسی کے ساتھ اس وڈیرے کا نام بھی جو غیر ملکی تخریب کاروں کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

تحسین خان نے میرے اس حکم کی تعمیل میں بھی دیر نہیں کی۔ صوبہ سندھ اس کے دائرہ اختیار

تھا۔ اس کے لئے تحسین خان نے ٹیلی فون پر ذمے دار افسران سے رابطہ قائم کر کے وڈیرے کی حویلی چھاپہ مارنے اور مجرموں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

”جوڑیا بازار کے معرکہ میں ایک واقعہ بہت ہی عجیب پیش آیا حضور۔“ تحسین خان بولا۔ ”عقل سے تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔“

”عقل کی بساط ہی کیا تحسین خان!“ میں بول اٹھا۔ ”تم جس واقعے کا ذکر کرنا چاہتے ہو، مجھے معلوم ہے۔“ پھر میں نے چند رپال کا حلیہ بیان کیا۔

”جی ہاں حضور!“ تحسین خان نے فوراً تصدیق کر دی۔ ”جن پولیس والوں نے اسے دیکھا تھا، اس ہی حلیہ بتایا ہے۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا آیا اور.....“

”اور پھر کار کو ایک گلی کے موڑ پر روک کر کار کے اندر روشنی کر دی۔“ میں نے تحسین خان کی تپوری کر دی، پھر بقیہ واقعہ بتا کر انکشاف کیا۔ ”اسی شخص کا گنٹل ملنے کے بعد گوداموں پر حملہ ہوا۔ بروہی چند رپال تھا۔“

”مگر..... مگر حضور، ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ وہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا۔“

”تو کیا تمہارے خیال میں وہ زندہ بچ گیا ہوگا۔“

تحسین خان سمجھ کر بھی جیسے کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ بات ہی ایسی تھی۔ وہ بس حیرت سے میرا منہ نکلتا رہ گیا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھ سے وضاحت کے لئے کہتا۔ اسی عرصے میں وہ چائے کے لئے کہہ چکا تھا۔ اردلی چائے رکھ کر چلا گیا تو وہ کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”ممکن ہے حضور کہ جو مقامی جرائم پیشہ افراد پکڑے جا چکے ہیں، ان میں سے کوئی کسی اور غیر ملکی تخریب کار کی نشاندہی کر سکے۔“

”اس کا امکان ارسلان بیگ کی موت کے بعد ختم ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”غیر ملکیوں اور مقامی غیر فروشوں کے درمیان وہی درمیانی کڑی تھا۔ جو لوگ حراست میں لئے گئے ہیں، پوچھ گچھ کے بعد ارسلان بیگ ہی کا نام لیں گے۔ ان پر تھرڈ ڈگری بھی استعمال کر لو گے تو یہی نتیجہ نکلے گا۔ فرار ہونے کی کوشش میں جو دو مجرم پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے ان میں سے ایک ارسلان بیگ تھا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے پہلے بھی اس شخص کا تم سے ذکر کیا تھا۔“ درمیان سے میں یہ بات گول کر گیا کہ ارسلان بیگ کی جگہ چند رپال، رحیم دادا سے ملا تھا اور اسے میں لے اڑا تھا۔ اس طرح مجھے یہ چھپانا مشکل ہو جاتا کہ میں کوئی جن زاد نہیں۔ میں نے اسی مصلحت کے تحت اپنی بات جاری رکھی۔ ”ارسلان بیگ، جوڑیا بازار والے معرکہ سے پہلے ہی پکڑا جاتا، مگر تمہارے مجھے کی نااہلی آڑے آگئی، میں نے اس کی گرفتاری کا جو بندوبست کیا تھا، اسی سبب رائیگاں ہو گیا۔“

”اس کے باوجود حضور، آپ کی رہنمائی میں جس تیزی کے ساتھ جرائم پیشہ افراد پکڑے جا رہے ہیں، وہ میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے کافی ہے۔“

”قابل تحسین تم بھی ہو تحسین خان کہ جو مشورہ بھی تمہیں دیا جا رہا ہے، اس پر عمل کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور بولا۔ ”میرا حمد سے بھرپور تعاون جاری رکھنا۔ اسے

نارائن، کمار اور ان کے سرپرست وڈیرے کی گرفتاری سے آگاہ کرنا بھی تمہاری ہی ذمہ داری ہے۔ سرکاری محکموں کے درمیان اگر رابطہ قائم رہے تو بہت سے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں۔“

”حضور کا فرمانا قطعی بجا ہے۔“ تحسین خان کہنے لگا۔ ”قمر احمد صاحب کو میں کل ہی صبح پوری صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا تو تحسین خان نے کسی قدر جھجکتے ہوئے مجھے میری کوٹھی چھوڑنے کے لئے کہہ ہی دیا۔

”مجھے اس وقت کہیں اور نہ جانا ہوتا تو یقیناً تمہاری یہ مخلصانہ پیشکش قبول کر لیتا۔“ میں نے اس کے کمرے میں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔

تحسین خان نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا اور کار کے قریب پہنچتے ہی ”خدا حافظ“ کہہ کر غائب ہو گیا۔ مجھے ایک فنڈ گر سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا اور چند پال کے یہ الفاظ بھی کہ آج ہی وہ مجھے چارج دینے والی تھیں۔ اسی سے وہ مجھے مقامی ایجنٹوں کی فہرست بھی دیتیں، پر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ یہ الفاظ اس نے سنیتا کے لئے ہی ادا کئے تھے۔ سنیتا سے اگر ان جرائم پیشہ افراد کی فہرست مل جاتی تو یہ کامیابی بھی کم نہ ہوتی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے یہ مسئلہ سنیتا کے کمرے کی تلاشی لینے سے حل ہو جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ سنیتا یا تو کمرے میں موجود نہ ہوتی یا پھر اس پر نیند مسلط کر دی جاتی۔ پہلی صورت تو اس وقت مشکل تھی اور دوسری تدبیر کی کامیابی پر بھی مجھے شک تھا۔ اس کے ذہن تک رسائی میں ایک مرتبہ مجھے ناکامی ہو چکی تھی، پھر بھی یہی تدبیر آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے اس کے چہرے کا تصور کیا اور اب وہ جس نئے کمرے میں تھی، وہاں جا پہنچا۔ اسے میں نے ساغر و مینا سے جی بسلاتے دیکھا اور چہرے پر کشیدگی سی محسوس کی۔ جیسے ہی میں نے اس پر غفلت طاری کرنا چاہی، وہ چونک اٹھی اور ہاتھ سے گلاس رکھ دیا۔ سر کو ایک مرتبہ جھٹک کر اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ دوسری اور پھر تیسری کوشش میں بھی ناکامی کے بعد میں نے سکھ بیر کا قالب اپنا لیا اور ظاہر ہو گیا۔ یہی انسانی قالب تو سنیتا کے لئے وجہ کش بنا ہوا تھا۔

”تم تو خود ایک نشہ ہو سنیتا۔“ میں نے اسے خواب ناک سی آواز میں مخاطب کیا۔ ”پھر تمہیں نئے کی کیا ضرورت ہے؟“

”آگئے تم سکھ بیر..... بہت اچھا کیا تم نے، کیوں کہ اس وقت مجھے بہت اکیلا پن لگ رہا تھا۔“ اس کے چہرے کا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے مزید کہا۔ ”شاید تم ہی سلا دینا چاہتے ہو گے مجھے، تاکہ میرے ذہن کو سکون مل جائے۔ تمہارے سوا اور کون یہ کوشش کر سکتا ہے، کسے پڑی ہے مجھے سکون دینے کی۔“

وہ عورت میری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ وہ فوراً حقیقت جان گئی۔ میں نے اسی وجہ سے اقرار کر لیا۔ ”ہاں سنیتا! تمہیں اس سے دائمی سکون کی بڑی ضرورت ہے۔“

”لیکن سکھ بیر، یہ تو کوئی حل نہ ہوا۔ اس طرح تو ابھی ہوئی تھی اور ابھی لکھ جاتی ہے۔“ وہ بولی، پھر پوچھا۔ ”تم پیو گے؟“

”نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”میرے لئے تمہیں دیکھتے رہنے سے بڑھ کر اور کوئی نشہ نہیں۔“

اس کے گلابی ہونٹوں پر حسرت بھری سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”قریب آ جاؤ نا..... اس برابر والی کرسی پر..... میرے پاس۔“

میں نے اس پر اردو زبان کے ایک مشہور شاعر کا شعر پڑھا جسے خدائے سخن کہا جاتا ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

”ارے تمہاری تو اردو بھی بہت اچھی ہے۔“ وہ حیران ہو کر بولی۔ ”یہاں آنے سے پہلے میں نے بھی باقاعدہ اردو پڑھی تھی۔“

”تاکہ تمہیں الماس بننے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ایسا ہی میں نے بھی کیا تھا۔ یہاں رہنے، بسنے اور اپنا ٹیڑھا اُلو سیدھا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔“

میرے آخری الفاظ سن کر اس کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی پھر کہنے لگی۔ ”ٹیڑھے اُلو کو سیدھا کرنے کی بات اچھی کسی تم نے، لیکن اُلو تو اردو بھی ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے۔“

”یہ بات شاید تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ چند پال وقت پر تمہیں رپورٹ دینے نہیں آ سکا۔ یہی بات ہے نا؟“

”ہاں اس وقت میں بالکل اندھیرے میں ہوں۔ کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟ میں جان بوجھ کر ان حالات میں ہوٹل سے نہیں نکلی۔“ وہ بتانے لگی۔ ”چند پال اپنے کمرے میں بھی مجھے نہیں ملا۔ اسے ابھی کچھ دیر پہلے میں دو مرتبہ فون کر چکی ہوں۔ اس کا کمرہ اسی ہوٹل کی تیسری منزل پر ہے۔“

”لگتا ہے کہ تم چال چلنے کے بعد دور بیٹھ کر تماشا دیکھتی ہو۔“ میں بولا۔ اب مجھے اس سے ہندی کے ثقیل الفاظ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے غالباً اب تک یقین آ چکا تھا کہ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، سچ ہے۔ وہ خود بھی اب ایسا ہی کر رہی تھی۔

”ہاں سکھ بیر! محفوظ طریقہ یہی ہے۔ کم سے کم لوگوں سے رابطہ رکھا جائے تو بات بگڑتی نہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا کرنا مزہ بھی پڑ جاتا ہے۔ معلوم نہیں چند پال کہاں.....“

”مجھے معلوم ہے چند پال کہاں ہے۔“ میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”وہ اس وقت نرک (جنم) میں ہو گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ تقریباً اچھل پڑی۔ ”کیا وہ..... وہ مارا گیا؟ مگر..... مگر کیسے؟“

”کیوں، تمہیں بہت دکھ پہنچا اس کے مرنے پر؟“ میری آواز میں جچین تھی۔ ”تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟“

”ہاں..... ہاں شاید بہت کچھ ہے۔“ وہ سننے لگی۔ ”پھر بھی جیون کے اس میلے میں آدمی اکیلا کیوں رہ جاتا ہے سکھ بھیر؟“

”اس لئے کہ آدمی دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے اور اکیلا ہی واپس جاتا ہے۔ نہ کوئی اس کے ساتھ آتا ہے اور نہ واپس جاتا ہے۔“

کچھ ہی دیر میں جیسے خوابوں کی دھند چھٹ گئی اور سیتا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم مجھے چندرپال کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے۔“

”ہاں وہ پھنس گیا تھا۔ اس کے متعلق تمہارا یہ اندازہ غلط نکلا کہ وہ بہت پہلے خطرے کی بو سونگھ لیتا ہے۔ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو بہت برا ہوتا۔“

”پھر..... پھر تم نے کیا کیا؟“ سیتا بے چین سی ہو گئی۔

”تم اگر میری جگہ ہو تیں تو کیا کرتیں؟“ میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

”کھلونا توڑ دیتی۔“ جواب دیتے ہوئے اس کے لمبے میں بڑی سفاکی تھی۔ مجھے اب وہ بدلی ہوئی سی نظر آئی۔

”سو میں نے بھی یہی کیا سیتا کہ کھلونا توڑ دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید پولیس تم تک بھی پہنچ جاتی۔ ممکن ہے کہ وہ تشدد کے باوجود زبان نہ کھولتا، مگر میں نے یہ خطرہ مول نہیں لیا۔ آدمی ہی تو ہے، اسے بولتے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟“

”لیکن ہوا کیا تھا؟ یہ تو بتاؤ۔“ سیتا نے دریافت کیا۔

”سائے کی طرح میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔“ میں نے جو پہلے ہی سوچ رکھا تھا، سیتا کو بتانے لگا۔

”مجھے ڈر تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ شاید اسے اپنے بارے میں ضرورت سے کچھ زیادہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ پولیس، رحیم دادا پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ رحیم دادا کے ٹھکانے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ غالباً کسی طرح پولیس کو سیٹھ عبدالرزاق پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی خبر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان دنوں انٹنی کرپشن والے، سیٹھ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تبھی پولیس کو پتا چلا ہو گا کہ سیٹھ پر رحیم دادا نے قاتلانہ حملہ کیا تھا جس میں ناکام رہا۔ پولیس کے پاس رحیم دادا کا ریکارڈ موجود ہے کہ وہ ایک پیشہ ور مجرم ہے۔ پھر اس نے کڑیاں جوڑ لی ہوں گی کہ رحیم دادا کسی اور سے مال لے کر سیٹھ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ سو یوں رحیم دادا، پولیس میں نظر آ سکتا ہے۔ جن لوگوں نے سیٹھ کو راستے سے ہٹانے کا سودا کیا تھا، رحیم دادا کی ناکامی کے بعد اس سے جواب طلبی کرنے یا قتل کے طے شدہ معاوضے کی واپسی کے لئے ضرور رابطہ قائم کریں گے، پولیس کو یہ نتیجہ نکالنے میں بھی دیر نہیں لگی ہوگی۔

میں جب چندرپال کے ساتھ ساتھ رحیم دادا کے ٹھکانے تک پہنچا تو وہاں پولیس کی موجودگی کا پتا چلا۔“

”تو کیا وہیں پولیس نے چندرپال کو گھیر لیا؟“ سیتا درمیان ہی میں بول اٹھی۔

”نہیں۔ میں نے چندرپال کو فرار کی راہ بچھا دی۔“ میں جواب میں بتانے لگا۔ ”میں یہ چاہتا تو نہیں تھا، لیکن مجھے مجبوراً چندرپال کے سامنے آنا پڑا۔ رحیم دادا کو میں نے بے ہوش کر دیا اور چندرپال کو اس

”کیسا جھوٹ؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”یہی کہ وہ صرف تمہارا ماتحت تھا۔ اس کے سوا تمہارا اس سے کوئی ناتا نہیں تھا۔“

سیتا نے گہرا سانس بھرا۔ اس کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ڈوروں کا رنگ اور گلابی ہو گیا، بولی۔ ”تمہیں دکھ ہوتا اس لئے نہیں بتایا۔“

”ملک افضل، سیٹھ عبدالرزاق اور دوسروں کے بارے میں جان کر بھی تو میں دکھی ہوا تھا، لیکن میں اگر چندرپال کا اضافہ اور ہو جاتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔ تمہیں تو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ تمہارا دیدار ہی میرے لئے کافی ہے۔ اس کے سوا تو میں نے تم سے اور کچھ نہیں چاہا۔“ میرا لہجہ روایتی قسم کے عاشقوں جیسا تھا۔

”معاف کر دو نا سکھ بھیر!“ اس نے جیسے تڑپ کر کہا۔ ”اب کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

ادھر دیکھو۔“

میں نے نگاہ اٹھائی تو وہ دونوں ہاتھ جوڑے مجھے متحی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ آگے جھک کر میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ یہ اس آدم زاد کی پہلا سس تھا جس نے چند لمحوں کو مجھے بے خبر سا کر دیا۔ میں نے گھبرا کر اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور سنہیل کر بولا۔ ”ایسا نہ کرو سیتا۔ اس سے میرا دکھ اور بڑھ جائے گا۔“

میرے لس کا اس پر بھی یقیناً اثر ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوابوں کے سائے سے لہرا گئے تھے۔ سپردگی کے انداز میں وہ میری طرف جھکی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے گنگنائی۔ ”اب..... اب سے اگر سکھ بھیر..... میں کسی اور کو اپنے قریب نہ آنے دوں تو..... تو کیا تم میرے پچھلے سارے گناہ معاف کر سکتے ہو؟“

”خود کو دھو کا نہ دو سیتا کہ ایسا ممکن نہیں۔ تم نے اپنے لئے جو راستہ چنا ہے اس میں قدم قدم پر تمہیں بیان وفا توڑنا پڑے گا۔“

”اور اگر تمہیں پانے کے لئے میں یہ راستہ ہی چھوڑ دوں؟“

”نہیں سیتا! اب تک تم اپنے تن من کا جو بلیڈان دے چکی ہو، وہ بیکار چلا جائے گا۔“

”پریم ساگر کی لہروں میں بہتے ہوئے کیا ہم..... ہم دونوں دور بہت دور نہیں نکل سکتے جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ ہو، کوئی نہیں۔“ وہ ابھی تک خوابوں کی دنیا میں تھی۔

”سے سے کی بات ہے سیتا۔ جو سے بیت جاتا ہے، وہ پھر کبھی نہیں لوٹتا۔ کمان سے چھوٹا ہوا تیر دوبارہ کمان میں واپس نہیں آتا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”تم..... تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور پھر اپنے سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

”یہ کیوں بھول رہی ہو سیتا کہ ہم اپنی دھرتی سے سینکڑوں میل دور کس لئے یہاں آئے ہیں۔ پریم کتھا کہنے اور سننے کے سوا بھی تو جیون میں اور بہت کچھ ہے۔“

علاقے سے نکال دیا۔ تم سے مجھے پتا لگ چکا تھا کہ چند ہپال کو ٹھیک ساڑھے دس بجے جوڑیا بازار پہنچنا ہے ورنہ میں بیچ میں نہ آتا اور.....

”رحیم دادا نے چند ہپال کو رقم واپس کر دی تھی؟“ سنیتا نے پھر میری بات کاٹ دی۔

”کام نہیں کیا تو رقم کیسے لی جاتا۔ میں اس لئے بھی وہاں گیا تھا کہ رحیم دادا رقم کی واپسی میں کوئی گڑبڑ نہ کرے۔ تم سے کیا ہوا وعدہ بھی تو مجھے یاد تھا۔ رقم کی واپسی کی ذمہ داری لی تھی میں نے۔ پھر یہ ذمہ داری کیسے پوری نہ کرتا۔“ پھر میں بقیہ ”کمانی“ سنانے لگا۔ ”میرا ارادہ یہی تھا کہ اب لوٹ جاؤں اور میں لوٹ بھی گیا، مگر چند ہپال کی ایک حماقت میرے سامنے آ چکی تھی۔ سو مجھے یہی سوچ کر بے چینی ہونے لگی۔ یعقوب کو تم نے جو مہلت دی تھی، اس کا خیال بھی آیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ یعقوب نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس پہلے ہی وہاں جال بچھائے بیٹھی ہو۔ اگر اس جال میں چند ہپال پھنس گیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہاری خاطر..... صرف تمہارے لئے سنیتا کہ تم کہیں پولیس کی نظر میں نہ آ جاؤ..... تمہارے دامن تک آج نہ آ جائے، مجھے جوڑیا بازار جانا پڑا۔ پھر مجھے جو اندیشہ تھا، وہاں پہنچتے ہی بیچ نکلا۔ میں جب وہاں پہنچا تو سارا علاقہ دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ اس آلو کے پٹھے چند ہپال کی کار کو گھیر لیا گیا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھنے پر موت کو ترجیح دے گا یا تو وہ پولیس سے لڑتے ہوئے جان دے دے گا یا پھر آتم ہتھیا (خودکشی) کر لے گا، لیکن وہ بزدل نکلا۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ ہتھیار پھینک کر گرفتاری دینے والا ہے تو..... تو پھر نہ رک سکا۔“

”تم نے اسے گولی مار دی ہوگی۔“ سنیتا مطمئن آواز میں بولی۔

”میں نے کچھ سوچ کر ایسا نہیں کیا۔ اسے گولی مار دیتا تو وہ کار، پولیس کے قبضے میں آ جاتی۔ میں نے سوچا، وہ کار جو چند ہپال کے استعمال میں رہتی ہے، اس کے اندر کچھ ایسے کاغذات نہ ہوں جن سے پولیس کو چند ہپال کی حقیقت کا پتا چل جائے۔ سو میں نے بے درگاہی کا نعروں لگایا۔ تم کو تو خبر ہوگی کہ درگاہی کس کس طرح اپنے داسوں اور داسیوں کی مدد کرتی ہے۔ نعروں مارتے ہی میرے اندر اتنی شہتی (طاقت) آگئی کہ میں نے اس کار کو اٹھالیا اور پھر اٹھاتا ہی چلا گیا۔“ بڑی صفائی سے میں اس عورت کو اس کے باطل عقائد کی آڑ لے کر بے وقوف بنا رہا تھا۔ میں نے من و عن پورا واقعہ بیان کر دیا۔

سنیتا مرعوب دکھائی دی اور بولی۔ ”درگاہی نے تمہیں اتنی شہتی دان کر دی ہوگی، مجھے اندازہ نہ تھا۔ تم نے جو کیا، بہت اچھا کیا، سکھ بھرا بہت دور کی سوچ ہی تمہیں۔ وہ کار، پولیس والوں کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر اس ہوٹل تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔ اس کے بعد شاید پولیس یہ بھی کھوج لگائی کہ چند ہپال مجھ سے بھی ملتا رہا ہے۔ وہ کار اسی ہوٹل والوں کی تھی۔ چند ہپال اس ہوٹل میں کامران مرزا کے نام سے ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے اچھا ہی کیا جو اس بے وقوف کو چارج نہیں دیا۔“

اس بات سے مجھے اصل موضوع پر آنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ”پھر تو مقامی ایجنٹوں کی فہرست بھی تمہیں اسی کے حوالے کرنا پڑتی۔ ظاہر ہے تم نے یہ فہرست سنبھال کے رکھی ہوگی۔“

”بہت سنبھال کے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”یہاں رکھی ہے میں نے وہ فہرست۔“ اس

نے اپنے سر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”اس سے زیادہ سنبھال کے اور کہاں رکھتی۔“ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ”پھر تو تمہارا حافظہ بہت تیز ہے۔ اتنے سارے نام یاد رکھنا اور پتے بھی، یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں۔“

”تمہاری ہی طرح مجھے بھی تو درگاہی سے کچھ ملا ہے نا۔“

حافظہ تیز ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کو وہ عقیدت کا رنگ دے رہی تھی۔ بہت سے لوگوں کا حافظہ انتہائی تیز ہوتا ہے۔ اس کے لئے انہیں کسی ارگاہی درگاہی کا داس یا داسی بننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر بھی میں نے اس کے عقیدے کو ٹھیک نہیں پہنچائی۔ درمیان میں کیوں کہ درگاہی کا نام آگیا تھا اور میں، سکھ بھرا کا کردار ادا کرتے ہوئے خود کو بھی اسی دیوی کا داس ظاہر کر چکا تھا، اس لئے بھی کچھ کہنا خلاف مصلحت ہوتا۔

”لیکن چند ہپال تو درگاہی کا داس نہیں تھا جو تمہاری طرح فہرست کو سنبھال کے رکھ سکتا۔“ میں بات کو آگے بڑھانے کے لئے بولا۔

”بھگوان جو کرتا ہے، اچھا ہی کرتا ہے سکھ بھرا! یوں جانو کہ گولی کان کے پاس سے نکل گئی۔ اگر میں اسے چارج دیتی تو سارے نام پتے لکھوانے پڑتے۔“

”ایک صلاح دوں تمہیں اگر مانو۔“

”ہاں کہو۔“ وہ فوراً بولی۔ ”مجھے تم پر بھروسہ ہے کہ کوئی غلط مشورہ نہیں دو گے۔“

”ایک تو تم سے یہ کہنا تھا کہ اس لالچی بیویاری یعقوب کو بھول جاؤ۔ وہ تو خود ذخیرہ اندوزی کے جرم میں اندر جائے گا۔ اسی کی وجہ سے اتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ بھلا کیا فائدہ ہوا اس سے ہمیں..... ہاں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ وہ صورت حرام ارسلان بیگ بھی پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔“

سنیتا نے ارسلان بیگ کی موت پر ذرا بھی افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ تو کہنے لگی۔ ”پیسہ لیتے ہیں تو کام کرتے ہیں، یہ تو آئی جانی ہے۔ ارسلان بیگ نہ سہی کوئی اور اس کی جگہ لے لے گا۔ خریدنے والا چاہئے، بکنے والے یہاں بہت۔“ پیسا پھینک کر تماشہ دیکھ۔ ”وہ ہنس دی، پھر یعقوب کے سلسلے میں میرا مشورہ مان لیا۔“

کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی اس عورت کے چہرے پر اچانک فکر مندی کے آثار دیکھ کر میں نے وجہ پوچھ ہی لی۔

”وہ ٹرک اور.....“ سنیتا بڑبڑائی۔ ”مجھے تفصیل بتاؤ سکھ بھرا! کون کون مارا گیا؟ کسے پولیس نے پکڑ لیا؟ مجھے کسی اور کے مارے جانے یا پکڑے جانے کی پروا نہیں، لیکن اس ٹرک، اس کے ڈرائیور اور کلینر کو پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہئے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ ایک دم کیوں گھبرا گئی ہے۔ میری باتوں میں الجھ کر وہ اس اہم نکتے کو بھول ہی گئی تھی۔

”کوئی بھی اس علاقے سے بچ کر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ میں نے مختصراً ساری روداد بیان

کردی، پھر آخر میں کہا۔ ”غلطی اس ٹرک ڈرائیور ہی کی تھی۔ اسے مین روڈ پر ٹرک کھڑا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آس پاس کوئی اور ٹرک بھی کھڑا ہو تا تو شاید پولیس کو اس پر شک نہ ہو تا۔ اس احمق نے اپنی سولت دیکھ کر اس جگہ ٹرک کھڑا کیا ہو گا کہ مال لدنے کے بعد اسے بھاگ نکلنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ خیر..... لعنت بھیجو اس پر۔ تم کیوں فکر کرتی ہو اس کی؟“

”اس کی وجہ ہے سکھ بھرا“ وہ تیزی سے بولی۔ ”ٹرک پکڑے جانے سے بات بہت آگے تک چلی جائے گی۔ پھر تو..... پھر تو.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

سیتا معاملے کی تہہ تک پہنچ ہی گئی تھی، اس لئے میں نے اپنی پراسرار قوتوں کا مزید رعب ڈالنے کے لئے کہہ دیا۔ ”مجھ سے کیوں یہ بات چھپا رہی ہو سیتا کہ پھر تو پولیس پہلے اس وڈیرے تک پہنچے گی جس کے نام پر ٹرک کا رجسٹریشن ہے اور..... اور..... کیا میں یہ بھی بتا دوں کہ پھر نارائن اور کمار بھی خطرے میں پڑ جائیں گے۔“

”کچھ بھی..... تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا جا سکتا، سکھ بھرا!“ اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے، پھر اپنی صفائی بھی پیش کرنے لگی۔ ”میرا مقصد یہ تھا بھی نہیں۔ میں تو یہ سوچنے لگی تھی کہ اس کا توڑ کیا ہو؟..... اس طرح تو سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا۔ پھر..... پھر کوئی اور راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”اری اوری سیتا۔“ اچانک میں نے بھی رنگ بدلا تاکہ اس کے ذہن کو اصل معاملے پر توجہ دینے سے ہٹا سکوں۔ ”دیکھ ری تو سکھ بھرا کی پریسیکا (محبوبہ) ہے۔ تجھے اتنی سی بات پر چنت (فکر مند) ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ ”کیا تو سمجھتی ہے کہ یہاں کی گھامڑ پولیس بہت ہی کمزور ہے (فرض شناس) ہے جو راتوں رات اس ٹرک کے مالک کو کھوج لے گی؟“

مجھے بے تکلف دیکھ کر اس نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور بولی۔ ”اے میرے پریمی، میرے سوا، میرے دیوتا! تو اگر میرے سنگ ہے تو پھر مجھے کیا چننا۔ پر یہ تو سوچ کہ ٹرک ڈرائیور اور کلینر تو سب کچھ بک دیں گے کہ کس کے آدی ہیں۔“

”پوچھ تاچھ ہی پر تو بکیں گے نا۔ پولیس والے ایک میدان مار کر گھوڑے بچ کر سونیں گے کہ اسی سے سب کچھ جان لینے کی چیٹنا (کوشش) کریں گے؟“

میری اس دلیل پر وہ قدرے مطمئن سی دکھائی دی اور کہنے لگی۔ ”تجھے ان باتوں کا تجربہ نہیں سکھ بھرا! کوئی کوئی پولیس والا بڑا جھاڑ کا چھتھرا ہوتا ہے۔ کسی بات کے پیچھے پڑ جائے تو اس وقت تک جین سے نہیں بیٹھتا جب تک بال کی کھال نہ نکال لے۔ میں اسی لئے یہ چاہتی ہوں کہ ابھی نارائن اور کمار کو خطرے سے خبردار کر دوں۔ وڈیرے کی حویلی میں خاصا سامان بھی پڑا ہے جو اس پار جانا ہے۔ نارائن اور کمار سارا مال ساتھ لے کر سرحد پار چلے جائیں تو کیا برا ہے، تو ہی بتا۔“

”بات تو تیری ٹھیک ہے۔“ مجھے اس کی تائید میں بولنا پڑا۔ ”مگر اب رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے، کیا وہ جاگ رہے ہوں گے؟“

”نہیں جاگ رہے ہوں گے تو جاگنا پڑے گا انہیں۔ یہ کوئی سونے کا وقت نہیں ہے۔ صبح ہوتے

ہوتے وہ سرحد پار کر جائیں گے۔ اس طرح مال بھی نکل جائے گا اور وہ دونوں بھی خطرے سے نکل جائیں گے۔ رہا وڈیرا تو ہماری بلا سے اس کا جو بھی حشر ہو۔ نارائن اور کمار کے سوا وہ کسی کو بھی جانتا پہچانتا نہیں۔“

میں سوچنے لگا کہ ڈی آئی جی حسین خان کے حکم کی تعمیل میں اب تک وڈیرے کی حویلی پر چھاپا پڑ چکا ہو گا۔ ایسے معاملات میں ڈھیت سے ڈھیت پولیس والے بھی کارکردگی دکھانے کا موقع نہیں چھوڑتے۔ ایک تو یہ کہ ان کے افسر اعلیٰ کی طرف سے چھاپا مارنے کا حکم ملا تھا، دوسرے سب کچھ پکا پایا مل گیا تھا۔ انہیں کرنا ہی کیا تھا۔ مجھے سوچتے دیکھ کر سیتا بولی نہیں۔ سیتا کے سامنے میں جھوٹا نہ پڑوں، اس خیال سے بولا۔ ”تیری یہ بات میرے دل کو لگتی ہے سیتا کہ پولیس والوں میں بھی کوئی جی کا جنجال ہو سکتا ہے۔ کیا خبر ایسا ہی کوئی افسر ہمارے پیچھے پڑ جائے۔ اس امکان کو ہم کیوں نظر انداز کر دیں۔ تیرے ساتھ رہ کر اب یہ معاملے کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آتے جا رہے ہیں۔“ میں جان کر بات کو طول دے رہا تھا کہ تھوڑا وقت اور گزر جائے۔ ”ایک بات بتا سیتا! اگر میں تجھے یہ سب آکر نہ بتاتا تو کیا کرتی تو؟“

”ہی جو اب کرنے والی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں بارہ بجے کے بعد یہ ایکشن لے لیتی۔ جب تم آئے تو میں یہی سوچ رہی تھی۔ تمہارے آنے سے میں اندھیرے میں نہیں رہی اور ساری باتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ بات سے بات نکلتی رہی تو میں جانے کہاں کھو گئی۔ سدھ بدھ ہی نہ رہی اپنی۔“

”نارائن اور کمار تمہیں جانتے ہیں؟..... میرا مطلب یہ کہ تمہارے اصلی اور نقلی نام سے واقف ہیں؟“

”نہیں۔ انہیں صرف میرا کوڈ نیم معلوم ہے۔“

”کوڈ نیم؟“ میں نے اظہار حیرت کیا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میرا کوڈ نیم بلیک کون ہے۔“

”جس نے تمہارا یہ کوڈ نیم رکھا ہے بڑا ہی باؤلا اور آنکھوں کا اندھا ہے۔“ میں نے برا مان جانے والے لہجے میں کہا۔

”ونود جی نے کبھی سن لیا کہ تم نے انہیں آنکھوں کا اندھا کہا ہے تو بہت ناراض ہوں گے۔ میرا یہ کوڈ نیم ونود جی ہی نے رکھا ہے۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔

”وہ کیوں کہ خود کالے ہوں گے اس لئے انہیں گورا بدن بھی کالا ہی لگتا ہو گا۔“

”یہ بھی تم نے خوب کہا، ونود جی کا رنگ واقعی کالا ہے، لیکن وہ من کے بہت اچلے ہیں۔“

”دیکھ سیتا! اپنی پریسیکا سے کوئی بھی پریمی کسی دوسرے مرد کی تعریف سننا پسند نہیں کرتا۔“ میں نے منہ بنا لیا۔

”اس طرح تو بات بات پر نہ روٹھا کر سکھ بھرا! میری پوری بات تو سن لیتا۔“ انہیں میں نے من کا اجلا اس لئے کہا کہ وہ کردار کے بہت مضبوط آدمی ہیں۔ لے تو نے مجھے پھر اپنی باتوں میں لگا لیا اور میں اصل بات بھول ہی گئی۔ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اگر تو میرے آنے سے سب کچھ بھول جاتی ہے تو پھر میں چلتا ہوں اور اب نہیں آؤں گا۔“
”مارڈالوں کی تجھے ورنہ بیٹھا رہ۔“

”ماری تو رکھا ہے تو نے ورنہ کیوں پھیرے پہ پھیرے لگاتا۔“ میں نے ایک سچے عاشق کی اداکاری جاری رکھی۔

الماری کھول کر اس نے ہائی فری کوئٹنی کا ایک ٹرانس میٹر نکالا اور کرسی پر بیٹھ کر اسے سیٹ کرنے لگی۔ پھر بڑی دیر تک وہ کوشش کرتی رہی، لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا۔
”میں تجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ سو رہے ہوں گے۔ کیا خبر زیادہ چڑھا کر سوئے ہوں۔“ میں اسے فکر مند دیکھ کر بولا۔

”یہ نہیں ہو سکتا ہے سکھ بھرا مجھے تو کوئی گزربز لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر کوشش کرنے لگی، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تنگ آ کر اس نے ٹرانس میٹر کا سوچ آف کیا اور اسے الماری میں رکھ آئی، پھر خود کلائی کے سے انداز میں کہنے لگی۔ ”اس وقت سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ونووجی کو یہ خبر دوں کہ نہیں؟“

”سو جاؤ شانت ہو کر، کل دیکھنا اس معاملے وہ مجھے بھی چلے دو۔ اب نیند آ رہی ہے۔“

”تم بھی بیس سو جاؤ نا۔“

”پاگل نہیں ہوں میں۔“

”اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟“

”آگ اور پڑول اگر ایک ساتھ رہ سکتے تو میں رہ جاتا یہاں۔“

”بڑے ہی کھنور ہو۔“

”سو تو میں ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف جھکتے اور ہاتھ بڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب آئے۔

وہاں سے میں ’یاسف‘ کی کوشی پر پہنچا، گئے ہاتھوں یعقوب کا قصہ بھی بھگتا ہی دوں۔ اس کے لئے میں نے یاسف کو رات کے وقت تنگ کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ ویسے بھی وہ اپنی خواب گاہ میں تھا اور امگری بھی وہیں تھی۔ یعقوب کو دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ یاسف نے بطور احتیاط اسے گہری نیند سلا رکھا ہے۔ یعقوب کو وہاں سے نکال کر لے جاتے ہوئے میں نے بہت احتیاط سے کام لیا کہ ہلکی سی آہٹ بھی نہ ہو۔ یعقوب کو کھارادر میں اس کے گھر چھوڑ کر میں اپنی کوشی لوٹ آیا۔ اسے میں گھر کے صحن میں پڑی ایک چارپائی پر ڈال آیا تھا۔ وہ اگر خود نہ جاگتا تو اس کے گھر والے صبح اسے دیکھ کر ہنگامہ مچا دیتے۔

گزشتہ تقریباً سارا دن اور اب آدھی رات سے بھی زیادہ مجھے آدم زادوں کے درمیان بھاگ دوڑ کرتے گزری۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں، پل میں ادھر تو پل بھر میں ادھر۔ اس پر بھی مجھے تھکن کے باوجود ایک راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں یہی احساس لئے میٹھی نیند سو گیا، لیکن یاسف نے صبح ہی صبح آکر مجھے اٹھا دیا۔

”سونے دے مجھے۔ ابھی نیند نہیں بھری۔“ میں نے کروٹ بدلی۔

”اچھا تو اے علیالیش! کیا تو نے پھر راتوں کو آوارہ گردی شروع کر دی۔ ورنہ نیند پوری نہ ہونے کا کیا سوال۔ مجھ سے تو بڑی پارسائی کا دم بھر رہا تھا تو۔“
”یہ بات نہیں اے یاسف۔“ میں لینے ہی لینے بولا۔ ”ایک اور معاملہ تھا جس میں دیر ہو گئی رات کو۔“

”میں نہیں مان سکتا۔ یقیناً کسی آدم زادی کے پاس ہو گا۔ اگر ایسا نہیں تو کھاشا جنات کی قسم۔“
”تمہیں کھانے والے وہ ہوتے ہیں جو کثرت سے جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔“ میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

”نہ کھا تسم! میں تو تجھے یہ بتانے آیا تھا کہ جس آدم زاد کو تو امانت کے طور پر میرے پاس رکھ گیا تھا اسے تیرا کوئی بھائی بند رات کو لے اڑا۔“

”لیکن تو نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کا باپ بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔“ میں نے اسے چھیڑا۔
اس نے غور سے میری طرف دیکھا، پھر کہنے لگا۔ ”مجھے تو لگتا ہے اے علیالیش! کہ تو ہی اسے لے اڑا ہو گا۔ ایسے فضول کاموں کا شوق تیرے سوا کسی اور جن زاد کو نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں۔“ میں نے اقرار کر لیا۔ ”تیری نیند خراب ہوتی اس لئے تجھے نہیں جگایا، لیکن تجھے میری ذرا پردا نہیں آتے ہی جگا دیا۔“

”کیوں، کیا اب اس کے قتل کا خطرہ مل گیا؟ تو نے تو دو تین دن کے لئے کہا تھا۔“

”کل رات ہی بات بن گئی تو میں نے سوچا، اسے اس کے گھر پہنچا دوں۔“

”پتا نہیں اے علیالیش! تو کن چکروں میں پھنس گیا ہے۔ کسی آدم زاد کو قتل ہونے سے بچا رہا ہے، کسی کے کھوئے ہوئے بچے کو اس کے باپ تک پہنچا رہا ہے۔“

”سمجھ جائے گا تو بھی ایک دن۔“

”خدا نہ کرے، مجھے نہ بکا، میں چلا۔“ یہ کہتے ہی یاسف رفوچکر ہو گیا اور میں دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا، کیوں کہ ابھی صبح کے چھ ہی بجے تھے۔

☆=====☆=====☆

رات کو مجرموں کے خلاف پولیس نے جو کارروائی کی تھی، اس کے نتائج جاننے کی خاطر دوسرے پہلے میں، حمین خان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک جانب تو میں قانون کے رکھوالوں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا، دوسری سمت مجرموں کی سرگرمیوں سے بھی آگاہ تھا۔ خلق خدا کو عذاب سے بچانے، مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور اس کے لئے ذمے دار افراد کو فعال رکھنے کی خاطر حالات سے پوری طرح آگہی ضروری تھی۔ عارضی طور پر کم از کم یہ بندوبست ہو ہی گیا تھا کہ جو اشیائے صرف ملک سے باہر اسمگل کی جا رہی تھیں، رک گئیں۔ اس کے لئے مجرموں اور ملک دشمنوں کو نیا بندوبست و انتظام کرنے میں وقت لگتا۔ میرے خیال میں اسی سے فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔

قمر احمد کی طرح تحسین خان بھی اب میری پراسرار قوتوں کا قائل ہو چکا تھا۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تاکہ کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ میں اس سے جو بھی کہوں، وہ کسی بحث کے بغیر مان لے۔ اس ضمن میں ابھی مجھے بہت سے اقدامات کرنا تھے۔ وزارت داخلہ کے دیگر محکموں کے اعلیٰ حکام تک بھی پہنچنا تھا۔ محکمہ خوراک کی کچھ کالی بھیڑیں بھی مجھے اس میں ملوث محسوس ہوئیں۔ ان کا تعاون حاصل کئے بغیر صرف تاجر برادری کے ذریعے مجرم اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ کر پاتے۔ گیہوں، چاول، چینی، گھی وغیرہ کی قلت پیدا کرنے اور ان اشیاء کو ملک سے باہر اسمگل کرنے میں ان کالی بھیڑوں کا بھی ہاتھ تھا۔ اجتماعی مفاد کو یہ ضمیر فروش اپنے ذاتی مفادات کے حصول کی خاطر قربان کر رہے تھے۔ تیزی سے حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن ان معاملات پر غور و فکر میں بھی مصروف رہا۔ میں نے مقصود میاں کے قالب میں تحسین خان سے ملاقات کی۔ مجھے اس قالب میں دیکھ کر کوئی بھی آدم زاد، مرد بزرگ سمجھنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ مردانہ وجاہت اور خوبصورتی سے قطع نظر میرا حلیہ ایک خوش حال نوجوان جیسا ہی تھا۔ اس وضع قطع میں کوئی مجھ پر خصوصی توجہ نہ دیتا۔ میں نے خود ہی آدم زادوں کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے لئے ایسا کیا تھا۔ میں اس وقت بوشرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا، پیروں میں بوٹ تھے۔ میرے ظاہری چلنے اور عمر کو نظر انداز کر کے ڈی آئی جی تحسین خان اس وقت احتراماً کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا جب میں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے کئی ماتحت افسران بھی کمرے میں موجود تھے۔ تحسین خان کو میرے احترام میں اٹھتے دیکھ کر وہ بھی اٹھے۔

”معاف کیجئے گا جناب“ میں ناوقت تو حاضر نہیں ہو گیا؟“ میں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ کمرے میں تحسین خان کے ماتحت بھی موجود ہیں۔ غیر ضروری سمجھ کر میں ہر آدم زاد پر اپنی برتری ظاہر کرنے سے کتراتا تھا۔ تقریباً یہی رویہ قمر احمد کے ساتھ بھی اب تک میں نے روا رکھا تھا۔

”جی نہیں حضور!“ تحسین خان فوراً بولا۔ ”آپ کی آمد تو ہمارے لئے باعث عزت ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنے ماتحت افسران کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اتنا ذہین بہر حال تھا کہ سمجھ لیتا، میں کسی کی موجودگی میں اس سے کھل کر کوئی بات نہ کہہ پاؤں گا۔

اس کے ماتحت افسران چلے گئے تو میں کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ رات کی کارگزاری کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟“

”رات کا چھاپا توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوا حضور۔“ اس کے لہجے میں خوشی چھلکی پڑی تھی۔ ”اطلاعات کے مطابق وڈیرے کی حویلی سے بڑی تعداد میں اشیائے صرف کا ذخیرہ پکڑا گیا۔ حویلی کے تہ خانے اور اس سے ملحق بڑے بڑے گوداموں سے گیہوں، چاول، چینی اور گھی کا بہت بڑا ذخیرہ ملا۔ وڈیرے کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”اور غیر ملکی تخریب کار؟“ میں نے سوال کیا۔

”چھاپے کے وقت وہ دونوں وڈیرے کی اوطاق میں تھے۔ نہایت احتیاط برتنے کے باوجود معلوم نہیں کس طرح وہ چوکتا ہو گئے اور پولیس کی نفری پر انہوں نے فائر کھول دیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر

پولیس کو بھی مجبوراً گولی چلائی پڑی۔ اس مقابلے کے نتیجے میں وہ دونوں تخریب کار تو خیر مارے ہی گئے۔ مگر ایک پولیس کانسٹیبل بھی کام آگیا۔ اس کے علاوہ ایک اے ایس آئی بھی شدید زخمی ہو گیا۔ چار پولیس والے اور بھی زخمی ہوئے، لیکن ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ تحسین خان نے تفصیل بتائی۔

”تم نے قمر احمد کو ان حالات سے مطلع کر دیا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں حضور! وہ بھی اس کارروائی پر بے حد خوش اور انتہائی حیران ہیں۔“ تحسین خان نے بتایا۔

”تم نے اس سلسلے میں میرا نام تو نہیں لیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”خود قمر احمد صاحب ہی نے یہ انکشاف کیا کہ وہ بھی حضور کے عقیدت مندوں میں ہیں اور اس معاملے میں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں تو اس خادم نے بھی بچ بول دیا۔“

”لیکن یہ بات تم دونوں ہی کے درمیان رہے تو بہتر ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنی تشریح نہیں چاہتا۔ کراچی سے کتنے جرائم پیشہ افراد اور پکڑے گئے؟“

”حضور نے جتنے نام پتے لکھائے تھے، ان میں سے صرف ایک شخص لعل خان ہاتھ نہیں لگا کیونکہ وہ اپنے گھر پر نہیں تھا۔ وہ بھی بہر حال پکڑا جائے گا۔ پولیس اس کے پیچھے ہے۔“

قمر احمد سے ملنا اب اتنا ضروری تو نہیں تھا، پھر بھی میں نے سوچا کہ ممکن ہے اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ اس کے علاوہ مجھے قمر احمد کو ایک ہدایت بھی دینا تھی جس سے بہتر نتائج نکلنے کی توقع تھی۔ میں اسی لئے تحسین خان سے مل کر قمر احمد کے دفتر جا پہنچا۔

خلوت میسر آتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور اظہار عقیدت کے طور پر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

”یہ سب نہ کیا کرو، قمر احمد!“ میں نرمی سے بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ برکت علی شاہ کی طرح میں بیری مریدی کا قائل نہیں ہوں۔“

”سرکار کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ بے اختیار ہو کر دل پر قابو.....“

”قابو رکھا کر دل پر۔“ میں بول اٹھا۔

”سرکار کے طفیل اتنی بڑی کامیابی پر وزارت داخلہ کے سیکرٹری صاحب نے فون پر ابھی مجھے شاباش دی ہے۔“ قمر احمد کھلا پڑ رہا تھا۔

”کیا نام ہے ان کا؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”حفیظ الرحمان فاروقی صاحب۔“ قمر احمد نے جواب دیا۔ ”انہیں میں نے فون پر ہی ساری رپورٹ دے دی تھی۔“

”اچھا کیا، تم سے یہ اور کتنا تھا قمر احمد کہ محکمہ خوراک والوں کو بھی ٹنلوں۔ ان کی ملی بھگت کے بغیر ملک دشمن عناصر اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔“

”سرکار نے بالکل بجا فرمایا۔ آج ہی سے ان خطوط پر کام شروع کر دیا جائے گا۔“

پھر میں وہاں رے کے بغیر اٹھ کھڑا ہوا، کیوں کہ میں قمر احمد کو یہی ہدایت دینے آیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اب سینٹا پر نظر رکھنا بہت اہم تھا۔ ہر چند کہ اس کے تینوں ساتھی

چند رپال، نادائن اور کمار مارے گئے تھے لیکن وہ تنہا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ مقامی ضمیر فروشوں کی مدد سے وہ نیا جال بچھانے میں مصروف ہوگی۔ اس جیسی تیز اور فتنہ پرور عورت کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس تک پہنچنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھا کہ وہ کہاں اور کس معاملے میں مصروف ہے۔

میں اب اپنی کوٹھی میں تھا۔ میں نے سنتا کے چہرے کا دھیان کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں تو چونک اٹھا۔ اس کا چہرہ میرے صفحہ ذہن پر نہیں ابھر سکا۔ کئی مرتبہ اس کوشش میں ناکامی کے بعد میرے ذہن میں سینکڑوں اندیشے اور دوسے پیدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے میں نے یہ سوچا کہ کہیں میری یہ نراسرار قوت کسی سبب مجھ سے چھن تو نہیں گئی؟ دوم یہ کہ کہیں سنتا کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا؟ اس نے کوئی ایسی حفاظتی تدبیر تو نہیں کر لی کہ میں اسے تلاش نہ کر سکوں؟ وہ کہیں بھی اور کسی حال میں بھی ہوتی، میں اس کے چہرے کا تصور کر کے سراخ لگانے میں کامیاب ہو جاتا، میری نظروں سے سنتا کا اوچھل ہو جانا، کسی بھی نئے فتنے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے، اس کا مجھے پوری طرح احساس تھا۔ میرے اوپر شک ہونے اور میرا راز کھل جانے پر سینٹا پلٹ کر مجھ پر کوئی وار بھی کر سکتی ہے، اس خیال نے مجھے مزید مضطرب کر دیا۔

اب تک مجھے کئی مرتبہ یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ میری جناتی صفات عارضی طور پر سب سے معطل ہو کے رہ گئیں۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں نے اپنے تصور کی قوت کو سنتا کے بجائے ایک اور آدم زاد پر آزمایا۔ یہ آدم زاد سینٹھ عبدالرزاق تھا۔ اس کا چہرہ میرے صفحہ ذہن پر واضح نظر آنے لگا۔ سینٹھ عبدالرزاق کے بارے میں مجھے یہ علم تو تھا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے سے گھبرا کر ڈھاکا جانے والا ہے، لیکن اس نے اپنے ارادے پر عمل کیا یا نہیں، یہ جاننے کی میں نے جستجو نہیں کی۔ یوں بھی مجھے اتنی مہلت نہیں مل سکی۔ براہ راست نہیں تو بالواسطہ وہ بھی ملک دشمنوں کا ہدف رہ چکا تھا۔ اس بہانے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ڈھاکا پہنچ چکا ہے۔ سینٹھ کا تعلق ملک افضل سے تھا اور ملک افضل کو غیر ملکی عناصر اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کر رہے تھے۔ خود سنتا مجھے بتا چکی تھی کہ ابھی ملک افضل سے کام لینا ہے۔

اس تجربے کے بعد مجھے اطمینان ہوا کہ میرے تصور کی قوت صرف سنتا کے باب میں کارگر ثابت نہیں ہو رہی۔ بس اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آیا جس نے میرے اضطراب میں خاصی حد تک کمی کر دی۔ میں نے سنتا تک پہنچنے کے لئے صرف اس کے چہرے کو وسیلہ بنایا تھا اور اس جیسی عورت اپنا چہرہ بدل بھی سکتی ہے۔ موجودہ حالات کی سنگینی اسے کوئی بہروپ بھرنے پر بھی تو مجبور کر سکتی ہے، میں نے سوچا۔ کسی آدم زاد کو تلاش کرنے کے لئے ہم جن زادوں کو بہت سے طریقے آتے ہیں۔ سو میں نے سنتا کی تلاش میں دوسرے طریقے آزمائے اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ ہر چند کہ اس کا چہرہ یکسر بدلا ہوا تھا مگر وہ بھی سنتا ہی۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اس حال میں ملے گی۔ دراز قد کو تو خیر وہ کیسے چھپاتی

اور نہ اس کے لئے یہ ممکن تھا کہ اپنے متناسب جسم کو بے ڈول بنا لیتی، مگر چہرے اور گلے نے اس کی شخصیت کو بالکل بدل دیا تھا۔ اپنی اصل عمر سے مجھے وہ تقریباً دس برس کم دکھائی دی، جسم پر معمولی کپڑے نظر آئے۔ وہ اب بھی اپنے چہرے، رنگ روپ اور جسمانی ساخت کے سبب پُرکشش ہی لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور شخص کو بھی دیکھا جو میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔

کراچی کے سٹی ریلوے اسٹیشن کے قریب اس تیسرے درجے کے ہوٹل کی حیثیت ایک مسافر خانے جیسی تھی۔ اسے ”چارپائی ہوٹل“ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ وہاں کچھ کوٹھریاں بھی تھیں جنہیں قدرے کم غریب مسافر کرائے پر حاصل کر لیتے تھے۔ سنتا مجھے انہی کوٹھریوں میں سے ایک کے اندر اجنبی شخص کے ساتھ ملی۔ قایم اشارہ ہوٹل میں عیش کرنے والی اس عورت نے یہ نیا بھیں بھر کر وہاں رہنا کیوں پسند کر لیا؟ یہ سوال میرے لئے لائجل نہیں تھا۔ اپنے تحفظ کی خاطر ہی اس نے ایسا کیا ہو گا۔ اسی کے ساتھ نئی چالیں چلنے کے لئے بھی اسے مہلت درکار ہوگی۔ اس کے تین اہم مہرے دیکھتے ہی دیکھتے پت کر باط سے غائب ہو گئے تھے، شہ پڑ چکی تھی اور اب وہ گویا اپنی دانست میں قلعہ بند تھی۔ شہ سے بچنے کے لئے وہ کوئی تو چال چلتی۔ میں اسی چال کو سمجھنے اور اس کا کوئی توڑ سوچنے کی غرض سے سکھ بیر بن گیا۔

اس ہوٹل میں وہ مہ جیوں کے نام سے ٹھہری ہوئی تھی۔ اجنبی شخص کا نام سکندر تھا۔ سکندر اس کا شوہر بنا ہوا تھا۔ میاں بیوی کی حیثیت سے ان دونوں نے خود کو سکھر کا ظاہر کیا۔ ”غریب اور نو بیاہتا یہ جوڑا۔“ کراچی کی سیر کرنے آیا تھا۔

کوٹھری کا دروازہ اس وقت اندر سے بند تھا جب میں نے دستک دی۔ سنتا اگر کوٹھری میں اکیلے ہوتی تو مجھے ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

دروازہ سکندر ہی نے کھولا اور مجھے کڑی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“ ”ہمارا نام کنور متاب علی خاں ہے اور ہم تمہاری بیوی مہ جیوں کے قریبی عزیز ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سنتا دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ ظاہر کوٹھری خالی ہی نظر آ رہی تھی جیسے سکندر کے سوا اندر کوئی نہ ہو۔ ”ہمیں پتا چلا تھا کہ تم لوگ سکھر سے گھومنے پھرنے یہاں آئے ہو تو سوچا، مل لیں۔“

اسی وقت سنتا دروازے کی آڑ سے نکل آئی اور اپنے سر پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ ”ارے کنور صاحب آپ! آئیے اندر آ جائیے۔“ وہ دل کش انداز میں مسکرائی۔ میں نے کوٹھری میں قدم رکھا تو وہ کہنے لگی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔“ پھر وہ سکندر سے مخاطب ہوئی۔ ”تم اتنے میں کہیں گھوم پھر آؤ، میں ان سے اپنے رشتے داروں کی خیر خیریت پوچھ لوں۔ جلدی لوٹ کر آنے کی ضرورت نہیں، آرام سے گھوم پھر کے آنا اور سنو، اپنے سرایوں کا خیال رکھنا، کہیں کوئی مل ملا جائے۔“ ”سرایوں۔“ سے سنتا کا مطلب پولیس والے ہی تھے، یہ سوچ کر میں نے مسکراتے ہوئے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ہنوتی سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس جراثیم پیشہ شخص کو مزید ہڑبازنے کے لئے کہہ دیا۔ ”اپنی منگوئوں کا بھی خاص خیال رکھنا، کہیں گر نہ جائیں۔ کچھ ڈھیلی سی لگ رہی ہیں کہ اب

گرس کہ جب گریں۔“

اس نے بوکھلا کر اپنی مونچھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس کے میک اپ میں ایسی کوئی خرابی نہیں تھی، مونچھیں بالکل اصلی نظر آ رہی تھیں۔ پھر بھی اس کے بوکھلانے پر سینٹا ہنس دی۔

”لعل خان ابھی کچا ہے، اسے تھوڑا سا اور پکاؤ۔“ میں مسکرا کر بولا۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو گزشتہ رات اپنے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اس مرتبہ میں براہ راست اسی سے مخاطب ہوا۔ ”گھبراؤ مت! تمہاری تلاش تو ہے سرایوں کو، مگر وہ تمہیں پہچانیں گے نہیں، جاؤ۔“

وہ مجھے کھانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا اور سینٹا نے کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کوٹھری کے فرش پر ایک دری پھٹی تھی جس پر دو ٹکٹے ساتھ ساتھ رکھے تھے۔ سینٹا کے ساتھ اسی دری پر میں بھی بیٹھ گیا۔ ایک طرف ٹین کا ایک بکس اور مختصر سا سامان پڑا تھا۔

کوٹھری پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں نے سینٹا سے کہا۔ ”عقل سے پیدل ایسے لوگوں کو ساتھ نہ رکھا کرو جو ذرا سی دیر میں گھبرا جائیں۔“

”جلدی میں ایسا کرنا پڑا، کیوں کہ رات ہی کو میں نے ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تمہاری طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ میں جہاں بھی ہوئی تم ڈھونڈتے ہوئے آ جاؤ گے۔ یہ بتاؤ، کیا واقعی پولیس کو لعل خان کی تلاش ہے؟ میں نے یوں ہی بہ طور احتیاط اس سے چونکا رہے ہو کہ وہ دبا تھا۔“

”غلط نہیں کہا، میں نے۔ تمہارے ساتھ اسے دیکھتے ہی میں کھٹک گیا تھا۔ ان مونچھوں کو ساتھ لگائے نہ پھرا کرو۔ ایک ہی دری پر.....“

”نہیں نا۔“ سینٹا نے میری بات کاٹ دی۔ ”دوسری دری بکس سے نکال کر دکھاؤں تمہیں۔ تم جیسا شکی عاشق بھی نہیں دیکھا میں نے۔ تم کو میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میں اتنی عام بھی نہیں کہ دو دو پیسے کے آدمی میرے قریب آ سکیں۔ نوبتا ہوتا جو ظاہر کرنے کو دوسری دری لپیٹ کر رکھنی پڑی۔ تم نے بتایا نہیں اس کے بارے میں۔“

”میری اطلاع کے مطابق پچھلی رات کو پولیس نے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا ہے۔ اسی سلسلے میں لعل خان کے گھر پر بھی چھاپا مارا گیا۔ یہ جوا کھیل رہا تھا۔ اس جوئے کے اڈے سے تو اسے تم انٹرا کر لائی تھیں۔ زیادہ جلد بازی نہ کیا کرو۔ مجھے خبر ہے کہ کسی ایسے ہوٹل میں مرد کے بغیر تمہارا رہنا اچھا نہ ہوتا، مگر لعل خان جیسے کسی آدمی کو تمہیں اپنے.....“

”اب اس پر خاک ڈالو نا، بس ہو گئی غلطی۔“ وہ بول اٹھی۔ ”اب اس کا ایک ہی حل ہے۔ چلو کہیں اور چلتے ہیں، تم رہنا میرے ساتھ۔“

”میرے پیروں میں زنجیر نہ ڈالو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے آزادی سے اپنا کام کرنے دو، یہی تمہارے لئے بھی بہتر ہے۔ تم سے دور رہ کر میں تمہارے لئے زیادہ فائدے مند ثابت ہوں گا۔ اس طرح میں تمہیں کسی خطرے میں تو نہیں گھرنے دوں گا۔“

”پھر بھی اب اس لعل خان کو تو دھکا دینا ہی پڑے گا۔ تم نے اس کو ہنسی ہنسی میں چھیڑ کر دیکھ ہی لیا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ پاگل کہیں کا، فوراً اپنی مونچھیں نٹولے لگا۔ تم نہ آتے تو مجھے پتا ہی نہ چٹا کہ پولیس اس کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ایک ترکیب ہے اس کی۔ فائو اسٹار ہوٹل نہ سہی تو اس سے کم درجے کا کوئی اور ہوٹل سہی، جہاں کسی اکیلی عورت کے رہنے پر کوئی حیرت نہ کرے۔ صدر کے علاقے میں ایک ایسا ہوٹل دیکھا ہے میں نے۔ وہاں نیچے باہر بھی ہے۔“ سینٹا نے اس ہوٹل کا نام بتایا، پھر کہنے لگی۔ ”باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی، پہلے اس لعل خان سے جان چھڑاتے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ وہاں میرا ضروری سامان لے کر پہنچ جاؤ۔ مجھے تم ہوٹل کے سامنے مل جانا۔ دو بڑے ایئر بیگ کافی ہیں۔ ان میں میرا ضروری سامان آ جائے گا۔ میں یہاں سے نکلنے میں دیر نہیں کروں گی۔ حلیہ اور چہرہ بدلنے کی بھی پھر ضرورت نہیں رہے گی۔“ سینٹا نے یہ کہتے ہی وہاں سے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ مجھ سے اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں راضی بھی ہوں یا نہیں۔

”دیے اس محلے اور چرے میں بھی تم بری نہیں لگ رہیں۔“ میں دھیرے سے ہنس کر بولا۔

”اپنے پیر کے کھٹے لگتے ہیں۔“ اس نے ایک ایئر بیگ میں ٹرانسمیٹر کو احتیاط کے ساتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بیری تو اپنے نہیں، اسی کا تو دکھ ہے۔ سدا سے پرانے ہیں۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”کرنے لگے پھر وہی گلے شکوے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں تو کاٹ کے کٹوے کر دوں۔ کسی طرح چین ہی نہیں تمہیں۔ نہ ملن پر راضی ہو نہ جدائی پر۔“ وہ کہنے لگی۔

”تمہیں کیا خبر کہ اک آنگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ اور شاید اسی کا نام محبت ہے۔ مجھ سے تو خیر محبت میں کچھ بھی نہ ہو سکا، تم نے بے وفائی تو کی۔“

سینٹا مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بھی کام سے غافل نہیں تھی۔ جلد ہی اس نے دو بڑے ایئر بیگ میرے حوالے کر دیئے اور بولی۔ ”اب تم جاؤ۔“

”عشق میں مزدوری بھی کی تو کسی معاوضے کے بغیر۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور دونوں ایئر بیگ اٹھائے، پھر اسے تاکید کی۔ ”جلدی آ جانا۔“

”تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ یہاں سے دور ہی کتنا ہے صدر۔“ سینٹا نے کہڑوں کا ایک جوڑا بکس پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

کوٹھری کا دروازہ کھول کر میں باہر نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک چارپائی پھٹی تھی۔ اس پر ایک شخص بیٹھا ہوا حقہ گزر رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ محلے سے وہ مجھے پنجاب کے کسی گاؤں کا لگا، سفید تہ بند اور ڈھیلی ڈھالی قمیض پہنے ہوئے تھا، سر پر سفید کپڑی تھی۔ مجھ سے نظر ہٹا کر وہ کوٹھری کے دروازے سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پچاس برس سے اوپر ہی ہو گا وہ، مگر ”نظر بازی“ کا شوق ابھی نہیں چھوٹا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا تو وہ اپنی ”گھری نما“ مونچھوں کو سملانے لگا۔ وہ مجھے سینٹا کا کوئی پرانا ”آشنا“ سمجھا تھا۔ کچھ آدم زادوں کو دوسروں کی نوہ میں لگے رہنے کی

مات ہوتی ہے۔ وہ بھی مجھے ایسا معلوم ہوا۔ اسے نظر انداز کرتا ہوا میں اس ”چارپائی ہوٹل“ کے بیرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔ لکڑی کے بڑے سے پھانک تک پہنچنے اور باہر نکلنے کے لئے تیز قدمی سے چلا۔ پھانک سے پہلے ہی دائیں جانب میز کرسی بچھائے، آنکھوں پر چشمہ لگائے ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی۔ ”ذرا سنا بھائی صاحب!“

میں رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا۔ ”بولو، کیا بات ہے؟“
”یہ کیا ہے؟“ اس نے میرے دونوں شانوں سے لٹکے ہوئے ایئر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔
”تمہیں نظر نہیں آ رہا؟ ایئر بیگ ہیں یہ۔“
”لیکن جب آپ آئے تھے خالی ہاتھ تھے۔ میں نے خود آپ کو اندر جاتے دیکھا تھا۔“ وہ بحث کرنے لگا۔

”تو تمہارا خیال یہ ہے کہ میں کوئی اٹھائی گیرا ہوں۔“ مجھے اس چالاک نوجوان پر غصہ آیا۔ ”کسی مسافر کا سامان لے کر چپت.....“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔ پھر بھی ہمیں نظر تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔“ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ابے چپ۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اسی وقت میں نے پھانک کی طرف سے ایک اور نوجوان آتے دیکھا۔ عمر میں وہ چھٹے والے سے بڑا تھا۔

”کیا ہوا یامین؟“ اس نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے دوری سے پوچھا۔
”بھائی جان! یہ صاحب.....“ چھٹے والے کا جملہ دھوڑا ہی رہ گیا۔ میں نے بات بگڑتے دیکھ کر سے اپنے اثر میں لے لیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ کھل ہو گیا تھا۔ پھر چھٹے والے نے گویا اپنی بات پوری کر دی۔
”یہ صاحب کسی ماجھا پہلوان کو پوچھ رہے ہیں جن کے دونوں کان ٹوٹے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں ماجھا پہلوان کو؟“

”مجھے کیا معلوم۔ دیکھ لو رجسٹر میں۔“ نوجوان نوجوان منہ بنا کر بولا۔ ”یہ تو کبوتر خانہ ہے، دن بھر میں کتنے آتے جاتے ہیں۔“

”رجسٹرڈ میں تو ماجھا پہلوان کا نام نہیں ہے۔“
”تو پھر چلتا کرو انہیں۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”تم جاؤ اوپر، اباجی بلا رہے ہیں۔ اتنی دیر میں بیٹھ جاتا ہوں تمہاری جگہ۔“

میں فوراً پھانک کی طرف لپک لیا کہ کہیں کوئی اور الا بلا گلے نہ پڑ جائے ذرا سی بات کے لئے مجھے اس چھٹے والے نوجوان کو اپنے اثر میں لینا پڑا تھا۔ ہم جن زادوں کو اپنی تمام تر پراسرار قوتوں کے باوجود ان آدم زادوں کے درمیان رہتے ہوئے کبھی کبھی تو بہت پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہ جیسے خود ہوتے ہیں، دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ چھٹے والا نوجوان مجھ کو کوئی اٹھائی گیر سمجھ بیٹھا۔ اس طرح کے ہوٹلوں میں ایسا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں۔ سینٹا نے غالباً اپنی جان چھڑانے کے لئے ہی وہ

ایئر بیگ میرے حوالے کئے تھے۔ دونوں بیگوں میں اصل شے ٹرانسمیٹر ہی تھا جسے وہ بہ حفاظت وہاں سے نکالنا چاہتی ہو گی۔ ٹرانسمیٹر کے بغیر وہ بھلا دونوں چیز جی سے کس طرح رابطہ قائم رکھتی۔ غیر ضروری طور پر مجھے اس ہوٹل سے نکلنے میں تاخیر ہو گئی۔ پھر بھی میں نے لعل خان کو نہیں بخشا۔ میرے لئے وہ چند لمحوں کا کھیل تھا۔

لعل خان مجھے ریلوے اسٹیشن کے باہر ٹمٹا ہوا مل گیا۔ میں نے اسے اپنے اثر میں لے کر سیدھا پولیس ہیڈ آفس بھیج دیا۔ اسے میں نے حکم دیا تھا کہ جا کر اپنی گرفتاری خود ہی دے دے۔ سینٹا کے بارے میں لعل خان کو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ ارسلان بیگ کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ وہ سینٹا کو ایک اور فرضی نام بانو کے نام سے جانتا پہچانتا تھا۔ معلوم نہیں سینٹا اپنے کتنے اور فرضی نام رکھ چھوڑے تھے۔ اول تو کس پولیس والے کو پڑی تھی کہ اس سے پوچھ گچھ کر کے بال کی کھال نکالتا۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو لعل خان حلقے کے سوا کچھ اور نہ بتا سکتا۔

یہ سب کچھ جانتا اور سمجھنا میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ ابھی سینٹا قانون کی گرفت میں نہ آئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اگر پکڑی بھی جاتی تو ہرگز زبان نہ کھولتی۔ ہاں یہ امکان ضرور تھا کہ وہ کسی طرح فرار ہو جاتی یا ناکامی کی صورت میں خودکشی کر لیتی۔ سینٹا کو دراصل میں چارے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح ایک تو مقامی ضمیر فروشوں پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جاتا، دوسری جانب مشرقی پاکستان تک پھیلی ہوئی سازش، تخریب کاری اور اسمگلنگ کے جال کو توڑنا ممکن ہوتا۔

صدر کے جس ہوٹل کا نام سینٹا نے بتایا تھا، وہاں پہنچ کر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اب وہ پھر سے ”الماس“ بن چکی تھی۔ مہ جیسں کا بحروپ اس نے ختم کر دیا تھا۔ ہوٹل کی پہلی ہی منزل پر اسے ایک کمرال گیا۔ یہ ہوٹل بھی منگیا ہی تھا مگر کافو اسٹار ہوٹل سے کم۔ ایئر بیگوں سے تمام سامان نکال کر اس نے الماری میں رکھ دیا۔

”ہاں اب کمو۔“ وہ آرام سے بیٹھتی ہوئی بولی۔

میں دانستہ اس کے برابر نہیں سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ”کہنا تو تمہیں ہے، مجھے نہیں۔“ میں بولا، پھر پوچھا۔ ”یہ تازہ پہلے کہ اتنی چیز (چالاک) ہو کر لعل خان جیسے پیدل آدمی کو تم نے اپنے ساتھ کیوں لگایا؟ اس شرمیں تمہیں کوئی اور نہیں ملا؟“

”پھر وہی لعل خان، بھڑ میں جھوٹو اسے، بتایا تو تھا تمہیں کہ مجبوراً ایسا کرنا پڑا تھا۔“

”وہی مجبوری تو جانا چاہتا ہوں میں۔“

”نارن اور کمار سے رابطہ قائم نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ زورس ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی بڑی گڑبڑ ہونے کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں بس یہی سوچا کہ میں کچھ دن کے لئے روپوش ہو جاؤں۔ مجھے ارسلان بیگ کی جگہ کوئی تو آدمی چاہئے تھا۔ پہلا نام اسی بے وقوف کا دماغ میں آیا اور نہ تو اس سے کہیں زیادہ کام کا آدمی تو عمر دین لاشاری ہے، کبھی کبھی حالات کی گردش سوچنے سمجھنے اور صحیح فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ ہو گئی بھول۔“ سینٹا کا لوجہ معذرت خواہانہ تھا۔

ایک اور نیا نام سامنے آیا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”اور یہ عردین لاشاری کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟“

”پہلے اندرون سندھ ڈاکے ڈالتا تھا، پھر کراچی آگیا۔ جب اس کے کئی ساتھی، پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تو گردہ توڑ دیا۔ بڑا ہی جیوٹ بندہ ہے۔ ارسلان بیگ ہی نے مجھے اس سے ایک دفعہ ملوایا تھا، ٹیل پاڑے میں رہتا ہے۔ ارسلان بیگ ہی کے ذریعے اس سے میں نے کئی کام لئے اور کبھی وہ ناکام نہیں ہوا۔ اس کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ کبھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا، دوسرے یہ کہ سال بھر کے اندر اس کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپورٹ نہیں لکھی گئی۔ کراچی پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں، نہ اس کے ماضی کی خبر ہے۔“ سنیتا نے بتایا۔

”لعل خان کی طرح اسے بھی تمہارا نام بانو ہی معلوم ہے؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میرے ہی ایما پر ارسلان بیگ نے اسے میرا نام نازنین بتایا تھا، میڈم نازنین! نام بدل بدل کر لوگوں سے ملنا اچھا بھی لگتا ہے سکھ میرا اور اس سے بچت بھی رہتی ہے۔ کرنا تو سب کچھ مجھی کو ہے، نام کچھ بھی ہو۔ بس یہ ہے کہ بت سے ناموں سے پہچان کھو جاتی ہے۔“

”ہاں روح سفر تم ہی ہو اور تمہیں ناموں سے نہیں پہچانا چاہئے۔“ میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا، پھر اس سے دریافت کیا۔ ”اب تو تم زروس نہیں؟“

”زروس تو خیر اب نہیں رہی، ہاں فکر ضرور ہے۔ یہ فکر اس وقت تک رہے گی جب تک رپورٹ نہ مل جائے۔“

”کس بات کی رپورٹ۔“

”یہ کہ ادھر کا مال ادھر ہو گیا یا نہیں۔“ وہ بولی۔

”رپورٹ کہاں سے اور کس سے مل سکتی ہے تمہیں؟ کیا اس کے لئے کسی آدمی کو اندرون سندھ بھیجو گی؟“

”پولیس ہیڈ آفس میں اپنا ایک بندہ موجود ہے۔ ڈی آئی جی کرائمرز کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے وہ، پھر۔“

”ڈی آئی جی کرائمرز حسین خان کے ساتھ؟“ میں نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

”ہاں اسی کے ساتھ، گردہ چھٹی پر تھا، ہفتے بھر کی، کل تک آجائے گا۔ اس کے علاوہ اسٹی کرپشن کے محکمے میں بھی ایک چھد ہے۔ اسے میں آج کل گھاس نہیں ڈال رہی تھی، لیکن ایک اشارے پر وہ بھی کھنچا ہوا چلا آئے گا۔ اگر وہاں اندرون سندھ کوئی ایکشن لیا گیا ہے تو ان دو محکموں کے آدمیوں کو اس کی خبر ضرور ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی کو کہیں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ دو چار بیگ اور دو چار سو روپے۔ سب کام سندھ (درست) بولو ٹھیک ہے نا؟“

”اسٹی کرپشن کے انسپکٹر جمیل کو تو جانتا ہوں میں، وہ بندہ ٹھیک ہے، لیکن حسین خان کے ساتھ جس پولیس والے کی بات کر رہی ہو تم اس کو نہیں دیکھا کون ہے؟“

”ڈی ایس پی مظفر حسین، لمبا مال کھا گیا تھا ایک دفعہ، اس لئے ہیڈ آفس میں ڈیوٹی لگ گئی، کچھ دن معطل بھی رہا مگر جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ بڑا پتپتا ہوا فقیر ہے، شوقین بھی ہے۔ ایک داشتہ بھی پال رکھی ہے، دو گھرا اور دو بیویاں ہیں، پھر بھی۔“

”تمہیں دیکھ کر اسے اپنے دل پر قابو کرنا مشکل ہو گیا۔“ میں نے جملے کے سے لہجے میں اس کی بات پوری کر دی۔

وہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”تم تو ہر ایک کو اپنا رقیب سمجھنے لگتے ہو۔ ایسے مجبور کو یا تو مال کھلایا جاتا ہے یا پھر آلو بٹانا کافی ہوتا ہے، یعنی یہ کہ امید بھار رکھ۔ سو جیل اور مظفر دونوں کے ساتھ یہی کھیل میں نے کھیلا ہے۔ دو چار ٹھنڈی میٹھی آئیں بھرس اور چل دیئے۔ لگا رہ دل کنارے سے کبھی تو لہر آئے گی۔“

”کوئی ایسا بھی تو ہو گا جو لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی جاتا ہو گا؟“

”کیا تم نے اب بھی اندازہ نہیں لگایا سکھ بیر کہ لہر لہر نہ لہری ہے؟ ہر ایک اس کی تھانہ نہیں پا سکتا۔“ یہ کہتے ہی وہ اپنی عادت کے مطابق ایک دم چونک اٹھی اور کہنے لگی۔ ”تمہارے آنے سے سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ جیل کو فون کرنا یاد ہی نہیں رہا، وہ ابھی اپنے دفتر سے نہیں اٹھا ہو گا۔ تم سے بھی ایک مشورہ کرنا تھا، وہ بھی دماغ سے نکل گیا۔“

”مجھ سے تو تمہیں جو مشورہ کرنا ہے، کر لو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن جیل کو بلوانے کی ضرورت نہیں۔“ سنیتا کو مزید اعتماد میں لینے کا مجھے ایک اور موقع مل گیا۔ وہ جیل سے مل لیتی تو میرے کچھ بتائے بغیر ہی اسے سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ جیل کے خلاف ابھی میرے ہی ایما پر قمر احمد نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ابھی تک ڈیوٹی پر تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی تھی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں بولا۔ ”جیل سے تمہیں جو پوچھنا ہے، مجھ سے پوچھ لو۔ میں اسی لئے تو تمہیں تلاش کرتا ہوں اس ہوٹل تک پہنچا تھا۔“

”پھر اتنی دیر سے منہ میں ٹھگنیاں بھرے کیوں بیٹھے تھے؟“

”منہ میں ٹھگنیاں بھر کے بیٹھنا، چپ بیٹھے رہنے کو کہتے ہیں۔ کیا میں خاموش بیٹھا تھا؟“

”اب ساؤ مت سکھ بیر،“ وہ ناز و انداز دکھانے لگی۔ ”اگر کچھ پتا چل گیا ہے تو بتا دو!“

”وجہ تھی نہ بتانے کی۔“ میں سنجیدگی سے بولا۔ ”تمہارے ہنسنے مسکراتے چہرے پر اداسی چھا جاتی اور ابھی تھوڑی دیر تمہیں خوش ہی دیکھنا چاہتا تھا میں۔ ویسے بھی کوئی اچھی خبر تو تھی نہیں کہ سارا مال پکڑا گیا، اسی کے ساتھ نارائن اور کمار بھی مارے گئے۔“

”کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم سکھ بیر؟“ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ ”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اتنا..... اتنا بڑا نقصان ہو گیا۔“

”ہاں سنیتا! ہونی کو ٹالا بھی کس نے ہے۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہی نکلا کہ کوئی کوئی پولیس والا جھاڑ کا چیترا بن جاتا ہے۔ صبح سے میں یہی سب تو پتا کرتا پھر رہا تھا۔ حسین خان نے رات ہی کو اس ٹرک ڈرائیور سے سب کچھ اگھوا لیا تھا اور پھر ڈیرے کی حویلی پر چھپا مارنے کا حکم دے دیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کو

جب انا لڑکایا گیا تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ لوٹ کا مال لے کر اسے کہاں جانا تھا۔ پھر تو اس نے خود ہی ساری کڑیاں جوڑ لیں۔ وڈیرا بھی دھر لیا گیا۔ ”میں نے پوری روداد سنا دی۔“

”بہت برا ہوا سکھ بیڑا! یہ بہت برا ہوا۔“ وہ اظہارِ افسوس کرنے لگی۔ ”یہی ڈر تھا مجھے۔ کل رات جب نارائن اور کمار کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو اسی وقت مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید..... شاید تب تک وہ دونوں مارے جا چکے ہوں گے“ پھر جواب کون دیتا۔ ونود جی کو خبر ہوئی تو اس پر بہت ناراض ہوں گے۔ یہ تو سارا کھیل ہی بگڑ گیا۔ تین خاص آدمی کام آگئے اور ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ اس کم بخت مظفر حسین کو بھی انہی دنوں میں چھٹی لینی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر ہوتا تو پہلے ہی خطرے کا سنگٹل دے دیتا۔“

”جو صلہ کیوں ہارتی ہو سیتا!“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”بھول جاؤ جو ہو گیا۔ مجھ سے کیا مشورہ کرنا تھا تمہیں؟“

چند لمحے وہ کچھ نہ بولی، پھر کہنے لگی۔ ”حالات اگر اس طرح بگڑ جائیں تو کچھ دن کے لئے بالکل خاموش بیٹھ جانا چاہئے۔ یہی سوچ کر میں نے روپوش ہو جانے کا فیصلہ پہلے سے ہی کر لیا تھا۔ تم کو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میرا فیصلہ ٹھیک ہے نا؟“ اس نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

سیتا کی روپوشی میری نظر میں سودمند نہیں تھی۔ اس طرح قانون کے لمبے ہاتھ ضمیر فروشوں اور مجرموں تک نہ پہنچتے۔ سیتا ہی تو ان تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھی۔ سیتا سے آج ملنا بھی رایگاں نہیں ہوا تھا۔ ڈی ایس پی مظفر حسین اور عمر دین لاشاری یہ دو نئے نام معلوم ہوئے تھے۔ عمر دین لاشاری کو تو ابھی ڈھیل بھی دی جاسکتی تھی اور مصلحت کے پیش نظر یہ درست بھی ہوتا، لیکن مظفر حسین ایک ایسا خطرہ تھا، فوراً جس کے سدباب کی ضرورت تھی۔ میں نے انہی باتوں پر تیزی سے غور کرتے ہوئے سیتا سے کہا۔ ”تم ہی تو کل رات کہہ رہی تھیں کہ کھیل بگڑ جائے گا تو پھر کوئی اور راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ اب کیا نئی بات ہو گئی کہ پھول سا چہرہ کھلا گیا۔“

”شک اور یقین میں بڑا فرق ہوتا ہے سکھ بیڑا..... آشنا اور نراشا کے بیچ کیسے دور بندھی رہتی ہے کہ شاید ایسا نہ ہو۔ جب یہ دور بھی ٹوٹ جاتی ہے تو من کو دھچکا تو لگتا ہی ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ ونود جی کیا حکم دیں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اگر تمہیں ونود جی کے حکم ہی پر چلنا تھا تو پھر مجھ سے مشورہ کرنے کی کیا پڑی تھی۔“

”برا کیوں مانتے ہو۔ بات کو سمجھو تو سکھ بیڑا! وہ یہاں نہیں ہیں۔ کوئی حکم دینے سے پہلے ونود جی میری رائے بھی تو مانگتا چاہیں گے۔ وہ میری رائے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ شاید ہی کبھی انہوں نے میری کسی بات کو رد کیا ہو۔ انہیں بڑا بھروسہ ہے مجھ پر اور میری ناکا ہی انہیں پہلی بار دھچکا لگے گا۔ میں اسی لئے تو خود بھی سوچ رہی ہوں اور تم سے بھی مشورہ کر رہی ہوں۔“ وہ فکر مند ہونے کے باوجود نرمی سے مجھے سمجھانے لگی۔

مجھے اس پر خوشی سی محسوس ہوئی کہ سیتا کو میری ناراضگی قبول نہیں تھی۔ میں بولا۔ ”میرا مشورہ

تو یہی ہے کہ بہت نہ ہارو! باقی تم جانو اور تمہارے ونود جی۔ روپوش ہو جانے کا مطلب میری نظر میں تو یہی ہے کہ دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔ بگڑا ہی لیا ہے ابھی۔ صرف ایک راستہ ہی تو بند ہوا ہے، سارا جال تو اسی طرح بچھا ہوا ہے۔ اگر جال بچھا رہے اور دانا بھی موجود ہو تو پیچھی پھٹتی ہی رہتے ہیں۔“

”تم اندازہ نہ کر سکو شاید سکھ بیڑا کہ میں نے کتنی محنت سے یہ جال بنا ہے..... بات کرتی ہوں میں، ونود جی سے۔ تمہارا مشورہ منظور ہے مجھے۔“

دوسروں کے لئے جال بننے والی کو خبر نہیں تھی کہ وہ خود بھی ایک جال میں پھنس گئی ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ ”کب کرو گی ونود جی سے بات؟“

”آج ہی..... بلکہ ابھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ آرام ضرور کرتے ہیں ورنہ پھر شام کو بات ہو گی۔“ وہ یہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے سرغنہ سے وہ میری موجودگی میں بات کرنے والی تھی، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔ وہ میرے دام عشق گرفتار ہو چکی تھی۔

ٹرانسٹیپر ونود چڑ جی سے رابطہ قائم ہو گیا تو میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔ اس آواز میں خلاف توقع بڑی نرمی اور مٹھاس تھی۔ اس کے لئے میرے ذہن میں صرف دو ہی الفاظ آئے، میٹھی چھری۔ اس نے بڑے مبرو سکون کے ساتھ پوری رپورٹ سنی، پھر نرم ہی لہجے میں سیتا سے دریافت کیا کہ ان حالات میں وہ کیا چاہتی ہے؟ سیتا نے وہی کچھ کہہ دیا جو میں نے سمجھایا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی نہیں چھپایا کہ پہلے اس کے ذہن میں روپوش ہو جانے کا خیال آیا تھا۔

”تم نے وہاں کے جو حالات بتائے ہیں ان سے پتا چلتا ہے، کشتی میں کیسے کوئی سوراخ ہے۔“ ونود چڑ جی کی آواز ٹرانسٹیپر پر ابھری۔ اس کی اردو بہت صاف تھی۔ ”جس کشتی میں سوراخ ہو جائے اور معلوم نہ ہو کہ پانی کہاں سے آ رہا ہے تو اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو میں تمہیں یہاں بلوانے والا تھا۔ ہم اپنی اصل جنگ یہاں سے شروع کرنے والے ہیں۔ جس کے لئے میدان ہموار کر لیا گیا ہے۔ جو کام تمہارے ذریعے وہاں شروع کرایا گیا، اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ تو بس یوں سمجھو کہ یہاں کے لوگوں کی توجہ دوسری طرف پٹائے رکھنے کے لئے تھا۔ اس سے بھی تھوڑا بہت فائدہ ہوا، لیکن اب یہ ضرورت نہیں رہی۔ جتنی جلدی ہو سکے تم یہاں آ جاؤ۔ اور اینڈ آل۔“

خبیث ونود چڑ جی نے میرے سارے منصوبے ہی کو چوٹ کر دیا۔ میرے ذہن میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”ہم اپنی اصل جنگ یہاں سے شروع کرنے والے ہیں جس کے لئے میدان ہموار کیا گیا ہے۔“

اصل جنگ، اس سے کیا مقصد ہو سکتا ہے میں سوچنے لگا۔ مارکیب سے اشیائے صرف غائب کرنا اور ان کو اسلگ کر دینا، ونود چڑ جی کے نزدیک کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا، تو گویا اس سے بھی بڑی کوئی سازش مد نظر تھی، کوئی بڑا خطرہ۔

اس عرصے میں سیتا نے ٹرانسیر کو دوبارہ الماری میں رکھ دیا اور اپنی جگہ آ بیٹھی۔

”کچھ بھرا“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“

میں تو پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ محض اس کے اصرار کی خاطر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور نہ چلوں تو؟“

”میرا تمہارا معاملہ ذاتی نوعیت کا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ونود جی اسے قبول کر لیں۔ تم سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لئے وہاں جہاں جاری ہوں، ونود جی تم سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔ اس میں میرا کیا ذکر۔ تم سے میں پہلے بھی تو کہہ چکا ہوں کہ ہماری منزل ایک سہی، مگر راستے الگ الگ ہیں۔“

وہ بولی۔ ”ہر شخص کی اپنی ذاتی زندگی اور حیثیت بھی تو ہوتی ہے۔ کیا ونود جی کی اپنی پرنس لائف نہیں؟“

یہی میں اس سے کہلوانا چاہتا تھا، پھر بھی فوری طور پر کچھ بولا نہیں۔

سیتا میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کہنے لگی۔ ”میں تمہیں کھو دینے پر ہرگز تیار نہیں ہوں۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔ یا تو تم بھی میرے ساتھ چلو گے یا پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔“

”اور ونود جی کا حکم؟“

”حکم تو اسی صورت میں حکم ہوتا ہے جب کسی کو حاکم تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں رزائن کر دوں گی تو میرے لئے ونود جی کا حکم ماننا ضروری نہیں رہے گا۔“

مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ سیتا پر اس حد تک میرا جادو چل چکا ہے۔ اسی سے میں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر ونود جی کو تم میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”یہ تو خود میں بھی فیصلہ کر چکی تھی۔“ وہ بڑا امید لہجے میں بولی۔ ”تو ہی بات تھی تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ اگر ونود جی سے نہ جلو تو میں تمہیں اپنے اور ان کے بیچ ایک اور ناتے کے بارے میں بتا دوں۔ اس ناتے کا تعلق بھی ان کی سرکاری حیثیت سے نہیں ہے۔“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”ان سے اور کیا ناتا ہے تمہارا؟“

”میری اور تمہاری ہی طرح وہ بھی درگا دیوی کے داس ہیں۔“

سیتا کا جواب سن کر میرے دل میں امید کی جو شمع روشن ہوئی تھی، وہ بجھ سی گئی۔ پھر بھی میں نے سیتا کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا اور بولا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا اس کا؟“

”بس ایک بار اچانک ہی یہ راز کھل گیا۔“ وہ بتانے لگی۔ ”یہ بات اب سے کوئی سال بھر پہلے کی ہو گی۔ میں اس وقت مشرقی پاکستان کے شہر جیسور میں تھی۔ وہ اس طرف کا پہلا سرحدی شہر ہے۔ فوجی چھاؤنی بھی ہے وہاں۔ ونود جی کو سرحد پار سے آتا تھا کہ فوجی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ جھڑپیں اتنی شدید تھیں کہ کسی کا بھی ایسے میں سرحد پار کر لینا ناممکن ہی تھا۔ میں اور میرے دو ساتھی اسی لئے بہت بے چین ہو گئے۔ ہمیں اپنے لئے بھی اس شہر میں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ جیسور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہم تینوں ایک معمولی درجے کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ونود جی کو اسی ہوٹل میں پہنچنا تھا۔ وہاں

سے ہم ڈھاکا کے لئے روانہ ہو جاتے۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے حالات میں ونود جی نہیں آ سکیں گے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ہم کو بھی وہ یہی حکم دیں گے کہ جیسور سے نکل جائیں، لیکن میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ونود جی اس کے باوجود بالکل صحیح وقت پر ہوٹل پہنچ گئے۔ تب ہی انہوں نے ڈھاکا پہنچنے کے بعد اکیلے میں ایک روز یہ بتایا کہ انہیں درگا دیوی کا آئینہ رواد حاصل ہے۔ پھر میں نے بھی ان کو اپنے بارے میں یہ بتا ہی دیا کہ میں درگا دیوی کی داسی ہوں۔ اس پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”خوشی کا اظہار کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، ونود جی نے ان میں سے کون سا طریقہ اختیار کیا تھا؟“

”جل گئے نا آخر۔ میں اسی لئے تمہیں یہ بات بتاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ارے پگے، ونود جی بوڑھے آدمی ہیں، ساتھ برس تو ہو گی ہی ان کی عمر۔“

”تو کیا بوڑھوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟“

”وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔“ سیتا تقریباً چیخ اٹھی۔

”اچھا اچھا، سمجھتے ہوں گے، چیخو تو مت! مجھے پاگل کہہ رہی ہو اور خود خود پاگل پن دکھا رہی ہو۔“

”تم ہی پاگل کر دیتے ہو مجھے..... ہر ایک پر شک کرنے لگتے ہو، بلا سوچے سمجھے۔“

”غصے میں جب تمہارے گورے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔“

”تو اسی لئے مجھے غصہ دلایا تھا۔“ اس نے اپنے شانوں پر بکھری ہوئی زلفوں کی گٹھا کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔

”نہیں، بات یہ نہیں، بلکہ تمہارے غصے پر بھی پیار آتا ہے مجھے۔“

”اچھا زیادہ بناؤ مت! یہ کہ اپنے ساتھ ہی تمہاری سیٹ بھی ریزرو کرا لوں نا؟“

”تم پہنچو وہاں، میں آ جاؤں گا۔“ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”کئی کام ادھورے ہیں، انہیں نمٹا دوں۔“

”اس میں کتنے دن لگ جائیں گے تمہیں؟“ سیتا نے معلوم کیا۔ ”دو ایک دن کی بات ہو تو رک جاتی ہوں میں۔“

”ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں یہ خبر ہے کہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں لگے گا۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”تو پھر میں چلی جاؤں؟ تم جلد سے جلد آ جاؤ گے نا؟“ سیتا نے اس طرح مجھ سے اجازت لی جیسے میری پابند ہو۔

”پکا اسٹامپ لکھ کر دوں تجھے۔“ میں ہنس دیا۔ ”اس طرح وچن لے رہی ہے مانو چمچ کی پریسکا ہو۔“

”دیکھ کچھ بھرا! کسی دن میرے ہاتھوں تیری ہتھیا (موت) ہو جائے گی۔“

”کون جانے سینٹا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا لیکن اتنا مجھے معلوم ہے، ایسی باتیں سوچنا اور کہنا پاپ (گناہ) ہے۔“

”ہوا کرے پاپ، سکھ بھرا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آتما کی شانتی (روحانی سکون) کے لئے رشیوں اور منیوں نے، دھرم کے سیوکوں نے آواگون کی بات کہہ دی ہو۔ اس طرح آدمی کو سکون مل جاتا ہے تاہم وہ اس دھیان میں بڑے آرام سے مر جاتا ہے کہ اس جیون کے بعد بھی اور کوئی جیون ہے۔“

”خود مجھ کو بھی کبھی کبھی ایسے دھار آتے ہیں سینٹا! پر میں ان کو اپنے ذہن میں جھٹک دیتا ہوں۔ اگر یہ سب جھوٹ ہے، دھوکا ہے تو یہ دھوکا بھی کتنا اچھا ہے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو اس سے میرے من کو شانتی مل جاتی ہے۔ تو بھی ایسا ہی کیا کر۔ دیکھ سینٹا! مانو تو بھگوان، نہ مانو تو پتھر۔ سو مان لیں تو کیا برا ہے۔“

”مان ہی تو گئی ہوں تبھی تو درگا دیوی کی داسی بنی ہوں۔ تجھ سے تو یہ سب کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے میں نے۔ مجھے تو اس پر خوشی ہے کہ تو نے مجھ پر نانتک ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ تو مجھے اس سے بہت اچھا لگا جب مجھ سے اپنے دھار نہیں چھپائے ورنہ تو ایسے معاملوں میں دھرم کے نام پر لوگ ایسے پاگل ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔“

”میں اور تو، شاید ہم دونوں پہلے ہی قتل ہو چکے ہیں، سو ہمیں کون قتل کرے گا۔ اچھا اب چلے دے۔“

”میرے ساتھ کھانا کھا کے چلا جانا۔“

”پھر کبھی سنی۔ اب تجھ سے ڈھاکا میں ملوں گا۔“

”چلا میں۔“ یہ کہتے ہی میں نے سکھ بیر کا قالب چھوڑ دیا۔ سینٹا اس خالی کرسی کو دیکھتی رہی گئی جہاں میں لمبے بھر پہلے بیٹھا تھا۔

☆=====☆=====☆

بہ حیثیت جن زاد اگر ڈھاکا میرے لئے زیادہ دور نہیں تو آدم زادوں کے لئے بہر حال قریب نہ تھا۔ ابھی مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہاں مجھے کتنا عرصہ لگ جاتا اور کب میری واپسی ہوتی۔ آدم زادوں کے درمیان رہ کر ان سے میرا جو تعلق بھی قائم ہو گیا تھا، میں نے اسے برقرار رکھنا ضروری جانا۔ ایک معاملہ ایسا تھا جسے میں اپنے ہی سامنے نمٹا دینے کے حق میں تھا۔ صدر سے مجھے جامع کلاؤنڈ مارکیٹ پہنچنے میں ذرا ہی دیر لگی اور میں نے وہاں بلقیس کے باپ حبیب کو تلاش کر لیا۔ اب میں، مقصود کے قالب میں تھا۔

حبیب کو میں نے اسی مارکیٹ میں کوئی دکان خریدنے کے لئے ایک بڑی رقم دی تھی۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ وہ جس دکان پر سیل میں ہے، وہاں کی نوکری چھوڑ دے۔ شریف آدمی اپنی شرافت سے اور رذیل اپنی رذالت سے باز نہیں آتا۔ مہینہ ختم ہونے میں اس وقت صرف چار پانچ دن رہ گئے تھے جب حبیب نے دکان کے مالک سے نوکری چھوڑ دینے کی بات کہی۔ دکان دار نے وجہ پوچھی تو حبیب نے بتا دیا کہ وہ خود کپڑے کی دکان کھولنا چاہتا ہے۔ اس پر دکان دار نے حبیب کا مذاق اڑایا اور کہا کہ شاید بڑھاپے

”پھر توجہ کی میرے بنا؟“

”جی کے کرنا بھی کیا ہے پھر۔ تجھے مارنے کے بعد خود بھی مری جاؤں گی میں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جیسے کہیں کھو گئی، پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ”اس نے بھی دھن دیا تھا مجھے اور اور بے وفا نکلا۔“

”تو نکالیں کا ساتھ جینے ساتھ مرنے کو کتا تھا۔“ اس کی آواز جیسے آنسوؤں میں بھگ گئی۔

”کون تھا وہ؟“ میں نے بھی آہستہ آواز ہی میں پوچھا۔ میری یہ مجبوری تھی کہ سینٹا جب تک خود ہی کچھ نہ بتاتی، مجھ سے معلوم نہ ہوتا۔

”کہہ دیا تھا مجھ سے کہ وہ بے وفا تھا، پانچ برس بھی ساتھ نہیں نبھایا اس نے اور مجھے چھوڑ کر چل دیا۔“

”کہاں چلا گیا؟“

”وہاں جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ اتنا غلام تھا وہ کہ کہ میں نے بھی مر جانا چاہا، لیکن مجھے مجھے بچا لیا گیا۔ شاید شاید تیرے ہی لئے بچ گئی ہو اور اب اب میں تجھے یہ بھی بتاؤں دوں سکھ بیر کہ کہ تو تو مجھے اسی بے وفا کا دوسرا روپ لگتا ہے۔ اسی غلام کی چھب سی مارتی ہے تجھ میں تبھی تو تجھے دیکھتے ہی اپنا تن من بھلا بیٹھی تھی میں۔“ اس کی حسین آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو گلابی رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اس آدم زاد کی کا یہ ایک نیا ہی رخ تھا۔

سینٹا مجھے ایسی آدم زادوں میں سے لگی جو کسی کو نوٹ کر چاہتی ہیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ میں نے بھی ایک آدم زاد کو نوٹ کر چاہا تھا اور وہ سنی مجھ سے پھگ گئی تھی۔ ہاں زگس! کوشش کے باوجود میں اس کا اب تک سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ میرے دل میں بھی ہو کہ سی اٹھی، لیکن برواشت کر گیا اور سینٹا کو تسلی دینے لگا تا کہ میرا دھیان بٹ جائے۔

”جانے والے کبھی نہیں آتے سینٹا! ہاں ان کی یاد ضرور آتی ہے۔“ سینٹا سے یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں زگس ہی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ عشق و ہوس کے درمیان شاید بال برابر فرق ہے۔ کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ عشق، ہوس کے دائرے میں داخل ہو کر وجود کھو دے اور کبھی ہوس ماند پڑ جاتی ہے اور عشق اس پر برتری حاصل کر لیتا ہے۔ میرے اور زگس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ ہوس پر عشق حاوی آ گیا تھا۔ شاید ان دونوں کے درمیان بھی کوئی منزل ہو جہاں جسم و جاں یک جا ہو جائیں، مگر مجھے اب تک کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے دھیان میں تھا اور سینٹا اپنے حصار ذات میں۔

میں نے اسی عالم میں اس کی آواز سنی۔ ”سکھ بیر! تو اگر مجھے نانتک (بے عقیدہ) نہ کہے تو کبھی کبھی جھوٹ سا لگتا ہے مجھے سب کچھ۔“

میں چونک اٹھا اور سوال کیا۔ ”کیا جھوٹ لگتا ہے تجھے؟“

”یہی ایک جنم سے دوسرے جنم کی بات۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ شاید وہ اپنی بات سے خود ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

اپنی دکان کا سودا نہ کرے؟ بتا، کیا تو کوئی نیا سیل مین ڈھونڈنے کے بہانے حبیب صاحب کو روکنا نہیں چاہتا کہ یہ بھی تیری طرح دکان دار بن کر نہ بیٹھ جائیں؟ بڑا سیانا سمجھ رہا تھا اپنے آپ کو تو۔ سیانا کا ہمیشہ گو کھاتا ہے یہ بھول گیا۔

”تو جھوٹ بول رہا ہے۔“ عبید اللہ صاف مکر گیا۔ ”الزام لگا رہا ہے مجھ پر..... میں نے تو حبیب کی غریبی پر رحم کھا کر اسے سیل مین رکھ لیا تھا ورنہ تو کٹکے کٹکے پر سیل مین مل جاتے ہیں۔ دیکھ لے، اس کے علاوہ بھی ایک اور سیل مین موجود ہے میری دکان میں۔ کھڑے کھڑے اسے جواب دے سکتا ہوں۔“

”جواب دیتا کیوں نہیں، جھوٹ کھل گیا نا آخر تیرا۔“

”نہیں دیتا جواب میری مرضی۔“

میں نے عبید اللہ کو بھری مارکیٹ میں ذلیل کر کے اپنا غصہ اتار ہی لیا تھا۔ اس لئے حبیب کو مخاطب کیا۔ ”لغت پڑھو، اس کی صورت پر۔ ابھی اور اسی وقت چھوڑ دو نوکری۔“

اس سے پہلے کہ حبیب کچھ کہتا، عبید اللہ بول اٹھا۔ ”حبیب! نوکری چھوڑنے سے پہلے یہ سمجھ لینا اچھی طرح کہ اگر اس وقت تم نے دکان سے نیچے قدم رکھا تو اس مینے کی تنخواہ نہیں دوں گا۔“

”اپنے کفن کے لئے رکھ لینا یہ پیسے۔ ضرورت بھی نہیں انیس، ان پیسوں کی۔“ حبیب کی جگہ میں نے ہی جواب دیا۔

میرا اشارہ پاتے ہی حبیب نے اپنا کٹورہ اٹھایا اور عبید اللہ سے بولا۔ ”اچھا بھائی عید! خدا حافظ۔ بھول چوک میں کبھی کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔“

”اب بھی سوچ لو حبیب! میں پھر کہہ رہا ہوں، اس مینے کے پیسے نہیں دوں گا۔“ عبید اللہ اپنی کینٹکی سے باز نہیں آیا۔

آس پاس کے دکان دار بھی عبید اللہ کو چیختے چلاتے دیکھ کر جمع ہو گئے تھے۔ انہی میں سے ایک دکان دار بول اٹھا۔ ”یار عبید اللہ! یہ تو سراسر زیادتی ہے تمہاری۔ شرافت تو نہیں ہے کہ تم ایک غریب آدمی کی پورے مینے کی تنخواہ کھا جاؤ۔“

”شرافت تو شریف آدمی برتتے ہیں میرے بھائی!“ میں نے اس دکان دار سے کہا۔ ”تیلی کے اس لونڈے میں شرافت کہاں ڈھونڈ رہے ہو۔“

پھر تو عبید اللہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس طرح آستینیں چڑھانے لگا جیسے ابھی مجھ پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور میں اس آدم زاد کی حماقت پر ہنسنے لگا۔ لوگوں ہی میں سے کوئی مزہ لینے کے لئے بولا۔ ”یہ تیلی کے لونڈے والا کیا قصہ ہے؟“

”کوئی گھر کا بھیدی معلوم ہوتا ہے بھائی!“ ایک اور آواز ابھری۔

میں اس عرصے میں حبیب کو ساتھ لے کر وہاں سے چل دیا اور کچھ آگے نکل آنے کے بعد پوچھا۔ ”جماگیر کی دکان کدھر ہے؟“

”اگلی ہی گلی میں ہے حضور!“ حبیب نے بتایا۔

میں تم سٹھیا گئے ہو۔ حبیب سیدھے دل کا آدمی تھا، دکان دار سے کہہ دیا، میرے ایک محسن نے مجھے قرض حسد دیا ہے۔ دکان دار عبید اللہ اس پر اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گیا اور بولا، کسی دوسرے سیل مین کا بد دوست ہو جائے تو تمہاری چھٹی کر دوں گا، ویسے بھی اب مینہ ختم ہونے والا ہے، پہلی تاریخ تک تمہارا حساب کر دوں گا۔ اس کا مقصد محض حبیب کو انکائے رکھنا تھا کہ وہ غریب اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ حبیب اس کی بات مان گیا کہ جہاں اتنے دن تک نوکری کی ہے، چند روز اور سی۔ اس عرصے میں حبیب نے ایک شخص جماگیر سے دکان خریدنے کے لئے بات کی۔ عبید اللہ کو معلوم ہوا تو اس نے جماگیر سے مل کر اسے بدکار دیا۔ نتیجہ یہ کہ بات کھٹائی میں پڑ گئی۔

مقصود کے قالب میں ظاہر ہونے سے پہلے ہی حبیب کو عبید اللہ کے اشاروں پر ناپتے دیکھ کر میں نے حقیقت کا پتا لگا لیا۔ حاسد عبید اللہ پر مجھے بہت غصہ آیا جو خواہ خواہ حبیب کی راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا۔ اگر حبیب اس کی طرف دکان لے کر بیٹھ جاتا تو عبید اللہ کا کیا بگڑتا۔ مارکیٹ میں اور بھی کپڑے کی بست سی دکانیں تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی حبیب سارا کام کاج چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گیا اور حیرت سے بولا۔ ”ارے حضور آپ اور یہاں؟“

عبید اللہ نے جب یہ دیکھا کہ حبیب ایک تھان لپٹتے لپٹتے چھوڑ کر مجھ سے ہم کلام ہے تو ٹرایا۔ ”حبیب میاں! کام کرو اپنا، ملنے جلنے والوں کو اپنے گھر بلایا کرو۔“

میں تو اس سے تپا ہوا تھا ہی، اسے گھور کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ”اے او تیلی کی اولاد! کیا پاکستان آکر دن لگ گئے ہیں تجھے۔ بھول گیا کیا کہ تیرا باپ سارنپور میں تیل بیچتا تھا۔ تجھے چھوٹے بڑے کا خیال بھی نہیں۔ حبیب صاحب! عمر میں کم سے کم بھی تجھ سے پندرہ سال بڑے ہوں گے۔ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں تجھے؟“

یہ کوئی پھبتی نہیں، حقیقت تھی کہ عبید اللہ کا باپ تیلی ہی تھا۔ اس کے قریبی عزیز رشتے داروں کے سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ مارکیٹ والوں پر اس نے یہ رعب ڈال رکھا تھا کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ بڑائی کا پیمانہ اس کی نظر میں پیسا ہی تھا۔ غصے کی وجہ سے عبید اللہ کو یہ خیال تو آیا نہیں کہ مجھے اس کا کچا چٹا کیسے معلوم ہو گیا۔ کڑوے بچ پر اس کے لمبے میں تلخی کھل گئی اور وہ بھی گویا میری بے عزتی کرنے پر اتر آیا، بولا۔ ”تو ہے کون؟ صورت سے تو مجھے کوئی چہرہ لگتا ہے۔“

”ارے ارے بھائی عید! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ مقصود میاں ہیں۔“ حبیب گھبرا کر بول اٹھا۔

”تم چپ رہو حبیب۔“ عبید اللہ نے اسے ڈانٹا۔ ”نوکر میرے ہو اور اس کی حمایت میں بول رہے ہو۔“

”تیرا نوکر۔“ میں ہنس دیا۔ ”شریف آدمی کی شرافت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو۔ بے وقوف بنا رہا ہے اس نیک آدمی کو حاسد کہیں کے۔ بول تو نے جماگیر کے کان نہیں بھرے کہ وہ حبیب صاحب سے

”سرکار کس طرح کوئی غلط بات کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ممکن کیسے ہے؟“
”اللہ ہر شے پر قادر ہے، تمہیں اس پر تو پورا یقین ہے نا۔“
”بے شک۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”تو سمجھ لو کہ اسی کی قدرت کے طفیل تمہیں گھر مل گیا تم آج ہی اپنے گھر میں منتقل ہو جاؤ گے۔“

”آپ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار! میری سمجھ میں تو کچھ..... کچھ بھی نہیں آ رہا۔“

”نہیں سمجھ میں آ رہا تو سمجھ لو حبیب کہ ہم دو ایک روز میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کچھ پتا نہیں، کب واپس ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ تم اس کوٹھی میں رہو جہاں ہم رہتے ہیں۔ ہم اکیلے آدمی ہیں، واپس بھی آئے تو تم ایک کمرہ ہمیں رہنے کو دے دینا، ہمارے لئے کافی رہے گا۔“

میری بات سن کر حبیب ایک دم چلتے چلتے رک گیا۔ مجھے بھی رک جانا پڑا۔ وہ اس طرح حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے میری داغی صحت پر اسے شبہ ہو یا پھر اس نے جو کچھ سنا ہے، محض فریب سماعت ہو۔ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”نہیں..... یہ نہیں کہا حضور نے، میں..... مجھ سے ہی سننے میں کوئی غلطی.....“

”کوئی غلطی نہیں ہوئی تم سے سننے میں۔“ مجھے بولنا ہی پڑا۔
”مگر حضور، میرا..... میرا گھر تو چھوٹا..... حضور کی کوٹھی سے بہت چھوٹا تھا۔“ اس کی آواز فرط جذبات سے رندہ سی گئی۔

”تو کیا ستم ہو گیا۔“ میں بولا۔ ”کوٹھیوں میں رہنے والے کیا کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں؟ یہ کوٹھیاں، یہ بنگلے، یہ بڑی بڑی حویلیاں سب ہمیں رہ جائیں گی حبیب، آدمی کے ساتھ اعمال کے سوا اس دنیا سے کچھ نہیں جاتا۔ چلتے رہو..... بڑا ہی عارضی ٹھکانا ہے یہ دنیا۔ مگر انسان بہت غافل ہے۔ جاہ و حشم، عزت و اقتدار اور دولت کی ریل پیل دیکھ کر بھول جاتا ہے سب کچھ۔ کوٹھیوں میں رہو کہ جنگیوں میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا حبیب! فرق پڑتا ہے تو صرف اعمال سے۔ جو کچھ خیر کی طلب میں کرتے اور سوچتے ہیں، ہمارے دماغوں میں ڈالنے والا اللہ ہی ہے۔ سو اسی نے ہمارے دماغ میں یہ بات ڈالی کہ تمہاری محرومیوں کا کچھ ازالہ ہو جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ایک غیرت مند آدمی ہو۔ سو اسے بھی قرض حسنہ سمجھ لو۔ کفرانِ نعمت بھی اللہ کو پسند نہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ تم ہماری بات کو رد نہیں کرو گے۔“

پھر حبیب نے مزید کچھ نہیں کہا اور سر جھکا لیا۔ رام سوامی پہنچ کر جب اس نے یہ خبر اپنے گھر والوں کو سنائی تو وہ بھی گنگ سے رہ گئے، لیکن ہوا وہی جو میں نے چاہا تھا۔ اس گھر میں ایسا تھا ہی کیا جسے وہ اپنے ساتھ لے جاتے۔ پھر بھی حبیب کا بڑا بیٹا صالح ضروری سامان لے کر کوٹھی پہنچ گیا۔ کٹھ کباڑ اسی گھر میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

”چلو اس کے پاس، ابھی بات کہی گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن حضور، اس نے تو اب دکان بیچنے سے انکار کر دیا ہے۔ کل ہی شام اس سے میری بات ہو چکی ہے۔“

”عبید اللہ نے اسے یہ بھانسا دیا تھا کہ زیادہ رقم میں اس کی دکان بکوا دے گا۔ تم چلو تو سہی ہمارے ساتھ، اب وہ انکار نہیں کرے گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

”جی بہتر ہے سرکار!“ حبیب یہ کہہ کر میرے ساتھ دوسری گلی میں نکل آیا۔

جہانگیر کو دکان کا سودا کرنے اور میری بات مان لینے میں چند منٹ لگے۔ میرے لئے یہ کون سا مشکل کام تھا۔ میں نے بہ طور بیعانہ دو ہزار روپے اسی وقت جہانگیر کو تھما دیئے۔ حبیب کے پاس اس وقت رقم نہیں تھی۔ بات کہی ہو گئی تو وہاں سے میں نے چلتے ہوئے حبیب کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے قراچہ سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”بالکل یاد ہے سرکار!“ حبیب کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”کیا ابھی وہاں چلنا ہے؟“

”کیوں تمہاری بیوی اور بڑے بیٹے کو اس موقع پر نہیں ہونا چاہئے کیا؟“ میں بولا۔

”تو کیا آپ ان کو ہمارے گھر لے کر آئیں گے؟“ حبیب نے پوچھا۔ ”آپ کو تو خبر ہے سرکار کہ میرا گھر اس قابل نہیں کہ ان جیسا بڑا آدمی وہاں آ سکے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے سرکار کہ شادی سے پہلے ہونے والے داماد کو ہم اپنے گھر نہیں بلاتے۔“

”تمہاری دونوں باتیں قطعی فضول ہیں۔“ حبیب سے یہ کہتے ہوئے اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا گھر کرائے کا ہے کہ اپنا ہے؟“

”کرائے کا ہے سرکار! کبھی اتنے پیسے ہوئے نہیں کہ گھر خریدنے کی سوچا۔“ اس نے جواب دیا۔
”کانپور میں تو تمہارا اپنا گھر ہو گا۔ دکان کے بارے میں تو تم بتا ہی چکے ہو۔ پھر کلیم داخل کیوں نہیں کیا؟“

”سرکار! کوئی ثبوت ہوتا تو کلیم بھی داخل کرتا۔ بھگدڑ چچی تو یہ ہوش ہی نہیں رہا، جان ہی بیچ گئی تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔“

”اب اگر تمہیں کلیم میں کوئی گھر مل جائے تو لے لو گے؟“

”مث..... ثبوت..... کسی ثبوت کے بغیر سرکار؟“ وہ حیرت کی زیادتی کے سبب ہکھانے لگا۔

میں بات کرنے ہی کی غرض سے پیدل ہی اس کے ساتھ رام سوامی کی طرف چل دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ روز پیدل گھر سے جامع کلا تھ مارکیٹ آتا جاتا ہے۔ میں نے اس کے ہمراہ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”حبیب! کسی کو خبر ہو نہ ہو، اللہ کو تو معلوم ہے تم سچے ہو۔ اس کے علاوہ ہم سے بھی تمہارے دل کا حال نہیں چھپا۔ ثبوت تو دنیا والے مانگتے ہیں، خواہ وہ ثبوت جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ بولو ہے نا ایسا؟“

بلیس کیوں کہ طلاق کے بعد عدت میں تھی اس لئے میرے سامنے نہیں آئی۔ ہاں اس کی چھوٹی بہن دیوانی سی ہو کر ساری کوٹھی میں گھوم رہی تھی۔
”ابا! کیا ہم بچ میاں رہیں گے؟“ نفیس جہاں نے اپنے باپ حبیب سے آکر پوچھا جو میرے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھا تھا۔

”ہاں بیٹا! اللہ کی یہ مرضی ہے اور سرکار کا بھی یہی حکم ہے۔“ حبیب نے میری طرف اشارہ کیا۔
”تم گھومتی ہی پھرو گی کیا؟ اندر جا کر اپنی ماں کا ہاتھ بناؤ۔“ قمر احمد آنے والے ہیں۔ اپنی ماں سے کہہ کر صابن کو بازار بھیج کر ناشتے کے لئے کچھ منگوا لیں، شام ہو رہی ہے۔ سرکار نے فرمایا ہے کہ خود قمر احمد کو لے کر آئیں گے۔“
”کیا ابا!“ کہہ کر نفیس وہاں سے چلی گئی۔

معموم سی اس کلی کو دیکھ کر مجھے معاً یوسف کا خیال آ گیا۔ اب اسے میری کوٹھی میں قدم نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ یوں بھی مجھے اس سے ملنا ہی تھا، بتانا تھا کہ میں کچھ عرصے کے لئے کراچی میں جا رہا ہوں۔ اسی خیال کے ساتھ مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ میں نے حبیب سے کہا۔ ”ویسے تو ہم نے شام کی نشست برخواست ہونے کا اعلان کر دیا ہے، پھر بھی ممکن ہے، لوگ ہماری تلاش میں آتے رہیں۔ ان آنے والوں سے تم کتنے رہنا کہ انشاء اللہ جب بھی ہماری واپسی ہوئی دوبارہ ہم خدمت کریں گے۔ اچھا اب ہم قمر احمد کو لے کر آتے ہیں۔“

وہاں سے میں، قمر احمد کی کوٹھی پہنچا تو پہلے یوسف ہی سے ملا۔ اصغری اس وقت دوسرے کمرے میں تھی۔

”یہ تجھے بیٹھے بیٹھے ایک دم کیا سوجھ گئی؟“ یوسف نے میری بات سن کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا پھر لمبے عرصے کے لئے چھڑ جانے کا ارادہ ہے؟“

”ایسی بات نہیں، واپس آؤں گا میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تجھ سے بس اتنا کہنا تھا کہ اب میری کوٹھی میں نہ آنا۔“

”کیوں وہاں کیا ٹونے کسی پردہ نشین کو لا کر بٹایا ہے؟“

”ٹھیک سمجھاؤ۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔
”تجھے اگر کسی کالے کتے نے نہیں کاٹا، تو یقیناً مولوی کفایت اللہ جیسے کسی آدمی نے ضرور کاٹ کھایا ہے ورنہ پہلے اچھا بھلا تھا۔“

میں اس کی بات پر صرف ہنس دیا کہ وہ میرے جذبات سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو یوسف مجھ سے گلے ملا۔

قمر احمد کو خبر ملی کہ میں آیا ہوں تو خود ہی دوڑا دوڑا چلا آیا۔ میں اس وقت یوسف سے مل کر کوٹھی کے اس حصے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں قمر احمد کی سکونت تھی۔

”ہم لان میں ٹہل رہے ہیں، تم لباس تبدیل کر کے آ جاؤ۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“ میں

نے قمر احمد سے کہا۔

اس نے کوئی سوال کئے بغیر کہ کہاں اور کیوں چلنا ہے، اقرار میں سر ہلایا اور تیز قدموں سے عمارت کی طرف چل دیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد جب وہ میرے ساتھ اپنی کار میں سفر کر رہا تھا تو میں نے اسے یاد دلایا۔ ”قمر احمد! اصغری کو طلاق دلانے کے بعد ہم نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا کہ تمہارا گھر آباد کر دیں گے۔ ایک ضرورت کے سبب ہم یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور۔“

”یہ..... آپ کیا فرما رہے ہیں سرکار؟“ قمر احمد بول اٹھا۔ اسے جیسے میری بات پر یقین نہ آیا۔
”پہلے ہماری پوری بات سن لو۔“ میں نرمی سے بولا۔ ”ہم کب واپس آئیں گے، ابھی علم نہیں اسی سبب ان لوگوں سے تمہیں ملنا دینا چاہتے ہیں جن کو تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔“ یہ کہنے کے بعد قمر احمد کو میں نے حبیب کے بارے میں مختصر طور پر بتا دیا، پھر بلیس کے متعلق بھی یہ بات نہیں چھپائی کہ وہ مطلقہ ہے۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”ہماری خواہش ہے کہ عدت پوری ہوتے ہی تم بلیس کو اپنے عقد میں لے لو۔ کیا خبر اس وقت ہم یہاں ہوں کہ نہیں۔“

”حضور کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہیں ہوگی۔“ قمر احمد نے یقین دلایا۔
”خیر یہ بات تو رہی ایک طرف، اب دوسری بات سنو۔ ہمیں حفیظ الرحمان فاروقی سے ملنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری موجودگی میں یہ ملاقات ہو۔“ میں نے وزارت داخلہ کے سیکرٹری کا ذکر کیا۔ ”ہم کل صبح تمہارے دفتر آئیں گے، تم ہمارے ساتھ چلنا۔“

میں نے قمر احمد کے چہرے پر قدرے الجھن کے آثار سے دیکھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہنے کی ہمت نہ ہو۔ مجبوراً مجھے اس کے ذہن کو ٹوٹانا پڑا۔
”تم یہی سوچ رہے ہو کہ تمہاری وزارت کا سیکرٹری اس بات کو پسند کرے گا بھی یا نہیں۔ تو سنو قمر احمد! کسی کی پسند یا ناپسند سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ تم اس لئے بھی فکرمند ہو کہ حفیظ الرحمان فاروقی الگ کینڈے اور مزاج کا آدمی ہے۔ وہ ہر ایک سے ملنا بھی پسند نہیں کرتا اور وقت طے کئے بغیر تو قطعی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ پراسرار باتوں کا اکثر وہ مذاق بھی اڑاتا ہے۔ تم پر بھی برکت علی شاہ کا مرید ہونے کے سلسلے میں ایک مرتبہ طنز کیا تھا۔“ اس کے ذہن میں جو خیالات ابھرے انہی کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ باتیں کیں اور اسے سمجھایا۔ ”اس سے ڈرنے یا جھجھکنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ پہلے قائل نہیں تھا تو اب اسے قائل ہونا پڑے گا۔“

”حضور سے کیا چاہا ہے۔ میرے تذبذب کا سبب یہی تھا۔“ قمر احمد نے اعتراف کر لیا۔
”کل تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ وہ کس طرح ہماری پذیرائی کرتا ہے۔ ہم چاہتے تو اس سے تنہا بھی مل لیتے، مگر ہمارا مقصد کچھ اور بھی ہے۔“ میں نے بات کو فی الحال ادھورا چھوڑ دیا۔ میں پہلے ہی قمر احمد کو بتا چکا تھا کہ کہاں چلنا ہے۔ سو اس نے کار میری کوٹھی کے سامنے ہی لے جا کر کھڑی کی۔ باتوں ہی باتوں میں سفر تمام ہو گیا تھا۔

”حضور! آپ نے ان لوگوں کو اپنی کوٹھی ہی میں بلوا لیا ہو گا، ملوانے کے لئے؟“ قمر احمد نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے مجھ سے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی۔

”نہیں قمر احمد!“ میں نے جواب دیا۔ ”اب یہ کوٹھی ہماری نہیں انہی لوگوں کی ہے۔ وہ یہیں رہیں گے۔ انہیں ہم نے اپنی کوٹھی دے دی ہے اپنے بارے میں تو ہم تمہیں بتا ہی چکے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اب تمہاری یہی سرسراہٹ ہے، ہونے والی سرسراہٹ۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں مسکرا دیا۔ ”آؤ۔“ میں نے اس سے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

قمر احمد کو میں نشست گاہ میں لے آیا جہاں پہلے ہی سے حبیب اور صالح موجود تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ قمر احمد بیالیس برس کی عمر سے کم نہیں ہو گا، مگر اپنے رکھ رکھاؤ سے اتنا لگتا نہیں تھا۔ اگر وہ بے راہ ہوتا تو شاید جسم اتنا چست اور توانا نہ ہوتا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت بارعب تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ اب تیسری مرتبہ اپنے سر پر سہرا سجانے والا تھا۔ حبیب اور صالح، دونوں ہی مجھے اس سے متاثر نظر آئے۔ قمر احمد لباس کے معاملے میں خوش ذوق تھا۔ اس وقت بھی قمر احمد کے جسم پر بے شکن کپڑے تھے۔

”حبیب! تم قمر کی طرف سے ہم ہی کو برا جانو۔“ میں بولا۔ ”تمہیں رشتے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کہنا ہے، ابھی کہہ لو۔“

”سرکار! مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میری طرف سے بھی تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔“ حبیب نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”مروغیرہ کا معاملہ بھی ہمارے سامنے طے ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیوں قمر احمد؟“

”حضور جو حکم بھی فرمائیں، مجھے منظور ہے۔“

”یہ بات ہم نے اس لئے دانستہ چھیڑی ہے کہ عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہوتے۔ مثلاً موجب اور معجل کے فرق کو لوگ عموماً سمجھتے نہیں۔ نکاح کے وقت نہ قاضی ان باتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ لوگ کیوں کہ ان دونوں الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتے اور دونوں کو ہم معنی سمجھ لیتے ہیں، اس لئے نصف موجب اور نصف مہر معجل کہہ دیتے ہیں۔ موجب اور معجل دونوں ہی عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ موجب کا مطلب ہے، مہلت دیا گیا، وقت مقرر کیا گیا، فرصت دیا گیا، یعنی مہر کی ادائیگی میں مہلت دی گئی جس کے لئے کوئی وقت بھی مقرر کیا جاسکتا ہے اور نہیں بھی۔ شوہر جب بھی چاہے مہر ادا کر دے، اس پر شرعی طور پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کے برعکس معجل کے معنی ہیں، جلدی کیا گیا، بے مہلت۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ شوہر کو نکاح کے بعد مہر کی رقم شب عروسی سے قبل اپنی بیوی کو ادا کر دینی چاہئے۔ لاعلمی سے بہر حال کسی بھی مسئلے کا علم بہتر ہے۔ مہر دراصل کوئی سودے بازی نہیں بلکہ اس طرح شرع، یعنی اسلامی قانون کے ذریعے عورت کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم اس طرح تمہیں کوئی درس دے رہے ہیں۔ ممکن ہے تم لوگوں کو بھی ان شرعی مسائل کا علم ہو۔“

میری بات پوری ہوئی تو پہلے قمر احمد ہی بولا۔ ”حضور! خاکسار کو مہر کی بابت ان نزاکتوں کا علم نہیں

تھا۔ میں ممنون ہوں کہ سرکار نے میرے علم میں اضافہ کیا۔“

حبیب تو سیدھا سادا کاروباری آدمی تھا، اس نے بھی تقریباً ایسے ہی الفاظ ادا کئے۔

”مہر کیوں کہ آدمی کی حیثیت دیکھ کر باندھی جاتی ہے قمر احمد!“ میں نے کہا۔ ”اور ماشاء اللہ تم

صاحب حیثیت ہو، اس لئے ہم مہر کی رقم دس ہزار روپے موجب طے کرتے ہیں۔“

اس وقت کو دیکھتے ہوئے یہ خاصی بڑی رقم تھی، مگر قمر احمد نے فوراً اس پر آنا دگی ظاہر کر دی۔

”ہماری نظر میں باقی کوئی ایسا معاملہ نہیں جس کے لئے ہماری موجودگی ضروری ہو۔“ یہ کہہ کر میں

نے حبیب کو مخاطب کیا۔ ”جیز وغیرہ کے لئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ قمر احمد کے پاس اللہ

کا دیا بہت کچھ ہے۔ جو تم سے ہو سکے وہ دے دینا، قمر احمد کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہو گا۔ تمہیں تو

اب نفیس جہاں کی فکر کرنی ہے۔ یوں جانو کہ تم بلیقے کا فرض تو ادا کر ہی چکے۔“

”یہ سب سرکار کی نظر کرم کا نتیجہ ہے، ورنہ تو میں کہاں اور میرے یہ نصیب کہاں۔“ حبیب کی

آواز بھرا سی گئی۔ پھر اس نے صالح کو اشارہ کیا۔

”سرکار ہی کے طفیل تو آپ جیسے نیک طبع لوگوں سے یہ رشتہ قائم ہو رہا ہے۔“ قمر احمد بھی

خاموش رہا۔

صالح جب ناشتا لے کر آیا تو اس کے ساتھ بلیقے کی چھوٹی بہن نفیس جہاں بھی تھی۔ اس نے قمر

احمد کو سلام کیا، پھر حبیب سے سرگوشی کرنے لگی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ حبیب نے اقرار میں سر ہلایا۔ پھر نفیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قمر

احمد سے بولا۔ ”قمر میاں، یہ میری چھوٹی بیٹی ہے، نفیس جہاں۔“

قمر احمد کے لئے نفیس جہاں کے چہرے پر بھی مجھے اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ اپنی بڑی بہن کے

ہونے والے شوہر کو گویا اس نے بھی سلام جیسے ظالم سے ہزار درجے بہتر جانا تھا صرف عمر کا فرق تھا۔ سو

ایسی عمر کا بھی کیا حاصل جو زندگی کو جنم بنا دے۔ جواب میں قمر احمد نے نفیس کو دعا دی۔ ”جیتی رہو۔“

نفیس خوش خوش اندر چلی گئی اور جب دوبارہ لوٹی تو اس کے ساتھ بشرین بھی تھی۔ وہ سر پر چادر

درست کرتے ہوئے آگے بڑھی تو حبیب نے قمر احمد سے اس کا تعارف کرایا۔ قمر احمد اپنی ہونے والی

ساس کے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بشرین نے ایک سو ایک روپے اور ایک رومال، قمر احمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یوں گویا یہ رشتہ پکا ہو

گیا۔

بشرین اندر واپس چلی گئی تو قمر احمد نے حبیب سے کہا۔ ”آپ لوگ بھی تو کبھی غریب خانے پر

تشریف لائیے۔ میں کسی چھٹی کے دن امی اور آپ کو آکر لے جاؤں گا۔“

حبیب مسکرا کر بولا۔ ”وہ تو خیر ٹھیک ہے، قمر میاں! تم کچھ کھاؤ بھی تو۔“

ناشتے کے بعد بلیقے کے سوا سب ہی قمر احمد کو کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے گئے۔ میں بھی ان کے

ساتھ تھا۔

”تو حضور، کل صبح تشریف لارہے ہیں؟“ قمر احمد نے رخصت ہونے سے قبل مجھے مخاطب کیا۔
 ”ہاں انشاء اللہ ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان پہنچ جائیں گے، تم تیار رہنا۔“ میں جواب میں بولا۔

قمر احمد اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا اور ہم سب اندر آ گئے۔ بشیرن کہنے لگی۔ ”سرکار! آپ نے تو ہماری زندگی ہی بدل دی۔ ماشاء اللہ قمر میاں لاکھوں میں ایک ہیں۔“
 ”زندگی بنانے والی ایک ہی ذات برحق ہے بشیرن! ہم تو محض وسیلہ ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ قمر احمد کو تم نے پسند کر لیا۔“ میں بولا۔

”سرکار رات کو جو کھانا چاہیں بتا دیں، صبح کو بھیج کر سودا منگوا لیتی ہوں۔“ بشیرن کہنے لگی۔
 ”تم نہیں تھیں بشیرن تو بھی اللہ ہمیں رزق فراہم کر دیتا تھا۔ ہمارے لئے زحمت کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی آج ہم رات کا کھانا کھیں اور کھائیں گے۔“
 اقرار میں سر ہلا کر بشیرن، نفیس جہاں کو ساتھ لئے چل دی تو حبیب اور صالح بھی مجھ سے قمر احمد کی تعریف کرنے لگے۔

میں اسی روز بعد مغرب خلاف توقع محمود حسن کی کوٹھی پہ پہنچا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ رابعہ کا بھائی راشد بھی مارکیٹ سے آچکا تھا۔

”آج میں رات کا کھانا آپ بن لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا۔“ میں نے بے تکلفی سے کہہ دیا۔
 محمود حسن کی چھوٹی بیوی صائمہ بولی۔ ”مقصود میاں! آج اچانک ہماری یاد کیسے آگئی؟ ہم لوگ تو خود دو ایک روز میں تمہارے یہاں آنے کس سوچ رہے تھے۔“

”بات یہ ہے چھوٹی بیگم صاحبہ کہ.....“ میں نے بتا دیا کہ کراچی سے میں جا رہا ہوں۔
 ”جا کہاں رہے ہو، کچھ تو بتاؤ۔“ رابعہ نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا، پھر بولا۔ ”کوٹھی بھی ایک صاحب کے حوالے کر دی ہے، انہیں ضرورت تھی۔ یہی عرض کرنے حاضر ہوا تھا بیگم صاحبہ! آپ وہاں جائیں اور مجھے نہ پائیں تو حیران نہ ہوں کہ مقصود کچھ کے سنے بغیر جانے کہاں چلا گیا۔“

بتول کو خبر ہوئی تو وہ بھی آگئی۔ ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر اور پرانی یادیں تازہ کر کے میں وہاں سے چلا آیا۔ اب دوسرے دن صرف قمر احمد اور تحسین خان سے ملنا باقی رہ گیا تھا۔ ڈی ایس پی مظفر حسین کو میں بھولا نہیں تھا جسے سینا آلہ کار بنائے ہوئی تھی۔ میں اس کے لئے سزا تجویز کر چکا تھا۔ ہر چند کہ سینا اب اس شر سے جاری تھی اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ وہ مظفر حسین کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر پاتی، پھر بھی ایسے لوگ میرے نزدیک سزا کے مستحق تھے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے مظفر حسین جیسے لوگوں کی وابستگی خطرناک تھی۔ عمر دین لاشاری ایک مفروز ڈاکو تھا، مگر اندر اور باہر ایک سا، وردی کے بغیر اور وردی پن کر ڈاٹ ڈالنے میں فرق تو ہے۔ ڈاکو دونوں ہی تھے لیکن میری نظر میں مظفر حسین بڑا ڈاکو تھا۔ قانون کو عمر دین لاشاری سے بڑا خطہ مظفر حسین سے تھا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر میں، قمر احمد سے ملا تو مجھے ثاقب اور جمیل کا خیال آ گیا۔ اب کھیل کی نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ یہ مہرے کام کے نہیں رہے تھے۔ ان کی نگرانی بے سود ثابت ہوئی۔ نہ سیٹھ عبدالرزاق کراچی میں تھا کہ ثاقب اس سے ملتا اور مجبوری کرتا، نہ مجرموں کو اب یہ ضرورت رہی تھی۔ ایسی کالی بھیڑوں کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی میں خاصی تاخیر ہوتی ہے۔ سو میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تاکہ قمر احمد کو کوئی دشواری نہ ہو۔ میرے ایما پر قمر احمد نے باری باری ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ انہوں نے میرے زیر اثر قمر احمد کو تحریری طور پر لکھ کر دے دیا کہ وہ جرائم پیشہ افراد سے رشوت وصول کرتے رہے ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی کہ مجرموں کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات سے قبل از وقت آگاہ کرتے رہنے کا جرم بھی ان سے سرزد ہوا ہے۔ اس تمام کارروائی میں بہ مشکل آدھا گھنٹا لگا۔ قمر احمد نے اس پر اظہار مسرت کیا، بولا۔ ”سرکار تو ہر مسئلے کو چٹکی بجاتے حل کر دیتے ہیں۔“ پھر اس نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔

”وزارت داخلہ کے سیکرٹری حفظ الرحمن فاروقی سے ملاقات کے وقت تمہاری موجودگی آئندہ کے لئے سودمند ثابت ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”درحقیقت تم جیسے فرض شناس اور ایمان دار افسران خال خال ہیں۔ سیکرٹری لیول کے لوگ اقتدار کے نشے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں پر سختی کر کے وہ ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کرپٹ افراد کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ تمہاری یا تحسین خان کی جگہ وہ کرسیوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ ان کا ہر قدم ذاتی مفاد کے لئے اٹھتا ہے۔ اوپر والوں کو وہ سب ٹھیک ہے، کا گنگل دے کے مطمئن کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود باز پرس کبھی اگر ہوئی بھی تو کرسی بچانے کی خاطر رشوت سفارش کام آ جاتی ہے۔ یہ باتیں تلخ سہی مگر حقیقت پر مبنی ہیں۔ موجودہ کیس میں تم پر جو غیر ضروری سختی اور جواب طلبی کی گئی، اس کے تماز مہ داری تم ہی نہیں تھے۔ کیا محکمہ خوراک کے افسران سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ ہوئی؟“

”جی نہیں حضور! میرے علم و اطلاع کے مطابق ایسا نہیں ہوا۔ اس طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا۔“ قمر احمد نے بتایا۔

”حالانکہ سب سے پہلے اسی طرف توجہ دینے کی ضرورت تھی۔“ میں زور دے کر بولا۔ ”بہرحال اب تو یہ کیس تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ غیر ملکی ایجنٹ مارے گئے۔ انہیں تحفظ دینے والا زیر حراست ہے، اشیائے صرف کا بہت بڑا ذخیرہ حکومت کی تحویل میں آ گیا ہے، اب اسمگلنگ کے لئے یہ راستہ بھی استعمال نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ وجوہ جن اشیاء کی قلت ہو گئی تھی، اب نہیں ہوگی۔ پھر بھی ذخیرہ اندوزوں کی طرف سے خاص طور پر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ تاجر یعقوب جیسے مفاد پرستوں کے خلاف کارروائی کرتے رہنا تمہارا فرض ہے۔“

”یعقوب کی گرفتاری بھی عمل میں آ چکی ہے حضور! میں یہ بات سرکار کے علم میں نہیں لاسکا تھا۔ کل دوپہر کے بعد اسے اس وقت حراست میں لیا گیا جب وہ جوڑیا بازار پہنچا۔ گزشتہ روز شام کو یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی، ورنہ سرکار کو ضرور آگاہ کرتا۔“ قمر احمد نے گویا اپنی صفائی پیش کی اور اس ضمن

میں آئندہ کے لئے مستعد رہنے کا یقین بھی دلایا۔

”اچھا اب اٹھو، تمہاری وزارت کے سیکرٹری سے بھی مل ہی لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اگر حضور کا حکم ہو تو معلوم کر لوں کہ سیکرٹری صاحب اپنے دفتر میں موجود بھی ہیں یا نہیں“ قمر احمد نے مجھ سے دریافت کیا۔

”کر لو معلوم۔“ میں نے قمر احمد کو اجازت دے دی۔

فون پر اس نے سیکرٹری کے پی اے سے بات کی، پھر ریسپور رکھ کر مجھ سے بولا۔ ”سیکرٹری صاحب تو اپنے دفتر میں موجود ہیں، مگر انہوں نے کسی سے بھی ملاقات کو منع کر رکھا ہے۔ ان کے پی اے نے وجہ یہ بتائی ہے کہ اس وقت وہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس شوکت حسین عباسی صاحب سے کسی اہم معاملے پر مینگ کر رہے ہیں۔ اب فرمائیے حضور، کیا کیا جائے؟“

”دی جوبم نے پہلے کہا تھا، یعنی یہ کہ چلو۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

قمر احمد حیرت سے میرے ساتھ چل دیا۔ دفاتی حکومت کے دفتری علاقے میں دور تک پھیلے ہوئے تھے جہاں قمر احمد کا دفتر تھا۔ حفیظ الرحمان فاروقی کے دفتر جانے کے لئے کار کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کا دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔ میری نظر میں سیکرٹری سے ملاقات کا یہ بڑا مناسب وقت تھا۔

اچانک نظروں سے اوجھل ہو جانا یا ایک دم ظاہر ہونا، قمر احمد کے لئے اب کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ میرے بارے میں یہ پراسرار صورت حال اسے حیران تو کرتی مگر پریشان نہیں۔ میں نے وزارت داخلہ کے دفتر میں داخل ہونے سے قبل قمر احمد کو صرف یہ حکم دیا۔ ”تم چند لمحوں میں ٹھہرو، ہم ابھی آتے ہیں۔“ اسی کے ساتھ گویا میں قمر احمد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے جو کام انجام دینا تھا اس کے لئے چند ہی لمحوں کا کافی تھے۔ میں واپس قمر احمد کے پاس آ گیا اور اس سے اندر چلنے کو کہا۔

میں اور قمر احمد جب پی اے کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اٹھتے ہوئے کھٹے لگا۔ ”غالباً آپ ہی محترم مقصود میاں ہیں۔ صاحب نے ابھی مجھے بلا کر حکم دیا ہے کہ قمر احمد صاحب کے ساتھ محترم مقصود میاں تشریف لارہے ہیں۔ دونوں حضرات کو فوراً ان کے کمرے میں بھیج دیا جائے۔“ پی اے مجھ سے مخاطب تھا۔

”ہاں ہمارا نام مقصود میاں ہے۔“ میں بول اٹھا۔

”تو پھر تشریف لائیے محترم..... اور آپ بھی قمر احمد صاحب!“ پی اے نے کہا، پھر خود سیکرٹری کے کمرے تک ہماری رہنمائی کی۔

پی اے کو ہمارے ساتھ آتے دیکھ کر چہرہ اسی اشارہ پاتے ہی ایک طرف ہو گیا۔ پی اے نے خود آگے بڑھ کر ہمارے لئے دروازہ کھولا۔

”قمر احمد صاحب کے ساتھ محترم مقصود میاں تشریف لے آئے ہیں سر!“ پی اے بولا اور ہمیں اندر جانے کے لئے راستہ دیا۔

بڑی سی میز پر چھوٹا سا سبز ہلائی پرچم ایک طرف رکھا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا ادیبز عمر شخص اٹھا۔ یہی وزارت داخلہ کا سیکرٹری حفیظ الرحمان فاروقی تھا۔ جس شخص کی پشت دروازے کی طرف تھی، اس نے بھی سیکرٹری کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس شوکت حسین عباسی کو بھی میں نے پہچان لیا۔ چہرے سے وہ مجھے سخت گیر معلوم ہوا۔ حفیظ الرحمان فاروقی نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور شوکت حسین عباسی سے بھی تعارف کرایا، کہنے لگا۔ ”شوکت صاحب! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ محترم مقصود میاں خود ہمارے دفتر میں تشریف لائے ہیں۔“

”بلاشبہ! میں نے بھی حضرت کا نام سنا ہے۔ آج شرف ملاقات بھی حاصل ہو گیا۔“ شوکت حسین عباسی کے لہجے سے بھی عقیدت کا اظہار ہو گئی۔

پھر جب میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ دونوں بیٹھے قمر احمد نے میرے برابر والی کرسی سنبھال لی۔

”بڑے ہی اچھے وقت پر آئے ہیں سرکار!“ حفیظ الرحمان فاروقی مجھ سے مخاطب ہوا۔ وہ اور شوکت دونوں ہی اس وقت میرے اثر میں تھے۔ فاروقی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اگر حضور کی اجازت ہو تو گفتگو جاری رکھی جائے؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ہم اسی لئے تو آئے ہیں۔“ میں نے کہہ دیا۔

”مشرقی پاکستان سے بھی کچھ اسی طرح کی رپورٹس ملی ہیں جن سے ہم یہاں نبرد آزما ہو چکے ہیں۔“ حفیظ الرحمان فاروقی نے بتایا۔ ”محترم وزیر داخلہ نے حکم دیا ہے کہ اس سلسلے میں انٹیلی جنس کے محکمے کو بھی فعال رکھا جائے۔ شوکت صاحب کے ڈپٹی ڈائریکٹر بدرالدین وہاں ڈپوٹ ہیں۔ ان کا تعلق مشرقی پاکستان ہی سے ہے۔ شوکت صاحب سے.....“

”یہ رپورٹس ملے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟“ میں نے حفیظ الرحمان فاروقی کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”تقریباً ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے سرکار!“ سیکرٹری نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ ”وہاں سے بھی اشیائے صرف غائب ہو رہی ہیں۔“

”اب نہیں ہوں گی۔“ میں پُر سکون آواز میں بولا۔ ”یہ پرانی بات ہو گئی اب۔ اس پر کوئی ایکشن لینے کی ضرورت نہیں رہی۔“

فاروقی اور عباسی دونوں ہی نے اس پر شدید حیرت کا اظہار کیا۔ پھر فاروقی بولا۔ ”سرکار کہتے ہیں تو پھر یہ بات ٹھیک ہی ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے مشورہ طلب نظروں سے عباسی کی طرف دیکھا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس شوکت حسین عباسی نے بھی وزارت داخلہ کے سیکرٹری کی بات سے اتفاق ہے۔

”ہم خود جارہے ہیں وہاں۔“ میں نے کہا۔ ”جو ہو گا دیکھ لیں گے۔“

”ایک درخواست کرنی تھی سرکار سے۔“ حفیظ الرحمان فاروقی نے میرے زیر اثر کہنے لگا۔ ”اگر قبول افتد زہ عزد شرف۔“ پھر اس نے جو کچھ کہا، میری مرضی کے مطابق ہی تھا۔

مرکزی حکومت کی طرف سے مجھے خصوصی اختیارات حاصل ہو گئے۔ ان اختیارات کی رو سے وزارت داخلہ کا ہر محکمہ میرے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور تھا۔ سیکرٹری داخلہ کے علاوہ ٹائپ کئے ہوئے

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنی خواب گاہ میں آرام کرتے ہوئے میں نے سینٹا کا تصور کیا۔ وہ اس وقت مجھے محو پرواز نظر آئی۔ وہ ایک غیر ملکی نضائی کمپنی کا طیارہ تھا جس میں سینٹا سفر کر رہی تھی۔ اس طیارے کو شام ہونے سے قبل ڈھاکا پہنچ جانا تھا۔ شام ہونے تک میں نے آرام کیا۔ حبیب کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ممکن ہے آج روانہ ہو جاؤں، سو وہ شام سے قبل ہی کوٹھی لوٹ آیا۔

مقصود کی حیثیت سے مجھے جن اشیاء کی ضرورت تھی، انہیں میں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ آدم زادوں کے درمیان وہ کہ اب مجھے ان تمام باتوں کی خبر ہو چکی تھی۔ ان تمام احتیاطی تدابیر پر میں اس لئے بھی عمل کرتا کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ میں بہر صورت آدم زاد ہی نظر آؤں۔ میں نے کوٹھی کی نشست گاہ ہی میں حبیب، بشیرن، صالح اور نفیس جہاں کو الوداع کیا۔ انہیں میں نے کوٹھی کے گیٹ تک ساتھ چلنے سے منع کر دیا۔ بلقیس سے میں دانستہ عدت میں ہونے کے سبب نہیں ملا۔ نشست گاہ سے نکل کر گیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے انسانی قالب ترک کر دیا۔

☆=====☆=====☆

ڈھاکا ایئرپورٹ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر وہ نو منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا جس میں سینٹا ٹھہری ہوئی تھی۔ ایئرپورٹ روڈ پر اسی ہوٹل کے سامنے چار منزلہ شاہ باغ ہوٹل تھا۔ عارضی طور پر میں نے یہ حیثیت مقصود اسی ہوٹل میں قیام کیا تھا کہ سینٹا سے قریب رہ سکوں۔ ڈھاکا پہنچنے ہی میں نے سینٹا کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اسے ڈھاکا پہنچنے ابھی ایک گھنٹا ہوا تھا۔ فون پر وہ اپنی ڈھاکا آمد سے فلوڈپڑجی کو آگاہ کر چکی تھی۔

میں جب سینٹا کے کمرے میں ظاہر ہوا تو وہ ہاتھ روم سے غسل مکلا کے نکل رہی تھی توقع کے مطابق وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھی تو میں بولا۔ ”دیکھ لے سینٹا! پہنچ گیا نا میں۔“

”ٹوکس فلائٹ سے آیا کبھی؟“ اس نے بھیگے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ ”میری معلومات کے مطابق تو اس وقت کوئی فلائٹ نہیں آتی۔“

میں اس کی لاعلمی پر ہنس دیا اور کہا۔ ”بھئی! ورگا دیوی کے داسوں کو کسی الائنڈ فلائٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”اب مجھ پر زیادہ رعب نہ بھاڑ۔“ وہ مسکراتی ہوئی کرسی پر آ بیٹھی۔ ”تو بھی اسی فلائٹ سے آیا ہو گا جس سے میں آئی ہوں۔“

”تو نظر آیا ہو تا تجھے۔“ میں اس کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔

”مسافروں کی نظروں سے چھپ کر ٹوٹنے ٹکٹ کے پیسے بچا لے ہوں گے، بس اتنی سی بات ہے جس کا ٹوٹنا نہ بتا رہا ہے۔“

”بڑی تیز ہے تو۔“ میں اس طرح بولا جیسے سینٹا کا اندازہ درست ہو۔

”کہاں ٹھہرا ہے تو؟ اسی ہوٹل میں آ جا۔“ اس نے سوال کرنے کے ساتھ پینکشن بھی کی۔

اس اختیار نامے پر ضمناً اسی ٹکٹ کے دو اعلیٰ افسران نے بھی دستخط کر دیئے۔ ان میں سے ایک ڈائریکٹر انٹیلی جنس اور دوسرا ڈائریکٹر انٹیلی کرپشن تھا، یعنی شوکت حسین عباسی اور قمر احمد! میں نے اسی عرصے میں قمر احمد کے لئے بھی راہ ہموار کر دی۔

پہلے فاروقی اور پھر عباسی، دونوں ہی کو میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا، لیکن اب اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ ان دونوں کے دل و دماغ میں میرے لئے انتہائی احترام اور عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سیکرٹری داخلہ نے مجھے مدارات کے بغیر اٹھنے نہ دیا۔ قمر احمد میرے ساتھ وزارت داخلہ کے دفتر سے باہر نکلا تو بے حد خوش تھا۔ اسے رخصت کر کے میں نے وہاں سے پولیس ہیز آفس کا رخ کیا۔

ڈی ایس پی مظفر حسین کو تلاش کرنے میں مجھ کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اسے میں نے اپنے اثر میں لے کر استعفیٰ لکھوایا اور پھر تحسین خان سے ملا۔ جب اسے میں نے یہ بتایا کہ مظفر حسین اس کے پاس استعفیٰ لے کر آنے والا ہے تو وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”لیکن حضور! اس کے ریٹائرمنٹ میں تو اب صرف دو سال رہ گئے ہیں، وہ یہ حماقت کس طرح کر سکتا ہے۔ استعفیٰ دینے کی صورت میں تو اسے خاصا مالی نقصان ہو گا۔“

”لیکن اس طرح تمہارا محکمہ تو مزید نقصان اٹھانے سے بچ جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس رشوت خور اور ابد بردار شخص کے لئے خود میں نے یہ سزا تجویز کی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے تحسین خان کو مظفر حسین کے چہرے کی اصل جھلک دکھا دی، پھر آخر میں تاکید کی۔ ”تمہیں اپنے ارد گرد سے غافل نہیں رہنا چاہئے ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ یہ کیا طریقہ کار ہو گا کہ کربٹ لوگوں کو ہیڈ آفس میں جمع کر لیا جائے۔ اپنے اقتدار کو دائم و قائم رکھنے کی خاطر انگریزوں نے جو قوانین وضع کئے تھے، ان کی رو سے تمہارے ٹکٹ کو جو غیر ضروری اختیارات حاصل ہیں، اب انہیں بدلنے کی ضرورت ہے۔..... مگر یہ معاملہ تمہارے دائرہ اختیار میں نہیں آتا، سو ہم اس پر بحث نہیں کرتے۔ ابھی تو اس نوآئیدہ مملکت کو ہر شعبے میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ابھی اس ملک سے محبت کرنے اور اس کی تعمیر کرنے والے زندہ ہیں۔ خدا کرے انہیں اتنی مہلت مل جائے کہ وہ اس ملک کی بنیادیں مضبوط کر جائیں۔ سازشی ٹولا صرف غیر ملکی تخریب کاروں ہی پر مشتمل نہیں تحسین خان، اس میں گھر کے بھیدی بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ فعل بد خود کرتے ہیں اور لائن شیطانی پر پڑھتے ہیں۔ شیطان تو خود ان کے اندر چھپا ہوا ہے۔ یہ شیطان کے آلہ کار ہی تو ہیں۔“ ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ سنتری نے شیطان کے ایک آلہ کار کی آمد سے مطلع کیا۔

”بھجج دوا سے۔“ تحسین خان نے مظفر حسین اور کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

مظفر حسین اندر آیا تو کسی سحرزدہ شخص کی طرح دکھائی دیا۔ ڈی آئی جی تحسین خان نے اس کا استعفیٰ قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ مظفر حسین نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی بیٹ کھول کر میز پر رکھ دی، اسی کے ساتھ اپنا سروس ریوالور وغیرہ بھی۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

رخصت ہونے سے قبل میں نے تحسین خان کو بھی آگاہ کر دیا کہ میں ڈھاکا جا رہا ہوں۔ وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آیا اور میں دابوں کو ٹھکی میں آ گیا۔

”کراچی میں کہاں ٹھہرا ہوا تھا، معلوم ہے تجھے؟“

”وہاں کی بات اور تھی، یہاں تو نیا نیا آیا ہے تو۔“ وہ کہنے لگی۔

”اور دیکھ لے اس کے باوجود فوراً ڈھونڈ کر پہنچ گیا تیرے پاس۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تو یہاں آتے ہی اپنے گرو گھنٹال کو اپنی آمد کی خبر دے چکی ہے۔“

”تو نے ونود جی کو گرو گھنٹال کا نام خوب دیا۔“ اس کی حترم ہنسی کمرے میں گونجی۔ پھر اس نے بتایا۔ ”آج رات ان سے ملنا ہے مجھے۔“

”راتوں کو لوگوں سے ملنا نہیں چھوڑے گی تو، کیوں ری؟“

”اور تو بھی میرا پیچھا کرنا نہیں چھوڑے گا، کیوں رے؟“ وہ بھی میری ہی طرح بولی۔

”تیرا پیچھا تو میں پاتال تک کروں گا۔ خیر چھوڑاں باتوں کو۔ یہ بتا تو نے کیا اندازہ لگایا کہ گرو گھنٹال نے کیا سوچ رکھا ہو گا، اس جنگ کے بارے میں اس کے لئے وہ راہ.....“

”خود ہی پتا چل جائے گا، ان سے مل کر۔ میں تو بہت دن بعد یہاں آئی ہوں۔ یہاں کی مجھے کچھ خبر ہی نہیں۔“ سنیتا بول اٹھی۔

”تجھے بتایا ہے اس نے کہ خود آئے گا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”مجھی کو بتایا ہے اپنی کوٹھی پر۔ یہاں سے ان کی کوٹھی زیادہ دور بھی نہیں۔ تچ گاؤں میں رہتے ہیں وہ۔ یہاں کا یہ صنعتی علاقہ ہے۔“ سنیتا مجھے تچ گاؤں کے بارے میں بتانے لگی۔ ”اس علاقے میں کپڑے کی بڑی بڑی ملیں، بڑے بڑے ورک شاپ، اسٹیل ملز، اناج کے سرکاری گودام وغیرہ بھی ہیں۔ یہاں زیادہ تر سرکاری صنعتیں ہیں۔“

”بڑا اچھا علاقہ چنا ہے، تیرے گرو نے یہاں رہنے کے لئے۔“ میں نے خود کو چونک اٹھنے سے روکا۔ ایسے علاقے میں غیر ملکی تخریب کاروں کے سرغنہ کی سکونت میرے خیال میں شدید خطرے کی علامت تھی۔ اناج کے سرکاری گوداموں کی وہاں موجودگی بھی میرے لئے منفی خیزی تھی۔ میں سوچنے لگا اشیائے صرف کی قلت کا کھیل شاید یہاں بھی کھیل گیا ہے۔

”مجھے یقین ہے سکھ بیر کہ تو بھی میری طرح کچھ دن میں ونود جی کی عقل مندی اور دوراندیشی کا قائل ہو جائے گا۔“ سنیتا بولی، پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا اور مجھ سے کہنے لگی۔ ”تجھے میری ٹوہ میں وہاں پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ونود جی کو شبہ ہو جائے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے چونک کر سوال کیا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ سنیتا اور ونود چر جی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لوں۔

”بھول گیا کیا ونود جی، درگا دیوی کے داس بھی ہیں۔ تجھے میں نے بتایا تھا نا۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“ میں حقیقت سے آنکھیں کی خاطر بولا۔

”انہیں اپنی کوٹھی میں تیری موجودگی کا ہٹا لگ سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے، انہوں نے حفاظت کے خیال سے اپنی کوٹھی کے گرد پری دمی (حصار) بنا رکھی ہے۔ کوئی بھی اس گھیرے کو توڑ کر اندر آتا ہے تو

ان کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اب سمجھ میں آئی میری بات؟“ اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”تجھے سے کس نے کہہ دیا کہ یہ ارادہ تھا میرا۔“ میں صاف مکر گیا۔

وہ مسکرائی۔ ”اب تجھے اتنا تو سمجھنے ہی لگی ہوں میں۔“

سنیتا سے یہ جاننے کے بعد میں نے فی الحال اس طرح کا کوئی خطرہ مول لینا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا خبر اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے۔ بوڑھا گھاگ ونود چر جی، سنیتا کو جو احکام بھی دیتا یا ”اصل جنگ“ کے بارے میں جو کچھ بتاتا، سنیتا سے مجھے معلوم ہو جاتا۔

”میں تو بس ایک نظرا سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی تو نے اتنی تعریف کی ہے۔“ میں نے کہہ دیا۔ ”تجھے یہ منظور نہیں تو نہ سہی۔“

”اس کا موقع بھی آ ہی جائے گا کہ تو ونود جی کو دیکھ لے۔ وہ کوٹھی سے باہر بھی تو نکلتے ہیں۔“

”کوٹھی سے نکل کر شاید وہ کسی کوٹھے پر جاتے ہوں گے۔“ میں نے سنیتا کو جان کر جھجڑا۔ یوں بھی میں بڑھے کی اس حرکت سے تپ گیا تھا کہ اس نے اپنی کوٹھی کے گرد حصار کھینچ رکھا تھا۔

”یہ شوق نہیں ہے انہیں۔ ورنہ تو کوئی کی نہیں ان کے لئے۔ مجھے خبر ہے سکھ بیر کہ تو ونود جی کو برا بھلا کہہ کر مجھ کو آزما رہا ہے۔ پر میں ان کا احترام کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔“

میں اس وقت سنیتا سے رات کو ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ ونود چر جی سے اس کی ملاقات آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہو گئی۔ اسی سبب اس سے میرے دس بجے کے بعد آنے کو کہا تھا۔ وہ شہر میرے لئے واقعی نیا ہی تھا، سو میں رات ہونے تک ضروری معلومات حاصل کرتا رہا۔ کسی آدم زاد کے لئے اتنی جلدی اس شہر کے سارے علاقے دیکھ لینا یقیناً ممکن نہ ہوتا۔ اسی عرصے میں مجھے ایک جگہ سے فرار بھی ہونا پڑا۔ پرواز کرتا ہوا میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں میرے ہی ہم جنس آباد تھے۔ ان کی پوچھتے ہی میں وہاں سے نکل آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی قوی جن زاد سے خواہ مخواہ میری ٹھن جائے۔ کسی اجنبی زاد کو اپنی آبادی میں دیکھنا یقیناً وہ پسند نہ کرتے۔ یہ لال باغ کا علاقہ تھا۔ یہاں ایک مشہور قدیم قلعہ ہے جو لال باغ ہی کہلاتا ہے۔ یہیں مغلیہ تاج دار جمائیکر کی ایک بیٹی کا مقبرہ بھی ہے۔ جمائیکر کی بنوائی ہوئی ایک سرگ بھی قلعے میں ہے۔ اسی قلعے سے ذرا فاصلے پر مغل سردار شائستہ خان کا قلعہ بھی کبھی تھا جو منہدم ہو چکا ہے، اسی قلعے کے کھنڈرات میں جن زاد آباد تھے۔ لال باغ کی آبادی ان کھنڈرات سے دور ہے۔ اسی آبادی میں شائستہ خان نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی جسے میں نے صبح حالت میں دیکھا۔

ڈھاکا شہر کے بارے میں تمام معلومات اکٹھی کر کے میں دس بجے رات کو سنیتا کے ہوٹل پہنچا۔ مجھے توقع تھی کہ اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ محض چھیڑ خانی کی خاطر ظاہر ہونے سے پہلے میں نے ایک ایسی حرکت کی جو مجھے مہنگی پڑی۔ اسے ڈرانے کے لئے میں کسی دندے کی طرح غرا کر اس کی طرف جھپٹا۔ اسی عرصے میں تیزی سے اس کے ہونٹ ہلے اور میں جیسے کسی آہنی دیوار سے ٹکرا کر دور جاگرا۔ وہ مسہری پر نیم دراز تھی، ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔ وقتی طور پر اس سے مجھے اذیت تو

ہوئی، لیکن کام کی ایک بات پتا چل گئی۔ سیتا کو غافل جان کر اس پر حملہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ سیتا آفت کی پرکالہ ہے۔

”تو جو کوئی بھی ہے میں تجھے نشت (فنا) کر دوں گی۔“ سیتا کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیتی، میں ظاہر ہو گیا اور بولا۔ ”تو مجھے پہلے ہی فکا کر چکی ہے اب اور کیا فکا کرے گی۔“

”ارے سکھ بھرا! وہ آلتی پالتی مار کر آسن جساتے جساتے رک گئی۔“ یہ تیری حرکت تھی؟“

”کون سی حرکت؟“ میں انجان بن گیا۔ ”میں تو جب یہاں پہنچا تو تجھے غصے میں بولنے دیکھا۔“

”تو نہیں تو پھر کون تھا وہ جو میرے اوپر وار کرنے کو جھپٹا تھا؟“ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”لگتا ہے تیری عقل ماری گئی ہے۔ میں اور تجھ پر وار کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھا اور مسمری کے سر ہانے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”وہ کوئی تھا ضرور۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”اور آج رات کو میں اس کا پتا کر لوں گی۔“

”کیسے پتا لگائے گی اس کا؟“ بہ ظاہر میں پرسکون آواز ہی میں بولا، لیکن اپنی حماقت پر مجھے ہچکتاوا محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ کون سی مشکل بات ہے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہو رہی ہے کہ تو درگا دیوی کا داس ہو کر یہ پوچھ رہا ہے۔ ارے بھگے! ٹھیک آدھی رات کو درگا کا چالیسی لگنا پڑھوں گی اور پھر مجھے گیان ہو جائے گا“ وہ کون ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کوئی بھوت (جن) تھا۔ اس کی غراہٹ غیر انسانی ہی تھی۔ چالیسی ٹھکنے کے چالیس شبہ (الفاظ) کوڑوں کی طرح اس پر برسیں گئے۔ پھر آئندہ کے لئے وہ میرے قریب آنے سے توبہ کر لے گا۔“

سیتا میرے ہی سامنے مجھے سزا دینے کا ذکر کر رہی تھی، سو میں نے کہا۔ ”وہم ہو گا تیرا“ چالیسی ٹھکنے کی خبر تو مجھے ہے، لیکن یہ الفاظ تو صرف بھوتوں پریتوں کے لئے ہوتے ہیں۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ بھوت ہی رہا ہو۔ کیا معلوم وہ کسی کی بھٹکی ہوئی آتما (روح) ہو۔“ میں نے اسی کے عقیدے کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمانہ کیا۔

آدم زاد کسی بھی مذہب اور عقیدے کے ہوں، ان میں ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ہم جن زادوں کے لئے خطرہ بن سکیں۔ یا ہمیں کسی اذیت میں مبتلا کر دیں۔ میں اسی لئے سیتا کو دم دلا سا دے کر اس سے روک رہا تھا۔ میں اگر یہ اعتراف کر لیتا کہ مجھ ہی کو شرارت سوچھی تھی تو بھی بات نہ بنتی۔ اس ظالم نے میری غیر انسانی غراہٹ سن لی تھی۔ یوں وہ میری طرف سے شک میں پڑ جاتی میرے سارے کئے کرائے پر اس طرح پانی پھر جاتا۔

میرے سمجھانے پر بھی سیتا نہیں مانی اور کہنے لگی۔ ”سکھ بھرا! وہ کسی کی بھٹکی ہوئی آتما ہو کہ کوئی بھوت پریت، میں اسے سزا ضرور دوں گی۔“

”تو جان!“ مجھے مایوس ہو کر کہنا ہی پڑا، پھر اس سے معلوم کیا۔ ”ہاں یہ بتا دودو جی سے تیری کیا

بات ہوئی؟ انہوں نے تجھے بتایا کہ آگے ان کے کیا ارادے ہیں؟“

”یہ تو دودو جی کبھی نہیں بتاتے۔ بس ان کے حکم پر عمل کرتے رہو تو سب کچھ خود ہی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ یہی ان کا اسٹاکل ہے۔“

اس پر میں چڑسا گیا اور جھنجھلا کر پوچھا۔ ”تجھے کچھ تو حکم ملا ہو گا“ اسی سے اندازہ کر لیتی۔ ویسے تو ہڈی عقل کی پتلی بنتی ہے تو۔“

وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ ”تو اس میں اتنے پٹنگے لگنے کی کیا بات ہے۔ تو کس لئے جل بھن گیا؟“

”اس لئے کہ میری پریکھا ہو کر تجھے کسی اور کے اشاروں پر ٹانچنا پڑ رہا ہے۔“

”تجھ سے تو میں نے کراچی ہی میں کہا تھا سکھ بھرا کہ تیری مرضی نہ ہو تو سب کچھ تیاگ (چھوڑ) دوں۔ تو نے ہی تو ہابی بھری تھی کہ.....“

”بس بس رہنے دے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”بتاتی کچھ نہیں، پسیلیاں بھجوا رہی ہے۔“

”تو کچھ بولنے تو دے مجھے۔“ سیتا نے کہا۔ ”ابھی تو دودو جی نے مجھے صرف ایک کام سونپا ہے۔ تجھے بتاتی ہوں میں۔ تو ہی بتا دے اس سے کچھ پتا چل سکتا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ مجھے کل شام گرین کلب میں ایک نوجوان حمید چوہدری سے ملنا ہے۔ دودو جی نے اس کی تصویر بھی دکھادی تھی مجھے کہ اسے بچان لوں۔ حمید چوہدری کو دس ہزار روپے دینے ہیں مجھے، کام ختم۔“

”یہ کام تو کوئی بھی معمولی آدمی کر سکتا ہے“ پھر تجھی سے ایسا کرنے کو کیوں کہا گیا؟ اس کی وجہ سوچتی تو شاید اصل بات سمجھ میں آجائی۔“

”اصل وجہ سے کیا مطلب ہے تیرا؟“ سیتا نے حیرت سے پوچھا۔

”اس نوجوان کو چارہ ڈالنا اور کیا۔ صرف پیسے سے کام نہیں چل رہا ہو گا۔“

”آگیا پھر تو انہی باتوں پر۔ دودو جی نے تو کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا ابھی۔ نہ یہ بتایا کہ حمید چوہدری ہے کون۔“

”تو کیا ہوا۔ بعد میں اشارہ مل جائے گا۔ پہلے وہ نوجوان چارہ دیکھ بھال تو لے۔“

”سکھ بھرا تو مجھے مسلسل چارہ کہہ کر میرا ایمان (توہین) کر رہا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

”ہجی بات کڑوی ہی لگتی ہے۔ میں تو یہی سمجھا ہوں کہ گرد گھٹال نے تجھے ایسے ہی کاموں کے لئے مہیاں ملایا ہے۔ تیری زلف گرہ گیر کا ایک شکار افضل بھی تو ہمیں اسی شہر میں موجود ہے۔ ابھی اس سے ملنے کا حکم نہیں ہوا؟ تو نے ہی تو مجھے بتایا تھا کہ اس سے بھی بہت سے کام نکالنے ہیں۔“

”وہ تو میں نے خود ہی دودو جی کو یہ دھیان دلایا تھا۔“ سیتا نے میرے طویہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ ”ملک افضل سے کل صبح ملنے جاؤں گی۔“

”اور پھر وہ تجھ سے رات کو ملے یہاں آجائے گا۔“ میری آواز میں اب بھی جھین تھی۔

”کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ رات کو آئی جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے نظریں چرانے لگی۔

میرے وجود پر کوڑے برستے رہے اور میں ناقابل برداشت تکلیف سے چنٹا رہا۔ اسی عرصے میں ایک جنیہ کی آواز میری سماعت سے گزرائی۔ ”کیا ہوا تجھے؟ کیوں چنٹے جا رہا ہے؟ کیا کسی آدم زاد نے تیری یہ حالت بنا دی ہے؟ بتا کیا بات ہے؟ میرا باپ عزتیل عالم ہے، میں اسے لے کر آتی ہوں۔“

جواب میں چنٹنے کے سوا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شدید اذیت کے سبب مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ مجھے گنتی بھی یاد نہ رہی کہ کتنے کوڑے اور باقی ہیں۔ میرے ہوش و حواس کھم ہو گئے۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو سرسبز و شاداب ایک جھیل کے کنارے پڑا دیکھا۔

”اے میرے باپ عزتیل! اس اجنبی جن زاد کو ہوش آ گیا ہے۔“ جنیہ کی آشنا آواز پھر میں نے سنی۔

قریب ہی ایک درخت کی شاخیں ملیں اور ایک ضعیف العرجن زاد کود کر میرے پاس آ گیا۔ اس نے جنیہ کو مخاطب کیا۔ ”اے میری بیٹی سوی! اس اجنبی جن زاد کا وجود جگہ جگہ سے جھلس گیا ہے۔ اس جھیل میں اتر جا اور اس کی تہ سے کچھ نکال کر لے آ۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ زندہ بچ گیا۔“

میں نے پہلی بار سوی کی طرف دیکھا ابھی تک مجھے قرار نہیں تھا۔ مجھ سے ہمدردی کرنے والی جنیہ اپنے باپ کے حکم پر جھیل میں اتر گئی۔ وہ خوب رو بھی تھی اور نازک اندام بھی۔ مجھے وہ اپنی طرح نوجوان ہی محسوس ہوئی۔ اس کی عمر چھ سات سو سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے تقریباً تین چار سو برس چھوٹی ہی ہو گی۔

سوی جھیل کی تہ سے کچھ نکال کر لے آئی تو اس کے باپ نے کوئی عمل پڑھتے ہوئے میرے وجود کے جھلے حصوں پر کچھ مل دی۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر رہی ہو۔ ذرا سی دیر میں جب مجھے قرار آ گیا تو عزتیل نے اپنی بیٹی سوی سے کہا۔ ”اب اس کی زندگی کو خطرہ نہیں رہا۔ تو اس کی دیکھ بھال کرتی رہ۔ زوال کا وقت گزر چکا ہے اور مجھے تہجد پڑھنا ہے۔ دیکھ اسے شرکی طرف نہ جانے دیجو ورنہ جس آدم زاد یا آدم زادی نے اس کا یہ حال بنا دیا ہے، جانے اس کا اور کیا حشر کرے۔“

عزتیل چلا گیا تو سوی میرے پاس بیٹھ گئی اور مجھے محبت سے دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔ ”اے اجنبی جن زاد تیرا نام کیا ہے؟“

”علیائش۔“ میں نے بتایا۔

”اے علیائش! کیا کسی آدم زاد سے تُو نے دشمنی مول لے رکھی ہے؟“ سوی نے بہ دستور ہمدردی سے پوچھا۔

”وہ ایک آدم زادی تھی جسے غلطی سے میں نے ڈرانا چاہا تھا۔ میرا مقصد اسے اذیت پہنچانا نہیں تھا۔ بس وہ خفا ہو گئی۔“

”کوئی جادوگر بنی ہو گی وہ۔ ایسی آدم زادیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں، ان کے قریب نہیں جانا چاہئے۔“ سوی مجھے سمجھانے لگی، پھر پوچھا۔ ”کیسے تُو ان جن زادوں میں سے تو نہیں اے علیائش جو

میں نے دانستہ سنیٹا سے نہیں پوچھا کہ ملک افضل سے کیا کام نکالنے ہیں۔ اب اس کی کیا ضرورت نہیں رہی تھی۔ آئندہ روز صبح جب سنیٹا اس سے ملتی تو خود بہ خود یہ عقدہ کھل جاتا۔ اگرچہ سنیٹا کا ذہن پڑھنا میرے لئے ممکن نہیں تھا تو جو لوگ اس کے رابطے میں آتے، ان سے تو مجھے بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ اگلے دن سنیٹا کو دو افراد سے ملنا تھا۔ ملک افضل کا ذکر تو میں، کراچی ہی سے سنیٹا آ رہا تھا، دوسرا نوجوان حمید چوہدری میرے لئے نیا تھا۔ یہ صورت حال واضح نہ ہونے کے باوجود کہ غیر ملکی تخریبی عناصر یہاں کیا کھیل کھیلنے والے تھے، میرے لئے راہ استوار ہوتی جا رہی تھی۔ سنیٹا کو مزید پیشانی سے بچانے اور زیر دام رکھنے کی خاطر میں نرمی سے بولا۔ ”او سنیٹا! میں تیری مجبوریاں سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تُو سنی سادتری نہیں۔ پھر بھی جانے کیوں سب کچھ جان لینے کے باوجود تُو میرے من سے اترتی نہیں۔ جانے کیسی پیاس ہے جو نہیں بجھتی، کیسی آگ ہے کہ ٹھنڈی نہیں پڑتی۔“

سنیٹا نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں تو اس مرتبہ میں بوکھلا سا گیا۔ کم ہی آدم زادیوں کی آنکھوں میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ آدم زاد تو آدم زاد کوئی جن زاد بھی جس کے اثر میں نہ آ جائے۔ اس کے لب ساکت تھے اور آنکھیں بول رہی تھیں۔

”میں..... میں چلتا ہوں اب۔“ گھبرا کر میں نے کہہ ہی دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بندہ تو دراصل وہی ہے جو دیر انداز پراسا کھڑا رہے اور دم نہ مارے۔

”کیوں ڈر گیا کیا؟“ وہ شاید میری کیفیت بھانپ گئی۔

”ہاں سنیٹا! تجھ سے بھی ڈرتا ہوں اور اپنے آپ سے بھی کہ میری ساری تپیا (ریاضت) بھگ نہ ہو جائے۔ تُو مجھے اس طرح..... ایسی نظروں سے نہ دیکھا کر۔“

”خمار سا ہو جاتا ہے تجھے، ہے نا؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی تو اس کا جسم کسی کمان کی طرح کھینچ گیا۔

جام سے توبہ شکن تھا اور میری توبہ جام شکن، مگر میں اپنے سامنے ٹوٹے ہوئے ”پیانوں“ کا ڈھیر دیکھنے وہاں مزید رکنا نہیں کہ مجھے یہ منظور نہیں تھا۔

جب اس رات بارہ بجنے والے تھے تو مجھ پر وحشت سی سوار رہنے لگی۔ سنیٹا کے الفاظ میری سماعت میں گونج رہے تھے۔ ”وہ کوئی بھگی ہوئی آتما ہو کہ بھوت پریت، میں اسے سزا ضرور دوں گی۔“ اور سزا بھگتنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ سزا سے کس طرح بچوں؟ یہی سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کئے جا رہا تھا۔ وہ جو میرے عشق کی دعوے دار تھی اور جسے میں پوری طرح شیشے میں اتار چکا تھا، وہی عذاب جاں بننے والی تھی۔ آدم زادوں کے ساتھ ذرا سی شرارت بھی کبھی رنگ لے آتی ہے۔

معلوم نہیں، کیا صورت ہو۔ وہ اذیت میرے لئے قابل برداشت بھی ہو یا نہیں۔ یہ سوچ کر میں اپنے بند کمرے سے فرار ہو گیا۔ انسانی قالب میں نے ترک کر دیا تھا۔ میں شرعے باہر نکلا ہی تھا کہ یوں لگا، آگ کا کوڑا مجھ پر پڑا ہو۔ میں بلبل کر چیخ اٹھا۔ ویرانے میں میری چیخ دور تک گونج گئی۔ ہوٹل چھوڑ کر میں نے اچھا ہی کیا تھا ورنہ وہاں بسنے والے آدم زاد جانے کیا سمجھتے۔

لے اسے پوچھا۔ ”تیرے باپ عزتیل کو تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ تو مجھ سے دوستی رکھے؟“
 ”میں اس کی بیٹی ہوں اور وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے محض آدم زادوں سے مربوط ضبط نہ رکھنے کو کہا ہے۔ میرے باپ کو خبر ہے کہ میں بھٹکنے والی نہیں ہوں۔“
 سوی کو میں بتا ہی چکا تھا کہ آدم زادوں کے درمیان آدم زاد بن کر رہتا ہوں، سو اس نے مجھے نہیں روکا۔

جھیل میں غوطہ لگا کر جب میں باہر نکلا تو میرا وجود پہلے ہی کی طرح بے داغ تھا۔ کچھ دور تک سوی میرے ساتھ پرواز کرتی رہی، پھر ”خدا حافظ“ کہہ کر لوٹ گئی۔

☆=====☆=====☆

سیتا نے تو مجھے جاں بہ لب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، مگر سوی نے مجھے بچالیا۔ وہ اگر بروقت میری مدد نہ کرتی تو جانے مجھ پر کیا گزرتی۔ دوسرے روز صبح مجھے یہ تشویش تھی کہ سیتا کو میرے بارے میں گزشتہ رات کیا معلوم ہوا؟ کہیں وہ میری حقیقت جان تو نہیں گئی؟ میں جب اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ ناشتا کرنے کے بعد چائے پی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے فکر مندی نظر آئی۔

”سکھ بھرا“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میرا اندیشہ صحیح نکلا۔“

”کیسا اندیشہ؟“ میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

”وہی جو تیرے آنے سے گھڑی بھر پہلے یہاں آیا تھا، وہ ایک بھوت ہی تھا۔“ وہ بتانے لگی۔
 ”چالیسی لگاکا پڑھتے ہوئے مجھے پتا چل گیا کہ اس کا نام علیالیش ہے اور وہ کچھ دن سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کی چٹیں بھی سینیں۔ پھر شاید وہ بے ہوش ہو گیا یا اسے موت آگئی۔ میں یہ بھی پتا کر سکتی ہوں کہ اگر وہ مرا نہیں تو اس کے ارادے کیا ہیں، لیکن اس کے لئے لبا دقت چاہئے، پورے چالیس دن۔“

سیتا سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا، میرے لئے خطرناک تھا۔ میں اندر ہی اندر کانپ کے رہ گیا۔ اس ظالم نے تو میرا نام بھی معلوم کر لیا تھا۔ پھر بھی میں خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”درگا دیوی کے چالیسی کھٹکے سے بچنا ممکن نہیں سیتا! چالیس آگ کے کوڑے کھا کر بھلا کون زندہ بچ سکتا ہے۔ وہ مر ہی گیا ہو گا۔“

”اور اگر زندہ ہوا تو؟“

”تو پھر میں اسے نہیں جینے دوں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”آج رات کو میں چالیسی لگاکا پڑھوں گا۔ اگر وہ کل بچ بھی گیا ہو گا تو آج رات نہیں بچے گا۔“

”پر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی سکھ بھرا کہ وہ خبیث میرے پیچھے کیوں لگا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”مجھے شاید یہ اندازہ نہیں سیتا کہ تو کس قدر حسین اور خوب صورت ہے۔“ میں نے بات کا رخ دانستہ دوسری طرف موڑ دیا۔

آدم زادوں پر مرتضے ہیں؟..... مجھے بھی ایک آدم زاد اچھا لگا تھا، مگر ان کی عمریں بہت تھوڑی ہوتی ہیں۔ سو وہ بہت جلد مر گیا، ستر سال بھی نہیں گیا۔ یہ بات پچاس برس پہلے کی ہے۔ میرے باپ نے مجھے بہت سمجھایا کہ آدم زاد جلد مر جاتے ہیں، مگر میری عقل پر پردہ پڑ گیا اور پھر مجھے، پچھتاہٹا پڑا۔ اس سے میں نے اپنا نکاح پڑھوا لیا تھا۔ اچھا ہوا کہ کوئی اولاد نہیں ہوئی ورنہ بڑی مشکل ہوتی۔ نہ اسے جن زاد قبول کرتے اور نہ آدم زاد۔ سوی نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا دکھڑا سنا دیا۔

”تو ایک آدم زاد کی بیوہ ہے۔ تیری چٹا سن کر مجھے دکھ ہوا۔“ میں نے بھی اس سے اظہار ہمدردی کہا۔

”ہاں“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اسی وجہ سے اب کوئی جن زاد مجھے اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے اور طعنے دیتے ہیں۔ تو ہی بتا اے علیالیش کہ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں اپنی ہستی سے نکال دیا اور میرا باپ مجھے لے کر یہاں چلا آیا۔ تو نے کچھ نہیں بتایا اپنے بارے میں۔“

”میرا قصہ بھی تجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں اے سوی!“ میں نے جواب میں کہا۔ ”مجھے بھی ایک آدم زادی سے عشق ہو گیا تھا، لیکن تیری طرح مجھے کبھی نہیں ہو سکی اور..... اور پھر وہ..... وہ مجھ سے بچھڑ گئی۔“ مجھے نرم گس یاد آگئی۔ ”ایک..... ایک..... مجھے آدم زادوں کے ساتھ رہتے ہوئے۔“ سوی جیسی ہمدرد جلیہ کو مختصر آئیں نے اپنی روداد سنائی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اجنبی شر میں کوئی تو میرا ہمدرد و غم گسار ہو۔

میں نے اس سے کوئی پردہ نہیں رکھا۔ نیک و بد جیسا بھی تھا، اس پر ظاہر ہو گیا۔ سوی نے اس پر خوشی کا اظہار کیا، پھر بولی۔ ”تجھ سے مل کر ایک خوشی تو یہ ہوئی اے علیالیش کہ تو بھی ہماری طرح ایمان والوں میں سے ہے۔ دوسرے یہ کہ تو نے ایک آدم زاد کی بیوہ ہونے پر مجھ سے نفرت نہیں کی، پھر یہ کہ اپنے بارے میں بھوت نہیں بولا۔ تو شاید جانتا ہو کہ آدم زاد اور جن زاد دونوں ہی تہائی کے عذاب سے گھبراتے ہیں۔ مجھے اپنے باپ کے ساتھ تمارے ہوئے پچاس برس ہو گئے۔ وہ مجھے اب آدم زادوں کی طرف نہیں جانے دیتا اور..... اور کوئی جن زاد بھی میرے قریب نہیں پھٹکتا۔ کیا..... کیا تو مجھ سے دوستی کرے گا اے علیالیش؟“

”ہاں“ اگر یہ دوستی صرف دوستی کی حد تک رہے۔“ میں نے صاف بات کہہ دی۔

”میرا باپ عزتیل بھی مجھ سے یہی کہتا ہے کہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔“ سوی بولی۔ ”تو مجھے تجاوز کرنے والوں میں سے نہیں پائے گا اے علیالیش!“

سوی وہ پہلی جلیہ تھی جس سے مجھے نفرت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے مجھ سے آکر مل سکتی ہے اور میں بھی اس سے ملنے آتا رہوں گا۔ اس ملاقات کے دوران میں نے سوی سے ایک مرتبہ بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو مجھے اس سے متنفر کر دیتی۔ یقیناً اسے اپنے جذبات پر قابو پانا آتا تھا۔ وہ مجھے کوئی بد اطوار جلیہ محسوس نہیں ہوئی جو اپنے نفس کی غلام ہوتی ہیں۔ میں

”تو پھر؟ اس بات سے اس لمبے بھوت کا کیا تعلق؟“ اس نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

”کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ بہت سے بھوت خوب صورت عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں؟“

”ہاں سنا تو تھا، لیکن مجھے کبھی اس بات پر دشواں (یقین) نہیں آیا۔“ سنیتا کہنے لگی۔ ”چل مان لیا کہ وہ کوئی ایسا ہی تھا، پر اسے ڈرانے کی ضرورت تھی مجھ کو؟“

”ڈرا کر وہ تجھے رعب میں لینا چاہتا ہو گا۔“ میں نے بات بنا دی۔

وہ ہنسی، پھر بولی۔ ”اگر ایسا ہی تھا تو بعد میں بڑا بچھڑایا ہو گا وہ..... اسے شاید خبر نہیں ہو گی کہ

میں درگا دیوی کی داسی ہوں، کوئی معمولی عورت نہیں کہ ڈرا دھمکا کر.....“

”لعلت بھیج اس پر۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نمٹ لوں گا اس سے، تیرے عشق

میں یہ بھی سہی۔“

اس نے میرے لئے چائے بنائی اور پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”جلدی سے پی لے،

تجھے ابھی جانا بھی ہے۔ آج ہی صبح ونود جی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ابھی کچھ دن ملک

افضل کو یہیں روکے رکھنا ہے وہ یہاں سے اڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”تیرے لئے اسے یہاں روکے رکھنا کون سا مشکل کام ہے اسے تو تیرا بس ایک اشارہ چاہئے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ونود جی نے بتایا ہے کہ وہ کچھ ڈرنے لگا ہے۔ ممکن ہے میری بات نہ

مانے۔“

”کسی بات سے ڈر گیا ہے وہ؟“ میں نے دریافت کیا۔

”انٹیلی جنس والوں سے۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”پھر یہاں کے حالات سے بھی۔ جناح ایونیو میں

آج بھی حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ ہو رہا ہے۔ ملک افضل کی کوٹھی بھی اسی علاقے میں ہے اور

دفتر بھی۔ ونود جی سے بات کر کے اسے فون کیا تھا میں نے۔ وہ کہنے لگا کہ آج اپنے دفتر نہیں آئے گا۔ سو

مجھے اس کی کوٹھی پر ملنے جانا ہو گا۔“

”ملک افضل کو یہاں روکنے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔“

”ہاں وجہ تو ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”ونود جی اسے قتل کرانا چاہتے ہیں۔“

”مگر تم نے کراچی میں کچھ اور ہی بتایا تھا کہ ملک افضل سے کئی کام نکلنے ہیں ابھی۔“

”ونود جی نے اب لائن آف ایکشن بدل دی ہے۔ اب ادھر کا مال ادھر کرنے کی پالیسی بدل گئی

ہے۔ اسی سلسلے میں ملک افضل سے ہم کام لے رہے تھے۔ جو کھیل ملک کے اس حصے میں کھیلا جا رہا تھا

یہاں بھی جاری تھا۔ گیہوں، چاول، گھی اور چینی یہاں سے بھی اسمگل ہو رہی تھی۔ اب اس کی ضرورت

نہیں رہی۔“ سنیتا بتاتے لگی۔ ”چاول کا بہت بڑا بیوپاری ہونے کے ساتھ ساتھ ملک افضل کپڑے کی ایک

مل کا بھی مالک ہے۔ ملک کے دونوں حصوں میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ وہ یہاں کا ایک جانا بچانا

صنعت کار ہے۔“

”لیکن اس کے قتل سے کیا فائدہ ہو گا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”پہلی بات تو یہ کہ ونود جی کسی ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتے جس کے پیچھے انٹیلی جنس والے لگ

جائیں یا کوئی اور سرکاری محکمہ۔ وہاں بھی وہ انٹنی کرپشن والوں کی لسٹ پر آگیا تھا، سو میں نے ایسا بندہ دست

کر دیا کہ اس پر شک و شبہ نہ کیا جائے۔ یہاں پتا چلا کہ ایسی ہی صورت ادھر بھی ہے۔“ یہ کہہ کر سنیتا

چپ ہو گئی۔

”اور دوسری بات؟“ میں نے سنیتا کو چپ دیکھ کر سوال کیا۔

”ونود جی نے تو خیر کچھ نہیں بتایا، مگر مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ ملک افضل کے قتل سے یقیناً

سیاسی فائدہ ہو گا۔“ کچھ سوچتے ہوئے سنیتا نے جواب دیا۔

”سیاسی فائدہ؟ سمجھا نہیں میں تمہاری بات۔“

”ملک افضل جیسے جانے بچانے صنعت کار کا قتل جب یہاں کے مقامی لوگوں کے ہاتھوں ہو گا تو

اسے سیاسی فائدہ نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ ملک افضل کا تعلق ملک کے دوسرے حصے سے ہے، اب سمجھ

میں آیا کچھ..... خیر چھوڑو یہ تمہاری سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔ ویسے ابھی خود میں بھی کسی

حتی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔“

”اپنے گرد گھٹنٹال سے پوچھ لیا ہو تا۔“ میں نے طنز کیا۔ ”وہ کچھ نہیں بتاتا تمہیں؟“

”نہیں۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”کل رات بھی تم کو میں نے بتایا تھا کہ ان کا یہی انداز ہے۔ اول تو

کسی کو ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی، پھر بھی پوچھ لو تو ڈانٹ دیتے ہیں۔“

”حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ملک افضل بتا رہا تھا کہ مقامی لوگ زبان کے مسئلے پر احتجاج کر رہے ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم

ہوا کہ آج دھپہر اردو روڈ پر بھی احتجاجی مظاہرہ ہونے والا ہے۔ مظاہرین کا مطالبہ یہ ہے کہ اردو روڈ کا نام

بدل کر بنگلہ روڈ رکھ دیا جائے۔“ سنیتا نے جواب دیا۔

”اگر سڑک کا نام بدل بھی دیا گیا تو یہاں کے لوگوں کو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”میں نے کہا تا تم سے سمجھ سیر کہ تم نہیں سمجھو گے ان باتوں کو۔ ہو گا کچھ، ہمیں کیا۔ لوگ کیا

چاہتے ہیں، وہ جانیں۔“

سنیتا کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ میں اسی لئے بولا۔ ”بار بار تم یہ کیا کہہ

دیتی ہو سنیتا کہ میں نہیں سمجھ سکوں گا۔ کیا بات چھپا رہی ہو مجھ سے؟“

براہ راست یہ سوال کرنے پر وہ چونک اٹھی، پھر کہنے لگی۔ ”میں اس لئے کوئی واضح بات کرنا نہیں

چاہتی کہ میں ابھی خود بھی اندھیرے میں ہوں۔ کل ہی تو آئی ہوں میں یہاں۔ کیا خبر میرے اندازے غلط

ثابت ہوں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کوئی بات چھپا رہی ہوں؟ اور..... اور یہ ممکن بھی تو

نہیں۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا انداز خود کلامی جیسا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ آخر کھل

ی گئی۔ ”سمجھ سیر! مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان احتجاجی مظاہروں کے پیچھے ونود جی کا ہاتھ ہے۔ ملک افضل کے

قتل کی بات سے یہ بات کچھ اور کھل جاتی ہے۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اگر زبان کے مسئلے پر

اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس سے یہ ملک سیاسی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ آپس میں جتنی نفرتیں بڑھیں گی، اس ملک کی بنیادیں اتنی ہی کمزور ہوں گی۔ مظاہرین کے ہاتھوں اگر ملک کے دوسرے حصے کے کسی بڑے صنعت کار کا قتل ہو جاتا تو اس سے بھی نفرت بڑھے گی۔

”اور اگر حکومت نے مظاہرین کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھایا پھر؟“

”پھر بھی قائدہ ہمارا ہی ہو گا، لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ حکومت کوئی سخت قدم اٹھائے گی نہیں۔ ملک افضل کو اس سلسلے میں زیادہ بہتر اندازہ ہو سکتا ہے وہ یقیناً یہاں کی صورت حال کو اچھی طرح بیان کر سکے گا۔ تم بھی چاہو تو ساتھ چلو، مگر اس کے سامنے نہ آنا۔“ یہ کہتے ہی سیتا بولی۔ ”میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔“

سیتا کے ساتھ چلتے پر میں نے آدمی ظاہر کر دی۔ بڑی حد تک اب میری سمجھ میں یہ بات آ چکی تھی کہ غیر ملکی تحریک کار ملک کے اس حصے میں کیا کھیل کھیلنے کی تیار کر چکے تھے۔ ”اصل جنگ“ کا مقصد اب میری سمجھ میں آتا جا رہا تھا۔

سیتا جلد ہی لباس تبدیل کر کے چلتے کو تیار ہو گئی۔ اس نے گلابی بنارس ساڑھی باندھی تھی۔ وہ مجھے کسی کھلے ہوئے گلاب کی طرح محسوس ہوئی تو میں نے اس کی طرف سے نظرس ہٹالیں۔ اس بات کا احساس اسے بھی ہو گیا تو بولی۔ ”کیا دیکھنے کی تاب نہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے اعتراف کر لیا، پھر بات کا رخ بدل دیا۔ ”تمہارے کمرے میں آتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا، اچھا یہ ہے کہ جاتے ہوئے بھی میں کسی کو دکھائی نہیں دوں۔ رہوں گا میں تمہارے ساتھ ہی۔ ٹھیک ہے نا؟..... جانا کیسے ہے وہاں، یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔“

”ہوٹل والوں نے میرے لئے کار کا بندوبست کر دیا ہے۔ ڈرائیور کے لئے میں نے خود منع کر دیا۔ کار کو میں خود ڈرائیور کروں گی، رستے دیکھے بھالے ہیں۔“ سیتا نے جواب دیا۔

”یہ تو اور اچھا ہے، چلو۔“ یہ کہتے ہی میں، سیتا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ہوٹل کی عمارت سے نکل کر وہ کار میں بیٹھے ہوئے بڑبڑائی۔ ”سکھ بھرا ساتھ تو ہو؟“

میں اس سے پہلے ہی کار میں بیٹھ چکا تھا، سو بولا۔ ”میری فکر نہ کرو، تم میرا ساتھ نہیں چھوڑنا۔“ سیتا کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ساتھ نہ چھوڑنے کو کہا ہے، یاد رکھنا۔“

اس علاقے کا نام بانی پاکستان کے نام پر جنٹل ایونیو رکھا گیا تھا۔ گزشتہ رات ہی کو میں اس علاقے کا پھیرا لگا چکا تھا۔ یہ علاقہ مجھے پسند آیا۔ راستے بھر سیتا مجھ سے باتیں کرتی رہی رات کے وقت اور اب صبح ساڑھے نو بجے میں بڑا فرق محسوس ہوا۔ رات کو بازار بند تھے اور یہ چل پھل نہیں تھی۔ سیتا کی کار ڈھاکا اسٹڈیم کے قریب سے گزرتی ہوئی مسجد بیت المکرم کی طرف بڑھنے لگی تو عقب سے ”ہولونا“ کے نعرے سنائی دیئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اسٹڈیم کی داہنی جانب پلٹن میدان تھا۔ اسی طرف سے مجھے ایک جھوم آتا دکھائی دیا۔ اسی کے ساتھ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ جھوم کسی بات کو نہ

ماننے کے حق میں نعرے لگا رہا تھا۔ سیتا نے کار کی رفتار تیز کر دی، کیوں کہ مظاہرہ کرنے والوں نے پھراؤ شروع کر دیا تھا۔ جھوم کی طرف مجھے پولیس کے ٹرک بھی تیزی سے بڑھتے نظر آئے۔

”ڈراما شروع ہو گیا سکھ بھرا!“ سیتا نے دھیمی آواز میں مجھے بتایا۔ ”یہ لوگ اردو زبان کو قومی زبان ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔“

اب ہماری کار، پلٹن میدان کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بازار سے گزر کر ہم ایک آبادی میں داخل ہو رہے تھے کہ دھماکے سنائی دینے لگے۔ میں چونک کر بولا۔ ”شاید پولیس نے فائرنگ شروع.....“

”نہیں۔“ سیتا بول اٹھی۔ ”یہ گولی چلنے کی آواز نہیں ہے۔ جھوم کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے ابھی آنسو گیس کے شیل پھینکا شروع کئے ہیں۔“

”تم شینگ اور فائرنگ کی آوازوں کو الگ الگ پہچان سکتی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، میں تو چھوٹے اور بڑے بور کی فائرنگ کو بھی دھماکا ہونے کی آواز سے الگ الگ پہچان کر بتا سکتی ہوں۔ یہ ساری باتیں ہماری تربیت کا حصہ ہیں۔ ہمیں یوں ہی تو بلی چڑھانے اس ملک میں نہیں بھیج دیا گیا..... اچھا اب تم چپ رہنا۔ میں کار کو روکنے والی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سیتا نے بائیں جانب ایک آہنی گیٹ کے سامنے کار کو روک دیا۔

ہارن دینے پر چوکیدار نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا۔ اس کے شانے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ باہر آتے ہی اس کی نگاہ سیتا کے چہرے پر پڑی۔ اس نے فوری انداز میں سیتا کو سلام کیا۔ سیتا نے مسکرا کر خفیف سے انداز میں سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ چوکیدار یقیناً سیتا کی آمد سے واقف ہو گا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور گیٹ کھول دیا۔ کار اندر داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ اس عرصے میں مسلح چوکیدار دوبارہ گیٹ بند کر چکا تھا۔

میں سامنے کی طرح سیتا کے ساتھ لگا رہا۔ اب ہم ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں دانستہ سیتا کے قریب نہیں بیٹھا۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ چوڑی کاٹھی اور لمبے قد والا ملک افضل آیا تو سیتا کے پہلو ہی میں آکر بیٹھا۔ اس کے چہرے پر مجھے فکر مندی سی نظر آئی۔ یوں لگا جیسے وہ زبردستی مسکرا رہا ہو۔

”ایسے میں تم یہاں کیوں آگئیں الماس ڈارلنگ؟“ ملک افضل کہنے لگا۔

”تم ہی سے تو سارا پروگرام طے ہوا تھا..... تمہاری محبت ہی تو مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔“

سیتا محبوبانہ انداز میں مسکرائی۔ ”تمہارے بغیر وہاں میرا جی کیسے لگ جاتا۔“

”لیکن ڈارلنگ، میں تو یہاں سے خود اڑنے کو پر توڑ رہا ہوں۔ جب تم سے پروگرام بنا تھا تو یہاں کے حالات کا مجھے ٹھیک طرح اندازہ نہیں تھا۔ اچانک ہی دیکھتے دیکھتے دو تین دن میں شہر کی فضا بگڑ گئی۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے میرے میجر نے فون کیا تھا۔ مظاہرہ کرنے والے میرے دفتر کو آگ لگانے والے تھے کہ پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ دفتر کا اسٹاف بڑی مشکل سے نکلا ہے۔ میں نے آج دفتر نہ جانے کا ٹھیک ہی فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال تو یہاں سے کراچی جانا ہی غنیمت لگتا ہے۔“

”میں تو نہیں جانے دوں گی تمہیں۔“ سنیتا ایک ادا سے بولی۔
”سمجھا کرو جان۔“ ملک افضل نے سنیتا کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ ”ہم پھر کبھی آجائیں گے یہاں۔“

”میں نے تو سوچا تھا کہ کچھ دن دنیا کے سارے جھیلوں سے دور صرف تمہارے ساتھ وقت گزاروں گی۔ تم نے بھی وعدہ کر لیا تھا، پھر اب کیوں وعدہ خلافی کر رہے ہو؟“
”نہیں یہ وعدہ خلافی..... میں تو کل ہی..... اچھا غصہ..... تمہیں اس طرح میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔“ یہ کہہ کر ملک افضل نے ایک ملازم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے اپنا بریف کیس لانے کو کہا۔ سنیتا اسی طرح منہ پھلائے بیٹھی رہی جیسے خفا ہو۔ ملازم بریف کیس دے کر چلا گیا تو اس میں سے ملک افضل نے ایک ایئر لائن کا ٹکٹ نکالا اور سنیتا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم خود ہی دیکھو۔“ میں آج شام ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔“
سنیتا نے اس سے ٹکٹ لیا، دیکھا اور پھر اچانک ایک ایسی حرکت کی کہ میں بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ٹکٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔

”ارے یہ..... یہ کیا کر دیا تم نے؟“ ملک افضل گھبرا کر بولا۔
”وہی جو کرنا چاہتے تھا مجھے..... بس نہیں جانے دیتی ہیں۔ کیا تم پر اب میرا اتنا بھی حق نہیں رہا۔ بولو..... بولو نا۔“ اس نے ملک افضل کے دونوں شانے پکڑے اور اسے جھنجھوڑ ڈالا سنیتا کا یہ روپ ایسی محبوباؤں جیسا تھا جو کسی سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہیں۔
”ال..... الماس! کیا ہو گیا ہے تمہیں..... مجھے جو خطرہ تھا، وہ..... وہ سامنے آ گیا۔ جو لوگ میرے دفتر پر حملہ کر سکتے ہیں، وہ..... کیا وہ کوئی تک نہیں پہنچ سکتے؟ یہ سوچ کر تو میں.....“

”کچھ نہیں سنوں گی میں۔“ سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کوئی ایسا طوفان نہیں آ رہا یہاں۔ اگر..... اگر تم اتنے ہی ڈر رہے ہو تو میرے پاس آ جاؤ ہوٹل میں۔“
”ہاں یہ..... یہ شاید ممکن ہے۔“ ملک افضل نے آخر ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ ”شام تک میں اپنے پروگرام کے مطابق وہی سب کچھ کروں گا جو پہلے سے طے ہے۔ پھر..... پھر یہ ظاہر یہاں سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ کسی کو بھی میں نہیں بتاؤں گا کہ میرا کیا ارادہ ہے۔ تمہارے ہی ہوٹل میں ایک سویٹ لے لوں گا میں۔ اس کے بعد تم..... تم ہو گی اور..... اور میں۔“
”تمہاری خاطر آج رات سے میں بھی اپنے سارے پروگرام منسوخ کر دوں گی۔ تم رات کو نوبے میرے کمرے میں فون کر کے اپنے سویٹ کا نمبر بتا دیتا۔ میں آ جاؤں گی تمہارے پاس۔“
”پہلے کیوں نہیں؟“ ملک افضل نے پوچھا۔

”مجھے بھلا تو کچھ کام نمٹانے ہیں نا۔ تاکہ کم سے کم ایک ہفتے تو کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور میں تمہارے ساتھ خوب گھوم پھر سکوں۔“ سنیتا نے جواب دیا۔

”گھومنا پھرنا چھوڑو۔“ ملک افضل بولا۔ ”ہم بس ہوٹل ہی میں رہیں گے۔“
”تو خاک مزہ آئے گا۔ کبھی لائٹ ڈرائیو کرتے ہوئے دور نکل جائیں گے، ہرے بھرے پیڑوں کے درمیان جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی نہ ہو اور کبھی سوئمنگ کریں گے۔“

ملک افضل اس کی ہر بات مانتا چلا گیا۔ یوں سنیتا نے اس کے قتل کا پورا سامان کر دیا۔ وہ بس یہ نہ جان سکی کہ وہاں اس منصوبے کو خاک میں ملانے والا بھی کوئی موجود ہے۔
”مجھے ملک افضل جیسے بدکار اور ضمیر فروش آدم زاد کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مارا جاتا کہ زندہ رہتا، میں صرف تماشائی بنا رہتا، لیکن اس کے قتل سے ملک دشمنوں کو فائدہ پہنچتا۔ ان حالات میں اسے قتل ہونے سے بچا لینا، دشمنوں کے منصوبے پر پانی پھیر دینے کے مصداق ہوتا۔ سنیتا ناز و انداز دکھاتی رہی اور میں نے ملک افضل کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی میرے ہی زیر اثر آ کر اب ملک افضل سوچنے لگا۔ یہاں میری زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ مجھے ہر قیمت پر آج ہی اس شہر سے نکل جانا چاہئے۔ الماس میرے عشق میں پاگل ہو رہی ہے، اسے میں سمجھانا بھی چاہوں تو کچھ نہیں سمجھے گی، کچھ نہیں سنے گی۔ الماس جیسی خوب صورت تخلیق تو اور بھی بہت مل جائیں گی، مگر زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ اس کے جاتے ہی باقی روڈ ڈھاکہ شہر سے نکل جاؤں گا۔ کراچی کے لئے کوئی فلائٹ تو مجھے چٹاگام سے بھی مل سکتی ہے۔ میں نے ایک ایک بات تفصیل کے ساتھ ملک افضل کے ذہن میں بٹھادی۔

”تم کہاں کھو گئے ملک؟“ سنیتا یہ کہتے ہوئے اس کے اور قریب آ گئی۔
”مجھ سے مخاطب بھی ہو تم اور قریب بھی۔“ ملک افضل نے میری ترغیب پر جواب دیا۔ ”تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں۔“

”ارے تم تو بڑی رومانٹک باتیں کرنے لگے ہو۔“ سنیتا ہنس کر بولی۔
”تمہاری صحبت کا اثر ہے۔“ ملک افضل بھی ہنس دیا۔
”اچھا تو پھر طے نا؟ تم آج ہی میرے ہوٹل پہنچ رہے ہو؟“
”بالکل طے۔“ ملک افضل نے اسے یقین دلایا۔

سنیتا کے چہرے سے اطمینان جھلکے لگا اور پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی دانست میں اس نے میدان مار لیا تھا۔

واپسی میں سنیتا کو میں نے مخاطب کیا۔ ”کیوں ری! کیا تو یہ بھول گئی تھی کہ میں بھی وہاں موجود ہوں؟..... جی چاہ رہا تھا کہ اس ملک کے اس طرح ٹکڑے کر دوں جس طرح تو نے ٹکٹ کے ٹکڑے کر دیئے تھے..... تو بھی پوری بے غیرت بنی ہوئی تھی..... کچھ تو شرم کر لیتی۔“
”شرم کرتی تو وہ کبھی نہ رکتا یہاں..... راضی ہی نہ ہوتا کسی طرح۔“ سنیتا نے ڈھٹائی سے کہہ دیا۔

”آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا مجھے۔ تجھ سے کہا بھی تھا میں نے کہ تیرے گرد گھٹنال نے تجھے انہی

ابھی میں نے وہاں سے غائب ہونے کے لئے سوچا ہی تھا کہ سنیا چنچی ہوئی زمین پر گری۔ اس کی ساری توجہ میری ہی طرف تھی اس لئے دھوکا کھا گئی۔ سوی کو میں نے سنیا کی ٹانگ پکڑ کر کھینچے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ صورت حال میرے لئے انتہائی خطرناک اور غیر متوقع تھی۔ اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا کہ میں 'سوی' کو وہاں سے لے کر فرار ہو جاؤں۔ اسے یقیناً یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ انجانے میں وہ کتنی بھیاںک غلطی کر بیٹھی ہے۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ سوی میری ہی تلاش میں آئی ہو گی، لیکن اس نے سنیا کو میرے قریب کیوں نہیں آنے دیا؟ یہ سوال الجھا دینے والا تھا۔ اس جیہ سوی کو خبر نہیں تھی کہ سنیا کتنی خطرناک آدم زادی ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ سنیا سنبھل کر سوی پر وار کرتی، میں اسے اپنے ساتھ لے اڑا۔

نواح شہر میں پہنچ کر ہم دونوں بیڑوں کے ایک جھنڈ پر اتر گئے۔

"کیا ہوا اے علیالیش! تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟" سوی نے مخموری حالت دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"اے سوی! تجھے یہ کیا سوچھی کیا؟..... تو نے یہ کیا کر دیا؟"

"وہ آدم زادی ابھی نہیں تھی اے علیالیش! تیری طرف شاید وہ کسی اچھے ارادے سے نہیں بڑھ رہی تھی۔ سو مجھے برا لگا اور میں نے اسے تیرے قریب آنے سے روک دیا۔"

"تجھے معلوم ہے اے سوی کہ کل رات میری جو حالت ہوئی، میں جو مرتے مرتے بچا، تو مجھے اس حالت پر کس نے پہنچایا تھا؟"

"تو نے بتایا ہوتا تو جانتی نا۔" اس نے بھولپن سے کہہ دیا۔

"تو پھر اب سن لے۔ مجھے اسی آدم زادی نے موت کے دہانے تک پہنچا دیا تھا۔" میں نے بتا دیا۔

سوی یہ سن کر حیران سی رہ گئی اور پھر مجھ سے پوچھا۔ "اگر وہی آدم زادی تیری دشمن ہے تو پھر کس لئے تو اس کے پاس گیا تھا؟"

"ایسے کسی دشمن سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ کر اسے زیر کیا جائے..... مجھے تو اب تیری طرف سے فکر ہو رہی ہے۔ آج رات وہ تجھ پر ضرور وار کرے گی۔ اے

سوی! اپنے باپ عزتیل کے پاس چل کہ وہی اس کا کوئی توڑ کر سکتا ہے۔" میں نے مشورہ دیا۔

سوی مجھے اپنے ساتھ لئے عزتیل کے پاس آگئی اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔ عزتیل نے اس پر انتہائی غصے کا اظہار کیا اور سوی کو ڈانٹنے لگا۔ "میں نے تجھ کو آدم زادوں کی بستی میں جانے سے منع کیا تھا اے

سوی! پھر تو نے ادھر کا رخ کیوں کیا؟ ایک دفعہ دکھ اٹھا کہ بھی تو نے عقل نہیں پکڑی۔"

"لیکن میں..... میں کسی آدم زاد سے ملنے تو نہیں گئی تھی۔ میں تو علیالیش کی خوشبو پر وہاں پہنچی تھی۔ تو نے مجھے جن زادوں سے ملنے کو تو منع نہیں کیا۔" سوی نے اپنی صفائی پیش کی۔ عزتیل چند

لمحے خاموش رہ کر مجھ سے کہنے لگا۔ "اے علیالیش! آدم زادوں کی طرف سوی کا جانا اچھا نہیں۔ تو ایسا کر کہ عییس اس سے آ کے مل جایا کر۔"

"اے عزتیل! یہ تو بعد میں سوچنے کی باتیں ہیں۔ اس وقت تو اپنی بیٹی کو اس آدم زادی کے وار

کاموں کے لئے یہاں بلایا ہے۔ ویسے تو بہ قول تیرے وہ تجھے بیٹی کی طرح سمجھتا ہے اور کام ایسے لیتا ہے۔ سراسر..... کبھی سامنا ہوا تو پوچھوں گا اس سے، تیری جگہ اس کی سگی بیٹی ہوتی تو پھر بھی وہ....."

"سکھ ہیرا! وہ بول اٹھی۔" کیوں دل دکھا رہا ہے میرا؟..... تیری جگہ اگر کوئی اور دوند جی کو برا کہتا تو میں کبھی برداشت نہ کرتی۔"

"اور میں جو یہ سب کچھ برداشت کر رہا ہوں، یہ کس کھاتے میں ہے۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ "خود میرے سامنے تو نے اس کے ساتھ مانو ہنی مون منانے کا پروگرام بنالیا ہے۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "ہوٹل نہیں پہنچ سکے گا، وہ شام کو..... آج شام کو پانچ بجے وہ نکلے گا اپنی کوٹھی سے، تو نے خود بھی سن لیا ہو گا میں ابھی ہوٹل پہنچ کر دوند جی سے بات کر لیتی ہوں کہ وہ اس قصے کو آج ہی ختم کرا دیں۔ بھگوان نے چاہا تو ملک افضل کی زندگی کا یہ آخری دن ہو گا۔ تو اب تو خوش ہے؟"

"ناں بھی لے گا وہ بڑھا تیری بات؟"

"کیوں نہیں مانیں گے۔ یہ موقع تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس علاقے میں پولیس اور مظاہرہ کرنے والوں کے درمیان ہونے والی آنکھ پھولی دن بھر تو جاری رہے گی۔ اسی میں ملک افضل کا کام تمام ہو جائے گا۔ بلوائی اس کی کار کو کوٹھی سے نکلے ہی گھیر لیں گے۔" سنیا نے گویا سارا مسئلہ حل کر دیا۔

"اور وہ بلوائی کرائے کے قاتل ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہی بات ہے۔" یہ کہہ کر سنیا ہنسنے لگی۔ "ملک افضل اپنے سارے سنے ساتھ لئے سدھار جائے گا، اس پاپی سنار سے۔"

میں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔ سنیا ایسے راستوں سے نکلی جہاں دنگا فساد نہیں تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے میرے سامنے ہی ٹرانسپیر پر دوند چڑجی کو تفصیلی رپورٹ دینے کے ساتھ ساتھ وہ تجویز بھی پیش کر دی جس سے وہ مجھے آگاہ کر چکی تھی۔ سنیا کا اندازہ صحیح نکلا۔ دوند چڑجی نے اس کی تجویز مان لی۔

وہ فتنہ پرور مجھے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگی، کیوں کہ اب میں 'سکھ ہیرا' کے قالب میں آچکا تھا۔

"سکھ ہیرا! دیکھ لیا تو نے کہ دوند جی کتنے اچھے ہیں۔" وہ ٹرانسپیر کو الماری میں رکھتے ہوئے پلٹ کر مجھ سے بولی۔ "اب تو کاٹنا نکل ہی گیا نا۔"

"کتنے کانٹے نکالے گی میری خاطر۔ تیرا تو سارا جیون ہی کانٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجھے تو وہ نوجوان حمید چوہدری بھی کانٹا ہی لگتا ہے جو شاید جیسے ہی کے لئے تجھ سے ملے والا ہے۔ تو اپنے بدن کو زخموں سے کس طرح بچا سکتی ہے سنیا کہ کانٹے تو تیرے لباس میں سلے ہیں۔" میں نے یہ کہہ کر ٹھنڈا سانس

بھرا۔

"تجھ کو اب اس کا غم کھائے جا رہا ہے جسے ابھی میں نے دیکھا بھی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے بڑھی اور میں اس کا ارادہ بھانپ گیا۔

نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، اس کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے مجھے۔ آج رات وہ میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بنے گا۔“

”ٹھکانا؟ بھوت پیتوں کے ٹھکانے تو دیرانوں میں ہوتے ہیں۔“

”ہاں، اس کا ٹھکانا بھی ایک ایسی ہی جگہ ہے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ پھر گزشتہ رات میں نے قلعہ لال باغ کے قریب جن کھنڈرات میں جن زادوں کو آباد دیکھا تھا، ان کے متعلق بتا دیا۔

”یاد پڑتا ہے؟ ایسی ہی کوئی بات میں نے بھی ان کھنڈرات کے بارے میں سنی تھی۔“ سینتا میری بات کی تصدیق میں بولی، پھر کہنے لگی۔ ”سکھ بھیرا! اس وقت اگر میرا دھیان تیری طرف نہ ہوتا اور میں سدھ بدھ نہ کھو بیٹھی ہوتی تو وہ میرے قریب نہ آ پاتا۔ کل رات کو چالیس کوڑے کھا کر بھی وہ زندہ بچ ہی گیا، پر آج میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ چاہے مجھے رات بھر بار بار چاہی لگائیں نہ پڑھنا پڑے، ڈھٹ کہیں گا۔ کل پٹ پٹ کر بے ہوش ہو جانے پر بھی آج پھر آجرا۔“

”تیرے پاس مجھے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا لگتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ بھوت پریت جس پر عاشق ہو جاتے ہیں، کسی اور کو اس کے قریب نہیں آنے دیتے۔“

”جب اس کینے علیالیش پر آج رات آگ کے کوڑے برسیں گے تو ساری عاشقی دھری رہ جائے گی۔ چیتے گا، چلائے گا کل رات کی طرح اور پھر جل کر بھسم ہو جائے گا۔“

وہ میرے ہی منہ پر مجھے گالیاں دے رہی تھی اور میں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ سوئی کی وجہ سے کم از کم مجھے ایک اطمینان تو ہو ہی گیا۔ سینتا مجھ پر بہر حال شک نہ کرتی۔ سوئی نے جب اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی تھی تو میں، سکھ بھیر کے قالب میں سامنے موجود تھا۔ اس سے اپنی حقیقت چھپانے کے لئے میں حاضر و غائب دونوں صورتوں میں آدم زادوں ہی کی طرح بولتا تھا کہ اسے میری آواز غیر انسانی معلوم نہ ہو۔ اسی کے ساتھ کچھ اور احتیاطی تدابیر بھی میں نے اختیار کر رکھی تھیں جن میں ایک عمل بھی شامل تھا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شیطانی پراسرار علوم سے واقف ہے، خود حفاظتی کی خاطر میں یہ عمل پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتا۔

حقیقت حال جاننے اور موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر میں نے سینتا سے کہا۔ ”تمہیں آج شام گرین کلب بھی تو جانا تھا، کیا ارادہ بدل گیا؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چھ بجے کے بعد حمید چوہدری وہاں پہنچے گا اور ابھی سوا پانچ بجے ہیں۔ یہاں سے دور ہی کتنا ہے گرین کلب۔ کیا تم بھی ساتھ چلو گے؟“

”تم کو تو چلوں ساتھ، ورنہ تو مجھے اپنے رقبوں کو دیکھنے کا اتنا شوق بھی نہیں۔“ میں نے بے اعتنائی کا اظہار کیا۔

”سوت نہ کپاس اور کوئی سے لٹم لٹھا شاید اسی کو کہتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ابھی سے وہ تمہارا رقیب ہو گیا۔“

”نہیں ہوا تو تمہیں دیکھ کر ہو جائے گا میرا رقیب۔“

سے بچانے کی تدبیر بتا۔“ میں بولا۔

”عزیز کی بیٹی کو کوئی آدم زادی نہیں مار سکتی۔ نہ اس پر کوئی وار کر سکتی ہے کہ ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔“ عزیز نے پرجوش آواز میں کہا۔ میں نے اسے درگا دیوی کے چالیسی سٹکے سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔ ”شیطان کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو جائے اللہ کے نیک بندوں کو اس سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ انشاء اللہ اب اس آدم زادی کا یہ شیطانی عمل تم دونوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ یہ کہہ کر عزیز نے کچھ پڑھا اور ہم دونوں پر دم کر دیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اب سوئی کے ساتھ ساتھ میں بھی آگ کے کوڑے کھانے سے بچ گیا تھا۔

مجھے اپنے ساتھ لئے سوئی فضا میں پرواز کرنے لگی۔ وہ بہت خوش تھی اور مجھے بھی اس کے ساتھ یوں اڑتے پھرتا اچھا لگ رہا تھا۔ اس عرصے میں مجھے ایک مرتبہ بھی سینتا کا خیال نہ آیا۔ پھر جب شام ہونے لگی تو میں چونک اٹھا۔ اس وقت ہم دونوں ایک جھیل کے کنارے آ بیٹھے تھے۔ وہاں ہمارے سوانہ کوئی آدم زاد تھا نہ جن زاد۔

”اے سوئی! اب مجھے جانے دو۔“ میں نے اس سے کہا۔

”تو پھر کب آئے گا اے علیالیش؟“ وہ پتہ اداں سی ہو کر پوچھنے لگی۔

”جب چاہوں گا آ جاؤں گا۔ تو رنج کیوں کرتی ہے مجھے احساس ہے اے سوئی کہ تو کتنی اکیلی ہے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا اور وہاں سے پرواز کر گیا۔

گرین کلب ایئر پورٹ روڈ ہی پر تھا۔ اس کی حیثیت اعلیٰ درجے کے ایک تقریبی ہوٹل جیسی تھی۔ وہاں میخانہ بھی تھا اور سونگنگ پول بھی۔ کلب میں داخلے پر کوئی پابندی نہ تھی، لیکن ہر ایک شخص ادھر کا رخ نہ کرتا۔ ایک مخصوص طبقہ ہی وہاں جاتا جن کا شمار اہل ثروت میں ہوتا ہے۔ سینتا کو اس کلب میں حمید چوہدری سے آج شام کو ملنا تھا، مگر کس وقت؟ یہ نہ میں پوچھ سکا نہ سینتا نے بتایا۔ ملک افضل کے بارے میں تو مجھے علم ہو چکا تھا کہ غیر ملکی تخریب کار مارکیٹ سے انشائیہ صرف غائب کرنے اور انہیں اسمگل کرنے کی خاطر کام لے رہے تھے۔ اب حمید چوہدری کا ذہن پڑھ کر مجھے، کچھ نئی باتوں کا سراغ ملنے کی توقع تھی۔ ونود چوہدری بلا سبب دس ہزار روپے لے کر یہ طور خاص سینتا ہی کو اس سے ملنے کیوں بھیج رہا ہے؟ مجھے کسی حد تک یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ اس کا اظہار بھی میں نے سینتا سے کر دیا تھا۔ سینتا کی تلاش میں گرین کلب جانے سے پہلے میں نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ اس وقت شام کے سوا پانچ بجتے والے تھے۔

خلاف توقع مجھے سینتا کا چہرہ اترتا ہوا نظر آیا۔ میں پہنچا تو وہ فون پر کسی سے بات کر کے ریسیور رکھنے والی تھی۔ میں ظاہر ہوا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور قدرے خشکی سے بولی۔ ”آگیا تو سکھ بھیرا! زبانی دعوے ہیں تیرے۔ وقت پڑنے پر جان بچا کر بھاگ گیا نا۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ سو میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”غلط فہمی ہے تیری میں تو اس کے پیچھے گیا تھا جس نے تجھے گرا دیا تھا۔ چلاوا تھا وہ۔ پک جھپکتے کہیں سے کہیں نکل گیا، مگر میں

اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سیتا نے فون رسیو کیا۔ ”ہیلو الماس اسپیکنگ۔“ کہنے کے بعد دوسری جانب سے جو کچھ اس نے سنا چہرے سے اظہار ہونے لگا۔ یقیناً سیتا کے لئے وہ کوئی غیر متوقع اور ناگوار بات ہی تھی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ پھر اس نے کہا۔ ”کسی سبب کو بھی سے نکلنے میں اسے دیر..... کیا؟..... فون کیا تھا اسے؟..... پھر؟..... نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟..... کسی بھی طرح، کسی بہانے بھی کھس جاؤ کو بھی میں اور معلوم کرو، وہ اندر ہے یا نہیں۔ مجھے پندرہ منٹ کے اندر اندر رپورٹ چاہئے۔“ یہ کہتے ہی اس نے رسیور رکھ دیا۔

یہ جاننے کے باوجود کہ سانپ نکل گیا ہے اور سیتا لکیر پیٹ رہی ہے، میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”کس کا فون تھا؟ کیا ہوا؟“

”میں ابھی ارسلان بیگ جیسے بہت سے جرائم پیشہ لوگ موجود ہیں جن سے ہم کام لیتے رہتے ہیں، انہی میں سے ایک کا فون تھا۔ ونودی نے اسے اور اس کے ساتھیوں ہی کو ملک افضل والا کام سونپا تھا۔ ایسے چھوٹے موٹے کام ونودی عموماً میرے ہی سپرد کر دیتے ہیں۔ سو انہوں نے کانتا سے کہہ دیا ہے کہ اب وہ مجھ کو ہی رپورٹ دے۔ کانتا اب ایک اور ہی کمائی بنا رہا ہے جس پر مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کتا ہے کہ جب پانچ بجے ملک افضل اپنی کو بھی سے نہیں نکلا تو اس نے فون کیا۔ فون رسیو کرنے والا ملک افضل کا ایک ملازم تھا۔ اس نے کانتا کو بتایا کہ ملک صاحب تو آج صبح ہی کو بھی سے اپنی کار میں کیس جانے کو نکل گئے تھے اور اب تک نہیں لوٹے۔ کانتا کے پوچھنے پر ملازم ہی سے یہ بھی پتا چلا کہ ملک افضل کسی کو کچھ بتا کر نہیں گیا کہ کہاں جا رہا ہے اور کب اس کی واپسی ہوگی۔ ہمیں تو خبر ہے سکھ بیر کہ وہ صبح کتنا ڈرا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں بھلا وہ کو بھی سے نکلنے کی ہمت کیسے کرتا۔ اسے تو اپنے کاروباری معاملات نمٹانے کے لئے کو بھی ہی میں رہتا تھا۔ اگر کسی سے اس کو ملنا بھی ہوتا تو اسے وہ اپنی کو بھی ہی پر بلا لیتا ورنہ تو فون کر دیتا ہی کافی ہوتا۔ تم ہی بولو، کیا میرا اندازہ غلط ہے؟“ سیتا نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

”اندازہ تو تمہارا ٹھیک ہی لگتا ہے، مگر کیا خبر ملک افضل پوری طرح شیشے میں نہ اترا ہو۔“ میں دورانہوشی کے تحت بولا، کیوں کہ جلد یا بہ دیر سیتا کو معلوم ہو ہی جاتا، اس کا شکار بچ کر نکل گیا ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”میرا تو خیال یہ ہے کہ اس نے وقتی طور پر ہمیں مطمئن کرنے کے لئے شام کو ہوٹل آنے کا وعدہ کر لیا ہو گا۔“

”نہیں سکھ بیر۔“ سیتا نے انکار میں سر ہلایا۔ ”وہ مجھ سے غلط وعدہ نہیں کر سکتا اسے..... اسے تو میں نے اپنے لئے اتنا ترپایا ہے کئی بار کہ..... کہ وہ یہ سنری موقع کبھی نہ چھوڑتا۔“

”تو ابھی پتا لگ جائے گا کہ وہ اپنی کو بھی میں ہے یا نہیں۔ کانتا ساڑھے پانچ بجے بتا ہی دے گا تمہیں۔ ہمارے وہاں سے آنے کے بعد ہی شاید وہ کو بھی چھوڑ کر بھاگ نکلا ہو گا۔“

”کیسے بھاگ سکتا ہے، کہاں بھاگ سکتا ہے؟..... ٹکٹ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے پھاڑ دیا تھا..... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ سیتا بے چمن سی ہو کر کمرے میں بیٹھنے لگی۔

پھر ساڑھے پانچ بجے کانتا نے فون پر تصدیق کر دی کہ ملک افضل کو بھی میں نہیں ہے۔

”ونودی جی کو میں کیا جواب دوں گی۔“ سیتا پریشان ہو گئی۔ چند لمبے توقف کے بعد اس نے کہا۔ اچھا سکھ بیر، پہلے گرین کلب چلو میرے ساتھ۔ پھر سوچیں گے وہاں سے لوٹ کر اس مسئلے پر۔“ یہ کہتے سیتا لباس تبدیل کرنے ہاتھ روم میں چلی گئی۔ ابھی وہ لباس تبدیل کر کے باہر آئی تھی کہ ٹرانسیر کی موص آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

سیتا الماری کی طرف لپکی اور ٹرانسیر نکال کر سوچ آن کر دیا۔

”تھری زبرد کالنگ..... بلیک کوئن! اور۔“ میں نے ونودی پر جی کی دھیمی اور میٹھی آواز سنی۔

”لیس! بلیک کوئن آن دی لائن اور۔“

”سکھ بیر کو تم اپنے ساتھ گرین کلب نہیں لے جاؤ گی، اور اینڈ آل۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی بلبلہ منقطع ہو گیا۔

ونودی پر جی کے یہ الفاظ مجھ پر جیسے بجلی بن کر گرے۔ میں پکرا کے رہ گیا۔ آخر اس گھاگ کو میرے بارے میں کیسے پتا چل گیا؟ سیتا کے سوا تو کسی کو میرے اس نام کی خبر بھی نہیں تھی۔ میں تو سیتا سے بند کرے ہی میں ملا تھا۔ مجھے تو کسی نے ڈھاکا شہر میں اس کے ساتھ دیکھا بھی نہیں تھا۔

اسی عرصے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ونودی پر جی بھی تو شیطانی عملیات سے واقف ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی شیطانی عمل کے ذریعے اس نے میرا سراغ لگا لیا ہو.....؟ لیکن اس کی ضرورت اسے کیوں پیش آئی؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ سیتا مجھے اپنے ساتھ گرین کلب لے جا رہی ہے، اس کا علم ونودی پر جی کو کیسے ہو گیا؟ پہلے سے تو خود سیتا کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ چلوں گا۔ سوالوں کے گرداب میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے میری نگاہ سیتا کی طرف اٹھی۔ ٹرانسیر کو الماری میں بند کرنے کے بعد اب وہ میری طرف پلٹ رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار دیکھے۔

میں نے اس سے کچھ کہنے کو ہونٹ کھولے ہی تھے کہ وہ بول اٹھی۔ ”سکھ بیر! تم میرے ساتھ گرین کلب نہیں چلو گے۔ مجھے اکیلے ہی وہاں جانا ہے۔ اب تم جاؤ، پھر ملیں گے۔“ یہ کہتے ہی خلاف توقع اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور بیڈ کے سر ہانے پڑا ہوا ہوٹل کالیئر ہیڈ اٹھا کر تیزی سے اس پر کچھ لکھنے لگا۔

جتنی تیزی کے ساتھ اس نے کچھ لکھا، اتنی ہی بھرتی سے میرے قریب آئی۔ میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

لیٹر ہیڈ اس نے میری طرف بڑھا دیا جس پر لکھا تھا۔ ”سکھ بیر! تم جاؤ گے نہیں بلکہ میرے ہی ساتھ رہو گے، لیکن اس طرح کہ کسی کو نظر نہ آؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اس وقت تم کی ظاہر کرو جیسے تم جا رہے ہو۔“

تحریر پڑھ کر میرا ذہن اور بھی الجھ گیا۔ معلوم نہیں سیتا کیا چاہتی ہے؟ میں نے یہ سوچا ضرور مگر

زبان سے کچھ اور ہی کہا۔ ”اچھا سنتا تو پھر میں چلتا ہوں۔ رات کو یا کل صبح کسی سے آؤں گا۔“ یہ الفاظ ادا کرنے سے پہلے میں نے اقرار میں سر ہلا دیا تھا، مطلب یہ تھا کہ سنتا کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ ”ٹھیک ہے۔“ سنتا بولی۔ ”پھر کل ہی صبح آؤ تو اچھا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرز بڑھی۔

اب دروازہ کھلنے والا تھا اس لئے میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا کہ کسی کی نظر میں نہ آؤں۔ سبز خود بھی یہی چاہتی تھی۔ اس نے دروازے تک پہنچنے کے بعد مڑ کر دیکھا اور مطمئن دکھائی دی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ہی ہوٹل کے کمرے سے باہر آ گیا۔

اپنے استعمال کے لئے ہوٹل والوں سے اس نے صبح جو کار لی تھی، اسی کار میں میرے ہمراہ گرین کلب روانہ ہوئی تو چھ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ گرین کلب وہاں سے بمشکل پانچ بجے منٹ کی ڈرائیو پر ہو گا۔ ہوٹل کی حدود سے نکل کر ایئر پورٹ روڈ پر آگے بڑھتے ہوئے سنتا نے ایک ذیلی شاہراہ پر کار موزاں لی۔

میں اس کے برابر والی سیٹ ہی پر موجود تھا۔ اس نے اب تک مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ جب اس نے سیدھا چلنے کے بجائے کار کو موڑ لیا تو میں بول ہی اٹھا۔ ”ادھر کہاں جا رہی ہو؟ گرین کلب ادھر تو نہیں ہے۔“

”معلوم ہے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چھ بجے کے بعد پہنچنا ہے وہاں۔ ابھی خاصا وقت ہے ہمارے پاس۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سڑک کے ایک کنارے کار کو روک لیا۔ ایئر پورٹ روڈ کی طرح اس سڑک پر زیادہ آمدورفت نہیں تھی۔ چند لمبے توقف کے بعد سنتا نے مجھ سے پوچھا۔ ”سکھ بیو! کچھ اندازہ لگایا تم نے کہ ونود جی کو تمہارے بارے میں کیسے پتا چل گیا؟“

”میں تو خود اس بات پر حیران ہوں۔“ میں بولا۔ ”ظاہر ہے تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا نہیں ہو گا۔ کسی نے تمہیں اور مجھے ملنے نہیں دیکھا۔ پھر تو بس ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ انہیں تمہاری کسی بات پر شبہ ہو۔ ممکن ہے، ان سے ملاقات کرتے وقت کوئی ایسی بات تمہاری زبان پر آگئی ہو اور پھر انہوں نے کسی عمل کے ذریعے.....“

”نہیں۔“ سنتا نے میری بات کاٹ دی۔ ”اس کے لئے ونود جی کو کسی عمل کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ میں نے کچھ اور ہی سوچا ہے۔ تم کیونکہ ان معاملات سے بے خبر ہو اس لئے نہیں سمجھ سکتے۔ دراصل ونود جی کا اپنا طریقہ کار ہے۔ میں ہی کیا، وہ جن لوگوں سے بھی کام لیتے ہیں، ان کی طرف سے غافل نہیں رہتے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی بات نہیں بلکہ اسے تم ایک حفاظتی نظام کہہ سکتے ہو۔ میرے پاس وقت ہوتا تو ابھی معلوم کر لیتی کہ میں ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہری ہوں وہاں کوئی ڈاکہ فون تو نہیں؟“

”ڈکٹا فون.....؟ یہ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

وہ مجھے ڈکٹا فون کے بارے میں بتانے لگی۔ ”ایک طرح کا مواصلاتی سسٹم سمجھ لو اسے۔ میرا

کمرے میں ہونے والے گفتگو ڈکٹا فون کے ذریعے غالباً اسی ہوٹل کے کسی اور کمرے میں سنی جا رہی ہو گی یا اسے ریکارڈ کر لیا گیا ہو گا۔ یہ کام انجام دینے والا ہمارا ہی کوئی خاص آدمی ہو گا۔ اس نے وہ گفتگو ونود جی کو سنوا دی یا بتا دی ہو گی۔ ان معاملوں میں رازداری شرط اول ہوتی ہے۔ حمید چودھری سے مجھے تنہا ملنے کا حکم ملا تھا اور میں تمہیں بھی ساتھ لے جا رہی تھی۔ ونود جی نے اسی لئے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔“

”چلو مان لی تمہاری بات۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اب میں یہ بھی سمجھ گیا کہ تم نے تحریر کا سارا کیوں لیا تھا، لیکن ڈکٹا فون کب اور کس طرح تمہارے کمرے میں لگا دیا گیا؟“

”آج صبح جب ہم دونوں ملک افضل سے ملنے گئے تھے تو یہ بندوبست کر دیا گیا ہو گا۔ ایسے ہوٹلوں کے کسی کمرے کا تالا کھول کر اندر گھس جانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ معمولی درجے کے کسی جرائم پیشہ آدمی سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ کل شام سے پہلے خود ونود جی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں، ڈھاکا پہنچ کر کہاں ٹھہروں گی۔ کل شام کے بعد سے بس آج ہی صبح میں اس کمرے سے نکلی تھی۔ پھر ملک افضل سے مل کر دوبارہ ہوٹل آگئی اور اس وقت نکلی ہوں۔ یہ کام میری غیر موجودگی ہی میں ہو سکتا تھا۔“

”اگر ونود جی کو بقول تمہارے حفاظت ہی مقصود تھی تو وہ اس سے تمہیں بھی آگاہ کر سکتے تھے۔“ میں نے اعتراض کیا۔

”میں نے تمہیں بتایا تاکہ وہ پہلے سے کچھ نہیں بتاتے۔“

”اور اس طرح وہ خود کو عقل کل ظاہر کرتے ہیں۔“ میں چڑ کر بولا۔ ”انہیں شاید اس طرح دوسروں کے اعصاب پر مسلط ہونے کا شوق ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب تمہارے کمرے میں تم سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی.....! ٹھیک ہے، آج کے بعد میں تم سے نہیں ملوں گا۔ تم جانو اور وہ تمہارا بوڑھا گدھ جانے۔“ میں نے ونود چوہدری کو ایک اور نیا خطاب دے دیا۔

”پاکل ہو تم؟“ سنتا نے کہا۔ ”اگر مجھے ونود جی کا حکم ماننا ہوتا تو اس وقت تم میرے ساتھ نہ ہوتے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہماری ملاقاتیں اسی کمرے میں ہوں۔“

”میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس طرح تو بڑھے کو اور بہت سی باتوں کا پتا چل گیا ہو گا۔“ میں کہنے لگا۔ ”اس بھوت علیالیش کے بارے میں بھی وہ جان گیا ہو گا جو تمہارے پیچھے بڑ گیا ہے۔“

”تم یہ باتیں اس لئے کر رہے ہو کہ ونود جی سے واقف نہیں۔“ سنتا مجھے سمجھانے لگی۔ ”ونود جی کبھی کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ وہ اسی وقت کوئی تاکید کرتے ہیں جب کوئی اجنبی ان باتوں سے آگاہ ہونے لگے جن کو وہ راز میں رکھنا چاہتے ہوں۔ تمہارے اور میرے تعلقات ذاتی نوعیت کے ہیں۔ ان پر یقیناً ونود جی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا، مگر وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کریں گے جو ذمے داریاں ان کی طرف سے میرے سپرد کی گئی ہیں، ان کا علم تمہیں بھی ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے جواب بھی طلب کر سکتے ہیں۔“

کلب کے سونگ پول کے ارد گرد کافی کافی فاصلے سے میز پر بیٹھیں۔ ان کا درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے افراد کی گفتگو دوسری میز پر بیٹھے والوں کے لئے سننا ممکن نہیں تھا۔ بیٹھے جیسے بدن ہاتھک کاسیٹوم میں پانی کے اندر اور سطح پر تیر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ ان کے دوست یا محبوب بھی ہوں گے۔ سیتا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں وہ نظارے دیکھتا رہا۔ ایک جانب اسٹیج سنا ہوا تھا۔ وہاں مجھے سازندے نظر آئے۔ موسیقی کی دھیمی دھیمی سی لے جیسے ہر طرف تیر رہی تھی۔

سونگ پول سے دور سیتا میزوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک جگہ رک گئی۔ اس میز کے گرد بھی کئی کرسیاں پڑی تھیں، مگر صرف ایک کرسی پر سانولا سا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ نوجوان سیتا کو رکتے دیکھ کر چونکا۔ چہرے سے مجھے وہ کوئی چلتا پرزہ ہی لگا۔ اس کے جسم پر اچھا لباس تھا۔

”مجھے شازیہ کہتے ہیں۔“ سیتا نے اس نوجوان کو دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ ”اور تم شاید حمید چودھری ہو۔“ سیتا نے اس نوجوان کو اپنا ایک نیا نام بتایا۔

”اوہ ایس، کم آن۔“ نوجوان جلدی سے بولا۔ ”آئی واز ویننگ یو۔“

سیتا بڑی بے تکلفی سے اس نوجوان کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنا بیگ میز پر رکھ کر نوجوان حمید چودھری سے ہاتھ ملایا۔ نوجوان نے فوری طور پر سیتا کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ حمید چودھری پر سیتا کے حسن کا جادو چل چکا ہے۔ میں آہستگی سے ان دونوں کے سامنے والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر شازیہ!“ حمید چودھری انگریزی ہی میں بات کر رہا تھا۔ ”کیا بیوگی؟ تمہاری ہی وجہ سے اب تک میں نے اپنے لئے کچھ نہیں منگوا کیا۔“

”جن منگوا لو۔“ سیتا نے کہہ دیا۔ ”مگر باہری۔“ وہ بھی انگریزی بول رہی تھی۔ ”جن“ شراب ہی کی ایک قسم ہے، مگر قدرے کم تیز اور ہلکی۔

حمید چودھری نے ایک باوردی ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور اسے آرڈر دیا۔ ایک پیئٹ (نصف بوتل) کے ساتھ اس نے کھانے کے لئے کباب وغیرہ بھی منگوائے تھے۔ میں اس وقت تک حمید چودھری کے ذہن پر توجہ مرکوز کر کے بہت کچھ جان چکا تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں وہ طلبہ کی تنظیم کا جنرل سیکرٹری تھا۔

جام سے جام نکرائے اور دور ساغر چلا۔ پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ سیتا نے دھیرے سے کہا۔ ”میں تمہاری امانت ساتھ لائی ہوں۔“ اس نے میز پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ حمید چودھری کے پاس بھی میں نے چہرے کا ایک بیگ دیکھ لیا تھا۔ وہ بیگ اس نے میز پر رکھنے کے بجائے کرسی کی سائڈ میں دبا رکھا تھا۔

”کہتے ہیں؟“ حمید چودھری نے دھیمی آواز میں معلوم کیا۔

”دس ہزار۔“ سیتا نے جواب دیتے ہوئے اپنا بیگ کھولا۔ ”دس ہزار کل بیس آکر لے جانا۔“

”یہ تو کم ہیں۔“ حمید چودھری کا لہجہ بدل گیا۔ ”میں نے مگر ہی کہہ دیا تھا کہ تیس ہزار

”اگر ایسا ہوا تو پھر تم کیا جواب دو گی؟“

”مجھے ان کا حکم ماننا پڑے گا۔“

”یعنی پھر تم مجھے کچھ بھی نہیں بتاؤ گی؟“

میرے اس سوال پر وہ مسکرائی۔ ”ہاں کم سے کم اس ہوٹل کے کمرے میں.....! اس کے علاوہ یہ کہ تم پر تو میں کوئی پابندی نہیں لگا سکتی۔“ سیتا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”مجھے تو کوئی ایسی خاص تکلیف نہیں کہ تمہارے عشق میں مارا مارا پھروں۔“

”اگر تمہیں تکلیف نہ ہوتی تو میرے پیچھے پیچھے کراچی سے ڈھاکہ نہ آ گئے ہوتے۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی، پھر میری ہی نقل اتارتے ہوئے کہنے لگی۔ ”دیکھ رے سکھ بھیر! اب کوئی بھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا۔ یہ تو بھی اچھی طرح جانتا ہے اور میں بھی۔“

”تو پھر اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میں تجھے رات کو سوتے میں چپکے سے اٹھا کر کہیں لے جایا کروں۔“

”کہاں لے جائے گا؟“

”جہاں بھی دل چاہے گا۔ ہرے بھرے درختوں کے کسی جھنڈ میں..... کسی جھیل کے کنارے..... کسی ایسی جگہ جہاں تیرے اور میرے سوا کوئی نہ ہو۔“ میں نے اس پر پھر اپنے عشق کا جادو چلانا چاہا اور اپنی آواز خواب ناک سی بنائی۔

”اس سے کیا ہو گا؟“

”تجھے دیکھا کروں گا اور..... اور دیکھتا ہی رہوں گا۔“

”کاش یہ تیرے بس میں ہوتا۔ تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ میں سونے سے پہلے اپنے گرد گھیرا ڈال کر سوتی ہوں۔ اچھا ہوا کہ تُو نے مجھے بتا دیا ورنہ مارا جاتا۔ میری مرضی کے بغیر کوئی بھی میرے قریب نہیں آ سکتا۔ فضول باتیں چھوڑ اور میری سن۔ اس وقت ہم جس طرح مل رہے ہیں، کیا کوئی جان سکتا ہے۔ جو بھی ادھر سے گزرے گا یہی دیکھے گا کہ میں کار میں اکیلی بیٹھی شاید کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ہم اسی طرح ملتے رہیں گے۔ پھر جب یہ خطرہ نہ ہوا کہ کوئی ہمیں دیکھ لے گا یا ہماری باتیں سن لے گا، ہم کسی بند کمرے میں اکیلے ہوئے تو پھر میں تجھ سے کہوں گی کہ میری نظروں کی پیاس بھی بجھا دے۔ تُو بھی کہیں ٹھہرا ہی ہو گا۔ میں وہاں آکر بھی تو تجھ سے مل سکتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کار اشارت کر دی کیونکہ اب چھ بجنے والے تھے۔

”ٹھیک ہے، تجھے دکھا دوں گا، میں اپنا ٹھکانا۔“ میں راضی ہو گیا کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی نہیں تھا۔

اس نے نوود چڑبی کا حکم نہیں مانا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ گرین کلب نہ لے جائے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اپنے سرغنہ سے زیادہ وہ مجھے اہمیت دے رہی تھی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نظروں سے اوجھل تھا۔ گرین کلب کے پارکنگ لاث میں اس نے کار کھڑی کی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

سے کم پر بات نہیں بنے گی۔ تمہیں پندرہ ہزار لانے تھے۔

”تم چاہو گے تو بات بن جائے گی۔“ سنیتا ایک ادا سے بولی۔ ”یہ تو رکھو۔“

”رکھے لیتا ہوں لیکن وعدہ نہیں کرتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ آج بھی دوسرے کو اردو روڈ پر مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری تنظیم کے پانچ لڑکے شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ پولیس نے آنسو گیس کے علاوہ سخت لاشی چارج کیا۔ اب یہ اطلاع ملی ہے کہ حکومت سختی کے ساتھ ہماری تحریک کو کچل دینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے آج ہی تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں۔“ حمید چودھری بتانے لگا۔ ”طلبہ کو پولیس کسی بھی قیمت پر نواب باڑی تک نہیں پہنچنے دے گی کہ وہاں احتجاجی مظاہرہ کیا جاسکے۔ یونیورسٹی کے آس پاس ابھی سے فورس لگا دی گئی ہے۔ کل کیا ہو گا؟ کچھ نہیں معلوم کیا خبر پولیس گولی چلا دے۔“

”خیال ہے تم لوگوں کا۔“ سنیتا پرسکون آواز میں بولی۔ ”یہ ڈس انفارمیشن ہے۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں معلوم ہوتا۔ حکومت اتنا سخت قدم نہیں اٹھا سکتی۔“

”لیکن احتجاجی مظاہرہ تو کہیں بھی کیا جاسکتا ہے۔“ حمید چودھری نے یہ کہہ کر اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا پھر کینے لگا۔ ”تم لوگ نواب باڑی کے سامنے ہی کیوں مظاہرہ چاہتے ہو؟“

”تم اسٹوڈنٹ لیڈر ہو کر اتنی سی بات نہیں سمجھے۔“ سنیتا بڑی دل ربائی سے مسکرائی۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس جگہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟“

”وہ سب جانتا ہوں میں۔“ حمید چودھری بولا۔ ”یہ بھی معلوم ہے مجھے کہ اس وقت گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ہیں۔ وہ بھی نواب باڑی ہی میں پلے بڑھے ہیں۔ حکومت اسی وجہ سے تو ہمیں وہاں مظاہرہ کرنے سے روکے گی۔ یہ انتظامیہ کی عزت اور آن کا مسئلہ ہے۔“

سنیتا اسے سمجھانے لگی کہ مظاہرہ وہیں ہونا چاہئے اس کے لئے وہ اپنے تمام نسوانی حربے آزماری تھی۔ انہی میں سے ایک حربہ یہ بھی تھا کہ اس نے اپنا گلاس حمید چودھری کے گلاس سے بدل لیا تھا۔ میں نے اس عرصے میں حمید چودھری کا ذہن پڑھ کر یہ جان لیا کہ نواب باڑی کی کیا تاریخی حیثیت ہے۔

نواب باڑی، نواب سر سلیم اللہ خان کا مسکن تھا۔ نواب سلیم اللہ خان مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ یہ 1906ء کا واقعہ ہے کہ ڈھاکا شہر ہی میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہوا تھا۔ نواب صاحب اس میں پیش پیش تھے۔ ان کا سارا ہی خاندان مسلم لیگی تھا۔ نواب صاحب سے لے کر خواجہ ناظم الدین اور اس خاندان کے دوسرے افراد تک تمام ہی مشہور سیاسی شخصیات اسی نواب باڑی میں رہی تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے کو نواب صاحب کے استعمال میں رہنے والی اشیاء کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہاں نواب صاحب کی کرسی، پگڑی، تلوار وغیرہ رکھی گئی تھیں۔ اسلام پور روڈ سے چوک بازار کی طرف جاتے ہوئے اندرونی سمت ایک بڑا سا گیٹ ہے جس کے اندر میدان نظر آتا ہے۔ اسی میدان میں سامنے دکھائی دینے والی بہت بڑی عمارت نواب باڑی کہلاتی ہے۔ نواب صاحب ہی کے نام سے۔ سر سلیم اللہ روڈ بھی ہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی اور ڈھاکا میڈیکل ہاسپٹل، دونوں ہی اسی روڈ پر ہیں۔ ڈھاکا کامیوژیم، ڈھاکا ہائی

برٹ اور سلیم اللہ ہال بھی اسی روڈ پر واقع تھے۔ ہائی کورٹ کی عمارت سفید رنگ کی تھی۔ اس سے ذرا سج دو منزلہ بہت بڑا ہوٹل سلیم اللہ ہال کہلاتا تھا۔ ڈھاکا شہر کی ایک اور اہم شاہراہ نواب پور روڈ بھی اب صاحب ہی کی وجہ سے نواب پور روڈ کہلاتی تھی۔

ڈھاکا شہر کے متعلق بہت سی باتیں تو میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا، مگر سیاسی پس منظر حمید چودھری کا بن پڑھ کر معلوم ہوا۔ وہ ایک ضمیر فروش نوجوان تھا جسے غیر ملکی تحریک کار اپنے سیاسی مقاصد کے مول کی خاطر استعمال کر رہے تھے۔ نود چہر جی کی ”اصل جنگ“ کا مضمون میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ ایک میں نے اور خاص طور پر محسوس کی کہ حمید چودھری خود بھی حکومت وقت کے خلاف باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنی دانست میں وہ غیر ملکی تحریک کاروں سے مالی منفعت حاصل کر کے طلبہ تنظیم کو مزید مضبوط کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کی نظروں میں سنیتا کے حسن سے خوشہ چیں کارنگ بھی

ن نے دیکھا۔

”شازیہ! تمہیں پیرا کی تو آتی ہو گی۔“ حمید چودھری کی آواز نشے سے بوجھل ہونے لگی۔ وہ تیسرا ایک ختم کر کے اپنے لئے اب چوتھا پیگ بنا رہا تھا۔

”ہاں کیوں؟“ سنیتا نے مسکرا کر پوچھا۔

”کل شام جب تم بقیہ رقم لے کر آؤ تو اپنا ہاتھنگ ڈریس بھی ساتھ لانا۔ ہم دونوں سوئنگ پول بن تیسرے گے۔“ حمید چودھری نے سنیتا پر جال بھینکا۔

وہ ”مچھلی“ تو خود جال میں پھنسنے آئی تھی، سو کس طرح انکار کر دیتی۔ عجیب سے لمبے میں سنیتا نے لک۔ ”پانی میں جسم بہت ہلکے ہو جاتے ہیں۔“

”مجھے بھی اس کا تجربہ ہے۔“ حمید چودھری ہنسا۔ ”ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑتا۔“

”اگر تم مجھے بوجھ سمجھ رہے ہو تو پھر میں ہاتھنگ ڈریس اپنے ساتھ نہیں لاؤں گی۔“ سنیتا ادائے اہری سے بولی۔

”بوجھ تمہیں نہیں، اپنے آپ کو کہا ہے میں نے ڈارلنگ!“ حمید چودھری ایک قدم اور آگے بڑھا۔ وہ دونوں مزید کچھ دیر تک ایک دوسرے کو رجمانے اور لہجائے رہے۔ میں خاموش تماشائی بنا سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر سنیتا ہی نے دھڑلے سے ہل منگوایا اور ادائیگی کے بعد اگلے روز نئے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ کلب سے باہر آ گیا۔

کلب سے واپسی پر کار ڈرائیو کرتے ہوئے سنیتا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”پہلے میں تمہارے ساتھ چلوں گی، نود جی کو رپورٹ بعد میں دوں گی۔“

”تم یہ کس سے باتیں کئے جا رہی ہو؟ میں تمہارے ساتھ ہوں کب؟“

”پھر کس کے ساتھ ہو؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”اپنی تنہائیوں کے ساتھ.....! کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارے عشق میں رقیبوں کو بھی براہ راست کرنا پڑے گا۔“

”رقيب کے بغیر عشق کرنے میں کوئی مزہ بھی تو نہیں..... یہ نہیں سوچا تم نے سکھ بھرا“
”لیکن ایک رقيب ہو تو برداشت کر لوں۔“ پھر میں نے اردو زبان کے ایک مشہور شاعر کا یہ شعر پڑھا:

جو بھی آوے ہے ترے پاس ہی آ بیٹھے ہے

ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

شعر سن کر وہ زور سے ہنس پڑی، پھر کہنے لگی۔ ”کدھر چلوں، یہ بتاؤ پہلے.....! خود ہی پہلو سے سرک جاتے ہو اور پھر گلہ بھی کرتے ہو۔“

”میں تو اب بھی تمہارے پہلو میں بیٹھا ہوں، تم ہی دوسروں کے پہلوؤں میں جا بیٹھتی ہو۔ تمہارا خیال نہ ہوتا تو اس کی گردن مروڑ دیتا، جو تمہیں بھی آنکھوں میں پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا اپنے آپ کو۔ صورت پر پھنگار برس رہی تھی، کمبخت کے۔“
”کام نکلنے کے لئے ایسے عقل کے پیدلوں کو بھی گوارا کرنا پڑتا ہے۔ تم نے بتایا نہیں کہ کہاں چلنا ہے؟“ سنتا نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

”جدھر بھی چل رہی ہو، ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اسے میں نے اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا۔ پھر سوال کیا۔ ”یہ کمری کون ہے؟“ یہ سوال کر کے میں جانا چاہتا تھا کہ سنتا مجھ سے کہیں رازداری تو نہیں برت رہی، ورنہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا، وہ بھی ایک اسٹوڈنٹ لیڈر ہے۔ اسی کے ذریعے حمید چودھری کو پھانسا گیا تھا۔ اس کا پورا نام ولال مکھی تھا۔

سنتا نے میری توقع کے مطابق جواب دیا، پھر یہ بھی بتایا کہ میری آمد سے قبل ونود چڑجی نے مخفی طور پر اسے ہدایات دے دی تھیں، کہ حمید چودھری سے کیا بات کرنی ہے۔

”سکھ بھرا! مجھے پتا نہیں تھا کہ تم سامنے والے ہوٹل ہی میں ہو گے۔“ سنتا مزید کہنے لگی۔ ”اب تو میں جب چاہوں تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔“
”کیا اس وقت چلنے کا ارادہ نہیں؟“

”ہاں میں یہی سوچ رہی ہوں کہ پہلے ونود چڑجی کو رپورٹ دے دوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا معلوم انہیں مجھ سے اور کوئی ضروری بات کہنی ہو۔ ملک افضل والا قصہ بھی درمیان میں ادھورا رہ گیا۔ اس سلسلے میں بھی ونود چڑجی سے مجھے معذرت کرنی پڑے گی، حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بزدل فرار ہو جائے گا۔ تم تو اپنے کمرے ہی میں ملو گے نا؟“

”آؤ گی کب؟ یہ بھی تو پتا چلے۔“ میں بولا۔
”ونود چڑجی کو رپورٹ دے کر آ جاؤں گی تمہارے پاس۔“ اس نے اپنے ہوٹل کے سامنے کار کو روک لیا۔ ”زیادہ سے زیادہ دیر بھی لگی تو آٹھ بج جائیں گے۔“

”میں انتظار کروں گا تمہارا..... ہاں کمرہ نمبر کے ساتھ نام بھی بتا دوں تمہیں۔ مقصود میاں کے نام سے کمرہ لیا ہے میں نے۔“ یہ کہتے ہی میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اتر گیا۔

سنتا کار کو آگے بڑھالے گئی۔ کار کا دروازہ میں نے دانستہ کھول کر بند کیا تھا تاکہ سنتا کو اندازہ ہو جائے، میں جا چکا ہوں ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں یہ جانا چاہتا تھا کہ سنتا اور ونود چڑجی کے درمیان کیا بات ہوتی ہے۔ میں اسی لئے سنتا سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

کچھ ہی دیر میں کمرے کا دروازہ کھلا اور سنتا اندر آ گئی۔ اسے شاید مجھ سے ملنے کی جلدی تھی اس لئے دروازہ بند کرتے ہی اپنا بیگ، بیڈ پر رکھ کر الماری سے ٹرانسپائر نکال لیا۔ مخصوص فری کوئٹ سیٹ کرنے کے بعد اس نے ونود چڑجی سے رابطہ قائم کر لیا اور حمید چودھری کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دی۔

”اول تو شاید وہ تم سے کل شام زیادہ رقم کا مطالبہ نہیں کرے گا۔“ ونود چڑجی کی نرم اور دھیمی آواز ٹرانسپائر پر سنائی دینے لگی۔ ”پھر بھی بطور احتیاط بیس ہزار روپے لے جانا۔ وہ بہت کام کا لڑکا ہے، اسے ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہئے۔ پانچ دس ہزار کی کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ رقم مجھے آج یا کل تمہارے پاس نہیں بھجوانی۔ تمہیں آج مجھ سے آکر ملنا ہے، رات کو آٹھ بجے کے بعد۔ چاہو تو میرے ساتھ ہی کھانا بھی کھا لیتا۔ اور۔“

”آپ کو مجھے ملک افضل کے بارے میں بھی بتانا تھا کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔ اور۔“
”معلوم ہے مجھے۔ تم تو مجھے سکھ بیر کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ ملک افضل کے متعلق اس وقت بات ہو جائے گی، جب تم آؤ گی۔ اور۔“

میرے بارے میں پوچھنے جانے پر سنتا کچھ بوکھلائی ہوئی سی دکھائی دی، پھر چند لمحوں توقف کے بعد قدرے سنبھل کر کہنے لگی۔ ”وہ سکھ بیر میرا بوائے فرینڈ ہے۔“ اس کے بعد سنتا نے ونود چڑجی کو مختصر آ وہ سب کچھ بتا دیا جو خود میری زبانی سنا تھا۔

”وہ تمہیں چاہتا ہے اور تم اسے،“ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ”ونود چڑجی جواب میں بولا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کی اور تمہاری منزل ایک ہے، لیکن تم اسے اپنے ساتھ گرین کلب کیوں لے جا رہی تھیں؟ اتنی بڑی بھول تم سے کیسے ہوئی؟ اور۔“

”سکھ بیر الگ میز پر بیٹھتا۔“ سنتا نے جھوٹ بولا۔ ”وہ میرے اور حمید چودھری کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن پاتا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ واپسی میں وہ ہوٹل دیکھ لوں گی جہاں وہ ٹھہرا ہوا ہے تاکہ اس سے ملتی رہوں۔ دراصل اس نے مجھ سے شام کو ملنے کے لئے کہا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا“
گرین کلب جانا ہے۔ اور۔“

”تم بھول رہی ہو کہ تمہارے اور سکھ بیر کے بیچ کوئی پردہ نہیں۔ کیا تم نے اس کے سامنے فون پر کانٹا سے بات نہیں کی؟ کیا تم نے اسے کانٹا کے متعلق نہیں بتایا؟ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ آج صبح جب تم ملک افضل سے ملنے گئی تھیں تو سکھ بیر بھی تمہارے ساتھ ہی تھا۔ بولو کیوں کیا تم نے ایسا؟ اور۔“

جواب طلبی پر سنتا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ واقعی وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے کمرے میں موجود ڈکٹ فون کے ذریعے وہ ساری باتیں ونود چڑجی کے علم میں آ چکی ہیں جو شام کو گرین کلب روانگی

”اسی لئے تو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”کیا تم واقعی جان گئے ہو سکھ بیر کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں؟“

”ہاں اور یہ بھی کہ کہاں لے جاؤ گی۔ مجھے اپنے گرو گھنٹال سے کیوں ملوانا چاہتی ہو تم؟ میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا تعلق صرف تم سے ہے اور یہ تعلق تمہاری ہی حد تک رہے تو ٹھیک ہے۔ تمہاری طرح میں اس بوڑھے گدھ کا غلام کیوں ہوں؟.....؟ بولو کیوں اس کی بات مانوں؟“

ہر چند کہ ونودی کے لئے میرے لیے میں سختی اور بیزاری تھی، پھر بھی سنیتا برا نہیں مانی اور بولی۔

”میری خاطر بس ایک بار ونودی سے مل لو، پھر جو تمہارے جی میں آئے سو کرنا۔“

”تمہاری ہی خاطر تو اب تک ہر دکھ جھیل رہا ہوں۔“

میرا اشتاہی تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ یوں اسے مجھ پر شک نہ ہوتا کہ میں خود ونود چڑی سے ملنے کو بیتاب ہوں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ سنیتا اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ یہ اس کی چاہت کا اثر ہے جو میں نے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ خلوت سے فائدہ اٹھا کر سنیتا نے ایک مرتبہ پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں اس طرح شلنے لگا جیسے کچھ سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی کہاں ہار ماننے والی تھی، اٹھی اور میرے قریب آنے لگی۔

”نہیں سنیتا!“ مجھے مجبوراً کہنا ہی پڑا۔ ”مجھے امتحان میں نہ ڈالو ورنہ میں..... میں تم سے دور بہت دور چلا جاؤں گا۔“

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور حسین چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیوں.....؟ آخر کیوں.....؟ تم..... تم میرے سینے میں اپنے پریم کی جوت جگا کر کس لئے آزار رہے ہو مجھے.....؟ بتا دو ایک بار مجھے کہ میں کیسے تمہیں پاسکتی ہوں؟“

”کسی کو پالینا ہی تو سب کچھ نہیں ہے سنیتا!“ میں بولا۔ ”اگر میرا ساتھ رہنا تم کو منظور نہیں تو چلا جاتا ہوں میں۔ مجھے تم ایک سندر پہنا سمجھ کر بھلا دینا۔“

”اور تم بھول پاؤ گے مجھے؟“

”نہیں۔ صرف درشن ہی کی بھیک تو چاہئے مجھے، سو اس سے کون روک سکتا ہے۔ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا تو نہ سہی۔“ پھر جب میں نے اسے یہ دھمکی دی کہ اس کے ساتھ ونود چڑی سے ملنے بھی نہیں چلوں گا تو وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئی۔ وہ مڑی اور واپس جا کر کرسی پر جا بیٹھی۔ میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ”وہن دو مجھے سنیتا، کہ تم آئندہ کبھی میرے من کی شنائی کو بھنگ نہیں کرو گی۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور سر جھک گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی، پھر وہ بولی۔ ”تمہاری مرضی اگر یہی ہے سکھ بیر کہ میں سدا اسی طرح ترتبی رہوں، میرے اندر کی آگ اسی طرح مجھے جلاتی رہے تو..... تو میں پتھر بن کر جی لوں گی۔“

سے قبل ہم دونوں کے درمیان ہوئی تھیں۔ جواب دیتے ہوئے سنیتا اس مرتبہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور بولی۔ ”سکھ بیر بہت کام کا آدمی ہے۔ میں نے یہی سوچ کر اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ اس کے اندر بڑی شگفتی (طاقت) ہے۔ میں..... میں اگر اسے کچھ نہ بھی بتاتی تو وہ جان جاتا۔“ پھر سنیتا نے ونود چڑی کو میری پراسرار قوتوں سے بھی آگاہ کر ہی دیا اور آخر میں کہنے لگی۔ ”کراچی میں بھی اس نے میری مدد کی تھی، مجھے بچایا تھا۔ اور۔“ سنیتا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ونود چڑی کو میرے متعلق حقیقت سے باخبر کر دیتی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں خدا نخواستہ درگا دیوی کا داس ہوں۔

دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا، میرے لئے خلاف توقع ہی تھا۔ ”تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ اگر سکھ بیر کے اندر اتنی شگفتی ہے کہ وہ آنکھوں سے ادبھل ہو سکتا ہے تو پھر تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس سے میری ملاقات کرا دو؟ اگر وہ تمہارے پریم میں واقعی سچا ہے، تو اس سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ اور۔“

”میں نے بھی پہلے پہل سوچا تھا، لیکن وہ من موچی ہے۔“ سنیتا نے یہ کہہ کر وہ باتیں دوہرا دیں جو کراچی میں اس سے ہوئی تھیں۔

”تم اس سے مجھے ملو، تو سہی۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گا۔ آج تم مجھ سے ملنے آؤ تو اسے بھی ساتھ لاؤ۔“ اور۔“

”میں اسے آپ سے ملوانے اور ساتھ لانے کی پوری کوشش کروں گی۔ اور۔“ سنیتا نے وعدہ کر لیا۔

”اور اینڈ آل۔“ ونود چڑی کے آخری الفاظ سنائی دیئے۔

اس کے بعد مزید میں وہاں نہیں رکا۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے اپنے ہوٹل پہنچنے اور انسانی قالب اختیار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ونود چڑی سے ملنے کی راہ خود بخود استوار ہو گئی تھی، لیکن اسے میری پراسرار قوتوں کا علم بھی ہو گیا تھا، یہ بات میرے نزدیک اطمینان بخش بہر حال نہیں تھی۔ سنیتا کی آمد تک میں اسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔ خوشبو کے جھونکے کی طرح وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ بہت نرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

”تم تو آٹھ بجے کے بعد آنے کو کہہ رہی تھیں، پہلے ہی آ گئیں۔“ وہ بیٹھ گئی تو میں بولا۔

جواب میں اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑی قائل نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ”تمہارے بنا اب چین بھی کب آتا ہے مجھے۔ میری ایک بات مانو گے سکھ بیر؟“

اس کے لمس کی خوشبو مجھے اپنی گرفت میں لینے لگی۔ آدم زاد یوں سے قرب کی فطری کمزوری غالب آنے لگی تو میں نے گہرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر مجھے خود پر قابو پانے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ میں بولا۔ ”سنیتا! میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟“

”بغیر جانے ہی کہ میں کیا بات کہنے والی ہوں؟“ وہ حیران سی رہ گئی۔

”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

گئے۔

ہمیں دودو چڑجی کی آمد کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نشست گاہ کے اندرونی دروازے سے وہ دبے قدموں اندر آگیا۔ میری پہلی نظر اس کے بالوں پر پڑی۔ سر کے بال برف کی طرح بالکل سفید تھے۔ سانولے چہرے پر بھی مجھے سفید بال نظر آئے جیسے شیو بڑھ گیا ہو، آنکھیں بڑی اور روشن تھیں، درمیانہ قد تھا۔ جسم پر سفید کھدر کا کرتا اور باجلا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ سنیتا اسے آتے دیکھ کر انہی تو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور بولا۔ ”پرنام سکھ میر جی!“

”پرنام۔“ میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہندو کس طرح ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

”تمہارا بڑا نام سنا تھا، سو درشن کرنے کو بلا لیا۔“ دودو چڑجی یہ کہتا ہوا سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا اور ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولا۔ ”سکھ میر جی! ہمیں بھی اپنا کوئی چٹکار دکھاؤ کہ ہم بھی درگا دیوی کے ایک سیوک (خادم) ہیں۔“

اس شخص کی مجموعی شخصیت کا تاثر وہ نہیں تھا جو میں نے سوجا تھا۔ عموماً آدم زادوں کے ظاہر و باطن میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔ ظاہر اس کی شخصیت بہت نرم و گداز ہی تھی۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ”میں یہاں کوئی چٹکار (کرشمہ) دکھانے نہیں آیا دودو جی! مجھ سے تو سنیتا نے بھیٹ (ملاقات) کرنے کو کہا سو چلا آیا۔“

”بڑے بہترے لگتے ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”ابنوں سے بھی چھو گے کیا۔ سنیتا تمہارے وشے (بارے) میں ہمیں سبھی کچھ بتا چکی ہے۔“

”پھر اور کیا جانکاری چاہتے ہیں۔“ میں نے سوال کیا۔

”ہم جانکاری نہیں چاہتے پرنتو تمہاری ایک غلط فہمی دور کر دینا ضروری جانتے ہیں۔ سنو سکھ میر! ہندو مہاسیما ہو کہ جن سنگ، راشٹریہ سیوک سنگ ہو کہ کانگریس، سبھی ایک ہیں۔ ہاں سب کا طریقہ ضرور الگ الگ ہے۔ تمہارا سمبندھ (تعلق) ہندو مہاسیما سے ہے نہ تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بھی ہمارے ساتھ ہو۔“

”نہیں دودو جی!“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”کانگریس اور ہندو مہاسیما میں بڑا اترا (فرق) ہے۔ ہمارا نعرہ تو ہندی، ہندو، ہندوستان ہے۔ چھما (معاف) کیجئے گا مجھے، کانگریس سرکار ہمارے سنے کبھی پورے نہیں کر سکتی۔ شیکھا منتری (وزیر تعلیم) کون ہے، کانگریس سرکار میں۔“

”سبھی کو خبر ہے کہ مولانا عبدالکلام آزاد شیکھا منتری ہیں۔“ دودو چڑجی نرمی سے بولا۔ ”اسی کو تو سیاست کہتے ہیں سکھ میر!“

”اور میں اس کو بوکھ پن (مناقضت) کہتا ہوں۔“ میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔ میری نظر میں وجود چڑجی بھی ایک منافق ہی تھا۔

”بس میں تم سے اتنا ہی تو چاہتا ہوں سنیتا، کہ تم میرے قریب نہ آؤ۔ جب میں میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارا تن پوتر (پاک) نہیں تو تو میرے من میں ہولی سی جلتے لگتی ہے۔ میں خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہوں اور اور ایسا صرف اسی سے ہوتا ہے جب تم مجھے چھوتی ہو۔“

”میں جان گئی سکھ میر کہ میں تمہارے لئے اچھوت ہوں۔ اب اب کبھی تمہیں پالینے کی آشا (امید) نہیں کروں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

اس کی طرف سے میں نے نگاہیں ہٹالیں اور پرسکون آواز میں بولا۔ ”ہاتھ روم میں جا کر منہ دھو لو۔ ابھی ہمیں چلنا بھی ہے۔“

”بڑے ہی کشور ہو تم۔“ وہ بولی اور اٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

میں مطمئن ہو گیا کہ اس آدم زادی سے خود کو بچا لیا۔ اس کے بعد ہوٹل سے روانگی میں ہمیں چند منٹ لگے، کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے۔ راستے میں اس سے میں نے پوچھا۔ ”تمہارے دودو جی نے اپنی کوٹھی کے گرد گھیرا تو آج بھی ڈال رکھا ہو گا نا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ جواب میں وہ بولی۔ اب اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور پہلے ہی کی طرح اعتدال پر نظر آ رہی تھی۔

میں اب سکھ میر کے انسانی قالب میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں نے بلا سبب اس سے ممکنہ حصار کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ مجھے خطرہ یہ تھا کہ وہ حصار مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ میں بہر حال ایک جن زاد تھا اور ابھی اس بڑے شیطان صفت آدم زاد کی پراسرار قوتوں کا مجھے قطعی اندازہ تھا۔

”ہم تو دودو جی کی مرضی ہی سے ان کے پاس جا رہے ہیں۔“ سنیتا چند لمحے بعد پھر بولی۔ ”ایسی صورت میں ہمیں گھیرے سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

میں صرف اقرار میں سر ہلا کے رہ گیا۔ پھر بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ صنعتی علاقہ تیج گاؤں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، سو ہم جلد ہی اس علاقے میں داخل ہو گئے پہلے بھی میں ادھر کا ایک پھیرا لگا چکا تھا، مگر دودو چڑجی کی کوٹھی کا علم نہیں تھا۔

کار جب ایک بڑی سی کوٹھی کے گیٹ پر رکی تو جانے کیوں میرے اعصاب تن گئے اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سنیتا نے کار کا ہارن بجایا اور گیٹ کھل گیا۔ کوٹھی کے باہر اور اندر اتنی روشنی تھی کہ درہی سے آنے والا نظر آ جائے۔ جیسے ہی کار کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی اور چوکیدار ایک طرف ہٹ گیا تو میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ چند لمحوں کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی بھڑکتے ہوئے لالہ سے گزرا ہوں۔ میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ وہ نادیہ حصار آدم زادوں کے لئے نہیں تھا۔

وہ ذہنی جھٹکا میرے لئے اتنا شدید ثابت ہوا کہ کچھ دیر کو میرے حواس گم سے ہو گئے۔ میں سنیتا کے ساتھ ساتھ کار سے اتر کر چل رہا تھا مگر خواب کے سے عالم میں۔ اب تک میرے وجود سے آگ کی تپش کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت نشست گاہ تھی جہاں میں اور سنیتا جیسے صوفوں میں دھنس

”بڑے بھاری بھاری لفظ بول رہے ہو۔“ وہ ڈھیٹ آدمی اس پر بھی مسکرانے لگا، پھر گویا مجھے سمجھایا۔ ”اس راج نیکی کو ہندو مہاسبحا بھی سمجھ نہ پائے گی۔ اسی کے کارز تم یہ دیکھو گے سکھ بیر کہ سرکار کا گھریں ہی کی رہے گی اور کبھی ہندو مہاسبحا اپنی سرکار نہیں بنا سکے گی۔“

”دودو جی! اگر آپ اپنی سرکاری حیثیت کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”غلط سمجھے سکھ بیر! تم سے اس سے ہم سرکاری حیثیت میں بات نہیں کر رہے، بلکہ سنتا کے ناتے تمہیں اپنا جان کر ایسا کہہ رہے ہیں۔ تم ایک غلط دشا (سمت) میں جا رہے ہو، سو تم کو سمجھایا ہے۔ جو کچھ ہم نے کہا، یہ ہمارے ہی دھار ہیں۔ اس کا سرکار سے کوئی سبب نہ نہیں..... اچھا خیر چھوڑو، اس بحث کو۔ اس دیس کے دشمن میں تو ہمارے تمہارے دھار ایک سان ہیں نا۔ پھر جھگڑا کس بات کا ہے۔ تم اگر کسی معاملے میں ہماری سہایتا (مدد) کر دو گے تو اس میں دونوں ہی کا لایہ (فائدہ) ہے۔“ اس نے پائنا پھینکا۔

اپنے مزاج و انداز کے اعتبار سے دودو چڑ جی ایک الگ ہی قسم کا آدم زاد تھا۔ اس کے لب و لہجے سے یوں لگتا جیسے انتہائی شریف اور مسکرا مزاج ہے۔ واقعی وہ میٹھی چھری ہی تھا۔ دانست اس نے ”سہایتا“ یعنی مدد کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس کے ارادے اندر سے کتنے خطرناک تھے، مجھے بخوبی علم تھا۔ جانے کتنے لوگوں کا خون اس کی گردن پر ہو گا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ ان تخریب کاروں کے درمیان رہ کر، ان کا اعتماد حاصل کر کے ہی انہیں نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی دانست میں مجھے پھانس رہا تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ خود صیاد زیر دام آگیا۔ اسی خیال سے میں بولا۔ ”بت اگر صرف سہایتا کی حد تک ہے تو مجھے اس سے انکار نہیں۔“

وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ”ہمیں تم سے یہی آشا تھی سکھ بیر کہ تم نراش (باپوس) نہیں کرو گے۔“ پھر اس نے ایک اور ہی بات چھیڑ دی۔ ”یہ بھوت پریت کا کیا قصہ ہے؟“

دودو چڑ جی کی سوالیہ نظریں کیونکہ سیتا کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اس لئے وہی جواب میں بولی۔ ”کوئی خاص بات نہیں دودو جی! میں اور سکھ بیر اس سے بھگت لیں گے۔“

تم لوگ جانو، ورنہ کھو تو میں کوئی بندہ دست کر دوں۔“

”نہیں دودو جی! اس کی ضرورت نہیں۔“ میں یہ سوچ کر بول اٹھا کہ کہیں وہ میرے لئے کوئی اور نیا عذاب نہ بودے۔ ”گھیرا ڈالنا مجھ کو بھی آتا ہے جس طرح آپ نے اپنی کوٹھی کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اس کا رد عمل جاننے کے لئے چہرے کا جائزہ لیا۔

لہجے بھر کو جیسے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا، پھر کہا۔ ”مجھے تم سچ گئیانی جان پڑے ہو سکھ بیر! مجھ کو حیرت ہے کہ تمہیں گھیرے کا پتا چل گیا۔“

دودو چڑ جی کے الفاظ کچھ تھے اور لہجہ کچھ۔ اس کے لہجے میں شک و شبہ کی جھلک دیکھ کر مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے اس کا تذکرہ کرنے میں تاخیر نہیں کی اور بولا۔ ”اس میں میرے

گیان دھیان کی کوئی بات نہیں دودو جی! مجھے تو گھیرے کے بارے میں سیتا سے پتا لگا تھا۔“

سیتا نے میری بات کی تصدیق کر دی تو دودو چڑ جی کے چہرے پر مجھے اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

”سبھی تو میں کہوں کہ تم کو گھیرے کی خبر کیسے ہوئی۔“ اس نے اظہار اطمینان کے طور پر کہا۔

”اس کے بارے میں تو بھوت پریت ہی جان پاتے ہیں۔ یہ آدمیوں کے لئے ہے بھی نہیں۔“ پھر وہ اصل موضوع کی طرف آگیا اور کہنے لگا۔ ”سکھ بیر! ہم جس پیر کے لئے دھرتی میں بیج بوتے ہیں، ضروری نہیں اس کی چھاؤں میں خود ہی بیٹھیں۔ اپنے بعد آنے والوں کے لئے ہمیں یہ کشت بھو گنا پڑتا ہے۔ سو آج ہم اس دیس کی دھرتی میں نفرت کا جو بیج ڈال رہے ہیں، ممکن ہے وہ ہمارے سامنے پروان نہ چڑھ سکے، پھر بھی ہمیں بیج ڈالتے رہنا چاہئے۔ تم بتاؤ سکھ بیر! اس کے لئے ہم جو بھی کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے نا؟ تمہارے دھاروں (خیالوں) سے ہمارے دھار ملتے ہیں یا نہیں؟“

”میں تو کھلی جنگ پر دوشواس (یقین) رکھتا ہوں دودو جی!“ میں نے وہی جواب دیا جو ہندو مہاسبحا کے کسی رکن کو دینا چاہئے تھا۔ ”پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنا کانگریس کی نیکی ہے ہماری نہیں۔“

”تم بار بار یہ بھول جاتے ہو سکھ بیر کہ ہم اپنے دیس میں نہیں ہیں۔ ہمارے بیج جو بھید بھاؤ ہیں۔ وہ اندر کی بات ہے۔ دھرم تو ہمارا ایک ہے نا!“

ایک متعصب ہندو مہاسبحائی نوجوان کا کردار ادا کرتے ہوئے میں نے کانگریس کی منافقانہ سیاست کو مسترد کر دیا تو وہ مجھے مذہب کے نام پر گھیرنے لگا۔

”ہاں دودو جی! یہ تو ہے۔ ہم اسی لئے تو اٹھنا بھارت کی بات کرتے ہیں۔“ میں جواب میں بولا۔

”سو کرتے رہو، ہم کب روکتے ہیں۔ اس سے تو کانگریس سرکار ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔“ اس نے

کہا۔ ”لو ہم پھر سیاسی باتیں کرنے لگے۔ اچھا اب اٹھو کھانا کھا لیتے ہیں پہلے۔“

نشست گاہ سے اٹھا کر اپنے ساتھ وہ ہمیں کھانے کے کمرے میں لے آیا۔ اس کے ملازموں نے جلدی جلدی کھانا لگا دیا۔

کھانا کھانے کے بعد اپنی کوٹھی کے جگمگ کرتے ہوئے لان میں ہمارے ساتھ ٹہلتے ہوئے دودو چڑ جی نے سیتا کو مخاطب کیا۔ ”ملک افضل اگر دھوکا دے گیا تو کوئی بات نہیں۔ ملک کے اس حصے میں اور

بہت سے ملک افضل ہیں، جن کا تعلق بنگال سے نہیں۔ سو دکھ نہ پالو، ہم کسی طرح کام چلا ہی لیں گے۔“

دودو چڑ جی کے ایک طرف میں تھا، دوسری طرف سیتا۔ اس نے اپنے خیال کی تائید میں میری

طرف دیکھا تو مجھے کتنا ہی پڑا۔ ”ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ دودو جی! ملک افضل کے قتل سے جو سیاسی فائدہ

ہوتا، وہ کسی دوسرے بڑے صنعت کار کو راستے سے ہٹا کر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔“ پھر میں نے پلٹا

کہا۔ ”لیکن میرا خیال یہ ہے، کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ یہ اگلا قدم ہو سکتا ہے۔“ یوں میں کسی

بے گناہ شخص کو ان تخریب کاروں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔

”تم جو یہ کہہ رہے ہو تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی سکھ بیر!“

”جی ہاں دودو جی! ایک قدم اٹھا کر پہلے اس کا نتیجہ دیکھ لینا چاہئے، پھر دوسرا قدم اٹھایا جائے تو اچھا

رہتا ہے۔ جہاں تک مجھ کو خبر ہے، ابھی زبان کے مسئلے پر آپ نے ایک جنگ چھیڑی ہے۔ پہلے اس جنگ

کی ہار جیت کا فیصلہ ہو جانے دیں تو پھر صوابیت اور قومیت کے ہتھیار آزمائیں۔ ویسے آپ مجھ سے زیادہ تجربے کار اور جان کار ہیں۔ اس میدان میں تو ابھی میں آپ کے آگے پیچہ ہوں۔ سنیتا سے پوچھ لیں، بہت سی باتیں تو یہ مجھے سمجھاتی ہے۔“

”ارے نہیں سکھ بھرا! اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم نے جو رائے دی ہے، اس پر بھی سوچنا پڑے گا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب آگ بھڑک اٹھے تو اسے ہر طرف سے بھڑکاتے ہی رہنا چاہئے۔ پھر بھی کل تک تو دیکھنا ہی پڑے گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کر لیں گے۔“

”ونود جی! کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہر طرف آگ ہی آگ ہو تو آگ لگانے والے خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔“ میں نے کچھ سوچ کر یہ بات کہی تاکہ آئندہ میری طرف سے اسے یا اس کے آدمیوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ کم از کم مجھ پر شبہ نہ کرے۔ اس کے سوا میری بات میں کوئی اور معنی خیزی نہیں تھی۔ خلاف توقع وہ چلتے چلتے ایک دم رک گیا اور میری طرف مڑ کر حیرت زدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ ”تمہیں یہ بھی پتا چل گیا۔“

معلوم نہیں اس کا اشارہ کس بات کی طرف تھا، میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ ہاں اتنا اندازہ مجھے ضرور ہو گیا کہ نادانگی میں کوئی تیز نشانے پر بیٹھ گیا ہے۔

”سکھ بھیر کی یہی تو خوبی ہے ونود جی!“ سنیتا موقع دیکھ کر بول اٹھی۔

”ہاں محسوس تو یہی ہوتا ہے۔“ ونود چڑچی نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میں بلا سبب اس طرح مسکرانے لگا جیسے واقعی مجھے کچھ معلوم ہو۔

ونود چڑچی نے لبا سانس بھرا بولا۔ ”تمہارا کتنا ٹھیک ہی تھا سنیتا! سکھ بھیر سے کوئی بات چھپانا شاید مشکل ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ پرستنا (خوشی) کی بات ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں، سکھ بھیر کی مرضی بھی وہی ہے۔ میں خود ہی سکھ بھیر سے یہ بات کرنے والا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم سے کیا چھپانا سکھ بھیر کے ہمارے کچھ خاص آدمی آگ لگاتے ہوئے واقعی آگ میں گھر گئے ہیں۔ ان کی بے وقوفی کہہ لو یا کچھ اور کہہ دو سی آئی ڈی والوں کی نظر میں آ گئے۔ انہیں شبہ کی وجہ سے پکڑ لیا گیا ہے۔ ان میں سے دو تو بہت کچے ہیں، وہ مار سہ جائیں گے، مگر باقی تین کے بارے میں مجھے یقین نہیں۔ وہ زبان کھول سکتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ زبان کھولنے سے پہلے ہی ان تینوں کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی جاتی، لیکن بات بنی نہیں۔ انہیں سخت پہرے میں رکھا گیا ہے۔“

اب میں جان گیا کہ ونود چڑچی نے سنیتا کے ذریعے مجھے آج ہی کیوں بلوایا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے فی الحال یہی کام لینا چاہتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ دشمنوں پر ضرب لگانے کا یہ اچھا موقع تھا۔ اس سے دوہرا فائدہ ہوتا۔ ایک طرف تو اس طرح مجھے ونود چڑچی کا اعتماد حاصل ہو جاتا، دوسری جانب اس کے پانچ خاص آدمیوں کے ذہن پڑھ کر بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد ان ملک دشمنوں کو

رہانے لگانا بھی میرے لئے مشکل نہ ہوتا۔

”تم کیا سوچنے لگے سکھ بھیر؟“ مجھے چپ دیکھ کر ونود چڑچی نے پوچھا۔

چوکنے بغیر میں نے جواب دیا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں ونود جی کہ اس طرح جو ہتھیار (انسانی قتل) کرنا ٹھیک بھی ہو گا کہ نہیں؟ اپنے ہی ہاتھوں اپنے آدمیوں کو مار دینا عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ ان کو قتل کر دینا تو خیر میرے لئے بہت آسان ہے، پھر بھی سوچ لیں تو اچھا ہے۔“

”سوچ لیا ہے ہم نے۔“ وہ بولا۔ ”صحیح طریقہ یہی ہے کہ جو آدمی نظر میں آجائیں انہیں سامنے سے ہٹا دیا جائے۔ تم کسی کی نظر میں آئے بغیر ان تک پہنچ سکتے ہو اور یہ بڑی بات ہے۔ تمہاری اس فکرتی (ملقات) سے اور بھی بہت.....“ اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی اور آگے قدم بڑھا دیئے، پھر مجھ اور سنیتا کو ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ شاید وہ یہ سوچ کر مزید کچھ کہتے ہوئے رک گیا تھا کہ پہلے ایک معاملے میں تو مجھے آزمالے۔

بات ادھوری چھوڑ دینے پر اس سے میں نے کچھ پوچھنے کے بجائے کہا۔ ”اگر میرے منہ سے کوئی غلط بات بھولے سے یا جانکاری نہ ہونے کے سبب نکل جائے تو اس کے لئے پہلے ہی معافی مانگ لیتا ہوں۔ آپ کا طریقہ جو بھی ہو، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، پر تو ایک سوال ذہن میں ضرور آتا ہے۔“

”جھگو مت سکھ بھیر! تمہارے من میں جو ہے صاف صاف کہہ دو۔“ ونود چڑچی نے کہا۔

”کل اگر سنیتا کسی کی نظر میں آ جائے تو کیا آپ اسے بھی.....“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”سب کے لئے ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا۔ جھگوان نہ کرے اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں اسے ہر صورت میں بچا کر یہاں سے نکال دوں گا۔ یہ تو میری اپنی بیٹی کی طرح ہے۔ تمہیں اس کے لئے پنت (فکر مند) ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری اس پنتا (فکر) سے مجھے پتا لگ گیا کہ تم سنیتا کو کتنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں وجہ (عہد) دیتا ہوں کہ سنیتا کے لئے کبھی یہ طریقہ نہیں اپنایا جائے گا۔ اسی کے ساتھ میں تمہیں ایک بات اور بھی بتا دوں کہ اگر کسی وجہ سے مجھے واپس بلا لیا گیا تو سنیتا ہی میری جگہ لے گی۔ اسے تم کسی طرح کم نہ جانو۔ یہ ہزار دشمنوں پر ایکلی بھاری ہے۔“

”آپ کو بڑا بھروسہ ہے سنیتا پر؟“

”ہاں اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا اپنے آپ پر ہے۔“ ونود چڑچی فوراً جواب میں بولا۔ ”بھروسہ نہ ہوتا تو

یہ تمہارے بارے میں مجھے ساری باتیں نہ بتا دیتی۔“

”تم نے یہ کیا باتیں چھیڑ دیں سکھ بھیر!“ سنیتا چپ نہ رہ سکی۔ ”ونود جی کو میں اپنے سورگ ہاشی پتا

جی کے سامان سمجھتی ہوں۔“

”سنیتا! کہنے دو سکھ بھیر کو۔ اس کی تسلی بھی تو ہونی چاہئے۔“ ونود چڑچی نے مداخلت کی۔

”ونود جی! مجھے اب اس بارے میں اور کچھ نہیں کہنا۔ آپ نے جو وجہ دیا ہے میرے لئے کافی ہے۔“ میں بولا۔

میری ان باتوں کا مقصد محض یہ تھا کہ ونود چڑجی اور سنیتا دونوں ہی میری طرف سے مطمئن ہو جائیں جو کردار میں ادا کر رہا ہوں اس پر انہیں یقین آ جائے۔ میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ ونود چڑجی مجھ سے جو کام لینا چاہتا تھا اس کی تفصیل بتانے لگا۔

”آج ہی رات یہ کام ہو جائے گا ونود جی!“ میں نے اسے یقین دلایا۔

”کام ہو جانے پر تم سنیتا کو بتا دیتا“ مجھے اس کے ذریعے معلوم ہو جائے گا۔“

اس وقت رات کے ساڑھے نو بجتے والے تھے جب میں اور سنیتا ونود چڑجی سے مل کر واپس آ رہے تھے۔ کوٹھی سے نکلے ہوئے مجھے ایک مرتبہ پھر اس اذیت سے گزرنا پڑا جو کوٹھی میں داخلے کے لئے وقت محسوس ہوئی تھی۔ اس مرتبہ میں پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھا سو کسی طرح وہ تکلیف برداشت کر گیا۔

ونود چڑجی کی کوٹھی پیچھے رہ گئی تو سنیتا مجھ سے بولی۔ ”تمہیں ونود جی سے وجہ نہیں لینا چاہئے تھا۔“

”میں نے تو ان سے وجہ دینے کو نہیں کہا تھا اگر کہہ بھی دیتا تو اس میں کیا برائی تھی؟ تمہیں ہو گا ان پر بھروسہ“ مجھے تو ابھی نہیں۔“

”اب تو بھروسہ کر لیا تم نے؟ چہن آگیا تمہیں؟“

”بالکل نہیں۔“ میں دانستہ بولا۔ ”مطلب نکالنے کے لئے تو تمہارے پتا سامان ونود جی جھوٹا وجہ دے سکتے ہیں۔“

”ونود جی ایسے نہیں ہیں۔ ابھی تم انہیں سمجھ نہیں سکے۔“

”مجھے کوئی ایسی خاص تکلیف بھی نہیں اس بڑھے کو سمجھنے کی تمہاری وجہ سے آج رات خواہ مخواہ مجھے ہتھیارا (قاتل) بننا پڑے گا۔“

”ہتھیارے تو ہو تم!“ سنیتا نے بات کا رخ بدل دیا۔ ”کیا مجھے قتل نہیں کر دیا تم نے؟“

”جو خود ہی قتل ہونا چاہے اسے قتل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ آج ہی رات ملو گے کہ کل صبح؟“ سنیتا نے معلوم کیا۔

”تم جب جاؤ اس وقت تو میں صدر گھاٹ جاؤں گا“ سی آئی ڈی آفس۔ اسی کے لاک اپ میں تو ہیں تمہارے وہ خاص بندے جنہیں اگلے جسم کی سیر کرانی ہے مجھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ سبھی ہمارے اپنے ہیں۔“ میں نے جان بوجھ کر اظہار افسوس کیا۔

”کرنا پڑتا ہے ایسا بھی۔ کیا کراچی میں خود تم ہی نے چندر پال کو ٹھکانے نہیں لگایا تھا؟“

”وہ بات اور تھی۔ اسے میں نے تمہاری خاطر ختم کیا تھا۔ وہ پکڑا جاتا تو تم بھی قانون کی نظر میں آ جاتیں لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ خیر تمہاری خاطر یہ بھی سہی“ ویسے بھی تمہارے ونود جی سے وعدہ کر لیا ہے میں نے۔ ہاں سنو آج رات گھیرا نہ ڈالنا میں کسی بھی وقت تمہیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اگر آج ہی رات کو تم ملے آ رہے ہو تو پھر مجھے سونے کی کیا ضرورت ہے۔ جاگتی رہوں گی تمہارے انتظار میں۔ گھیرا تو میں سونے سے پہلے ڈالتی ہوں۔ ایک بات کہوں جب تم مجھے اٹھا کر لے جانے کے لئے کہتے ہو تو جانے کیا کیا دھیان آنے لگتے ہیں مجھے۔“ اس کی آواز خواب ناک سی ہونے لگی۔

”کہیں گاڑی ٹکرا نہ دیتا۔ سامنے دیکھو۔“ سامنے سے آتے ہوئے ایک ٹرک کی طرف میں نے اس کی توجہ دلائی۔

”میں جھوٹو دوں تمہیں صدر گھاٹ؟“ اس نے کہا۔ ”اتنی دیر ہم اور ساتھ رہ لیں گے۔“

”نہیں“ تمہیں ادھر نہیں جانا چاہئے۔“ میں نے منع کر دیا۔ ”میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“

”تو پھر گاڑی روکو؟“

”نہیں۔“ یہ کہتے ہی میں نے سکھ بیر کا انسانی قالب چھوڑ دیا۔ ”رات کو آؤں گا تمہارے پاس۔“

”جب بھی آؤ گے جاگتی ملوں گی میں۔“ وہ بولی۔ ”ہو کہ چلے گئے سکھ بیر؟“

”جا رہا ہوں۔“ میں نے چلتی ہوئی کار کا دروازہ کھولا اور پھر اسے بند کر کے وہاں سے چل دیا۔

☆=====☆=====☆

بوڑھی لنگا کے کنارے صدر گھاٹ کی آبادی تھی۔ وہی وہ پرانی سی آبادی تھی جہاں سی آئی ڈی آفس تھا۔ سی آئی ڈی آفس کی عمارت بڑی اور آبادی سے کچھ ہٹ کر تھی۔ اس عمارت کے ارد گرد میں نے کوئی اور عمارت نہیں دیکھی۔ حفاظت کے خیال ہی سے شاید ایسا کیا گیا تھا۔

رات کے وقت وہ عمارت بظاہر سنسان لگ رہی تھی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ مسلح سادہ لباس والے پہرے پر موجود تھے۔ ان کی نظر میں آئے بغیر کوئی بھی عمارت میں داخل نہ ہو پاتا۔ میں نے اس عمارت کا ایک چکر لگایا اور احاطے میں اتر گیا۔

ان پانچ تخریب کاروں میں سے دو کو آج ہی پکڑا گیا تھا۔ تین تخریب کار گزشتہ روز حراست میں لئے گئے تھے۔ سی آئی ڈی کے ٹارچر سیل میں اس وقت بھی ان سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ جلد ہی میں نے معلوم کر لیا کہ تشدد کے باوجود کسی نے اب تک زبان نہیں کھولی۔ بھوکا پیاسا رکھنے کے علاوہ انہیں سونے بھی نہیں دیا گیا۔ ایک ایک کر کے انہیں ٹارچر سیل میں لایا جا رہا تھا۔ ایک سی آئی ڈی انسپکٹر اور اس کے دو معاون ان سے مختلف سوالات کر رہے تھے۔

جب میں ٹارچر سیل میں پہنچا تو ایک تخریب کار مندر ناتھ تختہ مشق بنا ہوا تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر خاصا تشدد کیا جا چکا ہے، آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ ایک نیکر کے سوا وہ کچھ اور پہنے ہوئے نہیں تھا۔

آئے دن حکومت کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں کی وجہ سے سی آئی ڈی کا عملہ حساس مقامات کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایک سی آئی ڈی والے نے مندر ناتھ کو گورنر ہاؤس کے ارد گرد چکر لگاتے دیکھا تو روک لیا۔ پوچھنے پر اس نے اپنا نام لطیف احمد بتایا اور یہ بھی کہ وہ نواب پور روڈ سے متصل ایک

ہندوستانی جاسوس ہے؟“

”ہاں۔“ مندر ناتھ نے فوراً اقرار کر لیا۔

مندر ناتھ کے ذہن کو اپنے اثر میں لے کر میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ وہ رحمان کے ہر سوال کا جواب دیتے ہوئے مزید مزاحمت نہ کرے۔ اس طرح میرے ظاہر ہونے کی ضرورت نہ ہوتی۔

”وہ عورت جو فرار ہو گئی تیری ہی ساتھی تھی؟ اس کا اصل نام کیا تھا؟ فرار ہو کر وہ کہاں گئی ہو گی؟“ رحمان نے پوچھا۔

”ہاں وہ بھی میرے ساتھ ہندوستان ہی سے آئی تھی۔ سروج نام تھا اس کا۔ فرار ہونے کے بعد اس نے تھری زیرو سے رابطہ قائم کیا ہو گا۔ پھر اسے جو حکم دیا گیا ہو گا وہیں گئی ہو گی۔“

”یہ تھری زیرو کون ہے؟“ رحمان نے دریافت کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ میں نے صرف اس کی آواز سنی ہے ٹرانسٹیپر۔ میں اور سروج اسی کے حکم پر چلتے تھے۔“

”لیکن تمہارے گھر کی تلاشی لینے پر تو کوئی ٹرانسٹیپر برآمد نہیں ہوا۔“

”فرار ہوتے ہوئے سروج وہ ٹرانسٹیپر اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔“

”جب تم پکڑے گئے تو گورنر ہاؤس کے گرد کیوں پھیرے لگا رہے تھے؟“

”تھری زیرو کی طرف سے حکم ملا تھا کہ میں شر کے تمام ایسے مقامات کا اچھی طرح جائزہ لوں۔“

”کس لئے؟“

”اس نے یہ نہیں بتایا۔“ مندر نے جواب دیا۔

”تین دن پہلے گورنر ہاؤس کے سامنے جو مظاہرہ ہوا، کیا تم بھی اس میں شامل تھے؟“ رحمان نے فضول سا سوال کیا۔ مندر ناتھ نے اگر گورنر ہاؤس دیکھا ہوتا تو پھر اسے دوبارہ وہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ ونود چڑجی کا حکم تھا کہ بلا سبب ادھر ادھر نہ گھوما جائے۔

مندر ناتھ نے حکومت کے خلاف تین روز پہلے ہونے والے احتجاجی مظاہرے میں شمولیت سے انکار کر دیا۔

”سروج کے علاوہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بتاؤ۔“ رحمان بولا۔

”میں کسی کو نہیں جانتا۔“

”تم پھر جھوٹ بول رہے ہو، مجھے دوبارہ تشدد پر مجبور نہ کرو۔“ رحمان نے دھمکی دی۔

اس کے بعد مندر ناتھ نے بار بار یقین دلایا کہ اسے اپنے کسی ساتھی کا علم نہیں، مگر سی آئی ڈی انسپکٹر رحمان نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مندر ناتھ مزید تشدد برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ رحمان صرف ایک ہی سوال پر انکے رہ گیا تھا ورنہ تو مندر ناتھ سے اور بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔

”اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔“ رحمان نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ”جب تک اسے

محکمے داری میں رہتا ہے۔ مندر ناتھ کی یہ مجبوری تھی کہ وہ خود کو مسلمان ہی ظاہر کرے۔ اسے ہندوستان سے آئے ہوئے ابھی تین ہی مہینے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ عورت کو اس نے اپنی بیوی بتایا اور کرائے پر مکان لے لیا۔ عورت کا نام زبیدہ تھا۔ مندر ناتھ کے بیان کی تصدیق کے لئے اسے داری لے جایا گیا۔ زبیدہ سے حماقت یہ ہوئی کہ وہ مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر فرار ہو گئی۔ زبیدہ بھی مندر ناتھ ہی کی طرح تخریب کار تھی اور اس کا اصل نام سروج تھا۔ اگر سروج یہ بے وقوفی نہ کرتی تو مندر ناتھ شہبے کی وجہ سے نہ پکڑا جاتا۔ خود کو مندر ناتھ نے ہمارے ایک شرچہچرا کا باشندہ بتایا۔ سی آئی ڈی والا اگر خود سروج کو فرار ہوتے نہ دیکھ لیتا تو شاید مندر کی جان بچ جاتی۔

محکمے والوں نے ان دونوں کے بارے میں یہی بیان دیا کہ گزشتہ تین ماہ سے وہ بحیثیت میاں بیوی وہاں قیام پذیر ہیں، لیکن کسی سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتے۔

مندر ناتھ کی گرفتاری کے بعد یہ راز کھلنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ڈھاکا شہر میں ہندو بھی آباد تھے، پھر مندر ناتھ نے خود کو مسلمان کیوں ظاہر کیا، وہ اسی لئے بری طرح پھنس گیا۔ ونود چڑجی نے مجھے مندر ناتھ کے بارے میں یقین دلایا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں زبان نہیں کھولے گا۔ سو وہ اب تک چپ سادے ہوئے تھا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر رحمان کو بھی ضد سی ہو گئی تھی کہ وہ مندر ناتھ کی زبان کھلوا کر دم لے گا۔ اس نے مندر ناتھ کو ایک کرسی سے باندھ رکھا تھا۔ مندر ناتھ اس وقت چیخنے لگا جب رحمان نے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر جھکا دیا۔

”بول کیا نام ہے تیرا؟“ رحمان نے دانت پیسے۔ ”اگر اب بھی چپ رہا تو پھر اٹلکا دوں گا۔“ اب تک اس نے اپنا اصل نام بھی نہیں بتایا تھا۔

”بتا بتا دوں گا، مگر پہلے مجھے کھول دو اور اور پانی تھوڑا سا ایک گھونٹ پانی پلا دو۔“ مندر ناتھ رک رک کر بولا۔

”یہ کھیل تو کل سے کھیل رہا ہے۔ اب نہیں چلے گی یہ بد معاشی۔“ یہ کہتے ہی رحمان نے اس کے بال پھر زور سے کھینچے۔ ”مجھے معلوم ہے اس طرح تو کچھ دیر سستا لیتا ہے، لیکن اب تجھے میں یہ مہلت نہیں دوں گا۔ زبان کھولنا پڑے گی تجھے۔“

”مار ڈالو مار ڈالو مجھے۔“ مندر ناتھ چیخنے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہی جرم ہے تا میرا کہ کہ میں ہندو ہوں۔“

”نہیں، ہندو ہونا تیرا جرم نہیں۔“ رحمان جواب میں بولا۔ ”ہندو ہو کوئی عیسائی، اگر وہ اس ملک کا باشندہ ہے، پاکستانی ہے تو اسے بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو ہیں، لیکن تو مجھے پاکستانی معلوم ہوتا نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو تجھے یہاں خود کو مسلمان ظاہر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اصل نام بتا اپنا۔“

میں نے اسی لمحے مندر ناتھ کے ذہن کو اپنے اثر میں لے لیا۔

”میرا نام مندر ناتھ ہے۔“ اس نے کسی محروم آدمی کی طرح اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

”آخر تیرے کس بل نکل ہی گئے۔“ رحمان نے اس کے بال چھوڑ دیئے، پھر سوال کیا۔ ”کیا تو

ہوش آئے ان دو کو بھی باری بار لے آؤ جو آج پکڑے گئے ہیں۔“

”سرا! ہم دوپہر سے اب تک ان دونوں کی بھی خاصی خاطر مدارات کر چکے ہیں مگر.....“

”معلوم ہے مجھے۔“ رحمان نے قدرے تلخ لہجے میں اپنے ایک ماتحت کی بات کاٹ دی۔ ”جائز ہوں میں تمہاری خاطر مدارات کو۔ تم لوگ کسی سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ یہ جو بے ہوش پڑا ہے اس کے لئے بھی تو یہی کہا تھا تم لوگوں نے۔ پھر اس نے کیسے زبان کھول دی۔“

رحمان کا ماتحت لاجواب ہو گیا اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل میں دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

سوال و جواب کے دوران میں میری توجہ مندر ناتھ کے ذہن ہی پر مرکوز رہی تھی۔ اس کا ذہن پڑھ کر مجھے کئی کام کی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ تین مہینے میں ونود چڑجی نے اس سے خاصا کام لیا تھا جس میں سرونج نے بھی خاصی مدد کی تھی۔ رحمان نے لاعلمی کے سبب اس پر مزید تشدد کیا تھا۔ مندر ناتھ کو واقعی یہ خبر نہیں تھی کہ ونود چڑجی اور کس تخریب کار سے کیا کام لے رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتا تھا جتنے تخریب کار اس وقت زیر حراست تھے۔

ذرا ہی دیر میں جس شخص کو نارچ سیل میں لایا گیا اس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ سمارے کے بغیر وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے رحمان کے سامنے ایک کرسی پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ سی آئی ڈی والوں کو اس پر یہ شبہ تھا کہ حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اسی شبہ کی بنیاد پر اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ آج دوپہر کو اردو روڈ پر مظاہرے کے وقت اسے بھی دیکھا گیا تو پھر مزید ڈھیل نہیں دی گئی۔ مظاہرے کے دوران میں وہ اپنی موجودگی کا کوئی مناسب جواز پیش نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ اپنے ذریعہ معاش کے بارے میں بھی اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

اس نے اپنا غلط نام بتانے کی غلطی سے گریز کیا اور پتا بھی ٹھیک ہی بتایا۔

”ہاں تو انوپ رائے!“ رحمان نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہارا بیان یہ ہے کہ تم صرف گھونٹے پھرنے کی خاطر اردو روڈ پر عین اس وقت جا پہنچے جب وہاں ہنگامہ ہو رہا تھا۔“ رحمان کی آواز میں طنز تھا۔ ”عام طور پر کوئی بھی شریف آدمی ایسی جگہ ٹھہرتا پسند نہیں کرتا جہاں توڑ پھوڑ جاری ہو، لیکن تم آخر تک وہاں سے نہیں ملے۔ کوئی توجہ ہو گی اس کی۔“

”میں گھر گیا تھا۔ مجھے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا کہ وہاں سے نکل جاؤں۔“ انوپ رائے نے بگڑے زبان میں جواب دیا۔

”یہ کہانی تو سنا چکے ہو تم، اب کوئی اور بات کرو۔“ رحمان بھی اس سے بگڑے ہی میں بات کر رہا تھا۔ ”اسٹوڈنٹ لیڈر دلال مکرچی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ بھی کارواں بازار میں رہتا ہے۔“ انوپ رائے نے جواب دیا۔

”آتے جاتے اس سے میل ملاقات ہو گئی تھی۔“

”صرف میل ملاقات یا دوستی؟“ رحمان نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔ ”تمہارے اور اس کے

گھر تو خاصے دور دور ہیں۔ تم اس کے گھر بھی جاتے رہے ہو کیا غلط ہے یہ؟“

”آبادی تو ایک ہے۔“ انوپ رائے نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بس ایک دو بار ہی خود اسی کے کمرے پر گیا تھا اس سے ملنے۔“

”لیکن کس لئے؟ تمہاری اور اس کی عمر میں بھی بہت فرق ہے۔ دیکھو اگر تمہیں اپنی چڑی سلامت چاہئے تو اب بھی بچ بول دو، ورنہ بہت برا حشر ہو گا تمہارا۔“ رحمان نے اسے دھمکایا اور پھر قریبی میز پر رکھا ہوا اپنا رول اٹھالیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے رحمان مزید بولا۔ ”میں تمہیں چلنے پھرنے سے محتاج کر دوں گا۔“

انوپ رائے کے چہرے سے خوف ظاہر ہونے لگا۔ جن عین تخریب کاروں کے بارے میں ونود چڑجی جی نے مجھے بتایا تھا کہ زبان کھول سکتے ہیں، انوپ رائے بھی انہی میں سے تھا۔

سی آئی ڈی والوں کے ذہنوں پر بھی میری توجہ تھی اور انوپ رائے کے ذہن پر بھی۔ اس کے گھر کی تلاشی لئے جانے پر بھی کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہو سکی تھی۔ ایک ریوالور ملا تھا جس کا لائسنس انوپ کمار کے پاس موجود تھا۔ چند ماہ قبل اس نے ایک مقامی ہندو لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس غریب لڑکی کے والدین اور دو بھائیوں کو بھی انوپ رائے کے بارے میں بس یہ خبر تھی کہ وہ کوئی خاندانی رئیس ہے۔ اس گھر میں کوئی تہ خاند بھی ہے، اس کا علم انوپ رائے کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ اگر سی آئی ڈی والے جلدی بازی سے کام نہ لیتے تو انہیں تہ خانے کا سراغ مل جاتا۔ تہ خانے کا راستہ انوپ رائے کے کمرے میں تھا۔ خود اس کی نوجوان بیوی کو بھی بغیر بلائے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس تہ خانے میں ٹرانسیر بھی تھا۔ ٹرانسیر پر ونود چڑجی سے رابطہ قائم کرنے کے خاص اوقات مقرر تھے۔ انوپ رائے نے یہ سارا حفاظتی بندوبست ونود چڑجی ہی کے ایمپر کیا تھا کہ وہ کسی بھی قسم کے شک و شبہ سے دور رہ سکے۔ سی آئی ڈی والوں کی نظر میں وہ چند دن پہلے آیا تھا جب اس نے دلال مکرچی سے رسم و راہ پیدا کی تھی۔ دلال مکرچی کی نقل و حرکت پر سی آئی ڈی والے نظر رکھے ہوئے تھے۔ انوپ رائے کے متعلق ونود چڑجی کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ زبان کھول سکتا ہے۔ اس کا ذہن پڑھ کر میرے علم میں یہ بات آئی کہ وہ خود کشی کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔

رحمان کی دھمکی سے انوپ رائے خوفزدہ ہوا مگر بولا کچھ نہیں۔ غصے میں آ کر رحمان نے اس کے دائیں گھٹنے پر زور سے رول مارا۔ انوپ رائے تڑپ کر رہ گیا۔ مجھے یہ ظاہر کرنا تھا کہ انوپ رائے نے بھی مندر ناتھ کی طرح تشدد کے نتیجے میں زبان کھولی ہے۔ سو انوپ رائے کو قابو میں کر لیا۔ چیختے ہوئے انوپ رائے نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور کہنے لگا۔ ”بس! اب..... اب میں اور زیادہ مار برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر بک وے جو بکنا ہے۔“ رحمان کے چہرے سے فتح مندی جھلکنے لگی۔

انوپ رائے نے سارا ”سبق“ سنا شروع کر دیا۔ اس کی تان بھی ”قہری زیرو“ یعنی ونود چڑجی پر ٹوٹی۔ انوپ رائے نے اپنے گھر میں موجود تہ خانے کے متعلق بھی بتا دیا۔ اس نے میرے زیر اثر رحمان کے

ہر سوال کے جواب میں سچ بولا، لیکن ایک سوال کا جواب نہ دے سکا۔ یہ وہی سوال تھا جو مندر ناتھ سے بھی کیا گیا تھا۔

”اگر تم نے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو پھر تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا میں۔“ رحمان نے دوبارہ اسے مارنے کے لئے رول اٹھایا۔

اسی وقت مندر ناتھ کو ہوش آگیا۔ کمرے میں اس کے کراہنے کی آواز گونجنے لگی۔

”اسے جانتے ہو تم؟“ رحمان نے کرسی سے بندھے ہوئے مندر ناتھ کی طرف ہاتھ سے اشار کیا۔

”نہیں۔“ انوپ رائے نے انکار کر دیا۔

پھر یہی سوال رحمان نے مندر ناتھ سے کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے، رحمان اس بات کو ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ مندر ناتھ نے بھی لاعلمی ظاہر کی تو رحمان آپے سے باہر ہو گیا۔ اسے آپے سے باہر کرنے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ مندر ناتھ پہلے ہی انتہائی تشدد کے سبب نڈھال تھا سر پر مسلسل رول پڑے تو اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ لب دم تو ہو گیا تھا مگر ابھی جان باقی تھی۔

”سر..... سر..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ رحمان کا ایک ماتحت بول اٹھا۔ ”ہمیں جواب دینا مشکل ہو جائے گا، اگر یہ مر گیا۔“

رحمان کو جیسے ہوش آگیا اور بولا۔ ”جلدی سے اسے ہسپتال لے جانے کا بندوبست کرو۔“

اس کے ایک ماتحت نے رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ اسی لمحے میں نے آگے بڑھ کر مندر ناتھ کا گلا دبا دیا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ رحمان اپنے اوپر والوں کو کیا جواب دیتا۔ میں نے تو ایک ملک دشمن کو اس کے انجام تک پہنچا دیا اور اب دوسرے کی باری تھی۔

”یہ..... یہ سر..... مر گیا یہ تو سر.....!“ رحمان کا ایک ماتحت گھبرا کر بولا۔

”نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ رحمان اس طرف لپکا۔ ”انتا..... اس پر اتنا تشدد تو نہیں ہوا کہ یہ.....“ رحمان اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑ کر مندر ناتھ کی لاش پر جھکا۔

ٹارچر سیل میں موجود تمام ہی افراد مندر ناتھ کے جسم کے اطراف جمع ہو گئے۔ انوپ رائے کو پیچ انہوں نے بھلا ہی دیا جو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت سی ظاہر ہو رہی تھی۔ ٹر اس کے قریب پہنچا اور سرگوشی کی۔ ”ان لوگوں کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر مرنے سے بہتر ہے کہ تم خود ہی جان دے دو۔“

انوپ رائے اب میرے زیر اثر تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس نے سامنے موجود دیوار سے سر ٹکرایا۔ اگر وہ میرے اثر میں نہ ہوتا تو شاید اٹھ کر کھڑا بھی نہ ہو پاتا۔ پہلی ہی ٹکرائی زوردار ثابت ہوئی کہ اس کا کاسہ سر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ جب تک محافظ اس کے قریب پہنچے وہ دم توڑ نہ تھا۔

ان دونوں تخریب کاروں میں سے ایک بظاہر تشدد کے نتیجے میں مرا تھا اور دوسرے نے خودکشی کر لی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ دونوں ہی ہندوستانی جاسوس ہونے کا اعتراف کر چکے تھے، پھر بھی رحمان انتہائی فکر مند تھا۔ اسے میں نے تیزی کے ساتھ ٹارچر سیل سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

ایک کمرے میں داخل ہو کر رحمان نے فون پر اپنے ایس پی سے رابطہ قائم کیا اور پیش آنے والے واقعے کی اسے رپورٹ دینے لگا۔ میں اس کمرے سے نکل آیا۔ اسی کمرے کے قریب سی آئی ڈی آفس کا لاک اپ تھا جس میں بقیہ تینوں تخریب کاروں کو بند کیا گیا تھا۔ مجھے سی آئی ڈی والوں کی اس حماقت پر ہنسی آئی۔ میرے خیال سے ان سب کو الگ الگ رکھنا چاہئے تھا۔ ان تینوں کے ذہن میں نے پہلے ہی پڑھ لئے تھے۔ اب میرے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

ان تینوں کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ خاصا تشدد سہہ چکے ہیں۔ وہ نڈھال سے فرش پر پڑے تھے۔ معائنہ میں سے ایک چونک کر اٹھا۔ اس کے دماغ پر اب میرا قبضہ تھا۔

”تُو نے مجھے گالی دی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ برابر پڑے ہوئے شخص کے سینے پر سوار ہو گیا اور پھر اس کی گردن دو بوج ل۔

تیسرا شخص ہڑبڑا کر اٹھا اور بیچ بچاؤ کرانے کے لئے آگے بڑھا، سر پٹ آدم زاد نے دوسرے کی گردن نہیں چھوڑی۔ اس پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ پھر وہ اسی وقت اٹھ کر کھڑا ہوا، جب دوسرے آدم زاد کی آنکھیں حلق سے جیسے باہر ابل پڑیں۔

”اب میں تجھے بھی بتاتا ہوں حرامزادے! تُو بھی مجھے اسی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔“ وہ کسی درندے کی طرح غرانا ہوا تیسرے شخص پر ٹوٹ پڑا۔

عمارت کے اندر موجود محافظوں نے جب یہ چیخ پکار سنی تو ادھر دوڑے۔ لاک اپ کے قریب برابر والے کمرے سے رحمان بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

وہ تربیت یافتہ تخریب کار تھے۔ اگر مار مار کر ان کے سارے کس بل پہلے ہی نکال نہ دیئے گئے ہوتے تو وہ اتنی جلدی ایک دوسرے کو زیر نہ کر لیتے۔

”دروازہ کھولو۔“ رحمان ایک مسلح محافظ کی طرف دیکھ کر چیخا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھ لیا تھا۔

لاک اپ میں ایک شخص تو مردہ پڑا تھا اور بقیہ دو افراد ”خونم خون“ تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ رحمان کو ایسا ہی لگا ہو گا جیسے دو خونخوار درندے برس پیکار ہوں۔ آدم زاد سے بڑا درندہ آخر ہے بھی کون۔ میں نے ان کے اندر کی درندگی کو ہوا دے دی تھی اور اب دور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ جو سینکڑوں میل دور سے اس سرزمین کو آگ اور خون میں منملانے آئے تھے، اپنے ہی لو میں نمائے ہوئے تھے۔

جب تک لاک اپ کھولا گیا، ان میں سے ایک ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دوسرا اپنی جگہ اس طرح کھڑا ہوا جھوم رہا تھا کہ اب گرنے ہی والا ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس جہنمی کو بھی سفر آخرت پر روانہ کر دیا۔ وہ مگرتے ہی تڑپا اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ رحمان ہونٹوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا

تھا۔ یوں جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

اب میں نے وہاں مزید رکنا فضول ہی جانتا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ ان پانچوں کے بارے میں ونود چڑجی نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اس کے خاص آدمی تھے۔ ان کے ذہنوں کو پڑھ کر مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں بہت اہم تھیں۔ چنانچہ ہلز سے سرحدی گاؤں پینا پل کے قریبی جنگلات تک تخریب کاروں کا جال پھیلا ہوا تھا، لیکن ان میں بڑی تعداد مقامی ضمیر فروشوں کی تھی۔ کچھ تو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس جال میں آ چسپے تھے، کچھ جرائم پیشہ تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں غدار وطن ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان غداروں کا خیال یہ تھا کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔ وہ مغربی اور مشرقی بنگال کی تقسیم کے خلاف تھے۔ وہ اسی لئے تخریب کاروں کے ہاتھوں میں کھلوتا بنے ہوئے تھے۔

ان پانچ تخریب کاروں میں سے دو کو مشرقی بنگال آئے ہوئے ایک برس سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ڈھاکہ کے علاوہ وہ چائنگام، جیسور، کلنا، راج شاہی اور دوسرے شہروں میں بھی رہ چکے تھے۔ ان سے مجھے متعدد مقامی ایجنٹوں کا علم ہوا۔ مقامی ایجنٹوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان میں کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جرائم پیشہ اور ملت فروشوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا۔ یہ صرف نام کے مسلمان اور ہندو ہوتے ہیں۔ ناموں سے دھوکا کھا کر ان کی غلط درجہ بندی کر دی جاتی ہے۔

سی آئی ڈی آفس میں مجھے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ اس وقت سوا گیارہ بج رہے تھے جب میں سنیتا کے پاس پہنچا۔

کراچی کی طرح سنیتا نے یہاں بھی اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ مسہری پر نیم دراز ایک غیر ملکی رسالہ پڑھنے میں محو تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ زیر مطالعہ رسالہ کیسا ہو گا۔ تیز تیز چلتا ہوا سانس اس کی غمازی کے لئے کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک بات اور خاص طور پر محسوس کی کہ سنیتا کے جسم پر شب خوابی کا ایسا لباس تھا جو ”صاف چھپتے بھی نہیں“ سانسے آتے بھی نہیں“ کے مصداق تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آنا ہے، سو اس نے پہلے ہی سے میرے صبر کا امتحان لینے کی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس آدم زاد کی طرف نہ دیکھنے کے لئے میں نے خود پر بہت جبر کیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کمرے میں ڈکٹافون موجود ہے۔ میرے اور سنیتا کے درمیان اس وقت جو گفتگو بھی ہو گی، ونود چڑجی کے علم میں بھی آ جائے گی۔

خود پر قابو پانے میں مجھے تھوڑی دیر تو لگی، لیکن میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ عورت جنس عام ہے اور اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود میرے قابل نہیں۔ یہ مجھے راہ راست سے بھٹکانا چاہتی ہے، گناہوں کی دلدل میں کھینچ لے جانا اس کا مقصد ہے۔ میں اس آدم زاد کی فریب میں نہیں آؤں گا۔ یہی سوچ کر میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس پر میری نظر نہ پڑے۔ کمرہ اس کے تیز سانسوں کی آواز سے اب بھی گونج رہا تھا۔

”سنیتا!“ میں نے سکھ بیکر کا قالب اپناتے ہی اسے مخاطب کیا۔

”سکھ..... سکھ بیکر!“ وہ اپنے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”تم..... تم آگئے.....“

آ جاؤ.....! میرے قریب۔“

”ہوش میں آؤ سنیتا!“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ غیر ملکی گھنٹیا رسالہ ایک طرف اٹھا کر پھینک دو۔“

”تم اسے دیکھو تو..... دیکھو تو سکھ بیکر! یہ..... یہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ آؤ ہم..... ہم دونوں مل کر اسے دیکھتے ہیں۔“

”اگر تم یہ چاہتی ہو سنیتا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ چلا جاتا ہوں میں، تم دیکھتی رہو یہ رسالہ۔“ میں نے اسے دھمکی دینے اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہونے میں دیر نہیں کی۔ میں اسی کے کمرے میں موجود رہا، مگر خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے علم تھا کہ سنیتا پر اس کا کیا رد عمل ہو گا۔

سنیتا کچھ دیر تک مجھے پکارتی رہی۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ میں ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا ہوں تو اس نے واقعی رسالہ ایک طرف میز پر پھینک دیا اور اٹھ کر لباس تبدیل کرنے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ وہ اب اپنی دانست میں مجھ سے ملنے کے لئے میرے ہوٹل جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ روم سے باہر آئی تو اس کے جسم پر پورا لباس تھا۔

جب سنیتا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو میں ظاہر ہو گیا اور پیچھے سے اسے آواز دی۔ ”رک جاؤ سنیتا!“

وہ ایک دم چونک کر پٹلی اور میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس ایک نگاہ میں شدید حیرت بھی تھی اور ہزاروں شکوکے بھی۔

میں بینڈ کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تو..... تو تم گئے..... گئے نہیں یہیں موجود تھے۔“ وہ اپنی گلابی ساڑھی کا پلو درست کرتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ ”پھر..... پھر مجھے کیوں ستایا تم نے؟ پولو۔“

”تم بھی تو مجھے ستا رہی تھیں۔ امتحان لے رہی تھیں میرا؟ خود اپنے کسے ہوئے الفاظ کیوں بھول جاتی ہو تم؟ پھر بن کر جینے کا دعویٰ تو کرتی ہو، مگر تم سے اس پر عمل نہیں ہوتا۔“ میں سنجیدگی سے کہتا رہا۔ اس دوران میں وہ میرے سانسے آ کر بیٹھ گئی۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہارے جسم کا لوبھی (لاالچی) نہیں ہوں تو پھر یہ لوبھ کیوں ویٹی ہو مجھے؟ وجہ دے کر پھر جانا کوئی اچھی بات ہے کیا؟“

”معاف کر دو سکھ بیکر! میں اس وقت جانے کماں کھو گئی تھی۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

”مجھے خبر ہے سنیتا، کہ تم کہاں کھو گئی تھیں۔ نیچے سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرو سنیتا! پاتال میں نہ جاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ گھمٹ کر وہاں نہ لے جاؤ۔ یہ تن تو ایک دن مٹی ہو جانا ہے، پر آتما (روح) سدا زندہ رہتی ہے۔ آتما کی شانتی اوپر اٹھنا اور تن کا سکھ پاتال میں گرنے کے برابر ہے۔“ پھر میں نے آئندہ کسی ایسے امتحان سے خود کو بچانے کی خاطر مصلحتاً کہا۔ ”میں نے یہاں آکر تمہیں جس حال میں دیکھا سنیتا، اس سے مجھے بڑی گھن آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سانسے میری پریک (محبوبہ) نہیں بلکہ کوئی گندی

عورت ہو۔ ایسی ہی بات ایک بار تم سے میں نے پہلے بھی کسی تھی اور تم برا مان گئی تھیں۔ تبھی میں نے تم سے کہا تھا کہ ہوش میں آ جاؤ، لیکن تم نے میری ایک نہ سنی۔ تم مجھے پاتال میں کھینچ لے جانے کے لئے اپنے پاس بلاتی رہیں تو پھر میں کیا کرتا۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں آنے والا ہوں تو پھر یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا؟“

پہلی بار میں نے سینٹا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔ پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ ”ٹھیک کہتے ہو تم کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تم سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ چکی ہوں، لیکن تم..... تم سکھ بھر جھوٹ بول رہے ہو۔“

میں اس کی بات سن کر حیران سا رہ گیا اور بولا۔ ”جھوٹ.....! میں کیوں جھوٹ بولنے لگا؟“

”یہ مجھے خبر نہیں کہ تم مجھ سے کیوں جھوٹ بولتے ہو لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ.....“

کہ مجھے میرے اس جسم ہی کے ناتے تم نے چاہا اور جانا ہے۔ تم آتما کی بات کرتے ہو تو پھر میرے اس سوال کا جواب دو کہ تم نے مجھ ہی کو کیوں چاہا؟ تن اگر کچھ نہیں تو پھر مجھ ہی سے تمہارا من کیوں ملا؟ کیا کسی بوڑھی اور بد صورت عورت کی آتما نہیں ہوتی؟ لوگ اسے کیوں نہیں چاہتے؟ صرف خوبصورت جسموں کی چاہت کس لئے.....؟ تم اگر اب تک نہیں جان سکے تو میں تمہیں بتاؤں سکھ بھر کہ تن اور من کا ملاپ ہی آتما کو شانت (پرسکون) کر سکتا ہے۔ تمہاری چاہت ادھوری ہے اور اگر ادھوری نہیں تو کسی بھی کارن (سبب) تم جھوٹ بولنے پر مجبور ہو۔“

سینٹا نے مجھے وقتی طور پر لاجواب سا کر دیا، لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا، سو سنبھل کر بولا۔ ”ہاں سینٹا! جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میری آنکھوں میں یہی سنے تھے، لیکن تمہارے تن پر لگے دھبوں نے میرے سپنوں میں آگ سی لگا دی۔ پھر میں نے صبر کر لیا۔ تم جسے جھوٹ کہہ رہی ہو، وہ جھوٹ نہیں سچ ہے۔ میں نے تمہیں جس روپ میں سوچا اور اپنے من کے سنگھاس پر بٹھایا، اسے قائم رکھنے کے لئے آتما کا سارا لیا۔ میں اسی سنے میں جینا چاہتا ہوں جو پہلی بار تمہارے لئے دیکھا تھا۔ اگر..... اگر وہ سپنا نوٹ گیا سینٹا تو..... تو پھر سب کچھ راکھ ہو جائے گا۔ میں شاید پھر جی نہ سکوں گا۔“

تم..... تم سینٹا، شاید یہ سوچ بھی نہ سکو کہ خود کو فریب دینا کتنا مشکل کام ہے.....! میں سب کچھ جانتے بوجھے اگر خود کو فریب دینا چاہتا ہوں، یہ دھیان کرنا چاہتا ہوں کہ تم..... تم صرف اور صرف میری ہو، تمہارا تن بھی میرا ہے اور من بھی تو..... تو یہ دھوکا تم مجھے کیوں نہیں کھا۔ دیتیں.....! میں نے اس سے کب انکار کیا ہے کہ جسم ہی کے ناتے ہم ایک دوسرے کو جانتے اور چاہتے ہیں۔ آج میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں، اسی تپیا (ریاضت) کی وجہ سے کہ اب تک تن کا ملاپ کو میں نے تیاگ (ترک) رکھا ہے، مجھے درگا دیوی نے یہ شکتی دان کی ہے۔ یہی شکتی کہ میں آتما تن سے باہر آ جاؤں اور کسی کو نظر نہ آؤں۔ جس دن مجھ سے یہ بھول ہو گئی، میں اپنی شکتی (طاقت) کا بیٹھوس لگا۔ تمہاری خاطر میں اپنی تپیا کو بھنگ (ختم) کرنے پر بھی راضی ہو گیا تھا کہ اب برہمچاری (ترک دنیا کر دینے والا) نہیں رہوں گا، پرنتو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیوں ضرورت نہیں پڑی، تم بھی خود

جانتی ہو۔ سو میں نے فیصلہ کر لیا کہ تن اور من کا ملاپ میرے بھاگ (نصیب) ہی میں نہیں۔“ ریاضت کی آڑ میں بڑی صفائی کے ساتھ میں نے اپنی جناتی صفات پر پردہ ڈال دیا۔

میرے چپ ہوتے ہی سینٹا جذباتی لمحے میں بولی۔ ”اگر..... اگر ایسا ہی تھا سکھ بھر تو..... تو تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے۔ میں تو بے خبر تھی کہ اگر تمہیں پالیا تو تمہاری شکتی تم سے چھین جائے گی۔ تم سے میں اتنا بڑا بلیدان (قربانی) نہیں چاہتی۔ میری بات پر وشواس (یقین) کرو کہ آج کے بعد پھر کبھی تمہیں امتحان میں نہیں ڈالوں گی۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی بھول چوک ہو جائے، سو معاف کر دینا.....! اپنی سینٹا کو معاف کر دو گے نا؟“

”بھول چوک تو بڑے بڑے رشیوں اور گیانیوں سے بھی ہو جاتی ہے، لیکن بھول کو بھول ہی کی حد میں رہنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے پریم کرتی ہو۔ بھول میں تمہارے قدم آگے بڑھ سکتے ہیں، مگر جب میں ان بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دوں، تمہیں تمہاری بھول کا احساس دلا دوں، تو برا نہ مانا اور نہ مجھے جھوٹا کہنا۔“

”تم جو چاہو شرط لگا دو، تمہاری ہر شرط اب مجھے منظور ہے۔“ اس کا لہجہ پرعزم تھا۔ پھر اپنی عادت کے مطابق اس نے ایک دم گفتگو کا موضوع بدل دیا اور مجھ سے ان تخریب کاروں کے بارے میں پوچھنے لگی، میں جنہیں ٹھکانے لگانے گیا تھا۔

”ونود جی کا یہ اندازہ غلط نکلا کہ مندر ناتھ زبان نہیں کھولے گا۔“ میں بتانے لگا۔ ”جب میں پہنچا تو سی آئی ڈی آفس کے ٹارچر سیل میں اسی سے پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ ہندوستانی جاسوس ہے اور اس کا نام مندر ناتھ ہے، میں نے اسے گلا دبا کر مار دیا۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ کچھ اور نہ بتا سکے۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ اور کیا کیا بتا چکا ہو گا، مجھے نہیں معلوم، وہ پانچوں ہی بہت کمزور نکلے اور مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ جانے وہ کیا کیا بتا چکے تھے۔“

”پھر..... پھر تو تمہیں یہ چاہئے تھا سکھ بھر کہ ان بھی کو ختم کر دیتے۔“ سینٹا تیزی سے بولی۔

”مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے دکھ بھی ہوا، لیکن کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھا۔“

”اچھا کیا تم نے، بہت اچھا کیا۔ اگر ان میں سے کوئی زندہ رہ جاتا تو یہاں کی حکومت ہمارے ملک کے خلاف اسے ثبوت کے طور پر استعمال کرتی۔“

”تو اس سے ہوتا بھی کیا؟“ میں بولا۔

”ہوتا تو خیر کچھ نہیں۔ ہمارے خلاف پروپیگنڈے کے لئے یہاں کی حکومت کو ایک بہانہ مل جاتا، سو ہم انہیں یہ موقع بھی کیوں دیں۔“

”یہ بہت اچھا ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی ونود جی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف یہی بتا سکے کہ قہری زیر کی طرف سے انہیں حکم ملتا تھا۔“

”اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ ونود جی بہت دور تک سوچتے ہیں۔ میرے علاوہ ونود جی کو صرف

ایک ہی آدمی اس حیثیت سے جانتا ہے کہ وہی تھری زیر و اور ہمارے کرتا دھرتا ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ان دنوں بھی یہاں موجود ہے یا واپس چلا گیا۔ ونود جی کے بعد ملک کے اس حصے میں وہی بڑا مانا جاتا تھا۔ اس کا کوڈ نیم بلیک کنگ تھا۔ بس ایک ہی بار اس سے میری مڈ بھیڑ ہوئی تھی۔

”وہ بلیک کنگ اور تم بلیک کون“ ادھر یعنی مشرقی پاکستان میں ونود جی کا نائب وہ ادھر مغربی پاکستان میں تم.....! ایک بات شاید تم بھول رہی ہو کہ ونود جی کو ایک اور شخص بھی جانتا ہے یا یوں کہہ لو کہ جان گیا ہے۔

”اگر تم اپنی بات کر رہے ہو تو تمہارا جانا نہ جانا برابر ہے۔“ سنیتا مسکرا کر کہنے لگی۔ ”پہلی بات تو یہ کہ تم اور میں الگ الگ نہیں ہیں، یعنی ہم ایک ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہاری حیثیت نہ تو سرکاری ہے نہ تم ونود جی کے انڈر میں ہو۔“

عین اسی لمحے میری نظر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھی۔ رات کے بارہ بجتے والے تھے۔ سنیتا نے بھی مجھے اس طرف متوجہ دیکھا تو چونک اٹھی۔

”باتوں میں نہ تمہیں دھیان رہا نہ مجھے کہ درگا دیوی کے چالیسی گھنٹے کا وقت ہو گیا ہے۔“ سنیتا بولی۔ ”مگر پہلے ونود جی کو رپورٹ بھی تو دینی ہے۔“

میں اس کی طرف جھکا اور سرگوشی کی۔ ”ڈکٹافون کی موجودگی میں رپورٹ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے تم سے ابھی جو باتیں کی ہیں انہیں پتا چل ہی جائیں گی۔“

”نہیں۔“ سنیتا نے کہا۔ ”ڈکٹافون ہٹا لیا گیا ہے یہاں سے۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں ہوٹل پہنچی تو خود ونود جی نے ہی مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ ایک اور دلچسپ بات اس بارے میں یہ معلوم ہوئی کہ جس شخص کو اس کمرے میں ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر کے ونود جی کو سناتا تھی، وہ پیدا انہی طور پر برا تھا۔ اس کمرے میں کیا باتیں ہوئی، وہ نہیں سن سکا۔ ایسے معاملوں میں ونود جی بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جب ہم ان سے ملنے گئے تھے تو یہاں سے ڈکٹافون ہٹا دیا گیا تھا۔“

”تمہیں اس بات کا یقین کیسے ہے کہ اب کمرے میں ڈکٹافون موجود نہیں؟“ میں نے دھیمی آواز ہی میں پوچھا۔

”ایک تو اس طرح کہ ونود جی خود مجھے بتا چکے ہیں، دوسری بات یہ کہ میں بطور احتیاط کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکی ہوں۔ تلاشی لینے کی وجہ ونود جی پر عدم اعتماد نہیں، بلکہ اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا رہنا بھی ہے۔ وہ بھی تو کوئی ایسی چال چل سکتے ہیں۔“

”لیکن اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پہلے ڈکٹافون لگایا گیا، پھر خود ہی ہٹا لیا۔“

”اس وقت جب میں یہاں آئی تھی تو حالات کچھ اسی طرح کے تھے۔ ملک افضل والا قصہ چل رہا تھا۔ پھر یہ کہ ونود جی یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ کوئی مغربی پاکستان سے تو یہاں میرے پیچھے لگا ہوا نہیں چلا آیا۔“ سنیتا نے وضاحت کی۔

”اور ونود جی اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”وہاں سے تمہارے پیچھے

پیچھے جو شخص آیا تھا، انہوں نے اس کا پتا لگالیا۔“

”تمہارے بارے میں تو ایک دن انہیں پتا چلنا ہی تھا۔“ وہ بھی ہنس دی، پھر اٹھ کر الماری سے ٹرانسپائر نکال لائی اور ونود چوہدری کو رپورٹ دینے لگی۔

سنیتا سے ونود چوہدری نے میرے متعلق پوچھا کہ اس وقت کمرے میں ہوں یا نہیں، میری موجودگی سے باخبر ہو کر اس نے سنیتا سے میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا، پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ آدم زادوں کو قتل کرنے پر ایک جن زاد کا شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ آدم زاد اسی قابل تھے، پھر بھی اس خیال سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اردو زبان کے ایک استاد شاعر کے شعر کا ایک مصرع موقع کی مناسبت سے میرے ذہن میں آیا کہ

”وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔“

”کیا سوچ کر اکیلے ہی اکیلے مسکرائے جا رہے ہو سکھ میر؟“ سنیتا میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”مجھے اس جن زاد علیا لیش کا خیال آ گیا تھا جو تم پر عاشق ہو چکا ہے۔“ میں نے ہنس کر بات بنا دی۔ ”اگر ایسے میں وہ آ گیا تو کیا ہو گا؟“

”کھڑے کر دوں گی اس کے۔“

”عاشقوں سے یہ سلوک اچھا تو نہیں ہوتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ جن آدم زاد یوں پر کوئی جن زاد عاشق ہو جائے، اس کا ہر حکم مان لیتا ہے۔“

”سب قصے کہانیاں ہیں۔ لوگ پر کا کوا بنا دیتے ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”پر ہوتا ہے تو کوا بنا ہے نا، ویسے بھی اب چالیسی گھنٹے کا وقت گزر چکا ہے۔“

”تو کیا ہوا، آج رات نہیں، تو کل سہی۔ میں اسے سزا دے بنا تو چھوڑوں گی نہیں۔“

”رقیب وہ میرا ہے اور سزا تم دو گی اسے۔ اب مجھے بھٹکتے دو اس سے۔ میں نے تو اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔ اگر اس میں دم ہوتا تو میرا کچھ بگاڑ لیتا۔ بھاگ کیوں گیا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ سنیتا نے اعتراف کیا۔ ”مجھ سے بہت زیادہ شکتی ہے تمہارے پاس۔ اس نے اندازہ کر لیا ہو گا۔“

”کل شام کو تمہیں حمید چودھری سے ملنے جانا ہے، وہاں تو تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، بلا وجہ خون کھولانے سے کیا فائدہ۔ ویسے بھی اس نے تمہیں ہاتھک کاسٹیٹم ساتھ لانے کے لئے کہا ہے۔ ظاہر ہے تم اس کی فرمائش ضرور پوری کرو گی۔ خیر اسے نرگ (جنم) میں ڈالو اور یہ بتاؤ کل کب اور کہاں ملو گی؟“

”تو کیا تم ابھی سے جا رہے ہو.....؟ بیٹھو نا۔“

”اس بند کمرے میں جی گھٹنے لگا ہے۔ من کرتا ہے کہ کہیں کھلی فضا میں دور تک اڑتا چلا جاؤں۔“

”سچ سکھ میر!“ وہ کھل اٹھی۔ ”مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ تم نے پہلے بھی تو کہا تھا مجھ سے کہ شہر سے باہر کہیں دور کسی جھیل کے کنارے مجھے لے چلو گے۔“

”لے چلے کو تو لے چلوں، مگر تم شاید اپنے ہوش کھو بیٹھو۔ میں بہت تیز اڑتا ہوں۔ اگر دھیرے بھی اڑوں تو.....“

”نہیں نہیں، میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔“ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔ ”میں کبھی ہوا میں نہیں اڑی۔“

مجھے دراصل اس وقت سومی کا خیال آگیا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اسی روادری میں دور تک اڑتے چلے جانے کی بات زبان پر آگئی تھی۔ سنیٹا نے ساتھ چلنے پر ضد کی تو مجھے یہ موقع مل گیا کہ دیکھ سکوں، وہ کتنے پانی میں ہے۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ مجھ سے بچنے کے لئے اس کی پراسرار شیطانی قوتیں کس حد تک ہیں۔

”ذکر بے ہوش تو نہیں ہو جاؤ گی تم؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”میں اور ذر جاؤں گی۔ یہ بھی تم نے خوب کہی۔ میں شستی میں تم سے لاکھ کم ہوں، لیکن درگا دیوی کی اداسی ہوں، یہ نہ بھولا کرو۔“

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے، آزما لیتا ہوں آج۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھا اور کمرے کی کھڑکی کھول دی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟“ عقب سے مجھے سنیٹا کی آواز سنائی دی۔

”اسی کھڑکی کے راستے چلیں گے نا!“ میں نے پلٹ کر جواب دیا، پھر بولا۔ ”ساڑھی کے بجائے تم کوئی اور لباس بدل لو تو اچھا ہے۔“

”سمجھ گئی میں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میرے پاس پینٹ اور شرٹ بھی ہے۔“

الماری کھول کر اس نے اپنا سوٹ کیس نکالا اور ایک جوڑا منتخب کر کے ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں اس عرصے میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ شہر سے باہر سومی تک پہنچنے اور پھر واپس آنے میں مجھے صرف اتنی ہی دیر لگی جتنی سنیٹا کو لباس تبدیل کرنے میں۔ ہم جن زادوں کو آدم زادوں پر یہی تو فوقیت حاصل ہے کہ لمحوں میں کہیں سے کہیں جا پہنچیں۔ سومی کو میں اس سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ سنیٹا کو وہاں لے کر آ رہا ہوں۔ اس سے میرا ایک اور مقصد بھی تھا۔ سومی سے میں نے یہ بات واضح طور پر کہہ دی تھی کہ آج رات اس آدم زادی کی پراسرار شیطانی قوتوں کا اندازہ لگانا ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے سومی کو یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اگر کسی مرحلے پر وہ خطرہ محسوس کرتے تو فرار ہو جائے، مزید یہ بھی کہ سنیٹا پر کوئی ایسا وار نہ کرے جس سے سنیٹا کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اس پر سومی کچھ کہنا چاہتی تھی، شاید یہ کہ میں اپنی دشمن کو کیوں زندہ رکھنے پر مصر ہوں؟ لیکن وقت نہ ہونے کے سبب میں وہاں رکا نہیں۔

سنیٹا لباس تبدیل کر کے آئی تو نئی نئی سی لگی۔ اس کا متناسب جسم پینٹ شرٹ میں اور زیادہ حسین معلوم ہونے لگا۔ آدم زادیوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو تو فوراً بھانپ جاتی ہیں۔ سنیٹا نے تو پھر بھی ایک دنیا دیکھی تھی۔ جانے کتنے آدم زادوں کو اس نے اپنا دیوانہ بنایا ہو گا، کتنوں کی نیندیں حرام کی ہوں گی، پھر بھلا اس جیسی عورت پر یہ عقدہ کیوں نہ کھل جاتا کہ وہ مجھے اچھی لگی ہے۔ وہ اسی لئے میرے

ذہب آتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اگر تمہیں میرے جسم پر یہ لباس اچھا لگا ہے تو پھر تمہارے سامنے یہی پرنا کروں گی۔“

”تم تو جس رنگ میں ہو، اچھی ہی لگتی ہو مجھے۔“ میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی، پھر مطلب کی بات پر آگیا۔ ”تم نے اس وقت کوئی گھیرا دیرا تو نہیں ڈال رکھا؟“

”تمہارے ساتھ رہ کر گھیرا کیا ڈالنا! میں تو اس وقت سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ تم مجھے اٹھائے ہو گے۔“

اس کے بھولپن پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ یقیناً اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ میں اسے گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔

”ہنسی کس بات پر آرہی ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ادھر ہاتھ لاؤ، بتاتا ہوں ابھی۔“ میں بولا۔

اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ مجھے تھما دیا۔ ہم جن زاد بھاری سے بھاری بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ تو بھول جیسی تھی۔ میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ذرا کی ذرا میں اسے فرش سے اٹھا لیا۔ اس کا وہ ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا جو میں نے پکڑ رکھا تھا۔ جسم کا سارا وزن صرف اس کے ہاتھ پر نہ پڑے اس لئے توڑا سا سارا دے رکھا تھا۔

”اب آیا کچھ تمہاری سمجھ میں کہ میں کیوں ہنس رہا تھا۔“ میں نے سکھ ہیر کی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”تم..... تم تو سکھ ہیر، میرے پاس ہو کر بھی دور ہو مجھ سے۔“ وہ بولی۔ اس کی آواز میں حیرت کے ساتھ ہلکی سی اداسی کی لہر تھی۔

”ہاں۔“ میں نے اسے فرش پر سیدھا کھڑا کر دیا اور ظاہر ہو گیا۔ ”قریب ہو کر تم سے دور ہی رہنا مجھے ٹھیک لگتا ہے۔“

”تمہیں جو ٹھیک لگے، وہی ٹھیک ہے۔“ وہ سراپا تسلیم و رضامندی ہوئی تھی۔

”اگر تمہیں ساتھ نہ لے جانا ہوتا تو میں اس کمرے کی کھڑکی بھی نہ کھولتا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں جانتی ہوں میں اور اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے مجھے کہ تم بند کمرے کے اندر سے دروازہ کھولے بغیر غائب ہونے کی شستی رکھتے ہو۔“ وہ بولی، پھر پوچھا۔ ”کمرے کی لائٹ اسی طرح جلتی ہوئی جھوڑوں کے بجھاؤں؟“

”بجھاؤ تو اچھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جی تبھی ہوگی تو یہی سمجھا جائے گا کہ تم سو چکی ہو۔“

”ایسے ہوٹلوں میں کسی کو یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ کون جاگ رہا ہے اور کون سو گیا۔ پھر بھی تمہارے کپڑے پر لائٹ آف کر دیتی ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر جی بجھاؤ دیا۔

میں نے خود ہی اس کے قریب جا کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”ایک بار پھر سمجھا رہا ہوں کہ ذرا مت بے ہوش بھی ہو جاؤ گی تو ہوش میں لے آؤں گا میں۔“

وہ صرف ہنس دی اور میں اس کا ہاتھ تھامے کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ہوٹل کی وہ پانچویں منزل تھی۔ وہاں سے دور خالصے فاصلے پر ایئر پورٹ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ جی بچتے ہی میں نے سکھ بیر کا قالب چھوڑ دیا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کھڑکی سے باہر آ گیا اور دوبارہ باہر سے کھڑکی بھڑ دی۔ اسی کے ساتھ میں نے دھیرے دھیرے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں اس ہوٹل کی عمارت کسی کھلونے کی طرح دکھائی دینے لگی۔ میں ایک جگہ رک گیا۔

”سینٹا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟“

”بہت ہی اچھا۔“ وہ جیسے گنگنائی۔ ”میری زندگی کا یہ سب سے انوکھا تجربہ ہے۔“

”اور اس سے بھی زیادہ انوکھا تجربہ تمہیں اب ہو گا۔“ یہ کہتے ہی میں تیز رفتاری کے ساتھ اڑنے لگا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ ہوا کی تیز رگزار اور دباؤ شاید وہ برداشت نہیں کر سکے گی، مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ اس کے جسم کو میں نے ڈھیلا ہوتے محسوس کر لیا۔ وہ ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ کسی بے ہوش آدم زاد اور مردہ شخص میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ایسے میں اس کے ذہن کو پڑھنا ممکن نہیں، سو میں نے یہ کوشش نہیں کی۔ ہاں کسی بے ہوش آدمی کو ہوش میں لانے کے لئے اس لئے ذہن کو ضرور بیدار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت مجھے سینٹا کے ذہن کو پڑھنے کا موقع مل سکتا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں کہ وہ مزاحمت نہ کرتی۔ ہر چند کہ مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی، پھر بھی بہت سی باتیں ایسی تھیں جو میں اس سے معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً مغربی پاکستان میں اس نے جن مقامی لوگوں کو اپنا آلہ کار بنا رکھا تھا، ان کے متعلق اگر میں کوئی سوال کرتا تو وہ ٹھٹھک جاتی، مجھ پر شک کرنے لگتی۔ میں نے اسی لئے براہ راست یہ سوال اس سے نہیں کیا۔

جب میں چند لمحے بعد گئے درختوں کے درمیان شہر سے باہر جھیل کے کنارے اڑا تو سوئی پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور سینٹا کو ہری ہری گھاس پر لٹا دیا۔ ہوا کی تیز رگزار کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ چاندنی درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔

وہ لمحہ بڑا نازک تھا جب میں نے سینٹا کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے ذہن کو چھیڑا۔ سوئی مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر موجود تھی۔ اس نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ایک آدم زادی سے کسی جن زادی کو ایسے حالات میں جو رقابت ہو سکتی ہے، اس کا احساس مجھے ہوا۔

سینٹا کا ذہن جب غفلت کے اندھیرے سے نکلا تو خلاف توقع وہ چیخ اٹھی مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے سینٹا کے دماغ پر ایک مرتبہ پھر اندھیرے کی چادر تن گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھے ہی کچھ پڑھنے لگی تو میں ایک دم سکھ بیر کے قالب میں ظاہر ہو گیا۔

”کیا کر رہی ہو یہ تم؟“ میں زور سے بولا۔

اس کے ہونٹ ہلنا بند ہو گئے۔ پھر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”ہاں سے چلو سکھ بیر! یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیوں؟ آخر ہوا کیا؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ میں اس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔

”یہ جگہ مجھے بھوت پریوں کا ٹھکانا لگتی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ابھی ابھی جب مجھے ہوش آ رہا تھا تو کوئی میرے دماغ میں گھسنے لگا، کوشش کر رہا تھا۔“

”پتلی ہو تم! بھلا میری سوچو گی میں کون ایسا کر سکتا ہے۔ ہاں تمہیں ہوش میں لانے کے لئے میں نے تمہارے دماغ کو ضرور چھیڑا تھا۔ اسی کی وجہ سے تمہیں یہ غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”نہیں سکھ بیر! مجھے دھوکا نہیں ہوا۔ اس نے میرے دماغ کو ٹٹولا تو تکلیف ہی کی وجہ سے میں چیخ اٹھی۔ وہ بس ایک ہی لمحہ تھا بلکہ شاید اس کا بھی آدھا حصہ۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”مجھے خود سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی سکھ بیر! جب کوئی میرے دماغ میں گھسنے یا یہ کہہ نہ کہ اسے ٹٹولنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنے آپ ہی میرے دماغ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اسے تم درگا دیوی کی بھکتا (بھیک) بھی کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں نظر نہ آیا ہو، مگر تھا ضرور کوئی نہ کوئی۔“

ایک راز سے اور پردہ اٹھ گیا۔ سینٹا جسے درگا دیوی کی بھیک بتا رہی تھی، وہ اس کے دماغ کی مخصوص خودکار قوت بھی ہو سکتی تھی۔ کچھ آدم زادوں کے ذہن اتنے ہی طاقتور اور قوی ہوتے ہیں کہ انہیں مغلوب نہیں کیا جا سکتا، یہ بات میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی یہ کہہ کر میں نے سینٹا کے عقیدے کو ٹھیس نہیں پہنچائی کہ اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ میں نے اسے آدم زادوں کے ذہن کی ایک مخصوص ساخت کا نام دیا تھا۔

”تو نے یہ کیا قصہ شروع کر دیا سینٹا۔“ میں بولا۔ ”ہو گا کوئی، بھاڑ میں ڈال اسے..... وہ دیکھ ادھر، جھیل کی سطح پر چاندنی کیسی اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ کیسا حسین منظر ہے۔ جھیل کا کنارہ، گھنے پھڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں، ہریالی، چاندنی، تو اور میں۔“

”ہاں سکھ بیر!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”شاید تو نے یہ جگہ پہلے بھی دیکھ رکھی ہو گی، لیکن..... جانے کیوں یہاں میرے من کو چین نہیں آ رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں ہمارے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے، کوئی ایسا ہے جو ہمیں نظر نہیں آ رہا۔“

”تیرا وہم ہے یہ۔ یہاں تیرے میرے سوا اور کون ہے..... کوئی بھی تو نہیں۔“ میں نے اسے لالسا دیا، پھر بات کا رخ موڑنے کے لئے بولا۔ ”تو نے تو مجھ سے کہا تھا کہ ہوش میں رہے گی، پھر ہوش کیوں کھو بیٹھی؟ کیسا لگا تجھے ہواؤں میں اڑنا؟“

”کچھ ہی دیر کو تو اڑی تھی میں تیرے ساتھ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر زناٹا سا محسوس ہوا اور ہراسہ چکرا گیا۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں، کیا ہوا۔“

”آ ادھر لیٹ جا۔“ میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ میرے شانوں پر سر رکھ کر لیٹ گئی تو میں نے سوئی کو اشارہ کر دیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ ہم

دونوں کے گرد ایک چکر لگایا۔

”سکھ میرا..... سکھ میرا!“ وہ گھبرا کر زور سے بولی۔

”ہاں بولو، کیا بات ہے؟“ میں نے دھیمی اور نرم آواز میں اس سے پوچھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سومی نے ایک مخصوص عمل کے ذریعے اسے جکڑ دیا ہے۔ یہ عمل صرف آدم زادوں پر کارگر ہوتا ہے، کسی جن زاد پر نہیں۔ سنیتا اگر اس کے زیر اثر آچکی تھی تو اب اپنے جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے حواس بیدار ہی رہتے، وہ بولتی اور سنتی بھی، لیکن اٹھ نہ پاتی۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ آدم زادی ہم جن زادوں کے اس وار سے کس طرح بچتی ہے۔

میرے سوال کے جواب میں سنیتا نے بتایا۔ ”کسی نے مجھے جکڑ لیا ہے سکھ میرا! اور..... اور اٹھنے نہیں دے رہا۔ میرا سارا جسم مفلوج سا ہو گیا ہے۔“

”میں اٹھاتا ہوں تمہیں۔“ میں نے اسے سہارا دیا اور کہا۔ ”کوشش کرو اٹھنے کی۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ ”مجھے سہارا نہ دو سکھ میرا! میں خود ہی اس جال کو توڑوں گی۔“

اس کے ہونٹوں نے جیسے ہی حرکت کی، سومی بھنی اور اسے گھسیٹتی ہوئی دور تک لے گئی، پھر اٹھا کر جھیل میں پھینک دیا۔

”سنیتا!“ میں چیختا ہوا جھیل کی طرف دوڑا۔ مجھے بہر حال سکھ میرا کا کردار تو ادا کرنا ہی تھا کہ اسے مجھ پر شک نہ ہو۔

سنیتا کو میں نے جھیل میں غوطہ کھا کر اوپر آتے دیکھا تو خود بھی جھیل میں کود گیا۔ چاندنی رات میں مجھے سنیتا کا چہرہ بھیانک سا لگا۔ اس کے ہونٹ بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھما تو زور کا جھٹکا کھا کر دور ہٹ گیا۔ سومی نے قریب آنا چاہا تو وہ بھی اچھل کر جھیل کے کنارے جا گری۔ میں سمجھ گیا کہ اب سنیتا کی شیطانی قوتیں بیدار ہو چکی ہیں اور وہ قابو میں نہیں آئے گی۔ جوابی وار کا خطرہ محسوس کرتے ہی سومی کو میں نے فرار ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی جھیل سے نکل آیا اور سنیتا کا دھیان ہٹانے کے لئے اسے آوازیں دینے لگا میری مجبوری یہ تھی کہ سنیتا کو وہاں چھوڑ کر بھاگ جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

”اس جھیل سے باہر آ جا سنیتا، باہر آ جا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ یہاں بھوت پریت آباد ہیں۔ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا۔

قریب ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں سومی کا باپ عزتیل تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے جو یہ چیخ و پکار سنی تو سلام پھیر کر لپکتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس کی پہلی نظر سنیتا پر پڑی جو پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔ ایک آدم زادی کو اس حالت میں وہاں دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔ وہ بہر حال اس کا مسکن تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا کرتا، عزتیل نے ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر لی۔ وہ کوئی دیو قامت بن مانس معلوم ہو رہا تھا۔ سنیتا جیسے ہی تیرتی ہوئی جھیل کے دوسرے کنارے تک پہنچی، عزتیل نے بالوں سے بھرا اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ غراتے ہوئے اس نے جھٹ کر سنیتا کو سر کے بالوں

سے پکڑا اور فضا میں اچھال دیا۔ سنیتا چیخ اٹھی۔ جھیل میں گرنے سے پہلے عزتیل نے سنیتا کو کسی گیند کی طرح لپک لیا۔ سنیتا خوفناک انداز میں دوبارہ چیخ کر بے ہوش ہو گئی۔ چند لمحوں میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ”عزتیل! اسے چھوڑ دے۔“ میں نے پہلی بار درخت کی آڑ سے نکل کر اسے مخاطب کیا۔ عزتیل کو دیکھتے ہی میں جھیل کے کنارے موجود ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

”کیا تو اسے یہاں لے کر آیا تھا؟“ یہ کہتے ہوئے عزتیل اڑ کر میرے پاس پہنچ گیا۔ بے ہوش سنیتا کو اس نے گھاس پر ڈال دیا۔ انسانی قالب میں ہونے کے باوجود اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ عزتیل جیسے عالم جن زادوں سے چھپنا ممکن نہیں ہوتا۔

”ہاں ادھر آ“ میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ کون ہے اور میں اسے کیوں یہاں لایا تھا۔“ میں نے اس کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ میرا مقصد محض احتیاط تھا کہ کہیں اس عرصے میں سنیتا کو ہوش نہ آ جائے اور وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن لے۔ میں اسے قریبی درختوں کے جھنڈ میں لے گیا۔ وہیں سومی جا چھپی تھی، وہ بھی سامنے آ گئی۔

میری پوری بات سن کر عزتیل بولا۔ ”اتنی سی بات تھی اے علیالیش! تو مجھے پہلے بتا دی ہوتی۔ میں ابھی اس کی ساری شیطانی قوتیں سلب کئے لیتا ہوں۔“

”کیا..... کیا ایسا ممکن ہے؟ اے عزتیل!“ میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر سوال کیا۔

”کیوں نہیں اے علیالیش! اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ دوبارہ اسے ان شیطانی قوتوں کو حاصل کرنے میں بڑا وقت لگے گا۔ اس وقت تک تیرا کام بن جائے گا۔ تو اگر چیخ میں نہ آ گیا ہوتا تو میں نے اسے مار دیا ہوتا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی اے علیالیش کہ تو دوسرے بے راہ جن زادوں کی طرح نہیں اور آدم زادوں کے درمیان رہ کر بھلائی کما رہا ہے۔ چل میرے ساتھ۔ تو دیکھے گا کہ آج رات کے بعد وہ آدم زادی عام آدم زادیوں جیسی ہو جائے گی۔“

میں، عزتیل کے ساتھ دوبارہ وہاں پہنچ گیا جہاں گھاس پر سنیتا بے سدھ پڑی تھی۔ اب تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ صورت حال یوں اچانک بدل جائے گی۔ سومی بھی میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

عزتیل نے کچھ پڑھ کر سنیتا پر دم کیا اور پھر ہمیں پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر کے سنیتا کے گرد ایک چکر کاٹا۔ سنیتا کے جسم میں حرکت ہوئی اور پھر وہ ترپنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شدید ازیت میں مبتلا ہو۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند ہی تھیں۔ دوسرے اور پھر تیسرے چکر کے بعد اس کا جسم ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

”یہ بے ہوش ہے اور تو جانتا ہی ہو گا کہ اسے کس طرح ہوش میں لائے گا۔ اٹھا کر لے جا اسے۔“ عزتیل نے مجھ سے کہا اور پھر دوبارہ درختوں کے جھنڈ میں گھس کر غائب ہو گیا۔ سومی میرے ہی پاس کھڑی رہ گئی۔

”تو آیا بھی اے علیا! تو اس بلا کو ساتھ لگالیا۔“ سہی نے شکایت کی۔

”اب آیا تو کیا ہی آؤں گا! اب جانے دے مجھے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے جھک کر سر ہوش سنتا کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا اور پھر انسانی قالب سے نکل آیا۔ کچھ دور تک سہی میرے ساتھ ازلہ رہی اور پھر ”خدا حافظ“ کہہ کر پلٹ گئی، کیونکہ آدم زادوں کی آبادی قریب آ رہی تھی۔

بچکے ہوئے جسم کے باوجود سنتا کے لمس میں بڑی حرارت تھی۔ میں جس طرح اسے ہوش سے نکال کر لایا تھا، اسی طرح کھڑکی کھول کر اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جی جلاتے سے پہلے میں نے مکہ بیر کا قالب اپنا لیا۔ سنتا کو میں نے بیڈ پر ڈال دیا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بحال ہوتی جا رہی تھی۔

وہ رات میرے ارادوں کی تکمیل میں بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی۔ میں اس پر بہت خوش تھا۔ یہ خوشی اس وقت دوبلا ہو گئی جب سنتا کو ہوش میں لاتے ہوئے میں نے اس کے ذہن کی ساری گزیریں کھول دیں۔ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جو اب تک راز تھا۔ سنتا کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ میری غلط فہمی ہی تھی کہ میں نے اس کے دماغ کو بہت قوی سمجھا جسے پڑھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ بے ہوشی سے ہوش میں آتے ہوئے سنتا کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آئے۔

”سکھ بر!“ اس کے ہونٹ ہلے۔ ”تو نے مجھے نیا جیون دیا ورنہ تو وہ بھوت پرست مجھے ماری ڈالتے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کبھی کے بل اٹھی۔

”تو جا کر پہلے کپڑے بدل آ“ یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ ”میں نے اسے مشورہ دیا۔“ تیرا بدن بیگنا ہوا ہے۔“

میرا مشورہ اس نے مان تو لیا، لیکن جب وہ اٹھ کر چلی تو قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بیڈ پر پھٹی ہوئی چادر بھی کیونکہ گیلی ہو گئی تھی، وہ بھی اس نے بدل دی۔ اب اس کے جسم پر شلوار سوٹ تھا۔ اس کے چہرے سے ٹھنکن جھلک رہی تھی، سو بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

”میں نے اگر تیری بات مان لی ہوتی اور جمیل سے نکل آتی تو شاید وہ خطرناک بھوت میری یہ حالت نہ بناتا۔ مجھے ضد سی ہو گئی تھی کہ ان بھوتوں کو سزا دوں۔ اسی کے لئے میں جاپ کر رہی تھی، مگر اس سے پہلے ہی.....“ سنتا نے اپنی بات اندر دھری چھوڑ دی۔ خوف کی وجہ سے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ یقیناً اسے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب عزتیل نے اسے بالوں سے پکڑ کر فضا میں اچھال دیا تھا۔

وہ آدم زادی اب میرے لئے قطعی بے ضرر ہو چکی تھی، سو میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”بھول جا“ اس واقعے کو۔ تیری جان بچ گئی میرے لئے یہی بہت ہے۔“

”مجھے تو خیر کچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا، لیکن سکھ بیر تو نے کس طرح ان بھوتوں کو بھگا دیا، ایسے چھڑایا ان سے مجھے؟ میں تو اس پر حیران ہوں کہ میرا کوئی بھی منتر کام نہیں آیا۔ وہ بڑا ہی طاقتور بھوت تھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی ایسے بھوت کو میں نے نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں یہ بھوت پرست میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہیں۔ اب مجھے ان کا کوئی نہ کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔“ سنتا کہنے لگی لیکن اسے ابھرا یہ علم نہیں تھا کہ اب وہ اپنی ہر شیطانی قوت سے محروم ہو چکی ہے۔

”پہلے بھی میں نے تجھ سے کہا تھا ادھر قوف کہ وہ تیرے بس میں آنے والے نہیں ہیں۔“ میں بولا۔ ”ان کو میں بھگت سکتا ہوں۔ مجھے امید تو پوری ہے کہ اب کوئی تیرے قریب نہیں آئے گا، کیونکہ ان میں سے ایک آج رات میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ علیا! تو کو مار دیا ہے میں نے۔“

”مار دیا تو نے اسے۔“ وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔ ”تو کیا وہ علیا! تو ہی تھا جس نے مجھے جمیل کے اندر سے گھسیٹ کر.....“

”نہیں۔“ میں بول اٹھا۔ ”وہ ایک اور جن زاد تھا جس سے تیری یا میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تجھے شاید معلوم نہ ہو کہ یہ بھوت پرست جہاں رہتے ہیں، وہاں کسی آدم زاد کو نہیں آنے دیتے۔ مجھ سے بھول یہ ہوئی کہ جانے بوجھے بغیر وہاں تجھ کو لے کر پہنچ گیا۔ اس جگہ کو میں نے ایک دفعہ بس اڑتے ہوئے اوپر سے دیکھا تھا اور مجھے وہ جگہ بہت اچھی لگی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا، کبھی تجھے وہاں لے جاؤں گا۔ ہوا یہ کہ جب میں نے تجھے بن مانس جیسے اس بھوت سے چھڑایا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی اس کے ٹھکانے پر نہیں آؤں گا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر علیا! تو میرے پیچھے لگ گیا۔ وہ تجھے بے ہوش دیکھ کر مجھ سے تجھ کو چھین کر لے جانا چاہتا تھا۔ بس اسی کوشش میں مارا گیا۔“ میں نے سنتا کے اطمینان کی خاطر ”کمانی“ سنا دی۔ اس کا مطمئن ہونا اب میرے لئے پہلے سے کہیں زیادہ ضروری تھا۔ میں اسی کے ذریعے ملک دشمن تخریب کاروں کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ رہ سکتا تھا۔ ان کے گرد جال بنے اور پھر انہیں گھیرنے میں سنتا ہی میرے کام آتی۔ اس کا ذہن پڑھ کر یہ بات بھی کھل گئی کہ واقعی وہ مجھ پر مرمی ہے۔

”پھر تو اب کوئی خطرہ ہی نہیں رہا۔“ سنتا نے اطمینان کا سانس لیا۔

”ہاں اب تو آرام سے سو جا، میں چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کل تو جہاں بھی ہوئی، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر اپنے ہوش کے کمرے میں آ گیا۔ سونے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اگلا قدم کیا اٹھانا ہے۔

☆=====☆

دوسرے دن صبح ناشتا کرتے ہی میں نے کرانچی کا قصد کیا۔ دوسرے کے بعد ڈھاکا میں میری موجودگی ضروری تھی اور ابھی دوسرے دور تھی۔

اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے جب میں اپنی کوٹھی میں داخل ہوا۔ میں دانستہ اپنے ساتھ کوئی سلاخ لے کر نہیں گیا کیونکہ مجھے کراچی میں صرف چند گھنٹے گزارنے تھے۔ کوٹھی میں جو کرا میرے زیر استعمال تھا، حبیب نے اسے جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ ہاں کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ روز کی جارہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے کمرے کی حالت دیکھ کر ہوا۔ میں سیدھا اپنے کمرے ہی میں پہنچا تھا جس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں پہلے وہاں اس لئے آیا تھا کہ حبیب سے معلوم کر سکوں، میری غیر موجودگی میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کی خیریت لینا بھی مقصود تھی جنہیں میں اپنی کوٹھی میں بلا گیا تھا۔

حبیب اس وقت تک کام پر نہیں گیا تھا۔ ابھی میں نے مقصود کا قالب اپنا کر کمرے سے نکلنے کے

”یہ ذکر چھوڑو کہ وہاں تمہارا بھائی کیا کرتا تھا“ مجھے تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ کس لئے آ رہا ہے؟“ میں بولا۔

”بات پکی کرنے کے لئے“ وہ نفیس کے ہاتھ پر کچھ رکھنا چاہتے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ تمہاری بھائی کو بھی ساتھ لاؤں گا۔“ حبیب نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”سرکار! مجھے تو اس وقت دوہری خوشی ملی ہے۔ ایک طرف تو بھائی صاحب کی ناراضگی دور ہو گئی، دوسرے نفیس کے فرض سے سبک دوش ہونے کا موقع مل گیا۔“

میں نے سوچا، حبیب کا بھائی لالچی ہے تو ہوا کرے، مجھے کیا۔ یہ ان دونوں بھائیوں کا معاملہ ہے۔ مجھے بس یہ خیال ضرور آیا کہ حبیب سیدھا آدمی ہے، کہیں اس کا بھائی قرض کے بھانے کوئی بڑی رقم اس سے نہ تھمالے۔ یہی سوچ کر میں نے حبیب کو تاکید کی۔ ”تم پہلے اپنا کام دھندا جمانے کی کوشش کرنا حبیب! اگر تمہارا بھائی تم سے قرض مانگے تو صاف انکار کر دینا۔ بھائی بندی کا یہ مطلب نہیں کہ اچھے دنوں میں تو ساتھ دیا جائے، میل ملاپ رکھا جائے اور برے وقت میں منہ پھیر لیا جائے۔“

”انہوں نے ابھی کوئی ایسی بات تو نہیں کی، لیکن حضور کا حکم ہے تو میں خیال رکھوں گا۔ کہہ دوں گا کہ ابھی تو خود مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔“

”یہ اچھی بات ہے کہ تم دونوں بھائیوں کے درمیان ناراضگی ختم ہو گئی، لیکن درمیان میں روپے پیسے کی بات نہ آئے تو اچھا ہے۔ ویسے بھی تمہارے حالات دیکھتے ہوئے اسے اچھا جینے ملے کی امید ہو گی۔ سال بھر سے تم دونوں کا ملنا جانا بند تھا، اس لئے اپنے بھتیجے کے بارے میں بھی معلوم کر لینا۔ رشتہ طے کرنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔“

اسی وقت حبیب کی بیوی بشرن بول اٹھی۔ ”میں بتاتی ہوں سرکار کہ بلیقیں کے ابا، اپنے بھائی کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتے۔ وہ جو بھی کہہ دیتے ہیں وہ خاموشی سے سن لیتے ہیں۔ ان کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت یہ کہاں سے لائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، بڑے بھائی کی عزت کرنی چاہئے، لیکن عزت کرنے اور بے جا دہنے میں بڑا فرق ہے۔ ابھی وقت ہے میرے پاس، میں خود بات کر لوں گا۔ اس وقت میرا آنا بہتر ہی ہوا۔ کب تک آنے کا کہا تھا تمہارے بھائی نے؟“ میں نے حبیب سے معلوم کیا۔

”کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک آ جاؤں گا، بس آتے ہی ہوں گے۔“

پھر حبیب کے بڑے بھائی حبیب کے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کی بیوی، بشرن کے ساتھ اندر چلی گئی۔ مجھ سے تعارف ہوا تو لپک کر اس نے میرے ہاتھوں کو بوسا دینا چاہا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولا۔ ”میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتا، بیٹھ جاؤ آرام سے۔“

”حضور کا نام ہی نام سنا تھا، قسمت اچھی تھی کہ دیدار بھی ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں چالوسی تھی۔ صورت سے وہ مجھے عیار معلوم ہوا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ ”حبیب نے تو مجھے بتایا تھا کہ سرکار کی واپسی.....“

لئے دروازے کی طرف قدم اٹھائے ہی تھے کہ نفیس جہاں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ حیران سی رہ گئی۔ وجہ ظاہر ہی تھی کہ کسی نے مجھے اندر آتے نہیں دیکھا تھا۔

پھر تو درازی دیر میں سب گھر والوں کو خبر ہو گئی کہ میں آ گیا ہوں۔ میں ان سب کے ساتھ نشست گاہ میں آ بیٹھا۔ ظاہر ہے، عدت کی وجہ سے بلیقیں ان میں شامل نہیں تھی۔

”کچھ خبر ہی نہیں ہوئی کہ سرکار کب آ گئے۔“ حبیب نے اظہار حیرت کیا۔ اسی وقت بشرن نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ ناشتہ کو میں پہلے ہی منع کر چکا تھا۔

میں نے حبیب کی بات کے جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”ہم اسی طرح آتے اور اسی طرح چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کو کراچی آنا ہوا تو سوچا تم لوگوں سے بھی مل لیں۔“

”بہت ہی اچھے وقت پر آئے ہیں سرکار!“ حبیب خوش ہو کر بولا۔ ”بھائی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ حضور کی نظر کرم کے طفیل.....“ حبیب کچھ کہتے کہتے رک کر اپنی چھوٹی نوجوان بیٹی نفیس جہاں سے مخاطب ہوا۔ ”تم نے سرکار کے کمرے کی صفائی شاید ابھی نہیں کی۔“

”ہاں ابا، بھول گئی خوشی میں۔ ابھی جاتی ہوں۔“ نفیس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں سمجھ گیا کہ کوئی بات ایسی ہے جو حبیب اپنی بیٹی کے سامنے کرنا نہیں چاہتا۔

”ہوا یہ سرکار کہ کل بھائی صاحب مارکیٹ میں مل گئے۔“ حبیب کہنے لگا۔ ”آپ تو جانیں خون تو پھر خون ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا، بہت خوش ہوئے اس پر کہ میری اپنی دکان ہو گئی ہے۔ صالح کو دکان پر بٹھا کر جب میں انہیں یہاں لایا تو حیران رہ گئے۔ پوچھنے پر میں نے بتا دیا کہ یہ سب میرے سرکار کی دین ہے۔ بس اسی وقت انہوں نے میرے بھتیجے شزاؤ کے لئے نفیس جہاں کا رشتہ مانگ لیا۔ سال بھر سے زیادہ ہو گیا تھا، ان سے ان بن ہوئے۔ غصے کے وہ ذرا سے تیز ہیں۔ میری ذرا سی بات انہیں بڑی لگ گئی تھی۔ میں بھی سرکار کیا کرتا کہ ان دنوں میرا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ انہیں کسی ضروری کام کے لئے دو سو روپے کی ضرورت تھی، میں بندوبست نہ کر سکا۔ اسی پر وہ ناراض ہو گئے اور بولے، حبیب اب میں تیرے گھر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا۔ میں نے لاکھ منت سماجت کی، مگر وہ پھر میرے گھر نہیں آئے۔“

سارا قصہ سن کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ حبیب کا بڑا بھائی لالچی آدمی ہے۔ نفیس جہاں کا رشتہ بھی اس نے حبیب کے پاس مال دیکھ کر کیا ہے۔

”تمہارا بھتیجا کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بوہرا جیرو پر نکل پالش کے ایک کارخانے میں کام کرتا ہے۔“ حبیب نے بتایا۔ ”بھائی صاحب آرام باغ میں رہتے ہیں۔ وہیں ایک پرانی بلڈنگ کی چھت پر انہوں نے جھگی ڈال رکھی ہے، کبھی ان سے یہ کہنے کی میری ہمت نہیں ہوئی کہ کوئی دکان کرائے پر لے لیں۔ کانپور میں تو ہم سب ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، مگر ان کا کام الگ تھا۔“

حبیب کی حالت قابل دید تھی۔ ایک طرف اس کا بڑا بھائی، دوسری طرف میں۔ وہ گوگر کی حالت میں بیٹھا تھا، کچھ کہتا بھی تو کیا کرتا۔

حبیب کو کچھ آتا جاتا نہیں تھا، محض خفت مٹانے کے لئے بڑا ہلکا رہا تھا۔ اسی خیال سے میں بولا۔
”تم سے جو ہو سکے میرے خلاف کر لیتا، لیکن یہ بات اچھی طرح اپنے دماغ سے ہٹا لو کہ تمہارے جواری بیٹے سے نفیس جہاں کا رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ تمہیں حبیب سے ایک پھونی کوڑی نہیں ملے گی۔“

”دیکھ رہے ہو تم حبیب! تمہارے سامنے بڑے بھائی کی بے عزتی ہو رہی ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری غیرت کو!“

”میں..... میں بھائی صاحب..... کیا.....“ حبیب ہلکا کے رہ گیا۔

اسی وقت اندر سے بشیرن آئی اور اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”بھائی ایک رومال اور گیارہ روپے نفیس جہاں کے ہاتھ پر رکھنے کو کہہ رہی ہیں، ان سے کیا کوں؟“

حبیب نے مظلوم سی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں پُر سکون آواز میں بولا۔ ”منع کر دو ان کو۔“

”اب ہمارے گھر کے رشتے بھی غیروں کی مرضی سے ہوں گے۔ ٹھیک ہے بھی، ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے حبیب اٹھ کھڑا ہوا اور زور سے اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ یقیناً سمجھ چکا تھا کہ دال نہیں گلے گی۔ ”تمہیں تمہاری دولت مبارک حبیب! اللہ نے چاہا تو اب یہاں کبھی تھوکنے بھی نہیں آؤں گا۔“
”چائے تو پی لینے بھائی صاحب!“ بشیرن بولی۔

”کی نہیں میرے گھر میں کھانے پینے کی۔ بہت دے رکھا ہے اللہ نے مجھے۔“ حبیب نے منہ بنا کر کہا۔

اس اثنا میں حبیب کی بیوی برقع اوڑھے ہوئے وہاں آگئی۔
”چلو، حبیب کی عقل پر تو پردہ پڑ گیا ہے۔ دودھ جو ان بیٹیاں گھر میں ہیں اور ایک غیر مرد کو گھسا رکھا ہے۔ اب میں سمجھ گیا اچھی طرح کہ یہ کیا چکر ہے، رشتے سے کس لئے انکار کیا گیا ہے۔“ مخاطب تو وہ اپنی بیوی سے تھا مگر الزام مجھ پر لگا رہا تھا۔

مجھے اس کی کینکلی پُر غصہ آگیا اور بولا۔ ”بے غیرت حبیب نہیں تو ہے جو اپنی بھتیجیوں پر تہمت لگا رہا ہے۔“

”دیکھو میرے منہ نہ لگتا، میں بہت خراب آدمی ہوں۔“ وہ مجھ پر سیدھا ہو گیا اور آستینیں چڑھا لیں۔

”ارے ارے بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ حبیب گھبرا کر میرے اور اپنے بھائی کے درمیان آگیا۔

”تو بٹ جاسائے، میں بھی دیکھتا ہوں، یہ کتنا بڑا عالم کا بچہ ہے۔“ حبیب اور بھی شیر ہو گیا۔

”ہاں، ہمیں ایک ضروری کام سے کراچی آنا پڑ گیا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اب میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔

”سرکار! آپ کو تو حبیب نے بتا ہی دیا ہو گا کہ میں اس وقت کس لئے آیا ہوں۔ گھر کی بیٹی گھری میں رہے، تو اس سے اچھی اور کیا بات ہے۔ صبح کا وقت اس لئے رکھا کہ حبیب نے جو نئی دکان خریدی ہے، اس سلسلے میں اسے رات کو واپسی میں دیر ہو جاتی ہے۔“ حبیب نے گویا جلد بازی کی وضاحت کر دی۔

”اور اس لئے بھی کہ بات پکی ہو جائے، حبیب کو یہ پتا ہی نہ چلے کہ تم اپنے بیٹے کی منگنی کر چکے ہو۔“ میں نے اسے جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”ارے سرکار! منگنی کا کیا ہے، بھائی کی خاطر توڑ دوں گا۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”منگنی ہی تو کی ہے، شادی تو نہیں کی۔“

”اور کل رات اپنے بیٹے سے تمہارا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“
میرے اس سوال پر وہ بوکھلا سا گیا اور بغلیں جھانکنے لگا۔

”بتاؤ نا حبیب کو!“ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ”تمہارا بیٹا اپنی ماں کے صندوق کا تالا توڑ کر پیے نکال لے گیا اور جوئے میں ہار دیئے۔ اسی پر جھگڑا ہوا تھا نا؟“

”وہ..... وہ سرکار، آپ کو تو خبر ہے، آج کل زمانہ کتنا خراب ہے۔“ حبیب نے آخر زبان کھول ہی دی، پھر صفائی پیش کرنے لگا۔ ”بری صحبت میں پڑ کر شہزاد کو جو کھیلنے کی لت پڑ گئی تھی، لیکن اب..... اب اس نے توبہ کر لی ہے اور..... اور وعدہ کر لیا ہے کہ آج سے کام پر جائے گا۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم۔ اس نے تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ہاں جب تم نے اسے شادی کا لالچ دیا اور بتایا کہ حبیب اچانک مالدار ہو گیا ہے تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ تم سے کہا تھا نا اس نے کہ پھر تو عیش ہی عیش ہوں گے..... جیسا باپ ویسا بیٹا۔ تمہیں بھی تو ریس کھیلنے کا شوق ہے اور یہ بات تمہارے بیٹے کو بھی معلوم ہے۔ پھر وہ تم سے کیوں دبے؟“ میں نے حبیب اور اس کے بیٹے کا سارا کپا چٹھا کھول دیا۔ حبیب اور اس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

”آپ میری توین کر رہے ہیں۔“ حبیب نے چولا بدلا، پھر وہ حبیب کی طرف پلٹ کر کہنے لگا۔
”ذرا سی بات کا یہ فسانہ بنا رہے ہیں۔ اگر یہ تمہارے محسن نہ ہوتے تو.....“

”تو کیا کر لیتے تم؟“ میں خاموش نہ رہ سکا۔

”خواہ مخواہ آپ بنی بنائی بات کو بگاڑ رہے ہیں..... آپ کے پاس اگر علم ہے تو میں نے بھی اتنی عمریوں ہی نہیں گزار دی۔ میں بھی کاٹ کرنا جانتا ہوں۔“

مجھے اس بیوقوف آدم زاد کی بات پر ہنسی آگئی اور اس سے کہا۔ ”میرے علم کمر اپنے علم کے زور سے کاٹ دو گے تم۔ یہی کہنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اپنے گول گول دیدے تھما کر مجھے یوں دیکھا جیسے کسی کو رعب میں لیتے ہوں۔

مئے تھے، مجھے ان کا علم ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر میں نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ ہرچند کہ اب غیر ملکی تخریب کاروں کے عزائم بدل چکے تھے، پھر بھی میں نے پہلے اس جال کو توڑنا ضروری سمجھا۔ بساط پچھی ہی کیوں رہے کہ دوبارہ اس پر بازی بھائی جاسکے۔ یہی سوچ کر میں فوری طور پر ڈھاکا سے کراچی آیا تھا۔ وہ فرسٹ کئی صفحات پر مشتمل تھی اور اس کے کئی حصے تھے جو میں نے قمر احمد سے بنوائی۔ فرسٹ کے پہلے حصے میں محکمہ خوراک و زراعت کے بڑے افسران کے نام درج تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ثبوت و شواہد بھی لکھے گئے جن کی تردید ممکن نہ ہو۔ دوسرا حصہ ذخیرہ اندوزوں پر مشتمل تھا جنہوں نے گیہوں، چاول، چینی اور سبزی کا اشاک کیا ہوا تھا۔ ان میں بڑے بڑے زمینداروں اور کاروباری لوگوں کے نام شامل تھے۔ فرسٹ کا تیسرا حصہ جرائم پیشہ افراد سے متعلق تھا۔

جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میں نے قمر احمد کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وزارت داخلہ کا سیکرٹری حفیظ الرحمن فاروقی، وزیر داخلہ سے ملے گیا تھا، اس لئے ہمیں تقریباً آدھے گھنٹے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کی طرح عزت و احترام اور نہایت عقیدت کے ساتھ ملا۔ پھر جب اسے حقیقت کا علم ہوا کہ میری اچانک آمد کا مقصد کیا ہے تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میرے اشارے پر قمر احمد نے فرسٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ فرسٹ پڑھنے کے بعد وہ پرجوش آواز میں بولا۔

”یہ تو کمال ہو گیا سرکار!“

”اور اس کمال کے ساتھ تمہیں یہ کمال دکھانا ہے کہ کسی کو ہوا نہ لگے، کیا ہونے والا ہے۔“ میں نے کہا۔

”حضور مطمئن رہیں، اس ضمن میں پوری رازداری برتی جائے گی۔“ حفیظ الرحمن فاروقی نے مجھے یقین دلایا۔

فرسٹ کا پہلا حصہ پڑھتے وقت حفیظ الرحمن فاروقی کو میں نے ایک نام پر چونکتے ہوئے دیکھا تھا اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی۔

”رازداری کے علاوہ ایک بات کا اور خیال رکھنا کہ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے“ خواہ تمہارا دوست ریاض الحق ہی کیوں نہ ہو۔“

ریاض الحق محکمہ خوراک کا ایک بڑا افسر تھا اور اس سے حفیظ الرحمن فاروقی کی دوستی تھی۔

”جی..... جی ہاں حضور..... بالکل۔“ حفیظ الرحمن فاروقی اس طرح بولا جیسے اس کی چوری چکڑی گئی ہو۔ وہ دراصل یہی سوچ رہا تھا کہ اپنے دوست کو کس طرح بچائے؟ میری توجہ اسی کے ذہن پر مرکوز تھی۔

”تم اگر چاہو بھی تو ریاض الحق بچ نہیں سکتا کیونکہ وہ ہماری نظر میں آچکا ہے۔“ میں بول اٹھا۔

حفیظ الرحمن فاروقی سوچنے لگا، مجھے کیا پڑی ہے اسے بچانے کی۔ جیسا کیا ہے، بھگتے گا۔ مقصود میاں سے کوئی بات نہیں چھپائی جاسکتی۔ میں بھی خواہ مخواہ ریاض سے دوستی کے سبب اس چکر میں نہ پھنس جاؤں۔

”مجبوراً اسے میں نے شیر سے بکری بنا ہی دیا۔ اس نے میرے پیر چکولے اور معافی مانگتے لگا۔ اتنی ہی سزا اس کے لئے کافی تھی۔“

”کھڑا ہو جا اور چلتا بن یہاں سے۔ معاف کیا میں نے تجھے۔“ میں بولا۔ ”اگر تو حبیب کا بڑا بھائی نہ ہوتا تو اس طرح نہ چھوڑ دیتا تجھے۔“

میرے حکم پر حبیب کھڑا ہوا اور پھر سر جھکائے اپنی بیوی کے ساتھ چل دیا۔ حبیب اور بیٹیرن دونوں ہی میرے اشارے پر اٹھے اور انہیں دروازے تک چھوڑ آئے۔

دونوں میاں بیوی واپس آئے تو میں نے ان سے کہا۔ ”اللہ جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ ہمارا یہاں آنا کارآمد ہی ثابت ہوا ورنہ بلقیس جہاں کی طرح نفیس جہاں کی قسمت بھی پھوٹ جاتی۔“ پھر میں نے اپنی غیر موجودگی میں آنے والوں کے متعلق حبیب سے پوچھا۔

”لوگ تو روزی آتے ہیں سرکار!“ حبیب نے جواب دیا۔ ”میں تو دکان پر ہوتا ہوں، یہی کہہ دیجئے ہیں کہ آپ جلد تشریف لائیں گے۔“ اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

”اور کوئی خاص بات؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی نہیں حضور..... میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ آپ تشریف لے آئے، ورنہ تو جانے کیا ہوتا..... بھائی صاحب نے آپ سے جو گستاخی کی اس کے لئے میں بھی.....“

”اب یہ قصہ چھوڑو۔“ میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”نوبتے والے ہیں تم دکان پر جاؤ اور ہم بھی چلتے ہیں، انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ان لوگوں سے رخصت ہو کر میں سیدھا قمر احمد کے دفتر پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

”حضور کب تشریف لائے ڈھاکا سے؟“

”آج ہی صبح۔“ دوسرے دن واپس بھی جانا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا قمر احمد کہ ہم نے تم سے محکمہ خوراک والوں کے بارے میں کچھ کہا تھا۔“

”جی ہاں حضور! آپ نے فرمایا تھا کہ انہی کی ملی بھگت سے ملک دشمنوں نے فائدہ اٹھایا ہو گا۔ میں نے اس سلسلے میں احکام جاری کر دیئے ہیں کہ.....“

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“ میں بول اٹھا۔ ”ان سب کا سراغ مل گیا ہے، لیکن اس ضمن میں اعلیٰ سطح پر کارروائی کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محکمہ خوراک کے کچھ بڑے افسران بھی اس میں ملوث ہیں۔ ان کے ساتھ ہی بہت سے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف بھی سخت اقدامات کی ضرورت پڑے گی۔ سرکاری حلقوں سے ان لوگوں کے گھرے مراسم ہیں۔ یہ آپریشن ایک ساتھ پورے ملک میں ہونا چاہئے۔ اس کے لئے تمام ثبوت و شواہد ہم فراہم کریں گے۔ ملک بھر میں جرائم پیشہ افراد کی بڑی تعداد کو بھی حراست میں لینا ہو گا۔ بازار سے اشیائے صرف غائب کرانے میں انہی جرائم پیشہ افراد سے کام لیا گیا ہے۔“

سینا نے ملک کے اس حصے میں جس طرح جال پھیلایا تھا اور اس کے لئے جو جھنجھڑے استعمال کئے

مرتبہ اچھلا تو میں نے اس کی گردن گھڑی۔ آواز اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ آس پاس جن طالب علموں کو اس نے اپنی حفاظت کے خیال سے جمع کر رکھا تھا، انہوں نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ ”دیکھو۔“ ایک طالب علم چیخا۔ ”یہ چودھری کو کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ پڑا جا رہا ہے اور آنکھیں ابلی پڑ رہی ہیں۔“

”چودھری۔۔۔۔۔۔ چودھری! کیا ہوا یا تمہیں؟“ اس کے ایک اور ساتھی نے اسے جھنجھوڑا۔ ”کچھ بولو، کیا بات ہے؟“

”اسے اٹھا کر لے چلتے ہیں اندر۔“ انہی میں سے ایک طالب علم نے مشورہ دیا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو کچھ بولتا بھی۔ میں چاہتا تو لمبے بھر میں اس کا کام تمام ہو جاتا۔ دانستہ میں نے اس کی گردن پر دباؤ نہیں بڑھایا اور اسے سانس لینے کی سہولت دے دی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ اس طرف متوجہ ہو جائیں۔ اسے مارنا تو تھا، مگر ایک دم نہیں، سو میں نے اس کی گردن چھوڑ کر پہلو پر ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور طالب علموں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ حمید چودھری چیختے ہوئے دوہرا ہو گیا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

ذرا سی دیر میں سب کو خبر ہو گئی، کیا ہوا ہے۔ حمید چودھری اب زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اس عجیب اور خلاف توقع واقعے نے طلبہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ پولیس پر پھراؤ کرنے کے بجائے وہ اپنے لیڈر کے گرد جمع ہو گئے۔ پولیس نے ابھی تک گولی نہیں چلائی تھی۔ خود پولیس والے بھی حیرت زدہ تھے کہ اچانک صورت حال کیسے بدل گئی۔

جھوم کو چہرہ ہوا ایک نوان آگے آیا اور طالب علموں کو مخاطب کیا۔ ”تم دگ کھڑے ہوئے کیا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ اسے اٹھا کر اندر یونیورسٹی میں لے جاؤ۔ اٹھاؤ جلدی۔“

”میں تو خود یہی کہہ رہا تھا، مگر خود چودھری نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔“ ایک طالب علم بولا۔

”ہمیں ہر قیمت پر نواب باڑی تک پہنچنا ہے۔“ نواب نوجوان نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”چودھری کی طبیعت بگڑ گئی ہے تو میں لیڈر کروں گا۔“

میں نے اس نوجوان کے ذہن پر توجہ مرکوز کی تو چونک اٹھا۔ وہی دلال کمرچی تھا۔ اسی کے حکم پر چند طالب علم، حمید چودھری کو اٹھانے لگے تو وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں کہنے لگا۔ ”م۔۔۔۔۔۔ میں اب۔۔۔۔۔۔ اب ٹھیک ہوں۔“

”نہیں چودھری! دلال کمرچی بول اٹھا۔ تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں جو موجود ہوں۔“

طالب علموں نے حمید چودھری کو سارا دے کر کھڑا کیا اور پھر اسے یونیورسٹی کے صدر دروازے کی طرف لے جانے لگے۔ حمید چودھری کی جگہ دلال کمرچی نے لے لی اور طلبہ کو دوبارہ جوش دلانے کے لئے

”اب تم صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔ ایسے معاملات سے بچ کر ہی رہنا چاہئے۔“ میری بات سن کر حفیظ الرحمن فاروقی تقریباً اچھل پڑا اور پھر اس کے چہرے سے خوف جھلکنے لگا۔ ”ذرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی سے دوستی کوئی جرم نہیں۔ ہم جانتے ہیں تمہارا دامن صاف ہے اور ہمارے لئے یہ کافی ہے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور قمر احمد کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وزارت داخلہ کے سیکرٹری نے بہت روکا کہ کم سے کم میں چائے تو پی لوں، مگر مجھے اب واپس ڈھاکا پہنچنے کی جلدی تھی، اس لئے انکار کر دیا۔

اس کے بعد قمر احمد سے رخصت ہو کر جب میں ڈھاکا پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں اسی لئے کھانا کھاتے ہی اپنے ہوٹل سے روانہ ہو گیا۔ میں نے اب انسانی قالب چھوڑ دیا تھا۔

سر سلیم اللہ روڈ پر واقع ڈھاکا یونیورسٹی کو پولیس کی بھاری جمیٹ اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی اور یونیورسٹی کے احاطے سے فلک شگاف نعرے۔ نائی دے رہے تھے۔ پھر میں نے طلبہ کے ایک جھوم و باہر آتے دیکھا۔ مجھے حمید چودھری کی تلاش تھی۔ وہ مجھے طلبہ کے جھوم میں نظر آ ہی گیا۔ اسے بہت سے طالب علم اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ وہ طلبہ کو آگے بڑھنے کے لئے جوش دلا رہا تھا۔

جھوم کو آگے بڑھتے دیکھ کر پولیس کے ٹرک کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ انہی کے ساتھ مجھے ایک جیب دکھائی دی۔ جیب میں بیٹری سے چلتے والا لاڈل اسپیکر لگا ہوا تھا۔ ایک پولیس افسر تک ہاتھ میں لئے اپنی سیٹ سے اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے لاڈل اسپیکر سے اس کی تیز آواز سنائی دینے لگی۔ ”تم لوگوں کو آخری بار وارننگ دی جا رہی ہے کہ اب بھی آگے بڑھنے سے رک جاؤ ورنہ مجبوراً مجھے کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔ میں جیب سے اتر کر تین لکیریں کھینچوں گا۔ اگر تم لوگوں نے پھر بھی حکم نہ مانا اور تیسری لکیر بھی عبور کر گئے تو فائر کھول دیا جائے گا۔“ یہ الفاظ اس نے بنگلہ اور اردو دونوں ہی زبانوں میں ادا کئے تھے۔

پولیس افسر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی سپاہی ٹرکوں سے کود کر پوزیشن لینے لگے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ جھوم کی طرف کر دیا تھا۔

جو کچھ پولیس افسر نے کہا تھا، اسی پر عمل کرنے کے لئے وہ جیب سے اترا اور عین اسی لمحے طلبہ نے پولیس پر پھراؤ شروع کر دیا۔

پولیس افسر دوبارہ جیب میں سوار ہو گیا اور مائیک سنبھال لیا۔ ”قانون کو ہاتھ میں نہ لو۔ میں تین تک گنتی گنوں گا۔ اگر تم منتشر نہ ہوئے پھر۔۔۔۔۔۔ اس کا جملہ ادھر وای رہ گیا۔ ایک پھر جیب کے دہڑا۔۔۔۔۔۔ اسکرین سے نکرایا۔ زوردار چھٹا ہوا۔“

”چلاؤ گولی چلاؤ۔“ جھوم کی طرف سے شور اٹھا۔

میں اس وقت تک حمید چودھری کے قریب پہنچ چکا تھا۔

☆=====☆

اس غدار حمید چودھری کو ٹھکانے لگانے ہی کے لئے میں یہاں آیا تھا۔ نعرہ لگاتے ہوئے وہ ایک

ذیشان حیدر تھا۔ وہ ان احتجاجی مظاہروں کے خلاف تھا، یہ بات پہلی مرتبہ میرے علم میں آئی۔ وہ جگہ زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔

”یہ غلط بات ہے چودھری کہ تم اپنے ہی ساتھیوں پر شک کرنے لگو۔“ ایک اور طالب علم کہنے لگا۔

”تو یہ کیوں فضول باتیں کر رہا ہے۔“ غصے کی وجہ سے حیدر چودھری اپنی تکلیف بھول گیا۔ وہاں موجود طالب علموں کے ذہنوں کو میں نے حیدر چودھری کے خلاف کر دیا۔ اس کے بعد ایک نیا ہی تماشا ہونے لگا۔

”تم نے الزام کیسے لگایا مجھ پر؟ بولو..... کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو۔“ جس طالب علم نے حکومت کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں پر اعتراض کیا تھا، حیدر چودھری کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ”ہمارے ہی بل پر لیڈر بنے پھرتے ہو اور ہم کو آنکھیں دکھاتے ہو۔“

”تو نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ حیدر چودھری کے گریبان پر۔“ یہ کہتے ہی حیدر چودھری نے اس طالب علم کے منہ پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔

ان طالب علموں کی تعداد چھ تھی اور حیدر چودھری اکیلا تھا۔ وہ سب ہی حیدر چودھری پر پل پڑے۔ حیدر چودھری تو پہلے ہی مجھ سے خاصی مار کھا چکا تھا، سو ذرا سی دیر میں اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ نیم جاں حالت میں وہ طالب علم اسے چھوڑ کر بھاگنے لگے تو طلبہ کا ایک گروہ دلال مکرمی کی لاش اٹھائے اسی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے اس عرصے میں حیدر چودھری کا گھلا دبا دیا۔ دو غداروں کو ان کے انجام تک پہنچا کر میں یونیورسٹی سے نکلا تو پولیس نے طلبہ کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس کے شیل پھینکنا شروع کر دیے۔ حیدر چودھری اور دلال مکرمی کے نہ ہونے کی وجہ سے طالب علموں کی ہمت تو پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ ان کی حالت ایسی فوج کی سی تھی جسے کمان کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پولیس افسر نے ہوش سے کام لیا ورنہ بات بگڑ جاتی۔ طلبہ پر گولی چلانے کی نوبت نہیں آئی اور وہ منتشر ہو گئے۔ اس احتجاجی مظاہرے کی اصل ناکامی کا سبب حیدر چودھری اور دلال مکرمی کو پیش آنے والے عجیب واقعات تھے۔

غیر ملکی دشمنوں کے منصوبے پر میں نے پانی پھیر دیا ورنہ نہ جانے کتنے طالب علم مارے جاتے۔ قصور ان طالب علموں کا نہیں تھا۔ اصل قصور وار تو وہ تھے جنہوں نے انہیں غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ ان کے ذہنوں میں نفرت کے بیج بونے والے، احساس محرومی پیدا کرنے والے اور دلوں میں کدورت بھرنے والے کچھ اور ہی لوگ تھے۔ یہ وہ تھے جن کی نظروں میں اس نئی مملکت کا وجود کھٹک رہا تھا۔ وہ جو قومیت اور زبان کو بنیاد بنا کر اس ملک کی نظریاتی جڑوں پر ضرب لگانے کے درپے تھے ورنہ تو خود کون اپنے پیروں پر کھڑی مارتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے نوجوانوں کو اپنا پسلا ہدف بنایا کیونکہ ناچتے ذہن جلد ہی قریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ابھی یہ معاملہ ابتدائی مرحلے میں تھا، اسی لئے اس پر قابو پانا زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ آگ ابھی بمزکی

تقریر کرنے لگا۔ ”ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ ہم کسی قیمت پر یہ ظلم برداشت نہیں کریں گے۔ سرکاری زبان اردو نہیں بلکہ ہوگی۔ حکومت کو ہمارا یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑے گا۔“ وہ جگہ زبان ہی میں تقریر کر رہا تھا۔ ”ہماری آبادی زیادہ ہے، زبان ہماری ہوگی ان کی نہیں۔“

دلال مکرمی زہرا اٹھتا رہا اور اسی عرصے میں دوبارہ نعرے بازی شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ طلبہ کا ہجوم دوبارہ مشتعل ہو کر پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیتا، میں نے آگے بڑھ کر دلال مکرمی کو گرفت میں لیا۔ چل پہلے تو ہی سی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ایک مرتبہ پھر وہی کھیل شروع ہو گیا۔ دلال مکرمی ”پچاؤ، پچاؤ۔“ چیخے جا رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک دلال مکرمی کو کیا ہو گیا ہے۔

”کوئی..... کوئی مجھے مار..... رہا ہے۔“ دلال مکرمی زور سے بولا اور پھر ادندھے منہ زمین پر گرا۔

”پاگل ہو گیا ہے یہ، خود ہی منہ کے بل گرا ہے اور چیخے جا رہا ہے۔“ کسی نے کہا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر دلال مکرمی کا سر اٹھایا اور پھر زمین پر دے مارا۔ دیکھنے والوں نے یہی دیکھا ہو گا کہ خود دلال مکرمی نے ایسا کیا ہے۔ چند ہی لمحوں میں وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں وہاں رکے بغیر یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ چند طلبہ کے درمیان میں نے حیدر چودھری کو ایک بیڑے کے نیچے گھاس پر لیٹے دیکھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں اور وہ بار بار اپنی گردن پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔

”بتاؤ تو سی یار کہ آخر ہوا کیا تھا؟“ ایک طالب علم نے اس سے پوچھا۔ ”میں نعرے لگا رہا تھا کہ..... کہ مجھے ایک دم ایسا لگا جیسے کسی نے میری گردن پکڑ لی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے حیدر چودھری کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔ ”پھر..... پھر میری گردن پر دباؤ بڑھنے لگا اور..... اور گردن چھوٹی تو.....“ حیدر چودھری رک رک کر وہ باتیں بتانے لگا جو پہلے ہی مجھے معلوم تھیں۔

”پیارے! تم بڑی عجیب سی باتیں کر رہے ہو۔“ ”تو کیا میں جھوٹ..... جھوٹ بول رہا ہوں۔“ حیدر چودھری کو اتنا غصہ آیا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، ہم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ اس سے ملے گا کیا ہمیں؟“ ”یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی..... کہیں تم ذیشان کی پارٹی سے تو نہیں مل گئے؟“ حیدر چودھری نے اس طالب علم کو گھور کر دیکھا۔

میں نے جان بوجھ کر فوری طور پر حیدر چودھری کو تھوڑی مہلت دے دی اور اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات پڑھنے لگا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ کی ایک اور تنظیم بھی تھی جس کا سیکرٹری

ہی تھی۔ اگر اس پر پانی ڈال دیا جاتا تو زیادہ نقصان نہ اٹھاتا پڑتا۔ غیر ملکی دشمنوں کے اشاروں پر ناپچے والے حمید چودھری اور دلال مکئی جیسے بے راہ نوجوان میرے اندازے کے مطابق زیادہ نہیں تھے۔ پھر یہ بات بھی اطمینان بخش تھی کہ طالب علموں ہی کے درمیان ایسے نوجوان بھی موجود تھے جو ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف تھے۔

موجودہ صورت حال میں قانون نافذ کرنے والے اعلیٰ سرکاری حکام سے میرا رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ سکھ بیر کے ساتھ ساتھ اب میں نے ”مقصود میاں“ بن جانا بھی ضروری سمجھا۔ نوڈو چڑجی کا اعتراف حاصل کرنے کی غرض سے جو پانچ تحریب کار میرے ہاتھوں مارے گئے تھے، ان سے بھی مجھے خاصی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ مغربی پاکستان میں بھی اسی طرح کا دوہرا کردار ادا کر چکا تھا۔ اسی کے نتیجے میں سنیتا کو اپنی بساط پلیٹ کر وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ ری سسی کسر میں نے آج پوری کر دی تھی۔ غیر ملکی دشمن اب اپنے بچائے ہوئے جال کو دوبارہ استعمال کرنے کے اہل نہیں رہے تھے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کا ہنگامہ فرو ہونے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ میں جب صدر گھاٹ میں سینٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ (سی آئی ڈی) کے دفتر پہنچا تو دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے اب مقصود کا قالب اپنا لیا تھا۔ میرے پاس وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامہ بھی تھا۔ اس اختیار نامے کی وجہ سے میری حیثیت سرکاری ہی تھی۔ مجھے جس شخص سے ملنا تھا اس کے افریقینی ڈائریکٹر انٹیلی جنس شوکت حسین عباسی کے دستخط بھی اس اختیار نامے پر تھے۔

ڈپٹی ڈائریکٹر بدرالدین گزشتہ رات پیش آنے والے معاملے میں الجھا ہوا تھا اس لئے فوری طور پر مجھ سے نہیں مل سکا۔ پانچ افراد کی ہلاکت یا خودکشی اس کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کے ذمے دار افسران کی میٹنگ ہو رہی تھی اور بدرالدین اس میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا۔ میں نے اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر یہ سب کچھ معلوم کر لیا۔ اس میٹنگ میں خاص طور پر گزشتہ شب سی آئی ڈی آفس میں موجود تمام عملے کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ اس میں انسپکٹر رحمان بھی تھا تاکہ معاملے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور و خوض کیا جاسکے۔ تقیثی افسر رحمان ہی تھا اس لئے وہی بہتر طور پر یہ بتا پاتا کہ واقعات کس طرح پیش آئے تھے۔

انوپ رائے کے گھر میں موجود تہ خانے کا سراغ بھی مل گیا تھا۔ وہاں سے ٹرانسپیر کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی کرنسی بھی ملی تھی۔ انوپ رائے وہی غیر ملکی تحریب کار تھا جسے میں نے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اگر اسے اپنے اثر میں نہ لیتا تو سی آئی ڈی والوں کو تہ خانے کے متعلق بھی معلوم نہ ہوتا۔

صرف انوپ رائے اور مندر ناتھ نے غیر ملکی جاسوس ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ باقی تین تحریب کاروں کے بارے میں یہ فرض ہی کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی غیر ملکی جاسوس ہوں گے۔ انہوں نے زبان نہیں کھولی تھی۔ پھر بھی اس سے کم از کم میرے لئے فرق نہیں پڑتا تھا، کیونکہ میں نے ان کے ذہن پڑھ لئے تھے۔ رحمان اپنی حماقت اور بے جا خود اعتمادی کے سبب مندر ناتھ اور انوپ رائے سے بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں کر پایا تھا۔ میں نے اسی لئے ڈپٹی انٹیلی جنس بدرالدین سے ملنا ضروری خیال کیا کہ وہ

مجھ خلور پر آگے بڑھ سکے۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد وہ میٹنگ ختم ہوئی جو دوپہر دو بجے شروع ہوئی تھی۔

بدرالدین کو میں نے میٹنگ ہال سے نکلنے دیکھا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کی تو پتا چلا اب اس کا ارادہ دفتر سے اٹھنے کا ہے۔

میں نے ایک پرچی پر اس کے پی اے کو اپنا نام لکھ کر دے دیا تھا۔ پی اے نے مجھ سے کہا تھا کہ آج صاحب سے ملاقات مشکل ہے، آپ کل صبح آجائیں تو بہتر ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ انتظار کر لیتا ہوں، میٹنگ کے بعد اگر ان کے پاس وقت ہوا تو مل لوں گا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے وقت بدرالدین اسی طرف سے گزرا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے اپنے چڑاسی کو مخاطب کیا۔ ”میرا سلمان گاڑی میں رکھ دو۔“ اسی وقت پی اے نے وہ چٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ ”سر! یہ صاحب بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

بدرالدین نے چٹ لے کر کھڑے کھڑے میرا نام پڑھا۔ میں سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے میرا نام اس کے لئے اجنبی ہی تھا۔ نام پڑھ کر اس نے مجھ پر سرسری سی نظر ڈالی، پھر میرے بجائے اپنے پی اے سے پوچھا۔ ”تم نے وجہ معلوم نہیں کی ان سے، کس لئے ملنا ہے؟“ ”سر! میں نے پوچھا تھا مگر انہوں نے وجہ نہیں بتائی۔“ بدرالدین کے پی اے نے ٹھیک ہی جواب دیا۔

”اب تو میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم جانتے ہو کہ بغیر وجہ بتائے میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ ان سے وجہ معلوم کر دو اور اگر وجہ معقول ہو تو کل صبح ملو لو۔“ مجھے کرسی چھوڑ کر اٹھنا ہی پڑا اور آگے بڑھ کر بدرالدین سے بولا۔ ”سر! اس کانڈ پر ایک نظر ڈال لیجئے، پھر آپ کی مرضی مجھے ملنے کا وقت دیں یا نہ دیں۔“

”کیا ہے یہ؟“ اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر اختیار نامے کی طرف دیکھا جو میں نے اس کی طرف بڑھا رکھا تھا۔

”پڑھ کر دیکھیں گے سر تو معلوم ہو گا۔“ میں نے بدستور نرم آواز میں کہا۔

اس نے مجھے سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے خصوصی اختیار نامہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔ وہ خصوصی اختیار نامہ وزارت داخلہ کے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کیا گیا تھا۔ اوپر ہی گورنمنٹ آف پاکستان چھاپا ہوا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔“ بدرالدین کا لہجہ بدل گیا۔ ”تشریف لائیے۔“ اس نے اختیار نامہ پڑھ لیا تھا۔ لہجہ بدلنے کی وجہ یہی تھی۔ اپنے کمرے میں میرے ساتھ داخل ہونے سے پہلے اس نے چڑاسی کو چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ اپنے اسٹاف سے بگلہ میں اور مجھ سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ نہیں بولا اور اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔

جب وہ اپنی کرسی پر اور میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے دانستہ اردو میں جواب دیا۔

اس نے بدستور انگریزی میں مجھ سے سوال کیا۔ ”کس طرح کا تعاون چاہئے آپ کو مجھ سے؟“

”مجھے آپ سے کوئی تعاون درکار نہیں بلکہ میں خود آپ کے ساتھ تعاون کرنے آیا ہوں۔“

”کس سلسلے میں؟“

”میرا خیال ہے کہ جب آپ اردو سمجھ سکتے ہیں تو بول بھی سکتے ہیں۔ یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ انگریزی بول رہے ہیں اور میں اردو۔ ہماری سرکاری یا قومی زبان اردو ہے تو پھر آپ اردو کیوں نہیں بول رہے؟ آپ کے اس سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا کہ کس سلسلے میں آپ سے تعاون کرنے آیا ہوں۔“

”میری اردو زیادہ اچھی نہیں ہے۔“ وہ خفیف سا ہو کر بولا۔ ”اس لئے انگریزی بولتا ہوں یا پھر بنگلہ۔“ وہ اردو میں بات کرنے لگا۔

”میں انگریزی بھی بول سکتا ہوں اور بنگلہ بھی لیکن اردو بولنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ بہت سے ایسے ممالک ہیں کہ جہاں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں، مگر ان کی قومی زبان ایک ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ان ملکوں میں کبھی زبان کے مسئلے پر کوئی جھگڑا کیوں نہیں ہوتا؟“

”ہم یہ بحث پھر کسی اور وقت کر سکتے ہیں۔ فی الحال تو آپ.....“

”یہ بحث بلا سبب نہیں چھیڑی میں نے۔ اسی پر تو ان دنوں حکومت کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ایک سے زیادہ زبانیں سیکھنا یا جانتا بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں بنگلہ، سندھی، بلوچی، پنجابی، پشتو اور اپنے ملک میں بولی جانے والی دیگر زبانیں سیکھنی اور بولنی چاہئیں لیکن رابطے کے لئے تو کوئی زبان لازمی ہے نا۔ قومی زبان کی اہمیت اسی لئے ہوتی ہے۔ آپ کے اسی شر ذہاک میں قائد اعظمؒ سے پاکستان کی قومی زبان کے بارے میں سوال کیا گیا تھا اور انہوں نے زور دے کر تمہیں مرتبہ ایک ہی لفظ کہا تھا، اردو، اردو، اردو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی اس جگہ میں موجود تھا۔“ بدرالدین نے تصدیق کی۔

اسی وقت چڑاسی چائے لے آیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے کہا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ زبان کا مسئلہ ہے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ کن لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اور کیوں؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر تمام باتیں خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائیں گی۔“

”کچھ تو اندازہ ہو رہا ہے لیکن ابھی طے شدہ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چائے پیجئے۔“

میں چائے کا گھونٹ لے کر کپ رکھتے ہوئے بولا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ اب بھی آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ جن پانچ افراد کو شبہ کی بنیاد پر پکڑا گیا تھا، ان میں سے دو نے تو یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ

ہندوستانی جاسوس ہیں۔ پھر طے شدہ طور پر کچھ نہ کہنے کا کیا مطلب ہے۔“

”آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ ان پانچوں میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ میری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟ یہ جان کر آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ خصوصی اختیار نامہ بلاوجہ نہیں دیا گیا مجھے، یہ تو آپ بھی سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، آپ کو تو ابھی تک اسٹوڈنٹ لیڈر دلال کمرہ کی بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہو گی، وہی ہندو اسٹوڈنٹ لیڈر جس کی نگرانی ہو رہی تھی۔“

”معلوم ہے مجھے کہ وہ زیر نگرانی تھا۔“ مجھ سے مرعوب ہونے کے باوجود بدرالدین نے خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔

”لیکن یہ معلوم نہیں ہو گا آپ کو کہ وہ مرچکا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کب؟ مجھے اب تک کوئی ایسی خبر نہیں ملی۔“

”شاید اس کی وجہ یہ ہو گی کہ آپ میٹنگ میں تھے۔ آپ کو یہ خبر تو ہو گی کہ آج طلبہ اپنے اعلان کے مطابق نواب باڑی کے سامنے مظاہرہ کرنے والے تھے؟“

”ہاں آئی، جی نورالاسلام سے بات ہوئی تھی میری۔ آئی جی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایسے انتظامات کر دیئے گئے ہیں کہ طالب علم، نواب باڑی تک نہ پہنچ سکیں۔“

”ایک سوال کرنا ہے مجھے آپ سے۔“ میں بولا۔ ”جب کل رات ہی کو خود کشی کرنے سے پہلے انوپ رائے نے غیر ملکی جاسوس ہونے کا اعتراف کر لیا تھا تو دلال کمرہ کی گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ انوپ رائے کو اسی شبہ میں تو زیر حراست لیا گیا تھا کہ دلال کمرہ کی سے اس کے مراسم ہیں۔“

میرے اس سوال پر بدرالدین لاجواب سا ہو گیا، پھر کہنے لگا۔ ”ہاں ان حالات میں اسے گرفتار کر لینا چاہئے تھا۔ میں اس سلسلے میں جواب طلبی کروں گا۔“

”اب اس سے کیا حاصل۔ انسپکٹر رحمان یہ کہہ دے گا کہ پے در پے پانچ افراد کی موت سے وہ بھلا گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”کیا آپ رحمان کو جانتے ہیں اور اسی کے ذریعے رات کو جو کچھ ہوا آپ کے علم میں آیا ہے؟“

”جی نہیں، میں آپ کے اس انسپکٹر کو نہیں جانتا، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ ایک بے وقوف آدمی ہے۔ مندر ناتھ سے اسے جو سوالات کرنے چاہئے تھے، اس نے نہیں کئے۔“

”لیکن یہ کریڈٹ تو بہر حال اسے جاتا ہے کہ اس نے مجرموں کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔“ بدرالدین کی لاعلمی پر میں دل ہی دل میں ہنس دیا اور بولا۔ ”ہاں واقعی، یہ کارنامہ بھی تو اس کا ہے کہ مندر ناتھ انتہائی تشدد کئے جانے کے سبب مر گیا۔ اس کے علاوہ اسی کی غفلت کے نتیجے میں انوپ رائے نے خود کشی کر لی۔ معاف کیجئے گا، آپ کے مجھے میں بھی دیگر سرکاری اداروں کی طرح نااہلوں کی کی نہیں ہے۔“

”اس پر رحمان سے تحریری طور پر جواب طلب کیا جاسکتا ہے۔“ بدرالدین نے مجھے مطمئن کرنا

چاہا۔

”جواب طلبی کے سوا شاید آپ کے پاس کسی بھی مسئلے کا کوئی اور حل نہیں۔ مجھے یہ بتائیے کہ اب اس جواب طلبی سے ہو گا کیا؟ چناگام ہلز سے لے کر سرحدی گاؤں چٹا بل تک غیر ملکی تخریب کاروں نے اپنا جال بچھایا ہوا ہے اور آپ بے خبر بیٹھے ہیں۔ خوش قسمتی سے کچھ غیر ملکی جاسوس پکڑے بھی گئے تو ان سے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں کی جا سکی۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ہمیں ان کے سرغنہ کا پتا چل گیا ہے۔“

”تو پھر پکڑ لیجئے اس قہری زیرد کو۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اسے پتا چلتا کتے ہیں۔“ میں جھنجھلا گیا۔ بدرالدین بھی مجھے غبی معلوم ہوا۔ مجھے وہ ایسے سرکاری افسران میں سے لگا جو ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

”اتنا سراغ مل گیا ہے تو پھر آئندہ تفتیش کے نتیجے میں اور ایسی باتیں سامنے آ سکتی ہیں جن کی مدد سے ہم غیر ملکی جاسوسوں کے سرغنہ تک پہنچ سکیں۔ یقیناً آپ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں گے۔ کراچی سے شاید آپ کو اسی لئے بھیجا گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے اختیار نامے پر نظر ڈالی۔ پھر اس کے چہرے پر حیرت نظر آنے لگی۔ وہ خصوصی اختیار نامہ جس تاریخ کو جاری کیا گیا تھا اس پر درج تھی۔ اختیار نامہ ابھی تک اس نے مجھے واپس نہیں کیا تھا۔

”آپ کو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ ابھی مجھے ڈھاکہ آئے ہوئے چند روز ہوئے ہیں اور میں نے اتنی ساری معلومات حاصل کر لیں؟“

”جی ہاں۔ واقعی یہ میرے لئے حیرت کی بات ہے۔“ اس نے اعتراف کر لیا۔

”کام اسی طرح ہوتا ہے ایسی ہی تیز رفتاری کے ساتھ۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے آج دوپہر کے ناکام احتجاجی مظاہرے کی تفصیل بتائی اور آخر میں کہا۔ ”اگر کسی وجہ سے حمید چودھری اور دلال کمر جی اپنی موت آپ نہ مر گئے ہوتے تو طلبہ ہرگز منتشر نہ ہوتے۔“

بدرالدین میری ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اس سے مل کر انتہائی مایوسی ہو رہی تھی۔ پھر وہ مجھی سے پوچھنے لگا کہ اب کیا ہونا چاہئے؟

”پہلے تو آپ یہ اختیار نامہ مجھے واپس کر دیجئے۔“ میں قدرے ناگواری سے بولا۔

”یہ لیجئے۔“ اس نے اختیار نامہ میری طرف بڑھا دیا۔ ”ہاں وہ آپ کا نام نکل گیا میرے ذہن سے..... لکھا تو تھا، مگر.....“

”مقصود میاں نام ہے میرا۔ ممکن ہے اب میں آپ سے دوبارہ ملنے آؤں تو میری صورت بھی آپ کے ذہن سے نکل جائے۔ فی الحال چلتا ہوں میں۔ آپ کو یوں بھی آج دفتر سے جلدی اٹھنا تھا۔ آپ کی بیٹی اور داماد بھی تو آئے ہوئے ہیں نا چناگام سے۔“ میں نے اختیار نامہ تہہ کر کے لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

”جی!“ وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ”آپ..... آپ کو یہ..... یہ بھی پتا ہے؟“

”رکھنا پڑتا ہے پتا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”کیوں..... کیوں میرے خلاف کک..... کوئی انوسٹی گیشن تو نہیں ہو رہی؟“ وہ گھبرا گیا اور پھر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”میں تو روز صبح وقت پر دفتر آتا ہوں اور.....“

”صبح وقت تک اٹھ جاتے ہیں بلکہ آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے، کچھ پہلے ہی اٹھ جائیں۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

”نہن..... نہیں۔“ وہ ہلکایا۔ ”بس آج..... آج ہی کچھ جلدی.....“

”آپ کے خلاف کوئی تفتیش نہیں ہو رہی۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”آپ کی بیٹی اور داماد کے بارے میں تو بس میں نے یوں ہی معلوم کر لیا تھا۔“

اس نے اپنی جیب سے رسال نکال کر چہرے پر آ جانے والا پسند پونچھا اور پھر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا حکومت نے..... میرا مطلب ہے ہوم منسٹری نے کوئی اور نیا ادارہ قائم کیا ہے؟“

بدرالدین کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میرا تعلق حکومت کے کسی نئے محکمے سے ہے اور اس کا سربراہ مجھے مقرر کیا گیا ہے۔ جواب میں صرف میں نے اتنا ہی کہا۔ ”جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس ذکر کو چھوڑ کر بہتر یہ ہے کہ کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔ دشمن کو عضو معطل بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے بے سہر کر دیا جائے۔“

”وہ کس طرح؟“ میری پوری بات سننے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

”دیئے تو اس ضمن میں مجھ سے زیادہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے، پھر بھی جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ اقدامات کر سکتے ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ کے محکمے میں جو ذہین، قابل اعتماد اور ذمے دار افسران ہیں ان کی ایک میٹنگ کل صبح دس بجے طلب کر لیں۔ میں آپ ہی کی موجودگی میں انہیں بریف کر دوں گا۔“

اس پر بدرالدین فوراً راضی ہو گیا۔ میں نے سوچ سمجھ کر ہی اس سے یہ بات کی تھی۔ ہر محکمے میں ذہین اور بے وقوف افراد ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اگر بدرالدین بے وقوف تھا تو اس کے تمام ماتحت بھی ایسے ہی ہوں گے۔ بعض افراد بہت کام کے ہوتے ہیں، لیکن بے وقوف افسران اپنے عہدوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتے۔ وہ اگر ایسے ذہین اور باصلاحیت افراد کو موقع دیں تو انہیں خود اپنی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگتی ہے۔ اس میٹنگ کی طلبی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اندازہ ہو جاتا کہ کوئی کالی بھیڑ تو اس محکمے میں موجود نہیں یا موجودہ صورت حال کے پیش نظر حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات رکھنے والے افراد سے تو کسی کو ہمدردی نہیں۔ زبان اور قومیت کی بنیاد پر ان افسران میں سے بھی کوئی متعصب ہو سکتا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ایسے ادارے میں کسی تنگ نظر یا متعصب افسر کی موجودگی میرے خیال میں مناسب نہیں تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا تو بدرالدین مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ وہ مجھ سے بے حد مرعوب نظر آ رہا تھا۔ صدر گھات سے میں نے پرانا پلٹن کارخ کیا۔ اب مجھے انسپکٹر جنرل پولیس نورالاسلام سے ملنا تھا۔

میں لینے والوں سے رعایت نہیں کی جانی چاہئے۔“
”ممبر و قتل سے میرا مطلب رعایت کرنا ہرگز نہیں۔ کتنا محض یہ ہے کہ صورت حال کو مزید بگڑنے سے روکنے کے لئے پولیس کو جلد بازی سے گریز کرنا ہو گا، اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ان حالات کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ طلبہ کو کوئی اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کر رہا ہو؟“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔“ آئی جی نے جواب میں کہا۔ ”طالب علموں کو بھڑکایا جا رہا ہے۔“
”اور انہیں بھڑکانے والے طالب علموں ہی کے درمیان موجود ہیں۔“ میں نے بات کو مزید واضح کر دیا۔ ”مثلاً حمید چودھری اور دلال مکرئی کو اگر پہلے ہی گرفتار کر لیا جاتا تو شاید آج اتنے بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کی تیاریاں نہ ہو پاتیں۔ جو اسٹوڈنٹ لیڈر، ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، ان پر تو آپ کو ہاتھ ڈالنا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ کہ یہی ملک دشمن صورت حال کو مزید بے قابو کرنے کی خاطر جرائم پیشہ افراد سے بھی کام لے رہے ہیں۔“

”یقیناً۔“ آئی جی نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ ”مظاہروں کے دوران میں اب تک جو گرفتاریاں ہوئی ہیں، ان میں کچھ جرائم پیشہ افراد بھی شامل ہیں۔ ہمارا خیال اب تک یہ تھا کہ ان اشتہاری مجرموں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار میں حصہ لیا ہو گا لیکن آپ کی بات میں زیادہ وزن معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی منظم سازش ہے اور سب کچھ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ حالات کارخ بدلا ہے۔“

میرے خیالات سے آئی جی کا متفق ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ بیدار مغز آدمی ہے۔ میں نے اسی سبب اس سے کھل کر بات کی۔ اسے میں نے ان جرائم پیشہ افراد کے بارے میں بتایا جن کے متعلق مجھے علم ہو چکا تھا، پھر کہا۔ ”کل جنازوں کے جلوس کو جو طالب علم رہنما لیڈ کرنے والے ہیں، انہیں دوسرے سے پہلے ہی گرفتار ہو جانا چاہئے۔ اس ضمن میں آپ کو ضروری معلومات کل صبح نو بجے تک فراہم ہونی چاہئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سے خاصا فرق پڑنے گا۔ جنازوں کا جلوس تو خیر ٹکے گا، لیکن اس سے ملک دشمن عناصر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔“

”میں ان شاء اللہ کل صبح نو بجے اپنے دفتری میں ملوں گا۔ اس پر یقیناً آپ نے غور کر لیا ہو گا کہ اپنے لیڈروں کی گرفتاری کا طالب علموں پر کیا رد عمل ہو سکتا ہے۔“

”قصہ دراصل یہ ہے کہ بعض اوقات بے جا جبری بھی کام بگاڑ دیتی ہے۔ اتنی سختی تو ضروری ہے۔ میں صرف ان طالب علم رہنماؤں کی گرفتار کے حق میں ہوں جو ملک دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں اٹلی جنس والوں کو آپ کی رہنمائی کرنی چاہئے تھی لیکن کسی سبب وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ فی الحال تو میں نے آپ کو جن جرائم پیشہ افراد کے نام لکھوائے ہیں، انہیں فوری طور پر حراست میں لے لیں۔“ میں نے جو فہرست فراہم کی تھی، اس میں کانٹا کا نام بھی شامل تھا۔

حالات کے پیش نظر آئی جی کو پولیس ہیڈ آفس ہی میں ہونا چاہئے تھا، کیونکہ شر کے حالات احتمال پر نہیں تھے۔ تھانہ پرانا پلٹن ہی کو اس وقت تک پولیس ہیڈ آفس کا درجہ حاصل تھا۔ توقع کے مطابق آئی جی نور الاسلام مجھے اپنے دفتری میں ملا۔ جب میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور اختیار نامہ دکھایا تو وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ ملا۔

”میرے لائق جو خدمت ہو، بلا تکلف فرما دیجئے۔“ وہ بولا۔ اس نے مجھ سے اردو میں بات کی، پھر چائے کے لئے پوچھا تو میں نے منع کر دیا۔

اس کا ذہن پڑھ کر میں نے جان لیا کہ وہ بدرالدین کی طرح نہیں ہے۔ وہ ایک ذمے دار اور ذہین افسر تھا۔ اس کے علاوہ بھی مجھے کچھ اور نئی باتوں کا علم ہوا۔

”میں اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں آپ کے محکمے سے تعاون نہیں چاہتا۔“ میں نے وضاحت کر دی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ کے محکمے میں کچھ ذمہ دار افسران بھی جو جو ہیں جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ممبر و قتل سے کام لیتے ہیں۔ اس وقت بھی اسی ممبر و قتل اور قوت برداشت کی ضرورت ہے۔ آج دوسرے کے وقت جو دو اسٹوڈنٹ لیڈر مظاہرے کے دوران میں مارے گئے، پولیس کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنی موت آپ مرے ہیں۔ ان میں سے ایک حمید چودھری کو خود اسی کے ساتھیوں نے ہلاک کر دیا ہے اور دوسرے اسٹوڈنٹ لیڈر دلال مکرئی نے ایک طرح سے خودکشی کی ہے، کیونکہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ پولیس پر جو الزام لگایا گیا ہے، غلط ہے۔ ایس ایس پی محمد صادق کا بیان بالکل درست ہے کہ طلبہ کو منتشر کرنے کے لئے صرف ٹیر شیڈنگ کی گئی تھی۔ ان میں سے کسی کو نہ تو پکڑا گیا، نہ ان پر پولیس نے تشدد کیا۔“ میں آئی جی سے جو کچھ کہہ رہا تھا، اسی کے ذہن کو پڑھ کر اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا تھا۔ جس پولیس افسر کو میں نے جپ میں سوار دیکھا اور مشتعل طلبہ کو جس نے لاؤڈ اسپیکر پر میرے سامنے دارنگ دی اسی کا نام محمد صادق تھا۔ مجھے یہ حال دونوں چیزیں ہی کی معلوم ہوئی کہ ان دونوں اسٹوڈنٹ طلبہ کی موت کا الزام پولیس پر لگا دیا جائے۔ اس کا واضح مطلب یہ بھی تھا کہ باقی طلبہ تنظیم کے درمیان حمید چودھری اور دلال مکرئی کے علاوہ کچھ مرے اور بھی تھے۔ دونوں چیزیں یقیناً اب انہی سے کام لے رہا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ہی سے آئندہ روز دوسرے کو حمید چودھری اور دلال مکرئی کے جنازوں کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اس سلسلے میں پولیس کو اطلاع مل چکی تھی۔

آئی جی نور الاسلام نے میری پوری بات بڑی توجہ اور سکون کے ساتھ سنی، پھر بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس حیثیت سے اس مسئلے پر اطمینان خیال کر رہے ہیں لیکن یہ اندازہ آپ کی گفتگو سے ضرور کر لیا ہے، مرکزی وزارت داخلہ نے آپ کو یہاں ہماری مدد کے لئے بھیجا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ آج پیش آنے والے واقعے سے پوری طرح باخبر نہ ہوتے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں، مقصود میاں.....! یہ فرمائیے کل جو صورت حال پیش آنے والی ہے، اسے کس طرح قابو میں کیا جائے؟ سختی کی جائے یا پھر آج ہی کی طرح نرمی سے کام لیا جائے؟ جنازوں کے جلوس کی آڑ میں طلبہ تو بھڑکے بھی کر سکتے ہیں اور آج ہی کی طرح پولیس پر پھراؤ بھی ممکن ہے۔ یہ تو آپ بھی یقیناً جانتے ہیں کہ قانون کو ہاتھ

کوئی بات نہیں کی تھی کہ وہ آئندہ روز اس ہوٹل کی سکونت ترک کر دے گی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ دونوں چیزوں کے حکم ہی پر اس نے ایسا کیا ہو گا، مگر کیوں؟ اس سوال کا جواب سنیتا سے ملے بغیر ممکن نہیں تھا۔ سو مجھے اس کے لئے اپنی جناتی صفات سے کام لینا پڑا اور میں نے معلوم کر لیا کہ سنیتا کہاں ہے۔ وہ چھوٹی سی ایک خوبصورت کوٹھی تھی جہاں مجھے سنیتا نظر آئی۔ سنیتا کے علاوہ مجھے وہاں مسلح محافظ بھی دکھائی دیئے۔ وہ کوٹھی دھان منڈی کے علاقے میں تھی۔ سنیتا تک پہنچنے کے لئے مجھے انسانی قالب چھوڑنا پڑا۔ مسلح محافظ کوٹھی کے بیرونی حصے میں تھے اور سنیتا اندر ایک کمرے میں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کوٹھی کے گرد کوئی حصار بھی کھینچا گیا ہو گا۔ اس اطمینان کی ایک وجہ یہ تھی کہ جن زادی سوی کے عالم باپ عزتیل نے سنیتا کی تمام شیطانی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت مجھے اچانک سخت اذیت محسوس ہوئی۔ ایسی ہی اذیت سے میں گزشتہ رات بھی گزرا تھا جب دونوں چیزوں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح سے دھرا حفاظتی نظام تھا کہ کوئی بھی اس کوٹھی میں داخل نہ ہو سکے۔ اپنے وجود میں پھیلی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ سنیتا کو اس قدر سخت پرے میں رکھنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور تھا۔ اس کوٹھی کے گرد وہ حصار کھینچنے والا دونوں چیزوں کے سوا اور کون ہوتا۔

کوٹھی کی چھت سے اتر کر میں اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں سنیتا موجود تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کا دروازہ آہستگی کے ساتھ اندر سے بند کر دیا۔ خود ہی دروازہ بند ہوتے دیکھ کر سنیتا کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔

”سنیتا! ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں سکھ بیر ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا اور پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے سکھ بیر کا قالب اپنا لیا۔

”تم..... تم کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟“ اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔ میری توجہ اس کے ذہن پر مرکوز تھی۔ ”تمہیں خبر ہے کہ مجھ پر کیا گزر گئی؟“

”ہاں معلوم ہے۔“ میں پُر سکون آواز میں بولا اور اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”کسی وجہ سے تمہاری ہلکتی چھن گئی ہے، یہی بات ہے نا؟“

اس نے میرے خیال کی تائید کر دی، پھر کہنے لگی۔ ”میں آج صبح سو کر اٹھی تو مجھے پہلی بار اس کا احساس ہو۔“

”اور پھر تم نے ولود جی کو ساری باتیں بتا دیں کہ میں تمہیں آدمی رات کے بعد کہاں لے گیا تھا۔“

”اس کے سوا اور کیا کرتی۔ پہلے میں نے تم ہی کو فون کیا تھا، مگر گھنٹی بجتی رہی۔ اس وقت نو بج رہے ہوں گے۔ تم نہیں ملے تو مجھے ولود جی ہی کو بتانا پڑا کہ کیا ہوا۔“

”انہوں نے تم سے میرے بارے میں بھی پوچھا ہو گا۔“ میں بولا۔

”ہاں پوچھا تھا میں نے بتا دیا کہ تم اپنے کمرے میں نہیں ہو۔“ سنیتا نے کہا۔

”آپ مطمئن رہیں، آج ہی رات انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ ان میں سے بیشتر پولیس کو پہلے ہی مطلوب ہیں۔“ آئی جی نے یقین دلایا۔ ”ان میں سے کانتا کا ہاتھ آنا ذرا مشکل ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ پولیس کسٹڈی سے فرار ہو چکا ہے۔ پھر بھی ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ پکڑا جائے۔“

کانتا کی حیثیت یہاں وہی تھی جو کراچی میں ارسلان بیگ کی تھی۔ وہ مجرموں کے ایک منظم گروہ کا سرغنہ تھا اور اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور دونوں چیزوں نے ملک افضل کو قتل کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کو سونپی تھی۔ کبھی اس کے بارے میں پولیس کو یہ اطلاع ملتی کہ جیسور میں ہے، کبھی پتا چلتا اسے چٹاگام میں دیکھا گیا ہے اور کبھی وہ ڈھاکہ میں نظر آتا۔ سنیتا نے میرے سامنے اسی سے فون پر گفتگو کی تھی۔

انٹھنے سے پہلے میں نے آئی جی کو مخاطب کیا۔ ”اگر کانتا نہ پکڑا جاسکا تو کل ہی صبح اس کے بارے میں بھی آپ کو بتا دیا جائے گا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ یہ بہر حال ملے ہے کہ ان دنوں وہ ڈھاکہ ہی میں ہے۔ اس کا امکان بھی ہے کہ وہ کل صبح خود ہی گرفتاری پیش کر دے۔“

اس پر آئی جی نے حیرت کا اظہار کیا اور میں مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کبھی کبھی جب مجرموں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا جاتا ہے تو وہ گرفتاری پیش کر دینے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اس طرح انہیں کم از کم وقتی طور پر تو اپنی جان بچانے کا موقع مل جاتا ہے، گولی تو مقدر نہیں بنتی۔“ میں نے آئی جی کے اطمینان کی غرض سے کہہ دیا۔

آئی جی بھی مجھے اخلافا اپنے دفتر سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ بدرالدین سے مل کر مجھے جو کوفت ہوئی تھی، آئی جی نور الاسلام نے اس کا ازالہ کر دیا۔

☆=====☆=====☆

قانون نافذ کرنے والے دو اعلیٰ سرکاری حکام سے ملنے کے بعد مجھے سنیتا کا خیال آیا۔ آج سارے دن اس سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میری تلاش میں وہ شاہ باغ ہوٹل گئی ہو جہاں میں مقصود میاں کے نام سے ٹھہرا ہوا تھا۔ اس ہوٹل میں مقصود میاں کے نام سے کمرہ حاصل کرنے کے باوجود میں نے سکھ بیر ہی کا قالب اپنا رکھا تھا تاکہ سنیتا کو مجھ پر کسی طرح کا شک نہ ہو۔ یہ کھیل میں بہت احتیاط کے ساتھ کھیل رہا تھا، کیونکہ میرے مقابل دونوں چیزوں جیسا عیار آدم زاد تھا۔ کب مجھے مقصود میاں بننا ہے اور کب سکھ بیر، میں نے اپنی دانست میں اس کا پورا خیال رکھا، پھر بھی غی کھا ہی گیا۔ اس کا احساس مجھے وقت گزرنے کے بعد ہوا۔ میری ذرا سی بے احتیاطی نے ولود چیزوں کو میری طرف سے چونکا کر دیا۔

جب میں سنیتا سے ملنے اس کے ہوٹل پہنچا تو وہاں وہ موجود نہیں تھی۔ پتا چلا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اچانک سنیتا کے یوں غائب ہو جانے سے میرے ذہن میں خطرے کی پہلی گھنٹی بجی۔ میرے خیال میں ایسا بلا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ سنیتا نے اسی روز صبح گیارہ بجے ہوٹل چھوڑا تھا۔ اس وقت میں ڈھاکہ سے ہزاروں میل دور کراچی میں تھا جہاں سے دوپہر کو میری واپسی تھی۔ گزشتہ رات سنیتا نے ایسی

”پھر ساڑھے دس بجے کے قریب ہمیں دودو جی نے فوری طور پر ہونٹل چھوڑ دینے کا حکم دیا، اس کے بعد تم نے.....“

”ہمیں جب سب ہی کچھ معلوم ہے تو پھر ان باتوں کو دہرا کیوں رہے ہو؟“ سیتا میری بات کاٹ کر بولی۔

”اس لئے سیتا کہ دودو جی نے مجھے غلط سمجھا ہے اور میں کسی بات سے بے خبر نہیں ہوں۔ اگر تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں ہرگز یہاں نہیں آتا۔ تم ہی بتاؤ انہوں نے جو کچھ کیا، اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟..... یہی ناکہ انہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں جب اپنے ہونٹل کے کمرے میں موجود نہیں تھا تو میرے سامان کی تلاشی لینے کا کیا مطلب ہوا؟“

”لیکن سکھ بھیرا! یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ تم نے یہاں کی ہوم فیسری کے اعلیٰ حکام سے وہ خصوصی اختیار نامہ کیوں حاصل کیا؟“

سیتا کی اس بات پر میں دیر سے ہنس دیا، پھر بولا۔ ”یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے کہ میں پوچھوں، تم نے وزارت خوراک کے ایک بڑے افسر ریاض الحق سے کیوں تعلقات بڑھائے؟ ایک ریاض الحق ہی کیا اور کتنے اعلیٰ سرکاری افسران ہیں جن سے تمہارے مراسم رہے ہیں۔ اگر میں نے کسی بڑے وقت کو ٹالنے کے لئے خصوصی اختیار نامہ حاصل کر لیا تو یہ جرم ہو گیا۔ میں تم اور خود دودو جی کا ہم سب ہی اس سرزمین پر خطرے میں نہیں ہیں؟ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست کر لوں؟“

مجھ سے نادانستگی میں جو غلطی ہو گئی تھی، اس کا ازالہ اسی طرح ممکن تھا کہ میں دوبارہ دودو چو جی کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بوزھا گھاگ یہ چال بھی چل سکتا ہے ورنہ خصوصی اختیار نامہ اپنے کمرے میں چھوڑ کر کراچی نہ چلا جاتا۔

سیتا کا ذہن میری طرف سے صاف ہو گیا اور اس نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو سکھ بھیرا! ملک کا یہ حصہ تمہارے لئے بالکل نیا تھا۔ اگر تم نے یہاں آنے سے پہلے کسی طرح یہ بندوبست کر لیا کہ ہمیں کہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے تو یہ اچھا ہی ہوا۔“

”لیکن دودو جی نے میرے کمرے کی تلاشی کا حکم دے کر تو اچھا نہیں کیا۔“ میں نے اظہارِ ناراضگی ضرور سمجھا۔

”بس یہ عادت ہے ان کی۔ وہ ہر طرف سے چوکنار رہتے ہیں۔“ سیتا نے بات کو ٹالنا چاہا۔

”چوکنار رہنا اور بات ہے، کسی پر شک کرنا اور بات ہے۔ اگر انہیں مجھ پر شک نہ ہوتا تو وہ تم کو یہ تاکید نہ کرتے کہ میری طرف سے محتاط رہو۔“

”ہمیں اگر یہ معلوم ہے تو پھر میرے جواب کی بھی خبر ہو گی۔“ وہ بولی۔ ”میں ان سے کہہ چکی ہوں کہ میں ہمیں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”تب ہی انہوں نے ہمیں یہاں لاکر پھرے بٹھا دیئے ہیں۔“ میرے لمبے میں تخیلی آگئی۔

”ایسا تو انہوں نے خود میری حفاظت کے خیال سے کیا ہے۔ اس کو خفی میں کوئی بھوت پرست داخل نہیں ہو سکتا۔“ سیتا نے صفائی پیش کی۔

”اور مسلح محافظ کس لئے ہیں؟“ یہ سوال کرتے ہوئے بھی میرے لمبے میں جھین تھی۔

”دودو جی کا کہنا یہ ہے کہ کچھ دن کے لئے مجھے سامنے سے ہٹ جانا چاہئے۔ حیدر چودھری کی اچانک موت کو انہوں نے اس کا سبب بتایا ہے۔“

”سبب تو خیر کوئی بھی بتایا جاسکتا ہے۔ اس کی اصل وجہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے گرد مگنٹل کا مقصد یہ ہے کہ میں تم سے آزاد فضا میں نہ مل سکوں.....“ میرے لمبے میں تخیلی اور جھجکاہٹ اس لئے تھی کہ سیتا اب میرے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ دودو چو جی کیا نئی چالیں چل رہا ہے۔

”ہمیں اور مجھے ملنے سے کون روک سکتا ہے۔ دودو جی نے محتاط رہنے کو ضرور کہا ہے مگر تم سے ملاقات پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔“

”محتاط رہنے سے مراد کیا تھی ان کی، تم نے یہ نہیں پوچھا؟..... یہی ناکہ مجھے کچھ نہ بتایا جائے۔ حیدر چودھری آج دہرے کے بعد مرا ہے اور ہمیں اس سے بہت پہلے یہاں لاکر قید کر دیا گیا ہے۔ تم اسے اپنے دل کو سمجھانے کے لئے روپوشی کہہ لو، مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”پھر تم ہی کو سکھ بھیرا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟“ سیتا نے بڑی بے بسی کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ ”دودو جی کا حکم تو مجھے ماننا ہی پڑے گا۔“

”تو میں نے کبھی منع کیا ہے ہمیں حکم ماننے سے۔ وہ بڑھا اگر یہی چاہتا ہے کہ میں تم سے نہ ملوں تو یہی سہی۔ نہیں آؤں گا اب تم سے ملنے۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”سکھ بھیرا! وہ بھی تڑپ کر اٹھی۔“ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ پھر اس نے اپنی دانست میں میرا راستہ روک لیا۔

”اس طرح تم مجھے جانے سے روک پاؤ گی کیا؟“ میں اس کی حماقت پر ہنس دیا، پھر اسے ٹھنڈی تسلی دینے کی خاطر بولا۔ ”میں تمہاری طرف سے غافل نہیں رہوں گا، بس یہی کافی ہے۔ جب اس بڑھے کی غلط فہمی دور ہو جائے گی تو پھر دیکھا جائے گا۔“

”میں آج ہی تمہارے بارے میں ان سے بات کروں گی، تم کل کسی بھی وقت آنا ضرور، وعدہ کرو“ پھر جانے دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، کوشش کروں گا۔“ میں نے کچھ سوچ کر اس سے وعدہ کر لیا، اسی کے ساتھ سکھ بھیرا کے قلاب سے باہر آ گیا۔

اس کو خفی سے باہر نکلتے ہوئے بھی مجھے ایک مرتبہ پھر اذیت سہتا پڑی اور مجھے سوتی کے باپ عزتیل کا خیال آیا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دے کہ مجھے آئندہ اس اذیت سے بھی نہ گزرنا پڑے۔ اس وقت تک مغرب کی نماز ہو چکی تھی جب میں جن زادی سوتی سے ملا۔ وہ مجھے

عزیزل کے پاس لے گئی جو ابھی تک دعا مانگ رہا تھا۔ سوی کو میں نے بتا دیا تھا کہ کس عذاب میں گرفتار ہوں۔

عزیزل دعا مانگ چکا تو میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”اے علیالیش! کیا ہوا تجھے؟ کچھ بیمار سا لگ رہا ہے۔“ میں نے اسے وجہ بتادی تو وہ کہنے لگا۔ ”تُو نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔“

پھر عزیزل نے مجھے جو علم بتایا، اسے سن کر مجھے عالم ہاموس کی یاد آگئی۔ یہ وہی عمل تھا جو زمس کی حویلی میں داخل ہونے کے لئے میرے کام آیا تھا۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ وہی عمل سماں بھی کارگر ثابت ہو گا۔ میں نے اس پر عزیزل کا شکریہ ادا کیا اور سوی کے ساتھ وہاں سے اڑ گیا۔

”آج تو تجھے واپس جانے کی جلدی نہیں، اے علیالیش!“ سوی نے میرے ساتھ ساتھ فضا میں اڑتے ہوئے پوچھا۔

”جلدی نہ ہوتی تو وہیں تیرے ساتھ جھیل کے کنارے رک گیا ہوتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اے سوی! تُو اب لوٹ جا کہ میں آدم زادوں کی ایک بستی پر اترنے والا ہوں۔“

”ہم دونوں بہت اونچی پرواز کر رہے تھے، کیونکہ سوی کے باپ نے اسے آدم زادوں سے دور رہنے کا حکم دیا تھا۔“

”یہ بھی کوئی آنے میں آتا ہوا اے علیالیش! تجھے آخر کبھی فرصت بھی ملے گی یا نہیں؟“

”صرف چند روز کی بات ہے اے سوی! پھر تُو ہو گی اور میں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس جن زادی کو خوش کر دیا اور وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

میں نے گہرا غوطہ لگایا اور تچ گاؤں کی آبادی میں داخل ہو گیا۔ یہیں دنو چڑجی کی کوٹھی تھی۔ عمل کا ورد کرتے ہوئے میں اس کوٹھی کی چھت پر اترتا تو چونک اٹھا۔ کوٹھی خالی پڑی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دنو چڑجی کا سراغ لگانے کی اب یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ میں اپنے تصور کی قوت کو بروئے کار لاتا۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔

دنو چڑجی کا چہرہ بار بار میرے سامنے آکر غائب ہوتا رہا لیکن میں یہ معلوم نہیں کر سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے اس پر سخت جھنجھلاہٹ ہوئی اور میں اس کی کوٹھی سے نکل آیا۔ اس عیار بڑھے نے تمام ایسے راستے بند کر دیئے تھے جس کے ذریعے اس تک پہنچ سکوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بندوبست بھی کر دیا تھا کہ مجھے اس کے ارادوں کا علم نہ ہو سکے۔ سنیتا کی روپوشی بھی اسی کا شاخسانہ تھی۔ مجھے اپنی ذرا سی غلطی کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا اور دنو چڑجی قلعہ بند ہو گیا۔

میں نے مایوسی کے عالم میں اپنے ہوش کا رخ کیا کہ اس مسئلے پر ٹھنڈے دماغ سے غور و فکر کر سکوں۔ میں جیسے ہی سکھ بیر کا قالب اپنا کر اپنے کمرے میں داخل ہوا، ٹھک گیا۔ خلاف توقع کمرے میں روشنی تھی۔ سامنے ہی مجھے ایک پستہ قد اجنبی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالبور تھا جس کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”دروازہ اندر سے بند کر لو تاکہ کوئی تمہیں میرے ہاتھوں قتل ہوتے نہ دیکھ سکے۔“ پستہ قد اجنبی

کسی سانپ کی طرح پٹکارا۔ اس کے چہرے کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

جواب میں کچھ کہے بغیر میں پلٹا اور بھڑے ہوئے دروازے کی چٹنی لگا دی۔ مجھے علم تھا کہ وہ کسی

بھی لمبے گولی چلا سکتا ہے، اس لئے میں نے انسانی قالب چھوڑنے میں دیر نہیں کی اور اسے مخاطب کیا۔

”اچھا ہوا کانتا کہ تم خود ہی آگئے ورنہ تمہیں تلاش کرنا پڑتا۔ دروازہ میں نے اس لئے اندر سے بند کیا

ہے کہ تم فرار نہ ہو سکو۔“ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ قالب کسی آدم زاد کا یا جن زاد کا خود

اختیاری دونوں کے لئے خطرے کی نوعیت ہوتی ہے۔ مٹی تو مٹی ہے۔ ہم کسی آدم زاد کے جسم میں اتر

جائیں یا کسی آدم زاد کا بروپ بھر لیں، خطرے ہی میں رہتے ہیں۔ اس حالت میں اگر کوئی ضیث آدم زاد

ہمیں قتل کر دے تو ہم اپنی تمام تر جتنی صفاقت کے باوجود اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ کسی ایسے خطرے کے وقت ہم فوری طور پر انسانی قالب چھوڑ دیتے ہیں۔ مختصر عمر ہونے کے

باوجود آدم زاد بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ غیر متوقع طور پر اس آدم زاد کانتا کو اپنے کمرے میں دیکھتے ہی

میں چونکا ہو گیا تھا۔ وہ کون ہے اور کتنا خطرناک ہے، یہ جاننے کے باوجود میں نے جلد بازی سے کام نہیں

لیا۔ ایسے وقت میں زندگی اور موت کے درمیان بس ایک ہی لمحہ ہوتا ہے۔ کانتا کو مجھے قتل کرنے کے لئے

بھیجا گیا تھا۔ غلطی اس سے یہ ہوئی کہ بے جا خود اعتمادی کے سبب وہ فوراً مجھ پر گولی نہیں چلا سکا، ہرچند کہ

علم اسے یہی ملا تھا، مجھے دیکھتے ہی گولی مار دے۔ اس غلطی کا سبب خود ستائی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ کانتا

چبے جرائم پیشہ افراد میں یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کو لٹکار کر مارتے ہیں۔ ان کے لئے کسی کو

قتل کر دینا بڑی معمولی سی بات تھی۔ اس کی گردن پر متعدد آدم زادوں کا خون تھا۔ آئی جی نور الاسلام

نے کانتا کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا کہ اس کا ہاتھ آ جانا مشکل ہے لیکن وہی اس وقت میرے سامنے

ہوتی بنا ہوا کھڑا تھا۔ یقیناً اس نے کوئی ایسا منظر نہیں دیکھا ہو گا کہ نظر آنے والا پلک جھپکتے غائب ہو

جائے۔ کانتا کی آمد میرے لئے نیک شگون ہی ثابت ہوئی، کیونکہ مجھے اس کے ذہن کو پڑھنے کا موقع مل

گیا۔ وہ ”بلیک کنگ“ کے حکم پر مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ بلیک کنگ وہی تھا جس کا تذکرہ سنیتا بھی مجھ سے

کر چکی تھی۔ مشرقی پاکستان میں دنو چڑجی کا نائب یہی بلیک کنگ تھا۔ یہ سمجھتا میرے لئے دشوار نہ ہوا کہ

بلیک کنگ کو میرے قتل کا حکم دینے والا دنو چڑجی کے سوا کوئی اور نہیں۔ بلیک کنگ اس کا کوڑنیم تھا۔

اس کوڑنیم کے علاوہ کانتا اور محبوب اسے آئندہ بابو کے نام سے بھی جانتے پہچانتے تھے۔ آئندہ بابو کی حیثیت

سے وہ ایک کاروباری آدمی مشہور تھا۔ اس کا دفتر اور کوٹھی بھی ایک کاروباری علاقے میں تھی۔ پلٹن

میدان کے پیچھے موتی جھیل کا وہ علاقہ انتہائی خوبصورت تصور کیا جاتا تھا۔ وہاں بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر

تھے۔ مشہور زمانہ ڈھاکہ کی ملل تھوک کے بھاؤ خریدنا اور اسے بازار میں سپلائی کرنا، آئندہ کا بظاہر یہی

کاروبار تھا۔ سنیتا کی طرح اس کا بھی یہ کوئی فرضی نام ہو گا، مجھے اس سے فی الحال کوئی سروکار نہیں تھا۔

میرے لئے یہی بہت تھا کہ مجھے کانتا کے ذریعے ایک ایسے آدمی کا سراغ مل گیا جو دنو چڑجی کا دایاں بازو

تھا۔ میں نے چند ہی لمحوں میں کانتا کا ذہن پڑھ کر اہم معلومات حاصل کر لیں۔ جن زادیوں کے بعد

اب مجھے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اگر میں اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور وہ مجھ پر گولی چلا دیتا تو میرا کچھ نہ

لے رہا تھا جسے تم نہیں جانتے۔ وہ جب بھی تم سے ملا، اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ بلیک کنگ کہاں رہتا ہے اور کون ہے، تم نہیں جانتے۔“

”ہاں میں اسے نہیں جانتا۔“ وہ بڑبڑایا۔

مجھے یقین تھا کہ اب اگر کانا پر انتہائی تشدد بھی کیا جاتا تو وہ بلیک کنگ کی نشاندہی نہ کرتا۔ میرے نزدیک ابھی بلیک کنگ کی گرفتاری سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ وہ جان دے دیتا، مگر زبان نہ کھولتا۔ کانا ہی کی طرح دوسرا ایک منظم گروہ محبوب کا تھا، مگر اس کی سرگرمیوں کا مرکز سرحدی علاقہ تھا۔ وہ عموماً بیسورہی میں رہتا اور کبھی کبھار ہی ملائے جانے پر ڈھاکہ آتا۔ ہندوستان آنا جانا محبوب کے لئے ایک کھیل تھا۔ سرحدی آبادی پناہ کے علاقہ ہندوستان میں بن گاؤں بھی اس کا ٹھکانہ تھا۔ مشرقی پاکستان اور ہندوستان کی یہ دونوں ہی سرحدی آبادیاں اس کی پناہ گاہیں تھیں۔ پناہی مشرقی پاکستان میں اور بن گاؤں ہندوستان کی سرحدی آبادی تھی۔ ان دونوں کے درمیان میلوں کے رتبے میں پھیلا ہوا گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل میں دونوں ملکوں کے فوجی گھسنے سے گریز کرتے تھے۔ مغربی پاکستان کی طرح ملک کے اس حصے سے بھی بڑے پیمانے پر اشیائے صرف کی اسمگلنگ ہوتی تھی۔ حکومت کی توجہ ادھر مبذول کر کے دودھ چڑجی اندر ہی اندر ایک اور کھیل کھیلنے کی تیاری کرتا رہا۔ اسی کے نتیجے میں اب حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے تھے۔ کانا اور محبوب دونوں ہی گروہ بند جرائم پیشہ تھے اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ محبوب کا ہاتھ آنا کانا سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اگر کانا اپنے اعتراضی بیان میں محبوب کا نام بھی لے لیتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں نے اسی لئے محبوب کے بارے میں کانا کو کوئی ہدایت نہیں دی۔ اس کا ریوالور اسے واپس کر کے میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

”تمہیں یہاں سے سیدھا پولیس ہیڈ آفس جانا ہے، کانا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”میرے متعلق بھی تمہیں پولیس کو کچھ نہیں بتانا، اب تم جانتے ہو۔“

”نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے اقرار کیا اور ریوالور اپنی جیب میں رکھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

کانا کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کیا اور آئی جی نور الاسلام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے اس کے گھر کا فون نمبر معلوم کیا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری کمرے میں موجود تھی، اس لئے مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہوٹل کے ایجنٹ سے میں نے مطلوبہ نمبر ملانے کو کہا۔

دوسری طرف سے ریسپور کسی خاتون نے اٹھایا تو میں بولا۔ ”میرا نام مقصود میاں ہے اور مجھے آئی جی صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”ہولڈ کیجئے، میں دیکھتی ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

توقع کے مطابق ذرا ہی دیر بعد مجھے آئی جی نور الاسلام کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو سر! میں نور الاسلام بول رہا ہوں، فرمائیے۔“

”میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ کل صبح تک کانا کے بارے میں بھی بتا دیا جائے گا، وہ کہاں چھپا

بڑتا۔ سو میں بڑے اطمینان کے ساتھ آگے بڑھا اور اس کے قریب چلا گیا۔

”ت..... تم کہاں..... کہاں ہو؟“ کانا خوفزدہ ہو کر ہٹا یا۔

”میں تو تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں کانا! گولی چلاؤ نا، ڈر کیوں رہے ہو؟“ میں ہنس کر بولا۔

”مم..... مگر تم نظر..... مجھے نظر کیوں نہیں آرہے؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”تم تو آواز پر بھی گولی چلا سکتے ہو، مجھے معلوم ہے تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔ آئندہ باؤ یا بلیک کنگ کو میرے بارے میں تمہیں بتا دینا چاہئے تھا کہ مجھے قتل کرنا آسان نہیں ہو گا۔ انہوں نے خواہ مخواہ تمہیں پھنسا دیا، یہاں بھیج کر..... تمہارے اندر اگر گولی چلانے کی ہمت نہیں تو میں تم سے یہ ریوالور لے لیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اب خود اسی کا ریوالور اس کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر اسے نشانے پر لے لیا تھا تاکہ ریوالور اس کی دسترس سے دور ہی رہے۔

خوف و دہشت کے سبب اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک قاتل سے زیادہ بھلا کون یہ جان سکتا ہے کہ ایک ہی گولی میں کسی کا کام تمام کیا جاسکتا ہے۔

”مجھے..... مجھے معلوم نہیں تھا سکھ..... سکھ بیکر کہ تم..... تم آدمی..... نہیں۔“

معاف کر دو مجھے۔“ وہ رک رک کر بولا۔

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں آدمی نہیں ہوں..... تمہاری ہی طرح میں بھی ایک آدمی ہوں کانا! مگر آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ تم نے تو خود مجھے اس کمرے میں آتے دیکھا تھا۔ کیا میں تمہیں آدمی دکھائی نہیں دیا؟“ میں نے کہا۔

”اس..... اس وقت تو..... تم مجھے آدمی سے لگے تھے، مگر اب..... اب..... اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

”تم نے پولیس ہیڈ آفس تو دیکھا ہو گا کانا؟“ میں اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... دیکھا ہے پھر؟“ وہ یہ کہتے ہوئے چونک پڑا۔

”اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم پولیس کو متعدد مقدمات میں مطلوب ہو۔“ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”تمہارا مقصد..... مقصد کیا ہے ان باتوں سے؟“ وہ گھبرا گیا۔

”بہت ہو گیا اب قتل و غارت گری کا یہ کھیل۔ تمہیں خود کو قانون کے حوالے کر دینا چاہئے۔“

میں نے پُر سکون آواز میں اسے مشورہ دیا۔

”وہ..... وہ مجھے پھانسی پر چڑھا دیں گے..... میرے ہاتھوں جو..... جو لوگ مارے گئے ہیں، ان..... ان میں سے کئی کے قتل کا ثبوت ہے پولیس کے پاس۔“

”پھر تو اور بھی اچھا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اسے میں نے اپنے اثر میں لے لیا، پھر حکم دیا۔ ”لیکن تم اس سلسلے میں آئندہ باؤ کا ذکر نہیں کرو گے۔ تمہیں صرف یہ بیان دینا ہے کہ کوئی بلیک کنگ تم سے کام

ہوا ہے لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”وہ کیوں سر!“ آئی جی نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے کہ کائنات کو گرفتاری دینے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت پولیس ہیڈ آفس ہی گیا ہے۔ آپ وہاں موجود افسران کو اس سے مطلع کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ اب آپ سے کل صبح نوبت ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ!“ یہ کہتے ہی میں نے رسیور رکھ دیا۔

دونوں چیزیں کیونکہ اس ہوٹل میں میری موجودگی سے واقف تھا، اس لئے فوری طور پر میں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا۔ سامنے ہی جس فائیو اسٹار ہوٹل میں سینٹا ٹھہری تھی، اسی کی دوسری منزل پر میں نے ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ احتیاط کے پیش نظر اب میں نے ایک نیا ہی انسانی قالب اختیار کر لیا تھا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام بھی میں نے گریز احمد لکھوا دیا۔ ڈھاکہ میں اپنی آمد میں نے چٹاگم سے ظاہر کی تھی اور وہیں کا ایک پتا لکھوا دیا تھا۔ ضروری خانہ پری کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا، مگر وہاں زیادہ دیر کا نہیں۔ کمرے کو اندر سے بند کر کے میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب مجھے محمد پور جانا تھا۔ متوسط طبقے کی یہ آبادی دھان منڈی سے ملی ہوئی ہے۔

محمد پور پہنچ کر مجھے اسٹوڈنٹ لیڈر ذیشان حیدر کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ مجھے اپنے گھر ہی پر مل گیا۔ میں گریز احمد ہی کے انسانی قالب میں اس سے ملا۔ ذیشان حیدر کا تعلق بہار کے ایک شہر پنڈے سے تھا جہاں کی مرچیں مشہور ہیں۔ یہ وہی ذیشان حیدر تھا جس کا ذکر میں نے حمید چودھری اور اس کے ساتھیوں سے سنا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں محب وطن طلبہ کی جو دوسری تنظیم تھی، ذیشان حیدر اسی کا جرنل سیکرٹری تھا۔

یہ جاننے کے بعد کہ میرا تعلق بھی پنڈے سے ہے، ذیشان حیدر نے مجھے اپنی نشست گاہ میں بٹھا تو لیا مگر کچھ الجھا الجھا سا نظر آنے لگا۔ وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ میں اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ میں چاہتا تو خاموشی سے اس کا ذہن پڑھ کر چلا جاتا لیکن مجھے آئندہ بھی اس سے رابطہ قائم رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف سوالات بھی کرنے تھے۔ ان سوالات سے اس کا ذہن متحرک ہو جاتا اور مجھے معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ میں نے جو نیا انسانی قالب اختیار کیا تھا، اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ کوئی بھی مجھے دیکھ کر پچیس تیس برس سے زیادہ عمر کا نہ سمجھتا۔ یوں اس کی اور میری عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ ایم اے فائنل کا طالب علم تھا۔

”میرا نام مختار ہے۔“ میں نے اس سے اپنا تعارف ایک فرضی نام سے کرایا۔ ”اور میری مجبوری یہ ہے کہ طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھوں۔ میں تم سے یہ چٹاؤں گا نہیں کہ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”لیکن تمہیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارے علم میں ہے کہ آج دوپہر کو حکومت کے خلاف ہونے والے مظاہرے میں تمہاری تنظیم کا کوئی ہاتھ نہیں۔ تم لوگ محب وطن ہو۔“

میرے آخری جملوں کا اس پر اچھا رد عمل ہوا۔ وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔

”ہمارا مقصد محض تمہارا تعاون حاصل کرنا ہے۔“ میں نے مزید کہا۔

”آپ ہم سے کس طرح کا تعاون چاہتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”صرف اتنا تعاون کہ ان طلبہ کی نشاندہی کر دو جو حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں پیش پیش ہیں۔“

مگر یہ تو طلبہ برادری سے غداری ہوگی۔ ذیشان حیدر نے سوچا۔ میری توجہ اسی کے ذہن پر تھی۔ ”تمہارا انداز فکر ممکن ہے، یہ ہو کہ طلبہ کے معاملات انہی کی حد تک رہنے چاہئیں۔“ میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”یا ممکن ہے، تم اسے مخبری سمجھو تو تمہارا یہ سوچنا غلط ہو گا۔ ملک و قوم کا مفاد، طلبہ برادری کے مفاد سے افضل ہے، اتنا احساس تو تمہیں بھی ہونا چاہئے ذیشان! ڈھاکہ یونیورسٹی کے احاطے سے کل ایک اڑتھی اٹھ گئی اور ایک جنازہ۔ تمہارے خیال میں اس کا مقصد کیا ظاہر کرنا ہے؟“ اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

”یہی کہ ہندو اور مسلمان قومی زبان کے معاملے میں ایک ہی سوچ رکھتے ہیں۔“ آخر اس کی زبان پر پڑا ہوا نقل کھل ہی گیا۔

”اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔“ میں بولا۔

”جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔“

”کل جنازوں کے جلوس کی قیادت کرنے والے طالب علم رہنماؤں کے نام ہمیں بھی معلوم ہیں۔ تم بھی ان کے ناموں سے بے خبر نہیں ہو۔ ہم تم سے ان کے ناموں کی صرف تصدیق چاہتے ہیں۔“ پھر میں نے وہ دونوں نام لے دیئے جو اسی کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہوئے تھے۔

اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے ان دونوں ناموں کی تصدیق کر دی۔ ان دو ناموں کے علاوہ بھی مجھے چند اور ناموں کا بھی پتا چلا۔

”تم سے ملاقات کا ایک اور مقصد بھی تھا ذیشان حیدر!“ میں نے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو قانون نافذ کرنے والے ادارے تمہاری تنظیم کی پشت پناہی کر سکتے ہیں۔ یہ مشورہ میں تمہیں اس لئے دے رہا ہوں کہ تمہاری تنظیم بہر حال ابھی نئی ہے۔ اس کے علاوہ تم ایک بنیادی غلطی بھی کر رہے ہو۔“

”وہ کیا؟“ اس نے چونک کر معلوم کیا۔

”تمہاری تنظیم کے تمام ارکان اور عہدیدار غیر بنگالی ہیں۔ اس سے آئندہ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ جو غلطی تمہاری مخالف تنظیم کر رہی ہے، اسی کو تم دوہرا رہے ہو۔ قومیت کی بنیاد پر محاذ آرائی کی فضا پیدا ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

مجھے اس پر خوشی ہوئی کہ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے کہا۔ ”ہر چند کہ یہ فضا خود ہم نے پیدا نہیں کی، پھر بھی اب ہماری یہی کوشش ہوگی، اس تفریق کو ختم کر دیں۔ ہماری تنظیم نئی ہونے کے باوجود طلبہ کی فلاح و بہبود کے لئے خاصا کام کر رہی ہے۔ ہم اپنے مسائل فی الحال خود حل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آئندہ کبھی ہمیں کسی معاملے میں قانون کی مدد درکار ہوئی تو میں آپ سے مل لوں گا۔ آپ مجھے

اپنے دفتری اوقات بتا دیجئے کب ملاقات ہو سکتی ہے۔

”عموماً میں آؤٹ ڈور ڈیوٹی پر رہتا ہوں، اس لئے دفتر میں ہونے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ تم میرے نام کا حوالہ دے کر آئی جی نور الاسلام صاحب سے مل سکتے ہو۔“

”لیکن ابھی تو آپ نے بتایا تھا کہ سی آئی ڈی سے.....“

”ایک ہی بات ہے۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو تم ایک ہی تصویر کے دو رخ سمجھ سکتے ہو۔ آئی جی صاحب کا نام میں نے اس لئے لیا کہ ان سے میرے ذاتی مراسم بھی ہیں۔ تمہیں ان سے ملنے میں زیادہ دشواری بھی پیش نہیں آئے گی۔ میرا پورا نام مختار الدین ہے، یاد رہے گا؟“

میری بات کے جواب میں ذیشان حیدر بولا۔ ”یاد نہ رہے گا کیا سوال ہے صاحب! میں آپ کا نام کیسے بھول سکتا ہوں۔“

”کل یہ کوشش کرنا کہ جنازے کے جلوس میں کم سے کم طلبہ شریک ہوں تاکہ امن وامان کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ میں خود بھی تم سے ملتا رہوں گا۔ تم مجھے اپنا کوئی عزیز یا دوست ظاہر کر سکتے ہو۔ تمہارے اور میرے لئے یہی بہتر ہے کہ کسی کو اس ملاقات کی خبر نہ ہو، اسی کے ساتھ یہ بھی کہ میری کوئی سرکاری حیثیت ہے۔ میں اسی لئے پہلی مرتبہ تم سے تمہارے گھر پر ملا ہوں۔“

”آپ مطمئن رہیں، اس ملاقات کا ذکر میں کسی سے بھی نہیں کروں گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا۔ میں نے آخری بار اس کے ذہن کو ٹٹولا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بول رہا، پھر اطمینان کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ محمد پور سے دھان منڈی دور ہی کتنی تھی، سو میں نے ایک چکر وہاں کا بھی لگا لیتا ضروری سمجھا۔ سنیٹا نے کہا تھا کہ وہ آج ہی ونود چڑجی سے میرے بارے میں بات کرے گی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اب تک اس نے بات کر لی ہوگی۔ میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ ونود چڑجی نے کس رد عمل کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ ونود چڑجی کی طرف سے سنیٹا کو برگشتہ کرنے کا ایک جواز بھی میرے پاس تھا۔ اس طرح ونود چڑجی آئندہ اس سے کوئی کام نہ لے پاتا۔ پراسرار شیطانی قوتیں چھن جانے کے باوجود سنیٹا بحال ایک ذہین اور فتنہ پرور عورت تھی۔ ونود چڑجی سے اس کا برگشتہ ہو جانا بھی دشمن پر ایک ضرب لگانے کے مترادف ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کو غشی کیا جہاں سنیٹا روپوش تھی۔ اس کو غشی میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لئے اب مجھے کسی اذیت سے نہیں گزرنا پڑا۔ ہاموس اور عزتیل نے مجھے جو عمل بتایا تھا، اسی کا ورد کرتا ہوا میں اس کو غشی میں اتر گیا۔

ونود چڑجی سے اب میرس ٹھن ہی گئی تھی تو میں اسے کس طرح چپین سے بیٹھ جانے دیتا۔ اس کو غشی میں اترتے ہی میں نے سوچا کہ مسلح محافظوں کے ذہنوں کو بھی پڑھ کر دیکھ لیا جائے، ممکن ہے کوئی نئی یا کام کی بات معلوم ہو جائے اور کچھ نہیں تو میں انہیں وہاں سے بھاگنے پر تو مجبور کر ہی دیتا۔ ان کے بارے میں میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ پیشہ ور مجرم ہوں گے۔ ان کی تعداد چار تھی اور وہ چاروں ہی کو غشی کی نشست گاہ میں موجود تھے۔ دو تو واقعی پیشہ ور مجرم ثابت ہوئے۔ ان کا تعلق کانٹا کے گروہ سے تھا لیکن بقیہ دو سرحد پار سے آئے تھے۔ ایک شخص اس کو غشی کا مالک تھا جو بظاہر محافظ بنایا ہوا تھا، دوسرا ”بلیک

کنگ“ کے حکم پر وہاں پہنچا تھا۔ وہ دونوں غیر ملکی تخریب کار، ونود چڑجی کو تو صرف قہری زیر کی حیثیت سے جانتے تھے، مگر بلیک کنگ سے واقف تھے کہ وہ کون ہے۔ ان دونوں کی ملاقات آج ہی صبح ہوئی تھی اور انہوں نے ”بلیک کنگ“ کے کوڑے سے ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ دونوں تخریب کاروں کے ذہن پڑھ کر مجھے مزید قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ جو تخریب کار آج اس کو غشی میں پہنچا تھا، قہری زیر کے حکم پر سروج نے اسی کے پاس پناہ لی تھی۔ سروج وہی مفروز تخریب کار تھی جس کی وجہ سے مندر ہاتھ پکڑا گیا تھا۔ واری کے علاقے سے فرار ہو کر سروج، رکن اسٹریٹ پہنچی جو نواب پور روڈ کا پچھلا حصہ تھا۔ واری اور رکن اسٹریٹ کے درمیان صرف ایک گلی تھی، اس لئے سروج کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کسی ایسے ہی آڑے وقت کے لئے ان تینوں تخریب کاروں کو قریب قریب ہی بسایا گیا تھا۔ یہ کاسیابی میرے لئے خلاف توقع ہی تھی کہ مجھے مزید تین تخریب کاروں کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔

وہ چاروں ہی میرے نزدیک کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے، سو میں نے بڑی خاموشی کے ساتھ انہیں موت کی میٹھی نیند سلا دیا۔ مرنے سے پہلے انہیں چیخنے تک کی مہلت نہیں دی تھی۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا ڈاکٹر ان کا طبی معائنہ کرتا تو یہی کہتا کہ وہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے مرے ہیں۔ اب اس کو غشی میں صرف سنیتا باقی رہ گئی تھی۔ میں چاہتا تو اسے بھی سفر آخرت پر روانہ کر دیتا، لیکن اس کی موت مجھے ابھی خلاف مصلحت محسوس ہوئی۔

نشست گاہ سے باہر آتے ہی میں نے سکھ بیر کا قالب اپنا لیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے جہاں سنیتا اپنی عادت کے مطابق ایک غیر ملکی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ چونک اٹھی، پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گیا اور سنیتا کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ سے اتر کر بچوں کے مل چلتی ہوئی میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ تھام کر اس کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کو غشی کی چھت پر جانے کے لئے ایک زینہ بنا ہوا تھا، سنیتا میرا ہاتھ تھامے خاموشی کے ساتھ میڑھیاں چڑھ کر چھت پر آگئی۔ چھت پر قد آدم چار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور ایک جانب سینٹ شیٹ ڈال کر شیڈ بنا دیا گیا تھا جہاں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ کم پاور کا ایک بلب بھی وہاں جل رہا تھا۔ بنگال میں بارش بہت ہوتی ہے۔ بارش سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہی شاید وہ شیڈ ڈالا گیا تھا۔ سنیتا مجھے وہیں لے آئی۔

”بیٹھو سکھ بیر!“ سنیتا نے طویل سانس لیتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”اب ہم آزادی کے ساتھ جو چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔“

”کیوں کیا وہ کمرہ بند کر کے گفتگو ممکن نہیں تھی؟“ میں نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”مجھے شک ہے سکھ بیر کہ اس کو غشی کے ہر کمرے میں ڈکٹافون لگے ہوئے ہیں۔“ سنیتا نے بتایا۔

”یہ شک تمہیں کیسے ہوا؟“

”دودو جی سے ابھی کچھ دیر پہلے بات کر کے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اسی لئے تمہیں یہاں لے آئی ہوں۔“

”تو بات ہو گئی تمہاری اس بوڑھے گدھ سے۔“ میں جھپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا کہا اس نے؟“

”کننے لگا کہ میری بات پر غور کر کے جواب دیں گے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے یہ سوال بھی کیا کہ سکھ بیکو کو محکمہ خوراک کے ریاض الحق کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ ریاض الحق کا نام تم نے آج ہی لیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی میرے تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو میں ریاض الحق کا ذکر نہیں آیا۔ اسی سے مجھے یہ شبہ ہوا کہ کم از کم میرے کمرے میں ڈکٹا فون ضرور موجود ہے۔ ممکن ہے ’کوٹھی کے دوسرے کمروں میں بھی یہ بندوبست کر دیا گیا ہو۔“ سینتا نے میرے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

”جب اس نے تم سے ریاض الحق کے بارے میں پوچھا تو کیا کہا تم نے؟“

”وہی جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔ میں نے تو کبھی اس سلسلے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا۔“ سینتا بولی۔

”پھر اسے یقین آیا؟“

”کہہ نہیں سکتی، کیونکہ انہوں نے فوراً دوسری بات شروع کر دی تھی۔ دودو جی مجھ سے مشورہ کرنے لگے کہ بلیک کنگ کو ڈھاکہ بلالیا جائے یا نہیں؟ اس کی وجہ انہوں نے میری عارضی روپوشی کو بتایا۔ بولے کہ میں تمہارہ گیا ہوں۔ ان ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ میں میری آمد سے ایک روز پہلے ہی انہوں نے بلیک کنگ کو بھارت جانے کی اجازت دی تھی، کیونکہ وہ مجھے یہاں بلوانے کا ارادہ کر چکے تھے۔“ سینتا جو کچھ کہہ رہی تھی ’سچ تھا۔ دودو چر جی نے اس سے یہی کہا تھا۔ میں نے یہی جاننے کے لئے اس کے ذہن پر توجہ دی تھی۔

سینتا کی باتیں سن کر میں ہنس دیا۔ وہ عیار بڑھا میرا داؤ مجھ ہی پر آزما رہا تھا۔ اسے یقین ہو گا کہ میں ’سینتا سے ضرور ملنے آؤں گا۔ سینتا نے مجھ سے آئندہ روز آنے کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ اب وہ مجھے سینتا کے ذریعے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ممکن ہے اس عرصے میں اسے کسی طرح پتا چل گیا ہو کہ مجھے قتل نہیں کیا جاسکا۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ مجھے قتل کرنے کے بعد کانتا کو بلیک کنگ سے رابطہ قائم کرنا تھا۔

”تم سے جھوٹ بولا ہے، اس بوڑھے گدھ نے۔“ سینتا سے یہ کہتے ہوئے میرے لمبے میں حقارت تھی۔

”مگر سکھ بیکو! وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولنے لگے؟“ سینتا حیران سی ہو کر بولی۔

”اپنی دانست میں تمہارے ذریعے مجھے بے وقوف بنانے کے لئے۔ تم تو خیر بلیک کنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں لیکن میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ تمہیں یقیناً یہ جان کر خیریت ہو گی کہ بلیک کنگ اس وقت ڈھاکہ ہی میں موجود ہے۔ کانتا کو تو جانتی ہو، نا تم؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ سینتا نے جواب دیا۔ ”وہ تو ایک مدت سے ہمارے لئے کام کر رہا ہے۔

ملک افضل کو قتل کرانے کے لئے فون پر تمہارے ہی سامنے اس سے میں نے بات بھی کی تھی۔“

”وہی کالا شیطان آج بلیک کنگ کے حکم پر مجھے بھی قتل کرنے آیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”کب؟“ سینتا تقریباً اچھل پڑی۔

”آج ہی جب میں تم سے مل کر اپنے ہوٹل پہنچا تو وہ میرے کمرے میں موجود تھا۔ اگر مجھے سنہلنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو اس نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا۔ تم اب اتنا تو سمجھ ہی سکتی ہو کہ مجھے راستے سے ہٹا دینے کا حکم کس نے دیا ہو گا۔ بلیک کنگ خود تو یہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔ میں جب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کانتا کو مایوس لوٹنا پڑا۔ میں اگر چاہتا تو جوابی کارروائی کر کے طور پر کانتا کو قتل کر دیتا، مگر میری نظر میں یہ غلط ہے۔ کانتا تو محض کرائے کا ایک ٹٹو ہے، اسے مار دینے سے مجھے کیا مل جاتا۔ سو زندہ چھوڑ دیا۔ تمہارے گرد گھنٹال کو آئندہ بھی تو اس سے کام لینا ہو گا نا۔“

”تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو اسے کبھی زندہ نہ چھوڑتی۔“ سینتا پرجوش آواز میں بولی۔ ”اور..... اور شاید بلیک کنگ بھی میرے ہاتھوں مارا جاتا۔“

”اور اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس نے بلیک کنگ کو میرے قتل کا حکم دیا تھا؟“

”دودو جی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ..... وہ میرے پتا سامان (باپ کی طرح) نہ ہوتے تو..... تو.....“ جذبات کی شدت کے سبب وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

”تو میری خاطر تم ان سے بھی ٹکرا جاتیں۔ تم شاید یہی کہنا چاہتی ہو۔“

”میں نے تمہارے بارے میں دودو جی کو اس لئے تو سب کچھ نہیں بتایا تھا کہ ہیر کہ..... کہ وہ میرے ہی سپنوں کو جلا کر راکھ کر دیں۔ انہیں تو معلوم تھا کہ تم..... تم میرا بپار ہو، جیون ہو میرا، پھر بھی..... وہ نہیں مانے۔ مجھے بتایا بھی نہیں انہوں نے اور یہی دلاسا دیتے رہے کہ غور کریں گے۔ یہ غور کیا انہوں نے؟ اب تک میں نے جس طرح ان کو عزت دی..... ان کا ہر حکم مانا، کیا..... کیا اس کا یہی صلہ ہے؟“ سینتا کی آواز بھرا گئی۔

”پنگی ہے تو، کبھی کسی کو وفاؤں کا صلہ ملا ہے جو تجھے مل جائے گا..... اب آیا تجھے یقین کہ اس بڑھے نے یہاں تجھ کو قید کر رکھا ہے؟“

”سینتا کو اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتا۔“ اس نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ ”حکلی چھن گئی ہے تو کیا ہوا، دماغ تو ہے میرے پاس۔“

”اور مجھے تو نے بھلا ہی دیا۔ تیرے پاس اگر حکلی نہیں رہی تو میرے پاس تو موجود ہے۔ ٹولا کہ بڑی سہی، مگر ہے میری۔ میں نے تجھے تیری تمام کمزوریوں اور برائیوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ تو میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں تجھے اس بڑھے کے جال میں پھنسنے نہیں دے دوں گا، کبھی نہیں۔ بلیک کنگ کے ذریعے وہ بڑھا تجھے میرے جیتے جی قتل نہیں کرا سکتا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے جذبات کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ بلیک کنگ کا ذکر میں نے خاص طور پر کیا تھا جس کا رد عمل فوراً ظاہر ہو گیا۔

”بلیک کنگ ہو نہ!“ سینتا حقارت سے بولی۔ ”اگر مجھے معلوم ہو جائے وہ کون ہے تو اسے کل کا

”تجھے میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا سنتا! وہ بوڑھا گھاگ اپنی کوٹھی چھوڑ کر کہیں فرار ہو چکا ہے۔“

”دودھی کہاں جاسکتے ہیں، مجھے معلوم ہے۔“ سنتا مسکرائی۔ ”مگر میں تجھے بتاؤں گی نہیں۔“

”کیوں نہیں بتائے گی؟“ میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔

”اس لئے کہ تو بھی تو مجھے بلیک کنگ کا پتا نہیں بتا رہا۔“ وہ بولی۔

”اگر تجھے یہی ضد ہے تو بتا دیتا ہوں۔“ کاتا کے ذریعے مجھے بلیک کنگ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا، اس شرط پر اسے بتانے پر آمادہ ہو گیا کہ کم از کم آج رات وہ بلیک کنگ کو زندہ رہنے دے۔ مجھے معلوم تھا کہ سنتا اس کی وجہ ضرور پوچھے گی، سو میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”اس کے نام بچے کا تو مجھے علم ہے، مگر ایک بات معلوم کرنا ابھی باقی ہے۔ وہ بات بھی میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔ کیا خبر دودھ چڑی کی طرح اس کے پاس بھی کوئی ہتھی ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو تیری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے جو مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں۔ ایسی صورت میں اس سے میں ہی نمٹوں گا، پھر تجھے دوری رہنا ہو گا۔ کل ہی تک کی تو بات ہے، انتظار کر لے۔“

میری دلیل میں وزن تھا اس لئے سنتا مان گئی حالانکہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ سنتا کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے میں اس کا ذہن پڑھ لینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد میں نے بلیک کنگ کے بارے میں سنتا کو بتا دیا۔ مجھے اس وقت گمان بھی نہ تھا کہ آئندہ روز سنتا سے نہیں مل سکوں گا۔

”سنتا! میں نے تو تیری ضد پوری کر دی، مگر تو مجھے دودھ چڑی کے بارے میں نہیں بتا سکتی کہ وہ کہاں ہے۔ اقرار کر لے کہ تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔“

”جب تجھے خبر تھی کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو میری باتوں میں کیوں آگیا؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”تیری انہی اداؤں نے تو مار رکھا ہے سکھ ہیر کو ورنہ تو دھرا ہی کیا ہے تجھ میں..... اچھا اب میں چلتا ہوں اور تو بھی جلد از جلد یہاں سے نکل جا۔ میں، دودھ چڑی تو ہوں نہیں کہ تیری تلاش میرے لئے مشکل ہو۔ تو جہاں اور جس حال میں بھی ہوگی، تیرے پاس پہنچ ہی جاؤں گا۔“

سنتا کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے موتی جھیل کا رخ کیا، کیونکہ آج رات کے لئے اب یہی آخری محرکہ رہ گیا تھا۔ بلیک کنگ کا ذہن پڑھ لینے کے بعد ایک امکان یہ بھی تھا کہ مجھے دودھ چڑی کا سراغ مل جاتا۔ میں اسی موموہ سی امید کے سارے تیزی سے پرواز کرتا ہوا موتی جھیل کے علاقے میں جا پہنچا۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے۔ دن کے وقت اس علاقے میں جو گھما گھمی میں نے دیکھی تھی، اب اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہی علاقہ کیا، ڈھاکہ شہر کا اب کوئی بھی علاقہ ایسا نہیں تھا جو میں نے دیکھا نہ ہو۔ اس علاقے کی رونق یہاں کے بازار سے تھی جو بند پڑا تھا۔ یہاں سکونت کے لئے کوٹھیاں بھی تھیں اور چھوٹی بڑی بلڈنگیں بھی۔ کچھ بلڈنگیں ابھی زیر تعمیر تھیں۔ یہ علاقہ تیزی سے ترقی

سورج دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔ وہ مجھے کیا قتل کرائے گا۔“

”تجھے تو اب بھی اسی کے آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ بس مجھے اس کوٹھی میں داخل ہوتے ہی یہ خیال آ گیا کہ ان مسلح محافظوں کا بھی پتا کر لوں جو بظاہر تیری حفاظت کر رہے ہیں۔“ سنتا کا ذہن پڑھ کر مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سنتا نے طویل عرصہ مغربی پاکستان میں گزارا تھا۔

”تو وہ مسلح محافظ بھی اسی..... اسی بلیک کنگ کے آدمی ہیں؟“ یہ سوال کرتے ہوئے وہ چونک اٹھی تھی۔

”ہیں نہیں سنتا! بلکہ تھے۔ میں ان چاروں کو ٹھنڈا کر چکا ہوں۔“ میں نے اسے بتا دیا۔

”لیکن مجھے..... مجھے تو کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دی۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

”کوئی آواز تو اس وقت سنائی دیتی جب میں انہیں اس کا موقع دیتا۔ اپنی ہتھکتی سے میں نے انہیں مار دیا، صرف تیری خاطر سنتا کہ تجھے اس قید سے رہائی مل جائے۔“

”اچھا کیا تو نے سکھ ہیر! تو اگر ایسا نہ کرتا تو وہ میرے ہاتھوں مارے جاتے۔“ سنتا پوری طرح میرے جال میں پھنس گئی اور مجھ سے بلیک کنگ کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”کیا کرے گی تو جان کر؟“ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”قتل کر دوں گی اسے اور کیا کروں گی۔ دودھ چڑی کو بھی تو پتا لگنا چاہئے کہ انہوں نے مجھ پر دھواں (بھروسہ) نہ کر کے کتنی بڑی بھول کی ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ وہ تمہارا گھر ہیں تو اب میں انہیں تنہا ہی کر دیتا چاہتی ہوں۔“ سنتا پرجوش آواز میں بولی۔

”اور اسے قتل کر کے تو کہاں جائے گی سنتا! کیا وہ بڑھا تجھے زندہ چھوڑ دے گا؟“ میں نے کہا۔

”تو مجھے نہیں جانتا سکھ ہیر!“ وہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔ ”میں جانتا اسی لئے ایسے سوال کر رہا ہے۔ مجھے ڈھونڈ لینا دودھ چڑی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ شہر تیرے لئے نیا ہو گا، میرے لئے نہیں۔ یہاں کا ایک ایک گلی کوچہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ اس شہر میں میرے ایسے کئی ٹھکانے ہیں کہ جن کی خبر وندو جی کو بھی نہیں۔“

”مان لیا سنتا کہ اس شہر میں تیرے بہت سے ٹھکانے ہوں گے، مگر یہ بھی تو سوچ کہ وہ بوڑھا گدھ، درگا دیوی کا داس ہے۔ تو اس کی نظروں سے کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟“

”مجھے معلوم ہے سکھ ہیر کہ دودھ چڑی میں کتنی ہتھکتی ہے۔ وہ خود تو دوسروں کی نظروں سے چھپ سکتے ہیں، مگر کسی کو تلاش کر لینا ان کے لئے ممکن نہیں۔ مجھ سے زیادہ انہیں اور کون جانے گا۔ میں نے ان کے ساتھ برسوں گزارے ہیں۔ مجھے صرف اپنا چہرہ بدلنا ہو گا، سوبدل لوں گی، وہ بھی اس لئے کہ ان کا کوئی پرانا آدمی مجھے پہچان نہ سکے۔“

سنتا نے یہ بتا کر میری ایک الجھن ختم کر دی۔ میں اسی لئے دودھ چڑی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔

کر رہا تھا۔ بلیک کنگ یا آئند کی کوٹھی ذرا الگ تھلگ واقع تھی۔ وہاں کئی مرتبہ کاٹا بھی آچکا تھا اس لئے مجھے کوٹھی کا محل وقوع معلوم ہو گیا۔ یہی محل وقوع میں نے سنیا کو بتایا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں ایک ہی تیر سے دو شکار کا بندوبست کر دیا تھا۔ ایک طرف تو سنیا کو اسی کے ساتھیوں کا حریف بنا دیا، دوسری جانب بلیک کنگ کو ٹھکانے لگانے کی راہ ہموار کر دی۔ یہ دونوں ہی دونوں چیز جی کے اہم مہرے تھے۔ سنیا سے تو میں پوری طرح مطمئن تھا کہ اسے شیشے میں اتار لیا ہے لیکن جانے کیوں بلیک کنگ کی طرف سے مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ آدم زاد اسے چھٹی حس کہتے ہیں۔

درختوں سے گھری ہوئی اس کوٹھی میں اترنے سے پہلے میں نے اس کا ایک چکر لگایا، پھر بطور احتیاط اس محل کا ورد بھی کیا جو کسی ناپیدہ حصار کو میرے لئے ناکارہ بنا دے۔ کوٹھی کے ایک کمرے میں مجھے روشنی دکھائی دی تو وہیں جاگس۔ وہ بڑا سا کمرہ جنت ارضی بنا ہوا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا، گاؤں تکتے لگے تھے اور دور سا غرجل رہا تھا۔ سے کس ایک تھا اور ساتی کئی۔ بڑی ہی حسین اور پرکشش آدم زادیاں تھیں وہ جن کے درمیان آئند، راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ میں نے بھی ایک عمر آدم زادیوں کی زلفیں سنوارنے میں گزاری تھی، اس لئے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کچھ دیر لگی۔

اسی عرصے میں اچانک میں بنے رنگ و خوشبو کی اس فضا کو بدلنے دیکھا۔ آئند کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کا رنگ گورا اور چہرے کے نقوش پرکشش تھے۔ وہ سفید ملل کا کرت اور سفید ہی دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ آنکھیں روشن اور بڑی تھیں، سر کے بڑے بڑے بال شانوں تک آرہے تھے۔ اس کی شخصیت صنف مخالف کے لئے یقیناً متاثر کن ہی تھی۔ ایک نازک اندام آدم زادی کو اس نے اپنے پیلو سے جدا کیا اور پھر اچھل کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”تو جو کوئی بھی ہے، یہاں سے چلا جا۔“ وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔ ”یہ آئند کا عشرت کدہ ہے اور آئند (عیش و آرام) ہی کے لئے ہے۔“

یہ صورت حال میرے لئے خلاف توقع ہی تھی۔ اس نے وہاں میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلے کا سبب وہ آدم زادیاں تھیں جو اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ میں اسی لئے اس کے قریب نہیں گیا تھا۔ آئند اچھل کر کھڑا ہوا تو وہ آدم زادیاں سسم کر ادھر ادھر ہو گئیں۔

”اب تیرے دن پورے ہو چکے آئند!“ میں جواب میں بولا اور پھر لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اسی لمحے مجھے بدبوی محسوس ہوئی۔ یہ بو شراب کی بو سے مختلف تھی۔ آئند کو میں نے گرتے دیکھا۔ یوں جیسے اسے چکر سا آگیا ہو۔ وہ بے سدھ میرے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ ابھی تک میں نے اس پر کوئی وار نہیں کیا تھا۔ یہی حیرت کے لمحے میرے لئے عذاب ناک ثابت ہوئے۔ اسی دوران میں ایک آدم زادی اس کی طرف لپکی تو میرا دھیان بٹ گیا۔

میں بس یہی سمجھ سکا کہ وہ عیار آدم زاد مجھے فریب دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے وجود کو جڑ لیا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا تو پوری قوت کے ساتھ میں اوپر اٹھا اور خود کو اس کی رقت سے چھڑا لیا۔ میرا رخ کھلے ہوئے دروازے کی طرف تھا اور میرے حواس بحال نہیں تھے۔ اب

اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں وہاں سے فرار ہو جاتا۔ ابھی میں اس کوٹھی کی حدود ہی میں تھا کہ دوبارہ پکڑا گیا۔

”بھاگ کر کہاں جائے گا۔“ یہ آئند ہی کی آواز تھی۔ اب وہ مجھے نظر بھی آ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ایک جن زاد کو بھلا یہ آدم زاد کس طرح زیر کر سکتا ہے۔ اسے خوفزدہ کرنے اور چرچاڑ دینے کی خاطر میں نے ایک چیتے کا قالب اختیار کر لیا۔ اسی کے ساتھ میں اس کی گرفت سے نکل گیا اور پلٹ کر زقند بھری۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب میرے مقابل آئند نہیں، ایک چیتا ہی تھا۔ میں اس سے بھڑ گیا۔ ہم دونوں کی غرائشیں کوٹھی کے احاطے میں گونجتی رہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پوری قوت سے سمجھوڑ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں اسے میں نے اور اس نے مجھے لمولمان کر دیا لیکن پھر وہ مجھ پر بھاری پڑنے لگا۔ وہ میرے زرخرے میں اپنے دانت گاڑنے والا تھا کہ مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ چیتے کا قالب اختیار کرنے کی وجہ سے میں شدید زخمی ہو چکا تھا، اس لئے میں وہ قالب چھوڑ کر بھاگا اور پھر اتنی اونچی پرواز کی کہ اس کی گرفت میں نہ آ سکوں، مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح جن زادی سوی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میرے ہوش و حواس جواب دے گئے۔

ہوش ٹھونے سے پہلے میں نے سوی کو آواز سنی تھی۔ وہ میرے زخم زخم وجود کو اپنی آغوش میں سیٹھ ہوئے اپنے باپ عزتیل کو آوازیں دے رہی تھی۔ ”جلد آ اے عزتیل! دیکھ کہ علیالیش کو کیا ہو گیا؟ یہ تو مجھے چند گھڑی کا مہمان لگتا ہے۔“

☆=====☆

شب و روز کا شمار سوی نے رکھا ہو تو خبر نہیں لیکن مجھے کچھ پتا نہیں کہ دن کب نکلا اور کب رات ہوئی۔ اس عرصے میں جب بھی مجھے ہوش آیا تو سوی کو اپنے پاس دیکھا، عزتیل بھی کبھی کبھار نظر آیا۔ وہ باپ بیٹی پوری طرح میری دیکھ بھال اور نگہداشت کر رہے تھے۔

میرے وجود کے زخم رفتہ رفتہ بھرنے لگے تو سوی مجھے سہارا دے کر فضا میں اڑانے لگی۔ ایک روز، ایک گھنٹے درخت پر اترتے ہوئے وہ مجھ سے بولی۔ ”سن اے علیالیش کہ اب میں تجھے آدم زادوں کی طرف نہیں جانے دوں گی۔ ہر چند کہ ابھی تک تُو نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ ہوا کیا تھا اور تجھے موت کے منہ تک کس نے پہنچا دیا، پھر بھی مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ وہ کوئی کمینہ آدم زادی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ ”یہ آدم زادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“

میں اس کی بات سن کر ہنس دیا اور ایک موٹی سی شاخ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ برابر والی شاخ پر جمولے لگی۔

”اے علیالیش! تُو کس لئے ہنس رہا ہے؟“ وہ جھولتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

سوی کے وجود کی حرارت مجھے پکھلانے لگی تو میں اٹھ کر بولا۔ ”اس طرح تو میں تیرے کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گا۔“

اس نے وہ شاخ چھوڑ دی جس پر میں بیٹھا تھا اور کہنے لگی۔ ”ہاں اب میرے سوال کا جواب دے

کہ وہ تو تھی؟

”ایک تو ہی کیا اے سوی! ہر جن زادی، آدم زادیوں سے نفرت کرتی ہے لیکن یہ قصہ کسی آدم زادی کا نہیں ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔
”تو پھر؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہ ایک شیطان صفت اور بدکار آدم زاد تھا اور..... اور اب تو میں کچھ.....“ میں جب ہو گیا اور اس گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ پہلے بھی میں نے اس پر کئی مرتبہ غور کیا تھا، مگر کئی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ سوی نے میری خاموشی پر مجھے نوکا تو میں نے کہا۔ ”مجھے سوچنے دے اے سوی!“ اس نے پھر کچھ نہیں کہا اور میں خیالوں میں کھو گیا۔ کبھی تو مجھے یوں لگتا کہ آئندہ بے اندازہ پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک ہے اور کبھی میں یہ سوچتا کہ وہ کوئی آدم زاد نہیں بلکہ میری ہی طرح ایک جن زاد ہے۔ میں اگر آدم زادوں کے درمیان رہنے کے لئے انسانی قالب اپنا سکتا ہوں تو دوسرے جن زاد بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ اس سے قبل کبھی مجھے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ کوئی آدم زاد دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک درندہ بن گیا ہو۔ آدم زادیوں کی طلب ہی میں تو یاسف بھی ایک آدم زاد بن کر رہنے پر مجبور تھا۔ میں سوچتا رہا اور مجھے وہ منظر یاد آیا جب آئندہ کے عشرت کدے میں قدم رکھا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان جو مقابلہ ہوا اس سے بھی بڑا چلا کہ وہ مجھ سے قوی ہے۔ اس نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ میں اسے زیر نہیں کر سکا۔ اگر واقعی وہ کوئی جن زاد ہی تھا تو پھر تنہا میرے لئے اس پر قابو پالینا ممکن نہیں تھا۔

”اے علیالیش! کیا تو مجھے کچھ بھی نہیں بتائے گا؟ ممکن ہے کہ میں تیری کوئی مدد کر سکوں۔ کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ میں بھی تو آدم زادوں کے درمیان رہ چکی ہوں؟ ایک آدم زادی کی تو بیوہ ہوں میں۔ مجھے بھی ان سے نسنے کے بت سے طریقے آتے ہیں۔“ سوی سے میری خاموشی برداشت نہ ہو سکی۔
سوی کے ان الفاظ نے مجھے ایک نئی راہ سمجھائی لیکن میں نے جو کچھ سوچا، اس کے لئے عزت کا راضی ہونا ضروری تھا۔

”اچھا تو پھر سن اے سوی کہ مجھ پر کیا گزری۔“ میں بولا اور پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر سوی نے مجھ سے سوال کیا۔ ”جب وہ چکر اکر گرا تو کیا تو نے اسے اٹھتے دیکھا تھا؟“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ بے سدھ پڑا تھا۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
”وہ اگر بے حرکت پڑا تھا تو پھر تجھ پر وار کس نے کیا؟“

”میں تو الجھا دینے والا معاملہ ہے اے سوی! جو آدم زاد شیطانی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں، فریب دے سکتے ہیں۔ حیرت کے وہ چند ہی لمحات ہوں گے کہ جب میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا۔ تجھ سے جھوٹ کیا بولا، وہاں ایسی آدم زادیاں تھیں کہ جن کی طرف سے نظر مٹانا مشکل ہو جائے۔ جب

ایک ایسی ہی حسین آدم زادی گھبرا کر اس کی طرف بڑھی تو میری نظر چوک گئی۔ پھر جو کچھ ہوا، میں تجھے بتا ہی چکا ہوں۔“

”تو نے ابھی کہا تھا اے علیالیش کہ جب تو وہاں سے بھاگ رہا تھا تو اسی آدم زاد نے تجھے جکڑ لیا تھا۔ یہ تاکہ اس کا یہ جکڑ لینا آدم زادوں جیسا ہی تھا کہ الگ؟“

”تھا تو الگ ہی، اتنی طاقت ایک ہی صورت میں کسی آدم زاد کے اندر پیدا ہو سکتی ہے جب اسے شیطانی قوتیں حاصل ہوں۔“

”تو اسے نظر کیسے آگیا؟ یہ بھی تو سوچ اے علیالیش!“ سوی کے ان الفاظ نے ایک نیا ہی باب کھول دیا۔

”سوچا تو ہے میں نے، شیطانی یا رحمانی قوتیں رکھنے والے آدم زاد ہمیں دیکھ سکتے ہیں، مجھے اس کا تجربہ ہے۔“ اس موقع پر مجھے نرمس کا باپ مولوی کفایت اللہ یاد آگیا جس نے مجھے ایک مرتبہ اپنی حویلی میں قید کر دیا تھا۔ مختصر آئیں نے یہ واقعہ سوی کو سنا دیا، پھر نرمس کے بارے میں بھی بتایا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سوی پر اس کا کچھ اور ہی رد عمل ہو گا۔ وہ کہنے لگی۔ ”تو پھر یوں بول نا کہ تو بھی اے علیالیش دوسرے جن زادوں کی ہی طرح ہے جو آدم زادوں کے عشق میں خوار ہوتے پھرتے ہیں۔ کیا وہ آدم زادی نرمس ایسی ہی تھی کہ تو اپنے ہوش کھو بیٹھا؟“

”کیوں میرے زخموں کو چھیڑتی ہے اے سوی! تو نے اپنے آدم زاد شوہر سے جتنی محبت کی ہوگی، شاید اتنی ہی..... بلکہ ممکن ہے، اس سے بڑھ کر میں نے نرمس کی چاہت میں زخم کھائے ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تجھے تو تیری منزل مل گئی اور میں..... میں تڑپتا رہ گیا۔ دنیا کی اس بھیڑ میں وہ جانے کہاں کھو گئی۔“

”اگر تجھے اس آدم زادی سے اتنی ہی محبت تھی اے علیالیش تو اسے تلاش کیوں نہیں کیا؟“
”بہت تلاش کیا، مگر وہ مجھے نہیں ملی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تجھے میں یہ بھی بتا دوں اے سوی کہ اس سے میرے عشق میں ہوس شامل نہیں رہی تھی۔ تو حیران ہوگی شاید یہ سن کر کہ..... کہ مجھے کبھی بھی اس کا قرب حاصل نہیں ہوا۔“ نرمس کا ذکر چھڑا تو موضوع گفتگو ہی بدل گیا اور بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔

”پھر بھی تو اس کا اتنا دیوانہ ہو گیا۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات کہہ دی تو نے۔ کبھی کوئی ایسا واقعہ سنا نہیں میں نے۔“ سوی نے اظہار حیرت کیا، پھر بولی۔ ”اے علیالیش! تو نے بتایا ہے کہ اس آدم زادی کا باپ ایک عالم تھا۔ اسے خبر تھی کہ تو اس کی بیٹی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس خیال سے کہ تو پھر کہیں پلٹ نہ آئے، اس نے کوئی بندوبست کر لیا ہو گا۔ ایک تو اس نے وہ جگہ چھوڑ دی، پھر کوئی ایسا عمل کیا کہ تو نرمس کو تلاش نہ کر سکے، ایسا بھی تو ممکن ہے۔“

”ہاں اے سوی! اسی آس پر تو میں اب تک زندہ ہوں۔ میں نے بھی یہی سوچ کر خود کو تسلی دے لیا ہے۔ کبھی تو اس کا باپ مر ہی جائے گا اور کسی دن تو میں اس تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ اس کے باپ کی

موت کے بعد شاید وہ عمل کارگر نہ رہے۔" زمر کی یاد نے مجھے ہر خیال سے بیگانہ کر دیا۔
 "لیکن خود وہ آدم زاد ہی تو کم نہیں، تو نے یہ بھی تو کہا ہے۔" سومی نے مجھے یاد دلایا۔ "اس کے باپ نے اسے علم سکھا دیا تھا۔"
 "تو کچھ بھی کہہ لے لیکن مجھے یقین ہے کہ زمر ایسا نہیں کرے گی۔ اسے میرے عشق پر یقین آ چکا تھا۔ وہ مجھے اپنے پاس آنے سے نہیں روکے گی۔" میں بولا۔
 "اے علیالیش! تو بھی کتنا بھولا ہے۔ تجھے یاد ہی نہیں رہا کہ آدم زادیوں کی عمر پلک جھپکے گزر جاتی ہے۔ مجھ سے بھی تو یہی بھول ہوئی تھی کہ جس کا خلیزہ آج تک بھگت رہی ہوں۔ یہ آدم زاد تو بہت ہی جلد بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں۔"
 "خدا نہ کرے اے سومی کہ زمر اتنی جلدی بوڑھی ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔" میں جذباتی سا ہو گیا۔

"میں تو تجھے اپنا تجربہ بتا رہی تھی۔" وہ ہلدی سے بولی۔ اسے یقیناً احساس ہو گیا تھا کہ مجھے اس کی بات بڑی مگی ہے وہ اسی لئے مجھ سے قریب تر ہو گئی۔ وہ بھی ہوا کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آگ سے بنی تھی اور میں بھی۔ آگ میں آگ ملا دی جائے نو شعلے بھڑکنے ہی لگتے ہیں۔ اسی عالم میں اس نے سردی کی۔ "اے علیالیش! تیری اور میری عمروں میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں۔ اگر میں بھگت نہ جاتی تو..... تجھ ہی جیسا کوئی جن زاد زندگی بھر میرا ساتھ نبھاتا اور..... اور پھر میں اپنے بچے پالتی" انہیں ہواؤں میں اڑنا سکھاتی۔ کیا..... کیا تو میرا اور صرف میرا بن کر نہیں رہ سکتا؟"

مجھے خبر تھی، ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ سومی مجھ سے، اظہار عشق کر دے گی۔ میں نے بڑی نرمی کے ساتھ خود سے اسے جدا کیا اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ "دیکھ اے سومی! تیرے باپ عزتیل نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنی چاہئے۔ ہر چند کہ تو نے حد سے تجاوز نہیں کیا اور نہ میں نے، پھر بھی ہم جذبات کی رو میں آکر بھٹکا تو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں نے تجھے دوسری جن زادیوں سے مختلف پایا۔ تو یقیناً اپنے نفس کی غلام نہیں ہے، اسی لئے تو میں نے تجھے اپنے قریب آنے دیا۔ عرصہ ہوا کہ میں نے یہ راہ چھوڑی ہے اور اب اس کی طرف پلٹ کر نہ آنے کا عہد کیا ہے۔ دعا کر کہ میں اپنے اس عہد پر قائم رہ سکوں۔ میں تو خود اپنا نہیں رہا، پھر کسی کا بن کر کیا رہوں گا..... ابھی میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ تیرے جذبات کی قدر ہے مجھے..... کچھ اور تو نہیں، ہاں تجھ سے یہ وعدہ ضرور کر سکتا ہوں کہ اگر میری زندگی میں کوئی جن زادی آئی تو وہ تو ہوگی، صرف تو سومی!"

"میرے لئے تیرا یہ وعدہ ہی بہت ہے۔ میں اس وعدے کے سارے بھی ساری زندگی گزار سکتی ہوں اور سن اے علیالیش! تیرے سوا اب کوئی اور جن زاد میری زندگی میں نہیں آسکے گا۔ میں نے بھی تجھے بڑا سچا اور کھرا پایا۔ تیرا ظاہر اور باطن ایک ہے ورنہ تو ایک آدم زادی سے اپنے عشق کا واقعہ بیان نہ کرتا۔ میرے اندر تیری چاہت پیدا ہوئی تو میں نے اس آدم زادی سے حسد کیا اور اسے ظاہر بھی کر دیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا اے علیالیش کہ تو اپنے عشق میں اتنا سچا ہو گا۔ مجھے معاف کر دے کہ میری وجہ سے تجھے رنج ہوا۔" سومی یہ کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مجھ سے قریب ہو گئی۔
 "اگر تو اسی سے خوش ہو سکتی ہے تو میں نے تجھے معاف کیا اے سومی!" میں نے اسے دلاسا دیا اور وہ بہل گئی۔ پھر ہم دونوں ہی ماضی کے دھندلکوں سے باہر آگئے۔ پہل میں نے ہی کی اور بولا۔ "تیرا باپ عزتیل اس پر خوش ہے کہ میں آدم زادوں کے درمیان رہ کر کارِ خیر میں مصروف ہوں۔ میں نے ایک ایسی راہ نکالی ہے اسے سومی کہ تو بھی میرے ساتھ رہ سکے۔ میں نہیں جانتا کہ عزتیل میرا کما مان بھی لے گا یا انکار کر دے گا۔"
 "میں اس کی اکلوتی اولاد ہوں۔ کبھی اس نے میری بات نہیں ٹالی۔ تو مجھے بتا کہ سوچا کیا ہے تو نے؟"

"پہلے تو اکیلی آدم زادوں کے درمیان رہی تھی اور اب میرے ساتھ ہو گئی۔ ہم دونوں ہی کارِ خیر میں ایک دوسرے کا سارا ہوں گے۔ نہ تو بھٹک جانے والوں میں ہے اور نہ میں۔ نہ میرا ماضی تجھ سے چھپا ہے، نہ میں تیری طرف سے بے خبر ہوں۔ تو یہاں تنہائیوں کا شکار ہے اور عزتیل کو بھی اس کا احساس ہے۔ ایسی صورت میں مجھے تو یقین ہے کہ وہ تجھے میرے ساتھ بھیج دے گا۔ تیرا کیا خیال ہے؟" اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی۔ "تو دو مرتبہ آدم زادوں کے ہاتھوں زخم کھانے کے بعد یہاں آیا ہے۔ دونوں ہی مرتبہ تو مرتے مرتے بچا ہے۔ سو پھر کیسے میرا باپ تیرے ساتھ مجھے بھیجنے پر راضی ہو جائے گا؟ میرے معاملے میں بھی ایک بار وہ چوٹ کھا چکا ہے۔ اس کی بس ایک ہی صورت ہے، اگر تو..... تو شاید اس پر آمنا نہ ہو۔ سو میں ایسی بات کیوں کہوں.....! ابھی تو تیرے زخم بھی پوری طرح نہیں بھرے، یہاں سے جانے کی سوچنے لگا۔"

سومی کو اپنے ساتھ لے جانے کا خیال مجھے اس لئے آیا تھا کہ پھر ہم ایک اور ایک گیارہ ہو جاتے۔ کوئی قوی جن زاد ہو تا یا آدم زاد ہمیں زیر نہ کر پاتا۔ آئندہ سے معرکہ آرائی کے وقت اگر سومی بھی میرے ساتھ ہوتی تو یقیناً مجھے راہ فرار اختیار نہ کرنا پڑتی، نہ میں موت کے دہانے تک پہنچتا۔ میں نے سومی سے بھی اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا۔ اس سے اب مجھے چھپانا بھی کیا تھا۔

"ٹھیک کہتا ہے تو۔" سومی نے کہا۔ "مگر میں ابھی اپنے باپ کی طرح کامل نہیں ہوں۔ وہ رات یاد کر کہ جب تو ایک آدم زادی کو لے کر یہاں آیا تھا اور وہ میرے قابو میں نہیں آسکی تھی۔ میں اسی کافر آدم زادی سینٹا کا ذکر کر رہی ہوں کہ جس کی شیطانی قوتوں کو میرے باپ نے سلب کر لیا تھا۔"

"اس کی وجہ اور تھی کہ میں انسانی قالب سے باہر نہیں آسکا۔" میں نے وضاحت کر دی۔ "اسے اظہار میں لے کر ہی قریب دینا ممکن تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تو کیا چاہتا ہے اور آدم زادوں ہی کے درمیان رہنے پر کیوں بضد ہے؟" وہ اُلجھ سی گئی۔

”تو میرے ساتھ رہے گی تو خود ہی سب کچھ جان لے گی۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ فیصلہ تو خیر بعد میں ہو گا، پہلے اس آدم زاد کی بات کر کہ جس نے تجھے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔“ سوی بولی۔ ”میرا بس چلے تو اسے چر پھاڑ دوں۔“
 ”ابھی تو میں یہی طے نہیں کر سکا کہ وہ کوئی آدم زاد ہی تھا کہ جن زاد۔“ میں نے یہ کہنے کے بعد سوی کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔

”ہاں یہ ممکن تو ہے۔“ یہ میرے خیال کی تائید میں بولی۔ ”وہ بھی تیری ہی طرح کوئی جن زاد ہو سکتا ہے جو آدم زادوں کے درمیان رہتا ہو۔ وجہ بھی تو خود ہی بیان کر چکا ہے کہ وہ حسین آدم زادوں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا۔ ایسے میں تو وہاں پہنچ گیا تو وہ کس طرح وہاں تیرے وجود کو برداشت کر لیتا۔ میں اسی لئے تو تجھ سے سوالات کر رہی تھی لیکن تو اسے کوئی شیطان صفت آدم زاد ہی ثابت کئے جا رہا تھا۔ میرے باپ نے تیرا روحانی علاج کیا ہے، اس سے چل کر پوچھتے لیتے ہیں ورنہ پھر اوراد و وظائف کا وقت ہو جائے گا۔“

یہ وقت عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا اور ابھی عصر ہونے میں دیر تھی۔ ہم دونوں اڑتے ہوئے عزتیل کے پاس پہنچ گئے۔
 وہ ہم دونوں کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ”اے علیالیش اور اے سوی! تمہیں ساتھ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

موقع ملتے ہی میں بول اٹھا۔ ”تو پھر ہمیں ساتھ ساتھ ہی رہنے دے اے عزتیل! میں تو خود ہی تجھ سے یہ کہنے والا تھا۔“

”میں نے تم دونوں کو ساتھ رہنے سے کب روکا ہے؟ سوی بھی اب کوئی بچی نہیں رہی، ماشاء اللہ جوان ہے اور ساڑھے سات سو برس کی ہو چکی ہے، اپنا بڑا بھلا اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ تو بھی اے علیالیش! ہزار سال کا تو ہو گا ہی، سو ابھی جوان ہی کہلائے گا۔ ہاں میں ضرور بوڑھا ہوں۔“

”میری عمر کا اندازہ تو نے ٹھیک ہی لگایا اے عزتیل!“ یہ کہہ کر میں پھر اصل بات پر آ گیا اور بولا۔
 ”ساتھ ساتھ رہنے کی اجازت مانگتے سے میرا مطلب کچھ اور تھا۔ سوی کو یہاں سے میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”مگر کہاں اور کیوں؟ یہ بھی تو بتا۔“ عزتیل نے پوچھا۔

میں نے اپنی دانست میں اس کے دونوں سوالوں کے اطمینان بخش جواب دیئے۔

”تجھے معلوم ہے اے علیالیش کہ میں نے سوی کو آدم زادوں کی طرف جانے سے منع کر رکھا ہے۔ یہ اپنی مرحومہ ماں ہی کی طرح فرمانبردار ہے، سو اس نے میرا حکم نہیں ٹالا۔ ہاں ایک دفعہ یہ تیرے پیچھے ضرور چلی گئی تھی، سو میں نے اسے سمجھا دیا اور یہ سمجھ گئی۔ پھر تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اسے تیرے ساتھ جانے دوں گا؟ تو نے میرے دوسرے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا، اس پر بعد میں بات ہو گی۔“ عزتیل بولا۔

”جن زاد اسے قریب نہیں آنے دیتے اور آدم زادوں کی طرف تو نہیں جانے دیتا۔ تو پھر یہ بتا یہ کس طرح زندگی گزارے؟ کب تک اکیلی ان جنگلوں اور دیرانوں میں بھٹکتی رہے؟ تیرے حکم کی زنجیر نے اسے باندھ رکھا ہے۔ یہ آدم زادوں کے درمیان اب تھا تو نہیں رہے گی، میں بھی تو اس کے ساتھ ہی رہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”سننا ہی چاہتا ہے تو سن، آدم زاد ہوں کہ ہم جن زاد، شیطان تو دونوں ہی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تو بھی جوان ہے اور سوی بھی، کیا تم دونوں کو شیطان ورغلا نہیں سکتا؟ تو یہ نہ سمجھ کہ مجھے اس کے دکھوں کا اندازہ نہیں۔ یہ بھی میری نظریں ہے کہ کسی بھی وقت میرا بلاوا آ سکتا ہے۔“ عزتیل کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”پھر..... پھر تو یہ بالکل ہی اکیلی رہ جائے گی۔ میں نے اسی لئے تو دعا کی تھی کہ اس کا اکیلا پن ختم ہو جائے اور خدا نے میری سن لی، تجھے یہاں بھیج دیا۔ تو نے یہ جان کر بھی اس سے نفرت نہیں کہ یہ ایک آدم زاد کی بیوہ ہے۔ سو میری نظریں تیری عزت بڑھ گئی۔ پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو نے اب خلق خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے تو تیری تو قیصر میں اور اضافہ ہو گیا۔ تیری جگہ اگر کوئی اور جن زاد ہوتا تو میں، سوی کے قریب اسے نہ آنے دیتا۔ تجھے میں نے راستی پر پایا جبکہ جن زادوں کی اکثریت بھٹکی ہوئی ہے۔ تو بھی پہلے بھٹکا ہوا تھا، اس کو تو نے چھپایا نہیں۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ تو نے اب توبہ کر لی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں تیری توبہ قبول ہو جائے۔ مجھے بتا اے علیالیش کہ کیا توبہ کر لینے کے باوجود شیطان دوسرے نہیں ڈالتا؟“

”اپنی پارسائی کا نہ مجھے پہلے دعویٰ تھا نہ اب ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کئی بار میں نے توبہ کی اور اس پر قائم نہ رہ سکا۔ میں تجھ سے جھوٹ کیوں بولوں اب بھی مجھے شیطان بھٹکتا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوتی۔“

”تو نے شاید اس پر کبھی غور نہیں کیا، اصل وجہ کیا ہے..... میں تجھے بتاتا ہوں۔ وہ جو فطری قاضوں سے انحراف کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریق پر عمل نہیں کرتے، انہیں ایسے ہی عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ بار بار توبہ کرتے ہیں اور توڑ دیتے ہیں یا اسے یوں کہہ لے کہ ان کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔ جن زاد ہوں کہ آدم زادان کے لئے ایک ہی حکم ہے، ایک ہی طریقہ ہے۔ میں وعظ نہیں کر رہا نہ تجھے نصیحت کرنے کا اہل ہوں۔ ہاں اگر تو مجھے اپنا بڑا جانے تو کوں کہ کسی ٹھکانے لگ جا اور اپنا گھر بسالے۔ پھر شیطان تجھے آسانی سے نہ بھٹکا سکے گا۔ یہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلے گا تو فلاح پائے گا اور تجھے اپنی توبہ پر قائم رہنے میں دشواری نہیں ہو گی۔“ عزتیل کی آواز میں سچ کی خوشبو تھی۔

وہ ایک عالم تھا اور اس نے میرے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی لیکن مجھے تو ایک مرض اور بھی لاحق تھا، مرض عشق۔ زمرس کو میں کیسے بھول جاتا؟ اسی کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ عزتیل اور سوی نے دوسرے میری جان بچائی ہے۔ وہ دونوں میرے محسن تھے۔ اس سے قطع نظر سوی جوان بھی تھی اور حسین بھی۔ اگر وہ ایک آدم زاد کی بیوہ تھی تو میں بھی ایک آدم زادی سے نکاح کر چکا تھا۔ عندلب

میرے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے اور میرا علم بھی یہی کہتا ہے، آگے خدا بہتر جانتا ہے۔“
اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ آئند کے جسم پر کوئی جن زاد بھی قابض ہو سکتا ہے۔ خود میں بہت سے آدم زادوں کے جسم میں رہ چکا تھا۔ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ میں اچھ کر رہ گیا۔ عزتیل کا تجزیہ مجھے درست ہی معلوم ہوا۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا، اس لئے عزتیل اٹھ کر چلا گیا۔ سوئی اس کے جاتے ہی بول اٹھی۔ ”یہ تجھے اچانک ہی کیا ہو گیا اے علیالیش! تو نے تو کہا تھا ابھی کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔“

”کبھی کبھی زندگی کے بڑے اور اہم فیصلے اس طرح اچانک بھی ہو جاتے ہیں اے سوئی!“ میں نے کہا۔ ”تو میرے ساتھ ہوگی تو بہنٹکنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔“
”اور وہ آدم زاد کی تو جس کے عشق میں مبتلا ہے، کیا اسے بھلا دے گا؟“
”کسی کو بھلا دینا یا اسے یاد رکھنا ہمارے اختیار ہی میں کب ہے۔ کیا تو اپنے مرحوم آدم زاد شوہر کو بھلا سکتی ہے؟“

”نہیں۔“ سوئی نے سچ بولا۔ ”لیکن وہ وہ آدم زاد تو ابھی زندہ ہے۔ یقین رکھ اے علیالیش کہ تیری خاطر میں بھی اسے تلاش کروں گی۔“
”مجھے تجھ سے یہی امید تھی اے سوئی! تو بڑے ظرف اور حوصلے والی ہے۔ میں تجھے پا کر بہت خوش ہوں۔“ پھر میں نے اسے ایک مشورہ دیا جو اس نے فوراً قبول کر لیا۔

اسی دن مغرب کے بعد جب ہم نے عزتیل پر اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ ہم علم سیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بولا۔ ”اس کے لئے تم دونوں کو بڑی ریاضت کی ضرورت ہوگی، علم اتنی جلدی نہیں سیکھا جاتا۔ اس کے لئے ایک مدت چاہئے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مختصر عرصے میں تم دونوں کو میں مختلف وظائف اور عمل تعلیم کروں۔ میں تمہیں اس طرح ایک دوسرے کی ذہال بنا دوں گا۔ مجھے تو یوں لگا اے علیالیش کہ سوئی تیرے ہی مشورے پر علم سیکھنے کو راضی ہوئی ہے۔“

”ہاں میں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔ ایک عالم باپ کی بیٹی ہو کر اس کو تجھ سے اب تک بہت کچھ سیکھ لیتا چاہئے تھا۔“

”کوشش تو کی تھی میں نے کہ اسے بھی کچھ سکھا دوں لیکن اسے سیرپاٹوں کا بہت شوق تھا۔ لاڈلی بھی تھی یہ میری اور اپنی ماں کی، سو ہم نے اس پر جبر نہ کیا۔ پھر بھی جو ہو سکا اسے سکھا دیا کہ یہ آدم زادوں اور قوی جن زادوں سے اپنی حفاظت کر سکے۔ یوں اس کا علم اور دہرائی رہ گیا۔ اس ادھورے پن کا بڑا سبب نوجوانی ہی میں ایک آدم زاد کے ساتھ اس کی شادی تھی۔ وہ مر گیا تو یہ مجھ ہی گئی۔ پھر یہ علم سیکھنے کی طرف راغب نہ ہوئی۔ تجھ سے مل کر تو یہ جیسے دوبارہ جی اٹتی ہے۔“ عزتیل نے بتایا۔

اس کے بعد تین دن جیسے پلک جھپکتے گزر گئے۔ میں اور سوئی بڑے شوق اور لگن کے ساتھ مختلف وظائف یاد کرتے رہے، عزتیل سے عملیات کا درس لیتے رہے۔ میں اسی عرصے میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا۔ یہ میری زندگی کا ایک نیا باب تھا۔

مجھے یاد تھی، مگر وہ میرا عہدِ آوارگی تھا۔ جلد ہی اس سے میرا جی بھر گیا اور پھر کبھی میں اس کی طرف نہیں پلٹا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آدم زادیاں میری زندگی میں آئیں لیکن کوئی جن زادی قریب نہ آ سکی، میں کسی کو قبول نہ کر سکا۔ سوئی ان میں سے نہیں تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنا گردیدہ بنا لیا اور اب تو وہ مجھ سے اظہارِ عشق بھی کر چکی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود بھی اس کی چاہت میں کوئی فرق نہیں پڑا کہ میں ایک آدم زادی سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے خود سے سوال کیا، یہ بھی کیا کلامِ خیر نہیں کہ ایک بیوہ جن زادی کو سہارا مل جائے؟ عزتیل نے منہذب الفاظ میں جو کچھ کہا، وہ بھی میں سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے اسی صورت میں سوئی کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دیتا کہ وہ میرے نکاح میں آجائی۔ وہ بڑے فیصلہ کن لگے تھے۔ سوئی سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کبھی زکس مجھے مل جاتی تو سوئی کو اس پر اعتراض نہ ہوتا۔

میری اور عزتیل کی گفتگو کے دوران میں سوئی اب تک کچھ نہیں بولی تھی۔
کچھ دیر چپ رہ کر میں نے عزتیل کو مخاطب کیا۔ ”تیرا مشورہ مجھے قبول ہے اور تیری بیٹی سوئی بھی۔“

یہ سن کر عزتیل نے سوئی سے پوچھا۔ ”تو کیا کہتی ہے؟“
فرط جذبات کے سبب سوئی گنگ سی ہو کے رہ گئی۔
”اے میری بیٹی! منت یہی ہے، جب تک تو راضی نہ ہوگی، میں تیرا نکاح علیالیش سے نہیں کروں گا۔“

وہ کوئی آدم زادی نہیں تھی کہ شرما کر سر جھکا لیتی، سو اقرار کر لیا، بولی۔ ”میں تو اسے چاہتی ہوں اور یہ بھی اس سے واقف ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے اے علیالیش! میرے اندازے کے مطابق ابھی تجھے پوری طرح صحت مند ہونے میں دو تین روز اور لگ جائیں گے۔ جب تو صحت یاب ہو جائے گا تو میں تیرا نکاح سوئی سے کر دوں گا۔ اس کے بعد میں سوئی کو تیرے ساتھ کہیں بھی جانے سے نہیں روکوں گا۔“ عزتیل نے خود یہ کہہ دیا۔
”پھر یہ میری نہیں تیری ذمہ داری ہو جائے گی۔“

”علیالیش کو تجھ سے ایک مشورہ بھی کرنا تھا۔“ سوئی نے یہ کہہ کر آئند کا ذکر پھیر دیا۔
عزتیل نے بھی مجھ سے پورا واقعہ سنا اور مختلف سوالات کئے، پھر بولا۔ ”میرے علم کے مطابق نہ تو وہ آدم زاد شیطانی قوتوں کا مالک ہے اور نہ کوئی جن زاد ہے۔ اچانک بلا کسی سبب کے اس کا بے ہوش ہو جانا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے جسم پر کسی بے راہ جن زاد نے قبضہ کر رکھا ہے۔ جب تو وہاں سے بھاگ رہا تھا تو تجھے دھوکا دینے کے لئے اس نے آدم زاد کا قالب اپنا لیا۔ تو اس کے قابو میں نہ آیا تو اسے بھی مجبوراً تیری ہی طرح بن جانا پڑا۔ پہلی دفعہ جب اس نے تجھے اپنی گرفت میں لیا تو اس نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی ہوگی تاکہ تو اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ مجھے کوئی بہت عیار جن زاد لگتا ہے، دھوکا دینے والا بھی اور قوی بھی۔ تو نے بدلو کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کوئی کافر جن زاد ہو گا۔“

عزیز جنت کی بستی میں جا کر اپنے بھائیوں کو ملالایا اور سوی سے میرا نکاح ہو گیا۔
 وہ شب وصال ان تمام راتوں سے افضل تھی جو میں نے آدم زادوں کے قرب میں گزار دی تھیں۔ پہلی مرتبہ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ آگ اور مٹی میں کتنا فرق ہے۔ عالم ہاموس کی بیٹی وازعہ اور سوی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق تھا حالانکہ دونوں ہی جن زادیاں تھیں۔ وازعہ ایک عذاب تھی تو سوی جسم ثواب۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں نے پہلی بار اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا۔ رات بھر سوی میری کشت بے آب پر گھٹا بن کر رہتی رہی۔ ہمارے ارد گرد رنگ ہی رنگ تھے، خوشبو ہی خوشبو تھی۔ سوی نے مجھے نمل کر دیا۔ آخر کار میں اپنی اصل کی طرف لوٹ ہی آیا کہ قانون قدرت بھی یہی ہے، ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔
 ہم نے ایک دن اور اسی جنگل میں گزارا، پھر عزیز کی دعاؤں کے سائے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

میں اور سوی پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اب ہمیں کہاں رہنا اور کیا کرنا ہے۔ سو ہم نے اسی پر عمل کیا۔

جنگل سے نکل کر جب ہم آبادی کے قریب پہنچے تو انسانی قالب اپنا لئے۔ سوی اب ایک حسین ترین آدم زادی لگ رہی تھی۔ میں بھی اسی مناسبت سے ایک پُرکشش اور وجہ نوجوان بن گیا۔
 ”اے علیائش! اب تو میرا کوئی اچھا سا نیا نام رکھ دے جیسے نام آدم زادوں کے ہوتے ہیں۔“
 سوی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”منصور ہے مجھے اے سوی! لیکن اس شرط پر کہ میرا نام تجھے رکھنا ہو گا۔“ میں بھی اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے ہنس کر بولا، پھر کہا۔ ”تو میری زندگی میں ٹھنڈی چھاؤں بن کر آئی ہے، سو میں تجھے صنوبر کہوں گا۔ اب تو بتا کہ مجھے کس نام سے پکارے گی۔“

”اور تو اے علیائش! میری تاریک زندگی میں اجالا بن کر آیا ہے، اس لئے تجھے میں خورشید کہوں گی۔“

ڈھاکہ شہر کا سب سے مشہور علاقہ چوک بازار ہے۔ یہیں ہم نے ایک گھر خرید لیا۔ یہ گھر سوی کو بہت پسند آیا۔ اس کا سبب قدیم طرز تعمیر تھا۔ کمروں کی چھتیں اونچی تھیں اور دروازے عمارتی تھے۔ بڑے صحن میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور درخت بھی لگے تھے۔ میں نے اس گھر کو ضروری ساز و سامان سے سجا دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی تھے اور یہی ظاہر بھی کیا۔ ایئر پورٹ پر واقع جس فائو اشار ہوٹل میں گریز احمد کے نام سے میں ٹھہرا ہوا تھا، وہاں جا کر میں اپنے دونوں سوٹ کیس بھی لے آیا۔ اب مجھے کسی ہوٹل میں سکونت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک سوٹ کیس کھول کر وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کردہ وہ اختیار نامہ دیکھا جو میرے لئے خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ اسی اختیار نامے کی وجہ سے وہود چڑجی کا اعتماد مجھے حاصل نہیں رہا تھا۔ اختیار نامہ سوٹ

کیس میں مل گیا۔ میں سوٹ کیس بند کر رہا تھا تو سوی نے مجھ سے اختیار نامے کے بارے میں معلوم کیا۔ سوی کو تو مجھے سب کچھ بتانا ہی تھا، سوا یک ایک بات تفصیل کے ساتھ اس کے ذہن میں بٹھادی۔ غیر ملکی دشمن وہاں کیا کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں اور میں نے انہیں گھیرنے کی خاطر کیا چالیں چلیں، سوی کو آگاہ کر دیا۔ وہ سب ہی کچھ جان گئی، ان آدم زادوں میں سے سوی نے صرف سیتا کو دیکھا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ بازار سے اشیائے صرف غائب ہونے سے جو قصہ شروع ہوا تھا، از اول تا آخر میں نے اسے سنا دیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میں دو مرتبہ کیوں مرتے مرتے بچا تھا۔ کافی دیر تک ہم دونوں اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سوی میرے خیالات سے پوری طرح متفق تھی۔

سوی آدم زادوں کے درمیان بود و باش اور رہن سہن سے بخوبی واقف تھی اور میں بھی۔ سو اسے رہنے سہنے کے طور طریق سمجھانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس علاقے میں سکونت اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ اب تک ہنگامہ آرائیوں سے بچا ہوا تھا۔ احتجاجی مظاہرے اردو روڈ تک محدود رہے تھے جو چوک بازار ہی سے ملی ہوئی آبادی تھی۔ چوک بازار اور اردو روڈ کی اکثر آبادی ڈھکیا کٹی کھلائی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو نواب خاندانوں سے بتاتے ہیں۔ یہ نہ جنگ بولتے ہیں نہ اردو۔ دونوں زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان بن گئی ہے جسے ان لوگوں کی بولی کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حقیقتاً یہاں زبان کے مسئلے پر کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکا۔ تخریب کاروں کی کوشش اسی لئے رائیگاں ہو گئی۔ موجودہ صورت حال میں چوک بازار کا علاقہ میری نظر میں سکونت کے لئے محفوظ ترین تھا۔
 شام ہوئی تو میں نے سوی سے کہا۔ ”چل چوک بازار کے دو چکر کاٹ آتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”تو مجھے نہیں بالکل ہی انجان تو نہیں سمجھ رہا؟ میں ایک عرصے اس شہر میں رہ چکی ہوں، ایک ایک علاقے کے رسم و رواج اور روایتوں سے واقف ہوں۔ میں سمجھ گئی کہ تو چوک کے دو چکر کاٹنے کو کس لئے کہہ رہا ہے۔“ پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اس کے ساتھ بھی میں نے چوک کے دو چکر کاٹنے تھے، مگر..... مگر برات کے ساتھ۔“

مجھے پہلی بار سوی کی زبانی اس کے آدم زاد شوہر کے بارے میں تفصیل کا علم ہوا۔ وہ اپنے مرحوم شوہر غضنفر کے ساتھ ڈھاکہ شہر ہی کے ایک علاقے عظیم پور میں رہ چکی تھی۔ وہیں ایک قدیم قبرستان ہے جو اسی آبادی کی مناسبت سے عظیم پور قبرستان کہلاتا ہے۔ وہیں اس کے شوہر کی قبر تھی۔ غضنفر سے جب سوی کی شادی ہوئی تو اسی کے ایما پر سوی نے انسانی قالب اپنا لیا تھا تاکہ آدم زادوں کو اس پر شک نہ ہو، وہ جن زادی ہے۔ وہ آدم زادوں ہی کی طرح دلہن بنی تھی اور برات نے چوک کے دو چکر لگائے تھے۔ سوی اسی لئے جذباتی ہو گئی اور اپنے ماضی کے ورق الٹنے لگی۔

چوک بازار ہی کی وجہ سے اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا تھا۔ یہ بازار گولائی میں ہے۔ ایک خاص بات اس سے یہ منسوب ہے کہ ڈھاکہ شہر میں کہیں شادی ہو تو برات اس بازار کے گرد دو چکر لگاتی ہے۔

اس کا مقصد تشیر و نمائش کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہاں کی یہ روایت میرے علم میں تھی۔ میں نے اسی لئے سوتی کو چھیڑا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ اس روایت سے سوتی کی کوئی جذباتی وابستگی بھی ہوگی۔

”مگر ایسا ہے تو پھر چھوڑ نہیں چلتے۔“ وہ چپ ہو گئی تو میں بولا۔

”نہیں اے علیالیش! ہم اس روایت کو برقرار رکھیں گے، برات نہیں تو نہ سہی۔ سنے دولہا دلہن تو ہیں ناہم۔“

کچھ ہی دیر میں سوتی نویا ہوتا دلنوں کی طرح جگ کر تیار ہو گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

”اب چل بھی کہ مجھے دیکھتا ہی رہے گا۔“ اس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”کیا سوچنے لگا؟“

”سوچ رہا ہوں کہ تجھے دیکھ کر کہیں لوگ رستہ چلتا نہ بھول جائیں۔“ میں نے شونخ لہجے میں کہا اور پھر اسے خود سے قریب کر لیا۔

سوتی کو بھی خبر تھی اور مجھے بھی کہ یہ سب کچھ نظر کا دھوکا ہے، مگر جان بوجھ کر دھوکا کھانا بھی تو اچھا لگتا ہے۔ نہ سوتی وہ تھی جو نظر آ رہی تھی، اور نہ میں۔ پھر بھی ہم دونوں بہت خوش تھے۔ شام کے وقت چوک بازار میں یوں بھی خاصا جھوم ہوتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں سے لوٹ کر خریداری کے لئے وہاں آتے ہیں۔ ہر نظر سوتی اور میری ہی طرف اٹھ رہی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ چوک کے دو چکر لگا کر ہم اپنے گھر لوٹ آئے۔

”تجھے اب اس آدم زادی ستیا کی خبر لینی چاہئے کہ وہ کہاں ہے۔“ سوتی نے مجھ سے کہا۔ ”تو نے اس سے ملنے کو کہا تھا، وہ تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔“ پھر اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”مجھے ڈر ہے اے علیالیش کہ وہ کہیں آئندہ کے چکر میں نہ پھنس گئی ہو۔ اسے دیکھا ہے میں نے، بہت خوبصورت ہے۔ وہ جن زاد کہ جس نے آئندہ کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے، ستیا کو تو اس کے ہتھتے نہیں چڑھنا چاہئے۔ تو نے چاہے اسے محبت کا فریب ہی دیا ہو، مگر وہ تو اس انسانی قالب کو چاہتی ہے جس میں تو اس سے ملا تھا۔“

”تو بھی میرے ساتھ چلتا چاہے تو چل، یہاں اکیلی پڑی پڑی کیا کرے گی۔“ میں بولا۔

”میں اتنے میں اپنے باپ عزتیل سے مل آتی ہوں۔ وہ بھی تو اکیلا ہو گا۔ عشاء کے وقت تک آ جاؤں گی میں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تو وہاں چلی جا، میں ستیا کا پتا چلا کر اس سے مل آتا ہوں۔“ میں نے سوتی کی تجویز مان لی۔

سوتی چلی گئی تو میں نے ستیا کا سراغ لگایا۔ ستیا کو میں نے بابو بازار میں دیکھا اور اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ یہ علاقہ ڈھاکہ شہر کا بازار خشن ہے۔ توقع کے مطابق اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ تنگ مری کا آڑا پاجامہ، گول کھیر والی گلابی قمیض جس میں ستارے ٹانگے گئے تھے، سر پر ہلکے گلابی رنگ ہی کی چڑی، آنکھوں میں کجرا، بانسوں میں کجرا اور پیروں میں کھٹکرو۔ محفل جی تھی اور وہ محو رقص تھی۔ اس محلے میں ستیا کو پہچان لینا واقعی مشکل ہی تھا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ

مجھے ایک اور نوجوان طوائف بھی رقص کرتی نظر آئی۔ دونوں ہی کے قدم طبلے کی تھاپ سے ہم آہنگ تھے۔ مجھے یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ ستیا اتنی اچھی رقصہ ہے۔ اس کے بدن میں بلا کالوچ تھا۔ اسے دیکھ کر یہ سمجھنا دشوار تھا کہ اس بازار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ دودو چڑی جی کے پرانے آدمی بھی اسے تلاش نہیں کر سکتے۔ سکھ ہیر کا قالب اپنا کر میں بھی اس محفل میں جا بیٹھا۔

رقص کرتے ہوئے اس کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی، وہ چونک اٹھی۔ اسے میں نے اچانک ایک طرف جھٹکے دیکھا اور پھر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ سازندوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ نائیکا لپک کر اس کے قریب پہنچی۔ تماش بین بھی آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ستیا کو میں نے نائیکا سے کچھ سرگوشی کرتے دیکھا۔

”ستارہ بانی کے پیر میں موج آگئی ہے اس لئے آج وہ نہیں ناچ سکے گی۔“ نائیکا نے تماش بینوں سے کہا۔ ”ہاں نیلم ناچتی رہے گی۔“ نائیکا نے دوسری رقصہ کی طرف اشارہ کیا جس کی شکل بس دا جی سی تھی۔ نائیکا نے ستیا کو سارا دے کر اٹھایا، پھر اسے اندرونی دروازے کی طرف لے جانے لگی۔

اکثر تماش بین اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہی کے ساتھ میں بھی اٹھا۔ آگے بڑھتے ہوئے ستیا نے ایک ہارپلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھ گیا۔ مجھ سے غلط میں ملنے کی خاطر ہی اس نے پیر میں موج آ جانے کا بہانہ کیا تھا ورنہ تو وہ محفل جانے کب ختم ہوتی۔

ستیا تک پہنچنے کے لئے مجھے ایک مرتبہ پھر انسانی قالب چھوڑنا پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ میں کسی بند کمرے میں بھی پہنچ سکتا ہوں۔ سو وہ بظاہر آرام کی غرض سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میری آمد کا انتظار کرنے لگی۔

میں اس کمرے میں داخل ہوا تو ستیا کو ایک مسری پر بیٹھے دیکھا۔ مسری کے قریب ہی دو موئڈھے پڑے تھے۔ میں نے جب سکھ ہیر کا قالب اپنایا تو انہی موئڈھوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ میرے ظاہر ہوتے ہی ستیا مسری کے سرہانے آکر بیٹھنے ہی بولی۔ ”تو کہاں غائب ہو گیا تھا سکھ ہیر! ایک روز بعد ملنے کے لئے کہہ کر گیا تھا اور اب دو ہفتے کے بعد آ رہا ہے۔ انتظار کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر تو نے مجھے روک نہ دیا ہوتا تو میں اب تک اس آئندہ کا کام تمام کر چکی ہوتی۔“

”یہاں کام تمام ہو جاتا۔“ میں بولا۔

”وہ کیسے؟“

”ایسے کہ وہ حرامزادہ آئندہ واقعی حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک نکلا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”تجھے تو زندہ سلامت دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اگر وہ تجھے زندہ بھی چھوڑ دیتا تو پھر اپنی کینز بنا کر رکھتا۔ اسی رات جب میں تجھ سے ملا تھا تو اس کی کونٹھی میں پہنچ گیا تھا۔“ پھر میں نے وہ منظر بیان کر دیا جو دیکھا تھا۔ ”میں اپنے جسم سے باہر تھا، پھر بھی اس نے وہاں میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔ تجھے یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میں بھی اس کی کھتی کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ میرے اور اس کے درمیان بہت زبردست مقابلہ ہوا۔ میں اور وہ، ہم دونوں ہی لہولہاں ہو گئے۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے میں اپنی جان بچا کر بھاگ سکا ورنہ

شاید وہ مجھے مار ڈالے۔ تیرے پاس اتنے دن نہ آنے کا سبب یہی تھا کہ میں اس شرم میں نہیں تھا۔
”پھر..... پھر کہاں چلا گیا تھا تو؟“ سنیتا کے لہجے سے فکر و تشویش کا اظہار ہونے لگا۔

”میں کیونکہ شدید زخمی تھا، اس لئے ایک دن تو ہمیں ڈھاکہ میڈیکل ہسپتال میں رہا، پھر یہاں سے راج شانی چلا گیا اور وہاں اپنا علاج کرایا۔ میں آج ہی وہاں سے لوٹ کر آیا ہوں۔ صحت یاب ہونے میں مجھے اتنے دن لگ گئے۔ اگر میں اس شرم میں ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تجھ سے نہ ملتا۔ ہر چند کہ اسے بھی میں نے زخمی کر دیا تھا لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ اپنا علاج اس شرم کے بجائے کہیں اور کراتا۔“

فکر مند ہونے کے باوجود سنیتا مجھے بہت غصے میں دکھائی دی۔ اسی کے سبب وہ اٹھ کر کمرے میں بیٹھنے لگی۔

میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ میں اسی لئے بولا۔ ”نہیں سنیتا! ڈوبنا نہیں کرے گی۔“

”کیوں نہیں؟“ وہ پلٹ کر غصے میں بولی۔ ”وہ کتنی ہی ہلکتی کیوں نہ رکھتا ہو، دور سے تو اسے گولی ماری جاسکتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آگئی۔ ”وہ اپنے دفتر تو آتا جاتا ہو گا۔ اسے..... اسے تو کسی بھی وقت ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔“

”بیٹھ تو جا۔“ میں بولا۔ سنیتا کی بات مجھے بے وزن معلوم نہ ہوئی۔ اس طرح وہ جن زاد بھی مارا جاتا جو آئندہ کے جسم میں تھا۔

”سن سکھ بھرا برا نہ مانو، تو نے اسے ٹھکانے لگانے کے لئے غلط طریقہ اختیار کیا۔“ وہ میرے سامنے دوسرے مونڈھے پر آ بیٹھی۔

”میرا مقصد اسے ٹھکانے لگانا تھا ہی کب۔ میں تو یہ دیکھنے گیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہلکتی تو نہیں ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”جو کچھ بھی ہوا، بس اچانک اور انجانے میں ہو گیا ورنہ تو تجھ ہی کو اسے قتل کرنا تھا۔“

”اور اب بھی میں ہی اسے قتل کروں گی۔ اس نے ایک مرتبہ کانا کے ذریعے تجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا، پھر تجھے شدید زخمی کر دیا۔ اس طرح اس نے اپنی موت کو خود ہی آواز دی ہے۔ جہاں ہلکتی کام نہیں آتی، دماغ کام آتا ہے۔ تجھے اس کا تجربہ نہیں کہ کسی کو قتل کرنے کے لئے کس طرح پلاننگ کی جاتی ہے۔ تو نے مجھے اس کے دفتر کا جو پتا بتایا ہے، ٹھیک اسی کے سامنے ایک بلڈنگ ابھی بنی ہوئی ہے۔ میں اس عرصے میں وہ پورا علاقہ دوبارہ اچھی طرح دیکھ آئی ہوں۔ وہ بلڈنگ ابھی آباد نہیں ہوئی۔ مغربی پاکستان کے ایک بہت بڑے صنعت کار نے وہ بلڈنگ بنوائی ہے۔ وہاں وہ اپنی فرم کے دفاتر کھولنے والا ہے۔ اس بلڈنگ کے دونوں چوکیداروں کو قابو میں کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔“ سنیتا مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگی۔ ”اگر اس بلڈنگ کی پہلی منزل سے گولی چلائی جائے تو آئندہ کو بڑی آسانی سے قتل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ وہ روزانہ کب دفتر آتا ہے اور کس وقت اٹھتا ہے۔ مجھے

اس عرصے میں وہ نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے، تیری ہی طرح وہ بھی بستر پر پڑا ہو۔ بہت عرصے پہلے صرف ایک مرتبہ اسے میں نے دیکھا تھا لیکن پہچان سکتی ہوں۔“ سنیتا مجھ سے تصدیق کی خاطر اس کا حلیہ بتانے کے بعد بولی۔ ”جیسور میں کچھ دیر کو اس سے میری ملاقات ہوئی تھی، ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے یہ۔ وہ نیا نیا یہاں آیا تھا۔ اس وقت تو مجھے ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس کے اندر اتنی ہلکتی ہوگی۔ نہ کبھی وودینی نے اس کا ذکر کیا۔“

”وہ عیار بڑھا تجھے کیوں کچھ بتانے لگا۔“ میں بولا اور پھر سنیتا نے آئندہ کا جو حلیہ بتایا تھا، اس کی تصدیق کر دی۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ آئندہ کے جسم پر اس وقت تک نامعلوم جن زاد نے قبضہ نہیں کیا ہو گا۔ سنیتا کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ دھان منڈی کی کوشمی سے اسی رات فرار ہو گئی تھی۔ پہلے جب وہ ڈھاکہ میں تھی تو چند افراد سے اس کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ انہی میں بابو بازار کا ایک بااثر غذا بھی شامل تھا۔ اسی کے ذریعے سنیتا اس کوٹھے تک پہنچی تھی۔ سنیتا کو وہ غذا عبدال ایک دولت مند عورت کی حیثیت سے جانتا پہچانتا تھا۔ سنیتا کا خیال تھا کہ کبھی ضرورت پڑی تو عبدال سے کوئی چھوٹا موٹا کام لیا جاسکتا ہے، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ کوشمی سے کوٹھے تک پہنچنے کے لئے سنیتا نے عبدال کو یہ کمائی سنائی تھی کہ اس کے کچھ رشتے دار دولت کے لالچ میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ یہی کمائی عبدال کے ذریعے اس نایکا نے سنی تھی۔ وہ اسی لئے سنیتا کو پناہ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ پھر جب سنیتا نے اس نایکا کو یہ بتایا کہ وہ رقص کرنا بھی جانتی ہے اور اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے تو نایکا اور بھی خوش ہو گئی۔ نایکا کو معلوم تھا کہ سنیتا نے اپنے دشمنوں سے چھپ کر وہاں پناہ لی ہے تو پھر چہرے کی تبدیلی پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ہاں اس پر اسے حیرت ضرورت ہوئی۔ دوسرے ہی دن سے سنیتا نے بھری محفل میں رقص شروع کر دیا۔ نایکا ہی نے اس کا نام ستارہ بانی رکھا تھا۔ دو تین ہی روز میں اس کے رقص کی دھوم مچ گئی تھی اور اس کوٹھے پر زیادہ تماشا بن آئے تھے۔ سنیتا پر نایکا نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اس کی ایک وجہ تو عبدال تھا اور دوسری وجہ خود سنیتا تھی۔ نایکا سے وہ ایک پیسہ بھی نہ لیتی۔ جب تک اس کا دل چاہتا رقص کرتی، جب چاہتی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ یوں اس کا جی لگا رہتا۔ کوشمی سے فرار ہوتے وقت سنیتا خاصی بڑی رقم سمیٹ لائی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر ضروری سامان بھی۔ اسی سامان میں اسلحہ بھی تھا۔

سنیتا کا ذہن اس وقت آئندہ کے قتل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ میں نے اسی لئے اسے نہیں ٹوکا اور خاموش بیٹھا رہا۔

”بس تو اب سکھ بھرا! تو درمیان سے ہٹ جا اور دیکھ کہ تیری سنیتا کس طرح آئندہ کو مارتی ہے۔“ سوچتے سوچتے وہ ایک دم بول اٹھی۔

”اگر تیری یہ مرضی ہے تو ایسا ہی سہی۔“ میں فوراً مان گیا۔ ”ورنہ تو میرا ارادہ خود ہی اس سے سننے کا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تجھے اس میں دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے، اسی کے بعد تو آخری قدم اٹھائے گی۔ تو نے اسے ٹھکانے لگانے کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے، ٹھیک ہے۔ اسے دور ہی رہ کر

مارا جا سکتا ہے۔ میں تیرے منصوبے میں تو کوئی مداخلت نہیں کروں گا لیکن اس وقت تیرے قریب ہی رہوں گا۔“

”نہیں سکھ بھرا! اس نے انکار کر دیا۔ ”تو وہاں ہو گا تو میرا دھیان بٹا رہے گا۔“

”مگر میں تجھے نظر آؤں گا تو تیرا دھیان بٹے گا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے تو خبر ہو گی کہ تو موجود ہے، یہ اچھا نہیں ہو گا سکھ بھرا! وہ بھند رہی۔“ اسے دیکھ کر تجھے غصہ بھی آ سکتا ہے۔ تیری ذرا سی بھی مداخلت سارا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔ وعدہ کر مجھ سے کہ تو اس وقت وہاں نہیں آئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

سنتیا سے مجھے جموٹا وعدہ کرنا ہی پڑا۔ اس کے پاس مزید کچھ دیر بیٹھ کر میں چلنے لگا۔

”ابھی تو میں نے تجھے جی بھر کے دیکھا بھی نہیں کہ تو اٹھ کھڑا ہوا۔“ وہ مجھے روکنے لگی۔ سنتیا کے پس نے اس مرتبہ مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ وہی تھی جو عزتیل نے بیان کی تھی۔ سوی نے میرے ادمورے پن کو دور کر دیا تھا۔ مجھے آسودگی حاصل ہو چکی تھی۔

سنتیا کو مطمئن کرنے کے لئے میں بولا۔ ”تجھے میں تو دکھائی بھی دے رہا ہوں، لیکن تیرا تو اصل چہرہ بھی مجھ سے چھپا ہوا ہے۔“

”اگر تو شکے تو یہ سوانگ ختم کر دوں، مگر دوبارہ میک اپ کرنے میں مجھے خاصی دیر لگ جائے گی۔“

”رہنے دے، میں اپنی نظروں کی پیاس پھر کبھی بجھا لوں گا۔“

”تو نے وہ ہوئی تو چھوڑ ہی دیا ہو گا سکھ بھرا کہ جہاں بلیک کنگ نے تجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا؟“

سنتیا نے پوچھا۔

”ہاں اسی دن چھوڑ دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ وہاں رہنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ اب ایک اور جگہ ٹھکانا کر لیا ہے۔ تو اس حرامزادے آئند کو گولی مار دے گی تو تجھے لے چلوں گا وہاں۔“ میں نے خود ہی یہ اس لئے کہہ دیا کہ وہ پوچھ نہ لے، اب کہاں ٹھہرا ہوا ہوں؟

”میرے پاس آتا تو رہے گا؟“

”ہاں، مگر اس وقت نہیں، دن میں آؤں گا جب تیرے ٹھکانہ نہ بول رہے ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تجھے یہ فن بھی آتا ہے۔“

”تو نے پوچھا نہیں کہ میں یہاں تک کیسے پہنچی؟“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔

”یہاں آنے سے پہلے ہی میں نے سب معلوم کر لیا تھا، پھر پوچھتا کیوں۔ تیری تسلی کے لئے میں بے خبر نہیں، تجھے اس غنڈے کا نام بتائے دیتا ہوں جس کے ذریعے تو یہاں تک پہنچی ہے۔ عبدل ہی نام ہے نا اس کا؟ اور تو ایک دولت مند عورت کشور ہے جس کا شوہر ایک حادثے میں مر چکا ہے اور کچھ بتاؤں؟“

وہ فس پڑی اور بولی۔ ”نہیں بس اتنا کافی ہے۔“

”اچھا اب چلے دے۔“ یہ کہتے ہی میں اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

اپنے گھر چوک بازار آنے کے بعد میں، سوی کا انتظار کرنے لگا کیونکہ ابھی عشاء کا وقت نہیں ہوا تھا۔

آئند کی موت کا سامان کر دینے کے باوجود ابھی تک میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اگر مارا جاتا تو دنود چڑی کی کمرٹ جاتی۔ میں نے سوچا، جو کام سنتیا کرنے والی ہے، اس سے بہتر طور پر میں خود انجام دے سکتا ہوں۔ سنتیا کا عدم اور وجود تو برابر ہی تھا۔ وہ دنود چڑی سے باغی ہو ہی چکی تھی۔ کسی علم و اطلاع کے بغیر دھان منڈی والی کو بھی سے اس کا غائب ہو جانا، اسی کے ساتھ وہاں چار لاشوں کا پایا جانا، اس بات کا ثبوت تھا کہ دنود چڑی سے وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ ان حالات میں اس کا قوی امکان تھا کہ دنود چڑی نے سنتیا کی موت کا حکم جاری کر دیا ہو۔ وہ ماری جاتی کہ زندہ رہتی، مجھے اب اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ سوی لوٹ آئی۔ اس نے آتے ہی سنتیا کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے تفصیل بتا دی، پھر اس سے مشورہ کرنے لگا۔

”لیکن ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں اے علیائیش کہ وہ اس شر میں موجود ہے۔ زخمی تو اسے بھی کر دیا تھا تو نے یا نہیں۔“ سوی اس جن زاد کی بات کر رہی تھی جو آئند کے جسم پر قابض تھا۔ ”تیری تو اتنی دیکھ بھال ہو گئی اور فوراً علاج بھی۔ کیا خبر وہ ابھی تک زخمی پڑا ہو یا پھر مر گیا ہو۔“

”ہمیں اس جن زاد سے زیادہ آئند کی فکر کرنی چاہئے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔“ ٹھہر میں ابھی معلوم کئے لیتا ہوں۔ ”یہ کہتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔“

”تو اس کا پتا کر، میں آتی ہوں ابھی۔“ سوی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ”کیاریوں میں پانی ڈالنا ہی یاد نہیں رہا مجھے، پھول اور پودے مر جھا جائیں گے۔“

آئند کا دھیان کرتے ہی میرے سامنے اس کا چہرہ آ گیا۔ وہ اپنی کوٹھی ہی میں تھا لیکن اس وقت نہ کوئی آدم زادی قریب تھی نہ دور ساغر چل رہا تھا۔ یہ اس کی خواب گاہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر میں فکر مندی کے آثار دیکھے۔ معاً وہ اٹھا اور خواب گاہ میں موجود ایک الماری کا خفیہ خانہ کھول کر ٹرانسپیر نکال لیا۔ اسی وقت کمرے میں موجود ٹیلی فون کی ٹھنٹی بجی۔ اس نے ٹرانسپیر واپس الماری میں رکھا اور لپک کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو..... ہاں محبوب، کچھ پتا لگا اس کا..... کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں ایک ہفتہ ہو گیا اس شر میں آئے اور تم اسے تلاش نہیں کر سکے..... کیا ہو سکتا ہے کہ وہ نکل گئی ہو یہاں سے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے..... ہاں ہاں، تم اس کی تلاش جاری رکھو..... تمہیں اسی لئے تو یہاں بلایا ہے کہ تم اسے پہچانتے ہو..... آں ہاں، جہاں بھی نظر آ جائے گولی مار دو..... تمہارے ساتھ اور کہتے ایسے آدمی ہیں جو اسے پہچان سکتے ہیں؟..... چلو ٹھیک ہے، ان سے بھی کام چل جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ کل صبح نوبے میرے دفتر آ جاؤ، وہاں تفصیلی بات ہو جائے گی..... ہاں اس لڑکے ڈیٹان حیدر کو تو آج رات ختم کرا ہی دو۔ وہ اب ہمارے لئے مسئلہ بننا جا رہا ہے..... ہاں میں نوبے سے پہلے ہی دفتر

پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔ ذیشان حیدر وہی طالب علم رہنما تھا جس سے میں خود بخود پور جا کر ملتا تھا۔

اس وقت آئند کا دھیان کرنا میرے لئے بہت سوندا ثابت ہوا تھا۔ مجھے کئی اہم باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ کانٹا کی گرفتاری کے بعد اب محبوب کو یہاں بلا لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ سیتا کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ دونو چیز جی اس کی طرف سے کسی طرح بھی غافل نہیں تھا۔ آئند کو اسی نے سیتا کی موت کا حکم دیا ہو گا۔ اس کا علم بھی مجھے کچھ ہی دیر میں ہو گیا کہ سیتا کے اچانک غائب ہو جانے سے دونو چیز جی کتنا بوکھلایا ہوا ہے۔

ٹرانسیر پر آئند نے جب یہ بتایا کہ سیتا کو ابھی تک تلاش نہیں کیا جاسکا تو دوسری جانب سے مجھے دونو چیز جی کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ "اسے ہر قیمت پر ڈھونڈو! اسے زندہ نہیں رہنا چاہئے۔ وہ ہمارے دشمنوں کی آلہ کار بن چکی ہے۔ سکھ بیر بھی غائب ہو گیا ہے۔ وہ یقیناً یہاں کی انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اتنا چالاک لکھا کہ مجھے بھی دھوکا دے گیا۔ سیتا اسی کے پروڈیکشن میں ہو سکتی ہے، مگر مشکل تو یہ ہے کہ اس کیلئے کو میرے اور سیتا کے سوا ہمارے کسی بھی آدمی نے نہیں دیکھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ یہاں سے مغربی پاکستان تو نہیں چلی گئی؟ اور۔"

"لگتا تو یہی ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو اب تک محبوب اور اس کے آدمی اسے تلاش کر چکے ہوتے۔ اور۔" آئند نے جواب دیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے، اس نے اپنے چہرے پر میک اپ کر لیا ہو؟ اور۔" وہ گھاگ کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کر رہا تھا۔

"اگر اس نے یہی کیا ہے تو پھر اسے ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ اور۔" آئند بولا۔
"میں تمہیں دو دن کی مسلت دیتا ہوں بلیک کنگ! ورنہ پھر مجھے خود ہی ڈھاکہ جانا پڑے گا۔ اور اینڈ آل۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں، کیونکہ سوی کی تیز چیخ میری ساعت میں کسی تیز و حدار خبر کی طرح اتر گئی تھی۔

اگر سوی سے میری گہری جذباتی وابستگی نہ ہوتی تو میں اتنی جلدی نہ گہرا جاتا۔ اس میں ان حالات کا بھی دخل تھا جن سے میں گزر رہا تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی خلاف توقع واقعہ پیش آ جاتا قرن قیاس تھا۔ کمرے سے نکل کر میں صحن میں آیا تو سوی پر نظر پڑی۔ وہ اپنا ایک پیر پکڑے بیٹھی تھی۔ اسی وقت میں نے ایک سانپ کو کیاریوں میں رینگتے دیکھا۔ میں نے لپک کر اسے دم کی طرف سے پکڑا اور مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ مردہ ہو کر وہ میرے ہاتھ میں جھول گیا تو میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور سوی پر توجہ دی۔ سانپ کے ڈستے ہی غیر ارادی طور پر سوی کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ سانپ کیونکہ زیادہ زہریلا نہیں تھا اس لئے فوری طور پر تدارک ہو گیا۔ میں نے سوی کو سارا دے کر اٹھایا اور بولا۔ "تو نے تو میرے ادساں ہی خطا کر دیئے تھے۔"

"میں دراصل کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی تھی۔" سوی نے بتایا۔ وہ اب میرے ساتھ ساتھ کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ "تجھے تو خبر ہے کہ ہم جن زاد کسی بھی قالب میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ کیاریوں میں پانی دیتے ہوئے مجھے اس جن زاد کا خیال آیا کہ جس نے آئند کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عین اسی لمحے سانپ نے مجھے ڈس لیا اور پھر وہ مجھے نظر بھی آ گیا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر میں چیخ اٹھی ورنہ تو....."

"بڑی بھادر ہے تو۔" میں بول اٹھا۔ "بس رہنے دے، ایک جن زاد ہو کر سانپ سے ڈر گئی۔"

"سانپ سے نہیں، میں اس جن زاد سے ڈری تھی جو تیری دشمنی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ تو نے بھی تو اسے زخمی کر دیا تھا۔"

"تمہارے حواس پر تو بس وہی جن زاد مسلط ہو کے رہ گیا ہے۔ اس سے اگر میری دشمنی ہے تو وہ پہلے مجھ پر وار کرے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ہم دونوں کمرے میں آکر بیٹھ گئے تو سوی بولی۔ "اب جو ہو گیا اس پر خاک ڈال اور یہ بتا، اس آدم زاد آئند کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

میں نے جو دیکھا اور سنا تھا، سوی کو بتا دیا، پھر کہا۔ "آئند کو اس وقت میں نے بدلا بدلا سا محسوس کیا۔ وہ بہت فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ کسی جن زاد کے لئے ایک آدم زاد کا پتا لگانا کون سا مشکل کام ہے۔ پھر اس کی پریشانی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟"

"اس کی ایک ہی وجہ ممکن ہے کہ وہ جن زاد ہر وقت آئند کے جسم میں نہ رہتا ہو۔" سوی نے ایک نئی راہ بھائی۔

"ہاں اسے سوی! ایسا ہو سکتا ہے۔ اس جن زاد کا مقصد اگر محض آدم زادوں کا قرب حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے اسے ہر وقت آئند کے جسم میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر دوسری صورت ایک یہ ہے کہ ابھی اس جن زاد کے زخم نہ بھرے ہوں۔"

"میری دعا تو یہ ہے اے علیائش کہ وہ کافر مری گیا ہو۔"

"ایسے بد بخت جلد نہیں مرتے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ذیشان حیدر کا خیال آ گیا۔ اس کے سر پر بھی موت منڈلا رہی تھی۔ آج رات اسے قتل کر دیا جاتا۔ آئند نے محبوب کو اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ یہ وہی محب وطن طالب علم رہنما تھا جس سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے سوی سے اس کا ذکر کیا۔

"ہاں اے علیائش! بالی باتیں پھر بھی ہو جائیں گی، پہلے ہمیں اس بے گناہ آدم زاد کو بچانے کا بندوبست کرنا چاہئے۔" سوی نے کہا۔

"تو پھر اٹھ چلتے ہیں۔ میں تجھے یہاں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جب تک کافر جن زاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو جاتا، ہم دونوں کو محتاط اور چوکنا رہنا پڑے گا۔"

سوی انسانی قالب سے نکل کر میرے ساتھ چلتے پر راضی ہو گئی۔
محمد پور پہنچ کر میں، سوی سے بولا۔ "تو اسی گھر کے آس پاس رہ تاکہ کسی قسم کا خطرہ ہو تو مجھے آگاہ کر دے۔ میں انسانی قالب ہی میں ذیشان حیدر سے ملوں گا۔"

”کیوں کیا ہوا؟ پہلے تو تم مجھ سے بڑی خوشی اخلاقی کے ساتھ ملے تھے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔

”غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔“ وہ تضحی سے بولا۔ ”معلوم نہیں آپ کون ہیں اور کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ میں جب بڑی کوشش کے بعد آئی جی صاحب سے ملا تو انہوں نے آپ کو پہچانے سے انکار کر دیا۔ آئی جی صاحب سے آپ کے ذاتی مراسم کا پتا چل گیا مجھے۔ میں نے انہیں حلیہ بھی بتایا کہ شاید وہ آپ کا نام بھول گئے ہوں، پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آج میں سی آئی ڈی آفس بھی گیا تھا۔ وہاں بھی آپ کو کوئی نہیں جانتا۔“

”مجھے افسوس ہے ڈیشان حیدر کہ آئی جی صاحب سے میں تمہارا ذکر نہیں کر سکا۔“ میں نے کہا اور اس کے ذہن کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”مجھے ایک ضروری کام سے اچانک چانگام جانا پڑا۔ بات صرف اتنی سی ہے ڈیشان حیدر کہ بہت سے لوگ سرکاری افسران کا نام معلوم ہو جانے کے بعد ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خود میں نے آئی جی صاحب سے یہ کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی میرا نام لے کر ملے تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دیں۔ واصل میرے سرکاری فرائض کچھ اسی نوعیت کے ہیں۔ اگر میں تمہارے متعلق آئی جی صاحب کو بتا دیتا تو وہ ہرگز مجھے پہچاننے سے انکار نہ کرتے۔ سی آئی ڈی آفس میں یہی صورت ہے۔ وہاں کوئی بھی میرے بارے میں معلوم کرے گا تو اسے یہی جواب ملے گا جو تمہیں ملا۔“

”میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں صاحب!“ ذیشان حیدر نے مجھ سے معذرت کر لی۔ ”مجھے آپ کے سرکاری فرائض کی نوعیت کا علم تھا۔ اگر مجبور نہ ہوتی تو میں ہرگز آپ کو تلاش نہ کرتا۔ خود آپ ہی نے کہا تھا کہ میں آپ کے نام کا حوالہ دے کر آئی جی صاحب سے مل سکتا ہوں۔ آپ کو میں نے اپنا ہمدرد سمجھا تھا“ اس لئے بڑے وقت پر یاد آ گئے۔ میری چھوٹی بہن امینہ کو اغ..... اغوا کر لیا گیا اور..... اور مجھے قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں تو..... تو مجبوراً.....“ اس کی آواز رندہ مچی۔

”آج ہی میں یہاں آنے کے بعد سب کچھ معلوم کر چکا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں تم پر کیا گزری ہے۔ امینہ کی کوئی تصویر ہو تو مجھے دکھا دو۔ اس طرح اسے یازباب کرنے میں ہمیں آسانی ہو جائے گی۔ تمہارے والد صاحب کو بھی میں نے قتل دے دی ہے۔ ان شاء اللہ آج ہی رات امینہ کو یازباب کرا لیا جائے گا۔“

”تازہ تصویر تو کوئی نہیں۔ دو سال پہلے کی ایک تصویر ضرور ہے، جسے والدہ دیکھ دیکھ کر روئے جا رہی ہیں۔“ ذیشان حیدر نے جواب دیا اور خود بھی رونے لگا۔

”حوصلہ رکھو قیطان حیدر!“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”وہی تصویر لے آؤ“ میں اسے ایک نظر دکھ کر ابھی واپس کر دوں گا۔“

اس نے آنسو پونچھ لئے اور گھر کے اندر اپنی بہن امینہ کی تصویر لینے چلا گیا جو اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔ ذیشان حیدر کا ذہن پڑھ کر مجھے ڈھاکہ یونیورسٹی اور شہر کی حالت کا علم ہوا۔ صورت حال

1997, 1998, 1999, 2000, 2001, 2002, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010, 2011, 2012, 2013, 2014, 2015, 2016, 2017, 2018, 2019, 2020, 2021, 2022, 2023, 2024, 2025, 2026, 2027, 2028, 2029, 2030, 2031, 2032, 2033, 2034, 2035, 2036, 2037, 2038, 2039, 2040, 2041, 2042, 2043, 2044, 2045, 2046, 2047, 2048, 2049, 2050, 2051, 2052, 2053, 2054, 2055, 2056, 2057, 2058, 2059, 2060, 2061, 2062, 2063, 2064, 2065, 2066, 2067, 2068, 2069, 2070, 2071, 2072, 2073, 2074, 2075, 2076, 2077, 2078, 2079, 2080, 2081, 2082, 2083, 2084, 2085, 2086, 2087, 2088, 2089, 2090, 2091, 2092, 2093, 2094, 2095, 2096, 2097, 2098, 2099, 2100, 2101, 2102, 2103, 2104, 2105, 2106, 2107, 2108, 2109, 2110, 2111, 2112, 2113, 2114, 2115, 2116, 2117, 2118, 2119, 2120, 2121, 2122, 2123, 2124, 2125, 2126, 2127, 2128, 2129, 2130, 2131, 2132, 2133, 2134, 2135, 2136, 2137, 2138, 2139, 2140, 2141, 2142, 2143, 2144, 2145, 2146, 2147, 2148, 2149, 2150, 2151, 2152, 2153, 2154, 2155, 2156, 2157, 2158, 2159, 2160, 2161, 2162, 2163, 2164, 2165, 2166, 2167, 2168, 2169, 2170, 2171, 2172, 2173, 2174, 2175, 2176, 2177, 2178, 2179, 2180, 2181, 2182, 2183, 2184, 2185, 2186, 2187, 2188, 2189, 2190, 2191, 2192, 2193, 2194, 2195, 2196, 2197, 2198, 2199, 2200, 2201, 2202, 2203, 2204, 2205, 2206, 2207, 2208, 2209, 2210, 2211, 2212, 2213, 2214, 2215, 2216, 2217, 2218, 2219, 2220, 2221, 2222, 2223, 2224, 2225, 2226, 2227, 2228, 2229, 2230, 2231, 2232, 2233, 2234, 2235, 2236, 2237, 2238, 2239, 2240, 2241, 2242, 2243, 2244, 2245, 2246, 2247, 2248, 2249, 2250, 2251, 2252, 2253, 2254, 2255, 2256, 2257, 2258, 2259, 2260, 2261, 2262, 2263, 2264, 2265, 2266, 2267, 2268, 2269, 2270, 2271, 2272, 2273, 2274, 2275, 2276, 2277, 2278, 2279, 2280, 2281, 2282, 2283, 2284, 2285, 2286, 2287, 2288, 2289, 2290, 2291, 2292, 2293, 2294, 2295, 2296, 2297, 2298, 2299, 2300, 2301, 2302, 2303, 2304, 2305, 2306, 2307, 2308, 2309, 2310, 2311, 2312, 2313, 2314, 2315, 2316, 2317, 2318, 2319, 2320, 2321, 2322, 2323, 2324, 2325, 2326, 2327, 2328, 2329, 2330, 2331, 2332, 2333, 2334, 2335, 2336, 2337, 2338, 2339, 2340, 2341, 2342, 2343, 2344, 2345, 2346, 2347, 2348, 2349, 2350, 2351, 2352, 2353, 2354, 2355, 2356, 2357, 2358, 2359, 2360, 2361, 2362, 2363, 2364, 2365, 2366, 2367, 2368, 2369, 2370, 2371, 2372, 2373, 2374, 2375, 2376, 2377, 2378, 2379, 2380, 2381, 2382, 2383, 2384, 2385, 2386, 2387, 2388, 2389, 2390, 2391, 2392, 2393, 2394, 2395, 2396, 2397, 2398, 2399, 2400, 2401, 2402, 2403, 2404, 2405, 2406, 2407, 2408, 2409, 2410, 2411, 2412, 2413, 2414, 2415, 2416, 2417, 2418, 2419, 2420, 2421, 2422, 2423, 2424, 2425, 2426, 2427, 2428, 2429, 2430, 2431, 2432, 2433, 2434, 2435, 2436, 2437, 2438, 2439, 2440, 2441, 2442, 2443, 2444, 2445, 2446, 2447, 2448, 2449, 2450, 2451, 2452, 2453, 2454, 2455, 2456, 2457, 2458, 2459, 2460, 2461, 2462, 2463, 2464, 2465, 2466, 2467, 2468, 2469, 2470, 2471, 2472, 2473, 2474, 2475, 2476, 2477, 2478, 2479, 2480, 2481, 2482, 2483, 2484, 2485, 2486, 2487, 2488, 2489, 2490, 2491, 2492, 2493, 2494, 2495, 2496, 2497, 2498, 2499, 2500, 2501, 2502, 2503, 2504, 2505, 2506, 2507, 2508, 2509, 2510, 2511, 2512, 2513, 2514, 2515, 2516, 2517, 2518, 2519, 2520, 2521, 2522, 2523, 2524, 2525, 2526, 2527, 2528, 2529, 2530, 2531, 2532, 2533, 2534, 2535, 2536, 2537, 2538, 2539, 2540, 2541, 2542, 2543, 2544, 2545, 2546, 2547, 2548, 2549, 2550, 2551, 2552, 2553, 2554, 2555, 2556, 2557, 2558, 2559, 2560, 2561, 2562, 2563, 2564, 2565, 2566, 2567, 2568, 2569, 2570, 2571, 2572, 2573, 2574, 2575, 2576, 2577, 2578, 2579, 2580, 2581, 2582, 2583, 2584, 2585, 2586, 2587, 2588, 2589, 2590, 2591, 2592, 2593, 2594, 2595, 2596, 2597, 2598, 2599, 2600, 2601, 2602, 2603, 2604, 2605, 2606, 2607, 2608, 2609, 2610, 2611, 2612, 2613, 2614, 2615, 2616, 2617, 2618, 2619, 2620, 2621, 2622, 2623, 2624, 2625, 2626, 2627, 2628, 2629, 2630, 2631, 2632, 2633, 2634, 2635, 2636, 2637, 2638, 2639, 2640, 2641, 2642, 2643, 2644, 2645, 2646, 2647, 2648, 2649, 2650, 2651, 2652, 2653, 2654, 2655, 2656, 2657, 2658, 2659, 2660, 2661, 2662, 2663, 2664, 2665, 2666, 2667, 2668, 2669, 2670, 2671, 2672, 2673, 2674, 2675, 2676, 2677, 2678, 26

”پھر آگے آپ؟“ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے بولا۔ اس کے لمبے میں ناگواری کے ساتھ سختی بھی تھی۔

خاصی کشیدہ ہو گئی تھی۔ خاص طور پر گزشتہ ایک ہفتے سے تو حکومت کے خلاف روز مظاہرے ہو رہے تھے۔ محب وطن طلبہ تنظیم کے ارکان کا جینا دوہر ہو گیا تھا۔ وہ چھپے چھپے پھر رہے تھے۔ ایک ہفتے پہلے ہی محبوب کو ڈھاکہ بلا لیا گیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی۔ وہ کلات سے کہیں زیادہ تیز اور عیار تھا۔ جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ کا خاتمہ ہونے کے بعد اب ان کی جگہ یقیناً محبوب کے منظم گروہ نے لے لی تھی۔ ونود چڑجی کا کھیل پہلے ہی کی طرح جاری تھا بلکہ اب اس کی تخریبی سرگرمیوں میں شدت آگئی تھی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ دور بیضاوی ڈوریاں ہلا رہا ہے۔ مخالف تنظیم کے جن طالب علم رہنماؤں کو بہت پہلے گرفتار ہو جانا چاہئے تھا وہ دندناتے پھر رہے تھے۔ میں نے یہی قیاس کیا کہ ونود چڑجی ان کی پشت پناہی کر رہا تھا، غنڈے بھی ان طلبہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ جب تک ذیشان حیدر اپنی بہن امینہ کی تصویر لے کر آیا، میں انہی خیالات میں گم رہا۔

تصویر کو میں نے بہت غور سے دیکھا۔ وہ تصویر ذیشان حیدر کے باپ کے ساتھ کھینچائی گئی تھیں امینہ کا چہرہ میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور تصویر ذیشان حیدر کو واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم اور تمہارے گھروالے یہ مکان چھوڑ سکتے ہیں؟“

”لیکن کس لئے صاحب! یہ تو بتا دیجئے؟“

”یہاں تمہاری زندگی کو سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ آج رات کسی بھی وقت تم پر قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے تمہارے گھروالے بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں۔“

ذیشان حیدر یہ سن کر گھبرا گیا اور بولا۔ ”صاحب! مجھے اپنی زندگی کی تو کوئی فکر نہیں لیکن میری والدہ اور اباجی پر کوئی آج آئے؟“ یہ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟ ٹھہریے میں میں اپنے اباجی کو بلا کر لاتا ہوں، وہی آپ کے سوال کا بہتر طور پر جواب دے سکتے ہیں۔“

وہ ایک بار پھر گھر میں چلا گیا اور لوٹا تو اس کے ساتھ کاشان حیدر بھی تھا۔ اس گھر میں اب تین ہی افراد تھے، ذیشان حیدر اور اس کے ماں باپ۔

”جی فرمائیے؟“ کاشان حیدر میرے قریب بیٹھے ہی فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

”کوئی ایسی جگہ ہے محترم! آپ کے علم میں، جہاں چند روز گزار سکیں؟ وہ آپ کے کسی عزیز کا گھر نہیں ہونا چاہئے۔“

توقع کے مطابق کاشان حیدر بھی پریشان نظر آنے لگا۔ پھر اس نے وجہ پوچھی تو میں نے بتا دی۔

”اس وقت کہاں کہاں جاؤں میں؟ عزیز واقارب کے یہاں جا جاسکتا تھا، مگر آپ آپ منع کر رہے ہیں۔ کوئی کوئی میرا ایسا دوست بھی نہیں کہ کہ وہاں ذیشان اور اس کی والدہ کو لے کر چلا جاؤں۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے ہیں اور یہاں زندگی خطرے میں ہے۔“

کاشان حیدر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی زندگی بہر حال بچانا تھی۔ اس کی مجھے فی الحال ایک ہی صورت نظر آئی۔ میں نے کہا۔ ”میرا ایک بہت عزیز دوست اپنی بیوی کے ساتھ چوک بازار میں رہتا ہے۔ اس پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ گھر بھی اس کا خاصا بڑا ہے جس میں کئی کمرے ہیں۔ اگر آپ چاہیں

تو میں چند روز کے لئے وہاں آپ کے قیام کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

اس اوجیز عمر آدم زاد نے فوراً میری پیشکش قبول کر لی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ میرے زیر اثر تھا۔

”تو پھر جلدی سے چلنے کی تیاری کیجئے۔ اگر میرا دوست گھر پر نہ بھی ہوا تو اس کی بیوی مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔“ میں مصلحت کے پیش نظر بولا۔

”چلو ذیشان! انھو! اللہ تعالیٰ نے ان صاحب کی صورت میں ہماری مدد کے لئے ایک فرشتے کو بھیج دیا ہے۔“ کاشان حیدر نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

”زیادہ سالانہ لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اتنا وقت نہیں۔ آپ لوگ صرف چند کپڑے ساتھ لے لیں۔“ میں نے تاکید کی۔

وہ دونوں اٹھ کر اندر گئے ہی تھے کہ سوی نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ”چند مسلح افراد اسی گھر کی طرف آرہے ہیں۔ مجھے یہ وی لگتے ہیں جنہیں ذیشان حیدر کے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اے علیالیش! تو کسے تو میں انہیں ختم کر دوں؟“

”نہیں اے سوی! انہیں صرف ختم کر دینا کافی نہیں۔ آ میرے ساتھ۔“ اتنا وقت نہیں تھا کہ سوی سے میں کچھ اور کہہ سکتا۔

فوراً ہی میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا اور سوی کے ساتھ باہر آ گیا۔ سوی کو اپنے ساتھ لانا میرے لئے کار آمد ثابت ہوا تھا۔ اس نے بروقت مجھے خطرے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ پانچوں مسلح غنڈے ابھی ذیشان حیدر کے گھر سے نصف فرلانگ دور ہوں گے کہ میں نے انہیں روک لیا۔

”واپس چلو۔“ میں نے انہیں اپنے زیر اثر لے کر حکم دیا۔

اسی گلی کے کنار پر انہوں نے وہ کار کھڑی کی تھی جس میں آئے تھے۔ میں انہیں وہیں لے آیا۔ ان کے ذہنوں پر میری توجہ تھی۔ وہ محبوب کے خاص گھر گئے تھے۔ محبوب نے اسی لئے انہیں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہ سب اسی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں میں بھی جا چکا تھا۔ بیج گاؤں کے علاقے کی یہ وہی کوٹھی تھی جسے خالی کر کے ونود چڑجی فرار ہو گیا تھا۔ اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں ذیشان حیدر کی نوجوان بہن امینہ قید تھی۔ یہ بڑی قیمتی معلومات تھیں جو مجھے ان غنڈوں سے حاصل ہوئیں۔ وہ پانچوں ہی پیشہ ور قاتل اور اسمگلر تھے۔ انہیں میں نے کار میں بٹھایا اور اس کار کو اٹھا کر دھان منڈی لے گیا۔ وہاں انہیں قتل کرنا میرے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ اس میں صرف چند لمحے صرف ہوئے۔ کار کو میں نے ایک جگہ رکوا دیا اور ان پانچوں کو ختم کر دیا۔

وقتی طور پر خطرہ ٹل گیا۔ پھر بھی میں نے سوی کو محتاط رہنے کو کہا اور دوبارہ انسانی قالب اپنا کر ذیشان حیدر کی بیشک میں داخل ہوا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے صاحب!“ کاشان حیدر نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کا بیٹا بھی اسی کے ساتھ تھا۔ میں نے دو بجے ان کے ہاتھوں میں تھے۔

ان پانچوں غنڈوں کے ذہن پڑھنے میں مجھے چند ہی منٹ لگے ہوں گے، ہاں انہیں ٹھکانے لگاتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ اسی مختصر عرصے میں خوفزدہ کاشان حیدر نے وہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر لی تھی۔ میں نے کاشان حیدر کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ اس پاس کے علاقے کا گشت لگانے گیا تھا۔ میں نے مزید کہا۔ ”یہ بہت ضروری تھا۔ آپ فکرمند نہ ہوں، اس لئے زیادہ دور تک نہیں جاسکا۔“

”اگر یہ بات ہے تو ہم کچھ دیر کو یہاں رک جاتے ہیں۔“ کاشان حیدر جلدی سے بولا۔ ”آپ دیکھ بھال آئیں، کہیں قاتل ہماری ٹاک میں نہ بیٹھے ہوں۔“

میرا فٹابھی تھا تاکہ سوئی کو صورت حال سے آگاہ کر دوں۔

”آپ بیٹھک اور گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ میری آواز پہچان کر ہی دروازہ کھولے گا۔“ یہ الفاظ میں نے محض کاشان حیدر کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہے تھے۔ میں اٹھا اور بیٹھک سے نکل آیا۔ کاشان حیدر نے بیٹھک کا دروازہ بند کر لیا۔

سوئی نے مجھے باہر آتے دیکھا تو لپک کر قریب آگئی اور بولی۔ ”اب کیا ہوا اے علیا لیش! کیا واپس چلیں؟ خطرہ تو ٹل ہی گیا ہے۔“

”نہیں، خطرہ ابھی ٹلا نہیں اے سوئی!“ آگے قدم بڑھاتے ہوئے میں بڑبڑایا۔ ”محبوب ابھی زندہ ہے۔ اگر وقت پر اس کے گرگے واپس نہ پہنچے تو وہ خطرے کی بو سونگھ لے گا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے گردہ کے دوسرے غنڈوں کو بھی یہاں بھیج سکتا ہے۔“ پھر میں نے غنڈوں سے حاصل ہونے والی معلومات سوئی کو منتقل کر دیں، اسی کے ساتھ اسے اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کر دیا۔ میں نے آخر میں یہ بھی کہا۔ ”اس وقت ہمیں بہت تیزی سے حرکت کرنے کی ضرورت ہے۔“

”میری ماں اے علیا لیش! تو پہلے تیج گاؤں ہی چل۔ کیونکہ ان لوگوں کو یہاں سے نکال کر چوک بازار لے جانے میں دیر لگ جائے گی۔ پہلے ہم اسی مردود آدم زاد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں جو ان غنڈوں کا سرغنہ ہے۔ وہاں سے ہم ذیشان حیدر کی بہن امینہ کو بھی نکال کر لاسکتے ہیں۔“ سوئی نے مجھے مشورہ دیا۔

”پھر تو مجھ دوبارہ ذیشان حیدر کے باپ سے بات کرنی پڑے گی۔ کیا خبر ہمیں یہاں واپس میں کتنی دیر لگ جائے۔ خیر میں کوئی بات بنا دوں گا۔ تیرا مشورہ ہے درست اے سوئی! تو ہمیں ٹھہر، میں بات کر کے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں واپس ذیشان حیدر کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

چلتے ہوئے میں نے سوچ لیا کہ ذیشان حیدر کے باپ سے کیا کہنا ہے۔

ان لوگوں کو اتنی جلدی میری واپسی کی امید نہیں تھی، اس لئے فوراً دروازہ نہیں کھولا۔

”میں مختار الدین ہوں محترم! دروازہ کھول دیں۔“ میں نے دوبارہ کاشان حیدر کو یقین دلایا تو دروازہ کھلا۔

”صاحب! کیا..... کیا آپ جائزہ لے آئے؟..... ابھی تو آپ گئے تھے۔“ کاشان حیدر نے گھر سے نکلے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گیا تھا۔

”آپ بیٹھک کا دروازہ کھولیں تو پھر بتاتا ہوں، کیا بات ہے۔“

”ایک منٹ۔“ یہ کہہ کر اس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

بیٹھک دروازہ کھلتے ہی میں اندر داخل ہو گیا تو کاشان حیدر اسے بھی بند کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ خطرے کے پیش نظر اس نے ذیشان حیدر کو بیٹھک میں نہ آنے کی تاکید کر دی تھی۔ اسے دروازہ بند کرتے دیکھا تو میں بول اٹھا۔ ”محترم! اگر آپ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لئے دروازہ بند کر لیں، ورنہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”وہ کیوں صاحب!“ کاشان حیدر دروازہ بند کر کے میری طرف پلٹا۔

”میرے ٹھکے کے آدمی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اب یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“ میں نے بتایا۔

”کیا اب..... اب آپ کا ارادہ بدل گیا ہے؟“ کاشان حیدر نے پوچھا۔ ”ہم لوگوں کو آپ اپنے دوست کے گھر چوک بازار نہیں لے جائیں گے؟“

”ضرور لے جاؤں گا لیکن فوری طور پر تو امینہ کی بازیابی ضروری ہے۔ میرے آدمیوں نے اس کا پتہ لگا لیا ہے، مبارک ہو آپ کو۔“

یہ خوشخبری سن کر کاشان حیدر کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ زبان پر نہ لاسکا۔

”اور اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیجئے محترم کہ امینہ کی عزت اب تک محفوظ ہے۔“ یہ بات میں نے غلط نہیں کی۔ یوں بھی امینہ کا رنگ کالا، ٹانگ نقشہ بھرا اور جسم بھاری تھا۔ ان غنڈوں کے لئے ایک سے ایک حسین لڑکیاں موجود تھیں۔ پھر وہ امینہ کو ہاتھ کیوں لگاتے۔ اس کے باوجود اولاد کیسی ہی کیوں نہ ہو والدین کو پیاری ہوتی ہے۔ امینہ کی شادی اسی وجہ سے اب تک نہیں ہو سکی تھی۔

”مم..... میں..... میں ابھی ذیشان کی والدہ کو یہ..... یہ خوشخبری سنا کر.....“

”مجھے چلنے دیں محترم!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ورنہ وہ مجرم فرار بھی ہو سکتے ہیں جنہیں حراست میں لینا ہے۔“ میں اٹھا اور اس سے مزید کہا۔ ”ایک مرتبہ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ اگر مجھے واپسی میں دیر بھی ہو جائے تو گھبرا ئیں نہیں۔ پھر بھی آپ میں سے کوئی گھر کے باہر نہ جائے۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔“ یہ کہتے ہی میں آگے بڑھا اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر نکل آیا۔

گلی سے باہر آتے ہی میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا۔ سوئی میرے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگی۔

چند ہی لمحوں بعد ہم تیج گاؤں کی مطلوبہ کوشی میں اتر گئے۔ محبوب کے گردہ کا ہی ایک غنڈہ چوکیداری کر رہا تھا کہ کوئی آئے تو گیت کھول سکے۔ سوئی نے اس کی گردن دبا لی اور اسی وقت چھوڑی جب جسم ڈھیلا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو اٹل پڑیں اور زبان باہر آگئی۔

”محبوب کو اس طرح نہ مار دینا اے سوئی!“ میں نے سوئی سے سرکوشی کی۔ ”وہ میرا شکار ہے اور مارنے سے پہلے مجھے اس کا ذہن پڑھنا ہے۔“

سوئی کو میں اپنی اس غیر جنتی قوت کے بارے میں بھی بتا چکا تھا۔ آج ہی وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ چکی تھی، اس لئے بولی۔ ”میں اتنی بے وقوف نہیں۔“

ہم کوٹھی کے اندر پہنچے تو نشست گاہ میں ٹیلی فون سیٹ کے قریب ایک صوفے پر محبوب کو بیٹھ دیکھا۔ کوٹھی میں اب اس کے سوا کوئی اور غنڈہ نہیں تھا۔

”محبوب!“ میں نے ظاہر ہوئے بغیر اسے مخاطب کیا تو وہ حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ نام کو بھی اس کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں ابھرے۔

جس تیزی سے وہ اچھل کر کھڑا ہوا اسی تیزی کے ساتھ اس نے ریوالور نکال لیا، پھر کسی درندے کی طرح غرایا۔ ”تو جہاں بھی چھپا ہوا ہے سامنے آ جا۔“

”غلط فہمی ہے تیری اے محبوب! میں تو تیرے سامنے ہی موجود ہوں۔ تو خواہ مخواہ اپنی موت کو دعوت دینے جیسور سے یہاں آ گیا۔ تیرے پیچھے ہوئے گرے اب کبھی محمد پور سے واپس نہیں آ سکیں گے، کیونکہ میں انہیں مار چکا ہوں اور اب تیری باری ہے۔“

اس پر بھی وہ نہیں ڈرا۔ اسے ابھی تک یہی غلط فہمی تھی کہ میں کسی پردے یا صوفے کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوں۔ وہ بد حال کانٹا سے زیادہ دلیر تھا۔ ذرا سا جھک کر وہ چونکا انداز میں غیر محسوس طور پر ادھر ادھر گھوما۔ اس کی آنکھیں کسی چپتے کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ جو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لئے بے چین ہو۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔ وہ بد بخت نہ تو توہم پرست تھا نہ جنت کے وجود کا قائل۔ اس کی بے خوفی کا سبب یہی تھا۔

میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا اور بولا۔ ”مجھے افسوس ہو رہا ہے محبوب کہ تیرا ایک ایک آدمی پکڑا جانے والا ہے۔ تو چاہے تو میں ان کے نام گنوا دوں۔“

محبوب کا ذہن فوراً متحرک ہو گیا اور یہی میری مرضی تھی۔

”تجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی اے محبوب!“ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ”تو نے تو آئندہ کے برکائے میں آ کر سرحد پار بن گاؤں تک سے اپنے ساتھیوں کو یہاں بلوایا۔ کیا تو اتنی ساری فوج لے کر اس شہر کو فتح کرنے کے لئے آیا تھا؟ تجھے کانٹا اور اس کے ساتھیوں کا انجام یاد نہیں رہا؟“

”کانٹا میرے سامنے کیا بیچتا ہے۔“ محبوب نے بے خوفی سے کہا۔ ”اس بزدل نے تو خود ہی گرفتاری پیش کر دی اور اپنے تمام ساتھیوں کو پکڑوا دیا۔“

”اور تو بہت دلیر ہے“ اس لئے خود ہی اپنی گردن میں پھندا ڈالے گا۔“ میں بولا۔ ”لیکن اس سے پہلے تجھے آئندہ کو فون کر کے یہ بتانا پڑے گا کہ ذیشان حیدر کو تیرے آدمیوں نے قتل کر دیا ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی محبوب کو میں نے اپنی جتنی صفات کے زیر اثر لے لیا۔

محبوب کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دبیز قالین پر گرا۔ پھر وہ میرے حکم کی تعمیل میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے ساڑھے دس بجے سے پہلے فون پر آئندہ کو یہ اطلاع دینا تھی اور ابھی ساڑھے دس نہیں بجے تھے۔ یہ بات بھی میرے لئے معنی خیز ہی تھی کہ رات کو ساڑھے دس بجے کے بعد آئندہ نے اسے رابطہ قائم نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب آئندہ کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ آئندہ کے جسم پر جو کافر جن زاد قابض تھا، اسی نے آئندہ کو یہ حکم دیا ہو گا، کیونکہ یہ اس جن زاد کے

بیش کا وقت تھا۔ میرے ذہن نے کڑیاں جوڑنا شروع کر دیں۔ مجھے سوتی کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوا کہ وہ جن زاد آدمیوں کے قریب کی خاطر ہی صرف رات کو آئندہ کے جسم میں اترتا ہو گا۔ اس عرصے میں محبوب نے فون پر آئندہ سے رابطہ قائم کر لیا۔ میری توجہ محبوب کے ذہن پر مرکوز ہو گئی۔

”آئندہ بابو! میں محبوب بول رہا ہوں۔“

”کیا رہا، کام ہو گیا محبوب!“ دوسری طرف سے محبوب نے آئندہ کی آواز سنی۔

”ہاں آئندہ بابو! میرے آدمی اس لونڈے ذیشان حیدر کو لٹھڑا کر آئے۔“ محبوب میرے زیر اثر بول رہا تھا۔

”اب اس کی بہن کو بھی مار کر کہیں پھینکوا دو۔“

”آج ہی رات یہ کام بھی ہو جائے گا آئندہ بابو! اور کوئی حکم۔“

”بس کل صبح نو بجے تک میرے دفتر ضرور پہنچ جانا۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

محبوب نے ریسیور رکھ دیا تو میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”کوئی رسی ڈھونڈ کر لاؤ، مضبوط سی۔ اس کے علاوہ ایک کرسی بھی لیتے آنا۔“

وہ کسی حیرت انگیز شخص کی طرح صوفے سے اٹھا اور اندر چلا گیا تو سوتی نے مجھ سے پوچھا۔ ”اے ملاییش! کیا تو اسے واقعی پھانسی دے گا؟“

”ہاں اس کی یہی سزا ہے۔“ میں نے سوتی کے سوال کا جواب دیا۔ ”ابھی دیکھتی رہ اے سوتی کہ میں کیا کیا کرتا ہوں۔“

”تو کے تو میں اس عرصے میں ذیشان کی بہن کو قید سے رہائی دلا دوں۔“

”نہیں۔“ میں نے منع کر دیا۔ ”ابھی اسے قید ہی میں رہنے دے۔ ابھی اس شیطان صفت آدم زاد کو تو ٹھکانے لگ جانے دے۔“

سوتی چپ ہو گئی۔ ذرا ہی دیر میں محبوب ریٹیم کی ایک مضبوط ڈوری اور کرسی لے آیا۔ بجلی سے چلتا ہوا ہینکھا میں نے بند کر دیا اور محبوب کے ہاتھ سے ڈوری لے لی۔ ڈوری کو میں نے پچھلے سے باندھا اور دوسرے سرے پر پھندا بٹا کر لٹکا دیا۔

”محبوب! اب تم خود ہی کرسی یہاں رکھ کر اس پر چڑھ جاؤ اور بمباری کے ساتھ پھندا اپنے گلے میں ڈال لو۔“ میں نے اسے حکم دیا۔

خواب کے عالم میں محبوب نے کرسی اٹھا کر بتائی ہوئی جگہ پر رکھی اور پھر اس پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے، میں نے آگے بڑھ کر کرسی اس کے نیچے سے کھینچ لی۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

جسم کے بوجھ سے پھندا اس کے گلے میں پھنس گیا تو وہ تڑپا۔ میں بولا۔ ”اگر تو کچھ سننے کے قائل ہے محبوب تو سن۔ جنت کے وجود کا تو قائل نہیں تھا اور آج ایک جن زاد ہی نے تجھے موت کو گلے

لگانے پر مجبور کیا ہے۔

کچھ ہی دیر میں محبوب کا جسم تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کی لاش کو اسی طرح منگا رہے دیا اور آگے بڑھ کر اس صوفے پر بیٹھ گیا جس کے قریب ایک پٹائی پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے آئی جی نورالاسلام کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ریسپور فوراً ہی اٹھالیا۔ ”یس نورالاسلام اسپتالک۔“ میں مقصود کی آواز میں بولا۔ ”ہیلو آئی جی صاحب! میں مقصود میاں بول رہا ہوں۔ مجھے پہچان گئے آپ؟“

”ارے آپ؟“ آئی جی کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ ”کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟“

”آپ ہی کے شہر ڈھاکہ سے۔ میں ہولڈ کر رہا ہوں، ذرا قلم اور کاغذ لے آئیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا کوئی بہت خاص بات ہے؟ آپ کی غیر موجودگی میں تو میاں حشر بپا ہو چکا ہے۔ میں اب بھی اسی لئے ٹیلی فون کے قریب بیٹھا ہوا اپنے ماتحتوں سے.....“

”معلوم ہے مجھے، یہاں کیا ہوا ہے۔ جس روز صبح مجھے آپ سے ملنا تھا، اچانک جیسور جانا پڑ گیا۔ محبوب عالم کا نام تو سنا ہو گا آپ نے؟“

”جی ہاں وہ بہت بڑا اسمتھر ہے اور آج تک.....“

”اس وقت اسی کی لاش میرے سامنے لٹکی ہوئی ہے۔“ میں بول اٹھا۔

”جی؟“ آئی جی شدید حیرت کے سبب زور سے بولا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ مقصود میاں؟“

”وہی جو آپ سن رہے ہیں۔“ میں نے پرسکون آواز میں کہا۔ ”گھر جانے کے بعد اس نے خودکشی کر لی لیکن اس سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آپ کانتا کو بھول گئے؟ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات آسکتی ہے کہ اس جیسا مجرم خود گرفتاری پیش کر دے گا۔“

”جی ہاں، یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ اس مرتبہ آئی جی کی آواز اعتدال پر تھی۔

”میاں خاصی توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ لگتا ہے مرنے سے پہلے محبوب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا ہو گا۔ کوٹھی کھنڈر معلوم ہو رہی ہے۔ یہاں ہمیں ایک لاش بھی ملی ہے جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ مرنے والے کی گردن دبائی گئی ہے۔ ممکن ہے پاگل پن کے دوران میں خود محبوب نے اپنے چوکیدار کو مار دیا ہو۔ آپ کاغذ قلم.....“

”ابھی منگواتا ہوں۔“ آئی جی صاحب جلدی سے بولا اور کسی کو آواز دے کر کاغذ قلم لانے کو کہا۔

”میرا خیال یہ ہے آئی جی صاحب کہ آج کی رات جاگتے ہی گزرے گی۔ اگر آپ اس آپریشن کی خود نگرانی کریں تو بہتر ہے۔“ میں بولا۔ ”میری اطلاع کے مطابق محبوب اپنے تقریباً پچاس آدمیوں کو لے کر اب سے ایک ہفتے قبل ڈھاکہ میں آیا تھا۔ ان آدمیوں میں اس کے گردہ کے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سرحد پار بن گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان خطرناک افراد کے نام پتے میں آپ کو لکھواؤں گا۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان میں سے کسی کو بچ کر نہیں لٹکانا چاہئے۔“

”آپ قطعی مطمئن رہیں مقصود میاں! آپ کی ہدایت کے مطابق میں خود اس آپریشن کی نگرانی

کروں گا۔“ آئی جی نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”جی لکھوائیے۔“

”پہلے تو اس کو کھٹی کا پتا لکھ لیں، جہاں محبوب نے خودکشی کی ہے۔ اس کی شناخت ظاہر ہے، اسی کے گرفتار ہونے والے ساتھیوں سے کرائی جاسکتی ہے۔ اس کو کھٹی کے بارے میں یہ پتا بھی لگانے کی ضرورت ہے کہ یہ کس کی ملکیت ہے۔“ میں نے کہا۔

”جی بہتر ہے، مقصود میاں! پہلے آپ اس کو کھٹی ہی کا پتا لکھوائیں۔“

میں نے اس کو کھٹی کا پتا لکھوا کر محبوب کے آدمیوں کے مکمل نام و پتے لکھوانا شروع کر دیئے۔ اس میں خاصا وقت صرف ہو گیا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میں بولا۔ ”اب آپ ان طالب علم رہنماؤں کے نام پتے بھی لکھ لیں جن کی فوری گرفتاری ضروری ہے۔“

اس پر آئی جی نے کہا۔ ”ایسے کچھ طلبہ کا سراغ پولیس نے بھی لگایا تھا جو حکومت کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی قیادت کر رہے ہیں۔ ان کی گرفتاری سے پہلے میں نے صوبائی وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ طلبہ کی گرفتاری سے اشتعال پھیلے گا، اس لئے یہ قدم نہ اٹھائیں۔ انہیں میں نے مصطفیٰ طلبہ کے نام بھی بتا دیئے تھے۔“

”احکام زبانی تھے یا تحریری؟“ میں نے سوال کیا۔

”ان سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔“ آئی جی نے بتایا۔

”اس سلسلے میں ہم کل صبح بات کر لیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایسے طلبہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں، جو غیر ملکی تحریک کاروں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔“

”آپ کا فرمان قطعی درست ہے لیکن محترم وزیر داخلہ کی واضح ہدایت کے بعد اس سلسلے میں میرا کوئی ایکشن لینا صحیح نہ ہوتا۔“ آئی جی نے وضاحت کی۔

”خیر دیکھتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ کل صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان آپ کے دفتر پہنچ جاؤں۔ خدا حافظ“ یہ کہہ کر میں نے ریسپور رکھ دیا۔

مجھے یہ معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوا۔ صوبائی وزیر داخلہ نے ایسا حکم کیوں دیا؟ اس سوال کا جواب میرے نزدیک ضروری تھا۔

”اے علیاباش! تُو نے یہ توڑ پھوڑ کا ذکر کیوں کیا؟“ سومی نے مجھ سے پوچھا۔ ”میاں تو.....“

”یہ تو کھٹی ملک دشمنوں کے تصرف میں رہی ہے اور آئندہ بھی وہ اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس توڑ پھوڑ کا مقصد دشمنوں کو نقصان پہنچانا ہے۔“ میں بول اٹھا۔ ”میاں داخل ہوتے وقت مجھے پوریج میں ایک کار بھی کھڑی نظر آئی تھی۔ ہم اس کار میں یہاں سے محمد پور چلیں گے، پھر محمد پور سے چوک بازار۔ اس سے آسانی رہے گی۔ ثواب امینہ کو تلاش کر کے اس کار میں ڈال دے۔ اسے بے ہوش کر دینا۔ اس عرصے میں میں توڑ پھوڑ کرتا ہوں۔ ابتدا اسی نشست گاہ سے کرتے ہیں۔“

اس کے بعد سومی تو چلی گئی اور میں نے نشست گاہ میں موجود ساز و سامان کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے ریشمی پردے پھاڑ دیئے، دبیز قالین کو کھڑے کھڑے کر دیا،

صوفوں اور دیگر قیمتی سامان آرائش کو میں نے توڑ پھوڑ دیا۔ یہی حال میں نے اس کو خفی کے دوسرے کمروں کا کیا۔ وہاں مجھے ہائی فری کوئٹے کا ایک ٹرانسمیٹر بھی ملا۔ اسے میں نے نشست گاہ میں ایسی جگہ رکھ دیا جہاں نظر پڑ سکے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو بھی میں نے صحیح سلامت نہ رہنے دیا۔ اس حرمے میں سوی نے اپنا کام انجام دے لیا تھا۔ میں عمارت سے باہر آیا تو کار کی پچھلی سیٹ پر مجھے امینہ بے ہوش پڑی دکھائی دی۔

کوئٹے کا پھانک پہلے ہی کھلا پڑا تھا۔ میں کار کو ڈرائیو کرتا ہوا باہر آ گیا۔ سوی میرے برابر دالی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے انسانی قالب اختیار کر لیا تھا۔ خود میں بھی انسانی قالب میں آچکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راستے میں گشتی پولیس کی کوئی گاڑی مل جائے تو میرے ساتھ ایک عورت کو بیٹھے دیکھ کر اسے شک نہ ہو۔ اس کے علاوہ کار کی پچھلی سیٹ پر بے ہوش امینہ پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر بھی پولیس کو شبہ ہو سکتا تھا۔ شہر کے حالات کیونکہ ان دنوں درست نہیں تھے اس لئے پولیس کا گشت بڑھ گیا تھا۔

تمام تر احتیاط کے باوجود پولیس کی ایک گشتی گاڑی نے ہمیں روک ہی لیا۔ بے ہوش امینہ کے اوپر سوی نے ایک چادر بھی ڈال دی تھی۔
”نیچے اترو۔“ مجھ سے کہا گیا۔ وہ ایک اے ایس آئی تھا جس کا انداز ایسا تھا جیسے میں کوئی جرائم پیشہ ہوں۔ الفاظ بگڑے زبان میں ادا کئے گئے تھے۔

مجھے اس بے وقوف پولیس والے پر بہت غصہ آیا جو خواہ میری راہ کھوئی کر رہا تھا۔
”کیوں اترو نیچے؟“ میں نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔
”کیا تجھے بگڑے بولنا نہیں آتی؟“ پولیس والے نے میرے اردو بولنے پر اعتراض کیا۔
”کیوں؟ کیا اردو بولنا کوئی جرم ہے؟“

”تو اس لڑکی کو کہاں سے بھگا کر لایا ہے؟“ اس نے سوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکھڑ لہجے میں سوال کیا، پھر بولا۔ ”تجھ سے میں نے کہا کہ نیچے اتر۔“

اس کے ساتھ موجود پولیس والوں نے بھی قریب آ کر میری کار کو گھیر لیا۔ میں نے اس اے ایس آئی کے ذہن پر توجہ دی تو میرے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ ان دنوں اردو زبان کے خلاف اور بگڑے زبان کے حق میں جو ہوا چلی ہوئی تھی، وہ بنگالی پولیس والا بھی اس سے متاثر تھا۔

”تم لوگ جرائم پیشہ افراد کو تو چھوڑ دیتے ہو اور شریف شہریوں کو تنگ کرتے ہو۔ یہ جو میرے ساتھ بیٹھی ہے، اسے میں کہیں سے بھگا کر نہیں لایا بلکہ یہ میری بیوی ہے۔“
”تو پھر نکاح نامہ دکھا۔“ پولیس والے نے مجھ کو مجھے گھورا۔

”ابے او بے وقوف! کیا کوئی نکاح نامہ ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے؟“ میں آخر اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔

”کیا کہاؤ نے؟“ وہ غرایا۔ ”تجھے بتاتا ہوں ابھی میں“ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

اسی وقت ایک پولیس والے نے اونٹ کی طرح اندر گردن ڈال کر کار کی پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی اور بے ہوش امینہ کے اوپر پڑی ہوئی چادر کھینچ لی۔
”سرا! یہ لاش۔“ پولیس والا چیخ اٹھا۔ ”کار کے اندر ایک لاش بھی موجود ہے۔“
اے ایس آئی نے ایک ہاتھ سے کار کا اگلا دروازہ کھولا، دوسرے ہاتھ سے وہ میرا گریبان پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے کار سے باہر تھمیت لیا۔

میں عموماً اپنی جناتی صفات کو کام میں لانے سے گریز کرتا تھا لیکن اب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے اس اے ایس آئی کو سبق دینا پڑا۔ اس کو اپنے زیر اثر لیتے ہی میں نے حکم دیا۔ ”مرغا بن جا۔“

وہ سچ سڑک پر فوراً مرغا بن گیا۔ پھر دوسرے پولیس والوں کا بھی میں نے یہی حشر کیا۔ یہ منظر دیکھ کر سوی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میں کار کی ڈرائیوگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پولیس جیپ سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور پولیس والے مرغا بنے ہوئے تھے۔ رات کے وقت اس سڑک پر ٹریفک نہیں تھا۔ انیس میں نے آدھے گھنٹے تک مرغا بنے رہنے کا حکم دیا تھا۔ اسی حال میں پولیس والوں کو وہاں چھوڑ کر میں کار کو آگے بڑھا لے گیا۔

”تیرا بھی کوئی جواب نہیں اے علیا لیش!“ سوی ہنستے ہوئے بولی۔ ”آخر اس کی کیا ضرورت تھی۔ کسی اور طرح کام نکال لیتا۔“

میں نے اسے متعجب اے ایس آئی کے بارے میں بتایا، پھر کہا۔ ”یہ بڑی خطرناک بات ہے سوی! قانون نافذ کرنے والے اداروں میں یہ دبا نہیں پھیلنی چاہئے۔“
”پھر تو اسے سزا دے کر توڑنے ٹھیک ہی کیا۔“

اس کے بعد ہمیں گشتی پولیس کی کسی گاڑی نے نہیں رد کا اور ہم محمد پور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ سوی نے انسانی قالب ترک کر دیا، مگر ساتھ ہی رہی۔ امینہ کو میں ہوش میں لے آیا تو وہ حیران سی ہو کر بولی۔ ”میں..... میں کہاں ہوں؟“

اب میں کار کو روک چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر کہا۔ ”تم اپنے گھر کے دروازے پر ہو۔“ یہ کہتے ہی میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور امینہ سے بھی یہی کیا۔

”لیکن میں..... میں..... تو وہاں..... اس کمرے میں بند تھی۔“ امینہ چادر اوڑھ کر کار سے اتر آئی۔ ”یہاں..... یہاں کیسے آگئی؟..... آپ کون ہیں؟“

”میں کون ہوں؟ یہ ان باتوں کے پوچھنے کا وقت نہیں۔ تم اپنے گھر کے دروازے پر دستک دو۔“ میں نے اس سے کہا۔

امینہ نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر قدم آگے بڑھا دیئے۔ یقیناً وہ محل وقوع کو پہچان گئی تھی۔ میں نے دانستہ اسی سے دروازہ کھولنے کو کہا تھا۔ ڈیٹان حیدر کے گھر والے اب تک جاگ رہے تھے۔ امینہ کی آواز سنتے ہی کاشان حیدر نے دروازہ کھول دیا۔ میں، امینہ کے پیچھے کھڑا

تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی امینہ اپنے باپ کے سینے سے چٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

”میری بچی..... میری جان!“ کاشان حیدر نے امینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں سے بھی خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”میں کار میں بیٹھا ہوں محترم!“ میں نے کاشان حیدر کو مخاطب کیا۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو“ آپ لوگ کار میں آکر بیٹھ جائیں۔“

اپنی بیٹی کو دیکھ کر کاشان حیدر جیسے مجھے بھول ہی گیا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر امینہ کو گھر کے اندر لے گیا۔ دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔

”جب ان لوگوں کے لئے یہاں کوئی خطرہ نہیں رہا تو پھر انہیں ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں کار میں آکر بیٹھا تو سومی نے سوال کیا۔

”خطرہ کیوں نہیں ہے اے سومی! وہ طالب علم جو غیر ملکی تخریب کاروں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں، تمہارے خیال میں کیا شریف ہوں گے؟ محبوب اور اس کے گروہ کا قلع قمع ہونے کے بعد تخریب کار، ان طلبہ کو بھی تو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کر سکتے ہیں۔ ذیشان حیدر کو ان کے ذریعے بھی قتل کرایا جاسکتا ہے۔ جب تک وہ بد معاش قابو میں نہیں آجاتے، ذیشان حیدر کی زندگی خطرے ہی میں رہے گی۔ تم دراصل اس گھاگ بڑھے و نوو چیز جی کو نہیں جانتیں۔ مجھے یقین ہے کہ جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کے بعد وہ شریک اور متعصب طلبہ ہی سے کام لے گا۔“ میں نے وضاحت کی۔

”ممکن تو ہے یہ اے علیا لیش!“ سومی نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

”تو پھر ہم کسی امکان کو نظر انداز کیوں کریں۔“ میں بولا۔ ”میرا خیال تو یہ ہے کہ محب وطن طلبہ تنظیم کے دیگر عہدیداروں کی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ کل آئی جی سے گفتگو کے بعد کوئی راہ نکالنی ہی پڑے گی۔“ پھر میں سومی کو آئی جی نور الاسلام سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتانے لگا۔

اسی دوران میں ذیشان حیدر اپنے گھر والوں کے ساتھ باہر آیا تو سومی کو میں نے اشارہ کر دیا۔ وہ کار سے باہر نکل گئی۔

دونوں بکس کار کی ڈگی میں رکھ دیئے گئے۔ اپنی بہن اور ماں کے ساتھ ذیشان حیدر پیچھے بیٹھ گیا۔

کاشان حیدر میرے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔

کار محمد پور کے علاقے سے نکلی تو کاشان حیدر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مختار صاحب! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔“

”محترم! یہ میرا فرض تھا، جو میں نے ادا کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔“

”ایسا کہنا آپ کی اعلیٰ طرفی ہے۔“ کاشان حیدر نے کہا، پھر پوچھنے لگا۔ ”ہمیں کتنے دن تک اس طرح روپوش رہنا پڑے گا؟“

”نی الحال میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، مگر امید یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں لگیں گے۔“ میں بولا۔

”اس طرح گھر سے اچانک غائب ہو جانے پر میرے چھوٹے بھائی اور دوسرے قریبی عزیز یقیناً پریشان ہو جائیں گے لیکن.....“

”جان سے زیادہ تو کچھ نہیں محترم۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”امینہ کی بازیابی کے سلسلے میں آپ کے کسی عزیز نے کیا کر لیا؟ اپنی جنگ آدمی کو خود ہی لڑنی پڑتی ہے۔ آپ ہی بہتر طور پر جان سکتے ہیں تاکہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔“

”یہ تو خیر ہے۔“ کاشان حیدر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اگر آپ اس بڑے وقت پر کام نہ آتے تو خدا جانے کیا ہوتا۔“

اپنی بیٹی کی بازیابی اور تحفظ ملنے کے بعد کاشان حیدر کو اب اپنے قریبی عزیزوں کا خیال ستانے لگا تھا کہ وہ کیا سوچیں گے۔ اس طرح اچانک گھر چھوڑ کر غائب ہو جانے سے یقیناً قریبی عزیزوں کو تشویش تو ہوتی لیکن یہ تشویش بہر حال ذیشان حیدر کی زندگی بچ جانے کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس ادھیڑ عمر شخص کی سمجھ میں یہ بات آئی گئی اور پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

چوک بازار پہنچنے کے بعد میں نے کار کو اپنے گھر کے سامنے روک لیا۔ سومی پہلے ہی گھر میں جا چکی تھی۔ میں نے کاشان حیدر کو مخاطب کیا۔ ”کیونکہ ہم کسی پیشگی اطلاع کے بغیر یہاں آئے ہیں، اس لئے آپ لوگ ابھی کار ہی میں بیٹھے۔ میں اپنے دوست سے بات کر کے آتا ہوں۔“

کاشان حیدر نے اقرار میں سر ہلا دیا تو میں کار کا دروازہ کھول کر اتر گیا اور گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ سومی ہی نے کھولا۔ وہ انسانی قالب میں تھی۔ میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا تو وہ بولی۔

”اے علیا لیش! اب حیرا کیا ارادہ ہے؟ تو ایک ساتھ دو دو انسانی قالب تو اپنا نہیں سکتا۔“

میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ میں نے سومی کو بتا دیا اور وہ مطمئن ہو گئی۔

باہر آکر میں نے کاشان حیدر کو مخاطب کیا۔ ”میرا دوست خورشید احمد تو اس وقت گھر پر نہیں ہے، مگر میں نے اس کی بیوی سے بات کر لی ہے اور اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ دراصل میرے دوست کو شطرنج کھیلنے کا شوق ہے اور اس کھیل میں وقت کا احساس نہیں رہتا۔ وہ اسی محلے میں اپنے ایک دوست کے گھر شطرنج کھیلنے گیا ہے۔ وہ بس آتا ہی ہوگا۔ اس کے دوست کا گھر بھی میں نے دیکھا ہے۔ احتیاطاً میں جا کر اس سے بھی ابھی بات کر لیتا ہوں۔ وہ بہت مخلص اور شریف آدمی ہے۔ آپ لوگ اسے بالکل میری ہی طرح پائیں گے۔ آئیے، میں اپنے دوست کی بیوی سے آپ کو ملوا دوں۔“

سومی دروازے پر کھڑی تھی۔ ذیشان حیدر نے کار کی ڈگی سے دونوں بکس اتار لئے۔

”آئیے تشریف لائیے۔“ سومی نے خوش اخلاقی کے ساتھ ان لوگوں کا استقبال کیا۔ وہ ذیشان حیدر کی ماں اور بہن کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئی۔

وہ تین ہی افراد تو تھے۔ گھر کا ایک بڑا کمرہ انہیں دے دیا گیا۔ اس کمرے میں مزید دوپٹنگ میں نے لا کر ڈال دیئے۔

”اچھا محترم! اب میں چلتا ہوں اور اپنے دوست کو بھیجتا ہوں۔“ میں نے کاشان حیدر سے کہا۔

ختم کرتے ہوئے میں نے کاشان حیدر سے پوچھا۔

”بالکل نہیں جناب! مجھے تو یہ جان کر ایک طرح کے تحفظ کا احساس ہو رہا ہے۔“ کاشان حیدر بولا۔
”تمہارا معاملہ میرے علم میں بھی ہے۔“ میں نے اس مرتبہ ذیشان حیدر سے کہا۔ ”تمہاری تنظیم کے دوسرے عمید اوروں کا تحفظ بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔ کل میں، مختار سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔“

”آپ کو یقیناً یہ سن کر خوشی ہوگی صاحب کہ ہمارے ساتھیوں میں کوئی بھی ڈرنے والا نہیں ہے۔ ان کو بھی دھمکیاں مل چکی ہیں، مگر کوئی پیچھے نہیں ہٹا، نہ کسی نے استعفیٰ دیا۔“ ذیشان حیدر نے بتایا۔
یہ گفتگو ابھی جاری تھی کہ سوی ایک ٹرے میں چائے کے کپ رکھ کر لے آئی۔ اس نے غیر معمولی طور پر حسین ترین انسانی قالب اپنایا تھا، سو میں نے محسوس کر لیا کہ ذیشان حیدر پر اس کے حسن کا جادو چل گیا ہے۔ اس کی نظرس سوی کی طرف سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ میں چاہتا تو ذیشان حیدر کو اپنے اثر میں لے کر اس سے روک دیتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سوی کو اس کا احساس کب ہوتا ہے۔ سوی بھی ذیشان حیدر کو اس سے باز رہنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ ذیشان حیدر جوان تھا اور جوانی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں لیکن یہ میرے علم میں تھا کہ وہ بدکردار نہیں۔ مجھے اسی لئے اس پر غصہ نہیں آیا۔

سوی بھی ہمارے ہی ساتھ نشست گاہ میں بیٹھی تھی۔ ذیشان حیدر چور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، کاش یہ شادی شدہ نہ ہوتی۔

میرے نزدیک یہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ سوی اس انسانی قالب میں جتنی پُرکشش اور انتہائی حسین دکھائی دے رہی تھی، اس کا یہی رد عمل ہونا تھا۔ معاً سوی کو میں نے چونکتے دیکھا۔ اس نے ذیشان حیدر کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پھر اسی ایک نگاہ میں کام ہو گیا۔

”صنوبر باجی! آپ کو ناحق ہماری وجہ سے اس وقت زحمت اٹھانا پڑی۔“ ذیشان حیدر نے سوی کو مخاطب کیا۔

سوی کے حسین ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے کہا۔ ”ارے نہیں، مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ آپ لوگوں کی خدمت کا موقع مل گیا۔“

سوی کو ”باجی“ کہنے سے صاف ظاہر تھا کہ ذیشان حیدر کے ذہن سے نشہ خن اتر چکا ہے۔ وہ صورت حال یوں بھی مناسب نہ ہوتی کیونکہ ان لوگوں کو چند روز وہیں گزارنا تھے۔ سوی نے ٹھیک ہی کیا تھا۔

چائے پی کر ہم نشست گاہ سے اٹھ گئے۔ ذیشان حیدر اپنے باپ کے ساتھ کمرے میں سونے چلا گیا۔ میں اور سوی خواب گاہ میں آگئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سوی کہنے لگی۔ ”یہ آدم زاد بھی خوب ہوتے ہیں اے علیا! ذرا سی اچھی صورت نظر آئی اور پھسل گئے۔“ اس کا اشارہ ذیشان حیدر کی طرف تھا۔

”ان شاء اللہ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ صنوبر آپ لوگوں کا پوری طرح خیال رکھے گی۔ کو بھی ضرورت ہو تو ان سے بلا تکلیف کہہ دیجئے گا۔“

”اب آپ سے کب ملاقات ہوگی؟“ کاشان حیدر نے مجھ سے پوچھا۔

”جب بھی فرصت ملی، حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ نے یہ اندازہ تو کر ہی لیا۔ گا کہ ہماری سرکاری ذمے داریاں کس نوعیت کی ہیں۔ دن ہو کہ رات، ہمیں ہر وقت مستعد اور چوکنا رہنا ہے۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو میں دوبارہ آپ کو یہاں سے محمد پور پہنچا دوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ!“ کاشان حیدر بولا۔

پھر وہ اور اس کا بیٹا ذیشان حیدر مجھے باہر تک چھوڑنے آئے۔ میں ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر، کو آگے بڑھا لے گیا۔ وہ کار بھی غیر ملکی دشمنوں کی تھی اور میں انہیں ہر طرح نقصان پہنچانے کے درپہ تھا۔ اس علاقے سے نکل کر کار کا میں نے پکلا بنا دیا اور اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد میں خورشید احمد کے انسانی قالب میں گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا سوی نے دروازہ کھولا اور میں گھر میں داخل ہو گیا۔

”آپ شطرنج کھیلتا نہیں چھوڑیں گے؟“ سوی نے بلند آواز میں کہا۔ ”معلوم بھی ہے آدمی راز ہو چکی ہے۔“ وہ اپنا کردار بخوبی نبھا رہی تھی۔

”بس کل سے دیر نہیں ہوگی۔“ میں بولا۔ میرا لہجہ زن مریدوں جیسا تھا۔

سوی اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کاشان حیدر وغیرہ کو سنانے کے لئے تھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہم دونوں صحن میں تھے۔

”آپ کے دوست مختار الدین آئے تھے۔ وہ اپنے کچھ مہمانوں کو چند روز کے لئے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔“ سوی نے گویا مجھے اطلاع دی۔

”معلوم ہے مجھے۔ مختار مجھ سے مل کر اور سب کچھ بتا کر گیا ہے۔“

اسی وقت کاشان حیدر کمرے سے نکل آیا۔ اس کا بیٹا بھی ساتھ ہی تھا۔ میں انہیں ساتھ لے نشست گاہ میں آگیا اور سوی سے چائے بنانے کو کہا۔

”مختار صاحب نے غائبانہ آپ کا تعارف کرا دیا تھا۔“ کاشان حیدر نے مجھے مخاطب کیا۔

”لیکن شاید یہ نہیں بتایا ہو گا کہ میرا تعلق بھی اسی کے محکمے سے ہے۔“ میں نے مصلحتاً کہا۔

”جی..... جی ہاں۔“ کاشان حیدر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”شاید کوئی وجہ ہوگی اس کی۔“

”بات یہ ہے کہ میرا تعلق اپنے محکمے کے ایک ایسے شعبے سے ہے جس میں راتوں کو خوار نہیں ہو پڑتا، عموماً دن ہی کی ڈیوٹی لگتی ہے، کبھی کبھار ایمر جنسی ہو جائے تو الگ بات ہے۔ مختار نے غالباً اس لئے اپنے محکمے سے میرا تعلق ظاہر نہیں کیا ہو گا کہ آپ فکرمند نہ ہوں۔ ویسے بھی ہم لوگ کسی پر ظاہر نہیں کرتے کہ ہمارا تعلق کس محکمے سے ہے۔ لوگ یہ سن کر خواہ مخواہ ہم سے ڈرنے لگتے ہیں اور کھل کر گفتگو نہیں کرتے۔ آپ کو اس پر کوئی تشویش تو نہیں کہ ایک سی آئی ڈی والے کے گھر میں ہیں؟“ اپنی بات

”تُو نے بھی تو آدم زادوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے ایسا انسانی قالب اپنایا ہے اے سوی کہ تیری طرف سے نظر ہٹانا مشکل ہو جائے۔“ میں ہنس کر بولا۔

”اس لڑکے کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔“

”اور وہ یہ سوچ رہا تھا کاش تُو شادی شدہ نہ ہوتی۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”تُو نے بھی تو اس سے خود کو باجی کھلو کر انتقام لے لیا۔“

”کیا کرتی؟ اس کے دماغ سے عشق کے کیڑے تو جھاڑنے ہی تھے۔“ سوی نے کہا۔ ”خیر اس پر لعنت پڑھ اور یہ بتا کل کیا کرتا ہے؟“

”کل دیسے تو بہت سے کام ہیں، آئی جی سے ملنا ہے، سی آئی ڈی آفس جانا ہے لیکن ایک کام سب سے اہم ہے۔ تجھ سے مشورہ بھی کرنا تھا کہ یہ خطرہ مول لیا جائے یا نہیں۔ ضروری نہیں اے سوی کہ ہمارا یہ اندازہ قطعی درست ہو کہ آئند کے جنم پر وہ جن زاد رات ہی کو قبضہ کرتا ہو۔“ میں بولا۔

”اس سے آخر تیرا مقصد کیا ہے اے علیالیش! میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح تخریب کاروں کے سرغنہ ونود چیز جی کا سراغ مل جائے کہ وہ چہا کس بل میں چھپا ہوا ہے۔ یہ تو ہٹا لگ چکا ہے کہ وہ اس شہر میں نہیں ہے۔ اس نے آئند کو دو دن کی مہلت دی تھی، سنیتا کو تلاش کرنے کے لئے۔ پھر یہ کہا تھا کہ اسے خود میاں آنا پڑے گا۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ونود چیز جی کا دایاں بازو توڑ دیا جائے، یعنی دور رہ کر سنیتا کے منصوبے کے مطابق آئند کو گولی مار دی جائے۔ کل بڑی آسانی سے ہمیں یہ موقع مل سکتا ہے۔ محبوب کہ آئند نے صبح نوبت ملاقات کے لئے اپنے دفتر بلوایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کل اپنے دفتر ضرور آئے گا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ سنیتا کے ہاتھوں ہی آئند کو قتل کراؤں لیکن ضروری نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے۔ اس کی جگہ ہم یہ کام بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، ہر چند کہ آئند کو راستے سے ہٹا دینے کی صورت میں ونود چیز جی تھلا کر رہ جائے گا اور اسے از سر نو جال بچھانا پڑے گا اور یہ بھی امکان ہے کہ وہ خود سانے آکر پاگ ڈور نہال لے، پھر بھی یہ قدم اٹھاتے ہوئے ہمیں غلط سے کام نہیں لینا چاہئے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آئند کو یقیناً معلوم ہو گا، ونود چیز جی کہاں چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم نے جلد بازی میں آئند کو ٹھکانے لگا دیا تو پھر ونود چیز جی تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ فرض کر اے سوی کہ میں کل صبح محبوب کا قالب اپنا کر آئند سے ملنے پہنچ جاؤں اور اس کا ذہن پڑھ لوں تو کیا رہے گا؟“ میں نے جو بھی سوچا تھا کہہ دیا۔

”اور وہ کافر جن زاد کل صبح بھی آئند کے جسم میں ہوا پھر؟“ سوی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اسی کو تو میں خطرہ مول لینا کہہ رہا تھا۔ ہم دو ہوں گے اور وہ اکیلا، کیا ہم اس پر بھاری نہیں پڑ سکتے؟“

”سوچ لے اچھی طرح اے علیالیش!“ سوی کی آواز میں فکر مندی ظاہر ہونے لگی۔ ”میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی رک جا۔“

”یعنی تیرا کہنا یہ ہے کہ ابھی آئند کو نہ پھینکا جائے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ تو ہمارے سامنے ہے، ہم کسی بھی وقت اس سے نمٹ سکتے ہیں، اس کے لئے کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ محبوب مارا جا چکا ہے اور اس کے آدمی آج رات گرفتار کر لئے جائیں گے۔ آئند تو یوں بھی بے دست دیا ہو جائے گا۔“

”لیکن سرحد پار سے آنے والے تخریب کار تو ابھی موجود ہیں۔ آخری حربے کے طور پر ونود چیز جی ان سے بھی تو کام لے سکتا ہے۔“ میں نے ایک اور خطرے کی نشاندہی کرنے کے بعد مزید کہا۔ ”یہ تخریب کار کتنے ہیں اور کہاں کہاں ہیں، ہمیں تو کچھ خبر نہیں۔ صرف ایک سروج کے بارے میں مجھے معلوم تھا لیکن کیا پتا؟ اس نے اپنا ٹھکانہ بدل دیا ہو۔“

”اب چھوڑ بھی اس قصے کو اے علیالیش!“ سوی نے انگڑائی لی۔ ”کل سوچیں گے، کیا کرنا چاہئے۔“

انگڑائی لیتے ہوئے سوی کا جسم کسی کمان کی طرح کھنچ گیا تھا۔ میرے حواس پر نشہ سا چھا گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب تر کیا ہی تھا کہ کسی نے اس کو میرے پہلو سے ٹھیک لیا۔ اسی کے ساتھ کمرے میں بدبو سی بھر گئی۔

”اے علیالیش! آخر میں نے تجھے تلاش کر ہی لیا۔“ ایک غیر انسانی آواز کمرے میں گونجی۔ ”میرا نام مسر ہے اور میں وہی جن زاد ہوں کہ جس کی گرفت میں آکر تُو نکل بھاگا تھا، مگر آج میں تجھے زخمی ہو کر بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ تجھ کو مارنے کے بعد میں تیری بیوی کو لے اڑوں گا۔ یہ مجھے پسند آگئی ہے۔ دیکھ لے کہ یہ میری آغوش میں ہے۔ تُو اسے مجھ سے چھڑا سکے تو چھڑا لے۔“

میں نے دیکھا کہ سوی کو اس نے جکڑ رکھا تھا۔ سوی ابھی تک انسانی قالب میں تھی۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ کافر جن زاد مسر مجھ سے بہت قوی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے مشتعل کرنا چاہتا ہے۔ سو میں نے اپنے جذبات کو بھڑکنے سے روک لیا اور پرسکون آواز میں بولا۔ ”آج تُو نے اندھیرے کی چادر نہیں اوڑھ لی؟“

”اب اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ مجھے دیکھنا نہ دیکھنا تیرے لئے برابر ہے۔“ وہ وحشیانہ انداز میں زور سے ہنسا، پھر بولا۔ ”تُو آج رات کے بعد زندہ ہی کب ہو گا جو میں تجھ سے چھوں۔ میں یہ سمجھا تھا اے علیالیش کہ تُو مر گیا ہو گا، تجھے اسی لئے اتنے دن جینے کی مہلت مل گئی۔“

”اور اے مسر! مجھے بھی یہی گمان تھا۔ یہ بتا کہ زخمی ہو کر تجھے ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگے؟“ میں دانستہ اسے باتوں میں لگائے رہا اور انسانی قالب سے بھی نہیں نکلا کہ اسے میری طرف سے اطمینان رہے۔

”میں تو دو تین دن ہی میں لوٹ پیٹ کر اچھا ہو گیا تھا۔ تیری طرح کمزور تو نہیں ہوں میں۔“ اس نے مجھ پر طنز کیا۔

”آج تُو اس آدم زاد کے جسم میں داخل نہیں ہوا؟ کیا تجھے آدم زادیوں کی چاہت نہیں رہی؟“ میں بدستور پرسکون آواز میں بولا۔

”تجھ کو جو تلاش کرنا تھا“ اس لئے آج رات اس آدم زاد کے جسم کو میں نے اپنا گھر نہیں بنایا۔ مجھے بس اچانک ہی تیرا خیال آگیا تھا کہ کہیں تو زندہ نہ بچ گیا ہو۔ میں دور دور تک تیری بوسو گھٹا پھرا اور آخر یہاں تک پہنچ ہی گیا۔ مجھے خبر تھی کہ تو اگر زندہ بھی ہو گا تو میری تلاش نہیں کرے گا، اپنی موت کو دعوت نہیں دے گا۔ تو نے ایسا ہی کیا اور یہ بھول گیا کہ میں خود بھی تجھے ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اس گھر میں داخل ہو کر میں فوراً اس لئے ظاہر نہ ہوا کہ پہلے تیری باتیں سن لوں، تیرے ارادے بھانپ لوں۔ میں نے تجھے اس آدم زاد کے قتل کا منصوبہ بناتے سنا کہ جس کا جسم میرے بت کام آتا ہے۔ تو اسے مار ڈالنا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ خود مرنے والا ہے۔“ وہ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جس کا مجھے انتظار تھا۔ سوئی وہ عمل پورا کر چکی تھی کہ جو کسی قوی سے قوی جن زاد کو زیر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ عمل مجھے اور سوئی کو عزتیں نے تعلیم کیا تھا۔ میں اس لئے وہ عمل نہیں پڑھ سکا کہ مسعر کو باتوں میں لگائے رکھوں۔ سوئی نے بھی اسی لئے انسانی قالب نہیں چھوڑا کہ مسعر کو شک نہ ہو۔ وہ اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ سوئی بے بس ہے اور اس کے لئے خطرہ نہیں بن سکتی۔ ہنسنے ہنسنے ایک دم اس کی آواز بدل گئی۔ گھبرا کر اس نے سوئی کو چھوڑ دیا، مگر اب دقت گزر چکا تھا۔ یہ اسی عمل کا اثر تھا کہ مسعر کا جو وہ کسی بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح نظر آنے لگا۔ شدید اذیت کے باوجود اس نے فرار ہونا چاہا، مگر اسے ناکامی ہوئی۔ سوئی اور میں نے اسے گھیر لیا۔ ہماری گرفت میں آنے کے بعد وہ بہت چپٹا چلایا لیکن ہم نے اسے نہیں چھوڑا۔

وہ مذہحال ہوتا گیا اور پھر اپنے حواس قائم نہ رکھ سکا۔ ہم نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ اب فرار ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ خود اپنی ہی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔ سوئی نے جو عمل پڑھا تھا، یہ بھی اسی کا نتیجہ تھا۔

مسعر سے نبرد آزمائی کے سبب ہم دونوں بھی تھک کر ڈھیر ہو گئے۔ جیسے ہی ہم انسانی قالبوں میں واپس آئے، کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور اسی کے ساتھ کاشان حیدر کی ڈری ڈری سی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ مداخلت ناگوار محسوس ہوئی لیکن کیا کرتا؟ دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی کاشان حیدر نے کہا۔ ”معاف..... معاف کیجئے گا صاحب! ہم..... مجھے ایسا لگتا ہے کہ..... کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ ابھی کچھ..... کچھ ہی دیر پہلے کوئی بہت زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اسی سے میری آنکھ کھل گئی۔ امینہ، اس کی والدہ اور ڈیٹان، سب ہی جاگ اٹھے۔ پھر صاحب! ہم نے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں۔ جب یہ..... یہ آوازیں آنا بند ہو گئیں تو میں ہمت کر کے اٹھا کہ..... کہ آپ کو بھی خبردار کر دوں۔ شاید آپ دونوں بہت گہری نیند سو رہے ہوں گے ورنہ تو ہماری طرح جاگ..... گئے ہوتے۔“ رک رک کر کاشان حیدر نے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کا علم مجھے پہلے ہی سے تھا۔

کاشان حیدر کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھا بجا کر واپس کیا۔ پھر بھی وہ آخر تک اسی پر بند رہا کہ اس گھر میں جنات آباد ہیں۔ غریب اس سے بے خبر ہی تھا کہ وہ ایک جن زاد سے ہم کلام ہے۔

کافر مسعر کی اچانک آمد اور پھر اس کی موت مجھے اور سوئی کو کسی خواب کی طرح لگی۔ ہم دونوں دیر تک اسی واقعے پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی گفتگو سے آئندہ کا ذکر نکل آیا۔ میں نے سوئی سے کہا۔ ”اب تو کوئی خطرہ نہیں رہا۔ میں اکیلا بھی اس آدم زاد سے نمٹ سکتا ہوں۔“ سوئی نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور پھر ہم گہری نیند سو گئے۔

☆=====☆

ہمارے گھر میں کیونکہ آدم زاد بھی تھے اس لئے جلدی اٹھنا پڑا۔ صبح میں ناشتہ وغیرہ کر کے ساڑھے آٹھ بجے تک نکل گیا۔ سوئی گہری میں رہی۔ محبوب کا قالب اپنا کر میں ٹھیک نو بجے آئندہ کے دفتر میں داخل ہوا۔ دفتر بہت بڑا اور شاندار تھا۔

آئندہ کا کمرہ دفتر کے پچھلے حصے میں تھا جہاں تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے چڑاسی نے مجھے سلام کیا اور پھر بولا۔ ”آئندہ بابو آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں محبوب بھائی! چلے جائیے۔“

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی بڑی سی ایک میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر مجھے آئندہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لانے میں جلد بازی سے میں نے گریز کیا۔

”آؤ آؤ محبوب!“ اس نے مجھے مخاطب کیا، آواز میں ہلکی سی چہمن تھی۔ ”آج تمہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی اس کا دایاں ہاتھ میز کے نیچے سے نکلا تو میں چونک اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے بڑی ٹال والا جرمین ساخت کا ریوالبور لیوکر دکھائی دیا۔ پھر وہ مجھے نشانے پر لئے ہوئے اٹھا اور ریوالبور کی ٹال کو حرکت دے کر سخت لمبے میں بولا۔ ”چلو ادھر۔“ اس کا اشارہ کمرے کے عقبی دروازے کی طرف تھا۔

کسی بھی لمحے اس کی بساط الٹ دینا میرے لئے ممکن تھا۔ میں نے اسی لئے اس کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ وہ اگر شیطانی قوتوں کا مالک ہوتا تو ایک کافر جن زاد اس کے جسم پر طویل عرصے قبضہ نہ کئے رہتا۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی تھا۔ اس کے ذہن کو بھی میں نے فوری طور پر پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھی، نہ اسے اپنے اثر میں لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس کے الفاظ سے یہ ظاہر ہو ہی گیا تھا کہ کسی طرح اسے محبوب کی موت کا علم ہو چکا ہے۔ میں کون ہوں، یہی جاننے کے لئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس کے برعکس مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اسے محبوب کی موت کا کیسے پتا چلا۔

آئندہ کے کہنے ہی پر خود میں نے عقبی دروازہ کھولا۔ وہ میرے عقب میں تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ آئندہ میری حقیقت جانے بغیر گولی نہیں چلائے گا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر نیچے جانے کے لئے بیڑھیاں نظر آئیں۔

”اترو نیچے۔“ آئندہ کی سخت آواز سنائی دی۔

فرار ہو گیا۔ اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی غرض سے مجھے اپنے ایک آدمی کی قربانی دینی پڑی وہی جس کے چہرے پر میں نے اپنا میک اپ کیا۔" میں دانستہ اس گفتگو کو طول دے رہا تھا اور اس کی وجہ تھی۔ کئی مرتبہ کوشش کرنے کے باوجود ابھی تک آئند کے ذہن تک میری رسائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں موجود بقیہ تین افراد کے ذہن میں نے پڑھ لئے تھے۔ وہ تینوں غیر ملکی تحریب کار آئند کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ سینٹا کے لئے کبھی میں نے جو یہ گمان کیا تھا کہ وہ مخصوص ذہنی ساخت کی مالک ہو گی، وہ تو بعد میں غلط ثابت ہوا لیکن آئند کا معاملہ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ مضبوط قوت ارادی رکھنے والے آدم زادوں کے ذہنوں کو پڑھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بہر حال ونود چڑجی کا دست راست تھا۔ اس کا انتخاب یوں ہی تو نہیں کر لیا گیا ہو گا۔ اس کے باوجود آخری قدم اٹھانے سے میں نے گریز ہی کیا ورنہ تو اسے ٹھکانے لگانے میں دیر ہی کتنی لگتی۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور اس کی قوت ارادی کو آخری حد تک آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اسی عرصے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس کے جسم پر قبضہ کر لوں، شاید اس طرح ونود چڑجی تک پہنچنا میرے لئے آسان ہو جائے، مگر بوجہ اس خیال کو بھی مجھے اپنے ذہن سے جھٹکانا پڑا۔ یوں ایک طرف تو سوی تنہا رہ جاتی، دوسری طرف آئند کی سرگرمیوں سے لاعلمی کے سبب ونود چڑجی کو دھوکا دینا مشکل ہوتا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے آئند سے مزید کہا۔ "وہ پانچوں جو اپنے پیچھے محمد پور سے سی آئی ڈی والوں کو ساتھ لگا کر لائے تھے، انہیں بھی میں نے زندہ نہیں چھوڑا، کیونکہ انہی کی حماقت سے میری زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔"

آئند کے چہرے پر چند لمحوں کو تذبذب کے آثار پیدا ہوئے، پھر وہ اعتدال پر آگیا اور بولا۔ "غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے محبوب! سو مجھ سے بھی ہو گئی۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ تم کاتا کی طرح بزدل نہیں ہو۔ چلو آؤ، اوپر دفتر میں بیٹھ کر سکون کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ وعدے کے مطابق آج تمہیں مہمان بھی کرنی تھی، وہ بھی لیتے جانا۔ ہاں میں تم سے ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گیا۔ اس ہنگامے کے دوران میں ڈیٹان حیدر کی بہن کو تو تم نے....."

"مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا آئند بابو کہ اس کی لاش کہیں پھینکا سکتا، ہاں اسے میں نے گولی ضرور مار دی تھی۔" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "آپ جانتے ہیں آئند بابو کہ محبوب کی زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔"

"اس نے تو قہری زیدو بھی تمہاری قدر کرتا ہے۔" آئند نے یہ کہتے ہوئے اپنے تینوں ساتھیوں کو الگ ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور پھر مجھے اپنے ساتھ لئے اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ کے بغیر اس نے کمرے میں موجود ایک آہنی الماری کھولی اور کینوس کا ایک بیک نکال کر میز پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "پہلے اپنی یہ امانت سنبھال لو۔ تمہاری مرضی کے مطابق اس میں استعمال شدہ چھوٹے نوٹ ہیں۔ رقم پوری دو لاکھ ہے۔"

وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ یہ میری آخری کوشش تھی۔

اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور بڑبڑایا۔ "یہ..... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟"

میں کچھ کے بغیر بیڑھیاں اترنے لگا۔ بظاہر وہ گودام ہی تھا۔ بڑی بڑی پیٹیاں نیچے اترتے ہی مجھے دکھائی دیں۔ انہی پیٹیوں کی آڑ سے تین مسلح افراد نکل کر سامنے آ گئے۔ آئند کے اشارے پر ان میں ایک نے میرے پیچھے آکر اپنے ریلو اور کی ٹال میری پشت سے لگا دی۔ سامنے آئند مجھے نشانے پر لئے ہوئے تھا۔ بقیہ دو افراد نے اپنے اپنے ریلو اور جیبوں میں رکھ لئے۔ آئند یقیناً پہلے ہی انہیں ضروری احکام دے چکا تھا۔

"پہلے اس کا اصل چہرہ دیکھنا ضروری ہے۔" آئند کا اتنا کہنا ہی کافی ہوا۔

دونوں افراد میں سے ایک کہیں رکھی ہوئی ایک بوتل اٹھا لیا۔ بوتل میں کوئی سیال مادہ بھرا ہوا تھا۔ اس آدمی نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور جیب سے رومال نکال کر سیال مادے میں بھگو لیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف بڑھا۔ میں خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہا۔

"میک اپ بہت اچھا کیا ہے اس نے، ذرا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ محبوب نہیں کوئی اور ہے۔ یہاں کے انٹیلی جنس والے بھی اب خاصے تیز ہو گئے ہیں۔" آئند یہ کہہ کر دھیرے سے ہنسا، پھر بولا۔ "بس ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ ہم اڑتی چڑیا کے پر بھی گن لیتے ہیں۔ کل رات مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے اس نے محبوب کی آواز تو بتائی، مگر ایک جگہ غلط کھائی گیا۔ محبوب نے کبھی مجھ سے یہ الفاظ نہیں کہے اور کوئی حکم؟ یہ اس کا مزاج ہی نہیں تھا۔ پھر اس کی آواز بھی ایسی تھی جیسے وہ نیند کی حالت میں بول رہا ہو۔ اسی سے پکڑا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آج صبح ضرور آئے گا۔"

آئند اپنے آدمیوں کو جتان رہا کہ اسے مجھ پر کیسے شک ہوا۔ اس عرصے میں کئی مرتبہ گیلے رومال سے میرا چہرہ رگڑا گیا، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے آئند بابو کہ اب آپ کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے۔" میں پہلی مرتبہ محبوب کی آواز میں بولا۔ "پرانے تعلقات کی وجہ سے اب تک میں نے بہت صبر کر لیا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر مجھے قہری زیدو کا خیال نہ ہوتا تو....." میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم..... تم محبوب ہو تو پھر..... پھر وہ کون تھا کہ جس نے خودکشی کر لی؟" آئند حیرت زدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

"محبوب اور خودکشی۔" میں ہنس دیا۔ "کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ وہ تو میرا ایک معمولی کارندہ تھا کہ جس کے چہرے پر میں نے اپنا میک اپ کر دیا تھا۔ اب کبھی پولیس یا انٹیلی جنس والے مجھے تلاش نہیں کریں گے۔ کسی مردہ آدمی کو کون تلاش کرتا ہے۔"

"لیکن یہ..... یہ سب ہوا کیسے محبوب؟" سوال کرتے ہوئے آئند کے ریلو اور کی ٹال جھک گئی۔

"آپ سے فون پر بات کرتے ہی میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی آئند بابو!" میں نے اسے بے وقوف بنایا۔ "اس لوٹڈے ڈیٹان حیدر کو ختم کرنے کے لئے میں نے اپنے جن آدمیوں کو بھیجا تھا، وہی بے وقوف اپنے پیچھے سی آئی ڈی والوں کو لگا لائے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ پولیس کو غشی پر چھاپہ مارتی، میں

نے سوچا ہے کہ اس موقع پر دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ کا ذکر کر دوں۔ سب کچھ تو آپ کا کیا دھرا ہے مجھے اس کا ریڈیو کیوں ملے۔“

”آپ سے میری ایک درخواست ہے کہ.....“

”درخواست نہیں، آپ حکم دیجئے سر!“ وہ فوراً بولا۔

”نہیں اسے درخواست ہی سمجھئے۔ چاہیں تو اسے آپ مصلحت کہہ لیں۔ کسی بھی معاملے میں میرا نام نہیں آنا چاہئے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اگر آپ کا یہی حکم ہے تو پھر مجبوری ہے۔“ آئی جی نے میری بات مان لی۔

”یہ بتائیے محبوب کے کردہ کا کوئی آدمی بچ کر تو نہیں نکل سکا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی نہیں۔“ آئی جی نے جواب دیا۔ ”ابنہ میرے عملے کی حماقت کے سبب ایک جگہ تو یہ صورت پیش آئی کہ مجرم جاگ اٹھے اور مسلح تصادم کی نوبت آگئی۔ اس تصادم کے نتیجے میں دو مجرم ہلاک ہو گئے۔ دوسری جگہ یہ ہوا کہ مجرم رنگ ریلوں میں مصروف تھے سوچنا ہو گئے۔ فرار ہونے کی کوشش میں ایک مجرم وہاں بھی مارا گیا۔ ان سب کی گرفتاری کے بعد آپ کے لکھائے ہوئے ناموں سے تصدیق کر لی گئی کہ کوئی بھی مجرم بچ نہیں سکا۔ ہم نے اسی لئے نصف شب کے بعد آپریشن شروع کیا تھا۔“

اس کا سبب آپریشن پر آئی جی کو میں نے مبارک دی۔

”مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں سر!“ اس نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”نہیں، اصل کام تو آپ ہی نے انجام دیا ہے۔ میں نے تو صرف آپ کو اطلاع فراہم کی تھی۔ خیر یہ بتائیے کہ آپ نے صوبائی وزیر داخلہ کو کس مصلحت کے تحت یہ اطلاع دی کہ طالب علم رہنماؤں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”براہ راست ان سے بات کرنے کی ایک وجہ تھی۔“ آئی جی نے بتایا۔ ”دراصل میرے محکمے کے افسران جن طلبہ کی گرفتاری پر زور دے رہے تھے، ان میں محترم صوبائی وزیر داخلہ کا بھتیجا شہاب الدین بھی شامل تھا۔ میں نے کافی سوچ وچار کے بعد محترم صوبائی وزیر داخلہ کو احتیاطاً یہ اطلاع دے دی کہ بعد میں کسی طرح کا پریشر نہ پڑے۔ اسی سبب میں نے اپنے محکمے کے افسران کو کسی قسم کی کارروائی سے روک دیا تھا۔ مجھے کایا حکم دیا گیا۔ یہ میں آپ کو کل رات بتا ہی چکا ہوں۔“

میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ صوبائی وزیر داخلہ نے محض اپنے بھتیجے کو گرفتاری سے بچانے کی خاطر ایسا کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ سراسر ناانسانی تھی۔ حقائق کی روشنی اور میرے علم و اطلاع کے مطابق جو طالب علم رہنما غیر ملکی دشمنوں کے آلہ کار بن سکتے تھے یا جن پر یہ شبہ تھا، ان میں شہاب الدین کا نام بھی شامل تھا۔ وہ حمید چودھری اور دلال مکرچی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر آئی جی نے کہا۔ ”مقصود میاں! یہ مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے اور اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ آپ صاف صاف صوبائی وزیر داخلہ سے بات کر لیں۔“ میں

میں نے اس کے ذہن کو ایک جھٹکا اور دیا۔ یہ جھٹکا وہ برداشت نہ کر سکا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور پھر سر جھٹکا چلا گیا۔ اسے چپچپے کی مصلحت بھی نہ مل سکی اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ آئندہ کی موت کے بعد یقیناً تین تخریب کاروں کو ٹھکانے لگانے میں بھی میں نے دیر نہیں کی اور کیونس کا ایک اٹھا کر خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ انہی تینوں میں سے دو کو آئندہ نے چچ گاؤں بھیجا تھا۔ اس وقت تک پولیس، نوڈو چڑچی کی کوشش پر چھاپہ مار چکی تھی۔ جب وہ دونوں وہاں پہنچے تو محبوب کی لاش کو ایک ایبولینس میں رکھا جا رہا تھا۔ پولیس والے، محبوب جیسے بڑے مجرم کی خودکشی پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ آس پاس کی کوشیوں میں رہنے والے پولیس کو بڑی تعداد میں وہاں دیکھ کر جمع ہو گئے تھے۔ اسی بھیڑ میں وہ دونوں تخریب کار بھی شامل تھے۔ یوں آئندہ کے ”شعبے“ کی تصدیق ہو گئی۔ اس عیار نے صرف چند الفاظ سے خطرے کی بوسوگھ لی تھی۔

نوڈو چڑچی پر ایک اور کاری ضرب لگا کر میں چوک بازار آ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو وہ کیونس کا ایک تھاجس میں دو لاکھ روپے تھے، دوسرا سبب سوئی کو یہ خوشخبری سناتا تھا۔

موتی جھیل سے واپسی میں مجھے مشکل سے ایک گھنٹہ لگا ہو گا۔ سوئی کو وہ بیک حوالے کرنے اور آئندہ کی موت سے آگاہ کرنے کے بعد وہاں میں زیادہ رکا نہیں۔ کاشان حیدر مجھ سے رات کو پیش آنے والے واقعے پر متفکرو کرنے کے لئے بے چین تھا، مگر میں نے سرکاری کام کا بہانہ کر دیا۔

”اچھا تو پھر اس مسئلے پر شام کو بات کر لیں گے صاحب! مختار الدین صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام ضرور کہہ دیجئے گا۔“ کاشان حیدر بولا۔

”جی ہتر ہے۔“ یہ کہتے ہی میں حیدر دئی کے ساتھ گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بار بار نئے انسانی قالب اپنانا میرے لئے اذیت ناک ہی تھا لیکن اب مجھے یہ اذیت سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ خورشید احمد سے میں پہلے محبوب بن کر آئندہ سے ملا اور پھر دوبارہ خورشید احمد بننے کے بعد چوک بازار آیا، اب مجھے مقصود میاں کا قالب اپنانا تھا۔ اس اذیت کا ذکر میں اپنی سرگزشت میں پہلے بھی ایک بار کر چکا ہوں۔ یہ اذیت بہر حال اس راحت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی جو مجھے کار خیر انجام دینے سے حاصل ہوتی تھی۔ آدم زادوں کے درمیان نفرتیں بونے والوں اور بدی کے ہر کاروں کو ان کے انجام تک پہنچانا بھی میرے نزدیک کار خیر ہی تھا۔

پولیس ہیڈ آفس پہنچ کر جب میں آئی جی نور الاسلام سے ملا تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اسے رات کو آرام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔

”تشریف لائیے مقصود میاں!“ اس نے پرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔

”آپ نے کاشا یا محبوب کے سلسلے میں کسی سے میرا ذکر تو نہیں کیا؟“ میں نے بیٹھے ہی پوچھا۔

”ابھی تک تو ایسی نوبت نہیں آئی اور سچ بات تو یہ ہے، کسی نے معلوم بھی نہیں کیا، سو میرے ہی سرسرا بندھا ہوا ہے۔“ آئی جی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہاں محبوب جیسے بڑے اسمگلر کے کردہ کا خاتمہ یقیناً بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سلسلے میں وزارت داخلہ کی طرف سے ضرور مبارک باد ملے گی۔ میں

منقطع کر دیا گیا۔

آئی جی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تو میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ کل تک صورت حال بدل چکی ہو گی۔ مجھے آپ کے چہرے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ دوسری طرف کیا کہا ہو گا۔“

”جی ہاں مقصود میاں! بات بننے کے بجائے اور بگڑ گئی۔“ آئی جی نے اعتراف کیا۔ پھر مجھے بے خبر جان کر وہ صوبائی وزیر داخلہ کے الفاظ دوہرانے لگا۔

”آپ دیکھیں گے کہ جن موصوف نے فون پر ابھی آپ کو دھمکی دی ہے، یہی سخت ایکشن لینے کا حکم دیں گے۔“ میں نے کہا، پھر اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے بتایا۔ ”ممکن ہے یہ بات آپ کے علم میں بھی ہو کہ یونیورسٹی میں طلبہ کی دو تنظیمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تنظیم زیادہ بااثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تنظیم کو غیر ملکی تحریب کاروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ صورت حال کو مزید سنگین بنانے کے لئے پہلے کانا پھر محبوب کے گردوں سے کام لیا گیا۔ اس کے ذمے دار صرف طلبہ ہی نہیں ہیں۔ طالب علموں کی اکثریت اس سے لاعلم ہے کہ وہ نادانستگی میں کس کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ یہ معاملہ صرف طالب علم رہنماؤں اور ان کے قریبی ساتھیوں تک محدود ہے۔ دوسری طلبہ تنظیم جو محب وطن ہے، اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ وہ غیر ہنگامی طلبہ پر مشتمل ہے۔ ان کی تعداد بھی کم ہے اور پشت پناہ بھی کوئی نہیں۔“ اس کے بعد میں نے مختصر آڈیشن حیدر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے اسے آگاہ کر دیا، پھر بولا۔ ”ان حالات میں یہ محب وطن طلبہ اپنی زندگی بچانے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔“

”مقصود میاں! یہ تو بڑی خطرناک بات ہے کہ ہمارے بچے غیر ملکی تحریب کاروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ مجھے طلبہ کی سرگرمیوں کا اتنا علم نہیں تھا۔ پھر تو یقیناً سخت ایکشن لینے کی ضرورت ہے۔“ آئی جی کی آواز سے فکر و تشویش جھلک رہی تھی۔

”ایسا ہی ہو گا، کیونکہ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں۔ اگر پہلے ہی طالب علم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جاتا تو اس حد تک آگ نہ بھڑکتی، مگر میں ایک اور معاملے میں الجھ گیا۔ آپ کو میں ان طلبہ کی فرست فراہم نہ کر سکا جنہیں گرفتار کیا جانا تھا۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ فکر مند نہ ہوں۔“

اس دوران میں آئی جی نے چائے منگوا لی تھی جو مجھے پینا ہی پڑی۔ پھر میں اس سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

آئی جی نور الاسلام سے مل کر مجھے سی آئی ڈی آفس جانا تھا، مگر میں نے ارادہ بدل دیا۔ اس کا سبب آئی جی سے ہونے والی گفتگو تھی۔ جب تک مرکز سے ڈوری نہ ملتی کچھ نہ ہوتا۔ مجبوراً مجھے کراچی کا رخ کرنا پڑا۔ ہم جن زادوں کو کہیں سے کہیں پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ فوری طور پر میں نے کراچی کا قصد اس لئے کیا کہ مجھے سرکاری اداروں کی کارکردگی کا علم تھا۔ بعض اوقات کسی فائل کو ایک میز سے دوسری میز تک پہنچنے میں کئی ہفتے لگ جاتے تھے، یہ معاملہ تو پھر بھی ملک کے دو حصوں کا تھا۔ اس سلسلے میں کسی بھی قسم کا تساہل حالات کو مزید بگاڑ دیتا۔

”آپ انہیں بتا دیجئے کہ شباب الدین پر آپ کے افسران نے غلط شک کیا تھا اور اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح کم از کم بقیہ طالب علم رہنماؤں کو تو آپ گرفتار کر سکیں گے۔“ آئی جی سے یہ لئے ہوئے میں سوچ چکا تھا کہ شباب الدین سے خود بھی کو نمٹنا پڑے گا۔ ویسے بھی وہ اکیلا رہ جاتا تو شاید پتہ نہ کر پاتا۔

”خاص طور پر اپنے پیچھے کا نام لینے پر وہ بڑا بھی تو مان سکتے ہیں۔“ آئی جی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”تو مانا کریں بڑا۔“ میرے لیے میں سختی آگئی۔ ”کیا انہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں ہو گا؟ آپ میرے سامنے ان سے بات کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں۔ وہی تو سب کچھ نہیں ہیں، ان سے اوپر بھی تو کچھ لوگ کراچی میں بیٹھے ہیں۔ انہیں اپنی کرسی بچانا مشکل ہو جائے گی۔“

میرا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا کہ آئی جی نور الاسلام کا حوصلہ بڑھ گیا، بولا۔ ”یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر ملک و قوم کی خاطر مجھ سے میرا عمدہ چمن بھی گیا تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔ میں ابھی انہیں فون ملاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی اس نے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کئی مرتبہ کوشش کے بعد صوبائی وزیر داخلہ سے رابطہ قائم ہو سکا۔ دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ موصوف ابھی تشریف نہیں لائے، مگر فون ملانے پر پتا چلا، دفتر جا چکے ہیں۔ اس میں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔

سلسلہ ملتے ہی آئی جی نے کہا۔ ”سرا! میں آئی جی نور الاسلام عرض کر رہا ہوں۔“

میری توجہ آئی جی کے ذہن پر مرکوز ہو گئی کہ جان سکوں، دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا ہے۔

”ہاں بولو، کیا بات ہے؟“ صوبائی وزیر داخلہ نے پوچھا۔

”آپ کو ایک ضروری اطلاع دینی تھی سرا! جن طالب علم رہنماؤں کی گرفتاری کے لئے میں نے آپ سے اجازت طلب کی تھی، مزید تفتیش کرنے پر ان سے ایک طالب علم قطعی بے گناہ ثابت ہوا ہے۔ حکومت کے خلاف ہونے والے مظاہروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“ آئی جی بہت محتاط لفظوں میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”سرا! اس طالب علم رہنما کا نام شباب الدین ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو شباب الدین کو چھوڑ کر بقیہ طلبہ کو گرفتار کر لیا جائے؟“

جواب میں دوسری جانب سے طنزیہ ہنسی کی آواز آئی، پھر کہا گیا۔ ”دوسرے جن طلبہ کو تم گرفتار کرنا چاہتے ہو، ان کے بارے میں بھی مزید تفتیش کراؤ۔ وہ بھی بے گناہ ثابت ہوں گے۔ تم شاید مجھے بچہ سمجھ رہے ہو نور الاسلام! ہمیں یقیناً شباب الدین سے میرے رشتے کا پتا چل گیا ہے۔ اس طرح تم مجھ پر احسان جتنا چاہتے ہو۔ اس معاملے سے شباب الدین کا تو خیر کوئی تعلق ہی نہیں لیکن تم نے کسی اور طالب علم رہنما کو بھی گرفتار کیا تو نتائج کے ذمے داری تم ہی پر ہو گی۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے صوبائی وزیر داخلہ کے لیے میں دھمکی تھی۔

”نیں سرا!“ آئی جی اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اسی کے ساتھ دوسری طرف سے سلسلہ

کراچی پہنچے ہی کسی اور سے ملنے کے بجائے میں سیدھا وزارت داخلہ کے سیکرٹری حفیظ الرحمن فاروقی سے ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر دیں اور پوچھا۔ ”مشرقی پاکستان سے سرکار کی آمد کب ہوئی؟“

”ہم آج ہی آئے ہیں وہاں سے۔“ میں نے جواب دیا۔ مجھے احساس تھا کہ حفیظ الرحمن فاروقی مقصود کے قالب میں میرا کتنا احترام کرتا ہے۔ میرا لہجہ اسی لئے بدل گیا تھا کہ وہ مجھے ایک برگزیدہ ہستی سمجھتا تھا۔

”حضور! وہاں سے بڑی تشویشک خبریں آرہی ہیں۔ محترم وزیر داخلہ بھی اس سلسلے میں مجھ سے اپنی تشویش کا اظہار کر چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا سرکار کہ اچانک کیا ہو گیا؟“ حفیظ الرحمن فاروقی کہنے لگا۔

”کچھ بھی اچانک نہیں ہوتا، ہاں ہمیں لگتا یہی ہے۔“ میں بولا۔
”بجا فرمایا سرکار نے۔“ اس نے فوراً میری تائید کی، پھر کہا۔ ”حضور تو آج ہی وہاں سے تشریف لائے ہیں، فرمائیے کیا حالات ہیں وہاں کے؟“

”حالات اچھے نہیں ہیں۔ زبان کے مسئلے پر حکومت کے خلاف وہاں روز مظاہرے ہو رہے ہیں، تو تمہارے علم میں بھی ہو گا۔“

”جی ہاں حضور، معلوم ہے۔ آپ کچھ رہنمائی فرمائیے، کس طرح ان حالات پر قابو پایا جا سکا ہے؟“

”ایک ہی صورت ہے اس کی کہ مظاہرین کے خلاف ایکشن لیا جائے اور تاخیر نہ ہو۔“
”میں بھی حضور، وزارت سطح پر یہی بحث جاری ہے۔“ حفیظ الرحمن فاروقی نے بتایا۔ ”اس مسئلے سے غصے کی تمام تر ذمہ داری محترم وزیر داخلہ پر ڈال دی گئی ہے۔ صوبائی وزیر داخلہ کی رپورٹس سے مطمئن نہیں ہیں۔ مجھے بھی آج طلبی کا حکم ملا ہے۔ حضور کے اس خدام کے مشوروں کو وہ بڑی اہمیت دیتے لگے ہیں۔ یہ بھی سرکار ہی کی نظر عنایت کے طفیل ہے۔ محکمہ خوراک و زراعت کے چند بڑے افسران، ذخیرہ اندوزوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف جب سے کامیاب آپریشن ہوا ہے، محترم وزیر داخلہ میری کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہیں۔“

مجھے یہی توقع بھی تھی کہ مرکزی وزیر داخلہ کی نظر میں حفیظ الرحمن فاروقی کی تقریر بڑھ گئی ہو گی۔
”تو پھر ہم تمہارے ہی سپرد یہ ذمہ داری کرتے ہیں کہ آج ہی مرکزی حکومت کی طرف سخت ایکشن کے احکام جاری ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔

”حضور کے حکم کی تعمیل میں یہ خدام کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا۔
”اچھا تو خدا حافظ! ہم چلے۔“ یہ کہتے ہی میں اسے مزید مرعوب کرنے کے لئے اس کی نظروں کو اوجھل ہو گیا۔

مرکزی وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے کراچی میں گفتگو کر کے ڈھاکہ واپس آنے میں بمشکل پانچ

آدھا گھنٹہ لگا ہو گا۔ میں اب مطمئن تھا۔ صرف ایک نوجوان آدم زاد شہاب الدین کی وجہ سے مجھے یہ طویل سفر کرنا پڑا، سو میں اسے کس طرح نظر انداز کر دیتا۔ مجھے یقین سا تھا کہ ونود چڑجی نے کسی نہ کسی طرح حیدر چودھری کی طرح اسے بھی اپنا آلہ کار بنا رکھا ہو گا۔ اس کے گھر کا پتا مجھے معلوم تھا، مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ مجھے ذیشان حیدر کا خیال آیا کہ اسے شہاب الدین کے ٹھکانوں کا ضرور علم ہو گا۔ میں نے اسی لئے ایک مرتبہ پھر چوک بازار کا رخ کیا۔ اس طرح مجھے شہاب الدین کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔

سوئی اور ایندھن مجھے باورچی خانے میں نظر آئیں۔ میرے لئے گھر کا دروازہ کاشان حیدر نے کھولا تھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ذرا ذیشان کو بھیج دیجئے۔ میں نشست گاہ میں ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں آگے بڑھنے لگا۔

”صاحب! کیا کوئی خاص بات ہے جو آپ کو دفتر سے آنا پڑا؟“ کاشان حیدر نے پوچھا۔
”ہاں مختار الدین نے خواہ مخواہ میرے ذمے ایک کام لگا دیا۔ ظالم نے مجھ کو دروازہ دیا کہ ذیشان سے ایک طالب علم کا پتا پوچھ آؤں خود وہ مصروف تھا بہت۔“ میں نے بات بتا دی۔

”ابھی سمجھتا ہوں اسے، آپ چلئے۔“ کاشان حیدر وہیں سے لوٹ گیا۔
سوئی نے گھر میں میری موجودگی محسوس کر لی تھی اور ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا بھی تھا۔ اسے خبر ہی تھی کہ میں کسی کام ہی سے آیا ہوں گا۔ اس سے مجھے کچھ کہنا ہوتا تو آواز دے لیتا۔ وہ اسی لئے باورچی خانے میں ایندھن کے ساتھ کام میں مصروف رہی آدم زادوں کے درمیان وہ کرکس طرح اپنی اصلیت کو چھپائے رکھتا ہے، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

جس آدم زاد کو اپنے قتل کر دیے جانے کا خطرہ ہو، وہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو جاتا ہے۔ اسی سبب جیسے ہی دروازے پر دستک ہوتی ذیشان حیدر کمرے میں چلا جاتا۔ کچھ یہ بھی تھا کاشان حیدر نے اس پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ جب میں موتی جمیل سے لوٹا تھا تو بھی اسے کمرے سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ کیا پتا گھر کے دروازے پر کس نے دستک دی ہو، کون آیا ہو۔ ایسے حالات میں تو آدمی ہر آہٹ پر چونک اٹھتا ہے۔

ذیشان حیدر کو اس کے باپ نے بتا دیا تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔ وہ اسی لئے نشست گاہ میں آتے ہی بولا۔ ”جی صاحب! کس کا پتا پوچھتا ہے؟“
”نیچو تو سہی، ابھی بات کرتے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ ”شہاب الدین کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں صاحب! وہ ایک نمبر کا بد معاش ہے۔ ہماری مخالف تنظیم کے لیڈروں میں سے ایک ہے۔ کل یونیورسٹی میں اسی کے اشارے پر لڑکوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ پھر میرے ساتھ بھی آگئے۔ اس کے ساتھ دس پندرہ طالب علم تھے جنہوں نے میری پٹائی شروع کر دی تھی۔ اگر میری تنظیم کے ساتھی مجھے آ کر نہ بچا لیتے تو جانے کیا ہوتا..... مجھے پٹنے دیکھ کر وہ ذلیل ایک طرف کھڑا ہوتا رہا۔ میں نے مختار الدین صاحب کو بھی اس کا نام بتایا تھا۔ حیدر چودھری اور دلال مگر جی کے جنازوں کے جلوس کی قیادت

کرنے والوں میں یہ شباب الدین بھی تھا۔ "ذیشان حیدر اپنی دانست میں مجھے اس معاملے سے قطعی بے خبر جان کر تفصیل کے ساتھ ساری روداد سنانے لگا۔ "صاحب! ایک دفعہ تو اس نے ایک پولیس انسپکٹر سے کہہ دیا تھا کہ میں جب چاہوں تیری ہیلت اتروا سکتا ہوں۔ پولیس انسپکٹر جواب میں ایک لفظ کے بغیر چلا گیا تھا۔ فشر کا بھتیجا ہے نا صاحب! اسی لئے سب اس سے ڈرتے ہیں۔ ہر پولیس تھانے میں وہ دندناتا ہوا ٹھس جاتا ہے۔ اپنی تنظیم کے کئی لڑکوں کو اس نے چھڑوایا ہے۔"

"یہ بتاؤ ذیشان حیدر! اس وقت وہ کہاں مل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آج کیونکہ کوئی مظاہرہ نہیں ہوتا اس لئے وہ ایک ہی جگہ ہو سکتا ہے۔" ذیشان حیدر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اے جوا کھیلنے کا بھی شوق ہے۔ معلوم نہیں اتنے پیسے اس کے پاس کہاں سے آتے ہیں۔ آپ کو تو خبر ہوگی صاحب کہ ڈھاکہ کلب میں بڑے پیمانے پر جوا ہوتا ہے۔ ہر کوئی تو وہاں گھستا بھی نہیں۔ دن ہو کہ رات وہاں جوا چلتا رہتا ہے۔ وہ آج وہیں ہو گا۔ پینے پلانے کا بھی شوقین ہے اور ڈھاکہ کلب میں شراب خانہ بھی ہے، وہاں بھی وہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ ہماری تنظیم سے ان لوگوں کی کھلی دشمنی ہے اس لئے ہمیں ساری خبریں رکھنی پڑتی ہیں۔ چند روز سے شباب الدین کے ساتھ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی زریںہ کو بھی دیکھا جا رہا ہے۔ شباب الدین سے ملنے وہ یونیورسٹی بھی آتی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں صاحب کہ وہ کون ہے۔"

ذیشان حیدر کے آخری جملے سن کر میں چونکا۔ مجھے گرین کلب میں سینٹا اور حیدر چودھری کی ملاقات یاد آگئی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ شباب الدین بااثر بھی تھا اور بزدل بھی۔ میں سوچنے لگا کہ دونوں چیزیں اب سینٹا کی جگہ ایسے کاموں کے لئے کسی اور فتنہ کو سامنے لے آیا ہے۔

"ویسے تو صاحب! مختار الدین صاحب کو معلوم ہی ہو گا کہ کل دہر کے بعد ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے زبردست مظاہرے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہی جلوس ڈھاکہ ہائی کورٹ جانے لگا۔ مخالف تنظیم کے دوسرے طالب علم رہنماؤں کے علاوہ شباب الدین بھی ان مظاہروں میں پیش پیش ہو گا۔" ذیشان حیدر نے مجھے ایک اور اطلاع دی۔

"میں کہہ دوں گا مختار الدین سے۔" میں بولا اور کھڑا ہو گیا۔ "تم جاؤ۔"

اسی وقت سوی ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹی ہوئی نشست گا۔ میں آگئی۔ ذیشان حیدر چلا گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ آج تو بار بار گھر کے چکر لگا رہا ہے؟ ذیشان حیدر سے کیا کاہ پڑ گیا؟" اس کی آواز دھیمی ہی تھی اور وہ میرے قریب بھی آچکی تھی۔

میں نے مختصر اسے آئی جی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا دیا، پھر اب تک کی بھاگ دو کا حاصل بھی۔ جن زادی سوی کے لئے یہ کوئی تعجب چیز بات نہیں تھی کہ میں اس عرصے میں کراچی چکر بھر گیا تھا۔ ہاں اس نے یہ ضرور کہا۔ "میں کبھی کراچی نہیں گئی، نام بہت سنا ہے۔ اب تیرا ارادہ اصر جانے کا ہو تو میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"میں تو خیر مجھے کم ہی لوگ جانتے ہیں، مگر وہاں بڑی شہرت ہے۔" میں دیرے سے ہنستے ہوا

بولا۔ "بڑے پرستار ہیں مقصود میاں کے وہاں۔ لوگوں کو جب یہ پتا چلے گا کہ مقصود میاں نے شادی کر لی ہے تو دنگ رہ جائیں گے اور اس پر سب سے زیادہ حیرت تیرے دیور کو ہوگی۔"

"دیور، کیا تیرا کوئی بھائی بھی ہے؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تو نے پہلے نہیں بتایا۔"

"بھائی تو خیر نہیں ہے، مگر بھائیوں جیہاں ہی سمجھ لے۔ ہم دونوں ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ یوسف نام ہے اس کا۔ کبھی میں تجھے تفصیل سے اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے اس فشر کے بھتیجے کی خبر لینے کو جانے دے۔" میں بولا اور سوی کے ساتھ نشست گاہ سے نکل آیا۔

میں باہر نکلا تو سوی ہی نے گھر کا دروازہ بند کیا۔ اس مرتبہ میں نے کوئی نیا انسانی قالب اپنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ذیشان حیدر کی فراہم کردہ اطلاع درست ہی نکلی۔ شباب الدین مجھے ڈھاکہ کلب ہی میں ملا۔ جو لوگ آداب سے نوشی سے واقف ہوئے ہیں، دن کے وقت پینے پلانے سے گریز کرتے ہیں۔ ڈھاکہ کلب کے بار میں اسی لئے اس وقت برائے نام لوگ تھے۔ بار تقریباً خالی پڑا تھا۔ اکا دکا میزوں ہی پر مجھے لوگ بیٹھے دکھائی دیئے۔ دن کے وقت چاروں طرف پردے کھینچ کر دم روشنی میں شام کا سماں پیدا کیا گیا تھا۔ جوا کھیلنے کے بجائے شباب الدین اس وقت بار میں کیوں بیٹھا تھا، اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک سیم تن بھی تھی۔

میزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا میں انہی دونوں کے قریب ایک میز پر جا بیٹھا۔ ایسا میں نے دانستہ ہی کیا تھا، حالانکہ وہ دونوں ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے تھے اور درمیان میں بہت سی خالی میزیں تھیں۔ میں چاہتا تو دور بیٹھ کر بھی اپنا کام چلا لیتا۔

جیسے ہی میں وہاں جا کر بیٹھا، ان دونوں ہی کی نظریں میری طرف اٹھیں۔ میں ایسا بن گیا کہ انہیں دیکھا ہی نہ ہوں

ویٹر آرڈر لینے آگیا تو مجھے وہاں بیٹھنے کا "نیکس" بھی ادا کرنا پڑا۔ میں نے کھانے کے لئے زیادہ اور پینے کو کم منگوایا، کیونکہ مجھے سے نوشی نہیں کرنا تھی۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے نکلیوں سے اس نوجوان لڑکی پر نظر ڈالی۔ بلاشبہ وہ حسین تھی۔ میں نے پہلے اسی کے ذہن پر توجہ دی کہ اس کی حقیقت جان سکوں۔ میرا اندازہ سو فیصد صحیح ثابت ہوا۔ اس عادت گروہوش نے دونوں چیزیں ہی کے حکم پر شباب الدین کا شکار کیا تھا۔

اس نے اپنا نام شباب الدین کو زریںہ ہی بتایا تھا لیکن وہ سروج تھی۔ اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے یہ گمان بہر حال نہیں تھا کہ وہ بھی سینٹا کی طرح حسین و پرکشش ہوگی۔ عمر میں بھی وہ سینٹا سے کم از کم پانچ سال چھوٹی تھی۔ سروج اس وقت داری کے علاقے سے فرار ہوئی تھی۔ جب مندر ناتھ پکڑا گیا تھا۔ داری سے فرار ہو کر وہ رنکن اسٹریٹ میں ایک اور تخریب کار کے گھر پہنچ گئی تھی۔ یہ تخریب کار جب میرے ہاتھوں دھان منڈی میں مارا گیا اور دونوں چیزیں کو پتا چلا تو اس نے سروج کو خطرے

کا گنل دے دیا۔ رکن اسٹریٹ کی سکونت ترک کر دینے کے بعد سروج' آئندہ سے ملی۔ آئندہ نے مہ جیل ہی کے علاقے میں اس کی سکونت کا بندوبست کر دیا۔ سروج کا ذہن پڑھنے میں مجھے کوئی دشوار پیش نہ آئی۔ وہ مضبوط قوت ارادی کی مالک نہیں تھی، نہ غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ ونود چوبی ا۔ محض ایک خوبصورت کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا تھا۔ اس عرصے میں سروج نے کئی بڑے سرکار افسران سے تعلقات استوار کر لئے تھے۔ مجھے ان کے نام بھی معلوم ہو گئے۔ ان افسران کا تعلق مختلف سرکاری محکموں سے تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور تخریب کار کا پتا چل گیا۔

ونود چوبی کا یہ خوبصورت کھلونا بھی آخر میری زد پر آئی گیا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں مسکراہٹ آگئی۔

”وہ غیبت اب تمہاری طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہا ہے۔“ شاب الدین غصے میں اپنی آواز پر قابو رکھ سکا۔

”تو کیا ہوا، دیکھنے دو اسے۔“ سروج ہنس دی۔

”نہیں زریں! مجھے لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر ہماری میز کے قریب آکر بیٹھا ہے۔“ شاب الد

کی آواز اب بھی تیز تھی۔

میں نے اس عرصے میں ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ شاب الدین کے ذہن پر توجہ دے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی جیب میں بھرا ہوا روپو اور موجود ہے۔ سروج اسے سمجھانے لگی۔

دامغ ٹھنڈا رہو شاب! تمہیں اونچی آواز میں نہیں بولنا چاہئے۔ وہ سن لے گا۔“

”تو سن لے..... میں ابھی اس سے جا کر کہتا ہوں کہ کسی اور جگہ بیٹھے۔“ یہ کہتے ہی وہ ا جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس دوران میں وہ میرا آرڈر سروس کر کے جا چکا تھا۔

”اے!“ شاب الدین قریب آکر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے بڑی شائستگی کا مظاہرہ کیا۔

”زیادہ شریف بننے کی کوشش نہ کر۔“ شاب الدین میری توقع کے مطابق اور زیادہ شیر ہو گیا!

”کیا تو اندھا ہے؟“

”نہیں جناب!“ میں اسے چڑانے اور خود کو بزدل ثابت کرنے کی غرض سے بدستور دھیمی

میں بولتا رہا۔ ”مجھے تو سب کچھ صاف نظر آتا ہے۔“

”اگر تو اندھا نہ ہوتا تو تجھے دوسری خالی میز پر نظر آگئی ہوتی۔“

”آپ فرماتے ہیں تو میں کہیں اور بیٹھ جاتا ہوں۔“ میں بولا۔ ”مگر زریں سے پوچھ لیں“

اسے تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”کیا؟“ وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ ”تو زریں کو کیسے جانتا ہے؟“

”جیسے آپ جانتے ہیں۔ اس سے آپ کے تعلقات تو چند روز کے ہوں گے، میں تو اس کا

شنا ہوں۔ یہاں میں بلاوجہ نہیں بیٹھا، زریں ہی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں اس وقت ہو گی۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو زریں سے پتا کر لیں کہ وہ مجھے جانتی ہے یا نہیں۔“ میری آواز میں اب تک نرمی تھی۔

شاب الدین نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر غرابا۔ ”اگر زریں نے انکار کر دیا کہ وہ تجھے نہیں جانتی تو میں تیرا بہت برا شکر کروں گا۔“ مجھے دھمکی دے کر وہ پلٹا۔

میز قریب ہونے کے سبب سروج پہلے ہی سب کچھ سن چکی تھی۔ اس کا ذہن اب میرے اثر میں تھا۔

”زریں! تم جانتی ہو، اس لفٹ کے؟“ شاب الدین نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔

”تو اس میں اتارنے غصے کی کیا ضرورت ہے؟ تم بیٹھ کر بھی یہ بات کر سکتے ہو۔“ سروج نے اس کا

ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟“ شاب الدین کرسی پر بیٹھ تو گیا مگر اس کا غصہ کم نہ ہوا۔

”کسی کو جانتا کوئی جرم تو نہیں ہے۔“ سروج بولی۔

”میں پوچھتا ہوں کہ تم نے اسے یہاں بلایا کیوں؟“

”تم تو مجھ سے اس طرح یہ سوال کر رہے ہو جیسے میں تمہاری زر خرید کینز ہوں۔ میں کسی سے بھی

ملوں، تم کون ہو مجھے روکنے والے؟“

”میں کون ہوں، بتاؤں تمہیں؟“ شاب الدین کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس کا ذہن اب بھی میرے قابو

میں تھا۔

”اگر اسی طرح کبواس کرتے رہے تو میں اس کی میز پر بیٹھ جاؤں گی۔“

”اچھا تو پھر اٹھ کر دیکھو۔“ یہ کہتے ہوئے شاب الدین نے اپنی جیب سے روپو اور نکال لیا۔

سروج طنزیہ انداز میں ہنسی، پھر بولی۔ ”تمہارا خیال ہے کہ میں اس کھلونے سے ڈر جاؤں گی، میں

اٹھ کر جا رہی ہوں، اس کے پاس روک سکو تو.....“

”بیٹھی رہ بیٹھی، ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔“ شاب الدین اتنی زور سے چیخا کہ بار میں دور دور

بیٹھے ہوئے لوگوں تک بھی اس کی آواز پہنچ گئی۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کر کاؤنٹر تک پہنچ گیا۔ اب یہ ضرورت نہیں

رہی کہ میں انسانی قالب اختیار کئے رہوں۔ میرے ساتھ ہی کئی افراد اور اٹھے۔ وہ بھی میری طرح کاؤنٹر

پر مل ادا کر کے بار سے نکل گئے۔ میں انسانی قالب چھوڑ کر دوبارہ بار میں آ گیا۔

”دیکھ لے وہ تیرا بزدل عاشق فرار ہو گیا۔“ شاب الدین اب بھی چیخے جا رہا تھا۔

میں نے بار کے مینجر اور دیگروں کو تیزی کے ساتھ ادھر لپکتے دیکھا۔

”کسی نے بھی میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“ شاب الدین اچھل

کر کھڑا ہو گیا۔

نہیں مانی۔ اس کی ایک جھلک میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مجھے پسند آگئی۔ پھر اس نے افضل کے گھرائی ماں کے ساتھ آنا چھوڑ دیا۔ مجبوراً میں نے اسے اغوا کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے پچھ دوستوں کے ساتھ میں ایک رات ہزاری باغ پہنچ ہی گیا۔ افضل بھی میرے ساتھ تھا، کیونکہ اس نے مرن کا گھر پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ ہم کار میں گئے تھے اور اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ میرے پاس یہی ریوالور تھا جس سے آج میں نے زہینہ کو قتل کیا ہے۔ دستک دینے پر دروازہ کھلا تو ہم زبردستی گھر میں گھس گئے۔ میں نے ریوالور نکال لیا تاکہ کوئی چیخے چلائے نہیں جب میں مرن کو گھیشتا ہوا گھر سے نکال کر لے جا رہا تھا تو اس کی ماں مجھے روکنے کے لئے آگے بڑھی۔ میں نے اسے گولی مار دی۔ مرن خوف سے بے ہوش ہو گئی۔ اسے افضل اٹھا کر بھاگا۔ لوگ گولی چلنے کی آواز سن کر گھروں سے نکلے تو میں نے انہیں ڈرانے کے لئے دو ہوائی فائر کر دیئے۔ خوفزدہ ہو کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔ یوں ہمیں فرار کا موقع مل گیا۔ میں نے کسی دوست کو مرن کے قریب نہیں آنے دیا۔ میرے دوست مجھ سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کوئی کچھ نہ بولا۔ مرن صرف میرے حصے میں آئی۔ بعد میں افضل سے معلوم ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ مرن کا باپ زندہ ہے۔ یا وہ بھی مر گیا، مجھے نہیں معلوم۔ ”شاب الدین نے اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ تھانیدار کے حکم پر اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

میں نے شاب الدین پر گہری نیند مسلط کر دی۔ اب اس کی آنکھ آئندہ روز سے پہلے نہ کھلتی۔ دوسرا ہندوستان میں نے یہ کیا کہ کل ہی صبح شاب الدین کا چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے تاکہ وہ عدالت کے روبرو بھی اپنے جرائم کا اعتراف کر لے۔ اس کے لئے مجھے تھانیدار کو اپنے اثر میں لینا پڑا۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی ایسی کسر نہیں چھوڑی کہ وہ بدکردار آدم زاد قانون کی گرفت سے بچ سکے۔

پے در پے میں غیر ملکی تخریب کاروں کو ان کے انجام تک پہنچا رہا تھا۔ سروج کا ذہن پڑھ کر مجھے جس ملک دشمن کے بارے میں معلوم ہوا، وہ مسلمان تھا۔ اس پر مجھے رنج سا ہوا۔ وہ بھی سرحد پار سے آیا تھا۔ آئندہ نے اسی کے ساتھ سروج کے رہنے کا ہندوستان کیا تھا۔ مجھے اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ کمال نامی اس تخریب کار کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کر پاتا۔ ستم تو یہ تھا کہ اس نے سی آئی ڈی آفس میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ اس سے یہ کہہ کر پوچھنے والا نہیں تھا کہ وہ ایک معمولی چڑھائی ہونے کے باوجود موتی جھیل جیسے علاقے میں کیسے رہتا ہے۔ چڑھائی ہو کر بھی وہ ونود چڑھی کے لئے ابھی تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ جس تخریب کار کا مجھے پتا چل گیا، اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔ اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی کہ جب میں مقتودین کرسی آئی ڈی آفس میں داخل ہوا۔ ”ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بدرالدین کے پی اے سے میں نے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا۔ ”لج کے بعد صاحب آرام کرتے ہیں اور اندر سے ان کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہوتا ہے۔ خود ہی وہ دروازہ کھول کر نکلتے بجاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جاگ چکے ہیں۔“

”کھنٹی کس لئے بجاتے ہیں؟“ میں نے پوچھ لیا۔

مینجر اور وٹیر میز سے کچھ ہی فاصلے پر رک گئے۔ پھر مینجر ہی ہمت کر کے بولا۔ ”ریوالور جیب میں رکھ لیجئے جناب! آپ کو جانتا ہوں میں۔ آپ ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ براہ مہربانی اپنے جذبات پر قابو رکھئے۔“

”اس کو مت سمجھاؤ مینجر! یہ ایک پاگل کتا ہے اور کتے انسانوں کی زبان نہیں سمجھتے۔“ سروج نے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے پاگل کتا کتا ٹوٹے..... تو پھر یہ لے۔“ شاب الدین نے پہلی گولی چلائی، پھر دوسری اور تیسری۔

پے در پے دھماکوں سے بار گونج اٹھا۔ پہلی گولی سروج کے سینے میں، دوسری گردن میں اور تیسری سر میں لگی۔ ونود چڑھی کا خوبصورت کھلونا جیسے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ سروج لہرا کر فرش پر گری اور دم توڑ دیا۔ شاب الدین کو میں نے ابھی تک اپنے اثر سے آزاد نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے ریوالور پھینک دینے کا حکم دیا۔ فوراً ہی اس نے میرے حکم کی تعمیل میں سروج کی لاش پر ریوالور پھینک دیا۔

مینجر نے اسے غیر مسلح دیکھتے ہی میٹروں کو اشارہ کیا جنہوں نے لپک کر اسے جکڑ لیا۔ شاب الدین نے مزاحمت نہیں کی۔ اسے یہ سزا میں نے بلا سبب نہیں دی تھی۔ کئی لڑکیوں کی زندگی تباہ کرنے کے علاوہ اس نے ایک قتل بھی کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک بوڑھی اور غریب عورت ماری گئی تھی۔ یہ قتل شہر کے ایک نواحی علاقے ہزاری باغ میں ہوا تھا۔ شاب الدین سے میں پولیس کے روبرو اس قتل کی روداد بھی بیان کرنا چاہتا تھا۔ غریبوں کی اس جھوٹی سی آبادی میں ہونے والے اس قتل کی تفتیش سے دلچسپی بھی کسے تھی۔ کوئی پیروی کرنے والا بھی تو نہیں تھا۔ قتل ہونے والی کا شوہر خود لب دم تھا۔

مینجر نے پولیس کو فون کر کے بلا لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر کسی طرح پولیس کو پتا چل گیا کہ شاب الدین، صوبائی وزیر داخلہ کا بھتیجا ہے تو میں جو چاہتا ہوں، وہ نہیں ہو گا۔ اس قتل کی پکی ایف آئی آر کڑ ضروری تھی تاکہ شاب الدین کسی طرح بچ نہ سکے۔ میں اسی لئے وہاں سے نہیں ہلا۔ پھر نہ تو شاب الدین کی زبان پر صوبائی وزیر داخلہ کا نام آیا اور نہ مینجر نے اپنے بیان میں یہ ظاہر کیا حالانکہ وہ شاب الدین سے واقف تھا۔

یعنی شاہدوں کے بیانات قلمبند کر لئے گئے۔ ضروری کارروائی کے بعد سروج کی لاش بھی وہاں سے پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دی گئی۔ اس ریوالور کو پولیس نے قبضے میں لے لیا جس سے قتل ہو تھا۔ سروج کے قتل کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ شاب الدین نے ایک اور قتل کی روداد بھی بیان کی۔

”یہ اب سے دو ماہ پہلے کی بات ہے۔“ شاب الدین اپنا اقبالی بیان لکھوا رہا تھا۔ ”میرے ایک دوست افضل نے مجھ سے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی مرن کا ذکر کیا۔ وہ اپنی بوڑھی بیوہ ماں کے ساتھ افضل کے گھر کا کام کاج کرنے آتی تھی۔ مرن کا باپ تپ دق کا مریض تھا۔ بھائی کوئی تھا نہیں مرن اپنے ماں باپ کی اکوتی بیٹی تھی۔ پہلے میں نے افضل کے ذریعے مرن کو پیسوں کا لالچ دیا، مگر

”چڑاسی کو بلانے کے لئے۔“ پی اے نے بتایا۔ ”سو کرائٹھنے کے بعد صاحب چائے پیتے ہیں لیکن آپ یہ سب کچھ کس لئے پوچھ رہے ہیں؟“

”بس یوں ہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہو جائے صاحب سے ملنے کے لئے کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔“

میں پہلے بھی ایک مرتبہ وہاں آ چکا تھا، مگر بدرالدین کا بوڑھا اور گنجا پی اے مجھے پہچان نہیں سکا۔ شاید اس کی نظر کمزور تھی اور حافظہ بھی۔

”بیٹھ جائیں ادھر کرسی پر، بس اب کھٹی بجتے ہی والی ہو گی۔“ پی اے نے دیوار کے قریب پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنا نام تو میں پرچی پر لکھ کر دے دوں تاکہ صاحب اٹھ جائیں تو آپ پرچی اندر بھجوا دیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ ٹنگی ہوئی ہیں پرچیاں، لے لیں۔“ پی اے نے سامنے انگلی اٹھائی۔

دیوار میں پوسٹ ایک کیل سے تار لٹکا ہوا تھا جس میں چھوٹی چھوٹی پرچیاں پرو دی گئی تھیں۔ میں نے ایک پرچی اس میں سے کھینچ لی اور پی اے سے قلم لے کر اس پر صرف مقصود میاں لکھ دیا۔ پرچی پی اے کو دے کر میں کرسی پر جا بیٹھا۔

”صاحب کا چڑاسی بھی اب لچ کر کے آتا ہی ہو گا، تین بجتے والے ہیں۔“ پی اے نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

میراجی چاہا کہ ٹائل بدرالدین اور اس کے بوڑھے پی اے دونوں کو اٹھا کر بوڑھی گنگا میں پھینک آؤں۔ شرکی حالت دگرگوں تھی اور بدرالدین قیلولہ کر رہا تھا۔ وہ تخریب کار کمال بھی اسی دفتر میں چڑاسی تھا، مگر پہلے میں نے بدرالدین سے ملنا ضروری سمجھا۔ کمال تو خیر اب مجھ سے کہاں بچ کر جاتا کہ مجھے اس کے ٹھکانے کی بھی خبر تھی، البتہ بدرالدین دفتر سے سرک لیتا۔ قیلولہ کر کے چائے پینے کے بعد وہ عمو دفتر سے نکل لیتا تھا۔ جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا تو بھی گھر جانے کی جلدی تھی۔

تین بجتے میں چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے اسی لئے بے مبری نہیں دکھائی ورنہ بدرالدین کے بند کمرے میں گھسنا کیا دشوار تھا۔ بس یہی تو ہوتا کہ اس کے لئے مجھے انسانی قالب سے باہر آنا پڑے لیکن دفتری اوقات میں سونے پر اسے مزہ ضرور چکھا دیتا۔

سو کرائٹھنے، اندر سے دروازے کی جتنی کھولنے اور کھٹی بجانے کے معاملے میں کم از کم بدرالدین نے پوری ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ چڑاسی بھی یقیناً بدرالدین کا مزاج آشنا تھا۔ وہ بھی گھڑی بھر پہلے ہی آ ہو گا۔ کھٹی بجتے ہی وہ لپکا اور اندر چلا گیا۔

میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی پی اے کو مخاطب کیا۔ ”اب چڑاسی باہر آئے تو آپ اسے پرچی دے دیں۔“

”کیا کہا؟ ادھر آ کے بتائیں۔“ پی اے نے بھی جواب میں ہانک لگائی۔ شاید وہ اونچا بھی سنتا تھا۔

مجھے اٹھ کر اس کے پاس جانا پڑا اور اپنا جملہ دوہرایا۔

”پہلے وہ صاحب کے لئے چائے بنا کر لائے گا، پھر میں اسے پرچی دوں گا۔ اگر وہ فوراً چائے بنا کر نہ لائے تو صاحب ناراض ہو جاتے ہیں۔ چائے پینے بغیر وہ کسی کی کوئی بات نہیں سنتے۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں اپنی جگہ جا کر..... اور ہاں، میں آپ سے ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گیا، صاحب سے کیوں ملنے آئے ہیں؟ وہ مجھے بلا کر پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا میں؟ ہاں تو جلدی سے بتا دیں۔“ پی اے نے وہ پرچی اٹھالی جس پر اسے میں نے نام لکھ کر دیا تھا۔

اسی اثنا میں چڑاسی اندر والے کمرے سے نکلا اور چائے بنانے چلا گیا۔ اس پر میں اور جل بھن گیا۔ پی اے نے پرچی الٹی کر کے قلم اٹھالیا۔

”کیا آپ اس پرچی پر لکھیں گے کہ میں کیوں ملنے آیا ہوں؟“ میں نے اسے گھورا۔

”ہاں، صاحب کا یہی حکم ہے کہ پرچی کے پیچھے ملاقات کی وجہ لکھ دی جائے۔ پھر انہیں مجھے بلانے اور پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”تو پھر لکھیں کہ آج رات صاحب کی کوٹھی پر ڈاکہ پڑنے والا ہے اور میں اس کی اطلاع دینے آیا ہوں۔“ میرے صبر کا پیمانہ آخر لبریز ہو ہی گیا۔

پی اے مجھے حیرت سے دیکھنے لگا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ میں جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر تیزی سے دائیں جانب گھوما اور دروازہ کھول کر بدرالدین کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کئے گھومنے والی کرسی پر نیم دراز تھا۔ نظر کے دو جٹے سامنے ہی اس کی میز پر پڑے تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سننے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھے ہی وہ انگریزی میں زور سے بولا۔ ”کون ہو تم؟ اور بغیر اجازت میرے کمرے میں کیسے.....“

”چشمہ لگا کر آپ مجھے دیکھیں تو شاید پہچان جائیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آئے، شاید اسی وجہ سے قریب کا چشمہ لگا لیا، پھر غلطی کا احساس ہوتے ہی بڑبڑا کر دوبارہ چشمہ اٹھایا۔

میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چشمہ لگا چکا تو میں نے پوچھا۔ ”اب آپ مجھے پہچانے؟“

ابھی وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ اس کا پی اے اندر آ گیا اور وہ چٹ سامنے رکھ دی جس پر میرا نام لکھا تھا۔ پھر اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”سر! یہ صاحب ایک دم آپ کے کمرے میں گھس آئے۔ میں نے ان کو بتا بھی دیا تھا کہ صاحب چائے پینے کے بعد.....“

”گھٹ آؤ۔“ بدرالدین نے میرا غصہ پی اے پر اتار دیا۔

”میں سر! کہتے ہی پی اے کمرے سے نکل گیا۔“

بدرالدین نے دور کا چشمہ اتار کر قریب کا چشمہ لگایا اور وہ چٹ اٹھا کر پڑھی جس پر مقصود میاں لکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے چٹ کو الٹ کر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ وہ میرا نام بھول چکا ہے۔ چٹ کے پیچھے

کچھ نہ لکھا دیکھ کر اس کی تیوریوں پر مل پڑ گئے۔

”اگر میرا نام یاد نہیں رہا تو چہرے کو غور سے دیکھ لیں۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔
”تمہیں معلوم ہے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔“ وہ چیخ اٹھا۔ ابھی تک اس نے دور کا چشمہ نہیں لگایا تھا۔ ”سڑتے رہو گے زندگی بھر جیل میں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔“ مجھے دھمکی دے کر اس نے اپنا سرکاری عہدہ بتایا۔ غصے کی وجہ سے وہ کانپنے لگا تھا۔

میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کر دیا اور پُر سکون آواز میں بولا۔ ”بہتر یہ ہے کہ آپ دور کی نظر کا چشمہ لگالیں تاکہ بعد میں مجھے پہچاننے کے بعد اظہارِ افسوس نہ کریں۔ میں وہی مقصود میاں جو پہلے بھی آپ سے مل کر جا چکا ہوں۔ اس ملاقات کو دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ کراچی سے آیا ہوں میں۔“
کراچی کا نام سن کر اس کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوا۔ دارالحکومت تو بہر حال دارالحکومت ہوتا ہے اور دور بیٹھے جھوٹے بڑے سرکاری افسران اس کا نام سن کر کچھ نہ کچھ تو مرعوب ہو ہی جاتے ہیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک چشمہ اتار کر دوسرا چشمہ لگایا اور مجھے گھورنے لگا۔

اسی وقت چڑاسی کمرے میں داخل ہوا اور میز کی دائیں جانب چائے کا کپ رکھ کر چلا گیا۔
”پہلے آپ چائے پی لیجئے“ مجھے زیادہ جلدی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ کچھ آدم زاد چائے وغیرہ پینے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر ان کا دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ یہی سوچ کر بدرالدین کو میں نے چائے پینے کا مشورہ دیا تھا۔

اس نے فوراً میرا مشورہ قبول کر لیا اور جھوٹے کو بھی مجھ سے چائے کے لئے نہیں پوچھا۔
”تمہیں جلدی نہ ہو لیکن مجھے ہے۔ فالٹو وقت نہیں ہے میرے پاس“ مجھے گھر بھی جانا ہے۔“
چائے کے دو تین گھونٹ لے کر وہ مجھ سے بولا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے واقعی بھول چکا تھا۔ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کردہ خصوصی اختیار نامہ دکھا دیا تھا میں نے آپ کو“ پہلی ہی ملاقات میں۔ غیر ملکی تحریک کاروں کے سلسلے میں بھی آپ سے میری گفتگو ہوئی تھی۔“ پھر میں نے پہلی ملاقات کی کئی باتیں دوہرائیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس روز میں اپنے ساتھ اختیار نامہ نہیں لے گیا تھا۔ مجھے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ اس کا حافظہ اتنا کمزور ہو گا۔ ذرا سی یاد دہانی کے لئے میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار نہیں لایا۔ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔

”اچھا..... یاد آ گیا مجھے“ آپ وہ ہیں۔“ آخر اس نے مجھے پہچان ہی لیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ کی یادداشت واپس آگئی۔“

”ویری سوری مسٹر مقصود میاں!“ بدرالدین نے معذرت کر لی۔ ”لیکن آپ..... آپ تو شاید دوسرے دن آنے کے لئے..... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے.....“

”جی ہاں“ میں نے آپ سے دوسرے دن صبح دس بجے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے فوری طور پر کراچی جانا پڑ گیا۔ ایک ضروری کام سے۔ غیر ملکی تحریک کاروں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے میں نے

تجویز دی تھی آپ کو“ شاید وہ تجویز بھی آپ کو یاد آ جائے۔“

”بالکل بتائیے، کیا تجویز تھی وہ؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”یعنی آپ وہ تجویز بھی بھول گئے۔“ اس پر مجھے غصہ تو آیا مگر پی گیا۔ اس بے وقوف آدمی کے رات کا دائرہ آئی جی سے بڑا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”ٹھکے کے ذہن، قابلِ اعتماد۔ دارالافران کی ایک میٹنگ طلب کرنے کی تجویز میں نے پیش کی تھی۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ..... مجھے یاد ہے“ میں نے دوسرے ہی دن ایک سرکلر جاری کر دیا وہ..... وہ ہو گا فائل میں، منگوا کر دکھاؤں آپ کو؟“

”اب کیا کرنا ہے، اسے دیکھ کر رہنے دیں۔ وہی سرکلر پھر کل صبح کے لئے جاری کر دیں۔ بس میں آپ کو تاریخ اور وقت بدلنا پڑے گا۔“ میں اس کے مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے اس وقت تو میٹنگ نہیں ہو سکتی۔“ مجھے اس کے چہرے پر الجھن نظر آئی تو یہ بھی بتا دیا کہ میٹنگ کرنے کا مقصد کیا تھا۔

”ادہو۔“ بدرالدین خوش ہو گیا۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔“ اس کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اسے پکائی مل رہی تھی۔ واہ واہ اسی کی ہوتی۔

اگر یہ معاملہ آئی جی نور الدین اسلام کے دائرہ اختیار میں ہوتا تو میں ہرگز بدرالدین سے نہ ملتا۔
”ٹھہریے“ میں ابھی آفس سرکلر کی فائل منگواتا ہوں تاکہ آپ کے سامنے ہی تاریخ اور وقت بدل۔ سرکلر دوبارہ ٹائپ ہو جائے گا اور میں کل صبح آتے ہی اس پر دستخط کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہی بدرالدین نے گھٹنی بجا کر اپنے چڑاسی کو بلایا اور پی اے سے مطلوبہ فائل لے کر آنے کے لئے کھڑا ہوا۔ ذرا بعد اس کا پی اے فائل لے آیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تاریخ تو کل کی ہو گی“ یہ آپ بتا ہی چکے، اب وقت بھی بتا دیجئے۔“ اس نے فائل کھولی تو سب سے اوپر وہی سرکلر لگا ہوا تھا، یعنی اس کے بعد میٹنگ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

”صبح نو بجے کا وقت رکھ لیجئے۔“ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

بدرالدین نے اسی سرکلر میں وقت اور تاریخ بدل کر فائل پی اے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”جی ہاں“ میں نے اس پر سب سے پہلے دستخط کر دیں۔ سرکلر مجھے اپنی میز پر لایا ہوا ملنا چاہئے۔“

”ایسا ہی ہو گا سر!“ پی اے بولا اور جانے لگا۔

”سنو!“ بدرالدین نے آواز دے کر پی اے کو روک لیا اور بولا۔ ”چائے بھی بھجوا دینا مقصود میاں لے۔“ ان کو پہچان لیا اچھی طرح، یہ جب بھی آئیں فوراً مجھ سے ملو۔“

”میں زیادہ چائے نہیں چیتا، منع کر دیں۔ کام بھی ہے مجھے، اور نہیں بیٹھوں گا۔“ میں بول اٹھا۔
”نک بدرالدین سے مزید گفتگو کرنے اور کوفت اٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں رہی تھی۔ میں اس سے اب آئندہ روز میٹنگ طلب کرنے کے لئے کہنے آیا تھا جس میں اتنا وقت لگ گیا۔ سرکاری دفاتر کی

کسی کے گمان میں بھی نہ آتا۔ کمروں کی تلاشی لینے پر مجھے کوئی کارآمد شے نہیں ملی۔ کرنی، دو اور، ایک رانگل، گولیاں، کارٹوس اور ٹرانسیر، میرے نزدیک ان کا شمار کارآمد اشیاء میں نہیں تھا۔ مجھے ایسی شے کی تلاش تھی جس کی مدد سے کچھ اور غیر ملکی دشمنوں کا سراغ مل سکتا یا ان کے سرغنہ چز جی کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی۔ کمروں کی حالت سے میں نے اندازہ کر لیا کہ جج اور کمال کے کمرے کون سے تھے۔ میں نے ان دونوں کمروں میں موجود ہر شے کو بنظر غائر دیکھا ابھی میں تلاشی لے کر صحن میں آیا تھا کہ کوٹھی کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میرا شکار موت کے جال پھنسنے کے لئے آ رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں اسے میں نے اندر آتے دیکھا۔

”کمال!“ اسے میں نے آواز دی تو وہ اچھل پڑا۔

”کمال کون..... کون..... کون ہے؟“ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ ابھی صحن میں ظاہر ہے اسے وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ کسی کمرے میں وہ ہوتا تو شاید یہی خیال کرتا، کہیں کوئی چھپ سے پکار رہا ہے۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔

”تو کیونکہ ایک لادین آدم زاد ہے، یعنی کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ یہ فانی دنیا ہی تیرے لئے سب ہے۔ تو صرف نام کا مسلمان ہے، وہ بھی اس لئے کہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہو گیا۔ میں اگر تیرے کا جواب دے بھی دوں، تو تجھے کس طرح یقین آئے گا۔ تو نے جنات کا ذکر تو سنا ہو گا نا؟“

”جج..... جن..... ناٹ!“ کمال کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ ہکلائے لگا۔ ”کیا..... کیا..... تم کوئی جن ہو؟“

- ”ہاں جس طرح تو آدم کی اولاد ہونے کے ناطے آدم زاد یا آدمی کہلاتا ہے، اسی طرح میں ایک زاد ہوں۔“ میں نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولا۔ ”جادو..... بنگال کا جادو..... غلط سوچا تو نے۔ کوئی جادوگر نہیں ہوں۔“

”تم اگر وہ..... واقعی کوئی جن ہو تے..... تو مجھے معاف کر دو۔“ وہ عاجزی پر اتر آیا۔

”یہ بتا کمال کہ تیرے کیا کیا قصور معاف کروں؟ تو نام کا مسلمان سہی لیکن تیرے ماں باپ تو ان ہیں، اتنا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ تو صرف چند نکلوں کی خاطر اس ملک کی جڑیں کاٹنے پر آمادہ ہو گیا جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے قربانی دی ہے..... تو نے اپنا سودا بہت سستے داموں کر لیا، لعنت ہو تجھ پر اسے جہنمی، زانی، بدکار، مکار..... تو نے صرف اپنا عیش دیکھا، دنیا دیکھی اور ت کو بھول گیا..... مرتد کی سزا تجھے معلوم ہے؟ اگر نہیں جانتا تو میں بتا دوں کہ دین سے پھر جانے کے حقوق تو نے ادا نہیں کئے لیکن تجھے خلق خدا کے حقوق پر ڈاک ڈالنے کا اختیار کس نے دیا؟“

”میں نے اس کے پتلو پر ضرب لگائی اور چیخنے بھی نہ دیا۔ ”اللہ کی مخلوق کو قتل تو نے کیا، ان سے پچھنا، انہیں ناکرہ گناہوں کی سزا دی۔ کیا نہیں کیا تو نے؟ اس پر بھی کہتا ہے کہ تجھے معاف کر دیا۔ سن اسے بد بخت! تجھ جیسے ظالموں کو معاف کر دینا بھی ظلم ہے..... وہ مال و دولت جو تو نے جمع

کا کر دگی سے میری بیزاری بلا وجہ نہیں تھی۔ بدرالدین بہت بھد ہوا کہ میں چائے پی کر ہی جاؤں، مگر یہ انکار، اقرار میں نہیں بدلا۔ مجھے ابھی کمال سے بھی نمٹنا تھا۔

اس دن بھی مجھے بدرالدین اپنے کمرے کے باہر تک چھوڑنے آیا اور چلتے چلتے کہا۔ ”کل صبح ضرور آئیے گا مقصود میاں!“

بدرالدین کا چڑاسی ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میری نگاہ ادھر ہی تھی۔ خلاف توقع اسے میں نے چوکتے دیکھا۔ سی آئی ڈی آفس میں مجھے جس غیر ملکی تخریب کار کو تلاش کرنا تھا، وہ چڑاسی کی حیثیت ہی سے وہاں ملازم تھا۔ میں نے بدرالدین کو ”خدا حافظ“ کہا اور آگے بڑھتے ہوئے اس چڑاسی کے ذہن کو ٹولا۔ چونکہ اٹھنے کی وجہ فوری طور پر مجھے معلوم ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا، آج گھر پہنچنے ہی میں، تھری زیرو کو یہ اطلاع دوں گا کہ مقصود میاں کا پتا چل گیا ہے۔ تھری زیرو، یعنی دونو چز جی کی طرف سے اسے ہدایت ملی تھی کہ مقصود میاں نام کا اگر کوئی شخص، بدرالدین سے ملنے آئے تو اس پر نگاہ رکھے۔ گزشتہ ہفتے کے دوران میں دونو چز جی کی بات اس سے معلوم کر چکا تھا کہ میرا کچھ پتا چلا یا نہیں۔ بدرالدین سے پہلی اور آج کی ملاقات ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ چڑاسی کو میرے نام کی چٹ لے کر نہیں جانا پڑا تھا۔ اسی چڑاسی کا نام کمال تھا۔ بھل میں بچہ اور شرمیں ڈھنڈورا۔ اردو زبان کا یہ محاورہ شاید ایسے ہی موقوف کے لئے تخلیق ہوا ہے۔

میں یہ جان کر بھی سی آئی ڈی آفس سے باہر آ گیا کہ میرا شکار اندر ہے۔ کمال کے ذہن کا ابھی مزید مطالعہ باقی تھا۔ یہ امکان بہر حال تھا کہ اس سے کام کی کوئی اور بات معلوم ہو جاتی۔ اس پر بھی میں غور کر رہا تھا کہ کمال کو اپنے اثر میں لے کر کوئی فریب دیا جائے تو اچھا ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں پیدل آگے بڑھتا رہا۔

مجھے خبر تھی کہ بڑے افسران کے چڑاسی بھی دفتر سے افسران کے اٹھتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ بدرالدین تو پہلے ہی دفتر سے چلا جاتا، اگر میں خلاف توقع نہ پہنچ گیا ہوتا۔ اس نے تو اپنے پی اے سے اس سرکلر پر بھی آئندہ روز صبح دستخط کرنے کو کہہ دیا تھا جو آج کا ٹائپ ہو جاتا۔ سرکلر کی میں نے ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ صرف چند سطروں پر مشتمل تھا۔ اسے ٹائپ ہونے میں پانچ دس منٹ سے زیادہ نہ لگتے۔ بدرالدین اتنی دیر بھی دفتر میں رکنے کا ارادہ نہ تھا تو پھر ان کا چڑاسی کمال کیسے ٹھہر جاتا۔ یوں بھی کمال کو دونو چز جی سے رابطہ قائم کرنے کی جلدی تھی۔ وہ اسی لئے سیدھا موتی جھیل ہی پہنچا۔ میں اس اطمینان کے بعد مزید کچھ دور تک پیدل ہی چلا اور پھر موقع ملنے کا انسانی قالب چھوڑ دیا۔ عموماً میری کوشش یہی ہوتی کہ کوئی آدم زاد مجھے نظروں سے اوجھل ہوتے نہ دیکھ سکے۔ کسی آدم زاد کو خواہ مخواہ خوفزدہ کرنا میرا وطیرہ نہیں تھا۔ کچھ آدم زادوں کے دل اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ کوئی لمبا منظر دیکھ کر دہشت سے مر بھی جاتے ہیں۔

کمال سے پہلے ہی میں اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ چھوٹی سی ایک کوٹھی ہی تھی جس میں وہ کمرے تھے۔ نشست گاہ ان کمروں کے علاوہ تھی۔ صحن بھی خاصا بڑا تھا۔ ایک چڑاسی اس کوٹھی میں رہ

”کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچتے ہی مجھ سے فوراً رابطہ قائم کرنا۔ دھاکہ شہر کے قریب کسی چھوٹی

میں اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ دودو چیز جی کے بارے میں اسے معلوم نہیں تھا، کہاں ہے۔ کمال کو مشرقی پاکستان آئے، کیونکہ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا، اس لئے کئی غیر ملکی تخریب کاروں کے نام بچے اسے معلوم تھے۔ ان میں سے دو چانگام، دو چیپل اور صرف ایک ڈھاکہ شہر میں تھا۔ اسے بھی میں نے اپنی کامیابی تصور کیا۔ میں نے اس عرصے میں سوچ لیا تھا کہ دودو چیز جی کو کمال کے ذریعے کس طرف فریب دیا جا سکتا ہے۔ اسے میں نے اپنے اثر میں لے کر دودو چیز جی سے رابطے پر مجبور کر دیا۔ ذرا ہی دن بعد وہ ٹرانسپیر دودو چیز جی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے خیال رکھا کہ اس کی آواز خوابیدہ سی نہ ہو۔

توقع کے مطابق دروازہ ذیشان حیدر کے باپ ہی نے کھولا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے وجود میں باریک باریک سونیاں پیوست ہو گئی ہیں۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ میں لڑکھڑایا تو کاشان حیدر نے لپک کر مجھے سنبھال لیا۔

”کیا ہوا صاحب! ابھی تو آپ ٹھیک تھے؟“ کاشان حیدر نے گھبرا کر پوچھا۔ ”ادھر آپ کی بیگم صاحبہ کی حالت بھی خراب ہے۔“

میں نے ایک اور بڑی خبر سنی۔ ممکن ہے کہ میں وحشت زدہ ہو کر اس گھر سے بھاگ جاتا، مگر سوسے کے خیال نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

”مجھے اندر لے چلو۔“ میں نے شدید تکلیف و اذیت کے باوجود بمشکل کاشان حیدر سے کہا۔

”ٹھہریے، پہلے میں گھر کا دروازہ بند کر دوں۔“ کاشان حیدر بولا اور مڑ گیا۔

میں دیوار کا سہارا لے کر وہیں رکا رہا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ ہوا کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہ اذیت تھی جو میرے حواس گم کئے دے رہی تھی۔ کاشان حیدر نے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر دوبارہ میرے پاس آ کے بولا۔ ”ہمت کریں صاحب! اللہ بہتر کرے گا۔“ پھر وہ مجھے سنبھالے ہوئے اندر لے آیا۔

میں نے ذیشان حیدر اور اس کی بہن کو دیکھا۔ وہ دونوں میری خواب گاہ کی طرف سے آ رہے تھے۔

کچھ پوچھے بغیر ہی ذیشان حیدر نے اپنے باپ کو بتایا۔ ”انہوں نے ہم دونوں کو کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔“ پھر اس نے میری حالت خراب دیکھی تو معلوم کیا۔ ”ان کو کیا ہوا بابا جی! ان کا چہرہ بھی باجی کی طرح سرخ ہو رہا ہے؟“ ذیشان حیدر کا اشارہ یقیناً سوسے کی طرف تھا۔

میں سمجھ گیا کہ سوسے بھی اسی اذیت کا شکار ہے جس سے مجھے گزرتا پڑ رہا ہے۔ آگ کی وہ نایدیدہ سونیاں میرے وجود کو چھیدے ڈال رہی تھیں۔

”صاحب! آپ مجھے کسی ڈاکٹر یا حکیم کا پتا بتا دیں۔ یہ حملہ میرے لئے بالکل نیا ہے اس لئے کسی حکیم ڈاکٹر کو نہیں جانتا۔ میں ابھی کسی کو بلا کر لاتا ہوں۔“ کاشان حیدر مجھ سے بولا۔ پھر اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ خواب گاہ کا دروازہ کھولوائے۔ ”اپنی باجی کو بتا دو تم کہ خورشید احمد صاحب آگئے ہیں۔ یہ بان کر وہ دروازہ کھول دیں گی۔“

”آپ مجھے نشست گاہ میں لے چلیں اور اور کسی حکیم ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اذیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کے ہاتھ میں آنے والا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے ذیشان حیدر کو بھی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دینے سے منع کر دیا۔

”صاحب! حالت تو آپ کی ایسی ہے کہ کسی طبیب کو دکھانا چاہئے، مگر“ کاشان حیدر نے

آبادی مثلاً نارائن گنج وغیرہ مرگزن نہ جانا۔ اور اینڈ آل۔“

دود چڑجی نے دوسری مرتبہ ایک ہی جگہ کا نام لیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کناں چھپا ہوا ہے۔ ڈھاکہ شہر سے صرف چودہ میل کے فاصلے پر نارائن گنج چھوٹی سی ایک آبادی تھی۔ وہاں اس بوڑھے گدھ کو تلاش کر کے گھیر لینا میرے اور سوسے کے لئے مشکل نہ ہوتا۔ ہم دونوں ہی کو عزتیل نے ایسے عمل تعلیم کئے تھے کہ اس آدم زاد کی پراسرار شیطانی قوتیں ہمارا کچھ نہ بگاڑ پاتیں۔ جب ہم مسرے جیسے قوی جن زاد کو گھیر کر مار سکتے تھے تو وہ آدم زاد دود چڑجی کس طرح مرنے سے بچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ شیطانوں کے شیطان دود چڑجی کی متوقع موت کے تصور ہی سے میرا وجود جوش اور ولولے سے بھر گیا۔

اس بڑے شیطان دود چڑجی کے الفاظ مجھے یاد آئے۔ اپنے تمام آدمیوں کو وہ ڈھاکہ سے نکل جانے کا حکم دے چکا تھا۔ خود اس نے پہلے ہی راہ فرار اختیار کر لی تھی لیکن ابھی مشرقی پاکستان سے نکلنے کا ارادہ نہیں تھا۔ دود چڑجی نے کہا تھا کہ ہم اس طرح یہاں سے نہیں جائیں۔ کوئی ہمیں نکال بھی نہیں سکتا۔ اپنے ایک آدمی کی جگہ ہم ایک سو آدمی گرائیں گے۔ اس کے اسی عزم کو میں نے اپنی کامیابی کی دلیل سمجھا۔ ان غیر ملکی تخریب کاروں کے دو مخصوص ٹھکانے میرے علم میں تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ڈھاکہ شہر سے نکل کر وہ انہی ٹھکانوں کا رخ کرتے۔ میری معلومات کا ذریعہ دود چڑجی کے وہی آدمی تھے جنہیں میں ٹھکانے لگا چکا تھا۔ انہی کے ذہن پڑھ کر مجھے دشمنوں کے آئندہ ارادوں کا پتہ چلا تھا جو انتہائی خطرناک تھے۔

کمال سے مجھے اس کے جن ساتھیوں کا سراغ ملا، ان میں سے صرف ایک کا قیام ڈھاکہ میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے سرغنہ کے حکم پر وہ بھی اس شہر سے نکل چکا ہو گا۔ اب صرف کمال رہ گیا تھا جو ابھی تک میرے اثر میں تھا۔ میں نے اسی کمرے میں موجود ایک میز کی دراز سے ریو اور نکال کر لوڈ کیا اور اسے کمال کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس بدکار آدم زاد کی فرد جرم اسے میں نے سنا دی تھی۔ ”تمہاری زندگی کے آخری لمحات قریب ہیں کمال!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ہر مسلمان کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ تم نے یقیناً یہ آرزو نہیں کی ہو گی لیکن ممکن ہے تمہارے والدین کی یہی تمنا رہی ہو۔ خواہ تم نام کے مسلمان سہی، تمہیں کلمہ پڑھ لینے کی صلت میں ضرور دوں گا۔“

میرے ایمان پر اس نے قلم بڑھا اور پھر ریو اور کی ٹال اپنی نپٹی پر رکھ لی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہونے ہی اس کا جسم فرش پر گرا۔ کھیل ٹم ہو گیا تو میں اس کو فحشی سے نکل آیا۔ اسے وہاں میری موجودگی کا حاصل ہوتی۔

میں فضا میں پرواز کرتا ہوا چوک بازار میں ایسی جگہ اترا جہاں کسی آدم زاد کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ انسانی قالب اپنے اپنے کھری طرف بڑھا تو شام ہو رہی تھی۔ مجھے اس وقت گمان بھی نہ تھا کہ اپنے گھر میں قدم رکھتے ہی مجھ پر کیا گزرنے لگی۔

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر مجھے سارا دے کر نشست گاہ میں داخل ہوا۔

”اب آپ آپ جائیے۔“ میں دروازے کے پاس ٹھہر گیا۔

”جی؟“ کاشان حیدر حیرت سے بولا۔ ”آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر میں کیسے چلا جاؤں؟“

میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور کہا۔ ”اکیلا مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ یہ کہتے ہوئے میرے لمبے میں سختی بھی آگئی۔

کاشان حیدر حیران سا ہو کر واپسی کے لئے مڑا۔ جیسے ہی اس نے نشست گاہ کے دروازے سے باہر قدم رکھا، میں نے دروازہ بند کر لیا۔ کبھی کبھی نیکی گلے بھی پڑ جاتی ہے، یہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ سوئی نے اس گھر سے نکلنے کی خاطر جو طریقہ اپنایا تھا اسی پر عمل کرنے کے لئے مجھے تنہائی کی ضرورت تھی، مگر کاشان حیدر میری جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ نشست گاہ کی طرف بڑھنے سے پہلے ہی میں نے معلوم کر لیا تھا کہ سوئی اب اس گھر میں نہیں ہے۔ سوئی کے وجود کی مخصوص خوشبو وہاں نہیں تھی۔

دروازہ بند کرتے ہی میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا اور اس گھر سے فرار ہو گیا۔ ہم جن زادوں کو ایک دوسرے کی بو پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ مجھے فضا میں اوپچی پرواز کرتی ہوئی نظر آگئی۔ اس گھر کی حد دوسرے نکل آنے کے باوجود ابھی تک میرے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے، اذیت میں البتہ کی آچکی تھی۔

مجھے اپنے قریب دیکھ کر سوئی بولی۔ ”تیری ہی وجہ سے اے علیالیش! مجھے اس گھر میں اتنی دیر رکا پڑا کہ تجھ کو فرار کی راہ بھا دوں۔ جیسے ہی مجھے گھر میں تیرے وجود کی خوشبو محسوس ہوئی، میں پھر وہاں نہ رکی۔ آدم زادوں سے خود کو چھپانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں اور مبر بھی۔ وہاں سے فرار ہونے کے لئے تنہائی ضروری تھی۔ مجبوراً مجھے کمرے سے ڈیڑھان حیدر اور امینہ کو نکالنا پڑا۔ ممکن ہے اس پر انہیں برا بھی لگا ہو، مگر میں کیا کرتی۔“

سوئی کی حالت سے میں نے اندازہ کر لیا کہ اس میں بڑی قوت برداشت ہے۔

”لیکن اے سوئی! یہ اچانک ہوا کیا؟“ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

”تیرے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے آگ کی سونیاں میرے وجود میں اترنے لگیں۔“ سوئی بتانے لگی۔ ”میں اس وقت صحن میں تھی۔ امینہ کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ باورچی خانے میں جا رہی تھی۔ مجھے لڑکھڑاتے قدموں سے خواب گاہ کی طرف جاتے دیکھ کر وہ میری طرف بھاگی اور پھر اپنے بھائی اور باپ کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ انہوں نے مجھے خواب گاہ میں پہنچا کر مسمیٰ پر لٹا دیا۔ وہ میری جگہ کی ہوئی حالت دیکھ کر تشویش میں مبتلا تھے کہ کیا کریں؟ مجھے تیرا خیال تھا کہ تو آ جائے تو میں وہاں سے نکلوں۔ پھر جب دروازے پر دستک ہوئی، تو گھر میں آگیا، تیری خوشبو میں نے محسوس کر لی تو ڈیڑھان حیدر اور اس کی بہن کو کمرے سے نکال کر دروازہ اندر لگا لیا کہ وہ مجھے غائب ہوتے نہ دیکھ سکیں۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تو مجھے گھر میں نہ پائے گا تو وہاں رکے گا نہیں۔ کسی نہ کسی طرح ان آدم زادوں کی نظر سے بچ کر تو بھی مجھ تک پہنچ جائے گا۔“ سوئی کی آواز سے نقاہت جھلکے لگی۔

خود مجھے بھی کمزوری اور نقاہت کا احساس ہو رہا تھا۔ اذیت اب تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ نیچی پرواز کرتے ہوئے دم لینے کی غرض سے ہم بیڑوں کے ایک جھنڈ پر اتر گئے۔ اب ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے۔

کچھ دیر سنا کر میں نے ہی سوئی کو مخاطب کیا۔ ”یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم دونوں پر یہ وار کس نے کیا؟“

”مجھے تو یہ کسی آدم زاد ہی کی حرکت لگتی ہے اے علیالیش!“ سوئی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”کون ہو سکتا ہے، وہ آدم زاد؟“ میں سوچ میں پڑھ گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ”ہماری دشمنی تو صرف ایک آدم زاد سے ہے اور وہی پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک ہے لیکن اس نے کس طرح ہمارا پتا لگا لیا؟ وہ تو اس وقت ڈھاکہ شہر میں ہے بھی نہیں۔“

”اے علیالیش! اگر تیرا اشارہ اس کافر آدم زاد و نوذوچڑی کی طرف ہے تو جس طرح فاصلے ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تو ایسے شیطانوں کے لئے بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں۔“ سوئی جواب میں بولی۔ ”مجھے میرے باپ عزتیل نے بت عرس پہلے ایک ایسا عمل تعلیم کیا تھا کہ ایسا کوئی وار کرنے والے آدم زاد کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اس عمل کا وقت رات کو عشاء کے بعد ہے۔ جب ہمیں اس آدم زاد کا پتہ چل جائے گا تو پھر ہم اسے سزا بھی دے سکتے ہیں۔“

”میں تو کچھ اور ہی سوچ کر گھر کی طرف لوٹا تھا، مگر ہم ایک اور ہی عذاب میں گرفتار ہو گئے۔“ یہ کہہ کر میں نے سوئی کو اب تک کی کارگزاری سے آگاہ کر دیا۔ اس میں خاصی دیر لگ گئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

”اس کافر آدم زاد کو گھیرنے کے لئے ہمیں کم از کم آج کی رات تو مبر کرنا ہی پڑے گا اے علیالیش!“ سوئی نے پوری روداد سن کر کہا۔ ”ہم پر اچانک وار کیا گیا ہے اور ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ ہمیں ابھی یہ بھی خبر نہیں کہ وار کس نے کیا، کیوں وار کیا گیا، یہ بھی ہمیں نہیں معلوم۔ اسی کی وجہ سے تجھ پر بھی کمزوری کا غلبہ ہے اور میں بھی پوری طرح سنبھلی نہیں ہوں۔ پھر یہ کہ ہمارے گھر میں کچھ آدم زاد بھی آباد ہیں۔ ان کو بھی اپنی طرف سے مطمئن کرنا پڑے گا۔ وہ آخر کب تک بند کمروں سے ہمارے نکلنے کا انتظار کرتے رہیں گے۔ ہم بڑی ہی عجب صورت حال میں پھنس گئے ہیں۔“

”اے سوئی! تجھے تو پتہ ہے، اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں ان آدم زادوں کو اپنے گھر میں لا کر نہ بتاتا۔“

”ہاں پتہ ہے مجھے۔“ سوئی بولی۔ ”عشاء میں اب دیر ہی کتنی ہے۔ عمل کے درد اور سب کچھ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“ سوئی نے مجھے اطمینان دلایا۔ ”تو فکر نہ کر اے علیالیش! ضرورت پڑی تو ہم عزتیل کے پاس چل کے اس سے مشورہ کر سکتے ہیں۔“

میری ڈھارس بندھ گئی۔ پھر عشاء کا وقت ہوا تو سوئی نے عمل کا ورد شروع کر دیا۔ میں اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا عمل کرنے اور ضروری معلومات کے حصول میں دیر نہ لگی۔

کراہی کے گھر چھوڑ آؤں گا یا پھر ان کی سکونت کا بندوبست کیں اور کر دوں گا۔ وہ آدم زادی جو وظیفہ جنات کو اس گھر سے بھاگنے کے لئے پڑھ رہی تھی، اس کے لئے جگہ کی قید بھی تھی۔ تین دن اسی جگہ وقت کی پابندی کے ساتھ وظیفہ پڑھا جاتا تو اثر کرتا۔ سوی نے مجھے یہ ساری باتیں تفصیل سے بتا دی تھیں۔ اس افتاد سے فرق صرف یہ پڑا کہ دونو چیز جی کے خلاف میں اور سوی اسی رات کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ اسے بھی میں نے اللہ کی کوئی مصلحت جان کر صبر کر لیا۔ سوی کو اور مجھے آرام کی ضرورت تھی، سو اس رات ہم جلد ہی سو گئے۔

☆=====☆=====☆

صبح ہوئی تو ہم تازہ دم اٹھے۔ اب کسی قسم کی کمزوری یا تھکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے رات کے وقت نارائن گنج جانے کا فیصلہ کیا، کیونکہ دن میں اور بہت سے ضروری کام انجام دینے تھے۔ سوی کو میں نے اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کر دیا۔

چلنے وقت سوی نے مجھے تاکید کی۔ ”اے علیالیش! تجھے ہر حال میں عصر سے پہلے گھر لوٹ آنا ہے تاکہ وہ آدم زادی دوبارہ ہمیں مشکل اور اذیت میں گرفتار نہ کر دے۔“ میں نے اسے یقین دلایا کہ بروقت آ جاؤں گا اور پھر گھر سے نکل آیا۔

ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بدرالدین مجھے اپنا خط ملا۔ میں اب مقصود کے قالب میں تھا۔ کمال کی جگہ مجھے ایک اور چڑاسی نظر آیا کہ بڑے سرکاری افسران کسی چڑاسی کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لئے سی آئی ڈی آفس کے کافرنس روم میں آ گیا۔ وہاں پہلے ہی سے تقریباً درجن بھر افراد جمع تھے۔

بڑی سی ایک میز کے دونوں طرف کرسیاں پڑی تھیں۔ اس میٹنگ کی صدارت بدرالدین کو کرنا تھی۔ اس کی کرسی کے ساتھ ہی میرے لئے ایک کرسی رکھی گئی تھی۔ اپنے مجھے کے سربراہ کو آتے دیکھ کر سبھی کرسیاں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آئیے مقصود میاں! آپ میرے ساتھ یہاں بیٹھئے۔“ بدرالدین نے اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے مجھے مخاطب کیا۔

شکریہ ادا کر کے میں برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا اور وہاں جس غرض سے آیا تھا، اس کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اس ادارے میں کوئی کالی بھیڑ تو موجود نہیں۔ اس کے بعد میں دیگر معلومات حاصل کرتا۔ بدرالدین اپنے مجھے کے افسران سے میرا تعارف کرائے لگا۔ میری توجہ ان کے ذہنوں پر تھی۔

”یہ مقصود میاں ہیں۔“ بدرالدین نے کہا۔ ”انہیں دارالحکومت سے خاص طور پر یہاں بھیجا گیا ہے تاکہ یہ ہماری رہنمائی کر سکیں۔“

”کس سلسلے میں سر!“ ایک افسر نے سوال کیا۔

”غیر ملکی تحریک کاروں کی گرفتاری کے لئے۔“ بدرالدین نے جواب دیا۔ ”اس ضمن میں مقصود

اس کی ہنسی میرے لئے تعجب خیز ہی تھی، سو میں نے وجہ پوچھ لی۔

”چل اے علیالیش! اب گھر چلے ہیں کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔“ سوی نے ہنستے ہوئے کہا۔

جو کچھ مجھے سوی نے بتایا، اس پر ہنسا تو میں بھی مگر غصہ بھی آیا۔

”دیکھ اے علیالیش! جن پر کوئی احسان کرتے ہیں ان پر غصہ نہیں کرتے۔ نادانستگی میں ایسا ہوا ہے اور اس کا تدارک ممکن ہے۔“ سوی نے مجھے سمجھایا۔

میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور میں، سوی کے ساتھ چوک بازار میں اپنے گھر آ گیا۔ میں نشست گاہ میں اور سوی خواب گاہ میں چلی گئی۔

نشست گاہ اور خواب گاہ کے دروازے تقریباً ایک ساتھ کھلے۔ اب میں اور سوی انسانی قالبوں میں تھے۔ دروازے کھلنے کی آواز ان آدم زادوں کے لئے جیسے خوشی کا پیغام ثابت ہوئی۔ کاشان حیدر، اس کا بیٹا اور بیٹی قتیوں ہی لپک کر قریب آ گئے۔ ہماری وجہ سے کمی نے بھی اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ امینہ، سوی کی خیریت دریافت کرنے لگی اور کاشان حیدر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”صاحب! اب کیسی طبیعت ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ اب ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ مائیں نہ مائیں مجھے یہ آجی پکڑ معلوم ہوتا ہے لیکن گھبراہٹیں نہیں۔“ کاشان حیدر بولا۔

”بس تین دن کی بات ہے۔ آج ذیشان کی والدہ نے عصر اور مغرب کے درمیان جو وظیفہ پڑھنا شروع کیا ہے، ان شاء اللہ اس کا اثر تیسرے دن ظاہر ہو جائے گا۔ پھر اس گھر میں کوئی آسیب داخل نہیں ہو سکے گا۔ آپ دونوں میاں بیوی کی اچانک علالت کا سبب مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کل عصر کی نماز پڑھ کر پھر وہ یہی وظیفہ پڑھیں گی۔ صاحب! آپ سے میں یہی بات تو کرنا چاہتا تھا، مگر مہلت ہی نہیں ملی۔ صبح آپ جلدی چلے گئے، پھر آئے بھی تو زیادہ رکے نہیں۔ مجھ سے تو ذیشان کی والدہ نے کل رات ہی کہہ دیا تھا کہ وظیفہ شروع کریں گی۔ ہمارے مرحوم سر نے انہیں یہ وظیفہ بتایا تھا۔ خود مرحوم بھی آسیب زدہ گھروں کو جاتی اثرات سے پاک صاف کر دینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے صرف اپنی بیٹی کو اس وظیفہ کی اجازت دی تھی۔“ ایک ہی سانس میں کاشان حیدر نے وہ روداد بیان کر دی جو مجھے پہلے ہی سوی سے معلوم ہو چکی تھی۔

ذیشان حیدر کی ماں پردہ نشیں تھی، اس لئے وہ میرے سامنے نہ آئی۔ میرا دھیان اسی لئے اس کی طرف نہیں گیا۔ میں اسے ایک بے ضرر سی عورت سمجھا تھا۔ کبھی کبھی ایسے ہی غیر اہم نظر آنے والے آدم زاد بھی ہمارے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر آدم زادی کہ جس کی صورت بھی میں نے نہیں دیکھی تھی، مجھے اور سوی کو اسی نے انتہائی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے عمل کا اثر اسی وقت تک برقرار رہا جب تک مغرب کی اذان نہ ہو گئی۔ ہم اس سے بے خبری رہے ورنہ پہلے گھر لوٹ آتے۔ ستم یہ ہوا کہ اس نے ہمیں آدم زاد جان کر ہم پر یہ احسان کیا کہ ہمارا گھر آسیب یا جنات کے اثر سے پاک ہو جائے۔ مجھے اور سوی کو اس پر ہنسی آئی تھی۔ نادان کی دوستی جی کا جنجال شاید اسی کو کہتے ہیں۔

میں نے اس پر کاشان حیدر کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت سوچ لیا کہ ان آدم زادوں کو یا تو سمجھا بھجا

میاں خود ہی آپ لوگوں کو بریف کریں گے۔"

میری بظاہر عمر کے پیش نظر ایک افسر کے ذہن میں خیال آیا، یہ تو ابھی خود نا تجربے کار لگتا ہے، ہماری کیا رہنمائی کرے گا۔ اس افسر کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ وہ مجھے کسی قدر متعجب اور تنگ نظر بھی معلوم ہوا۔ پہلے میں نے اسی کو مخاطب کیا۔ "عبدالجید صاحب!"

میں نے اس کا نام لیا تو وہ چونک اٹھا اور گھبرا کر بولا۔ "جی..... جی سر!"

"آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ عمر کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے۔" میری آواز میں چھین تھی۔ "مجھے افسوس ہے کہ اب تک آپ کی کارکردگی انتہائی ناقص رہی ہے۔ میں نے بدرالدین صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے اپنے محکمے کے ذہین اور باصلاحیت افسران سے ملوائیں۔ آپ بد قسمتی سے اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ایسی صورت میں آپ کی موجودگی اس مینٹگ کے لئے ضروری نہیں۔ تعجب کی جو ہوا ان دنوں چلی ہوئی ہے، اس سے بھی آپ کا ذہن متاثر ہے۔ ایسے حساس اداروں میں آپ جیسے ناچستہ ذہن کے افراد کو نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بہر حال آپ کے محکمے کا اندرونی معاملہ ہے، میں اس میں مداخلت کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ آپ سے کہیں زیادہ ذہین اور ذمے دار تو وہ افسر ہے جو برابر والی کرسی پر بیٹھا ہے۔ عمر میں یہ آپ سے کم از کم بھی دس پندرہ سال چھوٹا ہو گا۔"

سب کی نظرس اکبر علی کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ عبدالجید بوکھلا کر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں کیونکہ ان سب کے لئے اجنبی تھا اسی سبب میرے الفاظ کا زیادہ اثر ہوا۔ وہ سبھی مجھ سے مرعوب نظر آنے لگے۔ اسی وقت بدرالدین بول اٹھا۔ "مقصود میاں! آپ فرمائیں تو ایس ایس پی عبدالجید کو اس مینٹگ میں شامل نہ کیا جائے؟"

مجھے واضح الفاظ میں جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ بے وقوف بدرالدین، کے سوال نے اسی لئے مجھے بے مزہ کیا، مگر خود پر میں نے قابو رکھتے ہوئے اقرار میں صرف اتنا کہا۔ "جی ہاں۔"

بھری مینٹگ میں اپنی سبکی پر عبدالجید جربز تو ہوا لیکن اپنے افسر اعلیٰ کے حکم پر اسے اپنی کرسی چھوڑنا ہی پڑی۔

ان افسران میں مجھے کوئی کالی بھیڑ دکھائی نہ دی۔ میں ان کے ذہنوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

"آپ حضرت کو یقیناً معلوم ہے کہ غیر ملکی تخریب کار بڑی تعداد میں یہاں ٹھس آئے ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "ان کے عزائم کا اندازہ لگانا بھی غالباً آپ کے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ حکومت کے خلاف ہونے والے مظاہروں میں انہی ملک دشمنوں کا ہاتھ ہے۔ اس کے لئے انہوں نے جرائم پیشہ افراد کو استعمال کیا تھا، مگر اب صورت حال بدل چکی ہے۔ یکے بعد دیگرے مجرموں کے دو منظم گروہ گرفت میں آچکے ہیں۔ اس باب میں آئی جی نور الاسلام کی کارکردگی لازماً قابل تحسین ہے۔ اس کے باوجود معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس وقت ڈھاکہ شہر میں ایک بھی غیر ملکی تخریب کار موجود نہیں ہے لیکن ابھی ان کے مقامی ایجنٹوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا۔ ان کی تعداد بھی کم

نہیں ہے، کچھ مقامی ایجنٹ ایسے ہیں جن پر آپ کو شبہ ہو چکا ہے اور ان کی گہرائی جاری ہے۔ ان کے خلاف اب تک آپ کو کوئی ثبوت نہیں مل پایا، اس لئے کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ اس کی بڑی وجہ ان کا بااثر ہونا بھی ہے۔ ایس پی اکبر علی نے ان مقامی ایجنٹوں میں سے دو افراد کو شبہ کی بنیاد پر زیر حراست لینے کی اجازت چاہی تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔" میں نے دانستہ بدرالدین کا نام نہیں لیا، کیونکہ یہ اسی کی حماقت تھی۔ اس پر بدرالدین پہلو بدلنے لگا۔ اسے میں نے نظرانداز کر دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ لوگوں کو اس کا علم یقیناً نہیں ہو گا کہ سرحد پار سے اسلحہ اسمگل ہو کر یہاں پہنچ چکا ہے۔ یہ اسلحہ انہی مقامی ایجنٹوں کے ذریعے طالب علموں کو تقسیم کیا جانے والا تھا۔ ایس پی اکبر علی نے ایک ہفتے پہلے جن دو مشتبہ افراد کو گرفتار کرنا چاہا تھا، اگر انہیں بھی پکڑ لیا جاتا تو ان کے قبضے سے غیر قانونی اسلحہ کا بڑا ذخیرہ ملتا۔ پھر کسی ثبوت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس شہر میں ایسے چھ مقامی ایجنٹ ہیں۔ ان کی کوشیوں میں سرحد پار سے اسمگل کیا جانے والا اسلحہ اب بھی موجود ہے۔ ان میں سے دو تو اکبر علی کی نظر میں آچکے ہیں، بقیہ چار افراد کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ انہی چھ افراد کی گہرائی میں بقیہ تمام مقامی ایجنٹ سرگرم عمل ہیں۔ میں آپ حضرات کے سربراہ ڈپٹی ڈائریکٹر بدرالدین صاحب سے ذاتی طور پر یہ درخواست کروں گا کہ اس آپریشن کی تمام تر ذمے داری ایس پی اکبر علی کے سپرد کر دی جائے اور بقیہ افسران، اکبر علی کی معاونت کریں۔" یہ کہہ کر میں نے بدرالدین کی طرف دیکھا۔

"جو بھی آپ نے فرمایا ہے مقصود میاں! اسی کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔" بدرالدین میری سوالیہ نظروں کے جواب میں فوراً بولا۔ "آپ ان چھ مقامی ایجنٹوں کی نشاندہی کریں، آج ہی انہیں حراست میں لے لیا جائے گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ نرجوش ہو گیا۔

"ان میں سے دو افراد تو پہلے ہی ایس پی اکبر علی کی لسٹ پر ہیں۔ بقیہ چار مقامی ایجنٹوں کے نام پتے میں خود ایس پی کو لکھوا دوں گا۔" میں نے کہا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولا۔ "مقامی ایجنٹوں سے قطع نظر مختلف محکموں کے کچھ بڑے سرکاری افسران کو بھی غیر ملکی دشمن اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر آلہ کار بناتے رہے ہیں۔ ان کے خلاف ثبوت و شواہد جمع کرنا بھی آپ کے محکمے کی ذمہ داری ہے۔" یہ وہ افسران تھے جن سے سروج کے تعلقات رہ چکے تھے۔ "میں صرف ان کے ناموں، مددوں اور محکموں کے بارے میں آپ کو بریف کر سکتا ہوں۔ ثبوت و شواہد اکٹھے کر لینے کے بعد صوبائی یا مرکزی وزارت داخلہ سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ پھر آپ کو ان سرکاری افسران کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں دشواری نہیں ہو گی۔" یہ کہتے ہی میں نے اسی مینٹگ میں موجود دایک اور ذہین و مستعد افسر منظور احمد شیخ کا نام لیا۔ "میرا خیال ہے کہ شیخ صاحب کو یہ ذمے داری سونپ دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ صاحب نڈر آدمی ہیں۔ نہ یہ جانب داری سے کام لیں گے نہ کسی طرح کا دباؤ قبول کریں گے۔"

اس پر بدرالدین نے کہہ ہی دیا۔ "مقصود میاں! ایسا لگتا ہے کہ آپ کے پاس پہلے ہی سے میرے افسران کے بارے میں مکمل کوائف موجود ہیں۔ شیخ صاحب واقعی ایک ذمے دار افسر ہیں۔ مجھے یہ جان کر

خوشی ہو رہی ہے کہ میرے جگے میں ایسے افسران موجود ہیں جو آپ کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔“
منظور احمد شیخ عمر اور عمدے میں اکبر علی سے بڑا تھا۔ دونوں ہی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بار بار باری میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ایس بی اکبر علی نے مجھ سے کہا۔ ”سر! اس شہر میں یہ اسلحہ کہاں سے آیا؟ اس سلسلے میں بھی یقیناً آپ ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔“

”اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا اکبر علی!“ میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”وجہ یہ ہے کہ تمہارے جگے کے دائرہ اختیار سے یہ معاملہ باہر ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ملک کے اس حصے میں سرحد پار سے آنے والے اسلحہ کے دو بڑے ذخائر موجود ہیں۔ وہیں سے یہ اسلحہ ڈھاکہ پہنچا ہے۔ مرکزی حکومت اس کے لئے دوسرے ذرائع بروئے کار لانے والی ہے۔ تب ہی ان دونوں بڑے ذخائر تک پہنچنا ممکن ہے۔ اسی کے ساتھ آئندہ بھی اسلحہ کی درآمد روکی جاسکتی ہے۔“

”ٹھیک یو سر!“ اکبر علی یہ کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔
”مجھے صرف اکبر علی اور منظور احمد شیخ سے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ آپ میٹنگ برخاست کر سکتے ہیں۔“ میں نے بدرالدین سے دھیمی آواز میں کہا۔ ”یہ گفتگو ان دونوں افسران سے باری باری آپ کے کمرے میں ہو جائے گی۔“

”بہت مناسب ہے مقصود میاں!“ بدرالدین جواب میں بولا اور میٹنگ برخاست کر دی۔ اکبر علی اور منظور احمد شیخ کو اس نے روک لیا تھا۔

میں ان تینوں کے ساتھ کانفرنس ہال سے نکل آیا۔ وہاں سے بدرالدین کے کمرے میں آکر میں نے پہلے منظور احمد شیخ ہی کو بلوایا۔ سبب یہ کہ مختلف محکموں کے بڑے افسران کی فہرست زیادہ طویل نہیں تھی۔ یہ امکان بھی تھا کہ ان سرکاری افسران کے علاوہ اور دوسرے بھی دوند چڑنی کا آلہ کار بننے رہے ہوں لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اگر سینٹا کی طرح مجھے آئندہ کا ذہن پڑھنے میں بھی کامیابی حاصل ہو جاتی تو اور بات تھی۔ ضمیر فروش سرکاری افسران تک پہنچنے کے لئے تخریب کاروں نے یقیناً اور بھی ذرائع آزمائے ہوں گے۔ مجھے تو صرف ان افسران کا علم تھا جن سے سروج ملتی رہی تھی۔ بدرالدین کی موجودگی میں وہ فہرست میں نے مکمل کرادی۔

اس عرصے میں بدرالدین سے میں نے تاکید کر دی تھی کہ وہ چائے وغیرہ منگوانے کے لئے اپنے چڑاسی تک کو اندر نہیں بلوائے گا۔

”شیخ صاحب! غالباً آپ کو یہ ہدایت کرنا ضروری نہیں کہ اس معاملے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔ کسی بھی سرکاری افسر کو شبہہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ زیر نگرانی ہے۔ جگے کے بااعتماد اور ذمہ دار افراد سے آپ کام لیں۔ بدرالدین صاحب یقیناً آپ کی حوصلہ افزائی کریں گے۔“ میں نے آخری ما منظور احمد شیخ سے کہا۔

”آپ کو مایوسی نہیں ہو گی سر!“ منظور نے مجھے یقین دلایا۔
وہ میرے اشارے پر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا تو بدرالدین کہنے لگا۔ ”مقصود میاں! اب تو میں

آپ کے لئے چائے منگوا لوں؟“

”چائے پینے کی آپ کو شاید زیادہ ہی عادت ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”منگوا لیں، مگر اسی کے ساتھ چڑاسی کو حکم دے دیں کہ وہ چائے لے کر آنے سے پہلے دروازے پر دستک ضرور دے۔ آپ جیسے افسران کو ایسے معاملات میں بہت محتاط ہونا چاہئے۔“

”بس آج اتفاق ہی سے میرا چڑاسی نہیں آیا اور پی اے نے دوسرے چڑاسی کا بندوبست کر لیا ورنہ آپ شاید ایسا نہ کہتے۔ مقصود میاں! آپ کی نظر خاصی تیز معلوم ہوتی ہے آپ نے چڑاسی کی تبدیلی کو بھی محسوس کر لیا۔“ بدرالدین بولا۔

مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آگئی۔ وہ امتحان کی طرح میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ ”آپ کا چڑاسی کمال اب کبھی ڈیوٹی پر نہیں آئے گا۔“

”جی..... مگر کیوں؟“

”اس لئے کہ کوئی دوسری دنیا سے واپس نہیں آتا۔“

”کیا..... کیا اس کا انتقال ہو گیا؟ لیکن کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ آپ نے بھی اسے دیکھا ہو گا۔“

”جی ہاں دیکھا تھا۔ اس نے کل خودکشی کر لی۔ غیر ملکی ایجنٹوں کے پاس جب فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو وہ ایسا ہی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ میں نے بتا دیا۔

”وہ..... وہ کمال غیر ملکی ایجنٹ تھا؟“ بدرالدین یہ کہتے ہوئے مزید ہونٹ دکھائی دینے لگا۔
”اس کی لاش موتی جھیل کی ایک کونٹھی میں اب تک پڑی سڑ رہی ہو گی۔ اپنے کسی انسپکٹر کو بھیج دیں وہاں۔ اس ملک کے علاوہ غیر ملکی کرنسی، دو ریوالور، ایک رائفل، گولیاں، کارتوس اور ایک عدد ٹرانسیرر وہاں مل جائے گا۔ میرے خیال میں اتنے ثبوت کافی ہیں۔“ میں نے موتی جھیل کی اس کونٹھی کی پتہ بھی بدرالدین کو لکھوا دیا۔

بدرالدین نے پتہ لکھ کر کہا۔ ”مگر شاید دفتری کاغذات میں تو اس کا پتہ کچھ اور لکھا ہے۔ آپ نے تو یہ خبر سنا کر مجھے حیرت زدہ کر دیا مقصود میاں! اسے تو ملازمت کرتے ہوئے.....“

”کافی عرصہ ہو گیا تھا، آپ غالباً یہی کہنا چاہتے ہوں گے۔“ میں بول اٹھا۔ ”تم یا زیادہ عرصے ملازمت کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ معاف کیجئے گا، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور اس سے اہم معاملات ابھی درپیش ہیں۔ آپ چائے وغیرہ کا تکلف چھوڑ دیں اور ایس بی اکبر علی کو بلوالیں تو بہتر ہے۔“

بدرالدین شرمندہ سا نظر آیا اور پھر اسے چائے کی طلب کو خیر یاد کتا ہی پڑا۔ اس نے ایس بی اکبر علی کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

پھر میں نے جن چھ افراد کے نام پتے لکھوائے ان میں سے ایک نام ایسا تھا کہ اکبر علی بھی چونک اٹھا۔ میری توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔

”تمہیں اس لئے حیرت ہو رہی ہے اکبر علی کہ یہاں کے سیاسی حلقوں پر اس شخص زمان کا خاصا اثر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بڑا سماجی کارکن بھی مشہور ہے؟“ میں بولا۔

”جی..... جی ہاں سراسر ایسی بات ہے۔“ اکبر علی نے تصدیق کر دی۔

”ایسے ہی بااثر افراد کو غیر ملکی دشمن اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے بدرالدین کو مخاطبہ کیا۔ ”مجھے معلوم ہے، پہلے بھی آپ نے اکبر علی کو ان میں سے دو افراد کو زیر حراست لینے کی اجازت اسی لئے نہیں دی تھی کہ دونوں ہی اثر و رسوخ والے اور معروف آدمی تھے۔ اب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کسی کے ساتھ بھی کوئی رعایت یا نرمی نہیں ہوگی۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مقصود میاں!“ بدرالدین کہنے لگا۔ ”جب غیر ملکی اسلحہ برآمد کر لیا جائے گا تو پھر رعایت یا نرمی کیسی۔“

”خدا حافظ۔“ کہتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بدرالدین بھی اپنی کرسی سے اٹھا تو میں نے کہا۔ ”آپ بیٹھے، اکبر علی مجھے باہر تک چھوڑ آئیں گے۔“

”پھر کب تشریف لائیے گا مقصود میاں؟“ بدرالدین نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”جب ضرورت محسوس ہوئی تو آجاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا اور اکبر علی کے ساتھ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اکبر علی احتراماً میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا تو میں نے اسے ساتھ چلنے کو کہا اور پھر ایک راہداری سے گزرتے ہوئے بولا۔ ”اڈول تو یہ معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بھی باختیار شخص اس میں ملوث نہیں ہوگا، اس کے باوجود کسی طرف سے مداخلت ہو تو دہن کی ضرورت نہیں۔“

”سرا! آپ کی پشت پناہی میرے لئے کافی ہے۔ میں ان کو کسی سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ہی نہیں دوں گا۔“ اکبر علی کی آواز بڑبڑا رہی تھی۔

”اچھا اب تم جاؤ اور آپریشن کی تیاری کرو۔“ میں نے ایس پی کو رخصت کر دیا اور ہی آئی ڈی آفس کی عمارت سے باہر آ گیا۔

ہر چند کہ میں نے وہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، پھر بھی ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ ایک جن زاد ہو کر میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ میں آدم زادوں کی مدد کے بغیر جو چاہتا کر لیتا۔ ایسا نہ کرنے کی اصل وجہ وہ حکم تھا جو بیچپن ہی سے ہمارے عالم ہم کو دیتے آئے ہیں کہ آدم زادوں کے معاملات میں مداخلت کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ سو میں اسی پر عمل پیرا تھا۔ اسی حکم کے مطابق میں نے کبھی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ میری کوشش یہی ہوتی کہ وہ خود اپنے معاملات نفاذ لیں اور جہاں بے بس نظر آئیں ان کی مدد کر دی جائے۔

یہی بے بسی صوبائی وزیر داخلہ کے پیچھے شباب الدین کے سلسلے میں اس تھانیدار کو پیش آنے کا امکان تھا جس نے شباب الدین کو گرفتار کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شباب الدین اب تک جاگ چکا ہو گا۔ میں نے اس پر گہری نیند مسلط کر دی تھی۔ تھانیدار کو آج عدالت میں اس کا چالان پیش کرنا تھا۔ عدالت میں وہ اپنے جرائم کا اعتراف کر لیتا تو پھر کوئی مسئلہ باقی نہ رہتا۔ عموماً ایسے مجرم عدالت کے

درود پولیس کو دیتے ہوئے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں یا ان کے وکیل یہ کھلوا دیتے ہیں کہ پولیس نے زبردستی تشدد کر کے ان سے یہ بیان لیا ہے۔

میں جب انسانی قالب سے نکل کر مطلوبہ تھانے میں داخل ہوا تو شباب الدین نے ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ میں کون ہوں۔ تھانیدار تمام کاغذی کارروائی مکمل کر چکا تھا اور اب یہ جاننے کے بعد کہ شباب الدین، صوبائی وزیر داخلہ کا بھتیجا ہے تذبذب کا شکار تھا۔ مجھے کسی ایسی ہی صورت حال کی توقع تھی۔

”سرا! وہ کہہ رہا ہے کہ پورے تھانے کو معطل کرا دے گا۔“ ایک اے ایس آئی نے تھانیدار کو آ کر بتایا۔

”اسے حوالات سے نکال کر لاؤ۔“ تھانیدار نے اے ایس آئی کو حکم دیا۔

ذرا ہی دیر بعد شباب الدین کو تھانیدار کے کمرے میں لایا گیا تو وہ آپے سے باہر تھا۔ اس نے آتے ہی تھانیدار کو بھی دھمکی دی۔ ”ایک منٹ میں تیری بیٹی اترا دوں گا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تو یہ وردی پسینے رہے تو چھوڑ دے مجھے۔“

”مگر تم اپنا اقبالی بیان لکھوا چکے ہو۔“ تھانیدار تھوڑا نرم پڑ گیا۔ ”اس کے علاوہ تمہیں موقع پر رسنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا ہے، یعنی گواہ.....“

”کوئی عینی گواہ عدالت میں میرے خلاف بیان نہیں دے سکتا۔“ شباب الدین برہم آواز میں بولا۔

”اور آلہ قتل؟“ تھانیدار نے سوال کیا۔

”کیا آلہ قتل غائب نہیں ہو سکتا؟ تو مجھے کیا سبق سکھا رہا ہے؟ قتل کے وقت کیا میری موجودگی کہیں اور ثابت نہیں کی جاسکتی؟ ایک فون کرنے دے مجھے، پھر خود ہی تو مجھے بے گناہ ثابت کرنے کے لئے ایڈی چوٹی کا زور لگا دے گا۔“ شباب الدین یہ کہتے ہوئے میز کی طرف بڑھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں نے شباب الدین کے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے تھانیدار کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”پکڑ لو، اس بد معاش کو اور بیدھا کھڑا کر دو۔ کوئی بھی کیوں نہ ہو، قانون سب کے لئے ایک ہے۔“

برخود غلط شباب الدین نے غصے میں آ کر ایک سپاہی پر ہاتھ چھوڑ دیا اور یہی اس کے حق میں غضب ثابت ہوا۔ تھانیدار نے آواز دے کر مزید سپاہیوں کو بلا لیا۔ پھر شباب الدین کو آنے وال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ تھانیدار نے اس کے جسم پر ایسی جگہ فرائیں لگائیں جو بظاہر نظر نہ آئیں۔ شباب الدین کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

”تزام دے! تو میری بیٹی اترا دے گا..... پورے تھانے کو معطل کرا دے گا۔“ تھانیدار نے آخری ضرب لگائی اور پھر اپنے ماتحتوں کو مخاطب کیا۔ ”بھٹکڑی پٹنا کر اسے پولیس وین میں بٹھاؤ، جلدی کرو۔ اس کا چالان مجھے آج ہی عدالت میں پیش کرنا ہے۔“

میں نے صرف اتنا کیا کہ تھانیدار کو شباب الدین کا چالان عدالت میں پیش کرتے ہوئے کسی مرحلے

”بہتر ہے سر!“ ڈی آئی جی عین الحق بولا۔

”پولیس کی نفری تو اطمینان بخش ہے؟“ آئی جی نے معلوم کیا۔

”یس سر! آپ کا حکم ملتے ہی موقع پر پولیس کی نفری بھیجنا شروع کر دی گئی ہے۔ اس کے لئے ہم نے مختلف تھانوں سے بھی رابطہ قائم کر لیا ہے۔ ان شاء اللہ نفری کم نہیں پڑے گی۔ یونیورسٹی کو گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔ ہائی کورٹ کی طرف جانے والے راستے پر رکاوٹیں بھی کھڑی کر دی گئی ہیں۔“ عین الحق نے بتایا۔

”ڈیش آل‘ آپ کو خود موقع پر موجود رہنا چاہئے۔“ آئی جی نے آخری حکم دے کر اپنے دونوں ماتحتوں کو رخصت کر دیا۔

ان دونوں کے جاتے ہی میں بول اٹھا۔ ”اب تو آپ مطمئن ہیں آئی جی صاحب؟“

”آپ نے کل جو کچھ کہا تھا سر! وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوا۔“ آئی جی نورالاسلام نے کہا۔

”اب سے ایک گھنٹے پہلے صوبائی وزارت داخلہ کی طرف سے تحریری حکم مجھے مل گیا۔ اسی کے بعد خود محترم وزیر داخلہ نے بھی فون پر مجھ سے حکم ملنے کی تصدیق کر لی۔ زبانی طور پر بھی انہوں نے مظاہرین کو سختی سے کچل دینے کا حکم صادر کیا ہے۔ خواہ اس کے لئے پولیس کو گولی ہی کیوں نہ چلانی پڑے لیکن مظاہرین کو ہائی کورٹ تک نہیں پہنچنے دیا جائے۔ اس کے باوجود میں نے اسٹیپ ہائی اسٹیپ سختی کے احکام دیے ہیں۔“

میں نے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے آئی جی سے پوچھا۔ ”صوبائی وزیر داخلہ نے آج اپنے بھتیجے کے بارے میں تو آپ سے کچھ نہیں کہا؟“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئی سر! انہوں نے ضروری گفتگو کے بعد فوراً سلسلہ منقطع کر دیا۔“

”اب یہ نوبت آئے گی بھی نہیں آئی جی صاحب! ان موصوف کے بھتیجے شہاب الدین کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔“

”لیکن سر! میرے علم میں تو یہ بات نہیں آئی۔ کیا انٹیلی جنس والوں نے اسے حراست میں لیا ہے؟“

”نہیں‘ پولیس ہی نے ایک قتل کے جرم میں اسے گرفتار کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ آپ کے صوبائی وزیر داخلہ کو اب تک اس کا علم نہ ہو۔ آج تو عدالت میں اس کا چالان بھی پیش کیا جا چکا ہے‘ کیونکہ قتل ڈھاکہ کلب میں گزشتہ روز ہوا تھا۔ شہاب الدین نے عدالت کے سامنے اپنے دیگر جرائم کا بھی اعتراف کر لیا ہے۔“

”اتنی جلدی عدالت میں اس کا چالان بھی پیش کر دیا گیا؟“ آئی جی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اور اسے جیل بھی بھیج دیا گیا“ عدالت کے حکم پر۔“ میں نے کہا اور پھر مختصراً آئی جی کو شہاب الدین کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

”قدرت کی لامنی ہے آواز ہوتی ہے سر!“ آئی جی بولا اور اسی لمحے فون کی کھنٹی بجنے لگی۔

پر دشواری نہ ہو۔ میرے زیر اثر شہاب الدین نے جب عدالت کے روبرو اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا تو پھر میں وہاں نہیں رکا۔ عدالت نے اسے جیل بھیجے کا حکم دیا تھا۔

دوسرے کے بارے میں جتنے والے تھے جب میں انسانی قالب اپنا کر پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں مجھے خاصی گھما گھی دکھائی دی۔ آئی جی نورالاسلام مجھے اپنے کمرے ہی میں ملا۔ توقع کے مطابق اس نے مجھے فوراً اندر بلا لیا تھا۔ کمرے میں آئی جی کے دو ماتحت بھی بیٹھے تھے۔

میں نے فوری طور پر گھما گھی اور آئی جی کی مصروفیت کا سبب معلوم کر لیا۔ کرسی پر بیٹھے ہی میں اسی لئے آئی جی سے مخاطب ہوا۔ ”آپ اپنی مصروفیات جاری رکھیں۔ میں کچھ دیر انتظار کر سکتا ہوں۔ ابھی طلبہ کے مظاہرے میں تقریباً دو گھنٹے باقی ہیں لیکن انتظامات تو پہلے سے ہو جانا چاہئیں۔“

ڈی آئی جی جو میرے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا‘ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی اور پھر بولا۔ ”عین الحق صاحب! آپ نے آج اپنے بیٹے کو یونیورسٹی جانے سے روک کر اچھا کیا۔“

”آ..... آپ مجھے جانتے ہیں؟“ ڈی آئی جی کے چہرے پر شدید حیرت نظر آئی۔

”جی ہاں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اگر نہ جانتا تو آپ کا نام کیسے لیتا؟“

”مم..... مگر میرے بیٹے کے بارے میں.....“ ڈی آئی جی ہکلا کر رہ گیا۔

”کوئی تشویش کی ضرورت نہیں۔ نوجوانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ اس شرکی فضا میں جو زہر پھیلا ہوا ہے‘ اس سے بچنا مشکل ہے۔ آپ اپنے دفتری فرائض انجام دیں اور اس ذاتی مسئلے کو بھول جائیں۔ میں تو آپ کی دوداندگی کی تعریف کر رہا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

آئی جی نورالاسلام میری خاموشی کا مطلب سمجھ گیا اور عین الحق کو مخاطب کیا۔ ”جی؟ آپ کیا کہہ رہے تھے؟“

”سر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد رپورٹس کے مطابق آج صبح ہی سے یونیورسٹی کے احاطے میں موجود ہے۔ اس تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ طالب علموں کے پاس اسلحہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں مسلح تصادم بھی ہو سکتا ہے۔“ ڈی آئی جی نے جواب دیا۔

اس موقع پر میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ ”عین الحق صاحب! میں اس ضمن میں آپ کو یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ طلبہ کی اکثریت غیر مسلح ہوگی۔ چند طلبہ اگر مسلح ہوئے بھی تو وہ یہ حماقت نہیں کریں گے۔ دراصل تخریب کاروں کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ وہ طالب علموں کو اسلحہ تقسیم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔“

آئی جی نے کچھ جانے بوجھے بغیر ہی میری تائید کر دی‘ پھر کہا۔ ”طلبہ کو یونیورسٹی سے باہر آ کر مظاہرے سے نہ روکا جائے البتہ انہیں منتشر ہو جانے کے لئے وارننگ ضرور دی جاتی رہے۔ اگر وہ ہائی کورٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں تو انہیں کسی قیمت پر ایسا نہ کرنے دیا جائے۔“

”میں کون ہوں جانتی ہے تو؟“ یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں نہیں جانتی، سکھ میرے تو اور کون ہوتا۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔

”اور اب؟“ میں نے آواز بدل کر پوچھا۔

”تو شاید مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مختلف آوازیں بدل سکتا ہے۔“ وہ اب بھی مجھے سکھ بیری ماننے پر مصر تھی، پھر کہنے لگی۔ ”میں نے عبدل سے آئند کا پتا کرایا تھا، مگر وہ بے وقوف کچھ معلوم نہ کر سکا۔ کل گیا تھا وہ۔ کسے لگا کہ دفتر بند ہے۔ آج میں خود جا رہی تھی وہاں۔“

”اب کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی سنتا؟“ میں بولا۔ ”آئند اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

”کیا..... کیا تو نے اسے مار دیا؟“ اس نے حیرت زدہ آواز میں معلوم کیا۔

”ہاں مر گیا وہ۔ اسی کے ساتھ اور بہت سے مر گئے۔ ڈھاکہ شہر میں اب تیرے سوا سرحد پار سے یہاں آنے والا کوئی نہیں رہا۔ کچھ میرے ہاتھوں جہنم میں چلے گئے جو باقی بچ گئے تھے اور میں انہیں تلاش نہیں کر سکا تھا، بوڑھے شیطان دودو چڑی کے حکم پر یہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کیلئے بڑھے نے جسے تو اپنے باپ کی جگہ سمجھتی ہے، تجھے تلاش کر کے قتل کا حکم دے دیا تھا، مگر ناکام رہا۔ محبوب کو تو جانتی ہو گی تو؟“

”ہاں ہاں لیکن وہ تو جیسور میں ہوتا ہے۔ کیا کانتا کے بعد اسے یہاں بلا لیا گیا تھا؟“

”وہ بھی کام آ گیا۔“ میں نے بتایا۔ ”اسی کے ساتھ اس کا پورا گروہ بھی پکڑا گیا۔ محبوب ہی کو تیرے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، کیونکہ وہ تجھے پہچانتا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ان پرانے بد معاشوں کو بھی لے کر ڈھاکہ آیا تھا جنہوں نے تجھے دیکھا تھا۔“

”تجھ سے لکر لے کر اچھا نہیں کیا وندو جی نے۔“ سینتا نے اظہار افسوس کیا۔

”اور تجھے اس پر کوئی رنج نہیں ہوا کہ اس گدھ نے تیرے قتل کا حکم بھی دے دیا تھا؟“

”یہ تو ہونا ہی تھا سکھ بیری!“ اس نے طویل سانس لیا۔ ”مجھے پہلے ہی اس کا اندازہ تھا۔ باقی ہو جانے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر میں بھی وندو جی کی جگہ ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ یہ اس خطرناک کھیل کا حصہ ہے۔“ اس کے لہجے سے اب تک دودو چڑی کے لئے احترام کا تاثر ختم نہیں ہوا تھا۔

”پھر تو نے سوچا کیا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”واپسی کے سارے دروازے تیرے لئے بند ہیں۔ تو اگر یہاں سے کسی طرح فرار ہو کر اپنے ملک بھی چلی گئی تو یقیناً وہاں بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ تیرے گرد گھنٹال نے رپورٹ دے دی ہو گی کہ تو بغاوت کر چکی ہے۔“

”سوچنا دماغ کا کام ہے سکھ بیری! میں نے تیرے معاملے میں صرف اپنے دل کی آواز سنی۔ کل کیا ہو گا؟ اگر یہ سوچتی تو پھر تیری نہ رہتی۔ تیری خاطر میں نے سب کچھ تیاگ دیا۔ یہ تو تجھے سوچنا تھا کہ مجھے یہاں سے کہاں لے جائے گا؟ دنیا بہت بڑی ہے سکھ بیری! ہم کہیں بھی چل سکتے ہیں۔“

”اور اگر میں تیرے ساتھ نہ چل سکوں تو؟“ میں نے اصل بات کہنے کے لئے تمہید باندھی۔

میں نے غنیمت جانا اور آئی جی سے بشرط فرصت پھر کبھی ملنے کے لئے کہہ کر چل دیا۔ ابھی میرے پاس وقت تھا اور مجھے سینتا کی خیر خبر بھی لینا تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس عورت کے لئے میرے دل میں ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ پہلے سینتا کے بارے میں میں نے یہ سوچا تھا کہ آئند اس کے ہاتھوں مارا گیا تو خود اسے ختم کر دوں گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ سینتا، آئند کو قتل کر کے فرار نہ ہو پاتی یا پھر آئند کے آدمی اسے مار دیتے۔ اب نہ آئند زندہ بچا تھا نہ کوئی غیر ملکی تخریب کار اس شہر میں تھا۔

پولیس ہیڈ آفس کی عمارت سے نکلنے ہوئے خود میں نے اپنا تجزیہ کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سینتا بہر حال ایک دکھی آدم زادی تھی۔ میں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے اسے محبت کا فریب دیا اور وہ فریب کھا گئی۔ اس کا سبب کچھ بھی ہو لیکن وہ اپنے جذباتوں اور ان کے اظہار میں جچی تھی۔ اس امکان پر بھی میں نے غور کیا کہ اسے دودو چڑی کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ سینتا کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کرتے ہوئے مجھے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دور تک پیدل چلتے ہوئے آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اس طرح شاید میرے ضمیر پر بوجھ نہ رہتا۔

بابو بازار کے اس کٹھنے تک مجھے پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ جہاں سینتا سے آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ انسانی قالب اپنانے سے پہلے اسے میں نے تلاش کر لیا۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بڑی آہستگی سے دروازہ اندر سے بند کر لیا پھر بھی وہ چونک اٹھی اور تیزی سے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”اب کیا دیکھ رہی ہے سینتا کہ دیکھنے کو بچا ہی کیا ہے۔“ میں ان الفاظ کے ساتھ ہی ظاہر ہو گیا۔

”تیری آواز تو سکھ میرے ملتی ہے اور تو آیا بھی اسی کی طرح ہے، مگر تیرا چہرہ کیوں بدلا ہوا ہے؟ کیا تو نے بھی ہمیں بدلا سیکھ لیا؟“

”میرے کتنے چہرے ہیں سینتا! یہ تو خود میں نے بھی کبھی یاد نہیں رکھا۔ تو نے صرف میرا ایک ہی چہرہ دیکھا تھا۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”تو آج یہ کیسی باتیں کر رہا ہے سکھ بیری!“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”یہ جو چہرہ اس وقت تجھے نظر آ رہا ہے، اسے لوگ مقصود میاں کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔“

”مقصود میاں..... وہی کہ جس کے نام سے تو نے اپنی بچت کے لئے خصوصی اختیار نامہ حاصل کیا تھا؟“

”ہاں وہی مقصود میاں!“ میں نے تصدیق کر دی، پھر بولا۔ ”مگر میرے تو اور بھی بہت سے نام ہیں۔“

”ہوں گے، مجھے ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔“ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ میں مونڈھے پر بیٹھا تھا۔

”تجھے معلوم ہے، میں نے بھی کتنے نام بدلے ہیں اور چہرہ بھی۔ اب ستارہ بالی بنی ہوں۔ ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لئے تو ہر حال میں وہی رہے گا کہ جو ہے۔“

”تو مجھے کیسے جانے کی کیا ضرورت ہے، میں تیرے سنگ سنگ رہوں گی۔“

”سینا! تو شاید ایسا نہ کر سکے۔“

”تو پھر آزما کر دیکھ لے۔“ اس کے لمبے میں سچائی تھی۔

میں جو سوچ کر اس کے پاس آیا تھا، وہ کہتے ہوئے تذبذب کا شکار ہو گیا۔ چند لمبے خاموش رہ کر میں نے اس سے اپنی دانست میں آخری سوال کیا۔ ”یہ بتا سیتا کہ ایک طرف ونود چڑجی ہو اور دوسری طرف سکھ بیر، دونوں میں سے کس کا ساتھ دے گی تو؟“

”اس سوال کا جواب تو تجھے پہلے ہی مل چکا ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں، ونود جی کے ساتھ نہیں۔“

میں نے اپنے سوال کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ ”اگر کوئی ایسا موقع آ گیا کہ تجھے میری وجہ سے ونود چڑجی کے مقابل آنا پڑا تو کیا اس پر تیرا ہاتھ اٹھ جائے گا؟ تو میرے ساتھ اس سے لڑ سکے گی؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ذہن پر بھی توجہ دی کہ اس کے جھوٹ اور سچ کو پرکھ سکوں۔

کچھ دیر وہ خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔ ”اس کے لئے مجھے اپنے ماضی کو بھول جانا پڑے گا اور دشمن اور میں شاید ایسا..... ایسا بھی کر سکتی ہوں..... پھر کون ونود چڑجی، جو تیرا دشمن سو میرا دشمن..... اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گی میں۔“

میں نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ سینتا سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اسے فریب دیا تھا اور مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ پھر شاید دل برداشت ہو کر خود کشی کی راہ اپنالیتی، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ رہا مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میری خاطر ونود چڑجی سے بھی نبرد آزما ہونے کی ہمت کر سکتی ہے۔ میں نے اب تک دشمن کا یہ ہتھیار خود اسی کے خلاف استعمال کیا تھا۔ سینتا بہر حال ایک تربیت یافتہ انتہائی خطرناک عورت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کھیل کس طرح جاری رکھا جاسکتا ہے؟ مجھے اس نے سوچنے دیا اور ٹوکا نہیں لیکن اس کی نظریں میری ہی طرف تھیں۔ ایک نتیجے تک پہنچنے ہی میں نے مقصود کا قالب چھوڑ دیا۔

”ارے تو..... تو چلا گیا کیا؟“ وہ چونک کر بولی۔

”نہیں، میں تیرے ہی پاس ہوں۔“ میں دوسرے ہی لمبے سکھ بیر کے قالب میں ظاہر ہو گیا۔

”تیرے پاس بڑی ہمتی ہے سکھ بیر! اوپل بھر میں اپنا چہرہ بدل سکتا ہے۔“ وہ مرعوب سی ہو گئی۔

”سینا! ابھی تو مجھے جان کر بھی نہیں جان سکی۔ اس میں ابھی تجھے بڑا دقت لگے گا۔“ میں دانستہ

بولی۔

”تو نے کبھی مجھے کچھ بتایا بھی تو نہیں۔ میرے بارے میں تو سب کچھ جان لیا تو نے اور مجھ پر بھروسہ نہیں کیا تو نے۔“ اس کی آواز میں شکایت تھی۔

”وجہ تھی اس کی، کچھ بتا دیتا تو پھر تجھے میرے پیار پر دشواں نہ آتا۔“ میں جواب میں بولا، پھر اس سے چہرے کا میک اپ ختم کر دینے کو کہا۔ ”اتنے دن ہو گئے تیرا درشن کئے ہوئے، اب مجھ سے مبر نہیں ہوتا۔ دیے بھی اب یہ سوانگ رکھائے رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تجھے جس کی طرف سے خطرہ تھا“

بھی اس شر سے بھاگ چکا ہے اور اس کے چیلے چائے بھی..... آج میں تجھے اپنے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتاؤں گا جو پہلے نہیں کہیں۔“

میرے کہنے پر سینتا نے اپنے چہرے سے میک اپ ختم کر دیا، پھر مسکرا کر پوچھا۔ ”اب درشن کی پیاس بجھی؟“

میں اسے دار فکری کے عالم میں دیکھتا رہا لیکن میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مقصد اسے اپنے عشق کا یقین دلانا تھا۔

”ہاں تو مجھے کیا بتانے والا تھا؟“ سینتا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”میں اس دھرتی پر اکیلا نہیں آیا تھا۔“ میں نے گویا انکشاف کیا۔ ”میرے ہی ساتھ آشا بھی تھی۔“

”آشا..... وہ کون ہے؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”میری ہی طرح ہندو مہاسما کی ایک رکن۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ بھی درگا دیوی کی داسی ہے۔ اس کی ہفتی کسی طرح مجھ سے کم نہیں۔ تجھ سے آشا کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ تو میری طرف سے کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے۔ ہم دونوں نے مل کر اس ملک کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ ونود چڑجی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پہلے ہمارا خیال یہی تھا کہ ہماری منزل ایک ہے، مگر وقت نے یہ ثابت کر دیا، میں اور آشا غلط سوچ رہے تھے۔ ونود چڑجی عیار اور کمینہ نکلا۔ اس نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے تیرے ذریعے مجھے اپنا آلہ کار بنانا چاہا، پھر اپنی کینگیں پر اتر آیا۔ جس طرح کانگریس دغلی ہے، اس کے دو چہرے ہیں اسی طرح ونود چڑجی بھی دغلا ثابت ہوا۔ سو ہم نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اسی کے ساتھ خبر ملی کہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے کانگریس کی سرکار نے ہمارے بیویوں پر سختی شروع کر دی ہے۔ ادھر اسی سرکار کے ایک نوکر ونود چڑجی نے مجھے ختم کرانا چاہا۔ پھر میں اسے یہاں کیسے پہنچنے دیتا۔ تو کیوں اس کے ساتھ تھی، یوں تجھے ضرور ہوشیار کر دیا۔ اب ہمارے بیویوں کی طرف سے ہمیں حکم مل چکا ہے کہ ہم کانگریس سرکار کے پشو کا بیج ہاں کر دیں۔ ہم اس کے لئے سارے حربے آزما رہے ہیں۔ فیصلہ اب تجھے کرنا ہے کہ تو اس کھلی جنگ میں ہمارا ساتھ دے گی کہ نہیں۔“

سینتا نے اپنا فیصلہ سنانے میں دیر نہیں کی، بولی۔ ”میرا تو سب کچھ تو ہے سکھ بیر! ویسے بھی اب میرا بھارت سرکار سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ کانگریس اور ہندو مہاسما کے جھگڑے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ تو جو کہے گا، میں وہی کروں گی۔ اس کے بدلے مجھے کچھ اور نہیں، صرف تیرا ساتھ چاہئے۔ رہی آشا کی بات تو مجھے اپنے پیار پر بھروسہ ہے۔ تو میرے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہ بھی تو بتا ہے کہ کسی استری (عورت) سے تیرا تعلق ممکن ہی نہیں۔ تو نے اگر ایسا کیا تو تیری ہفتی چھن جائے گی۔ اب تک تیری ہفتی برقرار ہے، یہ بھی تو اسی کا ثبوت ہے کہ تیرا کسی سے سبندھ (تعلق) نہیں۔ پھر کسی آشا سے میں کیوں ڈروں کہ وہ تجھے مجھ سے چھین سکتی ہے۔ یا اس سے تو پریم کرتا ہو گا۔ تجھے پہلے ہی بتا دیتا چاہئے تھا اوپلنگ!“

کر۔

”کسی بھی شر کا نام لے دوں گا۔ تو کھانا سے آئی ہے۔ اب تو کمائی پوری ہو گئی؟“ میں بھی ہنس

دیا۔

”نہیں۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”تجھے کہاں ملی؟“

”بقیہ کمائی تو خود سوچتی رہ، میں چلا۔ نایکا سے بات کر لیجو۔“ میں یہ کہتے ہی اس کی نظروں سے

اوجھل ہو گئی۔

خوشخبری سنانے کے بہانے سوی کو میں نئی صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے دانستہ

انسانی قالب نہیں اپنایا کہ جلد واپس بھی جانا تھا۔

مجھے سوی اندر کمرے میں آرام کرتی ہوئی مل گئی۔ میری خوشبو اس نے محسوس کر لی تو دھیمی آواز

میں بولی۔ ”تو آگیا اے علیالیش! مگر اس طرح کیوں آیا؟“

”وہ تو میں تجھے بتا دوں گا“ مگر تو اس وقت باورچی خانے میں کیوں نہیں؟ امینہ اکیلی کام کر رہی

ہے۔“

”انہی لوگوں نے زبردستی مجھے کوئی کام کرنے سے روک دیا۔ ان کے خیال میں ابھی مجھے آرام کی

ضرورت ہے۔“

سوی سے میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ اس نے سنیتا کی آمد پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

”لے آ آے، میرا بھی دل اس پر راضی نہیں تھا کہ اسے مار دیا جائے۔“ سوی پوری بات سن کر

کنے لگی۔

”مرنا تو خیر اس کا مقدر ہے، مگر میں اپنے دامن پر یہ خون کا دھبہ نہیں لگانا چاہتا۔“

”یہ آدم زادیاں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں اے علیالیش! ایک بار کسی کو اپنا سمجھ لیں تو پھر جان بھی

دے دیتی ہیں۔ ہم جن زادیوں میں ایسی کم ہیں۔“

کمرے میں سوی اکیلی تھی اس لئے مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں واپس باہر بازار آیا تو سنیتا

میرے ساتھ چلنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اس نے عبد کو بلا کر بھی بات کر لی تھی اور نایکا سے بھی کہہ دیا تھا

کہ جاری ہے۔ نیلم جو اس کی ہم رقص تھی اور نایکا دونوں ہی اداس اداس تھیں۔ سامان بندھا رکھا

تھا۔

میں سارا جائزہ لے کر کوٹھے کے دروازے تک آیا اور خورشید احمد کا انسانی قالب اپنا کر دستک

دی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سنیتا نے نایکا سے کیا کہا ہے۔

دروازہ نایکا نے آ کر کھولا تو میں بولا۔ ”مشتور صاحبہ سے کہہ دیں کہ میں انہیں لینے آیا ہوں۔ میرا

نام خورشید احمد ہے۔“

”اندر آ جائیں۔ وہ آپ ہی کے انتظار میں تیار بیٹھی ہیں۔“ نایکا ایک طرف ہٹ گئی۔

میں نے اندر قدم رکھا۔ نایکا مجھے اپنے ساتھ اس کمرے میں لے آئی جہاں میں آج ہی آ چکا تھا۔

”یہ بھی سن لے ادبگلی! اوپریم دیوانی کہ وہ میری بیوی بن کر ایک ہی گھر میں ساتھ رہتی ہے۔ ہم ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔ اس کا نام صنوبر اور میرا نام خورشید احمد ہے۔ ہم دونوں ہی اپنے چہرے اور آوازیں بدل لیتے ہیں۔“ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا۔

”کیا چہرے اور آوازیں بدلنے سے آتما (روح) بھی بدل جاتی ہے؟“ وہ ہنس دی۔

”نہیں سنیتا! آتما نہیں بدلتی۔“ میں اس کی تائید میں بولا، پھر کہا۔ ”اب تو میرے ہی ساتھ رہے گی

..... بول چلے گی میرے ساتھ؟“

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”تو کسی روپ میں ہو، میرے من کی شناعتی کے لئے یہ بھی بہت ہے کہ میں

تیرے ساتھ ہوں۔“

”تو اپنا سامان سمیٹ لے، میں اتنے میں آشا کو یہ خوشخبری سنا کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ مجھے جانتی ہے؟“ سنیتا نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھی طرح، میں اسے بتا چکا ہوں کہ تو میری پریسیکا (محبوبہ) ہے۔“

”جب تو ہوٹل میں تھا تو اس وقت میں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ کہاں تھی؟“

مجھے معلوم تھا کہ سنیتا یہ سوال ضرور کرے گی، سو بولا۔ ”اسے میں مغربی پاکستان ہی میں چھوڑ آیا

تھا۔ جب میں ڈھاکہ سے فرار ہو کر راج شاہی چلا گیا تھا تو مجھے تلاش کرتی ہوئی آشا وہاں آ گئی۔ اس نے

مغربی پاکستان سے یہاں آتے ہی میرا کھوج لگا لیا تھا۔ اس کے پاس اگر فحش نہ ہوتی تو مجھے تلاش نہ کر

پاتی۔“

”اس کی فحش کا راز بھی میری سمجھ میں آ گیا۔“ سنیتا مسکرائی۔ ”وہ بھی تیری ہی طرح ہو گی۔ اس

کے شریر (جسم) کو اب تک کسی نے چھوا نہیں ہو گا۔“

”بڑی ہی تیز ہے تو!“ میں نے اس کی غلط فہمی کو بڑھاوا دیا۔ یہ بچی اسے میں نے ہی پڑھائی تھی۔

”دیکھ لے میرا داغ کتنی تیزی سے کام کرتا ہے۔ اب تو آشا پر کسی طرح کا شک ممکن ہی نہیں۔“

”اپنے گھر میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی میں نے عارضی طور پر پناہ دے دی تھی جن کی زندگی کو دونوں

چڑی کے غنڈوں کی طرف سے خطرہ تھا۔ اب یہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ آج شام سے پہلے باتو میں ان کو انہی

کے گھر چھوڑ آؤں گا یا پھر رہنے کا کہیں اور بندوبست کر دوں گا۔ یہ میں نے تجھے اس لئے بتا دیا کہ انہیں

گھر میں دیکھ کر تو حیران نہ ہو۔“

”میں اب کسی بات پر حیران ہونے کی حد سے بہت آگے نکل چکی ہوں۔ جیون کے اتنے روپ

بہروپ دیکھ لئے ہیں میں نے تیرے ساتھ کچھ دن بتا کر کہ شاید ہی کسی نے دیکھے ہوں۔ کوئی سن لے تو

یقین نہ کرے۔ سکھ بھرا! کبھی کبھی تو یہ سب پہنا سا لگتا ہے۔“

”ان لوگوں کو میں تیرے بارے میں یہ بتاؤں گا کہ تو میری بیوی صنوبر کی بڑی بہن کشور ہے، ٹھیک

ہے نا؟“

”اور اچانک آ کہاں سے گئی؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔ ”جو کمائی کسی کو سنانا ہو، پہلے ہی سوچ لیا

اندر تو چلو۔“

”تم اتنی حسین ہو گی آشا! میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“ سنیتا کہنے لگی۔ ”کچھ ہیر نے بھی نہیں بتایا۔“ اس پر سوسی مسکرائی اور کہا۔ ”میں صنوبر ہوں اور آپ میری باقی کشور ہیں جو کھلتا سے آنے والی تھیں۔ میرے شوہر خورشید احمد آپ کو ریلوے اسٹیشن لینے گئے تھے..... سمجھ گئیں سنیتا! تمہیں کچھ ہیر نے بتایا ہو گا کہ کچھ اور لوگ بھی یہاں ہیں۔“

گھر کے صدر دروازے اور اندر صحن کے درمیان خاصی طویل راہداری تھی اس لئے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہاں موجود دیگر افراد کوئی بات سن لیں گے۔ پھر بھی ان دونوں کی آوازیں دھیمی ہی تھیں۔ سنیتا کے لئے سوسی نے خواب گاہ کے برابر والا کمرہ منتخب کیا تھا۔ ہم اسی کمرے میں آ گئے۔ ”ارے واہ!“ سنیتا نے ادھر ادھر نگاہیں گھما کر کہا۔ ”تم نے تو پہلے ہی سے کمرہ سجا رکھا ہے۔ ہر چیز موجود ہے۔“

کاشان حیدر اور اس کے اہل خانہ اپنے کمرے میں تھے۔ اس وقت مجھے ان سے ملنا بھی نہیں تھا۔ ”تم دونوں باتیں کرو مجھے جانا ہے۔“ میں بولا۔ ”کہاں چلے؟“ سنیتا نے پوچھ لیا۔ ”آشا تمہیں بتا دے گی۔“ میں نے جواب دیا، پھر سوسی کو اطمینان دلایا۔ ”عصر سے پہلے لوٹ آؤں گا۔“

”دیر نہ کرنا۔“ سوسی نے تاکید کی۔

☆=====☆

سنیتا کی وجہ سے میں اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی پہنچ سکا جب پولیس گولی چلانے کے لئے پوزیشن لے چکی تھی۔ سر سلیم اللہ روڈ پر ہر طرف پتھری پتھر بکھرے پڑے تھے۔ شریند طالب علم آج بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھے کہ پولیس صرف دھمکیاں دے رہی ہے۔ وہ ڈھاکہ میڈیکل کالج کے سامنے ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے اور ان کے لیڈر انہیں آگے بڑھنے پر اکسارہے تھے۔ ڈی آئی جی عین الحق کو بھی میں نے ایک جیب میں سوار دیکھا۔ اسی کے ساتھ مجسٹریٹ بھی تھا۔ مشتعل طلبہ کو مزید جوش دلانے کی خاطر ایک طالب علم رہنما نے چیخ کر کہا۔ ”پولیس گولی نہیں چلائے گی، آگے بڑھو۔ میں چلاتا ہوں گولی۔“ یہ کہتے ہی اس کم عقل نے جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور ہوائی فائر کرنے لگا۔

”آگے بڑھو..... آگے بڑھو۔“ ہر طرف سے شور اٹھا۔

ہجوم پولیس کی طرف بڑھنے لگا۔ آگے آگے چند بد قسمت طالب علم رہنما تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

عین الحق موقع پر موجود مجسٹریٹ کی طرف جھکا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی تیز آواز جیب میں گئے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر گونجی ”فائر۔“

سنیتا میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں بھی مسکرایا۔ دانت میں کچھ ہیر کی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”میرا پیغام تو آپ کو عبدل کے ذریعے مل ہی گیا ہو گا نیگم صاحبہ!“

”ہاں خورشید احمد! ہم اسی لئے تو تمہاری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔“ سنیتا بولی! پھر نائیکا سے میرا تعارف کرایا۔ ”خورشید احمد میرے مرحوم شوہر کے ان وفادار ملازموں میں سے ہیں جو کسی صورت اپنی وفاداریاں نہیں بدلتے۔“

”اب کہاں رہ گئے ہیں ایسے لوگ۔“ نائیکا نے کہا۔ ”آپ خوش نصیب ہیں۔“

خورشید احمد کا انسانی قالب مردانہ وجاہت کا شاہکار ہی تھا۔ اس کا اثر نیلم پر بھی ہوا اور وہ مجھے چور نظروں سے دیکھنے لگی۔ طوائف زادی ہونے کے باوجود دل تو اس کے پہلو میں بھی تھا۔ مجھے اس آدم زادی پر رحم آیا کہ وہ قاتل رحم ہی تھی۔

سارا سامان سنیتا نے ایک بڑے سوٹ کیس اور بیگ میں سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے ایک وفادار ملازم کی طرح دونوں چیزیں اٹھالیں۔ سنیتا نے شمال اڈھ لی۔ چلتے وقت وہ نائیکا اور نیلم سے گلے ملی۔ پھر اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور نیلم کو دینے لگی۔ نیلم نے نوٹ لینے سے انکار کیا تو سنیتا کے اصرار پر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”آپ کی ضد ہے باقی تو رکھ لیتی ہوں، مگر اسے میں کبھی خرچ نہیں کروں گی۔ آپ کی نشانی سمجھ کر اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔“

نائیکا بھی ابدیدہ ہو کر بولی۔ ”آپ کے بغیر میرا کونسا ٹھکانا ہو جائے گا۔ یہاں آپ نے کم دن گزارے مگر میرا تو دل جیت لیا۔ شریف زادیوں پر بھی ایسا وقت آ پڑتا ہے کہ وہ ہم کم اصولوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ ہماری یاد تو خیر آپ کو کیا آئے گی، ہاں ہم نہیں بھولیں گے کہ.....“

”ایسا نہیں۔“ سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں بھی تمہیں بھول نہیں سکوں گی۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”چلو خورشید احمد!“

کوٹھے سے نیچے اتر کر میں نے چوک بازار کے لئے ایک سائیکل رکشا کر لیا۔

رکشا آگے بڑھا تو سنیتا نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”آشا کیا بولی؟“

”خوش ہو گئی تمہارے فیصلے سے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم اسی طرح آہستہ آواز میں باتیں کرتے ہوئے چوک بازار پہنچ گئے۔ کرایہ ادا کر کے میں نے سامان اٹھایا اور پیدل سنیتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”کیا تمہارا گھر دور ہے، کسی گلی میں جہاں رکشا نہیں جاسکتا تھا؟“ سنیتا نے سوال کیا۔

”احتیاط کے طور پر میں نے رکشائیں بازار میں چھوڑ دیا۔“ میں نے آہستگی سے بتا دیا۔ ”تم تو خود بہت سیانی ہو اتنی سی بات نہیں سمجھیں۔“

”تم ساتھ ہو تو پھر میں کچھ نہیں سوچتی۔“ وہ بھی دھیرے سے بولی۔

دو ایک گلیوں سے گزر کر میں اپنے گھر کے دروازے پر آ کے رک گیا۔ دستک دینے پر جب سوسی نے دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر سنیتا دنگ رہ گئی۔ اس کی وجہ سوسی کا انسانی پیکر تھا۔ میں نے کہا۔ ”ارے“

فضا پے در پے دھاکوں سے گونج اٹھی۔ پولیس نے سب سے پہلے اس ہجوم کی رہنمائی کرنے والوں ہی کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ سب وہی تھے کہ صوبائی وزیر داخلہ نے آئی جی نور الاسلام کو جن کی گرفتاری سے روک دیا تھا، غیر ملکی دشمنوں کے آلہ کار۔ ایک جگہ جمع ہو کر خود انہوں نے اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ ان کے سینے پھٹتی ہو جانے پر اسی لئے مجھے کوئی ملال نہیں ہوا تھا۔ پھر تو وہ جھگڑ چکی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ جس کے جدھر سینک سائے بھاگ اٹھا۔

ڈھاکہ شہر میں پیش آنے والا یہ تاریخی واقعہ تھا کہ جس کا ذکر کتابوں میں کیا گیا۔ ایک ہی ہلے میں دشمن کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان طالب علموں کے بعد میں اسی جگہ مزار تو بنادئے گئے، مگر ان پر فاتحہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جن بے خبروں نے حکومت کو مجبور و بے بس سمجھ لیا تھا، ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے بعد زبان کے مسئلے پر حکومت کے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں ہوا۔ لاقوں کے بھوت باتوں سے نہیں ماننے، آدم زادوں کی یہ مکمل صادق آئی لیکن وہ جنہوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا تھا، ان سے مجھے نمٹنا پڑا۔ قانون کی حکمرانی بحال ہو گئی۔ فضاؤں میں پھیلے ہوئے زہر کا اثر اتنی تیزی سے ختم ہوا کہ جس کی توقع نہیں تھی۔

میں گھر لوٹا تو خوش تھا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے ذیشان حیدر کو آواز دی۔ سوئی، کاشان حیدر اور اس کے بیٹے کو ساتھ لئے میں نشست گاہ میں آ گیا۔ میں نے انہیں بتایا۔ ”آج دشمن کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔“ اپنی آنکھوں سے جو واقعہ میں نے دیکھا تھا، بیان کر دیا۔ ”کیا سب..... وہ سب مارے گئے؟“ ذیشان حیدر نے یہ کہہ کر تصدیق کی خاطر دشمن طلبہ تنظیم کے سرکش رہنماؤں کے نام منوائے۔ ”ہاں ذیشان حیدر! تمہیں مبارک ہو۔ اب تمہاری زندگی کو کسی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”پھر..... پھر تو ہم اپنے گھر واپس جا سکتے ہیں لیکن.....“ کاشان حیدر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اب کسی وظیفے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ کشور یہاں آگئی ہیں۔“ میں نے سنیتا کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے قبضے میں تو خود کئی جنات ہیں۔ عملیات میں یہ بڑی مہارت رکھتی ہیں۔ کیوں کشور غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

سنیتا میرا اشارہ سمجھ گئی۔ اسے پہلے ہی سوئی ہموار کر چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بہانے ان لوگوں سے جان چھڑانی ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اب ذیشان حیدر کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر وہ طالب علم لیڈر نہ مارے جاتے جنہوں نے طلبہ کو بھڑکایا تھا تو دوسری بات تھی۔ میں ان لوگوں کی سکونت کا کہیں اور بندوبست کر دیتا۔

”جہاں میرے قدم پڑ جائیں وہاں سے جنات خود بخود بھاگ جاتے ہیں۔“ سنیتا نے میری بات کی تائید میں کہا۔

کاشان حیدر کو اپنے قریبی عزیزوں کا خیال آنے لگا۔ بولا۔ ”یہ بت اچھا ہوا، میرا چھوٹا بھائی اور دوسرے عزیز اچانک ہم سب کی گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے۔“

”ہاں اباجی! اب ہمیں اپنے گھر چلنا چاہئے۔“ ذیشان حیدر نے بھی کہا۔

”صاحب! وہ مختار الدین صاحب پھر نہیں آئے۔ انہی کی مرہانی سے تو ہمیں آپ کے گھر میں پناہ ملی تھی۔“ کاشان حیدر کہنے لگا۔

”ملا تھا وہ مجھے، حالیہ ہنگامے کی وجہ سے بہت مصروف تھا۔ پھر وہ اپنا تبادلہ رکوانے کے بھی چکر میں ہے۔ ممکن ہے یہاں سے اس کا مستقل تبادلہ جیسور ہو جائے۔“ میں نے آئندہ کے لئے یہ قصہ ختم کر دینے کی غرض سے کہہ دیا۔

”ان سے صاحب! آپ یہ ضرور کہہ دیجئے گا کہ اگر فرصت ملے تو اپنے تبادلے سے پہلے صرف ایک بار مل کر ضرور جائیں۔ ایسا نیک اور شریف آدمی میں نے تو نہیں دیکھا۔ ذیشان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہمارے بھائی شہزاد کے رہنے والے ہیں۔“ کاشان حیدر بولا۔

”آپ کا پیغام پہنچا دوں گا میں۔ کوئی بھی کام ہو تو آپ مجھ سے بھی آکر مل سکتے ہیں، مگر دفتر میں نہیں گھر پر۔“ میں نے اس کی تسلی کے لئے کہا۔

چائے پلانے کے الٹا آدم زادوں کو میں نے عصر سے پہلے ہی رخصت کر دیا۔ ذیشان حیدر دو رکعتوں کے لئے آیا تھا جن میں چار افراد پر مشتمل وہ لوگ محمد پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس پر میں نے سکون کا سانس لیا اور سوئی کے چہرے سے بھی اطمینان جھلکتے لگا۔ ہم دونوں ہی گزشتہ روز کی اذیت نہیں بھولے تھے۔

سوئی اور سنیتا کے ساتھ میں نشست گاہ ہی میں آ بیٹھا تھا۔ سنیتا مجھ سے بولی۔ ”کچھ بیڑا تیری یہ دوست واقعی بڑی ہنستی والی ہے۔“

”کیوں، تو نے کیا ہنستی دیکھ لی اس کی؟“ میں نے بھی اسی کی طرح بے تکلفی سے گفتگو شروع کر دی۔

”یاد ہے تجھے، ونود..... چڑچی نے تجھے چٹکار دکھانے کو کہا تھا اور تو ٹال گیا تھا۔“ سنیتا ”ونود جی“ کہتے کہتے پہلی دفعہ رک گئی۔ ”تو نے غائب ہو کر نہیں دکھایا۔“

”ہاں یاد ہے مجھے، وہ میرا امتحان لے رہا تھا۔“

”لیکن آشانے میری بات نہیں ٹالی۔ مل بھر میں تیری ہی طرح یہ کمر، سے غائب ہو گئی اور جب میں نے اسے آواز دے کر بلایا تو آگئی۔ تو نے اس کے بارے میں مجھ سے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اسے تو وہ سبھی کچھ معلوم ہے جو میں نے تجھے بتایا تھا۔ یہ تیری میری پریم کتھا سے بھی واقف ہے۔ تو نے مجھ پر برا ظلم کیا کہ اس سے پہلے نہیں ملوایا۔“

”بچھلی کسر اب پوری ہو گئی۔“ یہ کہہ کر میں اصل موضوع پر آ گیا۔ سنیتا کے ذہن کو متحرک کرنے کے لئے اس سے میں نے سوال کیا۔ ”تو کبھی نارائن سنج گئی ہے؟“

”ہاں گئی ہوں۔“ اس نے ٹھیک ہی جواب دیا۔ ”وہاں کا ایک بڑا زمیندار وحید الہاں ہمارا ہی آدمی

ہم اسی کی حویلی میں ٹھہرے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے سکھ بیر کہ جب میں نئی نئی یہاں آئی تھی۔ دودو چڑجی ہم سے پہلے یہاں آچکا تھا۔ اس نے اپنی جڑیں یہاں مضبوط کر لی تھیں۔ پانچ افراد کا گروپ تھا ہمارا، چھٹا خود دودو چڑجی تھا۔ اسی کے کہنے پر ہم اس کے ساتھ جیسور سے چانگام تک گھومے تھے۔ وہ ہمارا لیڈر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک ہم ملک کے اس حصے کو اچھی طرح گھوم پھر کے دیکھ نہ لیں۔ یہاں کام نہیں کر سکتے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہمیں گھومتے پھرتے گزرا تھا۔ دودو چڑجی کی اصلیت صرف مجھ کو معلوم تھی ورنہ تو سب اسے اپنی ہی طرح سمجھ رہے تھے۔ قمری زبردان کے لئے ایک راز تھا لیکن ٹو..... ٹو نے مجھ سے اچانک نارائن گنج ہی کے بارے میں کیوں پوچھا؟

میں نے اسے بتا ہی دیا۔ "پتا چلا ہے سیتا کہ وہ چوہا دیں جا کر چھپ گیا ہے۔"

"اور تو کیا چاہتا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ اسے مل سے نکال کر مارنے کے سوا اور کیا چاہوں گا۔"

"جے بہت مشکل اسے مارنا۔ وہ گھبرا ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی وہ کوئی گھبراہٹ پرست کے لئے ڈالتا ہے تو کبھی انسانوں کے لئے۔ اگر ٹو نے صحیح پتہ لگایا ہے کہ وہ نارائن گنج ہی میں ہے تو وحید الزماں کی حویلی میں ہو گا۔ حویلی کا ایک حصہ بالکل الگ تھلگ ہے۔" سیتا یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگی جیسے کوئی بات یاد کر رہی ہو۔

اسے ابھی ختم نہ کرنا اور بابو بازار سے اپنے ساتھ لے آنا میرے لئے سوند ثابت ہو رہا تھا۔

"کوئی خفیہ راستہ بھی تھا، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ بہت سے زمینداروں کو اپنی حویلیوں میں ایسے خفیہ راستے بنوانے کا شوق ہوتا ہے۔" سیتا یاد کر کے بتانے لگی۔ "وہ راستہ حویلی کے پیچھے جنگل میں لگتا تھا۔ ایک دفعہ دودو چڑجی مجھے اس راستے سے رات کے وقت جنگل میں لے گیا تھا۔"

"کس لئے؟" سو نے پہلی مرتبہ اس گفتگو میں حصہ لیا۔ "وجہ تو ہو گی اس کی۔"

سیتا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس نے کہا تھا، کہیں بھی رہو، فرار کا راستہ ضرور معلوم ہونا چاہئے۔ کسی اور کو اس نے وہ راستہ نہیں دکھایا۔ اگر ہم جنگل کی طرف سے بچنے ہی بچنے سرنگ کے راستے اس حویلی میں پہنچ جائیں تو..... تو پھر شاید ہمارا مقصد پورا ہو جائے، کیونکہ گھبراہٹ کے اندر نہیں ادھر ڈالا جاتا ہے۔" سیتا کے لہجے میں اب نام کو بھی دودو چڑجی کے لئے احترام نہیں تھا۔ وہ یوں بے تحاشہ بول رہی تھی جیسے دودو چڑجی سے اس کی بھی دشمنی ہو۔

اس موقع پر سیتا کے ذہن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"مجھے کب یہ معلوم ہوا کہ وہ نارائن گنج میں ہے؟" کچھ سوچتے ہوئے سیتا نے مجھ سے معلوم کیا۔

"کل شام۔" میں نے جواب دیا۔

سیتا سوچنے لگی، پھر تو شاید مشکل ہے کہ اب تک دودو چڑجی وہیں ہو۔ یہی بات اس کی زبان پر بھی آگئی۔

"تیرے خیال میں نارائن گنج سے فرار ہو کر وہ کہاں جا سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کا سب سے محفوظ ٹھکانہ چانگام ہلز میں ہے۔ اس گھنے اور وسیع و عریض جنگل میں اسے تلاش کر لینا ہنسی کھیل نہیں۔"

"تو وہاں بھی تو گئی ہے۔ اگر وہ نارائن گنج سے اب تک بھاگ بھی گیا ہو گا تو ہم اسے چانگام ہلز میں گھیر لیں گے۔" میں نے امید کا دامن نہ چھوڑا۔

"اور وہ سرحد پار کر کے نکل گیا تو؟" سیتا نے ایک اور اندیشہ کا اظہار کیا۔

"یہ مجھے یقین ہے سیتا کہ ابھی وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ کیا وہ اتنی ہی جلدی ہار مان جانے والوں میں سے ہے؟" میں بولا۔

"وہ ایسا ہے تو نہیں لیکن آدمی کب حوصلہ ہار جائے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اس کا مزاج بھی ایسا ہے کہ عین وقت پر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے۔ گرگٹ بھی شاید اس سے جلدی رنگ نہ بدل پاتا ہو۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، سو یہ کہہ رہی ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی سکھ بیر!"

"کہہ دے وہ بھی، شاید میں تجھے سمجھا سکوں۔" میں نے کہا۔

"پہلے تجھے یہ بتا دوں کہ تو یہ نہ سمجھ لیجو، اس طرح میں دودو چڑجی کو بچا رہی ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اس کی ملک اور رسد کے راستے بند کئے جاتے ہیں۔" سیتا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "تجھے ضد کیوں سوار ہو گئی ہے کہ پہلے دودو چڑجی کو ختم کرے؟ وہ اکیلا رہ جائے گا تو اسے گھیر کر مارنا آسان ہو جائے گا۔ یہ تو تجھ کو بھی خبر ہو گی کہ باہر سے آدمیوں کو مارتا رہے گا اور ان کی جگہ دوسرے لیتے رہیں گے۔ میں نے مان لیا کہ دودو چڑجی اگر مارا بھی گیا تو کیا کوئی دوسرا یہاں آکر کمان نہیں سنبھال سکتا؟ بات تو دیں کی دیں رہے گی نا۔ ایسی صورت میں تجھے کسی اور قمری زبرد کو تلاش کرنا پڑے گا۔ کیا معلوم کہ وہ دودو چڑجی سے بھی زیادہ عیار اور طاقتور ثابت ہو۔"

"میرا ارادہ بھی پہلے یہی تھا، مگر جب اچانک یہ خبر لگی کہ دودو چڑجی کہاں چھپا ہوا ہے تو اس موقع کو غنیمت جانا۔" میں نے وضاحت کی۔ "تو نے جو کہا میں تقریباً اسی حکمت عملی پر چل رہا تھا۔ ہاں اس میں تھوڑا سا فرق ضرور تھا۔ وہ یہ کہ میں نے اس راستے کو بند کرنے پر غور نہیں کیا جہاں سے اسے مدد ملتی رہے گی۔ تیرا اشارہ پینا پل کے قریب جنگلات کی طرف ہے جو بن گاؤں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی جنگلات کا ایک حصہ اس ملک کی حدود میں شامل ہے اور دوسرا حصہ ہمارے ملک کے پاس ہے۔" میں سکھ بیر کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا، اسی لئے پڑوسی ملک کو اپنا بتایا۔ "تو نے پہلے بھی ایک دفعہ اس راستے کا ذکر کیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انہی جنگلات میں کہیں بڑے پیمانے پر اسلحہ بھی ذخیرہ کیا گیا ہے۔"

سیتا کو کیونکہ مغربی پاکستان سے دوبارہ بنگال آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور یہاں آتے ہی وہ دوسرے معاملات میں پھنس گئی تھی اس لئے اسے یہ خبر نہیں تھی۔ میری مداخلت کی وجہ سے اسے اپنے سرغنہ کے آئندہ اقدامات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اسے میں نے مزید بتایا۔ "اسلحہ کا دوسرا بڑا ذخیرہ چانگام ہلز کے جنگلات

میں ہے۔

”ایسی صورت میں تو تجھے اپنی لائن آف ایکشن کو بدل دینا چاہئے۔ پہلے ہمیں جینا پل اور پھر چانگام بلز کا رخ کرنا چاہئے، یعنی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لیکن یہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”ٹھیک سوچ رہی ہے تو؟“ میں بول اٹھا۔ ”اس کے لئے ملٹری ایکشن کی ضرورت پڑے گی۔ یہ معاملہ وزارت داخلہ کے اختیار میں نہیں۔“

”پھر..... پھر کیا کرے گا تو؟ اس کے لئے تجھے یہاں کی وزارت دفاع کا تعاون حاصل کرنا ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تُو نے یہاں کی وزارت داخلہ کے اعلیٰ حکام کو کس طرح شیشے میں اتار لیا۔ وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام سے رابطے کی تُو نے کیا صورت سوچی ہے؟“

”ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔“ میں دانستہ اس ذکر کو ٹال گیا۔ ”یہ معاملہ کچھ الجھ سا گیا ہے۔ تُو بھی غلط نہیں کہتی کہ پہلے نوڈو چیز جی کو کمک ملنے کا راستہ بند کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نوڈو چیز جی ایک مرتبہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اس وقت وہ دباؤ میں ہے اور پسپائی اختیار کر چکا ہے۔ اس کی قوت بکھر گئی ہے۔ لگاتار اس پر اتنی ضرئیں لگی ہیں کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ پہلے کانٹا اور اس کے گردہ کا خاتمہ ہوا، پھر محبوب اور اس کے گردہ کی باری آئی، آخر میں بلیک کنگ، یعنی آئندہ بھی نہ رہا۔ جن طالب علم لیڈروں کو وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر آلہ کار بنائے ہوئے تھا، وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ یہاں جو اس کے مقامی ایجنٹ تھے، وہ بھی قانون کی گرفت میں آ گئے۔ اس نے یہاں جو سازش کا جال پھیلا یا تھا، اس کا تانا بانا بکھر گیا۔ اب تو وہ اپنی اور اپنے آدمیوں کی جان بچانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ اتنے بڑے جانی اور مالی نقصان کے بعد یہ ضروری تو نہیں سنیتا کہ ہمارے ملک کی حکومت، یعنی کانگریس سرکار، نوڈو چیز جی کو مزید یہ کھیل جاری رکھنے کی اجازت دے دے۔“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے سکھ بھیرا! ممکن ہے ہماری سرکار نے تربیت یافتہ افراد کو یہاں بھیجنے سے انکار کر دے۔“ سنیتا نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ ”تجھے شاید معلوم نہ ہو کہ ایسے کسی آدمی کی تربیت پر حکومت کو کتنے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔“

پھر کافی دیر تک سنیتا کے اور میرے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ سوی نے بھی اس میں حصہ لیا۔ وہ بھی اب معاملات کو سمجھنے لگی تھی۔

ہمارے درمیان یہی طے ہوا کہ پہلے نوڈو چیز جی سے نمٹ لیا جائے۔ اس موقع کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیا خردہ شیطان ہتھے چڑھ ہی جائے۔ میری دلیل میں وزن تھا کہ غیر ملکی تحریک کاروں کو کوئی کمان کرنے والا ہی نہ ہوتا تو وہ بوکھلا جاتے۔ پھر جینا پل کے قریبی جنگلات ہوتے کہ چانگام بلز انہیں کہیں امان نہ ملتی۔ جن جن کر انہیں مار دیا جاتا۔ بصورت دیگر اگر نوڈو چیز جی ہاتھ نہ آتا تو پھر کوئی راستہ اختیار کیا جاسکتا تھا۔ زخم خوردہ دشمن انتقام پر بھی اتر سکتا ہے، اس امکان کو بھی میں نے نظر انداز

نہیں کیا۔ ہاں سنیتا سے میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ اس انتہائی کارروائی کے احکام بھی نوڈو چیز جی ہی دیتا۔ اب میں اس پر بھی غور کر رہا تھا کہ غیر ملکی دشمنوں کی تیغ کشی کے لئے کم از کم پہلے مرحلے میں ملٹری ایکشن کی ضرورت نہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے بھی یہ مناسب نہ ہوتا۔ ہم دو جن زاد تھے اور ایک خطرناک و ذہن آدم زاد ہی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ شاید ہم تینوں مل کر دشمنوں کے لئے تباہی اور موت کا پیغام بن جاتے۔ اس دوران میں اگر سنیتا کہیں کام بھی آ جاتی تو مجھے ملال نہ ہوتا۔ میں نے اس کی قسمت کا یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی ہی کے ہاتھوں ماری جائے۔ سنیتا نے ملک کے اس حصے کا ایک ایک گوشہ دیکھا تھا۔ اسے خبر تھی کہ دشمن اپنے پچاؤ کے لئے کہاں کہاں چھپ سکتے ہیں۔ کون کون سے راستے فرار کے ہیں اور ان راستوں کی کس طرح ناکہ بندی ممکن ہے۔ یہ وہ آدم زاد تھی کہ جسے نوڈو چیز جی کی جگہ دئی جاتی۔ گھر کی اسی بھیدی کے گرد میں نے ایسا جال بنایا تھا کہ اس کے لئے کوئی راہ نہیں تھی۔ یا تو وہ موت کو گلے لگالیتی یا میرے ساتھ آ جاتی۔

نارائن گنج، ڈھاکہ شہر سے تقریباً چودہ میل کے فاصلے پر تھا۔ نواب پور روڈ سے وہاں کے لئے بسیں چلتی تھیں، مگر ہم نے بس کے سفر سے گریز کیا۔ ہم نے اسی رات نارائن گنج چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب میں نے سنیتا کو بتایا کہ ہم آدمی رات کے بعد چلیں گے تو وہ حیرت سے بولی۔ ”مگر اس وقت تو وہاں کے لئے کوئی بس نہیں ملے گی۔“

”آٹا تجھے اپنے ساتھ اڑا کر وہاں تک لے جائے گی اور میں بھی تم دونوں کے ساتھ رہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اس پر سنیتا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا، کہنے لگی۔ ”مجھے یاد ہے سکھ بھیر کہ کہ ایک مرتبہ پہلے بھی میں میں تیرے ساتھ اڑی تھی۔“ اس کے پرانے زخم جیسے ہرے ہو گئے۔ ”وہی رات تو تھی کہ جب جب مجھ سے میری ہفتی چھن گئی۔“

”وہ تو جنات کا معاملہ تھا، اب تو کوئی ایسی صورت حال نہیں۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”اور اگر اس جنگل میں بھی بھوت پریت ہوئے؟“ سنیتا خوفزدہ سی نظر آنے لگی۔ ”اب تو میرے پاس کوئی ہفتی بھی نہیں۔“

”ہمارے پاس تو ہے۔“ سوی بولی۔ ”پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اگر وہاں بھوت ہوتے تو پہلے جب تُو وہاں گئی تھی تو تجھ سے چٹ گئے ہوتے۔“ میں نے بھی کہا۔

”اس وقت کی بات اور تھی۔ میرے ساتھ نوڈو چیز جی بھی تھا۔“

”اور اب ہم تیرے ساتھ ہوں گے۔“ میں نے اسے سمجھا دیا۔

رفتہ رفتہ سنیتا کے چہرے سے فکر و تشویش کے بادل چھٹ گئے۔ اپنی تمام تر خطرناک صلاحیتوں کے باوجود سنیتا اب جنات کے معاملے میں ہڈر نہیں رہی تھی۔ اس کا یہ خوف بلا سبب نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ چوٹ کھا چکی تھی۔

تیرے ساتھ ہی۔ تیرے پاس ٹارچ بھی ہے اور بھرا ہوا ریوالور بھی۔ تو یہ سمجھ کر آگے بڑھتی رہ جیسے اکیلی ہو۔ تجھے دودھ چڑی تک پہنچنا ہے۔ باقی باتیں میں تجھے سمجھائی چکا ہوں۔“

سیتا نے اقرار میں سر ہلا دیا اور اپنی پینٹ کی جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکال کر جلائی۔ اس نے گڑھے میں ٹارچ کی روشنی ڈال کر جائزہ لیا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ میں اور سوی، انسانی قابلوں سے نکل کر اس کے ساتھ ہو گئے۔

ان سیڑھیوں کا اختتام قد آدم ایک سرنگ کے دہانے پر ہوا۔ وہ دہانہ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی نمودار ہوا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ پھر کی ٹاہوار سی ایک بڑی سل اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ سیتا بلا جھجک سرنگ میں داخل ہو گئی۔ خلاف توقع سرنگ اندر سے صاف ستھری تھیں اس کی صفائی کا خیال رکھا جاتا ہو گا، میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ سرنگ زیادہ بڑی نہیں تھی، کیونکہ حویلی قریب ہی تھی۔ سرنگ کے آخر میں بھی اوپر جانے کے لئے زینہ دکھائی دیا۔ سیتا محتاط انداز میں اس زینے پر چڑھنے لگی۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی، دوسرے میں ریوالور۔

اس زینے کے آخر میں بھی بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا لیکن جب سیتا سب سے اوپری سیڑھی پر پہنچی تو پتھرلی دیوار سامنے سے ہٹ گئی۔

اسی وقت کہیں دور سے ایک تیز آواز سنائی دی۔ ”آگئی وہ..... آگئی“ میں نے انداز والے کمرے سے دیوار سکڑنے کی آواز سنی ہے۔ جلدی کرو..... دوڑو.....“

”یہ کیا ہوا اے علیا لیش!“ سوی نے سرگوشی کی تاکہ سیتا کچھ نہ سن سکے۔ ”ایسا لگتا ہے کہ اس مردود کو پہلے ہی سیتا کی آمد کا انتظار تھا۔“

”ابھی معلوم ہو جائے گا، تو نہ گھبرا۔“ میں نے سوی کو دلاسا دیا۔

سیتا آگے بڑھتے بڑھتے ٹھک کر رک گئی تھی۔ اس نے ٹارچ بجھا دی اور کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو میں نے سوی کو سیتا کے پاس چھوڑا اور اس اندھیرے کمرے سے باہر آ گیا۔

مجھے چار مسلح افراد نظر آئے جن کے ہاتھوں میں لائینیں بھی تھیں۔ میں نے انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ کرنے میں دیر نہ لگائی، پھر تیزی سے پلٹا۔

”آ جاؤ، اب کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے سوی اور سیتا کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں کہا۔ اندھیرے کمرے سے نکل کر ہم باہر والے کمرے میں آ گئے جہاں چاروں مسلح افراد بے ہوش پڑے تھے۔

اس کے بعد ہم نے حویلی کا وہ پورا حصہ چھان مارا، مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

”اسے یہیں ہونا چاہئے تھا۔“ سیتا بڑبڑائی۔

”پھر وہ شیطان کہاں گیا؟“ میں غصے میں بولا۔

حویلی کے دونوں حصوں کے درمیان بڑا سا صحن تھا۔ میں نے دوسرے حصے کا چکر لگایا تو وہ آباد نظر

آدھی رات کے قریب میرے کہنے پر سیتا نے ایسا جست لباس پہن لیا کہ جس میں ہونا نہ بھرے۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور سوی کو اشارہ کیا۔ سوی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہم گھر کے صحن میں آ گئے۔ در و دیوار کو جیسے چپ سی لگی تھی۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

سیتا دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”سکھ بھرا! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دھیرے دھیرے ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے نارائن تنج پہنچ جائیں اور میں ہوش میں رہوں؟“ پھر اس نے دلیل دی۔ ”فاصلہ بھی تو زیادہ نہیں ہے۔“

”اس طرح دیر ہو جائے گی سیتا۔“ میں بولا۔ ”ہمیں صبح ہونے سے پہلے واپس بھی تو آنا ہے۔“

وہ مان گئی۔ پہلے میں نے انسانی قالب چھوڑا، پھر سوی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد ہم تیزی سے اوپر اٹھنے لگے۔ چند ہی لمحوں کے بعد سیتا کے حواس جواب دے گئے اور وہ ہوش کھو بیٹھی۔ سیتا کے جسم کو ہوا کی رگڑ سے بچانے کے لئے سوی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ میرے لئے بہر حال یہ ممکن نہیں ہوتا۔ نارائن تنج میں ہم زمیندار وحید الزمان کی حویلی سے کچھ فاصلے پر اتر گئے۔ اب ہم اسی جنگل میں تھے کہ جس کی نشاندہی سیتا نے کی تھی۔ وہ جنگل نہ تو زیادہ بڑا تھا نہ بہت گھنا۔ سوی نے سیتا کو نرم گھاس پر لٹا دیا اور پھر اسے ہوش میں لے آئی۔

”یہ..... یہ وہی جنگل معلوم ہوتا ہے۔“ سیتا نے ہوش میں آتے ہی بتایا۔ ”اور شاید ادھر حویلی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

سوی اور میں دوبارہ انسانی قابلوں میں آچکے تھے۔

”تو تمہیں بھول گئی ہے سیتا!“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس جنگل میں اترتے ہوئے وہ حویلی دیکھ لی ہے۔ تو نے جس طرف اشارہ کیا ہے، حویلی اس کی مخالف سمت میں ہے۔ تو ذرا گھوم پھر لے تاکہ تجھے خود ہی صحیح سمت کا اندازہ ہو جائے۔“

سیتا اٹھ کھڑی ہوئی اور میری بتائی ہوئی سمت میں چلنے لگی۔ اس کا حافظہ اچھا تھا۔ حالانکہ وہ ایک ہی مرتبہ اس جنگل میں آئی تھی لیکن اس نے موٹے تنے والا وہ درخت ڈھونڈ ہی لیا کہ جس کے قریب ایک گڑھا تھا۔ اس گڑھے کے اوپر گھاس پھونس اور خاردار لکڑیاں اس طرح ڈال دی گئی تھیں کہ بھولے سے اگر کوئی راہ گیر ادھر آ جائے تو گڑھے سے بچ کر گزر جائے۔ قریبی درخت کی شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر آدھی تر چھبی لکیروں کی صورت میں اس جگہ کو نیم روشن کئے ہوئے تھی۔ اگر سیتا کو ہمیں اپنے ساتھ اس حویلی میں نہ لے جانا ہوتا تو ہم اس خفیہ راستے سے نہ گزرتے۔ دودھ چڑی کیسا ہی حصار کیوں نہ کھینچ لیتا، ہم اس حویلی میں داخل ہو جاتے۔ اس شیطان آدم زاد کو شکار کرنے کی غرض سے ہم سیتا کو چارے کے طور پر اپنے ساتھ لائے تھے۔

سوی جلدی جلدی اس گڑھے کے اوپر سے گھاس پھونس اور خاردار لکڑیاں ہٹاتے لگی۔ اس میں سیتا بھی سوی کی مدد کر رہی تھی۔ جب اس گڑھے میں اترنے کا راستہ صاف ہو گیا اور سیڑھیاں نظر آنے لگیں تو میں نے سیتا سے کہا۔ ”اب ہم دونوں تیری نظروں سے ادھکل ہو جائیں گے لیکن رہیں گے

آیا۔ یہ معہ تو بہر حال حل کرنا ہی تھا کہ زمیندار وحید الزماں کے آدمی، سیتا کے ہتھکڑیوں تھے؟ انہیں کس طرح خبر تھی کہ کوئی آنے والا ہے اور آنے والی کوئی عورت ہوگی؟

جلدی ہی میں نے زمیندار وحید الزماں کا پتہ لگا لیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اسے میں اٹھا کر لے آیا۔ سوئی اور سیتا اس وقت ایک ایسے کمرے میں تھیں جو بطور خواب گاہ کسی کے استعمال میں رہا ہو گا۔ جب میں وہاں داخل ہوا تو سیتا کو اس کمرے میں موجود ایک لیٹ جلاتے دیکھا۔

وحید الزماں کو میں نے مسری پر بچا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ میں اور سوئی اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس کی نظر اسی لئے سیتا کی طرف اٹھی۔ جو اسے نشانے پر لے چکی تھی۔ سیتا نے مسری کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے زمیندار وحید الزماں کو مخاطب کیا۔ ”تو نے مجھے پہچانا؟“

عموماً بنگال کے شہروں، قصبوں اور دیہات میں بنگلہ زبان ہی بولی جاتی تھی۔ میں نے دانستہ جگہ جگہ اس سے گریز کیا ہے تاکہ میری بات کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اس وقت بھی سیتا اور زمیندار وحید الزماں کے درمیان بنگلہ ہی میں گفتگو ہوئی۔ سیتا کے سوال کو جیسے وحید الزماں نے سنا ہی نہیں۔ وہ حیران حیران سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ اپنی خواب گاہ سے وہاں کیسے آگیا؟ اس کے چہرے پر کسی قدر خوف کے آثار بھی تھے۔ سیتا نے اپنا سوال دہرایا تو وہ کہنی کے بل اٹھا۔

”پہچان..... پہچان لیا میں نے تمہیں۔ تم الماس ہو جو..... جو شمشاد خان کے ساتھ آئی تھی، مگر یہ..... یہ ریوالتور کیوں تان رکھا ہے مجھ پر؟ اسے..... تم جیب میں رکھ لو۔“ وحید الزماں نے رک رک کر سیتا کے سوال کا جواب دیا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے بے قابو حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری توجہ اسی پر تھی۔

سیتا نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”یہ بتا کہ شمشاد خان کہاں ہے؟“

”وہ..... وہ تو یہاں نہیں آئے۔“ وحید الزماں نے جھوٹ بولا۔

اسی لمحے میں نے انسانی قالب اختیار کر لیا اور وحید الزماں مجھے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں آگے بڑھا اور اس کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا۔

”جھوٹ بولتا ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”آج ہی دوپہر کے بعد تو وہ یہاں سے گیا ہے۔“ دونوں چڑچی کو وہ شمشاد خان کے نام سے جانتا تھا۔

”تنت..... تم کون ہو؟“ وہ مزید خوفزدہ نظر آنے لگا۔

”شمشاد خان کا باپ ہوں میں۔“ میں نے الٹا ہاتھ پھر اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس پر میں تھملا کے رہ گیا تھا کہ دونوں چڑچی وہاں مجھے نہیں ملا۔ میں اسی لئے اپنا غصہ زمیندار وحید الزماں پر اتار رہا تھا۔ یوں بھی وہ وطن فروشوں میں سے تھا۔ اس کا ذہن پڑھ کر سب کچھ جان لینے کے باوجود میں نے اسی کو زبان کھولنے پر مجبور کیا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سوئی اور سیتا بھی ان باتوں سے آگاہ ہو جائیں جو میرے علم میں آچکی تھیں۔

میرے ہاتھوں پٹ کر زمیندار وحید الزماں نے زبان کھول ہی دی۔ ”وہ..... وہ شمشاد خان

یہاں کئی پہننے سے تھے۔ کل رات انہوں نے مجھے بتایا کہ..... کہ اس حویلی میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ الماس کو بھی پتہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی وقت اسی راستے سے حویلی میں داخل ہو جائے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ الماس باغی ہو چکی ہے۔ انہی کے کہنے پر میں نے اپنے چار مسلح آدمیوں کو یہاں متعین کر دیا۔ ان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک عورت خفیہ راستے سے حویلی میں آنے کی کوشش کرے گی، اسے دیکھتے ہی گو..... گولی مار دینا..... میں شم..... شمشاد خان کے حکم سے کیسے انکار کرتا؟“ آخر میں وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

”انکار بھی کیسے کرتا کہ اناج کی ذخیرہ اندوزی میں بڑی دولت کمائی تھی تو نے؟“ میں بولا۔ ”اور تجھے عیش بھی تو کرائے تھے اس نے۔ عورت اور دولت تجھے انہی کی ہوس تو ہے۔ تو نے اسی لئے تو اپنا ضمیر بیچ دیا وحید الزماں! اور اب..... اب یہی ہوس لئے تو منوں مٹی کے نیچے جاسوئے گا۔ یہی عورت کہ جس کو تو نے گولی مار دینے کا حکم دیا تھا، تجھے موت کی میٹھی نیند سلا دے گی لیکن اس سے پہلے میں تیری حرام کی کمائی ہوئی دولت چھین لوں گا..... تیرے کھلیانوں میں آگ لگا دوں گا۔ اس کے علاوہ اسلحہ کا جو ذخیرہ تو یہاں سے ڈھاکہ بھیجتا رہا ہے، اب نہیں بھیج پائے گا۔ اس حویلی کے تہ خانے میں اب بھی تو خاصا اسلحہ موجود ہے نا۔“

”تم جو..... جو چاہے کرو، مگر مجھے نہ مارو۔ میں..... میں اپنی ساری تجوریاں خالی کر کے تمہیں دینے کو تیار ہوں۔“ وہ گھٹیانے لگا۔

”اسی کے ساتھ تو یہ بھی تو سوچ رہا ہے کہ کسی طرح تیرے کارندے یہاں پہنچ جائیں، تو ہمیں دولت کا لالچ دے کر موت کے جال میں پھنسا لے۔“

زمیندار وحید الزماں یہ سنتے ہی تقریباً اچھل پڑا۔ تجوریوں کی چابیاں دینے کے بہانے وہ مجھے اپنے ساتھ حویلی کے دوسرے حصے میں لے جاتا اور پھر موقع ملنے ہی بساط الٹ دیتا۔ اس نے یہی سوچا تھا۔ دو افراد پر قابو پا لینا اس کے خیال میں مشکل نہ ہوتا۔ حویلی کے دوسرے بیرونی حصے میں بھی اس کے مسلح کارندے موجود تھے۔ اسے اچانک میرے ظاہر ہو جانے پر حیرت تو ہوئی تھی لیکن وہ اس کو اپنی نظر کا دھوکا سمجھا۔ وقتی طور پر وہ ڈرا ضرور مگر جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔

پھر سوئی بھی میرے ایما پر ظاہر ہو گئی تو زمیندار وحید الزماں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

سیتا اور سوئی، دونوں ہی کو میرے ارادوں کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”تم بیٹیں رہو“ میں ابھی آتا ہوں۔“

دوسرے ہی لمحے زمیندار وحید الزماں نے مجھے غائب ہوتے دیکھا تو دہشت زدہ ہو کر چیخا چاہا۔ سوئی اس کی طرف سے غافل نہیں تھی۔ اس نے وحید الزماں کو اپنے اثر میں لے لیا۔ وحید الزماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں اس کمرے سے نکل آیا۔

پھر میں نے وہی کیا جو زمیندار وحید الزماں سے کہا تھا۔ اس کی تجوریاں خالی کر دیں، اناج سے بھرے ہوئے کھلیانوں میں آگ لگا دی، تہ خانے میں موجود اسلحہ کے ذخیرے کو بھی نذر آتش کر دیا۔ اسی

کے ساتھ پے در پے دھماکوں سے فضا گونجنے لگی اور حویلی میں سرام ساچ گیا۔ تہ خانے میں کارتوس کی بیٹیوں کا بھی خاصا ذخیرہ تھا۔

وحید الزماں کے کارندے گھبرا کر حویلی سے بھاگ گئے۔ اہل خانہ کے سوا کسی کو پرواہ نہیں تھی کہ وحید الزماں کہاں گیا لیکن کوئی بھی حویلی کے اس حصے کی طرف نہیں آیا۔ اس کی وجہ صحن کے نیچے موجود تہ خانہ تھا جہاں سے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔

تجوریوں سے کرنسی کم اور سونا بہت ملا۔ میں نے کرنسی اور سونے کو دو بڑے تھیلوں میں بھر لیا تھا۔ کچھ آدم زاد کرنسی پر سونا جمع کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ زمیندار وحید الزماں کو بھی یہی شوق تھا۔ میں دونوں تھیلے اٹھائے اسی کمرے میں لوٹ آیا کہ جہاں وحید الزماں اب بھی سوی کے اثر میں تھا۔

”اب اسے آزاد کر دے۔“ میں نے ظاہر ہوتے ہی سوی کو مخاطب کیا۔
سوی نے وحید الزماں کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے وحید الزماں کے جسم نے جھٹکا سا کھلایا۔

”تو اب جتنا چاہے چیخ“ تجھے ہم نہیں روکیں گے۔“ میں نے وحید الزماں سے کہا۔ ”کوئی تیری چیخیں نہیں سن سکے گا۔“

وحید الزماں واقعی وحشت زدہ ہو کر چیخنے لگا۔ ”بچاؤ..... بچاؤ.....“
”کوئی اپنی موت سے بچا ہے جو تھوچ جائے گا۔“ میں ہنسا پھر سنیتا سے بولا۔ ”پھونک دے اسے۔“
سنیتا نے اس کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ دداری گولی چلانے کی نوبت نہیں آئی اور وہ جنمی سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

سرنگ ہی کے راستے ہم جنگل میں نکل آئے تو سنیتا بولی۔ ”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ونود چڑی یہاں سے فرار ہو جائے گا۔“

”پھر بھی ہمارا یہاں آنا بے کار نہیں ہوا۔“ سوی نے کہا۔ ”ہم نے اس کی ایک پناہ گاہ کو تباہ و برباد کر ہی دیا۔ اب وہ آئندہ تو ادھر کا رخ نہیں کر سکے گا۔“

”ان تھیلوں میں کیا ہے سکھ بیر جو تو نے اٹھا رکھے ہیں؟“ سنیتا نے پوچھ لیا۔
”وہ ساری دولت جو زمیندار وحید الزماں نے زندگی بھر جمع کی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گھر چل کر دکھاؤں گا۔ تو نے شاید اتنا سونا پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اس تھیلے میں صرف سونا ہی سونا بھرا ہوا ہے۔ دوسرے تھیلے میں بھی نوٹ کم ہیں، سونا زیادہ ہے۔ اٹھا کر دیکھ اس تھیلے کو۔“ میں نے ایک بڑے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

سنیتا نے وہ تھیلہ زور لگا کر اٹھا تو لیا، مگر فوراً زمین پر رکھ دیا اور بولی۔ ”واقعی یہ تو بہت بھاری ہے۔ تو نے یہ دونوں وزنی تھیلے کیسے اٹھائے؟“

”میں تو ان تھیلوں کے ساتھ تجھے بھی اٹھا سکتا ہوں، مگر اٹھاؤں گا نہیں۔“ میں دھیرے سے ہنس دیا۔ ”تجھے آشا اٹھا کر لے چلے گی۔“

یہ سنتے ہی سوی نے آگے بڑھ کر سنیتا کا ہاتھ تھام لیا۔ پہلے سوی ہی نے انسانی قالب چھوڑا اور پھر میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہم فضا میں بلند ہوتے گئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہم ڈھاکہ پہنچ کر اپنے گھر میں اتر گئے۔ سوی کو سنیتا اس کمرے میں لے آئی جہاں اس کے رہنے کا بندوبست کیا تھا۔ مسمری پر سنیتا کو لٹانے کے بعد سوی نے مجھ سے پوچھا۔ ”اسے ہوش میں لانا ہے کہ اسی طرح غفلت میں پڑا رہنے دیا جائے؟“

”ہوش میں لے آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں انسانی قالب میں آ گیا۔ ”پھر یہ خود ہی سو جائے گی۔ اسے زمیندار وحید الزماں کی جمع شدہ دولت بھی تو دکھانی ہے۔“

سوی نے بھی میری تقلید کی اور انسانی قالب اپنا لیا۔ سنیتا کو میں ہوش میں لے آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ دیکھ سنیتا!“ میں نے دونوں بڑے بڑے تھیلے اس کے سامنے مسمری پر الٹ دیے۔
سنیتا کے سامنے چمکتے ہوئے سونے کے ٹکڑوں کا کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ اس ڈھیر کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تو ٹھیک ہی کہتا تھا سکھ بیر! میں نے اتنا سونا ایک ساتھ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس زمیندار کے پاس اتنی دولت ہو گی۔“

”اور یہ دولت اس کے کسی کام نہیں آئی۔“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”معلوم نہیں اس نے کتنے غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہو گی۔ اس دولت کے حصول میں ونود چڑی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ وحید الزماں اسی لئے تو اس کا بے دام غلام بنا ہوا تھا۔ مجھے پہلے یہ پتا نہیں تھا کہ وحید الزماں، ونود چڑی کا اتنا خاص آدمی ہو گا۔ جیسی تو وہ بوڑھا شیطان، ڈھاکہ سے فرار ہو کر وہاں جا بسا اور اب..... اب نہ جانے کہاں ہو گا۔ نہ جانے اس نے خطرے کی بو کیسے سونگھ لی۔“

”اس کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔“ سنیتا نے کہا۔ ”اسے یاد آ گیا ہو گا کہ وہ مجھے حویلی میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ دکھا چکا ہے۔“

”اسی لئے وہ تیرے لئے موت کا جال بچھا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ تیرا کیا خیال ہے، کہاں جا سکتا ہے وہ؟“ میں نے سنیتا سے سوال کیا۔

”اکثر اس کے بارے میں سارے اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔“ سنیتا نے جواب دیا۔ ”اچانک ہی وہ کوئی فیصلہ کر لیتا ہے اور پھر کسی کو اس کی بھٹک نہیں لگنے دیتا۔ تجھ سے میں نے پہلے بھی کہا تھا اور پھر کہتی ہوں کہ پہلے اس کی کمک کا راستہ بند کر دے اگر یہ تیرے لئے ممکن ہو۔“

”ممکن کیوں نہیں۔“ میں پرجوش آواز میں بولا۔
”تو پھر یہاں کی وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام سے رابطے کی کوئی صورت نکال۔“ سنیتا نے مشورہ دیا۔

”میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں سنیتا کہ لٹری ایکشن کی ضرورت نہیں۔ اس میں خطرہ ہے۔“

”کس طرح کا خطرہ؟“ سنیتا نے وضاحت چاہی۔

”ایک خطرہ تو یہ ہے کہ یہاں کی ملٹری اٹیلی جنس کو مجھ پر شبہ نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا خطرہ یہ ہے کہ سرحدی جھڑپیں شروع ہو سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہاں کی ملٹری کا پلہ بھاری رہے گا۔ یہاں کے فوجی باخبر ہوں گے اور ادھر والے بے خبر۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ سینتا نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ ”اچانک ملٹری ایکشن ہو گا تو ہمارے فوجیوں کو سنہلنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ پھر کیا ہونا چاہئے؟“

”تو اس وقت مجھے تھکی ہوئی لگ رہی ہے سو جا۔ ہم کل صبح اس پر غور کریں گے۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“ میں نے فوری طور پر سینتا کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ میرا کیا ارادہ ہے۔ ویسے بھی خاصی رات گزر چکی تھی۔ سوئی نے میرے کتے پر سونا اور کرنسی دوبارہ تھیلوں میں بھردی۔

اس گھر میں سینتا کی وہ پہلی رات تھی۔ ہر چند کہ میں اسے سوئی کی طرف سے پوری طرح مطمئن کر چکا تھا، پھر بھی وہ ایک عورت تھی۔ اس کا ذہن خلفشار کا شکار ہونے لگا۔ وہ اسی لئے بول اٹھی۔ ”ابھی تو مجھے نیند نہیں آ رہی سکھ بڑا! تو آشا کو سو جانے دے۔ میں تو جانتی ہوں کہ یہ تیری بیوی نہیں اور اسے بھی سب کچھ خبر ہے، پھر کسے دکھانے کو تو دوسرے کمرے میں جا رہا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا۔

میں نے اسی لئے سینتا کے ذہن پر توجہ دی تھی۔ میرا خدشہ درست ہی نکلا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اور سوئی ایک کمرے میں نہ رہیں۔

”غلط سوچ رہی ہے تو!“ میں نے کہہ ہی دیا۔ ”میں اس کمرے میں اس لئے جا رہا ہوں کہ وہاں دو مسکریاں ہیں۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”تو نے جان لیا کہ میری مرضی کیا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”آشا اور میں پہلے بھی وہاں سوتے رہے ہیں، مگر تیرے ساتھ میرے لئے ایک ہی کمرے میں رہنا ناممکن ہے۔“

میری صاف گوئی پر وہ کچھ اداس سی ہو گئی لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ اس کے ذہن کو مزید ٹونے پر مجھے پتا چلا، وہ سوئی یا میری طرف سے کسی شک میں مبتلا نہیں تھی۔ اس کا مقصد محض مجھ پر اپنا حق جتاننا اور میرے ساتھ رہنا تھا۔

”سینتا! ہم ایک ہی گھر میں اور ایک ہی ساتھ ہیں۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”کیا تیرے من کی شانتی کے لئے یہ کافی نہیں؟ کیا تو اپنے ہی کتے ہوئے الفاظ بھول گئی؟“

”یاد ہیں مجھے اپنے الفاظ، مگر میں..... میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں..... تجھے تو میرا اتنا بھی خیال نہیں کہ اپنی صورت ہی دکھا دیتا۔“ اس نے شکایت کی۔

”اتنی سی بات تھی تو پہلے کہہ دیا ہوتا۔“ یہ کہتے ہی میں، سکھ بڑا کے قالب میں آ گیا۔ اس کے لئے مجھے حسب معمول تھوڑی سی اذیت تو برداشت کرنا پڑی، مگر وہ بھل گئی۔

”اب میں تیرے دھیان میں اچھے اچھے پہنے دیکھی ہوئی سو جاؤں گی۔“ پھر اچانک اسے کمرے میں

سوئی کی موجودگی کا خیال آ گیا اور اس سے کہنے لگی۔ ”آشا! تجھے تو میری کوئی بات بڑی نہیں لگی؟ یقین کر کہ میں نے تجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔“

”معلوم ہے مجھے۔“ سوئی جواب میں بولی۔ ”مجھے خود تو اس کا کوئی تجربہ نہیں لیکن سنا ضرور ہے اور دیکھا بھی ہے کہ محبت کرنے والے تمہاری ہی طرح ہوتے ہیں۔“

”آشا! کیا تو نے کبھی کسی کو نہیں چاہا؟“

”ہاں آشانے کسی سے محبت نہیں کی۔“ سوئی نے ٹھیک ہی جواب دیا، کیونکہ وہ آشا نہیں تھی۔

میں مسکرانے لگا۔ سینتا جانے کب تک باتیں کرتی رہی اس لئے مجبوراً مجھے اس کے ذہن کو سونے کی ترغیب دینا پڑی۔ اس نے پہلے جمانیاں لینا شروع کیں اور پھر اوجھٹتے ہوئے ذرا سی سنبھل کر بولی۔ ”یہ مجھے ایک دم نیند کیوں آنے لگی؟“

”سندر سپنے دیکھنے کے لئے۔“ میں نے ہنس کر کہا اور اٹھا۔

”تو..... تو جا رہا ہے سکھ بڑا! بند ہوئی آنکھیں پوری طرح کھول کر اس نے میرے چہرے پر

نظرس جمادیں۔

اس چہرے سے سینتا کی جذباتی وابستگی میرے علم میں تھی۔ میں نے اسی لئے اس کے جذبات کو غصے لگانے سے گریز کیا۔ ایسا نہ ہوتا تو میں پہلے ہی اسے سو جانے پر مجبور کر دیتا۔ چند لمحے اس کی نظریں میری طرف اٹھی رہیں، پھر آنکھیں بند ہونے لگیں۔

”لیٹ جاؤ سینتا! تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ سوئی نے آگے بڑھ کر اسے سارا دے کر لٹا دیا۔

سینتا کچھ نہ بولی اور سوئی اس کے کمرے کی جی بجھا کر میرے ساتھ وہاں سے نکل آئی۔ میں نے سکھ بڑا کا قالب چھوڑ دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

خواب گاہ میں آ کر سوئی نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تو نے اس آدم زاد کو پاگل ہی کر دیا ہے اے علیالیش!“

”مجھے تو اس پر خوشی ہے اے سوئی کہ تو نے سینتا سے رقابت محسوس نہیں کی۔“

”میں کیوں ایسا محسوس کرتی۔ مجھے تو اس کی حالت دیکھ کر رحم آتا ہے۔“ سوئی بولی۔

”وہ قابل رحم تو ہے مگر معاف کر دینے کے قابل نہیں۔ اس کی گردن پر بھی جانے کتنے بے گناہوں کا خون ہے اگر دنوں دن آج رات نارائن گنج میں ہمیں مل گیا ہوتا تو شاید سینتا کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ غالباً ابھی قدرت کو یہ منظور نہیں۔“ میں نے یہ کہہ کر سوئی کو اپنے آئندہ اقدامات سے آگاہ کیا۔ میری یہی کوشش ہوتی کہ سوئی کسی بات سے بے خبر نہ رہے۔ اسے بہر حال میرے قدم سے قدم ملا کر چلنا تھا۔

☆=====☆=====☆

دوسرے دن صبح ہم دیر تک سوئے رہے۔ پہلے میری ہی آنکھ کھلی اور میں نے سوئی کو جگا دیا، پھر سینتا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ اب تک بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اسے سونے دیا۔ چند روز باپو

بازار میں گزار کر وہ یوں بھی راتوں کو دیر تک جاگنے اور دن میں سونے کی عادی ہو گئی تھی۔
ہم جن زادوں کو بھوک پیاس نہیں ستاتی لیکن جب ہم انسانی قابلوں میں ہوتے ہیں تو آدم زادوں کی عادات غالب آنے لگتی ہیں۔ سو کچھ ہی دیر میں مجھے بھوک سی محسوس ہونے لگی۔ سوی خود ایک عرصے آدم زادوں کے درمیان رہ چکی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ باورچی خانے میں ناشتہ بنانے چلی گئی کہ وہ بھی ان عادات سے واقف تھی۔
برآمدے میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں، میں وہیں بیٹھ گیا۔ سوی ناشتہ بنا لائی۔ ہم دونوں نے ساتھ ناشتہ کیا۔

میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے مطابق مجھے وہ دن ڈھاکہ ہی میں گزارنا تھا۔ مجھے سی آئی ڈی کے ایس بی اکبر علی کا خیال آیا۔ توقع تو مجھے یہی تھی کہ اس نے غیر ملکی دشمنوں کے آلہ کار کسی بھی مقامی ایجنٹ کو بچ کر نہیں نکلے دیا ہو گا۔ پھر بھی یہ مقامی ایجنٹ بہت بااثر تھے۔ اکبر علی تو خیر ایک دہنگ آدمی تھا، مگر اس جھکے کے سربراہ کی طرف سے میں مطمئن نہیں تھا۔ اس معاملے میں بدرالدین سے کوئی بھی حماقت سرزد ہو سکتی تھی۔ کچھ تو دقت گزاری کی خاطر اور کچھ براہ راست یہ معلوم کرنے کے لئے کہ گزشتہ روز کی کارروائی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا میں نے سوی سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ کہنے لگی۔
”سینٹا کو تو جاگ جانے دے۔ تجھے ایسی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو دہسہر بھی نہیں ہوئی، سارا دن پڑا ہے۔ رات کو بھی وہ تجھ سے آئندہ کے لئے پوچھ رہی تھی۔ تیرے بغیر وہ بولائی بولائی پھرے گی۔“
سینٹا کے لئے سوی کے اس تبصرے پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا۔ ”اچھا تو پھر اسے جگا دے“
پہلے اسی سے گفتگو کر لیتا ہوں۔“

سوی اٹھ کر چلی گئی، لوٹی تو سینٹا اس کے ساتھ تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب تک نیند کا شمار تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔ ”آشایا رہی ہے تجھے کہیں جانا ہے۔“
”ہاں جانا تو ہے، مگر تیرے درشن کے بغیر کیسے چلا جاتا۔“
”بس رہنے ہی دے، میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ پاس رہ کر بھی دور دور بھاگتا ہے۔ کیوں آشایا؟“
اس نے سوی سے تصدیق چاہی۔

”یہ تم دونوں کا معاملہ ہے، میں اس میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ سوی نے جواب دیا۔
”اچھا پہلے ہاتھ منہ تو دھو آ۔“ میں نے سینٹا سے کہا۔
”صبح اٹھ کر پہلے میں چائے پیتی ہوں، اس کے لئے کلی کرنا کافی ہے۔“ سینٹا بولی۔
”تم کلی کر آؤ، میں تمہارے لئے چائے بنا کے لاتی ہوں۔“ سوی یہ کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

وہ دونوں چلی گئیں تو میں، نوود چڑچی کے بارے میں سوچنے لگا، چونکہ اس وقت کہ جب سینٹا میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”کل رات کو تجھ سے جو گفتگو ہوئی، میں اسی پر غور کر رہا تھا۔ وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام تک تو پہنچنا مشکل ہے اور خود میں بھی یہ نہیں چاہتا۔ وجہ تو میں تجھے

بتائی چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دانستہ چپ ہو گیا۔ جو میرے دل میں تھا، میں اس کی زبان سے کھلوانا چاہتا تھا۔ میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

سینٹا نے کہا۔ ”پھر تو بس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہی ہوں کہ کل اپنی آنکھوں سے تیری ہشتی دیکھ لی۔ تو اکیلا سینکڑوں پر بھاری ہے اور پھر تیرے ساتھ آشایا بھی ہے۔ تم دونوں مل کر اپنے دشمنوں کی موت کا پیغام بن سکتے ہو۔“
”تو تو اپنے آپ کو تو نے کیوں نہیں گنا؟ تو بھی تو ہمارے ساتھ ہو گی۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے، اس سے۔ مگر میں تم دونوں کے سامنے کس گنتی میں ہوں۔“
”تیرا خیال ہے یہ، ورنہ تو جہاں ہماری ہشتی کام نہیں کرتی، تیرا دماغ کام کرتا ہے۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

اسی وقت سوی چائے لے آئی۔ اس نے بھی میرے الفاظ سن لئے تھے۔ سینٹا کو چائے کا کپ دیتے ہوئے اس نے بھی میری تائید کی۔
”تو نے یہ بھی سوچا سکہ بیر کے کدھر چلنا ہے؟“ سینٹا نے سوال کیا۔

”یہ فیصلہ تو تجھی کو کرنا ہے سینٹا! تو ہم سے کہیں زیادہ دشمن کو جانتی پہچانتی ہے۔ کل تو نے جو کچھ کہا تھا، مجھے یاد ہے۔ اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہمیں کسی سے بد نہیں لینا، اپنی ہی ہشتی پر بھروسہ کرنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سکہ بیر! تو نے مجھ پر بڑی بھاری ذمے داری ڈال دی ہے۔“ سینٹا یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگی، پھر خود ہی بولی۔ ”دشمن کو کمک ملنے کا راستہ اگر ہم بند نہ کر سکتے تو اسے کھوٹا ضرور کر سکتے ہیں۔ پہلے میں نے بیٹا پل اور پھر چانگام ہلر جانے کو کہا تھا۔ میرا مشورہ اب بھی یہی ہے۔“

”تو اسے مشورے کا نام دے لے، میں فیصلہ کہہ لیتا ہوں۔“ میں مسکرا کر بولا، پھر سوی کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے؟“
”میں، سینٹا کے فیصلے سے متفق ہوں۔“ سوی نے یہ کہہ کر بات کو اور آگے بڑھایا۔ ”ہمیں آج ہی رات چل دینا چاہئے۔“

”رات کو؟“ سینٹا چوگی۔ ”کیا پھر مجھے اٹھا کر لے چلنے کا ارادہ ہے؟ یہ بھی سوچ لیا ہے کہ بیٹا پل کے قریبی جنگلات بھی یہاں سے بہت دور ہیں؟“

”لیکن ہمارے لئے زیادہ دور نہیں ہیں۔“ سوی ہی بولی۔
سینٹا کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈھاکہ سے بیٹا پل کے فاصلے کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے سوی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے خود آج رات اس کا تجربہ ہو جائے گا سینٹا! تجھ سے آشنائے غلط نہیں کہا۔“ میں نے بھی سینٹا کو یقین دلایا۔

”تو بھی یہی کہہ رہا ہے سکہ بیر! تو مانے لیتی ہوں۔“ سینٹا کے لمبے سے اب بھی حیرت کا تاثر ختم

نہیں ہوا تھا۔

”اچھا اب تو مجھے چلنے دے، مقصود میاں بن کر مجھے سی آئی ڈی آفس بھی پہنچنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔

سینا سے اب چھپانا بھی کیا تھا۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے بتا دی۔

”کچھ بیڑا تو نے ونود چڑجی کے لئے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ اب وہ کیا کوئی دوسرا بھی اس کی جگہ آگیا تو تک نہیں سکے گا۔ اسے کہیں پاؤں رکھنے کو جگہ ہی نہیں ملے گی۔“ پھر سینا نے بڑے عجیب سے الفاظ کہے۔ ”تو نے دشمنی کا حق ادا کر دیا، دشمن ہو تو تجھ جیسا۔“

”ابھی پورا حق کہاں ادا ہوا ہے سینا! یہ حق اس وقت ادا ہو گا کہ جب ونود چڑجی اس دنیا میں نہیں رہے گا۔ نہ میاں اس کا کوئی نام لیا ہو گا۔“ میں بولا۔ پھر میں نے سوی کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اسے گھر کا دروازہ بند کرنا تھا۔ دروازے تک آتے آتے میں نے مقصود کا قالب اپنا لیا۔

مجھے سی آئی ڈی آفس پہنچنے کی جلدی نہیں تھی اسی سبب صدر گھاٹ کے لئے رکشا کر لیا۔ کل تک اس شہر میں جو کچھ ہوا تھا اس کے اثرات اب بھی باقی تھے۔ دن کے وقت بھی میں نے پولیس کو گفت کرتے دیکھا۔ لوگ ڈرے ڈرے سے تھے کہ جانے کب کیا ہو جائے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ اب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جنہوں نے نفرت اور تعصب کی آگ بھڑکائی تھی اب خود اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شہر کی فضا مجھے بڑی حد تک بدل بدل سی لگی۔ میرے نزدیک یہ ایک نیک شگون تھا۔

میری منزل آگئی تو رکشا رکوا کر میں نے کرایہ ادا کیا اور سی آئی ڈی آفس کی طرف چل دیا۔ رکشا میں نے کچھ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

بدالدین جیسے غبی شخص سے پہلے ملنا مجھے اچھا نہیں لگا تو میں نے ایس پی اکبر علی کو تلاش کیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے ہی میں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے احتراماً کرسی چھوڑ دی۔

”آئیے سر!“ اس کے لمبے میں تپاک تھا۔

”مینو اکبر علی!“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی اور پوچھا۔ ”کل کے

آپریشن میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟“

”جی نہیں سر! وہ سبھی پکڑے گئے اور اسلحہ بھی برآمد کر لیا گیا، مگر ان میں سے دو نے اب تک

تھرڈ ڈگری آزمائے کے باوجود زبان نہیں کھولی۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا اکبر علی کہ میں صحیح وقت پر آ گیا۔“ میں مسکرا دیا۔ ”تم انہیں یہاں بلوا

کتے ہو؟“

”یہاں سر!“ اکبر علی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں ہاں، یہاں بلوانے میں کیا مضائقہ ہے؟“

”آپ کا حکم ہے سر! تو بلوا لیتا ہوں۔ دونوں کو ایک ساتھ یا الگ الگ؟“ اکبر علی نے پوچھا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر ایس پی اکبر علی نے ان میں سے پہلے ایک شخص کو بلوا لیا۔ اس کا حلیہ خاصا گڑبگڑا ہوا تھا۔ میں نے اکبر علی کی مشکل آسان کرنے کے لئے اس شخص کو اپنے اثر میں لے لیا۔

”ایس پی صاحب کو تم سے شکایت ہے کہ زبان نہیں کھول رہے۔ تم تو پکڑے ہی گئے ہو، پھر دوسروں کو بچانے سے کیا فائدہ؟ جو یہ پوچھیں بتا دو۔“ میرا انداز ایسا تھا جیسے کسی نا سمجھ بچے کو نصیحت کرتے ہیں۔ ”بولو ایس پی صاحب جو تم سے پوچھیں گے، بتا دو گے نا؟“

”جی ہاں، بالکل بتا دوں گا۔“ وہ شخص فوراً تائید میں بولا۔

اکبر علی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ ”اس کے زبان نہ کھولنے کی وجہ تھی جو یہ خود ہی بیان کر دے گا۔ ہاں تو زبان باپو پہلے وجہ بتا دو۔“

”وجہ یہ تھی کہ میں نے یہاں سے اپنی رہائی کا بندوبست کر لیا تھا۔“ زمان نے بتایا۔ یہ وہی بااثر شخص تھا جس کا سیاسی حلقوں میں خاصا اثر و رسوخ تھا۔ اسی کے نام پر اکبر علی نے حیرت ظاہر کی تھی۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”کبھی کبھی چھوٹے لوگ بھی بڑے کام کر جاتے ہیں۔ کل رات پہرے میں موجود ایک محافظ لالچ میں آ گیا۔ اس کے ذریعے میں نے حزب اختلاف کے ایک بااثر

سیاسی لیڈر کو پیغام بھجوایا۔ بنگال کی سیاست میں اس لیڈر کو بڑا دخل ہے۔ جو لوگ اقتدار میں ہیں، وہ اس کی بات دھیان سے سنتے ہیں۔“ پھر زمان نے حزب اختلاف کے اس لیڈر کا نام لیا اور بولا۔ ”مجھے یقین

ہے کہ اب تک اوپر والوں کی طرف سے آپ کے افسر اعلیٰ بدرالدین کو اس سلسلے میں حکم مل چکا ہو گا۔“

”لیکن تمہارے خلاف تو ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں۔“ ایس پی اکبر علی بول اٹھا۔ ”تمہاری کوٹھی سے غیر ملکی اسلحہ کا ذخیرہ برآمد کیا جا چکا ہے۔ وقتی طور پر اگر تمہیں رہائی مل بھی جاتی تو تم کس طرح اس کیس سے بچتے؟“

”جناب! رہائی ملتے ہی میں روپوش ہو جاتا۔“ زمان نے جواب دیا۔ ”میری کوشش یہ ہوتی کہ کسی طرح سرحد پار کر جاؤں۔ پھر آپ میرے خلاف جو کارروائی چاہتے کرتے رہتے۔ جس محافظ سے میں نے

پیغام بھجوایا تھا، اسے میرے آدمیوں نے پانچ ہزار روپے ادا کر دیے ہیں۔ میرا پیغام پہنچ چکا ہے، اس محافظ نے آج صبح تصدیق کر دی ہے۔“

ایس پی اکبر علی کے پوچھنے پر زمان نے لالچی محافظ کا نام بھی بتا دیا۔

”اچھا زمان! اب تم ایس پی صاحب کو اپنے ان گرگوں کے نام پتے بھی لکھوا دو جو تمہارے ایما پر ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔“ میں بولا۔

میرے اشارے پر اکبر علی نے قلم اور کاغذ سنبھال لیا۔

کام ہو گیا تو میں نے زمان کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ وہ اس طرح چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے ابھی نیند سے جاگا ہو۔ اکبر علی نے اسے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے

حیرت ہے سر کہ آپ کے سامنے اسے کیا ہو گیا، کسی دباؤ کے بغیر اس نے خود ہی آپ کے حکم پر سب کچھ بتا دیا۔“

میں نے موضوع گفتگو بدل دیا۔ ”اب دوسرے کو بھی بلواؤ، کیونکہ اب مجھے بدرالدین صاحب سے بھی ملنا پڑے گا۔ ممکن ہے اب تک انہیں کسی بااثر شخصیت کا فون مل چکا ہو۔“

”بہت بہتر ہے سر!“ اکبر علی فوراً بولا۔

کچھ آدم زاد بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ انہی میں سے وہ دوسرا مقامی ایجنٹ تھا جسے اکبر علی نے بلوایا۔

”تمہارا خیال یہ ہے بے وقوف آدمی کہ اعتراف جرم نہ کر کے بچ جاؤ گے۔“ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے جناب! مجھے بالکل نہیں معلوم کہ میری کونسی غیر ملکی اسلحہ کہاں سے.....“

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ اسی لئے اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

”اسلحہ کہاں سے آیا، مجھے معلوم ہے۔“ اس نے اپنا جملہ پورا کر دیا۔ پھر وہ بھی زمان کی طرح کچھ نہیں چھپا سکا۔

اس کے بعد میں تو اٹھ آیا اور اکبر علی ضروری کارروائی کے لئے اپنے ماتحت افسران کو ہدایات دینے لگا۔ میں تو یوں ہی وقت گزاری کے خیال سے ادھر نکل آیا تھا۔ مگر یہاں میرا آنا رائیگاں نہیں ہوا۔ بدرالدین سے ملا تو وہ مجھے سخت پریشان اور بوکھلایا ہوا سا نظر آیا۔ اسے ایک بااثر سیاسی شخصیت کا فون مل چکا تھا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ ایک طرف تو اسے میرا خیال تھا، دوسری جانب ایک سیاست دان کی ناراضگی بھی منظور نہ تھی۔ اس کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے ان باتوں کا علم ہو گیا۔ اب تو وہ ادھر ادھر ہی کی اڑا رہا تھا۔ اصل مسئلے پر گفتگو کرنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”مقصود میاں! آپ کی ہدایت کے مطابق کارروائی پوری ہو چکی ہے۔“ وہ مجھے مطمئن کرنے کی غرض سے بولا۔ ”مگر ان میں سے دو نے ابھی تک اعتراف جرم نہیں کیا۔“

”یہ پرانی بات ہو گئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ان دونوں نے بھی زبان کھول دی ہے۔“

”کب؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”مجھے..... مجھے تو ایسے ہی اکبر علی نے اس سلسلے میں اور ہی رپورٹ دی تھی۔“

”وہ رپورٹ بھی صحیح تھی اور میں جو کہہ رہا ہوں، وہ بھی درست ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”دراصل کچھ لوگوں کے سامنے پھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ اکبر علی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہے۔ یہ ابھی ذرا ہی دیر پہلے کا ذکر ہے۔ میں اکبر علی کے پاس ہی سے آ رہا ہوں۔“ میں نے دانستہ اکبر علی کے سرسرا باندھ دیا۔

”تو کیا اس..... اس زمان نے بھی اعتراف کر لیا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹوں کا آلہ کار تھا؟“

”ہاں اسے اقرار تو کرنا ہی تھا۔“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ ”مگر آپ اپنی نوکری کو

خطرے میں محسوس کر رہے تھے تو اب اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیں۔ اب سے تقریباً ایک گھنٹے پہلے آپ کو زمان کے سلسلے میں جس سیاسی شخصیت نے فون کیا تھا، اس کا مجھے علم ہو چکا ہے۔ آپ سے یہی کہا گیا تھا تاکہ زمان کے معاملے میں اس سیاست دان کا نام نہ آئے اور کام بھی ہو جائے؟“

”آپ..... آپ مقصود میاں! اتنے چوکنا اور باخبر رہتے ہیں۔“ بدرالدین نے اظہار حیرت کیا۔

”رہنا پڑتا ہے باخبر، ورنہ تو قدم قدم پر قانون کے نفاذ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں۔ کچھ لوگوں کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ جس سیاسی شخصیت نے آپ کو فون کیا، اسے یقیناً اندازہ نہیں ہو گا کہ یہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہ تو انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، نہ قانون کو پس پشت ڈالنا ممکن ہے۔ زمان نے آپ پر اوپر سے دباؤ ڈالنے کے لئے ہی اب تک اپنے جرائم کا اعتراف نہیں کیا تھا۔“ پھر میں نے بدرالدین کو بتا دیا کہ اتنے سخت پیرے میں رہنے کے باوجود زمان نے کس طرح اپنی رہائی کا راستہ ہموار کرنا چاہا تھا۔

”اب تو میرے پاس پورا جواز موجود ہے۔“ بدرالدین نے مطمئن آواز میں کہا۔

”جی ہاں، زمان جیسے غدار کسی سیاسی شخصیت کی آڑ میں چھپ کر فرار نہیں ہو سکتے۔“

”مقصود میاں! آپ کے تشریف لانے سے میری بڑی ہمت بندھ جاتی ہے۔“ بدرالدین انکساری کا اظہار کرنے لگا۔

”بس اب کچھ دن کی بات اور ہے۔ غیر ملکی دشمنوں کا سرغنہ تھری زیرو بھی زیر دام آ جائے گا۔“

میں نے اسے اطمینان دلایا۔

”یہ تو آپ بڑی اچھی خبر سنارہے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم پر ایسے ایسے بی منظور احمد شیخ کو بھی سخت تاکید کر دی ہے کہ بڑے سرکاری افسران کے خلاف تحقیقات میں کسی قسم کی کسر نہ چھوڑی جائے۔

ان شاء اللہ آپ کو میرے جھگے کی طرف سے مایوسی نہیں ہو گی۔“ بدرالدین اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے قدرے خوفزدہ بھی تھا۔

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں آپ کو۔ اپنے فرائض پوری تندی سے ادا کرتے رہیں، اتنا کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ پر دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ غیر ملکی دشمنوں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کو گھبرا جا چکا ہے۔ جن تخریب کاروں نے اس شر سے راہ فرار اختیار کر لی ہے، وہ بھی بچ نہیں سکیں گے۔“

اس روز بدرالدین کی درخواست پر میں نے چائے پینا گوارا کر لیا۔

”ممکن ہے کہ اب آپ سے جلد ملاقات نہ ہو سکے۔“ میں اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا مقصود میاں کہ آپ تھری زیرو کی تلاش میں ڈھاکہ سے جا رہے ہیں۔“ بدرالدین بھی اپنی سیٹ سے اٹھا۔

میں نے اس کے خیال کی تصدیق ضروری نہیں سمجھی اور کہا۔ ”اس ضمن میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ بھی امکان ہے کہ مجھے خود کہیں نہ جانا پڑے۔“

”آپ اپنے معاملات مجھ سے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔“ بد والدین نے مجھ سے مزید کچھ معلوم نہ کیا۔ وہ اب مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے بہت محتاط رہنے لگا تھا۔

سی آئی ڈی آفس سے واپسی پر مجھے آئی جی نورالاسلام کا بھی خیال آیا، مگر میں اس سے نہیں ملا اور گھر واپس آ گیا۔ اب میں نے مقصود کا قالب چھوڑ دیا تھا۔ محلے پڑوس والوں نے وہاں مجھے خورشید احمد کے قالب میں دیکھا تھا۔ میں نے اسی لئے یہ خیال رکھا۔ کسی سے رسم و رواج نہ بھی رکھی جائے تو بھی لوگ چہرہ تو پہچانے ہی لگتے ہیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، مگر سینٹا نے اب تک میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ سوی اور سینٹا ایک ہی کمرے میں تھیں۔

”میں نے تو ان سے کہا تھا مگر یہ نہیں مانیں۔“ سوی نے بتایا۔

”تیرے ساتھ جو سے بیت جائے سکھ بڑا وہ غنیمت ہے۔“ سینٹا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ..... کہ تجھ سے ہنچڑ جاؤں گی۔“

”کیس تو اس بوڑھے گلدھ ونود چڑجی سے تو خوفزدہ نہیں؟“ یہ سوال کر کے میں نے اس کے ذہن کو متحرک کر دیا۔

”اس سے اب مجھے کیا ڈرنا۔“ سینٹا نے ٹھیک ہی جواب دیا۔ ”وہ تیرا دشمن ہے تو اب میری بھی اس سے کھلی جنگ ہے۔ میں کبھی اپنے کسی دشمن سے نہیں ڈری، مگر جنگ میں ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ مارو یا مر جاؤ۔ میرا خیال ہے سکھ بیر کہ ونود چڑجی سے ہونے والی جنگ اب اسی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ میں کل رات بھی یہی سوچ کر تیرے ساتھ نارائن گنج گئی تھی کہ شاید یہ نوبت آجائے، مگر وہ گھڑی ٹل گئی۔ یقین کر کہ مجھے اپنی موت کا ڈر نہیں، تجھ سے ہنچڑ جانے کا ڈر ہے۔“

”ہمارا ملن اگر اس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں ضرور ہو گا۔“ سینٹا کو دلاسا دینے کے لئے میں نے اسی کے عقائد کا سہارا لیا جو میرے نزدیک باطل ہی تھے۔ ”پھر تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس جنگ میں ونود چڑجی کا پلہ بھاری رہے گا؟“

”جنگ تو جنگ ہوتی ہے سکھ بیر! پہلے سے ہار جیت کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔“

کچھ دیر بعد سینٹا کو نیند آگئی اور وہ سونے کے لئے چلی گئی۔

میں اور سوی کچھ دیر یہی گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم بھی سو گئے۔

مغرب سے ذرا پہلے سوی کی آنکھ کھلی اور اس نے مجھے بھی جگا دیا۔ سینٹا اب تک سو رہی تھی۔ میں نے اسے بھی نیند کے جال سے باہر نکال لیا۔

سفر طویل تھا اور سینٹا کی وجہ سے ہم زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اسی خیال سے ہم نے جلدی جلدی تیاریاں مکمل کر لیں۔ ضروری ساز و سامان اور اسلحہ سینٹا نے ایک بیگ میں رکھ لیا تھا۔ کھانا ہم پہلے ہی کھا چکے تھے۔

جو غیر ملکی دشمن میرے ہاتھوں مارے گئے، ان کے ذہن پڑھ کر پہلے ہی مجھے خاصی معلومات حاصل

ہو چکی تھیں۔ اب سینٹا بھی ساتھ تھی۔ اسے بھی اپنے ساتھیوں کے بہت سے ٹھکانوں کا علم تھا۔ میں نے اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سینٹا سے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، جنگل میں گھسنے سے پہلے ہم بیٹا پل کیوں نہ چلیں؟ میری معلومات کے مطابق اس آبادی میں جنگل کے قریب ہی دشمنوں کا ایک ٹھکانہ موجود ہے۔ کیا خبر اس شہر سے فرار ہو کر کچھ لوگ اسی طرف گئے ہوں۔“

”ہاں ایک ٹھکانہ ہے تو سہی۔“ سینٹا سوچتے ہوئے بولی۔ ”یہ ٹھکانہ اس لئے زیادہ محفوظ سمجھا جاتا ہے کہ جنگل قریب ہے۔ کسی خطرے کی صورت میں جنگل کی طرف نکلا جاسکتا ہے۔ تو شاید یہ چاہتا ہے کہ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کرتا ہوا آگے بڑھے۔“

”میرا بھی مقصد ہے۔“ میں نے اقرار کیا۔

”اس کے لئے پہلے تجھے ان لوگوں کے فرار کا راستہ بند کرنا پڑے گا کہ وہ جنگل میں جا کر نہ چھپ سکیں۔“ سینٹا نے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے، ادھر آٹھارہ رہے گی اور انہیں بھاگنے نہیں دے گی۔ میں تیرے ساتھ رہوں گا۔“ میں بولا۔ ”ہم یہ کوشش کریں گے کہ وہ اس گھر سے نکل ہی نہ سکیں۔“

”میں وہاں خود بھی ایک دفعہ گئی ہوں۔ وہ ایک نیم پختہ بڑا سا گھر ہے۔ پہلے اس کی حیثیت ایک پڑاؤ کی سی تھی۔ جنگل کے راستے سرحد پار سے آنے والے پہلا پڑاؤ وہیں کرتے تھے۔ بعد میں کچھ عرصے یہ جگہ محبوب کے پاس رہی۔ پھر ونود چڑجی نے اسے اپنے آدمیوں کے استعمال میں لے لیا۔ محبوب کے لوگوں نے اسی بستی میں دوسری جگہ اپنے لئے بنائی۔“ سینٹا نے تفصیل بتائی۔ ”میں جب سرحد پار سے آئی تھی تو وہاں ایک جزیئر بھی دیکھا تھا کیونکہ بستی میں بجلی نہیں تھی۔ جزیئر کے ساتھ ہی ونود چڑجی کے علم پر سرچ لائیں بھی منگوائی گئی تھیں۔ ہمیں سے جنگل کی طرف بھی تار گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں نفل و حرکت کے لئے کبھی کبھی بجلی کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔“

اس ٹھکانے کے محل وقوع سے سینٹا کی واقفیت میرے لئے سودمند ہی ثابت ہوتی۔ میں نے اسی لئے اس کی باتیں توجہ سے سنیں۔ اسی کے ساتھ میرا دھیان اس کے ذہن پر بھی تھا۔ دوپہر کی طرح اس وقت سینٹا خوفزدہ نہیں تھی۔ بھرپور گرمی نیند نے اس کے ذہن پر اچھا اثر مرتب کیا تھا۔ آدم زادوں کو روحانی اور جسمانی عارضوں سے نجات دلاتے ہوئے اکثر مجھے اس طرح کے تجربات ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی گرمی اور پرسکون نیند بھی آدم زادوں کے لئے بہت ضروری ہوتی ہے۔

چوک بازار کی آبادی پر دھیرے دھیرے خاموشی طاری ہونے لگی تو میں اور سوی سینٹا کو ساتھ لے کر گھر کے صحن میں آ گئے۔ گھر کی بتیاں ہم نے بجھا دی تھیں۔ سینٹا کے ہاتھ میں جو بیگ تھا، سوی نے لے لیا اور اس کے قریب ہو گئی۔

انسانی قابلوں سے نکلنے ہی ہم نے سفر کا آغاز کر دیا۔ بلندی سے ہم نے ڈھاکہ شہر کی روشنیوں کو آخری بار دیکھا۔ سینٹا اب تک ہوش میں تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تجھے کیسا محسوس ہو رہا ہے سینٹا؟“

”یوں جیسے میں کسی اڑن کھٹولے میں بیٹھی ہوں۔“ اس نے جواب دیا تو لمبے سے خوشی جھٹک رہی تھی۔ سوی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ رکھا تھا۔

”اب ہم ذرا تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھیں گے، اس لئے تو آنکھیں بند کر لے۔“

میں نے کہا۔

سیتا نے فوراً میرا مشورہ مان لیا۔ ہم نے بیٹاپل کی طرف پرداز شروع کر دی۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر کے آگے بڑھ رہی تھی کہ مطلوبہ ٹھکانے کے قریب ہم آہستگی سے جنگل میں اتر گئے۔ سیتا کو میں ہوش میں لے آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور گہرے سانس لینے لگی۔ جلد ہی اس کی حالت اعتدال پر آگئی۔

”گھبرا مت اے سیتا کہ ہم تیرے ساتھ ہیں۔“ میں دھیمی آواز میں بولا۔ سیتا نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

سوی نے سیتا کے قریب ہی اس کا بیگ رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے سے کسی قدر مانوس ہو گئیں تو وہ بیگ کھولنے لگی۔ سیتا پوری تیاری سے چلی تھی۔ بیگ میں دو چھوٹے دستی بم بھی موجود تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ونود چڑجی نے اس کی موت کا حکم جاری کر دیا ہے۔ اب وہی لوگ اس کی جان کے درپے ہو جائیں گے جو کبھی اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس کی بناوت سے کوئی بھی بے خبر نہیں ہو گا۔

سیتا بیگ سے نارچ اور اسلحہ نکالنے میں مصروف تھی کہ سوی میرے قریب آئی اور مجھے ایک طرف لے گئی۔

”اے علیالیش! کیا تجھے جنگل کی یہ فضا کچھ غیر فطری سی نہیں لگ رہی؟“ سوی نے سرگوشی کی۔

میں نے چونک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہاں مجھے بھی ایسا محسوس تو ہو رہا ہے۔“

اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دشمن نے وہاں کیا جال بچھا رکھا ہو گا۔

چند لمحے توقف کے بعد میں سوی سے مخاطب ہوا۔ ”تو سیتا کے پاس جا کہ وہ اکیلی ہے۔ میں جنگل کا ایک پکڑ لگا کر آتا ہوں کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔“

میرے کہنے پر سوی چلی گئی تو میں ایک طرف بڑھا۔ جنگل کا یہ حصہ قدرے گھٹا تھا۔

میں زیادہ دور نہیں جا سکا تھا کہ اچانک مجھے اپنا دم گھٹا محسوس ہوا۔ عین اسی لمحے مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ”تو آگیا اے علیالیش! میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تو اگر چاہے بھی تو بھاگ نہیں سکتا۔ میں نے تجھے قید کر لیا ہے۔“

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک طرف مجھے اجالا سا نظر آیا۔ پھر درختوں کے درمیان سے میں نے ایک آدم زاد کو نکلتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی، سر پر ٹوپی، ماتھے پر سجدے کا نشان، ایک ہاتھ میں لالین اور دوسرے میں شمع تھی۔

میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دم گھٹنے سے میری

حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اجنبی آگے بڑھتے ہوئے اس طرح مسکرایا جیسے اس کی نظر مجھی پر ہو۔ اس کے پیروں تلے آنے والے سوکھے پتوں کی آواز مجھے موت کی آواز محسوس ہو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

ان لمحات میں بھی میں نے خود پر قابو رکھا۔ اس کی وجہ میرے ایمان کی پختگی ہی تھی۔ اب میں کوئی بھٹکا ہوا جن زاد نہیں تھا۔ اپنی طرف بڑھنے والے اس اجنبی پر میں نے نگاہ ڈالی۔ اپنے حلقے سے وہ مجھے کوئی مولوی ہی معلوم ہوا۔ میرے ذہن میں متعدد سوالات گردش کر رہے تھے۔ آخر اس اجنبی آدم زاد سے میری کیا دشمنی ہے؟ وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟ اسے کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں اس جنگل میں آنے والا ہوں؟ اس نے مجھے کیوں قید کیا ہے؟ اگر میرے دل میں بدی ہوتی، میں کسی غلط مقصد سے وہاں آیا ہوتا تو شاید حوصلہ ہار جاتا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر وہ آکر رک گیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھیں مجھ پر جما دیں۔

”اے اللہ کے نیک بندے!“ میں نے ہمت کر کے اسے مخاطب کیا۔ ”تو مجھے ایمان والوں میں سے لگتا ہے۔“

”اے جن زاد تو نے میرے بارے میں ٹھیک اندازہ لگایا۔“ اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی، پھر سخت آواز میں بولا۔ ”مگر تو راہِ راست سے بھٹک گیا ہے، ورنہ خلقِ خدا کا عذاب میں گرفتار نہ کرتا۔ عبدالصبور کو تو دھوکا نہیں دے سکتا، سزا کے طور پر میں تجھے جلا کے خاک کر دوں گا۔“

”تجھے میری جانب سے یقیناً کسی نے سخت غلط فہمی میں جلا کر دیا ہے۔ وہ ایک ہی عیار و بد بخت شخص ہو سکتا ہے جس نے تجھے اپنا نام شمشاد خان بتایا ہو گا۔“ میرا ذہن صحیح خطوط پر کام کرنے لگا۔ جب سیتا اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کر میرا نام جان سکتی تھی تو ونود چڑجی اس سے کہیں بڑا شیطان تھا۔ اس نے اپنی اصل شخصیت پر شمشاد خان کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ مولوی عبدالصبور کو اسی نے میرا نام بتایا ہو گا۔

میری بات سن کر عبدالصبور کہنے لگا۔ ”خود ہی تیری زبان پر شمشاد خان کا نام آگیا۔ بول کیا تو نے اس نیک آدمی کا جینا دو بھر نہیں کر رکھا؟“

”اے عبدالصبور! وہ ہرگز نیک آدمی نہیں۔“ دم گھٹنے کے باوجود میں نے اپنے اوسان برقرار رکھے اور پھر اس سے التجا کی۔ ”صاحب ایمان ہونے کی حیثیت سے کیا تو میری ایک درخواست مان لے گا؟ مجھے قید رکھ یا آزاد کر دے، مگر جرم تو ثابت ہو جائے۔ تبھی سزا دینا بھی روا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ جس پر کوئی الزام ہو، اسے صفائی کا موقع دیا جائے۔ میں تجھ سے اتنی ہی مہلت کا طلبگار ہوں۔“

”لیکن اے علیالیش! ابھی میں نے تجھے سزا کب دی ہے؟“ وہ بولا۔

”کیا یہ سزا نہیں کہ میرا دم گھٹ رہا ہے، میں شدید اذیت کا شکار ہوں؟ تو نے اگر مجھ بے گناہ کو مار دیا اے عبدالصبور! تو میرا خون تیری گردن پر ہو گا۔ جس طرح تو خدا کا بندہ اور جاندار ہے اسی طرح میں بھی ہوں۔ اس پر آخرت میں تجھ سے جواب طلبی ہو گی تو پھر کیا جواب دے گا؟ کسی جن زاد کا قتل بھی اتنا

ہی بڑا گناہ ہے جتنا کسی آدمی کو مار دیتا۔" میں نے پراثر آواز میں بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے۔
عبدالصبور کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ یقیناً میرے الفاظ کا اس پر اثر ہوا تھا، آنکھوں کی سرخی
بھی کسی قدر کم ہو گئی۔

"مجھے شاید خبر نہ ہو اے عبدالصبور کہ میرے ماں باپ نے میرا نام جنات کے ایک پیغمبر پر علیا لیش
رکھا تھا جسے اللہ نے نئی شریعت عطا کی تھی۔ چھتیس ہزار سال تک جنات نے علیا لیش کو عطا کی جانے والی
شریعت پر عمل کیا اور پھر نافرمانی پر اتر آئے۔ سو ان پر فکا کا عذاب بھیجا گیا۔" میں نے اپنے عالموں سے
اب تک جو کچھ سنا تھا، اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"تو کیا اے علیا لیش! تو فاسق نہیں؟ وہ جو آدمیوں کو طرح طرح سے ستاتے ہیں؟" عبدالصبور نے
حیرت سے پوچھا۔

"مجھ سے میں جھوٹ نہیں بولوں گا اے عبدالصبور! بلاشبہ میں بھی فاسقوں میں سے تھا۔ پھر مجھے
اللہ نے توبہ کی توفیق دی اور میں راہِ راست پر آ گیا۔"

میرا جواب سن کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "مگر وہ
شمشاد خان اس نے تو مسجد کی تعمیر کے لئے بہت بڑی رقم دی ہے۔ دونوں میں سے ایک ہی سچا ہو
سکتا ہے اچھا تو پھر ٹھیک ہے اے علیا لیش! میں تجھے صفائی کا موقع دیتا ہوں۔ تجھے بھاگنے تو نہیں
دوں گا میں، ہاں اب تیرا دم نہیں گھٹے گا۔" اس نے یہ کہہ کر کچھ پڑھا اور میری طرف بھونک دیا۔
مولوی عبدالصبور یقیناً کوئی عامل ہی تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرا دم گھٹنا بند ہو گیا، مگر اپنی جگہ سے
حرکت کرنا اب بھی میرے لئے مشکل تھا۔

"تیرا شکریہ اے مرد بزرگ!" میں نے فوراً کہا اور سکون کا سانس لیا۔

"یہ بتا اب کہ واقعی تو مسلمان ہے؟" عبدالصبور نے مجھ سے پہلا سوال کیا۔

"ہاں" میں تو مسلمان ہوں، مگر وہ کافر ہے کہ جس نے خود کو تیرے سامنے مسلمان ظاہر کیا۔" میں
نے جواب دیا۔

"اگر وہ کافر ہوتا تو میں، جیسور میں جو مسجد بنا رہا ہوں، اس کا خیر کے لئے رقم کیوں دیتا؟ کسی کافر
کو مسجد کی تعمیر میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"یہ کہ وہ تجھے اپنے نیک ہونے کا یقین دلا دے۔" میں بولا۔

"تیرے اس دعوے کا ثبوت کیا ہے؟" اس نے بحث کی۔

"پہلا واضح ثبوت تو یہ ہے کہ اسی نے تجھے میرا نام بتایا ہو گا۔ بول کیا ایسا ہی نہیں؟ تو ایک عالم
ہے اور تجھے یقیناً معلوم ہو گا کہ ہم جنات کسی آدم زاد کو اپنا نام نہیں بتاتے۔ اب تو پوچھو کہ اگر اس
کافر کو میرا نام کس طرح معلوم ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے اے اللہ کے نیک بندے کہ وہ کافر شیطانی
قوتوں کا مالک ہے، مگر اتنا بھی نہیں کہ میرے اوپر قابو پاسکے۔ اس کا اصل نام ونود چڑجی ہے اور وہ یہاں
ہم مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے سرحد پار سے آیا ہے۔" اس کے بعد مختصراً میں نے ونود چڑجی

کے متعلق عبدالصور کو بتا دیا۔

"اللہ مجھے معاف کرے کہ وہ کافر مجھے دھوکا دے گیا۔ اس کی زبان میں تو بڑی مٹھاس تھی۔ لگتا ہی
نہیں تھا کہ وہ جھوٹا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایک بڑے گناہ سے بچ گیا۔" مولوی عبدالصور کے لہجے
میں تاسف سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین آ گیا ہے۔ "اب میں سمجھا کہ وہ میری اتنی
خوشامد کر کے مجھے جیسور سے اپنے ساتھ یہاں کیوں لایا تھا مگر اے علیا لیش! تیرا ان باتوں سے کیا
تعلق؟ تو نے ایک جن زاد ہو کر آدمیوں کے معاملات میں کیوں مداخلت کی؟"

"اس لئے کہ میں نے خلق خدا کی خدمت کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ مجھے اس کی توفیق عطا کرے کہ میں
مظلوم اور بے گناہ آدم زادوں کی مدد کرتا رہوں۔"

"اے علیا لیش! اگر تو سچا ہے تو اللہ تجھے اس کی جزا اور اس کافر کو سزا دے گا۔"

اسی وقت مجھے سوئی نظر آئی۔ وہ مولوی عبدالصور کے پیچھے تھی اور اس پر وار کرنے والی تھی کہ
مٹھا زور سے بول اٹھا۔ "نہیں، ایسا نہ کرنا۔" دانستہ سوئی کا نام لینے سے میں نے گریز کیا تھا۔ سوئی مجھے
حیرت سے دیکھنے لگی۔

مولوی عبدالصور تیزی سے پلٹا، مگر اس وقت تک سوئی نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی تھی۔ وہ
میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی۔

"کون تھا اے علیا لیش! تو کس سے مخاطب تھا؟" عبدالصور نے مڑ کر مجھ سے دریافت کیا۔

"وہ میری بیوی تھی، ایک جن زادی!" میں نے بتا دیا۔ "اسی نے پہلی بار میری توجہ اس طرف
دلائی تھی کہ جنگل کی فضا غیر فطری مٹی ہے۔ سو میں اس کی تصدیق کے لئے جنگل کا ایک پتھر لگانے والا
تھا، مگر تو نے مجھے اڑنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا۔ مجھے واپسی میں دیر ہوئی تو وہ مجھے ڈھونڈتی ادھر نکل
آئی۔ وہ ایک عالم جن زاد کی بیٹی ہے۔ اس نے یہاں آتے ہی اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں کس مشکل میں
ہوں۔ میں تجھ سے ہرگز یہ نہیں چھپاؤں گا اے عبدالصور کہ میری بیوی تیرے اوپر وار کرنے والی تھی۔
میں نے اسی لئے اسے روک دیا۔" پھر عبدالصور کی یقین دہانی کے لئے میں نے سوئی کو نام لئے بغیر
مخاطب کیا۔ "اے عالم باپ کی نیک بیٹی! اس مرد بزرگ کے سامنے ظاہر ہو جا، کافر ونود چڑجی نے اسے
فریب دیا تھا ورنہ یہ مجھے قید نہ کرتا۔"

جنات کو قابو میں کر لینے والے عامل آدم زادوں کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ ہم جن زادوں کو
دیکھ سکیں ورنہ کوئی اور اس کا اہل نہیں۔ اس کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں۔ مثلاً عامل نے کسی خاص جن
زاد کو قابو میں کرنے کے لئے کوئی عمل کیا ہو۔ اس کا انحصار عمل پر ہے۔ کچھ عمل وقتی ہوتے ہیں اور
فوری طور پر اثر کرتے ہیں، کچھ کے لئے چالیس دن مقرر ہیں۔ چالیس روز کا عمل عموماً کسی جن زاد کو اپنا
غلام بنانے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ مولوی عبدالصور کا یہ مقصد نہیں تھا، سو اس نے مجھے قید کرنے کی غرض
سے مختصر مدت کا عمل کیا۔ یوں وہ مجھے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ پھر یہ کہ اس نے مجھے لاعلمی کے سبب شکار
کیا۔ اگر میں پہلے سے چوکنایا ہو شیار ہوتا تو شاید اس کی گرفت میں نہ آتا۔ سوئی کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ

نہیں تھا۔ نہ تو عبدالصبور کو اس کے نام کا علم تھا، نہ سوی کو قابو میں کرنے کے لئے اس نے کوئی عمل کیا تھا۔

جن شرائط کا میں نے ذکر کیا، ان میں جنات اور کسی عامل کی باہمی رضامندی کو بھی دخل ہے ورنہ جنات اندھیرے کی چادر اوڑھ لیتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ خود جنات بھی اپنے آپ کو ایک دوسرے سے چھپانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ سوی نے بھی عبدالصبور کی نظروں سے بچنے کی خاطر بطور احتیاط ایسا ہی کیا تھا۔ جب اس نے مجھے رضامند پایا تو خود کو ظاہر کر دیا اور عبدالصبور کے سامنے آگئی۔

”اے جن زادی! تو نے اپنے شوہر کے حکم کی تعمیل میں مجھ پر وار نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ تو نیک اور فرمانبردار ہے۔ تیرے شوہر علیالیش کو ایک شیطان کے بہکائے میں آکر میں نے قید کر لیا تھا۔ اس پر اب مجھے ندامت ہو رہی ہے۔“ عبدالصبور نے سوی سے کہا۔ ”میں تیرے شوہر کو آزاد کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی عبدالصبور نے کلمہ شہادت پڑھا اور اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ چند لمحوں کے بعد زیر لب کسی عمل کا درد کرتا رہا اور پھر اپنے ہاتھ کو الٹی جانب گردش دینے لگا۔

عامل عبدالصبور کے ہاتھ کی گردش کے ساتھ ساتھ مجھے یوں لگا کر نادیہ گرفت میرے وجود سے ہٹتی جا رہی ہے۔ ساتویں گردش پوری ہوتے ہی میں آزاد ہو گیا۔

اس پر میں نے عبدالصبور کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے لئے تجھے اتنا سرمایہ لا کر دوں گا جو کم نہ پڑے۔“

”تو نے اگر ایسا کیا اے جن زاد علیالیش! تو میں تیرے لئے دعائے خیر کروں گا۔“ عبدالصبور خوش ہو گیا۔

”اگر تو چاہے اے عبدالصبور! تو میں تجھے چند لمحوں میں جیسور پہنچا کر یہاں واپس آ سکتا ہوں۔“ میں نے پیشکش کی۔

”مجھے معلوم ہے، تم جن زادوں کے لئے یہ مشکل کام نہیں، مگر میں یہ رات اس جنگل میں عبادت کرتے ہوئے بھی گزار سکتا ہوں۔ میرے کچھ عزیز بھی جینا پل میں ہیں میں کل صبح ان سے مل کر جیسور واپس چلا جاؤں گا۔“ عبدالصبور جواب میں بولا۔

”تو اور برا نہ مانے تو یہ بتا دے اے عبدالصبور کہ وہ کافر کہ جس نے تجھے اپنا نام شمشاد خان بتایا تھا، آخری بار کب اور کہاں تجھ سے ملا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ آج ہی شام کی بات ہے۔ میں اسی کے ساتھ بس میں بیٹھ کر جیسور سے یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے تین دن تک جنگل میں ٹھہرنے کے لئے درخواست کی تھی۔“ وہ بتانے لگا۔ ”اس فریبی نے رات کو میرے لئے کھانا بھی بھجوا دیا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ تو اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں ضرور آئے گا۔ شام ہی کو وہ تو بس کے اڈے سے بستی کی طرف چلا گیا اور میں اس جنگل میں آگیا۔ کوئی آدمی بس کے اڈے پر اسے مل گیا تھا جسے اس نے میرے ساتھ کر دیا۔ اس آدمی نے مجھے بتایا تھا کہ شمشاد خان کا رشتہ دار ہے اور جینا پل ہی میں رہتا ہے۔ وہ آدمی، جنگل میں مجھے یہاں بٹھا گیا کہ میری ضروریات کا خیال رکھے۔ شمشاد خان

کہ جس کا نام تو دودو چڑی بتاتا ہے، شام کے بعد مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے ایسا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔“

تین دن تک اس عامل عبدالصبور کو جنگل میں ٹھہرائے رکھا، میرے لئے معنی خیز تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر عبدالصبور کو مخاطب کیا۔ ”دیسے تو تیری مرضی، تو اس جنگل میں رات گزار لے، مگر تیرا مقصد عبادت کرنا ہے جو پورا ہونا مجھے دشوار لگتا ہے۔ یہاں اب ایک اور ہی کھیل شروع ہونے والا ہے جس سے یقیناً تیری عبادت میں خلل پڑے گا۔ اس جنگل میں کافروں نے اسلحہ کا بڑا ذخیرہ چھپایا ہوا ہے جسے تلاش کر کے ہم تباہ کر دیں گے۔ ممکن ہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی شروع ہو جائے۔ ایسی صورت میں.....“

”اے علیالیش! تو نے یہ کیا کہا؟“ عبدالصبور نے میری بات کاٹ دی۔ ”جنات اور آدم زادوں کی جنگ میں.....“

ابھی عبدالصبور کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ جنگل ایک دھماکے سے گونج اٹھا۔ عبدالصبور اچھل پڑا۔

خطرہ! میرے اعصاب پر چھٹکا سا ہوا۔ سینٹا کو سوی تھا چھوڑ آئی تھی۔ مجبوراً ہی اسے یہ قدم اٹھانا پڑا، مگر سینٹا اکیلی شاید ان درندہ صفت آدم زادوں کا مقابلہ نہ کر پاتی جو اسی کی تاک میں ہوں گے۔ عیار و خبیث بوڑھے دودو چڑی کے اندازے حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہو رہے تھے۔ غالباً اس کے لئے وہ اپنی شیطانی قوتوں سے کام لے رہا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں ٹارائن گنج گئے تو پہلے ہی اس نے خطرے کی بو سونگھ لی اور وہاں سے بھاگ لیا۔ پھر ہم نے ادھر کا رخ کیا تو جی وہ پہلے سے چوکتا تھا۔ ایک لمحہ بھی مزید ضائع کئے بغیر سوی اور میں سینٹا کی طرف لپکے تو فضا پے در پے دھماکوں سے گونجنے لگی تھی۔

جنگل کا وہ حصہ کہ جہاں سینٹا کو ہم نے چھوڑا تھا، وہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ آس پاس کے درختوں پر مسلح آدم زاد چڑھے ہوئے تھے۔ جن کے پاس طاقتور ٹارچیں تھیں۔ ٹارچوں کے روشن دائرے ادھر سے ادھر حرکت کر رہے تھے۔ اسی کے ساتھ جدھر سے بھی ذرا سی آواز آتی، وہ ادھر گولی چلا دیتے۔ سینٹا وہاں نظر نہ آئی۔ وہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر کسی طرف نکل گئی تھی۔

ہم نے اسے جلد ہی تلاش کر لیا۔ وہ ایک گھسنے درخت پر چڑھ کر اسی جانب فانزنگ کر رہی تھی کہ جہاں ہمیں مسلح آدم زاد نظر آئے تھے۔ سینٹا کے ہاتھ میں رائفل تھی اور بیک اس کے شانے سے لٹکا ہوا تھا۔ اس بیک میں اتنی گولیاں تھیں کہ سینٹا صبح ہونے تک بھی مسلسل فانزنگ کرتی رہتی تو گولیاں کم نہ پڑتیں۔

ہم چاہتے تو پہلے ان مسلح آدم زادوں کو ٹھکانے لگا دیتے کہ جنہیں درختوں پر چڑھایا ہوا تھا، مگر دانستہ ایسا نہیں کیا۔ سینٹا کی تلاش ہمارے نزدیک اذیت کی حامل تھی۔ اسی سے ہمیں پتا چلتا کہ ہمارے پیچھے کیا واقعہ رونما ہوا؟ دشمن کس طرح چوکتا ہو گئے؟ سینٹا انہیں جمل دے کر کیسے نکل آئی؟

”سینٹا!“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ”اب اپنا ہاتھ روک لے کہ ہم آگئے ہیں۔“

”لیکن تم..... تم دونوں کہاں چلے گئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔
”اسی راہشس (شیطان) کی تلاش میں کہ جو ہمیں نارائن گنج سے نکل دے کر نکل گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ..... وہ یہاں..... کیا یہاں آگیا ہے؟“ سنیتا حیرت زدہ رہ گئی۔
”کل تک کی خبر تو یہی ہے کہ اسے یہاں دیکھا گیا ہے، اب کی معلوم نہیں۔ مگر تو بتا کہ تیرے ساتھ کیا ہوا؟“

”آشما مجھے تنہا چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنے چلی گئی تھی۔“ سنیتا بتانے لگی۔ اس دوران میں دوسری طرف سے اکا دکا فاز ہوتا رہا لیکن سنیتا نے جوابی فاز نہیں کیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتی رہی۔
”واپسی میں تجھے دیر ہو گئی تھی۔ آشما کو تیری طرف سے فکر تھی کہ تو کسی چکر میں نہ پھنس گیا ہو۔ وہ چلی گئی تو مجھے ذرا ہی دیر بعد ایسا لگا کہ دبے قدموں کچھ لوگ اسی طرف آرہے ہوں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی میں وہاں سے ہٹ گئی۔ میرا شک ٹھیک ہی نکلا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کسی کو نشانہ بناتی وہ پیڑوں پر چڑھ گئے۔ جنگل میں نیچے رہنا خطرناک ہوتا ہے۔ سو میں بھی کھکتی ہوئی اس درخت تک پہنچی اور پھر اوپر آتے ہی پہلا فاز کیا۔ اس کے بعد باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ معلوم نہیں انہیں کس طرح یہاں ہماری موجودگی کا پتا چل گیا..... اگر دونو چڑجی یہاں پہنچ چکا ہے تو اسی نے اپنی شکلی سے یہ معلوم کر لیا ہو گا۔“ سنیتا نے خود ہی دشمنوں کے چوکنا ہو جانے کی وجہ بیان کر دی، پھر کہنے لگی۔ ”میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی جن کو میں نے پیڑوں پر چڑھتے دیکھا تھا۔“
”آ میرے ساتھ۔“ میں بولا۔ ”تو خود ہی انہیں پھونک دے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اسے کسی پھول کی طرح اٹھالیا۔

میں اگر چاہتا تو پیڑوں پر چڑھے ہوئے ان مسلح آدم زاون کو اپنے ہاتھوں ٹھکانے لگا دیتا، مگر انہیں سنیتا موت کے گھاٹ اتارتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ سوئی کو بھی میں نے مداخلت سے منع کر دیا۔ ہمیں صرف سنیتا کو بچانے رکھنا تھا، باقی کام وہ خود کر لیتی۔ اگر سنیتا کے مقابل اس وقت بڑا شیطان، یعنی دونو چڑجی ہوتا تو شاید میں یہ فیصلہ نہ کرتا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ دونو چڑجی اسے زندہ نہ چھوڑتا اور پھر میں اور سوئی موقع ملنے ہی اس شیطان کو بھی ٹھنڈا کر دیتے۔ ابھی سنیتا کا زندہ رہنا میرے نزدیک ضروری تھا۔ اس طرح میرا ایک مقصد یہ تھا کہ آخر کار خود دونو چڑجی تنگ آمد پہ جنگ آمد کے مصداق ہو کھلا کر سامنے آ جائے۔ جنگ کا ابھی تو یہ پہلا ہی مرحلہ تھا۔

سنیتا کو اٹھائے ہوئے میں ان درختوں کے اوپر پہنچ گیا جن پر مسلح افراد چڑھے ہوئے تھے۔ ان کی کل تعداد آٹھ تھی اور وہ چار پیڑوں پر تھے۔

”بلکہ کون نے شاید وہ جگہ چھوڑ دی ہے جہاں سے فاز کر رہی تھی۔“ ایک درخت سے کسی کی سرگوشی ابھری۔ اسی درخت پر موجود وہ اپنے دوسرے ساتھی سے مخاطب تھا۔
”یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔“ دوسرے ساتھی نے تشویش کا اظہار کیا۔

اسی لمحے یکے بعد دیگرے دو فاز ہوئے۔ گولی چلانے والی سنیتا تھی۔ وہ دونوں کئی ہوئی شاخوں کی طرح درخت سے نیچے گرے۔

دوسرے درختوں پر موجود ان کے ساتھیوں نے بوکھلا کر جنم کے دہانے کھول دیے۔ انہوں نے اسی طرف گولیاں چلائی تھیں جہاں چند لمحے پہلے ہم موجود تھے۔
ان دونوں کو نشانہ بنائے جانے کے ساتھ ہی میں وہاں سے فوراً ہٹ آیا تھا۔
کچھ دیر گولیاں چلتی رہیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اب میں ایک اور درخت کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ ان میں سے کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ نیچے اترے۔

”وہ..... وہ بلیک کونٹن بیس کیس آس پاس موجود ہے اور..... اور.....“ وہ شخص اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور کسی کپے ہوئے پھل کی طرح درخت سے نیچے آ رہا۔

سنیتا نے اس درخت پر موجود دوسرے آدمی کو بھی موت کی فینڈ ملانے میں دیر نہ کی۔
جنگل کے اس حصے میں اب ان دشمنوں کی تعداد آدمی رہ گئی تھی۔ چار لاشیں خون میں لت پت سوکھے پتوں پر پڑھی تھیں۔ زندہ بچ جانے والے سخت دہشت زدہ ہو گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے گولیاں نہیں چلائیں۔

”جلدی کرو! شمشاد خان سے رابطہ قائم کرو۔ اسے بتاؤ کہ بلیک کونٹن نے ہمارے چار آدمی مار دیئے ہیں اور ہماری زندگی سخت خطرے میں ہے۔“ ایک درخت کی گھنی شاخوں کے درمیان سے کسی کی دھیمی آواز ابھری۔ اسے یقیناً معلوم نہیں تھا کہ شمشاد خان ہی ان کا سرغنہ، یعنی دونو چڑجی ہے۔ ان کے پاس محدود طاقت کے وائریس سیٹ موجود تھے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دونو چڑجی یا تو اسی جنگل میں کہیں موجود ہے یا پھر بیٹا بل کی بستی کے کسی گھر میں ہو گا۔

سنیتا اس درخت پر موجود افراد کو نشانہ بنانے والی تھی کہ میں نے اسے روک دیا اور سرگوشی کی۔
”نھر جا، جلدی نہ کر۔ انہیں وجود چڑجی سے رابطہ قائم کرنے دے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔
پھر اپنے ساتھی کے مشورے پر دوسرے آدمی نے کوشش کی کہ دونو چڑجی سے رابطہ قائم ہو جائے مگر ناکام رہا۔

”معلوم نہیں شمشاد خان کہاں چلا گیا؟“ دوسرا آدمی بڑبڑایا۔
یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ وہ لوگ، ’دونو چڑجی کو شمشاد خان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مجھے اسی لئے ایک اور خیال آیا۔

”تو سنیتا کو سنبھال۔“ میں نے قریب ہی موجود سوئی کو مخاطب کیا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“
”سکھ پیر! تو کہاں چلا؟“ سنیتا بول اٹھی۔

”گھبرا مت، میں زیادہ دور نہیں جا رہا۔“ میں نے جواب دیا۔ اسی لمحے سوئی نے میری جگہ لے لی۔
میں نے باری باری ان چاروں کے ذہنوں پر توجہ دی۔ پتا لگا کہ وہ لوگ جنگل میں داخل ہونے

سے پہلے ونود چڑجی کو جنگل کے قریب اسی ٹھکانے پر چھوڑ کر آئے تھے جس کی طرف ہمیں جانا تھا۔ رابطہ قائم نہ ہونے کا مطلب یہی تھا کہ ونود چڑجی اب وہاں نہیں۔ اس گھر میں ونود چڑجی کے ساتھ وہی آٹھوں افراد تھے جن میں سے چار مارے جا چکے تھے۔ انہی کے ذہن پڑھ کر مجھے ایک اور کام کی بات معلوم ہو گئی اور میں لوٹ آیا۔

پھر میرے ایما پر سنیٹا نے یکے بعد دیگرے بقیہ چار افراد کو بھی گرا لیا۔

آٹھ افراد کی لاشوں کو وہیں چھوڑ کر ہم جنگل سے نکل رہے تھے کہ ہمیں مولوی عبدالصبور ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اب ہم نے سنیٹا کو نیچے اتار دیا تھا۔

میں لپک کر عبدالصبور کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”کیا ہوا، تو کہاں جا رہا ہے؟“

”تو نے ٹھیک ہی کہا تھا اے علیالیش! یہاں جنگل میں عبادت کرتے رہنا میرے لئے مشکل ہے۔“ عبدالصبور نے جواب دیا۔ ”میں آبادی میں اپنے ایک عزیز کے گھر جا رہا ہوں۔“ پھر اس نے ذرا ہی دور کھڑی ہوئی سنیٹا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”وہ عورت کون ہے کہ جس کے ہاتھ میں رائفل نظر آ رہی ہے؟“

”پہلے وہ بھی دشمنوں کی ساتھی تھی۔“ میں نے دھیمی آواز میں بتایا۔ ”اب وہ ہم سے مل گئی ہے اور دشمنوں کو ٹھکانے لگانے میں ہمارے ساتھ ہے۔“

”کیا اسے تیری حقیقت کا علم ہے؟“ عبدالصبور نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”نہیں“ وہ مجھے اور میری بیوی کو اپنی ہی طرح آدم زاد سمجھتی ہے، ایسے آدم زاد کہ جو زرا اسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ دشمن اسی عورت کو گھیر کر مار دینا چاہتے تھے، مگر کامیاب نہ ہوئے۔ وہ دھماکے جو ٹوٹنے سے اسی عورت اور دشمنوں کے درمیان لڑائی کا نتیجہ تھے۔“

”پھر تو یہ بہت ہی خطرناک عورت ہوئی۔“ عبدالصبور بولا۔ ”جنگل سے نکلنے ہوئے میں نے آٹھ لاشیں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک وہی تھا جو میرے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔ کیا اسی عورت نے ان سب کو مار دیا؟“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس کی نگاہ سنیٹا کی طرف اٹھ گئی۔

”ہاں مارا اسی نے ہے۔ ہم نے صرف اس کے لئے راہ ہموار کر دی تھی۔“

”اس کافر کا کچھ پتہ چلا کہ جس نے مجھے قریب دیا تھا؟“ عبدالصبور نے ونود چڑجی کے بارے میں معلوم کیا۔

”ہم اب اسی کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“

”اللہ تیری مدد کرے۔“ عبدالصبور مجھے دعا دے کر آگے بڑھ گیا۔ لالین اب بھی اس کے ایک ہاتھ میں تھی، دوسرے ہاتھ میں بدستور تسبیح۔

میں واپس سنیٹا کے پاس آ کر بولا۔ ”پہلے اس گھر کی تلاشی لیتے ہیں، ممکن ہے وہاں سے کوئی کام کی چیز ہاتھ آ جائے۔“

”ابھی مجھے آشنا نے اس دائرہ والے کے بارے میں بتایا تھا جو بستی کی طرف گیا ہے۔ کیا واقعی

ونود چڑجی اسے جیسور سے اپنے ساتھ یہاں لایا تھا کہ وہ تجھے قابو میں کرنے کے لئے یہاں بیٹھ کے جا پ کرے؟“ سنیٹا نے دریافت کیا۔

”یہ سن کر تجھے اور جیرانی ہو گی سنیٹا کہ اس نے جیسور میں تعمیر ہونے والی ایک مسجد کے لئے بہت بڑی رقم بھی دی تھی۔“

”سچ سچ یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ونود چڑجی تجھ سے ڈر کے ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ تو اس کے قابو میں جو نہیں آ رہا۔“ سوی بولی۔ ”اس مولوی کو تو نے خوب بے وقوف بنایا، یہ بتا کر کہ تو مسلمان ہے۔“

”جیسی تو وہ چلا گیا ورنہ جانے کیا آفت ڈھاتا۔“ میں ہنس دیا کہ سوی کو بھی اب مصلحت سے کام لینا آ گیا تھا۔

وہ گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں آنے کا مقصد محض یہ تھا کہ اگر وہاں اسلحہ ہو تو اسے ناکارہ بنا دیا جائے۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ ونود چڑجی وہاں ہو گا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا تھا۔ اس خیال کا اظہار میں نے سوی سے نہیں کیا، مگر خود پوری طرح چوکنا رہا۔

اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا کہ سنیٹا کے لئے ونود چڑجی کوئی جال تو نہیں بچھا گیا۔ بظاہر مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔ گھر خالی ہی پڑا تھا۔ اس کا دروازہ بھی ہمیں کھلا ہوا ملا۔ آدم زاد بہر حال آدم زاد ہوتا ہے۔ سنیٹا اس گھر میں داخل ہوتے ہی چونک اٹھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے سنیٹا سے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات محسوس کی ہے تو؟“

”سن..... کیا تجھے تک تک کی آواز سنائی نہیں دے رہی..... غور سے سن کہ یہ آواز سانسے والے کمرے کے کھلے دروازے کی طرف سے آرہی ہے۔“

”یہ تو کسی گھڑی کی آواز لگتی ہے۔“ سوی بولی۔

”ہاں آشا! یہ گھڑی ہی کی آواز ہے جو کسی بھی لمحے موت کی آواز بن سکتی ہے۔“ سنیٹا نے تیز آواز میں کہا، پھر ٹائم بم کے متعلق بتانے لگی جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ ”ہمیں اس گھر سے جلد از جلد نکل جانا چاہئے۔“ یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر بھاگی۔

ونود چڑجی قدم قدم پر سنیٹا کے لئے موت کا جال بچھا رہا تھا۔ وہ ٹائم بم پھٹ بھی جاتا تو میرا کچھ نہ بگڑتا، نہ سوی کو کوئی نقصان پہنچتا۔ میں نے اسی خیال سے سوی کو سنیٹا کے پیچھے بھیجا اور خود اس کمرے میں گھس گیا جہاں ونود چڑجی ٹائم بم رکھ گیا تھا۔

وہ ٹائم بم مجھے ایک میز کے نیچے رکھا ہوا مل گیا۔ اس پر کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی اور اس سے منسلک تار کھینچ کر الگ کر دیے، پھر گھر کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہاں مجھے کام کی کوئی بھی چیز نہیں ملی تو باہر نکل آیا۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ جنگل میں فانگ کی آوازیں سننے کے باوجود بستی والوں نے پرواہ نہیں کی۔ میرے خیال میں وہ اس کے عادی تھے۔ سنیٹا اور سوی کو میں نے جنگل کے قریب دیکھا۔

”جب تک کوئی فیصلہ نہ کر لیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ذرا مجھے سوچنے دے۔“
میں اور سومی، دونوں ہی سیتا کی نظروں سے اوجھل تھے، پھر بھی اسے اپنے قریب ہماری موجودگی کا احساس تھا۔

ایک موبہم سی امید کے سارے میں نے ونود چڑجی کے خبیث چہرے کا دھیان کیا۔ اوّل اوّل وہی تجربہ ہوا جس سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اس کا چہرہ سامنے آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ پھر ایک نئی صورت پیش آئی۔ ایک چہرے کی جگہ مجھے اس کے دو چہرے نظر آنے لگے۔ ایک چہرہ تو بار بار چھپ جاتا، مگر ویسا ہی دوسرا چہرہ برقرار رہتا۔ میں نے اسی دوسرے چہرے پر توجہ مرکوز کر دی، کیونکہ وہ دونوں ایک ہی شخص کے چہرے تھے۔ مزید توجہ دینے پر اس دوسرے چہرے کے ارد گرد کا منظر بھی واضح ہوتا گیا۔ وہ مجھے تنہا دکھائی نہ دیا۔ اس کے ساتھ چار آدمی اور تھے۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ دو مسلح آدمی اس کے آگے پیچھے تھے، دو دائیں بائیں۔ ونود چڑجی ان چاروں مسلح افراد کے ساتھ تیز رفتاری کے ساتھ جنگل میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ونود چڑجی اب تک مجھے اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے دھوکا دیتا آیا ہے لیکن آج اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے دھوکا تو اب بھی دیتا چاہا تھا اور اسی کے سبب دو چہرے نظر آئے۔ اس وقت بھی اگر میں زیادہ دیر تک اپنے تصور کی قوت کو متحرک نہ رکھتا تو شاید قریب کھا جاتا۔ میں نے ان ساری باتوں پر غور تو کیا، اس کے باوجود مطمئن نہیں ہوا۔ میری بے اطمینانی کی وجہ اس عیار کا اتنی جلدی سراغ مل جاتا تھا۔

”مجھے معلوم ہے سیتا کہ اس جنگل میں ایک تہ خانہ بھی ہے؟“ میں نے قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔ یہ بات مجھے انہی چاروں کے ذہن پڑھ کر پتا چلی تھی جو مارے جا چکے تھے۔
”پہلے تو میرا کوئی ایسا تہ خانہ نہیں تھا۔“ سیتا نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے اس زمانے میں یہ تہ خانہ بنایا گیا ہو جب میں مغربی پاکستان میں تھی۔“
”ونود چڑجی میراں سے بھاگ کر اس تہ خانے میں بھی چھپ سکتا ہے۔“ سومی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”نہیں۔“ سیتا نے انکار میں سر ہلایا۔ ”وہ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ جنگل ہی کے کسی حصے میں ہو گا یا پھر اب تک اس نے راہ فرار اختیار کر لی ہو گی۔ مجھے تو اب یہ بھی شک ہے کہ جنگل میں پہلے جو ٹھکانے تھے وہاں بھی ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔ سکھ بھرتے تہ خانے کا خیال کیسے آیا؟“
”اپنی ہمتی سے مجھے یہ پتا چلا ہے۔“ میں نے پہلے ہی اس متوقع سوال کا جواب سوچ لیا تھا۔
”ایسی صورت میں ہمارے دشمن اسی تہ خانے کا رخ کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اسلحہ کا ذخیرہ بھی وہیں منتقل کر دیا گیا ہو۔ ونود چڑجی اپنی طرف سے ہماری توجہ ہٹانے کے لئے اپنے چند آدمیوں کی قربانی دے سکتا ہے۔ اصل خطرہ یہ ہے کہ وہ کہیں بن گاؤں کی طرف نہ چلا گیا ہو۔ وہ سرحد پار کر گیا تو پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔“ سیتا بولی۔
”پہلے اس شیطان کو فرار ہونے سے روکنا چاہئے۔“ سومی نے مشورہ دیا۔

سیتا نے بھی سومی کے مشورے سے اتفاق کیا تو میں بولا۔ ”میرا خیال یہ ہے کہ وہ ان حالات میں سرحد پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ وہ جان گیا ہے کہ ہم اس کے تعاقب میں ہیں۔ اسے جنگل کے اندر پیدل سفر کرتے ہوئے اپنے علاقے کی حدود میں داخل ہونے کے لئے کم سے کم بھی دو گھنٹے ضرور لگ جائیں گے۔ میرا اندازہ ٹھیک ہے نا سیتا؟“
”ہاں۔“ سیتا نے تائید کی۔ ”اس نے بہت تیز رفتاری بھی دکھائی تو اس سے کم وقت نہیں لگے گا۔“

”لیکن ہم تو اس سے بہت پہلے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔“ سومی نے کہا۔ ”اس امکان کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔ اگر وہ ہمیں نہ بھی ملا تو ہم دوبارہ لوٹ کر میراں آسکتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ واپس میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

ونود چڑجی کی تلاش میں سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ اپنی جتنی صفات کو بروئے کار لا کر بھی مجھے اب تک ناکامی ہوئی تھی۔ سیتا اگر ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید ہمیں اس کی گرد بھی نہ ملتی۔ اسی کو راہ سے ہٹانے کی خاطر ونود چڑجی بار بار دور سے اپنی بھلک دکھا کر غائب ہو رہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر سومی پھر نہ بولی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ ہر چند کہ ونود چڑجی کو ڈھونڈنے کے لئے پہلے بھی میں اپنے تصور کی قوت آزما چکا تھا، پھر بھی مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔
”سکھ بھرتے!“ سیتا چپ نہ رہ سکی۔ ”ہم کب تک یہیں کھڑے رہیں گے؟“

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چھپے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جنت اور کالے علم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

جنت زار



6

سنبیدہ خاتون

جن زاد کا سبب

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

چند لمحے یقین اور بے یقینی کے درمیان گزرے۔ میں نے اس منظر کو پھر اپنی چشم تصور سے دیکھا۔ بظاہر یہی محسوس ہوا کہ وہ فرار ہو رہا ہے۔ میں نے سمت کا تعین بھی کر لیا۔ اس کا رخ بن گاؤں کی طرف ہی تھا۔ سنیتا نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا تھا۔ ونود چڑجی جیسے آدم زاد سے مجھے ایسی فاش غلطی کی توقع نہیں تھی۔ نہ مجھے اس پر یقین آ رہا تھا کہ وہ ابھی سے ہتھیار ڈال دے گا۔ اس ملک سے فرار شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہی تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس کا سب سے محفوظ ترین قلعہ تو چانگام ہلز ہیں۔ وہ ادھر کیوں نہیں گیا؟ ایسا بھی نہیں تھا کہ یہاں وہ میرے گھرے میں آ گیا ہو۔ ابھی تو دوبارہ اس سے معرکہ آرائی کا یہ پہلا ہی مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں بھی وہ سامنے آئے بغیر اپنے مروں کو آگے بڑھاتا رہا تھا۔ موقع پر موجود رہ کر بھی وہ پس ہی رہا۔ ایک ایک کر کے اس کے مرے پٹے رہے، چالیں ناکام ہوتی رہیں، مگر اپنے پیچھے اس نے کوئی سراغ نہ چھوڑا۔ پھر اچانک اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کیسے کر لیا ہو؟ اس سوال کا یہی جواب ممکن تھا کہ وہ ایک دم غیر متوقع فیصلے کرتا ہے۔ اب تک کے تجربات اسی کے شاہد تھے۔ کچھ ایسی ہی فطرت سنیتا کی بھی تھی۔ اس کی تربیت ونود چڑجے کے ہاتھوں ہوئی تھی، یہ اسی کا اثر تھا۔

اس معاملے پر اچھی طرح سوچ بچار کے بعد میں نے سنیتا کو مخاطب کیا۔ ”تُو مجھے یہ بتا، کیا ونود چڑجی اتنی جلد ہار مان لینے والوں میں سے ہے؟“

”نہیں وہ ایسا نہیں ہے۔“ سنیتا نے واضح الفاظ میں جواب دیا۔

”پھر تجھے یہ گمان کیوں ہوا کہ وہ سرحد پار کر جائے گا؟“

”یہ سوچنے کی وجہ کچھ اور تھی۔“ سنیتا نے وضاحت کی۔ ”ونود چڑجی کے اوپر بھی تو کچھ اور لوگ ہیں۔ موجودہ حالات میں ونود چڑجی کو واپسی کا حکم بھی تو مل سکتا ہے۔ چانگام ہلز نہ جا کر وہ

ادھر ہی کیوں آیا؟ اس سوال کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟ میں یہ نہیں مان سکتی کہ وہ یہاں تجھے پھانسنے کے لئے جال بچھانے آیا ہو گا۔ تو اپنی ہفتی سے کام لے سکھ بھرا! یہ پتا چلا کہ میرا اندازہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

”میری تو کر رہا تھا اب تک۔“ میں نے سنیتا کو بتا دیا۔ ”اس کا پتا لگایا ہے میں نے۔ وہ اپنے چار مسلح آدمیوں کے ساتھ بن گاؤں کی طرف ہی بڑھ رہا ہے، مگر چرے دھوکا بھی تو دے جاتے ہیں۔ چروہ بدل کر وہ ہمیں دھوکا دینے کے لئے کسی اور کو بھی تو ادھر بھیج سکتا ہے۔“

”ہاں ممکن ہے سکھ بھرا! وہ یہ چال بھی چل سکتا ہے۔ پھر بھی جس کے چرے پر اس نے اپنا میک اپ کیا؟ آدی تو اس کا ہو گا۔ اس کے علاوہ چار مسلح افراد اس کے ساتھ ہیں، وہ بھی دشمن کے آدی ہوئے۔ تیرا مقاصد تو دشمنوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ اگر تیرا شک صحیح بھی نکلا، وہ شخص وجود چڑ جی نہ بھی ہوا تو ہم گھاسٹے میں نہیں رہیں گے۔ اب اور دیر نہ کر، ادھر چل۔ ہم نے جتنی دیر لگائی، وہ اتنی ہی دور نکل جائیں گے۔“

سوی نے بھی سنیتا کی رائے سے اتفاق کیا اور پھر ہم وہاں نہیں رکے۔ میں آگے آگے تھا اور سوی، سنیتا کو اٹھائے میرے پیچھے چل رہی تھیں ہم نے اپنی رفتار اتنی ہی رکھی کہ سنیتا ہوش و حواس میں رہے۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ پانچوں افراد جنگل میں زیادہ دور تک نہیں جاسکتے تھے۔

ہم ان سے آگے نکل آئے۔ نیچے میں نے ایک برساتی تالا دیکھا۔ وہ تالا خاصا گہرا اور چوڑا تھا۔ نالے کے اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی درخت کا لمبا اور موٹا تالا کٹ کر ڈال دیا گیا تھا۔ اسی تنے پر چل کر ایک طرف سے دوسری طرف آنا جانا، ممکن تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی آدی تالا عبور کر پاتا۔

یہ خطرناک راستہ اختیار کرنے کے مقصد یہی ہو گا کہ کسی کا ادھر دھیان نہ جائے۔ میں نے اسے دشمنوں کی بد قسمتی ہی تصور کیا۔

اسی نالے کی دوسری جانب ہم جنگل میں اتر گئے۔ تالا عبور کر کے دشمنوں کو ادھر ہی آنا تھا۔ نیچے اترتے ہی سنیتا نے ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے لی۔ نالے کے اس پار گئے درختوں کے درمیان ایک سرنگ سی بنی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ادھر ہی سے میں نے انہیں نالے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اب ان کی ترتیب بدل گئی۔ دو مسلح آدی، دودو چڑ جی کے آگے اور دو پیچھے تھے۔

میں پلٹ آیا اور سنیتا کو صورت حال سے آگاہ کر دیا، پھر بولا۔ ”تجھے جلد بازی نہیں کرنی۔“

”میں سمجھ گئی سکھ بھرا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ آگے آنے والوں پر میں گولی نہیں چلاؤں گی۔ انہیں تالا عبور کر کے ادھر آ جانے دوں گی۔“ سنیتا بولی۔

”ہاں انہیں آتش سنہال لے گی اور پیچھے آنے والوں کو میں۔ تجھے دودو چڑ جی کو اس وقت نشانہ بنانا ہے جب وہ آگے بڑھتا ہوا نالے کے درمیان میں آ جائے۔ چاندنی رات میں اسے دیکھ لینا

تیرے لئے شاید زیادہ مشکل نہ ہو، کیونکہ یہاں سے تالا قریب ہے۔“ میں نے سنیتا کو سمجھایا۔

”تیری مرضی یہ ہے کہ اگر وہ دودو چڑ جی ہے تو میرے ہاتھوں مارا جائے۔“ سنیتا یہ کہتے ہوئے مسکرائی۔ پھر اس نے کہا۔ ”سکھ بھرا! تو شاید بھول گیا کہ دودو چڑ جی، درگا دیوی کا داس ہے اور اسے شکار کر لینا اتنا آسان نہیں۔ خطرے کی بوہ بہت پہلے سو گھ لیتا ہے۔“

”میں اسے چھینڑنا نہیں چاہتا کہ اس طرح وہ چوکننا ہو جائے گا ورنہ تو اس کی اصلیت ابھی معلوم ہو جاتی۔“ میں بولا۔

سوی میرا مقصد سمجھ رہی تھی، اسی لئے اس نے کچھ نہیں کہا اور میرے اشارے پر وہاں سے ہٹ آئی۔ سنیتا کو ہم نے وہاں اکیلا چھوڑ دیا اور وہ گھات لگائے بیٹھی رہی۔ اس سے میں نے کہہ دیا تھا کہ ہم قریب ہی موجود ہیں۔ ان پانچوں آدم زادوں سے نمٹنا میرے یا سوی کے لئے مشکل نہیں تھا لیکن ہمارا اصل شکار دودو چڑ جی تھا۔ اگر وہ بھی انہی کے درمیان موجود تھا تو لوہے کا چنا ثابت ہوتا۔ دودو چڑ جی سے مقابلے کے دوران میں سنیتا ماری جاسکتی ہے، اسی امکان کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے میں نے تھما رہے دیا۔ میں اور سوی اب نالے کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ پیڑوں کے درمیان جو سرنگ نماز راستہ بنا ہوا تھا، وہ نالے کے قریب ہی آ کے ختم ہوتا تھا۔

”اے علیالیش! انہیں اب تک تو یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔“ سوی نے مجھے مخاطب کیا۔

”آ چل کر دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے راستہ بدل نہ دیا ہو۔“

سوی اور میں، سرنگ نما راستہ میں داخل ہو گئے۔ خلاف توقع ہمیں دور تک نظر نہ آئے۔ دائیں بائیں گھٹا جنگل تھا۔ کچھ ہی فاصلے طے کر کے ہمیں دائیں جانب پیڑوں سے گھرا ہوا چھوٹا سا ایک میدان دکھائی دیا۔ ان بد بختوں کو ہم نے اسی میدان میں ہری ہری گھاس پر آرام کرتے دیکھا۔ درمیان میں دودو چڑ جی تھا۔

”بلیک کنگ! اب تک تو کوئی خطرہ پیش نہیں آیا۔“ ان میں سے ایک دودو چڑ جی سے بولا۔

”تھری زیرو سے معلوم کرو کہ ہم واپس تہ خانے کی طرف لوٹ جائیں یا اوپر کچھ دیر جنگل

میں گھومتے رہیں؟“ دوسرے شخص نے دودو چڑ جی کو مشورہ دیا۔

دودو چڑ جی اٹھا۔ اس کے پاس ہی ایک بیگ رکھا تھا۔ بیگ سے اس نے ٹرانسٹیٹر نکال لیا اور

فری کو سنسی سیٹ کرنے لگا۔

”ہیلو تھری زیرو! بلیک کنگ کالنگ، اور۔“ بار بار وہ یہی الفاظ دہراتا رہا۔ اس کی آواز بڑی حد

تک دودو چڑ جی سے ملتی ہوئی تھی، مگر لمبے میں نہ مٹھاس تھی، نہ ہی نرمی۔ اس فرق کو میں نے واضح طور پر محسوس کر لیا۔

اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ شخص ہرگز دودو چڑ جی نہیں ہے۔ آئندہ کی موت کے بعد دودو چڑ جی نے اب اس شخص کو بلیک کنگ بنا دیا تھا۔

چند ہی لمبے بعد ٹرانسٹیٹر پر دودو چڑ جی کی آواز ابھری۔ ”تھری زیرو آن دی لائن، رپورٹ؟

اور۔۔۔ اس کی آواز قدرے بدلی ہوئی تھی، مگر لہجے سے میں نے اسے پہچان لیا۔

”بلیک کوئن کا کہیں پتا نہیں چلا تھری زیرو! وہ شاید مایوس ہو کر لوٹ گئی ہے۔ اور۔۔۔“

”ناٹمن،“ وہ اس طرح نہیں لوٹ سکتی۔ اسے تلاش کرو۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے رپورٹ ملی ہے کہ گھر میں رکھا ہوا ٹائم بم نہیں پھٹا۔ بلیک کوئن یقیناً وہاں گئی ہوگی۔ وہی ٹائم بم کو ناکارہ بنا سکتی ہے۔ میں نے تہہ خانے میں موجود افراد کو بھی حکم دینے والا ہوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر جنگل میں پھیل جائیں۔ بلیک کوئن کو ہر قیمت پر ختم کرنا ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی سرحد پار نہیں جانا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک بلیک کوئن زندہ ہے، تم میں سے کسی کی زندگی بھی محفوظ نہیں۔ اب مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب میں چاہوں گا، تم سے خود ہی رپورٹ لے لوں گا۔ تمہیں کچھ اور کتنا ہے؟ اور۔۔۔“

”صرف یہ پوچھنا ہے کہ صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد بھی ہم بلیک کوئن کی تلاش جاری رکھیں یا تہہ خانے میں اتر جائیں۔“ اس شخص نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں کیا صبح ہونے سے خطرہ ٹل جائے گا؟ تم سے مجھے ایسے اطمینانہ سوال کی توقع نہیں تھی بلیک کنگ! تمہیں ابھی شمشاد خان کے میک اپ ہی میں رہنا ہے۔ تمہاری آواز شمشاد خان سے ملتی ضرور ہے، مگر لہجے میں مٹھاس اور نرمی نہیں۔ تمہیں ابھی مزید مشق کرنے کی ضرورت ہے۔ میری جگہ اب یہاں تھی کو اپنے آدمیوں کی کمان سنبھالنا ہے۔ ان سے رابطہ قائم رکھنا، اور اینڈ آل۔۔۔“ دوند چڑ کی آواز آتا بند ہو گئی۔

وہ شخص کہ جسے وودو چڑ نے اب اپنا نائب مقرر کیا تھا، اسی کا ہم شکل بنا ہوا ہمیں فریب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی جگہ اسے ابھی شمشاد خان کے میک اپ ہی میں رہنے کی تاکید کر کے وہ سنتیا کو دھوکے میں رکھنا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وودو چڑ جی جنگل کے قریب موجود گھر میں ٹائم بم رکھنے کے بعد وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ چہرہ جو اپنے تصور کی قوت آزماتے ہوئے مجھ پہلے نظر آیا، وہی اس کا اصل چہرہ تھا جو بار بار میرے سامنے آکر اوجھل ہوتا رہا۔ ویسا ہی دوسرا چہرہ اس شخص کا تھا جس نے وودو چڑ جی کی جگہ لے لی تھی۔

اب سبھی کچھ مجھ پر واضح ہو گیا۔ وودو چڑ جی مجھے ادھر الجھا کر خود بھاگ لیا۔ میرے بیشتر قیاسات درست ہی ثابت ہوئے۔ سنتیا کا یہ گمان غلط نکلا کہ وودو چڑ جی سرحد پار جا سکتا ہے۔ وہ لوگ تو جنگل میں سنتیا کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان کا خیال شاید یہی ہو گا کہ سنتیا ان کے آٹھ آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر جنگل میں کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ اب یہ تلاش بڑے پیمانے پر شروع ہونے والی تھی۔

دشمن کے عزائم کا پتا چلنے کے بعد مجھ پر شدید جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ وودو چڑ جی ایک آدم زاد ہونے کے باوجود میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسی جھنجھلاہٹ کے نتیجے میں سوی کو مخاطب کیا۔ ”اب انہیں مہلت دینا فضول ہے اے سوی!“

”پھر تیرا کیا ارادہ ہے اے علی لیش!“ سوی نے پوچھا۔

میں نے سوی کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ پھر موت کا کھیل شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اور سوی اس میدان میں اتر گئے۔

”چلو اب اٹھ جاؤ کہ یہ آرام کا وقت نہیں ہے۔“ وودو چڑ جی کے ہم شکل بلیک کنگ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

وہ اٹھ کر اپنے قریب رکھے ہوئے ہتھیار اٹھانے والے تھے کہ سوی نے ان کی رائفلیں غائب کر دیں۔ میں نے وودو چڑ جی کے ہم شکل کا منہ نوچ لیا۔

اس افتاد پر وہ سبھی بوکھلا گئے۔ وہ آدم زاد میری نظر میں درندے ہی تھے۔ سو ہم دونوں ان کے لئے درندے بن گئے۔

”شیر..... شیر..... شیروں کا جوڑا۔“ وہ چیخے۔

وودو چڑ جی کا ہم شکل ایک سیاہ فام شخص تھا۔ اس نے اپنے کُرتے کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ عین اسی لمحے سوی نے پیچھے سے اس پر ہست بھری اور اسے دبوچ لیا۔ ریوالور چلانے کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ سوی نے اسے چیر پھاڑ ڈالا۔

”بھاگو۔“ کوئی پوری قوت سے چیخا، مگر اپنی موت سے کون بھاگ سکا ہے جو وہ بھاگ جاتے۔ ان چاروں کو ہم نے اسی میدان میں گھیر کر مار دیا۔ اب یہ ضروری نہیں رہا تھا کہ سنتیا ہی ان کے جسوں کو گولیوں سے چھلنی کرتی۔

دروندوں کے قابلوں سے نکل کر ہم سنتیا کے پاس آ گئے۔ ہم اسے جہاں اور جس حال میں چھوڑ گئے تھے، وہ اسی طرح ملی۔

”سنتیا!“ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھی۔

”ابھی تک ان میں سے کوئی ادھر نہیں آیا سکھ بیر!“ اس نے بتایا۔

”اور اب آئے گا بھی نہیں۔“ میں بولا۔ ”وہ کینہہ بوڑھا پھر ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہو گیا۔“

”لیکن کب اور کیسے؟ تو نے اور آٹھانے اسے کس طرح نکل جانے دیا؟“

اس پر میں ہنس دیا اور بولا۔ ”وہ چوہا سامنے آتا جب نا، اپنی جگہ اس نے کسی اور کو بلی چڑھوا دیا۔ وہ وودو چڑ جی نہیں تھا جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک آ گئے۔ میں نے جو کہا تھا، وہی ہوا۔ اس کا چہرہ دھوکا دے گیا۔ وودو چڑ جی نے اُسے آئندہ کی جگہ بلیک کنگ بنا دیا تھا۔ وہ تھا بھی کالا۔

اسے مارنے سے پہلے میں نے اس کا اصل چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ سرحد پار جانے کے لئے ادھر نہیں آیا تھا بلکہ اسے بلیک کوئن، یعنی تیری تلاش تھی۔“ پھر میں نے سنتیا کو اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو ٹرانسپیر پر سن تھی، پھر کہا۔ ”تو ہی بتا کہ اس کے بعد میں اور آٹھانہیں کیسے زندہ چھوڑ دیتے۔“

”ٹولیاں بنا کر جنگل میں میری تلاش کا مطلب یہ ہے سکھ بیر کہ ان کی تعداد زیادہ ہو گی۔“

سینٹا ساری بات سن کر بولی۔

”تو ہوا کرے“ ہم ان میں سے ایک کو بھی جان بچا کر نہیں بھاگتے دیں گے۔ اب تک انہیں دوند چڑی کا حکم مل چکا ہو گا۔ چل اب انہیں شکار کرتے ہیں۔ وہ تمہ خالے سے نکل کر جنگل میں آ گئے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے تمہ خانہ کہاں ہے۔ جن کی موت تیرے ہاتھوں لکھی ہے“ انہیں ٹو مار لے گی“ بقیہ کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔“ یہ کہتے ہی میں نے سوی کو اشارہ کیا۔ اس نے سینٹا کو اٹھا لیا۔

اس جنگل کے ابتدائی حصے میں جہاں مولوی عبدالصبور مجھے ملا تھا، اسی کے قریب تمہ خالے میں اترنے کا راستہ تھا۔ دوند چڑی نے بلا سبب عبدالصبور کے لئے وہ جگہ منتخب نہیں کی تھی۔ اس کا مقصد یہی رہا ہو گا کہ مولوی عبدالصبور کی موجودگی میں کوئی ادھر نہ آئے۔

سوی نے سینٹا کو ایک ایسی جگہ پیڑ پر اتارا کہ اب بھی کوئی تمہ خالے کے اندر ہو اور باہر نکلے تو گولیوں کا نشانہ بن جائے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ جلدی ہی میں نے معلوم کر لیا کہ تین تین آدمیوں کی دو ٹولیاں جنگل میں گئی ہیں۔ تمہ خالے میں اب صرف دس افراد تھے جو باہر آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ گویا ان کی کل تعداد سولہ تھی۔ سامنے ہی ایک پختہ قبر کا تعویذ کھلا ہوا تھا۔ قبر پر کسی کے نام کا کتبہ بھی لگا تھا۔ کتنے جنگل میں وہ قبر کب اور کس نے بنائی کسی کو اس سے کیا غرض ہوتی۔ کوئی بھولا بھٹکا آدمی اگر ادھر آ بھی جاتا ہو گا تو تمہ خالے کے راستے کی نگرانی کرنے والے اسے وہاں نہ نکلے دیتے ہوں گے۔ یوں بھی کسی قبر پر کون شبہ کرتا ہے۔ دشمنوں کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ ہو گا کہ وہ مصنوعی قبر ہی کبھی ان کی اصل قبر بن جائے گی۔

اگر تمہ خالے میں اسلحہ کا بڑا ذخیرہ میں نے دیکھا اور باہر آ گیا۔ کسی صندوق کی طرح سنگ مرمر کا وہ تعویذ دو حصوں میں تقسیم ہو کر دائیں اور بائیں جانب قبر کے بقیہ حصے پر رک گیا تھا۔ اسی کھلے ہوئے حصے کے قریب نیچے جانے کے لئے میڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

جس پیڑ پر سینٹا مورچہ لگائے بیٹھی تھی، سوی کو بھی میں وہیں چھوڑ آیا تھا۔ واپس آ کر میں نے سوی سے کہا۔ ”تو سینٹا کو لے کر یہاں سے اڑ جا۔“ پھر میں نے جو کچھ معلوم کیا تھا اور اب جو ارادہ تھا، اس سے ان دونوں کو بے خبر نہیں رکھا۔

سوی وہاں سے سینٹا کو لے کر دور چلی گئی اور میں دوبارہ تمہ خالے میں جا گھسا۔

وہ بد قسمت آدم زاد اس تمہ خالے سے نکل نہیں پائے تھے کہ میں نے اسلحہ کے ذخیرے میں آگ لگا دی۔ پھر تو یوں لگا جیسے جنگل کے اس حصے میں زلزلہ سا آ گیا ہو۔ نہ وہاں اس مصنوعی قبر کا نام و نشان رہا، نہ ان آدم زادوں کا پتہ چلا جو اندر تھے۔ دیر تک زبردست دھماکے ہوتے رہے۔ یہ دھماکے ایسے نہیں تھے کہ سرحدی محافظ انہیں نظر انداز کر دیتے۔ یقیناً ان کی آواز دور دور تک سنی گئی ہو گی۔

دور سے میں نے فوجیوں کے ٹرک تیزی سے جنگل کی طرف آتے دیکھے۔ میں لپک کر سینٹا اور سوی کے پاس پہنچ گیا۔

”ممکن ہے“ حقیقت حال جاننے کے لئے فوجی اس جنگل میں داخل ہو جائیں۔ یہ الگ بات کہ تلاش و جستجو کے باوجود انہیں جنگل میں بڑے سے ایک گڑھے کے سوا کچھ نہیں ملے گا، لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ دشمن کے ابھی چھ آدمی زندہ ہیں جو تمہ خالے سے نکل گئے تھے۔ انہیں بھی ٹھکانے لگانا ہے۔“ میں نے کہا۔ سوی کے وجود کی مخصوص خوشبو اس تک پہنچنے میں ہمیشہ میری رہنمائی کرتی تھی۔ مجھے تلاش کرنے میں سوی کو بھی اسی لئے کبھی دشواری پیش نہیں آئی۔

”بڑے ہی زوردار دھماکے تھے وہ۔“ سینٹا کہنے لگی۔ ”مجھے اس تمہ خالے میں اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرے کا اندازہ نہیں تھا۔“

”خیریت یہ ہوئی کہ اسلحہ تقسیم نہیں ہو سکا ورنہ تو اپنے دشمنوں کی سازش کو ناکام بنانا ہمارے لئے بہت مشکل ہو جاتا۔“ سوی بولی۔

وہ دونوں تمہ خالے سے خاصے فاصلے پر ایک گئے پیڑ کے اوپر تھیں۔

”میری ایک بات مانے گا سکھ بھرا“ سینٹا نے مجھے مخاطب کیا۔

”بول کیا چاہتی ہے تو؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جو مجھے موت کی نیند سلانے تمہ خالے سے نکلے تھے“ انہیں میں خود اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتی ہوں۔ تم دونوں کوئی مداخلت نہیں کرو گے، مجھے ان تک صرف پہنچاؤ۔ پھر میں جانوں اور وہ جانیں۔ مجھے بھی تو خود کو آزاد کر دیکھنا چاہئے۔“ سینٹا نے جواب دیا۔

اس آدم زادی کے اندر بھی ایک درندہ چھپا بیٹھا تھا۔ آج ہی رات وہ آٹھ آدمیوں کا خون بچا چکی تھی، پھر بھی اسے قرار نہیں آیا تھا۔

”دیکھ سینٹا، اپنا یہ شوق تو پھر کبھی پورا کر لیجئے۔ اب رات کا یہ آخری پر ہے، ہمیں واپس ڈھاکہ بھی پہنچنا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”پھر یہ کہ اس جنگل میں فوجی بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنا کام کرتے ہی یہاں سے نکل جانا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فائرنگ کی آواز نہ ہو، تاکہ فوجی ہماری طرف متوجہ نہ ہوں۔“

”جب انہیں ٹھکانے لگا کر یہاں سے نکل ہی جاتا ہے تو پھر فوجیوں سے کیا ڈرتا۔“ سینٹا بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

”تو صورت حال کو سمجھ ہی نہیں رہی۔ کچھ ہی دیر پہلے زبردست دھماکے ہو چکے ہیں۔ فائرنگ سے فوجی کسی غلط فہمی کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ بات میں دونوں طرف کے فوجیوں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر سرحدی جہازیں شروع ہو سکتی ہیں۔ ابھی تو دشمن سے آخری معرکہ باقی ہے۔ تجھے چانگام ہلز میں اپنی حسرت نکالنے کا موقع مل جائے گا۔ یہاں تو ہم نے دشمن کو تس تس کر ہی دیا۔ ہم نے جس مقصد سے ادھر کا رخ کیا تھا، وہ پورا ہو گیا۔“

دہاں سے لوٹ کر ہم نے سینٹا کو ساتھ لیا اور ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔
 فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں کہ جب ہم ڈھاکہ میں اپنے گھر کے اندر اترے۔ سینٹا کو ہم نے
 بے ہوش ہی رہنے دیا۔ اسے برابر والے کمرے میں بستر پر لٹا کر ہم اپنی خواب گاہ میں آکر سو گئے۔
 مگر رات ہوئی شب ہمارے لئے بڑی مبارک ثابت ہوئی تھی۔ ہمارے اعصاب اسی لئے پرسکون تھے،
 سو ہمیں بڑی گہری نیند آئی۔

☆ = = = = ☆ = = = = ☆

سوی بتانے لگی۔ ”مجھے ذرا سی دیر اس لئے ہو گئی کہ ان میں سے ایک ٹرانسپیر پربات کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے قہری زیرو کہا گیا تو میں سمجھ گئی، وہ ان کا سرغنہ ونود چڑجی ہے۔ اس نے رابطہ قائم کئے جانے پر خفگی کا اظہار کیا، پھر مختصر الفاظ میں اس کی وجہ پوچھی۔ یہاں سے ونود چڑجی کو بتا دیا گیا کہ تمہ خانے کی طرف سے زبردست دھماکے سنائی دیئے ہیں، لگتا ہے بلیک کوئن نے اسلحہ کا ذخیرہ اڑا دیا ہے۔ اس پر ونود چڑجی نے بے یقینی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ ناممکن ہے، بلیک کوئن کو اس تمہ خانے کا علم نہیں۔ اسی کے ساتھ ونود چڑجی نے ان تینوں کو بلیک کوئن کی تلاش چھوڑ کر تمہ خانے کی طرف جانے اور پھر رپورٹ دینے کا حکم دیا۔ اس شخص نے ونود چڑجی کو بلیک کنگ سے رابطہ قائم نہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ یہ گفتگو ختم ہوتے ہی میں نے ان تینوں کا کام تمام کر دیا۔“

وقت اور فاصلوں کی مٹانیں کھینچ لینا ہمارے لئے تو ممکن تھا، دشمن کے لئے نہیں۔ ونود چتر جی گزشتہ رات بینا پل سے فرار ہوا تھا۔ چانگام ہلر پہنچنے میں اسے وقت لگتا۔ ہم نے اسی لئے دو دن ڈھاکہ شہری میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرصے میں شہر کی حالت معمول پر آتی گئی۔ حکومت کے خلاف کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ بینا پل سے آنے کے بعد دوسرے روز میں نے سوئی سے جیسور جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مولوی عبدالصبور سے کیا ہوا وعدہ مجھے یاد تھا۔ غدار زمیندار وحید الزماں نے اسی ملک کے عوام کا حق مار کر وہ دولت جمع کی تھی جس پر اب میرا قبضہ تھا۔ یہ دولت اللہ کے گھر کی تعمیر میں صرف ہونے کے باوجود بچ رہتی۔ باقی رہ جانے والی اس دولت کا مصرف بھی میں نے سوچ لیا۔ سونا لے کر میں شہر کے صرافہ بازار میں پہنچ گیا۔ کسی کو بھی سونے کی شکل میں یہ دولت دینا شیعے کا سبب ہوتا۔ سو میں نے اسے کرنسی میں تبدیل کر لینا ضروری خیال کیا۔ میں اس وقت خورشید احمد کے قالب میں تھا۔ ایسا لباس میں نے زیب تن کیا کہ دیکھنے والے مجھے کوئی خاندانی رئیس یا نواب سمجھیں۔ صرافہ بازار میں گھوم پھر کر میں نے ایک بڑے صراف کی دکان کا رخ کیا۔ میرے شانے سے جو بیگ لٹک رہا تھا، اس میں سونا ہی سونا بھرا ہوا تھا۔ دکان دار نے میرا حلیہ اور وضع قطع دیکھ کر مجھ پر خصوصی توجہ دی۔

”جی ارشاد فرمائیے‘ یقیناً آپ بہترین زیورات کی خریداری کے لئے آئے ہوں گے۔“ دکان دار بولا۔ ”آپ ہی جیسے صاحب نظر حضرات کے لئے.....“

”ذرا توقف کیجئے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم اس وقت خریداری کے لئے نہیں آئے۔ یہ بتائیے کہ آپ کتنا سونا خرید سکتے ہیں؟“

میں اس کی بات سن کر مسکرایا اور بولا۔ ”عزیز من! ہمارے پاس جتنا خالص سونا ہے، آپ کی قوت خرید سے باہر ہے۔“ پھر میں نے بیک کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پورا بیک سونے کی تکیوں سے بھرا ہوا ہے۔ بولنے کیا آپ تمام سونے کا سودا کر سکتے ہیں؟“

میری توقع کے مطابق دکان دکار بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس بیک میں..... یہ پورا بیک سونے سے بھرا ہوا ہے؟“

دکان میں موجود دیگر افراد بھی میری طرف چوہک کر دیکھنے لگے۔ ان میں گاہک بھی تھے اور دکاندار کے معاون بھی۔ میں نے دکاندار کی یقین دہانی کے لئے بیک کھولا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”آپ خود ملاحظہ کر لیجئے..... تکلف نہ کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا“ آپ ہاتھ ڈال کر کچھ سونا نکال کے دیکھ لیں۔“ میں نے کہا۔

دکاندار کے چہرے پر شدید حیرت نظر آنے لگی۔ مولوی عبدالصبور کو میں نے ایسی ہی کسی صورت حال سے بچانے کے لئے خود یہ قدم اٹھایا تھا۔ حیرت کے ساتھ ساتھ اب دکاندار کچھ خوفزدہ بھی دکھائی دیا۔ بولا۔ ”آپ کے تو علم میں ہے جناب کہ شر کے حالات کیسے ہیں..... ہر چند کہ اب امن و امان بحال ہو چکا ہے، پھر بھی کیا خبر کہ کوئی فتنہ کھڑا ہو جائے..... میں تو اس پر حیران ہوں کہ ایسی فضا میں آپ اتنا سارا سونا ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔ میرے ساتھ آئیے آپ اور یہ بیک بھی یہاں سے اٹھا لیجئے۔“

وہ مجھے دکان کے اندرونی حصے میں لے آیا۔ یہاں مجھے دیوار کے ساتھ مچی ہوئی بڑی سی ایک تجوری بھی نظر آئی۔ بیرونی اور اندرونی حصے کے درمیان ایک دیوار تھی۔ آمدورفت کے لئے دیوار میں ایک دروازہ بھی بنا ہوا تھا۔ یہاں مجھے کچھ کارگر بھی ایک طرف کام کرتے دکھائی دیئے۔ دکان دار نے ان کارگروں کی بھی کچھ دیر کے لئے چھٹی دے دی۔

مجھے اس نے ایک مونڈھے پر بٹھا کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں جناب کہ یہ سارا سونا میں نہ خرید سکوں۔ میرے کچھ عزیزوں کی دکانیں بھی اسی بازار میں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں ان سے بھی رقم لے سکتا ہوں۔ اگر آپ بڑا نہ مائیں تو پہلے میں کوئی لگا کر دیکھ لوں کہ سونے میں کھوٹ تو نہیں۔“

”بالکل دیکھ لیجئے۔ اس میں بڑا ماننے کی کوئی بات نہیں۔“ یہ کہتے ہی میں نے خود بیک خالی کر دیا۔

کوئی پر سونے کی ان ٹکیوں کو پرکتے ہوئے دکاندار بولتا رہا۔ ”سونے کا بھاؤ اس وقت حالات کی وجہ سے گرا ہوا ہے۔ پھر بھی کیونکہ آپ مجھے خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہیں اس لئے میری کوشش یہی ہو گی، آپ زیادہ نقصان میں نہ رہیں۔“

وہ بھاؤ کم کرنے اور سونا سستے داموں خریدنے کے لئے راہ ہموار کرتا رہا۔ میں اس دوران میں خاموش ہی رہا۔ اتنی سی بات کے لئے میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار نہیں لایا۔ یہ بہر حال اس آدم زاد کا دھندا تھا۔ اسے نفع کمانے کا حق تھا۔ ایک ہی دکان پر اگر وہ سارا سونا بیک جاتا تو مجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

سونے کو کوئی پر رکھنے کے بعد اس نے وزن کیا اور پھر حساب لگانے بیٹھ گیا۔

”آپ ہمیں تشریف رکھیں، میں آتا ہوں۔“ دکان دار نے یہ کہہ کر سونے کی دو تین ٹکیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور چلا گیا۔

واپسی میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں سمجھ گیا کہ سارا سونا خریدنے کے لئے اس نے دوسرے کئی دکانداروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس نے سونے کے عوض مجھے جو رقم بتائی، میرے اندازے کے مطابق خاصی کم تھی، پھر بھی میں نے زیادہ جھٹ نہیں کی۔ اسے یقیناً امید نہیں تھی کہ بات اتنی جلدی بن جائے گی۔ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اس نے آواز دے کر اندر بلا لیا۔ اسی کے ذریعے اس نے دوسرے دکانداروں سے رقم منگوائی۔ اپنی تجوری کھول کر بھی وہ بڑے نونوں کی گڈیاں نکالنے لگا۔

ذرا ہی دیر میں سونے کی جگہ میرا بیک نونوں سے بھر گیا۔

میں نے دکاندار سے اجازت چاہی تو وہ بولا۔ ”جناب کا تعلق کہاں سے ہے؟“

”یہ پوچھ کر آپ کیوں ہمیں شرمندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری عزت و شرافت پر پردہ ہی پڑا رہنے دیں تو اچھا ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر شانے سے بیک نکالیا اور کھڑا ہو گیا۔

صرف بازار سے میں لوٹا تو شام ہو رہی تھی۔ سینٹا برآمدے میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز لی۔ نونوں سے بھرا بیک میں نے سوی کو تھما دیا تھا۔

”تو کہاں گھومتا پھر رہا ہے سکھ بھڑ؟“ وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”کیا چانگام اتر چلنے کا ارادہ نہیں؟“

”کل چلیں گے۔ آج تو مجھے جیسور جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے سامنے دوسری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”وہ کس لئے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اس مولوی کی خیر خبر لینے جانا ہے جسے دنود چڑجی نے میرے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ وہ کہیں دوبارہ مجھ سے میری فحقی چھیننے کے لئے جاپ شروع نہ کر دے۔ مجھے ایک شبہ یہ بھی ہے کہ سینا پل سے فرار ہو کر دنود چڑجی، جیسور میں کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اگر میرا یہ شبہ ٹھیک نکلا تو وہ اس مولوی عبدالصبور سے ضرور ملا ہو گا۔ مولوی کو میں نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ مسلمان ہوں۔ تبھی تو اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا لیکن اسی کے ساتھ ایک شرط بھی لگا دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں مسلمان ہوں تو مسجد کی تعمیر کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم دوں۔ مجبوراً اس سے میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ اب اگر میں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو وہ میری طرف سے شک میں پڑ جائے گا۔ ایسے میں اگر دنود چڑجی وہاں ہوا تو مولوی کو میرے خلاف دروغا سل سکتا ہے۔“ میرے نزدیک گھر سے غیر حاضری کا یہی جواز ممکن تھا۔

”تجھ سے غلطی ہو گئی سکھ بھڑ! اس مولوی کو بھی ماری دیتا۔“ سینتا نے اظہار افسوس کیا۔

”خواہ مخواہ اسے اپنی تاک میں لگا رہنے کو زندہ چھوڑ دیا۔“

”تجھے تو معلوم ہے، اس وقت ہماری تمام تر توجہ ونود چیز جی پر تھی۔ میں نے اسی لئے مولوی سے بھگڑا مول نہیں لیا۔“ سینٹا کو مطمئن کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔ ”بہسی کبھی اس طرح کے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے بچ کر ہی رہنا اچھا ہوتا ہے۔“

”یہ تو خیر میں بھی جانتی ہوں۔“ سینٹا بولی۔ ”لیکن تیرا یہ اندازہ مجھے غلط ہی لگتا ہے کہ ونود چیز جی وہاں ہو گا۔“

”نہیں ہوا تو پتا چل جائے گا، دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ اس مرتبہ میرا ارادہ یہ ہے، اکیلا جاؤں۔“ میں نے بتایا۔

”کیسی عجیب سی بات ہے سکھ بیر کہ تو ہندو مہاسبھا کا ایک رکن ہو کر مسجد کی تعمیر کے لئے رقم دینے پر مجبور ہو گیا۔“

”یہ سب اسی عیار بڑھے کا کیا دھرا ہے ورنہ تو یہ نوبت نہ آتی۔ چاپ کرنے کے لئے ونود چیز جی نے تو اسے میرا نام بھی بتا دیا تھا۔“

”مجھے ڈر ہے کہ تو بڑا مان جائے گا ورنہ تو میرے من میں جو ہے، سو کہہ دوں۔“

اس عرصے میں سوی بھی ہمارے پاس آ بیٹھی تھی۔ اس نے سینٹا سے کہا۔ ”جو بات زبان پر آ جائے، وہ کہہ دینی چاہئے۔“

”تم دونوں کیونکہ بڑے سخت قسم کے ہندو ہو، اسی لئے کچھ کہنے سے جھجک رہی تھی۔“ سینٹا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھر اس نے ایسی باتیں کیں جن کی مجھے اس سے توقع نہیں تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ”میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ سب کا پالن ہار (پالنے والا) ایک ہے۔ اسے کسی بھی نام سے پکارو، سب نام اسی کے ہیں۔ اسی طرح اس کا نام لینے کے لئے بنائی جانے والی عمارتیں ہیں۔ آرادھنلے (عبادت خانہ) کسی کا بھی ہو، اگر ہم اس کے زمان (تعمیر) میں حصہ لیں تو یہ پن (ثواب) ہے۔ سو تو کوئی پاپ (گناہ) نہیں کر رہا۔ میں اس مولوی کی بات نہیں کرتی کہ اسے ایسی شرط نہیں لگانا تھی۔ اپنی کرنی اسی کو بھگنی ہے، تجھے نہیں۔“

اس پر میں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی عورت تھی، مگر اس کے دل کی گہرائی میں کہیں سچائی کا چراغ بھی روشن تھا۔ میری ہی طرح سوی بھی خاموش رہی۔ پھر خود میں نے ہی موضوع گفتگو بدل دیا اور اس سے چانگام ہلز کے بارے میں پوچھنے لگا۔

عشاء کے بعد میں نے مولوی عبدالصبور کا دھیان کیا۔ وہ مجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ جیسور کی فوجی چھاؤنی سے کچھ ہی فاصلے پر وہ نیم آباد سا ایک علاقہ تھا۔ اسی علاقے میں وہ مسجد تھی کہ جس کی صرف ابھی چار دیواری اٹھی تھی۔ مسجد کا صحن ابھی کچا تھا اور والائن وغیرہ بھی نہیں بن سکا تھا۔ قبلے کے رخ چٹائی کی ایک صف پڑی تھی۔ اس چار دیواری کے اندر ہی ایک طرف چھوٹی سی کوٹھری دکھائی دی۔ جو چند افراد وہاں نماز پڑھنے آئے ہوں گے، غالباً جا چکے تھے۔ عبدالصبور کو میں نے لائین اٹھائے کوٹھری کی طرف جاتے دیکھا تو آنکھیں کھول دیں۔ مجھے جہاں پہنچنا تھا، وہ جگہ میں

نے اپنی چشم تصور سے دیکھ لی تھی۔

سوی سے میں نے سینٹا کا خیال رکھنے اور جلد واپس آنے کے لئے کہا، پھر خورشید احمد کے قالب سے نکل آیا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ میرے پاس تھا۔

ڈھاکہ سے جیسور پہنچ کر میں جب مطلوبہ مسجد میں داخل ہوا تو مولوی عبدالصبور اپنی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر رہا تھا۔ دوبارہ انسانی قالب میں مجھے لوٹنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مولوی عبدالصبور میری حقیقت سے واقف تھا۔ میں چاہتا تو بغیر اجازت عبدالصبور کی کوٹھری میں داخل ہو جاتا لیکن یہ مجھے مناسب معلوم نہ ہوا، سو دروازے پر دستک دی۔ پوچھنے پر اسے میں نے اپنا نام بتایا۔

”آجائیک جن زادا“ اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ ”تیری خوشبو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تو واقعی ایمان والوں میں سے ہے۔“

”میں اپنا عمد نبھانے آیا ہوں اے عبدالصبور!“ آگے بڑھ کر میں نے بیگ اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور بیگ کھول کر دیکھنے لگا۔

”اتنی ساری دولت تو کہاں سے لے آیا؟“ عبدالصبور نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ دولت میں نے اسی کافر ونود چیز جی کے ایک آلہ کار زمیندار سے چھینی تھی۔“ مختصر میں نے عبدالصبور کو وحید الزماں کے بارے میں بتا دیا، پھر بولا۔ ”اس غدار نے ہمیں کے عوام کو لوٹ کر یہ دولت جمع کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر اللہ کے نیک بندوں کا حق ہے۔ اگر اسے کار خیر میں لگا دیا جائے تو کیا بڑا ہے۔“

عبدالصبور سوچ میں پڑ گیا، پھر کہنے لگا۔ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دولت کو مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز بھی ہے یا نہیں۔“

”تو اسے اپنے تصرف میں تو نہیں لے رہا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”پھر یہ کہ اس زمیندار سے تو نے یہ دولت زبردستی حاصل نہیں کی۔ اس کا گناہ یا ثواب میری گردن پر ہے۔ گرفت اگر ہوئی تو میری ہوگی تیری نہیں۔ تو نہ ڈر، میں اگر تجھے اللہ کا نیک بندہ نہ سمجھتا تو تیرے سوال کا جواب نہ دیتا۔“

مزید کچھ دیر سمجھانے بھانے پر مولوی عبدالصبور مان گیا۔ یہ بھی اس کے نیک اور سچا ہونے کی دلیل تھی کہ وہ فوری طور پر راضی نہیں ہوا۔

”وہ کافر پھر تو پلٹ کر تیرے پاس نہیں آیا ہو گا؟“ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

”نہیں، اگر آتا بھی تو میں اسے ایسی سزا دیتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔“ عبدالصبور نے جواب

دیا۔

”انشاء اللہ جلد وہ کافر اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔“ میں بولا اور پھر اس سے رخصت کی

اجازت چاہی۔

”اللہ تجھے کامیابی دے۔“ اس نے مجھے دعا دی اور میں اس کی کوٹھری سے نکل آیا۔

جیسور سے واپس ڈھاکہ آنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اپنی روح کی تسکین کا سامان کر کے لوٹا تھا، سو مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ سینتا نے مجھ سے دونو چیز جی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ عیار بوڑھا جیسور میں نہیں ہے۔

”میں تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ وہ چانگام ہلز کے سوا اب کہیں اور نہیں جاسکتا۔“ سینتا پریقین آواز میں بولی۔

”ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے اس کے خیال کی تائید کر دی۔ ”کل رات اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔“

☆=====☆

وہ رات اور پھر اس سے اگلے دن کا بیشتر حصہ ہم نے آرام کرتے ہوئے گزارا، اسی کے ساتھ روادگی کی تیاریاں بھی مکمل کر لیں۔ دشمن کو میں نے اب تک سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ پلٹ کے وار کر سکتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب اس نے اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے میری حقیقت کا پتا لگا لیا ہے تو سینتا کی طرف سے بھی بے خبر نہیں ہو گا۔ اسے یقیناً یہ معلوم تھا کہ سینتا پر اب آسانی سے ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں کیونکہ وہ میرے تحفظ میں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دونو چیز جی کب کا اسے ختم کرا چکا ہوتا۔ اب تک دشمن نے براہ راست میرے مقابل آنے سے گریز کیا تھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ مجھ سے معرکہ آرائی نہیں چاہتا۔ مزید نقصان سے بچنے کے لئے اس کی یہ حکمت عملی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ وہ اسی سبب پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا۔ میرے نزدیک اب اس پر آخری ضرب لگانا باقی رہ گئی تھی۔

شام کو میرے اور سوی کے ساتھ چائے پیتے ہوئے سینتا نے بتایا کہ چانگام شر میں ایک کاروباری شخص طارق محمود سے اس کے ذاتی مراسم ہیں۔ طارق محمود اسے الماس کی حیثیت سے جانتا تھا۔ میں نے دانستہ ان ذاتی مراسم کی تفصیل نہیں پوچھی، ہاں یہ ضرور معلوم کیا کہ دونو چیز جی تو اس سے واقف نہیں؟

سینتا نے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر طارق محمود کے متعلق مزید بتانے لگی۔ ”وہ پرفیوم کا ہول بیلر ہے۔ اسد سنج روڈ پر اس کی بہت بڑی دکان اور گودام ہیں۔ وہیں اس کا گھر بھی ہے۔ مجھے اس کا خیال یوں آیا کہ میرے ہم عارضی طور پر چاہیں تو وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ طارق نے شادی نہیں کی اور اپنے گھر والوں سے الگ رہتا ہے۔ ایک ملازم اور ایک ملازمہ کے سوا گھر میں اس کے ساتھ کوئی اور نہیں رہتا۔ گھر بھی خاصا بڑا ہے۔“

اس پر سوی تائید میں بولی۔ ”سینتا کی یہ تجویز بہتر معلوم ہوتی ہے کہ ہم براہ راست چانگام ہلز نہیں جائیں۔ چانگام پہنچ کر ہم دشمن سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ اگر ہم اسی وقت چانگام کے لئے

روانہ ہو جائیں تو رات کو کسی وقت چانگام ہلز چل سکتے ہیں۔“

”لیکن ابھی تو دن ہے آشا!“ سینتا نے کہا۔ ”میں تو تم دونوں کی طرح لوگوں کی نظروں سے

اوجھل نہیں ہو سکتی۔ اچالے میں یہ سفر کیسے ممکن ہے؟“

”یہاں سے ہم کسی نوامی بستی کی طرف چلتے ہیں۔“ سوی نے جواب دیا۔ ”آبادی سے باہر

نکل گئے تو ہمیں کون دیکھنے والا ہو گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں بولا۔ ”اس طرح ہم دن ڈھلے تک چانگام پہنچ جائیں گے۔“

پھر ہم نے یہی کیا۔ شام پانچ بجے تک ہم آبادی سے نکل آئے۔ اس کے لئے ہمیں کچھ دور

پیدل بھی چلنا پڑا۔ ایک سوٹ کیس بھی ہم گھر سے ساتھ لے کر چلے تھے۔

”یہ جگہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔“ سینتا نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”تو پہلے بھی ایک مرتبہ ادھر آ چکی ہے۔ یہ جو اس طرف درختوں کا جھنڈ نظر آ رہا ہے، اسی

کے درمیان وہ جمیل ہے جہاں.....“

”پھر..... پھر تو ادھر نہیں آنا چاہئے تھا۔“ سینتا نے میری بات کاٹ دی۔ ”یہاں تو بھوت

پریت رہتے ہیں۔“ اس کا سرخ و سفید چہرہ فٹ ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ سوی ادھر ہی کیوں آئی تھی۔ اسے اپنے باپ عزتیل سے بھی ملنا تھا۔ میں

اسی لئے بول اٹھا۔ ”غلطی سے ہم ادھر نکل آئے لیکن تو خوفزدہ نہ ہو سینتا!“ میں نے یہ کہہ کر سوی

کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ جگہ لگا کر دیکھ آتی ہے ابھی کہ یہاں کوئی خطرہ تو نہیں۔“

یہ سن کر سینتا کی ڈھارس بدھمی اور بولی۔ ”تو سکھ بڑا! میرے ہی پاس رہے گا؟“ اس نے

میرا بازو پکڑ لیا۔

”ہاں ہاں، تو اتنا کیوں گھبرا رہی ہے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

سوی نظروں سے اوجھل ہو کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی۔

”یہی تو وہ جگہ ہے سکھ بھیر کہ جہاں مجھ سے میری ہفتی چھن گئی تھی۔“ سینتا کہنے لگی۔ اب

اس کے چہرے کی رنگت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ ”اؤل تو ہمیں ادھر آنا ہی نہیں چاہئے تھا اور اگر آ

ہی گئے تھے تو یہاں رکتے نہیں۔ تو نے بیکار ہی آشا کو بھیجا۔ وہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس

جائے۔“ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

”جو ہفتی میرے اندر ہے، آشا کے پاس بھی ہے۔ وہ بھوت پریت کے قابو میں آنے والی

نہیں۔“

میری بات سن کر سینتا نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر بتانے لگی۔ ”جب میں چانگام ہلز میں تھی تو

مجھے ایک دفعہ سوتے ہوئے بھوت اٹھالے گیا تھا۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”سینتا! کبھی پہلے تو یہ ذکر نہیں کیا تو نے، ہوا کیا تھا؟ ذرا تفصیل

سے بتا۔“ میں نے معلوم کیا۔

”تجھے میں یہ تو بتا ہی چکی ہوں کہ وہ بڑا خطرناک اور خوفناک جنگل ہے۔ وہاں شیر اور چیتے بھی ہیں۔ جنگل کے اندر پہاڑیوں کے دامن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چمکا قابل آباد ہیں۔ یوں سمجھ لے کہ وہ وسیع و عریض علاقہ کئی حصوں میں بنا ہوا ہے۔ جنگل کا ایک حصہ ایسا ہے کہ جہاں درندے ہیں۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ دودو چڑجی نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے اسی جنگل کے ایک ایسے حصے کا انتخاب کیا تھا جہاں سے پہاڑیاں بھی قریب تھیں اور چند میل دور ایک قبیلے کی آبادی بھی تھی۔ میں اس علاقے کو اچھی طرح گھوم پھر کے دیکھ لوں، دودو چڑجی نے اس خیال سے چند آدمی میرے ساتھ بھیج دیئے۔ وہ لوگ پہلے سے وہاں رہ رہے تھے۔ واپسی میں دیر ہو گئی تو میں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کو کہہ دیا۔ ہمارے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ساتھ میں جو لوگ تھے انہوں نے مجھ سے منع بھی کیا کہ وہاں رات نہ گزاروں۔ وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ جنگل کے اس حصے میں وہ بھی پہلی بار آئے ہیں۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ میں ڈر جاتی۔“ سنیتا اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کرتی رہی اور میں توجہ سے سنتا رہا۔ گہری نیند سوتے سوتے اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ میں سمجھی یہ کوئی پتہ ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا، کسی کی گرفت میں ہوں۔ عین وقت پر میری آنکھ کھل گئی درندہ تو جانے کیا ہوتا۔ میں ایک گھنے پیڑ کی شاخوں میں اس طرح الجھی ہوئی تھی کہ نیچے نہ گر سکوں۔ میں نے اس بھوت کی بس ایک جھلک دیکھی کہ جو مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ یوں سمجھ لے کہ بھڑکتے ہوئے شعلے کوئی بھیاںک روپ دھار لیں۔ فوراً ہی میں نے درگا دیوی کا چالیسی گنگا پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور چیخا ہوا بھاگا۔ میں چالیسی گنگے کا جاپ کرتی ہوئی بڑی مشکل سے نیچے اترتی۔ جہاں ہم نے پڑاؤ ڈالا تھا، وہاں سے وہ پیڑ زیادہ دور نہیں تھا۔ چیخ پکار سن کر لوگ دوڑے اور مجھے ڈھونڈ لیا۔ میں نے چالیسی گنگا پورا کیا اور پھر وہاں سے پڑاؤ اٹھا دیا۔ رات ہی کو سفر کرتے ہوئے ہم اپنے علاقے میں لوٹ آئے۔ پھر دودو چڑجی نے جنگل کے اس حصے کے بارے میں مقامی لوگوں سے پتا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں بھوت پریت رہتے ہیں۔ دودو چڑجی نے اس حصے کو ممنوع قرار دے دیا۔ تبھی سے تو میں رات کو گھبرا ڈال کر سونے لگی تھی۔“

سنیتا سے وہ پورا واقعہ سن کر میں دھیرے سے ہنس دیا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ اس واقعے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس عرصے میں سوی اپنے باپ عزتیل سے مل کر لوٹ آئی اور کہا۔ ”میں تو دور دور تک پھیرا لگا آئی، مجھے کوئی نہیں ملا۔ اگر کبھی کوئی بھوت یہاں رہتا بھی ہو گا تو اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر جا چکا ہے۔ پھر بھی اچھا ہی ہوا میرا چکر لگا لیتا۔ کیا خبر ہم انجانے میں کسی خطرے سے دور چار ہو جاتے۔“

”جہاں ہم جا رہے ہیں آشا! وہاں بھی ہمیں بہت چوکنا رہنا ہو گا۔“ سنیتا نے سوی کو مخاطب کیا۔

”یہ کتنی ہے کہ اس جنگل کے ایک حصے میں بھوت پریت آباد ہیں۔“ میں سوی سے بولا۔

”اس نے ابھی مجھے اپنے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ سنایا ہے۔ نہ یہ اتنی سندر ہوتی نہ اسے وہ بھوت اٹھا کر لے جاتا۔“

میری ہی طرح سوی بھی اس پر چونک اٹھی۔ پھر اس کے اصرار پر سنیتا نے مختصر الفاظ میں دوبارہ وہی واقعہ کہہ سنایا۔

”اس سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ جب ہم اس جنگل میں اتریں تو سنیتا ہوش میں ہو۔“ سوی نے کہا۔

”یہی میں نے بھی سوچا تھا۔“ میں بولا۔

”رہنے دے سکھ ہیرا! تجھ سے زیادہ عقل آشا میں ہے۔ تجھے تو ہنسی آ رہی تھی، سب کچھ سن کر۔“ سنیتا کہنے لگی۔

”آج معلوم ہوا کہ عقل صرف عورتوں میں ہوتی ہے۔ ایک تو عقلمند ہے، ایک آشا۔“

”خیر اب ایسی بات بھی نہیں۔ آشا کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تجھ میں بھی تھوڑی بہت عقل آگئی ہے۔“ سنیتا بھی ہنس دی۔

میں نے سنیتا ہی کو اعتدال پر لانے کے لئے تھوڑی سی نوک جھونک کی تھی جس کا اچھا اثر ہوا۔ اب سنیتا کے چہرے پر بیخوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ یہاں آتے ہی اس کے ہونٹ جو ایک دم سفید پڑ گئے تھے، ان میں پھر سے سرخی دوڑنے لگی۔ وہ بڑی عورت اب تک میرے کام آ رہی تھی۔ اس کا خون اپنی گردن پر نہ لے کر میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ اگر اسے میں نہ بچاتا تو دودو چڑجی اس کا کام تمام کر دیتا یا پھر وہ خودکشی کر لیتی۔

عصر اور مغرب کے درمیان ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ سنیتا کو حسب معمول سوی سنبھالے ہوئے تھی۔

سفر طویل تھا، پھر بھی ہم سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کے کنارے اتر گئے۔ ہم نے اترنے کے لئے ایک ایسی غیر آباد جگہ منتخب کی تھی جہاں دور دور تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا۔ سنیتا نرم ریت پر بے ہوش پڑی تھی۔ خلیج جنگل کی شور مچاتی لہریں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ اس کا بیک سوی نے اٹھا رکھا تھا۔ میں اور سوی، ہم دونوں ہی اب انسانی قابلوں میں آچکے تھے۔ سوٹ کیس میرے پاس تھا۔

سنیتا کو سوی ہوش میں لے آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہرچند کہ اب اس کے لئے کوئی ایسا پراسرار سفر نیا نہیں تھا، پھر بھی بول ہی اٹھی۔ ”ابھی ذرا ہی دیر پہلے تو ہم ڈھاکہ میں تھے اور چائنا گام بھی پہنچ گئے۔ ڈھاکہ سے تیز رفتار ٹرین بھی یہاں چوٹیں کھٹنے میں پہنچتی ہے۔ کسی کو بتاؤ تو یقین نہیں کرے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی اور کپڑوں سے ریت جھاڑنے لگی۔ پھر اس نے اپنا بیک سوی سے لے لیا۔

ہمارے ملے سیاحوں جیسے تھے۔ وہاں سے ہم پیدل اس طرف چل دیئے جہاں سمندر میں بحری

جہاز کھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہیں سے ہمیں شہری آبادی کے لئے سواری ملتی۔

”یہ تو بڑا سرسبز و شاداب شہر ہے۔“ سہی کئے گئی۔ ”ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دے رہی ہے۔“

”تم دونوں شاید پہلے کبھی یہاں نہیں آئے۔“ سنیتا نے کہا۔ ”یہ شہر ڈھاکہ سے چھوٹا ہے، مگر خوبصورتی میں کم نہیں۔“

بظاہر چانگام کی بندرگاہ دور سے قریب ہی معلوم ہو رہی تھی لیکن ہمیں وہاں تک پہنچنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔

اسد منج کے لئے وہاں سے ہم نے دو سائیکل رکشا کر لئے۔ میں ایک رکشا میں بیٹھ گیا مگر دوسرے رکشا پر سہی اور سنیتا سوار ہو گئیں۔ ان دونوں کا رکشا آگے تھا تاکہ سنیتا رہنمائی کر سکے۔ میں ’دندو چڑجی کے بارے میں سوچنے لگا اور اسی میں سفر تمام ہو گیا۔

اگلا رکشا ایک بھری پڑی آبادی میں سڑک کے کنارے رک گیا۔ میں نے رکشا سے اتر کر کرایہ ادا کیا، پھر سہی اور سنیتا کی طرف بڑھا۔

ہم بروقت پہنچے، کیونکہ سلطان اپنے ملازمین سے دکان بند کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی سنیتا پر پڑی، چونک اٹھا۔ ”ارے الماس تم۔“

میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ آڑے گلے کا سفید کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ چہرہ بھرا ’رنگ سانولا‘ سر کے بال بڑے بڑے، قد چھوٹا، جسم گھٹیا، آنکھیں بڑی بڑی، ادھری ہونٹ پر باریک سی مونچھوں کی لکیر، یہ تھا سلطان محمود، وہ سنیتا کو دیکھتے ہی اپنی اونچی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کے قریب ہو گئی۔

دکان خاصی بڑی تھی اور اس میں داخل ہونے کے تین دروازے تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑا سا کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔

”اندر آؤ نا۔“ سلطان نے کاؤنٹر کا ایک حصہ اوپر اٹھاتے ہوئے سنیتا کو مخاطب کیا۔

سنیتا نے مڑ کر ہم دونوں کو اشارہ کیا اور کاؤنٹر کے کھلے ہوئے حصے سے اندر چلی گئی۔ میں اور سہی اس کے پیچھے تھے۔

”پہلے ان سے ملو سلطان!“ سنیتا نے سلطان سے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ میرے دوست خورشید احمد خان ہیں۔۔۔۔۔۔ اور یہ ان کی بیگم صنوبر ہیں۔“

میں نے سلطان سے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ ہم دونوں کے درمیان رسمی جھلن کا تبادلہ ہوا۔

”اچھا ہوا تم دکان بند ہونے سے پہلے آ گئیں ورنہ تمہیں پریشانی ہوتی۔“ سلطان نے سنیتا کو مخاطب کیا۔

”وہ کیوں؟“ سنیتا نے پوچھا۔

”میں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے جہاں تم ایک مرتبہ آ کر رہی تھیں۔“ سلطان بتانے لگا۔ ”اس گھر کو میں نے گودام میں تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے سے اب کاروبار بھی خاصا بڑھ گیا ہے۔ براہ راست باہر سے مال امپورٹ کر رہا ہوں۔ پرفیومز کے علاوہ مختلف قسم کے تیل اور اسی قبیل کی دوسری اشیاء بھی باہر سے منگوانا شروع کر دی ہیں۔ تم دیکھ ہی رہی ہو، صابن، پاؤڈر اور کاسمیٹکس سے دکان بھری پڑی ہے۔“

اس دوران میں سلطان کے ملازموں نے ہمارے لئے کرسیاں لا کے رکھ دیں اور ہم ان پر بیٹھ

”ہاں دیکھ رہی ہوں۔ پہلے جب میں آئی تھی تو تمہارا کام ملکی اور غیر ملکی پرفیومز تک محدود تھا۔“ یہ کہہ کر سنیتا نے معلوم کیا۔ ”اب تم کہاں رہنے لگے ہو؟“

”پچھلے سال میں نے شہر سے باہر ایک ٹیلا خرید لیا تھا۔ اسی پر کونسی بنوا لی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ ساحلی شہر ہے اور آئے دن یہاں طوفان آتے رہتے ہیں۔ بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ بڑی ہی پرفضا جگہ ہے۔ تم دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ یہاں جو گھر تھا، اس میں صرف چھ کمرے تھے۔ وہاں میں نے اس سے دگنے کمرے بنوائے ہیں، ڈرائنگ روم وغیرہ ان کمروں کے علاوہ ہیں۔“ سلطان نے جواب دیا۔

اس پر میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔ ”مگر سلطان صاحب! آپ تو ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی بستر پر سوتے ہوں گے۔“

”جی ہاں۔“ وہ مسکرایا۔ ”لیکن آپ جیسے خوبصورت مہمان بھی تو آتے رہتے ہیں۔ ان دنوں بھی ایک غیر ملکی جوڑا میرا مہمان ہے۔“ اس نے میری بات کا برا نہیں مانا تھا۔

”خورشید! کیونکہ تم سلطان سے پہلی مرتبہ مل رہے ہو، اس لئے ان کی زندگی کے ڈھب سے واقف نہیں۔“ سنیتا مجھ سے بولی۔

”ڈھب کیا خورشید صاحب! بس اپنے اپنے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہے۔“ سلطان مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں صرف حال کا قائل ہوں اور لمحہ موجود ہی کو زندگی سمجھتا ہوں، ماضی اور مستقبل کے چکر میں کبھی نہیں پڑتا۔ یہ لمحات جو ہم اور آپ گزار رہے ہیں، یہی زندگی ہیں۔ یہ لمحے اگر خوشگوار نہیں گزر رہے تو پھر کیا حاصل۔ بہت سے لوگ میرے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہیں لیکن میں پرداہ نہیں کرتا۔ جس طرح میرا الگ ایک انداز فکر ہے، انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے۔ نچو اور جیسے دو خوش رہو اور جس حد تک امکان میں ہو، دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرو“ اس سے آگے میں نہیں سوچتا۔“

سلطان محمود مطمئن، بے فکر اور خوش مزاج آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ٹھنڈے مشروب سے ہماری خاطر کی اور پھر دکان بند کرنے کے لئے کہہ دیا۔ ہمارے ساتھ دکان سے باہر آ کر اس نے سڑک عبور کی اور وہاں کھڑی ہوئی کار کی طرف بڑھ گیا۔

”الماس! تم میرے ساتھ آگے بیٹھو۔“ سلطان نے کار کے اگلے اور پچھلے دروازے کھولے ہوئے کہا۔ ”خورشید صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ جائیں گے۔“

سوی نے جو انسانی قالب اپنا رکھا تھا، اس میں وہ سیتا سے کہیں زیادہ حسین و پرکشش نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی سلطان نے اسے ایسی نظروں سے نہیں دیکھا جو مجھے ناگوار ہوتیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سیتا نے سوی کا تعارف میری بیوی کی حیثیت سے کرایا تھا۔ سلطان بہر حال ایک اگلی ہی مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے غالباً اپنی آوارگی کی حدود مقرر کر رکھی تھیں۔

کار چلی تو راستے میں ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ اس پر سلطان بولا۔ ”کیسا حسین موسم ہے الماس! اور کیسے حسین لوگ اس وقت میرے ساتھ ہیں تم نے ابھی تک خورشید صاحب کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔ کیا یہ بھی میری طرح کاروباری آدمی ہیں؟“

”نہیں۔“ سیتا نے جواب دیا۔ ”یہ خاندانی رئیس ہیں۔ دھاکہ میں رہتے ہیں اور میری دعوت پر چائنگام اور اس کے گرد و نواح کی سیر کرنے نکلے ہیں۔“

”گرد و نواح سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ سلطان نے وضاحت چاہی۔

سوال کیونکہ غیر متوقع ہی تھا اس لئے فوری طور پر سیتا کوئی جواب نہ دے سکی، پھر بولی۔ ”یہ تو ان دونوں میاں بیوی کی مرضی پر منحصر ہے کہ یہ کہاں کہاں گھومیں گے۔ مجھے تو ان کی گائیڈ سمجھ لو تم، یہ جہاں کہیں گے، لے جاؤں گی انہیں۔“

سیتا سے اب تک مجھے چائنگام ہلز کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، انہیں مد نظر رکھتے ہوئے رات کے وقت وہاں جانے کا ارادہ میں نے بدل دیا تھا۔ سلطان سے مل کر اس ارادے میں مزید پختگی آگئی۔ وہ ایک غیر متعلق سا آدمی تھا۔ اس سے میں نے یہ رازداری برتنا ضروری نہیں سمجھا کہ کہاں جانے کا قصد ہے۔

”تو یوں کہیں کہ آپ نے مم جویانہ مزاج پایا ہے۔“ میری بات سن کر سلطان بولا۔ ”اس علاقے میں گھسٹا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔“

”ویسے وہاں جنگل میں گھسنے کے راستے تو ہیں۔“ سیتا نے کہا۔ ”میں بھی ایک بار گئی ہوں ادھر۔“

”ہاں بالکل ہیں۔ لوگ آتے جاتے بھی ہیں۔ یہ لوگ یا تو شکاری ہوتے ہیں یا پھر اسی علاقے کے رہنے والے۔“ سلطان نے بتایا۔ ”مقصد خواہ سیر و تفریح ہی کیوں نہ ہو، اسلحہ ضرور پاس ہونا چاہئے۔ اگر وہیں کا ارادہ ہے تو میری جیب لے جانا۔“ آخر میں اس نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ سیتا ہنس کر بولی۔ میری باتوں سے اس نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

پھوار ذرا تیز ہو گئی تو ہم نے کار کے شیشے چڑھا لئے۔ اب ہم آبادی سے باہر نکل آئے تھے۔

سیتا مجھے بتانے لگی۔ ”چائنگام میں سلطان کی طرح جو پیسے والے لوگ ہیں، وہ شہری آبادی سے باہر نیلے خرید لیتے ہیں۔ پھر ان نیلوں کے اوپری حصے کو ہموار کرا کے وہاں اپنے بڑے بڑے گھر بنوا لیتے ہیں۔ پیسہ تو خیر خاصا خرچ ہوتا ہے مگر ایک تو خلوت میسر آ جاتی ہے، دوسرے موسم کے ستم برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔“ وہ بڑی رواں اور اچھی اردو بول رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ہندو عورت ہو گی۔

”ادھر دیکھو الماس! وہ سامنے میری کونٹھی دکھائی دے رہی ہے۔ یہاں سے وہاں تک میں نے خود یہ سڑک بنوائی ہے جس پر کار موڑ رہا ہوں۔“ سلطان نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”بجلی کے محکمے والوں نے بھی وہاں تک کھجے لگانے کے لئے مجھ سے فاضل اخراجات وصول کئے تھے۔ اس کے باوجود یہ وقت ضرورت کے لئے ایک جزیئر بھی میں نے خرید لیا ہے۔ ایک اور خاص چیز بھی میں نے کونٹھی میں بنوائی ہے جو تمہیں وہیں چل کر دکھاؤں گا۔“

جدھر سلطان نے اشارہ کیا تھا، ادھر کچھ بلندی پر مجھے روٹیاں نظر آئیں۔ سڑک آہستہ آہستہ بلندی کی طرف جا رہی تھی۔

ہم کونٹھی تک پہنچے تو تیز پھوار، بارش میں بدل گئی۔ وہ سڑک، کونٹھی کے بڑے سے آہنی پھانگ پر ختم ہوئی تھی۔ برساتی اوڑھے ہوئے ایک چوکیدار نے کار کو آتے دیکھ کر پہلے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

سلطان محمود نے پیسے کے بل بوتے پر گویا جنگل میں متنگل بنا رکھا تھا۔ اس دوران میں سوی خاموشی ہی رہی۔ سلطان نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔

پورچ میں ہم کار سے اترے تو سلطان کے ملازمین نے سوٹ کیس اور بیگ اٹھا لیا۔ ”نی الحال یہ سامان گیٹ روم میں رکھ دو۔“ سلطان نے اپنے ملازمین سے کہا، پھر پوچھا۔ ”جیکب اور ماریا کہاں ہیں؟“

”بار روم میں ہیں جناب!“ ایک ملازم نے جواب دیا۔ ”پھوار پڑتے ہی وہ اپنے کمرے سے نکل کر وہاں چلے گئے تھے۔“

”دیری گڈ سلطان!“ سیتا کھل اٹھی۔ ”یہ کام تم نے لاجواب کیا ہے۔“

”میری خاص چیز تو دکھانے کو میں تم سے کہہ رہا تھا۔ کیا خیال ہے، پہلے ادھر ہی چلیں؟ جیکب اور ماریا سے بھی تم لوگوں کا تعارف ہو جائے گا۔“

”معاف کیجئے گا“ سلطان صاحب! مجھے اور میری بیگم کو ساغر و مینا سے کوئی رغبت نہیں۔ پھر بھی آپ کی خوشنودی کی خاطر.....“

”نہیں نہیں، جب آپ لوگ یہ شوق ہی نہیں کرتے تو یہ زیادتی ہے۔“ سلطان ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بول اٹھا۔ ”الماس کو میں بعد میں بار روم دکھا دوں گا۔ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ جیکب اور ماریا کو میں وہیں بلوا لوں گا۔“ پھر وہ سیتا سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں قہوہ چلے گا؟“

سنتا نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی اور ہم بڑے سے شاندار ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ سلطان ہمیں اپنے غیر ملکی مہمانوں کے بارے میں بتاتے لگے۔ ”ایک برطانوی فرم سے میرے کاروباری تعلقات ہیں۔ جبکہ اسی فرم کے مالک کا خط لے کر میرے پاس آیا تھا۔ ماریا اس کے ساتھ تھی۔ دونوں ہی کو پراسرار مشرق دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہندوستان گھوم پھر کر وہ یہاں آئے ہیں اور اب ان کا ارادہ مغربی پاکستان دیکھنے کا ہے۔ ڈھاکہ وغیرہ دیکھ لیا ہے انہوں نے۔ یہاں آ کر بہت خوش ہیں دونوں۔“

میں نے سوچا، ان لوگوں کے پاس بڑا وقت اور دولت ہے، مگر کما کچھ نہیں۔

ملازم ہمارے لئے قہو لے کر آیا ہی تھا کہ وہ دونوں بھی آ گئے۔ ماریا نے اپنی مغربی روایات کے مطابق مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور سر کے بال سنہری تھے، قد لمبا اور جسم متناسب تھا۔ نیلی آنکھوں میں بے نوشی کے سبب ہلکے ہلکے گلابی ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس برس کے درمیان ہوں۔ گوری چمڑی والے ابھی اپنے ان غلاموں کو بھول نہیں سکے تھے جن پر انہوں نے ایک عرصے حکومت کی تھی۔

جبکہ اور ماریا، دونوں ہی کو اردو نہیں آتی تھی، اس لئے وہ انگریزی ہی میں بات کر رہے تھے۔ ماریا، سوی اور سنتا کے ساتھ سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی تھی۔ جبکہ میرے پاس آ بیٹھا تھا۔ ہم جن زاد، آدم زادوں کے درمیان رہ کر ان کی مختلف زبانیں بھی سیکھ جاتے ہیں۔ سوی بھی طویل عرصہ آدم زادوں کے ساتھ گزار چکی تھی۔ وہ بھی میری ہی طرح بہت سی زبانیں بولنے اور سمجھنے پر قادر تھی۔ سوی نے ماریا سے پوچھا کہ جبکہ اور اس کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

”پیار کا رشتہ۔“ ماریا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ابھی ہم صرف دوست ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اس کے بعد؟“ سوی نے سوال کیا۔

”اگر ہم نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تو شادی کر لیں گے۔“ ماریا نے بلا جھجک بتا دیا۔ ”ہمارے یہاں کیونکہ شادی کر لینے کے بعد الگ ہو جانا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے بہت سوچ سمجھ کر ہم یہ قدم اٹھاتے ہیں۔ ابھی تو جبکہ سے میری دوستی کو صرف ایک سال ہوا ہے۔“

”اور اس ایک سال میں تم جبکہ کو نہیں سمجھ سکیں؟“ سنتا بھی بول اٹھی۔

”ہاں۔“ ماریا ہنس دی، پھر کہنے لگی۔ ”سنا ہے ادھر مشرق میں بہت جلدی لوگ ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ کس طرح ہوتا ہے یہ؟“

”تم اگر یہاں پیدا ہو تیں تو یہ سوال نہ کرتیں۔“ سلطان نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔ ”یہ اپنے اپنے معاشرے، تہذیب اور روایات کا فرق ہے۔“

”ہندوستان میں ایک شخص سے اسی موضوع پر میری بات ہو رہی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا، یہاں ایک نظر میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔“ جبکہ یہ کہہ کر ہنسا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ دونوں کو کتنے

دن لگے؟“

”فیصلہ کرنے میں تو صرف چند لمحے لگے تھے۔“ میں مسکرا کر بولا۔

”ایک عورت تو مجھے بتا رہی تھی کہ شادی سے پہلے اس نے اپنے شوہر کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

کتنی حیرت کی بات ہے۔“ ماریا نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بہر حال آپ کا مشرق ٹھوٹے ہوئے ہمیں بہت مزہ آ رہا ہے۔“ جبکہ نے کہا۔ ”میرے دادا

یہاں بنگال میں رہ چکے ہیں۔ وہ بڑے قصبے سناتے تھے، یہاں کے لیکن ہمیں تو اب تک کوئی جادوگر

نہیں ملا۔“ جبکہ مجھی سے ہم کلام تھا۔ ”کیا واقعی جادوگر ہوتے ہیں؟“

”کیوں نہیں ہوتے جادوگر۔“ میرے کچھ کہنے سے پہلے سنتا بول اٹھی۔ ”جادوگر بھی ہوتے ہیں

اور جادوگر نیاں بھی۔ خورشید اور ان کی بیگم صنوبر، دونوں کو جادو آتا ہے۔ یقین نہیں تو خود ان

دونوں سے پوچھ لیں۔“

اس پر سلطان زور سے ہنس پڑا، پھر بولا۔ ”تم کیوں ان دونوں سے مذاق کر رہی ہو۔ جادو دادو

کچھ نہیں ہو تک یہ سب قصبے کہانیاں ہیں۔ کچھ لوگ تو جنت کے بھی ایسے ایسے واقعات بیان کرتے

ہیں کہ ہنس ہنس کر پیٹ میں مل پڑ جائیں۔ آج تک کسی جن سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔“ سنتا نے کہا۔ ”کوئی جن تمہاری کوٹھی میں آ گیا تو مصیبت میں پڑ جاؤ

گے۔“

”مجھے تو کسی جن زادی سے ملنے کا شوق ہے۔“ ماریا بولی۔

”ابھی یہ جادو کی بات کر رہی تھیں۔“ جبکہ نے سنتا کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تو پوری ہو

جانے دو۔ کیا خبر مسٹر خورشید اور ان کی مسز کو جادو آتا ہو۔ میرے دادا کو آخر جھوٹ بولنے کی کیا

ضرورت تھی..... مسٹر خورشید! آپ جادو ضرور دکھائیں۔“

”الماس! تم نے یہ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے اور صنوبر کو۔“ میں نے سنتا کو کہا۔

”دکھا دو تھوڑا سا جادو، یہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ سلطان کو بھی یقین آ جائے گا کہ یہ

محض قصبے کہانیاں نہیں ہیں۔“

سنتا کو جانے کیوں مجھے آزمائش میں ڈالنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ شاید وہ اس طرح خاص

طور پر سلطان کو متاثر کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسی سبب سوی کو مخاطب کیا۔ ”تم ایسا کرو صنوبر کہ

الماس اور مس ماریا کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لو۔ میں مسٹر جبکہ اور سلطان صاحب کو یہی جادو

دکھاتا ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خورشید صاحب!“ سلطان ہنس کر بولا۔ ”خاصا ٹھوس جسم ہے میرا۔

اگر میں کھڑا بھی ہو گیا تو آپ کا ہاتھ کھل جائے گا۔“

”تو کیا ہوا؟“ میں نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو کیا ہوا؟“ میں نے اپنے ہاتھ کو ذرا سا بڑا کر لوں گا۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ماریا اس طرح خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی جیسے کوئی بچہ اپنا پسندیدہ تماشا دیکھنے والا ہو۔ سوی

بھی صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیوں ہمارے ہیں آپ خورشید صاحب! بیٹھ جائیے۔“ سلطان پھر ہنس دیا۔

”اچھا تو پھر یہ دیکھیں میرا ہاتھ۔“ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا جو میری خواہش کے مطابق بڑھتا چلا گیا۔

سلطان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور یہی حال جیکب کا ہوا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سلطان کو اٹھا کر اپنے دائیں ہاتھ پر بٹھا لیا۔

”آئیے مسٹر جیکب! آپ بھی میرے اسی ہاتھ پر بیٹھ جائیے، میں اپنے ہاتھ کو اور بڑا کر لیتا ہوں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ جیکب نے خوفزدہ آواز میں میرے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ..... آپ واقعی جادوگر ہیں۔“

اس وقت تک میرا ہاتھ اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ جیکب بھی اس پر آرام سے بیٹھ جاتا۔ سلطان کی حالت قابل دید تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ زرو پڑ گیا تھا۔ پھر جیکب کو بھی میں نے نہیں بخشا۔ اسے بھی میرے ہاتھ پر بیٹھنا پڑا۔ دوسری طرف سولی نے بھی میری تقلید میں ایسا ہی کیا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر سیتا اور ماریا بیٹھی تھیں۔ ماریا جو پہلے چمک رہی تھی، اب اس کے حواس کم تھے۔

”کیوں سلطان! اب تمہیں یقین آیا؟“ سیتا نے پرسکون آواز میں سلطان کو مخاطب کیا۔

”ان..... ان سے کک..... کو الماس کہ..... کہ یہ مجھے ت..... تو اتار ہی دیں۔“ سلطان ہکلاتے لگا۔

وہ شخص ہمارا میزبان تھا۔ اس نے جنات کا جو مذاق اڑایا تھا، اس کی اتنی سزا کافی تھی۔ میں نے پہلے اسے اور پھر جیکب کو آرام سے صوفے پر بٹھا دیا۔

”اب یہ دیکھئے سلطان صاحب! میں اپنے ہاتھ کو چھوٹا کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

سلطان اور جیکب، دونوں ہی وحشت زدہ سی نظروں سے میرے ہاتھ کو چھوٹا ہوتے دیکھتے گئے۔ میرے لئے اس کی حیثیت بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں تھی۔ یہی واقعہ بھی تھا۔ بچپن میں یاسف اور میں، آدم زادوں کے ساتھ ایسی ہی چھوٹی موٹی شرارتیں کر کے انہیں ڈرا دیتے تھے۔

سولی نے بھی یکے بعد دیگرے ماریا اور سیتا کو نیچے اتار دیا۔ کچھ دیر کو ڈرائنگ روم میں سناٹا سا چھا گیا۔ پھر میری ہی آواز نے یہ سناٹا توڑا۔ ”ارے سلطان صاحب! کیا بات ہے؟ آپ کو چپ کیوں لگ گئی؟ یہ تو محض ایک تماشا تھا۔“ یہ کہہ کر میں اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ اگر اسے تماشا کہہ رہے ہیں تو..... تو یہ بڑا خوفناک تماشا تھا۔“ سلطان کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میرا تو خون ہی خشک کر دیا تھا آپ نے..... حیرت ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ کو اتنا بڑا کیسے کر لیا تھا۔“

”اب آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہو گی سلطان صاحب کہ نہ میرا ہاتھ بڑا ہوا، نہ آپ دونوں

اس پر بیٹھے۔“ میں ہنس کر کہنے لگا۔

”کیا..... کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ نے خود مجھے اور جیکب کو اٹھا کر.....“

”وہ بس نظر بندی تھی اور کچھ نہیں۔“ میں نے سلطان کی بات کاٹ دی۔ ”کیا آپ خواب نہیں دیکھتے؟“

”مگر یہ کیا خواب تھا جو ہم نے کھلی آنکھوں سے دیکھا؟“ جیکب نے بھی بحث کی۔

”اسی کو تو طلسم کی زبان میں نظر بندی کہتے ہیں کہ جو حقیقت نہ ہو، نظر آنے لگے۔“ میں دانستہ ان آدم زادوں کو بسلا رہا تھا اور وہ آخر کار بہل ہی گئے۔ سلطان کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی۔ جیکب اور ماریا بھی مسکراتے لگے۔ سیتا سے میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب ایسی باتیں نہ کرے۔

”جسمی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔“ سلطان اب بھی خود کو جیسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کوئی خواب ہی دیکھا ہے۔

”جنات کے وجود پر بھی کسی دن آپ کو اسی طرح یقین آجائے گا سلطان صاحب!“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اب تو یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے انکار کیا تو آپ اپنے جادو کے زور سے کسی جن کو بھی یہاں بلوا سکتے ہیں..... خیر چلیں انھیں! پہلے اپنے لئے کوئی بیڈ روم پسند کر لیں، پھر میں کھانا لگواتا ہوں۔“ سلطان کی خوش مزاجی واپس آ گئی۔

”ہمارے برابر والے بیڈ روم میں آجائیں آپ دونوں۔“ ماریا مجھ سے بولی۔

”دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ماریا میرے انسانی پیکر میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھی۔

اس وقت تک بارش رک چکی تھی۔ سلطان نے ہمیں اپنی کوششی کی سیر کرائی۔ ماریا کے بہ ضد ہونے پر سولی نے اس کی بات مان لی۔ ہر بیڈ روم میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ ایک ملازم نے گیٹ روم سے ہمارا سوٹ کیس بھی لا کر اس کمرے میں رکھ دیا۔

”الماس! کیا تم بھی کوششی کے اسی حصے میں رہو گی؟“ سلطان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”ہاں۔“ سیتا نے بلا جھجک کہہ دیا۔ ”سب ایک ہی ساتھ رہیں تو اچھا ہے۔“ میں اگر وہاں اس کے ساتھ نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ سلطان کے سوال کا یہ جواب نہ دیتی۔

”مگر ایسا ہی ہے تو پھر جب تک تم لوگ یہاں ہو، میں بھی ادھر ہی کسی بیڈ روم میں آجاتا ہوں۔“ سلطان مسکرا کر بولا۔ ”کبھی کبھی تو اس کوششی میں اتنی رونق ہوتی ہے۔ کیا خراب تم پھر کب پلٹ کر آؤ! اتنے عرصے کے بعد تو اب آئی ہو۔“

ماریا اور جیکب بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہی تھے۔ ان دونوں نے بھی اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر سلطان نے اپنے ملازموں سے ڈرائنگ روم میں کھانا لگوا دیا اور ہمیں وہاں لے آیا۔ کھانا کھانے

کے دوران ہی میں آئندہ روز صبح کا پروگرام بننے لگا۔

”اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں اور جیکب بھی ساتھ چلیں!“ ماریا بولی۔ وہ یقیناً اسے سیر و تفریح کا کوئی موقع سمجھ رہی تھی۔

”مس ماریا! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس جنگل میں بڑے خوفناک درندے ہیں۔“ میں نے اسے ڈرایا۔

”اس کے علاوہ جنت بھی ہیں۔“ سوی نے بھی ماریا کو ڈرانے میں میرا ساتھ دیا۔

”پھر..... پھر آپ لوگ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟ آپ بھی ایسی خطرناک جگہ مت جاییے!“ ماریا کی نظریں یہ کہتے ہوئے میری ہی طرف تھیں۔

”کچھ لوگوں کو خطرات ہی سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ خورشید صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں۔“ سلطان نے ماریا کو سمجھایا۔ ”تم لوگ انہیں انجوائے کرنے دو۔ ان کے ساتھ تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔“

جیکب نے بھی سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولا۔ ”مسٹر سلطان ٹھیک کہہ رہے ہیں ماریا!“

یوں ماریا کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ وہ شاید زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے چہرے سے میں نے دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مجھے اس کے ذہن میں جھانکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی اس کی نیلی آنکھیں بولتی ہوئی سی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد دیر تک ڈرائنگ روم میں نشست جمی۔ اس دوران میں چائے کا ایک دور بھی چلا۔ جیکب اور ماریا نے البتہ چائے نہیں پی۔ میری اور سوی کی وجہ سے کسی نے بھی پھر بار روم کا رخ نہیں کیا۔ ڈرائنگ روم سے اٹھا کر سب اپنی اپنی خواب گاہوں میں آگئے۔ سلطان بھی کوٹھی کے اسی حصہ میں آگیا تھا۔ سبھی کے کمرے برابر برابر تھے۔ سوی کے ساتھ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

اس رات اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہاں صرف ایک مرتبہ گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ زور دار بارش ضرور ہوئی۔

دوسرے دن صبح سلطان اس وقت تک شہر نہیں گیا جب تک ہم اسی کی جیب میں بیٹھ کر چانگام ہلز جانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ہم تینوں ہی کے شانوں سے رانٹھلیں لٹک رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم شکار کھیلنے جا رہے ہوں البتہ اس شکار کی نوعیت مختلف تھی۔ ہمیں انسان نما درندوں کو شکار کرنا تھا۔

جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ سنیتا اس لئے میرے برابر بیٹھی تھی کہ راستہ بتا سکے۔ اسی کے ساتھ سوی تھی۔ سلطان کے ملازمین نے تمام ضروری سامان جیب میں رکھ دیا تھا، یہاں تک کہ دوپہر کے لئے کھانا، پانی وغیرہ بھی۔ جیکب، ماریا اور سلطان ہمیں رخصت کرنے کھڑے تھے۔

چلنے سے پہلے سلطان نے سنیتا سے پوچھا۔ ”شام تک لوٹ تو آؤ گے نا تم لوگ؟“

”کچھ ملے نہیں۔ اگر جنگل میں شام ہو گئی تو پھر کل صبح تک ہی ہماری واپسی ہو سکے گی۔“ سنیتا نے جواب دیا۔

”تو جنگل میں اتنے اندر تک جانے کی ضرورت ہی کیا ہے!“ سلطان نے اپنی دانست میں سنیتا کو مشورہ دیا، پھر بولا۔ ”وہاں جنگل میں کہاں رات گزارو گے؟“

”رات ہی گزارنا پڑی تو کسی آبادی میں گزار لیں گے۔ وہاں بھی تو آخر لوگ رہتے ہی ہیں۔“ سنیتا نے سلطان کو مطمئن کرنے کی خاطر کہہ دیا۔

”تم جانو، شام تک لوٹ آئیں تو اچھا ہوتا۔“

”یہ تو ان صاحب کی مرضی پر منحصر ہے۔“ سنیتا نے مسکرا کر میری طرف اشارہ کیا۔ ”میرا کام تو راستہ دکھانا ہے۔“

اسی وقت میں نے جیب اسٹارٹ کر دی اور ”خدا حافظ“ کہہ کر رخصتی انداز میں جیب آگے بڑھا دی۔ کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر جب ہم خاصے آگے آگئے تو میں نے سنیتا سے کہا۔ ”کیسے بھولے اور معصوم لوگ ہیں یہ! ایک ہی رات میں اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ تیرا دوست سلطان پسند آیا مجھے۔“

”اور وہ گوری چھڑی والی ماریا پسند نہیں آئی جو تجھ پر قربان ہوئی جا رہی تھی؟“ سنیتا نے ہنس کر پوچھا۔

”یہ انگریز قوم بھی خوب ہے سنیتا! اسے اپنی وفاداریاں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔“ میں بولا۔ ”تو نے روپ بھی تو ایسا بھر رکھا ہے کہ کوئی دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔“

”لیکن تجھے تو میں کسی اور ہی روپ میں اچھا لگتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر موضوع گفتگو بدل دیا۔ ”ہاں تجھے میں ایک بات پہلے ہی سے بتا دوں کہ اب جیب کو ہم جنگل میں داخل ہوتے ہی کہیں چھپا کر کھڑی کر دیں گے۔ جس طرح ہم نے بیٹا پل کے جنگل میں اپنے دشمنوں کو شکار کیا تھا، یہاں بھی ویسا ہی کرنا پڑے گا۔“ یہ وضاحت میں نے بوجہ کی۔ سنیتا نے مجھے بتایا تھا کہ جو علاقہ دشمن کی سرگرمیوں کا مرکز ہے، وہاں تک جیب کے ذریعے پہنچنا ممکن ہے۔

”وہ جگہ تو جنگل میں بہت اندر جا کر ہے۔ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہم جیب کو کہیں چھپا دیں گے۔“ سنیتا نے کہا۔

”لیکن اس کی ضرورت کیا ہے سنیتا؟“ سوی بول اٹھی۔ ”ہم جیب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔“

”پھر ایک بات اور بھی ذہن میں رکھ سنیتا!“ میں بولا۔ ”بیٹا پل کے سرحدی جنگل میں ہمیں یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ جو ٹھکانے تیرے دیکھے ہوئے تھے، انہیں ونود چڑجی نے چھوڑ دیا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آ سکتی ہے۔ میں نے جس جگہ کے بارے میں بتا چلایا تھا کہ وہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا

نام پر فریب دیا ہے، میرے خیال میں وہ بے گناہ ہیں۔ ہمیں کوئی ایسا راستہ نکالنا چاہئے کہ ان لوگوں سے مقابلے کی نوبت نہ آئے۔“

”ایسی کوئی تدبیر تو دیں پہنچ کر سوچی جاسکتی ہے۔“ میں بولا۔ ”پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دور بیٹھ کر ہم نے جو اندازے لگائے ہیں وہ درست بھی نکلتے ہیں یا نہیں! ہمارا دشمن ایک ایسا عیار آدمی ہے کہ جو غیر متوقع طور پر اچانک اپنی حکمت عملی تبدیل کر دیتا ہے۔“

سارے راستے ہم اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس سے کم از کم یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے اپنے طاقتور دشمن سے نیرو آزما ہونے کے لئے ایک لائحہ عمل طے کر لیا۔ اسی کے مطابق ہم نے اس جنگل میں داخل ہوتے ہی جیب کو کھنے درختوں کے درمیان ایسی جگہ کھڑا کر دیا کہ جہاں کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ پھر میں اور سومی انسانی قالیوں سے باہر آگئے۔ سینٹا کو سومی نے اپنی گود میں بھر لیا۔ ہم نے دشمن کے علاقے کی طرف پروا شروع کر دی کہ ہمیں پہلا قدم بھی اٹھانا تھا۔

دانستہ ہم نے اپنی رفتار کم ہی رکھی تاکہ سینٹا اپنے ہوش و حواس برقرار رکھ سکے۔ درختوں کے درمیان سے ہم زیادہ اوپر بھی نہیں اٹھے کیونکہ یہ دن کا وقت تھا۔ سینٹا دشمنوں کی نظر میں آسکتی تھی۔ جنگل میں ہم اس گہرے راستے کے قریب قریب ہی پرواز کر رہے تھے کہ جو دشمن کے علاقے کی طرف جاتا تھا۔ اس طرح راستہ بھگ جانے کا احتمال نہیں تھا۔ اس راستے پر سینٹا سفر کر چکی تھی۔ سینٹا کو اٹھائے ہوئے سومی بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی اور ان دونوں کے پیچھے تھا۔ درخت اونچے نیچے تھے۔ ان کی شاخوں سے اچھے بغیر سومی کو سفر تھی۔

خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پہاڑیاں دکھائی دیں کہ جن کے غاروں میں گولہ بارود اور اسلحہ کا بڑا ذخیرہ ہونا چاہئے تھا۔

ان پہاڑیوں کو دیکھ کر سینٹا نے دھیمی آواز میں بتایا۔ ”ہم بالکل صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔“ سومی سے میں نے کہا کہ وہ اپنی رفتار تھوڑی کم کر کے ذرا اور نیچے آجائے۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

ابھی ہم مطلوبہ پہاڑیوں سے کچھ دور ہی تھے کہ نیچے جنگل میں ایک طرف میری نظر پڑی۔ سیاہ قام آدم زادوں کی ایک قطار اپنے سروں پر لکڑی کی بیٹھیاں اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ وہ مضبوط اور تھیلے جسموں والے تھے۔ ان کے چمکدار سیاہ جسموں پر صرف ایک لنگوٹی بندھی تھی۔ اس قطار کی دونوں سمت تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مسلح محافظ چل رہے تھے۔ یہ مسلح محافظ اپنے لباس اور حلیوں سے مختلف نظر آئے۔

”ہمیں کسی اونچے درخت پر سینٹا کو لے کر اتر جا!“ میں نے سومی کے قریب جا کر سرگوشی کی۔ ”میں بھی ان سیاہ قاموں کو دیکھ چکی ہوں۔“ سومی بھی دھیمی آواز میں بولی۔ ”لگتا ہے کہ وہ شیطان اسلحہ کا ذخیرہ پہاڑیوں کے غاروں سے کہیں اور منتقل کر رہا ہے۔ لکڑی کی ان بڑی بڑی بیٹھیاں میں اسلحہ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے سومی ایک پہاڑ پر اتر گئی۔

”اس جگہ اسلحہ نہیں ملا۔ دشمن کے جو ٹھکانے تیرے یا میرے علم میں ہیں، ضروری نہیں کہ اب بھی دشمن وہیں ہو۔ ہمیں از سر نو دشمنوں کو تلاش کرنا پڑے گا۔ دونو چڑجی کو یہ تو یقین ہو گا کہ ہم ادھر ضرور آئیں گے۔ وہ اسی لئے پہلے سے چوکنا اور ہوشیار ہو گا۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جنگل میں کھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جائے۔ دن کا وقت میں نے اس لئے منتخب نہیں کیا تھا کہ ہم جیب میں سوار ہو کر دشمن کے علاقے تک آرام سے پہنچ جائیں۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جنگل کے جو حصے خطرناک ہیں، بھولے سے یا نادانستگی میں ہم ادھر کا رخ نہ کر بیٹھیں۔“

”یہ میں کل رات ہی سمجھ گئی تھی۔“ سینٹا نے تصدیق کی۔ ”تو نے گزشتہ تجربات کی روشنی میں جن خطرات کا اظہار کیا ہے، وہ غلط نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرے کو پہاڑی غاروں سے کہیں اور منتقل کرنا اتنا آسان کام نہیں ہو گا۔ اس کے لئے آدمی بھی بہت چاہئیں اور وقت بھی۔ اگر دونو چڑجی نے ایسا کیا بھی تو اس میں اسے کئی دن لگ جائیں گے۔ میں تجھے پہلے بھی یہ بتا چکی ہوں کہ جو قبیلے اس علاقے کے آس پاس آباد ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ دونو چڑجی کی حیثیت ان کے نزدیک ایک مہمان آتما جیسی ہے۔ اس نے اپنی ہشتی کے بل پر ان قبیلوں کے سرداروں کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔ یہ سردار، دونو چڑجی کے کہے کو نہیں ٹالتے۔ دونو چڑجی، درگا دیوی کا داس ہونے کے ناتے انہیں جھوٹے موٹے چنگاڑ (معجزے) دکھاتا رہتا ہے۔ اگر تیرے اندازے درست ہیں تو یہ قبیلے اس برے وقت میں دونو چڑجی کے کام آسکتے ہیں۔ وہ ان قبیلوں میں ٹانگ جی (سردار) کے نام سے مشہور ہے۔“

”تو نے مجھے مختلف وقتوں میں دونو چڑجی اور اس علاقے کے متعلق جو کچھ بتایا ہے، میں بھولا نہیں ہوں سینٹا! پھر بھی تو نے اچھا کیا کہ ان باتوں کو دہرا دیا۔ اس وقت کہ جب ہم دشمن پر آخری ضرب لگانے جا رہے ہیں، ہمارے ذہن میں تمام صورت حال واضح ہونی چاہئے۔“ میں کہنے لگا۔ ”مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے کہ اس خبیث بوڑھے نے یہاں اپنی چھوٹی سی الگ حکومت قائم کر رکھی ہے۔ مذہبی احترام کے سبب ہی سے وہ ٹانگ جی کہلاتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ لفظی جب بھی اس علاقے میں آتا ہے، لوگ اس کا درشن (دیدار) کرنے آتے ہیں۔ سرحد پار سے اس علاقے میں آئے والے، ٹانگ جی کے سیوک (خادم) کہلاتے ہیں۔ لوگ ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بول میں نے جو کچھ کہا، ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں۔ ان میں سے کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو شاید آشنائے پہلی بار سنی ہوں گی۔“ سینٹا نے سومی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ایسا نہیں ہے سینٹا!“ میں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ ”جو کچھ مجھے معلوم ہے، آشنا بھی جانتی ہے۔ میں نے اسے کسی بات سے بے خبر نہیں رکھا۔“

سومی نے میری تائید کر دی، پھر بولی۔ ”جن بھولے بھالے لوگوں کو دونو چڑجی نے دھرم کے

سوی نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ میرا خیال بھی یہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس کے لئے وہ مقامی قبیلوں کے طاقتور آدمیوں سے کام لے رہا ہے۔ یہ مسلح محافظ نظر آرہے ہیں، دشمن کے آدر ہیں۔ ان پر حملہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلحہ کہاں منتقل کیا جا رہا ہے! میں ان کے پیچھے جا رہا ہوں۔“

سینٹا بھی نئی صورت حال سے باخبر ہو گئی۔ اس نے اپنے شانے سے رائفل اتار لی تھی۔

”جب تک میں لوٹ کر نہ آ جاؤں سینٹا، انہیں چھیڑنا نہیں ہے۔“ میں نے تاکید کی۔

”تو بے فکر ہو کر جاسکے بھو! میں اس وقت تک گولی نہیں چلاؤں گی کہ جب تک جان خطرے میں نہ پڑے جائے۔“ سینٹا نے مجھے اطمینان دلایا۔

”آٹا تیرے پاس ہے، یہ تیری جان کو خطرے میں نہیں پڑنے دے گی۔“ میں یہ کہتے ہی وہاں سے چل دیا۔

سیاہ فاموں کی اس قطار کا تعاقب کرتا ہوا میں تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ مجھے لگان بھی نہیں تھا کہ وہ سیاہ فام اتنی بڑی تعداد میں ہوں گے۔ اس قطار کے ایک حصے کو میں نے دور تک پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان داخل ہوتے دیکھا۔ قطار کے دوسرے حصے کا پیچھا کرتا ہوا ایک اور آبادی تک جا پہنچا۔ خاصے بڑے بڑے چار جھونپڑوں میں ان سیاہ فاموں نے اپنے سروں پر رکھی ہوئی پٹیاں اتاریں۔ اس کے بعد ایک اور راستے سے انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ جو مسلح افراد تھے، وہ بھی واپس چلے گئے۔ ان جھونپڑوں کی نگرانی کے لئے وہاں پہلے ہی سے چار سیاہ فام موجود تھے۔ میں اس بستی کی طرف پلٹا کہ جہاں قطار کا پہلا حصہ گیا تھا۔ وہاں بھی مجھے ایسا ہی بندوبست نظر آیا۔

اسلحہ ان قبیلوں کی دو بستیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ انتظام مجھے عارضی معلوم ہوا۔ یقیناً دودو چڑجی یہ اسلحہ یہاں سے بھی کہیں اور لے جاتا۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ سرحدی جنگل کی طرف یہاں بھی کسی تہ خانے کی تعمیر کراتا۔

اب میں نے ان پہاڑیوں کا رخ کیا کہ جہاں سے یہ اسلحہ بستیوں میں لایا جا رہا تھا۔ دودو چڑجی نے اپنی افرادی قوت اسلحہ کی منتقلی میں جھونک دی تھی۔ ابھی تک وہ مجھے خود کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔

وہ چھ بڑے بڑے غار تھے کہ جہاں سے وہ اسلحہ اٹھا کر سیاہ فام لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ابھی تک صرف ایک غار خالی ہونے کے قریب تھا۔ کل بارہ مسلح محافظ میں نے وہاں دیکھے۔ وہ سارے غار قریب قریب ہی تھے۔

اتنی بڑی تعداد میں اسلحہ کا ذخیرہ دشمن کے آئندہ خطرناک عزائم کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ملک کے خلاف وہ کسی مسلح بغاوت کی تیاری ہوگی جس کے لئے پہلے سے اسلحہ پہنچا دیا گیا ہے، میں اسی نتیجے پر پہنچ سکا۔ میں نے اس عرصے میں سرحد پار سے آنے والوں کو بھی شکار کیا۔ ان کی تعداد ساٹھ

افراد سے اوپر ہی تھی۔ دودو چڑجی کے حکم پر وہ سب وہیں آکر جمع ہو گئے تھے۔

تفصیلی جائزہ لے کر میں، سوی اور سینٹا کے پاس واپس آ گیا۔

سینٹا کو جب میں نے حالات سے باخبر کیا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ اسے بھی یہاں اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرہ کی توقع نہیں تھی۔

”میرے اندازے کے مطابق دودو چڑجی انہی دونوں بستیوں میں سے کہیں ہوگا کہ جہاں اسلحہ منتقل کیا جا رہا ہے۔“ سینٹا نے سب کچھ سن کر اظہار خیال کیا۔

”ابھی اس کی فکر چھوڑ دے۔“ میں نے کہا، پھر جو سوچا تھا، اسے بتا دیا۔ ”اس طرح مجبوراً اسے خود ہی سامنے آنا پڑے گا۔“

”پھر میری پروا مت کر سکھ بھو!“ سینٹا پُر جوش آواز میں بولی۔ ”تو اگر آٹا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو لے جا!“

”اگر تو کہے سینٹا تو میں تجھے کسی اور محفوظ جگہ چھوڑ آؤں؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے سیاہ فاموں کی گزر گاہ قریب ہے۔“

”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ سینٹا نے جواب دیا۔

سوی کو ساتھ لئے میں پہلی بستی میں پہنچ گیا۔ وہ جھونپڑے عام آبادی سے ذرا ہٹ کر بنے ہوئے تھے کہ جن میں اسلحہ کی پٹیاں لاکر رکھی جا رہی تھیں۔ جو سیاہ فام ان جھونپڑوں کی نگرانی کر رہے تھے، انہیں ہم نے ہوش و حواس سے بگاڑ کر دینا کافی سمجھا۔ سیاہ فاموں کا ایک گروہ ابھی وہاں اسلحہ اتار کر واپس جا رہا تھا۔ ہم نے انہیں نظروں سے اوجھل ہو جانے دیا، پھر ان جھونپڑوں کو خالی کرنے لگے۔ وہ سارا اسلحہ ہم نے وہاں سے خاصی دور جنگل کے ایک حصے میں اتار دیا۔ اس کے بعد ہم دوسری بستی میں داخل ہوئے۔ وہاں سے بھی اسلحہ غائب کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔

ذرا ہی دیر میں جب ہم لوٹ کر پہلی بستی میں گئے تو وہاں توقع کے مطابق کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بستی کے سردار کو اسلحہ کی چوری سے باخبر کیا گیا تو وہ خود اپنے محافظوں کے ساتھ موقع واردات پر پہنچا۔ اسی کے حکم پر ان بے ہوش سیاہ فاموں کو ہوش میں لانے کی کوشش ہونے لگی جو جھونپڑوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس عرصے میں سیاہ فاموں کا ایک اور گروہ ہاں اسلحہ لے کر آچکا تھا۔ انہی لوگوں نے جھونپڑے خالی دیکھ کر بستی والوں کو اس سے آگاہ کیا تھا۔ بستی کے سردار نے انہیں واپس جانے سے روک دیا۔ ان کے ساتھ مسلح محافظ آئے تھے، وہ بھی حیران پریشان سے کھڑے تھے۔

”اے ٹانک جی کے سیو کو!“ سردار نے انہی مسلح محافظوں کو مخاطب کیا۔ ”ٹانک جی کو خبر کر دو کہ ابھی میں نے کام رکوا دیا ہے۔ جب تک یہ پتہ نہ لگ جائے کہ اس سازش کے پیچھے ہمارے کس دشمن قبیلے کا ہاتھ ہے، کام کو روک کر دینا ہی اچھا ہے۔“

ان محافظوں میں سے ایک بولا۔ ”لیکن ہمیں تو خود معلوم نہیں کہ ٹانک جی کہاں ہیں!“

”پھر کیا کیا جائے؟ ٹانک جی کو اس واقعے کی خبر کیسے ہو؟“ سردار نے پوچھا۔

”انہیں آج صبح ہم نے پہاڑیوں کی طرف دیکھا تھا۔ پھر وہ نظر نہیں آئے۔“ ایک اور محافظ نے بتایا۔

اس سے کم از کم یہ معلوم ہو گیا کہ ونود چڑجی وہیں موجود ہے، وہ شیطان چانگام ہلز آچکا ہے جس کی تلاش میں ہم یہاں آئے تھے۔

میں اور سوی اس بستی سے نکلے تو سوی نے مجھ سے کہا۔ ”اے علیالیش! ہم نے جو کچھ کیا، اس سے ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔ ونود چڑجی سامنے نہیں آسکا۔“

”لیکن اے سوی! یہ بھی تو دیکھ کہ فوری طور پر اسلحہ کی منتقلی کا کام رک گیا۔ مجھے یقین ہے کہ موجود صورت حال میں دوسری بستی کا سردار بھی یہی فیصلہ کرے گا۔“ میں بولا۔ ”اس عیار بوڑھے سے یہ اہم خبر زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔ تیرے خیال میں کیا وہ کہیں غافل بیٹھا ہوگا؟ ہمیں کچھ انتظار کرنا چاہئے۔“

”چل تو پھر دوسری بستی کا چکر لگا آتے ہیں۔“ سوی نے مشورہ دیا۔

میں نے سوی کا مشورہ قبول کر لیا۔ دوسری بستی میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی۔ دونوں بستیوں کے ہندو سردار ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ ان کے دشمن قبیلوں کی سازش ہے۔ کام وہاں بھی روک دیا گیا تھا۔ اب وہ ”نانک جی“ یعنی ونود چڑجی کے کسی نئے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

معا میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور سوی کو مخاطب کیا۔ ”اس مکار نے اپنے آدمیوں سے رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رکھی ہوگی۔ انہی کے درمیان اس کا کوئی نہ کوئی خاص آدمی ایسا ہو گا جس سے اسے کام کی رپورٹ ملتی رہے۔“

”مگر ایسے کسی آدمی کی تلاش بھی تو آسان نہیں۔ ان کی تعداد خاصی ہے اے علیالیش!“

”تو پھر اے سوی! ایک ہی تدبیر رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد تو وہ گھبرا کر اپنے بل سے باہر آ ہی جائے گا۔“ میرے ذہن میں جو تجویز آئی، سوی کو بتا دی۔

اس پر سوی بولی۔ ”یہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لے اے علیالیش! یہ ممکن ہے کہ وہ گھبرا کر یہاں سے بھاگ نکلے۔“

”نہیں اے سوی! وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا کہ اب اس کا کوئی اور محفوظ ٹھکانا نہیں رہا۔ یوں بھی یہ بینیل کا جنگل نہیں۔ یہاں اس کے ایک اشارے پر سینکڑوں آدمی کٹ مرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ وہ یہاں سے کیوں بھاگے لگا!“

”اس کی ایک دکھتی رگ بھی تو ہمارے قبضے میں ہے اے علیالیش! ابھی ہم نے اس پر تہاتھ رکھا ہی نہیں۔ کیا تو سیتا کو بھول گیا؟“

”ہاں ایک راستہ یہ بھی ہے۔ سیتا کے ہاتھوں اگر اس کے کچھ آدمی مارے گئے تو وہ جذباتی ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی سیتا پہنچ گئی ہے، یہ خبر اس کے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں ہوگی۔ عین ممکن

ہے، کہ وہ سیتا کے لئے کوئی جال بچھاتے ہوئے خود ہی جال میں پھنس جائے۔ چل پہلے اسی ذمہ کو آزماتے ہیں کہ اس کے آدمیوں کو تو ختم کرنا ہی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اس طرف پرداز شروع کر دی کہ جہاں سیتا کو چھوڑا تھا۔

سیتا ہمیں پوری طرح مستعد اور چوکنا بیٹھی ہوئی ملی۔ سوی نے اسے اب تک کی روداد سنا دی۔

”پھر اب تم دونوں کا کیا ارادہ ہے؟“ سیتا نے سوال کیا۔

”بینیل کے جنگل میں تجھے جو حسرت رہ گئی تھی، اب وہ حسرت پوری کر لے۔“ میں بولا۔ ”اس پورے علاقے میں ونود چڑجی کے لئے سب سے حساس مقام وہ غار ہے کہ جن میں اسلحہ بھرا پڑا ہے۔ وہاں تیری موجودگی کی خبر ونود چڑجی کے حواس گم کر دینے کے لئے کافی ہوگی۔ تجھے وہاں موجود صرف چند آدمیوں کو شکار کرنا ہے۔ ان میں سے جتنے بھی بچ نکل جائیں اچھا ہے۔“

”سکھ بھرا! میں تیری چال سمجھ گئی۔“ سیتا مسکرائی۔ ”تو چاہتا ہے ونود چڑجی کو یہاں میری آمد کا علم ہو جائے۔“

”ہاں میرا یہی فٹا ہے۔“ میں نے اقرار کیا۔

پھر سوی نے سیتا کو اٹھالیا اور ہم پہاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ہمیں یہ فکر نہیں تھی کہ سیتا کو دن کے اجالے میں کوئی دیکھ لے گا۔ ہم تو خود اب یہی چاہتے تھے۔ دھیرے دھیرے پرداز کرتے ہوئے ہم پہاڑیوں تک آگئے۔

اس وقت تک وہاں خاصی تعداد میں مسلح محافظ جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے ان غاروں کو گھیرے میں لے رکھا تھا کہ جن کے اندر اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

ان لوگوں سے کچھ بلندی پر سوی نے سیتا کو ایک جگہ اتار دیا۔ ایسا اس نے سیتا کی مرضی ہی پر کیا تھا۔ وہاں چھوٹی سی ایک چٹان کی آڑ لے کر سیتا کے لئے محافظوں کو نشانہ بنانا آسان ہوتا۔ محافظ اس قدر بدحواس تھے کہ انہوں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا ہی نہیں۔

سیتا نے اپنے شانے سے بیگ اتار کھول لیا۔ پھر وہ پوزیشن لے رہی تھی کہ سوی نے میرے اہیاء پر خاصی بلند آواز میں ان محافظوں کو مخاطب کیا۔ ”بلک کوئن تمہارے سر پر موت بن کر منڈلانے آگئی ہے اور تم بے خبر ہو!“ سوی نے یہ الفاظ سیتا ہی کی آواز میں ادا کئے۔

اس پر خود سیتا بھی چونک اٹھی۔ اسے یقیناً اپنی آواز کی اتنی بھرپور نقل کی توقع نہیں ہوگی۔ سوی نے سیتا سے کچھ دور جا کر یہ صدا لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس طرف کئی رائفلیں انھیں اور پھر فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔

سیتا نے پہلا فائر کیا اور ایک محافظ پہاڑی سے لڑھکتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ پھر فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔

اس کے ذرا دیر بعد میں نے ایک اور کھیل کا آغاز کر دیا جس سے جلد ہی محافظ گھبرا گئے۔ ان

کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہر طرف سے سنیتا انہیں کس طرح نشانہ بنا رہی ہے! اس کے لئے مجھے اور سوی کو تیزی سے حرکت کرنا پڑی۔ ہمارے پاس مرنے والے دو محافظوں کی رائفلیں اور گولیاں تھیں۔ اب ہم بھی مختلف سمتوں سے ان پر آگ برسا رہے تھے۔ انہیں مارنے کے ساتھ ساتھ ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں۔

مجموعی طور پر اب تک ہم نے ان کی نصف تعداد کا صفایا کر دیا تھا۔ آخر وہ لمحات آئی گئے کہ جب وہ حوصلہ ہار بیٹھے۔ وہ راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ ہم نے انہیں پہاڑی سے اتر کر بھاگ جانے کا موقع دے دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں موت کا سانسنا چھا گیا۔

ہم سنیتا کے پاس واپس آئے تو وہ بڑی پرجوش دکھائی دی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ”میں نے لکشن کو دیکھ لیا ہے۔ وہ بھی فرار ہونے والوں میں تھا۔ اب کام بن گیا سکھ بھیرا! تیری جو مرضی، اب وہ پوری ہو جائے گی۔“

”لیکن لکشن ہے کون؟“ سوی نے مجھ سے پہلے پوچھ لیا۔

”لکشن اس علاقے میں ونود چڑجی کا سب سے پرانا آدمی ہے۔ اسے سائیک (ٹائب) ہونے کا نشان (اعزاز) حاصل ہے، اس علاقے میں۔“ سنیتا نے بتایا۔

”مجھے تو خود کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی۔ یہ بہت اچھا ہوا سنیتا کہ وہ زندہ بچ نکل گیا۔“ میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ وہیں رک کر ونود چڑجی کا انتظار کرنا چاہئے یا دور رہ کر اس پہاڑی پر نظر رکھنا بہتر ہے؟ چند لمحے بعد یہی سوال میں نے سوی اور سنیتا سے کیا۔

”یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی۔“ سنیتا بول اٹھی۔ ”یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ دشمن کو یہاں میری موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔ اسی پہاڑی کے دامن میں چھوٹی سی کچی سڑک ہے اور اس کے ساتھ دوسری طرف جنگل ہے۔ وہاں سے ہم اس پہاڑی پر نظر رکھ سکتے ہیں۔“

سنیتا کی یہ تجویز مجھے مناسب معلوم ہوئی اور ہم وہاں سے ہٹ آئے۔ کچی سڑک ہی سے کچھ فاصلے پر ہمیں ایک اونچا اور گھٹا پڑ مل گیا اور ہم اس پر اتر گئے۔ ہمیں اس چیز پر اتارے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتا دکھائی دیا۔ وہ جنگل کی طرف سے اڑتا ہوا پہاڑیوں کی طرف گیا اور پھر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے سوچا، اس ہیلی کاپٹر میں کون ہو سکتا ہے؟

”سکھ بھیرا!“ اسی وقت سنیتا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”وہ ہیلی کاپٹر شاید ان پہاڑیوں کے پیچھے کہیں اتر گیا ہے۔“

”یہ امکان بھی تو ہے سنیتا کہ اس ہیلی کاپٹر میں ونود چڑجی ہو۔“ سوی نے قیاس آرائی کی۔

”ابھی پتا چل جائے گا، میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہی پہاڑیوں کی طرف لپکا۔

ان پہاڑیوں کے پیچھے بھی جنگل ہی تھا، مگر زیادہ گھٹنا نہیں۔ درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ انہی درختوں کے درمیان قدرے ایک ہموار جگہ پر مجھے وہ ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا دکھائی دے گیا۔

اس کی پنکھڑیاں اب تک حرکت کر رہی تھیں، مگر ان میں تیزی نہیں تھی۔

خلاف توقع اس ہیلی کاپٹر سے مجھے مسلح سیاہ فام اترتے نظر آئے۔ میں ان پر نگاہیں جمائے رہا۔ آخر میں جو سیاہ فام ہیلی کاپٹر سے اترتا، اسے دیکھتے ہی میں چونک اٹھا۔ یہ اسی ہیلی بستی کا درازندہ سردار تھا جہاں سے ہم نے اسلحہ غائب کیا تھا۔

اس غیر مذہب قبیلے کے سردار کا ہیلی کاپٹر میں وہاں آنا میرے لئے تعجب خیز بات ہی تھی۔ میں نے اس بستی میں کوئی ہیلی کاپٹر نہیں دیکھا تھا۔ سوی کے ساتھ میں نے اس بستی کے کئی چکر لگائے تھے۔ اگر وہاں کہیں ہیلی کاپٹر ہوتا تو ہمیں ضرور نظر آجاتا۔ پھر یہ ہیلی کاپٹر اس بستی کے سردار کے پاس اچانک کہاں سے آگیا؟ یہ سوال کئی بار میرے ذہن میں آیا۔ سردار کے ساتھ آنے والے مسلح سیاہ فاموں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ وہ سب جنگل سے پہاڑیوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔

جس خطرے کی نشاندہی سنیتا نے کی تھی، یہ مجھے اسی کا شاخسانہ معلوم ہوا۔ وہ بستی، پہاڑیوں سے اتنی دور نہیں تھی کہ وہاں تک فائرنگ کی آوازیں نہ جاتیں۔ ان سیاہ فاموں کو ٹھکانے لگا دینا میرے لئے مشکل نہیں تھا، مگر میں نے اسے لاحاصل ہی سمجھا۔

جنگل سے نکل کر وہ اسی پہاڑی پر چڑھنے لگے کہ جہاں ونود چڑجی کے آدمیوں سے معرکہ آرائی ہوتی تھی۔

میں ان سیاہ فاموں کا پیچھا کرتے ہوئے واپسی کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ رک گیا۔ اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ بستی کے سردار کا ذہن ٹٹول کر دیکھ لوں۔ اس طرح یہ تو معلوم ہو ہی جاتا کہ وہ ہیلی کاپٹر، سردار کے پاس کہاں سے آگیا؟ اسی کے ساتھ کوئی اور نیا عقدہ بھی کھل سکتا تھا۔

پہاڑی پر چڑھنے کے بعد وہ لوگ نسبتاً ایک ہموار جگہ کھڑے ہوئے اور گرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر غالباً وہ دوسری طرف اترتے۔ میں ان سے چند ہی گز کے فاصلے پر تھا کہ ایک سیاہ فام نے سردار کو مخاطب کیا۔ ”ٹانک جی! یہاں تو دور دور تک کوئی عورت دکھائی نہیں دے رہی۔“

یہ الفاظ سنتے ہی میں تقریباً اچھل پڑا۔ یقیناً ان سیاہ فاموں کو خبر تھی کہ سردار کے ہمیں میں کون ہے! وہ سیاہ فام صرف ونود چڑجی کو ٹانک جی کہتے ہیں، یہ بات میرے علم میں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس خبیث بوڑھے نے خود کو چھپانے کے لئے یہ بھیج بھرا ہے۔

طویل جدوجہد اور معرکہ آرائی کے بعد آج آخر وہ عیار میرے سامنے آئی گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ ہر مصلحت کو پس پشت ڈال کر اس پر جھپٹ پڑوں، مگر میں نے خود پر قابو پایا اور جلد بازی سے گریز کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک ہے اور میں تنہا آسانی اسے زیر نہیں کر سکتا گا۔ اس کے گرد کوئی ایسا ناپیدہ حصار بھی ہو سکتا تھا کہ جس کو عبور کرنا کسی جن زاد کے بس میں نہ ہو۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ اس طرح کا کوئی حصار کسی آدم زاد کے لئے ضرر ساں ثابت نہیں ہوتا۔ چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر کے میں تیزی سے پلٹا۔

”آخر کار ہم کامیاب ہو ہی گئے سنیتا! تیرا گر گھٹنا سامنے آگیا۔“ میں نے بتایا۔ ”آج ہم اس

عیار کو کسی صورت بچ کر نہیں نکلے دیں گے۔ پہلا وار اس پر ٹوکرے گی۔ پھر میں اور آشا اسے گھیر لیں گے۔“

میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، سوئی اور سنیا کو اس سے آگاہ کر دیا۔ سوئی کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ میرا ارادہ کیا ہے! اب سنیا کی تقدیر کے فیصلے کا وقت آگیا تھا۔ چارے کے طور پر سنیا اس شیطان صفت بوڑھے کے مقابل آجاتی۔ ایسے میں اس کی تمام تر توجہ سنیا پر ہوتی۔ میں اور سوئی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے گھیر لیتے۔ میں نے ونود چڑی کو زیر دام لانے کے لئے دہراجال بنا تھا۔ وہ اگر ایک آدم زاد کے وار سے بچ جاتا تو ہم جن زاد اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ وہ بڑے سنسنی خیز اور فیصلہ کن لمحات تھے کہ جب سوئی نے سنیا کو اپنی آغوش میں بھرا۔ ہم اس پہاڑی کی طرف پرداز کرنے لگے کہ جہاں ونود چڑی موجود تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اس غبیث کی زندگی کا آخری دن ہے۔

اپنے دشمن کو میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ وہ پہاڑی کے اوپر ہموار جگہ پر کھڑا ہوا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ مسلح سیاہ فام غالباً اسی کے حکم پر ادھر ادھر بکھر کر سنیا کو تلاش کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پہاڑی کی عقبی سمت نہیں تھا۔ وہ کیوں کہ پیچھے ہی سے آئے تھے اس لئے ادھر سنیا کی موجودگی قیاس نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس طرف سے ونود چڑی پر حملہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ سوئی نے میرے کہنے پر ایک لمبا چکر کاٹا اور ہم پہاڑی کے عقب میں آگئے۔ ادھر ونود چڑی کی پشت تھی۔

سوئی نے بڑی آہستگی سے سنیا کو وہیں ایک جگہ اتار دیا۔ سنیا قدرے خشیب میں تھی اور ونود چڑی اس سے تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر اوپر کھڑا تھا۔ سنیا نے ونود چڑی کی طرف رائفل سیدھی کی تو میں اور سوئی اسے وہاں تنہا چھوڑ کر پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے۔ ہم نے ابھی دانستہ اپنے دشمن کے قریب جانے سے اجتناب کیا۔ معلوم نہیں اچانک کس طرح ونود چڑی کو خطرے کا احساس ہو گیا وہ تیزی سے پلٹا اور اس نے سنیا کو دیکھتے ہی اسے نشانے پر لے لیا۔ اس وقت تک سنیا گولی نہیں چلا سکی تھی۔ مگر ہاتھ میں موجود رائفل کی ٹال ونود چڑی کی طرف ہی اٹھی ہوئی تھی۔

”فائر نہ کرنا سنیا!“ ونود چڑی بولا تو میں نے اس کی آواز بھی پہچان لی۔ ”ہم دونوں ہی اس وقت ایک دوسرے کے نشانے پر ہیں۔“ پھر اس عیار بوڑھے کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”تو اچھی طرح جانتی ہے سنیا کہ میں تجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔“

ونود چڑی شاید کچھ اور بھی کہتا کہ سنیا بول اٹھی۔ ”تم اگر مجھے اپنی بیٹی ہی جانتے تو میری موت کا حکم نہ دیتے۔“

”وہ میری مجبوری تھی سنیا! تجھے دشمن کی سازش کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہوں۔ میں مارا جاؤں گا تو دونوں ہی صورتوں میں فائدہ دشمن ہی کو پہنچے گا۔ وہ مسلمان جن زاد علیا لیش تجھے یہاں تکلی چڑھنے کے لئے ہی لایا ہے۔ مجھے دکھ یہ ہے کہ تو اسے آج تک پہچان نہیں سکی۔“

اس پر سنیا کو میں نے چونکتے دیکھا، پھر وہ بولی۔ ”علیا لیش تو سکھ بیر کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ وہ یہاں کہاں سے آگیا؟“

”تو اب تک جسے سکھ بیر سمجھتی رہی ہے میری بیٹی، وہی تو علیا لیش ہے۔“ ونود چڑی نے سنیا کو بتایا۔ ”جاپ کر کے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ اس وقت بھی وہ ہمیں کہیں موجود ہو گا ورنہ تو یہاں نظر نہ آتی، لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا! اگر اس نے میرے قریب آنا چاہا تو جل کر خاک ہو جائے گا کہ میں نے اپنے گرد ایسا ہی گھیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ اسی لئے تو تجھے سانسے لایا ہے کہ اس کا کوئی وار مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا۔“

سنیا کی ناکامی کے بعد ہی مجھے اور سوئی کو ونود چڑی پر وار کرنا تھا۔ خلاف توقع ونود چڑی بروقت چونکا ہو گیا۔ اس نے میرے بارے میں سنیا کو جو بتایا وہ حقیقت پر مبنی تھا، لیکن سنیا نے اعتبار نہیں کیا اور بولی۔ ”سکھ بیر کو مجھ سے زیادہ اور کون جانے گا! وہ اگر آڑے نہ آجاتا تو میں اب تک زندہ نہ ہوتی۔ تمہارے حکم پر مجھے موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ تم نے تو دھوکا دے کر مجھے اپنا قیدی بنا لیا تھا۔ سکھ بیر نے تو مجھے تمہاری قید سے رہائی دلائی تھی! تم بھی تو دھوکا میں اس سے مل چکے ہو۔ تب کیا ہوا تھا؟ کیا کوئی بھوت پربت کو چھو سکتا ہے؟ اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا کہ وہ کون ہے!“

”دھوکا دیا ہے تجھے اس نے!“ ونود چڑی کی آواز میں اب بھی نرمی ہی تھی، لیکن سنیا کو سمجھاتے ہوئے وہ ایک معاملے میں صحیح اندازہ نہ کر پایا۔ وہ بولا۔ ”تیری آنکھوں پر اس نے پیار کی بی باندھ دی، تجھے اسی لئے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ تجھے اس نے تن کا سکھ دے کر اپنی داسی بنالیا۔ تیری اسی کمزوری سے اسے فائدہ پہنچا ورنہ.....“

”غلط ہے یہ!“ سنیا نے ونود چڑی کی بات کاٹ دی۔ ”تم اسے نہیں جان سکتے کہ وہ کتنا مہمان (عظیم) ہے۔ اس کے پاس جو ہمتی ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے بڑی تپش کی ضرورت ہے۔ وہ تو میری وجہ سے تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا تھا، تم نے خود ہی اسے اپنا دشمن بنالیا۔ وہ تمہارے قابو میں نہیں آیا تو اب تم اس پر مسلمان جن زاد ہونے کا الزام لگا رہے ہو، اسے بد کردار کہہ رہے ہو!“

”چپ ہو سنیا! میری برداشت کا امتحان نہ لے! میں چاہتا تو اب تک تجھے پھونک دیتا، مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید تو سکھ بیر کی حقیقت جان کر سدھر جائے۔ اگر تجھے یہ غلط فہمی ہے کہ مجھ پر گولی چلا سکتی ہے تو چلا! تیرے دونوں ہاتھ میں نے اسی وقت باندھ دیئے تھے جب میرے کہنے پر تو گولی چلانے سے رک گئی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان وہی چند لمحے تھے جو ٹل گئے۔ اب میں تیرے بیر بھی باندھ دیتا ہوں کہ تو اٹھ کر بھاگ نہ سکے۔“

سنیا کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ ونود چڑی پر وہ گولی نہیں چلا سکی، نہ اپنی جگہ سے اٹھنے میں کامیاب ہوئی۔

”میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں، سنیا!“ ونود چڑی پھر بولا۔ ”اب بھی اگر تو مجھ سے معافی مانگ لے تو میں تجھے زندہ چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے بنائے کسی کھلونے کو توڑتے بھی دکھ ہوتا ہے

آدی کو! تجھے تو میں نے تراش کر ہیرا بنا دیا تھا اور تو پتھر بن گئی۔“

”اگر..... اگر میں تمہاری نظر میں پتھر بن چکی ہوں تو..... تو پھر اس پتھر سے کیوں سر چھوڑ رہے ہو؟“ سنتا نے کسی قدر سنبھل کر کہا۔ ”میں مرنے سے نہیں ڈرتی!“

یہی وہ لمحہ تھا جب میں تیزی سے سنتا کی طرف لپکا۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ آدم زاد یوں بے بسی کے عالم میں ایک شیطان کے ہاتھوں ماری جائے۔ مقابلہ اگر برابر کا ہوتا تو شاید میں یہ قدم نہ اٹھاتا۔ وہ عورت لاکھ گنہگار سہی، مگر اس نے اب تک قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ ادھر میں نے سنتا کو اٹھایا ادھر دونوں چیز کی جلی جلی سی چیخ سنائی دی۔ سوئی نے اسے گولی چلانے کی مہلت نہیں دی تھی اور اس پر پہلا وار کر دیا تھا۔ صورت حال کا اندازہ لگانے میں اس سے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف مجھے سنتا کی زندگی بچانی تھی، دوسری طرف سوئی کا خیال تھا کہ وہ بوڑھے شیطان وندو چڑجی کے مقابل اکیلی ہے۔ سینا کو میں جنگل میں ایک گھنے پتھر پر اتار کر پلانا تو سوئی کو گرتے اور وندو چڑجی کو ایک سمت بھاگتے دیکھا۔

میں نے پہلے سوئی کو سنبھالا۔ وہ بولی۔ ”اس شیطان نے پلٹ کر مجھ پر وار کیا تھا اور میں جھٹکا کھا کر گر گئی تھی۔ تو اس کے پیچھے جا اور اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ میں ٹھیک ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔

سوئی پر میں نے رد بلا کی ایک آیت پڑھ کر دم کی۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ میں اسے اس حال میں تھا چھوڑ کر کیسے چلا جاتا! دوسرے ہی لمحے وہ میرے ساتھ ساتھ اڑنے لگی۔ وندو چڑجی زیادہ دور تک نہیں بھاگ سکا کہ ہماری نظر میں آگیا۔ ہم نے اس کے فرار کی سمت کا صحیح اندازہ کیا تھا۔ پاڑی کا وہ پچھلا حصہ تھا۔ ہمیں، وہ ایک غار کے دہانے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ پل بھر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ سوئی کو میں نے غار میں گھسنے سے روک دیا اور خود بھی ایسا نہیں کیا۔

وندو چڑجی دہانے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کی نظریں غار کے دہانے کی طرف اس طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ ہماری ہی آمد کا منتظر ہو۔ عمل پڑھتے پڑھتے وہ معاً چونک اٹھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ آگئی۔

”رک کیوں گے تم دونوں؟“ وہ ایک دم اس طرح بولا جیسے ہمیں دیکھ رہا ہو۔ ”ڈر گئے شاید اندر آنے سے!“ وہ چڑانے والے انداز میں دھیرے سے ہنسا۔

”تو خود ہی چوہے وان میں آ پھنسا ہے وندو چڑجی!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”اے بے وقوف جن زاد علیالیش! اس غار سے نکلنے کا ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔“ اس نے غار کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک چوڑی دراڑ نظر آ رہی تھی۔ ”میں تو یہاں تجھے آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔“

سوئی اس عرصے میں وہ قاتل عمل پڑھ رہی تھی کہ جس سے کافر جن زاد مسر بھی نہیں بچ سکا تھا۔

”تجھے خبر نہیں اے مکار بوڑھے کہ تو خود اپنے گناہوں کی آگ میں جلنے والا ہے!“ میں اسے باتوں میں لگاتے رہا۔

”تو وہاں دور کیوں کھڑا ہے؟ آ میرے پاس اور مجھے جلا دے!“ وہ بہ دستور پُر سکون آواز میں بولا۔ ”غار کے دہانے پر گھیرا ڈال کر تو خوش ہو رہا ہے۔ تیری مرضی یہ ہے کہ میں چڑ جاؤں!“

”سمجھ ہی گیا تو! میں نے تیری بے بسی کا تماشا دیکھ لیا، سواب چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ مڑنے لگا۔

سوئی ابھی تک عمل پورا نہیں کر سکی تھی۔ میں نے اسی لئے اسے آواز دی۔ ”رک جاؤ نو چڑ جی!“

”کیوں، تجھے کچھ اور بھی کہنا ہے مجھ سے؟“ وہ مڑتے مڑتے رک گیا۔ وہ مجھے بہت مطمئن نظر آیا اور پھر کہنے لگا۔ ”کہہ لے آخری بار جو کہنا ہے۔ کیونکہ کہ تو کل کا سورج نکلے ہوئے نہیں دیکھ پائے گا۔ جس روز مجھے تیری حقیقت کا پتا چلا تھا تبھی سے تجھے ختم کرنے کے لئے ایک جاپ شروع کر دیا تھا۔ وہ جاپ آج کی رات پورا ہو جائے گا۔ پھر اس جن زاد کی باری آجائے گی جو تیرے قریب سہی ہوئی کھڑی ہے۔ پہلے مجھے خبر نہیں تھی کہ تو اکیلا نہیں ہے ورنہ تو یہ مجھ پر وار نہ کر پاتی۔“

”لعنتی بوڑھے! تو سنتا کو تو ختم کر نہیں سکا اور ہمیں مار ڈالنے کے دعوے کر رہا ہے!“

”وہ کس گنتی شمار میں ہے! جب تم دونوں ہی نہ رہو گے تو اسے کون بچائے گا! میں نے اسے جو آخری موقع دیا تھا.....“ معاً وندو چڑجی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر چونک کر بولا۔ ”تو کہیں کوئی چال تو نہیں چل رہا میرے ساتھ!..... یہ مجھے اتنی گرمی سی کیوں لگ رہی ہے!“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کے بڑے بڑے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔ انہی بالوں کے ساتھ چہرے پر منڈھی ہوئی جھلی بھی اتر گئی۔

”اچھا ہوا وندو چڑجی کہ اپنی موت سے پہلے تو نے اپنا منہ چہرہ بھی دکھا دیا۔“ میں نے کہا۔ ”تو زندہ جلنے والا ہے۔“

سوئی جو عمل پڑھ رہی تھی، وہ اب آخری مرحلے میں تھا۔ وندو چڑجی اب اسی کے زیر اثر آ رہا تھا۔ ”نہیں!“ وہ چیخ اٹھا۔ ”گئی (آگ) مجھے نہیں جلا سکتی کہ میں، درگا دیوی کا داس ہوں۔“ یہ کہتے ہی وندو چڑجی نے پلٹ کر بھاگنا چاہا، مگر چند ہی قدم کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی زندگی بچانے کے لئے آخری حربہ آزمایا۔ وہ بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ سکا۔

”اگر..... اگر میں..... کلمہ پڑھ لوں تو..... تو کیا اے علیالیش..... مجھے تو زندہ چھوڑ..... دے گا؟“

”کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تو نے اگر زبان سے کلمہ پڑھ بھی لیا تو تیار ہے۔ کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دل سے اس کا اقرار بھی ضروری ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرے دل پر کفر کی مہر لگی ہے۔ اب تو مہلت بھی ختم ہو گئی۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے سوئی کی طرف

سوی اس عمل کے آخری الفاظ پڑھ رہی تھی۔

دودو چڑی کی چیخوں سے غار گونجنے لگا اور پھر وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے بعد وہ لمحہ بھی آہی گیا کہ جب دودو چڑی کو بھڑکتے ہوئے شعلوں نے گھیر لیا۔ اس شیطان کو جل کر خاک ہونے میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگے۔

”آ اے علیالیش!“ سوی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ شیطان تو اپنے انجام کو پہنچ گیا“ اب سنتا کی خبر لیتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہے!“

”ابھی تک یقین نہیں آ رہا اے سوی کہ وہ عیار بوڑھا مر چکا ہے۔“ میں بولا۔ ”اب خیال آ رہا ہے کہ اسے سامنے لانے کے لئے آخری قدم نہ اٹھا کر ہم نے اچھا ہی کیا ورنہ تو جانے کتنے بے گناہ آدم زاد مارے جاتے۔ اسلحہ کے اتنے بڑے ذخیرے کو آگ لگا دینے سے دور دور تک تباہی پھیل جاتی۔ تیری تدبیر مناسب رہی۔“

”لیکن اب اسلحہ کا ہو گا کیا اے علیالیش؟“ سوی نے سوال کیا۔

”تجھے اور مجھے یہ اسلحہ میاں سے ڈھو کر سمندر میں پھینکنا پڑے گا“ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میں اس پر پہلے بھی غور کر چکا ہوں۔“

سوی نے میری تجویز سے اتفاق کیا“ پھر کہنے لگی۔ ”ابھی تو دشمن کے تقریباً آدھے ساتھی بھی زندہ ہیں۔ انہیں بھی تلاش کر کے ٹھکانے لگانا ہے۔ جان بچانے کے لئے جنگل میں وہ نہ جانے کہاں کہاں جا چھپے ہوں!“

”میرا خیال ہے اے سوی کہ انہوں نے جنگل کے بجائے بستیوں کا رخ کیا ہو گا۔ وہاں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ان سے غمناک زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“ پھر میں نے جو سوچا“ سوی کو بتا دیا اور اس کے ساتھ جنگل کی طرف اڑنے لگا۔

سنتا کو میں ایک گھنٹے پہلے کی شاخوں پر لٹا گیا تھا کیوں کہ وہ معذوری کی حالت میں تھی۔ ہم اس پہلے تک آئے تو سنتا کو حلق وچو بند دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پوچھنے پر وہ بتانے لگی۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پیر کھول دیے ہوں۔“

”کسی تدبیر یا عمل کے بغیر ایسا ہو جانا ایک ہی طرف اشارہ کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کس طرف؟“ سنتا نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ ”کیا..... کیا دودو چڑی مارا گیا؟“

”تُو نے ٹھیک ہی سمجھا سنتا! اس کی موت کے ساتھ ہی وہ ظلم بھی ٹوٹ گیا ہو گا جس نے تجھے باندھ رکھا تھا۔“ میں جواب میں بولا۔

سنتا کے چہرے پر بے یقینی کے سے آثار نظر آئے۔ پھر وہ بڑبڑائی۔ ”لیکن کیسے؟..... وہ تو بڑا قہقی والا تھا“ اسے موت کیسے آگئی؟“

”آگے پیچھے مرنا تو ہمیشہ کو ہے سنتا! ایک دن تو ایسا آئے گا جب بڑے بڑے بلوان (طاقت والے)

موت کی نیند سو جاتے ہیں۔“ میں نے سنتا کو دودو چڑی کی موت کا یقین دلایا۔ ”اس کا تو اتم سنکا (آخری رسوم) بھی ہو گیا۔ آگنی اس کے بدن کو چاٹ گئی۔“

”اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ تھے؟“ سنتا نے دریافت کیا۔

”انہیں کچھ نہیں معلوم۔ وہ ابھی تک دودو چڑی کے حکم پر پہاڑیوں میں تجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔“ یہ کہہ کر میں نے سنتا کو اپنے اگلے اقدام سے باخبر کیا“ پھر سوی کو اس کے پاس چھوڑ آیا۔

اب میں دوبارہ پہاڑیوں کی طرف لوٹ رہا تھا۔

میں اسی بلند پہاڑی کی ہموار سطح پر اتر گیا کہ جہاں سے دودو چڑی کو اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بے ہستی کے سردار کا بھیس نہیں بھرا۔ میرے نزدیک اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

دودو چڑی کا انسانی قیاب اپنا کر اسی کی آواز میں‘ میں نے سیاہ قاموں کو پکارا۔ ”لوٹ آؤ!“

میری آواز کی بازگشت چند لمحوں تک ان پہاڑیوں میں گونجتی رہی۔ میں نے آگے بڑھ کر نیچے نگاہ ڈالی تو مختلف سمتوں سے مسلح سیاہ قاموں کو پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ جلد ہی وہ سب میرے پاس آگئے۔

”ٹانک جی! کیا خطرہ ٹل گیا جو آپ اپنے اصل روپ میں لوٹ آئے؟“ ایک سیاہ قام نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ وہ عورت جو مجھ سے باغی ہو گئی تھی‘ پھر سے میری داسی بن گئی۔ میں نے اسے محاف کر دیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن ہمیں تو تلاشوں کے سوا کچھ نہیں ملنا ٹانک جی!“ ایک اور سیاہ قام بولا۔

”معلوم ہے مجھے۔“ میں بولا اور پہلے سیاہ قام کے ذہن پر توجہ دی۔ وہی سیاہ قاموں کی اس ٹولی کا گھراں تھا۔

پتا چلا کہ ان سیاہ قاموں کا تعلق اسی بستی کے سردار سے ہے‘ جس کے بھیس میں مجھے دودو چڑی نظر آیا تھا۔ وہ سردار کے خاص محافظوں میں سے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر بستی کے قریب ہی جنگل میں موجود تھا۔ اس جگہ سے کچھ فاصلے پر دودو چڑی نے وہاں آتے ہی بیٹاپل کے جنگل کی طرف ایک تہہ خانے کے لئے کھدائی شروع کر دی تھی۔ اس کے لئے وہ مقامی قبیلوں کے آدمیوں سے کام لے رہا تھا۔ یہ سیاہ قام بھی اس وقت دودو چڑی کے ساتھ تھے کہ جب پہاڑیوں کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دودو چڑی انہیں ساتھ لئے ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑا۔ پرواز کے دوران ہی میں ٹرانسمیٹر پر اسے

لکشمی کا پیغام ملا تو اس نے سردار کا بھیس بھر لیا۔ ہیلی کاپٹر میں ایسا سامان موجود تھا کہ وہ اپنا چہرہ اور جلیہ بدل سکتا۔ اس ہیلی کاپٹر کا اڑانے والا دودو چڑی ہی کا ایک آدمی تھا۔ اسے دودو چڑی کی طرف سے تاکید

تھی کہ وہ ہر وقت چوکنا اور مستعد رہے‘ کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ تاکید انہی سیاہ قاموں کی موجودگی میں کی گئی تھی۔ دودو چڑی کو یقیناً پہلے ہی سے خطرے کا احساس ہو رہا ہو گا ورنہ وہ اس طرح کا بندوبست نہ کرتا۔ پہاڑی کی عقبی سمت میں ہیلی کاپٹر اترواتے ہوئے بھی دودو چڑی نے اس

فحص روی کو یہی حکم دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ پہلی کاہڑ سے نہ اترے۔

چند ہی لمحوں کے اندر اندر مجھے حالات کا علم ہو گیا۔ میری نظر میں وہ سیاہ قام قابل معافی تھے۔

”تم سب وہیں واپس جاؤ کہ جہاں کھدائی ہو رہی ہے۔“ میں نے ان سیاہ قاموں کو حکم دیا۔ ”کھدائی فوراً رکوا دو اور اپنے آدمیوں کو لے کر بستی میں چلے جاؤ۔ مجھے ابھی یہاں رکنا ہے، پہلی کاہڑ بھی واپس نہیں جائے گا۔“ یہ سب میں اس لئے کر رہا تھا کہ صرف غیر ملکی دشمنوں کے گرد گھیرا تنگ کر سکوں، مقامی بے گناہ لوگ نہ مارے جائیں۔

”جو ٹانگ جی کا حکم۔“ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ پھر وہ پہاڑی سے کچی سڑک کی طرف اترنے لگے۔

ونود چڑجی کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب مجھے کوئی غلط نہیں تھی۔ میں بہت اطمینان کے ساتھ اتر کر پہاڑی کی عقبی سمت کے جنگل میں آ گیا۔ پہلی کاہڑ مجھے اپنی جگہ کھڑا ہوا ملا۔ میں اس میں سوار ہو گیا تو پائلٹ روی نے مجھ سے پوچھا۔ ”ٹانگ جی! کیا واپس چلنا ہے۔“

”ابھی نہیں روی!“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹرانسپیر پر لکشن سے رابطہ قائم کرو!“

روی نے اقرار میں سر ہلا کر فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی اور لکشن سے بولا۔ ”ٹانگ جی تم سے بات کریں گے اور۔“ یہ کہتے ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔

ہیٹل پر ٹرانسپیر بھی لگا تھا۔ میں نے روی کی سیٹ پر بیٹھے ہی کہا۔ ”لکشن! کہاں ہو تم؟ اور۔“

”آپ ہی کے حکم پر میں زندہ بچ جانے والے تمام ساتھیوں کو لے کر جنگل میں چھپا بیٹھا ہوں ٹانگ جی! اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ ابھی ہم بستیوں کی طرف جائیں یا نہیں؟ آپ نے کہا تھا کہ جلد ہی ہمیں نئی ہدایات مل جائیں گی، ہم انہی کے منتظر ہیں۔ اور۔“

”سنو لکشن! بلکہ کون نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور مجھ سے معافی مانگ لی ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ کام جو عارضی طور پر رک گیا تھا، اس کے لئے نئی منصوبہ بندی کرنی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، یہاں سے اب اسلحہ منتقل کرنا ضروری ہے؟ اور۔“

”ٹانگ جی! بلکہ کون کی وفاداری کے بعد میرے خیال میں اسلحہ کو وہاں سے بستیوں تک پہنچانے کا کام روک دینا چاہئے۔ جنگل میں جب تینوں تہہ خانے بن جائیں گے تو ان غاروں سے وہاں اسلحہ منتقل کرنا بہتر رہے گا۔ ویسے بھی ان بستیوں میں اسلحہ محفوظ نہیں رہا۔ وہاں سے اسلحہ کی چوری میں دشمن قبیلوں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا بھی کھوج لگانا ہے۔ اتنی جلدی وہاں سے اسلحہ کا غائب کر دیا جانا کسی منظم سازش کا نتیجہ لگتا ہے۔ اور۔“

”میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں لکشن! جو لوگ ان دونوں بستیوں سے اسلحہ غائب کر سکتے ہیں، غاروں تک پہنچنا بھی ان کے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ اس کے لئے ساتھیوں سمیت تمہارا یہاں فوری طور پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں غاروں والی پہاڑی کے اوپر ہموار جگہ پر ملوں گا۔ دن رات اسلحہ والے غاروں کی نگرانی جاری رہنی چاہئے! اپنے ساتھیوں کو لے کر جلد سے جلد یہاں آ جاؤ! بقیہ ہدایات تمہیں

میں آنے پر ملیں گی۔ اور اینڈ آل۔“

آدم زادوں کے درمیان رہ کر میں نے ان کے تمام ہتھکنڈے سیکھ لئے تھے۔ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے اس کی ضرورت بھی تھی۔ میرے سوا شاید ہی کوئی اور جن زاد ایسے تجربات سے گزرا ہو۔ پائلٹ کی سیٹ سے اٹھ کر میں نے روی پر توجہ دی۔

”میرے ساتھ آؤ روی!“ میری آواز میں ونود چڑجی کے لمبے والی نرمی اور مٹھاس تھی۔

”جی، ٹانگ جی؟“ وہ حیران ہو کر بولا۔ ”آپ کا حکم تو یہ تھا کہ میں پہلی کاہڑ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں!“

”اور یہ بھی میرا ہی حکم ہے کہ میرے ساتھ چلو!“ میں نے کہا۔ پھر جب وہ میرے ساتھ پہلی کاہڑ سے اتر آیا تو میں نے پوچھا۔ ”تمہیں معلوم ہے قمری زیرو کون ہے؟“

”جی نہیں ٹانگ جی! ہمارے لئے تو یہاں آپ ہی سب کچھ ہیں۔“ روی نے جواب دیا۔ ”ہمیں تو قمری زیرو کی طرف سے یہی حکم ہے کہ جو آپ کہیں اس پر عمل کیا جائے۔“

جنگل میں وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس سے میں نے قمری زیرو کے بارے میں بلا سبب نہیں پوچھا تھا۔ اس علاقے میں بھی نود چڑجی نے اپنی اصل شخصیت پر ”ٹانگ جی“ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ خود ہی غیبت قمری زیرو، یعنی ان غیر ملکی دشمنوں کا سرغنہ بھی ہے۔ وہ اسے قمری زیرو کا نائب خاص سمجھتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ لکشن بھی اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو گا۔

روی کا ذہن پڑھ کر ہی مجھ پر کچھ اور حقیقتوں کا انکشاف ہوا۔ وہ اسلحہ اب سے تقریباً چھ ماہ قبل وہاں لایا گیا تھا۔

اس کے لئے پڑوسی ملک کے ایک بحری جنگی جہاز کو استعمال کیا گیا تھا۔ وہ جنگی جہاز ساحل سے بیس میل دور کھلے سمندر میں کھڑا رہا۔ چانگام اہل میں اسلحہ اتارنے کی غرض سے پہلی کاہڑ کام میں لائے گئے۔ یہ کام رات کے وقت انجام پایا۔ ان پہلی کاہڑ پر دشمن کی فضا ئیہ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ انہی میں سے ایک پہلی کاہڑ کو ونود چڑجی نے اپنے لئے روک لیا۔ دشمن کے جو ایجنٹ پہلے ہی سے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر چکے تھے، انہی میں روی بھی تھا۔ روی نے پہلی کاہڑ اڑانے کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ سمندری راستے سے اسلحہ کی اسٹلنگ میں اس سے بھی کام لیا گیا تھا۔ ملک میں غیر ملکی اسلحہ سمندر اور خشکی، دونوں ہی راستوں سے آیا تھا۔

یہ معما بھی حل ہو گیا کہ اتنی بڑی تعداد میں وہ اسلحہ وہاں کس طرح آیا!

جو معلومات مجھے حاصل کرنا تھیں، ان کے بعد روی کو میں نے مخاطب کیا۔ ”یہ بتاؤ روی، کیا دنیا

میں دولت کا حصول ہی سب کچھ ہے؟“

وہ میرے سوال پر چونکا کیوں کہ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ چند لمبے بعد اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ٹانگ جی! میری نظر میں دولت عیش و آرام اور آسائشوں کے حصول کا دوسرا نام ہے۔ دنیا میں کون ایسا شخص ہو گا جو سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی گزارنا نہ چاہتا ہو!“

”مگر اس کے لئے خود زندگی ہی کو داؤ پر لگا دینا تو کوئی عقل مندی نہیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کی ہے! مشکل سے تیس برس کے ہو گے۔ تم وسط ہند کے ایک شہراجہن کے رہنے والے ہو۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا رومی کہ تم اپنے وطن سے اتنی دور زندگی کے آخری سانس لو گے! ایسی جگہ جہاں کسی آنکھ میں تمہاری موت پر آنسو نہیں آئیں گے۔ بولو پھر یہ سودا منگا ہوا یا نہیں؟“ میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔

رومی کے چہرے پر خوف کے سائے سے منڈلانے لگے۔ پھر وہ دھیمی اور راز دارانہ آواز میں کہنے لگا۔ ”نانک جی! اگر ایسی ہی کوئی خطرے کی بات ہے تو..... تو میں آپ کو ساتھ لے کر آج ہی رات یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ کسی کو میں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔“

”اور اپنے ساتھیوں کو یہیں چھوڑ جاؤ گے کیا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔
”لکشن اور جس جس خاص آدمی کے لئے آپ حکم دیں گے، انہیں ہم ساتھ لے چلیں گے۔ آپ کو تو مجھ سے زیادہ خبر ہے نانک جی کہ ایسے وقت میں جان بچانے کے لئے قربانی دینی ہی پڑتی ہے جتنے کم لوگوں کو ہمارے فرار کا علم ہو، اچھا ہے۔“ رومی کے لمبے میں خود غرضی عیاں تھی۔

”لیکن اب تو سے بیت چکا رومی! آتما ہتھیا (خودکشی) کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا۔“
”نک..... کیا مطلب نانک جی؟“ وہ گھبرا گیا۔ ”ایسا..... ایسا آخر کیا ہو گیا اچانک.....“
مجھے بھی تو بتائیں۔“

”رومی! ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ کیا تم اپنے وطن کی خاطر جان نہیں دے سکتے؟ کیا تمہیں یہ تربیت نہیں دی گئی کہ دشمن کے ہتھے چڑھنے سے بتر مر جانا ہے؟“

”نہیں نانک جی!“ ایک دم اس کا لہجہ بدل گیا۔ تیزی کے ساتھ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ”میں فرار ہونے کی کوشش ضرور کروں گا اور.....“
”اور میرے حکم پر خودکشی نہیں کرو گے!“ میں نے اس کا ہملہ پورا کر دیا۔

”جب میں ہی نہ رہا نانک جی تو کیسا وطن، کس کا وطن! ہر شخص کو اپنی جان بچانے کا حق حاصل ہے۔ آپ مجھ سے میرا یہ حق نہیں چھین سکتے!“ وہ یہ کہتے ہوئے میری طرف ریوالور تانے قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اب تک جن غیر ملکی دشمنوں سے میرا سابقہ پڑا تھا، رومی ان سے مختلف نکلا۔

”رک جاؤ رومی!“ میں نے آخر کار اسے اپنے اثر میں لے ہی لیا۔ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا اور کسی بھی لمحے مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔

پھر وہی ہوا جو میری مرضی تھی۔ اس نے اپنی کینٹی پر ریوالور کی نال رکھ کر گولی چلا دی۔

☆=====☆

دونو چڑجی کے قالب سے نکل کر میں، سوی اور سنیتا کے پاس آگیا۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے سبب سنیتا اب میرے وجود کی خوشبو سے آشنا ہو چلی تھی۔ مجھے اپنے قریب محسوس کرتے ہی وہ بول اٹھی۔ ”بچے کچھ دشمنوں کو ٹھکانے لگایا آیا سکھ ہیر؟“

”نہیں! ابھی تو ایک ہی مارا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا، پھر بتایا۔ ”ہاں اس کے لئے راستہ ضرور ہوا کر دیا ہے کہ وہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ لکشن اپنے ساتھیوں کو لے کر جنگل میں جا چکا تھا۔ اسے میں نے حکم دیا ہے کہ ساتھیوں سمیت غاروں والی پہاڑی پر آجائے۔ اب تک وہ چل چکا ہو گا۔“
”مجھے تو اس پر حیرانی ہے سکھ ہیر کہ تُو نے کس طرح دونو چڑجی کا روپ دھارا ہو گا!“ سنیتا بولی۔
اسے میں بتا کر گیا تھا کہ میرا ارادہ کیا ہے!

”تمہری یہ حیرت بھی آج دور ہو جائے گی سنیتا!“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

”وہ کیسے؟ کیا تُو مجھے اپنی ہلکتی کا کوئی نیا راز بتائے گا؟“ سنیتا نے پوچھا۔

”پہلے یہ معاملہ تو ختم جانے دے، پھر اس پر بات کریں گے۔ ابھی تو تجھے اور سوی کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ تُو خود اپنی آنکھوں سے مجھے دونو چڑجی بٹتے ہوئے دیکھ لے گی۔“ میں بولا اور مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، اسے بتا دیں۔

سوی نے ساری روداد سنی تو پوچھنے لگی۔ ”مجھے تو ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا۔“
”سنیتا کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کیسے دونو چڑجی بن گیا! تُو بھی تو اسے ذرا اپنی ہلکتی دکھا!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں اگر دونو چڑجی بن سکتا ہوں تو کیا تُو سنیتا نہیں بن سکتی؟ اس طرح سنیتا کو آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کچھ دیر کو تو لکشن اور وہ دوسرے لوگ بھی چکرا جائیں گے کہ ان میں سے اصل بلیک کون کون سی ہے! تھوڑی دل لگی ہی سی!“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے سکھ ہیر؟ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“ سنیتا کی آواز سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔
سوی بھی ہنسنے لگی اور سنیتا سے بولی۔ ”سکھ ہیر کوئی بات غلط نہیں کہتا۔ اسے اپنی اور میری ہلکتی کا پورا گیان ہے۔ چلو، چلتے ہیں۔“

جنگل سے ہم غاروں والی پہاڑی کی طرف اڑے۔ اس پہاڑی کی ہموار سطح پر اترتے ہی میں اور سوی انسانی قالیوں میں آگئے۔ سنیتا کی حالت قابل دید تھی۔ سوی کی طرف سے اس کی نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ پھر وہ آگے بڑھی اور سوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ارے آشا! تُو نے تو کمال ہی کر دیا! میں تو اپنی آواز کی نقل اتارنے ہی پر حیران تھی!“ یہ.....
یہ تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔“

”میری طرف بھی تو دیکھ سنیتا!“ میں دونو چڑجی کی آواز میں بولا۔

”کاش میں نے بھی تم دونوں کی طرح تپسیا کی ہوتی۔“ سنیتا نے مجھ پر نگاہ ڈال کر بڑی حسرت سے کہا۔ ”مجھے تو جو تھوڑی بہت ہلکتی مل تھی، وہ بھی چھن گئی۔“

میں اس پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لکشن فرار ہو کر جنگل میں زیادہ اندر تک نہیں گیا تھا، اسی لئے اپنے ساتھیوں سمیت اسے آنے میں دیر نہ ہوئی۔ اسے اور اس کے ساتھ آنے والوں کو میں نے بڑی مہارت سے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہاڑی پر جگہ جگہ ایسے کٹاؤ بنا دیئے گئے تھے کہ ان پر قدم جما کر اوپر چڑھنا آسان ہو جائے۔ دونو چڑجی کو مار دینے کے بعد اب میں

اپنے اور سومی کے اعصاب کو سکون پہنچانے کی خاطر جلد بازی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ سینا کے سامنے مختلف انسانی قالب اپنانا بھی بے مقصد نہ تھا۔

لکشن کے ساتھ سب ہی آنے والے مسلح تھے۔ پہاڑی کے اوپر آکر وہ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ لکشن سب سے آگے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں سومی اور سینا پر جمی ہوئی تھیں۔ میری توجہ اس کے ذہن پر تھی۔

”تیرا یہ سوچنا غلط ہے لکشن کہ ان دونوں میں سے ایک کے چہرے پر میک اپ ہے۔“ میں نے لکشن کو مخاطب کیا۔

”نانک جی کہتے ہیں تو پھر یہ ٹھیک ہی ہو گا۔“ لکشن سر ہاں تسلیم و رضا ثابت ہوا۔

”لکشن! اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دے تو کیا میرا حکم مانے گا؟“ میں بولا۔ اس اونچی پہاڑی سے چھلانگ لگا دینے کا مطلب موت ہی تھا۔

”کیوں نہیں نانک جی!“ لکشن نے بلا جھجک جواب دیا۔

”کیا تو اس کی وجہ بھی نہیں پوچھتے گا۔“ میں نے سوال کیا۔

”میری نظر میں نانک جی کا حکم ہی وجہ ہے۔“ لکشن پُر اعتماد آواز میں بولا۔

”تیرے ساتھیوں میں سے اور کتنے تیری ہی طرح ہوں گے جو اس امتحان میں پورے اتر سکیں؟“

”کون بھلا ایسا بد نصیب ہو گا جو نانک جی کے حکم کی تعمیل میں دیر کرے!“

”تم سب اپنے اپنے ہتھیار ایک جگہ رکھ دو کہ آج تمہاری وفاداری کی آزمائش ہے۔“ میں نے انہیں حکم دیا۔

انہوں نے میرے حکم پر اپنے ہتھیار تو ایک طرف ڈھیر کر دیے۔ مگر لکشن کے ساتھ صرف پانچ ہی آدمی تھے۔ وہ سب ہی پہاڑی سے چھلانگ لگانے پر آمادہ تھے۔

”تو نے دیکھ لیا لکشن کہ بد نصیبوں کی تعداد کتنی ہے! تیرے خیال میں ان کی سزا کیا ہونی چاہئے؟“

”نانک جی کا حکم نہ ماننے والوں کی سزا موت کے سوا کچھ اور نہیں۔“ لکشن نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”مگر نانک جی آج ہماری وفاداری کا امتحان کیوں لے رہے ہیں؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”کیا انہیں ہم پر بھروسہ نہیں رہا؟“

”بھروسہ ہوتا تو نانک جی کی زبان پر یہ بات ہی کیوں آتی! حکم نہ مان کر تم نے خود ہی ثابت کر دیا کہ تم لوگ بھروسے کے قابل نہیں ہو!“ لکشن بلند آواز میں بولا۔

”سزا تو تمہیں وہی ملے گی جو لکشن کہہ چکا ہے، مگر میں ایک رعایت دیتا ہوں۔ تم میں سے جو بھی اپنے کسی ساتھی کو اٹھا کر پہاڑی سے نیچے پھینک دے گا، اس کی سزائے موت معاف ہو جائے گی۔“ لکشن اور اس کے پانچ ساتھی جو پہلے ہی حکم کی تعمیل کا اقرار کر چکے ہیں، وہ اس مقابلے سے الگ رہیں گے۔

”لیکن یہ تو سراسر پاگل پن ہے! تھری زیرو نے اس لئے تو ہمیں ڈھاکا سے یہاں نہیں بھیجا تھا!“

ایک شخص کی احتجاجی آواز ابھری۔

”نانک جی کے فیصلے کو کس نے پاگل پن کہا؟“ لکشن آپے سے باہر ہو گیا۔

”پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے یہ؟“ کسرتی جسم والا وہ شخص دوسروں کے درمیان سے نکل آیا۔

”ہم تھری زیرو کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔“

”اسے اٹھاؤ اور پہاڑی سے نیچے پھینک دو!“ لکشن اپنے پانچ وفادار ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ شخص سنبھل پاتا، لکشن کے ساتھیوں نے اسے گرفت میں لے لیا۔ وہ شخص مرنے مارنے پر راز آیا، لیکن اس کے مقابل بھی تربیت یافتہ لوگ تھے۔ جلد ہی انہوں نے اس شخص کو گرا لیا۔ سب دور کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ جب اس شخص کو پہاڑی سے نیچے پھینکا گیا تو دیر تک اس کی آخری چیخ پہاڑیوں میں گونجتی رہی۔ اس عبرت ناک واقعے کے بعد کوئی اور احتجاجی آواز سنائی نہیں دی۔

مجھے تو ان ملک دشمنوں کو کسی نہ کسی بہانے ختم کرنا ہی تھا۔ میں نے اسی لئے ان کے ذہنوں پر توجہ دی۔ موت کے خوف نے ان میں سے کئی افراد کی زبانوں کو گنگ کر دیا تھا ورنہ تو وہ بھی میرے فیصلے پر ضرور احتجاج کرتے۔ ان کے دلوں پر دہشت بٹھانے کی خاطر میں نے سومی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر سینا کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے ان چاروں افراد کی نشان دہی کی جو بغاوت پر تو کمر بستہ تھے، مگر اظہار کا حوصلہ نہیں تھا۔

انہیں نام بہ نام میں نے پکارا اور آگے آنے کو کہا۔ جب وہ میرے سامنے آکھڑے ہوئے تو میں ان سے مخاطب ہوا۔ ”یہ بلیک کون ہے، ایک عورت! میں اسے تمہاری خاطر غیر مسلح کر رہا ہوں۔ اسلحہ تمہارے پاس بھی نہیں اور اس کے پاس بھی نہیں ہو گا۔ کیا تم مرد ہو کر اس اکیلی منتی عورت کو اٹھ کر پہاڑی سے نیچے گرا سکتے ہو؟“ وہ سسے ہوئے کھڑے رہے تو میں نے انہیں غیرت دلائی اور پھر سومی کو غیر مسلح کر دیا۔ ”بولو! جواب دو میرے سوال کا!“

”نانک جی! اگر ہم کامیاب ہو گئے تو..... تو کیا ہمیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا؟“ ان میں سے ایک نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم بلیک کون سے بچ گئے تو تمہیں معافی مل جائے گی۔“ میں نے پُر سکون آواز میں مسکرا کر جواب دیا۔

وہ خود ہی اپنی موت پر راضی ہو گئے۔ ایک جن زادی کو بھلا وہ آدم زاد کس طرح ٹھکانے لگا دیتے۔ اس انوکھے مقابلے کے لئے پہاڑی کی ہموار سطح کا ایک حصہ خالی کر دیا گیا۔ سومی برق رفتاری سے انہیں اِدھر اُسے اُدھر نہچاتی رہی۔ ان میں سے کوئی بھی اب تک سومی کو ہاتھ نہیں لگا سکا تھا۔

ذرا ہی دیر میں سومی نے انہیں تھکا دیا اور پہاڑی کے کنارے پر لے آئی۔ ہانپتے ہوئے ایک شخص کے سینے پر سومی نے اچھل کر اتنی زور سے لات ماری کہ وہ فضا میں اچھلا اور موت کی وادی میں گم ہو گیا۔ اس کے بعد سومی نے یکے بعد دیگرے مزید دو افراد کو پہاڑی سے نیچے اچھال دیا۔ زندہ بچ جانے والا آخری

آدی عیار ثابت ہوا۔ وہ اس طرح سوی کے قدموں پر گر گیا جیسے معافی کا خواستگار ہو۔ سوی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر سوی کے دونوں پیروں کو جکڑ لیا اور اسے گرانے کے لئے زور لگایا، مگر سوی کو ہلانہ سکا۔

”بس اتنی ہی طاقت ہے تجھ میں؟“ سوی یہ کہہ کر جھکی اور اسے بالوں سے پکڑ کے اٹھالیا۔ ”مجھ سے فریب کرتا ہے!“ سوی نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور اسے حکم دیا۔ ”تیری سزا یہ ہے کہ اب تو خود ہی دوڑتا ہوا جائے گا اور پہاڑی سے کودے گا!“

وہ شخص چالی بھرے ہوئے کسی کھلونے کی طرح دوڑنے لگا۔ سوی نے اسے اپنے اثر میں لے کر ہی ایسا کیا تھا۔ میں نے اسی دوران میں دو افراد کو بڑی آہستگی سے ادھر بڑھتے دیکھا جہاں ان سب نے اپنا اسلحہ ڈھیر کیا تھا۔ جب تک دوڑنے والے آخری شخص نے پہاڑی سے چھلانگ لگائی، وہ دونوں اسلحہ کے قریب آپکے تھے۔ سب کی توجہ کیوں کہ ایک ہی طرف تھی، ان دونوں نے اسی لئے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے ان کے ذہنوں کو منولا تو معلوم ہوا، وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے سب سے پہلے مجھی کو پھونک دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یا تو مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے یا پھر میں ان کے دشمنوں کا آلہ کار بن چکا ہوں۔ ان غیر معمولی حالات کے پیش نظر وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب ہی تھے۔

ابھی وہ دونوں اپنے ارادے پر عمل نہیں کر پائے تھے کہ میں نے سینا کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل موجود تھی۔

”انہیں تو شکار کر لے۔“ میں دھیرے سے بولا۔

سینا جیسی عورت کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ ان دونوں کو اسلحہ کے قریب دیکھتے ہی صورت حال سمجھ گئی۔ دوسرے ہی لمحے پے در پے دو دھماکے ہوئے۔ یوں دو اور شخص خاک و خون میں نہا گئے۔ انہیں اسلحہ کے قریب گرتے دیکھ کر سبھی نے اندازہ لگایا ہو گا کہ انہیں بلیک کونٹن نے بے خطا نہیں مارا۔

ان کی کل تعداد بتیس تھی جن میں سے اب تک صرف سات ٹھکانے لگے تھے۔ اس تعداد کو وہ نظر رکھ کر ہی میں نے ایک ایسی تجویز رکھی تھی کہ جلد فیصلہ ہو جائے۔ لکشن سمیت چھ افراد تو اپنی وفاداری کے جوش میں خود ہی مرنے پر تیار تھے۔ ان کے علاوہ بھی ابھی خاصی بھیڑ تھی۔ سو میں مٹنے اپنی تجویز پھر دہرائی۔

”بولو میری رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو کہ میں تمہیں لکشن کے حوالے کر دوں۔ وہ اپنا فیصلہ پہلے ہی سنا چکا ہے۔ اگر تم نے یہ موقع کھو دیا تو تمہیں گولی مار دی جائے گی! تم میں سے جو بھی اپنے کسی ساتھی کو پہاڑی سے نیچے نہ گرا سکا، اسے زندہ رہنے کا حق نہ ہو گا۔ کوشش کرو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔“

یہ الفاظ ادا کرتے ہی میں نے ان کے ذہنوں کے ایک نوع کے جنون میں مبتلا کر دیا۔ درندگی کا یہ

جنون خود انہی کے ذہنوں میں موجود تھا۔ میں نے اسے صرف ہوا دی تھی۔ اس کا نتیجہ میرے نقطہ نظر سے بہتر ہی نکلا۔ وہ سب ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

مجھے ان آدم زادوں کو یہ سزا دیتے ہوئے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ وہ جو اس سر زمین پر اپنے ہی جیسے دوسرے آدم زادوں کو آپس میں لڑانے آئے تھے، اب ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ چنچیں سنائی دیتی رہیں۔ اسی کے ساتھ ان شیطانوں کی تعداد کم ہوتی رہی۔ جو شخص کسی کو پہاڑی سے نیچے گرانے میں کامیاب ہو جاتا، اس پر کوئی اور جھپٹ پڑتا۔ جینے کی تمنا میں وہ موت کو گلے لگاتے رہے۔

اسی جھج پکار کے درمیان مجھے لکشن اور بقیہ پانچ افراد کا خیال آگیا۔ وہ قریب ہی کھڑے تھے۔ ”لکشن! کیا تو اور تیرے ساتھی مجھ سے وفاداری کا عہد نہیں نبھائیں گے؟“ میں نے لکشن کو مخاطب کیا۔

”ناٹک جی کو خبر ہے کہ لکشن راجپوت ہے۔ راجپوت اپنے قول سے نہیں پھرتا۔“ وہ بے وقوف آدم زاد سینہ پھلا کر بولا۔

پھر لکشن اور اس کے پانچوں ساتھیوں نے آگے بڑھ کر میرے پیروں کو ہاتھ لگائے۔ ”اپنے جاں نثروں کو آشیر داد دیجئے ناٹک جی!“ لکشن نے کہا۔ ”اب اگلے جنم میں بھینٹ (ملاقات) ہوگی۔“

ان سر پھروں نے میرے آگے سر جھکا دیئے۔ میں نے ان کے سروں پر باری باری ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد وہ بھاگتے ہوئے پہاڑی کے ایک سرے تک پہنچے اور بیک وقت ”ناٹک جی کی جے“ کہتے ہوئے چھلانگیں لگا دیں۔ اس عرصے میں پہاڑی پر گنتی کے چند افراد رہ گئے تھے۔ یہ وہ تھے کہ جن میں اب لڑنے کی مزید سکت نہیں تھی۔ میرے ایما پر سوی نے انہیں زندگی کی قید سے رہائی دلا دی۔ پھر میں، سوی ہی سے بولا۔ ”تو پھیرا لگا کر دیکھ آ، کہیں کوئی زندہ نہ بچ گیا ہو!“

”دیکھ آتی ہوں۔“ سوی نے یہ کہتے ہی انسانی قالب چھوڑ دیا اور وہاں سے چلی گئی۔ سوی کے جاتے ہی سینا مرعوب سی آواز میں مجھ سے کہنے لگی۔ ”تم دونوں کسی فوج سے کم نہیں ہو۔ ہندو ماسا سھانے تمہیں یہاں بھیج کر گاگرلیس سرکار کا بیڑا غرق کر دیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہماری سرکار اتنا بڑا جوا کھیل سکتی ہے! نودو چڑجی پر بھروسہ کر کے سرکار نے بہت بڑی غلطی کی۔“

”تو اگر نودو چڑجی کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟“ میں نے سوال کیا۔

”کم سے کم تجھے اپنا دشمن ہرگز نہ بنائی۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا تجھے دوست اور دشمن کی پہچان ہے؟“ میں دانستہ ایسی باتیں کر رہا تھا جس سے اس کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوں۔ خلاف توقع وہ اب تک زندہ تھی۔

”اگر پہچان نہ ہوتی سکھ بیرو تو اب تک تیرے پیار کی جوت اپنے سینے میں جگائے نہ رکھتی۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا، پھر کہنے لگی۔ ”اس وقت کہ جب میں زندگی کی آخری سرحد تک پہنچ گئی تھی اور کسی بھی لمحے نودو چڑجی مجھے گولی مار دیتا، میرا من اٹھتا (بے سکون) نہیں تھا۔ مجھے خبر تھی کہ تو

مجھے مرنے نہیں دے گا۔

سیتا کے اس یقین پر مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ ایسے لمحات پہلے بھی آئے تھے کہ میں اس پر اپنی حقیقت ظاہر کر دیتا۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب میں ڈھاکا میں ایک طوائف کے کونٹے سے اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ ونود چڑجی سے آخری معرکے میں وہ کام آجائے گی، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آدم زادوں کی طرح ہم جن زادوں کا بھی تقدیر پر کوئی بس نہیں۔ اتنی قتل و غارت گری کے باوجود سیتا پر آج نہیں آئی۔

سوی لوئی تو پتا چلا کہ پہاڑی سے گرنے والے افراد میں چند لب دم اور بے ہوش تھے۔

”میں نے ان کی مشکل آسان کر دی۔“ سوی نے بتایا۔

”اب میاں سے اس پہلی بستی کی طرف چلتے ہیں کہ جہاں سے ہم نے اسلحہ چرایا تھا۔“ میں بولا۔

”یہ اچھا نہیں ہو گا کہ خواہ مخواہ میاں آباد قبیلے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جائیں۔ پھر ہمیں میاں سے یہ اسلحہ بھی ڈھوکے سمندر برو کرنا ہے۔“

اس پر سیتا چونک اٹھی اور پوچھا۔ ”تنی بڑی تعداد میں اسلحہ کو میاں سے نکال کر لے جانا کس طرح ممکن ہے؟“

سیتا کے سامنے پہلی مرتبہ یہ بات میری زبان پر آئی تھی۔ میں نے جواب میں کہا۔ ”تو نے اب تک جو کچھ دیکھا ہے، وہ بھی کون سا ممکن تھا! ناممکن کو ممکن بنا دینا ہی تو ہمارا کام ہے۔ کیا تو نے سوچا تھا کہ ونود چڑجی کا یہ مضبوط قلعہ، ننگوں کی طرح بکھر جائے گا؟“

وہ لا جواب سی ہو گی، پھر کہنے لگی۔ ”ہاں میں نے اس سے پہلے ایسے عجیب واقعات نہ دیکھے نہ سنے۔ میرے لئے تو تیرا یہ موجود ہروپ بھی کم حیرت انگیز نہیں۔“

”تو اب کسی بات پر بھی حیران ہونا چھوڑ دے سیتا!“ سوی نے اسے سمجھایا۔

”تجھے بستی میں پہنچ کر بھی نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ اس عرصے میں تو ایک کام کر سکتی ہے۔“ میں، سوی سے مخاطب ہوا۔ ”اسلحہ کی آخری کھیپ اس بستی میں موجود ہے۔ اسی کے ساتھ تجھے دوسری بستی کا جائزہ بھی لینا ہے کہ وہاں تو اسلحہ موجود نہیں! دونوں بستیوں اور جنگل میں جو اسلحہ موجود ہے، تجھے ایک جگہ اکٹھا کر دینا ہے۔ اس کے لئے یہی پہاڑی بہتر ہے۔ اسلحہ ایک جگہ جمع ہو جائے گا تو ہمارے لئے آسانی ہو جائے گی۔“

سیتا حیرت سے میری بات سنتی رہی مگر کچھ بولی نہیں۔ سوی کو پہلی بستی تک ساتھ لے جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں، سیتا کے جسمانی لمس سے بچ سکوں۔ میرے نزدیک خود کو آزمائش میں نہ ڈالنا ہی بہتر تھا۔

سوی نے پہلی بستی کے قریب جنگل میں سیتا کو اتار دیا، پھر میری ہدایت پر عمل کرنے چلی گئی۔ میں دوبارہ ونود چڑجی کے قلاب میں لوٹ آیا اور سیتا کو ساتھ لے بستی کی طرف چل دیا۔ بستی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

اس بستی میں داخل ہوتے ہی میں نے غیر معمولی سرگرمی محسوس کر لی۔ جھونپڑوں سے باہر سیاہ فام اپنے بھالے اور نیرے پتھروں پر رگڑ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں۔ میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ مجھ پر فکھر پڑتے ہی وہ لوگ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر طرف ”نانک جی کی ہے“ کے نعرے گونجنے لگے۔ سیاہ فام عورتیں اور مرد دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ میں اور سیتا ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے سردار کے بڑے سے نیم پختہ جھونپڑے کی طرف بڑھتے رہے۔ اس عرصے میں ان لوگوں کے ذہنوں کو منسل کر مجھے بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔

بستی کے سردار ترلوکی نے اپنے جھونپڑے سے نکل کر میرے استقبال کیا۔ پھر مجھے اور سیتا کو وہ اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ نعرے سن کر اسے میری آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ بڑا سائیم پختہ جھونپڑا کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ اسی کے ایک حصے میں تخت بچھا تھا جس پر موٹا سا گد اڑا تھا۔ گدے میں پرندوں کے پر بھرے ہوئے تھے جس کی وجہ سے بڑی نرمی تھی۔ سردار ترلوکی نے مجھے اور سیتا کو تخت پر بٹھا دیا اور خود ہاتھ باندھے تخت کے سامنے کھڑا رہا۔

”تو بھی آج ہمارے ساتھ ہی بیٹھ جا ترلوکی!“ میں نے سردار کو مخاطب کیا۔

اس پر ترلوکی حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”میری یہ مجال کہاں کہ میں، ناک جی کے پاس بیٹھ سکوں۔“

”ترلوکی! تجھ سے جو کہا ہے کہ۔“ یہ کہتے ہوئے میرے لمبے کی نرمی برقرار رہی۔

بستی کا سردار تخت پر چڑھ کر میری دائیں جانب آ بیٹھا۔ سیتا بائیں طرف بیٹھ تھی۔ میری توجہ سردار کے ذہن پر تھی۔

”اپنے ان کھوجیوں کو بلا ترلوکی جنہوں نے اسلحہ کی چوری کا الزام ایک مسلمان قبیلے پر لگایا ہے۔“

میں بولا۔

ترلوکی نے آواز دے کر اپنے دو محافظوں کو بلایا اور انہیں کھوجیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ محافظ چلے گئے تو میں نے سردار سے سیتا کا تعارف کرایا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ناک جی کے ساتھ آج کوئی عورت کیسے ہے؟ اسے سیتا کا چہرہ بھی کچھ دکھ ہوا سا لگا تھا۔

”سیتا ایک مرتبہ پہلے بھی میرے ساتھ اس علاقے میں آچکی ہے۔ اس بات کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ تجھے اسی لئے یہ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔“

”ہاں سردار ترلوکی! یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب تیرے میاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام میں نے ہی تو گرو دھاری رکھا تھا۔“ سیتا بھی بول اٹھی۔

سیتا کی اس یاد دہانی پر سردار ترلوکی اسے پہچان گیا اور خوش ہو کر بولا۔ ”گرو دھاری اب ایک سال اور چار مہینے کا ہے۔ ناک جی نے اسے لمبی عمر کی دعا دی تھی۔ میری بیوی کو تمہارے آنے کی خبر ملے گی تو وہ بھی بہت خوش ہو گی۔“ سیتا سے یہ کہہ کر ترلوکی نے کھوجیوں کو بلانے کی وجہ پوچھی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”ابھی انہیں آجانے دے، تجھے وجہ معلوم ہو جائے گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسی لئے تو میں

یہاں آیا ہوں۔“

سردار ترلوکی نے پھر اس ضمن میں کوئی سوال نہیں کیا۔ جب چاروں کھوجی آگئے تو وہ تخت کے سامنے بہ طور احترام جھکے۔ میں اس عرصے میں ان کے ذہنوں کو ٹوٹل چکا تھا۔ ان کے چروں سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ اس کا سبب خلاف توقع وہاں میرا آنا ہی تھا۔ وہ مجھی سے خوفزدہ تھے۔

”سنو!“ میں ان چاروں سے بولا۔ ”ہر کام آدمیوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ تمہارے سردار ترلوکی نے تمہیں سامان کی چوری کا سراغ لگانے کے لئے جو مہلت دی تھی، تم اس مہلت میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تمہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ بولو، کیا یہ سچ ہے؟“

انہوں نے اقرار میں سر ہلائے۔ پھر ان میں سے ایک نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمیں خطرہ تھا کہ جو وقت سردار نے مقرر کیا ہے، وہ گزر گیا اور ہم چوری کا پتا نہ چلا سکے تو ہماری گردنیں اتار دی جائیں گی۔ سو ہم نے اسی مسلمان قبیلے کا نام لے دیا کہ جس سے ہماری پرانی دشمنی ہے۔ ہم نانک جی سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔“

”اپنی جان بچانے کی خاطر تم یہ بھول گئے کہ اس طرح کتنا خون بے گناہ!“ مجھے ان کھوجیوں پر غصہ آنے لگا۔

”ہم سے بڑا قصور ہوا نانک جی! ہمیں معاف کر دیں۔“ ایک اور کھوجی گڑ گڑایا۔

”اے تم صرف قصور کہہ رہے ہو! آج ہی کیا، تم اس سے پہلے بھی تو اپنے سردار کو غلط خبریں دیتے رہے ہو! دھرم (ذہب) رنگ اور نسل کے نام پر خون بہانے سے بڑا کوئی اور پاپ (گناہ) نہیں۔ کوئی بھی دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آدمی دوسرے کا آدمی کا خون بہا دے۔“ میں کھتا رہا۔ ”کیسی پرانی دشمنی، کس وجہ سے دشمنی! تمہی جیسے دھرم کے پرچار کوں (مبلغوں) نے دشمنی۔ کہ یہ بیچ بوئے ہیں۔ آج دو قبیلوں کے جوان مل کر ایک قبیلے پر شب خون مارتے تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟..... یہی ناکہ کوئی عورت بیوہ ہو جاتی، کچھ بچوں کے سروں سے ان کے باپ کا سایہ اٹھ جاتا۔ اس سے ملتا کیا؟ بولو!“

”ہم پر دیا (رحم) کریں نانک جی!“ وہ رونے لگے۔

”تم پر رحم کرنا بے رحمی ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر انہیں وہی سزا سنا دی کہ جس سے بچنے کے لئے انہوں نے جھوٹ گھڑا تھا۔

”نانک جی!..... نانک جی!“ وہ فریاد کرتے رہے گئے۔ محافظ انہیں وہاں سے گھسیٹ لے گئے۔

”تو بھی آئندہ کے لئے اچھی طرح سمجھ لے ترلوکی کہ کسی بھی معاملے میں کھوجیوں کو مہلت دیتے ہوئے جلدی نہیں کرے گا!“ میری آواز میں تاکید تھی۔

”نانک جی کے حکم کی تعمیل ہو گی۔“ ترلوکی نے یقین دہانی کرائی۔

”ہم سے پوچھ ترلوکی، اسلحہ چرانے کی سازش کس نے کی تھی!“ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”وہ میرے ہی سیوک تھے۔“

”نانک جی کے سیوک؟“ ترلوکی حیران رہ گیا۔

”ہاں ترلوکی، میرے سیوک! دھوکا دینے والوں کو میں وہی سزا دیتا ہوں جو ان کھوجیوں کو سزا دی ہے، سزائے موت! اب اس پورے علاقے میں میرا کوئی سیوک زندہ نہیں بچا۔ اب اگر کوئی میرا سیوک ہونے کا دعویٰ کرے تو جھوٹا ہو گا۔ اسے میرا دشمن جانو! دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہئے، تجھے یہ اچھی طرح خبر ہے۔ آس پاس کے تمام قبیلوں تک یہ اطلاع دینے کی ذمہ داری میں تجھ پر ڈالتا ہوں۔“

”میں یہ ذمہ داری پوری کروں گا نانک جی!“ ترلوکی بولا۔ ”تمہارے سیوک تو اپنے رنگ اور لباسوں سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ وہ تو باہر سے آکر یہاں آجے تھے۔ ہم نے تمہاری ہی وجہ سے انہیں چھوٹ دے رکھی تھی۔ اب ان میں کوئی نظر آگیا تو اسے نیزے میں پر دیا جائے گا۔“

”تجھے شاید خبر نہ ہو کہ سامان کی جو آخری کھپ یہاں اتری تھی، اسے بھی غائب کر دیا گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ سوئی اب تک اپنا کام کر چکی ہو گی۔ توقع کے مطابق ترلوکی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔

”اور سن ترلوکی!“ میں نے مزید کہا۔ ”آج اس علاقے میں یہ میرا آخری دن ہے، پھر کب لوٹنا ہو کچھ نہیں معلوم۔“

”نانک جی! تم نے تو یہ بڑی بری خبر سنائی۔“ ترلوکی رنجیدہ سا ہو گیا۔

”یہ بری نہیں، اچھی خبر ہے ترلوکی! مجھے جو کچھ پتا ہے تو نہیں جانتا۔“ میں بولا۔ ”پہاڑیوں کی طرف بغیر اجازت جانے کی جو پابندی تھی، آج رات کے بعد سے وہ بھی اٹھ جائے گی۔ یہ اعلان بھی تجھی کو کرانا ہے۔“

”لیکن نانک جی، وہاں غاروں میں تمہارا جو سامان پڑا ہے، اس کی حفاظت کے لئے.....“

”وہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ایسا کس طرح ہو گا، یہ تیرے سوچنے کا کام نہیں۔“

”اور نانک جی، تم نے جنگل میں جو کھدائی کا کام شروع کرایا تھا، کیا وہ بھی اب روک دیا جائے گا؟“

”ہاں اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔“ میں نے جواب دیا۔ اسی وقت مجھے سوئی نظر آئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور ترلوکی سے کہا۔ ”سیتا تیری مہمان ہے، تو اسے کچھ کھلا پلا! میں پہاڑیوں کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر تخت سے اترتا اور دوسرے ہی لمحے انسانی قالب سے نکل آیا۔

”نانک..... نانک جی دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے!“ ترلوکی بھونچکا رہ گیا۔ اس نے یقیناً یہ تماشا پہلی بار ہی دیکھا ہو گا۔

”وہ ایسی ہی مہمان آتما (عظیم روح) ہیں۔“ میں نے سیتا کی آواز سنی۔

سوئی کے ساتھ بہتی سے نکل کر میں نے پہاڑیوں کا رخ کیا تو وہ بتانے لگی۔ ”اس بہتی کی طرح دوسری بہتی میں بھی لڑائی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”معلوم ہے مجھے اے سوی! لیکن اب یہ لڑائی نہیں ہوگی۔“ میں نے سوی کو لڑائی نہ ہونے کی وجہ بتادی۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

اسلحہ کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ سوی نے ان غاروں کو بھی خالی کر دیا تھا۔ پہاڑیوں کے عقبی جنگل میں دور تک اسلحہ کی پٹیاں پڑی تھیں۔ وہیں مجھے پہلی کا پڑ بھی کھڑا ہوا نظر آیا۔ میں اور سوی اسلحہ کی ان پٹیاؤں کو وہاں سے ڈھونڈنے لگے۔

ہم جن زادوں کے لئے بھاری سے بھاری چیزیں اٹھالینا کوئی کمال نہیں، نہ ہمیں ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں کوئی دشواری ہوتی ہے۔ سو ہم وہ سارا اسلحہ دور کھلے سمندر میں غرق کر آئے۔ ہم نے اس کے لئے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ اسلحہ کی پٹیاں، آدم زادوں کی نظریں نہ آئیں۔ پہلی کا پڑ کبھی توڑ پھوڑ کر میں نے پانی میں ڈبو دیا۔ اب وہ علاقہ غیر قانونی اسلحہ سے پاک ہو چکا تھا۔ اس وقت دوسرے ڈھل رہی تھی جب ہم ترلوکی کے جھوپڑے میں اترے۔ اپنے دشمن کو نیست و نابود کرنے میں ہم نے زیادہ وقت نہیں لگایا۔

اس عرصے میں ترلوکی نے دوسری بستی والوں کو بھی خبر کر دی تھی کہ اب شب خون مارنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے جو احکام دیئے تھے، ان کی تعمیل بھی ہو چکی تھی۔ سینہ و میری واپسی ہی کا انتظار تھا۔

ترلوکی ہمیں بستی سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ آئندہ کوئی غیر ملکی دشمن اس علاقے کو اپنی پناہ گاہ نہیں بنا سکے گا۔ جنگل کے ابتدائی حصے میں جہاں ہم جپ چھوڑ گئے تھے، وہیں ملی۔ میں نے خورشید احمد اور سوی نے صنوبر کا انسانی قالب اپنا لیا۔

جپ کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے ہی سنبھالی اور اس جنگل سے نکل آیا۔ اب ہم واپس چانگام شہر کی طرف جا رہے تھے۔

”سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا ہے سکھ ہیرا!“ سینٹا طویل سانس لے کر بولی۔ وہ میرے ہی برابر بیٹھی تھی۔

”اس لئے سینٹا کہ حقیقت کبھی کبھی بت تلخ ہوتی ہے، ہم اسے خواب سمجھنے لگتے ہیں۔“ میں نے وہ بات کہنے کے لئے تمہید باندھی کہ جو واقعی سینٹا کے لئے تلخ ہی ثابت ہوئی۔ ”خواب اور حقیقت کے درمیان ہلک جھپکتے ہی کا تو فاصلہ ہوتا ہے!“

”میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی سکھ ہیرا، آج صبح جب ہم ادھر آ رہے تھے تو اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ.....“

”سینٹا! میں بول اٹھا۔“ اب مجھے سکھ ہیرا نہ کہہ!“

”کیوں نہ کہوں! کیا تو بھی کوئی خواب ہے؟“ وہ ہنس دی۔

”ہاں! سکھ ہیرا کو ایک خواب ہی سمجھ کر بھلا دے۔“

”کیا ہو گیا ہے تجھے؟ آج یہ تو نے کسی باتیں شروع کر دیں؟“ ہنسنے ہنسنے اس کا چہرہ اتر گیا۔

”کسی نہ کسی دن تو تجھ سے یہ کہنا ہی تھا سینٹا کہ آج تک تو مجھے جو سمجھتی رہی ہے، میں وہ نہیں ہوں۔“ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں اور تیزی سے جیسے پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگا۔ شاید میرے اندر اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔

چند لمحوں کے بعد ہم صم سی رہی، پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”تو اگر سکھ ہیرا نہیں تو..... تو کون ہے؟“ ”اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ دونو چڑجی نے میرے بارے میں جو کچھ کہا وہ سچ تھا تو کیا تجھے یقین آجائے گا؟“

”اس نے کیا..... کیا تھا؟..... کیا کہا تھا اس نے؟“ وہ ہڈیانی آواز میں زور سے بولی۔

”اے سوی! تو ہی سینٹا کو بتا دے کہ ہم کون ہیں!“

”سینٹا! ہم دونوں جن زاد ہیں۔ اس کا نام علیالیش ہے اور میں اس کی بیوی سوی ہوں۔“ سوی نے بتا دیا۔

”علیالیش..... سوی..... جن زاد.....“ سینٹا تقریباً چیخ اٹھی۔ ”سکھ ہیرا!..... کیا ہے یہ سب؟..... کیا بھیا یک پنا ہے یہ؟“ اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔

سوی اسے دھیمی اور پرسکون آواز میں حقائق سے آگاہ کرتی رہی۔ سینٹا سے اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ آخر میں سوی نے یہ بھی کہہ دیا۔ ”تیری شیطانی قوتیں بھی تجھ سے میرے ہی عالم باپ عزیل نے چھین لی تھیں تاکہ علیالیش تجھے قابو میں کر سکے۔“

اچانک سینٹا زور زور سے ہنسنے لگی اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ میری توجہ اسی پر تھی۔ یہ آخری صدمہ وہ برداشت نہ کر سکی۔ ہمیشہ کے لئے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ مجھے اس موقع پر میرٹھ کا یوسف یاد آیا۔ وہ اپنی محبوبہ سلٹی سے چھڑنے کا دکھ نہ سہہ پایا تھا۔ پھر وہ بسکی بسکی باتیں کرنے لگی۔ کبھی وہ سکھ ہیرا کو پکارتی، کبھی میرا نام لیتی، کبھی ہنستی اور کبھی رونے لگتی۔ اس نے میری توقع کے مطابق خود کشی تو نہیں کی مگر جیتے جی مر گئی۔ اب اس کی حیثیت ایک زندہ لاش سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سوی سے کہا۔ ”اس کا خیال رکھ اے سوی! کہیں یہ پاگل پن میں جپ سے باہر چلا نہ لگا دے۔“

”ہم نے تو اسے مرنے سے بچایا تھا اے علیالیش، مگر یہ قدرت کے انتقام سے نہ بچ سکی۔“ سوی کی آواز میں یہ کہتے ہوئے دکھ تھا۔

”ہاں اے سوی!“ میں نے بھی ٹھنڈی سانس بھرا۔ ”آدم زاد ہوں کہ جن زاد ساری دنیا کو فریب دے سکتے ہیں، لیکن ان کے لئے اللہ کی پکڑ سے بچنا مشکل ہے۔“

”اور اللہ کی پکڑ ہی سے ہمیں ڈرنا بھی چاہئے۔“ سوی میری تاکید میں بولی۔

دن ڈھلے تک ہم واپس سلطان محمود کی کوٹھی تک پہنچ گئے۔ ہماری خاطر وہ آج شام شہر سے جلدی آ گیا تھا۔ سینٹا کی حالت اب کسی خوفزدہ بچے کی سی تھی۔ ہم کوٹھی کی نشست گاہ میں تھے۔ سینٹا نے سسکی سسکی نظروں سے جیکب کی طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر کہنے لگی۔ ”وہ..... جن زاد.....“

جن زاد ہے وہ!“

سنیتا نے یہ الفاظ اردو میں ادا کئے تھے، اس لئے جیکب کچھ نہیں سمجھ سکا۔ پھر بھی وہ گھبرا سا گیا۔ ماریا کے چہرے کا تاثر بھی جیکب سے مختلف نہیں تھا۔

”خورشید صاحب! یہ الماس کو کیا ہو گیا ہے؟“ سلطان نے مجھ سے پوچھا۔

”ان پر جنات کا اثر ہے جس کی وجہ سے یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہیں۔ میں نے انہیں جنگل کے اس حصے میں جانے سے منع کیا تھا جہاں جنات آباد ہیں، مگر یہ نہیں مانیں۔ اپنے علم سے مجھے پتا چل گیا تھا کہ ادھر جانا خطرناک ہے۔“ میں نے پہلے سے سوچا سمجھا جواب دے دیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے!“ سلطان بے ساختہ بول اٹھا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ ”میں ابھی اپنے ڈاکٹر کو فون کر کے بلواتا ہوں۔“ سلطان فون کرنے چلا گیا۔ سنیتا کو ہم اس کمرے میں لے آئے جہاں وہ گزشتہ رات سوئی تھی۔

سوی سے ماریا پوچھنے لگی کہ سنیتا کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ جواب میں سوی نے وہی بتا دیا جو میں نے سلطان سے کہا تھا۔

”لیکن مسٹر خورشید اور آپ کو تو جادو بھی آتا ہے، پھر کس طرح ایسا ہو گیا؟“ اس مرتبہ جیکب نے سوال کیا۔

”جادو جنات پر اثر نہیں کرتا۔“ میں بولا۔ ”پھر یہ کہ اس وقت ہم مس الماس کے ساتھ بھی نہیں تھے۔“

”آپ کو انہیں خطرناک جنگل میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے تھے۔“ ماریا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

اسی وقت لیٹے لیٹے اچانک سنیتا اچھل کر بیٹھ گئی اور ”جن زاد“ جن زاد“ کی رٹ لگانے لگی۔

”مجھے..... مجھے تو یہاں ڈر لگ رہا ہے جیکب!“ ماریا خوفزدہ نظر آنے لگی۔

ڈرنے کی کیا بات ہے، ہم بھی تو موجود ہیں یہاں۔“ سوی نے اسے دلاسا دیا۔

”ابھی ڈاکٹر آجائے گا تو الماس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“ سلطان

کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔

غیبت یہ تھا کہ سنیتا کی دیوانگی ابھی ان حدود میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے یا دوسروں کے

لئے خطرناک ثابت ہونے لگتی۔ سلطان کے فیملی ڈاکٹر نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ اس نے سنیتا کا

معائنہ کر کے بتایا۔ ”کسی شدید صدمے کی وجہ سے یہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکیں۔ فی الحال یہی

ممکن ہے کہ میں انہیں انجکشن دے کر سلا دوں۔ سلطان صاحب! آپ انہیں کل میرے کلینک پر لے کر

آجائیں۔ ذہنی امراض کا ایک ماہر ڈاکٹر میرا دوست ہے، وہ انہیں دیکھ کر کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا۔“

”یہ ٹھیک تو ہو جائیں گی ڈاکٹر؟“ سلطان نے معلوم کیا۔

”میں یقینی طور کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا، پھر مجھ سے سنیتا کا بازو پکڑنے کے لئے

کہا۔

نرس میں انجکشن لگا کر ڈاکٹر رخصت ہو گیا۔ پھر ذرا ہی دیر میں سنیتا گہری نیند سو گئی۔

”ہم لوگ کل صبح چلے جائیں گے سلطان صاحب!“ میں نے کہا۔ ”معاف کیجئے گا، اب آپ کے شہر سے واپس ہونے لگی ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو آپ الماس کو میرے ہی پاس چھوڑ جائیں، میں اس کا علاج کراؤں گا۔ اس پر جنات

وغیرہ کا اثر نہیں۔ ڈاکٹر نے اس کا سبب کوئی شدید ذہنی صدمہ بتایا ہے۔ خود آپ بھی سن چکے ہیں۔ یہ

مجھے کوئی داغی عارضہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر بیماری کا علاج ممکن ہے۔“ سلطان پُر اعتماد آواز میں کہنے لگا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ اس کے خیال سے میں نے اتفاق یا اختلاف کی ضرورت نہیں سمجھی۔ سنیتا کی

آخری منزل کوئی پاگل خانہ ہی تھا جہاں اس کی زندہ لاش کو دفن دیا جاتا۔ یہ کام سلطان کرتا یا میں، اس سے

کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس نے خود ہی یہ ذمہ داری قبول کر کے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

سوگوار سی فضا میں ہم نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آگئے۔ ماریا نے اس دوران میں

مجھ سے مزید چند روز رک جانے کے لئے کہا تھا۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود اس کے ذہن سے میرا خیال

نہیں نکلا تھا۔ اسے میں نے سمجھا بجا کر ٹال دیا۔

دوسرے دن صبح ناشتا کرتے ہی میں اور سوی، سنیتا کے کمرے میں آگئے۔ وہ اب تک بے خبر سو

رہی تھی۔ اس آدم زادی پر میں نے آخری نظر ڈالی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت مجھے بالکل یوں

محسوس ہوا جیسے کسی مر جانے والے کا آخری دیدار کر کے آیا ہوں۔ مجھے رنج صرف یہ تھا کہ سنیتا نے دھوکا

نہیں دیا۔ وہ اپنے خوابوں کی دہلیز پر سر رکھے ہمیشہ کے لئے غافل ہو گئی۔ سلطان کی یہ پیشکش مصلحت میں

نے قبول کر لی کہ اس کا ڈرائیور جیب میں ہمیں ایئر پورٹ تک چھوڑ دے گا۔

وہ علاقہ شہر سے دور تھا، اس لئے ہم دن کے اجالے میں بھی ڈھکا کا داپس جانے کے لئے اپنا سفر

شروع کر سکتے تھے۔

جب میں جیب میں بیٹھنے والا تھا تو ماریا نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”مسٹر خورشید! آپ بہت یاد آئیں گے۔“

”آپ کے اس خلوص و محبت کا بہت بہت شکریہ مس ماریا!“ میں نے بھی اخلاکاً کہہ دیا۔

”صنوبر! تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں مسٹر خورشید جیسا شخص مل گیا۔“ ماریا نے سوی سے کہا

یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

سوی نے ماریا کی بیباکی کو نظر انداز کر دیا اور جواباً خوش اخلاقی ہی کا مظاہرہ کیا۔

”اس وقت تو آپ دونوں ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے جا رہے ہیں، لیکن جب چاہیں یہاں

سیرو تفریح کے لئے آجائیے گا۔ مجھے آپ کی میزبانی سے خوشی ہو گی۔ اس کوٹھی کو آپ اپنی ہی

سمجھیں۔“ سلطان بھی ہم دونوں سے بولا۔

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جیب میں بیٹھ گئے۔ جیکب نے بھی ہمیں مسکرا کر الوداع کہا اور

رخصتی انداز میں ہاتھ ہلایا۔

میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تو ہم کراچی جا رہے ہیں، پھر کہیں اور کا قصد کریں گے۔“

”میری بیٹی، دنیا دیکھ گئی!“ عزتیل دھیرے سے ہنس دیا۔ ”کیا رکھا ہے اس دنیا میں! خلق خدا نے ایک دوسرے کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے..... مگر تم..... دونوں ابھی جوان ہو۔ جاؤ مگر میری ایک نصیحت گرہ میں باندھ لو کہ آخرت کو کبھی نہ بھولنا! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ سوئی اگر مجھ سے اکیلے جانے کو کہتی تو یقیناً میں انکار کر دیتا، لیکن اب اس پر میرا حق کم اور تیرا حق زیادہ ہے اے علیالیش! یہ تیری فرماں برداری اور لائق ہے کہ مجھ سے اجازت لینے آگیا۔“

ہم عزتیل کی دعاؤں کے سامنے میں داپس ہوئے۔ ڈھاکہ شہر چھوڑنے سے پہلے میں صرف آئی جی نور الاسلام سے مقصود بن کر ملا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بدرالدین سے ملاقات کی خواہش مجھے نہیں ہوئی کیوں کہ وہ بے وقوف اور نااہل آدمی تھا۔ چوک بازار میں جو گھر میں نے خریدا تھا، وہ بھی بیچ دیا۔ مولوی عبدالصبور کو مسجد کے لئے خاصی بڑی رقم دینے کے باوجود اب بھی میرے نزدیک اس دولت پر ضرورت مندوں اور غریبوں کا حق تھا۔ کراچی میں اس کے مواقع زیادہ تھے، کیوں کہ وہاں میری حیثیت مختلف تھی۔ سوئی کو ساتھ لئے میں، ڈھاکہ سے کراچی آگیا تو مقصود کا قالب اپنا لیا۔ سوئی نے روز اول اپنے لئے جو انسانی پیکر پسند کیا تھا، اسی میں رہی۔ میں نے کراچی آنے کے لئے دانستہ رات کا وقت منتخب کیا تھا تاکہ حبیب گھری پر مل جائے۔ اسے اور اس کے اہل خانہ کو میں اپنی کوٹھی میں بلا گیا تھا۔

کسی باجیا مشرقی آدم زاد کی طرح سوئی چادر اوڑھے میرے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ کئی بڑے سوٹ کیس ہمارے قریب رکھے تھے۔ عشاء کا وقت ہو گا کہ جب میں نے اپنی کوٹھی کے اندر موجود کھٹی کاٹن دہلیا۔ گیٹ کھولنے حبیب کا نوجوان بیٹا صالح آیا۔

”مقصود میاں آگئے..... سرکار آگئے۔“ کوٹھی میں شور مچا ہوا گیا۔

اس عرصے میں بلقیس کی عدت کے دن بھی پورے ہو گئے تھے۔ اس کی عدت دو روز پہلے ہی ختم ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے سامنے آگئی۔

جب میں نے سوئی سے ان تعارف کرایا تو سبھی حیرت زدہ رہ گئے۔ میں نے بتایا۔ ”ان کا نام صنوبر ہے۔“

”ماشاء اللہ چاند سی دلہن ہے سرکار کی، مبارک ہو۔“ سب سے پہلے حبیب کی بیوی بشیرن نے مجھے مبارک باد دی۔ ”اللہ نظر بد سے بچائے۔ سرکار نے یہ بہت ہی اچھا کیا کہ اپنا گھر بسالیا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی فرمان ہے۔“

بلقیس جہاں کی چھوٹی بہن نفیس جہاں تو سوئی پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔

”بھئی صالح کی ماں! اب تم میری بات سن لو۔“ حبیب بول اٹھا۔ ”سرکار کا گھر تو بس گیا، مگر گھر پر ہمارا قبضہ ہے۔ اللہ نے اب میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور سرکار کی دعا سے دکان بھی خوب چل رہی ہے۔ ہم کہیں اور بھی گھر لے کر رہ سکتے ہیں۔“

”نہیں حبیب!“ میں نے انکار کر دیا۔ ”یہ کوٹھی اتنی بڑی ہے کہ یہاں تم لوگ بہت آرام سے رہ

چانگام سے ڈھاکا آکر ہم نے چند روز سکون سے گزارے۔ بہت عرصے تک ہمارے اعصاب کشیدہ رہے تھے۔ شیطان صفت آدم زادوں نے ہمیں ایک لمحے کی سہولت نہیں دی تھی۔ سوئی کے قرب کو اب میں نے شدت سے محسوس کیا۔

ایک روز سنیٹا کا ذکر چھڑ گیا تو سوئی کہنے لگی۔ ”سلطان نے اب اسے مایوس ہو کر کسی پاگل خانے میں داخل کرا دیا ہو گا۔“

اس پر مجھے راجہ یاد آگئی۔ وہ بھی مجھے پاگل خانے ہی میں ملی تھی۔ میں دیر تک سوئی سے گزرے ہوئے واقعات کا ذکر کرتا رہا۔ کراچی شہر کی یادیں میری دامن گیر تھیں۔

”تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اے علیالیش کہ مجھے کراچی لے کر چلے گا۔“ سوئی نے کہا۔ ”تُو اپنے بچپن کے کسی دوست یاسف کا ذکر بھی کر رہا تھا جو کراچی میں ہے۔“

”تجھے نہیں معلوم اے سوئی کہ وہ کتنا پتہ پتہ ہوا جن زاد ہے!“ پھر میں نے ہنستے ہوئے یاسف کے کئی واقعات سوئی کو سنائے۔

سوئی کے لئے ایسے واقعات سننے نہیں تھے، سو وہ بولی۔ ”جنت کی اکثریت ہی ایسی ہے اس میں تیرے دوست یاسف کا کوئی تصور نہیں۔ پھر بھی تیری باتیں سن کر اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی آدم زاد محبوبہ اضرعی کو بھی دیکھنے کا شوق ہے جس نے ایک جن زاد کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہے۔“

”میں بہت سے شہروں میں رہا ہوں اے سوئی! پھر بھی معلوم نہیں کیوں کراچی مجھے اپنا گھر سا لگتا ہے۔“

”تو مجھے اپنے گھر لے چل نا اے علیالیش!“

”لے چلوں گا، مگر تیرے باپ عزتیل سے تو اجازت لے لوں۔ کراچی ہی کیا، میں تو تجھے ساری دنیا کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔ زمین پر عجب عجب قسم کے آدم زاد بے ہوئے ہیں۔ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے اب تک مجھے قاہرہ اور بغداد بہت اچھے لگے ہیں۔ تقریباً دو سو برس پہلے کی بات ہے کہ جب میں اور یاسف ادھر گھومنے گئے تھے۔ لگتا ہے اے سوئی کہ تُو نے ابھی دنیا دیکھی ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے میرے باپ نے تیری طرح کبھی آوارہ گردی کی اجازت نہیں دی۔“ سوئی ہنس کر بولی۔

”لیکن اب وہ اس سے منع نہیں کرے گا۔“

”ہاں اے علیالیش! مجھے تیرے حوالے کر کے اب وہ بے فکر ہو گیا ہے۔ اب میں اس کی نہیں تیری ذمہ داری بن گئی ہوں۔“

اسی روز ہم عزتیل سے ملے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اے عزتیل! میں یہاں سے تیری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟“

”کیا اسے کہیں بہت دور لے جا رہا ہے اے علیالیش کہ تجھے مجھ سے پوچھنا پڑا؟“ عزتیل نے دریافت کیا۔

”اتنی عمر ہو گئی اور اس نے دنیا نہیں دیکھی، میں اسے دنیا گھماؤں گا۔ اسے بھی بہت شوق ہے۔“

سکتے ہو۔ ہم دو افراد کے لئے ایک کمرہ کافی ہے جو پہلے ہی کسی کے استعمال میں نہیں۔ تم لوگ کہیں اور نہیں جاؤ گے، یہ ہمارا حکم ہے۔ ابھی تو ہمیں بلیس جہاں کی شادی بھی کرنی ہے۔ بلیس یہیں سے رخصت ہوگی۔“

اس پر بلیس جہاں کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ بشیرن اس سے کہنے لگی۔ ”تم نفیس کو ساتھ لے جاؤ۔ سرکار اتنے لمبے سفر سے آرہے ہیں گرم گرم روٹیاں ڈال لو۔“ دونوں بہنیں اٹھ کر جانے لگیں تو سوی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے آپ کہاں جا رہی ہیں بیگم صاحبہ!“ حبیب نے کہا۔ ”بچیاں کس لئے ہیں! آپ کی خدمت کرنا تو ان کا فرض ہے۔“

”ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو پھر تکلف کیا!“ سوی بولی۔ ”یہ دونوں تو میری بہنوں کی طرح ہیں۔“

”انہیں جانے دو حبیب! یہ اسی طرح خوش رہتی ہیں۔“ میں بول اٹھا۔

”حضور کے حکم سے روگردانی اس خادم کے بس میں کہاں!“ حبیب یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ پھر اس نے میری یہ بات بھی مان لی کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اسی کوٹھی کے ایک حصے میں رہ لے گا۔ مستقبل کے ارادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی میں نے اس سے یہ اصرار کیا تھا۔

رات ہی کو کھانا کھانے کے بعد سوی نے اس کوٹھی کو گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ کوٹھی اسے پسند آئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ ”ہمارے چوک بازار والے گھر سے تو یہ کوٹھی بہت بڑی ہے۔“ اب وہ میرے ساتھ خواب گاہ میں آگئی تھی۔ ہم دونوں کے سوا وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ احتیاط کے طور پر میں نے خواب گاہ کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا تھا۔

”اور یہ آدم زاد تمہیں کیسے لگے جنہیں میں یہاں بٹا گیا تھا؟“ میں نے پوچھا

”نیک اور شریف لوگ ہیں۔ دونوں بہنیں تو بہت ہی اچھی ہیں۔ چھوٹی نے تو مجھے باہی کہنا شروع کر دیا ہے۔ جب تو نے مجھ سے پہلی مرتبہ ان کا ذکر کیا تھا تو میں ڈر رہی تھی کہ ان میں کوئی خطرناک آدم زاد نہ ہو جیسی ڈیشان حیدر کی ماں تھی، لیکن یہ لوگ مجھے ایسے نہیں لگتے۔ یہ بلیس جہاں وی ہے ناجو تیرے دوست یاسف کے ظلم کا نشانہ.....“

”ہاں یہ وی ہے۔“ میں بول اٹھا۔ ”یہ غریب تو دہرے ظلم کا شکار ہو گئی تھی جیسا کہ میں تجھے بتا بھی چکا ہوں۔“

”لیکن تو نے اس ظلم کا کچھ تو ازالہ کر ہی دیا۔“

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم سو گئے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح میں اور سوی تیار ہو کر یاسف سے ملنے چل دیئے۔ یاسف اس وقت تک سو کر نہیں اٹھا تھا، اس لئے میں نے کوٹھی کے دوسرے حصے کا رخ کیا جہاں قمر احمد کی سکونت تھی۔ سوی کو میرے ساتھ دیکھ کر اسے بھی حیرانی سی ہوئی۔ پھر اسے مزید حیرت یہ سن کر ہوئی کہ سوی سے میرا کیا رشتہ ہے!

”حضور نے شادی کر لی!“ قمر احمد اس قدر بوکھلا گیا کہ مجھے مبارک باد دینا بھی یاد نہ رہا۔

”کیوں قمر احمد کیا ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا؟“ میں مسکرا کر بولا۔

اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ”دراصل آپ جیسے اللہ کے برگزیدہ بندوں کے بارے میں ایسی کوئی بات کبھی سنی نہیں..... میں معذرت خواہ ہوں، اگر حضور کو ناگوار.....“

”ارے نہیں قمر احمد!“ میں ہنس دیا۔ ”اللہ کے احکام پر چلنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آدمی دنیا سے کنارہ کشی کر لے۔“

”بجا ارشاد فرمایا حضور نے۔“ اس نے کہا۔ ”غلطی پر میں ہی تھا جو میری زبان پر ایسی بات آگئی۔“

”اور سناؤ تمہارا بچہ ظفر کیسا ہے؟“ دفتری معاملات تو اب ٹھیک چل رہے ہوں گے!“ میں بولا۔

”ظفر ٹھیک ہے حضور کی دعا سے اور دفتر سے میں نے چند روز کی چھٹی لے لی ہے۔ دراصل

میرے کچھ مہمان آنے والے ہیں قاہرہ سے!“ اس نے بتایا۔

قاہرہ کے ذکر پر میں چونکا، کیوں کہ میں نے کراچی کے بعد سوی سے بغداد یا قاہرہ چلنے کے لئے کہا تھا۔

”میرے ایک دوست ہیں طیب صاحب۔ وہ فارن سروس میں ہیں۔“ قمر احمد خود ہی تفصیل بتانے لگا۔

”گزشتہ ہفتے انہوں نے مجھے قاہرہ سے خط لکھا تھا۔ طیب صاحب کی پوسٹنگ وہاں پاکستانی سفارت خانے میں ہے۔ انہی کے کچھ مصری دوست پہلی مرتبہ پاکستان آرہے ہیں۔ وہ ہمیں میری کوٹھی میں رہیں گے۔“

طیب صاحب کی خواہش یہ ہے کہ میں ان کی میزبانی کروں۔ وہ لوگ آج ایک فلائٹ سے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ دفتری حالات ان دنوں معمول کے مطابق تھے، سو میں نے چھٹی لے لی تاکہ مہمانوں کو

سیر و تفریح کرا سکوں۔“

مجھے جبک اور ماریا کا خیال آگیا اور سلطان بھی یاد آیا۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ معلوم ہوا۔ میں

نے اسی لئے مزید پوچھ گچھ نہیں کی اور ہنس کر بولا۔ ”اپنی شادی کے ساتھ ساتھ ہمیں تمہاری شادی کی

فکر بھی تھی قمر احمد! دیکھ لو ہم کیسے بروقت پہنچے ہیں! تمہاری ہونے والی بیوی کی عدت پوری ہو چکی

ہے۔“

”یہ بات تو میرے ذہن میں نہیں تھی حضور! کافی دن سے حبیب صاحب بھی نہیں ملے، نہ میرا

ادھر جانا ہوا۔ مصر سے آنے والے مہمان واپس چلے جائیں تو حضور کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے گی۔

ضرورت پڑی تو مزید چھٹیاں لے لوں گا۔ حضور ہی کی وجہ سے میرے محلے کے سیکرٹری آج کل مجھ پر

بہت مہربان ہیں۔“

اس کے بعد قمر احمد مجھ سے مشرقی پاکستان کے حالات پر گفتگو کرنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے

میری خاطر مدارات بھی کی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تمہارے پیر صاحب بھی سو کر اٹھ گئے ہوں گے۔ ان سے بھی ملنا ہے، ہم

چلتے ہیں۔“ میں بولا۔

”اللہ نے چاہا تو ایسی نوبت نہیں آئے گی قراحمہ!“ میں نے اس کی پشت تھپکی اور آگے بڑھ گیا۔
سوی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

قراحمہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے ”بھیر“ کی مارا فنگی مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم اور امغری پر غصہ آنے لگا۔ وہ عورت اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہی تھی۔ جب ہم کوچی کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہمارے آس پاس کوئی نہیں تھا تو سوی مجھ سے بولی۔ ”اے علیا! یہ آدم زاد تو بہت ہی ظالم معلوم ہوتی ہے۔ تو نے اس کے متعلق غلط نہیں کہا تھا۔ اس بے چارے کی بیٹی کو قتل کر کے بھی اسے سکون نہیں ملا!“

”یہ سب اسی وجہ سے ہے کہ یاسف نے اسے کچھ زیادہ ہی سرچڑھا رکھا ہے۔ یاسف اگر درمیان میں نہ ہوتا تو میں کبھی کا اسے سیدھا کر چکا ہوتا!“

”خوب تماشا ہے یہ بھی! کوئی جن زاد کسی آدم زادی کے اشاروں پر چلتا ہے تو کسی آدم زاد کو کوئی جن زادی اپنا بنا لیتی ہے۔“

”اے سوی! تجھے اپنا کر میں تو اس عذاب سے نکل آیا، لیکن یاسف کا سدھرنا مشکل ہے۔“
”کتنے دن جی سکے گی یہ آدم زادی! ذرا سی عمر مٹ جائے دے، پھر تیرا دوست خود ہی اس بے چہچھا چمڑا لے گا۔ تب اسے احساس ہو گا کہ وہ ایک سراب کے تعاقب میں تھا۔“
”یاسف نے کب کسی آدم زادی سے وفا کی ہے! امغری ساتھ چھوڑ گئی تو وہ کسی اور کا ہو جائے گا۔“

میری آمد کی خبر یاسف کو پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اس نے قراحمہ کے ملازم سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے! میں پہنچا تو وہ نشست گاہ میں میرا ہی خضر تھا۔ اس نے تخت سے اٹھ کر مجھے پٹنایا۔

امغری وہاں موجود نہیں تھی۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا۔

”بھیر برکت علی شاہ کا جگر جان آخر لوٹ ہی آیا۔“ وہ اپنے مخصوص لمبے میں بولا، پھر اس نے سرگوشی کی۔ ”یہ تیرے ساتھ کون ہے؟ مجھے تو انہوں ہی میں سے لگتی ہے۔“

”تو خود ہی پہچان کر بتا کہ یہ کون ہو سکتی ہے!“ میں نے اس سے الگ ہو کر کہا۔

”پہلے کبھی دیکھا تو نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سوی کو نظر بھر کر غور سے دیکھا۔ سوی میرے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے یاسف کو سلام کیا۔

”بیٹھے کو بھی نہیں کہے گا کیا اے یاسف!“ میں نے دانستہ اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

اس نے قدرے گھبرا کر پہلے مجھے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا، پھر سوی سے بولا۔ ”آپ بھی تشریف رکھئے خاتون!“

یاسف اس لئے گھبرا گیا تھا کہ کوئی بھی جن زاد کسی آدم زاد کے سامنے اپنا اصل نام ظاہر نہیں کرتا۔ انسانی قالب میں ہونے کے سبب وہ سوی کی طرف سے بھی تذبذب کا شکار تھا۔ سوی کو اس پر

”آپ تشریف رکھئے حضور! میں کسی ملازم کو بھیج کر دکھوا لیتا ہوں۔ عموماً اس وقت تک وہ اٹھ جاتے ہیں۔“ قراحمہ نے یہ کہہ کر ایک ملازم کو آواز دی اور اسے کوچی کے دوسرے حصے کی طرف بھیج دیا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”حضور سے خلوت میں بھی کچھ عرض کرنا تھا۔“

”دیکھو تم ان کے سامنے بھی ہم سے ہر بات کر سکتے ہو۔“ میں نے سوی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی تمہارے حالات سے میری ہی طرح آگاہ ہیں، لیکن خنائی میں ہی تمہیں کچھ کہنا ہے تو پھر کبھی سہی۔ اب تو ہم کراچی آئی گئے ہیں، ملنا جلتا رہے گا۔ ہمارا ارادہ یہ بھی ہے کہ پہلے کی طرح حاجت مندوں کے لئے کوئی وقت مقرر کر دیں۔“

”اگر بیگم صاحبہ کو میرے حالات کا علم ہے تو ان کے سامنے بھی مجھے گفتگو سے عار نہیں۔ میرے لئے جیسے حضور، ویسی ہی قابل صد احترام بیگم صاحبہ۔“ یقیناً بیگم صاحبہ بھی امغری سے غائبانہ طور پر واقف ہوں گی۔ میرے اندر تو اتنی جرات نہیں کہ پیر صاحب سے اس ضمن میں عرض کر سکوں، ہاں حضور سے ضرور درخواست کر سکتا ہوں۔“

میں نے قراحمہ کے ذہن پر توجہ دے کر پتا لگا لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، اسی لئے بول اٹھا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تمہاری پہلی مطلقہ بیوی امغری بیگم نے ان دنوں تمہیں ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے تمہیں جو دھمکی دی ہے اشاء اللہ رانگاں ثابت ہوگی۔ ظفر کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔“

”بات صرف اتنی سی تھی حضور کہ ایک دن ظفر کھیلنا ہوا کوچی کے اس حصے میں چلا گیا۔ اس پر امغری نے معصوم بچے کو مارا۔ پھر جب میں دفتر سے آیا تو.....“

”تمہیں دھمکی دی کہ وہ ظفر کو زندہ نہیں چھوڑے گی، یہی بات ہے نا؟“ میں نے قراحمہ کی بات پوری کر دی۔

”جی ہاں سرکار! یہی بات تھی۔“ قراحمہ نے تصدیق کر دی۔ ”آپ سے بھلا اس خادم کے دل کا حال کس طرح چھپا رہ سکتا ہے!“

”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے پیر سے بات کر لوں گا۔“ میں نے قراحمہ کو یقین دلایا۔

”خادم کا نام اگر درمیان میں نہ آئے تو کرم ہو گا حضور! میں یہ نہیں چاہتا کہ پیر صاحب کو یہ گمان ہو، میں نے امغری کی شکایت.....“

”نہ امغری سے ڈرو، نہ اپنے پیر صاحب سے! میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔“ میں بولا کیوں کہ ملازم کو واپس آتے دیکھ لیا تھا۔

ملازم نے آکر بتایا۔ ”پیر صاحب جاگ چکے ہیں۔“

میں یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور قراحمہ سے کہا۔ ”میں ابھی بات کر لوں گا، تم مطمئن رہو۔“

چلتے چلتے قراحمہ عاجزانہ آواز میں کہنے لگا۔ ”اور کچھ ممکن نہ ہو تو حضور، آپ پیر صاحب سے مجھے یہ اجازت عطا کرا دیں کہ میں اپنی سکونت کا کہیں اور بندوبست کر لوں۔“

تس آگیا۔ اس نے تخت کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”اے علیا لیش کے دوست یاسف! مجھ سے نہ ڈر اور نہ مجھے خاتون کہہ! میرا نام سوی ہے۔ تیری ہی طرح میں نے بھی انسانی قالب اپنا رکھا ہے۔ میں ایک عالم جن زاد عزتیل کی بیٹی ہوں اور.....“

”یہ میری شریک حیات ہے۔“ میں نے سوی کی بات پوری کر دی۔

اس پر یاسف دھیرے سے ہنس دیا، پھر مجھ سے بولا۔

”مبارک ہو تجھے اے میرے دوست کہ تیری قسمت میں کسی عالم ہی کی بیٹی لکھی تھی۔“

اندر کیوں کہ امگری بھی موجود تھی، اس لئے احتیاط کے پیش نظر ہم عربی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔

”ہاں اے یاسف! میں اسے اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تیرا اشارہ عالم ہاموس کی بیٹی وازمہ کی طرف ہے، لیکن سوی ان میں سے نہیں۔“ میں بولا۔ پھر یاسف نے سوی کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو سوی نے کہا۔ ”مجھ کو بھی تجھے دیکھنے کا شوق تھا۔ علیا لیش سے میں نے تیرے بہت قصے سنے ہیں۔“

”اچھا تو دیکھ لے مجھے۔“ یہ کہتے ہی یاسف انسانی قالب سے باہر آگیا۔

میں اور سوی بھی اپنی اصل پر لوٹ آئے۔ کوئی اب وہاں آتا تو اسے نشست گاہ میں کچھ دکھائی نہ دیتا۔

”اے سوی! یہاں ہمارے پاس آکر بیٹھ جا، تاکہ میرا دوست تجھے ٹھیک طرح اور قریب سے دیکھ سکے۔“ میں سوی سے بولا۔

سوی اٹھ کر ہم دونوں کے قریب آ بیٹھی تو یاسف نے بے اختیار کہا۔ ”سبحان اللہ! بلاشبہ تو بہت خوب صورت ہے اے سوی! میرے دوست نے گھانے کا سودا نہیں کیا۔“

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اے یاسف!“ میں بول اٹھا۔ ”کیا خبر کب امگری ادھر آجائے!“

”میں اٹھا تو وہ سو رہی تھی۔ اگر وہ جاگ بھی گئی تو اسے سولہ سگھار کرنے میں وقت لگے گا۔ تو اس کی طرف سے بے فکر ہو کے بات کرا۔“ یاسف نے بتایا۔

”اب یہ مکمل ختم ہو جانا چاہئے اے یاسف!“ میں نے کہا۔ ”اسے بے لگام نہ چھوڑ! قراحمہ کو اس نے بڑی ذہنی اذیت میں گرفتار کر رکھا ہے۔“

”کیا ہوا؟ مجھے تو امگری نے کچھ نہیں بتایا۔“ یاسف کی آواز میں بناوٹ نہیں تھی۔

”امگری نے قراحمہ کو دھمکی دی ہے کہ اپنے سوتیلے بیٹے ظفر کو بھی مار دے گی۔ اب قراحمہ یا ظفر سے اس کا کیا تعلق!“

”میں سمجھ گیا کہ قراحمہ نے تجھ سے شکایت کی ہوگی۔ تجھے تو خبر ہے کہ امگری کا مزاج ہی ایسا ہے۔ اسے دوسروں کو اذیت دے کر خوشی ہوتی ہے۔ وہ تو مجھے بھی نہیں چھوڑتی۔ اگر اس کا واقعی ایسا ہی ارادہ ہوتا تو مجھ سے ضرور کشتی اور میں ہرگز اس پر رضا مندی ظاہر نہ کرتا۔ امگری نے بس یوں ہی قراحمہ کو دھمکی دی اور میں ہرگز اس پر رضا مندی ظاہر نہ کرتا۔ امگری نے بس یوں ہی قراحمہ کو دھمکی دی اور میں ہرگز اس پر رضا مندی ظاہر نہ کرتا۔“

احمد کو دھونسنے اور مزہ لینے کے لئے دھمکی دی ہوگی۔ قراحمہ عجب غصہ ہے۔ ایسی کوئی بات تھی تو وہ مجھ سے کہہ دیتا۔“ یاسف نے حقیقت حال واضح کر دی۔

”قراحمہ تجھ سے بہت ڈرتا ہے۔ اسی لئے خاموشی اختیار کر لی ہوگی۔“

میری بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ ہم تینوں ہی چونک کر اپنے اپنے انسانی قالبوں میں لوٹ آئے۔ سوی اٹھی اور کرسی پر جا بیٹھی اور دھیرے سے بولی۔

”اے یاسف! شاید تیری آدم زاد محبوبہ ادھر ہی آ رہی ہے۔“

”ٹھیک اندازہ کیا تو نے! یہ اسی کے قدموں کی مخصوص آواز ہے۔ کم ہی وہ مجھے اکیلا چھوڑتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ مریدوں کی آمد پر بھی خفا ہو جاتی ہے۔“ یاسف نے تصدیق کی۔

نشست گاہ کا جو اندرونی دروازہ بھڑا ہوا تھا، اچانک کھلا اور سرد قد امگری اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ یاسف نے غلط نہیں کہا تھا۔ امگری اپنے خداداد حسن کو نکھارنے اور سنوارنے میں کوئی کسر چھوڑنے کی قائل نہیں تھی۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس کے آنے ہی یوں لگا جیسے نشست گاہ تازہ گلابوں کی خوشبو سے مہک اٹھی ہے۔ وہ گلابی ہی رنگ کی بنارس سازمی باندھے ہوئے تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ پھر اس کی نگاہ سوی پر پڑی اور آنکھوں سے حیرت چھلکنے لگی۔ اس حیرت میں سوی کے لئے ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کی وجہ سوی کا بے مثل انسانی پیکر ہی ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی آدم زاد خود سے زیادہ حسین عورت کو دیکھ کر ایسے ہی جذبات کا شکار ہو جاتی ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ اس لئے امگری کا رویہ مجھے غیر متوقع نہیں لگا۔ مجھ سے تو وہ پہلے ہی خاک کھاتی تھی۔ اگر میں ’یاسف کے بچپن کا دوست نہ ہوتا تو وہ مجھے ہرگز برداشت نہ کرتی۔“

”آؤ آؤ اے قرار دل و جان!“ یاسف نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ ”لگتا ہے کہ قنوج سے منگوا یا ہوا عطر روح گلاب آج ختم کر دیا تم نے۔“

”پیر صاحب! مہمانوں کے سامنے یہ بے حجابی آپ کو زیب نہیں دیتی۔“ امگری کی پیشانی مزید شگن آلود ہو گئی۔

”یہاں تو کوئی مہمان نہیں بیگم! بیٹھ تو جاؤ۔“ یاسف مسکرایا۔

امگری تخت کی دوسری جانب پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر سوی کے مقابل بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”اگر مقصود میاں آپ کے دوست ہیں تو یہ خاتون بہر حال اجنبی ہیں۔“ اس نے سوی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم نے آپ کو پہلے بھی اجنبیوں کے سامنے بے تکلفی سے منع کیا ہے۔“

”یہ خاتون بھی اجنبی نہیں ہیں، میرے دوست ہی کی بیوی ہیں۔“ یاسف نے گویا تعارف کرایا۔

”اور ان کا نام صنوبر ہے امگری بیگم!“ میں بول اٹھا۔ ”انہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔“

”وہ کس لئے؟ ہم کوئی تماشہ تو نہیں ہیں۔“ امگری نے اپنے شانوں پر پڑے ہوئے بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا دیا۔

”ہوا کرے آپ کا مرید ہم اسے اب یہاں مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لے چلا جائے یہاں سے!“

”لیکن یہ کوئی تو اسی کے نام ہے امغری بیگم!“

”تو آپ اسے میرے نام کرا دیں! مرید ہے آپ کا، منع تو نہیں کرے گا۔“

”میری نظر میں اس کا ایک حل ہے برکت علی شاہ!“ میں نے یاسف کو مخاطب کیا۔ ”کوئی کا یہ حصہ دوسرے حصے سے بالکل الگ ہے۔ اس حصے میں داخل ہونے کے لئے دوسرا دروازہ بھی موجود ہے۔ لان بھی الگ الگ دو ہیں۔ اگر درمیان میں دیوار اٹھ جائے تو دونوں حصے بہ آسانی علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ قمر احمد کی شادی بھی ہونے والی ہے۔ آج اگر ظفر کی وجہ سے جھگڑا ہے تو کل بقیس کو یہاں دیکھ کر امغری بیگم کے سینے پر سانپ لوٹیں گے۔“

”مقصود میاں! آپ نے پھر ہمارے لئے یہود زبان استعمال کی! اگر ہمیں پیر صاحب کا خیال نہ ہوتا تو اسی وقت آپ کو اپنے گھر سے نکال دیتے!“ شدید غصے کی وجہ سے امغری اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے اس طرح گھورنے لگی جیسے کچا چا جائے گی۔

”اپنے غصے پر قابو رکھو امغری بیگم! سکون سے بیٹھ جاؤ۔“ یاسف کے لہجے میں اب نرمی نہ رہی۔

”مقصود نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ اس کی تجویز مناسب ہے۔“

”ہم نے تجویز پر نہیں! ان صاحب کی زبان درازی پر تنقید کا اظہار کیا ہے۔ کیا انہیں باعزت اور محترم خواتین سے گفتگو کا سلیقہ نہیں آتا؟“

یاسف کے کہنے پر امغری بیٹھ گئی تو سوی پہلی مرتبہ امغری سے ہم کلام ہوئی۔ ”ان کی تو یہ عادت ہے۔ آپ برا نہ مانیں۔“

”جی ہاں! آپ بھی ٹھیک کہتی ہیں۔ کسی کی جان گئی اور ان کی ادا ٹھہری! شوہر ہیں یا یہ آپ کے اسی لئے حمایت لے رہی ہیں۔“ امغری جواب میں بولی۔

”ایسا کرتے ہیں امغری بیگم کہ آج ہی مزدوروں کو بلوا کر دیوار اٹھوا دیتے ہیں۔ کیا کہتی ہو تم؟“ یاسف نے امغری سے کہا۔

”جو آپ کی مرضی ہو کیجئے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ امغری نے کہہ دیا۔

”میں قمر احمد کو بلوا کر اس سے بھی کہہ دوں گا۔ نہ آئندہ تمہارا اس کا سامنا ہو گا، نہ اسے دیکھ کر ہمیں غصہ آئے گا۔“ یاسف نے یہ کہہ کر معاملہ نمٹا دیا۔

”ہماری موجودگی میں اسے نہ بلوایئے گا پیر صاحب! آپ کے علم میں ہے کہ اس پر نظر پڑے ہی ہمارا خون کھولنے لگتا ہے۔“

یاسف نے مسکرا کر سر ہلایا۔ میں نے چلنے کو کہا تو وہ بولا۔ ”اگر اجازت ہو تو ملنے آجائیں کسی وقت۔“

”ابھی نہیں۔ بقیس کو وداع ہو جانے دو۔ میں خود ہی تم سے ملنے آتا رہوں گا۔“ میں نے جواب

میں نے اس آدم زادی کو تپانے کے لئے کہہ دیا۔ ”صنوبر کو میں نے بتایا تھا کہ برکت علی شاہ آپ سے نکاح کرنے والا ہے۔ آپ نے عدت کے دن گزار دیے ہوں گے!“

”مقصود میاں! آپ کو ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت کی اجازت کس نے دی ہے؟“ امغری کا چہرہ غصے کی وجہ سے مزید سرخ ہو گیا۔

”آپ تو خفا ہو گئیں امغری بیگم! میں نے دوستی کے رشتے سے یہ بات کہہ دی تھی۔“ میں اسے چڑانے کے لئے مسکرائے لگا۔

”دوستی آپ کی پیر صاحب سے ہے، ہم سے نہیں۔ اور یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم نکاح کرنے والے ہیں؟“

”بے نکاحی عورت، مرد کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی اس حقیقت سے باخبر ہوں گی اور قمر احمد سے طلاق ملنے کے بعد برکت علی شاہ سے عقد ثانی کر لیں گی۔“

”ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ کیوں اس غم میں کھلے جا رہے ہیں! ہم کسی سے نکاح کریں نہ کریں، یہ اختیار ہمیں ہے۔ آپ بے نکاحی عورت کہہ کر ہماری توہین کر رہے ہیں! رہا قمر احمد تو ہم اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتے ہمیں تو اس پر حیرانی ہے کہ پیر صاحب ہماری بے عزتی پر خاموشی بیٹھے ہیں۔“ امغری بیگم نے یاسف کی طرف نگاہ اٹھائی۔

”مقصود کی باتوں کا برا نہ مانا کرو امغری بیگم! تمہارا اور اس کا رشتہ ہی ہنسی مذاق کا ہے۔ یہ تمہارا ہونے والا دہر ہے۔“ یاسف نے امغری کو نرمی سے سمجھایا۔

”ہم نہیں مانتے اس رشتے کو! مان نہ مان میں تیرا مہمان! یہ بھی خوب رہی!“ امغری کے لہجے میں حقارت تھی۔

”اچھا غصہ تھوک دو امغری بیگم! یہ بتاؤ کہ قمر احمد کو تم نے کیا دھمکی دی ہے؟“ یاسف نے پوچھ لیا۔

”ہمیں اندازہ تھا کہ آپ کے دوست کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرنے میں آئے ہوں گے۔ اس قمر احمد نے انہیں کوئی پٹی پڑھائی ہو گی!“

”اپنے پہلے شوہر کا نام اس نفرت کے ساتھ تو نہ لیں امغری بیگم! اس غریب نے ایک عمر آپ کے ناز اٹھائے ہیں۔“ میں بول اٹھا۔

”تم ذرا چپ رہو مقصود! مجھے بات کرنے دو۔“ یاسف نے مجھ سے کہا، پھر امغری سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بتاؤ، یہ کیا قصہ ہے؟“

”کوئی کا یہ حصہ قمر احمد کے تعارف میں نہیں۔ پھر اسے یا اس کے بیٹے کو ادھر آنے کی کیا پڑی ہے!“ امغری تنک کر بولی۔

”وہ ہمارا مرید بھی تو ہے، تم یہ کیوں بھول گئیں!“ یاسف اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ تعلق تو بہر حال برقرار ہے۔“

دیا اور سوی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اصغری نے اخلافا بھی سوی اور مجھ سے مزید رکنے یا خاطر داری کے لئے نہیں کہا۔

سوی کے ساتھ میں نشست گاہ سے نکلا تو یوسف بھی اٹھا۔ باہر آکر وہ سوی سے کہنے لگا۔ ”تُو نے اس آدم زاد کی کسی بات کا برا تو نہیں مانا؟“

”نہیں اے یوسف! علیائش پہلے ہی مجھے اس کی خود سری سے آگاہ کر چکا تھا۔ تُو کوئی خیال نہ کرا تجھ سے مل کر بہر حال مجھے بہت خوشی ہوئی، یوں لگا جیسے ایک مدت کی جان پہچان ہو۔ کم ہی جن زاد تیری طرح خوش مزاج ہوتے ہیں۔“ سوی جواباً بولی۔

یوسف ہم دونوں کو کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں اب قمر احمد کے معصوم بیٹے ظفر کی طرف سے مطمئن تھا کہ ظالم اصغری اس بچے کے لئے خطرہ نہیں بن سکے گی۔ ظفر سے مجھے اس لئے بھی انیت سی تھی کہ میں نے ہی اسے قمر احمد سے ملوایا تھا۔

وہ سارا دن ہم نے گھونٹے پھرنے میں گزار دیا۔ اس کے لئے ہم نے انسانی قالب نہیں چھوڑے، کیوں کہ ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ابھی ہم ساحل سمندر کی طرف نہیں گئے تھے۔ دن ڈھل گیا تو میں، سوی کو راجہ اور صائمہ سے بھی ملوایا۔ وہ دونوں کی سوی سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں رات کا کھانا کھانے بغیر نہ آنے دیا۔

اگلے روز میں نے بولٹن مارکیٹ کا ایک چکر بھی لگا لیا۔ اس علاقے کی حیثیت میرے لئے مرکزی سی تھی۔ میں یہیں سے ”مقصود میاں“ بنا تھا۔ سارے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میں کراچی واپس آ گیا ہوں۔ لوگوں سے میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جلد ہی حاجت مندوں کے لئے وقت مقرر کرنے والا ہوں۔ میرا مقصد یہی تھا کہ خلق خدا دوبارہ میرے پاس آنا شروع کر دے۔ ”مقصود میاں کا آستانہ“ پھر سے آباد ہو جائے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں زیادہ عرصے کراچی میں نہ رک سکوں گا۔

☆=====☆

کراچی آئے ہوئے مجھے پانچواں دن تھا۔ میں، سوی کو ساحل سمندر کی سیر کر کے لوٹ رہا تھا۔ واپسی میں ہمیں خاصی دیر ہو گئی اور اندھیرا پھیلنے لگا۔ واپسی کے لئے ہم نے ایک ٹیکسی کر لی تھی۔ ٹیکسی کی کچھل نشست پر ہم دونوں آرام سے بیٹھے ہوئے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔

”اے سوی! تجھے میکہ اچھا لگا کہ سسرال؟“ سوی سے میں نے عربی زبان میں سے یہ سوال کیا تاکہ ٹیکسی ڈرائیور ہماری باتیں نہ سمجھ سکے۔

”میکے سے تیرا مطلب ڈھاکہ اور سسرال شاید تُو اس شہر کراچی کو کہہ رہا ہے۔“ سوی بھی مسکرائی۔ ”دونوں اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔“

یہ سن کر میں کچھ کہنے ہی دالا تھا کہ تیزی کے ساتھ ایک کار ہماری ٹیکسی سے آگے نکل گئی۔ اسی کے تعاقب میں مجھے دوسری تیز رفتار کار دکھائی دی۔ پچھلی کار سے آگے جانے والی کار کے پچھلے ٹائر پر فائر

کیا گیا تو میں اچھل پڑا۔ اگلی کار کے بریک چرچرائے اور وہ سڑک کے کنارے رک گئی۔ ہماری ٹیکسی ان دونوں کاروں سے خاصی پیچھے رہ گئی تھی اس لئے میں نے کھڑکی سے وہ سارا منظر واضح طور پر دیکھا۔ اسکرٹ پہنے ہوئے ایک عورت اگلی کار سے اتری اور سڑک پر بھاگنے لگی۔ اسے کچلنے کے لئے تعاقب کرنے والی کار تیزی سے آگے بڑھی۔ سڑک پر بھاگنے والی عورت نے پلٹ کر کار کی طرف کئی فائر کئے۔ اس کے ہاتھ میں اب ریوالور تھا جو غالباً اس نے اپنے گم سان سے نکالا تھا۔ پھر وہ عورت سڑک سے اتر کر ایک جانب دوڑتی چلی گئی۔ ادھر مجھے کوئی آبادی نظر آئی۔ وہ عورت ذرا ہی دیر میں غائب ہو گئی۔

اس وقت تک ہماری ٹیکسی متعاقب کار کے قریب تک پہنچ گئی تھی۔ دیر اس لئے ہوئی کہ ٹیکسی ڈرائیور نے فائرنگ سے بچنے کے لئے ٹیکسی کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ میں بس ایک نظر اس کار میں سوار دونوں افراد کو دیکھ سکا۔ موٹے موٹے ہونٹوں والے وہ دونوں ہی سیاہ رو غیر ملکی تھے۔ ہماری ٹیکسی کے قریب آتے ہی انہوں نے تیزی سے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ میں نے دانستہ مداخلت نہیں کی، مگر ایک غلط سی میرے ذہن میں رہ گئی۔ وہ کار مجھے جانی پہچانی سی لگی تھی۔ اجنبی عورت کی چلائی ہوئی گولیوں سے اس کے وندھاسکرین کا ایک حصہ چٹکا چور ہوا تھا۔ وہ دونوں جیٹ پیج گئے تھے۔ ممکن ہے کار کی باڈی کو بھی کچھ نقصان پہنچا ہو، لیکن مجھے یہ دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔

اس واقعے سے میں یہی سمجھ سکا کہ جیٹ کسی سبب اجنبی عورت کو قتل کر دینا چاہتے تھے جس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اجنبی عورت بھی مجھے غیر ملکی ہی لگی تھی۔ ان جیٹیوں اور فرار ہو جانے والی عورت کے درمیان کیا دشمنی تھی، میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ عورت بھی میرے نزدیک چٹا پرزہ ہی تھی ورنہ اس کے پاس ریوالور نہ ہوتا۔ ان جیٹیوں کے چنگل سے بچ کر نکل جانا بھی اسی کا ثبوت تھا۔ اگر وہ عورت مجھے مظلوم معلوم ہوتی تو شاید میں خاموش تماشائی نہ بنا رہتا۔ بلا سبب آدم زادوں کے معاملات میں مداخلت میرا شیوہ نہیں تھا۔

اس پر سوی نے بھی اظہار اطمینان کے طور پر سرگوشی کی۔ ”تُو نے اچھا کیا اے علیائش کہ اس چکر میں نہیں پڑا۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے!“

اسی وقت ٹیکسی ڈرائیور پیش آنے والے اس سنسنی خیز واقعے پر تبصرہ کرنے لگا۔ ”اللہ نے بہت بچایا صاحب! اچھا ہوا کوئی گولی ٹیکسی کی طرف نہیں آئی معلوم نہیں کیسے کیسے خطرناک لوگ کراچی میں آکر بس گئے ہیں! وہ تو میں نے پہلی گولی چلتے ہی ٹیکسی کی رفتار کم کر دی تھی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا!“

ٹیکسی ڈرائیور کیوں کہ مجھی سے مخاطب تھا اس لئے میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کے بات ختم کر دی۔ میرا ذہن اب تک اس کار میں الجھا ہوا تھا کہ اسے میں نے کہاں اور کس کے پاس دیکھا ہے! میں نے یہ سوچ کر کہ ایک سے رنگ اور ماڈل کی بہت سی کاریں ہوتی ہیں، اس الجھن سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ کوٹھی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کئی افراد مجھے پوچھنے آئے تھے جو مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کبھی میرے زیر علاج رہ چکے تھے۔

حبیب دکان سے لوٹ آیا تو ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ چائے پیتے ہوئے حبیب کی بیوی بشیرن

نے بلیس کو کسی کام سے اندر بھیج دیا اور مجھ سے کہنے لگی۔ ”سرکار! اب آپ قراچہ صاحب سے بات کر لی لیں۔ کیوں بلیس کے ابا میں ٹھیک کہہ رہوں نا!“

”ایسی تھیں جلدی کیا ہے؟ سرکار جب مناسب سمجھیں گے بات ہو جائے گی۔“ حبیب نے کہا۔

”ہم تو خود ہی چاہتے ہیں حبیب کہ جلد از جلد اس فرض سے بیکدوش ہو جائیں۔ بشیرن نے تو ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ دراصل قراچہ کے کچھ مہمان باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اسی لئے بات نہیں چھیڑی۔ اسی روز وہ لوگ آنے والے تھے جب ہم قراچہ سے ملے تھے۔ ممکن ہے دو ایک دن میں وہ جانے والے ہوں۔ کل ہی جا کر پتا لگا لیتے ہیں۔ ویسے بھی قراچہ نے ان دنوں اپنے دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ اچھا ہے کہ اس دوران میں یہ کام بھی ہو جائے۔“ میں نے وعدہ کر لیا۔

سوی بھی بشیرن کی تائید میں بول اٹھی۔ ”بشیرن اسے دعائیں دینے لگی۔“ بیگم صاحبہ کو اللہ چاند سا بیٹا دے۔ سرکار کی طرح انہوں نے بھی بڑا نیک دل پایا ہے۔“

آئندہ روز میں اکیلا ہی قراچہ سے ملنے چل دیا۔ سوی کو میں کو بھی ہی میں چھوڑ گیا۔ نہیں جہاں کو یہ شکایت تھی کہ اسے اپنی ”منویر بائی“ سے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ سوی نے میرے ساتھ گھونٹے پھرنے کی وجہ سے کوٹھی میں کم ہی وقت گزارا تھا۔

میں جب قراچہ کی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوا تو کچھ ہی دور کھڑی ہوئی کار کو دیکھ کر میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا۔ کار کا دھڑا سکرین ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی پاؤں پر بھی دو ایک جگہ گولیوں کے نشان تھے۔ یہی وہ کار تھی جو میں نے گزشتہ رات غیر ملکی حبشیوں کے پاس دیکھی تھی۔ اس کار میں کئی دفعہ میں سفر کر چکا تھا۔

ذرا اور آگے بڑھ کر مجھے کوٹھی کے دونوں حصوں کے درمیان نو تعمیر دیوار بھی نظر آگئی۔ اس دیوار نے کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ میری ہی تجویز تھی، مگر اس وقت میرا ذہن کہیں اور تھا۔ صبح کے وقت میں اس لئے آیا تھا کہ قراچہ کہیں اپنے مہمانوں کو سپرد تفریح کرانے نہ نکل جائے۔ میری یہ توقع پوری ہوئی۔ قراچہ مجھے کوٹھی ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھے ہی میں نے پہلا سوال کار کے متعلق ہی کیا۔ ”کل رات تمہاری کار کس کے استعمال میں تھی قراچہ؟“

”حضور نے غالباً تشریف لاتے ہوئے کار کو دیکھا ہو گا۔ اس کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔“ قراچہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کسی قدر جھجک رہا تھا۔

”ہم نے تم سے جو سوال کیا ہے قراچہ، یہ اس کا جواب نہیں ہے۔ تم ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو، تمہیں اس خیال رکھنا چاہئے!“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے میں نرمی رکھی۔

”جج..... جی ہاں حضور! میں خود بھی اسی لئے پریشان تھا اور..... اور حضور سے کچھ کہتے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ مناسب سا نہیں لگا کہ اتنی سی بات کے لئے اپنے مہمانوں کو منع کر دوں۔ بعد میں احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

”مہمان؟..... تو کیا کل رات تمہارے مہمانوں کے استعمال میں تھی یہ کار؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

کر پوچھا۔

”جی ہاں حضور! کل ان کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ وہ اس شہر میں قطعی اجنبی ہیں، پھر بھی نہ جانے کن لوگوں نے ان پر اچانک فائرنگ کر دی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ کچھ مقامی لوگ ہی تھے جنہیں انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ مجھے تشویش یہ ہے کہ حضور کہ کسی نے کہیں میری کار کا نمبر نوٹ نہ کر لیا ہو۔ بہ ظاہر تو یہ رہزنی کی واردات معلوم ہوئی ہے کہ انہیں غیر ملکی جان کر کسی نے لوٹا چلا ہوا، لیکن ایسا لگتا نہیں۔ میں نے اپنے مہمانوں سے بھی اس سلسلے میں استفسار کیا تھا، پھر بھی مطمئن نہیں ہو سکا۔“ قراچہ نے بتایا۔

میں نے ان دونوں کے حلیے بیان کئے جنہیں گزشتہ شب قراچہ کی کار میں دیکھا تھا، پھر کہا۔ ”یہی حلیے ہیں تمہارے مہمانوں کے؟“

”جی نہیں حضور!“ قراچہ نے خلاف توقع جواب دیا۔ ”وہ دونوں تو صاف رنگ کے ہیں۔“

”کیا؟“ میں چونک اٹھا۔ ”لیکن تمہاری کار تو کل انہی حبشیوں کے پاس تھی جن کا میں نے حلیہ بیان کیا ہے۔“

”یہ..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے حضور؟“ قراچہ حیرت زدہ نظر آنے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ قراچہ کہ تمہارے مہمان اس وقت کوٹھی میں موجود ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ظلال بے وقاہرہ واپسی کے لیے اپنی نشستیں کفرم کرانے ایئر پورٹ گئے ہیں۔ ان کا ارادہ دونوں بعد واپسی کا ہے۔ نجیب المندس البتہ کوٹھی میں ہیں۔“

”تم نجیب ہی سے مجھے ملو دو، یہ معاہدہ بھی حل ہو جائے گا۔“ میں پُر یقین آواز میں بولا۔

”میں انہیں یہیں بلوائے لیتا ہوں حضور!“ قراچہ نے کہا اور پھر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں یہ تو بھول ہی گیا کہ نجیب صاحب اردو بالکل نہیں سمجھتے، میں خود چلا جاتا ہوں، کیوں کہ وہ ملازم کی بات نہیں سمجھ سکیں گے۔ انگریزی میں بھی وہ رک رک کے بات کرتے ہیں۔ عربی تیزی سے بولتے ہیں جو مجھے نہیں آتی۔ دونوں مہمانوں کو میں نے عربی ہی میں گفتگو کرتے سنا ہے۔ ابھی حاضر ہوا حضور!“ قراچہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

مجھے یہ معاملہ کچھ پراسرار سا لگا۔ قراچہ نے اپنی کار مہمانوں کو دی تھی تو وہ اجنبی حبشیوں کے پاس کس طرح پہنچ گئی؟ پھر انہوں نے قراچہ سے غلط بیانی کیوں کی کہ ان پر کچھ مقامی لوگوں نے فائرنگ کی تھی؟ امر واقعہ جب کہ یہ نہیں تھا۔

ذرا دیر کے بعد قراچہ جس شخص کے ساتھ نشست گاہ میں داخل ہوا، وہ درمیانے قد اور گھٹے اوڑھے جسم کا مالک تھا۔ چلیوں کی رنگت بھوری، رنگ صاف، ہونٹ پتلے پتلے، آنکھیں چھوٹی، سر کے بال انگریزی کٹے ہوئے اور اس کے جسم پر بھی انگریزی لباس تھا۔ قراچہ نے میرا تعارف کرایا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

وہ سامنے ہی موندنے پر بیٹھ گیا تو میں نے دانستہ اس سے عربی زبان میں گفتگو کی۔ ”میں نے جب یہ

شاہ کہ آپ قاہرہ سے تشریف لائے ہیں تو ملاقات کی خواہش پیدا ہو گئی، کیوں کہ عنقریب میرا ارادہ بھی قاہرہ جانے کا ہے۔“ میرے لیے میں شائستگی اور نرمی تھی۔

”ضرور ضرور! مجھے آپ کی میزبانی پر خوشی ہوگی مقصود میاں! یہ جان کر مزید مسرت ہوئی کہ آپ عربی زبان بڑی روانی سے بولتے ہیں۔“ اس کے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر سی کھنچ گئی اور بھوری آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی مجموعی شخصیت مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔

میں نے اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کی تو اچانک جھٹکا سا لگا اور میرے انسانی پیکر میں برقی روسی دوڑ گئی۔ اسی لمحے اس نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا۔ ایسا کوئی تجربہ مجھے اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ کسی آدم زاد کا ذہن پڑھنے میں ناکامی کے ساتھ جھٹکا لگنا اور برقی رو جسم میں دوڑ جانا میرے لئے قطعی نئی بات تھی۔ ابھی میں سنبھل نہیں پایا تھا کہ میرے ذہن میں نجیب کی آواز گونجنے لگی حالانکہ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔

واضح طور پر میں یہ الفاظ سن رہا تھا۔ ”معتز کے غلاموں کو چھیڑنے والے زندہ نہیں رہتے۔“ یہ الفاظ عربی زبان ہی میں تھے۔ ”آئندہ ایسی کوئی گستاخی تمہیں منگی پڑے گی۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی حد سے تجاوز نہ کرو۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ عین اسی لمحے نجیب اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر مجھے مخاطب کیا۔ ”آپ کو شاید آرام کی ضرورت ہے مقصود میاں! آپ کی پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ رات کو غالباً آپ سو نہیں سکے۔ پھر ملاقات ہوگی۔“ مجھ سے یہ کہہ کر وہ قراحمہ سے انگریزی میں بولا۔ ”میں کچھ ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا“ آپ کے کہنے پر فوراً چلا آیا ”اجازت دیجئے!“ وہ جانے کے لئے مڑنے لگا تو غنودگی کے باوجود میں نے اسے اپنی جتنی صفات کے زیر اثر لینا چاہا۔ وہ ایک دم اس طرح پلٹا جیسے کسی نے اس پر پیچھے سے وار کیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ہی تھی۔

میں نے اپنے ذہن میں پھر اس کی آواز گونجنی محسوس کی۔ ”تم کیوں ایسا کر رہے ہو؟ تمہارے اور میرے درمیان تو کبھی دشمنی نہیں رہی۔ باز آجاؤ! میں چاہوں تو تمہیں کسی حقیر کیڑے کی طرح مسل کر پھینک سکتا ہوں“ مگر تم کمزور ہو۔ میں عموماً کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ دوسری مرتبہ تمہیں معاف کر دیا ہوں۔ امید ہے کہ تم تیسری بار گستاخی کر کے اپنی موت کو دعوت نہیں دو گے۔“ یہ الفاظ میں نے خواب کے سے عالم میں سنے اور پھر کوشش کے باوجود اپنے ذہن کو غنودگی سے نہ بچا سکا۔

نجیب المہندس کو میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے قراحمہ کے ساتھ جاتے دیکھا۔ اس کے الفاظ مجھے کسی تیز فشر کی طرح محسوس ہوئے تھے۔

مجھے تو بس یہی لگا تھا کہ چند لمحوں کو میری آنکھ جھپکی ہو، لیکن جب جاگا تو شام ڈھل رہی تھی میں نشست گاہ کے صوفے ہی پر دراز تھا۔ میرے سوا وہاں اس وقت کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور نشست گاہ سے نکل آیا۔ سامنے لان میں مجھے قراحمہ نے اپنے بیٹے ظفر کے ساتھ کھیلنے

دکھائی دیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو پلٹتا ہوا قریب آگیا، کہنے لگا۔ ”حضور بیدار ہو گئے! کئی مرتبہ آواز دی“ پھر سوچا حضور شاید تھکے ہوئے ہیں اس لئے.....“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”نجیب کہاں ہے؟“ اپنے غصے پر میں قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ تو چلے گئے حضور!“ قراحمہ نے جواب دیا۔

”کہاں چلا گیا وہ؟“ میں اپنی آواز کو پست نہ رکھ سکا۔

میرے لیے میں سختی کے سبب قراحمہ سہم سا گیا، پھر بتانے لگا۔ ”وہ قاہرہ واپس چلے گئے۔“

”مگر کب اور کیوں؟“ انہیں تو دو روز بعد واپس جانا تھا! تھی نے تو بتایا تھا کہ نجیب کا ساتھی طلال بے ایئر پورٹ گیا ہے تاکہ سینیٹس کنفرم کر لے۔“ میں تھلا کر بولا۔

”جی ہاں حضور! پہلے ان کا یہی پروگرام تھا، لیکن انہیں آج ہی کی ایک فلائٹ مل گئی۔“ قراحمہ نے جواب دیا۔

سانپ گزر چکا تھا اور اپنے پیچھے ایک لکیر چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اسی لئے اپنے غصے پر قابو پایا۔ مجھے شک تھا کہ وہ دونوں دانستہ اور غلت میں فرار ہوئے ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے، میں ہی ہو سکتا تھا۔

میرے ذہن میں آیا کہ وقتی طور پر نجیب نے مجھے اسی لئے بے بس کیا ہو گا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ قراحمہ کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ”ظفر کو اندر بھیج دو اور میرے ساتھ آؤ۔“ میں ان لوگوں کے متعلق تم سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”بہت بہتر ہے حضور!“ قراحمہ یہ کہہ کر مڑ گیا اور اپنے بیٹے کو آواز دینے لگا۔

میں نے دیکھا کہ اب قراحمہ کی کار وہاں موجود نہیں تھی۔ جہاں صبح کھڑی نظر آئی تھی۔ نشست گاہ میں واپس آکر مجھے پھر وہ الفاظ یاد آنے لگے جو میرے ذہن میں گونجتے تھے۔ یہ بھی میرے لئے ایک نیا اور پراسرار تجربہ ہی تھا۔ قراحمہ واپس آگیا تو میں نے اس سے پہلے سوال کیا۔ ”آتے ہی طلال بے نے آج ہی کی کوئی فلائٹ مل جانے کے لئے کہہ دیا تھا یا پہلے نجیب سے اس کی بات ہوئی تھی؟ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں، ان باتوں کا جواب تمہیں سوچ سمجھ کر دینا ہے، کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا۔“

”جب طلال بے صاحب واپس آئے تو میں دوپہر کا کھانا کھا کر اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا۔“

قراحمہ تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دینے لگا۔ ”حضور اس وقت محو خواب تھے۔ ملازم نے مجھے آگرتایا کہ مہمان مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے پاس پہنچا تو وہ روائگی کے لئے تیار تھے۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی تو وہی جواب ملا جس سے میں حضور کو آگاہ کر چکا ہوں۔ میرے ملازم سے وہ ٹیکسی بھی منگوا چکے تھے۔ پھر انہوں نے سلمان ٹیکسی میں رکھوایا اور روانہ ہو گئے۔“

”کیا تم نے یہ محسوس کیا قراحمہ کہ انہیں جانے کی جلدی ہے؟“ میں نے معلوم کیا۔

”یہ تو وہ خود ہی بتا چکے تھے حضور کہ انہیں جلد از جلد ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔“ قراحمہ نے بتایا۔

میں نے یہ سن کر طویل سانس لیا، پھر دریافت کیا۔ ”تم نے انہیں کراچی کی سیر کرائی؟“
 ”صرف ایک دن۔ اس کے بعد انہوں نے کہہ دیا، اب ہم خود ہی گھوم پھر لیں گے۔ ان کے پاس کراچی شہر کا ایک نقشہ بھی تھا۔ روز وہ دونوں صبح ناشتا کر کے نکل جاتے اور پھر رات ہی کو لوٹتے۔ ان کی کوشش وہی ہوتی تھی حضور کہ وہ مجھے کم سے کم زحمت دیں۔ میں نے سوچا، اچھا ہے اس طرح مجھے آرام کا موقع مل رہا ہے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ لوگ واپس قاہرہ چلے جائیں تو حضور کا نیاز حاصل کروں۔“ یہ کہہ کر قمر احمد نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہے حضور؟.....“ آپ نے فرمایا تھا کہ گزشتہ رات میری کار ان کے استعمال میں نہیں تھی۔ وہ حبشیوں کے چلے بھی آپ نے بیان فرمائے تھے۔ نجیب صاحب سے تو ان حبشیوں کے متعلق آپ نے کچھ نہیں پوچھا۔“

”اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہمیں۔“ میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔
 قمر احمد نے جو بھی بتایا، اس کے سوا اسے اپنے پراسرار مہمانوں کے بارے میں کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر توجہ دے کر مجھے صرف ایک ہی اور نئی بات معلوم ہو سکی۔ وہ مجھے یہ بتانا بھول گیا تھا کہ کراچی کے نقشے پر ایک جگہ قلم سے دائرہ بنا ہوا تھا۔ اس دائرے سے ایک آبادی کی نشان دہی ہوتی تھی۔ یہ آبادی ساحل سمندر سے شہر کی طرف آتے ہوئے ایک جگہ تھی۔ مجھے یہ دہی آبادی معلوم ہوئی جہاں اس غیر ملکی عورت کو غائب ہوتے دیکھا تھا جسے حبشی قتل کر دینا چاہتے تھے۔
 میں سوچ رہا تھا کہ ان حبشیوں سے نجیب اور طلال کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اسی وقت قمر احمد بول اٹھا۔ ”حضور! میں نے بہ طور احتیاط فوری طور پر اپنی کار کو ضروری مرمت کے لئے گیراج بھیج دیا ہے۔ گیراج کا مالک میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ پھر بھی میں نے اسے تاکید کر دی ہے کہ کار کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتائے۔“

”اچھا کیا تم نے۔“ میں نے کہا۔ مجھے احساس تھا کہ صبح سے میں خلاف توقع غائب ہوں اور سوئی میری طرف سے فکر مند ہوگی۔ اس کے علاوہ جو عجب اور ہنگ آمیز واقعہ آج پیش آیا تھا، اس پر بھی مجھے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور و خوض کرنا تھا۔ قمر احمد سے آکر ملنے کی وجہ بھی مجھے یاد تھی۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے میں، قمر احمد سے بولا۔ ”کل اتوار ہے، چھٹی کا دن ہے۔ تم صبح نو دس بجے کے درمیان کوٹھی آجانا۔ حبیب موجود ہوگا، شادی کی تاریخ وغیرہ طے کر لینا۔“

قمر احمد نے سعادت مندی کے ساتھ اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”میں حاضر ہو جاؤں گا حضور!“
 چلنے سے پہلے مجھے ایک اور بات کا خیال آیا جسے میں نے دانتہ نظر انداز کر دیا تھا۔ نجیب نے خود ہی میری توہین کر کے دشمنی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پھر کسی دشمن کا تحفہ قبول کرنا، کیا معنی! قمر احمد کا ذہن پڑھ کر مجھے یہ بھی پتا چلا تھا۔ اسے میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ باتوں میں قمر احمد کو وہ تحفہ دینا یاد ہی نہیں رہا۔

جب میں اٹھنے لگا تو قمر احمد خود ہی چونک کر بول اٹھا۔ ”معاف کیجئے گا حضور، نجیب المندس آپ کے لئے ایک تحفہ دے گئے تھے۔ میں بھول ہی گیا، ابھی لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی قمر احمد اتنی تیزی

سے اندر چلا گیا کہ میں اسے نہ روک سکا۔

یوں مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے پراسرار دشمن کا تحفہ قبول کرنا پڑا۔ وہ تحفہ ایک کانڈ میں لپٹا ہوا تھا جسے میں نے قمر احمد کے سامنے کھول کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے اپنی کوٹھی پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ یاسف سے بھی نہیں ملا۔ چلتے وقت قمر احمد کو بھی میں نے تاکید کر دی کہ وہ اپنے حجرے سے میری آمد کا ذکر نہ کرے۔ بہت سی باتیں اس وقت میرے ذہن میں گزرتی رہی تھیں۔ دو سو برس پہلے میں اور یاسف قاہرہ گئے تھے۔ اس زمانے کی یادیں بھی ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ مقرر کون تھا، مجھے یہ بھی یاد آگیا تھا۔ نجیب نے خود کو اسی کے غلاموں میں سے ظاہر کیا تھا۔ ”مقرر کے غلاموں کو چھیننے والے زندہ نہیں رہتے۔“ یہ وہ الفاظ تھے کہ جو سب سے پہلے میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ میں انہی الفاظ پر غور کرتا ہوا قمر احمد کی کوٹھی سے نکل آیا۔

واپس آکر میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو سوئی بھی میرے ساتھ ہوئی۔ نفیس جہاں مجھے سلام کر کے چل گئی۔ اسی نے گیٹ کھولا تھا۔
 ”دروازہ بند کر دے۔“ میں نے اپنے ہاتھ سے دشمن کا تحفہ ایک طرف رکھتے ہوئے سوئی کو مخاطب کیا۔

سوئی دروازہ بند کر کے قریب آئی تو کہنے لگی۔ ”اے علیالیش! تو کچھ فکر مند سا لگتا ہے، کہاں وہ گیا تھا؟“

جو واقعہ مجھے پیش آیا، اس سے میں نے سوئی کو بے خبر نہیں رکھا۔ وہ بہر حال میری ہمد و دم ساز تھی۔ اب ہم دونوں کے دکھ اور سکھ ایک تھے۔

”بڑا ہی عجیب ہوا یہ تو؟“ سوئی بولی۔ ”تو نے ٹھیک ہی کہا تھا، علیالیش کہ زمین پر طرح طرح کے آدم زاد آباد ہیں۔ مجھے تو یہ نجیب المندس کوئی خطرناک آدم زاد معلوم ہوتا ہے کہ جس نے تجھے بے بس کر دیا۔“

”یہ تو خیر ظاہر ہے۔ اس پر بھی وہ میرے لئے ایک تحفہ دے گیا ہے۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کر کانڈ میں لپٹا ہوا تحفہ اٹھالیا۔

”دیکھ تو سہی کہ اس میں ہے کیا!“ سوئی نے پُر جنس آواز میں کہا۔

”میری مرضی تو نہیں تھی کہ یہ تحفہ قبول کرتا، مگر وہ جا چکا تھا۔ آج اگر قمر احمد یہ تحفہ نہ دیتا تو کل لے کر آجاتا۔“ میں نے یہ کہہ کر کانڈ کھولا۔

اندر سے چاندی کا ایک ڈبا برآمد ہوا۔ چمکتی ہوئی چاندی کے اس ڈبے کا ڈھکنا اٹھاتے ہی میں چونک اٹھا۔ ڈبے میں چند سونے کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ ابھی اڑ جائے گا۔ میں نے اسے ڈبے سے نکال لیا۔ اس کا وزن خاصا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو میرے چمک رہے تھے۔ ڈبے کے اندر ایک کارڈ بھی پڑا تھا۔ اس کارڈ پر عربی زبان میں چند سطرس لکھی ہوئی تھیں۔ میں انہیں پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ ”مقرر کے غلام تم سے دوستی چاہتے ہیں، دشمنی نہیں۔ یہ تحفہ اسی دوستی کا ثبوت ہے۔“

تمہارے اختیار میں ہے کہ دوستی کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تمام لو یا اسے جھٹک دو۔ ہم تمہیں نہ تو دوستی پر مجبور کرتے ہیں نہ دشمنی پر! اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم تمہیں بھول جائیں اور تم بھی ہمیں یاد نہ رکھو۔ تم ہمارے دوست ہو یا دشمن اس کا تعین آنے والا وقت کرے گا۔ اگر تمہیں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک بھی صورت قبول نہیں تو یہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ وقت سے بڑا انصاف کرنے والا کوئی اور نہیں۔“

یہ سطور سوی نے بھی پڑھیں، پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اگر وہ غیبت آدم زاد مجھے کسی حقیر کیڑے کی طرح مسل کر پھینک دینے کو نہ کہتا مجھے کزور کہہ کر میری توہین کا مرکب نہ ہوتا تو شاید میں اسے بھلا ہی دیتا اے سوی! اس نے شاید مجھے کوئی لالچی آدم زاد سمجھا ہو گا، جیسی اتنا قیمتی تحفہ دے کر گیا ہے۔ اسے یقیناً پتا نہ ہو گا کہ کسی جن زاد کی نظر میں ایسے کسی تحفے کی کوئی وقعت نہیں۔ میری جگہ اگر کوئی آدم زاد ہوتا یہ تحفہ ملنے کے بعد ان خبیثوں کا دوست بننا پسند کرتا۔ اس تحفے کی حیثیت رشتہ سے زیادہ نہیں۔ مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے راستے میں نہ آؤں۔“ میں کہتا رہا۔ ”ایک مرتبہ میں نے نجیب کا ذہن پڑھنا چاہا، دوسری بار یہ کوشش کی کہ اسے اپنے اثر میں لے لوں۔ نجیب نے اس سے یہ اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں پراسرار قوتوں کا مالک ہوں۔ وہ اسی لئے مجھ سے دوستی کا خواہش مند ہے۔ مجھے یہ تحفہ دے کر وہ..... مگر تحفے کے طور پر انہی کیوں؟..... مشرق میں یہ پرنسہ بے وقوفی کی نشانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں بے وقوف بنا قبول کر لوں!..... یہ طرز بھی تو ہو سکتا ہے، بڑا گہرا اور معنی خیز طرز!“ میں یہ کہہ کر سوچ میں پڑ گیا۔

چند لمحے بعد سوی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”حیرتی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے اے علیالیش کہ تو اس آدم زاد کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتا ہے کہ جس نے حیرتی توہین کی ہے اور تجھے حقیر جانا ہے۔ مجھے بھی اس پر بڑا غصہ ہے۔ لگتا ہے کہ اس نے حیرتی ہی نہیں، میری بھی توہین کی ہے۔ وہ بڑبولا آدم زاد یقیناً سزا کا مستحق ہے۔ وہ راہ سے بھٹکا ہوا لگتا ہے ورنہ خود کو بندہ خدا کے بجائے کسی مقرر کا غلام نہ کہتا۔ معلوم نہیں یہ مقرر کون ہے!“

”اے سوی! تو ان شیطانوں کے بارے میں صحیح اندازے لگا رہی ہے۔“ میں نے تصدیق کی۔ ”یقیناً وہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے آدم زاد ہیں۔ میں تجھے بتا چکا ہوں کہ اس سے دو سو سال پہلے بغداد اور قاہرہ گیا تھا۔ جیسی میں نے پہلی بار مقرر کا نام سنا تھا۔ یہ مصر کے فرعونوں میں سے ایک کا نام ہے۔“

حضرت موسیٰ کے زمانے میں بادشاہ مصر مصعب بن ریان تھا۔ فرعون اسی کا لقب تھا۔ مصعب کے بعد بھی مصر کے بادشاہ ہوئے انہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ یہی لقب لگانا شروع کر دیا۔ مقرر بھی مصر کے فرعونوں میں سے ایک تھا۔ قاہرہ میں آج بھی فرعون مقرر کا مقبرہ موجود ہے۔ ابرام مصر کا شمار دنیا کے قدیم ترین آثار میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مخصوص علاقہ ہے کہ جہاں فراغ مصر کے بہت سے مقابر ہیں۔ ان میں تین مقبرے سب سے بڑے ہیں۔ ان تینوں مقبروں میں بڑا مقبرہ فرعون خوفو کا ہے۔ اس کے

اندروں جانے کا راستہ بھی ہے۔ اس سے کچھ چھوٹا مقبرہ خوفو کے بیٹے فرعون خفرع کا ہے۔ خفرع کے مقبرے میں بھی جانا، ممکن ہے۔ اسی خفرع کا بیٹا، فرعون مقرر تھا۔ مقرر کا مقبرہ اپنے باپ اور دادا سے قدرے چھوٹا ہے۔ یہ تینوں مقبرے ترتیب سے ہیں ان فرعونوں نے دانستہ احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے چھوٹے مقبرے بنوائے ہیں۔ یہیں ابوالہول کا عظیم مجسمہ ہے جس کا جسم شیر کے جسم کی طرح ہے، چہرہ آدمی کا ہے۔ یہ مجسمہ تقریباً چالیس فٹ بلند ہے۔ تفصیل میں نے تجھے اس لئے بتائی اسے سونے کی تو سمجھ لے کہ یہ ہزاروں سال پہلے کی باتیں ہیں۔ اس زمانے میں خود کو مقرر کا غلام کہنے والے یقیناً بدی کے ہر کارے ہیں۔ یہ پراسرار شیطان زینا پر کیا کھیل کھیل رہے ہیں، ابھی ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ کیا خیراے سوی کہ اللہ ہمارے ہی ذریعے ان شیطانوں کو ختم کرنا چاہتا ہو! اس بد عقیدہ اور بھٹکے ہوئے گروہ کا مقصد کیا ہے، ہم نہیں جانتے۔ ہمیں تو اس ابھی ہوئی کشتی کا صرف ایک سرا ملا ہے۔ اسی ایک سرے کو پکڑ کر ہمیں آگے بڑھنا پڑے گا۔“

میرے خاموش ہوتے ہی سوی نے کہا۔ ”تو اے علیالیش، تو نے فیصلہ کر ہی لیا!“

”میرا ارادہ تو پہلے سے تھا اے سوی کہ تجھے بغداد یا قاہرہ لے کر چلوں گا۔ اللہ نے یہ سبیل پیدا کر دی۔ اسی کی ذات تو ہے جو ہمارے ارادوں کی سمت مقرر کرتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم ان شیطانوں کے پیچھے جانے سے پہلے کچھ سوالوں کے جواب حاصل کر لیں۔“

پھر میں اور سوی دیر تک ایک لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے۔ اس کا آغاز اسی رات کو میں نے اپنے تصور کی قوت سے کیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے صفحہ ذہن پر یکے بعد دیگرے ان جشیوں کے چہرے ابھر آئے کہ جنہیں صرف ایک نظر دیکھا تھا، پھر ارد گرد کا فضا بھی واضح ہوتا گیا۔ وہ ایک گندی اور نیم نائیک سی گلی تھی جس میں ایک جشی کو میں نے چونکا کھڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوا لور تھا۔ دوسرا جشی کسی بندر کی طرح ایک گندے پائپ پر چڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ مجھے کسی مکان کا عقبی حصہ معلوم ہوا۔ مکان دو منزلہ تھا۔ دوسرے جشی نے اس مکان کی پہلی منزل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ اپنے سر سے ایک ڈیڑھ فٹ اوپر نظر آنے والی کھڑکی پر اس نے نگاہ ڈالی۔ کھڑکی نیم دائی تھی۔ مدھم روشنی کی خفیف سی لکیر ادرہ کھلی کھڑکی سے باہر تک نظر آ رہی تھی۔ جشی نے اپنے لیے ہاتھ بڑھا کر اس کھڑکی کی چوکت پکڑ لی۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں پر زور دے کر اوپر اٹھنے لگا۔ میری چشم تصور اب اسی جشی پر جمی ہوئی تھی۔ گلی میں کھڑے ہوئے مسلح جشی کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ کھڑکی پر چڑھنے اور پھر اندر کودنے میں جشی نے انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔

اس کمرے میں دو بیڈ پڑے ہوئے تھے۔ ایک بیڈ پر کوئی محو خواب تھا۔ جشی نے اپنی جیب سے ریوا لور نکال لیا اور دبے پاؤں بیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ کمرے میں ہلکے نیلے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ پر خوابیدہ شخص کے قریب پہنچ کر جشی رکا۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھکا اور سونے والے کی پیشانی پر اپنے ریوا لور کی سیاہ نال رکھ کر غرایا۔ ”اٹھ جاموت کا فرشتہ تجھ تک پہنچ چکا ہے۔“ یہ الفاظ اس نے انگریزی میں کہے تھے۔

سوتے والے کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی۔

”آنکھیں کھول!..... بول ورنہ میں تیری کھوپڑی اڑا دوں گا!“ جشی دوبارہ سخت آواز دیا۔

بول۔

”خود بولتے نہیں۔“ کمرے میں ایک نسوانی آواز گونجی۔ انگریزی ہی میں ادا کئے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ ہی عقب سے رسی کا ایک پھندہ پھینکا گیا۔ اس سے پہلے کہ جشی سنبھل پاتا، ریشی رسی کا پھندہ سر سے پھلتا ہوا گردن تک آگیا۔

میں نے اس غیر ملکی عورت کو پہچان لیا جو جشی کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ عورت وہی تھی جسے جشی قتل کر دینا چاہتے تھے۔ ریشی رسی کا سرا اسی کے ہاتھ میں تھا۔ یقیناً وہ اسی کمرے میں کہیں چھپی ہوگی۔ اس کے جسم پر جست مغربی لباس تھا۔

جشی کی گردن میں رسی کا پھندا تنگ ہوا تو اس کے ہاتھ سے ریوالتور چھوٹ گیا۔ تنگ ہوتے پھندے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور زور آزمائی کرنے لگا۔

”اس غدار کو میں نے موت کی نیند سلا دیا“ کیوں کہ یہ مقرر کے غلاموں سے مل گیا تھا۔ اب تیری باری ہے۔ مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔“ عورت کی آواز بھرا بھری اس نے رسی کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔

جشی لڑکھایا، لیکن کرتے کرتے بھی پیچھے کی طرف جست بھری۔ اس سے رسی کا تھوڑا ختم ہو گیا۔ عین اسی لمحے عورت بھی اپنی جگہ سے اچھلی اور جیسے اڑتی ہوئی کمرے کے کھلے دروازے تک پہنچ گئی۔ جشی نے اپنی گردن سے پھندا نکالا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ عورت اب کمرے میں نہیں تھی۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جشی اپنا ریوالتور اٹھا کر تیزی سے پلٹا۔ ریوالتور جیب میں رکھتا ہوا وہ کھڑکی تک لپک کر پہنچا۔

جس طرح وہ جشی کمرے میں داخل ہوا تھا، اسی طرح کھڑکی سے باہر نکل گیا اور دیوار کی مگر پر پاؤں بجا دیئے۔ پائپ کے ذریعے گلی میں اتر کر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور بھاگنے لگا۔ دور کسی کا انجمن اشارت ہونے کی آواز آئی۔

جب وہ دونوں جشی بھاگتے ہوئے گلی سے سڑک پر آئے تو ایک کار کی عقبی سرخ لائٹ چپے انہیں منہ چڑا رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ کار اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب تک انہوں نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی موٹر سائیکل اشارت کی، کار کی سرخ ہی عتاب ہو چکی تھی۔

”وہ تو پھر بچ کر نکل گئی، اب ہوٹل واپس چلو!“ ایک جشی نے دوسرے سے کہا۔

”چوری کی اس موٹر سائیکل سے بھی تو جان چھڑوانی ہے۔“ دوسرا جشی پیچھے بٹھتے ہوئے بولا۔

”اسے کہیں ہوٹل کے قریب ہی چھوڑ دیں گے۔“ پہلے جشی نے مشورہ دیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں کیوں کہ ان جشیوں کو اس ہوٹل تک پہنچنے میں دیر لگتی جہاں

ٹھہرے ہوئے تھے۔

سوی مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولی۔ ”تو نے کیا دیکھا اے علیا لیش؟ وہ دونوں جشی کہاں ہیں؟“

”ابھی وہ اسی شہر میں ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”انہوں نے ابھی ذرا ہی دیر پہلے اس غیر ملکی عورت پر ایک اور ناکام قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“

”اگر ابھی وہ جشی اسی شہر میں موجود ہیں تو پھر طلال اور نجیب بھی بیٹھیں ہو سکتے ہیں۔ کیا خبر انہوں

نے قمر احمد سے جھوٹ بولا ہو کہ وہ قاہرہ واپس جا رہے ہیں۔“

”یہ امکان ہے اے سوی!“ میں بولا۔ ”لیکن ابھی میں‘ نجیب کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس شیطان سے

بعید نہیں کہ اسے معلوم ہو جائے، میں اس کی تلاش میں ہوں۔ پہلے ہم ان جشیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ پھر میں نے جو کچھ دیکھا تھا، سوی کو بتانے لگا۔

مجھ سے پوری روداد سن کر سوی نے کہا۔ ”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اے علیا لیش! نامعلوم

اجنبی عورت کا کوئی ساتھی اگر نجیب سے مل گیا تھا تو جشی بے خبر کیوں تھے؟ ہم نے یہی نتیجہ تو اخذ کیا تھا

کہ دونوں جشی‘ نجیب ہی کے آلہ کار ہیں!“

”اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ان جشیوں کو دانستہ نجیب نے کچھ نہ بتایا ہو۔“ میں نے

قیاس آرائی کی۔

”نجیب کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی ایک اور بھی صورت ہے اے علیا لیش! وہ اجنبی عورت جسے

نجیب قتل کر دینا چاہتا ہے، بہت کچھ جانتی ہوگی۔“

”تیرا مقصد یہ ہے کہ اے سوی کہ ہم اس عورت کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ یہ خیال مجھے بھی آیا

تھا، مگر ہم قدم بہ قدم آگے بڑھیں تو اچھا ہے۔“

سوی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ ہم دونوں اپنی خواب گاہ میں تھے۔

نصف شب کے قریب میں نے دوبارہ ان جشیوں کا تصور کیا۔ وہ دونوں اب ایک ہوٹل کے

کمرے میں تھے۔ صدر کا یہ وہی ہوٹل تھا جہاں سنیتا، مشرقی پاکستان روانگی سے قبل آخری بار ٹھہری تھی۔

مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔

آنکھیں کھولتے ہی میں، سوی سے بولا۔ ”میں نے پتا لگا لیا ہے کہ وہ جشی کہاں ٹھہرے ہیں! چل

ان کی خبر لیتے ہیں۔“

ہم نے انسانی قالب چھوڑ دیئے اور اپنی خواب گاہ سے نکل آئے۔ ہماری کوٹھی میں سناٹا چھاپا ہوا

تھا۔

چند ہی لمحے بعد ہم ان جشیوں تک پہنچ گئے۔ وہ ابھی سوئے نہیں تھے۔

”اس میں ہمارا کیا تصور جیس!“ ایک جشی دوسرے سے مخاطب تھا۔ عربی زبان میں وہ بات کر

رہے تھے۔ پہلی بار مجھے ان میں سے ایک کا نام معلوم ہوا۔ یہ اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا کہ وہ دونوں

بھی مصری ہیں۔ نام ہی سے عیسائی ہونے کا پتا چلا۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ میں تو خود آج رات مرتے مرتے بچا ہوں، مگر طلال بے کب کسی کی

سنتا ہے! میں نے تو اسے نجیب المندس کو بھی ڈانٹنے دیکھا ہے۔ ناکامی تو اسے قبول ہی نہیں۔ مہلت کی یہ آخری شب تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے رچڑ؟ طلال بے ہمیں معاف کر دے گا؟“ جیس نے اپنے ساتھی رچڑ سے سوال کیا۔

”سزا تو خیر ہمارا، امقدر ہے۔“ رچڑ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ نجیب کی سفارش پر سزا میں نرمی ہو جائے۔“

ان کی گفتگو پر مجھے حیرت ہوئی۔ نجیب کو وہ ثانوی حیثیت دے رہے تھے۔ گویا طلال بے کا درجہ نجیب سے بڑا تھا۔

جیس اور رچڑ کے ذہن پڑھنے سے پہلے میں نے ان کی باتیں سنیں۔ وہ آئندہ روز قاہرہ واپس جانے والے تھے۔ بہت سی باتیں ان کے ذہنوں میں جھانکے بغیر ہی معلوم ہو گئیں۔ اب وہ اس عورت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جسے قتل نہ کر سکے تھے۔

”نہو! جیسی پراسرار اور خطرناک عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں اسے کس طرح قبل از وقت خطرے کا احساس ہو جاتا ہے!“ جیس بولا۔

”وہ بڑی عجیب قوتوں کی مالک ہے۔ منقرع کے غلاموں سے مخالفت مول لے کر بھی وہ اب تک زندہ ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔“ رچڑ کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس عورت سے بہت مرعوب ہے، جیس نے جس کو پراسرار اور خطرناک کہا تھا۔ انجینی عورت کا نام نہوا تھا۔

”لیکن طلال بے نے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں بھی تو بہت کچھ سکھایا ہے ورنہ تو اب تک زندہ نہ ہوتے۔“

جیس کے یہ الفاظ سن کر میرے ذہن میں خطرے کی پہلی گھنٹی بجی۔ میں نے سوی کی طرف دیکھا۔ وہ پوری طرح چوکنہ تھی۔ پہلے میں نے جیس ہی کے ذہن کو گرفت میں لیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سے چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا جیس؟“ رچڑ اپنے بستر سے اٹھا۔

”یہ..... یہ شاید نہوا ہے جس نے میرے داغ کو جکڑ لیا ہے۔“ جیس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”گہراؤ مت اے میرے دوست! ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ حوصلہ رکھو، میں ابھی اس کا توڑ کئے دیتا ہوں۔“ رچڑ نے کہتا ہوا جیس کی طرف بڑھا۔

معاذ کے راستے میں سوی حائل ہو گئی۔ اس نے رچڑ کو اٹھا کر بستر پر اچھال دیا۔ سیاہ رو رچڑ کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔

جیس کا ذہن اب تک مزاحمت کر رہا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ اس کے ذہن پر میری گرفت سخت ہوئی گئی۔

”نہو! آج..... آج مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی رچڑ!“ یہ کہتے ہوئے جیس کی آنکھوں میں

سرخی اتر آئی۔ ”میرا داغ پٹنا جا رہا ہے۔“ اپنی اذیت کے سبب جیس کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھی پر کیا پر کیا گزر رہی ہے!

رچڑ کے موٹے موٹے بھدے ہونٹ جیسے ہی حرکت میں آئے، سوی نے اسے دبوچ لیا۔ وہ یقیناً سمجھ گئی تھی کہ رچڑ کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف ہے۔ تکلیف سے رچڑ چیخ اٹھا اور سوی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب جیس کے ذہن نے مزاحمت چھوڑ دی۔ اس پر قابو پالینے کے باوجود میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اچانک جو واقعہ رونما ہوا میری توقع کے برعکس تھا۔ میں نے خود کو بڑا ہی بے بس محسوس کیا۔

☆=====☆=====☆

اس حبشی جیس کا جسم آگے کی طرف جھٹکا چلا گیا۔ وہ بستر پر اوندھا گرا۔ اس کے منہ، ناک اور دونوں کانوں سے خون بہہ کر بستر پر پھیلنے لگا۔ میری بے بسی کا سبب یہ تھا کہ جیس نے جان دے دی اور میں اس سے کچھ معلوم نہ کر سکا۔ میں دوسرے حبشی رچڑ کی طرف پلٹا جسے سوی نے دبوچ رکھا تھا۔ سوی کو میں نے اشارہ کیا کہ وہ رچڑ کو چھوڑ دے۔ سوی الگ ہٹی تو رچڑ نے گہرے سانس لیے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مردہ ساتھی جیس کو دیکھنے لگا۔ اسے میں نے دھیمی اور نرم آواز میں مخاطب کیا۔

”رچڑ! تم یقیناً جیس کی طرح مرنا پسند نہیں کرو گے۔ بولو زندہ رہنا چاہتے ہو تم؟“

میری آواز سن کر وہ اچھل پڑا اور خوفزدہ نظروں سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا رچڑ!“ اس مرتبہ میری آواز میں قدرے سختی آگئی۔

”کک..... کون ہو تم؟ اور..... اور مجھے نظریوں نہیں آرہے؟“ رچڑ ہلکایا۔ اس کے

چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جیس کی غیر متوقع موت کی وجہ سے میں محتاط ہو گیا اور دوسرے حبشی کے ذہن کو گرفت میں نہیں لیا۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح موت کو گلے لگالیتا تو میں اندھیرے میں رہ جاتا۔ اسی غرض سے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

”میں کون ہوں؟ یہ جان کر تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا رچڑ! نظر اس لئے نہیں آ رہا کہ تم مجھے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکو گے۔ تمہارے دونوں سوالوں کے جواب مل چکے ہیں۔ تم اب مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے رچڑ! تم اسے کیوں گنونا چاہتے ہو؟ تم سے جو پوچھا جا رہا ہے، اگر بتا دو گے تو سمجھو کہ تمہیں زندہ رہنے دیا جائے گا ورنہ.....“ میں نے دانستہ اپنا آخری جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

رچڑ کے چہرے پر خوف کے سائے اور بھی گہرے ہو گئے۔ پھر اس کے موٹے بھدے ہونٹ ہلے۔ ”میں مر..... مرنا نہیں چاہتا..... تم..... تم شاید عظیم منقرع کے کسی باغی حواری کی روح ہو۔ اگر تم مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو..... جو بات معلوم ہوئی بتا دوں گا۔“

”تم میری پناہ میں کیوں آنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

ابھی سچ اور جھوٹ کی آزمائش ختم نہیں ہوئی جو مجھ سے ایسے سوال کئے جا رہے ہیں؟..... ہمیں تو

قاہرہ پہنچنے کے بعد ہی اگلا علم ملا کہ مقرر کے غلام ہم سے لب اور کہاں میں ہے؟ انہیں حقائق میں اب اس نتیجے پر پہنچنا جا رہا تھا کہ ان جشیوں کی حیثیت محض کھلونوں جیسی ہے۔ ”نجا کون ہے؟“ کا زیادہ علم نہیں۔ اس کے باوجود میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ میں نے پوچھا۔ ”نجا کون ہے؟“ اس سے مقرر کے غلاموں کو کیا دشمنی ہے؟“

اس سے مقرر کے علاموں کو یاد کی ہے۔
اس پر وہ ایک دم تقریباً چیخ اٹھا۔ ”تم کوئی اور ہو!..... تم کسی باغی حواری کی روح نہیں ہو! آزمائش کے بہانے تم مجھے دھوکا دے رہے ہو!..... اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا! تم تو پراسرار نچوڑ سے بھی واقف نہیں۔“ پھر وہ بڑبڑایا۔ ”اے مقرر کی عظیم روح! میری مدد کر! مجھے فریب سے بچا!“ اسی کے ساتھ اس نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

فریب سے بچا۔ اسی کے ساتھ اس کے رشتہ داروں میں اس کے بھائی کے بھتیجے کے لئے وہ عمل یقیناً چند الفاظ پر مشتمل ہو گا کیوں کہ ذرا ہی دیر میں اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ اپنی کوشش رانگاں ہونے پر میں بھجلا گیا۔ رچرڈ نے مجھے صرف ایک ہی نئی بات معلوم ہو سکی کہ وہ اور اس کا ساتھی قاہرہ کے بجائے بغداد سے پاکستان آئے تھے۔ اس کے علاوہ جو بھی گفتگو ہوئی، وہ میرے اندازوں کی تصدیق تھی۔

اب آخری قدم اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ آدم زاد زندہ رہتا کہ اپنے ساتھی کی طرح مر جاتا، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں رہی۔ جیسے کا حشر دیکھ کر اسے میں نے اپنی جناتی صفات کے اثر میں لینا چاہا۔ میں اگر اس کے ذہن کو گرفت میں لیتا تو وہ بھی یقیناً مزاحمت کرتا۔

وہ میرے اڑ میں تو آگیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر غفلت طاری ہو گئی۔

”یہ کیا ہوا اے علیایش؟ یہ تو ہوش کھو بیٹھا!“ سومی نے مجھے مخاطب کیا۔

”اے سوئی! پہلے کبھی ایسا ہوا تو نہیں۔“ میں بولا۔ ”لیکن اب جو نہ ہو جائے کم ہے۔ اس نے اپنی حفاظت کے لئے ہی کوئی عمل پڑھا ہوگا۔ یہ بے ہوشی اسی کا اثر لگتی ہے۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس بار شیطان صفت آدم زادوں کے ایک بڑے گروہ سے ہمارا واسطہ پڑا ہے، لیکن میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں۔“

”ہاں اے علیہ السلام، اللہ کی ذات سے ایسی کفر ہے۔“ سومی نے کہا۔

میں نے رچرڈ کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا اور اسے ہوش میں لے آیا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا اور

آ نکھیں کھول دیں۔

منقرع کے غلاموں ہی کے ساتھ تھی۔ پھر جانے کیوں وہ باغی ہو گئی اور منقرع کی عظیم روح نے اس کی موت کا حکم جاری کر دیا۔“

”مجھے اس کی خبر کیسے ہوئی؟“ میں نے سوال کیا۔

نڈھال سی آواز میں رچرڈ نے جواب دیا۔ ”طلال بے نے مجھے بتایا تھا۔ کیوں کہ منقرع کی روح

اس بے وقوف آدم کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے اپنی پناہ میں لینے کا یقین دلایا اور پہلا سوال کیا۔ ”طلال بے اور نجیب ابھی تک اسی شہر میں ہیں یا واپس قاہرہ چلے گئے؟“ محنتگو کرتے ہوئے میں پوری طرح چوکتا تھا کہ وہ کہیں کسی شیطانی عمل کا درد شروع نہ کر دے!

رچرڈ کے چہرے پر مجھے شدید حیرت نظر آئی۔ میرا سوال غالباً اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ چند لمحوں کے بعد آخر اس نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ مجھ سے زیادہ تو ہمیں ان کے بارے میں پتا ہو گا۔ تم سے بھلا کیا چھپا رہا سکتا ہے؟“

میں اس کی حیرت کا سبب سمجھ گیا۔ اس کے نزدیک منقرع کے کسی باغی حواری کی روح کو ایسی معمولی باتوں سے بے خبر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہی سوچ کر میں بولا۔ ”مجھ پر کیا ظاہر ہے اور کیا چھپا ہے“ اسے اپنے دماغ سے نکال دو۔ تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دیتے رہو۔ تمہیں کیا خبر کہ میں اس طرح پہلے تمہارے بچ اور جھوٹ کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں! اب یہ بتاؤ کہ وہ دونوں تم سے آخری بار کب ملے تھے؟“

رچڑ نے کسی قدر ہچکچا کر بتایا۔ ”کل رات کو نجیب ملا اور پھر صبح طلال ملنے آیا تھا۔“

”وہ کار اکی دوئوں میں سے کسی نے تمہارے حوالے کی ہوگی جو پرسوں تمہارے پاس تھی۔ اسی کار میں تم نے غور و فکر کیا اور اس پر فائدہ لیا کہ یہ خوب تقاضا تھا کہ جس طرح کے کام تم نے

کر دی۔" میں نے رچرڈ سے اپنے اندازوں کی تصدیق چاہی تو وہ اقرار میں سر ہلانے لگا۔ اس بار میں نے

معلوم کیا۔ ”تم دونوں طلال اور نجیب بی کے ساتھ قاہرہ سے یہاں آئے تھے؟ اسی کے ساتھ یہ بھی جواب دو کہ طلال تم سے کس لئے آیا؟“

”طلال نے ہمیں بتایا تھا کہ نجوا کہاں ٹھہری ہوئی ہے! آج رات اس نے نجوا کو ختم کرنے کا حکم دیا۔“

تھا۔ مقرر کے دونوں غلام یہاں کب آئے، ہمیں خبر نہیں۔ ہم تو تین دن پہلے یہاں پہنچے تھے۔ حکم کے مطابق ہمیں اس وقت ٹھہرنا تھا کہ ہمیں یہاں سے جاننا پڑے۔

کہ ہمیں بغداد سے یہاں کیوں طلب کیا گیا ہے! نجوا کے مارے میں ابھی انہی سے یہ حال کہ

یہاں ہے۔ پرسوں دوپہر کے بعد نجیب نے ہمیں آکر اطلاع دی کہ شام چھ بجے نجوا کلفٹن کے ساحل پر ہو

یہاں پر سحر ریمیں۔ چہ جب بجو ادہاں سے واپس ہو تو ہم اسے قتل کر دیں۔ وہی کار بھی ساتھ لایا
 گا۔ ہم نے.....“

”مجھے معلوم ہے کہ تم اسے قتل نہیں کر سکتے۔ وہ فرار ہو گئی۔“ میں بول اٹھا۔ ”آج رات بھی تم

سے بھاگے نہیں لگا سکے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں کو یہاں سے کل قاہرہ کے لئے روانہ ہونا

اس مرتبہ رچڑڈ پھر حیران سا دکھائی دیا۔ پھر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اے باغی حواری کی روح! کہا

صرف اپنے غلاموں سے سرگوشیاں کرتی ہے۔

”کیا تو متفرق کے غلاموں میں سے نہیں ہے؟“

میرے پوچھنے پر اس نے انکار کر دیا بولا۔ ”ہمیں تو اس کے غلاموں کا غلام ہونے کا اعزاز حاصل نہیں۔“

”تو نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ بغداد سے یہاں آیا ہے۔ کیا تیرا مستقل قیام بغداد ہی میں ہے؟ طلال اور نجیب بھی کیا وہیں رہتے ہیں؟“

میرے اثر میں رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا، پھر بھی جان نہ چھوڑی۔ خود اسی کا پڑھا ہوا عمل اس کے لئے وبال بن گیا تھا۔ سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس پر دوبارہ غشی طاری ہونے لگی تو پہلے کی طرح اسے میں نے جھنجھوڑ ڈالا کئی بار ایسا ہوا اور آخر کار اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ موت کی گمری نیند سو چکا تھا۔ مختلف سوالات کے نتیجے میں مرنے سے پہلے اس نے کچھ ہی نئی باتیں بتائیں۔ کمرے کی تلاشی لینے پر چھوٹی سے ایک ڈائری بھی ہمارے ہاتھ لگی۔ اس میں چند لوگوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبر درج تھے۔ اس ہوٹل سے ہم اپنی کوٹھی لوٹ آئے۔

”اب تیری تجویز پر بھی عمل کر ہی لیتا ہوں اے سوی!“ میں نے کہا اور نجوا کا تصور کیا۔

وہ مجھے کراچی ایئرپورٹ پر نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا اور شانے پر ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ عام مسافروں سے ہٹ کر وہ ایک الگ تھلگ جگہ بیٹھ گئی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں مسافر کشم وغیرہ سے فارغ ہو کر کسی فلائٹ کے انتظار میں بیٹھتے ہیں۔

بیٹھتی ہی اسے میں نے چوکتے دیکھا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگی۔ ”کون ہو تم؟ مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

یہ میرے لئے اتنی حیران کن بات تھی کہ تصور کا سلسلہ دھیان بیٹنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔

”تو نے آنکھیں کیوں کھول دیں اے علیالیش؟ کیا وہ تجھے دکھائی نہیں دی؟“ سوی نے مجھ سے

پوچھا۔

”اس پراسرار عورت نجوا کو جانے کس طرح پتا چل گیا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ تو بڑی ہی عجیب صورت حال ہے اے سوی! ایسے آدم زاد پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرے۔ نجیب کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ میں اس کے ذہن میں جھانکنا چاہتا ہوں۔ پھر جب اسے میں نے اسے اپنے اثر میں لینا چاہا تو

مجھے وہ لاعلم نہیں رہا۔ یہی معاملہ اس عورت کے ساتھ پیش آیا ہے۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اسے میں نے ایئرپورٹ پر دیکھا ہے۔“ پھر میں نے سوی کو یہ بھی بتا دیا کہ نجوا نے مجھ سے کیا کہا تھا۔

”میں تو سمجھتی ہوں اے علیالیش کہ نجیب اور طلال بھی یہاں سے چلے گئے ہوں گے۔ انہوں نے خطرے کی بوسنگھ لی ہے۔ یہ آدم زادی نجوا بھی پہلے انہی کی ساتھی رہ چکی ہے اس لئے کم خطرناک نہیں ہوگی۔ ان شیطانوں کے پیچھے جانے کے سوا اب کوئی راستہ نہیں رہا۔“

”یہ تو فوری طور پر ممکن نہیں اے سوی! تو جانتی ہے کہ ابھی بلیکس کا معاملہ بھی درپیش ہے، لیکن

نہر! میں یہ تو معلوم کر ہی لوں کہ نجوا کہاں جا رہی ہے!“

دوبارہ میں نے نجوا کا دھیان کیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے روانہ ہونے والی فلائٹ کا اعلان بھی سنا۔ وہ فلائٹ عراق کے دارالحکومت بغداد جا رہی تھی۔ پتے چلتے نجوا کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔

”تم جو کوئی بھی ہو، تمہیں اس پر بچھتا نا پڑے گا۔ اپنے راستے میں آنے والوں کو میں چلاتی ہوئی مگرر جاتی ہوں۔“ نجوا زیر لب یہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اس عورت نے بھی نجیب کی طرح میری عزت نفس کو مجروح کر دیا۔ آنکھیں کھول کر سوی کو میں نے اس خود سر آدم زادی کی سرکشی سے آگاہ کیا تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”یہ آدم زادی بھی معافی کے قابل نہیں اے علیالیش! نجیب ہو کہ نجوا ہمارے لئے دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ مشکل ہے کہ اس عورت سے ہمیں نجیب یا متفرق کے دوسرے غلاموں کا کوئی سراغ مل سکے۔ میرا اندازہ صحیح ثابت نہیں ہوا۔“

”ابھی کچھ کتنا قفل از وقت ہے اے سوی! حالات ابھی ہمارے قابو میں نہیں ہیں، لیکن شاید بغداد پہنچنے کے بعد صورت بدل جائے۔“

”ہاں اب تک کی ادھوری معلومات کا حاصل تو یہی ہے کہ پہلے ہمیں بغداد کا رخ کرنا پڑے گا۔“ سوی بولی۔

”چھوڑ اس قصے کو اور آ اب سو جا کہ آدمی سے زیادہ رات مگرر چکی ہے۔“ میں نے کہا اور سوی کو خود سے قریب تر کر لیا۔

☆=====☆=====☆

دوسرے دن جو وقت مقرر تھا، اس دوران میں قمر احمد آ گیا۔ حبیب اور اس کی بیوی کو قمر احمد کی آمد سے میں پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔

خاطر مدارات کے بعد میں نے یہ گفتگو چھیڑ دی۔ اس پر حبیب کی بیوی بشیرن کہنے لگی۔ ”حضور! چڑھتے چاند کی کوئی تاریخ ٹھیک رہے گی۔“

”چڑھتے اترتے چاند سے کوئی فرق نہیں پڑتا بشیرن!“ میں نے کہا۔ ”چاند کی تاریخوں کے حساب سے تو ابھی دس بارہ دن انتظار کرنا ہوگا۔ تم تو جلد سے جلد جو تاریخ نکاح کے لئے ممکن ہو، طے کر دو۔“

”سرکار کی یہی مرضی ہے تو مجھ بندی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ بشیرن یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔ ”بزرگوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ چڑھتا چاند مبارک ہوتا ہے، لیکن حضور کا حکم ہے اس لئے

چار دن بعد کی تاریخ رکھ لیں، جمعہ پڑے گا اس دن۔“

شادی کی تاریخ عموماً باہمی رضامندی سے مقرر ہوتی ہے، لیکن یہ وجہ لڑکی والوں کی رائے کو اس میں فوقیت دی جاتی ہے۔ میں اسی لئے مزید کچھ نہیں بولا۔ قمر احمد کو کیا اختلاف ہوتا، پھر بھی میں نے اسے مخاطب کر لیا۔ ”ٹھیک ہے نا قمر احمد؟“

”یہ بندہ عاجز حضور کے حکم سے باہر کب ہے! جو فٹا سرکار کا وہی اپنا۔“ قمر احمد نے جواب دیا۔

مروغیرہ کا معاملہ بھی میں نے اسی وقت نشا دیا۔ جتنے کی نماز کے بعد اسے برات لے کر آتا تھا۔ قر احمد خوش خوش داپس چلا گیا تو حبیب سے میں نے کہا۔ ”شادی کے تمام اخراجات ہم خود برداشت کریں گے۔ تمہیں اپنے پاس سے ایک پائی خرچ نہیں کرنی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم کچھ فکر مند ہو۔ ہمیں اس کی وجہ بھی معلوم ہے۔ تم نے کاروبار میں سارا پیسا لگا دیا ہے اور وقت مختصر ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ! تمہیں زیورات بنوانے کے لئے سونا دے دیں۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے سرکار!“ حبیب اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھ ناچیز کی گردن“ یہ احسان.....“

”تم پر ہم کوئی احسان نہیں کر رہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بلقیس جہاں جیسی تمہارے لئے ویسی ہمارے لئے“ یہ تو فرض ہے ہمارا۔“

حبیب سر جھکائے میرے ساتھ ہو لیا۔ میں اس طرح اپنی دانست میں ایک گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا جو میں نے نہیں میرے جن زاد دوست یاسف نے کیا تھا۔ دوستی کے ناتے یاسف سے میں نے جو رعایت کی تھی اس کا بوجھ اب تک میرے ضمیر پر تھا۔ نشست گاہ سے اپنے کمرے میں آکر حبیب کو میں نے سونا دیا اور خاصی بڑی رقم بھی حوالے کی۔ اس سے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ قرض حسد نہیں ہے۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اسی روز سے میں نے حاجت مندوں کے لئے دوپہر سے شام عصر تک کا وقت بھی مقرر کر دیا۔ ضرورت مند تو صبح سے شام تک آنے لگے تھے۔ نشست کا وقت مقرر ہو جانے پر بھی نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے ابھی پانچ چھ دن کراچی ہی میں گزارنے تھے۔ اس عرصے میں خلق خدا کی خدمت کرنا میرے لئے ممکن تھا۔ سوئی نے بھی اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اس لئے بھی خاصی بھیڑ ہو گئی۔ میری خصوصی توجہ ایسے آدم زادوں کی طرف تھی کہ جنہیں مالی مشکلات درپیش تھیں۔

حسب دستور پہلے عورتوں نے باری باری میری چوکی کے آگے آکر بیٹھنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں درمیانی عمر کی ایک عورت حزن و ملال کی تصویر بنی ہوئی میرے سامنے آ بیٹھی۔ وہ دھیمی اور دکھی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”سرکار کے آستانے پر آتے ہوئے مجھے کافی دن ہو گئے۔ پہلے معلوم ہوا سرکار کہیں شہر سے باہر تشریف لے گئے ہیں، پھر پتا چلا کہ لوٹ آئے ہیں اور جلد ہی.....“

”ہم جانتے ہیں نیرہ کہ تم کس عذاب میں گرفتار ہو۔“ میں بول اٹھا۔ ”ایک حادثے میں تمہارے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ تم بیوہ ہو اور تمہارے پانچ بچے ہیں۔ لڑکیاں بڑی ہیں۔ ایک بیٹا ہے جو ابھی چھوٹا اور کمانے کے قابل نہیں۔ لوگوں کے گھروں کا کام کاج کر کے تم بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بچوں کا بیٹ بھرتی ہو۔ ایسے میں بھلا تم وہ قرض کہاں سے ادا کر سکتی ہو جو تمہارے مرحوم شوہر نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے لیا تھا! بولو! تم اسی قرض کی ادائیگی کے سبب پریشان ہو؟ جن لوگوں نے قرض دیا تھا وہ تم پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ مکان بیچ کے ان کا قرض ادا کر دو۔“

”جی ہاں حضور!“ وہ آدم زادی بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”سرکار سے میں قرض کی ادائیگی

کے لئے کوئی وظیفہ معلوم کرنے آئی ہوں۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ پڑھنے کو بتا دیں کہ قرض ادا ہو جائے اور بچوں کے ساتھ گھر سے بے گھر نہ ہونا پڑے۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ سرکار دلوں کا حال جان لیتے ہیں۔“

”اللہ نے تمہارے لئے ہمیں وسیلہ بنا دیا نیرہ! تمہیں کسی وظیفے کی نہیں، فوری مالی امداد کی ضرورت ہے۔ ہمارے آستانے سے تم خالی ہاتھ نہیں جاؤ گی۔“ یہ کہتے ہی میں نے دایاں ہاتھ بلند کیا اور بولا۔ ”نیرہ کا حصہ اسے دے دو!“

سوئی کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اسے ظاہر ہوئے بغیر میرا ہاتھ بیٹانا ہے۔ اس نے چند ہی لمحوں کے بعد بڑے نوٹوں کی غٹی گڈیاں نیرہ کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں۔ وہاں موجود سبھی آدم زادوں نے یہ منظر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔

”نیرہ! نوٹوں کی گڈیاں اپنی چادر میں بھر لو۔ ہو سکے تو ہمارے لئے دعائے خیر کرنا۔“ میں نے اس معیت زدہ آدم زادی سے کہا۔

وہ اس طرح چونک اٹھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

”حضور کے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کرو!“ کسی طرف سے آواز آئی۔

اس بیوہ عورت نیرہ نے مشینی انداز میں نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ لیں اور خوفزدہ سی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں نیرہ!“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”تم سے کوئی یہ رقم نہیں چھین سکتا، کیوں کہ تم ہماری امان میں ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے مردوں کے حصے کی طرف نگاہ اٹھائی اور ایک شخص ضمیر علی کا نام لے کر اسے بلایا۔ وہ پہلی بار میرے پاس آیا تھا۔

”جی حضور! فرمائیے میرے لئے کیا حکم ہے؟“ ضمیر علی کے لہجے سے میرے لئے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”تمہارے پاس کار ہے ضمیر علی! تم نیرہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ، کیوں کہ یہ اکیلی آئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری والدہ دے کی مریضہ ہیں۔ تم ان کے لئے ہم سے نسخہ لکھوانے آئے ہو۔ سو تمہارا کام بھی کئے دیتے ہیں۔ پھر میں نے نسخہ لکھ کر ضمیر علی کو تمہارا اور ضروری ہدایات بھی دے دیں۔ نیرہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی ضمیر علی کے ساتھ چلی گئی۔ اسی وقت چند افراد ایک نوجوان لڑکی کو پکڑ کر ہال کمرے میں داخل ہوئے وہ لڑکی جس کی عمر بیس بائیس برس معلوم ہوتی تھی، ان لوگوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھی جو اسے لے کر آئے تھے۔ لڑکی کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ گرفت سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔

”چھوڑ دو اسے!“ میں نے اس لڑکی کو لانے والوں کو مخاطب کیا۔ ”یہ خود چل کر ہمارے پاس آئے گی۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس لڑکی جسم کو اپنے اثر میں لے لیا، پھر بارعب آواز میں اسے حکم دیا۔ ”نیم! یہاں سکون سے آکر ہمارے سامنے بیٹھ جاؤ!“

اس عرصے میں نسیم کو چھوڑ دیا گیا اور وہ مجھے خوفناک انداز میں گھورتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر کھردروں کے نشان تھے، ہاتھوں کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ ناخنوں میں میل بھرا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس بھی میلا اور جگہ سے جگہ سے پھٹا ہوا نظر آیا۔

”چادر لاؤ اور اسے اڑھا دو!“ میں نے وہیں موجود سولی کو مخاطب کیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ ایک چادر ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور نسیم کے جسم سے لپٹ گئی۔ نسیم کے جسم کے حوصے کھلے ہوئے تھے، اس سے ڈھک گئے۔ اس کے ساتھ آنے والے تینوں افراد ایک طرف دو زانو بیٹھ گئے۔

”یہ بچی کیوں کہ ہماری فوری توجہ کی مستحق ہے، اس لئے ہم پہلے اسے دیکھیں گے۔“ میں نے کمرے میں موجود افراد سے کہا۔

”بہتر ہے، بہتر ہے سرکار!“ کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

میں نے لڑکی کی طرف نگاہ اٹھائی تو چونک اٹھا۔ اس کی گردن پر بڑی سختی کے ساتھ ایک پٹی بندھی تھی۔ اسی پٹی کے سامنے والے رخ پر ایک جگہ ابھار تھا۔ اسے لانے والوں میں ایک اس کا باپ تھا، ایک ماموں اور ایک چچا۔ میں نے اس کے باپ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”بچی کے گلے سے یہ تعویذ کھول دو!“ میں بولا۔

”سرکار! اس پر جنت کا سایہ ہے۔ جن شاہ صاحب نے یہ تعویذ دیا تھا، ہدایت کی تھی کہ کسی حال میں نسیم کو یہ تعویذ نہ کھولنے دیا جائے۔“ نسیم کا باپ بتانے لگا۔ ”اگر یہ تعویذ کھل گیا تو نسیم کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ شاہ صاحب نے خود اپنے دست مبارک سے یہ تعویذ باندھا تھا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ نسیم اگر تعویذ کھولنے کی کوشش کرے تو سمجھ لینا کہ یقیناً یہ جنت کے اثر میں ہے۔ پھر یہی ہوا سرکار! نسیم بار بار یہ تعویذ کھولنا چاہتی ہے اور ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیتے۔ اس کے لئے ہمیں دن رات نسیم کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ اس کی جان تو بچانی ہے نا حضور! دوسری ہدایت شاہ صاحب نے یہ دی تھی کہ چالیس دن تک نسیم کو نمائے نہ دیا جائے۔ ایک مہینہ ہونے کو آیا، مگر اب تک کوئی فرق نہیں پڑا۔ روز ہم اسے شاہ صاحب کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ اسے دھونی دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کا فرمانا یہ ہے کہ اس طرح تنگ آکر جنت، نسیم کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ پوری بات سنی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں موجود دوسرے لوگ بھی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور روحانی علاج کرنے والے ایسے جعل سازوں سے بچ کر رہیں۔ جب وہ شخص اپنی بات پوری کر چکا تو میں بولا۔ ”تو اس طرح تم نے خود اپنی ہی بنی بنی کو اس حال تک پہنچا دیا۔ تمہاری عقل میں اتنی سی بات نہیں آئی اللہ کے بندے کہ کسی کی بھی گردن اتنی سختی سے باندھ دی جائے تو وہ یہی کوشش کرے گا کہ پٹی کھول دے! روز دھونی دی جائے گی تو پسینے آئیں گے، گرمی لگے گی اور نمائے کی خواہش ہوگی۔ تمہوڑے سے پیسے بنانے کے لئے اس ظالم اور جعل ساز پیر نے تمہاری بنی کے ذہنی مرض کو انتہا پر پہنچا دیا۔ اللہ کا تم پر خاص کرم ہے کہ بچی کو یہاں لے آئے۔ جوانی کی حد میں

قدم رکھنے کے بعد جسمانی ساخت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی ایسی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں جو براہ راست ذہن کو متاثر کر دیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر لڑکی ایسی کسی بیماری کا شکار ہو جائے۔ کم علمی کی وجہ سے اکثر لوگ اسے جنت کا اثر سمجھ لیتے ہیں اور جعلی پیروں کے پتھر میں پھنس جاتے ہیں۔ چاہئے یہ کہ کسی اچھے طبیب سے اس کا علاج کرایا جائے۔ یہ بچی بھی ایسے ہی ایک مرض میں مبتلا ہے۔“

یہ کہتے ہی میں نے سولی کو مخاطب کیا۔ ”اس مظلوم لڑکی کی گردن سے پٹی کھول دو!“

سولی نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور وہ لڑکی کمرے سے سانس لینے لگی۔ اسے ایک عذاب سے نجات مل گئی تھی۔ لوگوں نے بڑی حیرت سے ”خود بہ خود“ پٹی کھلتے دیکھی۔

نسیم کے باپ سے میں نے کہا۔ ”ہم تمہیں جو نسخہ لکھ کر دے رہے ہیں انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اس سے افادہ ہو جائے گا۔ کوشش کرنا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دو۔ ایک مہینے سے تم نے اسے نمائے نہیں دیا۔ سوا ب تم اسے نہیں روکو گے۔ دوا اسے پابندی کے ساتھ تینوں وقت پلائی ہے، خواہ اس کے لئے تمہیں جبر کرنا پڑے۔ دو دن دوا پیتے گزر گئے تو زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ سن لو کہ ہزاروں انسانوں میں سے کبھی کوئی ایک جنت سے ظلم کا شکار ہوتا ہے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور جنت، آدمی سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ ہمارے نسخے کی پہلی تین خوراکیوں کے بعد اللہ نے چاہا تو بچی کو باندھ کر نہیں رکھنا پڑے گا۔“ پھر میں نسخہ لکھنے لگا۔ اس دوران میں نسیم سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اسے میں نے ابھی تک اپنے اثر سے آزاد نہیں کیا تھا۔

نسخہ لکھ کر میں نے لڑکی کے باپ کو دیا تو وہ اظہار عقیدت میں میرے ہاتھ چومنے آگے بڑھا۔

اسے میں نے ایسا کرنے سے روک دیا اور بولا۔ ”ہم ان خلاف شرع باتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ سب انسان اللہ کی نظر میں برابر ہیں۔ کسی کو بھی دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے پاس پہلی مرتبہ آئے ہو اس لئے تمہاری لاعلمی کی وجہ سے ہم درگزر کرتے ہیں۔ یہاں سے باہر نکلنے تک نسیم اسی طرح پرسکون رہے گی۔ پھر تم اسے جس طرح یہاں تک لے کر آئے تھے، گھر واپس چلے جانا۔ خدا حافظ!“ یہ کہہ کر میں نے سولی کی طرف دیکھا۔

سولی سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں! نسیم کو اس نے اپنے اثر میں لے لیا اور کوشی کے باہر تک چھوڑنے چلی گئی۔

وہ لڑکی جسے بڑی مشکل سے تین آدمی پکڑ کر لائے تھے، آرام سے خود اپنے پیروں پر چل کر کمرے سے نکل گئی۔

”حق ہے..... حق ہے!“ میرے کسی عقیدت مند نے نعرہ لگایا۔

حاجی صاحب اور ڈی آئی جی تحسین خان کو بھی کہیں سے خبر ہو گئی تھی کہ آج سے میں نے نفست کا اہتمام کیا ہے۔ وہ دونوں بھی آج پہلے سے زیادہ حیران دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا سبب سولی تھی۔ پہلے میں اکیلا تھا۔ اب سولی بھی میرے ساتھ تھی۔ یوں مجھے اپنے ”کلمات“ کے اظہار کا زیادہ موقع مل رہا تھا۔

اسی عرصے میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک ایک کر کے عورتیں چلی گئیں تو مردوں کی باری آئی۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو اپنی یا اپنے لواحقین کی صحت یابی کی خوش خبری دینے اور میرا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ پہلے انہی کو میں نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ وہ اللہ کے حضور شکرانے کے نفل پڑھیں۔ پھر ذرا بیہوش ہوئی تو مجھے ان آدم زادوں کا خیال آیا جو تنگ دست تھے۔ میں نے ان پر توجہ کی اور نام بہ نام انہیں پکارنے لگا۔

میرے ایما پر ساری کپڑے کے ایک بڑے تھیلے میں سونے کی نکلیاں بھر کے لے آئی۔ ان لوگوں سے کچھ پوچھے بغیر میں ایک ایک مٹھی سونا تقسیم کرنے لگا۔ یہ وہی سونا تھا جو میں نے ایک غدار وطن زمیندار وحید الزمان سے چھینا تھا۔ خاصا سونا کرنسی میں تبدیل کرنے کے باوجود اب بھی میرے پاس تھا۔ اس کام میں نے بھی مصروف سوچا تھا۔

”جاؤ اور اللہ کا نام لے کر اس سے کوئی کاروبار شروع کرو! نیت اچھی رکھو گے تو اللہ کاروبار میں برکت دے گا۔“ میں نے ان لوگوں کو مخاطب کیا۔

وہ سب حیران پریشان سے کبھی سونے کی نکلیوں کو دیکھتے اور کبھی میری طرف نگاہ اٹھاتے۔ مٹھی بھر سونا بہر حال کم نہیں تھا۔

ان میں سے ایک آدمی کسی قدر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”حضور! اگر ہم سے کسی نے پوچھا کہ ہمارے پاس یہ سونا کہاں سے آیا تو کیا جواب دیں گے؟“

”جہاں سے آیا ہے، بتا دینا! اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ اسی نشست میں پولیس کے ایک بڑے ذمے دار افسر بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم انہی کے سامنے تم لوگوں کو یہ سونا دے رہے ہیں۔ تم پر چوری یا ڈاکے ڈالنے کا الزام نہیں لگے گا۔ پھر بھی کوئی تمہیں تنگ کرے تو ہمارے پاس آجانا۔ ابھی ہم اسی شہر میں ہیں۔“ میرے اطمینان دلانے پر وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے تو ایک شخص روتا ہوا میری چوکی کے آگے آ بیٹھا۔

”سرکار! مجھ غریب کو تو بھول ہی گئے۔“ وہ گڑگڑایا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ بغیر پکارے تم کیوں آئے؟“ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ شخص ایک نو سرباز تھا۔ ایسے لوگ مختلف خیلے بہانوں سے دوسروں کو دھوکا دے کر لوٹ لیتے ہیں۔ مجھے اس کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی۔ اس نے مجھے مٹھی بھر کر سونا بانٹنے دیکھا تو اندر کا شیطان جاگ اٹھا حالانکہ وہ ایک اور کام سے میرے پاس آیا تھا۔ وہ کام بھی جائز نہیں تھا۔ وہ فراڈ کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا۔ اس کے ذہن میں پر توجہ دینے سے مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئیں۔ ڈانٹ کھا کر اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں اور کہنے لگا۔ ”سات بیٹیاں ہیں میری جن کی شادی.....“

”بکواس نہ کر! بد بخت تو نے تو شادی ہی نہیں کی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی تجھے یہ خیال نہ آیا کہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکے گا۔ مال دیکھ کر تیری بھی رال ٹپک گئی! حرام کی کمانی پر گزارا کرتا ہے لعنتی شخص! کسی کو روک کر دھوکا دیتا ہے، کسی کو دھمکی دے کر لوٹتا ہے۔ کیا تجھے یہ احساس

نہیں کہ خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔“

اس پر وہ فریبنہ گھبرا کر جیسے چوڑی بھول گیا۔ آنسو پونچھ کر وہ مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ ”نہیں، تجھے معافی نہیں ملے گی۔ تو ظالم ہے اور تجھے خلق خدا کو عذاب میں گرفتار کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینا ظلم ہے۔ پولیس نے تجھ پر فراڈ کا ایک کیس بنایا ہے، لیکن دفعہ چار سو میں کے تحت تیرے اوپر تو متعدد کیس چلے چائیں۔ تیری سزا یہ ہے کہ خود تھانے جا کر اپنے جرائم کی تفصیل بیان کرے گا۔ اٹھ!“ میں نے یہ کہتے ہی اسے اپنے اثر میں لے لیا۔ اب میں اسے جو حکم دیتا، وہ اسی پر عمل کرتا۔ پہلے بھی میں اکثر مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر چکا تھا۔

وہ نو سرباز میرا حکم سننے ہی اٹھا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد باری باری لوگ میرے پاس آتے رہے۔ انہی میں سے ایک آدمی نے مجھ سے فریاد کی۔ ”خاندانی دشمنی کے سبب میرے چھوٹے جوان بھائی کو جن لوگوں نے قتل کر دیا ہے، وہ فرار ہو گئے ہیں۔ پولیس ان کا سراغ نہیں لگا سکی۔ حضور کے آستانے پر میں نے اس لئے حاضری دی ہے کہ اب مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ سرکار میری مدد کریں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ خدا نخواستہ وہ یتیم ہو گئے تو کوئی ان کے سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں ہو گا۔“

وہ آدمی بچ بول رہا ہے، یہ جان کر میں نے اسے تسلی دی اور بولا۔ ”کیا تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کی تصویریں ہمیں لا کر دکھا دو جو قتل کے بعد روپوش ہو گئے ہیں؟ وہ تمہارے خاندان ہی کے لوگ ہیں، کہیں نہ کہیں سے یقیناً تمہیں ان کی تصویریں مل جائیں گی۔“

”میں کوشش کروں گا حضور!“ اس آدمی نے جواب دیا۔

تو پھر کل تصویریں لے کر آجانا۔ ہم بتا دیں گے کہ وہ قاتل کہاں چھپے ہوئے ہیں! تم پولیس کو اس سے آگاہ کر دینا۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی بہن کے رشتے میں تم نے جلد بازی سے کام لیا ورنہ دشمنی کی بنیاد نہ پڑتی۔ اس کے باوجود کسی کو بھی قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تمہیں اگر ان قاتلوں کی تصویریں نہ بھی ملیں تو پریشان نہ ہونا اور کل ہمارے پاس ضرور آنا۔ ہم نے ان کے نام اور خیلے معلوم کر لئے ہیں، انشاء اللہ وہ گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔“

وہ آدمی آئندہ روز حاضری دینے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ شام تک یہی گھما گھمی رہی۔ لوگ آتے رہے اور میں ان کے دکھوں کا حتی الامکان مداہد کرتا رہا۔ نشست کا وقت ختم ہو گیا تو میرے پاس وہی لوگ رہ گئے جو پرانے شناسا تھے۔ حاجی صاحب کہنے لگے۔ ”مقصود میاں! مجھے تم سے علیحدگی میں کچھ کہنا ہے۔“

”ضرور حاجی صاحب! جب تک چائے وغیرہ پیجئے، کافی عرصے کے بعد آپ کے نیاز حاصل ہوئے ہیں۔“ میں بولا۔

ذرا ہی دیر میں سوئی وہاں موجود افراد کے لئے چائے اور پھل رکھ گئی۔

”گلتا ہے کہ حضور کا درجہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے کچھ اور بلند کر دیا ہے۔“ تحسین خان نے

مرعوب ہو کر کہا۔ ”سرکار کے آستانے پر میں پہلے بھی حاضر ہوتا رہا ہوں، مگر آج کی نشست نے تو حیران کر دیا۔ ادھر حضور نے کچھ فرمایا ادھر خود بہ خود پورا ہو گیا۔“

اس پر میں مسکرایا۔ ”خود بہ خود کچھ بھی نہیں ہوتا خمیں خاں! سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے یہ تو ہماری نظروں کا دھوکا ہے جو ہم ایسا سمجھتے ہیں۔ عمل کے بغیر کوئی چیز ممکن نہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے درجات بلند کرتا ہے، لیکن عموماً ان کا تعلق دنیا سے نہیں عقبی سے ہوتا ہے۔ بے عمل زندگی کسی کام کی نہیں۔ ہمارے یہی نیک و بد اعمال آخرت میں سزا یا جزا کا سبب بنیں گے۔ خیر میں جو کہہ رہا ہوں، تم بھی خوب جانتے ہو۔ یہ بتاؤ ان دنوں تمہارے محلے کی کارکردگی کیسی ہے؟“

”اطمینان بخش نہیں ہے حضور!“ خمیں خاں نے واضح الفاظ میں جواب دیا۔ ”اب کچھ کچھ ایسا اندازہ ہو رہا ہے کہ جرائم کی پشت پناہی کرنے میں خود ہمارے محلے کے افراد کا ہاتھ بھی ہے۔ وہ بھی لوٹ کھسوٹ میں شامل ہیں۔ اس کی بس ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی تنخواہیں کم ہیں اور وہ رشوت کو اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ ملک و قوم کے لئے قربانی کا جذبہ ان میں مفقود ہوتا جا رہا ہے اور وہ خود غرضی کا شکار ہیں۔ میں یہ نہیں کتا کہ سبھی ایسے ہیں، لیکن اکثر کا یہی حال ہے۔“

”تنخواہیں کم ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ حرام کھانے لگیں! ان کی ذمہ داری عوام کی مشکلات دور کرنا ہے، مشکلات میں اضافہ نہیں۔ اس مملکت خدا داد کے لئے عوام ہی نے قربانیاں دی ہیں۔ تو پھر محکمہ کوئی بھی ہو، اس سے مبرا کب ہے! وسائل کے حساب سے تو تنخواہیں مقرر ہوں گی۔ مبرو قعات سے کام لے بغیر تو معاملات نہیں سدھریں گے۔ تم جو صورت حال بتا رہے ہو، آئندہ خطرناک ثابت ہو گی۔ ابھی سے اس کی روک تھام ضروری ہے۔“

”بجا فرما رہے ہیں حضور! انگریزوں نے عوام کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لئے پولیس کے محکمے کو جو اختیارات دیئے تھے، انہیں قانون سازی کے ذریعے رفتہ رفتہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ انہی ناجائز اختیارات کے بل پر ہمارے محلے کے کرپٹ افراد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر بھی ہماری کوشش یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو، ایسے افراد کو اس محکمے سے وابستہ نہ رہنے دیا جائے۔“

”اللہ تمہیں اور تم جیسے دوسرے ایمان دار پولیس افسران کو کامیابی عطا کرے۔“ میں بولا۔

”آمین!“ وہاں موجود افراد میں سے کئی نے ایک ساتھ کہا۔

چائے پینے کے دوران ہی میں ایک شناسانے مجھ سے پوچھا۔ ”اڑتی اڑتی سی ایک خبر یہ بھی سنی ہے مقصود میاں کہ آپ نے شادی کر لی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟“

”ٹھیک سنا ہے آپ نے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے تصدیق کر دی۔ ”بولٹن مارکیٹ سے خبر ملی ہو گی!“

”جی ہاں۔ ارشد بھائی سے ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے محمود حسن کے برادر نسبتی کا نام لیا۔ ”وہ تو یہ بھی بتا رہے تھے کہ آپ بیگم صاحبہ کے ساتھ ان کی کوٹھی پر ملے بھی گئے تھے۔“

اس پر حاجی صاحب چونک کر بولے۔ ”بھئی مقصود میاں، یہ کیا بات ہوئی! چپکے چپکے شادی بھی کر لی اور کسی کو پتا بھی نہ چلے دیا۔“

”بس اچانک ہی یہ سب ہو گیا۔ پھر یہ اس شرکی بات بھی نہیں ورنہ احباب کو ضرور مدعو کرتا۔“

اپنے دیرینہ کرم فرماؤں کو میں کیسے بھول سکتا ہوں! آپ بھی تو انہی میں.....“

”رہنے دو مقصود میاں!“ حاجی صاحب بول اٹھے۔ ”ایسا ہی تھا تو یہاں آ کے ولیمہ کر دیتے۔ ہم تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے، مگر تم نے مہلت ہی نہیں دی۔“

حاجی صاحب کا تعلق اس کا کاروباری حلقے سے تھا جس کے درمیان میں نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ انہوں نے یہ شکایت دوستانہ لہجے میں کی تھی۔ میں اسی لئے ہنس کر ٹال گیا۔

کچھ بعد دیکرے جب حاجی صاحب کے سوا سب لوگ چلے گئے تو وہ کہنے لگے۔ ”مقصود میاں! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ دونوں ہاتھوں سے اس طرح دولت لٹانا کہاں کی دانش مندی ہے؟ برا مانو تو منہ پر کہہ دیتا۔ اللہ نے اگر تمہیں دولت دی ہے تو اسے یوں تو ضائع نہ کرو۔ مجھے تم اپنا بڑا کہتے ہو، میری عزت کرتے ہو، اسی تعلق کے سبب یہ بات زبان پر آگئی۔ تمہارے لئے تو میں نے ایک بڑا اچھا رشتہ بھی ڈھونڈ رکھا تھا۔ تم سے آج وہی بات کرنے آیا تھا تو یہاں آ کے کچھ اور ہی پتا چلا۔“

”سینٹھ عبدالرزاق نے ابھی تک ممبر نہیں کیا مجھے! کاروبار میں شراکت سے میں نے انکار کر دیا تو اب آپ کے ذریعے رشتے داری کی بات چھیڑ دی۔“

”تمہیں کس نے بتایا مقصود میاں؟“ حاجی صاحب چونک اٹھے۔ ”میرے اور سینٹھ عبدالرزاق کے سوا کسی اور کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔“

”کوئی بات چھپی نہیں رہتی حاجی صاحب! خیر اس ذکر کو چھوڑیں۔ یہ شادی ہوتی بھی تو کاروباری کھلائی۔ سینٹھ کی ہمشیرہ سے شادی کر کے مجھے رشتے داری کا خیال ہوتا۔ انہوں نے یہی سوچا ہو گا۔ پھر میں ان کا شریک کار بننے پر آمادہ ہو جاتا۔ رہا دولت لٹانے کا سوال تو یہ انہی لوگوں کا حق تھا جن تک میں نے پہنچا دیا۔ مجھے تو اللہ نے محض ایک ذریعہ بنایا ہے حاجی صاحب! آپ کی بات کا میں نے برا نہیں مانا۔

عمر اور تجربے میں آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ نے تو میرا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ جب میں مرحوم محمود حسن کا ایک معمولی ملازم تھا۔ آدمی کو اپنا ماضی نہیں بھولنا چاہئے۔ میں تو قائد آباد کی ایک بھگلی میں بھی رہ چکا ہوں۔“

”یہی تو تمہاری لائق ہے مقصود میاں! اسی وجہ سے میں تمہاری قدر کرتا ہوں ورنہ تو جب لوگوں کے پاس دولت آ جاتی ہے تو وہ پرانے ملے والوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ میں اسی لئے تمہیں سمجھا رہا تھا۔ برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔ آج تم خوش حال ہو تو کل خدا نخواستہ امتحان و آزمائش کا وقت بھی آ سکتا ہے، اس لئے پیسے کو سنبھال کر رکھو۔ یہ بڑا بے وقار ہوتا ہے، ہمیشہ ہر ایک کا ساتھ نہیں دیتا۔“

حاجی صاحب دیر تک مجھے اپنی دانست میں اونچے نیچے سمجھاتے رہے۔

میں اس دنیا دار آدم زاد کی دل جوئی کے لئے خاموشی اختیار کئے رہا۔ اسے خبری نہیں تھی کہ وہ

”کیوں، کیا جوئے کے اڈوں کی آمدنی کم پڑ گئی وا جا؟“ میں نے اسے گھور کر کہا۔

میں خاموشی سے ان سب کو ساتھ لے کر ہال کمرے میں آگیا تاکہ آنے جانے والوں کی نظر ان بد معاشوں پر نہ پڑے۔ بے وقوف واجا یہ سمجھا کہ میں اس سے ڈر گیا ہوں، اس لئے اپنے کسی ساتھی کو باہر نہ چھوڑا۔ عموماً بد معاش ایسا نہیں کرتے۔ کبھی میں نے واجا جیسے بد معاش آدم زادوں پر دانستہ ہاتھ نہیں ڈالا، ہاں جب کوئی خود ہی، ”کبل“ ہو گیا تو اسے معاف بھی نہیں کیا۔ خود میں نے ہی کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ آئندہ روز بلقیس جہاں کی شادی تھی۔ اسی سلسلے میں حبیب کے رشتے داروں کی آمد رفت جاری تھی۔ یہ احتیاط میں نے اسی غرض سے کی۔ واجا پر اس کا الٹا اثر ہوا۔

”تجھے کتنا سونا چاہئے“ ”واجا؟“ میں نے پُر سکون آواز میں سوال کیا۔

”ایک شرط ہے اس کی۔“ میں نے کہا۔

سوی بھی میرے ساتھ ساتھ ہی تھی، مگر اس نے میرے اشارے پر کوئی مداخلت نہیں کی۔

”منجور ہے! یہ واجا کا جہان ہے کسی تلخیر کا نہیں۔ تو اپن کو روک کے دکھانا!“ اس نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”خالی غولی نیو لے دے میرے کو! سوٹا اور نوٹ لے کر آ! جلدی کر، بہت دیر ہو گیا۔“

میرا اشارہ ملتے ہی سومی نے سونا اور نوٹ لاکر چوکی پر ڈھیر لگا دیا۔ اس حیران کن واقعے کا بھی واجا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ مجھے پکڑ لیں۔ میں اگر چاہتا تو وہ مجھے ہاتھ بھی نہ لگایا پاتے، مگر نظر انداز کر گیا۔ میرا مقصد ان سیاہ قالیوں کو سبق دینا تھا۔

”یہ ملے نہیں ہوا تھا واجا! تو زیادتی کر رہا ہے اور تجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا!“ میں اس کے

”جی ابھی بلواتا ہوں کہ وہ آپ کو سلام کرنے اور دعا لینے آجائیں۔“ میں نے یہی کہہ کر سوی کو دیکھا جو وہیں موجود تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی کہ انسانی قالب اختیار کر لے۔

”ارے مقصود میاں، تم تو یہیں بیٹھے ہو! بلا کر لاؤ نا وہن بیگم کو!“

سوی واقعی کسی دامن ہی کی طرح شرماتی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی سلیقے سے چادر اوڑھے آگے بڑھنے لگی۔ وہ حاجی صاحب کے سامنے آکر رکی اور بہ طور احترام قدرے جھکی اور ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ سوی کے حسین ترین انسانی پیکر پر نظر پڑتے ہی حاجی صاحب بے ساختہ بولے۔ ”سبحان اللہ! اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔“ پھر انہوں نے جب سے بڑا نکال کر کئی بڑے نوٹ کھینچے اور سوی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ”بیٹی! یہ تمہاری منہ دکھائی ہے۔ مقصود میاں پہلے بتا دیتے تو تمہارے لئے کوئی سونے کا سیٹ بنوا کر لاتے۔ اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔ تمہیں مقصود میاں کی صورت میں جو ہیرا ملا ہے، اسے سنبھال کے رکھنا۔“

”تمہاری دلہن کو دیکھ کر اب مجھے کوئی رنج نہیں رہا مقصود میاں کہ تم نے سیٹھ عبدالرازق کی ہمیشہ سے شادی نہیں کی۔“ یہ کہتے ہی حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مزید تین روز تک میں نے غلط خدا کی خدمت کر کے اپنی روح کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ اگلے روز کیوں کہ جمعے کی نماز کے بعد قمر احمد کو برات لے کر میری کوشی آنا تھا اس لئے مجھے نشست کی منسوخی کا اعلان کرنا پڑا۔ گزشتہ دنوں میں جس دریا دلی کے ساتھ میں نے لوگوں کی مالی امداد کی تھی، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دور دور تک اس کی شہرت ہو گئی۔ شر کے کچھ نامی گرامی بد معاشوں کو بھی اس کا ہاتھ چل گیا کہ ایک ”مخلص“ مفتی بھر بھر کے سونا بانٹ رہا ہے۔

جمرات کی شام کو جب نشست ختم ہوئی اور لوگ چلے گئے تو کئی بیچوں میں بھر کے وہ بد معاش زبردستی میری کوٹھی کے اندر آ گئے۔ جیسے انہوں نے کوٹھی کے کپاؤنڈ میں کھڑی کر دیں۔ میں اس ہال کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تو ان پر میری نظر پڑی۔

ان کا مغرور سر غنہ آگے بڑھ کر میرے قریب آگیا اور اکھڑ آواز میں بولا۔ ”اڑے او بابا جی لوگ! اپن کا حصہ کد رہے؟“

ساتھیوں کی گرفت میں آکر بولا۔

”اڑے بس کر اپنا تری مڑی! میرے کو مال سمیٹنے دے بابا جی!“ واجا نے منہ بگاڑ کر مجھ سے کہا اور چوکی کی طرف بڑھا۔ کاندھے پر پڑی ہوئی چادر اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ”شرط صرف اتنا تھا کہ سونا اور نوٹ میرے کو اٹھانا ہے!“ یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھا۔

سوی میرے ہی اشارے کی منتظر تھی۔ اس نے واجا کے سینے لکڑ ماری۔ واجا پیچھے کی طرف گرا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”اٹھ واجا! دوبارہ کوشش کر۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”مال تیرے سامنے رکھا ہے، سمیٹ لے۔“

”اب تم بولا تو ہم تھوڑا توڑ دے گا!“ مجھے جکڑنے والوں میں سے ایک نے میری گردن پر پیچھے سے ہاتھ مارا۔

ان جاہلوں کو کچھ خبر نہیں تھی۔ نہ انہیں جنت کا کچھ علم تھا، نہ پراسرار واقعات سے واقف تھے۔ انہیں تو صرف زور زبردستی اور اپنی بد معاشی پر غور تھا۔ واجا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خوف سے کانپنے لگتا، اس کے ساتھی بھی ڈر جاتے۔ میں نے اب تک رعایت سے کام لیا تھا۔ وہ مار پیٹ پر اتر آئے تو مجبوراً مجھے انسانی قالب چھوڑنا پڑا۔ مجھے یوں اچانک غائب ہوتے دیکھ کر پہلی مرتبہ وہ کچھ گھبرائے۔

”اڑے بابا لوگ تو چیت ہو گیا استاد!“ واجا کا ایک ساتھی زور سے بولا۔

واجا اچھل کر بیٹھ گیا اور اسی لمحے میں نے غیر انسانی آواز میں دھیرے دھیرے غرانا شروع کر دیا۔ جس نے میری گردن پر ہاتھ مارا تھا، میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور پھر اسے پیچھے بھی نہ دیا۔ اس کی چیخ طلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

”تیرے کو کیا ہوا اڑے؟“ اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر دوسرا بد معاش اسے اٹھانے کو جھکا تو وہ بھی اندھے منہ زمین پر آ رہا۔ میں نے ہی اسے زور سے دھکا دیا تھا۔ اس عرصے میں واجا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”میرے کو یہ بابا کوئی چکری لگتا ہے۔ تم لوگ کیوں گرا پڑ رہا ہے؟..... ابی تو وہ میرے سے ڈر کے کدری چھپ گیا ہے۔ ہم اس کو جبان دیا تھا تو کھد ہی مال اٹھائے گا!“

سوی اس کے قریب ہی تھی۔ جیسے ہی اس نے سینہ پھلا کر چوکی کی طرف لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا، سوی حرکت میں آ گئی۔ واجا کو اس بار اٹھا کر بیٹھنے کے بعد سوی نے اسے دبوچ لیا، اسی کے ساتھ گردن دہلی کہ وہ چیخ نہ سکے۔ کمرے میں موجود بد معاشوں نے اپنے سرغند کو دوبارہ گرتے دیکھا تو جھپٹ کر اس کے پاس پہنچ گئے۔ واجا بڑی بے چارگی سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار تھے۔

”ہمارے کو بولو استاد!..... لگتا ہے تمہارا طبیعت کھراب ہو گیا ہے۔“ ایک بد معاش بولا، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم لوگ ابی استاد کو اٹھا کر جیب میں ڈالو، ہم مال لے کر آتا ہے۔ جس کو استاد

جبان دیا، کھد سے بھاگ گیا، پھر کیسا شرط!“

سارے بد معاشوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس وقت تک واجا ہوش کھو بیٹھا تھا۔ سوی نے اسے چھوڑ دیا اور اس پر بھٹی جو اب واجا کی جگہ لے چکا تھا۔ وہ فرش پر گر کر اڑیاں رگڑنے لگا۔ واجا کو میں ہوش میں لے آیا اور اس سے کہا۔ ”تو ہار گیا ہے واجا! تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ اب اپنے ساتھیوں کو لے کر یہاں سے چلا جا۔ فقیر کے اس ڈیرے سے تجھے کچھ نہیں ملے گا۔“

واجا آنکھیں پھاڑے زمین پر چٹ پڑا ہوا کراہنے لگا۔ وہ کہنی کے بل اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم کدربنی چھپا ہوا بابا لوگ، تمہارے سے ٹیم کا کوئی بات نہیں ہوا تھا۔ ہم تم سے آکھری بار مال اٹھانے کو بولتا ہے، نہیں اٹھا سکا تو چلا جائے گا۔ بولو منجور؟“

وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔ خود اس پر اور اس کے ساتھیوں پر کسی حیرت انگیز واقعے کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کم عقل اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ میں کہیں چھپ کر اس سے مخاطب ہوں۔ میں نے جواب میں کہہ دیا۔ ”ٹھیک ہے واجا! تجھے آخری موقع دے رہا ہوں، کر لے کوشش!“

دوسرے ہی لمحے میں ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر کے چوکی پر جا بیٹھا۔ میرے قریب ہی سونا اور نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ پہلی بار واجا اور اس کے ساتھی خوفزدہ نظر آئے۔ جو بد معاش اڑیاں رگڑ رہا تھا، سوی کی گرفت میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے چھوڑ کر سوی میرے پاس آ گئی۔

ان میں سے کسی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ چوکی کی طرف قدم اٹھاتا۔

”او بابا جی لوگ! تم کدربے؟ ہمارا بات سنو!“ واجا کی ڈری ڈری سی آواز میں نے سنی۔ ”یہ تم کس کو چوکی پر بٹھا دیا ہے؟ اس کو بھگاؤ تو ہم مال اٹھائے گا، نہ اٹھائے تو پھر بولنا! ہم تو سمجھا تھا کہ تم ہمارا راستہ روکے گا، لڑے گا۔ ابی تم ہمارے ساتھ لڑے تو ہم جانے۔“

وہ بد معاش بس ایک ہی رٹ لگاتے جا رہا تھا۔ اسے اپنی جسمانی طاقت پر بہت ناز تھا۔ سو میں انسانی قالب اختیار کر کے سامنے آ گیا۔

”اب ہوا نا کوئی بات!“ واجا کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔

”تیرے غرور کو میں ابھی خاک میں ملائے دیتا ہوں!“ میں نے کہا۔ ”مجھ سے تو لڑے گا تو کیا“

میرے سامنے اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں رہ سکتا!“

اس پر واجا کے ساتھی آپے سے باہر ہونے لگے اور مجھے گرفت میں لینے کو آگے بڑھے تو واجا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولا۔ ”اس کو ابی ہم چٹنی بنائے گا۔ دیکھتا ہوں ہم کہ یہ میرے کو کس طرح روکتا ہے!“

اسی لمحے میں نے اچھل کر واجا کے سینے پر لات ماری اور پھر اسے سنہلنے نہ دیا۔ اس کو گھسیٹتا ہوا میں دور لے گیا۔ سوی نے اس کے ساتھیوں کی پٹائی شروع کر دی۔ اس پر یہ کہ انہیں پیچھے چلانے بھی نہ دیا۔ ذرا سی دیر میں ان کے طے بگڑ گئے اور ساری اکڑ فوں دھری رہ گئی۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ میں اور سوی ان سب کو باہر کھڑی چیپوں میں ڈال آئے۔ واجا نے اپنی شکست قبول کر لی

”میرا باپ! اب ہم ادھر نہیں آئے گا۔“ واجا نے بڑی مشکل سے اپنی جیب کا انجن اشارت کرتے ہوئے کہا۔

خاصی مار کھانے کے باوجود واجا کے کچھ ساتھی اس قابل تھے کہ ڈرائیونگ کر سکیں۔ تینوں جھپیں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں تو سوی نے کوٹھی کا گیت بند کر دیا۔ ان بد معاشوں کو میں نے اس لئے بھی سبق دینا ضروری سمجھا کہ اس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو جائے۔ بد معاشوں کے نولے ایک دوسرے سے باخبر اور ملے ہوتے ہیں۔ انہیں پتا چلتا کہ واجا میرے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہے تو کوئی میری کوٹھی کا رخ نہ کرنا۔ کم عقل اور جاہل آدم زاد عموماً توہمات کا شکار ہوتے ہیں، لیکن واجا اور اس کے ساتھی مختلف نکلے۔ انہوں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں نہ کسی عقیدے کی گرفت مضبوط ہوتی ہے نہ وہاں علم کی روشنی پہنچتی ہے۔ ان کی اکثریت صبح سے شام تک پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف رہتی ہے۔ انہی میں سے کچھ غلط راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ دھوکس، دھمکی اور زبردستی کو یہ اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ واجا اور اس کے ساتھی بھی ایسے ہی آدم زادوں میں سے تھے۔ یہ صرف طاقت اور زور بازو ہی کو سب کچھ جانتے ہیں۔ اس کے سوا انہیں کسی اور طرح زیر نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ناقابل اصلاح لوگوں کی حالت پر افسوس ہی ممکن ہے۔ سو میں نے اس واقعے کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ سونا اور نوٹوں کی گڈیاں ہال کمرے سے پہلے ہی ہٹا دی گئی تھیں۔

میں اندر پہنچا تو سوی خواب گاہ میں تھی۔ نشست کے دوران میں اس نے مصلحتاً یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ خواب گاہ میں آرام کر رہی ہے۔ یوں بھی کوٹھی کا وہ حصہ الگ تھلک تھا جہاں حبیب اور اس کے اہل خانہ کی سکونت تھی۔ آئندہ روز ہونے والی شادی کی سرگرمیاں اسی حصے تک محدود تھیں۔ ہاں ڈھولک بجنے کی دھیمی آواز میری خواب گاہ تک بھی آ رہی تھی۔ سوی اور میں ہم دونوں ہی خوش تھے کہ ایک مظلوم آدم زاد اپنی زندگی کے ایک خوشگوار دور میں قدم رکھنے والی ہے۔ بلیقے کی چھوٹی بہن نفیس جہاں نے سوی سے وعدہ کر لیا تھا کہ شام کو سوی بھی ان کی خوشی میں ضرور شریک ہوگی۔ سوی وہاں چلی گئی اور میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ معاً مجھے اپنے دوست یاسف کا خیال آیا۔ اس پر میں نے بلیقے جہاں کی وجہ سے یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ میری کوٹھی میں نہیں آئے گا۔ کراچی آنے کے بعد سے میں صرف ایک ہی بار ملا تھا۔ اس کا دھیان آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انسانی قالب میں قمر احمد کا پیر بنا ہوا تھا۔ قمر احمد اسے شادی میں شرکت کی دعوت یقیناً دیتا۔ یاسف نے ابھی تک اپنے عہد کا پاس کیا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ وعدہ کرنے کے باوجود ابھی تک میں اس سے نہیں ملا۔ یوں بھی اب کراچی میں میرا قیام چند روزہ تھا۔ اگر یاسف بھی پیر برکت علی شاہ کی حیثیت سے قمر احمد کی شادی میں شریک ہو جاتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہی سوچ کر میں نے حبیب کے بیٹے صالح کو اندر بھیجا کہ سوی کو بلا لائے۔

”ابھی تو میں وہاں گئی تھی کہ تُو نے مجھے بلوالیا۔ مجھے وہاں بڑا مزہ آ رہا تھا اے علیا لیش!“ سوی آتے ہی بولی۔

میں نے سوی کو بلوانے کی وجہ بتائی اور کہا۔ ”تجھے اس لئے بتا کر یاسف سے ملنے جا رہا ہوں کہ تُو فکر نہ کرے۔“

”بڑا ہی فرماں بردار شوہر ملا ہے مجھے۔“ وہ ہنسی۔ ”ورنہ تو ایک سے ایک آواہ جن زاد موجود ہے۔ اپنے اسی دوست کو دیکھ لے کہ جس کے پاس تجھے جانا ہے۔“

”تُو بھی تو اے سوی، دوسری جن زادیوں سے مختلف ہے کہ جو کم ہی سیدھے راستے پر چلتی ہیں۔“

”تجھے میں ایک بات بتاتا تو جھول ہی گئی اے علیا لیش!“ سوی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”تیرے ایما پر جب میں سونا اور نوٹ اکٹھے کر کے ہال کمرے میں لے جا رہی تھی تو وہ اُلو غائب تھا جو نجیب تجھے بہ طور تحفہ دے گیا تھا۔“

یہ اطلاع میرے لئے چونکا دینے والی تھی۔ میں نے بھی خواب گاہ کھچال ڈالی، مگر نہ تو نجیب کا دیا ہوا عجیب تحفہ ملا، نہ وہ کارڈ جس پر میرے لئے ایک پیغام درج تھا۔ میری کوٹھی کے ایک حصے میں جو آدم زاد آباد تھے، ان سے مجھے ایسی کسی حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں ان کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھا۔

”اے علیا لیش! نجیب کے تحفے کا اس طرح غائب ہو جانا حیران کن ضرور ہے، مگر تُو اتنا پریشان کیوں ہو گیا؟“ سوی نے کہا۔

”پریشان تو میں نہیں اے سوی، لیکن یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟..... اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ مقرر کے غلام چونکا ہو چکے ہیں۔ پراسرار تحفے کے غائب ہوجانے میں انہی کی شیطانی قوتوں کا دخل ممکن ہے۔ جیس اور رچرڈ کی موت بھی ان سے چھپی نہ رہی ہوگی۔ ان دونوں حبشیوں کو دوسرے دن قاہرہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ تجھے کے ساتھ کارڈ پر لکھے ہوئے پیغام کا ایک فقرہ بھی مجھے یاد آ رہا ہے۔ لکھا تھا کہ تم ہمارے دوست ہو یا دشمن اس کا تعین آنے والا وقت کرے گا۔ حبشیوں کی ہلاکت کے بعد یقیناً انہوں نے اس کا تعین کر لیا ہو گا۔“

”لیکن وہ حبشی، اس عورت نجوا کے ہاتھوں بھی تمارے جاسکتے تھے!“ سوی بولی۔

”وہ شیطان جو اس کوٹھی سے اپنا دیا ہوا تحفہ غائب کر سکتے ہیں، کیا وہ تیرے خیال میں اتنے بے خبر ہوں گے!“

”ہاں تُو یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ سوی نے طویل سانس لے کر اقرار میں سر ہلایا۔ پھر اس نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”اب اگر ٹھن ہی گئی ہے تو ٹھن جائے! ہم تو پہلے ہی ان حبشیوں کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تُو اگر چاہے تو اپنے دوست یاسف سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کر لیجئے۔“

”مجھے معلوم ہے اے سوی کہ وہ اس معاملے سے دور رہنے کو کہے گا، پھر بھی بات کر کے دیکھ لوں گا۔“ میں یہ کہہ کر چل دیا۔

اس وقت مجھے کیوں کہ یاسف ہی سے ملنا تھا اسی سبب کوٹھی کے پہلو والے پھانک کا رخ کیا۔ ایک

ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی نشست گاہ میں ہے۔ اصغری کی وجہ سے اس نے اپنی کوٹھی میں کچھ ملازم بھی رکھ لئے تھے۔ میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کے کچھ مرید بھی وہاں بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے لئے یاسف نے کرسیوں کے درمیان زمین پر فرش بچھو دیا تھا۔ خود وہ مجھے تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا نظر آیا۔ میری طرف نگاہ اٹھی تو وہ چونک کر مسکرایا۔

”تمہیں اپنے دوست پیر برکت علی شاہ کی یاد آگئی مقصود میاں! آؤ، ادھر آجاؤ!“ یاسف نے مجھے مخاطب کیا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے پاس تخت پر جا بیٹھا تو وہ کہنے لگا۔ ”دیکھو آج کیسے کیسے صاحبان علم یہاں جمع ہیں! پھر بھی انہیں ہماری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ادھر دائیں جانب علم فلسفہ کے پروفیسر.....“

یاسف نے وہاں موجود کئی صاحب حیثیت آدم زادوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا اور وہ سبھی یاسف کے مرید تھے۔ مجھے ان آدم زادوں کی ضعیف الاعتقادی پر افسوس ہوا۔ انہیں ایک جن زاد نے اپنے ”کرتب“ دکھا کر بے وقوف بنا رکھا تھا۔ یاسف اپنے مہمانوں کو کرسیوں پر بٹھاتا اور مریدوں کو فرش پر۔ اس طرح کی درجہ بندی سے شاید اسے تسکین ملتی تھی۔ آدم زادوں پر یاسف اپنی برتری قائم رکھنے کا قائل تھا۔ اس کے تعصب سے مجھے واقفیت تھی۔

کچھ دیر تو میں ’یاسف کی بے سرو پا باتیں سنتا رہا‘ پھر اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”بس کر اب! یہ سب وہی رٹنی باتیں ہیں جو تو جن زاد عالموں کی زبانی سنتا آیا ہے۔ ان لوگوں کو رخصت کر دے کہ مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنا وعظ مختصر کر دیا، کہنے لگا۔ ”ہمارے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ہونا اور نہ ہونا کچھ بھی طے نہیں۔ وہ بے وقوف ہیں جو اپنا وقوف چاہتے ہیں۔ ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرو گے تو دھوکا کھاؤ گے۔ جو اس عقل کے تابع ہیں اور عقل کی حدود مقرر ہیں۔ سو عقل کے ساتھ چشم باطن بھی کھلے تو ہر شے کی اصل نظر آئے۔“

”سبحان اللہ!..... سبحان اللہ!“ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”پیر صاحب نے کیا نکتہ تعلیم کیا ہے!“ پروفیسر نے بھی صدا لگائی۔

وہ محفل برخاست ہوئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ان میں سے اکثر نے زمین پر اوندھالٹ کر یاسف کے پیروں کو بوسہ دیا۔ اس کے لئے یاسف نے تخت سے اپنے دونوں پیر نیچے لٹکا دیئے تھے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی میں نے یاسف کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ”یہ تو نے کیا جمل پھیلا رکھا ہے؟“

”اس میں جمل کی کیا بات ہے اے علیائش! آدم زادوں کو یوں اپنے آگے پست دیکھ کر خوشی ہوتی ہے مجھے! تیری طرح میں انہیں اپنے سر پر نہیں چڑھاتا۔“

”کیا تجھے یہ احساس نہیں کہ اس طرح تو گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے؟“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”ذرا سی خوشی کی خاطر کیوں اپنی آخرت خراب کرتا ہے!“

”وعظ نہ کر اے مولوی علیائش!“ وہ مجھے ایک نیا خطاب دے کر ہنسا۔ ”اپنی کہہ، کیسا ہے تو؟“

تیری بیوی سومی کا کیا حال ہے؟“

”وہ بھی ٹھیک ہے اور تجھے یاد کرتی ہے۔ رہا میں تو تیرے سامنے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میری آمد کا مقصد یہ ہے کہ تیرے اوپر سے اپنی کوٹھی میں داخلے کی پابندی ہٹا دوں۔ تجھے معلوم ہی ہو گا کہ کل بقیں جہاں سے قمر احمد کی شادی ہے۔ تو بھی برات کے ساتھ آئے گا۔“

”قمر احمد آیا تھا میرے پاس۔ اس نے مجھ سے شرکت کو کہا تھا، مگر تیرا خیال آگیا۔ مجبوراً مجھے منع کرنا پڑا۔ پھر اصغری بھی اس پر خوش نہیں۔“

”اس میں اصغری کی ناخوشی کا کیا سوال! قمر احمد سے اب اس کا کیا تعلق؟“

”مجھ سے تو اس کا تعلق ہے!“ یاسف مسکرایا۔ ”خیر اگر تیرا یہی فٹا ہے تو اسے مثالوں کا میں.....! جب سے تو اسے نکاحی اور بے نکاحی عورت والی پٹی پڑھا کر گیا ہے، اس نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ کہتی ہے، تم بھی نکاح پڑھو لو مجھ سے! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کروں تو کیا کروں! اب تک اس کے ناز اٹھاتا آیا ہوں میں، اسی لئے زبردستی انہی نہیں لگتی۔ وہ موم کی گڑیا بن کر اصغری نہیں کوئی اور ہی معلوم ہوگی۔ اس مرتبہ اے علیائش، تو نے مجھے بہت برا پھنسیا ہے۔“

”تو کر لے اس سے نکاح! برائی کیا ہے اس میں؟“

”خواہ مخواہ پیروں میں زنجیر پڑ جائے گی، جانے کب تک کے لئے! وہ تو ویسے بھی میری ہر مریدہ سے خار کھاتی ہے، بیوی بن گئی تو کسی کو قریب نہیں آے دے گی۔“

”یہ تو بھگتنا پڑے گا تجھے اے یاسف! باغباں اور صیاد دونوں کو ایک ساتھ راضی رکھنا ممکن نہیں۔“

”مسکرا لے میری بے بسی پر اے دوست! لیکن میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔ ہوں یہ بتا، اتنے دن سے تو کمان تھا؟ وعدہ کر کے بھی ملنے نہیں آیا!“

”تجھے یاد ہو گا اے یاسف کہ برسوں پہلے ہم دونوں مصر اور بغداد کی سیر کرنے گئے تھے۔“ میں نے موقع دیکھ کر یہ ذکر چھیڑ دیا۔

”انتہی پرانی بات آج تجھے کیسے یاد آگئی؟ کیا تسوی کو ساتھ لے کر وہاں گھومنے جا رہا ہے۔“

”پہلے تو یہی ارادہ تھا، مگر اب وہاں جانا مجبوری بن گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تجھ سے مجھے اس سلسلے میں بھی مشورہ کرنا ہے۔“

”یہی آخر کیا مجبوری آپڑی ہے، مجھے بھی تو بتا!“

”تجھے تو خبر ہے کہ خاص طور پر مصر میں کچھ قدیم ترین مذاہب کے پیروکار بھی موجود ہیں جو پراسرار شیطانی قوتوں کے مالک ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں انہی سے میری مڈبھڑ ہو گئی۔ خود کو وہ فرعون مقرر کے غلام کہتے ہیں۔“ میں نے مختصراً پیش آنے والے عجیب واقعات بیان کر دیئے۔

یاسف کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”مجھے ساری باتیں سن کر ایسا لگتا ہے اے علیائش کہ یہ آدم زاد قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہوا تھا کہ قمر احمد کے یہاں باہر سے مہمان آئے

ہوئے ہیں، لیکن میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ یہ قراحہ بھی ایک ہی پاگل ہے، جانے کہاں کہاں سے اپنے پیچھے بلائیں لگا لیتا ہے! مجھے خبر ہی نہیں ہوئی اور تیرے ساتھ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا۔ تو نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا، اب میں تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پھر سوچ لے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ سوی کو اپنے ساتھ وہاں نہ لے جا۔ کیا پتا وہاں کیا حالات سامنے آئیں! سوی وہاں کبھی گئی بھی نہیں ہے۔ تجھے اگر ضد ہو گی ہے تو اس کو خطرے میں کیوں ڈال رہا ہے! وہ ساتھ ہو گی تو تیرا دھیان دو طرف ہٹا رہے گا۔“ یہ کہہ کر وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”یہ کیوں بھولتا ہے اے یاسف کہ اس طرح میری قوت دگنی ہو جائے گی!“ میں بولا۔ ”خود سوی بھی مجھے اکیلا نہیں جانے دے گی۔“

”تیری مرضی! دوست کی حیثیت سے میرا کام تجھے سمجھانا تھا، سو اپنا فرض پورا کر دیا۔“ خلاف توقع یاسف اس وقت سنجیدہ تھا۔

”اگر کسی طرح اس پراسرار آدم زادی نجوا کو یقین آجائے کہ تو مقرر کے غلاموں سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو شاید تیرا کام بن جائے۔“

”یہ میں نے بھی سوچا تھا اے یاسف، لیکن وہ کمپنی ثابت ہوئی۔“ میں، یاسف کو نجوا کے بارے میں بھی بتانے لگا۔

”اس کی وجہ یہ گنتی ہے کہ وہ تجھے اپنے دشمنوں ہی کا آلہ کار سمجھی ہو گی۔ لاعلمی کے سبب ایسا ہو سکتا ہے۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ مقرر کے غلاموں سے تیرا کوئی تعلق نہیں تو صورت حال بدل جائے گی۔ پھر ممکن ہے کہ وہ خود ہی تجھے اپنے ساتھ ملانا چاہے۔“ یاسف نے مشورہ دیا۔ ”دشمن کا دشمن“

دوست ہوتا ہے، یہ وہ آدم زادی بھی جانتی ہو گی۔“

”کوشش کروں گا کہ تیرے مشورے پر عمل کر سکوں۔“

”ساری خرابی تیرے ساتھ یہ ہے اے علیا لیش کہ تو میری طرح عیار نہیں۔ یہ خرابی تیرے اندر بچپن سے ہے اور اب تو اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔“

”اب تو مجھے اتنا بے وقوف بھی نہ جان! مجھے بھی عیاری کا جواب دینا آتا ہے۔ ہاں بس حد سے تجاوز نہیں کرتا کہ آخرت میں جواب دی سے ڈرتا ہوں۔“

”اسی لئے تو اب میں نے تیرے نام کے ساتھ مولوی لگا دیا ہے۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق چیخڑ چھاڑ پڑا کر آیا۔ زیادہ دیر سنجیدگی سے بات کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔

”اب تو نے مجھ پر سے پابندی اٹھا دی ہے تو کل کے بعد پھر تفصیلی ملاقات ہو گی۔ تیرا ارادہ کب تک جانے کا ہے؟“

”ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے۔“

”میں خود ہی تجھ سے ملنے آؤں گا۔“ یاسف بولا۔ ”تو نے دیکھ ہی لیا کہ میں اپنے عہد سے نہیں پھرا۔ بلقیس جہاں کو میں نے بھلا دیا۔“

”آئندہ بھی تجھ سے مجھے یہی امید ہے۔“

”تیرے دل میں اگر اس کی چھوٹی بہن کی طرف سے شک ہو تو اسے بھی نکال دے اے علیا لیش! تو نے اس خاندان کو امان دی ہے تو پھر مجھے کم طرف نہ پائے گا۔ میری وجہ سے تو نے اصغری کو معاف کر دیا، مجھے یہ خیال بھی تو ہے! دوستی میں تو نے میرا لحاظ کیا تو میں بھی تیرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے تیری دوستی عزیز ہے۔“ یاسف نے خود ہی وہ بات واضح کر دی جو میری زبان پر آنے والی تھی۔

”اچھا تو اب تجھ سے کل ملاقات ہو گی۔ اپنی اصغری بیگم سے میرا سلام کہہ دیجو۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”لے گا نہیں اس سے؟ تیری اور اس کی نوک جھونک ہوتی ہے تو مجھے بڑا مزا آتا ہے۔“

”اس وقت چھوڑ، پھر کبھی سنی۔“ میں یہ کہتا ہوا نشست گاہ سے نکل آیا۔

قراحہ سے ملنا میں نے ضروری نہیں سمجھا اور واپس آ گیا۔ اسی رات میں نے سوی کو بتا دیا کہ یاسف سے کیا بات ہوئی ہے۔

”مجھے تیرے دوست پر حیرت ہے۔“ سوی کہنے لگی۔ ”اسے معلوم ہے کہ میں ایک عالم باپ کی بیٹی ہوں، پھر مجھے بھی کمزور جانتا ہے! اس کے علاوہ اسے شاید تجھ سے میری محبت کا اندازہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہو گی کہ اسے کسی نے اتنی محبت نہیں دی۔“

”ہاں اے سوی! میرا دوست اس معاملے میں محروم ہے۔ خود وہ بھی تو کسی کا وفادار نہیں رہا۔ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔“

اس رات میں اور سوی دیر تک اپنے پراسرار دشمنوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ قاہرہ میں واقع پاکستانی سفارت خانے کے کسی افسر سے رشتہ دوستی استوار کر لینا ان جیسے شیطانوں کے لئے کون سا مشکل تھا! میرے نزدیک قراحہ کے دوست طیب کو یقیناً ان کی حقیقت کا علم نہیں ہو گا۔ طیب سے اگر

کچھ معلوم کیا جاتا تو شاید ہی ان کے متعلق کام کی کوئی بات بتا پاتا۔ کراچی آکر وہ کسی ہوٹل میں بھی ٹھہر سکتے تھے، لیکن انہوں غالباً سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایسا نہیں کیا۔ ہم نے اس پر بھی غور کیا۔ سوی

کا خیال یہ تھا کہ قراحہ کی کوٹھی میں ان کے قیام کا مقصد قانونی تحفظ حاصل کرنا ہو گا۔ اسی غرض سے انہوں نے پہلے طیب کو شیشے میں اتارا، پھر قراحہ تک پہنچے۔ یہ کامیاب کوشش بھی ان کے مجرمانہ ذہن کی

عکاسی تھی۔ وہ کسی قسم کے شک و شبہ کی زد میں نہیں آئے۔ کئی وجوہات ایسی تھیں کہ ہم نے پہلے قاہرہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہلاک ہو جانے والے سفاک حبشی، بغدادی سے آئے تھے اور نجوا بھی وہیں

نہی تھی۔ حبشیوں کے سامان سے ملنے والی ڈائری کو بھی ہم نے نظر انداز نہیں کیا۔ اس میں جو نام پتے اور ٹیلی فون نمبر درج تھے، اکثر بغدادی کے تھے۔“

دوسرے دن ہم صبح جلد اٹھ گئے۔ کوٹھی کے لان میں بڑا سا شامیانہ لگا دیا گیا۔ دوپہر تک ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

برات کا استقبال کرنے کے لئے میں خود کوٹھی کے گیٹ پر موجود تھا۔ آگے آنے والی کار میں سے

قراچہ کے ساتھ میں نے یاسف کو بھی اترتے دیکھا۔ اس کے پیر کی حیثیت سے کرتادھر تانا ہوا تھا۔ اہل نوعیت کے اعتبار سے یہ ذرا مختلف قسم کی تقریب تھی کہ جس میں نمایاں طور پر دو جن زاد بھی شریک تھے۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ اس موقع پر قراچہ راجہ بیگم کے بھائی ارشد کو بھی نہیں بھولا۔ ارشد ہی نے اس کے بیٹے ظفر کو ایک عرصے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ برات میں دیگر اعلیٰ سرکاری افسران کے ساتھ وزارت داخلہ کا سیکرٹری حفیظ الرحمان فاروقی بھی شامل تھا۔ انہی افسران میں مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس شوکت حسین عباسی بھی نظر آیا۔ ذاتی طور پر میں ان دونوں ہی سے واقف تھا۔ وہ میرے عقیدت مند تھے۔

مہمانوں کو جب عزت و احترام کے ساتھ شامیانے میں بٹھا دیا گیا تو حبیب میری طرف لپکتا ہوا آیا اور بولا۔ ”سرکار! آپ تشریف رکھیے۔“

آگے بڑے بڑے آرام دہ صوفے بچے تھے اور پیچھے کرسیاں لگی تھیں۔ سامنے دولے اور اس کے قریبی عزیز واقارب کے بیٹھے کو سجا ہوا تخت تھا۔ صوفوں پر اعلیٰ افسران بیٹھے تھے۔ قراچہ نے یہ عقل مندی کی کہ اپنے بیٹے ظفر کو ساتھ نہیں لایا۔ آگے ہی ایک صوفے پر یاسف کو دیکھ کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”آج میں لڑکے والا ہوں اور ٹو لڑکی والا!“ یاسف نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ ”کیسی رہی؟“ اس کے ہونٹوں پر بڑی شرارتی مسکراہٹ تھی۔

”فضول باتیں نہ کرا“ میں نے اسے محبت سے جھڑک دیا۔ ”تیرا بچپن کب رخصت ہو گا! وقت اور موقع تو دیکھ لیا کہ اللہ کے بندے!“

جھڑکے جانے پر بھی وہ مسکراتا ہی رہا۔ اسی کے ساتھ مجھ پر فقرے بازی سے بھی نہ چڑکا۔ قراچہ سے بلیس جہاں کا نکاح پڑھا دیا گیا تو پُرکلف کھانے کے بعد مختلف رسمیں ہونے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بلیس جہاں اور قراچہ کی یہ پہلی شادی ہے۔ شام کو وداع کا وقت آیا تو بشیرن اور نفیس جہاں کے ساتھ سوی بھی تھی۔ سوی ہی نے کار میں بلیس جہاں کو قراچہ کے برابر بٹھایا۔ رخصتی پر حبیب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تو میں نے گلے لگا کر اسے تسلی دی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”سرکار! میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بلیس کو رخصت کروں گا۔ یہ سب آپ ہی کی نظر کرم ہے ورنہ میں کہاں اور میرا یہ نصیب کہاں!“

اس دن ایک بوجھ سامیرے سینے سے ہٹ گیا۔ میں نے کبھی جو ذمہ داری خود ہی قبول کی تھی، پوری ہو گئی۔

جمرات کی شام کو میں نے صرف بیچے کی نشست منسوخ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ سواگلے ہی روز دوسرے کو پھر بھیڑ ہو گئی۔ چند مریض اور ضرورت مند ایسے بھی تھے کہ جن سے صرف نظر میرے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ ایسے عارضوں کا شکار تھے کہ جن کے لئے طویل عرصے علاج ضروری تھا۔ میں نے بہ طور خاص انہی سے آنے کو کہا تھا، مگر اور حاجت مند بھی آگئے۔ بلائے جانے والے مریضوں کو میں ایسے نئے لکھتا

کہ میری غیر موجودگی اس پر اثر انداز نہ ہوتی۔ دوسرے نئے افراد کی آمد کے سبب مجھے انہیں بھی دیکھنا پڑا۔ اس عرصے میں وہ قاتل بھی میری نشان دہی پر پکڑے گئے تھے جنہوں نے خاندانی دشمنی کی وجہ سے ایک شخص کے چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔

نشست کے آغاز ہی میں اس روز میں نے لوگوں کو بتا دیا کہ آئندہ روز آخری نشست ہوگی۔ ”کچھ عرصے کے لئے ہم شر سے باہر جا رہے ہیں۔“ میں نے وجہ بھی بیان کر دی۔ ”واپس پر انشاء اللہ پھر آپ کی خدمت کریں گے۔“ اسی کے نتیجے میں مجھ سے متعلق تمام ہی لوگوں کو پتا چل گیا کہ ایک مرتبہ پھر میں نے رخت سفر باندھ لیا ہے۔ اگلا دن بھی بڑی مصروفیت میں گزرا۔ شام تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ پھر بھی میں نے کسی کو باپوش نہیں کیا۔ اپنے دوست یاسف کے سوا میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہوں! پیر کے روز صبح یاسف بھی تفصیلی ملاقات کے لئے آگیا۔ اسی روز مجھے سوی کے ساتھ بغداد روانہ ہونا تھا۔

راز داری اور احتیاط کے پیش نظر یاسف کو میں اپنے کمرے میں لے آیا۔ سوی بھی وہیں تھی۔ ”ہاں تو اے میرے دوست علیالیش، تو نے کیا سوچا؟“ یاسف نے بلا جھجک گفتگو شروع کی کیوں کر کمرے میں ہم تینوں جن زادوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”جو سوچا ہے، تجھے پہلے ہی پتا چکا ہوں۔“ میں جواب میں بولا۔ ”یعنی تو اپنے ساتھ سوی کو بھی لے جائے گا؟“ اس نے سوال کیا، پھر میرے اقرار کے بعد کہنے لگا۔ ”ایک تجویز لے کر آیا ہوں میں تیرے پاس! اگر تو چاہے تو میں تیرے ساتھ چلوں؟ چند روز کے لیے تیری خاطر میں، امگری کی جدائی برداشت کر لوں گا۔“

”لیکن میں تو پھر بھی علیالیش کے ساتھ جاؤں گی۔“ سوی بول اٹھی۔ ”کیا ایسا ممکن نہیں کہ تو اس عرصے میں اپنے باپ کے پاس رہ لے اے سوی؟ وہ بھی ایسی صورت میں کہ اگر یہاں تیرا جی نہ لگے!“ یاسف نے کہا۔ ”میں اس لئے خوب سوچ سمجھ کر ایسا کہہ رہا ہوں کہ میری نظر میں یہ معاملہ خطرناک ہے۔“

”پھر تو میں، علیالیش کو ہرگز اکیلا نہیں چھوڑ سکتی!“ سوی نے صاف کہہ دیا۔ ”یہ اکیلا کب ہو گا اس کے ساتھ میں بھی رہوں گا۔“ یاسف بولا۔

یاسف کی تجویز نے وقتی طور پر مجھے الجھا دیا۔ سوی اگر ایک عالم جن زاد کی بیٹی تھی تو یاسف عیاری میں طاق تھا۔ پھر مجھے یہ بھی یقین تھا، وقت پڑنے پر وہ فرار نہیں ہو گا، کیوں کہ اس معاملے میں کسی آدم زادی کا حصول مقصود نہیں تھا جو اسے بے وفائی پر اکساتا۔ سوی میری وجہ سے کسی خطرے میں نہ پڑے، یہ بات بھی میرے حق میں تھی۔ سوی نے میرے تذبذب کو محسوس کر لیا کہنے لگی۔ ”دیکھ اے علیالیش، تیرے دوست نے یہ تجویز رکھ کر اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا، لیکن مجھ پر بھی تو تیرا حق ہے۔ کیا تو مجھے میرا حق ادا نہ کرنے دے گا؟ اگر ایسا نہیں تو چپ کیوں ہے؟ کیا سوچ رہا ہے؟“

چند لمحے توقف کے بعد میں نے یاسف کو مخاطب کیا۔ ”ارے میرے دوست! ہم تینوں ہی کیوں ساتھ چلیں؟ یہ بھی تو ایک صورت ہے۔“

”برائے نامیو اے علیا لیش! میں نے جو تجویز رکھی، تجھ سے دوستی نبھانے کے ساتھ سہی کو بھگول خطرات میں نہ ڈالنے کے لئے تھی۔ یہ اگر نہیں مان رہی تو پھر کیا حاصل! میں تیرے ساتھ چلوں چلوں، مقصد تو پورا نہ ہوا۔“ یاسف نے لگی لپٹی نہ رکھی۔

کافی دیر بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جب یاسف نے ضرورت محسوس کی ہمارے پاس چلے جائے گا۔ اب تو وہ سہی کے وجود کی خوشبو سے بھی آشنا ہو چکا تھا۔ یاسف کو میں نے بتا دیا تھا کہ ہم آج ہی بغداد چلے جائیں گے۔ وہ اسی لئے مجھ سے گلے مل کر رخصت ہوا۔ چلتے چلتے اس نے پھر تاکید کی کہ تم کہ میں، نجواسے دشمنی مول نہ لوں۔

ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ بغداد پہنچ کر بھی انسانی قابلوں ہی میں رہیں گے۔ آدم زادوں کی ضروریات سے ہم دونوں ہی واقف تھے۔ ہمارے درمیان اس پر خاصی گفتگو بھی ہو چکی تھی۔ روزانہ نشست کی وجہ سے اس ضمن میں کچھ تیاری باقی تھی۔ میرے پاس جو سونا اور پاکستانی کرنسی رہ گئی تھی، اسے عرق دینا میں تبدیل کرانے کی غرض سے میں بولٹن مارکیٹ روانہ ہو گیا۔ اس عرصے میں سہی سے میں نے بقیہ سامان سفر کی فراہمی کے لئے کسب کیا۔

☆-----☆-----☆

دریائے فرات، بغداد شہر کے درمیان بہتا ہے جس کے دونوں طرف آبادی ہے۔ شہر کے نواح میں ہم دریا کی بائیں جانب ایک قدیم قبرستان کے قریب اترے جہاں اندھیرا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم نے نئے انسانی قالب اختیار کر لئے۔ اب کوئی ہمیں دیکھتا تو عراقی باشندے ہی سمجھتا۔

کچھ فاصلہ طے کر کے دریا کی بائیں سمت میں مجھے ایک آبادی کے آثار نظر آئے۔ یہاں پہلے دیرانہ تھا۔ شہر کی یہ کوئی نئی آبادی تھی۔ یہاں نئی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہم تیز قدمی سے اس علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ہمیں بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ایک منزلہ فائو اشار ہوٹل فرنانڈس دکھائی دیا۔ فی الحال بغداد میں قیام کے لئے ہم نے کسی ہوٹل ہی کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہو گیا اور ہمیں کسی ہوٹل کی تلاش میں بھٹکانا نہیں پڑا۔

خود کو ہم نے عراق ہی کے ایک شہر سلیمانہ کے باشندے ظاہر کیا۔ سلیمانہ، عراق کا ٹھنڈا پہاڑی علاقہ ہے جہاں خوب صورت وادیاں ہیں۔ اس سے آگے ترکی کی سرحد ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے سرخ و سفید اور صحت مند ہوتے ہیں۔ ہوٹل میں ضروری اندراجات کے وقت میں نے اپنا نام سعد اور سہی کا نام رشیدہ لکھوایا۔ سلیمانہ سے بغداد آمد کا مقصد گویا سیر و سیاحت تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ یہ کمرہ ہمیں ہوٹل کی پہلی منزل پر ملا تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد میں نے سہی سے کہا۔ ”یہ شہر تو مجھے وہ لگتا ہی نہیں کہ جہاں کبھی میں یاسف کے ساتھ آیا تھا۔ چل پہلے انسانی قابلوں سے نکل کر اس شہر کا ایک چکر لگا آتے ہیں۔ کل صبح بزرگان دین کے مزاروں پر حاضری دیں گے، پھر ہم اس کام کا آغاز کریں گے کہ جس کے لئے یہاں آئے ہیں۔“

اس وقت عراقی دینار تقریباً ساڑھے چونتیس روپے کے برابر تھا۔ پاؤ دینار سے لے کر سو دینار تک کے نوٹ میں نے حاصل کر لئے۔ ان میں آدھے، ایک، پانچ، دس اور پچاس دینار کے نوٹ بھی شامل تھے کہ ضرورت پڑنے پر کام آسکیں۔ یہ سب میرے انداز فکر کی تبدیلی کا نتیجہ تھا ورنہ تو میں خالی ہاتھوں ہی بغداد چلا جاتا تو وہاں کی کرنسی حاصل کر لیتا۔ اس کے لئے مجھے کسی آدم زاد کی تجوری پر ہاتھ صاف کر پڑا۔ بلاوجہ اور بغیر ضرورت مجھے یہ منظور نہ ہوا۔

عراقی کرنسی میں درہم صرف حساب لگانے اور فلس کا شمار کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ درہم، باقاعدہ وجود نہیں۔ وہاں صرف دینار اور فلس بہ طور کرنسی چلتے ہیں۔ فلس سکے ہیں۔ پچاس فلس کا ایک درہم اور بیس درہم، ایک دینار کے برابر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ معلومات مجھے کرنسی تبدیل کراتے وقت حاصل ہوئیں۔ دو سو برس پہلے اور اب کے عراق میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں تقریباً سارا دن گزر گیا۔

میں جب شام کو بولٹن مارکیٹ سے واپس آیا تو سہی تمام تیاری کر چکی تھی۔ اس نے صرف دو سوٹ کیس ساتھ لئے تھے۔ ایک سوٹ کیس میں میرا سامان، دوسرے میں سہی نے اپنے استعمال کی ضروری اشیاء رکھ لی تھیں۔ عراقی کرنسی کو وہ بڑے شوق سے دیکھنے لگی، پھر اسے میرے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

حبیب کو خبر تھی کہ ہم آج روانہ ہونے والے ہیں تو وہ دکان سے جلد لوٹ آیا۔

مغرب کے بعد جب اندھیرا پھیل گیا تو ہم حبیب اور اس کے اہل خانہ سے رخصت ہو کر عمارت

سہی خوشی خوشی اس پر آمادہ ہو گئی۔ کمرے کو اندر سے بند کر کے ہم ہوٹل سے نکلے اور قدیم تاریخی حیثیت کے حامل دریائے فرات کے اوپر پرواز کی۔ دریا کے دونوں کناروں پر ہمیں چھوٹے بڑے ہوٹل نظر آئے۔ ان کی روشنی رات کے وقت دریا کے پانی پر پڑ کر بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ دریا پر کئی بیل ہیں۔ ہمیں پانی میں کشتیاں بھی تھیں دیکھائی دیں، کیوں کہ ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ سارا

شہر محوم پھر کر اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم اپنے ہوٹل میں آ گئے۔

ناشٹا کر کے دوسرے روز صبح ہم نے امام اعظم حضرت ابوحنیفہ کے مزار کا پہلے رخ کیا۔ میں راستے میں سوئی کو بتایا امام اعظم ان کا لقب 'نعمان اسم مبارک اور ابوحنیفہ کنیت ہے کہ ہم جن کے پر حاضری دینے جا رہے ہیں۔

"ہاں مجھے خبر ہے۔" سوئی نے بھی میری طرح اردو زبان میں جواب دیا تاکہ کوئی اور ہماری بات نہ سمجھ سکے۔ عراق کی سرکاری اور عوامی زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور کردی بھی بولی جاتی ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ "مجھے میرے باپ نے امام اعظم کے بارے میں ایک دفعہ جو تفصیل بتائی تھی، آج بھی یاد ہے۔ آپ اول درجے کے فقیہ، مجتہد اور محقق شریعت مانے جاتے ہیں۔ 80 ہجری میں آپ پیدا ہوئے اور ایک سو پچاس برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ امام اعظم کے پیرو دنیا کے تمام ممالک میں، خاص کر ہندوستان اور پاکستان میں سب سے زیادہ ہیں۔ بتا، کیا مجھے ساری باتیں معلوم ہیں؟"

"میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ تو ایک عالم کی بیٹی ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے مسکرا دیا۔ "تیری معلومات قطعی درست ہیں۔"

اردو میں گفتگو کرنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے اصل نام لینے سے دانتہ گریز کر رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں پہلے یاسف کے ساتھ بغداد آیا تھا تو ایک بھٹکا ہوا جن زاد تھا۔ اس وقت میں نے بزرگوں کے مزاروں پر حاضری نہیں دی۔ اب میرا معاملہ مختلف تھا، سو میں نے اسی کو ترجیح دی۔ امام اعظم کی نسبت کے سبب سے اس علاقے کا نام اعظمیہ رکھ دیا گیا تھا۔ یہ آبادی کاظمیہ سے آگے تھے جہاں ہم واپسی پر گئے۔ اعظمیہ اور کاظمیہ دونوں ہی علاقے شہر کی اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

کاظمیہ کا علاقہ حضرت امام کاظم کے نام سے منسوب ہے۔ وہیں امام کاظم کا مقبرہ ہے۔ وہاں فاتحہ اور دعا کے بعد ہم نے اس آبادی کی بھی سیر کی۔

بغداد ریلوے اسٹیشن کے عقب میں ایک قدیم اور مشہور قبرستان ہے۔ اسی قبرستان میں حضرت شیخ معروف کرخی، بملول داتا، زبیدہ بیگم کے علاوہ دیگر مشہور بزرگوں کے مزار ہیں۔ کاظمیہ ہی سے ایک سڑک اس قبرستان کی طرف جاتی ہے۔ ہم ادھر ہوئے اور بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دی۔

اب ہمیں باب الشرق جانا تھا کہ جہاں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا مقبرہ ہے۔ باب الشرق متوسطہ درجے کی آبادی ہے۔ حضرت شیخ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ کر ہم کچھ آگے بڑھے۔ وہاں امام ابوغریب کا قبرستان ہے جہاں ان کا مزار بھی ہے۔ ہم وہاں بھی گئے۔ اسی میں ہمیں صبح سے دیکھ رہی تھی اور کچھ دیر ہم آرام کرنے اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ سوئی کہنے لگی۔ "میرے وہم و قیاس میں بھی یہ نہیں تھا کہ علیمائے کرام مجھے کبھی یہ سعادت حاصل ہوگی۔ جن عظیم ہستیوں کے تذکرے اپنے باپ کی زبانی سنے تھے ان کی آخری آرام گاہیں بھی دیکھ لیں۔ یقین کر کہ اس سے مجھے بڑا روحانی سکون حاصل ہوا۔"

"اور اے سوئی، میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اللہ ہمیں ہمارے دشمنوں پر غلبہ دے گا، وہ خواہ کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں۔" میں نے بھی اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کیا۔ "ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ وقتی طور پر ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، سو اس کے لئے ہم پہلے سے تیار ہیں۔"

"ہماری ابتدا اچھی ہے اے علیالیش! انشاء اللہ انتہائی مایوس کن ثابت نہیں ہوگی۔" سوئی یہ کہہ کر سوٹ کیس سے وہ ڈائری نکالنے لگی کہ جو حبشیوں کے سامان سے ملی تھی۔ گفتگو سے اس نے اندازہ کر لیا کہ اب میرا کیا ارادہ ہے! ڈائری اس نے میرے حوالے کر دی۔

میں نے ڈائری میں درج ایسے چوں پر خصوصی توجہ دی کہ جن کے ساتھ فون نمبر بھی موجود تھے بیلڈ کے قریب رکھے ہوئے فون کا ریسپونڈر اٹھا کر میں نے ہوٹل کے ایکس چیچ سے ایک نمبر ملانے کو کہا۔ ذرا ہی دیر میں آپریشنر نے بتایا۔ "لائن مل گئی ہے" بات کیجئے۔

آپریشنر کا شکریہ ادا کر کے میں دوسری طرف سے ریسپونڈر اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کھنٹی بجتی رہی اور ریسپونڈر فوراً نہیں اٹھایا گیا۔

تنگ آکر میں سلسلہ منقطع کرنے والا تھا کہ نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ پوچھا گیا۔ "کس سے بات کرنی ہے؟" وہ آواز مجھے کچھ آشنا ہی لگی۔

"یہ منصور صاحب ہی کا فون نمبر ہے؟" میں نے نمبر دہرایا۔

"جی ہاں۔ آپ کون بول رہے ہیں؟" اس مرتبہ وہ آواز قدرے واضح تھی۔

بولنے والی کی آواز پہچانتے ہی میرے انسانی پیکر میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے اتنی جلد کامیابی کی ہرگز امید نہیں تھی۔ میں نے فوراً مزید ایک لفظ کے بغیر لائن کاٹ دی۔ وہ نجوا کی آواز تھی۔ اس پراسرار عورت کی آواز دو مرتبہ میں سن چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب وہ کراچی سے بغداد کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ میرے لئے وہ بھی ایک عجیب اور حیران کن تجربہ تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کڑیاں جوڑنے لگا۔ حبشیوں میں سے کسی نے اس ڈائری کے ایک صفحے پر ایسے شخص کا نام پتا اور فون نمبر لکھا تھا کہ جہاں نجوا کے لئے کامکان تھا۔ یا تو نجوا تھکی ہوئی تھی کہ دن کے وقت سو رہی تھی یا پھر اسے دیکھ کر سوئے کی عادت تھی۔

وقت ضائع کئے بغیر سوئی کو میں نے حقیقت سے آگاہ کیا اور بولا۔ "تو بھی چاہے تو ساتھ چل!" "کیوں نہیں! میں اکیلی یہاں کیا کروں گی! یوں بھی وہ عورت خطرناک ہے۔" سوئی نے کہا۔ "مجھے تیرے ساتھ ہونا چاہئے۔"

وہ پتا شاہراہ سیوکل پر واقع ایک بلڈنگ کا تھا۔ خان غلیل العزیز بلڈنگ سات منزلہ تھی۔ اسی کی دوسری منزل کے ایک حصے میں منصور قیام پڑ رہا تھا۔ فون پر نجوا سے میں نے اسی کے بارے میں تصدیق کی تھی۔ انسانی قایلوں سے نکل کر جلد ہی میں اور سوئی مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر مجھے یاسف کی تاکید یاد آئی۔ یاسف نے کہا تھا کہ میں 'نجوا سے دشمنی مول نہ لوں۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ

خیال بھی آیا کہ پہلے نجیب اور پھر نجوا کے معاملے میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں ہی چوکتا ہو گئے تھے۔ سو میں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی میں نے تو انسانی قالب اپنا لیا، لیکن سوی میرے ایما پر ٹائیڈ ہی رہی۔ راستے میں اسے میں اپنے ارادے سے باہر کر چکا تھا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے منصور کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس کے جسم پر موجود لباس پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی ابھی کبیں سے آیا ہے اور لباس تبدیل نہیں کر سکا۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص کوئی سوال کرتا، میں خود ہی بول اٹھا۔ ”میرا نام سعد ہے اور مجھے منصور صاحب سے ملنا ہے۔“ میرا ذریعہ اظہار عملی ہی تھا۔

”مجھی کو منصور کہتے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ..... آپ کو پہلے میں نے کبھی نہیں دکھا۔“

”جی ہاں، میں پہلی بار سلیمانیہ سے آپ کے شہر آیا ہوں۔ مجھے دراصل نجوا صاحبہ سے ملاقات کرنی تھی جو آپ کے ہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔“

اس پر میں نے توقع کے مطابق منصور کو چوکتے دیکھا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکرا کر بولا۔ ”تشریف لائیے!“

منصور کے کہنے پر میں نے اندر قدم رکھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور مجھے ساتھ لے

نشت گاہ میں آگیا۔ وہاں کے سامان آرائش سے منصور کی امارت ظاہر ہو رہی تھی۔ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے منصور تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ریوالور نکال لیا۔

”ہاں اب بتاؤ سعد! تمہیں میرا پتا کہاں سے ملا؟“ منصور نے یہ کہتے ہوئے ریوالور مجھ پر تان لیا۔ ابھی تک میں صوفے پر بیٹھ نہیں سکا تھا۔ منصور کی طرف دیکھ کر میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

”اگر ہم دوستانہ فضا میں بات کریں تو ہمارے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب اطمینان بخش دوں گا۔ میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں۔ مجھے غلط نہ سمجھو اور یہ ریوالور جیب میں رکھ لو۔“

”تم یقیناً مضبوط اعصاب کے مالک ہو، لیکن تمہیں شاید یہ خبر نہیں کہ میں گولی چلانے میں دیر نہیں کرتا اور غیر ضروری مشورے بھی مجھے قبول نہیں۔“ منصور کی آواز میں سختی برقرار رہی۔ ”تم سے جو پوچھا جا رہا ہے، صرف اس کا جواب دو! مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“

”تمہارے ایک سوال کا جواب دینے سے اور بہت سوالات پیدا ہوں گے۔“ میں بولا۔ ”اس سے بات اور الجھتی جائے گی، غلط فہمیاں ہوں گی جو میں نہیں چاہتا۔ نجوا صاحبہ اس گفتگو کے دوران میں یہاں موجود ہوں تو مناسب ہے۔ میں انہی سے ملنے بھی آیا تھا کیوں کہ وہی مرکز شہر دونوں پاکستان گئی تھیں۔ انہیں میں نے وہیں پہلی بار دیکھا تھا۔“

”پاکستان سے تمہارا کیا تعلق؟ تم تو عراقی ہو اور اپنے بارے میں بتا چکے ہو کہ سلیمانیہ سے آئے ہو۔“ منصور کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔

”میں وہاں سیروسیاحت کی غرض سے گیا تھا۔“ بلا جھجک میں نے کہہ دیا۔

اسی لمحے نشست گاہ کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہٹا اور نجوا نظر آئی۔ اس کے جسم پر ریشمی گاؤن تھا۔ اسے پہلی مرتبہ میں نے قریب سے دیکھا۔

”منصور! تم آرام سے ادھر سائے والے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ اس اجنبی شخص سے میں بات کروں گی۔ میں آگئی ہوں تو اب یہ کہیں نہیں جاسکتا! نجوا کی آواز میں خود اعتمادی تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”بیٹھو!“

میں قریب ہی موجود صوفے پر بیٹھ گیا تو نجوا چلتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نجوا کے کہنے پر منصور دور ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ ریوالور اس نے اب اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔

”اب تم جو بھی کو گے، اس میں جھوٹ شامل نہیں ہو گا!“ نجوا کے لہجے میں حکم تھا۔

میں نے محسوس کر لیا کہ جیسے وہ میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔

”میں سچ بولوں گا اور تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔“ میں دانستہ خواب ناک سی آواز میں بولا۔ میرا مقصد اس سے یہ ظاہر کرنا تھا جیسے اس کی شیطانی قوتوں کے زیر اثر آچکا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

”پاکستان میں تم نے مجھے کہاں اور کب دیکھا تھا؟“ نجوا نے مجھ سے پہلا سوال کیا۔

”یہ واقعہ پاکستان کے شہر کراچی کا ہے۔“ میں نے یہ دستور خوابیدہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”ساحل سمندر کی سیر کر کے میں لوٹ رہا تھا کہ دو حبشیوں کو تمہاری کار کا تعاقب کرتے دیکھا۔ پھر انہوں نے تم پر فائرنگ کی اور.....“ وہ پورا واقعہ میں نے من و عن بیان کر دیا جو دیکھا تھا، پھر کہنے لگا۔

”اس واقعے کو میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا، مگر ان حبشیوں پر مجھے بہت غصہ آیا جنہوں نے تمہیں قتل کرنا چاہا تھا۔ ممکن ہے کہ میں انہیں بھول جاتا، لیکن دوسرے دن وہ مجھے پھر نظر آگئے۔ جس ہوٹل میں میرا قیام تھا وہاں وہ دونوں بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں اپنے تجسس کو نہ دبا سکا اور ان کی ٹوہ میں لگ گیا۔ اسی رات ایک پستہ قد بھوری آنکھوں والا شخص ان سے ملنے آیا۔ میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں تو ان حبشیوں کے نام معلوم ہوئے۔ تمہارا نام اور اس پستہ قد شخص کے نام کا بھی پہلی مرتبہ پتا چلا۔ خبر نہیں کس طرح نجیب کو یہ علم ہو گیا کہ میں کمرے کے دروازے سے کان لگائے ان لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں! بس اچانک دروازہ کھلا اور مجھے انہوں نے کمرے کے اندر گھسیٹ لیا۔ نجیب کے حکم پر ان حبشیوں نے مجھے زد و کوب کیا۔ مجھے انہوں نے دھمکی دی کہ آئندہ ان کے راستے میں آیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنی اس توہین پر میرا خون کھول اٹھا۔ جسمانی طور پر میں اتنا صحت مند ہوں کہ ان دونوں حبشیوں کے قابو میں نہ آتا، لیکن بھوری آنکھوں والے نے جیسے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ وہ

بڑا پراسرار شخص تھا۔ اس نے مجھے بہت ذلیل کیا اور کہا 'میں تمہیں کسی کیڑے کی طرح مسل کر بیٹھ سکتا ہوں۔ اسی کے ساتھ نجیب نے فوری طور پر مجھے وہ ہوٹل چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ میں اسی رات ایک اور ہوٹل میں منتقل ہو گیا، لیکن بلاوجہ اپنی توہین و ذلت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی۔ میں ان حبشیوں سے انتقام لینے کی خاطر اگلی ہی رات کو پھر ان کے ہوٹل پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے میں نے ان حبشیوں کی عجیب اور حیرت انگیز باتیں سنیں۔ اس رات وہ تم پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ کر کے لوٹے تھے۔ وہ تمہارے ہی متعلق گفتگو کر....."

"وہ عجیب اور حیرت انگیز باتیں کیا تھیں؟" نجوا نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"ان باتوں سے مجھے پتا چلا کہ نجیب اور کوئی شخص ظلال بے مقرر کے غلام ہیں۔ تم مقرر کے غلاموں سے بغاوت کر چکی ہو۔"

میرا جواب سن کر نجوا نے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ حبشی آئندہ روز قاہرہ روانہ ہونے والے ہیں، موقع غنیمت جانا۔ دستک دینے کے بعد جیسے ہی دروازہ کھلا، میں نے ان حبشیوں کو سنبھلنے نہ دیا۔ میرا ارادہ انہیں ہلاک کرنے کا نہیں تھا، مگر اپنی جان بچانے ہوئے وہ دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔ وہیں ایک بیڈ پر پاکٹ ڈائری پڑی تھی۔ جو انہی دونوں میں سے کسی کی تھی۔ فرار ہونے سے پہلے میں وہ ڈائری اٹھا لیا۔ اسی ڈائری میں مجھے کچھ نام پتے اور فون نمبر ملے جو اس شہر کے ہی تھے۔ خوف کے سبب کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں، دوسرے ہی روز پاکستان سے عراق واپس آ گیا۔"

"ظاہر ہے کہ تم کراچی سے اپنے شہر سلیمانہ گئے ہو گے۔ وہاں سے تم بغداد کیوں آئے؟" نجوا نے دریافت کیا۔

"تمہاری تلاش میں۔" میں نے جواب دیا۔ "ڈائری میں درج پتے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا تعلق تمہی سے ہو سکتا ہے۔ صرف ایک پتا ایسا تھا کہ جس کے ساتھ حاشیے پر تمہارا نام بھی لکھا تھا۔" نجوا کو اپنی بات کا یقین دلانے کی خاطر میں نے ایسا کہہ دیا ورنہ ڈائری میں کہیں اس کا نام نہیں لکھا تھا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ مجھے تمہاری تلاش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اگر تم..... تم مجھے نہ ملتیں تو شاید میں اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو جاتا۔"

"وہ کیوں؟ تمہیں میری تلاش کس لئے تھی؟" نجوا نے پوچھا۔

"اس لئے نجوا کہ تمہی مجھے مقرر کے پراسرار غلاموں سے بچا سکتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری ہی طرح وہ میرے قتل کا حکم بھی نہ دے دیں۔ میں تمہاری امان میں آنا چاہتا ہوں۔ نادانگی میں میرے ہاتھوں وہ حبشی قتل ہو گئے۔ نجیب اور اس کے ساتھی مجھ سے بدلہ لے سکتے ہیں۔" میں قدرے سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تمہی نے فون کیا تھا؟"

"ہاں۔" میں نے اقرار کر لیا۔ "میرے اندازے کے مطابق ریسیور تمہی نے اٹھایا تھا۔ سلسلہ میں

نے اس لئے منقطع کر دیا کہ یہ باتیں فون پر ممکن نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ میں تمہارے لئے بالکل اجنبی تھا۔ ممکن ہے کہ تم مجھ سے ملنا پسند نہ کرتیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مجھے اپنے ذہن سے ایک بوجھ سا ہٹا محسوس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ نجوا نے اپنی دانست میں مجھے اپنے اثر سے آزاد کر دیا ہے۔ اس نے میری طرف سے نظریں ہٹائیں اور سامنے ہی رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب غالباً اسے یہ ضرورت نہیں رہی تھی کہ مجھے سچ بولنے پر مجبور کرے۔ اس کے ہونٹوں پر مجھے بڑی پراسرار مسکراہٹ رقص کرتی دکھائی دی۔

"کہاں ٹھہرے ہو تم؟" نجوا نے معلوم کیا۔

"میں نے ہوٹل کا نام بتا دیا اور بولا۔ "میری بیوی رشیدہ بھی ساتھ ہی آئی ہے۔"

"کیا؟" اس نے اظہار حیرت کیا۔ "ان حالات میں کہ جب تمہاری زندگی سخت خطرے میں ہے، تم

اپنی بیوی کو ساتھ لئے پھر رہے ہو! کیا اسے بھی تم یہ حالات بتا چکے ہو؟"

"اسی نے تو مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ کسی طرح تمہیں تلاش کروں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی

ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اسے کیسے نہ بتاتا کہ کس عذاب میں گرفتار ہوں! ایسے میں وہ مجھے کس طرح تھا

بغداد آنے دیتی! وہ میرے ساتھ پاکستان بھی گئی تھی۔ جس وقت کراچی میں تم پر پہلا قاتلانہ حملہ ہوا،

ٹھیکسی میں وہ بھی میرے ساتھ تھی۔" نجوا کو میں نے مصلحت کے تحت سوئی کے متعلق بھی بتا دیا۔ اگر وہ

تصدیق کرتی تو میرا بیان غلط ثابت نہ ہوتا۔

"تم وہ ڈائری اپنے ساتھ لائے ہو جس میں نام پتے درج ہیں؟"

"نہیں۔ ڈائری ہوٹل میں میرے پاس محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔

"منصور ابھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم وہ ڈائری اس کے حوالے کر دو۔"

"نجوا! ابھی تک تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ میں تمہاری امان....."

"تم زندہ رہو کہ مر جاؤ، اس سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!" وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔ "مجھے

تلاش کرنے سے پہلے تمہیں یہ تو سہنا ہی چاہئے تھا!"

"تو..... تو کیا تم مجھے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو جانے دو گی؟" میں نے خود کو خوفزدہ

ظاہر کیا۔

"اپنے دشمنوں پر جال پھینکنے کے لئے میں تمہیں چارے کے طور پر استعمال کر سکتی ہوں۔ اب یہ

تمہاری قسمت ہے کہ تم زندہ بچ جاؤ۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ تمہیں بچاؤں۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور

ہے تو بولو ورنہ آج کے بعد کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں صاف بات کر رہی ہوں اور تمہیں

اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی۔"

"یہ..... یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔ وہ..... وہ نجیب بہت خطرناک آدمی ہے۔" میں

جیسے گھبرا گیا۔

"اور مجھے تم کیا سمجھتے ہو؟..... نجیب کی تو حیثیت کیا ہے، میں تو ظلال بے کوالیوں پر نچاتی

ساتھ تھا اس لئے سوئی سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ پھر بھی میڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سوئی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ منصور آگے آگے تھا۔ پھر کھانے کے بھانے میں اترتے اترتے رکا۔ اسی لمحے سوئی قریب آگئی۔

”تو جا اور ڈائری میں حاشیے پر نچوا کا نام لکھ دے، منصور کے پتے.....“

میری بڑبڑاہٹ کے جواب میں وہ بول اٹھی۔ ”میں سمجھ گئی تھی اور جانے ہی والی تھی۔“ اس کی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی تھی۔

منصور نے میڑھیاں اترتے ہوئے میری جانب پل کر دیکھا تو میں تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

بلڈنگ کے نیچے اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ آگے ہی بٹھالیا اور بولا۔ ”چونکہ رہائشیوں کے تم پہچانے جا چکے ہو۔“ اس نے کار اشارت کر دی۔

”پہچانے جانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”انتہائی بات نہیں سمجھو! اگر وہ دونوں حبشی اب اس دنیا میں نہیں کہ جنہوں نے تمہیں پاکستان میں دیکھا تھا تو نجیب تمہاری صورت کیسے بھول سکتا ہے؟“

”تو..... تو کیا وہ..... وہ یہاں بغداد میں ہے؟“ میں نے اس طرح یہ سوال کیا کہ مجھ پر خوف کا غلبہ ہو۔

اس پر منصور ہنس دیا اور کہا۔ ”تم تو نجیب سے یوں ڈر رہے ہو جیسے وہ ابھی سامنے آکر تمہاری گردن دبا لے گا۔ میں نے تو احتیاطاً تمہیں چونکنا رہنے کو کہہ دیا تھا۔ نجیب یا مقرر کے دوسرے غلام کب کہاں پہنچ جائیں، کچھ علم نہیں ہوتا۔ خود ہم بھی ان کی طرف سے محتاط رہتے ہیں۔ تمہارے خوفزدہ ہونے پر مجھے حیرت ہے۔ معلوم نہیں تم نے کس طرح رچرڈ اور جیس جیسے خطرناک قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا! اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو سعد! اب تم اکیلے نہیں ہو۔“

کار تیز رفتاری سے فاصلے طے کر رہی تھی کہ منصور کو میں نے رفتار ایک دم کم کرتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ اسی کی نگاہ عقبی آئینے پر پڑی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے چونک کر منصور سے پوچھا اور پھر پیچھے دیکھا۔

”شاید کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”مگر تم مڑ کر نہ دیکھو! یہ بے وقوفی ہے۔“

سیارہ رنگ کی ایک کار کافی دیر سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے کار کی رفتار کم کر دی تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ممکن ہے یہ میرا شخص وہم ہو مگر میں تصدیق ضرور کروں گا۔ اب ہم سیدھے ہوٹل نہیں جائیں گے۔ تمہارے پاس ریوالور ہے؟“ اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس نے مجھے سے معلوم کیا۔

”نہیں۔“ میں نے بتایا۔

”تم عجیب آدمی ہو۔“ منصور کہنے لگا اور کار کی رفتار دوبارہ بڑھا دی۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کا ایک

رہی ہوں۔ تمہیں چارہ بنانے کی پیش کش بھی میں نے اس لئے کی ہے کہ تم ان دونوں حبشیوں پر غالب آگئے۔ انہیں مارا ڈالنا بہر حال آسان کام نہیں تھا۔ مجھے بھی ان کی موت کا پتا چل گیا تھا، لیکن یہ آج معلوم ہوا کہ وہ تمہارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ زیادہ گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں اپنی زندگی بچانے کا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ! تم سے جو کہا جائے اس پر عمل کرتے رہو۔ کہ منصور ہے؟“

”تم نے تو میرے لئے کوئی اور راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ م..... میں کس طرح انکار کر سکتا ہوں!“

”میں جہاں بھی ہوئی تم سے رابطہ قائم رکھوں گی۔ یہ بات اپنے ذہن میں بٹھالو کہ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہے!“ نچوا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس طرح وہ آدمی زادی کیا چاہتی ہے! اس کا مقصد مجھے اپنا آلہ کار بنانا تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے چھپائی بھی نہیں تھی۔ ہاں اسے یہ خبر نہیں تھی کہ میں تو خود ہی اس کے جال میں پھنسنے آیا ہوں۔

”اچھا اب تم جاؤ! میری اجازت کے بغیر نہ تو اب تم وہ ہوٹل چھوڑو گے، نہ سلیمانہ واپس جاؤ گے!“ نچوا نے تاکید کی پھر اس نے منصور کی طرف مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے گفتگو کے دوران میں منصور نے مداخلت نہیں کی تھی۔ اس کی حیثیت مجھے نچوا کے ایک مرے سے زیادہ محسوس نہ ہوئی۔

نچوا کا اشارہ پاتے ہی منصور اٹھ کر کھڑا ہوا اور مجھے مخاطب کیا۔ ”چلو!“ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے نچوا پر رخصتی نگاہ ڈالی تو وہ کہنے لگی۔ ”تمہیں اگر رقم کی ضرورت ہو تو منصور کو بتا دینا، یہ فراہم کر دے گا۔ ویسے تو مجھے تم کسی خوش حال خاندان کے فرد لگتے ہو ورنہ تمہیں سیروسیاٹ کا رنگا شوق نہ ہوتا۔“

”فی الحال مجھے رقم نہیں چاہئے، صرف تمہارا تحفظ درکار ہے۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔“ میں بولا۔ جواب میں وہ صرف مسکرا دی اور میں، منصور کے ساتھ نشست گاڑ سے نکل آیا۔ نچوا سے ملاقات کے دوران میں مصلحتاً میری زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی تھی کہ جو غلط ثابت ہو جاتی۔ ڈائری میں جہاں منصور کا پتا لکھا تھا، وہاں حاشیے پر نچوا کا نام بھی لکھا ہونا چاہئے تھا۔ پھر بھی میرے لئے ایک تسلی بخش امر یہ تھا کہ میرے اور نچوا کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سوئی نے سن لی تھی۔ اس عرصے میں سوئی وہیں ارد گرد منزل لاتی رہی تھی۔ اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے باوجود غالباً نچوا نے اس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ نچوا کو مجھ پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہوا۔ پھر یہ کہ اس کی پوری توجہ میری طرف تھی۔ میرے لئے اس طرح آئندہ بھی کسی ایسی صورت حال سے فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔

سوئی سے مجھے امید تو یہی تھی کہ اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ اسے کیا کرنا ہے! ڈائری اس نے بھی دیکھی تھی۔ کراچی میں ہم دونوں ہی کئی بار اس ڈائری کی ورق گردانی کر چکے تھے۔ منصور میرے ساتھ

خانہ کھولا۔ سامنے ہی ریوالور پڑا تھا۔ وہ بولا۔ ”اٹھالو اسے!“

میں نے ریوالور اٹھ کر جیب میں رکھ لیا۔

”ہو سکتا ہے اس کی نویت نہ آئے۔“ منصور بولا۔ ”لیکن ہمیں غافل نہیں رہنا چاہئے۔“

ہماری کار اب میوزیم کے قریب سے گزر رہی تھی جسے اہل عرب مصحف کہتے ہیں۔ عربی مصحف اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں رسالے اور صحیفے جمع ہوں۔ مجازاً رخسار محبوب بھی اس کے میوزیم میں کیوں کہ نادر اشیاء جمع کی جاتی ہیں، غالباً اسی سبب سے یہ لفظ میوزیم کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ یہ وضاحت میں نے اس لئے کی کہ لفظ مصحف مجھے میوزیم کے فہم البدل کے طور پر اچھا تھا۔

مصحف ہی سے ایک راستہ بائیں جانب مڑ رہا تھا۔ تعاقب میں آنے والی کار ادھر چلی گئی۔ سیدھے چلے رہے۔

”تمہارا اندیشہ تو غلط، ظہرت ہوا منصور!“ میں نے کہا۔ ”وہ سیاہ کار اب ہمارا تعاقب نہیں کر رہی۔“

”معلوم ہے مجھے!“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”اب اس کی جگہ ایک نیلی کار نے لی ہے۔ مجھے شبہ

وہ بے وقوف سمجھ رہے ہیں۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ ایک ساتھ ک

کاریں بھی آگے پیچھے تعاقب کر سکتی ہیں۔ یہ نیلی کار بھی میری نظر میں تھی۔“

”لیکن تعاقب سے ان کا مقصد کیا ہے؟“ میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

”تمہیں تو کچھ خبر نہیں!“ وہ کسی قدر جھنجھلا گیا، پھر مجھے سمجھانے لگا۔ ”کسی کے تعاقب کا مقصد

جاننا ہوتا ہے۔ کہ وہ کہاں جا رہا ہے! اب سمجھے؟“

”ہاں سمجھ گیا۔“ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”ان کا اگلا قدم یہ معلوم کرنا ہو گا کہ یہ سفر میں کس لئے کر رہا ہوں!“ منصور نے خود ہی بتایا۔

پھر ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں نئی تعمیرات ہو رہی تھیں۔ نیلی کار اب بھی ہمار

پیچھے آرہی تھی۔ اس چھوٹی سی آبادی سے گزر کر ہم شہری آبادی سے نکل آئے۔ منصور یقیناً دانستہ اد

آیا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کیوں کہ منصور نے کار کی رفتار بڑھادی تھی۔ اس سے درمیانی فاص

بڑھ گیا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کرتے ہی منصور نے مجھ سے کہا۔ ”یہاں ان سے نمٹنا جاسکتا ہے۔ میں ایک

کار کو سڑک کے کنارے روک لوں گا۔ تمہیں اسی وقت کار کی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر نیلی کار پر فائر کھو

دینا ہے۔ کوشش کرنا کہ اس کا کوئی ٹائر برسٹ ہو جائے۔“

منصور ابھی اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا کہ پیچھے آنے والی کار مزید تیزی سے آ

بڑھی۔ اسی کے ساتھ فضا دھماکوں سے گونجنے لگی۔ تعاقب کرنے والوں نے ہماری کار پر فائرنگ شروع

دی تھی۔ اس کے باوجود منصور نے سڑک کے کنارے کار کو روک لیا اور دروازہ کھول کر باہر چھلانگ

دی۔

میں نے بھی منصور کی تقلید میں ایسا ہی کیا اور پھر کار کی آڑ لے کے اسی کی طرح جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

تعاقب کرنے والی نیلی کار خاصے فاصلے پر رکی ہوئی تھی۔ کار کی ایک جانب میں تھا، دوسری طرف

منصور۔ میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ سڑک کے کنارے ذرا فاصلے پر بھاڑیاں اگی ہوئی تھی۔ میں نے اس

طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے انسانی قالب چھوڑ دیا۔ میرے پاس جو ریوالور تھا، اس میں اب صرف

ایک گولی باقی رہ گئی تھی۔

میں چشم زدن میں نیلی کار والوں تک پہنچ گیا۔ وہ تین تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل بھی

تھی۔ میں نے پہلے اسی پر ہاتھ ڈالا اور رائفل چھین لی، پھر یقینہ دو کو بھی نہ چھوڑا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی

ریوالور نہ رہ سکے۔ اسی کے ساتھ میں نے انسانی پیکر اپنا لیا۔ میں ان تینوں کے عقب میں تھا۔ وہ گھبرا کر

کھڑے ہو گئے۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو!“ میں نے انہیں سخت آواز میں حکم دیا۔ ان میں سے ایک کی پشت پر میں

نے رائفل کی ٹال رکھ دی تھی۔

مخالف سمت سے فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ منصور کے پاس یقیناً دوبارہ ریوالور لوڈ کرنے کے لئے

گولیاں نہیں ہوں گی۔

”کون..... کون ہو تم؟“ ایک شخص نے خوفزدہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”تمہاری موت!“ میں سخت آواز میں بولا۔ ”آگے بڑھو! اس کار کی طرف جس پر ابھی تم نے

فائرنگ کر رہے تھے!“

انہوں نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ میں نے اسی عرصے میں منصور کی کار کو تیزی سے

مڑ کر ادھر ہی آتے دیکھا۔ اسے غالباً فائرنگ رکتے ہی صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ کار کو اسی جانب

آتے دیکھ کر میں نے ان تینوں کو روک جانے کے لئے کہا۔

ذرا ہی دیر میں منصور نے قریب آکر کار روک لی اور نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جسے

وہ شاید دوبارہ لوڈ کر چکا تھا۔

منصور نے ان تینوں کے چروں کو غور سے دیکھا، پھر بولا۔ ”میں پہچان گیا تمہیں! تم کرائے کے ٹو

ہو۔ پھر بھی تم میں سے صرف ایک زندہ بچ کر جاسکے گا۔ اب یہ فیصلہ تم خود کر لو کہ کسے زندہ رہنا ہے!

تمہیں شاید ضرغام نجفی نے یہ نہیں بتایا کہ میں کون ہوں! اگر تم یہ جاننے تو شاید مجھ پر حملہ نہ کرتے۔“

”ہم تینوں کا قصور یکساں ہے تو پھر تم کسی ایک کو زندہ کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟“ ایک شخص نے

ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”ناک وہ ضرغام نجفی کو میرا پیغام پہنچا دے۔“ منصور جواباً بولا۔ ”پیغام یہ ہے کہ اب اگر اس نے

مجھے چھیڑا تو لپٹی قتل کر دی جائے گی۔“

میں اس عرصے میں ان تینوں کے ذہن پڑھ چکا تھا۔

منصور سے وہ تینوں زندگی کی بھیک مانگتے گئے۔ اس پر منصور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم شاید خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کسے زندہ رہنا چاہئے! تو پھر یہ فیصلہ میں اپنے ساتھی پر چھوڑا ہوں۔ وہ جسے چاہے گولی مار دے۔ اس کی وجہ سے تم اس وقت چوہے بن گئے ہو۔“

اس موقع پر میں خاموش نہ رہا اور منصور کو مخاطب کیا۔ ”دولت کے لالچ میں آکر انہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ تم جہاں ایک شخص کو زندگی بخش رہے ہو، بقیہ دو کو بھی چھوڑ دو۔ میرا خیال ہے انہیں ہمارے قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہ صرف ہم پر فائرنگ کر کے لوٹ جاتے۔“

”تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟“ منصور کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

”اس لئے کہ انہوں نے صرف ہوائی فائرنگ کی ہے۔ ایک بھی گولی سیدھی نہیں چلائی ورنہ رائل سے چلائی جانے والی گولیاں ہماری کار کو چھلنی کر دیتیں۔“ میں نے بڑی مضبوط دلیل دی۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ ان تینوں کو صرف ہوائی فائرنگ کا حکم ملا تھا۔

”لیکن اس ہوائی فائرنگ کا مقصد؟“ منصور نے مجھ سے پوچھا۔

”ضرغام شاید اس طرح یہ باور کرانا چاہتا ہو گا کہ وہ چاہے تو تمہیں قتل بھی کر سکتا ہے۔ اسے دھمکی یا وارننگ بھی کہا جا سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

منصور کی تیوریوں کے بل غائب ہو گئے۔ وہ بولا۔ ”اگر تم ان تینوں ہی کو زندہ چھوڑنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ انہیں جانے دو!“

میری دلیل میں اتنا وزن تھا کہ منصور نے ان تینوں سے میرے خیال کی تصدیق بھی نہیں چاہی۔ میں انہیں غیر مسلح تو پہلے ہی پرچکا تھا، پھر بھی منصور نے نیلی کار کی تلاشی لی جو کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ ہماری فائرنگ سے اس کار کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ وہ کار ریوالتوروں سے چلائی جانے والی گولیوں کی رینج میں نہیں آسکی۔ ان لوگوں سے چھپنے ہوئے ریوالتور اور رائل کو منصور نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

”اسے پہلا اور آخر موقع سمجھنا!“ منصور نے ان تینوں سے کہا۔ ”میں آئندہ تمہاری جان بخشی نہیں کروں گا! خواہ تم آج کی طرح مجھ پر ہوائی فائرنگ ہی کیوں نہ کرو! جاؤ! لیکن میرا پیغام ضرغام تک ضرور پہنچا دینا!..... چلو بیٹھو کار میں!“

”ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔“ ان میں سے ایک شخص نے چلتے چلتے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

پھر جب وہ لوگ چلے گئے اور نیلی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو منصور اپنی کار کی طرف بڑھا۔ مجھے بھی اس نے چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

”یہ ضرغام کون ہے؟“ کار میں بیٹھے ہی منصور سے میں نے سوال کیا۔

”خود کو وہ جراثیم کی زیر زمین دنیا کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ مقرر کے غلام بھی کبھی کبھار اس سے کوئی کام لیتے رہتے ہیں۔ نجوانے اسی لئے اس کی ٹاک میں ٹکیل ڈال رکھی ہے۔“

”وہ کس طرح۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کی محبوبہ لیلیٰ کو اغوا کر کے۔“ منصور نے بتایا۔ ”یوں وہ کبھی حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ تم

ساتھ رہو گے تو رفتہ رفتہ خود ہی تمہیں بہت سی باتوں کا علم ہوتا رہے گا۔ ہاں تم یہ تو بتاؤ کہ اچانک کہاں اور کیسے غائب ہو گئے تھے؟ تم نے واقعی کمال کر دیا۔ ان حملہ آوروں تک تم کس طرح پہنچ گئے اور پھر کیسے انہیں غیر مسلح کر دیا؟ تمہارا یہ معمولی کارنامہ نہیں۔“

مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ منصور مجھ سے اس ضمن میں ضرور معلوم کرے گا، سو بولا۔ ”ریوالتور میرے پاس بھی تھا اور جب تم نے کار دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تو تمہارے ہاتھ میں بھی صرف ریوالتور تھا۔ دو ریوالتوروں میں کتنی گولیاں ہوتی ہیں، یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی! ہم دونوں کب تک جوابی فائرنگ کر سکتے تھے! ہماری فائرنگ کا مقصد بھی محض یہ تھا کہ وہ ہمیں غیر مسلح سمجھ کر قریب نہ آئیں ورنہ تو وہ رینج سے باہر تھے۔

ان حالات میں ہماری زندگی خطرے میں تھی۔ اس وقت تک یہ اندازہ نہیں تھا کہ حملہ آوروں کا اصل مقصد کیا ہے! میرے ریوالتور میں جب آخری گولی رہ گئی تو میں نے سڑک کے کنارے نشیب میں جھاڑیاں دیکھیں اور تیزی سے ادھر سینے کے بل رینگ گیا۔ انہی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا میں، حملہ آوروں کے عقب میں پہنچ گیا۔ پھر وہ قدموں رائل والے کے پیچھے جا کر میں نے اس کی گردن کو اپنی کلائی کی گرفت میں لے لیا۔ ایسا کرتے وقت میں نے انتہائی تیزی دکھائی کیوں کہ میری ذرا سی غفلت مجھے موت سے ہٹکار کر دیتی۔ عقب سے یہ وار رائل والے کے لئے غیر متوقع ہی رہا ہو گا۔ یوں مجھے اس سے رائل چھین لینے میں دشواری نہیں ہوئی۔ رائل میرے ہاتھ میں آگئی تو ایک شخص کی پشت پر نال رکھ کر میں نے اسی کی آڑ لے لی۔ یہ وہی شخص تھا کہ جس سے میں نے رائل چھینی تھی۔ اس کے بعد بقیہ دو افراد کو میں نے دھمکی دی کہ وہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ ان کے ساتھی کو پھونک دوں گا۔“ یہ پوری روداد میں نے منصور سے اس طرح بیان کہ اسے میری کسی پراسرار قوت کا اندازہ نہ ہو۔ جو کچھ میں نے جس انداز میں بتایا، کسی بھی ذہین اور دلیر آدم زاد کے لئے ناممکن نہیں تھا۔

منصور کے چہرے سے سرعوبیت کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”یہ ظاہر تو تم ایک عام سے آدمی لگتے ہو، مگر انتہائی بیدار مغز اور بہادر ہو۔ تم نے صورت حال کا بالکل صحیح قیاس کیا۔ یقیناً تمہارا انتخاب کر کے نجوانے کمال دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ مردم شناس عورت ہے۔“

ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ مجھے سوی کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ ہوٹل پہنچنے میں تاخیر کی وجہ تک پہنچ گئی تھی۔ میری طرف سے اس کا فکر مند ہو جانا فطری تھا۔ منصور کی نگاہ سامنے سڑک پر تھی۔ میں نے سوی کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔ خود وہ بھی مجھے یہ خیریت دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔

پھر ہمیں ہوٹل فرمائڈس تک آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ منصور نے ہوٹل کے پارکنگ لائٹ میں کار کھڑی کی اور میرے ساتھ پہلی منزل پر آگیا۔

سوی پہلے ہی ہماری آمد سے واقف تھی۔ اس نے دسک دیتے ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ دانستہ

میرے ساتھ منصور کو موجود پا کر اس طرح چونک اٹھی جیسے حیران ہو۔

”یہ ہمارے دوست ہیں، دشمن نہیں۔“ میں آگے بڑھتے ہوئے سوی سے مخاطب ہوا۔ ”ان کا نام منصور ہے۔“

سوی ایک طرف ہو گئی اور منصور بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔

”دروازہ بند کر دو رشیدہ!“ میں نے سوی کا فرضی نام لے کر کہا۔ جب وہ دروازہ اندر سے بند کر کے پلٹی تو میں نے مسدود سے اس کا تعارف کرایا۔

”تمہاری جوی سے مل کر بھی خوشی ہوئی سعد! پہاڑوں پر رہنے والے رشیدہ ہی کی طرح حسین و پرکشش ہوتے ہیں۔“ منصور قدرے بے تکلفی سے بولا۔

”شکریہ! تشریف رکھئے۔“ سوی نے ایک طرف پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

سوی نے موجود انسانی پیکر اپناتے ہوئے بھی حسن و دل کشی کا خیال رکھا تھا۔ مجھے یہ بات کچھ گراں سی گزری کہ منصور کی نظرس برابر سوی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسے وقتی مجبوری اور آدم زادوں کی سرشت جان کر میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ الگ بات کہ جن زاد اس معاملے میں آدم زادوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

”چائے تو پلاؤ گے نا سعد!“ منصور نے غالباً مزید کچھ دیر بیٹھنے کی غرض سے کہا۔ وجہ مجھے معلوم ہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ ”جی فرمائیے!“

”آپ کی کال ہے، بات کیجئے!“ آپریٹر کی آواز آئی۔

دوسری طرف نجوا تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”دیر کیسے ہو گئی؟ ابھی تک منصور واپس نہیں آیا! کتنی دیر ہوئی اسے تمہارے پاس سے چلے؟“

”وہ ابھی موجود ہیں، آپ بات کر لیجئے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ نجوا کی آواز میں سختی آگئی۔ ”وہ اب تک کیوں رکا ہوا ہے وہاں؟ فون پر بلاؤ اسے؟“

”منصور؟ تمہارا فون ہے، بات کرلو۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس کرسی سے اٹھ گیا۔

”میرا فون؟..... اچھا سمجھ گیا!“ منصور نے اٹھ کر مجھ سے ریسیور لے لیا۔ چند لمحوں کے بعد منصور نے جواب میں کہا۔

”راستے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی..... تفصیل آکر بتاؤں گا..... ٹھیک ہے، میں جلد سے جلد ڈائری لے کر آ رہا ہوں۔“ اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

نجوا کو میں، ہوٹل کا نام تو بتائی چکا تھا، انکو ڈائری سے اس نے میرا روم نمبر معلوم کر لیا ہو گا۔

”کبھی کہیں چین سے بیٹھنا نصیب ہو گا۔“ منصور بڑبڑایا، پھر میرے بجائے سوی کو مخاطب کیا۔ ”تمہارے ساتھ پھر کبھی آکر چائے پیوں گا رشیدہ! فی الحال مجھے جلدی واپس جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ

سے بولا۔ ”سعد! ڈائری دے دو! نجوا نے مجھے فوراً بلوایا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، پھر کبھی سہی!“ میں اپنے دل پر جبر کر کے اخلاقاً مسکرایا اور سوی سے ڈائری منگالنے کے لئے کہہ دیا۔

سوی اٹھی اور کڑی کی الماری کے نچلے حصے میں رکھا ہوا ایک سوٹ کیس نکھول لیا۔

”یہ لو۔“ سوی نے ڈائری لا کر مجھے تھما دی۔ اس نے بھی یقیناً منصور کی آوارہ نگاہی کو بھانپ لیا تھا۔

ڈائری میں نے منصور کے حوالے کر دی۔ اس کے چہرے پر لمبے بھر کو مجھے تناؤ سادکھائی دیا۔ اسے شاید یہ توقع ہو گئی کہ سوی میرے بجائے اسی کو ڈائری دے گی۔

منصور اس کے بعد رکا نہیں۔ وہ چلا گیا تو سوی نے دروازہ بند کر لیا اور مجھ سے بولی۔ ”اس کم عقل آدم زاد کو خبر نہیں کہ کس کی طرف میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا!“

”تو بھی تو ایسے انسانی قالب اپناتی ہے کہ رستہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اس لئے بھی اے علیا لیش کہ تیری نگاہ کسی اور طرف نہ اٹھے۔ تیری ہی خوشی کی خاطر میں ایسا کرتی ہوں۔ تو یہ گلہ کر رہا ہے!“

”لیکن دوسروں کو خوش ہونے سے میں کیسے روک سکتا ہوں!“

”لعلت بھیج اس آدم زاد پر اور یہ بتا کہ یہاں آنے میں اتنا وقت کیسے لگ گیا؟“

میں اسے راستے میں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کرنے لگا۔

سارا واقعہ تفصیل سے سننے کے بعد سوی کہنے لگی۔ ”ایسا لگتا ہے اے علیا لیش کہ نجوا نے بھی اپنا

الگ کوئی گروہ بنا رکھا ہے۔ مجھے تو بڑی عیار عورت معلوم ہوئی۔“

”عیار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پراسرار شیطانی قوتوں کی بھی مالک ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مقرر

کے غلام اسے کبھی کاٹھکانے لگا چکے ہوتے۔“ میں بولا۔

”کس ڈھنسا ئی سے وہ تیرے ہی منہ پر تجھے چارہ بنانے کو کہہ رہی تھی! مجھے تو اس کی باتوں پر بڑا

غصہ آ رہا تھا۔ خبر نہیں وہ تجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے!“

”کون کسے چارہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے؟ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا! ہمیں بہر حال

اپنے دشمنوں تک پہنچنے کے لئے ایک راہ تو مل ہی گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

اس روز ہم خاصے تھک گئے تھے۔ یہ تھکن انسانی قابلوں میں رہنے کی وجہ سے تھی۔ ہم اس لئے ہوٹل سے نہیں نکلے۔

رات کو نہوٹھنے سے پہلے میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوی کو مخاطب کیا۔ ”وہ ڈائری جو ہم نے نجوا

کے حوالے کر دی ہے، اس میں جو نام پتے درج تھے میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ہمیں ان کو بھی نظر

انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیا معلوم ان میں سے کوئی شخص ایسا ہو کہ جس کے ذریعے ہم مقرر کے غلاموں

دو عورتوں، ایک مرد اور چار بچوں سمیت اس گھر کے افراد کی تعداد سات تھی۔ انہیں تین مسلح افراد ڈرا دھکا رہے تھے۔ ان سب کو غالباً وہی تینوں ایک کمرے میں گھیر کر لے آئے تھے۔ مسلح آدمیوں میں سے دو کمرے کے اندر اور ایک باہر کھڑا تھا۔

میں نے چند ہی لمحوں میں صورت حال کا اندازہ کر لیا، پھر بھی فوری طور پر مداخلت نہیں کی۔ زمین پر بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں میں سے ایک نے مڑے بغیر بھاری جسم والے شخص کو مخاطب کیا۔ ”ناصر! بتا دو یہ جو پوچھ رہے ہیں۔“ اس کی آواز میں التجا تھی۔ بھاری جسم والے شخص ناصر نے ایک نظر عورت پر ڈالی، پھر اپنے تین سالہ بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسے آثار نظر آئے جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

”میرے بیٹے کو چھوڑ دو!“ ناصر ٹکست خود سی آواز میں بولا۔ ”میں..... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا، مگر..... یہاں نہیں۔“

”پھر؟..... پھر کیا تم ہمارے ساتھ کہیں چلنا چاہتے ہو؟“ جو شخص ناصر کو نشانے پر لئے ہوئے تھا، اس نے پوچھا۔

”صرف محض تک..... اسی گھر میں۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کمرے سے باہر لے چلو۔“

”اگر تو نے کوئی چالاکی دکھائی تو خود بھی زندہ نہیں بچے گا اور تیرے گھر والے بھی قتل کر دیے جائیں گے!“ ریوالور والے نے دھمکی دی۔

”نہیں، میں..... میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔“ ناصر نے یقین دلایا۔

”چھوڑ دو بچے کو!“ ریوالور والا اپنے ساتھی سے بولا۔ ”تمہیں کمرے کے اندر رہنا ہے۔ عورتوں اور بچوں میں کوئی بھی چپچپے چلائے تو اسے ٹھنڈا کر دینا!“

بچے کو اس آدمی نے آگے بڑھ کر ایک عورت کے پاس چھوڑ دیا۔ بچہ دوڑ کر عورت کے سینے چٹ گیا۔ عورت نے اسے رونے نہیں دیا۔

”چلو باہر!“ دروازہ ریوالور والے نے ناصر کو چلنے کا اشارہ کیا۔

میں اور سومی خاموش تماشا بنے ہوئے ان لوگوں کو دیکھتے رہے۔ نظروں سے چھپے رہنے کے سوا اب تک ہم نے دانستہ اپنی جاتی صفات استعمال نہیں کی تھیں۔ ہم بھی ناصر اور مسلح شخص کے ساتھ گھر کے صحن میں آگئے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یقیناً کوئی ایسی بات ہے کہ جو ناصر اپنے گھروالوں کے سامنے بتانا نہیں چاہتا۔

”ہاں بتاؤ اب! ان دونوں جھیشیوں کو تم کیسے جانتے ہو؟“ ناصر سے پوچھا گیا۔

”اب سے یہ تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ..... وہ مجھ سے ملے تھے۔“ ناصر بتانے لگا۔

”میں..... میں جعلی دستاویزات بناتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے یہی کام لیا تھا اور..... اور اس کے بدلے مجھے ملے شدہ معاوضہ بھی ادا کیا تھا۔ پھر وہ مجھ سے اسی سلسلے میں کئی بار ملے اور اپنا کام کرا کر چلے

کی راہ پر لگ جائیں!“

”یہ ممکن تو ہے اے علیائش، مگر اب وہ بچے نجوا کے علم میں بھی آچکے ہیں۔ اس طرح ہم کسی انجانے خطرے میں بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”خطرہ تو قدم قدم پر ہے۔ ہم اس سے کہاں تک بچ سکتے ہیں! ہاں ایک بات ضرور امید افزا ہے اے سومی کہ تیری موجودگی کو نجوا محسوس نہیں کر سکی۔ ہم اگر انسانی قابلوں سے نکل کر کہیں آئیں جائیں تو شاید نجوا کو اس کی خبر نہ ہو سکے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ ”اور اس کے لئے رات کا وقت ہی زیادہ مناسب ہے۔“

”تو کیا تیرا ارادہ آج ہی رات کسی بچے پر جانے کا ہے؟“ سومی نے پوچھا۔

”اس میں مضائقہ بھی کیا ہے! چلتے ہیں۔ انسانی پیکروں کی قید سے نکل کر کھلی فضا میں پرواز ہمارے لئے تازگی کا سبب ہوگی۔“ میں بولا۔

سومی راضی ہو گئی۔ ہم نے انسانی قالب چھوڑ دیے اور ہوٹل سے نکل آئے۔ ذرا ہی دیر میں ہم بغداد کے ایک قدیم ترین محلے کرب کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ یہاں کی عمارتیں پرانی طرز کی تھیں۔ ہم نے جلد ہی وہ گھر تلاش کر لیا جہاں کوئی شخص ناصر مقیم تھا۔ اس گھر کی چھت پر اترتے ہی ہمیں نیچے سے کھنٹی کھنٹی سی آوازیں سنائی دیں۔ ہمارے لئے یہ صورت حال غیر متوقع ہی تھی، سو چونکا ہو گئے۔

چھت سے اتر کر ہم نیچے صحن میں آئے تو ایک کمرے میں روشنی نظر آئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسلح شخص کھڑا دکھائی دیا۔

”اگر تم نے بچ نہ بولا تو تمہاری کھال اڑھیر دی جائے گی!“ کمرے کے اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ”بولو، جیس اور رچرڈ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

میں ان دونوں جھیشیوں کے نام سن کر چونک اٹھا جو کراچی میں میرے ہاتھوں اپنی جانیں گنوا چکے تھے۔

”اے عورت! دیوار کی طرف منہ کر کے خاموشی سے بیٹھی رہ!“ مردانہ آواز پھر ابھری۔ ”اگر اب تو نے پلٹ کر دیکھا یا کچھ بولی تو تیرے بیٹے کو گولی مار دوں گا میں!“

”نن..... نہیں! اللہ کے واسطے ایسا..... ایسا نہ کرنا! ہم..... مجھے مار دو، مگر میرے معصوم بیٹے کو چھوڑ دو!“ جواب میں ایک عورت کی دہلی دہلی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

”تو پھر اپنے شوہر سے کہہ کہ یہ زبان کھول دے!“

میں نے سومی کو اشارہ کیا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود تمام ہی افراد میرے لئے اجنبی تھے۔ سامنے ہی دو عورتوں اور تین بچوں کو میں نے دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کے منہ سے کھنٹی کھنٹی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ درشت چہرے والے ایک آدمی نے تین سالہ بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچے کے منہ پر اس کا ہاتھ تھا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بھاری جسم والے ایک شخص کو دوسرا مسلح آدمی اپنے ریوالور کی زد پر لئے ہوئے تھا۔

گئے۔ یہ تم بھی جانتے ہو گے کہ..... کہ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور ایسے.....
ایسے کسی جرم کی سزا بہت لمبی ہے۔ میں..... میں اسی لئے چپ تھا۔ پہلے میں یہ..... یہ سمجھا تھا
کہ تمہارا تعلق حکومت کے کسی خفیہ محکمے سے ہے۔ پھر..... پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ..... کہ
ایسا نہیں تو مجبوراً اپنی غیر قانونی سرگرمی سے تمہیں آگاہ کرنا پڑا۔
”کھودا ہوا لکھا چوہا!“ دراز قد مسلح شخص بڑبڑایا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، بلکہ
اور الفاظ سے مجھے یہی اندازہ ہوا۔ پھر اس نے قدرے بلند آواز میں ناصرے بکھا۔ ”ہم تمہیں زندہ
چھوڑے جارہے ہیں۔ تمہاری زندگی کی قیمت یہ ہے کہ تم کسی سے ہمارے بارے میں کچھ نہیں کہو گے!
تم سے کیا پوچھا گیا، کبھی اپنی زبان پر نہیں لاؤ گے! جس دن تم نے خلاف ورزی کی مار ڈالے جاؤ گے۔
ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیا کرتے ہو! جو چاہو کرو، لیکن آج رات کے اس واقعے کو قطعی
بھلا دو گے!“

وہ آدم زاد ناصر ایک جعل ساز تھا اور جو دونوں جہتی اس سے کام لیتے رہتے، اب اس دنیا میں
نہیں تھے۔ اس جعل ساز کے ذریعے کچھ اور بتا چلنا ممکن نہ تھا۔ سو ہم وہاں سے چلے آئے۔ میرے لئے
یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ ان تینوں مسلح افراد کا تعلق نجوا سے ہو گا۔ جو ڈائری اسے میرے ذریعے ملی تھی،
اس میں درج چوں پر کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈائری میں درج پتے
مختلف قسم کے تھے۔ ان چوں سے صرف نجوا اس کے آدمیوں کا تعلق نہیں تھا۔

اس رات ہم نے پھر کسی نئے پتے پر چھان بین نہیں کی۔
اگلے دن صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو منصور آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اربیک تھا۔ سوی
نے روم سروس سے فون پر رابطہ قائم کر کے چائے منگوالی۔ ویٹر چلا گیا تو منصور کہنے لگا۔ ”معلوم ہوتا ہے
کہ تم دونوں بہت گہری نیند سوتے ہو۔“

میں اس پر چونکا اور بولا۔ ”ہاں یہ تو ہے، لیکن تمہیں کیسے خبر ہوئی؟“
”کل رات تمہیں فون کیا تھا، مگر آپریٹر سے جواب ملا کہ فون ریسیو نہیں کیا جا رہا۔“ منصور نے
بتایا۔

”سکون اور اطمینان کے ساتھ سونے کی خاطر ہم ریسیور اٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔“ میں نے فوراً بات
بنا دی۔ فون یقیناً اس وقت کیا گیا ہو جب ہم رات کو کمرے میں نہیں تھے۔

”آئندہ ایسا نہ کرنا!“ منصور نے تاکید کی۔ ”کیوں کہ کسی بھی وقت نجوا کو تم سے رابطے کی
ضرورت پڑ سکتی ہے۔ رات کو اگر تم سے نجوا کی بات ہو جاتی تو اس وقت مجھے نہ آنا پڑتا، مگر یہ اچھا ہی
ہوا۔ اس بامنے مجھے تم لوگوں کے ساتھ چائے پینے کا موقع مل گیا۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور چائے کا
گھونٹ لیتے ہوئے سوی کی طرف دیکھا۔

”کل جو واقعہ پیش آیا، اس پر نجوا صاحبہ کا کیا رد عمل تھا؟“ میں نے منصور سے پوچھا۔
”وہ اس پر خوش تھی اور اس نے تمہیں کام کا آدمی بتایا تھا۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”تمہی تو اس

نے تم سے ایک کام لینے کے لئے فون کیا تھا۔“

”کیا کام؟“ میں یہ سوال کرتے ہوئے چونکا ہوا گیا۔

”میں جو بیگ لے کر آیا ہوں، اس میں سونے کے کچھ برتن ہیں۔“ منصور بتانے لگا۔ ”شاہراہ
بہلول ہی پر اس عمارت سے ذرا آگے جا کر جہاں تم کل آئے تھے، سوخ الذہب (صرافہ بازار) ہے۔
اسے تلاش کرنے میں تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ ان برتنوں کو تم اسی بازار میں فروخت کرو گے۔ اس
سے جو رقم حاصل ہو، آج رات کو ایک جگہ پہنچانی ہوگی۔ پتا تمہیں رات ہی کو کسی دقت فون پر بتا دیا
جائے گا۔“

”لیکن سٹاروں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ سونے کے برتن کہاں سے آئے ہیں تو میں کیا جواب دوں
گا؟“ میں بولا۔

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ نجوا کو صرف ان کی فروخت اور حاصل ہونے والی رقم سے مطلب ہے۔“
”پھر بھی ذاتی طور پر تم تو مجھے کوئی مشورہ دے ہی سکتے ہو منصور! تمہیں تو خبر ہے کہ میں اس شہر
میں اجنبی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اول تو ایسے معاملات میں سنا زیادہ پوچھ کچھ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود کوئی یقین کرے نہ
کرے، تم ان ظروف کو اپنی خاندانی وراثت بتا سکتے ہو۔“ منصور مسکرایا۔ ”یوں بھی تم اپنے طیلے سے کسی
اہلی خاندان کے فرد لگتے ہو۔ تمہیں اس قدر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب
میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریوالور نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ طور احتیاط اسے اپنے پاس رکھ لو۔ ویسے
اس کے استعمال کی تمہیں ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ لوڈ ہے۔ کو تو فاضل گولیاں بھی دے دوں؟“
”اگر احتیاط ہی مقصود ہے تو پھر گولیاں بھی دے ہی دو۔“ میں بولا۔ ”ایسا میں کل کے واقعے کو مد
نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔“

منصور نے اپنی کمرے سے چڑے کی ایک بیٹل کھولی جس کے ہولسٹر میں ریوالور بھی تھا۔ بیٹل میں
خاصی گولیاں تھیں۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا، پھر سوی سے
مخاطب ہوا۔ ”رشیدہ! تمہیں تو ان باتوں سے ڈر نہیں لگ رہا؟“

سوی کے بجائے میں بول اٹھا۔ ”یہ میری بیوی ہے منصور! میری موجودگی میں اسے ڈرنے کی کیا
ضرورت ہے! گزشتہ دنوں سے ہم جن حالات کا شکار ہیں، ان کا علم اسے بھی ہے۔ یہ اگر کوئی ڈرنے والی
فورت ہوتی تو میرے ساتھ سلیمانیہ سے یہاں نہ آتی۔“

اس پر منصور ہنس کر کہنے لگا۔ ”اگر رشیدہ بھی تمہاری طرح جی دار ہے تو پھر میں، نجوا سے اس کی
مخاطبہ کروں گا۔“

”کیسی سفارش؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”یہی کہ وہ رشیدہ سے بھی کام لے اور کیا!“

”ہرگز نہیں! تم ایسا نہیں کہو گے منصور! اس معاملے سے میری بیوی کا کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے

انکار میں سر ہلایا۔ ”نچوانے مجھے پابند کیا ہے، رشیدہ کو نہیں۔“ منصور مجھ پر احسان دھرنے کے انداز میں کہنے لگا۔ ”اگر تم یہ نہیں چاہتے تو تمہاری دوستی کی خاطر بات نہیں کروں گا۔ نچوا کو تو ایسی عورتوں کی تلاش رہتی ہے۔“ مزید کچھ دیر بیٹھ کر منصور رخصت ہو گیا تو میں نے ایڑ بیگ کھول کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ یہی حال سوی کا ہوا۔

وہ سونے کے برتن اپنی بناوٹ سے صدیوں پہلے کے معلوم ہوتے تھے۔

”اے سوی! کل جو نچوانے کہا تھا، اس پر عمل شروع کر دیا ہے۔“ میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ ”میرے ذریعے ان ظروف کی فروخت بلا مقصد نہیں۔ اس طرح نچوا یقیناً منقرع کے غلاموں کو میری طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ ان ظروف کی ساخت سے پتا چل رہا ہے کہ یہ قدیم ترین مصری تہذیب و تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں جب مصر گیا تھا تو بہت سی عجیب باتوں میں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی تھی کہ مصر کے فرعون اپنے تابوتوں میں وہ اشیاء بھی رکھواتے تھے جو ان کے استعمال میں رہ چکی ہوں۔ یہی حال ان کے امیروں اور وزیروں کا تھا۔ اب بھی ہزاروں من سونا ان کے تابوتوں میں موجود ہے۔“

”یوں لگتا ہے اے علیالیش کہ اس سازش کی جڑیں مصر تک پھیلی ہوئی ہیں۔“ سوی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

پھر یہ جانتے ہوئے بھی کہ نچوا مجھے چارے کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور میں شدید خطرے سے دو چار ہونے والا ہوں، سوخ الذہب روانہ ہو گیا۔

☆=====☆

استحان و آزمائش کا وقت کب آجائے آدم زادوں کی طرح ہم جن زاد بھی اس سے واقف نہیں ہوتے۔ میرے لئے یہ ایسا ہی وقت تھا۔ بغداد کے صرافہ بازار کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں مختلف سوالات چکر رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ پراسرار عورت نچوا کے پاس یہ قدیم ترین ظروف کہاں سے آئے؟ یہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کبھی یہ ظروف ’فرعون منقرع کے غلاموں سے چھینے ہوں گے لیکن حقیقت کچھ اور بھی ممکن تھی۔

میں اور سوی پہلے ہی بغداد شہر کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر چکے تھے۔ مجھے اسی لئے صرافہ بازار تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جلد ہی میں نے یہ محسوس کر لیا کہ لوگ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ میں پوری طرح مستعد و چوکنا ہونے کے باوجود یہ ظاہر بے پروائی سے چلتا رہا۔ مجھے کسی ایسی بڑی دکان کی تلاش تھی جہاں میں گھیرا نہ جاسکوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ شدید ضرورت کے بغیر انسانی قالب ترک کرنا تھا نہ اپنی کوئی پراسرار قوت آزمانا تھی۔ میں تو وہاں خود ہی شکار ہونے آیا تھا۔ بازار کا ایک چکر لگا کر میں واپس ہوا۔ اس سے آگے سوخ الکلب تھا جہاں کتابوں کی دکانیں اور پرنٹنگ پریس تھیں۔ میں ادھر نہیں گیا۔ میں نے اس عرصے میں ایک بڑی دکان منتخب کر لی تھی۔

میں شانے سے ایڑ بیگ لٹکائے آہستہ قدمی سے چلتا ہوا اسی دکان میں ٹھس گیا۔ دکان دار کو خلاف توقع میں نے چوکتے ہوئے دیکھا۔ اس کی نگاہ ہلکے نیلے رنگ کے ایڑ بیگ پر تھی۔ بیگ کے اوپر سرخ دھاریاں تھیں۔ مجھے اس کا علم تھا کہ وہ ایڑ بیگ عام استعمال میں آنے والا نہیں۔ دکان دار سے میری نظریں ملیں تو وہ اجنبی ہونے کے باوجود دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس مرتبہ عدنان نے تمہیں بھیجا ہے!“

کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اقرار میں سر ہلادیا۔ وہ اپنے معاونین سے الگ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔

”لاؤ تو پھر بیگ مجھے دے دو!“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”مگر پہلے تم دیکھ تو لو کہ اس کے اندر کتنی نادر اشیاء ہیں اور.....“

”مجھے معلوم ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔“ دکان دار نے میری بات کاٹ دی۔ ”اس لئے شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں۔“

”لیکن ان کو دیکھنے بغیر قیمت کا تعین کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے اب بھی بیگ شانے سے نہیں اتارا۔

”تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو، قیمت کے تعین سے تمہارا کیا تعلق؟“ وہ حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

”تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھے اس بیگ میں موجود قیمتی اور نادر اشیاء فروخت کرنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی قیمت لئے بغیر میں کس طرح جاسکتا ہوں۔“

”ذرا ٹھہرو، میں ابھی آیا۔ اس سے پہلے عدنان نے کبھی اتنی عجلت نہیں کی۔“ دکان دار یہ کہتے ہی تیزی سے مڑا اور پیچھے ایک طرف رکھے ہوئے فون پر کسی کے نمبر ملانے لگا۔

معلوم نہیں عدنان کون تھا؟ بس اتنا ہی سمجھ سکا کہ دکان دار کے لئے اس طرح کی سودے بازی نئی نہیں تھی۔ اس نے یقیناً مجھے مخصوص ایڑ بیگ کی وجہ سے کسی عدنان کا آدمی سمجھا تھا۔ میں اطمینان و سکون کے ساتھ دکان دار کو فون پر بات کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

ریسیور رکھ کر وہ پلٹا تو مجھے اس کے چہرے پر تناؤ سا محسوس ہوا۔ وہ واپس میرے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔

”ہاں بولو، تم سودا کر رہے یا پھر میں کسی اور دکان پر جاؤں؟“ میں نے دکان دار کو تیز نظروں سے دیکھا۔

”اب تم کہیں نہیں جاسکتے!“ دکان دار کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ”تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ دکان کے باہر شرطے (پولیس والے) کھڑے ہیں۔ میری ایک آواز پر وہ دوڑتے ہوئے اندر آجائیں گے اور تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ عدنان سے میری بات ہو چکی ہے۔ جب تک اس کے آدمی یہاں نہ پہنچ جائیں، تمہیں ہٹانا نہیں ہے۔“

”لیکن..... لیکن کیوں؟“ میں نے یہ کہتے ہوئے ایسا تاثر دیا جسے ڈر گیا ہوں۔

”یہ تو تمہیں عدنان ہی بتائے گا۔ تم نے میرے پوچھنے پر خود ہی تو اس سے شناسائی کا اظہار کیا تھا، پھر گھبرا کیوں رہے ہو!“ دکان دار طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میں اگر چاہتا تو وہ ہرگز مجھے نہ روک پاتا۔ میری سمجھ میں اتنا تو آ ہی گیا تھا کہ کسی ایسی دکان میں آ گیا ہوں جہاں ایسی نادر اشیاء پہلے بھی عدنان نامی شخص فروخت کے لئے بھیجتا رہا ہے۔ میرے خیال میں عدنان کا تعلق نجوا کے مخالف گروہ، یعنی متفرع کے غلاموں میں سے ممکن تھا۔ یوں گویا نجوا اپنے دشمنوں تک پہنچنے کے لئے مجھے ذریعہ بناری تھی۔ خود میرا مقصد بھی کیوں کہ یہی تھا اس لئے خاموشی اختیار کئے رہا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ عدنان کے پیچھے ہوئے آدمی اتنی جلدی آجائیں گے۔ وہ صرف دو افراد تھے۔

”یہ ہے وہ۔“ دکان دار نے میری طرف اشارہ کیا۔

ان میں سے سب سے پہلے چرے والے ایک شخص نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ادھر دیکھو، میری طرف!“ میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو اس کی خواب ناک سی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے ذہن پر دباؤ محسوس ہوا۔ یہ تجربہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ پراسرار نجوا نے بھی اپنی دانست میں اسی طرح میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

”تمہیں خاموشی کے ساتھ دکان کے باہر کھڑی ہوئی دین میں بیٹھ جانا ہے۔“ اس نے میری طرف سے نظرس ہٹائے بغیر سرکشی کی۔

”بیٹھ جاؤں گا۔“ میں اس طرح بولا جیسے اس شخص کے اثر میں آچکا ہوں حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔

”تو پھر چلو!“ وہ شخص یہ کہہ کر میرے ساتھ ہو لیا۔ اس کا ساتھی آگے آگے تھا۔

دکان کے باہر ذرا فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک دین کھڑی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں خواب ناک آنکھوں والا میرے ساتھ بیٹھ گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس کا ساتھی، دین کے اگلے حصے میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد دین کا انجن جاگ اٹھا۔ اس بھرے پرے بازار سے مجھے ”انجوا“ کر کے دین کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ مجھے اپنے حکم پر چلانے والا سامنے والی نشست پر براجمان تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا، نہ ایئر بیگ لیا جو ابھی تک میرے شانے سے لٹکا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا، یوں جیسے میرا ذہن نیم غنودہ ہو۔

کسی ہنگامے کے بغیر وہ سفر جاری رہا۔ دین جب ایک کوٹھی کے پھانک میں داخل ہو کر رک مچی تو مجھ میں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے اٹھ کر دین کا دروازہ کھولا اور مجھے حکم دیا۔ ”چلو نیچے اترو!“

میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی اور دین سے اتر آیا۔ اس وقت تک کوٹھی کا

پھانک بند کیا جا چکا تھا۔

وہ شخص مجھے اپنے ساتھ کوٹھی کے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں ایک جسم آدمی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو مسلح افراد گھنٹیں ہاتھوں میں لئے مستعد کھڑے تھے۔ مجھے اس جسم آدمی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

”یہ ایئر بیگ اس سے لے لو!“ میرے ساتھ آنے والے شخص کو جسم آدمی نے اشارہ کیا۔

مجھ سے وہ ایئر بیگ لے لیا گیا۔ اب بھی میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

”عدنان! اس سے تم پوچھ گچھ کرو گے یا میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں؟“ وہ جو مجھے لے کر آیا تھا، اس نے جسم شخص سے پوچھا۔

”یہ معاملہ کیوں کہ سنگین نوعیت کا ہے اس لئے میں نے نجیب کو مطلع کر دیا ہے۔ وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ اسی کو یہ ذمہ داری نبھانے دو تاکہ وہی طلال بے کے سامنے جواب دی کر سکے۔“ جسم آدمی عدنان نے جواب دیا، پھر اپنے قریب کھڑے ہوئے مسلح آدمیوں سے بولا۔ ”اسے نیچے تہ خانے کے کسی کمرے میں بند کر دو!“

میں نے دیکھا کہ ایئر بیگ، عدنان کی کرسی کے قریب رکھا ہوا تھا۔

مسلح افراد میں سے ایک نے میری پشت پر اپنی راکفل کی نال رکھ دی۔ دوسرا آدمی مجھ سے چند قدم آگے چلے لگا۔ اسی وقت خوابیدہ سی آنکھوں والے شخص کو میں نے وہاں سے جاتے دیکھا۔ اس کا کام شاید مجھے عدنان تک پہنچانا ہی تھا۔

تہ خانے میں حوالات جیسا وہ ایک کمرہ تھا جہاں وہ مسلح افراد مجھے بند کر کے چلے گئے۔

اپنے پراسرار دشمن نجیب کا نام سننے ہی مجھے علم ہو گیا تھا کہ میں بالکل صحیح جگہ پہنچا ہوں۔ متفرع کے غلاموں کا ایک ٹھکانا میں نے دیکھ لیا تھا۔ اب مجھے وہاں سے نکلنے کی فکر تھی، لیکن میں نے جلد بازی نہیں کی۔ مجھے کسی ایسی صورت حال کا انتظار تھا کہ جس میں کوئی آدم زاد اپنی جدوجہد اور کوشش سے فرار ہو سکے۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ نجوا ان حالات سے ضرور فائدہ اٹھائے گی۔ اس کوٹھی تک نجوا کے آدمیوں نے لازماً میرا تعاقب کیا ہو گا، میرا ذہن تیزی سے کام کرتا رہا۔ نجیب کی وہاں آمد سے قبل شاید نجوا کے آدمی کوئی قدم اٹھانے سے گریز کر رہے تھے۔ یہ امکان بھی تھا کہ خود نجوا اپنے آدمیوں کی رہنمائی کے لئے وہاں پہنچ جاتی۔ یہ جان کر بھی مجھے اپنے اندازوں کی درستی کا احساس ہوا کہ نجیب بغداد ہی میں موجود ہے۔

مجھے نجیب کی شیطانی قوتوں کا ایک مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھتا کہ ایئر بیگ میرے پاس کہاں سے آیا تو میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاتا۔ مجھے اس کا سامنا کرنے سے پہلے ہی کچھ کر گزرتا تھا۔ اس کا انحصار آنے والے لمحات پر ہوتا۔ متفرع کے غلام اپنی دانست میں مجھے قابو کر کے اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے میری تلاش ہی نہیں لی۔ میرے پاس ریوالور بھی موجود تھا اور گولیوں کی پیلٹ بھی۔ چہرے کی وہ پیلٹ میری کمر سے بندھی ہوئی تھی جسے منصور نے میرے حوالے کیا تھا۔

سوی وہیں ارد گرد منزلہ رہی تھی۔ اسے میں نے غلوت میسر آتے ہی بتا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور میرا ارادہ کیا ہے۔

مجھے تمہ خانے کے اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بھاری قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے انہی دونوں مسلح افراد کو آتے دیکھا جو مجھے وہاں قید کر گئے تھے۔ انہوں نے کمرے کا آہنی سلاخوں والا مقفل دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا حکم دیا۔ ان دونوں کی رانکلوں کا رخ میری ہی طرف تھا۔

ابھی میں نے اس کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک زیرست دھماکا ہوا۔ مسلح افراد چونک اٹھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ نجیب اس کوٹھی میں آچکا ہے۔ تمہ خانے سے مجھے اسی لئے نکالا گیا ہو گا کہ نجیب کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ غیر متوقع دھماکا بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ نجوا نے اس کوٹھی پر ہلہ بول دیا ہے۔ چند لمحوں کے بعد ہی اوپر سے پے در پے دھماکوں کی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے دو مسلح گروہوں کے درمیان ٹھن گئی ہو۔

وہ دونوں مسلح افراد مجھے تذبذب کا شکار معلوم ہوئے جن کی رانکلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں، مگر نظریں میڑھیوں پر تھیں۔

یہی وہ لمحات تھے کہ میں جن کا خنجر تھا۔ پھر میں نے دیر نہیں کی۔ انسانی قالب سے نکلے ہی میں نے ان کی گردنوں پر وار کئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈھیر ہو گئے۔ گردنوں کی ہڈیاں ٹوٹنے کی واضح آواز مجھے سنائی دی۔ ان دونوں کا زندہ بچنا اب ناممکن تھا۔

تمہ خانے سے نکل کر میں اوپر پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ کوٹھی کے بیرونی رخ پر زبردست معرکہ جاری تھا۔

اسی وقت مجھے نجیب دکھائی دیا۔ اسے میں نے بائیں جانب والے لان میں بھاگتے دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ نجیب نے میرے ہی سامنے کوٹھی کی عقبی دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب پھلانگ لگا دی۔ دور سے پولیس سائرن کی آوازیں آتی سنائی دیں تو اچانک فائرنگ بند ہو گئی۔

نجیب کوٹھی کی عقبی گلی سے دوڑتا ہوا نکلا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ گلی سنائے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہاں بسنے والوں نے شاید گولیاں چلنے کی آوازیں سنتے ہی اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لئے تھے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ نجیب کا تعاقب جاری رکھوں، لیکن اسی لمحے مجھے سوی نظر آگئی۔

”اے علیالیش! وہ ایئر بیگ تو مجھے ایک کمرے میں مل گیا، مگر خالی ہے۔ اس میں سونے کے ظروف نہیں ہیں۔“ سوی نے میرے قریب آکر سرکوشی کی۔

”آ میرے ساتھ! عدنان نے یقیناً انہیں ایئر بیگ سے نکال کر کسی محفوظ جگہ رکھ دیا ہو گا۔“ میں یہ کہتا ہوا واپس کوٹھی کی طرف لپکا۔

سوی کے سپرد میں نے یہی ذمہ داری کی تھی۔ نجیب کا تعاقب مجبوراً مجھے ترک کر دینا پڑا۔ سونے کے وہ ظروف تلاش کرنے میں ہمیں چند لمحے لگے۔ جس کمرے میں خالی بیگ پڑا تھا، وہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ اسی کمرے کی ایک الماری کے خفیہ خانے میں وہ ظروف مل گئے۔ انہیں بیگ میں

واپس رکھتے ہی ہم وہاں سے غائب ہو گئے۔ یوں میں نے اپنے دشمنوں کو بھی زک پہنچائی اور آئندہ کے لئے نجوا کی نظر میں سرخروئی کا سامان بھی کر لیا۔ اس طرح دشمنوں کے رتنے میں پھنس کر نکل آنا، کوئی معمولی بات بہر حال نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے سونے کے نادر ظروف بھی نہیں منوائے تھے۔

اپنے ہوٹل واپس آنے کے بعد اس ایئر بیگ کو میں نے لکڑی کی الماری میں رکھ دیا۔ ”اس آدم زادی نجوا نے تو تجھے اپنے خیال میں موت کی سمیٹ چڑھا ہی دیا تھا اسے علیالیش!“ سوی کہنے لگی۔ ”بڑی خبیث عورت ہے وہ۔“

”اور تو دیکھے گی اے سوی کہ اب وہ خبیث عورت ہی میرا دم بھرے گی۔ اسے تو میرے زندہ بچ جانے کا گمان بھی نہ ہو گا۔ اس ہنگامے کے دوران میں بس ایک مجبوری ہمارے آڑے آگئی۔ میں اس شیطان نجیب کے پیچھے نہ جاسکا ورنہ ممکن ہے، اس کے ٹھکانے کا بھی پتا لگ جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”تو اسے مجبوری کہہ لے، مگر یہ میری غلطی تھی۔“ سوی بولی۔ ”تجھے یہ اطلاع دینے کے بجائے خود مجھ کو اس کمرے میں وہ ظروف تلاش کر لینے چاہئے تھے۔“

”لیکن ہماری یہ کامیابی بھی تو کم نہیں اے سوی کہ ہمیں معلوم ہو گیا، نجیب اسی شرم میں ہے۔“ حالات ہی کچھ اتنی تیزی سے بدلے کہ مجھ سے یہ بھول ہو جانا عجیب نہیں۔ ”تو نے اس پر بھی غور کیا کہ یہ قصہ کیا ہے؟“ سوی نے مجھ سے سوال کیا۔

”ابھی تو کوئی بات کھل کر سامنے نہیں آ رہی اے سوی!“

”مجھے تو نے بتایا تھا کہ آج بھی مصر کے فرعونوں اور بڑے امیروں کے تابوتوں میں ہزاروں من سونا موجود ہے۔ کہیں منقرع کے یہ غلام کسی طرح اسی سونے کو تو حاصل کرنے کے چکر میں نہیں؟ صدیوں پہلے کے ان ظروف کو دیکھ کر بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ آخر یہ ظروف نجوا کے پاس کہاں سے آئے؟“ سوی نے یہ کہہ کر مجھے سوچنے کی ایک نئی راہ سمجھا دی۔ پھر بھی یہ بات کچھ قابل یقین سی نہیں تھی۔ میرا ذہن اسی لئے ادھر نہیں گیا تھا۔

”یہ اتنا آسان کام نہیں ہے اے سوی! کیوں کہ مصر کی حکومت ان قدیم اہراموں کی سختی سے حفاظت کرتی ہے۔ وجہ تجھے بھی معلوم ہے کہ ان کا شمار دنیا کے قدیم ترین آثار میں ہوتا ہے۔ میں خود بھی مصر گیا ہوں۔ قاہرہ کے میوزیم میں جن فرعونوں کی میاں ہیں ان پر سخت پرا ہے۔ وہیں محفوظ تابوتوں میں سے ایک کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ مصعب بن ریان کا تابوت ہے، مگر مجھے اس روایت پر یقین نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصعب، حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتا ہوا دریائے نیل میں اپنی فوج کے ساتھ ڈوب گیا تو اس کی لاش کہاں سے ملی؟ میرا خیال ہے کہ وہ مصر کے کسی اور ہی فرعون کا تابوت ہو سکتا ہے۔“ میں، سوی کو بتانے لگا۔ ”اس میوزیم کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ ان فرعونوں کے تابوتوں میں بھی بہت سونا تھا، لیکن اسے ان تابوتوں میں سے نکالنا ممکن نہیں۔ اہرام کے علاقے میں جن دو فرعونوں کے مقبروں میں جانے راستہ ہے، وہاں بھی کڑی نگرانی ہے۔“

”لیکن تیرا کہنا یہ بھی تو تھا کہ بڑے امیروں اور وزیروں نے بھی اپنے مقبرے بنوائے تھے۔ ان میں بھی تو سونا ہو سکتا ہے!“ سوی نے کہا۔

”ہاں فرعونوں کی طرز پر انہوں نے بھی ایسا کیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں دو سو سال پہلے دیکھے ہوئے مصر کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ قاہرہ کے علاوہ میں نے یاسف کے ساتھ دوسرے شہروں میں بھی آوارہ گردی کی تھی، لیکن ہم ان آبادیوں سے سرسری گزر گئے تھے۔ ہم وہاں زیادہ رکے نہیں تھے۔ انہی خطوط پر سوچتے ہوئے میں بولا۔ ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اے سوی، قاہرہ کے علاوہ بھی دیگر جگہوں پر آثار قدیمہ موجود ہیں۔ چھوٹی سی ایک قدیم آبادی ستارہ تو قاہرہ سے تقریباً تیس چالیس میل ہی پر تھی۔ وہاں بھی انتہائی قدیم اہرام میں نے دیکھے تھے۔ ستارہ کے علاوہ مصر ہی میں ایک اور قدیم جگہ الاقصر (قصر کی جمع) بھی ہے۔ وہاں بھی ہم زیادہ نہیں ٹھہرے تھے۔ وہاں یاسف کو خطرہ محسوس ہوا تھا۔ الاقصر میں قدیم مندر اور عبادت گاہیں تھیں۔ یہ جگہ شاہان مصر کا دارالحکومت بھی رہ چکی ہے۔ سو اسے شاہی وادی (وبلی آف کنکن) بھی کہا گیا ہے۔ اس جگہ ہم نے شاہی محلات دیکھے۔ کتابوں میں اسے مغرب والوں نے لکسر لکھا ہے۔ اس مقام پر بھی آثار قدیمہ بہت ہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ مندروں کی طرف جاتے ہوئے یاسف راستے ہی سے میرے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ ادھر کافر جنات آباد ہوں گے۔ سو کھلا یہ کہ اگر واقعی منقرع کے غلام بہ قول تیرے سونے کی تلاش میں ہیں یا سونا ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں تو کم از کم قاہرہ میں ان کے لئے ایسا قطعی نامکن ہے۔ اگر کسی طرح اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کر انہوں نے ایسی کوئی کوشش کی تو یہ داز کھل جائے گا۔ اس سے قطع نظر ایک بات اور بھی ہے۔ وہ خود کو ایک فرعون منقرع ہی کا غلام کہتے ہیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی تو عقیدہ ہو گا۔ پھر وہ کسی فرعون کے اہرام کی بے حرمتی کیسے کر سکتے ہیں! اگر تیرے قیاس کو درست مان لیا جائے تو پھر وہ امیروں اور وزیروں ہی کے اہراموں پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی متعدد دشواریاں ہیں کیوں کہ ان اہراموں کے اندر اترنے کے راستے نہیں ہیں۔ اگر کبھی صدیوں پہلے ہوں گے بھی تو اب کسی کو ان کی خبر نہیں یا انہیں کبھی بند کر دیا گیا ہو گا۔“

خاصی دیر میں اور سوی انہی قیاسات پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی گفتگو میں گھوم پھر کر دوبارہ نجیب کا ذکر نکل آیا۔

”اے سوی! اگر تیرا مشورہ ہو تو میں اپنے تصور کی قوت کو جگا کر نجیب کا سراغ لگاؤں! کیا اسے چھیڑنا مناسب ہو گا؟“ میں نے کہا۔

”اب اس سے معرکہ آرائی کا آغاز تو ہو ہی گیا ہے، دیکھ لے کوشش کر کے۔ پھر یہ کہ نجوا بھی تو اس کے حریفوں میں ہے۔ اس سے بھی تو ہمارا رابطہ قائم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تیری خیر خبر لینے منصور کو ضرور بھیجے گی۔“ سوی جواب میں بولی۔

”اس خیال سے میں اب تک ایسا کرنے سے باز رہا کہ نجوا کی طرح نجیب کو بھی یہ پتا نہ چل جائے، کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔“ میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”تو چل جائے پتا۔ اس سے یہی تو فرق پڑے گا کہ وہ چوکنا ہو جائے۔ سو آج جو واقعہ پیش آیا ہے، اس کے بعد بھی تو وہ مزید محتاط ہو جائے گا۔ ہمیں آخر اس کے مقابل تو آنا ہے، خواہ نجوا کی آڑ ہی میں سی!“ سوی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

”یہ تجھے بھی علم ہے اے سوی کہ معاملہ صرف نجیب کی حد تک نہیں۔ طلال بے، عدنان اور نہ جانے کتنے آدم زاد، منقرع کے غلام ہیں۔ پھر بھی ہم نجیب کا سراغ لگانے سے اس کی ابتداء کر سکتے ہیں۔ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ مصر میں بھی منقرع کے غلام موجود ہوں گے، مگر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو ہمیں یہاں موجود اپنے دشمنوں کی خبر لینا ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کیں اور نجیب کا تصور کیا۔ دوسرے ہی لمحے نجیب کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ وہ کسی کی طرف جھکا ہوا دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے اپنے تصور کا دائرہ وسیع کیا تو دوسرا شخص بھی نظر آگیا۔ نجیب کی طرح وہ پست قد نہیں تھا بلکہ اس کی ضد معلوم ہوا۔ بھرے بھرے چہرے والے اس شخص کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، دہانہ بھی آنکھوں کی طرح چھوٹا تھا، سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی مجموعی شخصیت مجھے عجیب سی اور مضحکہ خیز لگی۔

”طلال!“ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو نجیب نے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھا، لیکن تصور کا سلسلہ قائم رہا۔ نجیب راز دارانہ انداز میں طلال بے سے کہنے لگا۔ ”مجھے یقین ہے کہ نجوا ایک مرتبہ پھر ہمارے راستے پر لگ چکی ہے۔ مصر میں منقرع کے غلاموں نے اس کے گرد حلقہ تنگ کر دیا تو وہ فرار ہو گئی۔ پھر خالص عرصے تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جب ہمیں یہ خبر ہوئی کہ وہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں ہے تو ہم.....“

”تم آخر یہ فضول باتیں کیوں دہرا رہے ہو؟“ طلال بے کی آواز پہلی بار سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی بچے کی آواز ہو۔

”وجہ ہے اس کی!“ نجیب نے کہا۔ ”آخری مرتبہ وہ ہمیں کراچی میں نظر آئی تھی۔ اس کے بعد وہ کہاں گئی معلوم نہیں ہوا۔ آج جو واقعہ رونما ہوا، اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ یہاں آگئی ہے۔ مصر سے وہ جو سونے کے ظروف لے کر بھاگی تھی، عدنان انہیں دیکھ چکا ہے۔ عدنان نے اس عراقی باشندے کو اغوا کر لیا تھا جو سوخ الذہب میں.....“

”معلوم ہو چکا ہے مجھے!“ طلال بے نے پھر نجیب کی بات کاٹ دی اور جواب طلبی کے انداز میں بولا۔ ”پھر وہ ظروف کہاں گئے؟“

”اندازہ یہ ہے کہ وہی عراقی شخص جو موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا، اپنے ساتھ ہی ان ظروف کو بھی اڑا لے گیا۔“ نجیب نے جواب دیا۔

”بالکل غلط! ایک اجنبی شخص کو الماری کے اس خفیہ خانے کا علم کس طرح ہو سکتا ہے جہاں ظروف رکھے گئے تھے؟ عدنان پر مجھے شک ہے کہ اس کا بیان درست نہیں ہے۔ خود اس کی نیت بھی خراب ہو سکتی ہے۔“ طلال بے کے پھولے ہوئے رخسار غصے کی وجہ سے اور پھول گئے۔

”لیکن پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ نجیب نے عدنان کی حمایت لی۔ ”ہم اگر اسی طرح ایک دوسرے پر شک کرنے لگے تو بکھر جائیں گے طلال!“

”یہ کوئی دلیل نہیں کہ ایک شخص پہلے ایمانداری سے کام کرتا رہا ہے تو کبھی اس کی نیت میں فتنہ نہیں آ سکتا۔ وہ عراقی باشندہ کہ جسے اغوا کیا گیا“ اس کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ عدنان کے دو محافظوں کو قتل کر کے فرار ہو جائے، لیکن ظروف بھی وہی اپنے ساتھ لے گیا“ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں۔ تم خود وہاں موجود تھے اور.....“ طلال مزید کچھ کہتے کہتے ایک دم اچھل پڑا۔ ”یہ..... یہ کون ہو سکتا ہے؟“

”کیا ہوا؟“ نجیب نے چونک کر پوچھا۔

”کوئی ہم دونوں کو دیکھ رہا ہے اور..... اور شاید ہماری باتیں بھی اس نے سنی ہیں۔“ طلال بے کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں جیسے شعلے سے رقص کرنے لگے۔ ”اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو بول کون ہے جو منقرع کے غلاموں سے خوف نہیں کھا رہا؟ تیری آواز سن لوں گا میں!“

میں بد دستور دھیان کی جوت جگائے، آنکھیں بند کئے ہوئے غیر انسانی آواز میں بڑبڑایا۔ ”میں“ فرعون منقرع کے باپ خضر کے ایک امیر کی روح ہوں کہ جس کے اہرام میں تیرے ٹپاک قدم آچکے ہیں۔“ دانستہ میں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا۔

لہجے بھر کو طلال بے خوف وہ سادھائی دیا۔ پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ کر اس نے اپنے اوپر پھونکا اور نجیب پر بھی دم کیا۔

میرے صفحہ ذہن پر ایک دم اندھیرے کی چادر پھیل گئی۔ طلال بے اور نجیب کے چہرے اب مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، سوئی کو بتا دیا۔

”یہ تو اچھا نہیں ہوا اے علیالیش!“ سوئی بولی۔ ”اب شاید وہ دونوں تیرے تصور کی گرفت میں نہ آسکیں۔“

”اس کا کچھ اندازہ تو مجھے پہلے سے تھا، لیکن میری کوشش رائیگاں نہیں ہوئی۔ یوں کچھ نئی باتوں کا علم ہو گیا اور میں نے طلال بے کو بھی دیکھ لیا۔ یہ بھی تو سوچا اے سوئی کہ اسے میری حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ نجوا تو پہلے ہی ان کے لئے عذاب جان بنی ہوئی ہے، اب انہیں ایک روح سے بھی خوف محسوس ہو گا جو ان کی حریف بن چکی ہے۔“ میں یہ کہتے ہوئے دھیرے سے ہنسا۔ ”اسے یہ تو دھیان بھی نہ آیا ہو گا کہ میں وہی ہوں جس کے سبب اسے اور نجیب کو کراچی سے بھاگنا پڑا تھا۔“

”ہاں میں نے تیری بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔“ سوئی بھی مسکرا دی۔

”اگر وہ اور کچھ دیر نجیب کی باتوں میں الجھا رہتا تو میں یہ بھی معلوم کر لیتا کہ ان کا قیام کہاں ہے!“

میں نے کہا۔

اسی روز شام کو دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا، منصور آیا ہو گا۔ دروازہ میں نے ہی کھولا۔

غلاف توقع نجوا پر میری نگاہ پڑی تو میں چونک اٹھا۔ اس نے تیزی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”سعد! مجھے امید نہیں تھی کہ تمہیں زندہ دیکھ سکوں گی۔“

”تشریف رکھئے نجوا صاحبہ!“ سوئی بول اٹھی۔

”تم مجھے کیسے جانتی ہو؟“ نجوا آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”سعد سے آپ کا ذکر سنا تھا۔“ سوئی نے جواب دیا۔ ”آپ کے سوا یہاں اور کون آ سکتا ہے!“

”دروازے پر موت بھی تو دستک دے سکتی ہے!“ نجوا نے سوئی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”تم ہی یقیناً سعد کی بیوی رشیدہ ہو!“

”ہاں یہی رشیدہ ہے۔“ میں بولا۔ ”مگر تم اسے ڈرا کیوں رہی ہو نجوا؟“

ہم تینوں اب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نجوا ہم دونوں کے مقابل تھی۔ میری بات پر نجوا ہنس کر کہنے لگی۔ ”ڈرا نہیں رہی، حقیقت کا اظہار کر رہی ہوں۔ منقرع کے غلام سارے شہر میں پھرتے پھرتے بھڑوں کی طرح ڈھونڈنے نکل چکے ہیں۔ مجھے اسی لئے خود آنا پڑا کہ اگر تم زندگی گنوا چکے ہو تو تمہاری بیوی کو یہاں سے بہ حفاظت نکال کر لے جاؤں۔ وہ پہلے ہوٹلوں کا ہی رخ کریں گے۔“ نجوا سنجیدہ نظر آنے لگی۔

”پھر تو ہماری زندگی یہاں شدید خطرے میں ہے!“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اس لئے جتنی جلد ممکن ہو، یہ ہوٹل چھوڑ دو۔“ نجوا بولی۔ ”باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔“

”مگر..... مگر ہم جائیں گے کہاں؟“ یہ سوال کرتے ہوئے میں نے اپنی آواز سے فکر مندی ظاہر کی۔

”یہ کیوں بھول گئے سعد کہ نجوا تمہیں امان دے چکی ہے! تم دونوں میرے ساتھ چلو گے۔“

پھر ہم نے سامان سمیٹنے اور وہ ہوٹل چھوڑنے میں دیر نہیں کی۔ میں ابھی نجوا پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایئر بیگ بھی میرے پاس ہے جو منصور لے کر آیا تھا، جس میں سونے کے ظروف تھے۔ ہوٹل کی الماری سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بڑی صفائی کے ساتھ میں نے ایئر بیگ کو بھی سوٹ کیس کے اندر رکھ دیا۔ میری پشت اس وقت نجوا کی طرف تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے ہوٹل کے دو پورٹر ہمارے ساتھ تھے۔ سوٹ کیس انہوں نے اٹھا رکھے تھے۔

ہوٹل کی پہلی منزل سے نیچے آتے ہوئے میں پوری طرح چونکا تھا۔ کسی طرح سے بھی کوئی گولی آکر میرے انسانی پیکر میں اتر سکتی تھی۔ نجوا نے مجھے پہلے ہی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میرے دشمنوں میں سے کئی افراد ایسے تھے جو مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔

نجوا ہم دونوں سے پہلے نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہمیں ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں مل جائے گی۔ پورٹر سوٹ کیس رکھنے کے بعد ٹپ لے کر چلے گئے تو مجھے نجوا ایک لمبی سی کار کی آڑ سے نکلنے دکھائی دی۔ دونوں سوٹ کیس اٹھا کر میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ سوئی میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

جب تک میں کار تک پہنچا، نچو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ کار کا پچھلا دروازہ اس نے کھول دیا تھا۔ سوٹ کیس ہم نے اپنے ساتھ ہی پیچھے رکھ لئے۔ ہمارے بیٹھے ہی کار پارکنگ لائٹ سے نکل آئی۔ کار کے شیشے دھندلے تھے۔ باہر سے اسی سبب کار کے اندر بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ سفر زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ وہ چھوٹی سی ایک نو تعمیر آبادی تھی۔ کار ایک خوب صورت بنگلے کے گیٹ پر رکی اسی کے ساتھ مجھے منصور کی جھلک نظر آئی۔ گیٹ اسی نے کھولا تھا۔ وہ یقیناً پہلے سے ہماری آمد کا منتظر ہو گا۔ کار گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

نچو کے ساتھ ہم بھی کار سے اتر آئے۔ میرے ہاتھ سے ایک سوٹ کیس منصور نے لے لیا۔ ذرا ہی دیر بعد ہم اس بنگلے کی نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔

”اب تم دونوں کو یہاں رہنا ہے۔ اس نشست گاہ کے علاوہ دو کمرے اور ہیں، انہیں پھر دیکھ لیں“ پہلے کچھ ضروری باتیں کر لیتے ہیں۔“ نچو مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں کیوں نہیں!“ میرے اعصاب اب کشیدہ نہیں تھے۔

”پہلے مجھے یہ بتاؤ سعد کہ تم موت کے اس جال سے کس طرح نکلے؟ میری مراد اس کو خمی سے ہے جہاں ہمیں سوخ الذہب سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔“ نچو نے پوچھا۔

اس پر میں دانستہ چونکا اور کہا۔ ”تو کیا تمہیں میرے اغوا کئے جانے کی خبر تھی؟“

نچو دھیرے سے ہنسی اور کہنے لگی۔ ”بچکانہ سوال نہ کرو سعد! کیا مجھے تمہاری طرف سے غافل رہنا چاہئے تھا؟ اگر میرے آدمی اس کو خمی پر جنم کے دہانے نہ کھول دیتے تو کیا تمہیں وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاتا؟ میرے اندازے کے مطابق تم نے اسی موقع سے فائدہ اٹھایا ہو گا، لیکن کس طرح؟ میں یہ جاننا چاہتی ہوں۔“

”یوں سمجھ لو کہ جان پر کھیلتا پڑا۔“ میں نے بتایا۔ ”ورنہ تو یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس وقت زندہ سلامت تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔“

”یہ تو خبر ہے مجھے، تفصیل بیان کرو۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

نچو کا یہ حربہ میرے لئے اب نیا نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنے ذہن پر بوجھ ضرور محسوس ہوا، مگر اس کے اثر میں نہیں آیا۔ میں نے خوابیدہ سی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”اس شخص کا نام عدنان تھا جس کے سامنے مجھے پیش کیا گیا۔ جو آدمی مجھے وہاں لے کر گیا تھا، بڑا عجیب تھا۔ ستے ہوئے چہرے والے اس آدمی نے مجھے معلوم نہیں کس طرح بے بس کر دیا۔ میں اس کا کوئی حکم ٹال نہیں سکا۔ عدنان ہی کے کہنے پر مجھ سے ایئر بیگ لے لیا گیا۔ جب مجھے دو مسلح افراد کو خمی کے تہ خانے میں بند کرنے لے جا رہے تھے تو میں نے ایئر بیگ کو عدنان کی کرسی کے قریب رکھا دیکھا۔ عدنان نے کہا تھا کہ اس نے نجیب کو مطلع کر دیا ہے، وہی مجھ سے پوچھ گچھ کرے گا۔ میں تہ خانے کے ایک کمرے میں بند رہا۔ پھر شاید نجیب آگیا اور مسلح افراد مجھے لینے آ گئے۔ میں کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اوپر فائرنگ شروع ہو گئی۔ مسلح افراد چند ہی لمحوں کو میری طرف سے غافل ہوئے تھے اور یہی غفلت انہیں مہلکی پڑی۔ میں ان کے عقب میں تھا۔ میں

نے سوچا، اِدھر یا اُدھر! یا تو میں مارا جاؤں گا یا پھر بیچ نکلوں گا۔ بجلی کی طرح تڑپ کر میں نے کیے بعد دیکھے ان دونوں کی گردنوں پر کھڑی ہتھیلی سے ضربیں لگائیں۔ یہ ضربیں اتنی شدید تھیں کہ وہ ڈھیر ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ بھی بچے یا نہیں! میرے پاس منصور کا دیا ہوا ریوالور موجود تھا۔ ریوالور ہاتھ میں لئے میں اوپر آیا تو وہاں موجود تمام ہی افراد کو خمی کے بیرونی حصے میں تھے۔ فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ہمارے آدمی کو خمی کے باہر سے آگ برس رہے تھے۔ میں لپک کر اس کمرے میں آیا جہاں عدنان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں مجھے خالی ایئر بیگ پڑا دکھائی دیا۔ سونے کے ظروف اس میں سے نکال لئے گئے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ان قیمتی ظروف کو اسی کمرے میں ہونا چاہئے۔ میں نے انتہائی سرعت سے کمرے میں موجود واحد الماری کی تلاشی لی۔ خبر نہیں کہ اس عرصے میں کس جگہ میرے ہاتھ کا دباؤ پڑا ہلکا سا ٹھکا ہوا۔ میں چونک اٹھا۔ مجھے الماری کا ایک خفیہ خانہ کھلا نظر آیا۔ ظروف اسی میں رکھے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے وہ ظروف خالی ایئر بیگ میں ڈالے۔ اب مجھے وہاں سے فرار ہونا تھا۔ وہ لمحات میرے لئے بڑے مبر آزما تھے جب میں فائرنگ کرنے والوں کے پیچھے سے کسی چوپائے کی طرح کو خمی کے لان کی طرف بڑھا۔ کسی کو میری ذرا سی بھی آہٹ سنائی دے جاتی تو مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا۔ لان تک آتے ہی ایک مرتبہ پھر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے وہاں نجیب کو دیکھا تو جیسے پتھر کا ہو گیا، لیکن قسمت شاید میرا ساتھ دے رہی تھی۔ نجیب نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور دوڑتا ہوا کو خمی کی عقبی دیوار پھلانگ گیا۔ میری جان میں جان آئی اور پھر میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب میں کو خمی کی پیچھے والی گلی میں تھا تو دور سے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیئے۔ اسی کے ساتھ فائرنگ رک گئی۔ ”پورا واقعہ میں نے حقیقت سے قریب تر اس طرح بیان کیا کہ جس پر اعتبار کرنا ممکن ہو۔ بس کہیں کہیں مجھے مصلحت کے تحت اپنی جناتی صفات پر پردہ ڈالنے کے لئے حاشیہ آرائی کرنی پڑی تھی۔“

میری طرف سے نچو نے نظریں ہٹالیں اور میرے ذہن پر دباؤ ختم ہو گیا۔

”لیکن وہ ایئر بیگ تو مجھے تمہارے پاس نظر نہیں آیا!“ نچو نے کہا۔

میں اس پر مسکرایا اور بولا۔ ”اس مخصوص رنگ کے ایئر بیگ کو کیا میں کھلے عام لئے پھرتا! وہ تو میرے لئے خطرے کا نشان تھا۔ اسی کی وجہ سے تو میں چھٹا تھا۔ اپنے ہوٹل واپس آتے ہی اسے میں نے سوٹ کیس میں رکھ دیا تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔“

”یا تو تم بے انتہا خوش قسمت اور بہادر آدمی ہو۔ یا پھر بہت چالاک اور اس قدر فریبی ہو کہ نچو کو بھی دھوکا دینے میں تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی۔“ نچو نے یہ کہہ کر منصور کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ دونوں میں سے کون سی بات درست ہے؟“

”لیکن یہ ہمیں فریب کیوں دینے لگا؟“ منصور جواب میں کہنے لگا۔ ”اس کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ قیمتی ظروف ہمیں کر جاتا۔ یہ کہہ دیتا کہ وہاں سے جان بچا کر ہی نکل آیا تو بہت ہے۔ اس معاملے میں اسے جج بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”اس کی بھی وجہ ہے۔“ نجوا مسکرائی۔ ”اسے خبر ہے کہ چاہے بھی تو یہ میرے سامنے جھوٹ بول سکتا۔ یہ میری پراسرار قوتوں سے واقف ہے ورنہ میری امان میں کیوں آتا؟ اس نے جو کچھ بیان تمہیں غیر فطری محسوس نہیں ہوا؟ ایسے وقت کہ جب جان پر مبنی ہو کیا قیمتی سے قیمتی شے کی تلاش خیال آسکتا ہے؟ کیا وہ سونے کے ظروف اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی تھے؟ اس کی جگہ تم خود کو فرض منصور! ایسے میں تم کیا کرتے؟“

”میں صرف اپنی جان بچاتا۔“ منصور نے واضح الفاظ میں بلا جھجک جواب دیا۔

”یہی وہ نکتہ ہے منصور جس کی وجہ سے میرا ذہن اس کی طرف سے مطمئن نہیں۔“ نجوا کی آواز میں شک تھا۔

نجوا کی بے اطمینانی میرے لئے غیر متوقع تھی۔ میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ اس ”کارنامے“ پر میرا دم بھرنے لگے گی۔ اس نے اب تک مجھ سے قیمتی ظروف بھی طلب نہیں کئے تھے۔ یقیناً اسے مجھ کو ہو گا کہ میں اس کے قابو میں ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ وہ اگلا قدم کیا اٹھائے گی؟

”یہ بتاؤ منصور کہ میں اگر اسے موت کی نیند سلا دوں تو کیا فرق پڑے جائے گا؟“ نجوا نے منصور سے اس طرح پُرسکون آواز میں یہ سوال کیا کہ جیسے میری موت و حیات سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ”ہمارا کام اس کے بغیر بھی تو چل سکتا ہے، پھر اسے ساتھ لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”نجوا!“ میں بول اٹھا۔ ”یہ سراسر خلاف ورزی ہے۔ تم..... تم مجھے اپنی امان میں لینے کا وعدہ کر چکی ہو۔“

اس پر وہ زور سے ہنس پڑی، پھر بولی۔ ”وعدہ تو میں نے مقرر کی روح سے بھی کیا تھا اور اگر وعدے سے پھر گئی۔ وہ چند ہی لمحے تو تھے کہ جب میں نے تمہیں مشروط طور پر امان دینے کا وعدہ کیا۔ میر ساری عمر اس وعدہ کا ایذا کیوں کروں جو چند لمحوں میں کیا گیا؟“

منصور گوگو کی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ نجوا کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے کوئی عمل پڑھنے لگی۔ سوئی میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے بے چینی سے ہلو بدلا۔ خطرہ! میرے ذہن میں بار بار یہی ایک لفظ گونجنے لگا۔

اسی وقت سوئی نے دھیمی آواز میں منصور کو مخاطب کیا۔ اس نے منصور سے ہاتھ روم جانے کے لئے کہا تھا۔

”آؤ چلو“ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔“ منصور بولا اور سوئی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

نجوا کی تمام تر توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ مگر مجھے یوں لگا کہ میرے انسانی پیکر کو کسی نادیدہ وجود نے سختی سے جکڑ لیا ہو۔ دباؤ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس انسانی پیکر سے مجھے لگتا ہی پڑے گا۔ پھر بھی میں برداشت کرتا رہا۔ اس کے نتیجے میں تکلیف و اذیت کے سبب میرے منہ سے کراہیں اور پھر چیخیں نکلنے لگیں۔ نجوا ابھی تک عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔ پھر میری نظرس دھندلانے لگیں۔ اسی عرصے میں منصور لوٹ آیا۔ اب میرے انسانی پیکر کی ہڈیوں پر اتنا شدید دباؤ پڑ رہا تھا کہ جیسے نوٹ

جائیں گی۔ ممکن تھا، میں گھبرا کر اس انسانی پیکر سے باہر آجاتا کہ دباؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ میرے حواس بحال ہونے لگے، مگر سر میں اب بھی دھک سی تھی۔ میں ابھی تک چیخے جا رہا تھا کہ مجھے سوزی دکھائی دی۔ ”انسانی قالب میں نہیں تھی۔ اس نے میرے اوپر دم کیا، پھر نجوا کی طرف متوجہ ہوئی۔

میں سمجھ چکا تھا کہ سوئی اپنے غصے سے قابو نہیں رکھ سکی ہے۔ نجوا نے مجھے جس اذیت میں مبتلا کیا تھا سوئی شاید اسی کا انتقام لینے والی تھی۔

”نہیں!“ میں چیخ اٹھا۔ ”ایسا نہ کرو!“

سوئی آگے بڑھتے ہوئے پلٹ آئی۔ مخاطب تو میں نے سوئی کو کیا تھا، مگر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”نجوا! مجھے ہلاک نہ کرو!..... نہ مارو مجھے!“ میں چیخنے ہوئے بولا۔

حرکت کرتے ہوئے نجوا کے ہونٹ رک گئے۔ سوئی وہاں سے غائب ہو گئی۔ خطرہ ٹل گیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر ہانپنے لگا۔ نجوا کی زہریلی ہنسی سنائی دی، پھر اس نے کہا۔ ”حیرت انگیز قوت برداشت ہے تمہارے اندر! تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا سجد تو میرے قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگنے لگتا۔“

”م..... مگر تم نے..... ایسا کیوں کیا نجوا؟“ میں رک رک کر بولا۔

”صرف یہ جاننے کے لئے کہ تمہارے اندر کتنی قوت برداشت ہے اور..... اور یہ کہ اگر تم کسی پراسرار قوت کے مالک ہو تو معلوم ہو جائے۔“

”مخلص اس کی خاطر تم نے میری زندگی خطرے میں ڈال دی!“ میرے لہجے میں شکایت تھی۔

”تمہیں تو میرا منوں ہونا چاہئے۔ میں اگر چاہتی تو تمہیں ٹھکانے لگا دیتی۔“ نجوا مطمئن انداز میں مسکراتے لگی۔ پھر اس کی نگاہ سوئی کی طرف اٹھی جو اندر والے دروازے سے دوبارہ انسانی قالب اپنا کر نشست گاہ میں داخل ہو رہی تھی۔ نجوا نے ہنس کر اسے مخاطب کیا۔ ”شکر کرو رشیدہ کہ تم بیوہ ہونے سے بچ گئیں!“

”لیکن آپ..... میرے شوہر کو اذیت کیوں دے رہی تھیں؟..... ان کی چیخیں سن کر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔“ سوئی یہ کہتے ہوئے میرے قریب آئی تھی۔

”تم کیوں کہ مجھے نہیں جانتیں اس لئے تمہاری گستاخی کو معاف کر رہی ہوں۔ نجوا سے جواب طلبی کرنے والے پیشہ پچھتاؤں کی آگ میں جلتے ہیں۔“

”میرا مقصد آپ سے جواب طلبی ہرگز نہیں تھا۔“ سوئی نے وضاحت کی۔

”میرے دل میں کئی وجوہات سے تمہارے لئے نرم گوشہ موجود ہے۔ پہلی وجہ کہ تم میری ہی طرح ایک عورت ہو، دوسرے یہ کہ تم ہی نے اپنے شوہر کو مجھ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر یہ کہ تم نامساعد حالات میں بھی حوصلہ برقرار رکھتی ہو۔ تم جیسی عورتیں کم ہوتی ہیں۔ ہاں تمہارے اندر صرف ایک خرابی ہے۔“ نجوا ہنسنے ہوئے منصور کی طرف دیکھنے لگی۔ ”کسی عورت کو اپنے مرد کا اتنا وفادار نہیں ہونا چاہئے جتنی تم ہو!“

”اسے آپ خرابی کہتی ہیں؟“ سوی نے اظہار حیرت کیا۔

”ہاں میں اسے خرابی سمجھتی ہوں کہ مرد اتنے با وفا نہیں ہوتے۔“

”مگر سعد ایسے نہیں ہیں۔“

”ہر عورت کو یہی غلط فہمی ہوتی ہے۔ مرد اسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے منصور؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو! کم از کم اپنے بارے میں تو میں یقینی طور کہہ سکتا ہوں۔ کسی عورت

باب میں کبھی میں نے وفا نہیں کی۔“

”سعد سے ایئر بیگ لے لو۔“ نجوانے منصور سے کہا۔ ”ہمیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔“

میں نے اٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور ایئر بیگ منصور کے حوالے کر دیا۔

”غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سعد کہ میرے حکم کے بغیر تم یہاں سے باہر قدم نہیں

رہو گے۔ یہاں ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ تم دونوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ فون پر بھی میں تم

رابطہ رکھوں گی اور منصور بھی تمہاری ضروریات کا خیال رکھے گا۔“ یہ کہتے ہوئے نجوانا اٹھی۔

اس کی تقلید میں منصور نے بھی ایسا ہی کیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت

نہیں سعد! تمہارے دشمن یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔“

نجوا اور منصور کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں گیٹ بند کر کے اندر آ گیا۔ سوی کچھ کہنے ہی والی تھی

کہ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی تو اس کے قریب جا کر میں نے سر کو

کی۔ ”پہلے ہمیں اس بیٹکے کی اچھی طرح تلاشی لینی ہے۔“

سوی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ گزشتہ تجربات کے سبب نجوا کی طرف سے میں پوری طرح چوکنا تھا

میں نے اسی لئے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا۔ آدم زادوں کے پاس معلومات حاصل کرنے اور باخ

رہنے کے کیا کیا ذرائع ہیں، میں ان سے واقف تھا۔

پورے بیٹکے کی تلاشی لینے پر بھی ہمیں کوئی ایسی شے نہیں ملی کہ نجوا یا اس کے آدمی دور بیٹھ کر

ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ باورچی خانے میں ہم

کھانے پینے کا خاصا سامان نظر آیا۔

عرب ممالک میں عموماً کھانے پینے اور بے مزہ ہوتے ہیں۔ جب سے میں نے انسانی قابلوں میں

شروع کیا تو چٹ پٹے کھانوں کی عادت ہو گئی۔

عراق میں روٹیاں دو طرح کی ہوتی ہیں جنہیں سمون اور خبز کہا جاتا ہے۔ باورچی خانے میں سمون

رکھی ہوئی تھیں جو بیکری سے آتی ہیں۔ سمون بیضی شکل ہوتی ہے، بعض جگہ صرف ایک بالشت کی اور

کبیں ڈیڑھ فٹ تک کی ہوتی ہے۔ خبز تندوری روٹی جیسی ہے، تنگے صرف نمک لگا کر تقریباً کچے کھائے

جاتے ہیں۔ مچھلی اور چاول بھی استعمال ہوتا ہے۔ خشک میوہ میں پست زیادہ چلتا ہے۔ پھلوں میں۔ سیب

انگور اور موہمی ہیں، تربوز کی بہتات ہے۔ آم بھی ہوتا ہے۔ سب کو نقد اور موہمی کو پرقتال کہتے ہیں۔

باورچی خانے میں رکھے ہوئے پھلوں کی طرف میں نے دیکھا اور سوی سے مسکرا کر پوچھا۔ ”نقد کھائے گی

کہ پرقتال؟“

”مجھے پرقتال سمجھ کر وہ بد ذات آدم زادی نچوڑ تو رہی تھی!“

”اور تو ہمانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی کہ اس کے شیطانی عمل کا توڑ کر سکے۔“

”ہاں۔ اگر تو مجھے عین وقت پر روک نہ لیتا تو میں اس قدر غصے میں تھی کہ اس بد بخت کی ہڈی

ہلی ایک کر دیتی۔“

”واقعی اس نے مجھے شدید اذیت پہنچائی، لیکن میں صبر کر گیا۔ اے سوی! تو نے اچھا کیا کہ اے

جوڑ دیا ورنہ سارے کئے کرانے پر پانی پھر جاتا۔“ میں یہ کہتا ہوا باورچی خانے سے نکل آیا۔ آخر میں ہم

نے باورچی خانے کا جائزہ لیا تھا۔

چھوٹی سی اس نئی آبادی کا نام منصورہ تھا۔ وہاں تعمیری کام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ ایک گھریا

بنگلے کے دوسرے کا فاصلہ اتنا ہو گا کہ کوئی چپتا بھی تو آواز نہ جاتی۔ بغداد شہر کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے

حکومت نے نئی آبادیاں بسانا شروع کی تھیں۔ وہاں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کئے جانے کے باوجود شہر کی

معنی آبادیوں میں رہنے والے ادھر کارخ نہیں کرتے تھے۔ ادھر آتے ہوئے میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا

تھا۔ چند دکانیں بھی مجھے نظر آئی تھیں۔ نجوانے غالباً مجھے جان بوجھ کر ایسے علاقے میں رکھا تھا۔

بنگلے کا عقبی دروازہ بھی تھا۔ صحن کی دیواریں البتہ نیچی تھیں۔ دو کمروں میں سے ایک کو ہم نے بے

طور خواب گاہ منتخب کر لیا۔ اسی میں ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا تھا۔ اس بنگلے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہاں کوئی

ہم سے پہلے بھی رہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں رہنے والا نجوا ہی کا کوئی آدمی ہو گا۔ اسی سے

فوری طور پر وہ بنگلا خالی کر لیا گیا تھا۔

پھر اس روز نہ تو نجوانے فون کیا، نہ منصور ہی آیا۔ ہم بھی پہلے دن اس بنگلے سے نہیں نکلے۔ اس

کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نجوا کو مجھ پر شک ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت فون کر لیتی اور میں موجود نہ ہوتا تو

اس کے شک میں اضافہ ہو جاتا۔ بے ظاہر تو وہ میری طرف سے مطمئن ہی لگتی تھی۔ پھر بھی میں نے احتیاط

کو ملحوظ رکھا۔ اگر ہمیں کہیں جانا ہی ہوتا تو اس کے لئے رات کا وقت مناسب تھا۔ دشمن کا ایک ٹھکانا میں

نے دیکھا تو لیا تھا، مگر جلد بازی سے گزر گیا۔ شاہراہ سحدون پر واقع یہ وہی کوٹھی تھی کہ جہاں مجھے انخوا کر

کے لے جایا گیا تھا۔

اس رات کو میں نے اپنے تصور کی قوت بھی نہیں آزمائی۔ میں اور سوی جلد ہی بنگلے کی بتیاں بجھا

کر سو گئے۔ ہم دونوں انسانی قابلوں ہی میں تھے۔

☆=====☆

معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پھر تھا کہ مجھے بے چینی اور بوس محسوس ہوئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

جاگنے کے باوجود میرے ذہن پر غودگی سی طاری رہی۔ میں نے سر کو کئی بار جھٹکا۔ پھر اچانک ہی مجھے یہ

احساس ہوا کہ کمرے میں اکیلا ہوں۔

”سوی!..... اے سوی!“ میں نے کروت لے کر بستر پر ہاتھ پھیرا۔

بستر خالی تھا۔ میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ناگوار سی بواب تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی بتی جلائی اور صحن میں نکل آیا۔ وہاں بھی میں نے روشنی کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سونے سے پہلے عقبی دروازہ بند تھا۔ اسے ہم نے کھول کر دیکھنے کے بعد لاک کر دیا تھا۔

عقبی دروازہ صرف بھڑا ہوا ملا تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کمرے میں بو کیسی تھی؟ میں یہ سوچتا ہوا دوسرے کمرے اور پھر نشست گاہ میں بھی گیا۔ سارا بنگلا چھان لینے کے باوجود مجھے سوئی کیس نظر نہ آئی۔ نہ مجھے اس کے جسم کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ سوئی خود کہیں چلی جاتی۔ مجبوراً مجھے انسانی قالب سے باہر آنا پڑا۔ عین اسی وقت کمرے میں موجود ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں لپک کر اندر گیا اور ریسپور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سے فوراً لائن کاٹ دی گئی۔ میں پکرا گیا۔ سوئی کی گمشدگی سے میں پہلے ہی پریشان تھا۔ اسی سبب فوری طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ فون کرنے والی نجوا ہو سکتی ہے یا پھر منصور۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ میں بنگلے میں موجود ہوں یا نہیں!

ریسیور رکھ کر میں نے سوئی کا دھیان کیا اور پھر پرداز کرتا ہوا اس کی مخصوص خوشبو پر ایک جگہ پہنچ گیا۔

سوئی کو میں نے اس گھر کے ایک کمرے میں بستر پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا مگر وہاں روشنی تھی۔ بنگلے کی خواب گاہ میں پھیلی ہوئی بو کا مجھے پھر خیال آیا تو مجھ پر یہ عقدہ کھل گیا۔ میں نے سوچا، وہ بوجے ہوش کر دینے والی کسی دوا کی ہوگی۔ انسانی پیکروں میں ہونے کے سبب سوئی اور میں، دونوں ہی پر اس دوا کا اثر ہوا تھا۔ میرے ذہن نے ساری کڑیاں جوڑ لیں۔ سوئی کو وہاں سے بے ہوشی کے دوران ہی میں اغوا کر کے اس جگہ لایا گیا تھا، مگر کیوں؟ اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے؟ یہ سوالات میرے ذہن میں پیدا ضرور ہوئے لیکن یہ باتیں بعد میں سوچنے کی تھیں۔ پہلے میں سوئی کو ہوش میں لے آیا۔

آنکھیں کھولتے ہی سوئی کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ میں نے جھک کر سرگوشی کی۔ ”تُو جس طرح پہلے بے سدھ پڑی تھی دیسے ہی پڑی رہ!“

”لیکن یہ وہ..... وہ جگہ تو نہیں۔“ سوئی بھی دھیمی ہی آواز میں بولی۔ ”ہم کہاں ہیں؟“

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تُو پردہ نہ کر! میں آتا ہوں۔“

میرے کہنے پر سوئی نے اقرار میں پلکیں پھپکائیں اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کمرے سے نکل آیا۔ وہاں میں نے تین مسلح افراد کو دیکھا۔ ایک شخص اس کمرے کے باہر تھا کہ جہاں سوئی تھی۔ دوسرے آدمی کو ذرا ہی فاصلے پر ایک اور کمرے کے دروازے پر مستعد پایا۔ تیسرا مسلح شخص گھر کے صدر دروازے پر متعین تھا۔

دوسرے کمرے میں بھی مجھے اجالا نظر آیا۔ وہاں بھی غالباً کوئی قید تھا۔ میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہاں ایک بستر پر کوئی نوجوان و حسین آدم زادی محو خواب تھی۔ چہرے کے نقوش سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی عربی النسل ہے۔ آگے بڑھ کر میں نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ اس طرح جگا دیا جیسے خود بہ خود آنکھ کھل گئی ہو۔ اسے اپنے اثر میں لے کر میں ان اس کے ذہن پر جیسے ہی توجہ دی چونک اٹھا۔

”لیلیٰ!.....“ ہاں وہ لیلیٰ ہی تھی، ضرعام نجفی کی محبوبہ! جب میں ’نجوا سے مل کر پہلی مرتبہ منصور کے ساتھ لوٹ رہا تھا تو ضرعام ہی کے آدمیوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ انہی کے ذریعے منصور نے ضرعام کو پیغام بھجوایا تھا کہ اگر اب اس نے منصور کو چھیڑا تو لیلیٰ کو قتل کر دیا جائے گا۔ بعد میں مجھے منصور ہی سے پتا چلا کہ ضرعام نجفی سے متفرق کے غلام کبھی کبھار کام لیتے رہتے ہیں اور یہ کہ لیلیٰ، ضرعام کی محبوبہ ہے۔ لیلیٰ کو قید رکھنے کا مقصد غالباً یہی تھا کہ ضرعام نجفی دباؤ میں رہے۔

کیا نجوا میرے ساتھ بھی یہی کہانی دہرا رہی ہے؟ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا فطری تھا۔ اس کے سوا سوئی کے اغوا کا اور کیا مقصد ہوتا! اسی کے ساتھ مجھے منصور کی آوارہ نگاہی کا خیال بھی آیا اور میرا وجود سلگ اٹھا۔ اگر اغوا کے پس پشت منصور نے یہ بھی سوچا تھا تو پھر کوئی مصلحت آڑے نہ آتی۔ منصور نے یہ گھٹاؤنا کھیل لیلیٰ کے ساتھ بھی کھیلا تھا۔ وہاں لیلیٰ کی موجودگی نے سارا معاملہ کر دیا۔ وہاں موجود محافظوں کے ذہن پر یہ سکون ہوا کہ منصور ان محافظوں کو ہدایت دے کر وہاں رکا نہیں تھا۔ اسی سکون نے مجھے ایک ایسی راہ سمجھا دی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔

میں لوٹ کر سوئی کے پاس آگیا اور جو سوچا تھا، اسے بتا دیا۔ یہ میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا کہ اس گھر میں کوئی ٹیلی فون نہیں ہے۔

میری ہدایت کے مطابق سوئی نے چیخنا شروع کر دیا۔ پھر وہ بستر پر اس طرح ترپنے لگی جیسے شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔

توقع کے مطابق باہر موجود محافظ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اس نے سوئی کی حالت دیکھی تو آواز دے کر دوسرے محافظ کو بھی وہیں بلا لیا۔

”اس کے منہ پر فوراً کپڑا باندھ دو!“ دوسرے محافظ نے مشورہ دیا۔ ”ورنہ اس کی چیخیں آس پاس رہنے والوں کو بھی ادھر متوجہ کر سکتی ہیں۔“

”لیکن یہ..... یہ کسی اذیت کا شکار ہے، کہیں مرنے جائے! منصور نے خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ ارے!..... یہ تو شاید..... ایڑیاں رگڑ رہی ہے یہ! اس کا جسم بھی اکڑتا جا رہا ہے۔ کیا..... کیا ہوا؟“ پہلا محافظ گھبرا گیا۔

سوئی نے اب چیخنا بند کر دیا تھا، لیکن اس کی چیخیں سن کر تیسرا محافظ بھی دوڑا چلا آیا۔ آتے ہی اس نے معلوم کیا۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہی تھی یہ؟“

”تم خود ہی دیکھ رہے ہو کہ اس کی کیا حالت ہے! شاید اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“ پہلے محافظ ہی نے جواب دیا۔ ”کار موجود ہے۔ ہم اسے.....“

”ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔“ تیسرا محافظ آگے بڑھ آیا۔

اس محافظ کے قریب پہنچتے ہی سوی یوں اچھلی جیسے بجلی سی کوندی ہو۔ سوی نے اس کی رانفل چھین کر اسی کی پشت پر رکھ دی۔

”اپنے دونوں ساتھیوں سے کہو کہ رانفلیں پھینک دیں ورنہ میں تمہیں بھون دوں گی!“ سوی نے سخت لہجے میں دھمکی دی۔

”دھو کا!“ محافظ بڑبڑایا۔ میں نے دونوں محافظوں کو اپنے اثر میں لے لیا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے رانفلیں پھینک دیں۔

”ارے! تم نے یہ کیا کیا؟“ تیسرا محافظ شدید خطرے سے دوچار ہونے کے باوجود حیران رہ گیا۔ ”تم ایک عورت سے ڈر گئے؟“

”تو کیا ہم تمہیں مرجانے دیتے!“ وہ دونوں میرے زیر اثر ایک زبان ہو کر بولے پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تھیاری عورت کے ہاتھ میں ہو یا مرد کے، ایک ہی بات ہے۔“

”تم تینوں ادھر دیوار پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاؤ!“ سوی نے دوسرا حکم دیا۔

تیسرا محافظ کچھ زیادہ ہی ٹیڑھا تھا۔ سوا سے بھی مجھے اپنے اثر میں لینا پڑا۔ کاری چابیاں بھی اسی کے پاس تھیں جو سوی نے اس کی جیب سے نکال لیں۔ یہ وہ بھی سن چکی تھی کہ وہاں کار بھی موجود ہے۔ میرے ہی اشارے پر سوی نے ایسا کیا تھا۔

آہستہ قدمی کے ساتھ سوی پیچھے ہٹی اور کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی دونوں رانفلیں بھی اٹھالیں۔ اس کمرے میں ایک روشندان کے سوا کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ تینوں محافظوں کو اس کمرے میں بند کر کے سوی باہر آگئی۔

لیلیٰ کو رہائی دلانا بھی میرے لئے ممکن تھا، لیکن بہ وجہ اسے وہیں قید رہنے دیا۔ وہ ایک آوارہ آدم زادی تھی، ایک سبب تو یہ تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس سے بات بگڑ جاتی۔ سوی کا فرار ہونا تو نجوا کی سمجھ میں آجاتا، لیکن اپنے ساتھ لیلیٰ کو بھی رہائی دلانا اسے غیر فطری معلوم ہوتا۔ مجھ سے منصور، لیلیٰ کا ذکر کر چکا تھا۔ لیلیٰ کی رہائی کا مقصد کچھ اور ہی سمجھ لیا جاتا۔ نجوا تو پہلے ہی مجھ پر شک کر رہی تھی۔ میں تو یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مجھے یا سوی کو خبری نہیں کہ انہوں نے والے کون تھے!

کار میں بیٹھ کر ہم منصورہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں سوی کو میں نے حقیقت سے آگاہ کیا تو اسے غصہ آگیا۔

”ان شیطانوں کو سبق سکھانا ہی پڑے گا اے علیالیش! یہ اب حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔“

”ابھی اس کا وقت نہیں آیا اے سوی! تھوڑا اور صبر کر لے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”تیری طرح طیش تو مجھے بھی آیا تھا، مگر کوئی قدم اٹھانے سے رک گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ سخت اذیت برداشت کرنے کے باوجود میں نے خود کو ظاہر نہیں ہونے دیا! ہم نے ابھی جو سواگت رکھا، وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ نجوا پر ابھی یہ نہیں کھلنا چاہئے کہ ہم غیر معمولی پراسرار قوت رکھتے ہیں۔“

میرے سمجھانے بجھانے پر سوی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کار کو ہم نے اپنے بنگلے سے دور ایک جگہ چھوڑ دیا۔

اضطراب اور غلج کے سبب ہی میں بنگلے کا عقبی دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ ہم اندر پہنچے اور عقبی دروازہ بند کر کے روشنیاں گل کیوں اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ابھی صبح ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ کمرے میں بدبو اب نہیں تھی۔

دوسرے روز ٹیلی فون کی گھنٹی ہی سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے رسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف منصور تھا، میری آواز پہچانتے ہی وہ بولا۔ ”حیرت ہے کہ تم اتنی گہری نیند سو رہے تھے!“

”کیوں، اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“ میری آواز پر سکون ہی تھی۔

”خاصی دیر گھنٹی بجنے کے بعد تم نے رسیور اٹھالیا جب کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ تم.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا، پھر پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟ کوئی پریشانی تو نہیں؟“

”پریشانی رات کو تھی، اب نہیں رہی۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر مجھے یاد نہیں رہا ورنہ رات ہی کو فون کرتا۔ جس ڈائری میں نمبر تھا، وہ.....“

”ایسی کیا پریشانی تھی؟“ منصور میری بات کاٹ کر بولا اٹھا۔ ”اور پھر وہ پریشانی کیسے دور ہو گئی؟“

کینہ کہیں کا! میں نے سوچا، کیسا بھولا بن رہا ہے! میں نے جواب میں کہا۔ ”فون پر نہیں بتا سکتا۔“

”تو پھر میں ابھی آرہا ہوں۔“ اس کے لہجے سے اضطراب نمایاں تھا۔ ”میرا انتظار کرو!“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سوی بھی جاگ چکی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ”وہ ذلیل آدم زاد منصور یہاں آرہا ہے، تو اپنے غصے پر قابو رکھو!“

”مجھے خبر ہے اے علیالیش کہ تیری مرضی کیا ہے!“ سوی بستر سے اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ان بد اعمال آدم زادوں کی حرکتوں پر غصہ تو آتی جاتا ہے۔ انہیں قابو میں کرنے کے لئے صبر و تحمل چاہئے۔ سو تو مجھے صبر کرنے والوں میں ہی سے پائے گا۔“

”اس پر بھی انہوں نے حد سے گزرنا چاہا تو پھر درگزر کرنے والا میں بھی نہیں اے سوی!“ میں نے اطمینان دلایا۔

انسانی پیکروں کی ضروریات سے ہم دونوں ہی واقف تھے۔ منصور کے انتظار میں ہم نے دقت رائیجاں نہیں کیا۔ ناشتا وغیرہ کر کے ہم نے لباس تبدیل کئے اور گزشتہ شب گزرے ہوئے واقعے کی روشنی میں نجوا کے رد عمل پر گفتگو کرنے لگے۔ نجوا کی اجازت کے بغیر منصور نے یہ قدم نہیں اٹھایا ہو گا۔

میں یہ سمجھا تھا کہ منصور کو آنے میں دیر نہیں لگے گی، مگر اس کا خاصا انتظار کرنا پڑا۔ فون پر اس کے لہجے سے مجھے یہی تاثر ملا تھا کہ وہ فوراً دوڑا چلا آئے گا۔ منصور کے لئے دروازہ میں نے ہی کھولا اور اسے نشست گاہ میں لے آیا۔

”تمہاری بیوی رشیدہ کہاں ہے؟“ منصور نے بیٹھے ہی سوال کیا۔ اس کے چہرے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ تاخیر سے اس کی آمد کا سبب میں جان گیا۔

”اندر ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”تمہیں اس سے کیا کام ہے، اسے بلاؤں؟“

”ہاں بلاؤ!“ منصور بولا۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“

”کہاں اور کس لئے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”اب تک میں نے دانستہ منصور کے ذہن میں نہیں جھانکا تھا۔ اس کی وجہ پراسرار نجوا سے منصور کی قربت تھی۔ کیا پتا نجیب اور نجوا کی طرح وہ بھی کوئی سیدھا سادا آدم زاد نہ ہو۔ ابھی وہ مجھ پر پوری طرح کھلا نہیں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں منصور نے کہا۔ ”یہ نجوا کا حکم ہے۔ میں اسی کے پاس رشیدہ کو لے جاؤں گا۔ اسی سلسلے میں وہ تمہیں فون بھی کرنے والی ہو گی۔“

”تم نے ابھی تک مجھ سے یہ معلوم نہیں کیا منصور کہ گزشتہ رات مجھ پر کیا گزری؟“ جان بوجھ کر مجھے یہ ذکر چھیڑنا پڑا۔

اس پر منصور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”تمہیں اب تک یہ اندازہ کر لینا چاہتے تھامسکہ کہ نجوا سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔“

منصور کے لہجے سے واضح تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ سے فون پر گفتگو کے بعد وہ یقیناً پہلے ادھر گیا ہو گا جہاں لیلیٰ قید تھی اور سوئی کو بھی اغوا کر کے وہیں لے جایا گیا تھا۔ گزشتہ شب میرا پریشان ہونا اور پھر پریشانی دور ہو جانے کا مطلب اس کے لئے سمجھ لینا مشکل نہ رہا ہو گا۔ ”یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ نجوا حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے، لیکن جو کچھ مجھ پر گزری.....“

”ہوتی رہیں گی یہ باتیں۔“ منصور نے میری بات کاٹ دی۔ ”نجوا نے تمہیں بلایا تو نہیں، مگر چاہو تو ساتھ چلو۔ فون پر تم اس سے معلوم کر لینا۔ اس کے لئے میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ مقرر کے غلام کیوں کہ اب بھی تمہاری تلاش میں ہیں اس لئے مجھے تمہارا چہرہ بدلنا پڑے گا۔ اس کے بغیر تمہارا باہر نکلنا خطرناک ہے۔“

”میرا چہرہ بدل دو گے، مگر کیسے؟“ میں انجان بن گیا۔

”تم خود ہی دیکھ لو گے۔“ وہ ہنسنا۔ ”ہمارے لئے کوئی کام ناممکن نہیں۔“

اسی لمحے اندر والے کمرے سے ٹیلی فون کی تھنٹی بجنے کی آواز آئی اور پھر ریسپور اٹھا لیا گیا۔ سوئی اسی کمرے میں تھی۔

”سعد! تم جاؤ یہ نجوا ہی کا فون ہو گا۔“ منصور مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں اٹھا اور نشست گاہ سے ملحق کمرے میں آ گیا۔

”نجوا! صاحبہ کا فون ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ سوئی نے یہ کہتے ہوئے ریسپور میری طرف بڑھایا۔

”سعد بول رہا ہوں۔“ ریسپور لیتے ہی میں بولا۔

”منصور کو اب تک تمہارے پاس پہنچ جانا چاہئے۔“ نجوا نے کہا۔

”ہاں وہ نشست گاہ میں بیٹھا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ رشیدہ کو وہ اپنے ساتھ.....“

”مجھے معلوم ہے۔“ نجوا بول اٹھی۔ ”اسے میں نے ہی یہ حکم دیا ہے۔“

”میں بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں، کیا تمہیں منصور پر بھروسہ نہیں کہ اپنی حسین بیوی کو اس کے ساتھ تنہا بھیجنے سے ڈر رہے ہو؟“ نجوا دھیرے سے ہنسی۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے منصور پر اس طرح کا کوئی شک نہیں۔ اس نے تو خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ ساتھ چلنا چاہوں تو تم سے پوچھ لوں۔ اس سے قطع نظر کہ رشیدہ بھی میری طرح اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں رہنے کے آداب اسے بھی میں نے اچھی طرح سکھا دیئے ہیں۔“

”یہ تو مجھے خبر ہو چکی ہے۔ میں نے اسی لئے تو اسے بلوایا ہے۔“ نجوا بولی۔

”کہیں تم اس سے بھی تو کوئی کام لینے کے بارے میں.....“

”فون پر ایسی باتیں نہ کرو! تم دیں رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کی وجہ تمہیں خود پتا ہے۔“

”منصور مجھے یہاں سے اس طرح لے جانے کا کہ کوئی دیکھے تو پہچان نہ سکے۔“ میں نے محتاط الفاظ میں منصور کی تجویز بتا دی۔

”وہ بھی ایک ہی کم عقل ہے۔ خیر..... آجاؤ تم بھی۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

میرے اور منصور کے درمیان ہونے والی گفتگو سوئی نے بھی سن لی تھی۔ مجھے اسی لئے اسے کچھ بتایا نہیں پڑا۔ اسے ساتھ لئے میں نشست گاہ میں آ گیا۔

”نجوا راضی ہو گئی ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔“ میں نے منصور کو مخاطب کیا۔

منصور یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں ابھی آیا۔“

اپنی کار ہی میں رکھا ہوا میک اپ باکس نکال کر منصور دوبارہ نشست گاہ میں آ گیا۔ اس نے میرے چہرے پر ایک ماسک چڑھادیا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، پھر بھی میں نے آئینے میں اپنا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”دیکھ لو! میں نے کتنی جلدی تمہارا چہرہ بدل دیا!“ منصور مسکرایا۔ ”یہ برا منگنا سامان ہے۔“ نجوا ایک دفعہ امریکہ گئی تھی تو وہاں سے بہت سی ایسی چیزیں لے کر آئی تھی۔“

سوئی بھی مجھے حیران نظروں سے دیکھنے لگی۔ مقصد اس آدم زاد کو بے وقوف بنانا ہی تھا۔

پھر ہم بیگلے کو قاتل کر کے منصور کی کار میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں آگے بیٹھا اور سوئی پیچھے بیٹھی تھی۔

”تو کیا رشیدہ کو اغوا کر کے لے جانے والے مقرر کے غلام تھے؟“ میں نے حقیقت جاننے کے باوجود حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ نجوانے جواب دیا۔ ”اگر وہی ہوتے تو پھر تمہیں زندہ نہ چھوڑ جاتے۔“

”پھر وہ کون تھے؟ انہوں نے رشیدہ کو کیوں اغوا کیا؟“

”وہ ضرغام غنئی کے آدمی تھے جو تمہیں نہیں پہچانتے۔“ نجوانے جھوٹ بولا۔ ”انہیں کسی طرح یہ علم ہو گیا تھا کہ تم دونوں منصور کے مہمان ہو۔ تمہیں منصور بتا ہی چکا ہے کہ ضرغام غنئی کون ہے! اس کی محبوبہ لیلیٰ ہماری قید میں ہے۔ رشیدہ کو اغوا کرانے کا مقصد یہی ہو گا کہ اس کے بدلے لیلیٰ کو رہا کرایا جا سکے۔“

نجوا کی اس عیاری اور واضح جھوٹ پر مجھے غصہ آیا، مگر پل گیا اور نجوا سے سوال کیا۔ ”تمہیں ان باتوں کی خبر کب ہوئی؟“

”میں تم دونوں کی طرف سے لاعلم نہیں رہتی۔ کل رات ہی کو مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتی، پتا چلا کہ رشیدہ، ضرغام کے آدمیوں کی قید سے فرار ہو گئی۔ پھر مجھے دیگر تفصیلات بھی معلوم ہو گئیں۔ تین مسلح افراد کی قید سے نکل آنا واقعی کوئی معمولی بات نہیں، خاص طور پر ایک عورت کے لئے! پہلے میں تمہاری بیوی کو کوئی عام سی عورت سمجھی تھی لیکن یہ تو بڑے کام کی نکلی۔“

”مگر نجوا، میں یہی چاہوں گا کہ تم رشیدہ کو ان معاملات سے دور ہی رکھو۔“ میں نے کہہ ہی دیا۔ میری بات سن کر نجوا کی پیشانی پر بل پڑ گئے، بولی۔ ”سعد! مجھے کبھی اس سے کوئی غرض نہیں رہی کہ کون کیا چاہتا ہے! میں نے اس لئے تمہیں امان نہیں دی کہ تم مجھے فضول مشورے دینے لگو۔ کب اور کس وقت مجھے کیا قدم اٹھانا ہے، یہ میں ہی بہتر جانتی ہوں۔ تم کو، کس لئے مجھ سے ملنے آئے تھے؟“

”اسی لئے کہ کہیں تم میری بیوی کو بھی اس راہ پر نہ ڈال دو۔ مجھے یہی اندیشہ تھا۔“

”تو کیا تم مجھے ایسا کرنے سے روک سکتے ہو؟“ نجوا کا لہجہ بہ دستور سخت ہی رہا۔

”روک تو نہیں سکتا، ہاں تم سے درخواست ضرور کر سکتا ہوں۔“ میں نے زری سے کہا۔

”اور درخواست مسترد بھی کی جا سکتی ہے۔“ نجوا ذرا نرم پڑ گئی۔ ”تم ایک عورت کی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے باوجود اس کی راہ میں دیوار بن رہے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے رشیدہ کے لئے کیا سوچا ہے! میں اسے ناقابل شکست بنا دوں گی۔“

”لیکن..... لیکن اس سے مجھے کیا..... کیا فائدہ؟“ میں نے جیسے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

”کس طرح کا فائدہ مطلوب ہے تمہیں؟ صاف بات کرو!“ نجوا بولی۔ ”کو جو تمہارے دل میں ہے“

میں برا نہیں مانوں گی۔“

”تم شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔ فائدے سے میری مراد یہ نہیں تھی۔ مجھے کوئی مالی منفعت مقصود نہیں۔ معاملہ میرے تمہارے درمیان تھا۔ تم سے میری ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ رشیدہ بھی تمہارے اشاروں پر چلے گی۔ اسے تم میری گستاخی نہ سمجھنا۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ تم نے

”شاہراہ سیموئل ہی چل رہے ہو؟“ میں نے منصور سے پوچھا۔

”نہیں تو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا؟“ منصور بولا۔

”اس لئے کہ وہیں نجوا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔“

”نجوا کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے سعد! جس روز تم اس سے وہاں ملے تھے، اسی دن وہ چلی گئی تھی۔ اگر وہ اسی طرح کسی ایک جگہ رہنے لگے تو مقرر کے غلام اسے تلاش کر لیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی کمزور نہیں سمجھتی، اسی وجہ سے اسے برتری حال رہتی ہے۔ تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں!“

اس کے بعد میں نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی اور سفر تمام ہو گیا۔ دریائے فرات کے کنارے ایک ٹل کے قریب منصور نے کار روک لی اور ہم اتر آئے۔

کسی بوئنگ کلب کی جھوٹی سی ایک موٹر بوٹ میں منصور ہمیں ساتھ لے کر سوار ہو گیا۔ دریا کی لہروں پر موٹر بوٹ بہتی ہوئی آگے بڑھی۔

”تم شاید پہلی مرتبہ کسی موٹر بوٹ میں بیٹھی ہو گی؟“ منصور نے سوی سے دریافت کیا۔

”ہاں پہاڑوں پر رہنے والے ہم لوگوں کے لئے یہ پہلا تجربہ ہے۔“ سوی نے جواب دیا۔ وہ یہ بھولی نہیں تھی کہ منصور کو ہم نے اپنے متعلق کیا بتایا ہے!

موٹر بوٹ جلد ہی خاصی آگے نکل آئی۔ سفر کے دوران میں ہمیں دوسری چھوٹی بڑی کشتیاں اور موٹر بولس بھی نظر آئیں۔ شہری حدود سے باہر آکر مجھے ایک بڑی موٹر بوٹ دریا میں رکی ہوئی دکھائی دی۔ ہماری موٹر بوٹ اس کے قریب پہنچ گئی۔

”چلو اٹھو!“ منصور نے ہم سے کہا۔

ہم بڑی موٹر بوٹ پر چڑھ گئے۔ اس کے عرشے پر ایک شناسا چہرہ دیکھ کر میں چونکا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ اس شخص کو میں نے کہاں دیکھا تھا! بغداد کے قدیم ترین محلے کرخ میں جعلی دستاویزات بنانے والے شخص ناصر سے اس نے پوچھ گچھ کی تھی۔ اس کے ساتھ جو دو اور مسلح ساتھی تھے، انہیں بھی میں نے موٹر بوٹ کے کین کے طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس وقت بھی وہ تینوں مسلح ہی تھے۔ چھوٹی موٹر بوٹ واپس جا چکی تھی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ نجوا مجھ سے کسی ایسی جگہ ملے گی۔

اس موٹر بوٹ کا کین خاصا بڑا اور آرام دہ تھا۔ اکبرے جسم اور تھکے نقوش والی نجوا اس وقت پینٹ اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بیٹھنے کو کہا۔ ”نہیں، تم ادھر میرے پاس آکر بیٹھو! یہاں اس کین میں دو مرد اور دو عورتیں ہیں جنہیں ایک دوسرے کے مقابل ہونا چاہئے۔“ یہ کہہ کر نجوا ہنسی، پھر جب سوی اس کے قریب جا بیٹھی تو کہنے لگی۔ ”مجھے اس پر خوشی ہے کہ تم اپنے شوہر سعد سے کسی طرح کم نہیں ہو۔“ نجوانے سوی کی پشت پر تھکی دی۔

”اگر سعد، مقرر کے غلاموں کی قید سے نکل آیا تو تم بھی پیچھے نہیں رہیں۔ عورتوں کو تم ہی جیسا ہونا چاہئے۔“

صاف بات کرنے کے لئے کہا ہے، یہ کہنے کی ہمت پیدا کی ہے۔
”اس وقت تک رشیدہ سے نہ تو میں آشنا تھی، نہ مجھے اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا علم تھا۔ میں تو خود اس سے کوئی ایسا کام نہیں لوں گی کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑے جائے۔“ نجوا کی آواز اب معمول کے مطابق تھی۔ پھر وہ بتانے لگی۔ ”فی الحال رشیدہ کو مستثنیٰ ایلموگ میں ایک نرس کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔“

مستثنیٰ ایلموگ شہر کا سب سے بڑا ہسپتال تھا۔ مستثنیٰ ہسپتال کو کہا جاتا ہے۔ یرموک وہ علاقہ تھا کہ جہاں یہ ہسپتال واقع تھا۔ دریائے فرات کی بائیں جانب ہی یرموک ایک اچھی آبادی شمار ہوتی ہے۔ یہاں متوسط طبقے کے لوگ بھی آباد ہیں۔ یہ ہسپتال ایک منزلہ ہونے کے باوجود بڑے رتبے میں پھیلا ہوا تھا۔ صرف ادنیٰ ذی کی عمارت دو منزلہ تھی۔ بغداد شہر کے متعلق ہم نے جو معلومات پہلے ہی حاصل کر لی تھیں، وہ اب کام آ رہی تھیں۔

یہ بات میرے حق ہی میں تھی کہ سومی سے بھی نجوا کام لینے کو کہہ رہی تھی، لیکن اس طرح ہم دونوں الگ الگ ہو جاتے۔ فوری طور پر مجھے اس کا ایک حل نظر آیا۔

”تمہیں اپنے متعلق میں یہ بتا ہی نہیں سکا نجوا کہ میرا پیشہ کیا ہے! ایک متول خاندان سے تعلق رکھنے کے ساتھ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔“ میں بولا۔

”پھر تو کام بن گیا!“ نجوا خوش ہو گئی اور اس نے تصدیق طلب نظروں سے منصور کی طرف دیکھا۔
”شاید تمہارا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر جمال کی جگہ سعد اس کام کے لئے مناسب ہے!“ منصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تم، ایک، سمجھے۔ خریدے ہوئے آدمی سے اپنا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ ہمیں بس یہی تو کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر جمال کو چند روز روپوش رہنے پر آمادہ کر لیں۔ وہ مان جائے گا۔“ پھر نجوا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی۔ ”رہی نرس رشیدہ تو اس کے اندر اتنی جرات نہیں کہ تمہاری کسی بات سے انکار کر دے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کام آج ہی ہو سکتا ہے۔ وقت کو ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہئے۔“

”آج ہی ہو جائے گا یہ کام۔ تم مطمئن رہو نجوا!“ منصور نے یقین دلایا۔
”لیکن ہمیں وہاں کیا کرنا ہے؟ یہ نہیں بتایا تم نے!“ میں بول اٹھا۔

”جلدی کیا ہے، معلوم ہو جائے گا تمہیں۔ پہلے ابتدائی مراحل تو طے ہو جانے دو۔“
نجوا کی بات ابھی پوری ہوئی تھی کہ ایک مسلح شخص تقریباً دوڑتا ہوا کیمین میں داخل ہوا۔

اس نے کچھ پوچھے بغیر تیزی سے کہا۔ ”ایک موٹر بوٹ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ دور بین سے میں نے دیکھا ہے کہ اس پر مسلح افراد سوار ہیں۔“

یہ سنتے ہی نجوا ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ نجوا نے موٹر بوٹ کو اشارت کرنے کا حکم دے

دیا۔ موٹر بوٹ میں خاصا اسلحہ موجود تھا۔ مجھے اور سومی کو بھی گنیں دے دی گئیں۔ نجوا اور منصور بھی غیر مسلح نہیں رہے۔ موٹر بوٹ ڈرائیو کرنے والے کے سوا ہم سات افراد نے پوزیشن لے لی۔ میری ایک جانب نجوا اور دوسری طرف سومی تھی۔ اس کے بعد منصور اور بقیہ تینوں آدمی تھے۔ نجوا کے گلے میں اب دور بین بھی پڑی تھی۔ اس نے دور بین آنکھوں سے لگائی اور پھر زور سے بولی۔ ”انہیں قریب آنے دو!“

موٹر بوٹ کا ڈرائیونگ کیمین قریب ہی تھا۔ نجوا کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہاں تک پہنچ گئی۔ لہروں کے شور اور موٹر بوٹ کے انجن کی آواز مانع نہ ہو سکی۔ رفتار کم ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ نجوا اپنے دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی ہے۔ ذرا ہی دیر کے بعد پہلا فائر بھی نجوا ہی نے کیا۔ دوسری طرف سے فوراً جواب دیا گیا۔ پھر باقاعدہ فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگیں۔

”مجھے اس مسخرے کی جھلک نظر آ گئی ہے منصور!“ معاً نجوا کی پرجوش آواز سنائی دی۔ ”آج اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے!“

”کون مسخرا؟“ بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔

”منقرع کا پہلا غلام طلال ہے!“ نجوا نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے اس کا نام ہی سنا ہو گا، دیکھا نہیں ورنہ میری زبانی مسخرا سننے ہی سمجھ گئے ہوتے کہ میں کس کا ذکر کر رہی ہوں! تم بھی اسے دیکھو گے تو تمہارے ذہن میں بھی یہی ایک لفظ ابھرے گا۔“ یہ کہتے ہی نجوا نے فائر کیا۔

نجوا کی بے خبری پر میں دل ہی دل میں ہنسا، پھر مخالف سمت میں فائر کر کے بولا۔ ”نجوا! اگر تم کو تو میں اس موٹر بوٹ تک پہنچ سکتا ہوں۔“

”تمہارا ذہنی توازن تو درست ہے سعد؟“ نجوا نے مجھے جھڑک دیا۔ ”کیا خود کشی کا ارادہ ہے؟“

”میں کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو ممکن نہ ہو۔ وہ موٹر بوٹ زیادہ دور نہیں ہے۔ پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا اس تک جا.....“

”تو جاؤ، کر لو خود کشی!“ نجوا میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھی۔

”سعد کے ساتھ مجھے بھی جانے دیں نجوا صاحبہ!“ سومی بھی خاموش نہ رہی۔

”نہیں!“ نجوا نے سخت آواز میں کہا۔ ”اپنے شوہر ہی کو تم موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کا شوق پورا کرنے دو!“

وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی رہی۔ نجوا سے میں نے بلا سب دوسری موٹر بوٹ تک جانے کو نہیں کہا تھا۔ طلال بے کی موجودگی میرے اس اضطراب کی وجہ تھی۔

”تم یہیں رہو رشیدہ!“ میں نے سومی کو مخاطب کیا۔ ”میں انشاء اللہ جلد لوٹ آؤں گا۔“

پھر میں نے نجوا کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ مجھے روک سکتی۔ اسے غالباً یقین نہیں ہو گا کہ

میں اتنا خطرناک قدم اٹھا سکتا ہوں۔ رانفل اور اس کا میگزین وہیں چھوڑ کر میں اچانک اپنی جگہ سے اچھلا اور چلتی ہوئی موٹر بوٹ سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

یہ وہ دریائے فرات تھا کہ جس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اسی دریا کے کنارے حضرت ابراہیمؑ نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ فرات کے لغوی معنی بہت میٹھا اور صاف پانی کے ہیں۔ اس علاقے میں اس سے عمدہ کسی دریا کا پانی نہیں ہے۔ اسی وجہ اس کا یہ نام پڑ گیا۔ میں اس وقت اس دریا کے پانی میں غوطہ زن تھا۔

سوی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ زیادہ فکر مند نہیں ہوگی۔ اس نے یقیناً اندازہ کر لیا تھا کہ میں انسانی قالب میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ میں نے ایسا کرنے میں دیر بھی نہیں کی اور انسانی پیکر سے باہر آ گیا۔ پانی میں رہنے والے جنات کی طرف سے البتہ مجھے خطرہ تھا کہ کسی سے مڈبھڑنہ ہو جائے۔ پہلے بھی مجھے پنجاب کے دریائے راوی میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ میں اسی لئے فوراً پانی کے اندر سے نکل آیا۔ میں دریا کی سطح سے ذرا بلندی پر اڑنے لگا۔

دو دنوں موٹر بوٹس حرکت میں تھیں۔ اسی کے ساتھ فائرنگ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دشمنوں کی موٹر بوٹ کے اوپر پرداز کرتے ہوئے میں نے انہیں شمار کیا۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ طلال بے سمیت وہ صرف چھ افراد تھے۔

”معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس خاصا اسلحہ ہے۔ ہم زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے واپس چلو!“ پھولے ہوئے رخساروں والے شخص نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور میں اس کی آواز سننے ہی چونک اٹھا۔

وہ مسخرا ہرگز طلال بے نہیں تھا۔ میں نے اس کی باریک اور بچکانہ آواز سنی تھی۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔ جس طرح منصور نے میرا چہرہ بدل دیا تھا، اس آدم زاد کے چہرے پر بھی طلال بے کا میک اپ تھا۔ رنج اور غصے کی حالت میں اس کا چہرہ میں نے نوچ لیا۔ اسی کے ساتھ وہ آدمی چیخ اٹھا۔

اس کے دوسرے ساتھی بھی گھبرا گئے اور انہوں نے فائرنگ روک دی۔ اب اس آدمی کے چہرے پر چڑھا ہوا مامک میرے قبضے میں تھا۔

مجھے یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ وہ راہ فرار اختیار کرنے والے ہیں۔ میں اسی لئے صرف اسی آدمی کو دوبارہ دریا میں کود گیا کہ جس کے چہرے سے مامک اتارا تھا۔ اسی عرصے میں لوگوں کو میں نے چیختے سنا۔ ”حسن نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔“

چند ہی لمحوں کے بعد جب میں دریا کی سطح پر ابھرا تو دوبارہ انسانی قالب اپنا چکا تھا۔ اس دوران میں حسن پر غفلت طاری ہو چکی تھی۔ اسے میں نے اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ نجوا کی موٹر بوٹ کو میں نے پانی کی سطح پر رکے ہوئے دیکھا۔ میں اس کے قریب ہی تھا۔

”وہ..... وہ شاید سعد ہے۔“ سوی کی تیز آواز سنائی دی۔ ”اس نے ایک ہاتھ بھی اٹھا

رکھا ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا تو دشمنوں کی موٹر بوٹ انتہائی تیز رفتاری سے واپس جا رہی تھی۔ منصور نے موٹر بوٹ سے ایک رسامیری طرف پھینکا۔ میں نے رسے کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد مجھے حسن کے ساتھ موٹر بوٹ پر گھسیٹ لیا گیا۔

بے ہوش اور موٹے حسن پر نظر پڑتے ہی منصور بولا۔ ”کینہ! آج آخر ہتھے چڑھ ہی گیا!“ اسی وقت میں نے تیزی سے جھک کر طلال بے کا مامک اس کے چہرے پر چڑھا دیا۔

”وہ نہ سہی تو اس مسخرے کا ڈپلی کیٹ ہی سہی!“ نجوا کسی زخمی شیرینی کی طرح غرائی۔ دوسرے ہی لمحے نجوا نے رانفل سے بے ہوش حسن کے چہرے کا نشانہ لیا اور ٹرگر دبا دیا۔ چہرے کے چھترے اڑ گئے۔ طلال بے سے شاید نجوا کو شدید نفرت تھی۔

پھر نجوا ہی کے حکم پر وہ سر بریدہ لاش دریا میں پھینک دی گئی۔ ”آؤ!“ نجوا نے پرسکون آواز میں اس طرح مجھے مخاطب کیا جیسے چند لمحوں پہلے کچھ نہیں ہوا۔ نجوا نے کیمین کی طرف بڑھتے ہوئے واپسی کا حکم دیا۔ میں، سوی اور منصور اس کے پیچھے تھے۔

کیمین میں آتے ہی خلاف توقع نجوا نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر سخت آواز میں سوال کیا۔ ”تم اسے اپنے ساتھ کیوں لائے تھے؟“

”مامک تمہیں یقین دلا سکوں، طلال بے اس موٹر بوٹ میں نہیں تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تم نے اسے کس طرح پہچانا کہ وہ طلال بے نہیں کوئی اور ہے؟“ نجوا بہ دستور مجھے گھورتی رہی۔

وہ بڑی ہی ٹیڑھی اور عجیب عورت تھی۔ اس نے کچھ اور معلوم کرنے یا اس ”کارنامے“ کی تعریف کرنے کی بجائے مجھ سے جواب طلبی شروع کر دی۔

”اس کے ایک ساتھی نے اسے نام لے کر مخاطب کیا تھا!“ میں نے پرسکون آواز میں بتایا۔ ”تم اس وقت کہاں تھے؟“ نجوا نے پوچھا۔

”اس موٹر بوٹ کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا اور عقب سے اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ ”ناممکن!“ نجوا تقریباً چیخ اٹھی۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو! تیز سے تیر تیرا کہ بھی موٹر

بوٹ کے ساتھ ساتھ نہیں تیر سکتا!“ ”لیکن سعد کیوں جھوٹ بولنے لگا نجوا صاحبہ۔“ سوی بول اٹھی۔

”یہی تو اس سے معلوم کرنا ہے!“ نجوا کی آواز میں چیخ تھی۔ ”شاہراہ سعدون والی کوٹھی سے یہ ایئر بیگ لانا نہیں بھولا اور اب اس شخص کو ساتھ لے آیا جو طلال بے کے میک اپ میں تھا۔ اس سے کس نے کہا تھا کہ مجھے یقین دلانے کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دے؟ یہ ناممکن کام اس نے کیوں اور کیسے انجام دیا؟“

”تم کچھ سننے پر آمادہ ہو تو میں بتاؤں بھی! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کس بات پر غماخ ہو؟“ میں نے کہا۔

”غیر ضروری کارکردگی دی لوگ دکھاتے ہیں کہ جنہیں کسی کا اعتماد حاصل کرنے کی جلدی ہو۔ تم یقیناً سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری تجویز سے مجھے اختلاف تھا۔ یہ خطرناک قدم اٹھانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پہلے اس بات کا جواب دو کہ میری ناپسندیدگی کے باوجود تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں اس پر معذرت خواہ ہوں نجوا!“ میں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ نجوا کو اسی طرح رام کیا جا سکتا ہے۔ اپنے سامنے کسی کو عاجزی کرتے دیکھ کر اس کی انا کو شاید تسکین ملتی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں مزید بولا۔ ”یہ جاننے کے بعد کہ اس موٹر بوٹ پر میرے دشمن موجود ہیں، میں جذباتی ہو گیا تھا۔“

توقع کے مطابق نجوا کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آگے کہو!“

”پانی میں غوطہ لگانے کے بعد جب میں سطح پر ابھرا تو وہ موٹر بوٹ خاصی قریب آچکی تھی۔“ میں بتانے لگا۔ ”وہ تقریباً رک گئی تھی جب میں اس کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ وہ شخص حسن جو کہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا“ اس کے ساتھیوں نے اسے اسلحہ کم پڑ جانے کے متعلق بتایا تو میں اس موٹر بوٹ پر چڑھنے والا تھا۔ مجھے اسی وقت پتا چلا کہ وہ طلال بے نہیں ہے۔ حسن نے واپسی کا حکم دیا اور موٹر بوٹ کے کینن کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک مجھے موٹر بوٹ پر چڑھنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ حسن کینن میں داخل ہوتا، میں نے عقب سے اس کی گردن دبوچ لی۔

زور آزمائی کی وجہ سے اس کے چہرے کا ماسک اتر گیا۔ میں نے اس کی گردن پر دباؤ برقرار رکھا کہ وہ چیخ نہ سکے۔ ہم دونوں لڑتے ہوئے کینن کی آڑ میں اور پھر موٹر بوٹ کے ایک سرے تک آگئے تھے۔ وہ بہت طاقتور تھا۔ اب میرے لئے بھی ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ اسے کسی طرح ہوش و حواس سے غافل کر دوں۔ مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔ اسی دوران میں اس کے چہرے سے اترا ہوا ماسک میرے قبضے میں آچکا تھا۔ میرا ارادہ ہرگز اسے اپنے ساتھ یہاں لانے کا نہ تھا۔ ہوا یہ کہ

کپٹن پر شدید ضرب پڑنے کے بعد اس کے بھاری جسم کو میں سنبھال نہ سکا۔ موٹر بوٹ سے میں دباؤ میں کودا ہی تھا کہ وہ بھی پانی میں آگرا۔ اچھا کا سنتے ہی اس کے آدمی یہ سمجھے کہ خود اس نے پانی میں چھلانگ لگائی ہے۔ انہوں نے چیخ کر اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ مجھے یہ خیال آیا کہ وہ شخص بھی بہر حال دشمنوں میں سے ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں اس کی تلاش ہو۔ میرے لئے یہ ممکن تھا کہ

اسے سہارا دیے پانی میں تیر سکا۔ سطح پر ابھر کر میں نے دشمنوں کی موٹر بوٹ کو تیزی سے مرکز واپس جاتے دیکھا۔ وہ یقیناً گھبرا گئے تھے۔ شاید یہ وہ سمجھے ہوں گے کہ شدید خطرے کے سبب حسن نے دریا میں خود چھلانگ لگائی ہے۔ اس عرصے میں میری نگاہ تمہاری موٹر بوٹ پر پڑی جو رکی ہوئی تھی۔ پھر جو کچھ ہوا تمہیں معلوم ہے۔ اگر حسن کو یہاں لاکر میں نے حماقت کی تو ایسا نادانستگی کے

بب ہوا اس پر بھی میں معافی کا خواست گار ہوں۔“

میں خاموش ہو گیا تو نجوا فوراً کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔

”یہ تمہاری دوسری غلطی ہے سعد!“ نجوا کے ہونٹوں کو آخر حرکت ہوئی۔ ”تیسری غلطی صاف نہیں کی جائے گی۔ جاؤ کینن سے نکل کر اپنے گیلے کپڑے سکھاؤ، تم بیٹھے کبوتر لگ رہے ہو!“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

میں کینن سے باہر آگیا اور تیز ہوا میں اپنے جسم پر موجود بیٹھے کپڑے سکھانے لگا۔ اس آدم زادی نجوا کے متعلق میرے اندازے زیادہ درست ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ ابھی تک میری طرف سے اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ وہ مجھ پر شک کر رہی تھی۔ میں نے جن دو موقعوں پر یہ سوچا کہ نجوا میری کارکردگی سے خوش ہوگی، مجھے اس کا اعتماد حاصل ہو جائے گا، وہ رائیگاں ہی گئے۔

نجوا نے ان دونوں موقعوں پر مجھے مایوس کیا۔ اب وہ سوئی اور مجھ سے کوئی اور کام لینے والی تھی جس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر جمال اور رشیدہ کون تھے کہ مجھے اور سوئی کو ان دونوں کی جگہ لینا تھی!

میں انہی خیالوں میں کھویا رہا۔ میرے کپڑے اس عرصے میں خاصی حد تک سوکھ گئے۔ موٹر بوٹ کا سفر شہر کی طرف جاری تھا کہ خاصے فاصلے پر ایک اور چھوٹی موٹر بوٹ دکھائی دی۔ اس موٹر بوٹ کو دور بین سے دیکھ کر نجوا کا ایک مسلح ساتھی، کینن میں گیا، منصور، نجوا اور سوئی اندر ہی تھے۔ وہ تینوں باہر آگئے۔ نجوا نے موٹر بوٹ کو روکنے کے لئے کہا، پھر میرے قریب آکر کھٹکے لگی۔

”آج شام کو منصور تمہارے پاس آئے گا۔ وہ جو کچھ تمہیں اس پر عمل کرنا ہے۔“

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ جلد ہی مخالف سمت سے آنے والی موٹر بوٹ قریب آ کے رک گئی۔ میں اس پہچان گیا۔ یہ وہی موٹر بوٹ تھی کہ جس میں ہم پہلے بھی سفر کر چکے تھے۔ منصور مجھے اور سوئی کو ساتھ لئے اس موٹر بوٹ پر آگیا۔ اسی وقت نجوا کی موٹر بوٹ کو میں نے واپس جاتے دیکھا۔

چھوٹی موٹر بوٹ نے ہمیں دریا کے کنارے اسی جگہ اتار دیا کہ جہاں منصور نے اپنی کار چھوڑی تھی۔ ہم کار میں آ بیٹھے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

”تمہیں بہت محتاط رہنا چاہئے سعد!“ منصور مجھ سے مخاطب ہوا۔

”کس معاملے میں؟ اب تک تو میں نے اپنی دانست میں کسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔“ میں اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

”نجوا کو ابھی تم سمجھ نہیں سکے۔ وہ آدمی کو آدمی ہی دیکھنا پسند کرتی ہے۔ رشیدہ تمہیں سمجھا دے گی کہ نجوا کیا چاہتی ہے!“ منصور جواب میں بولا۔

”میں کو شش کردوں گا کہ آئندہ نجوا کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔“ میں نے کہا، پھر اس سے

ڈاکٹر جمال کے متعلق پوچھا۔

”وہ بصرے کا رہنے والا ہے۔“ منصور نے بتایا۔ ”بغداد میں وہ اکیلا ہے۔ اس کے گھر والے بصرے میں ہیں۔ اسی وجہ سے مستشفیٰ الیرموک والوں نے اسے ایک کوارٹر دے رکھا ہے۔ وہ کم کم اور سنجیدہ نوجوان ہے۔ فی الحال ہمارے لئے انتہائی جان لینا کافی ہے۔“

”اور وہ نرس رشیقہ؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”وہ میری منظور نظر ہے۔ رشیدہ کو اس کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ نجوا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں کوشش کروں رشیدہ اور تم ایک ہی کوارٹر میں رہ سکو۔ یوں بھی ڈاکٹر جمال اور رشیقہ کا تعلق ایک ہی شہر سے ہے۔ فی الحال رشیقہ ایک اور نرس کے ساتھ دوسرے کوارٹر میں رہتی ہے۔ ڈاکٹر جمال ہی کی کوشش کے نتیجے میں ای این ٹی کے شعبے میں رشیقہ کا تبادلہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ہوا ہے۔ دونوں کے درمیان دور کی کوئی رشتہ داری بھی ہے۔ ڈاکٹر جمال اسی لئے رشیقہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہسپتال والے بھی اس سے واقف ہیں۔“ منصور نے میرے سوال کا جواب کسی قدر تفصیل سے دیا، پھر بتانے لگا۔ ”رشیدہ سے نجوا بہت خوش ہے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ میں اسے دوسری نجوا بناؤں گی۔ عورتوں کے معاملے میں یوں بھی وہ تھوڑی سی متعصب ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جانا چاہئے اب تک! تم جب باہر اپنے گیلے کپڑے سکھا رہے تھے تو رشیدہ نے گفتگو کرتے ہوئے ایک موقع پر تو نجوا کو بھی حیران کر دیا۔“

”ایسی کیا بات تھی کہ جس پر نجوا بھی حیران رہ گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”خود رشیدہ ہی سے معلوم کر لو۔“ منصور نے عقبی آئینے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

سوی پچھلی نشست پر بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی۔ ”آوازوں کی نقل اتارنے کا جو ہنر تم نے مجھے سکھایا ہے، اس کے عملی تجربے سے نجوا صاحبہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ میں نے ان کی آواز میں بول کر دکھا دیا تھا۔ بات یہ پھڑی ہوئی تھی کہ جب میں نرس رشیقہ کی جگہ لوں تو اپنی آواز بیٹھ جانے کا بہانہ کر دوں۔ اس پر میں نے نجوا صاحبہ کو بتا دیا کہ اگر ایک مرتبہ رشیقہ کی آواز سن لوں تو میرے لئے کافی ہے۔ میں اس کی آواز میں بول سکتی ہوں۔ انہیں یقین نہ آیا اور میرا امتحان لینے کی خاطر بولیں کہ میری آواز کی نقل اتار کر دکھاؤ۔ ایسا کرنے پر وہ بہت خوش ہوئیں تو میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ تم سے آوازوں کی نقل اتارنا سیکھا ہے۔“

مجھے سوی کی ذہانت پر خوشی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی اور میری ایک جتنی صفت پر پردہ ڈال دیا تھا۔

”منصور! مجھے بچپن ہی سے اس کا شوق تھا۔ کالج لائف میں بھی میں اسے شیخ ڈرامے کرتا رہا ہوں۔“ میں سوی کی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کے لئے بولا۔

اس پر منصور ہنسا اور کہا۔ ”سعد! کبھی کبھی تو تم بھی مجھے ایک ڈراما لگتے ہو۔“

ایسی ہی باتوں میں سفر تمام ہو گیا اور منصور ہمیں ہنگلے کے سامنے کار سے اتار کر چلا گیا۔

اندر پہنچتے ہی میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”اس پراسرار آدم زادی نجوا نے تو میرے اعصاب کو بھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ تو بتا کہ وہ کس کینڈے کی عورت ہے؟“

جواب میں سوی بولی۔ ”اس بد ذات عورت کی ایک کمزوری تو یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے سامنے مجبور اور بے بس دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ یہ اندازہ تو نے بھی کر لیا ہو گا۔ اسی نے مجھ سے کہا تھا، تجھے سمجھاؤں کہ جو حکم دیا جائے اسی پر عمل ہو۔ تجاوز اسے پسند نہیں۔“

”اس نرس رشیقہ کے بارے میں منصور نے جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کے علاوہ اور کیا پتا چلا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اے علیالیش! اس نرس کی جگہ لینا ذرا سا مشکل مسئلہ ہے۔ نجوا سے میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ یہ معاملہ سنبھالنا میرا کام ہے۔ وہ اچھے کردار کی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسے ڈاکٹر جمال سے محبت ہے۔ ڈاکٹر جمال بھی اس کے کردار کی کجی سے واقف ہے اسی لئے اسے زیادہ قریب نہیں آنے دیتا۔ اگر اس نرس سے ایک بار میری ملاقات ہو جاتی تو اسے اپنے اثر میں لے کر بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ پھر جن لوگوں سے اس کی تعلقات رہ چکے ہیں، ان سے نمٹنا میرے لئے آسان ہوتا۔ نجوا سے میں نے یہ کہا بھی تھا۔ وہ بولی کہ منصور کوشش کرے گا کہ اس سے میری ملاقات کرا دے۔ منصور کی موجودگی میں رشیقہ کو اپنے اثر میں لینا اور کچھ معلوم کرنا میرے لئے تو خیر ممکن نہیں، لیکن تو اس کے ذہن میں ضرور جھانک سکتا ہے۔“

”ہاں اے سوی! ایسا ہو سکتا ہے، لیکن اسی وقت کہ جب تجھ سے رشیقہ کی ملاقات کے وقت میں بھی موجود رہوں۔ پھر بھی تو فکر نہ کر کہ اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ فی الحال تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ نجوا بلاوجہ ہم دونوں کو اس ہسپتال میں نہیں بھیج سکتی۔“ میں بولا۔

”یقیناً اے علیالیش! اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہو گا۔“ سوی کہنے لگی۔ ”لیکن ہمیں یہ جاننے کے لئے جلدت سے گریز کرنا چاہئے۔ سارا کھیل خود ہی سامنے آجائے گا۔“

”دنگا فساد اور ہنگامہ کرنا اس ملک میں سخت ممنوع ہے اے سوی! پھر بھی نجوا یا مقرر کے غلام اس سے باز نہیں آتے۔“

”لیکن تو نے یہ بھی تو دیکھا ہو گا اے علیالیش کہ شاہراہ سعدون پر پولیس کا سائرن سنتے ہی فلائنگ ایک دم رک گئی۔ نجوا کے آدمی غائب ہو گئے۔ رہا کسی بات کا ممنوع ہونا یا سخت سزاؤں کا خوف تو شیطان صفت آدم زاد اس کی پروا کب کرتے ہیں!“

”تیرے یہ کہنے سے دھیان آیا کہ ہم نے ابھی تک عدنان اور اس کے گروں کی خبر تو لی ہی نہیں!“

”ہمیں اتنی مہلت ہی کب ملی ہے اے علیالیش!“

”اے سوی! اس وقت تو ہمارے پاس مہلت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”منصور شام کو آئے گا اور شام ہونے میں ابھی بڑا وقت ہے۔ نجوا کے ساتھی تو خیر بھاگ گئے ہوں گے، لیکن عدنان اور

اس کے آدمیوں سے تو پولیس نے ضرور پوچھ گچھ کی ہوگی۔ ممکن ہے پولیس نے اس کو بھی اسے اسلحہ بھی برآمد کیا ہو۔“

”تیرا ارادہ اگر ادھر چلنے کا ہے تو چل دیکھ آتے ہیں۔“ سوی بولی۔

”یہ میں نے اس لئے کہا ہے سوی کہ ہمیں صرف نجوابی کے ذریعے اپنے پراسرار دشمنوں کے گرد گھیرنا تک نہیں کرنا۔ میں تو تے ہوئے چرے والے اس شخص کو بھی نہیں بھولا کہ جو مجھے سوخ الذهب سے عدنان کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ تو کے تو میں اس کا بھی سراغ لگانے کی کوشش کروں؟ اسی طرح ہم قدم بہ قدم آگے بڑھ سکتے ہیں۔“

”پہلے شاہراہ سعدون چلتے ہیں پھر کچھ سوچیں گے۔“ سوی نے مشورہ دیا۔

پھر ہم دونوں انسان قابلوں سے نکل کر فضا میں پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل تک آگئے۔

”ارے یہاں تو سنا پڑا ہے۔“ میں نے سوی سے سرگوشی کی۔

کوٹھی کے گیٹ پر تالا پڑا تھا اور دو پولیس والے باہر کھڑے تھے جیسے پیرا دے رہے ہوں۔

”بظاہر تو کوٹھی کے اندر کوئی معلوم نہیں ہوتا“ پھر بھی اندر چل کر دیکھ لیتے ہیں اسے علیالیش!“

”یا تو عدنان اور اس کوٹھی میں موجود افراد بھی پولیس کی آمد سے پہلے فرار ہو گئے۔ یا پھر پکڑے گئے! کوٹھی کے تہ خانے میں ان دو آدمیوں کی لاشیں بھی تو تھیں اے سوی جو میرے ہاتھوں قتل ہو گئے۔“ یہ کہتا ہوا میں سوی کے ساتھ اس کوٹھی کے لان میں اتر گیا۔

ساری کوٹھی ہم نے چھان ماری وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ کوٹھی کے تہ خانے سے دونوں لاشیں بھی غائب تھیں۔

مجھے عدنان کا خیال آیا تو سوی سے کہا۔ ”میرا قیاس یہ ہے کہ عدنان بھی متفرق کے غلاموں میں سے ایک ہے۔ طلال بے نے اس پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اس پر نجیب نے کہا تھا کہ اگر ہم اسی طرح ایک دوسرے پر شک کرنے لگے تو بکھر جائیں گے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ عدنان کا چہرہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ پتا چلانے کے لئے کہ وہ کہاں ہے، میں اپنے تصور کی قوت کو آزما ہوں۔ ممکن ہے اس طرح کوئی نئی بات سامنے آجائے!“

اس پر سوی نے رضامندی ظاہر کر دی۔ دوسرے ہی لمحے تصور کی قوت متحرک ہو گئی۔ میں نے عدنان کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یا تو وہ بے ہوش تھا یا محو خواب۔ اپنے تصور کا دائرہ وسیع کرتے ہی مجھے شدید حیرت ہوئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ عدنان کہاں اور کس حال میں ہے! میں نے جو دیکھا تھا، سوی کو بھی بتایا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ پھر ہم دونوں اپنے بنگلے میں لوٹ آئے۔

نجوا نے ہمیں جس راز سے ابھی بے خبر رکھا تھا، وہ ہم پر پہلے ہی کھل گیا۔ ہم نے اندازہ کر لیا کہ نجوا ہمیں کس لئے مستثنیٰ الیروموک بھیجنے والی ہے۔ عدنان مجھے اسی ہسپتال میں دکھائی دیا۔

اس کے جسم پر کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ انتہائی گمداشت کا شعبہ تھا۔ کئی پولیس والے عدنان کی گمرانی کر رہے تھے۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ عدنان زیر حراست ہے۔ مگر شہ روز اس کی کوٹھی پر نجوا کے آدمیوں نے اچانک شدید حملہ کیا تھا۔ اسی وقت غالباً عدنان کو گولیاں لگی تھیں۔ درمیانی کڑیاں جڑ گئیں تو صورت حال واضح ہو گئی۔

شام کو جب منصور آیا تو اس کے ساتھ ایک خوب صورت آدم زادی بھی تھی۔ ”یہ رشتہ ہے۔“ منصور نے اس سے ہمارا تعارف کرایا۔ ہم نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ منصور نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”رشتہ اور اس کے نام میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ جسم ان دونوں ہی کے متناہ ہیں، قد بھی تقریباً یکساں ہیں۔“ پھر وہ سوی سے مخاطب ہوا۔ ”رشتہ! تم اس سے ملنا چاہتی تھیں، میں اسی لئے ملانے لے آیا۔ تم دونوں کو یقیناً ایک دوسرے سے مل کر خوشی ہوگی۔“

”کیوں نہیں!“ رشتہ پہلی بار بولی۔

میں نے اسی کے ساتھ اس کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔ سوی کو کیوں کہ پہلے ہی اس کا علم تھا، وہ اسی لئے رشتہ اور منصور کو باتوں میں لگائے رہی۔

”میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔“ رشتہ اپنے بارے میں سوی کو بتا رہی تھی۔ ”اس دنیا میں ایک بڑی بہن کے سوا میرا کوئی نہیں۔“

”تم غلط کہہ رہی ہو۔“ منصور بول اٹھا۔ ”کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟“

”میں خون رشتوں کی بات کر رہی تھی۔“ رشتہ نے وضاحت کی۔

اس حسین آدم زادی کے ذہن میں جھانک کر مجھے معلوم ہو گیا کہ نجوا نے اس کے متعلق غلط نہیں کہا تھا۔ اب تک اس نے کسی سے وفا نہیں کی تھی۔ ایک ہی شخص تھا کہ جس سے اسے رشتہ وفا استوار کرنے کی آرزو تھی، ڈاکٹر جمال۔ اس کی یہ تمنا اب تک پوری نہیں ہو سکی تھی۔

سوی چائے بنانے کے لئے اٹھنے لگی تو منصور نے اسے روک دیا اور بولا۔ ”ابھی رہنے دو! میں ذرا اسے چھوڑ آؤں۔“ اس نے رشتہ کی طرف اشارہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے ساتھ ہی وہ ایک ٹیپ ریکارڈر بھی لایا تھا۔ مجھ سے اس نے کہا۔ ”تم میری واپسی تک اسے سنو!“

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ رشتہ کو منصور اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ موقع ملتے ہی میں نے سوی کو مختصراً وہ باتیں بتادیں جو رشتہ کا ذہن پڑھ کر معلوم ہوئی تھیں۔

پھر میرے کہنے پر سوی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیا۔ اس میں بیٹری سیل پڑے ہوئے تھے۔

”میرا نام ڈاکٹر جمال بھری ہے۔“ ایک مردانہ آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ اس کی آواز دھیمی اور پرسکون تھی۔ وہ بھی ایک مختصر تعارف ہی تھا۔

ابھی ٹیپ چل ہی رہا تھا کہ خلاف توقع منصور واپس آگیا۔ میں نے اٹھ کر ٹیپ کا سوئچ آف کیا۔

کر دیا۔

”تم اتنی جلدی کس طرح لوٹ آئے؟“ میں نے منصور سے پوچھا۔
 ”اس لئے کہ مجھے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ میرے ساتھ ایک کار اور بھی اس آبادی تک آئی تھی۔ رشتہ کو میں نے اسی میں بٹھا کر واپس بھیج دیا۔ وقت کیوں کہ کم تھا اس وجہ سے یہ بندوبست کرنا پڑا۔“ منصور نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”تم نے ٹیپ ریکارڈر کیوں بند کر دیا؟“
 ”ڈاکٹر جمال کی آواز سن لی میں نے۔ تم اسی لئے تو یہ ٹیپ ریکارڈر لائے تھے نا؟“
 ”تو کیا اب تم اس کی آواز میں بول سکتے ہو؟“ منصور نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میرا تو خیال تھا کہ تم بار بار ٹیپ سنو گے تاکہ آواز کا اتار چڑھاؤ اور.....“
 ”اس کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔“ منصور کی بات کاٹ کر میں بول اٹھا۔ ڈاکٹر جمال کی آواز ہی میں یہ الفاظ میں نے ادا کئے تھے۔

”حیرت انگیز!“ منصور نے میری تعریف میں بخل سے کام نہ لیا۔ ”تم تو واقعی کمال صلاحیتوں کے مالک ہو سعد!“
 ”پھر بھی نجوا صاحبہ، سعد سے خفا رہتی ہیں۔“ اس مرتبہ سوزی نے رشتہ کی آواز میں منصور کو مخاطب کیا۔

”میں تمہیں تو بھول ہی گیا تھا رشیدہ! بہت خوب! خود رشتہ بھی اپنی آواز سن کر چکرا جاتی۔ اچھا ہوا کہ یہ مرحلہ جلد طے ہو گیا۔“ منصور نے یہ کہہ کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے دو تصویریں نکالیں۔ ان میں سے ایک تصویر وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ہے ڈاکٹر جمال! تم اتنے میں یہ تصویر دیکھو، میں کار سے میک اپ باکس نکال کر لاتا ہوں۔ دوسری تصویر رشتہ کی ہے۔ اب تمہیں ڈاکٹر جمال اور رشیدہ کو رشتہ بنانا ہے۔ تم بھی میرا ہنر دیکھنا!“
 اس سے ڈاکٹر جمال کی تصویر لے کر میں دیکھنے لگا۔ تصویر سے اس کی عمر پچیس اور تیس برس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ اس عرصے میں منصور میک اپ باس لے آیا۔
 ”رشیدہ! اب تم چائے بنا لو کیوں کہ سعد کے چہرے کی تبدیلی میں دیر لگے گی۔“ منصور نے رشیدہ سے کہا اور میک اپ باکس کھولنے لگا۔

سوزی اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی تو منصور نے میرے چہرے سے وہ ماسک اتار لیا جو پہلے موجود تھا۔
 ”میں نے سارا بندوبست کر دیا ہے۔“ منصور بتانے لگا۔ ”رشیدہ تمہارے ہی ساتھ رہے گی۔“

”لیکن اب تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں وہاں کرنا کیا ہے؟“ میں نے دانستہ یہ سوال کیا۔
 مجھے اپنے اندازے کی تصدیق مطلوب تھی۔
 ”تمہیں وہاں پہنچ کر خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ پھر بھی بتا دوں گا۔ فی الحال تم خاموش بیٹھو

تاکہ تمہارے چہرے کی تبدیلی میں کوئی کسر نہ رہ جائے!“
 جب تک سوزی چائے بنا کر لائی، منصور کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ اس دوران میں وہ بار بار ڈاکٹر جمال کی تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ سوزی نے چائے کی ٹرے لاکر رکھی تو منصور اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں جھوٹا سا آئینہ تھما دیا۔
 آئینے میں اپنا بدلا ہوا چہرہ دیکھ کر میں بولا۔ ”تم بھی اپنے ہنر میں یکتا لگتے ہو مجھے۔ تصویر اور میرے چہرے میں کوئی فرق نہیں۔“
 ”اچھا اب پہلے چائے پیتے ہیں، پھر بقیہ کام ہو گا۔“ منصور نے کہا۔ ”ابھی تو رات کے دس بجنے میں بہت دیر ہے۔“

”کیوں، کیا رات کو دس بجے تمہیں کہیں پہنچنا ہے؟“

میرے سوال پر وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ”مجھے نہیں بلکہ تم دونوں کو ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ ہاں پہنچاؤں گا میں ہی تمہیں اور دقت سے پہلے۔ آج تم رات کی ڈیوٹی پر ہو۔ ڈیوٹی پر پہنچنے سے پہلے اچھا ہے کہ تم وہ کوارٹر بھی دیکھ لو جہاں تمہیں رہنا ہے۔ یوں بھی ہسپتال کی یونیفارم دہیں ہے۔ اس کے علاوہ بقیہ ضروری سامان بھی ڈیوٹی کے وقت تمہیں جو درکار ہو گا، اسی کوارٹر میں ہے۔ مجھے تم سے امید تو یہی ہے کہ جو کام تمہارے سپرد کیا جائے والا ہے، اسے آج رات ہی انجام دے سکتے ہو۔ پھر بھی جلدی نہیں کرنا۔ تم دونوں کو بہت محتاط اور چوکنا رہنا پڑے گا کیوں کہ منقرع کے غلام بھی وہاں موجود ہوں گے۔“

”منقرع کے غلام؟“ میں جان بوجھ کر چوٹک اٹھا۔

”تو کیا ہوا! کیا تم ڈرتے ہو ان سے؟“ منصور ہنس کر بولا۔

پھر چائے پیتے ہوئے منصور نے بتا ہی دیا کہ نجوا، ہم سے کیا کام لینا چاہتی ہے! میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ نجوا کے حکم پر ہمیں منقرع کے غلام عدنان کو موت کی گہری نیند سلاتا تھا۔ موقع پر متعین پولیس والے، ڈاکٹروں اور نرسوں کے سوا کسی کو بھی عدنان کے قریب نہیں جانے دے رہے تھے۔

”نجوا نے پہلے اس کام کے لئے ڈاکٹر جمال اور رشتہ کو منتخب کیا تھا، لیکن پھر اس نے اپنا

ارادہ بدل دیا۔“ منصور نے بتایا۔ ”اس کا سبب تم دونوں ہو۔“

”لیکن یہ کام ہے بہت خطرناک۔ پولیس کو ہم پر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو پھنس جائیں گے۔“ میں بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ وہاں منقرع کے غلام بھی ہوں گے۔ یہ تمہیں بھی خبر ہے کہ وہ پراسرار قوتوں کے مالک ہیں۔ وہ ہماری راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ اتنی آسانی سے وہ اپنے ساتھی کو نہیں مرنے دیں گے۔“

”اگر یہ خطرات نہ ہوتے تو نجوا تمہیں وہاں کیوں بھیجتی! پھر جس شخص کو ٹھکانے لگانا ہے، وہ تمہارے بھی دشمنوں میں سے ایک ہے۔“ منصور نے یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنا چاہا۔ یہ گفتگو ابھی

”رک کیوں گئے تم دونوں؟“ اندھیرے سے ایک آواز ابھری۔ ”دردا زہ بند کر کے اندر

آ جاؤ!

وہ آواز مجھے آشنا سی محسوس ہوئی جیسے حال ہی میں کہیں سنی ہو۔ آواز کے ساتھ ہی میرے ذہن پر دباؤ پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ سومی کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگی۔ منصور کی تاکید بھی مجھے یاد آئی۔ اس نے مقرر کے غلاموں سے چوکنا اور محتاط رہنے کو کہا تھا۔ میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ اسے فریب دینے کے لئے یہی ظاہر کروں کہ اس کی شیطانی قوت کے اثر میں آگیا ہوں۔ پلٹ کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور اسی وقت روشنی ہو گئی۔

ہوں۔ پلٹ کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور اسی وقت دوسری طرف سے آواز آئی۔
 سامنے ہی مجھے تے ہوئے چہرے اور خوابیدہ سی آنکھوں والا وہی آدم زاد کھڑا ہوا نظر آیا جو
 میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہی شخص مجھے صرافہ بازار سے عدنان کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ شیطانی
 قوت بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ غالباً اس نے ہمیں دھوکا دینے کے لئے ریوالور بھی ہماری طرف
 اٹھا رکھا تھا۔

”میں چاہوں تو ابھی تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں، لیکن تمہیں جان بچانے کا ایک موقع ضرور دوں گا۔“ وہ سخت آواز میں بولا اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ ”نجوا سے تمہاری کیا سو دے بازی ہوئی ہے؟“

جواب دینے میں مجھے دیر نہ ہوئی۔ ”وہ میرے شعبے میں زیر علاج ایک شخص عدنان کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے نجوا نے مجھے بیس ہزار دینار دینے کا کو کہا۔“

”اور تم نے اس کی پیش کش قبول کر لی؟“ وہ شخص بول اٹھا۔

”نہیں۔“ میں نے بلا جھجک انکار کر دیا۔ ”اپنے بچے سے میں غداری نہیں کر سکتا۔“

”پھر اس نے تمہیں زندہ واپس کیسے بھیج دیا؟ تمہیں ابھی کار میں یہاں چھوڑ کر جانے والا آدی تو تھا!“

”ہاں۔“ میں نے یہ دستور خواب آلود آواز میں اقرار کیا۔ ”وہ کار والا“ نجوا کے حکم ہی پر ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس پراسرار عورت نے ہمیں کل تک کی مہلت دی ہے۔ اگر ہم نے اس کی پیش کش رو کر دی تو وہ..... وہ ہمیں قتل کرا دے گی۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اپنی آواز سے خوفزدہ ہونے کا تاثر دیا۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟ کوئی فیصلہ کیا؟“ خوابیدہ آنکھوں والے نے اس بار نرمی سے پوچھا۔
 ”ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ..... یہ صورت حال ہمارے
 لئے انتہائی خطرناک ہے۔ کل شام اس کا آدمی جواب لینے آئے گا۔“
 ”تم یقیناً قتل کی دھمکی سے ڈر گئے ہو، لیکن ایک راستہ اب بھی تمہارے لئے کھلا ہوا
 ہے۔“ اب اس شخص کی آواز پر سکون تھی۔ ”تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ تمہارا ضمیر اپنے پیسے سے
 غداری پر آمادہ نہیں۔ کل تک دی جانے والی مہلت سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔“

جاری ہی تھی کہ اندر والے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

”نبو جانے فون کیا ہو گا۔“ منصور نے کہا، ”چلو میں بھی اسے گرین سگنل دے دیتا ہوں۔“

منصور میرے ساتھ اندر والے کمرے میں آگیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے نجوا کی آواز ہی سنائی دی۔ ”تمہیں کام بتا دیا گیا؟“ میری آواز پہچان کر وہ بولی۔

”ہاں پتا چل گیا کہ کیا کرنا ہے!“ میں نے جواب دیا۔

”تم دونوں کو تیار ہونے میں کتنی دیر اور لگے گی؟“ نجوانے معلوم کیا۔

”ہم تیار ہیں۔“ میں فوراً بولا۔

”منصور کو بلاؤ! میں جانا چاہتی ہوں کہ وہ بھی مطمئن ہے یا نہیں!“

"وہ یہیں میرے قریب موجود ہے، بات کر لو۔" میں نے یہ کہہ کر ریسپور منصور کو دے دیا۔ دوسری طرف سے جو بھی پوچھا گیا اس کے جواب میں منصور نے کہا۔ "میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے..... ہاں اطمینان ہے مجھے!..... ٹھیک ہے، میں انہیں ابھی پہنچاتا ہوں۔" یہ کہہ کر منصور نے ریسپور میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "رکھ دو کریڈٹل پر اتنے میری بات سن کر سمجھ ہی گئے ہو گئے کہ مجھے کیا حکم ملا ہے!"

”سمجھ چکا ہوں کہ ہمیں ابھی چلنا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”اگر ہم اپنے سوٹ کیس بھی ساتھ لے چلیں تو کیسا رہے گا؟“

”ضرورت تو نہیں کیوں کہ تمہیں اسی بنگلے میں واپس آنا ہے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھو، وہاں سے فرار ہوتے وقت ممکن ہے تمہیں اپنے کو وارنٹر تک جانے کی مہلت نہ ملے۔ ایسی صورت میں تم اپنے سوٹ کیس واپس نہ لا سکو گے۔ کپڑے وغیرہ تمہیں وہاں مل جائیں گے۔ تمہیں اور چاہیے بھی کیا؟“

”پھر تو سوٹ کیس یہیں رہنے دو سعد!“ سومی بول اٹھی۔

ذرا ہی دیر کے بعد سوئی اور میں، منصور کی کار میں بیٹھے ہوئے یرموک کی طرف جا رہے تھے۔ اس دقت اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب ہم ہسپتال کی حدود میں داخل ہوئے۔ وہ کوارٹر ہسپتال کی عقبی سمت میں تھا جس کے سامنے منصور نے کار روک دی۔

”لو یہ کوارٹر کی چابیاں۔“ منصور نے ایک کی رنگ مجھے تھما دیا، پھر ہمارا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہنے لگا۔ ”نچو! تمہاری طرف سے غافل نہیں رہے گی، گھبراہٹ!“

ہم دونوں خاموشی کے ساتھ کار سے اتر گئے۔ منصور کار کو آگے بڑھالے گیا۔

اندر پہلے سے کوئی موجود ہو۔ میں نے سوئی کبھی سرگوشی میں خطرے سے آگاہ کر دیا اور وہ چوکنما ہو گئی۔

”وہ..... وہ کس طرح؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”آج رات ڈیوٹی دینے کے بعد کل صبح تم چھٹی کی درخواست دے دو اور اپنے شرواہیں چلے جاؤ۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

”لیکن اس عورت نے جو دھمکی دی ہے، اگر..... اگر اس نے.....“

”راہل تمہاری حفاظت کرے گا۔“ اس نے پہلی بار اپنا نام لیا۔ ”تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا!“

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کچھ سوچ رہا ہوں۔ راہل نے میری طرف سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ عدنان کو کوئی سے وہ ہنگامہ آرائی سے پہلے ہی چلا گیا تھا ورنہ اس وقت نظر نہ آتا۔ ”تمہیں اس چکر میں پھنسانے والی یہ حسین عورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی نے تمہیں نجوا کے آدمی منصور سے ملوایا ہو گا۔“ وہ پھر بولا۔

راہل کے قیاس کی میں نے تصدیق کر دی، پھر اس نے جو تجویز پیش کی تھی، اسے قبول کر لیا۔ یہ سنتے ہی راہل نے ریو اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن پر سے دباؤ ختم ہو گیا۔ اسی لمحے راہل کے عقب میں مجھے نجوا دکھائی دی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ معلوم نہیں راہل کو کس طرح خطرے کا احساس ہو گیا۔ وہ انتہائی تیزی سے پلٹا، مگر اسے دیر ہو گئی۔ اس وقت تک نجوا نے راہل پر چلائنگ لگا دی تھی۔

معلوم نہیں اس آدم زادی کے جسم میں کتنی طاقت تھی کہ اس نے راہل کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد راہل کسی مردہ چھپکلی کی طرح فرش پر پڑا تھا۔ نجوا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کے بغیر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ نجوا نے کسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ذرا ہی دیر میں دو اجنبی تیزی سے اندر آئے۔

”اسے اٹھا کر کر لے جاؤ!“ نجوا نے ان اجنبیوں کو حکم دیا جو یقیناً اسی کے آدمی تھے۔

قیل حکم میں ان اجنبیوں نے دیر نہیں کی۔ ان کے پاس کپڑے کی ایک بڑی سی بوری تھی۔ راہل کو انہوں نے بوری میں ڈالا اور پھر بوری کو اٹھائے ہوئے باہر نکل گئے۔ نجوا نے دروازہ بند کیا۔ یہ مشکل دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی کار کا انجن اشارت ہونے کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اس دوران میں نجوا خاموش رہی۔

نجوا کو میں نے اس کمرے کے اندرونی دروازے سے اندر آتے دیکھا تھا۔ یہ بات میرے لئے کسی حیرانی کا سبب نہیں تھی کہ نجوا اور راہل اس کوارٹر میں کہاں سے آگئے! ان جیسے مجرموں کے لئے کسی مقفل کوارٹر میں داخل ہونا کون سا مشکل کام تھا۔ میرے اندازے کے مطابق نجوا مجھ سے فون پر گفتگو کرتے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ ہسپتال کے کہیں قریب ہی ہو گی۔ راہل شاید وہاں اس کے بعد آیا تھا۔ یہ محض ایک اندازہ تھا جس کا درست ہونا ضروری نہیں تھا۔

کوارٹر کے اس کمرے کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ وہ بہ طور نشست گاہ استعمال کیا جاتا ہو گا۔ فرنچر معمولی تھا۔ نجوا بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ہمیں بھی یہی حکم دیا۔ اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تو میں پکرایا۔

”تم نے راہل سے یہ جھوٹ کیسے بولا کہ تمہیں کل شام تک کی مہلت دی گئی ہے؟“ نجوا نے مجھ سے سوال کیا۔

”میں اس سے بچنے کے لئے اور کرتا بھی کیا کہ وہ مجھے نشانے پر لئے ہوئے تھا!“ میں بولا۔ ”کیا یہ وہی شخص نہیں تھا کہ جس کے حکم کی تعمیل میں تم کسی مزاحمت کے بغیر ساتھ چلے گئے تھے؟“

”ہاں یہ وہی تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے میں پہچان گیا تھا۔“ ”پھر اس وقت ایسا کیا ہوا کہ تم نے اس کا حکم نہیں مانا؟ تمہارے جھوٹ کو اس نے کس طرح سچ سمجھ لیا؟“

”یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔“ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”لیکن وہ کچھ بتانے کے لئے اب اس دنیا میں زندہ نہیں رہا!“ نجوا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”راہل کا مطلب بھی تو یہی ہے، کوچ کرنے والا! سو وہ کوچ کر گیا!“ میں اس طرح چونکا جیسے میرے لئے کوئی اطلاع ہو۔ ”وہ مر گیا؟“ میری آواز میں حیرت تھی۔

”نجوا کی گرفت میں آجانے والے مشکل ہی سے زندہ بچتے ہیں۔“ وہ پُر غور آواز میں بولی۔ ”لیکن تم ابھی زندہ ہو، اس لئے تم سے پوچھ رہی ہوں۔ تمہیں خبر ہے کہ منقرع کے غلام پراسرار قوتوں کے مالک ہیں۔ تمہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ راہل بھی انہی میں سے ایک تھا۔ پھر تم اسے دھوکا دینے میں کس طرح کامیاب ہو گئے؟“

اس پر میں نے گہرا سانس لیا۔ اپنی جناتی صفات پر پردہ ڈالنے کی ایک تدبیر پہلے ہی میرے ذہن میں آچکی تھی۔

”جب وہ مجھے سوخ الذہب سے اغوا کر کے لے گیا تھا تو اس وقت میرا ذہن کسی ناپیدہ گرفت میں تھا۔“ میں بتانے لگا۔ ”لیکن اس وقت ایسا نہیں ہوا۔ مجھے دھمکی دینے اور سچ اگلوانے کے لئے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اسے یقیناً یہ غلط فہمی ہو گی کہ اس کے ہاتھ میں ریو اور دیکھ کر میں ڈر جاؤں گا۔ سو مجھے موقع مل گیا۔ اس مرتبہ میں نے تمہاری تاکید کا خیال رکھا اور حد سے تجاوز نہیں کیا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ تمہارا حکم میرے لئے پتھر کی لکیر ہے۔“

میرے آخری الفاظ کا اس پر خوش گوار اثر ہوا۔ وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ”اگر تم ایسا کرتے تو یہ تمہاری تیسری غلطی ہوتی۔ شاید راہل کی موت کا وقت آگیا تھا ورنہ تو تمہیں قابو میں کرنے

کے لئے اسے ریوالور نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی یہی حماقت اسے لے ڈیٹی۔“
نچوا کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ میری تدبیر کارگر رہی۔ منقرع کے غلاموں سے ننٹے کے لئے نچوا مجھے یہ طور چارہ استعمال کر رہی تھی۔ اس پر مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ یوں منقرع کے غلاموں کی قوت رفتہ رفتہ ٹوٹ جاتی۔ پھر ان پر مجھے آخری ضرب لگانے کا موقع مل جاتا۔ فی الحال نچوا کی کامیابی گویا میری ہی کامیابی تھی۔ ابھی تو مجھے اپنے پراسرار دشمنوں کی طاقت اور تعداد کا بھی صحیح اندازہ نہیں تھا، ان کے شیطانی عزائم کھل کر سامنے آئے تھے۔ میں اسی لئے نچوا کی آڑ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک خطرناک کھیل تھا۔ نچوا اور منقرع کے غلاموں کی اس پیکار میں کسی بھی وقت میرے لئے امتحان کی گھڑی آجاتی۔ ایسی صورت میں کس طرح میں اپنا بچاؤ کرتا، اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرتا۔

مجھے خاموش دیکھ کر نچوا چند لمحے توقف کے بعد پھر بولی۔ ”تم کیوں کہ خود ایک ڈاکٹر ہو۔ اس لئے تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں کہ عدنان کو کس طرح موت کی نیند سلاتا ہے! اس کے زخموں کی بینڈیج کرتے ہوئے بھی یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ یا پھر انجکشن بھی ایک آسان راستہ ہے۔ یہ میں تم پر چھوڑتی ہوں۔ راحل کی موت کے بعد منقرع کے غلام چونکنا ہو جائیں گے۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آج رات ہی کام ہو جائے۔“ نچوا کے آخری الفاظ کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس عرصے میں نچوا نے سوی سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ منقرع کے مقتول غلام راحل سے میری ہی گفتگو ہوئی تھی۔ سوی اس دوران میں خاموش ہی رہی تھی۔ نچوا چلی گئی تو میں نے دروازہ بند کر لیا، پھر سوی کو مخاطب کیا۔ ”ہم یہاں بہر حال محفوظ نہیں ہیں کیوں کہ یہ جگہ منقرع کے غلاموں کی نظر میں آچکی ہے۔ ہم سے پہلے یہاں راحل کی موجودگی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ عدنان کو موت کی نیند سلانے کے لئے نچوا نے ڈاکٹر جمال سے سوڈے بازی کر لی ہے۔“

”تیرے یہ چونچنا صحیح لگتا ہے اے علیالیش! اگر وہ آدم زاد راحل مارا نہ جاتا تو شاید ہم خطرے میں نہ ہوتے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ نچوا نے پہلے ہی سے سارا بندوبست کر لیا تھا۔ اسے یقین ہو گا کہ وہ راحل کو قابو میں کر لے گی۔ خطرہ تو یہاں یقیناً ہے، لیکن شاید ایک بات تیرے ذہن سے نکل گئی۔ نچوا کے آدمی بھی اس پاس گھلت لگائے بیٹھے ہوں گے۔ پھر بھی ایک تدبیر میرے دماغ میں آئی ہے۔ ابھی دس بجنے میں تقریباً ڈھائی گھنٹا باقی ہے۔ یہی وقت تو ہمیں اس جگہ گزارنا ہے، اس کے بعد تو ہمیں ڈیوٹی پر پہنچنا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم وہاں اس قدر خطرے میں نہیں ہوں گے۔“

”لیکن وہ تدبیر تو بتا اے سوی!“ میں بول اٹھا۔

”دبی تو بتانے والی تھی۔ ہم اگر انسانی قابلوں سے باہر آجائیں تو پھر ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“ سوی نے رائے دی۔

”اس سے پہلے کوارٹر کا جائزہ لیے لیتے ہیں۔ جانے کی تیاری بھی ہم ابھی سے کر لیں تو بہتر ہے۔“ یونیفارم پہن لے اور میں بھی لباس تبدیل کر لوں۔ اس کے بعد ہم انسانی پیکروں سے نکل رہا رہی جا سکتے ہیں۔ ہمیں اس سے اپنے دشمنوں کی سرگرمیوں کا بھی علم ہو جائے گا، اسی کے ساتھ ہم نچوا کے آدمیوں کا بھی سراغ لگالیں گے۔“

سوی نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ اندر کمرے میں ایک الماری دکھائی دی۔ اس میں نرس کی یونیفارم مل گئی۔ وہیں ایک سوٹ کیس بھی رکھا نظر آیا۔ اسے کھول کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نرس رشیقہ ہی کے کپڑے اور دیگر ضروری استعمال کا سامان اس میں تھا۔ نرس رشیقہ یقیناً دوسرے کوارٹر سے اسی کمرے میں منتقل ہوئی تھی۔ کمرے کے دوسرے سادو سامان سے بھی یہی اندازہ ہو رہا تھا۔ سوی کو وہاں چھوڑ کر میں نے کوارٹر کے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ اس کمرے میں قدر رکھتے ہی پتا چل گیا کہ وہ ڈاکٹر جمال کے استعمال میں رہا ہو گا۔ لباس تبدیل کر لے میں باہر آیا تو سوی بھی دوسرے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس کے جسم پر نرس کی یونیفارم نظر آئی۔

اس پر میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ پھر ہم دونوں انسانی قابلوں سے باہر آتے ہی اس کوارٹر سے نکل گئے۔ بتیاں ہم نے اسی طرح جلی چھوڑ دی تھیں تاکہ معلوم ہو، اندر کوئی موجود ہے۔ ارد گرد کا چکر لگانے کے بعد جلد ہی ہمیں وہاں کچھ مشتبہ لوگ دکھائی دے گئے۔ یوں لگتا تھا کہ آتے جاتے وہ ہمارے ہی کوارٹر کی نگرانی کر رہے ہوں۔ سوی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اے علیالیش! انہیں بلاوجہ چھیڑنا کچھ مناسب نہیں۔“

”اس لئے بھی اے سوی کہ ہم انہیں نہیں جانتے۔ یہ نچوا کے آدمی بھی ہو سکتے ہیں اور منقرع کے غلام بھی۔“ میں نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

”انسانی پیکر اپنانے کے بعد اگر یہ ہماری راہ میں مزاحم ہوئے تو پھر دیکھا جائے گا۔“ سوی کہنے لگی۔

ہم ان آدم زادوں سے اتنی دور پرواز کر رہے تھے کہ ہماری باتیں سن لینا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ایک شخص کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہم نے اپنے کوارٹر کی جانب آتے دیکھا۔ اپنے لباس اور چلیے سے وہ کوئی ڈاکٹر معلوم ہوا۔ اس نے کوارٹر کے دروازے تک پہنچ کر اطلاعی تھنٹی کے جین پر انگلی رکھ دی۔ پھر وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

”یا تو یہ آدم زاد ڈاکٹر جمال کا کوئی دوست ہے یا پھر رشیقہ کا جاننے والا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہی سے واقف ہو۔ اس کا تعلق اسی ہسپتال سے لگتا ہے۔ مجبوراً

ہمیں دوبارہ کوارٹر میں جا کر انسانی پیکر اپنانا پڑیں گے۔ آ چل!“

”بتیاں جلنے کے باوجود اگر ہم نے اس کے لئے دروازہ نہ کھولا تو نگرانی کرنے والے شک میں مبتلا ہو سکتے ہیں جو شاید مناسب نہ ہو۔“ میں یہ کہتے ہی کوارٹر کی طرف لپکا۔

سوی میرے ساتھ ہی تھی۔ اندر آتے ہی ہم نے انسانی قالب اپنائے اور پھر دردناک کھرا دیا۔ اس سے پہلے میں 'سوی کو اندر جانے کا اشارہ کر چکا تھا۔

"تم نے بڑی دیر لگا دی دردناک کھولنے میں ڈاکٹر جمال!" نوادر دے تکلفی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہاری ڈیوٹی کے وقت میں تو ابھی دیر ہے، مگر دیکھ کر یہی لگتا ہے جیسے تیار بیٹھے ہو رشتہ کہاں ہے؟"

میں نے اس عرصے میں اس کے ذہن پر توجہ دے کر پتا لگایا تھا کہ وہ کون ہے! وہ رشتہ کے آشناؤں میں سے ایک تھا۔

"آؤ! اندر آجاؤ ڈاکٹر ارسلان!" میں ایک طرف ہٹ گیا۔ "رشتہ کو بلاتا ہوں ابھی۔" اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "کچھ ہی دیر پہلے مجھے معلوم ہوا کہ رشتہ تمہارے کوارٹر میں منتقل ہو چکی ہے۔ تم دونوں کے آخر ارادے کیا ہیں؟"

"یہ تو تمہیں رشتہ ہی بتا سکتی ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر سوی کو بلانے کے بجائے اندر چلا آیا۔

سوی تیزی سے میرے قریب آگئی تو میں نے سرگوشی میں اسے ڈاکٹر ارسلان کے متعلق بتا دیا۔

"معلوم نہیں یہ بد کردار نرس مجھے کس عذاب سے دوچار کرائے گی!" سوی بڑبڑائی اور میرے ساتھ چل دی۔

نشست گاہ میں آتے ہی ڈاکٹر ارسلان نے اسے جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے تم نے ہوا بھی نہیں لگنے دی اور یہاں آگئیں؟"

"بس یکسانیت سے جی گھبرا گیا تھا، سو میں نے ڈاکٹر جمال سے درخواست کی اور یہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔" سوی بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو خیر تمہاری پرانی عادت ہے۔ تم ایسے پرندوں میں سے ہو جو آشیانے بدلنے رہتے ہیں۔" ڈاکٹر ارسلان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "لیکن ڈاکٹر جمال کو اس پر تم نے کس طرح راضی کر لیا، میرے لئے یہ امر ضرور تعجب خیز ہے۔" وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تمہیں خبر ہے ڈاکٹر ارسلان کہ رشتہ کا تعلق میرے ہی شر سے ہے۔ اس سے میری رشتہ داری بھی ہے۔" سوی کے بجائے میں بول اٹھا۔ "اس کے باوجود مجھے رشتہ کے ذاتی معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ مجھے تم اچھی طرح جانتے ہو، میں اس طرح کا آدمی نہیں جن کا ظاہر و باطن مختلف ہوتا ہے۔"

"تم تو سنجیدہ ہو گئے ڈاکٹر جمال! میرا مقصد یہ نہیں تھا۔" ڈاکٹر ارسلان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "مجھے تو رشتہ سے گلہ تھا کہ اس نے پہلے سے کچھ نہیں بتایا۔ قربت ہونے پر بھی کوئی بات کسی دوسرے کی زبانی معلوم ہو تو دھچکا لگتا ہے۔"

"مگر میں نے پہلے سے یہ سوچا ہوتا تو تمہیں بتا دیتی۔" سوی نے وضاحت کی۔ "اچانک ہی بن میں یہ بات آئی اور میں نے ڈاکٹر جمال کو راضی کر لیا۔"

"تمہاری ڈیوٹی تو ڈاکٹر جمال کے ساتھ دس بجے شروع ہو گی۔ ابھی سے یونیفارم کیوں پہن لی؟ لباس تبدیل کر لو، کہیں گھوم کر آتے ہیں۔ مجھے بھی تو رات کو ڈیوٹی دینی ہے۔ دونوں وقت پر پہنچ جائیں گے۔ بولو کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر ارسلان نے پیش کش کی۔

"پھر کبھی سہی ڈاکٹر! آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ گزشتہ رات کو ڈیوٹی دے کر آنے کے بعد نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔" سوی نے بہانہ بنا دیا۔

"دیکھنے میں تو ترو تازہ لگ رہی ہو، خیر تمہاری مرضی! چلتا ہوں میں، رات کو ملاقات ہو گی۔"

چند ذمہ جملوں کے سوا ڈاکٹر ارسلان نے ناشائستگی کا ثبوت نہیں دیا اور چلا گیا ورنہ اسے اثر میں لینا پڑتا۔

"ایک آدم زاد کی شوق آوارگی کی سزا تجھے مل رہی ہے، اے سوی!" میں ہنس کر بولا۔

"پہلے سے اگر یہ خبر نہ ہوتی تو شاید اس کے الفاظ سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ پاتی۔"

"یہ بھی آئی سی یو، یعنی انتہائی گمراہی کے شعبے میں ہے۔ رات کو بھی تجھے اس کو بھگتنا ہو گا اے سوی!" میں نے بتایا۔

"اس وقت تو میں نے اسے چھوڑ دیا اے علیا لیش، لیکن رات کو نہیں بخشوں گی۔"

"کیا کرے گی تو؟" میں نے پوچھ لیا کہ کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔

"اسے اپنے اثر میں لے کر سارا خناس دماغ سے جھاڑ دوں گی۔"

"ہاں اس کا علاج یہی ہے، اگر حد سے تجاوز کرے۔ دیسے میرا خیال یہ ہے کہ ڈیوٹی کے دوران میں اور میری موجودگی کے سبب وہ کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا مرتکب نہیں ہو گا۔" میں نے یہ کہہ کر سوی کو مطمئن کیا، پھر بولا۔ "اس کوارٹر میں مزید وقت گزارنے کے ہم پابند تو نہیں اے سوی!"

"ہم یہ کوارٹر مقفل کر کے کہیں چلتے ہیں، بتیاں بھی بجا دیتے ہیں۔ ڈیوٹی کے وقت پر ہم انتہائی گمراہی کے شعبے میں پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ اس کوارٹر کی نگرانی کر رہے ہیں، انہیں ضرور نجل دینا پڑے گا تاکہ وہ ہمارے پیچھے نہ آسکیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ہم یہاں موجود کسی بھی عمارت کی آڑ لے کر انسانی قالب چھوڑ دیں گے۔ اگر پراسرار طور پر یہاں سے غائب ہو گئے تو نجوا کے آدمی شک میں پڑ جائیں گے۔ نگرانی کرنے والوں پر ہمیں یہ ضرور ظاہر کرنا ہے کہ ہم ان کے سامنے یہاں سے گئے ہیں۔ تو اس غیبت آدم زادی نجوا سے تو واقف ہے کہ وہ کس طرح بال کی کھال نکالتی ہے!" میں نے سوی کو سمجھایا۔

"ہاں اے علیا لیش! ہم اس جگہ مزید رہے تو کوئی اور آفت گلے پڑ سکتی ہے۔"

اس کے بعد ہم بڑے اطمینان کے ساتھ کوارٹر کی بتیاں بجھا کر باہر آئے اور تالا لگا کر طرف چل دیے۔ ہم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ چند آدم زادوں کی نظر میں ہیں۔ وہ کچھ فاصلے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ہسپتال کے قریب ہی ایک عمدہ اور شاندار پارک تھا۔ ان آدم زادوں نظروں سے اوجھل ہونے کے لئے ہمیں وہ جگہ مناسب لگی۔ ہم چل قدمی کے انداز میں وہاں پہنچے۔ رات کے وقت پارک کے کچھ حصے ایسے بھی تھے جہاں نیم تاریکی تھی۔ ہم ایسے ہی ایک کی طرف بڑھ گئے۔ پارک کا وہ عقبی حصہ تھا۔ ادھر ہی کچھ دور پارک کا پچھلا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ تعاقب کرنے والے اس طرح ہماری نگرانی کرتے رہے جیسے ہم سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ یوں ارد گرد پھیلے ہوئے تھے جیسے گھومنے پھرنے آئے ہوں۔

”مجھے یہ منقرع کے غلام نہیں، نجوا کے آدمی ہی لگتے ہیں۔“ میں نے سوی سے سرگوشی کی ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ سوی نے بھی جواباً سرگوشی کی۔ ”یہ اگر ہمارے پراسرار دشمن ہوتے تو اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاتے۔ منقرع کے غلام تو اس سے واقف ہیں کہ نجوا، عدالت کے قتل کا سودا ہم سے کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں وہ ہمیں کیسے آزاد چھوڑ دیتے؟“ ہم سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک گھنے درخت کی آڑ میں آگئے۔ یہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ درخت پارک کے پچھلے دروازے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ہم نے فوراً ہی انسانی قالب چھوڑ دیے۔ تعاقب کرنے والے ہمیں نظر میں رکھنے کی خاطر تیزی سے آگے بڑھ آئے۔ وہاں ان کے سوا آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔ انہی میں سے ایک آدمی نے پنل ٹارچ نکال کر روشن کی اور اطراف کا جائزہ لیا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ ایک شخص کی آواز آئی۔ وہ اب اس جگہ کھڑے تھے جہاں ہم دیر پہلے ہم موجود تھے۔

”لیکن میں نے ان دونوں کو اسی درخت کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔“ دوسرے آدمی کی آواز سنائی دی۔

”ایسا لگتا ہے کہ وہ پارک کے عقبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ نجوا کا حکم ہے کہ انہیں بہر صورت نظریں رکھا جائے۔ اگر وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت برا ہو گا۔ آؤ۔ جلدی کرو! وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ معلوم نہیں انہیں کیا سوچھی کہ کوارٹر سے نکل آئے؟“

پھر وہ بھی تقریباً دوڑتے ہوئے پارک کے عقبی دروازے سے نکل گئے۔ ہم ابھی اسی پارک میں تھے۔

”اے سوی! اگر ہمیں ان آدم زادوں سے اپنی حقیقت چھپانا مقصود نہ ہوتی تو اتنی تک و دو کی ضرورت نہ پڑتی۔“ میں بولا۔ ”جو کام انجام دینے میں انہیں گھنٹوں لگتے ہیں، ہم اسے لمحوں میں نمٹا سکتے ہیں۔ چروں کی تبدیل ان آدم زادوں کے لئے دیر طلب مسئلہ ہے، ہمارے لئے نہیں۔ اسی طرح کسی بے ہوش آدم زاد کو موت کی نیند سلا دینا بھی ہمارے لئے مشکل نہیں۔ وقت صرف

ہے کہ ہمیں خود کو انہی کی طرح آدم زاد ظاہر کرنا ہے۔ یہ مجبوری بھی اس وقت تک ہے کہ ہم صحیح راہ پر نہ لگ جائیں۔ ابھی تو ہمیں نجوا کی آڑ لے کر اپنے دشمنوں سے نیرو آزما ہوتے رہنا ہے۔“

تقریباً ایک گھنٹہ ہم نے اسی پارک میں گزارا، پھر ہسپتال کا رخ کیا۔ ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے میں اب چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔

ہسپتال میں ہمیں ایک گوشہ نظر آگیا کہ جہاں کوئی نہیں تھا تو ہم نے انسانی قالب اپنالئے۔ انتہائی نگہداشت کے شعبے تک پہنچتے ہوئے ہم بے حد محتاط اور چوکنا رہے۔

اس شعبے کا انگریز پروفیسر ایک روز کی چھٹی پر تھا۔ اس کا علم مجھے ڈیوٹی میں جا کر ہوا۔ مگر اس پروفیسر کا نائب ہونے کے سبب مجھ ہی کو دارو کا دورہ کرنا تھا۔ ڈاکٹر ارسلان اور دو ڈاکٹر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ میں نے ڈیوٹی روم میں موجود الماری سے ضروری سامان نکال لیا۔ سوی بھی اس میں میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے جس شے کی تلاش تھی، جلد ہی مل گئی۔ اس چھوٹی سی شیشی پر واضح اور سرخ الفاظ میں پوزیشن، یعنی زہر چھپا ہوا تھا۔ میں نے وہ شیشی بھی اس ٹرے میں رکھ دی جو سوی اٹھائے ہوئے تھی۔

دارو کا دورہ کرتا ہوا جلد ہی میں اس جگہ آگیا جو اپنی چشم تصور سے دیکھ چکا تھا۔ سوی ٹرے اٹھائے ہوئے میرے ساتھ تھی۔ دور ہی سے مجھے اس الگ تھلگ حصے میں پولیس والے کھڑے نظر آگئے تھے۔ کپڑے کے اسٹینڈ اس بیڈ کی تینوں جانب موجود تھے کہ جس پر منقرع کا ایک غلام عدالت بے ہوش پڑا تھا۔ چوتھی سمت دیوار تھی۔

پولیس والے ایک طرف ہٹ گئے اور میں اسٹینڈ کو ذرا سا کھسکا کر آگے بڑھا۔ سوی میرے عقب میں تھی۔

میں نے بڑے اطمینان سے ایک سرنج میں زہر بھرا۔ مجھے مریض کی کیس ہسٹری دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی! ٹرے میں زہر کی خالی شیشی ڈال کر میں نے عدالت کے چہرے پر نظر ڈالی اور اس کے بازو میں انجکشن لگانے کو جھکا۔ عین اسی لمحے پیچھے سے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، پولیس انسپکٹر نے میری دائیں کلائی پکڑ لی اور غرایا۔ ”ڈاکٹر! تم اس کے جسم میں زہر نہیں اتار سکتے!“

پلٹ کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو سناٹے میں رہ گیا۔ چہرے میں تبدیلی ضرور تھی، مگر میں اپنے پراسرار دشمن نجیب کی مجبوری آنکھوں کو کیسے بھول جاتا، اس کی آواز کو میں کیسے نظر انداز کر دیتا، پولیس انسپکٹر کی وردی میں یقیناً وہ نجیب ہی تھا جسے میں نے اس کی آواز اور آنکھوں سے پہچان لیا۔

اپنے ایک ساتھی کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کی خاطر منقرع کے غلاموں نے کیا تدبیر اختیار کی تھی، ظاہر ہو گئی۔ پھر بھی مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ نجیب خود میرے مقابل آجائے گا۔ یہ وہی تھا

کہ جس نے کراچی میں مجھے کسی کپڑے کی طرح مسل کر پھینکنے کی دھمکی دی تھی۔ اسی کی وجہ سے بغداد آیا تھا۔ نجیب کو دیکھ کر وقتی طور پر میرے ذہن کو جھٹکا ضرور لگا، لیکن میں نے فوراً ہی خود پر قابو لیا۔

اس خطرناک آدم زاد کی تمام تر توجہ مجھ پر تھی۔ سوی کی طرف سے وہ غافل ہی رہا جس صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا اور تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔

سوی کو کچھ کر گزرنے کا موقع دینے کے لئے میں نے پرسکون آواز میں نجیب سے کہا۔ ”تمہیں غمی ہو گئی ہے انپکٹر! میری کلائی چھوڑ دو!“

”ادھر دیکھو ڈاکٹر!..... میری طرف!“ نجیب نے میری کلائی پر گرفت قائم رکھی۔ اس کے میں حکم تھا۔ ”آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو!“

اس کی بھوری آنکھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی میں نے ادھر سے نگاہ پھیر لی تھی۔ متفرق غلاموں کا یہ حربہ اب میرے لئے نیا نہیں رہا تھا۔ اس طرح وہ میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لیے کوشش کرتا یا پھر مجھ پر کوئی اور شیطانی عمل آزماتا۔ میں نے اسی لئے یہ خطرہ مول نہیں لیا۔

”میں تمہیں اطمینان دلا دوں گا انپکٹر کہ اس سرنج میں زہر نہیں۔“ میں دھیمی آواز میں بولا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں نے سوی کو نجیب کے عقب میں پہنچ کر انسانی قالب سے باہر آ دیکھا۔

پھر یہ ایک وقت کئی باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ میں نے جھٹکا دے کر نجیب سے اپنی کلائی چھڑوا اسی لمحے سوی نے نجیب کی گردن دبوچ لی۔ تیزی کے ساتھ میں نے سرنج کی سوئی عدنان کے بازو میں اڑ دی۔ زہر اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ وہ سرنج اور ٹرے سے زہر کی شیشی اٹھا کر میں نے اپنی جیب ڈال لی۔

غیر متوقع اور اچانک حملے کی وجہ سے نجیب اپنے حواس کو چکا تھا۔ اسے بھی سزا آخرت پر روانہ دینا ہمارے لئے مشکل نہ ہوتا، لیکن یہ وجوہ ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ معلوم اب صرف نجیب کی حد تک نہیں رہا تھا۔ پھر نجیب کو اس وقت راستے سے نہ ہٹانے کے اور بھی اسباب تھے۔ ان میں سے ایک وہ نجو تھی۔

پردوں کی آڑ میں یہ سب کچھ ہوتا رہا اور باہر موجود پولیس والے اس سے بے خبر ہی رہے۔ م نے یہ ضرور کیا کہ نجیب کے چہرے سے میک اپ ختم کر دیا۔

سوی نے نجیب کو آہستگی سے زمین پر لٹاتے ہی انسانی قالب اپنا لیا اور میرے ساتھ ٹرے اٹھا باہر آ گئی۔

مسلح پولیس والے پردوں سے کسی قدر فاصلے پر کھڑے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزرے تو ایک پولیس والے نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا انپکٹر صاحب اندر ہیں؟“

”ہاں۔“ میں جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ایک وارڈ بوائے سامنے سے آتا دکھائی دیا تو میں نے سوی سے سرگوشی کی۔ ”ٹرے اسے دے دو کہ ذہنی روم میں پہنچا دے۔ اب ہمارا مزید رکنا خطرناک ہے۔“

سوی نے اثبات میں سر ہلایا، پھر وارڈ بوائے قریب آ گیا تو میرے کہنے کے مطابق ٹرے اسے تھا۔

”ڈاکٹر ارسلان سے کہنا، ہم دونوں ابھی آتے ہیں۔“ مصلحت میں نے وارڈ بوائے سے کہہ دیا۔

وارڈ بوائے واپس ہو گیا تو میں تیز قدمی سے ایک طرف بڑھا۔ سوی نے بھی میری تقلید کی۔ وارڈ سے نکل کر ہم چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ چونک اٹھے۔ مجھے منصور کی جھٹک نظر آئے جو تیزی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ ہم ایسے بن گئے جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس پاس ہی نجو کے دوسری آدی بھی نظر آئے جو ہماری نگرانی کرتے رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے ہمیں انسانی قابلوں سے باہر آنا پڑے گا، لیکن اب ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ اس کے لئے ہمیں ایک بار پھر نجو کے آدمیوں کو جخل دینا پڑتا۔ سو میں نے سرگوشی میں سوی کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیا۔

ہم نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمارے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ دبے قدموں ہمارے پیچھے آنے والا منصور تھا۔

”ادبی ڈی کی عمارت کے سامنے پہنچو!“ منصور دھیمی آواز میں یہ کہتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔

منصور کی ہدایت کے مطابق ہم اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ منصور ہمارے آگے آگے ہی چل رہا تھا۔ کچھ فاصلے سے نجو کے آدی بھی ہم دونوں کو جیسے گھیرے میں لیے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ یقیناً نجو نے وہاں سے بہ حفاظت ہمارے فرار ہونے کا بندوبست کر دیا تھا۔

مقررہ جگہ پہنچ کر منصور جب لمبی سی ایک کار کے قریب رکا تو میں چونک اٹھا۔ یہ وہی کار تھی کہ جس میں نجو ہمیں ہوٹل فرمائڈس سے لے گئی تھی۔ کار کے دھندلے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ منصور نے ہمارے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ منصور آگے بیٹھ گیا۔ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھتی ہی ہم نے دروازہ بند کر لیا۔ اسی کے ساتھ کار کا انجن اشارت ہو گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے نجو نظر آئی۔

ہسپتال کی حدود سے نکلنے تک کار میں خاموشی چھائی رہی۔ میں بھی دانستہ کچھ نہیں بولا۔ کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔

”سعد!“ معاً نجو کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا تھا، تم انجام دے چکے ہو!“ اس کا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

میں نے جواب میں کہا۔ ”ہاں نجو! ہم نے دیر نہیں کی کیوں کہ.....“

”بقیہ باتیں اطمینان سے بیٹھ کر ہوں گی۔“ نجو نے میری بات کاٹ دی۔ ”فنی الحال اتنا بنا دینا کافی ہے۔“

”تم..... تم ٹھیک تو ہو رشیدہ؟“ گہرا نے کے باوجود مجھے سوی کو اس کے فرضی نام سے مخاطب کرنا یاد رہا۔
 ”ہاں..... آں۔“ سوی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی۔

سوی اور نجوا دونوں ہی کو اعتدال پر آنے میں تھوڑا وقت لگا۔ پھر نجوا ہی خود کلاہی کے سے اندر میں بڑبڑائی۔ ”ممکن ہے..... ایسا ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے نجیب کو اتنی مہلت نہ مل سکی ہو کہ وہ اپنا بچاؤ کرنا۔ اس کی توجہ سعد پر تھی۔“ نجوا جیسے ہسپتال میں پیش آنے والے سنسنی خیز لمحات کا تصور کرنے لگی۔ ”اسی وقت دبے پاؤں رشیدہ اس کے پیچھے پہنچ گئی اور..... اور نجیب کی گردن اسی طرح اپنے ہاتھوں کے آہنی شکنجے میں کس لی..... گرفت واقعی بہت سخت تھی۔ سویوں نجیب ہوش کھو بیٹھا۔“ اس نے ساری کڑیاں خود ہی جوڑ لیں۔ ”میں نے رشیدہ کے بارے میں منصور سے غلط نہیں کہا تھا کہ یہ دوسری نجوا بن سکتی ہے، مگر.....“ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔
 نجوا کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے میں پورے دھیان سے اس کے الفاظ سنتا رہا۔ اچانک اس کا خاموش ہو جانا میرے نزدیک معنی خیز ہی تھا۔

”جب نجیب قطعی بے بس تھا تو تم نے اسے بھی راستے سے کیوں نہیں ہٹا دیا سعد؟“ نجوا ایک دم مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”تم نے مجھے صرف عدنان کو موت کی نیند سلانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اسی لئے حد سے تجاوز نہیں کیا۔“ میں بلا جھجک بولا۔ ”یہ تمہارے حکم کی خلاف ورزی ہوتی۔“
 ”یقیناً؟“ نجوا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”سعد! اب تم راہ راست پر آتے جا رہے ہو۔ تم خوش نصیب ہو کہ رشیدہ جیسی عورت تمہاری بیوی ہے۔ اس کی صلاحیتیں مجھ پر دھیرے دھیرے کھل رہی ہیں۔ اگر یہ ہسپتال میں تمہارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید نجیب تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔“
 ”میں نے یہ بھی اچھا ہی کیا نجوا کہ نجیب کے چہرے کا میک اپ ختم کر دیا۔“ میں داد طلب انداز میں کہنے لگا۔ ”اس طرح وہ قانون کی گرفت میں.....“

اس پر نجوا ہنسنے لگی تو میں نے اسے حیرت سے دیکھا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ بولی۔ ”تمہاری خام خیالی ہے سعد! مقررع کا وہ غلام کہ جس کا نام نجیب ہے کبھی کبھی گولیاں نہیں کھیتا۔ موقع پر موجود پولیس والوں کی ملی بھگت کے بغیر اس نے یہ خطرناک قدم نہیں اٹھایا ہو گا۔ جب تم ڈاکٹر جمال بن سکتے ہو تو کیا وہ کسی پولیس انسپٹر کی جگہ نہیں لے سکتا؟ خود پولیس والوں کی مدد سے مقررع کے غلام اب تک اسے وہاں سے اٹھا کر لے جا چکے ہوں گے..... ہاں میں تم سے ایک بات پوچھنا تو بھول ہی گئی۔“ نجوا کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”تم دونوں قبل از وقت کوارٹر سے کیوں نکل گئے تھے؟“

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گی، سو میں نے وضاحت کی۔ ”نرس رشیدہ کا ایک آشنا ڈاکٹر ارسلان ملے آگیا تھا۔ اس کی وجہ سے رشیدہ کو بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ ہم نے سوچا ڈاکٹر

میں چپ ہو گیا۔ یہ سفر اسی بجنگے پر ختم ہوا جہاں سے دن ڈھلے ہم چلے تھے۔
 کار سے اترتے ہوئے نجوا نے منصور کو مخاطب کیا۔ ”تم جاؤ اور انہیں بھی اپنے ساتھ ہی لے جا۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔“
 منصور واپسی کے لئے مڑا تو کچھ ہی دور مجھے دو کاریں کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ ان کاروں میں وہ نجوا کے وہی آدمی سوار تھے جنہوں نے ہماری نگرانی کی تھی۔
 بجنگے کے اندر نشست گاہ میں آتے ہی نجوا نے ہمارے چہروں سے ڈاکٹر جمال اور نرس رشیدہ میک اپ ختم کر دیا۔ پھر اس نے ہم سے لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا۔
 بلد ہی ہم لباس تبدیل کر کے نشست گاہ میں آگئے۔ نجوا اس وقت بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔
 ”عدنان کو موت کے گھٹات اتارنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟“ نجوا نے پہلا سوال کیا۔
 ”کیوں نہیں؟“ میں بولا۔ ”وہاں پولیس انسپٹر کی وردی میں نجیب بھی موجود تھا۔“ میں نے گویا اپنی دانست میں انکشاف کیا۔

”معلوم ہے مجھے۔“ نجوا نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ ”تم تو یہ بتاؤ کہ اس نے تمہیں روکنے کے لئے کیا قدم اٹھایا؟“

”وہ اچانک پردوں کے اندر آگیا تھا۔ عدنان کے بازو میں زہریلا انجکشن لگانے کے لئے میں جھکاؤ.....“ جو کچھ ہوا تھا میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔ پورے واقعے میں صرف اس پر میں نے پردہ ڈالا کہ سوی کو انسانی پیکر سے باہر آنا پڑا تھا۔

میرے خاموش ہوتے ہی نجوا نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”ادھر آؤ تم؟“ سوی اٹھ کر اس کے قریب پہنچی تو نجوا بولی۔ ”میری گردن دباؤ؟“

”جی؟..... جی نجوا صاحبہ؟“ سوی نے حیرت سے کہا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا..... کیا کہہ رہی ہیں؟ میں..... میں ایسا کس طرح کر سکتی ہوں؟“

”رشیدہ!“ نجوا کے لہجے میں سختی در آئی۔ ”میں نے تمہیں جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو! جب میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دوں تو تم اپنی کوشش ترک کر دو گی!“

مجبوراً سوی جھکی اور نجوا کی گردن اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لی۔ چند ہی لمحوں میں نجوا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یوں لگا جیسے سارا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ پھر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا۔ اسی کے ساتھ جیسے سوی کو کسی انجانی قوت نے پیچھے کی طرف اچھال دیا۔

سوی میرے قریب فرش پر گری۔ میں نے اسے سارا دے کر اٹھایا۔ نجوا اپنی گردن سلاتے ہوئے مگرے سانس لینے لگی۔ میرا انداز نشست ایسا تھا کہ اس عجیب واقعے کے دوران میں نجوا اور سوی دونوں ہی پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ میں نے آخری لمحات میں ہاتھ اٹھانے سے پہلے نجوا کے ہونٹ ہلکے دیکھ لئے تھے۔ سوی کا جسم کسی شیطانی عمل کے نتیجے میں اس طرح اچھلا تھا گویا اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کا انسانی پیکر اب تک کانپ رہا تھا۔

ارسلان کی طرح کوئی اور اجنبی رات ہونے سے پہلے نہ آجائے! نادافیت کی وجہ سے کسی ایسے ملاقاتی کو ہم پر شک بھی ہو سکتا تھا۔ یوں اگر ڈیوٹی کا وقت ہونے سے پہلے کوئی غیر متوقع صورت سامنے آجاتی تو ہم تمہارے حکم کی تعمیل نہ کر پاتے۔ اس کے علاوہ وہ کوارٹر منقرع کے غلاموں کی نظر میں بھی آچکا تھا۔ ہمیں اسی لئے وہاں خطرے کا احساس ہوا اور وقت گزاری کے لئے وہاں سے نکل آئے۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ کچھ لوگ ہماری نگرانی کر رہے ہیں، ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔“

”لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ نگرانی کرنے والے تمہارے ہی خواہ، یعنی میرے ہی آدمی ہوں گے؟“ نجوا نے دریافت کیا۔

”وہ اگر دشمن ہوتے تو صرف ہماری نگرانی پر اکتفا نہ کرتے۔“ میں نے دلیل دی

”بہادر ہونے کے ساتھ تم دونوں ذہین بھی ہو۔“ نجوا نے پہلی بار میرے لئے بھی تعریفی الفاظ استعمال کئے۔

”شکریہ نجوا!“ میں اس عیار آدم زاد کو خوش کرنے کے لئے بولا۔

وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ”تمہیں اور رشیدہ کو اگر مجھے تربیت دینے کا موقع مل گیا تو منقرع کے غلام تم سے پناہ مانگیں گے، لیکن اس وقت تک تمہارا زندہ رہنا ضروری ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہیں مرنے نہ دوں۔ یہ الگ بات ہے کہ منقرع کے غلام تمہیں جینے نہ دیں۔“

”حوصلہ بھی بڑھاتی ہو اور ڈرا بھی رہی ہو!“ میں نے کہا۔ پھر مجھے اس کے ایک جھوٹ کا خیال آگیا اور بولا۔ ”یہ بنگلہ بھی غالباً ہمارے لئے محفوظ نہیں رہا۔ ضرغام نجفی کے آدمی یہاں سے رشیدہ کو اغوا کر کے لے جا چکے ہیں۔ وہ دوبارہ بھی یہ کوشش کر سکتے ہیں۔“

”ان کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اب وہ ادھر کارخ نہیں کریں گے۔“ نجوا نے مجھے اطمینان دلایا۔

حقیقت یہ تھی کہ خود اس نے مجھ پر دباؤ قائم رکھنے کے لئے سوی کو اغوا کرایا تھا اور الزام ضرغام نجفی کے سر تعویپ دیا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی۔ ”تم نے اچھا کیا سعد کہ یہ ذکر چھپز دیا۔ میری یقین دہانی کے بعد تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اب ہم خود کو یہاں محفوظ ہی سمجھیں گے۔“ میں نے بھی مطمئن ہونے کا اظہار کر دیا۔ مجھے یہ بات بھی کر لینے کی ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ نجوا سمجھ لے، میں کسی طرف سے بے خبر نہیں ہوں۔ خود اس کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہونا قرن قیاس تھا کہ میں اس واقعے پر تشویش میں مبتلا کیوں نہیں!

”اب تم دونوں آرام کرو کہ آدمی رات ہونے والی ہے، میں چلتی ہوں۔ تمہارے لئے میں نے اور بہت کچھ سوچا ہے جو اگلی ملاقات ہونے پر بتاؤں گی۔“

”اور اگلی ملاقات کب ہوگی؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”ابھی کچھ طے نہیں۔“ نجوا جواب میں بولی۔ ”فی الحال تو مجھے ڈاکٹر جمال اور اس نرس رشیدہ کے معاملے کو سنبھالنا ہے۔“

”عدنان کے قتل کا الزام تو انہی پر آئے گا۔“ میں بول اٹھا۔

”نجوا جن لوگوں سے کام لیتی ہے، انہیں کبھی اس طرح بے سارا نہیں چھوڑتی۔ وہ دونوں تو آج رات ڈیوٹی پر پہنچنے سے پہلے ہی چھٹی کی درخواست دے چکے تھے۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن انہیں تو ڈاکٹر ارسلان اور ہسپتال کے دیگر عملے نے بھی دیکھا تھا!“

”جنہیں دیکھا گیا، کوئی اور ہوں گے وہ!“ نجوا معنی خیز انداز میں نہی۔ ”جس وقت عدنان کا قتل ہوا ڈاکٹر جمال، رشیدہ کے ساتھ باہل کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ دونوں وہاں آثار قدیمہ کی سیر کرنے گئے تھے۔ تمہیں تو معلوم ہو گا کہ باہل یہاں سے تقریباً پندرہ میل ہے۔ آج شام چھٹی کی درخواست دے کر ان کے لئے باہل پینچا کون سا مشکل تھا! پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں جب یہ ظاہر ہو گا تو منقرع کے غلام بوکھلا اٹھیں گے۔“

”جب تم بھی کچھ طے کر چکی ہو تو پھر کیا سنبھالنا باقی ہے؟“ بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آگیا۔

”سعد! یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں۔ تم ان میں داغ نہ کھپاؤ!“ نجوا یہ کہتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

میں اس کے ساتھ چل دیا اور بنگلے کا گیت بند کر کے واپس آگیا۔ اندر آتے ہی میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”کم از کم آج رات ہماری ہے اے سوی!“

”میں سمجھی نہیں اے علیالیش کہ تیری بات کا مقصد کیا ہے!“

”نجوا کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ ہم آج رات ایک معرکہ انجام دینے کے بعد اس بنگلے سے کیس جاسکتے ہیں۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔“ میں وضاحت کرنے لگا اور پھر میرے ذہن میں جو بھی تھا، سوی کو بتا دیا۔

ذرا ہی دیر میں ہم بنگلے کی روشنیاں گل کر کے انسانی پیکروں سے باہر آگئے۔ ہم جن زاد کسی کو تلاش کرنے کے بہت سے عمل جانتے ہیں۔

☆=====☆=====☆

بغداد کے اس قدیم علاقے کا نام بغدادیہ تھا کہ جہاں پرواز کرتے ہوئے ہم پہنچے۔ یہ متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ ہمیں ہم ایک بڑے سے پرانے گھر میں داخل ہوئے تو سوی آگے بڑھتے بڑھتے ٹھک گئی اور سرگوشی کی۔ ”اے علیالیش! یہ گھر تو مجھے حرزہ سا لگتا ہے، رک جا!“

میں نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ وہاں عجیب سی ناگوار بو تھی، ایسی بو جو مردہ جسموں سے اٹھتی ہے۔ میں رک گیا تو اسی لمحے ایک طرف سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بچہ غصے سے بول رہا ہو۔ اس آواز کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔

”تم ناقابل یقین باتیں کر رہے ہو!“ غصے میں بھری ہوئی یہ بچکانہ آواز یقیناً طلال بے کی تھی۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے۔“

”جس طرح میں نے بتایا ہے۔ مجھے مہلت ہی نہیں ملی۔“ جواب میں دوسری آواز ابھری۔ یہ نجیب تھا۔

”ایک عورت نے تمہاری گردن کو گرفت میں لے لیا اور تم..... تم ہوش کھو بیٹھے!“

”مجھے یقین ہے کہ وہ زرس نہیں، نجوا تھی۔ کسی اور کی گرفت اتنی مضبوط اور سخت نہیں ہو سکتی۔“ نجیب کی پُر اعتماد آواز آئی۔

معاً یوں لگا کہ کوئی بچہ زور سے ہنس پڑا ہو۔ اس طرح ہنسنے والا طلال بے کے سوا کون ہوتا!

”اے سوی! ہمت کر۔“ میں نے سرگوشی کی اور سوی کو ادھر بڑھنے کا اشارہ کیا جہاں سے وہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ اس گھر کا وہی کمرہ تھا جو میں نے اپنی چشم تصور سے دیکھا تھا۔ وہیں طلال بے اور نجیب دکھائی دیے۔ پھولے ہوئے رخساروں والا طلال بے ایک آرام کرسی پر دراز تھا اور نجیب بے چینی کی سی حالت میں ٹھل رہا تھا۔

”میری بے بے بی پر تم ہنسنے جا رہے ہو!“ نجیب رک کر طلال بے سے مخاطب ہوا۔

”تمہاری بے بے بی پر نہیں بلکہ احقانہ خیال پر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔“ طلال بے نے کہا۔ ”تمہاری عقل ماری گئی ہے۔ وہ اگر نجوا ہوتی تو کیا تمہیں زندہ رہنے دیتی؟..... یہ ذرا سی بات تمہارے دماغ میں نہیں آئی!“

”تو..... تو پھر وہ کون تھی؟“ نجیب کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی۔

”اور یہ بھی سوچو کہ وہ ڈاکٹر کون تھا کہ جس نے عدنان کے جسم میں زہر اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا؟“ طلال بے بولا۔

”وہ تو ڈاکٹر جمال تھا کہ جسے نجوا خرید چکی تھی۔“ نجیب نے جواب دیا۔ ”راصل کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔“

”خیال ہے تمہارا۔ اس ڈاکٹر اور زرس کی جگہ نجوا نے یقیناً دوسروں کو بھیجا ہو گا۔ راصل کا ابھی تک کوئی سراغ کیوں نہیں مل سکا معلوم ہے تمہیں؟..... نجیب! تم کچھ نہیں جانتے۔ مجھ سے پوچھو کہ راصل اس وقت کہاں ہے!“

”ہاں تم بتا سکتے ہو۔ میں تو عدنان کے پاس تھا۔“ نجیب یہ کہتے ہوئے آرام کرسی کے سامنے ہی پڑی ہوئی ایک کرسی پر جیسے تھک کر بیٹھ گیا۔

”راصل وہاں ہے نجیب کہ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔“ طلال بے نے انکشاف کیا۔ ”آج رات نجوا نے منقرع کے دو غلاموں کو ٹھکانے لگا دیا اور ہم دیکھتے رہ گئے!..... ذرا سوچو کہ یہ کتنی المناک صورت حال ہے۔ کوئی تو وجہ ہے اس کی! پہلے تو اس کا پلہ اتنا بھاری نہیں تھا۔“

نجیب کے چہرے سے حزن و ملال کا اظہار ہونے لگا۔ چند لمحے وہ گم صم بیٹھا رہا، پھر ایک دم بولا۔

”طلال! تمہیں وہ..... وہ غیر انسانی آواز یاد ہے جو بیس اسی جگہ ہم نے سنی تھی!..... کوئی ہے“

تیسرا کوئی وجود!..... اور وہ فرعون خضر کے کسی امیر کی روح ہو سکتی ہے۔ اس نے یہی تو کہا تھا!“

”اب تم صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو نجیب! میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ نجوا اسی سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔“

”میں تو ابھی تک کراچی کے اس پراسرار شخص کو بھی نہیں بھولا کہ جس کی وجہ سے ہمیں فوری طور پر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔“ نجیب نے کہا۔

”ہاں وہ بھی!“ طلال بے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

ہمارے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے، لیکن وہ پراسرار شخص یہاں تک ہمارے تعاقب میں نہیں آسکتا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کے لئے اب شاید ہمیں منقرع کی روح سے سرگوشیاں کرنا ہوں گی۔“

”جانتے ہو تم کہ نجوا پر اس کا کیا رد عمل ہوگا!..... وہ یہی سوچے گی کہ اس مرتبہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

”تو سوچا کرے۔“ طلال بے جواب میں بولا۔ ”اس کے یہ سوچنے سے کیا فرق پڑ جائے گا!“

”اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے مصر بھی پہنچ گئی تو؟“ نجیب نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”پہلے بھی اس نے ہمارا کیا بگاڑ لیا تھا! خود اسی کو جان بچانے کے لئے فرار ہونا پڑا تھا۔“

”اب اور اس وقت کی صورت حال میں بڑی تبدیلی آچکی ہے طلال! بار بار تم فرعون خضر کے امیر کی روح کو بھول جاتے ہو کہ وہ بھی ہمارے تعاقب میں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نجیب کی آواز میں ارتعاش سا تھا۔ ”اس کے الفاظ اکثر میری سماعت میں گونجتے رہتے ہیں۔“

”نجیب! تم کچھ زیادہ ہی خوفزدہ لگتے ہو۔ تمہارے ذہن سے شاید یہ بات نکل گئی کہ ارواح اور جنات کو دور رکھنے کے لئے منقرع کی روح نے کئی عمل مجھے بتا رکھے ہیں۔ ابھی ان میں سے میں نے صرف ایک عمل کو آزمایا ہے۔ اس کا تجربہ تمہیں بھی ہو چکا ہے۔ جب اس امیر کی روح ہمیں دیکھ رہی تھی تو ہم اس کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ بولو! کیا ایسا نہیں ہوا؟ پھر تو اس کی آواز آنا بند ہو گئی تھی نا!“

طلال بے نے اپنی ہچکانہ آواز میں نجیب کو سمجھایا۔

اس پر میں چونکا اور مجھے وہاں خطرہ محسوس ہوا۔ یہ شیطان صفت آدم زاد آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں، میں نے سوچا۔ ارواح کے ساتھ اس نے پہلی بار جنات کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہی میری تشویش کی وجہ تھی۔ پھر مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں کسی روح کی مداخلت سے ڈرے ہوئے ضرور ہیں۔

اب تک ان دونوں کو وہاں ہماری موجودگی کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا۔ خطرے کا احساس ہونے پر بھی میں نے انہیں روح کے وجود سے مزید خوفزدہ کرنے کی خاطر سوی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس مکان کے گرد پرواز کرتے ہوئے میں نے سوی سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

سوی نے مجھے روکنا چاہا تو میں بولا۔ ”تو فکر نہ کر! ذرا سا بھی خطرہ ہوا تو میں وہاں نہیں رکوں گا۔“

وہ مان گئی تو میں دوبارہ اس مکان کے اندر گھس گیا۔ جہاں وہ دونوں موجود تھے، اس کے کمرے

کے دروازے پر رک کر میں نے کسی درندے کی طرح غرانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے ایک دم اچھل پڑے۔

”اے نادانو!“ میں نے غیر انسانی آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ ”تم فرعون خضر کے امیر زاعون کی روح سے کب تک بچو گے!“ روح کا میں نے ایک نام بھی رکھ لیا۔ ”زمین پر تم کیس بھی چلے جاؤ“ زاعون کا قہر تمہارا پچھا کرے گا!“

طلال بے کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جیسے چراغ سے جل اٹھے۔ نجیب کی حالت غیر سی دکھائی دی۔ وہ گڑگڑایا۔ ”اے زاعون کی روح! ہمیں بتا کہ تیرا اہرام کہاں ہے؟ ہم..... ہم ادھر نہیں پھنکیں گے۔“

”اے نجیب! اب کچھ بتانے کا وقت گزر چکا۔ تم بڑا سے نہ بچ پاؤ گے!“ میری نگاہ یہ کہتے ہوئے طلال بے پر تھی جس نے کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

میرا مقصد انہیں کسی روح کے وجود کا یقین دلانا تھا، سو پورا ہو گیا۔ میں پلٹنے ہی دلا تھا کہ ایک شعلہ سامیری طرف لپکا۔ میں پہلے ہی کسی ایسی صورت حال کے لئے تیار تھا، سو اس شعلے کی زد سے بچنے کی خاطر اڑا۔ پھر بھی مجھے دیر ہو گئی۔ شعلے کی حرارت مجھے محسوس ہوئی۔ میرے وجود میں انگارے سے بھر گئے۔ شعلے کا وہ ہلکا سا لمس بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں چشم زدن میں اس کی زد سے نکل گیا۔

سوی میرے پیچھے لپکی۔ اب ہم اس گھر سے بہت دور اونچی پرواز کر رہے تھے۔ میری حالت کا اندازہ کرتے ہی سوی نے ایک عمل پڑھا۔ چند ہی لمحوں میں جب اس نے مجھ پر دم کیا تو برف جیسی ٹھنڈک میرے وجود میں اترنے لگی۔ انگارے سرد پڑ گئے۔

مجھے اعتماد پر آتے دیکھ کر سوی کہنے لگی۔ ”اے علیالیش! تجھے میں نے ایسا کرنے سے روکا تھا“ مگر تُو باز نہ آیا۔ ان شیطانوں کو ابھی چھیڑنا اچھا نہیں تھا۔“

”مجھ سے بس تھوڑی سی بھول ہو گئی۔ طلال بے نے جب عمل پڑھا، شروع کیا تو مجھے اندازہ نہ ہو سکا“ اے کتنا وقت لگے گا! عمل کے ابتدائی لمحات ہی میں اگر میں وہاں سے نکل آتا تو شاید اذیت نہ اٹھاتا۔ اس کے باوجود یہ سب رائیگاں نہیں گیا۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”ہمیں ان کے آئندہ ارادوں کا علم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ وہ زاعون کی روح کے خوف میں بھی مبتلا ہو گئے۔ لگتا ہے کہ اب ہمیں یہاں سے مصر کی پراسرار سر زمین کا رخ کرنا پڑے گا۔“

”کیا تجھے یہ عجیب نہیں لگا اے علیالیش کہ وہ محض منقرع کی روح سے سرگوشیاں کرنے مصر جا رہے ہیں؟“

”ہاں یہ عجیب تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے عقائد کے مطابق کسی روح کا وجود ممکن تو ہے، لیکن اسے عالم برزخ میں ہونا چاہئے۔ سزا و جزا کا فیصلہ ہونے سے پہلے کسی روح کو یوں آوارہ بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا جاتا۔ فرعون منقرع بھی ایک آدم زاد ہی تھا، تو پھر اس کی روح کس طرح عالم برزخ سے

نکل آئی؟ مجھے یہ کوئی پراسرار فریب ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہم جن زادوں کے سوا بھلا کون یوں نظروں سے اوجھل رہ سکتا ہے!“

”اور اس کی بھی ایک معیار مقرر ہے۔“ سوی نے میری بات آگے بڑھائی۔ ”جب ہم زندہ ہیں“ اس پر قادر ہیں۔“

”اے سوی! ابھی مجھے یہ خیال آیا کہ وہ کوئی کافر جن زاد بھی ہو سکتا ہے جس نے ان آدم زادوں کو راہ راست سے بھٹکانے کے لئے فرعون منقرع کی روح کا ڈھونگ رچا لیا ہو! میں نے بھی کیا ایسا ہی نہیں کیا؟“

”لیکن اس کے لئے اسے صرف مصر ہی تک محدود رہنے کی کیا پڑی ہے اے علیالیش؟“ سوی نے ایک اہم سوال کیا۔

”شاید وہ اس طرح ان آدم زادوں کو فریب دینا چاہتا ہو۔“ میں نے قیاس آرائی کی۔ ”فرعون منقرع کا مقبرہ کیوں کہ مصر ہی میں ہے۔ شیطان صفت کافر جن زادوں کی کمی تو نہیں اے سوی! اللہ نے انہیں روزِ حشر تک آدم زادوں کو بھٹکانے کی مہلت دے رکھی ہے، یہ تجھے بھی خبر ہے۔ اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کی پرستش بھی تو اس شیطان جن زاد کا مقصود ہو سکتا ہے! شیاطین بھی تو ہم ہی جن زادوں میں سے ہیں کہ جنہیں ہم اولادِ ابلیس کہتے ہیں۔“

”خدا نہ کرے اے علیالیش کہ ایسا ہو۔“ سوی کی آواز سے کسی قدر خوف جھلکنے لگا۔ ”شیاطین بڑے قوی ہوتے ہیں۔ ان سے نمٹنا ہمارے لئے آسان تو نہیں ہو گا۔ وہ اگر کوئی شیطان جن زاد ہے کہ جس نے کچھ آدم زادوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے تو اسے قابو میں لانا مشکل ہو جائے گا۔“

”اے سوی! اللہ پر بھروسہ رکھ اور نہ کھبرا کہ وہ اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔“ سوی کو میں نے دلاسا دیا۔ ”ابھی تو یہ محض ہمارا قیاس ہے۔ حقیقت کا علم تو مصر جا کر ہو گا۔ کیا خبر وہاں کچھ اور ہی صورت پیش آئے! تو یہ کیوں بھول گئی کہ خود نجوا بھی تو اسی شیطان کے غلاموں کے ساتھ رہ چکی ہے اور اب تک زندہ ہے۔ منقرع کے غلام اسے زیرِ دام نہیں لا سکے۔ شیطان صفت آدم زادوں کا ٹکراؤ ہمارے لئے انشاء اللہ نیک فال ثابت ہو گا۔ خود منقرع کے غلاموں کو بھی یہ شک ہے کہ نجوا، مصر تک ان کا تعاقب کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا ہوا تو نجوا ہمیں یہاں نہیں چھوڑے گی۔ اسے کم از کم یہ اندازہ تو ہو چکا ہے کہ ہم آدم زاد ہو کر بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ تجھ پر تو وہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔“

”اس کی یہ مہربانی ہمیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے اے علیالیش! اسے ہمارے جینے یا مرنے کی ایک حد تک ہی پروا ہے۔ ہم اس کے لئے ایسے کھلونوں کی طرح ہیں کہ جو کبھی نوٹ بھی گئے تو اسے رنج نہ ہو گا۔ یہ تو ہم ہی کو پتا ہے کہ ہم ابھی تک اپنی جنائی صفات کے سبب بچے ہوئے ہیں۔“

”اور اللہ نے چاہا تو بچے ہی رہیں گے۔“

”خدا تیرا کتنا مبارک کرے اے علیالیش!“ سوی بے ساختہ بولی۔

”چل اب اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ چلتے ہیں اور انسانی قالب اپنالیتے ہیں۔“ میں نے مشورہ دیا اور نیچی پرواز کرنے لگا۔

منصورہ کے اس بنگلے میں واپس آکر مجھے خیال آیا کہ وہاں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جنہیں نہیں ہونا چاہئے۔ نرس رشیقہ کی یونیفارم، ڈاکٹر جمال کا لباس، زہر کی خالی شیشی اور سرج میں نے وہاں سے غائب کر دی۔ نجوانے جانے کیوں ان چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا!

اس رات کا بقیہ حصہ ہم نے سکون کے ساتھ سوتے ہوئے گزار دیا اور دوسرے دن دیر سے اٹھے۔ کھانے پینے کا کچھ ضروری سامان سوی اسی آبادی کے چھوٹے سے بازار تک جا کر لے آئی۔ دن میں کسی بھی وقت نجوانہم سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ سو یہی سوچ کر ہم کہیں نہیں گئے۔ وہاں سے ہماری غیر موجودگی نجوا کو شک میں ڈال دیتی۔ یہ رابطہ فون پر بھی ممکن تھا اور ایسا ہی ہوا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگی۔

میں نے ریلیور اٹھالیا تو دوسری جانب سے منصور کی آواز سنائی دی۔

”ہاں کو!“ میں بولا۔

”رشیدہ کو اور تمہیں یقیناً ڈرائیونگ آتی ہو گی!“ منصور کی آواز تصدیق طلب تھی۔

”آتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہارے بنگلے کے سامنے اب سے آدھے گھنٹے کے بعد ایک خالی کار کھڑی ہو گی۔“ منصور بتانے لگا۔

”چاپایاں تمہیں کار ہی میں مل جائیں گے۔“

”تو پھر؟“ میں بول اٹھا۔ مجھے کسی خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔

”کانفڈ قلم لے کر ایک پتا لکھو! میں ہولڈ کرتا ہوں۔“

مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ منصور جو پتا بتانے والا تھا، میں اسے ذہن نشین کر لیتا۔ پھر بھی میں نے تھوڑا توقف کیا اور بولا۔

”ہاں لکھو! پتا!“

منصور نے اعظیہ کا ایک پتا بتایا۔ ”کوٹھی نمبر ڈھونڈنے میں تمہیں وقت نہیں ہو گی۔ سود ہمارا ہی

آدی ہے۔ وہ تمہیں جہاں لے جائے چلے جانا۔ تم اس پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ رشیدہ کا

ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کوٹھی کے گیٹ کا رنگ نیلا ہے، یہ ذہن میں رکھنا۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا؟ تم خود کیوں نہیں آرہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈرا مصروف ہوں ورنہ خود ہی آتا۔ پھر بھی ملاقات ہونے کا امکان ہے۔“ منصور جواب میں بولا

اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے پہلے سوال کو وہ نظر انداز کر گیا۔

سوی نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں تو میں نے کہا۔ ”یہ خبیث عورت نجوا کسی پل چین

سے نہیں بیٹھتی۔ معلوم نہیں اس مرتبہ وہ ہمیں کس کس آزمائش میں ڈالنے والی ہے! اگر مصلحت

آڑے نہ ہوتی تو اس کی ساری عیاری دھری رہ جاتی۔ میرے ہاتھوں پہلے اسی کا خون ہوتا۔ بار بار مجھے

یاسف کی تائید کا خیال آ جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نجوا سے دوستی ہمارے لئے سود مند رہے گی۔ یاسف

بھی تو ایک عیار جن زاد ہے، کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ مشورہ دیا ہو گا۔ جن زاد ہو کر خود کو آدم زاد ظاہر کرتے رہنا، بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔“

”اب ایسا کیا ہو گیا کہ تجھے اتنا غصہ آرہا ہے اے علیالیش؟“ سوی بولی۔

”آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں یہاں سے اعظیہ روانہ ہونا ہے۔ نجوا کا کوئی آدمی سود ہمیں وہاں لے

گا اور کہیں ساتھ لے جائے گا۔ منصور نے اسی لئے فون کیا تھا۔“ پھر سوی کو میں نے کار کے متعلق بھی بتا

دیا، پھر کہا۔ ”خود نجوا بتا چکی ہے کہ منقرع کے غلام میری تلاش میں ہیں وہ اسی لئے تو ہوٹل سے لے کر

ہمیں یہاں آئی تھی۔ منصور نے اسی سبب میرا چہرہ بھی بدل دیا تھا۔ اب چہرے کی تبدیلی کے بغیر کھلے عام

یہاں سے اعظیہ جیسے علاقے میں میرا جانا خالی از علت نہیں لگتا۔“

”یہ تیرا دہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت منقرع کے غلام خود ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

شاید انہوں نے تیری تلاش چھوڑ دی ہو گی۔ نجوا ان کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، ایک انجان عراقی

نہیں کہ جسے وہ بہ آسانی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے نجوانے مزید احتیاط نہ برتی ہو۔

پھر مجھے بھی تیرے ساتھ چلنا ہے تو وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتی۔ بات کوئی اور ہی لگتی ہے۔ تو اندیشہ نہ

کرا!“ سوی مجھے سمجھنے لگی۔

”کسی خطرے سے محفوظ رہنے کا ایک اور حل بھی ہے اے سوی! میں تیرے ساتھ آگے نہ

بٹھوں۔ کار تو چلائے اور میں پچھلی نشست پر اس طرح بیٹھوں کہ میرے چہرے پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔

انسانی قالب سے نکل کر بھی تیرے ساتھ سفر ممکن ہے۔ جب تک ہم مطلوبہ کوٹھی تک پہنچ جائیں گے تو

میں دوبارہ انسانی پیکر اپنالوں گا۔ اس میں صرف ایک ہی قباحت ہے کہ نجوا کے آدمی ہماری کار کا تعاقب

بھی کر سکتے ہیں۔ تجھے وہ تما کار میں دیکھیں گے تو نجوا سے یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی۔“

”جس پر تیرا دل ٹھکے سو کر لو! اب ملی تو اس سے چہرہ بدلنے کا سامان بھی لے لیں گے۔ پھر وہ

سامان بھی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ ہم جب چاہیں گے، چہرے بدل لیا کریں گے۔ وہ سامان

تو ایک بہانہ ہو گا۔ تو پہلے ہی منصور کو ڈراموں میں کام کرنے کے متعلق بتا چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ

اے علیالیش کہ نجوا کو اس پر اعتراض نہ ہو گا کہ اپنی حفاظت کے لئے ہم خود ہی چہرے بدلتے رہیں۔“

سوی نے ایک اور جناتی صفت پر پردہ ڈالنے کی راہ پیدا کر لی۔

”اے سوی! تیری تجویز دل کو لگتی ہے۔ اس سے آئندہ کے لئے بھی یہ راہ کھل جائے گی۔ تجھے

پہلے ہی یہ خیال آ گیا ہو تا تو نجوا سے بات ہو جاتی۔ خیر اب سہی!“

آدھا گھنٹا ایسی ہی باتوں میں گزر گیا۔ ہم نے حالات سے نبرد آزما ہونے کی خاطر کئی تجاویز پر غور

کیا۔ میرے کان باہر ہی لگے ہوئے تھے۔ ایک کار کے انجن کی آواز سنی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہ

کوئی اجنبی تھا جو گیٹ کے باہر کار کھڑی کر کے ایک طرف چل دیا۔

بنگلے کو منتقل کر کے ہم باہر گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سوی ہی بیٹھی۔ اوہ گرد کا جائزہ لینے پر مجھے کوئی

مشتبہ آدمی نظر نہ آیا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو سوی نے کار آگے بڑھا دی۔ دیکھے بھالے راستوں پر

”ہاں۔ اطلاعات کے مطابق ہمارے جو آدمی آج صبح ہی صبح منقرع کے غلاموں نے پکڑے ہیں،
نہیں بغداد سے وہیں بھیج دیا گیا ہے۔ ہمارے حریف، ضرغام سے ایسے جھوٹے موٹے کام لیتے رہتے ہیں۔
ضرغام کا ایک ٹھکانا وہاں بھی ہے۔“ سود نے کہا۔
”لیکن ہم..... ہم تو اسے نہیں جانتے۔ لیلیٰ کے حوالے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے
نجات چاہی۔

”بس اتنا کہ ضرغام وقتی طور پر تم لوگوں کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کا جاننا تمہارے لئے کوئی
فردی نہیں۔ تم کوئی بھی کمائی راستے میں سوچ لینا!“ سود قدرے بے تکلفی سے کہنے لگا۔ ”مثلاً یہ کہ
م بغداد کے کسی علاقے سے گزر رہے تھے کہ ایک نسوانی آواز نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
ملاؤں دار کسی کھڑکی کے پیچھے اس حسین عورت کا چہرہ نظر آیا جس نے اپنا نام تمہیں لیلیٰ بتایا۔ وقت
رات کا بتاؤ تو مناسب ہے۔ لیلیٰ ہی سے تمہیں معلوم ہوا کہ اسے اغوا کر کے وہاں لایا گیا ہے۔ اسی نے
نہیں ضرغام کا پتا دیا۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ضرغام اس کمائی پر یقین کر لے گا؟“ میری آواز میں چھین تھی۔
”وہ یقین کر لے، اس کی ضرورت بھی تو نہیں۔ میں وجہ پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ اسے تو الجھنا
ہے۔ تمہاری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ تم پر شبہ ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دیر تک پوچھ گچھ
کرنا رہے۔“

”اور اس پوچھ گچھ کے دوران میں وہ تشدد پر اثر آیا تو؟“
”ممکن تو ہے یہ بھی۔“ سود نے جواب دیا۔ ”لیکن شاید منصور اسے اتنا وقت نہ دے۔ پھر تم خود
جی تو اپنی حفاظت کر سکتے ہو! مجھے تو یہی بتایا گیا ہے۔“

”لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ رشیدہ بھی وہاں میرے ساتھ جائے؟ کیا میں اکیلا یہ کام انجام نہیں
دے سکتا؟“ میں نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔

”منصور کا کہنا ہے کہ تم دونوں مل کر ایک اور ایک گیارہ بن جاتے ہو۔ اس کے علاوہ خوب
مورت چہرے ضرغام کی توجہ بہت جلد اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ نجوا کوئی کام مصلحت کے خلاف
نہیں کرتی۔ میری بات کا برا نہ ماننا کہ میں نے صرف اپنے طور پر یہی اندازہ کیا ہے۔“ سود کے آخری
الفاظ معذرت خواہانہ تھے۔

کچھ دیر کو نشست گاہ میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ اپنے آدمیوں کو رہائی دلانے کی خاطر نجوا دیدہ
و دانستہ مجھے اور سومی کو پھنسا رہی تھی۔ ضرغام کی طرف سے تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ ہم جن زادوں
کے لئے ان جرائم پیشہ آدم زادوں کو قابو میں کر لینا کوئی مشکل نہ ہوتا۔ اصل تشویش کا سبب میرے لئے
نجوا تھی۔ بعد میں اسے مطمئن کرنا محال ہو جاتا۔ نجوا نے یقیناً یہی سوچا ہو گا کہ جب میں، منقرع کے
غلاموں کی قید سے نکل کر زندہ سلامت آ سکتا ہوں تو میرے سامنے ضرغام کی کیا حیثیت ہے! وہ تو پُر اسرار
قوتوں کا مالک بھی نہیں۔ اس کے سوا کوئی اور بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔

کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔ بڑا سا ایک رومال میں نے اس طرح سر پر ڈال لیا کہ جیسے تیزوار
سرد ہوا سے بچنے کے لئے ایسا کیا ہو۔ اس کا اصل مقصد چہرہ چھپانا تھا۔ کار جب اعظیہ کے علاقے میں
داخل ہوئی تو میں مزید محتاط ہو گیا۔

مطلوبہ کو کبھی تلاش کرنے میں دشواری نہ ہوئی۔ سومی کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ راستے میں کسی سے
ہمیں نہیں روکا۔ غالباً ہماری کار کا تعاقب بھی نہیں کیا گیا۔
کار ایک طرف کھڑی کر کے ہم اترے۔ اطلاعی کھنٹی کا بٹن دبانے کے چند لمحوں بعد ہی گیٹ کھل
گیا۔

”آپ دونوں سعد اور رشیدہ ہیں؟“ گیٹ کھولنے والے نے تصدیق چاہی۔

”ٹھیک سمجھے تم۔“ میں بولا۔ ”ہمیں سعد سے ملنا ہے۔“

”آئیے! وہ آپ دونوں کی آمدی کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ آدمی ایک طرف ہٹ گیا۔

اسی آدمی کے ساتھ ہم ایک خوب صورت اور بڑی نشست گاہ میں پہنچ گئے جہاں سعد ہمارا منتظر
تھا۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ عام عراقی باشندوں کی طرح وہ بھی صحت مند اور سرخ و سفید تھا۔
اس کی آنکھیں ہلکی سبز تھیں۔ اپنی وضع قطع اور طے سے وہ متمول شخص دکھائی دیا۔ خلاف توقع اس کے
چہرے سے شیطنت ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ خوش اخلاقی سے پیش آیا، پھلوں اور چائے سے ہماری مدارات
کی۔ اس کا رویہ ہمارے ساتھ ایسا تھا جیسے ہم مہمان ہوں اور وہ میزبان۔

شائستہ انداز و اطوار والا وہ شخص مجھے نجوا کا کوئی ساتھی محسوس نہ ہوا۔ اب تک اس نے ہم سے
کہیں چلنے کو نہیں کہا تھا۔

”لگتا ہے کہ تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”پہلے تھی، مگر اب نہیں رہی۔ آرام سے چلیں گے۔“ سود نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ لوگ
شاید اس وقت راستے میں ہوں گے جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ دن ڈھلے تک یوسفیہ پہنچنا ہے، فوری طور پر
نہیں۔ یہاں سے یوسفیہ تقریباً پندرہ میل دور ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے۔“
”یوسفیہ میں کون ہے؟ کیا تم کسی سے وہاں ملوانے ہمیں اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟“

”نہیں۔ مجھے تو وہاں تک آپ کی رہنمائی کر کے بغداد لوٹ آنا ہے۔ اس چھوٹی سی آبادی کے
نواح میں وہ مکان ہے کہ مجھے جس کی نشاندہی کرنی ہے۔ میں اپنی کار ہی میں سفر کروں گا اور آپ دونوں
گویا میرا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچیں گے۔ اس مکان کے آگے چند لمحوں اپنی کار کھڑی کر کے میں
آگے بڑھ جاؤں گا۔“

”اور اس کے بعد؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”اس مکان میں داخل ہونا ہے۔ اس کے لئے آپ ضرغام نجفی کی محبوبہ لیلیٰ کا حوالہ دے سکتے
ہیں۔“ سود نے بتایا۔

”ضرغام نجفی؟..... لیلیٰ؟“ میرا منہ ٹھکا۔

خاصی دیر دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا، مگر پورا نہیں، دروازہ کھولنے والا سامنے نہیں آیا۔
”کون ہو تم لوگ؟“ کرخت آواز میں پوچھا گیا۔

”ہم بغداد سے آئے ہیں اور ہمیں ضرغام نجفی سے ملنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”تمہیں کس نے بتایا کہ ضرغام نجفی یہاں مل سکتا ہے؟“ سوال کرنے والے کی آواز میں سختی برقرار رہی۔

”لیلیٰ سے معلوم ہوا تھا۔ اسی نے ہمیں یہاں کا پتا دیا ہے۔“
میرے الفاظ اس چھپے ہوئے آدمی کے لئے غالباً کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ شاید بے اختیار ہو کر ہی وہ سامنے آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں راکفل خفی جس کی ٹال میرے سینے کی طرف ہو گئی۔ اس نے کڑی نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر راکفل کی ٹال سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔
”تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ!“ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیں حکم دیا۔ اب وہ ہمارے عقب میں تھا۔

ہم نے اس آدمی کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے کہنے پر ہم ہاتھ اٹھائے آگے بڑھتے رہے۔ دباڑی سے گزر کر جب ہم صحن تک آئے تو کئی اور مسلح افراد نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ذرا دیر میں وہاں بالکل سی جگہ گئی۔

”ضرغام کو خبر کرو۔“ انہی میں سے کسی نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا۔
”وہ ابھی تو آیا ہے، آرام میں مداخلت پر کیسے خفا نہ ہو!“ وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے۔
”تو پھر ان دونوں کا ہم کیا کریں جو کہتے ہیں کہ لیلیٰ نے انہیں اس پتے پر بھیجا ہے؟“
”ایک عرصے کے بعد تو لیلیٰ کی کوئی خبر ملی ہے۔ ضرغام اس پر بھی ناراض ہو سکتا ہے کہ اسے بے خبر کیوں رکھا گیا!“

کچھ دیر ان مسلح افراد کے درمیان یہی بحث ہوتی رہی۔ پھر وہ ہمیں اس گھر کے ایک بڑے سے کمرے میں لے آئے۔ ایک آدمی، ضرغام کو ہمارے متعلق خبر دینے چلا گیا۔ اس آدمی نے اسی کمرے کے اندرونی دروازے کا رخ کیا تھا۔

لبی ناک اور اونچے قد والے ضرغام نجفی کو آنے میں کچھ ہی وقت لگا۔ اس کے چہرے سے محسوس ظاہر تھی جیسے کسی لمبے سفر سے آیا ہو۔

اس نے تیز نظروں سے ہمارا جائزہ لیا، پھر اچانک ہی بولا۔ ”یہاں کے علاوہ لیلیٰ نے منصور کو اور کہاں کہاں کے پتے بتا دیئے ہیں؟“

”ہم تو کسی منصور کو نہیں جانتے۔“ میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔
”پھر تم یہاں تک کس طرح پہنچ گئے؟“

”ہمیں اگر ایسی خبر ہوتی کہ ایک مظلوم عورت کی مدد کرنے کا انجام یہ ہو گا تو ہم ہرگز یہاں نہ آتے۔ میری بیوی کو بھی تم لوگوں نے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر رکھا ہے۔“

تقریباً ایک گھنٹا ہم نے سود کی کوٹھی میں گزارا، پھر یوسفیہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ ہم نے سودی کے ساتھ آگئے ہی بیٹھنا مناسب سمجھا۔ شہر کی حدود تک میں نے احتیاط برتی، اس کے بعد سر سے رومال ہٹا دیا۔ سود اپنی سیاہ کار میں ہم سے آگے آگے چل رہا تھا۔
”یوں لگتا ہے کہ یہ عورت نجوا بار بار ہمیں آزمائش میں ڈال کر ہمارے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔“ میں نے سودی کو مخاطب کیا۔

”ہم نے خود ہی تو اپنے لئے ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا ہے اے علیالیش!“ سودی نے گہرا سانس بھرا۔ ”وہ تو اپنی دانست میں ہمیں موت کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو، لیکن ہم بچ نکلتے ہیں۔“

”اور پھر ستم یہ کہ اسے مطمئن بھی کرنا پڑتا ہے، ہم زندہ کیسے ہیں! تجھے بھی تو اس نے نہیں بھٹلا ہاں تیرے ساتھ تھوڑی رعایت ضرور کی۔ تیرا امتحان لیتے ہوئے وہ خود بھی اذیت سے گزری اور تجھ سے اپنی گردن دہانے کو کہا۔ میرے معاملے میں اس نے صرف مجھے تکلیف و اذیت کا شکار کیا۔ اسے ابھی فراموش نہیں کہ جب ہم پلٹ کے اس پر وار کریں گے تو کہیں پناہ نہیں ملے گی، لیکن وہ وقت شاید دور ہے۔“ میں سوچتے ہوئے بولا۔

”تُو نے تو لیلیٰ کو دیکھا ہے اے علیالیش! تجھ سے لیلیٰ کا حلیہ جان کر کچھ دیر کو تو ضرغام نجفی چکرا کر جائے گا۔“

”میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے کہ وہ جلد بھوٹ اور بچ کا اندازہ نہ کر سکے۔ تجھے ساتھ لے جانے کا جواز بھی میری سمجھ میں آگیا ہے۔ ہم سودی کی بیان کردہ کہانی ضرغام کو سنائیں گے۔ اس وقت تُو بھی میرے ساتھ تھی کہ جب لیلیٰ نے مجھے اپنے متعلق بتایا۔ میں گویا ضرغام کی یقین دہانی کے لئے تجھے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”یہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن تُو نے ایک بات پر غور نہیں کیا اے علیالیش! مجھے انہی کے بعد نجوا نے الزام ضرغام کے سر تھوپ دیا تھا۔ جھوٹوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے نجوا کے ذہن سے بات محو ہو گئی۔“

”لیکن تجھے ضرغام نے نہیں، بہ قول نجوا اس کے آدمیوں نے دیکھا تھا۔ نجوا کو تُو اتنا سیدھا جان! وہ بھولی نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا اور سودی چپ ہو گئی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق سود نے وہی کیا جو پہلے سے بتا چکا تھا۔ وہ مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر رہی تھا۔ آس پاس ہمیں کوئی اور گھر دکھائی نہ دیا۔

سودی کی سیاہ کار وہاں رک کر جب آگے بڑھ گئی تو سودی نے محرابی دروازے والے اس مکان کے سامنے اپنی کار کو روک لیا۔

ہمیں وہاں کسی اطلاع کھنٹی کا بٹن نہیں ملا۔ کار سے اتر کر میں نے دروازے پر دستک دی۔ سودی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔

پہلے ہی میں چونک اٹھا۔ کار کی رفتار میں نے کم کر دی، اسی کے ساتھ اندر کی بتیاں جلا دیں۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک پولیس وین سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ دو پولیس والوں کو میں نے کار روکنے کا اشارہ کرتے دیکھ لیا۔ میرے لئے یہ امر خلاف توقع ہی تھا۔ ان دونوں پولیس والوں کے قریب میں نے کار کو روک لیا۔

پولیس والوں نے کار کے اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کہاں سے آرہے ہو تم؟“

میں نے دانستہ یوسفیہ کا نام نہیں لیا اور جواب دیا۔ ”ہائل گئے تھے ہم، سیرو تفریح کی غرض ہے۔“ ”بغداد میں کہاں رہتے ہو؟ اور تمہارے ساتھ کون ہے؟“ ایک ہی سانس میں اس نے دو سوال کرتے ہوئے سوی کی طرف دیکھا

”یہ میری بیوی رشیدہ ہے اور ہم ایک زیر تعمیر نئی آبادی منصوبہ کے ایک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”ٹھہرے ہوئے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ نیچے اتر آؤ تم دونوں۔“ پولیس والے نے گویا ہمیں حکم دیا۔

میں نے ان سے الجھنایا ذرا اسی بات کے لئے انہیں اپنے اثر میں لینا ضروری نہیں سمجھا۔ اب تک ان دونوں نے ہمارے ساتھ کوئی بد تمیزی نہیں کی تھی۔ گزشتہ چند روز سے بغداد شہر میں قانون شکنی کی جو وارداتیں ہو رہی تھیں، یہ مجھے اسی کا شاخسانہ معلوم ہوا۔ پولیس کو غالباً اس ضمن میں سخت احکام دیے گئے تھے۔

اپنے ساتھیوں کے آواز دینے پر پولیس وین سے دو افراد اتر آئے۔ انہوں نے مجھ سے کار کی چابیاں لے کر ڈکی بھی کھول کر دیکھی۔ پھر جو پولیس والا مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا، اس نے اپنا سوال دہرایا۔ مجھے پہلے ہی علم تھا کہ عراقی پولیس بہت سخت گیر ہے اور ذرا سا بھی شبہ ہونے پر حراست میں لے لیتی ہے۔

”ہم سلیمانہ کے رہنے والے ہیں اور اپنے ایک دوست منصور کی دعوت پر یہاں گھومنے آئے ہیں۔ اسی نے ہمیں منصور کے اس بنگلے میں ٹھہرایا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اور یہ کار کس کی ہے؟“ پوچھا گیا۔

”ہمارے دوست ہی نے بھجوائی تھی تاکہ ہمیں کہیں آمد و رفت میں دشواری نہ ہو۔“ میں پُر سکون آواز میں بولا۔

”منصورہ کا پتا لکھو! تمہارا دوست بھی کیا ساتھ ہی رہتا ہے؟“ تفتیش میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔

”میرا دوست شاہراہ سیسول کی ایک عمارت میں سکونت پذیر ہے۔“

پھر پولیس والے کے کہنے پر اپنے نام پتے کے ساتھ ہی میں نے منصور کا پتا بھی لکھوا دیا۔ اس کے

”تو یہ تمہاری بیوی ہے! اسے کیوں ساتھ لے کر آئے ہو؟“ ضرغام نے سوی کی طرف ڈٹ اٹھائی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ضرغام کے سوال کا جواب دیتا، وہ اپنے مسلح آدمیوں سے بولا۔ ”اگر انجینی کی تلاشی لو!“ اس نے صرف میری تلاشی کا حکم دیا۔

ایک آدمی اپنے شانے سے رائفل لٹکا کر آگے آیا اور دونوں ہاتھ میرے جسم پر پھیرے۔

”اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ اس آدمی نے پلٹ کر ضرغام کو بتایا۔

”اب تم دونوں اپنے ہاتھ اٹھائے رہنے پر مجبور نہیں۔“ ضرغام نے کہا۔ ”اب میرے سوال کا جواب دو!“

”ضرغام! تم اگر میری بات سن لو تو پھر شاید تمہیں مجھ سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ میرا مقصد اگر کچھ اور ہوتا یا لیلیٰ کے بجائے کسی دوسرے آدمی نے مجھے یہاں بھیجا ہوتا تو میں اپنی بیوی کا ساتھ نہ لاتا۔“ سعود کی ہدایت کے مطابق میں اس لمبی ناک والے کو اپنی باتوں میں الجھائے رہا۔

چند لمحوں ضرغام خاموش رہا۔ اس کی نظریں سوی کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ”بولو، کیا کہنا ہے تمہیں؟“

میں نے دھیمی آواز میں وہی کہانی سناتا شروع کر دی جو سعود نے مجھے سمجھائی تھی۔ اس کہانی پر صرف میں نے لیلیٰ کے طبعی کا اضافہ کر دیا۔

ضرغام کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

”تم نے یہاں آنے کے بجائے پولیس کو مطلع کیوں نہیں کیا؟“ ذرا توقف سے ضرغام نے پوچھا۔

میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”لیلیٰ نے ایسا کرنے سے منع کیا تھا۔“

”منصور ایسے بے خبر محافظوں کے درمیان اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟“ ضرغام بڑبڑایا۔

بات سمجھ میں نہیں آ رہی!

ضرغام کے الفاظ ابھی ختم ہوئے تھے کہ پہلا دھماکہ ہوا اور وہ اچھل پڑا۔ عین اسی لمحے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

”کسی نے بجلی کے تار کاٹ دیئے ہیں۔“ ضرغام چخا۔ ”بچھلنے کمرے کی طرف دوڑو!“

اسی کے ساتھ فضا پے در پے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ میں اور سوی انسانی قالینوں سے باہر آئے ہی چشم زدن میں اس گھر سے نکل گئے۔ فائرنگ کی آوازیں گھر کی عقبی سمت سے آ رہی تھیں۔ کار میں بیٹھے ہی ہم وہاں سے ہوا ہو گئے۔ ہمیں اب اس معرکہ آرائی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جو کام ہمارا سپرد کیا گیا تھا، ہم انجام دے چکے تھے۔ اندھیرے نے ہماری مشکل کو آسان کر دیا تھا۔ مصلحتاً اس گھر سے بیرونی دروازے کی کنڈی میں نے کھول دی تھی۔

تیز رفتاری کے ساتھ ہماری کار بغداد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یوسفیہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

اب ہم انسانی قالینوں میں تھے۔ کار کے اندر کی بتیاں میں نے روشن نہیں کیں۔ کار کی ڈرائیوگ سیٹ پر اب میں بیٹھا تھا۔ سوی بھی میرے برابر والی نشست پر تھی۔ شرکی حدود میں داخل ہونے کا

بعد پولیس والوں نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ کار کے ساتھ انہوں نے میری تلاشی بھی لی تھی اور کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا۔ جرائم پیشہ افراد عموماً رات کے وقت ہی سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ پولیس نے غالباً اسی سبب چیکنگ کے لئے رات کا وقت مناسب خیال کیا ہو گا۔ ممکن ہے سوی میرے ساتھ نہ ہوتی تو وہ مجھے مزید روکتے۔ نہ ہمارے پاس اسلحہ تھا، نہ کار سے کوئی قابل اعتراض شے برآمد ہوئی تھی۔

”خدا جانے جب نجوا کے آدمی واپس بغداد کی طرف لوٹیں گے تو ان پر کیا گزرے گی!“ سوی نے کہی۔

”ان کے پاس تو اسلحہ بھی ہو گا۔“

”پولیس نے شاید شر میں داخل ہونے والے راستوں کی ناکا بندی کر رکھی ہے۔ اس سے ہمیں کا لینا دینا اسے سوی کہ نجوا کے آدمیوں پر کیا گزرتی ہے! وہ شیطان صورت حال سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ پولیس سے بچنے کی کوئی تدبیر انہوں نے پہلے ہی سوچ رکھی ہو گی۔“

منصورہ واپس آکر ہم نے کار کو گیٹ کے باہر ہی کھڑا رہنے دیا اور بیچلے میں آگئے۔

”اے علیالیش! ہم ان انسانی قابلوں میں دیکھے جا چکے ہیں۔ پولیس کے علاوہ ضرغام کے مرگے بھی ہمارے چہرے دیکھ چکے ہیں۔ ہمارے لئے اب یہاں خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ مقرر کے غلام بھی ہم سے بے خبر نہیں۔ ایسی صورت میں اب چہرے بدلنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ سوی نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔

”منصور یا نجوا سے ملاقات کے بعد ہی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“ میں بولا۔ ”جہاں تک میرا قیاس ہے، وہ آج رات ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔“

ایک حد تک میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا۔ منصور یا نجوا نے تو نہیں البتہ سعود نے فون کیا۔ اس وقت تک ہمیں منصورہ آئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔

”تم دونوں اپنا سامان لے کر میری کونٹھی میں آ جاؤ!“ سعود نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ ”زیادہ دیر نہ لگانا! کار تمہارے پاس موجود ہے۔“ مزید کسی گفتگو کے بغیر سعود نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون پر بیٹھا اس نے کچھ پوچھنا بہتر خیال نہیں کیا ہو گا۔

”نجوا کو بھی شاید خطرے کا احساس ہو گیا ہے۔“ ریسور کو کریڈل پر رکھ کر میں نے سوی سے کہل

”اب ہمیں یہاں نہیں رہنا۔“ پھر سعود نے جو کہا تھا بتا دیا۔

منصورہ سے روانگی میں غلت کے باوجود ہم نے کوئی ایسی شے اس بیچلے کے اندر نہیں چھوڑی ہمارے نشان دہی کر سکے۔

ہم اعلیٰ میں سعود کی کونٹھی پر پہنچے تو وہاں منصور بھی موجود تھا۔

”پولیس کی پوچھ گچھ کے نتیجے میں تمہیں میرا نام پتا نہیں لکھوانا چاہئے تھا سدا!“ منصور مجھ سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”تم دونوں کے متعلق پولیس نے مجھ سے تصدیق کی تھی۔“ منصور جواب میں بولا۔ ”تم کوئی بھا

ہم پتہ لکھوا دیتے۔ تمہیں اس قدر ڈرنے کی کیا ضرورت تھی کہ سب کچھ صحیح بتا دیا؟ ایسے معاملات میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔“ منصور کا انداز ایسا تھا جیسے آئندہ کے لئے مجھے سمجھا رہا ہو۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے تھے اور وہاں سعود بھی موجود تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”غالباً پہلی مرتبہ یہاں کی پولیس سے ان کا سامنا ہوا ہے، اسی لئے یہ گھبرا گئے ہوں گے۔“

میں نے بھی بہود کے خیال کی تائید کر دی، پھر منصور سے پوچھا۔ ”یوسفیہ میں کیا رہا؟“

وہ میرے سوال پر مسکرایا، پھر بولا۔ ”تمہارے قدم جہاں پہنچ جائیں، وہاں کیا ہو سکتا ہے! ضرغام کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔“

”کیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا وہ..... وہ مارا گیا؟“

”ظاہر ہے کس طرح بچ جاتا! حملہ اتنا اچانک اور منظم تھا کہ ہمارے آدمیوں نے اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ ہمارے دو آدمی کام آگئے، لیکن وہاں موجود اس کے کسی مرگے کو زندہ نہیں چھوڑ گیا۔ مقرر کے غلاموں نے ہمارے جن بندوں کو پکڑ کر یوسفیہ پہنچایا تھا، انہیں بھی چھڑا لیا گیا۔“ منصور نے تفصیل بتائی۔

”لیکن وہ بغداد کس طرح واپس آئے؟ پولیس نے انہیں.....“

منصور ہنس دیا تو میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ”وہ تو اس وقت محمودیہ میں ہوں گے۔ تم شاید اس علاقے سے واقف نہیں۔ یہ آبادی بغداد اور کوفہ کے درمیان ہے۔ یوسفیہ سے تقریباً سات میل آگے محمودیہ ہے۔ دونوں آبادیوں کے درمیان صنعتی علاقہ ہے۔ تمہیں یہ میں اس لئے بھی بتا رہا ہوں کہ گردنواح سے بے خبر نہ رہو۔ ہمیں پہلے سے اطلاع مل گئی تھی کہ آج رات پولیس، شر کے راستوں کی ناکا بندی کرنے والی ہے۔ صرف میں ہی یوسفیہ سے واپس آیا ہوں، بقیہ افراد کل دن کے وقت بغداد پہنچیں گے۔ جس راستے سے تم بغداد میں داخل ہوئے اسی سے میں آیا تھا۔ وہیں چیکنگ کے وقت مجھے تمہارے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے میرا نام سنتے ہی تمہارے متعلق معلوم کیا تھا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ تم سے کیا غلطی ہوئی ہے!“

میرے استفسار پر منصور نے یہ بھی بتا دیا کہ یوسفیہ میں حملے کی کمان اسی نے کی تھی۔

”تم اگر اس مکان کی طرف آنے والے بجلی کے تار نہ کاٹ دیتے تو شاید ہمارے لئے دشواری پیدا ہو جاتی۔“ میں بولا۔

”ہاں، میں نے مکان کا صدر دروازہ کھلا دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ تم دونوں نکل چکے ہو۔ پھر بھی تم نے بہت تیزی دکھائی۔“ منصور نے مجھے اور سوی کو ستائشی نظروں سے دیکھا، پھر ہم پر جو گزری معلوم کرنے لگا۔ سعود نے اس دوران میں چائے منگوائی۔ ساری روداد سن کر منصور نے اطمینان کا اظہار کیا۔

اسی موقع پر سوی نے منصور سے وہ بات کہہ دی جو ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

”میک اپ کا سامان تمہیں سعود فراہم کر دے گا۔ یہ بھی اس فن میں ماہر ہے۔ ویسے ماسک وغیرہ استعمال کرنے کے لئے زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تمہیں خود بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ محنت

کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کسی کے چہرے سے چہرہ ملنا ہو۔ اگر تم حفاظت کے خیال سے ایسا چاہتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔" منصور نے یہ کہہ کر سعود کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "کیا کہتے ہو تم؟ اس معاملے میں نجوا سے اجازت لی جائے؟"

"یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں کہ نجوا کی رضامندی ضروری ہو۔" سعود نے جواب دیا۔ "ان دونوں کو یہاں سے نکلنے ہوئے بہر حال محتاط رہنا ہو گا۔"

پھر منصور اٹھ گیا اور بولا۔ "یہاں تم دونوں قطعی طور پر محفوظ ہو۔ سعود تمہارا خیال رکھے گا۔" منصور کے رخصت ہوتے ہی سعود نے اپنے دو ملازموں کو بلایا۔ انہوں نے ہمارے سوٹ کیس اٹھائے اور چلے گئے۔ ہمارے لئے وہ اپنی کوٹھی کا ایک کمرہ پہلے ہی منتخب کر چکا تھا جو پہلی منزل پر تھا۔ اوپر جاتے ہوئے میری نگاہ ایک عورت پر پڑی۔ وہ مجھے کچھ پراسرار سی دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔

"یہ میری بیوی آسیہ ہے۔" سعود نے اس عورت سے ہمارا تعارف کرایا۔

اس پر آسیہ پراسرار سے انداز میں مسکرائی پھر بولی۔ "یہ سعد اور رشیدہ ہیں۔"

"آسیہ کو قدیم پراسرار علوم ہے بڑی گہری دلچسپی ہے۔ ان دونوں یہ جنات کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" سعود یہ کہتے ہوئے ہنس دیا۔ "ہمت سی باتوں کا علم اسے خود بہ خود ہو جاتا ہے جس طرح اس نے ابھی ابھی تم دونوں کے نام بتا دیے۔"

اس آدم زادی آسیہ کے متعلق یہ جان کر میں چونکا ہوا گیا پھر ہمت کر کے بولا۔ "جنات کے پیچھے پڑنے کا مطلب نہیں سمجھائیں۔"

"یہ ایسے عمل سکھ رہی ہے جن کے ذریعے جنات کو قابو میں کیا جاسکے۔" سعود نے وضاحت کی۔ "اس نے بڑی قدیم اور نایاب کتابیں اس موضوع پر جمع کر رکھی ہیں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں پوری شدت سے بجنے لگیں۔ اس کوٹھی میں کسی ایسی عورت سے سابقہ پڑ سکتا ہے، مجھے توقع نہیں تھی۔

آسیہ نیچے ہی رہ گئی اور سعود ہمیں اوپری منزل پر لے آیا۔ وہاں کئی کمرے تھے۔ صرف ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اسی میں روشنی بھی تھی۔ ملازم وہاں ہمارے سوٹ کیس رکھ کر جا چکے تھے۔ وہ ایک پُر تعیش خواب گاہ تھی جہاں ضرورت کا سب سامان موجود تھا۔ دو مسیحاں قریب قریب بیٹھی ہوئی تھیں جن کے درمیان ٹیبل پر ایک ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا دکھائی دیا۔ سعود نے کہا۔ "تم اگر چاہو تو سکون کے ساتھ سونے کے لیے اس کا پلگ بھی نکال سکتے ہو۔ کوئی ضروری کال ہو تو تمہیں مطلع کر دیا جائے گا کیونکہ اس کا ایک کنکشن نیچے بھی ہے۔ ملازم کو بلانا ہو تو یہ ادھر ایک بٹن لگا ہوا ہے، اسے دبا دینا۔ کوئی اوپری منزل پر نہیں ہوتا اس لئے یہ بتا رہا ہوں۔"

پھر مزید چند باتیں کر کے سعود چلا گیا۔ اوپری منزل کے لئے غسل خانہ وغیرہ بھی الگ تھا تاکہ وہاں کوئی رہے تو اسے نیچے نہ جانا پڑے۔

کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا۔ کمرے میں ایک طرف آرام دہ کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ میں اور سوی انہی پر آ بیٹھے۔ ابھی تک میری آنکھوں میں آسیہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سوی دھیمی آواز میں بول اٹھی۔ "یہاں آ کر تو ہم برے پھنسے اے علیالیش! وہ آدم زادی آسیہ مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں خطرہ تو ہے یہاں!" میں نے اقرار کیا۔ "وہ ہمیں دیکھ کر بڑے پراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔ تجھ سے میں، زمرس کا ذکر تو کر ہی چکا ہوں۔ اس....."

"تجھے اچانک اس وقت زمرس کیسے یاد آگئی؟" سوی نے میری بات کاٹ دی۔ "کیا اس آدم زادی کا چہرہ اس سے ملتا ہے؟"

"تو غلط سمجھ رہی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ لاہور میں زمرس ہی سے لے کر میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس کتاب کا نام علم تغیر جنات تھا۔ زمرس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کتاب پڑھ کر وہاں دے دوں۔ میں نے وعدہ وفا کیا۔ اگر ایسی ہی کوئی کتاب آسیہ کے پاس ہے تو سمجھ لے کر ہم یہاں محفوظ نہیں۔ اس کتاب میں مجھے ایسے عمل بھی نظر آئے تھے کہ اگر ان کا کوئی عامل ہو تو جنات کو کسی بھی جگہ سے بھاگنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ خبر نہیں آسیہ ان عملیات پر عبور حاصل کر چکی ہے یا نہیں! وجہ یہ ہے کہ ان پر عبور حاصل کرنے کے لئے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔" سوی کو میں نے خطرے کی نوعیت سے آگاہ کر دیا۔

"اس سے تو ہم وہیں منصورہ کے بنگلے میں ٹھیک تھے۔ یہ نئی بلا خواہ مخواہ ہمارے اوپر منزلانے لگی!"

"آسیہ کو اگر ہم پر شک ہوا جمعی تو وہ ہمارے لئے خطرہ بنے گی۔ ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ عامل ہے یا نہیں!" میں نے سوی کو دلاسا دیا۔ پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس تدبیر سے میں نے سوی کو بھی آگاہ کر دیا۔ فی الحال بچاؤ کی یہی ایک موبہم سی صورت تھی۔ اس کا انحصار آسیہ کے عامل نہ ہونے پر تھا۔ یوں وہ گویا بے سپر ہو جاتی۔

"ہم آج ہی رات یہاں آئے ہیں۔" سوی نے اختلاف کیا۔ "شک ہم ہی پر ہو گا۔ ابھی رہنے دے، کل رات دیکھیں گے۔"

"تیری مرضی کل سہی۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ فوری طور پر تدارک ہو جائے تو اچھا ہے۔" "چل اب سو جاتے ہیں کہ خاصی رات گزر چکی ہے۔ دروازہ بند ہی کر لے تو ٹھیک ہے۔" سوی نے مشورہ دیا۔

"میں نے دانستہ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا کہ کوئی ادھر آئے تو پتا چل جائے۔" میں یہ کہہ کر اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر کمرے کی روشنی بھی بجھا دی۔ ٹیلی فون کا پلگ نکالنا بھی میں نہیں بھولا۔ ہم لیٹ تو گئے، مگر نیند آنکھوں سے دور تھی۔

ہمیں لیٹے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو معاً میرے اعصاب تن گئے۔ یوں لگا جیسے کوئی دبے پاؤں چل

رہا ہو۔ پھر کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

”ہم جن زاد“ آدم زادوں سے اور آدم زاد ہم سے ڈرتے ہیں۔ میری ہی طرح ساری بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

”کوئی اوپر ضرور آیا ہے۔“ ساری نے سرگوشی کی۔

”لیکن سود نے تو بتایا تھا کہ اوپری منزل پر کوئی نہیں رہتا۔“ میں بھی بہت دھیمی آواز میں بولا۔

”کسی کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔“ ٹھہر‘ میں جا کر دیکھتا ہوں۔“

میں انسانی قالب سے باہر آ گیا۔ ساری کو میں نے اسی کمرے میں رہنے کی تاکید کر دی۔

خواب گاہ سے نکلے ہی مجھے ایک جانب روشنی دکھائی دے گئی۔ اس کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ سامنے کے رخ پر کونے میں بنے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں چونک اٹھا۔ ایک جانب آرام کرسی پر آئیہ مجھے کسی کتاب کا مطالعہ کرتی نظر آئی۔ اس کمرے کی الماریوں میں کتابیں بھری پڑی تھیں۔

آئیہ کے عقب میں پہنچ کر میں نے کتاب کے صفحوں پر نظر ڈالی۔ دائیں صفحے پر ایک ذیلی سرخی عربی زبان میں لکھی تھی۔ سرخی پڑھتے ہی میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ”جنت کو پہچاننے کے طریقے۔“ اور اک ماسوائے حواس کے بغیر جنت کی پہچان بہت مشکل ہے۔ آگے اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔ ہاں وہ جنت کہ جو بنی آدم کی شکل میں ہوتے ہیں‘ ان کی پہچان انگلیوں اور آنکھوں سے ممکن ہے‘ لیکن کوئی عامل ہی انہیں پہچان سکتا ہے۔“

میں نے کتاب سے نگاہ ہٹائی کہ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجھے تو اس پر تشویش تھی کہ آئیہ کو رات کے وقت وہ کتاب دیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی! اسے پھیرے بغیر میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور انسانی قالب اپنا لیا۔

”وہ آئیہ ہے۔“ میں نے ساری کو بتایا۔ ”مطالعہ گاہ اوپری منزل پر ہے۔ دبے پاؤں اس کا یہاں سے گزرتا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کہیں ہماری آنکھ نہ کھل جائے۔“ میں تاویل دے کر ساری کے ساتھ گویا خود کو بھی مطمئن کر رہا تھا۔

”مگر مطالعے کا یہ کون سا وقت ہے؟“ ساری بولی۔

”کوئی نہ کوئی تجسس اسے ضرور ہے جو اس وقت وہ ایک خاص کتاب نکال کر پڑھنے آئی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا‘ کچھ کتابیں ہوں گی‘ وہاں تو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ ایک طرح سے اچھا بھی ہے۔ جنت کے متعلق کچھ کتابیں وہاں سے غائب ہو گئیں تو میری تدبیر کارگر رہے گی۔ فوراً شاید ان کی کمی محسوس نہ ہو۔“

”خیال ہے تیرا۔“ ساری نے تردید کی۔ ”اس کا شوہر بتا چکا ہے کہ ان دنوں وہ جنت کو قابو میں کرنے کے عمل سیکھ رہی ہے۔ تو پھر یہ کتابیں اس کے مطالعے میں ہوں گی۔ تیری تدبیر کے مطابق اگر انہیں غائب کر دیا گیا تو یہ بات چھپ نہ سکے گی۔ اوپری منزل پر ہمارے سوا اور ہے بھی کون! یہاں ہماری

آمد کے بعد ان کتابوں کا غائب ہو جانا آئیہ اور اس کے شوہر کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے گا۔ اس وقت وہ کس خاص کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی؟“

”کتاب کا نام تو میں نہیں پڑھ سکا البتہ جو صفحات اس کے زیر مطالعہ تھے‘ ان پر نگاہ ضرور پڑی۔ وہ جنت کو پہچاننے کے طریقے پڑھ رہی تھی۔“

”تب تو اسے یقیناً ہم پر شک ہو گیا ہے۔“ ساری نے چونک کر کہا۔

وہ رات اسی تذبذب میں گزری اور ہم ٹھیک طرح سو نہیں سکے۔ آئیہ کو اپنے اثر میں لینے یا اس کے ذہن کو پڑھنے کا خطرہ بھی میں نے مول نہیں لیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دبے قدموں ہی واپس چلی گئی تھی۔ اس کو بھی کی جدید تر سہولتیں بھی ہمارے لئے حیرانی ہی کا سبب تھیں۔

دوسرے روز صبح خلاف توقع جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو آئیہ بھی ہمارے کمرے میں آگئی۔ ہم اس سے نظریں چرانے لگے۔

”نئی جگہ ہو تو ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔“ آئیہ کہنے لگی۔ ”رات کو شاید سو نہیں سکے آپ لوگ!“

”نیں نیند تو آگئی تھی۔“ میرے بجائے ساری بولی۔ ”ہاں یہ ہے کہ ذرا دیر سے آنکھ لگی۔“

”میں بھی آئی تھی رات کو اوپر!“ آئیہ نے چھپایا نہیں۔ ”خیال رکھا تھا کہ آپ کی آنکھ نہ کھلے۔“

دراصل کتب خانہ میں ہے اور مجھے رات کے وقت مطالعے کا شوق ہے۔ سود سو جاتے ہیں تو میں اوپر آجاتی ہوں۔ اس سے آپ لوگوں کو تو کوئی زحمت نہیں ہوگی ورنہ آج کل جو کتابیں پڑھ رہی ہوں‘ نیچے لے جاؤں؟“

”جی نہیں‘ ہمیں کیوں زحمت ہوتی! آپ کا گھر ہے جب چاہیں جہاں چاہیں آئیں جائیں۔“ ساری نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”سود میری عادت سے واقف ہیں۔ دراصل وہی مجھ سے اس سلسلے میں معلوم کر رہے تھے۔ میں نے سوچا‘ خود آپ سے پوچھ لوں۔“

میں اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا۔ وہ غالباً اپنے شوہر کے ایماء پر ہمارے پاس آئی تھی۔ اس وقت آئیہ کا رویہ گزشتہ رات سے قطعی مختلف تھا۔ سود نے اسے شاید بتا دیا ہو گا کہ اس کے نزدیک ہماری بڑی اہمیت ہے۔ اس دوران میں ہم نے ناشتا کر لیا اور ملازم خالی برتن رُے میں رکھ کے لے گیا۔

آئیہ ہمارے پاس سے اٹھنے ہی والی تھی کہ سود بھی وہیں آگیا اور اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ ”تو کیا طے ہوا؟“

”ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ آئیہ نے بتایا۔

”اخلاقاً کہہ رہے ہوں گے۔“ سود ہنس کر بولا۔ ”میرا کہا مانو تو اپنے جنت کو نیچے ہی لے جاؤ۔“ کتابوں کو ہی اس نے ”جنت“ کہا تھا۔

”ایسا کر لیتی ہوں تاکہ تمہارے ممان آرام سے رہ سکیں۔“ آئیہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”پھر

تم جلدی لائٹ آف کرنے کو نہ کہنا!

”نیچے اور بھی تو کمرے ہیں، وہاں اپنا شوق مطالعہ پورا کر لیتا!..... ویسے ایک بات بتادوں تمہیں، کوئی جن دن تمہارے ہتھے چڑھے گا نہیں۔“

میں اسی لمحے آسیہ نے ہم دونوں کی طرف پراسرار انداز میں مسکرا کر دیکھا اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ میں ایک مرتبہ پھر چکرا کر رہ گیا۔ سوی بھی سہم ہی گئی۔

”سعد! تم نے ابھی تک ٹیلی فون کا پلگ نہیں لگایا! منصور کا فون آیا تھا۔ اس نے تمہارے لئے پیغام دیا ہے کہ آج دوپہر کے بعد آئے گا۔“ سعد نے بتایا۔

”ہاں میں پلگ لگانا بھول ہی گیا۔“ میں یہ کہہ کر اٹھا اور پلگ لگا دیا۔

”میں آج کچھ ایسا بندوبست کرا دوں گا کہ تمہاری کال ہو تو کھٹنی بجے ورنہ نہیں۔“ سعد بولا۔ ”کیوں کہ میرے فون تو آتے ہی رہتے ہیں، تم خواہ مخواہ بار بار ریسپورڈ اٹھاتے پھر دگے۔ کہیں جانا تو نہیں تمہیں؟ چاہو تو دوپہر تک گھوم پھر آؤ۔ میں میک اپ باکس منگوا دیتا ہوں۔ مجھے بھی جانا ہے ذرا دوپہر سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔“

میں کچھ سوچ کر اس پر فوراً رضامند ہو گیا۔ سعد نے ایک ملازم بلا کر میک اپ باکس منگوا دیا اور میرے حوالے کر دیا۔

”ابھی تو خیر نہیں، پھر کسی وقت تمہیں میک اپ کرنا سکھاؤں گا۔ اس میں خواتین کے لئے بھی کئی ماسک ہیں۔ یہ خصوصی طور پر باہر سے بنوائے گئے ہیں۔ فی الحال ان سے کام چل جائے گا۔ اس باکس کو ذرا سنبھال کر رکھنا!“ سعد نے باکس کھول کر کئی ماسک دکھائے۔

”تمہارے ملازمین کو تو ہمارے بدلے ہوئے چہرے دیکھ کر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں کیسے پہچانیں گے؟“

”مادی ہیں وہ اس کے۔ تمہیں جانتے بھی تو دیکھیں گے نا وہ!“ پھر سعد نے مجھ سے اس کاری چاہیاں لے لیں جس میں بیٹھ کر ہم وہاں آئے تھے۔ ”تمہارے استعمال میں اب دوسری کار رہے گی، اس کی چاہیاں رکھ لو۔“ سعد نے ایک اور کی رنگ مجھے دے دیا۔ ”نیچے پورچ میں سفید رنگ کی یہ کار کھڑی ہے۔“

سعد نے ہم سے نہیں پوچھا کہ ہمارا ارادہ کہاں جانے کا ہے اور اٹھ کر چلا گیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ نجواب ہم پر اعتماد کرنے لگی ہے۔“ سوی نے کہا۔

”اس عورت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ایک ماسک اٹھایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سوی نے بھی میری تقلید میں یہی کیا۔ اوپری منزل پر اب کوئی نہیں، اس اطمینان کے بعد ہم نے ماسک اتار کر تو الگ رکھ دیے اور انہی کے مطابق اپنے چہرے تبدیل کر لیے۔ دونوں ماسک اب میرے کونٹ کی جیب میں تھے۔

”اب تک ٹوٹنے یہ نہیں بتایا کہ چلنا کہاں ہے!“ سوی نے معلوم کیا۔

”یہ بھی بتا دوں گا، یہاں سے تو نکل چل!“ میں بولا اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

سعد کے ملازموں نے ہمیں دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ آسیہ ہمیں نظر نہ آئی۔ ہم عمارت سے باہر آگئے۔ سعد کی سیاہ کار وہاں نہیں تھی۔ جس سفید کار کی چاہیاں سعد نے ہمیں دی تھیں، ہم اس میں بیٹھ گئے۔ وہ کار بھی دکھائی نہ دی جو گزشتہ شب ہمارے استعمال میں تھی۔

کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر میں، سوی سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے سوچا کہ اس سہلت سے فائدہ اٹھانا چاہئے، مگر پہلے یقین ہو جائے کوئی تعاقب میں تو نہیں!“

”کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو؟“ سوی نے پوچھا۔

”نجوا نے ہمیں اپنے ہی محالوں میں الجھا رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں کم ہی یہ موقع ملتا ہے کہ اپنے پراسرار دشمنوں کی راہ پر لگ سکیں۔ جب آج سعد نے ہمیں گھونٹے پھرنے کا مشورہ دیا تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس طرح کم از کم ایک بات تو واضح ہو ہی جائے گی۔“ پھر میں، سوی کو بتانے لگا کہ میرا ارادہ کیا ہے! اس کے ساتھ میری نگاہ عقبن آئینے پر بھی تھی۔ میں نے یرموک کی آبادی کا رخ کیا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔

یرموک ہی کے علاقے میں چڑیا گھر بھی تھا۔ اس کے سامنے کار کھڑی کر کے ہم اندر چلے گئے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ بھی تھا کہ اگر کسی طرح ہماری نگرانی کی بھی جاری ہو تو یہی سمجھا جائے کہ ہم یرموک سے تفریح کر رہے ہیں۔ بدلے ہوئے چہروں کے باوجود اس کار کے نمبروں سے نجوا کے آدمی ہمیں پہچان سکتے تھے۔

سرسبز شاداب اور وسیع چڑیا گھر میں کئی گوشے ایسے تھے کہ جہاں سے غائب ہونا ہمارے لئے آسان ہوتا۔ یوں بھی صبح کے وقت وہاں بھیڑ کم تھی۔ ایک ایسے ہی گوشے میں آکر جہاں کوئی نہیں تھا، ہم اپنی اصل پر لوٹ آئے۔ انسانی جسم ہمارے لئے لباس کی طرح تھے۔ یرموک کے اس چڑیا گھر کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہم بغداد کے صرافہ بازار میں تھے۔ یہی وہ جگہ تھی کہ جہاں سے منقرع کا ایک غلام اپنی دانست میں مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ یہ راصل تھا کہ جو نجوا کے ہاتھوں مارا گیا۔

وہ دکان میں نے پہچان لی جہاں سونے کے ظروف ایک ایئر بیگ میں رکھ کر لایا تھا۔ اس دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار کے ذہن پر میری توجہ مرکوز ہو گئی۔ جلد ہی مجھے میرے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اسی سے مجھے صرافہ بازار کے دو اور بڑے دکان داروں کا علم ہوا۔ میں نے ان کے ذہنوں کو بھی ٹٹولا۔

بازار میں وہی تین ایسی بڑی دکانیں تھیں کہ میں ان قیمتی ظروف کا وہیں سودا کرتا۔ ان تینوں ہی سے منقرع کے غلام عدنان کے روابط تھے۔ اس کا کوئی بھی آدمی ایئر بیگوں میں ان دکان داروں کو ظروف

یا دیگر سونے کی اشیا پہنچا کر چلا جاتا۔ دکاندار انہیں گلا کر دوسری شکلوں میں ڈھال دیتے۔ بازار کے بھاڑ سے کچھ کم پر وہ دکان دار سونے کی قیمت عدنان کو خود ہی جا کر دے آتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصے سے جاری تھا۔

نچو کو بھی یقیناً اس کا علم ہو گا۔ حقیقت کا سراغ لگانے اور عدنان تک پہنچنے کے لئے اس نے مجھے استعمال کیا اور کامیاب رہی۔

ان نایاب سونے کی اشیا کو اگر انہی کی اصل شکل میں رہنے دیا جاتا تو یقیناً یہ بات راز نہ رہتی۔ میں نے درمیانی کڑیاں جوڑ لیں۔

صرافہ بازار سے نکل کر ہم دوبارہ یرموک کے چڑیا گھر میں آگئے اور انسانی قالب اپنا لئے۔ آدم زادوں سے الگ تھلگ ٹہلنے ہوئے میں نے تازہ معلومات سے سوی کو آگاہ کیا تو وہ کہنے لگی۔ ”ایسی نادر اشیا کی یہ ناقدری حیران کن ہے۔“

”لیکن اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ عراقی یا مصری حکومت کے علم میں یہ بات آجانا ان کے لئے شاید خطرناک ثابت ہوتا۔ اس سے قطع نظر یہ عقدہ تو کھل ہی گیا کہ مقرر کے غلام مصر سے سونا اسمگل کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ یہ سونا قدیم اہراموں ہی سے نکالا جا رہا ہے۔“

”مگر اس کے لئے صرف بغداد ہی کیوں؟“ سوی نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہمیں یہ کھیل کھیل رہے ہوں۔ یہاں سے وہ ایران، ترکی اور دیگر ممالک تک بھی بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ عراق کی جغرافیائی صورت حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس ملک سے کئی ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے اسے مرکزی حیثیت دے رکھی ہے۔ جہاں قوانین زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ ایسے کسی ملک کے بارے میں یہ گمان کم ہی کیا جاتا ہے کہ وہاں نی سرگرمیاں جاری رکھی جاسکتی ہیں۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”تو نے جو مقرر کی روح کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس کے پردے میں کوئی کافر جن زاد ہو سکتا ہے تو اسے اس معاملے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”مجھے تو خبر ہے آدم زاد کتنے لالچی ہوتے ہیں! دولت و اقتدار ان کی کمزوری ہے۔ انہیں راہ راست سے ہٹانے اور اپنا مطیع بنانے کے لئے یہ لالچ دیا جاسکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خود کو مقرر کا غلام کہنا اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ محض قیاس آرائیاں، حقیقت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔“

”تو بھی جانتا ہے اور مجھے بھی خبر ہے کہ جنات مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں آتش پرست، یودی، عیسائی، بت پرست اور اہل ایمان بھی شامل ہیں۔ فطری طور پر انہیں اپنے ہم عقیدہ آدم زادوں سے لگاؤ ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مقرر کی روح کا ڈھونگ رچانے والا کوئی کافر جن زاد ہے، یعنی وہ اولادِ اہلس میں سے ہے تو پھر اہل ایمان کا وہ دشمن ہی ٹھہرا۔ عراق اور آس پاس جتنے ملک ہیں اور خود مصر میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ میری مراد آدم زادوں سے ہے۔ سوا ان آدم زادوں کو

بھگانا اور کفر پر مائل کرنا، اہل ایمان کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ اس پر بھی غور کرنا“ سوی نے مجھے مشورہ دیا۔

”اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔“ میں، سوی کی تائید میں بولا۔

میں اور سوی دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے، پھر واپس کار میں آ بیٹھے۔ کھلی فضا میں ارد گرد سے آگاہ رہنا زیادہ آسان ہوتا ہے، پھر بھی ہم نے بت احتیاط سے کام لیا کہ کوئی آدم زاد ہماری باتیں نہ سن لے۔

یرموک سے اعظیہ کی طرف جاتے ہوئے مجھے طلال بے اور نجیب کا خیال آیا۔ ان دونوں کو میں نے بغداد ہی کے ایک گھر میں دیکھا تھا۔ وہ مصر جانے کے منصوبے بنا رہے تھے وقت ہوتا تو ہم ادھر بھی جاتے، مگر اب وہ پھر ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ ابھی بغداد ہی میں تھے کہ مصر جا چکے تھے!

میں اسی سوچ بچار میں تھا کہ سوی بول اٹھی۔ ”ابھی آسیہ کے متعلق کچھ پتا نہیں چل سکا اے علیائش! کبھی تو وہ بہت پراسرار لگتی ہے اور کبھی ایک عام سی آدم زادی۔“

”میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور کامل نہیں ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ کامل دھال ہوتی تو اسے کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی پھر بھی اسے ہمارے متعلق تجسس یقیناً ہے۔ اسے ہم پر کوئی شبہ ہے بھی تو یہ شبہ یقین میں نہیں بدلا۔ جنات کے بارے میں جو کتب اس نے جمع کی ہیں، انہیں وہ مطالعہ گاہ سے لے گئی ہے۔ آج رات اگر موقع ملا تو میں ان کتابوں کو دریا برد کردوں گا۔ یوں بھی آدم زادوں کے پاس ایسی کتابیں نہیں ہونی چاہئیں۔“

”تیری دلیل جان دار لگتی ہے۔ کچھ آدم زادوں کو پراسرار بننے کا شوق بھی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خود کو دوسروں سے برتر ظاہر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ آدم زادی بھی انہی میں سے ہو۔ تھوڑا بہت علم اس نے شاید حاصل کر لیا ہے اور مزید کی جستجو میں ہے۔ اس میں برسوں لگ جاتے ہیں، حصول علم کوئی آسان تو نہیں! وہ بھی ایسا علم ہو عالم نہ ہو۔ اس کے لئے کسی استاد کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو مختلف رموز و نکات سمجھا سکے۔ آسیہ کو یہ سہولت بھی میسر نہیں۔“ سوی مطمئن سی ہو گئی۔

”دیوے بھی ہمیں طویل عرصے تک اس کو ٹھہریں نہیں رہنا جو آسیہ سے خوف کھائیں۔ ہمیں بس یہی تو اندیشہ ہے ناکہ وہ کہیں ہماری حقیقت نہ کھول دے، سو یہ اتنی جلدی ممکن نہیں۔ اسے جب پورا یقین ہو جائے گا تبھی زبان کھولے گی۔“ میں نے یہ کہہ کر سوی کو مزید اطمینان دلایا۔

جب ہماری کار سعودی کو ٹھہریں میں داخل ہوئی تو ہم قالب بدل چکے تھے۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ ہمارے چہرے اجنبی رہتے۔

سعود کی سیاہ کار ہمیں کمزری نظر آگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہم سے پہلے واپس آچکا ہے۔ اسی کے پیچھے میں نے اپنی کار روک لی۔

ذرا ہی دیر میں جب ہم اوپری منزل پر جانے کے لئے زینے کی طرف بڑھ رہے تھے تو نہ جانے کدھر سے آسیہ نکل کر ہمارے سامنے آگئی۔ ہم رک گئے۔

”آپ لوگ کون سی خوشبو استعمال کرتے ہیں؟“ آسیہ نے خلاف توقع سوال کیا۔

”ہم جب پاکستان گئے تھے تو وہاں سے ایک عطر لیا تھا۔“ میں بولا۔ ”وہی اب تک ہمارے لباسوں میں بٹا ہوا ہے۔ کئی بار کپڑے دھلنے پر بھی وہ خوشبو نہیں گئی۔“ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کی مراد ہمارے وجود کی مخصوص خوشبو سے ہے۔ وہ پہلی آدم زادی تھی کہ جس نے یہ خوشبو محسوس کر لی تھی۔ اس کے متعلق آسیہ نے کتابوں میں ہی پڑھا ہو گا۔

”میں نے یہ اس لئے پوچھ لیا کہ ایسی خوشبو کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔“ آسیہ نے بات برابر کرنا چاہی، پھر بڑی ہوشیاری سے پوچھا۔ ”وہ عطر تو ہو گا آپ کے پاس؟“

”جی نہیں۔“ میں نے پُر سکون آواز میں جواب دیا۔ ”یہاں نہیں ہے۔ ہم اسے سلیمانہ ہی میں بھول آئے ورنہ.....“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بول اٹھی، پھر کما۔ ”سعود لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ میں نیچے ہی کھانا لگوا دیتی ہوں، آپ لوگ آجائیے گا۔“

”شکریہ خاتون!“ میں یہ کہہ کر سوی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اوپر کمرے میں داخل ہوتے ہی سوی بولی۔ ”یہ آدم زادی تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئی ہے!“

”روزہ کتابوں میں غنی غنی باتیں جنت کے متعلق پڑھ کر ہماری جان کھائی رہے گی۔“ میں دیر سے سے ہنس دیا۔ ”نہ اس کے پاس کتابیں ہوں گی نہ یہ ہمیں تنگ کرے گی۔“

سعود کے ایک ملازم نے جب ہمیں آکر بتایا کہ کھانا لگا دیا گیا ہے تو ہم نیچے کھانے کے کمرے میں آگئے۔

”کہاں کہاں گھوم پھر آئے؟“ سعود نے اپنے لئے ایک ڈش سے کھانا نکالتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، اچانک آسیہ کہنے لگی۔ ”میں بتا سکتی ہوں کہ یہ کہاں گئے تھے!“

میں اس پر چونکا، لیکن سعود پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”ان مہمانوں کو تو تم بخش ہی دو، حیران کرنے سے! اس کے لئے میں ہی بہت ہوں۔“

”سارا زمانہ بھی میرے علم کا قائل ہو گیا تو تم اسی طرح ہنستے رہو گے۔“ آسیہ نے اپنے شوہر سے کہا۔

”اچھا تو پھر یہ بتاؤ، میں کہاں گیا تھا؟“

”تمہارے بارے میں پتا نہیں لگایا میں نے ورنہ بتا دیتی۔“ آسیہ نے جواب دیا۔

”تو ان کا پتا لگانے کی تمہیں کیا پڑی تھی؟“ اس مرتبہ سعود سنجیدہ دکھائی دیا۔ ”آئندہ ایسا نہ کرنا! اپنے شوق اپنی حد تک رکھا کرو۔“

”چھوڑیں بھی، اس سے کیا فرق پڑ گیا۔“ سوی نے مداخلت کی۔ ”ہم خود بتائے دیتے ہیں کہ چڑیا گھر گئے تھے۔“

”یہی تو میں بتانے والی تھی۔“ آسیہ کا شوق خود نمائی دبا نہ رہ سکا۔ پھر بھی اس کا چہرہ بھگ سا گیا۔

اپنے اس لئے کہ وہ ہمیں حیران نہ کر سکی۔ ”بتا بھی دیتیں تو کیا کمال ہو جاتا! کھانا کھاؤ۔“ ”مسعود بولا، کھانا کھانے کے بعد ہم آرام کرنے اور پری منزل پر اپنے کمرے میں آگئے۔ میں نے سوی سے کہا۔ ”تم نے یہ کہہ کے متوف پر پانی پھیر دیا۔“

”ہاں وہ تو جیسے چنے جھاڑ کر ہمارے ہی پیچھے پڑ گئی ہے۔“ سوی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”شام سے کچھ پہلے منصور کے آنے کی خبر ملی تو ہم نیچے نشست گاہ میں آگئے۔ سعود پہلے ہی منصور کے ساتھ وہاں بیٹھا تھا۔ منصور کے شانے سے ایک کیرا بھی لٹکا ہوا نظر آیا۔

”اپنے جواز (پاسپورٹ) ساتھ لائے ہو؟“ منصور نے ہمارے بیٹھے ہی دریافت کیا۔

”نہیں، وہ تو سلیمانہ ہی میں ہیں۔“ میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔ ”کیوں ان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”اگر یہاں نہیں ہیں تو کیا ہوا؟“ نئے بن جائیں گے۔“ سعود درمیان میں بول اٹھا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا تو منصور نے کہا۔ ”نجا کا حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس یہاں جواز نہ ہوں تو فوری طور پر ہٹا لئے جائیں۔ اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم۔ میں اسی لئے فارم وغیرہ ساتھ لے کر آیا تھا۔“ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر فارم نکالے اور میری طرف بڑھا دیے۔ ”ان کی خانہ پری کر دو۔ تم دونوں کی تصویریں بھی میں اسی وقت کھینچ لوں گا، کیرا اسی لئے ساتھ لے کر چلا تھا۔“

پاسپورٹ کے لئے اپنا اور سوی کا فارم بھرتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ نجا یقیناً ہمیں اپنے ساتھ مصر لے جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ ممکن ہے منصور اس سے ابھی بے خبر ہو، لیکن میں نادانف نہیں تھا۔ نجا کو اپنی پراسرار شیطانی قوتوں سے دشمنوں کے ارادے کا شاید علم ہو گیا تھا۔

ہم نے دستخط کر کے فارم منصور کے حوالے کر دیے تو وہ ہماری تصویریں کھینچنے لگا۔ کیرا کسی مغربی ملک کا معلوم ہوتا تھا۔

بغداد سے شاید اب ہم رخصت ہونے والے تھے کہ جس کا نام کبھی باغ داد تھا۔ میرے علم کے مطابق یہ ایک باغ تھا۔ یہاں ہر پھنٹے ایک حکمران نو شیرواں عادل آکر مظلوموں کی فریاد سنتا تھا۔ کثرت استعمال سے الف ساقط ہو گیا اور لوگ اسے بغداد کہنے لگے۔ اصطلاحاً بغداد کو خراب اور کنہ کے معنی میں بھی لکھا گیا ہے اور کنایہ شراب کے پیالے سے بھی ہے۔

قیاس اب یہ تھا کہ ہمیں مصر کا سفر درپیش ہے۔ مصر کے ایک معنی دو چیزوں کے درمیان حد کے بھی ہیں۔ اس سے میں نے گویا یہ جانا کہ غالباً اب خیر و شر کے درمیان حد بندی کا وقت آنے والا ہے۔ یہی لفظ عربی زبان میں ہر چیز کی تیزی کے لئے بھی آتا ہے اور مصر کا ہی ایک مطلب تلوار یا شمشیر بھی ہے۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ منصور نے بتایا۔ ”نجا شاید آج رات تم سے ملے۔ ممکن ہے، وہ تمہیں کہیں بلوا لے یا خود آکر مل لے۔ تم کہیں جانا مت!“

”ہمیں کہاں جانا ہے! سعود کے ایما پر آج صبح سے دوپہر تک گھوم پھر آئے تھے۔ یہ اچھا ہو گیا، ہم آرام سے گھومے۔“

ہمارے ساتھ چائے پینے کے بعد منصور چلا گیا اور ہم اٹھ کر ادبزی منزل پر آ گئے۔ اپنے کمرے میں آئیہ کو دیکھ کر ہم دونوں ہی چونک اٹھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر اس نے کہا ”معاف کیجئے گا کہ میں بغیر اجازت آپ کے کمرے میں آ گئی۔ آپ لوگوں نے اس پر برا تو نہیں مانا؟“

”جی نہیں۔ ہمیں تو آپ کی آمد سے خوشی ہوئی ہے۔“ سوئی نے جب یہ الفاظ ادا کئے تو آواز اور الفاظ کا ساتھ نہ دے سکی۔ آئیہ کی بلا سبب آمد سے وہ خوش نہیں تھی۔

”میں نے جب یہ معلوم کر لیا کہ جو صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، اٹھنے والے ہیں تو یہاں چلا آئی۔ سود مجھے پہلے ہی بتا چکے تھے کہ انہیں کہیں جانا ہے۔ سو یہ وقت مجھے آپ لوگوں سے گفتگو کے لئے مناسب معلوم ہوا۔“ آئیہ یہ کہہ کر جانے کیوں مسکرانے لگی۔

ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر آ بیٹھے۔ پھر میں ہی بولا۔ ”جی فرمائیے!“

”جنت کے وجود پر تو یقین ہو گا آپ کو؟“ آئیہ نے میری آنکھوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”بالکل یقین ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا گفتگو کرنا چاہتی ہیں؟“

”میں نے پڑھا ہے کہ بہت سے جنت، آدم زاد بن کر بھی ان کے درمیان رہتے ہیں۔“

”ممکن ہے رہتے ہوں۔“ میں اسے ٹالتا رہا۔ ”جنت کے متعلق مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں۔“

”میرا تو خیال یہ تھا کہ آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔“ وہ پھر اپنے مخصوص پراسرار انداز میں مسکرائی۔

”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟“ اس مرتبہ سوئی نے اس سے سوال کیا۔

”اس کا اندازہ مجھے اپنے علم سے ہوا۔“ آئیہ کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ”آپ دونوں اگر چاہیں، مجھے بہت سی راز کی باتیں بتا سکتے ہیں۔“

پانی اب سر سے گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے اسی لئے نتائج کی پروا نہیں کی اور اس آدم زادی کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اس نے مزاحمت تو کی مگر قابو میں آئی گئی۔ اب وہ میرے ہر سوال کا جواب دینے پر مجبور تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا مقصد کیا ہے؟“

”تم دونوں کی حقیقت جانتا۔“ آئیہ محرزہ آواز میں بولی۔

”لیکن کیوں؟ تمہیں یہ جتنو کس لیے ہے؟“

”مجھے تم پر شک ہے۔ تمہیں دیکھتے ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ جو ظاہر کر رہے ہو، وہ نہیں۔“

آئیہ خواب کے سے عالم میں بولتی رہی۔ ”میں نے کتابوں میں ان جنت کے متعلق پڑھا تھا جو آدم زادوں میں رہتے ہیں۔ جو علامات لکھی تھیں، ان کی پرچھائیاں سی مجھے محسوس ہوئیں۔ تبھی سے میں اس کھوج میں ہوں۔“

”تم نے اپنے شوہر سود یا کسی اور شخص سے تو اس شے کا اظہار نہیں کیا؟“

”ابھی نہیں۔ حقیقت جان لینے کے بعد ہی میں کچھ کہتی۔“

”تمہارا شک قطعی غلط ہے۔ اسے تم اپنے ذہن سے جھٹک دو!“ میں نے اسے حکم دیا۔ ”آئندہ

بھی تم ہماری جتنو میں نہیں رہو گی!“

”ہاں میرا شک غلط تھا۔ میں اسے اپنے ذہن.....“ وہ میرے ہی کہے ہوئے الفاظ دہرانے لگی۔

”تمہارے پاس جنت کے موضوع پر جو کتابیں ہیں، انہیں آج ہی جلا دو گی!“

اس نے میرے دوسرے حکم کی تعمیل کا بھی اقرار کر لیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔

”مجھے..... مجھے کیا..... کیا ہو گیا تھا ابھی؟ شاید اونگھ سی آئی تھی۔“ وہ بوڑھائی۔

”آپ کو آرام کی ضرورت ہے خاتون! کچھ تھکی ہوئی سی معلوم ہوتی ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا تو میں چلتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا ہے۔“ آئیہ یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس ایک بلا سے تو جان چھوٹی!“ سوئی نے طویل سانس لیا۔ ”جب تو نے اسے اپنے اثر میں لیا تو میں ڈر رہی تھی کہ بات بگڑ نہ جائے!“

”اور تو نے اس دوسری بلا کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں جو آج ہی رات ہم سے ملنے والی ہے اے سوئی!“ میرا اشارہ نجوا کی طرف تھا۔

”اس بلا کو تو خیر ہم نے خود ہی ساتھ لگا رکھا ہے۔ کبھی اس کا آخری دن بھی آ ہی جائے گا۔“

”وہ ہمیں اپنی دانست میں مصر ساتھ لے جانے پر مجبور کرے گی۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔

اس سے پہلے یہ تو معلوم کیا ہی جا سکتا ہے کہ طلال بے اور نجیب یہاں سے جا چکے ہیں یا نہیں! تیرا مشورہ

ہو تو میں اپنے تصور کی قوت آزمائوں؟“

”کیا یہ ممکن ہے اے علیائش کہ تو اپنے تصور کا دائرہ اسی شریک محد در رکھے؟“

”تو ایسا کیوں چاہتی ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”تاکہ وہ یہاں سے مصر جا چکے ہوں تو پہلے ہی چوکننا اور ہوشیار نہ ہو جائیں!“ سوئی نے وضاحت کی۔

”میرے لیے یہ بھی ممکن ہے۔“ میں بولا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع تھی۔ میرے صفحہ ذہن پر ان دونوں کے چہرے نہ ابھر سکے۔ چند لمحے بعد

میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”وہ بغداد میں نہیں ہیں اے سوئی! اس سے آگے تیرے کہنے کے مطابق میں نے دھیان نہیں لگایا۔“

اس رات کو نجوا سے ملاقات کی ہمیں بڑی بے چینی تھی۔ دس بجے کے قریب سود نے آکر بتایا کہ نجوا خود آنے والی ہے۔ ہمیں اس سے ملنے کہیں نہیں جانا۔ نجوا کے انتظار میں مزید آدھا گھنٹا گزر گیا تب وہ آئی۔ سود اسے ہمارے ہی کمرے میں لے آیا۔

”کیسی گزر رہی ہے یہاں؟“ نجوا نے میرے بجائے سوئی کو مخاطب کیا۔

”یہاں ہمیں کوئی تکلیف نہیں بنوا صاحبہ!“ سوی نے جواب دیا۔ ”اور ہم یہاں محفوظ بھی ہیں۔“
”لیکن اب زیادہ دن محفوظ نہیں رہ سکو گے۔“ بنوا مسکرائی۔ ”مقرر کے غلام بہت جلد تم دونوں تک پہنچ جائیں گے۔“

”ہم دونوں تو اب چہرے بدلے بغیر باہر بھی نہیں جاتے۔“ میں بولا۔ ”پھر..... پھر وہ.....“
”طرح.....“

اس پر بنوا ہنسی پھر کہنے لگی۔ ”تم آخر انہیں سمجھتے کیا ہو سہ! کیا چہرہ بدل کر تم انہیں دھوکا دے سکتے ہو؟ اب تک تم دونوں صرف میری وجہ سے زندہ ہو ورنہ وہ تمہیں کبھی کا قتل کر چکے ہوتے۔ پھر اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ ان سے بچ سکتے ہو تو میری طرف سے آزاد ہو۔ تم چاہو یہاں رہو یا واپس سلیمانہ چلے جاؤ۔“

”اگر ایسا ہی ہوتا بنوا صاحبہ تو ہم آپ کی امان میں کیوں آتے!“ سوی نے اسے بے وقوف بنایا۔
”ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ بنوا سے کیا بات کرنی ہے!“

”تم سہ سے زیادہ ذہین اور معاملہ فہم ہو رشیدہ!..... مجھے خود یوں آنا پڑا کہ میں کچھ عرصہ کے لئے اس ملک سے جاری ہوں۔ منصور سے میں نے بس یہ طور احتیاط کہہ دیا تھا کہ تمہارے جواز ہم بنوالے۔ کل وہ یہ کام کرا لے گا۔ سہ سے زیادہ مجھے تمہارا خیال تھا رشیدہ! ورنہ میں ایسا نہ سوچتی۔“ بنوا احسان جتانے لگی۔

”مگر بنوا، تم ہمیں اپنے ساتھ کہاں لے جا رہی ہو؟“ جانتے بوجھتے میں نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔
”کیوں کیا عراق سے کہیں باہر جاتے ہوئے تمہیں خوف آرہا ہے؟“ بنوا میری ”بے بسی“ مسکراتے لگی پھر بولی۔ ”کبھی مصر گئے ہو؟“

”ہاں گیا ہوں ایک مرتبہ۔“ میں نے دانستہ اقرار کر لیا کہ اس سے کتنی مسئلے خود بہ خود حل جاتے۔ ”مگر یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب رشیدہ سے میری شادی نہیں ہوئی تھی۔“

”یعنی رشیدہ وہاں نہیں گئی۔“ بنوا بولی۔ ”تم نے کون کون سے شہر دیکھے ہیں وہاں کے؟“
”قاہرہ اور اسکندریہ۔“ میں نے بتایا۔

”غنیمت ہے اتنا بھی۔ میں فی الحال قاہرہ جانے والی ہوں۔ تم دونوں اگر چاہو تو وہاں چل سکتے ہو۔“
ہاں یہ میں تمہیں ابھی سے بتا دوں، وہاں جا کر اس گمان میں نہ رہنا کہ مقرر کے غلام تمہارا پیچھا چھا دیں گے۔ یہاں اور وہاں فرق صرف اتنا ہو گا کہ میری موجودگی بہ آسانی تمہیں موت کے منہ میں نہ نہ جانے دے گی۔“

میں کچھ دیر اس طرح خاموش رہا جیسے تذبذب کا شکار ہوں۔ میری فوری آمدگی مصلحت کے خلاف ہوتی۔

”بہتر یہی ہے سہ کہ ہم بنوا صاحبہ کے ساتھ ہی رہیں۔“ سوی گویا مجھے سمجھانے لگی۔
”آخر مقرر کے غلاموں سے نجات کب ملے گی؟“ میرے لہجے میں بے بسی تھی۔ ”یہ.....“

”زندگی بھر کا روگ ہو گیا رشیدہ!“
”رشیدہ تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکے گی سہ! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اس روگ سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے۔“

”وہ..... وہ طریقہ کیا ہے بنوا؟“ میں نے بے ساختہ سوال کیا۔
”یہ کہ تم مرنے پر راضی ہو جاؤ! رشیدہ کی طرف سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اس کی ذمہ داری میں سنبھال لوں گی۔“
”نہیں! تم ایسا..... نہ کو بنو! یہ..... یہ بڑی بے رحمی ہے۔“ میں جیسے خواس باختہ ہو گیا۔

”اس میں بے رحمی کی کیا بات ہے سہ! موت تو ایک گہری اور پرسکون نیند ہے۔ تم مصر گئے تھے تو کیا فرعونوں کو ان کے تابوتوں میں بیٹھنے کی نیند سوتے نہیں دیکھا؟“

”بنوا ممکن ہے ایسے مناظر لوگوں کے لیے دلچسپی رکھتے ہوں، مگر میں ان سے ڈرتا ہوں۔ مجھے وہ درس عبرت لگے۔ میں نے اسی لئے ایک مرتبہ کے بعد پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ وہ کہ جن کی زبانوں سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی قانون تھے، اب کس حال میں ہیں! شاید یہی قانون قدرت ہے۔“ میری آواز میں ابھی تک خوف شامل تھا۔

”اور تم اس قانون قدرت سے فرار چاہتے ہو!“ بنوا نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔
”نہیں! ہر جاندار کو اپنی زندگی بچانے کا حق ہے اور اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔“

”لیکن جان دار ہی ایک دوسرے سے ان کا یہ حق چھین لیتے ہیں۔ تم نے بھی تو ایسا کیا ہے سہ! تمہارے دامن پر بھی تو لبو کے داغ ہیں۔ ایک طاقت ور جان دار دوسرے کمزور جان دار کو مار دیتا ہے۔“

”مگر تو ہر زمانے میں طاقت ہی کا چلتا ہے۔ تمہارے اندر اگر طاقت ہے تو دوسروں کو روندتے ہوئے کمزور جاؤ۔ کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔ اگر تم جینے کی آرزو رکھتے ہو تو اپنے دل سے خوف کو نکال دو! میں نے اب تک تمہارے متعلق یہ جانا ہے کہ تم دہری شخصیت کے مالک ہو۔ وقت پڑ جائے تو تم موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہ تمہاری شخصیت کا ایک رخ ہے اور دوسرا رخ اس وقت ظاہر ہو رہا ہے۔ اس سے بچو!“

تمہارے برعکس رشیدہ دورخی نہیں۔ مجھے دو ٹوک الفاظ میں جواب دوا میں نے تمہیں دونوں صورتیں بتا دی ہیں۔ زندگی یا موت دونوں میں سے تم کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہو!“ بنوا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اس موقع پر سوی نے کچھ کہنا چاہا تو بنوا نے اسے روک دیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کون ایسا ہو گا کہ خود اپنے لئے موت کو پسند کر لے!“ میں بالآخر بولا۔
”کیوں نہیں! ایسے لوگ بھی ہیں۔ کیا تم خود کشی کرنے والوں کو بھول گئے؟“

”مگر میں ان میں سے نہیں ہوں بنوا!“ میری آواز اب کسی قدر بدلی ہوئی تھی۔ ”میں چلوں گا تمہارے ساتھ مصر!“

”کون ایسا ہو گا کہ خود اپنے لئے موت کو پسند کر لے!“ میں بالآخر بولا۔
”کیوں نہیں! ایسے لوگ بھی ہیں۔ کیا تم خود کشی کرنے والوں کو بھول گئے؟“

”مگر میں ان میں سے نہیں ہوں بنوا!“ میری آواز اب کسی قدر بدلی ہوئی تھی۔ ”میں چلوں گا تمہارے ساتھ مصر!“

”میرے ساتھ نہیں بلکہ رشیدہ کے ساتھ! تم دونوں میرے بعد پہنچو گے وہاں۔“ نجوانے بتا۔
”تفصیل تمہیں سود سے معلوم ہو جائے گی۔“

”ہمارا ہم سفر کون ہو گا؟ کیا سود؟“ میں نے معلوم کیا۔

”کوئی نہیں۔ نہ سود، نہ منصور! تمہیں مطار (ایئر پورٹ) تک بہ حفاظت پہنچا دیا جائے گا۔ تمہارے پاس جتنے بھی دینار ہوں، سود کو دے دینا! انہیں وہ مصری کرنسی گئی اور پیا سٹر میں تبدیل کر دے گا۔ رقم کم ہوئی تو اور مل جائے گی۔ تمہیں کچھ اور تو نہیں کہتا؟“

میں نے انکار میں سر ہلا دیا تو نجوا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ سوئی اس کے برابر بیٹھی تھی۔
نجوانے اس کی پشت پر چھکی دی۔

”اب تم سے قاہرہ میں ملاقات ہو گی رشیدہ!“ نجوانے کہا اور پھر مزید نہیں رکی۔ سود بھی اسی کے ساتھ چلا گیا۔

جب سناٹا پھیل گیا تو سوئی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”شاید نجوا آج ہی رات یا پھر کل کسی وقت بغداد سے چلی جائے۔“

”اس کی باتوں سے تو یہی پتا چل رہا تھا۔ یہ اچھا ہے کہ ہمارے ساتھ بہ ظاہر نجوا کا کوئی آدمی نہیں ہو گا۔“

”بہ ظاہر سے کیا تیرا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے دوران سفر میں بھی ہم پر نگرانی رکھے گی اے علیالیش؟“

”ہاں اس سے یہ بعید نہیں۔ وہ اسی طرح کی عورت ہے۔ اگر ہمیں انسانی قابلوں میں یہ سفر نہ کرنا ہوتا تو نجوا سے پہلے قاہرہ پہنچ جاتے۔“

”اے علیالیش! مجھ سے تو نے بغداد اور قاہرہ کی سیر کرانے کے لئے کہا تھا اور آخر اس کی سبیل پیدا ہو ہی گئی۔ یہ ضرور ہوا کہ ہمارا یہ سفر بے مقصد نہیں رہا۔ یہاں آکر ابتدا میں ہم جس طرح آزادی کے ساتھ گھومے پھرے، شاید قاہرہ پہنچ کر یہ موقع نہ مل سکے۔ وہاں ہم شروع ہی سے نجوا کی نظر میں ہوں گے۔“

اس رات سوئی کو میں، قاہرہ کے متعلق بتاتا رہا۔ پھر ہم سو گئے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد سود نے مجھ سے عرقی دینار مانگے۔ جب میں نے اپنے سوٹ کیس سے دینار نکال کر اسے دیے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا، کہنے لگا۔ ”تمہارے پاس تو بہت بڑی رقم ہے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا۔ پھر تو تمہیں مزید رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی بڑی رقم تمہیں یہاں سے لے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔“

”تم بس یہ کرو کہ ان دیناروں کو مصری کرنسی میں تبدیل کر دو۔ اسے یہاں سے نکال کر لے جانا میرا کام ہے۔“ میں بولا۔

”نہیں۔ یہاں کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مطار بغداد پر یہ رقم تم سے لے لی جائے گی۔“

اس کا اندراج تمہارے جواز (پاسپورٹ) پر کر دیا جائے گا جب تم عراق واپس آؤ گے تو رقم واپس مل جائے گی۔ عراقی حکومت اس معاملے میں بہت سخت ہے۔ وہ اپنے ملک کی دولت کسی بھی طرح یہاں سے نکلنے نہیں دیتی۔ اس کی ایک ہی صورت ہے۔“ سود کہنے لگا۔ ”یا تو یہ رقم تم میرے پاس چھوڑ جاؤ یا پھر اسے عراقی رافدین بینک میں جمع کر دو۔ جتنی رقم تم قانون کے مطابق اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو، وہ میں الگ کر رہا ہوں۔ اب تم جیسا چاہو، کر لیا جائے۔ تمہارا اکاؤنٹ میں یہاں بینک میں کھلو!.....“

”اکاؤنٹ کھلوانے کی ضرورت نہیں سود! یہ بقیہ رقم تم اپنے پاس بہ طور امانت رکھ لو، ہم واپس آ کر لے لیں گے۔“ میں نے کہہ دیا۔

”تمہیں بھروسہ ہے مجھ پر؟“ سود مسکرایا۔ ”اگر میں نے تمہاری رقم واپس نہ کی تو؟“

”تم ایسا نہیں کر سکتے، اتنا یقین ہے مجھے!“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ مصلحت کے تحت میں اس پر بہ ضد نہ ہوا کہ رقم اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔

سود نے دیناروں کی گڈیاں شمار کیں اور انہیں ایک تھیلے میں رکھ لیا۔ میرے لئے کہیں اور کسی بھی ملک میں رقم کا حصول کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر بھی آئندہ کا کچھ پتا نہ تھا کہ کیا حالات پیش آتے! میں پھر اس شر میں واپس آتا یا نہیں! وہ رقم مجھے بہر حال سود کے پاس نہیں چھوڑنا تھی۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی اور میں کسی بھی وقت وہ رقم لے اڑتا۔ قاہرہ سے بغداد میرے لئے دور ہی لگتا تھا!

اسی روز شام کو ہمارے پاسپورٹ، مصری کرنسی اور اگلے دن کی ایک فلائٹ کے ٹکٹ بھی مل گئے۔ منصور پھر نہیں آیا۔ سود ہی نے یہ ساری چیزیں ہمارے حوالے کیں۔

”قاہرہ میں تم ایک شخص فواد کے مہمان ہو گے۔“ سود نے یہ کہتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ ”یہ ہے فواد۔“

تصویر کو میں نے غور سے دیکھ کر سوئی کی طرف بڑھا دیا۔ ہمارے لئے اس شخص کی تصویر کو ایک نظر دیکھ لینا ہی کافی تھا۔

”چاہو تو تم یہ تصویر اپنے پاس رکھ لو۔ تصویر ہی کے پیچھے فواد کا پتا بھی لکھا ہے۔“ سود بولا۔ ”اس کی ضرورت تو نہیں پڑے گی کہ تم پتا تلاش کرو کیوں کہ فواد خود تمہیں لینے ایئر پورٹ پر موجود ہو گا۔ تم خود قاہرہ جا چکے ہو اس لئے میرا خیال ہے تمہیں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ تمہیں تو علم ہو گا کہ قاہرہ شہر تین حصوں میں بنا ہوا ہے۔ قاہرہ، جیزا اور پرانا قاہرہ۔ فواد، جیزا کے علاقے دتی میں رہتا ہے۔ دتی ہی میں مختلف ملکوں کے سفارت خانے بھی ہیں۔“

یہ سن کر میں چونکا۔ مجھے پاکستانی سفارت خانے کے ایک افسر طیب کا خیال آ گیا۔ وہ قمر احمد کا دوست تھا۔ اسی نے قمر احمد کو طلال بے اور نجیب کے بارے میں تعارفی خط لکھا تھا۔ پھر میرے پراسرار دشمن قمر احمد کی کوٹھی ہی میں آکر ٹھہرے تھے۔ مجھے ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

”تم کن خیالوں میں کھو گئے سعد؟“ سود نے مجھے ٹوکا۔

”میں یہ سوچ رہا تھا کہ فواد ہمیں کس طرح پہچانے گا؟“ میں نے بہانہ بنا دیا۔

”جس طرح تم اسے پہچانو گے۔ تم دونوں کی تصویریں آج رات اسے مل جائیں گی۔“
سعود کو مطمئن کرنے کی غرض سے فواد کی تصویر کے پیچھے لکھا ہوا پتا پڑھ کر وہ تصویر میں لے
پاس رکھ لی۔
”تم فواد کو مری ہی طرح پاؤ گے۔ وہ بڑا مسمان نواز اور خوش اخلاق ہے۔“ سعود نے بتایا۔
”یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا۔ ہم دونوں بہر حال تمہارے ممنون ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی کرا
میں پناہ دی۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔
”تم اس طرح کہہ رہے کہ جیسے ابھی میں تمہیں مطار البغداد لے کر جا رہا ہوں۔“ سعود
ہوئے بولا۔

”منصور دکھائی نہیں دیا؟“ میں نے پوچھ ہی لیا۔

”وہ اب تمہیں قاہرہ ہی میں دکھائی دے گا۔“

”کیا وہ بغداد سے روانہ ہو گیا؟“

”نہیں“ آج رات شاید چلا جائے۔“ سعود نے جواب دیا، پھر کہا۔ ”ہاں میک اپ باکس مجھے دے
دو، وہاں تمہیں ضرورت پڑی تو فواد فراہم کر دے گا۔ ایئرپورٹ پر یہاں سامان کی سخت چیکنگ ہوتی ہے
تمہارے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہونی چاہئے جو کسی کو شبہ میں ڈال دے۔“
مجبوراً مجھے میک اپ باکس سعود کو واپس دینا پڑا اور پھر وہ ہمارے پاس سے اٹھ گیا۔
مجھے اس کا اندازہ تھا کہ جس طرح دو صدیوں کے دوران میں بغداد قطعی بدل گیا تھا، قاہرہ شہر
بھی یہی حال ہو گا۔ سوئی نے بھی مجھے اس کا احساس دلایا۔

”ابھی ہمارے پاس رات ہے اے سوئی!“ میں نے کہا۔ ”اور ایک رات ہم جن زادوں کے لئے
بست ہوتی ہے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہمیں بے خبر نہیں ہونا چاہئے۔ میرے لئے تو یہی بات نئی تھی کہ
قاہرہ شہر اب تین حصوں میں بچل گیا ہے۔ معلوم نہیں بغداد ہی کی طرح وہاں کیا کیا تبدیلیاں آگئی
ہوں!“

سوئی میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ اسی رات جب سعود کی کوٹھی میں خاموشی چھا گئی تو ہم انسانی
قالیوں سے نکل آئے۔ جتنی بجھا کر ہم نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

دریائے فرات کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ہم نے قاہرہ کا رخ کیا۔ ایک قدیم دریا سے دوسرے
قدیم ترین دریا کا سفر ہمارے لئے چند لمحوں پر محیط تھا۔ اب ہمیں دریائے نیل کے دونوں طرف آباد قاہرہ
شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ مشرق کی طرف رخ کرنے کی صورت میں پرانا قاہرہ اور قاہرہ دریا کی
بائیں جانب اور جیزا دائیں طرف تھا۔ میرا قیاس غلط ثابت نہ ہوا۔ وہ شہر مجھے نیا نیا سا لگا۔ قدیم آثار کے
سوا جیسے سبھی کچھ بدل گیا تھا۔ دو سال کے دوران میں انسانی تہذیب اپنے سفر میں خاصی آگے نکل گئی
تھی۔ سو ہمیں ضروری معلومات کے حصول میں کوئی قیاحت نہیں ہوئی۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم بغداد لوٹ آئے۔ قاہرہ کا کوئی ایسا گوشہ نہیں پہچا جو ہم نے دیکھ نہ لیا

ہو۔
کوٹھی میں اسی طرح سکوت چھایا ہوا تھا جیسا ہم چھوڑے گئے تھے۔ سو کچھ دیر کو ہم سو گئے۔
سوئے سے پہلے ہم نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ہم اتنی گہری نیند سوئے کہ سعود کے ایک ملازم نے آکر ہمیں جگایا۔ معلوم ہوا کہ سعود ناشتے پر
ہمارا انتظار ہے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر ہم نیچے پہنچ گئے۔ آسیہ بھی وہاں موجود تھی۔ سعود نے ہنستے ہوئے
ہمیں بتایا۔ ”جنات نے آسیہ کی جان چھوڑ دی۔“

یہ الفاظ اس وقت مجھے بڑے معنی خیز معلوم ہوئے حالانکہ حقیقت میرے علم میں تھی۔ میں صرف
مسکرا دیا۔

”آسیہ نے جنات کے خوف کی وجہ سے وہ ساری کتابیں جلا دیں جو بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔“
سعود نے ناشتہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

اس پر آسیہ کہنے لگی۔ ”جی نہیں۔ میں جنات سے نہیں ڈرتی۔ وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر میرا دل بھر گیا
تھا۔ اب میں کچھ اور پڑھ رہی ہوں۔“

”تم جانو۔ مجھے تو بہر حال خوشی ہوئی اس سے!“ سعود یہ کہہ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آج تم
دونوں بڑی دیر میں سو کر اٹھے! میں نے سوچا، پھر نہ جانے کب ملاقات ہو اس لئے ساتھ ہی ناشتہ کر لیتے
ہیں۔ دو گھنٹے کے بعد تمہیں ایئرپورٹ بھی تو چھوڑنا ہے۔ تیاری تو کر لی ہو گی تم نے!“

”تیاری کیا کرنی ہے، سوٹ کیس اٹھا کر چل دینا ہے۔ لباس ہم تبدیل کر ہی چکے ہیں۔ جب تم کو
گے چل دیں گے۔“

ناشتہ کے ہم اوپر آگئے تو سوئی، مصری کرنسی دیکھنے لگی۔ گئی اس وقت تقریباً چودہ روپے کے
مساوی تھی۔ پانچ، دس، بیس، پچاس اور سو گئی تک کے نوٹ ہمارے پاس تھے۔ ان کے علاوہ کچھ
پیاسٹر اور ملیم بھی تھے۔ سو پیاسٹر کی ایک گنتی تھی۔ پیاسٹر کے نوٹ اور سکے دونوں تھے۔ پانچ، دس، پچاس
اور پچاس پیاسٹر کے نوٹ، نیز سو پیاسٹر کا سکہ تھا۔ ملیم سکے تھے۔ سو ملیم کا سکہ بھی میں نے دیکھا۔ مصری
کرنسی کے متعلق یہ معلومات ہم نے گزشتہ شب حاصل کی تھیں۔

سوئی کو دیں دیں کی کرنسی دیکھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ جب ہم کراچی سے بغداد آرہے تھے تو
عراقی کرنسی بھی اس نے بڑی دلچسپی سے دیکھی تھی۔

عراق آکر میں یہاں کے قدیم تہذیبی آثار بابل و نینوا نہیں دیکھ سکا۔ مجھے اور سوئی کو زیادہ طلال
اس پر تھا کہ ہم کربلا نہ جاسکے۔ اگر ہمیں مہلت ملتی تو ہم وہاں اہل بیت کے مزاروں کی زیارت کر لیتے۔
سوئی سے میں نے وعدہ کر لیا کہ اسے وہاں کبھی ضرور لے جاؤں گا۔

روانگی کا وقت ہو گیا تو سعود کے ملازم ہمارے سوٹ کیس اٹھا کر نیچے لے گئے۔ ہم بھی ان کے
ساتھ ساتھ اتر آئے۔ وہاں آسیہ بھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب ہمیں اپنے لیے کوئی تجسس نظر نہیں
آیا۔ نہ اب اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑی خوشی اخلاقی کے ساتھ ہمیں رخصت

کیا۔ عمارت سے نکل کر ہم سعود کی سیاہ کار میں آ بیٹھے۔ ملازموں نے سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھ دیے۔

سعود خود ہی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ آگے اور سوی پیچھے بیٹھی۔ راستے میں سعود مجھے سمجھاتا رہا کہ نجوا کی موجودگی میں ہمیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں، مقرر کے غلام ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مجھے دلاسا دینے کی وجہ یہ تھی کہ نجوا اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو سعود نے بھی سنی تھی۔

جب ہم بغداد ایئرپورٹ پہنچے تو جہاز کے روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ چلتے وقت سعود مجھ سے گلے ملا۔ عربی روایات کے مطابق ہم نے ایک دوسرے کے رخساروں کو بوسے دیے۔ ضروری کاغذات اور پاسپورٹ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے۔

سعود نے غلط نہیں کہا تھا، ایئرپورٹ پر سخت چیکنگ ہوئی، پھر ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ ہم جن زادوں کا یہ پہلا سفر تھا کہ آدم زادوں کی طرح ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں جہاز بغداد سے قاہرہ کے لئے پرواز کر گیا۔

ہم اس شرکی طرف اڑ رہے تھے کہ جسے گزشتہ شب ہی اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

☆=====☆

قاہرہ پہنچنے تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ پھر بھی ہم بے حد محتاط اور چوکنا رہے۔ کسی مسافر پر ہمیں یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ضروری خانہ پری کے بعد ہم ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئے۔ بغداد کی طرح قاہرہ ایئرپورٹ پر ہمارے سامان کی زیادہ چیکنگ نہیں ہوئی تھی۔ عربی ہی مصر کی بھی سرکاری اور عوامی زبان ہے۔ فریج اور انگریزی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فریج صرف بوڑھے بولتے اور سمجھتے ہیں، نوجوان نہیں۔ وہ عربی کے علاوہ انگریزی بولتے اور سمجھنے پر قادر ہیں۔ سو ہمارا میزبان فواد بھی جب ہم سے ملا تو اس سے عربی ہی میں گفتگو ہوئی۔

ہم جیسے ہی باہر آئے تھے، درمیانے قد والا فواد ہمارے پاس لپک کر آ گیا تھا۔

”تم سعد ہو؟“ فواد نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اور یہ تمہاری بیوی رشیدہ ہے؟“

”اور تم یقیناً فواد ہو۔ میں نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”آؤ، ادھر آ جاؤ؟“ فواد نے ایک سوٹ کیس اٹھا لیا۔ دوسرا سوٹ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر فواد کی کار کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے فواد پر کشش شخصیت کا مالک تھا۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے فواد نے ایک مرتبہ مجھے مخاطب کیا۔ ”میں نجوا کی طرف سے اپنے شرمیں تم دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”ہمیں بھی تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ میں نے بھی اخلافا کہہ دیا۔

کار تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔ میں نے اس عرصے میں یہ محسوس کر لیا کہ فواد درگد سے

بے خبر نہیں ہے۔ اب ہم قاہرہ کی سب سے طویل سڑک پر تھے۔ یہ سڑک بالکل سیدھی اور پندرہ میل لمبی ہے۔ یہ فاصلہ اہرام سے تحریر اسکوائر تک ہے۔ اسی مناسبت سے یہ شاہراہ اہرام کہلاتی ہے۔ یہیں ایک جگہ فواد نے کار کی رفتار ذرا دھیمی کر دی۔

”اب اوبرج نائٹ کلب کی عمارت آئے گی، اس طرف!“ فواد مجھ سے کہنے لگا۔ ”یہاں تمہیں آج رات آنا ہے اس لئے دیکھ لو۔“

”یہاں آنا ہے!“ میں چونکا۔ ”مگر کس لئے؟“

”ابھی تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس اتنا ہی پیغام ملا تھا کہ ایئرپورٹ سے واپسی پر میں تمہیں اوبرج کی دو منزلہ عمارت دکھا دوں جہاں رات کو کسی وقت تمہیں پہنچنا ہے۔ وہ..... وہ دیکھو!“ فواد نے کار کی رفتار مزید کم کر کے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے وہ عمارت دیکھ لی۔ قاہرہ آتے ہی نجوا نے میری ذہنی الجھن کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ ”مجھے تو بتایا گیا ہے کہ تم پہلے بھی قاہرہ آ چکے ہو۔ کیا تم اوبرج نہیں گئے؟“ فواد نے حیرت سے پوچھا جیسے یہ کوئی عجیب سی بات ہو۔

”میں واقف تو ہوں کہ اس شاہراہ پر غالباً دس بارہ نائٹ کلب ہیں، لیکن کیس کیا نہیں۔“ میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں جواب دیا۔ گزشتہ رات بھی میں ادھر سے گزر چکا تھا۔ یہیں میں نے کئی آدم زادوں کے ذہن پڑھ کر بہت کچھ معلوم کیا تھا۔ شر کا یہ حصہ سب سے زیادہ بیدار تھا۔

”کہیں تم اپنی بیوی رشیدہ کی وجہ سے تو انکار نہیں رہے؟“ فواد نے آہستہ سے فس کر کہا۔

”نہیں۔ رشیدہ کو مجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ میں خراب ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

فواد خوش مزاج آدمی تھا اس لئے راستہ ہنستے بولتے گزر گیا۔ اس کے باوجود میرا ذہن اسی سوال میں الجھا رہا کہ نجوا مجھے کس لئے اوبرج بھیجنا چاہتی ہے؟ میرے نزدیک نجوا کا مجھے کہیں بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تک تو مجھے ایسے ہی تجربات ہوئے تھے۔

دقی کے علاقے میں وہ بڑی شان دار کوٹھی تھی جس کے بڑے سے آہنی گیٹ کو عبور کر کے کار اندر داخل ہوئی۔

اس کوٹھی کا عقبی حصہ، بیرونی حصے سے قطعی الگ تھلگ تھا۔ فواد نے وہیں ہمارے قیام کا بندوبست کیا۔

”ضرورت پڑنے پر تم عقبی دروازہ بھی آدورفت کے لئے استعمال کر سکتے ہو۔ یہ تمہاری خواب گاہ ہے۔ اس کے برابر والا کمر نشست گاہ ہے جو میں ابھی تمہیں دکھا دوں گا۔ عقبی دروازے کے قفل کی چابی اپنے پاس رکھ لو۔“ فواد نے یہ کہتے ہوئے ایک چابی میرے حوالے کر دی، پھر بولا۔ ”یہاں اتنی جگہ ہے کہ کار بھی کھڑی کی جاسکے۔ اگر تمہیں کار کی ضرورت پڑی تو وہ بھی مل جائے گی۔ خاص طور پر آج رات کو تو تمہیں کار چاہئے ہوگی۔ ممکن ہے رات کے وقت ٹیکسی تلاش کرنے میں تمہیں دشواری ہو۔“

آؤ اب میرے ساتھ! تمہیں کوٹھی کا یہ حصہ دکھا دوں۔“ فواد ہمیں اپنے ہمراہ باہر برآمدے میں لے آیا۔ کوٹھی کے اس حصے میں بھی کچھ تھا۔ یہاں تک کہ دو ملازمین کے رہنے کو الگ کمرہ بھی بنا ہوا تھا جنہیں کسی بھی وقت بلایا جاسکتا تھا۔

”دراصل یہ حصہ مہمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں جو ٹیلی فون تم نے اپنی خواب گاہ میں رکھا دیکھا ہو گا؟ اس کا نمبر بھی الگ ہے۔“ فواد نے بتایا۔

”اچھا بندہ دست کیا ہے تم نے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے نہ مہمان کو کوئی پریشانی، نہ میزبان کو۔“ پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے میں نے میک اپ بکس کے لئے بھی کہہ دیا۔ ”اس کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“ اب ہم خواب گاہ میں واپس آچکے تھے۔

”ٹھیک ہے، مل جائے گا۔ فی الحال تم لوگ لباس تبدیل کر لو، اس کے بعد کھانا.....“

”جہاز میں کھالیا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پھر بھی جب جو ضرورت محسوس کرو، ملازمین سے کہہ دیتا۔“ فواد بولا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

ہم لباس وغیرہ تبدیل کر کے آرام کی غرض سے لیٹے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی کھنٹی بجنے لگی۔

”اس آفت سے کہیں مفر نہیں۔“ سوی بڑبڑائی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

میں نے ریسپور اٹھالیا تو دوسری جانب سے نجوا کی آشنا آواز سنائی دی۔ ”کچھ دیر میں منصور تم سے آکر ملے گا۔ تمہیں اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔“

”ظاہر ہے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اس پر نجوا کے بننے کی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فون پر اس سے ادبرج کے متعلق پوچھنا فضول ہی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ نہ بتاتی۔ منصور شاید اسی لئے آرہا تھا۔ میں نے سوی کو منصور کی آمد سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگی۔ ”تو نے بھی محسوس کر لیا ہو گا اے علیالیش کہ اب پہلے کی نسبت منصور کا رویہ بدل گیا ہے۔“

”ہاں اب اس کی آوارہ نگاہی ختم ہو چکی ہے۔ یہ تبدیلی بغداد میں تیرے اغوا کے بعد سے آئی ہے۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا ہے کہ تو کوئی عام سی عورت نہیں۔“ میں نے سوی کے خیال کی تصدیق کر دی۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ نجوا نے تیرے باب میں اسے تاکید کر دی ہو۔“

منصور کی آمد میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ میک اپ باکس وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

”تمہیں یاد ہے سعد کہ ایک مرتبہ بغداد میں تم ڈاکٹر جمال بنے تھے! آج میں تمہیں منقرع کا ایک غلام بناتے آیا ہوں۔“ منصور مسکرا کر بولا۔

”منقرع کا غلام؟“ میں چونک اٹھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں..... میں کیسے اس کی جگہ لے سکتا ہوں؟ میں نے تو اس کی آواز.....“

”آواز سننے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف چہرے کی تبدیلی کافی ہوگی۔ تمہیں کسی سے کوئی بات

میں کرنی۔ احتیاطاً تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ منقرع کے اس غلام کا نام عماد ہے۔ خود ہی تمہیں پہچان لیا جائے گا۔“ منصور بتانے لگا۔

”مگر کب اور کہاں؟ آخر یہ قصہ کیا ہے؟“ میں نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”فواد تمہیں ادبرج ٹائٹ کلب کی عمارت دکھا چکا ہے۔ آج رات نصف شب کے قریب تم وہاں پہنچو گے۔ کلب ہی کے ایک ہال میں رقصہ جزیلہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے گی۔ تم چاہو تو اس کا رقص دیکھنا، نہ چاہو تو انتظار کر لیتا۔ رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے جزیلہ کلب کی عمارت سے نکلے گی تو اس کے شانے

سے ایک ایئر بیگ لٹکا ہو گا۔ نیلے رنگ اور سرخ دھاریوں والے اس ایئر بیگ کو تم یقیناً پہچان لو گے۔ ایسا ہی ایک ایئر بیگ تم بغداد میں دیکھ چکے ہو۔ یاد آیا؟“

”کیوں نہیں! اسی کی وجہ سے تو میری زندگی کے لالے پڑ گئے تھے اور..... اور شاید آج بھی.....“

”کچھ نہیں ہو گا۔“ منصور بول اٹھا۔ ”تم پہلے پوری بات تو سن لو!..... تم جیسے ہی جزیلہ کے قریب پہنچو گے، وہ کچھ کہے سے بغیر ایئر بیگ تمہارے حوالے کر دے گی بس اتنی سی بات ہے۔ تم وہ

ایئر بیگ لے کر یہاں آجانا!“ منصور نے بوئے اطمینان سے کہا۔ ”اس میں خطرے کی کیا بات ہے!“ میں یہ سن کر دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔ ”منصور! تم کیوں مجھے کسی بچے کی طرح ہسلا رہے ہو!

اگر اس میں کوئی خطرہ نہ ہوتا تو میری جگہ کوئی بھی یہ کام انجام دے لیتا۔ اس کے لئے نجوا بھی کو منتخب نہ کرتی۔ پھر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ وہ رقصہ جزیلہ اگر کلب کی عمارت سے ڈیڑھ بجے نکلے

لگی تو وہاں پہلے سے میری موجودگی کیا ضروری ہے! میں نصف شب گزرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک بجے تک وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ اس طرح مجھے جزیلہ کا زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

”نہیں۔“ منصور نے انکار میں سر ہلایا۔ ”عماد کے معمولات کی خلاف ورزی دشمنوں کو چونکا کر

سکتی ہے۔“ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادبرج میں منقرع کے اور غلام بھی موجود ہوں گے!“ میں نے اپنے

اندازے کی تصدیق چاہی۔ ”میں تمہیں اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا، اس کا امکان ہے۔“ منصور نے اعتراف کیا۔

”انہی میں سے اگر کسی نے عماد سمجھ کر.....“ ”ایسا نہیں ہو گا۔“ منصور نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ ”تمہیں شاید یہ اندیشہ ہے کہ عماد

کچھ کر کوئی تم سے وہاں ملے آجائے گا۔ تو سنو کہ ایسی جگہوں پر وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے۔ اس مرتبہ اصل کام تو نجوا نے میرے سپرد کیا ہے۔ میں آج رات عماد کو ادبرج نہیں جانے دوں گا!“

”اور اگر تمہیں اس میں ناکامی ہوئی تو؟“ میں نے خطرے کی بو سونگھ لی۔ ”داؤ لگاتے ہوئے آدمی صرف اپنی جیت پر نگاہ رکھتا ہے۔ میں بھی بیشہ ایسے وقت یہی سوچتا ہوں

کہ مجھے ہر قیمت پر بازی جیتی ہے۔ کسی بھی معاملے کے مثبت پہلو پر نظر ہو تو اس سے حوصلہ بڑھتا

”یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے!“ نجوا کی سخت آواز سنائی دی۔ ”تمہارے انکار کے بعد میں نے دوسری پلاننگ کر لی ہے۔ اس نئی پلاننگ کے مطابق رشیدہ کو اب فواد کے ساتھ جانا ہے۔ میں اس ضمن میں فواد کو ضروری ہدایات دے چکی ہوں۔“

”مگر..... مگر سنو تو سہی! میں.....“

”مجھے اب مزید کچھ نہیں سننا!“ نجوا نے یہ کہتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

سوی کو جب مجھ سے یہ بات معلوم ہوئی تو اسے غصہ آگیا اور بولی۔ ”اس آدم زادی نے تو ہمیں اپنا غلام سمجھ رکھا ہے!“

”پہلے بھی تو مجھے اکیلا ہی جانا تھا۔ میں اور تم، ہم دونوں الگ الگ رہ کر بھی تو ان آدم زادوں سے نہٹ سکتے ہیں۔“ میں نے بڑی مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تو ہم خاموش ہو گئے۔ آنے والا فواد تھا۔ ”سارا بندوبست ہو گیا ہے۔“ فواد نے آتے ہی بتایا۔ ”تمہاری خواہش پر میں یہ میک اپ باکس بھی لے آیا ہوں۔ اسے کسی الماری میں رکھ دو!“

”رکھ دوں گا۔“ میں نے حتی الامکان اپنی آواز کو پُر سکون ہی رکھا۔ ”یہ بتاؤ کہ رشیدہ کو ساتھ لے کر تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”ابھی کچھ معلوم نہیں۔ مجھے پرانے قاہرہ میں عابدین بیلز کے قریب رشیدہ کو لے کر پہنچنا ہے۔ وہیں نصف شب تک پہنچ کر مجھے نجوا کے احکام ملیں گے جن پر عمل کرنا ہے۔ یہاں سے ہم ساتھ ساتھ ہی دو کاروں میں نکلیں گے۔ تم اوپر چر پر رک جانا، ہم آگے بڑھ جائیں گے۔“ فواد نے جواب دیا۔

مجھے سخت الجھن میں گرفتار کر کے فواد نصف گھنٹے کے بعد آنے کو کہہ گیا۔ اس سے کچھ پوچھنا لا حاصل ہی تھا۔ اسے اگر کسی بات کا علم بھی ہو گا تو نہ بتاتا۔ فواد کو سوی کے ساتھ عابدین بیلز تک جانا تھا۔ یہ علاقہ بھی میرے یا سوی کے لئے نیا نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی گزشتہ شب وہاں جا چکے تھے۔ عابدین بیلز کی خصوصیت یہ تھی کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں کی مناسبت سے اس میں تین سو پینسٹھ کمرے تھے۔ اسی بے مثل عمارت کی وجہ سے اس علاقے کا نام عابدین بیلز پڑ گیا تھا۔ یہ علاقہ قدیم ہونے کے باوجود شان و شکوہ کا حامل تھا۔ اسی کے قریب الحافظ (گورنر ہاؤس) بھی ہم نے دیکھا تھا۔ اسی علاقے میں قاہرہ کی عظیم لائبریری دارالکتب تھی جس میں لاکھوں کتابیں ہیں۔ یہ علاقہ لازماً ہر سے قریب تھا۔

خطرے کے شدید احساس کے باوجود میرے لئے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ سوی نے وہ پورا علاقہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ بہر حال ایک جن زادی تھی۔ آسانی سے آدم زادوں کے قابو اس کا آ جانا مشکل تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب کسی ممکنہ معرکہ آرائی کے وقت ہم دونوں الگ الگ ہوتے۔

مقررہ وقت پر فواد آگیا۔ اس نے مجھے اور سوی کو ریوالور دیے اور فاضل گولیاں بھی!

”اس کی نوبت تو نہیں آئے گی، پھر بھی احتیاطاً رکھ لو۔“ فواد نے ہمیں گویا دلا سادیا۔

سوی کے چہرے پر فواد نے میک اپ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”منصور کا جواب میرے لئے تسلی بخش نہیں تھا۔ مزید میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ایک نم نکال کر میز پر رکھ دی اور پھر میک اپ باکس کھول لیا۔ تصویر کے مطابق وہ میرے چہرے پر طبع آ کر کرنے لگا۔ اس میں منصور نے حاصل وقت لگایا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”نجوا نے یہ اجازت دے دی ہے اگر تمہاری مرضی ہو تو اپنی مدد کے لئے رشیدہ کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو۔ ایسی صورت میں اس چہرے پر کوئی بھی ماسک چڑھا دوں گا۔“

”عماد کے ساتھی کلب میں کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر کیا دشمن چوکنہ نہیں ہو جائیں گے؟“ نے پوچھا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔ عماد کے ساتھ اکثر خوب صورت اجنبی چہرے دیکھے جاتے رہے ہیں ہاں کلب سے نکلنے وقت اسے تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔“

”پھر تو کوئی فائدہ نہیں۔“ میں نے دانستہ سوی کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ ”دہرا خا کیوں مول لیا جائے! رشیدہ بیٹیں رہے گی۔“

منصور نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بتانے لگا۔ ”فواد تمہارے لئے کلا کار بندوبست کر دے گا۔ جانے اور واپس آنے کے لئے تم عقبی دروازہ ہی استعمال کرو گے۔“

”یہ میک اپ باکس تم بیٹیں چھوڑ جانا۔“ میں نے کہا۔

”ابھی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ فواد تم سے کہہ تو چکا ہے۔ تمہیں وہ میک اپ باکس پہنچا دے گا۔ میں تمہارے پاس مزید رکنا مگر ابھی بہت سے کام ہیں۔“ منصور یہ کہتے ہی اٹھ گیا۔

جب منصور کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو سوی مجھ سے آہستہ آواز میں بولی۔ ”تو نے مجھ ساتھ لے جانے سے کیوں انکار کر دیا؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس طرح تیرے قریب رہوں کہ کسی نظر نہ آؤ؟ یہ انسانی پیکر چھوڑ کر.....“

”نہیں اسے سوی! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ معاملہ اب تک کے معاملات سے مجھے مختلف لگا ہے۔ تو میرے ساتھ نہ چل!“

خلاف توقع سوی نے میری بات فوراً مان لی تو مجھے شک ہوا۔ میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ سوی فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگی۔ ”اے علیائش! میں تجھے اس خطرے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی! تو لاؤ مجھے سمجھالے مگر میں تیرے ساتھ چلوں گی!“

مجبوراً مجھے سوی کو ساتھ لے جانے پر آمادہ ہونا پڑا۔ طے یہی ہوا کہ وہ انسانی قالب میں نہیں رہے گی۔ اس وقت میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہو گا۔ منصور سے یہ کہہ کر میں نے غلطی کی تھی کہ اکیلا ہی اوپر چر ٹائٹ کلب جاؤں گا۔ اس غلطی کا احساس مجھے بعد میں ہوا کہ جب رات کو تقریباً ساڑھے دس بجے دوبارہ نجوا کا فون آیا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں، سوی کو فواد کے ساتھ بھیج دوں۔

”لیکن وہ..... وہ تو میرے ساتھ چلنے پر بہ ضد ہے۔“ میں نے پلٹا کھایا۔ ”تم خود اجازت دے چکی تھیں کہ.....“

ذرا ہی دیر میں دو کاریں آگے پیچھے فواد کی کوٹھی سے نکلیں۔ ایک کار کو میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسری کار کی ڈرائیو تک سیٹ فواد نے سنبھال رکھی تھی۔ سوئی اس کے ساتھ آگے ہی بیٹھی تھی۔ دریائے نیل کا ایک پل عبور کر کے ہم تحریر اسکوار سے گزرتے ہوئے شاہراہ اہرام پر نکل آئے۔

میرا دل اس دقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جب اپنی کار میں نے ادبرج ٹائٹ کلب کی طرف موڑی اور جس کار میں سوئی تھی وہ آگے نکل گئی۔

اس وقت رات کے بارہ بجتے والے تھے جب میں کلب کی دو منزلہ عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ متفرق کے ایک غلام عمار کی حیثیت سے مجھے وہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزارنا تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ راقصہ جزیلہ کا پروگرام پہلی منزل کے ایک ہال میں ہے۔

کلب میں دن کا سا سماں تھا۔ مجھے ایک نظر جزیلہ کو دیکھنا بھی تھا۔ پتا چلا کہ جزیلہ مصری رقص نیلے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ ہفتے میں ایک شب وہ نیلے ڈانسر ادبرج میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ وقت گزاری کے لئے میں کلب میں ادھر سے ادھر گھومتا رہا۔ ایک بجے سے کچھ پہلے ہی میں پہلی منزل کے اس ہال میں پہنچا کہ جہاں جزیلہ کا رقص آخری مراحل میں تھا۔ روشنیاں اس کے جسم پر مرکوز تھیں اور وہ حسین آدم زادی جیسے بجلی کی طرح اسٹیج پر کوند رہی تھی۔ میں نے جزیلہ کو بہت غور سے دیکھا۔ اسٹیج سے خاصے فاصلے پر مجھے ایک گوشے میں خالی میز نظر آگئی۔ وہ میز غالباً کسی کے لئے مخصوص تھی جو آج شب کسی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔

اس میز تک پہنچتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ میز عمار کے لئے ہی مخصوص تھی۔ میں جیسے ہی وہاں بیٹھا ایک ویٹر لپک کر قریب آگیا۔ تقریباً ساری ہی میزوں پر دور سا سفر چل رہا تھا، مگر میں نے ویٹر کو کھانا لانے کا آرڈر دیا۔ اس پر میں نے ویٹر کو واضح طور پر چوکے دیکھا، لیکن وہ وہاں رکا نہیں۔ اس کے چونکنے کا سبب میں نے یہی سمجھا کہ کھانے کے ساتھ جام وے کے لئے نہیں کہا۔

ادھر ویٹر نے کھانا میز پر لگایا اور ادھر موسیقی کا چھٹکا ہوا۔ رقص ختم کیا اور اسٹیج کا پردہ برابر ہو گیا۔ کھانا تو وہاں بیٹھے کا بہانہ تھا۔ میں بل ادا کر کے اٹھ گیا۔ ڈیڑھ بجے سے پہلے ہی میں کلب کی عمارت سے نکل آیا۔ دائیں جانب پارکنگ لاث تھا۔ جزیلہ کو میں نے باہر آتے دیکھا تو میرے اعصاب تن گئے۔ اس کے شانے سے ایئر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس کے قدم پارکنگ لاث کی طرف اٹھے ہی تھے کہ میں آگے بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی جزیلہ نے میرے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی، مسکرائی اور وہ مخصوص ایئر بیگ شانے سے اتار کر مجھے دے دیا۔ میں اسی لمحے ایک کار انتہائی تیز رفتاری سے کچھ فاصلے پر آکے رکی۔ اسی کے ساتھ ایک سنسناتی ہوئی گولی میرے جسم میں اتر گئی۔

دھماکا سننے ہی جزیلہ پلٹ کر بھاگی۔ گرتے گرتے میں نے طلال بے کو اس کار سے اترتے دیکھا اور پھر اس کی بچکانہ آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ ”متفرق کے غلاموں کو دھوکا دینا آسان نہیں! تو عمار نہیں ہے، سو اپنی موت کو قبول کر لے اور گمری نیند سو جا، ہمیشہ کے لئے!“

دوسرے ہی لمحے مجھ پر غفلت طاری ہونے لگی۔ اس انسانی قالب سے نکلنے کے لئے میں نے

کوشش تو کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے ذہن پر اندھیرے کی چادر پھیل گئی۔ ہوش کھونے سے پہلے میں نے یہ سوچ کر کلمہ ضرور پڑھ لیا کہ شاید میرا آخری دقت آپکا ہے۔

☆=====☆

اپنے سینے میں مجھے آگ سی لگی محسوس ہوئی تو میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ میری ہات سے ایک آشنا آواز گھرائی۔ ”سعد کو شاید ہوش آرہا ہے۔“ یہ آواز نجوا کی تھی۔

”سعد!..... سعد! آنکھیں کھولو سعد!“ اس مرتبہ میں نے سوئی کی آواز سنی۔ سوئی کی آواز سے شدید اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔

ان آوازوں کو سن کر شدید تکلیف و اذیت کے باوجود میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے میری زندگی بچالی تھی۔ اب تک میں نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں! اپنی نبض پر میں نے کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ پھر چند ہی لمحے بعد ایک اجنبی آواز آئی۔ ”حیرت انگیز میڈم! نبض کی رفتار معمول پر آتی جا رہی ہے۔“

”کیا اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے؟“ نجوا نے غالباً ڈاکٹر سے معلوم کیا۔

”یقینی طور ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا میڈم!“ جواب دیا گیا۔ ”اگلے تین گھنٹے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ مریض کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ زخم خاصا گہرا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہو گی۔ میں اسے انجکشن لگا دیتا ہوں تاکہ یہ سو جائے۔ اسے آکسیجن دینے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ میں آکسیجن سلنڈر بھجوا دوں گا۔“

ڈاکٹر غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ مجھے واقعی سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ ذرا ہی دیر میں مجھے انجکشن لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے یہ انجکشن میرے ہاتھ کی ایک نس میں لگایا تھا۔

”تین گھنٹے گزرنے سے پہلے ہی اسے دوبارہ ہوش آجائے گا۔ اس وقت.....“ پھر ڈاکٹر نے مزید کیا کہا، میں نہیں سن سکا۔ میرا وجود اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ نس میں لگائے جانے والے انجکشن کا فوری اثر ہوا تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ حواس کھونے سے پہلے میں نے آنکھیں کھولی تھیں یا نہیں! ہوش آنے پر مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا۔

”جلدی کرو! اس کا سانس رک رہا ہے۔“ یہ اجنبی آواز ڈاکٹر ہی کی ہو سکتی تھی۔ ”اسے آکسیجن کی ضرورت ہے۔“

چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ مجھے تازگی سی محسوس ہوئی۔ میرا دم گھٹنا بند ہو گیا اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس سے مجھے اپنے سینے کی دائیں جانب شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میں انتہائی اذیت میں تھا۔ اگر وہاں کوئی آدم زاد موجود نہ ہوتا تو میں کبھی کا اس انسانی پیکر کو چھو ڈر باہر آگیا ہوتا۔

”فواد! تم نجوا کو فون کر کے بتا دو کہ سعد کو ہوش آگیا ہے اور اب اسے آکسیجن دی جا رہی ہے۔“ میں نے منصور کی آواز سنی۔

”لیکن پہلے ڈاکٹر سے یہ تو معلوم کر لو کہ سعد خطرے کی حدود سے نکل آیا ہے یا نہیں!“ فواد کی

آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کو منصور مخاطب کرتا، وہ خود ہی بول اٹھا۔ ”مریض کی قوت برداشت حیران کن ہے۔ میرا تو اندازہ یہ تھا کہ شاید اسے بچانا ممکن نہ ہو مگر اب ایسا نہیں لگتا ساتھ فیصد امید بندھ گئی ہے کہ بچ جائے گا پھر بھی اسے ابھی آئندہ چوبیس گھنٹے تک انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہے۔ اگر اسے یہاں سے کسی ہسپتال میں منتقل کیا جاسکے تو.....“

”یہ ممکن نہیں ہے ڈاکٹر!“ منصور نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی۔ ”اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہم آپ (میں) کیوں بلائے! آپ اگر چاہیں تو کل تک یہاں رک جائیں۔“

”مجھے جو ٹیٹ منٹ دینا تھا، دے چکا ہوں۔ ویسے بھی آج میرا آپریشن ڈے ہے اور میں یہاں مزید نہیں رک سکتا۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”اگر آپ کی غیر موجودگی میں اس کی حالت بگڑ گئی تو؟“ منصور نے پوچھا۔

”اول تو اب اس کا امکان نہیں، پھر بھی آپ مجھے فون کر کے ایسی صورت میں بلا سکتے ہیں۔“

”لیکن آپ تو آپریشن تھیر میں ہوں گے!“ منصور بولا۔ اسی وقت میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

”دوپہر کے بعد آپ مجھے فون کر سکتے ہیں۔ صرف چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ میں اگر ہسپتال میں ملوں تو گھر فون کر لیجے گا۔“

”ٹھیک ہے، پھر تو مجبوری ہے۔“ منصور نے کہا، پھر فواد سے مخاطب ہوا۔ ”تم ڈاکٹر صاحب کو! کار میں چھوڑ آؤ! نجوا کو میں فون کر لوں گا۔“

فواد کو میں نے ڈاکٹر کے ساتھ جاتے دیکھا۔ یہ فواد کی کوٹھی کا وہی عقبی حصہ تھا جہاں ہمیں ٹھہرا گیا تھا۔ کمرے میں اس وقت صرف منصور تھا۔ معلوم نہیں سوئی کہاں تھی! منصور بائیں جانب کرسی بیٹھا تھا۔ وہ اٹھا اور دونوں مسروں کے درمیان ایک تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ وقت کمرے میں سوئی داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا تھا۔

”کیا ہوا منصور؟ یہ سہجہ کو آکسیجن.....“

”فکر کی کوئی بات نہیں۔“ منصور مڑ کر بولا۔ ”تم جیسے ہی ہاتھ روم گئی تھیں، سہجہ کا سانس رک گیا۔“

”ڈاکٹر نے اسی وجہ سے.....“

”مگر ڈاکٹر..... وہ کیوں چلا گیا؟“ سوئی نے پوچھا۔

منصور نے اس کی وجہ بتا دی اور کہا۔ ”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ پھر بھی اس آئندہ چوبیس گھنٹے احتیاط کے لئے کہا ہے۔“

مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر نے واضح طور پر خطرہ ٹل جانے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ منصور کا منہ محض سوئی کو تسلی دینا تھا۔

”میں ذرا نجوا کو فون کر کے سہجہ کی حالت کے بارے میں بتا دوں۔“ منصور بولا اور آگے بڑھا۔

ریسیور اٹھالیا۔

سوئی میرے سر ہانے آکھڑی ہوئی اور پھر مجھے آنکھیں کھولے دیکھ کر چونک اٹھی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تمہیں ہوش آگیا!“ اس کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اقرار میں پلکیں جھپکا کر اسے دلاسا دیا۔

اسی لمحے منصور فون پر نجوا کو میرے ہوش میں آجانے کے متعلق بتانے لگا۔ پھر اس نے نجوا کے کسی سوال کا جواب دیا۔ ”فواد، ڈاکٹر کو چھوڑنے گیا ہے۔ ٹھیک ہے، پہلے میرا یہ ارادہ تھا کہ فواد واپس آجائے گا تو میں یہاں سے چل دوں گا، مگر..... ہاں ہاں، میں آرہا ہوں۔“ منصور نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا، پھر قریب آکر سوئی سے مخاطب ہوا۔ ”کچھ دیر میں فواد آجائے گا۔ مجھے نجوا نے فوری طور پر بلایا ہے ورنہ میں اس کے آنے تک رکتا۔“

”تم جاؤ، میں ہوں سہجہ کے پاس۔“ سوئی بولی۔

”احتیاطاً یہ ٹیلی فون نمبر اپنے پاس رکھ لو۔ یہ ڈاکٹر کے ہسپتال اور گھر کے فون نمبر ہیں۔ خدا نخواستہ سہجہ کی حالت بگڑ جائے تو ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لینا۔“ منصور نے ایک کانفڈ سوئی کی طرف بڑھا دیا۔ ”میں بھی فون پر خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔“

سوئی نے اس سے کانفڈ لے لیا۔ پھر منصور وہاں رکا نہیں۔ اب کمرے میں میرے اور سوئی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کافی دیر سے میں انہی لمحات کا منتظر تھا۔ منصور کے جاتے ہی میں فوری طور پر اس انسانی قالب کو چھوڑ کر باہر آگیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس کے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اب وہ بستر خالی پڑا تھا جس پر ذرا دیر پہلے ایک زخمی انسانی بیکر پڑا تھا۔ اسے چھوڑتے ہی جیسے مجھے ایک عذاب سے نجات مل گئی تھی۔ اب میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ جب میں دوبارہ وہ انسانی قالب اپناتا تو اس کے سینے میں زخم نہ ہوتا۔

”اے سوئی! اب تو مجھے بتا کہ میری جان کیسے بچی؟ اور مجھے یہاں کون لے کر آیا؟“ میں نے سوئی کو مخاطب کیا۔ ”اس خبیث آدم زاد لطلال بے نے تو مجھے اپنی دانست میں ماری ڈالا تھا۔“

”مجھے تو خبر ہے اے علیا لیش کہ میں، فواد کے ساتھ تھی۔“ سوئی بتانے لگی۔ ”ہمیں عابدین پلس پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نجوا خود ایک کار میں وہاں آگئی۔ نجوا نے پرانے قاہرہ ہی کے ایک علاقے عباسیہ کے بارے میں فواد کو بتایا اور ایک پتا سکھایا۔ مجھے اور فواد کو فوراً اس پتے پر پہنچنا تھا۔ ہمیں نجوا نے بے حد محتاط اور چونکا رہنے کی تاکید کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہاں نجیب المندس یا لطلال کے بے کی موجودگی ممکن ہے۔ وہ قدیم طرز پر بنا ہوا مکان جس گلی میں تھا، ہمیں اسی کے سامنے والی نیم ٹرک گلی میں اپنی کار کھڑی کر کے اس انتظار میں رہنا تھا کہ سامنے والی گلی سے کوئی کار تو نکل کر کہیں نہیں جاتی۔ نجوا کی اطلاع کے مطابق اس کار کا رنگ سیاہ ہونا چاہئے تھا۔ کسی اور رنگ کی کار دیکھنے کی صورت میں ہمیں اس کا تعاقب نہیں کرنا تھا۔ سیاہ کار میں نجیب یا لطلال کی موجودگی کا امکان تھا۔ اسے پھرنے بغیر خاموشی سے ہمیں اس کا تعاقب جاری رکھنا تھا۔ نجوا کی ہدایت یہ تھی کہ وہ سیاہ کار، اہرام روڈ

پر ادرج نائٹ کلب کی حدود میں داخل ہوتی دکھائی دے تو ہم سمجھ لیں، کوئی خطرہ قریب ہے۔ پھر دونوں کو اپنے طور پر اس خطرے سے نمٹنا ہو گا۔ خطرے کی نوعیت بھی نجوا نے بتا دی تھی کہ نجیب طلال تجھے قتل کر سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ ہدایات دے کر نجیب وہاں سے چلی گئی۔ ہم عابدین پبلز سے عباسیہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مطلوبہ مکان تلاش کرنے میں فواد دشواری نہیں ہوئی۔ وہ پورا علاقہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ ہم سامنے والی نیم تاریک گلی میں کار کھڑی کر سیاہ کار کے پتھر رہے۔ فواد نے اس دوران میں مجھے بھی ایک ریوالور دے دیا تھا۔ ہمیں اس گلی میں در کر خاصی دیر انتظار کرنا پڑا، تب ایک سیاہ کار آندھی طوفان کی طرح مطلوبہ گلی سے نکلتی دکھائی دی۔ نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ہمارے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ فواد نے اس فاصلے کو کم کر کے لئے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی۔

سیاہ کار پرانے قاہرہ سے نکل کر اہرام روڈ پر آگئی تو مجھے یقین سا ہو گیا کہ اس کی منزل ادرج ہاؤس کلب ہی ہو سکتی ہے۔ پھر یہی ہوا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے تجھے اور بابا حسین عورت کو کلب کے دروازے سے نکلنے دیکھا۔ اس عورت نے تجھے ایک ایئر بیگ دیا اور اسی وقت دونوں سے کچھ فاصلے پر سیاہ کار رکی۔ اسی کے ساتھ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ تجھے گولی کھا کر گر دیکھتے ہی میں نے چلتی ہوئی کار کا دروازہ کھولا اور باہر چلا نکلا۔ فواد اس وقت تک اپنی کار کو روک نہیں سکا تھا۔ سیاہ کار سے اترنے والے نے بچکانہ آواز میں تجھ سے کیا کہا، میں نہیں سن سکی۔ میں فواد چٹم زدن میں اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی موٹی گردن کو میں نے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھرا۔ سنبھلنے نہ دیا۔ اسی دوران میں فواد تیرے زخمی بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر کار میں ڈال چکا تھا۔ پھر ہوئے رخساروں والے کا جسم اس وقت تک ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر کار کی طرف لپکی۔ کا دروازہ کھول کر میں اندر بیٹھی ہی تھی کہ کلب کے دروازے سے کئی مسلح افراد باہر آئے۔ انہوں ہماری کار پر فائر کھولا ہی تھا کہ پارکنگ لائٹ کی ایک جانب سے ان فائرنگ شروع ہو گئی۔ فواد اس موقع فائدہ اٹھا کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اہرام روڈ پر آگیا۔ فواد ہی نے مجھے بتایا کہ کلب سے نکلنے والے مسلح افراد کو الجھانے اور ان پر فائرنگ کرنے والوں کا تعلق اسی کے ساتھیوں سے ہو سکتا ہے۔ فواد حالت میں کار کی پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔ تجھے کار میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ فواد نے اس ایئر بیگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے سارا فساد برپا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے فواد نے ایئر بیگ میرے حوالے کر دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس ایئر بیگ میں سونے کے ظروف ہا سکتے تھے۔ ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ ایک کار تیزی سے ہمارے قریب آگئی۔ اس کار کو نجوا ڈان رہی تھی۔ اس نے مجھ سے ایئر بیگ لے لیا اور پھر تحریر اسکو از سے ایک طرف مڑ گئی۔ نجوا نے ہمیں از جلد کو شمی پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ ”سوی یہ کہہ کر چند لمحے کو رکی۔

”پھر نجوا اور منصور کب یہاں پہنچے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہمیں کو شمی آئے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ منصور اپنے ساتھ ایک ڈاکٹر کو لئے تھا۔

جب وہ ڈاکٹر تیرے سینے سے گولی نکال چکا تھا تو نجوا بھی آگئی۔ ”سوی نے جواب دیا۔ ”گویا اس مرتبہ بھی نجوا نے میری زندگی کو داؤ پر لگا کر مقرر کے غلاموں کو شکست دے دی۔“ میں بولا۔

”ہاں اے علیا لیش، اس نے اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے سونے کا نوالہ چھین لیا۔“ ”سوی! یہ موقع ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے اے علیا لیش؟ میں تیری بات سمجھی نہیں۔“ سوی نے دریافت کیا۔ ابھی میں کوئی جواب نہیں دے سکا تھا کہ دور سے مجھے کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ”شاید فواد لوٹ آیا ہے۔“ میں نے قیاس آرائی کی۔

”پھر تو تجھے فوراً انسانی قالب میں لوٹ آنا چاہئے!“ سوی جلدی سے بولی، پھر مجھے ایک خطرے سے آگاہ کیا۔ ”دوبارہ انسانی قالب اپناتے ہوئے سینے کے زخم کو نہ بھول جائیو! ڈاکٹر شام کو یا کل صبح آکر تیرے زخم کا معائنہ کر سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔“

”ابھی شام بہت دور ہے۔ تو پروا مت کر!“ میں بول اٹھا۔ ”ڈاکٹر کی آمد سے پہلے ہی میں پھر زخمی قالب اپنالوں گا۔ پٹیاں البتہ سینے پر بندھی رہیں گی۔ دراصل مستقل طور پر زخمی قالب اپناتے رکھنا میرے بس میں نہیں۔ اس سے مجھے انتہائی تکلیف ہوگی۔“ میں یہ کہتے ہی انسانی قالب میں لوٹ آیا اور پہلے کی طرح بستر پر دراز ہو گیا۔

توقع کے مطابق ذرا ہی دیر میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور سوی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

آنے والا فواد ہی تھا۔ اس نے اندر قدم رکھتے ہی سوی سے پوچھا۔ ”تم نے دروازہ کیوں بند لیا تھا؟“

”سعد کو کچھ سردی سی محسوس ہو رہی تھی۔“ سوی نے وجہ بتائی۔ فواد نے حیرت سے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”تجب ہے اتنی جلدی سعد نے بولنا بھی شروع کر دیا! آکسیجن مالک بھی تم نے ہٹا دیا!“

”ہاں اس کے لئے بھی سعد ہی نے کہا تھا۔ اب اس کے تنفس کی رفتار معمول پر آچکی ہے۔“ ”ڈاکٹر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا رشیدہ کہ سعد کی قوت ارادی حیرت انگیز طور پر بہت مضبوط ہے۔“ فواد یہ کہتے ہوئے بستر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی بیٹھ گیا۔

”ہاں فواد!“ میں دھیمی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”میں اتنی آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ اب مجھے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

”ڈاکٹر کی نظر میں تمہارا زندہ بچ جانا حیرت انگیز ہے۔ قوت ارادی کے ساتھ ہی اس میں تمہاری صحت مندی کو بھی دخل ہے۔“ فواد بولا۔

”اور اس سے بھی زیادہ رشیدہ کی دعاؤں کا اثر ہے۔“ میں نے مسکرا کر سوی کی طرف دیکھا۔
 ”میری نظر میں تم دونوں میاں بیوی کی جوڑی مثالی ہے۔“ فواد کہنے لگا۔ ”اس وقت رشیدہ کی حالت قابل دید تھی جب ڈاکٹر تمہارے سینے سے گولی نکال رہا تھا۔ نجوا نے اسے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اس وقت رشیدہ کی آنکھوں میں میں نے آنسو تیرتے دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ میں وہ منظر بھی شاید کبھی نہ بھول سکوں جب رشیدہ نے کسی زخمی شیرینی کی طرح طلال بے پر حملہ کیا تھا۔ رشیدہ نے اسے دوسرا فاز کرنے کی مصلحت نہیں دی تھی ورنہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ نجوا کے سوا آج تک کسی عورت کو میں نے اس طرح جست لگاتے نہیں دیکھا۔ مجھے تو اس پر بھی حیرانی ہے کہ طلال بے جیسے طاقتور شخص کو رشیدہ نے کس طرح زیر کر لیا! نجوا ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس سے پہلے بغداد میں نجیب کو رشیدہ نے قابو میں کر لیا تھا۔ اگر سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا اور کسی دوسرے شخص نے مجھے یہ بتایا ہوتا تو شاید یقین نہ آتا۔ جسمانی طاقت سے قطع نظر نجیب اور طلال بے دونوں ہی پراسرار قوتوں کے مالک ہیں۔ رشیدہ کا حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ یقیناً طلال بے کو کوئی عمل پڑھنے کے لئے وقت نہیں مل سکا ہو گا ورنہ وہ یوں قابو میں نہ آجاتا۔“

”فواد! اب تمہیں میری طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”تم جاؤ اور آرام کرو، میرے پاس رشیدہ موجود ہے۔“

”ہاں رشیدہ، تم کہہ رہی تھیں کہ سعد کو سردی لگ رہی تھی، اسے چادر اڑھا دو۔“ فواد بولا۔

سوی نے اپنے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے آگے بڑھ کر مجھے چادر اڑھا دی۔

”تو پھر میں واقعی جاؤں؟“ فواد نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں جاؤ! میں ٹھیک ہوں اب۔“ میں نے جواب دیا۔

”رشیدہ! تم نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔ ملازموں سے اپنے لئے ناشتا منگوا لیتا!“ فواد یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھا۔

”میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر سے پوچھنے بغیر سعد کو ابھی کچھ نہ دینا۔“

”یہ سراسر ظلم ہے کہ ناشتا میں نے بھی ابھی نہیں کیا اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”شام تک ٹھہر جاؤ سعد! ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر تمہیں کچھ نہیں کھانا چاہئے۔“ فواد نے مجھے اپنی

دانت میں سمجھایا۔

”تم کہتے ہو تو کچھ نہیں کھانا پیتا۔“ میں گویا مان گیا۔

فواد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ سوی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”تو نہ گھبرا اے علیا لیش!“

میں اپنے لئے اتنا ناشتا منگوا لوں گی کہ تیرا پیٹ بھی بھر جائے۔“

سوی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ جلد ہی ملازمین ناشتا بنا کر لے آئے۔ سوی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ ناشتا کر لے گی تو انہیں بلالے گی کہ ٹرائی لے جائیں۔ پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے میری طرف پلٹی اور کہا۔ ”چل اٹھ! ناشتا کر لیتے ہیں۔ ہم دونوں کے لئے یہ کافی رہے گا۔“

میں فوراً ہی اٹھا کر بیٹھ گیا۔ فواد سے میں غلط نہیں کہا تھا، مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔
 ”ہاں وہ بات تو بتا اے علیا لیش، جو فواد کی آمد کے سبب ادھوری رہ گئی۔ تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ کہنے والا تھا!“

”دیکھ اے سوی، پہلے مجھے ناشتا کر لینے دے، باتیں بعد میں کرتے رہیں گے۔“

ناشتا کر کے میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور یہ فطری تھا کیوں کہ میں انسانی قالب میں تھا۔ ملازم ناشتے کی ٹرائی لے کر جا چکا تھا۔ اس کے جاتے ہی سوی نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اگر میں نے زخمی قالب ہی اپنایا ہوتا تو تکلیف و اذیت کی وجہ سے مجھے نیند نہ آتی۔
 ”اے سوی! کچھ دیر کو ہم دونوں سو جائیں تو کیسا ہے؟ تو بھی گزشتہ رات کی جاگی ہوئی ہے۔“ میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”اور تو وہ بات مجھے نہیں بتائے گا جو بتانے والا تھا!“

”ایسی جلدی بھی کیا ہے، بتا دوں گا۔“ میں نے نیند کی وجہ سے اسے ٹالنا چاہا۔

”نہیں، ابھی بتا ورنہ میں تجھے نہیں سونے دوں گی!“

نیند بھگانے کی مجھے یہی تدبیر نظر آئی کہ انسانی قالب سے باہر آجاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا اے سوی کہ شدید زخمی ہو جانے کے سبب میرا جلد صحت یاب ہو جانا ممکن نہیں۔ نجوا فی الحال مجھے بہ طور چارہ استعمال نہیں کر سکتی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنے پراسرار دشمنوں کے بارے میں بت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ نجوا کے وہم گمان میں یہ بات نہیں آسکے گی کہ جو شخص بیٹھنے اٹھنے کے قابل نہ ہو، وہ کیسے آ جاسکتا ہے۔ میری نظر میں اس کے لئے رات کا وقت زیادہ مناسب ہے۔“ جو بات میرے ذہن میں آئی تھی، میں نے بتا دی۔

”تیرا کہنا درست ہے۔“ سوی نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ”مجھے دشمن کے ایک ٹھکانے کا بھی علم ہو چکا ہے۔“

سوی کا اشارہ سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔ ”لیکن ضروری نہیں اے سوی کہ طلال بے یا نجیب ہمیں عباسیہ کے اسی مکان میں مل جائیں۔ جس طرح نجوا اپنے ٹھکانے بدلتی رہتی ہے، وہ دونوں بھی میرے اندازے مطابق کسی ایک جگہ نہیں نکلتے ہوں گے۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ۔“

”دیکھ لینے میں کیا مضائقہ ہے!“ سوی بول اٹھی۔ ”ورنہ تو انہیں تلاش کرنے کے ہمارے پاس دوسرے راستے بھی ہیں۔“

”ان دونوں سے پہلے ہمیں راقصہ جزیلہ کو تلاش کر کے بھی کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔“

”وہی کہ جس نے تجھے اوبرج کے باہر ایئر بیگ دیا تھا؟“ سوی نے تصدیق چاہی۔

”ہاں وہی۔“ میں بولا۔ ”ہر چند کہ وہ شخص ایک درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے، پھر بھی ہمیں کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تو بہر حال طے ہے کہ مقرر کے غلاموں سے جزیلہ کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے ورنہ اس کے پاس وہ قیمتی ایئر بیگ نہ ہوتا۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ پہلے اسی رقامہ جزیلہ کو آج رات ہم تلاش کر لیتے ہیں۔“ سوی نے کہا۔
”اور کچھ نہیں تو اس سے یہ تو پتا چل ہی سکتا ہے کہ وہ ایئر بیگ اسے کس نے دیا؟“
مزید کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو کر کے میں انسانی قالب میں لوٹ آیا۔ پھر کچھ ہی دیر میں ہم دونوں بے خبر سو گئے۔

☆=====☆

فون کی گھنٹی بج رہی تھی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ سوی ابھی نہیں جاگی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ گہری نیند سو رہی تھی۔ ذہن پر غودگی کے اثر کی وجہ سے میں یہ بھول ہی گیا کہ یہ ظاہر شدید زخمی ہوں اور انٹھے بیٹھنے کے قابل نہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ایسے شخص سے فون ریسیو کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔ سوی کو سوتا دیکھ کر میں اطمینان سے اٹھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ میں ابھی اس تپائی کے قریب پہنچا تھا کہ جس پر ٹیلی فون رکھا تھا کہ خوش قسمتی سے سوی جاگ اٹھی۔
”رک جا! یہ کیا کر رہا ہے تو؟“ سوی تیز اور گہرائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔
میں ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ سوی لپک کر میرے قریب آگئی اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اسی وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ سوی نے ریسیور اٹھا لیا اور بولی۔ ”ہیلو!“ دوسری طرف سے غالباً دیر سے ریسیور اٹھائے جانے کی وجہ پوچھی گئی۔ سوی اسی لئے کہنے لگی۔ ”جی..... جی ہاں“ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ اب پہلے کی نسبت بہت ٹھیک ہے..... بہتر ہے، میں آپ کی طرف سے اس کی خیریت پوچھ لوں گی..... جی کوئی بات نہیں، جب آپ کو فرصت ملے آجائیے گا..... کیا؟..... اچھا ٹھیک ہے، شام کو چار بجے..... منصور لے کر آئے گا؟..... بہتر ہے۔“
سوی جس لمبے میں میں فون پر بات کر رہی تھی، اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ دوسری طرف سے بولنے والی نجوا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ پھر جب سوی نے ریسیور رکھ دیا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ سوی مجھے میری بے وقوفی کا احساس دلاتی، میں نے خود ہی اس کا اعتراف کر لیا۔

”میری دیکھ کر تو میں دنگ رہ گئی کہ تجھے کیا ہو گیا ہے! وہ تو اچھا ہوا کہ میں وقت پر جاگ گئی ورنہ تو ریسیور اٹھا لیتا تو جانے کیا ہوتا! اس عیار آدم زاد کی مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ اسے تو شروع ہی سے تجھ پر شک ہے۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں بے بس جان کر کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی ہے۔“
”تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس نے کس لئے فون کیا تھا؟ منصور کسے لے کر آئے والا ہے؟“ میں نے معلوم کیا۔

”شام چار بجے منصور اپنے ساتھ ڈاکٹر کو لے کر آئے گا۔ نجوانے یہی اطلاع دینے اور تیری خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔“ سوی نے بتایا۔
میں نے سامنے ہی لگے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ

تھا کہ ہم کئی گھنٹے گہری نیند سو چکے تھے۔

”سوی! اب تو جلدی سے کھانا منگوا لے ورنہ پھر موقع نہیں ملے گا۔“ میں بولا۔

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں لپک کر بستر پر دراز ہو گیا اور چادر اوڑھ لی۔ سوی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو فواد اندر آگیا اور کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے نجوا کا فون آیا تھا۔ کیا تم لوگ سو گئے تھے؟“

اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ نجوانے جب دوسری مرتبہ فون کیا ہو گا تو میری آنکھ کھلی ہو گی۔

”ہاں۔“ سوی نے جواب دیا۔ ”سعد نے مجھے سلا دیا تھا۔ بات ہو گئی نجوا صاحبہ سے۔“

”لیکن کیا سعد بھی.....“

”میری بھی آنکھ لگ گئی تھی۔“ میں بول اٹھا۔ ”شاید یہ اس خواب آور انجکشن کا اثر ہو گا جو ڈاکٹر

نے لگایا تھا۔“ میں نے بات بنا دی۔

”حیرت ہے۔“ فواد کہنے لگا۔ ”تمہاری جو حالت ہے سعد، اسے مد نظر رکھتے ہوئے یہ تعجب خیز بات

ہی لگتی ہے۔ کمال قوت برداشت ہے تمہارے اندر۔“ پھر فواد نے بھی یہی خبر دی کہ منصور شام کو ڈاکٹر کے ساتھ آئے گا۔ ابھی اس کی بات ختم ہوئی تھی کہ ملازم کھانا لے آئے۔

”میں کہتا ہوا آیا تھا۔ سوچا کہ تمہارے ساتھ ہی میں بھی کھانا کھاؤں گا۔“ فواد نے بتایا۔

اے آدم زاد! تجھے خدا ہی سمجھے! تو نے ایک جن زاد کو بھوکا مار دیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

پھر بھی میری زبان پر یہ الفاظ آئی گئے۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہے فواد! مجھ بھوکے پیاسے آدمی کے سامنے

تم کھانا کھاؤ گے! یہ تو سوچو کہ اس سے میرے دل پر کیا گزرے گی!“

”اگر ایسی بات ہے تو ہم دونوں کو غمی کے دوسرے حصے میں جا کر کھانا کھا لیتے ہیں۔“ فواد یہ کہتے

ہوئے دھیرے سے ہنس دیا۔ ”تمہیں تو ویسے بھی ابھی ڈاکٹر کھانا کھانے کی اجازت نہیں دے گا۔“

اس کی ہنسی مجھے زہر معلوم ہوئی اور میں نے دل پر جبر کر کے کہہ ہی دیا۔ ”اب کھانا آئی گیا ہے تو

یہیں کھاؤ، میں دوسری طرف منہ پھیرے لیتا ہوں۔“

وہ دونوں کھانا کھاتے رہے اور میں صبر کر کے لیٹا رہا۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا! اسی وجہ سے

اس روز مجھے رات تک بھوکا رہنا پڑا۔ فواد تین بجے کے قریب اٹھ کر گیا تو موقع ملتے ہی میں نے سعد کا

زخمی قالب اپنا لیا اور کر رہنے لگا۔ اگر ڈاکٹر کو نہ آنا ہوتا تو میں ہرگز دانستہ یہ عذاب مول نہ لیتا۔

”کیوں، کیا زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟“ سوی میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے

لگی۔ کمرے کا دروازہ اب اس نے کھلا رہنے دیا تھا۔

”تکلیف تو ہے، مگر پہلے سے کچھ کم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ میری آواز دھیمی ہی تھی۔ ”یہ

سب خود کو آدم زاد ثابت کرنے کی سزا ہے۔“

ڈاکٹر کی آمد تک مجھے وہ اذیت برداشت کرنی پڑی۔ منصور چار بجے سے کچھ پہلے ہی ڈاکٹر کو لے کر

آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا اور کسی قدر حیرت بھی۔ منصور کے اشتہار پر ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”اب یہ خطرے کی حدود سے باہر نکل آئے ہیں۔ انہوں نے بہت جلدی رکوپ کیا ہے۔ ایسے کیسز میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ کل صبح انہیں صرف قہوہ پینے کو دیا جاسکتا ہے۔“ پھر ڈاکٹر نے تکلیف کم کرنے کے لئے مجھے انجکشن لگایا۔

خدا خدا کر کے منصور کے ساتھ ڈاکٹر ملا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور فوراً ہی قالب تبدیل کر لیا۔

”اب تو اپنے لئے چائے اور تھوڑا بہت ناشتہ منگوا ہی لے۔“ میں نے سوی سے کہا۔

”اپنے لیے یا تیرے لئے؟“ سوی یہ کہتے ہوئے مسکرائی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس روز رات تک کیوں کہ میری قسمت میں بھوکا رہنا ہی لکھا تھا، شاید اسی وجہ سے فواد آگیا۔ سوی اسی کے ساتھ کمرے میں لوٹ آئی۔ عیادت میرے لئے عذاب بن گئی تھی۔ نجوا اب تک ظاہر تو یہی کرتی رہی تھی کہ اسے میری کوئی پروا نہیں ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس معلوم ہونے لگی تھی۔ اسے یقیناً میری اہمیت کا احساس ہو چلا تھا۔ فواد ابھی میرے پاس سے اٹھ کر نہیں گیا تھا کہ کسی اطلاع کے بغیر وہ مجھے دیکھنے چلی آئی۔ اسی دوران میں اس نے فواد کو تاکید کی کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت میرے پاس گزارے۔

میں نے اس مصیبت سے بچنے کے لئے نجوا کو مخاطب کیا۔ ”اب ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ میری نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے صرف رشیدہ کافی ہے۔“

”تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم موت کے دہانے سے واپس آئے ہو۔ طلال بے کی چلائی ہوئی گولی تمہارے دائیں پیچھڑے سے نکالی گئی ہے جس سے پیچھڑے کو بھی نقصان پہنچا ہے۔“ نجوا نے وضاحت کی۔ ”یہ کوئی معمولی زخم نہیں ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر تمہارے اندر غیر معمولی قوت برداشت نہ ہوتی تو تمہارا بچنا محال تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد صحت یاب ہو جاؤ۔“

”ناک تم ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف چارے کے طور پر استعمال کر سکو۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز میں چہن تھی۔

خلاف توقع اس پر نجوا ہنس کر کہنے لگی۔ ”بالکل ٹھیک سمجھے۔ آئندہ بھی میرا یہی ارادہ ہے۔ کاش تم اتنے شدید زخمی نہ ہوتے تو مجھے اس کے لئے انتظار نہ کرنا پڑتا۔“

”میرے علاوہ بھی تو تمہارے پاس اور بہت سے آدمی ہیں۔ تم ان سے بھی تو یہ کام لے سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میرے پاس آدمی تو ہیں، لیکن میں انہیں دانستہ موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔“ وہ مسکرائی۔

”اور مجھے دھکیل سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ ”اور اس کی کئی جو بات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اگر

تم مارے بھی جاؤ تو مجھے کوئی رنج نہیں ہو گا۔ دوم یہ کہ کم از کم پانچ فیصد مجھے یہ یقین ہوتا ہے کہ تم موت کا گھبراؤ کر نکل آؤ گے اور اب تک یہی ہوا ہے۔ پھر یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں نے نہ تو تم سے کچھ چھپایا ہے اور نہ تمہیں اس پر مجبور کیا ہے۔ تم آج بھی میری طرف سے آزاد ہو۔ جب بھی تم کو گئے، میں تمہیں عراق واپس بھجوا دوں گی۔ پھر تم پر جو بھی گزرے تھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔“

”عراق پہنچ کر مجھ پر جو گزرے گی، اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ مقررہ کے غلام مجھے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”میں اسی لئے تو یہ چاہتی ہوں کہ جب تمہیں مرنا ہی ہے، تو پھر گھبرانا کیسا! اپنے دشمنوں سے تم بڑے ہوئے مارے جاؤ تو یہ بہتر ہے اور میں تمہیں یہی مواقع فراہم کرتی رہتی ہوں۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ تمہارے دشمن آسانی سے تمہیں شکار نہیں کر سکیں گے۔ اس کی بڑی وجہ تمہاری بیوی رشیدہ ہے۔ گزشتہ رات بھی اگر رشیدہ درمیان میں نہ آگئی ہوتی تو طلال بے تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ طلال بے یا نجیب کو قابو میں کر لینا کتنا مشکل ہے! میرے سوا کبھی کوئی ان دونوں پر آج تک حملے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جیسی تو میں کہتی ہوں کہ رشیدہ دوسری نجوا بن سکتی ہے اور اس نے خود کو اہل بھی ثابت کر دیا ہے۔ تمہاری طبیعت تھوڑی سنبھل جائے تو میں، رشیدہ سے کام لینا شروع کر دوں گی۔“ نجوا نے نیا شوشہ چھوڑا۔

”نہیں!“ میں بول اٹھا۔ ”تم ایسا نہیں کرو گی جب تک کہ میں پوری طرح صحت یاب نہ ہو جاؤں۔“

”تم شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو سہ کہ تمہارے بغیر رشیدہ تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔“ نجوا دھیرے سے ہنسی۔ ”میں جلد ہی تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں گی۔ تمہارا انکار میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ رشیدہ کی نظر میں اب تم سے زیادہ میری اہمیت ہے۔ وہ تمہارا نہیں، میرا حکم مانے گی۔“ نجوا نے یہ کہتے ہی قریب ہی موجود سوی کو مخاطب کیا۔ ”ادھر دیکھو رشیدہ! اپنے شوہر کو بتاؤ کہ تم اس کی زیادہ وفادار ہو یا میری!“

میں اس عیار آدم زاد کی کاکھیل اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ یقیناً سوی بھی اس سے بے خبر نہیں تھی۔ اپنی دانست میں سوی کے ذہن کو نجوا نے اپنے قابو میں لے لیا تھا۔

”اپنے شوہر سے زیادہ میں، نجوا صاحبہ کی وفادار ہوں۔“ سوی خواب ناک سی آواز میں کہنے لگی۔ مجھے سوی سے اسی جواب کی توقع بھی تھی۔

”اگر سہ تمہیں کوئی حکم دے اور میں وہ حکم ماننے سے تمہیں منع کر دوں تو تم کس کی بات مانو گی؟“ نجوا نے سوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

”میں آپ کی بات مانوں گی نجوا صاحبہ!“ سوی نے بہ دستور خواب آلود آواز میں جواب دیا۔

”نجاو یہ سنتے ہی میری طرف دیکھ کر بولی۔“ تم نے سن لیا سہ! تمہاری وفادار و جاں نثار بیوی نے ابھی کیا کہا ہے!“

”ہاں سن لیا۔“ میں نے طویل سانس لیا۔ ”ایک رشیدہ ہی کیا“ شاید کوئی بھی تمہاری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یقیناً تمہاری پراسرار قوتیں ہیں۔“

”جب تم اس نتیجے پر پہنچے ہو تو آئندہ میری کسی بات سے انکار نہ کرنا۔“ نجوانے مجھے تاکید کی، پھر کہا۔ ”اگر تم اس کا مزید عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتے ہو تو وہ بھی میں تمہیں دکھا سکتی ہوں۔ بہ ظاہر تم خود اٹھنے بیٹھنے یا چلنے کے قابل نہیں ہو، لیکن اگر میں چاہوں تو میرے حکم پر تمہیں بستر سے اتر کر چلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔“

”نہیں نجوا صاحبہ!“ سوی خوفزدہ سی آواز میں بول اٹھی۔ ”ایسا نہ کیجیے! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ سعد کوئی بھی حکم ماننے سے انکار نہیں کرے گا۔“

فواد بھی اس موقع پر خاموش نہیں رہا۔ اس نے بھی میری سفارش کی تو نجوا بولی۔ ”میرے کسی حکم سے انکار کرنا اس کے بس میں ہے بھی کہاں!“

”آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔“ سوی نے فوراً تائید کی۔

”رشیدہ! میں خود ڈاکٹر سے بات کر لوں گی کہ سعد کو مزید کتنے دن خصوصی نگہداشت کی ضرورت ہے! جب یہ تمہارے بغیر تیار نہ سکے گا تو پھر میں تمہیں اس کے پاس سے بلوا لوں گی۔ ممکن ہے عارضی طور پر مجھے تمہارے قیام کا کہیں اور بندوبست کرنا پڑے۔“ نجوانے کہا۔

”مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے، لیکن میری درخواست یہی ہے کہ میں‘ سعد ہی کے ساتھ رہوں۔“ سوی کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ ویسے میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، اس کے پیش نظر تمہیں چند روز کسی اور ہی جگہ رہنا ہو گا۔ تمہیں سعد کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، تمہاری غیر موجودگی میں فواد اس کا پورا خیال رکھے گا۔“ نجوا یہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

نجوا چلی گئی، مگر فواد اس کی ہدایت کے مطابق مجھے چھوڑ کر نہیں گیا۔ اسی دوران میں رات کے کھانے کا وقت بھی ہو گیا۔ اس نے سوی سے کھانا منگوانے کے لیے پوچھا۔ سوی دانستہ اس کی بات ٹال گئی کہ ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔ اگر وہ فواد کے ساتھ کھانا کھا لیتی تو پھر مجھے بھوکا ہی رہنا پڑا۔ سوی کے لئے دوبارہ کھانا منگوانے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔

فواد شاید دیر سے کھانا کھانے کا عادی نہیں تھا اس لئے کچھ ہی دیر میں اٹھ گیا۔ اس وقت رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔

”اب جلدی سے کھانا منگوا اے سوی!“ فواد کے جاتے ہی میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”مزید بھوکا رہنا میرے لئے ممکن نہیں۔“

”جہاں تُو نے اتنا مہر کیا ہے، توڑی دیر اور سی! فواد کو عمارت کے اس حصے سے تو نکل جانے دے۔“

”تُو کہتی ہے تو کر لیتا ہوں مہر!“ میں نیم دلی سے بولا۔ ”روٹی شای منگوانا تاکہ جلدی ہضم نہ ہو۔“

سوی نے اقرار میں سر ہلایا۔ دیگر عرب ممالک کی طرح مصر میں بھی کھانے پھینکے ہوتے ہیں۔ روٹیاں دو طرح کی ہوتی ہیں، شامی اور بلدی۔ شامی روٹی میدہ کی ہوتی ہے اور بلدی وہ روٹی کھلاتی ہے جس کے آنے سے بھوس نہیں نکالی جاتی۔ ایک پیاسٹر کی ایک روٹی ملتی تھی۔ کھانوں میں سب کباب اور کوفہ، دونوں میں بیٹخوں پر نیم کچے بھونے جاتے ہیں۔ سب کباب تھک ہوتا ہے اور کوفہ، چھوٹی چھوٹی گوشت کی نیم کچی، یعنی ہوتی بوٹیاں کھلاتی ہیں۔ قیے سے بنائے ہوئے کباب الگ ہوتے ہیں۔ غریبوں کی غذا تامیہ ہے جو پکڑوں کی مانند ہوتی ہے۔ روٹی کے درمیان تامیہ رکھ کر روٹی کو سکھنے کے بعد دو ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ ایک تامیہ اس وقت پانچ پیاسٹر کا سینڈویچ کی صورت میں مل جاتا تھا۔ روٹی کے علاوہ کھانے میں جاول بھی استعمال ہوتے ہیں۔ پھلوں میں تربوز بہت ہوتا ہے۔ آم، خربوزہ، موہبی، کیلا، سیب بھی پھل ہوتے ہیں۔ خشک میدہ باہر سے آتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں سوی کے کتنے پر ملازم کھانا لے آئے۔ میں دن بھر کا بھوکا تھا اس لئے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اس کے لئے سوی کو کمرے کا دروازہ بند کرنا پڑا تھا۔

اس رات ہمارا ارادہ راقصہ جزیلہ کو تلاش کرنے کا تھا۔ میرے خیال میں جزیلہ سے کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔

”اے سوی! نصف شب گزرنے کے بعد ہی ہمیں اس حسین فتنے جزیلہ کی تلاش میں نکلنا چاہئے۔“ میں نے سوی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”ابھی تو دس ہی بجے ہیں۔“

”ضروری نہیں اے علیالیش کہ ہم آدھی رات ہی کو نکلیں۔“ سوی بولی۔ ”کیا خبر آج کسی ٹائٹ کلب میں اس کا پروگرام نہ ہو۔ اگر پروگرام ہو بھی تو گزشتہ رات جو واقعہ پیش آیا ہے، اس کے سبب جزیلہ نے اپنا پروگرام منسوخ کرا دیا ہو۔ تُو پہلے یہ تو معلوم کر کہ اس وقت وہ ہے کہاں!“

”تیرے قیاسات درست بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔“ میں نے سوی کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”میں ابھی اپنے تصور کی قوت آزما تا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

چند ہی لمحوں کے بعد میرے صفحہ ذہن پر جزیلہ کا حسین چہرہ ابھر آیا۔ اسی کے ساتھ میری سماعت سے ایک آشنا آواز نکلنے لگا اور میں چونک اٹھا۔ یہ آواز سو فیصد نجیب المہندس کی تھی۔ وہ جزیلہ سے مخاطب تھا۔ ”تمہارے اندر یہ بڑی خرابی ہے کہ تم قلوبہ پر جیتی ہو۔“

میں نے اپنے تصور کا دائرہ وسیع کیا تو راقصہ جزیلہ اور نجیب کو ایک میز کے گرد بیٹھے دیکھا۔ میز پر دو بوتلیں اور خوب صورت جام رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بوتل غیر ملکی شراب کی تھی، دوسری مقامی مصری شراب قلوبہ کی۔ میرے علم میں تھا کہ مقامی مصری شرابوں میں ”قلوبہ“ اور ”عمر خیام“ بہت مقبول تھیں۔

”مجھے کوئی اور شراب پی کر مزہ ہی نہیں آتا۔“ جزیلہ کے حسین لبوں کو حرکت ہوئی۔ ”نجیب! میرا مشورہ مانو تو تم بھی عمر خیام پیا کرو۔“ جزیلہ نے یہ کہہ کر اپنا جام اٹھالیا۔

نجیب نے اپنے جام سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ تندہ تیز نشہ مجھے اچھا

نہیں لگتا۔ نشہ ہلکا ہلکا ہی مزہ دیتا ہے، بالکل تہمداری طرح!“ پھر جیسے نجیب کو کچھ یاد آگیا اور اس نے پوچھا۔
”تم نے ایریزنا نائٹ کلب تو فون کر دیا تھا؟“

”فون کیوں نہ کرتی؟ آج کی رات تمہارے نام جو کر چکی تھی!“ جزیلہ نے اٹھلا کر جواب دیا، پھر بتایا۔
”غیر مجھے دھمکی دے رہا تھا آئندہ کے لئے میرا معاہدہ منسوخ کر دے گا۔“
”تم مطمئن رہو، میں اسے سنبھال لوں گا۔“ نجیب نے جزیلہ کو اطمینان دلایا۔

معلوم نہیں کیوں نجیب کو اپنی پراسرار قوتوں کے باوجود اب تک یہ احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے! اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آسکی کہ نجیب کی تمام تر توجہ جزیلہ کے حسن کی حشر سامنیوں پر مرکوز تھی۔ ان کی گفتگو سے سوئی کا یہ قیاس درست ثابت ہوا کہ ممکن ہے، جزیلہ آج رات کسی نائٹ کلب میں رقص نہ کرے۔ ہاں اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ اس کا سبب بہ ظاہر گزشتہ شب پیش آنے والا واقعہ نہیں تھا۔ جزیلہ اس رات نجیب کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ جزیلہ، نجیب کی داشت ہوگی۔ نجیب کی موجودگی میں جزیلہ تک پہنچنا یا اس سے کچھ معلوم کرنا بہر حال ناممکن تھا۔ اس لئے وہ رات رائیگاں چلی جاتی۔ پھر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ یہی سوچتے ہوئے میرے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ابھی تک میں اپنے تصور کو مزید وسعت دے کر یہ بھی پتا نہیں لگا سکا تھا کہ جزیلہ اور نجیب کہاں تھے! اسی خیال سے میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مجھے جو معلوم کرنا تھا، معلوم ہو گیا۔

اس وقت نجیب اور جزیلہ، جزای کے ایک علاقے المنیل میں تھے۔ المنیل تقریباً جزیرہ ہے۔ دریائے نیل نے اسے بقیہ خشکی کے راستوں سے کاٹ دیا ہے۔ اب یہ علاقہ پلوں کے ذریعے خشکی سے منسلک ہے۔ بہت خوب صورت اقامتی علاقہ ہے۔ تحریر اسکو از سے اس کا فاصلہ ایک میل ہے۔ یہیں ایک مکان میں نجیب اور جزیلہ موجود تھے۔ یہ مکان بہترین سامان آرائش سے مزین تھا۔ لگتا یہی تھا کہ وہاں راقصہ جزیلہ رہتی ہوگی۔

جب میں نے یہ معلوم کر کے آنکھیں کھولیں تو سوئی کو اپنی ہی طرف متوجہ پایا۔
”کچھ پتا لگا؟“ سوئی نے مجھ سے دریافت کیا۔

”ہاں میں نے اس کا پتا تو لگا لیا ہے مگر وہاں فی الحال جانیں سکتے کیوں کہ جزیلہ کے پاس اس وقت ایک خطرناک آدم زاد موجود ہے، ہمارے پراسرار دشمنوں میں سے ایک! وہی بغداد کے ایک ہسپتال میں ٹوٹنے جس کا گلا دبایا تھا۔“ میں نے بتایا۔

سوئی یہ سن کر اچھل پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کس کا ذکر کر رہا ہوں!

”تو نجیب۔“ نجیب ہے اس کے پاس؟“ سوئی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں وہی ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر سوئی کو سب کچھ بتا دیا۔

”اے علیا لیش! اگر تیرا یہ کہنا درست ہے کہ جزیلہ، نجیب کی داشت ہے تو ایک امکان اور بھی ہے۔“ سوئی کے چہرے سے فکر مندی ظاہر ہونے لگی۔

”وہ امکان کیا ہے اے سوئی؟ یہ بھی تو بتا!“

”وہ یہ کہ جزیلہ بھی شیطانی عملیات سے واقف ہو سکتی ہے۔ کیا تو ان جہشیوں جیسے اور رچرڈ کو بھول گیا جو کراچی میں تیرے ہاتھوں مارے گئے! وہ دونوں مقرر کے غلام نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہیں نجیب اور طلال بے نے اپنے دفاع کی خاطر کچھ شیطانی عمل سکھا رکھے تھے۔ یہی معاملہ جزیلہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کوشش کے باوجود اس سے کچھ معلوم نہ کر سکیں۔ یاد رکھ کہ وہ صرف نجیب کی داشت ہی نہیں بلکہ آلہ کار بھی ہے۔“ سوئی نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”اس کا اندازہ تو تجربہ کر کے ہی ممکن ہے۔ ہم یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتے۔“ میں بولا۔
”اس وقت تو یہ مسئلہ ہے کہ کسی طرح نجیب کو جزیلہ کے پاس سے بھگا دیا جائے۔“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں، ہاں خطرناک ضرور ہے۔ میں یہ اس لئے بھی کہہ رہی ہوں کہ تجھے خدروں سے کھیلنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔“ سوئی نے یہ کہہ کر مشورہ دیا۔ ”تجھے اس مقصد کے حصول کی خاطر فرعون خضر کے ایک امیر زاعون کی روح کا ڈھونگ چرانا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پھر نجیب وہاں نہیں رک سکے گا، لیکن تجھے بھی ایسا کرتے ہوئے انتہائی چوکنا اور محتاط رہنا ہو گا۔ جیسے ہی تو یہ دیکھے کہ نجیب کوئی شیطانی عمل پڑھنے لگا ہے، تجھے وہاں سے غائب ہو جانا ہے۔ پہلے کی طرح تجھے دیر نہیں کرنی کہ تیرے وجود میں انگڑے بھر جائیں۔“

سوئی کا مشورہ مجھے قابل عمل معلوم ہوا۔ میں نے اسی لئے اسے یقین دہانی کرائی کہ غافل نہیں رہوں گا۔

کمرے کا دروازہ تو پہلے ہی سے بند تھا۔ میں نے لائٹ بھی آف کر دی۔ اس پر سوئی نے مجھ سے نیلی فون کا ریسپور اٹھا کر بھی ایک طرف رکھ دینے کو کہا۔

”اول تو رات کے وقت نجوایا منصور کا فون نہیں آئے گا، اگر انہوں نے فون کیا تو یہی سمجھیں گے کہ سکون سے سونے کی خاطر خود ہی ہم نے ریسپور اٹھا کے رکھ دیا ہو گا۔ بعد میں فون ریسپو نہ کرنے کی انہوں نے وجہ پوچھی تو ہم اس بات کی تصدیق کر دیں گے۔“ سوئی نے یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنا چاہا۔

”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اس کمرے میں یہ بلا بھی موجود ہے۔“ میں نے ٹھنڈا سا ناس بھرا۔ ”مان لے کہ نجوایا نے ہماری غیر موجودگی میں فون کیا تو کوئی جواب نہ ملے پر وہ حرافہ چین سے نہیں بیٹھے گی۔ یاد نہیں تجھے کہ آج دوپہر کو جب ہم سو رہے تھے تو فوراً ریسپور نہ اٹھانے پر اس نے فواد کو فون کر دیا تھا اور پھر وہ ہمارے پاس دوڑا چلا آیا تھا۔“

”تو پھر تو ہی بتا اے علیا لیش کہ کیا کیا جائے؟ اگر ہماری غیر موجودگی میں فواد نے ہمارے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو کیا ہو گا؟“

”اس سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اے سوئی!“ میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل آئی گیا۔ ”تو ذرا لائٹ جلا اور فواد کو فون کر کے بتا دے کہ ہم سو رہے ہیں۔ آرام سے سونے کی خاطر ہم ریسپور بھی الگ رکھ کر سوئیں گے، فواد کو یہ بھی بتا دینا کہ رات کے وقت نجوایا کوئی پیغام آئے تو وہ صبح

ہیں اس سے آگاہ.....

ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت تک سوی کمرے میں روشنی کر چکی تھی۔

”دیکھ اے سوی! کون ہے!“ میں ناگوار سی آواز میں بولا۔ ”اس بلائے تو دن کا سکون اور رات کا چین غارت کر رکھا ہے۔“

سوی لپک کر میرے قریب آگئی۔ میں پیچھے ہٹ گیا تو اس نے ریسور اٹھا لیا اور کہا۔ ”ہیلو!..... اچھا منصور بولو۔“ وہ مجھے سنانے کے لئے فون کرنے والے کا نام لینے لگی۔ ”اگر چند لمے اور تمہارا فون نہ آتا تو میں ریسور اٹھا کے رکھنے ہی والی تھی۔“ دوسری جانب سے منصور نے غالباً اس کی وجہ پوچھی تھی۔ سوی اسی لئے وہ سبق دہرانے لگی جو میں نے ابھی اسے پڑھایا تھا، پھر پوچھا۔ ”کس لئے فون کیا تھا تم؟..... تو یہ اطلاع تم صبح دے دیتے کہ اب ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آج کی طرح کل شام ہی آؤ گے..... کیا؟ ریسور الگ نہ رکھوں، مگر کیوں؟..... تو کیا ایسا بھی ممکن ہے؟..... ہاں ہاں دشمن کو کبھی میں بھی کمزور نہیں سمجھتی، مگر ایسی کسی صورت حال سے لکھنا مشکل ہو جائے گا..... اچھا..... ہوں..... ٹھیک ہے۔“ سوی نے ریسور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

مجھے سوی کے چہرے پر فکر اور جھنجھلاہٹ کے طے جلتے اثر نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”شیطان کا ہر کارہ کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہہ رہا تھا کہ ریسور الگ نہ رکھوں۔“ سوی نے بتایا۔ ”میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس کے خیال میں یہ امکان بھی ہے کہ مقرر کے غلام اس کو خفی کا سراغ لگا کر اس پر حملہ کر دیں۔ ایسی صورت میں رابطے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور ہونی چاہئے تاکہ ہمیں بروقت خطرے سے آگاہ کیا جاسکے۔ تیری حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر ایسا کوئی خطرہ ہوا تو تجھے کسی ایبولینس کے ذریعے یہاں سے نکال کر لے جایا جاسکتا ہے۔ اب یہ بتا کہ کیا کیا جائے؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اب کوئی قدم اٹھانے کے لئے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے سوی سے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

”دیکھ اے علیائش! اگر تو اس گمان میں ہے کہ میں تجھے دشمنوں کی طرف اکیلا جانے دوں گی تو اسے بھول جا!“ سوی میری تجویز سن کر بولی۔

”آخر اس میں مضائقہ بھی کیا ہے! تو کیوں دوسروں کا شکار ہوتی ہے اے سوی! اگر یہاں کوئی خطرہ ہوا تو بروقت مجھ تک پہنچ کر تو مجھے اس سے آگاہ کر سکتی ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ تو یہیں رہ اور مجھے جانے دے۔“ میں اسے سمجھانے لگا۔ ”یقین رکھ کہ میں کوئی غیر محتاط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“

بڑی مشکل سے سوی مجھے اکیلا بھیجے پر آمادہ ہوئی۔ انسانی قالب چھوڑ کر میں اس بند کمرے میں سے نکل آیا۔ المیل پہنچنے میں مجھے چند ہی لمے لگے۔ میں جب مطلوبہ مکان میں داخل ہوا تو نجیب اور جزیلہ اس کمرے کے اندر نہیں تھے جہاں وہ مجھے پہلے نظر آئے تھے۔ میں نے سوچا، ”دور شراب کے بعد

اب شاید دور شباب شروع ہو چکا تھا اور میرا اندازہ زیادہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس مکان کی نشست گاہ سے اٹھ کر وہ دونوں خواب گاہ کا رخ کر چکے تھے۔ میں نے انہیں تلاش کر لیا۔

بلاشبہ وہ آدم زاد جزیلہ بلا کی حسین تھی۔ خواب گاہ میں ہلکے نیلے رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ منظر بھی توبہ شکن ہی تھا جو میں نے دیکھا، مگر اب میرے لئے نہیں کہ میں ہٹکے ہوئے جن زادوں میں سے نہیں رہا تھا۔

”یوں لگتا ہے جزیلہ کہ بتے جھروں کی روانی تیرے بدن میں ساگئی ہے۔“ نجیب جیسے گفتگیاں۔ میں اسی لمحے میں نے غیر انسانی آواز میں غرنا شروع کر دیا۔ نجیب لٹے سے بو جھل ذہن کے باوجود اچھل پڑا کیوں کہ یہ آواز اس کے لئے بہر حال اجنبی نہیں تھی۔

”زاعون! دیکھ لے اے نجیب المہندس کہ میں تیرے تعاقب میں بغداد سے یہاں بھی پہنچ گیا۔“ خواب گاہ میں میری غیر انسانی آواز گونجنے لگی۔

”تو..... تو اے فرعون خضر کے امیر کی روح!“ نجیب گھبرا کر اٹھا۔

میں نے مزید ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر مسری سے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی کیوں کہ مجھے اس کے حرکت کرتے ہوئے نظر آگئے تھے۔ یقیناً اس نے ارواح اور جنات سے بچنے کا کوئی عمل پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ اس شیطانی عمل کو پڑھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اس دوران میں صرف یہی ممکن تھا کہ میں اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لیتا۔ نجیب جیج اٹھا، مگر فوراً ہی دوبارہ عمل پڑھنے لگا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ غیبی آدم زاد مجھے کسی عذاب میں مبتلا کر دیتا، میں تیزی کے ساتھ فضا میں بلند ہوتا گیا۔ در و دیوار بھلا کب کسی جن زاد کو روک سکے ہیں! میں نے اونچی پرواز کرتے ہوئے اپنے تعاقب میں شعلے سے لپکتے دیکھے، لیکن وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ میں ان سے بہت اونچا اڑ رہا تھا۔ یہ اسی شیطانی عمل کا نتیجہ تھا جو نجیب نے پڑھا تھا۔ مجھے بغداد میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا اسی لئے ان سے بچ کر پہلے ہی نکل گیا۔ چند لمحوں میں شعلوں کا وہ جال غائب ہو گیا۔

میں نے نجیب کا تصور کیا تو جزیلہ اس سے لپٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔

”تم اتنا کیوں گھبرا رہی ہو جزیلہ! وہ زاعون کی روح ہماری دشمن ہے، مقرر کے غلاموں کی دشمن!“ نجیب اسے تسلی دینے لگا۔ ”تجھ سے وہ کچھ نہیں کہے گی۔“

”مم..... مگرت..... تم مجھے اکیلا چھو..... چھوڑ کر کیوں جا..... رہے ہو؟“ جزیلہ رک رک کر بہ مشکل بول رہی تھی۔ خوف کی زیادتی کے سبب اس کا حسین چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ”تم..... تم نے کہا تھا کہ..... کہ آج رات..... میرے ساتھ ہی گزار دو گے!“

”سمجھنے کی کوشش کرو جزیلہ!“ نجیب نے کہا۔ ”اب یہ ممکن نہیں۔ زاعون کی روح کو یہاں میری موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔ وہ یہاں دوبارہ بھی آسکتی ہے۔“

”لے..... لیکن وہ کلک..... کون ہے؟ وہ ہماری دشمن..... کیوں..... کیوں ہو

گئی ہے؟“ جزیلہ نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔
 ”تم نے سنا تو ہو گا“ میں نے اسے فرعون خضر کے امیر کی روح کہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مقرر کے غلاموں سے اس کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔ اس کا مقصد ہم سے انتقام لینا ہے، لیکن شاید اسے خبر نہیں کہ مقرر کے غلام اس کے قابو میں آنے والے نہیں۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ اسے میرے سامنے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔“ نجیب کا لہجہ پُر غرور تھا۔

”جب وہ..... وہ روح فرار ہو چکی ہے تو..... تم رک کیوں نہیں جاتے؟“ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب جزیلہ اپنے حواس پر قابو پاتی جا رہی تھی۔
 ”میں تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ دوبارہ بھی اس کے یہاں آنے کا امکان ہے۔“ نجیب نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔

”لیکن وہ تمہارے جانے کے بعد یہاں تمہیں ڈھونڈتی ہوئی آگئی تو؟“
 ”تم کیسی اتھانہ باتیں کر رہی ہو! وہ ایک روح ہے۔ اس کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ میں یہاں سے جا چکا ہوں۔“ نجیب نے اس کی گرفت سے نکلنے ہوئے کہا۔
 ”اگر تم جابج رہے ہو تو مجھے وہ عمل بتا دو جس کو پڑھنے سے اس کی روح بھاگ گئی تھی۔“
 ”یہ عمل صرف مقرر کے غلام ہی پڑھ سکتے ہیں، کوئی اور نہیں۔“ نجیب نے اس کو زری سے سمجھایا۔ ”تمہیں اپنی حفاظت کے لئے میں نے کئی عمل بتا تو رکھے ہیں!“
 ”مگر ان میں سے کوئی عمل مجھے کسی روح کے حملے سے تو نہیں بچا سکتا۔“
 ”تمہیں خود بخود یہ وہم ہو گیا ہے کہ زاعون کی روح یہاں آئے گی۔ ہاں اگر میں یہاں سے نہ گیا تو ایسا ضرور ممکن ہے۔“

جزیلہ نے یہ سن کر پھر نجیب سے رکنے کو نہیں کہا۔ اسی لمحے خواب گاہ میں موجود فون کی تھنٹی بج گئی۔ جزیلہ نے فون ریسیو کیا، پھر نجیب کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا فون ہے۔“
 ”میرا فون؟“ نجیب آگے بڑھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ”یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں ہوں!“ پھر اس نے جزیلہ کے قریب پہنچ کر ریسیور لے لیا اور کہا۔ ”ہیلو!“ دوسری جانب سے نہ جانے کیا کیا گویا جسے سن کر نجیب کو میں نے چونکتے دیکھا۔ چند لمحے توقف کر کے وہ پھر بولا۔ ”لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آج ہی رات دھادا بول دیا جائے؟..... نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تو خود یہاں سے چلنے والا تھا۔“ نجیب کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ ”ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔“

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ نجیب جیسے شخص کا لہجہ کس سے گفتگو کرتے وقت معذرت خواہانہ ہو سکتا ہے! اطلاع کے مطابق مقرر کے غلاموں کو آج رات کہیں دھادا بولنا تھا۔ فون پر اسے خبر دینے والا طلال بے کے سوا اور کون ہو گا! میں یہ سوچنے لگا کہ موجود صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اسی کی وجہ سے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے یاد آیا، آج ہی فون پر منصور نے بتایا تھا کہ مقرر کے غلام، فواد کی کوٹھی پر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ کہیں ایسا ہی تو نہیں؟ میں نے سوچا۔ ایسی صورت

میں مجھے فواد کی کوٹھی پر بلا تاخیر پہنچ کر سجدہ کا انسانی قالب اپنا لینا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ محض مراد ہم بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے، مقرر کے غلام کہیں اور حملہ کرنے والے ہوں۔ نجیب کا تعاقب کرنے کی صورت میں مجھے مقرر کے غلاموں کا کوئی نیا ٹھکانا بھی معلوم ہو جاتا۔ دوسری جانب جزیلہ تھی۔ اسے بھی اب نظر انداز کرنا، ممکن نہیں تھا۔

سوچ بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال جزیلہ ہی پر اکتفا کر لینا چاہئے۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو سو ہی بردت مجھ تک پہنچ کر مجھے اس سے آگاہ کر دیتی۔
 چند ہی لمحوں میں نیچی پرواز کرتا ہوا میں ایک مرتبہ پھر اسی مکان کے اوپر منڈلانے لگا جہاں سے نزار ہوا تھا۔ نجیب کو میں نے ایک کار میں بیٹھ کر وہاں سے جاتے دیکھا۔ اب میں اطمینان کے ساتھ کسی مداخلت کے بغیر جزیلہ سے ضروری معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

جزیلہ مجھے اپنی خواب گاہ ہی میں ملی۔ وہ اب سونے کے لئے مسری پر دروازہ ہو چکی تھی۔
 ”جزیلہ!“ میں نے غیر انسانی آواز میں اسے مخاطب کیا۔
 وہ کرٹ سے لیٹے لیٹے اچھل پڑی اور پھلائی۔ ”کک..... کون ہو تم؟“
 ”کیا تو مجھے میری آواز سے نہیں پہچان سکی! ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو نے میری آواز سنی تھی۔ میں زاعون ہوں، فرعون خضر کے ایک امیر کی روح! مجھے یقین ہے کہ تو مقرر کے غلاموں کی طرح میرے عتاب کا نشانہ بننا نہیں چاہے گی۔“ میں اس کے خوف سے فائدہ اٹھاتا چاہتا تھا۔
 ”تت..... تو کیا..... کیا، مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“ جزیلہ کی حسین آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔

”تیری زندگی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور اس کا فیصلہ تجھے خود کرنا ہے کہ تو زندہ رہنا چاہتی ہے یا مرنا!“
 ”مم..... میں..... اے زاعون کی روح! میں مرنا نہیں چاہتی۔“ جزیلہ نے خوفزدہ آواز میں کہا۔
 ”خوبصورت کھلونے توڑنے کا شوق مجھے بھی نہیں۔“ میں غیر انسانی آواز میں دھیرے سے ہنس کر بولا۔

جزیلہ کو میں نے بلا سبب خوفزدہ نہیں کیا تھا، نہ یوں ہی باتوں میں لگائے ہوئے تھا۔ نجیب اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر مجھے ہٹا چل گیا تھا کہ اسے بھی کچھ شیطانی عمل آتے ہیں۔ جزیلہ کو یہ موقع دیے بغیر میں اچانک اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ جلد بازی سے کام بگڑنے کا خطرہ تھا۔ میں نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔

”نہیں!“ جزیلہ ایک دم جھنجھکی۔ ”تجھے میں اپنے دماغ میں نہیں سمجھنے دوں گی!“
 جزیلہ کے ذہن نے شدید مزاحمت کی۔ اسی کے ساتھ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اس نے کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہی میں نے اس

عین اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سومی نے کمرے میں روشنی کر دی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔
 فواد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سومی کو مخاطب کیا۔ ”رشیدہ! تمہیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔“

مجھے ذرا ہی دیر میں یہ محسوس ہوا کہ وہ گمراہ نیند سو چکی ہے۔ شاید یہ بھی شیطانی عمل ہی کا نتیجہ تھا۔ میرے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دوبارہ جھنجھوڑ کر جگا دیتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے اس سے جو پتا کرنا تھا، معلوم ہو چکا تھا۔ میری نظر میں یہ معلومات بہت قیمتی تھیں۔ اول تو یہ کہ مقرر کے ایک

”مگر کہاں؟“ سوی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جدید قاہرہ کے ایک علاقے مند سین تک چلتا ہے۔“ فواد نے بتایا۔ اس کے لہجے سے جلد ہانپ کا اظہار ہو رہا تھا۔

”تو کیا میں‘ سعد کو اس حالت میں اکیلا یہاں چھوڑ دوں؟“ سوی بولی۔

”مجبوری ہے کیوں کہ نجوا کا یہی حکم ہے۔“ فواد نے کہا۔ ”یوں بھی سعد بے خبر اور گہری نیند رہا ہے۔ دروازے پر دستک دینے کے باوجود اس کی آنکھ نہیں کھلی۔“

”لیکن رات کو اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے مجھے آواز دی تو.....“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ہمیں فوری طور پر مند سین پہنچنا ہے۔“ فواد نے سوی کی بات کی بات کاٹ دی، پھر اپنی داستان میں مجھے سوتا ہوا سمجھ کر آواز دی۔ ”سعد!“

”ہوں۔“ میں نے فواد کی دوسری آواز پر آنکھ کھول دی اور حیرت سے بولا۔ ”تم فواد؟“

”ہاں میں۔“ فواد نے تیزی سے کہا۔ ”نجوا کے حکم پر میں‘ رشیدہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ پھر وہ میری کوئی بات سننے بغیر سوی سے لباس تبدیل کرنے کو کہنے لگا۔

”لیکن تم رشیدہ کو اپنے ساتھ کہاں اور کیوں لے جا رہے ہو؟“

”نجوا کو کسی ذریعے سے یہ خبر ملی ہے کہ مند سین کے جس بنگلے میں منصور ٹھہرا ہوا ہے‘ منقرع کے غلاموں کی نظر میں آگیا ہے۔“ فواد جلدی جلدی بتانے لگا۔ ”آج رات کسی بھی وقت منقرع کے غلام اس بنگلے پر حملہ کرنے والے ہیں۔“

”تو منصور کو وہاں سے ہٹا دو!“ میں نے گویا اس مسئلے کا ایک حل پیش کر دیا۔ ”کیا منصور کو متوقع حملے کی اطلاع نہیں دی جاسکتی؟“

”منصور کو اطلاع دی جا چکی ہے۔ وہ اب اس بنگلے میں نہیں ہے۔“

”پھر فکر کی کیا بات ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نجوا اس مرتبہ منقرع کے غلاموں سے دودھ ہاتھ کرنا چاہتی ہے۔ اب کچھ سمجھے تم؟“

اس دوران میں سوی لباس تبدیل کرنے ہاتھ روم کا رخ کر چکی تھی کیوں کہ اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔

”اس ٹکراؤ کے وقت کیا رشیدہ کو ساتھ لے جانا ضروری ہے؟ رشیدہ کی زندگی بھی تو خطرے میں پڑ سکتی ہے!“ میں بولا۔ ”اگر میں بھی رشیدہ کے ساتھ ہوتا تو اور بات تھی۔“

”کیا تمہیں نجوا‘ منصور اور مجھ پر بھروسا نہیں؟ ہم تو رشیدہ کے ساتھ ہوں گے! گزشتہ رات بھی تو رشیدہ میرے ہی ساتھ تھی!“ فواد نے گویا مجھے اطمینان دلایا۔

فواد کو خبر نہیں تھی کہ سب سے زیادہ مجھے سوی پر بھروسا تھا۔ وہ آدم زادوں سے اچھی طرح نہ سکتی تھی۔ اس کے لئے اگر کوئی مشکل مرحلہ تھا تو صرف یہ کہ خود کو ایک آدم زادی ہی ظاہر کرنا تھا۔ فواد کی بات سن کر میں اس طرح خاموش ہو گیا جیسے کوئی لاجواب ہو جاتا ہے۔

سوی ہاتھ روم سے نکل آئی اور مجھے مخاطب کیا۔ ”سعد تم میری طرف سے کوئی فکر نہ کرنا! تم جانتے ہو کہ مجھے اپنی حفاظت کرنا آتا ہے۔“

”تم خود کو تنہا نہ سمجھنا۔“ میں منحنی خیز لہجے میں بولا۔

سوی نے اقرار میں گردن ہلا کر کہا۔ ”میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو!“ اس کا لہجہ بھی معنی خیز تھا۔ ”تمہارا اشارہ یقیناً فواد کی طرف ہے۔“ اس نے بات بنا دی۔

”میرے علاوہ خود نجوا بھی وہاں ہو گی رشیدہ! یہ میں‘ سعد کو بھی بتا چکا ہوں۔ اچھا اب چلو!..... اور سعد! تم آرام سے سو جاؤ!“

”خدا حافظ سعد!“ سوی یہ کہہ کر آگے بڑھی اور کمرے کی بتی بجھا دی۔ پھر وہ فواد کے ساتھ کمرے سے نکل گئی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

اب مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آج رات منقرع کے غلام کہاں حملہ کرنے والے تھے! مندس عربی زبان میں انجینئر کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس علاقے کا نام مند سین رکھا گیا تھا۔ یہ علاقہ جدید اور خوب صورت تھا۔ تحریر اسکوائر سے اس کا فاصلہ تین میل کے قریب تھا۔ جدید قاہرہ کا یہ انتہائی ترقی یافتہ علاقہ تھا۔ یہ اعلیٰ درجے کی آبادی تھی۔ یہاں جدید طرز کے چھوٹے بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ان بنگلوں کو طرح طرح کی جدید تعمیر کے خوب صورت نمونے کہا جا سکتا تھا۔ دو سو سال پہلے جب میں اپنے دوست یاسف کے ساتھ قاہرہ آیا تھا تو اس آبادی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ نجیب کے نام کے ساتھ ”المنس“ کا اضافہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا تھا کہ وہ انجینئر ہے۔

جب سوی اور فواد کے قدموں کی چاپ معدوم ہو گئی تو میں انسانی قالب سے نکل آیا۔ میرے لئے یہ ممکن بھی کب تھا کہ سوی کو تنہا چھوڑ دیتا! خاص طور پر ایسے وقت کہ جب منقرع کے غلاموں سے اس کا ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ میں کوٹھی کے عقبی حصے سے نکل کر بیرونی حصے میں آیا تو مجھے وہاں بڑی سی ایک سیاہ دین کھڑی دکھائی دی۔ اس دین میں ڈرائیور کے علاوہ آٹھ مسلح افراد بیٹھے تھے۔ دین کے آگے ایک کار کھڑی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بھی میں نے تین مسلح ہجوم زدوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان بھی کے پاس جدید خود کار ہتھیار تھے۔ کار کی اگلی نشستیں خالی تھیں۔ فواد‘ سوی کو اپنے ساتھ لئے اسی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر فواد بیٹھ گیا۔ سوی اس کے برابر والی سیٹ پر آگے ہی بیٹھی تھی۔ دونوں سیٹوں کے درمیان دو خود کار رائفلیں رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک رائفل اٹھا کر سوی نے اپنی گود میں رکھ لی۔ رائفلوں کے لیے مزید فاضل میگزین سیٹوں کے نیچے سوی کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

کار کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں تو سامنے ہی کچھ فاصلے پر موجود کوٹھی کے مسلح چوکیدار نے آہنی گیٹ کھول دیا۔ تیز رفتاری کے ساتھ کار گیٹ سے نکلی۔ اسی کے پیچھے سیاہ دین تھی۔ میں نے سوی کے کان میں سرگوشی کی۔ ”میں آگیا ہوں۔“ سرگوشی کے باوجود میں نے یہ الفاظ احتیاطاً اردو زبان میں ادا کیے تھے۔

سوی نے زبان سے کچھ کہے بغیر مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔
مجھے اندازہ نہیں تھا کہ فواد کی قوت سماعت اتنی تیز ہوگی۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوی سے پوچھنے لگا۔ ”رشیدہ! ابھی تم نے کوئی ٹائٹل سنی سرگوشی سنی؟“

”نہیں تو۔“ سوی نے فوراً انکار کر دیا۔ ”مجھے تو کوئی سرگوشی سنائی نہیں دی۔ وہم ہو گا تمہارا!“
”جب تم نے کچھ نہیں سنا تو پھر وہم ہی ہو گا۔“ فواد سامنے سڑک پر نظر جمائے ہوئے بولا۔

ذرا دیر کے بعد فواد کی کار دریائے نیل پر بنے ہوئے پلوں میں سے ایک پل پر تیز رفتاری کے ساتھ دوڑنے لگی۔ میں نے سوچا، اس عرصے میں ایک چکر مند سین کا لگا لوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں تیزی سے اڑتا ہوا مطلوبہ آبادی تک پہنچ گیا اور اس پر منزلانے لگا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ اس علاقے کے کس حصے یا کس جنگلے میں منصور کا قیام تھا۔ رات نے ابھی اپنا نصف سفر طے نہیں کیا تھا۔ اس لئے جگہ جگہ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ جہاں متوقع معرکہ گرم ہونے والا تھا، اسی کے آس پاس نجوا، منصور اور نجوا کے دیگر آدمیوں کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ منصور کا چہرہ مجھے نظر آگیا۔ اسی کے ساتھ مجھے نجوا بھی دکھائی دی۔

معاً میں نے نجوا کو چوکتے دیکھا، پھر اس کی سخت آواز سنی۔ ”کون ہو تم؟ ہمیں کیوں دیکھ رہے ہو؟“

منصور اور نجوا ایک کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ اگلی نشستوں پر نجوا کے مسلح ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔ نجوا اور منصور کے ہاتھوں میں بھی مجھے خود کار رائفلیں نظر آرہی تھیں۔ نجوا کی آواز سن کر منصور نے اس سے حیرت زدہ آواز میں معلوم کیا۔ ”نجوا کیا ہوا؟ تم کس سے مخاطب ہو؟“

”اس سے جو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ٹھہرو، میں ابھی اس کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔“ نجوانے یہ کہتے ہی کوئی عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

چند ہی لمحوں گزرے ہوں گے کہ میرے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ نجوا اور منصور کے چہرے غائب ہو گئے۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نجوا ہی کیا، منقرع کے غلام بھی اپنی شیطانی قوتوں کے ذریعے یہ پتا لگا لیتے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔ اپنے سامنے اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی میں تصور کو وسعت دے کر اس جگہ کا سراغ لگا چکا تھا جہاں نجوا کی کار کھڑی تھی۔ اس کے قریب ہی میں نے ایک اور کار کو بھی دیکھا تھا، اس میں بھی مسلح افراد تھے۔

میں جان بوجھ کر نجوا کی کار کے ارد گرد ہی منزلانے لگا۔

”اطلاع کے مطابق اب سے ٹھیک پانچ منٹ بعد انہیں تمہارے جنگلے پر حملہ کر دینا چاہئے۔“ نجوا کی آواز آئی۔

”لیکن فواد اور رشیدہ کو بھی تو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔“ یہ آواز منصور کی تھی۔

”وہ بھی پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“ نجوا بولی۔

میں نے سوچا کہ اب منقرع کے غلاموں کی خبر بھی لے لیتا چاہئے کہ وہ کہاں ہیں! نجوا کی طرح اگر

انہیں بھی یہ پتا چل گیا کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی سوچ کر میں نے پھولے ہوئے رخساروں والے خطرناک منقرعے طلال بے کا تصور کیا۔ وہ ایک لفٹ سے باہر آرہا تھا۔

اس کی دائیں جانب مجھے نجیب المہندس نظر آیا۔ میں نے طلال بے کو چوکتے دیکھ کر فوراً ہی اس پر سے نگاہ ہٹائی اور اپنے تصور کا دائرہ وسیع کر لیا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے! مجھے اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل ملٹن تھا جس کی ساتویں منزل پر مجھے طلال بے اور نجیب ایک لفٹ سے نکلنے دکھائی دیے تھے۔ انہیں وہاں دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھکا۔ منقرع کے ان غلاموں کو تو اس وقت مند سین کے علاقے میں ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہاں اس ہوٹل میں یہ کیوں نظر آرہے ہیں؟ میں نے سوچا۔ یہ دس منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل، جدید قاہرہ میں تحریر اسکوئر پر تھا۔ مجھے یاد آیا، سوی نے بتایا تھا کہ گزشتہ رات ادبرج ٹائٹ کلب سے لوٹتے ہوئے سونے کی طرف سے بھرا مخصوص ایئر بیگ لے کر نجوا تحریر اسکوئر ہی کی طرف مڑ گئی تھی۔ مجھے خیال آیا، کیس ایسا تو نہیں کہ نجوا اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہری ہو؟

تصدیق کی غرض سے کہ میرا خیال درست ہے یا نہیں، میں نے اچانک بلند غیر انسانی آواز میں نجوا کو مخاطب کیا۔ ”اے نجوا! تو بڑی ہی بے وقوف عورت ہے۔ تیرے دشمن ہوٹل ملٹن کی ساتویں منزل تک پہنچ چکے ہیں اور تو یہاں ان کا انتظار کر رہی ہے!“

پہلی مرتبہ مجھے نجوا کی آواز میں خوف کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ”نہیں! حادثہ مجھے فریب نہیں دے سکتا، مگر تو..... تو کون ہے؟“

”میں زاعون ہوں، فرعون خضر کے ایک امیر کی روح!“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تو پہلے منقرع کے غلاموں ہی میں شامل تھی۔ پھر تو نے ہوس زر میں منقرع کی روح سے بغاوت کر دی۔ بول کیا ایسا ہی نہیں؟“

مجھے نجوا کی آواز سنائی نہ دی تو خطرے کو بھانپ لیا اور میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ میں نے کلا میں جھانک کر دیکھا تو نجوا ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی شیطانی عمل پڑھ رہی تھی۔ میں چشم زدن میں اس علاقے ہی سے نکل گیا۔ یوں اب مجھے وہاں نہیں رکنا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ منقرع کے غلاموں کی طرح نجوا بھی روحوں اور جنات سے نمٹنا جانتی ہوگی۔ وہ غالباً کوئی ایسا ہی عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔

مند سین سے میں سیدھا ہوٹل ملٹن کی ساتویں منزل پر پہنچ گیا۔ جلد ہی میں نے منقرع کے غلاموں کو تلاش کر لیا۔ ایک راہداری میں مجھے نجیب دو مسلح افراد کے ساتھ نظر آیا۔ یہ ظاہر وہ اس راہداری میں آہستہ قدمی سے چلتا ہوا ایک طرف قدم اٹھا رہا تھا، لیکن اس کی نظر ایک کمرے کے دروازے پر تھی۔ اس وقت راہداری میں ان تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ خطرناک

منقرعہ طلال بے کہاں ہو گا! اسی خطرناک منقرعے نے گزشتہ رات مجھے انسانی قالب میں قتل کرنا چاہا تھا میں مطلوبہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رک گیا۔ طلال بے مخصوص ایئر بیگ اپنے ہاتھ میں لیے دروازہ کھول کر باہر آرہا تھا۔ اسی کے ساتھ اندر سے ایک اور شخص نکلا اور اس کے

سمجھ گیا کہ فواد اب اپنی کونھی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ امکان بھی تاکہ وہ سوی کے ساتھ ساتھ کونھی کے عقبی حصے میں چلا آتا۔ ایسی صورت میں میرا وہاں ہونا ضروری تھا۔ سو میں نے واپس کونھی پہنچ کر سعد کا قالب اپنا لیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد سوی کے ساتھ فواد بھی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ سوی نے کمرے کی بنی جلائی تو میں دانستہ دھیرے دھیرے کراہنے لگا۔ میرا مقصد فواد پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

توقع کے مطابق فواد لپک کر میری مسری کے قریب آگیا اور مجھ سے پوچھا۔ ”سعد! کیا تم تکلیف محسوس کر رہے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے سے جواب دیا، پھر دریافت کیا۔ ”مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم لوگ اتنی جلدی لوٹ آؤ گے۔ منقرع کے غلاموں سے ٹکراؤ کا کیا نتیجہ رہا؟“

اسی دوران میں سوی بھی فواد کے پاس آکھڑی ہوئی اور مصلحتاً مجھ سے میری خیریت معلوم کرنے لگی۔

”بس اچانک ہی سینے میں درد ہونے لگا تھا۔“ میں نے بات بنا دی۔ ”اب تو درد میں خاصی کمی آگئی ہے، کچھ دیر پہلے خاصا درد تھا۔“

”سعد! تم کل ڈاکٹر کو یہ ضرور بتانا!“ فواد نے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے، بتا دوں گا، مگر تم بیٹھ تو جاؤ!“ میں بولا۔

”میں ابھی آیا، ذرا ملازموں سے چائے لانے کے لئے کہہ دوں۔“ فواد یہ کہہ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”تھوڑے سے پھل، بسکٹ اور چائے میرے لئے بھی منگوا لینا فواد!“ میں نے ہانک لگائی۔

”معاف کرنا دوست، ابھی تمہیں کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں مل سکتا۔“ فواد نے مڑ کر کہا۔

”یہ تو سراسر ظلم ہے۔“ میں نے گویا احتجاج کیا۔

”اور تمہیں یہ ظلم خود اپنی خاطر برداشت کرنا پڑے گا۔“ فواد یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

سو لباس تبدیل کرنے ہاتھ روم میں چلی گئی۔ فواد لوٹ کر آیا تو مسری کے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”فواد! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”منقرع کے غلاموں سے ٹکراؤ کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ فواد نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”کیا مطلب.....؟ تو کیا ساری بھاگ دوڑ بے سود ثابت ہوئی؟“ میں جان کر انجان بن گیا۔

”لگتا تو یہی ہے کہ اس مرتبہ نجوا دھوکا کھا گئی۔ میں نے پہلے بھی حادثہ پر شک کا اظہار کیا تھا۔“ فواد نے بتایا۔

”حادثہ کون ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

چہرے پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ یہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہی تو منقرع کا وہ غلام عماد تھا کہ منصور نے گزشتہ رات جس کا میک اپ میرے چہرے پر کیا تھا۔ میں نے ادبرج ٹائٹ کلب میں منقرع کے اسی غلام کی جگہ لی تھی۔ منصور کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ عماد کو ادبرج نہ بچنے دیتا۔ مجھے ابھی یہ تو ہوا نہیں چل پایا تھا کہ منصور اپنے مقصد میں کامیاب رہا یا نہیں، لیکن طلال بے کو کسی طرح خبر ہو گئی تھی، میں عماد نہیں ہوں۔ مجھے منصور یا نجوا سے اس سلسلے میں کچھ معلوم کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ طلال بے اپنے آدمیوں کے ساتھ راہداری میں آگے بڑھ رہا تھا۔ میں چاہتا تو اس پر عقب سے حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ یقیناً وہ اس چانک حملے سے بچ نہ پاتا، مگر میں نے ابھی اسے نامناسب سمجھا۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ طلال بے یا نجیب المہندس کو قتل کر کے میں اندھیرے میں رہ جاتا۔ پھر وہ ابھی ہوئی گتھی کبھی نہ سلجھتی کہ وہ شیطان صفت آدم زاد کیا کھیل کھیل رہے تھے۔ پھر بھی طلال بے کو میں نے معاف نہیں کیا، اس سے انتقام کی ایک اور صورت نکال لی۔

پیچھے سے لپک کر آگے بڑھتے ہوئے میں نے شیر کا قالب اپنا لیا اور غراتے ہوئے طلال بے کے دائیں بازو پر پنجہ مارا۔ دائیں ہاتھ میں وہ ایئر بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔ ایئر بیگ اس ک ہاتھ سے گرا اور وہ چیختا ہوا جیسے ڈھے گیا۔ میں نے اس کا دایاں ہاتھ بازو تک چبا ڈالا۔ یہ ہول ناک منظر دیکھ کر منقرع کے غلام بھاگ اٹھے، مگر نجیب ان میں شامل نہیں تھا۔ اسے میں نے کوٹ کی جیب سے لمبی نال والا ایک رپو لور نکالتے دیکھا۔ وہ میرے سر کا نشانہ لینے ہی والا تھا کہ میں نے شیر کا قالب چھوڑ دیا اور اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر ضرب لگائی۔ کلائی کی بڑی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی نجیب چیخ اٹھا اور دوسرے ہاتھ سے ٹوٹی ہوئی کلائی تھامے زمین پر لڑھک گیا۔ اسی وقت میں نے عماد اور اس کے دو ساتھیوں کو اسی طرف دوڑ کر واپس آتے دیکھا۔ لوبلمان اور بے ہوش طلال بے کے قریب ہی ایئر بیگ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ اس ایئر بیگ میں سونے کے قیمتی ظروف ہوں گے۔ وہاں سے میں نے فواد کی کونھی کا رخ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق کئی کلو وزنی یہ وہی ایئر بیگ تھا جو گزشتہ رات عماد سمجھ کر مجھے دے دیا گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔ پھر یہی ایئر بیگ نجوا نے سوی سے لیا تھا اور اب اسی کو لے کر خطرناک محضرہ طلال بے چسپت ہونے والا تھا کہ میری جھپٹ میں آگیا۔ محضرے طلال بے کو میں نے اس کے دائیں ہاتھ سے محروم کر کے گزشتہ شب کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ نجیب المہندس کو بھی میں نے نہیں بخشا تھا۔ وہ نجیب ہی تو تھا کہ جس نے کراچی میں مجھے کسی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینکنے کی دھمکی دی تھی۔

وقتی طور پر اس ایئر بیگ کو میں نے اپنے سوٹ کیس میں چھپا دیا۔ اب مجھے سوی کی فکر تھی کہ وہ کہاں ہوگی! فواد کی کونھی میں رکے بغیر میں سوی کو تلاش کرنے روانہ ہو گیا۔ سوی کے وجود کی مخصوص خوشبو نے میری رہنمائی کی۔ اسے میں نے فواد ہی کی کار میں لوٹنے دیکھا۔ فواد کی کار تحریر اسکوائر سے نکل کر دریائے نیل کے ایک پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاہ وین بھی دکھائی دی۔ میں

”منقرع کے غلاموں ہی میں سے ایک ہے۔ نجوا نے اپنی دانست میں اسے خرید لیا تھا۔ جزیلہ کے بارے میں بھی حارث ہی نے اطلاع دی تھی جو درست ثابت ہوئی۔ اس قیمتی اطلاع کی اسے بھاری قیمت ادا کی گئی تھی، لیکن آج حارث نے نجوا کو جو اطلاع دی، وہ قطعی غلط نکلے۔“

”تم تو یہ بتاؤ کہ جب مہند سین پہنچے تو کیا ہوا؟“ میرے یہ پوچھتے ہی سوی لباس تبدیل کر کے ہاتھ روم سے نکل آئی۔

”ہم وہاں پہنچے تو خلاف توقع نجوا فکر مند ہی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ فرعون خضر کے ایک امیر زاعون کی روح ذرا دیر پہلے نجوا کے پاس آئی تھی۔ اس روح کی آواز منصور اور کار میں بیٹھے ہوئے ہمارے دوسرے ساتھیوں نے بھی سنی تھی۔“ پھر فواد بتانے لگا کہ زاعون کی روح نے کیا انکشاف کیا تھا! اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فواد نے مزید کہا۔ ”چند منٹ مہند سین میں رک کر نجوا نے ہمیں تحریر اسکوآر چلنے کا حکم دیا جہاں وہ ایک فائو اسٹار ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔“

”تو کیا زاعون کی روح کا انکشاف صحیح نکلا؟“ میں بہ دستور انجان بنا رہا۔

”ہاں۔“ جواب دیتے ہوئے فواد کے لہجے میں اداسی تھی۔ ”تمہاری ساری محنت اکارت گئی۔ جس ایریگ کو حاصل کرنے کے لئے تمہیں جان کی بازی لگانی پڑی تھی، منقرع کے غلام اسے لے اڑے۔ ان کے سوا یہ کام کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ایک اور عجیب سی بات بھی معلوم ہوئی۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوٹل کی ساتویں منزل پر چیچ پکار اور ہنگامے کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے کسی درندے کی غرائش بھی سنی تھیں۔ ساتویں منزل ہی پر مقیم افراد نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی فون پر اس سے مطلع کیا۔ چند افراد کسی شدید زخمی شخص کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے بھی دیکھے گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ زخمی شخص کا جو حلیہ معلوم ہوا، وہ طلال بے سے ملتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہوٹل سے فرار ہوتے وقت منقرع کے غلاموں سے کسی کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ رابداری میں خون بھی پڑا ہوا دیکھا گیا۔ خود نجوا کے لئے بھی یہ معاملہ کسی معصے سے کم نہیں۔ یہ پتا نہیں لگ سکا کہ منقرع کے غلاموں کا راستہ روکنے والے کون لوگ تھے! ابھی تک یہی اندازہ لگایا جا سکا ہے کہ کوئی تیسرا پراسرار مردہ بھی درمیان میں آچکا ہے جو منقرع کے غلاموں اور نجوا کی دشمنی سے واقف ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایسا ہوا ہے۔“ فواد نے تفصیل بیان کی۔

”یہ تیسرا مردہ زاعون کی روح کے زیر اثر بھی تو ہو سکتا ہے۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔ ”بہ قول تمہارے زاعون کی روح کو معلوم تھا کہ نجوا کے دشمن کہاں ہیں!“

”لیکن ایک روح کو ان معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“ فواد بولا۔

”اگر دلچسپی نہ ہوتی تو اسے نجوا سے ملنے کی کیا ضرورت تھی!“ میں نے دلیل دی۔

اسی وقت چائے آگئی۔ ملازم چلا گیا تو فواد کہنے لگا۔ ”یقیناً طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“

”مجھے تو بہر حال طلال بے کے شدید زخمی ہونے پر خوشی ہے۔ اس نے مجھے گولی مار کر اگر چلنے

پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا تو خود بھی گردش میں آگیا۔“ میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

”جو بھی ہو مگر اب حارث کی خیر نہیں۔ نجوا اسے کسی صورت زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس نے یقیناً نجوا کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ فواد نے کہا۔

میرے اور فواد کے درمیان ہونے والی گفتگو میں سوی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا جب فواد چائے پی کر ہمارے کمرے سے گیا۔ سوی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

”اے علیالیش! اب تو مجھے بتا کہ اچانک تجھے کیا سوچھی؟ تو نے زاعون کی روح کا چکر کیوں چلایا؟“ سوی نے دریافت کیا۔ وہ میرے بستر ہی پر آ بیٹھی تھی۔

”میرا مقصد تو اس عیار آدم زادی نجوا کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا تھا۔ مگر یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ مجھے طلال بے اور نجب سے انتقام لینے کا موقع بھی مل گیا۔ پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نجوا اور منقرع کے غلاموں میں کہاں ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ میں اسی غرض سے تجھے راستے میں چھوڑ کر مہند سین پہنچ گیا۔ وہاں میں نے نجوا، منصور اور ان کے ساتھیوں کو تلاش کر لیا۔ پھر میں نے منقرع کے غلاموں کی خبر لینا بھی ضروری سمجھا۔ مجھے پہلے ہی سے خبر تھی کہ آج رات منقرع کے غلام کہیں دھادا بولنے والے ہیں۔“

”وہ کیسے اے علیالیش؟“ سوی نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ سن لے کہ منقرع کے غلاموں کو تلاش کر کے میں نے ان کا کیا حشر کیا!“ میں یہ کہہ کر سوی کو بقیہ واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

آخر میں جب سوی کو یہ پتا چلا کہ سونے کے ظروف سے بھرا ہوا ایریگ میں نے سوٹ کیس میں چھپا دیا ہے تو وہ چونک اٹھی۔

”یہاں اس ایریگ کی موجودگی ہمارے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اے علیالیش!“ سوی نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”اے سوی! اس کا اندازہ مجھے بھی ہے اور میں نے ایک تدبیر بھی سوچ رکھی ہے۔“

”تو پھر جلد وہ تدبیر بتا!“ سوی بے چینی سے بولی۔ ”اس خطرناک شے کو بہر حال یہاں ہمارے پاس نہیں ہونا چاہئے۔“

”میں ابھی اسے اپنی کراچی والی کوٹھی میں پہنچاؤں تو کیسا ہے؟“

”فوراً ایسا ہی کر اے علیالیش! باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے یہ خطرہ ٹل جائے۔“

میں نے اٹھ کر اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے ایریگ نکال لیا۔ احتیاطاً میں نے اس ایریگ کی زپ بھی کھول کر دیکھی۔ اس ایریگ میں واقعی سونے کے ٹادر اور قیمتی ظروف بھرے ہوئے تھے۔ میں نے سوی کو بھی وہ ظروف دکھائے اور پھر زپ کھینچ کر بند کر دی۔

ہم جن زادوں کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ قاہرہ سے کراچی پہنچنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ اپنی کونٹری میں داخل ہوتے ہی میں چونک اٹھا۔ مجھے دہلی کی ایک نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ ادھی رات گزرنے کے بعد آخر وہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا۔ کونٹری کے ایک حصے میں مجھے روشنی نظر آئی اور میں ادھر لپکا۔ یہ کونٹری کا وہ حصہ تھا جہاں بلیقں جہاں کے خاندان والے رہتے تھے۔

میں وہاں پہنچا تو چار سیاہ زومسلخ افراد کو دیکھا۔ ان میں سے دو اپنی رائفلوں کی ٹائیس، بلیقں جہاں کے اڈیٹر عمر باپ حبیب اور اس کی ماں بشیرن کے سر سے لگائے کھڑے تھے۔ بشیرن کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید وہ اب زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اس کا جسم کسی خزاں رسیدہ بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ذرا ہی فاصلے پر بلیقں جہاں کا بھائی صالح زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ مجھے اس کے سر سے خون بہتا ہوا دکھائی دیا۔ یقیناً اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ ان چاروں سیاہ رو اور سیاہ قالب آدم زادوں کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بد معاش پہلے بھی میری کونٹری میں آچکے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی کہ جب میں خلق خدا کی خدمت میں مصروف تھا۔ ضرورت مندوں کو معافی بھر بھر کے سونا بانٹنے کی شہرت کراچی شہر کے بڑے بڑے گروہ بند بد معاشوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ انہی بد معاشوں میں سے ایک گروہ کا سرغنہ واجا بھی تھا جو سونا اور دولت لوٹنے کی خاطر اپنے ساتھیوں کو لے کر میری کونٹری میں گھس آیا تھا۔ واجا اور اس کے ساتھیوں کی میں نے کیا درگت بنائی، اس کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ وہی واجا شہر میں میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر آج رات اپنے ساتھیوں کو لے کر پھر میری کونٹری میں ڈاکا ڈالنے آ گیا تھا۔ چاروں سیاہ رو اسی کے ساتھی تھے، لیکن خود واجا مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

معاً مجھے سامنے والے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے واجا کے غرانے کی آواز سنائی دی۔

”سیدا طرح پڑا رہ لڑکی! ورنہ ابی ہم تیرا گردن دبا جائے گا!“

”خدا! خدا! خدا کے لئے میری بچی کو بے..... بے عزت نہ کرو!..... مجھے!..... مجھے چاہے گولی مارو!“ حبیب گڑ گرایا۔

”ارے! تم چپ رہتا ہے کہ ہم تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دیوے! بولا تا ہم تیرے کو کہ واجا استاد کو جو چھوڑ کر پسند آجاتا ہے، وہ اس کو نہیں چھوڑتا۔“

یہ سنتے ہی میرے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ واجا اندر کمرے میں کس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والا ہے! بلیقں جہاں کی چھوٹی بہن نفیس جہاں کی وہاں غیر موجودگی بھی اسی کا ثبوت تھی۔ ایئر بیک ایک طرف رکھ کر میں دوسرے ہی لمحے اندر کمرے میں پہنچ گیا۔ واجا نے نوجوان نفیس جہاں کو زمین پر گرا لیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نفیس جہاں کے منہ پر تختی سے جما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ نفیس جہاں کے جسم پر موجود کپڑے پھاڑ رہا تھا۔ نفیس جہاں کا دوہنا ایک طرف پڑا تھا اور قیض تقریباً پھٹ چکی تھی۔

میں نے واجا کو نفیس جہاں کے اوپر سے گھسیٹ لیا۔ اس کی گردن میری گرفت میں تھی۔ میری نظر میں اس بد معاش کا جرم ناقابل معافی تھا۔ سو جھکا دے کر میں نے اس کی گردن توڑ دی۔ نفیس جہاں پھٹی

پہلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ واجا کی گرفت سے آزادی ملنے کے باوجود نفیس جہاں میں فرش سے اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

کمرے میں موجود مسہری پر پڑی ہوئی چادر اٹھا کر میں نے نفیس جہاں کے جسم پر ڈال دی۔ واجا کی لاش کو میں نے کمرے سے باہر پھینک دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ بروقت وہاں ان مظلوموں کی مدد کو پہنچ گیا۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ ایئر بیک اس کے لئے بمانہ بن گیا تھا۔ اگر مجھے توڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ ظالم آدم زاد ایک معصوم دبے گناہ آدم زادی کی زندگی تباہ کر چکا ہوتا۔

واجا کی لاش کمرے سے باہر جا کر گری تو اس کے ساتھی بوکھلا کر چیخ اٹھے۔

میں اس عرصے میں مقصود کا انسانی قالب اپنا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی واجا کا ایک ساتھی اچھل پڑا اور بولا۔ ”اڑے! بابا لوگ آگیا، بھاگو!“

”حرا مزاد! اب تم کہیں نہیں بھاگ سکتے!“ میں نے یہ کہتے ہی انہیں اپنے اثر میں لے لیا۔

”خو..... حضور!“ حبیب ہکھلایا۔ وہ اس طرح مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

بشیرن اسی وقت غش کھا کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے حبیب اور بشیرن کو نظر انداز کر کے ان

چاروں کو حکم دیا کہ وہ واجا کی لاش وہاں سے اٹھالے جائیں۔ اس کے لئے مجھے زبان سے کچھ کہنے کی

ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میری آواز ان کے ذہنوں میں گونج رہی تھی۔ انہیں میں نے یہ حکم بھی دیا تھا

کہ واجا کی لاش کو ٹھکانے لگا کر وہ خود کو قانون کے حوالے کر دیں اور آج کا واقعہ بھول جائیں۔ باہران

کی جپ موجود تھی۔ میرا حکم ملتے ہی انہوں نے قیض کی۔ وہ واجا کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ پھر مجھے جپ

اشارات ہونے کی آواز سنائی دی تو حبیب کو مخاطب کیا۔ ”جاؤ گیٹ بند کر آؤ!“

ادھر حبیب گیٹ بند کرنے گیا، ادھر نفیس جہاں سسکتی ہوئی باہر آگئی۔ وہ میرے گلے سے لگ کر

رونے لگی۔

اس کے سر پر میں نے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ”خود کو سنبھالو نفیس! جا کر کپڑے بدلو!“

وہ سسکتی ہوئی ایک کمرے میں چلی گئی تو میں نے بشیرن اور اس کے بیٹے صالح پر توجہ کی۔ فوراً ہی

ان دونوں کو ہوش آگیا۔ صالح کے ماتھے کی جلد پھٹ گئی تھی۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ بشیرن سے میں نے

اس کے سر پر پٹی باندھنے کے لئے کہا۔ وہ ہانپتی کانپتی ایک کمرے میں چلی گئی۔ اسی وقت حبیب لوٹ آیا۔

”اللہ کا شکر ادا کرو حبیب کہ جس نے نفیس جہاں کی عزت بچائی اور ہمیں یہاں بھیج دیا۔“ یہ کہہ

حبیب کو میں نے یہ باور کرا دیا کہ اس کی بیٹی کے دامن پر کوئی داغ نہیں لگا۔ وہ پہلے ہی کی طرح معصوم

ہے۔ ان چاروں بد معاشوں کو اپنے اثر میں لے کر مجھے حقیقت کا علم ہو چکا تھا۔

”حضور!..... میرے سرکار!“ حبیب بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا۔

وہ میرے قدموں پر جھکنے ہی والا تھا کہ اسے میں نے شانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور بولا۔ ”نہیں

حبیب! خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتے۔“

”دیر ہو گئی تو اس کی کوئی وجہ بھی تھی اے سوی!“ میں یہ کہتے ہوئے انسانی قالب میں لوٹ آیا۔
 ”روئے زمین پر کہیں بھی شیطان صفت آدم زادوں کی کمی نہیں۔“
 سوی اس کا کوئی اور ہی مطلب سمجھی اور کہنے لگی۔ ”کیا راستے میں تجھ سے کوئی خطرناک آدم زاد
 ٹکرا گیا تھا؟“

”نہیں، یہ بات نہیں تھی۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا، پھر سوسمی کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا جو مجھے کراچی میں پیش آیا تھا۔

”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا اے علیا لیش کہ تو نے بروقت پہنچ کر اس معصوم لڑکی کی عزت بچالی جو مجھے بڑی محبت سے صنوبر باجی کہتی ہے۔“

”دراصل یہ بھی ہماری خوش گمانی ہے کہ ہم نے کچھ کیا ہے اے سوی! اللہ کے حکم کے بغیر تو ہم اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ وہی قادر مطلق ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اپنے کسی بندے سے کوئی کام لے لیتا ہے، خواہ وہ کوئی آدم زاد ہو کہ بنی زاد۔“

”ٹھیک کہتا ہے تو؟“ سومی نے میری تائید کی۔ مجھے خوشی یہ تھی کہ میری شریک حیات بھی ذاتِ برحق پر یقین کامل رکھتی تھی۔ چند لمبے خاموشی کے بعد سومی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہاں اب تو یہ بتا کہ تجھے کیسے خبر تھی، آج رات منقرع کے غلام کہیں حملہ کرنے والے تھے؟“

”خجے یہ تو معلوم ہے، تیرے ہی مشورے پر میں، راقصہ جزیلہ کی طرف واپس گیا تھا کہ نجیب کو کسی طرح وہاں سے بھاگ دوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ خود کو میں نے زاعوان کی روح ظاہر کیا اور پھر اس سے پہلے اُڑ گیا کہ نجیب کا کوئی شیطانی عمل مجھ پر اثر انداز ہو۔ دور رہ کر بھی نجیب پر میں نے نظر رکھی کہ وہ جزیلہ کے گھر سے گیا یا نہیں!“ پھر نجیب نے فون پر طلال بے سے جو گفتگو کی تھی، ’سوی کو میں نے بتا دی۔“

”تو اس سے یہی سمجھا ہو گا کہ منقرع کے غلام شاید اسی کو ٹھہی پر حملہ کریں گے؟“ سوی نے معلوم کیا۔

”ہاں پہلا خیال مجھے یہی آیا تھا۔“ میں نے سوی کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ ”اس خیال کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا“ فی الحال مجھے یہ موقع نہیں کھونا چاہیے۔ اگر خطرے کی کوئی بات ہوگی تو بروقت تیرے ذریعے مجھے اس کی اطلاع مل جائے گی۔ میں نے اس وقت نجیب کو بھی نظر انداز کر دیا اور جزیلہ پر توجہ مرکوز کر دی۔ نجیب کے وہاں سے جاتے ہی میں ”جزیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ اسے اپنے اثر میں لے کر مجھے مقرر کے غلاموں کا ایک اہم راز معلوم ہو گیا۔“ جزیلہ سے مجھے جو پتا چلا، مختصر سوی کو بتا دیا۔

”پھر تو اے علیا لیش“ ہمارا یہ اندازہ درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ مقرر کے غلام‘ قدیم اہراموں سے سونا نکال رہے ہیں!“

”ہاں لگتا تو یہی ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اے سوی کہ ہمیں آئندہ کیا قدم اٹھانا چاہئے؟“ میں نے کہا۔ ”اب تو میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ انجوائے ساتھ رہ کر ہم بلا سبب کیوں پابندیاں برداشت کرتے رہیں! میرا خیال یہ ہے کہ اب ہم صحیح راستے پر لگ گئے ہیں اور اپنے پراسرار دشمنوں تک پہنچنے کے لئے

ہمیں نجوا کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم آزاد فضا میں بہتر طور پر منقرع کے غلاموں سے نمٹ سکتے ہیں۔ یہ سونا جو منقرع کے غلام، قدیم اہراموں سے نکال رہے ہیں، دراصل مصری قوم کی امانت ہے۔ یہ عورت بھی میرے نزدیک قابل معافی نہیں ہے۔ نجوا اور منقرع کے غلاموں کا آپس میں برسرِ پیکار ہونا ہمارے لئے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی شیطانی گروہ کسی حد تک اس معاملے میں کسی تیسری پراسرار قوت کی مداخلت کے نتیجے تک پہنچ رہے ہیں۔“

”سوچ لے اے علیالیش، کیسے ہم ان دونوں شیطانی گروہوں کے درمیان پس کر نہ رہ جائیں! پھر تو دونوں ہی خطرناک گروہ ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔“

”یہ خطرہ تو خیر اب مول لینا ہی پڑے گا ورنہ تو نجوا اسی طرح ہمیں اپنا آلہ کار بنائے رہے گی۔“ میں بولا۔ ”مثال کے طور پر نجوا کے چنگل سے نکلنے کی صورت میں توبہ آسانی جزیلہ کے جسم پر قبضہ کر کے ستارہ تک پہنچ سکتی ہے۔ بول یہ ممکن ہے کہ نہیں؟“

”لیکن جمعہ تو ابھی دور ہے۔“ سوی کے لمبے میں سے واضح طور پر ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے کوئی جلدی نہیں اے سوی! تومیری تجویز پر اچھی طرح غور کر لے۔“

”اس پر غور تو کرتا ہی پڑے گا۔ چل اب سو جاتے ہیں اے علیالیش! انسانی قالیوں میں رہنے سے نیند اور تھکن غالب آنے لگتی ہے۔“ سوی نے یہ کہہ کر انگڑائی لی۔

اس وقت سوی کے یوں انگڑائی لینے سے مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا۔ اس کا جسم کسی کمان کی طرح کھینچ گیا تھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ہر چند کہ وہ انسانی قالب ایک دھوکا ہی تھا مگر یہ دھوکا بھی کتنا حسین تھا! میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

”ارے! یہ تجھے آج کیا سوجھ گئی اے علیالیش!“ وہ دھیرے دھیرے ہنس دی، مگر میری گرفت سے نکلنے کے لئے مزاحمت نہیں کی۔

”وہی جو ان دنوں تجھے نہیں سوجھتی۔ کبھی یہ تو سوچا کہ میں بھی ایک جن زاد ہوں کوئی پتھر نہیں۔“

”تجھے بھی خبر ہے کہ یہ سوچنے کی مہلت ہی کب ملتی ہے! شیطان صفت آدم زاد سکون کا سانس ہی نہیں لینے دیتے۔“

”آدم زادوں کے درمیان خود بھی آدم زاد بن کر رہنے کی قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے، اے سوی!“

”پھر مجھ سے گلہ کیوں کر رہا ہے!“

”گلہ کرنا تو شیوہ عاشقی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

حرم کے دل میں ہر لمحہ ہر لمحہ

آنکھیں ہلکے لہریں

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات سناؤ تو اس کی آنکھیں ہلکے لہریں

جنات اور کالے لٹم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ

جہنم زار



7

سنبھیدہ خاتون

جن زاد

آپ نے انسانوں کی بے شمار آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور حیرت انگیز کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن ایسی حیرت انگیز داستان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہوگی۔ یہ ایک جن کی آپ بیتی ہے جو آدم زادوں کے درمیان زندگی گزارنے کا خواہشمند تھا۔ آئیے، دیکھیں، ایک جن پر آدم زادوں کے درمیان کیا گزری۔

اپنے انداز کی ایک نرالی داستان

دوسرے دن صبح جب سوی ہاتھ روم سے باہر آئی تو بہت نکھری نکھری سی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی آجاتا، میں بھی نہادھو کر تازہ دم ہو گیا۔ جب سوی میرے سینے پر پٹی باندھ رہی تھی تو میں نے کہا۔ ”اب جلدی سے ناشتا منگولے“ کہیں فواد نہ آجائے!“

سوی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے اپنی باندھ دی تو میں بستر پر لیٹ گیا۔ بہ ظاہر سوی نے میرے لئے صرف قہوہ ہی منگوایا تھا، مگر دروازہ بند کر کے اسے ہاتھ روم میں بہا آئی۔ میں نے اس ڈر سے کہ دوسرے کو کل کی طرح بھوکا نہ رہنا پڑے، خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ ابھی میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ”لو وہ آگیا حلق کا داروغہ!“ میں آہستہ سے ہنس کر بولا۔ ”جا دروازہ کھول دے!“ توقع کے مطابق آنے والا فواد ہی تھا۔ وہ آتے ہی کہنے لگا۔ ”تم کچھ کھاتے پیتے وقت دروازہ کیوں بند کر لیتی ہو رشیدہ؟“

”اس لئے کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے!“ میں بول اٹھا۔ ”پہلے تو رشیدہ کو تمہاری ہی نظر لگے گی سعد!“ فواد خوش مزاجی سے بولا۔ ”کیوں کہ تم ہی کھانے پینے کو ترس رہے ہو۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری میرے دوست! میں ابھی فرحت بخش قہوے کی ایک پیالی نوش جاں کر چکا ہوں۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ ایک پیالی قہوہ پی کر میرے بدن میں طاقت اور توانائی کتنی بڑھ گئی ہے!“ میں نے جان بوجھ کر کمرے کا دروازہ بند کئے جانے کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ ”ابھی نجوا نے فون کیا تھا۔“ فواد نے بتایا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے مزید کہا۔

”رشیدہ! تمہیں میرے ساتھ پرانے قاہرہ چلنا ہے۔“

”قصہ کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”منقرع کے ایک غلام حارث کا قصہ پاک کرنا ہے۔“ فواد نے اطمینان سے جواب دیا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔ ”نجوا نے اسے ملاقات کے لیے مقطم کے پہاڑی سلسلے میں بلایا ہے۔ گیارہ بجے تک حارث وہاں پہنچ جائے گا۔ ہم دونوں کو اس سے پہلے ہی وہاں موجود رہنا ہے۔“

”یہ کار خیر خود نجوا ہی انجام کیوں نہیں دے لیتی؟“ میں نے طنز کیا۔

”نجوا ایسے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتی۔“

”اگر وہ پہلے سے چوکنہ ہوا تو؟“ میں نے خدشے کا اظہار کیا۔ ”منقرع کا غلام ہونے کی وجہ

سے وہ بھی تو پراسرار قوتوں کا ملاک ہو گا؟“

”ہے تو سہی، مگر اسے نجوا پر بھروسہ ہے۔ اسے نجوا کے عاشقوں میں سے ایک بھی سمجھ سکتے ہو۔ اسے گمان بھی نہیں ہو گا کہ نجوا اس کی زندگی کا چراغ گل کرا سکتی ہے۔“

”گزشتہ رات اس کی فراہم کردہ اطلاع غلط ثابت ہونے کے باوجود بھی؟“ میں نے اظہار حیرت کیا۔

”نجوا سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ اپنی صفائی پیش کر چکا ہے۔ اس نے بتایا کہ عین وقت پر طلال بے نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ نجوا نے اس کا یہ جواز تسلیم کر لیا تھا۔ حارث ہی نے نجوا کو ایک اور عجیب خبر دی ہے کہ جو ایئر بیگ طلال بے ہوٹل کے کمرے سے لے کر نکلا تھا، پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔“

”لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا خبر حارث جھوٹ بول رہا ہو؟“ میں بولا۔

”نجوا کا بھی یہی خیال ہے۔“ فواد نے بتایا۔ ”حارث کی یہ اطلاع بھی غلط ہو سکتی ہے۔ ویسے حارث نے نجوا کو یقین دلانے کی خاطر یہ بتایا ہے کہ ہوٹل میں اس وقت خود وہ بھی طلال بے اور نجیب کے ساتھ تھا۔ نجوا نے اسی واقعے کی تفصیل جاننے کے بہانے اسے ملاقات کے لئے بلایا ہے۔“

مجھے یاد آیا کہ طلال بے کے ساتھ ہوٹل کے کمرے سے نکلنے والا عماد تھا۔ نجیب اس وقت راہداری میں دو مسلح افراد کے ساتھ تھا۔ اگر حارث نے نجوا اسے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ وہ بھی ہوٹل میں طلال بے کے ساتھ تھا تو وہ انہی دونوں مسلح افراد میں سے ہو گا جو راہداری میں تھے۔ اس کا علم صرف مجھے اور سوی ہی کو تھا کہ پراسرار طور پر ایئر بیگ غائب ہو جانے کی اطلاع غلط نہیں ہے۔ اگر نجوا کو اس پر یقین نہیں آیا تھا تو یہ میرے حق میں بہتری تھا۔

ذرا توقف کے بعد فواد نے سوی کو پھر مخاطب کیا۔ ”اب تم چلنے کی تیاری کرو، ساڑھے نو بج

رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ ہمیں وقت سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔“

مجبوراً سوی کو تیار ہونا ہی پڑا۔ فواد اور سوی کو جہاں جانا تھا، میں اس جگہ کے محل وقوع سے واقف تھا۔ وہاں دن کے وقت کسی کو بہ آسانی موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ پرانے قاہرہ کا وہ

علاقہ ”قلعہ“ کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ قدیم ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں کی آبادی ”قلعہ“ کہلاتی ہے۔ اسی قلعے میں ایک خوب صورت محل ہے جو خاندان خدیوہ کے بانی محمد علی پاشا نے تعمیر کرایا تھا جو مصر کے آخری تاجدار شاہ فاروق کا جدِ اعلیٰ بھی تھا۔ محمد علی پاشا نے اس قلعے کے اندر ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو استنبول کی مسجد کی طرح اسی نمونے پر بنوائی گئی تھی۔ قلعے کے اندر ہی مسجد ناصر یہ بھی ہے۔ قلعے کے عقب میں مقطم کا پہاڑی سلسلہ نظر آتا ہے۔ یہ جگہ آج منقرع کے ایک غلام حارث کی قتل گاہ بننے والی تھی۔

جب سوی لباس تبدیل کر کے فواد کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی تو میں نے فواد سے اپنے ایک اور شک کا اظہار کیا۔ ”سنو فواد! اگر حارث غداری ہی پر اتر آیا ہے جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے اور گزشتہ رات اس کا ثبوت بھی مل چکا ہے تو منقرع کے غلام اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے نجوا پر ہاتھ ڈالنے کا یہ شہری موقع ہو گا۔ حارث اگر دہرا کھیل کھیل رہا ہے تو اپنے ساتھیوں کو نجوا کی دہاں آمد سے مطلع کر سکتا ہے۔“

”ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ حارث، نجوا کے عشق میں مبتلا ہے۔ یہ امکان تو ہے کہ وہ مال دزر کے معاملے میں نجوا سے غداری کر جائے، مگر نجوا ماری جائے، وہ یہ کسی صورت قبول نہیں کرے گا۔ تم حارث کو نہیں جانتے، وہ نجوا کے دیوانوں میں سے ہے، گزشتہ مرتبہ نجوا کو مصر سے فرار کرانے میں بھی حارث ہی کا ہاتھ تھا نہ وہ بری طرح پھنس چکی تھی۔ طلال بے اور نجیب اسے زندہ نہ چھوڑتے۔“ فواد نے یہ کہہ کر مجھے گویا اپنی دانست میں اطمینان دلایا۔

میں پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ میرے نزدیک یہ مفادات کی جنگ تھی۔ اس جنگ میں جذبات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ جب نجوا اپنے ایک محسن اور عاشق کے قتل کا حکم دے سکتی تھی تو عاشق بھی اس سے بے وفائی پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے فواد سے مزید بحث فضول ہی سمجھی۔ ”اچھا سعد، ہم چلتے ہیں۔ تم آرام کرو! اگر تم سو جاؤ تو اچھا ہے، میں کمرے کا دروازہ بھیڑ جاتی ہوں۔“ سوی نے چلتے چلتے مجھے مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا خیال رکھنا اور میں تمہارا خیال رکھوں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میںیں بستر پر لیٹے لیٹے؟“ فواد ہنس کر بولا۔

”محبت کرنے والوں کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے میرے دوست! اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو رشیدہ سے پوچھ لو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو سعد! مجھے رشیدہ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“ فواد کہہ کر سوی کے ساتھ ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

کمرے سے نکلے ہوئے سوی نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ فواد سے میں نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا، اسے فواد نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی، مگر مجھے شدید بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ میری نظر میں سوی کی زندگی انتہائی خطرے سے دوچار ہونے والی تھی۔

”آؤ چلیں! اب ہمیں اس چٹان کے پاس زیادہ دیر نہیں رکنا چاہئے۔ کیا خبر نچوا وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے۔“ حادث نے کہا۔

”ہاں چلو۔“ عماد نے یہ کہہ کر اپنے ساتھ موجود افراد کی طرف دیکھا۔ وہ خاصے فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں کو میں نے زمین پر بچے ہوئے تار کو مٹی سے چھپاتے دیکھا۔

دائیں جانب خاصی دور ایک اور بڑی چٹان دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ اسی طرف بڑھ رہے تھے۔ عماد نے ہاتھ ہلا کر انہیں مخصوص اشارہ کیا اور پھر خود بھی اس طرف بڑھ گیا۔ حادث ادھر نہیں گیا اور سامنے نظر والی پہاڑی کی جانب قدم اٹھانے لگا۔

میرا اندیشہ سو فیصد درست نکلا تھا۔ اس عیار آدم زادی نچوا نے بھی شاید خطرے کی بوسنگھ لی تھی۔ اس نے غالباً اسی سبب اپنی جگہ فواد اور سوی کو وہاں بھیج دیا تھا۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھ لی جہاں حادث چھپا ہوا تھا۔

تمام معلومات حاصل کر کے میں پلٹا۔ ابھی تک مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ نچوا نے حادث کو موت کے گھاٹ اتارنے کی خاطر کیا منصوبہ بنایا تھا۔ فواد نے مجھے اس کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ مجھے بھی اس سے یہ معلوم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سوی کی مخصوص خوشبو پر جلد ہی میں اس کا رنگ پہنچ گیا۔ جو تیز رفتاری سے اپنے سفر طے کر رہی تھی۔ ابھی وہ اہرام روڈ پر تھی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر فواد بیٹھا اور سوی برابر والی نشست پر تھی۔ معاً میں نے سوی کو چونکتے دیکھا۔ یقیناً اس نے میری خوشبو محسوس کر لی تھی۔ اسے اپنے قریب میری موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ مجھے ایک مرتبہ اندازہ ہو چکا تھا کہ فواد کی قوت سماعت بہت تیز ہے۔ میں نے اسی سبب سوی سے سرگوشی بھی نہیں کی۔

معاً سوی کو فواد نے مخاطب کیا۔ ”رشیہ! اپنے سامنے والا ڈیش بورڈ کا خانہ کھول لو۔“ ”کیا ہے اس میں؟“ سوی نے پوچھا۔ ”تم کھولو تو سہی!“ فواد زور دے کر بولا۔ ”ابھی تمہیں یہ بھی تو بتانا ہے کہ حادث کو کس طرح ٹھکانے لگنا ہے!“

سوی نے آگے جھک کر آگے ہاتھ بڑھایا اور فواد کی ہدایت پر ڈیش بورڈ کھول لیا۔ ”اس میں جو پلاسٹک کی تھیلی رکھی ہے، اسے باہر نکل لو رشیہ!“ فواد نے کہا۔ سوی نے وہ تھیلی باہر نکال لی اور پھر فواد ہی کے کہنے پر اس میں ہاتھ ڈال کر ایک ماسک نکلا۔ ماسک کے ساتھ ہی ایک دگ بھی منسلک تھی۔

”اب تم یہ ماسک ذرا احتیاط کے ساتھ اپنے چہرے پر چڑھا لو!“ فواد پھر بولا۔ فواد کی اس ہدایت پر بھی سوی نے عمل کیا تو میں جو کچھ اٹھا۔ اب اس کا چہرہ بڑی حد تک نچوا سے مل رہا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ نچوا ہی معلوم ہوتی۔ خود سوی نے بھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور حیرت سے کہا۔ ”میرا چہرہ تو اب نچوا صاحبہ سے مل رہا ہے۔“

اول تو بغیر بلائے کسی ملازم کا میرے کمرے میں آنا، ممکن نہیں تھا، پھر بھی میں نے احتیاط سے کام لیا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود میں کمرے سے غائب ہوں، یہ راز کھل جانا میرے لئے خطرناک ہی ثابت ہوتا۔ میں نے اسی لئے آہستگی کے ساتھ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کڑکیوں کو بند کرنا بھی میں نہیں بھولا تھا۔

فواد اور سوی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں مقلم کے پہاڑی سلسلے کا اچھی طرح جائزہ لے لیتا چاہتا تھا۔ منقرع کے غلام، نچوا کے لئے جو جال بچھاتے اس میں سوی بھی فواد کے ساتھ پھنس جاتی۔ فواد کا کیا حشر ہوتا! اس سے تو خیر مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن سوی کو دشمنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دیتا!

انسانی قالب سے نکلنے ہی میں نے پرانے قاہرہ کی طرف پرواز شروع کر دی۔ صلاح الدین ایوبی کے قلعے کی سب سے اونچی فصیل پر چڑھ کر وہاں سے دور دور کا جائزہ لینا ممکن تھا۔ اس جگہ کھڑے ہو کر قاہرہ شہر کا نظارہ بھی کیا جاسکتا تھا، لیکن اس وقت میری نظرس قلعے کے عقب میں دور تک پھیلے ہوئے مقلم کے پہاڑی سلسلے پر تھیں۔ جلد ہی مجھے وہاں ایک چٹان کے نیچے کچھ لوگ دکھائی دے گئے۔ میں پرواز کرتا ہوا ان تک جا پہنچا۔

دو چہرے ان میں میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ منقرع کے غلام ہی تھے۔ پہچانے ہوئے دو چہروں میں سے ایک آدم زاد کا تو مجھے نام بھی معلوم تھا۔ وہ عماد تھا۔ دوسرے آدم زاد کو میں نے ہوٹل پلٹن میں نجیب کے ساتھ دیکھا تھا۔ چند ہی لمحے بعد مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ اس کے لئے مجھے اپنی کسی جناتی صفت کو بروئے کار نہیں لانا پڑا۔

”حادث! تمہیں یقین بھی ہے کہ نچوا ضرور آئے گی؟“

عماد نے تراشیدہ سے چہرے والے سے دریافت کیا۔ میرے لئے یہی دوسرا ثنا سا چہرہ تھا۔ تو حادث: یہ ہے! میں نے سوچا، اسی وقت حادث بول اٹھا۔ ”کیوں نہیں! اس نے خود ہی تو مجھے یہاں بلایا ہے۔ میں پہلے بھی ایک مرتبہ نچوا سے اسی جگہ مل چکا ہوں۔ اس نے مجھ سے اسی جگہ آنے کے لئے کہا تھا۔ نچوا کے نہ آنے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ مجھ سے ہوٹل کے واقعے کی تفصیل معلوم کرنا چاہتی ہے۔“

”یہ خیال رکھنا کہ تمہیں اس چٹان سے دور ہی رہنا ہے جہاں ہم ڈائنامائٹ لگا چکے ہیں۔ چٹان اڑی تو دور دور تک اس کے ٹکڑے جا کر گریں گے۔“ عماد بولا۔

”مجھے اندازہ ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ نچوا اس چٹان کے نیچے پہنچے تبھی میں اس سامنے والی پہاڑی کے عقب سے نکلوں گا۔ دور سے ہاتھ ہلا کر میں اسے اپنی آمد کا اشارہ کروں گا تاکہ وہ وہیں رکی رہے۔ یہی وہ وقت ہو گا جب تم چٹان کو اڑا دینا!“ حادث نے تفصیل بتائی۔

”اس کے ساتھ نچوا کا جسم بھی چھیڑے ہو کر فصا میں بکھر جائے گا۔“ عماد کے لہجے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے۔ منقرع کے اس غلام حادث کو دھوکا دینے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ وہ تمہیں دور سے دیکھ کر نجوا ہی سمجھے گا۔“

”مگر فواد! تم بھی تو میرے ساتھ ہو گے! کیا اس سے وہ چوکنا نہیں ہو جائے گا؟“

”میں تمہارے ساتھ اس وقت نہیں ہوں گا۔“ فواد نے بتایا۔ ”میں دور ہی سے ایک چٹان کی نشان دہی کروں گا۔ تمہیں اسی چٹان کے نیچے پہنچنا ہوگا۔ جب حادث تمہیں نجوا سمجھ کر تمہاری طرف بڑھے گا تو میں اسی وقت اس کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کروں گا۔“

اب میں سمجھ گیا کہ فواد اپنے کسی ساتھی کے بجائے سوی ہی کو وہاں کیوں لے کر جا رہا تھا! نجوا کا قاتلانہ منصوبہ بہ ظاہر بے داغ ہی تھا، لیکن شاید اسے یہ خبر نہیں تھی کہ منقرع کے غلام پہلے ہی اس کا منصوبہ ناکام بنانے کی تدبیر کر چکے ہیں۔

ہم جن زادوں کو ایسے بھی بہت سے عمل آتے ہیں کہ کسی آدم زاد کو موجودگی میں ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں۔ اس کے لئے ہمیں زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مگر ایسے جتنے بھی عمل ہیں، وہ ہمیں وقتی طور پر شدید اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ہم اس لئے ان سے گریز کرتے ہیں، لیکن اس وقت سوی کی زندگی خطرے میں تھی۔ اسے اس خطرے سے آگاہ کرنا بہت ضروری تھا، خواہ اس کے لئے مجھے اذیت ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑتی۔

میں نے ایک عمل پڑھ کر جیسے ہی سوی کو مخاطب کرنا چاہا، میرے وجود میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ اس کے باوجود میں نے سوی کو وہ سب کچھ بتا ہی دیا جو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔

”تو پھر اے علیائش! جان بچانے کی کیا تدبیر ہو؟“ سوی نے سوال کیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ سوی یہ ضرور پوچھے گی۔ میں اسی لئے جواب پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ میرا جواب سن کر سوی مطمئن ہو گئی۔ اسی کے بعد رد عمل کی غرض سے میں نے ایک اور عمل پڑھا تاکہ میرے وجود میں بھڑکتے ہوئے شعلے سرد پڑ جائیں۔ اب مجھے سوی سے مزید کچھ نہیں کہنا تھا۔

کار اب قدیم ترین اہراموں کے قریب سے گزر کر پرانے قاہرہ کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

”فواد! ہمیں وہاں پہنچ کر پہلے اس علاقے کا جائزہ لے لینا چاہئے۔“ سوی نے میری ہدایت کے مطابق تجویز پیش کی۔

”یہ ناممکن ہے رشیدہ!“ فواد نے کہا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ علاقہ کتنے وسیع و عریض، رقبے پر پھیلا ہوا ہے! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا۔ ہم نے بہت جلدی بھی کی تو وہاں پہنچتے پہنچتے دس تو بج جائیں گے۔ پون گھنٹے میں ہم کیا کر سکتے ہیں!“

”کم از کم اس عرصے میں ہم چٹان کے آس پاس کے علاقے کا تو جائزہ لے ہی سکتے ہیں۔“ سوی بولی۔ ”کیا خبر کہ سعد نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا، درست نکلے۔“

”لیکن رشیدہ! تم شاید یہ بھول رہی ہو کہ مجھے بھی تو چھپنے کے لئے وہاں کوئی ایسی جگہ تلاش

کرنی پڑے گی۔ جہاں سے حادث کو نشانہ بنا سکوں۔“

”تو اس کی بھی ایک صورت ہے۔ ضروری نہیں کہ وہاں پہنچ کر گیارہ بجے سے پہلے ہم دونوں ساتھ ہی رہیں فواد!“

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ تم نے کیا سوچا ہے، صاف صاف بتاؤ!“ فواد کہنے لگا۔ ”تم وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس چٹان کی نشان دہی کر دینا جس کے نیچے مجھے گیارہ بجے ہونا چاہئے۔ اس کے لئے چٹان کے قریب جانے کی بھی ضرورت نہیں۔“ سوی محتاط انداز میں بولی کیوں کہ میں اسے حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس چٹان کے قریب جانا موت کو دعوت دینا ہوتا۔ منقرع کے غلام، سوی کو نجوا سمجھ کر اور اسے چٹان کے پاس دیکھ کر قبل از وقت بھی اپنے قاتلانہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ سوی کو یقیناً اس کا احساس تھا۔

”اچھا تو پھر؟ آگے تو بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ فواد نے دریافت کیا۔

”اس چٹان کی نشان دہی کر کے، ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ تم اس عرصے میں اپنے چھپنے کے لئے جگہ تلاش کرنا اور میں ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لے کر واپس چٹان تک پہنچ جاؤں گی۔ اس طرح ایک ہی وقت میں دونوں کام ہو سکتے ہیں۔“ سوی نے جواب دیا۔

فواد کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ سوچ پڑ گیا ہو۔ کچھ دیر میں بعد وہ بولا۔ ”رشیدہ! تمہارے ذہن میں خواہ مخواہ یہ وہم بیٹھ گیا ہے کہ حادث وہاں نجوا کے لئے جال بچھائے بیٹھا ہوگا۔ پھر بھی اگر تم اپنا اطمینان چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”شکریہ فواد کہ تم نے میری تجویز مان لی۔“ سوی نے مطمئن آواز سے کہا۔ ”دراصل کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“

”میں یہی سوچ کر تو تمہیں نہیں روک رہا، ہر چند کہ مجھے خبر ہے تمہارے اندیشے بے بنیاد ہیں۔“ فواد نے یہ کہتے ہوئے اپنے کوٹ کی پائیں جیب میں ہاتھ ڈالا ایک ریوالور نکال کر سوی کو تھمادیا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے جدا ہو کر تمہیں غیر مسلح نہیں ہونا چاہئے۔“

سوی نے وہ ریوالور اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لیا۔ فواد نے فاضل گولیاں بھی اسے دے دیں۔ انہیں بھی سوی نے اپنے ہینڈ پرس میں ڈال لیا۔

کار تیز رفتاری سے فاصلے طے کرتی ہوئی آخر قلعے کی آبادی میں داخل ہو ہی گئی۔ صلاح الدین ایوبی کا بنوایا ہوا قلعہ چھوٹی سی اس آبادی سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ فواد کی کار آبادی سے نکل کر قلعے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں ساتھ ساتھ تھا۔

قلعے کے عقبی حصے کی جانب فواد نے ایک جگہ اپنی کار روک دی اور سوی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ اب فواد کے ہاتھ میں ایک خود کار رائفل نظر آرہی تھی۔ ایک مقام ایسا تھا کہ جہاں سے نشیب میں اترنا جاسکتا تھا۔ فواد نے سوی کا ہاتھ تھام لیا اور نیچے اترنے لگا۔ وہاں سے مطلوبہ چٹان صاف نظر آرہی تھی۔

”وہ چٹان دکھائی دے رہی ہے تمہیں؟“ فواد نے ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ سوی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

”بس تمہیں ٹھیک گیارہ بجے تک اس چٹان تک پہنچ جانا ہے۔“

”میں پہنچ جاؤں گی۔ تم بے فکر رہو فواد!“ سوی نے اپنی کھائی پر نظر ڈالی۔ ”ابھی تو دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔“

کچھ دیر ساتھ رہ کر فواد اور سوی کی راہیں جدا ہو گئیں۔ فواد نے دائیں جانب رخ کیا اور سوی مخالف سمت میں بڑھی۔ جیسے ہی ان دونوں کے درمیان پھوٹی سی ایک چٹان آئی، میں نے سوی سے کہا۔ ”اب تو اس انسانی قالب کو چھوڑ کر باہر نکل آ اے سوی! تو حادث کی نظر میں آئے بغیر اس پہاڑی تک نہیں پہنچ سکے گی جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا ہے۔“

سوی نے فوراً میرا مشورہ قبول کر لیا۔ وہ انسانی قالب سے باہر آگئی۔ میں اسے ساتھ لیے مطلوبہ پہاڑی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

حادث جلد ہی ہماری نظر میں آگیا۔ وہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے سکون و آرام کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کیوں کہ ابھی گیارہ بجنے میں بہت دیر تھی۔ وہ بھی میرے دشمنوں ہی کا ایک ساتھی تھا۔ مجھے اس لئے اس کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نجوا نے اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے فواد اور سوی کو وہاں بھیجا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ نجوا اپنے حکم سے تجاوز پسند نہیں کرتی ورنہ تو میرے اور سوی کے لئے یہ بھی ممکن تھا، ہم عماد اور منقرع کے دوسرے غلاموں کو بھی موت کی نیند سلا دیتے۔

سوی نے بھی میری تقلید کی۔ ہم دونوں حادث سے کچھ ہی فاصلے پر جا کر اترے۔ سوی نے فواد کا دیا ہوا ریوالور نکال کر حادث کی پیشانی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ گولی حادث کی پیشانی میں اتر گئی اور فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ حادث منہ کے بل گرا اور پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

یقیناً گولی چلنے کی آواز دور دور تک سنائی دی ہوگی۔ پہاڑی سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہ چٹان تھی جس کے عقب میں عماد اور منقرع کے دوسرے غلام چھپے ہوئے تھے۔

”اے سوی! دیکھتے ہیں کہ منقرع کے دوسرے غلاموں پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہے!“ میں بولا۔

”لیکن اے علیا لیش، مجھے فواد کے پاس بھی تو واپس پہنچنا ہے!“

”اس میں کتنی دیر لگے گی! میں تو وقت گزاری کے لئے ایسا کہہ رہا تھا کیوں کہ حادث کے پاس تجھے فوراً نہیں پہنچنا چاہئے۔“

”ہاں تو یہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ سوی نے کہا۔

میں اور سوی فضا میں بلند ہوئے ہی تھے کہ عماد اور اس کے ساتھیوں کو چٹان کی آڑ سے نکل کر پہاڑی کی طرف بھاگتے دیکھا۔ عین اسی لمحے پے درپے کئی دھماکے ہوئے۔ عماد کے دو ساتھی زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ ان پر جنم کا دہانہ کھولنے والا فواد کے سوا کوئی اور نہیں ہو

سکتا۔

عماد اور اس کے بقیہ ساتھیوں نے آس پاس پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لے لی اور جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ منقرع کا پہاڑی سلسلہ فائرنگ کی آواز سے گونجنے لگا۔

”فواد نے منقرع کے غلاموں کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔“ میں نے خیال آرائی کی۔

”وہ شاید سمجھا ہو گا کہ منقرع کے غلام مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ سوی نے کہا۔

ہم پرواز کرتے ہوئے کچھ اور نیچے آگئے تو عماد کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے، اکیلا ہی معلوم ہوتا ہے اور ہم اسے آسانی سے گھیر کر مار سکتے ہیں۔“ عماد کے ساتھ اب بھی آٹھ مسلح افراد تھے۔ اس نے ان میں سے دو ساتھیوں کو اپنے ساتھ وہیں روک لیا اور بقیہ چھ کو دو مختلف سمتوں سے ادھر بڑھنے کا حکم دیا جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ تین افراد پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے ایک جانب سے اور بقیہ تین دوسری طرف سے آگے بڑھے۔

”میں نے کہا تھا نا سوی کہ فواد نے بڑی غلطی کی ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”اب اس کی کوئی تدبیر سوچ کہ فواد کو کیسے بچایا جائے؟“ سوی جواباً بولی۔ اس کی آواز بھی دھیمی ہی تھی کیوں کہ ہم عماد سے زیادہ دور نہیں تھے۔

”صرف ایک ہی تدبیر ہے اے سوی!“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”فواد کو علم نہیں کہ ٹوٹکال ہے نہ ہی منقرع کے غلام اس سے واقف ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ فواد کی طرف بڑھتے ہوئے موت کے ان ہر کاروں کو تو ٹھکانے لگا دے۔“

”مگر نجوا تو اس پر جواب طلبی نہیں کرے گی؟“ سوی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”جو کچھ بھی یہاں پیش آیا ہے، غیر متوقع ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں حیرانہ قدم اٹھانا فطری امر ہے۔ یوں سمجھ کہ گویا تو نے فواد کی جان بچانے کے لئے ایسا کیا۔“

میرے جواب سے سوی مطمئن ہو گئی۔ پھر میں اور وہ پہلے ایک سمت بڑھے۔ سوی نے اپنے ریوالور کی گولیوں سے مزید تین دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہم جن زادوں کے لئے انہیں کسی اور طرح مارنا بھی ممکن تھا، لیکن ایسا کرنا حقیقت سے قریب تر نہ ہوتا۔ سوی کو بہر حال اسی حد تک آگے بڑھنا تھا کہ اس کا کوئی عمل غیر انسانی معلوم نہ ہو۔

دوبارہ ریوالور لوڈ کر کے اب سوی میرے ساتھ دوسری سمت میں بڑھ رہی تھی۔ پھر چند لمحوں کے بعد منقرع کے تین غلام اور مارے گئے۔ اب تک مع حادث کے سوی نے منقرع کے سات غلاموں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ان کے علاوہ دو غلاموں کو فواد نے مارا گرایا تھا۔ اب صرف عماد اور اس کے دو ساتھی زندہ رہ گئے تھے۔ وہ مخالف سمتوں سے مزید فائرنگ کی آوازوں سے شاید فواد اور عماد دونوں ہی کو چکرا دیا تھا۔ اسی کے رد عمل میں دونوں جانب سے اچانک فائرنگ بند ہو گئی۔ ذرا دیر کو سناٹا سا چھا گیا۔

”عماد اور اس کے دونوں ساتھیوں کی موجودگی میں فواد اور تیرے لئے یہاں سے اوپر پہنچنا

ناممکن لگتا ہے۔ وہ تم دونوں کو بھون کے رکھ دیں گے۔“ میں نے سوی کو ایک اور خطرے سے آگاہ کیا۔ ”ان کے پاس میں نے دور بینیں بھی دیکھی تھیں۔“

”کہیں تو یہ تو نہیں چاہتا اے علیالیش کہ میں ان تینوں کو بھی ٹھکانے لگا دوں؟“ سوی نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں۔“

”تو آپھر انہیں ٹھنڈا کیے دیتے ہیں۔“ سوی فضا میں بلند ہونے لگی۔

میں نے بھی سوی کا ساتھ دیا۔ جب ہم اس جگہ پہنچے کہ جہاں عماد اور اس کے دو ساتھیوں کو دیکھا تھا تو وہ ہمیں وہاں نظر نہ آئے۔

”ارے‘ تینوں کہاں گئے؟“ میں حیرت بولا۔

”انہیں تلاش کرنا کون سا مشکل ہے اے علیالیش! وہ کہاں جاسکتے ہیں!“

ہم دونوں ایک مرتبہ پھر فضا میں بلند ہوئے اور اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ عماد اور اس کے دونوں ساتھی ہمیں اس جگہ سے خاصی دور ایک پہاڑی غار میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ہمیں ان تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ سوی انہیں نشانہ نشانے ہی والی تھی کہ میں نے اسے اشارے سے روک دیا۔ ہم دونوں غار کے دہانے پر تھے۔

معا غار کے اندر سے عماد کی آشنا آواز ابھری۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس پہاڑی سلسلے میں نجوا کے خاصے آدمی موجود ہیں۔ جان بچانے کے لئے یہی ممکن ہے کہ ہم اس غار میں چھپے رہیں ورنہ وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ جا چکے ہیں تبھی ہم یہاں سے نکلیں گے۔“

عماد کے دونوں ساتھیوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ وہ تینوں ہی آدم زاد خوفزدہ لگ رہے تھے۔

”آ اے سوی‘ واپس چلیں۔“ میں نے سرگوشی کی۔

سوی نے میرے مشورہ پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میرے ساتھ فضا میں اڑتے ہوئے

اس نے پوچھا۔ ”تو نے ان شیطانوں کو کیوں زندہ رہنے دیا؟“

”اس لئے کہ ان کی موت غیر فطری معلوم ہوتی۔“ میں بولا۔

”وہ کیسے اے علیالیش؟“ سوی نے سوال کیا۔

”اس طرح اے سوی کہ وہ تینوں ہی مسلح تھے۔ یہ بتا‘ کیا تو انسانی قالب میں اس غار کے دہانے سے اندر داخل ہو کر انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی؟ کیا وہ تجھ پر جہنم کے دہانے نہ کھول دیتے؟ بول‘ کیا تیرے لئے ایک آدم زادی کی حیثیت سے ایسا ممکن تھا؟“

”اے علیالیش! تو یقیناً ٹھیک کہتا ہے۔ غار میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی وہ میرے انسانی قالب کو چھلنی کر دیتے۔“ سوی نے اعتراف کیا۔

”اب تیرے اور فواد کے یہاں سے فرار ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔

”اس طرف چل کہ جدر فواد چھپا ہوا ہے۔ تجھے اس کے قریب ہی کہیں اتر کر انسانی قالب اپنانا ہے۔ تو نے فواد کو کس طرح تلاش کر لیا؟ غالباً تجھے اس سوال کا جواب دینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی!“

”ظاہر ہے کہ مجھے فائرنگ کی سمت ہی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تو فکر نہ کر‘ فواد کو میں کسی طرح کا شک نہیں ہونے دوں گی۔“

پھر سوی ایک جگہ اتر گئی جہاں قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ وہاں سے فواد چند ہی گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ہی اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تقریباً لیٹا ہوا تھا۔ جھاڑیوں کی آڑ میں سوی انسانی قالب اپنا کر جیسے ہی وہ قدموں فواد کی طرف بڑھی‘ فواد نے ایک دم اچھل کے اپنی راکفل کا رخ سوی کی طرف کر دیا۔ سوی ایک دم ساکت ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا‘ مگر ظاہر ہے کہ وہ فواد پر گولی نہیں چلا سکتی تھی۔

فواد کسی چپتے کی طرح بدن سمیٹے قد آدم جھاڑیوں پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ جھاڑیوں کو ہلنے دیکھ کر یقیناً وہ فائر کھول دیتا۔

”گولی نہ چلاتا فواد! یہ میں ہوں۔“ سوی نے فواد کو مخاطب کیا۔

فواد کی راکفل جھک گئی۔ سوی اب تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

”تم..... تم کہاں تھیں رشیدہ؟“ فواد نے حیرت سے پوچھا۔

”میلے یہاں سے نکل چلو فواد! میں راستے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”لیکن وہ..... وہ منقرع کے غلام ہمیں یہاں سے نہیں نکلنے دیں گے رشیدہ! جیسے ہی ہم

نے اوپر چڑھنا شروع کیا وہ.....“

”اب ایسا کوئی خطرہ نہیں رہا۔“ سوی نے فواد کی بات کاٹ دی۔

”کیا..... کیا تم نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟“ یہ سوال کرتے ہوئے فواد کے

لبے میں انتہائی حیرت تھی۔

”نہیں‘ ان میں سے تین ابھی زندہ ہیں۔“ سوی نے بتایا۔

”تو..... تو پھر کس طرح ہمیں فرار ہو جانے دیں گے؟“

”وہ تینوں تو خود اپنی جان بچانے کی خاطر یہاں سے خاصے فاصلے پر ایک غار میں چھپے بیٹھے

ہیں۔“

فواد غیر یقینی سے انداز میں سوی کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا‘ پھر سوی کے ساتھ چلنے لگا۔

زرا ہی دیر میں فواد اور سوی اوپر چڑھ رہے تھے۔ فواد بہت چوکنا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد

پلٹ کے دیکھ لیتا۔ جب وہ دونوں اوپر پہنچ کر کار میں بیٹھ گئے اور کار اشارت ہو گئی تو میں وہاں سے

ردانہ ہوا۔ میری منزل اب فواد کی کوٹھی ہی تھی۔ فواد اور سوی کو بھی بہر حال وہیں پہنچنا تھا۔ راستے

میں مجھے خیال آیا کہ نجوا کا سراغ لگاؤں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے! ظاہر ہے گزشتہ رات جو واقعہ پیش آچکا تھا، اس کے بعد نجوا ہوٹل ملن تو چھوڑ ہی چکی ہوگی۔ مجھے معلوم تھا کہ نجوا اس سے بے خبر نہیں رہے گی، کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر بھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

اپنے تصور کی قوت آزماتے ہی مجھے نجوا نظر آگئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ منصور بھی تھا۔ وہ دونوں ایک کار میں سفر کر رہے تھے۔ ان کی کار دریائے نیل پر بنے ہوئے ایک پل سے گزر رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ نجوا کار ڈرائیو کر رہی تھی، دوم برابر والی نشست پر بیٹھے ہوئے منصور سے مخاطب تھی، وہ شاید اسی سبب فوری طور پر یہ محسوس نہ کر سکی کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ نجوا جو کچھ کہہ رہی تھی، اسے سن کر میں چونک اٹھا۔

”اب مجھے یقین ہوتا چلا رہا ہے منصور کہ سعد اور رشیدہ خود کو جو ظاہر کرتے ہیں، دراصل ہیں نہیں۔“ یہ نجوا کی آواز تھی۔ ”کسی بڑا سراغ قوت کے بغیر ہر مرتبہ موت کے منہ سے نکل آتا کسی طرح ممکن نہیں۔ آج اگر رشیدہ، منظم کے پہاڑی سلسلے سے زندہ سلامت بچ کر آگئی تو میرا شک یقین میں بدل جائے گا۔ منقرع کے درجن بھر غلاموں سے جان بچانا موت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ حادث اور عماد جیسے عیار وہاں موت کا جال بچھائے بیٹھے ہوں گے۔ میں نے اسی لئے تو فواد کے ساتھ اسے بھیجا ہے۔“

”نجوا اگر تمہیں یہ سب کچھ معلوم ہو گیا تھا تو فواد کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔“ منصور کے لہجے میں شکایت تھی۔

”جنگ کی بابت پر دشمن کے خلاف چالیں چلتے ہوئے کبھی کبھی اپنا کوئی مرا بھی پڑانا پڑتا ہے منصور!“

”اگر وہ دونوں موت کا گھیرا توڑ کر نکل آئے تو؟“ منصور نے سوال کیا۔

”اول تو یہ ناممکن بات ہے۔ فرض کرو ایسا ہو گیا تو بھی میری ہی جیت ہوگی۔ رشیدہ اگر وہاں سے زندہ بچ آئی تو پھر میں اسے نہیں جینے دوں گی۔ میں اسی لئے تو اس وقت فواد کی کوٹھی جاری ہوں۔ اگر صورت حال مختلف ہوئی، یعنی فواد اور رشیدہ مارے گئے تو بھی میں گھائے میں نہیں رہوں گی۔ سعد تو بہر حال میرے قبضے میں رہے گا جس سے آئندہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اب کچھ سمجھے تم کہ نجوا بے سبب کوئی چال نہیں چلتی۔“ نجوا یہ کہہ کر دھیرے سے ہنسی۔

اس عیار آدم زادی کی باتیں سن کر میرا خون کھولنے لگا۔ کار میں چند لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک ہی نجوا کو میں نے چونکتے دیکھا۔ وہ غصے سے چیخ اٹھی۔ ”کون ہے تو؟“

میں نے فوری طور پر تصور کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ فواد کے ساتھ سوی ایک یقینی موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس خیال سے میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ فیصلہ کن لمحات آپکے تھے۔ مجھے ہر قیمت پر سبکی کو مرنے سے بچانا تھا، مگر کس طرح؟ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

ان لمحات کی سنگینی مجھ سے تقاضا کر رہی تھی کہ مجھے جلد از جلد کسی نتیجے تک پہنچ جانا چاہئے۔ ایک تو سیدھا سارا سہ یہ تھا کہ میں اور سوی فوری طور پر راہ فرار اختیار کر لیتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ حالات کا مقابلہ کرتے۔ ایک آدم زادی کے مقابلے پر راہ فرار اختیار کرنا مجھے بزدلی سی محسوس ہوئی۔ اگر ہم خود مصلحت کے پیش نظر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے تو دوسری بات تھی۔ اس موضوع پر سوی سے میری گفتگو بھی ہوئی تھی کہ اب ہمیں آزاد فضا میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔ وہ ناشکری اور عیار آدم زادی نجوا یا منقرع کے غلام ہم جن زادوں کا کیا بگاڑ لیتے! سوی کا خیال تھا کہ اس طرح ہم دونوں خطرناک گردہوں کی دشمنی مول لے لیتے۔ اس نے مشورہ دیا تھا کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہئے۔

موجودہ صورت حال پر غور کرتے ہوئے میں نے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ سوی نے منقرع کے غلاموں کو ٹھکانے لگاتے ہوئے کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی تھی جو غیر فطری یا پراسرار نظر آتی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا کسی غیر معمولی ذہین اور بہادر آدم زادی کے لئے بھی بے ظاہر ممکن تھا۔ اس کا گواہ خود نجوا کا ایک ساتھی فواد بھی تھا۔ منقرع کے دو غلام تو خود فواد کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ زندگی اور موت کی جنگ میں شکست فتح کا انحصار تعداد پر نہیں بلکہ ذہانت، بروقت اقدام اور حوصلے پر ہوتا ہے۔

مجھے اس پر بھی یقین تھا کہ نجوا حقائق جاننے بغیر کہ فواد اور سوی کس طرح موت کا حصار توڑ کر نکل آئے، کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ اسے سوی اور مجھ پر لاکھ شک سہی مگر حقیقت سے کس طرح انکار کر دیتی! سوی کو یا مجھے موت کے گھاٹ اتار دینے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

نجوا کی کار اب دتی کے علاقے میں فواد کی کوٹھی کے قریب پہنچنے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے ہی کمرے کا رخ کرتی۔ جاتے وقت میں احتیاطاً اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں اندر سے بند کر گیا تھا تاکہ کسی کو علم نہ ہو کہ میں اندر موجود نہیں ہوں۔ نجوا کی آمد سے پہلے مجھے اپنے کمرے میں ہی میں ہونا چاہئے تھا۔ میں اسی لئے فوراً اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ انسانی قالب اپنانے سے پہلے میں نے دروازے کی چٹنی کھول دی، پھر بستر پر دراز ہو گیا۔

مجھے زیادہ دیر نجوا اور منصور کی آمد کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نجوا کے لیے بہر حال میری موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سوی کو موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ کمرے کی سب کھڑکیاں بند تھیں اور دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا۔ کمرے میں اسی سبب دن کے وقت بھی نیم تاریکی سی تھی۔ نجوا اور منصور کے قدموں کی چاپ سن کر میں نے آنکھیں بھی بند کر لیں۔ میں ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ سو رہا ہوں۔ وہ دونوں دروازہ کھول کر اندر بھی آگئے تو میں نے اپنے جسم کو حرکت نہیں دی۔

”لاست جلاؤ منصور!“ نجوا کی آواز ابھری۔ ”لگتا ہے کہ سعد سو رہا ہے۔“

آنکھیں بند ہونے کے باوجود میں نے محسوس کر لیا کہ کمرے میں روشنی ہو چکی ہے۔

”مجھے تو اس وقت سعد کا اس طرح بے فکری کے ساتھ سونا بھی غیر فطری معلوم ہو رہا ہے۔“

”نن..... نہیں!“ میں بہ ظاہر گھبرا کر بول اٹھا۔ ”ایسا..... ایسا نہ کہو نجوا..... درندہ میں..... میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔“

”تم ہی نے تو خود خطرے کا اظہار کیا ہے۔ اگر تمہارا اندیشہ درست ثابت ہوا تو ان دونوں کی واپسی ناممکن ہے۔ مقرر کے غلام انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، لیکن تم فکر نہ کرو سعد! اگر ایسا ہوا تو میں کسی قیمت پر حارث کو جینے نہیں دوں گی! میں اس سے رشیدہ اور فواد کا انتقام ضرور لوں گی!“ نجوا نے گویا مجھے دلاسا دیا۔

”لیکن اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ میری رشیدہ تو مجھ سے بچھڑ جائے گی۔“ میں نے بھرائی آواز میں کہا۔

”کیا تم رشیدہ کے قاتلوں سے انتقام نہیں لو گے؟“

”یہ..... یہ نہیں..... نہیں ہو سکتا!“ میرا انداز خود کلائی کا سا تھا۔ ”وہ..... وہ میری بیوی ہے۔ اسے..... اسے کوئی اتنی آسانی سے نہیں مار سکتا، کبھی نہیں!“

”تمہیں یہ خوش گمانی اس لئے ہے سعد کہ تم حارث کو نہیں جانتے۔ وہ انتہائی عیار اور خطرناک شخص ہے۔“ نجوا اپنی داستان میں ایک بری خبر سننے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کرنے لگی۔ پھر اس نے مجھے یہ دھوکا بھی دیا۔ ”ضروری تو نہیں کہ اس مرتبہ بھی حارث نے فریب سے کام لیا ہو!“ یہ گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ دور سے کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی اور نجوا ایک دم چونک پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ فواد اور رشیدہ یقیناً کوشی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ پھر ذرا ہی دیر میں میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ فواد کے ساتھ رشیدہ کمرے میں آئی تو اس کے چہرے پر ماسک نہیں تھا۔ وہ دونوں حیرت سے نجوا اور منصور کو دیکھنے لگے۔ نجوا اور منصور کی وہاں موجودگی ان کے لئے غیر متوقع ہی تھی۔

نجوا نے جیبتی ہوئی سی نظروں سے سوی کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ”تو اس مرتبہ بھی تم موت کا گھبرا توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئیں!“

”لیکن آپ..... آپ کو یہ..... یہ کیسے معلوم ہوا؟“ سوی نے اظہار حیرت کیا۔ اسی وقت میں نے اذیت کی پروا کئے بغیر اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر سوی کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

نجوا کہہ رہی تھی۔ ”تو کیا میں تم دونوں کو وہاں بھیج کر تمہاری طرف سے غافل ہو جاتی! لیکن مجھے حقیقت کا علم وقت گزرنے کے بعد ہوا جب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں یہاں منصور کو لے کر اتنی لے تو آئی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ حارث نے دھوکا دیا ہے اور وہ پہلے ہی تم دونوں کے لئے موت کا جال بچھا چکا ہے۔“

”لیکن رشیدہ نے اپنی جان پر کھیل کر اس جال کو توڑ دیا۔“ فواد پُر جوش آواز میں بولا۔ ”اس نے اپنے ساتھ میری زندگی بھی بچالی۔“

سعد کو معلوم تو ہوگا کہ رشیدہ فواد کے ساتھ کہاں گئی ہے!“ منصور کی دھیمی آواز سنائی دی۔ ”بہر حال میں چکاتا ہوں اسے!“ پھر منصور مجھے نام لے کر پکارنے لگا۔

میں نے ذرا ہی دیر آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے پہلے منصور پھر نجوا کی طرف دیکھا۔ نجوا میری مسہری کے قریب موجود کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکی تھی۔

”تم نے تو شام کو ڈاکٹر کے ساتھ آنے کے لئے کہا تھا!“ میں نے منصور کو مخاطب کیا۔ ”ہاں شام کو بھی آؤں گا۔ اس وقت دراصل ہمیں رشیدہ کی وجہ سے آنا پڑا۔ اسے فواد کے ساتھ جس کام سے بھیجا ہے تمہارے علم میں بھی تو ہوگا!“ منصور بولا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ پھر کہا۔ ”میں نے فواد اور رشیدہ دونوں ہی کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔“ میں دانستہ فضا ہموار کر رہا تھا۔

”کیسا خطرہ؟“ میری بات پوری ہوتے ہی نجوا بول اٹھی۔ ”تمہیں کسی خطرے کا احساس کس طرح ہو گیا؟“

”اس طرح کہ جب حارث ایک مرتبہ دھوکا دے سکتا ہے تو دوبارہ بھی اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم نے فواد اور رشیدہ سے کیا کہا تھا؟“ نجوا نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ کہ مقرر کے غلام وہاں پہلے ہی سے ان دونوں کے لئے کوئی جال بچھا سکتے ہیں اس لئے انہیں بہت محتاط اور چوکنا رہنا چاہئے۔ فواد نے میری بات سے اختلاف کیا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ پھر بھی میں ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہے، رشیدہ نے میری بات کو نظر انداز نہیں کیا ہو گا۔“

”کیوں کیا رشیدہ نے اس سلسلے میں روانگی سے قبل کچھ کہا تھا تم سے؟“ نجوا نے دریافت کیا۔

”زبان سے تو اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ میرے اندیشے کو وہ درست سمجھ رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہوں!“ نجوا کچھ سوچنے لگی۔ کمرے میں کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ ”ممکن ہے نجوا کہ سعد نے جو خطرہ محسوس کیا ہے، ٹھیک ہی نکلے۔“ منصور کی آواز نے سکوت کو ختم کر دیا۔

”بارہ بجتے والے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک ان دونوں کو لوٹ آنا چاہئے۔“ نجوا بولی۔ ”اگر وہ مزید آدھے گھنٹے تک واپس نہیں آتے تو.....“

”تو کیا؟“ میں نے پوچھ لیا۔ ”تو پھر تمہیں رشیدہ کو اور مجھے فواد کو مبرا کرنا پڑے گا۔“

طرف بڑھ رہے تھے۔ فواد کی زندگی شدید خطرے میں تھی۔ میں اپنی جان کی پروا کئے بغیر تیزی سے ایک سمت بڑھی اور آگے بڑھنے والے تین افراد کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور انہیں موت کی نیند سلا دیا۔ سامنے سے فائرنگ کا تبادلہ اب بھی جاری تھا۔ اب مجھے دوسری سمت جانا تھا۔ پھر وہ تینوں بھی میری گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اسی کے بعد منقرع کے وہ غلام جو سامنے سے فائرنگ کر رہے تھے، وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے۔ میں اس وقت ایک بلند جگہ پر تھی۔ ان زندہ بچ جانے والوں کو جب میں نے اپنی ہی طرف آتے دیکھا تو ایک پتھر کی آڑ میں چھپ گئی۔ وہ میرے خالصے قریب سے گزرے۔ تب میں نے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھیوں سے یہ کہتے سنا کہ ”مجھے یقین ہے، اس پہاڑی سلسلے میں نجوا کے خالصے آدمی موجود ہیں۔ جان بچانے کے لئے یہی ممکن ہے کہ ہم کسی غار میں چھپ جائیں ورنہ وہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں تبھی ہم یہاں سے نکلیں گے۔“ پھر وہ تینوں میرے ہی سامنے ایک قریبی غار میں جا چھے۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اگر میں ان میں سے کسی کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتی تو خود بھی جان گونا بیٹھتی۔ میں اسی لئے دم سادھے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ یوں بھی وہ تینوں خود اپنی زندگی بچانے کی فکر میں تھے مجھے یا فواد کو اب ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لئے ان سے الگنا فضول تھا۔ خطرہ پوری طرح ٹل جانے کے بعد مجھے تو اب جلد از جلد فواد تک پہنچنے کی فکر تھی۔“ پھر سوی نے بقیہ روداد بھی بیان کر دی۔

اس عرصے میں میری نظر نجوا کے چہرے میں پر تھی۔ سوی کے بیان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو ناقابل یقین معلوم ہوتی۔ نجوا کے چہرے کا جائزہ لے کر مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ سوی کے بیان پر اس کا کیا رد عمل ہے! میں تو اس وقت چونکا جب سوی ایک دم چیخ اٹھی۔ نجوا کے ہونٹ تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔ یقیناً وہ خبیث آدم زاد کوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کی تمام تر توجہ سوی کی طرف مبذول دیکھ کر میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں نے بھی ایک عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ عمل کوئی دوسرا ہی پڑھے تو کارگر ثابت ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بغداد میں سوی نے یہی عمل پڑھ کر مجھے نجوا کے شیطانی حملے سے بچایا تھا۔

سوی اب فرش پر گر کر ترپنے لگی تھی۔
 ”بول کہ تُو نے جو کچھ بیان کیا“ اس میں جھوٹ شامل نہیں تھا ورنہ میں تجھے اس طرح ترپا ترپا کر مار ڈالوں گی!“ نجوا غضب ناک آواز میں سوی سے مخاطب ہوئی۔ سوی اس کی کرسی کے قریب ہی زمین پر گر گئی تھی۔ نجوا نے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔
 اس وقت تک میں اپنا عمل مکمل کر چکا تھا۔ سوی پر فوراً اس عمل کا اثر ہوا اور وہ مزید اذیت برداشت کرنے سے بچ گئی۔ پھر بھی اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور کراہتے ہوئے بولی۔
 ”میں..... میں نے سب..... سب کچھ سچ..... سچ بتایا ہے۔..... مجھے..... مجھے ہلاک نہ کریں۔ میں بے..... بے گناہ ہوں۔“

”مگر کیسے؟ میں یہی تو جانتا چاہتی ہوں۔ میری اطلاع کے مطابق تو وہاں حادثہ اور عمار کے ساتھ خاصی تعداد میں منقرع کے غلام موجود تھے۔“ نجوا نے کہا۔
 ”تمہاری اطلاع غلط نہیں نجوا!“ فواد نے تصدیق کی۔

”تم خاموش رہو فواد!“ نجوا نے فواد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”رشتیدہ کو بتانے دو کہ کیا ہوا تھا!“ نجوا یہ کہہ کر سوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں بتاتی ہوں نجوا صاحبہ!“ سوی پرسکون آواز میں بولی۔ ”پہلے تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں، جب سے آپ نے میرے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ایک دن مجھے دوسری نجوا بنا دیں گی، میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ آج بھی جو واقعہ پیش آیا، میں نے یہی سوچ کر ہر قدم اٹھایا کہ اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں!“

واضح طور پر میں نے محسوس کیا کہ سوی کے ان الفاظ نے نجوا پر خوشگوار اثر مرتب کیا ہے۔ یقیناً اس سے نجوا کی اتنا کو بڑی تسکین ملی تھی۔ اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے سوی نے مزید کہا۔ ”جب ہم یہاں سے روانہ ہونے والے تھے تو سعد نے ہمیں.....“

”سعد مجھے بتا چکا ہے، تم آگے کو!“ نجوا نے سوی کی بات کاٹ دی۔
 ”فواد نے تو سعد کو مطمئن کر دیا تھا لیکن میں اسی وقت کھٹک گئی۔ راستے ہی میں، میں نے اپنے خیالات کا اظہار فواد سے کر دیا۔“ پھر سوی بتانے لگی کہ فواد ہی نے اسے ریوالور اور فاضل گولیاں دیں۔ ”مطمئن کے پہاڑی سلسلے میں پہنچ کر فواد نے اس چٹان کی نشان دہی کی جہاں مجھے حادثہ سے ملنا تھا۔ فواد مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں اس عرصے میں ارد گرد کا جائزہ لینے کی خاطر فواد سے جدا ہو گئی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ چھوٹے بڑے پتھروں کی آڑ لیتی ہوئی میں اس پہاڑی کے عقب میں پہنچ گئی کہ جہاں ایک شخص چھپا ہوا تھا۔ مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ تراشیدہ سے چہرے والا وہ شخص کون ہے۔ بعد میں جب میں نے فواد کو اس کا حلیہ بتایا تو پتا چلا کہ وہی حادثہ تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ حادثہ وہاں میری موجودگی سے واقف ہوتا میں نے اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ اسے وہاں اس طرح چھپے دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی دشمن ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ گولی چلنے کی آواز سے وہاں قریب ہی موجود منقرع کے دوسرے غلام میرے لیے پیغام اجل بن جائیں گے۔ میں تو ان کی وہاں موجودگی سے اس وقت آگاہ ہوئی جب فواد نے انہیں ایک چٹان کی آڑ سے نکل کر پہاڑی کی طرف دوڑتے دیکھا اور ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے بھی انہیں دیکھ لیا۔ فواد ان میں سے دو کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ وہ پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پہاڑی سے اتر آئی۔ اگر فواد بروقت فائرنگ کر کے انہیں روک نہ لیتا تو یقیناً وہ مجھے گھیر کر مار دیتے۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے میں نے ایک اور ایسا منظر دیکھا کہ لرز گئی۔ دو مختلف سمتوں سے تین تین افراد فواد کی

”تو پھر اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ رشیدہ! مجھے تمہارے بیان کی صداقت پر یقین آگیا۔“ نجوا نے آخری حربہ آزمایا۔
مجھے بہ خوبی علم تھا کہ سوی اب اس قابل ہے کہ خود اٹھ کر کھڑی ہو سکتی ہے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ نجوا کے قریب میں نہیں آئی۔

”میں خود..... خود نہیں اٹھ سکتی۔“ سوی کہنے لگی۔ اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ ”مجھے یوں..... یوں لگ رہا ہے جیسے میرا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا ہے۔“

”فواد! اسے سہارا دے کر اٹھاؤ اور دوسری مسہری پر لٹا دو!“ نجوا نے کہا۔

جلدی سے فواد آگے بڑھا۔ سوی نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔ فواد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہ تم نے کیا کر دیا نجوا؟“ میں بول اٹھا۔ ”کیا رشیدہ کی ذہانت اور دلیری کا یہی انعام ہے؟“
”اپنی حد میں رہو سعد!“ نجوا نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”نجوا یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسے کب کیا کرنا چاہئے! میں کسی کو احتجاج کرنے کا حق نہیں دیتی۔“

اس دوران میں سوی کو فواد نے سہارا دے کر دوسری مسہری تک پہنچا دیا تھا۔ اب سوی بستر پر لیٹ رہی تھی۔

”تم ہمارے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں! ہم تو شاید زندہ نہ رہیں، لیکن تمہیں اپنے سلوک پر پچھتاوا ضرور ہو گا۔ ہم نے اب تک وہی کیا جو تم نے کہا۔ تمہارا کوئی بھی حکم ماننے سے ہم نے کبھی انکار نہیں کیا اس لئے کہ تم نے ہمیں پناہ دی ہے، مگر اس بے اعتمادی اور اذیت دینے سے یہ بستر ہے کہ.....“

”تمہیں مر جانے دیا جائے۔“ نجوا نے میری بات کاٹ دی۔ ”تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ تم جب چاہو گے میں تمہیں تمہارے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں گی۔ تم اس غلط فہمی کا شکار نہ رہنا کہ میں تم دونوں سے کوئی فائدہ اٹھا رہی ہوں۔“ اسی وقت منصور نے نجوا کو مخاطب کیا۔ ”میرا خیال ہے نجوا کہ اپنی بیوی کو اذیت میں مبتلا دیکھ کر سعد کچھ جذباتی ہو گیا ہے، اسے معاف کر دو۔“

فواد نے بھی نجوا سے میری سفارش کی تو نجوا نے کہا۔ ”تم دونوں کے کہنے پر میں اسے آخری موقع دے رہی ہوں۔ اگر اس نے آئندہ مجھ سے ایسے لمبے میں بات کی تو میں برداشت نہیں کروں گی۔ اپنے طور پر تم اسے سمجھا دینا! اس سے پہلے کہ منقرع کے غلا اسے ٹھکانے لگا دیں، میں خود ہی اس کا کام تمام کر دوں گی!“

”تم مطمئن رہو نجوا! میں سمجھا دوں گا سعد کو۔“ فواد نے یقین دہانی کرائی۔

نجوا مجھے گھورتی ہوئی انہی اور منصور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس ظالم آدم زاد نے پلٹ کر سوی کو ایک نظر دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔

”سعد! میں شام کو آؤں گا، ڈاکٹر کو لے کر۔“ منصور نے چلتے چلتے مجھ سے کہا اور پھر تیزی

کے ساتھ قدم بڑھا کر نجوا کے قریب پہنچ گیا۔

یوں گویا خطرہ ٹل گیا۔ سوی کا بیان حقیقت سے قریب تر ہونے کے باوجود اس عیار عورت نے اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کر ”سچائی“ کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ اگر اس نتیجے پر نہ پہنچتی کہ سوی نے سچ بولا ہے تو شاید آخری قدم اٹھانے سے دریغ نہ کرتی۔ سوی کے ساتھ ظلم پر میری خاموشی بھی غیر فطری ہوتی۔ اس سے بھی وہ کھٹک جاتی۔ اس جیسی کسی آدم زادی سے پہلے بھی میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔

”اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو رشیدہ؟“ سوی سے یہ سوال کرتے ہوئے فواد کے لمبے میں ہمدردی تھی۔

”پہلے سے ٹھیک ہوں۔“ سوی نے گمراہ سانس لیتے ہوئے جواب دیا، پھر پوچھا۔ ”نجوا صاحبہ کو آخر کیا ہو گیا تھا؟ وہ میرے بیان پر شک کیوں کر رہی تھیں؟“

”نجوا کی یہ پرانی عادت ہے۔ غیر معمولی حالات میں تو وہ ہمیں بھی نہیں بخشتی۔“ فواد بولا۔
”لیکن یہ تو سراسر ظلم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے اپنے جاں نثاروں پر شک نہیں کرنا چاہئے۔“

”تمہارا کہنا بجا ہے سعد، مگر تمہیں بھی اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہئے۔ نجوا اسے پسند نہیں کرتی۔ اس سے بات کرتے ہوئے خود کو قابو میں رکھنا تمہارے لئے بہت ضروری ہے ورنہ وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“ فواد مجھے سمجھانے لگا۔

”کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ قوت برداشت جواب دے جائے۔ تم نے دیکھا تھا کہ رشیدہ کس طرح تڑپ رہی تھی!“

”یقیناً جو کچھ ہوا افسوس ناک ہے۔ بھول جاؤ اب اسے! میں نے تمہیں جو تاکید کی ہے، آئندہ اسے ذہن میں رکھنا۔ تم دونوں کی بہتری اسی میں ہے۔“

فواد مزید مجھے کچھ دیر سمجھا بجا کر جانے والا تھا کہ مجھے ایک بات یاد آگئی اور میں نے اسے روک لیا۔ ”مجھے تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”ہاں پوچھو۔“ فواد یہ کہتے ہوئے میرے قریب آگیا۔

”منصور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ منقرع کے غلام عمار کو ادبرج ٹائٹ کلب تک نہیں پہنچنے دے گا۔ وہ غالباً اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کے باوجود طلال بے کو حقیقت کا علم کیسے ہو گیا؟ طلال بے کو کس طرح پتا چلا کہ عمار کی جگہ کوئی اور لے چکا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کیا ابھی تک تم یہ نہیں جان سکے سعد کہ طلال بے حیرت انگیز پراسرار قوتوں کا مالک ہے! منقرع کے غلاموں میں اس سے زیادہ پراسرار قوتیں نجیب المہندس کو بھی حاصل نہیں۔ اتنے اہم معاملے سے بھلا وہ کس طرح غافل رہ سکتا تھا! اس نے اپنی پراسرار قوتوں ہی کے ذریعے یہ سراغ

لگایا ہو گا۔“ فواد نے جواب دیا۔

اس کے جواب سے میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا اور بولا۔ ”ہاں یہی ممکن ہے۔“ اسی وقت میرے ذہن میں ایک سوال اور آیا جو زبان تک بھی آگیا۔

”رقاصہ جزیلہ ہی سے یہ کام کیوں لیا گیا؟“

”تمہارے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ منقرع کے بیشتر غلام اٹھلی جنس والوں کی نظر میں آچکے ہیں۔ جزیلہ سے پہلے منقرع کے غلام اس طرح کے کام اور دوسرے افراد سے بھی لیتے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اب زندہ نہیں۔ چند روز کے بعد جزیلہ کا بھی کچھ پتا نہیں چلے گا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی! عموماً وہ لڑکیوں ہی کو ایسے کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وجہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ لڑکیوں پر ذرا کم ہی شک کیا جاتا ہے۔“ فواد نے بتایا۔

”بقول تمہارے اگر منقرع کے غلاموں پر اٹھلی جنس والوں کی نظر ہے تو وہ ان پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کسی ثبوت کے بغیر وہ یہ قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں! تمہارے خیال میں کیا طلال بے اور منقرع کے دوسرے غلاموں پر ہاتھ ڈالنا آسان کام ہے! طلال بے اور نجیب کا اثر و رسوخ اونچے ایوانوں تک ہے۔ جزیلہ جیسی خوب رو اور حسین لڑکیاں ان کے لئے راہیں ہموار کرتی رہتی ہیں۔ ہاں تمہیں میں ایک بات اور بتا دوں۔ مجھ سے تو خیر تم نے اس طرح کے سوال کر بھی لئے اور میں نے جواب بھی دیئے، مگر نجوا سے کبھی کچھ نہ پوچھتا۔ تمہیں تو خبر ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر شک.....“

”میں پاگل نہیں ہوں جو اس سے کچھ پوچھوں گا۔“ میں دھیرے سے ہنس دیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ نجوا کو اب تم تھوڑا بہت سمجھنے لگے ہو۔“ فواد یہ کہہ کر مزید کا نہیں۔ وہ چلا گیا تو میں نے دھیمی آواز میں سوی کو مخاطب کیا۔ ”اس شیطان صفت عورت کے عمل سے تجھے زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”تکلیف تو خیر ہوئی تھی مگر تیری بروقت مدد نے مجھے سنبھال لیا۔ یوں لگا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے اپنی گرفت میں لے کر پوری طاقت سے بھیج رہی ہے اور میرے انسانی قالب کی ہڈیاں ٹوٹنے والی ہیں۔ قوت برداشت کی حد گزرنے سے پہلے ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ مجھے اس اذیت سے بچانے کے لئے تو نے ہی عمل پڑھا ہو گا۔ پھر بھی میں نے نجوا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور یہ دستور زمین پر پڑی رہی۔“

”وہ تو خیر تو نے ٹھیک کیا، لیکن اب یہ بتا کہ آئندہ کیا راہ اختیار کی جائے؟ ہم نجوا کے ساتھ ہی رہے تو آئے دن ایسے ہی عذابوں سے گزرتے رہیں گے۔“

”بہتر یہ ہے کہ ہم اس موضوع پر رات کو گفتگو کریں۔“ سوی نے احتیاط کو مد نظر رکھتے ہوئے

مشورہ دیا۔

میں نے اس کے باوجود سوی کا مشورہ قبول کر لیا کہ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں

تھا اور ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

اس روز دوپہر کو مجھے سوی کے ساتھ چوری چھپے کھانا کھانے کا موقع مل گیا۔ گزشتہ روز کی طرح مجھے بھوکا نہیں رہنا پڑا۔ شام سے کچھ پہلے ہی میں نے دانستہ سعد کا زخمی قالب اہٹا لیا کیوں کہ کسی بھی وقت ڈاکٹر کو ساتھ لے کر منصور آسکتا تھا۔

اب میرے انسانی قالب کے سینے میں گہرا زخم تھا۔ مجھے تکلیف و اذیت تو برداشت کرنی ہی تھی۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو جائے۔ وعدے کے مطابق منصور آگیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا جس نے میرا معائنہ کیا۔

”پہلے سے بہت اچھی حالت ہے۔“ ڈاکٹر نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”رات کو پینے کے لئے سوپ دیا جاسکتا ہے۔ میں کچھ دوائیں بھی لکھ کر دے رہا ہوں، مگر خالی پیٹ یہ دوائیں نہ کھلائیں۔ کل صبح جب یہ ہلکا سا ناشتا کر لیں تو دوا دی جائے، اسی طرح دوپہر اور پھر رات کے وقت۔ انجکشن میں ابھی لگا دیتا ہوں۔“ اس کے بعد ڈاکٹر نے میرے بازو میں انجکشن لگایا اور منصور کو ایک پرچے پر دوائیں لکھ کر دے دیں۔

منصور نے وہ پرچہ سوی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”رشیدہ! تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔ فواد کو دے دیتا، وہ دوائیں منگوا دے گا۔“

ڈاکٹر کو لانے لے جانے کی ذمہ داری منصور ہی نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ بھی اسی لئے ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا۔

ایک ملازم کے ذریعے سوی نے دواؤں کا پرچہ فواد کو بھجوا دیا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ فواد خود دوائیں لے کر آگیا۔

”لگتا ہے کہ ڈاکٹر نے کھانے پینے کی اجازت دے دی ہے ورنہ دوائیں لکھ کر نہ دیتا۔“ فواد مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مبارک ہو۔“

”ابھی تو سوپ اور ہلکے پھلکے ناشتے وغیرہ پر گزارا کرنے کو کہا ہے، وہ بھی شاید دوائیں دینے کے لئے۔ کل سے دوائیں استعمال کرنی ہیں۔“

سوی کو فواد ان دواؤں کے بارے میں بتانے لگا۔ ”یہ گولی صبح اور رات کو دینی ہے۔ یہ گولیاں تین وقت کھلائیں۔ کیپول صرف رات کو سوتے وقت دینا ہے۔“ پھر وہ میری طرف پلٹا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”منصور نے شاید تمہارے بارے میں مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم خود بھی ڈاکٹر ہو۔“

”ہاں، ہوں تو سہی مگر ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کرتے۔“

”غالباً اس لئے کہ خود اپنا علاج کر کے وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔“ فواد یہ کہتے ہوئے

مسکرایا۔

اس کی بات سن کر میں بھی مسکرا دیا۔ وہ بہر حال ایک خوش مزاج آدمی تھا۔

ساتھ ساتھ ہم پر اس کے شے میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ بغداد سے یہاں تک پہنچنے کے لئے اس سے دوستی کار آمد رہی، مگر اب تو ہم خود ہی اپنے دشمنوں کی راہ پر لگ چکے ہیں۔ تو اپنے ذہن سے اب اندیشوں کو جھٹک دے اے سوی!“

”تو نے اگر اپنے جی میں یہ ٹھان ہی لی ہے تو پھر چل! جو ہو گا اللہ مالک ہے۔“ آخر کار سوی راضی ہو ہی گئی۔

قاہرہ سے ایک سو بیس میل دور ایک شہر کا نام اسماعیلیہ ہے۔ یہ شہر پورٹ سعید اور شہر سوئز کے درمیان واقع ہے۔ شہر سوئز چھوٹی سی ایک خوب صورت آبادی پر مشتمل ہے جہاں شہر سوئز ختم ہوتی ہے۔ وہاں سے کسی ہوٹل میں مسئل ہونے سے پہلے ہمیں ان سوالوں کے جواب سوچ لینے تھے جو ہم سے کئے جاتے۔ آدم زادوں کے درمیان رہنے کی خاطر پہلے سے بہت کچھ سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ خود کہ ہم اسماعیلیہ کے باشندے ظاہر کریں گے جو سید تفریح کی غرض سے قاہرہ آئے تھے۔ اس ضمن میں مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لئے مجھے شاہراہ اہرام کا رخ کرنا پڑا۔ مصر کے دوسرے شہروں سے قاہرہ آنے والے سیاح رات کے وقت عموماً ایسے موجود نائٹ کلبوں میں ہوتے تھے۔ ان نائٹ کلبوں کی تعداد دس بارہ کے قریب تھی۔ اور ج نائٹ کلب بھی یہیں تھا جہاں منقرع کے غلام طلال بے سے میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ قاہرہ کے سوا مصر کے دیگر شہروں کے بارے میں میری معلومات واجبی سی تھیں۔ خود کو کسی شہر کا ظاہر کرنے کی صورت میں اس کے متعلق مجھے ضروری معلومات ہونی چاہئے تھیں۔

شاہراہ اہرام پہنچ کر میں، شاہراہ نائٹ کلب میں داخل ہو گیا۔ مجھے جو پہلا سیاح ملا، اس کا تعلق مصر کے شہر اسکندریہ سے تھا۔ قاہرہ کے بعد اسکندریہ مصر کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ میں نے سوچا، ضروری تو نہیں کہ خود کو اسماعیلیہ ہی کا ظاہر کیا جائے۔ اسی غرض سے میں نے ایک آدم زاد کے ذہن کو پڑھ کر اسکندریہ کے بارے ہی میں ضروری معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسکندریہ کی آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے۔ یہ شہر قاہرہ سے دو سو بائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ایئر پورٹ بھی ہے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے اسکندریہ سے قاہرہ تک کا سفر صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ مصر کے مختلف علاقوں سے لوگ عموماً اسکندریہ میں گرمیاں گزارنے اور تفریح کی خاطر آتے تھے۔ اسکندریہ کی دو مشہور آبادیاں ساحل ال عجی اور قصر اس التین تھیں۔ قصر اس التین دراصل شاہ فاروق کا محل تھا۔ اسی کی مناسبت سے اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا تھا۔ شاہ فاروق کے محل میں ریلوے اسٹیشن بھی تھا اور بندر گاہ بھی۔ اس ساحلی شہر کے متعلق مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کی وجہ سے میری یہ خواہش ہوئی کہ اگر موقع ملا تو میں وہاں بھی گھومنے پھرنے ضرور جاؤں گا۔

نئے حالات کے مطابق میں اور سوی پہلے ہی ملے کر چکے تھے کہ اب خود کو مصری ہی ظاہر کرنا ہے۔

رات کو چکن سوپ تو میں نے پی ہی، مگر سوی کے ساتھ سب کباب بھی کھائے۔ جب گیارہ بج گئے اور کوٹھی میں چل پہل معدوم ہو گئی تو سوی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ٹیوب لائٹ بجھا کر اس نے ہلکا سیلا بلب بھی جلا دیا۔ اس سے یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ادھر کوئی آئے بھی تو یہی سمجھے ہم سو چکے ہیں۔ پھر وہ میرے ہی بستر پر آٹھنی اور پوچھا۔ ”اب یہ بتا کہ تو دوسر کو کیا بات کرنا چاہتا تھا؟“

”یہی کہ اب ہمیں نجوا کی آڑ میں چھپے رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔“ میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ وقت بہت مناسب ہے کہ ہم نجوا سے الگ ہو جائیں۔ تجھے تو خبر ہے کہ طلال بے ان دنوں اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہو کر بستر پر پڑا ہو گا۔ نجیب کے ہاتھ کی کلائی بھی میں نے توڑ دی تھی۔“

”مگر اے علیالیش، تو شاید یہ بھول رہا ہے کہ اس کے باوجود وہ دونوں پراسرار شیطانی قوتوں کے مالک ہیں۔“

”تو ہوا کریں۔“ میں بے پروائی سے بولا۔ ”ہمیں تو یہی سراغ لگانا ہے تاکہ وہ کیا شیطانی کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں! اس کے لئے ہمارے پاس جزیلہ کی شکل میں ایک مہربان حال موجود ہے۔ میرا ارادہ تو یہ ہے کہ ہم آج ہی رات یہاں سے فرار ہو جائیں۔“

”اور پھر؟“ سوی نے سوالیہ نظریں میری طرف اٹھائیں۔

”ہم نئے انسانی قالب اپنا کر کسی بھی ہوٹل میں رہ سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آخر آئندہ کے لئے تیرے ذہن میں ہے کیا؟ کچھ بتا تو سہی!“

”میں چاہتا ہوں کہ تو آئندہ ہفتے جزیلہ کے جسم پر قبضہ کر لے۔“

”تو شاید اس کے بعد مجھ سے ستارہ جانے کے لئے کہے گا۔“

”ٹھیک سمجھی تو اے سوی!“ میں نے تصدیق کی۔ ”میں بھی تیرے ہی ساتھ رہوں گا۔ وہاں پہنچ کر ممکن ہے، ہمارے وہ اندازے درست ثابت ہوں جو اب تک یقین کی حدود میں داخل نہیں ہوئے۔ اگر وہاں کسی قدیم اہرام سے منقرع کے غلام سونا نکال رہے ہیں تو پتا چل جائے گا۔“

”تجھے معلوم ہے کہ عموماً ایسی جگہوں پر ہمارے ہم جنس بھی ہوتے ہیں۔ اگر وہاں کسی قوی جن زاد سے مل بھیجھو ہو گئی تو؟“ سوی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ اس وقت تو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ نجوا سے علیحدگی اختیار کی جائے یا نہیں!“

”اے علیالیش! تیرے اس خیال سے تو میں بڑی حد تک متفق ہوں کہ آزاد فضا میں رہ کر ہم اب بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں۔“

”پھر مزید کیا سوچنا باقی رہ جاتا ہے! رہا تیرا یہ کہنا کہ اس طرح ہم دونوں شیطانی گردوہوں سے دشمنی مول لے لیں گے تو نجوا کی دوستی اب ہمارے لئے زیادہ سود مند نہیں رہی۔ وقت گزرنے کے

جلد ہی میں شاہراہ اہرام سے فواد کی کوٹھی میں واپس آ گیا۔ اب ہمیں یہاں سے عراق تو جانا

کہیں بھی چلے جائیں گے۔ تم نے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں سخت اذیتیں دیں کہ ہم کہیں غیر معمولی پراسرار قوتوں کے مالک تو نہیں، مگر اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے باوجود تمہیں یہ راز معلوم نہیں ہو سکا۔ ہم نے تم سے دوستی نبھانی چاہی لیکن تمہیں اس کا اہل نہیں پایا۔ اب میں خود ہی تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تمہارا شبہ درست تھا، مگر تم نے اسے ہمارا قصور کیوں سمجھا؟ جب بھی ہم نے تمہارے لئے کوئی غیر معمولی کام انجام دیا، اظہار احسان مندی کے بجائے ہر مرتبہ تم ناشکری ثابت ہوئیں۔ سو اسی کے نتیجے میں ہمیں تمہارا ہاتھ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس فیصلے کی تمام تر ذمہ داری خود تم پر ہے۔ کبھی جو تمہارا ساتھی تھا۔ سعد۔“

یہ عبارت لکھ کر میں نے سوی کو بھی پڑھوائی اور پوچھا۔ ”کیوں، ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں اے علیالیش، اس سے تیرا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔“ سوی نے اطمینان کا اظہار کیا۔

ہمارے پاس کیوں کہ مصری کرنسی زیادہ نہیں تھی اور ہم اسے ناجائز ذرائع سے بھی حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے مجھے ایک ہی حل نظر آیا۔ فی الحال کسی بڑے اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کرنے کے بجائے ہم نے تیسرے درجے کے ایک ہوٹل مونٹانا کا رخ کیا۔

ہوٹل مونٹانا شاہراہ شریف پر تھا۔ نو منزلہ ایک بلڈنگ کی ساتویں اور آٹھویں منزلوں پر یہ ہوٹل واقع تھا۔

نواد کی کوششی سے خاصی دور نکل آنے کے بعد ہی ہم نے نئے انسانی قالب اختیار کیے۔ یہ بھی دقت ہی کا علاقہ تھا اور یہاں غیر ملکی سفارت خانے تھے۔ انہی میں پاکستانی سفارت خانہ بھی شامل تھا۔ یہاں ہم اس لئے رکے تھے کہ ہمیں کئی خالی ٹیکسیاں نظر آگئی تھیں۔ شاہراہ شریف تک ہمیں اب ٹیکسی ہی میں سڑ کرنا تھا۔ نیم تاریک سی ایک گلی سے نکل کر ہم سڑک پر آگئے۔ شاہراہ شریف جدید قاہرہ میں تحریر اسکوائر سے بہ مشکل دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔

رات نے ابھی اپنا نصف سفر طے نہیں کیا تھا۔ ہم ایک خالی ٹیکسی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے شاہراہ شریف چلنے کے لئے کہا۔ وہ ہمیں لے جانے پر آمادہ تو ہو گیا، مگر کرایہ دو گنا مانگا جو میرے خیال میں زیادہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً میرے ساتھ سوی کی موجودگی ہی تھی۔

”ایک گنی دوں گا۔“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

”ذریعہ گنی دینی ہے تو بیٹھ جائے۔“ ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

مزید وقت ضائع کئے بغیر ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ہمارے دونوں سوٹ کیس ڈرائیور نے ڈیگی میں رکھ دیئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں ٹیکسی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

قاہرہ میں دو طرح کی ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ سرکاری ٹیکسیاں لیموزین کلماتی ہیں جو ایئر پورٹ سے شہر اور شہر سے ایئر پورٹ ہی کے لئے چلتی ہیں۔ ان کا کرایہ مقررہ ہے۔ شہر سے ایئر پورٹ اور ایئر پورٹ سے شہر کے کسی بھی حصے میں جانے کے لئے یہ چار گنی لیتی ہیں۔ عام ٹیکسیوں میں میٹر لگے ہوئے ہیں جن

تھا نہیں کہ اپنے پاس ان پاسپورٹوں کی سنبھال کر رکھتے جو منصور نے ہوا کر دیئے تھے۔ اگر اس کی ضرورت پیش بھی آتی تو پاسپورٹ لازمی نہیں تھے۔ یہ پاسپورٹ تو صرف اسی وقت کام آتے کہ ہم سعد اور رشیدہ کے انسانی قالبوں میں بغداد واپسی کا ارادہ کرتے۔ میں یہ بھولا نہیں تھا کہ سعود کے پاس عراقی دینار کی صورت میں میری خاصی بڑی رقم موجود ہے۔ مجھے اس سے وہ رقم بھی حاصل کرنی تھی جو یہ طور امانت اس کے پاس رکھوائی تھی۔ یہ رقم میں کسی بھی وقت حاصل کر لیتا۔ میری نظر میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ دراصل نئے انسانی قالب اپنانے کے بعد گزشتہ قالبوں کا کوئی ثبوت ہم اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے پہلا کام یہی کیا کہ ان دونوں پاسپورٹوں کو نذر آتش کر کے ان کی راکھ بھی پانی میں بہا دی۔

جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں، ان سے بھی میں نے سوی کو آگاہ کر دیا۔ نئے انسانی قالب اپنانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے نئے نام بھی رکھنے تھے۔

”کیا خیال ہے سوی، کیوں نہ ہم یہاں بھی وہی نام اپنائیں جو کراچی میں رکھے تھے؟ وہ دونوں نام بھی تو عربی زبان ہی کے ہیں۔“ میں نے سوی سے مشورہ طلب کیا۔

”تیری مراد مقصود اور صنوبر سے ہے؟“ سوی وہ نام بھولی نہیں تھی، بولی۔ ”ٹھیک ہے۔“

”اتنی شدید زخمی حالت میں میرا غائب ہو جانا یقیناً نجوا کے لئے تعجب خیز ہی ہو گا۔ اسے اپنی طرف سے مزید حیرت اور الجھن میں ڈالنے کی خاطر ہم اس کمرے کو اندر سے بند کر کے غائب ہوں گے۔ اس سے وہ عیار آدم زادی ذہنی اذیت کا شکار ہو گی۔ اس کو مزید الجھانے کی خاطر میں ایک خط بھی یہاں چھوڑ جاؤں گا۔“

”مگر اے علیالیش، اس سے حاصل کیا ہے؟“ سوی نے سوال کیا۔

”اے غلط راہ پر ڈالنا۔“ میں نے جواب دیا، پھر نجوا کے نام خط لکھنے لگا۔ جس کی عبارت مندرجہ ذیل تھی۔

”نجوا! میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک دن ہمیں کھو کر تمہیں پہچانتا پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی حفاظت کے لئے کچھ پراسرار قوتیں عطا کی ہیں جن کے سبب ہم تمہارے اور متفرق کے غلاموں کے شیطانی حربوں سے اب تک بچتے رہے۔ ہمارا اور تمہارا دشمن ایک ہی تھا اس لئے مجھے خیال تھا یا اب یہ کہہ لو غلط فہمی تھی کہ تم سے بچ جائے گی، مگر تمہیں ہماری قدر نہ ہوئی۔ تم نے ہم پر ہی شک کر کے ہمیں عذابوں میں گرفتار کر دیا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ نہ تم ہمیں مار سکتی ہو، نہ متفرق کے غلام ہماری زندگی کا چراغ گل کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں سے اب واپس اپنے وطن عراق جا رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فی الحال وہاں زیادہ محفوظ رہ سکتے ہیں کیونکہ اس وقت تم اور دوسرے تمام شیطان یہاں ہیں۔ اگر ہم نے آئندہ عراق میں اپنے لئے کوئی خطرہ محسوس کیا تو اللہ کی زمین بہت بڑی ہے، عراق سے

واپس لے لوں گا، دوسرا فائدہ یہ کہ نجوا کو یقین آجائے گا، ہم مصر سے عراق پہنچ چکے ہیں۔ پھر جب سعود سے نجوا کو یہ پتا چلے گا کہ ملاقات کے وقت میں قطعی صحت مند تھا تو وہ چکرا کر رہ جائے گی۔ اس کی الجھن میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔“

”پھر تو اسے علیالیش میں بھی تیرے ساتھ چلوں تو اور مناسب رہے گا۔ نجوا کو یقین آجائے گا کہ ہم دونوں ہی مصر سے جا چکے ہیں۔“

میں اس پر راضی ہو گیا۔ مصر آنے سے پہلے ایک رات ہم بغداد سے قاہرہ آئے تھے تاکہ قاہرہ کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ آج رات ہم قاہرہ سے بغداد واپس جا رہے تھے۔ ہم نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے لائٹ بجھا دی۔ اس ”افسانے“ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ہم نے اپنے سوٹ کیس بھی ساتھ لے لئے۔ ہمیں سعود سے مل کر کیا کہنا تھا، یہ بھی ہم نے سوچ لیا تھا۔ اس دت رات کے بارہ بجتے میں چند منٹ باقی تھے جب ہم قاہرہ سے بغداد کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم نے بہت تیز اور اونچی پرواز کی۔ سفر میں ہمیں چند لمحے لگے۔ سعود کا قیام اعظمیہ کے علاقے کی ایک کوٹھی میں تھا۔ اس کوٹھی میں ہم قیام کر چکے تھے۔

آدھی رات گزرنے کو تھی۔ اعظمیہ جیسے پُر رونق علاقے کی چل پھل بھی اب دم توڑ رہی تھی۔ پھر بھی ہم نے احتیاط سے کام لیا۔ سعد اور رشیدہ کے انسانی قالب ہم نے ایسی جگہ اپنائے جہاں دور تک کوئی نہیں تھا۔ پھر ہم جلد ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ گئے۔

کوٹھی کے ایک حصے میں ہم نے روشنی دیکھی۔ اس وقت تک جاگنے والی سعود کی بیوی آسیہ ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے اطلاعی تھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ذرا ہی دیر میں ایک ملازم نے آکر کوٹھی کا گیٹ کھول دیا۔ اس کوٹھی کے تمام ہی ملازمین ہمیں جانتے تھے۔ ہمارے لئے گیٹ کھولنے والا ملازم بھی ہمیں پہچان گیا۔ وہ ہم دونوں فوراً نشست گاہ میں لیا گیا۔ اسی ملازم سے ہم نے سعود کے بارے میں پوچھا۔

”صاحب تو موجود نہیں ہیں، میں بیگم صاحبہ کو آپ کی آمد سے مطلع کر دیتا ہوں۔“ ملازم نے بتایا۔ ”وہ جاگ رہی ہیں۔“ ملازم یہ کہہ کر چلا گیا۔

”یہ سعود اس وقت کہاں چلا گیا؟“ میں بڑبڑایا۔ ”یہ تو مسئلہ ہو جائے گا کیوں کہ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔“

میری بڑبڑاہٹ سوی نے بھی سن لی اور کہنے لگی۔ ”اس کی بیوی آسیہ کو معلوم ہو گا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کب آئے گا!“

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ آسیہ آئی تو اس نے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر سوی کا خیال درست ہی ثابت ہوا۔ آسیہ نے بتایا کہ سعود کسی ضروری کام سے بغداد کے ایک نواحی علاقے یوسفیہ تک گیا ہے۔ پھر آسیہ نے مزید بتایا۔ ”سعود کو اب تک آجانا چاہئے تھا، مگر کوئی بات نہیں۔ میں آپ لوگوں کے قیام.....“

”ہمیں رکنا نہیں ہے خاتون!“ میں بول اٹھا۔ ”سعود کی آمد کے بعد ہی ہم یہاں سے روانہ ہو

گا کرایہ بارہ پیاسٹرنی میل ہے، مگر ڈرائیور عموماً میٹر سے چلنے کے بجائے مختلف علاقوں کے لئے کرایہ طے کرتے ہیں۔“

نقل و حمل کے لئے قاہرہ میں ٹیکسیوں کے علاوہ ٹرامیں، بسیں، پک اپ اور وگنیں بھی ہیں۔ ٹرامیں بھی دو طرح کی ہیں۔ ایک الیکٹرک ٹرام ہے جو میٹرو کھلاتی ہے۔ اس کا ڈپو پولیس میں ہے اور یہ ریم سیم تک جاتی ہے۔ اس میں چھ ڈبے ہوتے ہیں، چار اول درجے کے اور دو درجہ دوم کے۔ اس کا کرایہ دو پیاسٹر سے پانچ پیاسٹر تک ہوتا ہے۔ میٹرو کے علاوہ جو ٹرام ہی کے نام سے پکاری جاتی ہے، اس میں صرف دو چھوٹے ڈبے ہوتے ہیں۔ ایک ڈبا درجہ اول کا، دوسرا درجہ دوم کا۔ اس کا ڈپو ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے العباسیہ میں ہے۔ یہ دونوں ٹرامیں جدید قاہرہ تک محدود ہیں۔ جیزا یا پرانے قاہرہ میں نہیں چلتیں۔ بسیں عمدہ اور اچھی ہیں۔ گزٹری بسیں بھی ہیں جو ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ ان کا کرایہ عام بسوں سے زیادہ ہے۔ پک اپ اور وگنوں کا کرایہ بسوں سے زیادہ ہوتا ہے جو مختلف علاقوں سے چلتی ہیں۔ جیزا اور پرانے قاہرہ میں عام لوگوں کی آمدورفت کا بڑا ذریعہ بسیں، پک اپ اور وگنیں ہی ہیں۔

مشرق کی طرف رخ کی صورت میں دریائے نیل کی دائیں جانب کا علاقہ جیزا کہلاتا ہے۔ جہاں سے ہماری ٹیکسی گزر رہی تھی۔ نیل کی بائیں جانب جدید قاہرہ اور پرانا قاہرہ ہے۔ ہمیں جدید قاہرہ پہنچنا تھا۔ شاہراہ شریف وہیں واقع تھی۔

کچھ دیر بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ میں نے مطلوبہ نو منزلہ بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی رکوالی اور کرایہ ادا کر کے اتر گیا۔ سوی اور میں نے ایک ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا اور ہم بلڈنگ کے صدارت دروازے کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔

ہوٹل تک پہنچنے کے لئے لفٹ موجود تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر پہنچے۔ وہیں ہوٹل کا استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ کمرے کا کرایہ پانچ گنیومیہ تھا۔ ضروری اندراجات کے بعد آنکھیں منزل پر ہمیر ایک کمرہ لے گیا جسے گزارے کے لائق ہی کہا جاسکتا تھا۔ وہاں بجلی کا پتھکا بھی لگا ہوا نہیں تھا، مگر موسم بہار تھا کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یوں بھی قاہرہ میں گرمی کم ہی پڑتی ہے۔ بارش بھی کبھی کبھار چھینے کی حد تک ہوتی ہے۔ گرمی نہ ہونے کے سبب اوسط درجے کے ہوٹلوں میں بچکے نہیں لگائے جاتے عموماً موسم معتدل ہی رہتا ہے۔ سردی البتہ یہاں خوب پڑتی ہے۔ اکتوبر سے مارچ تک تقریباً چھ ماہ سردی کے ہوتے ہیں۔

نئے انسانی قالب اپنا کھاری شخصیتیں بالکل بدل گئی تھیں۔

کچھ سوچ کر میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”فواد کی کوٹھی سے ہمارے فرار کا راز صبح ہونے سے پہلے نہیں کھلے گا۔ ممکن ہے یہ راز کھلنے کے بعد کل نجوا، بغداد میں موجود سعود اٹھ اپنے دوسرے آدمیوں اس سے آگاہ کر دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسی وقت بغداد کا ایک چکر کیوں نہ لگائوں!“

”وہ کس لئے؟“ سوی نے پوچھا۔

”اس سے دہرا فائدہ ہو گا۔ ایک تو یہ کہ سعود کے پاس جو میں خاصی بڑی رقم چھوڑ آیا ہوں

جائیں گے۔

”کہاں؟“ آسیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم یہاں سے سلیمانہ جائیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم وہیں کے رہنے والے ہیں۔“ میں

نے کہہ دیا۔

”پھر تو آپ کو بڑا طویل سفر درپیش ہے۔“ آسیہ بولی اور پھر ایک ملازم سے چائے لانے کو کہا۔

ابھی ہم نے چائے کا پیلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

آنے والا سود ہی تھا۔ توقع کے مطابق وہ ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

”تم لوگ اچانک کب اور کیسے آگئے؟ منصور نے تو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی ورنہ میں

تمہیں ایئر پورٹ لینے آجاتا۔“ سود خوش اخلاقی سے کہنے لگا۔

”تم تو خود یوسفیہ گئے ہوئے تھے، ہمیں ایئر پورٹ لینے کیسے پہنچ جاتے!“ میں بولا۔

”اگر پہلے سے مجھے علم ہوتا کہ آج کی کسی فلائٹ سے تم لوگ آرہے ہو تو میں یوسفیہ کسی اور دروازے

چلا جاتا۔“

”کھانا لگواؤں تمہارے لئے؟“ آسیہ نے اپنے شوہر سے دریافت کیا۔

”نہیں۔ کھانا کھایا تھا میں نے وہیں۔“ سود نے جواب دیا، پھر کہا۔ ”تم آرام سے جا کر سو جاؤ۔“

میں سمجھ گیا کہ سود اپنی بیوی کی موجودگی میں ہم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ آسیہ اٹھ کر چلا

گئی۔

”نچو اور منصور کیسے ہیں؟ انہوں نے تمہیں کیسے بغداد بھیج دیا؟“ سود نے دریافت کیا۔

”ہمیں یہاں بغداد میں رکنا نہیں ہے، فوراً ہی اپنے شہر سلیمانہ جانا ہے۔ وہاں قاہرہ میں ہمار

زندگی کو خطرہ تھا۔ ہم دشمنوں کی نظر میں آگئے تھے۔ نچو نے بغداد میں بھی ہمیں رکنے سے منع کیا ہے

ہم اسی لئے آج رات ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تم سے ملنا ضروری نہ ہوتا تو ہم سیدھے ریلوے

اسٹیشن جاتے۔“

”سمجھ گیا میں۔“ سود مسکرایا۔ ”تمہاری امانت میرے پاس محفوظ ہے۔ تم چائے پیو میں ابھی۔“

کر آیا۔

سود کے جاتے ہی میں دھیرے سے بولا۔ ”کام بن گیا۔“

”کہیں وہ ہمیں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کی پیش کش نہ کر دے! اس طرح خواہ مخواہ دنا

ضائع ہو گا۔“ سوئی نے خدشے کا اظہار کیا۔

”میں کوشش تو یہی کروں گا کہ وہ ہمارے ساتھ نہ چلے، پھر بھی نہ مانا تو مجبوری ہے۔“

جلد ہی سود لوٹ آیا اور ایک بڑا سا پیکٹ میرے حوالے کر دیا جس میں عراقی دینار تھے۔

”تم رقم گن لو تو اچھا ہے۔“ سود نے کہا۔

”مجھے تم پر اعتماد ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا سوٹ کیس کھولا اور پیکٹ اس میں رکھ دیا۔

”اب تم سے کب ملاقات ہوگی؟“ سود نے سوال کیا۔

”دیکھو کب تقدیر ملاتی ہے۔“ میں نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”تم آؤ نا کبھی سلیمانہ! بڑا پر فضا علاقہ

ہے۔ آسیہ کو بھی اپنے ساتھ ضرور لانا!“

”بغداد سے کہاں نکلتا ہوتا ہے! پھر بھی کبھی موقع ملا تو آؤں گا۔“ سود نے یہ بات محض اخلاقیاتی

کسی تھی ورنہ پتا ضرور پوچھتا۔

میں اور سوئی چائے پی چکے تھے۔ سود سے رقم بھی وصول ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم لوگوں کو اسٹیشن تک چھوڑ دوں میں؟“

”نہیں۔“ میں نے منع کر دیا۔ ”تم پہلے ہی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ ہم ٹیکسی کر کے چلے جائیں

گے۔“

”تو پھر میں کسی ملازم کو بھیج کر تمہارے لئے ٹیکسی منگوا دیتا ہوں، بیٹھو!“

مجبوراً ہمیں مزید اس وقت تک رکنا پڑا جب تک سود کا ایک ملازم ٹیکسی نہ لے آیا۔ سود ہمیں

باہر تک چھوڑنے آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے سوٹ کیس ڈیگی میں رکھنے کو کہا، مگر بہ وجہ میں نے انکار

کر دیا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی تو سود نے رخصتی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اب میں پوری طرح مطمئن تھا کہ سود سے ہماری بغداد آمد کی تصدیق ہونے کے بعد نچو کو گمان

بھی نہ ہو گا، ہم قاہرہ ہی میں ہیں۔ آج رات بغداد آکر میں نے دہری چال چلی تھی۔ اس کے علاوہ نچو

یہ جان کہ مزید الجھن کا شکار ہو جاتی کہ سود سے ملنے وقت میں قطعی صحت مند تھا۔

ٹیکسی جیسے ہی کچھ آگے بڑھی، میں نے مصلحت کے تحت ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ”اندر کی لائٹ

بجھا دو!“

”بہتر ہے جناب!“ یہ کہتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے میرے کہنے پر عمل کیا۔

اس ڈرائیور کو جانے کب یہ پتا چلا ہو گا کہ ٹیکسی خالی ہے اور دونوں مسافر پراسرار طور پر غائب ہو

چکے ہیں! ہم تو ٹیکسی میں اندھیرا ہوتے ہی وہاں سے قاہرہ کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ واپسی بھی چند

لحوظ میں ہو گئی۔ ہم قاہرہ میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ ہم نے دوبارہ اپنے نئے انسانی قالب اپنا لیے۔

”اے سوئی! کل صبح فواد کی کوٹھی چلنا ہے۔“ میں بستر پر دروازہ ہو کر بولا۔

”وہ کس لئے؟“ سوئی نے حیرت سے پوچھا۔

”اس عیار آدم زادی نچو کی وحشت کا تماشا دیکھنے۔“

”میں ضرور چلوں گی تیرے ساتھ۔“

پھر دوسرے دن صبح ہم جلد ہی اٹھ گئے اور ناشتا کر کے انسانی قابلوں سے نکل آئے۔ صبح کے نو بج

رہے تھے کہ جب ہم فواد کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اب تک اس کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں

جہاں گزشتہ رات تک ہمارا قیام تھا۔ عموماً اس وقت تک ہم سو کر اٹھ جاتے تھے۔ شاید یہی سوچ کر فواد

نے ہمارے کمرے کا رخ کیا تھا۔ بار بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو فواد فکر مند نظر آنے

لگا۔ اس نے کوٹھی کے اس حصے میں موجود دونوں ملازموں کو آواز دے کر بلا لیا۔ ملازم بھی اس پر حیران نظر آنے لگے کہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا۔

”تم ادھر چھ کر اس کھڑکی کا ادھر والا شیش توڑ دو!“ فواد نے ایک ملازم کو مجبوراً حکم دیا۔ ملازم نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی تو اسے دوسرا حکم ملا۔ یہ حکم اندر ہاتھ ڈال کر چٹنی کھولنے اور کھڑکی کے ذریعے اندر کودنے کے متعلق تھا۔

”اندر جا کر دروازہ کھول دینا!“ فواد نے ملازم کو تاکید کی۔

ذرا سی دیر میں کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ فواد تیزی سے اندر داخل ہوا اور پھر کمرے کو خالی دیکھ کر اس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا ہوا ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا۔ پھر اس نے کمرے میں روشنی کر دی۔ اسی وقت فواد کی نظر میری مسمری پر پڑے ہوئے کانڈ پر پڑی۔ یہ وہی خط تھا جو میں نے نجوا کے نام لکھا تھا۔ اس نے لپک کر وہ خط اٹھا لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ خط کی عبارت پڑھنے کے ساتھ ساتھ فواد کا چہرہ متحیر ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں ملازم بھی کمرے ہی میں تھے۔ خط پڑھتے ہی فواد نے انہیں کمرے سے نکال دیا اور تیزی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

چند ہی لمحوں میں فواد نے جلدی جلدی کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ریسپور نہیں اٹھایا گیا اسی لئے فواد کو انتظار کرنا پڑا۔ اس کے چہرے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔ معاً وہ بول اٹھا۔ ”ہیلو مسزور!“..... ہاں میں فواد بول رہا ہوں۔ نجوا کہاں ہے؟..... اس کے لئے ایک بری خبر ہے۔ سعد اور رشیدہ بند کمرے سے پراسرار طور پر غائب ہو چکے ہیں۔ ہاں ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ نجوا کے لئے سعد ایک پیغام بھی چھوڑ کر گیا ہے۔ تم خود بھی آ رہے ہو، آ جاؤ! میں بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ تمہارا کتنا درست ہے، نجوا ہی یہ معصومہ حل کر سکتی ہے..... نہیں، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں، کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، تم مطمئن رہو!“ فواد نے یہ کہہ کر ریسپور رکھ دیا۔

ابھی نجوا کے وہاں پہنچنے میں دیر تھی۔ میں نے اسی لئے سوی کو اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ ”آ اے سوی! اس عیار آدم زادی کو چل کر ستاتے ہیں۔“ میں بولا۔

”کہیں تجھے یہ کھیل مزگ نہ پڑے اے علیا لیش! تجھے معلوم ہے کہ وہ آدم زادی کتنی خطرناک ہے!“

”ہاں خبر ہے، مگر ہم جن زادوں سے زیادہ نہیں۔ کیا تو بھول گئی کہ اس نے بھی ہمیں کتنا ستایا تھا!“

”باد ہے مجھے! اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ توبہ لہ اتارنا چاہتا ہے۔“

”تو پھر ڈرتی کیوں ہے؟ چل میرے ساتھ!“

اس وقت میں نے دانستہ اپنے تصور کی قوت کو نہیں آزمایا۔ اس کے بجائے میں اپنی ایک اور جنائی صفت کو بروئے کار لایا۔ جلد ہی مجھے نجوا کا سراغ مل گیا۔ میں سوی کو ساتھ لیے اس علاقے میں پہنچ گیا۔ وہ جدید قاہرہ کا ایک عمدہ علاقہ رم سیس اسکوائر تھا۔ یہیں رم سیس چوک ہے۔ اسی چوک میں رم سیس کا

اتنی ٹن وزنی مجسمہ نصب ہے۔ یہ مجسمہ مصری کے کسی دور دراز علاقے سے لا کر یہاں نصب کیا گیا ہے۔ اس مجسمے کے قدموں سے فوارہ نکلتا ہے۔ اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ یا تو یہ مجسمہ فرعون موسیٰ کے باپ کا ہے یا پھر بیٹے کا۔ اس چوک میں چاروں جانب بلند عمارتیں ہیں اور نیچے بڑی بڑی دکانیں۔ انہی عمارتوں میں ایک عمارت وہ تھی جہاں ہم داخل ہوئے۔ اس عمارت کا ایک بڑا حصہ نجوا کے تصرف میں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس عمارت کی پیشانی پر قصر اللطال لکھا ہوا تھا۔ دوسری بار حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب ایک بڑے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک دیوار پر طلال بے کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ نجوا اسی کمرے میں لی جو بہترین سامان آرائش سے مزین تھا۔ وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

”کیا کہہ رہے ہو تم! یہ کس طرح ممکن ہے؟..... کیا؟ میرے نام خط چھوڑ کر گیا ہے؟.....“ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔..... تم بھی فوراً وہاں پہنچو!..... ہاں میں آ رہی ہوں۔“ نجوا نے یہ کہہ کر ریسپور رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”یہ ناممکن ہے..... بالکل ناممکن! وہ خود فرار نہیں ہو سکتے۔ یقیناً انہیں کسی نے فرار کرایا ہے، مگر.....“

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے! میں تو وہاں نجوا کو ستانے آیا ہی تھا اس لئے دھیرے دھیرے غرانا شروع کر دیا۔ توقع کے مطابق وہ ایک دم اچھل پڑی۔ اسی وقت میں غیر انسانی آواز میں بول اٹھا۔ ”زاعون کی روح تجھے بتا سکتی ہے اے بے وقوف عورت کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں!“

”زا..... زاعون!“ نجوا بوکھلا گئی اور بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ ”کہاں ہیں وہ؟“

”عراق میں۔ وہ یہاں سے کل ہی رات عراق پہنچ چکے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن..... لیکن وہ..... وہ سعد تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔“

اس پر میں نے زور دار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”بڑی ہی بے خبر ہے تو! زاعون کی روح چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا! میں نے انہیں تیرے ظلم سے نجات دلادی۔“

”تو..... تو نے انہیں فرار..... کرایا ہے؟“ نجوا ابھی تک بدحواس نظر آ رہی تھی۔

”نہیں۔ وہ تیرے ظلم سے تنگ آ کر خود ہی فرار ہوئے ہیں۔ میں نے تو صرف انہیں اس قابل بنایا تھا۔“

معاً میں نے اس عیار آدم زادی کو چونکتے اور پھر کچھ پڑھتے دیکھا۔ وہ اپنی شیطانیت پر اتر آئی تھی۔ فرار ہونے کے بجائے اسے میں نے سزا دینے کی خاطر اچانک اس کے ذہن کو گرفت میں لے کر جھنجھوڑ دیا۔ وہ چیخ اٹھی اور اس کا عمل ادھورا رہ گیا۔ عین اسی لمحے میرے وجود کو شدید جھکا لگا جیسے بجلی کا ننگا تار چھو لیا ہو۔ میں دور جا کر گرا۔ اسی وقت سوی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر تھمٹ لی۔ گرتے گرتے وہ پھر چیخی، مگر چند ساعتوں کے بعد ہی اس نے دوبارہ عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ اب مزید وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وقتی طور پر شدید جھکا گئے سے مجھے جو اذیت ہوئی تھی، اب ختم ہو چکی تھی۔ سوی کو

اشارہ کرتے ہی میں تیزی کے ساتھ اس عمارت سے نکل گیا، لیکن سوی کو دیر ہو گئی۔ اونچی پرواز کرتے ہوئے میں نے اس کی طرف شعلے لپکتے دیکھے۔

سوی شعلوں کے اس جال سے نکل تو آئی مگر تکلیف و اذیت کے سبب چیخ اٹھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”میں..... میں جل..... جل رہی ہوں اے..... علیا لیش!“ سوی نے بہ مشکل مجھے بتایا۔

ایسے ہی سخت روح فرسا عذاب سے ایک مرتبہ خود میں بھی بغداد میں گزر چکا تھا۔ مجھے اس عذاب میں مبتلا کرنے والا طلال بے تھا۔ بلاتا خیر میں نے ایک عمل پڑھ کر سوی پر دم کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی حالت معمول پر آگئی تو میں نے کہا۔ ”تو مجھے تو چونکا رہنے کی بڑی نصیحتیں کرتی رہتی تھی، آج خود چوٹ کھا گئی۔“

”ہاں غلطی میری ہی تھی اے علیا لیش! دراصل تجھے گرتے دیکھ کر مجھے غصہ آگیا تھا ورنہ میں اس پر حملہ نہ کرتی۔“ سوی نے اعتراف کیا۔ ”اس نے جیسے ہی شیطانی عمل پڑھنا شروع کیا تھا، ہمیں فوراً وہاں سے نکل آنا چاہئے تھا، لیکن تجھے کیا ہوا تھا؟ تو کیوں دور جاگرا تھا؟“

”تو نے اسے چیخنے تو سنا تھا! جب اس نے عمل پڑھنا شروع کیا، میں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کے منہ سے اسی لئے چیخ نکل گئی۔ اے سزا دینے کے ساتھ ساتھ اس سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اپنا شیطانی عمل پورا نہ کر سکے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اس حرکت کے نتیجے میں میرے وجود کو شدید جھکا لگے گا۔“ میں نے بتایا۔

پھر مجھے اس عمارت کا نام یاد آیا اور میں نے سوی سے اس کے بارے میں پوچھا۔ ہم دونوں اب دریائے نیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔

”نہیں“ میں اس عمارت کا نام نہیں پڑھ سکی۔ کیوں، کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس عمارت کا نام قصر الطلال ہے۔“

”واقعی اے علیا لیش، یہ تو بڑی تعجب کی بات ہے۔ میں نے نجوا کے کمرے میں بھی ایک دیوار پر طلال بے کی تصویر لگی دیکھی تھی۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”یہ کہ وہ عمارت طلال بے کی ملکیت ہے یا پہلے کبھی تھی۔“ میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”دوسری اہم بات یہ کہ یقیناً ماضی میں اس خطرناک سفرے طلال بے سے نجوا کا کوئی گہرا تعلق رہ چکا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو نجوا کے کمرے میں اس کے دشمن کی تصویر نہ لگی ہوتی۔“

”مگر نجوا کے لئے یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس تصویر کو وہاں سے ہٹا دیتی!“ سوی بولی۔

”وہاں سے تصویر نہ ہٹانے کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔“

”پہلے خود نجوا بھی تو مقرر کے غلاموں ہی میں سے تھی۔ ممکن ہے اس زمانے میں طلال بے سے وہ بہت قریب رہ چکی ہو۔“ سوی نے خیال آرائی کی۔

”لیکن اب تو ایسا نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔“

”یہ بھی تو ٹھیک ہی کہتا ہے اے علیا لیش، ہمیں اس کا بھی سراغ لگانا پڑے گا۔ اس عمارت میں اور بھی آدم زاد رہتے ہوں گے، ان سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”ہاں یہ ممکن ہے۔“ میں نے سوی کی تجویز سے اتفاق کیا، پھر کہا۔ ”آجہل دیکھتے ہیں کہ نجوا بھی روانہ ہوئی یا نہیں!“

”اس مرتبہ ہم نجوا سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔“

”ایک ہی دفعہ چوٹ کھا کر تو اس سے اتنی ڈر گئی اے سوی!“ میں ہنس دیا۔

”یہ تو تجھے بھی خبر ہے کہ وہ کتنی خطرناک ہے! میں ڈر نہیں رہی بلکہ احتیاطاً تجھ سے ایسا کہہ رہی ہوں۔“

پھر جلد ہی ہم نے دوبارہ نجوا کو تلاش کر لیا۔ وہ لمبی سی ایک کار میں بیٹھی ہوئی دریائے نیل کے ایک پل سے گزر کر جزیرہ کی حد میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار تھے۔ سوی کی تاکید کے باوجود میں نجوا کو ستانے سے باز نہ آیا۔ میں اس کی کار کے سامنے آگیا اور اسے روک لیا۔ آگے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی تھیں۔ ایک دیگن نے پیچھے سے کار کو ٹکرا دیا۔ نجوا کے جسم کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا سر وینڈا سکرین سے ٹکرا گیا۔ میں اسی لمحے سامنے سے ہٹ گیا۔ نجوا کی کار تیزی سے آگے بڑھی، مگر جھٹکا کٹنے سے اسٹرنگ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ پھر سر ٹکرانے سے بھی وہ غالباً وقتی طور پر بدحواس ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کار بے قابو ہو کر فٹ پاتھ کے قریب بائیں جانب ایک کھجے سے ٹکرا گئی۔

میں دور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں کار کے گرد لوگوں کا جھوم ہو گیا۔ نجوا کو میں نے تیزی کے ساتھ کار کے اترتے اور پھر جھوم سے نکلے دیکھا۔ کار کو وہیں چھوڑ کر اس نے ایک خالی ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اس کی کار اب سفر کے قابل رہی بھی نہیں تھی۔ آگے اور پیچھے سے اس کا علیہ بگڑ گیا تھا۔ سوی نے بھی یہ سارا منظر دیکھا، مگر مجھے روک نہیں سکی۔ میں نے اسے کچھ بتائے بغیر اچانک وہ حرکت کر ڈالی تھی۔ وہ چند ہی لمحوں کا تو کھیل تھا۔

”تو آخر نہیں مانا اے علیا لیش!“ سوی نے میرے ساتھ پرواز کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”میں نے نجوا کو تو نہیں چھیڑا، نہ اس کے قریب گیا۔“ میں نے گویا صفائی پیش کی۔

”تو نے اس کی کار تو روکی تھی! مجھے کیوں جھٹلا رہا ہے!“

”ہاں بس چند لمحوں کے لئے اس کی کار کو ضرور روک لیا تھا۔ باقی سب کچھ خود بہ خود ہو گیا۔“

”بھولا نہ بن اے علیا لیش! تجھے خبر تھی کہ اس طرح پیچھے آنے والی دیگن، نجوا کی کار سے ٹکرا جائے گی۔ پھر جب تو کار کے سامنے سے بڑے گا تو.....“

”خاک ڈال اس واقعے پر!“ میں نے سوی کی بات کاٹ دی۔ ”یہ سوچ کہ اس خبیث عورت نے بھی تو ہمیں کس قدر ستایا تھا!“

”ہاں اس کے مقابلے میں تو تیری یہ حرکت معمولی سی شرارت کے مترادف ہے۔“
 ”ابھی تو اس سے مزید حساب چکانے ہیں۔ بس تو دیکھتی جا!“
 ”میں حساب چکانے سے تجھے منع نہیں کرتی اے علیائش! مجھے بس یہ فکر ہے کہ تجھے کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

نجوا کی عینسی اب دتی کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہم خاموشی سے اس کا تعاقب کرتے رہے۔ ذرا ہی دیر میں عینسی فواد کی کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ کرایہ ادا کر کے نجوا عینسی سے اترنے والی تھی کہ ڈرائیور نے تیزی کے ساتھ پلٹ کر نجوا کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا۔ ڈرائیور میرے اثر میں تھا۔ غصے کی زیادتی کے سبب نجوا جیسے پاگل ہو گئی۔ ایک معمولی عینسی ڈرائیور کے ہاتھوں یہ ذلت یقیناً اس کے لئے ناقابل برداشت ہی تھی۔ جواباً اس نے بھی ڈرائیور پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ ڈرائیور نے اچانک کھلے ہوئے پچھلے دروازے سے نجوا کو نیچے دھکا دیا۔ دروازہ میں نے ہی کھولا تھا۔ نجوا زمین پر گر گئی اور میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ اسی اثناء میں عینسی وہاں سے ہوا ہو گئی۔ عینسی ڈرائیور کو میں نے ہی وہاں سے بھگا دیا تھا ورنہ شاید نجوا اس بے گناہ شخص کو زندہ نہ چھوڑتی جسے خود بھی علم نہیں تھا کہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا! بہر حال نجوا کو میں نے اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ عینسی ڈرائیور کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتی۔ اس کے ساتھ میں بھی اس کے قریب نہیں رکا۔ مجھے یقین تھا کہ نجوا اب تک سمجھ چکی ہوگی اس غیر معمولی واقعے میں کسی پراسرار قوت کا ہاتھ ہے۔ زمین سے اٹھتے ہوئے اسے میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ سوتی کے ساتھ میں فضا میں اس وقت تک خاصا بلند ہو چکا تھا۔

”میں نے نجوا کو کچھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے دیکھا ہے۔“ سوتی نے مجھے بتایا۔
 ”اس مرتبہ شاید نجوا نے ہم پر حملہ کرنے کے بجائے اپنی حفاظت کے لئے کوئی عمل پڑھا ہے۔“
 میں نے خیال آرائی کی۔ ”اب ذرا زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔“
 ”صرف محتاط ہی نہیں اے علیائش! اب میں تجھے اس کے قریب نہیں جانے دوں گی۔“
 ”دور سے تو تماشا دیکھنے دے گی نا!“ میں ہنس کر بولا۔

پھر ہم دونوں نجوی پرداز کرتے ہوئے فواد کی کوٹھی کے عقبی حصے میں اتر گئے۔ بس دوران میں نجوا وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ اس کمرے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی جہاں گزشتہ رات تک ہمارا قیام تھا۔ کمرے میں مجھے فواد کے ساتھ منصور بھی نظر آیا۔ وہ نجوا سے پہلے وہاں آچکا تھا۔

”فواد! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ نجوا کمرے میں داخل ہوتے ہی فواد پر برس پڑی۔ اس کا انداز کسی ایسی کھسیانی بلی کی طرح تھا جو کھبا نوچنے لگتی ہے۔ چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ اس سے پہلے کہ فواد کچھ کہتا، نجوا دوبارہ چیخ اٹھی۔ ”تم نے ان کمینوں کو یہاں سے کیسے فرار ہونے دیا؟“

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں نجوا! وہ دونوں تو بند کمرے میں سے غائب.....“
 ”خاموش رہو!“ نجوا نے تیز آواز میں فواد کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے وہ خط دکھاؤ جو اس نے میرے

نام لکھا ہے۔“
 فواد نے مزید کچھ کہے بغیر میرا لکھا ہوا خط نجوا کی طرف بڑھا دیا۔ نجوا ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ منصور نے اس سے کہا۔ ”تم بیٹھ تو جاؤ نجوا!“
 ”منصور! یہ قیمتی مشورے اپنے پاس ہی رکھو!“ نجوا نے اسے ڈانٹ دیا۔
 ”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنی غصے میں کیوں ہو؟ رشیدہ اور سعد اگر فرار ہو گئے تو کیا ہوا؟ ہم تو تمہارے.....“

”مجھے خط پڑھنے دو منصور!“ نجوا بول اٹھی۔ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے، تم خط پڑھ لو، پھر بات کریں گے۔“ منصور بولا۔

نجوا نے میرا خط پڑھ کر منصور کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا تم نے کہ نجوا کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ پڑھو اس خط کو! اس نے خود پراسرار قوتوں کا اعتراف کیا ہے اس خط میں! تم کہتے تھے، مجھے خواہ مخواہ ہم ہو گیا ہے۔ اب کو، وہم مجھے تھا یا تمہیں؟“
 ”میں خط پڑھ چکا ہوں۔“ منصور کی آواز میں نری تھی۔ ”تم ٹھیک ہی کہتی تھیں، مگر وہ بند کمرے سے غائب کیسے ہو گئے؟“

”زاعون..... ان دونوں کو زاعون کی روح نے یہاں سے فرار کرایا ہے۔“ نجوا کی آواز میں اب پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔ ”یقیناً یہ جاننے کے بعد تمہیں اب کسی بات پر حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ایک روح کے لئے سب کچھ ممکن ہے۔“
 ”لیکن ان دونوں سے زاعون کی روح کا کیا تعلق؟“ منصور نے اظہار حیرت کیا۔ ”اس خط سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود فرار ہوئے ہیں۔“

”تو کیا وہ خط میں یہ بھی لکھ دیتا کہ فرار میں ایک روح نے اس کی مدد کی ہے!“ نجوا ناگواری سے بولی۔ ”تمہاری عقل میں یہ بات آتی ہے کہ وہ خود ایک بند کمرے کے اندر سے غائب ہو سکتے تھے؟ فواد نے تمہیں یہی تو بتایا تھا نا!..... ہاں ابھی میں نے فواد سے اس کی تفصیل پوچھی ہی نہیں۔ آخر ہوا کیا تھا فواد؟“ نجوا نے فواد کی طرف سوالہ نظریں اٹھائیں۔ ”تمہیں اس واقعے کا علم کب اور کیسے ہوا؟“

جواب میں فواد نے پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا، پھر کہنے لگا۔ ”حیرت تو اس پر ہے کہ سعد چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔“

”تم لوگ پھر احقناہ باتیں کر رہے ہو۔ جب میں بتا چکی ہوں کہ اس معاملے میں زاعون کی روح ملوث ہے تو پھر کسی بات پر حیرت کیسی!“

”تمہیں اس بات کا یقین کیسے ہے؟“ منصور نے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا تم نے اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے یہ معلوم.....“

”نہیں۔“ نجوا بولی اٹھی۔ ”جب مجھے تمہارا فون ملا اور میں یہاں آنے والی تھی تو خود زاعون

کی روح میرے پاس آئی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ان دونوں کو مجھ سے نجات دلا دی ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق وہ عراق پہنچ چکے ہیں۔“

”اتنی جلدی وہ عراق بھی پہنچ گئے! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ انہوں نے پہلے ہی اپنی نشستیں محفوظ کرالی ہوں گی۔“ فواد نے کہا۔

”ظاہری بات ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ وہ عراق کب اور کیسے پہنچے، ہمیں سوچنا تو کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا منصوبہ؟“ فواد نے بے اختیار سوال کیا۔

”یہ کہ فرعون مقرر کے ایک امیر کی روح نے ان دونوں کا ساتھ کیوں دیا؟ منصور بولا۔

”تمہارا ذہن صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے منصور!“ نجوا کا غصہ اب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر منصور کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، پھر کہنے لگی۔ ”میرا اندازہ یہ ہے کہ کسی سبب زاعوان کی روح میری دشمن بن چکی ہے۔ اس نے مجھ سے ملاقات کے وقت بھی میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ پھر جب میں یہاں اپنی کار میں آری تھی اس وقت بھی وہ دو مرتبہ مجھ پر حملہ آور ہوئی۔“ نجوا نے یہ کہہ کر حملوں کی تفصیل بتائی۔

”تمہاری ان باتوں سے تو اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔“ منصور کے لہجے سے یہ کہتے ہوئے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ ”یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔ لاعلمی میں وہ تمہیں کوئی بڑا نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ ہم مقرر کے غلاموں سے غنیمتیں گے یا زاعوان کی روح سے؟“

”اس کی بس ایک ہی صورت ہے کہ میں اسے اپنے قریب نہ آنے دوں۔ ہر وقت مجھے اس کی طرف سے چمکنا اور محتاط رہنا پڑے گا۔ میں نے ایک عمل کے ذریعے آئندہ چوبیس گھنٹوں کے لئے خود کو قطعی محفوظ کر لیا ہے۔“ نجوا نے بتایا۔ ”اس عرصے میں زاعوان کی روح میرے قریب نہیں آسکے گی۔ اگر اس نے یہ کوشش کی تو ناپیدہ آتش حصار اسے جلا کر راکھ کر دے گا۔ یہ حصار ارواح اور جنات سے محفوظ رہنے کے لئے ہی کھینچا جاتا ہے۔ میں نے اگر ضرورت محسوس کی تو پھر کل دوبارہ اپنے گرد یہ حصار کھینچ لوں گی۔ تاکہ مزید چوبیس گھنٹے محفوظ رہ سکوں۔ یہ حصار بس چوبیس گھنٹے تک ہی اپنا اثر قائم رکھتا ہے۔“

میں اور سومی کمرے کے باہر نجوا سے دور دروازے پر موجود تھے ہم سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ نجوا نے ہم سے محفوظ رہنے کی کیا تدبیر کی ہے!

”نجوا یہاں سے وہ دونوں بغداد ہی گئے ہوں۔ کیوں نہ ہم سود کو مطلع کر دیں کہ وہ انہیں ٹھکانے لگا دے؟ ممکن ہے ابھی وہ بغداد ہی میں ہوں!“ منصور نے تجویز پیش کی۔ ”انہیں بغاوت کی سزا تو ملنی ہی چاہئے۔ وہاں وہ کسی ہوٹل ہی میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ یوں بھی سعد کی جو حالت ہے اسے آسانی سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ سعد کی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک امکان اور بھی ہے کہ رشیدہ نے اسے کسی ہسپتال میں داخل کرا دیا ہو۔

انہیں.....“

”نہیں۔“ نجوا بول اٹھی۔ ”وہ کم از کم بغداد میں کسی ہسپتال کا رخ نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں پولیس ان کے پیچھے لگ جائے گی۔ انہیں یہ جواب دینا مشکل ہو جائے گا کہ گولی کب اور کہاں لگی! ہاں یہ ممکن ہے، وہ ذاتی طور پر کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔“

”پھر بھی ہم احتیاطاً سود کو سعد کی حالت سے آگاہ تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس طرح اسے تلاش میں سہولت رہے گی۔“ فواد نے مشورہ دیا۔

”اچھا تو پھر بغداد کے لئے ٹرنک کال بک کرا دو۔“ نجوا نے اجازت دے دی۔

اس کمرے میں ٹیلی فون موجود ہی تھا۔ فواد کرسی سے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں لائن مل گئی اور نجوا فون پر سود سے بات کرنے لگی۔ ”ہیلو سود! میں نجوا بول رہی ہوں۔ میری بات غور سے سنو! کل رات یہاں سے رشیدہ اور سعد فرار ہو گئے ہیں۔ تمہیں..... کیا؟ وہ دونوں کل رات تم سے ملے تھے؟“ نجوا کی آواز میں ہلاکت حیرت تھی۔ ”ہاں ہاں..... رقم لے گئے تم سے؟ کیا؟..... ہاں..... تفصیل سے بتاؤ!..... کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ کس طرح..... سعد بالکل صحت مند تھا؟..... بالکل ٹھیک حالت میں؟..... دونوں نے تمہارے ساتھ چائے پی تھی!..... کیا میرے حکم پر؟..... رات ہی کو دونوں چلے گئے؟..... سلیمانہ گئے ہیں؟..... اچھا..... ہاں..... سب کچھ فریب ہے۔ قطعی جھوٹ بولا ہے انہوں نے تم سے..... خیر اب یہ سمجھ لو کہ ان دونوں کا شمار ہمارے دشمنوں میں ہے..... نہیں! ابھی بغداد آنے کا کوئی ارادہ نہیں..... ہاں آنے سے پہلے تمہیں مطلع کر دوں گی۔“

منصور نے نجوا کی زبانی جو باتیں سنیں، انہیں سن کر مضطرب نظر آنے لگا۔ یہی حالت کم و بیش فواد کی بھی تھی۔

ریسیور رکھ کر نجوا پھر انہی دونوں کے پاس اپنی کرسی پر آ بیٹھی اور کچھ پوچھنے سے پہلے بتانے لگی۔ ”اب مجھے قطعی طور پر یقین آچکا ہے کہ وہ دونوں پراسرار قوتوں کے مالک تھے۔ سود نے بتایا کہ جب گزشتہ رات وہ اس سے ملے تو سعد پہلے ہی کی طرح تھا، قطعی صحت مند! کیا یہ بات کم حیرت انگیز ہے؟ میں اپنی تمام تر قوتوں کے باوجود ان کی حقیقت کا سراغ نہیں لگا سکی۔ میں تو اب یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت ہی مجھ سے ملے تھے اور مقصد پورا ہو گیا تو انہوں نے راہ فرار اختیار کر لی، لیکن ان کا مقصد کیا تھا؟“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نجوا کا لہجہ خود کلامی کا سا تھا۔

”میرا مشورہ یہ ہے نجوا کہ اب ہمیں ان دونوں کے بارے میں مزید الجھن کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تو اب یہاں سے جا ہی چکے ہیں نا!“ فواد نے کہا۔

”ہاں نجوا!“ منصور نے بھی فواد کے مشورے سے اتفاق کیا۔ ”اب تو ہمیں اپنے دشمنوں کی

حیات تھی۔ کافی عرصے سے ان دونوں کے درمیان ناچاقی کے باوجود ابھی قطعی طور پر علیحدگی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ عمارت شادی کے کچھ دن بعد ہی طلال بے نے نجوا کے نام کر دی تھی۔ اس عمارت کے بقیہ حصوں، کئی منزلوں اور نیچے موجود دکانوں کا ہر ماہ اتنا کرایہ آتا تھا کہ نجوا کو ایک امیر زادی ہی کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی کچھ کئے بغیر نہایت عیش و آرام کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ جو باتیں میرے علم میں آئیں، ان میں ایک بات سب سے زیادہ حیران کن تھی۔ ہم وہاں سے لوٹ کر ہوٹل مونٹانا آگئے اور اپنے نئے انسانی قالب اپنا لئے۔ سوئی ابھی تک اس سے بے خبر تھی کہ میں نے کیا معلومات حاصل کی ہیں!

”ہاں اب یہ بات کہ ان دونوں کے تعلق کا کچھ پتا چلا؟“ سوئی نے مجھ سے سوال کیا۔
”تو سن کر دنگ رہ جائے گی اے سوئی کہ نجوا اس خطرناک مسخرے طلال بے کی بیوی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”نہیں۔“ سوئی چونک کر بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
”حقیقت یہی ہے اے سوئی!“ میں نے یہ کہہ کر اس عبارت کے بارے میں بتا دیا کہ کس کی ملکیت ہے! پھر اسے مزید حقائق سے آگاہ کر دیا۔

”لیکن اس قدر شدید دشمنی کے باوجود انہوں نے اب تک علیحدگی کیوں اختیار نہیں کی؟“
”یہ بات تو خیر ایک طرف رہی، مزید حیران کن بات تو ابھی بتانا باقی ہے۔ اب بھی کبھی کبھار طلال بے اس عمارت میں آ کے رہتا ہے، لیکن اس وقت نجوا وہاں نہیں ہوتی۔ طویل عرصے سے ان دونوں کو اس عمارت میں ایک ساتھ رہتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ بتا ہے یا یہ حیرت کی بات؟“
”یہ تو ان دونوں کے درمیان عجیب تعلق اور عجیب دشمنی ہے اے علیالیش!“ سوئی کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دونوں مل کر منقرع کے دوسرے غلاموں کو بے وقوف بنا رہے ہوں؟ شاید اسی وجہ سے اب تک انہوں نے علیحدگی اختیار نہ کی ہو۔“

”میرے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ جو بات ہمارے علم میں آئی ہے، منقرع کے دوسرے غلام بھی اس سے واقف ہوں گے۔ پھر کسی بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ آخر انہیں اپنے درمیان دشمنی کا سوانگ رچانے کی ضرورت بھی کیا ہے!“ میں بولا۔

”یقینی طور پر تو خیر کچھ کتنا ممکن نہیں اے علیالیش! ہاں ایک بڑی وجہ حصول زر ہو سکتی ہے۔ مختلف شواہد کی روشنی میں اب تک ہم اسی نتیجے پر تو پہنچے ہیں کہ شیطان صفت آدم زادوں کا یہ گردہ قدیم اہراموں سے سونا نکال رہا ہے۔ فرض کر کہ طلال بے اور نجوا آپس میں ملے ہوئے ہیں تو وجہ تیری سمجھ میں آجائے گی۔ منقرع کے غلاموں سے اگر نجوا، اہراموں سے نکلا ہوا سونا جھپٹ لے جاتی ہے تو اس سے دونوں ہی فائدے میں رہیں گے! یہ سونا صرف نجوا اور طلال بے کی ملکیت ہو گا، اس پر منقرع کے دوسرے غلاموں کا حق نہیں رہے گا۔ بول، کیا ایسا ممکن نہیں؟“ سوئی یہ کہہ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”فکر کرنی چاہئے۔“
”جن میں ایک نئے اور بڑے دشمن کا اضافہ ہو چکا ہے۔“ نجوا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”معلوم نہیں یہ زاعون کی روح کہاں سے میرے پیچھے لگ گئی!“

”اور اس دشمنی کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم تو اب منقرع کے غلاموں پر بھاری پڑنے لگے تھے کہ یہ واقعہ پیش آگیا۔“ منصور کے لہجے میں تاسف تھا۔ ”کاش کچھ عرصے اور وہ دونوں ہمارے ساتھ رہتے تو حالات مزید ہمارے حق میں استوار ہو جاتے۔ اگر وہ پراسرار قوتوں کے مالک تھے بھی تو اپنی قوتیں ہمارے دشمنوں کے خلاف ہی تو استعمال کر رہے تھے۔ ہمیں تو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نجوا! تم نے ناخن انہیں اپنی طرف سے برگشتہ کر کے بھگا دیا۔“
”منصور!“ نجوا کی تیوریوں پر پل پڑ گئے۔ ”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو! تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ کیا میں ان کی محتاج ہوں؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا نجوا! میں تو حالات کا تجزیہ کر رہا تھا کہ جب سے وہ دونوں ہمارے ساتھ تھے، ہم.....“

”لعلت سمجھو ان پر! آئندہ میرے سامنے ان کا تذکرہ نہیں کرنا۔“ نجوا نے سختی سے کہا۔
”چلو بھیج دی لعلت بس۔“ منصور کا لہجہ خوشامدانہ تھا۔ ”فحقی چھوڑ دو۔“
نجوا یوں بھی خوشامد پسند تھی اور منصور اس کا دست راست بھی تھا اس لئے بات مزید آگے نہیں بڑھی۔

معا سوئی نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور فضا میں بلند ہونے لگی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی۔ ”اب ہمیں بھی ان پر لعلت بھیج دینی چاہئے۔“
”طلال بے اور نجوا کے درمیان کیا تعلق رہ چکا ہے، ابھی اس کا بھی تو سراغ لگنا ہے اے سوئی!“

”تو کیا تیرا ارادہ اسی وقت رم سیس چوک چلنے کا ہے؟“
”اس میں حرج بھی کیا ہے! ہمیں اور کام بھی کیا کرنا ہے!“ میں بولا۔
”کیوں، کیا تو اپنے اصل دشمنوں کو بھول گیا؟ منقرع کے غلاموں کی خبر نہیں لے گا؟“
”بھول کیوں جاؤں گا انہیں! انہی کی وجہ سے تو مصر تک آیا ہوں، مگر پہلے ایک معاملہ تو نمٹ جائے!“

”اچھا تو پھر چل اے علیالیش! ایسے میں نجوا بھی وہاں نہیں ہے۔“ سوئی راضی ہو گئی۔

☆=====☆

ہم ایک مرتبہ پھر رم سیس چوک پہنچ گئے۔ عمارت کا جو حصہ نجوا کے تصرف میں تھا، وہاں ہمیں اس کے ملازمین بھی دکھائی دیے۔ میں نے ان میں سے ایک بوڑھے ملازم کے ذہن کو ٹٹولا تو پہلی ہی کوشش کامیاب رہی۔ یہ اطلاع میرے لئے ایک انکشاف ہی تھی کہ نجوا، طلال بے کی شریک

انسانی قالب ترک کر دیے اور فضا میں اونچی پرواز کرتے ہوئے ہم نے پرانے قاہرہ کا رخ کیا اور وہاں کے علاقے عباسیہ پہنچ گئے۔ سوی نے مطلوبہ مکان تک رہنمائی کی۔ یہ وہی مکان تھا کہ جہاں طلال نے کی موجودگی کا امکان تھا۔ ہم اس لئے مکان کے حدود میں داخل ہوتے وقت بے حد چوکنا اور محتاط تھے۔

خلاف توقع ہمیں اس مکان میں صرف ایک مسلح شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں خود کار رائل تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ پورا دن رہا ہو۔ اس شخص کو ہم نے ایک کمرے میں دیکھا۔ کمرے میں کتابوں کی ایک بڑی الماری دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک طرف دو کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ انہی کرسیوں میں سے ایک پر وہ شخص گود میں رائل رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ ظاہر تھے وہ کمرہ مطالعہ گاہ معلوم ہوا۔ میز پر اس روز شائع ہونے والے وہ اخبار ”اہرام“ اور ”الجہوریہ“ رکھے تھے۔

میں نے سوی کو اس کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ اب میں دوسرے کمروں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مطالعہ گاہ کے علاوہ ایک نشست گاہ تھی اور بقیہ دو کمروں کے سلمان سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہ طور خواب گاہ استعمال کیے جاتے ہوں گے۔

”اے سوی!“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”بہ ظاہر تو اس مکان میں کوئی ایسی قیمتی چیز نظر نہیں آئی جس کی حفاظت کے لئے مسلح شخص کی یہاں موجودگی ضروری ہو۔“

”ہاں اے علیالیش“ خود مجھے بھی اس پر حیرانی ہے۔ وہ مسلح آدم زاد جس کمرے میں موجود ہے، وہاں تو یوں بھی کتابوں کے سوا کچھ نہیں۔“

”اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ مسلح شخص کو قابو میں کر کے کچھ معلوم کیا جائے۔“ میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے، وہ آدم زاد، منقطع کے غلاموں میں سے ہو۔ اگر وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہوا تو آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔“

”تیرا اندیشہ درست بھی ثابت ہو سکتا ہے اے سوی!“ میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”لیکن ہمیں کچھ معلوم کرنے کے لئے یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ اس شخص کو بلا سبب تو یہاں پہرا دینے کے لئے نہیں چھوڑا گیا ہو گا۔ وہ آدم زاد اگر پراسرار قوتوں کا مالک بھی ہوا تو بہر حال اکیلا ہے اور ہم دو جن زاد ہیں۔ ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ انشاء اللہ ہم اس پر قابو پالیں گے۔ خاصی طور پر اسی کمرے میں اس مسلح شخص کو موجودگی بھی مجھے معنی خیز لگتی ہے۔ وہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔“

”جہل تو پھر اسے قابو میں کرتے ہیں۔“ سوی راضی ہو گئی۔

محض عبور کر کے ہم دوبارہ مطالعہ گاہ میں آگئے۔ جیسے ہی میں نے اس آدم زاد کے ذہن کو گرفت میں لینا چاہا، وہ اچھل پڑا اور خوفناک آواز میں بولا۔ ”کون ہے؟“

اسی لمحے سوی نے اسے اپنی جنائی صفات کے اثر میں لے لیا۔ اس دہرے حملے سے وہ بچ نہ

”میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اگر یہ نجوا اور طلال بے کی ملی بھگت ہے تو منقطع کے دوسرے غلام اس سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔“

سوی نے پھر اس موضوع پر مزید لب کشائی نہیں کی۔ ہاں اس نے یہ ضرور کہا۔ ”اے علیالیش! کیا اب تجھے طلال بے کی خبر نہیں لینی جسے تو ایک ہاتھ سے محروم کر چکا ہے؟ ہمیں دیکھنا تو چاہئے کہ اب وہ کس حال میں ہے! جہد میں تو ابھی کئی دن ہیں، تیرے کہنے کے مطابق مجھے رقامہ جزیرہ کے جسم میں داخل ہو کر ستارہ جانا ہے۔“

”کچھ دیر آرام کر لے اے سوی! دوسرے ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ ہم کھانا کھا کر ہی یہاں سے چلیں گے۔“ میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

”کیا کتا ہے“ پہلے پرانے قاہرہ میں عباسیہ ہی چلیں؟ وہیں سے فواد کے ساتھ میں نے طلال بے کا تعاقب کیا تھا۔ وہ مکان مجھے یاد ہے کہ نجوا نے جس کی نشاندہی کی تھی۔ کیا خبر طلال بے کا قیام اسی مکان میں ہو! سوی نے میرے قریب بستر پر دراز ہو کر پوچھا۔

توقع تو نہیں کہ طلال بے اب بھی وہیں ہو۔ تجھے بھی خبر ہے کہ یہ لوگ اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی ایک جگہ مستقل نہیں رہتے اور ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی اپنی تلاش کا آغاز احتیاطاً اسی مکان سے کریں گے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کی طرف کروٹ لے لی۔ سوی نے یہ نیا انسانی قالب اپناتے ہوئے بھی نسوانی حسن و دلکشی کا پورا خیال رکھا تھا۔ میں پسندیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہا ہے اے علیالیش کہ جیسے پہلی بار دیکھا ہو!“

”ہاں اس رنگ روپ میں تو پہلی بار ہی نظر بھر کر دیکھ رہا ہوں۔ کل سے فرصت ہی نہیں ملی جو تیرے اس نئے قالب کے حسن کو قریب سے محسوس کر سکتا۔“ میری آواز خمار آلود ہو گئی اور میں نے ہاتھ بدھا کر اسے خود سے مزید قریب کر لیا۔

سوی نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جب اس کے انفاس کی خوشبو مجھے دیوانہ بنانے لگی تو میں نے خود کو سنبھال لیا۔ مجھے یاد آگیا کہ ہمیں کچھ دیر بعد کھانا کھا کر طلال بے کی تلاش میں بھی جانا ہے۔ نشاط دے خودی کا یہ سفر کسی اور وقت بھی طے کیا جاسکتا تھا۔ دھیان بنانے اور اس ذہنی کیفیت سے نکلنے کے لئے میں سوی کے پہلو سے اٹھ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ غلط خدا ہونے کے ناتے فطری تقاضے جن و بشر بھی پر غالب آجاتے ہیں! میں بھی اس سے مبرا نہیں تھا۔ پہلے کے مقابلے میں فرق اب یہ پڑا تھا کہ میں نے ان کی تکمیل کا ایک جائز راستہ اختیار کر لیا تھا۔ میں اپنی خواہشات کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دیتا۔ یقیناً سوی کو بھی اس کا پورا احساس تھا۔ وہ اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کرتی اور حسین ترین انسانی قالب اپناتی۔ پھر سوی کے سوا مجھے کسی اور طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

اس روز دوسرے کو کھانا کھا کر سوی اور میں ہوٹل کے بند کمرے سے غائب ہو گئے۔ ہم نے

”بتا کر تو یہاں کس لئے پرا دے رہا ہے؟“ سوی نے اس آدم زاد سے پوچھا۔
”تاکہ تمہ خالے میں موجود قیدی فرار نہ ہو جائے!“ مسلح شخص نے خواب ناک سی آواز میں

جواب دیا۔
”تمہ خانہ کہاں ہے اور کیا تجھے خبر ہے کہ وہ قیدی کون ہے؟“ سوی نے ایک ہی دفعہ میں دو سوال کیے۔

”اسی کمرے کے نیچے تمہ خانہ ہے۔“ پہلے سوال کا جواب ملا، پھر مسلح شخص نے بتایا۔ ”اس قیدی کا نام حسنین ہے اور وہ بھی ہماری ہی طرح منقرع کا ایک غلام تھا۔“

”پھر اسے کیوں قید کر دیا گیا؟“ تفصیل کے ساتھ بیان کرنا سوی نے اسے حکم دیا۔
”وہ باقی ہو گیا تھا۔ منقرع کی روح نے سرگوشیوں میں نجیب المہندس کو یہ خبر دی تھی۔ اس نے منقرع کی امانت میں خیانت کی تھی۔ منقرع کی روح نے اس کی تمام قوتیں سزا کے طور پر چھین لیں۔ اس کے باوجود بھی وہ ابھی زبان کھولنے پر آمادہ نہیں۔ منقرع کی روح نے اس کے خلاف کرپراسرار قوت کے استعمال سے منع کر دیا ہے ورنہ اب تک پتا چل گیا ہوتا کہ ستارہ کے ایک ابھرا سے سونے کے حروف چرا کر اس نے کہاں چھپائے ہیں! طلال بے کا حکم ہے کہ اس پر اتنا تشدد کیا جائے کہ وہ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ تشدد ہی کی وجہ سے اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ گزشتہ دو دن سے اسی لئے اس پر تشدد نہیں کیا گیا۔ جب وہ دوبارہ تشدد برداشت کرنے کے قابل ہو جاگا تو اس کی زبان کھولنے کے لئے پھر کوشش کی جائے گی۔“ قیدی کے متعلق اس آدم زاد نے سرکچھ تفصیل سے بتا دیا۔

”تو نے جو کچھ ابھی کہا ہے، تجھے یاد نہیں رہے گا!“ سوی نے تاکید کی۔ ”تو یہ بھی بھرا جائے گا کہ کسی نے تیرے ذہن کو گرفت میں لینا چاہا تھا۔“

”میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔“ وہ آدم زاد سوی کے زیر اثر بولا۔
معا اسی لمحے میں بول اٹھا۔ ”کیا تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت طلال بے کہاں ہے؟“

”نہیں“ میں نہیں جانتا۔“
میرا اشارہ پا کر سوی نے اس آدم زاد کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ پھر ہم دونوں کو اس کے نیچے موجود تمہ خانے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

تمہ خانے میں ہمیں ایک آدمی فرش پر پڑا ہوا ملا۔ اس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ ا سے دیکھ کر بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس پر انتہائی تشدد کیا گیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس جسم کو گرم لوہے سے داغا گیا ہے۔ یقیناً وہ بڑی قوت برداشت کا مالک رہا ہو گا ورنہ اس قدر تشدد بعد زبان کھول دیتا۔

مسلح شخص کی زبانی پہلے ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس آدم زاد کی پراسرار قوتیں چھین

ہیں۔ مجھے اسی لئے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔
”حسین!“ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔
”لگ..... کون ہو تم؟ اور..... اور مجھے نظر..... نظریوں نہیں آرہے؟“ اس کی آواز سے خوف جھٹک رہا تھا۔

”روحیں نظر نہیں آتیں اسی لئے تو مجھے دیکھنے سے قاصر ہے۔ میں‘ فرعون خضر کے ایک امیر زاعون کی روح ہوں۔“

یہ سنتے ہی وہ ایک دم سجدے میں گر پڑا اور پھر مگر گزرائے لگا۔ ”اے عظیم اور مقدس روح! تجھے فرعون خضر کا واسطہ، مجھے اس قید سے رہائی دلا دے۔“

”میرے لئے یہ ممکن ہے کہ تجھے اپنی امان میں لے لوں۔ پھر منقرع کے غلام تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، لیکن پہلے مجھے یقین ہو جائے کہ تو سچا ہے اور مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔“

”تو جس طرح چاہے میرا امتحان لے لے اسے مقدس روح!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”اگر تو سچا ہے تو پھر وہ پورا واقعہ بیان کر دے جس کی وجہ سے تجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔ سجدے سے اٹھ جا!“ میں نے اسے حکم دیا۔

اس نے سر اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب مجھے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیے تو چونکا ہوا گیا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زبان کھولنے کے لیے یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ منقرع کے غلام اس طرح ممکن ہے اسے فریب دے رہے ہوں۔ ”تو غلط سوچ رہا ہے حسنین!“ میں اچانک بول اٹھا۔

میری آواز سنتے ہی اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ پھر وہ مجھے ایک روح سمجھ کر معافی مانگنے لگا اور کہا۔ ”یقیناً اے عظیم روح! تجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ تجھ پر شک کیا۔ تو نے مجھ سے جو معلوم کیا ہے، میں بتانے پر آمادہ ہوں تاکہ تجھے میری سچائی پر یقین آجائے۔ میں..... میں تیری امان میں آنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر دیر نہ کر! جو پوچھا گیا ہے، سچ سچ بیان کر دے!“ میں نے تاکید کی۔ اس آدم زاد سے کچھ معلوم کرنے کے لیے دانستہ میں اپنی کوئی پراسرار قوت بروئے کار نہیں لایا تھا اور اس کی وجہ تھی۔ میرے خیال میں منقرع کی روح نے اپنے غلاموں کو یہ حکم بلا سبب نہیں دیا ہو گا کہ حسنین کی زبان کھولنے کے لئے کوئی پراسرار قوت استعمال نہ کی جائے۔ یہی سوچ کر میں نے بھی اب تک ایسا نہیں کیا تھا۔

”مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے، قطعی بے بنیاد اور غلط ہے۔“ تمہ خانے میں حسنین کی آواز گونجی۔

اس کے خلاف کوئی پراسرار قوت نہ آزمانے کے باوجود میں بہر حال غافل نہیں تھا۔ میری توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔ میں اس سے بے خبر نہیں رہا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس پر مجھے غصہ

آگیا۔ میں نے احتیاط کو بلائے طاق رکھ کر اس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔
 ”حسین! اب تو جھوٹ نہیں بولے گا!“ میں نے سخت آواز میں اسے حکم دیا۔ ”تھا کہ تو نے
 سونے کے ظروف کہاں چھپائے ہیں؟“

میرے اس سوال کا جواب حسین نے اپنی زبان سے نہیں دیا۔ چند لمحوں کو اس کے ذہن میں
 جو خیالات ابھرے وہ میں نے پڑھ لیے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ستارہ کے ایک اہرام سے چرائے جانے
 والے سونے کے ظروف کہاں ہیں! اسی کے ساتھ حسین کے ذہن پر تاریکی پھیل گئی۔ ایسا صرف
 ایک ہی وجہ سے ممکن تھا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ منقرع کی روح نے حسین کے خلاف کوئی
 پراسرار قوت نہ آزمانے کا حکم کیوں دیا تھا یقیناً اس کا ذہن کسی پراسرار قوت کو برداشت کر لینے کے
 قابل نہیں رہا تھا۔ ممکن ہے جب حسین کی پراسرار قوتیں سلب کی گئی ہوں تو اس کا دماغ بڑی حد
 تک مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔

”اے علیالیش! یہ کیا ہوا؟“ سوی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ تو ڈھمکیاں لگتا ہے، اس نے زندگی
 کی بازی ہار دی۔“

”ہاں اے سوی! یہ مر گیا۔“ میں نے حسین کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں
 پھٹی رہ گئی تھیں۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”مگر اس کی موت سے پہلے مجھے
 اپنے سوال کا جواب مل گیا۔“ پھر میں سوی کو اپنے قیاس کے مطابق یہ بتانے لگا کہ وہ آدم زاد کیسے
 اپنی جان گنوا بیٹھا!

”مجھے تیرا اندازہ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”چل اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ بہر حال ہمیں اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کا ایک اور موقع
 مل گیا۔“ میں نے یہ کہہ کر بتا دیا کہ اب میرا ارادہ کیا ہے!

اس مکان سے نکلتے نکلتے سوی کہنے لگی۔ ”یہ مسلح آدم زاد بھی تو ہمارے دشمنوں ہی میں سے
 ہے۔ ہم اس کو زندہ کیوں چھوڑ جائیں!“

”ہمیں اپنے سر اس کا خون لینے کی کیا ضرورت ہے اے سوی!“ میں بولا۔ ”حسین کی طرف
 سے غفلت برتنے پر طلال بے اور نجیب خود ہی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”اگر تیرا یہ خیال ہے تو پھر رہنے دے۔“ سوی مان گئی اور ہم اس مکان سے نکل آئے۔
 اب ہم پرانے قاہرہ ہی کی ایک ایسی آبادی کی طرف پرواز کر رہے تھے جو تقریباً گیارہ سو برس

قدیم تھی۔ اس آبادی کا نام سیدہ زینب تھا۔ یہاں حضرت سیدہ زینب کا مزار مبارک ہے۔ اسی
 سبب یہ علاقہ سیدہ زینب کہلاتا ہے۔ یہ مزار مبارک بہت خوب صورت بنا ہوا ہے۔ حضرت سیدہ

زینب کے مزار مبارک کے اطراف بوہرہ فرقے نے چاندی کا احاطہ بنوایا ہے۔ میں اور سوی پہلی
 مرتبہ ادھر آئے تھے۔ ہم نے اسی لئے پہلے حضرت سیدہ زینب کے مزار مبارک پر حاضری دی اور
 فاتحہ پڑھی۔ وہیں سے دائیں جانب پہلی سی ایک گلی میں وہ گھر تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ ویران سا وہ گھر

آسیب زدہ مشہور تھا اسی لئے وہاں کسی کی سکونت نہیں تھی۔ دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب گھر کی کچھ
 دیواریں منہدم بھی ہو گئی تھیں۔ بعض اوقات افواہیں حقیقت بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اسی کو مد نظر
 رکھتے ہوئے ہم نے جلد بازی میں نہیں کی اور فوری طور پر اس گھر میں داخل نہیں ہوئے۔ ایک جن زاد
 ہونے کی وجہ سے مجھے خبر تھی کہ جنات میں بھی انفرادی ملکیت کا جذبہ حیوانوں اور انسانوں ہی کی
 طرح قوی ہوتا ہے۔ وہ جہاں رہتے بستے ہیں، وہاں کسی اور کا نہ تو قبضہ برداشت کرتے ہیں، نہ کسی
 ادھر آنے دیتے ہیں، خواہ وہ ان کا کوئی ہم جنس ہی کیوں نہ ہو۔

”اے سوی! تو باہر ہی ٹھہر۔ میں اکیلا اندر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”میں سمجھ رہی ہوں کہ تو کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ میں اسی لئے تجھے اکیلا اس گھر میں
 نہیں جانے دوں گی!“ سوی فیصلہ کن آواز میں کہنے لگی۔

مجبوراً مجھے سوی کی بات ماننی پڑی۔ اس گھر میں ٹھکتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ یہ
 احساس اس بدبو کا مرہون منت تھا جو وہاں پھیلی ہوئی تھی۔ نیک جن زادوں کی خوشبو اور بدوں کی
 بدبو مخصوص ہوتی ہے۔ وہ خاص قسم کی بدبو وہاں کسی جن زاد ہی کی نشان دہی کر رہی تھی۔

سوی نے بھی اس مخصوص بدبو کو فوراً پہچان لیا اور بولی۔ ”اے علیالیش! جلد یہاں سے نکل
 چل! میں نے خطرے کی بو سونگھ لی ہے۔“

”ٹھہر تو سہی اے سوی! یقیناً یہاں کوئی کافر جن زاد رہتا ہے، لیکن وہ اس وقت یہاں موجود
 نہیں ورنہ اب تک ہمارے مقابل آچکا ہوتا۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چند ہی لمحوں
 کی تو بات ہے۔“ میں یہ کہتے ہی ایک محرابی دروازے کی طرف لپکا جس کے تسائے لمبا پڑا ہوا تھا۔
 اسی لمبے میں مضبوط کپڑے کا ایک بڑا تھیلا دبا ہوا تھا۔ اسی میں سونے کے نادر اور قیمتی ظروف تھے۔
 انہی کی خاطر ایک آدم زاد نے اپنی جان دے دی تھی۔

لمبے میں دبا ہوا وہ تھیلا نکالتے ہی میں وہاں رکا نہیں۔ سوی میرے ساتھ ہی تھی۔ ہوٹل
 مونٹا پہنچ کر ہم نے تھیلے سے ان ظروف کو نکال کر دیکھا اور پھر انہیں واپس اسی تھیلے میں رکھ دیا۔
 اسی وقت سوی نے مجھے مشورہ دیا۔ ”ان برتنوں کو بھی تو کراچی جا کر اپنی کوٹھی میں رکھ آ۔ یہاں
 ہمارے پاس ان کا رہنا ٹھیک نہیں۔“

”ایسی جلدی بھی کیا ہے اے سوی! رات کو بھی تو یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال تو ہمیں
 طلال بے کی تلاش میں جانا ہے۔ میں اس تھیلے کو اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیتا ہوں۔ کسی آدم زاد
 کو ان ظروف کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔“

”میں تو احتیاط کے پیش نظر کہہ رہی تھی، آگے تیری مرضی۔“

خطرناک مسخرے طلال بے کی تلاش میں ہم ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئے اور اسے ڈھونڈ ہی
 لیا۔ وہ بھی پرانے قاہرہ کے ایک علاقے الاذرہ میں تھا۔ یہ علاقہ بھی کئی سو برس قدیم ہے۔ اسی مشہور
 معروف علاقے میں جامعہ الاذرہ ہے جو وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ایک مسجد ہے۔ اس مسجد کی اطراف

اسی جامعہ سے متعلق مختلف کالجوں کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ہمیں قدیم و نادر کتب کی ایک لائبریری ہے جو جامعہ ہی سے متعلق ہے۔ اسی علاقے میں سیدنا حسینؑ کی مسجد ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس مسجد میں حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک دفن ہے۔ یہ مسجد جامعہ الازہر کے قریب ہی ہے۔ اس بڑی مسجد میں عیدین کی نمازیں بھی ادا کی جاتی ہیں۔ عید الفطر کی نماز اگر الازہر کی مسجد میں ہوتی ہے تو عید الاضحیٰ یہاں ادا کی جاتی ہے۔ بازار خان خلیل بھی اسی علاقے میں ہے جو قاہرہ کا قدیم ترین بازار ہے۔ میری معلومات کے مطابق بازار خان خلیل سات سو برس قدیم ہے۔ یہاں دستی صنعت اور ظروف سازی ہوتی ہے۔ ظروف پر نقش و نگار بھی بنائے جاتے ہیں۔ جمالیہ کا علاقہ بھی الازہر میں شمار ہوتا ہے اور ہمیں وہیں پہنچنا تھا۔

قدیم طرز پر بنے ہوئے اس بڑے سے گھر کے اوپر ہم منڈلاتے رہے، پھر گھر کے وسیع و عریض صحن میں اتر گئے۔

دور ہی سے ہمیں ایک کمرے کا کھلا دروازہ دکھائی دے گیا۔ ہمیں اسی کمرے میں داخل ہونا تھا۔ سامنے ہی ایک مسہری پر طلال بے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے دائیں شانے پر پٹیاں بندھی تھیں۔ دایاں ہاتھ غائب تھا۔ اسے شیر کے قالب میں چبا کر میں نے بازو سے الگ کر دیا تھا۔ مسہری کے قریب ہی ایک آرام دہ کرسی پر کوئی خوب صورت آدم زادی بیٹھی تھی۔ لباس سے وہ کوئی نرس معلوم ہوئی۔ وہ نرس غالباً طلال بے کی نگہداشت کے لیے وہاں موجود تھی۔

”نچو کی طرح اس مسخرے کو بھی میں کچھ سناؤں گا۔“ میں نے دمبی آواز میں بتایا اور ذرا سا آگے بڑھا۔

”اتنا دھیان رکھو اے علیالیش کہ یہ آدم زاد نچو سے بھی زیادہ ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”تو فکر نہ کر اے سوی! مجھے معلوم ہے۔“ میں یہ کہتے ہی دہشت ناک غیر انسانی آواز میر

چینا۔

نرس اتنی زور سے اچھلی کہ کرسی الٹ گئی۔ وہ فرش پر گری اور چیخ مار کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

خلاف توقع مجھے طلال بے کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار مسکراہٹ نظر آئی۔ میں ابھی کمرے کے باہر ہی تھا کہ طلال بے کی بچکانہ آواز سنائی دی۔ ”میں تجھے پہچان گیا۔ آ اے زاعون کی روح میرے ہی انتظار میں تھا۔“

”تو نے مجھے ٹھیک ہی پہچانا اے خبیث طلال بے!“ میں یہ کہہ کر آگے بڑھا۔

معاً مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ اسی کے ساتھ ہی چیخ اٹھا۔ مجھے اتنا شدید جھٹکا لگا کہ دروازے کے باہر جاگرا اور ترپنے لگا۔ تکلیف و اذیت اتنی ناقہ برداشت تھی کہ میرے چاروں طرف گمراہ اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ حواس کھوئے سے پہلے میں نے سوی

اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے میرے جلتے جھلتے ہوئے وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس خطرناک و عیار آدم زاد نے یقیناً مجھے دانستہ غصہ دلایا تھا تاکہ میں آگے بڑھتے ہی اس کے پھیلانے ہوئے جال میں پھنس جاؤں۔ ایسا ہی ہوا بھی تھا۔

ہوش آنے پر خود کو میں نے ہونٹ کے کمرے میں بستر پر دراز دیکھا۔ سوی میرے قریب ہی موجود تھی۔

”اے علیالیش! اب تو تجھے کوئی تکلیف و اذیت محسوس نہیں ہو رہی؟“ سوی نے بڑے محبت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”ہاں اب جلدی تو کم ہے مگر کمزوری بہت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”معلوم نہیں کیسا شیطانی عمل تھا کہ جس نے میری جان نکال لی ہے!“

پھر سوی کے مشورے پر جب میں نے انسانی قالب اپنایا تو میرے وجود کو جھٹکے سے گلے لگے۔ سوی مجھ سے پہلے ہی انسانی قالب اپنا چکی تھی۔

میری حالت دیکھ کر سوی گھبرا گئی اور بولی۔ ”کیا ہوا تجھے؟“

”جھٹکے..... جھٹکے لگ رہے ہیں اور ان کی وجہ سے..... اذیت.....“

”ٹھہرا! یوں ہی لیٹا رہ۔ میں ایک عمل پڑھتی ہوں جس سے تجھے قرار آجائے گا۔“ سوی نے جلدی سے کہا۔ اسی کے ساتھ وہ تیزی سے ایک عمل پڑھنے لگی۔

میرے انسانی قالب کو اس وقت تک جھٹکے لگتے رہے جب تک سوی نے عمل پڑھ کر مجھے پر دم نہ کر دیا۔ مجھے انسانی قالب میں قرار آگیا، لیکن کمزوری پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ میں نڈھال سا بستر پر پڑا ہوا تھا۔ سوی نے مجھے سارا دے کر بیڈ کے سرہانے نیم دراز حالت میں بٹھا دیا۔

”ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا اے سوی!“ میں تھکی تھکی سی آواز میں بولا۔

”تجھ سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آدم زاد بہت خطرناک ہے اے علیالیش! یقیناً اسے خبر ہوگی کہ تو اس کی طرف پلٹے گا۔ اس نے اسی لئے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا تھا کہ وہ جس کمرے میں ہے، تو وہاں داخل ہو کر اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔“

”تو ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ عیار آدم زاد پہلے سے چوکنا ہو گا۔“ میں نے سوی کے خیال سے اتفاق کیا۔

”اس حالت میں تو تیرا کراچی جانا بھی ممکن نہیں اے علیالیش!“

”اب تجھ ہی کو سونے کے ظروف لے کر اچھی جانا ہو گا۔“

”لیکن میں تجھے اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتی۔“

”ابھی تو رات ہونے میں بہت دیر ہے۔ اس وقت تک میری حالت بہتر ہو جائے گی۔ میں تجھے ایک نسخہ لکھواتا ہوں جو ضعف جسم و روح کو ختم کرنے کے معاملے میں تیرے بہ ہدف ہے۔ اس کی تین خوراکیں میں میری یہ حالت نہیں رہے گی۔“ میں نے کہا اور سوی کو وہ نسخہ لکھوا دیا، پھر بولا۔

”ایک خوراک اب‘ ایک رات کو اور ایک کل صبح استعمال کرنی ہے۔ انشاء اللہ کل تک میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا، تو فکر نہ کرنا“

سوی انسانی قالب سے نکل کر دوا لینے چلی گئی۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اسے واپسی میں دیر نہ لگی اور میں نے پہلی خوراک کھالی۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں اے سوی کہ اگر تو میرے ساتھ نہ ہوتی تو تنہا مجھ پر کیا گزرتی! یہ شیطان صفت آدم زاد تو مجھے شاید مار ڈالتے!“

”خدا نہ کرے اے علیالیش! تو ایسی باتیں منہ سے نہ نکالا کرنا“

دوا کی پہلی خوراک ہی سے خاصا افادہ ہوا اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ رات کا کھانا بھی میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اس سے بھی فرق پڑا۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے کہ جب میرے ایما پر سوی نے سوٹ کیس کھول کر سونے کے ظروف والا تھیلا نکال لیا۔

”اب تو جا اے سوی! میں ٹھیک ہوں۔ جب تو کراچی سے لوٹ آئے گی تو میں دوا کی دوسری خوراک کھاؤں گا۔“

”اے علیالیش! سوچ لے اب بھی کہ تو میرے بغیر اکیلا رہ سکے گا؟ ورنہ تو یہ کام کل رات بھی ہو سکتا ہے۔“

”نہیں اے سوی! اب کوئی ایسی تشریش کی بات نہیں۔ تو بے فکر ہو کر جا! یوں بھی تجھے کراچی آنے جانے میں دیر ہی کتنی لگے گی!“

میری بات سن کر سوی مطمئن ہو گئی اور پھر تھیلا لے کر کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچنا شروع کر دیا ہے۔

میں گھبرا کر انسانی قالب سے باہر نکل آیا، لیکن اسی کے ساتھ دوسرے عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ میرے وجود کو کوئی آن دیکھی پراسرار قوت جیسے کانٹوں پر ڈال کر گھسیٹنے لگی۔ تکلیف و اذیت

کے سبب میرے لئے اپنی چیخیں روکنا دشوار ہو گیا۔ میری چیخیں سن کر ہوٹل میں قیام پذیر دوسرے مسافر بھی اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں اسی خیال کو مد نظر رکھ کر ہوٹل کے اس کمرے سے

نکل آیا۔ کمراندر سے بند ہی تھا۔ میں نے اڑنے کا ارادہ کیا تو اس پر بھی عمل نہ کر سکا۔ اس کی وجہ ثقاہت و اذیت ہی تھی۔ اسی وقت میری نگاہ نویں منزل پر جانے والے زینے پر پڑی۔ میں حتیٰ الا

مکان تیزی سے اس طرف بڑھا۔

زینے پر چڑھتے ہوئے میں نے ایک آدم زادی کو نیچے آتے دیکھا۔ اس وقت تک مجھ پر گزرنے والی اذیت میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ بے ساختہ میں چیخ اٹھا۔ وہ آدم زادی اچھل پڑی اور اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اسے میں نے میڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے

دیکھا۔ میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکا کہ خود ہی شدید اذیت میں مبتلا تھا۔

اس عمارت کی نویں منزل پر پہنچنے کے باوجود میں وہاں رکا نہیں۔ اب میں مزید ایک زینہ چڑھ کر چھت پر پہنچنا چاہتا تھا۔ چھت پر پہنچتے پہنچتے کئی بار میری چیخیں نکلیں، مگر میں وہاں کسی نہ کسی طرح گرنا پڑتا پہنچ ہی گیا۔ رات کے اس پہر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں مذہال ہو کر ایک طرف گر پڑا۔

معا مجھے خطرناک مسخرے طلال بے کی آشنا آواز سنائی دی۔ ”اے زاعون کی روح! تجھ تک یقیناً میری آواز پہنچ رہی ہو گی۔ تجھ پر اس وقت جو گزر رہی ہے، مجھے معلوم ہے۔ میرے عمل کے

نتیجے میں کل صبح تک تجھے بیشہ کے لئے قرار آجائے گا۔ پھر تو اس طرح بھٹکتا چھوڑ دے گی اور اپنے تابوت میں سکون کے ساتھ سو جائے گی۔“ ان الفاظ کے بعد اس کا بچکانہ قہقہہ میں نے سنا جیسے کوئی

بچہ خوش ہو کر زور زور سے ہنس رہا ہو۔

مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی کہ سوی کو میں نے اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ وہ یقیناً کراچی سے لوٹ آئی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر کمرے میں لے آئی اور کوئی عمل پڑھ کر مجھ پر دم کیا۔ میرے وجود میں فوراً ہی ٹھنڈک سی دوڑ گئی۔ تکلیف و اذیت اچانک بالکل ختم ہو گئی۔ میں انسانی قالب میں لوٹ آیا۔

”اے علیالیش! تجھے کمرے میں نہ دیکھ کر تو میرے حواس ہی گم ہو گئے تھے۔ تو اوپر چھت پر کیسے چلا گیا؟ میں اسی لئے تو تجھے چھوڑ کر نہیں جا رہی تھی!“

”وہ خبیث آدم زاد طلال بے میری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ مجھے پر وار اسی نے کیا تھا اے سوی!“ پھر سوی کی غیر موجودگی میں مجھ پر جو گزری تھی، میں نے اسے آگاہ کر دیا۔

”پھر تو ہمیں بھی اپنی حفاظت کے لئے کچھ کرنا پڑے گا اے علیالیش! تاکہ اس خطرناک آدم زاد کا کوئی شیطانی عمل ہمیں کسی عذاب میں مبتلا نہ کر سکے۔ رو بلا کا یہ عمل تجھے اور مجھے دونوں ہی

کو ایک ساتھ پڑھ کر ایک دوسرے پر دم کرنا پڑے گا۔ پھر ہم اپنے پراسرار دشمن کے ہر وار سے محفوظ ہو جائیں گے۔“ سوی نے مشورہ دیا۔

میں نے فوراً سوی کے مشورے کو قبول کر لیا۔ وہ عمل مختصر نہیں تھا اس لئے ہمیں دیر لگی۔ پھر سوی نے مجھ پر اور میں نے اس پر دم کیا۔

”اب انشاء اللہ وہ شیطان صفت آدم زاد ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ سوی نے اطمینان کا اظہار کیا۔

”جی تو چاہتا ہے اے علیالیش کہ اس مسخرے کو میں بھی تڑپا تڑپا کر مار ڈالوں جس نے تجھے اتنی اذیت میں مبتلا کیا ہے، لیکن مصلحت آڑے آرہی ہے۔“

سوی کو بھی علم تھا ایسے عمل موجود ہیں کہ اگر کسی آدم زاد کے ٹھکانے کا پتا ہو تو دور رہ کر بھی اسے موت کے گھاٹ اتارنا جاسکتا ہے۔

”ہاں اے سوی! ابھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ تو اس آدم زاد پر پلٹ کر وار نہ کر۔“ میں

میں سمجھ ہی چکا تھا کہ فون کرنے والا نجیب المہندس ہی تھا۔ ہاں مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس نے فون کیا تھا!

مجھے اس سے سوئی نے آگاہ کیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بڑبڑا رہی ہو۔ احتیاط کے پیش نظر یہ ضروری تھا کیوں کہ گھر میں جزیلہ کے ملازم بھی تھے۔

”وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں تیار ہوئی یا نہیں!“ سوئی بتانے لگی۔ ”میرا جواب ملنے پر اس نے سوال کیا کہ مجھے معلوم ہے، کہاں آتا ہے! تو نے سن ہی لیا ہو گا جو میں نے کہا! نجیب نے مجھ سے مقررہ جگہ جلد پہنچنے کی بھی تاکید کی تھی۔“

”جلد پہنچنے سے اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں بولا۔ ”جزیلہ کو تو مغرب کے بعد ہی ستارہ پہنچنا تھا۔ پھر اس تاکید کی اسے کیا ضرورت پیش آگئی؟ پھر یہ کہ ستارہ یہاں سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک جلد پہنچنا ممکن نہیں۔“ میری آواز دھیمی ہی تھی۔

”میرا خیال ہے اے علیا لیش کہ تجھ سے جلدی میں ایک غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں جزیلہ کے جسم میں داخل ہوتی، تجھے اس کا ذہن پڑھ لینا چاہیے تھا۔“

”تیرا کہنا غلط نہیں، مگر یہ کوشش میں نے پہلے ملاقات میں بھی کی تھی۔ میں اس کے ذہن کو گرفت میں نہیں لے سکا تھا۔ اس کے ذہن نے شدید مزاحمت کی تھی، پھر یہ کوئی شیطانی عمل پڑھنے لگی تھی۔“

مجبوراً مجھے اپنی جنائی صفات کو بروئے کار لا کر اسے اپنے اثر میں لینا پڑا تھا۔ اسی کے بعد میں ضروری معلومات حاصل کر سکا تھا۔ اس وقت اسی لئے میں نے اس کے ذہن کو گرفت میں لینے سے گزیر کیا تھا۔ اگر اس سے کچھ معلوم کرنا ہے تو اسے اثر ہی میں لینا پڑے گا۔“

”موجودہ حالات میں بے خبری ہمارے لئے کسی خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اے علیا لیش! ہمیں ہر قدم بہت احتیاط سے اٹھانا چاہئے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ اس کے جسم سے باہر نکل آتی ہوں۔ پھر میں اسے اپنے اثر میں لے کر معلوم کر لوں گی کہ اس کو ستارہ ہی پہنچنا تھا یا کہیں اور! حالات کے پیش نظر دشمن اپنا ارادہ بدل بھی تو سکتے ہیں! کیا خبر اس وقت اسے کہیں اور جانا ہو!“ سوئی بولی۔

مجھے سوئی کی بات میں وزن محسوس ہوا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، تو اتنی کا جسم چھوڑ کر باہر آجا! میں احتیاطاً اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیے دیتا ہوں تاکہ کوئی ملازم ادھر نہ آجائے!“ میں یہ کہتے ہی دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا اور دروازہ بند کر کے اندر سے چٹختی لگا دی۔

اس دوران میں سوئی نے اسے مخاطب کیا، پھر پوچھا۔ ”تو اس وقت کہاں جا رہی تھی؟“

”میں نجیب سے ملنے زامک جا رہی ہوں۔ اس نے مجھے وہیں ملنے کو بلایا ہے۔“ جزیلہ نے خواب ناک آواز میں غیر متوقع جواب دیا۔

”مگر تجھے تو آج ستارہ جانا تھا!“

”نجیب نے کل ہی اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب مجھے آئندہ روز شام کو ستارہ جانا ہے۔“

”کس وقت؟“ سوئی نے معلوم کیا۔

نے کہا۔ ”ہم نے اپنی حفاظت کا تو بندوبست کر ہی لیا ہے۔“

خاصی رات ہو چکی تھی اس لئے میں نے دوسری خوراک کھائی اور سو گیا۔ کمزوری کے سوا اب میں کسی قسم کی تکلیف و اذیت کا شکار نہیں تھا اس لئے نیند آگئی۔

☆=====☆=====☆

طلال بے نے مجھے زاعون کی روح سمجھ کر جو دھمکی دی تھی، وہ رانیکان ثابت ہوئی۔ میں دوسرے دن سو کر اٹھا تو پہلے سے زیادہ توانائی محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی دوا کی تیسری خوراک کھا کر دن بھر میں نے سوئی کے مشورے پر آرام کیا۔ رات ہونے تک میں قطعی طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ اپنے وجود کی طاقت کو آزمانے کے لئے میں نے انسانی قالب سے نکل کر سوئی کے ساتھ فضا میں پرواز بھی کی۔ مجھے اس میں کوئی قباحت نہیں ہوئی، نہ ٹھکن کا احساس ہوا۔

ہم واپس ہوئے کمرے میں آئے تو سوئی بولی۔ ”خدا کا شکر ہے کہ جس نے تجھے صحت یاب کر دیا۔ کل رات کو تو میں تیری حالت دیکھ کر ڈر رہی گئی تھی۔“

”ہاں وہی قادر مطلق اور غرودوں میں جان ڈال دینے والا ہے۔ ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے اے سوئی!“

جمعہ میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں بھولا نہیں تھا کہ راقصہ جزیلہ کو جمعہ کے دن ہی ستارہ جانا تھا۔ سوئی نے یہ مشورہ دیا کہ ان دنوں میں ہمیں اپنے دشمنوں کو قطعی نہیں چھیڑنا ہے تاکہ وہ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ میں نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ یہ دو دن ہم نے آرام کرتے ہوئے گزارے۔

میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق راقصہ جزیلہ کو شام چار بجے اپنی کار میں قاہرہ سے ستارہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ سو میں اور سوئی اس سے پہلے ہی المنیل پہنچ گئے جہاں جزیلہ کا گھر تھا۔ وہ اس وقت کہیں جانے کے لئے ہی تیار ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ منصوبے پر عمل کرنے کے لئے ستارہ ہی جا رہی ہے۔ جیسے ہی وہ لباس تبدیل کر کے ہاتھ روم سے باہر آئی، میرا اشارہ پاتے ہی سوئی اچانک اس کے جسم میں اتر گئی۔ اس سے جزیلہ کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔

اسی لمحے کمرے میں موجود فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایسی کسی صورت حال کے لئے ذہنی طور پر میں تیار نہیں تھا۔ جزیلہ کے جسم پر اب سوئی قبضہ کر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے الجھن کے آثار نظر آئے۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔ ”فون کا ریسیور اٹھا کے دیکھ لے، کون بات کر رہا ہے!“

میرے کہنے پر سوئی نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا اور جزیلہ کی آواز میں بولی۔ ”ہیلو!.....“

کون؟..... نجیب بول رہے ہیں..... ہاں تیار ہوں۔ بس میں نکلنے ہی والی تھی کہ تمہارا فون آگیا..... کیا؟..... ہاں ہاں یاد ہے مجھے کہ کہاں پہنچتا ہے! تم مطمئن رہو۔“ پھر اس نے ریسیور رک دیا۔

”مجھے آج ہی کی طرح شام کو ساڑھے چار بجے یہاں سے ستارہ کے لئے روانہ ہوتا ہے۔“ جزیلہ نے بتایا۔

پھر سوی نے جزیلہ سے جزا کے علاقے زناک میں واقع اس کوٹھی کا محل وقوع بھی معلوم کر لیا جہاں نجیب المندس اس کا منتظر تھا۔

جزیلہ کے جسم پر اب قبضہ کرنا لامحالہ ہی تھا کہ کیوں کہ وہ ستارہ نہیں جا رہی تھی۔ سوی نے اسے اپنے اثر سے آزاد کر دیا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا کہ جزیلہ کو کوئی شک نہ ہو۔

سوی کے ساتھ ہی میں جزیلہ کے گھر سے نکل آیا۔ فضا میں میرے ساتھ پرواز کرتے ہوئے سوی نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب یہ بتا کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟ میرا قیاس درست ہی نکلتا! دشمنوں کا ارادہ بدل گیا۔ اب جزیلہ کل شام کو ستارہ جائے گی۔“

”اگر تیرا مشورہ ہو تو ہم زناک چلیں۔ معلوم تو ہو کہ نجیب نے آج جزیلہ کو ستارہ بھیجنے کے بجائے اپنے پاس کیوں بلایا ہے!“ میں بولا۔

”کیا تجھے خبر نہیں کہ نجیب ایک عیاش و بدکردار آدم زاد ہے!“

”لیکن اے سوی! یہ وقت عیاشی کا نہیں ہے۔“

”تو پھر تیرا کیا خیال ہے، نجیب نے اسے اس وقت کیوں بلایا ہو گا؟“ سوی نے دریافت کیا۔

”یہی جاننے کے لئے تو میں زناک چلنے کو کہہ رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر محل معلوم کیے لیتے ہیں، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ نجیب نے بھی کہیں اس کوٹھی میں ہمارے لئے کوئی جال نہ بچھا رکھا ہو!“

”یہ تو وہاں پہنچ کر پتا چل سکتا ہے اور تو یہ کیوں بھول گئی کہ اب دشمنوں کا کوئی وار ہمارے اوپر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا!“

”یاد ہے مجھے اے علیالیش! پھر بھی چونکا رہنے کی ضرورت ہے۔“ سوی نے تاکید کی۔

جزا میں زناک قدیم امراء کا علاقہ تھا جہاں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ نجیب جس کوٹھی میں تھا اس کا محل وقوع سوی نے جزیلہ سے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔ اگر وہ یہ معلوم نہ بھی کرتی تو ہم نجیب کو تلاش کر لیتے۔ ہم اطمینان سے پرواز کرتے ہوئے مطلوبہ کوٹھی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہ کوٹھی بڑے رتبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں بھی چھوٹا سا ایک باغ تھا۔ ہم اسی طرف سے کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔

آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہ دو جسیم آدم زادوں پر پڑی اور میں رک گیا۔ سوی نے بھی میری تقلید کی۔ کچھ ہی دور درختوں کے درمیان چوڑے چٹکے جسموں والے دو آدمی زمین کھود رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھاڑے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو ٹھہر! میں آگے بڑھ کر دیکھتا ہوں۔“ میں نے سوی سے کہا۔

سوی وہیں رک گئی اور میں آگے بڑھا اور ان دونوں آدمیوں کے قریب پہنچ کر حیران رہ گیا۔ گڑھا خاصا کھودا جا چکا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہاں کسی کے لئے قبر کھودی جا رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر سوی کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

”پھر تو اے علیالیش! مجھے یقین ہے کہ یہ قبر جزیلہ کے لئے ہی کھودی جا رہی ہے۔ شاید اب منقرع کے غلام جزیلہ سے مزید کام لینا نہیں چاہتے۔ نجیب نے اس وقت غالباً اسے اسی لئے یہاں بلایا ہو گا۔“ سوی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہاں اب تک کی معلومات تو یہی ہیں۔ منقرع کے غلام کچھ عرصے کے بعد سبھا سے ان مردوں کو پیشہ کے لئے غائب کر دیتے ہیں جنہیں اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ اگر تیرا یہ اندیشہ صحیح نکلا اے سوی! تو پھر ہمارے کام میں دشواری پیدا ہو جائے گی۔ تو جزیلہ کے جسم پر قبضہ کر کے ستارہ نہیں جاسکے گی۔“

”اے علیالیش! ہم ایسا بھی تو کر سکتے ہیں کہ جزیلہ کو یہاں آنے سے روک دیں۔“

”لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟“ میں نے سوال کیا۔

”جزیلہ پہلے بھی اس غرض سے ستارہ جاتی رہی ہے۔ اگر ہم آج بھی اسے وہیں جانے پر مجبور کر دیں تو؟“

”میں سمجھا نہیں اے سوی کہ آخر اس سے تیرا مقصد کیا ہے!“ میں نے کہا۔ ”تیرے خیال میں کیا جابر اور منقرع کے دوسرے غلام اس بات سے بے خبر ہوں گے کہ آج جزیلہ کو وہاں نہیں پہنچنا؟ ایسی صورت میں وہ کس طرح دھوکھا کھا جائیں گے؟“

”تو کیا سمجھتا ہے جزیلہ کو خلاف توقع وہاں دیکھ کر ان کا رد عمل کیا ہو گا؟“

”ظاہر ہے کہ وہ یا تو جزیلہ کو حراست میں لے لیں گے یا پھر ٹھکانے لگا دیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور ایسا کرنے کے لیے انہیں بہر حال سامنے آنا پڑے گا۔ کیا ہم اس طرح ان کے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگا سکتے!“

”تو یہ کہہ اے سوی کہ تو جزیلہ کو چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اگر تیرا ارادہ یہی ہے تو پھر ہمیں یہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔“

میں اور سوی فوراً ہی اس کوٹھی سے نکل آئے۔ اس سے پہلے سوی نے میرے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔ اس کا ارادہ جزیلہ کو چارہ بنانا ہی تھا۔ اب ہم جلد از جلد جزیلہ تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اس میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ کارڈرائیو کرتی ہوئی جزا کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

جزیلہ کو میں نے فوراً ہی اپنے اثر میں لے کر ستارہ چلنے کا حکم دیا۔ میرے حکم پر اس نے کار موڑ لیا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ ستارہ پہنچنے سے پہلے ہی اس کی کار کا پیٹرول ختم نہ ہو جائے! اسی غرض سے راستے میں اہرام روڈ پر واقع ایک پیٹرول پمپ سے کار کی فٹکی بھر والی۔ میرے زیر اثر جزیلہ ہر حکم کی بلا تامل تعمیل کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مقررہ وقت تک ستارہ پہنچنے میں کامیاب

دیر ہی میں کھنڈر کی جانب سے مجھے دو آدمیوں کے ہولے دبے قدموں کار کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی نال والے ریوالور تھے۔ میں نے اسی لمحے سوی کی موجودگی اپنے قریب محسوس کر لی۔

”تو نجیب ہی کے حکم پر یہاں آئی ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر جزیلہ سے سرگوشی کی۔ جزیلہ نے اقرار میں سر ہلا دیا اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ دونوں ہولے اب کار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ معاً دونوں آدمیوں میں سے ایک نے جزیلہ کو مخاطب کیا۔ اس کے لیے میں سختی تھی اور ریوالور کی نال جزیلہ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”مجھے نجیب نے یہاں بھیجا ہے۔“ جزیلہ نے پرسکون مگر خواب آلود سی آواز میں جواب دیا۔ ”لیکن کس لئے؟“ دوسرے آدمی نے سخت آواز میں سوال کیا۔

جزیلہ ابھی تک میرے زیر اثر تھی، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی لئے اسے اثر سے آزاد کر دیا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ جزیلہ پر کیا گزرتی یا منقرع کے غلام اس کا کیا حشر کرتے! ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ منقرع کے غلام سامنے آچکے تھے۔ ہم تعاقب کر کے ان کے ٹھکانے کا پتا لگا سکتے تھے۔ جزیلہ سے جو سوال کیا گیا، اب تک وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ ”تم سے پوچھا گیا ہے جزیلہ کہ تم کس لئے آج یہاں آئی ہو؟ جواب دو!“ ایک آدمی پھر سخت آواز میں جزیلہ سے مخاطب ہوا۔

”میں..... میں یہاں..... یہاں کس طرح پہنچ گئی؟“ جزیلہ کے لیے میں انتہائی حیرت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ابھی جاگي ہو۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی۔ ”مجھے..... مجھے تو نجیب نے بلایا تھا اور میں..... میں وہیں جانے کے لئے روانہ ہوئی تھی، پھر..... پھر یہاں.....“

”لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ نجیب کے کہنے پر یہاں آئی ہو!“ دونوں آدمیوں میں سے ایک بول اٹھا۔

”میں نے یہ..... یہ کہا تھا؟“ جزیلہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

اسی وقت سامنے سے ایک دراز قد شخص قریب آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نارچ اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

”جاہرا تم ہی اسے معے کو حل کر سکتے ہو۔“ وہاں پہلے سے موجود دونوں آدمیوں میں سے ایک نے دراز قد شخص کو مخاطب کیا۔ پھر جزیلہ سے ہونے والی گفتگو سے اسے آگاہ کیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ جزیلہ ہمارے دشمنوں کی آلہ کار بن چکی ہے۔“ دراز قد شخص جابر بولا۔ ”ورنہ یہ آج یہاں نظر نہ آتی۔“

”نہن..... نہیں جاہرا ایسا..... ایسا نہیں ہے۔“ جزیلہ گھبرا کر کہنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

ہو جائے گی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ تیز رفتاری کے ساتھ سفر جاری رہا۔ جزیلہ کی کار اب قاہرہ شہر کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ معلوم نہیں ستارہ کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے کیوں ایک انجانے سے خطرے کا احساس ہو رہا تھا! شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے قدیم مقابلے میں میرے ہم جنس بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ٹکراؤ کا امکان بھی تھا۔ خود سوی بھی پہلے اس خطرے کا ایک مرتبہ اظہار کر چکی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو دلاسا دیا کہ اب تو ایک قدم اٹھا ہی لیا ہے، جو ہو گا اللہ مالک ہے۔ ہماری نیت بہر حال صاف تھی اور ہم کسی برے ارادے سے وہاں نہیں جا رہے تھے۔ اپنے خیالات سے میں نے سوی کو بھی بے خبر نہیں رکھا۔

”میں خود بھی ایسے ہی دوسو سو اور انڈیشوں میں گھری ہوئی تھی جن کا ٹوٹنے اظہار کیا ہے۔“ سوی کہنے لگی۔

اس دوران میں جزیلہ میرے زیر اثر خواب کے سے عالم میں کار ڈرائیو کرتی رہی۔

جب سورج غروب ہو گیا تو دور کسی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔

”جزیلہ! تجھے قدیم اہرام کے قریب منقرع کے غلام جابر سے اسی جگہ ملنا ہے۔ جہاں پہلے ملتی رہی ہے۔“ میں نے جزیلہ کو حکم دیا۔

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ جزیلہ خواب ناک آواز میں بولی۔

پھر آبادی خاصی قریب آگئی، مگر جزیلہ اسے دائیں جانب چھوڑتی ہوئی اپنی کار کو آگے بڑھالے گئی۔ وہ پورا علاقہ دور تک نیم تاریک اور سنسان پڑا ہوا تھا، جس طرف جزیلہ کی کار بڑھ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کے باوجود ابھی تک گہرا اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔

آخر جزیلہ کی کار ایک دیران کھنڈر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اور سوی کار سے کچھ ہی فاصلے پر موجود تھے۔

”یہ بھی تو ممکن ہے اسے سوی کہ منقرع کا کوئی غلام یہاں نہ آئے۔ انہیں مطلع کر دیا گیا ہو کہ جزیلہ کو آج یہاں نہیں آنا۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”اگر ایسا ہوا اے علیالیش، تو پھر ہمارا یہاں تک آنا بے سود ہی ثابت ہو گا۔“

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ خاصے فاصلے پر روشنی نظر آئی، پھر وہ بجھ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ کسی نارچ کی روشنی ہو۔ میں لپک کر جزیلہ کے پاس پہنچ گیا۔

”یہ روشنی کیسی تھی؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”جابر نے اپنی آمد کا اشارہ دیا ہے۔“ جزیلہ نے بتایا۔

”اور تجھے اس کے جواب میں کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنی کار کی ہیڈلائٹس جلا کر بجھانی ہیں۔“ جواب ملا۔

”تو پھر جلدی ایسا کر!“ میں تیزی سے بولا۔

جزیلہ نے میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ نارچ کی روشنی ایک بار پھر جل کر بجھی۔ کچھ

”تو پھر کیسا ہے، تم بتا دو؟“ جابر نے جزیلہ کو گھور کر دیکھا۔ ”بتاؤ تاکہ تم آج یہاں کس لئے آئی ہو؟“

”یقین کر دو جابر، مجھے خود نہیں معلوم کہ..... کہ میں یہاں کیسے آگئی!“ جزیلہ مزید بدحواس ہو گئی۔

اس پر جابر نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ”جزیلہ! تمہیں شاید یہ خوش فہمی ہے کہ نجیب سے قریبی تعلقات کی وجہ سے تم بچ جاؤ گی تو اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو! جو کچھ بھی ہے صاف صاف بتا دو کہ اس جگہ نشاندہی کرانے کے لئے تم کسے اپنے پیچھے لگا کر یہاں لائی ہو؟“

”میں تمہیں کس طرح بتاؤں جابر کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ جزیلہ کی آواز بھرا گئی۔ وہ غالباً سمجھ چکی تھی کہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ اپنی صفائی میں وہ کتنی بھی کیا!

”باہر نکل آؤ!“ جابر کی آواز میں اب حکم تھا۔

”تم..... تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ مجھے..... مجھے ابھی واپس بھی جانا ہے۔“ نجیب کو میرا انتظار ہو گا۔“

”کیا خبر جزیلہ، تمہارا انتظار کس کو ہے! نجیب کو یا تمہاری موت کو!“ جابر کی آواز سرد تھی۔ ”خود ہی کار سے اتر جاؤ ورنہ مجبوراً یہ دونوں تمہیں باہر گھسیٹ لیں گے۔“ جزیلہ کو کار سے اترنا ہی پڑا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ گھبرائی ہوئی لگت رہی تھی۔

”تم دونوں جزیلہ کی کار لے جاؤ اور اچھی طرح ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لو! جو کوئی بھی اجنبی نظر آئے اسے بلا دروغی گولی مار دینا!“ جابر نے اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”میں اس حسین تھلی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کے پر نوچنے پڑیں یا پھر.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بولا۔ ”جلدی واپس آنا!“

جابر کے دونوں ساتھی، جزیلہ کی کار میں بیٹھ گئے۔

”چلو!“ جابر نے جزیلہ کو مخاطب کیا۔ ”تمہاری قسمت کا فیصلہ میں نہیں خود نجیب ہی کرے گا۔“

”تم..... تم شاید اسے فون کرو گے تو..... تو پھر اس سے میری بات بھی کرا دینا۔“ جزیلہ آگے بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔

”کوشش کروں گا تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔“ جابر بولا۔

جدھر ٹارچ کی روشنی دکھائی دی تھی، جزیلہ کو ساتھ لیے جابر اسی طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں اور سومی خاموشی کے ساتھ اس کا تعاقب کرتے رہے۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک عمارت کا ہیولا نظر آیا جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جابر کے قدم اسی سمت اٹھ رہے تھے۔

ذرا دیر میں جابر اس عمارت کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ جزیلہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ سومی کو میں نے اشارہ کیا اور پھر ہم بھی اس عمارت میں گھس گئے۔ جاہ نے اس دوران میں اندر روشنی کر دی تھی۔ وہ جزیلہ کو لیے ایک کمرے میں پہنچا اور اس کی لاش بھی جا

دی۔

وہ کمرہ اپنے سارے سامان سے نشست گاہ معلوم ہوتا تھا۔ جابر نے جزیلہ کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک جانب تپائی پر رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے اور سلسلہ مل جانے پر بولا۔ ”ہیلو! میں جابر بول ہوں..... ہاں نجیب، ضروری ہی کام تھا۔“ پھر وہ جزیلہ کے بارے میں بتانے لگا۔ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو جابر نے کہا۔ ”خود میرا بھی یہی خیال ہے کہ جزیلہ ہمارے دشمنوں کو اپنے پیچھے لگلائی ہے۔ میں نے علاقے کا جائزہ لینے کی خاطر اپنے آدمیوں کو بھیج دیا ہے، ابھی کچھ دیر میں اس کی تصدیق ہو جائے گی..... کیا؟ جزیلہ کی زندگی کا آج آخری دن تھا؟“

”نہیں!“ جزیلہ چیخ اٹھی۔ ”مجھ سے بات کراؤ!“..... نجیب کی مجھ سے بات کراؤ!“ اسی کے ساتھ وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ذرا ٹھہرو نجیب! تمہاری خوب صورت تھلی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس کی یہ آخری خواہش پوری کر دو!“ جابر یہ کہتے ہوئے مسکرایا۔ اس عرصے میں جزیلہ قریب پہنچ چکی تھی۔ جابر نے اس کی طرف نظر اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فون پر بات کرنے لگا۔ ”یہ تو بڑی دلچسپ صورت حال ہے کہ تم نے وہاں اس کی قبر کھدوا لی تھی اور یہ یہاں دفن ہونے آگئی!..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم اس سے بات کرنا نہیں چاہتے نہ سہی..... کیا؟ اگر تم کل خود آرہے ہو تو پھر مجھے آج ہی رات اس اہرام میں اترنا پڑے گا..... ہاں ہاں سرنگ کا جو حصہ گر گیا تھا، اس کی مرمت ہو گئی ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... ہاں میں نے منترع کی سرگوشتیاں سن لی تھیں۔ آئندہ ہفتے سے اس اہرام تک پہنچنے کے لئے کام شروع کر دیا جائے گا۔ ٹھیک ہے، تفصیلی گفتگو تم سے کل ہو.....“

اسی لمحے جزیلہ نے اچانک ٹیلی فون کا ریسپور جابر سے چھین لیا اور چیخ اٹھی۔ ”ہیلو نجیب، میں.....“

دوسری طرف سے غالباً لائن کاٹ دی گئی اور جزیلہ کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے ریسپور جابر کو دے دیا۔

”میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ تمہاری آخری خواہش پوری کر دے، مگر نہیں مانا، مجبوراً ہے۔“ جابر نے کہا۔

”لیکن تم..... تم مجھے قتل نہیں کر سکتے!“ جزیلہ یہ کہتے ہی کمرے کے دروازے کی طرف بھاگی۔

جابر نے کسی چپتے کی طرح اس پر جست لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ میں اگر چاہتا تو جزیلہ کی زندگی بچا لیتا، مگر اس طرح جابر چو کنا ہو جاتا۔ دوم یہ کہ مجھے اس بد کردار آدم زاد کی زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں جزیلہ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی اور دونوں آنکھیں غٹھنوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ جابر اسے چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہوا تھا کہ در سے دستک دینے کی آواز

آئی۔ وہ کمرے سے نکل کر عمارت کا صدر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

آنے والے وہی دونوں آدمی تھے جنہیں جابر نے اردگرد کا جائزہ لینے بھیجا تھا۔

”اس کی لاش یہاں سے اٹھالے جاؤ اور ٹھکانے لگا دو!“ جابر نے جزیلہ کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور اب تم دونوں کو یہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں۔“

وہ دونوں آدمی جزیلہ کی لاش کو وہاں سے اٹھالے گئے۔ جابر نے عمارت کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہم نے جابر کو اب تک اس لئے بھی نہیں چھیڑا تھا کہ اسے آج ہی رات کسی اہرام میں اترنا تھا۔ میں سوچنے لگا، معلوم نہیں کب تک ہمیں اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اسی عمارت میں موجود ایک تہہ خانے کے اندر ایک سرنگ کا دہانہ تھا۔ جابر کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی۔ وہ اسی کی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اور سوی اس کے تعاقب میں تھے۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد سرنگ کا دوسرا دہانہ نظر آیا۔

وہ ایک بڑا سا گول کمرہ تھا جس کے پتھروں بچ ایک اونچے چوترے پر خاصا بڑا تابوت رکھا ہوا تھا۔ تابوت تک پہنچنے کے لئے میڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میری تمام تر توجہ اسی تابوت پر تھی کہ اچانک مجھے مخصوص قسم کی بدبو محسوس ہوئی۔ سوی میرے عقب میں تھی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں تیزی سے پلٹا اور اسی وقت سوی کی چیخ سے اہرام گونج اٹھا۔ سوی کو میں نے ایک قوی جن زاد کی گرفت میں دیکھا۔ یقیناً اس پر قابو پانا میرے لئے انتہائی مشکل تھا۔

”اے علیالیش! مجھے بچالے!“ سوی نے فریاد کی۔

”ماتب کی گرفت میں آکر کوئی جن زادی نکلی ہے جو تو زور لگا رہی ہے!“ قوی جن زاد جیسے غرایا۔ میں نے تڑپ کر قوی جن زاد ماتب پر چھلانگ لگائی تو یہ کوشش مجھے منگی پڑی۔ میں اس کے ایک ہی دھکے میں اہرام کی ایک دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔

”میری راہ کھوئی نہ کر اے علیالیش! مجھے اس حسین جن زادی کو لے جانے دے۔ اگر تو نے میرا پیچھا کیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!“ ماتب نے مجھے دھمکی دی۔

دھمکی دے کر قوی جن زاد ماتب پرواز کرنے والا تھا کہ میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر مجھے یقین سا نہ آیا۔

☆=====☆=====☆

اس قوی جن زاد ماتب کی نظر مجھ پر تھی اور میری نگاہ ماتب کے عقب میں اپنے عزیز دوست یاسف پر جمی ہوئی تھی۔ یاسف کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ بروقت میری اور سوی کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ ہماری طرف سے غافل نہیں رہے گا۔

یاسف کو پیچھے سے ماتب پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر میں اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ماتب کو اپنے اوپر عقب سے حملے کا احساس نہ ہو جائے اور اس کی توجہ میری ہی طرف رہے۔ اگر خیال سے میں نے اسے لٹکارا۔ ”رک جا ماتب! ورنہ پچھتائے گا۔“

اس پر ماتب زور سے ہنسا اور بولا۔ ”روک سکتا ہے تو مجھے روک لے۔“

میرا مقصد پورا ہو گیا کیوں کہ اسی لمحے یاسف نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ ماتب اوپر اٹھتے اٹھتے نیچے گرنے لگا۔ سامنے سے میں نے اس پر جست لگا دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوی کو تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

”اے سوی! تو یہاں سے بھاگ جا!“ یاسف نے چیخ کر کہا۔ ”ہم دونوں دوست اس کافر کے لئے کافی ہیں۔“ اس کے باوجود سوی وہاں سے فرار نہیں ہوئی۔ میں نے اسے ایک عمل پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً یہ وہی خطرناک اور ہلاکت خیز عمل تھا جو آیت مرتبہ ڈھاکہ کے دوران قیام میں بھی ہمارے کام آیا تھا۔ اس وقت بھی اسی عمل کے ذریعے ہم نے ایک کافر جن زاد کو ٹھکانے لگایا تھا۔ میں اسی لئے خاموش رہا اور سوی سے کچھ نہ کہا۔ مجھے اور یاسف کو اب اس وقت تک ماتب کا مقابلہ کرنا تھا جب تک کہ سوی کا عمل پورا ہو جائے۔

عیار یاسف اسے جھکاؤ دے کر نکل گیا، مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ ماتب نے مجھے جکڑ لیا۔ میں اپنے وجود کی تمام تر قوت کے باوجود اس کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ قریب تھا کہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھتا، میرا دوست یاسف تیزی سے پلٹا۔ اس نے پہلو سے ماتب پر ایسا وار کیا کہ وہ بلبلایا اٹھا۔ مجھے موقع ملا گیا۔ ماتب جیسے ہی یاسف پر جھپٹا، میں اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اسی لمحے آدم زاد جابر میری جھپٹ میں آگیا جو ایک طرف حیران پریشان سا کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر ڈھیر ہو گیا۔ معلوم نہیں کس طرح ماتب کو خطرے کا احساس ہو گیا! وہ اس تیزی کے ساتھ اہرام سے نکل کر بھاگا جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ ماتب کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہمارے لئے اسے پکڑ لینا ناممکن تھا۔ میں نے یہ کوشش کی بھی، مگر یاسف نے مجھے روک دیا۔

”رہنے دے اے علیالیش! اب وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ یاسف نے مجھ سے کہا۔

”لیکن اے یاسف! اس کا یوں بچ کر نکل جانا ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں۔“ میں بولا۔

”معلوم ہے مجھے۔“ یاسف نے میری تاکید کی۔ ”وہ کسی بھی وقت پلٹ کر ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔“

اس وقت سوی بھی ہمارے قریب آگئی۔ اس نے عمل ادھورا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ عمل ایسا تھا کہ نامکمل رہ جانے کی صورت میں عمل پڑھنے والے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مجھے بھی اس عمل کی شرائط اور دیگر تفصیلات کا علم تھا۔ اس عمل کی ہلاکت خیزی کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ جن زاد بھی وہیں موجود ہو تا جسے ہلاک کرنے کے لئے عمل پڑھا گیا تھا۔ دوسری صورت میں اس عمل کا صرف اتنا اثر ہوتا کہ وہ قوی جن زاد کم از کم تین دن تک سوی کے قریب نہ آسکا۔ گویا تین دن گزرنے کے بعد ہی وہ سوی کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔

غالباً یاسف اس عمل کی اثر پذیری سے واقف نہیں تھا۔ اس کے باوجود قوی جن زاد ماتب مجھے یا میرے دوست یاسف کو بہر حال نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میری فکر مندی کا اصل سبب یہی تھا۔ عمل پورا ہونے اور ماتب کے فرار میں صرف چند لمحوں کا فرق تھا۔ اگر وہ چند لمحے مزید ہمارے پاس اس اہرام میں

رک گیا ہوتا تو یقیناً مارا جاتا۔

اس موضوع پر یاسف سے مزید کوئی گفتگو کیے بغیر پہلے میں اس آدم زاد جابر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اہرام کے پتھر لیے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں چاہتا تو اس حالت میں جابر کو سفر آخرت پر روانہ کر دیتا، مگر اسے فی الحال خلاف مصلحت سمجھا۔ جابر اور نجیب کے درمیان فون پر ہونے والی گفتگو میں نے سنی تھی۔ جابر نے نجیب کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ”ہاں میں نے منقرع کی سرگوشیاں سن لی تھیں۔ اس اہرام تک پہنچنے کے لئے کام شروع کر دیا جائے گا۔“

ان الفاظ کا مطلب تھا کہ منقرع کے غلام کسی اور اہرام کی کھدائی کا کام شروع کرنے والے تھے۔ یہ کام آئندہ ہفتے سے شروع ہوتا تھا۔

سرنگ کے علاوہ اس اہرام کا جائزہ لینے پر ہمیں ایک جانب سیڑھیاں دکھائی دیں۔ ان سیڑھیوں کے اختتام پر ہم نے ایک رنگ خوردہ آہنی دروازہ دیکھا جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سلاخوں دار آہنی دروازے کی دوسری جانب پتھروں اور مٹی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہی اس اہرام میں اترنے کا اصل رستہ تھا جو نہ جانے کب بند کر دیا گیا تھا یا خود ہی بند ہو گیا تھا۔ منقرع کے غلاموں نے اس اہرام میں اترنے کی خاطر یہ راستہ غالباً دانستہ نہیں اپنایا تھا۔

”اے میرے دوست علیالیش! اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے!“ یاسف نے مجھے مخاطب کیا۔

”ذرا ٹھہراے یاسف!“ میں یہ کہہ کر چوتھے پر رکھے ہوئے تابوت کی طرف بڑھا۔

تابوت کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ڈھکنا اٹھایا تو دیکھا۔ حنوط شدہ لاش کا چہرہ کھلا تھا۔ چہرے پر کوئی محلول ملا گیا تھا۔ اس سے چہرہ سیاہ نظر آرہا تھا۔ لاش کے گرد جو کپڑا لپٹا ہوا تھا، وہ بھی بیگم رہا تھا۔ مجھے ایک ناگوار بو بھی محسوس ہوئی۔ تابوت خاصا بڑا تھا۔ اس میں مجھے سونے کے ظروف نظر آئے جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس تابوت سے خاصے ظروف پہلے ہی نکالے جا چکے ہیں۔ مجھے سونے کا لالچ نہیں تھا۔ میرا مقصد اپنے دشمنوں کو زک پہنچانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس تابوت میں موجود سونے کے تمام ظروف ایک ایک کر کے نکال لیے۔ سوئی نے بھی اس میں میری مدد کی۔ ظروف نکال کر میں نے تابوت پھر بند کر دیا۔

ہم وہ قیمتی ظروف لے کر اہرام سے نکل آئے۔ اب ہمارا دہاں رکنا لا حاصل ہی تھا۔

ابھی تک یاسف سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اسے بھی ہم اپنے ساتھ ستارہ سے قاہرہ لے آئے۔ سونے کے ظروف کو میں نے اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اب ہم ہوٹل مونٹانا کے کمرے میں تھے۔ ہماری ہی طرح یاسف نے بھی انسانی قالب اپنا لیا۔

”اب تو یہ بتا اے یاسف کہ اچانک یہاں کس طرح آگیا؟“ میں نے یاسف کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے دریافت کیا۔

”اے علیالیش! تجھے اور خاص طور پر سوئی کو مشکل میں دیکھ کر مجھ سے رہانہ گیا۔“ یاسف بتانے لگا۔ ”اب سے پہلے بھی کئی بار میں نے تیری اور سوئی کی خبر گیری کی تھی، مگر تم دونوں کو قاہرہ ہی میں دیکھا

تھا۔ آج خلاف توقع جب تم مجھے قاہرہ کے بجائے کہیں اور نظر آئے تو میں چونک اٹھا۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ میں اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر تم پر نظر رکھے رہا۔ پھر میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ جیسے ہی تم اس آدم زاد کا پچھا کرتے اہرام میں داخل ہوئے، مجھے ذہنی قوی جن زاد نظر آگیا۔ ادھر اس نے سوئی کو اپنی گرفت میں لیا، ادھر میں کراچی سے چل دیا۔ میں سمجھ چکا تھا اے علیالیش کہ تو اکیلا اس سے نہیں نمٹ سکے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، تجھے معلوم ہے۔ اب تو مجھے بتا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے؟ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ تجھے آخر ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”تیرے آخری سوال کا جواب تو میں نے تجھے کراچی ہی میں دے دیا تھا۔“ میں بولا۔ پھر یاسف کو میں نے مختصراً تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔

سب کچھ سن کر یاسف نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو ابھی تک اپنے دشمنوں کو ختم نہیں کر سکا!“

”ہاں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آج رات سے پہلے میرے اندازوں کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ شیطان صفت آدم زاد، اہراموں سے سونا نکال رہے ہیں اور ان کی رہنمائی کا فرض کوئی منقرع کی روح انجام دے رہی ہے۔ ابھی تک ہم اس کا بھی کوئی سراغ نہیں لگا سکے کہ وہ کون ہے کہاں ہے۔ تجھے تو خبر ہے کہ کسی روح کا دوبارہ دنیا میں آنا ممکن نہیں، ہمارا قیاس یہ ہے کہ منقرع کی روح کے پردے میں کوئی کافر جن زاد ہے جس نے آدم زادوں کے اس گردہ کو سونے کے حصول کا لالچ دے کر کفر کی راہ پر ڈال دیا ہے۔“ میں نے جو اندازہ لگایا تھا، یاسف سے بیان کر دیا۔

”مجھے تیرے اس قیاس سے پورا اتفاق ہے کہ وہ کوئی کافر جن زاد ہی ہو سکتا ہے جو ان آدم زادوں سے اپنی پرستش کرا رہا ہے۔“ یاسف نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔ ”لیکن یہ تو سوچ اے علیالیش کہ ہمیں اس سے کیا! تیرا مسئلہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینا تھا، سو اس معاملے کو وہیں تک رکھ! ایک قوی جن زاد ملا تب کو تو ہم اپنا دشمن بنا ہی چکے ہیں، ہمارے لئے ابھی اسی سے نمٹنا مشکل ہے۔ ایسی صورت میں کسی اور کافر جن زاد سے دشمنی مول لینا ہمیں منگا پڑ سکتا ہے۔“

”پھر ان حالات میں تیری کیا صلاح ہے اے یاسف!“ پہلی مرتبہ سوئی نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”تم دونوں نمایاں بیوی میری مانو تو نجیب المہندس اور طلال بے کو ختم کر کے یہاں سے چلے چلو۔“ یاسف نے جواب دیا۔

”اور ملا تب؟ کیا وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا؟“ میں بول اٹھا۔ ”تجھے تو معلوم ہے کہ ہم جن زادوں کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“

”ہاں یہ معاملہ ضرور ٹھہرا ہے۔“ یاسف نے اعتراف کیا۔ ”اب تو میں بھی اس کی نظر میں آچکا ہوں۔ موجودہ خطرناک صورت حال میں تو ہمیں مجبوراً ایک ساتھ ہی رہنا پڑے گا تاکہ ایک دوسرے کی ذوالحال بن سکیں۔ مجھے زیادہ فکر سوئی کی طرف سے ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم دونوں میں

سے کوئی ایک جاگ کر پرا دیتا رہے، خطرہ ہو تو دوسرے کو جگا دے۔ اسی طرح ہم سوی کو ملاتب سے بچا سکتے ہیں۔“

”اے یاسف!“ سوی بولی۔ ”تجھے کم از کم تین دن تک تو میری طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس عرصے میں ملاتب میرے قریب نہیں آ سکے گا۔“

”وہ کس طرح؟“ یاسف نے چونک کر پوچھا۔ جواب میں سوی نے اسے پڑھ جانے والے عمل کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔

”اب میں سمجھا کہ تو میری تاکید کے باوجود اہرام سے کیوں نہیں گئی تھی!“ یاسف نے گہرا سانس لیا، پھر کہنے لگا۔ ”اس نے شاید یہ خطرہ بھانپ لیا تھا اسی لئے تیرا عمل پورا ہونے سے پہلے ہی بھاگ نکلا۔ تو وہ عمل مجھے اور علیالیش کو بھی تعلیم کر دے تاکہ ہم بھی اس کے متوجع حملے سے بچ سکیں۔“

”علیالیش تو اس عمل سے واقف ہے۔“ سوی نے بتایا۔ ”ہاں تجھے معلوم نہیں۔ یہ عمل مجھے میرے باپ عزتیل نے سکھایا تھا تاکہ میں قوی جن زادوں سے بچی رہ سکوں، لیکن اے یاسف، یہ اس مسئلے کا عارضی حل تو ہو سکتا ہے، مستقل نہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے اے سوی؟ تو کیا چاہتی ہے؟“ یاسف نے سوال کیا۔

”ملاتب سے آخر کار ہمیں نمٹنا ہی پڑے گا، اگر اب نہیں تو چند روز بعد!“

”ذرا غصہ اے سوی! میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔“ یاسف یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔ ”عمل پڑھتے وقت کیا تیری موجودگی ضروری ہے؟ یا تو دور رہ کر بھی عمل پڑھ سکتی ہے؟ آج اگر تیرا عمل پورا ہو جاتا تو تجھے کیا کرنا پڑتا؟“

”تیرے اس سوال کا جواب تو میں یقینی طور پر نہیں دے سکتی کہ عمل پڑھتے ہوئے میری موجودگی لازمی ہے یا نہیں! یا یہ کہ دور رہ کر بھی یہ عمل پڑھنا ممکن ہے؟ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ عمل پورا ہونے کے بعد مجھے ملاتب پر دم کرنا ہوتا۔ وہ اسی کے ساتھ جل کر خاک ہو جاتا۔“ سوی نے جواب دیا۔

”تو نے جو کچھ کہا، اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عمل پڑھ کے دشمن پر دم کرنے کے لئے تیری موجودگی ضروری ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دور رہ کر بھی عمل پڑھا جاسکتا ہے۔ جب عمل کے آخری الفاظ پڑھنا باقی رہ جائیں تو دشمن جن زاد پر دم کرنے کی غرض سے تو اس تک پہنچ سکتی ہے۔“ یاسف نے اظہار خیال کیا۔

”لیکن اے یاسف، کیا خرابی صورت میں عمل کا درگاہت ہو نہ ہو!“ میں نے کہا۔

”دور رہ کر عمل کے اثر کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ملاتب تین دن تک سوی کے قریب نہیں آ سکتا۔ بول، ایسا ہے کہ نہیں؟“

”ہاں یہ ہے تو سہی!“ میں نے اقرار کیا، پھر پوچھا۔ ”تو یہ تو بتا کہ تجھے کیا تدبیر سوچتی ہے؟“

”تو میرے ساتھ ملاتب کو تلاش کرنے چل۔“ یاسف اپنا ارادہ بتانے لگا۔ ”اور سوی یہیں رہے۔ ویسے بھی اسے تو ملاتب کی طرف سے ابھی کوئی خطرہ نہیں۔“

”یعنی تو یہ چاہتا ہے کہ ہم خود اپنی موت کو دعوت دیں!“

”پہلے میری پوری بات تو سن لے اے علیالیش! دور رہ کر بھی سوی ہم پر نظر رکھ سکتی ہے۔ جب یہ دیکھے کہ ہم نے ملاتب کو ڈھونڈ لیا ہے تو عمل پڑھنا شروع کر دے۔ عمل کے آخری مرحلے میں ملاتب پر دم کرنے کے لئے یہ ہمارے پاس پہنچ جائے۔ ملاتب کو اس طرح دھوکا دے کر مارا جاسکتا ہے۔“ یاسف نے اپنی تجویز بیان کی۔

”اگر اس طرح عمل کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اول تو ایسا ہو گا نہیں۔ اگر یہ صورت پیش آئی تو سوی دوبارہ عمل پڑھنا شروع کر دے گی۔“ یاسف نے جواب دیا۔

”اس دوران میں اگر ملاتب نے تجھے یا مجھے ٹھکانے لگا دیا پھر؟“

”ملاتب سے نمٹنے کے لئے یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ ہم دونوں اتنے کمزور بھی نہیں کہ وہ آسانی سے ہم پر قابو پالے گا۔ حفاظت کی ایک اور صورت یہ بھی ہے اے علیالیش کہ اسے دیکھتے ہی تو بھی عمل پڑھنا شروع کر دے۔ میں کوشش کروں گا کہ کچھ دیر ملاتب کو اپنی ہی طرف متوجہ رکھوں اور تو اپنا عمل پورا کر لے۔“

کچھ دیر ہم اسی پر بحث کرتے رہے۔ سوی نے یہ تجویز رکھی کہ کل رات تک یہ دیکھ لیا جائے، ملاتب خود ہم پر حملہ کرتا ہے یا نہیں! وہ اگر ایسا نہ کرے تو پھر خود اس کی تلاش کا خطرہ مول لیا جائے۔

سوی کو یقین تھا کہ ملاتب خاموش نہیں بیٹھے گا۔ مجھے یہ تجویز مناسب معلوم ہوئی، سو میں نے تاکید کی۔ مجبوراً یاسف کو ہم دونوں کی بات ماننی پڑی، پھر بولا۔ ”اس کے علاوہ ایک مسئلہ اور بھی درپیش ہے۔ کراچی سے چلتے وقت جلد بازی کے سبب اصغری بیگم کو میں اپنی روائگی سے آگاہ نہیں کر سکا۔ تم دونوں کو تو خبر ہے، میرے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر وہ کس قدر خفا ہو گی! معلوم نہیں مجھے یہاں سے واپسی میں کتنی دیر لگ جائے! یہاں سے لوٹ کر گیا تو اصغری مجھے ہرگز نہیں بخشے گی، مار پیٹ پر بھی اتر آئے تو عجب نہیں۔ خیر میں یہ بھی بھگت لوں گا، مگر اسے مناؤں گا کیسے!“

”شرم کر اے یاسف!“ میں دھیرے سے ہنسا۔ ”تو جن زاد ہو کر ایک آدم زادی سے مار کھاتا ہے اور اتنا ڈرتا بھی ہے۔“

”ہائے علیالیش، تجھے کیا پتا کہ اس کے نازک نازک حسین ہاتھوں سے پنپنے میں مجھے کتنا مزہ آتا ہے! کبھی تجھے مارا ہے سوی نے؟“ یاسف بھی ڈھٹائی سے ہنسا۔

”خدا نہ کرے اے یاسف کہ میں کبھی علیالیش پر ہاتھ اٹھاؤں۔“ سوی بول اٹھی۔ ”ویسے یہ تیری طرح آوارہ بھی تو نہیں۔“

”اے سوی! تجھے شاید اس نے اپنے کروتوت نہیں بتائے۔ میں تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔“ یاسف کہنے لگا، پھر گویا مجھے دھمکی دی۔ ”ہتاؤں تیرے کارنامے؟“

”تو کیا بتائے گا اے یاسف! مجھ سے علیالیش کا ماضی چھپا ہوا نہیں۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔“

ہے۔" سوی بولی۔
"لیکن مجھے پورا یقین ہے، ایک بات نہیں بتائی ہو گی کہ یہ آج تک ایک آدم زادی کو چاہتا ہے۔"
"اے یاسف! مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ اس آدم زادی کا نام زمرس ہے اور تو بھی اس کے چکر میں تھا۔"

اس پر یاسف حیران سا ہوا اور کہا۔ "پھر بھی تو نے اس کی خبر نہیں لی اے سوی!"
"یہ تو خود اس کے گم ہو جانے پر بہت دکھی ہے، پھر میں کیوں اس پر لعن طعن کر کے اسے اور دکھ پہنچاتی!"
"مجھے یوں لگتا ہے کہ تو اسے ڈھیل دے کر بگاڑ دے گی۔ بیویاں تو اپنے شوہروں کو نکیل ڈال کر رکھتی ہیں، تو آخر کیسی ہے اے سوی!"
"کیسی ہی ہوں جیسی مجھے ہونا چاہیے۔ تیرے دوست کو میں اپنا بھائی خدا سمجھتی ہوں۔" سوی نے پُر اعتماد آواز میں کہا۔

"پھر تو تیرا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر اصغری کو پتا چل جائے کہ اس کے سوا بھی میں کسی کو چاہتا ہوں تو میرا جینا حرام کر دے۔"
"اپنا اپنا اندازہ محبت ہے۔ میرا بس چلے تو علیا لیش کی آدم زاد محبوبہ زمرس کو تلاش کر کے اس سے ملا دوں۔"

میرے زخم محبت ہرے ہونے لگے تو میں بول اٹھا۔ "بس کراے سوی! یہ ذکر چھوڑ دے۔"
"تو پھر اے علیا لیش! میں کراچی ہو کر آتا ہوں ابھی۔" یاسف پھر اصل موضوع گفتگو کی طرف لوٹ آیا۔
"موجودہ حالات میں تم دونوں کو الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔" سوی کے گلی۔ "اے علیا لیش! تو بھی یاسف کے ساتھ ہی رہ!"

"اور تو جو یہاں اکیلی رہے گی!" میں بولا۔
"مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ پھر تم دونوں کو کراچی جا کر واپسی میں دیر ہی کتنی لگے گی! سونے کے یہ ظروف بھی ساتھ لے جا اے علیا لیش! انہیں اپنی کوٹھی میں رکھ آئیو۔ ان کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" سوی یہ کہہ کر ابھی اور میرا سوٹ کیس کھولنے لگی۔

سوی کی یہ بات میں نے مان لی کہ مجھے اور میرے دوست یاسف کو ساتھ رہنا چاہیے۔ اس طرح ہم دونوں ہی کے لئے خطرہ کم ہو جاتا۔ اس وقت میرے وہم دنگان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں سوی کو قاہرہ میں تنہا چھوڑ کر شدید غلطی کر رہا ہوں، مگر آنے والے وقت کی کسے خبر ہوتی ہے!
ذرا ہی دیر میں یاسف کے ساتھ ہی میں بھی قاہرہ سے کراچی جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔ سونے کے ظروف سوی نے ایک چادر میں باندھ کر مجھے دے دیئے تھے۔ وہ گھڑی میرے پاس تھی۔ میں اسی لیے

پہلے اپنی کوٹھی میں اترا۔ یاسف بھی میرے ساتھ تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ یاسف کو میں اپنی کوٹھی کے لان میں چھوڑ گیا تھا۔ میں اپنی خواب گاہ کی ایک الماری میں سونے کے ظروف رکھ کر لوٹ رہا تھا کہ میری نگاہ عمارت کے صدر دروازے پر پڑی تو چونک اٹھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ یہ بہر حال خلاف معمول بات تھی۔ میرے خیال میں حبیب یا اس کے گھر والے ایسی بے پروائی نہیں کر سکتے تھے کہ دروازہ کھلا ہوا چھوڑ دیں۔ بہ ظاہر کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سب محو خواب ہوں۔

کہیں کوٹھی میں چور یا ڈاکو تو نہیں گھس آئے؟ میں نے سوچا کیوں کہ پہلے بھی ایک مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ ایسی خیال سے میں نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا، مگر میرا قیاس غلط ثابت ہوا۔ ہاں مجھے ایک بات پر ضرور تعجب ہوا۔ کوٹھی کے جس حصے میں حبیب اور اس کے اہل خانہ کی سکونت تھی، وہاں مجھے بلیوں کی چھوٹی نوجوان بہن نفیس جہاں دکھائی نہ دی۔ نفیس جہاں غائب تھی اور کوٹھی کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس سے میرا ماننا ٹھنکا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گزربو ہے۔

میں اسی ادھیڑن میں واپس یاسف کے پاس پہنچ گیا۔ یاسف سے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ مجھے لان میں ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بتایا۔ "ادھر بیڑوں کے پیچھے کوئی آدم زادی اور ایک آدم زاد بیان وفا باندھ رہے ہیں۔ مجھے تو وہ بلیوں جہاں کی چھوٹی بہن لگتی ہے۔"

یہ سن کر مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ نفیس جہاں ایسی نہیں تھی۔
"اے علیا لیش! مجھ سے تو نے عہد لے لیا تھا کہ اسے نہ چھینڑوں اور میں اپنے عہد پر قائم رہا۔ اب تو خود ہی دیکھ لے کہ وہ کیا مکمل کھلا رہی ہے!" یاسف نے مزید کہا۔
"چل دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ دوسرا کون ہے! یقیناً اسے کسی عیار نوجوان نے دھوکا دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔" میں یہ کہہ کر اس طرف بڑھا جہاں یاسف نے اشارہ کیا تھا۔ یاسف بھی میرے پیچھے ہولیا۔ مجھے اس نوجوان آدم زاد سے زیادہ نفیس جہاں پر غصہ تھا کہ وہ کس طرح ہنک گئی۔
"تم..... ارے تم یہ..... یہ کیا کر رہے ہو اشرف؟" تیز تیز سانپوں کے درمیان مجھے نفیس جہاں کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز میں احتجاج تھا۔

"اب..... اب مجھ سے اور زیادہ صبر نہیں ہوتا۔" مردانہ آواز بیڑوں کے پیچھے سے ابھری۔
"لیکن یہ..... یہ سب غلط ہے، گناہ ہے۔ شادی سے پہلے....."

"خاموش پڑی رہو!" مردانہ آواز میں سختی آگئی۔ "تم نے اب تک جو کچھ کہا، میں خاموشی سے مانتا رہا۔ اپنے والدین کو بھی تمہارے یہاں رشتے کے لئے بھیج دیا۔ مجھ سے تم اور کیا چاہتی ہو؟ تمہارے گھر والوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ تمہارے مقصود میاں کی واپسی تک مجھ سے انتظار نہیں ہو گا۔ کیا پتا مقصود میاں اس رشتے سے انکار کر دیں۔ پھر تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو میری بات مان لو ورنہ میں دوسرا راستہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔" انہی الفاظ کے ساتھ گمراری دار

چاقو کھولنے کی آواز بھی آئی۔ اس کا مقصد نفیس جہاں کو خوفزدہ کرنا ہی تھا۔

میں نے اس عرصے میں اس نوجوان آدم زاد اشرف کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ برابر والی کوٹھی اسی کی تھی۔ اس کا باپ ایک تاجر تھا۔ جس بات سے مجھے دکھ ہوا، وہ یہ تھی کہ اشرف عشق کا نہیں ہوس کا بندہ تھا۔ اس کا ”طریقہ واردات“ ذرا مختلف تھا۔ وہ اپنے متوقع ”شکار“ کے گھر اپنے والدین کو رشتے کے لئے بھیج دیتا۔ یوں وہ اسے شکار کو اعتماد میں لے لیتا اور حصول ہوس کے بعد رشتے سے انکار کر دیتا۔ اس طرح کئی معصوم لڑکیوں کو وہ اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا۔ صورتِ شکل پُرکشش تھی اس لئے لڑکیاں آسانی سے اس کے جال میں پھنس جاتیں۔ نفیس جہاں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

”دیکھو میں کتنا ہوں اب بھی مان جاؤ ورنہ.....“ اس نے دھمکی کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نن..... نہیں!“ نفیس جہاں کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔ ”تم..... تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے! میں..... میں شور مچا دوں گی۔“

”اور میں اس نے پہلے تمہاری یہ مہراجی دار گردن.....“

”ہٹاؤ..... میری گردن سے یہ..... یہ چاقو کی نوک ہٹاؤ!“ نفیس جہاں کی آواز سے دہشت جھلکنے لگی۔

”اب تو چاقو کی یہ نوک اسی وقت تمہاری گردن سے ہٹے گی جب.....“ اشرف کی زبان سے ناشائستہ الفاظ ادا ہوئے۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے لپک کر اشرف کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ میری نظر میں اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا اور میں نے اسی پر عمل کیا۔ دوسرے ہی لمحے اشرف کے ذہن کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا۔ اس نے نفیس جہاں سے اعتراف جرم کر کے معافی مانگ لی۔

”تو..... تو تمہاری محبت کے دعوے جھوٹے تھے اور..... اور تم..... تم مجھے..... میرے دامن پر گناہ کا داغ لگانا چاہتے تھے! تم نے مجھے محبت کا فریب دیا۔ میں اب تمہارے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں! آج کے بعد کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا کہ میں نے تمہارا اصل چہرہ دیکھ لیا ہے۔“

نفیس جہاں جوش جذبات میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

نفیس جہاں کے معصوم ذہن سے میں نے اشرف کی محبت کے نقوش مٹا دیے، دوسری جانب اشرف کے ذہن سے نفیس جہاں کے حصول کا خیال نکال دیا۔ اشرف کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ نفیس جہاں بھی اس عرصے میں وہاں سے جا چکی تھی۔

”اے علیا لیش! اٹو نے دیکھ لئے اس آدم زادی کے کر تو!“ یاسف نے چپتی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

”اے دھوکا دیا گیا تھا۔ یہ اس کی معصومیت کا ثبوت ہے کہ وہ فریب کھا گئی اے یاسف!“ میں دھیرے سے بولا، پھر اشرف کا ذہن پڑھ کر جو کچھ معلوم کیا تھا، بتا دیا۔

”اچھا اب یہاں سے چل! امغری میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“ یاسف نے کہا۔

پھر وہاں سے یاسف کی کوٹھی پہنچنے میں ہمیں دیر نہ لگی۔ امغری کیوں کہ یاسف کی حقیقت سے واقف نہیں تھی اور اسے اپنی طرح ایک آدم زادی سمجھتی تھی اس لئے یاسف نے انسانی قالب اختیار کر لیا۔ میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یاسف اب پیر برکت علی شاہ کے قالب میں نظر آ رہا تھا۔ وہ کوٹھی کے پھانک پر کھڑا ہوا دستک دینے لگا۔ ذرا ہی دیر میں اس کے ایک ملازم نے آکر پھانک کا ذیلی دروازہ کول دیا۔

”بیگم صاحبہ جاگ رہی ہیں یا محو خواب ہیں؟“ یاسف نے زن مریدوں کی طرح ملازم سے دریافت کیا۔

ملازم نے بتایا کہ امغری جاگ رہی ہے اور سخت غصے میں ہے۔ یاسف تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت کی طرف بڑھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک شرارت سوچی۔ یوں میرے دوست یاسف کو بھی اپنی کوٹھی میں زیادہ دیر نہ رکنا پڑتا، لیکن میں نے جلد بازی سے کام نہ لیا۔

یاسف جیسے ہی اندر پہنچا امغری اس پر برس پڑی۔ ”کہاں چلے گئے تھے تم؟“

”اپنے ایک مرید کے گھر ضروری کام سے گیا تھا۔“ یاسف نے بہانہ بنایا۔

”لیکن تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں خواب گاہ میں چلی جاؤں، تم ابھی آرہے ہو! سچ بتا دو، کہاں گئے تھے؟ ورنہ تم مجھے جانتے ہو۔ کسی مرید کے گھر گئے تھے یا مریدہ کے گھر؟ اور اگر جانا اتنا ہی ضروری تھا تو مجھ سے کہہ کر کیوں نہیں گئے؟ بولو، جواب دیتے ہو کہ اتاروں جوتی!“ امغری کا سرخ و سفید چہرہ غصے کی زیادتی کی وجہ سے اور زیادہ سرخ ہو رہا تھا، ستواں ٹاک کے چھوٹے چھوٹے تھننے پھڑک رہے تھے۔

”یقین کرو چندا، میں کسی مریدہ کے گھر نہیں گیا تھا۔“ یاسف کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ آدم زاد عشق ہم جن زادوں کو بھی بزدل بنا دیتا ہے میں نے سوچا۔ ”بس جلدی میں تم سے جانے کی اجازت لینا بھول گیا۔ دراصل میرے اس مرید کا بھتیجا سخت بیمار ہے۔ اس پر ایک جینیہ عاشق ہو گئی ہے۔ جلد ہی اس بے چارے کی شادی ہونے والی ہے۔ اگر میں نے جینیہ سے اس کا پتہ نہ چھڑایا تو شادی کے بعد جینیہ اسے نوبیاہتا بیوی کے پاس نہیں جانے دے گی۔ میرے مرید نے اپنی بیٹی کی شادی بھتیجے سے کرنی ہے۔ یہ دو انسانوں کی زندگی کا سوال ہے۔ میں نے اپنے مرید سے وعدہ کر لیا ہے کہ آج ہی رات اس کے ساتھ موٹر میں حیدر آباد چلوں گا۔ اس کا بھتیجا حیدر آباد میں رہتا ہے۔ مجھے ممکن ہے، حیدر آباد میں جینیہ کو اس کے بھتیجے پر سے اتارنے میں کچھ دن لگ جائیں اسی لئے تم سے حیدر آباد جانے کی اجازت لینے.....“

”ہرگز نہیں!“ امغری بات پوری ہونے سے پہلے ہی پھنکاری۔ ”اگر تم نے گھر سے باہر قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا!“

”دیکھو مان جاؤ! امغری بیگم!“ یاسف نے عاجزی سے کہا اور آگے بڑھ کر امغری کے شانے پر ہاتھ

رکھ دیا۔

اصغری نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غصے سے بولی۔ ”مجھے ہاتھ نہ لگانا، بتا دیا ہے میں نے!“
معلوم نہیں یاسف کو منت ساجت کرنے اور اصغری سے اپنی بات منوانے میں اور نہ جانے کتنی دیر لگ جاتی! وہ اصغری کو منانے کے لئے اس کی خوشامد کر رہا تھا حالانکہ وہ دوسرا راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔
میں نے جو کچھ کیا، یاسف کے لئے بھی ممکن تھا، لیکن اصغری کے معاملے میں یقیناً وہ اپنی جتنی صفات کو دانستہ بروئے کار نہیں لاتا تھا۔ شاید اصغری کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے اس کے کسی جذبے کو تسکین ملتی تھی۔ پوری طرح ہر معاملے میں با اختیار اور بالا دست ہونے کے باوجود کوئی تو ایسا ہوتا جو اس سے نہ ڈرتا، اس کے رعب میں نہ آتا، اس پر ہاتھ اٹھا سکتا اور اصغری یہ فرض بہ خوبی ادا کر رہی تھی۔
میں نے جیسے ہی اصغری کو اپنے اثر میں لیا، اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ پھر جب اس نے یاسف کو مخاطب کیا تو آواز میں نرمی تھی۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو! میں تو تمہاری کنیز ہوں! عورت تو اپنے مرد کے پیروں کی جوتی ہوتی ہے۔“ اصغری بدلے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

یاسف یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور اس نے چونک کر کہا۔ ”اصغری بیگم! یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا؟..... ابھی تو تم ٹھیک تھیں!“

”میں اب بھی ٹھیک ہوں۔ تمہیں مرد ہو کر مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے! تم جب بھی جہاں جانا چاہو، چلے جاؤ۔“

اصغری کی خواب ناک آواز نے آخر بھانڈا پھوڑ ہی دیا کہ وہ میرے زیر اثر ہے۔ یاسف نے اسی لئے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا، مگر کچھ بولا نہیں۔ وہ یقیناً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔
اس نے اصغری سے کہا۔ ”تو پھر میں چلتا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا!“

”میری طرف سے کوئی فکر نہ کرنا۔ تم جس کام سے جا رہے ہو، اللہ تمہیں اس میں کامیابی دے۔“ اصغری کسی فرماں بردار بیوی کی طرح بولی۔

یاسف اس موقع کو غنیمت جان کر میرے ساتھ فوراً باہر نکل آیا۔ ملازم کو آواز دے کر اس نے پھانک بند کر لینے کو کہہ دیا تھا۔

کوٹھی سے باہر آتے ہی یاسف مجھ سے کہنے لگا۔ ”اے علیالیش! ٹوٹے یہ کیا کیا! سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا!“

”مجھے مزے کی پڑی ہے اے یاسف! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمیں اب تک واپس قاہرہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ ایک تو نفیس جہاں کو پیش آنے والے واقفے کی وجہ سے پہلے ہی ہمیں دیر ہو چکی ہے، پھر یہاں تو اپنی محبوبہ کی ناز برداریوں میں لگ گیا۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ معلوم نہیں مجھے کیوں اضطراب سا محسوس ہو رہا ہے۔ خدا کرے سوئی خیریت سے ہو۔“ میں نے یاسف سے جو کچھ کہا، غلط نہیں تھا۔ میرے احساسات ایسے ہی تھے۔

”سب تیرا وہم ہے۔“ یاسف بولا۔ ”سوی کو کچھ نہیں ہو گا۔ تین دن تک ملا تب اس کے قریب نہیں آسکتا۔ سوی کو کسی اور سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے! آچلتے ہیں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی یاسف انسانی قالب چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

نصف شب ہو رہی تھی اس لئے وہاں کوئی آدم زاد دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا جو یاسف کو اچانک غائب ہوتے دیکھ لیتا۔

چند ہی لمحوں میں ہم پرداز کرتے ہوئے قاہرہ پہنچ گئے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خالی بستر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ سوی وہاں نہیں تھی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ بستر پر بھیجی ہوئی چادر دیکھ کر صاف پتا چل رہا تھا کہ سوی اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی۔ آدھی چادر فرش پر پڑی تھی۔

کچھ دیر کو میں گم صم رہا اور پھر یاسف کی آواز سن کر چونکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تو ٹھہراتا کیوں ہے اے علیالیش! ہم ابھی پتا لگاتے ہیں کہ سوی کہاں ہے!“

”دیکھ لے اے یاسف، میرا اندیشہ غلط تو نہیں تھا!“ میری آواز بھاری ہو گئی۔

”سوال یہ ہے ملا تب تو اس کے قریب آ نہیں سکتا تھا پھر..... پھر کون.....“

یاسف نے مزید اور کیا کہا، سن کر بھی جیسے میں نے نہیں سنا۔ ایک امکان کو ہم نے نظر انداز ہی کر دیا تھا کہ ملا تب، سوی کو اغوا کرانے کے لئے اپنے کسی دوست جن زاد سے بھی مدد لے سکتا تھا۔ پھر بھی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ سوی اس جن زاد کی گرفت سے نکلنے کے لئے بھی تو عمل پڑھ سکتی تھی۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں اسی سوال پر غور کرنے لگا۔ سوی کی خوشبو پر اس تک پہنچنا میرے یا یاسف کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا، لیکن مصلحت کے تحت میں نے فوری طور پر ایسا نہیں کیا۔

”تو کن سوچوں میں گم ہے اے علیالیش؟ چلتا کیوں نہیں؟“ یاسف نے مجھے ٹوکا۔

”جتنا ہوں تجھے کہ ہم سے کیا فاش غلطی ہوئی ہے!“ میں نے کہا اور پھر یاسف کو اپنے قیاس سے آگاہ کر دیا۔

”ہاں یہ ممکن تو ہے۔“ یاسف نے تائید کی۔ ”واقعی ہم نے یہ سوچا ہی نہیں تھا۔“

”سوی کی تلاش میں جانے سے پہلے میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے!“ میں نے یہ کہہ کر اپنے تصور کی قوت کو متحرک کیا۔

جلد ہی مجھے سوی نظر آگئی۔ مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا کہ سوی نے اغوا ہونے کے بعد فرار کی کوشش کیوں نہیں کی؟ وہ بے ہوش تھی۔ اسے اغوا کر کے لے جانے والا جن زاد یقیناً قوی ہو گا۔ اسی لئے اس پر بے ہوشی مسلط کر دی تھی۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ سوی فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو وہ کھنڈرات مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگے۔ مزید جائزہ لینے اور غور کرنے پر مجھے پتا چل گیا کہ وہ کون سی جگہ ہے! میں جب پہلے یاسف کے ساتھ مصر آیا تھا وہاں سے بھی گزرا تھا۔ قدیم ترین اہراموں کے اس علاقے میں ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ وہاں کہیں کافر جن زادوں کی آبادی نہ ہو! یہ الا قصر کا علاقہ تھا۔ اہراموں کے علاوہ یہاں قدیم مندر اور

عبادت گاہیں بھی ہیں۔ یہ علاقہ شاہان مصر کا دار الحکومت بھی رہ چکا ہے۔ یہاں قدیم شاہی محلات بھی ہے۔ اسی سبب اس کا نام الاقصر بڑ گیا ہے جو قصر کی جمع ہے۔

”کچھ سراغ ملا اے علیالیش؟“ کچھ دیر میں یاسف نے مجھ سے سوال کیا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ تصور کا سلسلہ اب منقطع ہو چکا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے یاسف کو بتایا۔ ”وہ ایک خطرناک جگہ ہے اور شاید وہاں کافر جن زادوں کی آبادی بھی ہے۔ ہم جب پہلے مصر آئے تھے تو اسی خطرے کے پیش نظر وہاں رہے نہیں تھے۔“ پھر مجھے جو کچھ پتا چلا تھا، یاسف کو اس سے آگاہ کر دیا۔

”وہاں جانے میں خطرہ تو ہے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے ہمیں سوی کو ہوش میں لانا پڑے گا تاکہ وہ بھی ہماری جدوجہد میں ساتھ دے سکے۔“

”مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے کہ ملاتب نے ہمیں اب تک کیوں نہیں چھیڑا؟“ یاسف بولا۔

”اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ سوی کو قابو میں کرنا چاہتا ہوگا۔ ٹھہراؤ کہ اس کا ملاتب ہماری راہ میں نہ آئے، ہم اس کی تدبیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ ہمیں اس کا نام بھی معلوم ہے اور اسے دیکھ بھی چکے ہیں جو عمل کے لئے ضروری ہے۔ سوی کی طرف سے مطمئن ہو کر اب وہ یقیناً ہم پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا ہوگا۔“ پھر میں نے یاسف کو عمل کے الفاظ یاد کرائے۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی وہ عمل پڑھنے لگے۔

ابھی ہم عمل پڑھ ہی رہے تھے کہ مجھے کمرے میں مخصوص نو محسوس ہوئی اور میں چونک اٹھا۔ میں نے بد ذات ملاتب کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا بھیا تک وجود ہمیں اپنی گرفت میں لینے کے لئے ہماری طرف بھٹ رہا تھا۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میں نے یاسف کو فرار ہونے کا اشارہ کیا اور بھاگ نکلا۔ اب تک میں نے عمل پڑھنا ترک نہیں کیا تھا۔ میں تو خیر ملاتب کی گرفت میں آنے سے بچ گیا مگر یاسف کو اس خبیث نے جکڑ لیا۔ اونچی پرواز کرتے ہوئے اچانک میں نے فضا میں غوطہ لگایا۔ عمل پڑھنا اب بھی جاری تھا۔ پوری قوت کے ساتھ میرا آتش وجود ملاتب سے ٹکرایا۔ اسی لمحے یاسف نے بھی زور لگایا اور ملاتب کی گرفت سے نکل گیا۔ ہم دونوں دوبارہ بھاگے، لیکن ملاتب ہم سے کہیں زیادہ طاقتور اور پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے ہمیں اپنی دسترس سے نکلنے نہ دیا۔ اس کی قوت پرواز ہم سے دگنی تھی۔ اس مرتبہ میں نہ بچ پایا۔ اس نے مجھے جکڑ لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے پیس ڈالے گا۔ اس کی گرفت اتنی ہی سخت تھی۔ پھر اس عیار کو پہلے ہی کی طرح خطرے کا احساس ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے فضا میں اچھال دیا۔ میں نے اس کے وجود کو انتہائی تیز رفتاری سے ایک سمت پرواز کرتے دیکھا۔ یاسف اس کے پیچھے لپکا اور میں نے بھی اس کا تعاقب کرنے میں دیر نہیں کی، لیکن درمیانی فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہماری رفتار اس کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اور یاسف کو وہ باری باری اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ اس سے ہماری طاقت جیسے آدمی رہ گئی تھی۔ اس وقت تک میں اور یاسف اپنا اپنا عمل پورا کر چکے تھے۔

”اے یاسف! وہ بڑا ہی چالاک اور عیار ہے۔“ میں کراہتے ہوئے بولا۔ ”اس مرتبہ بھی وہ بچ کر نکل گیا اور ہم عمل پورا نہ کر سکے۔“

یاسف کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی کراہ رہا تھا۔ میں نے ایک مختصر عمل پڑھ کر یاسف پر دم کیا تو اس کی حالت سدھر گئی۔ یہی عمل میں نے اپنے اوپر بھی دم کر لیا۔ میرے وجود میں جو خصلت سے بھڑک رہے تھے، سرد پڑ گئے، انہی کے ساتھ توانائی بھی لوٹ آئی۔

”یوں لگتا ہے اے علیالیش کہ اس حرام زادے کو کسی طرح پتا چل جاتا ہے، کوئی عمل اس کے خلاف پڑھا جا رہا ہے ورنہ وہ دونوں مرتبہ فرار نہ ہو جاتا۔“ یاسف میرے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہم دونوں پر بھاری پڑنے کے باوجود اس کا میدان چھوڑ کر بھاگ جانا اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔“

”خیر ہم نے عمل تو پورا کر ہی لیا۔ اب وہ کم سے کم تین دن تک تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ میں نے یاسف کو دلاسا دیتے ہوئے خود کو بھی گویا تسلی دی۔

”ایک عالم جن زادی کی بیٹی کو اپنی بیوی بنا کر تو نے اچھا ہی کیا اے علیالیش! تجھے اس طرح بہت سے عمل معلوم ہو گئے۔ ابھی تو نے مجھ پر جو عمل پڑھ کر دم کیا، یہ بھی بہت حیرت انگیز ہے۔ اس سے میں پہلے ہی کی طرح تروتازہ ہو گیا ورنہ اس خبیث ملاتب نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔“ یاسف نے کہا۔

”آ اے یاسف! اب الاقصر چلنے ہیں تاکہ سوی کو قید سے رہائی دلا سکیں۔“ یاسف کی بات کو نظر انداز کر کے میں بولا۔

اب ہم تیز رفتاری سے پرواز کرنے کے اہل تھے۔ ہمیں الاقصر پہنچنے میں دیر نہ لگی، لیکن ہم فوری طور پر نیچے نہیں اترے۔ ہم اوپر ہی اوپر پرواز کرتے ہوئے اس علاقے کا جائزہ لیتے رہے۔ مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ بد ذات ملاتب فرار ہو کر الاقصر پہنچ جائے گا۔

☆=====☆

ملاتب تما نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مجھے ایک اور قوی جن زاد نظر آیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو رہی ہے۔ ان دونوں سے ہم خاصی بلندی پر تھے اور ان کی باتیں سننا ہمارے لئے اسی سبب ممکن نہیں تھا۔ میں نے یہ جاننے کے لئے کہ وہ کس بات پر جھگڑ رہے ہیں، اپنی ایک پراسرار قوت کو متحرک کر لیا۔ اس سے پہلے میں نے یاسف کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”اے شامرو! تو وعدہ خلافی کر رہا ہے۔“ مجھے ملاتب کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ ”یہ سراسر امانت میں خیانت ہے۔“

”تجھ سے میں نے جب وعدہ کیا تھا تو اس حسین جن زادی کو دیکھا نہیں تھا۔ پہلے تو سہی یا میں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے! تین دن بعد تو وہ تیرے ہی قبضے میں ہو گی۔ پھر میں اسے ایک نظر بھی نہیں

دیکھوں گا۔" دوسرا قوی جن زاد شامہ کہنے لگا۔

"تجھے خبر نہیں اے شامہ! وہ کوئی عام جن زادی نہیں ہے۔ وہ بڑے خطرناک اور ہلاک کر دینے والے عمل جانتی ہے۔ میں خود اس کے ایک عمل سے مرتے مرتے بچا ہوں۔" ملاط کچھ نرم پڑ کر شامہ کو سمجھانے لگا۔ "ہوش میں ہی آتے ہی وہ عمل پڑھنا شروع کر دے گی۔ پھر تو اسے چھوڑ کر نہ بھاگا تو مارا جائے گا۔"

"یہ بتا کر تو نے بت اچھا کیا اے ملاط!" شامہ دھیرے سے ہنسا۔

"کیوں کیا تیرے پاس اس کا کوئی توڑ ہے؟" ملاط نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں!..... میں اس فتنہ گر کو ہوش ہی میں نہیں لاؤں گا۔" شامہ نے ہنس کر

بتایا۔

"تو میں یہ سمجھ لوں اے شامہ کہ تو باز نہیں آئے گا؟" ملاط کی آواز سے پھر غصہ جھلکنے لگا۔

"اگر تو یہ نہیں چاہتا کہ تیرا دوست بھی کچھ دن عیش کر لے تو اپنی امانت اٹھا کر یہاں سے لے

جا!" شامہ عیاری سے بولا۔

"تجھے خبر ہے کہ میں تین دن تک اس کے قریب نہیں جاسکتا اسی لئے میری مجبوری سے فائدہ اٹھا

رہا ہے!" ملاط غرایا۔

"تو پھر کس لئے جل بھن رہا ہے! مبرک۔" شامہ نے کہا اور واپسی کے لئے مڑنے لگا۔ اس کے

عقب میں دور تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے۔

"کاش میں نے تجھ پر بھروسہ نہ کیا ہوتا اے شامہ! اے عہد شکن!" ملاط خود کلامی کے سے

انداز میں بڑبڑاتا ہوا وہیں رہ گیا۔

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ ملاط نے اپنے جن زاد دوست شامہ ہی کے ذریعے سوی

کو اغوا کرایا تھا۔ اس نے وجہ بھی بتا دی ہوگی کہ ایک عمل کے نتیجے میں تین دن تک سوی کے قریب

نہیں جاسکتا۔ اسی کے ساتھ ملاط نے شامہ سے امانت میں خیانت نہ کرنے کا وعدہ بھی لے لیا ہوگا۔

سوی کو دیکھ کر شامہ عہد شکنی پر اتر آیا تھا۔ ایک شامہ ہی کیا، سبھی جن زاد ان معاملات میں اپنی زبان

سے پھر جاتے تھے۔ یہ جان کر ہی میرے وجود میں چنگاریاں سی جھنسنے لگی تھیں کہ بد بخت شامہ بے ہوشی

کے دوران میں سوی کو بھیجوڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کے ہٹاک عراٹم کو خاک میں ملانے کی یہی ایک صورت

تھی کہ میں اسے جلا کے خاک کر دیتا۔ میرا جو ارادہ تھا، اس سے میں نے یاسف کو آگاہ کر دیا۔ یہ اچھائی

ہوا تھا کہ ہم فوری طور پر نیچے نہیں اترے تھے۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، یاسف کو بھی لفظ بہ لفظ بتا دیا۔

عمل پڑھتے ہوئے شامہ کا میری نظر میں رہنا ضروری تھا۔ اسے میں نے جہاں دیکھا تھا، وہاں سے

کچھ فاصلے پر سوی ایک کھنڈر میں بے ہوش پڑی تھی۔ اب یہ موقع نہیں تھا کہ میں، سوی کو ہوش میں

سکتا۔ شامہ مجھ سے پہلے سوی تک پہنچ جاتا۔ میں نے جو تدبیر سوچی تھی، اس پر عمل کرنے کے لئے

میرے دوست یاسف کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑی۔ یاسف نے دوستی کا حق ادا کیا اور اس پر آمادہ

لیا۔ اسے یہ فرض انجام دینا تھا کہ شامہ، بے ہوش سوی کے قریب پہنچ بھی جائے تو اپنے ہٹاک مارے کی تکمیل فوری طور پر نہ کر سکے۔ یاسف کو اتنی دیر تک اسے روکے رکھنا تھا کہ میں اپنا عمل پورا

رہوں۔

ہم دونوں دوست پرواز کرتے ہوئے جب نیچے اترے تو شامہ، سوی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں

بے ہوش ہوئے ایک محرابی دروازے کی آڑ میں اس طرح چھپ گیا کہ شامہ میری نظر میں رہے۔

ی کے ساتھ میں نے تیزی سے ہلاکت خیز عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

بے ہوش سوی کے اوپر شامہ بھٹکا ہی تھا کہ عقب سے اس پر اچانک یاسف نے وار کیا۔

"ملاط!" شامہ غلط فہمی کی بنا پر چیخ کر پلٹا۔ یاسف کے وار کا قوی شامہ پر صرف اتنا اثر ہوا تھا

کہ وہ لڑکھڑاکے رہ گیا۔

یاسف کو خود سے کچھ فاصلے پر دیکھ کر شامہ چند لمحے کو حیران سا ہوا۔

"تو نے مجھ پر وار کیا!" شامہ دہلاڑا۔ "اے بونے جن زادا تیری یہ مجال! کون ہے تو؟" اپنے

بالے پر یاسف کو اس نے بونا ٹھیک ہی کہا تھا۔ یاسف اس کے سامنے بالکل بے حقیقت سا معلوم ہو رہا

ا۔ "بول! کون ہے تو؟ ورنہ تجھے ابھی چر بھاڑ ڈالوں گا!"

"میں تیری موت ہوں اے شامہ!" یاسف اس سے نہیں ڈرا۔

"تو تجھے میرا نام بھی معلوم ہو گیا، لیکن شاید یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تیری زندگی کی یہ آخری رات

ہے!" شامہ یہ کہتے ہی یاسف کی طرف جھپٹا۔

یاسف اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ وہ شامہ کو ان کھنڈرات میں چک پھیراں دینے لگا، لیکن

ب تک! آخر شامہ نے اسے پکڑ ہی لیا۔

"اے شامہ! مجھے مارنے سے پہلے یہ تو سن لے کہ میں تجھے اور تیرے نام کو کس طرح جان گیا!"

فٹ مٹھکھانے لگا۔ "تجھے تیرے دیوتاؤں کی قسم!"

میں سمجھ گیا کہ یاسف اس طرح شامہ کو باتوں میں لگا کر دقت گزار رہا ہے۔

"ٹھیک ہے بتا! میں تجھے اتنی مہلت دیتا ہوں۔" شامہ باتوں میں آگیا۔

"مگر پہلے تو اپنی گرفت تو ذرا سی ڈھیل کر دے، میرا وجود جھلسا جا رہا ہے۔ یقین کر کہ میں بھاگوں گا

ن۔"

اس پر شامہ زور سے ہنسا اور بولا۔ "تو مجھ سے بھاگ کر جائے گا بھی کہاں! تو نے دیکھا نہیں کہ

انے تجھے کسی چوہے کی طرح پکڑ لیا۔ اب اپنی موت کے وقت کو نہ ٹال اور تجھے جو کہتا ہے، وہ کہہ

ئے۔ میں نے اپنی گرفت کم کر دی ہے، مگر اتنی بھی نہیں کہ تو بھاگ سکے۔"

"میں یہاں خود نہیں آیا۔ مجھے لانے والا کوئی اور ہے۔"

یاسف نے دانستہ ادھوری بات کی۔

"پھر بتانا کہ تجھے یہاں کون لے کر آیا ہے؟" شامہ کی آواز میں سختی اور غصہ تھا۔

رف جھپٹے دیکھا مگر یاسف نہ اٹھ سکا۔ اس کی چٹخیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر برے وجود میں شدید غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اس وقت تک یہ علم نہیں تھا کہ یاسف شدید تکلیف و بیت سے بے ہوش ہوا ہے یا مر چکا ہے۔ شاید اسی غصے کا نتیجہ تھا کہ شامروہ کی پہلی ضرب میں برداشت رہا اور جواباً اس پر وار بھی کیا۔ میں نے اس کے سامنے سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عمل کے آخری الفاظ پڑھتا باقی تھے کہ شامروہ نے مجھے بھی یاسف کی طرح جکڑ لیا۔ مشکل سے وہ ری لمحے ہوں گے جو میرے لئے انتہائی اذیت ناک تھے۔ مجھے شامروہ یقیناً مار ڈالنا چاہتا تھا، لیکن اس نے پہلے ہی میرا عمل پورا ہو گیا۔ ”یا جبار“ یہ اس عمل کے آخری الفاظ تھے جو گویا میں نے لب دم ہو کر اے اور پھر شامروہ پر دم کر دیا۔ ”آگ، آگ!“ شامروہ چیخ اٹھا۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں کسی طرح لڑھکتا ہوا یاسف کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اپنے ہوش و حواس لوٹنے سے پہلے میں نے قوی جن زاد شامروہ کے بھیاںک وجود کو کسی سوکھی لکڑی کی طرح جلتے دیکھا تھا۔ بلوم نہیں میں کتنی دیر غافل رہا! ہوش آیا تو کوئی مجھے پکار رہا تھا۔

”ہوں!“ میں نے تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھنا چاہا مگر ناکام رہا۔

”اٹھ اے علیالیش کہ مجھے تیرے دوست یاسف کی حالت اچھی نہیں لگتی۔“ یہ آواز میری قرار لاسوی کی تھی۔ ”تجھے تو میں ہوش میں لے آئی، مگر اسے ہوش نہیں آ رہا۔ وہ زندہ تو ہے مگر اس کی تات مردوں سے بدتر ہے۔ چل بہت کرا“ سوی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

اپنے قریب ہی مجھے یاسف پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی حالت واقعی تشویش ناک ہی لگتی تھی۔ اس کا رد کوٹنے کی طرح سیاہ ہو رہا تھا۔ مجھ سے کہیں زیادہ دیر تک شامروہ نے اسے اپنی گرفت میں رکھا تھا۔ بانیہ اسی کا اثر تھا۔

”اے علیالیش! ہر چند کہ تیری حالت بھی ٹھیک نہیں، مگر ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔“ ”تو ٹھیک ہی کہتی ہے اے سوی! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل چلنا چاہئے۔“ میں تائید میں بولا۔

”میں تیرے سارے کے بغیر شاید میں پرواز نہ کر سکوں۔“

”میں تجھے سہارا دوں گی اور یاسف کو بھی اٹھا کر لے چلوں گی۔ تو فکر نہ کرا“ سوی نے یہ کہتے یاسف کو اپنے اوپر لا دیا۔

پھر سوی مجھے بھی سہارا دے کر دھیرے دھیرے فضا میں بلند ہونے لگی تو نیچے راکھ کے ڈھیر کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے سوی سے کہا۔ ”اے سوی! تو نیچے وہ راکھ کا ڈھیر دیکھ رہی ہے! یہ اس قوی زاد شامروہ کے وجود کی راکھ ہے جس نے تجھے اغوا کیا تھا۔“

”ہاں اے علیالیش! میں نے راکھ کا وہ ڈھیر دیکھ لیا تھا اور حقیقت جان گئی تھی۔“ سوی یہ کہتے ”اے اور ادھر اٹھتی گئی۔“ لیکن تجھے اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”یہ سب تفصیلی باتیں ہیں اے سوی!“ میں نے کہا۔ ”ہم یہ باتیں بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ فی

”دہی کہ جس کا نام لے کر ابھی ذرا دیر پہلے ٹوچنا تھا۔ اسی نے مجھے تیرا نام بھی بتایا تھا۔ اس کا مطلب ہے اور وہ بھی تیری ہی طرح ایک قوی جن زاد ہے۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ مجھے یقین دلا چکا کہ اگر تُو نے مجھے پکڑ لیا تو تجھ پر حملہ کر دے گا، مگر افسوس کہ وعدے سے پھر گیا۔ اس نے مجھ سے کام لینا چاہا تھا، میں اسے معمولی سمجھا تھا اور یقیناً یہ میری غلطی تھی۔ اگر مجھے یہ اطمینان نہ ہوتا، مطلب.....“

”پہلے یہ بتا کہ مطلب تجھ سے کیا کام لینا چاہتا تھا؟“ شامروہ نے یاسف کی بات کاٹ کر سوال کیا۔ ”اس نے مجھے ان کھنڈرات کا پتا بتا کر کہا تھا کہ یہاں ایک حسین جن زادی بے ہوش پڑی ہوگی میں اسے اٹھا کر ستارہ پہنچا دوں۔ اے شامروہ! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مطلب نے حسین زادی کے حسن کی مجھ سے اتنی تعریف کی کہ میں نے سوچا، اسے راستے ہی سے لے آؤں گا۔“ یاسف نے اسے باتوں میں الجھائے رہا۔

”واہ! کیا کہنے تیرے!“ شامروہ یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ ”تُو نے اپنی اوقات نہیں دیکھی کہ میں تجھے چوہنی کی طرح مسل کر پھینک سکتا ہوں!“

”مجھ سے بڑی غلطی ہوئی اے شامروہ! مجھے معاف کر دے میں اس حسین جن زادی کو مارنے کے لالچ میں آ گیا۔ مجھے چھوڑ دے۔“ یاسف التجا کرنے لگا۔

”کیا تُو مجھے بے وقوف سمجھتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا! ہر غلطی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اور تُو غلطی تسلیم کر چکا ہے۔“

شامروہ، یاسف کو جکڑے ہوئے بے ہوش سوی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے اس موقع سے اٹھاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں سوی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ ضرورت پڑے تو میں بھی شامروہ سے بھڑ جاؤں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ میرا عمل پورا ہونے سے شامروہ، سوی کے قریب نہ آتا۔ میرے اور سوی کے درمیان اب صرف ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کالمبہ تھا۔

اسی وقت میری سماعت میں ایک نشتر سا اتر گیا۔ میں نے اپنے دوست یاسف کی تیز چیخ سنی عمل کے یہ آخری مراحل تھے۔ مطلب کی طرح اب تک شامروہ کو کسی خطرے کا احساس نہیں ہوا، یاسف کی بے بسی پر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ شاید شامروہ، مطلب کی طرح عیار نہیں تھا ورنہ خطرہ سو گھ لیتا۔

”میں تجھے اسی طرح دیوچ کر مار ڈالوں گا بونے جن زاد!“ شامروہ کی آواز میں نے سنی۔

اپنے دوست یاسف کی پے در پے چٹخیں سن کر مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ طے کی آٹھ کر اور نتائج کی پردا کیے بغیر میں نے جست بھری۔ بھلا میں اپنے دوست کو موت کے منہ میں ہوئے کس طرح دیکھ لیتا! میں اپنے وجود کی تمام تر طاقت جمع کر کے شامروہ سے ٹکرا گیا۔ یہ ٹکرائی تھی کہ شامروہ ایک طرف جاگرا اور یاسف اس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ پھر شامروہ کو تو میں۔

الحال تو ہمیں یاسف کی جان بچانی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اور تیز رفتاری سے تیرے ساتھ سکوں۔ جہاں بھی تجھے کوئی مناسب جگہ نظر آئے، اتر جائیو۔“

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم ایک سرسبز و شاداب باغ میں اترے۔ یاسف کو گھاس پر لٹا دیا۔ وہ اب تک بے ہوش تھا۔

”معلوم نہیں یہاں سے کوئی آبادی کتنی دور ہوگی!“ میں نے یاسف کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

”کیوں کیا بات ہے اے علیالیش، مجھے بتا!“ سوی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”مجھے ایک دوا منگوانی ہے جسے سٹھکانے سے یاسف کو ہوش آسکتا ہے۔ اپنی طاقت بحال کرنے کے لئے بھی مجھے کچھ دواؤں کی ضرورت ہے۔“

”دواؤں کے نام بتا دے، میں لا دیتی ہوں۔“ سوی بولی۔

”نہیں اسے سوی، تو رہنے دے۔ میں ہی کوشش کرتا ہوں۔ ہوش میں لانے کے علاوہ یاسف لئے اور بھی دوائیں چاہئیں۔ تو یاسف کا خیال رکھو! میں دوائیں لے کر آتا ہوں۔ مجھے اس میں آسانی رہے گی۔“ میں نے کہا۔

پھر سوی کو یاسف کے پاس چھوڑ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ہر چند کہ میری رفتار معمول مطابق نہیں تھی، پھر بھی جلد ہی ایک آبادی تک پہنچ گیا۔ بازار ابھی کھلا نہیں تھا۔ مجھے اسی لئے ایک عطاری کی بند دکان میں داخل ہو کے مطلوبہ دوائیں حاصل کرنی پڑیں۔ ایک عرصے تک میں نے زاد حکیم خاشع سے جو حکمت سیکھی تھی، اب وہ میرے کام آ رہی تھی۔ دوائیں لے کر میں واپس آؤں میں پہنچ گیا جہاں سوی اور یاسف کو چھوڑ گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یاسف اب دھیرے دھیرے کراہنے لگا تھا۔ سوی نے مجھے بتایا کہ اس عرصے میں وہ کئی عمل پڑھ کر یاسف پر دم کر چکی ہے۔ اسی کا رد عمل تھا۔

یاسف کو میں نے ایک جڑی بوٹی سٹھکانے میں دیر نہیں کی۔ چند ہی لمحوں میں اسے ہوش آجائے۔ ”م..... میں کہاں..... ہوں؟“ یاسف نے ہوش میں آکر کراہتے ہوئے پوچھا۔

”اے یاسف، اے میرے دوست! خود ہمیں بھی نہیں معلوم یہ کون سی جگہ ہے، لیکن ہم محفوظ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔ لو یہ شرمٹ اور پی لو!“ میں نے جواب دیا اور پوٹل سے شرمٹ کے چند گھونٹ پلائے۔

یاسف کو دوا پلا کر میں نے بھی اپنے وجود کی توانائی بحال کرنے کے لئے دوا کی ایک خوراک آدھرا ہونے تک یاسف کی حالت بہت سنبھل گئی۔ وہ اس قابل ہو گیا کہ سارا دینے پر پرواز کر سکے۔ میں اور سوی اسے ساتھ لے کر قاہرہ آگئے۔ ہم نے ہوٹل مونٹانا چھوڑ دیا اور وہاں ایک فائو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اب ہم تینوں ہی نے انسانی قالب اپنا لیا تھا۔ دس منزلہ ملٹن جدید قاہرہ میں تحریر اسکوائر پر واقع تھا۔ اس کی پانچویں منزل پر برابر برابر ہمیں دو کمرے ملے۔

میں ایک ڈبل بیڈ روم تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ بھی تھا جسے ہم نے کھول لیا۔ رات کو سوتے وقت یہ دروازہ بند کیا جاسکتا تھا۔ تین دن تک ہمیں ہر حال ملاپ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تین دن ختم ہونے سے قبل ہم دوبارہ عمل پڑھ کر اس مدت میں اضافہ کر سکتے تھے۔ فی الحال ہماری حالت اس قابل نہیں تھی کہ ہم اپنے دشمنوں کو پھینٹنے کا خطرہ مول لیتے۔ سو ہم نے اس سے گریز کیا۔

ہم تینوں اس وقت کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کے بعد اٹھے تھے۔ یاسف کو ہم نے اپنے کمرے میں ہی بلایا تھا۔ ہمارا مقصد موجودہ حالات پر گفتگو کرنا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ آج نجیب المہندس کو قاہرہ سے ستارہ جانا تھا۔ سو میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اے سوی! کہ گزشتہ رات ستارہ میں جو پراسرار واقعہ پیش آیا ہے اور جس طرح اہرام سے سونے کے قیمتی ظروف غائب ہو گئے ہیں، جابر نے اس واقعے کی اطلاع اب تک نجیب کو دے دی ہوگی۔“

”ہاں۔“ سوی نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔ ”نجیب کو وہی سونے کے ظروف لینے وہاں جانا تھا جو ہم لے اڑے ہیں۔ ایسی صورت میں اب غالباً وہ اپنا ارادہ بدل دے اور ستارہ کا رخ نہ کرے۔ آئندہ ہفتے سے وہ کسی اور اہرام تک پہنچنے کا کام شروع کریں گے۔ ظاہر ہے اس کام کی تکمیل کے بعد ہی وہ اب سونے کے ظروف حاصل کر سکتے ہیں۔ تو نے ایک اور بات پر شاید غور نہیں کیا اے علیالیش کہ اس کام کی نوعیت ایسی ہے کہ آدم زادوں کی خاصی بڑی تعداد انہیں اس کے لئے درکار ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ منقرع کے غلاموں کی تعداد بہت ہے۔“ سوی نے یہ کہہ کر میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”یہ ممکن ہے اے سوی کہ ان کی تعداد خاصی ہو۔“ میں بولا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ منقرع کے تمام غلاموں کی حیثیت مساوی نہیں ہوگی، نہ ہی وہ سب پراسرار قوتوں کے مالک ہو سکتے ہیں۔ ان میں یقیناً درجہ بندی ہوگی، کچھ کی حیثیت معمولی، کچھ کی اس سے زیادہ اور کچھ بڑے درجات پر فائز ہوں گے۔ اسی اعتبار سے حاصل ہونے والا مال تقسیم کیا جاتا ہوگا۔ تجھے حبشی جیسے اور رچڑ بھی یاد ہوں گے جو کراچی میں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ انہوں نے خود کو منقرع کے غلاموں کا غلام بتایا تھا۔ درجہ بندی اس طرح بھی ممکن ہے۔ ہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بڑا اور منظم گروہ ہے۔“

”اے علیالیش! اب تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ یاسف نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔ ”تیرا مقصد صرف اپنے دشمنوں نجیب المہندس اور طلال بے سے ہی انتقام لینا ہے یا آدم زادوں کے اس پورے گروہ کو ختم کرنا ہے!“

”پہلے میں، نجیب اور طلال سے نمٹنا چاہتا تھا، لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ یہ معاملہ اب ایک اور نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اب یہ محض ذاتی انتقام کا مسئلہ نہیں رہا اے یاسف! اگر طلال بے اور نجیب المہندس کو ختم بھی کر دیا گیا تو ان کی جگہ دوسرے لے لیں گے۔ ہمیں تو اس لعنتی گروہ کے اصل سرغنہ تک پہنچنا ہے۔ جو خود کو منقرع کی روح ظاہر کرتا ہے۔ اس بہروپ کے پردے میں کون ہے، ہم یہ جان کر ہی اسے اس کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

ہوئے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کریں گے۔ ہمارے لئے یہ بھی بہت ہے کہ تو ہم سے غافل نہیں رہے گا۔ دوستی کے ثنائے تو ہمارا اتنا بھی ساتھ دے رہا ہے تو قیمت ہے ورنہ کون پرانی آگ میں کودتا ہے! مگر شہ رات سوی کی بازیابی کے لئے تو نے جس طرح اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی! یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ شامروہ سے معرکے کے دوران تو مارا بھی جاسکتا تھا۔ میں نے یاسف کی تعریف میں بگل سے کام نہیں لیا۔ ”مت پوچھ کہ جب میں نے تیری چپچپیں سنیں تو مجھ پر کیا گزری!“

”مجھے تیری چاہت کا اندازہ ہے اے علیالیش!..... خیران باتوں کو چھوڑ اور یہ بتا کیا تو اس فتنہ پرور آدم زادی نجوا کو بالکل بھول ہی گیا؟“

”ہرگز نہیں اے یاسف!“ میں فوراً بول اٹھا۔ ”اس عیار آدم زادی سے بھی مجھے بہت سے حساب چکانے ہیں۔ اسے میں کس طرح بھول سکتا ہوں! ابھی تو دوسرے مسائل درپیش ہیں جن میں سرفرست ملاط کا مسئلہ ہے۔ جب تک تو اپنی پچھلی حالت پر واپس نہیں آجاتا، ملاط کو چھیڑنا خطرناک ہو گا۔“

”پہلے سے تو میں خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں“ ہاں کچھ کمزوری ضرور ہے۔ ایک طبیب کی حیثیت سے تیرا کیا اندازہ ہے، میں کب تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا؟“

”کل رات تک تجھے پوری طرح صحت یاب ہو جانا چاہئے اے یاسف!“ میں نے بتایا۔

”اگر ایسا ہے تو پھر کل کی رات فیصلہ کن ثابت ہو گی۔ ہم کل رات ہی ملاط سے بھڑ جائیں گے۔“

اس کی تدبیر میں تجھے پہلے ہی پتا چکا ہوں۔“

”اے یاسف! تیری تدبیر میں ایک ناکامی کا پہلو بھی ہے اور میں اس خبیث ملاط پر ایسا بھرپور ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں کہ وہ بچ کر نہ نکل سکے۔“

”اگر تیرا ارادہ مجھے پھر سے چارہ بنانے کا ہے تو میں ہرگز اس کے لئے تیار نہیں۔“ یاسف یہ کہہ کر ہٹا۔

”اس عیار کو الجھائے رکھنے کے لئے ہم میں سے کسی نہ کسی کو چارہ بننا ہی پڑے گا۔ اگر تو نہیں تو میں سہی!“

”اور تم دونوں مجھے تو بھول ہی گئے!“ سوی نے مداخلت کی۔

”اے سوی! تو اس کے لئے چارہ نہیں بن سکتی!“ مجھ سے پہلے ہی یاسف بول اٹھا۔ ”تجھ پر نظر پڑتے ہی وہ تجھے لے کر چپٹ ہو جائے گا۔ پھر اسے رکنے کی کیا ضرورت رہ جائے گی! تیرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ تو عمل پڑھتی رہو! اتنی دیر میں میں اور علیالیش اسے الجھائے رہیں گے۔“

”یاسف ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ میں نے سوی کو سمجھایا۔ ”تیرا سامنے آنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا۔“

سوی کو میری بات ماننی ہی پڑی۔ پھر وہ دن اور اس سے اگلا دن ہم نے آرام کرتے ہوئے گزارا۔ میرا یہ اندازہ قطعی درست ثابت ہوا کہ آئندہ رات تک یاسف پوری طرح صحت یاب ہو جائے گا۔ نصف شب کے قریب جب ہم نے ملاط کی تلاش میں جانے کا ارادہ کیا تو یاسف ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم

”لیکن تجھے اس سے کتنی رکعت کا ثواب ملے گا! تو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے اے علیالیش!“

یاسف نے گویا مجھے سمجھایا۔

”یہ دولت مصری قوم کا حق ہے جسے یہ گروہ بڑی بے دردی سے لوٹ رہا ہے۔ مصر ایک مسلمان مملکت ہے اور ہمیں بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے۔ تو کیا یہ حیثیت مسلمان ہمارا یہ فرض نہیں کہ اپنے بھائیوں کو نقصان سے بچائیں! جب کہ ہمارے لئے ایسا ممکن ہے۔“

میری پرجوش آواز سن کر یاسف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ پھر وہ بولا۔ ”تو دراصل اتنا بگڑ چکا ہے اے علیالیش کہ سدھرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ کیے جانیکی اور ڈالے جا دیا میں! کبھی تو نیکی کا یہ دریا بھی بھرے گا ہی!“

”متزعج کی روح تک پہنچنے کا ذریعہ میری نظر میں نجیب اور طلال ہی ہیں اے علیالیش! ہمیں ان دونوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہو گی۔“ سوی بولی۔

”ابھی طلال بے تو بستر علالت پر پڑا ہے البتہ نجیب ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔

”اگر تم دونوں میرا کہا مانو تو میں کوئی راستہ بتاؤں، لیکن میری تجویز پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب ملاط کا قصہ پاک ہو جائے۔“ یاسف کہنے لگا۔

”تو بتاتا تو سی اے یاسف کہ تیرے ذہن میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے نجیب تنہا تو نہیں رہتا ہو گا۔ اس کے ارد گرد اور لوگ بھی ہوں گے۔ تو نے اس کی

سکونت کا سراغ لگایا اے علیالیش؟“ یاسف نے معلوم کیا۔

”آخری بار وہ مجھے جیزا کے ایک علاقے زمالک کی ایک کوشی میں نظر آیا تھا۔“ میں نے جواب

دیا۔ ”یہ واقعہ کل ہی شام کا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ اب تک وہیں ہو۔“

”خیر وہ جہاں بھی ہو اس کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے آس پاس جو آدم زاد ہوں، ہم ان کے

جسموں پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم نجیب کی نقل و حرکت پر بے آسانی نظر رکھ سکیں گے۔ بول اے علیالیش، تجھے میری یہ تجویز پسند آئی؟“

”تیری تجویز تو مناسب ہے اے یاسف!“ میں نے تائید کی۔ ”بس یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ جن آدم زادوں کے جسموں پر ہم قبضہ کریں، وہ پراسرار قوتوں کے مالک نہ ہوں۔ اس کے لئے نجیب کے ذاتی ملازمین کے جسموں پر قبضہ کرنا بہتر ہو گا، مثلاً ڈرائیور، بادریچی، کوئی خادمہ وغیرہ۔ ملازمین کے لئے بے

ضروری نہیں کہ وہ بھی متزعج کے غلاموں میں سے ہوں اور انہیں بھی پراسرار قوتیں حاصل ہوں۔“

”ہاں تم دونوں کو میں ایک بات بتا دوں کہ مجھے تمہاری طرح نیکیاں کمانے کا زیادہ شوق نہیں۔“

ملاط کا قصہ پاک ہوتے ہی میں واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ یہ بہر حال میرا وعدہ ہے کہ جب بھی خدا

نخواستہ تم پر کوئی برا وقت پڑا تو یہاں پہنچ جاؤں گا۔“ یاسف بولا۔

”تو نے اچھا کیا اے یاسف کہ ہمیں اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ اب ہم اسی کو مد نظر رکھتے

دونوں مجھے دوبارہ بیمار ڈالنے کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ ارے خالو! ابھی تو میں نے غسل صحت بھی نہیں کیا۔“

”دوبارہ بستر پر پڑنے اور صحت یاب ہونے کے بعد تو ایک ساتھ ہی غسل صحت کر لیجو، ابھی تو بکرا بننے کے لئے چل!“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔

”میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اے علیالیش کہ اصل بکرا مجھے نہیں اس مرتبہ تجھے بنا ہے۔ مجھے تو بس دور سے تماشا دیکھنا ہے۔ جب دو موزیوں کے درمیان کھٹ پٹ ہو تو ہر جن و بشر پر لازم ہے کہ وہ جھٹ پٹ اپنے پیچھے کی فکر کرے۔“

”اس ہمانے تو مجھے بھی موزی کہہ رہا ہے!“ میں نے اسے ٹوکا۔

”چل تو نہ سہی، وہ ملاطبت تو موزی ہے۔ رہی کھٹ پٹ تو وہ ہونی لازمی ہے۔“

اپنے اپنے کمرؤں کے دروازے ہم اندر سے پہلے ہی بند کر چکے تھے اور ہلکے نیلے بلب جلا دیے تھے۔ ردا گئی کی غرض سے ہم انسانی قابلوں سے باہر آ گئے۔

ملاطبت کے وجود کی مخصوص بونے ہماری رہنمائی کی۔ وہ ہمیں اپنے مسکن ستارہ ہی میں ملا۔ یہ وہی زیر زمین اہرام تھا کہ جہاں ہم پہلے بھی اس سے نبرد آزما ہو چکے تھے۔ ہم نے یہ تو سراغ لگا لیا کہ وہ اپنے مسکن ہی میں ہے، مگر جلد بازی سے کام نہ لیا۔ ہم اس سرنگ میں تھے جو مقرر کے غلاموں نے اس کے اہرام تک پہنچنے کے لئے کھودی تھی۔ سوئی کو میں نے تاکید کر دی تھی کہ اسے سرنگ ہی میں دہانے کے قریب رہنا ہے، اس طرح عمل پڑھنے ہوئے ملاطبت اس کی نظریں میں رہے گا۔ یاسف کو اور مجھے اہرام کے اندر اس وقت داخل ہونا تھا جب ملاطبت خطرے کی بوسونگھ لے اور وہاں سے راہ فرار اختیار کرنا چاہے۔

ہم جیسے ہی سرنگ کے دہانے تک پہنچے، سوئی نے عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

ملاطبت اس وقت اہرام میں محو خواب تھا۔ یہاں سے وہاں پر فرش تک پھیلا ہوا اس کا وجود ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہماری جگہ اگر کوئی اور معمولی جن زاد ہوتا تو ملاطبت کے بھینک وجود کو دیکھتے ہی وہاں سے بھاگ لیتا، مگر ہم تو اسے ختم کرنے کے ارادے سے وہاں آئے تھے، پھر کس طرح اس سے ڈر جاتے!

ہمارے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ موجود صورت حال سے فائدہ اٹھا کے اچانک اس پر ٹوٹ پڑتے کیوں کہ وہ ہماری طرف سے غافل تھا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ میں اور یاسف مل کر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ اسے زخمی کر دیے، مگر زخمی جن زاد اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے، ہمیں علم تھا۔ وہ قنہ جتنی دیر تک غافل رہتا، ہمارے ہی حق میں بہتر تھا۔ اس طرح سوئی کو ہلاکت خیز عمل پڑھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت مل جاتا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ملاطبت سوتے سوتے ایک دم اچھل پڑا۔

”یہاں ضرور کوئی گھس آیا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے بو محسوس ہو رہی ہے اور اور کوئی

ہے جو میری ہلاکت کا سامان کر رہا ہے۔“ پھر وہ دباؤا۔ ”کون ہے؟“

اہرام اس کی تیز آواز سے گونج اٹھا، مگر ہم دم سادھے رہے۔ ہم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے یقیناً خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ کسی بھی لمحے وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے یاسف کو اشارہ کیا اور تیزی کے ساتھ سرنگ سے نکل کر ملاطبت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب ملاطبت نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے نظری نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

”بول، کون ہے تو؟ اور یہاں میرے مسکن میں کیوں داخل ہوا ہے؟“ وہ چیخا۔

ملاطبت مجھے پہلے دیکھ چکا تھا اور میرے نام سے بھی واقف تھا۔ ایسی صورت میں اس کا یہ سوال کرنا میرے لئے معنی خیز ہی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میرا نظرنہ آنا اسی عمل کا نتیجہ ہو سکتا ہے جو میں نے اور یاسف نے پڑھا تھا۔

اچانک اس نے اندھوں کی طرح میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ملاطبت اہرام کی ایک دیوار سے ٹکرا کر چیخ اٹھا۔

اب گویا مجھے ملاطبت پر یہ برتری حاصل تھی کہ میں تو اسے دیکھ رہا تھا مگر وہ اس سے قاصر تھا۔ میں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔

”اے لعنتی ملاطبت! کیا تو اندھا ہو گیا ہے جو میں تجھے نظر نہیں آ رہا؟ میں ادھر ہوں۔“ میں یہ کہتے ہی وہاں سے ہٹ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق ملاطبت اپنی پوری طاقت سے ادھر جھپٹا جہاں میں لمعے بھر پہلے موجود تھا۔ اپنے ہی زور میں ایک مرتبہ پھر وہ پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ پھر وہ چیخنے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تجھے پہچان گیا اے بد بخت علیالیش! تیری موت ہی تجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!“

میں جواب میں زور سے ہنسا اور اس چپو ترے پر چڑھ گیا جہاں تابوت رکھا تھا، پھر اہرام کی چھت کے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے بولا۔ ”اے خبیث ملاطبت! تو مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا! ہمت ہے تو میرے قریب آ کر دیکھ!“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے غوطہ لگا لیا۔

ملاطبت کو میں نے چھت کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس بار چھت سے ٹکرانے کے سبب بھاری دھمک ہوئی۔ اسی دوران میں یاسف بھی سرنگ سے نکل آیا۔ اس نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ملاطبت کو نظر نہیں آ رہا۔ یاسف بھی اس ”نکیل“ میں شامل ہو گیا۔

”نیچے آ اے دوزخی جن زاد میں یہاں ہوں۔“ یاسف نے میری آواز کی کامیاب نقل اتاری۔

ملاطبت کے بھاری بھر کم وجود کے لئے وہ جگہ تنگ تھی۔ یاسف کے ذہن سے غالباً یہ بات نکل گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زدا ہی دیر میں وہ ملاطبت کی پکڑ میں آ گیا۔ عین اسی لمحے مجھے ایک حیران کن منظر دکھائی دیا۔ اہرام کے اندر زبردست کڑک سنائی دی۔ یوں لگا جیسے آسمانی بجلی کہیں گری ہو۔ ملاطبت کا وجود

بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھیر گیا۔ اس نے گھبرا کر یاسف کو چھوڑ دیا۔ میں یہ سمجھا کہ شاید سوی نے عمل پورا کر لیا ہے۔ یہ بعد میں پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ سوی اس وقت تک پورا عمل نہیں پڑھ سکی تھی۔ اس ہلاکت خیز عمل کے بارے میں پہلی بار ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ وہ عمل جس کو ہلاک کرنے کے لئے پڑھا جائے، اگر تین دن کی مدت گزرنے سے پہلے عامل کے قریب آجائے تو جل کر خاک ہو جائے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں ملاط راگہ کا ڈھیر بن گیا۔ اس سے اہرام میں اتنی بدبو بھر گئی کہ وہاں مزید ٹھہرنا ہمارے لئے ناممکن ہو گیا۔ ہم فوراً وہاں سے نکل آئے۔ باہر آکر ہمیں تازگی کا احساس ہوا اور ٹھنک جاتی رہی۔

”اے علیالیش! اچانک یہ ہوا کیا؟“ سوی حیرت سے بولی۔ ”ابھی تو میں پورا عمل بھی نہیں پڑھ سکی تھی!“

جواب میں جو بات میں نے سوچی تھی اسے بتا دی اور کہا۔ ”اگر مجھے پہلے سے یہ علم ہوتا تو اسے ختم کرنے میں اتنی دیر بھی نہ لگتی۔“

”ہماری ہی طرح ملاط کو بھی یہ معلوم نہیں ہو گا ورنہ اس سے اتنی بھیانک غلطی نہ ہوتی۔“ یاسف نے اظہار خیال کیا، پھر بولا۔ ”چلو اب میری جان تو چھوٹی۔“

”کیوں“ اب تیرا کیا ارادہ ہے اے یاسف؟“ میں نے دریافت کیا۔

”دہی جو پہلے تجھے جتا چکا تھا۔ میں نے کہہ ہی دیا تھا کہ ملاط کے خاک میں ملتے ہی یہاں نہیں رکوں گا۔“ یاسف نے جواب دیا۔

”کم سے کم قاہرہ تک تو ہمارے ساتھ چل اور ہوٹل کا وہ کرا چھوڑ دے۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ ہوٹل والوں نے تجھے ہمارے ہی ساتھ دیکھا تھا۔ تو نے بھی یہی ظاہر کیا تھا کہ اسکندر یہ سے قاہرہ آیا ہے۔ تیرے اچانک غائب ہو جانے سے وہ ہم پر بھی شک کریں گے۔“ میں بولا۔

”تیری یہ بات ماننے والی ہے اے علیالیش! مگر یہ سن لے کہ میں مزید رکھنے والا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی گل بکاؤلی بہت یاد آ رہی ہے، وہی کہ جسے دنیا.....“

”سمات امغری بیگم کے نام سے جانتی ہے۔“ میں نے ہنسنے ہوئے یاسف کا جملہ پورا کر دیا۔

پھر ستارہ سے قاہرہ لوٹ آنے میں ہمیں دیر نہ لگی۔ یاسف نے کمر گویا خالی کر دیا۔ یوں بھی اس کا کمر خالی ہی تھا کیوں کہ کوئی سامان اس کے پاس نہیں تھا۔ اس پر کوئی شک نہ کرے، اس غرض سے میں نے اپنا سوٹ کیس اسے تھما دیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سوٹ کیس میرے حوالے کر دیا۔ وہ انسانی قالب ہی میں تھا۔

”اچھا تم دونوں کا اللہ تمہارا! میں چلتا ہوں، تم نیکیاں کماؤ! اللہ تمہیں اس کی اور توفیق دے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ انسانی پیکر سے نکل آیا۔

”آمین!“ میں نے کہا۔

یاسف ہمارے ہی ہوٹل کے کمرے سے کراچی روانہ ہو گیا۔ ملاط کی ہلاکت نے میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ شامہ اور ملاط جیسے دو قوی جن زادوں کو ختم کرنے سے میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اگر میرے قیاس کے مطابق منقرع کی روح کے پردے میں بھی کوئی کافر جن زاد ہی تھا تو اس سے بزدل آزاد ہونا ہمارے لئے اب مشکل نہیں رہا تھا۔ اصل مسئلہ اس کا سراغ لگانا تھا جس کے لئے ہم پہلے ہی ایک لائحہ عمل ترتیب دے چکے تھے۔

وہ رات ہم نے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ سوتے ہوئے گزاری۔ آئندہ روز سے ہمیں ایک نئی مہم کا آغاز کرنا تھا۔

انسانی جسم کے تقاضوں کی وجہ سے دیر تک سوتے رہے۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے جب میری آنکھ کھلی اور میں نے آواز دے کر سوی کو بھی جگا دیا۔

کچھ دیر کے بعد ناشتا کرتے ہوئے میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”اب نجیب الہندس کا سراغ لگانا ہے کہ ابھی تک وہ اپنی زناک دالی کو خفی میں ہے یا نہیں!“

”لیکن اے علیالیش! اس کے لئے تو اپنے تصور کی قوت نہ آزمایو!“ سوی نے تاکید کی۔

”مجھے احساس ہے کہ اس طرح ہمارا دشمن چونکا ہو جائے گا۔ ہمارے پاس سراغ لگانے کے اور دوسرے راستے بھی تو ہیں۔ اپنے پراسرار دشمنوں کی طاقت کا مجھے اندازہ ہے۔“

ناشتا کرتے ہی میں اپنی ایک جتنی صفت کو بروئے کار لایا اور نجیب الہندس کا پتا لگا لیا۔ وہ ابھی تک زناک دالی کو خفی ہی میں قیام پذیر تھا۔

”چل اے سوی! وہاں ایک پھیرا لگا کر آتے ہیں۔“ میں نے اسے بتا دیا کہ نجیب اس وقت کہاں ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ ”ہمیں وہاں چل کر یہ بھی دیکھنا ہے کہ کن آدم زادوں کے جسم پر قبضہ کر سکتے ہیں!“

سوی فوراً ہی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ دیر کو بلا کر ہم نے ناشتے کی ٹرالی لے جانے کو کہا۔ اس ہوٹل میں قیام کرتے وقت ہی ہم نے مصلحتاً ایک مینیجنگ ادا کر دیا تھا۔ بغداد سے جو دنبرا میں نے نجوا کے ساتھی سعود سے حاصل کیے تھے، انہیں مصری کرنسی میں تبدیل کرایا تھا۔ میرے پاس اسی لئے اب رقم کی کمی نہیں تھی۔ اس سے قطع نظریہ رقم نہ بھی ہوتی تو رقم کا حصول میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

کمرے کو اندر سے بند کر کے ہم نے انسانی قالب چھوڑ دیے۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ منقرع کے غلام اپنی تمام تر پراسرار قوتوں کے باوجود ہم جن زادوں کی موجودگی سے لاعلم ہی رہتے تھے۔ لیکن اب جب کہ ہم نہایت اطمینان سے زناک پہنچ کر نجیب کی کو خفی میں گھس گئے۔

یہ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ کو خفی خاصی بڑی تھی۔ اسی کے ایک بڑے سے کمرے میں نجیب الہندس فون پر مجھے کسی سے بات کرتا ہوا نظر آ گیا۔ جلد ہی مجھے اس کی باتیں سن کر پتا چل گیا کہ دوسری جانب کون ہو سکتا ہے! نجیب یقیناً حلال نے سے بات کر رہا تھا۔

”تمہ خانہ صاف کر دیا گیا ہے جناب!“ شجاع نے نجیب کو مخاطب کیا۔
”تم دونوں کو اس پر تشدد کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا ہے کہ وہ زندہ رہے“ سمجھ گئے!“ نجیب نے تاکید کی۔

”جی بہتر ہے۔“ اس مرتبہ میں بھی شجاع کے ساتھ ساتھ بولا۔
”تمہیں میں نے یہ بتا ہی دیا ہے کہ اس سے کیا معلوم کرنا ہے! اب تم جاؤ۔ جب ضرورت ہوگی تمہیں بلاؤں گا۔“ نجیب نے یہ کہہ کر وہ کتاب قریبی میز سے اٹھالی جس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی وقت ایک طرف رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نجیب مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ذرا مجھے ریسیور اٹھا کر دو۔“ میں نے آگے بڑھ کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا مگر اسے کان سے نہیں لگایا۔ دوسری جانب سے ”ہیلو ہیلو“ کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی بچہ بول رہا ہو۔ یہ بچکانہ آواز سو فیصد اسی منخرے طلال بے کی تھی۔ میں نے ریسیور نجیب کو تھما دیا۔
”ہیلو!..... ہاں بول رہا ہوں، کھو!..... کیا وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا؟..... حیرت ہے! اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ..... ذرا ہولڈ کرو! میں تم سے ابھی بات کرتا ہوں۔“ تم کیوں کھڑے ہو؟“

”اس لئے کہ آپ فون پر بات کر لیں تو میں ریسیور لے کر دوبارہ کریڈل پر.....“

”نہیں، تم جاؤ!“ نجیب نے میرا پورا جواب نہیں سنا۔

میں ادب سے جھکا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ شجاع پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ اسٹڈی سے باہر نکلتے ہوئے میں صرف اتنا جان سکا کہ جابر پکڑا گیا ہے اور اسے جلد ہی نجیب کی کوشی روانہ کیا جائے والا ہے۔ میرے لئے بھی یہ بات حیران کن تھی کہ جابر فرار ہونے والا تھا۔ اس کا ایک ہی سبب ممکن تھا۔ اسے غالباً یقین ہو گا کہ طلال بے اس کے بیان پر یقین نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں جان بچانے کا اسے یہی راستہ نظر آیا ہو گا کہ راہ فرار اختیار کر لے۔

ایک راہداری سے گزرتے ہوئے مجھے ادھیڑ عمر ملازمہ رابعہ نظر آئی۔ یہ وہی تھی کہ جس کے جسم پر سوی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ ایک ٹی ٹرائل لے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سوی کو مجبوراً ایک ادھیڑ عمر آدم زاد کی جسم اپنانا پڑا تھا۔ سوی کو خبر تھی کہ میں ’ضرغام کے جسم میں چھپا ہوا۔ وہ اسی لئے میرے قریب آکر دھیمی آواز میں بولی۔“ میں تجھے اس جسم میں کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بہت ہی بری۔“ میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ سوی مجھے رابعہ کے جسم میں ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ جسم بدلنا جن زادوں کے لئے اسی طرح ہے جیسے آدم زاد کپڑے بدل لیتے ہیں۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں ’سوی کو ادھیڑ عمر رابعہ کے جسم میں اترنے کا ہرگز مشورہ نہ دیتا۔“

کوشی سے نکل کر میں ’ضرغام کے کوارٹر میں آگیا جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اسی کے برابر والا کوارٹر شجاع کا تھا۔ کمرے چھوٹے چھوٹے تھے جن کے سامنے چھوٹا ہی سامن تھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند

کمرے میں نے احتیاطاً تلاشی لی۔ وہاں ضرورت کا تمام ہی سامان موجود تھا۔ ایک خود کار راکٹفل، اس کا بیڑین اور مزید اسلحہ بھی مجھے وہاں دکھائی دیا۔ ایک الماری میں مجھے ایک نوجوان لڑکی کی تصویر بھی نظر آئی۔ اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس خوب صورت لڑکی کو میں پہچان گیا۔ بھرے بھرے سے بدن والی اس نوجوان لڑکی کو میں نے کوشی ہی میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ملازموں میں شامل تھی۔ اس کی تصویر ضرغام کے پاس ہونے کا یہی مطلب تھا کہ ضرغام سے اس کا کوئی قریبی تعلق ہے۔ ضرغام کا جسم اپناتے ہوئے میں نے اس بات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کوئی چکر تو نہیں!

اس لڑکی کا نام نرجس تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے ذہن سے جھٹک دیا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ابھی مجھے ضرغام کے کوارٹر میں تقریباً ایک گھنٹہ آرام کرتے گزارا ہو گا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو نرجس کو خلاف توقع دیکھ کر کچھ گڑبڑا گیا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اندر آگئی اور کہنے لگی۔ ”تم نے یہ دن کے وقت بھی دروازہ کیوں بند کر رکھا تھا؟“

”بس یوں ہی آرام کر رہا تھا۔“ میں نے کہہ دیا۔

”سنو! تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں تمہیں یہ پیغام دینے اس لئے چلی آئی کہ..... کھو!.....“ شرا کر اس نے سر جھکا لیا۔

”خود ہی سمجھ لو! تم ہی تو پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ..... کہ بہت دن ہو گئے ہیں۔ صاحب ہی سے جان نہیں چھوٹی۔“ آج میں نے ان سے بہانہ کر دیا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں..... میں رات کو بارہ بجے کے بعد آؤں گی۔ تم دروازہ کھلا رکھنا!“ یہ کہتے ہی وہ تیزی سے چلی اور تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

مجھے اس حسین بلا کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ وہ نجیب کی منظور نظر ہے، لیکن یہ پتا نہ تھا، ضرغام کو بھی اس نے اپنی اداؤں کا امیر بنا رکھا ہے۔ اس بلا سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ نرجس کے ذہن سے اس بات کو مخور دیتا کہ اسے آج رات میرے پاس آنا ہے۔ دن میں کسی بھی وقت مجھے یہ موقع مل سکتا تھا۔ فی الحال تو مجھے نجیب کے پاس پہنچنا تھا۔

نجیب ابھی تک اسٹڈی ہی میں تھا۔ مجھ سے پہلے ہی شجاع وہاں موجود تھا۔

”جابر کو ہمارے آدمی بے ہوشی کی حالت میں میاں لے کر آرہے ہیں۔ وہ بس بچنے ہی والے ہوں گے۔ ہوش آنے سے پہلے ہی اسے ستونوں سے باندھ دیتا ہے۔“ نجیب مجھے اور شجاع کو ہدایت دیتے لگا۔ ”اسے ہوش آجائے تو مجھے آکر خبر دینا! باہر جا کر ان لوگوں کو دیکھو، جاؤ!“

شجاع کے ساتھ ہی میں اسٹڈی سے نکل آیا۔ میرے لئے ایک بات ابھمن کا سبب بنی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق جابر بھی منقرع کے غلاموں میں سے ایک تھا۔ میں نے خود اس کی زبان سے ستارہ میں یہ سنا تھا کہ منقرع کی روح نے اس سے سرگوشیاں کی ہیں۔ فون پر اس نے یہ بات نجیب ہی کو بتائی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ بھی پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں

اسی وقت بھانگ کی طرف سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ میں نے شجاع کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا۔ اب اس کی مزید ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ میرا کام ہو چکا تھا۔
”مجھے۔ ابھی مجھے کیا ہو گیا تھا ضرغام؟ کیا میں کھڑے کھڑے سو گیا تھا؟“ شجاع نے مجھے حیرت سے مخاطب کیا۔

”نہیں تو۔“ میں بولا۔ ”تم تو ابھی مجھ سے رابطہ کا ذکر کر رہے تھے۔“
”لغت سمجھو اس بڑھیا پر!“ شجاع نے حقارت سے کہا۔ ”وہ بھی کوئی عورت ہے!“ پھر وہ آنے والی کار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں بھی اسی طرف دیکھنے لگا۔ اب مجھے سوجی کی طرف سے فکر نہ رہی کہ رابطہ کے جسم میں اس کے لئے کوئی خطرہ تھا۔ کار قریب آ کے رک گئی۔ ڈرائیور نے ہم دونوں کی جانب مٹکرا کر دیکھا۔ یقیناً ضرغام اور شجاع کو پہلے سے جانتا ہو گا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک شخص اور موجود تھا جو بے ہوش جابر کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ میں، جابر کو پہچان گیا۔ اسے میں نے ستارہ میں دیکھا تھا۔

شجاع نے آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں نے بے ہوش جابر کو کار سے نکال لیا تو کار مزید ایک لمبے بھی وہاں رکے بغیر واپسی کے لئے مڑ گئی۔ نہ ان دونوں میں سے کسی نے کچھ کہا نہ ہم نے۔

بے ہوش جابر کو اٹھائے ہم کوٹھی میں لے آئے۔ ذرا ہی دیر بعد ہم کوٹھی کے تہ خانے میں اتر رہے تھے۔ نجیب کی ہدایت کے مطابق ہم نے بے ہوش جابر کو ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ اسے ہوش میں لانے کے لئے شجاع نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔
جابر کو جلدی ہی ہوش آ گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

”نگ۔ کون ہو تم لوگ؟“ جابر نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔ ”اور طلال۔ طلال بے کہاں گیا؟ ابھی تو وہ میرے سامنے نیم دراز تھا۔ تم۔ تم نے مجھے یہاں۔ یہاں باندھ کیوں رکھا ہے؟“ کھول دو مجھے! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں منقرع کا غلام ہوں اور منقرع کے کسی غلام کو کوئی قید نہیں رکھ سکتا! کھول دو مجھے!..... کھول دو ورنہ تمہیں پھنستا پڑے گا۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے جابر کے لمبے میں حکم تھا۔ پھر اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے سر کو ادھر ادھر زور زور سے جھٹکے دینے لگا اور بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔ ”یہ کیا ہو گیا؟ کیا..... کیا مجھ سے میری قوتیں چھن گئیں؟..... مگر کس طرح؟“

میرا قیاس درست ہی ثابت ہوا۔ اس کے الفاظ سے پتا چل رہا تھا کہ اسے ابھی طلال بے کے پاس سے لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسی منقرع طلال بے نے جابر کی پراسرار قوتیں چھین لی تھیں۔ جابر کو اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر ہم دونوں مڑے۔

”ٹھہرو!“ جابر نے ہمیں آواز دی۔ ”کم از کم مجھے یہ تو بتا دو کہ میں کس کی قید میں ہوں؟“

یہاں لایا جانا بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر جابر پراسرار قوتوں کا مالک ہے تو پھر اسے یہاں کس طرح قید رکھا جا سکتا ہے؟ اسی سوال پر غور کرتے ہوئے معاً مجھے منقرع کے ایک اور غلام حسنین کا خیال آیا۔ اس پر بھی سونے کے ظروف چرانے کا الزام تھا۔ یہ الزام غلط بھی نہیں نکلا۔ اس نے ایسا کیا تھا۔ جو ظروف حسنین نے چرائے تھے، اب میرے قبضے میں تھے۔ اس بد نصیب شخص کی موت واقع ہو چکی تھی۔ حسنین کی پراسرار قوتیں اس سے چھین لی گئی تھیں۔ ایسا ہی جابر کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔

اب میں، شجاع کے ساتھ کوٹھی کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔
”تم کن خیالوں میں کھو گئے میرے دوست؟“ شجاع نے مجھے خاموش دیکھ کر ٹوکا۔ ”کیا ان دنوں نرجس سے تفصیلی ملاقات کا موقع نہیں مل رہا؟“ اس نے لفظ ”تفصیلی“ پر کچھ زیادہ ہی زور دیا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرغام اور نرجس کے تعلقات کی نوعیت سے شجاع بھی واقف ہے۔

”ہاں دوست، یہی بات ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کو کہہ دیا۔
”دیے تو تم خود سمجھ دار ہو ضرغام، پھر بھی نرجس کے معاملے میں ذرا احتیاط سے کام لیا کرو! اگر صاحب کو تمہارے اور اس کے تعلقات کی خبر ہو گئی تو اچھا نہیں ہو گا۔ تمہیں تو خود ہی خبر ہے کہ صاحب ایسے معاملات میں کتنے سخت گیر ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ جن دنوں صاحب، قاہرہ میں نہ ہوا کریں، تم نرجس.....“

”میں بھی سمجھتا ہوں۔“ میں بول اٹھا۔ ”مگر اس دل کو کیسے سمجھاؤں!“
”کسی طرح سمجھاؤ اپنے دل کو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“ شجاع مجھے اپنا ساتھی ضرغام سمجھ کر نصیحت کرنے لگا، پھر بولا۔ ”تم نے تو خیر ابھی شادی نہیں کی مگر میں تو شادی شدہ ہوں اور میری بیوی بھی خوب صورت ہے۔ سال بھر ہونے کو آیا، صاحب نہ تو مجھے اسماعیلیہ جانے دیتے ہیں، نہ بیوی کو یہاں بلانے کی اجازت دیتے ہیں۔ مجبوراً مجھے ایک مدت سے ادھیڑ عمر رابطہ پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے اور.....“
پھر شجاع نے اور کیا کہا، میں سن کر بھی نہ سن سکا۔ یہ جان کر مجھ پر سناٹا سا چھا گیا تھا کہ شجاع نے رابطہ سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ادھیڑ عمر اور سیاہ رد رابطہ بھی کسی ایسے معاملے میں ملوث ہو سکتی ہے۔ میں نے تو خوب سوچ سمجھ کر سوجی کے لئے ایک ایسی آدم زادی کے جسم کو منتخب کیا تھا جس کی طرف کوئی مرد اس انداز میں آگے اٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہ کرے۔ باتوں باتوں میں مجھے ایک اہم بات معلوم ہو گئی تھی۔ سوجی نے رابطہ کے جسم میں پناہ لے رکھی تھی۔ خود سوجی کے لئے بھی یہ ممکن تھا کہ وہ شجاع کے بڑھتے ہوئے دست ہوس کو جھٹک دیتی اور اسے اپنے اثر میں لے کر یہ معاملہ ہی ختم کر دیتی۔ پھر بھی میں نے سوجی کو ذہنی اذیت سے بچانے کی خاطر خود ہی یہ معاملہ اپنے ذمہ لے لیا۔

دوسرے ہی لمحے شجاع کو میں اپنے اثر میں لے چکا تھا۔
”ہاں اب میں کبھی رابطہ کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گا۔“ شجاع میرے زیر اثر خواب کی سی حالت میں بڑبڑانے لگا۔ ”وہ سیاہ رد بڑھیا اس قابل نہیں۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔“ جابر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”اس کی وجہ طلال بے تھا۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کتنا شکی مزاج ہے! مجھے شبہ تھا کہ وہ میرے بیان پر یقین نہیں کرے گا اور یہی ہوا۔ میں فرار ہو کر اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔“

”لیکن طلال بے تم سے زیادہ ذہین ثابت ہوا۔ اس نے تمہیں فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ اسی لئے تو عظیم مقرر کا پہلا غلام کلاتا ہے۔ جابر! میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ زبان کھول دو ورنہ اپنے یہ دونوں عقاب تمہارے اوپر چھوڑ دوں گا۔ یہ گرم چٹوں سے تمہارے جسم کا گوشت نوچیں گے۔ یہ تمہیں ایسی ہول ناک اذیتیں دیں گے جن کا تم نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔“ نجیب نے اس مرتبہ سخت لہجے میں کہا۔

جابر جو کچھ کہہ رہا تھا، سچ تھا۔ پھر بھی نجیب نے اس کی بات پر اعتبار نہیں کیا۔ جب جابر نے اپنا بیان نہیں بدلا تو نجیب ہماری طرف مڑا۔

”اب اس کی زبان کھلوانا تم دونوں کی ذمہ داری ہے۔“ نجیب نے حکم دیا۔

تشد کا آغاز ہم نے نجیب کے سامنے ہی کیا۔ تہہ خانے کی ایک میز پر رکھے ہوئے لوہے کے چٹے ہم نے ہینر جلا کر اتنے گرم کیے کہ وہ سرخ ہو گئے۔ پھر ہم جابر کی طرف بڑے تو وہ چیخنے لگا۔ ”نہیں نجیب! ایسا نہ کرو! تمہیں عظیم مقرر کی قسم!“

نجیب نے کوئی جواب نہیں دیا اور بت بنا کھڑا رہا۔ جابر کی پینٹ کے دونوں پانچے پھاڑ دیئے گئے۔ وہ آہنی چٹے مخصوص ساخت کے بنے ہوئے تھے۔ ہم نے وہ دنداے جابر کی پنڈلیوں میں گاڑ دیئے۔ اسی کے ساتھ تہہ خانہ اس کی ہیکل کیونچوں سے گونج اٹھا اور گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ ہر چند کہ مجھے جابر کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی دردنگی کے اس کھیل سے وحشت سی محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس تشدد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اگر کچھ اور نہیں تو میں، جابر کو ترپ ترپ کر مرنے سے تو بچا ہی سکتا تھا۔

پھر میں نے دیر نہیں لگائی تاکہ نجیب اپنے سامنے سب کچھ دیکھ لے۔ دوسری صورت میں مجھے اور شجاع کو جواب طلبی کے مرحلے سے گزرنا پڑتا۔

چی چی کر جابر کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس کی دونوں پنڈلیوں سے گوشت نوچے جانے کے سبب جگہ جگہ زخم ہو گئے تھے۔ ان زخموں سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا، لیکن ابھی تک وہ ہوش میں تھا۔ اسی وقت نجیب نے جابر کے دونوں ہاتھ ٹہنچوں میں کسے کا حکم دیا۔

جابر رحم کی ہیکل مانگنے لگا، مگر نجیب کی ایک ہی شرط تھی کہ زبان کھول دے۔ نجیب کے دوسرے حکم پر عمل کرتے ہوئے اچانک میں نے جابر کے ذہن کو گرفت میں لے کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہوا۔ چیخنے چیخنے اچانک اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”شاید یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔“ نجیب نے خیال ظاہر کیا۔ ”کھینچے کھول دو! تم دونوں بیس رہو! جب اسے ہوش آجائے تو دوبارہ۔“

”ابھی کچھ ہی دیر میں تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“ شجاع نے پلٹ کر کہا اور پھر میرے ساتھ میزھیاں چڑھنے لگا۔

ضرغام اور شجاع کو جابر جانتا نہیں ہو گا ورنہ یہ نہ پوچھتا کہ ہم کون ہیں اور وہ کہاں ہے! یوں بھی وہ ستارہ میں رہتا تھا۔

نجیب کو جب ہم نے جابر کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اور شجاع کو بھی اس نے ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا۔ واپس تہہ خانے میں پہنچتے ہی جب جابر کی نگاہ نجیب پر پڑی تو وہ کم صم سا ہو گیا۔ وہ اس طرح نجیب کو دیکھ رہا تھا جیسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔

”جابر!“ معاً جابر کو نجیب نے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں نری تھی۔ ”یقیناً تم حیران ہو گے کہ تمہیں یہاں کیوں قید کیا گیا ہے! مجھے اس پر افسوس ہے کیوں کہ تم ہمارے پرانے ساتھی ہو۔ ہمارا ساتھ برسوں کا ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے، مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری ہے یہ؟“ جابر تقریباً چیخ اٹھا۔ ”کیا تمہیں دوست اور دشمن کی تمیز نہیں رہی؟“

”تمہیں ہم اب بھی اپنا دوست اور ساتھی ہی سمجھتے ہیں۔“ نجیب کی آواز میں نری برقرار رہی۔

”اسی دوستی کے ناتے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ بتا دو، سونے کے ظروف اہرام سے نکال کر کہاں چھپا دیئے ہیں؟ خود تمہی نے مجھے بتایا تھا کہ ابھی اس اہرام میں خاصے ظروف باقی ہیں۔“

”تم بھی جانتے ہو کہ میں نے اس سے انکار تو نہیں کیا۔“ جابر کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔

”تو پھر وہ ظروف کہاں اور کیسے غائب ہو گئے؟“ نجیب نے سوال کیا۔

”تمہیں اور طلال بے دونوں ہی کو میں اس کا تفصیلی جواب دے چکا ہوں۔ یہ کوئی پراسرار معاملہ ہے۔ میں جب اہرام میں پہنچا تو وہاں عجیب غیر انسانی آوازیں سنیں، پھر یوں لگا جیسے کچھ پراسرار قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرائی ہوئی۔ مجھے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ یہ چیخیں بھی انسانی نہیں تھیں۔ جو الفاظ میں نے سنے، میرے لئے مانوس ہی تھے۔ بظاہر مجھے اہرام میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی دوران میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے ہوش و حواس برقرار نہ رکھ سکا۔ جب مجھے ہوش آیا اور میں نے تابوت کھول کر دیکھا تو اس میں سونے کے ظروف نہیں تھے۔ میں نے فوراً اس کی اطلاع تمہیں اور طلال بے۔“

”پھر وہی کہانی!“ نجیب بول اٹھا۔ ”بقول تمہارے اگر اہرام میں کوئی نادیدہ پراسرار وجود تھا بھی تو اسے سونے کے ظروف سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ تم ہی بتاؤ کہ تمہاری اس کہانی پر کس طرح یقین کر لیا جائے؟ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ اسی سے ملتی جلتی کہانی حسنین نے بھی ایک مرتبہ سنائی تھی۔ اب بھی وقت ہے جابر! سچ بول دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری جان بخش دی جائے گی۔“

”میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں۔ تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے؟“ جابر بے بسی کے ساتھ بولا۔

”اگر ظروف تم نے نہیں چرائے تو پھر فرار کیوں ہو رہے تھے؟“ نجیب کی آواز میں جھجھک تھی۔

”لیکن جناب مجھے تو لگتا ہے کہ یہ مرچکا ہے۔“ میں بول اٹھا۔
”یہ کس طرح ہو سکتا ہے!“ نجیب یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ ”یہ اتنا کمزور تو نہیں تھا کہ اتنا تشدد بھی برداشت نہ کر پاتا۔“
ذرا سی دیر میں نجیب کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ شدید حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے فکر پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ نجیب خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ”اسے اطمینان دلانا مشکل ہو جائے گا کہ اس پر اتنا تشدد نہیں کیا گیا کہ یہ مر جاتا۔“
میں اس کی فکر مندی کا سبب جان گیا۔ اسے جابر کی موت کا ملال نہیں تھا۔ یقیناً وہ طلال بے کی طرف سے کی جانے والی جواب طلبی کے سبب فکر مند تھا۔
”اسے ابھی اسی حالت میں رہنے دو۔ تمہ خانہ بند کر دو! تم دونوں کھانا کھاؤ، پھر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ نجیب یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

میں اور شجاع بھی نجیب کے پیچھے پیچھے یہ تمہ خانے سے نکل آئے اور اس کا راستہ بند کر دیا۔
”حیرت ہے ضرغام کہ وہ اتنی جلدی مر گیا!“ شجاع نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
”شکر کرو شجاع کہ صاحب بھی اس وقت تمہ خانے میں موجود تھے ورنہ تو سارا الزام ہم پر آ جاتا۔“ میں بولا۔

”ہاں، یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو، مگر صاحب نے ابھی اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا حکم کیوں نہیں دیا؟“ شجاع کہنے لگا۔

”یہ تو صاحب ہی بہتر جان سکتے ہیں۔“ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اونکھ خیال آیا۔ اس طرح نجیب اور طلال بے کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں جو میرے لئے سو مند ثابت ہوتیں۔ کوٹھی کے باورچی خانے میں کھانے کے لئے کہہ کر میں تیز قدموں سے اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

سوئی سے میں کہہ آیا تھا کہ کھانا جلد بھجوا دے، مجھے نجیب کے ساتھ جانا ہے۔ سو اس نے نہیں کی۔ میرے لئے کھانے لے کر آنے والی زرجس تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے پاس لے لیا۔ جب سے سوئی میری زندگی میں آئی تھی، میں قطعی بدل گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ نوجوان وحشیان آدم زادوں سے قرب کے بہانے ڈھونڈتا تھا اور اب معاملہ برعکس تھا۔ ایک پڑکھ آدم زادوں کے قرب سے بچنے کی خاطر میں نے اسے اپنے اثر میں لے لیا۔
زرجس کے ذہن میں مجھے نجیب کا خوف بٹھانے میں دیر نہ لگی۔

”ہاں میں تو آگ سے کھیل رہی ہوں۔“ زرجس میرے زیر اثر خواب آلود سی آواز میں کہنے لگی۔
”اگر صاحب کو ضرغام سے میرے تعلقات کا پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں اب ضرغام کی چٹنی چڑی باتوں میں آکر اپنی زندگی کو خطرے سے دو چار نہیں کروں گی۔“

میرا مقصد پورا ہو گیا تو میں نے زرجس کو اپنے اثر سے آزاد کر دیا اور دانستہ اس سے پوچھا۔ ”رات کو تو آؤ گی نا؟ میں دروازہ کھلا رکھوں؟“

”آہستہ بولو!“ وہ خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔ رات کو میں نہیں آ سکتی اور..... اور اب مجھے بھول جاؤ ضرغام! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے ورنہ صاحب کو شبہ ہو گیا تو..... تو وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔“

”کبھی کبھی تو یہ خطرہ مجھے بھی محسوس ہوتا ہے، لیکن اتنا ڈرنے کی بات بھی.....“
”نہیں!“ اس نے میری بات کاٹ دی اور فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اسے نہیں روکا۔
بہر حال اب اس سے میری جان چھٹو گئی تھی۔

میں نے ایک ہی دن میں خود کو بھی بچا لیا تھا اور سوئی کو بھی۔ وقت کیوں کہ کم تھا اس لئے میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اپنے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ضرغام کا قالب چھوڑ کر میں دانستہ ایک جھٹکے سے نکلا تاکہ اس پر بے ہوشی طاری ہو جائے۔ میری توقع پوری ہوئی۔ اس کے بے ہوش جسم کو بستر پر پڑا چھوڑ کر میں دوسرے ہی لمحے کوٹھی کے تہ خانے میں پہنچ گیا۔ جابر کی لاش کو ستون سے کھول کر میں تیزی کے ساتھ تہ خانے سے نکال لایا۔ میں نے ایک دم تیز اور اونچی پرواز کی تاکہ جابر کی لاش پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ چند ہی لمحوں کے اندر میں، قاہرہ شہر سے کئی سو میل دور آ گیا۔ اب میں سمندر کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔

اڑتے ہوئے میں نے اچانک گہرا غوطہ لگایا اور جابر کی لاش کو سمندر میں ایسی جگہ پھینک دیا جہاں دور دور تک خشکی کا نام و نشان نہیں تھا۔ قاہرہ واپس پہنچنے میں بھی مجھے چند ہی لمحے لگے۔ ضرغام کو ہوش میں لا کر میں اس کے جسم میں اترا ہی تھا کہ کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔
دروازہ کھولنے پر پھر زرجس نظر آئی۔ وہ خالی برتن لینے آئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھے بتایا۔
”صاحب نے کار نکالنے کے لئے کہا ہے۔“

عموماً پیغام رسانی کا فرض وہی ادا کرتی تھی۔ وہ برتن لے کر چلی گئی تو میں بھی کوارٹر سے باہر آ گیا۔ اسی وقت مجھے برابر والے کوارٹر سے شجاع بھی نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی کوٹھی کے کمرے تک پہنچے۔ کار لا کر میں نے پورج میں کھڑی کی تھی کہ نجیب کوٹھی سے نکل آیا۔
شجاع نے بہ عجلت کار سے اتر کر نجیب کے لئے دروازہ کھولا۔

کار میں بیٹھ کر نجیب نے مجھے مخاطب کیا۔ ”مصر قدیمہ چلو ضرغام!“
”جی بہتر ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً گھبرا جاتا کیوں کہ اسے خبر نہ ہوتی کہ اس وسیع و عریض علاقے میں نجیب کو کہاں جانا تھا! غالباً ضرغام کو اس کا علم رہا ہو گا اسی لئے نجیب نے صرف علاقے کا نام بتانے پر اکتفا کیا تھا۔ کار ڈرائیور کرتے ہوئے میں نے اسی غرض سے شجاع کے ذہن کو ٹھٹھا اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔
شجاع کو پورا پتا معلوم تھا۔ طلال بے کی یہ ایک خفیہ پناہ گاہ تھی جس سے کم ہی لوگ واقف تھے۔

میں تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا ہوں چیزا کو پیچھے چھوڑ آیا۔ اب کار اہرام روڈ سے گزر رہی تھی۔ اچانک ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک دندناتا ہوا کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ٹرک ڈرائیور پاگل ہو گیا ہے۔ میں نے انتہائی تیزی اور مہارت کے ساتھ اسٹیرنگ گھمایا اور بائیں جانب کار کو کچے میں اتار لیا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہاں ایک سیاہ دین کھڑی تھی۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ سیاہ دین کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے افراد مجھے نظر آ گئے۔ ڈرائیور کے ساتھ ہی مجھے نجوا کا دست راست منصور بیٹھا دکھائی دیا۔ میرے لئے یہ حیران کن بات ہی تھی۔ یہی لمحات حیرت میرے لئے انتہائی تباہ کن ثابت ہوئے۔ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر نجیب اور شجاع کو میں نے باہر چلا نکلیں لگاتے دیکھا کیوں کہ کار تقریباً رک چکی تھی۔ پھر ایک ساتھ ہی دونوں جانب سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ منصور کے ہاتھ میں خود کار رائل نقل تھی۔ مجھے کار سے اترنے کا موقع نہیں مل سکا۔

شاید وہ ایک لمحے کا ہزارواں حصہ ہو گا جب میں 'ضرغام کے جسم سے باہر نکل آیا۔ اسی کے ساتھ ضرغام کا جسم گولیوں سے جھٹکتی ہو گیا۔

مجھ سے اگر ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو انسانی قالب میں ہونے کے سبب اپنی تمام تر ہراساں جتنی قوتوں کے باوجود اپنی زندگی گنوا دینھتا۔ یہ حملہ بہت منظم اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ پہلے ایک ٹرک اس طرح کار کی طرف بڑھا جیسے اسے روندنا ہو کر گزر جائے گا۔ اس ہولناک حادثے سے بچنے کی یہی صورت ممکن تھی کہ کار کو کچے میں اتار لیا جاتا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک سیاہ دین میں منصور اپنے مسلح ساتھیوں سمیت موجود تھا۔ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے منصور اور اس کے ساتھیوں نے جنم کے دہانے کھول دیے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ نجیب اور شجاع کار کی آڑ لئے فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ منصور اور اس کے ساتھی سیاہ دین کی آڑ لئے ہوئے تھے اور بظاہر ان کا پلہ بھاری تھا۔ میرے لئے یہ وجوہ نجیب کی زندگی زیادہ اہم تھی۔ اسی کے ذریعے میں 'مقرر کی نام نادر روح تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے دیر نہیں کی۔ نجوا اور اس کے ساتھیوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر نجوا کا دست راست منصور اس معرکے میں کام آجاتا تو نجوا کو یقیناً ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ میں چشم زدن میں منصور کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے دائیں بائیں دو مسلح افراد موجود تھے۔ انہی میں سے ایک کو میں نے اپنے زیر اثر لے لیا۔

دوسرے ہی لمحے اس شخص نے سامنے کی طرف گولیاں چلاتے ہوئے اچانک اپنی رائل نقل کار منصور کے سر کی جانب کر دیا۔ گولی چلی اور منصور کا کاسہ سر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ منصور کے جو ساتھی پیچھے موجود تھے انہوں نے بھی منصور کو قتل ہوتے دیکھا۔ رد عمل میں انہوں نے منصور کے قاتل کو پھونک دیا۔ "بھاگا!" منصور کا ایک ساتھی میرے زیر اثر بیچ اٹھا۔ "مقرر کے غلام ہمیں چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔"

پھر منصور اور اس کے قاتل کی لاش کو وہیں چھوڑ کر وہ سب تیزی کے ساتھ سیاہ دین میں بیٹھے اسے موڑ کر فرار ہونے لگے۔ غیبت یہ ہوا کہ دین کا کوئی ٹائمرسٹ نہیں ہوا اور نہ وہ اپنی اس کی کوئی

میں کامیاب نہ ہوتے۔ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ شاید نجیب بھی اس کا سبب نہیں سمجھ سکا۔ میں جس کار کو ڈرائیو کر رہا تھا، اس کا ونڈا سکرین چکنا چور ہو چکا تھا اور کاری کی پاڑی پر بھی جگہ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ضرغام مردہ پڑا ہوا تھا۔ میں لپک کر شجاع کے جسم میں اتر گیا۔ اسی وقت نجیب نے مجھے مخاطب کیا۔ "جلدی کرو شجاع! کبیں پولیس کی کوئی پیڑونلنگ کار ادھر نہ آجائے!"

مجھے شجاع کے جسم میں قرار آگیا تو کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ضرغام کی لاش کو گھسیٹ کر برابر والی سیٹ پر ڈال دیا۔

اس اثناء میں نجیب کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ نجیب تیزی سے بولا۔ "واپس زناک چلو" جلدی!"

میں نے تیزی سے کار کو موڑا اور پھر سڑک پر آگیا۔ واپسی کا سفر میں نے آندھی طوفان کی طرح طے کیا۔ ونڈا سکرین ٹوٹ جانے کے سبب تیز ہوا کے تھپیڑوں نے میری حالت خراب کر دی۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح میں 'زناک پہنچ ہی گیا۔ ضرغام اور شجاع کے علاوہ بھی نجیب کی کوٹھی میں اس کے اور وفادار غلام موجود تھے۔ نجیب کے حکم پر انہی کی مدد سے میں نے ضرغام کی لاش کو اس قبر میں دفن کر دیا جو خود ضرغام اور شجاع نے رقامہ جزیلہ کے لئے کھودی تھی۔ کبھی کبھی تقدیر انسانوں کو یہ تماشائی دکھائی ہے کہ جو قبر وہ دوسروں کے لئے کھودتے ہیں، خود اسی میں انہیں اترنا پڑتا ہے۔ ضرغام کے ساتھ ہی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔

سوی کو علم تھا کہ میں 'ضرغام کے جسم میں ہوں۔ وہ اسی لئے ضرغام کی موت پر سخت فکر مند تھی۔ میں اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اسے حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی مجھے یہ موقع مل گیا۔ جو واقعہ پیش آیا تھا، اسے میں نے مختصراً بتا دیا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

کوٹھی میں دوسری دو کاریں بھی موجود تھیں۔ نجیب نے انہی میں سے مجھے ایک کار نکالنے کا حکم دیا۔ کسی دوسرے موقع حملے کے پیش نظر دوسری کار میں نجیب کے چار مسلح وفادار سوار ہو گئے۔ انہیں میری کار کے آگے آگے چلنا تھا۔ نجیب یقیناً آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے گزرے ہوئے ہولناک واقعے کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے پڑ سکون ہی دکھائی دیا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر مصر قیدیہ جا رہا تھا۔

اگلی کار جو آگے آگے چل رہی تھی، میں اسی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دیے تو میں پہلے ہی شجاع کا ذہن پڑھ کر پتا لگا چکا تھا کہ مصر قیدیہ میں کہاں پہنچنا ہے! پھر بھی اب اگلی کار کی وجہ سے میں بے فکر تھا۔ اس کے ڈرائیور کو بھی یقیناً طلال بے کے ٹھکانے کا علم تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے مجھے بہر حال رہنمائی حاصل تھی۔

☆=====☆=====☆

قدیم طرز پر بنی ہوئی وہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی جس کے احاطے میں آگے پیچھے ہماری

دونوں کمرے داخل ہوئیں۔ عمارت گھنے درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ بظاہر اس عمارت میں سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ ہو۔ عمارت کا پھانک بھی ہمیں کھلا ہی ملا تھا۔

کار کو روکنے ہی میں نے جلدی سے اتر کر اس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ نجیب نے صرف مجھے اپنے ساتھ اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ بقیہ افراد باہر ہی رہے۔ میں، نجیب کے ساتھ آگے بڑھا۔

عمار ت کا صدر دروازہ منقش اور ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ دائیں جانب مجھے کال بیل کاٹن نظر آیا۔ نجیب کے اشارے پر میں نے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں خاصے فاصلے سے گھنٹی بجنے کی دھیمی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد میں نے بٹن سے انگلی ہٹائی۔

دروازہ فوراً انہیں کھلا۔ اس کے لئے ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر جب دروازہ کھولا گیا تو مجھے وہی دروازہ قد حسین نرس نظر آئی جسے میں نے طلال بے کی ملازہ والی کو بھی میں دیکھا تھا۔ نجیب کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔

”کیسی ہو یونیکا؟“ نجیب نے بڑی بے تکلفی سے نرس کا سرخ و سفید رخسار تہنیتاً پایا۔

”اچھی ہوں۔ آپ تو ٹھیک ہیں؟“ یونیکا نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، مگر کبھی کبھی تم بہت یاد آتی ہو۔“ نجیب نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”طلال بے کی حالت کچھ اور ٹھیک ہو جائے تو میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”میں بھی بڑی بے چینی سے اس دن کے انتظار میں ہوں۔“ وہ بولی، پھر سوال کیا۔ ”آج آپ کے ساتھ ضرغام نہیں آیا؟ وہ کہاں ہے؟“ یونیکا دروازہ بند کر کے مڑی۔

”ضرغام وہاں ہے یونیکا، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔“ نجیب نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بتایا اور آگے بڑھنے لگا۔

یونیکا چلتے چلتے چونک اٹھی اور کہا۔ ”کیا..... کیا وہ..... وہ مارا گیا؟“

”ہاں۔“ نجیب نے جواب دیا۔ ”یہ آج ہی کا واقعہ ہے۔“

”اس کی موت پر افسوس ہوا کیونکہ وہ آپ کے جاں نثاریوں میں سے تھا اور اس نے آج یہ فرض ادا کر دیا۔“

نجیب نے جواب دیا۔ ”جاں نثار اسی لئے ہوتے بھی ہیں۔“

یونیکا اور نجیب کے درمیان ہونے والی ابتدائی گفتگو سن کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان مراسم کی کیا نوعیت رہی ہوگی۔

مختلف راہداریوں سے گزر کر آخر ہم ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں بڑی سی ایک مسہری پر مسخرا طلال بے تکیوں کے سارے نیم دراز تھا۔ مسہری کے قریب ہی کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ نجیب اور یونیکا ان کرسیوں پر بیٹھ گئے، مگر میں نجیب کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہی رہا۔ مجھے اپنی حیثیت کا علم تھا۔

مسخرے طلال بے نے خلاف توقع میری طرف حقارت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے نجیب کو اپنی

چکانہ آواز میں مخاطب کیا۔ ”نجیب! تم سے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب مجھ سے ملا کرو تو اپنے وفا دار ہاتھوں کتوں کو ساتھ لائے کی ضرورت نہیں۔ اپنے اس کتے کو تم باہر بھی چھوڑ کر آسکتے تھے۔“ اس غیبت مسخرے نے میری طرف اشارہ کیا۔

”اسے میں بلاوجہ ساتھ نہیں لایا ورنہ تو بقول تمہارے باہر بھی چھوڑ کر آسکتا تھا۔“ نجیب کہنے لگا۔

”اچھا تو پھر پہلے وہی وجہ بتا دو تاکہ تمہارے اس کتے کو یہاں سے دفع کیا جاسکے۔“ طلال بے نے ایک مرتبہ پھر میری طرف نفرت سے دیکھا۔

وہ مسخرے مجھے شجاع سمجھ کر میرے لئے جو الفاظ استعمال کر رہا تھا، انہیں سننے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا۔

پھر نجیب نے طلال بے کو جابر کی غیر متوقع موت سے آگاہ کیا۔

”اور تم نے اس کی لاش ٹھکانے لگوا دی ہوگی!“ طلال بے چہچہتی ہوئی آواز میں بولا۔

اس پر نجیب مسکرایا اور کہا۔ ”اگر میں تم سے واقف نہ ہوتا تو یقیناً ایسا ہی کرتا۔ جابر کی لاش ابھی تک اسی حالت میں میری کونٹھی کے تہ خانے میں موجود ہے۔“

”تم نے کچھ انداز لگایا کہ وہ معمولی سا تشدد بھی کس لئے برداشت نہیں کر سکا؟“ طلال بے نے سوال کیا۔

”نہیں۔“ مجھے خود اس پر حیرت ہے۔ ”نجیب نے جواب دیا۔ ”بظاہر تو وہ صحت مند ہی دکھائی دیتا تھا۔ میرے حکم پر ضرغام اور شجاع نے اس پر تشدد شروع کیا۔ خود میں بھی اس وقت تہ خانے میں موجود تھا۔“ پھر نجیب نے ابتدائی تشدد کی تفصیل بتا کر کہا۔ ”جب اس کے دونوں ہاتھوں کو آہنی شکنجوں میں کسا گیا تو بس اچانک ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے، لیکن

ضرغام نے بتایا کہ جابر کی موت واقع ہو چکی ہے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو واقعی وہ.....“

”ناممکن!“ طلال بے نے نجیب کی بات کاٹ دی۔ ”وہ اس طرح نہیں مر سکتا! اسے قتل کیا گیا ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اسے کون قتل کر سکتا ہے؟“ نجیب نے کہا۔ ”تہ خانے میں میرے اور ضرغام.....“

”تم شاید اپنے اس ہاتھ کتے کو اسی لئے ساتھ لائے ہو کہ یہ تمہارے بیان کی تصدیق کر سکے۔“ طلال بے بول اٹھا۔ ”مگر دوسرا کہاں ہے؟“

”وہ اب زندہ نہیں رہا۔“ نجیب سپاٹ سی آواز میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ طلال بے چونک اٹھا۔ ”اسے کس نے مار دیا؟“

”نجا کے آدمیوں نے۔“ نجیب نے یہ کہہ کر پیش آنے والا واقعہ بھی مختصراً اس انداز میں بتا دیا جیسے اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

”لیکن یہ خبر نجا کو کیسے مل سکتی ہے کہ تم مجھ سے ملنے یہاں آرہے ہو؟ یقیناً تمہارا کوئی آدمی اس

سے ملا ہوا ہے۔ اسی نے تجری کی ہوگی۔

”میرے آدمی مجھ سے غداری نہیں کر سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے نجیب کے لمبے میں ناگواری تھی۔
”تم تو تھا ہو گئے نجیب!“ طلال بے دھیرے سے ہنسا۔ ”اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نجوے تمہارے کسی آدمی کو خرید لیا ہو۔ خیر یہ تم جانو! مجھے تو یہ سراغ لگتا ہے کہ جابر کو کس نے قتل کیا ہے! اس کے لئے ہم جابر کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس معاملے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ پوسٹ مارٹم کا بندوبست اس عمارت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ تم اپنے آدمیوں کو بھیج کر جابر کی لاش یہاں منکوالو۔“

”ٹھیک ہے۔“ نجیب نے اقرار میں سر ہلایا، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”شجاع! تم اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے جاؤ اور جابر کی لاش لے آؤ! تمہیں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ احتیاط سے کام لینا ہے۔ کسی کو راستے میں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تمہاری کار میں کوئی لاش ہے۔“

”ایسا ہی ہو گا! آپ مطمئن رہیں جناب!“ میں ادب سے بولا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

اس پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ نجیب مجھے ثنا لاش لانے کے لئے نہیں بھیج رہا تھا۔ اب اس کے دو آدمی بھی یہ گواہی دیتے کہ جابر کی لاش کو غشی کے تہ خانے سے غائب ہے۔ مجھے تو پہلے یہ علم تھا کہ لاش تہ خانے میں نہیں ہے۔ باہر آکر میں نے نجیب کے دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ان دونوں کو میں نے راستے میں بتا دیا کہ انہیں کس لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں! یہ بات ان کے لئے کوئی حیرت انگیز نہیں تھی۔ وہ بہر حال نجیب کے آدمی تھے اور غالباً اس طرح کے کام پہلے بھی کرتے رہے تھے۔

راستے میں وہ مجھ سے ضرغام کی موت کے متعلق پوچھتے اور افسوس کرتے رہے۔

”اپنے دوست ضرغام کی اچانک موت پر میں بھی آدھا رہ گیا ہوں۔“ میں نے بھی دکھ کا اظہار کیا۔

”ٹھیک کہتے ہو، ضرغام ہمارا بہت اچھا ساتھی تھا۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”تمہارا اور اس کا تو ہر

وقت کا ساتھ تھا۔“

انہی باتوں میں سفر تمام ہو گیا اور ہم زماک پہنچ گئے۔ کو غشی میں موجود تہ خانے کا راستہ میں نے ہی کھولا اور ان دونوں کو ساتھ لئے میڑھیاں اترنے لگا۔

پھر جیسے ہی میں نیچے پہنچا، حیرت سے تقریباً چیخ اٹھا۔ ”ارے لاش کہاں غائب ہو گئی؟“

نجیب کے دونوں آدمی بھی حیران حیران سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا۔ ”وہ لاش تھی کہاں؟“

”وہاں۔“ میں نے ستونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ ستونوں کے درمیان زنجیروں سے بندھی ہوئی

تھی۔“

”اگر لاش یہاں تھی تو کہاں جا سکتی ہے؟“

”اسی پر تو مجھے تعجب ہے۔“ میں بولا۔ ”آؤ چل کر صاحب کو بتاتے ہیں۔“

وہ دونوں میرے ساتھ ہو لیے۔ ان کے چروں سے فکر مند کا اظہار ہو رہا تھا۔ تہ خانے سے لاش کا غائب ہو جانا ان کے لئے ایک معما ہی تھا۔ میں نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ واپس میں ہمارے درمیان زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ واپس مصر قیدیہ میں طلال کی کو غشی پہنچ کر ان دونوں کو بھی میں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ مقصد یہی تھا۔ کہ وہ بھی میرے اس بیان کی تائید کر دیں، جابر کی لاش تہ خانے سے غائب ہے۔

میرے ساتھ نجیب کے دو آدمیوں کو دیکھ کر طلال بے کے پھولے ہوئے رخسار کچھ اور پھول گئے، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں جیسے مزید اندر دھنس گئیں۔ یہ گویا اس کے غصے کا اظہار تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، طلال بے مضحکہ خیز انداز میں غرایا۔ ”لاش کہاں ہے؟ اور ان دونوں کو تم کس کی اجازت سے اندر لے کر آئے ہو؟“

میں نے اس کے غصے کی پروا کئے بغیر جواب دیا۔ ”جابر کی لاش تہ خانے میں نہیں ہے۔ ان دونوں کو میں اس لئے ساتھ.....“

”کیا؟“ طلال بے اور نجیب ایک ساتھ چیخ اٹھے۔ نجیب تو ایک دم اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بتاؤ لاش کہاں غائب ہو گئی؟“ نجیب نے مجھے گھورتے ہوئے سخت لمبے میں سوال کیا۔

”میں تو خود حیران ہوں جناب! آپ ان دونوں سے پوچھ لیں، یہ تو میرے ساتھ تھے!“

معاً طلال بے کے بچکانہ قہقہے سے کرا گونج اٹھا۔ نجیب نے اس طرح طلال بے کی طرف دیکھا

جیسے طلال بے کی ذہنی صحت پر اسے شبہ ہو، پھر بولا۔ ”تم ہنس کیوں رہے ہو؟“

”تمہاری اس حماقت پر میں ہنسنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں!“ طلال بے کا لہجہ بدل گیا۔ ”پہلے جابر

بُراسر طور پر مارا گیا اور پھر اس کی لاش بھی غائب ہو گئی تاکہ کوئی ثبوت ہی باقی نہ رہے۔ نجیب! کیا تم

مجھے کوئی بچہ سمجھتے ہو کہ میں ان باتوں سے بہل جاؤں گا!“

”اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“ نجیب کی آواز میں بھی تلخی آگئی۔

”اب بھی مطلب سمجھانا باقی ہے! تمہارے اشارے پر پہلے جابر نے اہرام سے سونے کے ظروف

غائب کئے۔ پھر جب مجھے اس پر شک ہو گیا اور اسے تمہارے پاس زبان کھلوانے کے لئے بھیجا تو تم نے

پردہ پوشی کی خاطر اس کا کام تمام کر دیا۔ جابر کی لاش تم نے اس لئے ٹھکانے لگا دی کہ اس کے قتل کا راز

نہ کھل جائے!“

”طلال بے!“ نجیب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”تم مجھ پر بدترین الزام لگا رہے ہو! مت بھولو

کہ میں تم پر اس سے بھیانک الزام لگا سکتا ہوں۔“

”مثلاً؟“ طلال بے کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں انگاروں کی طرح دیکھنے لگیں۔

”تو سنو! میرے آدمیوں کو آخر تک معلوم نہیں تھا کہ میں تم سے ملنے کے لئے آئے والا ہوں۔

تمہیں البتہ پہلے سے اس کی خبر تھی۔ سو تم نے نجو کو یہ خبر دے دی تاکہ اس کے آدمی یہاں پہنچنے سے

پہلے ہی مجھے قتل کر دیں۔ منقرع کے بہت سے غلاموں کو یہ شک ہے کہ تم اور نجو اندر سے ایک ہو۔ اگر

”زاعون؟..... تم زاعون کی بات کر رہے ہو؟“ نجیب کے لہجے میں حیرت اب بھی برقرار تھی۔
 ”ہاں وہی۔“ طلال بے نے جواب دیا۔ ”اسی نے اہرام میں جابر کو بے ہوش کر کے سونے کے
 ظروف غائب کئے تاکہ ہم اپنے پرانے ساتھی پر شک کریں۔ ایسا ہی ہوا۔ اس سے زاعون کا مقصد یقیناً
 یہی ہو گا کہ ہم اپنے ایک پرانے اور وفادار ساتھی سے محروم ہو جائیں۔ جب میں نے جابر کی گزارش
 توہیں اس سے چھین کر اسے تمہارے پاس بھیج دیا تو زاعون ہی نے اسے تشدد کیے جانے کے دوران قتل
 کر دیا۔ پھر بعد میں تمہ خانے سے اس کی لاش بھی غائب کر دی۔ زاعون نے یہ خطرناک چال چل کر ایک
 طرف تو ہمارے اور میرے درمیان اختلاف کا بیج بو دیا۔ اگر مجھے بروقت اس کا خیال نہ آجاتا تو یہ چال
 کامیاب رہتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔ پھر منقرع کے غلام آپس میں ہی
 لڑ مرتے۔ اب کچھ آیا تمہاری سمجھ میں!“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو طلال!“ نجیب تاکید میں بولا۔ ”زاعون ہمیں آپس میں لڑا کے نہ
 صرف کمزور بلکہ ختم کر دینا چاہتا ہے۔“

”مجھے خوشی ہے نجیب کہ تم بھی حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے۔“ طلال بے نے کہا۔ اسی وقت یونیکا
 لوٹ آئی، مگر طلال بے نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تمہیں اس پر تعجب ہو گا کہ میں نے الازہر دالی کو بھی
 کیوں چھوڑ دی اور یہاں کیوں آگیا! اس کی وجہ بھی زاعون ہی تھا۔ اس نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ قسمت
 اچھی تھی کہ وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا ورنہ اسی رات کو مارا جاتا۔“ طلال بے نے یہ کہہ کر وہ واقعہ بیان
 کیا جب اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔

”لیکن وہ یہاں تک بھی تو پہنچ سکتا ہے!“ نجیب نے خدشے کا اظہار کیا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ایک مرتبہ وہ چوٹ کھا چکا
 ہے۔ پھر بھی میں اس کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ اگر وہ یہاں آیا تو بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ میرا
 مشورہ ہے کہ تم بھی اس کی طرف سے محتاط رہو۔ تم پر قاتلانہ حملہ کرانے میں بھی مجھے اس کا ہاتھ معلوم
 ہوتا ہے۔“

مجھے جو معلوم کرنا تھا، پتا چل گیا تو میں باہر آگیا۔ شجاع کے جسم سے میں زیادہ دیر تک غائب رہنا
 نہیں چاہتا تھا۔ جتنے عرصے میں اس کے جسم پر قابض رہا تھا، مجھے خبر تھی کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں ہوگا۔
 ایسی صورت میں اس نے نجیب کے آدمیوں سے جانے کیا کیا کہا ہوگا! مجھے یہ معاملہ بھی سنبھالنا تھا۔

عمارت سے باہر آنے کے بعد میں نے کچھ ایسا ہی منظر دیکھا۔ شجاع کو چاروں افراد نے گھیر رکھا تھا
 اور اس پر حیران ہو رہے تھے کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ وہاں کیسے پہنچ گیا! میں نے اس کے جسم
 میں اتر کر معاملے کو مزید بگڑنے سے بچالیا۔ چاروں آدم زادوں کو اپنے اثر میں لے کر میں نے ان کے
 ذہنوں سے وہ ساری باتیں محو کر دیں جو شجاع نے ان سے کی تھیں۔ یہ باتیں اگر نجیب کے علم میں
 آجاتیں تو وہ شجاع کی طرف سے شک میں مبتلا ہو جاتا جو میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہ ہوتا۔

کچھ ہی دیر میں نجیب بھی عمارت کے صدر دروازے سے باہر آتا دکھائی دیا۔ میں کار سے ٹیک

ایسا نہیں تو تم نے اب تک نجوا کو قانونی طور پر طلاق کیوں نہیں دی؟ میرے اس سوال کا تمہارے پاس
 کوئی جواب ہے؟ بولو؟“ نجیب غصے کے عالم میں بولتا رہا۔ ”تم مجھ پر‘ نجیب المندس پر غداری کا الزام لگا
 رہے ہو! کبھی تم نے اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھا ہے!“

”بس‘ نجیب‘ بس! بہت ہو گیا۔ تم میری قوت برداشت کا مزید امتحان نہ لو! کیا بچ ہے اور کیا بھوت،
 بہتر یہ ہے کہ ہم اس کا فیصلہ منقرع کی روح پر چھوڑ دیں۔“ طلال بے نے یہ کہتے ہوئے ایک دم چونک اٹھا۔
 اس کے چہرے سے غصے کے اثرات چند ہی لمحوں میں غائب ہو گئے اور پھر اس نے نرم لہجے میں نجیب کو
 مخاطب کیا۔ ”بیٹھ جاؤ! ہم دونوں ہی ایک دوسرے پر شک کر کے الزام لگا کر بھیاںک غلطی کے مرتکب ہو
 رہے ہیں۔ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں کہ یہ سب کیا ہے! اہرام سے سونے کے ظروف کیسے
 غائب ہو گئے؟ انہیں کس نے غائب کیا؟ جابر کیوں معمولی سے تشدد سے مارا گیا؟ پھر اس کی لاش کہاں
 گئی؟ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔“

نجیب نے غیر یقینی سی نظروں سے طلال کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹھ جاؤ‘ نجیب!“ طلال بے کا لہجہ بہ دستور نرم رہا۔ ”تمہارے اور میرے درمیان اختلاف کا
 بیج کس نے بویا ہے؟ یہ بھی میں تمہیں بتاؤں گا۔“ کچھ کے بغیر نجیب دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے
 پر حیرت کے آثار تھے۔

”تم لوگ باہر جاؤ!“ طلال بے نے مجھے اور نجیب کے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ پھر یونیکا سے کہا۔
 ”تم جا کر دروازہ اندر سے لگا لو۔“

عیار مسخرے طلال بے نے عین موقع پر مجھے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ یقیناً اس کا شاطرانہ ذہن کوئی
 اہم نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔ نجیب سے وہ کوئی اہم بات کہنے والا تھا۔ یونیکا جیسے ہی ہمارے ساتھ اس کمرے سے
 نکلی، میں حتی الامکان آہستگی سے شجاع کا جسم چھوڑ کر باہر آگیا۔ میری اس کوشش کا مقصد یہ تھا کہ شجاع
 کہیں بے ہوش نہ ہو جائے! وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ میں نے اسے اپنے اثر میں
 لے کر فوراً ہی سیدھا کھڑا کر دیا۔ اسی کے ساتھ اسے میں نے حکم دیا کہ باہر تک خود وہ اپنے پیروں پر چل
 کر جائے گا۔ شجاع کسی حمزہ فقیص کی طرف آگے بڑھا تو میں تیزی سے پلٹا۔ دوسرے ہی لمحے میں طلال
 بے کے کمرے میں تھا۔

”ہاں اب سنو نجیب کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ہم سے کیا بنیادی غلطی ہوئی ہے۔“ طلال بے کہہ رہا
 تھا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے سب سے بڑے دشمن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اب میں اس نتیجے
 پر پہنچا ہوں کہ جابر کا بیان غلط نہیں تھا۔“

”کیا مطلب؟“ تم واضح الفاظ میں بتاؤ! تم کس دشمن کی بات کر رہے ہو؟“ نجیب نے حیرت کے
 ساتھ پوچھا۔

”وہی کمینہ اور سنگ دل دشمن کہ جس نے مجھے میرے ایک ہاتھ سے محروم کر دیا ہے۔“ طلال
 بے نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔ اس عیار نے بالکل درست نتیجہ اخذ کیا تھا۔

لگائے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے سنبھل کر کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ کار میں بیٹھ گیا تو دروازہ بند کر کے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

نجیب کے جو چاروں مسلح آدمی دوسری کار میں سوار تھے، پہلے وہی عمارت کے احاطے سے نکلے۔ میں نے ان کے پیچھے اپنی کار ڈال دی۔ نجیب نے زامک واپس چلنے کے لئے کہا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ نجیب کے دست راست منصور کے بارے کا علم بھی ہے یا نہیں! یہی سوچ کر میں نے نجیب کو مخاطب کیا۔ ”جناب! ہم پر اہرام روڑ پر جو حملہ ہوا تھا، اس میں منصور مارا جا چکا ہے۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ میں کتنی بڑی غلطی کر رہا ہوں! میں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ شجاع منصور کو پہچانتا بھی ہو گا یا نہیں!

”نہو! کے دست راست منصور کو تم کیسے جانتے ہو؟“ نجیب نے جھپتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

اس پر میں چکرا کے رہ گیا اور فوری طور پر بس ایک ہی بہانہ سوچا۔ ”ایک مرتبہ آپ..... آپ ہی نے فون پر کسی کو اس کا حلیہ بتایا تھا۔“

”تو میں فون پر جو باتیں کرتا ہوں، تم چسپ کر سننے رہتے ہو؟“

”جج..... جی نہیں جناب!“ میں گڑبڑا گیا۔ ”وہ..... وہ تو میں نے بس یوں ہی۔ یوں ہی میں نے آپ کی بات سن لی تھی۔ اس..... اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ دانستہ میں نے اس کا حلیہ بھی یاد نہیں رکھا، بس وہ گیا ذہن میں۔“

”مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کسی سے فون پر کبھی منصور کا حلیہ بیان کیا ہو۔ تم کہتے ہو تو ممکن ہے..... خیر چھوڑو! ضرغام کی بے وقت موت کے سبب تمہاری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔“

نجیب کہنے لگا۔ ”آج رات بارہ بجے تیار رہنا! مجھے عظیم منترع کی سرگوشیاں سننے کے لئے جانا ہے۔“

”جی..... جی جناب! میں تیار رہوں گا۔“ مجھے کہنا پڑا حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہیں تھی، اس غیبت کو کہاں جانا ہے!

ایک عذاب سے ابھی جیسے تیسے میری جان چھوٹی تھی کہ میں دوسری مصیبت میں پھنس گیا۔

”تمہیں تو خبر ہے ناکہ ہمیں کہاں چلنا ہے؟“ نجیب نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم پہلے بھی وہاں جا چکے ہو۔“

”جی ہاں جناب!“ میں اس کے سوا اور کہتا بھی کیا!

پھر بقیہ سفر خاموشی سے گزرا، مگر میرا ذہن الجھا رہا۔ مجھے نجیب کو آج رات کہاں لے جانا تھا، اس سے لاعلم تھا۔ نجیب کا ذہن پڑھ کر تو کچھ پتا لگتا، ممکن نہیں تھا، ہاں اس کے ملازمین کے ذہنوں کو ضرور نؤلا جاسکتا تھا۔ پھر بھی مجھے یقین نہیں تھا کہ مجھے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

کوٹھی پہنچتے ہوئے شام کے چھ بج چکے تھے۔ میں نے نجیب کو کار سے اتار کر گیرج کیا۔ کار کو گیرج میں کھڑی کر کے میں نے چائے پینے کا بہانہ سوچا۔ بہر حال ملازمین کے ذہنوں کو پڑھنا تھا۔ مجھے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنے سوال کا جواب مجھے نہیں ملا۔ اب، ایک آخری صورت ہی رہ گئی تھی کہ میں اس آدم

زاد شجاع کے ذہن کو پڑھتا جس کے جسم پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ اسی غرض سے میں اپنے کوارٹر میں آگیا۔ کوارٹر کا دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ اسے میں نے بے ہوش نہ ہونے دیا اور اپنے اثر میں لے لیا۔

مجھے اپنی منزل قریب نظر آرہی تھی کیوں کہ منترع کی روح کا راز کھلنے والا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں یقین سانسیں آ رہا تھا کہ مجھے اتنی جلدی کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ پھر جب میں نے شجاع کے ذہن کو پڑھا تو چونک اٹھا۔ اسی کے ساتھ میں نے شدید خطرہ محسوس کیا۔ اپنی دانستہ میں نجیب نے مجھے پھانسنے کے لئے جال بچھا دیا تھا اور اب ڈوری کھینچنے ہی والا تھا۔

☆=====☆

ایک غلطی تو مجھ سے یہ ہوئی کہ میں نے نجیب پر یہ ظاہر کر دیا کہ نجوا کے دست راست منصور سے واقف تھا۔ نجیب یہ سن کر یقیناً میری طرف سے کھٹک گیا تھا۔ بہ ظاہر تو اس نے یہی تاثر دیا تھا کہ میرے جواب سے مطمئن ہو گیا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ نجیب نے اسی لئے ایک اور چال چلی جو کامیاب رہی۔ منترع کی سرگوشیاں سننے کے لئے وہ کبھی شجاع کو اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ پھر بھی اس نے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی خاطر دانستہ یہ کہا کہ میں اس غرض سے پہلے بھی اس کے ساتھ جا چکا ہوں۔ میں نے لاعلمی کے سبب یہ اقرار کر لیا۔ شجاع کا ذہن پڑھ کر میں اسی لئے چونک اٹھا تھا کہ اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ شجاع کبھی اس غرض سے نجیب کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ شجاع کے جسم کو چھوڑ دیتا۔

نجیب سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ آدھی رات گزرنے کا بھی انتظار نہ کرتا۔ وقت سے پہلے بھی نہ پھیلانے ہوئے جال کی ڈوری کھینچ سکتا تھا۔ میں اب شجاع کے جسم میں محفوظ نہیں تھا۔ یہی سوچ کر میں فوراً اس کے جسم سے باہر آگیا۔ میں نے ایسا کرتے ہوئے کسی احتیاط سے کام نہیں لیا تھا۔ شجاع کے جسم کو اسی لئے جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

شجاع کو بے ہوش چھوڑ کر میں اس کے کوارٹر سے نکل آیا۔ مجھے اب سوی کی تلاش تھی۔ اس کے لئے میں نے کوٹھی کا رخ کیا۔ سوی مجھے نجیب کے کمرے کی طرف ٹرائی میں کافی لے جاتی دلی مل گئی۔ اس وقت راہداری میں سوی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ لیا۔

مجھے دیکھ کر وہ رک گئی اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”تو اس آدم زاد کے جسم میں سے باہر کیوں.....“

”یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے تو فوراً اس آدم زادی کے جسم سے نکل آ!“ میں اس کی پوری بات سننے بغیر جلدی سے بول اٹھا۔

”کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟“ سوی نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ہاں یہی سمجھ لے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر خطرہ تیرے لیے نہیں میرے لیے تھا۔“
سوی نے میرے کہنے پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ اسی سبب آدم زادی رابعہ بے ہوش ہو کر ایک طرف گر پڑی۔ اب مجھے کوئی پروا نہیں تھی کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا!
میں نے سوی کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد ہی میں ’نجیب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ فون پر طلال بے سے بات کر رہا تھا۔

”ہاں ہاں میں سن رہا ہوں طلال!..... وہ تو خیر میرے جال میں پھنس ہی گیا ہے۔..... تمہارا یہ کتنا درست ہی ثابت ہوا کہ زاعون میرے کسی قریبی ملازم کے جسم پر بھی قبضہ کر سکتا ہے۔ تم نے جو نشانیاں بتائی تھیں، وہ شجاع میں موجود ہیں۔ اس کی آنکھوں اور ہاتھوں کے ناخنوں کو میں نے غور سے دیکھ لیا تھا، ایک بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یہی نشانیاں مجھے اپنی ایک ادھیڑ عمر ملازمہ رابعہ میں بھی نظر آئی ہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“ نجیب نے سوال کیا، پھر کچھ دیر دوسری جانب کی بات سن کر بولا۔ ”ممکن ہے، یہ میرا وہم ہو۔ اس ملازمہ کو میں نے اسی لئے بلوایا ہے، ابھی پتا چل جائے گا۔“

طلال بے میری توقع سے کہیں زیادہ عیار ثابت ہو رہا تھا۔ نجیب سے طلال بے نے یہ بات اسی وقت کی ہوں گی جب میں اس کے کمرے سے نکل کر شجاع کے جسم میں واپس آ گیا تھا۔ میں صرف اپنے لیے ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا، مجھے کیا خبر تھی کہ نجیب کو سوی پر بھی شبہ ہو چکا ہے۔ میرے بروقت اقدام نے سوی کو بھی ایک ممکنہ خطرے سے بچا لیا تھا۔

میں توجہ سے نجیب کی گفتگو سننے لگا۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا کیا مشورہ ہے کہ رات انتظار نہ کروں؟..... تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اسی وقت شجاع کو ٹھنڈا کیے دیتا ہوں۔..... تم نہ کرو، میں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہوں گا۔ ہاں میں اسے سنہلنے کا موقع نہیں دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ پلٹ کے دار بھی کر سکتا ہے۔ میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی نجیب نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے چہرے پر مجھے شدید تناؤ نظر آ رہا تھا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ریوالور چیک کیا جس کے چیمبر میں پوری گولیاں موجود تھیں۔ ریوالور دوبارہ کوٹ کی جیب میں رکھ کر وہ بے چینی سے کمرے میں ٹھنسنے لگا۔ اسے یقیناً اپنی ادھیڑ عمر ملازمہ رابعہ کی آمد کا انتظار تھا جو کافی لمبے کر آنے والی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ رابعہ اس کے کمرے تک آنے والی راہداری میں بے ہوش پڑی ہے۔

ٹھلٹھلے ٹھلٹے آخر وہ رک کر کمرے کے دروازے کی طرح اٹھانے لگا۔ شاید اب وہ مزید انتظار متحمل نہیں تھا۔

رابعہ اس کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ نجیب نے اسے راہداری میں بے ہوش پڑے ہوئے دیکھ لیا اور تقریباً دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

ذرا سی دیر میں نجیب نے اپنے ملازمین کو آوازیں دے کر وہاں جمع کر لیا۔ بے ہوش رابعہ

منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو وہ ہوش میں آگئی۔

”رابعہ! تم میرے کمرے میں آؤ!“ نجیب یہ حکم دے کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

حیران حیران سی رابعہ جب نجیب کے کمرے میں داخل ہوئی تو نجیب نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

”اپنے دونوں ہاتھ آگے کرو!“ نجیب نے کہا۔

”جی..... جی ہاتھ؟“ رابعہ حیرت سے بولی۔

”ہاں ہاتھ!“ نجیب کے لمبے میں سختی آگئی۔

رابعہ نے خوفزدہ انداز میں اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔ نجیب نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ناخن دیکھے، پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔

”کیا ہوا تھا تمہیں؟ تم بے ہوش کیسے ہو گئیں؟“ نجیب نے سوال کیا۔

”مجھے..... مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب!“ رابعہ نے ڈری ڈری سی آواز میں جواب دیا۔

”بس..... میں تو باورچی خانے میں تھی، معلوم نہیں کیسے راہداری تک پہنچ گئی!“

”تم سے زرجس نے میرے لئے کافی بنا کر لانے کو کہا ہو گا اور تم کافی ہی لمبے کر آ رہی تھیں۔“

”مجھے..... مجھ سے تو زرجس نے کچھ بھی نہیں کہا اور نہ میں نے آپ کے لئے کافی بنائی۔

مجھے..... مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ..... کہ اتنی جلدی رات کیسے ہو گئی! ابھی تو دن تھا۔“

نجیب کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔ رابعہ کی آنکھیں اور ہاتھوں کے ناخن دیکھ کر یقیناً وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا، لیکن رابعہ جو کچھ کہہ رہی تھی، نجیب کے لئے حیران کن ہی رہا ہو گا۔ دن بھر سوی، رابعہ کے جسم پر قابض رہی تھی۔ پھر اسے کس طرح اس عرصے کی کوئی بات یاد رہتی! یہ معاملہ کرنا نجیب کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باوجود نجیب نے اپنی پوری کوشش کر لی، مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رابعہ کو اس نے اپنے کمرے سے جانے کی اجازت دے دی۔

”مجھے الجھائے رکھنے کے لئے یہ بھی زاعون کی کوئی چال ہو سکتی ہے تاکہ میں اس تک نہیں پہنچ سکوں۔“ نجیب خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

چند لمحے بعد ہی نجیب نے مفتی خیز انداز میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی کے

ساتھ میں نے اس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ کوئی عمل پڑھ رہا تھا۔

خطرہ! میرے ذہن میں یہی ایک لفظ بار بار گونجنے لگا۔ نجیب بلا وجہ کوئی عمل نہیں پڑھ سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے سوی کو اشارہ کیا اور اس کو مٹھی سے نکل کر فضا میں پرواز کرنے لگا۔ میرے

ساتھ ساتھ سوی بھی تھی۔ میں دانستہ زیادہ اونچی پرواز نہیں کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نجیب کہاں جا رہا ہے!

”تو نے اب تک بتایا نہیں اے علیا لیش کہ اچانک ہوا کیا؟“ سوی نے مجھے مخاطب کیا۔

درداڑے تک پہنچ چکا تھا۔

میں' نجیب کے قریب سے گزرا ہی تھا کہ مجھے شدید جھٹکا لگا۔ میں دور جا کر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جگہ روکنے میں کامیاب ہوا۔ میں کوارٹر کے اندر ہی کمرے کے سامنے گرا تھا اور نجیب کے قدم اسی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اگر وہیں پڑا رہتا تو دوبارہ اس ناپیدہ حصار کی زد میں آجاتا جو نجیب کے ارد گرد قائم تھا۔ یہ حصار اسی عمل کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا جو میں نے نجیب کو پڑھتے ہوئے دکھا تھا۔ یہ مشکل میں اٹھ کر نجیب کے راستے سے ہٹ گیا۔ حصار کی زد میں آجانے کے سبب فوری طور پر میں پرداز کے قائل نہیں رہا تھا۔ میرے وجود کی جان سی نکل گئی تھی۔ نجیب کے قدموں کی چاپ بھینٹا شجاع نے سن لی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ نجیب کمرے میں داخل ہوتا، شجاع کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریواور تھا جس کی نال نجیب کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”رک جائیے صاحب!“ شجاع نے سخت لہجے میں نجیب کو مخاطب کیا۔ ”اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیجئے! میں جانتا ہوں آپ مجھے قتل کرنے آئے ہیں، لیکن اب..... اب آپ ایسا نہیں کر سکتے! مجھے جانے دیں ورنہ.....“ شجاع نے دھمکی کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”غدار!“ نجیب چیخ اٹھا۔ ”تیری یہ ہمت کہ مجھ پر ہتھیار اٹھائے!“

”آپ ہی نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔ بولیں، کیا آپ مجھے اس وقت قتل کرنے نہیں آئے؟“

”ہاں میں تجھے قتل ہی کرنے آیا ہوں کہ تو میرے دشمن کا آلہ کار بن گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تیرے ہاتھ میں ریواور نظر نہ آتا۔“ نجیب نے یہ کہتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ ریواور نکال لے۔

میں اسی لمحے دھماکا ہوا۔ شجاع نے نجیب پر گولی چلا دی تھی۔

نجیب کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ گولی اس کے دائیں بازو میں لگی تھی۔ شجاع کا ارادہ نجیب کو قتل کرنے کا نہیں تھا ورنہ وہ نجیب کے سینے پر گولی مارتا یا سر کو نشانہ بناتا۔ کبھی کبھی آدم زادوں کی سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی انہیں لے ڈوبتی ہے۔ یہی نجیب کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایل ہاتھ سے اپنا دایاں بازو پکڑ لیا اور کراچے ہوئے شجاع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اسی کے ساتھ میں نے شجاع کے جسم کو جھٹکا سا لگتے دیکھا۔

”شجاع! میں..... میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ..... کہ اپنے ہاتھ سے ریواور نیچے پھینک دے۔“ نجیب رک رک کر بول رہا تھا۔ پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ کہنے لگا۔ ”نہیں، ریواور میں پھینک! تو..... تو اس کی نال کو اپنی کپڑی پر رکھ کر گولی چلا دے!“

نجیب نے شجاع کو اپنی پراسرار قوتوں کے اثر میں لے رکھا تھا۔ میں نے دانستہ کوئی مداخلت نہیں کی۔ نجیب کو میں اسی کے ایک ٹمک خوار کے ہاتھوں زخمی کر چکا تھا۔ میرے نزدیک فی الحال اتنا

”کیا تو نے خود نجیب کی باتیں نہیں سنی! یہ سب اسی عیار مغزے کی کارستانی ہے اسے سوی!“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو میں سمجھ گئی، لیکن طلال بے یا نجیب کو تجھ پر شک کیسے ہو گیا؟“

”اس میں کچھ تو میری غلطی ہے، کچھ اس مغزے کی عیاری کو دخل ہے۔ یہ باتیں تفصیل طلب ہیں، پھر کریں گے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے نیچے دیکھا۔

نجیب مجھے عمارت سے نکل کر تیز قدموں کے ساتھ اس طرف بڑھتا نظر آیا جہاں ملازمین کے لئے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ وہ شجاع کے پاس ہی جا رہا ہے۔ اسے یہی غلط فہمی ہو گی کہ میں ابھی تک شجاع کے جسم میں ہوں۔ اسے میں نے جو عمل پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، غالباً اس نے اپنی حفاظت اور اپنی دانست میں میرے کسی ممکنہ حملے سے بچنے کے لئے ہی پڑھا تھا۔ میں غوطہ لگا کر کچھ اور نیچے آگیا۔

”اور زیادہ نیچے نہ جا اے علیا لیش!“ سوی نے مجھے ٹوکا۔

”میرا خیال ہے اے سوی کہ نجیب نے ہم پر حملہ کرنے کی خاطر نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی عمل پڑھا ہے۔ تو مہم گھبرا! میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ شجاع کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے ممکن ہے، وہ اسے گولی مار دے۔ تو نے بھی دیکھ لیا ہو گا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں بھرا ہو ریواور موجود ہے۔“ میں بولا۔

سوی نے پھر مزید کچھ نہیں کہا اور میرے ساتھ نیچی پرداز کرنے لگی۔ ہم اب اتنے نیچے آچکے تھے کہ نجیب کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلاکی بختی تھی۔ اگر ہمارے لئے کوئی خط ہوتا تو اب تک ہم اس کی زد میں آجاتے۔ اب نجیب کو اردوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ اس شاید شجاع کو دانستہ نہیں بلایا ہو گا۔ شجاع کو غالباً وہ بے خبری میں شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس آدم زاد شجاع کی زندگی یا موت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے اسی لئے اس وقت جو خیال آیا، سوی اس سے آگاہ کر دیا۔

”لیکن اے علیا لیش، اس سے حاصل کیا ہے؟ تو کیوں یہ خطرہ مول لیتا ہے؟“ سوی کہنے لگی۔

”اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ بس چند لمحوں کی تو بات ہے۔ دشمن کو تھوڑا بہت سبق بھی تو چاہئے۔“ میں یہ کہتے ہی چشم زدن میں شجاع کے پاس پہنچ گیا۔

شجاع کو اب ہوش آچکا تھا اور وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے میں نے اپنے اثر میں لے لیا۔

”کیا میری وفاؤں کا یہی صلہ ہے کہ مجھے بلا سبب قتل کر دیا جائے!“ شجاع میرے زہرے بڑبڑانے لگا۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ نجیب کسی شک کی بنا پر اسے مارنے آ رہا ہے۔ اس کے ذہن کو میں نے نجیب کی طرف سے باغی کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہزار قوتوں کا مالک نجیب اس کے قابو میں نہیں آئے گا۔ شجاع بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ میں نے اسے اثر سے آزاد کر دیا اور اس کے کوارٹر سے نکل آیا۔ اس وقت تک نجیب کوارٹر کے کھلے ہو

ہی کافی تھا۔ میں اگر چاہتا تو شجاع کو نجیب کے قتل کا حکم بھی دے سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا۔ ابھی نجیب کو ختم کرنا خلاف مصلحت تھا۔ منقرع کی روح تک پہنچنے کے لئے نجیب ہی میرے لئے ذریعہ بننا۔ اب میرے وجود کی توانائی کسی حد تک واپس آچکی تھی۔

شجاع نے نجیب کے حکم پر ریوالور کی نال خود اپنی کینٹی پر رکھ لی۔

”گولی چلا!“ نجیب نے اسے سخت لمبے میں مخاطب کیا۔

دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا۔ شجاع کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا۔ اس کی کینٹی سے خون ابل رہا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جا گرا تھا۔

معا میں نے سوی کو اپنے قریب دیکھا۔ وہ یقیناً میرے جلد واپس نہ آنے پر فکر مند تھی۔ مگر اس کے سارا لے کر فضا میں بلند ہونے لگا۔

”تجھے کیا ہوا اے علیالیش؟“ سوی نے مجھ سے پوچھا۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں کہ تجھ سے ٹھیک طرح اڑا نہیں جا رہا۔“

”ہاں۔“ میں نے یہ کہہ کر سوی کو اپنی کمزوری کی وجہ بتا دی۔

”تجھے نجیب کی طرف سے خطا اور چوکنا رہنا چاہئے تھا۔“ سوی بولی۔

”بس ہو گی غلطی! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے گرد کوئی ٹائیڈ حصار کھینچ رکھا ہو گا۔“

میں نے اعتراف کیا۔

”ٹھہر! ابھی تیری طاقت لوٹ آئے گی۔“ سوی نے یہ کہہ کر ایک مختصر عمل پڑھا۔

جیسے ہی سوی نے عمل پڑھ کر مجھ پر دم کیا، میرے وجود میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ مگر سوی کا سارا لیے بغیر اڑنے لگا۔

”یہ عمل مجھے میرے باپ عزتیل نے تعلیم کیا تھا۔ میں تجھے اس کے الفاظ بتاتی ہوں تاکہ ایسے موقع پر تو خود یہ عمل پڑھ کر اپنے اوپر دم کر سکے۔“ پھر سوی نے مجھے اس عمل کے الفاظ بتائے اور کئی بار دہرا کر یاد کروا دیے۔ دریائے نیل پر پرواز کرتے ہوئے اب ہم شہری آبادی سے نکل آئے تھے۔

دریائے نیل کے کنارے ہم ایک جگہ اتر گئے تو سوی کے استفسار پر میں نے اسے پیش آنے دا۔ ان واقعات سے آگاہ کر دیا جن کی وجہ سے نجیب کو مجھ پر شک ہو گیا تھا۔

ساری باتیں سن کر سوی نے سوال کیا۔ ”یہ بتا اے علیالیش کہ اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”اے سوی! اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نجیب کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے ہمیں آدم زادوں کے جسموں میں اترنے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر؟“ سوی نے پوچھا۔

”ہم اسی کی کونٹھی میں رہیں گے۔ مقتول ضرغام کا کوارٹر خالی ہے۔ ہم وہاں رہ سکتے ہیں۔“

نے جواب دیا۔

سوی نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں شہر کی طرف چل دیے۔ ہماری منزل نجیب کی کونٹھی ہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے پہلے حالات کا جائزہ لیا۔ ضرغام کی طرح شجاع کی لاش کو بھی دنیا جا چکا تھا۔ دونوں دوست مرنے کے بعد بھی گویا ساتھ ساتھ تھے۔ نجیب نے اپنے دائیں بازو کی ڈریسنگ کمرالی تھی اور اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ دل بستی کے لئے زرجن بھی اس کے پاس تھی۔

کونٹھی سے نکل کر ہم ضرغام کے کوارٹر میں آ گئے۔ توقع کے مطابق کوارٹر خالی ہی تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔

میری خواہش تھی کہ میرا دشمن چین سے نہ بیٹھ سکے۔ اس کے لئے میں نے ایک تدبیر سوچی اور سوی کو بتائی۔ تدبیر پر عمل کرنے کی صورت میں ہمارے لیے ہر حال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سوی نے اسی سبب میری تدبیر سے اختلاف نہیں کیا۔

”اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا اے سوی کہ یہاں کی انتظامیہ پر منقرع کے غلاموں کا کتنا اثر ہے! وہ کتنے بار سوخ ہیں!“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ بھی ہے۔“ سوی نے تاکید کی۔

”تو پھر چل!“ میں نے سوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم ضرغام کے کوارٹر سے نکل آئے۔ نجیب کے اس وفادار ملازم کا نام ارشاد تھا۔ ہم اس کے کوارٹر میں پہنچ گئے۔ وہ سونے کے لئے لیٹ چکا تھا۔ میں نے اس کے ذہن پر توجہ دی۔ وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ تھکن کی وجہ یہ تھی کہ اسی نے مقتول شجاع کے لئے کونٹھی کے چھپلے حصے میں قبر کھودی تھی۔

میں نے اسے اپنے اثر میں لے لیا۔ وہ ابھی تک سویا نہیں تھا۔

”ہاں اگر آج ضرغام اور شجاع مارے گئے ہیں تو کل میری باری بھی آسکتی ہے۔“ ارشاد میرے زیر اثر بڑوانے لگا۔ ”صاحب نے تو یہی بتایا ہے کہ شجاع نے خود کشی کی ہے، مگر وہ ایسا کیوں کرنے کا کیا فر صاحب نے خود اسے گولی مار دی ہو!.....“ پھر صاحب پر کس نے گولی چلائی؟ اب میرا

کی کونٹھی میں رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں، لیکن مجھے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے دینی اپنے تاکہ مجھ پر قتل کا الزام نہ لگے۔ میں دونوں قبروں کی نشان دہی کروں گا۔ پھر پولیس جانے اور صاحب جانیں!“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”پولیس کو میں یہ بھی بتاؤں گا کہ آج دن میں

ہاں ایک بے ہوش آدمی کو لایا گیا تھا جس پر کونٹھی کے تہہ خانے میں تشدد ہوا تھا۔ پھر اس کی لاش اجب نے جانے کہاں اور کس طرح ٹھکانے لگوا دی! صاحب نے یہ کام شاید شجاع اور ضرغام سے

ہو گا۔ یقیناً شجاع نے راز داری کی خاطر ہمارے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ اسے نہیں معلوم لاش

ہاں غائب ہو گئی! بھلا تہہ خانے سے لاش کہاں جاسکتی ہے!“

جب میں شجاع کے جسم پر قابض تھا تو نجیب نے مصرعہ قدیمہ سے مجھے اپنے جن دو آدمیوں

کے ساتھ جابر کی لاش لائے بیٹھا تھا، ان میں سے ایک ارشاد تھا۔ اپنے دشمن کو بے سکون کرنے کے لئے اسی کے ایک ٹمک خوار کا میں نے انتخاب کیا۔ اس امکان کو بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا کہ میرا دشمن کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں۔ پولیس والے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز کر سکتے تھے۔

کوشی سے نکل کر ارشاد نے زانگ کے تھانے کا رخ کیا۔ رات کے وقت تھانے میں کوئی پولیس افسر نہیں ہو گا، مجھے علم تھا۔ پھر یہی ہوا۔ ارشاد کو تھانے میں ایک سب انسپکٹر ملا۔ دنیا بھر میں عموماً پولیس والوں کا رویہ ایک سا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی قانون کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے، پولیس والے پہلے اسی کو شہبے میں دھر لیتے ہیں۔ پہلے بھی پولیس والوں سے میرا سابقہ پڑ چکا تھا۔ سب انسپکٹر دو بچوں کو ملا کر تھانہ انچارج کے کمرے میں کمر سیدھی کرنے والا تھا کہ دروازے پر موجود سپاہی اندر داخل ہوا۔ سب انسپکٹر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور چہرے سے ناگوارا ظاہر ہونے لگی۔ سپاہی نے اسے سلیوٹ کیا۔

سپاہی کے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ برہم لہجے میں بول اٹھا۔ ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کچھ دیر کو آرام کرنے یہاں آیا تھا؟“

”مجھے تو معلوم ہے جناب، مگر اسے پتا نہیں جو آپ ہی سے ملنا چاہتا ہے۔“ سپاہی نے نرا سے بتایا۔

”کون ہے وہ؟“ سب انسپکٹر نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”اس نے اپنا نام ارشاد بتایا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی اہم اطلاع آپ کو دینی ہے۔“

”لیکن ارشاد نامی کوئی آدمی تو ہمارا تجربہ نہیں ہے!“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!“

”بلاؤ اسے!“ سب انسپکٹر نے کہا اور بچوں سے اٹھ کر تھانہ انچارج کی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے سے ابھی تک ناگوارا جھلک رہی تھی۔

سپاہی کمرے سے نکل گیا اور دروازے کے باہر کھڑے ہوئے ارشاد سے مخاطب ہوا۔ ”صاف تمہیں بلا رہے ہیں، اندر جاؤ۔“

ارشاد نے دروازے پر پڑی ہوئی حق اٹھائی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب انسپکٹر نے اٹھ کر دیکھا اور بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا حالانکہ اس کی میز کے سامنے کئی خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ ارشاد میز کی ایک جانب جا کھڑا ہوا تو سب انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”کیا اطلاع دینی چاہو؟“

”جناب! میں جس کو کوشی میں ملازم ہوں وہاں میرے ایک ساتھی شجاع کا قتل ہو گیا ہے۔ ارشاد نے بات شروع کی۔

”اسے کس نے قتل کیا ہے؟“ سب انسپکٹر نے قتل کی خبر پر چونک کر دریافت کیا۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم جناب، مگر مجھ کو اپنے صاحب پر شک ہے کہ انہوں نے شجاع کو گولی ماری ہے۔“ ارشاد نے جواب دیا۔

”جب قتل ہوا تو تم کہاں تھے؟“ سب انسپکٹر نے گویا تفتیش شروع کر دی۔

”میں اس وقت اپنے کوارٹر میں تھا۔ میں نے تھوڑی تھوڑی دیر سے دو مرتبہ گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔“

”مقتول کی لاش کہاں ہے؟“ سب انسپکٹر نے معلوم کیا۔

”اپنے صاحب کے حکم پر اس کی لاش میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کوشی کے پچھلے حصے میں دفن کر دی جناب!“ ارشاد نے بتایا۔

”تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ قتل کی اس واردات میں تم بھی شامل ہو!“ سب انسپکٹر پولیس کے روایتی پھکنڈوں پر اتر آیا۔

”میں..... میں نے جناب، اسے..... اسے قتل نہیں کیا۔“ ارشاد گھبرا گیا۔

”ہر مجرم تمہاری ہی طرح خود کو معصوم اور بے گناہ ظاہر کرتا ہے، جب مار پڑتی ہے تو سارا سبق فر فر شانے لگتا ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو ساری بات سچ بتا دو ورنہ سمجھ لو کہ پھانسی کا پھندا تمہاری ہی گردن میں پڑے گا!“ سب انسپکٹر نے دھمکی دی۔

”یقین کریں جناب کہ میں نے جو کچھ اب تک بتایا ہے، اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں۔“ ارشاد عاجزی سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کے ساتھ چل کر اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں جناب! آج ہی وہاں ایک اور لاش بھی دفن کی گئی ہے۔“

”کیا؟“ سب انسپکٹر ایک اور نئی اطلاع ملنے پر دوبارہ چونک اٹھا۔ ”ایک اور لاش؟..... کیا تم لوگوں نے اس کو کوشی میں قبرستان بنا رکھا ہے؟“

”نہیں..... نہیں تو جناب!“ ارشاد ہکا کر رہ گیا۔

”دوسری لاش کس کی ہے؟..... لیکن ٹھہرو! پہلے اس کو کوشی کا پتا بتاؤ جہاں تم ملازم ہو! کوشی کے مالک کا نام کیا ہے؟“

”محبیب المندس۔“ ارشاد نے یہ کہہ کر کوشی کا پتا بھی بتا دیا، پھر بولا۔ ”دوسری لاش بھی ہمارے ہی ایک ساتھی، ضرغام کی تھی۔ اس کی لاش ہمارے صاحب اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ صاحب کے حکم پر پہلے ضرغام ہی کو پہلے سے کھدی ہوئی ایک قبر میں ہم نے دفن کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب؟ قبر پہلے سے کھدی ہوئی تھی؟ کس نے کھودی تھی وہ قبر؟“

”خود ضرغام اور شجاع نے۔ صاحب ہی نے انہیں یہ حکم دیا ہو گا۔“ ارشاد نے جواب دیا، پھر تہہ خالے سے غائب ہو جانے والی لاش کے بارے میں بتانے لگا۔

”لاش پر لاشیں! ایک دو نہیں تین تین لاشیں! جن میں سے بقول تمہارے ایک لاش پراسرار

”ہمیں آپ کے ایک ملازم سے اطلاع ملی ہے کہ یہاں کسی کو قتل کیا گیا ہے۔“ سب انسپٹر میرے زیر اثر بے دھڑک بولا۔

”غلط اطلاع ملی ہے آپ کو؟“ نجیب نے تردید کی۔ ”یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔“ ارشاد پولیس دین میں بیٹھا تھا۔ سب انسپٹر نے کہا۔ ”ہم آپ ہی کے ملازم ارشاد کی رپورٹ پر یہاں آئے ہیں جو ہماری کسٹڈی میں ہے۔“

”میں نے آپ سے کہا تاکہ اطلاع غلط ہے!“ نجیب نے اس مرتبہ سخت لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے درنہ اس طرح میری کوٹھی میں گھسنے کی ہمت نہ کرتے۔“ ”کیوں، کیا تم یہاں کے محافظ (گورنر) ہو؟“ سب انسپٹر کا لہجہ بدل گیا۔ ”مت بھولو کہ میں تمہیں حراست میں بھی لے سکتا ہوں۔“

اسی پر نجیب چونکا۔ اسے یقیناً یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ سب انسپٹر کو اپنی پراسرار قوتوں کے اثر میں نہیں لے سکا۔ اس نے پھر سب انسپٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”تمہیں وہی کرنا ہے جو حکم دیا جائے!“

سب انسپٹر کے جسم کو جھکا لگا، مگر اسے میں نے سنبھال لیا۔ وہ اس سے بے خبر ہی تھا کہ دو پراسرار قوتیں اسے اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کا نتیجہ معلوم تھا۔ اس کھٹکشی میں کسی بھی لمحے سب انسپٹر اپنے ہوش و حواس سے غافل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسی لئے دیر نہیں کی۔

”چلو..... جلدی کرو! پولیس دین میں جو ملازم بیٹھا ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور قبریں کھود کر دونوں لاشیں نکال لو!“ سب انسپٹر نے کمزور سی آواز میں اپنے ماتحت اے ایس آئی کو حکم دیا۔ ”ان لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیجتا ہے اور..... اور اس شخص نجیب الہندس کو گرفتار کر لو!“ سب انسپٹر میرے زیر اثر بہ مشکل یہ الفاظ ادا کر سکا اور پھر لڑکھڑا گیا۔

ایک سپاہی نے جلدی سے اسے سنبھال لیا درنہ وہ گر پڑا۔ ”کیا ہوا؟..... آپ کو کیا ہوا جناب؟..... آپ ٹھیک تو ہیں؟“ سپاہی نے سب انسپٹر کی آنکھیں بند ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”مم..... مجھ..... مجھے نہیں معلوم کیا..... کیا ہو رہا ہے! لٹا..... لٹا دو مجھے!“ انسپٹر غنودہ سی آواز میں بڑبڑایا۔

”انہیں جیپ میں لے جا کر لٹا دو!“ اے ایس آئی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ دو سپاہی، سب انسپٹر کو سارا دے کر لے گئے۔ اسی اثناء میں نجیب تیزی سے چلتا۔ عمارت میں داخل ہو کر اس نے صدر دروازہ بند کرنا چاہا کہ اے ایس آئی نے لپک کر اپنا دایاں پیر دروازے میں اڑا دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ہولسر سے ریوالور نکال لیا۔

”ٹھہر جاؤ!“ اے ایس آئی چیخا۔ ”مگر تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کو دھکا دیا۔

طور پر کوٹھی کے تہ خانے سے غائب ہو گئی! میرا خیال ہے کہ یا تو تم پاگل ہو یا مجھے پاگل کر دو گے۔ اگر تمہارا بیان صحیح ہے تو یہ مجھے کوئی بہت بڑا چکر لگتا ہے۔“

میرے نزدیک سب انسپٹر بلا سبب وقت ضائع کر رہا تھا اسی لئے مجھے مداخلت کرنی پڑی۔ پھر سب انسپٹر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ضابطے کی کارروائی پوری کیے بغیر تھانے سے چلنے والا تھا۔ اس کا مقصد موقع سے فائدہ اٹھا کر نجیب سے ”لبا مال“ بنانے کا تھا، مگر میں نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ سب انسپٹر ہی کے ایما پر تھانے کے ہیڈ محرر نے ارشاد کا پورا بیان لکھا، اس پر دستخط کرائے اور پکی رپورٹ درج کی۔ نجیب کو میں نے پوری طرح قانونی تحفظ میں کس دیا تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اس سے نہ نکل سکے۔ سب انسپٹر پہلے ہی سپاہیوں کو نجیب کی کوٹھی پر چھاپا مارنے کے لئے تیاری کا حکم دے چکا تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے کہ جب سب انسپٹر سپاہیوں کو ساتھ لیے ارشاد کی رہنمائی میں پوری تیاری کے ساتھ تھانے سے روانہ ہوا۔

تھانے سے نجیب کی کوٹھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جلد ہی پولیس وہاں تک پہنچ گئی۔ پولیس کی آمد سے کوٹھی میں ہلچل سی مچ گئی۔ نجیب کو خبر ہوئی تو وہ اس غیر متوقع افتاد سے وقتی طور پر بوکھلا اٹھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس کے ساتھ ارشاد بھی ہے۔ اس کے حواس قدرے بحال ہوئے تو فوری طور پر طلال بے کو فون پر یہ اطلاع دی۔ میں اس کے قریب ہی موجود تھا۔ پھر اس نے کئی نمبر کیے بعد دیگرے طائے، لیکن رابطہ ایک ہی نمبر پر قائم ہو سکا۔ نجیب کہنے لگا۔ ”نا وقت زحمت دینے پر معافی چاہتا ہوں جناب!..... جی، جی ہاں وہی نجیب الہندس..... معلوم نہیں کیوں ہوں، جلدی میں اپنا نام نہیں بتا سکا..... جی، جی ہاں وہی نجیب الہندس..... معلوم نہیں کیوں پولیس نے میری کوٹھی پر چھاپا مارا ہے..... اسی علاقے کی پولیس معلوم ہوتی ہے..... جی نہیں، ابھی پولیس والوں سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرے ملازموں نے اطلاع دی ہے کہ کوئی پولیس افسر باہر میرا منتظر ہے۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے آپ کو اس کی اطلاع کر دوں..... بہت بہت شکریہ جناب! بڑی نوازش!“ نجیب نے یہ کہتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

نجیب کے چہرے سے اب کسی قدر اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ اب اپنے کمرے سے نکل کر تیز قدی کے ساتھ عمارت کے صدر دروازے سے نکل تیز قدی کے ساتھ عمارت کے صدر دروازے کی طرف چل دیا۔

صدر دروازے کے باہر سب انسپٹر مسلح سپاہیوں کے ساتھ نجیب کا منتظر تھا۔ ”جی فرمائیے؟“ نجیب نے سب انسپٹر کو مخاطب کیا۔ ”آپ کس لیے میری کوٹھی پر چڑھ دوڑے ہیں؟“ نجیب نے سب انسپٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

سب انسپٹر کو میں نے فوراً اپنے زیر اثر لے لیا تاکہ نجیب اسے اپنے قابو میں نہ کر سکے۔ پہلی مرتبہ مجھے اس کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑی، مگر میں ناکام نہیں رہا۔

دروازہ کھل گیا اور دور سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک دم دروازہ کھلنے سے اے ایس آئی گرتے گرتے بچا۔ سامنے راہداری میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اے ایس آئی سپاہیوں کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گیا۔

میں چشم زدن میں نجیب کے پاس پہنچ گیا۔ اسے میں نے بھاگتے ہوئے چھوٹے سے ایک کمرے میں گھستے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ اس نے اندر سے لگا لیا۔ اس کمرے کا عقبی دروازہ کھول کر نجیب ایک راہداری میں نکل آیا اور دوڑنے لگا۔ اس راہداری کے اختتام پر ایک دروازہ اور نظر آیا۔ میں اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ دوسری جانب پہنچ کر میں نے اس دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر عقبی پھانک دکھائی دے رہا تھا۔ میں دوبارہ نجیب کے پاس پہنچا تو وہ پلٹ کر اسی راہداری میں موجود ایک کمرے کے دروازے کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کمرے کے دروازے کو بھی میں نے اندر سے بند کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ نجیب دروازہ کھولنے کے لئے زور لگانے لگا۔ اس کمرے کی کھلی ہوئی ایک کڑی سے کود کر بھی نجیب وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا، مگر میں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ نجیب عمارت کے اس حصے میں کسی چوہے کی طرح پھنس گیا۔

اے ایس آئی سپاہیوں کے ساتھ عمارت میں داخل ہو کر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے اثر میں لے لیا اور رہنمائی کرنے لگا۔ جس کمرے کا دروازہ نجیب نے اندر سے بند کر لیا تھا، میں نے اسے بھی کھول دیا۔ آخر اے ایس آئی نے نجیب کو دیکھ ہی لیا۔

”اب تم نہیں بھاگ سکتے!“ اے ایس آئی نے نجیب کو نشانے پر لے لیا۔ نجیب اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ”اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو!“

”ادھر دیکھو میری طرف!“ نجیب نے اے ایس آئی کو مخاطب کیا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا تمہارے پاس میری گرفتاری کا وارنٹ موجود ہے؟“

مجھے معلوم تھا کہ اگر اے ایس آئی کی نظریں نجیب سے مل گئیں تو اسے بھی نجیب اپنی پراسرار قوتوں کے اثر میں لینے کی کوشش کرے گا۔ پھر اے ایس آئی کا حشر بھی سب انسپکٹر سے مختلف نہیں ہو گا۔ میں نے اسی سبب اے ایس آئی کو نگاہ نہیں اٹھانے دی۔

”پولیس کسی کو بھی شبیے کی بنا پر پوچھ گچھ کے لئے گرفتار کر سکتی ہے۔ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کرو!“ اے ایس آئی سخت لہجے میں بولا۔

اسی وقت میں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ نجیب قطعی بے بس ہو کر رہ جائے اور اپنی کوئی پراسرار قوت بروئے کار نہ لاسکے۔ مگر ایک سپاہی میرے زیر اثر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے کہ نجیب سمجھتا یا سنبھل پاتا، سپاہی نے راکٹل کا پچھلا حصہ نجیب کے سر پر دے مارا۔ نجیب چیخ کر زمین پر گر پڑا۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ نجیب اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ سکا۔ اس فتنے کو قابو میں کرنے

کی یہی ایک صورت تھی۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ اے ایس آئی نے سپاہی سے جواب طلبی کی۔ اب اے ایس آئی کو میں نے اپنے اثر سے آزاد کر دیا تھا۔

”اس لئے جناب کہ مجرم فرار نہ ہو سکتے۔“ سپاہی نے دلیل پیش کی۔

”تمہیں میرے حکم کے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیر..... اس کے ہتھکڑی لگا دو!“ اے ایس آئی بولا۔

ایک سپاہی نے بے ہوش نجیب کو ہتھکڑی پہنا دی۔ پھر اے ایس آئی کے حکم پر دو سپاہیوں نے بے ہوش نجیب کو اٹھا لیا اور ذرا ہی دیر میں عمارت سے باہر آگئے۔ جس پولیس دین میں ارشاد بیٹھا تھا، اسی میں بے ہوش نجیب کو ڈال دیا گیا۔

”تم باہر آ جاؤ!“ اے ایس آئی نے ارشاد کو مخاطب کیا۔ ارشاد باہر آ گیا تو میرے ہی ایما پر اے ایس آئی نے دین کے پچھلے حصے کا دروازہ منتقل کر دیا۔ اندر بے ہوش نجیب پڑا ہوا تھا۔ دین کے باہر ایک مسلح سپاہی کو متعین کر دیا گیا۔

پولیس دین کے آگے جیب کھڑی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بے ہوش سب انسپکٹر کو لٹا دیا گیا تھا۔ میں اسے ہوش میں لے آیا۔ وہ فوراً اچھل کر بیٹھ گیا۔

”جناب! ہم نے مجرم کو آپ کے حکم پر گرفتار کر لیا ہے۔“ اے ایس آئی نے اپنی کارکردگی بیان کی۔ ”مجرم فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ہم نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے قابو میں کیا ہے۔“

”اور قبرس؟ انہیں کھدوا کر تم نے لاشیں نکلائی؟“ سب انسپکٹر نے جیب سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی ہمیں اس کا موقع ہی نہیں مل سکا جناب!“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ”مجرم کی گرفتاری میں اتنی دیر لگ گئی۔“

”اچھا چلو، اب دیر نہ کرو!“ سب انسپکٹر نے کہا اور ارشاد کی طرف دیکھا۔

وہاں دین کے قریب صرف ایک مسلح پولیس والے کو چھوڑ کر بقیہ تمام پولیس والے ارشاد کی رہنمائی میں کوئٹہ کے عقبی حصے تک پہنچ گئے۔ ارشاد ہی نے قریب ہی موجود ایک کوٹھری کی نشاندہی کی جس میں پھاڑے اور کدالیں موجود تھیں۔ گیس لیپ بھی اسی کوٹھری میں مل گیا جسے جلا لیا گیا۔

پولیس والے اس جگہ کی کھدائی کرنے لگے جو ارشاد نے بتائی تھی۔ پہلی لاش ضرغام کی برآمد ہوئی جسے ارشاد نے شناخت کر لیا۔ لاش ایک طرف رکھ دی گئی۔ اس سے بدبو پھیلنے لگی کیوں کہ لاش کا بیٹ پھٹ گیا تھا۔

”اسے دور لے جا کر ڈال آؤ!“ سب انسپکٹر نے اپنے منہ پر رومال رکھتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔

مجبوراً سپاہیوں کو یہ ناخوشوار فرض انجام دینا پڑا۔ اس میں تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ دوسری قبر کھودی جا رہی تھی کہ خلاف توقع اس علاقے کا تھانہ انچارج دہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ڈی ایس پی بھی تھا۔ یہاں سے دہاں تک ایڑیاں بچ اٹھیں۔ کھدائی کا کام رک گیا۔
”یہ تم لوگ یہاں کیا غیر قانونی کارروائی کر رہے ہو؟“ ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں سپاہیوں سے جواب طلبی کی۔

”جناب! ہمیں اطلاع ملی تھی کہ.....“ سب انسپکٹر نے مؤدب لہجے میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔

”کیا عدالت کی طرف سے تمہیں محترم نجیب المندس کو گرفتار کرنے یا یہاں سے لاشیں برآمد کرنے کا حکم ملا تھا؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”جی نہیں جناب!“ سب انسپکٹر نے گھبرا کر جواب دیا۔
”پھر تم نے بغیر وارنٹ کے محترم نجیب المندس کو کیسے گرفتار کیا؟ اور یہاں سے کس کے حکم پر لاشیں برآمد کر رہے ہو؟“

سب انسپکٹر لاجواب ہو گیا۔ میں نے اس عرصے میں ڈی ایس پی کا ذہن پڑھ لیا۔ اسے آئی جی پولیس کی طرف سے موقع پر پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ نجیب کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ پھر ڈی ایس پی نے علاقے کے تھانہ انچارج کو آئی جی کے حکم سے آگاہ کیا تھا اور اسے اپنی کوٹھی پر طلب کر کے یہاں پہنچا تھا۔ پولیس کے کوٹھی پہنچنے ہی نجیب نے فون پر یقیناً آئی جی پولیس ہی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ڈی ایس پی کو موقع پر پہنچنے میں اس لئے دیر لگی تھی کہ اس کی ماں شدید علیل تھی۔ وہ ہسپتال میں اپنی ماں کے پاس تھا۔ ہسپتال میں فون پر ڈی ایس پی سے رابطہ قائم ہونے میں دیر لگی کیوں کہ وہ اپنی ماں کے پاس آئی سی یو میں تھا۔ ہسپتال سے ڈی ایس پی اپنی کوٹھی پہنچا اور فون پر تھانہ انچارج کو طلب کر لیا۔ اگر ڈی ایس پی کو اپنے آئی جی کی طرف سے یہ حکم نہ ملتا تو وہ کسی صورت اپنی ماں کو ہسپتال میں چھوڑ کر نہ آتا۔

”بے وقوف! تمہیں خبر نہیں کہ تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ تمہاری اس حماقت کے نتیجے میں پورا تھانہ معطل ہو سکتا ہے!“ ڈی ایس پی برہم لہجے میں بولا۔
”پھر..... پھر اب کیا حکم ہے جناب؟“ سب انسپکٹر نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ ”میں نے تو پکی ایف آئی آر بھی کٹ دی ہے۔“

”یہ تو تم نے اور بھی غضب کر دیا۔“ ڈی ایس پی بوکھلا سا گیا۔
اس موقع پر تھانہ انچارج بول اٹھا۔ ”جناب! یہ ضروری تو نہیں کہ پولیس ہر رپورٹ پر فوراً تفتیش شروع کر دے۔ اگر اس اہمیت نے پکی ایف آئی آر کٹ بھی دی ہے تو ہم ابتدائی کارروائی کے طور پر محترم نجیب المندس کے اس ملازم کو حوالات میں بند کر سکتے ہیں جس نے رپورٹ درج کروائی ہے۔ کبھی کبھی قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے خود مجرم بھی تو ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔“

تھانے میں لکھوائی جانے والی ہر رپورٹ توجہ نہیں ہوتی۔“
تھانہ انچارج کی یہ تجویز ڈی ایس پی کو پسند آئی۔ وہ بولا۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جو لاش برآمد کی گئی ہے اسے دوبارہ یہیں دفن کر دیا جائے، محترم نجیب المندس کے ہم رہا کر دیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا ظاہر کیا جائے، پولیس یہاں نہیں آئی اور نہ اس نے کوئی کارروائی کی۔ پولیس نے صرف اس ملازم کو حراست میں لیا ہے جس نے رپورٹ لکھوائی تھی۔“ ڈی ایس پی نے یہ کہہ کر گویا سارا مسئلہ حل کر دیا۔

”بعد میں ہم یہ بھی ظاہر کر سکتے ہیں جناب کہ پولیس نے تفتیش کی تو لکھوائی جانے والی رپورٹ غلط ثابت ہوئی۔ اس طرح یہ کیس ختم کیا جاسکتا ہے۔ پولیس کو ایک معزز شہری کے بارے میں غلط اطلاع دینے پر ملازم کا چالان عدالت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔“ تھانہ انچارج نے پکی ایف آئی آر کے اندراج کا توڑ پیش کیا۔

”بہت خوب!“ ڈی ایس پی نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ ”اس عرصے میں ہم محترم نجیب المندس سے یہ گزارش کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں لاشوں کو کہیں ٹھکانے لگوا دیں تاکہ آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہی نہ رہے۔“

سوئی کو اشارہ کر کے میں ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ”تو دیکھ رہی ہے اے سوی کہ قانون کے رکھوالے یہ آدم زاد کس طرح خود قانون کی دھجیاں اڑا رہے ہیں!“

”ہاں اے علیالیش!“ سوی نے کہا۔ ”مجھے تو اب یہ بتا کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟“
”دبی جو پہلے تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اپنے دشمن کو اتنی آسانی کے ساتھ تو قانون کی گرفت سے نہیں نکلنے دوں گا۔ اس لئے تو میں نے یہ سب کچھ نہیں۔“ پھر سوی کو میں نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ ڈی ایس پی کے حکم پر اب سپاہی، ضرغام کی لاش کو اٹھا کر لا رہے تھے کہ دوبارہ اسے دفن دیں۔

تھانہ انچارج، سب انسپکٹر اور ڈی ایس پی، تینوں مجھے کوٹھی کے بیرونی حصے کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ ظاہر ہے ڈی ایس پی کے حکم پر اب نجیب کو رہا کیا جانے والا تھا، لیکن میری موجودگی میں ایسا کس طرح ہو جاتا!

یہ دیکھنے کے لئے کہ میرا دشمن ہوش میں آچکا ہے یا نہیں، میں تینوں پولیس والوں سے پہلے دین تک پہنچ گیا۔

نجیب میری توقع سے زیادہ چالاک نکلا۔ وہ فرار ہو چکا تھا۔ دین کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کے قریب ہی مسلح پولیس والا بے ہوش پڑا تھا۔ دین کے مقتول دروازے کی چابی اسی پولیس والے کے پاس تھی۔ مجھے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی دیر نہ لگی۔ نجیب کو یقیناً ہوش آگیا ہو گا۔ پھر مسلح سپاہی کو اپنی نپراسرار قوتوں کے اثر میں لے کر مقتول دروازہ کھلوانا نجیب کے لئے کون سا مشکل کام تھا!

آجائے!“ میں نے مشورہ کیا۔

”ہاں یہ موقع تو اچھا ہے۔“ سوی نے اتفاق کیا۔ ”مجھ ہونے میں بھی ابھی دیر ہے۔“ اس کے بعد ہم کوٹھی کی تلاشی لینے لگے۔ نجیب کے کمرے میں ہمیں ایک تجوری ملی۔ اس میں ایک لاکھ گنی (تقریباً چودہ لاکھ روپے) سے زیادہ مصری کرنسی تھی۔ ہم نے اسے ایک ایئر بیگ میں رکھ لیا۔ کچھ سونا بھی نکلیوں کی شکل میں ملا۔ اس کا وزن بھی خاصا تھا۔ اسے بھی ہم نے تجوری سے نکال لیا۔ تجوری ہی کے ایک خانے میں سونے کا ایک آٹو بھی رکھا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ یہ دیا ہی آٹو تھا جو نجیب کراچی میں بہ طور تحفہ میرے لئے قراچہ کو دے گیا تھا۔ وہ آٹو میرے پاس سے پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

”کیوں اسے علیالیش کیا تو اس آٹو سے ڈر رہا ہے؟“ سوی نے دھیرے سے ہنس کر پوچھا۔ ”نہیں! یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں اس آٹو سے کوئی ظلم وابستہ ہے اور پھر ہمارے پاس سے غائب ہو جائے گا۔“

اسی وقت سوی نے تجوری کا ایک اور خفیہ خانہ کھول لیا۔ اس خانے سے کچھ نقشے برآمد ہوئے۔ ان نقشوں کو بھی فرصت سے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ہم نے وہاں سے نکال لیا۔ اس کے علاوہ ایک ڈائری بھی اس خانے میں ملی۔ ڈائری میں درج عبارت قدیم عبرانی زبان میں تھی جسے پڑھنا ہمارے لئے مشکل نہیں تھا۔

پھر ہم نے جو کچھ کیا، اس کا مقصد محض اپنے دشمن کو نقصان پہنچانا ہی تھا تاکہ وہ اپنے اس ٹھکانے کو فوری طور پر دوبارہ استعمال نہ کر سکے۔ وہ کوٹھی انتہائی قیمتی سازو سامان سے مزین تھی۔ ہم نے کوٹھی میں آگ لگا دی۔ گیرج کو بھی ہم نے نظر انداز نہیں کیا۔ وہاں دو کاریں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک وہ کار تھی جس پر منصور نے حملہ کیا تھا۔ اس کا دینڈا سکرین ٹوٹا ہوا تھا اور جگہ جگہ کار کی باڈی پر گولیوں کے نشانات تھے۔ دوسری کار صحیح حالت میں تھی۔ گیرج بھی آگ کی لپیٹ میں آگیا تو ہم اونچی پرواز کرنے لگے۔ نقشوں اور ڈائری کو ہم نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں رکھ دیا۔ سونے کی نکلیاں اور مصری کرنسی ہم نے قاہرہ میں اپنے پاس رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کرنسی اور سونا ہم نے کراچی پہنچا دیا اور واپس قاہرہ آگئے۔ اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھے۔

ابھی تک ہم نے یہ سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ہمارا دشمن کہاں اور کس حال میں ہے!

”اے سوی! پولیس سے ابھی نجیب کی جان نہیں چھوٹی چاہئے۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”وہ کیسے؟ ابھی تو ہمیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے!“ سوی نے کہا۔ ”تو معلوم کیے لیتے ہیں۔ اس میں کتنی دیر لگے گی!“ میں دھیرے سے ہنس دیا۔ ”میں اسے سکون کا سانس نہیں لینے دوں گا! پولیس کے نزدیک فی الحال تو وہ ایک مفرور قاتل ہے۔ جب تک وہ

اس دوران میں تینوں پولیس والے دین تک پہنچ گئے۔

”ارے یہ کیا ہو گیا؟“ ڈی ایس پی صورت حال کا جائزہ لیتے ہی اچھل پڑا۔ یہی وہ لمحات تھے کہ میں نے ڈی ایس پی کو اپنے اثر میں لے لیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”خطرناک مجرم! پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا!“

”جناب! خطرناک مجرم؟“ تھانہ انچارج حیرت سے بولا۔

”تو اور کیا؟“ ڈی ایس پی نے تھانہ انچارج کو ڈانٹ دیا۔ ”کیا اب بھی تمہیں اس کے خطرناک مجرم ہونے پر کوئی شک ہے؟“

”جی بالکل نہیں جناب!“ تھانہ انچارج کو کہنا پڑا۔

اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا جو میں نے چاہا۔ نجیب کی بساط الٹ گئی، خواہ عارضی طور پر سہی۔ ڈی ایس پی کے حکم پر ضرغام کی لاش کو دوبارہ دفنانے سے روکنے کے علاوہ شجاع کی لاش بھی برآمد کر لی گئی۔ کوٹھی ہی سے فون کر کے ایمرینس منگوالی گئی۔ دونوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ میرے ایما پر ارشاد نے تمہ خانے سے غائب ہونے والی لاش کا ذکر بھی کیا۔ ارشاد نے اپنے بیان میں بھی تمہ خانے اور غائب ہونے والی لاش کے متعلق بتایا تھا۔

”جناب! تمہ خانے میں ایذا رسانی کا سامان بھی موجود ہے۔“ ارشاد نے کہا۔

ڈی ایس پی کے حکم پر تمہ خانے کی تلاشی بھی لی گئی۔ تمہ خانے تک ارشاد ہی نے رہنمائی کی۔ ایذا رسانی کا سامان بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

ارشاد کی رپورٹ پر پولیس نے جو کارروائی کی، اس کا تفصیلی اندراج بھی روزنامے میں کیا گیا۔ نجیب المہندس کو مفرور قاتل قرار دے دیا گیا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا۔ تمام اندراجات ڈی ایس پی نے اپنی موجودگی میں کروائے۔ ارشاد کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ اس پر صرف یہ پابندی لگائی گئی تھی کہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر وہ شہر سے کہیں نہ جائے۔ ارشاد نے کہا کہ موجودہ حالات میں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ نجیب کی کوٹھی میں نہیں رہ سکتا۔ جیسا ہی کے ایک علاقے امبابہ میں اس کا ایک عزیز رہتا تھا۔ پولیس نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اپنے عزیز کے گھر رہ سکتا ہے۔ اس کے عزیز کا ہا پولیس نے نوٹ کر لیا۔ امبابہ تیسرے درجے کی ایک آبادی تھی جہاں غریبوں ہی کی سکونت تھی۔ ارشاد اپنا سامان لینے پہلے نجیب کی کوٹھی گیا، پھر وہاں سے امبابہ روانہ ہو گیا۔

☆=====☆

جو واقعہ پیش آیا تھا، اس سے دہشت زدہ ہو کر نجیب کے ملازمین کوٹھی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کوٹھی میں اب گویا آٹو بول رہا تھا۔ ملازمین کو شاید یہ خوف ہو گا کہ دہرے قتل کی واردات میں پولیس انہیں بھی پکڑ نہ لے جائے۔ میں نے دیکھا کہ کوٹھی سے ایک کار بھی غائب تھی۔ نجیب غالباً اسی کار میں بیٹھ کر فرار ہوا تھا۔

”کیا خیال ہے اے سوی! کوٹھی کی تلاشی کیوں نہ لی جائے! کیا خبر کوئی کام کی چیز ہوتی

ایک پولیس افسر نے تھانہ انچارج کو مشورہ دیا کہ وہ تھانہ مصر قدیم پہنچ کر ضروری اندراج کے بعد مطلوبہ عمارت پر چھاپا مار سکتا ہے۔ اس کارروائی میں اس پونے سات بج گئے اور وہ پولیس پارٹی کو ساتھ لے کر جزا سے پرانے قاہرہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بھی بٹھا دی کہ کسی مفرد قاتل کو پناہ دینا بھی جرم ہے۔ جس عمارت میں نجیب نے پناہ لی ہے، وہاں موجود افراد کو بھی گرفتار کر لیا جائے۔ میں اس طرح طلال بے کو بھی اس معاملے میں ملوث کر کے ذہنی اذیت پہنچانا چاہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ اپنے غیر معمولی اثر و رسوخ کی بنا پر متحرق کے وہ عیار میرے بچھائے ہوئے اس جال سے بچ نکلیں گے۔ وقتی طور پر سہی! میں تو انہیں خود انہی کے شر میں بے بسی کا احساس دلا رہا تھا۔ تھانہ انچارج نے پولیس ہیڈ آفس کی ہدایت کے مطابق پہلے مصر قدیم کے تھانے ہی کا رخ کیا۔ وہاں ضروری اندراج کروانے کے بعد وہ رکا نہیں۔ اس کے دماغ میں تو نجیب کو گرفتار کر کے ترقی کی دھن سامگنی تھی۔ کچھ نفری اس نے تھانہ مصر قدیم سے بھی اپنے ساتھ لے لی تھی۔

طلال بے جس کو بھی میں تھا اسے پولیس پارٹی نے گھیرے میں لے لیا۔ اطلاعی تھنٹی بجائے جانے پر خاصی دیر میں یونیکا نے آکر صدر دروازہ کھولا۔
”گرفتار کر لو اسے!“ تھانہ انچارج نے حکم دیا۔

یونیکا ”ارے ارے“ ہی کرتی رہ گئی اور اسے ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ ایک سپاہی اسے پولیس دین کی طرف لے گیا۔

تھانہ انچارج مسلح سپاہیوں کو لے کر کسی فاتح کی طرح کوٹھی میں داخل ہوا۔ میں نے اس کمرے تک اس کی رہنمائی کی جہاں نجیب کو محو خواب دیکھا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اطلاعی تھنٹی کی آواز سے اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی وہ بند کر کے نہیں سوبا تھا۔ نتیجتاً اسے سوتے ہی میں چھاپ لیا گیا۔ بازو کے علاوہ اب نجیب کے سر پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ منہلنے سے پہلے ہی نجیب کو آہنی زبور پہنا دیا گیا۔

معاً عقب سے طلال بے کی بچکانہ آواز سنائی دی۔ وہ تھانہ انچارج سے مخاطب تھا۔ ”تم میری کوٹھی میں کیسے داخل ہوئے؟“

مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر وہاں تک پہنچا تھا۔ میرے خیال میں ابھی اس کی حالت چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ یہ اس کی قوت برداشت ہی کا کمال معلوم ہوتا تھا۔ تھانہ انچارج نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور یہیں مجھ سے بھول ہو گئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں پوری طرح طلال بے کی طرف متوجہ تھا۔ پھر میں نے لاکھ کوشش کی کہ تھانہ انچارج کو اپنے اثر میں لے لوں مگر ناکام رہا۔ طلال بے یقیناً نجیب سے بھی زیادہ پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے تھانہ انچارج کو اپنے قابو میں کر لیا۔ پھر میں نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔
”غلطی ہو گئی جناب! معاف کر دیجئے!“ تھانہ انچارج گڑگڑایا۔

اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے، پولیس کو اس تک پہنچ جانا چاہئے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس برے وقت میں وہ طلال بے کے پاس ہی گیا ہو گا۔ ابھی پتا لگائے لیتا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہی دانستہ اپنے تصور کی قوت کو آزمایا۔

میرا خیال تھا کہ نجیب اس وقت تھک ہار کر سو رہا ہو گا۔ یہ خیال غلط ثابت نہ ہوا۔ وہ قدر واقعی بیدار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرا یہ قیاس بھی درست نکلا کہ وہ طلال بے کی کوٹھی ہی کے ایک کمرے میں تھا۔ یہ کوٹھی مصر قدیم میں تھی اور وہاں میں جا چکا تھا۔

”چل! اب تھانہ انچارج کو چل کر جگاتے ہیں اے سوی! میں نے سراغ لگا لیا ہے کہ وہ چہا کہاں جا کر چھپا ہے!“ میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ اس میں تھوڑا وقت لگے گا۔ معلوم نہیں، تجھے خبر ہے یا نہیں کہ جزا اور قاہرہ کی انتظامیہ الگ الگ ہے۔ دونوں کے گورنر بھی الگ ہیں۔ تھانہ انچارج کو نجیب کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے قاہرہ کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔“

”ہاں اے علیا لیش! یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔“ سوی نے اعتراف کیا۔
تھانہ انچارج کی سکونت زانک ہی میں تھی۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے اور تھانہ انچارج خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ میں نے اسے جگا دیا۔
”اٹھ اے بے خبر کہ یہ سونے کا وقت نہیں۔“ تھانہ انچارج کو میں نے خود اسی کی آواز میں مخاطب کیا۔

”کک..... کون..... کون ہو تم؟“ تھانہ انچارج اچھل پڑا اور ہکھلانے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔

”کیا تو خود اپنی آواز نہیں پہچانتا! سن کہ میں تیرے ہی ضمیر کی آواز ہوں۔“ میں کہتا رہا۔
”اگر تو اپنی ترقی چاہتا ہے، اگر تیری یہ خواہش ہے کہ اپنے افسران کی نظر میں سرخرو ٹھہرے تو مفرد قاتل نجیب المندس کو گرفتار کر لے۔ میں تجھے اس کا پتا بتاتا ہوں کہ وہ کہاں ہے!“ پھر میں نے تفصیل کے ساتھ پتا اس کو ذہن نشین کروا دیا اور بولا۔ ”تو نے خود اپنی کوشش سے اس مفرد قاتل کا سراغ لگایا ہے۔“

”ہاں..... ہاں میں نے ہی ایسا کیا ہے۔“ تھانہ انچارج میرے زیر اثر دھیمی اور خواب ناک آواز میں کہنے لگا۔ پھر اس نے دیر نہیں لگائی۔ منہ ہاتھ دھو کر وردی پہنتے ہی اس نے تھانے کی راہ لی۔ تھانے کا عملہ صبح ہی صبح اسے دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔ تھانہ انچارج نے فوری طور پر موجود پولیس کی نفری کو تیاری کا حکم دے دیا اور فون پر قاہرہ کی انتظامیہ سے ایک مفرد قاتل کو پکڑنے کے لئے تعاون چاہا۔ اتنی صبح اسے کوئی بڑا افسر تو نہیں ملا مگر کسی نہ کسی طرح اس نے کام نکال ہی لیا۔ میرا توجہ اس کے ذہن ہی پر تھی۔ قاہرہ کا پولیس ہیڈ آفس تحریر اسکوائر کی ایک دس منزلہ عمارت میں تھا۔ یہیں اسی عمارت میں پاسپورٹ آفس اور سی آئی ڈی آفس بھی ہے۔ وہیں سے ڈیوٹی پر موجود

طلال بے نے تھانہ انچارج کو گالی دی اور بولا۔ ”تجھے شاید اپنے جسم پر یہ وردی اچھی نہیں لگتی! اس کی ہتھکڑی کھلو!“ اس نے نجیب کی طرف اشارہ کیا۔

میں اتنی جلدی کس طرح شکست قبول کر لیتا! وہ مسخرا آدم زاد ایک جن زاد کو کیسے نچا دکھا دیتا! سو میں نے ایک آزمودہ حربے سے کام لیا۔ ادھر تھانے انچارج نے نجیب کی ہتھکڑی کھولنے کا حکم دیا، ادھر جیسے کچھ پولیس والے پاگل ہو گئے۔ وہ نجیب المہندس اور تلال بے پر ٹوٹ پڑے۔ راکٹوں کے ہٹ مار مار کر ان پولیس والوں نے تلال اور نجیب کو زمین پر گرا دیا۔ وہ دونوں تو پہلے ہی زخمی تھے اس لئے ذرا سی دیر میں ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

اچانک تھانہ انچارج گویا گمری نیند سے جاگ اٹھا۔ میں نے جان لیا کہ وہ تلال بے کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کا سبب تلال بے کی بے ہوشی ہی ہو سکتی تھی۔ تھانہ انچارج نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور کمرے کے فرش پر پڑے ہوئے دونوں بے ہوش قتلوں کو دیکھا۔ جن سپاہیوں نے میرے زیر اثر تلال اور نجیب کو مار کر گرایا تھا، وہ بھی حیران حیران سے نظر آرہے تھے۔ وہ خود بے خبر تھے کہ اچانک انہیں کیا ہو گیا تھا!

”اب دیکھ کیا رہے ہو!“ تھانہ انچارج نے آخر سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ ”بجروں کو ہتھکڑیاں پہناؤ اور انہیں یہاں سے اٹھا کر لے چلو!“

سپاہیوں نے اپنے افسر کے کہنے پر فوراً عمل کیا۔ تلال بے اور نجیب المہندس کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ پھر سپاہی انہیں اٹھا کر باہر لے گئے۔ کوٹھی کے اندر اب کوئی نہیں رہا۔ تھانہ انچارج نے اسی علاقے کے دو سپاہیوں کی ڈیوٹی کوٹھی کے باہر لگا دی۔

بے ہوش تلال اور نجیب کو جیزا سے آنے والی پولیس پارٹی گرفتار کر کے لے گئی۔ یونیکا بھی انہی کے ساتھ تھی۔

میں اور سوئی واپس کوٹھی میں لوٹ آئے۔ مجھے اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کا ایک اور موقع مل گیا۔ تلال بے کی کوٹھی کی تلاشی لینے پر مجھے وہاں زیادہ سونا اور کرنسی نہیں مل سکی۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ وہاں تلال بے کی مستقل سکونت نہیں تھی۔ بیس پچیس ہزار گمنی کے نوٹ اور سونے کی چند ٹکیوں کے سوا مجھے کچھ نہ ملا۔ میں نے اپنے دشمنوں کے اس ٹھکانے کو تباہ کرنے سے پہلے وہاں متحین دونوں سپاہیوں کو بھگا دینا ضروری سمجھا۔

دونوں سپاہی کوٹھی کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔ ارد گرد درخت ہی درخت تھے۔ سول اور میں نے آہستہ آہستہ درندوں کی طرح غرنا شروع کر دیا۔ اس پر سپاہی چونک کر خوفزدہ نظروں سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں نے ایک بن ماس کا قالب اپنا کر قریبی درخت سے چھلانگ لگائی، ان کے ساتھ منہ سے خوفناک آواز نکالی۔ دہشت کے مارے سپاہی اپنی جگہ جیسے پتھر کے ہو گئے۔ مجبوراً مجھے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہونا پڑا۔

”بھاگو!“ ایک سپاہی چیخ اٹھا اور کوٹھی کے پھانک کی طرف بھاگا۔

دوسرا سپاہی بھی گرتا پڑتا پہلے سپاہی کے پیچھے دوڑا۔

ان دونوں سپاہیوں کے بھاگتے ہی میں نے تلال بے کی کوٹھی کو نذر آتش کر دیا۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو کوٹھی سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

مصر قدیم سے ہم نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا تاکہ ”مال غنیمت“ کو وہاں رکھ سکیں۔ رقم بڑی نہیں تھی کہ اسے اپنے پاس رکھنے میں ہمیں کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔ گزشتہ روز سے اب تک ہم نے اپنے دشمنوں کو جس قدر نقصان پہنچایا اور ذہنی اذیت سے دو چار کیا، وہ کافی تھا۔ میرے خیال میں انہیں اب کچھ ڈھیل دینے کی ضرورت تھی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ پورے ایک دن بھی پولیس کی حراست میں رہ سکتے۔ اس کی وجہ اعلیٰ حکام سے مراسم کے علاوہ ان کی پراسرار قوتیں بھی تھیں۔ جیزا کا آئی جی یقیناً علاقے کے ڈی ایس پی سے رپورٹ طلب کرتا۔ حقیقت جاننے کے بعد وہ ڈی ایس پی اور تھانہ انچارج کے ساتھ کیا سلوک کرتا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے نجیب کو اس طرح قانونی گرفت میں لیا تھا کہ انتظامیہ کے لئے اسے بے گناہ ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔

میں سوچنے لگا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر نجوا سے نمٹا جا سکتا ہے۔ اس عیار آدم زادی نے ہمیں بہت اذیتیں دی تھیں۔ اب وقت آگیا تھا کہ اس سے ان تمام اذیتوں کا بدلہ لیا جاسکے۔ ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے۔ میں نے اپنے خیال کا اظہار سوئی سے کیا۔

”اب تو ہم مقرر کے غلاموں کی راہ پر لگ ہی گئے ہیں اے علیا لیش!“ سوئی کہنے لگی۔

”عیار نجوا کا وجود عدم ہمارے لئے برابر ہے۔“

”تو کیا تیری یہ مرضی ہے کہ نجوا کو ختم کر دیا جائے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں اے علیا لیش!“ سوئی نے جواب دیا۔ ”اس طرح ہمارے مقابلے پر صرف مقرر کے غلام رہ جائیں گے۔ پھر ہمیں کم از کم نجوا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں بولا۔ ”مگر میں اے آسانی سے نہیں مرے دوں گا۔ تجھے تو خبر ہے اے سوئی کہ اس آدم زادی نے ہمیں کتنی تکلیفیں پہنچائی ہیں!“

”بس یہ خیال رکھو کہ وہ پلٹ کے ہم پر دار نہ کر سکے۔ یہ تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کتنی خطرناک ہے!“ سوئی نے مجھے تاکید کی۔

نجوا کا ہٹا لگانے کی غرض سے میں نے جان بوجھ کر اپنے تصور کی قوت کو متحرک کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ میں نے اپنے تصور کا دائرہ وسیع کیا تو معلوم ہوا نجوا ایک لالچ کے کین میں ناشتے کی میز پر بیٹھی ہے۔

میری توقع کے مطابق نجوا ناشتا کرتے کرتے ایک دم چونک اٹھی۔

”کون ہے تُو جو مجھے دیکھ رہا ہے؟“ وہ کسی زخمی ناگن کی طرح پھٹکاری۔ ”بول کہ تیری آواز مجھ تک پہنچ جائے گی۔“

”اے بد ذات و حقیر عورت! میں زاعون ہوں۔ تیرا کھیل اب ختم ہونے والا ہے کیوں کہ میں تجھے بہت جلد مار ڈالوں گا!“ میں نے غیر انسانی آواز میں جواب دیا۔

”اے زاعون! تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا!“ نجوا سخت لہجے میں بولی۔ ”میں تجھ سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“

”تجھے مارنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں ‘سعد اور اس کی بیوی رشیدہ کو عراق کے شہر سلیمانہ سے یہاں بلوا لوں۔ اس طرح تو نے ان پر جو ظلم کیے تھے، وہ تجھ سے ان انتقام بھی لے لیں گے۔ میں صرف اتنا کروں گا کہ ان دونوں کو تیرے شیطانی حملوں سے بچاتا رہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”تو خود میرے مقابلے پر کیوں نہیں آتا؟“

”اس لئے کہ مقابلہ برابر والے سے ہوتا ہے اور تیری حیثیت میرے نزدیک زمین پر ریگے والی ایک حقیر چوٹی سے زیادہ نہیں۔“

”تو میری حیثیت اور طاقت دیکھنا چاہتا ہے تو یہ دیکھ!“ نجوا غرائی۔ ”اب تو مجھے نہیں دیکھ سکتا!“ نجوا یہ کہتے ہی کچھ پڑھنے لگی۔

چند ہی لمحوں میں نجوا کا چہرہ میرے سامنے سے غائب ہو گیا۔

”اب تو صرف میری آواز سن سکتا ہے، وہ بھی اس وقت تک کہ جب تک میں چاہوں! اگر آج چاہتا ہے کہ سعد اور اس کی بیوی، دونوں میرے ہاتھوں مارے جائیں تو اپنی یہ حسرت بھی پورا کر لے!“ انہیں سلیمانہ سے یہاں بلا لے۔ ”نجوا کا اندازہ چیلنج دینے والا تھا۔“

”تو سن کہ آج ہی وہ دونوں تجھ تک موت کا پیغام بن کر پہنچ جائیں گے۔“ میں بولا۔ ”تو دایاں بازو تو میں پہلے ہی توڑ چکا ہوں۔ اپنے دست راست منصور کی موت کو ابھی تک تو یقیناً بھرا نہیں ہو گی!“ میں نے دانستہ نجوا کو ذہنی اذیت پہنچانے کی خاطر یہ ذکر چھیڑا تھا۔

”اگر تیری ہی سازش کے نتیجے میں منصور مارا گیا ہے تو..... تو پھر تجھے میں زیادہ دن تک آوارہ روح کی طرح بھٹکنے نہیں دوں گی!“ نجوا نے مجھے دھمکی دی۔

جواب میں، میں زور سے ہنس دیا، پھر خود ہی نجوا سے رابطہ منقطع کر لیا۔

”اے علیالیش! تو یہ کیسا خطرناک کھیل کھیلنے کا ارادہ کر رہا ہے؟ آدم زادوں کے جسم اپنا کر ہم مجبور ہو جائیں گے!“ سوی کہنے لگی۔

”ایسا نہیں ہو گا اے سوی!“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”نجوا کو سعد اور رشیدہ کی تو مرز جھلکیاں دکھاتے رہنا ہے۔ ہم جب چاہیں گے یا ضرورت محسوس کریں گے، انسانی قالب اپنالیں۔ جب خطرہ ہوا، چھوڑ دیں گے۔ مستحقاً ہمیں انسانی قابلوں میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ سعد اور رش کی حیثیت سے کیوں کہ ہم نجوا کے محکوم رہ چکے ہیں، اس لئے وہ ہم سے مقابلہ کرتے ہوئے، ذلت محسوس کرے گی۔“

”میں تیرا مقصد سمجھ گئی۔ اگر ایسا ہے تو پھر خطرے کی کوئی بات نہیں۔“ سوی میری تجویز پر عمل کرنے کے لئے راضی ہو گئی۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنی دوسری جناتی صفات کو بروئے کار لا کر یہ سراغ لگایا کہ نجوا کہاں ہے! وہ دریائے نیل میں اپنے چند مسلح آدمیوں کے ساتھ ایک بڑی لانچ کے ذریعے سفر کر رہی تھی۔ یہ لانچ شہری آبادی سے کافی دور تھی۔ منصور کی موت کے بعد شاید نجوا نے یہ قدم اس لئے اٹھایا تھا کہ منقرع کے غلاموں سے محفوظ رہ سکے۔ ہم ہوٹل سے چل دیے۔ دریائے نیل کے اوپر پرواز کرتے ہوئے مجھے کئی موٹر بوٹس نظر آئیں۔

ایک موٹر بوٹ میں صرف ایک ہی آدم زاد سفر کر رہا تھا۔ میں اسے بے ہوش کر کے ساحل پر ڈال آیا اور اس کی موٹر بوٹ اپنے قبضے میں لے لی۔

ذرا سی دیر میں وہ موٹر بوٹ انتہائی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی، پھر شہری حدود سے آگے نکل آئی۔ اب موٹر بوٹ اور نجوا کی لانچ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا۔ میں نے سوی کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور پرواز کرتا ہوا نجوا کی لانچ پر اتر گیا۔

لانچ پر نجوا کے ساتھ پانچ مسلح افراد تھے۔ ان کے علاوہ لانچ کا ڈرائیور بھی تھا۔ میں نے لانچ میں اسلحہ کا ذخیرہ بھی دیکھا۔ کچھ سوچ کر میں نے دو خود کار رائفلیں اور ان کے لئے خاصا میگنٹین دہاں سے غائب کر کے اپنی موٹر بوٹ پر پہنچا دیے۔ لوٹ کر میں پھر لانچ پر پہنچا۔ اسلحہ کے ذخیرے کو میں نے بڑی خاموشی کے ساتھ دریا میں غرق کر دیا۔ ایسا میں نے بلا سبب نہیں کیا تھا۔ لانچ کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ نجوا کینن کے اندر نظر آئی۔ اس کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس سوچ میں تھی! اس کی بے خبری سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ وہ جس آرام کرسی پر نیم دراز تھی، اسے میں نے الٹ دیا۔

نجوا کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی، لیکن اس نے اچھل کر کھڑے ہونے میں دیر نہیں کی۔

”اے بے خبر عورت!“ میں نے غیر انسانی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”تو یہاں غافل بیٹھی ہے اور تیری موت تجھ تک پہنچنے والی ہے۔ سعد اور رشیدہ ایک موٹر بوٹ میں تیری لانچ تک پہنچ کر تجھ پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ تجھے میں یہی بتانے آیا تھا۔“

نجوا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ کوئی شیطانی عمل پڑھنے کی وجہ سے یہ غلت حرکت کر رہے تھے۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ نجوا کے دو مسلح ساتھی کینن میں داخل ہوئے۔ وہ یقیناً نجوا کی چیخ سن کر ہی کینن میں آئے تھے۔

”ہم نے آپ کی چیخ سنی تھی میڈم!“ ان دونوں میں سے ایک بولا۔ ”کیا ہوا؟“

نجوا نے جواب میں ہاتھ اٹھا کر انہیں کینن سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹ اب بھی تیزی سے حرکت میں تھے۔ اس سے پہلے کہ میں، نجوا کے شیطانی عمل کے سبب کسی مصیبت میں

ہاتھ سے دور بین چھوٹ کر گلے میں جھولنے لگی۔ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے شانے سے رائل نقل اٹھادی اور ڈرائیور کے کبین کی طرف لپکی۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی جہاں کھڑے تھے وہیں بت سے بے ہوئے کھڑے رہے۔ اسی وقت کبین کی آڑ سے نکل کر میں نے ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اسی اثناء میں سوی اپنا کام انجام دے کر میرے قریب پہنچ گئی۔ لالچ کے ڈرائیور کو اس نے گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اب نجوا کا کوئی ساتھی زندہ نہیں بچا تھا۔ اسے میں نے ڈرائیور کے کبین سے نکلے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ موجودہ صورت حال سے یقیناً وہ گھبرا گئی تھی۔ سوی کے ساتھ میں ایک مرتبہ پھر اس کبین کی آڑ میں ہو گیا تھا جہاں نجوا نظر آئی تھی۔ اس کی وجہ محض ان خود کار رائل نقلوں کو چھپانا تھا جو ہمارے پاس تھیں۔ نجوا کے ہاتھ میں رائل نقل تھی۔ اب وہ اپنے ان دونوں ساتھیوں کی طرف قدم اٹھا رہی تھی جو کچھ ہی دیر پہلے زندہ تھے۔ پھر جیسے ہی اس کی پشت ہماری طرف ہوئی، ہم سعد اور رشیدہ کے انسانی قابلوں میں آگئے۔ اسی کے ساتھ میں نے نجوا کے دائیں ہاتھ کا نشانہ لیا۔

دھماکا ہوا، گولی چلی، نجوا چیخ اٹھی اور اس کے زخمی ہاتھ سے رائل چھوٹ کر نیچے گری۔
”نجوا!“ میں نے سعد کی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”دیکھ لو کہ جنہیں تم اپنا محکوم سمجھتی تھیں اس وقت تمہاری زندگی انہی کے رحم و کرم پر ہے۔“

زخمی ہونے کے باوجود نجوا تیزی سے مڑی۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”میں نے تم دونوں کو سمجھنے میں غلطی کی، مجھے یہ اعتراف ہے۔ اب بھی تم چاہو تو میں تم سے صلح کر سکتی ہوں، لیکن اس کی ایک شرط ہے۔“

ہماری رائل نقلیں نجوا کو نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔ میں نے کہا۔ ”ہمارے جانے والوں کو شرطیں مانگ کرنے کا حق نہیں ہوتا، پھر بھی بولو تم کیا کہنا چاہتی ہو!“

نجوا کے زخمی ہاتھ سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ اسی لئے کراہتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مجھے معلوم ہے سعد کہ مقررہ کے غلاموں سے بچنے کے لئے اب تم نے زاعون کی پناہ لے لی ہے۔ مصالحت کی شرط یہ ہے کہ تم زاعون کی پناہ سے نکل آؤ گے۔“

”اور پھر تم دوبارہ ہمیں اپنی پناہ میں لے لو گی!“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس پڑا۔
”ہاں میں یہی۔“ نجوا کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیوں کہ لالچ کے نچلے حصے میں پانی جمع ہونے کی وجہ سے لالچ اب دریا میں ڈوبنے لگی تھی۔

نجوا بوکھلا گئی اور میں نے قہقہہ لگا کر اسے بتایا۔ ”نجوا! یہ لالچ ڈوبنے والی ہے۔ تم سے دیرینہ تعلقات کے سبب میں تمہیں جان بچانے کا ایک موقع دے سکتا ہوں۔ تم دریا میں چھلانگ لگا دو اور کوشش کر کے کسی طرح ساحل تک پہنچ جاؤ۔ تم اگر زندہ بچ گئیں تو باقی باتیں پھر ہو سکتی ہیں۔“
دوسرے ہی لمحے یہ پردا کیے بغیر کہ میں اسے گولی بھی مار سکتا ہوں، نجوا تیزی سے پلٹی اور اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھنس جاتا، دوسرے ہی لمحے پرواز کر گیا۔
اونچی پرواز کرتے ہوئے مجھے اپنے تعاقب میں شعلے لپکتے دکھائی دیے۔ میں ان کی دسترس سے دور تھا اس لئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ تجربہ میرے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ مسخرہ طلال بے بھی مجھ پر اسی طرح حملہ کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ خود نجوا نے بھی ایک مرتبہ سوی پر یہی کار کیا تھا۔
لپکتے ہوئے شعلے چند ہی لمحوں میں غائب ہو گئے۔ میں اسی کے ساتھ تیزی سے غوطہ لگا کر سوی کے پاس پہنچ گیا۔ نیچے آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نجوا دور بین آنکھوں سے لگائے موٹر بوٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جو ظاہر ہے اسے خالی ہی نظر آ رہی ہو گی۔
میں نے سعد کا انسانی قالب اپنا لیا اور سوی سے مخاطب ہوا۔ ”اب تو رشیدہ کے قالب میں آجا! نجوا دور بین سے اسی طرف دیکھ رہی ہے۔“

سوی نے میرے کہنے پر فوراً عمل کیا۔ میں نے ایک خود کار رائل نقل اٹھالی اور سوی کو بھی یہی مشورہ دیا۔ پھر لالچ پر ہماری فائرنگ سے پہلے ہی فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ چلائی جانے والی گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ میں لیٹ گیا اور سوی نے بھی میری تقلید کی۔
سینے کے بل لیٹتے ہی ہم دونوں نے ایک ساتھ لالچ پر جنم کے دہانے کھول دیے۔
”اے سوی! وہ ہمیں دیکھ چکی ہے اور اتنا ہی کافی ہے۔ اب انسانی قالب سے نکل آ!“ میں نے یہ کہتے ہی خود پھل کی۔

ایسا کرنے میں سوی نے بھی دیر نہیں لگائی۔ اب ہمیں گولیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔
دیر تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ میں جان بوجھ کر اس مقابلے کو طول دے رہا تھا تاکہ نجوا کے آدمیوں کے پاس میگزین کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ لالچ میں اسلحہ کا جو فاضل ذخیرہ تھا اسے میں پہلے ہی دریا میں غرق کر چکا تھا۔

موٹر بوٹ اور لالچ کا درمیانی فاصلہ میں نے رفتہ رفتہ کم کر دیا۔ اسی دوران میں نجوا کے تین آدمی ہماری گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ فائرنگ میں اب پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ معاً میں نے موٹر بوٹ کی رفتار انتہائی تیز کر دی اور اسے لالچ سے ٹکرا دیا۔

اسی وقت کوئی چیخا۔ ”موٹر بوٹ خالی ہے“ اس میں کوئی نہیں۔“
”یقیناً انہوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو گی۔“ مجھے نجوا کی آواز سنائی دی۔

موٹر بوٹ کو میں نے بلاوجہ ہی لالچ سے نہیں ٹکرایا تھا۔ اس سے موٹر بوٹ کو تو نقصان پہنچا ہی، مگر لالچ کے نچلے حصے میں بھی سودا خ ہو گیا۔ اسی سبب لالچ میں تیزی سے پانی بھرنے لگا۔ نجوا شاید فوری طور پر اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ آنکھوں سے دور بین لگائے سطح سمندر کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ میں اور سوی اس عرصے میں نجوا کی لالچ پر پہنچ گئے۔ سوی کو میں بتا چکا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

سوی اس لالچ کے ڈرائیور کی طرف لپکی۔ دوسرے ہی لمحے فائر کی آواز سنائی دی۔ نجوا کے

”ہم بعد میں اس بیگ کو بھی کراچی پہنچا دیں گے۔“ میں نے یہ کہہ کر سوئی کو اطمینان دلایا۔

سوی کو تنہا قاہرہ میں رہ کر کیا کرتا تھا! وہ بھی میرے ساتھ ہوں۔ دن کا وقت ہونے کے سبب ہم نے اونچی برداز کی اور کراچی پہنچ گئے۔ اس بیگ کو میں نے حفاظت کے ساتھ اپنے کمرے کی ایک

الماری میں رکھ دیا۔ اب تک ہم خاصی دولت جمع کر چکے تھے۔ یہ دولت ہم نے اپنے دشمنوں ہی سے چھینی تھی۔

واپسی میں سوی نے مجھ سے سوال کیا۔ ”تو اتنی دولت کس لیے جمع کر رہا ہے؟“

”مجھے تو خبر ہے کہ ہم جن زادوں کے لیے یہ دولت کسی کام کی نہیں، لیکن یہ ضرورت مند آدم زادوں کے کام تو آسکتی ہے۔“ میں نے جواب دیا تو سوی چپ ہو گئی۔

کراچی سے واپسی پر ہم فواد کی کوٹھی کے قریب ہی ایک ایسی جگہ اترے جہاں کسی کی نظر میں نہ آئیں۔ ہمیں اب سعد اور رشیدہ کے انسانی قالب اپنانے تھے۔ پتلی سی اس گلی سے جب ہم نکلے تو انسانی قابلوں میں تھے۔ فواد کی کوٹھی وہاں سے دور نہیں تھی۔ ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔

کوٹھی کے مسلح چوکیدار نے ہمیں دیکھ کر اظہار حیرت کیا۔ وہ سعد اور رشیدہ کی حیثیت سے ہم دونوں کو پہچانتا تھا۔ اس کے ذہن پر توجہ دینے سے پتا چلا، اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ ہم اچانک پراسرار طور پر کہیں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے ہمیں کوٹھی میں داخل ہونے سے نہیں روکا۔ اس کوٹھی کے ملازمین بھی ہم سے واقف تھے۔ ہمیں نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا اور فواد کو ہماری آمد کی خبر دی گئی۔ وہ کوٹھی ہی میں موجود تھا۔

فواد کے لئے یہ اطلاع کسی دھماکے سے کم نہیں رہی ہوگی کہ ہم اس سے ملنے آئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فوراً دوڑا چلا آیا۔

میں صوفے سے اٹھ کر اس طرح فواد کے گلے لگ گیا جیسے دو عزیز دوست عرصہ دراز کے بعد ملے ہوں۔

”تم..... تم دونوں اچانک کہاں..... کہاں چلے گئے تھے؟“ فواد حیرت زدہ سا ہو کر ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے میرے دوست!“ میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ ”تم تو جانتے ہو کہ نجوا نے ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہم آج ہی عراق سے یہاں پہنچے ہیں۔ نجوا سے ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ اب ہم سے مصالحت چاہتی ہے۔“

”نجوا اسے تم لوگ کب اور کہاں مل لیے؟“ فواد نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”میری معلومات کے مطابق تو وہ قاہرہ میں نہیں ہے۔“

”اس سے ہماری ملاقات قاہرہ کے باہر ہی ہوئی تھی، لیکن اب وہ غالباً قاہرہ پہنچ گئی ہوگی۔“ میں نے بتایا۔

”کیا نجوا نے تم سے میری کوٹھی پر ملنے کے لئے کہا تھا؟“ فواد نے دریافت کیا۔

”نہیں، لیکن میرا قیاس ہے کہ اسے یہیں آنا چاہئے۔“ میں نے جواب دیا۔

”خیر!..... اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہو گا۔ جب تک نجوا آئے، تم لوگ کھانا تو کھاؤ!“

”ہاں ضرور کھائیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہہ دیا۔

”اور ہاں، تم لوگوں کا سامان کہاں ہے؟“ فواد نے پوچھا۔

”ایک ہوٹل میں ہے۔ نجوا کو مصالحت پر راضی کیے بغیر ہم تمہاری کوٹھی میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔“ میں بولا۔ ”اس طرح تمہارے لیے بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ فواد نے اقرار کیا۔ ”نجوا بہر حال ایک سخت گیر عورت ہے۔“

پھر فواد نے ایک ملازم کو بلا کر کھانا لگانے کے لئے کہہ دیا۔

”تم دونوں ہی کو شاید یہ سن کر دکھ ہو کہ منصور اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“ فواد کی آواز یہ کہتے ہوئے کسی قدر بھاری ہو گئی۔

”کیا؟..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو فواد؟“ میں اس طرح چونک اٹھا جیسے یہ خبر میرے لئے نئی ہو۔

”ہاں سعد!“ فواد نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”یہ کل ہی کا واقعہ ہے۔“ پھر وہ نجیب پر حملے کی تفصیل بتانے لگا۔ ”ہمارے ہی ایک آدمی نے ایک معرکے کے دوران میں منصور کو گولی مار دی۔ وہ یقیناً ہمارے دشمنوں سے مل گیا ہو گا۔ ہمارے آدمیوں نے اسے بھی زندہ نہیں چھوڑا۔“

”یہ بہت برا ہوا فواد!“ میں نے اظہار افسوس کیا۔ ”میری نظریں وہ نجوا کا دایاں بازو تھا۔“ ہم منصور کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ ملازم نے آکر بتایا کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ فواد کے ساتھ ہم نشست گاہ سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے آئے۔

کھانا کھا کر ہم ابھی اٹھنے ہی والے تھے کہ ڈائننگ روم کے دروازے سے میں نے نجوا کو داخل ہوتے دیکھا اور چونک اٹھا۔ میرے چونک اٹھنے کی وجہ نجوا کے اٹل ہاتھ میں موجود لمبی نال والا ریوالور تھا، دائیں ہاتھ پر اپنی بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ اس نے کمرے میں گھستے ہی اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”فواد!“ اچانک نجوا چیخ اٹھی۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے بڑے احمق ہو گے! تم میرے دشمنوں کی خاطر مدارات کر رہے ہو!“

”لیکن سعد نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم اس سے مصالحت کرنا چاہتی ہو!“ فواد کہنے لگا۔

”اور تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا!“ نجوا بہ دستور سخت اور ناگوار لہجے میں بولی۔ ”تمہیں خبر ہے کہ آج ان دونوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے! انہوں نے میرے چھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور لالچ ڈیو دی۔ اس پر بھی کیا میں ان سے مصالحت کر سکتی ہوں!“

”مگر ہم نے تمہیں تو زندہ بچ کر نکل جانے دیا تھا۔“ میں بولا۔ ”صرف اس لئے کہ تم نے ہم سے مصالحت چاہی تھی۔ بولو نجوا، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”مصالحت اور تم سے؟ ناممکن! تم میرے دشمن زاعون کے آلہ کار بن کر یہاں آئے ہو۔“

معا میں نے فواد کو حرکت کرتے دیکھا تو ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا اور کہا۔ ”نہیں میرے دوست! تم اپنی جگہ سے نہیں ہلو گے! یہ دو عورتوں کا معاملہ ہے جس میں ہم مردوں کو مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔“ نجوا نے مجھ پر گولی چلا کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ مصالحت نہیں چاہتی۔“

فواد اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ سوی نے نجوا کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ پھر اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا کہ سوی ایک طرف اچھل کر جاپڑی اور فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگی۔ اس عرصے میں نجوا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ ٹھوکروں کے سبب نجوا کے چہرے کی کھال کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ نجوا کوئی شیطانی عمل پڑھ چکی ہے اور اسی کے نتیجے میں سوی کا یہ حال ہوا ہے۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور رد بلا کا مختصر عمل پڑھ کر سوی پر دم کر دیا۔ ابھی سوی پر دم کر کے سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا کہ میری کمر پر زور دار لات پڑی۔ میں سنہلے سنہلے بھی گر پڑا۔ اسی لمحے مجھ پر فواد نے چھلانگ لگائی اور میرے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ لیا۔ سوی نے فرش سے اٹھتے اٹھتے فواد کے ہاتھ پر اپنے دائیں پیر کی ضرب لگائی۔ فواد کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر برتنوں کے ریک سے ٹکرایا۔ سوی پر رد بلا کے عمل کا فوری اثر ہوا تھا۔

اب ہم چاروں میں سے کسی کے پاس بھی ریوالور نہیں تھا۔ پھر سوی تو نجوا سے اور میں ’فواد‘ سے بڑھ گیا۔ نجوا کا دایاں ہاتھ زخمی تھا اس لئے سوی کا پلہ بھاری تھا۔ مجھے ایک ایسا موقع مل گیا کہ فواد کے دائیں ہاتھ کی کلائی توڑ دی۔ وہ چیخ کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

نجوا بھی زیادہ دیر سوی کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکی۔ وہ زمین پر گر چکی تھی اور سوی کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کی گردن تھی۔

”اسے ابھی مارنا نہیں ہے۔“ میں ’سوی‘ سے مخاطب ہوا۔

سوی نے نجوا کی گردن چھوڑ دی اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”نی الحال اس کے دونوں پیر توڑ دو‘ یہی کافی ہے۔“ میں نے سوی سے کہا۔

”نن..... نہیں!“ نجوا چیخنے لگی۔ ”میں..... میں تم سے مصالحت کے لیے تیار ہوں۔“

”اب مصالحت کا وقت گزر چکا ہے نجوا!“ میں جواب میں بولا اور سوی کو اشارہ کیا۔

اسی لمحے نجوا نے پھر کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ میں پہلے ہی اس کا توڑ کر چکا تھا۔

اب اس کا کوئی شیطانی حربہ سوی اور مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو اسے سوی نے اتنی مہلت نہیں دی۔ میرے ایما پر سوی نے نجوا کے دونوں پیروں کی ہڈیاں جگہ جگہ سے توڑ دیں۔ تکلیف کی شدت سے نجوا اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ سکی۔ دروازے پر اب بھی دستک دی جا رہی تھی۔

”آپ یہاں سے چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تو اسے مزید زندہ رکھنا چاہتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

زاعون مجھے خود سب کچھ بتا چکا ہے۔ ”نجوا نے دانت پس کر کہا“ پھر فواد کو بتانے لگی۔ ”زاعون نے مجھے آج زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ قصر الطلال کے جس حصے میں میری سکونت تھی“ زاعون نے اسے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ تجوری کا فولادی دروازہ بھی ٹوٹا پڑا ہے جسے توڑنا کئی آدمیوں کے بس کا کام بھی نہیں ہے۔ لاکھوں گنتی، ہیرے جواہر اور قیمتی زیورات بھی تجوری سے غائب ہیں۔ وہاں کوئی شے قابل استعمال نہیں چھوڑی گئی۔ میرے ملازمین جو خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے“ ان کے بیانات سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ اس تباہی و بربادی اور لوٹ مار کا ذمہ دار صرف اور صرف زاعون ہے۔ پولیس کی آمد کے بعد میرے ملازمین لوٹ آئے تھے کیوں کہ وہ نیچے رم سیس چوک میں تھے۔ میں اپنے دشمن کے آلہ کار بن جانے والوں کو کسی صورت زندہ نہیں چھوڑوں گی!“

”نجوا! تم ایک مرتبہ پھر غلطی کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ غلطی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی!“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو“ نجوا کو!“ وہ آگے بڑھی۔ میں اس کا ارادہ بھانپ گیا کہ اب وہ کسی بھی لمحے فائر کر سکتی ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ نجوا اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائے میں نے سوی کو دھکا دیا اور ڈانٹنگ ٹیبل کے نیچے گھس گیا۔ اگر مجھ سے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو نجوا کم از کم مجھے تو موت کے گھاٹ اتار ہی دیتی۔ ڈانٹنگ ٹیبل کے نیچے گھسنے کا مقصد محض یہ تھا کہ میں چند لمحے کے لئے نجوا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کمر و حمل کے سے گونج اٹھا تھا۔ نجوا نے گولی چلا دی تھی۔ میرے لئے اتنی ہی مہلت کافی ہوئی۔ میں انسانی قالب سے نکل کر نجوا کے پیچھے پہنچ گیا اور دوبارہ انسانی قالب اپنا لیا۔ سوی نے بھی جان بچانے کے لئے انسانی قالب چھوڑ دیا تھا۔ کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہونے لگی۔ یہ شاید فواد کے ملازم تھے۔

”تم دونوں میز کے نیچے سے نکل آؤ!“ نجوا غرائی۔

میں نے اسی لمحے تیزی کے ساتھ پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر نجوا کا ریوالور چھین لیا اور اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور چیختی ہوئی منہ کے بل زمین پر گری۔ فواد غیر مسلح تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بھی ریوالور نکال لیتا۔

”رشیدہ! اب تم باہر آ جاؤ!“ میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سوی اب انسانی قالب اپنا سکتی ہے۔

سوی میرا اشارہ سمجھ گئی اور جب ظاہر ہوئی تو رشیدہ کے انسانی پیکر میں تھی۔

”یہ ایک عورت ہے رشیدہ! مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک مرد ہو کر اس پر ہاتھ اٹھاؤں۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی نجوا کے کس بل نکال سکتی ہو۔“ میں بولا۔

نجوا اس وقت فرش سے کھنٹیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوی جست لگا کر نجوا کے قریب پہنچ گئی اور اس کے پہلو پر اپنے دائیں پیر کی زور دار ٹھوک ماری۔ چیخنے ہوئے نجوا پھر گر پڑی۔ میں ریوالور ہاتھ میں لیے دور کھڑا تھا۔

”ہاں ابھی میرے انتقام کی آگ نہیں بجھی۔“ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اسے تو ابھی تڑپا کر مارنا ہے۔“

پھر ہم دونوں اس بند کمرے سے غائب ہو گئے۔ فضا میں پرداز کرتے ہوئے سوی نے مجھ سے پوچھا۔ ”مگر ہر چلنا ہے؟“

”اپنے دوسرے شکاروں کی خبر لینے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں چھوٹے بڑے شیطان اب تک رہائی حاصل کر چکے ہوں گے۔ چل پہلے زناک کے تھانے چلتے ہیں۔“

☆=====☆

چند ہی لمحوں بعد ہم تھانے پہنچ گئے۔ میرا اندازہ قطعی درست نکلا۔ جیزا کے آئی جی نے ڈی ایس پی اور تھانہ انچارج سمیت پورے تھانے کو لائن حاضر ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ وہاں بی کارروائی جاری تھی۔ طلال بے اور نجیب المہندس کو رہا کر دیا گیا تھا۔ عدالت نے ان دونوں کی ضمانتیں منظور کر لی تھیں۔ ضرغام اور شجاع کے دہرے قتل کی تفتیش کے لئے ارشاد کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا میری توقع کے مطابق ہی تھا۔

”کیا تو کوئی اندازہ لگا سکتی ہے اے سوی کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہوں گے؟“ میں نے تھانے سے نکلنے ہوئے سوی سے دریافت کیا۔

”اندازہ چھوڑ اے علیالیش! میں ابھی ان کا سراغ لگائے لیتی ہوں۔“ سوی بولی۔ پھر اپنی جٹائی صفات کو بروئے کار لانے کے بعد مجھے بتایا۔ ”وہ دونوں الازہر کی اسی کوشی میں ہیں جہاں طلال بے پہلے سکونت اختیار کیے ہوئے تھا۔“

”اے سوی! میرا خیال ہے کہ ان حالات میں وہ متفرق کی نام نہاد روح سے رابطہ ضرور قائم کریں گے اس لئے ہمیں ان کے قریب ہی رہنا چاہئے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”ہاں اے علیالیش! ہمارا اصل مقصد تو اسی تک پہنچنا ہے ورنہ طلال بے اور نجیب المہندس کو ختم کرنا اب کیا مشکل ہے!“ سوی مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میرا مشورہ مان تو اب ان دونوں کو نہ چھیڑا ہمارے لئے صرف ان کی نگرانی کافی ہے۔ اگر ہم انہیں دوسرے معاملوں میں الجھائے رہے تو وہ متفرق کی روح سے رابطہ قائم نہ کر سکیں گے۔ ایسی صورت میں ہم صحیح خطوط پر آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔“

”ٹھیک کہتی ہے تو! مگر ایک معاملے کو ہم نے اب تک یکسر نظر انداز کر رکھا ہے۔ صرف طلال اور نجیب کو ختم کر دینے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ اگر ہمارے ہاتھوں مارے بھی گئے تو ان کی جگہ متفرق کے دوسرے غلام سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ ہمیں طلال اور نجیب کے علاوہ متفرق کے دوسرے غلاموں کا بھی سراغ لگانا ہے۔“

”لیکن یہ کس طرح ممکن ہے اے علیالیش؟“

اسی لمحے مجھے نجیب کی تجوری سے ملنے والی ڈائری اور نقشوں کا خیال آیا۔ انہیں ابھی تک

نے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے سوی سے ہوٹل چلنے کو کہا۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر سوٹ کیس سے میں نے ڈائری اور نقشے نکال لیے۔ کسی آدم زاد کے ہاتھ وہ ڈائری پڑتی تو وہ اس کی عبارت پڑھنے میں ناکام ہی رہتا۔ دنیا میں اب قدیم عبرانی زبان پڑھنے اور سمجھنے والے آدم زاد شاید خال خال ہی ہوں گے، مگر میرے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

ڈائری کے ابتدائی صفحات پر شیطانی عمل تحریر کیے گئے تھے۔ میں نے ان صفحوں کو الٹ دیا۔ پھر جو صفحات سامنے آئے انہیں دیکھ کر میرے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان صفحات پر متفرق کے غلاموں کے نام پتے لکھے ہوئے تھے۔ انہی میں مجھے جابر، حسنین اور کئی ایسے غلاموں کے نام نظر آئے جن سے سابقہ پڑ چکا تھا اور اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ اس ڈائری کو دیکھنے سے پہلے مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ متفرق کے غلام اتنی بڑی تعداد میں ہوں گے۔ ان میں سے اکثر ستارہ اور الاقصر میں تھے۔ ان دونوں ہی مقامات پر قدیم اہرام تھے۔ وہاں ان کی زیادہ تعداد کا ہونا میری نظر میں معنی خیز تھا۔ قاہرہ شہر میں بھی ان کی کچھ تعداد موجود تھی۔ اس کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک، خصوصاً مشرق وسطیٰ میں متفرق کے غلام سکونت پذیر تھے۔ عراق کے دارالحکومت بغداد میں بھی مجھے ڈائری کے ذریعے ان کا سراغ ملا۔ پاکستان میں بھی متفرق کا کوئی غلام ہو گا۔ یہ امر میرے لئے تعجب خیز ہی تھا۔ وہ دونوں غیر مسلم تھے، ایک پارسی تھا، دوسرا عیسائی، پارسی کا قیام کراچی میں اور عیسائی لاہور میں تھا۔ ان دونوں سے تو میں پاکستان جا کر بھی نمٹ سکتا تھا۔ فی الحال تو مصر میں متفرق کے جو غلام تھے، مجھے ان کو ختم کرنا تھا۔ ڈائری میں درج نام بچوں کے مطابق ان شیطان صفت آدم زادوں کی کل تعداد تین سو کے قریب تھی۔

”اے سوی! ہمیں اس پورے ہی شیطانی کردہ کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔“ میں پُر عزم لہجے میں بولا۔

”اس کا ایک دوسرا راستہ بھی تو ہے اے علیالیش!“ سوی نے کہا۔

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر ہم آدم زادوں کو راہِ راست سے بھٹکانے والی متفرق کی روح کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ پورا کردہ ہی بے دست و پا ہو کے رہ جائے گا۔ پھر ہمیں زیادہ خون بہانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“ سوی نے جواب دیا۔

”ایک صورت یہ بھی ہے۔“ میں تائید میں بولا، ”پھر نقشوں کو کھول کر دیکھنے لگا۔“

”یہ نقشے ان مقامات کے ہو سکتے ہیں جہاں اہراموں کی کھدائی کر کے انہوں نے سونا نکالا ہو۔“ سوی نے قیاس آرائی کی۔

”ممکن ہے۔“ میں یہ کہہ کر یہ دستور ان نقشوں کو غور سے دیکھتا رہا اور ایک خاص بات محسوس کی۔ ایک نقشے کے سوا تمام نقشوں پر صحیح کے نشانات لگے ہوئے تھے۔ مجھے مقتول جابر اور

دیا گیا ہو۔ سوی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف بے بسی کے ساتھ دیکھا۔ اس کی حالت بھی یقیناً مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ نہ اس کے اندر اٹھنے کی طاقت معلوم رہی تھی، نہ مجھ میں اتنی قوت تھی۔ پرواز کرنے یا وہاں سے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان خطرناک و عیار مقرر کے غلاموں نے اس عمارت کے ارد گرد یقیناً کوئی ناپیدہ حصار قائم کر رکھا تھا۔ ہم اس حصار کی زد میں آگئے تھے۔ یہ میرا آخری احساس تھا کیوں کہ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے اس اذیت سے بچنے کے لئے کوئی عمل پڑھنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی۔ خدا جانے ہم کب وہیں لان کے ایک گوشے میں بے ہوش پڑے رہے۔ مجھے ہوش آیا تو ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گویا اب رات ہو چکی تھی۔ ہم شام سے پہلے وہاں آئے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بے ہوشی کا وقفہ خاصا طویل تھا۔ سامنے ہی مجھے عمارت نظر آ رہی تھی۔ عمارت کے اندر مجھے کیس کیس روشنی دکھائی دی۔ غالباً اس کے کین ابھی جاگ رہے تھے۔ ہوش میں آنے کے باوجود بھی اب تک میرے وجود میں آگ سی لگی ہوئی تھی حالانکہ حصار کی زد میں آئے خاصا وقت گزر چکا تھا۔

میں نے سوی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک غافل پڑی تھی۔ میں نے رد بلا کا عمل پڑھ کر پہلے سوی پر اور پھر خود پر دم کیا لیکن خلاف توقع اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تکلیف و اذیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ میرے وجود کی ساری قوتیں جیسے کسی نے نچوڑ لی تھیں۔

”اے سوی!“ میں نے سوی کو پکارا اور کراہنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں سوی کو خود ہی ہوش آگیا اور وہ رک رک کر بہ مشکل بولی۔ ”مم..... میں اندر..... اندر سے جل رہی ہوں اے..... علیالیش! مگر ٹھہرا!..... میں رد بلا کا عمل پڑھتی ہوں..... تو بھی پڑھ! پھر..... پھر ہم اس تکلیف سے نجات.....“

”میں یہ عمل پڑھ چکا ہوں اے سوی!“ میں بول اٹھا۔ ”پھر بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا۔“

”اے علیالیش! میرے باپ عزتیل نے اس وقت تجھے کوئی عمل تعلیم کیا تھا جب تو ڈھاکا میں دوند چڑجی کے قائم کردہ حصار کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔“ سوی نے مجھے یاد دلایا۔ ”وہ عمل مجھے یاد نہیں۔ شاید اسے پڑھنے سے.....“

”مجھے یاد ہے وہ عمل اے سوی!“ میں جلدی سے بولا۔ ”یہی عمل ایک جن زادی وازعہ کے عالم باپ ہاموس نے بھی مجھے بتایا تھا۔“ میں یہ کہتے ہوئے وہ مخصوص عمل پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے میں وہ عمل پڑھتا گیا، میرے وجود میں ٹھنڈک سی پھیلتی گئی۔ عمل کے آخری الفاظ پڑھنے تک میرے اندر بڑھکتی ہوئی آگ سرد پڑ چکی تھی۔ میں نے سوی پر بھی دم کر دیا۔ اس کی حالت بھی اعتدال پر آگئی۔ اس اذیت سے نجات پانے پر ہم دونوں ہی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم اس عذاب سے توبہ کر گئے مگر نقاہت اتنی تھی کہ ہمارے لئے وہاں سے پرواز کرنا ممکن نہیں تھا۔ سو ہم وہیں پڑے رہے۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

کمزوری ختم کرنے کے لئے ہمیں مقوی ادویات کی ضرورت تھی لیکن موجودہ صورت حال میں

نجیب کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آئی۔ یہ گفتگو جابر فون پر کر رہا تھا، اس وقت جب کہ میں رقامہ جزیلہ کا تعاقب کرتا ہوا ستارہ پہنچا تھا۔ جابر نے کہا تھا کہ آئندہ ہفتے سے کسی اہرام تک پہنچنے کے لئے کام شروع کر دیا جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق جس نقشے پر صحیح کا نشان نہیں لگا تھا وہ اسی اہرام کا ہو سکتا تھا جس تک پہنچنے کی غرض سے مقرر کے غلام کوئی سرنگ کھودنے کا آغاز کرنے والے تھے۔ نجیب کے ساتھ مهندس کا لاحقہ بھی لگا ہوا تھا۔ عربی میں مهندس انجینئری کو کہتے ہیں۔ یہ حیثیت انجینئر نجیب یہ نقشے خود بھی بنانے کا اہل تھا۔

”اے علیالیش! تو ان نقشوں کو دیکھ کر کیا سوچ رہا ہے؟“ سوی نے مجھے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

میں نے جو کچھ سوچا تھا، سوی کو بتا دیا۔ پھر کہا۔ ”ستارہ میں مقرر کے غلاموں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ جابر کی جگہ کوئی بھی لے سکتا ہے اور اس کام کا آغاز ممکن ہے۔ ہمیں ان کا کام روکنے کے لئے تو کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی ہی پڑے گی۔“

”اس کے لئے تو ستارہ جانے کی تجویز پیش کرے گا؟“

”ہاں ہمیں وہاں تو جانا ہی پڑے گا اے سوی!“

”لیکن یہ نہ بھول اے علیالیش کہ ملاجی کی طرح وہاں پھر کسی قوی جن زاد سے ہمارا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔“

”اب تو جو بھی ہو بھگتا ہی پڑے گا۔ ابھی تو اس میں کئی دن باقی ہیں۔“ میں بولا اور پھر سوی سے الاؤ ہر چلنے کے لئے کہا۔

چند ہی لمحوں میں ہم پرانے قاہرہ کی اس بڑی اور قدیم آبادی کے ایک حصے میں پہنچ گئے۔ جمالہ کہلاتی تھی۔ ہماری حاصل کردہ معلومات کے مطابق طلال بے کی اس کونٹری میں یونیکا بھی تھی اور وہاں مسلح محافظ بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ ملازمین الگ تھے۔ اس کونٹری کی حیثیت زمالک میں دارغ نجیب کی کونٹری جیسی تھی۔ ہم پہلے ہی یہ طے کر چکے تھے کہ اپنے دشمنوں کو چھیڑ کر چوکننا نہیں کرنا گئے۔

میں اور سوی اس کونٹری کے وسیع و عریض لان میں اتر گئے۔ طلال بے اور نجیب کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے اب ہمیں عمارت میں داخل ہونا تھا۔ اس وقت مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ چند لمحوں کے بعد ہم پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے، نہ اس کا علم تھا کہ یہ کوشش ہمیں کتنی مہلک پڑے گی!

ہم دونوں جیسے ہی عمارت کی حدود میں داخل ہوئے اچانک بھڑکتے شعلوں میں گھر گئے۔ ان کے ساتھ کسی آن دیکھی طاقت نے ہمیں اٹھا کر دور پھینک دیا۔ میں نے اپنے وجود میں کوئی الاؤ نہ بھڑکتا محسوس کیا جو مجھے اندر سے جلانے ڈال رہا تھا۔ وہ تکلیف و اذیت میرے لئے ناقابل بیان ہے۔ آدم زاد اس شدید اذیت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں جیسے کسی زندہ شخص کو بھڑکتے الاؤ میں ڈال

ان کا حصول ناممکن تھا۔ ہم دونوں میں سے اگر کسی ایک کی حالت بھی ٹھیک ہوتی تو جا کر دوا لیں آتا۔ مجبوراً ہمیں صبر کرنا پڑا۔ اب تو محض یہی ایک صورت تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے فطری طور پر ہماری کھوئی ہوئی توانائی کسی حد تک واپس آجاتی۔ اسی کے بعد ہم دواؤں کے حصول کو شش کر سکتے تھے۔

”سوجا اے سوی! انشاء اللہ صبح تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے لئے ضروری دوا حاصل کر سکیں۔ یہ کمزوری کسی عمل سے نہیں، مقوی دواؤں ہی سے جائے گی۔“ میں نے سو کر تسلی دی اور اس عبارت کی طرف دیکھنے لگا جہاں ہمارے دشمن موجود تھے۔ ہم ان آدم زادوں کو تو کیا لیتے، ان تک پہنچنے سے بھی قاصر تھے۔ ایسی بے بسی شاید اس پہلے میں نے کبھی محسوس کی ہو۔ وہ تو یہ غنیمت تھا کہ وہ شیطان مقرر کے غلام وہاں ہماری موجودگی سے واقف نہیں در نہ اور نہ جانے کیا ستم ڈھاتے، ممکن ہے ہمیں اپنی جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ دشمن گویا اپنے قلعے میں محفوظ تھے ہم نے اس قلعے میں شکاف ڈالنے کی تدبیر تو سوچ لی مگر ابھی اس تدبیر پر عمل کرنے کے قابل نہیں تھے۔ ہم نے دشمنوں کو پے در پے جو اذیتیں تھیں اور نقصانات پہنچائے تھے، ان کے سبب ہی غالباً درست نتیجہ اخذ کر کے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ان نے ان واقعات کے پیچھے ناپیدہ زاعون کی کار فرمائی محسوس کر لی ہوگی۔ میں نے اپنی پردہ پوش خاطر کہ ایک جن زاد ہوں، خود ہی یہ ڈھونگ رکھایا تھا۔ اس سے میں حقیقت پر پردہ ڈالنے کامیاب رہا مگر خود کو دشمنوں کے وار سے نہ بچا سکا۔ آدم زاد واقعی ہم جن زادوں سے زیادہ ظالم مخلوق ہے۔

ہمارے دشمن ہم سے زیادہ دور نہیں تھے اس لئے ہمیں محتاط اور چوکنا رہنا پڑا۔ میری کے باوجود سوی بھی لمبے بھر کو نہیں سوئی۔ رات بھر ہم جاگتے ہی رہے۔ صبح ہوتے ہوتے ہم کم اس قابل ہو گئے کہ حرکت کر سکیں۔ پھر بھی ہم تیز اور اونچا اڑنے کے قابل نہیں تھے۔

ایک دوسرے کو سارا دیے ہم فضا میں دھیرے دھیرے تیرتے ہوئے اس کو بھی آئے۔ بازار ابھی کھلے نہیں تھے۔ مجبوراً ہمیں ایک عطار کی بند دکان میں داخل ہو کر مطلوبہ حاصل کرنا پڑا۔ دوا کی پہلی خوراک ہم نے وہیں کھائی اور دکان سے نکل آئے۔ ہمارے لئے ہی ایک محفوظ پناہ گاہ تھا۔ سو ہم نے پرانے قاہرہ سے تحریر اسکواری پر تھا۔

تجربے سے مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ آدم زادوں کے قابلوں پر دواؤں کی جلد اثر انداز ہونے ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ہم جن زادوں کی نسبت اس عالم آب و گل میں بہت ہی قریب عرصے زندہ رہتے ہیں۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے ہوٹل پہنچنے سے پہلے انسانی قالب اپنا انہی قابلوں کو اپنا کر ہم اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ انسانی قابلوں کی ضرورت کے تحت ہم نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور بستر پر آرام کرنے لیٹ گئے۔ دوا کی دوسری خوراک ہمیں دھیرے دھیرے کھانی ہم اور آرام، اسی سے ہمارے وجود کی کھوئی ہوئی توانائی واپس آسکتی تھی۔ ہم اسی لئے کمری

جب ہم سو کر اٹھے تو دھیرے دھیرے چکی تھی۔ دوا کی دوسری خوراک کھا کر ہم نے تازہ دم کی غرض سے باری باری غسل کیا۔

ابھی میں فون پر روم سروس سے رابطہ قائم کر کے کھانا منگوانے والا تھا کہ خلاف توقع دروازے پر دستک ہوئی۔

سوی دروازہ کھولنے کے لئے اٹھنے والی تھی کہ میں بول اٹھا۔ ”ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں کون“

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور چونک اٹھا۔ ان دو افراد میں سے ایک کا چہرہ میرے اجنبی نہیں تھا۔ آشنا چہرے والے کو میں نے فواد کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ وہ فواد کے ملازمین میں سے ایک تھا۔ کرخت چہرے اور بھاری ڈیل ڈول والا دوسرا شخص میرے لئے قطعی اجنبی ثابت ہوا۔

”فرمائیے!“ میں نے کرخت چہرے والے کو مخاطب کیا۔

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اسکندریہ سے یہاں تشریف لائے ہیں۔“ کرخت چہرے اپنی کھردری سی آواز میں بولا۔

”تو پھر؟“ میں نے کہا۔

”یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہمارے جو مہمان اسکندریہ سے آنے والے ہیں، ان کے نام بھی سود اور منور ہیں لیکن آپ وہ نہیں ہیں۔“ اجنبی نے بات بنائی، پھر کہنے لگا۔ ”معاف کیجئے گا کہ ہمارے آپ کو زحمت دی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں خوش اخلاقی سے مسکرا دیا اور خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

میں اس عرصے میں اجنبی شخص کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ اس طرح مجھے نجوا کے بارے میں بھی علم گیا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے! کھلے ہوئے دروازے سے فواد کے ملازم کی ایک جھلک سوی نے بھی دیکھ لی تھی۔ وہ اسی لیے مجھے کچھ فکر مند سی دکھائی دی۔

”کل شام سے نجوا کے آدمی شہر کے تمام چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں رشیدہ اور سعد کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ ہوٹل میں ہم نے گویا اپنے اصل نام نہیں لکھوائے ہوں۔ یہ وہی ہے ہر نوجوان جوڑے کو دیکھ رہے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے فواد کے ملازمین کو تھم رکھا ہوا ہے۔ اگر ہم رشیدہ اور سعد کے قابلوں میں ہوتے تو ملازم کھائیں دیتا۔ اسی کے ساتھ رخت چہرے والا اجنبی ہمیں گولی مار دیتا۔“ میں، سوی کو بتاتے لگا۔

”تو نے شاید اس اجنبی کا ذہن پڑھ کر یہ سب کچھ معلوم کیا ہو گا اے علیالیش!“

”ہاں۔“ میں نے اقرار کیا، پھر مزید بتایا۔ ”نجوا کو کافی دیر میں ہوش آسکا تھا۔ اس کی حالت اب بھی اسی کی ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ کل شام کو اس سخت جان عورت نے ش آتے ہی ہماری تلاش اور دیکھتے ہی ہمیں گولی مارنے کا حکم دے دیا۔ کل ہی اس کی دونوں

یاگوں کا آپریشن ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو بھی سکے گی یا نہیں! ہماری تلاش ہوٹلوں میں کی جا رہی ہے۔ اس ہوٹل میں بھی صرف نوجوان جوڑوں کے متعلق تفصیل معلوم کی گئی ہے۔ یہاں ٹھہرے والے نوجوان جوڑوں کے نام، کمروں کے نمبر اور یہ کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے خاصی رقم خرچ کی گئی ہے۔ سچی تو اس اجنبی نے ہمارے وہ نام بتا دیے جو ہم نے لکھوائے ہیں۔ بہر حال نجوا کے آدمی اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور ہم تک پہنچ گئے، یہ الگ بات کہ بدلے ہوئے انسانی قابلوں کی وجہ سے ہمیں پہچان نہیں جاسکا۔ ان کا یہ اندازہ درست ہی نکلا کہ ہم کسی ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے۔

”خاک ڈال نجوا اور اس کے آدمیوں پر! کھانا منگوا کہ بڑے زور کی بھوگ لگ رہی ہے۔“

سوی کہنے لگی۔

میں نے فون پر روم سروس سے کھانا بھیجنے کے لئے کہہ دیا۔ پہلے کی نسبت اب ہماری فضا میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ کھانا کھا کر ہم پھر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ رات کو تیسرا خوراک کے بعد ہم نے خود کو بہت بہتر پایا۔ مجھے بھی یہی توقع تھی کہ تیسری خوراک استعمال کرنے پر ہماری فضا بہت تقریباً ختم ہو جائے گی۔ اپنی حالت کا صحیح اندازہ لگانے کی خاطر ہم نے انسانی قابلوں سے نکل کر فضا میں پرواز کی۔

”اب تو کیسا محسوس کر رہی ہے اے سوی؟“ میں نے پوچھا۔

”کمزوری تو تھوڑی بہت ابھی باقی ہے لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔“ سوی نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے، کل صبح تک یہ کمزوری بھی ختم ہو جائے گی۔“

”تیسرا کیا مشورہ ہے، ہم آج رات طلال بے کی کوشش کرنے کی؟“

”سوچ لے اے علیالیش! کیوں کہ ابھی ہماری توانائی پوری طرح واپس نہیں آئی ہے۔“

”اللہ مالک ہے، چلتے ہیں وہاں! عمارت کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے وہ مخصوص پڑھ لیں گے۔ عمل پڑھ کر ہم انشاء اللہ اس خطرناک نادیہ حصار کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس نے کل ہمیں عضو معطل بنا دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

سوی کو میری بات مانی ہی پڑی۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہوٹل سے وقت ہم اپنے کمرے کی روشنی بجھا آئے تھے۔ کھانا ہم نے پل ہی کھا لیا تھا۔

☆=====☆

ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ پہلے کی طرح ہم طلال بے کی کوشش کے لان میں اترے تھے۔ سوی کو میں نے مخصوص عمل کے الفاظ یاد کرائے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ عمل پڑھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے میں کسی قدر خوفزدہ تھا۔

پھر وہ لمحات بھی آہی آہی گئے کہ جب میں اور سوی اس عمارت میں داخل ہو ہی گئے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ نادیہ حصار آدم زادوں کے لئے قطعی

اڑ ہے، اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

طلال بے اور نجیب ہمیں اس کوشش کی اسٹڈی میں آرام کرسیوں پر نیم دراز مل گئے۔ ان کا موضوع گفتگو حالیہ واقعات ہی تھے۔ دونوں کے سروں اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور چروں پر انحصار تھا۔ طلال بے کا ایک رخسار کچھ زیادہ ہی پھولا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس پر بھی غالباً چٹ لگی تھی۔

”زاعون کی روح نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ نجیب کہہ رہا تھا۔ ”اب مجھے از سر نو نقشہ بنانا پڑے گا جہاں کھدائی کا کام شروع کروانا ہے۔“

”وہ تو خیر ہے۔“ طلال بے اپنی ہچکانہ آواز میں بولا۔ ”مگر ایک بات بہر حال تشویش ناک ہے کہ نقوش کے ساتھ ساتھ وہ تمہاری کوشش سے ڈائری بھی لے اڑا، وہی ڈائری کہ جس میں منقرع کے تمام غلاموں کے نام پتے درج تھے۔“

”یقینی طور پر یہ بات کہنا مشکل ہے۔ کیا خبر وہ ڈائری اور نقشے بھی دیگر سازد سامان کے ساتھ مل گئے ہوں!“ نجیب کہنے لگا۔

”نجیب! کبھی کبھی تم بھی بڑی ہچکانہ باتیں کرنے لگتے ہو!“ طلال بے کا چہرہ یہ کہتے ہوئے مزید مضحکہ خیز ہو گیا۔ ”تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔“

”ہاں یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی کہ تجوری کا دروازہ آگ لگنے سے نہیں کھل سکتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن زاعون وہ ڈائری نہ بھی لے جاتا تو اس کے لئے کون سا مشکل تھا کہ وہ ہمارے ساتھیوں کے نام پتے معلوم کر لیتا!“ نجیب نے اظہار خیال کیا۔

”خیر جو بھی ہو، مگر ان حالات میں اب منقرع کی روح سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔“ طلال بے نے کہا۔

”اور اس کے لئے ہمیں اپنی محفوظ پناہ گاہ سے نکلنے کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ موجودہ حالات میں کیا یہ قدم اٹھانا درست ہے؟“ نجیب نے سوال کیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ زاعون کے پے در پے حملوں کی وجہ سے تم کچھ زیادہ ہی ڈر گئے ہو۔ شاید اسی وجہ سے تمہاری عقل کام نہیں کر رہی۔“ مغزہ طلال بے بولا۔ ”بھلا اس میں خطرے کی کیا بات ہے۔ بولو، کیا ہم اپنے گرد حصار قائم نہیں کر سکتے تاکہ ہمارا دشمن زاعون قریب نہ آسکے۔ اب کچھ آیا تمہاری سمجھ میں! زاعون اس عمارت میں تو خیر داخل ہو ہی نہیں سکتا، مگر ہم یہاں سے نکلے گی تو وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

”منقرع کی روح سے تم کس لئے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہو، یہ تو ابھی تم نے بتایا ہی نہیں!“

نجیب نے طلال بے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم کیا۔

”زاعون کا عذاب آخر کب تک ہمارے سروں پر مسلط رہے گا! وہ ہمیں جسمانی، ذہنی اور مالی طور پر نقصان پہنچائے جا رہا ہے اور اب تک ہم اسے ختم نہیں کر سکے۔ اس ظالم نے مجھے میرے

منقرع کے غلاموں کو اب کسی اہرام تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ طلال بے فوری طور پر منقرع کی روح سے رابطہ قائم کرنے کے حق میں تھا اور نجیب اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ کہیں وہ مصرعہ نجیب کی بات نہ مان لے! اس طرح مجھے مزید انتظار کرنا پڑتا۔ فی الحال انہی دونوں آدم زادوں کے ذریعے منقرع کی روح تک پہنچنا ممکن تھا۔

وہ دونوں شیطان صفت آدم زاد خاصی دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ طلال بے اس پر آمادہ ہو گیا کہ نقشے کی تکمیل کے بعد پہلے ستارہ میں کھدائی کا کام شروع کروا دیا جائے۔

اب ہمارا مزید دہاں رکنا لا حاصل ہی تھا۔ سو میں نے سوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اپنے ہوٹل کی طرف پرواز کر رہے تھے کہ سوی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے علیالیش! یہ بھی تو ممکن ہے کہ نجیب دو روز کی محنت کے بعد جو نقشہ بنائے تو اسے غائب کر دے! اس طرح منقرع کے غلام، ستارہ میں کھدائی کا کام شروع نہیں کر سکیں گے۔“

”یہ ممکن تو ہے سوی، لیکن کئی وجوہ کی بنا پر یہ مناسب نہیں ہو گا۔ اس پر ہم ہوٹل پہنچ کر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“ میں کچھ سوچ کر بولا۔

ہم آرام کے ساتھ فضا میں پرواز کرتے ہوئے اپنے ہوٹل کے کمرے میں آگئے۔ اسی کے ساتھ ہم نے انسانی قالب اپنا لیا۔

”ہاں اب یہ بتا کہ نیا نقشہ غائب کرنے میں کیا قیامت ہے اے علیالیش؟“ سوی نے دریافت کیا۔

”پہلی بات تو یہ اے سوی کہ اس عمارت سے نقشہ غائب ہو جانے کی صورت میں ہمارے دشمن چونکا ہو جائیں گے۔“ میں بتانے لگا۔ ”وہ سمجھ لیں گے کہ نقشہ غائب کرنے والا ان کا دشمن زاعون کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس سے وہ یہ نتیجہ بھی نکال لیں گے کہ زاعون اس عمارت میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اس عمارت کے گرد کوئی اور خطرناک حصار بھی قائم کر سکتے ہیں جسے عبور کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔ پھر دوبارہ بھی نقشہ تیار کیا جانا، ممکن ہے۔ میرے خیال میں انہیں اس وقت تک نہ چھیڑا جائے جب تک کہ وہ ستارہ میں کھدائی کا کام شروع نہ کرادیں۔ اس کام کے آغاز کے بعد ہی وہ منقرع کی روح سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمارا اصل مقصد تو منقرع کی روح تک پہنچنا ہی ہے۔ منقرع کے غلاموں کو تو کسی بھی مرحلے پر اہرام تک پہنچنے سے روکا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ کام دو ایک دن میں تو پورا ہو گا نہیں، اس میں دقت لگے گا۔ ان شیطانوں کو روکنے کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے، مگر.....“

میں کچھ سوچنے لگا تو سوی نے مجھے ٹوکا۔ ”اپنی بات پوری کر اے علیالیش! بتا کہ تیرے ذہن میں کیا بات آئی ہے؟“

”میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ والوں کو ان شیطانوں کے پیچھے لگا دیا

دائیں ہاتھ سے محروم کر دیا، تمہیں ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی اور ہماری کوشیوں کی آگ لگا دی۔ لاکھوں گنی کا نقصان ہو گیا اور ہم ابھی تک خطرے میں ہیں، سکون کا سانس نہیں لے سکتے، نہ آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کر سکتے ہیں۔ ہر وقت ہمارے سروں پر خطرے کی تلوار لٹکی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں منقرع کی روح یقیناً ہماری رہنمائی کر سکتی ہے کہ ہم کس طرح زاعون کو ختم کریں!“ طلال بے نے تفصیلی جواب دیا۔

یہ سن کر نجیب کچھ سوچنے لگا، پھر کہا۔ ”لیکن منقرع کی سرگوشیاں سننے کے لئے تم تنہا بھی تو جاسکتے ہو!“

”مجھے اندازہ تھا کہ تم یہی کہو گے۔“ طلال بے دھیرے سے ہچکانہ انداز میں ہنسا۔ ”تم پر زاعون کا خوف طاری ہے اسی لئے یہاں سے لٹکنا نہیں چاہتے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ نجیب نے کہا تو اس کے لہجے سے خجالت کا اظہار ہو رہا تھا پھر بولا۔ ”ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، منقرع کی روح بھی تو ان سے بے خبر نہیں ہو گی۔ وہ خود بھی تو ہمارے پاس پہنچ کر ہم سے سرگوشیاں کر سکتی ہے۔ پہلے بھی تو ایسا ہوتا رہا ہے۔“

”تو پھر منقرع کی سرگوشیوں کا انتظار کرتے رہو۔“ طلال بے کی آواز سے ناگواری جھلکنے لگی۔

”میں اور تم یہاں کب تک چھپے رہیں گے؟ ابھی تمہیں یا مجھے ستارہ بھی تو جانا ہے تاکہ جابر کی جگہ کسی اور کو کھدائی کے کام کی ذمہ داری سونپی جاسکے۔ تم نے تو ابھی نقشہ ہی نہیں بنایا!“

”مجھے نقشہ دوبارہ بنانے میں زیادہ سے زیادہ دو دن لگیں گے۔ ایسا کیوں نہ کریں طلال کہ نقشے کی تکمیل کے بعد پہلے ہم ستارہ پہنچ کر کام شروع کروا دیں! پھر منقرع کی روح سے رابطہ قائم کریں۔ اس طرح منقرع کی روح کو بھی اطمینان ہو جائے گا کہ ہم اس کے احکام پر عمل کر رہے ہیں۔“

”نجیب! تمہاری اب تک کی گفتگو سے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ فی الحال تم اس عمارت کے باہر قدم رکھنے کا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتے۔ اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں تو کیا دو روز کے بعد حالات بدل جائیں گے؟ کیا زاعون ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا؟“

”میں نے یہ کب کہا کہ دو دن گزرنے پر زاعون کا خطرہ ٹل جائے گا! میرا مقصد تو نقشے کی تکمیل ہے۔ نقشے کے بغیر تو ہم کام شروع نہیں کر سکتے!“

”تمہیں نقشہ بنانے سے کس نے روکا ہے! لیکن اسی کے ساتھ منقرع کی روح سے بھی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے!“ طلال بے اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”تمہیں ایک بات اور بتا دوں جس کا اندازہ شاید تم نے نہ کیا ہو۔ زاعون اب آسانی کے ساتھ ہمیں کسی اہرام تک نہیں پہنچنے دے گا۔ وہ ہم سے انتقام لینے پر اتر آیا ہے۔ اس کا ثبوت ہم دونوں ہی کو مل چکا ہے۔ میرے نزدیک زاعون سے نمٹنا ضروری ہے۔“

اس عیار مصرعے کے قیاسات حیرت انگیز طور پر درست تھے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا

جائے، مگر ایک امکان اور بھی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ کی کچھ بڑی کالی بھینڑیں، منقرع کے غلاموں سے مل گئی ہوں۔ اس ملی بھگت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔" میں نے بتایا۔

"اے علیاییش! یہ محض ایک امکان ہے جو ضروری نہیں کہ درست ہی ثابت ہو۔ پھر اس محکمہ میں ایسے اعلیٰ افسران بھی تو ہو سکتے ہیں جو محب وطن ہوں اور مجرموں سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اس اہم قومی نوعیت کے معاملے کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہم سر حال ان شیطان صفت آدم زادوں کے خلاف یہ چال بھی چل سکتے ہیں۔" سوی نے پُر زور لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے" یہ تدبیر بھی ہم آزمائیں گے اور خود بھی چوکنا رہیں گے۔ اگر کسی سبب محکمہ آثار قدیمہ والے، مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے تو ہم خود ان کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔" میں نے سوی کی تائید کرتے ہوئے اسے اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔

اگلے دن ہم نے پھر طلال بے کی کوٹھی کا پتھر لگایا کہ کہیں اس کا ارادہ بدل تو نہیں گیا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نجیب نیا نقشہ بنانے میں مصروف تھا۔ طلال بے الگ ایک کمرے میں نظر آیا۔ وہ کسی کافون نمبر ملا کر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔

"ہاں میں قاہرہ سے طلال بے بول رہا ہوں۔" طلال بے نے کہا۔ اس سے میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ وہ کسی ایسے شخص سے بات کر رہا تھا جو قاہرہ میں نہیں تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولا۔ "میری بات غور سے سناؤ! تمہیں اب جابر کی جگہ سنبھالنا ہے۔ جابر کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں بیرون ملک بھیجا گیا ہے۔ اس کی واپسی جلد ممکن نہیں۔ اسے وہاں سے لوٹنے میں کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ نیا کام شروع کرنا ہے۔ تمہیں بتایا تھا جابر نے؟..... ٹھیک ہے۔ پرسوں دوپہر تک میں خود ستارہ پہنچ رہا ہوں۔..... ہاں نقشہ بھی تمہیں مل جائے گا۔..... نجیب بھی میرے ساتھ ہی ہو گا۔ وہ اس جگہ کی نشان دہی کر دے گا جہاں سے کام کا آغاز ہوتا ہے۔..... ہاں ہاں۔..... تم تمام تیاریاں ان دو دنوں کے اندر مکمل کر لو!..... سمجھ گئے؟....." پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اسے سن کر طلال بے نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

جابر کی جگہ اب منقرع کے ایک اور غلام حازق کو دے دی گئی تھی۔ کسی مصلحت کے تحت طلال بے نے حازق کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا کہ جابر دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہے۔ بعد میں جابر کے متعلق کچھ بھی کہا جاسکتا تھا، مثلاً یہ کہ وہ بیرون ملک مارا گیا۔ طلال بے سے جواب طلبی کرتا بھی کون! اس وقت طلال بے کی کوٹھی آنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پرسوں نجیب کے ساتھ وہ ستارہ جانے والا ہے۔

یہ بات پہلے سے میرے علم میں تھی کہ ستارہ ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ اس آبادی سے

فاسے فاصلے پر قدیم آثار تھے جہاں میں نے جابر اور اس کے آدمیوں کو دیکھا تھا۔ مزید کچھ دیر طلال بے کی کوٹھی میں گزار کر ہم وہاں سے چلے آئے۔ میں اور سوی اب قطعی طور پر صحت مند ہو چکے تھے۔ ہمارے عمل نے دشمنوں کے حفاظتی ناپیدہ حصار کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ آج بھی ہم نے عمارت کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے حصار شکن عمل پڑھ لیا تھا۔

آئندہ روز بھی ہم اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب ہم طلال بے کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔

لبوترے چہرے والا ایک دروازہ قد آدم زاد ہمیں کوٹھی کی نشست گاہ میں بیٹھا دکھائی دیا۔ اپنے چلے سے وہ کوئی بائشیت آدمی ہی لگتا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل رکھی تھی۔ اس فائل پر چپے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ مصر کے ایک سرکاری محکمہ کا نام تھا، محکمہ آثار قدیمہ! وہ دروازہ قد آدم زاد میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ شخص کون ہے اور وہاں کیوں آیا ہے نشست گاہ کے اندرونی دروازے کا ریشمی پردہ اٹھا کر طلال بے آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔

اجنبی شخص کی نظر جیسے ہی طلال بے پر پڑی، وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "بیٹھو بیٹھو حاکم علی!" طلال بے یہ کہتا ہوا اجنبی شخص کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا۔ "ہام ہو گیا ہے جناب!" اس شخص حاکم علی نے بتایا اور درمیانی میز پر رکھی ہوئی فائل اٹھا کر طلال بے کی طرف بڑھا دی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" طلال بے مسکرایا تو اس کے رخسار اور بھی پھول گئے۔ اس نے حاکم علی کے ہاتھ سے فائل لے لی۔ "اس فائل میں جابر کی معطلی اور حازق کے تقرر کا پروانہ موجود ہے، آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے جناب!" حاکم علی بولا۔ "جابر سے چارج کی رپورٹ حازق کو ایک ہفتے کے اندر ہمارے محکمہ کو بھیج دینی ہے۔"

"سمجھتا ہوں میں۔" طلال بے فائل کھولتے ہوئے کہنے لگا۔ "رپورٹ بھیج دی جائے گی۔" موقع غنیمت جان کر جو طلال بے دیکھ رہا تھا میں بھی دیکھنے لگا۔ مجھے فائل سے لگے ان کاغذات کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سرکاری طور پر حازق کو آثار قدیمہ کی نگہداشت کا فرض سونپا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ اس پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ قدیم اہراموں کی تلاش جاری رکھے۔ اس ضمن میں اسے جگہ جگہ اس علاقے میں کھدائی کرانے کی اجازت بھی دی گئی تھی۔ کھدائی کے لئے مزدوروں کو بھرتی کرنے اور انہیں محکمہ کی طرف سے معاوضہ ادا کرانے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ اس سلسلے میں اسے کم سے کم اخراجات کی تاکید بھی کی گئی تھی۔ اس کا تقرر نامہ مرکزی محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ تقرر نامے پر محکمہ کے ڈائریکٹر نے دستخط کیے تھے۔ مجرموں کی اس دیدہ دلیری پر میں دنگ رہ گیا۔ وہ قانون کی آڑ میں قومی دولت لوٹنے کا گھناؤنا کھیل بڑی

عیاری کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گویا وہی محافظ تھے، وہی لیرے! محکمہ آثار قدیمہ نے انہیں خود کھدائی کی اجازت دی تھی۔ پھر قانونی طور پر انہیں کس طرح کھدائی سے روکا جاسکتا تھا! طلال بے نے فائل میں لگے ہوئے کاغذات دیکھ کر فائل کو بند کیا اور اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔

پھر طلال بے نے اپنے بانیں ہاتھ سے پچاس گنی کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور حاکم علی کو مخاطب کیا۔ ”اس کام کے لئے غالباً پانچ ہزار گنی کی رشوت کافی ہے۔ تمہیں تو خبر ہے حاکم علی کہ میں لگی لپٹی نہیں رکھتا اور صاف بات کرتا ہوں۔ رشوت کو رشوت کہنے میں آخر حرج بھی کیا ہے! یہ لو۔“

”آپ نے بالکل بجا فرمایا جناب!“ حاکم علی نے نوٹوں کی گڈی لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کی صاف گوئی پسند ہے۔ میں بھی اسی لئے رسمی طور پر آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کیوں کہ اس رشوت کو اپنا حق سمجھتا ہوں۔“ حاکم علی نوٹوں کی گڈی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

اس پر طلال بے دھیرے سے ہچکانہ انداز میں ہنس دیا۔ اسی کے ساتھ حاکم علی اٹھ کھڑا ہوا۔ طلال بے نے اس سے اخلافا چائے کو بھی نہیں پوچھا۔

میرے نزدیک حاکم علی کا ذہن پڑھنا اب بے سود ہی تھا۔ مجھے حقیقت کا علم تو ہو ہی چکا تھا۔ میری نظر میں منقرع کے غلام اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے تھے کہ انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ کو اصل معاملے کی ہوا گلے دی ہوگی۔

اب اس کا ایک ہی قانونی راستہ باقی تھا کہ منقرع کے غلاموں کو رنگے ہاتھوں اس وقت گرفتار کرا دیا جاتا جب وہ کسی اہرام تک راستہ بنا کے وہاں سے سونا نکال رہے ہوتے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ میری مرضی تو یہ تھی کہ وہ اہرام تک پہنچ ہی نہ پاتے، اس سے پہلے ہی انہیں روک دیا جاتا۔ اس کے لئے قانون کی مدد لینا بہ وجوہ ممکن نہیں تھا کیوں کہ وہ سرکاری طور پر حکومت کی اجازت ہی سے کھدائی کرتے۔

ان عیار آدم زادوں کا ”طریقہ واردات“ اب مجھ پر واضح ہو گیا۔ ڈائری میں درج نام پتے دیکھ کر میرے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار نہ تھا کہ ستارہ میں منقرع کے غلاموں کی اتنی بڑی تعداد کیوں موجود ہے! ظاہر ہے، کھدائی کے لئے بھرتی کیے جانے والے وہی ہوتے۔

نجیب کو میں نے گزشتہ روز کی طرح آج بھی نقشہ بناتے ہوئے دیکھا جو آدھے سے زیادہ تر مکمل ہو چکا تھا۔

طلال بے کی کوششی میں اب مزید رکنا لا حاصل ہی تھا۔ سو میں اور سوی وہاں سے نکل آئے۔ اب ہمیں اگلے روز صبح وہاں آنا تھا جب طلال بے اور نجیب ستارہ کے لئے روانہ ہوتے

میں انہیں اپنی نظروں سے کس طرح ادھملا رہے ہو جانے دیتا!

دوپہر سے پہلے ہی ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے اور انسانی قالب اپنا لیے۔

میں نے سوی سے کہا۔ ”ہمارے پاس آج کا وقت تو ہے نا!“

”پھر تیری کیا مرضی ہے؟“ سوی نے پوچھا۔

”میں اس عیار آدم زادی کی مزید خاطر مدارات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اسپتال میں پڑی ہے۔“ میں معنی خیز لہجے میں بولا۔ میرا اشارہ نجوا کی طرف ہی تھا۔

”کیوں، کیا اس کا قصہ پاک کرنے کا ارادہ ہے؟“ سوی نے معلوم کیا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ اسے کچھ اور ترپانا ہے۔“ سوی کو میں نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

ذرا سی دیر میں نجوا کا سراغ لگا کر ہم اس اسپتال تک پہنچ گئے جہاں وہ زیر علاج تھی۔ اس وقت نجوا کے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے باہر البتہ اس کے مسلح آدمی پہرا دے رہے تھے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ نجوا نے بھی کہیں حفاظتی حصار نہ کھینچ رکھا ہو، حصار شکن عمل پڑھا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ نجوا کی آنکھیں بند تھیں۔ یا تو وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی یا پھر یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس کے چہرے سے تکلیف و اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی ہم نے سعد اور رشیدہ کے انسانی قالب اپنا لیے تھے۔

”تنت..... تم!“ نجوا ہٹکائی۔ اسی کے ساتھ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور چہرے پر خوف کے آثار ابھر آئے۔

”ہم تمہاری خیریت دریافت کرنے آئے ہیں نجوا!“ میں نے مسکراتے ہوئے نرم آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، تم اپنے پیروں پر چل سکو گی؟“

میری بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے نجوا نے تیزی سے کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہونٹ اس کا ثبوت تھے۔

”رشیدہ!“ میں نے قریب ہی کھڑی سوی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”نجوا کو ہمارے خلوص پر یقین نہیں۔ یہ دشمنی پر آمادہ ہے۔ کیا خبر ڈاکٹر اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں اور نجوا اپنے پیروں پر چل سکے۔ تم یہ قصہ ہی کیوں نہ کاٹ دو!“

سوی میری بات سنتے ہی تیزی سے آگے بڑھی۔ اسے یقیناً یہ احساس تھا کہ نجوا اپنا شیطانی عمل پورا نہ کر سکے۔ مجھے اور سوی کو اس وقت یہ خیال نہیں تھا کہ ایک اور خطرہ بھی ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ نجوا نے تیزی سے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر پٹنگ کے سرہانے لگا ہو کوئی ٹپن دبا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے باہر گھنٹی بجنے کی تیز آواز سنائی دی۔

اس وقت تک سوی نے نجوا کے دونوں پیروں کو اپنی گرفت میں لے کر مروڑنا شروع کر دیا تھا۔ کمرے میں نجوا کی بھیاںک جھینس گونج رہی تھیں۔

پھر اس سے پہلے کے میں، سوی کو خطرے سے آگاہ کر سکتا، کمرے کا دروازہ زور دار آواز سے کھلا اور کئی مسلح آدمی اندر بھس آئے۔

میں نے فوراً انسانی قالب چھوڑ دیا، مگر سوی کو لمحے بھر کی دیر ہو گئی۔ یہی لمحے بھر کی دیر تباہ کن ثابت ہوئی۔

کمرہ پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھا۔ سوی کے انسانی قالب میں بہ یک وقت کئی گولیاں بیوست ہو گئیں اور میں نے اسے لہرا کر گرتے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔ کاش میں وہاں نہ آیا ہوتا!

☆=====☆=====☆

آدم زادوں کی طرح ہم جنات بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ سو وہ ہمیں بھی امتحان و آزمائش میں ڈالتا ہے۔ وہ لمحات بھی ایسے ہی تھے۔ میں نے اس بات کو محسوس کر لیا۔ بس اچانک ہی وہ واقعہ رونما ہو گیا جس نے میری امید کے بجھتے ہوئے چراغ کو بجھنے سے بچا لیا۔ فرش پر ترختا ہوا سوی کا انسانی قالب ایک دم غائب ہو گیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ سوی کو آخری لمحات میں انسانی قالب سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس انسانی قالب کے ساتھ ہی سوی بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ مسلح افراد کے لئے تو اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر وہ مجھے نظر آ گئی۔ اس کے وجود کو انسانی قالب سے نکلنے ہی مدد حاصل ہو کر میں نے ایک طرف لڑھکتے دیکھا۔ میں چشم زدن میں اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس پر غفلت طاری ہو گئی۔

نوجوان کو ازیت دینا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ اس وقت تک ہسپتال کے کمرے میں کئی ڈاکٹر اور نرسیں پہنچ چکی تھیں۔ نوجوان بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ مجھے سوی کی فکر تھی اس لئے اسے اٹھائے سیدھا اپنے ہوٹل کا رخ کیا۔ میرے نزدیک سوی کی حالت تشویش ناک تھی۔ اس کے وجود پر چھائی ہوئی غفلت بلاوجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ انسانی قالب میں یقیناً اس کے وجود کو نقصان پہنچا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ہر ممکن تدبیر آزمائی، مگر سوی ہوش میں نہیں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کوئی عمل کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں بہت سی باتیں یاد نہیں آتیں۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ کوئی عمل اس وقت کارگر ثابت نہیں ہو گا۔ اس معاملے کی نوعیت قطعی مختلف تھی۔ عملیات سے نہیں، اس معاملے کا تعلق حکمت سے تھا۔ جب مجھے اس کا احساس ہوا تو جن زاد حکیم خاشع یاد آ گیا۔ میں نے خاصا عرصہ اس کی صحبت میں گزارا تھا۔

حکیم خاشع کے پاس ایسے جن زاد مریض بھی آتے تھے جنہیں انسانی قالب اپنانے سے نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جب ایک جن زاد کو بے ہوشی کی حالت میں حکیم خاشع کے پاس لایا گیا تھا۔ حکیم خاشع نے مجھے ایک خاص جڑی بوٹی کی تلاش میں روانہ کیا۔ وہ جڑی بوٹی اونچے پہاڑوں کے دامن ہی میں پائی جاتی تھی۔ حکیم خاشع نے مجھے اس کی واضح نشانیاں بتا دی تھیں۔ میں وہ جڑی بوٹی ڈھونڈ کر لے آیا۔ یاسف نے اس جڑی بوٹی کو کوٹ کر سنوف بنا دیا۔ حکیم خاشع نے کچھ اور دوائیں بھی مجھے لکھ کر دیں جو سنوف میں ملائی تھیں۔ جن زاد کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی کہ حکیم خاشع نے اسے وہ سنوف کئی بار سنگھایا۔ چند ہی لمحوں میں جن زاد کی ہوش آ گیا۔ حکیم خاشع نے کچھ اور دوائیں

اسے استعمال کرائیں تو وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

پتا چلا کہ وہ جن زاد کی ایک آدم زاد پر مر مٹی تھی۔ وہ آدم زاد کسی آدم زادی کے عشق میں گرفتار تھا۔ جن زاد کی مداخلت سے آدم زاد کی اس شک میں جھلا ہو گئی کہ اس کا عاشق بے وفائی پر اتر آیا ہے۔ عشق جنوں کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی محبت پر ڈاکا ڈالنے والی کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ پھر ایک رات اسے یہ موقع مل گیا۔ اس نے ایک چاقو سے پے در پے جن زاد کی انسانی قالب پر دار کئے۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ جن زاد خود اسی کا قالب اپنائے ہوئی تھی۔ جن زاد کی کو آخری لمحات میں انسانی قالب ترک کرنے کا موقع مل گیا، مگر اپنے ٹھکانے تک پہنچتے پہنچتے وہ ہوش کھو بیٹھی۔ لاکھ جتن کرنے پر بھی جب اسے ہوش نہیں آیا تو ایک جن زاد نے حکیم خاشع کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔ یوں اس جن زاد کی زندگی بچ گئی۔

یہ واقعہ سوی کو پیش آنے والے واقعے سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا۔

پھر میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور مخصوص جڑی بوٹی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ جڑی بوٹی حاصل کر کے میں نے انسانی قالب اپنایا اور ایک عطار کی دکان پر پہنچ گیا۔ میں نے عطار پر یہ ظاہر کیا کہ ایک حکیم ہوں۔ میری ہدایت پر جڑی بوٹی کا سنوف تیار کر کے اس میں دوسری دوائیں ملا دی گئیں۔ اب دوا تیار تھی۔ کچھ دوا میں نے اور خریدیں جو سوی کو ہوش میں آنے کے بعد استعمال کرانی تھیں۔ جب میں واپس ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو سوی کی حالت مزید بگڑ چکی تھی۔ میں گھبرا گیا کیوں کہ سوی اب چند لمحوں کی صمان معلوم ہو رہی تھی۔ جلدی سے میں نے اسے دوا سنگھائی جس کا اثر فوری طور پر ہوا۔ سوی زندگی کی طرف لوٹنے لگی اور پھر اسے ہوش آ ہی گیا۔

”سوی!“ میں نے تڑپ کر اسے مخاطب کیا۔

”علی..... علیا..... لیش!“ وہ بڑی مشکل سے بولی۔

”گھبرا نہیں، تیرے وجود کے زخم جلد بھر جائیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسے کئی دوائیں دیں اور ایک مشروب بھی پلایا۔ سوی کو اس سے سکون ملا تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دواؤں کے زیر اثر وہ سو گئی۔ مجھے اس کا علم پہلے ہی سے تھا اس لئے فکر مند نہ ہوا۔ میں جانتا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھے گی تو اس کی حالت مزید بہتر ہو جائے گی۔ مجھے خوشی تھی کہ میں ”سوی“ کی زندگی بچانے میں کامیاب رہا۔ اگر میں نے حکمت نہ دیکھی ہوتی تو یقیناً یہ ممکن نہ تھا۔ خدا جو کرتا ہے، اس کے بندوں کے حق میں بہتری ہوتا ہے۔

سوی کو میں نے سوئے دیا۔ شام کو خود ہی وہ بیدار ہوئی۔

”اب تیری طبیعت کیسی ہے؟“ میں نے بڑی محبت کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”پہلے سے اچھی ہوں۔“ سوی کی آواز میں نقاہت تھی۔

میرے مشورے پر اس نے صنوبر کا انسانی قالب اپنایا۔

”مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے اے علیا لیش!“ سوی نے مجھ سے کہا۔

میرے نزدیک یہ اچھی علامت تھی۔ اپنے اور سوی کے لئے میں نے روم سروس کو فون کر کے کھانا منگوایا۔
کھانا کھا کر ہم چائے پی رہے تھے تو سوی کہنے لگی۔ ”تجھ سے میں نے کہا تھا اے علیالیش کہ اس آدم زادی کا قصہ پاک کر دے، مگر تو نہیں مانا۔ اس کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے چکر میں یہ نوبت آگئی کہ میں موت کے دہانے تک پہنچ گئی۔“

”تو ٹھیک کہتی ہے اے سوی!“ میں نے اعتراف کیا۔ ”نجوا کو ختم کر دینا چاہئے تھا۔ خیر اب میں اسے مزید مہلت نہیں دوں گا۔ ان شاء اللہ یہ اس کی زندگی کا آخری دن ثابت ہو گا۔ وہ کل کا سورج نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کے ان مسلح محافظوں کو بھی میں زندہ نہیں چھوڑوں گا جنہوں نے تجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز میں سختی آگئی، غصے کے سبب میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج گئیں۔ پھر میں سوی کو بتانے لگا۔ ”جب میں تجھے غفلت کی حالت میں یہاں اٹھا کر لایا تھا تو نہ پوچھ کہ میرے دل پر کیا گزری تھی۔ تیری حالت تشویش ناک تھی اور کوئی عمل کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ میری عقل اتنی خبط ہو گئی تھی کہ اتنی سی بات اس وقت سمجھ میں نہیں آئی کہ عملیات کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ کسی شیطانی عمل کے نتیجے میں تیری یہ حالت ہوتی تو کوئی رحمانی عمل اثر بھی کرتا۔ پھر میرے معبود ہی نے مجھے راہ دکھائی۔ حکمت ہی میرے کام آئی۔ میں اپنے مولا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے تجھے بچالیا۔ ٹھہر، پہلے میں شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔“

اس کے بعد ہم دونوں نے وضو کیا اور بطور شکر اپنے اللہ کے آگے جھک گئے۔ میرے نزدیک اللہ نے سوی کو ایک نئی زندگی عطا کی تھی۔

رات کو سوی نے دواؤں کی آخری خوراک بھی پی لی۔ اب وہ پہلے جیسی ہی لگ رہی تھی۔ تیز اثر دوانے اس کے وجود کے زخم بھر دیئے تھے۔ مجھے اب اس ہسپتال کا رخ کرنا تھا کہ جہاں نجوا زیر علاج تھی۔ میں نے سوی سے اپنے ارادے کا اظہار کر دیا۔

”میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی اے علیالیش!“ وہ بولی۔
”نہیں اے سوی! تو آرام کر کہ تیرے لئے اس وقت یہی مناسب ہے۔ میں، نجوا اور اس کے محافظوں کو تنہا بھی موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔“

”لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر تو مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جا رہا؟“
”اس لئے کہ تیرا ساتھ چلنا ضروری نہیں اے سوی!“ میں نے اسے سمجھایا۔
”کیا تو مجھے اس نظارے سے محروم رکھنا چاہتا ہے جو میری روح کو مسرت سے ہمکنار کر سکے۔ اس عیار آدم زادی نجوا کو میں مرے ہوئے دیکھ سکوں۔“

سوی کے لہجے میں ایسی حسرت تھی جسے میں نظر انداز نہ کر سکا۔ میں نے اس کی بات ایک شرط پر مان لی۔

”یقین کر اے علیالیش کہ میں صرف تماشائی بنی رہوں گی۔“ سوی نے یقین دہانی کرائی۔

مطلوبہ ہسپتال پہنچ کر نجوا ہمیں اس کمرے میں نہیں ملی جہاں صبح اسے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ جلد ہی ہم نے اس کا سراغ لگا لیا۔ وہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھی۔ اس کے مسلح محافظ بھی مجھے نظر آئے۔ وہ اس شعبے کے صدر دروازے کے آس پاس بے حد محتاط اور چوکنا دکھائی دے رہے تھے۔
نجوا کی حالت یقیناً خطرے کی حدود میں تھی ورنہ کمرے سے اسے یہاں منتقل نہ کیا جاتا۔ پہلے میں نے یہی جانتا ضروری سمجھا کہ آج صبح کے بعد نجوا پر کیا گزری۔

معلوم ہوا کہ سوی نے جب اس کی دونوں ٹانگیں مروڑ دی تھیں تو وہ ہوش و حواس کو بیٹھی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کے لئے فوری طور پر آپریشن کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے انہیں نجوا کی دونوں ٹانگیں کولہوں کے قریب سے کاٹ دینا پڑیں۔ نجوا نے جو بے پناہ مال و دولت اکٹھا کیا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔ اب وہ تصویر عبرت بن کر زندگی بھر کے لئے محتاج ہو چکی تھی۔ سوی کے علم میں بھی یہ باتیں آئیں۔ وہ بہر حال گداز فطرت کی مالک تھی، مجھ سے کہنے لگی۔ ”اے علیالیش! اب اگر وہ زندہ بچ بھی گئی تو اس کی زندگی کس کام کی، اسے مارنے سے کیا حاصل؟“

”تو شاید یہ بھول گئی اے سوی کہ زندہ بچ جانے کی صورت میں اس کا شیطانی ذہن کام کرتا رہے گا۔ اس کے علاوہ اس کی پراسرار قوتیں بھی بیدار رہیں گی۔ معذور ہونے کے باوجود وہ دوسرے آدم زادوں کے لئے خطرہ بنی رہے گی۔“ میں بولا۔

میری دلیل میں اتنا وزن تھا کہ سوی کو میرے خیال سے متفق ہونا ہی پڑا۔ وہ نجوا کو موت کے گھاٹ اتارنے پر آمادہ ہو گئی، مگر اس سے پہلے میں نے مسلح محافظوں کو ٹھکانے لگانا ضروری سمجھا۔ میں نے انہیں اپنی جنات صفت کے اثر میں لے لیا۔ چند ہی لمحوں میں ہسپتال کا وہ حصہ فائروں کی آواز سے گونج اٹھا۔ ان شیطان صفت آدم زادوں نے ایک دوسرے کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ اس ہنگامے کے دوران میں کوئی بے گناہ آدم زاد نہ مارا جائے۔

اس اچانک اور غیر متوقع واقعے سے ہسپتال میں کھلبلی مچ گئی۔ سوی کو ساتھ لے ہوئے میں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخل ہو گیا۔ نجوا ایک بیڈ پر عاقل پڑی تھی۔ اسے خون چڑھایا جا رہا تھا، اسی کے ساتھ گلوکوز کی ڈپ بھی لگی ہوئی تھی۔ سانس لینے میں یقیناً اسے دشواری پیش آرہی تھی اسی لئے آکسیجن بھی دی جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں اگر نجوا کو انتہائی ضروری طبی امداد سے محروم کر دیا جاتا تو بھی وہ زندہ نہ بچتی لیکن میں اسے اس طرح غفلت کی حالت میں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی جناتی صفت کو بروئے کار لا کر اسے ہوش میں لے آنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ سوی کو بھی میں نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہم دونوں نے سعد اور رشیدہ کے انسانی قالب اپنا لئے۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں گل دستے تھے جیسے کسی مریض کی عیادت کرنے آئے ہوں۔ یوں بھی اس شعبے کے باہر جو ہنگامہ برپا تھا اس کی وجہ سے کوئی ڈاکٹر، نرس یا دارو بوائے وہاں نہیں تھا۔

میں اور سوی، نجوا کے سرہانے جا کھڑے ہوئے۔ پھر میں اسے ہوش میں لے آیا۔ نجوا نے ہوش میں آتے ہی ہم دونوں کو اپنے قریب دیکھا تو اس کے چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے۔ میں نے

ذخیر ہوگی کہ مقرر کے غلام اس سے کہاں اور کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں؟ میں نے آخر میں سوال کیا۔

”ہاں میں جانتی ہوں، مگر تمہیں بتاؤں گی نہیں کیوں کہ تم ہمارے دشمن ہو۔“ نجوا نے جواب دیا۔ ”تم جن زاد ہو۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تجھے تو اس دنیا سے اب ستر کرنا ہی ہے، پھر کچھ چھپانے کا کیا فائدہ؟“ میں بولا۔

”میری ایک شرط ہے۔ اگر تم مجھے زندہ چھوڑنے کا وعدہ کر لو تو تمہارے سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔“ نجوا نے کہا۔

اس پر میں نے مشورہ طلب نظروں سے سوئی کی طرف دیکھا۔

”اس عیار آدم زادی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“ سوئی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ”یہ ہمیں کسی مشکل میں بھی پھنسا سکتی ہے۔“

”مجھے..... مجھ پر یقین کرو، میں..... میں ایسا نہیں کروں گی۔“ نجوا بول اٹھی۔

”نجوا! اگر تو سچی ہے تو پھر مزاحمت نہ کر اور اپنے دماغ کو پڑھنے دے۔ تُو نے اگر ہم سے تعاون کیا تو تجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔“ سوئی بولی۔

”میرے دماغ میں کیا ہے؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا، خواہ وہ کوئی جن زادی کیوں نہ ہو۔“

”پھر بھی میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا اور اسی کے ساتھ نجوا کے ذہن پر توجہ مرکوز کر دی۔

میں نے نجوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے ذہن نے شدید مزاحمت کی۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔ میں یہ بھول گیا کہ نجوا تو خود موت کے دہانے تک پہنچ گئی ہے۔ اس کا ذہن میری شدید گرفت بالکی خفیف سے جھٹکے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اس کا نتیجہ فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ یکبارگی نجوا کا جسم جھٹکا لگا کر ساکت ہو گیا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ مر چکی تھی۔ اس شیطان صفت عیار آدم زادی نجوا کو شاید خود بھی خبر نہیں تھی کہ مزاحمت کا نتیجہ موت کی صورت میں ظاہر ہو گا ورنہ وہ یہ حماقت نہ کرتی۔ یقیناً اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔

اب ہمارا دہاں مزید رکنا فضول تھا۔ سوانسانی قالیوں سے نکل کر ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

وہ عورت جس نے ڈھیروں دولت جمع کی تھی، ہوس زر میں ہر انسانی قدر کو پامال کر دیا تھا، جانے کتنی جائیداد بنائی تھی، سب اسی دنیا میں چھوڑ گئی تھی۔ دنیا کمانے کے چکر میں اس نے آخرت گنوا دی اور کھائے میں رہی۔ ستم یہ کہ نہ اسے اس کا رنج ہوا نہ خبر ہوئی۔ وہ لاعلمی کی موت ماری گئی۔

ہمارے دشمنوں میں سے ایک دشمن کا خاتمہ ہو چکا تھا، مگر ابھی اصل دشمنوں یعنی مقرر کے غلاموں سے نمٹنا باقی تھا۔

ہم اس رات ہسپتال سے لوٹ کر سکون کے ساتھ سو گئے۔ میری روح سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا

دھیمی اور نرم آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”نجوا! ہم تجھے بے ہوشی کی حالت میں بھی موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے، مگر دانستہ ایسا نہیں کیا تاکہ تُو مرنے سے پہلے جان لے کہ تیرے قاتل کون ہیں..... نہیں، تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ تُو صرف سن..... تیرا خیال یہ تھا کہ تُو نے ہمیں اپنا آلہ کار بنایا تھا، مگر معاملہ برعکس تھا۔ مقرر کے غلاموں تک پہنچنے کے لئے تُو ہماری آلہ کار بنی تھی۔ نجوا! اپنی زندگی کے ان لمحات کو اور مختصر نہ کر۔ مرنے سے پہلے تُو شیطانی عمل پڑھنے سے باز آ جا..... تُو نہیں مان رہی۔“ میں نے اس کے ہونٹوں کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھ کر آسجین ماسک ہٹا دیا۔

نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ نجوا آسجین کی ترسیل رک جانے کی وجہ سے منہ کھول کر سانس لینے لگی۔ ایسے میں شیطانی عمل پڑھتے رہنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا جسم جھٹکے کھائے لگا تو میں نے دوبارہ ماسک لگا دیا۔

”نجوا! اب اگر تُو نے دوبارہ شیطانی عمل پڑھنا شروع کیا تو میں پھر آسجین ماسک ہٹا لوں گا۔“ میر نے اسے دھمکی دی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تُو یہ حقیقت جان لے کہ اگر ہم دونوں پر ظلم کرتی، ہمیں اذیتیں نہ دیتی تو تجھ سے ہماری کوئی دشمنی نہ تھی۔ ہم تجھے قتل نہ کرتے۔“ میں نے یہ کہنے ہوئے اس کے ہونٹوں پر نظر رکھی۔ میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے ہونٹ ساکت رہے۔ میر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”نجوا! تُو نے ٹھیک سمجھا تھا کہ ہم پراسرار قوتوں کے مالک ہیں مگر ہماری یہ قوتیں تیری طرح شیطانی نہیں ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے فطری طور پر ہمیں یہ پراسرار قوتیں عطا کی ہیں۔ سن کہ تُو اس وقت بھی جو کچھ دیکھ رہی ہے، تیری نظر کا دھوکہ ہے کیوں کہ ہمیں کوئی آدم زاد دیکھ نہیں سکتا۔ زاعون کوئی اور نہیں، میں ہی تھا۔ اپنی طرف سے تیری توجہ ہٹانے کے لئے یہ چال میں نے چلی تھی جو کامیاب رہی۔“

”پھر..... تم..... تم کون ہو؟“ نجوا نے کراہتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ سوال کیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف، خوف اور شدید حیرت کے آثار تھے۔

”تجھے تو مر رہی جانا ہے اسے نجوا! اس لئے سن لے کہ ہم آدم زاد نہیں، جن زاد ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”جن..... جن زادا“ نجوا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”لیکن..... جنات کا ان معاملات سے کیا تعلق؟“

”خیر و شر کے جو معیار خالق حقیقی نے آدم زادوں کے لئے مقرر کئے ہیں، انہی کا اطلاق ہم جنات پر بھی ہوتا ہے۔ خدا کا حکم اپنے بندوں کے لئے یہ ہے کہ بدی کو بزور بازو روک دیا جائے، اگر بندے اس کے اہل ہوں۔ ایمان کی یہی نشانی ہے۔ سو ہم بھی حکم ربی پر بدی سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ نجوا! تُو بھی بدی کی نمائندہ ہے اور مقرر کے غلام بھی۔ مصر میں مقرر کے غلام کیا کھیل کھیل رہے ہیں، ہم واثق ہو چکے ہیں۔ تیرے بعد اب انہی کی باری ہے۔ اگر مجھے مقرر کی نام نہاد روح تک نہ پہنچنا ہوتا تو اب تک ظلال بے اور نجیب المہندس کو ختم کر چکا ہوتا۔ تُو بھی اس شیطانی گروہ میں شامل رہ چکی ہے۔ تجھے اب

یار ہوں۔ زاعون اتنی آسانی سے ہمارا چچا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ ہمارے اس لئے منصوبے کو بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دے گا۔“

”میں نے اسی لئے تمہارے سامنے پہلے یہ تجویز رکھی تھی کہ منہج کی روح سے رابطہ قائم کر لیا جائے۔ زاعون سے منہج کے لئے وہ یقیناً ہماری رہنمائی کرتا۔ پھر ہمیں کوئی خطرہ نہ رہتا لیکن تم اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ تمہاری باتوں سے اب تک تو میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ.....“

طلال بے اپنی بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ اچانک ایک طرف تپائی پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج گئی۔ تلال بے صوفے سے اٹھ کر ٹیلی فون تک پہنچا اور ریسیور اٹھالیا۔ ”ہیلو..... کیا؟.....“

نہیں..... یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟..... تفصیل بتاؤ۔“ تلال بے کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔ وہ دیر تک دوسری جانب سے کی جانے والی باتیں سنتا رہا، پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔

”ہاں..... میں آخری بار اس..... اس کا چہرہ ضرور دیکھوں گا۔ آ رہا ہوں میں۔“ یہ کہہ کر تلال بے نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ تلال بے کے پھولے ہوئے چہرے پر دکھ کی چادر سی پھیل گئی تھی اور آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔

”کیا ہوا، کس کا فون تھا؟ اور..... اور تم کہاں جا رہے ہو؟“ نجیب نے دریافت کیا۔

چند لمحے تلال بے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ یقیناً خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نجیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھائی رہی جسے تلال بے کی آواز نے توڑا۔ ”تمہارا یہ خیال غلط نہیں تھا نجیب کہ زاعون کی خاموشی معنی خیر ہے۔ اس کی خاموشی کا فائدہ کھل گیا۔ کل رات اس نے نجا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فون پر یہ اطلاع مجھے فواد نے دی ہے۔ نجا کا جنازہ اس کی کوٹھی سے گھنٹے بھر کے بعد اٹھنے والا ہے۔“ پھر نجیب کے اصرار پر تلال بے اسے ان نصیحتات سے آگاہ کرتا رہا جو پہلے ہی سے میرے علم میں تھیں۔

”مجھے افسوس ہے میرے دوست کہ تمہاری بہترین ساتھی اور بدترین دشمن ہمیشہ کے لئے تم سے بچ گئی۔“ نجیب نے عجیب سے الفاظ میں اظہار تعزیت کیا۔

”ہاں نجیب! مجھے نجا نے جس شدت سے چاہا، مجھ سے جتنی محبت کی، اتنی ہی شدید ترین نفرت ملی۔ اس نے محبت اور نفرت دونوں کا حق ادا کر دیا۔“

”اب ذرا یہ سوچو تلال کہ جس عورت کو ہم اپنی کثرت تعداد اور طاقت و قوت کے باوجود اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکے اسے زاعون نے کتنی آسانی سے مار ڈالا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمارا دشمن زاعون بے حد قوی ہے؟“

”میں نے بھی زاعون کو کبھی کمزور نہیں سمجھا، مگر اس کے باوجود خوفزدہ نہیں ہوا۔“ تلال بے نے زاب دیا۔

”زاعون کے بارے میں ہمیں ایک اور خاص نکتے پر بھی نظر رکھنی ہو گی۔“ نجیب کچھ سوچتے اٹھ کئے لگا۔ سوچ کا اندازہ اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

کیوں کہ میں نے سوی کو موت کی دہلیز تک پہنچانے والوں سے انتقام لے لیا تھا۔ میرے سکون کا سبب یہی تھا۔ دوم یہ کہ سوی بھی اب صحت یاب ہو گئی تھی۔

ہماری معلومات کے مطابق نجیب المہندس کو اگلے روز تک نقشہ تیار کر لینا چاہئے تھا۔ وہ بڑی تندہی سے اس کام میں لگا ہوا تھا۔

دوسرے دن صبح جب ہم ناشتہ وغیرہ کر چکے تو ہمیں اپنے دشمنوں کی فکر ہوئی۔ فوری طور پر ہم نے جمالیہ کا رخ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق نجیب وقت سے پہلے بھی نقشہ تیار کر سکتا تھا۔ تلال بے کی کوٹھی پہنچ کر میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ گزشتہ رات نجیب دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اسے سو کر اٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ دونوں شیطان تلال بے اور نجیب المہندس اس وقت نقشہ گاہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے سامنے سینٹر ٹیبل پر نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ تلال بے نے اپنی پگھڑی آواز میں نجیب سے معلوم کیا۔ ”اب اس نقشے کی تکمیل میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟“

”زیادہ سے زیادہ وقت بھی لگا تو بس ایک گھنٹہ۔“ نجیب نے بتایا۔ ”یوں سمجھو کہ فاسٹ ٹیچ دینا باقی ہے۔“

”پھر تو ہم آج ہی دوسرے کے بعد ستارہ کے لئے روانہ ہو سکتے ہیں۔“ تلال بے نے اپنے خیال اظہار کیا۔

”ہاں یہ ممکن ہے۔“ نجیب نے جواب دیتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ فکر مند سے دکھائی دے رہے ہو؟“ تلال بے نے اپنے ساتھی کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”نقشہ تو خیر تیار ہو جائے گا اور آج دوسرے کے بعد ہم ستارہ بھی روانہ ہو سکتے ہیں مگر زاعون کی طرف سے مسلسل خاموشی میرے نزدیک معنی خیر ہے۔“

”اس میں معنی خیزی کیا ہے؟ تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم یہ کیوں بھول گئے ہمارے اس محفوظ قلعے میں وہ کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔ ارواح اور جنات سے بچنے کے لئے ہم نے ناویدہ حصار اپنی کوٹھی کے گرد کھینچ رکھا ہے، زاعون کے لئے اسے عبور کرنا، ممکن نہیں۔ اگر اس نے حماقت کی تو جہل کر خاک ہو جائے گا۔ کیا خبر کہ اس کوشش میں اب تک زاعون اپنے انجام کو پہنچ بھی ہو۔“

اس پر نجیب دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ”اسے میں تمہاری خوش گمانی ہی کہہ سکتا ہوں۔ دشمن کمزور سمجھ کر ہم پہلے بھی زبردست نقصان اٹھا چکے ہیں۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ، کیا ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ زاعون کے خوف سے ہم یہاں۔ قدم باہر نہ نکالیں؟“ یہ کہتے ہوئے تلال بے کے لہجے میں قدرے جھنجھلاہٹ تھی۔ اس نے اپنی ہاتھ جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”تمہارے اعصاب پر زاعون کا خوف کچھ زیادہ ہی سوار ہے۔“

”ایسا نہیں ہے بلکہ میں اب تک پیش آنے والے تجربات کی روشنی میں خدشات اور اندیشوں

”وہ کیا؟“ طلال بے نے سوال کیا۔

”تفصیل کے مطابق نجوا کے معاملے میں بھی زاعون نے ایک عراقی نوجوان جوڑے سعد اور رضی کو اپنا آلہ کار بنایا تھا۔ یہ حربہ وہ کسی حد تک ہم پر بھی آزمایا چکا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ کہیں ہمارے آدمیوں کو ہم سے برگشتہ نہ کر دے۔ ہمیں خود اپنے آدمیوں کی طرف سے بھی محتاط اور چوکنا رہنا پڑ گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو نجیب! زاعون سے یہ بعید نہیں۔“ طلال بے نے نجیب کے خیال سے اتفاق پھر کئے لگا۔ ”اس موضوع پر ہم گفتگو کریں گے۔ تم اتنے میں اپنا کام مکمل کرو، میں میں نجو آخری دیدار کر کے آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی طلال بے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اور سولی اس اداس منظر کے پیچھے گئے رہے۔ اس نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر حکم دیا ڈرائیور گاڑی تیار رکھے۔ ڈرائیور کے علاوہ تین مسلح محافظوں کو بھی اس کے ساتھ جانا تھا۔ لباس تبدیل کرنے میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ پھر اس نے کوئی شیطانی عمل پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا۔ میں گیا کہ میرے کسی متوقع حملے سے بچنے کے لئے اس نے اپنے گرد نایدیدہ حفاظتی حصار قائم کر لیا تھا۔ اس سے بے خبری تھا کہ اب یہ نایدیدہ حصار عبور کر لیتا میرے لئے کوئی مشکل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی اس میں اسے اور نجیب کو چھینٹنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈھیل دینے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ جلد سے جلد مقررہ روح سے رابطہ قائم کر لیں اور اس طرح میں مقررہ تک پہنچ جاؤں۔

اس وقت میں صرف طلال بے کو اپنی نظر میں رکھنے کے لئے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ طلال بے نے جب کوٹھی سے باہر قدم رکھا تو تین مسلح محافظ اس کے آگے پیچھے تھے۔ کوٹھی صدر دروازے پر بڑی سی ایک کار کھڑی تھی۔ کار ڈرائیور باہر ہی کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر طلال بے کے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ طلال بے کار کے اندر بیٹھ گیا تو وہ محافظ اس کے دائیں بیٹھ گئے۔ طلال بے ان کے درمیان تھا۔ ڈرائیور کے برابر والی نشست تیسرے محافظ نے نبھال لی اور ان میں ڈرائیور بھی اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ کار اشارت ہو کر جلد ہی روانہ ہو گئی۔

معاً مجھے خیال آیا کہ میں اپنے دشمن طلال بے کو ایک ذہنی اذیت میں مبتلا کر سکتا ہوں۔ میں سولی کو اشارہ کیا اور فضا میں کچھ بلند ہو گیا۔ سولی کو میں نے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ ہر چند کہ میرے خیال سے متفق نہیں تھی، پھر بھی مان ہی گئی۔

”تو ذرا اور اونچی پرواز کر اے سولی!“ میں نے کہا۔ ”تاکہ اس شیطان کے کسی ممکنہ حملے سے۔“

”میری فکر نہ کر اے علیائش! تو اپنا خیال کر۔“ سولی نے مجھے تاکید کی۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ جوابی حملہ ضرور کرے گا مگر میں اس سے پہلے ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں

اس وقت تک طلال بے کی کار پرانے قاہرہ کی حدود میں تھی۔ فوری طور پر میں نے خود کو طلال بے کا ہار کرنا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے چیزا بچنے کی جلدی ہے کیوں کہ وہاں فواد کی کوٹھی سے نجوا کا جنازہ اٹھنے والا تھا۔ کار کی رفتار اسی لئے تیز تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد میں نے کچھ فاصلے سے ایک ٹرک آتے دیکھا۔ مجھے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ اس ٹرک کے ڈرائیور کو میں نے اپنے اثر میں لے لیا۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اس ٹرک اور کار میں ٹکراؤ ہو جائے اسی لئے تیزی سے کام لیا۔ کار ابھی اس ٹرک سے کچھ دور تھی کہ ٹرک ترچھا ہو کر سڑک پر اس طرح رک گیا کہ کار کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ مل سکے۔ کار کے ڈرائیور نے انتہائی مہارت کا ثبوت دیا ورنہ حادثہ ممکن تھا۔ اس نے کار کو روک لیا۔ ٹرک اور کار کے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ کار کے ڈرائیور نے جھنجھاکر زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔

طلال بے کے محافظوں نے اپنی اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے لیں۔ یقیناً انہیں کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔

”اتر کر دیکھو جلدی سے کہ اس آلہ کے پیچھے ٹرک ڈرائیور کو کیا ہوا؟“ طلال بے اپنی مضحکہ خیز ہنگامہ آواز میں غرایا۔ ”اس نے کیوں راستہ روک لیا ہے؟“

وہ مسلح محافظ کار سے اتر کر تیزی کے ساتھ ٹرک کی طرف بچھے۔ پھر ان میں سے ایک نے ٹرک ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”اب! تجھے کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ نہیں جناب!“ ٹرک ڈرائیور نے میرے زیر اثر معصومیت سے جواب دیا۔

”تو پھر تو نے ٹرک کو اس طرح کیوں سڑک پر کھڑا کر لیا ہے؟“ مسلح محافظ نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

”جناب! ٹرک کے انجن میں کوئی خراب ہو گئی ہے، میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ ٹرک ڈرائیور پُر سکون آواز میں بولا اور ٹرک کا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔

بچ سڑک پر ٹرک کے رکنے کی وجہ سے دونوں جانب سے آنے والا ٹریفک رک گیا تھا۔ ہر طرف ہارنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

معاً میں نے تیسرے محافظ کو طلال بے کی کار سے اتر کر ادھر آتے دیکھا۔

”واپس چلو۔“ تیسرے محافظ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

وہ دونوں اپنے ساتھی کے ہمراہ کار کی طرف واپس چلے گئے۔ طلال بے کی کار ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی، مگر اس نے ایک حل نکال ہی لیا۔ اس نے مسلح محافظوں سے کچھ کے بغیر ڈرائیور کو حکم دیا۔

”کار کو کچے میں اتار لو، ادھر نشیب ہے، ذرا احتیاط سے کام لیتا۔“

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ وہ یقیناً ایک اچھا ڈرائیور تھا ورنہ ایسا کرنا آسان نہ ہوتا۔ کچے میں اترتے ہوئے کار بڑی حد تک ایک طرف جھک گئی تھی، مگر ڈرائیور نے اسے قابو میں رکھا۔

ذرا سی دیر میں طلال بے کی کار ٹریفک کے جھوم کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ایک مرتبہ پھر سڑک پر آگئی۔
 ”جلدی چلو“ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہمیں پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔“ طلال بے نے ڈرائیور کو تاکید کی۔
 عین اسی لمحے میں نے تیزی سے دوڑتی ہوئی کار کا بونٹ اوپر اٹھالیا۔ اس کی وجہ سے اب کار ڈرائیور کے لئے آگے راستہ دیکھنا ممکن نہیں رہا۔
 ”ارے یہ کیا ہو گیا؟“ کار ڈرائیور نے فوراً بریک لگا دیئے تاکہ سامنے سے آنے والی کوئی گاڑی کار سے نہ ٹکرا جائے۔

بونٹ پورا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ طلال بے نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں ڈرائیور کو برا بھلا کہا۔ ڈرائیور معذرت کرتا ہوا تیزی کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تاکہ بونٹ کو بند کر سکے۔ اس وقت تک میں اپنا کام دکھا چکا تھا۔ میں نے انجن کے تار کھینچ کر جگہ جگہ سے نکال دیئے تھے، اسی کے ساتھ کار کی بیٹری نکال کر دور پھینک دی تھی۔ اب طلال بے کے لئے اس کار میں مزید سفر جاری رکھنا کسی طرح ممکن نہیں رہا تھا۔ کچھ اسی طرح کا کھیل میں ایک مرتبہ نبوا کے ساتھ بھی کھیل چکا تھا۔ کار ڈرائیور اس سے لاعلم ہی رہا کہ انجن میں کیا گڑبڑ کی جا چکی ہے۔ وہ جلدی سے بونٹ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ کار کو اسٹارٹ کرنے لگا، مگر ظاہر ہے یہ اب قطعی ممکن نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے سخت پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔

”اب کیا ہوا؟“ طلال بے کے صبر کا پیمانہ جھلک اٹھا۔
 ”سر! انجن میں کوئی بڑی خرابی ہو گئی ہے۔ بیٹری بالکل کام نہیں کر رہی۔“ ڈرائیور روہانی آواز میں بولا۔ ”دیکھتا ہوں۔“
 ”ٹو دیکھتا رہ۔“ طلال بے غرایا۔ ”مگر میرے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے۔“
 اس کے بعد طلال بے نے اپنے محافظوں کو کار سے اترنے کا حکم دیا اور خود بھی کسی بڑی سی ڈال کی طرح گویا لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔

”کوئی خالی ٹیکسی روکو۔“ طلال بے مضطرب آواز میں محافظوں سے مخاطب ہوا۔
 وہ سب اب سڑک کے کنارے کسی خالی ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے۔ میری موجودگی میں ہلکا کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک خالی ٹیکسی بالکل ان کے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئی۔ تینوں محافظ چیخنے رہ گئے لیکن ٹیکسی نہیں رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میں پہلے ہی اپنے اثر میں چکا تھا۔ طلال بے کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے طلال اور اپنے درمیان کچھ فاصلہ قائم رکھ کر غیر انسانی آواز میں مخاطب کیا۔ ”اے لعنتی! اے طلال بے! واپس چلا جا اپنی اسی کابک میں جہاں سے تو نکلا ہے۔ زاعون نبوا کا آخری دیدار نہیں کرنے دے گا۔“

میری آواز سننے ہی وہ اچھل پڑا۔ ”زاعون تو..... میں ابھی تجھے جلا کر خاک کر دوں گا۔“ یہ سننے ہی وہ تیزی سے کوئی شیطانی عمل پڑھنے لگا۔

میں وہاں مزید ایک لمحہ رکے بغیر فضا میں بلند ہوتا گیا۔ چند ہی لمحے بعد میں نے شعلوں کو فضا میں لپکے دیکھا۔ ان کی دسترس سے اب میں دور نکل آیا تھا اس لئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ سوئی فوراً میرے پاس پہنچ گئی۔ اس نے بھی یقیناً شعلوں کو میرے پیچھے لپکتے دیکھ لیا تھا۔
 ”تو اے علیالیش! تو نے اسے خبردار کر ہی دیا۔“ سوئی نے مجھ سے کہا۔

”ہاں اسے سوئی! اگر میں اسے خبردار نہ کرتا تو وہ ذہنی کرب و اذیت میں کس طرح مبتلا ہوتا۔ میں اسے بے بسی کے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”ظاہر ہے کہ اب تو پھر نیچے جائے گا کہ اس کی راہ کھوئی کر سکے لیکن اب تجھے پہلے سے کہیں زیادہ چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے اے علیالیش!“

”مجھے اندازہ ہے، طلال بے کی حالت اس وقت زخمی و زندے کی سی ہے۔ میں اسی لئے اسے کچھ ملت دے رہا ہوں۔“ میں بولا۔ ”اس سے وہ یہی نتیجہ نکالے گا کہ میں اب اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی اسے کوئی ٹیکسی مل جائے گی تاکہ وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔“

کچھ دیر کے بعد جب میں نے فضا میں غوطہ لگایا تو اپنی توقع کے مطابق طلال بے کو محافظوں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں سفر کرتے دیکھا۔ اس کی ٹیکسی اب پرانے قاہرہ کی حدود سے نکل کر اہرام روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ طلال بے بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں دقت دیکھ رہا تھا۔ بحالیہ سے چلنے سے آگے گھٹنے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کے لئے اب بھی یہ ممکن تھا کہ دقت پر فواد کی کوٹھی تک پہنچ جاتا۔ اس مرتبہ میں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ ٹیکسی ڈرائیور اب میرے زیر اثر تھا۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ اسے پرانے قاہرہ چلنے کے لئے کہا گیا ہے، وہ بھی جلد از جلد۔ اسی سبب ایک موڑ آتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے تیزی کے ساتھ ادھر ٹیکسی موڑی اور واپس پرانے قاہرہ کی طرف چل گیا۔

”ارے ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ آگے بیٹھا ہوا محافظ تقریباً چیخ اٹھا۔ ”کہاں جا رہے ہو تم؟“
 ”جہاں چلنے کو آپ لوگوں نے کہا تھا جناب!“ اس نے یہ جواب دیتے ہوئے ٹیکسی کی رفتار اور بڑھادی۔

”ہم نے تو تم سے جیڑا چلنے کے لئے کہا تھا۔“
 ”واہ جناب! یہ بھی خوب رہی۔ میں نے خود سنا تھا کہ آپ جلد سے جلد پرانے قاہرہ میں بحالیہ جانا چاہتے ہیں۔“ ٹیکسی والا بحث کرنے لگا۔

”کتے کے بچے! ٹیکسی روکو۔“ طلال بے پیچھے سے تقریباً چیخ اٹھا۔
 ”دیکھیں جناب! آپ مجھے گالی نہیں دے سکتے۔ نہیں روکتا میں ٹیکسی۔ آپ سے جو ہو سکے کر لیں۔“ ٹیکسی ڈرائیور میرے زیر اثر بولا۔

آگے بیٹھے ہوئے مسلح محافظ نے رائفل کی ٹال ڈرائیور کے پہلو پر رکھ دی اور سخت لہجے میں کہا "روک لے ٹیکسی ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

اس پر ٹیکسی ڈرائیور دھیرے سے ہنس دیا اور کہنے لگا۔ "اور مجھے گولی مارتے ہی تم سب بھی میرے ساتھ سفر آخرت پر روانہ ہو جاؤ گے۔ اسی کے ساتھ وہ مونگتا بھی مر جائے گا جس نے مجھے ابھی گالی دی تھی۔ چلاؤ گولی۔"

"گولی نہ چلاتا۔" طلال بے پیچھے سے بول اٹھا۔

"پھر..... پھر کیا کیا جائے سر؟" محافظ کی آواز میں بے بسی تھی۔ "ہم تو پھر کچھ ہی دیر میں پرانے قاہرہ کی حدود....."

"خاموش رہو۔ یہ معاملہ تمہارے بس کا نہیں۔" طلال بے کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے حقیقت کا علم ہو گیا ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ طلال بے کوئی شیطانی عمل پڑھ کر مجھے وہاں نہ رکھ دیتا، میں نے غیر انسانی آواز میں قہقہہ لگایا اور پھر کہا۔ "اے لعنتی حقیر کیڑے! تیری آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ تو نجوا کا چہرہ نہیں دیکھ پائے گا۔ سولٹ جا، اس بد بخت عورت کو مٹی میں اپنا چہرہ چھپا لینے دے جو کبھی تیری بیوی تھی۔ زاعون کسی قیمت پر تجھے اس تک نہیں پہنچنے دے گا۔"

طلال بے کا چہرہ غصے کی زیادتی سے اور بھی پھول گیا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ادھر اس نے شیطانی عمل پڑھنا شروع کیا، ادھر میں فضا میں پرواز کرتا چلا گیا۔ دوسری مرتبہ بھی میں اس کے شیطانی وار سے بال بال بچ گیا۔

مزید کچھ وقت گزر گیا تو میں پھر اسی ٹیکسی کے قریب پہنچ گیا جس نے اب دوبارہ اپنی سمت سٹریڈل دی تھی۔ ٹیکسی وہی تھی۔ یقیناً اب طلال بے نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی پراسرار قوتوں کے اثر میں لے لیا تھا۔ اب اگر میں ٹیکسی ڈرائیور کے ذہن کو اپنے قابو میں کرتا تو اس کا نتیجہ بھیانک نکلتا۔ وہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ پاتا اور ٹیکسی کسی حادثے کا شکار ہو جاتی۔ ٹیکسی کی رفتار خاصی تیز تھی اس لئے حادثے کی صورت میں طلال بے کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور میں ابھی اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔

معاً مجھے ایک اور خدشے کا احساس ہوا۔ طلال بے جیسے عیار آدم زاد سے بعید نہیں تھا کہ اس نے اب ٹیکسی کے گرد ناویدہ حفاظتی حصار قائم کر دیا ہو۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں ٹیکسی کے مزید قریب نہیں گیا۔ میں نے اس سے پہلے ناویدہ حصار کو ناکارہ بنانے کا عمل پڑھا اور پھر اچانک ٹیکسی کے سامنے آکر اسے روک دیا۔ ڈرائیور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے اسی پر انکشاف نہیں کیا اور اس ٹیکسی کو اٹھا کر فضا میں بلند ہوتا گیا۔

محافظوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ مجھے پوری طرح اندازہ تھا کہ شیطان صفت طلال بے کسی بھی لمحے مجھ پر وار کر سکتا ہے۔ میں نے اسی سبب انتہائی تیز رفتاری کا ثبوت دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں

بہی کو قدیم اہرام مصر کے قریب ریت پر اتار دیا اور پھر وہاں رکا نہیں۔ اب اس ٹیکسی کو ریت سے کرمزک تک پہنچنے میں خاصا وقت لگتا۔ اس بار طلال بے نے غیر متوقع طور پر وار نہیں کیا۔ یقیناً وہ مایوس ہو چکا تھا کہ نجوا کا آخری دیدار کر سکے گا۔ اب اس کے لئے فواد کی کوٹھی پر بروقت پہنچنا نہیں رہا تھا کیوں کہ مقررہ وقت گزر چکا تھا۔

سوی میرے قریب ہی ٹو پرواز تھی۔ وہ مجھ سے ہنس کر مخاطب ہوئی۔ "ایک شوہر کو اس کی بیوی آخری دیدار سے محروم کر کے تیرے کیلجے میں ٹھنڈک پڑی یا نہیں اے علیا لیش! ساری زندگی شاید بے نے ایسی بے بسی محسوس نہیں کی ہوگی۔"

"تیرا کیا خیال ہے اے سوی! کیا اب طلال بے مایوس ہو کر بحالیہ لوٹ جائے گا؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں موجودہ صورت حال میں تو اسے یہی کرنا چاہئے۔" سوی نے جواب دیا۔ "اس کی ایک بڑی یہ بھی ہے کہ اسے اور نجیب کو آج دوسرے کے بعد ہی ستارہ کے لئے بھی روانہ ہونا ہے۔ وہ اپنا یہ ارادہ بدل سکتا۔" چند لمحے توقف کے بعد سوی نے مجھ سے دریافت کیا۔ "اے علیا لیش! ایک بات میری میں نہیں آئی۔ جب نجوا اور طلال بے کے گرد ہوں میں اس قدر شدید دشمنی تھی تو پھر فواد نے طلال بے کی موت سے کیوں مطلع کیا؟"

"تو یہ کیوں بھول گئی کہ دوستی یا دشمنی زندگی تک ہوتی ہے۔ نجوا ہی زندہ نہیں رہی تو پھر دشمنی پھر یہ علم فواد کو بھی ہو گا کہ دشمنی کے باوجود طلال بے اور نجوا کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ اس کے ایک امکان یہ بھی ہے کہ اس طرح فواد، طلال بے سے مصالحت کا متنی ہو۔ وہ چاہتا ہو کہ نجوا کے اب طلال بے کے گردہ میں شامل ہو جائیں۔ اس مسئلے پر ہم پھر بات کریں گے، پہلے میں ذرا طلال کی خبر لے کر آتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

پھر جب میں نیچے اترا تو سوی کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ طلال بے اپنے محافظوں کے ساتھ پرانے وادی طرف لوٹ رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں نمی تیرتے دیکھی۔ نجوا کے آخری دیدار سے محرومی پر اسے غالباً گہرا درد پہنچا تھا۔ اب اس نے ٹیکسی بدل دی تھی۔ پہلی ٹیکسی والا شاید خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا تھا ورنہ ٹیکسی لے کر ضرورت پیش نہ آتی۔

"اے لعنتی طلال بے! کاش تو نے پہلے ہی میری بات مان لی ہوتی۔" اچانک میں طلال بے سے بول رہا ہوں۔

"زاعون! تجھے آخر مجھے یہ صدمہ پہنچا کر کیا ملا؟" طلال بے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہی خوشی ملی جو ایک دشمن کو اپنے سامنے بے بس دیکھ کر ملتی ہے، مگر تجھے اس کی موت کا اتنا ناگوار ہے؟ وہ تو تیری دشمن تھی۔ تم دونوں کہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تو نہیں تھے۔ ورنہ اندہ تم نے علیحدگی اختیار کیوں نہیں کی؟"

میرے سوال پر طلال بے چونک اٹھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ میرا تیر ٹھیک

نشانے پر بیٹھا ہے۔
 ”یہ غلط ہے۔“ طلال بے نے تردید کی۔ اس کے لیے سے واضح طور پر جھوٹ کا اظہار ہوا۔
 ”ہمارے درمیان اب صرف دشمنی کا رشتہ تھا۔ یہ نجوابی کی مرضی تھی کہ میں اس سے باقاعدہ علی
 اختیار نہ کروں۔ دشمنی کے باوجود شاید اس کے دل کی گھمراہیوں میں میرے لئے کہیں محبت کا کوئی گوشہ
 روشن تھا۔“

اس پر میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ ”اور اب تو مجھے یہ جھانسا دے گا کہ تیرے دل میں اس کی محبت زندہ تھی۔“

”میرے جذبات سے نہ کھیل زاعون!“ طلال نے کالجہ بدل گیا۔ ”ورنہ تو جانتا ہے کہ اس نے دھمکی دینے کے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔“

”نجا اور تیری ملی بھگت تھی کہ منقرع کے دوسرے غلاموں سے زیادہ تم دونوں کو حصہ ملے۔ اسی لئے میری بات بڑی لگی ہے۔ جانے سے پہلے تجھے ایک بات اور بتا دوں کہ اب تم لوگوں کے ہاں قدم کسی مقدس اہرام کی حرمت پامال نہیں کر سکیں گے۔ منقرع کے سارے غلام بہت جلد صفحہ ہستی مٹا دیئے جائیں گے۔“

”لگتا ہے زاعون کہ تو ایک عورت کو راستے سے ہٹا کر اترائے لگا ہے۔ مقررع کی روح بہت تجھے ابدی نیند سلا دے گی۔“

میں نے جواب میں قہقہہ لگایا اور پھر وہاں رکا نہیں۔ طلال کے چہرے سے میں نے اس خطرناک ارادے کا اندازہ لگایا تھا۔ برہم ہو کے مجھ پر وار بھی کر سکتا تھا۔ میں اونچی پرواز کرتا ہوا۔ تک پہنچ گیا۔ اب طلال بے کی کونھی زیادہ دور نہیں تھی۔

”اے علیائش! تو نے طلال بے کو جیزا جانے سے تو روک دیا مگر ایک بات بھول گیا۔“ سہلی لگی۔ ”موجودہ حالات میں طلال بے، نجیب کے ساتھ ستارہ جانے کا ارادہ بھی تو بدل سکتا ہے۔ اس ہماری منزل دور ہوتی چلی جائے گی۔ فی الحال تو یہ ضروری ہے کہ دونوں شیطان کسی طرح متفرق نہ ہوں۔ نمداد روح سے رابطہ قائم کرنے پر متفق ہو جائیں۔ تجھے خبر ہے کہ ستارہ میں کام شروع کرانے کے بعد ان کا یہ ارادہ تھا۔“

”تصور کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اے سومی!“ میں بولا۔ ”میں نے ظلالِ بے کوجو دھمکی دلی اس سے بھی سومی کو آجھا کر دیا اور مزید کہا۔ ”ان حالات میں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ستارہ جانے سے منقطع کی روح سے رابطہ قائم کریں۔ اس طرح وہ اپنے نئے منصوبے پر سکون و اطمینان کے ساتھ عمل کیں گے۔ انہیں کسی زاعون کی طرف سے خطرہ نہیں رہے گا۔“

”دوپہر ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے اے علیالیش! اگر تیرا قیاس درست ہے تو انگو دونوں کی گتگو سے سب کچھ پتا چل جائے گا کہ آئندہ وہ کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ ہمیں ان شیطانوں بہر حال نظر رکھنی ہے۔“

تنبیہ! یہ تم نہیں تمہارا خوف بول رہا ہے۔ اسی خوف کے سبب تم مقرر کی سرگوشیوں کو بھی نظر انداز کر رہے ہو۔ اس نے ہمیں حکم دیا تھا کہ جلد از جلد نئے منصوبے پر کام شروع کر دیا جائے۔ میں نے اسی لئے تمہاری بات مان لی تھی کہ پہلے منصوبے پر کام شروع کرا دیا جائے، اسی کے بعد مقرر کی روح سے

ہم رابطہ قائم کریں۔ سنو؛ زاعون ہمیں جس حد تک نقصان پہنچا سکتا تھا، اس نے کسر نہیں چھوڑی اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے امکان میں کچھ اور ہوتا تو اب تک کرگزرتا۔ اس کا ہمیں دھمکیاں دینے سے محض یہ ہے کہ ہم اپنے نئے منصوبے پر عمل کرنے سے رک جائیں۔ انفس یہ ہے کہ تم ایسا ہی کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“

اس پر نجیب کے چہرے کا تاثر بدل گیا اور وہ بولا۔ ”طلال! تم مصلحت کو میری بزدلی سمجھ رہے اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنے پر آمادہ ہوں۔ چلو، میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے پر تیار ہوں۔“

طلال بے فوراً راضی ہو گیا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے تو پھر ہم ستارہ پہنچ کر ہی دوپہر کا کھانا کھائیں تم چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں اس عرصے میں فون پر حاذق کو اپنی آمد کے متعلق مطلع کر دیتا ہوں۔ کتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوہا گرم دیکھ کر اس نے ضرب لگانے میں دیر نہیں کی تھی۔

سوی میرے قریب ہی تھی۔ اسے میں نے چلنے کا اشارہ کیا اور کوٹھی سے نکل آیا۔ سوی ساتھ ساتھ کوٹھی کے لان میں آگئی۔

”میرا قیاس غلط نکلا اے علیالیش! یہ شیطان بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ انہوں نے جانے کا ارادہ نہیں بدلا۔“ سوی نے خیال آرائی کی۔

”ہمارے حق میں تو یہ اچھا ہی ہے۔ کام شروع کراتے ہی وہ فوراً منقرع کی روح سے رابطہ کریں گے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ستارہ تک جائیں گے، مگر انہیں چھیڑیں گے نہیں اور نہ ان کی راہ کریں گے۔“ میں نے سوی کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”یہ بھی ممکن ہے کہ ستارہ میں موجود منقرع کے غلاموں نے پہلے سے تمام تیاریاں مکمل ہوں اور آج ہی سے کھدائی کا کام شروع ہو جائے۔ ان لوگوں کو طلال بے اور نجیب کے پہنچنے کا انتظار ہو گا تاکہ اس جگہ کی نشاندہی ہو جائے جہاں سے کھدائی شروع ہونی ہے۔“ سوی بولی۔

”شاید وہ اتنی جلد بازی سے کام نہ لیں اور کل صبح کام شروع کریں۔ بہر حال صورت حال اندازہ تو ستارہ پہنچ کر ہی ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

پھر ہم ان کی تیاریوں کا جائزہ لیتے رہے۔ کوٹھی کے گیراج میں دو جیپیں اور ایک کار موجود دونوں جیپوں میں چار چار مسلح محافظ سوار ہو گئے۔ کار میں ڈرائیور کے علاوہ پچھلی سیٹ پر طلال بے، نجیب بیٹھے۔ طلال بے اس مرتبہ میرے خوف سے پوری تیاری کے ساتھ چلا تھا کہ اگر میں کار کو باؤں دوں تو وہ دونوں جیپوں میں سے کسی کے ذریعے اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو خود یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر جلد سے جلد ستارہ پہنچ جائے

کار کے آگے ایک جیپ تھی، دوسری پیچھے۔ آگے پیچھے تینوں گاڑیاں کوٹھی کے پھاٹک نکلیں۔ روانگی سے قبل میں نے تینوں گاڑیوں کے گرد طلال بے کو چکر لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس یقیناً گاڑیوں کے گرد ناویدہ حصار قائم کر دیا تھا کہ میں ان کے قریب نہ جاسکوں۔

فضا میں پرواز کرتے ہوئے میں اور سوی ان گاڑیوں کا تعاقب کرتے رہے۔ ”اے سوی! یہ آدم زاد اپنی مختصر سی زندگی کے لئے کتنے کھانے کا سودا کرتے ہیں۔“ میں سوی سے کہنے لگا۔ ”کتنے بے خبر ہیں یہ۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ انہیں ان کی موت سے قریب کرنا جا رہا ہے اور یہ دنیا کمانے میں لگے ہیں۔“

”یہ ان آدم زادوں میں سے ہیں اے علیالیش کہ جن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں اور دلوں پر مہر لگا دی گئی ہیں۔ یہ سدھرنے اور راہ راست پر آنے والے نہیں۔ یہی ہیں وہ کہ جن کے لئے سخت عذاب کی بشارت دی گئی ہے۔ چند روزہ زندگی پر انہوں نے بیشک کی زندگی قربان کر دی۔ انہیں نہ خوف خدا ہے، نہ آخرت کے عذاب کا ڈر۔ جنم کو انہی سے تو بھرا جائے گا، جہاں یہ ہمیشہ ہمیش کے لئے رہیں گے۔“

میں اور سوی اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ ہمارا موضوع گفتگو شیطان صفت آدم زاد ہی تھے۔ اسی میں سفر تمام ہو گیا۔ گاڑیوں کی رفتار خاصی تیز تھی اس لئے قاہرہ سے ستارہ پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تینوں گاڑیاں ستارہ کی چھوٹی سی آبادی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اس عمارت کی طرف بڑھ گئیں جو پہلے جابر کے تصرف میں تھی۔ میں یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ یہیں جابر نے رقامہ جزیلہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

تینوں گاڑیاں اس بڑی عمارت کے سامنے جا کر رک گئیں۔ ہارن دینے پر عمارت کا پھاٹک ایک مسلح شخص نے کھول دیا۔ گاڑیاں پھاٹک عبور کر کے عمارت کے کمپائونڈ میں رک گئیں۔ اسی وقت عمارت کا صدر دروازہ کھلا۔ ایک جسم اور لمبا ترنگا آدمی دو افراد کے ساتھ باہر آیا۔ اس وقت تک طلال اور نجیب کار سے اتر چکے تھے۔ نجیب کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ جسم آدمی نے آگے بڑھ کر ان دونوں کا استقبال کیا۔

”حاذق، منقرع کے غلام آؤں و دوم کو خوش آمدید کہتا ہے۔“ جسم آدمی نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

میں سمجھ گیا کہ اسی جسم آدمی کا نام حاذق ہے۔ وہ طلال بے اور نجیب کے ساتھ بڑے مؤدب انداز میں چلا ہوا انہیں عمارت کے اندر لے گیا۔ اس کے دونوں ساتھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ بہترین سامان آرائش سے مزین وہ نشست گاہ بھی میرے لئے بنی نہیں تھی۔ یہاں رقامہ جزیلہ کو میں نے جابر کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ جابر نے اس خوبصورت کھلونے کو بڑی بے دردی سے توڑ دیا تھا۔ منقرع کے غلام بڑے سفاک اور بے رحم تھے۔

نجیب نے صوفے پر بیٹھنے ہی بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک فائل نکال کر حاذق کی طرف بڑھادی اور بولا۔ ”اس فائل میں تمہاری سرکاری تقرری کے احکام ہیں جن سے تمہیں پہلے ہی مطلع کیا جا چکا ہے۔“ پھر اس نے پوچھا۔ ”تم نے یقیناً اس سلسلے میں اب تک تمام تیاریاں مکمل تو کرائی ہوں گی؟“

”جی ہاں۔“ حاذق نے جواب دیا۔ ”سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔ ہمیں صرف آپ کی ہدایت اور

نقشے کا انتظار تھا۔ کسی بھی وقت کام شروع کیا جاسکتا ہے۔“

”منقرع کے دیگر غلاموں پر تمہیں اس لئے ترجیح دی گئی ہے حاذق کہ تم ایک طویل عرصے تک جابر کی معاونت کرتے رہے ہو۔“ طلال بے پہلی بار اپنی بیگانہ آواز میں حاذق سے مخاطب ہوا۔ ”میں امید ہے کہ تم ہماری توقعات پر پورے اترو گے۔“

”حاذق اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے اور اس پر منقرع کے غلام اذل اور دوم کا شکر گزار ہے۔“ حاذق نے شکرگزاری کا اظہار کیا۔

”تم ایسا کرو حاذق کہ میرے قریب آکر بیٹھ جاؤ تاکہ میں تمہیں نقشے کی تفصیلات سے آگاہ کر سکوں۔“ نجیب نے کہا۔

”بہتر ہے جناب!“ حاذق یہ کہہ کر سامنے والے صوفے سے اٹھا اور نجیب کے قریب آ بیٹھا۔

نجیب نے نقشہ نکالا اور بولا۔ ”یوں سمجھو کہ آدھا کام پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ ادھر دیکھو، یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک اہرام تک پہنچنے کے لئے ہم نے پہلے کھدائی کی تھی۔ اسی عمارت سے ایک سرنگ اس اہرام تک گئی ہے۔ اس کے علاوہ اہرام تک پہنچنے کی غرض سے پہلے ایک اور سرنگ بھی کھودی گئی تھی جسے بعد میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہلی سرنگ کے لئے کھدائی کی گئی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا؟“

”جی اچھی طرح یاد ہے۔“ حاذق نے جواب دیا۔

”اس کام کو تیزی سے نمٹنا ہے۔ میں اس کے لئے پوری منصوبہ بندی کر چکا ہوں۔ یہ کام ۱۱ حصوں میں شروع ہو گا۔ منقرع کے نصف غلاموں کی تعداد بند کی جانے والی سرنگ کو اوپر سے دوبارہ کھودنا شروع کرے گی۔ باقی غلام اس عمارت کے ذریعے پہلے سے کھدی ہوئی سرنگ میں اتر جائیں گے۔ سرنگ کا نصف فاصلہ طے کر کے وہ مغرب کی سمت ایک نئی سرنگ کھودیں گے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں سے نئی سرنگ کی کھدائی کا آغاز ہو گا۔“ نجیب نے نقشے پر انگلی رکھی۔ ”جو سرنگ پہلے بند کر دی گئی تھی اس کی دوبارہ کھدائی میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اسی راستے سے نئی کھودی جانے والی سرنگ کی مٹی باہر جائے گی۔ اس کے لئے تمہیں پہلے کی طرح لوہے کی لائیں بچھانی ہوں گی جن پر ٹرائیاں چل سکیں اور ان میں مٹی بھر کر باہر پھینکی جاسکے، مگر یہ مرحلہ بعد کا ہے۔ فی الحال تو فوری طور پر کھدائی کی ابتدا کرنی ضروری ہے۔ اگر تمہاری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی ہو تو بتا دو۔ میں خود چل کر اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں جہاں نئی سرنگ کھودی جانی ہے۔ یہ نئی سرنگ مغرب کی سمت میں بالکل سیدھی کھودی جاتی رہے گی۔ کھدائی اس وقت تک جاری رکھتی ہے جب تک سرنگ ’مطلوبہ اہرام تک نہ پہنچ جائے گی۔ ایک مختار اندازے کے مطابق یہ سرنگ ڈھائی سو گز سے زیادہ بڑی نہیں ہوگی۔ سمجھ گئے ساری باتیں؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا جناب! آپ نے نقشہ اتنا مکمل اور واضح بنایا ہے کہ ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“ حاذق کہنے لگا۔ ”آپ کو سرنگ میں چل کر اس جگہ کی نشاندہی کرنے کی بھی ضرورت نہیں جہاں نئی سرنگ کھودی جانی ہے۔ میں سرنگ کی پیمائش کے بعد ہی کام شروع کراؤں گا تاکہ کسی قسم کی غلطی کا

احتمال نہ رہے۔ آپ ہر طرح مطمئن رہیں۔ اگر حکم ہو تو کھانا لگوا دیا جائے؟“

”ہاں لگوا دو۔“ نجیب نے کہا۔ ”اور یہ نقشہ اپنے پاس احتیاط سے رکھو۔“ نجیب نے نقشہ اس کے حوالے کر دیا۔

”تو پھر پہلے میں اس نقشے ہی کو سیف میں رکھ کر آتا ہوں۔“ حاذق یہ کہتے ہی پہلے دی گئی فائل اور نقشہ ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ نشست گاہ کے دروازے پر حاذق کے دونوں معاونین مستعد کھڑے تھے۔ حاذق نے انہیں کھانا لگوانے کا حکم دیا اور نشست گاہ سے نکل گیا۔ اس کے معاونین بھی وہاں سے چلے گئے۔ نشست گاہ میں اب صرف طلال بے اور نجیب المہندس رہ گئے۔

”زاعون کی طرف سے تم ناحق فکر مند ہو رہے تھے کہ وہ ہمیں شاید ستارہ تک نہیں پہنچنے دے گا۔“ طلال بے نے نجیب کو مخاطب کیا۔ ”تم نے دیکھ لیا کہ وہ ہمیں یہاں تک پہنچنے سے نہیں روک سکا۔ خالق حصار کی وجہ سے وہ ہماری گاڑیوں کے قریب نہیں آیا۔“

”مگر یہ نہ بھولو طلال کہ یہ اس کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔“ عیار نجیب نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”یعنی کیا چال؟“ طلال بے نے وضاحت چاہی۔

”ممکن ہے وہ ہمارے منصوبے کی تفصیلات جاننا چاہتا ہو۔“ نجیب نے بتایا۔ اس کا ذہن بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا تھا کہ حقیقت یہی تھی۔

”زاعون نے دعویٰ کیا تھا کہ ہمارے قدم اب کسی اہرام تک نہیں پہنچ سکیں گے اور ہم اس کے دعوے کو باطل ثابت کر دیں گے۔“ طلال بے خود اعتمادی سے بولا۔ ”میرے خیال میں آج ہی سے کام کی ابتدا کرائی جاسکتی ہے۔ ہم اپنی نگرانی میں کام کا آغاز کرا کے آج رات تک قاہرہ واپس پہنچ سکتے ہیں۔“ اس پر نجیب نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف اقرار میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

طلال بے اور نجیب المہندس جس حالت میں یہاں پہنچے تھے، اس کا تقاضا تھا کہ حاذق پہلے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ ان دونوں کے سروں پر ٹرائیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ طلال بے ایک ہاتھ سے بھی محروم تھا۔ میری نظر میں اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ حاذق کو پہلے ہی سب کچھ فون پر بتا دیا گیا ہو گا۔ اسی کے ساتھ یہ امکان بھی تھا کہ حاذق کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑی ہو۔

ذرا دیر میں حاذق لوٹ آیا اور پھر برابر والے کمرے میں کھانا لگائے جانے کی خبر بھی مل گئی۔ طلال بے اور نجیب کے ساتھ صرف حاذق نے کھانا کھایا۔ ان دونوں کے ساتھ دو بچیوں میں جو مسلح محافظ آئے تھے، ان کے کھانے کا بندوبست الگ کیا گیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے طلال بے نے حاذق سے اپنے ارادے کا اظہار کر دیا تو وہ بولا۔ ”جو آپ کا حکم کا آغاز آج سے بھی ممکن ہے۔“

”ہم کھانا کھا کے کچھ دیر آرام کر لیں گے۔“ نجیب نے کہا۔ ”تم اس دوران میں پیمائش وغیرہ کرا

لینا اور پھر ہمیں یہاں سے آکر لے جانا۔“
”بالکل مناسب ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ کام کی ابتدا آپ دونوں کی موجودگی میں ہو۔“ حازق نے لگا۔

”حازق! تمہیں یقیناً یہ سن کر بھی خوشی ہو گی کہ ایک خطرہ اب ہمیشہ کے لئے ٹل گیا ہے۔“ نجواب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ نجیب نے بتایا۔

”معاف..... معاف کیجئے گا جناب! مجھے اس خبر پر کچھ یقین سانسیں آ رہا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ہمیں دھوکا دینے کے لئے سال بھر پہلے بھی نجوا نے یہی افواہ اڑا دی تھی۔ پھر وہ ہمیں غافل پاکر اچانک ہم پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اس موقع پر کہ جب ہم اپنے ایک نئے منصوبے کا آغاز کرنے والے ہیں، نجوا کے انتقال کی خبر بڑی معنی خیز ہے۔“ حازق نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔

”یہ افواہ نہیں حقیقت ہے حازق!“ لٹال بے بول اٹھا۔
”مگر کس طرح جناب..... نجوا کیسے مر گئی؟ اسے کس نے مار دیا؟ وہ..... وہ اتنی بے سہارا اور کمزور تو کبھی نہیں تھی۔“

”تمہیں میں نے پراسرار زاعون کے بارے میں فون پر بتایا تھا..... یاد ہے تمہیں؟“ لٹال بے نے حازق سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ حازق نے تصدیق کی، پھر سوال کیا۔ ”اس نے کیا ابھی تک ہماری جان نہیں چھوڑی؟“

”نہیں، اسی نے نجوا کو قتل کیا ہے اور اب..... اب وہ ہمارے پیچھے بڑ گیا ہے۔“ پھر لٹال نے میرے دعوے کے بارے میں حازق کو بتایا اور کہنے لگا۔ ”تمہیں زاعون کی طرف سے پوری طرح چوکنا رہنا ہے کہ وہ سرنگ میں داخل نہ ہو سکے۔ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ اس کے حفاظتی حصار کھینچنے کی ضرورت ہو گی۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ حفاظتی حصار بھٹکتی ہوئی روحوں اور جنات کے لئے ہے۔ سرنگ کے دہانے پر حفاظتی حصار کھینچنے جانے کے بعد زاعون کی روح اندر نہیں آ پائے گی پھر تم لوگ بلا خطر اپنا کام انجام دیتے رہو گے۔ جاہر کی موجودگی کے سبب اب تمہارا درجہ مقرر کے غلام سوم کا ہو گیا ہے۔ اب میرے اور نجیب کے بعد تمہی سب کچھ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ذمہ داری پورا کرو گے۔“

”حازق، مقرر کے غلام اوّل کو مایوس نہیں کرے گا۔“ حازق نے یقین دہانی کرائی۔
اسی گفتگو کے دوران میں ان تینوں نے کھانا کھا لیا اور اس کمرے سے نکل آئے۔ حازق انہیں ایک اور کمرے میں لے آیا جو خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرہ خاصا بڑا تھا۔ وہاں تین آرام دہ مسکائی چھٹی ہوئی تھیں۔
”آپ لوگ آرام کریں۔ جب ضرورت ہو گی، میں آپ کو آکر لے جاؤں گا۔“ حازق نے یہ کر خواب گاہ کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اور سوی کو یہ پتا چل گیا کہ حازق بھی شیطانی علوم پر دسترس رکھتا ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے بھی محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ لٹال بے اور نجیب کی مسلسل نگرانی ہمارے لئے سودمند ثابت ہو رہی تھی۔

لٹال بے اور نجیب الگ الگ دو مسروں پر دروازہ ہو گئے۔ نجیب اب بھی کچھ متشکر نظر آ رہا تھا، مگر لٹال بے مطمئن لگ رہا تھا۔ اس کے اطمینان کی وجہ اب تک میری عدم مداخلت ہی ہو سکتی تھی۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے خود ہی دور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری خود بھی یہی کوشش تھی کہ وہ مسخرا سی غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ میں اور سوی ان دونوں کو اسی کمرے میں چھوڑ کر نکل آئے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مقرر کا غلام حازق کن تیاریوں میں مصروف ہے۔

اس عمارت سے باہر آکر ہم نے وہاں خاصی چل پھل دیکھی۔ عمارت سے کچھ ہی فاصلے پر نیچے نصب کئے جا رہے تھے۔ انہی کے نزدیک ہمیں کھدائی سے متعلق مشینیں بھی نظر آئیں۔ ہمیں حازق کی تلاش تھی جو بہت جلد نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ دونوں ماتحتوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ انہیں ساتھ لئے وہ عمارت کے ایک حصے میں داخل ہو گیا۔ عمارت کا یہ وہی حصہ تھا جہاں پہلے سے کھدی ہوئی سرنگ کا دہانہ تھا۔ حازق کے ساتھ موجود افراد کے ہاتھوں میں گیس لیمپ تھے جنہیں انہوں نے روشن کر رکھا تھا۔ وہ بھی میزبھیوں کے ذریعے سرنگ میں اتر گئے۔ وہ سرنگ جہاں سے شروع ہوئی تھی، حازق نے وہاں سے اس کی پینکشن شروع کر دی۔ وہ اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ آخر وہ پینکشن کرتا ہوا سرنگ کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ سرنگ کی دیوار پر ایک چاک سے وہ نشانات بھی لگاتے جا رہا تھا کہ کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ انہی نشانات کو دیکھتا ہوا وہ واپس ہوا۔ سرنگ کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے سرنگ کی دیوار پر چاک سے ایک جگہ کراس کا بڑا سا نشان لگا دیا۔ گویا یہی وہ جگہ تھی جہاں سے کھدائی کی جانے والی تھی۔

حازق کے چہرے پر مجھے سکون و اطمینان کے آثار دکھائی دیئے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے کام سے مطمئن ہے۔ سرنگ کی جس دیوار پر اس نے کراس کا نشان لگایا تھا، اس کے سامنے والی دیوار پر بھی ویسا ہی نشان لگا دیا۔

”اوپر سے کھدائی یہاں کی جائے گی۔“ حازق نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”تم لوگ سمجھ رہے ہو؟“

”جی ہاں جناب!“ کئی افراد نے ایک ساتھ جواب دیا۔
”ان دونوں کو یہاں کب لے کر آتا ہے جو ہم میں سے نہیں ہیں؟“ حازق کے ایک ساتھی نے اس سے دریافت کیا۔ میں یہ سن کر چونکا کہ وہ لوگ کن دو افراد کا ذکر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مقرر کے غلاموں میں سے نہیں تھے۔ پھر انہیں یہاں لانے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہاں موجود تمام ہی افراد مقرر کے غلام تھے۔ انہیں اسی لئے پراسرار قوتیں حاصل تھیں۔ میرے نزدیک کچھ معلوم کرنے کے لئے ان شیطانوں کو چھیڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ اس طرح وہ چوکنا ہو جاتے اور

سرنگ میں طلال بے کی بچکانہ آواز گونجی۔ ”اے عظیم منقرع کی روح! اپنے غلاموں کی قربانی قبول کر..... رسم ادا کی جائے۔“

طلال بے کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ جھکے ہوئے حبشیوں کے پیچھے کھڑے حاذق کے دونوں ماتحتوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں سے قدیم طرز کی بھاری تلواریں نکال لیں۔ انہوں نے چشم زدن میں ان دونوں حبشیوں کے سر کاٹ دیے۔ کئی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ سرنگ کی دیوار پر کراس کی جگہ خون ہی خون نظر آنے لگا۔

”مبارک ہو..... مبارک ہو۔“ ہر طرف سے سرنگ میں منقرع کے غلاموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

میں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر وحشت سی ہونے لگی۔ اپنے منصوبے کا آغاز کرنے سے پہلے ان شیطان صفت آدم زادوں نے دو انسانی جانوں کی قربانی دی تھی۔ یقیناً اس سے ان کا مقصد منقرع کی نام نہاد روح کو خوش کرنا ہو گا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ مجھے اس کا رنج تھا کہ لاعلمی کے سبب ان دونوں بے گناہ حبشیوں کی زندگی نہ بچا سکا۔ رنج کے ساتھ ساتھ ہی مجھے شدید غصہ بھی تھا۔ اس غصے کو قابو میں رکھنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ میں فوری طور پر وہاں سے ہٹ جاؤں۔ میں اگر ایسا نہ کرتا تو شاید اسی وقت ان درندوں پر ٹوٹ پڑتا جو یقیناً خلاف مصلحت ہوتا کیوں کہ وہاں طلال بے اور نجیب بھی موجود تھے۔ جب تک میں ان دونوں کے ذریعے منقرع کی روح تک نہ پہنچ جاتا، انہیں زندہ رکھنا ضروری تھا۔ سرنگ کی دیوار پر جہاں تازہ تازہ انسانی خون بہہ رہا تھا، طلال بے کے اشارے پر وہاں حاذق نے ڈرنلنگ مشین کا برا رکھ دیا۔ یوں گویا نئی سرنگ کی کھدائی کے کام کا آغاز ہو گیا۔ میں اسی لمحے تیزی کے ساتھ سرنگ سے نکل آیا۔ سوی میرے عقب میں تھی۔

میری ہی طرح سوی بھی اس واقعے کے اثر میں تھی جو کچھ دیر قبل سرنگ کے اندر پیش آیا تھا۔ ”اے علیالیش! کاش ہم ان بے گناہ حبشیوں کو قتل ہونے سے بچا سکتے۔“ سوی کی آواز میں دکھ تھا۔ ”تو نے دیکھا وہ منظر کتنا روح فرسا تھا، یہ آدم زاد تو ہم جن زادوں سے بھی زیادہ بے رحم اور سفاک ہیں۔“

”اور اب تو دیکھے گی اے سوی کہ ان درندہ صفت آدم زادوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔“ میں طیش کے عالم میں بولا۔ ”انہیں اپنی زندگی کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ مجھے بس طلال بے اور نجیب کی یہاں سے قاہرہ روانگی کا انتظار ہے۔ آ کچھ دیر کو یہاں سے کہیں دور نکل چلتے ہیں۔“

پھر میں اور سوی وہاں سے اونچی پرواز کرتے ہوئے ستارہ سے خامے آگے نکل آئے۔ میرے لئے ایک ایک لمحہ گزارنا دو بھر ہو رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

وقت گزاری کے لئے میں نے سوی سے اس کے عالم باپ عزتیل کی باتیں شروع کر دیں۔

”ہاں اے علیالیش! میرا باپ تجھے بہت یاد کرتا ہو گا۔“ سوی بولی۔ ”ہم ان شیطانوں سے

کھیل بگڑ جاتا۔ پھر میں اس منصوبے پر عمل نہ کر پاتا جس کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنے فیصلے سے میں نے سوی کو بھی بے خبر نہیں رکھا تھا۔ وہ بھی اس فیصلے سے متفق تھی۔ اس طرح منقرع کے غلاموں کا سارا منصوبہ دھوا رہا جاتا۔ انہیں شدید نقصان پہنچتا۔ ہم جن زادوں کے لئے یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔

اس دوران میں حاذق نے اپنے ساتھی کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ جواب سے بھی میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا۔ پھر بھی تجسس کے باوجود میں نے کوئی غیر محتاط قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ میں اور سوی خاموشی کے ساتھ تمام حالات کا جائزہ لیتے رہے۔

عمارت سے بجلی کا کنکشن لے کر سرنگ کے درمیان تک ایک موٹا تار بچھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک ڈرنلنگ مشین سے منسلک تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب ساری تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔“ حاذق بولا۔ وہ اپنے دونوں ماتحتوں سے ہم کلام تھا۔ ”اب تم جاؤ اور ان دونوں کو بھی یہاں لے آؤ۔ میں خود منقرع کے غلام اول و دوم کو لے کر یہاں آتا ہوں تاکہ رسم کی ادائیگی کے بعد کام شروع کیا جاسکے۔“

رسم..... کیسی رسم؟ مجھے پھر بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اپنے اضطراب پر قابو پانے میں مجھے بڑی دشواری پیش آئی۔

سوی کو ساتھ لئے ہوئے میں اس سرنگ سے نکل آیا۔ حاذق اور اس کے دونوں ماتحت بھی سرنگ سے باہر جا چکے تھے۔

”اے علیالیش! یہ شیطان کیا رسم ادا کرنے والے ہیں، تو نے کچھ اندازہ لگایا؟“ سوی بھی یہ سوال کرتے ہوئے مجھے متشکر سی محسوس ہوئی۔

”نہیں اے سوی! میں کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے کچھ خطرہ ضرور محسوس ہو رہا ہے، ان لوگوں کے لئے جو منقرع کے غلام نہیں اور جنہیں یہاں لایا جائے والا ہے۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اس موقع پر خاموش قماشائی بننے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے۔“

”ہاں یہ تو ہے اے علیالیش!“ سوی نے اعتراف کیا۔

ذرا ہی دیر کے بعد ہم دوبارہ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ حاذق اس وقت تک طلال بے اور نجیب الہندس کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس مرتبہ مجھے وہاں دو حبشیوں کے اجنبی چہرے بھی نظر آئے۔ ان دونوں کے جسم مضبوط اور کسرتی معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے حلیوں سے عام مزدور لگتے تھے۔ ان دونوں حبشیوں کے بالکل پیچھے حاذق کے ماتحت مستعد چوکنا کھڑے تھے، یوں جیسے انہیں کسی اشارے یا حکم کا انتظار ہو۔ ان کے جسموں پر ڈھیلے ڈھالے لباس تھے۔ جس جگہ سرنگ کی دیوار پر کراس کا نشان بنا ہوا تھا، حبشیوں کو اس کے بالکل سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔

”اپنے ہاتھوں کو سرنگ کی دیوار پر رکھ کر جھک جاؤ۔“ حاذق نے حبشیوں کو حکم دیا۔

حبشیوں نے فوراً حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کیا۔ وہ دونوں مجھے سحرزدہ سے معلوم ہوئے۔ انہوں نے تعمیل حکم سے پہلے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ان کے جسموں کے اوپری سیاہ حصے بے لباس تھے۔ اچانک

مسی قدر ختی آگئی۔

”بہتر ہے جناب!“ ماتحت یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

اس گفتگو سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا کوئی دشوار نہ ہوا کہ ملکہ نامی کوئی لڑکی یا عورت، جابر کی رشتہ رعی ہوگی۔ جابر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر حازق اسے زیر دام لانا چاہتا تھا۔ گاڑی لے کر جانے کی وجہ یہ ہوگی کہ ملکہ کا قیام ستارہ کی آبادی میں ہوگا۔

حازق کے شوق ہوس کی وجہ سے مجھے اپنے طے شدہ منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ اس کا زندہ بچ جانا میرے نزدیک مناسب نہ ہوتا۔

اس منصوبے پر کام کرنے والوں کی کل تعداد ایک سو بارہ افراد پر مشتمل تھی اور وہ سبھی منقرع کے غلام تھے۔ نیچے سرنگ میں اس وقت پچاس سے زیادہ منقرع کے غلام کام کر رہے تھے۔ سوی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ راستے میں سوی کو میں نے بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔

سوی اور میں نے منقرع کے دو غلاموں کی گردنیں دیوچ لیں۔ ذرا سی دیر میں وہ دونوں چکرا کر گر گئے۔

”ارے! ان دونوں کو کیا ہوا؟“ دوسرے غلام یہ کہتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ سرنگ میں کھلبلی مچ گئی اور کام رک گیا۔

گردنیں دبائے جانے کی وجہ سے ان دونوں کی زبانیں باہر لٹکی ہوئی تھیں۔

”انہیں..... انہیں دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ..... کہ جیسے ان کی گردنیں دبائی گئی ہیں۔“

میں نے دونوں لاشوں کے قریب بیٹھ کر جائزہ لیتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”لیکن ایسا..... ایسا کون کر سکتا ہے؟“ ایک اور آواز ابھری۔

”فضول باتیں چھوڑو اور جلدی سے حازق کو اس واقعے کی خبر کرو۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

پھر ایک غلام تقریباً دوڑتا ہوا سرنگ کے دہانے کی طرف گیا۔ سرنگ کا یہ دہانہ عمارت کی طرف

نہیں اور سوی بھی سرنگ سے نکل آئے کیوں کہ اب وہاں ہماری موجودگی ضروری نہیں تھی۔ ہمیں تو

بصرف یہ انتظار تھا کہ حازق اس واقعے کی اطلاع پا کر نیچے سرنگ میں پہنچ جائے۔

حازق نے دو غلاموں کے پراسرار طور پر مارنے جانے کی خبر سنی تو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ حازق کے لہجے میں حیرت کے ساتھ بے چینی بھی تھی۔ ”کون انہیں

گردنیں دبا کر مار سکتا ہے؟“

”ہم تو خود حیران ہیں جناب!“ آنے والا غلام بولا۔ ”ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو آپ کو خبر

ہے.....“

”ٹھیک ہے“ میں خود چل کر دیکھتا ہوں۔“ حازق بول اٹھا اور اس غلام کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا

داخل ہوا۔

”کوئی اپنی موت سے کب تک بھاگ سکتا ہے اے سوی!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”یہ آدم زاد

نہت کر اس سے ملنے ڈھاکہ چلیں گے۔“

”میں تو سمجھتا ہوں اے سوی کہ تیرا باپ عزتیل بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے یقیناً اپنی خداداد قوتوں کے ذریعے پتا لگایا ہو گا کہ ہم کہاں اور کس حال میں ہیں۔“

میری قیاس آرائی کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ ایسا ممکن تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہم پھر ستارہ کی طرف چلے۔ زیر زمین اور باہر منصوبے کے مطابق کام شروع ہو چکا تھا۔ طلال بے اور نجیب قاہرہ واپسی کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ عمارت کے باہر کھڑی ہوئی دونوں

جیپوں میں مسلح محافظ سوار ہو چکے تھے۔ اب طلال بے اور نجیب کے عمارت سے باہر آنے کا انتظار تھا۔ پھر وہ لمحات بھی آگئے جب وہ دونوں چھوٹے بڑے شیطان، تیسرے شیطان حازق کے ساتھ عمارت کے صدر

دروازے سے باہر آتے دکھائی دیئے۔ جس کار میں طلال بے اور نجیب میاں آئے تھے، اس کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”حازق! جتنی جلد ممکن ہو اس منصوبے کی تکمیل ضروری ہے۔“ طلال بے نے آگے بڑھتے ہوئے تاکید کی۔

”مطمئن رہیں، میں آپ کو پابندی سے کام کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔“ حازق نے یقین دلایا۔

”اصل منصوبے کا تعلق اندر کی کھدائی سے ہے۔ تمہیں اس کا خیال رکھنا ہے۔“ نجیب بھی خاموش نہ رہا۔ ”خود اپنی نگرانی میں تمہیں اندر کی کھدائی کا کام جاری رکھنا ہے۔“

”مجھے پوری طرح ہر بات کا احساس ہے جناب! مجھ سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ حازق نے اظہار فرمانبرداری کیا۔

طلال بے اور نجیب آگے بڑھ کر کار میں بیٹھ گئے اور پھر کار کا دروازہ ڈرائیور نے بند کر دیا۔ ذرا سی دیر میں تینوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ کار دونوں جیپوں کے درمیان میں تھی۔ اسی ترتیب کے ساتھ وہ قاہرہ سے چلے گئے۔

منصوبے کے مطابق منقرع کے غلاموں کی آدھی تعداد زیر زمین اور نصف باہر کام میں مصروف تھی۔ طلال بے اور نجیب کو رخصت کر کے حازق عمارت کی واپس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کام کی نگرانی

کرنے کے لئے نیچے سرنگ میں جائے گا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ عمارت ہی میں موجود ایک اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ بھی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ حازق کو وہاں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس

کے دونوں ماتحتوں میں سے ایک آتا دکھائی دیا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ میں آج بہت خوش ہوں۔“ حازق نے آنے والے کو مخاطب کیا۔ ”تم جا کر ملکہ کو بلا لاؤ کہ میں اس خوشی کا جشن مناسکوں۔ گاڑی لے جاؤ اور زیادہ دیر نہ لگانا۔ ملکہ سے کہنا کہ میں

بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”لیکن یہ سوچ لیجئے کہ جابر واپس آگیا تو اسے اس پر اعتراض ہو گا۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے تمہارا نہیں۔ تم سے جو کہا گیا ہے، اس پر عمل کرو۔“ حازق کی آواز میں

میں نے اس عمارت کی بنیادیں ہلا دیں۔ وہ عمارت کسی نازک کھلونے کی طرح کانپنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مضبوط عمارت زمین یوس ہو گئی۔ اس کے اندر منقرع کے جتنے بھی غلام تھے، گویا زندہ دفن ہو گئے۔ عمارت کے گرنے کا دھماکہ دور دور تک سنا گیا۔ بستی والوں نے بھی اس دھماکے کی آواز سنی۔ کچھ باہمت نوجوان حقیقت حال جاننے کی خاطر بستی سے نکلنے لگے تو انہیں منقرع کے غلاموں نے روک لیا۔

”ادھر نہ جانا کہ وہاں موت رقص کر رہی ہے۔“ منقرع کے ایک غلام نے نوجوانوں کو سمجھایا۔ وہ اسی وقت بھاگتا ہوا بستی میں پہنچا تھا۔

سوی کے ساتھ اب میں بستی میں پہنچ چکا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب منقرع کے غلام کیا قدم اٹھاتے ہیں۔

”آخر کچھ بتاؤ تو سہی کہ وہاں کیا ہوا؟“ ایک نوجوان نے سمجھانے والے سے سوال کیا۔ ”دھماکہ کیوں ہوا تھا؟“

”جو زیر زمین سرنگیں کھودی جا رہی تھیں، وہ شاید بیٹھ گئی ہیں۔ دھماکہ انہی کے گرنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ زلزلے کے جھکوں سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔“ منقرع کے اس ادھیڑ عمر غلام نے جواب دیا۔ وہ بڑی خوبصورتی سے حقیقت پر پردہ ڈال گیا تھا۔

اب بھی کچھ نوجوان موقع واردات پر جانے کے لئے بھند تھے۔ ان کے پاس وہاں جانے کا مناسب جواز بھی تھا۔

”سرنگوں کے اندر لوگ دب گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ہم ان میں سے کچھ کو بچا سکیں۔“ ایک بزرگ نوجوان کہنے لگا۔

بستی کے نوجوان آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ میں نے اسی دوران میں منقرع کے غلاموں کو ایک دوسرے سے اشارے کرتے دیکھا۔ چند لمحے بعد ہی وہ تیزی کے ساتھ ایک قدیم سی عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ بظاہر وہ عمارت ویران اور آسیب زدہ سی لگتی تھی۔

منقرع کے وہ چھ غلام اس عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے دروازے پر مخصوص دستک دی۔

دروازہ کھولنے والی ایک مدقوق بڑھیا تھی۔ منقرع کے غلاموں پر ایک نظر ڈال کر بڑھیا نے انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ جب وہ سب اندر چلے گئے تو دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

میں بھی سوی کے ساتھ اس گھر میں داخل ہو گیا۔ اس بڑھیا کی شخصیت مجھے بڑی پراسرار معلوم ہوئی تھی۔ بڑھیا انہیں ایک نیم تاریک سے کمرے میں لے آئی اور ان سے مخاطب ہوئی۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ آج پھر تم پر کوئی مصیبت ٹوٹی ہے۔ بولو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”تو نے ٹھیک سمجھا اے ساحر! ہم پر ایک بڑی افتاد پڑی ہے۔“ منقرع کے ادھیڑ عمر غلام نے بتایا۔

میں جانتا کہ اس کے قدم موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

”ہاں اے علیالیش! آدمی بہت بے خبر ہے۔“ سوی بھی دھیرے سے بولی۔

اب صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ درندہ صفت منقرع کے غلام کسی رحم کے مستحق نہیں تھے اور ہم نے ان پر رحم نہیں کیا۔

اچانک ایک دھماکہ ہوا اور وہ زیر زمین سرنگ منقرع کے ان غلاموں کی اجتماعی قبر بن گئی۔ سرنگ کی چھت گرانے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ منقرع کے جتنے غلام زیر زمین اس سرنگ میں موجود تھے۔ سب کے سب اپنی پراسرار قوتوں کے ساتھ نیست و نابود ہو گئے۔

دھماکے کی آواز باہر تک سنی گئی۔ باہر عمارت سے کچھ فاصلے پر منقرع کے جو غلام کھدائی کے کام میں مصروف تھے، ان کے ہاتھ رک گئے۔

”یہ دھماکہ کیسا تھا؟“ وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔

”کہیں زیر زمین سرنگ تو نہیں گر گئی؟“

”ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے۔“

میری توقع کے مطابق باہر موجود منقرع کے زندہ بچ جانے والے غلام عمارت کی طرف دوڑنے لگے کہ حقیقت حال کا پتا چلا سکیں۔ پھر جیسے ہی وہ سب اس عمارت میں داخل ہوئے، میں غیر انسانی آواز میں چیخ اٹھا۔ ”اے شیطانو! اے منقرع کے غلامو! تم خدا کے قہر سے نہیں بچ سکتے۔“

یہ آواز سننے ہی ان میں سے کچھ عمارت سے نکل کر بھاگ اٹھے۔ انہیں یہ موقع میں نے فراہم کیا تھا۔

”اپنی موت سے کہاں تک بھاگو گے کہ زاعون تمہیں کہیں پناہ نہیں لینے دے گا۔“ میں نے خود دانستہ زاعون ظاہر کیا۔ چیختے ہوئے میں نے ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر لی۔ ”زاعون!..... زاعون! اے منقرع کے غلامو! تمہیں زاعون سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

بھاگتے ہوئے بدحواس لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان میں سے اکثر کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور کچھ اپنے حواس کھو بیٹھے۔ آبادی کی طرف دوڑتے ہوئے وہ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے۔ منقرع کے غلاموں پر میں اپنی دہشت بٹھا کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اچانک پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے منقرع کے غلاموں کو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ خود پراسرار شیطانی قوتوں کے مالک ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لاتے۔ پھر ممکن تھا کہ وہاں میرے لئے مزید ٹھہرا مشکل جانک۔ میری غیر انسانی آواز سن کر عمارت سے نکل کے بھاگنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بالکل دس بارہ ہوں گے جن میں سے کچھ اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ آبادی کی طرف زندہ بچ کر نکل جا۔

والوں کا میں نے تعاقب نہیں کیا کیوں کہ تیرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

پھر مزید ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں نے سوی کو اشارہ کیا اور عمارت کی طرف چھپنا۔ منقرع۔ غلاموں نے اس عمارت میں داخل ہو کے خود ہی اپنی موت کا بندوبست کر لیا تھا ورنہ مجھے کوئی اور راہ

”ہم تجھ سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تو ہمارے غلام اڈل کو خطرے سے آگاہ کر دے۔ ممکن ہو تو اسے بتا دے کہ یہاں سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔“

”تمہارے غلام اڈل کو صرف خطرے سے خبردار کیا جا سکتا ہے، اس کے سوا کوئی پیغام دینا ممکن نہیں ہے۔“ بوڑھی ساحرہ بولی۔ ”مگر اس کے لئے تم میرا معاوضہ یعنی سونے کی دو ٹکیاں بھی لے کر آئے ہو یا نہیں؟“

”تیرا معاوضہ ہم تجھے ادا کر دیں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے۔ بس تو ہمارا یہ کام کر دے۔ تو جانتی ہے کہ ہم نے کبھی پہلے بھی تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔“

اس یقین دہانی پر وہ ساحرہ راضی ہو گئی اور لکڑی کی ایک بوسیدہ الماری کھولنے لگی۔ ”مگر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟“ منقرع کے ایک غلام نے اوجھڑ عمر شخص سے سرگوشی کی۔ ”غلام اڈل طلال بے کو صرف یہی تو پتا چل سکے گا کہ ہم کسی خطرے میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بھی ایک گھنٹے میں قاہرہ پہنچ جائے گا۔ پھر ہم اسے فون کر کے سب کچھ بتا سکیں گے۔“

اس عرصے میں بڑھیا نے الماری سے ایک انسانی کھوپڑی اور دو ہڈیاں نکال لی تھیں۔ اب وہ کھوپڑی اور ہڈیوں کو فرش پر رکھ کر خود بھی ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ منقرع کے غلام اب بھی چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا کہ طلال بے کو ادھوری بات سے آگاہ بھی کیا جائے یا نہیں۔

”تم سب خاموش ہو جاؤ۔“ اچانک بڑھیا کی کڑک دار آواز نیم تاریک کمرے میں گونجی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

بڑھیا نے ایک ہڈی دائیں ہاتھ میں اٹھا کر کھوپڑی پر دھیرے سے ماری اور پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھنے لگی۔

ابھی بڑھیا کو کوئی شیطانی عمل پڑھتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرا دم گھٹنے لگا ہو۔ میں نے سوی کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی کیفیت بھی مختلف محسوس نہیں ہوئی۔ ہر چند کہ شیطانی عمل کسی اور مقصد کے حصول کی خاطر پڑھا جا رہا تھا مگر وہ ہم پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اب ہمارے لئے یہی ایک راستہ تھا کہ سفلی عملیات کی ماہر اس بڑھیا کے مکان سے راہ فرار اختیار کر لیتے۔

سوی کو چلنے کا اشارہ کرتے ہی میں نے ایک دم اونچی پرواز کی۔ تازہ ہوا میں پہنچتے ہی میرا دم گھٹنا بند ہو گیا۔ سوی بھی میرے پاس آگئی۔ اسے بھی میں نے اعتماد پر محسوس کر لیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”یہ اچانک ہوا کیا تھا اے علیائش! کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”تجھے تو خبر ہے اے سوی کہ خیر و شر کی قوتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم رہتی ہیں۔ ہماری جو حالت ہوئی، اسی کا نتیجہ لگتی ہے۔“ میں نے وضاحت کی، پھر بولا۔ ”یوں بھی اب ہمیں منقرع کے ان غلاموں پر نظر رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کیا قدم اٹھا رہے ہیں اور کیا اٹھانے والے ہیں، ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔“

”اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“ سوی نے مجھ سے پوچھا۔

”اپنے دشمنوں کو یہ خوشخبری دینی ہے کہ ہم نے ان کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ شیطان ابھی راستے ہی میں ہوں گے۔“ سوی بولی۔

”ہاں، ابھی انہیں یہاں سے چلے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ آج کل۔“ میں نے یہ کہتے ہی سمت سفر تبدیل کر لی۔

”اے علیائش! ان کے زیادہ قریب جانے کی ضرورت نہیں۔“ سوی نے مجھے تاکید کی۔

”تو نہ گھبرا اے سوی! میں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہوں گا۔“ میں نے یقین دہانی کرائی۔

”تجھے آخر ان شیطانوں کو یہ خبر دینے کی اتنی جلدی کیا ہے؟“ سوی نے میرے ساتھ ساتھ پرداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”تاکہ طلال بے کو میرے دعوے کی سچائی کا یقین ہو جائے۔ وہ یہ سمجھ لے کہ مجھ پر قابو پانا اور میرے کسی بھی وار سے بچنا اب اس کے لئے ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں اس کے لئے جلد از جلد منقرع کی نام نہاد روح سے رابطہ قائم کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ یہی ہم چاہتے ہیں۔“ میں نے تفصیل کے ساتھ سوی کو سمجھایا۔ ”ان دونوں شیطانوں کے لئے یہ نیا صدمہ برداشت کرنا یقیناً دشوار ہو جائے گا۔ اتنی بڑی تعداد میں منقرع کے غلاموں کا مارا جانا بہرحال کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ان حالات میں ان کے پاس منقرع سے رابطے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہو گا۔“

چند لمحوں بعد جب ہم نے فضا میں نیچی پرواز شروع کی تو قاہرہ جانے والی سڑک پر ہمیں دونوں جہیوں کے درمیان اپنے دشمنوں کی کار نظر آگئی۔

سوی کو ان تینوں گاڑیوں کے اوپر اڑتا ہوا چھوڑ کر میں نے فضا میں غوطہ لگایا۔ مجھے اس بات کا خیال بھی تھا کہ گاڑیوں کے گرد ناپیدہ حفاظتی حصار قائم ہو سکتا ہے۔ میں اسی لئے کار کے بالکل قریب نہیں گیا۔ دور ہی سے میں نے طلال بے اور نجیب کے چروں کا جائزہ لیا، پھر احتیاطاً حصار شکن عمل پڑھ کر خود پر دم کر لیا کہ کوئی خطرہ نہ رہے۔ ان دونوں ہی کے چروں سے فکر مند ہی جھلک رہی تھی۔

”ستارہ سے خطرے کا اشارہ تو مل گیا ہے لیکن اس کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ طلال بے نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے نجیب کو مخاطب کیا۔

”تمہیں میری اس بات پر یقین کیوں نہیں آتا کہ اس خطرے کی وجہ ہمارا دشمن زاعون ہو سکتا ہے۔“ نجیب اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

”میں تمہاری بات کا جواب پہلے بھی دے چکا ہوں نجیب! اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہوتا تو ہمیں اپنے منصوبے کا آغاز ہی نہ کرنے دیتا۔“ طلال بے کہنے لگا۔

”یہ امکان بھی تو ہے کہ زاعون کو ہماری وہاں سے روانگی کا انتظار ہو۔“ نجیب نے خیال آرائی کی۔ ”بڑی ہچکچاہٹ بات کر رہے ہو تم، تمہارے خیال میں کیا زاعون کو ہم دونوں کی وہاں موجودگی سے

کوئی خوف ہو گا؟

اس پر نجیب لاجواب سا نظر آنے لگا، پھر دھیرے سے کہا۔ ”اگر جیسی ٹھیک کہہ رہے ہو تو پھر خطرے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”یہ مجھے کوئی اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ستارہ کی بوڑھی سارہ کے ذریعے ممکن ہے، ہم دونوں کو مقرر کے غلاموں نے پیش آنے والے کسی خطرے سے خبردار کیا ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ عام حالات میں کبھی ایسا نہ کرتے۔“ طلال بے کا ذہن ایک اور طرف بھٹک گیا۔ ”ہمیں چونکارنا چاہئے۔“

”قاہرہ اب دور ہی کتنا رہ گیا ہے۔“ نجیب نے کہا۔ ”وہاں پہنچ کر سب کچھ پتا چل ہی جائے گا کہ ستارہ میں کیا ہوا ہے۔“

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میں غیر انسانی آواز میں بول اٹھا۔ ”لیکن زاعون تمہیں قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی سب کچھ بتا سکتا ہے۔“

”زاعون!“ طلال بے میری آواز سننے ہی اچھل پڑا۔ یہی حالت نجیب کی ہوئی۔

”اے لعنتی کیڑو! اپنے دعوے کے مطابق زاعون نے تمہارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔“ میری آواز میں حقارت تھی۔

”بتا اے زاعون کہ تُو نے کیا کیا؟“ نجیب نے اس مرتبہ مجھ سے سوال کیا۔

میں نے اس دوران میں طلال بے کو اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا۔ مقصد سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ طلال بے کے پتلے پتلے ہونٹ حرکت میں آ چکے تھے۔ وہ مجھے نقصان پہنچانے کے لئے کوئی شیطانی عمل پڑھنا شروع کر چکا تھا۔ اس عرصے میں نجیب مجھے باتوں میں الجھائے رکھتا اور طلال بے اپنا شیطانی عمل پورا کر لیتا۔ یہ دیکھ کر میں زور سے ہنس دیا اور طلال بے کے پھولے ہوئے رخسار پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ یہ ہلکی ضرب بھی اس کے لئے اتنی زوردار تھی کہ عمل پڑھتے پڑھتے وہ چیخ اٹھا۔ اس کا چہرہ نجیب کی طرف گھوم گیا تھا۔

”مخڑے! تُو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تُو اپنی فطری کمینگی سے باز نہیں آئے گا۔ سن کہ تیرے لئے اس وقت اتنا ہی جان لینا کافی ہے، ستارہ میں سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔ تفصیلات قاہرہ پہنچ کر تجھے خود ہی معلوم ہو جائیں گی۔“ میں یہ کہتے ہوئے فضا میں بلند ہوتا گیا۔ مجھے خطرے کا پورا احساس تھا۔ کسی بھی لمحے طلال بے کا شیطانی عمل مکمل ہو جاتا اور ایسا ہی ہوا، مگر میں اپنے پیچھے لپکنے والے شعلوں کی زد میں نہ آیا۔

میرے لئے قدرت کی طرف سے یہ انعام ہی تھا کہ میں ہر مرتبہ شیطانی حملوں کی زد میں آتے ہوئے بال بال بچ جاتا تھا۔

”کر لی تُو نے اپنی سی اے علیالیش!“ سوی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”بس ذرا سا فرق رہ گیا ورنہ تُو شعلوں کے جال میں ہوتا۔“ تجھے آخر وہاں اتنی دیر لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ تُو کس لئے بار بار اپنی جان پر کھیل کر میرے مبرا کا امتحان لیتا ہے؟“

سوی کے لمبے میں مجھے محبت آمیز شکایت محسوس ہوئی تو میں نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھ اے سوی! ہم نے اپنے لئے جس راہ کا انتخاب کیا ہے، وہ آزمائشوں اور امتحانوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمیں کسی نے اس راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اس کا فیصلہ تو ہم نے خود کیا ہے۔ جنت ہوں کہ آدم زاد، خلق خدا کا ایک جوم بیکراں ہے جو بلا مقصد جی رہا ہے۔ تُو بھی واقف ہے کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ خیر و شر کی اس جنگ میں خطرات تو ہماری زندگی کا لازمہ ہیں۔ بس اتنا ہے کہ ہم اپنے حوصلوں کی دیوار نہ گرنے دیں اور اپنے خالق حقیقی پر بھروسہ کریں۔“

”یہ سب میں بھی جانتی ہوں اے علیالیش!“ سوی یہ کہتے ہوئے میرے انتہائی قریب آ گئی۔ ”تُو اس جنگ میں ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ ساتھ پائے گا۔ کبھی کبھی میں صرف یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ تجھے بڑی مشکل سے پایا ہے اور اور کسی قیمت پر کھوٹا نہیں چاہتی۔ تجھے میں اسی لئے سمجھاتی رہتی ہوں۔“

فضائی میں سوی مجھ سے ہٹتا رہ گئی۔ اسے میں نے اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ پھر نہ جانے کتنے ہی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ ہم خود فراموشی کے ایک ایسے عالم میں تھے کہ جس کے بعد شاید کوئی اور عالم نہیں ہوتا۔ ہوائیں ہمارے ارد گرد سنسناتی رہیں۔ ہم ایک دوسرے کی خوشبو میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔

جب ہم سرشاری کی اس کیفیت سے باہر آئے تو ہمارے دشمنوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا لیکن میں نے جلد ہی ان کا سراغ لگا لیا۔ قاہرہ سے وہ اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ہم نے انہیں دوبارہ جھپٹنا بہتر نہیں سمجھا۔ ان کی گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح قاہرہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ قاہرہ پہنچ کر انہیں یقیناً حقیقت حال جاننے کی جلدی تھی۔ ہم نے انہیں ان کی منزل تک پہنچ جانے دیا۔

طلال بے اور نجیب کار کے رکتے ہی تقریباً دوڑتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہوئے لیکن ہم نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہم حصار شکن عمل پڑھ کر ہی اندر پہنچے۔ موزیکا نے طلال بے اور نجیب کو یوں بدحواس دیکھ کر وجہ پوچھی۔ طلال بے اس قدر جھنجھلایا ہوا تھا کہ موزیکا کو جھڑک دیا۔ حسین و پرنکش موزیکا کی حیثیت سے میں واقف تھا۔ وہ طلال بے کی محبوبہ تھی۔ یوں جھڑک دیئے جانے پر اسی لئے اس کا چہرہ اتر گیا۔

موزیکا کو نظر انداز کر کے طلال بے ٹیلی فون کی طرف لپکا اور جلدی جلدی نمبر ملانے لگا۔ نجیب اس کے قریب کھڑا تھا۔

”کیا ہوا؟“ نجیب نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کیا کوئی ریسور نہیں اٹھا رہا؟“

”لائن بالکل بے جان پڑی ہے۔“ طلال بے نے بتایا۔ ”دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ طلال بے نے دوبارہ نمبر ملانے اور اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ پھر وہ اچانک اس طرح چونک اٹھا جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ وہ دوبارہ تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”بستی میں موجود اپنے کسی آدمی کا نمبر ملاؤ طلال!“ نجیب نے مشورہ دیا۔

”یہی کر رہا ہوں۔“ طلال بے نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے حاذق کے ماتحت زیر سے رابطہ قائم ہو جائے۔“ اس مرتبہ طلال بے کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ کسی نے دوسری طرف سے ریسپور اٹھا لیا تھا۔ ”ہیلو! میں قاہرہ سے طلال بے بول رہا ہوں۔ ہاں ہاں تم زیر ہی بول رہے ہو؟..... اچھا..... جلدی بتاؤ کہ وہاں ستارہ میں کیا ہوا ہے؟..... سب کچم ختم ہو گیا ہے کیا مطلب ہے تمہارا؟ حاذق کہاں ہے..... کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم؟ منقرع کے غلام سرنگ میں دب گئے؟ وہ..... وہ عمارت بھی زمین بوس ہو گئی۔“ طلال بے تقریباً چیخ اٹھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جو کچھ سنا ہے، اس پر یقین نہ ہو۔ پھر وہ گم صم سا دوسری طرف سے بتائے جانے والے واقعات کی تفصیل سنتا رہا۔

”نہیں۔“ طلال بے نے انکار میں سر ہلایا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ حصار کھینچنے جانے کی صورت میں زاعون کے ساتھ ہی منقرع کی روح بھی میاں داخل نہیں ہو سکی گی۔ میری نظر میں پہلے ہمیں زاعون کے حملے سے بچنے کی ضرورت تھی اور ہم اس میں کامیاب رہے۔ وہ مجھے یا تمہیں مزید کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ منقرع کی روح سے رابطے کی تو ہمارے پاس ایک اور صورت بھی تھی۔ ہم خود اس کی سرگوشیاں سننے کے لئے جاسکتے تھے۔ اب تمہی بتاؤ کہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے کیا غلط کیا؟ بتاؤ مجھ سے کہاں اور کس مرحلے پر غلطی ہوئی؟“ طلال بے نے نجیب کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”میرا خیال ہے طلال کہ ہم ایک دوسرے کو مورد الزام نہ ٹھہرا کر آئندہ اقدام کے لئے سوچیں۔“ نجیب کا رویہ مصالمانہ ہو گیا۔ ”سانپ گزر چکا ہے اور اب لکیر پینٹنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تم نے اور میں نے اب تک وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔“

چند لمحوں کو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ طلال بے کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے۔ کمرے میں طلال اور نجیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ پھر طلال بے کی آواز ہی نے خاموشی توڑی۔ اس کی آواز میں بلا کا اعتقاد تھا۔ ”نجیب! ہم ہر قیمت پر یہ جنگ جیتیں گے۔ ہم از سر نو اپنے منصوبے کا آغاز کر سکتے ہیں۔ مصر میں ابھی منقرع کے غلاموں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ہم انہیں الاقصر اور مصر کے دوسرے شہروں سے ستارہ میں طلب کر سکتے ہیں۔ تمہیں ایک مرتبہ پھر اس جگہ کا نقشہ بنانا پڑے گا جہاں کھدائی کی جانی ہے۔ حاذق کی جگہ منقرع کے کسی اور غلام کو سرکاری طور پر مقرر کیا جاسکتا ہے۔ ہم اپنے دشمن زاعون کے اس دعوے کو باطل ثابت کر دیں گے کہ ہمارے قدم اب کسی اہرام تک نہیں پہنچ سکتے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے طلال بے کی آواز پُر جوش ہو گئی۔ جوش کے عالم ہی میں وہ کرسی سے اٹھا اور ٹپٹلے لگا۔

”یقیناً زاعون ہمیں ایسا کرنے سے نہیں روک سکتا۔“ نجیب نے کہا۔ ”ہماری ہوئی بازی جیتنا ہمارے امکان میں ہے لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ کوئی بھی نیا قدم اٹھانے سے قبل ہمارے لئے منقرع کی روح سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔“

”مجھے تمہارے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے۔“ طلال بے نے تائید کی۔ ”اب ہم اسی کی رہنمائی میں آگے بڑھیں گے۔ زاعون سے سننے کے لئے منقرع کی روح ہمیں کوئی راستہ دکھا سکتی ہے۔ ہمارے سروں پر لگی ہوئی خطرے کی یہ تلواریں ہٹ گئی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“

”ہاں میری رائے بھی یہی ہے طلال کہ پہلے زاعون کو اس کے انجام تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے بعد ہی کوئی نیا قدم اٹھانا بہتر ہو گا۔“ نجیب کہنے لگا۔

”اس کا فیصلہ ہمیں نہیں، منقرع کی روح کو کرنا ہے۔“ طلال بے بول اٹھا۔

”یہی کر رہا ہوں۔“ طلال بے نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے حاذق کے ماتحت زیر سے رابطہ قائم ہو جائے۔“ اس مرتبہ طلال بے کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس کی وجہ یہی ممکن تھی کہ کسی نے دوسری طرف سے ریسپور اٹھا لیا تھا۔ ”ہیلو! میں قاہرہ سے طلال بے بول رہا ہوں۔ ہاں ہاں تم زیر ہی بول رہے ہو؟..... اچھا..... جلدی بتاؤ کہ وہاں ستارہ میں کیا ہوا ہے؟..... سب کچم ختم ہو گیا ہے کیا مطلب ہے تمہارا؟ حاذق کہاں ہے..... کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم؟ منقرع کے غلام سرنگ میں دب گئے؟ وہ..... وہ عمارت بھی زمین بوس ہو گئی۔“ طلال بے تقریباً چیخ اٹھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جو کچھ سنا ہے، اس پر یقین نہ ہو۔ پھر وہ گم صم سا دوسری طرف سے بتائے جانے والے واقعات کی تفصیل سنتا رہا۔

مجھے علم تھا کہ طلال بے کو ستارہ سے کیا اطلاعات دی گئی ہوں گی۔ طلال بے کے پھولے ہوئے منہ کے خیز چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

”نی الحال کوئی..... کوئی حکم نہیں۔“ طلال بے نے کسی سوال کا جواب دیا۔ اس کی آواز بھاری اور بھرائی ہوئی سی تھی۔ اس نے کریڈل پر ریسپور رکھ دیا۔ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ بوجھل قدموں سے وہیں موجود ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

”کچھ مجھے بھی تو بتاؤ طلال کہ کیا ہو گیا؟“ نجیب نے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا..... ہمارے دشمن زاعون نے ہمیں تباہ و برباد کر دیا۔“ طلال بے کی آواز میں دکھ تھا۔ ”زاعون نے اپنا دعویٰ جج کر دکھایا۔ اتنی بڑی تعداد میں پہلے کبھی منقرع کے غلام نہیں مارے گئے۔“ پھر طلال بے اپنے دست راست کو ان واقعات سے آگاہ کرنے لگا جو ابھی فون پر اسے ستارہ سے معلوم ہوئے تھے۔ اس کے لہجے میں رنج کے ساتھ شدید غصے اور بے بسی کا تاثر بھی تھا۔

”قرب ہی ایک اور کرسی پر بڑی تھی۔“ نجیب گویا اس پر ڈھے گیا اور بولا۔ ”یہ تو بہت..... بہت برا ہوا میرے دوست!“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ پہلے ہمیں اپنے دشمن سے نمٹ لینا چاہئے، مگر..... تم نے میری بات نہیں مانی۔ دیکھ لیا تم نے اس کا انجام..... اگر ہم پہلے ہی منقرع کی روح سے رابطہ قائم کر لیتے تو یقیناً یہ نوبت نہ آتی۔“ طلال بے کہنے لگا۔

”ممکن ہے کہ ان حالات میں منقرع کی روح خود ہماری رہنمائی کے لئے ہم سے رابطہ قائم کر لیتی لیکن تم نے یہ راستہ بھی روک دیا۔ نادیہ حفاظتی حصار کی موجودگی میں بھلا کوئی بھی روح کس طرح ہم تک پہنچ سکتی ہے۔“ نجیب نے طلال بے پر الزام لگایا۔

”اور تم زاعون کی روح کو بھول ہی گئے۔ حصار اٹھائے جانے کی صورت میں کیا زاعون کی روح ہم تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جاتی؟ کیا پھر وہ ہم دونوں کو زندہ چھوڑ دیتی؟“ طلال بے ترکی بے ترکی بولا۔

”جب تک اس عمارت کے گرد حفاظتی حصار قائم ہے، زاعون کی روح میاں داخل نہیں ہو سکتی۔ خود تم

”اور منقرع کی روح پہلے ہی تمام حالات سے آگاہ ہو گی۔ مجھے یقین ہے طلال کہ اس کا فیصلہ یہ ہو گا، زاعون کو ختم کر دیا جائے۔“

”ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔ یہ تو اب منقرع کی روح سے مل کر ہی پتا چل سکتا ہے۔“

طلال بے نے محتاط الفاظ سے کام لیا۔

”اس کے لئے اب ہمیں غیر ضروری تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“ نجیب بولا۔

”تم جانتے ہو، ملاقات کی رات مقرر ہے اور جگہ بھی۔ پہلے ہم کس طرح اس سے مل سکتے ہیں۔“

طلال بے نے یاد دہانی کرائی۔ ”آج بدھ ہے، ہمیں بس کل رات تک ہی تو انتظار کرنا ہے۔ جہاں اتنا مہر کیا ہے، ایک دن اور سہی۔“

”پریشانی میں یہ بات میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔“ نجیب نے اعتراف کیا۔ ”منقرع کی روح سے ملاقات کا دن، وقت اور جگہ، سبھی کچھ مقرر ہے۔ ہم ہفتے بھر میں صرف ایک رات کو اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

مزید اس کو بھی میں وقت گزارنے، طلال بے اور نجیب کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے باوجود ہمیں سب سے اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ اہم بات یہ تھی کہ طلال بے اور نجیب کو کل رات منقرع کی نام نہاد روح سے ملنے کے لئے کہاں جانا تھا۔ ہاں ہم نے یہ ضرور جان لیا کہ آئندہ رات کو وہ گیارہ بجے کو بھی سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ انہیں آدھی رات کے قریب کہیں پہنچنا تھا اور وہ جگہ جمالیہ سے ایک گھنٹے کی مسافت سے کم ہی ہو سکتی تھی۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ دونوں شیطان احتیاطاً کو بھی سے قبل از وقت روانگی کا فیصلہ کر چکے ہوں اور مسافت ایک گھنٹے کی نہ ہو۔

اب ہمارا اس کو بھی میں رکنا لاحاصل ہی تھا۔

ہر طرف شام کے سائے پوری طرح پھیل چکے تھے۔ جب ہم جمالیہ سے اپنے ہوٹل تحریر اسکوائر کے لئے روانہ ہوئے۔ آئندہ رات تک اب اپنے دشمنوں پر ہمیں نظر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ کل رات تک وہ اپنے ”محفوظ قلعے“ سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

اپنے ہوٹل پہنچتے ہی ہم نے انسانی قالب اپنالے۔ سوی اب منصوبہ اور میں مقصود تھا۔

”اے علیالیش! آج کا دن خاصا ہنگامہ خیز گزرا۔“ سوی یہ کہتے ہوئے خوش نظر آنے لگی۔ ”م نے اپنے دشمنوں پر بڑی کاری ضرب لگائی۔“

”اور اے سوی! کل کی رات مجھے آج سے بھی زیادہ ہنگامہ پرور معلوم ہو رہی ہے۔“ میں بولا۔

”کل رات منقرع کی روح کا راز کھل جائے گا۔ ظاہر ہے ہمارے عقائد کے مطابق وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح تو ہو نہیں سکتی۔ جسموں کے فنا ہوتے ہی روہیں عالم برزخ میں چلی جاتی ہیں جہاں سے ان کا نکلنا ممکن نہیں۔ میرا قیاس اب بھی یہی ہے کہ آدم زادوں کے اس گروہ کو بھٹکانے والا ہم ہی میں سے کوئی گمراہ جن زاد ہو سکتا ہے۔“

ہے کہ اگر وہ کوئی گمراہ جن زاد کوئی انتہائی طاقتور عفریت ہوا تو ہم کیا کریں گے؟ اس کے علاوہ وہ جن زادوں کی دیگر اقسام میں سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً عمار، قرنایا، تول۔ یہ تجھے بھی خبر ہے اور مجھے بھی کہ جن زادوں کی یہ سبھی قسمیں قوی اور انتہائی خطرناک ہیں۔ ہم ان پر قابو نہیں پاسکتے۔“

”تیرا کہنا اپنی جگہ ٹھیک ہے اے سوی!“ میں نے اقرار کیا۔ ”لیکن پہلے ہمیں حقیقت کا علم تو ہو جائے۔ اسی کے بعد ہم کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کریں گے۔“

اس رات کو دیر تک میں اور سوی اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ سوی نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، میرے نزدیک حقیقت پر مبنی تھے۔ ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ فی الحال ہمارے لئے یہی بہت بڑی کامیابی ہوتی کہ اصل دشمن کا پتا چل جاتا۔

سوئے سے پہلے میں نے سوی کو یہ تسلی بھی دی۔ ”تو میرے دوست یاسف کو تو بالکل بھول ہی گئی اے سوی! وہ بھی تو ہماری طرف سے بے خبر نہ ہو گا۔ اس کا ثبوت وہ پہلے ہی دے چکا ہے۔ آڑے وقت پر یاسف یقیناً ہمارے کام آئے گا۔“

”میں تیرے دوست کو بھولی نہیں اے علیالیش! مگر وہ بھی تو ہم ہی جیسا ہے۔ کسی عفریت سے نمٹنا تو اس کے بس کا بھی نہیں۔“ سوی نے کہا۔

”لیکن ہم تینوں کی طاقت مل کر شاید ہمیں پیش آنے والے کسی خطرے سے بچالے۔“

”تو نے ایک اور بات پر بھی غالباً ابھی غور نہیں کیا اے علیالیش!“

”وہ کیا اے سوی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہم طلال بے اور نجیب المہندس کا تعاقب کرتے ہوئے کسی ایسی جگہ تک پہنچیں گے جہاں ان کا مرغہ موجود ہو گا۔“ سوی کہنے لگی۔ ”اگر تیرے قیاس کے مطابق وہ ہم ہی میں سے ہوا تو کیا وہاں ہماری موجودگی سے واقف نہیں ہو جائے گا؟“

”میں اس پر غور کر چکا ہوں اے سوی!“ میں نے جواب دیا۔ ”اور میں نے اس کا ایک حل بھی تلاش کر لیا ہے۔ ممکن ہے اے وہاں ہماری موجودگی کا علم ہو جائے لیکن وہ ہمیں دیکھ نہیں سکے گا۔ ہم دونوں اندھیرے کی چادر اوڑھ لیں گے۔“

میرے جواب سے سوی مطمئن ہو گئی اور کروٹ بدل کر سوئے کی کوشش کرنے لگی۔

سوی اور میرے لئے اگلا دن گزارنا دوبھر ہو گیا۔ اندھیرا پھیلنے ہی ہم انسانی قابلوں سے نکل کر جمالیہ روانہ ہو گئے۔

☆=====☆

جمالیہ پہنچ کر طلال بے کی کو بھی میں داخل ہونے سے پہلے ہم حصار شکن عمل پڑھنا نہیں بھولے۔ ہم اس سے بے خبر تھے کہ کتنے عرصے کے لئے وہ حصار قائم کیا گیا ہے۔ خلاف توقع میں نے کو بھی میں ایک نوجوان جوڑے کو دیکھا۔ وہ دونوں کو بھی کی نفست گاہ میں طلال بے اور نجیب کے ساتھ بیٹھے تھے۔

نیل آنکھوں، سرخ و سفید رنگ اور تھیکے نقوش والی اس خوبصورت عورت کی عمر چوبیس پچیس برس سے

زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ نوجوان بھی اسی کا ہم عمر لگتا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ طلال بے اور نجیب کی لپٹائی ہوئی نظریں بار بار عورت کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”تم نے یہ بہت اچھا کیا ناصر کہ لیلیٰ کو بھی الاقصر سے اپنے ساتھ لے آئے۔“ نجیب کے ادا کے ہوئے ایک ہی جملے سے مجھے اس نوجوان جوڑے کے نام معلوم ہو گئے، اسی کے ساتھ یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ دونوں کہاں سے آئے ہیں۔

”مگر تم لوگوں نے اچانک شادی کا فیصلہ کیسے کر لیا؟“ طلال بے بھی خاموش نہ رہا۔

”ایسے فیصلے بس اسی طرح اچانک ہوتے ہیں۔“ نوجوان ناصر نے دھیرے سے ہنس کر جواب دیا۔ ”ہم دونوں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے، مگر اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آپ دونوں کو یہ سن کر یقیناً حیرت ہو گی کہ اظہار محبت میں پہل لیلیٰ ہی نے کی تھی۔“

”واقعی یہ حیرت کی بات ہے۔“ نجیب کہنے لگا۔ ”بہر حال تم خوش قسمت ہو۔“

جلد ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ ناصر اور لیلیٰ کو آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

”محترم طلال بے! مجھے اس پر بہر طور دکھ ہے کہ کسی دشمن نے آپ کو ایک ہاتھ سے محروم کر دیا۔“ ناصر نے اظہار افسوس کیا۔ ”وہ تھا کون؟“

”تم اور لیلیٰ غیر نہیں ہو، ہماری طرح مقرر کے غلام ہو اس لئے میں تمہیں حقائق سے بے خبر نہیں رکھوں گا۔“ طلال بے نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”ناصر! تمہیں بھی شاید اس بات کا احساس ہو کہ الاقصر میں مقرر کے جتنے بھی غلام ہیں، تم ہی پر مجھے سب سے زیادہ اعتماد ہے۔“

”جی ہاں محترم طلال بے! میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں۔“ ناصر بول اٹھا۔

”میں جانتا ہوں ناصر کہ اس وقت قاہرہ میں تمہاری آمد کا مقصد لیلیٰ کے ساتھ کچھ حسین و خوشگوار دن گزارنا ہے۔ بقول تمہارے تم لوگوں کی شادی کو ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ تم اگر خود آج الاقصر سے میرا نہ آ جاتے تو میں خود تمہیں بلوا لیتا۔“

”ظاہر ہے اس کی کوئی نہ کوئی مناسب وجہ آپ کی نظریں ہو گی۔“ ناصر نے چونک کر کہا۔

”یقیناً۔“ طلال بے زور وے کر بولا۔ ”تمہارے علاوہ بھی الاقصر سے ہمیں مقرر کے دوسرے غلاموں کو یہاں طلب کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ ناصر! تمہیں یہ جان کر تعجب ہو گا کہ اب سے پہلے مقرر کے غلاموں پر کبھی ایسا برا وقت نہیں پڑا۔ فرعون خضر کے ایک امیر زاعون کی روح ہماری دشمن ہو گئی ہے۔ اسی نے مجھے میرے ایک ہاتھ سے بھی محروم کر دیا ہے اور.....“

”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں محترم طلال بے!“ ناصر نے کہا۔ ”اس دشمنی کی کوئی وجہ معلوم ہوئی؟“

”زاعون نے خود ہی ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہم نے اس کے اہرام کی بے حرمتی کی ہے۔ وہ ہم سے اسی کا انتقام لے رہا ہے۔“ طلال بے بتانے لگا۔ ”زاعون نے اب تک ہمیں جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان کی تفصیل سن کر تم حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ کل ستارہ میں زاعون کے ہاتھوں تقریباً

ایک سو مقرر کے غلام مارے جا چکے ہیں۔“ طلال بے کی نظریں یہ بتاتے ہوئے ناصر کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”نہن..... نہیں۔“ ناصر بول کھلا کر بولا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

”بھی تو سنتے جاؤ میرے نوجوان دوست کہ ہمارا مقابلہ کتنے خطرناک دشمن سے ہے۔“ پھر طلال نے تفصیل کے ساتھ مجھ سے اپنی معرکہ آرائیوں کا ذکر کرنے لگا۔ اس دوران میں میرے ہاتھوں نجا کے قتل کی بات بھی ہوئی۔ طلال بے نے یہ بھی بتایا کہ وہ نجا کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔

سب کچھ سن کر ناصر مزید فکر مند نظر آنے لگا اور بولا۔ ”محترم طلال بے! یہ تو بڑی ہولناک صورت حال ہے۔ آپ اس سلسلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر زاعون اتنا ہی سفاک، بے رحم اور خطرناک ہے تو..... تو میں اس کے مقابلے پر کس طرح ٹھہر سکتا ہوں؟“

”محترم طلال بے! اگر مجھے کچھ بولنے کی اجازت دیں تو میں چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ لیلیٰ نے ہلکی مرتبہ اس گفتگو میں مداخلت کی۔

”ہاں ہاں ضرور بولو، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ طلال بے نے کہا۔

”جہاں تک میرے علم میں ہے، اب تک ہم الاقصر اور ستارہ میں کئی اہراموں کی کھدائی کر کے وہاں سے سونا نکال چکے ہیں۔ ہمیں ایسا کرتے برسوں ہو گئے، لیکن اب سے پہلے کسی اہرام میں ابدی نیند سونے والے کی روح نے ہم سے انتقام نہیں لیا۔“ لیلیٰ کہنے لگی۔ ”پھر زاعون ہی ہمارا دشمن کیوں ہو گیا؟ کیا آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں؟“

وہ خوبصورت عورت اپنے چہرے اور جسم کی طرح مجھے حسین ذہن کی مالک بھی معلوم ہوئی۔ اس نے ایک اہم سوال اٹھایا تھا۔

”ہاں لیلیٰ! یہ غیر معمولی بات تو ہے۔“ نجیب نے اعتراف کیا۔ ”مگر ہم حقائق سے کس طرح چشم پوشی برت سکتے ہیں۔“

”کیا یہ ضروری ہے کہ زاعون نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ درست ہو؟“ لیلیٰ نے پھر ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

”تمہاری باتیں واضح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہیں لیلیٰ!“ طلال بے نے کہا۔ ”تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“

”یہ کہ کسی اہرام میں ابدی نیند سوئی ہوئی کوئی روح انتقام لینے کے لئے بیدار نہیں ہو سکتی۔“ لیلیٰ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”تو اس سوال کا تمہارے پاس کیا جواب ہے کہ زاعون کون ہے؟“ طلال بے نے اپنی ہچکناہ آواز میں سوال کیا۔

”وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ لیلیٰ نے جواب دیا۔ ”مگر کسی فرعون کے امیر کی ایسی روح ہرگز نہیں ہو سکتی جس کے اہرام کی بے حرمتی کی گئی ہو۔ اپنے اطمینان کی خاطر ہم اسے ایک پراسرار وجود فرض

کر سکتے ہیں۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ ”لیلیٰ یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگی۔ اس کے چہرے سے مجھے یہی پتا لگا۔

”اور وہ سوال کیا ہے لیلیٰ؟“ نجیب خاموش نہ رہ سکا۔

”کسی پراسرار وجود کو مقرر کے غلاموں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ لیلیٰ بولی۔ ”اور اس ام سوال کا جواب آپ ہی دونوں بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔ ممکن ہے ماضی قریب میں کسی پراسرار شخصیت سے آپ نادانستگی میں ٹکرائے ہوں۔ یاد کیجئے، کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا؟“

چند لمحوں کو نشست گاہ میں بوجھل سا سکوت چھا گیا۔ لیلیٰ کے سوا سبھی کے چہروں پر تاؤ تھا۔

”لیکن وہ..... وہ تو ایک غیر اہم سا شخص تھا۔“ نجیب آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

”کون..... تم کس کا ذکر کر رہے ہو نجیب؟“ طلال بے نے چونک کر پوچھا۔

”وہی کہ پاکستان میں جسے ہم نے دوستی کی پیشکش کی تھی اور..... اور اس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی تھی۔“ نجیب کہنے لگا۔ اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”ہماری پیشکش ٹھکرانے کا ثبوت وہ تحفہ تھا جو ہمارے پاس واپس آ گیا۔“

”تم یہ کیا پرانے قصے لے بیٹھے نجیب!“ طلال بے کے لہجے میں ناگواری تھی۔ ”ان واقعات کا اس شخص سے کیا تعلق؟“

”طلال! تم یہ بھول رہے ہو کہ اسی پراسرار شخص کے سبب ہمیں فوری طور پر پاکستان سے فرار ہونا پڑا تھا۔“ نجیب نے یاد دلایا۔

”اگر محترم طلال بے کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس پراسرار شخص کے بارے میں تفصیلات جانتا چاہوں گی۔“ لیلیٰ بول اٹھی۔

”میں بتاتا ہوں۔“ طلال بے قدرے نرم پڑ گیا اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ لیلیٰ ہی تھی۔ وہ لیلیٰ کو شاید ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید کہنے لگا۔ ”یہ ان دنوں کا ذکر ہے کہ جب ہم نجوا کا تعاقب کرتے ہوئے پاکستان کے ایک شہر کراچی پہنچے تھے۔“

”آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ نجوا کا قتل بھی اسی پراسرار وجود نے کیا ہے۔“ لیلیٰ نے تصدیق چاہی۔ ”اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ وہ پراسرار وجود صرف مقرر کے غلاموں کا دشمن نہیں تھا۔“

”ہاں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ طلال بے نے اقرار کیا۔

”آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ نجوا سے اس کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟“ لیلیٰ نے سوال کیا۔

”حتمی طور پر تو خیر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اہراموں سے سونا نکالنے کے معاملے میں نجوا بھی ملوث تھی۔“ اس مرتبہ نجیب نے جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا محترم طلال بے! آپ کی بات ادھوری رہ گئی۔“ لیلیٰ نے کہا۔ ”آپ مجھے اس پراسرار شخص کے متعلق بتا رہے تھے جو پاکستان میں ملا تھا۔“

”براہ راست اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔“ طلال بے نے بتایا۔

”دراصل ہم جس پاکستانی سرکاری افسر کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے، وہ اس پراسرار شخص کا عقیدت مند تھا۔“ نجیب بول اٹھا۔ ”وہ یقیناً حیرت انگیز قوتوں کا مالک تھا۔ اس نے ہی پہل کی تھی۔ وہ میری ہیئت جاننے کے لئے میرے ذہن کو پڑھتا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اسے مجھ پر کس طرح شبہہ ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے میں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی اور اسے دھمکی دی۔“ جو واقعہ پیش آیا تھا، نجیب اس کی تفصیل بتانے لگا۔

تفصیل جاننے کے بعد لیلیٰ کچھ دیر خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔ ”آپ کی دوستی اس نے قبول نہیں کی۔ اس کا ثبوت بھی آپ کو تجھے کی واپسی کی صورت میں مل گیا۔ آپ نے اسے جو دھمکی دی تھی، ممکن ہے اس کی انا کے لئے تازیانہ بن گئی ہو۔ پھر وہ آپ کے تعاقب میں یہاں تک آ گیا ہو۔“ لیلیٰ کے خیالات بڑی حد تک درست تھے۔ ”آپ تک پہنچنے کے لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے وقتی طور پر نجوا سے مصالحت کر لی ہو، پھر.....“

”لیکن لیلیٰ! اب تک جو واقعات پیش آئے ہیں، وہ انتہائی غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ ان میں اس کا نظرنہ آنا بھی شامل ہے۔“ طلال بے نے لیلیٰ کی بات کاٹ دی۔ ”یہ اس پراسرار شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو ہمیں پاکستان میں ملا تھا۔ وہ اگر ہمارے پیچھے آیا ہوتا تو کبھی نہ کبھی نظر تو آتا۔“

”وہ آپ کو نظر نہیں آیا۔“ لیلیٰ خود کلامی کے انداز میں دھیرے سے بولی، پھر معلوم کیا۔ ”لیکن اس کی آواز تو آپ نے سنی ہو گی۔ کسی تھی اس کی آواز، میرا مطلب یہ ہے کہ آواز انسانی تھی یا غیر انسانی؟“

”اگر تم زاعون کے بارے میں پوچھ رہی ہو تو اس کی آواز غیر انسانی ہی تھی۔“ طلال بے نے وضاحت کی۔ ”اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں ملنے والا پراسرار شخص اور زاعون دو الگ الگ وجود ہیں۔“

لیلیٰ نے طلال بے کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”آپ کراچی میں جس سرکاری افسر کی کوٹھی پر ٹھہرے تھے، کیا اس سے فون پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، مگر کس لئے؟“ طلال بے حیرت سے بولا۔

”یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ وہ پراسرار شخص اس وقت کراچی میں موجود ہے یا نہیں۔ آپ کو اس کا نام تو یاد ہو گا۔“

”اس سرکاری افسر قمر احمد نے مقصود میاں نام بتایا تھا۔“ نجیب نے بتایا۔

”اگر وہ پراسرار شخص مقصود میاں گزشتہ کچھ عرصے سے کراچی میں نہیں ہے تو پھر وہ آپ ہی کے تعاقب میں یہاں آیا ہے۔ اسی نے آپ لوگوں کو دھوکا دینے کی خاطر خود کو زاعون ظاہر کیا ہے تاکہ اس کی اصل شخصیت پر پردہ پڑا رہے۔“ لیلیٰ خطرناک حد تک ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔

”اور اس کا نظرنہ آنا؟ دندنہ بن کر میرا ہاتھ چبا جانا اور وہ تمام واقعات جو میں نے اس کے متعلق

تمہیں بتائے ہیں؟“ طلال بے نے پوچھا۔

”محترم طلال بے! کیا آپ کو جنات کے بارے میں معلومات حاصل ہیں؟“ لیلیٰ طلال بے کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دے کر بولی۔

”جنات..... ہاں ان کے متعلق تھوڑا بہت جانتا ہوں لیکن جنات کا میرا کیا ذکر؟“

”آپ کو علم ہو گا کہ جنات بھی نظر نہیں آتے۔ آپ نے زاعون کے بارے میں جتنے بھی واقعات بتائے ہیں، وہ سب اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔“ لیلیٰ کہنے لگی۔ ”جنات، چرند، پرند، درند اور انسان کی کا بھی قالب اپنا سکتے ہیں۔ وہ جس قالب میں ہوں، اس کی آواز نکال سکتے ہیں۔“ جنات کے باب میں لیلیٰ کا علم خاصا وسیع تھا۔ وہ دیر تک ہم جن زادوں کی حیرت انگیز خداداد صلاحیتوں کا ذکر کرتی رہی۔

”لیلیٰ! بقول تمہارے اگر زاعون دراصل کوئی جن زاد ہے تو اس سے ہماری کیا دشمنی؟“ طلال بے نے سوال کیا۔

”وہ آپ لوگوں کا دشمن نہیں تھا بلکہ محترم نجیب المندس نے اسے چوہنی کی طرح ملنے کی دھمکی دے کر اپنا دشمن بنا لیا۔ اس کے علاوہ ان سے نادانستگی میں ایک بھول یہ بھی ہو گئی کہ خود کو اس جن زاد پر ظاہر کر دیا، اسے بتا دیا کہ ہم فرعون مقرر کے غلام ہیں۔“ لیلیٰ نے جواب دیا، پھر کہنے لگی۔ ”میں ابھی بتا چکی ہوں کہ جنات بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ جن زاد مسلمان ہو۔ وہ اپنی دانست میں ہمیں گمراہی کے راستے پر چلتے دیکھ کر ہمارا دشمن بن گیا ہو۔ میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، یہ ابھی محض قیاسات ہیں لیکن ان کی تصدیق بھی ممکن ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ نجیب نے دریافت کیا۔

”ایک عمل کے ذریعے۔“ لیلیٰ نے بتایا۔ ”جنات کے متعلق علم حاصل کرنے میں میری ماں نے اپنی پوری زندگی گزار دی تھی۔ اپنی موت سے پہلے انہوں نے مجھے بہت سے عمل سکھائے تھے اور الگ الگ عجیب و حیران کن باتوں سے آگاہ کیا تھا جو ناقابل یقین سی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ عمل ایسے ہیں جن کے ذریعے نہ صرف جنات کا سراغ لگانا ممکن ہے بلکہ انہیں قابو میں بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ زاعون کے پروے میں درحقیقت کوئی جن زاد ہے، تمہیں کتنا وقت لگے گا؟“ طلال بے نے لیلیٰ سے معلوم کیا۔

”اس کے لئے مجھے آج رات ٹھیک بارہ بجے سے صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے تک ایک عمل پڑھنا ہو گا۔“

”پھر تو لیلیٰ! تم آج ہی رات یہ عمل شروع کر دو۔“ نجیب بول اٹھا۔

”یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہمارا دشمن کوئی جن زاد ہے، کیا اسے قابو میں کر لینا ممکن ہو گا؟“ طلال بے مضطرب لہجے میں کہنے لگا۔

”کسی جن زاد کو قابو میں کرنے کے لئے پہلے اس کا نام جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لئے مجھے کل رات عمل کرنا ہو گا۔ کسی جن زاد کو قابو میں کر لینا کوئی ہنسی کھیل نہیں محترم طلال بے! میری ماں

نے وصیت کی تھی کہ میں کبھی یہ کوشش کر کے اپنی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالوں۔ میں نے اسی لئے سب کچھ جاننے کے باوجود یہ کوشش نہیں کی۔ کسی جن زاد کو قابو میں کرنے کے لئے مسلسل چالیس روز تک عمل پڑھنا ضروری ہے۔“

”مگر لیلیٰ! یہ تو ہم سب مقرر کے غلاموں کی زندگی کا سوال ہے۔“ لیلیٰ کا شوہر ناصر اس معاملے میں پہلی بار بولا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ناصر! لیکن یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا کہ اس سے میری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ لیلیٰ نے کہا۔

”طلال! فی الحال جب ہمارے سامنے ایک اور راستہ موجود ہے تو ہم لیلیٰ کی زندگی کو کیوں خطرے میں ڈالیں۔“ نجیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ”ہم نے لیلیٰ اور ناصر کی آمد سے پہلے یہ طے کیا تھا کہ آج رات مقرر کی روح سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمیں اپنے اسی ارادے پر عمل کرنا چاہئے۔ یقیناً اس معاملے میں مقرر کی روح بہتر طور پر ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔“

نجیب کی بات ماننے کے ساتھ ساتھ طلال بے کہنے لگا۔ ”اگر اسی کے ساتھ آج رات لیلیٰ بھی عمل پڑھ لے تو کیا مضائقہ ہے؟ کم از کم اس سے لیلیٰ کے قیاسات کی تصدیق تو ہو جائے گی۔ کیا خبر زاعون کے پروے میں واقعی کوئی جن زاد ہو۔“

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ نجیب نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا طلال کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مقرر کی روح سے کیا چمپا ہو گا۔ اس کی سرگوشیاں سن کر تو ہمیں خود ہی سب کچھ پتا چل جائے گا۔ پھر کسی اور چکر میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے۔“

”معاف کرنا میرے دوست! لیلیٰ کی باتیں سن کر میرا انداز فکر بدل گیا تھا۔“ طلال بے نے اعتراف کیا، پھر اس کی معنی خیز نظرس لیلیٰ کے حسین چہرے کی طرف انھیں اور وہ ناصر سے مخاطب ہوا۔ ”ہر چند کہ ستارہ میں جو اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے، اس کی تفصیل حاذق کے ایک ماتحت ذہیر سے فون پر مجھے مل چکی ہے لیکن میں اس کی تصدیق کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ حاذق کی جگہ تم لے لو۔“

”مگر محترم طلال بے! میں ان حالات میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟“ ناصر نے یہ سوال کیا تو اس کی آواز میں عجیب سی بے بسی تھی۔

”جو منصوبہ زاعون کی مداخلت کے سبب ادھورا رہ گیا ہے، ہم ہر قیمت پر اس کی تکمیل چاہتے ہیں کیوں کہ یہ مقرر کی روح کا حکم ہے۔ تم اگر چاہو تو آج ہی رات ورنہ پھر کل کسی وقت ستارہ کے لئے روانہ ہو جاؤ۔“ طلال بے نے جواب دیا، پھر لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیلیٰ! بیس قاہرہ میں ہمارے پاس رہے گی۔ ان حالات میں وہاں لیلیٰ کا تمہارے ساتھ رہنا مناسب نہیں۔“

میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ مضمر لیلیٰ کو اپنے پاس قاہرہ میں کیوں رکھنا چاہتا تھا۔ یقیناً اس نوجوان اور نئے شادی شدہ جوڑے کو یہ خبر نہیں ہو گی کہ الاقصیٰ سے قاہرہ آکر وہ کتنی بڑی آزمائش

میں پڑنے والا ہے۔

”محترم طلال بے!“ معاً لیلیٰ نے مسخرے کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیں گے۔“ لیلیٰ نے یہ کہتے ہوئے طلال بے کو بڑی قائل نظروں سے دیکھا تھا۔ کسی مرد کے لئے ان نظروں کا منہوس سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔

مسخرے طلال بے کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ بولا۔ ”کیوں نہیں..... دراصل میری نظر میں ناصر سے زیادہ اہل.....“

”میں جانتی ہوں محترم طلال بے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔“ لیلیٰ بول اٹھی، اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اسی وقت ایک ملازم نشست گاہ میں داخل ہوا اور اس نے طلال بے سے کھانا لگانے کے بارے میں معلوم کیا۔ طلال بے نے فوراً کھانا لگانے کو کہہ دیا اور نجیب سے کہنے لگا۔ ”باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا کہ رات کے دس بج چکے ہیں اور ہمیں یہاں سے گیارہ بجے روانہ ہو جانا ہے۔“

پھر وہ سبھی اٹھ کر کوٹھی کے ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ کھانے کی میز پر موزیکا بھی تھی۔ لیلیٰ کے لئے اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی حالانکہ وہ خود بھی کم خوبصورت نہیں تھیں کوئی بھی حسین آدم زادوں اپنے مقابل کسی دوسری خوبصورت عورت کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

کھانا کھاتے ہی طلال بے اور نجیب نے لباس تبدیل کئے اور رواج کی تیاری شروع کر دی۔ ڈرائیور کو طلب کر کے طلال بے نے تصدیق کر لی تھی کہ کار کی ٹنکی میں پٹرول بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ڈرائیور کو نہیں لیا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر نجیب بیٹھا تھا۔

اس وقت سوا گیارہ بج رہے تھے جب کار اس کوٹھی کے گیٹ سے نکلی۔ میں اور سوی اس کے تعاقب میں تھے۔

جلد ہی وہ پرانے قاہرہ کی آبادی سے نکل کر اہرام روڈ پر آ گئے۔ ایک جانب طویل و عریض ابوالہول کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر فراعنہ مصر کے تینوں اہرام ایک ترتیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت وہاں دور دور تک کوئی سیاح نہیں تھا۔ ہر طرف اندھیرے اور سانے کی حکمرانی تھی۔ نجیب نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور طلال بے کے ساتھ کار سے اتر کر اہرام کی طرف روانہ ہو گیا۔ فرعون منقرع کے اہرام کے عقب میں پہنچ کر وہ دونوں ریت پر دو زانو بیٹھ گئے۔ ٹھیک بابا بجے وہ دونوں بیک آواز بول اٹھے۔ ”اے عظیم منقرع کی روح! اپنے غلاموں پر ظاہر ہو جا۔“

اچانک روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پھر میں نے جو حیران کن منظر دیکھا، وہ میرے لئے ناقابل یقین ما تھا۔

اندھیرے کی چادر اوڑھے میں اور سوی ہر طرف پھیلی ہوئی دودھیا روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی روشنی میں گویا آسمان سے اترتا ہوا غبار سا نظر آیا تھا۔ اس غبار نے جو شکل اختیار کی اس کو دیکھ کر مجھے یقین سا نہ آیا۔ وہ شکل مصر کے کسی باجروت فرعون ہی کی معلوم ہو رہی تھی جو زمین کی سطح سے کچھ اوپر فضا میں معلق تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی طلال بے اور نجیب الہندس سجدے میں گر

پڑے۔

”اے عظیم منقرع کی روح! تیرے غلام حاضر ہیں۔“ سانے میں طلال بے کی آواز گونجی۔ ”ہماری رہنمائی کرا“ یہ کہنے کے باوجود اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ اسی لمحے مجھے شدید ترین بدبو کا احساس ہوا اور میں چونک اٹھا۔ میرے لئے یہ ایک واضح اشارہ تھا۔

معاً فضا میں معلق شکل کے موٹے موٹے ہونٹ ہلے اور ایک غیر انسانی آواز سنائی دی۔ ”اے میرے غلامو! تمہارے آقا فرعون منقرع کی روح سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ تمہارے آقا کو خبر ہے کہ تم پر کیا گزری ہے اور اس کی وجہ کیا ہے! سو پہلے ہی تمہاری مدد کو ہم نے الاقصر سے اپنے دو غلاموں کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ ان کی باتوں اور مشوروں پر دھیان دو اور ثابت قدم رہو! اپنے آقا کی پرستش کرتے رہو کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک دم اندھیرا پھیل گیا اور فرعون کی وہ شکل غائب ہو گئی۔

”جلدی کراے سوی!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”ورنہ وہ نکل جائے گا۔“ یہ کہتے ہی میں تیزی کے ساتھ دور ہوتی بدبو کی طرف لپکا۔

”اے علیالیش! وہ ایک طاقتور عفریت ہے، رک جا!“ مجھے اپنے عقب میں سوی کی آواز سنائی دی۔ ”وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

اس وقت تک میں فضا میں عفریت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے اوپر اندھیرے کی چادر تھی، وہ عفریت مجھے اسی لئے دیکھ نہیں سکا، لیکن اس نے میری بو محسوس کر لی اور تیزی سے پلٹا۔

”کون ہے تُو؟“ وہ عفریت غرا کر مجھ پر جھپٹا۔ پھر اس نے میرے اوپر سے اندھیرے کی چادر کھینٹ لی۔ ”اے مردہ کی نسل کے حقیر بونے! تیری یہ مجال کہ میرا پچھا کرے!“ اس عفریت نے یہ کہتے ہی میرے وجود پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

ہوش کھونے سے پہلے مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ شاید اب میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ اس عفریت نے یقیناً مجھے دیکھ کر میری نسل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میرا تعلق جن زادوں کی ایک قسم ”مردہ“ ہی سے ہے۔ قوی ترین عفریتوں کے مقابلے میں جنات کی یہ نسل زیادہ خدا داد قوتوں کی مالک نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر جنات کی جتنی بھی اقسام ہیں، ان میں مردہ کی تعداد ہی زیادہ ہے۔

سوی، اس کے باپ عزتیل، یاسف اور خود میرا تعلق بھی اسی نسل سے ہے۔

☆=====☆

معلوم نہیں کب اور کتنی دیر کے بعد میرے سوچنے سمجھنے کی قوت واپس آئی۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ زندہ ہونے کے باوجود میری حالت خردوں سے بدتر ہے۔ میں اپنے وجود کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ میری تمام تر جناتی صفات معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کوئی ویران کھنڈر تھا۔ معاً مجھے اپنے قریب ہی ایک مانوس بو محسوس ہوئی، لیکن اس طرف میں حرکت نہ کرنے کی وجہ سے دیکھ نہ سکا۔

اس بو کو میں نے پہچان لیا۔ میں نحیف سی آواز میں بڑبڑایا۔ ”یا..... یاسف!..... میرے دوست!“

”خدا کا شکر ہے اے علیالیش کہ تجھے ہوش آگیا۔“ یاسف کی آواز مجھے سنائی دی اور پھر وہ میرے سامنے آگیا۔

”تو..... تو اے یاسف!“ میں حیرت سے بولا۔ ”تو کب آیا؟ اور.....“

”اے علیالیش! مجھے تجھ تک پہنچنے میں یقیناً کچھ دیر ہو گئی۔“ یاسف بول اٹھا۔ ”ورنہ میں تجھے اس خطرناک عفریت کی زد میں نہ آئے دیتا۔“

”سوی کہاں ہے اے یاسف؟“ میں نے پوچھا۔

”سوی؟..... اسے تو میں نے نہیں دیکھا۔“ یاسف نے جواب دیا۔ ”میری ساری توجہ تو صرف تجھ پر تھی اے علیالیش!..... اس سے پہلے کہ وہ ظالم اور قوی عفریت تجھے دوسری ضرب لگا کر موت کی نیند سلا دیتا، تیرے وجود کو میں اپنی آغوش میں سمیٹ کر وہاں سے ہوا ہو گیا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ کیا تیرے ساتھ سوی بھی تھی؟“

”ہاں وہ..... وہ بھی تھی۔“ میں نے بمشکل بتایا۔ ”کیس ایسا تو نہیں ہوا کہ سوی اس عفریت کے پیچھے گئی ہو اور.....“ میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اس سے آگے سوچنا بھی میرے لئے سوہان روح تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ سوی نے تو خود منع کیا تھا کہ میں اس عفریت کا پیچھا نہ کروں۔ ایسی صورت میں خود وہ یہ غلطی کس طرح کر سکتی تھی! اگر ایسا نہیں تو سوی کہاں گئی؟ میں سوچنے لگا۔

”تو مجھے پہلے یہ بتا اے علیالیش کہ یہ قصہ کیا تھا؟ اس خطرناک عفریت سے تیری کس طرح ٹھن گئی؟“ یاسف مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”میں تو جب خطرے کا احساس ہوتے ہی یہاں پہنچا، وہ عفریت تجھے کاری ضرب لگا چکا تھا۔ واقعات کا علم ہو تو کچھ اندازہ لگایا جاسکے کہ سوی کہاں جاسکتی ہے۔“

”تجھے خبر ہے اے یاسف کہ ہم ایک عرصے مقرر کے غلاموں سے نبرد آزما تھے۔“ میں اپنے بچپن کے دوست یاسف کو بتانے لگا۔ ”ہماری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح آدم زادوں کے بھٹکے ہوئے اس گزردہ کے سرغٹہ تک رسائی ہو جائے۔“

”یوں کہہ اے علیالیش کہ تو مقرر کی روح تک پہنچنا چاہتا تھا۔“ یاسف نے کہا۔

”ہاں یاسف! اسی کے لئے ہم نے مقرر کے غلاموں کو مجبور کیا۔“ میں یہ کہہ کر مختصراً یاسف کو ان واقعات سے آگاہ کرنے لگا جن سے وہ لاعلم تھا۔ اسی دوران میں اسے میں نے نجوا کے معلق بھی بتا دیا کہ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔

”تو یہ راز کھل ہی گیا کہ مقرر کی روح کے پردے میں ہمارا ہی ایک ہم قوم چھپا ہوا تھا۔“ یاسف پوری بات سن کر بولا۔ ”ایک انتہائی طاقت ور اور خطرناک جن زاد! وہ کہ جس سے مقابلے کی ہمیں تاب نہیں کیوں کہ وہ ایک عفریت ہے۔ یہ قصہ تو خیر الگ رہا، اس وقت ہمارے سامنے اصل

مسئلہ سوی کی تلاش ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس کی خوشبو سے مانوس نہیں ورنہ اسے ڈھونڈ لاتا اور تیری حالت اس قابل نہیں.....“

”ٹھہرے یاسف!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے اچانک سوی کے عالم باپ عزتیل کا خیال آگیا تھا۔ میری ہی طرح عزتیل بھی اپنی بیٹی کی خوشبو سے آشنا تھا۔ اس کے لئے سوی کو تلاش کرنا دشوار نہ ہوتا۔ اپنے اس خیال کا اظہار میں نے یاسف سے بھی کر دیا۔

یاسف نے مجھ سے اتفاق کیا اور بولا۔ ”ہاں اے علیالیش! یقیناً وہ سوی کو ڈھونڈ سکتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سوی کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہے ورنہ اب تک خود تجھ تک پہنچ چکی ہوتی۔ تو تقریباً دو گھنٹے بے ہوش رہا ہے۔ یہ خاصا وقت ہے۔ میرے قیاس کے مطابق سوی اگر کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہوتی تو اسے یہاں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تیری جو حالت ہے، سوی کا عالم باپ عزتیل شاید اس سے بھی تجھے نجات دلا سکے۔ تیرا روحانی علاج کر سکے۔ یہ بہر حال میرے بس کی بات نہیں۔“ آخر میں یاسف نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”میں تیری مجبوری سے واقف ہوں اے میرے دوست یاسف!“ میں نے کہا۔ ”تو مجھے یہاں سے اٹھا کر مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ لے چل! پھر جو ہو گا اللہ مالک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سوی کا باپ عزتیل ہماری مدد کرے گا اور ہمیں جلد ہی انشاء اللہ سوی کا سراغ مل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ یاسف فوراً راضی ہو گیا اور اس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ غیر متوقع طور پر صورت حال اچانک بدل گئی تھی۔ اپنے دشمنوں کو تو میں کیا ختم کرتا، خود میری جان کے لالے پڑ گئے۔ یہی نہیں بلکہ سوی بھی مجھ سے ٹھن گئی۔ معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھی! یہ سوچ سوچ کر میری روح پر چرکے سے لگ رہے تھے۔ ہر چند کہ خود میری حالت کے سبب مجھے فوری طور پر سر زمین مصر کو خیر یاد کہنا پڑا۔ آج رات سے پہلے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے اچانک مصر سے جانا پڑے گا۔ غیب کے علم سے کوئی واقف نہیں۔ اس سے قطع نظر وہ بھی ہی جن زادوں میں سے تھے جنہیں غیب کی باتیں جاننے کا شوق تھا۔ وہ یہ جاننے کے لئے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے، آسمانوں کا رخ کرتے اور جو کچھ معلوم ہوتا کانٹوں کو آکر بتا دیتے۔ پھر اللہ کے حکم پر فرشتوں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ ان پر آگ کے کوڑے برسائے جانے لگے۔ اسی کا ذکر قرآن پاک کی سورہ جن میں ہے۔

”پہلے ہم سن گن لینے کے لئے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پالیتے تھے، مگر اب جو چوری جیسے سننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے لیے گھات میں ایک شاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔“ (ترجمہ)

سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی رو سے ہم جن زاد تو خود آتش مخلوق ہیں، پھر آگ سے ہمیں کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رو سے آدمی بھی مٹی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹی کا ڈھیلہ کھینچ کر مارا جائے تو اس کو چوٹ کیوں لگتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا

جسم اگرچہ زمین کے مادوں سے بنا ہے، مگر جب ان سے گوشت پوست کا زندہ انسان وجود میں آجاتا ہے تو وہ ان مادوں سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے اور انہی مادوں سے بنی ہوئی دوسری چیزیں اس کے لئے اذیت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اسی طرح جنات بھی اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آتشی مخلوق ہیں، لیکن آگ سے جب ایک زندہ اور صاحب احساس مخلوق وجود میں آجاتی ہے تو وہی آگ اس کے لئے تکلیف کا موجب بن جاتی ہے۔

اس کا تجربہ ایک جن زاد ہونے کی حیثیت سے خود مجھے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا جس کا ذکر میں اپنی سرگزشت میں کر بھی چکا ہوں۔ اس وقت بھی میرا دوست یاسف مجھے مصر سے ڈھاکہ لے جا رہا تھا، میری کیفیت مختلف نہیں تھی۔ میرے وجود میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ میں اندر ہی اندر جیسے جلا جا رہا تھا۔ وہ میری بے پناہ قوت برداشت ہی تھی کہ میں کسی طرح خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ آخر ایک عرصے کے بعد وہ لمحات آہی گئے کہ اس سرسبز و شاداب سر زمین کی حدود میں داخل ہو گیا جہاں سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ یہی وجہ وہ جگہ تھی جہاں پہلی بار مجھے سوی ملی تھی۔

میں نے یاسف کی رہنمائی کی۔ یہ ڈھاکہ شہر کا نواحی علاقہ تھا۔ دور تک ہرا بھرا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جس کے درمیان یاسف نے مجھے ایک جھیل کے کنارے اتار دیا۔ یہی وہ جھیل تھی جہاں کبھی میں پراسرار شیطانی قوتوں کی مالک سنتیا کو لے کر آیا تھا پھر عزتیل نے سنتیا کی تمام شیطانی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ کچھ دیر کو وہاں آکر جیسے مجھے چپ ہی لگ گئی۔ پھر میں نے یادوں کے غبار کو ذہن سے جھٹک دیا۔

”اے علیالیش! یہاں تو مجھے دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا۔ یہ تو مجھے کہاں لے آیا؟“ یاسف مجھ سے مخاطب ہوا۔

”سوی کے باپ عزتیل کو یہیں کہیں آس پاس ہونا چاہئے۔“ میں بولا۔ ”لگتا ہے کہ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میری معلومات کے مطابق عزتیل اس وقت تہجد کی نماز پڑھ رہا ہو گا۔ اے یاسف! میں عزتیل کی خوشبو پر اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ تو مجھے اٹھالے اور جدھر کون لے چل! عزتیل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہو گا۔“

میرے کہنے پر یاسف نے مجھے اٹھالیا اور ایک طرف چل دیا۔ میں نے سوی کے باپ کی خوشبو محسوس کر لی تھی۔

”اے یاسف! ادھر..... بیڑوں کے اس گھنے جھنڈ کی طرف چل!“ میں نے یاسف سے کہا۔

ذرا سی دیر میں یاسف مجھے اٹھائے درختوں کے اس جھنڈ کے درمیان پہنچ گیا۔ وہیں مجھے ایک طرف گھاس پر عزتیل پڑا دکھائی دے گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے وجود کو جھٹکا سا لگا۔ اسے میں نے اس کی خوشبو سے پہچانا تھا ورنہ اس کی ظاہری حالت تقریباً بدل چکی تھی۔

”اے میری بیوی سوی کے باپ عزتیل! تجھے یہ کیا ہوا؟“ میں اس کی حالت دیکھ کر چیخ اٹھا۔ کون؟..... کیا تو علیالیش ہے؟“ عزتیل کی نحیف سی آواز ابھری اور وہ بدقت اٹھ کر بیٹھا۔ ”اے یاسف! مجھے عزتیل کے پاس لانا ہے۔“ میں بولا۔

یاسف نے میرے کہنے پر عمل کیا تو عزتیل میرے اوپر جھک گیا اور بڑبڑایا۔ ”اے میرے بچے، اے علیالیش! یہ تیری کیا حالت ہو گئی؟“ ”اے عزتیل! میں اس کے بچپن کا دوست یاسف ہوں۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ اس پر کیا گزری ہے!“ یاسف بول اٹھا۔

”اے علیالیش کے دوست یاسف! تو اگر نہ بھی بتائے تو میں اس کی حالت دیکھ کر جان گیا کہ کسی عفریت نے اسے کاری ضرب لگائی ہے۔“ عزتیل دھیمی اور کمزور آواز میں کہنے لگا۔ ”لیکن عفریت نے اسے زندہ کیسے چھوڑ دیا؟“

”اس لئے اے عزتیل کہ میں اسے وہاں سے لے اڑا۔“ یاسف نے بتایا۔ ”شاید مجھے میرے خالق نے اب تک اسی دن کے لئے زندہ رکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی کے شوہر کو سک سک کر زندہ جلنے سے بچا سکوں۔“ عزتیل نے کہا، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے علیالیش! میں ایک عمل پڑھ کر تجھ پر دم کرتا ہوں۔ اس سے تیرے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی، لیکن تو پہلے کوئی انسانی قالب اپنا لے۔ عزتیل نے عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ انسانی قالب اپنا کر میں نے اپنی حالت قدرے بہتر محسوس کی۔ کچھ دیر میں عزتیل نے اپنا عمل پورا کر لیا۔ اس نے جھک کر سر سے پیر تک میرے اوپر دم کیا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے سرد پڑ گئے ہیں۔ سکون کا احساس ہوتے ہی میری آنکھیں جیسے خود بہ خود بند ہونے لگیں اور ذہن پر نیند کا فرحت بخش غبار سا چھانے لگا۔ اسی عالم میں مجھے یاسف کی آواز سنائی دی۔ ”اے عزتیل! یہ علیالیش کو کیا ہو گیا؟“

”فکر نہ کراے یاسف! تیرا دوست بالکل ٹھیک ہے۔ اسے کچھ دیر کو سو جانے دے اور میں تجھ سے جو پوچھوں، مجھے بتا!“ عزتیل بولا۔ پھر میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو زیادہ دیر تک نہیں سن سکا اور مجھے گہری نیند آگئی۔

جب میں جاگا تو دن نکل آیا تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک بیڑ کے نیچے سائے میں لیٹا تھا۔ اپنے قریب ہی مجھے عزتیل دکھائی دیا۔ وہ بھی گھاس پر دراز مگر بے خبر تھا۔ ہاں میں نے اپنے دوست یاسف کو ضرور بیدار پایا۔

میں اٹھ کر بیٹھا تو مجھے کوئی قہقہہ یا تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ”آ اے علیالیش! ادھر چل کر باتیں کرتے ہیں تاکہ عزتیل سوتا رہے۔“ یاسف نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

ہو سکتی تھی، لیکن وہ بیمار اور بوڑھا جن زاد اس وقت محو خواب تھا۔ سو مجھے اس کے سو کر اٹھنے کا انتظار کرنا پڑا۔ ابھی یاسف کا معاملہ بھی میرے لئے غور طلب تھا۔ اگر مجھے عزتیل کے پاس ہی چالیس دن گزارنے تھے تو یاسف وہاں کیوں اور کب تک رہتا!

دوپہر کو قہر کے وقت عزتیل بیدار ہوا۔ بڑی مشکل سے اٹھ کر وہ جھیل تک گیا، پھر وضو کے بعد نماز پڑھنے لگا۔

”اے علیالیش! آخر تیری حکمت کس دن کام آئے گی؟“ یاسف مجھ سے کہنے لگا۔ ”کیا تو عزتیل کا علاج نہیں کر سکتا؟“

”بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں اے میرے دوست!“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”میرے اندازے کے مطابق عزتیل علاج کی حد سے گزر چکا ہے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی مرضی ہے کہ عزتیل کو وہ مزید کتنے دن زندہ رکھتا ہے! بہر حال اس کے اندر اب طاقت و توانائی نہیں رہی۔“

نماز پڑھ کر عزتیل نڈھال سا نظر آنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اے علیالیش! اب تو یوں لگتا ہے کہ شاید کچھ دن میں اشاروں سے نماز ادا کرنی پڑے گی۔ روز بہ روز نشاوت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔“

میں بولا۔ ”اے عزتیل! اللہ شفا دینے والا ہے۔ وہ تنکے میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔“

”ہاں وہ ہر شے پر قادر ہے اے علیالیش! تجھے بھی تو دراصل اسی نے بچایا ہے ورنہ وہ عفریت تجھ کو زندہ نہ چھوڑتا“ تیرا دوست یاسف تو محض ایک ذریعہ بنا ہے۔ وہ اسی طرح مارنے اور زندہ رکھنے کے ذرائع پیدا کر دیتا ہے۔“

”اے عزتیل! میں تجھ سے شرمندہ ہوں کہ تیری بیٹی سوی کی حفاظت نہ کر سکا۔“ میں نے اصل موضوع گفتگو چھیڑ دیا۔

”اس میں بھلا تیرا کیا قصور؟ تیری تو خود جان پر بنی تھی!“ عزتیل بولا۔

”سوی کی طرف سے مجھے اصل فکر یہ ہے کہ کہیں وہ..... وہ اسی عفریت کے چنگل میں

نہ پھنس گئی ہو!“

”انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔“ عزتیل نے مجھے تسلی دی۔ ”آج رات کو میں بعد نماز عشاء ایک

عمل پڑھوں گا۔ تیرے دوست یاسف نے تجھے شاید اس سلسلے میں بتایا ہو۔ عمل سے چند باتیں معلوم

ہو جائیں گی۔ انہی باتوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ میری بچی کسی کی قید میں تو نہیں!“

عزتیل سے یہ سن کر میرے دل کو بہت ڈھارس بندھی۔ میں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

”اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھ اے علیالیش! وہ ہمارے حق میں جو بھی کرے گا، بہتری ہو گا۔“

عزتیل نے کہا، پھر بولا۔ ”تجھے چالیس دن تک میرے پاس رہنا ہے اس لئے اگر تو چاہے تو اپنے

دوست یاسف کو واپس جانے دے۔ پورے چالیس دن تک روزِ عصر اور مغرب کے درمیان مجھے ایک

عمل پڑھ کر تجھ پر دم کرنا ہے۔ انشاء اللہ اس سے تیری کھوئی ہوئی جناتی صفات تجھے واپس مل جائیں

میں دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا اور یاسف کے ساتھ چل دیا۔ ہم دونوں دوست، عزتیل سے خاصے فاصلے پر ایک گھنٹے بیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت عزتیل کا یوں بے خبر سو جانا میرے لئے زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ شدید علیل ہے، اتنا علیل کہ اس کے لئے اٹھنا بیٹھنا بھی دو بھر تھا۔ اس کی عمر ہزاروں سال تھی۔ اصل مرض اس کا بڑھاپا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ انتہائی نحیف اور کمزور ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں عزتیل سے یہ توقع رکھنا لامحالہ ہی تھا کہ وہ سوی کو تلاش کر سکے گا۔

”اے یاسف! یہاں آنا تو بیکار ہی ثابت ہوا۔“ میں نے بچھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ ”مجھے کیا خبر تھی کہ عزتیل اتنا بیمار ہو گا!“

”یہاں آنا بیکار تو نہیں ہوا۔“ یاسف بولا۔ ”اگر ہم یہاں نہ آتے تو تیرا روحانی علاج کیسے شروع ہوتا!“

”پھر..... پھر تو ہی بتا کہ..... کہ سوی کو کون تلاش کرے گا؟ عزتیل اس قابل نہیں رہا اور میری جناتی صفات مجھ سے تقریباً چھن گئی ہیں۔ مجھے تو اس پر بھی حیرانی ہے کہ میں ایک انسانی قالب اپنانے میں کس طرح کامیاب ہو گیا!“

”اس سلسلے میں عزتیل سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔“ یاسف بتانے لگا۔ ”وہ کہتا ہے کہ تیری تمام جناتی صفات چالیس دن کے اندر واپس آسکتی ہیں۔ خود عزتیل تیرا روحانی علاج کرے گا۔ اس کے لئے تجھے عزتیل کے پاس ہی یہ دن گزارنے پڑیں گے۔ پھر تو خود اس قابل ہو جائے گا کہ خود اپنی سوی کو تلاش کر سکے۔ دعا کر میرے دوست کہ چالیس دن تک عزتیل زندہ رہے۔“

”عزتیل کو بھی یہ جان کر بڑا رنج پہنچا ہو گا کہ سوی مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ ”اے یاسف! چالیس دن بہت ہوتے ہیں۔ میں..... میں یہ دن کس طرح گزاروں گا..... آخر کس طرح؟“

”غم کیوں کرتا ہے میرے دوست! یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔“ یاسف نے مجھے دلاسا دیا۔

”اور کیا خبر اس عرصے میں خود سوی تجھ تک پہنچ جائے!“

”تو کیوں مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے! اسے آنا ہوتا تو اب تک آگئی ہوتی۔ خیر..... یہ

بتا کہ عزتیل سے تیری اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟“

”میں نے عزتیل کو وہ سب کچھ بتایا جو تجھ سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے بڑی توجہ سے تمام

باتیں سنیں۔ وہ اس پر مجھے کچھ فکر مند سا بھی نظر آیا کہ تو نے ایک عفریت کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ سوی کے بارے میں عزتیل صرف یہی قیاس آرائی کر سکا کہ وہ ابھی مصرعی میں ہو گی یقینی طور پر وہ

آج رات تجھے کچھ بتا سکے گا۔ اس کے لئے وہ کوئی عمل کرے گا، آج رات کو نماز عشاء کے بعد۔“

یاسف نے تفصیل سے جواب دیا۔

یاسف کے بجائے اس سلسلے میں عزتیل سے براہ راست گفتگو میرے لئے اطمینان بخش ثابت

گی۔ اس وقت تک تجھے اسی انسانی قالب میں رہنا پڑے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ مجھے تیری مکمل صحت یابی تک زندہ رکھے۔“

”آمین!“ میں بول اٹھا، پھر یاسف کی طرف سوالیہ نظرس اٹھائیں۔ ”بول اے یاسف! تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”جب تک سوی کے بارے میں کوئی اطمینان بخش بات معلوم نہیں ہو جاتی، مجھے بے چینی رہے گی۔“ یاسف کہنے لگا۔ ”آج رات کو، عمل کے بعد خدا کرے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے۔ پھر میں آج رات یا کل کسی وقت واپس چلا جاؤں گا۔ اے علیالیش! اس کے باوجود میں تیری طرف سے غافل نہیں رہوں گا اور یہاں تجھ سے ملنے آتا رہوں گا۔“ حالات کے پیش نظر یاسف کے لیے میں نہ تو غیر سنجیدگی تھی، نہ شوخی۔

”اے میرے دوست! تجھ سے مجھے یہی امید ہے۔“ میں نے کہا۔

پھر اسی روز سے عزتیل نے میرا روحانی علاج شروع کر دیا، مگر مجھے اپنے علاج سے زیادہ سوی کی فکر تھی۔

خدا خدا کر کے عشاء کا وقت ہوا۔ عزتیل وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ انسانی قالب اختیار کرنے کے سبب مجھے بھوک بھی محسوس ہونے لگی۔ جنگل میں ایسے پھل دار درخت موجود تھے جن سے پھل توڑ کر میں اپنی بھوک مٹا سکتا۔ سو میں نے یہی کیا۔ یاسف بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں جنگل کے اس حصے کی طرف لوٹ آئے جہاں عزتیل مصروف عبادت تھا۔ اب اس نے عمل پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اپنے عروج پر تھیں، ہونٹوں پر یوگا دعا تھی کہ سوی کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملے۔ میں اور یاسف بڑی بے چینی کے ساتھ عمل کی تکمیل کا انتظار کر رہے تھے۔ عزتیل کو اس عمل میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا، لیکن مجھے یہ مختصر وقت بھی بہت معلوم ہوا۔ ہم دونوں ہی دوست لپک کر عزتیل کے قریب پہنچ گئے۔ ”مبارک ہو تجھے اے علیالیش کہ سوی زندہ ہے۔“ عزتیل نے مجھے پہلی خوش خبری سنائی۔

”وہ کسی کی قید میں بھی نہیں ہے۔“ عزتیل نے بتایا۔ یہ بتاتے ہوئے خود وہ بھی حیرت زدہ تھا۔

”اگر سوی کو کسی نے اپنا قیدی نہیں بنا رکھا تو پھر وہ ہے کہاں؟“ میں نے سوال کیا۔

”میرے عمل اور علم کے مطابق اس وقت بھی سوی ملک مصر ہی میں ہے۔“ عزتیل نے جواب دیا۔

”اے عزتیل!“ یاسف بول اٹھا۔ ”یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ جب سوی آزاد ہے تو پھر وہ علیالیش کے پاس کیوں نہیں آ جاتی؟“

”اس پر تو میں خود بھی حیران ہوں اے یاسف! آخر سوی کی راہ میں ایسی کیا مجبوری ہے کہ یہاں تک نہیں پہنچ سکتی!“ عزتیل بولا۔ ”یا اگر وہ اس ملک کی حدود سے باہر نکلتا نہیں چاہتی تو

کیوں!“

میں جس سے کچھ معلوم کر سکتا، وہ خود لاعلم تھا۔ میرے لئے یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ سوی کے بارے میں جو پتا چلا، اس نے میری بے چینی کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دی۔ سوی کسی کی قید میں بھی نہیں تھی کہ اسے کوئی مجبوری ہوئی۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔

”کاش مجھ میں اتنی طاقت ہوتی اے علیالیش کہ میں اسے تلاش کر کے لا سکتا!“ یہ کہتے ہوئے عزتیل کے لیے میں بڑی بے بسی تھی۔

اسی لمحے میرے ذہن میں جیسے روشنی سی ہو گئی۔ جانے کیوں مجھے اب تک اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔

”لیکن میں..... میں اسے ڈھونڈ کر لا سکتا ہوں!“ میرے لیے میں خود اعتمادی تھی۔

”وہ کیسے اے علیالیش؟“ عزتیل اور یاسف ایک ساتھ بول اٹھے۔

پھر میں نے جو کچھ کہا، اسے سن کر یاسف اور عزتیل دونوں ہی حیران رہ گئے۔

”تجربہ ہے اے علیالیش کہ اتنی سانس کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی!“ یاسف کہنے لگا۔

”ہاں، جب حالات غیر معمولی ہوں تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“ عزتیل نے کہا۔ ”اب تم دونوں

دوست جاؤ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

☆=====☆=====☆

زرا ہی دیر کے بعد یاسف مجھے اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ایک مرتبہ پھر مصر کی طرف جا رہا تھا۔ وقتی طور پر میری جتنی صفات مجھ سے چھین گئی تھیں، مگر یاسف کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھے اٹھائے ہوئے فضا میں پرواز کر سکتا تھا۔ سوی تک پہنچنے کے لئے میں اس کی رہنمائی کرتا۔ سوی مجھ سے جہاں جدا ہوئی تھی، یاسف نے جلد ہی مجھے وہاں پہنچا دیا۔ سوی کے وجود کی مخصوص خوشبو مجھے وہاں دور دور تک محسوس نہیں ہوئی تو میں نے یاسف سے کہا۔ ”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”تو پھر بتا کہ میں تجھے کس طرف لے کر چلوں؟“ یاسف نے دریافت کیا۔

”اب تو ہمیں اسے ہر سمت میں تلاش کرنا ہو گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شہر کی طرف چل

اے یاسف!“

یاسف مجھے ساتھ لیے ہوئے پلٹا۔ چند ہی لمحوں میں ہم دریائے نیل کے اوپر پرواز کر رہے

تھے۔

بس اچانک ہی وہ مجھے نظر آگئی اور میں پوری قوت سے چیخ اٹھا۔ ”سوی!..... سوی! اے سوی!“

وہ دریائے نیل سے جیزا کی طرف پرواز کر رہی تھی۔ یاسف نے بھی اسے دیکھ لیا اور بولا۔

”وہ رہی سوی۔“

مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ میرے آواز دینے کے باوجود سوی نہیں رکی، نہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

عزیز کو اس سے آگاہ کر دیا۔ عزیز نے مجھ سے اتفاق کیا۔
 ”ان حالات میں کوئی عمل کارگر نہیں ہو سکتا۔“ عزیز نے کہا۔ ”کیوں کہ یہ معاملہ مختلف ہے اے علیالیش! اسے کسی ماہر طبیب کو دکھانا پڑے گا۔ وہی اس کا علاج کر سکتا ہے۔ تب تک کے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اس کے گرد ایک حصار کھینچ دوں۔ پھر یہ چاہے گی بھی تو اس حصار سے باہر نہیں نکل سکے گی۔“ عزیز نے یہ کہتے ہی کوئی عمل پڑھنے لگا۔ اس دوران میں یاسف، سوی کو اپنی گرفت میں لیے رہا۔ عمل پڑھ کر بوڑھے عزیز نے اشارے سے سوی کے گرد حصار قائم کر دیا، پھر بولا۔ ”اے یاسف! اب تو اسے چھوڑ دے، یہ کہیں نہیں جاسکتی۔“

یاسف نے سوی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ حصار صرف سوی کے لئے مخصوص تھا اس لئے یاسف پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ حصار اتنا وسیع تھا کہ سوی اس کے اندر آرام سے چل پھر سکے۔ یاسف نے اسے جیسے ہی چھوڑا، اس نے جست بھری اور پھر چیخ مار کر ایک طرف گر پڑی۔ میں اس کے قریب ہی تھا۔ اسے میں نے اٹھا کر بٹھا دیا۔

”تو نے ہی اے آدم زاد! مجھے پکڑ کے گھسیٹا تھا نا؟“ سوی میری طرف دیکھ کر خوفزدہ آواز میں بولی۔ ”مجھے تو نے اپنا قیدی بنا لیا ہے نا؟“ پھر وہ ایک دم زور سے ہنس دی اور بولی۔ ”مجھے شاید خبر نہیں، میں کون ہوں! اگر میں تجھے یہ راز کی بات بتا دوں تو معلوم ہے، کیا ہو گا؟ ڈر کے مارے تو بے ہوش ہو جائے گا، مگر مجھے اس سے کیا تیرے دل کی دھڑکن رکے تو رک جائے، تو ہوش میں نہ رہے تو نہ سہی!“ اس کے بعد سوی کا لہجہ راز دارانہ ہو گیا۔ ”میں ایک جن زادی ہوں“ سمجھ گیا نا!..... تو پھر جلدی سے بے ہوش ہو جا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔“

سوی اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرتی کرتی رہی۔ کبھی اس کی باتوں میں ربط ہوتا اور کبھی یہ باتیں قطعی بے ربط ہوتیں۔

میں نے ایک طبیب کی حیثیت سے کئی ایسے مریضوں کا علاج کیا تھا جو کسی صدمے کے سبب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ مریض کتنے عرصے میں شفا یاب ہو سکتا ہے، اس کا انحصار مرض کی نوعیت و شدت پر ہے۔ اس میں ایک دن سے لے کر ایک مہینہ تک لگ سکتا تھا۔
 ”اے میرے دوست یاسف! تو جانے سے پہلے میرے دو کام اور کر دے۔“ میں نے یاسف کو مخاطب کیا۔

”مجھے یہاں سے جانے کی کوئی ایسی جلدی نہیں اے علیالیش!“ یاسف پر خلوص لہجے میں بولا۔
 ”بول تجھے مجھ سے کیا کام ہیں؟“

”پہلا کام تو یہ ہے کہ مجھے تجھ سے سوی کے لئے کچھ دوائیں منگوانی ہیں۔“ میں نے بتایا۔
 ”دوسرا کام یہ ہے کہ تجھے ایک مرتبہ پھر قاہرہ جانا پڑے گا۔“

”قاہرہ؟“ یاسف نے اظہار حیرت کیا۔ ”اب تو مجھے کس لیے قاہرہ بھیجنا چاہتا ہے؟“
 ”وہاں تو جس ہوٹل میں ہمارے ساتھ ٹھہرا تھا، ہمارا سامان اس کے کمرے میں پڑا ہے۔ سامان

”اے علیالیش! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے سوی اپنے حواس میں نہ ہو۔“ یاسف نے مجھ سے اور سوی کے پیچھے پکا۔

ایک مرتبہ پھر میں نے سوی کو آواز دی، مگر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئی۔ یاسف اب مجھے اٹھائے سوی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سوی کو جب میں نے نزدیک سے دیکھا تو چونک اٹھا۔ وہ وحشت زدہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے اور یاسف کو دیکھنے کے یاجود سوی اجنبی بنی رہی۔
 ”تیرا اندازہ مجھے درست ہی لگتا ہے اے یاسف!“ میں بولا۔ ”سوی اپنے ہوش میں نہیں ہے۔“

میرے ایما پر یاسف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ چیختے لگی۔ ”علیالیش مر گیا..... مر گیا وہ!“ سوی یہ کہہ کر زور سے ہنس پڑی۔
 ”دیکھ..... دیکھ اے سوی کہ تیرا علیالیش مرا نہیں، زندہ ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سوی کو مخاطب کیا۔

”تو..... تو علیالیش نہیں۔“ سوی چیخی۔ ”تو..... عفریت ہے، عفریت!..... دی عفریت کہ جس نے میرے علیالیش کو مار ڈالا!“

”اے یاسف! اسے عزیز کے پاس لے چل!“ میں نے اپنے دوست کو مشورہ دیا۔
 دوسرے ہی لمحے یاسف نے اوپنی پرواز کی اور اپنی سمت سربدل دی۔ سوی کی حالت دیکھ کر اور اس کی باتیں سننے کے بعد میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوا کہ اس پر کیا گزری ہے! بیٹنا صدمے کی وجہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اس نے عفریت کو مجھ پر حملہ کرتے دیکھا ہو گا۔ اس سے یہی سمجھی ہو گی کہ عفریت نے مجھے مار ڈالا۔ پھر اسے اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ اپنے ہوش گموا بیٹھی۔

اب یہ معاملہ ہو چکا تھا کہ کسی کی قید میں نہ ہونے پر بھی سوی مجھ تک کیوں نہیں پہنچی وہ اپنے حواس میں ہوتی تو ایسا ممکن تھا۔ عزیز نے اپنے علم کے ذریعے جو کچھ پتا لگایا، وہ غلط نہیں تھا۔ ڈھاکہ پہنچنے تک کئی مرتبہ سوی نے یاسف کی گرفت سے نکل جانا چاہا، مگر ناکام رہی۔ یاسف پوری طرح چونکا اور محتاط تھا۔ ہمیں سوی کو تلاش کر کے مہر کے شر قاہرہ سے ڈھاکہ پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

عزیز نے سوی کو دیکھا تو جیسے اس کے ناتواں وجود میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔
 ”میری بچی!..... میری سوی!“ عزیز نے اس سے لپٹ گیا۔ ”تو کہاں چلی گئی تھی؟“
 ”اے عزیز! اسے چھوڑ نہ دیجو کہ یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔“ یاسف بول اٹھا۔ ”اگر تو نے اسے چھوڑ دیا تو یہ پھر کسی طرف نکل جائے گی۔“

”لیکن..... لیکن اسے ہوا کیا؟ یہ..... یہ اتنی وحشت زدہ کیوں ہے؟“ عزیز حیرت سے بولا۔ ”یہ تو شاید اپنے باپ کو بھی نہیں پہچان رہی۔“ سوی کی حالت دیکھ کر میں نے جو قیاس کیا

میں سونا بھی ہے اور خاصی کرنسی بھی۔ موجود حالات میں کچھ خبر نہیں کہ ہم اب دوبارہ کب سکیں اس لئے وہاں سے وہ سامان نکال کر لانا ضروری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اس پر یوسف کہنے لگا۔ ”حیرت ہے اے علیالیش کہ اب تک تیرے داغ سے قاہرہ پر خیال نہیں لکھا! تو اتنی بڑی مصیبت کا شکار ہو چکا ہے۔ تیری جناتی صفات تجھ سے چھن چکی ہیں سو اپنے ہوش کھو بیٹھی ہے۔ پھر بھی تو نے اس سے کوئی نصیحت نہیں پکڑی! لعنت پڑھ ان کے غلاموں پر!“ پھر وہ عزتیل سے مخاطب ہوا۔ ”اے عزتیل! تو ہی علیالیش کو کچھ سمجھا۔“

”اے یوسف! تیرے دوست نے اپنی زندگی کے لئے جس راہ کا انتخاب کیا ہے، یہ اسے حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔“ عزتیل بولا۔ ”ہر چند کہ یہ راہ بڑی کنھن ہے مگر تیرا دوست حق ہے، میں اسے روکنے یا منع کرنے سے قاہر ہوں۔“

”پھر تو اس کا اللہ ہی مالک ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”ویسے بھی میں بہت عرصے پہلے اسے چکا ہوں۔“

اس کے بعد یوسف کو میں نے وہ دوائیں بتائیں جو اسے لانی تھیں۔ خود یوسف بھی ایک لٹکان کے دوران قیام میں میری نیابت کر چکا تھا۔ مجھے اسی لئے یقین تھا کہ دوائیں لانے میں وہ نہیں کرے گا۔ یوسف چلا گیا۔

عزتیل حیرت سے یہ سب سنتا اور دیکھتا رہا۔ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے حکمت پر بھی حاصل ہے۔ اس کے استفسار پر میں نے مختصراً اسے بتا دیا کہ ایک جن زاد طبیب خاشع سے، سیکھی تھی۔ عزتیل نے اس پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا۔ ”پھر تو سوی کا علاج تجھ سے بہتر اور کا سکتا ہے!“

”اے عزتیل! علاج کرنا طبیب کا کام ہے اور مریض کو شفا دینا اللہ کا کام۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے کہ وہ سوی کو شفا دے گا۔ پہلے بھی میں نے ایسے کئی مریضوں کا علاج کیا ہے۔“ میں عزتیل کو بتایا۔ پھر عزتیل کو میں نے سو جانے کا مشورہ دیا کیوں کہ وہ مجھے مذہال سا دکھائی دے تھا۔ اس کے لئے اب تک جاگتے رہنے کی مشقت بھی بہت تھی۔

”تو کتنا ہے اے علیالیش، تو میں سو جاتا ہوں۔“ عزتیل مان گیا۔ ”دراصل جب سے میں پڑا ہوں، بعد نماز عشاء صبح تک کے لئے سو جاتا ہوں۔ اسی سبب ایک عرصہ ہو گیا کہ میں نماز بھی نہیں پڑھ سکا۔ اب تو فرض نمازیں ہی ادا ہوتی رہیں تو غنیمت ہے۔“

پھر عزتیل سونے کے لئے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنے دوست کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

حصار میں قید ہونے کے بعد کچھ دیر تک تو سوی نے اس سے نکلنے کے لئے اچھل کود کی تھک کر ایک طرف پڑ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ میری ہی میں اس حال کو پہنچی تھی۔

کچھ دیر میں جب یوسف لوٹ کر آیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے ایک ہی پھیرے میں دونوں کر دیئے تھے۔ وہ دوائیں بھی لے آیا تھا اور قاہرہ سے ہمارا سامان بھی۔ سوی کو جو دوائیں دینی تھیں، ان میں سے کچھ کو کونٹا، چھانٹا اور سنوف بنانا ضروری تھا۔ یوسف اس کے لئے بھی ضروری سامان ساتھ لے کر آیا تھا۔ دوائیں تیار کرنے میں وہ میری مدد کرتے لگا۔

اب حالات بڑی حد تک قابو میں آچکے تھے اس لئے یوسف کی شوخی بھی لوٹ آئی۔ وہ ایک کو ہاں دیتے میں کونٹے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔ ”اے علیالیش! آخر موقع ملے ہی تو نے ایک عرصے کے بعد مجھے اپنے ساتھ مزدوری پر لگا ہی لیا!“

”میں نے تو تجھے اس پر مجبور نہیں کیا تھا!“ میں بولا۔ ”تو خود ہی اپنی بھابی سوی کی محبت میں اٹھ بٹانے بیٹھ گیا۔“

”اور تجھے اپنی بھابی امغری بیگم کا ذرا خیال نہیں کہ میرے فراق میں وہ بے چاری کروٹوں پر دھن بدل رہی ہو گی۔“

”سمات امغری بیگم سابق زوجہ قمر احمد کب سے میری بھابی ہو گئیں؟ کیا تو نے ان خاتون سے جانچ پڑھو لیا؟“

”نکاحی اور بے نکاحی عورت کا تو نے خوب شوشہ چھوڑا ہے اے علیالیش!“ یوسف دھیرے دھیرے ہنسا۔ ”امغری بیگم نے جیسی سے میرا نکاح میں دم کر رکھا ہے۔“

”تو نکاح کر کیوں نہیں لیتا! کب تک آخر گناہ کمائے گا؟“ میں نے کہا۔

”دیکھ اے علیالیش! کم سے کم تو میرے سامنے مولوی نہ بن! میں تجھے بچپن سے جانتا ہوں۔

کتنا بڑا پار سا ہے، مجھے سب معلوم ہے!“

”میں نے کبھی اپنی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں تو خدا کا خود ایک گناہ گار بندہ ہوں، مگر اب ناہوں سے توبہ کر چکا ہوں۔ تو کیوں کہ میرا دوست ہے اس لئے تجھے سمجھاتا رہتا ہوں کہ اپنی رکوتوں سے باز آجا!“

”امغری بیگم سے میں نکاح تو کر لوں مگر اس میں ایک سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ بتا کہ

نکاح کا نکاح پیر برکت علی شاہ سے ہو گیا پھر جن زاد یوسف سے؟ تجھے تو خبر ہے کہ میں نے اب تک امغری بیگم پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی۔“

”یہ کوئی ایسی زکاوت نہیں۔“ میں بولا۔ ”تو اس سے کہہ سکتا ہے کہ تیرا اصل نام یوسف ہے۔“

”ہاں یہ ممکن تو ہے لیکن وہ یہ ضرور پوچھے گی کہ میں نے اب تک اس سے اپنا اصل نام کیوں چھپایا!“

”کوئی بھی بہانہ کر دیجو! جھوٹ بولنے میں تو یوں بھی تیرا کوئی جواب نہیں اے یوسف!“ میں نے ہلکی سی۔

”اب تو مجھے میرے ہی منہ پر جھوٹا کہہ رہا ہے!“

”کبھی کبھی سچ بات بھی سن لیتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

ہم دونوں دوست اسی طرح ایک دوسرے پر فقرے بازی کرتے رہے اور سوی کے دوائیں تیار ہو گئیں۔ سوی اس وقت تک حصار کے اندر سوچتی تھی۔ میں نے دوائیں پلانے کے لیے اسے جگایا تو وہ اٹھتے ہی مجھ سے الجھ پڑی۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی!“ سوی چیخنے لگی۔ ”تو وہی عفریت ہے جس نے میری علیالیش کو قتل کیا ہے۔“

اگر اس وقت یاسف موجود نہ ہوتا تو میرے لیے سوی کو سنبھالنا اور دوائیں پلانا مشکل جاتا۔ ایک دوا اسے سنبھالنے کی بھی تھی۔ اس دوا کو میں نے دانستہ سب سے آخر میں سنبھال دیا۔ اس دوا کے اثر کا علم تھا۔ چند ہی لمحوں میں سوی پر غفلت طاری ہو گئی۔

”اے علیالیش! اس طرح تو سوی کو دوائیں پلانا تیرے لیے بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“ یاسف۔
تشویش کا اظہار کیا۔ ”سوی کے باپ عزتیل میں اتنا دم نہیں کہ وہ اسے سنبھال سکے۔ تن تنہا تیرے قابو میں سوی آئے گی نہیں۔“

”انشاء اللہ دواؤں کی دوسری خوراک پلانے کے بعد سوی کی یہ حالت نہیں رہے گی اس کی وحشت کم ہو جائے گی۔ یوں سمجھ اے یاسف کہ بس کل صبح تک کی خوراک پلانا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”تو پھر میں کل صبح تک کے لیے رک جاتا ہوں۔“ یاسف نے خود ہی پیشکش کی۔

”ہاں رک جا تو اچھا ہے۔“ میں نے کہہ دیا۔

پھر یاسف کے ساتھ میں ایک گھنے بیڑ کے نیچے آکر لیٹ گیا۔ وہاں گھاس لمبی اور نرم تھی۔

”میں تجھے ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا اے علیالیش!“ معاً یاسف نے مجھے مخاطب کیا، پھر

ہی بولا۔ ”لیکن تجھے بتانے سے کیا فائدہ!“

”تو پھر یہ ذکر ہی تو نے کیوں چھیڑا تھا؟“

”دراصل مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ اب تو مولوی بن چکا ہے۔ تجھ سے حسین ورتین باپ

کرنے کا کچھ حاصل نہیں۔“

”ایسا ہے تو دفع کر یہ ذکر اور مجھے سونے دے۔“ میں نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی۔

”اے علیالیش! ادھر منہ کر۔“ یاسف نے یہ کہہ کر خود ہی میری کروٹ بدل دی۔

”تجھے کسی طرح چین بھی ہے یا نہیں اے یاسف!“

”چین ہی تو نہیں ہے میرے دوست! جب سے اسے دیکھ کر آیا ہوں، ہوش اڑ گئے!

میرے!“

”تو پھر کل صبح سوی کے ساتھ تجھے بھی دوا کی ایک خوراک پلا دوں گا۔ تیرے ہوش ٹھکا

آجائیں گے۔“ میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

”ہائے اے مولوی علیالیش! تو نے اس نازک و حسین ترین آدم زادی کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر

تو اسے ایک نظر دیکھ لیتا تو مجھے یقین ہے کہ تجھے اپنی توبہ پر ضرور انوس ہوتا۔ اپنی ایک ہزار سال

کی زندگی میں ایسی آدم زادیاں میری نظر سے کم ہی گزری ہیں۔“

”اے یاسف! تو یہ کیا بے پر کی اڑائے جا رہا ہے! آخر وہ ہے کون؟ تو نے اسے کب اور کہاں

دیکھ لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اسی جنگل میں چند میل کے فاصلے پر ایک عمارت کی چھت پہ اسے میں نے محو خواب دیکھا

تھا۔“ یاسف بتانے لگا۔ ”یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب تو نے مجھے دوائیں لینے بھیجا تھا۔ اگر مجھے

یہ اشد ضروری کام نہ ہوتا تو میں فوراً اس عمارت کی چھت پر اتر جاتا۔“

”اس وقت تو تجھے کوئی ضروری کام نہیں۔ تجھے اگر اس آدم زادی کی اتنی ہی یاد آ رہی ہے تو

اب چلا جا اور مجھے سونے دے۔“

”سوچ لے اے علیالیش! تو ہی مجھے ترغیب گناہ دے رہا ہے۔“ یاسف اٹھتے ہوئے بولا۔

”تیرے ہی کہنے پر میں جا رہا ہوں۔“

”تجھے تو جانے کا بہانہ چاہیے تھا، سول گیا۔ مجھ پر الزام نہ لگا۔“ میرے الفاظ معلوم نہیں

اس نے سنے یا نہیں! دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو چکا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ رات کو یاسف کب واپس

آیا! میں سوچا تھا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو یاسف موجود تھا۔

جھیل پر جا کر میں نے منہ دھویا اور درختوں سے کچھ پھل توڑ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔

اب مجھے سوی کو دواؤں کی دوسری خوراک پلانی تھی اس لیے مجبوراً یاسف کو جگانا پڑا۔ وہ بڑی مشکل

سے اٹھا کیوں کہ بے خبر اور گہری نیند سو رہا تھا۔ اسی وقت عزتیل ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔

”اے علیالیش! اب سوی کا کیا حال ہے؟“ عزتیل نے مجھ سے معلوم کیا۔

”رات ہی کو اسے میں نے دواؤں کی ایک خوراک پلا دی تھی۔ دوسری خوراک اب دینی

ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ آج شام کو جب تیسری خوراک پی لے گی تو کچھ کما جا سکتا ہے۔ اللہ کی

ذات سے امید تو ہے کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ ممکن ہے تیسری خوراک کے بعد ہی وہ صدمے

کی کیفیت سے نکل آئے۔“

”خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔“ عزتیل نے کہا۔ ”میں نے بھی ابھی نماز پڑھ کر اس کے لیے دعا

کی ہے۔“

عزتیل میرے اور یاسف کے ساتھ ہی وہاں تک چلا آیا جہاں سوی حصار کے اندر محو خواب

تھی۔ توقع کے مطابق جیسے ہی میں نے سوی کو جگایا وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑی۔

یاسف کسی ایسے ہی موقع کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے سوی کو گرفت میں لے لیا۔

”اے ظالم عفریت! میں تیرا خون پی جاؤں گی!“ سوی میری طرف دیکھ کر غرائے لگی۔

”تم ضرور اس کا خون پی جانا مگر پہلے دوائیں پی لو۔“ یوسف اس طرح بولا جیسے کسی بچے کو کہا رہا ہو۔

بہر حال میں نے سوی کو دوائیں پلا دیں اور آخر میں ایک دوا سنگھا بھی دی۔ سوی کو غافل ہونے میں دیر نہ لگی۔
عزیزیل کو فکر مند دیکھ کر اس سے میں نے کہا۔ ”یہ غفلت اس دوا کا اثر ہے جو میں نے سنگھائی ہے۔“

میری اس وضاحت پر عزیزیل مطمئن ہو گیا۔ اسے میں نے یہ بھی بتا دیا کہ دوا کی تیری خوراک پلاتے وقت سوی کو گرفت میں لینے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ عزیزیل کہنے لگا۔ ”میں اسی وجہ سے کچھ پریشان تھا کیوں کہ تیرا دوست یوسف تو شاید اب چلا جائے گا“ رہ گیا میں تو میرے اندر اتنا دم نہیں۔“

”چل اے علیالیش“ کچھ دور تک تو مجھے چھوڑنے چل!“ یوسف مجھ سے مخاطب ہوا۔
”تو کیوں میرا مذاق اڑا رہا ہے اے یوسف! تجھے خبر ہے کہ میں تیری طرح فضا میں.....“
”تجھ سے اپنے ساتھ اڑنے کو میں کب کہہ رہا ہوں! تو پیدل تو میرے ساتھ کچھ دور چل سکتا ہے۔“ یوسف بول اٹھا۔
”ہاں یہ ممکن ہے۔“ میں راضی ہو گیا۔

”اچھا اے عزیزیل! اب مجھے اجازت دے۔ میں کوشش کروں گا کہ یہاں آتا رہوں۔“ یوسف نے عزیزیل سے کہا۔

جواب میں یوسف کو عزیزیل نے دعائیں دیں۔ یوسف نے میرا ہاتھ تھام لیا اور درختوں کے اس جھنڈ سے نکلنے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔

اچانک جب یوسف نے مجھے زمین سے اٹھا کر فضا میں اڑنا شروع کر دیا تو میں بولا۔ ”ارے ارے! تو یہ کیا کر رہا ہے اے یوسف؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تو بھی ایک نظر اس عمارت گر ہوش و خرد کو دیکھ لے جس نے مجھے اپنا نام پوجا دیوی بتایا تھا۔“ یوسف نے جواب دیا۔

”مگر میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا؟ اس کافر آدم زادی سے میرا کیا تعلق؟“
”تعلق نہیں ہے تو بن جائے گا۔ یوسف نے مسکرا کر کہا۔

”کیا مطلب ہے تیرا؟ میں سمجھا نہیں اے یوسف!“
”اے علیالیش! تو نے اس وقت جو قالب اپنا رکھا ہے، پوجا سے میں اسی قالب میں ملا تھا۔“

یوسف نے بتایا۔
”یہ حرکت تو نے کیوں کی اے یوسف؟ کیا ضرورت تھی تجھے اس کی؟“ میں جھنجھلا گیا۔

”صرف اس امید پر کہ شاید مچ کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے!“ یوسف نے ڈھٹائی کے

ساتھ کہا۔ ”میں بھی تو دیکھوں کہ تیری توبہ اس کے سامنے کب تک نہیں ٹوٹی! میں نے اسی لئے اسے تیرا پتا بھی بتا دیا ہے تاکہ جدائی برداشت نہ ہو تو وہ تجھے ڈھونڈتی ہوئی تیرے پاس چلی آئے۔“
”تو نے مجھے اس امتحان میں ڈال کر کچھ اچھا نہیں کیا اے یوسف! کیا خبر اس کا کیا نتیجہ نکلے!“
”نتیجہ تو کسی حسین حادثے کی صورت ہی میں نکلتا ہے، پھر گھبراتا کیوں ہے! ایسے میں تو تجھے سوی کی طرف سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

”اے یوسف! میں، سوی سے نہیں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔“
”امشاء اللہ بڑے ہی نیک خیالات ہیں۔ تجھے روزِ محشر یقیناً اس کا اجر ملے گا میرے دوست!“
مجھ سے یہ گفتگو کرنے کے لیے یوسف دانستہ دھیمی رفتار سے اڑ رہا تھا ورنہ کوئی جن زاد چند میل کا وہ فاصلہ لمحے میں طے کر سکتا تھا۔ یوسف نے میرے ساتھ اپنی دانست میں جو شرارت کی تھی، مجھے وہ گمراہی تو گزری مگر آئندہ اس کے کتنے بھیانک نتائج نکلیں گے، یہ اندازہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی بظاہر کوئی بے ضرر اور معصوم سی شرارت بھی گلے پڑے جاتی ہے۔

فضا میں پرواز کرتا ہوا یوسف درختوں کے درمیان گھری ہوئی ایک عمارت کی چھت پر اتر گیا۔
میں نے اس پر احتجاج کیا۔ ”یہ تو یہاں کیوں اتر گیا؟ دور ہی سے اس عمارت کو دکھا دیتا۔“
”تجھے میں یہاں سے عمارت دکھانے نہیں، اس آدم زادی پوجا کو دکھانے لایا ہوں۔“ یوسف یہ کہہ کر مجھے ساتھ لیے عمارت کی بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھا۔ وہاں سے نیچے گھر کے آنگن میں جھانکنا ممکن تھا۔

یوسف کے اصرار پر میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک سرد قد حسین ترین آدم زادی آنگن میں گئے ہوئے پودوں اور گملوں کے اندر ایک لوتے سے پانی ڈال رہی تھی۔
بہشتی رنگ کی ساڑھی میں اس کے بدن کا رنگ جیسے باہر چھلکا پڑ رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ زلفوں کی گھٹنا اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھی۔ ہرینوں جیسی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کے سائے تھے۔
ابھرے ابھرے سے ہونٹ اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ جسم بلا کا مناسب تھا۔ میں بہ مشکل اس کی طرف سے اپنی نظریں ہٹا سکا۔ واقعی وہ اتنی ہی حسین تھی، بنگال کے حسن کا منہ بولتا جادو! ایسا جادو جو فوراً سر چڑھ کر بولنے لگے۔

”مم..... مجھے..... مجھے یہاں سے لے چل اے یوسف!“
یوسف نے میری کیفیت بھانپ لی اور دھیرے سے بولا۔ ”کیوں“ اڑ گئے نا ہوش! مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ اب تو یقیناً تجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا کہ میں نے تیرا انسانی قالب کیوں اختیار کیا! اور سن! میں نے اسے اپنا نام بھی مقصود میاں بتایا تھا اور تیری ہی آواز میں اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ دیکھ لے اے علیالیش، میں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ تیرے اور پوجا کے درمیان میں نے کوئی دیوار باقی نہیں رہنے دی۔ اب تو اس سے ملے گا تو وہ تجھی کو اپنا محبوب سمجھے گی۔ تو ہی اس کا حاصل زندگی ہو گا“ میں نہیں۔“

میرے ذہن خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کافر زادی کے حسین خدوخال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کے لئے میں لاجول پڑھنے لگا۔ وہاں سے چلتے چلتے یاسف نے مجھے ایک مرتبہ پھر چھیڑا۔ ”چاہے تو اسے ایک بار اور دیکھ لے۔ اس وقت وہ ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لے رہی ہے۔“

”نہیں دیکھنا مجھے!“ میں نے تیزی سے کہا اور اسی لمحے یاسف نے مجھے اٹھالیا۔

”اے علیالیش! میں دانستہ دھیمی اور نیچی پرواز کر رہا ہوں تاکہ تجھے اس عمارت تک پہنچنے کا راستہ یاد رہے۔“ یاسف مجھ سے کہنے لگا۔

میں جواب میں کچھ نہیں بولا۔ میرے ذہن میں تو یہ سوال بار بار گردش کر رہا تھا کہ اس گھنے جنگل میں آبادی سے دور وہ آدم زادی پوجا دیوی کیوں رہ رہی تھی؟ دو پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی وہ ڈال اب تک میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

یاسف نے مجھے واپس جھیل کے قریب چھوڑ دیا۔ غیر ارادی طور پر پوجا کے گھر کا راستہ میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا حالانکہ وہاں پھر کبھی میرے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ رخصت ہونے سے قبل یاسف نے مجھ سے کہا۔ ”اے علیالیش! تو میرا شکریہ ادا کر یا نہ کر مگر اتنا تو اعتراف کر ہی لے کہ پوجا واقعی ایک حسین ترین آدم زادی ہے۔ میں نے تجھ سے اس کی تعریف غلط نہیں کی تھی۔ کیا تیرے اندر یہ سچ بولنے کا حوصلہ بھی نہیں!“

”تو آخر کیوں مجھے ستانے پر تلا ہوا ہے اے یاسف!“

”مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔“ یاسف ہنس دیا اور پھر مجھے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اس وقت تک دھوپ نکل آئی تھی۔ جنگل کا وہ حصہ اتنا گھنا تھا کہ درختوں کے درمیان سے بس کہیں کہیں دھوپ جیسے چھن چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ میں اس طرف قدم اٹھانے لگا جہاں عزتیل اور سوی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے اپنی جنائی صفات واپس ملنے تک وہاں چالیس دن گزارنے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اس سملت سے خاصا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ عزتیل ایک عالم جن زاد تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی عبادت کرتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ مجھے متعدد ایسے عمل تعلیم کر سکتا تھا جو شیطانی قوتوں پر غالب آنے میں میرے مددگار ثابت ہوں۔

میں یہی سوچتا ہوا عزتیل کے پاس پہنچ گیا جو ایک گھنے پیڑ کے نیچے سائے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہ ہوئی۔

”اے عزتیل!“ میں نے اسے پکارا۔ ”تیری طبیعت کیسی ہے؟“

”اچھی نہیں ہے۔“ اس نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

”تو کیا محسوس کر رہا ہے؟“ میں نے اس کی کیفیت جاننے کے لیے پوچھا۔

”مجھے یوں لگ رہا ہے اے علیالیش کہ جیسے میرے وجود کو کوئی اندر ہی اندر کالے ڈال رہا ہے۔“ عزتیل نے بتایا۔

”کیا کبھی تجھے کوئی شدید ضرب لگی تھی؟“ میں نے معلوم کیا۔

”ہاں تو نے صحیح اندازہ لگایا اے علیالیش! یہ ایک پرانی ہی چوٹ ہے جو دکھ دے رہی ہے۔“

”تو نے شاید پہلے اس پر توجہ نہیں دی تھی یہ تکلیف رفتہ رفتہ بڑھ گئی۔“ میں نے کچھ

سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر تو پہلے ہی اس کا علاج کر لیتا تو.....“

”چھوڑ اس ذکر کو۔“ عزتیل نے میری بات کاٹ دی۔ ”تقدیر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے!“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”اے عزتیل! تو عالم ہے اور میں تیرے سامنے طفل مکتب۔“ میں بولا۔ ”پھر بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ تقدیر کا تعین بندے کے عمل سے وابستہ ہے۔ عمل کے ذریعے بندہ اللہ کی مدد سے اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔“

”تیری باتوں میں گمراہی اور دانش ہے۔“ عزتیل کہنے لگا۔ ”کاش تجھے کچھ عرصے میرے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہوتا۔“

”اب تو مجھے یہ موقع حاصل ہے اے عزتیل!“ میں فوراً بول اٹھا اور جو سوچا تھا اس سے کہہ دیا۔

”ٹھیک کہتا ہے تو، مگر میری زندگی کا اب کیا بھروسہ! کیا خبر میں کتنے دن اور جی سکوں!“ عزتیل کہنے لگا۔ ”میں نے اس کے لئے ایک تدبیر سوچی ہے۔ پھر اگر تیرا پورا روحانی علاج کرنے سے پہلے میرا آخری وقت بھی آگیا تو اس تیرے علاج پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں تجھے صرف تین دن کے اندر اندر اس قاتل بنا دوں گا کہ تو خود اپنا روحانی علاج کرنے کا اہل ہو جائے۔ اس کے لئے میں تجھے کچھ اور وظائف تعلیم کروں گا۔ تجھے روزانہ نماز ظہر سے نماز عصر تک تین دن کے دوران میں میری ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔“

”اے عزتیل! میں آج ہی سے تیری ہدایات پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔“ میں فوراً ہی راضی ہو گیا۔

”اچھا تو پھر میں تجھے جو قرآنی آیات بتاتا ہوں، تو انہیں یاد کر لے۔ تجھے ظہر سے عصر تک انہی آیات کا ورد جاری رکھنا ہے۔ اس تین دن کے عرصے میں تجھے ایک وقت کی نماز بھی نہیں چھوڑنی! اگر تجھے آج ہی سے عمل کرنا ہے تو فجر کی قضا پہلے پڑھ لے اور سن کہ نماز فجر کی دو سنتیں مکروہ ہیں، یعنی انہیں پڑھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ سو دو فرض رکعتوں سے پہلے تجھے سنتوں کی بھی قضا ادا کرنی ہے۔“

فجر کی قضا نماز پڑھنے پر آمادگی ظاہر کر کے میں اسی وقت جھیل کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے وضو کرنا تھا۔

وضو کر کے میں پیڑوں کے درمیان اس جگہ پہنچا جہاں میرا سامان رکھا تھا۔ یہ وہی سامان تھا جو میں نے قاہرہ سے یاسف کے ذریعے منگوایا تھا۔ اپنا سوٹ کیس کھول کر میں نے دھلی ہوئی ایک

صاف چادر نکالی لی اور اسے قبلے کے رخ بچھا کر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

نماز پڑھ کر میں نے اپنی اور سوی کی صحت و تندرستی کے لئے دعا مانگی، اسی کے ساتھ شرکی قوتوں پر غلبہ پانے کے لئے دعا کی۔ پھر میں نے چادر جھانک کر دوبارہ سوٹ کیس میں رکھ دی اور عزتیل کے پاس آگیا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ایک طبیب کی حیثیت سے میں نے تیری جو کیفیت سنی ہے اے عزتیل، مجھے اس سے ایک امید بندھی ہے۔ میں تیری مکمل صحت یابی کا دعویٰ تو نہیں کرتا، ہاں یہ ممکن ہے کہ تیری تکلیف قابل برداشت حد تک کم ہو جائے۔ اسی جنگل میں ایک خاص قسم کا خود رو پودا پایا جاتا ہے۔ اس سے تیرے لئے ایک دوا تیار کر سکتا ہوں۔“

”رہنے دے اے علیالیش! تو کہاں اس پودے کو ڈھونڈتا پھرے گا۔“ عزتیل مایوس آواز میں کہنے لگا۔

”تو مجھے کوشش تو کر لینے دے۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس پودے کو میں تلاش کر لوں گا۔“

میرے بعد ہونے پر عزتیل مان گیا اور میں اس مخصوص پودے کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ اس کی پتیاں توڑ کر میں نے کھل کیں اور ایک گاڑھا شربت بوتل میں بھر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے۔ اس کا انحصار مرض کی صحیح تشخیص اور مناسب دوا پر ہے۔

شربت کی وہ بوتل لے کر میں عزتیل کے پاس آگیا اور کہا۔ ”تجھے یہ شربت دن میں چار مرتبہ ایک ایک گھونٹ پینا ہے۔ انشاء اللہ پہلی ہی خوراک میں تجھے افادہ ہوگا۔ یہ شربت تجھے پابندی سے روز پینا ہے۔ جب یہ بوتل ختم ہو جائے گی تو میں اور شربت بنادوں گا۔ میں تجھے یہ پہلے ہی بتا دوں کہ تیرا پوزھا دودھ اس شربت کی تیزی کو فوری طور پر قبول نہیں کرے گا۔ یہ شربت پیچھے ہی تقریباً نصف گھنٹے تک تجھ غودگی طاری رہ سکتی ہے، پھر یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ ابتدائی چند روز اسی طرح گزر رہے، اس کے بعد تو شربت کا عادی ہو جائے گا اور غودگی نہیں ہوا کرے گی۔“ میں نے کہہ کر خود ہی عزتیل کو شربت کی پہلی خوراک پلا دی۔ اس کا نتیجہ میرے انداز کے مطابق ہی نکلا۔ عزتیل غافل ہو گیا۔

وہاں سے اٹھ کر میں سوی کے قریب آگیا۔ دواؤں کے زیر اثر وہ بھی غفلت میں پڑی تھی۔ میں نے اپنے خدا کا شکر ادا کیا کہ جس نے مجھے حکمت سیکھنے پر راغب کیا۔ دراصل خدا ہی اپنے بندوں کو راہ راست دکھاتا ہے۔ اگر اس نے مجھے حکمت کے علم سے سرفراز نہ کیا ہوتا تو آج میں نہ تو اپنی سوی کا علاج کر پاتا، نہ ہی خلق خدا کی خدمت میرے لئے ممکن ہوتی۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا تو عزتیل جاگ اٹھا اور پھر خلاف توقع اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تو نے ٹھیک ہی کہا تھا اے علیالیش!“ عزتیل مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس شربت کی پہلی ہی خوراک سے میری تکلیف آدمی رہ گئی ہے۔“ پھر وہ ایک دم چونک اٹھا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ وہ بولا۔ ”میرے علاج کی وجہ سے تو اپنا علاج تو بھول ہی گیا! میں تجھے کچھ آیات یاد کرانے والا تھا۔“

”ابھی دوپہر ہونے میں خاصا وقت ہے۔ تو مجھے یہ آسانی وہ آیات یاد کرنا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

پھر عزتیل نے ایک ایک کر کے مجھے سات مختلف سورتوں کی سات آیات یاد کرنا شروع کیں۔ مجھے ان آیات کو یاد کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کہیں کہیں تلفظ کی غلطیاں تھیں، عزتیل نے ان کی اصلاح کر دی۔

اسی روز میں نے عزتیل کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، اسے شربت کی دوسری خوراک پلائی اور ان آیات کا درد کرنے بیٹھ گیا جو یاد تھیں، عصر کی نماز کا وقت ہونے تک میں ان آیات کا درد کرتا رہا۔ اس کے بعد عزتیل کو مغرب تک میرے لئے عمل پڑھنا تھا۔ عصر کی نماز بھی ہم نے ایک ساتھ ادا کی۔

میں خاصی دیر تک ایک ہی جگہ بیٹھا رہا تھا اس لئے اٹھ کے چل قدمی کرنے لگا۔ مغرب کے وقت سے کچھ پہلے میں نے دواؤں کی تیسری خوراک پلانے کے لئے سوی کو بیدار کیا۔ اس مرتبہ سوی مجھ پر حملہ آور نہیں ہوئی اور کسی جھگڑے بغیر خاموشی سے دوائیں پی لیں۔ اب اسے غافل کر دینے والی دوا سنگھانا ضروری نہیں رہا تھا۔ سو میں نے وہ دوا نہیں سنگھائی۔ اس کے باوجود سوی نڈھال سی ہو کر ایک طرف پڑ رہی۔ ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے سوی کچھ بڑبڑا رہی ہو۔ میں اس کے اور نزدیک ہو گیا کہ سن سکوں وہ کیا بڑبڑا رہی ہے!

”کون..... کون ہوں میں؟..... مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا؟“ سوی بڑبڑا رہی تھی۔ ”تیرا نام سوی ہے اور میں علیالیش ہوں۔“ میں فوراً بول اٹھا۔

”ہاں..... ہاں شاید میرا یہی نام ہے، مگر علیالیش کو تو.....“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”علیالیش کو وہ طاقت در عفریت نہیں مار سکتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں نے تو خود یہ دیکھا تھا کہ..... کہ اس عفریت نے علیالیش پر کاری ضرب لگائی اور..... اور پھر علیالیش جی نہ سکا۔ اسے..... میں نے گہرائی میں گرتے دیکھا۔ اگر وہ..... وہ زندہ ہوتا تو یوں گرتا چلا جاتا؟ سوی عجیب سے لہجے میں بحث کرنے لگی۔

”اے سوی! کیا تو علیالیش کے دوست یاسف کو جانتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ہاں..... غالباً یہ نام بھی سنا ہے میں نے!“

”تو عین وقت پر یاسف اپنے دوست کی مدد کو پہنچ گیا۔“ میں بتانے لگا۔ ”پھر اس سے پہلے کہ وہ عفریت دوسری ضرب لگا کر علیالیش کو مار ڈالتا، یاسف اسے لے اڑا۔ سو یوں علیالیش مرنے سے بچ گیا۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ سوی بچوں کی طرح خوش ہو گئی، پھر پوچھنے لگی۔ ”اگر علیالیش زندہ ہے تو کہاں گیا؟“

کچھ یاد آگیا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو آگئے۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے روتے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک طویل عرصے سوی بچھڑنے کے بعد دوبارہ ملی ہے۔

جب میرے دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو میں بولا۔ ”اے سوی! مجھ سے شدید محبت کے سبب ہی تو اپنے ہوش گموا بیٹھی تھی۔“

”مجھے بس اتنا یاد ہے اے علیا لیش کہ تجھے ضرب کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ میں یہی سمجھی تھی کہ خدا خواستہ ظالم عفریت نے تیرا کام کر دیا۔ پھر کیا ہوا، مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔“ سوی کہنے لگی۔ ”یقیناً صدے نے میرے ہوش اڑا دیئے تھے۔ مجھے بتا کہ اس کے بعد کیا واقعات پیش آئے؟ اور اور میں قاہرہ سے یہاں ڈھاکہ کس طرح پہنچ گئی؟“

”کیوں نہیں سوی! میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“ میں پُر سکون آواز میں بولا، پھر سوی کو گزرے ہوئے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

سب کچھ سن کر سوی نے کہا۔ ”تُو نے یہ اچھا فیصلہ کیا اے علیا لیش کہ میرے باپ عزتیل کے پاس چلا آیا، مگر وہ ہے کہاں؟ نظر نہیں آ رہا۔“

”اے سوی! تجھے میں بتا چکا ہوں کہ جب یہاں پہنچا تو عزتیل کو شدید غلیل پایا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آج ہی سے میں نے اس کا علاج شروع کیا ہے۔“ پھر سوی کو میں نے شربت اور اس کے اثر سے آگاہ کیا اور بولا۔ ”وہ تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔“

”کیا کوئی ایسا علاج ممکن نہیں اے علیا لیش کہ میرا باپ عزتیل دوبارہ صحت یاب ہو جائے؟“ سوی نے امید افزا لہجے میں پوچھا۔

”میں تجھے کوئی جھوٹی آس دلانا نہیں چاہتا اے سوی!“ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”دراصل بڑھاپے میں قوت مدافعت ختم ہوتی جاتی ہے اور معمولی امراض بھی حاوی آجاتے ہیں۔ تُو خود عزتیل کو دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ وہ تو اب پہچانا نہیں جاتا۔“

مجھے اور سوی کو باتیں کرتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس عرصے میں عزتیل کی غنودگی ختم ہو گئی اور وہ خود ہی ادھر آگیا۔

وہ منظر بھی بڑا رقت آمیز تھا جب سوی اپنے باپ سے لپٹ کر روئی۔ یوں بھی وہ باپ بیٹی ایک عرصے کے بعد ملے تھے۔

سوی کے گرد اب حصار قائم رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عزتیل نے اسی لئے حصار اٹھا لیا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنی دانست میں عزتیل سے ایک اہم سوال کیا۔ ”اے عزتیل! کیا تمام جنات کے لئے یہ حصار موثر ثابت ہو سکتا ہے؟ یعنی جنات کی جتنی بھی قسمیں ہیں، انہیں اسی طرح کسی مخصوص جگہ قید کیا جاسکتا ہے؟“

”علیا لیش تیرے ہی سامنے تو ہے۔ میں ہی تو علیا لیش ہوں۔“

”تُو جھوٹ بولتا ہے!“ سوی کی آواز میں تیزی آگئی اور اس نے اٹھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ ”کیا تُو سمجھتا ہے، میں اندھی ہوں! میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ تُو ایک آدم زاد ہے! بول، کج تا کون ہے تُو؟“ سوی نے مجھے جھنجھور ڈالا۔

”میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولا اے سوی! میں بھی تیری ہی طرح ایک جن زاد ہوں۔ کیا تُو نہیں جانتی جن زاد انسانی قالب بھی اپنا لیتے ہیں!“

”ہاں یہ تُو ٹھیک ہی کہتا ہے تُو!“ سوی نے یہ کہتے ہوئے میرا گریبان چھوڑ دیا اور میرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔

”تجھے میں نے شاید پہلے بھی دیکھا ہے۔“ مغرب کا وقت قریب تھا اس لئے میں نے سوی سے کہا۔ ”میں علیا لیش ہی ہوں اور اس وقت مقصود میاں کے انسانی قالب“

”مجھے یاد آگیا۔“ سوی بول اٹھی۔ تیرا یہی نام مقصود میاں!“

”میں ابھی کچھ دیر میں تیرے پاس لوٹ کر آتا ہوں اے سوی! اس وقت تک تُو یاد کر کہ مقصود میاں سے تیرا کیا تعلق ہے!“ میں بولا۔

مجھے فوری طور پر اپنے اوپر دم کرانے کے لئے عزتیل کے پاس پہنچنا تھا اور پھر مغرب کی نماز بھی پڑھنی تھی اس لئے وہاں مزید نہیں رکا۔ سوی کی حالت میرے لئے انتہائی اطمینان بخش تھی۔ اب تک اس پر دو ہی خوراکوں کا اثر ہوا تھا اور تیسری خوراک کا اثر ہونا باقی تھا۔ تیسری خوراک کا اثر ہونے میں تھوڑی دیر لگتی۔ مجھے یقین تھا کہ پھر سوی قطعی طور پر اپنے حواسوں میں لوٹ آتی۔ یہ بحیثیت ایک طبیب میری یہ ایک بڑی کامیابی ہوتی۔ میں اس پر اپنے خالق حقیقی کا جتنا بھی شکر ادا کر تاہم تھا۔

میں جب عزتیل کے پاس پہنچا تو وہ میرا ہی ہنسر تھا۔ وہ اپنا عمل پورا کر چکا تھا۔ اس نے میرے پورے جسم پر دم کیا اور پھر میرے ساتھ مغرب کی نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ دعا مانگنے کے بعد عزتیل کو میں نے یاد دلایا۔ ”اب تجھے شربت کی تیسری خوراک پینی ہے۔“

”مجھے یاد ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”اور چوتھی خوراک آج رات سونے سے پہلے پینا نہ بھولیو اے عزتیل!“ میں نے کہا۔ ”اور اب ایک خوش خبری سن!“ عزتیل کو میں نے سوی کی حالت سے آگاہ کر دیا، پھر بتایا۔

”اے میں نے تیسری خوراک بھی پلا دی ہے۔ انشاء اللہ جب تُو نیند سے بیدار ہوگا تو سوی تجھے پوری طرح صحت یاب ملے گی۔ اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہے۔“

بوڑھا عزتیل خوش ہو کر مجھے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ میں اٹھ کر ایک مرتبہ پھر سوی کے پاس پہنچ گیا۔ دوا کی تیسری خوراک پلائے آدھا کھٹا ہو چکا تھا اور مجھے اسی کا انتظار تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سوی ”علیا لیش“ علیا لیش“ کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میں اسے تسلی دیتا رہا۔ اسے سب

جو باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں، ان میں نے تفصیل کے ساتھ سوی اور عزتیل کو بھی آگاہ کر دیا۔
”خدا کا شکر ہے اے علیالیش کہ وہ خطرہ پیش آنے سے پہلے ہی سوی صحت یاب ہو گئی۔“
عزتیل کہنے لگا۔ ”ورنہ تو نہ میرے اندر اتنی طاقت ہے کہ اڑ کر مصر تک جاسکوں، نہ تو اس کا اہل ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس سے عزتیل کا مقصد کیا تھا! یقیناً وہ سوی کے ذریعے لیلیٰ کے ممکنہ عمل میں دخل اندازی چاہتا تھا۔ لیلیٰ مجھے اپنا غلام نہ بنا سکے، اس کی یہی ایک صورت ممکن تھی کہ کسی بھی طرح اسے عمل پڑھنے سے روک دیا جاتا۔

یہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ برسوں پہلے کی بات تھی کہ ایک آدم زاد نے مجھے اپنا غلام بنانے کے لیے عمل پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہ آدم زاد، زمس کے باپ مولوی کفایت اللہ کا ایک نوجوان مرید تھا۔ اسے دولت کی ہوس تھی۔ وہ اسی لئے مجھے اپنے قابو میں کر کے دولت مند بننا چاہتا تھا۔ ان دنوں مولوی کفایت اللہ مجھ سے بہت تپا ہوا تھا۔ اپنے مرید کے اصرار پر اس نے میرا نام اسے بتا دیا۔ کسی جن زاد کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے اس کا نام جانا ضروری ہوتا ہے۔ مجھ سے اصل غلطی یہ ہوئی تھی کہ مولوی کفایت اللہ کو اپنا نام بتا دیا تھا۔ میں یہ پورا قصہ اپنی سرگزشت میں بیان کر چکا ہوں اس لئے اس کو دہراؤ گا نہیں۔ میرا مقصد محض یاد دہانی ہے۔ اس آدم زاد سے میں نے انتہائی سخت انتقام لیا تھا۔ اس کی موت بڑی بھیانک تھی۔

بہر حال میری زندگی کا یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے یہ خطرہ قبل از وقت محسوس کر لیا تھا۔ میری نظر میں لیلیٰ خطرناک حد تک ذہین تھی۔ اس نے میرے بارے میں قطعی درست اندازے لگائے تھے۔

اس ممکنہ خطرے سے قطع نظر میں نے عزتیل سے ایک اور سوال کیا۔ ”یہ بتا اے عزتیل کہ کسی عفریت کے حملے سے بچنے کے لئے بھی کیا یہ حصار کار آمد ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا ہم اپنے گرد یہ دہرا حصار قائم کر کے کسی طاقت ور عفریت کو خود تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں؟“

”ہاں اے علیالیش! ایسا ممکن ہے۔“ عزتیل نے حوصلہ افراد جواب دیا۔
”تو اے عزتیل، تو مجھے اور سوی کو یہ حصار کھینچنے کا عمل تعلیم کر دے۔“ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”کیوں نہیں میرے بچو! تم سے زیادہ مجھ اور کون عزیز ہے۔ میں تمہیں یہ دہرا حصار قائم کرنا ضرور سکھاؤں گا۔“ عزتیل نے یہ کہہ کر وہ اہم عمل مجھے اور سوی کو تعلیم کر دیا جس کے ذریعے ہم اپنے کسی دشمن عفریت کا نام جاننے کی صورت میں اسے قید بھی کر سکتے تھے اور خود کو اس کے ممکنہ حملے سے بھی بچا سکتے تھے۔ میں اور سوی اس عمل کے الفاظ دیر تک دہراتے رہے تاکہ وہ ہمیں یاد ہو جائے۔

”ہاں اے علیالیش!“ عزتیل نے بتایا۔ ”لیکن ایک فرق ہے۔ ہم جنات کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے لئے تو یہ ایک حصار کافی ہے مگر عفریت کیوں کہ ہم سے انتہائی طاقت ور ہوتے ہیں، سو وہ یہ حصار توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ انہیں قید کرنے کے لئے ایسے ہی دہرے حصار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی بھی ایک شرط ہے۔ یہ حصار کیوں کہ نام سے مخصوص ہے، جسے قید کرنا مقصود ہو، اس کا نام جانا ضروری ہے ورنہ حصار بے اثر رہے گا۔ میں سمجھ رہا ہوں اے علیالیش کہ تو یہ سوال کس لئے کر رہا ہے! یقیناً تو اس سے عفریت کو موقع پائے قید کر لینا چاہتا ہے۔ جس نے تجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”کیا اس عفریت کا نام معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں؟“ میں نے معلوم کیا۔
”کم از کم میرے علم میں ایسا کوئی رحمانی عمل نہیں جس کے ذریعے کسی جن زاد کا نام معلوم کیا جاسکے۔“

اس وقت پہلے مجھے سنیتا اور پھر لیلیٰ یاد آئی۔ سنیتا نے ایک عمل کے ذریعے میرا نام معلوم کر لیا تھا، مگر وہ کوئی شیطانی عمل تھا۔ اس کے علاوہ لیلیٰ نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا تھا۔ غالباً اس کے لئے وہ بھی کسی شیطانی عمل ہی کا سہارا لیتی۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک اور خطرہ جاگ اٹھا۔ مجھے عفریت کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے طلال بے اور نجیب المندس سے کہے تھے۔ ”اے میرے غلامو! تمہارے آقا فرعون منقرع کی روح سے کچھ بھی چمپا نہیں۔ تمہارے آقا کو خبر ہے کہ تم پر کیا گزری ہے اور اس کی وجہ کیا ہے! سو پہلے ہی تمہاری مدد کو ہم نے الاقر سے اپنے دو غلاموں کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ ان کی باتوں اور مشوروں پر دھیان دو اور ثابت قدم رہو! اپنے آقا کی پرستش کرتے رہو کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اس عفریت کا واضح اشارہ ناصر اور لیلیٰ کی طرف تھا کیوں کہ بنی دونوں الاقر سے قاہر پہنچے تھے۔ میری نظر میں لیلیٰ یقیناً ایک خطرناک آدم زاد تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ جاتی کہ زاعون کے پردے میں کوئی جن زاد منقرع کے غلاموں کا دشمن ہو گیا ہے۔ نام معلوم کرنے کے علاوہ اس نے کسی ایسے عمل کا ذکر بھی کیا تھا جس کے ذریعے جنات کو قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ طلال بے اور نجیب نے عفریت کے حکم پر یقیناً لیلیٰ کو مجبور کیا ہو گا کہ وہ میرے نام کا پتا لگالے۔ اگلا مرحلہ وہ عمل ممکن تھا جسے پڑھ کر لیلیٰ گویا مجھے قابو میں کر لیتی۔

”اے علیالیش! تو میرے ساتھ بات کرتے کرتے چپ کیوں ہو گیا؟“ سوی نے مجھ مخاطب کیا۔
”تیرے چہرے سے فکر مندی جھلک رہی ہے۔“
”ہاں اے سوی!“ میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”ہمارے سروں پر ایک خطرہ منڈلا رہا ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں۔“

”کیسا خطرہ؟ ہم تو اب خطرے کی حدود سے بہت دور نکل آئے ہیں۔“ سوی بولی۔
”یہ تیری غلط فہمی ہے اے سوی!“ میں نے کہا۔ ”اس خطرے کی حدود مقرر نہیں ہیں۔“ پھر

یہ واقعہ اسی رات کا ہے کہ سوتے سوتے اچانک میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میرے جود میں اچانک ایک الاؤ سا دھک اٹھا تھا۔

”کیا ہوا تجھے اے علیا لیش؟“ سوی میری چیخ سن کر جاگ اٹھی۔

”اس غبیث آدمی زادی لیلیٰ نے یقیناً آج ہی رات سے مجھے قابو میں کرنے کے لئے عمل شروع.....“ میں شدید اذیت کے سبب اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ میری تیز چیخ سے عزتیل بھی بے خبر نہ رہا۔ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں سویا تھا۔ سو کر تا پڑتا ہم تک آپہنچا۔

”اے میرے باپ! آخر وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔“ سوی نے عزتیل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

میں کسی مانی بے آب کی طرح زمین پر پڑا ہا ترپ رہا تھا۔

”اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اے سوی کہ علیا لیش اپنے رب کے حضور جھک جائے۔“ عزتیل نے کہا۔ ”جب تک یہ یاد الہی میں مصروف رہے گا“ آگ اے نہیں جلائے گی۔“

مجھے یاد آیا کہ عالم ہاموس نے بھی مجھ سے ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ سوی نے مجھے سارا دے کر اٹھایا اور جھیل تک لے گئی تاکہ میں وضو کر کے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو سکوں۔ میں ہی جانا ہوں کہ جھیل تک پہنچنے اور وضو کرتے ہوئے مجھے کتنی شدید اذیت سے گزرنا پڑا۔

”اے علیا لیش! تو نہ گھبرا۔“ سوی نے مجھے دلاسا دیا۔ ”میں اس لعنتی آدم زادی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی!“

پھر سوی تو قاہرہ روانہ ہو گئی اور میں نیت باندھ کر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے اپنے رب کی طرف لو لگائی، میرے اندر دکھتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا۔ سلام پھیرنے اور دوبارہ نیت باندھنے کے دوران البتہ الاؤ پھر سے بھڑک اٹھا۔ میں اسی سبب دو رکعت کے بجائے چار رکعت نفل پڑھنے لگا۔

عزتیل کچھ دیر تک تو جاگتا رہا، پھر یہ دیکھ کر کہ نماز میں مجھے سکون مل جاتا ہے، وہ سو گیا۔

صبح ہونے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اسی عرصے میں فجر کی نماز بھی پڑھ لی۔

لیلیٰ یقیناً کوئی شیطانی عمل ہی پڑھ رہی تھی ورنہ جتنے بھی رحمانی عمل ہیں، ان کا وقت نماز تک ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت کوئی بھی نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ سو مجبوراً میں رک گیا۔ اسی دن سے میں دوبارہ آگ کے عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ میرے لیے یہ اذیت سوبان روح تھی اسی سبب کوشش کے باوجود میں اپنی چیخیں نہ روک سکا۔ دور تک جنگل میں میری چیخیں گونج رہی تھیں۔ سوڈ کا باپ عزتیل بھی وہیں قریب ہی موجود تھا، لیکن شاید اس نے نماز پڑھنے کے بعد شربت کی کبا خوراک پی لی تھی۔ اس وقت غالباً وہ غفلت میں پڑا تھا ورنہ میرے پاس ضرور آتا۔

سوی ابھی تک قاہرہ سے لوٹ کر نہیں آئی تھی، نہ ہی میری تکلیف و اذیت ختم ہوئی تھی۔

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ چالاک آدم زادی لیلیٰ کو عمل پڑھنے سے نہیں روک سکی تھی۔ اسی عالم میں زمین پر تڑپتے ہوئے میں نے سورج کو نکتے دیکھا۔ دھوپ کی پہلی کرن جیسے ہی میرے جسم پر پڑی میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ غبیث آدم زادی لیلیٰ یقیناً اس رات کا عمل پورا کر چکی تھی۔ عمل کا وقت نصف شب سے سورج طلوع ہونے تک ہی ممکن تھا ورنہ مجھے قرار نہ آ جاتا۔ اچانک شدید کرب و اذیت ختم ہوتے ہی میرے ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی۔ یوں بھی میں ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔

”علیا لیش!..... علیا لیش!“ مٹا غنودہ ذہن کے ساتھ میں نے سوی کی آواز سنی۔ وہ مجھی کو پکار رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور سوی کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ ”ٹو..... ٹو لوٹ آئی اے سوی!“ میں بولا۔

”ہاں۔“ سوی نے جواب دیا۔ ”مجھے اس پر سخت ملال ہے اے علیا لیش کہ میں اس لعنتی آدم زادی کو حصار سے باہر نکلانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔“

”حصار؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیا حصار تھا کہ جس میں تو داخل نہیں ہو سکی اے سوی!“

”وہ آدم زادی اپنے گرد ایک آتش حصار کھینچ کر عمل پڑھنے بیٹھی تھی۔“ سوی بتانے لگی۔ ”میں نے ایک مرتبہ اس حصار کو عبور بھی کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ میری راہ میں آگ کی دیوار آگئی۔ میں اگر اس کی تپش محسوس کر کے فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتی تو جل اٹھتی۔ پھر اسے میں نے حصار کے باہر دھک کر طرح طرح سے دھوکا دینے اور ڈرانے کی کوشش کی تاکہ وہ خود ہی اس حصار سے باہر آجائے، مگر..... مگر شاید اس غبیث کو پہلے سے ان تمام باتوں کا علم تھا۔ وہ حصار کے اندر اطمینان سے بیٹھی ہوئی شیطانی عمل پڑھنے میں مصروف رہی۔ اسی کوشش کی چھت پر اس نے عمل پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ آدمی رات سے لے کر عمل ختم ہونے تک میں اپنی کوشش میں لگی رہی اور پھر مجبوراً لوٹ آئی۔“

میرے ذہن پر اس وقت نیند کا غبار چھایا ہوا تھا اسی لئے سوی سے بولا۔ ”مجھے بہت زور کی نیند آ رہی ہے۔ اس وقت مجھے سو جانے دے اے سوی! جب میں سو کے اٹھوں گا تو پھر ہم اس مسئلے پر بات کریں گے۔“

”اگر ایسا ہے اے علیا لیش تو سو جا!“ سوی یہ کہہ کر بڑی محبت سے میرے سر کے بالوں کو سلائے لگی۔

مجھے نیند کی پرسکون وادی تک پہنچنے میں شاید چند ہی لمحے لگے ہوں گے۔ میں بے خبر سو گیا۔ پھر میری آنکھ خود نہیں کھلی۔ مجھے عزتیل نے جگا یا۔

”اے علیا لیش! کیا تجھے یاد نہیں رہا کہ تیری کوئی نماز قضا نہیں ہونی چاہئے۔“ عزتیل بولا۔

”ظہر کا وقت ہو چکا ہے۔ پھر تجھے نماز پڑھنے کے بعد فوراً ہی عمل بھی شروع کرنا ہے۔ اس عمل کی مدت عصر کی نماز کے وقت تک ہے، یہ تجھے معلوم ہی ہے۔“

”ہاں اے عزتیل!“ میں یہ کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کل میں یہ عمل پڑھ چکا ہوں۔“

سوی بھی وہیں موجود تھی، مگر میرے پاس اس سے بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تیزی کے ساتھ جھیل کی طرف بڑھ گیا تاکہ وضو کر سکوں۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی کیوں کہ گزشتہ رات سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ میں نے بھوک کو برداشت کر لیا اور وضو کے بعد آ کے نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھتے ہی میں نے عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر عصر کی نماز ادا کرنے تک سوی میری منتظر رہی۔

بھوک اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ دعا مانگتے ہی میں اسی سبب سوی سے مخاطب ہوا۔ ”جلدی سے میرے لیے کچھ کھانے کو لا دے! اور سن اے سوی! کچے کچے پھل کھا کر میری طبیعت بھر چکی ہے۔ کھانے کے لئے تو کچھ اور لے کر آئیو۔“

”بس میں یوں گئی اور یوں آئی اے علیالیش!“ سوی یہ کہتے ہی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

انسانی قالب میں رہنے کی وجہ سے بھوک کا عذاب بھی میری جان کو لگ گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سوی لوٹ آئی۔ وہ میرے لئے بھنا ہوا گوشت، روٹیاں اور کھانے کی دیگر لذیذ چیزیں لے آئی تھی، ایسی کھانے کی چیزیں جو انسانوں کو بہت مرغوب ہوتی ہیں۔ اس شام کو میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اس سے طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی اور میں نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔

”آج رات کو میں پھر اپنی سی کوشش کروں گی اے علیالیش کہ اس لعنتی آدم زادی کو عمل پڑھنے سے روک دوں۔“ سوی کہنے لگی۔

”شدید تکلیف و اذیت سے بچنے کے لئے ابھی میرے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی ہے۔“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آدمی رات ہوتے ہی میں بے ہوشی کی دوا سوگتھ لوں گا جو تجھے سنگھاتا تھا۔ پھر میں صبح تک اس دوا کے زیر اثر غافل پڑا رہوں گا۔ یوں مجھے اذیت سے نہیں گزرنا پڑے گا۔“

”ہاں اے علیالیش! یہ تدبیر بہت مناسب ہے۔“ سوی نے میرے خیال سے اتفاق کیا، پھر کہا۔

”لیکن میں کچھ اور بھی سوچ رہی ہوں۔“

”وہ کیا اے سوی؟“ میں نے پوچھا۔

سوی فوری طور پر کچھ نہیں بولی۔ وہ مجھے کسی گہری سوچ میں کھوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اٹا

لئے اسے نہیں ٹوکا۔

”اے علیالیش! ہم نے ایک خاص مقصد کے تحت طلال بے اور نجیب المہندس کو زندہ رکھا تھا۔“ معاً سوی بول اٹھی۔ ”ورنہ انہیں ختم کر دیتا ہمارے لئے مشکل نہیں تھا۔ اس مقصد سے تو کبھی واقف ہے کہ ہم ان دونوں کے ذریعے مقرر کی نام نماز روح تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اب یہ عطا

کل چکا ہے کہ آدم زادوں کے اس گروہ کو بھٹکانے والا دراصل ایک عفریت تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس عفریت کو ہم کب اور کیسے زیر دام لائیں گے، اب ہمارے پاس طلال بے اور نجیب کو زندہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے علاوہ ہم خبیث آدم زادی لیلیٰ کا قصہ بھی پاک کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ عمل شروع کرنے سے پہلے اپنے گروہ آتشی حصار میں کھینچے گی۔ جب عمل کرنے والی ہی زندہ نہیں رہے گی تو پھر کیا عمل، کیسی تکلیف و اذیت اور کیا خطرہ! تو میری بات سمجھ تو رہا ہے؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اے سوی!“ میں بولا۔ ”سوچنا محض یہ ہے کہ چالیس دن سے پہلے میری جناتی صفات تو مجھے واپس نہیں مل سکتیں، یہ کام تجھے تنہا انجام دینا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ ایک اور دوسری بات بھی میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ کیا اس ظالم عفریت نے لیلیٰ یا اپنے دونوں خاص غلاموں طلال اور نجیب کے لئے حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا ہو گا؟ کیا اسے یہ خدشہ نہ ہو گا کہ ہم.....“

”پہلے میری بات سن!“ سوی نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”اس خطرناک عفریت نے صرف تجھ پر حملہ کیا تھا اور تیرے ہی اوپر سے اندھیرے کی چادر گھسٹی تھی۔ میں اس وقت اندھیرے کی چادر اوڑھے ہوئے تھی اس لئے وہ مجھے نہیں دیکھ سکا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس عفریت کی نظر میں صرف تو ہی آیا۔ تجھ پر کاری ضرب لگانے کے بعد وہ ظالم عفریت یہ بھی سمجھا ہو گا کہ تیری جناتی صفات ختم ہو چکی ہیں۔ پھر ذرا عین حقیقت سے پردہ اٹھا کر لیلیٰ بھی صرف تیرا نام جان سکی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے بھی قابو میں کرنے کے لئے ساتھ ساتھ عمل شروع کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں جس اذیت سے کل رات تو گزرا، مجھے بھی گزرنا پڑتا۔ مختصر یوں سمجھ کہ ایک جن زاد کی حیثیت سے وہ صرف تیرا سراغ لگا سکے ہیں۔ میں ان کی نظر میں نہیں آئی۔ تو اس وقت ظالم عفریت کے نزدیک عضو معطل ہے۔ ایسی صورت میں اسے بھلا تیری طرف سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے جو وہ اپنے غلاموں کی مزید حفاظت کا کوئی بندوبست کرے گا؟“

سوی کے دلائل میں وزن تھا۔ مجھے اسی لئے ان سے اتفاق کرنا پڑا۔

”اس کے علاوہ ایک بات پر اور غور کر اے علیالیش!“ سوی مزید بولی۔ ”وہ کوئی شیطانی عمل ہو کہ رحمانی اس کے لئے کچھ شرائط لازمی ہوتی ہیں۔ مثلاً وقت اور مقررہ جگہ! فرض کر کہ میں کسی سبب لیلیٰ کو ختم نہ کر سکتی تو کم از کم کوئی بھی اس چھت کو تو گرا سکتی ہوں جہاں بیٹھ کر گزشتہ رات اس آدم زادی نے عمل شروع کیا تھا۔ یوں بھی وہ اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکے گی۔“

ممکن ہے سوی اور بھی کچھ کہتی کہ عزتیل خود ہی آدھر آگیا۔ وہ اپنا عمل ختم کر چکا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان یوں بھی وقت کم ہوتا ہے۔ میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ عزتیل کو عمل پڑھ کر مجھ پر دم بھی کرنا ہے۔ سو اس نے مجھ پر دم کیا۔ پھر میں مغرب کی نماز پڑھنے اس کے ساتھ چلا گیا۔ نماز پڑھ کر حسب معمول عزتیل نے ایک گھونٹ شربت پیا اور لیٹ گیا۔ میں دوبارہ سوی کے پاس چلا آیا۔

میں نے واپسی میں سوچا کہ اگر مقرر کے ان غلاموں کو ختم کرنے کے لئے یاسف بھی سوی کے ساتھ ہو تو اچھا ہے۔ ”اگر تیری یہی مرضی ہے اے علیالیش“ تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں تیرے دوست یاسف کو یہاں بلائے لاتی ہوں۔ تو اسے ساری بات سمجھا دیجو۔ پھر میں اس کے ساتھ قاہرہ چلی جاؤں گی۔“

”ہاں تو یاسف کو کراچی سے بلا کر لے آؤ!“ میں نے کہہ دیا۔

سوی اسی وقت روانہ ہو گئی۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ میرے تصور کی قوت کا تعلق جتنی صفات سے نہیں ہے۔ مجھے یقین سا تھا کہ میری اس قوت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہو گا۔ پھر بھی میں اسے آزمانا چاہتا تھا۔ یہ تجربہ تھا کہ مقرر کے غلام اس سے غافل نہیں رہتے کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔ طلال بے اور نجیب کا تصور کرنا اسی لئے کسی طرح مناسب نہ ہوتا۔ وہ اس طرح چوکنا ہو جاتے۔ ان عیاروں کو کسی ممکنہ خطرے کا احساس ہو جاتا جو میری نظر میں خلاف مصلحت تھا۔ سو اپنی اس قوت کو آزمانے کی خاطر میں نے یاسف کی آدم زاد محبوبہ امغری بیگم کا تصور کیا۔ یاسف مجھے اسی کے قریب پیر برکت علی شاہ کے انسانی قالب میں نظر آیا۔

امغری بیگم کی چوڑی اور حسین پیشانی شکن آلود تھی۔ وہ یاسف سے مخاطب تھی۔ ”تمہاری آوارہ گردیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر مجھے جوتی سنبھالنی پڑے! اب تو تم راتوں کو بھی غائب رہنے لگے ہو!“

یہ صورت حال میرے لئے بہت دلچسپ تھی۔ ایک بے خبر آدم زاد ایک جن زاد کو مارنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

”بس کچھ دیر کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت دے دو۔“ یاسف اس کے سامنے بیٹھ گیا ہوا تھا۔ ”میرا ایک مرید جو لائڈھی میں رہتا ہے، سخت بیمار ہے۔ مجھے اس پر دم کرنے کے لئے جانا ہے۔ میں نہ گیا جان من تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔“

میں سمجھ گیا کہ سوی، یاسف سے مل چکی ہے اور اسے اپنے ساتھ میرے پاس لائے والی ہے۔ یاسف اسی لئے امغری بیگم سے کسی مرید کی بیماری اور اس پر دم کا بہانہ کر رہا تھا۔ سوی نے غارت خانہ یاسف اور امغری بیگم کی غلطی میں آنے سے گریز کیا تھا۔ پھر وہ بھی تصور کرنے پر مجھے آکھنٹی کے لان میں نظر آگئی۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے جان کر بہر حال بے حد خوشی ہوئی کہ میرے تصور کی قوت بحال تھی۔ پھر ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ سوی میرے دوست یاسف کو ساتھ لے کر پہنچ گئی۔

”اے علیالیش! مبارک ہو تجھے کہ سوی صحت یاب ہو گئی۔“ یاسف نے پُر خلوص آواز سے پہلے مجھے مبارک باد دی۔

”تجھے بھی مبارک ہواے یاسف کہ تیری بھابی کے ہوش و حواس بحال ہو گئے۔“ میں بولا۔

”اب یہ بتا کہ مجھے تو نے کس لئے بلوایا ہے؟“ یاسف نے سوال کیا۔

اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ سوی نے ابھی یاسف کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں نے مختصر الفاظ میں یاسف کو ساری بات بتا دی۔

”یہ تو بہت ہی برا ہوا اے علیالیش کہ ایک خطرناک آدم زاد نے تجھے اپنے قبضے میں کرنے کے لئے عمل شروع کیا ہے۔“ یاسف نے افسوس کا اظہار کیا، پھر پُر جوش لہجے میں کہنے لگا۔ ”اسے ہر قیمت پر ایسا کرنے سے روکنا پڑے گا۔“

”وہ اس طرح رکنے والی نہیں ہے اے یاسف! پوچھ اپنی بھابی سوی سے کہ اس نے گزشتہ رات اسے روکنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کر لیا؟“ یاسف نے سوی کی طرف دیکھا۔ سوی نے گزشتہ رات کا سارا واقعہ بیان کر دیا۔

”پھر تو اسے عمل کرنے سے روکنا بہت ہی مشکل لگتا ہے۔“ یاسف فکر مند سا ہو گیا۔

”اب تجھے سوی ہی یہ بھی بتائے گی کہ اس نے کیا تدبیر سوچی ہے!“ میں نے کہا۔ ”یہ اسی تدبیر پر عمل کرنے کی غرض سے اکیلی قاہرہ جانے والی تھی، مگر میں نے مشورہ دیا کہ تجھے بھی ساتھ لینی جائے تاکہ کسی خطرے کی وقت تم دونوں ایک دوسرے کی ڈھال بن سکو۔“

اس کے بعد سوی نے تفصیل کے ساتھ یاسف کو سب کچھ بتا دیا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے اے علیالیش، مگر وہ خطرناک عفریت کہ جس نے تجھ پر حملہ کیا تھا، اگر اس عمارت میں ہوا تو؟“ یاسف نے خدشہ ظاہر کیا۔ میرے بجائے یاسف کے اس سوال کا جواب سوی نے دیا۔

”وہ عفریت اس عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے گرد مقرر کے غلاموں نے ایک حصار کھینچ رکھا ہے۔ اس حصار کو کوئی جن زاد عبور نہیں کر سکتا۔“

”ایسا ہی ہے اے سوی، پھر تو تیرے ساتھ میں کس طرح وہاں جا سکتا ہوں؟“ یاسف نے سوال کیا۔

”اے یاسف! میں تجھے ایک ایسا عمل بتاؤں گی کہ جسے پڑھ کر ہم اس حصار کو عبور کر سکتے ہیں۔“ سوی بولی۔

”سوچ لے اے میرے دوست کی بیوی! کہیں ایسا نہ ہو کہ بے چاری امغری بیگم ہماری جوانی میں یوہ ہو جائے؟“ یاسف دھڑکے سے ہنسا۔

”میں اور سوی پہلے بھی وہ عمل پڑھ کر کئی بار اس حصار کو عبور کر چکے ہیں اے یاسف! گزشتہ رات بھی سوی اس عمارت میں داخل ہو چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”گھبراہٹ کے کوئی بات نہیں۔“

”چل اگر تو کہتا ہے تو میں نہیں گھبراتا اے علیالیش!“ یاسف، سوی کے ساتھ قاہرہ جانے پر آمادہ ہو گیا۔

چند ہی لمحوں میں وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ذرا دیر کے بعد ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوی کا تصور کیا۔ وہ اس وقت تک قاہرہ پہنچ کر طلال بے کی کوٹھی کے لان

”مقصود میاں!“ اچانک دھویں ہی میں سے ایک نسوانی آواز ابھری۔
میں اچھل پڑا اور بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”اتنی جلدی بھول گئے تھے!“ وہی نسوانی آواز پھر سنائی دی۔ ”مجھے یہی خطرہ تھا کہ تم اپنا مطلب نکل جانے کے بعد اسی طرح اجنبی بن جاؤ گے اور وہ سارے وعدے بھلا دو گے ہو تم نے مجھ سے کیے تھے۔ میں اسی سبب اب تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے پاس لے آئی ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں مقصود میاں کہ تم سے جو تن کا سکھ ملا وہ کوئی اور نہیں دے سکا۔“

”تم مجھے نظریوں نہیں آرہیں؟ تم میرے سامنے کیوں نہیں آتیں؟“ میں بولا۔
”من کی آنکھیں کھول کر دیکھو گے تو میں تمہیں نظر بھی آجاؤں گی۔“ جواب ملا۔ ”لیکن یہ بتاؤ کہ جب تم نے ہر رات آنے کا وعدہ کیا تھا تو پھر کیوں نہیں آئے؟ تم نے مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟“

”میں نہ تو تمہیں جانتا ہوں نہ تم سے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا جس کا ذکر کر رہی ہو۔“ میں نے جواباً کہا۔

”یہ بھی غیبت ہے کہ تم مجھے بھول گئے مگر تمہیں اپنا نام یاد رہا۔“ اس کی آواز میں چھین تھی۔ ”ورنہ تم اگر یہ بھی کہہ دیتے کہ تمہارا نام مقصود میاں نہیں ہے تو میں کیا کر لیتی!.....“

شاید مجھے دیکھ کر تمہاری کھوئی ہوئی یادداشت واپس آجائے۔“
معاً اس دھویں میں مجھے ایک حسین آدم زاد کی چہرہ نظر آیا اور میں ایک مرتبہ پھر اچھل پڑا۔
”پوجا دیوی!“ بے اختیار میری زبان پر اس چلتی پھرتی قیامت کا نام آگیا۔ یہ وہی تھی جس کے ساتھ میرا دوست یاسف، مقصود میاں کے انسانی قالب میں ایک شب گزار چکا تھا۔ پھر دوسرے روز صبح یاسف ہی نے مجھے اس کا دیدار کرایا تھا۔

”آخر پہچان ہی گئے مجھے!“ پوجا کی ہنسی کا جلتنگ بچ اٹھا۔ ”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ مجھے نہیں جانتے!“

میں گم صم سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ یقیناً وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ میرے تصور کی ڈور کو کاٹ دینا، پھر مجھے بے ہوش کر کے میاں اٹھا لانا ایک ہی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ عورت پراسرار قوتوں کی مالک تھی۔ مجھے اس نے جس فضا میں رکھا تھا اس سے بھی یہی ظاہر تھا۔ یہ طلسمی فضا تھی۔ انجانے میں میرا دوست یاسف بنگال کی کسی ساحرہ سے ٹکرا گیا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ وہ کوئی عام آدم زاد ہی ہو یا پراسرار قوتیں رکھنے والی کوئی ساحرہ، کسی جن زاد کا قرب اسے دیوانہ بنا سکتا ہے۔ پوجا اسی دیوانگی کے زیر اثر مجھے یاسف سمجھ کر اٹھا لاتی تھی۔ میرے ذہن نے تیزی کے ساتھ ساری کڑیاں جوڑ لیں۔

”چپ کیوں ہو مقصود میاں؟ کچھ بولنا!“ وہ یہ کہتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ ”اتنا تو بتا ہی دو کہ تمہیں میرا پریم استھان (ایوان محبت) کیسا لگا؟..... بولو! اچھا ہے نا!..... میں اگر چاہوں تو

میں اتر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاسف بھی نظر آیا۔
”اے یاسف! اب اس عمل کے الفاظ یاد کر لے جو تجھے پڑھنے ہیں۔“ سوی نے یاسف کو مخاطب کیا۔

پھر یاسف کو سوی وہ عمل یاد کرانے لگی جو میں نے ہی اسے بتایا تھا۔ جلد ہی یاسف نے عمل کے الفاظ یاد کر کے سوی کو سنا دیے۔

”ٹھیک ہے اب چل!“ سوی نے اطمینان کا اظہار کیا، پھر بولی۔ ”سب سے پہلے ہم اس لفظی آدم زادی کو ختم کریں گے جس نے گزشتہ رات سے علیالیش کو اپنا غلام بنانے کا عمل شروع کیا ہے۔“

”لیکن میں نے تو اس آدمی زادی کو کبھی نہیں دیکھا، اسے کس طرح پہچانوں گا؟“ یاسف نے سوال کیا۔

”میں اس کی نشاندہی کر دوں گی۔“ سوی نے جواب دیا۔ ”اور سن! اگر تجھے اس وقت بھی وہ آدم زادی آتشی حصار میں نظر آئے تو اس کے قریب جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تجھے نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”ایسی صورت میں کیا کرنا ہے اے سوی!“ یاسف نے پوچھا۔
”ہم اس پوری عمارت ہی کو زمین بوس کر دیں گے۔“ سوی نے بتایا۔ ”اس طرح جو آدم زاد بھی اس عمارت میں ہوئے سبھی مارے جائیں گے۔ ان میں وہ خطرناک آدم زادی لیلیٰ بھی ہوگی۔ اس طرح بھی ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

اس کے بعد سوی اور یاسف کو میں نے اپنی چشم تصور سے طلال بے کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک غیر متوقع طور پر میرے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن پر ایک غبار سا چھٹا ہوا محسوس کیا۔ پھر میں نے لاکھ اپنے سر کو جھٹکا اور کوشش کی کہ اپنے حواس قائم رکھوں مگر یہ ممکن نہ ہوا۔

ہوش کھولنے سے پہلے میں نے کسی کی مہترم نسوانی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ یہ آواز اتنی پرکشش تھی جیسے دور تک نقری گھنٹیاں ہی بجتی چلی گئی ہوں۔ ہنسی کی وہ آواز میرے لیے لفظی اجنبی تھی۔ پہلے کبھی میں نے یہ آواز نہیں سنی تھی۔

☆=====☆=====☆

جب میرے ذہن سے غفلت کا غبار چھٹا تو میں نے اپنے گرد اگر دوشبہ کے دائرے پھیلتے محسوس کیے۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا، مگر اس دھویں سے میرا دم نہیں گھٹا۔ اس دھویں میں کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ عجیب سا خوشبو دار دھواں تھا۔ میں کسی نرم و گدھا بستر پر دراز تھا، لیکن دھویں کی وجہ سے وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس خوشبو دار دھویں میں رنگ اور نشہ بھی شامل کر سکتی ہوں۔“
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں؟ جتنی صفات چھن جانے کے سبب میں ایک عام آدم زاد بن کر رہ گیا تھا۔

منا مجھے پوجا کے حسین جسم کا لس محسوس ہوا۔ اسی کے ساتھ میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، پھر جیسے گنگنائی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تم کتنے سندر ہو!..... شاید تم نہ جانتے ہو۔ تمہیں یہ بات کوئی ناری (عورت) ہی بتا سکتی ہے۔ بتاؤ نا کہ تم آج اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ عین اسی لمحے ارد گرد کا دھواں چھٹ گیا اور میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پوجا کے جسم پر لباس ایک تہمت کی طرح تھا۔ میرے امکان میں نہیں تھا کہ اسے دیکھتا رہتا۔

”ارے! تم نے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟“ پوجا حیرت سے بولی۔ ”لگتا ہے کہ تم مجھے ستانا چاہتے ہو، مگر پوجا کو آج تک کوئی ستا نہیں پایا۔ میں تمہیں ابھی بولنے پر مجبور کر دوں گی اور تم آنکھیں بھی کھول دو گے۔“

پوجا کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کی آواز مجھے کیس دور سے آتی سائی دی۔
”تم میرے ہو، مقصود میاں، صرف میرے! اپنی زبان سے اس کا اقرار کرو!“ پوجا کی آواز میں حکم تھا۔

مجھ پر ایک خود فراموشی سی طاری ہو گئی۔ میں جیسے اپنے بس میں نہیں رہا۔
”ہاں پوجا! میں صرف تمہارا ہوں۔“ میں کہنے لگا اور مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ یقیناً وہ مجھے اپنے محرمین لے چکی تھی۔

”تم نے مجھ سے زیادہ حسین کوئی اور عورت آج تک نہیں دیکھی نا؟“
”ہاں تم سے حسین کوئی عورت میری زندگی میں نہیں آئی۔“ میں نے جواب دیا اور آنکھیں بھی کھول دیں۔

پوجا مجھ سے انتہائی قریب تر تھی۔ اسی وقت فضا میں جیسے رنگ ہی رنگ بکھر گئے اور ہر طرف نشہ سا تیرنے لگا۔ یہ بھی اسی کے کسی کا سحر کا نتیجہ تھا۔ سرشاری و بے خودی کے عالم میں اس کے حسین چہرے کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا۔

”پوجا!“ میں جیسے نشے میں بڑبڑایا۔
”مقصود میاں!“ اس کے تراشیدہ ہونٹ ہلے۔

مجھے یوں لگا جیسے گلاب کی پنکھڑیاں حرکت میں آ گئی ہوں۔ خوشبوؤں کا ایک بھنور مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میرا وجود کسی تنکے کی طرح اس بھنور میں گردش کرتا رہا۔ خواب خواب ساعتوں کا وہ

ظلم جانے کب تک مجھے اپنے حصار میں لیے رہا! مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میری جان کھینچنے لے رہا ہو۔ میری رنگوں میں لو کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ میں خوشبو اور رنگوں کے ساتھ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا! نہ مجھے اب یہ یاد تھا کہ میں کہاں ہوں اور نہ یہ خبر کون ہوں!

وہ بے خودی کا سفر تمام ہوا تو اچانک پوجا اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کی آواز سنی۔ ”کون ہے یہ جو یہاں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے؟“ پھر جیسے پوجا اس دھویں میں تحلیل ہو گئی۔

میرے ذہن پر ایک راحت آمیز غنودگی سی چھا گئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔
ذرا ہی دیر میں مجھے پوجا کی آواز پھر سنانی دی۔ اس وقت تک میری آنکھ پوری طرح لگی نہیں تھی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھی۔ ”کیا تم سو گئے مقصود میاں؟“

”ہاں مجھے نیند آ رہی ہے۔“ میں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔
”کچھ دیر کو اٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہو سکتا ہے جو تمہیں یہاں سے لے جانا چاہتا ہے؟“ پوجا نے مجھ سے سوال کیا۔

اسی وقت میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب نہ وہاں دھواں تھا، نہ خوشبو! ہاں وہاں روشنی ضرور تھی مگر وہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی، میں یہ نہ سمجھ سکا۔ وہ ایک گول سا کمرہ تھا جس میں مجھے کوئی دروازہ یا کوئی کھڑکی نظر نہیں آئی۔ کمرے کی چھت کسی گنبد کی طرح تھی۔ اس کمرے کے درمیان بڑی سی ایک آرام دہ مسری پڑی تھی جس پر میں دراز تھا۔ مسری کے قریب ہی پوجا کھڑی تھی۔ اب اس کے جسم پر ایک ساڑھی تھی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا مقصود میاں!“ پوجا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور اپنا سوال دہرایا۔

میرے ذہن میں پہلا نام سوی کا ابھرا اور پھر مجھے اپنے دوست یاسف کا خیال آیا۔ اسی نے مجھے اس عذاب میں پھنسا یا تھا۔

سوی کون ہے؟“ پوجا نے پوچھا۔
میں نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ پوجا کی توجہ میرے ذہن پر تھی۔ یقیناً وہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو پڑھ رہی تھی۔ میں نے خطرے کی بو محسوس کر لی۔ پوجا سے اپنی حقیقت چھپانے کی یہی ایک صورت ممکن تھی میں اپنی قوت ارادی سے کام لیتا۔ تجبی میں اپنی حقیقت پر پردہ ڈالے رکھنے میں کامیاب ہو سکتا تھا کہ اپنے ذہن کے اندر ایسے خیالات نہ آئے دیتا جن سے میرا راز کھل جاتا۔

”وہ..... وہ میری دوست ہے۔“ میں نے پوجا کو سوی کے بارے میں بتایا۔

”اور یاسف؟“ پوجا نے دریافت کیا۔
”اسے بھی تم میرا دوست کہہ سکتی ہو۔“

ساتھا۔

ساتھ سے جو دیا جلتے وہ بھور بھے بگھ جائے

تیرے دھیان کی جوت امر ہے کبھی نہ بگھنے پائے

پوجانے اس دوسے کی بہت تعریف کی، پھر کہنے لگی۔ ”تم اسی طرح باتیں کرتے رہے تو یوں ہی رات بیت جائے گی۔ میں اب چلتی ہوں۔“ اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک دم گمراہ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اب وہاں اکیلا ہوں۔ پوجا وہاں سے جا چکی تھی۔

جنگل کی وہ ساحرہ میری باتوں میں نہیں آئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ بے خبر سو جائے تو اس کا کام تمام کر دوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے ساتھ ہی سارا ظلم ختم ہو جاتا۔ پھر مجھے اس کی قید سے رہائی مل جاتی۔

ابھی میں اس سے بھی بے خبر تھا کہ سوی اور یاسف جس مقصد کے تحت قاہرہ گئے تھے، اس میں انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں! مجھے اس کا بھی پورا احساس تھا کہ میرے اچانک اغوا ہو جانے سے سوی سخت پریشان ہوگی۔ سوی اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے، یہ جاننے کے لئے میں نے اپنے تصور کی قوت کو آزمانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لمحے بھر کو مجھے سوی نظر آئی اور پھر میرے صفحہ ذہن پر تاریکی پھیل گئی۔ میں کئی بار کوشش کے باوجود اپنے تصور کی قوت کو متحرک نہ کر سکا۔ اس پر مجھے برا رنج ہوا۔ پوجا کے سوا گویا بقیہ تمام دنیا سے میں میرا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس کا سبب یقیناً وہ سحری تھا، مجھے پوجا جس کا شکار بنا چکی تھی۔

اس رات کو میں آگ کے عذاب میں گرفتار نہیں ہوا۔ میں نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اس رات غالباً لیلیٰ اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکی تھی۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ لیلیٰ اب تک زندہ بھی تھی یا نہیں!

دوسرے دن صبح جب میں سو کر اٹھا تو پوجا اس کمرے میں پہلے سے موجود تھی۔ اس کے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

”مقصود میاں! جاؤ وہاں جا کے اشان (غسل) کر لو۔ پھر ہم جل پان (ناشتا) کریں گے۔“ پوجا نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس سمت مجھے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر اس دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا مجھے یوں لگا جیسے کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہوں۔ سامنے ہی مجھے ایک خوب صورت حوض نظر آیا جس میں صاف و شفاف پانی بھرا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کی ایک بیچ حوض کے کنارے دکھائی دی۔ اس پر نمائے کا مختصر سالباں موجود تھا۔ میں نے اپنے جسم پر موجود کپڑے بدل لیے۔ جسم پونچھنے کے لئے ایک بڑا تولیا بھی کپڑوں کے ساتھ تھامے میں نے وہیں ہی پر پڑا رہنے دیا۔ پھر میں حوض میں اتر گیا۔ پانی میں ایک مسور کن خوشبو بھی شامل تھی۔ مجھے اس حوض میں نہا کر بڑی

”کیا تمہارے یہ دونوں دوست غیر معمولی پراسرار قوتوں کے مالک ہیں؟“ میرے لئے اس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اگر میں یہ جھوٹ بول بھی دیتا تو وہ یقین نہ کرتی۔ میں نے اسی لئے اعتراف کر لیا۔

”جیسی تو وہ میرے کھینچے ہوئے گھیرے کو توڑنے کو شش کر رہے تھے۔“ پوجا کہنے لگی۔ ”اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو زندہ نہ بیچ پانک گھیرے سے ٹکرا کر وہ صرف معمولی سے زخمی ہوئے اور پھر بھاگ لیے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پھر آئیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شاید میرے ذہن کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ جیسے ہی پوجا نے میری طرف سے نظرس ہٹائی تھیں، مجھے یوں لگا تھا کہ میرے ذہن سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس پر میں نے سکون کا سانس لیا کیوں کہ پوجا میری حقیقت نہیں جان سکی تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ”اگر تمہارے دوست پراسرار قوتوں کے مالک نہ ہوتے تو یقیناً وہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ جاتے۔ کیا وہ آج رات کو تم سے ملنے کے لئے آنے والے تھے؟“

”ہاں ان دونوں کو آج رات مجھ سے ملنے آنا تھا۔“ میں نے مصلحت کے تحت کہہ دیا۔ ”تمہیں ٹھکانے پر نہ دیکھ کر انہیں تمہاری تلاش کا خیال آیا ہوگا۔“ پوجا اپنی دانست میں خود ہی درمیان کیڑیاں جوڑنے لگی، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”مقصود میاں! تمہیں میں نے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔ تم اب ہمیشہ میرے پاس رہو گے۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا! بولو، تمہیں تو میرے پاس رہنے پر کوئی اعتراض نہیں؟ رہو گے نا میرے ساتھ؟“

”کیوں نہیں!“ میں نے اسے دھوکا دیا۔ ”تمہارے ساتھ رہنا تو جنت میں رہنا ہے۔ تم جنت کی کسی حور سے کم تو نہیں ہو!“

”کہیں تم مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے؟“ اس نے ایک ادا سے مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں کون بے وقوف بنا سکتا ہے پوجا!“

”پھر تم نے میری آواز سننے کے باوجود پہلے چل مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کر دیا تھا؟“

”اس لئے کہ جلد سے جلد اپنا دیدار کرادوں۔“ میں نے ہمانہ کر دیا۔

”بڑے ہی چتر (چالاک) ہو تم!“ وہ ہنس دی۔ اچھا اب تم سو جاؤ، میں چلتی ہوں۔“

”تم کیوں کہیں اور جا رہی ہو، یہیں سو جاؤ نا!“ میں نے ایک مصلحت کے تحت پوجا کو پیشکش کی۔

”میں یہاں تمہارے پاس رہی تو معلوم ہے کیا ہوگا!“ وہ معنی خیر انداز میں مسکرائی۔ ”پھر نہ میں سو پاؤں گی نہ تم!“

”مگر تمہارے بغیر بھی تو مجھے چین نہیں آئے گا۔“ میں بولا۔

”میرے دھیان کی جوت جگائے رکھنا، پھر چین سے سو جاؤ گے۔“

اس پر مجھے ایک دوبا یاد آ گیا جو میں نے پوجا کو بھی سنا دیا۔ یہ دوبا میں نے ایک آدم زادی سے

فرحت محسوس ہوئی۔

تازہ دم ہو کر جب میں لوٹ کر آیا تو مسہری کے قریب ہی چھوٹی سی ایک میز پر ناشتا رکھا دکھائی دیا۔ پہلے وہ میز بھی اس کمرے میں نہیں تھی۔ گرم گرم پوریوں اور آلو کے ساگ سے میں نے پوجا کے ساتھ ناشتا کیا۔

ناشتا کر کے پوجا نے شیشے کے دو گلاسوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ان گلاسوں میں ہر ہر کوئی مشروب تھا۔ پوجا نے ان میں سے ایک گلاس میرے ہاتھ میں تھمادیا اور پینے کا اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے پوجا؟“

”یہ ٹھنڈائی ہے۔“ پوجا نے بتایا ”اسے پی کر جسم میں طاقت آتی ہے۔“

میں اس مشروب کو پیتے ہوئے کچھ جھپکنے لگا تو پوجا نے خود میرے ہونٹوں سے گلاس لگا دیا۔ وہ مشروب گاڑھا، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پوجا کے اصرار پر مجھے وہ مشروب پینا ہی پڑا۔ خود پوجا نے بھی اپنا گلاس خالی کر دیا۔

”پوجا! کیا یہاں تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے؟“ میں نے معلوم کیا۔

”کیوں؟ کیا تمہیں میرے سوا بھی کسی کی ضرورت ہے؟“ اس نے سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے وضاحت کیا۔

”یہاں تمہاری اور میری خدمت کے لئے دایاں بھی ہیں، لیکن میں نے انہیں تمہارے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے۔“ پوجا نے بتایا۔

”وہ کس لیے؟“ میں دریافت کیا۔

”مقصود یہاں! معاف کرنا مجھے مرد ذات پر دشواری (بھروسا) نہیں اور تم بھی ایک مرد ہو۔“ وہ بولی۔

”کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہیں پوجا؟“

”یقین ہوتا تو تم پر پہرے کیوں بٹھائی!“ پوجا نے بلا جھجک کہہ دیا۔ ”میں جانتی ہوں کہ موقع ملنے ہی تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے، لیکن تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا مقصود میاں! جو چیزیں مجھے پسند آ جاتی ہیں، میں ان کی حفاظت کرنا اچھی طرح جانتی ہوں اور تم بھی میری پسند ہو۔ آؤ اب یہاں سے اٹھو کہ تاکہ دایاں (کنیزیں) اس کمرے کی صفائی کر سکیں۔“ پوجا اٹھ کھڑی ہوئی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

پوجا کے ساتھ میں ایک طرف بڑھا ادھر دیوار میں اچانک ایک دروازہ نمودار ہو گیا۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میں اس حسین عورت کے سحر سے واقف ہو چکا تھا۔ دروازہ عبور کر کے میں ایک ایسے سجے سجائے بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا جو اپنے ساز و سامان کے سبب کئی صدیوں پہلے کا معلوم ہو رہا تھا۔ فرش پر خوب صورت قالین بچھے تھے۔ جگہ جگہ دیواروں سے گاڑے تکیے لگے تھے۔ مختلف شوخ رنگوں کے ریشمی پردے ادھر ادھر بڑی نفاست کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ وہ کمرا اپنی تزئین آرائش کی

وجہ سے مجھے کسی محل کا حصہ لگا۔

میرا ہاتھ تھامے پوجا ایک گاڑ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔

”تمہیں میرا یہ گھر کیسا لگ رہا ہے مقصود میاں؟“ پوجا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”یہ مجھے کوئی گھر تو نہیں، ایک محل معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔

”مقصود میاں! کسی بھی آدمی کو اپنے جیون میں سکھ ہی چاہیے اور یہاں سکھ ہی سکھ ہے۔ یقیناً تم یہاں رہ کر سکھی رہو گے۔ ہے نا!“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں!“ میں بول اٹھا۔ میرا مقصد اس کا اعتماد حاصل کرنا ہی تھا۔ ”میں نے ایسی ہی زندگی کے خواب دیکھے تھے۔“

”اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو پھر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا!“ پوجا نے تاکید کی لہجے میں کہا۔

ابھی مجھے وہاں آئے اور پوجا سے باتیں کرتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرا سر بھاری ہونے لگا۔ پھر مجھے کمرے کی ہر شے گھومتی سی محسوس ہوئی۔

”یہ..... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟..... کیا ہو رہا ہے مجھے؟“ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”کچھ نہیں۔“ پوجا نے میرے جسم کو سہارا دیا۔ ”لگتا ہے کہ تم نے پہلی بار ہری بوٹی پی ہے۔ تھوڑی دیر میں تمہیں سرور آنے لگے گا۔“

”ہری بوٹی؟..... یہ کیا ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ لوگ اسے بھگ بھی کہتے ہیں۔ فقیری نشہ ہے۔“ پوجا دھیرے سے ہنسنے ہوئے کہنے لگی۔

”نت..... تم نے مجھے نشہ..... نشہ پلا دیا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے میرا جسم بے قابو ہونے لگا۔

”اور..... اور میں نے خود بھی تو نشہ کیا ہے۔“ پوجا بولی اور میرے جسم کو سنبھال لیا۔

رفتہ رفتہ میرے ذہن پر نشہ حاوی ہو گیا۔ پوجا کسی من پسند کھلوٹے کی طرح مجھ سے کھینچنے لگی۔ پھر سب کچھ وہی ہوا جو گزشتہ رات ہو چکا تھا، مگر اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے ذہن کے کسی گوشے میں گناہ کا احساس ضرور تھا۔ یہی احساس میرے ضمیر پر کچھ کے سے لگا رہا تھا۔ گزشتہ رات اور اس وقت صرف ایک فرق تھا۔ رات کو میں پوجا کے سحر میں تھا اور اب میرے حواس نشے کے زیر اثر تھے۔ بہر حال میں دونوں ہی بار مجبور تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کب تک میں کیف و سرشاری میں ڈوبا رہا اور کب میرے دماغ پر نیند کا غبار چھا گیا!

جب میرا شعور بیدار ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو پتا چلا وہ کوئی نئی جگہ ہے۔ وہاں میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ میرے ہی سامنے دوسری آرام کرسی پر پوجا موجود تھی۔ وہ جاگ رہی تھی اور اس کی نظریں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

میری بات سن کر وہ ایک دم زور سے ہنس پڑی، پھر بولی۔ ”تمہارے دل میں کیا ہے بتا دوں؟ سن پاؤ گے مقصود میاں!“

”بتا دو تاکہ میں تمہاری غلط فہمی دور کر دوں۔“ میں نے کہا۔
 ”تمہاری خواہش یہ ہے کہ بے خبری میں مجھے موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سے فرار ہو جاؤ۔“
 پوجا کی آواز میں جھپٹ تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا۔ ”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرا شبہ غلط ہے۔ اگر تم میری مجبوری نہ بن گئے ہوتے تو اب تک میں تمہیں زندگی کی قید سے رہا کر دیتی۔ ابھی میں تمہیں کچھ دن زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔“

”اور پھر؟“ بے اختیار ہی یہ سوال میری زبان پر آ گیا۔
 ”ظاہر ہے کہ پھر میں تمہیں مار ڈالوں گی۔“ پوجا اس طرح بولی جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔
 ”لیکن کیوں پوجا؟ میرا قصور کیا ہے؟ تم اتنی بڑی سزا مجھے کیوں.....“
 ”اس لئے کہ میں آستین میں سانپ پالنے کی قائل نہیں ہوں۔“ پوجا نے میری بات کاٹ دی۔
 اسی لمحے میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر اچانک اسے دھج لیا۔ میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے ہی تھے کہ میرے جسم کو زبردست جھٹکا لگا اور میں کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر جا گرا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن پر اندھیرا چھا گیا۔

☆=====☆=====☆

اندھیرے، گرمی اور جس کے ساتھ مجھے تکلیف کا احساس ہوا تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے جسم سے گوشت نوچ لیا ہو۔ میں نے اس جگہ ہاتھ لگا کر دیکھا تو زخم اور خون کی چھچھاپٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا۔ مجھے دوبارہ بیٹھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہوں۔

وہ کوٹھری اتنی چھوٹی تھی کہ میں اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے سے کسی قدر مانوس ہوئیں تو پتا چلا، میں اس کوٹھری میں اکیلا نہیں ہوں۔ اندھیرے میں متعدد چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں، چوہوں کی آنکھیں! انہی میں سے ایک چوہے نے ابھی میری بائیں کلائی سے گوشت نوچ لیا تھا۔ کیا یہ چوہے آدم خور ہیں؟ میرے ذہن میں ایک بھیانک سوال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی خوف کی شدید لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ مجھے یہ سزا کس نے دی ہے اور سزا دینے کی وجہ کیا ہے! پوجا پر میں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا اور وہ اب مجھ سے انتقام لے رہی تھی۔ موجودہ حالات میں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ حسین عورت حیرت انگیز پراسرار قوتوں کی مالک ہے، اس پر حملہ کرنا یقیناً میری دانش مندی ہرگز نہیں تھی۔ میں اس پر بچتائے لگا کہ مجھے یہ قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔

معاً میرے ذہن میں پوجا کی آشنا آواز گونجنے لگی۔ ”مقصود میاں! کچھ لوگوں کو عزت داس

”تم سو کر اٹھ گئے مقصود میاں!“ پوجا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ادھر غسل خانہ ہے، نہالو گے تو طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔“
 میں کچھ کہے بغیر اٹھ کر غسل خانے میں ٹھس گیا۔ میرا ذہن واقعی بو جھل تھا۔ نہانے سے میری طبیعت سنبھل گئی۔ باہر آکر میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں ایک جانب میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ پوجا وہیں بیٹھی تھی۔ اس نے آواز دے کر مجھے وہاں بلا لیا۔
 ”تمہارے لیے خاص طور پر میں نے الگ کھانا منگوا یا ہے کیوں کہ مجھے گوشت کھانا پسند نہیں ہے۔“ پوجا نے مجھ سے کہا۔

”شکریہ پوجا!“ میں نے یہ کہہ کر اپنے سامنے موجود بڑی سی قاب کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں مرغی کا گوشت اور دوسری قاب میں کباب تھے۔

پوجا کے سامنے ایک تھالی میں مختلف کنوریاں رکھی تھیں جن میں کئی طرح کی سبزیاں، اچار، پاپڑ وغیرہ تھے۔ وہ سر جھکائے کھانا کھانے لگی۔ جب میں نے کھانا کھالیا تو پوجا بولی۔ ”دوسرے کھانا کھا کے شام تک میں آرام کرتی ہوں۔ اتنے میں تم بھی آرام کر لو مقصود میاں!“

”لیکن یہاں اس کمرے میں تو مجھے کوئی بستر نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔
 ”کھانے کے کمرے میں بستر نہیں بچھائے جاتے۔“ پوجا ہنس کر کہنے لگی۔ ”میں تمہیں تمہاری خواب گاہ تک پہنچا دیتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کمرے سے نکل کر پوجا کی رہنمائی میں مجھے ایک راہداری سے گزرتا پڑا۔ میں بہت چوکنا انداز میں راستے کا جائزہ لے رہا تھا۔

معلوم نہیں کس طرح پوجا نے یہ بات محسوس کر لی اور مجھ سے کہنے لگی۔ ”کیا غور سے دیکھ رہے ہو مقصود میاں؟ یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ اب تم دوبارہ ادھر آئے بھی تو یہ راہداری تمہیں دکھائی نہیں دے گی۔“

میں خاموش رہا۔ اس راہداری کے اختتام پر ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ پوجا میرے ساتھ چلتی ہوئی اس دروازے تک پہنچی۔

”جاؤ اندر!“ پوجا نے میرے لئے وہ دروازہ کھول دیا۔ خود وہ دروازے ہی پر رک گئی۔
 ”تم..... تم بھی آؤ تا پوجا!“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔
 ”کیوں، کیا ابھی جی نہیں بھرا!“ پوجا کا لہجہ معنی خیز تھا۔ پھر اس نے مجھے کئی بچے کی طرح سمجھایا۔
 ”یہ آرام کا وقت ہے، صرف آرام کا! جاؤ۔“

”تمہارے بغیر مجھے بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔“ میں کسی وفا شعار عاشق کی طرح بولا۔ ”تم میرے کمرے میں بھی تو آرام کر سکتی ہو!“

”مقصود میاں!“ معاً اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو! اس لئے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ میری زبان نہ کھلواد۔“

”مجھے..... مجھے تم غلط سمجھ رہی ہو پوجا!“ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

نہیں آئی، تم بھی انہی میں سے ہو۔ اب تمہارا پچھتاہٹا حاصل ہے کیوں کہ اس کا وقت گزر چکا ہے میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ.....

”پوجا!“ میں بول اٹھا۔ مصلحت وقت کا تقاضا یہی تھا کہ میں کسی طرح منت سماجت کر کے اسے شیشے میں اتار لیتا۔ سو یہی کوشش کرنے لگا۔ ”میں اپنی غلطی پر سخت نادم ہوں“ مجھے معاف کر دو! اب..... اب مجھ سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہو گی۔“

جواب میں مجھے پوجا کا قہقہہ سنائی دیا، پھر اس کی آواز آئی۔ ”نہیں مقصود میاں! اب تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ تمہیں ہفتے دو ہفتے اپنے پاس رکھوں گی، پھر ہاں دوں گی لیکن تم نے خود ہی اپنی زندگی، موت کے حوالے کر دی۔ یہ آدم خور بھوکے چوہے زیادہ سے زیادہ کل تک تمہارے جسم پر موجود سارا گوشت اتار کر کھا جائیں گے۔“

”نہیں پوجا، نہیں!“ میں چیخ اٹھا۔ ”تم اتنی بے رحم نہیں ہو سکتیں!“

اسی وقت کسی چوہے نے میری پنڈلی میں اپنے تیز اور نکیلے دانت گاڑ دیے اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا مقصود میاں؟ کیا پھر کوئی بھوکا آدم خور چوہا تمہارا گوشت نوچ کر لے گیا؟“ پوجا کی ہنسی میرے ذہن میں گونجی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میری اذیت سے لطف لے رہی ہو۔

میں نے پنڈلی میں دانت گاڑنے والے چوہے کو ہاتھ سے پکڑ کر دور پھینک دیا۔ اس وقت تک وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ مجھے اپنی پنڈلی کے تازہ زخم میں انتہائی جلن اور تکلیف محسوس ہوئی اور میرے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔

”مقصود میاں!“ پوجا کی آواز تھوڑے توقف سے مجھے سنائی دی۔ ”ہر مرنے والے سے رکی طور پر اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ تمہاری بھی کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ میں کوشش کروں گی، تمہاری آخری خواہش پوری کر دوں۔“

میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس ظالم و سنگ دل عورت سے رحم کی توقع رکھنا عبث ہے۔ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گی۔ میں اسی لیے زور سے بولا۔ ”میری آخری خواہش یہ ہے کہ پوجا کہ تجھے ترپ ترپ کر مرنے دیکھوں۔“

وہ میرے الفاظ سے ذرا بھی مشتعل نہیں ہوئی اور پرسکون آواز میں بولی۔ ”کاش تمہاری خواہش پوری کرنا میرے بس میں ہوتا۔“

”کیواس نہ کر اے لعنتی عورت! یہ نہ بھول کر موت اور زندگی تیرے اختیار میں نہیں۔“ میں نفرت و حقارت سے بولا۔

جواب میں نے اس کی دور ہوتی ہنسی سنی، پھر یہ آواز بھی معدوم ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ علیالیش! کیا تیری موت اسی طرح لکھی تھی؟ پوجا مجھے خود بنا چکی تھی کہ اس عمارت کے گرد والے نے کوئی حصار کھینچ رکھا تھا۔ اگر اس حصار کو عبور کرنا ممکن ہوتا تو یقیناً سوئی مجھ تک پہنچ چکی ہوتی۔

مجھے اعتراف ہے کہ وہ لمحات اتنے ہی روح فرساتے کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔

ان آدم خور چوہوں کی صورت میں ایک یقینی موت میرے سامنے متحرک تھی۔ اسی وقت میرے وجود میں کسی نے سرگوشی کی، اے علیالیش! مایوسی کفر ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اچانک افتاد پڑنے سے میرے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے اور بالکل سامنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں جس اذیت میں مبتلا تھا اس کا سبب مقصود کا انسانی قالب تھا۔ اگر میں وہ قالب چھوڑ دیتا تو آدم خور چوہوں کے عذاب سے مجھے نجات مل جاتی۔ اپنی جناتی صفات چھن جانے کے باوجود جب میں وہ انسانی قالب اپنا سکتا تھا تو اس سے باہر آنا بھی میرے لئے ممکن تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے پر عمل کیا۔ مقصود کا انسانی قالب میرے خیال ہی کی تجسیم تھا، سو وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں باآسانی اس تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ وہاں نیم تاریکی ہی تھی۔

میرے لئے پرواز کرنا تو ممکن نہیں تھا البتہ میں چل سکتا تھا۔ ذرا دیر ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ وہ محل نما عمارت نہیں جہاں پہلے میرا قیام تھا۔ یہ تو کسی بڑی عمارت کے کھنڈرات معلوم ہو رہے تھے۔ مجھ سے انتقام لینے کی خاطر پوجا دیوی نے مجھے کسی اور جگہ قید کر دیا تھا۔ یقیناً وہ مطمئن ہو گی کہ میں اس کوٹھری سے نہیں نکل پاؤں گا۔ اسے میری حقیقت کا علم نہیں ہو سکا تھا اور وہ مجھے کوئی آدم زاد ہی سمجھ رہی تھی۔

میں اس وقت ایک نیم شکستہ راہداری سے گزر رہا تھا۔ مزید کچھ آگے بڑھنے پر لمبے کے ڈھیرنے میری راہ مسدود کر دی۔ میں چکرا کر رہ گیا کہ اب کروں تو کیا کروں؟ مجھے ہر صورت ان کھنڈرات سے نکلنا تھا اسی لئے واپسی میں دیر نہیں کی کہ شاید کسی اور طرف راست مل جائے۔ میں جب اس راہداری میں داخل ہوا تھا تو دائیں جانب مجھے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آئی تھی۔ میں نے اس طرف جانے کے بجائے راہداری کو ترجیح دی تھی۔

وہ راہداری عبور کر کے میں دیوار کے لمبے پر چڑھا اور ایک کمرے میں پہنچ گیا جس کا شکستہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں تیزی سے ادھر بڑھا۔ دروازے سے نکلتے ہی مجھے ہر طرف دن کا اجالا نظر آیا۔ دور تک سبزہ ہی سبزہ اور جنگل تھا۔ جنگل کا وہ حصہ مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہوا۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ میں اس پر خوش تھا کہ ان کھنڈرات سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پوجا دیوی نے اگر ان کے گرد بھی کوئی حصار کھینچ رکھا ہوتا تو یقیناً میں وہاں سے نکلنے میں ناکام رہتا۔ جنگل میں آگے بڑھتے بڑھتے مٹا میں چونک اٹھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس عمارت کو پہچان گیا۔ یاسف مجھے یہیں لے کر آیا تھا اور یہیں میں نے پہلی بار پوجا دیوی کو دیکھا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ جنگل کا یہ حصہ مجھے مانوس کیوں لگا تھا۔

کیا پوجا دیوی اس وقت بھی اپنے گھر میں ہو گی؟ میں نے سوچا۔ میرے وجود میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پوجا دیوی نے مجھے اپنا آلہ کار بنانے کے بعد شدید اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے موت کے حوالے کر چکی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں موت کی اس

کوٹھری سے زندہ بچ نکلوں گا۔ پوجا دیوی کی اسی غفلت سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

جنگل کے اس حصے سے میرے لئے عزتیل کے ٹھکانے تک جانا مشکل نہیں تھا۔ راستہ مجھے یاد تھا۔ میں اگر چاہتا تو پوجا دیوی سے اچھے بغیر عزتیل تک پہنچ جاتا مگر اس طرح میرے انتقام کی آگ نہ بجھتی۔ ہر چند کہ میری جتنی صفات چھن چکی تھیں لیکن فی الحال یہ بھی کم نہیں تھا کہ میں آدم زادوں کے لئے ناپیدہ تھا۔ بنگال کی وہ ساحرہ پوجا دیوی مجھے دیکھ نہ پاتی۔ میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا پوجا دیوی کے گھر تک پہنچا۔

صدر دروازے پر دباؤ ڈالنے سے پتا چلا کہ وہ اندر سے بند ہے۔ میں نے سوچا، اگر دروازے پر دستک دی تو پوجا دیوی دروازہ کھول کر یہ ضرور دیکھنے لگی کہ دستک دینے والا کون ہے؟ اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ چونکا ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنے گرد کوئی ناقابل عبور حائل حصار کھینچ لیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک عیش پرست عورت ہے۔ اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے دوسرے ہی لمحے ایک خوبصورت و پرکشش آدم زاد کا قالب اپنا لیا۔ اس طرح اسے دھوکا دینا آسان ہوتا۔ چند لمحے رک کر میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا ہے، پھر دروازے پر دستک دی۔ ذرا ہی دیر میں دروازے کی دوسری جانب سے قدموں کی چاپ ابھری تو میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ وہ بہر حال ایک خطرناک آدم زادی تھی جس نے مجھے موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آ کر رک گئی، مگر فوری طور پر دروازہ نہیں کھلا۔ پوجا دیوی شاید دروازے کی کسی جھری سے باہر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں دروازے پر دوبارہ دستک دیتا، دروازہ کھل گیا۔

پوجا دیوی اپنی تمام تر حشر سامنیوں کے ساتھ مجھے دروازے میں کھڑی نظر آئی۔

”کون ہو تم؟“ پوجا دیوی کے خوبصورت ہونٹوں نے حرکت کی۔ اس کی نظرس میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں ایک مسافر ہوں اور اس جنگل میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔“ میں نے پرسکون مگر بدلی ہوا آواز میں جواب دیا۔

”تمہیں کہاں جانا ہے اور کہاں سے آرہے ہو؟“ پوجا دیوی نے پوچھا۔

”مجھے ڈھاکہ شہر جانا ہے۔“ میں نے بات بنائی۔ ”میں یہیں کی ایک بستی کا رہنے والا ہوں۔ کیا میری رہنمائی کر سکتی ہو؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، مگر مجھے تم کچھ تھکے تھکے سے لگتے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ دیر آرام لو۔ پھر میں تمہیں شہر کا راستہ بتا دوں گی۔“ پوجا دیوی نے یہ کہتے ہوئے مجھ پر اپنی نظروں کے تیر چلائے اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”تھکن تو خیر ہو گئی ہے لیکن.....“ میں نے دانستہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ میری تدبیر کارگر ثابت ہوئی تھی۔ پوجا دیوی نے مجھے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دے دی تھی۔ یہ اسی انسانی قالب کا کمال ہے

جو میں نے اپنایا تھا۔

”لیکن کیا؟“ پوجا دیوی نے مجھے ٹوکا۔

”تمہیں بلاوجہ زحمت ہو گی۔“ میں بولا۔ پوجا دیوی سے گفتگو کرتے ہوئے اب تک میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ کہیں اس سے میری نظرس نہ مل جائیں۔ ایسا ہونے کی صورت میں وہ مجھے اپنے سحر میں لے لیتی اور پھر مجھے کچھ بھی کرنے کا موقع نہ ملتا۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا۔

”اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں۔ آدمی ہی تو آدمی کے کام آتا ہے۔“ پوجا دیوی نے کہا۔

”کیا تم گھر میں اکیلی ہو؟“ میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے سوال کیا۔

”ہاں اس وقت اکیلی ہوں۔ میرا شوہر شہر گیا ہے جو رات کو لوٹے گا۔“ اس نے مجھے مطمئن کرنے کی غرض سے جھوٹ بولا۔

یہ سن کر میں دانستہ چونک اٹھا اور دھیرے سے بولا۔ ”تو..... تو تم شادی شدہ ہو، مگر لگتی نہیں ہو۔“

”شادی شدہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ قدرے بے تکلفی سے بولی۔

”اگر تمہارا شوہر رات ہونے سے پہلے واپس آ گیا تو؟ کیا وہ گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ کر اعتراض.....“

”تم اس کی پرواہ مت کرو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہاتھ چھوڑ، میں اندر چل رہا ہوں۔“ میں یہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور پلٹ کر گھر کا صدر دروازہ اندر سے بند کرنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے انسانی قالب چھوڑ دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ میں اس پر بھپٹ پڑا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی میرے وجود کو زبردست جھٹکا لگا اور میں دور جا کر۔

”دھوکا۔“ پوجا دیوی، کسی درندے کی طرح غرائی۔ ”پوجا دیوی کی مرضی کے بغیر کوئی اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“

میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ شیطانی علوم کی ماہر سنیتا بھی اسی طرح اپنے تحفظ پر قادر تھی۔ اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہاں سے فرار ہو جاؤں اور فی الحال پوجا دیوی سے انتقام لینے کو بھول جاؤں۔ اسی خیال سے میں اٹھا اور لپک کر دروازے تک پہنچ گیا۔ پوجا دیوی مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی، مگر میں نے اس پر دوبارہ حملہ کرنے کی حماقت نہیں کی۔ اسے میں نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھتے دیکھ لیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی شیطانی عمل پڑھ کر شاید مجھ پر دار کرنا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس سے پہلے ہی فرار ہو جانا چاہئے۔

دوسرے ہی لمحے میں نے دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں جتنی جلدی خطرے کی حدود سے نکل جاتا میرے حق میں بہتر تھا۔ اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ میں اس ساحرہ کا کچھ نہیں بگاڑ پاؤں گا تو اسے ہرگز نہ چھیڑتا۔

پوجا دیوی کے گھر سے نکل کر میں نے دوڑنا شروع کیا ہی تھا کہ اچانک مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے پلٹ کر دیکھا تو شعلے میرے تعاقب میں تھے۔ پوجا دیوی اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی اور یہ شعلے اسی کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔ وہ عجیب اور ناقابل یقین سامنہ تھا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ان شعلوں نے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں لگا جیسے میری راہ میں کوئی دیوار آگئی ہے اور میں اب مزید آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔ وہ شعلے مجھے جلائے کے بجائے میرے وجود کو مفلوج کئے دے رہے تھے۔ انتہائی ٹھنڈک سے میں خود کو جتا محسوس کر رہا تھا۔ یقیناً یہ اسی شیطانی عمل کا اثر تھا جو پوجا دیوی پڑھ رہی تھی یا پڑھ چکی تھی۔ ذرا سی دیر میں میرے لئے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا اور میرے حواس میں ٹھنڈی دھند سی چھانے لگی۔ میں نے سوچا کہ اب زیادہ دیر اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہ سکوں گا۔ پھر وہ بنگالی ساحرہ مجھ پر کیا نیا ستم ڈھاتی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆=====☆

ہوش آنے پر میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ ”علیالیش!..... اے علیالیش!“

چند لمحے مجھے یاد نہ آسکا کہ میں کہاں ہوں، پھر خود پر سوئی کو جھکے ہوئے دیکھا۔

”اے علیالیش! اب تیرا کیا حال ہے؟“ سوئی نے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر پوچھا۔

”ٹھیک..... ٹھیک ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ ایک گھنا درخت تھا۔ ”میں تیری تلاش میں بھٹک رہی تھی کہ تجھے بھاگتے دیکھا۔ پھر مجھے تیرے تعاقب میں شعلے نظر آئے۔ میں تیری طرف لپکی۔ اس وقت تک تو زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔“ سوئی مجھے بغیر کچھ پوچھے جانے لگی۔ ”ان شعلوں کی پردہ کئے بغیر میں نے تجھے اٹھایا اور شعلوں کی زد سے نکل آئی۔ اس عرصے میں مجھے شدید ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی۔ وہ بڑے عجیب ٹھنڈے شعلے تھے۔ میں نے رد بلا کا عمل پڑھ کر تجھ پر اور خود پر دم کیا تو ٹھنڈک کا احساس ختم ہوا۔“

”کیا تو نے اس بنگالی ساحرہ کو نہیں دیکھا اے سوئی؟“ میں نے معلوم کیا۔

”نہیں۔“ سوئی نے جواب دیا۔ ”میری تمام تر توجہ تیری طرف تھی۔“

”کیا میرا دوست یاسف واپس کراچی چلا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں وہ چلا گیا تھا، مگر آج رات کو آئے گا۔“ سوئی نے بتایا۔

”عزیزیل کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”تو نے اسے جو شہرت بنا کر دیا تھا، اس سے اسے خاصا افاقہ ہے۔ وہ تیری طرف سے بہت فکرمند تھا۔ چل اب میں تجھے اسی کے پاس لے چلتی ہوں۔“ سوئی نے یہ کہہ کر مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور پرداز کرنے لگی۔ جلد ہی ہم جنگل کے اس مخصوص حصے تک پہنچ گئے جہاں عزیزیل گھاس پر پڑا تھا۔ مجھے اور سوئی کو دیکھتے ہی عزیزیل اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اے علیالیش! کہ

ڈنٹ آیا۔ تاکہ تجھ پر کیا گزری؟ تیرے دوست یاسف اور سوئی نے تیرا سراخ لگا لیا تھا کہ تو کہاں ہے، مگر جہاں تجھے رکھا گیا تھا اس مکان کے گرد ایک ایسا حصار کھینچا گیا تھا جسے عبور کرنا ان دونوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔ یاسف نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کوئی خطرناک آدم زادی ہے جو تجھے اٹھا لے گئی ہے۔ اے ملیالیش! کیا اس سے تیری کوئی دشمنی تھی؟“

عزیزیل بہر حال میری بیوی سوئی کا باپ تھا، اس سے حقیقت کا اظہار کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے دشمنی کا بہانہ بنا دیا۔

”پھر اس نے تجھے جھوڑ کیسے دیا؟“ عزیزیل نے دریافت کیا۔

”اے عزیزیل! وہ تو مجھے اپنی دانست میں موت کے حوالے کر چکی تھی۔“ میں نے یہ کہہ کر آدم زور چڑھوں اور پھر مقصود کے انسانی قالب کو چھوڑنے کا واقعہ بیان کر دیا۔

”پھر تو وہ خطرناک آدم زادی اب بھی تیرا پیچھا کر سکتی ہے۔“ عزیزیل نے خدشے کا اظہار کیا۔

”وہ میرا پیچھا تو کرے گی مگر مجھے ڈھونڈ نہیں پائے گی۔“ میں نے عزیزیل کو اطمینان دلایا۔ ”اس لئے کہ وہ مجھے مقصود ہی کے انسانی قالب میں پہچان سکتی ہے، جسے میں ترک کر چکا ہوں۔ اس خطرناک آدم زادی کو تو یہ تک معلوم نہیں کہ میں آدم زاد نہیں، ایک جن زاد ہوں۔“

”کیا اس نے اپنی شیطانی قوتوں کو بروئے کار لا کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی اے علیالیش!“ اس مرتبہ سوئی نے سوال کیا۔

”اس نے کوشش کی تھی، مگر میں اپنی حقیقت چھپانے میں کامیاب رہا۔“

”کاش میں بیمار نہ ہوتا۔“ عزیزیل کی آواز میں تاسف تھا۔

مجھے اس موقع پر سنیتا یاد آگئی جس کی تمام ہراساں قوتیں عزیزیل نے سلب کر لی تھیں۔ یہی سوچ کر میں بولا۔ ”ممکن ہے اے عزیزیل! کہ اس آدم زادی کی موت اسے یہاں تک کھینچ لائے۔ اسے بہر حال یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ میں اس کی قید سے نکل کر راہ فرار اختیار کر چکا ہوں۔“

”اگر اس نے ادھر کا رخ کیا تو ان شاء اللہ یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جائے گی۔“ عزیزیل پریقین آواز میں کہنے لگا۔

”اے عزیزیل! میں اپنی جناتی صفات کی واپسی کے لئے تیری رہنمائی میں جو عمل پڑھ رہا تھا، وہ تو ادھر راہی رہ گیا۔ کیا وہ عمل اب پھر سے شروع.....“

”نہیں۔“ عزیزیل نے میری بات کاٹ دی۔ ”اس کے لئے میں نے ایک اور راہ نکال لی ہے۔ اب صرف تین دن کے بعد تیری جناتی صفات تجھے واپس مل سکتی ہیں۔“

”وہ کس طرح اے عزیزیل؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کی خاطر سوئی اور تیرے دوست یاسف کو بھی تیرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس کے علاوہ مجھے بھی مسلسل تین دن تک ایک عمل پڑھنا پڑے گا۔“

”مگر اے عزیزیل! تیری حالت تو اس قابل نہیں کہ تو.....“

”تو فکر نہ کر اے علیالیش! اللہ بڑا کارساز ہے، وہ مجھے ہمت دے گا۔“ عزتیل بول اٹھا، پھر لپٹ لگا۔ ”اس کے لئے تیرے دوست یاسف کو تین دن تک یہیں رہنا پڑے گا۔ سوی نے بتایا تھا کہ آج رات کو عشاء کے بعد یاسف یہاں آئے گا۔“

”ہاں ہم اس سے بات کر لیں گے۔“ سوی بولی۔ ”یقیناً وہ علیالیش کی خاطر تین دن یہاں رہنے پر راضی ہو جائے گا۔“

جس رات پوجا دیوی مجھے اغوا کر کے لے گئی تھی، سوی اور یاسف قاہرہ گئے تھے تاکہ وہ اس خطرناک آدم زادی لیلیٰ کو ختم کر سکیں جو مجھے اپنا غلام بنانے کے لئے ایک شیطانی عمل شروع کر چکی تھی۔ اب تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوی اور یاسف اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہیں، میں نے اسی لئے سوی سے لیلیٰ کے بارے میں پوچھا۔

”ہم دونوں جب اس عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں نہ لیلیٰ تھی، نہ اس کا شوہر ناصر اور نہ وہ دونوں شیطان طلال بے اور نجیب المندس۔“ سوی نے جواب دیا۔ ”وہ عمارت خالی پڑی تھی۔ ہمارا مقصد اس عمارت کو منہدم کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ اس طرح لیلیٰ اپنا شیطانی عمل جاری نہ رکھ پاتی۔ سو ہم نے ایسا ہی کیا اور اس عمارت کو زمین بوس کر دیا۔ یقیناً تجھے کل رات اذیت سے نہیں گزرتا پڑا ہو گا۔ اے علیالیش!“

”تو ٹھیک کہتی ہے اے سوی!“ میں نے تصدیق کی۔

”ممکن ہے جب تم دونوں نے اس عمارت کو منہدم کیا ہو تو وہ چاروں کہیں گئے ہوئے ہوں۔“

”ہاں اے علیالیش! یہی ممکن ہے۔“ سوی نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ وقتی طور پر ٹلا ہے۔“ میں نے اظہار خیال کیا۔ ”عمارت منہدم ہونے کے بعد وہ اپنے کسی اور ٹھکانے پر چلے گئے ہوں گے۔ لیلیٰ وہاں از سر نو اپنا شیطانی عمل شروع کر سکتی ہے۔ موجودہ صورت حال میں مجھے اب دو طرف سے خطرہ لاحق ہے۔ پوجا دیوی اور لیلیٰ دونوں ہی زندہ ہیں۔“

”میری ماں اے علیالیش!“ عزتیل کہنے لگا۔ ”پہلے تو اپنی جناتی صفات دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تین روزہ عمل شروع کر دے۔ جب تجھے تیری جناتی صفات واپس مل جائیں گی تو اپنے دشمنوں سے بخلا نمٹ سکے گا۔ میں جو تجھے یہ مشورہ دے رہا ہوں تو اس کی ایک وجہ ہے۔“

”لیکن اس دوران میں اگر لیلیٰ نے اپنا شیطانی عمل شروع کر دیا تو؟“ میں نے فکر مند لہجے میں عزتیل سے دریافت کیا۔

”تو بھی اس سے تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“ عزتیل ہنس مکھ آواز میں بولا۔ ”تین روزہ عمل پڑنے کے دوران میں وہ شیطانی عمل تجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔ تو اذیت سے نہیں گزرے گا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ وہ خطرناک آدم زادی جو عمل پڑھ کر تجھے اپنا غلام بنانا چاہتی ہے، دھوکا کھا جائے گی۔“

”وہ کس طرح اے عزتیل! میں کچھ سمجھا نہیں۔“ میں حیرت سے بولا۔

”تین روزہ عمل کے دوران میں اس کا شیطانی عمل باطل رہے گا، مگر وہ اس سے بے خبر ہوگی۔ وہ ان دنوں کو بھی اپنے عمل کی مدت میں شمار کر لے گی۔ سویوں اس کا عمل ادھورا ہی رہ جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ وہ ان تین دن کے دوران ہی میں اپنا شیطانی عمل شروع کر دے۔“ عزتیل نے وضاحت کی۔

یہ صورت حال میرے لئے امید افزا تھی، مگر اس کے ساتھ ہی مجھے دوسرے خطرے، یعنی پوجا دیوی کا خیال آگیا۔ عزتیل سے میں نے اس خطرے کا اظہار کیا۔

”میں تو خود یہ چاہتا ہوں اے علیالیش کہ وہ کافر ساحرہ تیری تلاش میں یہاں آئے۔“ عزتیل نے کہا۔

”لیکن اے عزتیل! کیا تو عمل پڑھنے کے دوران میں اس سے نمٹ سکے گا؟“ میں نے معلوم کیا۔

”ہاں اے علیالیش! میرے لئے یہ مشکل نہ ہو گا۔“ عزتیل نے یقین دہانی کرائی۔

”پھر تو ہمیں جلد از جلد بلکہ آج ہی رات سے عمل شروع کرنا چاہئے۔“ سوی بولی۔

”مگر اے سوی! تو یہ بھول گئی کہ اس کے لئے یاسف کی رضامندی بھی ضروری ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”آج رات تو وہ آئی رہا ہے، اس سے بات ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ یاسف مان جائے گا۔“ سوی کہنے لگی۔

اس وقت تو میں خاموش رہا کہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، سوی کے باپ عزتیل کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا، پھر جب دوسرے کے بعد ہمیں خلوت میسر آئی میں نے سوی کو مخاطب کیا۔ ”اے سوی! یاسف کے ماننے نہ ماننے کا مسئلہ نہیں، اصل معاملہ اس کی محبوبہ اصغری بیگم کا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ وہ کتنی تنگ مزاج اور سخت گیر ہے۔ وہ یاسف کو تین دن گھر سے باہر رہنے کی اجازت با آسانی نہیں دے گی۔ تو نے شاید یہ نہیں سوچا۔“

”تیری خاطر یاسف اسے کسی نہ کسی طرح اس پر آمادہ کر لے گا۔“ سوی جواباً بولی، پھر پوچھا۔

”اب یہ تاکہ پوجا دیوی کی قید میں تجھ پر کیا گزری؟“

مجھے اندازہ تھا کہ سوی یہ سوال ضرور کرے گی۔ اس سے جھوٹ بولنا میرے لئے ممکن نہیں تھا اس لئے اسے سب کچھ سچ بتا دیا۔

”ذلیل آدم زادی!“ سوی غصے سے بڑبڑائی، پھر کہا۔ ”یاسف نے جب مجھے اس آدم زادی کے بارے میں حقیقت سے آگاہ کیا تھا تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ وہ تجھے اپنی ہوس کا نشانہ ضرور بنائے گی اور وہی ہوا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”ہرچند کہ جو کچھ ہوا اس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا، پھر بھی اے سوی! میں تجھ سے شرمندہ ہوں۔“

”مجھے خبر ہے اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔ میں جانتی ہوں اے علیالیش! کہ تو مجھ سے بے وفائی

پڑے گا۔ میں اصغری سے یہ بہانہ کروں گا کہ اپنے ایک بیمار مرید کو دیکھنے کے لئے مجھے میرپور خاص جانا ہے۔“

”پھر توبہ واپس آئے گا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کل صبح آ جاؤں گا۔“ یاسف نے وعدہ کر لیا۔

”تو کل ہی صبح سے ہم عمل شروع کر دیں گے۔“ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔

”اور اگر اس عمل کے دوران میں لیلیٰ نے دوبارہ تجھے قابو میں کرنے کے لئے.....“

”تو اس کی فکر نہ کر۔“ میں نے یہ کہہ کر وہ ساری باتیں یاسف کو بتا دیں جو عزتیل نے مجھ سے

کہی تھیں۔ ان میں پوجا دیوی کی طرف سے کی ممکنہ خطرے کا ذکر بھی تھا۔

”خدا کرے کہ وہ حسین آدم زادی ادھر کا رخ نہ کرے۔“ یاسف کے لہجے میں شرارت عود کر

آئی۔

”کیوں؟ کیا تجھے اس آدم زادی کی موت پر افسوس ہو گا جو مجھے قتل کر دینا چاہتی تھی؟“

”وہ اس میں کامیاب تو نہیں ہوئی تاہم آدم زادیوں کی موت پر بھلا کس اہل دل جن زاد کو ملال

نہیں ہو گا۔ میں نے تو اسے بس ایک ہی رات قریب سے دیکھا ہے اور.....“

”اور دوبارہ قریب سے دیکھنے کی ہوس ہے..... اگر میں نے اصغری بیگم کو تیری اس حرکت سے

آگاہ کر دیا تو وہ ہاتھ میں جوتی سمیٹال کر تجھے ساری کوٹھی میں نچاتی پھرے گی۔“

”ہاں واقعی یہ تو ہے۔“ یاسف ہنس پڑا۔ ”وہ کسی دوسری عورت کو میرے قریب نہیں دیکھ

سکتی۔“

پھر یاسف مزید کچھ دیر ہمارے ساتھ رہ کر واپس کراچی چلا گیا۔ اس نے آئندہ روز صبح آنے کا وعدہ

کیا تھا۔ عزتیل نے اس روز کی شربت کی آخری خوراک پی لی تھی اور غافل پڑا تھا۔ سوی مجھے ساتھ لے

کر ایک گھنٹے بیڑ پر آگئی۔

”اے علیالیش! کل سے تو ہمیں تین روزہ عمل شروع کرنا ہے نا۔“ سوی میرے پہلو سے لگی ہوئی

گنگنائی۔ ”ان تین دنوں کے درمیان ہم۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور معنی خیز نظروں سے

میری طرف دیکھنے لگی۔

”تو پھر اے سوی!“ میں دانستہ اسے چھیڑنے کے لئے انجان بن کر بولا۔

”کیا اس بنگالی ساحرہ نے تجھ سے تیرے حواس بھی چھین لئے ہیں اسے علیالیش! کیا تو بھول گیا کہ

ہم دونوں کتنے دن بعد یوں ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔“

اس عرصے میں مجھ پر سوی کے قرب کا نشہ حاوی آ چکا تھا۔ سو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

لذت و سرشاری سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے جنگل کے اس حصے میں کسی کی موجودگی کا احساس

ہوا۔ میں چونک اٹھا اور سوی کو خطرے سے آگاہ کیا۔

”ہاں اے علیالیش! خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ مجھے بھی سنائی دے رہی ہے۔“ سوی

نہیں کر سکتا۔ غلطی تیرے دوست کی ہے، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

سوی کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ یاسف نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یاسف کو یقیناً یہ اندازہ

نہیں ہو گا کہ اس کی شرارت یہ رنگ لائے گی۔

اسی رات کو حسب وعدہ یاسف عشاء کی نماز کے بعد آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اطمینان کا اظہار

کیا، پھر مجھ سے معلوم کیا کہ میں پوجا دیوی کی قید سے کس طرح رہا ہوں میں کامیاب ہوا؟ مختصر میں

نے اسے صرف اپنی رہائی کے بارے ہی میں بتایا کیوں کہ وہاں عزتیل بھی موجود تھا۔

”آچل اے علیالیش! جھیل کے کنارے چل کر بیٹھتے ہیں۔“ یاسف نے مجھے مخاطب کیا۔

میرے لئے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ یاسف تنہائی میں مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ میں اس

کے ساتھ جھیل کے کنارے آ بیٹھا۔ سوی اپنے باپ عزتیل کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ میں نے ٹھنڈا سائیں

بھرنے کے بعد یاسف سے کہا۔ ”اے میرے دوست! تو نے میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔“

”تیرے ساتھ ہوا کیا؟ یہ تو بتا اے علیالیش!“

”وہی جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔“ پھر مجھ پر پوجا دیوی کی قید میں جو کچھ گزری تھی اس سے یاسف کو

آگاہ کر دیا۔

”تو پھر یوں کیوں نہیں کہتا کہ عیش کر کے آ رہا ہے۔“ یاسف کے لہجے میں شوخی آگئی۔ ”آخر

تیری پارسائی ختم ہو ہی گئی۔“

”نہیں، مجھے اس نے اپنے محرمیں لے رکھا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ہرگز.....“

”اچھا چھوڑ ان باتوں کو۔“ یاسف بول اٹھا۔ ”یہ بتا کہ اب آئندہ تیرے کیا ارادے ہیں؟“

”سب سے پہلے تو مجھے اپنی جناتی صفات کی واپسی کے لئے ایک عمل شروع کرنا ہے۔ وہ عمل شروع

کرنے میں مجھے تیری مدد بھی چاہئے۔“

”میری مدد؟“ یاسف نے اظہار حیرت کیا۔

”ہاں تیری مدد۔“ میں نے جواب دیا۔ پھر میں نے اسے تین روزہ عمل کے بارے میں بتایا۔

”یہ تو بہت اچھا ہے کہ تین دن بعد تجھے تیری جناتی صفات واپس مل سکتی ہیں، مگر.....“ یاسف

کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر یہی کہ اصغری بیگم تیری جدائی برداشت نہیں کر پائے گی، تو یہی کہنا چاہتا ہے نا؟“

”ہاں..... یہی بات ہے۔“ یاسف نے اعتراف کر لیا۔

”یہ تیرا مسئلہ ہے کہ تو اصغری بیگم کو کس طرح راضی کرتا ہے۔ مجھے جو کچھ بتانا تھا تجھے بتا چکا

ہوں۔“

یاسف کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے اے علیالیش! یہ تیری موت اور زندگی کا سوال

ہے۔ میں ہر حال میں تیرا ساتھ دوں گا۔ اصغری اس پر یقیناً خفا ہوگی مگر میں اسے بعد میں منالوں گا۔

اصغری کو مطلع کرنا ضروری ہے کہ میں تین دن تک نہیں آؤں گا۔ اس کے لئے مجھے واپس کراچی جانا

یہ کہتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئی۔ ”مگر یہاں کون آ سکتا ہے؟“

”آجمل کر دیکھتے ہیں۔ تو مجھے اس بیڑے سے نیچے اتار دے۔“ میں نے کہا۔

سوی نے میرے کہنے پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ قدموں کی چاپ اب اور قریب آ گئی تھی۔ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اب تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں اور سوی اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں سے مجھے مقصود کے قالب میں پوجا دیوی نے اغوا کیا تھا۔ ہم نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ قدموں کی چاپ اسی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ کوئی اسی سمت بڑھ رہا تھا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر عزتیل غافل پڑا ہوا تھا۔

معا ایک بیڑی کی آڑ سے نکل کر پوجا دیوی ہمارے سامنے آ گئی۔ عزتیل کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا کہ پوجا دیوی میری تلاش میں وہاں ضرور آئے گی۔ سوی نے پوجا دیوی کو نہیں دیکھا تھا اس لئے اسے نہ پہچان سکی۔

”اے علیائش! یہ آدم زادی کون ہو سکتی ہے؟“ سوی نے مجھ سے سرگوشی کی۔ ”اور یہاں یہ کس لئے آئی ہے؟“

”یہ وہ بنگالی ساحرہ ہے جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔“ میں نے سرگوشی میں سوی کو بتا دیا۔

”پھر تو میں اسے زندہ.....“ سوی تیزی سے آگے بڑھی۔

میں نے سوی کا راستہ روک لیا اور بولا۔ ”نہیں اے سوی! یہ ہمارے بس میں آنے والی نہیں۔

اس سے صرف عزتیل ہی نمٹ سکتا ہے جا اسے جگا دے۔“

”مگر عزتیل تو شربت بی کر غافل پڑا ہے۔ خیر تو مجھے جانے دے اے علیائش! کیا خبر وہ جاگ ہی جائے۔“ سوی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

میں نے مطمئن ہو کر سوی کا راستہ چھوڑ دیا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں ہو سکا کہ سوی کیا خطرناک قدم اٹھانے والی ہے ورنہ میں اسے ایسا نہ کرنے دیتا۔ میرے سامنے سے بہتے ہی سوی آندھی طوفان کی طرح پوجا دیوی کی طرف لپکی اور دوسرے ہی لمحے اس کی تیز غیر انسانی چیخ جیسے میرے وجود کو دو نیم کر گئی۔ پوجا دیوی پر سوی کا حملہ رانگیاں گیا تھا۔ وہ اب زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر میں تیزی سے آگے بڑھا اور سوی کے وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کا وجود برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا اور یہ ٹھنڈک مجھے اپنے وجود میں بھی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ رد بلا کا مختصر عمل پڑھ کر میں نے سوی پر دم کیا تو دوسرے ہی لمحے اس کے وجود سے شدید ٹھنڈک ختم ہونے لگی۔

پوجا دیوی کچھ فاصلے پر اب تک موجود تھی۔ اب اس کے جسم کے اطراف ایک چمکیلا غبار سا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً کسی نادیدہ خطرے کو محسوس کر کے پوجا دیوی نے اپنے گرد حفاظتی حصار کھینچ لیا تھا۔ سوی اب ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف لٹایا ہی تھا کہ عزتیل کو ادھر آتے دیکھا۔ سوی کی چیخ سن کر شاید وہ جاگ گیا تھا۔ میں لپک کر عزتیل تک پہنچ گیا اور اسے پوجا دیوی کے بارے میں بتا دیا۔

عزتیل نے جواب میں کچھ نہ کہا اور اشارے سے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ عزتیل کوئی عمل پڑھ رہا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد فضا میں ایک حصار نمودار ہوا اور پوجا دیوی کے کھینچے ہوئے حصار سے ٹکرا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے بجلی کڑکی ہو۔ اسی کے ساتھ پوجا دیوی کا کھینچا ہوا چمکیلا حصار ٹوٹ کر بکھرنے لگا۔ پوجا دیوی کے چہرے پر مجھے بدحواسی کے آثار نظر آئے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گھبرا گئی ہے۔ پوجا دیوی کے گرد اب وہ حصار نظر آ رہا تھا جو عزتیل نے قائم کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پوجا دیوی اس حصار سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”اے آدم زادی! تیری یہ کوشش فضول ہے کہ میں نے تجھے اس حصار میں قید کر دیا ہے۔“ عزتیل نے پوجا دیوی کو مخاطب کیا۔

پوجا دیوی کے چہرے پر حیرت اور کسی قدر خوف کے آثار نظر آئے۔ پھر میں نے اسے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھتے دیکھا۔

”بیکار ہے۔“ عزتیل پھر بول اٹھا۔ ”اس حصار میں قید ہونے کے بعد تیرا کوئی شیطانی عمل کارگر ثابت نہیں ہو گا۔“

عزتیل کی بات سننے کے باوجود پوجا دیوی کے ہونٹوں کی حرکت نہیں رکی۔

”دیکھ اے آدم زادی! میں تجھے آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ کوئی بھی شیطانی عمل نہ پڑھ۔ سن لے کہ تیرا ہی عمل تجھ پر الٹا پڑ جائے گا۔“ عزتیل نے پوجا دیوی سے کہا۔

اس پر پوجا دیوی نے آواز کی سمت اپنی تہر آلود نفرس اٹھائیں، مگر عمل پڑھنا بند نہیں کیا۔

کچھ ہی دیر میں حصار کے اندر آتش کوڑا نمودار ہوا اور حصار سے ٹکرایا لیکن اس سے باہر نہیں نکل پایا اور پلٹ کر پوجا دیوی کی طرف بڑھا۔ پوجا دیوی نے اس کی زد سے بچنا چاہا مگر ناکام رہی۔ آتش کوڑا فضا میں بلند ہو کر پوجا دیوی کے جسم پر پڑا۔ اسی کے ساتھ پوجا دیوی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ آتش کوڑا پھر حصار کی طرف گیا اور پھر پلٹ کر پوجا دیوی پر گرا۔ ایسا ہی بار بار ہوتا رہا اور پوجا دیوی کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ اب زمین پر گر کر تڑپنے لگی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ شدید کرب و اذیت میں مبتلا ہے۔ پھر وہ آتش کوڑا اچانک غائب ہو گیا۔

”تو نے یہ آتش کوڑا مجھ پر حملہ کرنے کے لئے آزمایا چاہا تھا، مگر یہی تیرے لئے عذاب بن گیا اور تجھے اس حال کو پہنچا دیا۔“ عزتیل نے پوجا دیوی سے مخاطب ہوا۔ ”اگر تو میری بات مان لیتی تو اس حال کو نہ پہنچتی اے آدم زادی!“

پوجا دیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شاید اب اس کے حواس کسی قدر بحال ہو چکے تھے۔

”میں سمجھ چکی ہوں کہ تو کوئی بھوت ہے۔“ پوجا دیوی کراہتے ہوئے بولی۔ ”مگر یہ بتا کہ تو نے مجھے کیوں قید کر دیا ہے اور مجھ سے تیری کیا دشمنی ہے؟“

”نیکی اور بدی کے درمیان تو ازل سے دشمنی ہے اے آدم زادی! تو مجسم بدی ہے اور بدی کو مٹ ہی جانا چاہیے۔“ عزتیل نے جواب دیا۔

ہے۔

”اے عزتیل! کیا واقعی صبح ہونے تک اس لعنتی آدم زادی کی شیطانی قوتیں چھن جائیں گی؟“ میں نے عزتیل سے تصدیق چاہی۔

”ہاں اے میری بیٹی کے شوہر علیائش! میں نے اس عورت سے غلط نہیں کہا تھا۔“ عزتیل نے جواب دیا۔ ”کل صبح سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی وہ ایک بے ضرر آدم زادی بن جائے گی۔ پھر اس کی طرف سے تجھے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ وہ اس وقت بالکل بے بس ہے اور میں چاہوں تو اسے مار بھی سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا خون اپنی گردن پر لینے کا کیا فائدہ۔“ عزتیل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا لیکن سوی اس سے متفق نہیں تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ”اے میرے باپ! کیا تو بھول گیا کہ اس آدم زادی نے علیائش کی جان لینا چاہی تھی؟..... تو آخر اسے کیوں زندہ چھوڑ دینا چاہتا ہے؟ کیا اسے سزا نہیں ملنی چاہئے؟“

”اے میری بیٹی سوی! اس کے لئے یہی سزا کم نہیں ہو گی کہ وہ اپنی شیطانی قوتوں سے محروم ہو جائے۔“ عزتیل نے سمجھایا۔

پھر سوی کچھ نہیں بولی اور مجھے اپنے ساتھ لئے دوبارہ گھنے پیز تک آگئی۔ ہم سے پہلے عزتیل سونے کے لئے لیٹ چکا تھا۔ پیز کے نیچے نرم اور بڑی بڑی گھاس تھی۔ میں نے سوی سے کہا۔ ”آئیں لیٹ کر سو جاتے ہیں۔“

”اے علیائش! کیا تو ابھی سے سو جائے گا؟ ابھی اتنی رات تو نہیں ہوئی۔“ سوی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میرے وجود میں ادھورے قرب کی لذت جاگ اٹھی۔ پوجا دیوی کی آمد کے سبب میں اور سوی قرب کی آسودگی سے محروم رہ گئے تھے۔

”سوی!“ میں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

”ہوں۔“ سوی جیسے گنگنائی۔

”آ اے سوی! ہمیں رنگ و خوشبو کی دنیا اپنی طرف بلا رہی ہے۔“ میں بولا۔

اس کے بعد ہم کچھ کہنے اور سننے کی حدود سے بہت آگے نکل گئے۔ عرصہ دراز ہو گیا تھا کہ ہمیں قرب کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں حسروں کے بھنور میں اترتا ہی چلا گیا اور سوی بھی کسی گھٹا کی طرح میرے وجود پر کھل کر برسی۔ جلد ہی آسودگی نے ہمارے وجود پر نیند کے جال بن دیئے اور ہم بے خبر سو گئے۔

صبح ہونے والی تھی کہ سوی نے مجھے جگا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اٹھ اے علیائش! کیا فجر کی نماز نہیں پڑھنی؟“

”مگر ابھی نماز کا وقت تو نہیں ہوا۔“ میں بڑبڑایا۔ نیند کا غبار ابھی تک میرے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ جن احکام دین پر آدم زاد عمل کرتے ہیں وہی ہم جن زادوں کے لئے بھی ہیں۔ سوی نے مجھے اس

”تو کیا تیرا ارادہ مجھے مار ڈالنے کا ہے؟“ پوجا دیوی نے سوال کیا۔

”نہیں“ میں تجھے ماروں گا نہیں بلکہ تجھے تیری تمام شیطانی قوتوں سے محروم کر دوں گا تاکہ تو کسی پر ظلم نہ کر سکے۔“ عزتیل بولا۔

”نن..... نہیں۔“ پوجا دیوی تقریباً چیخ اٹھی۔ ”تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ قوتیں ایک عمر کے بعد حاصل کی ہیں۔ اگر..... اگر یہ مجھ سے چھن..... چھن گئیں تو.....“ پوجا دیوی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر وہ عزتیل کی منت ساجت کرنے لگی۔ ”بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دے۔ جانے دے مجھے کہ پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گی۔“

”میں تجھے یقیناً آزاد کر دوں گا لیکن کل صبح سورج نکلنے سے پہلے یہ ممکن نہیں۔ یقین کر اے آدم زادی کہ میں تیرا خون اپنی گردن پر نہیں لوں گا۔“

”کل صبح کیوں اسی وقت کیوں نہیں؟“ پوجا دیوی نے پوچھا۔ ”جب تیرا ارادہ مجھے آزاد ہی کرنے کا ہے تو پھر رات بھر قید میں کیوں رکھنا چاہتا ہے؟“

”تو اگر یہ جانتا ہی چاہتی ہے تو سن! اس حصار میں ایک رات گزارنے کے بعد تیری شیطانی قوتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔“ عزتیل نے بتایا۔

یہ سن کر پوجا دیوی کے چہرے پر تاریکی سی پھیل گئی۔ پھر جانے کس خیال سے وہ ایک دم چونک اٹھی اور ایک ادا سے کہنے لگی۔ ”کیا تجھے میری بھری جوانی پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا..... مجھے خبر ہے کہ بھوت پرست بھی عاشق مزاج ہوتے ہیں اور وہ خوبصورت عورتوں کو اپنی داسی بنا لیتے ہیں۔ سو میں جیون بھر تیری داسی بننے پر تیار ہوں۔ بول کیا تو اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا؟“

پوجا دیوی کو یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ عزتیل کو یہ پیشکش اس کی بیٹی سوی کے سامنے کر رہی ہے۔ سوی کو اس دوران میں ہوش آ چکا تھا۔

”اے بد کردار آدم زادی! اپنی زبان کو لگام دے۔“ عزتیل طیش کے عالم میں بولا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تجھے ماری ڈالوں۔“

”مجھے تیری داسی بن کر مرنا بھی قبول ہے۔“ پوجا دیوی ڈھنٹائی سے کہنے لگی۔ ”شاید تجھے اندازہ نہیں کہ میرے پہلو میں آکر تو اسی دھرتی پر سورگ (جنت) کے درشن کر لے گا۔ کسی بھوتی سے بھی کبھی تجھے وہ سکھ نہیں ملا ہو گا جو میری آغوش میں ملے گا۔“

”چپ ہو جا اے بدکار!“ عزتیل نے غصے میں آکر کہا۔ ”ورنہ میں تجھ سے تیرے بولنے کی قوت چھین لوں گا۔“

پھر عزتیل نے مجھے اور سوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اس جگہ سے دور چلے آئے جہاں پوجا دیوی حصار میں قید تھی۔ پوجا دیوی کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ تنہا رہ گئی ہے۔ اپنی دانست میں وہ اب بھی عزتیل کو اپنے قریب سمجھ کر لپٹائے جا رہی تھی۔ دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی، مگر اتنی دھیمی کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کہہ رہی ہے۔ پوجا دیوی کو خود ہی کچھ دیر میں احساس ہو جاتا کہ وہ اکیلی

ہم اس جگہ پہنچے جہاں پوجا دیوی کو حصار میں قید کیا تھا تو حیران رہ گئے۔ پوجا دیوی حصار سے غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بد قوت بڑھیا دکھائی دے رہی تھی۔ اس بڑھیا کی لڑ بھلی ہوئی تھی اور سر کے بال 'میاں تک کہ بھوس اور پلکیں بھی سفید تھیں۔ اس کی عمر سو سال سے زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ "اے عزتیل! وہ خطرناک آدم زادی پوجا دیوی تو فرار ہو گئی۔" میں بے اختیار کچھ سوچے سمجھے بڑبڑا اٹھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا اے علیالیش! اس حصار نے کوئی فرار نہیں ہو سکتا۔" عزتیل جواب میں بولا۔
"تو پھر وہ کہاں گئی؟" میں نے سوال کیا۔ پھر میں 'عزتیل کا جواب سننے سے پہلے اس بڑھیا سے طالب ہوا۔ "بول کون ہے تو؟"

"میں..... میں ہی پوجا دیوی ہوں۔" بڑھیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے ایک عمل کے ذریعے خود کو جوان بنا رکھا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ اگر میری قوتیں چھن گئیں تو..... تو میں پھر سے رزمی ہو جاؤں گی۔ آخر یہی ہوا۔ میری عمر ایک سو بیس برس ہے۔"
پوجا دیوی کے اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا۔ اس دوران میں عزتیل نے اس کے گرد قائم مدار اٹھالیا۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے ماری ڈالتے۔" پوجا دیوی یہ کہہ کر زار و قطار رونے لگی۔
"اے آدم زادی! اب تو میاں سے چلی جا۔" عزتیل نے اسے حکم دیا۔ "میں نے تجھے آزاد کر دیا ہے۔"
عزتیل کا حکم سن کر پوجا دیوی لرزتی ہوئی آگے بڑھی، مگر چند قدم ہی چل کر زمین پر گر پڑی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"شاید اب یہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔ اس کا آخری وقت آچکا ہے۔" عزتیل کہنے لگا۔
پھر ایسا ہی ہوا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پوجا دیوی ستر آخرت پر روانہ ہو گئی۔ وہ خطرناک بدکار بنگالی لڑکھن اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔
"تو نے دیکھ لیا اے سوی! کہ یہ آدم زادی خود ہی چل بسی۔" عزتیل بولا۔ "تو ناخن اس کا خون بنا کر دن پر لیتا چاہتی تھی۔"

"ہاں اے میرے باپ! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔" سوی نے دبیرے سے کہا۔
"بہتر یہ ہے کہ اس کی لاش میاں سے اٹھا کر جنگل کے کسی اور حصے میں پھینک دی جائے۔ اے علیالیش کے دوست! کیا تو یہ کام کر سکتا ہے؟" عزتیل نے یاسف کو دیکھا۔
"کیوں نہیں اے عزتیل! میں اسے اٹھا کر دور کیس پھینک آتا ہوں۔" یاسف یہ کہہ کر آگے بڑھا اور پوجا دیوی کی لاش اٹھا کر لے گیا۔

والہی میں یاسف کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ عزتیل مجھے 'سوی اور یاسف کو وہ عمل بتانے لگا جو آئندہ انسان کے دوران میں ہمیں پڑھنا تھا۔ عمل مختصر ہی تھا۔ ہم نے اس کے الفاظ یاد کر لئے۔ وہ عمل صرف

کا احساس دلایا تو میں اٹھ کر جمیل میں نہانے چلا گیا۔ سوی مجھ سے پہلے ہی غسل کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں نے عزتیل کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے ہی کے دوران میں دور سے پوجا دیوی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔

"اری کوئی ہے..... کوئی ہے میاں؟" پوجا دیوی چیخ رہی تھی۔
نماز پڑھ کر میں نے اس طرف عزتیل کو متوجہ کیا تو وہ بولا۔ "میں اب کچھ دیر کی بات ہے" میں حصار اٹھالوں گا اور اسے آزاد کر دوں گا۔ ابھی ادھر جانے کی ضرورت نہیں۔ چیخنے دواے۔ سورج طلوع ہوتے ہی وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لئے میں نے اسے قید کیا ہے۔"
"اس کی شیطانی قوتیں چھن جانے کے بعد تو میں اسے با آسانی موت کے گھاٹ اتار سکوں گی۔" سوی غصے اور نفرت سے بولی۔

پوجا دیوی سے سوی کی نفرت کا سبب مجھے تو معلوم تھا مگر عزتیل کو نہیں۔ وہ اسی لئے سوی کو سمجھانے لگا۔ "اے سوی! کسی کو معاف کر دینا انتقام لینے سے افضل ہے۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ اس آدم زادی نے علیالیش کو مار ڈالنا چاہا تھا، پھر بھی میرا کتنا یہی ہے کہ تو اسے معاف کر دے۔"
"اے میرے باپ! وہ آدم زادی معافی کے قابل نہیں ہے۔" سوی ضد کرنے لگی۔
"اے علیالیش! اب تو ہی سوی کو سمجھا۔" عزتیل نے مجھے مخاطب کیا۔

عزتیل کے کہنے پر میں نے بھی سوی کو سمجھایا تو وہ کچھ نرم پڑ گئی۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ میرا دوست یاسف آ گیا۔ اس نے بھی وہاں آتے ہی پوجا دیوی کو حصار میں قید دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا۔ "آخر اس آدم زادی کی موت اسے میاں سمجھ لائی۔"

"لیکن اے یاسف! میرا باپ اسے زندہ چھوڑنے دینے کے حق میں ہے۔" سوی بول اٹھی۔
"اگر ایسا ہے اے سوی! تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" یاسف بولا۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ پوجا دیوی کو کب اور کیسے قیدی بنا لیا گیا؟
میں نے یاسف کو ساری باتیں بتا دیں۔

"یہ بھی ایک طرح سے اس کا اختیار آدم زادی کی موت ہو گی کہ وہ قطعی بے اختیار ہو جائے۔" یاسف نے سب کچھ سن کر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "مکن ہے کہ اپنی مجبوری دے بی بی کے سبب تنگ آ کر خود ہی موت کو گلے لگا لے۔"

"ہاں اے یاسف! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" سوی نے تائید کی۔
انہی باتوں کے دوران میں صبح کا اجالا پوری طرح پھیل گیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔
"اب اس آدم زادی کو آزاد کر دینا چاہئے۔" عزتیل بولا۔

عزتیل کے ساتھ میں 'سوی اور یاسف بھی چل دیے۔ مجھے اس وقت گمان بھی نہ تھا کہ میں ایک ناقابل یقین اور حیرت انگیز منظر دیکھنے والا ہوں۔ میں قوت پرواز سے محروم تھا اس لئے میری وجہ سے عزتیل وغیرہ کو بھی سست رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھے سکون کے ساتھ کراچی میں نہیں رہنے دے گا۔ میرا مشورہ ہے اے علیالیش! کہ تو چند روز سکون سے یہاں ڈھاکہ میں گزار لے۔“

”اے علیالیش! تیرے دوست کا مشورہ مناسب ہے۔“ عزتیل جو وہیں موجود تھا، بول اٹھا۔ ”اس رے میں تیری توانائیاں مزید بحال ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ میں تجھے کچھ ایسے عمل بھی تعلیم کر سکوں گا کہ تو اس عفریت کا مقابلہ کر سکے۔“

سوی نے بھی اپنے باپ کی تائید میں مجھے سمجھایا۔ نتیجتاً مجھے عزتیل کی بات ماننی پڑی۔ کچھ ہی دیر میں یاسف کراچی روانہ ہو گیا۔

پھر پورے ایک ہفتے تک عزتیل مجھے اور سوی کو مختلف عملیات کی تعلیم دیتا رہا۔ یہ عملیات اس کی بنکوں سالہ زندگی کا نچوڑ تھے۔ ان میں بیشتر عمل ایسے تھے جو اپنے سے برتر جن زادوں، یعنی عفریت دنیہ کا مقابلہ کرنے اور انہیں زیرِ دام لانے کے لئے تھے۔

”اب میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ تم دونوں کی زندگی کو اس ظالم عفریت سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“ عزتیل نے ایک شام اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

”تو اے عزتیل! کیا اب ہم اس عفریت کی تلاش میں قاہرہ روانہ ہو سکتے ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں تم دونوں جب چاہو جا سکتے ہو۔“ عزتیل نے ہمیں اجازت دے دی۔

”اے سوی! تیرا کیا مشورہ ہے ہم آج ہی قاہرہ کیوں نہ چلیں؟“ میں نے سوی کو مخاطب کیا۔

”میرا باپ عزتیل اس پر راضی ہے تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔“ سوی نے کہا۔ ”مگر میں کچھ اور بھی سوچ رہی ہوں۔ وہ یہ کہ اس عفریت کو تلاش کرنے سے پہلے ہمیں طلال بے، نجیب المہندس، لیلیٰ اور اس کے شوہر کا سراغ لگانا چاہئے کہ وہ کہاں ہیں؟“

”تو ٹھیک کہتی ہے اے سوی!“ میں تائید میں بولا۔ ”مجھے اس پر بھی حیرانی ہے کہ لیلیٰ نے دوبارہ مجھ کو قابو میں کرنے کا عمل کیوں شروع نہیں کیا؟“

”ممکن ہے طلال بے یا نجیب نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا ہو یا پھر لیلیٰ پہلی بار کی ناکامی سے ڈر گئی ہو۔“ سوی نے قیاس آرائی کی۔

”تم شاید یہ بھول گئی اے سوی! کہ اس عفریت نے منقرع کی روح بن کر طلال بے اور نجیب کو کیا ہدایت کی تھی؟ مجھے اس کے الفاظ یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ تمہاری مدد کو ہم نے الاقصر سے اپنے دو غلاموں کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔ ان کی باتوں اور مشوروں پر دھیان دو۔ ایسی صورت میں طلال بے اور نجیب، لیلیٰ کو عمل کرنے سے نہیں روک سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لیلیٰ نے خود ہی کسی سبب عمل کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔“ میں بولا۔

”لیکن وہ سبب کیا ہو سکتا ہے اے علیالیش؟“ سوی نے سوال کیا۔

”وفی الحال تو اس سلسلے میں کچھ کتنا مشکل ہے۔ ان کا پتا لگانے کے بعد ہی صحیح صورت حال سامنے

دن کے وقت پڑھا جاتا تھا‘ سورج طلوع ہونے کے بعد غروب سے پہلے تک عمل کی ایک شرط یہ تھی کہ ہمیں تین دن تک کچھ نہیں بولنا تھا نیز یہ کہ پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھنی تھی۔

”اے عزتیل! کیا ہم آج ہی سے یہ عمل شروع کر سکتے ہیں؟“ میں نے معلوم کیا۔

”ہاں، لیکن آج سورج طلوع ہوئے کچھ وقت گزر چکا ہے اس لئے ہمیں عمل پڑھنے میں ذرا تیز سے کام لینا پڑے گا۔“ عزتیل نے بتایا۔

پھر جنگل کے اسی حصے میں ہم چاروں جن زاد ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے اور عمل پڑھ شروع کر دیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم نے عمل پڑھنا بند کر دیا۔ اس عرصے میں ہم ظہر اور عصر

نمازیں پڑھ چکے تھے۔ دن بھر بیٹھے رہنے کی وجہ سے عزتیل اتنا تھک گیا تھا کہ عمل کا وقت ختم ہوتے ہی نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا، مگر اسے زیادہ دیر آرام نہیں مل سکا کیوں کہ اب مغرب کی نماز پڑھنی تھی۔

اس روز عشاء کے بعد ہم سبھی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اگلے دو روز تک ہمارا یہی معمول رہا۔ آخر دن عمل پڑھتے ہوئے میں اپنے اندر واضح تبدیلی سی محسوس کرنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اب

میں فضا میں پہلے کی طرح پرواز کر سکتا ہوں۔ اس احساس کے باوجود میں عمل پڑھنے میں مصروف رہا۔ صبر آزما انتظار کے بعد آخر وہ لمحات آ ہی گئے جب میں نے اپنے وجود میں پہلے کی طرح تیز

توانائی محسوس کی۔ عمل کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فضا میں اڑنا شروع کر دیا۔ یاسف اور سوی بھی میرے ساتھ تھے۔

”اے میرے دوست علیالیش! تجھے مبارک ہو کہ تیری جناتی صفات بحال ہو گئیں۔“ یاسف نے مجھے مخاطب کیا۔

”اے یاسف! اگر تو ساتھ نہ دیتا تو ایسا ممکن نہ ہوتا۔“ میں نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا، ہم بولا۔ ”ہاں میں نے تجھ سے یہ یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اصغری بیگم کو کیسے منایا؟“

”اصغری کو سونے کے زیورات پہنے کا بہت شوق ہے اور مجھے اس کی یہ کمزوری معلوم ہے۔ سو کا ایک بار مجھے بطور رشوت اسے دینا پڑا۔“ یاسف نے ہنس کر بتایا۔

کچھ دیر فضا میں پرواز کر کے ہم جنگل میں اسی جگہ اتر گئے جہاں عزتیل موجود تھا۔ مسلسل دن کی مشقت نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ میں نے اس کی توانائی بحال کرنے کے لئے کچھ دوائیں تجویز کیں

اور یاسف جلدی ہی وہ دوائیں لے آیا۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے عزتیل کو وہ دوائیں پلا دیں جن فوری اثر ہوا۔ یاسف کو کراچی واپس جانے کی جلدی تھی، سو میں نے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی۔

یاسف نے اپنی روادگی سے قبل پوچھا۔ ”اب یہ بتا اے علیالیش کہ تیرا ارادہ کیا ہے؟ کہیں تو دوبارہ

تو خود کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں چاہتا؟“

”اے یاسف! اگر تیرا اشارہ اس عفریت کی طرف ہے جس نے مجھے ہلاک کرنا چاہا تھا تو یہ درست ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

آسکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

جب ہم عزتیل سے رخصت ہونے لگے تو اس نے ہمیں مخاطب کیا۔ "کیا خبر کہ اب جو تم دونوں لونو تو مجھے نہ پاؤ۔"

"اے میرے باپ! تو ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟" سوی بھاری آواز میں بولی۔

"اے سوی! ہر ذی روح کو ایک دن موت کا منہ دیکھنا ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ تجھے اور علیالیش کو اب دیکھ نہ پاؤں گا۔" عزتیل نے یہ کہہ کر مجھے اور سوی کو چٹا لیا، پھر کہا "میں تم دونوں کو ایک ایسی نصیحت کرنا چاہتا ہوں جو آج تک نہیں کی۔ اے علیالیش! تو خاص طور پر میری نصیحت سن! اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ ایک مخلوق دوسری مخلوق کے معاملات میں مداخلت کرے۔ ہر چند کہ تو راہ راست پر ہے مگر تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، آدم زادوں سے لافعلی ہو جا۔ ان آدم زادوں کی اپنی دنیا ہے اور ہم جن زادوں کی اپنی دنیا، دونوں ہی کو اپنا حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تجھ جو نصیحت کی اے علیالیش، تو اس پر عمل کرنے کا؟" عزتیل نے آخر میں مجھ سے دریافت کیا۔

چند لمحوں تک میں گم صم سا رہا۔ عزتیل مجھے آدم زادوں سے جلد از جلد لافعلی کی نصیحت کر رہا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر عزتیل پھر بول اٹھا۔ "بھہ اللہ تو مسلمان ہے اے علیالیش! ایک مسلمان لازم ہے کہ جو بات اللہ کو ناپسند ہو، اسے چھوڑ دے۔"

اس وقت عزتیل کے لہجے میں کچھ ایسی ہی بات تھی کہ میں نے اس کی نصیحت پر عمل کا عہد کر لیا۔

"انشاء اللہ میں اپنے عہد پر قائم رہوں گا اور جتنی جلد ممکن ہو گا آدم زادوں سے لافعلی ہو جاؤں گا۔" میں نے عزتیل کو یقین دلایا۔

پھر میری تقلید میں سوی نے بھی اپنے باپ سے یہی عہد کیا۔

"میری دعا ہے کہ تم دونوں اپنے عہد پر قائم رہو۔" عزتیل بولا۔

چند ہی لمحوں بعد میں اور سوی، ڈھاک سے قاہرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ آدم زادوں سے اب تک سوی اور میرا تعلق رہا تھا۔ سوی تو ایک آدم زاد کی بیوی بھی رہ چکی تھی اور میں ایک آدم زاد، نرگس کے عشق میں مبتلا تھا۔ دنیا کی بھیر میں وہ نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی؟ ہزار کوشش کے باوجود ابھی تک نرگس کو بھلا نہیں سکا تھا۔ اس وقت بھی مجھے نرگس کی یاد آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اب آدم زادوں سے لافعلی کا عہد کر چکا تھا۔ میں نے فضا میں پرواز کرتے ہوئے سوی کو مخاطب کیا "کاش اے سوی! آدم زادوں سے مکمل لافعلی سے پہلے وہ..... وہ نرگس مجھے ایک پار مل جاتی۔"

"اے علیالیش! تیری یہ خواہش ضرور پوری ہو گی۔" خلاف توقع سوی نے کہا۔ "تو نرگس کو تلاش کر لے گا۔"

"وہ کس طرح اے سوی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"نرگس کی تلاش میں تیری ناکامی کی وجہ میں جان چکی ہوں۔" سوی بڑے اعتماد سے بولی۔

"تو پھر اے سوی! مجھے بھی اس وجہ سے آگاہ کر دے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"تو نے مجھے نرگس کے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ ایک عالم آدم زاد کی بیٹی تھی!" سوی کا لہجہ فدا بین طلب تھا۔

"ہاں اے سوی! ایسا ہی تھا۔" میں بولا۔

"اور یہ کہ نرگس کسی آدم زاد نوجوان اقبال سے شادی کی خواہش مند تھی؟ تو نے ہی ایسا نہیں بولے دیا تھا؟"

"یہ بھی حقیقت ہے۔" میں نے ہانپ کر کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ تیرے اس عمل سے نرگس بھی بے خبر نہیں رہی ہو گی۔"

"تو پھر؟" میں بول اٹھا۔

"نرگس نے اقبال کو اپنانے کے بعد کسی عمل کے ذریعے ایسا بندوبست کر دیا ہو گا کہ تو اسے تلاش نہ کر سکے تاکہ اپنے محبوب اقبال کے ساتھ وہ پرسکون زندگی گزار سکے۔ بول کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟" سوی نے سوال کیا۔

"ممکن تو ہے اے سوی، مگر..... مگر نرگس اتنی سنگ دل نہیں ہو سکتی کہ مجھ..... مجھ سے لانا بھی نہ چاہے۔" میں جذباتی ہو گیا۔ "اے میرے عشق کی صداقت پر یقین آ گیا تھا۔ میرے عشق میں ہوس شامل نہیں رہی تھی۔ اس کا علم خود نرگس کو بھی ہو چکا تھا۔"

"لیکن اس نے تیری خود غرضی کو بھی تو جان لیا ہو گا۔"

"خود غرضی سے تیری کیا مراد ہے اے سوی؟" میں نے پوچھا۔

"سچ بتا اے علیالیش، کیا یہ خود غرضی نہیں تھی کہ تو نے نرگس اور اقبال کے درمیان دیوار کھڑی کر دی؟"

"ہاں اس حد تک میں خود غرض ضرور تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔

"دراصل قدرت نے تجھے اسی خود غرضی کی سزا دی ہے کہ تو نرگس کو تلاش کرنے کا میاب نہیں ہو سکا۔"

"لیکن ابھی تو اے سوی، تو نے کہا تھا کہ میں، نرگس کو تلاش کر لوں گا۔"

"ہاں میں نے یہ کہا تھا اور اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں، لیکن اے علیالیش، تجھے مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"یہ کہ اگر نرگس میرے اندازے کے مطابق واقعی اپنے محبوب اقبال کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہو گی تو تجھے ہمیشہ کے لئے نرگس کو بھلا دینا ہو گا۔ تو ایک بار اس سے ملنے کے بعد پھر کبھی

یہ خواہش نہیں کرے گا۔" سومی بولی۔

”اے سومی! اگر واقعی نرگس نے اقبال کو اپنا لیا ہو گا تو میں اسے پھر بھی بھول جانا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ مجھے میرے اظہار صداقت پر برا نہیں مانے گی۔

”اے علیالیش! میں تجھے اس پر مجبور نہیں کروں گی۔“ سہمی نے کہا۔ ”اور اب سن کہ نرگس! تلاش کرنا کس طرح ممکن ہے، تو نے اب تک اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر صرف نرگس کو تلاش کیا ہے۔ اگر تو اس کے محبوب اقبال کو تلاش کرتا اور اقبال کے ذریعے نرگس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقین ہے تجھے ناکامی نہیں ہوتی۔ تو کہیں یہ نہ سمجھ لیجو کہ میں نے اب تک تجھ سے یہ بات راز رکھی۔ دراصل آج ہی میں اس وقت اس نتیجے پر پہنچی تھی۔ جب میرا باپ عزتیل تجھے آدم زادوں سے لائق قرار دے رہا تھا۔ تبھی نرگس کا دھیان آیا تھا کہ آدم زادوں سے لائق کے بعد تو نرگس سے بھی پیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ میرے باپ سے عہد کرتے ہوئے کیا تجھے نرگس کا خیال نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ میں نے سچ بولا، پھر وضاحت کی۔ ”اس وقت فضا ہی کچھ اور تھی۔ ہاں جب میں تیرا ساتھ قاہرہ جانے کے لیے روانہ ہوا تو پہلی بار مجھے زمرگ کی یاد آئی۔ تو نے زمرگ کی تلاش کے لیے تدبیر بنائی ہے، مجھے بھی کارگر معلوم ہوتی ہے۔ عفریت اور اس کے آدم زاد غلاموں سے نمٹ کر زمرگ کو تلاش کر س گئے۔“

”ہاں مجھے بھی اس آدم زادی کو دیکھنے کی بڑی تمنا ہے جسے ثواب تک نہیں بھلا سکا۔“

ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کے سبب ہر چند کہ ہماری رفتار تیز نہیں تھی پھر بھی ہمیں فاصلے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اپنا سامان ہم ڈھاکہ سے لے کر چلے تھے جو دو عدد سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا۔ ہمارے پاس مقامی کرنسی بھی تھی اور زنانے 'مردانے' کپڑوں کے علاوہ ضرورت کی ہر شے بھی۔ ضروری اشیاء ہم جن زادوں کو نہیں آدم زادوں کو مطلوب ہوتی ہیں۔ مصلحت کے تحت فی الحال ہم انسانی قالب اختیار کر لیے اور قصرال یعنی پر واقع ایک فائیو اسٹار ہوٹل میرٹھ میں کارخ کیا۔ ہوٹل میں نے خود کو پاکستانی سیاح ظاہر کیا۔ انسانی قالب اپنا تے وقت ہم نے خیال رکھا تھا کہ پاکستانی معلوم ہوں۔ ہوٹل کی دوسری منزل پر ہمیں ڈبل روم مل گیا۔ ہم نے ہوٹل میں اپنے نام مقصود اور صفحہ لکھوائے تھے۔

میں اور سومی کیوں کہ اب آدم زادوں کے قالب میں تھے اس لیے ہمیں بھوک محسوس ہو گئی۔ یوں بھی اب رات ہونے والی تھی۔ روم سروس کو فون کر کے میں نے کھانا منگوایا۔ کھانا کھانے دوران میں سومی نے پھر مقرر کے غلاموں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کھانے فارغ ہوتے ہی میں نے اپنے تصور قوت کو متحرک کرنے کے لئے آنکھیں بند کیں اور لیلیٰ کا خیال کیا۔ کوشش کے باوجود میرے صفحہ ذہن لیلیٰ کا چہرہ نہیں ابھر سکا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور سومی کو مخاطب کیا۔ ”لیلٰی یا تو اب اس دنیا میں نہیں یا پھر“

Figure 1

ادھر ٹیلی فون کی تھنٹی بجی ادھر دروازے پر دستک ہوئی۔
ناصر کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ غالباً یہ سوچ رہا ہو گا کہ پہلے ٹیلی فون کا ریسپور
اٹھاے یا کمرے کا دروازہ کھولے۔ بالآخر اس نے ریسپور اٹھالیا۔

”ہاں بات کراؤ!..... ہیلو! میں ناصر بول رہا ہوں۔ سلیمان..... روانہ ہو چکے ہیں، آپ! شکریہ۔“ یہ کہتے ہی اس نے ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازے تک پہنچ کر فوراً اسے کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک بھاری بھر کم شخص اندر داخل ہوا، پھر اس نے تیزی سے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس سے پہلے کہ ناصر سنبھل پاتا آئے والے نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال کر ناصر کی طرف تان لیا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو سلیمان!“ ناصر حیرت زدہ آواز میں بولا۔ ”تمہیں تو میں نے دوستی کے نام اپنی مدد کے لئے بلایا تھا!“

”میں تمہاری مدد کے لئے ہی آیا ہوں۔“ سلیمان نے کہا۔

”مگر یہ..... یہ ریوالور..... تم نے ریوالور کیوں نکالا ہے؟“

”تمہاری مدد کرنے کے لیے تاکہ تمہیں دوسری دنیا کا سفر کرنے میں دیر نہ ہو۔“ سلیمان کے ہونٹوں پر بدستور سفاک مسکراہٹ تھی۔

”لیکن یہ ظلم ہے۔ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے اور میں تمہیں تفصیلات بتاؤں گا تو تم بھی اسی نتیجے پہنچو گے۔ تم پہلے میری چٹان لو، پھر۔“

”تم پر جو کچھ گزری ہے، مجھے منقرع کا غلام اول تفصیل سے بتا چکا ہے۔ صرف ایک عورت کی خاطر تم نے منقرع کے غلام اول طلال بے کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور قاہرہ سے فرار ہو کر یہاں آ گئے۔ اسے غداری نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟ ناصر! تم غدار ہو اور غداری کی سزا.....“

”نہیں سلیمان!“ ناصر نے چیخ کر سلیمان کی بات کاٹ دی۔ ”لیلیٰ کوئی عام عورت نہیں میری بیوی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی میری اور تمہاری طرح منقرع کی غلام تھی۔ نجیب المہندس کو یہ حق نہیں تھا کہ میری بیوی لیلیٰ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ جب وہ اپنے اس ناپاک مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے اپنی پراسرار قوتوں کو بروئے کار لا کر لیلیٰ کو موت کی نیند سلا دیا۔ وہ.....“

وہ لیلیٰ اپنے منہ سے خون تھوکتے ہوئے میرے بازوؤں میں دم توڑ گئی، مگر اپنی موت سے پہلے اس نے مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔“

”اور پھر تم نے اسی وجہ سے منقرع کے غلام دوم نجیب المہندس پر قاتلانہ حملہ کیا، مگر وہ بچ کر فرار ہو گیا۔ تم مجھے یہی بتانا چاہتے تھے نا؟“ سلیمان بول اٹھا۔

”ہاں۔“ ناصر نے اقرار میں سر ہلایا، پھر کہا۔ ”میں نے طلال بے سے شکایت کی تو اس نے مجھے واپس الاقصہ جانے کا حکم دیا۔ طلال بے کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے میری شکایت پر کان نہیں دھرا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور طلال بے سے کہہ دیا کہ اس کے حکم پر الاقصہ واپس جا رہا ہوں، مگر حقیقت یہ نہیں تھی۔ میں نجیب کو تلاش کر کے اس سے انتقام لینا چاہتا تھا، سو قاہرہ ہی ٹپ رہا۔ طلال بے سے یہ بات چھپ نہ سکی۔ اس نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے آخری بار دار تک دی کہ

میں اب مزید ایک دن بھی قاہرہ میں رہا اور الاقصہ واپس نہ پہنچا تو حکم نہ ماننے کی سزا میں مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ الاقصہ پہنچنے ہی میں فون پر اسے مطلع کروں۔ میرے لئے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ تن تنہا نجیب المہندس سے انتقام نہیں لے سکوں گا۔ الاقصہ پہنچنے ہی میں نے منقرع کے ان غلاموں سے رابطہ کیا جو میرے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے نہ صرف میری مدد سے انکار کر دیا بلکہ طلال بے کو ساری بات بتا دی۔ اس کے بعد طلال بے نے میری موت کا حکم جاری کر دیا۔ مجھے اپنے ایک دوست ہی سے یہ خبر ملی۔ الاقصہ مصر کے کسی بھی شہر میں اب میری زندگی محفوظ نہیں تھی، سو میں مصر سے فرار ہو کر یہاں آ گیا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کر مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ تم یقیناً میری مدد کرو گے۔ میں نے اسی لیے تمہیں آج بلایا تھا کہ.....“

”کہ اپنی طرح مجھے بھی غداری پر آمادہ کر لو گے۔“ سلیمان طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا، پھر مزید بولا۔ ”طلال بے کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ اسے مجھ سے تمہاری دوستی کا علم تھا۔ اس نے مجھے تمام حالات سے آگاہ کر دیا اور اپنا حکم دہرایا کہ وہ تمہاری موت کا حکم دے چکا ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر تم مصر سے فرار ہو کر ترکی پہنچنے تو مجھ سے جلد یا بدیر ضرور رابطہ قائم کرو گے اور یہی ہوا۔ آج دوپہر کو جب مجھے تمہارا فون ملا تو میں اسی وقت تمہیں طلال بے کے حکم پر قتل کرنے کا فیصلہ..... نہیں ناصر! اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا! سیدھے کھڑے رہو!“

”سلیمان! کیا ہماری برسوں کی دوستی کا یہی صلہ ہے؟“ ناصر کی آواز بھرا گئی۔

”اگر تم مجھ سے رابطہ قائم نہ کرتے تو شاید کچھ دن اور زندہ رہ سکتے تھے۔“ سلیمان نے ناصر کی بات نظر انداز کر دی۔ ناصر نے پھر اپنا سوال دہرایا تو سلیمان نے کہا۔ ”سنو! منقرع کے غلام اول طلال بے کا حکم نہ مان کر تمہاری طرح میں اپنی موت کو گلے لگانا نہیں چاہتا۔ رہی دوستی تو وہ زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی۔“

”کیا تمہیں یہ بھی احساس نہیں کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اچانک ناصر نے سلیمان پر جھلانگ لگا دی۔

سلیمان غافل نہیں تھا۔ اس نے ناصر پر گولی چلا دی۔ ناصر اس تک پہنچنے سے پہلے ڈھیر ہو گیا۔

”تم..... تم نے یہ اچھا نہیں کیا سلیمان!“ ناصر بہ مشکل رک رک کر بولا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ جیسے وہ بتے ہوئے خون کو روک لینا چاہتا ہو۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ ناصر کا دوسرا ہاتھ آہستگی سے اپنے کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بھی ریوالور نکال لیا اور بلا تاخیر سلیمان پر فائر کر دیا۔ ناصر کی چلائی ہوئی گولی سلیمان کی پیشانی میں بیوست ہو گئی اور وہ کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح ادندہ منہ زمین پر آ رہا۔ مرتے مرتے بھی ناصر نے اپنے قاتل کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

گولیاں چلنے کے دھماکے یقیناً سن لیے گئے تھے اسی سبب دروازے پر زور دار دستک سنائی دے رہی تھی۔ ناصر کچھ دور ٹھٹھا اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اب اس کمرے میں کوئی دروازہ کھولنے کے لیے

زندہ نہیں بچا تھا۔ دروازے کو توڑ کر ہی اب کوئی اندر آسکتا تھا۔

☆=====☆

کھیل ختم ہو چکا تھا، مگر اس سے پہلے مجھے لیلیٰ کی موت کا سبب معلوم ہو گیا تھا۔ ناصر کو تلاش کرنے میں اگر مجھ سے کچھ دیر ہو جاتی تو اندھیرے ہی میں رہتا۔ مجھے یہ معلوم نہ ہو پاتا کہ لیلیٰ اور ناصر کا کیا انجام ہوا۔ ناصر کی موت کے ساتھ ہی میرے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرے آنکھیں کھولتے ہی سوی نے مجھ سے مضطرب آواز میں پوچھا۔ ”کیا لیلیٰ کے شوہر ناصر کا کچھ پتا چلا؟“

”ہاں اے سوی! سب کچھ پتا چل گیا۔“ میں نے جواب دیا، پھر سوی کو ان تمام باتوں سے آگاہ کر دیا جو مجھے معلوم ہوئی تھیں۔

”لیلیٰ کی موت سے کم از کم ہمیں یہ فائدہ ضرور ہوا اے علیالیش! کہ وہ تجھے قابو میں کرنے کے لیے دوبارہ عمل شروع نہیں کر سکی۔“ سوی نے کہا۔ ”ایک خطرہ تو اب ہمیشہ کے لئے ٹل ہی گیا۔ ایک برائی نے دوسری برائی کو ختم کر دیا۔ اب ہم طلال بے اور نجیب الہندس سے آسانی کے ساتھ نمٹ سکتے ہیں۔“

”لیکن منقرع کے ان دوسرے غلاموں کا کیا ہو گا جو مصر کے دوسرے شہروں اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں؟“ میں بولا۔

”طلال بے اور نجیب ہی کی طرف سے انہیں احکام ملتے ہیں، جب یہی دونوں نہیں رہیں گے تو انہیں کون منظم رکھے گا؟ پھر تو یہ کیوں بھول گیا کہ ہم سے معرکہ آرائی کے دوران میں اب تک منقرع کے غلاموں کی بڑی تعداد ماری جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس بہروپے عفریت ہی کو کب زندہ چھوڑیں گے جو منقرع بن کر آدم زادوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس عفریت کی موت کے بعد تو یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر اگر کوئی آدم زاد خود کو منقرع کا غلام سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ اس دنیا میں کافروں اور گمراہوں کی کمی تو نہیں، ہم کس کس کو ختم کرتے پھریں گے؟“ سوی نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”یعنی تو یہ چاہتی ہے اے سوی! کہ ہم پہلے طلال اور نجیب کو ان کے انجام تک پہنچائیں، پھر اس کافر عفریت کو ٹھکانے لگائیں۔ باقی جو بھٹکے ہوئے آدم زاد ہیں، ان سے کوئی غرض ہمیں نہیں رکھنی چاہئے۔“ میں نے سوی سے تصدیق چاہی۔

”ہاں اے علیالیش! میرا یہی مقصد ہے۔“

”تو پھر چل! ہم اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر پہلے انہی دونوں لعنتی آدم زادوں کو تلاش کرنے میں نے کہا۔

”کیوں؟ کیا تو انہیں تلاش کرنے کے لیے اپنے تصور کی قوت نہیں آزما سکتا؟“ سوی نے سوال کیا۔

”اس طرح وہ دونوں چوکنہ ہو جائیں گے۔ تجھے شاید یاد نہیں رہا کہ ان شیطانوں کو علم ہو جاتا ہے، کوئی انہیں دیکھ رہا ہے۔“

”ہاں میں یہ بات بھول گئی تھی۔“ سوی نے اعتراف کیا۔

روانگی سے قفل میں نے دوم سروس کو فون کیا تاکہ ویٹر کھانے کے برتن اور ٹرائی لے جائے۔ کچھ دیر میں ویٹر آگیا اور ٹرائی میں برتن رکھ کر لے گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کمرے کے دروازے پر ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کی تختی لٹکا دی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

طلال بے اور نجیب کو تلاش کرنے کے لیے مجھے اور سوی کو انسانی قالب چھوڑنے پڑے۔ ضروری نہیں تھا کہ ہمیں وہ دونوں شیطان ایک ہی جگہ مل جاتے۔ میں نے اسی لیے پہلے نجیب الہندس کو تلاش کیا۔ اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لانے کے بعد مجھے اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میرا یہ اندازہ بھی درست ہی نکلا تھا کہ طلال اور نجیب الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔

خلاف توقع نجیب اس وقت دریائے نیل کے سینے پر تیرتی ہوئی ایک موٹر بوٹ میں سفر کر رہا تھا۔ موٹر بوٹ شہری حدود سے باہر نکل رہی تھی۔ بوٹ پر نجیب کے سوا صرف ڈرائیور ہی مرد تھا۔ باقی تین حسین و نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے جسوس پر برائے نام لباس تھا۔ وہ تینوں ہی بوٹ کے کیمبن میں نجیب کی دل بستگی کا سامان کر رہی تھیں۔ نجیب گویا جشن عیش منا رہا تھا۔ اس کے وہم دگمان میں بھی نہ ہو گا کہ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہو گی۔ نجیب کے ایک ہاتھ میں جام تھا اور دوسرا ہاتھ ایک لڑکی کی کمر تھامے ہوئے تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاصی پی چکا ہے اور نشے میں ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ نوجوا بھی مجھ سے ایک موٹر بوٹ ہی پر ملی تھی۔

میں اور سوی دونوں ہی کیمبن کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر ہم جن زادوں کے لیے بند دروازوں میں داخل ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں نے سوی کو مخصوص اشارہ کیا اور نجیب کی طرف لپکا۔ یہ وہی لعنتی اور بد بخت آدم زاد تھا جس نے مجھے کسی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینکنے کا دعویٰ کیا تھا۔ نجیب کے ہاتھ سے میں نے شیشے کا جام مے چھین کر کیمبن کی دیوار سے دے مارا جس کے سبب زبردست چھٹا ہوا۔ اسی وقت سوی نے اس لڑکی کو گھسیٹ کر ایک طرف پھینک دیا جس کی کمر میں نجیب دوسرا ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔ لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ خوف کی وجہ یہی رہی ہو گی کہ اسے گھسیٹ کر پھینک دینے والی سوی نظر نہیں آئی تھی۔

”کون..... کون ہے یہاں؟“ نجیب تقریباً چیخ اٹھا۔

”تیری موت زاعون۔“ میں نے غیر انسانی آواز میں جواب دیا۔

”بھوٹا ہے تو! تیرا راز کھل چکا ہے۔“ نجیب یہ کہہ کر خوفزدہ سے انداز میں ہنسا۔ ”تو فرعون خضرع

کے امیر کی روح نہیں ہے بلکہ ایک جن زاد ہے اور میں تیرا نام بھی جانتا ہوں۔ تیرا نام علیالیش ہے اور تو اب تک ہمیں دھوکا دیتا رہا ہے۔“

میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ فوراً اس شیطان پر چڑھ دوڑتا۔ مجھے یقین تھا کہ اس عرصے میں نجیب نے اپنے گرد کوئی نادیدہ حصار قائم کر لیا تھا۔ مزید تصدیق کی خاطر میں نے نجیب کو مخاطب کیا۔ ”تجھے شاید اس نادیدہ حصار پر غرور ہے جسے تو نے اپنے گرد قائم کر لیا ہے، مگر زاعون کو کوئی حفاظتی حصار نہیں روک سکتا۔“

”اسی لیے تو میرے قریب آنے سے خوف کھا رہا ہے!“ نجیب کی آواز میں طنز تھا۔ ”دیے میں تجھے یہ ضرور بتا دوں کہ تیرا انداز غلط نہیں۔ پھر بھی بات ایک تجھے نہیں معلوم کہ میں نے دہرا حصار کھینچا ہے۔ ایک حصار اپنی حفاظت کے لیے دوسرا تجھے قید کرنے کے لیے۔“

”دہرا حصار؟“

”گھبرا گیا!“ نجیب ہنس دیا، پھر خود ہی بتانے لگا۔ ”دوسرا حصار میں نے اس کیبن کے گرد کھینچا ہے۔ اب تو اس کیبن سے فرار نہیں ہو سکتا۔“

غرور میں آکر نجیب نے مجھے انجانے خطرات سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔ میں اور سوی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ عزتیل نے مجھے اور سوی کو کئی حصار شکن عمل تعلیم کیے تھے، مگر ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ اس وقت کون سا عمل کارگر ثابت ہو گا؟

اسی لمحے سوی لپک کر میرے قریب آگئی اور سرگوشی کی۔ ”میں حصار شکن عمل پڑھنا شروع کرتی ہوں۔“

”مگر تو کون سا عمل پڑھے گی؟“ میں نے بھی سوی سے سرگوشی ہی میں پوچھا۔

”وہ سارے حصار شکن عمل جو میرے باپ نے سکھائے تھے۔“ سوی نے بتایا۔ ”ان میں سے کوئی نہ کوئی عمل اس دہرے حصار کو توڑ دے گا۔“

”خوفزدہ ہو کر تو نے چپ کیوں سادھ لی علیالیش؟ یہاں سے تو فرار تو ہو نہیں سکتا، ہاں جل کر خاک ضرور ہو سکتا ہے۔“ نجیب نے مجھ سے کہا۔ ”اب تو تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ اگر تیری کوئی خواہش ہو تو بتا دے۔ میں تجھے جلا کر خاک کرنے سے پہلے تیری آخری خواہش پوری.....“

”اے بڑبڑولے!“ میں بول اٹھا۔ دانستہ اسے باتوں میں لگا کر میں سوی کو حصار شکن عملیات پڑھنے کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں بولا۔ ”اپنی اوقات نہ بھول! تو فرعون خضر کے امیر زاعون کو دھمکی دے رہا ہے!“

”بار بار جھوٹ بول کر تو مجھے نہیں خود کو دھوکا دے رہا ہے اے جن زاد علیالیش!“ نجیب المندس کے لہجے سے نخوت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”تجھے شاید کسی نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ کوئی بھی جن زاد آدم زادوں سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔“

”معلوم ہے مجھے!“ میں بات کو طول دینے کی خاطر بولا۔ ”میری ایک تجویز ہے، اگر تو مان لے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہے کہ تیرے اور میرے درمیان مصالحت ہو جائے۔“

”مصالحت اور تجھ سے!“ وہ طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا۔ ”مصالحت کی راہ کمزور اختیار کرتے

”تجھے اس عورت لیلیٰ نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، غلط ہے۔“ میں نے مصلحتاً تردید کی کیوں کہ آدم زادوں کو جنات کے نام معلوم ہونا خطرناک بات ہے۔ نجیب کے سوا وہاں تین آدم زادیاں بھی موجود تھیں، انہوں نے بھی میرا نام سن لیا تھا۔

”علیالیش! جھوٹ بولنے سے تیری جان نہیں بچے گی۔ میں تجھے جلا کر خاک کر دوں گا!“ نجیب نے مجھے دھمکی دی۔ ”یہ جاننے کے بعد کہ تو زاعون نہیں ایک جن زاد ہے، میں نے ایسے عمل سیکھنا شروع کر دیے تھے کہ کسی بھی جن زاد کو موت کے گھاٹ اتار سکوں۔“

”جس طرح تو نے ایک شیطانی عمل کے ذریعے لیلیٰ کو مار ڈالا کیوں کہ وہ تیری ہوس کی بھیئت چڑھنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے طنز کیا۔

نجیب یہ سن کر چونک اٹھا۔ میں دانستہ اسے باتوں میں لگا کر یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ میرے خلاف کیا قدم اٹھا سکتا ہے؟ مجھے اس میں ناکام نہیں ہوئی۔

”تجھے لیلیٰ کی موت کے بارے میں بھی معلوم ہے!“ نجیب نے یہ کہہ کر اپنے جڑے بھیجے لیے۔

”مجھے تو یہ بھی خبر ہے کہ لیلیٰ کا شریر ناصر، مصر سے فرار ہو کر کہاں گیا اور اس پر کیا گزری؟“

میرے چپ ہوتے ہی نجیب نے بے ساختہ پوچھا۔ ”وہ غدار کہاں ہے؟“

”جہاں تجھے جانا ہے۔“ میں غرایا۔

”کیا مطلب ہے تیری اس بات کا؟“

”اگر تو اپنی موت سے پہلے یہ جانتا ہی چاہتا ہے تو میں اسے تیری آخری خواہش سمجھ کر بتا دیتا ہوں کہ اب سے کچھ دیر پہلے ناصر کو موت کی نیند سلایا جا چکا ہے۔“ میں نے نجیب کو بتا دیا۔ اس سے میرا مقصد نجیب پر اپنی برتری جتانا تھا۔ ناصر کی ہلاکت کے بارے میں تفصیل بتانے سے کوئی فرق نہ پڑتا، سو میں نے کہا۔ ”جب طلال بے نے ناصر کی موت کا حکم دے دیا تو وہ مصر سے فرار ہو کر ترکی کے شر استنبول پہنچ گیا اور.....“

”اور وہاں اس نے اپنے دوست سلیمان سے رابطہ کیا ہو گا۔“ نجیب نے میری بات کاٹ دی۔ ”پھر سلیمان ہی نے اسے مار ڈالا ہو گا۔“

”تو یہاں تک ٹھیک سمجھا مگر تجھے یقیناً یہ معلوم نہیں کہ اپنی موت سے پہلے ناصر نے سلیمان کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔“

”حیرت ہے کہ سلیمان جیسا شاطرات کھا گیا!..... خیر میں تو اس پر خوش ہوں کہ میرا دشمن اب اس دنیا میں نہیں۔“

”اس دنیا میں تو تجھے بھی نہیں رہنا نجیب!“

”علیالیش! یہ تیری بھول ہے۔ اس وقت میں غافل تھا کہ جب تو نے اچانک میرے ہاتھ سے جام جھین کر پھینک دیا، مگر اب تجھے میرے قریب آنا مہنگا پڑے گا۔ اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں تو میرے قریب آکر دیکھ لے۔“ نجیب نے دعویٰ کیا۔

ہیں اور میں کمزور نہیں۔ اس کے باوجود میں تیری تجویز کو آخری خواہش تصور کرتے ہوئے اسے سنا ضرور چاہوں گا۔

”جیسے سنا ہی چاہئے اے نجیب المندس کہ تُو بہت سی حقیقتوں سے واقف نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا۔ اس طرح میں اسے مزید کچھ دیر تک اور الجھائے رکھ سکتا تھا۔ ”سن کہ تُو جسے فرعون منقرع کی روح سمجھ رہا ہے، وہ دراصل ایک طاقتور جن زاد ہے جسے عفریت کہتے ہیں۔“

”تُو نے یہ کیا نئی بکواس شروع کر دی! اس طرح تُو فرعون کی روح کا عذاب مول لے رہا ہے۔“ اس نے مجھے اپنی دانست میں ڈرایا۔

”یہ بکواس نہیں حقیقت ہے اور میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔“ میں نے دعویٰ کیا اور سوی کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی عمل پڑھنے میں مصروف تھی۔

”اگر تُو اپنے دعوے میں سچا ہے تو پھر اسے ثابت کرا“ نجیب فوراً بولا۔

میں نے جعلی منقرع کی روح کے ہیولے کو دیکھا تھا اور اس کی آواز بھی سنی تھی۔ میرے لئے یہ مشکل نہیں تھا کہ اس کی ہیئت اختیار کر لیتا۔

”تو پھر دیکھ میرے دعوے کی سچائی!“ میں نے یہ کہتے ہی دوسرے ہی لمحے منقرع کی روح کا فرضی قالب اپنا لیا اور ظاہر ہو گیا۔

نجیب المندس کی نظر جیسے ہی مجھے پر پڑی وہ غیر ارادی طور پر بوکھلا کر تعظیماً میرے سامنے سجدے میں گر گیا اور خوابیدہ آواز میں بڑبڑائے لگا۔ ”اے عظیم منقرع کی روح! مجھ پر حقیقت ظاہر کر دے۔ میں تیرا غلام تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے فریب وادہام سے نکال لے!“

”اٹھ اے نجیب المندس!“ میں دانستہ عفریت ہی کی آواز میں بولا۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے منقرع کی روح تصور کر رہا ہے۔ اس کی دانست میں شاید یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اور وجود منقرع کی روح کا قالب اختیار کر سکتا ہے۔ میرے حکم پر نجیب آہستہ آہستہ اب سجدے سے سر اٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ ”سن کہ تجھ سے جو کچھ کہا گیا اور تو نے جو کچھ سنا وہی حقیقت ہے۔ تُو مجھے فرعون منقرع کی روح سمجھ رہا ہے جب کہ میں وہ نہیں ہوں۔“

”تت..... تو کیا..... کیا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں؟ کلک..... کیا تم عظیم منقرع کی روح نہیں ہو۔“ نجیب نے میری طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔ غالباً اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اب تک جس کی عبادت کرتا آیا تھا، اس سے نظریں ملا سکتا۔

”ہاں اے بے خبر آدم زاد! میں منقرع کی روح نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پھر..... پھر کون ہے تُو؟“ نجیب نے خوفزدہ سی آواز میں سوال کیا۔

”وہی جو تجھے ابھی بتایا گیا تھا۔ میں تو ذامعون ہوں جو منقرع کی روح کا راز تجھ پر فاش کر رہا ہوں۔ تُو جسے اب تک پوجتا آیا ہے وہ منقرع کی روح نہیں بلکہ ایک طاقتور عفریت ہے۔ تجھے یہ یقین دلانے کی خاطر میں نے منقرع کی روح بن کر ظاہر کرنا.....“

ابھی میرے الفاظ پورے نہیں ہوئے تھے کہ جیسے آسانی بجلی کا زبردست کڑا کا ہوا۔ کہیں میں ہر طرف شعلوں کی لمبی لمبی زبانیں لپکتے لگیں۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ سوی جو عمل پڑھ رہی تھی، ان میں سے کوئی عمل اپنا کام کر چکا ہے۔ کہیں میں موجود حسین و نوجوان لڑکیاں حیرت انگیز مناظر دیکھ کر جانے کب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں۔ جو عمل سوی نے پڑھا تھا، حصار شکن ہونے کے علاوہ دشمن کے لیے کتنا ہلاکت خیز ہو گا، اس کا مشاہدہ بھی مجھے چند لمحوں میں ہو گیا۔ وہ شعلے بگولوں کی طرح رقص کرتے ہوئے نجیب المندس کی طرف بڑھ رہے تھے جس نے اپنے گرد بھی ایک ناپیدہ حصار قائم کر رکھا تھا۔ اب مجھے منقرع کی روح کا قالب اختیار کیے رہنے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اسے ترک کر دیا۔ رقص کنائ شعلے جیسے ہی نجیب المندس کے قریب پہنچ ایک مرتبہ پھر بجلی کڑکی اور چنگاریاں اڑنے لگیں۔ ناپیدہ حصار ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر تھا جیسا میں نے بنگال کی ساحل پوجا دیوی کے کھینچے ہوئے حصار کو ٹوٹ کر بکھرتے دیکھا تھا۔

نجیب المندس شعلوں میں گھرا ہوا چنچ رہا تھا۔ ”اے عظیم منقرع کی روح! اپنے غلام کو بچالے۔“

”اے بھٹکے ہوئے آدم زاد! اب تجھے کوئی مرنے سے نہیں بچا سکتا کہ تیرا آخری وقت آچکا ہے۔“ میں بولا۔

پھر میرے ہی سامنے دیکھتے ہی دیکھتے نجیب المندس زندہ جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت تک کہیں میں لگی ہوئی آگ نے ساری موٹر بوٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں اور سوی فضا میں پرواز کر گئے کہ اب وہاں ہمارا رکنا ضروری نہیں تھا۔ دور سے ہم نے موٹر بوٹ کو دریا میں ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

نجیب المندس کی موت نے مجھے اب ایک اور نئی راہ بھادی تھی۔ اس طرح طلال بے پر قابو پانا بہت آسان ہو جاتا۔ میں نے سوی سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو اس نے بھی اتفاق کیا۔ چھوٹا دشمن ختم ہو چکا تھا، مگر ابھی بڑا دشمن باقی تھا، یعنی طلال بے! اسے دھوکا دے کر مارنا ہی مناسب ہوتا کہ جنگ اور عشق میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں نے آدم زادوں کے اسی اصول کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اپنی جناتی صفات کو بروئے کار لا کر ہم نے طلال بے کا بھی سراغ لگا لیا۔ وہ پرانے قاہرہ کے ایک علاقے عباسیہ میں تھا۔ یہ متوسطہ درجے کی ایک قدیم آبادی تھی۔ پرانے طرز کی ایک عمارت میں طلال بے ہمیں تامل گیا۔ اس وقت زیادہ رات نہیں ہوئی تھی، لیکن طلال بے سونے کے لیے خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے جان لیا کہ وہ کچھ بیمار ہے۔ مسمری کے قریب سرہانے رکھی ہوئی میز پر موجود دوائیں اس کا ثبوت تھیں۔

خواب گاہ میں ہلکا نیلا بلب جل رہا تھا اور طلال بے مسمری پر آنکھیں بند کیے غالباً سونے کی کوشش میں تھا۔ میں نے منقرع کی روح کا قالب اپنانے میں دیر نہیں کی اور اسی کے ساتھ عفریت کی آواز میں زور سے بولا۔ ”اے طلال بے! اٹھ جا اور اپنی سزا قبول کرا“

آواز سنتے ہی طلال بے ہڑبڑا کر مسمری سے اٹھا اور پھر میرے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

”اے عظیم مقرر کی روح! اپنے غلام کے لیے تیرا کیا نیا حکم ہے؟“

طلال بے کے ذہن پر یقیناً غنودگی چھائی ہوئی تھی اسی سبب اس نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ میں نے اسی لیے اپنے الفاظ پھر دہرائے اور مزید کہا۔ ”تیرا جرم یہ ہے کہ تُو نے نجیب المندس کو پچانے کی خاطر ہمارے دو غلاموں کو موت کی نیند سو جانے دیا۔ ہم نے تیری ہی مدد کو لیلیٰ اور ناصر کے مشوروں پر عمل کا حکم دیا تھا، مگر لیلیٰ کو تیرے دست راست نے مار ڈالا اور تُو نے اس کے شوہر ناصر کی موت کا حکم دے دیا جسے آج ہی تیرے حکم پر ترکی کے شرابنبل میں قتل کیا جا چکا ہے۔ تیری اس نافرمانی کی سزا یہ ہے کہ تُو خود ہمارے حکم پر اپنی زندگی ختم کر لے۔ سجدے سے سر اٹھا اور جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کر!“

کسی سحر زدہ شخص کی طرح طلال بے اٹھا اور لرزے قدموں سے مسہری کی طرف بڑھا۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی دوبارہ ہمت نہیں کی تھی۔ مسہری کے سر ہانے رکھے ہوئے تکیے کے نیچے سے طلال بے نے ریو اور نکلا اور اسے اپنی کپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم لہرا کر پہلے مسہری کے سر ہانے سے ٹکرایا اور پھر نیچے فرش پر جا پڑا۔ اسے ٹھنڈا ہونے میں دیر نہیں لگی۔ مجھے پہلے سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اپنے سب سے طاقتور دشمن کو اتنی آسانی کے ساتھ ختم کر دوں گا۔ میں اگر اسے مقرر کی روح ہونے کا فربہ نہ دیتا تو یقیناً اسے مارنا اس قدر سہل نہ ہوتا۔

اب صرف آخری معرکہ باقی رہ گیا تھا۔ میں پرانے قاہرہ سے سوی کے ساتھ قنارال عینی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ ہماری رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

جن دو شیطان صفت آدم زادوں کو آج ہم نے موت کے گھاٹ اتارا تھا، انہیں مارنا پہلے بھی ممکن تھا، مگر اس طرح ہم اندھیرے میں رہتے۔ ہمیں اس کافر عفریت کا پتا نہ چلتا جس نے آدم زادوں کے ایک گروہ کو دولت کا لالچ دے کر کفر و شرک کی لعنت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

”اے سوی! تیرا کیا مشورہ ہے، آج ہی رات اس ظالم عفریت سے بھی کیوں نہ منٹ لیا جائے؟“ میں نے سوی کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے پوچھا۔

”تُو یہ نہ سمجھ لیجئے اے علیالیش! کہ میں ہمت ہار رہی ہوں، لیکن جانے کیوں مجھے اس سے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔“ سوی نے جواب دیا، پھر کہنے لگی۔ ”اور بھی تو جانے کتنے کافر اور بدکردار عفریت اس دنیا میں ہیں جنہوں نے آدم زادوں کو کفر و شرک کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ ہم کس کس کو ختم کریں گے؟“

”ٹھیک کہتی ہے تُو اے سوی!“ میں نے تائید کی، پھر بولا۔ ”مگر اس عفریت کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ کیا تُو بھول گئی کہ اس نے مجھے مار ڈالنا چاہا تھا!“

”اے علیالیش! مجھے سب کچھ یاد ہے، میں کچھ بھی نہیں بھولی اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہم جن زاد انتقام لینے میں آدم زادوں سے بڑھ کر ہیں۔ تیری روح کو اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک اس ظالم عفریت سے انتقام نہیں لے لے گا۔ میں نے تو صرف وہ بات کہی ہے جو مجھے محسوس ہو رہی ہے۔“

سوی کی بات سن کر مجھے ایک اور خطرے کا احساس ہوا جس کی طرف پہلے میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اسی احساس کے تحت میں نے سوی سے کہا۔ ”یہ بتا اے سوی کہ اس عفریت کے بارے میں میرے جو جذبات ہیں، کیا اس کے بھی میرے متعلق نہ ہوں گے؟ وہ بھی تو مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہو گا؟“

”کس بات کا انتقام؟ تُو نے آخر اس کا کیا بگاڑا ہے؟“ سوی نے کہا۔

”اس جیسے بد ذات عفریت کو مجھ سے دشمنی رکھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نے اس کی راہ کوئی کرنا چاہی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کی دوسری کاری ضرب لگنے سے پہلے ہی یاسف مجھے لے اڑا تھا۔ مجھے غائب دیکھ کر اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا ہو گا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔“

”برا نہ مانو اے علیالیش! یہ سب تیرے واسطے ہیں۔ اگر اس عفریت نے تجھے حقیر جاننے کے باوجود کوئی اہمیت دی ہوتی تو اس کے لیے تیری تلاش کون سی مشکل تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ تجھے اب تک بھول بھی گیا ہو گا ورنہ وہ انتقام ضرور لیتا۔ روزانہ جانے ایسے کتنے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ طاقتور جن زاد خود سے کمتر جن زادوں کی جناتی صفات سلب کر لیتے ہیں یا مار ڈالتے ہیں۔ اس عفریت کی پہلی ضرب نے کم از کم تیری جناتی صفات تو تجھ سے چھین ہی لی تھیں۔ تیرا قصور محض یہی تو تھا کہ تُو نے اس کا پیچھا کیا تھا! انتقام یا سزا کے طور پر اس نے تجھے تیری جناتی صفات سے محروم کر دیا۔ کیا اس کے اطمینان کی خاطر اتنا کافی نہ رہا ہو گا؟“ سوی نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے تفصیل سے سمجھایا۔

اب ہم دونوں پرواز کرتے ہوئے اہرام مصر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ وہیں فرعون مقرر کے اہرام کے پیچھے اس عفریت کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

سوی کی باتوں اور دلیلوں میں وزن تھا جس کا میں نے اعتراف کر لیا۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ سوی اس عفریت سے معرکہ آرائی کے معاملے میں تذبذب کا شکار کیوں ہے؟ کچھ باتیں صرف محسوس کی جاتی ہیں، ان کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ شاید کچھ ایسا ہی معاملہ سوی کے ساتھ تھا۔ اس وقت میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ ہوٹل پہنچ کر اس مسئلے پر سوی سے تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اس عفریت کی مخصوص بو کے ذریعے ہمارا اسے تلاش کر لینا مشکل نہ ہوتا۔ اس کا مستقل ٹھکانہ مجھے فرعون مقرر کا اہرام ہی معلوم ہوتا تھا کیوں کہ طلال اور نجیب اسے وہیں جا کر پکارتے تھے۔

برسوں گزر جانے کے باوجود آج بھی مجھے پچھتاوا محسوس ہوتا ہے کاش میں نے سوی کی بات مان لی ہوتی اور اس عفریت سے نہ ٹکرایا ہوتا۔ پھر شاید میری روح پر وہ ذمہ نہ لگتا جو کبھی نہیں بھر سکے گا۔ اس ذمہ کی چھین نہ مجھے جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ اگر خود کشی حرام نہ ہوتی تو شاید میں خود کشی کر لیتا۔

اس رات ہوٹل پہنچ کر سوی نے میری بات مان لی اور عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”اے علیالیش! تجھے شاید نرگس سے ملنے کی جلدی ہے اسی لیے اس معاملے کو آج ہی رات نمٹا دینا چاہتا ہے۔ چل اگر تیری یہی مرضی ہے تو پھر یہی سہی!“

”تیرا کہنا غلط نہیں اے سوی! ایک وجہ یہ بھی ہے۔“ میں نے اظہار حقیقت سے گریز نہ کیا۔

جن زاد ہو کر ایک عفریت سے ٹکر لینے جا رہا ہے۔

مجھے ساتھ لیے یاسف اہرام میں داخل ہوا تو ایک مرتبہ پھر جیسے میں پتھر کا ہو گیا۔ عفریت صاعق میری سوی کے بھول سے وجود کو روند رہا تھا اور میں اس کے نتیجے سے واقف تھا۔ کسی عفریت کی ہوس کا نشانہ بن کر کوئی کمزور نسل کی جن زادی کبھی زندہ نہیں بچتی۔ سوی یا تو اس حادثے کے سبب اپنے ہوش کو بیٹھتی یا پھر..... میں اس سے زیادہ سوچنے کی امت نہ کر سکا۔ عفریت صاعق ہوس کے جنون میں جلا سوی کو روندتے ہوئے غرا رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میرا سکتہ ختم ہوتا، یاسف اس عفریت صاعق پر جھپٹ پڑا۔ اسے شاید یہ توقع ہو گی کہ میں بھی دوسری جانب سے صاعق پر اسی لمحے حملہ کر دوں گا، لیکن میرا سکتہ ٹوٹنے میں چند لمحے کی تاخیر ہو گئی اور انہی چند لمحوں میں سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا سکتہ اپنے دوست یاسف کی آخری چیخ سن کر ٹوٹا تھا۔ غالباً جنون ہوس میں جلا عفریت نے اس پر ایسی شدید ضرب لگائی تھی کہ اسے دوبارہ چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ میرا دوست مجھ پر قریان ہو گیا، اس احساس نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھرویں۔ میں نے جھپٹ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ بھرپور وار کیا۔ اس کی گرفت سے سوی کا وجود نکل گیا۔ غرا کر اس نے مجھ پر ضرب لگنا چاہی مگر چیخ اٹھا۔ یہ میرے گرد قائم دہرے خافتی حصار ہی کا کمال تھا کہ وہ عفریت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں اس دہرے حصار میں عفریت کے ہر وار سے محفوظ تھا۔

عفریت صاعق کی حالت اس وقت کسی ایسے زخمی شیر کی سی تھی جس سے اس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔ سوی کا بے حس و حرکت وجود فرعون منقرع کے تابوت کے قریب چبوترے پر پڑا تھا اور صاعق نتائج سے بے پردہ ہو کر جنونی انداز میں مجھ پر وار یہ دار کے جا رہا تھا۔ نتیجتاً اہرام میں اس کی تیز اور بھیانک چیخیں گونج رہی تھیں۔ بار بار مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش میں وہ خافتی حصار کی زد میں آکر اپنی غیر معمولی قوت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ میری بھرپور ضربوں سے بھی اس حالت خراب تھی۔

میری ایک ضرب کھا کر اہرام کی دیوار سے ٹکراتے ہوئے وہ چٹا۔ ”اے مردہ نسل کے حقیر بونے! میں تجھے یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جانے دوں گا!“ اس کے ساتھ ہی اپنی دانست میں وہ مجھ پر دوبارہ ٹوٹ پڑا۔ اس کا انداز اتنا خطرناک، جنونی اور فیصلہ کن تھا جیسے وہ اس مرتبہ مجھے مار ہی ڈالے گا۔ وہ دہرے خافتی حصار میں کھس آیا تھا جس کی وجہ سے اس کی طاقت تقریباً سلب ہو گئی تھی۔ اس کی ضربیں مجھے بھولوں کی ضربیں محسوس ہو رہی تھیں۔ چند لمحے گزرے ہوں گے کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ یوں جیسے اب اس کے وجود میں طاقت نہ رہی ہو۔

اب گویا میری بادی تھی، مجھ پر جنون طاری تھا۔ اس نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ جب تک اس میں چیخنے کا دم رہا چیخ رہا اور میں اس کے وجود کو روکنے کی طرح دھکے لگا۔ جلد ہی وہ میری ٹوکروں سے زخمی ہو کر مارا گیا مگر میرا جنون ختم نہ ہوا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب اس عرصے میں میری نگاہ سوی کے وجود پر پڑی۔

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں ایک مرتبہ پھر ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔ اب ہماری منزل اہرام مصر تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ عفریت ہمیں اپنے ٹھکانے ہی پر مل جائے۔ وہ کوئی آوارہ و بد کردار اور عیاش عفریت بھی ہو سکتا تھا جو راتوں کو جن زادیوں یا حسین آدم زادیوں کی تلاش میں بھٹکتا ہو۔ پھر بھی ہم نے اسے پہلے اسی کے ممکنہ ٹھکانے پر تلاش کرنا بہتر سمجھا۔ اس کا ملنا یقینی نہیں تھا اسی سبب ہم نے قبل از وقت کوئی خافتی بندوبست نہیں کیا اور یہی ہماری سب سے بڑی بھول تھی۔ اسے میں بھول بھی کہہ سکتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ تقدیر بھی کہ جسے بدلنا ممکن نہیں۔ بھول بھی ایسی ہولناک بھول کہ ہم نے اپنے اوپر اندھیرے کی چادر تک نہیں اوڑھی۔ ہمیں کوئی بھی جن زاد بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ شاید ان بے احتیاطیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس وقت مجھ پر غصہ اور انتقام سوار تھا۔ غصہ انتقام جو آدم زادوں کی طرح ہم جن زادوں کو بھی ہر قسم کے خوف و خطرے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ مجھ پر ایسی ہی دھن سوار تھی کہ مجھے ہر قیمت پر اس کافر عفریت کو ختم کرنا ہے۔

میں اور سوی، اہرام پہنچ کر ابوالہول کے چٹخنے کے اوپر سے پرداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ رات اب اتنی ہو چکی تھی کہ وہاں دور دور تک کوئی سیاح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم ابھی فرعون منقرع کے اہرام تک پہنچے یہ تھے کہ مانوس بدلو کا تیز جھونکا عقب سے آیا۔ اسی لمحے مجھے سوی کی تیز چیخ سنائی دی اور میں تیزی سے پلٹا۔ لمحے بھر کو جیسے مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ سوی کو اسی کافر عفریت نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

”بھاگ جا میاں سے اے مردہ کی نسل کے بونے!“ عفریت نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اس حسین جن زادی کے طفیل عفریت صاعق تیری جان بخشا ہے۔“ وہ عفریت کہ جس نے مجھے اپنا نام بھی بتا دیا تھا چشم زدن میں سوی کو دوپٹے فرعون منقرع کے اہرام میں داخل ہو گیا۔

شدید غصے اور جذبات انتقام کے باوجود میں اپنے گرد دہرا خافتی حصار قائم کرنا نہیں بھولا۔ میں اگر اکیلا وہاں آیا ہوتا تو سوی کی جگہ اس وقت میں ہی اس عفریت صاعق کی گرفت میں موت کی گھڑیاں گن رہا ہوتا۔

میں دہرا خافتی حصار قائم کر کے منقرع کے اہرام میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اپنے قریب یاسف کو محسوس کر لیا۔ وہ بروقت اپنے وعدے کے مطابق میری مدد کو پہنچ گیا تھا۔

”یاسف! میرے دوست، وہ سو..... سو..... سو کو.....“ میری آواز بھرا مٹی اور میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

”مجھے معلوم ہے اے میرے دوست علیالیش! میں نے دور ہی سے سب کچھ دیکھ اور سن لیا تھا۔“ یاسف نے مجھے دلاسا دیا۔ ”نہ گھبرا اور آ میرے ساتھ! ہم سوی کو بچا لیں گے۔ ہم دو ہیں اور وہ اکیلا۔ اسے ہم خود پر حاوی نہ آنے دیں گے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے یاسف کی آواز پر جوش ہو گئی۔ میں اگر پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو شاید یاسف کے گرد بھی دہرا خافتی حصار قائم کر دیتا۔ پھر یہ کہ یاسف بھی جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ وہ اس جوش میں یہ بھول گیا تھا کہ ایک معمولی

اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے ہوں گے جب میں نے قطعی غیر جذباتی کیفیت میں اپنے ماضی کے رقبہ اقبال کا تصور کیا اور وہ مجھے فوراً ہی نظر آگیا۔ بے ڈول سے جسم والی ایک آدمی زادی، اقبال کی فیض میں بنن ٹانگ رہی تھی۔ میری طرف اس آدم زادی کی پشت تھی۔

”جلدی کرو زگرس“ دکان جانے کو دیر ہو رہی ہے۔“ اقبال کا یہ جملہ سن کر میں چونک اٹھا۔

”فیض پھنے سے پہلے ہی بتا دیتے تو اب تک بنن ٹانگ بچل ہوتی۔“

آدم زادی کی آواز سن کر میرے حواس پر جھٹکا سا ہوا۔ وہ سو فیصد زگرس کی آواز تھی۔ مگر وہ بھدے اور بے ڈول جسم والی زگرس کیسے ہو سکتی ہے؟ اس دوران میں توجہ بٹ جانے کے سبب میرے تصور کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوال یہ ایک وقت گردش کرنے لگے۔ ان میں ایک اہم سوال یہ بھی تھا کیا اپنے محبوب اقبال کی خاطر زگرس نے کوئی ایسا عمل کیا تھا کہ میں اسے تلاش نہ کر سکوں؟ اپنی جناتی صفات بروئے کار لانے اور زگرس تک پہنچنے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے پیاروں کی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور ڈھاکہ سے چل دیا۔ خلاف توقع مجھے زگرس، لاہور یا کسی اور شہر کے بجائے کراچی ہی کے ایک محلے پاکستان چوک میں مل گئی، مگر کاش نہ ملی ہوتی! یہ وہ نازک اندام اور حسین و جمیل آدم زادی زگرس نہیں تھی جس سے میں ایک مدت قبل لاہور میں ملا تھا۔ ہاں اس سے مل کر میری ایک غلط فہمی ضرور دور ہو گئی۔ اس نے میری نظروں سے چھپے رہنے کے لیے خود کو کوئی عمل نہیں کیا تھا۔ یہ ”کارگزاری“ اس کے باپ مولوی کفایت اللہ کی تھی۔ مرتے مرتے مولوی کو میری طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ سو اسی نے ایک ایسا عمل کیا تھا کہ میں زگرس کو نہ ڈھونڈ سکوں۔ پھر مولوی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اپنی موت سے پہلے اس نے اقبال کے باپ سے دوبارہ تعلقات استوار کر کے اقبال کے ساتھ زگرس کی شادی کر دی تھی۔ پھر وہ بیٹی اور داماد کو ساتھ لے کر قیام پاکستان کے ساتھ ہی کراچی آبا تھا۔ غالباً اس کی وجہ بھی میں ہی تھا۔ لاہور کا مکان اور دکان بچ کر دونوں چیزیں کراچی میں خرید لی تھیں۔ مکان تو پاکستان چوک میں اور دکان صدر میں۔ کپڑے کی اس دکان پر اب اقبال بیٹھتا تھا۔ ان تمام باتوں میں سے کچھ تو میں نے خود اپنی جناتی صفات کے ذریعے معلوم کیں اور کچھ کا علم مجھے زگرس سے مل کر ہوا۔ وہ اب پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اسے مجھ سے مل کر بڑی حیرت ہوئی کہ میں اس تک کس طرح پہنچ گیا؟ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ اپنے مرحوم باپ کی حرکت پر اس نے اظہار ملال کیا، میرے لیے یہ بھی بہت تھا۔ مولوی کفایت اللہ کا غم زگرس کی ماں برداشت نہیں کر سکی تھی۔ اگلے ہی مہینے وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ زگرس ایک بھر پور ازدواجی زندگی گزار رہی تھی اور اس پر خوش تھی اس لیے میں اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا۔ اس کا حسن اب صرف اس کی بڑی بڑی خواب ناک آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ رخصت ہونے سے قبل اسے میں نے بتا دیا تھا کہ اب آدم زادوں سے ہمیشہ کے لیے لا تعلق ہو جاؤں گا۔ اس نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے رخصت کیا تھا۔ پھر کراچی سے میرا جی اٹھ گیا۔ میرے پاس جتنا مال و دولت تھی، میں نے مقصود میاں بن کر غریبوں اور مستحقوں میں تقسیم کر دیا۔ میں نے اب اپنی زندگی کا مقصد پایا۔ بندے کی زندگی کا مقصد اللہ کی بندگی ہی تو ہے! سو میں نے بندگی اختیار کر لی اور لاہور میں

”سوی!“ میں چیخا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

معلوم نہیں وہ سوی سے میری محبت کا کرشمہ تھا یا خدا کی مصلحت و قدرت کہ چند لمحوں کو سوی کے ٹھنڈے وجود میں حرارت لوٹ آئی اور اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اے علیالیش! خدا حافظ۔ مجھے تم سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اپنی محبوبہ زگرس کو ضرور تلاش کیجیو۔ کیا خبر اس نے شادی نہ کی ہو اور..... اور.....“

”تو زگرس کی بات چھوڑ اور اپنی کہہ!“ میں جلدی سے بول اٹھا۔ ”میں..... میں تجھے تیرے باپ عزتیل کے پاس ڈھاکہ لیے چلتا ہوں۔ وہ تجھے.....“

”نن..... نہیں اے علیالیش! اب وقت نہیں رہا۔ تو..... تو مجھے لپٹا لے کہ میں..... میں اسی حال میں اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتی ہوں۔“ سوی کی آواز ڈوبنے لگی۔ اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا کہ سوی کا آخری وقت آچکا ہے۔ بے رحم صاعق نے اس کے وجود کو دو نیم کر دیا تھا، کچل دیا تھا۔ میں نے سوی کو خود سے اور قریب کر لیا، اتنا قریب کہ اس سے زیادہ قریب کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھر میں اسے پکارتی رہ گیا اور وہ مجھ سے اتنی دور چلی گئی جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ صدمے سے وقتی طور پر میرے ہوش و حواس معطل ہو گئے اور نہ جانے میں کب تک اسی عالم میں رہا۔ سوی کا مردہ وجود میری آغوش ہی میں تھا۔ حواس بحال ہوئے تو مجھے پہلا خیال سوی کے باپ عزتیل کا آیا۔ وہ ابھی زندہ تھا اور میرا فرض تھا کہ اسے یہ جانکا خبر ضرور دیتا۔ سوی کی تدفین بھی میں نے ڈھاکہ ہی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے وفادار دوست یاسف کے وجود کو بھی میں نے وہاں لاوارث نہیں چھوڑا۔

نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی کہ میں دو جنازے اٹھائے ڈھاکہ پہنچ گیا۔ عزتیل مجھے ایک طرف گھاس پر پڑا دکھائی دیا۔ میں سمجھا کہ وہ محو خواب ہے، سو اسے آوازیں دیں۔ جواب نہ ملے، قریب جا کر اسے میں نے جھنجھوڑا تو چونک اٹھا۔ عزتیل نے ہمیں رخصت کرتے وقت غلط نہیں کہا تھا کہ سوی اور مجھے اب نہ دیکھ پائے گا۔ آج ہی شام جب میں اور سوی اس سے پھڑپھڑتے تھے تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ میرا دل غم سے پھٹنے لگا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے صبر کی دعا مانگی۔ اپنی ہزار سالہ زندگی میں کبھی میری دعا اتنی جلدی قبول نہیں ہوئی جتنی اس وقت ہوئی۔ میری روح کو قرار سا آگیا اور میں نے عزتیل، یاسف اور اپنی سوی کو وہیں جمیل کے کنارے تہ خاک سلا دیا۔ پھر مجھے پولا لگا جیسے اس بھری پری دنیا کی بیڑ میں، میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں وہیں صبح ہونے تک اپنے پیاروں کی قبروں کے قریب بیٹھا رہا۔

اب پہلے تو مجھے ایک مرنے والی کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی محبوبہ زگرس کو تلاش کرنا تھا، پھر عزتیل سے کیا ہوا یہ عہد نبھانا تھا کہ آدم زادوں سے لا تعلق ہو جاؤں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مجھے سوی کی آخری خواہش پوری کرنے کا خیال نہ ہوتا تو میں ہرگز زگرس کو تلاش نہ کرتا۔ سوی کی موت کے بعد دنیا سے میرا جی اٹھ گیا تھا۔ مجھ پر اب یہ منکشف ہوا تھا کہ میں زگرس کی محبت کے حملہ سے نکل کر سوی کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ مجھے علم ہی نہ ہوا کہ کب ایسا ہو گیا؟

داتا صاحب کے دربار پر آکر پڑ گیا۔ یہیں میری ملاقات اللہ کے ایک برگزیدہ بندے حافظ رحمت علی سے ہوئی جنہیں میں نے اپنی سرگزشت اس خیال سے سنائی کہ شاید آدم زادوں کے لیے اس میں عبرت ہو کوئی سامان ہو۔ میں نے اپنے ماضی میں جو گناہ آلود زندگی گزاری ہے، اللہ کی شہادت و روز عبادت کر کے اس سے معافی مانگتا رہتا ہوں کیوں کہ وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، وہ جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔“

☆===== ختم شد =====☆

پاکستانی دفترا
ڈاٹ کام